ترقی کی جڑ:

سب (ترقی) کی جڑ یہی۔
کہ
علم کے خزانوں کو اپنے
قابو میں کرلو۔

سرسید

مجلس ادارت

(تہذیب الاخلاق اور لسانیات)

بانی
سرسید احمد خاں

سرپرست
سید حامد
وائس چانسلر۔ اے ایم یو

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ـــــــ ۶ | جنوری ۱۹۸۷ء | شمارہ ـــــــ ۱

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین

ترسیل زر کا پتہ
ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔ انڈیا

تزئین
سرفراز

قیمت Rs. 3/-

زر سالانہ
انڈیا Rs. 30/-
بیرونی ممالک 20/- $ US ہوائی ڈاک
8/- $ US عام ڈاک

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے بہر حال متفق ہو]

اداریہ

تجربہ کے طور پر کبھی سونے سے پہلے ذرا ہم اپنی دن بھر کی مصروفیات کا جائزہ لیں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ ہم نے کتنا وقت اپنے کام کو ں اسلوبی سے انجام دینے، اپنے پروفیشن میں کمال حاصل کرنے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے میں لگایا ہے اور کتنا فضولیات میں ضائع کیا ہے۔ اگر جائزہ دیانت دارانہ ، تو ہم میں سے بیشتر یہ دیکھ کر تعجب میں پڑ جائیں گے کہ ان کے شب و روز کا زیادہ تر وقت بے مقصد اور بے سود مصروفیات میں گزرا اور صرف ایک قلیل حصہ ہی با مقصد ا ود مند طور پر استعمال ہوا۔

دراصل ہماری پسماندگی اور درماندگی کے بنیادی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری اکثریت کو وقت کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں۔ اور ہم اسے ایسے باد کرتے رہتے ہیں جیسے یہ کوئی انتہائی حقیر اور فضول قسم کی شے ہو۔ ہمیں یہ احساس ہی نہیں کہ وقت ایک ایسا حیات پرور دریا ہے جس کے تصرف پر قدرت نے سب کو ساں حق دے رکھا ہے۔ جس فرد یا گروہ نے ہوشمندی سے اس سے اپنی زندگی کی کھیتی کو سیراب کر لیا، اسے ہی عروج و بلندی ہے اور جس نے اپنی نادانی سے اس ، حقیقت کو نہ پہچانا اس کا مقدر تنزلی اور پستی ہے۔

شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے سونے اور مشغول تفریح دوسرے ضروری کاموں کے لیے اوسطاً بارہ گھنٹے نکال دینے کے بعد بھی ہر انسان کے پاس رہ گھنٹے ایسے بچتے ہیں جنھیں صحیح اور مناسب طور پر استعمال میں لا کر قسمتوں کو بدلا جا سکتا ہے اور انتہائی بلندیوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم ایسا کرنے ہی کیوں لگے۔ ہم نے تو یہ تقریباً قومی شعار بنا لیا ہے کہ رات و دن میں سے تین یا چار گھنٹے سے زیادہ کام میں نہ لگائیں اور باقی وقت کام کے نام پر کسی نہ کسی طرح کاٹیں۔ بات یہاں تک ہے کہ اگر کوئی ترکیب ایسی ہو جس سے یہ چند گھنٹے کام کیے بغیر ہی زندگی کی گاڑی چلتی رہے تو کچھ بعید نہیں جو ہم اتنا وقت بھی کام پر نہ لگائیں۔ ظاہر ہے جب صورت حال یہ ہو تو ہم ان اقوام کے مقابلے میں جن کے افراد ہر روز کم از کم دس سے بارہ گھنٹے تک دلجمعی اور پوری دلچسپی سے کام کرتے ہیں، پسماندہ کیوں نہ ہوں اور وہ ہمارے مقابلے میں دن دو رات چوگنی ترقی کیوں نہ کریں؟

وقت کاٹنے کے لیے ہم نے جن مشاغل اور عادتوں کو اختیار کر رکھا ہے ان میں اوّل وہ مشاغل ہیں جو محض تفریحی نوعیت کے ہیں اور جن پر اگر اوسطاً چند گھنٹے صرف ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ بہرحال تفریح بھی انسان کے لیے ضروری ہے۔ البتہ کچھ لوگ ان مشاغل کی لت لگا لیتے ہیں اور پھر ان کے لیے وقت ایک بے معنی شے بن جاتا ہے۔ بڑی بڑی صلاحیتوں کو ان مشاغل کے چسکا لگنے سے برباد ہوتے دیکھا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر ہماری وہ عادتیں ہیں جو غیر محسوس طور پر وقت کی بربادی کا سبب بنتی ہیں اور جن میں ہماری اکثریت گرفتار ہے۔ اگرچہ یہ عادتیں بظاہر معصوم لگتی ہیں لیکن وقت کی بربادی کا باعث بننے میں کسی طور کم نہیں۔ حجت و تکرار، گفتگو برائے گفتگو، ہر بات پر نکتہ چینی، گپ بازی، افواہ باز ہمہ وقت دوسروں کی ٹوہ، اندیشہ ہائے دور دراز اور بدگمانیوں کے جال بنتے رہنا ایسی ہی عادتیں ہیں۔ ان میں گرفتار لوگوں کے پاس تعمیری اور مفید کام کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں وقت کی ناقدری کا سلسلہ اتنے ہی پر نہیں ختم ہوتا، بلکہ انجانے میں ہم اپنی انہیں عادتوں کی وجہ سے اکثر ان افراد کے وقت کا بھی گلا گھونٹ دیتے ہ طور پر اپنے وقت کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

ب تک یہ شمارہ طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آئے گا، ۱۹۸۶ء کا سورج غروب ہو چکا ہوگا اور ۱۹۸۷ء کے سورج کی کرنیں پھیل رہی ہوں گی۔ اس موقع پر آئیے ہم سب ر اپنی ان عادتوں کو جو وقت کی بربادی کا سبب ہیں ترک کر دیں گے، اور نئے سال کا ایک ایک پل خود اپنی اور اپنے ملک و قوم کی ترقی کے لیے استعمال کریں گے۔

ن الفاظ کے ساتھ ہم ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانات کی طرف سے اپنے قارئین کو نئے شمسی سال کی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اسرار احمد

ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کی سمت ایک قدم

جیسا کہ ان صفحات میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے گزشتہ سال مرکز فروغ سائنس (سینٹر فار پروموشن آف سائنس) قایم کیا ہے جو موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب کی بھرپور سرپرستی میں گوناگوں مشکلات اور مالی وسائل کی کمی کے باوجود مستقل ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اپنی اب تک کی مختصر زندگی میں تعلیمی سروے اور دوسرے کاموں کے علاوہ اس مرکز نے فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور لائف سائنس میں مسلم زیر انتظام اسکولوں اور کالجوں کے ٹیچروں کے لیے چار ریفریشر کورسوں کا انعقاد کیا جس میں ملک کے کونے کونے سے اساتذہ نے شرکت کی۔ اسی دوران مرکز کے تحت ایک آل انڈیا کانفرنس کا بھی انعقاد ہوا۔ جس کا موضوع "ملک میں سائنسی تعلیم ــــ مسلمانوں کے خصوصی حوالے سے" تھا۔ اس کانفرنس کا افتتاح دنیا کے مشہور سائنس داں پروفیسر عبد السلام (نوبل انعام یافتہ) نے کیا تھا اور اس میں ملک کے مشہور سائنس دانوں کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔

یہ عرصے سے محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ ملک کے دینی/عربی مدارس میں بھی کسی نہ کسی سطح پر ریاضی اور سائنس کی تعلیم دی جائے۔ کیوں کہ مسلمانوں کی خواندگی بیشتر انہیں مدارس کی مرہون منت ہے۔ اس سلسلے میں مرکز فروغ سائنس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ان مدارس سے یہ معلوم کیا جائے کہ سائنسی تعلیم کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہے؟ وہ سائنسی تعلیم کو فی زمانہ ضروری سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر ضروری سمجھتے ہیں تو اسے داخل نصاب کرنے میں ان کے سامنے کیا کیا دشواریاں ہیں؟ اس غرض سے مرکز نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے جسے ملک کے تقریباً دو ہزار مدارس کو بھیجا جا رہا ہے۔ اس سوالنامے کے ساتھ وائس چانسلر صاحب کا ایک خط بھی بھیجا جا رہا ہے جسے انھوں نے دینی مدارس کے سربراہوں کے نام لکھا ہے۔ افادیت کے پیش نظر یہ خط اگلے صفحہ پر پیش خدمت ہے۔

تہذیب الاخلاق کے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے قرب وجوار کے دینی مدارس (مکاتب کو چھوڑ کر) سے یہ معلوم کریں کہ وائس چانسلر صاحب کا خط اور سوالنامہ ان تک پہنچا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں پہنچا ہے تو براہ کرم ان مدارس کے نام اور پتے بھیجنے کی زحمت کریں تاکہ انھیں سوالنامہ بھیجا جا سکے اور اگر پہنچا ہے تو وہ ہماری طرف سے ان سے درخواست کریں کہ سوالنامے کو جلد از جلد پُر کر کے روانہ کر دیا جائے۔ اس تعاون کے لیے ہم انتہائی شکر گزار ہوں گے۔

اسرار احمد
ڈائرکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس۔

۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

وائس چانسلر

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمان علومِ جدیدہ خصوصاً سائنسی علوم میں بہ مقابلہ دوسری قوموں کے کافی پیچھے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ا[illegible]
سفر میں وہ گردِ کارواں بھی نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ ملت جس نے لگ بھگ ساڑھے تین سو سال تک دنیائے علم و دانش کی امامت کی
جس نے جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، ابوالوفا، البیرونی، بوعلی سینا اور ابن الہیثم جیسے اپنے دور کے علومِ جدیدہ کے ماہرین پیدا کیے، آج مقتدیوں کی صف میں
نہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ مسلمان یہ کیوں بھول بیٹھے کہ خدا کی کتاب کا علم، علمِ دین ہے تو خدا کی کائنات کا علم سائنس ہے؟ تاریخی اتار چڑھاؤ کا یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کا
پالینا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس معمہ میں الجھ کر وقت نہ برباد کیا جائے بلکہ ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے سائنسی علوم کی بابت
ہندوستانی مسلمانوں کا جمود جلد از جلد ٹوٹ جائے۔

یہ بات اب کھل کر سامنے آچکی ہے کہ نت نئے سائنسی انکشافات کے بطن سے پیدا ہونے والے معاشی، تعلیمی و سماجی انقلاب کے اس دور میں صرف و[illegible]
عالمی برادری میں ایک باعزت مقام کا خواب دیکھ سکتا ہے جو سائنسی علوم سے آراستہ ہو اور جسے ٹکنالوجی پر عبور حاصل ہو۔ اس کے علاوہ

الحکمۃ ضالۃ المؤمن

حکمت مومن کی متاعِ گم شدہ ہے

کے انقلاب آفریں قول کی روشنی میں دنیائے علم و دانش میں منصبِ امامت کی بازیابی ہم پر واجبات میں سے ہے۔

یہ جان کر آپ کو یقیناً خوشی ہوگی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزشتہ سال 'مرکز فروغ سائنس' (سینٹر فار پروموشن آف سائنس) کا قیام عمل میں آ[illegible]
جس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ مرکز مسلمانوں کو سائنس کی اہمیت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ سائنسی مد[illegible]
میں کچھ تربیتی پروگرام کا انتظام بھی کرے گا۔ گو اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک مشکل کام ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل
تو انشاء اللہ اس کام کو بخوبی انجام دیا جاسکے گا۔

اس خط کے ساتھ ہم آپ کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیج رہے ہیں جس کے ذریعے ہم آپ کی درس گاہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں او[illegible]
یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ سائنس کی تعلیم کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس سوالنامہ کو اپنی اولین فرصت میں پُر کر کے منسلکہ لفافہ میں [illegible]
واپس بھیج دیں گے۔ ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ آپ ہمارے اس پروگرام کے بارے میں اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں نوازیں گے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز کیش

[illegible]

سید احمد خاں

خود غرضی اور قومی ہمدردی

پہلا لفظ تو بہت پرانا ہے، مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہیں، مگر یہ پچھلا لفظ شاید چند روز سے پیدا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکم شوال ۱۳۰۱ نبوی کے بعد اس کی پیدائش ہوئی ہے، مگر ضرور ہے کہ پچھلے زمانے میں بھی اس کی جگہ کوئی اور لفظ بولا جاتا ہوگا۔

پچھلے زمانے پر جب ہم نگاہ کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ جدھر جاؤ اُدھر ہزاروں کھنڈرات مسجدوں اور پُلوں اور کنوؤں اور مہمان سراؤں کو پاؤ گے، ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے قوم کے آرام کے لیے مہمان سرائیں بنوائی تھیں، مسجدیں بنوائی تھیں، کنوئیں کھدوائے تھے، پل بنوائے تھے جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے مغرق تھے۔ نرے سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجدوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ چینی کی کامدار سراؤں کے دروازے، مسجدوں کے گنبد تیار کرائے جو آج تک اسی آب و تاب سے موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کیسی بڑی بڑی عالی شان خانقاہیں تعمیر کیں۔ اُن کے بنانے میں لاکھوں روپے خرچ کیے، دیہات معافی کی جاگیریں دے دیے جن کی لاکھوں روپے کی آمدنی قومی ہمدردی میں صَرف ہوتی تھی۔ ہاں! مدرسہ وغیرہ بنانے کا اس قدر خیال نہ تھا، مگر پھر بھی مدرسے جاری کیے تھے۔ جب تاریخ کی کتابوں کی بہت تلاش کرو تو معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کے وقت میں کوئی مدرسہ تھا اور کچھ زیادہ نشان نہیں ملتا۔ دلی کے پرانے کھنڈرات میں تلاش کرو تو اکبر کے عہد میں ماہم انگہ کی بنائی ہوئی مسجد اور اس کے گرد کوٹھریاں پائی جاتی ہیں جس کو لوگ ماہم انگہ کا مدرسہ مشہور کرتے ہیں۔ غالباً اُس میں چند اندھے قرآن حفظ کرتے ہوں گے نہایت مشہور اور پر رونق شاہجہاں کے عہد میں بھی چند لدا ؤں کی کوٹھریاں شاید پچیس تیس ہوں، جامع مسجد کے نیچے بنی ہوئی تھیں جو دارالبقا کے نام سے مشہور تھیں اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہانی مدرسہ تھا اور غالباً جس قدر ادعیہ قُل ختم خواجگان و ختم بخاری اور ختم دلائل الخیرات واسطے سلامتی شاہجہاں کے ہوتے تھے وہ سب اسی میں ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ مدرسوں کے بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ بہت سے طالب علم متفرق مسجدوں میں رہتے تھے۔ تیل بتی اُن کو مطالعے کے لیے ملتی تھی، نذر نیاز، مُردوں کی فاتحہ، سویم، چہلم، بیماروں کے صدقوں کی بہت روٹیاں مسجدوں کے طالب علموں کو مل جاتی تھیں۔ ان کا نمونہ ہمارے زمانے تک بھی موجود تھا۔ فتحپوری اور پنجابی کٹرا اور کشمیری کٹرا کی مسجدوں اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں سے بہت سے طالب علم مُردوں کی روٹیاں کھانے اور فاتحہ درود پڑھنے کو ملتے تھے۔ اب بھی قومی ہمدردی میں کچھ کسر نہیں ہے۔ دیکھو اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں نے کیسی ہمت کی ہے، کس قدر روپیہ خرچ کر کر جامع مسجد دہلی کی مرمت کی ہے۔ دلی کی پرانی عیدگاہ کا چبوترا بڑھایا جاتا ہے اُس کا فرش درست کیا جاتا ہے، تاکہ قوم کو نماز پڑھنے میں زمین کا اُچان نیچان تکلیف نہ دے۔ سہارنپور میں دیکھو کئی لاکھ روپے خرچ کر کر جامع مسجد نئی بنائی ہے اور پرانی مسجد کو چھوڑ دیا ہے۔ دیوبند میں دیکھو کیسی عالی شان مسجد

کی جاتی ہے۔ اس زمانے میں اگلے زمانوں سے بھی زیادہ مدرسے
ری ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھو پنجاب میں کتنے مدارس اسلامیہ جاری
ئے۔ دہلی میں اسلامی مدرسہ جاری ہوا۔ لکھنؤ میں مدرسۂ اسلامیہ
ایم ہوا۔ دیوبند کے مدرسے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ افتخار العلماء د
ز الکملا امام اعظم عہد شیخ زمان وصاحبین دوران مدرس و مہتمم ہیں
مرسہارنپور میں، انبیٹھ میں مدارس اسلامی موجود ہیں۔ غرضیکہ بہت
ی جگہ مدارس جاری ہیں۔ پھر قومی ہمدردی کے لفظ کو نیا لفظ کہنا صحیح
ہیں، ہاں! شاید یہ ترکیب لفظی نئی ہو، مگر اسی مضمون کا پہلے بھی ضرور
وئی لفظ ہوگا جو ہماری یاد سے جاتا رہا ہے۔ جب کہ ہم یہ باتیں سنتے
ور خیال کرتے ہیں تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم لوگوں
یں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے اور اب بھی بہت پائی جاتی ہے
گر جب زیادہ غور کرکے دیکھتے ہیں تو وہ سب دھوکا ہی دھوکا پایا
جاتا ہے (قطع نظر اس بحث کے کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو اس
کی ضرورت ہے یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے) جب
ان لوگوں کے جنھوں نے یہ کام کیے اور کر رہے ہیں دل سے پوچھو تو
معلوم ہوگا کہ وہ یہ تمام کام اس خیالی جوش میں کر رہے ہیں کہ ہم بڑے
ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں
مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جاویں گے اور بہشت میں بڑے
بڑے درجے پاویں گے۔ تاج ہمارے سر پر ہوگا اور ایک موتی کا محل
جنت میں ملے گا، حوریں تصرف کو ہوں گی، جن کو ہمارے سوا کسی نے
چھوا بھی نہیں ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی، بے انتہا
جتنی چاہو۔ غلمان بھی نہایت خوبصورت معلوم نہیں تصرف یا خدمت کو
ملیں گے۔ باغ ہوگا، میوہ ہوگا، نہریں ہوں گی، شراب ہوگی، پئیں گے
اور چین کریں گے اور کہا کریں گے کہ حافظ نے کیسا غلط یہ شعر
کہا تھا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

ہم بھی نہایت ادب اور صدق دل سے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوگا
خدا ہم کو بھی نصیب کرے، مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ سب کام خودغرضی
کے ہیں یا قومی ہمدردی کے۔ کوئی کہے، میں تو نہ مانوں گا کہ یہ کام قومی
ہمدردی کے ہیں۔ یہ تو بالکل ایسے ہی کام ہیں جیسے کہ ایک رند مشرب
دنیا میں اپنی عیشوں کے حاصل کرنے کو کرتا ہے۔ اس میں اور ان
میں اتنا فرق ہے کہ انھوں نے نقد کو نسیہ پر چھوڑا ہے اور دوسرے
جہاں میں ان عیشوں کے حاصل کرنے کی لالچ سے یہ کام کیے ہیں۔ غور
کرنے کی بات ہے کہ باغبانوں سے اپنے چین کے لیے مزدوری
دے کر باغ لگوانا، مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے
لئے محل چنوانا۔ کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لئے شراب کھنچوانا
اور علاوہ اس کے روپیہ خرچ کر کر سامانِ عیش اور لذائذ نفسانی کا
جمع کرنا کیا قومی ہمدردی گنی جاوے گی؟ نعوذ باللہ ہرگز نہیں،
یہ تو عین خودغرضی ہے۔ پھر وہ باتیں جو ثواب کے لالچ سے کی جاتی
ہیں کیوں قومی ہمدردی گنی جاویں گی اور اگر ہم سے پوچھو تو ثواب
بھی نہیں۔ گدھے کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن۔

اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اُسی کام کے کرنے
میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ
نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا
جیشِ اُسامہ کی تیاری کے لئے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیق
نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے
برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سچا اصول مذہب اسلام کا ہے مگر
کوئی بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔

قوم کی حالت اور اسلام کی حرمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے
اُس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے
اپنے خیال کے مطابق جو اپنے ثواب اور دوسرے جہان میں اپنے
چین کرنے کا کام سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا
ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں۔ بلکہ ٹھیٹ خودغرضی ہے اور
امید ہے کہ وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔

آل احمد سرور

تہذیب الاخلاق کا رول کیا ہونا چاہیے

مجھے خوشی ہے کہ جناب سید حامد کی وائس چانسلری کے زمانے میں تہذیب الاخلاق دوبارہ منظر عام پر آیا اور اب سید ہاشم علی صاحب موجودہ وائس چانسلر کی سرپرستی میں یہ استحکام اور ترقی کی منزل میں داخل ہوا ہے۔

میرے نزدیک اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہ رسالہ تعلیم کے مسئلے پر زیادہ توجہ کرے۔ ملک کی نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ہوچکا ہے اور اس پر عمل کے لیے اقدامات کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ سرسید کی تحریک دراصل ایک تعلیمی اور تہذیبی تحریک تھی جس کا ایک شاندار پہلو ایم۔اے۔او کالج اور بعد میں یونیورسٹی کا قیام تھا، مگر تہذیب الاخلاق تعلیم کے ذریعے سے تہذیب کے پرانے تصور کے بجائے اس کے زیادہ جامع، زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصور کو عام کرنے کے لیے جاری ہوا تھا۔ اس لیے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم ملک میں تعلیم کی رفتار، اس کے نتائج اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی تعلیم کے ہر پہلو کو جانچیں پرکھیں اور آئندہ کے لیے لائحۂ عمل مرتب کریں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ملک میں مسلمانوں کے اور بھی ادارے جدید تعلیم کو عام کرنے میں لگے ہوئے ہیں، مگر مجموعی طور پر مسلمان اب بھی تعلیم میں پس ماندہ کہے جاسکتے ہیں پھر ان میں سائنس کی تعلیم اب بھی عام نہیں ہے اور علوم کے نئے گوشوں کی طرف تو توجہ اور بھی کم ہے۔ ایک طور پر یہ تعلیم ان ہی خطوط پر دی جارہی ہے جو آج سے چالیس سال پہلے متعین ہوئے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ نئے نئے طبقے ابھر رہے ہیں، نئے نئے امکانات تلاش کیے جارہے ہیں مگر صنعت و حرفت اور تجارت میں ہم اب تک سب سے پیچھے ہیں۔ اب بھی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں کے لیے تگ و دو جاری ہے۔ سیلف امپلائمنٹ Self Employment کی طرف ہم کم متوجہ ہوئے ہیں۔ سب لوگ ڈاکٹر اور انجینیر نہیں بن سکتے۔ لیکن بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں ابھی گنجائش ہے، ان کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے۔ مسلمانوں میں کاریگر اور ہاتھ سے کام کرنے والے اچھے تھے اب ان کو نئے طریقوں سے آراستہ ہوکر اور چھوٹی مشینوں سے کام لے کر اپنے کام کو آگے بڑھانا اور پھیلانا ہے۔ ہمیں مزید یونیورسٹیوں سے زیادہ بہت سے پالی ٹیکنک قائم کرنے ہیں ہمیں آج کی ضرورت کو دیکھ کر بجلی کا کام کرنے والے، مشینوں کو درست کرنے والے Plumbing کا کام کرنے والے ریفریجریشن Refrigeration کا کام کرنے والے چاہئیں ان کے لیے ہائی اسکول یا بارھویں درجے تک تعلیم کافی ہوگی، پھر انھیں کوئی پیشہ سیکھنا ہوگا، جن کے سہارے یہ اپنی روزی کما سکیں۔ یونیورسٹیوں میں ہجوم کو کم کرنا ہوگا۔ یہاں صرف اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں کو آنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اداروں میں کام اور صرف کام کی عادت ڈالنا ہوگی، ان کے استادوں کو بھی سستی سیاست اور ہنگامہ آرائی سے دور رکھنا ہوگا۔ پھر ہمیں اس پر اصرار کرنا ہوگا کہ ابتدائی منزل پر قرآن پاک اور

دو زبان سے ضرور واقف ہوں، خواہ ان کی مادری زبان کوئی
ر زبان ہو۔ اردو ہندستان کی ایک قومی زبان ہے اور
ں کے ساتھ مسلمانوں کی تہذیبی زبان بھی۔ اگر سرکاری اسکولوں
ں اردو کی تعلیم کا انتظام تنگ نظری یا بے نیازی کی وجہ سے
ہیں کیا جاتا تو ہمیں خود یہ انتظام کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہماری
کوشش بھی ہونی چاہیے کہ اس وقت جو دینی مدارس ہیں ان میں
انگریزی اور سائنس کی ابتدائی تعلیم کا بھی انتظام ہو۔ ہمارے
س آج بھی اعداد و شمار کی کمی ہے — اس لیے تہذیب الاخلاق
کے ہر شمارے میں کسی نہ کسی علاقے کی تعلیمی حالت کا جائزہ اور
س کے لیے مستند اعداد و شمار ضرور ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں
کے اداروں کا جائزہ الگ ہو اور سرکاری یا نیم سرکاری ادارے
جن میں مسلمان طالب علم پڑھتے ہیں ان کا جائزہ الگ۔ اس کے
ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم نئی تعلیمی پالیسی کے ہر پہلو کا الگ الگ
جائزہ لیں۔ عمومی نقطۂ نظر سے بھی اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے
بھی۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں جو سفارشات کی گئی ہیں ان کی
خوبی اور خامی کیا ہے؟ ثانوی منزل پر یہ تجاویز کس حد تک
ہمارے درد کا مداوا ہیں؟ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر کیا تصویر
سامنے آتی ہے؟

تہذیب الاخلاق کو دلچسپ بنانے کی نہیں اور
مفید بنانے کی ضرورت ہے اور یہ مفید باتیں ایسے اسلوب
میں پیش کی جاسکتی ہیں جو لوگوں کو متاثر کرسکے۔

تہذیب الاخلاق کو آج نیا ذہنی انقلاب لانا ہے، جس کے ذریعے
سے ہماری نئی نسل اپنی جڑوں اور بنیادوں سے واقف ہو۔
اپنی تاریخ اور تہذیب سے آشنا ہو اور نئے دور کی ضروریات
کو سمجھ کر ان کے لیے اپنے کو تیار کرسکے۔ ابھی سے یہ دیکھنے میں
آ رہا ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوان صارفیت — con-
sumerism — کے جال میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ انھیں قدروں
کا احساس دلانا ہے، اُن میں اسلام کی روح، تہذیب اخلاق
انسانیت کی قدروں اور عالمی معیاروں کا احساس عام کرنا ہے
سائنسی معلومات کو اور بڑھانا ہے اور اس کے ساتھ جمالیاتی پہلو
اور ادب کی قدروں کا عرفان بھی عام کرنا ہے۔ تہذیب الاخلاق کو
اس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے کہ مسلمان سائنس اور جدید علوم
میں پیچھے کیوں ہیں؟ ملکی اور عالمی سطح پر اُن کا نام اعزاز پانے
والوں کی فہرست میں اتنے کم کیوں ہیں؟ وہ جدید دور سے اب
بھی خائف کیوں ہیں؟ اس پر اپنا نقش ثبت کیوں نہیں کرسکے
تہذیب الاخلاق میں ہر نئے سائنسی کارنامے، نئے علمی و ادبی انکشاف
کی اہمیت نوجوانوں تک پہنچانے کی کوشش اور تیز ہونی چاہیے —
تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے ہم سچی دانشوری، ذہنی بیداری،
قدیم سے آگہی اور جدید میں شرکت، ان سب کاموں کو انجام
دے سکتے ہیں، جنھیں ایک مقدس فریضے کی طرح انجام
دینا چاہیے۔

اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں
کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی
اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے
ہیں، ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر، بہ نسبت ان کے جو قوم
کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں، بہت
زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محبِّ وطن اور
محبِّ قوم ہیں۔

سرسید

سیّد حامد

حاصلِ زندگی

حاصلِ زندگی دلہن بنی ہوئی عمارتیں نہیں ہیں، نہ اُن کو سجانے والا ساز وسامان، نہ مال وزر، نہ وہ حُسن جو دلفریب اور دلربا ہے، نہ وہ اختیار اور اقتدار جو مٹنے کے لیے بنا ہے۔ حاصلِ زندگی نہ وجاہت ہے، نہ صحت، نہ منصب، نہ مرتبہ، نہ شان وشوکت، حاصلِ زندگی وہ لمحات بھی نہیں جو دو محبت سے دھڑکتے ہوئے دلوں کو قریب لاتے ہیں، دیرینہ خوابوں کی تعبیر کے روپ میں۔ اور نہ محبت اور فخر کی وہ چمک جو ہونہار بیٹیا ماں کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔ حاصلِ زندگی وہ عبادت بھی نہیں، جو عابد کو دنیا ومافیہا سے بے خبر بنا کر تھوڑی دیر کے لیے معبود کی ذات میں گُم کر دیتی ہے۔

حاصلِ زندگی وہ لمحات ہیں جو دوسروں کے لیے صَرف ہوئے وہ قدم ہیں جو دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے اُٹھائے گئے وہ قربانیاں ہیں جو دوسروں کی خاطر کی گئیں، وہ جرأتیں ہیں جو مظلوموں کے تحفظ کے لیے بروئے کار آئیں، وہ خدمت ہے جس نے غرض کی شکل نہیں دیکھی، وہ پسینہ ہے جو محتاجوں کے لیے بہایا گیا، وہ اختراعات ہیں جنھوں نے انسان کی کلفتیں کم کیں، وہ تحقیقات اور انکشافات ہیں جنھوں نے بیماریوں کا راستہ روکا، امن اور صلح راست روی، ہمدردی اور رحم کے وہ پیغام ہیں جنھوں نے انسان کو خونخواری، درندگی اور ظلم سے دور رکھا۔ حاصلِ زندگی وہ ریاضتیں اور کاوشیں ہیں جن کی بدولت علوم پھلے پھولے اور تسخیر فطرت کے برگ وبار لائے۔ حاصلِ زندگی وہ میٹھے بول ہیں، و[illegible] مسکراہٹیں، وہ شرافتیں اور ملنساہتیں ہیں جو دلوں کی کلی[illegible] کو بادِ صبا اور خورشید کی پہلی کرنوں کی طرح کھلاتی ہوئی چل[illegible] ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی نرم رویاں اور خیر خواہیاں ہیں، جن[illegible] اثر سے دلوں کی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، حاصلِ زندگی وہ لمح[illegible] ہیں جو کسی کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے یا کسی ٹوٹے ہوئے د[illegible] جوڑنے میں خرچ ہوئے۔ اس فیصلے کی جرأت ہے جو انصاف[illegible] راہ میں عزیزوں اور قریبوں کے خلاف کیا گیا۔ وہ انصاف[illegible] جس نے دشمن کے حق کو تسلیم کیا، حاصلِ زندگی وہ ہمت ہے اس جگہ "نہیں" کہلواتی ہے جہاں 'ہاں' کہنے میں سلامتی[illegible] عافیت ہو، آسائش ہو، ترقی ہو۔ حکمراں اور افسر اور بر[illegible] سامنے حق گوئی کی طاقت ہے۔ حاصلِ زندگی ہر وہ نیکی ہر وہ[illegible] ہر وہ محنت اور ہر وہ کام ہے جو صلہ کی امید کے بغیر خلقِ خدا[illegible] بھلائی اور اس کی دلدہی اور دل آسائی کے لیے کیا جائے حاصلِ زندگی وہ تھوڑا سا وقت ہے جو فرائضِ منصبی کے اد[illegible] کے بعد فرصت کے لمحات سے نکال کر تعلیم یا تربیت، ہدایت[illegible] دستگیری میں صَرف کیا جائے۔ اصل زندگی مخلوق کی بھ[illegible] لیے اللہ کی راہ میں کیا جانے والا ہر کام ہے۔

احمد رشید شیروانی

کوشش کی گئی تو بڑھنے لگے

مغربی بنگال کے چار مسلم بوائز ہائی اسکولوں سے ۱۹۸۶ء کے نتائج آئے ہیں۔ فی الحال ہم پورے نتائج پر تبصرہ نہیں کر رہے ہیں۔ چند اور نتائج آجائیں تو تبصرہ شروع کریں گے۔ البتہ ان چار اسکولوں میں صرف فرسٹ ڈویژن کی تعداد کو دیکھیے۔

۱۹۸۱ء میں ان چار اسکولوں سے ملا کر چار عدد مسلم بچوں نے مادھیمک بورڈ امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ اوسطاً فی اسکول صرف ایک عدد ملت کے لاڈلے میاں فرسٹ ڈویژن لا پائے تھے۔ بس۔ اگلے سال یعنی ۱۹۸۲ء میں یہ تعداد گھٹ کر صرف تین رہ گئی۔ یعنی اوسطاً فی اسکول پورے ایک عدد بھی نہیں بلکہ صرف پون عدد ملت کے لاڈلے میاں فرسٹ ڈویژن لائے تھے۔

خیر ۱۹۸۳ء میں تعداد بڑھ کر چھ ہوگئی یعنی اوسطاً فی اسکول ڈیڑھ عدد ملت کے لاڈلے میاں فرسٹ ڈویژن لے آئے۔ ماشاء اللہ۔ لیکن ۱۹۸۴ء میں تعداد پھر گر کر چار عدد رہ گئی۔ یعنی اوسطاً فی اسکول وہی ایک کا ایک رہا جو ۱۹۸۱ء میں تھا۔ گویا ۱۹۸۱ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک مغربی بنگال کے مسلم ہائی اسکولوں سے فرسٹ ڈویژن لانے والے فرزندان ملت کی تعداد کبھی ذرا سی گھٹتی۔ کبھی ذرا سی بڑھ گئی تو پھر ذرا سی گھٹ گئی۔ یہی ہوتا رہا۔ یعنی ترقی کا کوئی رجحان نہیں تھا بلکہ ایک سطح پر معاملہ اٹکا ہوا تھا۔ ذرا سی برائے نام گھٹتی یا بڑھوتری ہوتی رہتی تھی۔

پھر کیا ہوا؟

۱۹۸۴ء میں پہلی بار مغربی بنگال کے مسلم ہائی اسکولوں کے نتائج منگوائے گئے، چھاپے گئے۔ ہونہار ترین طلباء کو کچھ چھوٹے موٹے انعامات پیش کیے گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ خوب شور مچایا گیا کہ یہ دیکھیے اس اسکول سے اتنے نونہالان امت فرسٹ ڈویژن لائے۔ اہا ہا۔ واہ۔ وا اور وہ دیکھیے فلاں اسکول سے ان ان صاحبزادوں نے اتنے اتنے مارکس حاصل کیے۔ سبحان اللہ۔ اور جناب تعداد اتنی کم کیوں ہے؟ زیادہ ہونا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس اتنا کرنے سے ہی فرسٹ ڈویژن کی تعداد ۱۹۸۵ء میں دس ہوگئی اور ۱۹۸۶ء میں پندرہ ہوگئی۔

مغربی بنگال کے چار مسلم بوائز ہائی اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن

اسکول کا نام	سنہ ۸۶ء	سنہ ۸۵ء	سنہ ۸۴ء	سنہ ۸۳ء	سنہ ۸۲ء	سنہ ۸۱ء
ہوڑہ ہاٹ بوائز سیکشن	۷	۴	۴	۴	۱	—
مومن کلکتہ ۱۴	۴	۳	—	—	۱	۲
رانی گنج ضلع بردوان	۳	۱	—	۲	۱	—
پارک سرکس ۱۷	۱	۲	—	—	—	۲
چاروں ملا کر	۱۵	۱۰	۴	۶	۳	۴

سید علی راشد کاظمی

کمپیوٹر اور انسان

انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے کہ انسان لکھنا پڑھنا جانتا ہے اور اپنی تحقیقات اور اپنا علم آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے تحریری صورت میں چھوڑ جاتا ہے۔ جب کہ یہ کام حیوان نہیں کر سکتا اسی لیے تحریر کو انسان کی دیگر تمام ایجادات کی ماں تصور کیا جاتا ہے۔ یہ تحریر ہی کا کارنامہ ہے کہ علم و دانش کے بیش بہا خزانے تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ انسان کا تحریری ریکارڈ لائبریریوں، فائلوں، دفتروں اور گھروں میں جمع ہو رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف سائنس کے ذریعے ہر سال ساٹھ لاکھ نئے حقایق سے پردہ ہٹایا جاتا ہے اور ان حقایق کے بارے میں نہ جانے کتنے لاکھ نئے مضامین لکھے جاتے ہوں گے۔ لیکن اصل مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور تحریری ریکارڈ میں اسی طرح اضافہ ہوتا چلا گیا تو اسے رکھنے کے لیے کہیں جگہ نہیں ملے گی اور اس خطرے کو سائنس دانوں نے بھانپ لیا ہے اور اس کا علاج انھوں نے جو دریافت کیا وہ ہے کمپیوٹر۔ کتاب اور کمپیوٹر میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں معلومات جمع اور محفوظ رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کتاب کی معلومات ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب کہ کمپیوٹر وہی معلومات ایک سینٹی میٹر مربع سلیکون پر منتقل کر سکتا ہے۔ آگے چل کر جب تحریر کی ضرورت باقی نہیں رہے گی تو پرنٹر ہوں گے نہ پبلشر، اور نہ کتب فروش۔ کمپیوٹر میں منتقل شدہ کتابیں اتنی چھوٹی ہوں گی کہ لفافوں میں ڈال کر بھیجی جا سکیں گی اور انھیں کیبل یا مائیکرو ویو کے ذریعے بھیجا جا سکے گا۔ پھر لطف یہ کہ ان کی قیمت بہت کم ہو گی کہ ہر شخص انھیں خرید سکے گا اور خود اپنی لائبریری بنا سکے گا۔ کمپیوٹر کے ذریعے کتابوں کے صفحات ایک ایک کر کے اس کی اسکرین پر آ جائیں گے اور اس اسکرین کو مرضی کے مطابق چھوٹا یا بڑا کیا جا سکے گا۔ یہاں تک کہ اگر ہم چاہیں تو یہ اسکرین یا پردہ ہماری ہتھیلی کے برابر ہو جائے گا۔

کمپیوٹر اور ذہانت

یقیناً کمپیوٹر میں ذہانت پیدا کی جا سکتی ہے جو انسان کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ذہانت کی ماہیت کیا ہے اس کا انحصار چھ عوامل پر ہے۔

۱۔ اول حواس، جن سے اپنے ماحول کی اطلاعات حاصل کرتے ہیں اور ان کی بنا پر اپنا ردّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ سامنے سے کوئی ٹرک آ رہا ہے تو ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ یہ حواس جتنے طاقتور ہوتے ہیں اتنی ہی ذہانت کی سطح بلند ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کا ردّ عمل کمپیوٹر بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً برطانوی سائنس داں گرے والٹر نے ایک ایسا متحرک کمپیوٹر ایجاد کیا ہے جو روشنی کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگر اس پر

روشنی پڑتی ہے تو یہ کھلونا متحرک کمپیوٹر روشنی سے دور بھاگتا ہے اور جہاں سایہ ملتا ہے، وہاں رُک جاتا ہے۔ کیا یہ اس کی حس صلاحیت، ذہانت کی نشانی نہ تھی؟

۲۔ ذہانت کی دوسری قسم معلومات جمع کرنا ہے۔ ہم جتنی بھی معلومات اپنے حواس سے جمع کرتے ہیں، وہ دماغ کے بنک میں رکھے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت بروئے کار لاتے ہیں کمپیوٹر میں بھی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے جو معلومات حاصل کرتے ہیں وہ اپنی یادداشت کے بنک میں جمع رکھتے ہیں اور پھر جس طرح کا پروگرام مرتب کیا جائے وہ اسی معلومات کی بنا پر عمل کرتے ہیں۔

۳۔ ذہانت کی تیسری قسم یہ ہے کہ ماحول سے اطلاعات ملتے ہی ردعمل شروع ہو جائے۔ اور یہاں ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسانی ذہن جتنا وقت ردعمل کرنے میں لیتا ہے، اس سے لاکھوں گنا کم عرصے میں اور برق رفتاری سے کمپیوٹر کام کرتا ہے۔

۴۔ ذہانت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ وہ ماحول سے بیک وقت کتنی قسم کے اثرات قبول کرتا ہے۔ دماغ کے مقابلے میں کمپیوٹر کی صلاحیت کہیں زیادہ ہے اور قابل اعتماد بھی۔

۵۔ ذہانت کی پانچویں خصوصیت کارکردگی ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی انسانی دماغ کے مقابلے میں کمپیوٹر کی کارکردگی کہیں زیادہ قابل اعتماد اور درست ہے۔

۶۔ ذہانت کی چھٹی خصوصیت دائرہ کار کی وسعت ہے۔ کمپیوٹر کے بنک میں ہزاروں چیزیں رکھی جا سکتی ہیں، اس کے علاوہ اس کا دائرہ کار بھی وسیع کیا جا سکتا ہے۔

یہی چھ عوامل مجموعی طور پر انسان اور حیوان کی ذہانت کا تعین کرتے ہیں اور اگر یہ سب صلاحیتیں "کمپیوٹر" میں موجود ہوں تو اسے کیوں نہ "ذہین" کہا جائے۔

"سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فطرت کو سمجھا جائے اور اس پر قبضہ حاصل کیا جائے اور یہ بھی کہ آدمی حقیقتوں کو جانے اور توہمات کی بندش سے رہائی حاصل کرے۔ خیالات اور طبیعت میں آزادی پیدا کرے اور محض اختیار و حکم کا غلام بن کر نہ رہ جائے سائنس نے ذہنی آزادی کا اعلان عام کیا ہے اور انسانی خیالات کی وسعتوں کو ترقی دے دی ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنس کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔"

سر شاہ سلیمان

محمد عمران قریشی

سورج اور اس کی موت

ایک سیاہ اور کالی رات کو ہزاروں چمکدار ستارے آسمان پر دکھائی دیتے ہیں لیکن دن کے وقت آسمان پر صرف ایک چیز دیکھی جاسکتی ہے اور وہ ہے سورج اس لیے کہ سورج کی تیز اور چمک دار روشنی ستاروں کی روشنی پر غالب آجاتی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ سورج کی روشنی زمین تک پہنچنے میں صرف ۸٫۳ منٹ صرف کرتی ہے جب کہ زمین سے سب سے قریبی ستارے Proxima Centauri کی روشنی کو زمین تک پہنچنے کے لیے چار سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

سورج کی عظمت اور شان و شوکت نے ابتدائی دور کے مشاہدین کو ان راہوں پر بھٹکا دیا جن کی رُو سے وہ سورج کو ایک خاص قسم کا ستارہ سمجھتے تھے لیکن اب ماہر فلکیات اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ سورج ایک لاکھ ملین ستاروں کا اوسط نمائندہ ہے جو کہ ہماری کہکشاں بناتے ہیں اور یہ کہکشاں ان لاتعداد کہکشاؤں میں سے ایک ہے جو ہماری کائنات میں پائی جاتی ہیں۔

سورج اور زمین کا موازنہ کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ سورج زمین سے بہت بڑا اور دیوقامت ہے۔ اگر سورج کائنات کے ہلکے ذرّات یعنی ہائیڈروجن Hydrogen اور ہیلیم (Helium) پر مشتمل ہے لیکن اس کا باوجود اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۰ گنا زیادہ ہے جب کہ اس کی کمیت زمین کی کمیت سے ۳۰۰،۰۰۰ گنا زیادہ ہے۔

سورج کی کیمیائی ساخت

۱۸۳۵ء میں ایک اعلیٰ فرانسیسی فلاسفر Auguste Comte نے رائے دی کہ انسان کبھی بھی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ سورج اور دیگر ستاروں کی ساخت اور تناسب دریافت کرسکے لیکن صرف ۲۵ سال بعد دریافت کرنے کا عمل شروع ہوچکا تھا۔

۱۸۶۰ء میں جرمن ماہر طبعیات رابرٹ کرچاف گستاو نے سب سے پہلے سوڈیم (Sodium - Na) اور پھر دیگر عناصر سورج میں دریافت کیے۔ Kirchhoff ایک سال پہلے Bunsen - spectroscopy دریافت کرچکا تھا جو ایک ایسی تیکنک ہے جس کے ذریعے کسی چیز سے خارج شدہ روشنی کی شعاع کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی کیمیائی بناوٹ معلوم کی جاسکے۔ دیگر ماہرین طبعیات بھی اس تحقیق میں شامل ہوگئے اور ۱۸۶۸ء میں ہائیڈروجن دریافت ہوئی۔ چھ سال بعد ایک نامعلوم گیس (۱۸۹۰ء تک زمین پر نامعلوم) دریافت ہوئی جس کا نام ہیلیم رکھا گیا جو کہ یونانی لفظ ہیلیون سے ماخوذ ہے جس کا نام "سورج" ہے۔ سائنس داں بغیر کسی تناسب کے یہ تمام عناصر سورج میں دریافت کرچکے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد تک یہ تمام تکنیکیں کافی حد تک ترقی یافتہ ہوچکی تھیں جن کی رو سے ہائیڈروجن سورج کی کمیت کا ۷۰٪، ہیلیم ۲۸٪ اور تمام باقی عناصر ۲ فیصد ہے۔ اس وقت تک ستاروں کی روشنی کے تجزیے سے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ ان کی روشنی بھی کیمیائی طور پر سورج سے ملتی جلتی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ سورج کو سمجھنے سے دوسرے ستاروں کے بارے میں معلومات مہیا ہوسکتی ہیں۔

۱۹۳۸ء کے آخر تک ایک سوال مسلسل ماہرین فلکیات کو پریشان کرتا رہا ہے کہ سورج کے دہکنے اور چمکنے کا سبب کیا

سدیوں سے سائنس داں جانتے چلے آرہے تھے کہ سورج
مت رکھنے والے جسم کو اگر اس طرح جلایا جائے جس طرح
ا ڈھیر یا کوئلے جلتے ہوں تو ان کو چند ہزار سالوں میں انگارے
ن میں تبدیل ہو کر راکھ ہو جانا چاہیئے۔

۱۹ ویں صدی کے دوران جب ماہرین ارضیات نے Fossils
ے دریافت کیا کہ زمین کی عمر کا اندازہ ہزاروں ملین سالوں
یا جاسکتا ہے تو ماہرین فلکیات نے بھی محسوس کیا کہ سورج بھی
سی عمر کا ہوگا۔ لہٰذا سورج کی توانائی کے ذرائع بھی اتنے لمبے عرصے
توانائی مہیا کرنے کے قابل ہوں گے۔

اس توانائی کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے جو نظریہ پیش کیا گیا
تھا کہ سورج آہستہ آہستہ سکڑ رہا ہے اور یہ عمل سورج میں شدید
پیدا کر رہا ہے۔ یہ نظریہ اس رائے سے ملتا جلتا تھا جس کی رُو
رج اور سیارے ابتدا میں گیس کے سکڑتے ہوئے غبار سے
ہوئے تھے۔ مزید برآں سورج کے قطر میں سکڑنے کے عمل کا اندازہ
سالوں میں ۱۰۰ ایک میل لگایا تھا۔

اس نظریے کے چند نقائص تھے ان میں سے ایک نقص یہ تھا
لنے کے عمل نے اتنی سست رفتاری کے باوجود سورج (اور زمین)
ملین سالوں سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب جگہ نہیں دی تھی
مسئلے نے اس وقت شہرت پائی جب اس صدی کے شروع
زمین کی چٹانوں کی مسلسل تابکاری نے اپنی معلوم کی ہوئی عمر کا
و کار بڑھا کر ہزاروں ملین سالوں تک کر لیا۔ آخر اس مسئلے کا حل
نیوکلیئر ماہر طبیعات نے مہیا کیا۔

۱۹۲۰ء کے دوران جب ماہرین طبیعات آہستہ آہستہ ایٹم کے اندر
شان توانائی کے ممکنہ ذخائر سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے یہ گمان کیا
اید سورج کے مخفی رازوں سے بھی پردہ اٹھ گیا ہے۔ اس گمان کو
۱۱ میں ٹھوس نظریاتی ثبوت جرمن سائنس داں ہنس بیتھ
راہم کیا۔ انھوں نے سورج میں نیوکلیئر تعاملات کی تفصیلی طرح لگائی
ل طور پر سورج سے خارج ہونے والی توانائی کی بنیاد
۔ اب ان تمام اور بعد کے مشاہدات سے سائنس داں سورج کی
مکمل اور قابل فہم تصویر بنا چکے ہیں۔

عظیم نیوکلیئر ری ایکٹر

سورج ایک نیوکلیئر بھٹی ہے جس میں ....,....۱۵ سینٹی گریڈ ڈگری
درجہ حرارت پر ہائیڈروجن گیس ہیلیم میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس عمل کو فیوژن کہتے
ہیں۔ چار ہائیڈروجن ایٹموں کے نیوکلیائی (Nuclei) (نیوکلیس کی
جمع) آپس میں مدغم ہو کر ہیلیم ایٹم کا ایک نیوکلیس پیدا کرتے ہیں۔ یہ
ہیلیم ایٹم چار ہائیڈروجن نیوکلیائی سے جزوی طور پر وزن میں کم
ہے اور "باقی" (گمشدہ) مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ
توانائی ہے جو سورج کو طاقت دیتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عمل ہائیڈروجن
بم کی توانائی پیدا کرتا ہے۔ لیکن سورج اتنا وزنی اور بھاری ہے کہ
اس کی اپنی کشش کی قوت اپنے اندر موجود توانائی کو باہر آنے سے
روکے رکھتی ہے۔ یہ حساب لگایا گیا ہے کہ سورج کو اتنا دہکانے
اور چمکانے کے لیے جتنا کہ وہ چمک اور دہک سکتا ہے ہر سکنڈ میں ۶۰
کروڑ ٹن ہائیڈروجن مستقل ہیلیم میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس حیرت
انگیز اعداد و شمار کے باوجود سورج میں اتنی ہائیڈروجن موجود ہے
جو اس کو ۵۰۰ کروڑ سالوں تک جلائے رکھنے کے لیے کافی ہے۔ توانائی
سورج کے core سے سطح تک پہنچنے کے لیے جو وقت لیتی ہے وہ تقریباً
۳۰ ملین سال ہے core سے سطح تک راستے کا ۳/۴ حصہ توانائی
Radiation کی صورت میں بہہ کر طے کرتی ہے۔ یعنی توانائی
ایک ایٹم سے دوسرے ایٹم کے ذریعے گزرتی ہے جب کہ راستہ توانائی
Convection کے ذریعے طے کرتی ہے۔

سورج کی نظر آنے والی سطح جس کا درجہ حرارت ۵,۵۰۰
سینٹی گریڈ ڈگری ہے، Photosphere کا نام دیا گیا
ہے جس کا مطلب "روشنی کا گولا" ہے۔ یہ اتنا روشن اور چمکدار
ہے کہ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے براہ راست مشاہدہ کرنے سے آنکھیں
بینائی سے محروم ہو سکتی ہیں۔ ماہرین فلکیات سورج کی شبیہ پردہ
پر ڈال کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں اگرچہ Photosphere باقی سورج
کی طرح ٹھوس نظر آتا ہے مگر یہ گیس سے بنا ہے۔ درحقیقت
Photosphere زمین کی فضا سے بھی ۱۰,۰۰۰ گنا کم ٹھوس ہے

Photo Sphere مختلف چوڑائی کی پٹیوں کے ساتھ مختلف رفتار
میں گردش کرتا ہے Photo Sphere میں گیس مستقل طور پر کھولتی رہتی
ہے جس کی وجہ سے سورج دانہ دار شکل کا ہے اور ہر دانہ درحقیقت
انگلستان کے سائز جتنا ہے۔

سورج کے فوٹو گراف میں چند کالے دھبے نظر آتے ہیں جنہیں
سن اسپاٹ (Sun Spot) کہا جاتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے یہ ایک چوڑا
مگر کم گہرا گڑھا ہوتا ہے جو فوٹو سفیر (Photo Sphere)
میں پایا جاتا ہے۔ اس گڑھے کے درمیانی حصّہ کو امبرا (Umbra)
کہتے ہیں۔ اس کا چوتھائی سے کم حصّہ اتنا روشن ہوتا
ہے جتنا کہ سورج کی ملحقہ سطح ہوتی ہے۔ Sun Spot
اکثر گروہوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ ہمیشہ شدید گرم
مقناطیسی فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی Sun spot کی مقناطیسی فیلڈ اچانک جواب دے
جاتی ہے جس کے نتیجے میں توانائی آتش فشاں کی طرح پھٹ جاتی ہے
اس کا نام Solar Flare یعنی تیز شمسی روشنی ہے یہ Solar
Photo Sphere Flare کے آگے تک ۱۶۰،۰۰۰ کلومیٹر (۱۰۰،۰۰۰ میل)
تک پہنچ جاتی ہے یہ Flare طاقتور مقناطیسی فضا میں پھینکتے ہیں
جو کہ زیادہ تر الیکٹران اور پروٹان کی شکل میں ہوتی ہیں اور اپنی
خلقی قوت کی وجہ سے خلابازوں کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہیں۔
یہ ذرّات زمین کی مقناطیسی فیلڈ میں داخل ہو کر دلکش فضائی روشنیاں
بنا سکتے ہیں جن کو Aurorae کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لمبے
فاصلے کے ریڈیو مواصلاتی نظام کو مکمل طور پر ختم کرسکتے ہیں۔

فضا کی طرح Photo Sphere کے اردگرد گیس کی ایک تہہ ہے
جسے Chromosphere کہتے ہیں۔ یہ تقریباً ۱۶۰۰ر۸۰۰ کلومیٹر
تک کثیف اور ٹھوس ہے Chromosphere, Corona کو
جگہ دیتا ہے جہاں سورج چیزوں کو اپنا شروع کردیتا ہے، وہاں
پتلا سا ہالۂ نور پھیل جاتا ہے Corona کی ہلکی روشنی عام طور پر
Photosphere کی چمکدار روشنی کی وجہ سے واپس کر دی جاتی ہے
Chromosphere کی طرح یہ بھی صرف آلات کی مدد
سے دیکھے جاسکتے ہیں یا مکمل سورج گرہن کے وقت بھی دیکھا جاسکتا ہے
وہ گیسیں جو Corona کو بناتی ہیں شمسی نظام سے باہر نکل کر Solar
wind بنا دیتی ہیں Solar wind کی موجودگی کی تصویری
شہادتیں دم دار ستاروں کی دم مہیا کرتی ہیں جو کہ سورج کے
corona سے مستقلاً بہنے والے ایٹمی ذرّات کی کشش کی وجہ سے چمکتے
ہیں۔

شمسی ابھار SOLAR PROMINENCE

جلتی ہوئی گیس کے شوخ ابھار Prominence کہلاتے
ہیں اور یہ بعض اوقات Corona سے Photo Sphere تک پہنچ جاتے
ہیں۔ ان ابھاروں کو مقناطیسی فیلڈ قابو کرتی ہے جو کہ سورج کی
سطح سے کھینچتی ہے۔ Photo Sphere پر جہاں Sun spot اکٹھے
بنتے ہیں ان میں ایک شمالی مقناطیسی قطب کا جب کہ دوسرا جنوبی قطب
کا کام کرتا ہے اور ابھار اُن کے درمیان بنتے ہیں۔

سورج کی حیرت اور عجیب الشان طاقت کے باوجود بالآخر
ممکن ہے کہ اب سے ۵،۰۰۰ ملین سال تک سورج کے Core میں
ایندھن کی کمی کی وجہ سے یہ مرنا شروع ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا
تو سورج ایک لال دیوہیکل ستارے کی شکل میں سُوج جائے گا
اور اس وقت اس کا سائز موجودہ سائز سے ۲۵۰ گنا زیادہ ہوگا
اور یہ زمین کو نگل لے گا۔ یہ سورج بعد میں اپنی بیرونی تہوں کو ختم
کر کے پست قامت سفید ستارہ بن جائے گا۔ پھر ہزاروں ملین
سالوں بعد یہ ٹھنڈا ہو کر آخر کار غائب ہو جائے گا۔

سورج بحیثیت "لال دیو ہیکل ستارہ"

جب سورج لال دیوہیکل ستارے کی شکل میں پھول جائے گا تو
یہ بہت زیادہ روشن ہو جائے گا چند سو ملین سالوں کے اندر پھولا ہوا
ستارہ اور پھول جائے گا اور اس کا قطر موجودہ قطر سے ۱۰۰ گنا زیادہ
ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ۱۰۰۰۰ گنا زیادہ روشنی اور
حرارت خارج کرے گا۔

سورج کی لال دیوہیکل جسامت زمین کے ماحول کے لیے خوفناک
نتائج کی حامل ہوگی اور زمین پر تمام ذی روح اشیاء تباہ ہو جائیں گی۔

- بہرحال ابھی اور ڈراماتی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ لال دیو ہیکل
ستارے کی بیرونی تہیں مہین اور ہلکی ہائیڈروجن گیس سے بنی ہوئی
جو کہ زمین کی فضا سے بھی کہیں زیادہ مہین ہیں۔ لال دیو ہیکل ستارے
کی کل مجموعی کیت کا چوتھائی حصہ ہیلیم سے بھرے ہوئے core
میں جکڑا ہوگا۔ اگر یہ ستارہ اتنا ہو سکے کہ کرے میں سما جائے تو اس
core ایک نقطہ جتنا ہوگا۔

ہائیڈروجن گیس کا پتلا غلاف جس میں نیوکلیئر تعاملات ہوتے
ہیں، دب جائے گا اور core کو اس حد تک گرم کردے گا جہاں
ہیلیم ستارے کے اندر آگ پکڑ لے گی۔ پھر ہیلیم کاربن Carbon
میں تبدیل ہو جائے گی اور توانائی کے ذخائر خارج کرے گی۔ اس
موقع پر نیوکلیئر آگ اتنی تیزی سے core میں تباہی پھیلائے
گی کہ چند ملین سالوں بعد ہیلیم ختم ہو جائے گی اور جلی ہوئی ہیلیم
ایک غلاف میں چلی جائے گی اور یہ غلاف core کے ارد گرد ہوگا
ایک دفعہ پھر ستارہ پھول کر لال دیو ہیکل جسامت اختیار
کرے گا جس کا قطر شاید اس کے اصل قطر سے ۱۰۰ گنا زیادہ ہوگا
جب سورج کے ساتھ یہ عمل ہوگا تو اس کی بیرونی تہیں سب سے نزدیکی
سیاروں کو نگل لیں گی جو ہماری زمین ہوگی یا Mars ہوگا۔

سورج کی موت

اس حالت میں سورج غیر مستحکم ہوگا۔ اس کی بیرونی
تہیں اتنی پھول جائیں گی کہ کشش کی قوت کی اسیر نہیں رہ سکیں
گی بلکہ یہ خلا میں ختم ہو جائیں گی اور Planetary Nebula بنادیں
گی جو فضا میں ایک چمک دار پلیٹ یا چمک دار گیس کا دائرہ نظر آئے گا
ستارے کا باقی ماندہ core کاربن کی ٹھوس گیند ہوگی
جس کو گرم ہیلیم کی روشن تہ نے گھیرے میں لیا ہوگا جن میں نیوکلیئر تعاملات
وقوع پذیر ہو رہے ہوں گے اُن کو White Dwarf کہیں گے۔
جیسا کہ White Dwarf باقی ماندہ ایندھن سے
محروم ہو رہا ہوگا تو آہستہ آہستہ چنگاری کی طرح ماند پڑ جائے گا اور
Black Dwarf بن جائے گا جو کہ فضا میں راکھ کی ایک
غیر نمودار اور نظر نہ آنے والی گیند ہوگی جو مردہ اور کالی ہوگی۔
یہ ہمارے سورج کی موت ہوگی۔

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں، اور وہ
ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا۔
بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں
یاد دلاتی ہیں، اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں
ہوتا ہے، وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ
جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور
زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے
اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے، یا نامہذب ملکوں
میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔

سرسیدؒ

اکیسویں قسط

قاضی عبدالستار

خالد بن ولید

اُس نے وہ زیور اُٹھائے۔ ان ہاتھوں کے لمس کی خوشبو تلاش کی لیکن وہ تو ایک موٹے بھدّے ہاتھ کی بدبو سے بھبک رہے تھے۔ اس نے ناچنے والی کنیزوں کو اپنے پاس بلایا۔ اور کنیز کو مخاطب کیا۔

"تم سب لوگ بانٹ لو۔"

ہندہ اور ابوسفیان نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ صراحی نے اٹھ کر پیالے کو لبریز کرنا چاہا تو قالین بھیگ گیا۔ ہونٹوں نے جھک کر پیالے کو چوم لیا۔ پیالہ خالی ہو گیا۔ صراحی تک خالی ہو گئی۔ جب اٹھنے لگا تو ہندہ اور ابوسفیان کو سہارا دینا پڑا۔ ان کے اصرار پر انکار کرتا باہر آ گیا۔ گھوڑے پر اسی طرح سوار ہوا جس طرح سوار ہونا چاہیے۔ ابوسفیان نے حیرت سے ہندہ کو دیکھا اور غلاموں کو حکم دیا کہ ساتھ جائیں۔

اشقر کھڑا ہو گیا تو وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے واپس آ گئے۔ فصیل شہر کا وہ مشرقی دروازہ سامنے تھا جوان کی سپہ سالاری کی پابوش پر منہ کے بل گر پڑا تھا۔ پہرے داروں نے پھاٹک کھول دیا تھا، لیکن انھوں نے اشقر کی باگ پھیر دی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ شہتیر ڈال دیا گیا۔ وہ قدم قدم چلتے دوسری سڑک پر آ گئے۔ سواروں کا ایک دستہ اُترا اور ایک تیر کے فاصلے سے آگے آگے چلنے لگا۔

اب وہ دیکھ رہے تھے کہ زمین نے آخری آسمانی رحمت اُٹھالی گئی، سورج سیاہ اور دن رات ہو گیا۔ بڑے بڑے گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔ روزنوں اور دریچوں نے آنکھیں ڈھانپ لیں۔ وہ مہیب اور جلیل انسان جن کے قدموں کی دھمک سے زمین ہلنے لگتی، پرچھائیوں کی طرح ویران سڑکوں اور سنسان گلیوں میں لرزنے لگے۔ تھوڑی دیر کی اس کیفیت کے بعد کہیں سے ایک چیخ بلند ہوئی اور مدینے کی دیواریں تک اس کی تکرار میں چیخنے لگیں۔ جوان اور بوڑھے، عورتیں اور بچے گھروں سے نکل پڑے۔ نالہ و ماتم کا وہ حشر برپا ہوا جیسے زمین کا سینہ پھٹ گیا ہو۔ وہ اپنے مرکز سے ہٹ گئی ہو۔ جیسے آسمان اپنے مدار سے ہل گیا ہو۔ کوئی دم جاتا ہے کہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں گے، چاند کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور سورج سیاہ ٹھنڈے توے کی طرح زمین پر گر پڑے گا کہ سب کچھ منقلب ہو گیا۔ جو تھا نہیں رہا۔ جو رہ گیا اس کے رہنے کی ضمانت کیا۔ گلیاں کہرام کی ندیاں بن گئیں۔ مسجد نبوی جو ایک جبل نور کی طرح کھڑی تھی اس کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں کیسے کیسے پہاڑ اس ہولناک حقیقت کے سامنے پارہ پارہ ہو گئے۔

ابن حنتمہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) ننگی تلوار لے کر مسجد میں داخل ہوئے کہ نبیؐ کی موت کا نام لینے والے کی گردن اڑا دوں گا۔ منبر رسول کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کہرام کو مخاطب کر کے قسم کھانے لگے کہ رسول اللہؐ کی وفات نہیں ہوئی۔

پھر وہ آواز بلند ہوئی جو اسی قیامت کی گھڑی کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

"اے قسم کھانے والے ذرا ٹھہر۔ جلدی نہ کر۔"

نائب رسول کی آواز پر سب خاموش ہو گئے ۔ ابن حنتمہ خاموش ہو گئے جنھیں ہزاروں تلواروں کی زبانیں بھی خاموش نہ کر سکی تھیں یہی آواز پھر بلند ہوئی ۔

"جو شخص محمد (صلعم) کی پوجا کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد (صلعم) کی موت واقع ہو گئی لیکن جو خدا کی بندگی کرتا ہے وہ جان لے کہ خدا زندہ ہے اور خدا کے لیے موت نہیں ۔"

اور امت کے اسم ہائے معظم نے اپنی بلند آوازوں سے تائید کی ۔ ابھی نیابت رسول کا مسئلہ حل ہوا تھا کہ عرب جو ایک سرکش اونٹ کی مثال ہے، وصال نبوت کی خبر سنتے ہی بے مہار ہو گیا، بے قابو ہو گیا زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے کوڑے چبا ڈالے اور زکوٰۃ ہضم کرنے لگا ۔ انکار زکوٰۃ پر وہ تہلکہ پڑا کہ آہن و فولاد کے انسان حریر و پرنیاں ہو گئے ۔ ابن حنتمہ (حضرت عمرؓ) کو جھڑک کر دیہی شخص اعظم کھڑا ہو گیا

" اگر زکوٰۃ کے نام پر اونٹ کا ایک بندھن واجب ہو گیا تو خدا کی قسم اس کو وصول کرنے کے لیے تلوار اٹھاؤں گا ۔"

اعراب جو صدیوں سے جنگل کا قانون کے مطابق زندگی گزار رہے تھے ۔ بستیوں سے ان کی حفاظت کے محصول پر زندہ تھے ۔ مدینے کی مضبوط حکومت کے سامنے بے دست و پا ہو گئے ۔ اپنے سرداروں کے مسلمان ہونے پر مسلمان ہو گئے ۔ لیکن خراج وصول کرنے والے زکوٰۃ دینے پر مجبوراً رضامند ہوئے تھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو اپنی بے دست و پائی کا محصول سمجھتے تھے ۔ مدنی قوانین ابھی صدیوں کی بے مہار آزادی کی تربیت کر رہے تھے کہ آفتاب رسالت غروب ہو گیا اور اس اندھیرے میں وہ ہر طرف شبخون مارنے لگے ۔ ختم المرسلین کی آسمانی کامیابی کو بڑے بڑے سرداروں نے مثال بنا کر اپنی اپنی نبوت کا اعلان کر دیا ۔ ایک عجیب و غریب آزادی کے نشے میں سرشار اور مسلح اور بے خوف انسانوں کا ہجوم عظیم ان جھنڈوں کے نیچے موجیں مارنے لگا اور یہ جھوٹے نبی اور ان کے حلیف قبیلے اتنی کراک دھمکے سے اٹھے کہ خود مدینے کا وجود خطرے میں پڑ گیا ۔ جو مکے اور طائف کی اکثریت کی طاقت پر محمدی قانون کا محافظ تھا ۔ مسجد نبوی کی ہر نماز بغاوت کی خبروں کے ساتھ پڑھی جانے لگی ۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ہر نماز نماز خوف معلوم ہونے لگی کہ نماز تلواریں مدینے پر چڑھ آئی تھیں اور وہ سارا سارا دن بنی مخزوم کے تھوڑے سے شہسواروں کے ساتھ نائب رسول کے حکم کی تعمیل میں مصروف اور ساری ساری رات جوارِ رحمت (مدینہ) کی حفاظت پر بذات خود مامور رہتا ۔ اس روز کہ روز خوف تھا اور ایک عالم اصرار کر رہا تھا کہ اسامہ بن زید کا لشکر مدینے سے رخصت ہونے کے بجائے خود مدینے کی حفاظت پر حاضر رہے ۔ وہ فرد معظم کھڑا ہو گیا ۔ آواز جو آوازِ رسالت کے نور سے منور تھی بلند ہوئی ۔

" اگر مجھے باور کرا دیا جائے کہ اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی روانگی کے بعد امہات المومنین کو جنگل کے جانور گھسیٹتے پھریں گے تب بھی ربّ ذوالجلال کی قسم اسامہ بن زیدؓ کا لشکر روانہ ہو گا کہ یہ نبی کا حکم تھا اور میں احکام نبوّت کا محافظ ہوں ۔"

اور ابن حنتمہ کے چہرے سے نگاہ ہٹالی ۔ کس آواز میں طاقت کہ اس آواز کے سامنے بلند ہونے کی جسارت کرے ۔ اسامہ بن زید کا لشکر روانہ ہوا اور اسی دن روانہ ہوا ۔

اور وہ دن جب ذوالقصہ کے میدان میں وہ اپنی فوج کے سامنے سیاہ گھوڑے پر سوار محمدی علم کے سایے میں کھڑا تھا اور خلیفۂ اکبر بنفس نفیس اس کے لشکر کا معائنہ کرتے سامنے آئے

" خالد ۔"

" خالد بن ولید ۔"

" سیف اللہ خالد بن ولید ۔"

" ختم المرسلین نے تم کو خطاب دیا تھا ۔ ان کی امت تم سے اس جلیل القدر خطاب کا جواز مانگتی ہے ۔ معلوم ہے کہ طلیحہ نے بزاخہ کو لوہے کا قلعہ بنا دیا ۔ جانتا ہوں کہ مالک بن نویرہ بنی تمیم کی تلواروں کے

سمندر کے ساتھ طلیحہ کا دست و بازو ہو چکا۔ لیکن یہ
بھی جانتا ہوں کہ تم سیف اللہ ہو۔ محمد کے علمدار
ہو۔ ـــــــ جاؤ۔ بزاخہ کے میدانوں
کو اس علم کی توقیر کا سبق دو۔"

ذوالقصہ کے میدان سے اٹھنے والا وہ پہلا سپہ سالار
تھا جس نے اٹھارہ کوس پر پہلی منزل کی۔ راستے کے قبیلوں کو
زیر و زبر کرتا وہ اس مقام پر خیمہ زن تھا جہاں سے قبیلۂ طے کی
بستیاں نظر آنے لگتی ہیں کہ عدی بن حاتم حاضر ہوا۔

"آپ کی آمد سے پہلے آپ کے نام کی ہیبت کا غلغلہ
بلند ہو چکا۔ سارا قبیلہ لرزہ براندام ہے۔ خوف تلوار
پھینک دیتا ہے۔ خوف تلوار اٹھالیتا ہے۔ اتنی
مہلت دیجیے کہ میں خوف کو تلوار پھینکنے پر رضامند
کر سکوں۔"

"کتنی مہلت۔"

"تین دن۔"

"تین دن؟ تین دن میں تو ہم تین لشکر شکار کرتے
ہیں لیکن تم حاتم کے چراغ ہو اس لیے منظور ہوئے۔"

تین دن بعد عدی بن حاتم اور اس کے ایک ہزار سواروں
کے ساتھ لشکر کو آراستہ کر کے طلیحہ کے سامنے علم کھول دیا۔
ہراول نے بنی خزیمہ کے ایک شخص کو پیش کیا۔ سوال ہوا۔

"طلیحہ کون ہے؟"

"طلیحہ نہیں۔ طلیحہ بن خویلد اسدی ـــ ہمارا
نبی ہے۔"

"ثبوت۔"

"آج تک جتنے لوگوں نے نبی ہونے کا اعلان کیا وہ
جھوٹے ہیں۔ صرف ہمارا نبی سچا ہے۔ اس لیے کہ اس
نے مدینے کے نبی کی زندگی میں اپنے نبی ہونے کا
اعلان کر دیا تھا اور اپنا حق مانگا تھا، لیکن مدینے
کے نبی نے آدھا حق بھیجنے کے بجائے فوج بھیج دی۔
فوج کے سردار نے ہمارے نبی کے بدن پر تلوار کا پورا
ہاتھ مارا لیکن خراش تک نہ آئی۔ ہمارے نبی کے پاس
بھی جبرئیل آتا ہے۔ وحی لاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے
نبی نے نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ سجدہ
موقوف کر دیا ہے اور آخری ثبوت یہ ہے کہ ہمارا
نبی زندہ ہے اور اسی کی بددعا پر مدینے کا نبی
موت کا شکار۔"

حملہ پورا ہونے سے پہلے اس کا سر شانوں سے گر پڑا۔ تلوار
غلام کے سامنے پھینک دی کہ پاک کر کے لائے۔ دوسرا آدمی
پیش ہوا۔

"طلیحہ کے پاس کتنی فوج ہے۔"

"کتنی فوج ـــ اس کی فوج کا شمار نہیں۔ مالک بن
نویرہ بیس ہزار سواروں کے ساتھ بطاح میں پڑا
ہوا نبی کے حکم کا انتظار کر رہا ہے اور اس جیسے
کتنے ہی سردار۔"

اسے حراست میں دے کر میدان سجنے کا حکم دے دیا۔

چند ہزار سواروں کو جلو میں لے کر خود حملہ کیا۔ قریب پہنچے
تو دیکھا کہ ایک معمولی سا آدمی زرتار قبا اور ازار پر زرکار فیروزی
جھنڈے کے نیچے فیروزی بالاپوش سے سجے ہوئے گھوڑے پر
سوار بڑی مہارت سے فوجیں لڑا رہا ہے۔ ضرار کو ایک رسالہ
دے کر اس کے پہلو پر للکار دیا اور خود صفیں کاٹتے اس کے
قریب پہنچنے لگے۔ لیکن وہ جھنڈا چھوڑ کر بھاگا۔ ایک عورت کسی طرف
سے نمودار ہوئی اسے بھی اپنے گھوڑے پر چڑھا کر غائب ہو گیا۔
اس کا سپہ سالار عیینہ بن حصن فزاری بھی فرار ہو گیا۔
پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ سجدۂ شکر کے ساتھ عیینہ
کی گرفتاری کا حکم دیا۔ عیینہ اور دوسرے سالار قرہ بن
جبیرہ کو بیڑیوں میں جکڑ کر فتح نامے کے ساتھ دربارِ خلافت
روانہ کیا اور چشمۂ بزاخہ پر خیمہ ڈال دیا۔ سو سو کوس تک
پھیلے ہوئے قبیلوں کے سردار قاتلوں اور باغیوں کو باندھ کر

ہونے لگے۔ وہیں پروانۂ خلافت موصول ہوا

"سیف اللہ فاتح طلیحہ کے نام
قاتلوں اور باغیوں اور ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ
سے سرکشی اور دشمنی اختیار کر کے اس کے احکام کی
خلاف ورزی کی۔ اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ ان کا قتل
کر دینا مناسب ہے تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے"۔

...اۃ وصول ہو رہی تھی۔ امن و امان بحال ہو چکا تھا، نظم و ضبط قائم
...چکا تھا کہ جاسوسوں نے خبر دی۔

طلیحہ شام کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بھاری لشکر
ام زمل نامی ایک بہادر عورت کے جھنڈے کے نیچے
جمع ہو گیا ہے۔ ام زمل کی طاقت حیرت انگیز طور
پر دن بدن بڑھتی جا رہی ہے"۔

یہ خبر سنتے ہی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ام زمل بڑے ساز و
سامان کے ساتھ آئی۔ سات سو اونٹوں کا محافظ دستہ اس کے سرخ
...حافے کے چاروں طرف دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔ حکم دیا کہ تمام اونٹوں
کی کونچیں کاٹ دو۔ لیکن وہ اتنی بہادری سے جنگ کر رہی تھی جتنی
بہادری سے اس نے پوری زندگی میں کسی عورت کو لڑتے نہیں
دیکھا۔ بنی مخزوم کے شہ سواروں کو عاجز ہوتے دیکھ کر جلال آ گیا۔
خود اپنے سواروں کے ساتھ جنبش کی۔ سارا لباس خون میں تر بتر ہو گیا
تب ام زمل کا اونٹ گرا اور وہ قتل کی گئی۔

دوسرا فتح نامہ لکھ کر بطاح کے لیے روانہ ہوئے۔ بستیوں اور
قبیلوں کی سلامیاں قبول کرتے بطاح پر اترے تو حیرت ہوئی۔
حدِ نگاہ تک میدان خالی پڑا تھا۔ راکھ کے ڈھیروں، لوٹی ہوئی طنابوں
اور میخوں کے نشانوں کے سوا بیس ہزار کے لشکر کا کوئی نشان نہ تھا
سو سو سواروں کے چند دستے مالک بن نویرہ کی تلاش میں دوڑا کر
بطاح کے چشمے پر اتر پڑے۔ رات کا وقت تھا۔ مخبروں سے خبریں سن
رہے تھے کہ مالک بن نویرہ چند آدمیوں کے ساتھ پیش ہوا۔ گرفتار
کرنے والوں کی اکثریت کہہ رہی تھی کہ ہماری اذانوں کے جواب میں اس
کی بستی سے اذانوں کی آواز نہیں آئی۔ لیکن ابو قتادہؓ کا فرمانا تھا

کہ انہوں نے آواز سنی۔ صحابیٔ رسول کے بیان کی صحت کا خیال کر کے
حکم دیا کہ قید کر دو۔ عشاء کی نماز کے لیے خیمے سے نکلے تو سردی کا شدید
احساس ہوا۔ نماز پڑھ کر خیمے کے اندر داخل ہوئے تو خیال آیا کہ قیدیوں
کو سردی لگ رہی ہو گی۔ غلام کو حکم دیا کہ قیدیوں کے محافظوں کو حکم
پہنچاؤ۔

"دافئوا اسراکم"

کنانہ کی زبان میں جس کے بولنے والے مالک بن نویرہ کے محافظ تھے
مدافاۃ کا لفظ قتل کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ محافظوں
نے یہ حکم سنتے ہی قیدیوں کی گردن اڑا دی۔ شور سن کر خیمے کے باہر
آئے لیکن اس وقت تک کام تمام ہو چکا تھا۔ ضرار بن ازور جنہوں
نے مالک کو قتل کیا تھا حکم کے معنیٰ بیان کیے اور شرمسار کھڑے رہے۔
تسلی دی۔

"خدا جو کرنا چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے"۔

ساری رات تاسف میں گزار دی۔ صبح ہوتے ہی ام تمیم حاضر
ہوئیں۔ انہیں دیکھتے رہے۔ آنکھوں کی خشک نمی دیکھتے رہے۔ کھلے
ہوئے بالوں کا ماتم دیکھتے رہے۔ حسن کی سیاہ پوشی دیکھتے رہے۔

"خدا گواہ ہے کہ ہم مالک بن نویرہ کے قتل سے بری الذمہ
ہیں۔ بری الذمہ ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ تمہاری خاطر
سے اس کی بغاوت کا جرم معاف کر دیتے۔ لیکن اپنے
ہاتھ سے سزا دینے کے بجائے دربار خلافت روانہ
کر دیتے۔ عیینہ اور قرہ کی طرح شاید اس کی جان
بھی بچ جاتی۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔ جیسے ان تمام مراحل سے بلند ہو چکی ہوں
دیر کے بعد ان کی آواز آئی۔

"میرا باپ مر چکا"
"میری ذات کی حد تک میرے بھائی بھی مر چکے"۔
"ایک گھر تھا وہ تم نے اجاڑ دیا"۔
"میں تم کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا گھر میں نے
نہیں مالک بن نویرہ کے گناہ نے اجاڑا تاہم تم

چاہو تو اپنے اجڑے ہوئے گھر کو آباد کر سکتی ہو۔ چاہو
تو میرے گھر کو مزید آباد کر سکتی ہو۔"

پہلی بار انھوں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ان آنکھوں سے
دیکھا جو زبان سے زیادہ خوبصورت اور واضح کلام کی قدرت رکھتی
ہیں اور اس طرح خیمے سے رخصت ہوئیں جیسے وہ کسی سے مشورہ کرنے
جا رہی ہوں۔ اچانک چند بزرگوں کے ساتھ ابو قتادہؓ اندر آ گئے
قبل اس کے کہ وہ ان کی تعظیم کا اظہار کرے وہ زبان سے کوڑے
برسانے لگے۔

"اے سپہ سالار! میں جاننا چاہتا ہوں کہ مالک کا
قاتل کون ہے۔ میں اس سے قصاص طلب کرتا
ہوں۔"

ان کا لہجہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ تخت پر کھڑا ہو گیا۔

"ہر لشکری اور سردار کے فعل کا ذمّہ دار سپہ سالار
ہوتا ہے۔ مالک کے قتل کا میں ذمّہ دار ہوں۔"

"میں تم سے قصاص طلب کرتا ہوں۔"

"تم مالک بن نویرہ کے وارث نہیں ہو۔ اس لیے میں
تمہارے دعوئے قصاص کو مسترد کرتا ہوں۔"

یہ چرکہ لگا کر ابو قتادہؓ مالک کے بھائیوں کے ساتھ دربار خلافت میں
حاضر ہوئے۔ مالک کا مرثیہ سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے۔ نایب رسول
سے گزارش کی کہ خالد کو معزول کیا جائے اور مالک کا قصاص دلایا
جائے۔ جب اصرار حد سے تجاوز کرنے لگا تو ارشاد ہوا۔

"اللہ کی اس تلوار کو جو اس نے اپنے دین کے تحفظ
میں علم کی میں نیام کرنے والا کون ہوتا ہوں۔"

پھر فرمان خلافت آ گیا۔ وہ اپنے فاتح لشکر کے ساتھ مدینے میں
داخل ہوا تو مدینے میں شور مچ گیا کہ نایب رسول کا پہلا سپہ سالار
تھا جو مہمات کبریٰ کی انجام دہی کے بعد مظفر و منصور دار الخلافت میں
حاضر ہوا تھا۔ مسجد نبوی کی سیڑھیوں پر طلیحہ اور ام زمل کے جھنڈے
گاڑ دیے۔ سبھی مسجد میں قدم رکھا۔

"السلام علیکم یا نایب رسول اللہ۔"

وعلیکم السلام یا سیف اللہ یا فاتح طلیحہ یا فاتح
ام زمل۔ وعلیکم السلام"

ساری مسجد ان کے جواب سے گونج گئی۔ نایب رسول کے ہاتھوں کو
بوسہ دیا تو انھوں نے سینے سے لگا لیا۔ دونوں بازوؤں پر تھپکی دے
کر اپنے پاس بٹھایا۔ دیر کے بعد مالک کا ذکر نکلا تو بہ آواز بلند عرض
کیا۔

"یا نایب رسول اللہ! آپ کے تحریر فرمان کے مطابق مجھے
ہر اس شخص کے قتل کا حق حاصل تھا جس نے اللہ کے
احکام کی خلاف ورزی کی ہو۔ میں نے مالک کے
شرک کے افسانے سنے، مشرکانہ اشعار سنے، اگر طلیحہ
پر یلغار میں انتہائی عجلت نہ کرتا تو اس کے بیس ہزار
سواروں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا۔ پھر بھی میں نے قتل
کا حکم نہیں دیا۔ عیینہ کی طرح اس کے بھی زنجیریں ڈال
کر حضور میں حاضر کر دیتا۔ لیکن میرے حکم کو غلط سمجھا
گیا۔ میں نے ام تمیم سے بھی۔"

"تم نے ام تمیم سے شادی کی۔"

"ام تمیم کو میں نے خرید بھی لیا۔ عدت پوری ہونے کا
انتظار بھی کیا۔ آپ کے سپہ سالار نے جو بھی کیا صلۂ رحمی
کے تحت کیا۔ اپنے بیان کی صداقت میں خدائے حاضر و
ناظر کے علاوہ خود ام تمیم کو پیش کرتا ہوں۔"

نایب رسول نے حضرت عمرؓ کو خاص انداز میں دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

(جاری ہے)

نسیم انصاری

جوابِ دوست

دشتِ جنوں پرور ۱۹۴۵-۴۷ء

۴۵ء کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہماری قومی زندگی کی پیچیدگیاں
بوقلمونی گویا پوری طرح سمٹ کر آگئی تھیں۔ یہ گلدستہ شاید اس سے
بھی اتنا رنگین نہیں تھا۔ صوبۂ سرحد کے مفتی ادریس اور حیات پنجاب
مختار مسعود، کشمیر کے خورشید میر، دہلی کے سعید الشفیع، بہار کے عارف
ال کے ایٹم مصطفیٰ، سلہٹ کے ہمایوں رشید، حیدر آباد کے صادق
نڈنگ کے کیپٹن، بمبئی کے اسمٰعیل پٹیل، جنوبی افریقہ کے قاسم جیوا اور
نک کے عبدالعزیز لوٹنکی۔ یہ تو میں نے محض چند نام لیے ہیں۔ ورنہ
ں زمانہ میں اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں کو ملا کر یونیورسٹی میں پڑھنے
لوں کی تعداد شاید آٹھ ہزار تھی اور ان میں ہندوستان کے ہر صوبے
نمائندے اور ہر پارٹی کے پیرو موجود تھے۔ طبقاتی اعتبار سے بھی
مارے سماج کی پوری عکاسی تھی۔ جاگیردار، سرمایہ دار، کسان، مزدور،
سیاست داں، مذہبی عالم، ملازمت پیشہ، ڈاکٹر، وکیل، فوجی افسر
مدرس۔ غرض ہر طرح کے گھرانوں کے لوگ یہاں موجود تھے۔ اختلافات
ہے طبقاتی ہوں چاہے نظریاتی۔ کچھ ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ لیکن رواداری
تنی تھی کہ ایٹم مصطفیٰ اور شوکت حمید کے الکشن میں کچھ جھگڑا ہوا تو
فیصلے کے لیے لوگوں کی نظر پروفیسر حبیب پر پڑی جو کانگریس پارٹی کی طرف
سے مسلم لیگی امیدوار کے خلاف اسمبلی کا الکشن لڑ چکے تھے اور ایٹم
مصطفیٰ اور شوکت حمید دونوں مسلم لیگی تھے۔ لیکن الگ الگ گروپوں
کے۔ اسی طرح گو یہ سب کو معلوم تھا کہ مونس رضا کیمونسٹ ہیں لیکن
ایٹم مصطفیٰ کے چیف ورکر رہے تھے۔

جہاں تک کیمونسٹوں کا معاملہ تھا ان کی پوزیشن بہت دلچسپ
تھی۔ وہ ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو (کوئٹ انڈیا) تحریک سے
بالکل الگ رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں عالمی جنگ عوامی
جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی جس میں ایک طرف ساری دنیا کے
عوام تھے اور دوسری طرف جرمن، اطالوی اور جاپانی سامراج،
جنگ کی نوعیت اس وقت سے بدل گئی تھی جب سے جرمنی نے سوویت یونین
کے خلاف لڑائی چھیڑ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس لڑائی میں سوویت
یونین کی ہار ہو جاتی ہے تو ساری دنیا کی انقلابی تحریکیں کچل دی جائیں
گی۔ اس کے برخلاف اگر سوویت یونین کی جیت ہوتی ہے تو ساری
دنیا کے عوام کو سہارا ملے گا اور غلام ملک بھی سامراج سے آزادی
حاصل کر لیں گے۔ کانگریس والے اس منطق کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ کیمونسٹ پارٹی کا کہنا تھا کہ ہندوستان
کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں صلح
ہو جائے۔ وہ پاکستان کے ریزولیوشن کی حمایت کرتے تھے
کہ اس میں ہندوستانی جمہوریت کا اصلی روپ نکلے گا۔ ان کے
نزدیک حق خود ارادیت جمہوریت کا لازمی حصہ ہے۔ اس سے
کانگریس والے ان لوگوں سے اور خفا ہو گئے۔ مسلم لیگ نے
بہت ہوشیاری سے یہ پالیسی اختیار کی کہ کیمونسٹوں سے ان
کو جتنی مدد مل سکے وہ ضرور حاصل کر لی جائے لیکن ان کو یعنی
کیمونسٹوں کو اپنے نظریات کی اشاعت نہ کرنے دی جائے۔ خود
کیمونسٹ مسلم لیگ کے جلسوں میں جاتے تھے۔ تاکہ اس طرح ان کا
مسلمان عوام سے رابطہ قایم ہو جائے

علی گڑھ میں بھی یہ سب کچھ ہوا۔ طالب علموں میں جو کیمونسٹ گروپ تھا، اس کے لیڈر مونس رضا تھے۔ اقبال نیازی، ہمایوں رشید چودھری قیصر رشید چودھری، مولانا یوسف اور بھی اس کے دوسرے شرکار تھے۔ ہم لوگوں کے جلسے عموماً جرار حید رصاحب کے گھر پر ہوتے تھے۔

اسی زمانے میں یعنی دسمبر ۴۵ء اور جنوری ۴۶ء میں دہلی میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ جلسہ ہوا۔ علی گڑھ سے ہم پندرہ بیس آدمی اس میں شریک ہوئے۔ جلسوں کے لیے جو مجلس صدارت بنی اس کے ممبر مونس رضا اور بہار کے سید حبیب بھی تھے۔ سید حبیب پہلے علی گڑھ میں پڑھتے تھے لیکن تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ بہار کی سیاست میں حصّہ لینے لگے تھے۔ مونس صاحب نے شیروانی اور ٹوپی پہن کر جلسہ کی صدارت کی۔

اس کانفرنس میں پہلی دفعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کا سیاسی تعلق ملک کے دوسرے طلباء سے ہوا تھا۔ میں نے تو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اتنے غیر مسلم طالب علم دیکھے تھے۔ اس کانفرنس کے بعد یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ ہندوستان کے مسائل کا حل ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر کرنا ہوگا۔ دونوں کے اتحاد اور دوستی کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

افسوس صد افسوس کہ یہ بات نہ تو کانگریس والے مانتے تھے اور نہ مسلم لیگ والے۔ کانگریس مسلم لیگ کو برابر کا درجہ دینے پر تیار نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ایسی قومی پارٹی تھی جس میں ملک کے ہر طرح کے لوگ شامل تھے اور اس کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ محض مسلمانوں کی کئی جماعتوں میں سے ایک جماعت ہے۔ ادھر مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ اسے برابر کا درجہ دیا جائے کیوں کہ وہ اسی طرح مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے جیسے کانگریس ہندوؤں کی۔

ان دونوں کی تکرار میں ہندوستان کے لاکھوں لوگ برباد ہو گئے۔ خاندان اجڑ گئے، گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے، لیکن آج تک دونوں میں سے کوئی اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آپ پوچھیے گا کہ اس میں مسلم لیگ والوں کی کیا غلطی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کانگریس کے خلاف بس انھوں نے ایک محاذ بنالیا اور ایسی ہر تحریک سے دامن بچائے رکھا جس میں انھیں اور ہندوؤں کو مل کر کام کرنا ہوتا۔ اگر وہ مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے افہام و تفہیم سے کام لیتے تو شاید اتنی تلخیاں پیدا نہ ہوتیں یہ محض میرا خیال ہے۔ آخر کانگریس نے تو مسلم عوام سے سیدھا رابطہ قایم کرنا چاہا تھا لیکن اسے اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

مسلم لیگ کی یہ کمزوری شاید مسلمانوں کی ذہنی پس ماندگی کا ایک مظہر تھی۔ اس وقت تک بہت کم مسلمان اس قابلیت کے تھے کہ وہ ہندو دانشوروں کو متاثر کر سکتے اور جتنے لوگ اس قابلیت کے تھے وہ زیادہ تر مسلم لیگ کے باہر تھے۔ کاش مسلم لیگ والے ان قابل اور پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ کوشش کون کرتا؟ مسلم لیگ کی قیادت میں بہت کم دانشور تھے۔ خود جناح صاحب بہت اچھے وکیل اور بڑے ہوشیار سیاست داں تھے۔ لیکن میری نظر سے ان کی کوئی تحریر یا تقریر ایسی نہیں گزری جس میں کوئی فلسفیانہ، ادبی یا اقتصادی مسئلہ اٹھایا گیا ہو۔ کم سے کم علی گڑھ میں جو مسلم لیگی کارکن تھے ان کا انداز بہت حد تک اینٹی انٹلیکچول تھا اور وہ ہر دانشور کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے۔

آج جب میں مسلمانوں کے اس ذہنی افلاس کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں تو میرا ذہن ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کی طرف بھی جاتا ہے اور نظر حال کے بعد ماضی کی طرف بھی اٹھتی ہے۔ پچھلے پانچ چھ سو برسوں میں جو قد آور علمی شخصیتیں ابھرتی ہیں وہ کون ہیں۔ کوپرنیکس گیلیلو، نیوٹن، بیکن، ہیگل، مارکس، جان اسٹورٹ مل، فرائڈ، ڈارون، آئن اسٹائن، رومارولاں برٹنڈرسل ——— غرض ایک نام بھی کسی مسلمان کا نہیں۔ حالاں کہ یہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا وجہ ہے اس کی؟ میرے خیال میں ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چار پانچ سو برسوں سے مسلمان غیر مذہبی علوم سے ڈرنے لگے ہیں۔ ان کے دل میں جیسے یہ بیٹھ گیا ہو کہ اگر ان علوم کی گہرائیوں میں گم گئے

نے مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ یہ بات ایسے کھردرے طریقے *
تو نہیں البتہ بہت زور دے کر غزالی نے کہی تھی۔ سیاسی حالات
ایسے ہوئے کہ غزالی کی بات چل نکلی اور مسلمانوں کی سلطنتوں
یہ تاثر دیا جانے لگا کہ حکومت وقت غزالی کے ان خیالات سے
فق ہے۔ میرے پاس کوئی دستاویزی ثبوت تو اس بات کا
ں ہے۔ لیکن واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان
مسلمانوں کا اقتدار کئی سو سال رہا۔ لیکن اس طویل عرصے میں
ہوں نے یہاں ایک یونیورسٹی بھی نہیں بنائی۔

غزالی پر الزام لگانا تو نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے لیکن
م ثابت کرنا اتنا آسان نہیں۔ آپ یقیناً پوچھیے گا کہ آخر اُن لوگوں
ان علوم کی طرف کیوں توجہ نہیں کی۔ جو ذہنی اعتبار سے غزالی
پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کا وہ طبقہ جن کے خلاف
الی نے گویا ایک محاذ کھول دیا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی
اب نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ علمی جمود سے قبل کے زمانہ
ں بہت سے علماء اور فلسفی شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے
خر ان کی آئندہ آنے والی نسلوں نے بھی باقی مسلمانوں کی طرح
وں غیر مذہبی مشغلے چھوڑ دیے؟

ظاہر ہے کہ اس ذہنی جمود کی ذمہ داری مذہب اسلام
نہیں ڈالی جا سکتی۔ کیوں کہ ظہور اسلام کے بعد سے تقریباً
سو سال تک علمی دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی رہی اور ہر علم و فن میں
س مذہب کے ماننے والوں نے قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔
لیکن پچھلے پانچ چھ سو برس ذہنی خشک سالی کے تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کہنے کے لیے پہلو بدل رہے ہیں۔
آپ کہیے گا کہ یہ کیسی خشک سالی تھی جس میں فیضی، غالب اور اقبال
ہندوستانی افق پر نظر آتے ہیں اور تاج محل جیسی عمارت کھڑی
ہو گئی۔ میاں تان سین اور فیاض خاں کی تانیں آج تک فضا میں
گونجتی ہیں۔ پیا جان عالم واجد علی شاہ کی بارہ دری میں کتھک کا جو
رقص ہوتا تھا، لوگ آج تک اسے یاد کرتے ہیں اور میاں امانت
کی اندر سبھا کو کیوں بھول جائیں؟ میں آپ کی بات مان لوں گا اور
اس سے انکار نہیں کروں گا کہ فلسفہ، منطق اور سائنس کے زوال
کے باوجود فنون لطیفہ مسلمانوں سے نہیں چھوٹے لیکن ظاہر ہے
کہ غزل خوانی اور رقص و سرود سے فطرت کے سب راز تو
نہیں آشکارا ہوتے اور فطرت ایک محبوبہ کی طرح اس انتظار میں رہتی
ہے کہ اس کے چاہنے والے اس کی ظاہری خوبصورتی سے گزر
کر اس میں کچھ اور بھی تلاش کریں۔

بہر حال۔ اس بحث کو آئندہ کے لیے اٹھائے رکھیے۔
فی الحال تو چلیے ۴۷-۱۹۴۵ء کے علی گڑھ کہ شاید وہاں تہذیب
حجازی کی حیاتِ نو کے کچھ آثار دکھائی دیں، مجھے تو صرف سیاسی
جوش و خروش کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان بنانے کے
لیے تو سب بے چین ہیں لیکن اس کا کوئی نقشہ کسی کے ذہن میں نہیں
ہے اور ستم بالائے ستم تو یہ بات تھی کہ کوئی اس کی ضرورت بھی
نہیں سمجھتا تھا۔ جماعتِ اسلامی قائم ہو چکی تھی اور جناب عبدالجلیل
صاحب اس کے سربراہ تھے، یاد ہیں جلیل صاحب! وہی جنھیں ہم
سب رومانٹک شاعری سے ان کے لگاؤ کی وجہ سے انھیں بھی
مولانا کیٹس کہتے تھے۔ میں نے سہ کر "انھیں بھی" لکھا۔ اس وجہ
سے کہ سنا ہے کہ ایک دوسرے صاحب کو بھی اسی نام سے پکارا
جاتا تھا۔ لیکن جلیل صاحب کو اس نام سے رشید حسنؔ اور میں
یاد کرتے تھے اور اس میں سوائے ان کے احترام کے اور کوئی
دوسرا پہلو نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے؟ نورانی چہرے پر سیاہ
خوشنما داڑھی اور ماتھے پر "ناصیہ سائی" کا نشان! مجھ پر
بڑی عنایت فرماتے تھے اور مجھے ان کی خدمت میں گستاخی کی بھی
اجازت تھی۔ وہ ہم لوگوں کو اس زمانے میں فیٹز جیرالڈ کی رباعیات
پڑھاتے تھے اور لطف تو یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ عمر خیام
کی فارسی اصل بھی سناتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک سے
زیادہ دفعہ ان سے خدا کے تصور پر بحث کی، وہ بڑے صبر سے میری
باتیں سنتے تھے اور مذہبی انداز میں میرے اعتراضات کا جواب
دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بحث ختم نہ ہوتی اور ہوتی بھی کیسے؟
سیکڑوں برس سے تو لوگ اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش

کر رہے ہیں لیکن

"کس نہ کشود و نہ کشاید زحکمت ایں معما را"

ایک آدھ دفعہ تو انھوں نے ازراہِ مہربانی مجھے اپنی خاص مجلسوں میں بھی شرکت کی اجازت دی، وہاں اسلام کے مکمل نظامِ فکر کے چرچے تھے لیکن پاکستان کی تحریک کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ بات اس وقت مجھے عجیب سی معلوم ہوئی، اب سمجھتا ہوں کہ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ پاکستانی تحریک کے رہنما مسٹر جناح بالکل غیر مذہبی آدمی تھے اور ان کے سارے رفیق سوائے مولانا حسرت موہانی، راجہ صاحب محمود آباد، جمال میاں اور ظفر علی خاں کے خالص سیاسی لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے جماعت اسلامی کے پیرو اپنے اندر کوئی کشش کیسے محسوس کرتے۔

مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے یہ اچھا بھی تھا کیوں کہ اگر اس وقت اسلامی حکومت کی بات چھڑ جاتی تو مسلمانوں میں ایسا اختلاف ہوتا کہ تحریک پاکستان بھی ختم ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ شیعہ مسلمان عقیدتاً اس قسم کی کسی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور پھر مسٹر جناح کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی؟ وہ نہ تو کسی ایسی تحریک کی رہنمائی کرتے اور نہ اس میں شامل ہوتے جس کا مقصد کسی قسم کی مذہبی حکومت کا قیام ہوتا۔ خود مسلمان انھیں اپنا لیڈر نہ بناتے۔ کیوں کہ اگر اس قسم کی سیاست شروع ہو جاتی تو پھر لوگ یہ دیکھنے لگتے کہ کس کی وضع شرعی ہے اور کس کی غیر شرعی۔ میں نے سنا ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ ایک دفعہ یہ ہو بھی چکا تھا۔ وہ ایک جلسہ میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ لوگ ان کی تقریر بالکل بے دلی سے سن رہے ہیں۔ انھیں کچھ تعجب بھی ہوا لیکن یکایک انھیں احساس ہوا کہ شاید ان کے پائنچے ٹخنے سے نیچے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اس کا تدارک کیا اور اس کے بعد سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ آج شاید آپ ان باتوں پر ہنسیں لیکن ۴۷ء سے پہلے انھیں خارج از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔

آپ کہیے گا کہ ۴۷ء کو وقت کی سرحد کیوں سمجھا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ۴۷ء کے بعد کے جو واقعات ہوئے وہ مسلمانوں ک
لیے بہت سبق آموز تھے۔ رفتہ رفتہ موجودہ دور کی سیاسی حقیقت
ان پر واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک کے بعد ایک بت ٹوٹتے جا رہے ہ
دو قومی نظریے پر مشرقی بنگال میں جو کچھ بیتی وہ سب کو معلوم ہے۔
لبنان، عراق اور ایران کے نہتے شہریوں کے زخم پان اسلامزم ک
سیاسی تصور کی بہت ہیبتناک تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ باتیں ہو
بہت دنوں سے رہی تھیں لیکن ہماری توجہ اس طرف نہیں تھی۔ میں
اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ مولانا محمد علی اپنے مرشد مولانا عبدالبا
سے ابن سعود کے معاملے پر خفا ہو گئے تھے، وہ یعنی مولانا محمد ع
خدامِ کعبہ کی تحریک سے اس لیے علیحدہ ہو گئے کہ اس نے جنت ا
کے مزاروں کی بے حرمتی کے سلسلے میں ابن سعود کی سخت م
کی تھی۔

مولانا محمد علی ابن سعود سے ملنے گئے اور ان کے سامنے
تجویز رکھی کہ چونکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تمام مسلمانوں کے
محترم ہیں اس لیے ان کا انتظام ایک بین الاقوامی کونسل کے س
کر دیا جائے۔ سنا ہے ابن سعود نے ساری باتیں بہت غ
سے سنیں اور اس کے بعد اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر ک
کہ مولانا! میں نے اس کے ذریعے ان شہروں کو اپنے اقتدار
لیا ہے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو آپ بھی قسمت آزمائیے۔

جب تک ساری دنیا میں آزاد مسلم ریاستیں نہیں بنی تھیں
اس وقت تک پین اسلامزم کی بات نوجوانوں کو متاثر بھی کرتی تھ
لیکن اب جب کہ ساری دنیا کے مسلمان سیاسی طور پر آزاد ہو گئے
یہ بات سب پر آشکارا ہے کہ سیاسی وحدت ناممکن ہے، کوئی
حکومت خوشی سے کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔

پین اسلامزم کا تصور جمال الدین افغانی کے نام کے س
ایسا مل گیا ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے کوئی بھی الگ
نہیں پہچانا جاتا۔ جمال الدین افغانی نے دنیائے اسلام کو محکو
مجبور دیکھا تھا، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی
پہلی پانچ دہائیوں تک غلامی اور ذلت کے سوا مسلمانوں کو

یا تھا۔ ایسے میں پین اسلامزم ان کے زخمی دل کی ایک پکار تھی
لی چونکہ باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھی۔ اِس لیے کسی کے ذہن میں بھی
یا تھا کہ اس میں الگ الگ مورچے ہوں گے اور ہر مورچے کے لیے
ی حکمت عملی ہوگی۔ کسی کے سامنے انڈونیشیا اور ولندیزیوں کی کشمکش
پیچیدگیاں نہیں تھیں۔ نہ ہی ان کو وہم و گمان تھا کہ نہر سوئز کو آزاد
نے میں مصر والوں کو خاص قسم کے مسائل درپیش آئیں گے، الجیریا میں
ں انداز کی لڑائی ہونے والی تھی اس سے کون واقف تھا؟ آزادی
ی تمنا البتہ سب کے دلوں میں تھی جس کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ

"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر"

اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب ایک دکھی دل کی پکار اور ایک
شاعر کی تمنا تھی، سیاسی پان اسلام ازم اور حقیقت میں بعد المشرقین
ہے۔

میں نے جان بوجھ کر سیاسی پین اسلام ازم کی اصطلاح استعمال
کی ہے کیوں کہ ایک دوسری طرح کی پین اسلام ازم اب ابھر کر سامنے
آ رہی ہے اور وہ حقیقت ہے خواب نہیں۔ یہ جذباتی پین اسلام ازم
ہے اور اسے میں نے ساری دنیا میں دیکھا ہے کہ دنیائے اسلام
کے لوگ ایک دوسرے کے متعلق جاننا چاہتے ہیں، ایک دوسرے
کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور یہ احساس سب کو ہے کہ
صدیوں کی غلامی کے بعد اب جو آزادی ملی ہے، اس کی دل و جان
سے حفاظت کرنا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور پین اسلام ازم ہے، جس کی طرف
عبدالسلام صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی تمنّا ہے کہ مسلمان
ملکوں میں سائنس کی ایک دولتِ مشترکہ بنے کہ جس میں سائنس داں
بغیر کسی تکلف کے ایک ملک سے دوسرے ملک جا سکیں اور
جس میں اہل دانش اپنے خیالات کے اظہار میں بالکل آزاد ہوں
اور جس میں حکومتیں اپنی سالانہ قومی آمدنی کا کم از کم ایک فی صد
حصہ سائنس کی ترقی پر خرچ کرنے کا انتظام کریں۔

۴۷ - ۴۵ء کے علی گڑھ میں تو اس طرح کی باتیں کوئی سوچ
بھی نہیں سکتا تھا۔ ساری دنیائے اسلام پر مغربی طاقتوں کا قبضہ تھا،
انڈونیشیا میں البتہ مسلح لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن علی گڑھ میں ایک طرف تو پاکستان
جوش و خروش تھا اور دوسری طرف نظریاتی کشمکش کے آثار بھی دکھائی دینے لگے تھے۔

اسی کشمکش میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ وہاں
بھی کھلی، پہلا جلسہ ٹونکی صاحب کے گھر پر ہوا اور اس میں جناب صاحب
خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، انور انصاری، مولانا یوسف،
یونس رضا، خود سیّد محمد صاحب ٹونکی اور ان کے صاحبزادے
عزیز ٹونکی اور میں شامل تھے۔ اس جلسہ میں پڑھنے کے لیے میں
نے ایک نظم لکھی تھی جس پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اصلاح دی تھی۔
نظم کا عنوان تھا

مجبوری

تم سمجھتی ہو کہ دنیا میں ہم ہی ہیں مجبور
اپنے ہی پاؤں میں گمنام سی زنجیریں ہیں
اپنے ہی ہونٹ ہیں جن کو نہیں ملنے کی مجال
اپنی ہی راتیں ہیں جن پر کبھی نکلے نہیں چاند
تم سمجھتی ہو، پر ایسا تو نہیں یوں تو نہیں
اور بھی پاؤں ہیں جکڑے ہوئے زنجیروں میں
اور بھی ہونٹ ہیں جن کو نہیں ملنے کی مجال
اور بھی راتیں ہیں محروم حسیں تاروں سے
تم اگر چاہو کہ کٹ جائے ہماری زنجیر
تو مری جانِ وفا
سن لو
یہ نہیں ممکن ہے
ایک زنجیر بھی جب تک کہ یہاں باقی ہے

جب یہ نظم لکھی گئی تھی تو اس وقت تک میری اور میرے استاد
خلیل الرحمٰن اعظمی کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی، ہم دونوں کے
خیال میں یہ نظم ترقی پسندی کے ہر پیمانے پر پوری اترتی تھی، ا
تو آزاد نظم تھی، جس کا رواج ہو چکا تھا اور جس کو رواج دی
میں ترقی پسندوں نے اتنی کوشش کی تھی اور کتنی مخالفتیں سہی تھ

دوسرے اس میں شاعر نے اپنی ذاتی مجبوری کو سماجی مجبوری کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا تھا اور اس سے اس کے سماجی شعور کا پتہ چلتا تھا۔ تیسرے اردو غزل اور نظم کی شعری روایت سے فیض احمد فیض کی طرح بغاوت کر کے مخاطب کسی لڑکی کو قرار دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے ماحول میں تو یہ بغاوت ہی تھی، حالانکہ دس برس پہلے مجاز کی نظموں میں اسی قسم کے اشارے مل چکے تھے میرا مطلب " اصنام نمائش" اور "نورا" سے ہے۔ غرض کہ استاد اور شاگرد دونوں مطمئن تھے۔ جب تنقید شروع ہوئی تو سب سے پہلے انور بھائی نے کہا کہ نظم فیشن حال کے مطابق تو ہے لیکن آمد سے زیادہ آورد معلوم ہوتی ہے۔ یہ یقین نہیں ہوتا کہ مخاطب کا واقعی کوئی وجود ہے یا شاعر کو واقعی کوئی مجبوری درپیش ہے اب بھلا بتایئے کہ ان باتوں کا کوئی کیا جواب دیتا۔

جینے کا سلیقہ

اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو، یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دوبدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اسی طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو، مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے الفاظ استعمال کرو، مثلاً یہ کہ "میری سمجھ میں نہیں آیا" یا "شاید مجھے دھوکا ہوا" یا "میں غلط سمجھا" "گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں"۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے، تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ "میں اس بات کو پھر سوچوں گا"، "یا" اس پر پھر خیال کروں گا" جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کر دو۔

سرسیدؒ

سید مفتاح العارفین رضوی

خلائی تحقیق اور ہندوستان

انسیٹ B کی کامیابی دنیائے سائنس میں ایک اہم مقام رکھتا
،۔ آج ہم جو بھی سائنسی انقلابات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس
خواب کبھی ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت نہرو نے دیکھا
ا۔ انھوں نے ۱۲؍ اگست ۱۹۶۳ء کو سائنس دانوں، انجینروں اور
وسرے اسکالروں کی ایک کانفرنس میں اپنے خیالات کا اظہار ان
فاظ میں کیا تھا۔

"آج ہم سائنس کی لائی ہوئی اہم تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ زندگی کا پورا تصوّر بدل رہا ہے۔ جب ہم ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہم تبدیلیاں بنیادی طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے وقوع پذیر ہیں۔ تبدیلیوں کا یہ عمل جاری ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچاس سال بعد یا ممکن ہے پچیس سال بعد ہی ہم اور بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھیں۔ یہ تبدیلیاں نہ صرف خلائی تحقیق میں ہوں گی بلکہ ان سے انسانی زندگی پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر آپ اس تحریک کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھالیے جس کی سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا متقاضی ہے۔"

بے شک ہندوستان کے سائنس دانوں اور انجینروں نے ان کے خواب کو عملی جامہ پہنایا۔ ۳۰؍ اگست ۱۹۸۳ء کا دن سائنسی تاریخ کا اہم دن تھا۔ کیوں کہ اسی دن ہندوستانی کثیر المقاصد مصنوعی سیارہ انسیٹ 1B امریکی خلائی شٹل چیلنجر کے ذریعے کیپ کناورل کے خلائی مرکز فلوریڈا سے خلا میں چھوڑا گیا جس وقت ایک سو ٹن وزنی چیلنجر اپنے لانچنگ بیس سے تاریک خلاؤں کی طرف پرواز کر رہا تھا اس وقت کا سماں بڑا ہی دلکش اور خوشنما تھا۔ ہر شخص اسی پر اپنی نگاہیں جمائے دم بخود بیٹھا تھا۔ اس وقت امریکہ میں رات کے ۲½ اور ہندوستانی وقت کے مطابق دن کے ½ ۱۱ بجے تھے۔ چیلنجر سے دونوں بوسٹر راکٹ روانہ ہونے کے دو منٹ اور چھ سکنڈ بعد خود سے ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ الگ ہو گئے سیاہ نسل کے خلاباز بلوفورڈ جونیر کے بٹن دبانے سے یہ عمل شروع ہوا۔

انسیٹ کو جس چیلنجر جہاز سے خلا میں بھیجا گیا ہے۔ اس کا یہ آٹھواں سفر ہے۔ اس میں انسیٹ A کی گاڑی سے نسبتاً کم خرچ بھی آیا اور بھی کئی خوبیاں ہیں مثلاً انسیٹ کے خراب ہونے پر بہت ہی آسانی کے ساتھ چیلنجر کی مدد سے اسے واپس لایا جا سکتا ہے۔ جب کہ انسیٹ A میں ایسی بات نہیں تھی۔ اسی لیے اس کے آگے کا سارا کام ٹھپ پڑ گیا تھا۔ انسیٹ A اور B دونوں ہی سیارے فورڈ ایرو اسپیس اینڈ کمیونیکیشن کارپوریشن نے حکومت ہند کے خلائی محکمے کے تعاون سے تیار کیے۔

انسیٹ بی ہندوستان کا نواں مصنوعی سیارہ ہے۔ مکڈونلڈ ڈوگلس کمپنی نے اس کے بوسٹر انجن تیار کیے۔ اب تک اس سے چار مواصلاتی سیاروں کو خلائی شٹل کی مدد سے مدار میں چھوڑا جا چکا ہے۔ ان میں سے دو کناڈا کے ایک انڈونیشیا اور ایک امریکی

داصلاتی کمپنی کا تھا۔ انسیٹ بی کا کل وزن ۱۰۴۷ کلوگرام لمبائی ۱۹۰۴ میٹر سیارہ کے خاص حصّہ کی چوڑائی 2.18 × 1.55 × 1.42 میٹر برق کی پیداوار ۹۰۰ واٹ اور ایندھن 50 کلوگرام ہے۔ حکومت ہند نے امریکی خلائی مرکز کو انسیٹ داغے جانے کے لیے ۸۰ ہزار ڈالر دیے۔

امریکی فضائی اور خلائی مرکز ناسا کے آٹھویں خلائی مشن پر خلائی شٹل چیلنجر فلوریڈا سے روانہ ہوا جس میں پانچ خلا باز تھے۔ کمانڈر رچرڈ ٹرولی اس کے کمانڈر تھے جو نومبر ۱۹۸۱ء میں بھی خلائی شٹل کے دوسرے مشن کے کمانڈر تھے Daniel Brandenstein پائلٹ اور ان کے علاوہ امریکہ کے پہلے سیاہ فام خلاباز Gulonbluford کے ہمراہ Dali Gardener اور معمر اسپیس ماہر ڈاکٹر ولیم تھورنٹن بھی ہیں۔

چیلنجر مشن کے ماہر خلاباز بلوفورڈ نے جوں ہی بٹن دبایا تو ہندوستانی مصنوعی سیارہ چیلنجر سے الگ ہوگیا اس کے بعد ہی اسے ایک موٹر کی مدد سے ہندوستان کے جنوب میں خط استوا سے ۳۵ ہزار، ۸۸ کلومیٹر اوپر قایم کر دیا گیا۔ آفتاب کے نمودار اور اوجھل ہونے کا نظارہ ہر ۴۵ منٹ پر سوار خلا باز کرتے ہیں۔ پہلا پروگرام چیلنجر سے انسیٹ کو الگ کرنے کا تھا۔

کرناٹک کے ہاسن نامی جگہ پر ایک خلائی مرکز قایم کیا گیا ہے۔ جس نے بعد میں سیّارہ کو مدار میں اپنی صحیح جگہ پر لانے کے لیے انسیٹ B کے سی۔بی اینٹینا اور سولر ایریل کو چالو کر دیا۔ جہاں وہ چیلنجر کے ساتھ زمین کے گرد چکر لگانے لگا۔ کمانڈر رچرڈ ٹرولی نے ہی چیلنجر کے انجن کو داغا تاکہ دونوں کی مطلوبہ دوری قایم ہو جائے۔ سیارہ کے زمین کی رفتار سے گردش کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مقررہ جگہ پر ہی دکھائی دیتا ہے۔

سیارہ کو خلا میں بھیجے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد چند تکنیکی خرابیاں آگئیں۔ لہذا اسے ناکارہ ہونے سے بچانے کی کوششیں شروع کی گئیں۔ خرابی کی وجہ یہ تھی کہ شمسی بازو کھل نہیں پایا تھا۔ سیّارہ کا شمسی بازو چھاتہ نما اور بالکل اوپر ہوتا ہے۔ اس شمسی بازو کے نہ کھلنے سے جو مشکلیں آن پڑتی ہیں، ان کے باعث ایک ایسی گھڑی بھی آئی جب کہ سائنس دانوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ مگر ریسرچ نام ہی ہے حالات اور ناکامیوں سے مقابلہ کرنے کا چنانچہ ہاسن کے سائنس دانوں نے اپنی تجربہ گاہ میں رکھے ہوئے ماڈل میں وہی کیفیات مصنوعی طور پر پیدا کر دیں جو فضا میں پیوستہ سیارچہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور پھر یہ زمین پر وہ اس کی اصلاح کی ترکیبیں طرح طرح سے کرنے لگے۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس شمسی بازو کو گرمی اس درجۂ حرارت پر نہیں مل رہی ہے جس کے باعث اس میں عمل شروع ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو پا جانے کے بعد سائنس دانوں نے سیارچہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے پہلو کو اس طور پر بدلے کہ شمسی توانائی کی چھتری یا بازو جو سورج کے رُخ سے دوسری جانب تھا، گھوم کر سورج کے بالمقابل آ جائے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد جب اس پہلو میں حرارت آئی تو شمسی بازوؤں میں زندگی کے آثار کے سگنل ملنے لگے۔ پھر کیا تھا سارے مسئلے حل ہو گئے۔ سائنس دانوں اور انجینئروں کے اس ہمت نہ ہارنے کے باعث یہ سارا مشن فیل ہونے سے بچ گیا۔ شمسی بازو ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو کھلنے میں کامیاب ہو سکا۔

دراصل شمسی پنکھ کے ذریعے ہی ریڈیو اور کیمرہ وغیرہ کو بجلی بیٹریوں سے حاصل ہوتی ہے۔ بیٹریوں کو چارج کرنے کے لیے یہ شمسی پنکھے سولر انرجی کو الیکٹریکل انرجی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کے نہ رہنے سے بجلی کی قلت ہو جانے پر سیّارے کے تمام آلات ٹھپ پڑ جاتے ہیں۔

اسپیس سینٹر ہوسٹن کی خبر کے مطابق اس مرتبہ خلائی شٹل چیلنجر کے ساتھ ۶ عدد سفید اور گلابی آنکھوں والے چوہوں کو بھی بھیجا گیا ہے۔ انھیں ایک مخصوص قسم کے پنجرے میں رکھا گیا ہے۔ پنجرہ کو تیار کرنے والی کمپنی کے مسٹر تھامسن نیکر نے کہا کہ ان چوہوں کو بھیجنے کا مقصد یہ پتہ لگانا ہے کہ چوہے پنجروں کی سطح پر یا خلا میں تیر رہے ہیں۔ ان چوہوں کی عمر دس ہفتے کی ہے مگر یہ صرف ۶ ہفتے ہی خلا میں رہے۔ ناسا نے اِن خلاباز چوہوں کے لیے ناشتہ کا انتظام بڑے ہی سائنسی ڈھنگ سے کیا تھا۔ ان کو آلو کا عرق پینے کے لیے دیا جاتا تھا۔

سیارہ اب بالکل درست ہے۔ اس نے قریب ۹۰ تصویریں Mateorological data کے ساتھ بھیجیں۔ ۱ر اکتوبر سے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۳ء تک روزانہ سات تصویروں کے حساب سے تصویریں

ل ہوگئیں۔ ہمارے ملک کی سابق وزیراعظم محترمہ اندراگاندھی نے
قت انسیٹ IB کو عوام کی خدمات ان کی فلاح وبہبودی اور امن
و قف کرتے ہوئے کہا کہ شروع میں جب ہم خلائی تحقیق کے کاروان
لے بڑھانے میں پُرعزم راہی کے مانند تھے تو چند ممالک کو ہمارے
ن دانوں اور انجینروں پر شک تھا۔ وہ یہ سوچتے کہ ہندوستانی
مشن میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ لیکن انسیٹ IB کی محیرالعقول
بابی کے بعد ان کی غلط فہیوں کا شیرازہ بکھر گیا۔

آنجہانی وزیراعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی نے بنگلور کی ایک
یب میں مزید کہا تھا کہ:

"ہندوستان نے یہ پروگرام کسی اور ملک سے آگے
نکل جانے یا نمائشی چیز کی طرح دکھانے یا اپنی ساکھ بڑھانے
کے لیے نہیں شروع کیا ہے اور نہ اس پروگرام میں فوجی
تیاری کا کوئی پہلو ہے۔ ہندوستان نیوکلیائی توانائی
کی طرح خلائی ریسرچ کو بھی تمام تر پُرامن مقاصد کے
لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ متحدہ اقوام کے اس فیصلے
کا پابند ہے کہ خلا کو اسلحہ سے پاک رکھا جائے اور اسے
فوجی اغراض کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔"

یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے وطن عزیز نے سائنس اور ٹکنالوجی میں تحقیقی کام
رف اور صرف یہاں کے عوام کی فلاح اور پوری دنیا میں امن وامان قایم رکھنے
ے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی رہنے کا پابند ہے

انسیٹ IB سے ٹیلی فون کے ۴ ہزار لمبی دوری والے سرکٹ قایم کیے جاسکیں
گے T.V کے ۱۳ بڑے اور ۱۲ چھوٹے ٹرانسمیٹر تعمیر کیے جائیں گے۔ بہار، اترپردیش
مہاراشٹر، گجرات، آندھراپردیش اور اڑیسہ کے تین تین اضلاع جو ایک دوسرے
ے قریب ہیں، وہاں آسانی سے ٹی۔ وی اور براڈ کاسٹنگ سروس دستیاب
ہوجائے گی۔ صوبۂ بہار کے گیا، مونگیر اور دیگر اضلاع میں بھی ٹرانسمیٹر نصب کیے
جاچکے ہیں اور اب وہاں کے لوگوں کو ٹی وی کی سہولتیں میسر ہیں جس سے وہ
لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

ایک ایسا اسٹوڈیو قایم کیا جائے گا جس سے سات صوبوں میں تعلیمی
پروگرام نشر ہوسکیں۔ گر[illegible]

ہوں گے جن کی مدد سے ٹی وی پروگرام کو دوبارہ نشر کیا جاسکے گا۔ رانچی میں
ٹرانسمیٹر کے INSTALLATION کا کام مکمل ہوچکا ہے اور بہت سارے پروگرام
بھی نشر ہو رہے ہیں جس سے چھوٹا ناگپور جیسے پسماندہ علاقے کے لوگ بھی
فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اسی پروگرام کے تحت جامعہ ملیہ میں ایک مرکز قایم کیا
گیا ہے جو تعلیمی پروگرام تیار کرنے والوں کو تربیت دے گا۔

کثیرالمقاصد مصنوعی سیارہ بیک وقت محکمۂ موسمیات، محکمۂ ڈاک وتار،
آکاشوانی اور دوردرشن کا ایک مشترکہ پروجیکٹ ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ
یہ ہوا کہ اب ٹیلی فون کے سرکٹس کو زمینی نظام پر منحصر نہیں رہنا پڑے گا کیوں کہ
زمینی نظام میں بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جب
دہلی کا رابطہ الٰہ آباد سے کرنا ہو تو سب سے پہلے کلکتہ سے گزرنا پڑتا تھا لیکن
اب انسیٹ IB کے ہونے سے صرف احمد آباد کو چینل دیے جانے پر یا پھر
کوئی مزید چینل ہو تو اسے اس جگہ پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے
جہاں ان کی ضرورت ہے۔

مصنوعی سیارے میں ۸۰۰۰ ٹیلی فون سرکٹس تھے جو ابتدائی
منصوبے کے تحت تھے۔ ان سرکٹس سے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں خصوصی
ٹی۔ وی پروگرام نشر کرنے میں مدد ملے گی۔ ساتھ ہی مختلف طبقوں کے
درمیان مفاہمت کا پیغام پہنچانے میں مددگار و معاون ثابت ہوگا۔ نیز
یہ کہ جذباتی ہم آہنگی کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے۔ پورے ہندوستان میں
۱۲ چینلوں کے ٹیلی فون ٹیلی ویژن اور دوسری سہولتیں فراہم کرے گا۔ دو
چینل بہت طاقتور ہیں جن کے ذریعے دیہی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے
انٹینا کو براہ راست نشریات موصول ہوسکیں گی۔ ملک کے مشرقی ساحل کے
لیے تو یہ سیارہ ایک گراں قدر عطیہ ثابت ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس علاقے
میں آنے والے طوفان کے متعلق متاثرہ علاقوں کو یہ براہ راست آدھا گھنٹہ
قبل ہی مطلع کردے گا۔ جس سے لوگ اپنا بچاؤ کر پائیں گے۔

اس منصوبے کے لیے پورے ملک میں ایک ہزار تین سو مراکز قایم کیے
جائیں گے۔ ۴۵ منٹ کا تعلیمی پروگرام اور ایک گھنٹہ کا ترقیاتی پروگرام
بھی ہوگا جس کے تحت سائنسی فیچرز، زراعت، کنبہ بندی، صحت عامہ،
کھیل کود اور ماحولیات سے متعلق پروگرام پیش کیے جائیں گے۔

محمد مسعود عالم قاسمی

اسلام میں پاکیزگی کی اہمیت

اگر روشنی کے مقابلے میں تاریکی کو پسند کرنا قوانین فطرت سے بغاوت ہے تو پاکیزگی کے مقابلے میں گندگی کو اختیار کرنا بھی فطرت دشمنی سے عبارت ہے۔ طہارت اور نظافت یعنی پاکی اور صفائی تہذیب کا حصہ اور مہذب زندگی کی علامت ہیں۔ مہذب انسان وہی ہو سکتا ہے جس میں اخلاق کی عمدگی، سیرت و کردار کی پختگی اور فکر و عمل میں ہم آہنگی کے ساتھ نفاست اور پاکیزگی بھی موجود ہو، ایک سلیم الفطرت انسان کسی بھی حالت میں گندگی اور ناپاکی کو برداشت نہیں کر سکتا، کیوں کہ پاکیزہ روح کبھی گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔

چنانچہ اسلام نے پاکی اور صفائی کو غیر معمولی اہمیت دی ہے قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت پر اسی طرح زور دیا گیا ہے کہ گویا اس کے بغیر مکمل اسلامی شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزگی کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ النظافۃ تدعوا الی الایمان والایمان مع صاحبہ فی الجنۃ (معجم طبرانی) (پاکیزگی ایمان کی داعی ہے اور ایمان والا جنت میں جائے گا) اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنانہ زندگی کے لیے پاکیزگی ایک بنیادی اور لازمی صفت ہے اور جنت کا حق دار اسی کو ہونا چاہیے جس میں یہ صفت موجود ہو۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا۔ ان اللہ طیب یحب الطیب، نظیف یحب النظافۃ، کریم یحب الکرم، جواد یحب الجود، فنظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیہود (سنن ترمذی) (اللہ پاک ہے پاکیزگی کو پسند کرتا ہے، صاف ہے صفائی کو پسند کرتا ہے، شریف ہے شرافت کو پسند کرتا ہے، سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، تم لوگ اپنے آنگو[ں] کو صاف رکھو اور یہودیوں کی مشابہت نہ کرو) خود حضور اکرم صلی [اللہ] علیہ وسلم کو جہاں منصب نبوت کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا وہاں پاکی [اور] صفائی کا بھی حکم دیا گیا۔ یا ایھا المدثر قم فانذر، وربک فکبر وثیابک فطھر والرجز فاھجر (المدثر - ۵) (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو)

پاکیزگی کی اہمیت فرضی اور اعتباری نہیں ہے اور اسے ایما[ن] کا جزو یوں ہی قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایمان اور پاکیزگی میں ایک منطقی ربط ہے۔ ایمان کا مطلب ہے کہ تمام باطل معبودوں اور عقائد فاسد افکار و تصورات سے کنارہ کش ہو کر صرف اللہ کے لیے یکسو ہو جانا اور اسی کی اطاعت میں زندگی گزارنا، یہ ایک باطنی پاکیزگی ہے جو دل و دماغ اور افکار و اعمال سے متعلق ہے، اسی کا دوسرا رخ ظاہری پاکیزگی ہے جو جسم اور لباس، مکان اور طعام وغیرہ کی پاکیزگی سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین (البقرہ ۲۲۲) (اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو توبہ کریں اور پاکیزگی اختیار کریں)۔ اس لیے ظاہری پاکیزگی کو باطنی پاکیزگی کی علامت اور مظہر سمجھنا چاہیے۔

پاکیزگی عبادت ہے

اسلامی نظام زندگی میں پاکیزگی کا جو مقام ہے اس کا اندازہ

ں سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عبا
ی قرار دیا ہے۔ مِفْتَاحُ الصَّلٰوۃِ الطُّهُوْرُ (سنن ترمذی) یعنی
ں کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی"۔ پاکی ایک بڑی عبادت کی قبولیت کا
بہ ہونے کی وجہ سے خود بھی عبادت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم
ہر نماز سے پہلے ظاہری اعضا کا دھونا فرض قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ دن
یں پانچ مرتبہ پاکیزگی اختیار کرنے کا یہ عمل مومن کو پاکیزہ زندگی گزارنے
یے محرک اور معاون ثابت ہو۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ
دِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ
ْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (المائدہ - ٦)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ
ے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں
نوں تک دھو لیا کرو۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک
جاؤ۔"

اس کے علاوہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ غسل کرنے کو ضروری
ر دیا ہے۔ ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
فرمایا۔ للّٰہ علیٰ کل مسلم حق ان یغتسل فی کل سبعۃ
یام یومًا (بخاری) (ہر مسلمان پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ ہفتے میں
ک دن غسل کرے۔") مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دن اجتماعی فرصت،
تہ کی عید اور بڑی خصوصیات کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے اس دن
غسل کرنے کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ ابو سعید خدریؓ روایت
تے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "غسل یوم الجمعۃ
جب علی کل محتلم (بخاری) (جمعہ کے دن غسل کرنا ہر بالغ پر
جب ہے") جمعہ کو ہفتہ کی عید اسی لیے کہا گیا ہے کہ عید ہی کی طرح
ب اور صاف ہو کر، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر
ں دن کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے پاکیزگی کی ایک عمومی فضا پیدا
تی ہے۔

اسلام نے پاکیزگی کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ پیشاب کی چھینٹوں
ے احتیاط نہ کرنے کو بھی گناہ شمار کیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ راوی
ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ یا مدینہ کے کسی باغ کی چہار دیواری
سے گزرے تو آپؐ نے دو ایسے انسانوں کی آواز سنی جن کو قبروں میں
عذاب دیا جا رہا تھا۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا "یعذبان وما یعذبان
فی کبیر ثم قال بلیٰ کان احدهما لا یستتر من بولہ وکان
الآخر یمشی بالنمیمۃ (بخاری) "(ان پر عذاب ہو رہا ہے مگر
یہ عذاب کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ہے) پھر فرمایا، ہاں! ان میں
سے ایک اپنے پیشاب سے نہیں احتیاط کرتا تھا اور دوسرا چغلخوری
کیا کرتا تھا۔)

اسلام کو گندگی سے ازلی نفرت ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو اور
مقدار میں کتنی کم ہی کیوں نہ ہو۔ آپؐ نے گندے اور بدبودار جسم و لباس
میں رہنے کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب عامل
(COLLECTOR) تھے، محنت اور مصروفیات کی وجہ سے ان کے
جسموں سے پسینہ وغیرہ کی بو نکلتی تھی تو آپ نے فرمایا "لو اغتسلتم
"اچھا ہوتا کہ تم لوگ غسل کر لیتے" (بخاری)۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے جسم
پر میلا کچیلا لباس تھا تو آپؐ نے فرمایا 'کیا اسے اپنا کپڑا دھونے
کے لیے کچھ نہیں ملتا؟ (احمد و نسائی)۔ اسلام اس سلسلے میں اس
قدر حساس ہے کہ اسے پیاز اور لہسن کی بو تک گوارا نہیں ہے۔ ان کا
کھانا اگرچہ حرام نہیں ہے لیکن ان کو کھا کر مسجد میں جانا سخت ناپسندیدہ
ہے۔ جابرؓ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اکل ثومًا او بصلًا فلیعتزل مسجدنا ولیقعد فی
بیتہ (بخاری) (جس نے پیاز یا لہسن کھایا وہ ہماری مسجد یا ہم سے
دور رہے اور اپنے گھر میں جا کر بیٹھے۔) اسی طرح سعید بن مسیبؓ
کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ 'من اکل من
هذہ الشجرۃ فلا یقرب مساجدنا یؤذینا ریح الثوم (موطا
امام مالک) (جس نے اس پیڑ کا پھل کھایا وہ ہماری مسجدوں کے
قریب نہ آئے۔ مبادا ہمیں لہسن کی بو سے تکلیف پہنچائے")۔ اس کے
ساتھ ہی مسواک کرنے کا اور منہ صاف کرنے کا اہتمام کرنے پر زور

گیا ہے۔ ایک مرتبہ تو آپؐ نے فرمایا کہ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِی
مرتُہم بالسواک مع کل صلوٰۃ (بخاری) (اگر میں اپنی امت پر بوجھ
محسوس کرتا تو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا") ایک دوسری
حدیث میں ہے کہ مسواک کرو اس سے منہ صاف رہتا ہے اور یہ رضائے
الٰہی کا ذریعہ ہے۔ جب بھی جبرئیل میرے پاس آئے مجھے مسواک کی تاکید
کی یہاں تک کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ ایسا نہ ہو کہ مجھ پر اور میری امت
پر یہ فرض ہو جائے" (ابن ماجہ)

اسلام نے عمومی پاکیزگی کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ اس نے سوکر اٹھنے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر پانی کے ٹب میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا ہے۔ صرف اس بنا پر کہ انسان سونے کی حالت میں اپنے ہاتھ کے مقامات سفر سے باخبر نہیں ہوتا (ابوداؤد) اسلام صرف پاکی اور صفائی ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ وہ زیب و زینت یعنی smartness کا بھی حکم دیتا ہے۔

پاکی اور صفائی

طہارت اور نظافت یعنی پاکی اور صفائی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر ایک چیز صاف ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ پاک بھی ہو۔ اسی لیے اسلام نے پاکیزگی کے کچھ اصول مقرر کیے ہیں اور یہ اصول اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پاکیزگی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ بالکل منفرد اور ممتاز ہے۔ البتہ اسلام نے پاکی اور صفائی دونوں کا مطالبہ کیا ہے، ان میں سے کسی کو ترک نہیں کیا جا سکتا فرق یہ ہے کہ پاکی پر نسبتاً زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیوں کہ صفائی پاکی کے بغیر بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بجائے خود صفائی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

دنیا کی بیشتر قومیں صرف ظاہری صفائی کو تہذیب و ثقافت کا جز و سمجھتی ہیں اور پاکیزگی پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ اسلام کی مطلوبہ پاکیزگی ان قوموں میں مفقود ہے۔ لباس اگر میلا ہو جائے یا اس پر کوئی دھبہ آ جائے تو مہذب لوگ فوراً اسے تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ درست ہے مگر آنکھوں سے نہ دیکھی جانے والی گندگی کی خواہ کتنی ہی مقدار اس میں جذب ہو جائے تو وہ کبھی اسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن سب سے زیادہ افسوس مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جس قوم کو طہارت، نفاست اور زینت کی اتنی زبردست تعلیم دی گئی ہے وہ کس طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے مطلوبہ معیار سے نیچے آ گئی کہ بعض اوقات اسے یہ طعنہ بھی سننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک پاکیزہ مذہب ہے مگر مسلمان گندے لوگ ہیں۔ اس تاثر سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی حالت پاکی اور صفائی کے معاملے میں قابل اصلاح ہے اگر آپ سنجیدگی سے مسلم سماج کا جائزہ لیں تو آپ کو اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے موجودہ رویوں میں بڑا فرق محسوس کریں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ ذوقِ جمال بہت دور کی چیز ہے ان میں شہری ذوق کی بھی بہت حد تک کمی ہے۔ امید یہی تھی کہ مسلمان دنیا میں اعلیٰ ایمانی قوت کے ساتھ اعلیٰ درجے کی نفاست پسند قوم کی حیثیت سے متعارف ہوتے اور دنیا کو ایمان کے ساتھ پاکی اور صفائی کی بھی دعوت دیتے۔ مگر اس کے برعکس وہ خود ہی اپنی راہ بھلا بیٹھے اس صورتِ حال کے بھی کچھ اسباب ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیے۔ ایک سبب تو تمدنی پس ماندگی اور معاشی بدحالی ہو سکتی ہے، معاشی بدحالی اور خوش حالی کا انسان کی تہذیب و ثقافت پر اثر پڑتا ہے خوش حال قوموں کی معاشی مصروفیات ایسی نہیں ہوتیں کہ صفائی ستھرائی اور ظاہری نفاست کا اہتمام کرنے میں رکاوٹ ہوں۔ مگر جو قوم معاشی اعتبار سے مصروف اور پریشان ہو، اس کو فکرِ معاش اس بات کا موقع کم دیتی ہے کہ وہ ان چیزوں پر خاطر خواہ توجہ دے سکے، وہ زندگی کو سنوارنے سے زیادہ زندگی گزارنے پر توجہ دیتی ہے۔ چنانچہ ایک فارغ البال انسان جو فکرِ معاش میں پریشان نہ ہو، وہ اپنا جسم لباس اور مکان بلکہ ایک ایک شے کو صاف ستھرا اور قرینہ سے رکھتا ہے، روزانہ کپڑے تبدیل کر سکتا ہے اور جس چیز کو غیر موزوں دیکھتا ہے، فوراً اسے درست کر دیتا ہے۔ مگر ایک مصروف انسان روزانہ کپڑے نہیں تبدیل کر سکتا اور نہ اتنا وقت ان چیزوں پر صرف کر سکتا ہے، اس کی نظر خورد و نوش کے

ل میں الجھی رہتی ہے، وہ اپنے کپڑے ذرا میلے بھی دیکھتا ہے تو
م الفرصتی کا بہانہ بنا کر اس سے صرفِ نظر کر لیتا ہے اور بہت سی چیزوں کو
سلیقہ دیکھ کر بھی ان کی درستگی کے لیے اس کے دست و پا جنبش
ں کرتے۔

دوسرا سبب جہالت اور عدم واقفیت ہو سکتی ہے۔ جس قدر
لیمی ترقی ہوتی ہے اسی قدر نفاست کا تصور عام ہوتا ہے پاکیزگی
رواج ملتا ہے۔ جہاں جہالت زیادہ ہوتی ہے وہاں بالعموم اجتماعی
مور حس کی ایک شاخ شہری شعور (Civic Sense) بھی
ے پست ہوتا ہے، اس وقت حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑی
عداد صفائی ستھرائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقف ہے
بلکہ ان بنیادی تعلیمات سے بھی نابلد ہے جو قرآن و حدیث اور اسلامی
تابوں میں اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ اپنی تاریخ اور تعلیم سے جو قوم
اواقف ہو وہ اس کی حفاظت یا اس سے استفادہ کس طرح کر سکتی
ہے؟ اسلام سے پہلے عرب میں پاکیزگی کا جو کمترین معیار تھا، اس سے
اہلِ نظر بخوبی واقف ہیں اور اس کی وجہ جہالت تھی لیکن جب اسلام
آیا اور اسلامی علوم رائج ہوئے تو اعلیٰ درجے کی نفاست اور
پاکیزگی کا تصور عام ہوا۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات سے دور ہو گئے اور
ان احکام سے عملاً منحرف ہوئے جن پر عمل کرنا ہی ذریعۂ نجات قرار دیا
گیا تھا، دوسرے شعبہ ہائے حیات کی طرح وہ طہارت اور نفاست
کے سلسلے میں بھی اسلام کے پابند نہیں رہے۔ وہ ایک بیکار اور مفلوج
زندگی گزارنے کے عادی بن گئے۔ حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
اور ان کے اصحاب کا معیار زندگی دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
فاقہ کشی اور مفلسی بھی ضرب المثل ہے مگر جس قدر صفائی اور پاکیزگی کا وہ
خیال رکھتے تھے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اگر مسلمان شعوری طور پر تمام
احکام پر عمل کرنے لگیں تو ان کا کھویا ہوا وقار واپس آسکتا ہے۔ اگر
وہ پاکیزگی کے اصولوں پر عمل کریں تو تہذیب و تمدن میں آج بھی ان کا بڑا
مرتبہ ہے مگر جب تک وہ ایسا نہیں کرتے وہ ہرگز اسلام کا مطلوب
مہذب انسان نہیں بن سکتے اور اسلامی تہذیب کی نمائندگی کا
حق ادا نہیں کر سکتے۔

اخلاق سکھانے کے دو ہی موثر طریقے ہیں۔ ایک تو اچھی
صحبت اور ماحول کے ذریعے، دوسرے ان برگزیدہ ہستیوں کی
سوانح زندگی کے ذریعے جنھوں نے دنیا کی مخالفتیں اور
سختیاں جھیل کر اپنے نفس کو مار کر تن من دھن سے اپنے ملک
یا قوم کی خدمت کی اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا
اور ایسے کام کر گئے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ یہ لوگ
مرے نہیں زندہ ہیں اور ہمیشہ اپنے بعد آنے والی نسلوں
کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

احمد الدین مارہروی

امریکہ کا موہن جوڈارو

زمین صرف مردہ جسموں ہی کو ہضم کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ بڑے بڑے آباد اور گنجان شہروں کو بھی لقمۂ تر سمجھ کر ہڑپ کر جاتی ہے۔ جہاں جہاں بھی اس کا سینہ چاک کیا گیا، نئے نئے شہر اور عجوبۂ روزگار بستیاں برآمد ہوئیں۔ اٹلی میں پومپیائی دریافت ہوا جس کا مشاہدہ کر کے سیاحوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ بھارت میں نالندہ یونیورسٹی کے کھنڈرات جن میں ایک مندر کے اوپر بعینہٖ ویسا ہی دوسرا صنم خانہ بڑے بڑے انجینروں اور ماہرین آثار قدیمہ کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہے، مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں موہن جوڈارو اور ہڑپہ اس جوع البقر کی بڑی نایاب مثالیں ہیں جن کے ماتحت زمین ان بستیوں کو اپنے بطن میں صدیوں تک چھپائے رہی اور بالآخر انسان نے اس کا شکم چاک کر کے انھیں کھود نکالا۔

یہی کیفیت امریکہ کے قدیم ترین شہر طوطی ہوکان کی ہے جس کے آثار ابھی حال میں دریافت ہوئے ہیں، اور گو نئی اور پرانی دنیا کی تہذیب کی تاریخ میں کئی سو برس کا درمیانی فاصلہ ہے لیکن بعض مشابہتیں تو ایسی ہیں کہ انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ موہن جوڈارو کی طرح اس کی بھی کوئی صحیح تاریخ معین نہیں کی جاسکتی۔ صرف ماہرین کے بیانات پر انحصار کر کے ماننا پڑتا ہے کہ اس کے آثار دو ہزار برس پرانے ہیں۔ پھر جس صورت سے بعض اینٹوں اور برتنوں کے ٹکڑوں کی بدولت موہن جوڈارو دریافت ہوا اور رفتہ رفتہ کھدائی کر کے پورا شہر برآمد کر لیا گیا۔ اسی طرح طوطی ہوکان کا پتہ بھی قرب و جوار کے کھیتوں میں قدیم دیواروں کے آثار اور سفالی برتنوں سے لگا۔ ہمارے ہاں تو لارڈ کرزن نے باقاعدہ محکمۂ آثار قدیمہ قایم کر رکھا تھا اور اس نے پنجاب اور بلوچستان کے علاقوں میں کھدائی کا کام شروع بھی کر دیا تھا۔ اس لیے ۱۹۲۲ء میں جب سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں کچھ قدیم اشیاء دستیاب ہوئیں تو سرکاری مشین فوراً حرکت میں آگئی اور چند ہی سال کے اندر موہن جوڈارو کے چہرے سے صدیوں پرانا فراموشی کا نقاب اٹھ گیا اور پورا شہر کتم زمین سے عالم وجود میں آگیا۔ میکسیکو میں چوں کہ اس قسم کا کوئی محکمہ موجود نہ تھا، اس لیے وہاں یہ کام عمومی سطح پر انجام پا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں ایک طالع آزما نیول گا ہو بچہ ساتھیوں کی ایک جماعت لے کر اس علاقہ میں پہنچا اور دو برس تک دفینوں کی تلاش میں زمین کی پسلیاں ٹٹولتا رہا۔ لیکن کسے علم تھا کہ "دھرتی ماتا" بجائے سونے، چاندی یا جواہرات کے ایک نادر شہر کو اپنی کوکھ سے جنم دینے والی ہے۔ لیکن جب اینٹوں کے ڈھیر اور پتھروں کے انبار سے قدیم تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تو پوری جماعت دم بخود رہ گئی۔ لیکن چوں کہ ان کا مطمح نظر دولت کمانا تھا نہ کہ صرف کرنا اس لیے کام تو جاری رہا لیکن نہایت سست رفتاری سے۔ کیوں کہ جو کچھ سرمایہ ان کے پاس تھا وہ جلد ہی ختم ہو گیا اور بقول ڈاکٹر یاد کوتیا کے جو آج کل آثار قدیمہ کے نگراں ہیں، "ہماری دو نسلیں تو اس سنگلاخ زمین کو کدالوں اور ہاتھوں سے کھود کر شہر کو برآمد کرنے ہی میں ختم ہو گئیں"۔

آخر کسی ذی اثر شخصیت نے صدر مملکت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی اور اُن کی سفارش سے ۱۹۶۲ء میں سترہ ملین پیسو، یا

ڑھے تیرہ لاکھ ڈالر اس دریافت کے واسطے مختص کر دیے گئے جس کے
ہ کام بڑی تندہی سے شروع ہوا۔ بلڈوزر چلتے گئے اور ہزار ہا ٹن ملبہ
ن زمین سے باہر نکالا گیا۔ ۲۵ ماہرین فن کا عملہ اس غرض سے مقرر کیا
ا کہ وہ اس میں سے نکلے ہوئے ٹکڑوں اور چیزوں کو جمع کر کے ان کے
علق تحقیق کرے اور ان کے توسط سے قدیم تہذیب کے تار و پود کو
ا کرے۔ چنانچہ چند برسوں کی کد و کاوش کے بعد پورا شہر منظر عام پر
یا۔

رفتہ رفتہ ان کی رسائی ازٹیک AZETIC قوم کے ان مخطوطات
ک ہو گئی جنھوں نے اس شہر کی تباہی کے تین سو برس بعد اس علاقے پر
بضہ کیا تھا۔ اِن صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام ان کا مذہبی مرکز
تھا۔ سارے دیوتا دیوی یہیں مقیم تھے اور اُن کا بادشاہ ہر نازک موقع
پہ زیارت کے واسطے اس شہر میں آتا اور ہمیشہ اپنے مقاصد میں کامران و
کامیاب ہو کر واپس لوٹتا۔ انھوں نے اس مقام کا نام طوطی ہوکان
رکھا تھا جس کے معنیٰ ان کی لغت میں "مرنے کے بعد دیوتاؤں سے مل
جانے والے بزرگوں کا شہر" ہے۔ اور انھوں نے ہی دونوں اہراموں
اور ان کے درمیان بڑی سڑک کے نام علی الترتیب سورج اور
چاند کے آسمان اور شاہراہ رفتگان تجویز کیے تھے اور اب انھیں کے
مرقومہ حالات سے ہمیں اس قوم کی عظمت اور تہذیب کا علم ہوتا
جا رہا ہے۔

(۲)

میکسیکو کے شمالی مشرقی علاقے میں پہاڑیوں کا سلسلہ دور
تک چلا گیا ہے۔ ان کے درمیان دارالسلطنت سے تقریباً پچاس میل
کے فاصلے پر ایک خشک میدان ہے جو ریت اور جھاڑوں سے ڈھکا
ہوا ہے۔ اندر جانے کے واسطے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ بھی
نہایت دشوار گزار۔ چند سال قبل تک تو کوئی اس طرف کا رخ بھی نہ
کرتا تھا لیکن اب ہر طرف موٹریں، لاریاں اور جیپیں گھومتی نظر آتی ہیں
میکسیکو سے یہاں تک مسافت کچھ زیادہ نہیں لیکن راستے کی ناہمواری
ٹریفک کے قواعد اور دو تین مقامات پر رکاوٹوں کے باعث وہاں
تک پہنچنے میں تقریباً آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ پہلا نظارہ پہاڑی کے
اوپر سے ہوتا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے گویا ہم کسی جادو کی سرزمین
میں داخل ہو رہے ہیں کیوں کہ تصاویر میں جن یادگاروں کو ہم اہرام
مصر کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ اب زیادہ صاف اور واضح نظر آتی
ہیں اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں بلند سے بلند تر ہوتی جاتی
ہیں۔ مشرقی کا نام شمسی اور مغربی کا قمری استھان ہے اور پانچ
گز چوڑی اور تین میل لمبی سڑک ان دونوں کو ملاتی ہے۔ اس کے
اِرد گرد مضبوط دیواریں ہیں جن کی موٹائی بعض مقامات پر تین فٹ تک
ہو جاتی ہے اس کے آگے شہر ہے جس کی عمارات کو بآسانی تین حصوں
میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو وہ حصّہ ہے جہاں عمائدین کے
پر تکلف اور شاہانہ محلّات واقع تھے۔ دوسرے کو دیکھ کر بخوبی
اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں تجارت پیشہ اور صنّاع لوگ آباد ہوں گے
جنھیں آپ اپنی اصطلاح میں مڈل کلاس کہہ لیجیے اور آخر میں عوام جمہور
اور غربا کے مکانات تھے، جو اَب بالکل منہدم ہو چکے ہیں۔ سڑکیں صاف
اور ستھری نظر آتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دور پر چوراہے ہیں اور کہا
جاتا ہے کہ ہر بلاک میں ایک ہی نوعیت اور پیشے کے لوگ آباد تھے۔ مثلاً
ایک میں نداف، دوسرے میں سنگ تراش اور تیسرے میں آڑھتی اور
بقال وغیرہ۔ تمام مکانات کے دروازے اندر کی طرف کھلتے تھے تاکہ
سڑک پر چلنے والوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ دیکھ کر
حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کھڑکیوں کا رواج نہ تھا جس کے
متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ اس سے ایک طرف تو گھر والے شور و شغب
سے محفوظ رہتے اور دوسری جانب چوروں اور اُٹھائی گیروں سے
محافظت ہوتی تھی۔ آبادی سے باہر نکلیے تو کھیتوں کے آثار صاف نظر
آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نہریں بنا کر ان کے ذریعے آب پاشی کی جاتی تھی
اور ان ہی میں ایک شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتی تھی جس سے علاوہ گھروں
میں آب رسانی کے صفائی کا بھی کام لیا جاتا تھا۔

اس نواح میں جو قوم آباد تھی اس کے متعلق یہ بات تو ابھی تک
تحقیق نہیں ہو سکی کہ وہ نوشت و خواند سے واقف بھی تھی یا نہیں لیکن
بعض اربابِ علم اس خیال کے مؤیّد ہیں کہ یہ بھی قدیم مصریوں کی طرح
اپنے مافی الضمیر کو فرضی اشکال کے ذریعے ظاہر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ

ان کی اکثر عمارات پر طرح طرح کی تصاویر کے نقوش اب تک باقی ہیں۔ ان کا مندر جو شہر کے وسط میں واقع ہے، فن کی تعمیر کی ایک بیش بہا مثال ہے۔ اس کی دیواروں پر جگہ جگہ مختلف سانپوں کے سر اور پھن بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بارش کے دیوتا تلدلو کو بھی عجیب و غریب نوعیت سے دکھایا گیا ہے جس سے مختلف کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ دیوان کو دیکھیے تو اس پر بھی چاروں طرف دیو مالائی جانوروں کی تصاویر کندہ اور نقوش ہیں۔ بعض نظاروں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ دریا میں اشنان کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ نوجوان پانی میں اچھلتے کودتے چہلیں کرتے ایک دوسرے پر چھینٹے اڑا رہے ہیں اس کے قطرے علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں۔ جو آوازیں ان کے منہ سے نکل رہی ہیں ان کو سُر کے لحاظ سے مختلف لہروں سے ظاہر کیا گیا ہے جس سے ماہرین اس نتیجے کے اخذ کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ وہ موسیقی کے ماہر تھے اور آواز کے ارتعاش کو بخوبی سمجھتے تھے۔

ایک دوسری تصویر کسی فلسفی یا سادھو کی ہے جو وضع قطع میں سقراط سے مشابہ ہے۔ لوگ اس کے اردگرد ادب سے دو زانو بیٹھے ہیں اور وہ اُن کو یا تو نصیحتیں کر رہا ہے یا فلسفہ کا کوئی نکتہ سمجھا رہا ہے۔ ایک شاگرد کھڑے ہو کر کوئی مسئلہ دریافت کر رہا ہے اس کے منہ سے نکلی ہوئی آواز بھی ہوائی لہروں کے توسط سے ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن استاد اور شاگرد کے لباس میں بھی فرق ہے اور ایسا لگتا ہے کہ نوجوان کسی متمول اور سربرآوردہ خاندان کا چشم و چراغ ہے جو علم کا دلدادہ ہونے کے باعث اس مجلس میں شریک ہوتا اور اس استاد کے خیالات سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔ اور ایک تصویر جو بے انتہا جاذب نظر ہے محفل عروسی کی ہے۔ دولہا دلہن براتیوں کے درمیان دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ موسیقی کے ساتھ رقص بھی جاری ہے۔ دولہا دلہن کو رقاصہ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر وہ لاجونتی شرمائی لجائی گردن جھکائے ساکت و صامت بیٹھی ہوئی ہے اور مطلق توجہ نہیں کرتی۔ پشت پر سواری کے گھوڑے کھڑے ہیں جن کے ساز و سامان موقع کی مناسبت سے سنہری اور روپہلی رنگوں سے مزین کیے گئے ہیں۔ بعض عورتوں کی گودوں میں شیرخوار بچے بھی دکھائے ہیں، جنھیں وہ بے تکلف اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہیں اور آپس میں باتیں بھی کرتی جاتی ہیں۔

حال میں دو نواحی بستیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ وہاں بھی مکانوں اور عمارتوں پر پرندوں، مویشیوں، دیوتاؤں اور پھر دیوتیوں کی تصاویر منقوش ہیں۔ دیواروں پر سرخ رنگ کیا ہوا تھا جس کی دھندلی سی رمق اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ لیکن جہاں نقوش اور رنگ ہوئے بھی اسی طرح ترو تازہ ہیں اور جب اُن کا تقابل اٹلی کے مشہور شہر وینس کی قدیم تصاویر سے کیا جاتا ہے تو اُن کی برتری اور افضلیت کو تسلیم کر دل بے اختیار ان کاریگروں اور صناعوں کی چابک دستی پر عش عش کر ان ہاتھوں کو چوم لینے کا خواہش مند نظر آتا ہے جن کے موقلموں نے یہ رنگ آمیزی کی تھی۔

فن عمارت اور نقاشی کے بعد اس نامعلوم قوم کی دوسری خصو ان کی صنعت کاری تھی جس کے پچاسوں نمونے برتنوں اور مجسموں کی شکل ابتک دریافت ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مٹی کے پیالے ا برتن تو تقریباً ہر کھدائی میں ملا ہی کرتے ہیں لیکن یہاں سے جو ظروف د ہوئے ہیں ان میں استعمال ہونے والی مٹی بہت پتلی اور کاغذ کی طرح جرم ہے۔ پیالوں میں پانی، دودھ، چائے، شراب کچھ بھی بھر دیجیے باہر اس کی جھلک بالکل اسی طرح نظر آتی ہے جیسے بلور کے برتن میں دکھا دے گی۔ دیوتاؤں کے مجسمے بھی اسی اصول پر وضع کیے گئے ہیں کہ کپڑوں کے اندر سے جسم کی ساخت اور اعضا کی ڈھلان، سینہ نشیب و فراز، ناف کا سوراخ، غرض کہ ہر شے صاف نظر آجاتی خوش قسمتی سے وہ کارخانے بھی دریافت ہو گئے ہیں جہاں یہ بیش اور نادر اشیا تیار ہوتی تھیں۔ سنگ مرمر کی طرح کے بنے ہو پتھر کے بے شمار سانچے طاقچوں میں رکھے یا زمین پر بکھرے ہوئے آ بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مٹی کو صاف کرنے اور مجسمہ بنانے کا فن وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے اور اب نہ کوئی سائنس دا اُن سے واقف ہے نہ دستکار۔ موسیقی کے کچھ ٹوٹے پھوٹے سا اور آلات بھی کہیں کہیں ملے ہیں۔ لیکن ابھی ان کے متعلق تحقیقات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ چکنی مٹی کی بنی ہوئی بانسریاں البتہ درمیانی بڑ

ملامات میں پائی گئی ہیں جن سے بڑی سریلی آوازیں نکلتی ہیں۔ دھر
ں سے جو نے نواز ان کو دیکھنے آئے ہیں وہ گھنٹوں ان پر اپنی راگ
تے ہیں اور ماہرین کا خیال ہے کہ لکڑی، نکل یا دھات کی بنی ہوئی
ریاں اتنی مدھر سُر نہیں نکال سکتیں جتنے ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳)

طولی ہوکان کے اہرام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جو شہر کے شرقی اور
ہ حصوں میں واقع ہیں۔ مجھے تو فن عمارت میں اتنا درک حاصل نہیں
ن وہ انجینئر اور سیاح جو غزہ کے اہرام کا بغور مطالعہ کر چکے ہیں،
فق الرائے ہیں کہ ان دونوں میں اتنی زبردست مماثلت پائی جاتی ہے
یہ اندازہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ دونوں کے مہندس، صنّاع، معمار
ر کاریگر ایک ہی تہذیب اور ثقافت سے منسلک تھے بلکہ اس کا
ی امکان ہے کہ جو دماغ اور ہاتھ مصر میں کارفرما تھے وہی یہاں
ی سرگرم عمل رہے تھے۔ لیکن کہاں مصر اور کہاں میکسیکو پھر دونوں
ے درمیان علاوہ بعد المشرقین کے بحر روم اور بحر اوقیانوس کے ایسے
ول طویل اور عمیق آبی خطے حائل ہیں جن کو عبور کرنے کے لیے اس
زمانے میں جب کہ دخانی جہاز موجود نہ تھے، کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا
ب صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں جو مورخین، ماہرین آثار قدیمہ اور طبقات
لارض کے زیر غور رہیں۔ یا تو یہ کہ جس زمانے میں اہرام مصری اور
یہ استھان تعمیر ہوئے، بحر اوقیانوس ابھی وجود ہی میں نہ آیا ہو اور
فریقہ، امریکا کے وسیع براعظم ایک دوسرے سے پیوست ہوں اور
یہاں سے وہاں تک ایک ہی تہذیب اور تمدن کا دور دورہ تھا۔ یا
پھر ایسا ہوا ہوگا کہ فراعنۂ مصر نے ان صناعوں کو اس خیال سے کہ
کبھی ان میں ایسی لاثانی عمارت بنا دینے سے غرور و تمکنت پیدا نہ
ہو جائے قتل کرنے کی ٹھان لی ہو اور وہ جان بچانے کی خاطر کسی
کشتی میں بیٹھ کر بحر قلزم کے راستے فرار ہو گئے ہوں اور افریقہ کے
ساحل چلتے چلتے راس امید کو چھوتے بالآخر ساحل میکسیکو پہنچنے میں
کامیاب ہو گئے ہوں۔ دونوں ہی نظریے بظاہر ناممکن اور بعید از
قیاس نظر آتے ہیں۔ لیکن ارباب علم کو اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل
آج تک نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ

حضرت آدمؑ کی نسل سے جو لوگ مشرقی یا مغربی دنیا میں آباد ہوئے ان
کی دماغی صلاحیتیں اگر یکساں ہوں تو اس میں کیا نقص ہے۔ ممکن ہے
کہ دونوں کی سوچ اور ہاتھ کی کاریگری یکساں رہی ہو۔

اہرام کے بعد دوسری حیرت انگیز عمارت وہ ہے جسے ماہرین تقویم
یا "کیلنڈر" کے نام سے پکارتے ہیں جن صاحبان کو قدیم دہلی کے کھنڈرات میں
جنتر منتر کی عمارات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کی نوعیت کو بخوبی
سمجھ لیں گے۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین علم الافلاک دور دور سے محض
اس کو دیکھنے کی غرض سے آتے اور مہینوں یہاں ٹھہر کر اس کا مشاہدہ
اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ دن میں سورج کا جو سایہ پڑتا ہے اسے
یہ عمارت دھوپ گھڑی کی طرح ساعتوں اور منٹوں میں تقسیم کر کے صحیح
وقت بتا دیتی ہے جبکہ جب آفتاب سمت الراس پر ہوتا ہے تو اس
کا شمہ بھر سایہ بھی کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح رات کو چاندنی روشنی
بھی ہو بہو ان ہی مدارج سے گزرتی ہے جو اس کے واسطے متعین کر دی
گئی ہیں۔ ایک ریاضی دان کا کہنا ہے کہ اگر میں سحر کا قائل ہوتا تو ضرور
کہہ اٹھتا کہ یہ عمارت جادوگروں کی تعمیر کردہ اور ان کے شعبدوں کا
شاہکار ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ نہ معلوم کس قسم کے لوگ تھے جنہوں
نے آج سے ہزاروں سال قبل وہ تمام راز معلوم کر لیے تھے جن کی
دریافت کا سہرا بعد میں نیوٹن اور آئن اسٹائن کے سر باندھا گیا۔
جتنے منہ اتنی باتیں وہاں پہنچ کر سنیے تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص عالم تحیر
میں عجیب و غریب قسم کے خیالات کا اظہار کر رہا ہے جن میں سے بعض
کو سن کر ہنسی آتی ہے اور بعض بڑی دلچسپ معلوم
ہوتی ہیں۔

(۴)

اس قدیم شہر کی تاریخ کے بارے میں افسوس ہے کہ حتمی طور پر
کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کے ماہرین اس راز پر سے پردہ اٹھانے
کی فکر میں منہمک ہیں، کھدائی جاری ہے، سروے ہو رہا ہے، اینٹوں
اور برتنوں کو قدامت کے آلات اور پیمانوں سے پرکھا جا رہا ہے۔
اب تک جن باتوں کا پتہ لگ سکا ہے وہ یہ ہیں کہ طولی ہوکان کو

سو برس کی زندگی نصیب ہوئی جس میں اس کی وسعت بڑھتے بڑھتے
ہ میل کے دائرے تک پہنچ گئی۔ دولت اور ثروت میں جیسے جیسے
ی ہوئی اونچے اور متمول طبقے کے لوگ اپنے واسطے شاندار محلات
رتے رہے۔ لیکن شاہی محل کی غیر موجودگی اس امر کی غماض ہے
ن کے ہاں بادشاہت کا رواج ہی نہ تھا یا بقول آرتھر مور کے وہ
ی دوسری سلطنت کے ماتحت یا باجگزار تھے جس نے انتظام کی
ض سے یہاں کوئی گورنر یا اعلیٰ افسر مقرر کر رکھا ہوگا۔ دوسری ایک
یب بات جس سے تاریخ داں کو سخت حیرت ہوتی ہے یہ ہے کہ اتنے
ے دولت مند شہر کے گرد کوئی فصیل یا شہر پناہ نہیں تھی جس سے
یہ اندازہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جو قوم یہاں آباد تھی اس کو جنگ و
جدل سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور امن پسندی کی یہ کیفیت تھی
کہ رات کو باہر سے آنے والے ڈاکوؤں اور قزاقوں کا بھی اندیشہ
نہ تھا۔ اس خیال کو مزید تقویت اس دریافت سے ہوتی ہے کہ کھدائی
کے دوران آج تک نیزہ، تلوار، خنجر یا کسی اور آلۂ حرب کی دریافت
عمل میں نہیں آئی۔ انسان اور لڑائی بھڑائی سے ایسا بے نیاز
اور برگشتہ؟ کم از کم مغربی ممالک کے رہنے والے تو اس رمز کو سمجھنے سے
قاصر ہیں۔ البتہ بدھ مت کے پیرو جب ان کی معاشرت کے اس پہلو پر
غور کرتے ہیں تو انھیں گمان ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ ممکن ہے کہ اس
مرنجاں و مرنج رہبر کے پیرو ہوں جو دنیا میں گوتم بدھ کے نام سے
مشہور ہے اور جس کے نزدیک ایک چیونٹی کو مارنا بھی مہا ہتیا تھی
جس کی پاداش میں کوئی اشرف المخلوقات نروان سے محروم ہو سکتا
ہے۔ ان کی تصاویر اور دوسری اندرونی شہادتوں کو دیکھتے ہوئے
مذہب کے متعلق یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ گرد و پیش کی دوسری
قدیم امریکی اقوام کے برخلاف جو دولت کے دیوتا کو پوجتی تھیں ان کے
ہاں آریوں کی طرح پانی، خوراک، زراعت، سورج اور چاند کی پوجا تو
ہوتی تھی لیکن دولت کی دیوی کا کہیں پتا نہیں ملتا، جس سے یوں سمجھنا
چاہیے کہ ان کے نزدیک روپے کی ایسی قدر و منزلت نہ تھی کہ اس کی پوجا
کی جائے اور اس سے بعض ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے ملک میں
مفلس اور کنگال کوئی نہ تھا۔

(۵)

آٹھ سو برس کے اس تمدنی ارتقا میں ایک دور ایسا بھی آیا جب
یہاں دولت، ثروت اور ذرائع معاش کی فراوانی نے دور دراز کے
باشندوں کو بھی دعوت دینی شروع کر دی اور وہ جوق در جوق یہاں
آکر آباد ہونے لگے۔ ہرے بھرے جنگل کاٹ دیے گئے۔ پہاڑیاں
تیشہ زنی کی نذر ہو کر میدانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ مکانات بنتے رہے
نئی نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں اور دو اچھی خاصی بھری پُری نواحی
بستیاں وجود میں آگئیں۔ لیکن جنگلوں کے فقدان نے بارش کو رفتہ
رفتہ کم کرتے کرتے بالکل ہی ختم کر دیا۔ نہریں خشک ہو گئیں، سرسبز
لہلہاتے کھیت کسی ریگستانی خطے کا سماں پیش کرنے لگے۔ امن و
سکون کی زندگی میں خلل واقع ہونے لگا۔ افراتفری مچ گئی اور جس
طرح ہمارے ہاں موہن جوڈارو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی
بیرونی قوم (آریہ) نے حملہ کر کے وہاں کے امن پسند باشندوں کو
تہ تیغ کر دیا۔ اسی طرح ان پر بھی کسی جانب سے اچانک یلغار ہوئی۔
مکانوں کو آگ لگا دی گئی جس کی علامت چھتوں کی وہ جلی ہوئی کڑیاں
اور راکھ کے ڈھیر ہیں جو جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے
کہ اس عالمگیر تباہی سے کوئی زندہ نہ بچ سکا اور نہ صرف یہ کہ شہر تباہ
ہوا بلکہ اس کے ساتھ پوری قوم اور اس کا تمدن بھی صفحۂ ہستی
سے نیست و نابود ہو گیا۔ اندرونی شہادتوں سے اندازہ لگایا گیا ہے
کہ یہ واقعہ اندازاً ۸۰۰ء کے لگ بھگ پیش آیا ہوگا۔ اس پر تین صدیاں
اور گزر گئیں ایک طرف ریگستانی تند و تیز ہوائیں توڑ پھوڑ کا کام کرتی
رہیں اور دوسری جانب اس کی یاد لوگوں کے دلوں سے محو ہوتی
رہی حتیٰ کہ ۱۱۰۰ء کے قریب ازٹک قوم نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا
اور خدا معلوم ان کے دلوں میں کیا سمائی کہ انھوں نے اسے دیوتاؤں
کا شہر سمجھ کر اس کا نام طوطی ہوکان یعنی مرکر دیوتا بن جانے والوں
کی بستی رکھ دیا۔ پھر اس کے متعلق طرح طرح کی حکایات اور روایات
وضع ہوتی رہیں جن میں حقیقت کا شائبہ بہت کم نظر آتا ہے۔
کولمبس کی دریافت کے بعد جب ان علاقوں میں اسپین والوں کی
یلغار ہوئی تو انھوں نے اس خیال سے کہ تہذیب و تمدن کے اس قدیم مرکز میں

ں چاندی، سونے اور جواہرات کے کثیر انبار ملیں گے ادھر کا رخ کیا
ن جب اس میں مایوسی ہوئی تو پھر اسے بالکل ہی فراموش کر دیا۔
کی دست برد برابر اپنا کام کرتی رہی۔ جنگل پھر کبھی نہ اگے،
یں ہمیشہ کے لیے جواب دے گئیں۔ بس صرف اتنا ہوا کہ اہراموں
گھاس اور میدان میں خار دار جھاڑیاں اُگ آئیں۔ ریت اُڑ
کر شہر کو ڈھکتی رہی حتیٰ کہ تمام آثار قدیمہ زمین میں دفن ہو گئے اور
ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ حالت کب تک قایم رہتی اگر نیول گاہو کو اس
انہ کا اتفاقیہ طور پر علم نہ ہو جاتا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ کھدائی مسلسل جاری ہے۔ نئے نئے
ادرات مسلسل نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اشیا رجو
رت سے دستیاب ہوتی ہیں یورپ اور امریکا کے عجائب گھروں
ں پہنچ چکی ہیں اور بعض کی تصاویر اور چربے مختلف ممالک کو فراہم
ے جا رہے ہیں۔ کچھ علم دوست ماہرین نے تحقیقات میں حصّہ لینے
کے واسطے اپنی خدمات اعزازی طور پر پیش کر دی ہیں۔ کام دن رات
جاری رہتا ہے۔ جرمن ماہر فرنز کا خیال ہے کہ ابھی بہت کچھ معلوم
ہونا باقی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی مثال برف کے اُس تودے کی سی
ہے جس کا صرف پانچواں حصّہ دکھائی دیتا ہے اور باقی زیرِ آب ہوتا
ہے۔

ڈاکٹر ہرنال جو اس مہم کا انچارج ہے، کہتا ہے کہ طولی ہوکان
صرف امریکا کا ہی نہیں ساری دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔ اس کو مصری
اہرام، آریہ (بدھ) مذہب اور پراسن تہذیب و تمدن نے مجتمع ہوکر
ایسا چیستان بنا دیا ہے جس کو چابک دست مورخ بھی حل کرنے میں آج
تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے کہ کھدائی کے دوران آگے چل کر کوئی ایسا
سراغ ہاتھ آئے جس سے مشرق و مغرب کو باہم پیوست کرنے میں مدد مل
سکے، ابھی تک تو سب اپنے اپنے عقلی گھوڑے ادھر اُدھر دوڑا رہے
ہیں۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور
بہت بڑا منصف ہے اور سچا، سچائی کا پسند کرنے والا ہے، وہ ہمارے
دلوں کے بھید جانتا ہے، وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے
مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بہت بُری
خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔

تمام بنی نوعِ انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور
سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی
کرنا، ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی کرنی چاہیے۔"

سر سیّد

صابرہ خاتون

ٹیلی ویژن کی کہانی

عصرِ حاضر کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی ہم آہنگی کی آئینہ دار وہ سائنسی ایجاد ہے جو ٹیلی ویژن کے نام سے موسوم ہے یہ انسانی زندگی کا اہم تفریحی، تدریسی، علمی، عملی اور لازمی جزو بن گیا ہے۔ اس کی ایجاد سے ریڈیو کی اہمیت ثانوی بن کر رہ گئی ہے۔ گو دونوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ریڈیو سے صرف موسیقی اور تقریر وغیرہ سن سکتے ہیں، جب کہ ٹیلی ویژن کے ذریعے دیکھ بھی سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ اس میں تصویر سے متعلق برقی لہریں ریڈیو کی طرح ہی ایک ایریل کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں جسے انٹینا کہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن مرکز سے آواز اور تصویریں بھیجنے کا بنیادی اصول وہی ہے جو ریڈیو کا ہے۔ آیئے! آج دیکھیں کہ ٹیلی ویژن کس اصول پر کام کرتا ہے۔

اسکیننگ کا اصول

ٹیلی ویژن میں پوری تصویر ایک ساتھ نہیں بھیجی جاتی بلکہ اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بھیجا جاتا ہے، اس طریقے کو اسکیننگ (Scanning) کہتے ہیں۔ یعنی تصویر کے روشن و تاریک اور مختلف رنگوں کا تجزیاتی جائزہ لینا۔ جس طرح اگر کتاب کا صفحہ پڑھنا ہو تو ایک ساتھ نہیں پڑھتے۔ پہلے آنکھ اوپر کی سطر ایک سرے سے پڑھتی ہے پھر ایک دم واپس آکر اسی طرح دوسری سطر۔ اور یہ سلسلہ صفحہ کے آخر تک جاری رہتا ہے۔ تصویر کو بھی اسی طرح الکٹران شعاع کی مدد سے پڑھا جاتا ہے یہ بات دوسری طرح بھی سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیا کوئی تصویر تاریکی میں رکھی ہے۔ ٹارچ سے باریک سی شعاع اس پر ڈالنے سے وہ تصویر کا بہت ہی چھوٹا حصہ روشن کرے گی۔ جب یہ شعاع بائیں سے دائیں چلے گی تو تصویر کی ایک پوری پٹی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ترتیب وار روشن ہوتی چلی جائے گی۔ اگر یہ کام بہت تیزی سے ہوگا تو انسانی نظر کے ٹھہراؤ (Persistance of Vision) کے باعث پوری کی پوری پٹی دکھائی دے گی۔ جب کہ روشنی کے ذریعے تصویر کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی روشن ہو رہا ہوگا۔

انسانی آنکھ کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ کوئی تصویر دیکھنے کے بعد اس کا عکس تھوڑی دیر تک آنکھ پر بنا رہتا ہے، یہی نظر کا ٹھہراؤ کہلاتا ہے۔

لہٰذا ہم تصویر کو افقی سمت میں کچھ پٹیوں میں کاٹ لیتے ہیں اور اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ الکٹران شعاع ان پٹیوں پر تصویر میں اوپر سے نیچے ڈالی جائے۔ پھر ان پٹیوں کو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کرتے ہیں کہ پہلی پٹی کا داہنی طرف کا سرا دوسری پٹی کے بائیں طرف کے سرے کے ربط میں آجائے اور دوسری پٹی کا داہنی طرف کا سرا تیسری پٹی کے بائیں سرے سے جڑ جائے۔ پھر آگے کی پٹیوں کے لیے بھی یہی کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہماری اصل تصویر ایک لمبے فیتے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص اس تصویر کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ کیا کرے گا؟ بظاہر فیتے کو ان جگہوں سے کاٹے گا

ے پٹیوں کو پہلے مربوط کیا گیا تھا۔ پھر انھیں تعداد کے مطابق اوپر
ھنے پر مکمل تصویر دیکھ سکے گا۔

اسکیننگ دو طریقے سے کی جاتی ہے ۱۔ چکر دار اسکیننگ (Spiral Scanning) ۲۔ سیدھی سیدھی اسکیننگ (Interlace Scanning)

سب سے پہلے اسکیننگ کرنے کے لیے ایک چکر دار پہیے کا
عمال کیا جاتا تھا جس میں بہت سے سوراخ ہوتے تھے۔ اُن کے
ے پردے پر بہت دھندلی تصویریں آتی تھیں۔ اس لیے
طریقے کا استعمال اب متروک ہو گیا ہے۔

صاف تصویر حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ سیدھی سیدھی
کیننگ ہی کی جاتی ہے۔ اسکیننگ کرنے کے بعد تصویر کو دوبارہ
مل کرنے پر وہ تھوڑی سی کانپنے لگتی ہے۔ اسے دور کرنے
لیے پوری تصویر کی دو مرتبہ اسکیننگ کرتے ہیں۔ پہلی مرتبہ
ایک پٹی چھوڑ کر الکٹران شعاع گھومتی ہے پھر دوبارہ بچی ہوئی
پر چلتی ہے۔ اس طرح پوری تصویر پر ۵۰ بار فی سکنڈ گھومنے
ایک سکنڈ میں صرف ۲۵ بار مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس کو دوسرے
لفظوں میں اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ کتاب پڑھنے والا پورے
فے کی پہلی ۱، ۳، ۵ ... وغیرہ سطریں پڑھ جائے۔ صفحے کے آخر
ں پہنچنے پر پھر واپس اوپر سے ۲، ۴، ۶ ... وغیرہ سطریں پڑھے۔
س طرح پورے صفحے پر دو بار اوپر سے نیچے آنے پر ایک بار
میں پورا صفحہ پڑھا جائے گا۔ یہ سیدھی سیدھی (Interlace Scanning) کہلاتی ہے۔ اسکیننگ کے اس پورے طریقے
ں تقریباً $\frac{1}{25}$ سکنڈ کا وقت درکار ہوتا ہے۔ اسکیننگ ٹرانسیٹر
ور ریسیور دونوں میں کی جاتی ہے اور دونوں میں اس کی شرح
رابر رکھی جاتی ہے۔

EMITRON کیمرہ

ٹیلی ویژن مرکز پر ایک مخصوص کیمرہ استعمال کیا جاتا ہے
جسے EMITRON یا ICONOSCOPE کیمرہ کہتے
ہیں، جو تصویر دیکھ کر اس سے برقی وولٹیج کا ایسا ہی سلسلہ
بنا دیتا ہے جس طرح ہم نے تصویر سے فیتہ بنایا تھا۔ برقی توانائی
کے اس سلسلے کو ایک مناسب ریڈیو فریکوئنسی کی لے جانے والی
لہروں (Carrier Waves) پر ڈال کر دور دراز فاصلوں
تک نشر کیا جاتا ہے۔

ICONOSCOPE کیتھوڈ شعاع نلی

(Cathode Ray Tube) جسے تصویر نلی (Picture-Tube) بھی کہا جاتا ہے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے فوٹو
برقی سیلوں (Photo Electric Cells) سے مل کر
بنتا ہے۔ اس کے تین مختلف حصے ہوتے ہیں۔

۱۔ الکٹران بندوق (Electron Gun)
۲۔ اسکیننگ طشتری یا پلیٹ (Scanning Disc - OR Plate)
۳۔ اکٹھا کرنے والا چھلا (Collecting Ring)

تصویر نلی کے اندر فلامنٹ گرم ہونے سے الکٹران بندوق
سے الکٹرانوں کی ایک دھار نکلتی ہے جو ایک سکنڈ میں ۱۵۶۲۵
افقی سطریں بناتی ہے۔ ہر تصویر ۶۲۵ سطروں پر مشتمل ہوتی
ہے اور یہ بہت قریب قریب ہوتی ہیں۔ تاکہ تصویر کا پورا پس منظر
پردے پر آ جائے۔

اسکیننگ پلیٹ ایک عام طشتری ہوتی ہے جس میں چھوٹے
چھوٹے سوراخ چکر دار بنے ہوتے ہیں۔ ہر سوراخ کا درمیانی
فاصلہ اس تصویر کی چوڑائی کے برابر ہوتا ہے، جسے بھیجنا ہوتا ہے
پلیٹ میں ایک ابرق کی چادر کی سطح پر چھوٹی چھوٹی سیزیم (Cesium) سے لپی (Coated) چاندی کی گولیاں باقاعدگی
سے مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے رکھ دی جاتی
ہیں۔ اس طریقے سے تیار کردہ پلیٹ موزئک پردہ (Mosaic-Screen) کہلاتی ہے۔ ابرق کی چادر کی دوسری سطح سے
ملحق ایک پتلی تانبے یا گریفائٹ کی پلیٹ لگا دی جاتی ہے جسے
سگنل پلیٹ (Signal Plate) کہتے ہیں۔ ابرق کی
چادر کی ہر ایک گولی اس دھات کی پلیٹ کے ساتھ کنڈینسر

(CONDENSER) بناتی ہے۔ ان کنڈینسروں میں ابرق کو Di electric کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

جس چیز کو ٹیلی وژن پر دکھانا ہوتا ہے، اس پر بہت تیز روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چیز کے مختلف حصوں سے مختلف مقدار میں روشنی منعکس (Reflect) ہوتی ہے۔ یعنی چیز کے کالے حصے سے کم اور سفید حصے سے زیادہ۔ مختلف حصوں سے منعکس ہوئی اس روشنی کو ایک لینس کے ذریعے موزئک پردے پر گرنے دیا جاتا ہے جس سے پردے پر چیز کا عکس بننے لگتا ہے۔ عکس بننے کے اس طریقے میں جیسے ہی روشنی موزئک پردے پر گرتی ہے گولیوں سے الکٹران (جنھیں فوٹو الکٹران کہتے ہیں) نکلنے لگتے ہیں۔ اکٹھا کرنے والا پلاٹینم کا بنا چھلّا ان الکٹرانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے نکلنے والے الکٹرانوں کی تعداد وقوعی (INCID-ENT) روشنی کے سیدھے تناسب میں ہوتی ہے۔ لہذا چیز کے کالے حصے سے جب روشنی گولیوں پر پڑتی ہے تو اس سے الکٹرانوں کی تعداد کم اور سفید حصے سے پڑنے پر زیادہ ہوتی ہے۔ الکٹرانوں کے اخراج کے باعث گولی پر مثبت چارج آجاتا ہے۔

اب کیتھوڈ شعاع نلی سے نکلی ہوئی الکٹرانوں کی دھار کو موزئک پردے پر مخصوص لچھے (Coils) کی مدد سے افقی سمت میں اس طرح چلایا جاتا ہے کہ ہر افقی لائن کے خاتمے تک پہنچتے ہی الکٹرانوں کی دھار جلد ہی اپنی ابتدائی حالت میں واپس آجائے (شکل ۱) پھر عمودی (Virtical) حالت میں تھوڑا سا ہٹ کر دوبارہ افقی سمت میں لگاتار چل کر اس طریقے کو دُہرایا جاتا ہے اسے جھٹکا دے کر واپس آنے کے طریقے کو (Kick-Back System) کہتے ہیں۔ الکٹرانوں کی دھار کو افقی اور عمودی سمت میں حرکت

الکٹران کا راستہ
1 2 3 4 5 6 7 8 9
وغیرہ
وغیرہ

شکل ۱

کراتے ہوئے موزئک پردے پر بنی ہوئی تصویر کے پورے عکس کو Scan کر لیا جاتا ہے جیسے ہی ننھی کیتھوڈ شعاعوں کی دھار گولیوں کے اوپر سے گزرتی ہے وہ گولی پر موجود مثبت چارج کو ختم کر دیتی ہے۔ نتیجے میں گولی اور دھات کی پلیٹ کے ذریعے بنا ہوا کنڈینسر ڈسچارج ہونے لگتا ہے۔

کنڈینسر کے نیوٹرل ہوتے ہی اس جگہ کی روشنی کی حدت برقی سگنل کی شکل میں جمع کرنے والے چھلّے اور سگنل پلیٹ کے درمیان منتقل ہو جاتی ہے جس کو بڑھانے کے بعد نشر کرتے ہیں۔ ان سگنلوں کو ویڈیو سگنل (Video Signal) بھی کہتے ہیں کیوں کہ موزئک لینس کے ذریعے الٹی تصویر بنتی ہے، اس لیے اسکیننگ نیچے سے شروع کی جاتی ہے۔

اس آلے کی ایک خرابی یہ ہے کہ ایک جگہ سے نکلے ہوئے الکٹران اُڑ کر دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں جس کی وجہ سے تصویر تھوڑی دھندلی بنتی ہے۔ اس لیے اب تیسرا طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

فوٹو کیتھوڈ (Photo cathode) ایک شیشے کی پلیٹ ہوتی ہے جس کے پیچھے سیزیم سلور کے مرکب کا لیپ لگا ہوتا ہے۔ تصویر کا عکس اس پلیٹ کے سامنے کی سطح پر بنتا ہے۔ فوٹو کیتھوڈ سے الکٹران نکل کر نشانے (TARGET) سے ٹکراتے ہیں۔ نشانے اور کیتھوڈ کے درمیان (تقریباً ۶۰۰ وولٹ) ہونے کی وجہ سے الکٹرانوں کی توانائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ نشانے سے ٹکرانے پر ثانوی الکٹران نکلتے ہیں اور نشانے پر تصویر برقی وولٹیج کی شکل میں بن جاتی ہے۔

الکٹران بندوق سے نکلی ہوئی الکٹران دھار انحرافی لچھوں (Deflecting Coils) کے درمیان سے گزرتی ہے۔ ان کی مدد سے الکٹران دھار پورے نشانے کی اسکیننگ کرتی ہے۔ اس متبادل رَو میں برقی سگنل ہوتے ہیں۔ جنھیں بڑھا کر نشر کرتے ہیں۔ ٹیلی وژن میں ۱۸۰ سے ۹۰۰ میگا سائیکل کا تواتر استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن ریسیور
(TELEVISION RECEIVER)

آئیے! اب دیکھیں کہ کس طرح دوبارہ چیز کا عکس
لہروں کے ٹیلی ویژن پر حاصل کیا جاتا ہے۔
ریسیور میں ایک خاص قسم کا لیمپ استعمال کیا جاتا ہے۔
ن لیمپ (Neon lamp) کہتے ہیں۔ اس میں دو
ں کی متوازی پلیٹیں کچھ فاصلے پر لگی رہتی ہیں۔ لیمپ میں
یس بھری ہوتی ہے۔ جب لیمپ میں کرنٹ بہتا ہے تو گلابی
روشنی ہوتی ہے۔ زیادہ کرنٹ ہونے پر روشنی تیز ہو
جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن مرکز سے بھیجے ہوئے برقی سگنل اَن ٹینا کے ذریعے
کے پہلے ٹیون (Tune) یعنی ہم آہنگ کیے جاتے ہیں۔ پھر سگنل
ن لہروں کے عرض کو بڑھا کر انھیں روشنی کی لہروں میں تبدیل
جاتا ہے۔ روشنی کی یہ لہریں جو عکس کے تاریک اور روشن نقاط
بق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اسکیننگ پلیٹ پر بنے ہوئے سوراخوں
رنے پر ایک پردے پر فوکس ہو جاتی ہیں۔ اسکیننگ پلیٹ یہاں
ی مستقل رفتار سے گھومتی ہے جس رفتار سے نشر کرنے والے
شن پر۔ اس طرح پردے پر ہم کو دوبارہ چیز کا عکس مل جاتا
ہر ۱/۲۵ سکنڈ میں اسکیننگ پلیٹ کے نیچے کے حصے میں ایک تصویر
بن جاتی ہے۔ تصویر کے نیچے کا حصہ اوپر کے مقابلے میں ۱/۲۵ سکنڈ
تا ہے، لیکن نظری ٹھہراؤ کے باعث مکمل تصویر نظر آتی ہے
ریسیور میں بھی کیتھوڈ شعاع نلی (CRT) استعمال کی جاتی
ے (KINOSCOPE) کہتے ہیں۔ برقی سگنل کے CRT
ڈ اور کنٹرول گرڈ (CONTROL GRID) کے درمیان لگا دیے جاتے
۔ ایسا کرنے سے کیتھوڈ شعاع کی شدت (INTENSITY)
تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ اب نشری اسٹیشن پر استعمال ہونے
(ICONOSCOPE) کے ذریعے کیتھوڈ شعاع میں ہونے
ے انحراف (DEFLECTION) کی طرح ہی اس شعاع کا انحراف
[illegible]

پر عمودی ہوتے ہیں۔ یعنی ایک افقی ہوتا ہے اور دوسرا عمودی۔
دونوں لچھے نلی کے اندر لگے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک شعاع کی افقی
حرکت پر قابو رکھتا ہے اور دوسرا عمودی حرکت پر۔ الکٹران دھار
پردے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس طرح گھومتی ہے
جس طرح تصویر کے عکس پر گھومی تھی۔ جس سے (Fluorescent)
پردے پر چیز کا عکس بننے لگتا ہے۔ اگرچہ پورا عکس بہت چھوٹے
چھوٹے حصوں سے مل کر بنتا ہے پھر بھی نظری ٹھہراؤ کی وجہ سے
تصویر پوری نظر آتی ہے۔

ٹیلی ویژن پر دگراموں کے ساتھ آواز کو بھی
(Frequency Modulation) یا FM پر نشر کیا جاتا ہے
ٹیلی ویژن ریسیور میں اس لیے ایک FM-Receiver
بھی لگا ہوتا ہے۔ جس سے ٹیلی ویژن اسٹیشن سے نشر ہونے والی
آواز دوبارہ سنی جا سکے۔

موجودہ دور میں نلیوں کی جگہ

Semi Conducting Devices نے لے لی ہے۔ یہ اثر
آفریں اور کافی اچھا کام کرتے ہیں۔ ان میں فلامینٹ نہ ہونے
کے باعث زیادہ بجلی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ پھر عصر حاضر کی
ایک نئی ایجاد Integrated Circuits ہے۔ ایک Integrated
سرکٹ کافی اجزاء (Components) کو بہت کم کر دیتا ہے
اور بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔ عموماً ٹیلی ویژن ریسیور میں صرف ایک
Integrated سرکٹ لگا ہوتا ہے۔

CONSULTATIVE COMMITTEE OF INTER-NATIONAL RADIOS (CCIR) کے مطابق ٹیلی ویژن کے
کچھ معیار مقرر ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک سکنڈ میں تصویریں بھیجنے کی تعداد ۲۵
۲۔ ایک تصویر میں سطروں کی تعداد ۶۲۵
۳۔ لائن کا تواتر ۱۵۶۲۵ c/s
۴۔ ایک تصویر میں فریموں کی تعداد ۲
۵۔ فریم کا تواتر ۵۰ c/s

چینل کی چوڑائی ۷ MC

۷۔ آسپیکٹ ریشو (Aspect Ratio) ۳:۴

ہر ٹرانسمیٹر میں استعمال ہونے والے تواتر کی بالائی اور زیریں حدیں مقرر کی ہیں جو چینل کی چوڑائی کا تعین کرتی ہیں — بین الاقوامی معیار کے مطابق یہ چوڑائی 7. MC لی گئی ہے۔ نلی کی اونچائی اور چوڑائی کا تناسب — Aspect Ratio کہلاتا ہے۔

حال ہی میں ایک سالڈ اسٹیٹ ٹیلی ویژن جس میں ٹرانسسٹرائزڈ (Transistorized) ریسیور لگا ہے، احمد آباد میں Atomic-Energy Commission کے الکٹرانکس سسٹم ڈویژن نے تیار کیا ہے۔ اس کے ریسیور میں ریڈیو نلیوں کے بجائے ٹرانسسٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بجلی اور بیٹری دونوں سے چل سکتا ہے۔

رنگین ٹیلی ویژن

رنگین ٹیلی ویژن کا ٹرانسمیٹر اور ریسیور کالے سفید ٹیلی ویژن کی ہی طرح ہوتا ہے۔ صرف اس کے اپنے کچھ معیار الگ ہیں جو استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ یہ تین باتوں پر منحصر ہوتا ہے۔

۱۔ رنگین سگنل 7 MC پر کام کرتے ہیں۔
۲۔ رنگین ٹیلی ویژن میں یہ بھی انتظام ہوتا ہے کہ وہ کالا سفید سگنل حاصل کرکے کالی سفید تصویر بھی دے۔
۳۔ رنگین ٹیلی ویژن ریسیور اس قسم کا بنا ہوتا ہے کہ اگر سگنل رنگین نہیں آتا تو کالی سفید تصویریں مل جاتی ہیں۔

ابتدائی رنگین سگنل

رنگین روشنی کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ ایک مخصوص لہر لمبائی کی ہوتی ہے۔ لہٰذا رنگوں میں تفریق مختلف قسم کی لہر لمبائیوں کے باعث کی جا سکتی ہے۔ کسی اسپکٹرم میں سرخ رنگ کی لہر لمبائی سب سے زیادہ اور بنفشئی کی سب سے کم ہوتی ہے۔

ابتدائی رنگ صرف تین قسم کے ہوتے ہیں۔ سرخ، ہرا اور نیلا۔ یہ تینوں رنگ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی سے دو ابتدائی رنگ ملائے جاتے ہیں تو ایک تیسرا رنگ بنتا ہے جو ابتدائی رنگوں سے مختلف ہوتا ہے، اسے ثانوی رنگ کہتے ہیں۔ تینوں ابتدائی رنگوں میں سے کوئی سے دو ایک وقت میں ملانے پر تین ثانوی رنگ بنتے ہیں۔ سرخ اور ہرا ملانے پر پیلا، سرخ اور نیلا ملانے پر قرمزی Magenta اور ہرا اور نیلا ملانے پر نیلگوں (Cyan) اور تینوں رنگ ملانے پر سفید (شکل ۲.۲) سارے ابتدائی اور ثانوی رنگ Hue کہلاتے ہیں۔ ہر رنگ کے اندر کچھ نہ کچھ سفید روشنی کی مقدار رنگ کی چمک کا تعین کرتی ہے۔

شکل ۲.۲

آئیے! اب دیکھیں کہ کسی چیز کی رنگین تصویر کس طرح ٹیلی ویژن پر نظر آتی ہے۔

تصویر نلی (Picture Tube) میں تین الکٹران بندوقیں ہوتی ہیں، جن سے تین الکٹرانوں کی دھاریں تینوں ابتدائی رنگوں کے مطابق نکلتی ہیں۔ ان کو لال، ہری اور نیلی بندوقوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن ریسیور کے پورے پردے پر Phosphor کے نقطے ایک تکون (Triangles) کی شکل میں لیے رہتے ہیں۔ جب الکٹران کی دھاریں پردے سے ٹکراتی ہیں تو وہ سرخ، نیلی اور

ی روشنی کا اخراج کرتی ہیں۔ پردے پر تقریباً چار لاکھ
ے نقطے ہوتے ہیں۔ ان کے صحیح تعداد ٹیلی وژن کے سائز پر
ر ہوتی ہے۔ تصویری نلی جو ریسیور میں استعمال کی جاتی ہے
Trigun Shadow Mask کہلاتی ہے۔ یہ نلی اس
ی بنی ہوتی ہے کہ سرخ بندوق سے آنے والی الکٹرانوں کی دھار
خ نقطے، نیلی نیلے اور ہری ہرے نقطے چمکا دیتی ہے۔ اس عمل
کن بنانے کے لیے دھات کی پتلی پلیٹ پردے کے پیچھے رکھ دی
لی ہے جسے Shadow Mask (سایہ کا ڈھکن) کہتے
۔ یہ پردے سے آدھا انچ پیچھے رکھی جاتی ہے۔ اس کی موٹائی
2 mm ہوتی ہے۔ ساری پلیٹ باریک باریک سوراخوں سے
ری ہوتی ہے۔ ہر سوراخ فاسفر نقطوں کی سیدھ میں ہوتا ہے
ں کا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ پردے پر ٹھیک ٹھیک رنگ مہیا کرے
ہر رنگ کا سگنل گرڈ (Grid) اور تصویری نلی کے کیتھوڈ
ے درمیان لگایا جاتا ہے۔ صحیح رنگ لانے کے لیے یہ ضروری
ہے کہ دھار Shadow Mask پر ایک خاص زاویے
سے ٹکرائے۔ سرخ دھار صرف سرخ رنگ کے نقطوں کو، نیلی
دھار نیلے اور ہری ہرے رنگ کے نقطوں کو اکساتی ہے۔
دھار Shadow Mask سے ٹکرانے کے ساتھ ساتھ
اس سے ملحق سوراخوں سے بھی گزرتی ہے، لیکن کچھ عوامل ان
دھاروں کے زاویے میں خلل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ عوامل
دھات کی چیزیں یا بیرونی مقناطیسی میدان وغیرہ ہوتے ہیں۔
اس دقت کو تصویری نلی کی گردن پر انحرافی لچھے Deflecting
coils) اور مقناطیس لگا کر دور کیا جاتا ہے۔
کیمرے میں رنگین فلٹر (Filters) منظر کا تجزیہ کرتے
ہیں۔ سفید رنگ کا سگنل تصویری نلی کے تینوں کیتھوڈوں پر
لگانے سے کالا سفید منظر ملتا ہے۔ اگر سرخ، ہرا اور نیلا
تینوں ابتدائی رنگوں کا سگنل تینوں مطابقت رکھنے والی
بندوقوں پر لگا دیں تو تصویر پوری رنگین ملتی ہے۔ اب
فرض کیا کیمرہ ہرے رنگ کی چیز نشر کر رہا ہے تو ہرے رنگ
کی بندوق سے سگنل ملے گا۔ یہ برقی سگنل ایک میسری لے جانے
والی لہر (carrier wave) کے ذریعے رنگوں کی اطلاع لے
کر بھیجا جاتا ہے اور چونکہ صرف یہی واحد رنگ ہے اس لیے
ہرے رنگ کا عکس ہم کو مل جائے گا۔

رنگین ٹیلی وژن جوڑنے کے اصول پر کام کرتا ہے۔ لہٰذا
جب آنکھ کو ایک ساتھ سرخ، ہرا اور نیلا رنگ ملتا ہے تو سفید روشنی
کا احساس ہونے لگتا ہے۔ درحقیقت یہ بات اس اصول کے
برخلاف ہے جس میں عام رنگ ملائے جاتے ہیں اور اسے گھٹانے
والی آمیزش (Subtractive Mixing) کہتے ہیں۔

رنگین ٹیلی وژن سیٹ اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ
یہ رنگین اور کالے سفید دونوں قسم کے عکس پردے پر بنائیں۔
رنگ دینے والا یونٹ خراب ہو جانے پر یہ ٹیلی وژن کام کرنا بند
نہیں کرتا بلکہ یہ کالی سفید تصاویر دیتا رہتا ہے۔ اس یونٹ
کو عموماً Colour Decoder کہتے ہیں۔ رنگین تصاویری نلی
کے سرکٹ Trigun Mask کے ساتھ ساتھ مخصوص
قسم کے (Extra High Tension) یعنی EHT Generator
Stabilising Circuits اور Voltage Regulator
بھی لگے ہوتے ہیں۔

مصنوعی سیارے کے استعمال کی ضرورت

اگر آپ ہموار زمین پر کھڑے ہوں تو چاروں طرف
زمین کے گول ہونے کی وجہ سے تقریباً ۴.۵ کلومیٹر کے فاصلے
تک دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ دس میٹر اونچے پیڑ پر چڑھ جائیں
اور دن صاف ہو تو آپ اپنے چاروں طرف تقریباً ۱۲ کلومیٹر تک
دیکھ لیں گے۔ اسی طرح اگر آپ ٹیلی وژن کے سگنلوں کو دور تک
بھیجنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے ٹرانسمیٹر ان ٹینا کی اونچائی بڑھانی
پڑے گی۔ بمبئی کے ٹیلی وژن مرکز کے ان ٹینا مینار کی اونچائی
۳۰۰ میٹر ہے۔ اب فرض کیجیے کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی
ٹیلی وژن ٹرانسمیٹر سے نشر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ان ٹینا کی
اونچائی ۲۱۰ کلومیٹر کرنا پڑے گی۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم

کسی مصنوعی سیارے (Satellite) کا استعمال کریں۔

سیارے کے ذریعے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام دہلی، سری نگر، بمبئی اور احمد آباد کے زمینی اسٹیشنوں پر اکٹھا کر کے دوبارہ نشر کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ریسیوروں پر دوبارہ نشر ہونے والے پروگرام دور دراز فاصلوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

دور کا اسٹیشن موصول کرنے کے لیے Booster کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اس وقت مددگار ثابت ہوتا ہے جب آپ کی رہائش قریبی ٹرانسمیٹر کی حد سے باہر ہو۔ لیکن بوسٹر صرف ایک مناسب فاصلے تک ہی سگنل حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ کرنٹ میں بہت تیزی سے کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ٹیلی ویژن میں ایک Voltage Stab-ilizer ضرور استعمال کرنا چاہیے۔

انٹینا

ٹیلی ویژن کے انٹینا دو قسم کے ہوتے ہیں — خارجی (Out door) اور اندرون خانہ (Indoor)۔ خارجی انٹینا کا سائز اس کے عناصر کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ جو ۳ سے کر ۱۸ ہوتی ہے۔ جتنا آپ ٹیلی ویژن اسٹیشن سے دور ہوں گے، اتنے ہی انٹینا میں زیادہ عناصر درکار ہوں گے۔ اس کے علاوہ انٹینا کے عناصر کی تعداد Channel Band پر بھی منحصر ہوتی ہے جو آپ کا ٹیلی ویژن حاصل کرتا ہے۔

ہندوستان میں ٹیلی ویژن

— اپنے ملک میں ٹیلی ویژن کی ضرورت دن بہ دن زیادہ سے زیادہ محسو
کی جا رہی ہے۔ نہ صرف شہری بلکہ دیہی علاقوں میں بھی اس
استعمال عام ہو گیا ہے۔

۱۹۷۱ء میں بیس ہزار ٹی وی سیٹ تیار کیے گئے تھے لیکن ۱۹۷۶ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ایک لاکھ چوالیس ہزار ہو گئی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں یہ تعداد تین لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ ایشیاڈ ۸۲ء کے شروع ہوتے ہی رنگین ٹیلی ویژن بھی ہندوستان میں آ گیا اور اس کی صنعت نے افق کی حد کو چھو لیا۔ کئی نئے ٹی۔ وی۔ اسٹیشن شروع کیے گئے۔ کم پا کے ٹرانسمیٹر اور خرد لہر ریلے (Relay) اسٹیشنو کو بڑھایا گیا۔ تاکہ وہ زیادہ ر گھیر سکیں۔ اس سب سے زیاد فائدہ دیہی عوام کو ہوا۔ حکو کا خیال ہے کہ کم سے کم سار ریاستوں کی راجدھانیوں ٹیلی ویژن ٹرانسمیٹر لگا دیے جا

ضروری ہدایات

ٹیلی ویژن بہت کم فاصلے سے دیکھا جائے یا بہت زیا فاصلے سے، دونوں صورتو میں آنکھیں بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں دیکھ سے اس کی چکاچوند سے آن خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے ٹیلی ویژن کو کبھی بھ اندھیرے میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ دیکھنے والے کمرے میں روشنی ہونی ضروری ہے۔ آرام دہ طریقے سے ٹیلی ویژن دیکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ٹیلی ویژن آنکھوں کی سطح میں ہو

> "بغداد اور قرطبہ کے قدیم درس گاہوں کے ذکر سے اپنی گزشتہ عظمتوں پر فخر کرنا بیکار ہے۔ گو تاریخ کے صفحات پر وہ نہایت مہتم بالشان نظر آتی ہیں۔ لیکن نہ تو اس امر کا بار بار ذکر کر قدیم عہد ماضی میں کیا کیا جا چکا ہے اس وقت ہمارے لیے کار آمد ہے اور نہ موجودہ پستیوں کی الم انگیز و تاریک حالت کی تصویر کشی ہی ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے، بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنے چاروں طرف نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ دیگر قومیں ہمارے مقابلہ میں کیسی ترقی کر چکی ہیں اور اپنے ذرائع کا اندازہ کر کے ہم کو اسی طرح کی ترقی کے حاصل کرنے کے وسائل بہم پہنچانا چاہیں۔ ہمارے خیالات اور روایات اور ہماری زندگی کے طریقے پر عظمت ماضی کی یادگاریں ہیں، لیکن جس حد تک وہ قدیم ہیں اسی قدر وہ پرانی بھی ہیں اور وہ ہرگز اس ترقی کے سامنے نہیں رکھی جا سکتیں جسے دنیا نے عہد حاضر میں پیدا کیا ہے۔ ہم کو اپنی اصلیت محفوظ رکھنی چاہیے اور اپنی روایات کی روح و جوہر کو بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔"
>
> — سر شاہ سلیمان

ین سے تقریباً ۲ فٹ اونچا رکھا ہونا چاہیے۔

سیاہ و سفید ٹیلی ویژن سیٹ میں ۱۹ کلو والٹ اور ر
ٹی۔ وی میں ۲۵ کلو والٹ تک کی ٹیوب ہوتی ہے جس سے ایکس
ے شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ دراصل یہ شعاعیں نظر نہیں آتیں۔
یہ انسانوں اور جانداروں کے لیے بے حد ضرر رساں ہیں اور اُن سے
ری طرح دوسری مہلک بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس سے
ن اپنی آنکھیں گنوا سکتا ہے یا مر سکتا ہے۔ اس لیے سائنسدانوں
ورہ ہے کہ ٹیلی ویژن لگاتار آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں دیکھنے
چاہیے۔

گاندھی مارگ، پٹنہ مئی ۱۹۸۶ء میں شائع کردہ دی۔ پی
ی نے اپنے مضمون "کیا ٹیلی ویژن صحت کے لیے تباہ کن
؟" میں لکھا ہے کہ امریکہ کے نابالغ بچوں میں خونی کینسر کی
پھیلی ہے، اس کی خاص وجہ ٹی۔ وی کی شعاعوں کے
ت رساں اثرات ہی ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ٹی۔ وی سیٹ کے
بیٹھ کر پروگرام دیکھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ امریکا
کے بوسٹن نامی شہر کے صرف ایک اسپتال میں خونی کینسر کے
شکار چھ سو لڑکے لڑکیاں زیر علاج ہیں۔ صوبہ ایری زونا کے
ٹکسن اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں خونی کینسر سے متاثر
دو ہزار پچاس لڑکے موت سے لڑ رہے ہیں۔

انتہائی تیز اور طاقتور شعاعیں تو فوراً موت کے گھاٹ
اتار دیتی ہیں یا بالکل اندھا بنا دیتی ہیں، لیکن اس سے کم
طاقت والی کرنیں بھی دھیرے دھیرے جسم کے مختلف حصوں
کو مفلوج کر دینے کی حد تک متاثر کر دیتی ہیں۔ اس لیے یہ
ضروری ہے کہ ایسی شعاعیں پیدا کرنے والے تمام ذرائع کے
متعلق خبردار رہنا چاہیے۔ اپنے ملک میں ان دنوں ٹیلی ویژن
اور دوردرشن کا پرچار جس طوفانی رفتار سے بڑھتا جا رہا ہے
اس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی کی شکل میں رونما ہونے
والا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکومت ہند اس کی
جانب موثر اقدام اٹھائے۔

"ہم اس امر کو فراموش نہیں کر سکتے کہ صدیوں سے
ہم اسی ملک میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور یہیں پرورش پائی ہے
اور یہی ہمارا وطن ہے۔ ہماری قسمتیں اسی ملک سے وابستہ
ہیں اور اسی کی آئندہ اقبال مندی میں ہمارا سود و بہبود مضمر ہے
لہٰذا ہماری تمام قوتیں مادرِ وطن کی ترقی میں صرف ہونی چاہییں
ہم کو تعلیمی حیثیت سے اپنے تئیں اس قابل بنانا چاہیے کہ ہم اپنے
عزیزانِ وطن کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں اور محض اس
وجہ سے کہ ہم ان کی برابر ترقی کے میدان میں گامزن نہیں ہو سکتے
ہمیں ان کے لیے بار نہ ثابت ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ مناسب نہیں
کہ .... جو لوگ آگے نکل گئے ہیں ان کو پیچھے کھینچیں بلکہ ہم کو
لازم ہے کہ ہم خود اتنی ترقی کریں کہ ان کا ساتھ نہ چھوٹے۔"

سر شاہ سلیمان

محمد اسلم صدیقی

ایسی چنگاری بھی....

چند نیک دل مسلمانوں کی خدا ترسی اور انسان نوازی کے کچھ سبق آموز واقعات، جن میں ان کی حق پرستی، فقر و قناعت، زہد و توکل، اجر و صلہ سے استغنا، انکسار و فروتنی اور حق گوئی و بے باکی کی دلکش جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

یہ واقعات مسلمانوں کے دورِ اقبال سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ جب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ آخری لو دے کر بجھ چکا تھا اور چاروں طرف گھور اندھیاری چھائی ہوئی تھی، اس وقت خدا کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جن کو دلبازی اور دل باختگی سے دلچسپی اور اس کا حوصلہ تھا وہ نقصانِ مال و زر میں نشاطِ روح کا سامان پاتے تھے۔

ان فقر و قناعت اور زہد و توکل کے فرزانوں نے جگہ جگہ ایمان و اخلاق کی شمعیں جلا رکھی تھیں، جن کی ضیاء دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اُس سے راہ کے بھولے بھٹکے مسافر روشنی حاصل کرتے تھے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے فیض حاصل کیا۔

سرسیدؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا عبدالرحیمؒ، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیرِ مالٹا اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ جیسے بزرگوں کی زندگی کے کارناموں، ان کے اخلاقِ کریمانہ اور مثالی کردار سے کتنے انسانوں نے فیض پایا، ان کا کوئی شمار نہیں۔

یہ سب تو جانی پہچانی برگزیدہ شخصیتیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے گمنام حضرات ہیں، جن کے کارناموں سے اگرچہ ہم ناواقف ہیں لیکن ان کے مثالی کردار و اخلاق سے بے شمار انسانو[ں] نے فائدہ اٹھایا ہے۔

ان بہت سے بزرگوں میں سے صرف چند حضرات کے حالات و واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان حالات و واقعات کو پڑھ کر ان سے کچھ سبق لیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں تو بھولی بھٹکی انسانیت کی بڑی خدمت اور ہمارے لیے موجبِ سعادت ہوگی

جلا ہے کس کا لہو رات بھر چراغوں میں
غرورِ حسنِ سحر اب یہ دیکھتا ہی نہیں

۱۔ خشیتِ الٰہی

علاقہ روہیلکھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے بریلی کالج کے لیے ایک ایسے استاد کی، جو عربی و فارسی میں اعلیٰ استعداد اور تجربہ رکھتا ہو، ضرورت محسوس کی۔ اس کے لیے انھوں نے مولانا عبدالرحیم صاحب کو دو سو پچاس روپے کی پیش کش کی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے دو سو پچاس روپے ماہوار مشاہرہ بہت گراں قدر تھا۔ مو[لانا] اس زمانے میں نواب رام پور کے مدرسے میں پڑھاتے تھے اور دس روپے ماہانہ وظیفہ پاتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور عذر یہ کیا کہ اگر میں بریلی چلا جاؤں گا تو جن طالب علموں کو میں پڑھاتا ہوں ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو جائے گا جو بہت بڑا نقصان ہے۔ اس لیے مجھے یہ منظور نہیں۔

انگریز حاکم نے یہ عذر سنا تو کہا کہ "آپ اس کی فکر

ے کے سب طالب علموں کو یہاں بلا لیا جائے گا اور اُن کا وظیفہ
یا جائے گا۔" مولانا نے کئی دوسرے عذر پیش کیے اور
ا کر " مجھے نواب صاحب دس روپے ماہوار وظیفہ دیتے ہیں
ضروریات سے بھی زیادہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر بڑی رقم قبول کر لوں
ت کے دن اللہ تعالیٰ کو معلمی کی اس زیادہ اجرت لینے پر کیا
وں گا" ؟

چنانچہ انھوں نے نواب صاحب کے دس روپے ماہوار وظیفہ
ر دو سو پچاس روپے ماہوار کا مشاہرہ قبول نہیں کیا۔

قومی غیرت اور صلہ و انعام سے انکار

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں سر سید احمد خاں بجنور میں
تھے۔ اس وقت وہاں تقریباً بیس انگریز بیوی بچوں کے ساتھ
تھے۔ ان سب کی جان خطرے میں تھی۔ ایک رات ایسی آئی کہ بلوائیوں
نے گھیر کر ختم کر دینا چاہا۔ اس وقت سر سید نے انتہائی جرأت
حوصلے سے کام لے کر بلوائیوں کو اس اقدام سے روکا اور ان سب
ان کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ بحفاظت رڑکی بھجوایا جہاں
حفاظت کا پورا انتظام تھا۔

سر سید نے یہ کام صرف اخلاق و شرافتِ نفس اور اسلام
یت کے بموجب انجام دیا تھا۔ اس میں ان کو کسی سے صلہ یا انعام
ل کرنے کی خواہش کو کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ ان کی جبلت و طبیعت
لکا منافی تھا۔

ہنگامہ ختم ہو جانے کے بعد جب امن و امان قایم ہو گیا تو
سید کو اس حسنِ خدمت کے صلے میں ضلع بجنور کے ایک بڑے رئیس
ان، جو انگریزوں کے خلاف ہنگامے میں شریک ہونے کی وجہ
باغی قرار دیے گئے تھے اور ان کا بہت بڑا علاقہ ضبط کر لیا
تھا۔ اس علاقے کو بطور جاگیر سر سید کو حکومت نے دینا تجویز
مگر سر سید نے اس کو قبول کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ ایک
مان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھائی اور اس کو بطور صلہ و انعام
کسی طرح گوارا نہ تھا۔

اس صلہ و انعام کے متعلق سر سید نے ایک موقع پر تقریر کرتے
ہوئے کہا تھا کہ " بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے
ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زائد مالیت کا تھا مجھ
کو (حکومت نے) دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے
اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم
پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقدار بنوں، میں نے
اس کو لینے سے انکار کر دیا۔"

سر سید ان حالات سے اس درجہ غمگین اور افسردہ تھے کہ
۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ان کا مصمم ارادہ تھا کہ یہاں سے ہجرت کر کے
مصر جا کر سکونت اختیار کریں۔ لیکن مسلمانوں کی بربادی اور تباہی
نے ان کے غیور دل کو اس سے باز رکھا اور یہیں رہ کر انھوں نے قوم کی
جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

۳۔ انسانیت نوازی اور اجر و صلہ سے بے نیازی

سر سید کی طرح ایک اور واقعہ قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی
کا بھی ہے۔ قاری صاحب باندہ کے نواب ذوالفقار الدولہ کے یہاں
مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ نواب صاحب نے آپ کا وظیفہ مقرر کر رکھا
تھا۔ آپ کے وہاں قیام کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کا آشوب پیش آیا
اور امن و امان بالکل ختم ہو گیا لیکن آپ مدرسے ہی میں مقیم رہے۔
باندہ میں اس وقت کچھ انگریز بھی بال بچوں کے ساتھ تھے۔ وہ
لوگ جان کے خوف سے بھاگ کر مدرسے میں آپ سے حفاظت اور
پناہ کے طلب گار ہوئے۔ قاری صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان سب
کو پناہ دی بلکہ ان سب کی حفاظت اور کھانے پینے کا بھی انتظام کیا
اور انگریز عورتوں کے لیے مدرسے میں ایک الگ محفوظ جگہ دی تا کہ
عام مردوں کی نظروں سے وہ پوشیدہ رہیں۔ انقلابیوں نے بہت
چاہا کہ قاری صاحب ان لوگوں کی پناہ سے دستبردار ہو جائیں اور
ان سب کو حوالے کر دیں۔ لیکن آپ کی دینی حمیت نے اس کو گوارا نہ کیا
اور ان انقلابیوں سے کہا کہ جب کسی کو پناہ دے دی جاتی ہے تو پھر
دینِ اسلام اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کی حفاظت
کا حق ہم پر واجب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ ناکام لوٹ گئے۔

پناہ گزین انگریز قاری صاحب کے اخلاق حمیدہ اور اعلیٰ کردار

سے بے حد متاثر تھے۔ ان میں سے ایک نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا اور امن و امان قایم ہوا تو انگریزوں کا یہ خاندان بحفاظت دہلی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنی حفاظت و پناہ اور قاری صاحب کے اخلاق و کردار کی بہت تعریف و توصیف بیان کی۔ چنانچہ حکومت نے آپ کی ان خدمات کے صلے میں آپ کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہا۔ مگر آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے تحت، بحیثیت ایک مسلمان کے انجام دیا ہے۔ اس لیے میں کوئی بھی صلہ قبول نہیں کر سکتا۔

۴۔ حق گوئی و بے باکی

مفتی الٰہی بخش تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے خاندان کے ایک بزرگ کا عجیب واقعہ مظفر نگر گزیٹیر میں بیان ہوا ہے گزیٹیر کے علاوہ دوسری روایات سے واقعہ یوں بتلایا گیا ہے کہ قصبہ کاندھلہ میں ایک قطعہ زمین کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ملکیت کے متعلق تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت کچہری عدالت تک پہنچ گئی۔

انگریز مجسٹریٹ، جس کی عدالت میں یہ مقدمہ تھا، اس نے اس مقدمے کے ایک فریق مسلمانوں سے کہا کہ تم کاندھلہ کے کسی ایسے ہندو کو تجویز کر دو جس کی شہادت پر تم کو بھروسہ ہو اور اس کو تم تسلیم بھی کر دو۔ مسلمانوں نے ایسے کسی ہندو کا نام تجویز نہیں کیا۔ مجسٹریٹ نے یہی سوال ہندوؤں سے کیا تو انھوں نے کہا کہ ہاں۔ قصبہ کی مسجد میں ایک میاں جی رہتے ہیں ان کی گواہی پر ہم کو بھروسہ اور اطمینان ہے اس کو ہم قبول کر لیں گے۔ کیوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور وہ بہت نیک آدمی ہیں۔ ہم سب قصبہ والے ان کی عزت کرتے ہیں۔"

یہ بات سن کر مجسٹریٹ نے میاں جی کو بلوایا مگر وہ نہیں آئے تو مجسٹریٹ نے سرکاری پروانہ حاضر عدالت ہونے کا جاری کر دیا چنانچہ مجبور ہو کر جب میاں جی حاضر عدالت ہوئے تو انھوں نے اپنا چہرہ کپڑے میں چھپا رکھا تھا۔ مجسٹریٹ یہ دیکھ کر متحیر ہوا اور جب

اس نے ان سے متنازعہ زمین کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بلا شہادت دی کہ "یہ زمین ہندوؤں کی ہے اور مسلمانوں کا غلط ہے۔"

مقدمہ کی کارروائی ختم ہونے پر مجسٹریٹ نے ان کہ پہلے آپ کو بلایا گیا تھا تو کیوں نہیں آئے تھے اور جب پروانہ بھیجا گیا تو چہرہ کو کپڑے سے چھپا کر کیوں آئے ہیں؟ نے جواب دیا کہ مجھے انگریزوں سے نفرت ہے۔ اس لیے پہلے تھا کہ اس میں میری مرضی کو اختیار تھا اور جب قانوناً طلب کی آنا پڑا اور جب آ گیا تو تمہاری صورت دیکھنا گوارا نہ تھی اس نے اپنا چہرہ کپڑے میں چھپا لیا تاکہ تمہاری صورت پر نظر نہ پڑ

۵۔ مثالی انکسار و استغناء

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ ابن مولانا مملوک علیؒ اجمیر روپے ماہوار پر مدرس تھے لیکن اپنے بزرگوں کے مشور اس کو چھوڑ کر دارالعلوم دیوبند میں صرف تیس روپے ماہوار آئے۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا جمال الدین دہلوی مدار المہام بھوپال نے، جو آپ کے والد مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے صاحبزادگی مولانا محمد یعقوبؒ کو تین سو روپے ماہوار پر بھو چاہا، تو مولانا محمد یعقوبؒ نے جواب دیا لَا حَاجَةً فِی نَفْ یعقوب الا قضاھا۔ یعقوب کی جو حاجت تھی وہ پوری کہ بقدر ضرورت معاش کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب اور عا کی خدمت نصیب ہو گئی۔ لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا م ہے۔"

۶ ایثار و قربانی

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے متعلق یہ واقعہ بیان کیا گ کہ علی گڑھ کے ایک رئیس بزرگ ایک جہاد میں شہید ہو گئے تھے۔ ان صاحبزادے تھے جن کی تعلیم (غالباً حدیث وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم) ایک اچھے اور مستند عالم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم گیا کہ وہ کسی کو منتخب فرما کر انتظام کر دیں۔ مولانا نے اس خدم لیے خود اپنے کو پیش کیا تاکہ ایک شہید راہ خدا کے لڑکے کو عدی

ی سعادت حاصل کریں۔ وہ علی گڑھ تشریف لے آئے اور
کے متعلق خود ہی فرمایا کہ میری ضروریات دس روپے میں
جاتی ہیں۔ اس لیے بس دس روپے ہی لیا کروں گا۔ اس پر عمل
عرصے کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ میں جو دس روپے لیا کرتا تھا
سے پانچ روپے والدہ ماجدہ کو بھیجتا تھا۔ اب والدہ ماجدہ کا
و گیا۔ اب صرف پانچ روپے میرے لیے کافی ہوں گے۔ اس
پانچ روپے ہی دیے جائیں۔ چنانچہ باوجود اصرار جب تک
ھاتے رہے صرف پانچ روپے ہی قبول کرتے رہے۔

مولانا محمد قاسمؒ ہی کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ ایک مرتبہ بھوپال
کی طلبی ہوئی اور پانچ سو روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ چنانچہ
ایک بزرگ مولوی امیرالدین صاحب نے کہا " اب قاسم چلا
ہیں جاتا؟" تو آپ نے عرض کیا کہ " حضرت وہ مجھے صاحب علم و
سمجھ کر بلاتے ہیں اور اس بنا پر وہ پانچ سو روپے مجھے دے رہے
میں اپنے اندر کوئی علم و کمال نہیں پاتا۔ پھر کس بنا پر جاؤں؟"
امیرالدین صاحب نے بہت اصرار کیا مگر آپ نہیں مانے اور
گئے۔

۹۔ بے نفسی اور فروتنی

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا، دارالعلوم دیوبند میں
مدرس تھے اور پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے تھے اور
ا خلیل احمد محدثؒ سہارنپور مظاہر العلوم میں صدر مدرس تھے
الیس روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے تھے۔

ان دونوں حضرات کے علم و فضل کی بنا پر مدرسہ کے اکابرین
سرپرستوں نے ترقی کی تجویز کی تو ان دونوں حضرات نے اپنی اپنی
یہ کہہ کر ترقی سے انکار کر دیا کہ " یہ بھی ہماری حیثیت سے زیادہ
۔ پھر ان دونوں مدرسوں میں مدرس دوم کی تنخواہیں آپ دونوں
ت کے برابر ہو گئیں تو اکابرین اور سرپرستوں نے یہ کہا کہ " اب
ت مدرسین کی تنخواہیں چوں کہ صدر مدرسین صاحبان کی تنخواہوں
زیادہ نہیں ہو سکتی۔ آپ کے انکار سے ان کی ترقیاں بھی رک
ہیں گی۔"

اس دلیل سے مجبور ہو کر ان ہر دو حضرات نے اپنی اپنی ترقیاں
قبول کر لی۔

۱۰۔ کمالِ زہد و تقویٰ

دارالعلوم دیوبند کے تیسرے مہتمم مولانا محمد منیر صاحب
ایک بار ڈھائی سو روپے لے کر مدرسے کی روئداد چھپوانے
دہلی گئے۔ یہ رقم چوری ہو گئی۔ گھر واپس آئے اور کوئی زمین وغیرہ
فروخت کر کے رقم فراہم کی اور کسی کو اس سانحہ کی خبر نہ کی۔ روئداد
چھپوا کر دہلی سے لے آئے۔ بعد میں اس کی اطلاع کسی طرح اہلِ مدرسہ
کو ہو گئی تو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو اس کی اطلاع دی گئی اور حکم
شرعی پوچھا گیا۔ مولانا گنگوہیؒ نے جواب دیا کہ "مولوی صاحب امین
تھے۔ روپیہ بلا تعدی کے ضایع ہوا ہے۔ اس لیے ان پر ضمان
(تاوان) نہیں۔"

اہلِ مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحب سے درخواست کی کہ
مدرسے سے روپیہ لے لیں اور مولانا گنگوہی کا فتویٰ بھی دکھلایا
مولانا نے فتویٰ دیکھ کر فرمایا کہ

"کیا میاں رشید نے فقہ میرے ہی لیے پڑھا تھا
اور کیا یہ مسائل میرے ہی لیے ہیں۔"

باوجود شدید اصرار اور فتویٰ کے آپ نے روپیہ نہیں لیا۔
یہ تھا آپ کا تقویٰ کہ فتوے پر اس کو ترجیح دیا اور
مقدم رکھا۔

> " بے شک آسمانوں اور زمین کی
> پیدائش اور رات دن کے بدل بدل
> کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں
> ہیں۔"
>
> قرآنِ عظیم

حبیب الحق انصاری

فزکس — ایک سائنس

فزکس سب سے بنیادی سائنس ہے اور سب سائنسوں کو اپنے میں سموے ہوئے ہے اس لیے ہمیں دوسری سائنسوں کے بنیادی سوالوں کو بھی دیکھنا چاہئیے۔ نوٹ کیجیے کہ سائنس کی ہماری تعریف کے مدنظر ریاضی (Mathematics) سائنس نہیں ہے یعنی یہ فطرت کی سائنس نہیں ہے۔ ریاضی کے صحیح یا غلط ہونے کی کسوٹی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر سائنس نہیں ہے تو ضروری نہیں کہ وہ چیز خراب ہی ہو۔ مثلاً عشق شاید سائنس نہیں ہے۔ اس لیے اگر کوئی چیز سائنس نہیں ہے تو اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ وہ ایک سائنس نہیں ہے زیادہ کچھ نہیں۔

کیمسٹری ساری سائنسوں میں کیمسٹری وہ سائنس ہے جو فزکس سے سب سے زیادہ گہرے طور پر متاثر ہوتی ہے۔ پہلے کیمسٹری کے تحت بے جان چیزوں پر غور ہوا۔ یہ کیمیا فزکس کے لیے بڑی اہم ثابت ہوئی۔ کیمسٹری کی تھیوری یعنی تفاعلات کی تھیوری کا خلاصہ ایک بڑی حد تک دوری جدول (Periodic table) میں اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ان سارے قاعدوں کو بالآخر کوانٹم میکانیکس نے سمجھایا اور اس طرح نظری کیمیا دراصل فزکس ہی ہے۔ لیکن کھیل کے قاعدے معلوم ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم کھیل بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتے ہوں۔ کھیل کے قاعدے جاننے اور کھیلنے میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے دراصل کیمیائی تفاعلات میں پیش گوئی کرنا عموماً کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ ایک اور طریقہ جو میکانیات کے قانونوں کی موجودگی میں شماریات استعمال کرنے کا طریقہ ہے اور جسے اس لیے شماریاتی میکانیات (Statistical Mechanics) کہتے ہیں فزکس اور کیمیا دونوں میں فروغ پایا۔ شماریاتی میکانیات اس طرح حرارت کے مظاہر یعنی حرتویّات (Thermodynamics) کی سائنس ہے۔

کیمیا کی دوسری شاخ نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry) ہے جو جاندار چیزوں سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی کیمیا ہے۔ ایک زمانے میں یہ مانا جاتا تھا کہ جاندار چیزوں سے تعلق رکھنے والی چیزیں ایسی حیرت انگیز ہوتی ہیں کہ ان کو غیر جاندار چیزوں کی مدد سے اپنے ہاتھ سے بنایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بات قطعی صحیح نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بھی بالکل اسی طرح کی چیزیں ہیں جیسی غیر نامیاتی کیمیا (Inorganic chemistry) میں ملتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ایٹموں کی زیادہ پیچ در پیچ ترتیب ملتی ہے بہت ساری فزیکل کیمسٹری اور کوانٹم میکانیکس بالکل اسی طرح نامیاتی کیمیا میں استعمال ہوتی ہیں جس طرح وہ غیر نامیاتی کیمیا میں ہوتی ہیں۔ نامیاتی کیمیا کا گہرا تعلق حیاتیات (Biology) سے ہے۔ اس طرح فزکس، بائیو فزکس، بائیو کیمسٹری سے ہوتے ہوتے درجہ بدرجہ حیاتیات بشمول سالمتی حیاتیات (Mole-cular biology) تک رہبری کرتی ہے۔

حیاتیات حیاتیات کی سائنس میں ہم جاندار چیزوں پر غور کرتے ہیں۔ اگر ہم جاندار چیزوں میں ہونے والے عملوں کو دیکھیں تو ہمیں ان میں بہت سی فزیکل باتیں دکھائی دیتی ہیں جیسے کہ خون کا دوران وغیرہ۔ اس کے علاوہ اعصاب (Nerves

برقی اشارے دوڑتے ہیں۔ اگر کوئی تیز چیز چبھے
ن کا احساس ہمیں ہو جاتا ہے۔ اس کی مخالف تاثیر
غ سے ایک عصب پر ہو کر پیغام کا بھیجنا بھی کیمیائی۔ برقی
ے ہوتا ہے۔ عصب کے آخر میں جب اشارہ پہنچتا ہے تو
وی شے (chemicals) ایسی ٹائیل کولائن۔ (Acetyl-
ch) ۔ چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کی شکل میں (جو ایک
ں پانچ یا دس سالموں پر مشتمل ہوتے ہیں) خارج ہوتی
یہ شے عضلے (Muscle) پر اس طرح اثرانداز ہوتی
ضلے کو سکڑنے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن وہ کیمیائی آلیات
(mechan) جن سے ایسی ٹائیل کولائن عضلے کو سکڑنے
رتا ہے، ابھی پوری طرح سمجھے نہیں جا سکے ہیں۔
ٹ فرمائیے کہ اعصاب، عضلات، سوچ وغیرہ حیاتیات
سے بنیادی بات نہیں۔ مثلاً پودوں میں نہ تو اعصاب
یں نہ عضلات لیکن وہ پھر بھی جاندار کہلاتے ہیں۔ تو پھر
کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ حیاتیات کی امتیازی
ت ہے خلیے (Cells)۔ ہر جاندار چیز خلیوں سے بنی
ے اور وہ اس طرح کہ ہر خلیہ ایک پیچیدہ مشینری ہوتی
ں میں کیمیائی طور پر عمل ہوتے رہتے ہیں۔
جاندار چیزوں کے خلیوں میں ہونے والے کیمیائی تفاعلات
مثال تنفسی سائیکل (Respiratory Cycle)
فاعلات کے اس سائیکل میں ہمیں معلوم ہے کہ ایک کے بعد ایک
ہے لیکن (اور یہ بات کافی اہم ہے) اگر ہم یہ چیزیں
ری میں ایک سے دوسری بنانے لگیں تو مشکل ہوتا ہے
جب تک توانائی کی ایک خاص مقدار جسے تنشیلی توانائی
(Activation E) کہتے ہیں نہ ملے، تفاعلات ہو نہیں
۔ خلیے میں یہ تفاعلات اس لیے ہو جاتے ہیں کہ خلیے میں بڑے
ور سالمات ایسے ہوتے ہیں جو چھوٹے سالموں کو کچھ
ح جکڑ دیتے ہیں کہ چھوٹے سالموں میں کیمیائی تفاعل کا
ن ہو جاتا ہے۔ ان بڑے بڑے سالموں کو انزائم (Enzyme)
کہتے ہیں۔

ایک انزائم ایک اور چیز پروٹین (Protein) سے بنتا ہے۔
انزائم کے سالمے بڑے اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ہر ایک انزائم
کسی مخصوص تفاعل یا تفاعلات کو کنٹرول کرنے کے لیے بنایا گیا
ہوتا ہے۔ تفاعل کے باعث انزائم خود نہیں تبدیل ہوتے۔ وہ
محض ایک ایٹم کو ایک جگہ سے لے کر ایک اور جگہ پہنچانے میں
مددگار ہوتے ہیں، جیسے کسی کارخانے کی مشینری ہوتی ہے۔

تنفس دائرے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے
کہ ایک شے GDP بدل کر ایک اور شے GTP ہو جاتی ہے۔
GTP میں GDP کے مقابلے زیادہ توانائی ہوتی ہے۔
بننے کے بعد GTP جا کر کسی اور دائرے کو چلانے میں مدد
دے سکتا ہے جہاں طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال
کے طور پر GTP نہ ہو تو عضلات سکڑتے نہیں!

فزکس کی مدد سے حیاتیات کے سالموں کو لیبل کیا
جا سکتا ہے۔ پیچیدہ سالموں سے تجربے کر کے تفاعلات کی
نشاندہی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مختلف طرح کے ہم جاؤں
(Isotopes) کے استعمال سے جس میں تابکار ہم جا بھی شامل
ہیں تفاعلات کا سراغ لگانا ممکن ہوتا ہے۔

اب ہم پروٹینز کا ذکر کریں گے۔ پروٹینز حیات کا امتیازی
نشان ہیں۔ سارے انزائم پروٹینوں سے بنے ہوتے ہیں۔ زندہ
چیزوں کا زیادہ باقی حصہ بھی ان ہی سے بنا ہوتا ہے۔

پروٹینوں کی ساخت بہت دلچسپ اور آسان ہوتی ہے۔
یہ مختلف امینو ایسڈز (Amino Acids) کی زنجیریں ہوتی ہیں۔
کل ملا کر کوئی بیس کے قریب امینو ایسڈز ہوتے ہیں اور یہ
سب ایک دوسرے سے جڑ کر زنجیریں بنا سکتے ہیں جس کی،
جیسا کہ کہتے ہیں، ریڑھ کی ہڈی CO-NH وغیرہ سالمے ہوتے
ہیں۔ ہر امینو ایسڈ کوئی خاص مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ پروٹینز
ان مختلف امینو ایسڈز کی زنجیروں کے سوائے اور کچھ نہیں
باوجود پیچیدگی کے یہ ممکن ہے کہ ان ہزاروں ایٹموں کی پوری

ترتیب دریافت کی جائے جو کسی پروٹین میں ہوتی ہے۔ اس طرح مثلاً ہیموگلوبن کی ساخت دریافت کی گئی۔

دوسرا بنیادی مسئلہ وراثت اور تناسل کا ہے۔ کوئی آرگنزم کیسے جانتی ہے کہ اسے کیا ہونا ہے؟ یہ کام خلیے کے نیوکلیس میں واقع ایک چیز سے ہوتا ہے جو پروٹین نہیں ہوتی اور جسے DNA کہتے ہیں۔ DNA وہ بنیادی شئے ہے جو ایک خلیے سے دوسرے میں جاتی ہے (مثلاً منی زیادہ تر DNA پر مشتمل ہوتی ہے)۔ DNA ایک طرح کا نقشہ یا خاکہ ہوتا ہے۔ اس کے سالموں کو کیمیائی طور پر اور پھر ایکسریز سے کھوجا گیا۔ نتیجہ میں یہ معلوم ہوا کہ DNA سالمہ زنجیروں کی ایک جوڑی ہوتا ہے۔ یہ زنجیریں ایک دوسرے پر گھوم کر مڑی سی ہوتی ہیں ایک مرغولے (helix) کی شکل میں ان زنجیروں کی ریڑھ کی ہڈی، شکر اور فوسفیٹ گروپوں کا ایک سلسلہ سا ہوتا ہے۔ ہر زندہ چیز میں یہ سلسلہ مختلف طرح سے بنا ہوتا ہے۔ اس طرح کسی طور پر پروٹینوں کے بنانے کے لیے مخصوص احکامات، DNA کے مخصوص سلسلے میں درج ہو جاتے ہیں۔

HO
رائبوز شکر — B:A — رائبوز شکر
OH
A:B
A:B
D:C
C:D
O
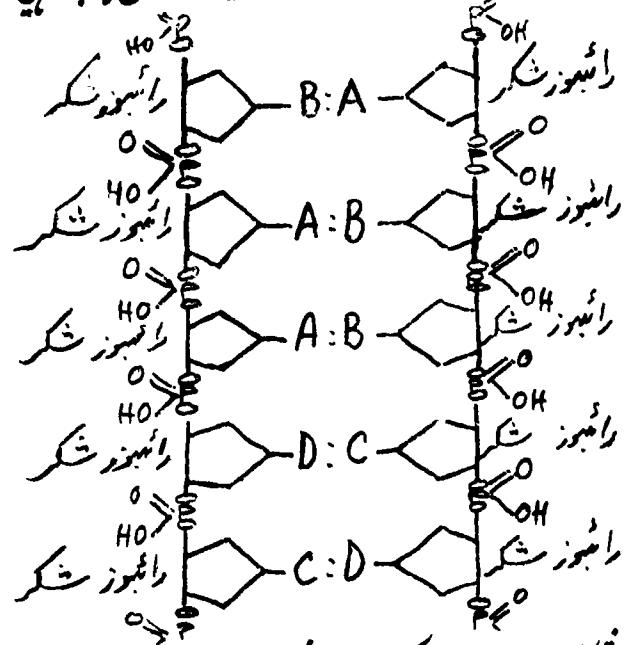
شکل نمبر ۳ DNA کی نمائندہ شکل

جیسا کہ شکل نمبر ۳ سے دیکھا جا سکتا ہے لائن کے ساتھ ساتھ ہر شکر سے جڑے اور دونوں سالمتی زنجیروں کو جوڑتے ہوئے

درمیانی رابطوں کے کچھ جوڑے ہوتے ہیں لیکن یہ سب ایک چیز کے بنے نہیں ہیں۔ یہ چار قسموں کے ہوتے ہیں جن کو ایڈینائن (Adenine)، تھائی مائن (Thymine)، سائیٹوسائن (Cytosine) اور گوانائن (Guanine) کہتے ہیں۔ آسانی کے لیے ہم انھیں A, B, C, D کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں بعض مخصوص جوڑے ہی ایک دوسرے کے مقابل ہو سکتے ہیں جیسے A ہمیشہ B کے مقابل ہوگا تو C ہمیشہ D کے مقابل ہوگا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تناسل (Reproduction) سے کیا تعلق؟ اس کے لیے فرض کیجئے DNA کے زنجیری سلسلے کو بیچ سے دو حصوں میں لمبا لمبا توڑ دیں۔ خلیے میں موجود A, B, C, D کی یونٹیں، شکر اور فوسفاٹ ٹوٹی زنجیروں کے خالی کناروں پر اس طرح جڑنے لگیں گے کہ ہر یونٹ کے مقابل اس کی درست متمم یونٹ ہی جڑے گی جیسے مثلاً BAADC کے سامنے ABBCD ہی جڑے گا۔ اس طرح پہلے کے ایک کی جگہ اب دو مکمل زنجیریں DNA کی تیار ہو جائیں گی۔ اب پورا خلیہ اگر دو حصوں میں بٹتا ہے تو ان دو زنجیروں میں سے ایک ایک زنجیر ہر حصے میں چلی جائے گی۔

سوال اٹھتا ہے کہ DNA میں A, B, C, D یونٹوں کی مخصوص تنظیم، بننے والی پروٹینز میں امینو ایسڈز کی ترتیب کو ٹھیک ٹھیک کیسے متعین کرتی ہے؟ آج کل حیاتیات کا یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کا جواب معلوم نہیں ہے۔ کچھ سراغ ضرور ملے ہیں جو اس طرح ہیں۔ خلیے میں چھوٹے ذرے ہوتے ہیں جنھیں مائیکروسومس (Microsomes) کہتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ پروٹینز یہیں بنتی ہیں۔ لیکن مائیکروسومس نیوکلیس کے باہر جب کہ DNA اور اس میں موجود احکامات نیوکلیس کے اندر ہوتے ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ پورا DNA تو نہیں لیکن DNA کے بعض ٹکڑوں کی کاپیاں سی نیوکلیس سے نکل کر مائیکروسومس تک آتی ہیں۔ ان کو RNA کہتے ہیں۔ جب RNA مائیکروسومس پر پہنچتا ہے تو پروٹینیں بننے لگتی ہیں۔ جو چیز نہیں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ امینو ا

آگر RNA میں واقع رمز (code) کے مطابق مرتب ہوتے
ن بناتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی ابھی نہیں معلوم کہ اگر RNA
R میں کوئی ترتیب جیسے A ccc A ملے تو کیسے بتایا
کون سی پروٹین بننے والی ہے۔
ر حیاتیات کے سمجھنے میں کوئی پوچھے کہ سب سے زیادہ
مفروضہ کیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ وہ مفروضہ یہ ہے
ی چیزیں ایٹموں سے بنی ہیں اور یہ کہ ہر چیز جو زندہ
سکتی ہیں ایٹموں کے ہلنے جلنے اور ادھر اُدھر ہونے سے
آسکتی ہیں۔

لکیات

فلکیات فزکس سے زیادہ قدیم ہے۔ فلکیات کے شروع
ہدوں سے فزکس کو بڑی مدد ملی۔ فلکیات کی سب سے
قابل ذکر دریافت یہ بات ہے کہ تارے ایسے ہی قسموں
وں سے بنے ہیں جیسے زمین پر ہوتے ہیں۔ یہ کیسے معلوم
ایٹم روشنی خارج کرتے ہیں جس کا مخصوص تواتر ہوتا
رکتی تواتر کی روشنی لہریں ملی ہوں تو دیکھ کر ہم انھیں
ف نہیں کرسکتے مگر ایک آلہ ہوتا ہے اسپکٹروسکوپ جو
ی کی لہروں کے تواتروں کو الگ الگ کرسکتا ہے اور اس
فتلف تاروں میں ایٹموں کا پتہ لگ سکتا ہے۔ بلکہ دو عناصر
اور ٹیکنیشیم علی الترتیب سورج اور بعض ٹھنڈے تاروں
ں طرح پہلی بار دریافت ہوئے۔ اس طرح ہمیں پتہ چلا کہ
، بھی اسی طرح کے ایٹموں سے بنے ہیں جو زمین پر ہیں۔
ملنے والے ایٹموں کی بابت تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں، اس
روں کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کا محاسبہ ہم یہاں
رکرسکتے ہیں۔

سب سے زیادہ پر اثر دریافت ایک وہ تھی جس کا تعلق
سوال سے تھا کہ تاروں کی توانائی کا وہ راز کیا ہے جو انھیں
سل جلتے رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ سورج کی توانائی
ہدروجن کے نیوکلیائی 'جلنے' سے حاصل ہوتی ہے جس سے

ہائیڈروجن ہیلیئم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں آخر میں
ہائیڈروجن سے مختلف کیمیائی عنصروں کی صناعت بھی تاروں کے
اندر ہوتی رہتی ہے۔ وہ مواد جس سے ہم بنے ہیں، ایک تارے
کے اندر پکایا گیا اور بعد میں باہر اُگل دیا گیا۔ ہم یہ کیسے جانتے
ہیں؟ ایک سراغ ہے۔ مختلف آیسوٹوپس کا تناسب — یعنی کتنا
C^{12}، کتنا C^{13} وغیرہ — ایک ایسی چیز ہے جو کیمیائی تفاعلات
سے کبھی نہیں بدلتا کیونکہ سب آیسوٹوپس کے لیے کیمیائی تفاعلات
یکساں ہوتے ہیں۔ یہ تناسب خالص نیوکلیائی تفاعلات کا نتیجہ
ہوتا ہے۔ ٹھنڈے انگاروں میں جو ہم ہیں ایسوٹوپس کا تناسب
دیکھتے ہوئے ہم بتا سکتے ہیں کہ وہ بھٹی کیسی رہی ہوگی جس میں
وہ مواد جس سے ہم بنے ہیں، بنا تھا۔ وہ بھٹی تاروں کی طرح تھی
اور اس لیے یہ اغلب ہے کہ ہمارے عناصر تاروں میں بنے تھے؛
اور اُن دھماکوں میں باہر اُگل دیے گئے جنھیں ہم نووا (Novae)
اور سپر نووا (Supernovae) کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ہم دیکھیں گے کہ فلکیات فزکس
کے بہت قریب ہے اور فزکس کی اسٹڈی میں ہمیں کئی فلکیاتی
چیزوں پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔

ارضیات

اب ہم زمین کی سائنسوں یعنی ارضیات کو لیتے ہیں۔
پہلے موسم کی جانکاری یعنی موسمیات (Meteorology) لیجیے۔
یہاں مشکلیں ہیں۔ یہاں ہوا اور پانی کے متلاطم (Turbulent)
بہاؤ ملتے ہیں جن کو ہم تحلیل (Analyse) نہیں کرسکتے۔ موسمیات
سے متعلق آلات البتہ ضرور فزکس کی دین کہے جاسکتے ہیں۔

ارضیات کا بنیادی سوال یہ ہے کہ زمین جیسی ہے ویسی
کیوں اور کیسے ہے؟ اربوں سال کے گھسنے گھسانے کے باوجود
آج بھی ہمیں اونچے اونچے پہاڑ ملتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے
کہ آتش فشانی (Vulcanism) اور پہاڑ بنانے کے عمل
ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آتش فشاں پہاڑوں کا مظہر دراصل
ابھی سمجھا نہیں جاسکا ہے۔ یہ کیوں ہوتے ہیں سمجھا نہیں جاسکا

ہے۔ تھیوری یہی ہے کہ زمین کے اندر گھومتے ہوئے کرنٹس (currents)
ہیں۔ ایک پلیٹ دوسری پلیٹ کو ڈھکیلتی ہے جس سے مادہ اکٹھا
ہونے لگتا ہے، پہاڑی سلسلہ ابھر آتا ہے اور آتش فشاں پہاڑ
اور زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بالآخر وہ کیا ہے جو ڈھکیلتا
ہے اور کیوں ڈھکیلتا ہے ابھی معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

زمین کے اندر کی بابت کیا معلوم ہے؟ زمین سے ہو کر
گزرنے والے زلزلوں کی رفتار اور زمین کی کثافت کا پھیلاؤ
معلوم ہے۔ لیکن زمین کے مرکز پر جو دباؤ ہے اس دباؤ کے
تحت مادے کی خاصیتوں کے بارے میں ابھی کم معلوم ہے۔ واقعہ
یہ ہے کہ ہمیں زمین کے اندر کیا ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے کم معلوم
ہے کہ تاروں کے اندر کیا ہوتا ہے۔ بڑے دباؤ کے تحت چٹانوں
کا برتاؤ تجربے سے معلوم کرنا ہوگا جو ابھی کیے نہیں جا سکے۔

نفسیات

اس کے بعد ہم سائنس کی نفسیات لیتے ہیں۔ سب
سے پہلے یہ کہ سائیکو اینالیسس (Psycho analysis)
کوئی سائنس نہیں ہے۔ نفسیات کے دیگر اور حصے جیسے احساس
کی عضویات (Physiology) آنکھ میں کیا ہوتا ہے، دماغ
میں کیا ہوتا ہے، وغیرہ۔ ویسے نسبتاً کم دلچسپ معلوم ہو سکتے
ہیں لیکن اِدھر حال میں ان پر کافی کام ہوا ہے۔ ذہنی نظام کا
مرکزی سوال یہ ہے کہ جب کوئی حیوان کچھ سیکھتا ہے تو وہ پہلے
کے مقابلے میں کچھ چیزیں مختلف کر سکتا ہے۔ اور اگر اس کا دماغ
اینٹوں سے بنا ہے تو اس کے دماغ کے خلیے بھی کچھ بدل جاتے ہیں
سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح سے بدل جاتے ہیں؟ اس مسئلے کو ہم
ابھی حل نہیں کر پائے ہیں۔ لیکن دماغ میں باہم جوڑتی لکیروں
اور اعصابوں کی جو زبردست تعداد ہوتی ہے تو اس کے مدنظر
دماغ کی کمپیوٹر سے مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت دلچسپ
موضوع ہے۔ میرا مطلب ہے سوچ اور کمپیوٹر کے تعلق کا موضوع۔
یہ مضمون بہت پیچیدہ ہے اور یہیں اوپری سوالوں کے جواب
پانے میں لمبا عرصہ لگ سکتا ہے۔

جہاں دوسری سائنسوں میں اکثر یہ سوال اٹھتا ہے
سب کیسے ہوا' یعنی ارتقا کا سوال' وہاں فزکس میں فی ال
یہ مان کر چلتے ہیں کہ فزکس کے قوانین ہمیشہ سے وہی تھے۔
ہیں وہ وقت کے ساتھ بدلے نہیں۔ اگر ہم کسی دن دریا
کہ ایسا نہیں تھا تو پھر تاریخی سوال یا ارتقا کا سوال فز
بھی زیر غور لایا جائے گا کہ ایسا کیسے کیسے ہوا۔ ایک طرح
اکٹھائی (Super Unification) عظیم اکٹھائی nd-
(Unification) وغیرہ کے نظریوں نے فزکس میں ایک
طرح کا ارتقائی سوال شامل کروا ہی دیا ہے۔

اختتام

آخر میں غور کرنے کی بات ہے کہ شاعر نے جب
کہ ساری کائنات شربت کے ایک گلاس میں موجود ہے تو
کچھ صحیح ہی کہہ رہا تھا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے ذہنوں میں
آسانی کی خاطر اگر شربت کے گلاس کو (اس کائنات کو جس
اجزا کے نمونے گلاس میں موجود ہیں) مختلف حصوں میں با
لیتے ہیں جنھیں فزکس، حیاتیات، ارضیات، فلکیات، نف
اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں تو قدرت یہ سب نہیں جا
ایک شربت کا گلاس شربت کا ایک گلاس ہوتا ہے۔ اس
آخری لطف اور اٹھانا مت بھولیے۔ اسے اٹھائیے اور پ

"ہنر، فن اور علم ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز
کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے۔ ایک
مہذب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں
سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے
حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا
ہے اس کی عقل اور اس کی دماغ کی قوت محض
بیکار رہ جاتی ہے اور تربیت و شائستگی،
تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

سر سید

غلام یحییٰ انجم

درس نظامی کے جدید تقاضے

ہندوستان میں دینی علوم کی تدریس و تعلیم مسلمانوں کے
[آ]باد ہونے کے بعد سے برابر رہی ہے۔ تاریخ و تذکروں
[...]ت میں بہت سی ان کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں جو پڑھائی
[...]ی ہیں لیکن کسی منظم نصاب کے عام رواج کا کوئی حتمی ثبوت
[...]تا۔ درس نظامی ہی غالباً پہلا منظم نصاب ہے جس سے ہم
[...]ں ہیں جو اٹھارھویں صدی عیسوی (بارھویں صدی
[...]میں پورے ملک میں رواج پذیر ہوا۔

مشہور مستشرق اور محقق مسٹر ڈبلو کانٹ ویل اسمتھ
[...]نون' علماء ان انڈین پالیٹکس" میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

[...] آخر الذکر کے ارتقاء کے بطور ہیں دو ایک چیزیں
ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر فرنگی محل لکھنؤ کی بڑھتی
ہوئی اہمیت ہے جس کی خصوصیت یہ تھی کہ ۱۶۹۸ء
میں صرف ایک شخص نے تنہا اسے قایم کیا لیکن جو
اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایک ایسا ادارہ بن
گیا جو قومی پیمانے پر ہندوستان کا قریب قریب
اولین سنی مدرسہ تھا اور اس کا نصاب ایک ایسے
معیاری "درس نظامی" کی شکل میں رائج و شایع ہو گیا جو مذہبی
علماء کی تعلیم و تعلیم کا ایک اہم اور ہمہ گیر طریقہ کار بن گیا۔"

[کتاب پالیٹکس اینڈ ہسٹری ان انڈیا۔ ص ۴۴،
[...]ون' دی علماء ان انڈین پالیٹکس از ڈبلو کانٹ ویل اسمتھ]

اس عبارت سے واضح ہے کہ مولانا نظام الدین کا مرتب کردہ
پورے ہندوستان کے علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے
اپنے اداروں میں اسے نافذ کیا۔ جن لوگوں نے درس نظامی کی تکمیل
کر کے ملک گیر شہرت حاصل کی ان میں ملا حسن، بحر العلوم ملا مبین،
مولوی ولی اللہ، مفتی ظہور اللہ، مولوی عبد الحکیم اور مولوی
عبد الحلیم وغیرہم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے
خاندان کے تلامذہ میں قطب الدین گوپاموی، امان اللہ بنارسی
محب اللہ بہاری، مولوی حمد اللہ، مولوی فضل امام اور علامہ
فضل حق خیر آبادی نے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں علوم و
فنون کی ترقی کے لیے بڑی کوششیں کیں اور آج تک ان کے گزشتہ
مساعی کے جو کچھ نتائج باقی ہیں ان سے ہر شخص ان کی عظمت کا اعتراف کر سکتا ہے

درس نظامی کے پانچ ادوار

ہندوستان کی عربی درس گاہوں میں مروجہ نصاب تعلیم
کے سلسلے میں تفصیلی معلومات مولانا ابو الحسنات ندوی کی کتاب
"ہندوستان کی قدیم درس گاہیں" کے مطالعے سے فراہم کرنی
چاہیے۔ یہاں مختصر طور پر صرف اتنا بیان کیا جا رہا ہے کہ درس
نظامی کی ابتدا کب ہوئی اور زمانے کے تغیر و تبدل سے اس
میں کس طرح تبدیلی پیدا ہوئی۔

دور اول

ہندوستان میں اس نصاب تعلیم کا آغاز ساتویں
صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر
اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا کم و بیش
دو سو برس صرف، نحو، ادب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ
منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث، [...]

تھیں، فقہ و اصول فقہ پر خصوصی زور دیا جاتا تھا۔

اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات تھیں وہ فاتحین ہند کے موثر مذاق کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا تخت جن لوگوں نے بچھایا وہ غزنی اور غور سے آئے تھے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں فقہ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم دین کا طغرائے امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس لیے فقہ اور اصول فقہ پر خصوصی توجہ دی گئی۔

دور دوم

نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ نے سابقہ معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضدالدین کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم نصاب میں داخل کر دی۔ اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر المعانی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ نیز اسی زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح جامی داخل نصاب کی گئیں۔

اسی دور کے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علمائے حرمین شریفین سے علم حدیث کی تکمیل کر کے حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی ان کے بعد ان کے فرزند نور الحق نے بھی درس حدیث کی اشاعت کی سعی کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

دور دوم کے بابت اختصار میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ دور اول میں جو کتابیں شامل درس تھیں ان میں مطالع اور مواقف، مطول، مختصر تلویح، شرح عقائد نسفی شرح وقایہ اور شرح جامی کا اضافہ کرنے سے اس دور کا نصاب مرتب کیا جا سکتا ہے۔

دور سوم

دور دوم کے نصاب درس میں جو تبدیلی ہوئی اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئیں اور وہ معیار فضیلت کو پہلے سے زیادہ بلند کرنے کے لیے کوشاں نظر آنے لگے۔ میر فتح اللہ شیرازی جب شیراز سے ہندوستان آئے تو اکبر نے انھیں عضدالملک کا خطاب عطا کیا۔ انھوں نے ہی سابقہ نصاب درس میں کچھ ا کیے جن کو علماء نے فوراً قبول کر لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جو اس دور کے آخری سب سے زیادہ نامور عالم تھے انھوں نے بھی 'الجزء اللطیف' میں تقریباً اپنی درسیات میں انھیں کتابوں کو شمار کرایا اس زمانے میں شامل درس تھیں۔ البتہ اس دور میں احاد کی صرف چند کتابیں شامل تھیں۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس میں مہارت پیدا کرنے کے چودہ ماہ شاہ صاحب حرمین شریفین میں رہے اور شیخ کردی سے سند حدیث لے کر ہندوستان میں ترویج حدی اہم فریضہ انجام دیا۔ صحاح ستہ کو نصاب میں شامل کر شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کی مشترکہ جدوجہد شامل صاحب نے اس دور میں ایک نیا نصاب تعلیم مرتب کیا تھا میں کتب احادیث کثرت سے شامل تھیں مگر اسی زمانے میں مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا۔ تمام درس گاہوں منطق و حکمت کا غلبہ تھا۔ اس لیے اس نصاب کو قبول عام ہو سکا۔

دور چہارم

چوتھے دور کا آغاز بارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بانی ملا نظام الدین سہ ہیں۔ یہ بزرگ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے۔ درس نظا نام سے جو نصاب آج عربی مدارس میں رائج ہے وہ انھی ہے۔ انھوں نے از سر نو کوئی نیا نصاب مرتب نہیں کیا دور سوم کے نصاب میں کچھ ترمیم کر کے ایک نئے نصاب کی کی تھی۔ اس نصاب کے اندر ایک خاص بات یہ ہے کہ طلبہ کے اندر امعان نظر اور قوت مطالعہ پیدا کر دیتا کوئی شخص یہ نصاب تحقیق سے پڑھ لے تو اگرچہ تعلیم کرنے کے بعد کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا

ردو پیدا ہو جاتی ہے کہ آئندہ محض اپنی محنت سے جس
ہے کمال پیدا کرے۔

رت میں تحقیق کی قید اس لیے لگائی ہے کہ موجودہ
مں ہے۔ ملا نظام الدین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کتابی خصوصیات
لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو محض ذریعۂ تعلیم قرار دے
ن کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرز تعلیم کا نتیجہ ملا کمال الدین،
دم اور حمداللہ جیسے جید علما تھے۔

ور پنجم:

یہ دور اسلامی درس گاہوں کے زوال کا ہے
وستان میں مسلم حکمراں کی حکومت رو بہ زوال تھی۔ مسلمانوں
علمی مجلسیں بھی غیر منتظم و پراگندہ ہو رہی تھیں۔ اس دور
صاب تعلیم متعین ہوا وہ دراصل پچھلے درس نظامی کی بگڑی
ہے اور وہی آج اسلامی درس گاہوں میں رائج ہے۔ آج
دہ نصاب جسے ہم درس نظامی کا نام دیتے ہیں، یہاں
رہے ہیں، تاکہ اس پر تجزیہ کرنا آسان ہو۔

میں نحو میر، ماۃ عامل، شرح ماۃ عامل، ہدایۃ النحو
کافیہ، شرح جامی، مغنی اللبیب

میں میزان و منشعب، پنج گنج، زبدہ، دستور المبتدی،
صرف میر، علم الصیغہ، فصول اکبری کہیں کہیں شافیہ
بھی پڑھائی جاتی ہے۔

ۃ میں دروس البلاغت، مختصر المعانی، تلخیص المفتاح،
کامل مطول۔

میں نفحۃ الیمن، منثورات، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ،
مقامات بدیع الزماں ہمدانی، مقامات حریری، حماسہ۔

میں نور الایضاح، منیۃ المصلی، قدوری، شرح وقایہ
اولین، ہدایۃ، الاشباہ والنظائر۔

ل فقہ میں اصول الشاشی، نور الانوار، توضیح تلویح،
مسلم الثبوت۔

یث میں موطاء امام محمد، بلوغ المرام، ترمذی، مشکوٰۃ،
ابو داؤد، طحاوی، مسلم شریف، بخاری شریف۔

تفسیر میں جلالین، مدارک، بیضاوی۔

کلام میں متن العقائد، شرح العقائد، خیالی۔

منطق و فلسفہ میں صغریٰ، کبریٰ، شمسیہ، قطبی، میر زاہد،
ملا حسن، صدرا، شمس بازغہ، قاضی مبارک، ہدایۃ الحکمۃ
شرح ہدایۃ الحکمۃ۔

ریاضی میں خلاصۃ الحساب، اقلیدس (مقالہ اولیٰ)
ہیئت میں قوشجیہ، تصریح، شرح چغمنی (باب تشریح
الافلاک) سبعہ شداد۔ بست باب در اسطرلاب۔

یہی نصاب کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ تقریباً تمام دینی
مدارس میں رائج ہے۔

موجودہ نصاب تعلیم ایک جائزہ:

جب ہم اپنے نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہی محسوس
ہوتا ہے کہ چند مخصوص کتابوں کی تدریس کو درس نظامی کا نام دے
دیا گیا ہے اور یہ نام لیتے ہی چند روایتی کتابوں کا تصور ذہن
میں آجاتا ہے جو قدیم زمانے سے میراث کی طرح ہمارے طلبہ میں
منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں، علامہ حریری اور بدیع الزماں
ہمدانی کے مصنف مقامات کی ادبیت سے ہمیں انکار نہیں۔ یقیناً یہ
مقامات عربی ادب میں ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن
غور فرمایئے کہ یہ بیسویں صدی ہے۔ اس زمانے میں ڈرامے افسانے
مختصر دلچسپ کہانیاں بے حد ترقی کر چکی ہیں اور ہمارے یہاں یہ
ڈرامے کی ابتدائی شکل یہ مقامات اب تک زیر تدریس ہیں۔ ہمارے
طلبہ ابو تمام، متنبی، بحتری کا نام تو جانتے ہیں مگر انھیں نزار
قبانی، ایلیا ابو ماضی، شبکہ، محمد ابو ریشہ یا پھر حافظ و شوقی کے بارے
پوچھا جائے تو شاید ہی جواب دے سکیں۔ گویا کہ ہمارے مدارس
میں عربی ادب ابھی جاہلی، اموی، عباسی دور ہی میں اٹکا اور
رکا ہوا ہے جب کہ عثمانی دور کے بعد اور بھی دو دور گزر چکے ہیں
عربی نظم کی تمام کتابیں از کار رفتہ تو نہیں مگر پرانی ضرور ہو چکی
ہیں۔ حماسہ، دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ بے شک اہم کتابیں ہیں لیکن

ایک پوری کتاب کو شامل درس رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے
کہ قدیم و جدید شعراء کے دواوین کے انتخابات پڑھائے جائیں تاکہ
طالب علم عربی شاعری کے مختلف ادوار اور اس دور کے شعراء
کے ارتقائی مزاج سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اس کے علاوہ وہ مضامین
جو ہمارے نصاب میں شامل ہیں مگر علوم آلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں
مثلاً نحو، صرف، معانی و بیان اور عروض وغیرہ میرا مشورہ
قطعاً نہیں کہ انھیں نصاب سے خارج کر دیا جائے بلکہ اس مضمون
سے متعلق جو کتابیں شامل درس ہیں ان پر نظر ثانی کی ضرورت
ہے۔ ابتدائی درجے سے لے کر سند فراغت کی تحصیل تک ایک
طالب علم نحو و صرف کی تعلیم حاصل کرتا ہے، مگر زندگی کا ایک اہم
حصہ اس میں صرف کر دینے کے بعد صرف چند موٹی موٹی اصطلاحوں
تک محدود رہتا ہے۔ لہذا میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ کافیہ اور شرح
جامی جیسی مشکل ترین کتابیں نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ اصل
مقصود تک پہنچنے کے لیے مضر بھی ہیں کیوں کہ طالب علم سارا وقت
اس کی پیچیدہ گتھیوں کے سلجھانے میں صرف کر دیتا ہے اور
نتیجہ لاحاصل ہوتا ہے۔ یا صرف وقتی طور پر دل کو مطمئن کر لیتا ہے
اور بس! اب تو نفس مسئلہ سمجھانے کے لیے عرب ممالک میں
اس موضوع پر زمانہ کے مطابق بہت سی کتابیں لکھی جا چکی
ہیں جس سے جدید فن کا بڑی ہی آسانی سے فائدہ اٹھایا
جا سکتا ہے۔

علوم عقلیہ میں منطق و فلسفہ پورے نصاب درس پر
حاوی ہے موجودہ نصاب تعلیم میں جتنی کتابیں اس موضوع پر
شامل درس ہیں اور کسی فن میں نہیں۔ "صغری و کبری" سے لے
کر "قاضی مبارک" اور "صدرا" تک شمار کرتے چلے جائیے ایک
لمبی فہرست ہو جائے گی۔ اس دور میں نہ تو منطق پڑھانے کا وہ
جذبہ رہا اور نہ طلبہ کی اس کے حصول میں دلچسپی رہی۔ نصابی
خانہ پری کے تحت اسے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ جہل بسیط
جہل مرکب، علم باری تعالےٰ اور کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ
ایسے اہم مباحث ہیں جس میں ایک طالب علم الجھ کر رہ جاتا ہے اور
منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم متوجہ ہو پاتا ہے۔ ہاں ایک
دور تھا جب اس فن سے لوگوں کا عشق کی حد تک لگاؤ تھا مگ
اب وہ دور نہیں۔ لہذا اب ایسی کتابوں کو درس میں شامل ر
دینا دماغ سوزی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ البتہ بس وہی کتابیں
درس رہیں جو منطق و فلسفہ کے مبادی اور اس کے اصول و
سے متعلق تشنگی بجھا سکیں۔ نیز منطق و فلسفہ کے عالمی تصور کو نظ
میں رکھتے ہوئے ان کتابوں کا اضافہ کیا جائے جو ان فنون ک
نئی جہتوں کو سامنے لاتی ہیں اور معنویت عصر کے شواہد ر
کی حقیقت میں مقصد بن جاتی ہیں۔

علوم اسلامیہ میں تفسیر و حدیث کو نصاب درس میں بڑ
اہمیت حاصل ہے مگر ہماری درس گاہوں میں جس طرح ان مق
علوم کی تعلیم دی جاتی ہے' وہ عیاں ہے۔ تفسیر میں وہی کتا
داخل درس ہیں جو قدیم زمانے میں عصری تقاضوں کے مطابق
گئی تھیں آج وہ زمانہ نہیں پھر بھی انھیں کتابوں سے است
کی کوشش کی جاتی ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے قرآن کی ایک ایسی
کی ضرورت ہے جو اس دور کے مقتضیات پر حاوی ہو۔ اگر کو
تفسیر ہماری اس ضرورت کو پورا کر رہی ہو تو اسے داخل نص
میں جھجک نہیں کرنا چاہیے۔

احادیث میں بخاری و مسلم انتہائی اہمیت کی حامل ہیں
ان کی عظمت اور جلالت قدر سے کسی مومن کو انکار نہیں۔ ا
مقدس کتابوں اور احادیث کے دوسرے مجموعوں میں گو
سارے عنوانات بکھرے ہوئے ہیں جو کامل ترین اور کامیا
ترین زندگی کے لیے نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت ا
امر کی ہے کہ آج کا توجیہ پسند انسان اور تجزیہ طلب مزاج زندگ
کو جس عنوان کے ماتحت سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے وہ سنت
کے بے کراں ذخیرے سے ابھار دیے جائیں تو احادیث شریفہ کا م
ایک نئی اہمیت اور ایک نئی معنویت اختیار کر لے گا اور اس
انکار نہیں ہو سکتا کہ فہم و فراست کے ہر دور میں ایک سطح ر
اس کے دائرے رہے ہیں اور ان کا مزاج رہا ہے۔ ان

ریں رکھنا افہام وتفہیم کی خاطر انتہائی ناگزیر ہے۔ ہاں
جدیدہ مغربی معیاروں کے سامنے سر جھکانا یقیناً ایک مکروہ
غلامی کی علامت ہے جو قرآن کریم کے نزدیک قابل مذمت
سی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ ذخیرہ احادیث میں سے بخاری
ی کو جو قرآن کریم کے بعد سب سے اہم اور جامع رہنما کتاب بھی
ہے اگر اس کتاب کو از سر نو نئے عنوانات کے ماتحت مرتب
یں اور اس کی توجیہ وتشریح ان علمی اصطلاحات کی مدد سے
یں جو آج کی فکری دنیا میں رائج الوقت سکوں کی حیثیت
ی ہے تب اس مقدس مجموعے کا معنوی جمال اور رہبری و
ئی کے واضح اشارے زیادہ موثر اور کارآمد بن جائیں گے۔
الغرض میری مراد تمام فنون سے ہے جو علوم آلیہ ہیں۔
ں صرف مبادی تک محدود رکھائے جائے اور جن علوم سے
ں کا گہرا ربط ہے ان کی بھرپور اور ٹھوس تعلیم دی جائے مگر
یقہ تعلیم میں اس کا لحاظ ضرور رکھا جائے کہ نصوص قرآنیہ اور
دیث کو کلاسیکی انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کے بجائے عصری
اضوں کے مطابق ان کی توجیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ
اس پرست عقلوں کے لیے بھی یہ توجیہ قابل عمل ثابت ہو سکے۔
علوم اسلامیہ کو عصری تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے
کوشش نہیں کریں گے اور افہام وتفہیم کی یہ راہ مسدود
ریں گے تو علوم اسلامیہ میں جمود وتعطل کا یہ سلسلہ روایتی
بوب کے زلف دراز کی طرح طویل تر ہوتا چلا جائے گا۔ اور
یہ بالکل صفر ہو گا۔ مثلاً یہی کہ قرآن میں جہاں پانی جل جائے گا'
مفہوم آیا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جسے اعلیٰ ذہن رکھنے
لا طبقہ قطعاً مان لینے کے لیے تیار نہ ہو گا تو ہم اس کو نصابی
دسے نکل کر عصری علوم کی روشنی میں اس طرح سمجھائیں گے
پانی دو اجزاء پر مشتمل ہے ایک آکسیجن اور دوسرا ہائیڈروجن
سیجن کا کام بھڑکانا اور ہائیڈروجن کا کام بھڑکنا ہے۔ پانی
نہیں دو گیسوں کا مرکب ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پانی کی ترکیب
ٹد تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بٹ جائے گی۔ نتیجۃً ہائیڈروجن
جل جائے گا اور آکسیجن بھڑکائے گی۔ بات وہی ہے لیکن جمود
سے ہٹ کر عصری علوم کا سہارا لے کر سمجھانے کی کوشش کی تو
یہ سادہ سی توضیح دل پذیر بھی ہوتی اور احساس پرست عقلوں کے
لیے قابل قبول بھی۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں
علوم اسلامیہ کے ساتھ علوم عقلیہ کا تجرباتی حصہ بھی اگر نصاب
درس میں شامل کر دیا جائے تو موجودہ دور کی رہنمائی بھی
ہو گی اور نصوص قرآنیہ اور احادیث کے سمجھنے میں مدد بھی
ملے گی۔

تعلیم کے سلسلے میں بنیادی نقطۂ نظر

تعلیم وتدریس کے معاملے میں ہمارا اپنا ایک
نقطۂ نظر رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ذہنوں کی اس طرح تربیت
کی جائے کہ وہ پورے طور پر اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں
گویا حد ممکن تک کامل انسان بنانا مقصود تعلیم رہا ہے۔ مطلق
علم انفس وآفاق کے متعلق تو بہت کچھ بتا دے گا لیکن زندگی
کی ماہیت اور غایت کے متعلق اس کی رہنمائی ناقص رہے گی
اسلام چوں کہ انسان کو مکمل شعور حیات بخشنا چاہتا ہے اس
لیے وہ اس مطلق علم کی پذیرائی تو کرتا ہے لیکن اس پر اکتفا نہیں
کرتا ہے۔ اس خاص نقطۂ نظر سے جو کچھ بھی سیکھا جائے گا وہ ماہیتِ
حیات کے واضح تصور کی روشنی میں سیکھا جائے گا۔ خالص
دینی اصطلاح میں اقرار توحید سے علم شروع ہو گا اور اثباتِ
توحید پر اس کے سفر کی منزلیں ختم ہوں گی۔ انفس یا آفاق یہ
جلوۂ الٰہی کے مظاہر ہیں۔ اس لیے جب کسی شے کی حقیقت تک
نظر جائے گی تو جلوہ الٰہی خود بخود ابھر کر سامنے آجائے گا۔
گویا ہم علم کو دینی اور دنیوی خانوں میں نہیں بانٹ سکتے وہ
ایک "کل" ہی رہے گا اور کلی حیثیت سے وہ روشنی عطا کرے
گا جو ذہن کو خبر باطن اور دل کو دولت ایمان سے سرفراز
کرے گا۔

میں نے اپنے مقصد کو زیادہ سے زیادہ کھلے الفاظ
میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر آپ توجہ فرمائیں تو

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان معروضات کی روشنی میں نصاب کے مسئلے پر غور کرنے کا صحیح رُخ اور صحیح اندازہ کیا ہے؟ ہم نصاب اس لیے تیار کرتے ہیں کہ عمر اور شعور کا لحاظ کرتے ہوئے قسط بہ قسط علم کو انسانی ذہنوں میں پہنچانا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کم اہم نہیں ہے کہ ابلاغ کا اندازہ کیا ہونا چاہیے۔ گویا بہت اچھی طرح انسانی شعور کے ارتقا کے تصور کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہمیں علم انسانی کا انتظام کرنا ہے اسی لیے ہم تعلیمی مدت مدارج میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر درجے کے ساتھ کمیت اور کیفیت کا ایک واضح تصور وابستہ کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں درس نظامی کے نصاب کے سلسلے میں بات کر رہے ہیں، اس لیے بات ابتدا سے شروع کی جائے گی گویا ہمیں ابتدائی سطح پر بچے کو الفاظ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی عبارتوں اور مشاہداتی تاثر کے وسیلے سے اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کرنا ہے اور اس کے ذہن کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ اسے اسی انداز میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا شوق پیدا ہو جائے۔ اس ذہن کے بچے جب ثانوی کلاس میں ہوں تو ہم اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے سوچے سمجھے متعلق نصاب کی مدد سے انھیں زیادہ سے زیادہ باخبر کر سکتے ہیں اور صاحب ایمان بھی بنا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسی خالص نقطۂ نظر سے ہمارے نصاب تعلیم میں بنیادی ترمیمات کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس نصاب کو عمر کے اعتبار سے مقصدیت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ جاندار، موثر اور بامعنی بنانا ہے۔ اگر میں ایک جملے میں کہنا چاہوں تو یہ عرض کروں گا کہ جس طرح یونانی طب "ھو الشافی" کی بدولت اسلامی طب بن گیا اسی طرح "ھو الخالق" کی بدولت موجودہ سائنس اسلامی سائنس بن جائے گی۔ مگر اس کے لیے ہمیں ان محرکات پر غور کرنا پڑے گا جو اس کے لیے مدد و معاون ثابت ہو سکیں گے۔ آج کی رائج الوقت تعلیم عظیم ترین اسلامی مقاصد میں کامیابی نہیں عطا کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں از سر نو تو نہیں مگر نصاب میں کچھ اس طرح ترمیم لازمی سمجھیں گے جو انسانی شعور کی صحیح تربیت کرنے کے ساتھ عصری تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔

یہاں میری مراد ترمیم سے چند نصابی کتابوں کو خار[ج] کچھ غیر نصابی کتابوں کو شامل درس کرنا ہرگز نہیں بلکہ مراد ترمیم سے یہ ہے کہ دینی علوم کو آپ دنیاوی علوم [کی] طرح اتار دیں کہ وہ اس کا دوران خون اس کی روح [،] اس کی بینائی اور شنوائی اس کا احساس و ادراک ا[س] کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تما[م] اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بنا [لے] اپنے اس مقصد میں ہم کامیاب ہو جائیں گے اور اس ن[ئی] تعلیم کے ساتھ مدارس میں تعلیمی رواج پیدا کریں گے تو باکمال مسلمان فلسفی، مسلمان سائنس داں، مسلمان [ماہر] معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین اور دیگر تما[م] فنون کے مسلمان ماہرین پیدا ہوں گے جن پر دنیا رشک [کرے]

ہمارے اس طریقۂ کار پر کوئی شرعی گرفت بھی [نہیں] آپ خود غور فرمائیں کہ جب نصاب کی کوئی حد بندی نہ [تھی] عمومی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سماجیات، تاریخیات، [...] نفسیات، طبعیات تمام علوم سے اپنے کو باخبر بناتے [تھے] فنون کو دلچسپی سے حاصل کرتے تھے۔ مذکورہ فنون کو [درس] نظامی کے نصاب میں شامل کرنا ہی صرف ضروری نہیں [...] ہے۔

ابن خلدون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'مقد[مہ]' موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انھوں نے علوم ا[...] دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا علوم طبعیہ، دوسرا [...] اس کے علاوہ ایک معنوی تقسیم بھی ہے۔ ایک علم لدنی، [...] عقلی۔ آج بھی ہم جو اپنی درس گاہوں میں علوم پڑھ[اتے] ہیں، اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو علوم منقو[لہ] دوسرے کو علوم معقولہ کہتے ہیں۔ بات بالکل واضح ہے [...] میں ریاضیات، طب، طبعیات، کیمیا، ہیئت و زراعت وغی[رہ]

ل تھے ۔ دینی علوم میں تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام شامل مانا
تھا اور غالباً آج بھی وہی ذہن ہے جب علم کے مفہوم میں
فدر وسعت ہے تو ہمارے درس نظامی کو صرف دینی علوم
ندود رکھنا اور علوم عقلیہ کو صرف منطق و فلسفہ تک حد بندی
یا ملتِ اسلامیہ کے ساتھ زیادتی بلکہ اسلام کے ساتھ
ی ہوگی ناانصافی ہے ۔

اس موقع سے میں یہ کہوں گا کہ علوم عقلیہ کو منطق و فلسفہ
حد تک نصاب درس میں شامل کرکے چھٹکارا حاصل کرنا کمال
ں ہے ۔ موجودہ سائنس جسے قریب ہوکر سمجھنے اور پرکھنے
کوشش نہیں کرتے درحقیقت یہ بھی علوم عقلیہ کا ایک
ری ہی صرف نہیں بلکہ اہم ترین جز ہے ۔ وہ اس طرح کہ ہم
وم عقلیہ کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ۔ ایک کا تعلق
سیات" سے جن کا نام ہم "منطق و فلسفہ" یا کوئی دوسرا
م دیں اور دوسرے کا تعلق "تجربات" سے ہوگا جسے
موجودہ سائنس کی زبان میں فزکس (طبعیات) کیمسٹری
لیمیا) باٹنی (نباتات) زولوجی (حیوانیات) جیالوجی
طبقات الارض) وغیرہ کہہ سکتے ہیں تو درحقیقت ان تجرباتی
لوم سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے ۔ بلکہ علوم عقلیہ کا ایک حصہ
ان کر اس کی تحصیل کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے ۔ ہمارے لیے
اقدام کوئی نیا نہیں ہے بلکہ عہد وسطیٰ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں
و آپ کو ایسے بیشتر افراد ملیں گے جنھیں دینی علوم کے علاوہ ہر قسم
ے دنیوی علوم میں بھی دست گاہ حاصل تھی ۔ اس دور کے نظام
علیم نے بڑے بڑے فقیہ، متکلم، سائنس داں، ماہر ریاضیات
دیب اور سیاست داں پیدا کیے، انھیں میں سے امام ابوحنیفہ
مام غزالی، ابن سینا، البیرونی، خیام، ابن خلدون، امیر خسرو،
بو الفضل فیضی اور فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں جیسے
ماہر بھی ہیں ۔

موجودہ نصاب تعلیم کی تکمیل کے بعد تو دینی معلومات حاصل
ہو جاتی ہے مگر اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول کے بارے میں
اس علم تقریباً نہیں کے برابر ہوتا ہے لیکن پھر ایک وقت ایسا
آتا ہے کہ وہ اپنی ان دینی معلومات کی بنیاد پر سماج کا منفعت
بخش رکن نہ بن کر ناخواندہ جاہل مسلمانوں کا رہنما بن جاتا ہے ۔

موجودہ نصاب تعلیم کی ہم قطعاً مخالفت تو نہیں کرتے مگر اتنا
ضرور کہیں گے کہ اس نصاب تعلیم میں جو کمیاں ہیں ان کی تلافی کرکے
اسے مکمل کریں اور عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی روشنی
میں اس پر نیا خول چڑھائیں ۔ موجودہ نصاب تعلیم اپنے ارتقائی
مراحل میں کچھ کم اہمیت کا حامل نہ تھا ۔ اس کی افادیت اور
اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم
ساتویں صدی ہجری سے لے کر اب تک کچھ ہی ترمیم و تبدیلی
کے ساتھ بدستور جاری ہے اور وہ لکیر جو صدیوں پہلے کھینچ گئی
تھی اس پر طلبہ اور اساتذہ مقصود حیات سمجھ کر سرگرم سفر
ہیں ۔ آج زمانہ کس راستے پر چل رہا ہے اہل دانش اسے
بخوبی جانتے ہیں ۔ مگر اس کے باوجود بھی گوشۂ عزلت میں
بیٹھ کر قوم کی تباہی پر اشک ریزی کرنے کے بجائے اس کا
مداوا ڈھونڈھنا چاہیئے ۔

زمانی ارتقاء کے ساتھ مزاج تعلیم میں تبدیلی

اسلام نے جو ارتقائی زمانی کے ساتھ مزاج تعلیم اختیار
کرنے کا حکم دیا ہے یہ تو بہرحال آپ کو معلوم ہوگا کہ قبل بعثت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی کیا حالت تھی ۔ ان کا سماج و
معاشرہ کس ڈھرّے پر چل رہا تھا ؟ بعثت کے بعد اسی معاشرے
نے ایک نیا موڑ اختیار کیا جس کا احساس اب بھی باقی ہے ۔ اسی
موڑ کو تاریخ اسلام میں انسانیت کا معمار دور قرار دیا گیا ۔
خلاق عالم نے اسی مناسبت سے ان بدلتے ہوئے تقاضوں کو
دیکھتے ہوئے اپنی الہامی کتاب کو ایک بدلتے ہوئے لب و لہجے میں
نازل کیا جو قدیم معاشرے کے لب و لہجے سے اس قدر مختلف تھا
کہ "فاتوا بسورۃ" کہہ کر قدیم منہج تعلیم کی دھجیاں بکھیر دیں اور
یہ واضح کردیا کہ تعلیم و تدریس کا یہ موجودہ لہجہ تمہارے روایتی لب و لہجے

سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ چنانچہ ہمارے علماء بھی وقتاً فوقتاً زمانے
کی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے مناہج تعلیم کو وقت کے سانچے
میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر جب دوسری
صدی ہجری کی ابتدا میں فلسفہ بالخصوص منطق اسلامی فکر میں داخل
ہوئی تو بعض دین دار علماء نے اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی
یہاں تک کہ حضرت امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ وہ فرماتے تھے
کہ لوگ منطق میں مشغول ہوگئے اس لیے اگر تم کسی کو منطق میں مشغول
دیکھو تو اس سے بیزار ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھو۔ مگر جب
ملاحدہ زنادقہ دونوں نے اسلام پر حملے شروع کیے تو پھر مجبوراً
اس بیزاری کے پچیس تیس سال بعد خلیفۃ المسلمین مہدی نے
متکلمین کو بلا کر زنادقہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں اور اس کے
لیے ان متکلمین نے فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا اور پھر وہ زمانہ
بھی آیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ لکھنے سے پہلے مقاصد
الفلاسفہ لکھی اور اس طرح فلسفہ جس کے خلاف علماء نے ایڑی
چوٹی کا زور لگایا تھا نصاب میں داخل کیا اور جس منطق کے متعلق
بڑی شد و مد سے کہا جاتا تھا من تمنطق تزندق اسی منطق
کو امام غزالی نے اصول فقہ کے مبادی میں شامل کیا۔ وہی صورت
آج بھی درپیش ہے۔ جس سائنس کو ہمارے علماء دہریت کا پیش خیمہ
سمجھتے ہیں آج ہماری معاشی ضرورتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ اپنے
بچوں کا مستقبل روشن کرنے کے لیے انھیں دینی علوم کے بجائے
اس سائنس کے شعبوں میں بھیجیں اور اس کے لیے ہم لوگ اپنے
تقویٰ اور تدین کے باوجود جو کوشش کرتے ہیں اور جس طریقے
سے اپنے بچوں کا انجینیرنگ (علم ہندسہ) یا میڈیکل میں داخلہ
کراتے ہیں وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اپنے بچوں کو
ایسی تعلیم دیں کہ وہ سائنس پڑھ کر اپنے دنیوی مستقبل کو روشن
کر سکیں اور اس کے ساتھ دینی علوم پڑھ کر اپنی عقبیٰ و آخرت
سنوار سکیں اور اس طرح دنیا کے سامنے ایک انسان کامل کا نمونہ
پیش کر سکیں۔

آج زمانے کے مزاج سے کون واقف نہیں۔ یقیناً دنیا کی
زبان بدل چکی ہے۔ اس کے مفروضات اور مسلمات تبدیل ہوگئے ہیں۔
تصورات میں زمین و آسمان کا فرق آگیا ہے۔ سوچنے کا انداز بالکل
مختلف ہو چکا ہے، پرانے اسلحے بدل ڈالے گئے ہیں، طاقتوں میں
نوعی فرق آگیا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا
کا مزاج کلیتاً بدل چکا ہے۔ لہٰذا اگر آج ہمیں اس یے زمانے کے
سامنے اسلام کی ابدی صداقت کا پیغام پہنچانا ہے تو پہلے سے مختلف
زبان اختیار کرنا پڑے گی اور اس کے تفکر کے مطابق نئے طریقوں
سے اسلام کو اس کے دماغ میں پہنچانا پڑے گا۔

یہ بیان کرنے سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ علوم اسلامیہ کو
بدلتے ہوئے زمانے کا غلام بنا دیا جائے۔ لیکن یہ ضرور چاہیں گے
عصر جدید کے ساتھ ایک معنوی موزونیت قایم کی جائے اور وہ
اس طرح کہ قرآن کو سائنس کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے سائنس
کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے (قرآن کریم کا ایک معجزہ یہ بھی
ہے کہ وہ مذہبی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس نے مشاہدے اور
تجربے کو حقایق کے لیے بیّن دلائل کے طور پر پیش کیا ہے) اگر ان
درس گاہوں کے منہج میں اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو یقیناً
ایک بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے نصاب کا تغیر
ایک اہم اور ٹھوس ضرورت ہے جسے طے کرنے کے لیے مسلمہ
جید قدیم و جدید کے حسین امتزاج والے علماء کی ضرورت ہے۔
موجودہ نصاب تعلیم تضیع اوقات ہی کا صرف سبب نہیں بلکہ مضر
رساں بھی ہے۔ آج اس نصاب تعلیم کو طلبہ پر زبردستی لادا جا
اور وہ مضامین جنھیں داخل نصاب ہونے کی وجہ سے طلبہ پڑ
ہیں قطعاً اس سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں
تک میں سمجھتا ہوں کہ وہ فن نہیں صرف کتاب پڑھتے ہیں۔

یورپی نصاب تعلیم میں زمان و مکان کے اعتبا
تبدیلیاں

شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی علماء زمان و مکان کی تبد
ساتھ ساتھ نصاب تعلیم میں ترمیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی

ہوتی مگر تین چار برس میں ضرور اس کی طرف توجہ دیتے ہیں
واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں علم سماجی عمل
وسیع تصور کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے جیسے وہ مشعلِ راہ بنا
رگی کی راہ عمل میں گامزن ہو جاتے ہیں۔ ہمارے علماء قرآن
ث کی تفہیم میں جدید نکات کو بیان کر دیتے ہیں مگر درسی کتابوں
توجہ نہیں کرتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے طلبہ
تحقیقات سے کورے اور نابلد رہ جاتے ہیں۔ مغربی ماہرین
نے جو طریقِ تعلیم اختیار کیا ہے وہ صرف مفید ہی نہیں بلکہ
ور سہی ہے۔ اس طریقہ تعلیم کے دو اہم فائدے یہ ہیں کہ اولاً
م وتفہیم میں آسانی پیدا ہوتی ہے اور ثانیاً برسوں کا کام
نوں میں ہونے لگا ہے۔ لہذا اگر ہم اپنے ذہن وشعور کی
ت سے تعلیمی مشکلات کو دور نہیں کر سکتے ہیں تو مغربی منہج تعلیم
انداز میں ضرور اپنی تعلیم کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں اور جہاں تک
خیال ہے کہ منہج تعلیم کے سلسلے میں میری یہ تقلید من تشبہ
وم" کی زد میں نہ لائے گی۔

مغربی علماء نے جو اس قدر ترقی کی ہے، مجھے مکمل اعتماد
کہ اگر وہ اس ترقی یافتہ دور میں آٹھ سو برس پرانے نصاب
لیم میں سر کھپاتے تو عروج وارتقاء کی اس منزل پر نہ پہنچتے۔
نہیں! انھوں نے زمانہ کی ضروریات کو محسوس کیا اور اسی
سب میں تعلیم کا نصاب ڈھالا اور طریقہ تعلیم کا جدید طرز ایجاد
جس کی بنیاد پر آج تعلیمی معاملے میں تمام ممالک سے سبقت
تے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فلیب کے ہتی ان کے قدیم تہذیب کا
کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:

"مسلم اسپین میں سڑک کے دونوں طرف روشنی
کا استعمال اس وقت کیا جاتا تھا جب فرانس کی
راجدھانی پیرس میں لوگوں کے پاؤں کیچڑ سے آلودہ
رہتے تھے۔"

اس زمانے میں یہ عبارت حیرت انگیز معلوم ہوتی
لیکن یہ تاریخی حقیقتیں ہیں جنھیں بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا،
حکیم ابن المقنع نے مصنوعی چاند بنایا تھا جو پندرہ دن تک مسلسل
ایک کنوئیں سے طلوع ہوتا رہا، لیکن ابن المقنع کے مرتے ہی
اس کی ساری ٹکنالوجی سپرد خاک ہوگئی۔ کاش اس نے حاضرین
کو اس ٹکنالوجی سے آگاہ کیا ہوتا یا اسے کسی کتاب میں قلم بند
کر دیا ہوتا تو یہ تاریخی حقیقت ایک افسانہ بن کر نہ رہتی۔ لیکن ایسا
ہی ہوا اور صرف اسلاف کے تساہل کی وجہ سے ہوا۔ اس کے
برعکس اہل مغرب اپنے تعلیمی منہج کو نئی دریافتوں اور نئی
ایجادات سے لیس کر دیا۔ گویا کہ یہ نصاب مغرب کے تعلیمی منہج کا ارتقائی
سفر ہے اور محقق آسانی کے ساتھ اس ارتقائی سفر کے منازل کا خاکہ کھینچ سکتا ہے۔

اختتامیہ

سوز دل نے اکسایا اور مطالعے نے سہلا دیا اور
ہمہ جہت فروغ اسلام دیکھنے کی تمنا نے جرأت پیدا کی تو یہ چند
کلمات آپ کے پیش خدمت ہو گئے۔ میں نے صرف ایک نئی جہت کی
نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہمارے
اکابر علماء نے اپنے اپنے دور میں نئی جہتوں کی طرف رہنمائی کی ہے
غور کرنا، سوچنا، اور اپنی عقل کو اعلیٰ ترین اور وسیع ترین سطح پر
بروئے کار لانا تاکہ منشائے الٰہی ہر پہلو قلب اور ذہن کا سرمایہ
دولت بن جائے اور سرشاری ولذت کا سامان بھی۔ یہ
طریقہ ہے جو قرآن فہمی کے روز اول سے چل رہا ہے اور جسے رکنا
نہیں چاہیے برابر چلتے رہنا چاہیے گویا کل یوم ھو فی شان
جدید ترین تعبیر ہر دور میں اسلامی فکر ونظر اور عمل کے آئینوں
میں نمایاں ترین رہنا چاہیئے۔ میں بہت ادب سے پورے اخلاص
دل سے اپنے شعور وآگہی کے پورے زور قوت کے ساتھ یہ عرض کرنے
کی جرأت کرتا ہوں کہ تعلیم کو اعلیٰ ترین تبلیغ بنا دینے کا عظیم الشان
کام جو ہمارے اکابر نے کیا ہے وہ ہم سے برابر تقاضہ کرتا
ہے کہ ہم فراست کے ساتھ، ہمت کے ساتھ، دیدہ وری کے
ساتھ اور مجاہدانہ ذوق وشوق کے ساتھ اس راہ پر برابر
آگے بڑھتے رہیں اس لیے کہ:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز — یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۸/ ۸۶ ۔ ۸۷
مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ٹریننگ اینڈ پلیسمنٹ آفیسر [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ:۔ ذاکر حسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۳۰۰ ۔ ۶۰ ۔ ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:

۱۔ لازمی ا۔ انجینرنگ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں بنیادی ڈگری
ب۔ انجینرنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری
ج۔ دس سال کا تجربہ جس میں سے کم از کم تین سال کا تجربہ کسی انڈسٹری میں ہونا چاہیئے اور دو سال تدریس/تحقیق میں ہونا چاہیئے۔ ساتھ میں کسی انڈسٹریل/تدریسی/تحقیقی ادارے میں کسی ممتاز عہدے پر فائز ہوں۔

۲۔ پسندیدہ: کسی انڈسٹری میں انجینرنگ گریجویٹس کے انڈسٹری پلیسمنٹ اور ان کی عملی تربیت کا انتظام کرنے یا سپروائز کرنے اور طلبار کی بہبودی کی دیکھ بھال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۲/۸۶ ۔ ۸۷ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۲۔ کیجولٹی میڈیکل آفیسر [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ:۔ جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت ۱۔ لازمی۔ ا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔

ii۔ کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔
iii۔ کسی تدریسی اسپتال میں بحیثیت ریذیڈنٹ یا رجسٹرار تین سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ:۔ کیجولٹی کام کا تجربہ۔

سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ [سروے انسٹرومنٹ مکینک] [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ:۔ سول انجینئرنگ۔
شرح تنخواہ: ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای۔بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: الیکٹریکل یا مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ ہی ساتھ پانچ سال کا تجربہ۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

سینیئر مکینک۔ [ایک جگہ]۔[مستقل]۔
ڈپارٹمنٹ سول انجینئرنگ۔
شرح تنخواہ: ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰۔ ای۔بی۔ ۳۰۔ ۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:۔ الیکٹریکل/مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما۔اور ساتھ ہی ساتھ پانچ سال کا تجربہ۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

ٹکنیکل اسسٹنٹ (ریڈیو اینڈ ٹی۔وی) (ایک جگہ)۔
ڈپارٹمنٹ:۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ: ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای۔بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت: عموماً انجینئرنگ کی متعلقہ برانچ میں پوسٹ میٹرک ڈپلوما اور ساتھ ہی ساتھ دو سال کا مناسب تجربہ۔

یا

متعلقہ ٹریڈ میں ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں کسی انسٹی ٹیوٹ/ورکشاپ/مشہور فیکٹری میں کام کرنے کا سات سال کا تجربہ۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

ٹیکنیکل اسسٹنٹ۔ (آٹوموبائل اسٹورز) [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ: سینٹرل آٹوموبائل ورکشاپ۔
شرح تنخواہ: ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای۔بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت: آٹوموبائل انجینئرنگ/مکینکل انجینئرنگ [ترجیحاً آٹوموبائل انجینئرنگ میں] تین سالہ ڈپلوما اور

او ساتھ ہی ساتھ اس فیلڈ میں کم از کم دو سال کا تجربہ۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۷۔ کارڈیو تھوریسک ٹیکنیشن [ایک جگہ] [مستقل]۔
ڈپارٹمنٹ:۔ جے۔این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:
ا۔ لازمی۔ ۱۔ بی۔ ایس سی [بائیولوجی گروپ]
۲۔ نان انویزو کارڈیالوجی ایکوپمنٹ (ہولٹر، ٹریڈمل، ایکو) سے کام کرنے کا تجربہ۔

ii۔ پسندیدہ:۔ بیسک کمپیوٹر لینگویج کی جانکاری
صرف خواتین امیدوار ہی درخواست دے سکتی ہیں۔

نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔
وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۸/ ۸۶۔ ۸۷۔ مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ پہلی درخواست کے تحت امیدوار تصور کیے جائیں گے۔

۸۔ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ [ایک جگہ] [مستقل]
ڈپارٹمنٹ:۔ میڈیسن۔
شرح تنخواہ:۔ ۳۸۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت:۔
۱۔ لازمی۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ ہایر سکنڈری پاس کیا ہو۔
کسی میڈیکل کالج کی ای۔ ای۔ جی لیب میں کام کرنے کا سابقہ تجربہ ہو۔

۲۔ پسندیدہ: ای۔ ای۔ جی میں ٹریننگ/ ڈپلوما۔

نوٹ :۔ اہل امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۰/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۱۳ راگست ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو پہلی درخواست کی ہی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

غیر معمولی تجربے اور اعلیٰ استعداد کے حامل افراد کے لیے ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا اُن کو بطور ٹی اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے -/۵ روپے (برائے اسامی نمبر ا- تا - ۴) اور تین روپیے باقی ماندہ اسامیوں کے لیے نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اُسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذریعہ ڈاک ارسال کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ۲۳×۱۰ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ہوگا۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ

۲۰ر جنوری ۱۹۸۷ء

(آفس ٹائم تک) ہے

نامکمل اور تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی

رجسٹرار

878/2353

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۹/ ۸۶-۸۷
مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۶ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسرس
شرح تنخواہ: ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

۱	پروفیسر آف ہسٹری۔	ڈپارٹمنٹ: ہسٹری۔
۲	پروفیسر آف ایجوکیشن۔	ڈپارٹمنٹ: ایجوکیشن۔
۳۔	پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز۔	ڈپارٹمنٹ: اسلامک اسٹڈیز۔
۴۔	پروفیسر آف انگلش۔	ڈپارٹمنٹ: انگلش۔

قابلیت:

۱۔ لازمی: معروف اسکالر جس کی اعلیٰ معیاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس اور تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو اور ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔

یا

ایک مشہور و معروف اسکالر جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

۲۔ پسندیدہ: (اسامی نمبر ۲ پروفیسر آف ایجوکیشن کے لیے۔)
درج ذیل ایریاز میں سے کسی ایک میں امتیاز ہو۔ (صرف ایک جگہ کے لیے)

ایڈوانسڈ سائیکومیٹرکس، چائلڈ ڈیولپمنٹ، سائیکولوجی آف لرننگ، ایجوکیشنل ٹیکنالوجی فار سوشیالوجی آف ایجوکیشن

(اسامی نمبر ۳ پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز کے لیے)

عربی، یا فارسی یا ترکی کی اچھی جانکاری۔

نوٹ: اسامی نمبر ۴ پروفیسر آف انگلش کے لیے

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

ریڈرس

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

ریڈر ان انگلش	ڈپارٹمنٹ :	انگلش
ریڈر ان اسلامک اسٹڈیز	ڈپارٹمنٹ :	اسلامک اسٹڈیز
ریڈر ان اکونومکس	ڈپارٹمنٹ :	اکونومکس

قابلیت:

۱۔ لازمی: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام اور اس بات کا وافر ثبوت کہ امیدوار (i) ریسرچ یا (ii) انوویشن ان ٹیچنگ میتھڈ یا (iii) پروڈکشن آف ٹیچنگ میٹریل میں مصروف ہے۔

تدریس اور/ یا تحقیق کا تقریباً ۵ سال کا تجربہ جس میں سے کم از کم تین سال متعلقہ مضمون میں بحیثیت لکچرار یا اس کے مساوی پوزیشن پر کام کرنے کا ہو۔

اگر امیدوار تدریس/ تحقیق میں اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوئے تو اس صورت میں مندرجہ بالا شرائط میں نرمی کی جاسکتی ہے۔

نوٹ: اسامی نمبر ۵ ریڈر ان انگلش کے لیے

وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کی پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

اسامی نمبر ۶ ریڈر ان اسلامک اسٹڈیز کے لیے

عربی یا فارسی یا ترکی یا ملائی کی جانکاری

لکچررس

شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

لکچرر ان جیالوجی	ڈپارٹمنٹ :	جیالوجی ۔

۹ لکچرار ان فزکس ڈپارٹمنٹ ، فزکس سیکشن۔ ذاکر حسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

قابلیت ؛

ا۔ لازمی : ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام ؛ اور

ب۔ متعلقہ موضوع میں اچھے تعلیمی رکارڈ کے ساتھ (سیون پوائنٹ اسکیل میں C) متعلقہ مضمون ماسٹرس ڈگری یا غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی ترقیاتی پروگرام کے لیے مذکورہ بالا الف و ب کے متعلقہ موضوع میں ڈگری۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسز سے ظاہر ہے، یا اس کا مطبوعہ کام انتہائی اعلیٰ درجے کا ہے تو وہ [ب] کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورتِ دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار [اس صورت میں ایم۔فل ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو وزن دیا جائے گا] کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس کو کسی ریسرچ لیبارٹری میں یا آرگنائزیشن میں پریکٹیکل تجربہ ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے ۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

فیکلٹی آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

پروفیسرس

شرح تنخواہ : ۱۵۰۰- ۶۰ - ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰ - ۲/۱۲۵ - ۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

۱۰۔ پروفیسرس آف کیمیکل انجینرنگ / پیٹرولیم پروسسنگ

ڈپارٹمنٹ ؛ - انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اینڈ کیمیکل انجینرنگ

قابلیت ؛

ا۔ لازمی ۔ معروف اسکالر جس کی اعلیٰ معیاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیق میں مشغول ہو۔ دس سال کا تحقیق تدریس کا تجربہ ہو اور ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔

یا

ایسا غیر معمولی صلاحیت کا انجینر یا ٹکنالوجسٹ جو اپنے میدان میں شہرت رکھتا ہو اور جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔

۲۔ پسندیدہ: یونیورسٹی کے معیار کے کسی انسٹی ٹیوشن میں تدریس کا تجربہ ہو۔

خصوصی مہارت کے میدان

درج ذیل ایریاز میں سے کسی ایک یا زیادہ میں تخصیص۔

ٹرانسفر پروسیسز، ری ایکشن انجینرنگ، کیمیکل انجینرنگ، تھرموڈائنامک

کمپیوٹر ایڈڈ ڈائزائن اینڈ اوپٹیمائزیشن، پٹرولیم ریفائنگ، پیٹروکیمیکلس

نوٹ:۔ پٹرولیم ریفائننگ کی اچھی مہارت (صرف ایک جگہ کے لیے)

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۷/ ۸۶۔ ۸۷ مورخہ ۲۵ جون ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امید وار تصور کیا جائے گا۔

ریڈرس

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۴۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

ریڈر ان سول انجینرنگ۔	ڈپارٹمنٹ: سول انجینرنگ
ریڈر ان مکینیکل انجینرنگ۔ (کیسٹنگ)	ڈپارٹمنٹ: مکینکل انجینرنگ
ریڈر ان مکینکل انجینرنگ (فلوئیڈ مکینک)	ڈپارٹمنٹ: مکینکل انجینرنگ
ریڈرس ان کیمیکل انجینرنگ/ پٹیرولیم پروسسنگ	ڈپارٹمنٹ: انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اینڈ کیمیکل انجینرنگ
ریڈر ان مکینکل انجینرنگ، مکینکل انجینرنگ سیکشن	ڈپارٹمنٹ: یونیورسٹی پولی ٹیکنک
ریڈر ان الیکٹریکل انجینرنگ، الیکٹریکل انجینرنگ سیکشن۔	ڈپارٹمنٹ: یونیورسٹی پولی ٹیکنک
ریڈر ان الیکٹرونکس انجینرنگ برائے ٹی۔وی اینڈ ریڈیو ٹیکنالوجی	ڈپارٹمنٹ ویمنس پولی ٹیکنک۔
ریڈر ان الیکٹریکل انجینرنگ (انسٹرومینٹیشن)	ڈپارٹمنٹ: یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔

قابلیت:

۱۔ لازمی: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تقریباً پانچ سال کا درس وتدریس اور/ یا تحقیق اور ترقیاتی تجربہ۔

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ پی ایچ۔ڈی کی ڈگری نہیں ہے لیکن اعلیٰ معیار کا مطبوعہ تحقیقی کام ہے یا ڈیزائن/ڈیولپمنٹ میں کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں انتہائی اعلیٰ معیار کا ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو، اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں، جن میں نئی ایجادات/ تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۲۔ پسندیدہ: آسامی نمبر ۱۲ اور ۱۳ ریڈر ان مکینکل انجینرنگ کے لیے۔
مشہور و معروف رسائل میں مطبوعہ تحقیقی کام اور پوسٹ گریجویٹ کلاسنز کو پڑھانے کا تجربہ۔
اسامی نمبر ۱۴ ریڈر ان کیمیکل انجینرنگ کے لیے
خصوصی مہارت کا میدان
درج ذیل ایریاز میں سے کسی ایک یا زیادہ میں تخصیص۔
ٹرانسفر پروسیسز، ری ایکشن انجینرنگ کیمیکل انجینرنگ، تھرموڈائنامیکس، کمپیوٹر ایڈڈ ڈیزائن اینڈ اوپٹمائزیشن، پٹرولیم ریفائننگ، پیٹرو کیمیکل۔
نوٹ:۔ پٹرولیم ریفائننگ کی اچھی جانکاری (صرف ایک جگہ کے لیے)۔

۱۹۔ ریڈر ان کوسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ ڈپارٹمنٹ: ویمنس پولی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت: ٹیکسٹائل اینڈ کلاتھنگ میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی قابلیت اور ساتھ میں کسی پولی ٹیکنک / کالج / یونیورسٹی میں پروفیشنل، تدریس کا سات سال کا تجربہ
یا
ہوم سائنس کے ساتھ کم از کم سکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری ہو یا اس کے مساوی کوئی قابلیت اور ساتھ ساتھ کاسٹیوم ڈیزائننگ اینڈ ڈریس میکنگ میں فرسٹ کلاس میں ڈپلوما اور ساتھ میں کسی پولی ٹیکنک کالج / یونیورسٹی میں پروفیشنل / تدریس کا سات سال کا تجربہ
نوٹ: خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی اور ان کے تجربہ کی مدت میں ایک سال کی رعایت برتی جائے گی۔
نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۷ / ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کی پہلی درخواست کی بنا پر ان کو امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۲۰ ریڈر ان آرکٹیکچر ڈپارٹمنٹ: یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت: بی۔ آرچ اور ساتھ میں تدریس / تحقیق پروفیشنل ورک کا سات سال کا تجربہ۔
یا
ایم۔ آرچ
ایم۔ آرچ اور ساتھ میں تدریس / تحقیق پروفیشنل ورک کا پانچ سال کا تجربہ۔

لکچررس
شرح تنخواہ: ۷۰۰۔ ۴۰۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
۲۱۔ لکچرر ان ٹی۔ وی اینڈ ریڈیو ٹکنالوجی ڈپارٹمنٹ: ویمنس پولی ٹیکنک

ار ان سول انجینرنگ۔ سول انجینرنگ سیکشن "" ڈپارٹمنٹ، یونیورسٹی پولی ٹیکنک

بیت: ا۔ انجینرنگ / ٹیکنالوجی کے متعلقہ میدان میں ماسٹرز ڈگری۔

ب ۔ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ انجینرنگ / ٹیکنالوجی میں بیچلرز ڈگری ۔ بیچلرز ڈگری میں فرسٹ کلاس ہو اور / یا پھر ماسٹرز ڈگری ہو۔

ج ۔ تعلیمی / تحقیق ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ ورانہ تجربہ۔

- انجینرنگ اور ٹیکنالوجی کے موضوعات میں نامیاتی بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینرنگ اور ٹیکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے۔
- ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتے ہوں۔ یا ایسے امیدوار جو پیشہ وارانہ تجربہ کے حامل ہوں لیکن وہ تقرر کے لیے موزوں تصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تا وقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

اگر ایم ٹیک / ایم۔ای کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب خیال نہ کیے جائیں تو اس صورت میں لازمی تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ انجینرنگ گریجویٹ کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار تقرر کے پانچ سال کے اندر ایم۔ٹیک یا ایم۔ای کی سند حاصل کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا جب تک کہ وہ مذکورہ قابلیت کی شرط کو پورا نہ کر دے۔

لیکچرر ان کوسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ ڈپارٹمنٹ، ویمنس پولی ٹیکنک۔

قابلیت:

ا۔ لازمی: ٹیکسٹائل اینڈ کلاتھنگ میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری۔

یا

ہوم سائنس کے ساتھ کم از کم سکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری اور اس کے ساتھ کوسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ میں فرسٹ کلاس میں ڈپلوما۔

۲۔ پسندیدہ: دو سال کا پیشہ ورانہ / تدریس کا تجربہ

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۷/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۲۵ رجون ۸۶ء کے تحت درخواست

دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

فیکلٹی آف میڈیسن

پروفیسرس

شرح تنخواہ: ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

۲۴۔ پروفیسر آف اِسکن اینڈ وی۔ڈی — ڈپارٹمنٹ: میڈیسن۔

قابلیت: ایم۔ڈی (ڈرماٹولوجی اینڈ وینیریالوجی)

ایم۔ڈی (میڈیسن) ساتھ میں ڈی۔وی۔ڈی، ڈی۔ڈی۔

تدریس/تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں وینیریالوجی اینڈ ڈرماٹولوجی میں بحیثیت ریڈر چار سال کا تجربہ۔

۲۵ پروفیسر آف فارماکولوجی (عارضی) — ڈپارٹمنٹ: فارماکولوجی۔

قابلیت ایم۔ڈی (فارماکولوجی)/

ایم ڈی (فارماکولوجی اینڈ تھیراپیوٹکس)/

ایم بی بی ایس ساتھ میں ایم۔ایس سی۔ (فارماکولوجی)/

پی۔ایچ۔ڈی۔ (میڈیکل فارماکولوجی)/

ڈی۔ایس سی (میڈیکل فارماکولوجی)۔

تدریس/تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں فارماکولوجی میں ریڈر کی حیثیت سے چار سال کا تجربہ۔

ریڈرس

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

۲۶۔ ریڈر اِن نیوروسائکیٹری (ایک جگہ) — (چھٹی کی بناپر خالی جگہ)۔

ڈپارٹمنٹ: میڈیسن

قابلیت

ا۔ لازمی ہے۔ ایم۔ڈی (سائکیٹری)/

ایم۔ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/

ایم۔ڈی۔ اِن میڈیسن ساتھ میں سائیکالوجیکل میڈیسن میں ڈپلوما۔

تدریس / تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں نیورو سائکیٹری میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ:-

ریڈر ان آرتھوپیڈکس ڈپارٹمنٹ: آرتھوپیڈکس سرجری۔

قابلیت: ۱- لازمی: ایم ایس (آرتھوپیڈکس) / ایم سی ایچ (آرتھوپیڈکس)

تدریس / تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں آرتھوپیڈکس میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۲- پسندیدہ: i۔ تحقیق اور مطبوعات

ii۔ آرتھروسکوپی میں تجربہ۔

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۶/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۱۸ جون ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

نوٹ: ریڈرس کی تمام اسامیوں کے لیے

وہ حضرات جو ۱۹۸۲ء کی ریکمنڈیشن کے تحت پہلے سے بحیثیت لکچرر منتخب کیے جا چکے ہیں ان کا لکچرر اور رجسٹرار کی حیثیت سے تدریسی تجربہ شامل کیا جائے گا اور وہ ریڈر کی حیثیت سے منتخب کیے جانے کے لیے اہل تصور کیے جائیں گے۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو پر بلایا جائے گا ان کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی ۲) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے ۵/ روپے نقد ادا کر کے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کر کے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۴ × ۹ سینٹی میٹر کا اپنا پتہ لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ ارسال کر کے بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۲۹ جنوری ۱۹۸۷ء (آفس ٹائم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

نوٹ: موزوں امیدواروں کو آئندہ انتخاب کے لیے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

جاوید عثمانی

رجسٹرار

905/2526

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آیٹم ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۲۰ر جنوری ۱۹۸۷ء دوپہر ایک بجے تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی روز ساڑھے تین بجے شام کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر کام کے روز دفتر کے اوقات میں یونیورسٹی انجینئر کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈر وصولیابی کی مقررہ آخری تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زرِ ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی
۱	بھولا میں واقع اے۔ ایم یو اسٹینیل اسٹاف کوارٹرس کی سڑکوں کی تعمیر	۷۱،۸۹۰-۰۰ روپے	۱۸۰۰-۰۰ روپے	۵-۰۰ روپے	چار

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر

یونیورسٹی انجینئر

(896/2365)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - پرنٹر و پبلشر: اسرار احمد - مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق، ... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پریس: ایس کے آفسیٹ پریس، دہلی۔

بانی : سرسید احمد خاں

MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد-٦ فروری ۱۹۸۷ء شمارہ-۲

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر — کبیر احمد جائسی
اسسٹنٹ ایڈیٹر — شباب الدین

تزئین ——— سرفراز

انچارج سرکولیشن ——— مستقیم احمد خاں

زرِ سالانہ : انڈیا ... Rs. 30·00
بیرونی ممالک ... US $ 20·00 ہوائی ڈاک
US $ 8·00 عام ڈاک
اس شمارے کی قیمت : تین روپیہ

ایڈیٹر
ترسیلِ زر کا پتہ : تہذیب الاخلاق اینڈ لشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مقالہ نگاروں کے لیے

* تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابلِ قبول ہوں گے۔
* عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔
* ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
* مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
* مسودہ بڑے سائز (20cm × 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔
* مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انھیں لگانا ہو۔
* اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھی ہو۔

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ: ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ لشانت،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔

○ دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ سالانہ اگلے ماہ ختم ہو رہا ہے یہ شمارہ ملتے ہی اپنا زرِ سالانہ ارسال کریں۔

مندرجات

اداریہ

آج کی نشست میں پروفیسر عبدالسلام کی ایک انگریزی تقریر کے ایک اقتباس کا آزاد اردو ترجمہ سنیے۔

" یاد کیجیے۔ آج سے تین سو سال قبل لگ بھگ ۱۶۶۰ء میں جدید عالمی تاریخ کی دو عظیم یادگاریں قایم ہوئیں۔ ایک مغرب میں ـــــ لندن کا سینٹ پال چرچ۔ دوسری مشرق میں ـــــ آگرہ کا تاج محل۔ بیان کی ضرورت نہیں یہ دونوں یادگاریں بذاتِ خود اس بات کا مجسم اظہار ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں ان دو میں سے کون سی تہذیب فنِ تعمیرات، کاریگری، دستکاری، صناعی اور ثروت کی کس منزل میں تھی۔ البتہ لگ بھگ اسی زمانے میں ایک تیسری یادگار بھی وجود میں آئی۔ جس کے بعد کے اثرات زیادہ گہرے اور دور رس ثابت ہوئے۔ یہ نیوٹن کی طبعیات کے موضوع پر شہرہ آفاق تخلیق پرنسپیا (Principia) ہے۔ مغرب کے اس شاہکار کے ہم پلّہ مغل ہندوستان میں کچھ بھی نہ تھا۔ اب میں آپ کو مختصراً بتاؤں گا کہ نادر المثال تاج محل دینے والی ٹیکنالوجی پر، نیوٹن کی پرنسپیا پر قایم ٹیکنالوجی سے ٹکرانے کے بعد کیا بیتی۔

اِس ٹکراؤ کا پہلا دھماکہ ۱۷۵۷ء میں ہوا۔ شاہ جہاں کے تاج محل کی تعمیر کے تقریباً سو سال بعد رابرٹ کلائیو کے ہلکے پھلکے اسلحہ جات کی بہتر کارکردگی نے شاہجہاں کے وارثوں کو شرمناک شکست دی اور اس کے مزید سو سال بعد ہندوستانی شہنشاہ کا شاندار تاج ملکہ وکٹوریہ کے قدموں پر تھا۔ آہ ! یہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ نہ تھا، بلکہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک طرزِ معاشرت اور ایک ٹیکنالوجی کی موت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی اسٹیٹ کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہو گئی۔ مشرق کے شیریں نغموں کو اسکولوں کے نصاب سے نکال کر ان کی جگہ شیکسپیر اور ملٹن کی ادبیات کو لایا گیا۔ مشرق کے علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق سے اُڑا دیا گیا اور ڈھاکہ کے ململ کے خاکستر پہ لنکاشایر کی سوتی پرنٹوں کا محل تعمیر ہوا۔"

اس اقتباس کی روشنی میں انصاف سے بتایئے کہ کیا ہمارا وہ طبقہ جو آج بھی سائنسی تعلیم کو غیر ضروری سمجھتا ہے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کی ترویج و اشاعت کی راہ میں حائل ہے، قوم و ملک کے تئیں ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کر رہا ہے؟

اسرار احمد

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ——

اندھیرا چھٹے ... جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کا

اجالا پھیلے ... مذہب، اخلاق اور تعلیم کے زیادہ ہمہ گیر تصورات کا

احیاء ہو ... دانشوری، مربوط فکری اور سائنس مزاجی کا

اشاعت ہو ... عام فہم زبان میں سائنسی علوم و فنون کی

ترقی ہو ... تعلیم کے میدان میں ملک بالخصوص پسماندہ مسلم اقلیت کی

قربت بڑھے ... ملک کے مختلف مذہبی فرقوں اور اردو ہندی زبانوں میں

—— تو ——

مسیحائے قوم سر سیدؒ کے جاری کردہ رسالے

تہذیب الاخلاق اور اس کے ہندی روپ نشانت

کے فروغ میں ہماری مدد کیجیے۔ جو آج جناب سید ہاشم علی (وائس چانسلر) کے زیر سرپرستی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

* خود خریدار بنئے اور اپنے احباب کو خریدار بنائیے۔
* اپنے قرب و جوار کے تعلیمی اداروں کو خریدار بننے کی ترغیب دیجیے۔
* بطور عطیہ چندے کی رقوم بھیجیے جس سے ہم غریب تعلیمی اداروں کو خریدار بنائیں۔

زر سالانہ : Rs. 30·00

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

سید احمد خاںؒ

ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں، جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا
دنیادار اور رند مشرب آدمی، جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں، اس
یادہ اپنے تئیں بد بتلاتے ہیں۔ دین داری کی بناوٹ کرنے والے
قدر کہ ہوتے ہیں، اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں۔
دین داری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں؛ اور دن رات
، تماش بینی اور ریچھ پنے کی باتوں کی، جن کو دراصل انھوں نے
ی نہیں، گپیں اڑاتے ہیں؛ اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور
ں کو ایک ظاہری دین داری کے پردے میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی
ل شکار کھیلتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں،
یک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں،
انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بناوٹ
، اور ہی عجب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب
یں دیتے۔ بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکے میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود
سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک
اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں
یال ہی نہیں کرتے یا اُن بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے
ت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے، اور اس طرح پر
ی مناجات کی ہے:

"کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے؛ تو ہی مجھ کو میرے
پوشیدہ عیبوں سے پاک کر۔"

جو لوگ ملانہ بدی کرتے ہیں، اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے
بچانے کے لیے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ، جو درحقیقت موت کی راہ
چلتے ہیں، اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستہ پر سمجھتے ہیں، کسی قدر علم
کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں! ہاں میں چند قاعدے
بیان کرنا چاہتا ہوں، جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوئی
ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان خود اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں
جان سکتا، معلوم ہو سکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اُن
مذہبی اصولوں سے جو ہماری ہدایت کے لیے مقدس کتاب اللہ میں
لکھے ہیں، جانچیں؛ اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے
مقابلہ کریں، جس کی زندگی ہماری زندگی کے لیے نمونہ ہے — "
اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے"، بلکہ تمام دنیا کے لیے بڑا
ہادی، اور بہت بڑا دانا استاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی
بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس
میں اختلاف رائے ہوتا ہے، جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا؛ اور کچھ زمانے کے
گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت اُن واقعات کی جو گزرے معلوم نہیں
ہو سکتی۔ اس لیے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان
کرنے پر میں اکتفا نہیں کرتا؛ بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان
کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس
بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل
کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں، یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے
اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان

دچھپاتے ہیں، یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم اُن کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے، دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈھ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے، مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا!

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو۔ اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیئے کہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا، تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیئے تھا۔

دشمن جو عیب غلط یا صحیح ہم میں نکالتا ہے، ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں؛ اور اگر نہیں ہوتا، تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ

"دشمن از دوست ناصح تراست؛ ایں جز نکوئی نہ
گوید، وآں جز بدی نجوید۔"

'پلوٹارک' کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے، اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے کہ،

"دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں، اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں؛ اور ہماری گفتگو میں، اور ہمارے چال چلن میں، اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں؛ وہ بغیر ایسے دشمنی کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔"

علی ہذا القیاس، اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں، ان میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں؛ اور پھر یہ سوچنا چاہیے کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں، وہ کام ہم درحقیقت اللہ نیک دلی سے دنیا کو فائدہ پہونچانے کے لیے کرتے ہیں یا نہیں؛ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ نیکیاں، جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں، دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔

ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضرور ہے کیوں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کر اپنے تئیں بہت بڑا سمجھنے لگتے ہیں، اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں؛ اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے، اس کے مقابلے میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی، جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے، مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے، زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان لوگوں کی رایوں کو بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیئے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں؛ اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں، اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اس نیک دلی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے، اختلاف کیا ہے۔ یا کسی بیرونی دباؤ، یا پابندی رسم و رواج، اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے؛ کیوں کہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو، تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکا کھانے کا احتمال ہے، وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیے۔ حد سے زیادہ سرگرمی، اور تعصب، اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو برا اور حقیر سمجھنا، یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فی نفسہٖ نہایت ہی بری ہیں۔ گو وہ ہم سے کم زور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہوں؛ مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ایسے لوگ کا دنیا میں ہیں جو دین داری اور نیکی کے لئے نہایت مشہور رہے مگر نہایت لغو اور خراب شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دل میں اس کی جڑ گاڑ دیتے ہیں۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوا

آج تک کوئی ایسا عقل مند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا،
ںپوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی وہ گناہ سے
ہے۔

اس طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیے، جو انسان
ور دل کی قدرتی بناوٹ سے، یا کسی خاص شوق سے، یا
اص تعلیم کے اثر سے، یا کسی اور سبب سے ہوتے ہیں جس میں
دُنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت
سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے، اور اس کا دل غلطی
ت مائل ہو جاتا ہے؛ اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے
ب، اور ہزاروں غلطیاں، اور پوشیدہ برائیاں، اور
دم عیب، انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں۔ جس کام کے کرنے
ل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو، اس کے کرنے میں
ند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا، اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہیئے، کہ
اس میں کوئی نہ کوئی بُرائی چھپی ہوئی ہوگی۔

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا، اور اپنے
و ٹٹولنا، اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا، ہمارے لئے
ے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی

[illegible] بننی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔
جس دن کہ ہمارے دل کے بھیدوں کا جاننے والا ہمارے دل کو
جانچے گا، جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں، تو ان اصولوں
پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔

ہمارے بانیٔ اسلامؐ نے، جب ہم کو یہ سکھلایا ہے
کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا
ہے، تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی
ہم کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکا دیتا ہے اور خود اپنے آپ
کو بھی فریب میں ڈالتا ہے۔

داؤدؑ نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو،
جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہایت دلچسپ
لفظوں میں ادا کیا ہے، جہاں اس نے کہا ہے کہ "اے خدا! مجھ کو جانچ
میرے دل کی تہہ کو ڈھونڈ! میرے خیالوں کو دیکھ! مجھ کو ٹٹول!
مجھ کو بخوبی پرکھ! کہ مجھ میں کس برائی نے راہ کی ہے، اور مجھ کو
ایسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ
کو قائم رہے۔"

برائی کو ختم کرنا ہے تو بھلائی کا آغاز کر دیجیے۔ آپ کو لوگوں
کی طرف سے بدسلوکی کا تجربہ ہو تو آپ ان کے ساتھ حسن سلوک
کے ساتھ پیش آیئے۔ لوگ ظالم بنے ہوئے ہوں تو آپ انصاف کرنا
شروع کر دیجیے، لوگ آپ کے ساتھ امتیاز برت رہے ہوں
تو اس پر صبر کر کے اپنی کمیوں کی تلافیوں میں لگ جایئے۔ لوگ آپ
کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں تو آپ ان کو نظر انداز
کر کے اپنے اصل کام میں معروف ہو جایئے۔ یہی کسی مسئلے کو حل
کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں وہ مسئلے کو
الجھانے والے ہیں نہ کہ مسئلے کو حل کرنے والے۔

[مولانا وحید الدین خاں]

سید حامد

کینچلی

موت کی تیاری لوگ طرح طرح سے کرتے ہیں، بعض تیاری بغیر ہی چلے جاتے ہیں۔ بعض افراد زندگی سے اس قدر اکتا جاتے ہیں کہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ عجیب فعل ہے، کامیاب ہوگیا تو کوئی جرم نہیں بنتا، ناکام ہوا تو تعزیرات ہند کا ہدف بن گیا۔ دوسرے جرائم ناکامی پر ہلکے ہو جاتے ہیں اور سزا میں بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔ خودکشی میں صورتِ حالات اس کی الٹی ہے، چوں کہ خودکشی بذات خود جرم نہیں ہے۔ اس لیے اقدامِ خودکشی پر جو سزا ملتی ہے وہ ناکامیابی کی سزا ہے۔ قانون اس بات پر چیں بہ جبیں ہوا کہ اس شخص میں خودکشی کرنے کا سلیقہ نہ تھا' اس نے بھونڈا اور بے اثر طریقہ اختیار کیا اپنی زندگی سے جدا ہونے کا۔ بھونڈے پن کی سزا ملنی چاہیے۔

ہمارے قانون کی ٹھنڈی منطق پر غور کیجیے۔ ایک شخص مصیبتوں کا مارا ہوا' زندگی کا ستایا ہوا' چاہتا ہے کہ موت کے دامن میں جا کر پناہ لے۔ ایک طرف تو اس کی کوشش ناکامیاب ہوئی اور جن مصیبتوں سے وہ بھاگا تھا، انھوں نے اسے پھر دبوچ لیا؛ دوسری طرف اس پر مجرم کا ٹھپّہ بھی لگ گیا اور پولس اور عدالت نے چکّی کے دو پاٹوں کی طرح اسے پیس دیا۔ یہ کون سا انصاف ہے؟ جبھی تو لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ قانون اندھا ہے؛ اسے مرے پر سو دُرّے لگانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ سزا اور جزا میں امتیاز کرنا کبھی کبھی اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

موت سے لوگ ڈرتے ہیں؛ کسی نے کہا ہے یہ اسی قسم کا ڈر ہے جو اکیلا آدمی گھپ اندھیرے میں محسوس کرتا ہے۔ معلوم نہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ کہاں جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا ملے گا بھی کہ نہیں۔ [...] کا کیا حشر ہوگا۔ کیا رات دن بھٹکتی رہے گی، یا زندگی کے وسوسوں [...] خرخشوں سے نجات پا کر مطمئن اور مسرور ہوگی۔ اور کچھ لوگ اس [...] سے دہشت زدہ ہوتے ہیں کہ جسم جس کے ذریعے وہ خود کو پہچانتے [...] اور جس کے توسط سے وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ جسم سڑ جا[ئے گا] کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائے گا یا چیل کوّے اسے کھا جائیں [...] یا ایک حصّہ آگ کی لپٹ میں دھواں بن کر اڑ جائے گا اور دو[سرا] راکھ کے ڈھیر کی شکل اختیار کرے گا۔

زیادہ تر لوگ اس خیال سے خائف رہتے ہیں کہ جانکنی [کی] تکلیف برداشت نہ ہو پائے گی، نزع کی صعوبت جان لے لے گی۔ ایک پل میں خاتمہ ہو جاتا تو اچھا تھا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ ک[ر جان] دینا' یہ ہفت خواں کیسے طے ہوگا۔ ایسا لگے گا کہ دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں' پسینے چھوٹنے لگیں گے۔

جن لوگوں نے مردم آزاری بہت کی ہے، لوگوں کو ست[ایا] ہے، ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے، ظلم کیا ہے، لوگوں کا حق مار[ا ہے] غریبوں اور سائلوں اور غرض مندوں کو دھتکارا ہے' بزرگوں [کے] ساتھ گستاخی کی ہے، محسنوں کو آنکھیں دکھائی ہیں، فریب، ریا[کاری] اور حرص و حسد کو شعار بنایا ہے، انھیں موت سے زیادہ ڈر ل[گتا ہے] وہ سمجھتے ہیں یہ ساری خود غرضیاں، دل آزاریاں، حرص و فریب کو سانپ کی طرح ڈسیں گے؛ زہر رگ و پے میں سرایت کر جا[ئے گا] معلوم ہوگا جسم پھٹا جا رہا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا ہے،

ال جس وقت پیش ہوگا وہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔ وہ
ہیں کہ انہیں تلافی مافات کا موقع مل جائے۔ وہ اپنی جفاؤں کو
ں سے معاف کرا لیں، گناہوں سے توبہ کر لیں اور پاک صاف
گزار لیں، اول تو ہماری زندگی کی بناوٹ ایسی ہے کہ موقع ملتا
ں۔ جو گھڑی ایک بار آ کے گئی وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ زندگی
سفر جانیے تو ایک اسٹیشن جیسے گاڑی چھوڑ چکی ہے، دوڑ کر گاڑی
پکڑ سکتا۔ یہی حال مواقع کا ہے۔ ایک بار ایک موقع ہاتھ سے
ر ہاتھ نہیں آئے گا چاہے زندگی بھر حسرت میں ہاتھ ملتے رہیے۔
ر کسی کو مہلت مل گئی تو وہ اپنے دیرینہ مشاغل میں لگ جاتا ہے
ے اور تلافی کا خیال بھی اس کے دامن دل کو نہیں چھوتا۔ اسی لیے
ں تو بہ معتبر نہیں ہوگی جو اس وقت کی جائے جب انسان زندگی
بدا ہو رہا ہے۔ اس توبہ کا وزن ہی کیا جو مجاہدہ اور ضبط کی
وہیں نہ تولی جا سکے، جسے کڑی آزمائش سے گزرنا نہ پڑے۔

اس سے بھی کچھ زیادہ بے بسی وہ لوگ محسوس کرتے ہیں جو
ہ خاندان کے تئیں ذمہ داریاں پوری نہیں کر پائے ہیں۔ بیوی پر
پہاڑ ٹوٹ پڑے گا، اسکا سب کچھ لٹ جائے گا۔ ننھے ننھے بچوں
یا ہوگا۔ بہنیں جن کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں، کیا کریں گی، بوڑھی
جو بیٹھی ہوئی ہے اُسے کون دیکھے گا۔

جن لوگوں نے ظلم ڈھائے ہیں، وہ ڈرتے ہیں کہ مظلوم ان کا
کریں گے، اُن سے بھاگ کر وہ کہاں جائیں گے۔ وہ ہانپتے ہوئے
ک کر گر جائیں گے اور جانے والے کل کے مظلوم آنے والے کل کے دن
روں کی طرح انہیں پھاڑ کھائیں گے۔ ضمیر زندگی بھر موقع پا کر انہیں
وٹتا رہا۔ ضمیر کی ساری خلشیں مجسم اور مہیب ہو کر ان کی تکا بوٹی
یں گی۔

وہ لوگ جن کے سارے معاملات پھیلے ہوئے اور حسابات بکھرے
ے رہتے ہیں جو عادتاً ہر کام کو آخری وقت کے لیے اُٹھا رکھتے
۔ انہیں نہ موت کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے نہ اس کی عقوبت سے
تکلیف وہ خیال انہیں کھائے جاتا ہے کہ موت ایک روز اچانک
ئے گی اور انہیں حساب کو سمیٹنے اور لبادہ کو جھٹکنے کا موقع ہی نہیں

ہے۔ ان کا حال کچھ اس طالب علم کا سا ہوگا جسے امتحان میں پانچ سوالوں
کا جواب دینا ہے اور میں نے تین جو تہائی سے زیادہ وقت پہلے سوال
کی نذر کر دیا ہے۔ جو تہائی وقت میں چار سوال کیسے کیے جائیں گے؟
گھبراہٹ سی گھبراہٹ پریشانی سی پریشانی۔

پھر وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے آخری ایام میں اپنی غلطیوں
سے دوسروں کو عبرت پہنچانا چاہتے ہیں۔

ہمہ کارم بہ شد بہ نادانی۔ من نہ کردم شما حذر بکنید

میرا کام تو نادانی میں تمام ہو گیا۔ میں غلطیوں سے بچ نہ سکا
تم اُن سے پرہیز کرنا"

آپ ہی سوچیے اس پندِ لبِ بام سے کیا حاصل۔ پرہیز جب
آپ نہیں کر سکے تو ہمیں کیا سکھاتے ہیں۔ خود پرہیز کیا ہوتا تو ہم دیکھ کے
آپ کے نقشِ قدم پر چلتے۔ "میں نے غلطی کی تم نہ کرنا۔" کیا خوب گویا
غلطی کرنے کا حق صرف آپ ہی کو تھا، میں تو زندگی بھر کھیلا کیا، لیکن
تم کھیل کے میدان میں قدم نہ رکھنا۔" یہ بھی کوئی بات ہوئی؟
مرنے والا خطرے کی گھنٹی بجائے گا تو کون سنے گا۔ سب یہ سمجھیں
گے کہ یہ اس خطرے سے خوف زدہ ہے جو اسے درپیش ہے۔ جو خود
ڈوب رہا ہو وہ آئندہ ڈوبنے والوں کو کیسے بچائے گا؟ کیا یہ کہہ
کر کہ زنہار پانی کے قریب نہ آنا؟ آخر کیوں نہ آئیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ
مرنے والے سے لوگ سلامتیِ ہوش و حواس منسوب نہیں کرتے۔ شاعر نے
کہا بھی ہے کہ ہم نے ہوش و حواس اور تاب و تواں آگے بھیج دیے ہیں
یہ ساز و سامان چلا گیا اب ہم بھی جاتے ہیں۔ تاکہ جب نئے گھر میں پہنچیں تو
وہاں ضرورت کا سارا سامان ہمیں سجا ہوا پہلے سے مل جائے۔ یہ دستور
تھا اس وقت جب حکام ضلع دورہ کیا کرتے تھے۔ اب تو دھیاً چھو کر
چلے آتے ہیں کہ صدر مقام میں بہت اہم لوگوں کا نزول اجلال ہوتا رہتا ہے
وزیرانِ باتدبیر نہ خود عوام کے قریب آتے ہیں نہ افسران کو آنے دیتے ہیں۔
دستور یہ تھا کہ پہلے پڑاؤ پر پہنچتے ہی دوسرے پڑاؤ کا سامان کیا جاتا تھا
ایک خیمہ اور اس کے لوازمات اگلے پڑاؤ کے لیے روانہ کر دیے جاتے تھے
تاکہ جب پہلے پڑاؤ سے کوچ کر کے آپ وہاں پہنچیں تو کوئی تکلیف نہ ہو،
اِدھر اُدھر بھٹکنا اور انتظار کرنا نہ پڑے۔

شعراء کرایک جبلی حس رکھتے ہیں اس دنیا کو ایک پڑاؤ کہتے چلے آئے ہیں
انسان اپنے طویل سفر میں یہاں ستانے کے لیے رُکتا ہے اور دم لے کر
آگے بڑھتا ہے۔ پڑاؤ کو جو نادان منزل سمجھ بیٹھیں ان کا خدا حافظ ہے۔ کتنے
ہی ہم میں سے جو اس زندگی کو منزل اور منتہا نہیں سمجھتے؟

لیکن مرنے والے کی اور باتیں، خصوصاً پند و نصیحت، آگاہی
اور عبرت، انتباہ اور حسرت کی دوسری باتیں، لوگ سنیں یا نہ سنیں،
دو باتیں ضرور کان لگا کر سنتے ہیں۔ پہلی بات عزیز و اقارب اور امیدوار
سنتے ہیں، دوسری بات پولیس اور عدالت۔ میرا روئے سخن ترتیب کے
ساتھ "وصیت اور بیان قبل از موت" (ڈائنگ ڈیکلریشن) کی طرف
ہے۔ وصیت کا نفع براہ راست امیدوار عزیزوں کو پہنچتا ہے (یا کبھی
کبھی نہیں پہنچتا)۔ دوسرے مذکورہ بیان کا فائدہ پولیس والوں (اور
نقصان بعض اوقات، انصاف) کو پہنچتا ہے۔ جس وقت سلامتی ہوش و
حواس بالعموم مشتبہ ہوتی ہے، عین اسی وقت بہ سلامتی ہوش و حواس بیان
دینے والے (اظہار کنندہ) سے منسوب اور اس کے بارے میں قلمبند
کی جاتی ہے۔ قانون یہ تصور کرتا ہے کہ جو شخص دنیا کو چھوڑ رہا ہے اور
زندگی کے علایق کو توڑ رہا ہے، جسے جلد ہی اپنے اعمال کا دفتر اپنے پیدا کرنے
والے کے سامنے پیش کرنا ہے، جو وابستگی اور دشمنی کی گرد سے دامن
جھاڑ کر پرواز کے لیے پر تول رہا ہے، وہ جھوٹا بیان نہیں دے گا۔ سچی
سچی، کھری کھری بات کہہ دے گا۔ اسے اب کیا لینا دینا ہے۔

موت سکون کے ساتھ بھی آتی ہے اور تکلیف کے ساتھ بھی،
جانگداز تکلیف کے ساتھ۔ کچھ لوگ عارضی نیند کو دائمی نیند میں بدل دیتے
ہیں۔ سوتے سوتے اٹھائے جاتے ہیں۔ بعض گھنٹوں، بعض ہفتوں جانکنی کے
عالم میں رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور کس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ ہی
جانے۔ شاید یہاں نیک و بد کی تفریق بھی نہیں ہوتی۔

موت کو طول دینا یا مختصر کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے لیکن
موت کے بعد جسم پر جو گذرتی ہے، اس کو انسان اکثر خواہ مخواہ طول دے
دیتے ہیں اور جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے (عرف عام میں)، اتنا ہی زیادہ طول
'پس از مرگ واویلا' کو دیا جاتا ہے۔ مرنے والے کو تماشا بنا دیتے ہیں۔
لوگ درشن یا زیارت کے لیے جوق در جوق آتے ہیں اور جس شخص کی زندہ و

تابندہ شخصیت کے نقوش ان کے ذہن میں ہیں، اس شخص کی بگڑی ہوئی
بے جان شکل، بے نور چہرے اور پوپلے منہ اور لاچاری کی نگاہو
میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہے کہ پہلے نقوش سب دھل جاتے ہیں۔
پوچھے کہ پہلے تاثرات کو بگاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوچے میں کسی کی نع
کو کھینچے پھرنے سے کیا حاصل؟ اگر مقصد یہ ہو تا کہ انسان دنیا کی ز
اور اس کے اقتدار کی بے ثباتی سے آشنا ہو جائے، تو بھی کوئی بات ہو
عبرت کے لیے پہلے سولی پر چڑھا کر پیڑ پر لٹکا دیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں مقص
ہے۔ مرنے والے کی عظمت کا اعتراف اور اسے خراج ادا کرنا لیکن تاث
کے برعکس ہوتا ہے۔ میں نے ایک بہت بڑے آدمی کو جو خوبرو، جا
خوش قطع اور عہد آفریں تھا۔ آخری سفر پر جاتے ہوئے دیکھا۔ قبر میں کھ
والی بات بھی تو نہیں تھی۔ کس قدر حقیر، کتنا بدنما، کیسا لاچار، کتنا عبرت خی
اس جلیل جلیل، اس پیکر جمیل کا تصور کرتا ہوں تو وہ آخری تاثر پہلے تا
گڈمڈ ہو جاتا ہے اور لطف کو کرکرا کر دیتا ہے۔ ایک اور بزرگ کے
سفر کا مشاہدہ کیا۔ میت دلی سے لکھنؤ کی طرف جا رہی تھی۔ برف کی س
پر رکھی ہوئی۔ بے جان جسم آماسیدہ لگتا تھا، پھولا ہوا تھا، دلی میں تج
تکفین و تدفین کر دیتے تو کیا جاتا۔ یہ ایک ایسے شخص کی نعش تھی جس کی ذہانت
پیش قدمی اور ابتکار کی دنیا قایل تھی۔ اس کی لاچاری اور اس کے
بے روح کو مشتہر کرنے سے کیا ملا؟ یہی نا کہ گھر جا کر دفن ہوئے۔ گھر
کیا مختلف ہوتی ہے۔ انسان خاک سے اٹھتا ہے اور اسی میں جاملت
انسانوں کو خانوں میں بانٹ کر کیا مل گیا، جو خاک کے خانوں میں بانٹ
ہیں؟ یہ دونوں بزرگ اگر کسی طرح زندہ ہو کر ایک عام آدمی کی
اپنی میت کے جلوس کو دیکھ سکتے تو سر پیٹ لیتے اور آخری رسوم ادا ک
والوں کی خیر نہ ہوتی۔

خول کے اندر جو کچھ تھا وہ تو پرواز کر گیا۔ خول میں اب کیا رہا ہے
اس کی نمایش کیوں کرتے ہو؟ مٹی کے قالب کی شیرازہ بندی روح
کی تھی، اسے قد و قامت اور خد و خال دیے تھے، اس بے جان ڈھا
اسے حرکت سے آراستہ کیا تھا۔ اس کی نس نس میں شادابی کی لہریں دوڑ
تھیں۔ روح رخصت ہو گئی۔ اب مٹی کے اس قالب میں کیا رہا۔ سڑا دآ
[illegible]

بلی جاتی ہے جو ظرف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ظروف نکال لیے جاتے
نچے مٹی کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اس مٹی کے
تش کوئی آخر کیوں کرے؟

زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ پیکر بناتی ہے اور انھیں
ے۔ روح ایک ایسی شمشیر ہے جس کے لیے بقول اقبال جسم کی نیام
ان کا کام کرتی ہے۔ شاہ آرتھر کی تو تلوار ہی سمندر میں ڈال دی گئی
نیام کو لے کر گھومتے ہیں۔ چڑیا اُڑ گئی، اور پنجرے کی نمائش ہو رہی ہے
دمکتا ہوا، خوش خرام، خاموش، تیز رو، لچکدار، سانچے میں ڈھلا ہوا
ن سانپ، کینچلی اُتار کر آگے بڑھ گیا۔ ہم ملگجی کینچلی کو سینے سے لگائے
بیٹھ رہے ہیں کہ سانپ یہی ہے۔ کینچلی اتار پھینکنے میں سانپ کو اس قدر
نہیں ہوتی جتنی ہمیں کپڑے اتارنے میں ہوتی ہے۔ روح کا بھی یہی عالم
ی جب چاہتی ہے جسم کو کینچلی کی طرح اُتار دیتی ہے۔ انگریزی میں کینچلی
ر ایک حرف (پری پوزیشن) جوڑ دیتے ہیں۔ پیچے جو لفظ ابھی اسم
بن گیا۔ انگریزی زبان کی توانائی کا ایک راز یہ ہے کہ اس میں اسم
اسم ہوتا ہے، فعل بہ آسانی بنا لیا جاتا ہے اور اس طرح ایک جامد
حرکت میں آجاتا ہے، سیارہ بن جاتا ہے۔ کینچلی اُتار دینے سے
لیا جاتا ہے کسی شے، وصف یا عادت کو خیرباد کہہ دینا۔ روح
ہتی ہے جسم کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔

اور وہ لوگ جو خوش قسمت ہیں جو ایسا سوچنے اور سمجھنے پر قادر
یں موت سے گھبراہٹ نہیں ہوتی، ڈر نہیں لگتا۔ جس طرح دیہات کی
ند اور جفاکش اور متحرک عورتوں کے لیے ولادت (وضع حمل) کا عمل
مولی اور طبعی ہوتا ہے۔ اسی طرح ان انسانوں کے لیے جنھوں نے سادگی
فاکشی اور ہمدردی کے ساتھ زندگی گزاری ہے موت کا عمل سہل اور
ہے۔ نہ اندیشے نہ وساوس نہ الجھنیں، نہ خوف، نہ گھبراہٹ۔ انگریزی
رے بریڈبری Ray bradbary نے اپنی دادی اماں
ی گروہ کے ساتھ کیا ہے۔ بڑی بی کے ہاتھ میں ایک نہ ایک چیز ضرور ہوتی تھی
الو یا کونا اٹھانے کی لکڑی یا پوچھا کرنے والا کپڑا یا ڈوئی۔ وہ ہر وقت
ھر جاتی ہوئی نہیں تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ انھیں کبھی کسی نے خالی ہاتھ
م کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مکان کا ہر گوشہ ان کی ہمہ گیر گرفت میں تھا۔

انھوں نے بے شمار کام انجام دیے تھے۔ اب آخری بستر اپنی جگہ پر لگنے والا تھا
ایک شام انھوں نے تین زینے طے کیے اور تیسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔
بستر پر دراز ہو گئیں اور ٹھنڈی سفید چادر تان لی۔ ایک اور آخری کام باقی
تھا۔ مرنا۔ انتہائی دلجمعی، باقاعدگی اور ذوق کے ساتھ انھوں نے یہ کام بھی
کیا۔ سارے رشتہ دار جمع ہو گئے: "دادی اماں چلی گئیں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔
وہ بغیر نوٹس دیے جا رہی ہیں"۔

"تم رو کیوں رہے ہو؟" بڑی بی بولیں: "وہ آدمی احمق ہے جو اپنے کٹے
ہوئے ناخن بچا کر رکھتا ہے۔ کبھی تم نے کسی سانپ کو دیکھا کہ اس نے اپنی اُتری ہوئی
کینچلی کی طرف مڑ کر بھی دیکھا ہو۔ آج اس بستر میں تم کیا دیکھ رہے ہو۔ کٹے ہوئے ناخن
اور اُتری ہوئی کینچلی۔ ایک گہری سانس لے کر میں برف کے ٹکڑوں کی طرح پگھل جاؤں گی
میں مر کہاں رہی ہوں؟ جس کے بچے زندہ ہوں کہیں وہ مرتا ہے؟... میرے بارے
میں اچھی اچھی باتیں کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے زندگی کا بھرپور لطف اُٹھایا
کھانے کی کون سی شے ہے جو میں نے مزے لے کر نہیں کھائی۔ زندگی کا کون سا
رقص ہے جو میں نہیں ناچی۔ ایک چاشنی باقی تھی جو میں نے ابھی تک نہیں چکھی تھی ایک
راگ میں نے ابھی تک نہیں گنگنایا تھا۔ میں دیکھوں تو وہ چاشنی کیسی ہے؟ اس
نغمہ کی دھن میں بھی تو الاپوں۔ تم سب لوگ اب جاؤ۔ مجھے سو جانے دو۔" وہ
اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی جو وہ نوّے سال پہلے دیکھ رہی تھی کہ
اچانک کسی نے اسے جگا دیا تھا۔ وہ اس کی پیدائش کا دن تھا۔ "میں اس
خواب کو پھر جوڑوں گی۔" اور نوّے سال کا یہ وقفہ جسے دنیا زندگی کہتی
ہے، راستے سے ہٹ گیا، خواب کا سرا اس کے ہاتھوں میں آگیا... "یہ تو
بالکل ٹھیک ہے"۔ اس نے اطمینان کے ساتھ سرگوشی میں کہا: "زندگی کی
دوسری چیزوں کی طرح یہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ رہی ہے۔" اس کے چہرے
پر ایسی طمانیت تھی، ایسا وقار تھا، ایسا بہاؤ جیسے کہ وہ ایک سانس لیتا
ہوا سمندر ہو اور وہ سمندر کے ساتھ بہتی چلی گئی۔[1]

جو زندہ رہنا جانتے ہیں، مرنا بھی ان کے لیے سہل ہوتا ہے۔ موت
کو وہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ گلے لگاتے ہیں جیسے زندگی کو۔

---

[1] آخری سے پہلا پیراگراف اکتوبر ۸۶ء کے ریڈرز ڈائجسٹ سے ماخوذ ہے۔

احمد رشید شیروانی

مسلمانوں کے دشمنوں کو دوستانہ مشورہ

آج کل ہمارے کچھ پیارے بھائی مسلمانوں سے بہت ناراض ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ڈنڈ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ڈنڈ دینے کی کئی جگہ کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ میں اپنے ان پیارے بھائیوں سے (ساحر کی نظم کے ایک مصرعے میں ذرا سی ترمیم کرکے) کہتا ہوں

"آپ بے وجہ پریشان سے کیوں ہیں بھائی؟"

جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ تو کچھ مسلمان آپ سے بھی زیادہ اچھی طرح سرانجام دے رہے ہیں۔

مثلاً ایک سال تک مسلمانوں کو ایک غیر اہم مسئلے میں الجھائے رکھا گیا۔ مسلمان بل کے لیے بلبلاتے رہے اور جب بل پاس ہوگیا تو کچھ مسلمانوں نے کہنا شروع کردیا کہ یہ تو شریعت کے بالکل خلاف ہے چند ماہ پہلے تک یہ کہا جا رہا تھا کہ ملت میں ایسا اتحاد تو کبھی دیکھا ہی نہیں گیا تھا۔ (خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی نہیں) جیسا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت میں دیکھا گیا۔ مسلمانوں نے جگہ جگہ بار بار ہڑتالیں کیں اپنے کاروبار بند کیے۔ کروڑوں کا نقصان ہوا مسلمانوں کا۔ مسلمانوں نے اپنے سارے مسائل کو بھول کر اس ایک معاملے میں اپنی ساری طاقت لگادی اور پھر یہ اعلان ہوا کہ ملت اسلامیہ ہند کی شاندار فتح ہو گئی۔ شریعت کے مخالفوں کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانو! بجاؤ تالیاں۔

مگر ان تالیوں کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ شور مچ گیا کہ یہ بل (جو اب ایکٹ بن چکا ہے) شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ "پُر از اغلاط" ہے۔ اتنا ہی نہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ نے شریعت کا سودا کر لیا۔ یہ لوگ ملت فروش ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو بھائی جس ملت کی حالت ہے اس کو سزا دینے کے لیے آپ کیوں زحمت گوارا کریں؟ وہ تو خود اپنے آپ کو سزا دے رہی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ ٹھنڈائی پیجیے۔

ان خالی جگہوں کے لیے

تعلیمی اعتبار سے مسلمان آج باقی سب ہندوستانیوں دس گنا پیچھے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک مسلمان برہمنوں کایستھوں وغیرہ سے تو پیچھے تھے تعلیم میں۔ مگر ہریجنوں اور بیک ورڈ کلاس کافی آگے تھے اور اگر مسلمانوں کے اوسط کا مقابلہ تمام غیر مسلم اوسط سے کیا جاتا تو مسلمان تعلیم میں سب غیر مسلموں کے اوسط نہیں تھے۔ اس کے بعد گاؤں گاؤں اسکول کھلے۔ غیر مسلم اپنے بچوں کو دھڑا دھڑ اسکول میں داخل کیا۔ آج آپ کو برہم کھتری اور بنیوں میں کوئی جاہل مشکل ہی سے ملے گا۔ بیک ورڈ کے لوگ بھی تعلیم میں آگے آ گئے۔ حد یہ ہے کہ ہریجن بھی اب او سے تعلیم میں آگے نکل گئے ہیں۔ مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کو نظر رہے اور اب وہ غیر مسلم ہندوستانیوں کے اوسط سے دس گنا ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ سال بہ سال مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی بہ نسبت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ اب بتلایئے کہ ایسے لوگوں دینے کے لیے آپ کیوں تکلیف کریں؟ یعنی کہ مزے سے کیا شوق سے سنیما دیکھیے جاکر۔ مسلمان تو خود ہی اپنے آپ کو ا

بار کر رہے ہیں جواب ہوکر غل کرتے جا رہے ہیں۔
فائدہ نہ ہو جائے۔
معاشی اعتبار سے مسلمان دن بہ دن غربت و افلاس کی
رہو رہے ہیں۔ بہت سے مسلمانوں کے پاس فن تھا کاریگری
ست کاری تھی، لیکن جہالت کی وجہ سے ان میدانوں میں بھی
ں پرانے ڈھرے پر چلتے رہے۔ وہ اپنے فن اپنی کاریگری
ت کاری میں کوئی جدت پیدا نہیں کر سکے۔ نئے زمانے کی تکنیکی
ں سے بالکل بے خبر رہے۔ چنانچہ دوسرے نئی تکنیکیں استعمال
نئی ایجادوں سے فائدہ اٹھا کر نئے طریقے اپنا کر مسلمانوں سے
کل گئے۔ جن شہروں میں مسلمان بڑی اکڑ دکھا کر کہتے تھے:

"اجی پڑھ وڑھ کر کیا ہوگا، ہمارا تو نو دس سال کا
لونڈا پچاس روپے روز کمالے ہے۔"

ن ہی مقامات پر پرانے ماہر کاریگر بے روزگار ہیں، رکشہ

چلاتے ہیں، بھیک مانگ رہے ہیں اور یہ سب جہالت کی
وجہ ہے۔ نئے زمانے کے تقاضوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اور
کچھ اپنی بیوقوفیوں اور حماقتوں کی وجہ ہے۔ ایسے لوگوں کو
ڈنڈ دینے کا آپ کیوں کشٹ کریں۔ یہ تو سویم اپنے آپ کو
ڈنڈ دے رہے ہیں۔ آپ مزے سے میوزک بجائیے۔
ڈانس کیجیے۔

آپ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو سکنڈ کلاس
سٹی زن بنا دیا جائے؟ بھائی دیکھیے ایسا نہ کیجیے گا مسلمانوں
نے اپنے آپ کو تھرڈ کلاس سٹی زن بنا رکھا ہے۔ وہ
تھرڈ کلاس سٹی زن ہیں۔ ان کو یہی رہنے دیجیے۔ اگر آپ
نے مسلمانوں کو سکنڈ کلاس سٹی زن بنا دیا تو مسلمانوں کا
بڑا فائدہ ہو جائے گا۔

"ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو ہندوستانی کہلائے
جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے
ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ
پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پییں ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل
ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرسۃ العلوم کو قایم کرنے
میں میرا یہی مطلب تھا مگر میرا کیا مقدور تھا کہ میں اس کو انجام دے سکتا۔ میں ان لوگوں کا
شکر گزار ہوں جنھوں نے اس میں مدد کی۔ اس مدد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں
جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی
عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں۔ جس سے ہمیشہ کو
یہ یادگار قایم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی
سے مدد کی تھی۔"

سر سید
(تقریر امرت سر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء)

محمد انصار اللہ

انیسویں صدی کے نصف اوّل تک علمی کتب کے

مَطبُوعہ اُردُو تراجم

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کو ترجے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ نویں صدی کے آخر کا یہ واقعہ[1] بزرگ بن شہریار نے بیان کیا ہے کہ کشمیرِ زیریں کے درمیانی علاقے کے ایک راجہ کی فرمائش پر منصورہ کے بادشاہ عبداللہ نے ایک عراقی کو وہاں بھیجا تھا جس نے زبانِ ہندوی میں اپنے مذہب کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔

سلطان محمود غزنوی نے کلمۂ اسلام کو سنسکرت زبان میں ترجمہ کروا کر اپنے "دلّی والے" سکوں پر اس طرح لکھوایا تھا[2]:

سیدھی طرف

اَوْیکتمیکم محمد اَوتارہ	अव्यक्तमेकं मुहम्मद अवतार:
نرپت محمود	नृपति महमूद:

پشت پر

اَوْیکتِیَہ نام اَئیہ ٹنکہ	अव्यक्तीय - नाम (?) अयं टंकं
محمود پورے گھٹتم	महमूदपुरे घटित: ।
تاجکی سنوتا ۴۱۸	ताजिकीय संवत ४१८

تاجکی سنبت ۴۱۸ سے مراد ہجری سال ہے جو بکری سنبت ۱۰۸۴ (۱۰۲۷ء) سے مطابق ہوتا ہے۔

اس کے بعد سے عربی، فارسی کے علاوہ ہندوستان کی مختلف علمی زبانوں سنسکرت وغیرہ سے زبانِ ہندوی (قدیم ارد[و]) اور زبانِ ہندوی سے ان مختلف زبانوں میں منظوم ترجمے کیے [گئے] ہے۔ یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہن[د میں] نثر کا رواج شروع ہوا تو نثری ترجموں کا سلسلہ بھی شرو[ع ہوا۔] فضل علی خاں فضلی کی "کربل کتھا" کو جسے شمالی ہند میں ارد[و کی] پہلی کتاب خیال کیا گیا ہے۔ فارسی کی ایک قدیم کتاب "[...]" کا آزاد ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ شاہ عالم ثانی نے اپنی ضخیم نث[ر] "عجائب القصص" میں قرآن پاک کی آیتوں کا نہ صرف ترجمہ کی[ا] کی تفسیر بھی لکھی۔ اسی زمانے میں حسین عطا خاں تحسین نے مشہور قصہ چہار درویش کو قدیم طرز کی فارسی آمیز اردو [...] کے نام سے ترجمہ کیا۔

۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں جب فورٹ ولیم کالج قایم ہو[ا] فارسی کی بعض داستانوں کے علاوہ علی ابراہیم خاں خل[یل] "گلزارِ ابراہیم" کے دو ترجمے "گلشنِ ہند" کے نام سے ک[یے] ولیم کالج میں درس و تدریس کا آغاز ہوا تو نصابی کتابو[ں کی ضرورت] پیش آئی۔ رفتہ رفتہ اس ضرورت کا احساس عام ہوا۔ [یہ] سمجھنا چاہیے کہ اس سے کچھ ہی پہلے انگریزی زبان کی تعل[یم] کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا اور اس زبان میں نصابی

---

[1] نقوشِ ادب، جولائی ۱۹۶۶ء صفحہ ۶۷ بحوالہ عجایب الہند۔

[2] [...]al Inscriptions by D.C. Silcar, Vol II, Delhi 1968, Page 650 -

تھیں۔ انگریز حکام کے واسطے سے مذہبی کتابوں کا ہندوستانی زبان
اس حلقہ کو ان کی طرف توجہ ہوئی۔ شیوع بغیر شروع تھی ان کتابوں
منتقل کرنے کی کچھ انفرادی کوششیں ہوئیں۔ چنانچہ انیسویں صدی
تیسرے عشرے میں جو کتابیں ترجمہ ہو کر چھپ گئی تھیں، اُن میں سے
ہیں:

خلاصہ[1] علم الارض (مع انگریزی) نام مصنف ندارد، ترجمہ ن۔ن، کلکتہ
ندارد، ۱۸۲۲ء، نصابی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ بمعہ متن۔

اصولِ[2] نظایر شرح محمدی، میگناٹن ولیم، ترجمہ مکند لال، لکھنؤ،
ہند، ۱۸۲۹ء انگریزی سے ترجمہ"

ایلیمنٹس[3] آف جنرل ہسٹری، ٹائیلز: ترجمہ: ایل ڈی کاسٹا،
۱۸۲۹ء، نصابی کتاب کا ترجمہ"۔

ان اقتباسوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے زیراثر
کی طباعت کا کام کلکتہ میں تو ہو ہی رہا تھا۔ اب دوسرے مقاموں
اس سے دلچسپی لی جانے لگی۔ "اصول نظایر شرح محمدی" کو جو
نام حاصل ہوا اس کا قیاس اس طرح کیا جانا چاہیے کہ ۱۸۴۰ء میں
اب کا تیسرا ایڈیشن چھپ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اہلِ علم
فایدا اور معاملات کے بارے میں بھی اہل یورپ کے خیالوں سے واقف
ہتے تھے اور ترجموں نے اس کام کو آسان بنا دیا تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے میں بھی علمی کتابوں کے
کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے کی مطبوعہ کتابوں میں قابلِ ذکر

علم ہیئت[4]: نام مصنف ندارد، ترجمہ لفٹننٹ ملیس، لکھنؤ،
ندارد، ۱۸۳۲ء علم ہیئت سے متعلق کتاب کا ترجمہ"۔

اجرام آسمانی[5]: نام مصنف ندارد، ترجمہ ن۔ن، کلکتہ، نام طابع ندارد،
اجرامِ سیارگان سے متعلق کتاب کا انگریزی سے ترجمہ۔

اوپر جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن سے یہ حقیقت سامنے
آجاتی ہے کہ ہندوستان میں مقیم یورپین اہلِ علم خود بھی اپنے ملک کی
تصانیف کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے اور ترجمے کے کام میں
انھوں نے خود بھی کوشش کی تھی۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں نصیرالدین
حیدر بادشاہ تھے اور اُن کے دربار میں انگریز مختلف انداز سے دخیل تھے
غالباً انھیں کے اثر سے بادشاہ نے بھی بعض کاموں کی سرپرستی کی تھی۔
مثال کے طور پر کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں "مفتاح الافلاک" نامی
ایک کتاب کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں جناب نصیرالدین
ہاشمی نے لکھا ہے:

"یہ رسالہ[6] علم ہیئت سے متعلق ہے۔ فرانسیسی زبان کے ایک رسالہ
کا ترجمہ ہے جو بطور سوال و جواب لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بارہ فصل
پر منقسم ہے ۔ ۔ ۔ پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔ یہ رسالہ حسب الحکم
حکم جناب سلطنت مآب ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ و عادل نوشیروان
زماں نصیرالدین حیدر بادشاہ زادہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کے حکیم فرکوس
صاحب کے اصولِ علم ہیات سے مترجم نے بوسید عبدالسلام لکھنوی
کے اردو زبان میں ترجمہ کیا اور دار الامارت کلکتہ میں مطبوع ہوا۔
۱۸۳۳ء"

فرانسیسی زبان سے اردو میں ترجمہ کی جانے والی پہلی کتاب
غالباً یہی ہے۔ اس کتاب کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی
کے بعد اردو نے یورپ کی زبانوں میں جس زبان کے علمی سرمایے سے
فایدہ اٹھانا شروع کیا تھا وہ فرانسیسی زبان ہے۔

ترجمے کے نقطۂ نظر سے انیسویں صدی عیسوی کے اس عشرے
کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اسی زمانے میں حیدرآباد میں شمس الامرا

---

[1] کتابیاتِ تراجم۔ مرتبہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، شایع کردہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۰۲
[2] ایضاً ص۔ ۲۶۲ [5] ایضاً ص ۲۸۷
[3] ایضاً ص۔ ۳۸۶ [4] ایضاً ص ۳۸۷
[6] کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد اول، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱۹

نے اپنا دارالترجمہ قایم کیا۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ اردو ادب کے مورخین نے عموماً اس کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ علمی کتابوں کے ترجمے کی حد تک اِس دارالترجمہ کی خدمات بے مثال ہیں۔ شمس الامرا کے بارے میں جناب نصیرالدین ہاشمی نے جو لکھا ہے، مختصراً اِس طرح ہے:

"شمس الامرا کے مورثِ اعلیٰ ابوالخیر خاں تیغ جنگ ہیں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں آپ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے... آپ کے دو فرزند تھے۔ بڑے ابوالبرکات خاں... کا عالمِ جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ابوالفتح خاں کو باپ کی زندگی میں ابوالخیر خاں تیغ جنگ کا خطاب عنایت ہوا۔۔۔ آپ کے فرزند محمد فخرالدین خاں تیغِ جنگ شمس الامرا ثانی امیر کبیر ہیں۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں آپ کی پیدائش برہانپور میں ہوئی۔۔۔ ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ صاحب حیدرآباد میں دفن ہیں۔۔۔ ستۂ شمسیہ میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ نقل کرنے کے قابل ہے۔ نیازمند درگاہِ ایزدی کا محمد فخرالدین خاں المخاطب شمس الامرا اِس طور پہ گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں۔۔۔ میری سماعت میں آئیں۔۔۔ بعضے علوم فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ علم جرِ ثقیل اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر ستے نہیں کہ جیسا اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعض علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پاگئے ہیں کہ اُن کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنے۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ... بہ حسبِ مدعا چند رسالے مختصر علومِ فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے۔۔۔ بہم پہنچے۔"[۹]

کتاب ستۂ شمسیہ کے بارے میں لکھا ہے:

"ستۂ شمسیہ: ریورنڈ چارلس، ترجمہ غلام محی الدین موسوی تندوسی وغیرہ، حیدرآباد دکن، مطبع سنگی شمس الامرا (۱۸۴۰ء) یہ کتاب جرِ ثقیل، علمِ ہیئت، علمِ آب، علمِ ہوا، اور علمِ برق سے متعلق چھ رسایل کا مجموعہ ہے۔"[۱۰]

نصیرالدین ہاشمی نے اِس کتاب کی تکمیل کی تاریخ جو قمر فیض نے کہی ہے اِس طرح نقل کی ہے۔

تالیفِ نواب شمس الامرا

۱۲۵۳

اِس سے بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ خود شمس الامرا [illegible] ہوا ہے۔ امکان ہے کہ انھوں نے اِس کام میں مختلف اہلِ علم کا [illegible] حاصل کیا ہو۔

اِن شمس الامرا کے سبھی فرزند صاحبِ علم و فضل تھے۔ محمد [illegible] خاں عمدۃ الملک کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ ان کی [illegible] کتاب "رفیع البصر" فارسی میں تھی جسے رتن لال مست نے [illegible] ۱۸۴۷ء میں منتخب البصر کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ متر[illegible] ہے کہ "یہ[۱۲] رسالہ بیچ علم دور نما کے کہ اسے علم انظار بھی کہتے [illegible] اور یہ رسالہ بھی اسی زمانے میں مطبع شمس الامرا سے چھپ گ[illegible]

۹۔ دکن میں اردو از مولوی نصیرالدین ہاشمی۔ مطبوعہ، حیدرآباد: ۱۹۳۶ء ص ۳۵۹۔تا [illegible]

۱۰۔ کتابیات تراجم ص ۲۰۵

۱۱۔ اردو مخطوطات جلد اول ص ۲۷۴

۱۲۔ اردو مخطوطات جلد اول ص ۲۷۳

ہ الملک کے ایک ترجمے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:
رو نگارتم [illegible] (رفیع الحساب) ترجمہ محمد رفیع الدین شمس الامرا
آباد دکن، مطبع سنگی شمس الامرا' ۱۸۳۶ء
لوگارتم ریاضی کا انگریزی سے ترجمہ۔"

الامرا کے دارالترجمہ سے مختلف اہلِ علم کی ترجمہ کی ہوئی جو کتابیں
ہوئی ہیں، اُن میں سے بعض کا تعارف اِس طرح ہے:
کتاب [illegible] ہندسہ، ٹاڈ ہنٹر؛ ترجمہ رائے منولال، حیدرآباد دکن
سنگی شمس الامرا' ۱۲۵۵ھ"
معلوم ہوتا ہے کہ ٹاڈ ہنٹر کی کتابیں اُنیسویں صدی میں بہت مقبول
ی۔ چنانچہ اس کی کتابوں کو دوسرے مترجمین نے بھی اردو میں
ل کیا تھا۔

"رسالۂ [illegible] چیچک؛ میکلین ڈاکٹر ڈبلیو۔ ای۔ ترجمہ: ڈاکٹر
حیدرآباد دکن، مطبع شمس الامرا' ۱۸۴۹ء۔
چیچک کی احتیاطی تدابیر سے متعلق کتابچہ، طبع دوم، مدراس
۱۸ء"

"نافع الامراض [illegible]: میکنزی ولیم، ترجمہ: مترجمین شمس الامرا
درآباد دکن۔ مطبع سنگی شمس الامرا' ۱۸۴۶ء انگریزی سے
ہ۔"

"رسالہ نافع الامراض: رامزے فاربز، ترجمہ ڈاکٹر ولیم میکنزی
درآباد دکن، مطبع شمس الامرا '۱۸۴۶ء' ادویہ کے خواص اور
ہ علاج، بنگالی سے ترجمہ۔"
رسالے اور مترجم کے نام کا اتحاد ان دونوں رسالوں کے ایک
نے پہ دلالت کرتا ہے بہر نوع اگر یہ رسالہ بنگالی زبان سے ترجمہ کیا
ہے تو یہ اس زبان سے اردو میں ترجمہ ہونے والا پہلا رسالہ ہوگا۔

[illegible] معدنیات اور کیمیات علمِ آب؛ چارلس ریونڈ ترجمہ: مترجمین
شمس الامرا حیدرآباد دکن۔ شمس الطالع طبیعیات کی کتاب سوال
وجواب کے انداز میں انگریزی سے ترجمہ"
اِس اقتباس میں "شمس المطابع" غالباً غلط ہے۔ صحیح "مطبع
شمس الامرا" ہونا چاہیے۔
شمس الامرا کے دارالترجمے سے علاقہ رکھنے والی درجِ ذیل
کتابوں کی نقلیں کتب خانۂ آصفیہ میں بتائی گئی ہیں:
"[illegible] رسالہ کیمسٹری، تاریخِ ترجمہ ۱۲۵۹ھ شروع میں رسالہ کا
تعارف اس طرح کرایا گیا ہے ــــ یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم
حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر دام اقبالہٗ کے
ترجمہ کیا گیا۔۔۔ روریڈ جان ٹاکم کے مختصر رسالہ کا اردو ترجمہ انگریزی
زبان سے اردو عبارت میں لکھا گیا۔ رسالہ بارہ ابواب میں منقسم ہے۔
۔۔۔ ۱۲۶۲ھ میں شمس الامرا کے پریس سے طبع ہوا تھا۔"
"[illegible] رسالہ قطاع (علم وعمل): مترجم محمد فیاض الدین فیاض۔
تاریخ ترجمہ ۱۲۷۸ھ۔۔۔ یہ ایک فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے۔
فارسی رسالہ شمس الامرا کا مرتبہ تھا۔ مقدمہ میں قطاع، کہ وہ نادر آلہ ہے
خطوطِ مرتسمۂ قطاع کی تعریف کی گئی ہے۔ دو مقالوں پر کتاب مشتمل ہے یعنی
اعمالِ قطاع کے بیان میں اور استخراج خطوطِ مرتسمہ کے بیان میں۔ خاتمہ میں
کہا گیا ہے کہ ان خطوط کے عامل کو علمِ لوگارتم ضرور جاننا چاہیئے۔"
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسالہ چھپ سکا تھا یا نہیں۔ بہرحال اِس
سے اِس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلّی
کالج کی طرح شمس الامرا کا دارالترجمہ ان کی وفات کے بعد بھی اُن کے
اخلاف کی سرپرستی میں کام کرتا رہا اور ان کے مطبع سے نادر علمی کتابیں
چھپتی رہیں۔ شمس الامرا اور ان کے اخلاف کی سرپرستی میں ترجمے

[illegible] نایابات تراجم ص ۲۳۰
[illegible] ایضاً ص ۱۸۶
[illegible] ایضاً ص ۱۹۶
[illegible] ردو مخطوطات ص ۲۸۲ تا ۲۸۳

[illegible] ایضاً ص ۱۴۳
[illegible] ایضاً ص ۱۸۸
[illegible] ایضاً ص ۲۱۹
[illegible] ایضاً ص ۲۸۹

کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی ہو تا رہا تھا اور مختلف علوم و فنون کے علاوہ شعر و ادب سے متعلق بھی کتابیں تیار کی جاتی رہی ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ان کے دار الترجمہ اور مطبع کی علمی خدمات کلکتے کے فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج سے کچھ کم نہیں ہیں بلکہ موضوع کے انتخاب کے معاملے میں منفرد بھی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے اور ان کی خدماتِ علم و ادب کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

انیسویں صدی عیسوی کے پانچویں عشرے میں مذکورہ اداروں کے تراجم نے ملکی سطح پر قبولِ عام حاصل کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ہر شہر کے مطبع میں ترجمے چھاپے جانے لگے۔ پانچویں عشرے میں چھپنے والے تراجم میں سے بعض، جو دستیاب ہیں، درج ذیل ہیں:

(الف) حیدر آباد

سائنس[21] کے فوائد و اعمال: براہم لارڈ، ترجمہ: کمال الدین حیدر سید (المعروف میر محمد حسین لکھنوی)۔ حیدر آباد دکن، مطبع سلطانی ١٨٤٣ء، یہ کتاب پہلی بار لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ جنرل سائنس سے متعلق۔"

(ب) دہلی

[22] اصولِ منطق، نام مصنف ندارد، ترجمہ: سید محمد میر دہلی: نام مطبع ندارد، ١٨٤٣ء۔ فلسفہ کی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ۔"

[23] "اصولِ قوانینِ ممالک: ترجمہ، رام کرشن، دہلی، ١٨٤٤ء۔ اصولِ قانون سے متعلق انگریزی کتاب کا ترجمہ۔"

[24] معاشیاتِ مل: مل جان اسٹورٹ، ترجمہ: وزیر علی، دہلی، نام مطبع ندارد، ١٨٤٤ء، انگریزی سے ترجمہ۔"

[25] اصولِ قانون: ترجمہ رام کرشن، دہلی، ١٨٤٥ء، قانون سے متعلق اصول سازی، کوائف و ضمیمہ جات کے ساتھ۔"

[26] اصولِ علم انتظام مدن: فرانسس وائے لینڈ، ترجمہ پنڈت دھرم نراین، دہلی: انجمن اشاعتِ علوم مفیدہ، دہلی کالج ١٨٤٥ء، ایلیمنٹری آف پالیٹکل اکانومی کا انگریزی سے ترجمہ۔

[27] "ہیاگرافیکل ہسٹری آف محمڈن: نام مصنف ندارد، ترجمہ: ..... دہلی، ١٨٤٨ء۔ مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق انگریزی کتاب کا ترجمہ۔"

[28] جغرافیۂ ہند: نام مصنف ندارد، ترجمہ: پنڈت سوارو و شوروپ نرائن، دہلی، نام مطبع ندارد، ١٨٤٨ء۔ انگریزی سے ترجمہ

[29] اصولِ علم طبعی: نام مصنف ندارد، ترجمہ: اجودھیا پرشاد سیوا پرشاد، دہلی، نام مطبع ندارد، ١٨٤٨ء۔ فزکس کی نصابی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ۔"

[30] "اصولِ مساحت: نام مصنف ندارد، ترجمہ دیبی چند، د نام مطبع ندارد، ١٨٥٠ء۔ انگریزی سے ترجمہ۔"

[31] "رسالہ مرایا مناظر: ہرشل، ترجمہ: مترجمین ورنیکولر سو دہلی: ورنا کیولر سوسائٹی، دہلی کالج، ترجمہ ١٨٥٠ء سے قبل شائع ہو

[32] "اصولِ فواید مائیات: نام مصنف ندارد، ترجمہ اجودھیا پرشاد، دہلی، نام مطبع ندارد، ١٨٥٠ء۔ نصابی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ۔"

[33] رسالہ مقناطیس: نام مصنف ندارد، ترجمہ: سید کمال الدین حیدر لکھنوی، دہلی، نام مطبع ندارد۔ ١٨٥٠ء، نصابی کتاب کا ترجمہ۔"

(ج) کلکتہ

[34] "تاریخِ ممالکِ چین (دو جلدیں): کار کرن جیمز فران ترجمہ: مصنف نے خود کیا ہے، کلکتہ، مطبع پادری ٹامس، پہلی جلد ١٨٤١ء میں اور دوسری جلد ١٨٤٢ء میں طبع ہوئی

[35] مقاصد العلوم: نام مصنف نامعلوم، ترجمہ سید محمد کلکتہ: نام مطبع ندارد، ١٨٤١ء۔ فلسفہ سے متعلق کا انگریزی سے ترجمہ۔"

---

[21] کتابیاتِ تراجم ص ١١٥	[22] ایضاً ص ٢٤٧	[23] ایضاً ص ٢٩٠
[24] ایضاً ص ٣٣١	[25] ایضاً ص ٢٥٩	[26] ایضاً ص ٣٢٩
[27] ایضاً ص ٤٧	[28] ایضاً ص ١٠٧	[29] ایضاً ص ٣٠٥ باقی

۵ علم حکمت : فنک پارس، ترجمہ ن۔ن کلکتہ، نام مطبع ... ۱۸۴۳ء۔ طب یونانی سے متعلق کتاب کا انگریزی ... ہے۔"

۶ " معین الجراحین : جان مونٹ ڈاکٹر فریڈرک، ...ن۔ کلکتہ، بپٹسٹ کالج پریس ۱۸۴۶ء۔ سرجری ...ق کتاب کا ترجمہ برائے نصاب۔"

۷ " فیصلہ عدالت دیوانی صدر : ترجمہ، عبدالصمد، کلکتہ ... آف انڈیا، مطبع محمدی، ۱۸۵۰ء۔ فیصلہ جات اپیل خاص متفرقہ و اجرائے ڈگری قانون ۱۸۴۳ء ...ہے۔"

(د) لکھنو

..." رسالہ مقاصد العلوم : بروم لارڈ، ترجمہ: مترجمین اودھ، لکھنؤ : مطبع سلطانی ۱۸۴۱ء، انگریزی ...رجمہ، علوم و فنون کے مقصدی ہونے سے متعلق ..."

... دائرۂ علم : نامِ مصنف ندارد، ترجمہ، محمد کریم بخش، ... نام مطبع ندارد، ۱۸۴۶ء۔ فلسفہ سے متعلق کتاب ...یزی سے ترجمہ۔"

...ن فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں ترجمے کی ...لکتہ میں بدستور تھی۔ لکھنؤ میں اس بابت کسی خاص ... کا اظہار غالباً نہیں ہوا۔ لیکن دہلی میں دیر آید درست آید کے مطابق ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اشاعت دوسرے مراکز کے مقابلے میں زیادہ ہوئی۔ مترجمین میں سیّد کمال الدین حیدر لکھنوی کا نام نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف اوّل کے بعد ترجمے کے کام کی رفتار بہت تیز ہوگئی اور آج کم و بیش تمام ہی سائنسی علوم میں دنیا کی مختلف اور متعدد زبانوں کی کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ایسی ستر ہ سو چوراسی کتابوں کی فہرست تیار کی ہے۔ لیکن جیسا کہ سطور بالا سے بھی ظاہر ہے یہ فہرست نامکمل ہے۔ علمی کتابوں کے تقریباً اتنے ہی ترجمے اور بھی ہوں گے جن تک مرتب کتابیاتِ تراجم کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ علوم مذہب، السنہ اور ادب و شعر کے موضوعات سے متعلق جو ترجمے ہوئے ہیں، ان کا بھی قیاس کیا جانا چاہیے پھر جو تراجم زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے۔ ان کا شمار تو قیاس سے باہر ہے۔ بہت محتاط اندازے کے مطابق بھی اردو میں تراجم کی تعداد دس ہزار سے بھی اوپر ہوگی۔ محض اتنی بات سے بھی اس زبان کے سرمایۂ علمی کی وسعت اور وقعت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو ہندوستان ہی کی نہیں دنیا کی وسیع ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔

... ایضاً ص۔ ۱۴۱
... ایضاً ص۔ ۲۲۱
... ایضاً ص۔ ۱۸۱
... ایضاً ص۔ ۲۹۴
۲۷ ایضاً ص۔ ۲۱۰
۲۸ ایضاً ص۔ ۷۵
۲۹ ایضاً ص۔ ۱۸۴
۳۰ ایضاً ص۔ ۲۵۲
۳۱ ایضاً ص۔ ۲۱۹
۳۲ ایضاً ص۔ ۳۵۴
۳۳ ایضاً ص۔ ۲۸۸

ابو علی

عبدالسلام ندوی

[۱۶؍فروری (۱۸۸۳ء) علامہ شبلی کے مایۂ ناز شاگرد، اسوۂ صحابہ، شعر الہند اور اقبال کامل کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی تاریخ ولادت ہے۔ اسی مناسبت سے تہذیب الاخلاق مولانا ابو علی صاحب کا درج ذیل تاثراتی مقالہ شائع کر رہا ہے۔ ابو علی صاحب کو تقریباً ۲۵ برسوں تک مولانا عبدالسلام ندوی کی جلوت و خلوت کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے اس مقالے میں بعض ایسے حقایق بھی ملتے ہیں جن کا تذکرہ کسی اور مقالہ نگار نے نہیں کیا ہے۔ (ادارہ)]

ادارۂ الہلال میں، ایک زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے
و ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد ہی اس میں چلے گئے تھے اور اس میں بڑے
معرکۃ الآرا مضامین لکھے جن سے علمی اور صحافتی حلقے میں وہ اور زیادہ مشہور
ہو گئے۔ اور ہر جگہ سے ان کی مانگ آنی شروع ہو گئی۔ فرگوسن کالج سے آفر آیا تو
انھوں نے مولانا آزاد کی توقع کے خلاف اس کو قبول کر لیا اور وہاں ان کا تقرر
فارسی کی لکچرر شپ پر ہو گیا۔ جہاں وہ مولانا شبلی کی وفات نومبر ۱۹۱۴ء تک
درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی جگہ ان ہی کے
ایسا علم کا کوئی فاضل پر کر سکتا تھا جس کو قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی کے
سمجھنے پر بھی پوری قدرت ہو۔ اور جدید عربی مطبوعات اور رسائل اور
اخبارات کے مضامین کو بے تکلف اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا
ہو۔ اس کے لیے مولانا ابوالکلام کی نگاہ انتخاب ندوہ ہی کے ایک دوسرے
فارغ التحصیل اور صاحب ذوق پر پڑی اور وہ مولانا عبدالسلام ندوی
تھے۔ یہ مولانا کے شاگرد، ہم برادری، عزیز اور ہم وطن بھی تھے۔ ان کے
مسلسل متعدد مضامین ندوہ میں ایک بہترین مضمون کے شائع ہونے کا علمی حلقوں میں بڑا

چرچا تھا۔ مزید براں وہ مولانا شبلی اور مولانا شروانی کی مشترکہ
میں نکلنے والے اسی ماہنامہ الندوہ کے سب ایڈیٹر بھی تھے۔ اس
ان کے بعض مضامین کی بنا پر ان کے متعلق مولانا شبلی نے پیشین گ
اور اپنے دوست مہدی افادی الاقتصادی کو ایک خط میں لکھا
خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔ مولانا ابوالکلام نے ان
خود مولانا شبلی کو بہت موثر خط لکھا اور انھوں نے بخوشی ا
کی اجازت دے دی اور وہ الہلال میں چلے گئے۔ چونکہ م
کو تجربہ ہو چکا تھا کہ الہلال میں بغیر نام کی صراحت کے مضامین
وجہ سے مولانا سید سلیمان کو جتنا ملک کو جاننا چاہیے تھا، اتنا نہ
ان کی شہرت پر کسی قدر پردہ پڑا رہا۔ اس لیے انھوں نے م
کو لکھا کہ

"میں تمہارے مضامین پڑھتا ہوں، مولوی ابوالکلام
اجازت دیں تو اپنا نام بھی ضرور لکھا کرو۔ ایسے مضامین
گمنام ٹھیک نہیں۔ اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کو

[illegible] گئے۔ [illegible]
[illegible] ہو گیا تھا۔

ر اور اخبار کی الگ الگ پالیسی ہوتی ہے، جس پر قائم رہنے کا
ل حق ہے۔ مولانا ابوالکلام کی اس وقت ادبی شہرت کا شباب
، نسبت سے پورا الہلال بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا
ے اشاف کے مضامین، تراجم اور تلخیص بغیر نام کی صراحت کے
تیں کہ ان کو بھی مولانا کی سمجھ کر پوری دلچسپی اور شوق سے پڑھا
راقعی انہی کا سمجھ کر ان کو پرستاران ابوالکلام پڑھتے بھی تھے اور
تھے۔ پھر بھی مولانا شبلی کی خواہش یہی تھی کہ مولانا عبدالسلام
یز بھی الہلال میں چھپے اس کے نام کی صراحت ضرور ہو۔ مگر الہلال
، روش پر قائم رہا۔ اس کے بہت سے مضامین جو ان کی شہرت
و د کا باعث ہوتے بغیر نام کی صراحت کے برابر چھپتے رہے۔ سید
ے اپنے اور عبداللہ عمادی کے مضامین کے ساتھ، ان کے مضامین
پردہ اُٹھایا کہ فلاں فلاں مضمون میرے ہیں، فلاں فلاں عبداللہ
، ہیں اور فلاں فلاں مولانا عبدالسلام ندوی کے ہیں اور فلاں
ر لوگوں کے ہیں جو مختلف اوقات میں مجلس ادارت میں شریک
ہے اور ہر موضوع پر مضامین لکھ کر الہلال کا وزن اور وقار
رہے۔ میرے خیال میں نام نہ ظاہر کرنے میں مولانا ابوالکلام کی
ستہ کسی قسم کی بدنیتی کو دخل نہ تھا، نہ بعد میں اس پر سے پردہ اُٹھانے
ا سید سلیمان ندوی کی بدنیتی کو حاشا و کلا دخل تھا۔ جب کہ ان کے
ے خواہ مخواہ اس کا پروپگنڈا کیا اور ان کو مطعون کرنے کی کوشش
صاحب کا منشا محض ایک حقیقت کا اظہار تھا۔ مولانا شبلی جیسا کہ
طوط سے پتہ چلتا ہے، یہ ضرور چاہتے تھے کہ ندوہ کے جو فارغین بھی
ں جائیں تو ان کے مضامین کے ساتھ اُن کے نام کی بھی صراحت ضرور
ے کے نام سے پردہ پڑ جانے سے ندوہ کی تعلیم و تربیت کی شہرت
ر جانے کا اندیشہ تھا اور وہ برابر مولانا عبدالسلام کو لکھتے رہے
مضامین کے ساتھ اپنا نام ضرور لکھو۔ اور اس کے لیے خاص طور
الہلال مولانا ابوالکلام سے اجازت بھی لے لو۔ لیکن الہلال نے
نہیں بدلی اور جب تک زندہ رہا، اپنی اسی پالیسی پر قائم رہا۔

[illegible] کے مضامین ہم تک آخر تک پہنچتے رہے۔ [illegible]
فر [illegible] ادارہ کو اپنی ادبی صلاحیت کی بنا پر جب چمکنا چاہیے تھا نہیں چمک
سکے اور وہی جب اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے تو خوب چمکے بلکہ ادبی
دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، خود مولانا عبدالسلام اردو کے بہت
بڑے مصنف ہو گئے۔ وہ اپنی گراں قدر تصنیفات و تالیفات مثلاً انقلاب
الامم، شعر الہند اور اقبال کامل کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور لوگ
ان کو خراج عقیدت برابر پیش کرتے رہیں گے۔

ندوہ کی اسٹرائک ندوۃ کی زندگی کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ ہے
اس کی ہمدردی میں ملک کا سارا روشن خیال طبقہ تھا، جس کی رہبری مولانا
ابوالکلام کر رہے تھے اور اس کو انھوں نے اپنے زور قلم اور پے در پے
مضامین سے ملک کا ایک اہم مسئلہ بنا دیا تھا۔ گویا اس کے حل پر ملک و ملت
کی نجات تھی۔ علماء میں ایک طبقہ اس کا سخت مخالف تھا اور اس کو بدعت
سمجھتا تھا اس کے سرخیل مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ اس کی مخالفت میں
انھوں نے جو مضمون لکھا اس کا جواب انہی مولانا عبدالسلام ندوی نے بہت
پرزور اور مدلل دیا تھا اور الہلال میں انہی کے نام کی صراحت کے ساتھ
کئی قسطوں میں چھپا تھا۔ اس کا شمار الہلال کے بہترین اور منتخب
مضامین میں ہے۔ مولانا ابوالکلام، مولانا عبدالسلام ندوی کی
قابلیت اور علمی صلاحیت کے اسی زمانے سے معترف تھے اور ان کو بڑی
عزت اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو جب کبھی
خط لکھتے تھے تو ان کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ اُن کے علمی مشاغل
بھی ضرور دریافت کرتے تھے۔ مولانا عبدالسلام نے موسیو لیبان کی ایک
فرانسیسی کتاب کے عربی ترجمہ سر تطور الامم کا انقلاب الامم کے نام سے
ایسا انشاء پردازانہ ترجمہ کیا کہ اس پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ مولانا
ابوالکلام ان کے اس ترجمے سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کو ایک
خط میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالسلام نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پرزور
موثر، بلیغ اور دلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ خوشی اس
کی ہے کہ ایک عمدہ اور علمی کتاب اردو میں شائع ہو گئی۔ جس کے لیے
میں ان کو اور ادارہ دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔
ان کے معارف کے ایک شائع شدہ مضمون سے جو تمام تر نقادی کی

کتاب الفرق سے ماخوذ تھا۔ سید صاحب کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں داد دیتے ہیں:

"آپ ہمارے مولوی عبدالسلام کے حسن اخذ و ترتیب و تزئین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں۔ صرف بغدادی کی کتاب سے ایک اچھا خاصہ مضمون لکھ دیا۔ چوں کہ اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں، اس لیے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے اور ارباب علم سے اس کا تعارف کرایا جائے۔ مولانا عبدالسلام نے یہ خدمت انجام دے دی اور ایک بہت اچھا مضمون تیار کر دیا جو ان کی اعلیٰ قابلیت کا غماز ہے۔ کاش کہ وہ خود اپنے قدرشناس ہوتے اور اپنے افاداتِ قلم سے برابر ملک و ملت کو مستفیض کرتے رہتے۔ وہ بہترین ادیب، بہترین انشاپرداز اور بہترین اہل قلم ہیں اور ادب میں تو مولانا شبلی کے صحیح جانشین ہیں اور مولانا شبلی کے محققانہ اور خالص علمی اسلوب کے تتبع میں بہت کامیاب ہیں۔"[1]

مولانا عبدالسلام کو مولانا سید سلیمان سے علمی چشمک تھی۔ وہ ان کے مقابلے میں مولانا مسعود علی ندوی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ وہ دارالمصنفین میں جس خدمت پر مامور ہیں، اس کے لیے وہ بہت زیادہ موزوں ہیں۔ مگر اس چشمک کے باوجود سید صاحب کی ہر چیز بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ مگر مجھ سے کبھی ان کے اسلوب پر یا ان کی انشاپردازی پر یا اُن کے فضل و کمال پر اظہار خیال نہیں فرمایا۔ خود سید صاحب بھی اُن کے تمام مضامین بغیر نظر ثانی، اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدل کے معارف میں شایع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مولانا عبدالسلام ادب شناس نہیں ہیں۔ بزرگوں کے ذکر میں خلاف احتیاط الفاظ ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے مضامین کی تصحیح میں تم اس کا خاص طور سے لحاظ رکھنا کہ جہاں بھی سوءِ ادب کا پہلو نظر آئے، فوراً بدل دینا۔

تصنیف و تالیف میں دونوں ایک دوسرے کے معاون تھے، اور

دونوں کتابوں سے اخذ و استنباط میں ایک دوسرے کی مدد ک
حیاتِ شبلی کا پورا خاکہ تو انھی نے پہلے ہی تیار کیا تھا جس
جب وہ مکروہاتِ دنیوی سے فارغ ہوتے، سید صاحب نے ا
سے رنگ بھر اکر وہی کتاب تمام تر سید صاحب کی ہوگئی
میں جہاں اس کتاب کے سلسلے میں اور معاونین کا شکریہ ادا کیا
نہایت فیاضی، فراخ دلی اور حقیقت پسندی کے ساتھ ان کا
ادا کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھی کی قایم کی ہوئی بنیاد پر اتنی بڑی
میں نے کھڑی کر دی ہے۔ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ جو ان
سے مولانا شبلی کی تمام تصنیفات پر تبصرہ تھا، اس کو حجم کے بڑ
کے ڈر سے، اس میں قصداً شامل نہیں کیا گیا اور پھر مولانا
تمام تصنیفات فرداً شہرت کی بنا پر کسی تعارف اور تبصرہ
بھی نہیں تھیں۔ کسی مصنف کی ایک کتاب مشہور ہوتی ہے اور اسی کا
وہ یاد کیا جاتا ہے۔ اسوۂ صحابہ ایسی ہی کتاب ہے جس کی نسبت سے ان کو یاد
ان کو اس کا بالکل غم نہیں تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے
سلیمان ندوی کے پاکستان میں مجبوراً قیام کی وجہ سے مولانا شا
ندوی کو دارالمصنفین کا ناظم کیوں بنا دیا گیا۔ انھوں نے اپنی
تک ان کی نظامت سے انحراف نہیں کیا اور ان کی ماتحتی
فرائض اسی جوش و اخلاص و سرگرمی و انہماک و یکسوئی
انجام دیتے رہے جیسا کہ سید صاحب کی نظامت کے د
دیتے رہے۔ اسوۂ صحابہ، شعر الہند، امام رازی، ابن
سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، تاریخ اخلاق اسلامی، انقلا
اسوۂ صحابیات، تاریخ فقہ اسلامی وغیرہ تو سید صاحب
کے دور میں شایع ہو چکی تھیں۔ صرف ان کی اقبال کامل
نے سید صاحب ہی کی فرمایش سے ان کی یہاں کی موجود
کر لیا تھا، شاہ معین الدین ندوی کے دورِ نظامت میں
میں شاہ معین الدین صاحب نے کوئی ترمیم و اصلاح
نہ کر سکتے تھے۔ لیکن کسی قدر اس کا حجم اپنی تصنیف سا
سے کم ضرور کر دیا ہے۔ ورنہ اس کا ایک ایک حرف
ندوی ہی کے قلم کا ہے۔ شاہ معین الدین کا ایک حرف

پر جناب یوسف حسین خاں صاحب کی روح اقبال کے بعد اردو
دوسری کتاب ہے جس میں سوانحی معاملات و وقائع زندگی
یاب احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کمالات
پہلوؤں کی زیادہ تفصیل لکھی گئی ہے۔ ان کی اردو شاعری
فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ
ل تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی
ہیں۔ پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ، خودی،
فہ بیخودی، نظریہ ملّیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف،
عورت)، فنون لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی نہایت سیر حاصل

تشریح کی گئی ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال ہر لحاظ سے اقبال کامل
نظر آتے ہیں۔ جتنی اچھی بحث ان کے فلسفہ پر اس کتاب میں
ملے گی ان پر اور کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گی کیونکہ مولانا عبدالسلام
ندوی خود بہت اچھے معقول اور فلسفی تھے اور معقولات کے ایک ایک
حرف سے آشنا تھے۔ وہ اس موضوع پر شناسانہ جتنا اچھا لکھ
سکتے تھے، اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اقبال کامل
ان کی بہترین کتاب ہے۔

• یہاں پر مقالہ نگار کو تسامح ہوا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اصل الفاظ یوں ہیں۔

"آپ ہمارے مولوی عبدالسلام صاحب کے حسن اخذ و ترتیب و تزئین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں؟
صرف بغدادی کی ایک کتاب الفرق سے ایک اچھا خاصا پورا مضمون لکھ دیا، چوں کہ اس میں بعض تفصیلات
نئی ملتی ہیں، اس لیے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے، لیکن مولوی عبدالسلام صاحب
نے ایک مضمون تیار کر لیا۔ سخت افسوس ہوتا ہے کہ بایں ہمہ استعداد انھوں نے اپنے آپ کو
کیوں گرا رکھا ہے۔"

آخری جملے میں مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی وارفتہ مزاجی کی طرف اشارہ ہے۔ اس جملے سے نئی نسل کو کوئی اور
معنیٰ اخذ نہ کرنا چاہیے۔ (ادارہ)

سید قاسم محمود

سُقراط

یونانی شاعر اگاتھان کے مکان پر ایک پر تکلف ضیافت کا اہتمام تھا۔ اس شخص کو یونانی تھیٹروں میں کھیلے جانے والے ڈرامے پر اوّل درجے کا انعام ملا تھا۔ چنانچہ اس کامیابی کی تقریب پر اس نے اپنے چیدہ دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ مہمانوں کا پسندیدہ موضوع محبت زیر بحث تھا۔ ان میں سے ہر ایک اس ہمہ گیر بحث پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔

فیڈرس کہنے لگا: محبت تمام دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قدیم اور طاقتور دیوتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو ایک ادنیٰ آدمی کو سورما بنا دیتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عاشق اپنی محبوبہ کے آگے بزدلی کی حرکات پر سخت شرمندہ ہوتا ہے۔ اگر مجھے عاشقوں کی ایک فوج مہیا ہو جائے تو میں تمام دنیا کو فتح کر سکتا ہوں۔

"ہاں" دوسرے مقرر پاسانیاس نے کہا۔ "مگر تمہیں سفلی اور علوی محبت میں امتیاز کرنا ہوگا۔ دو جسموں کے اتصال اور دو روحوں کی کشش میں بہت فرق ہے۔ دنیاوی محبت جوانی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے، مگر آسمانی محبت دائمی ہوتی ہے۔"

اس کے بعد مزاحیہ شاعر ارسٹوفینز نے محبت کے بارے میں ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ زمانہ قدیم میں مرد اور عورت دونوں ایک ہی جسم رکھتے تھے۔ یہ جسم گیند کی طرح گول تھا۔ اس کے چار ہاتھ، چار پاؤں اور دو چہرے تھے۔ یہ جسم اپنے ہشت اعضاء کو پہیے کے آرے کی طرح قلابازی کھاتا ہوا نہایت سرعت کے ساتھ حرکت کرتا تھا۔ یہ مرد عورت والے جسم کی نسل بے اندازہ طاقت کی مالک تھی۔ اس کے عزائم لامحدود تھے۔ چنانچہ اپنی اس طاقت کے بل بوتے پر اس نے آسمانوں پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔ زیوس دیوتا نے ایک عمدہ تدبیر سوچی، اس نے کہا۔ "کیوں نہ ہم اس جسم کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیں۔ تاکہ ان کی طاقت نصف رہ جائے اور ہم
قربانیاں ملیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اُن کے جسموں کو کاٹ کر ایک
مرد بنا دیا گیا اور دوسرے کو عورت۔ اس دن سے لے کر آج تک یہ د
منقسم اجسام پھر سے ایک جسم بن جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں
کی یہی ایک قالب ہو جانے کی تمنا ہے جو محبت کہلاتی ہے۔

ارسٹوفینز کی محبت کی اس مزاحیہ توجیہ کے بعد اور دوسرے
مدعوئین نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ اُس کے بعد مہمان خصوصی
درخواست کی گئی کہ وہ بھی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر
سقراط کہنے لگا: حضرات ان فصیح و بلیغ توجیہات نے
حیرت میں ڈال دیا ہے۔ میں اور زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے
ایسے حکیمانہ اندازِ گفتگو کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں"۔

اپنی اس طنزیہ انکسار آمیز تمہید کے بعد سقراط اپنی ا
سے ان کی دانشمندی کو بے نقاب کرنے لگا۔ ان کی تمام دلیا
کر سقراط نے انھیں لاجواب کر دیا۔ سقراط مناظراتی طریق تعلیم
پہلے تو وہ حریف کی تمام دلیلوں کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اس کے
نظریات پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے محبت روح کی وہ ماشتہا
حسن کی تلاش ہے۔ محبت کرنے والا محبت کی صرف جستجو ہی نہ
کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اسے حیات دوام بخشتا ہے۔ فانی
بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے
تاکہ وہ دوبارہ پیدا ہوں اور ابدالآباد تک اپنی ہستی کو قا
والدین کی اپنی اولاد سے محبت کرنے کی یہی وجہ ہے۔ م
والدین کی روح صرف اولاد ہی نہیں پیدا کرتی بلکہ ایک

ائی تلاش میں اس کا ساتھ دے۔ اس کا مقصد یہ تھا اس
ا کام کرے اور یہ وہ کون سا حسن ہے جسے ہم محبت کے ذریعے
جانتے ہیں؟ یہ ہے عقل، نیکی، عزت، ہمت، انصاف اور یقین
ن صداقت ہے اور صداقت ہی وہ شاہراہ ہے جس پر گامزن
تک پہنچ سکتے ہیں۔

ام مہمانوں نے اس برہنہ پا فلسفی کی تقریر کو خراج تحسین پیش کیا
وہ شام کی دوسری دلچسپیوں میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے
یا کہ ساری رات ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مے نوشی
جائے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ان لوگوں نے اتنی شراب نوشی
و جب مرغ نے بانگ دی تو صرف تین آدمی ایسے رہ گئے تھے
اپنے حواس قایم رکھے اور گفتگو میں معروف رہے، وہ تھے
، اگاتھان اور سقراط۔ یہ تینوں باری باری ایک بڑے کوزے
ڈال ڈال کر پیتے رہے اور سقراط اُن دونوں شاعروں کو جن
وگی کا عالم طاری تھا، بتلا رہا تھا کہ ایک عظیم شاعر نہ صرف طرب نگار
ہے بلکہ وہ یکساں طور پر الم نگاری بھی کر سکتا ہے۔ دوران گفتگو
تو ارسٹوفینز غافل ہو گیا۔ پھر صبح ہوتے ہوتے اگاتھان بھی بے خبر
سقراط نے شراب کے دیوتا ڈیونی سس کی یاد میں آخری جام لیا
کو سوتا چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا اور حسب معمول ایتھنز کی سڑکوں
دانش کے موتی بکھیرنے لگا۔

سقراط جسمانی اعتبار سے نہایت بدشکل تھا لیکن باطن میں وہ صفت
کے ایک قابل ترین شاگرد السی بیاڈس نے اس کی مثال ایتھنز
وں میں فروخت ہونے والے ان مجسموں سے دی ہے جو اوپر سے
مضحکہ خیز نظر آتے تھے لیکن انھیں کھول دیا جائے تو اندر دیوتا
ہوتی تھی۔

سقراط انسان سے بالاتر کسی الوہی عقل کی تلاش میں سرگرداں
بلکہ وہ چند نہایت سیدھے سادے سوالات کیا کرتا تھا۔ وہ
میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ میں کچھ نہیں جانتا۔
م کرنی دانم۔ اس کے بعد وہ ثابت کرتا تھا کہ جس طرح وہ نادان
ح دوسرے بھی تھے اس کا کام دوسروں سے سیکھنا اور

[illegible] تھا۔ وہ کہتا تھا "میری ماں ایک دایہ تھی، میں اس
کے نقش قدم پر چلتا ہوں۔ جس طرح وہ وضع حمل کے وقت زچہ کی مدد کرتی
تھی اُسی طرح میں بھی دوسروں کو نئے خیالات پیدا کرنے میں مدد دیتا
ہوں۔"

یہ تھا وہ سادہ گو، سادہ وضع، چپٹی ناک، موٹے ہونٹ، باہر نکلی
ہوئی آنکھیں، بے ڈول جسم کا دل منت سقراط جو اپنے ملکوتی خیالات کے موتی
ایتھنز کی سڑکوں پر بکھیرتا پھرتا تھا۔ پاکیزگی کیا شے ہے؟ جمہوریت کس چیز کا نام
ہے، دیانت داری کسے کہتے ہیں، جرأت، ایمان داری، انصاف، صداقت کیا ہیں؟
تمہارے فرائض کیا ہیں۔ تم نے اپنے علم و دانش سے اس میں کیا اضافہ کیا
ہے؟ کیا تم سیاست داں ہو؟ اگر ہو تو تم نے حکومت کے کیا طور طریقے
سیکھے ہیں۔ کیا تم وکیل ہو؟ اگر ایسا ہے تو انسانی افعال کا کیا مقصد
ہے؟ کیا تم معلم ہو؟ اگر ہو تو دوسروں کی جہالت پر حملہ کرنے سے پہلے تم
نے اپنی جہالت پر کہاں تک فتح یابی حاصل کی ہے؟ یہ تھے ابتدائی سوالات
جو سقراط ہر ایک سے پوچھتا تھا۔

ایسے سوالات کے ذریعے وہ جرح کر کے بڑے بڑے داناؤں کی
دانائی کا راز فاش کر دیتا تھا مگر وہ ایسا کسی بری نیت کے زیر اثر نہیں کرتا
تھا۔ اس نے اپنی لاعلمی کے اظہار میں کبھی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس
کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ صداقت کو غلطیوں سے پاک کیا جائے۔ وہ
کہتا ہے "میں صداقت کا اس طرح پیچھا کرتا ہوں جیسے ایک شکاری کتا
شکار کا پیچھا کرتا ہے۔" سقراط پیشے کے لحاظ سے مجسمہ ساز تھا لیکن اس
نے اپنے مفاد اور کاروبار کی کبھی پروا نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اہل و
عیال کا بھی خیال نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بد مزاج بیوی زانتھی پے ہمیشہ اس
سے جھگڑتی رہتی تھی۔ دراصل سقراط قتیل فلسفہ تھا۔ اُس کے نزدیک فلسفہ
وہ انداز فکر ہے جو انسان کو خود آگاہ بنا دیتا ہے۔ خود را بشناس سقراط
کا فلسفہ تھا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب انسان اپنے آپ سے واقف ہو جاتا ہے
تو اسے بڑی ناامیدی ہوتی ہے۔ جب سقراط نے اہل ایتھنز کے سامنے
سے خود ستائی کا آئینہ ہٹا کر صداقت کا شیشہ رکھا تو انھیں اپنی شکلیں
دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ اس شیشے میں انھوں نے انسانی شکلوں

کے بہانے درندوں کی شکلیں بکھیں اور وہ درندوں کی طرح سقراط کے
درپے آزار ہو گئے۔ ایک عرصہ تک تو اس کی تضحیک کرتے رہے پھر
دشنام طرازی پر اتر آئے۔ اس کے بعد زدوکوب کرنے لگے۔ کچھ
عرصہ بعد ایک ایسا وقت آیا کہ ایتھنز کے اخلاقی ماحول میں آگ لگ گئی
اور اُن کے لطیف احساسات جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ ۴۰۴ ق م
اسپارٹا کی آمریت اور ایتھنز کی جمہوریت کے درمیان پیلو پونیشن جنگ
چھڑ گئی۔ جس میں مؤخر الذکر کو شکست ہوئی۔ اس جنگ میں انسانی
تہذیب، زندگی کی عظمت اور انفرادی آزادی کو مہلک ضرب پہنچا۔
ایتھنز کے ظالم اور غدار کریٹی آس نے آزاد حکومت کا تختہ الٹ دیا۔
اور اپنی حکومت قائم کر لی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا تختہ بھی
الٹ دیا گیا۔ اس کشمکش میں ایتھنز ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس
میں انسان کے تمام بہیمانہ جذبات ابھر آئے۔ اب یہ مقام کسی فلسفی کے
لیے قطعی محفوظ نہ رہ گیا تھا خصوصاً ایسا فلسفی جسے حق و صداقت
کی تبلیغ سے کوئی شے نہیں روک
سکتی تھی۔ ایک صبح کو جب سقراط
بازار میں آیا تو اس نے اپنے خلاف
حسب ذیل قرار دادِ جرم چسپاں
دیکھا:

"سقراط مجرم ہے اول اس لیے
کہ وہ ان دیوتاؤں کا منکر ہے جن کی
پرستش اہل ایتھنز کرتے ہیں۔ ان کے
عوض وہ اپنے نئے دیوتا پیش کرتا ہے
ثانیاً وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب
کرتا ہے۔ لہٰذا اسے سزائے موت
دی جائے"

سقراط کے خلاف ان الزامات کا سب سے بڑا محرک انی ٹس
نامی ایک چرم فروش تھا۔ اسے سقراط سے ذاتی عناد تھا کیوں کہ
سقراط نے اس کے لڑکے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کا پیشہ
ترک کر کے فلسفے کے مطالعے کی کوشش کرے، اس لیے انی ٹس مصر
تھا کہ اس طرح نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کرنے کی سزا موت ہونی
اس جرم اور علم کے جھگڑے میں جرم کو فتح ملی، سقراط گرفتار
گیا اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔

سقراط اگر چاہتا تو اس سزا سے بچ سکتا تھا کیوں کہ ایتھنز
قانون میں اس بات کی اجازت تھی کہ ایک شخص جسے سزائے موت
دی گئی ہو، اگر چاہے تو جلا وطنی قبول کر لے، علاوہ ازیں اس کے
سے دولت مند دوستوں نے جن میں افلاطون بھی شامل تھا، ز
کے محافظ کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ سق
کو رہا کر دے۔ سقراط اگر چاہتا تو بچ نکلتا، لیکن اس نے ایسا کر
مناسب نہیں سمجھا۔ اس کا وقت آچکا تھا اور وہ جانے کے لیے تیا
وہ تمام عمر بلا خوف و خطر خطرات کا سامنا کرتا رہا اور جب د
پڑا تو موت کا سامنا کرنے سے بھی نہیں گھبرایا۔ نوجوانی کے د
میں اس نے میدان جنگ میں بہادری کا انعام حاصل کیا تھا۔ اس
میں جب وہ ایتھنز کا سینیٹر
اس نے شہر کے عوام کی متفقہ
کی کوئی پروا نہیں کی، لوگوں کا
تھی کہ بزدلی کے جرم میں ماخوذ
امیر البحر کو قتل کر دینا چاہیے۔
سقراط اس کا مخالف تھا۔
تھا کہ امیر البحر بے قصور تھا
سانحے کے چند سال بعد اس
کریٹی آس کی نہایت جرات
کے ساتھ مخالفت کی۔ اس ج
نے سقراط کو حکم دیا کہ وہ لیو
ایک جمہوریت پسند باغی کو
بھاگ گیا تھا، پکڑ کر واپس لائے۔ سقراط نے اس کے حکم
سے صاف انکار کر دیا۔ سقراط کہتا ہے:
ہو سکتا تھا کہ کریٹی آس مجھے حکم عدولی کے جرم
مگر اتفاق سے جلد ہی اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

"اے حاکمانِ عدالت موت سے بھاگنا مشکل نہیں
ہے بلکہ گناہ سے بھاگنا مشکل ہے گناہ، موت سے زیادہ
تیز رفتار ہے۔ ہم بہت جلد اس کے نرغے میں آجاتے ہیں
مجھے موت نے آگھیرا ہے اور مجھ پر الزام لگانے والے مبتلائے
فریب ہیں۔ میں موت کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہوں اور
وہ فریب کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔"

اور اب جب کہ ما فات موت اس کے سامنے کھڑی تھی، اس نے
گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے کہا؛

"میرے لیے یہ اچھا ہے کہ جب ابھی میرا جسم صحیح و سالم ہے
میں موت کی آغوش میں چلا جاؤں، بجائے اس کے کہ
بے یار و مددگار نحیف و درماندہ بڑھاپا گزاروں۔"

سقراط کو اپنی قوتِ برداشت پر ناز تھا۔ سارے ایتھنز میں صرف
وہی ایک ایسا شخص تھا جو شدید سردی میں برہنہ پا برف پر گھوما کرتا
تھا۔ اس کے نزدیک زندگی بغیر حرکت کے بے معنی چیز تھی۔ اس کا کہنا
تھا۔

"جس استقلال کے ساتھ ہم زندگی کا سامنا کرتے
ہیں، اسی استقلال کے ساتھ موت کا بھی مقابلہ کرنا
چاہیئے۔"

اپنے منصفوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا؛

"اے حاکمانِ عدالت موت سے بھاگنا مشکل نہیں ہے
بلکہ گناہ سے بھاگنا مشکل ہے۔ گناہ، موت سے زیادہ
تیز رفتار ہے۔ ہم بہت جلد اس کے نرغے میں آجاتے
ہیں۔ مجھے موت نے گھیرا ہے اور مجھ پر الزام لگانے
والے مبتلائے فریب ہیں۔ میں موت کے آگے سرِ تسلیم
خم کرتا ہوں اور وہ فریب کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔"

اس کی زندگی کے آخری دن اس کے بہت سے شاگرد اس
سے ملاقات کرنے آئے۔ اس منظر کا نقشہ افلاطون نے اپنی کتاب فیڈو
میں کھینچا ہے۔ یہ کتاب دنیا کے چند اعلیٰ ترین رزمیہ میں سے ایک ہے
تمام شاگرد اپنے محبوب استاد کے اردگرد جمع ہیں۔ سقراط ان میں سے
ایک کو اپنے قریب بلاتا ہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زندگی
اور موت، فنا اور بقا پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ موت یا تو ایک
گہری خواب ہے، ایک سہانی خود فراموشی جہاں کچھ نہیں ہے۔ نہ سزا،
نہ انصاف، نہ یاس، نہ ظلم، نہ رنج یا پھر یہ ایک دروازہ ہے جس سے
گزر کر ہم زمین سے آسمان پر پہنچتے ہیں۔ ایک ڈیوڑھی ہے جو ہمیں
ایوانِ خداوندی تک لے جاتی ہے۔

"اے میرے دوستو! یہاں کسی کو کبھی اپنے خیالات کی
وجہ سے موت کی سزا نہیں دی جاتی۔ اس لیے تمہیں خوش
ہونا چاہیے اور میری موت کا افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔
جس وقت تم مجھے قبر کے اندر اتارو گے تو سوچنا کہ تم
میرے جسم کو دفن کر رہے ہو روح کو نہیں۔"

آفتاب غروب ہو رہا ہے، جیلر زہر کا پیالہ لیے اندر داخل ہوتا
ہے؛

"سقراط! تم مجھ سے خفا نہ ہونا تم جانتے ہو کہ اس گناہ کا
ارتکاب میں نہیں کر رہا ہوں۔"

کہتا ہوا پیالہ سقراط کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جس وقت وہ واپس
ہوتا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔

"ہمیں بھی یارائے ضبط نہ رہا۔ انتہائی کوششوں کے
باوجود ہماری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ ہم
میں صرف سقراط ہی ایسا تھا جس کے چہرے پر کوئی
ملال نہ تھا۔ اس نے کہا۔ یہ کیا احمقانہ حرکت ہے۔ میں
نے تو عورتوں کو صرف اس وجہ سے باہر کر دیا تھا کہ ایسی
باتیں نہ ہوں، خاموش رہو اور مجھے سکون کے ساتھ
مرنے دو۔"

یہ سن کر ہم سب شرمندہ ہو گئے اور آنسوؤں کو پی
گئے۔ جیلر کی ہدایت کے مطابق سقراط نے زہر کا پیالہ پیا
اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ زہر اس کے پیروں
سے دل کی جانب سرایت کرنے لگا۔ اس کے جسم میں ٹھنڈک
ہونے لگی اور اس نے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ یہ تھا ہمارے
استاد کا آخری لمحہ، وہ استاد جس کے بارے میں میں کہہ سکتا
ہوں کہ جتنے آدمی بھی مجھے ملے ان میں سب سے زیادہ عقلمند
اور سب سے زیادہ اچھا انسان تھا۔"

سقراط ۳۹۹ ق م میں شہید ہوا۔ طبیعیات اور فلکیات جیسے قدیم
سائنس کی بجائے اس نے نفسیات اور اخلاقیات کے علوم عمرانی پر
لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

نسیم انصاری

جوابِ دوست

دشتِ جنوں پرور ۱۹۴۵-۴۷ء

انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے اس کے بعد باقاعدگی سے
[illegible]نے لگے۔ اب یہ ایک ریسٹورنٹ الحمرا میں ہوتے تھے جو حاذق
[illegible]حب کی کوٹھی کے سامنے کے حصے میں کھل گیا تھا۔ ایک دفعہ
[illegible]شید احمد صاحب صدیقی کو بھی تکلیف دی گئی کہ وہ تشریف لا کر
نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائیں۔ اس جلسہ میں آل احمد سرور
[illegible]حب رامپور سے بحیثیت مہمانِ خصوصی تشریف لائے تھے، رشید صاحب
[illegible]فرمایا کہ جب مجھے بتایا گیا کہ سرور صاحب آ رہے ہیں تو میں سمجھ
[illegible]کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوگی۔ سرور صاحب نے مودبانہ عرض کیا کہ
[illegible]بڑ تو زندگی کی علامت ہے، اس سے ڈرنا کیسا؟ ایک جلسہ میں
[illegible]تشق بٹالوی صاحب آئے تھے، ایک دفعہ مونس رضا صاحب نے
[illegible]سانہ سنایا تھا، ویسے باقر مہدی اور خلیل الرحمٰن اعظمی تو اکثر اپنی
[illegible]لیں اور غزلیں پیش کرتے تھے۔

خورشید الاسلام صاحب کا ان جلسوں میں آنا مجھے یاد
[illegible]یں، وہ اس زمانے میں یونیورسٹی کے اسٹاف میں آچکے تھے
[illegible]ب ان کا تقرر ہو گیا تو وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد
[illegible]نے انھیں اپنے گھر بلا لیا۔ وہاں سر یعقوب بھی تھے۔ پہلے تو سر
[illegible]ضیاء الدین نے سر یعقوب سے شکایت کی کہ دیکھیے قوم کا کیا حال
[illegible]ہو رہا ہے کہ سب ذہین لڑکے اپنی خاندانی روایات کو چھوڑ کر
[illegible]ے راہ روی اختیار کر رہے ہیں اور کچھ تو دہریت کی طرف بھی مائل
[illegible]یں۔ سر یعقوب نے جو کچھ بھی سنا اس کی تائید کر دی۔ جو کچھ
[illegible]بھی سنا میں نے اس وجہ سے کہا کہ انھیں ثقلِ سماعت تھا اور
وہ کان میں بھونپو لگا کر باتیں سنتے تھے۔ اس کے بعد سر ضیاء الدین
خورشید صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔

"دیکھیے خورشید صاحب، آپ کا تقرر تو ہو گیا ہے
لیکن خیال رہے کہ یہ مسلم یونیورسٹی ہے۔ یہاں
خدا اور وائس چانسلر کے متعلق کچھ کہنے میں احتیاط
سے کام لیجیے گا۔"

خورشید صاحب اکثر شام کو اپنے دوستوں سے ملنے آفتاب ہوسٹل
آجاتے تھے۔ اُن کے دوست آشکار صاحب اور شجاع احمد زیبا
پورب رخ کے اوپر کی منزل کے کمروں میں رہتے تھے۔ میں اس کے
مقابل نیچے کی منزل کے کمرہ ۳۶ میں تھا۔ حسن اختر اوپر کی منزل
میں تھے اور متین الزماں نیچے کی منزل میں۔ یہ دونوں میرے کلاس
فیلو تھے۔ حسن اختر کا ارادہ انجینئرنگ پڑھنے کا تھا۔ اس لیے ان
کے مضامین میں سائنس کے ساتھ ریاضی تھی اور متین الزماں آرٹس
کے طالب علم تھے۔ یہ دونوں میرے اسکول کے ساتھیوں میں تھے۔
حسن اختر اسکول میں فارسی پڑھتے تھے اور اکثر میرا امتحان لیا کرتے
تھے۔ ایک دن کہنے لگے کہ اچھا ایک پہیلی بوجھو

گر ہمی خواہی کہ دانی کہ اسم آں سیمیں ذقن
قلب قلب قلب را بر قلب قلب قلب زن

دو دن تک میں اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پہلے
ٹکڑے کا مطلب تو میں سمجھ گیا کہ قلب کے بیچ کے حرف کو بدل دو
لیکن دوسرے مصرعہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ حسن اختر جب

بہت الجھن [illegible] کہا کہ ایک کتاب کے بہت سے حروف کے نمبر
تے ہیں۔ انھیں نمبروں کو بدل دو۔ تب میں سمجھا اور میں نے خوشی
سے چیخ کر کہا "اسم آں سیمیں زقن بلقیس است"۔ ل کے تیس نمبر ہوتے
ہیں اور تیس کو فارسی میں "سی" کہتے ہیں۔ سی کو الٹ دیا جائے تو
ل اور "س" ہو گیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر بلقیس بنا۔

حسن اختر کو اسکول کے زمانے سے ہی اصغر گونڈوی کا کلام
بہت پسند تھا۔ کہتے تھے کہ خیال اور انداز بیان کی نزاکت جیسی اصغر
کے یہاں ملتی ہے کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ دو شعر کئی بار سنائے

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اور

سنتا ہوں بڑے شوق سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

مجھے اصغر سے زیادہ حسرت کا کلام پسند تھا۔ میں کہتا تھا کہ
حسرت کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے کہ جیسے اپنے ہی دل کی بات کہہ دی
ہو۔ اب جب پچھلی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ
آدابِ صحبت تو میں نے سعدی کی گلستان سے سیکھے اور آدابِ محبت حسرت
کی غزلوں سے۔

آدابِ صحبت کا قصہ یہ ہے کہ جب چھ سات برس کی عمر ہوئی
تو آمدنامہ کے بعد گلستاں شروع کرا دی گئی۔ والد نے فرمایا کہ پہلا
باب "در سیرتِ پادشاہاں" پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں بادشاہت
تو کرنا نہیں ہے، اس کے بعد "در عشق و جوانی" کے ورق الٹتے
ہوئے فرمایا کہ یہ بعد کی چیزیں ہیں۔ فی الحال آدابِ صحبت کی ضرورت
ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گلستاں کا صرف یہی ایک باب مجھے بطور سبق پڑھایا گیا اور
بوستاں میں بھی باب اول "در عدل و رائے و تدبیر جہانداری" ہی
تک نوبت آئی۔ اس کے بعد صرف ایک کتاب مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی
کی بطور سبق پڑھائی گئی۔ عربی میں گرامر کے سبق والد گرمیوں کی
چھٹیوں میں دیتے تھے [illegible] عربی لٹریچر پڑھنے کی نوبت نہیں

آتی [illegible] کے سبق مولوی عبد السلام صاحب [illegible] سے
تعلیم کا یہ طریقہ ہمارے گھر میں صدیوں سے چلا آتا ہے کہ ابتدائی [illegible]
پڑھا دی جاتی ہیں اور باقی خود شاگرد کی طبیعت پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جس
مضمون میں جتنی مہارت حاصل کرنا چاہے، کرے۔ میرے ساتھ
بھی یہی ہوا۔

حسن اختر سے ۷۴ء کے تینتیس برس کے بعد کراچی میں [illegible]
میں ملاقات ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کل ہی ملے تھے۔ وہی اصغر اور
حسرت کی باتیں، حافظ اور خسرو کی غزلیں اور بیچ بیچ میں میری عربی
اور اُن کی انجینئرنگ کی تعلیم کے زمانے کے واقعات ایک دوسرے کو
سنائے گئے۔

متین الزماں اس زمانہ میں یعنی ۴۶-۱۹۴۵ء میں نہرو کی ڈسکوری
آف انڈیا پڑھ رہے تھے، یہ تبھی شائع ہوئی تھی۔ مجھے بھی شوق ہوا
اس سے پہلے اسکول کے زمانے میں ان کی خود نوشت سرگذشت کا
اردو ترجمہ "میری کہانی" دیکھ چکا تھا۔ ہندوستان کی پرانی تاریخ
سے میری واقفیت کچھ یونہی سی تھی۔ بس جو کچھ ایشوری پرشاد کی کتاب
میں پڑھا تھا، وہی جانتا تھا۔ البتہ گھر میں گیتا کا منظوم ترجمہ فارسی
میں پڑھا تھا۔ لیکن اس میں کا بہت تھوڑا حصہ سمجھ میں آیا تھا۔ ڈسکوری
آف انڈیا سے بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے
بعد غبارِ خاطر بھی دیکھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے
مذہب سائنس اور فلسفہ کے آپس کے تعلق پر بحث کی ہے اور [illegible]
ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ایک نے ہندو شاستروں اور گیتا کی [illegible]
حقیقت دریافت کی تو دوسرے نے اپنے مذہب کے سہارے۔
مولانا آزاد کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ وہ مذہبی عالم ہیں۔ جواہر لال
کے متعلق ہم سب کا خیال تھا کہ وہ لامذہب ہیں۔ ان کی [illegible]
کر اس رائے کو بدلنا پڑا۔ جواہر لال سیاسی اعتبار سے لامذہب
تھے، لیکن روحانی اعتبار سے مذہب سے ان کا گہرا تعلق تھا۔
یہاں مذہب سے مراد ظاہری رسوم والے مذہب سے نہیں ہے
بلکہ دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے اعتقاد سے ہے۔ مجھے ان کی
تصنیف کے اس حصے سے بہت دلچسپی تھی۔ کیونکہ اس زمانے

سائنس خود بڑی مذہبی الجھنوں میں تھا۔ مذہب کی ظاہری رسموں سے دلچسپی خود بخود کم ہوتی جا رہی تھی، ادھر مارکسسٹ فلسفہ میں مذہب کو کوئی خانہ دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس فلسفہ سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ادھر مذہب کو زندگی سے بالکل نکال دینے کی نہ تو ہمت پڑتی تھی اور نہ جی چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں بس ایک ہی دروازہ کھلا دکھائی دیا جو ہم ایسے گنہگاروں کے لیے صدیوں سے کھلا ہوا تھا اور وہ تھا وحدۃ الوجود کا دروازہ کہ اس کے اندر داخلے کے بعد بہت سی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن وحدۃ الوجود کے متعلق میری معلومات بالکل سطحی تھیں۔ جواہر لال نہرو کی کتاب پڑھ کر یہ تو اطمینان ہوا کہ میری طرح اور بھی لوگ اسی بھول بھلیاں میں بھٹک رہے ہیں۔

خدا کے مسئلہ میں اور باتوں کے علاوہ دو باتیں قابلِ غور ہیں ایک تو تخلیق کا مسئلہ اور دوسرے ذات و صفات کا معاملہ۔ تخلیق کے متعلق ہمیشہ سے دو نظریات رہے ہیں۔ ایک کے مطابق خدا کا تصور انسانی دماغ کی اختراع ہے، عالم قدیم ہے اور تخلیق کا عمل نہیں ہوا۔ دوسرا نظریہ ہے کہ خالق قدیم ہے اور عالم تخلیق کیا گیا ہے۔ وحدت الوجود میں خالق اور مخلوق کی یہ تقسیم ختم ہو جاتی ہے۔ رہا تخلیق کا معاملہ، اکثر کن فیکون کے ذریعے مسئلہ کو حل کرتے ہیں۔ باقی سکوت اختیار کرتے ہیں۔

مجھے تخلیق کے متعلق کبھی کوئی الجھن نہیں ہوئی، معاملہ ذات و صفات پر اٹک جاتا تھا اگر وہ ویسا ہی رحمٰن، رحیم، قاہر اور علیم ہے جیسے کوئی انسان؛ تو بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایسا ہی رحیم ہے جیسے ہم میں سے کوئی، تو لوگ جسمانی اور روحانی اذیت میں کیوں مبتلا کیے جاتے ہیں؟ وہ بچّہ جو پیدائش ہی سے معذور پیدا کیا گیا ہے آخر اس پر اور اس کے ماں باپ پر یہ کیسا رحم ہے؟ اس لیے ذاتی یا مجسم خدا کا تصور میرے لیے کشش نہیں رکھتا تھا۔ ہاں وہ جو ہر ترازِ گمان ہے جس کے قانون کسی کے لیے نہیں بدلتے اور جس کے قانون کے باہر نہ تو کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی شاعر ایک مصرعہ موزوں کر سکتا ہے۔ بیشک وہی قادر مطلق ہے۔ قادر مطلق؟ تو ہم گنہگار بندے، جن میں کچھ مسلمان ہیں کچھ مشرک، کچھ کافر، کچھ عابد، کچھ فاسق اور فاجر۔ کیا یہ سب مجبور ہیں؟ اشارے تو ایسے کے ملتے ہیں، کہا گیا ہے کہ "اگر ہم چاہتے تو سب کو ہدایت دے دیتے۔"

والد کا خیال تھا کہ ہم سب مجبور ہیں لیکن ہماری فطرت میں ہے کہ اپنے ہر عمل کو اختیار سمجھیں اور ہدایت کا سامان اسی انتظام کی ایک کڑی ہے۔

دیکھیے پیر رومی نے خالق و مخلوق اور جبر و اختیار کے مسئلہ کو کیسی خوبصورتی سے حل کیا ہے۔

بالیست کہ ہم او بود کہ می گفت عن الحق۔ در صورت
الٰہی منصور نہ بود آں کہ بر آں دار برآمد، خلق بگمان
شدہ۔

میں نے ایک دفعہ والد سے پوچھا تھا کہ معتزلہ تو عقل کے اتنے بڑے پرستار تھے، آخر وہ قدر کے کیوں قائل تھے۔ فرمایا کہ یہ معاملہ سیاسی تھا۔ معتزلہ عموماً حاکم وقت کے چشم و ابرو نہیں دیکھتے تھے (سوائے دو تین خلفائے عباسیہ کے) لیکن اکثر ان کے مخالف اپنے فلسفے کو حاکم وقت کی مرضی کے باہر نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کے یعنی اشاعرہ کے فلسفے کے معنیٰ یہ ہوتے تھے کہ حاکم وقت کا تقرر مرضئ الٰہی سے ہوا ہے اور اس میں کسی چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ معتزلہ اختیار کے فلسفے کی بنا پر انھیں ظلّ الٰہی نہیں تسلیم کرتے تھے۔

معتزلہ کے لیے طالب علمی کے زمانے ہی سے ذہنی کشش محسوس ہوتی تھی۔ لیکن ان کے اختیار کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب مارکس کے فلسفے سے سابقہ پڑا تو دیکھا کہ وہ تو اس معاملے میں بالکل جبر کے قایل ہیں۔ کم از کم ان کی تاریخی مادیت سے تو میں نے یہی نتیجہ نکالا۔ پھر بھی معتزلہ سے ایک طرح کا لگاؤ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ فلسفہ کے دقیق مسائل نہ بچپن میں سمجھ میں آتے تھے اور نہ اب۔ لیکن فلسفے کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ اس میں عالم اور مبتدی ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے ریاضی یا کسی اور علم میں بغیر اس پر عبور کے کسی کو اپنی رائے دینے کی جرأت کرنا تو دور کنار کوئی

خالد بن ولید

عورتوں اور بچوں کے غول آدھی رات تک جھنڈے دیکھنے آتے رہے جن کے گرد مشعلوں کا حلقہ کھڑا ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کیے ہوئے مکان میں اترے تو پہلی بار مکان چھوٹا معلوم ہوا۔ اپنے عزیزوں سے مل رہے تھے کہ غلام نے حاضری کا حکم سنا دیا۔ خلیفہ اکبر نے خلوت میں باریاب کیا۔ ارشاد ہوا۔

"سیف اللہ کی طرح عکرمہ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا جب خبریں آنے لگیں کہ مسیلمہ پچاس ہزار لشکر کے ساتھ نکل رہا ہے تو شرجیل بن حسنہ کو ایک فوج دے کر عکرمہؓ کی کمک پر بھیجا گیا۔ عکرمہ نے شاید یہ سوچ کر کہ فتح کا سہرا ان کے سر رہے، شرجیلؓ کا انتظار کیے بغیر حملہ کر دیا اور شکست کھائی۔ شکست کی خبر سنتے ہی شرجیل کو حکم بھیجا گیا کہ تم انتظار کرو۔ یہ مہم عظیم سیف اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ پر سر ہونے والی نہیں۔ لیکن شرجیلؓ نے بھی عکرمہؓ ہی کی طرح فتح کی ۔ا۔ میں حملہ کر دیا اور عکرمہؓ ہی کی طرح شکست کھائی۔ اب مسیلمہ پورے عرب میں وہ تنہا مدعی نبوت ہے جو خلافت کی دو بڑی بڑی فوجوں اور بڑے بڑے سپہ سالاروں کو شکست فاش دے چکا ہے اور مزید فوجیں جمع کر رہا ہے اور بڑے بڑے منصوبے باندھ رہا ہے۔"

"اگر رسول اللہ نے کسی غلام کے ہاتھ خبر بھیج دی ہوتی تو یہ غلام بستر سے اٹھتا اور مسیلمہ کا سر کاٹ کر بارگاہِ خلافت کی سیڑھیوں پر ڈال دیتا۔"

"خبر آئی ہے کہ سجاح بھی بڑی دھوم دھام سے نکلی ہے اور مسیلمہ سے شادی کر کے اس کے حوصلوں میں پیوند لگا رہی ہے۔"

"حکم دیجیے کہ دونوں کے سر نذر میں گزاروں"۔

"شمشیر الٰہی کی زبان سے اسی جواب کی توقع تھی، لیکن تمہارا لشکر؟"

"خدا کا رحم، رسول کا کرم اور آپ کی دعا شامل حال ہو تو اسی لشکر سے پورا عرب فتح کر کے قدموں میں رکھ دوں۔"

"تو پھر میری خواہش ہے کہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت اپنی کمان میں لو۔ اور دشت یمامہ کی زمین ان ناپاک ہستیوں سے پاک کر دو۔"

"حکم ہو تو ابھی سوار ہو جاؤں۔"

"میں مہاجرین و انصار کو جلد از جلد تیار کرتا ہوں۔"

مدینے سے رخصت کا منظر ساری عمر کے لیے آ[illegible] وظیفہ ہو گیا۔ قبۂ الٰہی سے نکلے تو داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ لشکر کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ باگ اٹھنے والی تھی۔ شفیق ہاتھ، وہ مضبوط ہاتھ وہ بے نظیر ہاتھ جنہوں نے بکھرا امت کو سمیٹ کر اپنی مٹھیوں میں بند کر لیا تھا اٹھے اور دعا

[illegible] لگام تھامے ہوئے وہ [illegible] گھوڑے سے اترنے [illegible]

"بیٹھے رہو ۔۔۔ اور سنو ۔۔۔ جو میں کہہ رہا ہوں۔"

[illegible]س کے آگے دو بلند و بالا اونٹوں پر دو جھنڈے بندھے کھڑے تھے۔ [illegible]ن کے پیچھے وہ مہاجرین تھے وہ انصار تھے جنہوں نے رسول خدا کی رکاب [illegible]یں تلواریں چلائی تھیں اور جو ابوحذیفہؓ، زید بن خطابؓ اور ثابت بن [illegible]یسؓ کی سرداری میں سوار ہوئے تھے اور خلقت امڈ آئی تھی۔ اس [illegible]سپہ سالار کو دیکھنے کے لیے جو مسیلمہ کذاب پر عذاب الٰہی کی طرح اٹھ رہا تھا اور جس کی لگام تھامے ہوئے نائب رسول ہدایات دے رہے تھے کہ حضرت زبیرؓ کی آواز آئی۔

"یا نائب رسول اللہ ۔ مسیلمہ کا سر مبارک ہو۔"

"خدا تجھ کو جزائے خیر دے ۔۔۔ وہ کیسے۔"

"خدا کی قسم آپ کا سپہ سالار جس جاہ و جلال سے سوار ہوا ہے وہ اعلان کر رہا ہے کہ اگر مسیلمہ آسمان سے ستارے بھی توڑ لائے گا تو بھی سیف اللہ کے غضب کا شکار ہو کر رہے گا۔"

[illegible]سارا منظر مرحبا کی تکرار سے بھر گیا۔ بازو پر تھپکی دی اور ساعت [illegible]خری بار اس آواز رحمت سے مشرف ہوئی۔

"جاؤ ۔ شمشیر الٰہی کے جوہر دکھاؤ ۔ قہر الٰہی کے جھنڈے اڑاؤ۔"

[illegible]س نے سر جھکا کر گھوڑے کو چھیڑ دیا۔ بطاح پہ نازل ہو رہا تھا کہ شرحبیل [illegible]حسنہ حاضر ہوئے۔

"نائب رسول کے حکم کے مطابق ہمارا انتظار کیوں نہ کیا۔ تمہاری شکست نے دشمنِ اسلام کو دلیر کر دیا۔ دامنِ خلافت داغدار کر دیا۔"

[illegible]سر جھکائے کھڑے رہے سنتے رہے۔

یہ محمدی علم کا سایہ تھا جس نے بتایا تھا کہ مسیلمہ کے دل بادل [illegible]سامنا ہو گیا۔ خیموں کا ایک شہر بسا تھا کہ حد نگاہ تک آباد تھا جس [illegible]ے کنویں اور چشمے حصار میں لے کر خیمہ برپا کرنے کا حکم دیا۔ [illegible]حالت جلال میں تھی جب وہ چند سواروں کے ساتھ غنیم

کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے نکلا تھا۔ کمال کی بلندی کے [illegible] سے نکلا تھا کہ شعلوں کے بگولے چکنے لگے۔ ہاتھ اٹھا کر چند سو سواروں کو جو عقب میں آ رہے تھے ساکت کر دیا۔ شعلیں اور قریب آگئیں۔ اتنے قریب آگئیں کہ بنی حنیف کا مشہور سوار اور مسیلمہ کا مغرور سپہ سالار پہچانا جانے لگا۔ سیف اللہ کو دیکھتے ہی گرجا۔

"کون۔"

وہ خاموش رہا لیکن ضرار بن الازورؓ جو شجاعت و شہامت اور جوش و خروش کا مجسمہ تھے کڑک اٹھے۔

"خدا کی تلوار
محمد کا علم بردار
خلیفۂ اکبر کا سپہ سالار خالد بن ولید"

مجاعہ ابن مرارہ نے تلوار پھینک دی۔ ضرار نے حیث کر اپنی کمند سے کس لیا اور ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گھوڑا پھیر دیا۔ خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی مجاعہ گرجنے لگا۔

"اے سپہ سالار تیرے باپ اور بنی مخزوم کے بادشاہ ولید کا ہم پر ایک احسان باقی ہے۔ اتنی مہلت دے کہ میں ادا کر دوں۔"

"ادا کر۔"

"تو سن ۔ مسیلمہ کی رکاب میں چودہ ہزار منتخب گھوڑے، اٹھارہ ہزار سانڈ (اونٹ) اور اٹھارہ ہزار پیدل ہیں اور ایسے ہیں جیسے پورے عرب میں نہیں نکلیں گے۔ عکرمہ اور شرحبیل کے بڑے بڑے نامور لشکری بھر میں خاک کا پیوند ہو گئے۔ اس لیے تو ان بیمار گھوڑوں اور لاغر اونٹوں اور بھوکے ننگے لشکریوں کے ساتھ میدان سے بھاگ اور مکے میں مقیم ہو جا۔ میں تیری اور تمام بنی مخزوم کی عظمت کی قسم کھاتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مسیلمہ یہاں سے اٹھا تو مدینے سے پہلے دم نہیں لے گا۔"

"ان کے بیڑیاں ڈال دو۔ یہ مسیلمہ کے سر کے ساتھ
انشاء اللہ دربار خلافت روانہ ہوگا۔"

ابھی مسیلمہ کی صحیح قوت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ سلیط ایک فوج کے
ساتھ حاضر ہوا۔

"آپ کی روانگی کے بعد نائب رسول آپ کی فوج کی
قلت اور غنیم کی کثرت سے مضطرب ہو گئے۔ مجلس
شوریٰ نے حکم لگایا کہ مسیلمہ کے پاس عرب کے بڑے
بڑے نامور جمع ہو گئے ہیں اور بنی حنیف اپنے
علاقوں کے شیر بھی ہیں اور چوہے بھی۔ اگر خفیہ راستے
سے سیف اللہ کی پشت پر حملہ آور ہو گئے تو نقصان
پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے مجھے حکم ہوا کہ کمک کو کمان
میں لے کر فوراً حاضر خدمت ہو جاؤں۔"

"عکرمہ اور شرجیل کی بے ثباتی اور بے وقوفی
نے دربار خلافت میں اضطراب پھیلا دیا۔ ورنہ ہم تو
یہ بھی جانتے ہیں کہ مسیلمہ نے سجاح کے لیے کون سا
کھانا پکوایا ہے۔ تاہم تم نائب رسول کے حکم کی تعمیل
میں لشکر کی پشت پر قائم ہو جاؤ۔"

سجاح بنت حارث لیلیٰ کی طرح سانولی اور زہریلی
بنی تمیم اور بنو تغلب کے ہزاروں نوجوانوں کی راتوں کا خواب، شجاعت
میں مثالی، خطابت میں طاق، گھوڑے پر چڑھ کر تلوار ملی کی تو ایک
ملک کے نوجوان ہتھیار پہن کر جھنڈے کے نیچے جان دینے کھڑے
ہو گئے۔ مسیلمہ نے جو اس کی چمک دمک کی کہانیاں سنیں تو اپنے
مال و منال کے افسانے سفارت میں بھیج دیے۔ خیمہ کمخواب
میں اس طرح ملے کہ خیمہ حجلۂ عروسی بن گیا۔ مسیلمہ نے روزہ موقوف
اور نماز کو مجروح کر دیا۔ سجاح نے حج و زکوٰۃ کو سولی پر چڑھا دیا
ایک نے شراب کے دریا بہا دیے دوسری نے زنا کے بازار لگا دیے
دونوں کو ہانک کے اس طرح چلا کر تمام عرب کی بیٹیاں غلام ہونے
لگیں۔

مجاعہ کو ام تمیم کی حراست میں دے کر زید بن خطابؓ کو
[illegible] میسرہ [illegible]
ساتھ قلب پر تعینات کر دیا۔ اور عمری علم کی [illegible] میدان
جنگ روشن کر دیا۔ مسیلمہ سرخ ریشم کے طلاکار جھنڈے کے نیچے
کھڑا ہوا تھا۔ اس کی سرخ قبا کی آستینوں اور بازوؤں پر سونے
کا کام جگمگا رہا تھا اور سرخ عمامے کی کلغی دھوپ میں چمک رہی تھی۔
اسی طرح کے دوسرے جھنڈے کے نیچے سجاح سر سے پاؤں تک شعلہ
جوالہ بنی اپنی صفوں کو للکار رہی تھی۔ پہلی ہی ٹکر اتنی قاتل ہوئی کہ تین سو
مجاہد شہید ہو گئے۔ ان میں بڑے بڑے صحابی رسول اور حافظ قرآن [illegible]
اور غنیم کا پورا قلب خیمے پر چڑھ آیا۔ وہ میسرے کے قدم جما کر پلٹا
بنی حنیف سیلاب کی طرح امڈ رہے تھے۔ سرداران غلام کا نام لے
لے کر آوازیں دیں کہ اپنے اپنے قبیلوں کی شجاعت کا حساب پیش کریں
اور تمام قریش کو سمیٹ کر اس زور شور سے حملہ کیا کہ اپنے تمام کھوئے
ہوئے مقامات چھین لیے۔ مسیلمہ کے میمنہ کا سردار زید بن خطابؓ کی
تلوار کا غلاف ہو گیا۔ اس کے میسرے کا کماندار عبدالرحمٰن بن ابو [illegible]
کے تیر کا شکار ہو گیا۔ میدان قابو میں آتے ہی مسیلمہ کو للکار دیا۔ [illegible]
اس طرح سامنے آیا کہ پچاس سوار نگہبانی پر مامور تھے اور خود سجاح
اس کی پشت پر موجود تھی۔

"صلح کی وہ کون سی شرطیں ہیں جو تو پیش کرتا ہے؟"

اس نے بائیں طرف منہ پھیر کر ظاہر کیا کہ وہ جبرئیلؑ سے مشورہ کر رہا
ہے۔ قبل اس کے کہ مشورہ پورا ہو تلوار کا پورا ہاتھ کلائی پر ملا [illegible]
جو آہنی دستانے کے باوجود جھول گیا۔ مسیلمہ نے اپنے سدھے ہوئے
گھوڑے کو پیچھے ریل دیا جس سے سواروں کا حلقہ ٹوٹ گیا اور سجاح
کو لے کر پوری رفتار سے بھاگا۔ بنی حنیف کی ہزاروں جانیں قربان کر [illegible]
وہ فرار حاصل کر سکا اور اس عالی شان باغ میں گھس گیا جس کی فصیل
زیر کر لینا آسان نہ تھا۔ براء بن مالکؓ جوش جہاد میں جست لگا کر [illegible]
پر پہنچ گئے۔ صحابی رسول کی اس جسارت پر وہ تڑپ گیا۔ پوری [illegible]
سے اخفر کو چھوڑ دیا۔ پہلی بار اخفر کی اس عجیب و غریب صفت کا علم
دیوار کے قریب پہنچ کر وہ اڑا اور دونوں ہاتھ [illegible] ڈال
دیے اور اتنی مہلت دی کہ وہ نیچے سے [illegible]

بڑی [illegible] کے [illegible] سجاح کا [illegible]
لا۔ بنی حنیف کے وہ اکیس ہزار سپاہی جو میدان جنگ میں اس کے
غضب کا شکار ہوئے اگر رکاب میں ہوتے تو آدھی دنیا فتح ہو چکی ہوتی

مجاعہ نے مسیلمہ کا سر اور سجاح کا جھنڈا دیکھا تو حیرت سے دیکھتا رہا۔ دیر تک آنکھیں پھاڑے بیٹھا رہا۔

"فاتح — میں نے مسیلمہ کو زبان دی تھی کہ جب تو سیف اللہ پر غالب آجائے گا تو میں اپنی بیٹی تیرے نکاح میں دے دوں گا۔ مگر اب — کہ مسیلمہ مارا گیا اور مدینے کا مقتل میرا انتظار کر رہا ہے آرزو ہے کہ اس شان سے جان دوں جو مجھ جیسے سردار کے شایانِ شان ہے لیکن میری بیٹی میری شان کی گردن کا طوق بن گئی اے سپہ سالار اسلام تو اسے قبول کر لے۔"

"آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سیف اللہ نے چونک کر دیکھا تو معاویہ بن ابی سفیان اس کی رکاب کے پاس کھڑے تھے۔

"کیوں؟"

"اشقر اتنی دیر سے اسی جگہ کھڑا ہوا ہے۔"

سامنے وہ خیمہ لگا تھا جو جس دیار میں لگتا، اس کی زمین ہلنے لگتی معاویہ نے اشقر کی لگام تھام لی وہ اتر پڑا۔ خیمے کے دونوں پہلوؤں پر مسلح سواروں کا ہجوم کھڑا تھا۔

"تم لوگ کمر کھولو اور آرام کرو۔"

نماز فجر کے بعد سے مصلے پر بیٹھے تھے۔ دمشق کا سورج جو شاہی شاعری کے دفتر کا ایک باب بن چکا تھا، آب و تاب سے آراستہ ہو رہا تھا کہ غلام نے ایک سائل کو پیش کیا۔ لانبا چوڑا ادھیڑ عمر کا ایک آدمی، سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ سیاہ ریشم کی اونچی گوشے دار ٹوپی، سیاہ ریشم کی نیچی قبا پہ سیاہ جبہ جس کے گریبان سے جنیو کی طرح پڑی ہوئی سیاہ پٹی جھانکتی ہوئی۔ اس کے نیچے صلیب لٹکتی ہوئی، انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے مصلے کے سامنے قالین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ دو زانو بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کر [illegible] شاہی مہر [illegible] آہستہ سے کہا۔

"شہنشاہ کا حکم ہے۔"

"شہنشاہ؟"

"ہرقل — ہرقل اعظم"

"تم کون ہو؟"

"شہنشاہ کی فوج کا ایک سالار۔ یرموک میں تین ہزار شاہی سوار میرے ماتحت تھے۔"

ایک سایہ اس کے چہرے پر آیا اور گزر گیا۔

"ہوں۔"

"شہنشاہ کا فرمان ہے آپ کے نام۔ اگر خلوت ہے تو پڑھ کر سنا دوں۔"

ذرا سے تامل کے بعد ابرو کا اشارہ کر دیا۔

تیغ آسمانی، فاتح عراق و شام، سپہ سالار اعظم خالد بن ولید کے نام

دمشق کی مسجد میں جو سلوک تمہارے ساتھ ہوا ہم کو اس کا علم تھا، لیکن یقین نہیں تھا۔ اب مدینے میں تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے، اس کا بھی ہم کو علم ہے اور اب ہم یقین کرنے پر مجبور بھی ہو چکے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک رشتہ ہے جو سپاہی اور سپاہی کے درمیان ہوتا ہے۔ سپہ سالار اور سپہ سالار کے درمیان ہوتا ہے۔ روما الکبریٰ کے تختِ اعظم پر جلوس کرنے والے ہاتھ سے تم نے شام چھین لیا۔ ہم تمہاری سپہ سالاری کو سلام کرتے ہیں۔ تم کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر تم روم آنے پر تیار ہو سکو تو ایک منزل تک ہرقل تمہاری پیشوائی کے لیے پا پیادہ آئے گا۔ مہدِ مسیح کے فاتح مہدِ مسیح کی قسم ہرقل تمہارا ایسا استقبال کرے گا، کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہ ہو گی۔

لیکن اگر تم اس پر رضامند نہیں تو میرے سفیر ہے، اردگرد کون سے کے بھائی ہے جو تمہارے ہاتھ پر سلطان

پہنچا ایک لشکر دو ہم ایک لاکھ سواروں کے ساتھ
تمہارے متعین کیے ہوئے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ ہم ایک
دوست کی طرح تمہارے مشوروں کے محتاج ہوں گے
شام اور مصر کے بادشاہ کے مشوروں کے محتاج ہوں گے۔

اے سپہ سالار اعظم مدینے مت جانا۔

ہرقل۔ شہنشاہ شرق و غرب

اس نے خط پڑھ کر خریطۂ شاہی میں بند کیا۔ کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کیا۔ سیف اللہ اس کی دونوں ہتھیلیوں کی طشتری پر رکھے ہوئے خریطۂ زرّیں کو دیکھتے رہے۔

"تم اپنی خدمت انجام دے چکے۔ اب جا سکتے ہو۔"

"مجھے حکم ہے کہ دمشق کے پادری کا مہمان رہوں اور شہنشاہ کے حکمِ ثانی تک آپ کے ارشاد کا انتظار کروں۔"

"تم جا سکتے ہو۔"

ابی سفیان مدینے جا چکے تھے۔ عمرو بن العاص 'بیماری' کی حالت میں دمشق سے سوار ہوئے تھے اور ایک ہی منزل پر پڑاؤ ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یزید بن ابی سفیان حمص کے دروازے پر تھے۔ اور معاویہ بن ابی سفیان ان کی نیابت کر رہے تھے اور لشکرِ اسلام کے دستے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے مکے اور مدینے اور طائف کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ رخصت ہو رہے تھے کہ دمشق میں شور مچ گیا۔

"سیف اللہ کا خیمہ اُٹھ رہا ہے۔"

"سیف اللہ گرفتار ہو کے مدینے جا رہے ہیں۔"

جاسوسوں نے افواہ ناموں سے ڈاک کے تھیلے بھر دیے۔ صحابیِ کبیر ابو عبیدہ بن الجراح کی برگزیدگی کانپ اُٹھی۔ جمعے کا خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو لرزنے لگے۔ اس زور سے اعلان کیا کہ در و دیوار سُن گئے۔

"عمر بن خطاب کسریٰ نہیں ہیں، ہرقل نہیں ہیں، امیر المومنین ہیں۔ ہم نے ان کو خلافت کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر امیر المومنین احکامِ الٰہی اور ارشاداتِ نبوی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے

تو جراح کا بیٹا ان سے بھی اسی طرح مصافحہ کرے گا جس طرح تم سے کرتا رہا ہے۔"

جب سیف اللہ نے مسجد کے سامنے کھڑے ہوئے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا تو خاموشی سے الوداع کہنے والی آبدار آنکھیں تلواروں کی طرح چمکنے لگیں۔ نگاہیں صیقل کیے ہوئے نیزوں کی طرح تڑپنے لگیں۔ ہزاروں کا ہجوم انھیں کوسوں تک رخصت کرنے گیا جس میں خود امیر شامل تھے۔

خود عبد الرحمان بن خالدؓ امیرِ سفر تھے، جن کی رکاب میں قریش کے ان چار ہزار سواروں کے گھوڑے چل رہے تھے جو موت کو اپنی تلوار کا غلاف کہتے تھے اور جو سیف اللہ کے گھوڑے کی ایک نعل پر اپنا سر ڈالنے کو حاضر تھے۔ عبد الرحمان نے صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ بڑے بڑے قبیلوں کی نمائندہ آبادیوں میں قیام کرتے، خطابت کے جوہر دکھاتے، سخاوت کے دریا بہاتے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

تبوک میں سیف اللہ کے خیام برپا تھے۔ ایک لمبے چوڑے ... کے کنارے کھجور کے درختوں کی چھتریوں کے نیچے شقائق کے پھولوں کے ... لگے تھے۔ ان کے سامنے اردکون کی تختے میں دی ہوئی شیر کی کھال پر ... ہوئے سیف اللہ بنو حنیفہ کے سرداروں سے ملاقات کر رہے تھے کہ عبد الرحمان نے ایک نوجوان کو پیش کیا جو ایرانیوں کی اونچی ٹوپی اور زرد اطلس کی قبا پر سیاہ چمڑے کے موزے پہنے تھا جن سے ... ازار کے گھٹنے جھانک رہے تھے۔ وہ سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔ ایرانی تصویروں کی طرح سفید رنگ، اونچی ناک، لانبی آنکھیں، ترشے ہوئے پتلے سرخ ہونٹ، لانبی لانبی انگلیوں سے سجے ہوئے نازک ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ تنہائی ہوتے ہی اور ... ہو گیا۔

(جاری ہے)

امتیاز احمد

ڈاکٹر ذاکر حسین

[ذاکر صاحب کے نوے دیں یوم پیدائش پر تہذیب الاخلاق کا نذرانہ عقیدت۔ ادارہ]

مادرِ درس گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اُن فرزانوں میں جنھوں
نی دیوانگی میں بھی فرزانگی کی بہترین مثالیں پیش کیں، ذاکر صاحب کو
ممتاز و نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور سے
اپنی مادر درس گاہ کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی نمایاں خدمات انجام
اور تاحیات انھیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، یہاں تک کہ اسی
ت میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج اپنی شہرت اور عظمت کے عہدِ زرّیں سے
رہا تھا جب ذاکر حسین یہاں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ (سائنس)
نے کے بعد وہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے لیکن ناسازیِ طبع کی
سے مجبوراً وہاں سے واپس آکر بی۔ اے میں داخلہ لیا اور کالج میں
آئے۔ پھر ایم۔ اے (معاشیات) میں داخلہ لے لیا اور جب
یہاں رہے، شرافت و نجابت کا بہترین نمونہ پیش کرتے رہے۔
کے یہاں کے دوستوں میں رشید احمد صدیقی خاص طور سے قابلِ ذکر
دوست ہی نہیں بلکہ ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم افادہ، ہم سبق اور ہم خیال
ہم مشرب و ہم مسلک و ہم راز بھی تھے۔

علی گڑھ کے دوران قیام ہی میں انھوں نے افلاطون کی مشہور
ب ریاست کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن افسوس کہ وہ زیادہ دنوں
نہ رہ سکے۔ نان کوآپریشن موومنٹ کی زد میں آکر انھوں نے
کالج کو خیرباد کہا لیکن اس میں بھی ذاتی مفاد کو نہیں مادر درس گاہ کی
سربلندی اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کو دخل تھا۔

اسے ہندی مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے یا کچھ اور کہ مادرِ درس گاہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے بانی کی بے انتہا دانشمندی کے باوجود
دیوانوں کے مقابلے میں فرزانے کم ہی پیدا کر سکی ہے۔ سرسید اور
اُن کے معدودے چند رفقا کے بعد اس ادارے کے پروردہ
خواہ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی ہوں یا مولانا محمد علی جوہر
سب ہی نے ہوش کی جگہ جوش اور فرزانگی کی جگہ دیوانگی کو ہی ترجیح
دی۔ شاید یہاں کے پروردوں کی یہی دیوانگی تھی جس نے کسی کو
علم و فن کا امام بنا دیا تو کسی کو شعر و شاعری کا؛ کسی کو شہرت کے
بامِ عروج تک پہنچا دیا تو کسی کے لیے وہ سمِ قاتل بھی ثابت ہوئی۔
ذاکر صاحب کو بھی وراثت میں یہی کچھ ہاتھ آیا لیکن وہ اسی پر بجوس کے
مارِ سرِ گنج کی طرح بیٹھے نہ رہے اور نہ ہی صوفیانہ قناعت پسندی کا
ثبوت دیا۔ بلکہ انھوں نے اپنی فہم و فراست اور دانش مندی سے
جوش کے ساتھ ہوش اور دیوانگی کے ساتھ فرزانگی بھی پیدا کر لی۔
یہی وجہ ہے کہ دیوانگی و فرزانگی اور جوش و ہوش کا جیسا خوبصورت
امتزاج ہمیں ان کی شخصیت میں ملتا ہے؛ ہندی مسلمان رہنماؤں میں
سرسید کے بعد ابوالکلام آزاد کے علاوہ اور کسی کی شخصیت میں

نظر میں نہیں آتا۔ ان تینوں شخصیتوں کے رفتار، گفتار اور کردار سبھی میں
دیوانگی اور فرزانگی کے توازن کا ایک عجیب انوکھا پن نظر آتا ہے۔
دیوانگی اپنی انتہا پر، فرزانگی اپنی انتہا پر۔
دیوانگی کی انتہا یہ تھی کہ صرف ایک شعر ۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

سن کر جذبات سے مغلوب ہو گئے اور نان کو آپریشن موومنٹ میں شامل ہو کر مادر درس گاہ کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن برائی اور شاید فرزانگی کی انتہا یہ ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر مادر درس گاہ کو خیرباد کہنے کے باوجود اپنے مقاصد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور گاندھی جی کی مدد سے کالج ہی کی جامع مسجد میں اپنی مادر درسگاہ کی حریف نہیں بلکہ حلیف کی حیثیت سے اور انہیں مقاصد کے پیش نظر جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی جو بعد میں یہاں سے منتقل ہو کر دہلی چلی گئی۔ یہاں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے جرمنی گئے اور وہاں مشہور جرمن ماہر معاشیات ڈاکٹر زومبارٹ کی نگرانی میں برطانوی ہند میں زراعت کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ساتھ ہی جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک کی تہذیب و تمدن اور تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ واپس آنے کے بعد ڈاکٹر عابد حسین اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تن من دھن سے جامعہ کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور جرمنی کے دوران قیام کیے مختلف مغربی ممالک کی تہذیب و تمدن اور تعلیمی نظام کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا اور مسلسل پچیس سال تک اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ایک حکیم قومی رہنما کی طرح طرح طرح کی تکلیف اور پریشانیاں برداشت کر کے اپنی عمر کے بہترین صلاحیتوں کو اس کی ترقی اور بقا کی کوششوں میں صرف کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے کس طرح جامعہ کی صورت میں اپنے قوم اور ملک کی خاطر جو قربانیاں دیں ان کا اندازہ اس معمولی مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں جامعہ کی تنخواہ صرف تین سو روپے تھی لیکن جامعہ کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی تنخواہ آہستہ آہستہ گھٹا کر صرف ۸۰ روپے کر لی اور آخر وقت تک اسی میں گزر بسر کی۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد مسلم یونیورسٹی پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تو ذاکر صاحب نے جامعہ کو چھوڑ کر اس کا رخ کیا کیونکہ جامعہ اب کم و بیش پودے سے تناور درخت بن کر پھیل چکی تھی اور اب اسے ان قربانیوں کی اس قدر ضرورت نہیں رہ گئی تھی جس طرح جامعہ کے سابقون الاولون دے چکے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی جس کھولت کو پہنچ کر ایک ایسی بیماری کا شکار ہو گئی تھی جس کے مسیحا ذاکر صاحب ہی ہو سکتے تھے۔ ساتھ ہی اس طرح ذاکر صاحب کو قوم و ملک کی خدمت کا وسیع میدان اور زیادہ مواقع ہاتھ آ رہے تھے کیونکہ علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کو اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معین و مددگار ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو و نما میں مدد دیں۔ اگرچہ جامعہ کے قیام کے بھی کم و بیش یہی مقاصد تھے لیکن پھر بھی جامعہ کو اس وقت تک حیثیت نہیں مل پائی تھی جو مسلم یونیورسٹی کی تھی۔ لہذا نومبر ۱۹۴۸ میں مسلم یونیورسٹی کورٹ نے بالاتفاق رائے ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کر لیا۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"لسان الغیب نے بشارت دی: یوسف گم گشتہ
باز آید بکنعاں غم مخور"

اور وہی ہوا یعنی یوسف گم گشتہ واپس آیا اور رنج و غم کا دور جاتا رہا۔ لیکن بہت جلد وہ وقت بھی آیا وہ سب بھی شروع ہو گیا جس کی وجہ سے اسے طرح طرح کی صفات سے متصف کیا گیا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کچھ نہیں کہا — جو لوگ کہا کرتے تھے بلکہ اس خار دار جھاڑی سے دامن نکل جانے کی کوشش میں تمام خراشوں کو برداشت کر کے رہ گئے۔

قسمت نے انہیں اس کا بدلہ دیا اور خوب دیا، جلد ہی گورنر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس دور میں بھی ان کی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ ہوا اور ان کے پورے دور میں

محمود الحسن

انسانی گردہ

انسان کا جسم ایک مشین کی مانند ہے۔ مشین کی طرح اس کی
صفائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ انسانی جسم کے اندر بہت سے زہریلے
مادّے پیدا ہوتے ہیں جن کا اخراج لازمی ہوتا ہے۔ انسان میں ان
زہریلے مادّوں کے اخراج کے لیے مخصوص اعضا ہوتے ہیں۔ ان میں
پھیپھڑے، گردے اور جلد شامل ہے۔

پھیپھڑوں کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ خارج ہوتی ہے
اس کا عمل یوں ہے کہ سانس کے ذریعے آکسیجن جسم کے اندر داخل ہوتی
ہے۔ پھیپھڑوں میں داخل ہونے پر یہ آکسیجن خون کی رگوں میں جذب
ہو جاتی ہے۔ خون اسے خلیوں تک لے جاتا ہے، جہاں آکسیجن ہضم شدہ
غذا سے جا ملتی ہے جس سے آکسیڈیشن اور توانائی پیدا ہوتی ہے
اور کاربن ڈائی آکسائڈ اور نائٹروجنی مادّے پیدا ہوتے ہیں۔ کاربن
ڈائی آکسائڈ خون کے پلازما میں جذب ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں کے
ذریعے باہر خارج ہو جاتی ہے۔

جلد کے ذریعے بھی نائٹروجن والے مادّے پسینے کے طور پر
خارج ہو جاتے ہیں۔ جلد میں ان کو خارج کرنے کا موجب جلدی
غدود ہوتے ہیں۔

نائٹروجنی مادّوں میں بہت سی زہریلی اشیاء مثلاً امونیا،
یوریا اور یورک ایسڈ ہوتے ہیں جو قلیل مقدار کے باوجود زہریلے
ہوتے ہیں اور انھیں خارج کر دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ
یہ جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ نائٹروجنی مادّے پروٹین کے
آکسیڈیشن سے حاصل ہوتے ہیں۔

کاربوہائیڈریٹس + آکسیجن ← کاربن ڈائی آکسائیڈ + پانی

فیٹس + آکسیجن ← کاربن ڈائی آکسائیڈ + پانی

پروٹین + آکسیجن ← کاربن ڈائی آکسائیڈ + پانی + نائٹروجنی ما

انسان کے اندر نائٹروجنی مادّوں کو خارج کرنے کے مخصوص
اعضا کو گردہ کہتے ہیں۔

گردہ کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ گردہ لوبیے کے بیج کی شکل کا
ہے اور ان کی تعداد دو ہوتی ہے۔ گردوں کا کام خون سے بے کار نا
مادّوں کو حاصل کر کے انھیں جسم سے خارج کرنا ہے۔ یہ گردے پیٹ
اندر پیچھے کی طرف ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف واقع ہوتے ہیں ا
پیٹ کی بالائی دیوار کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ دایاں گردہ،
گردے سے ذرا آگے کی طرف ہوتا ہے۔ گردوں کا رنگ سرخی مائل
ہوتا ہے اور اس کی جسامت کچھ یوں ہے۔ 12 سی. ایم لمبا، 6 س
چوڑا اور 3 سی. ایم موٹا۔ ہر ایک گردے کے ارد گرد ایک جھ
ہے جسے پیری ٹونیم کہتے ہیں جو گردے کا احاطہ کرتی ہے اور ا
کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ گردے کے ارد گرد چربی کی موٹی ت
ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ گردے لوبیے کے بیج
کے ہوتے ہیں اور گردے کی طرف محدب (Convex) اور
مقعر (Concave) ہوتی ہے۔ مقعر سطح پر ایک گڑھا
اس گڑھے کو ہائیلس کہتے ہیں اور اسی ہائیلس والی جگہ پر
اور خون کی نالیاں ہوتی ہیں جو گردے کے اندر داخل ہوتی ہیں
طرف کی یوریٹر اور ایک عضلاتی شاخ کے بالائی سطح پر کھلی
خون کی نالیوں سے گردے بے کار مادّوں کو علیحدہ کر لیتے

یورٹیر کے ذریعے مثانے میں پہنچ دیتے ہیں۔ مثانہ تھوڑی سکڑتا ہے اور پیشاب کی صورت میں بے کار مادّوں کو جسم سے ر دیتا ہے۔ یوریٹر کی اندرونی جانب چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں سیلیا کہتے ہیں جو پچھلی طرف حرکت کرتے ہیں۔ جب پیشاب گردوں یٹر تک آتا ہے تو یہ سیلیا نیچے ہو جاتے ہیں اور پیشاب گزر جاتا ہے تو ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے مثانے سے پیشاب خارج نہ ہو سکے بھر جاتا ہے اور انہیں سیلیا کی وجہ سے پیشاب اوپر نہیں جا سکتا ین نائٹروجنی مادوں کے علاوہ نمکیات بھی ہوتے ہیں۔ ان نمکیات میں شیم، سوڈیم، کیلشیم، فاسفیٹ اور سلفیٹ ہوتے ہیں اور انھیں دوں ہی کی مدد سے خارج کیا جاتا ہے۔

اب یہ دیکھنے کے لیے کہ گردوں کے اندر کیا عمل ہوتا ہے اور کون عضا ہوتے ہیں جو خون سے پیشاب کو علیحدہ کرتے ہیں۔ ایک گردے و حصوں میں تقسیم کریں تو دو حصے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک لی حصہ جس کا رنگ گہرا ہوتا ہے اور دوسرا اندر والا ہلکے رنگ کا ہے اوّل الذکر کو کارٹیکس (Cortex) کہتے ہیں اور موخرالذکر یڈولا کہتے ہیں۔

گردے میں بولی نالیوں کا جال بچھا ہوتا ہے۔ ہر بولی نالی کا اگلا پھولا ہوا ہوتا ہے۔ اسے میلپگیین کیپسول Malpighian Capsule کہتے ہیں۔ یہ کارٹیکس کے اندر ہوتے ہیں۔ عمودی ے کی وجہ سے یہ ہمیں نقطے سے نظر آتے ہیں۔ یہ میلپگیین کیپسول ی ہوئی نالی ہوتی ہے۔ بولی نالیاں کارٹیکس سے ہو کر میڈولا میں ی ہو جاتی ہیں اور پھر وہاں سے وہ دوبارہ کارٹیکس میں چلی جاتی ور ان کی شکل مخروطی ہو جاتی ہے جنہیں پیرامڈ کہتے ہیں۔ پیرامڈ بنانے ہر بولی نالی کلیکٹنگ ڈکٹ سے مل جاتی ہے۔ گردے کے ہائیلس جگہ میں اندر کی جانب ایک گڑھا سا جگہ ہوتی ہے جو ایک جوف کی کی ہوتی ہے۔ اس کو پیلوس (Pelvis) کہتے ہیں۔ یہ دراصل کا پھولا ہوا حصہ ہوتی ہے پیلوس کی بہت سی شاخیں بھی ہوتی میڈولا میں داخل ہو کر وہ پیالہ نما ساختیں بناتی ہے اسے کیلکس

میلپگیین کیپسول میں جب رینل شریان داخل ہوتی ہے تو اس کی بہت سی شاخیں بن جاتی ہیں اور یہ شاخیں میلپگیین کیپسول کے کے اندر ایک گچھے کی شکل میں ترتیب پاتی ہیں۔

جب رینل شریان ہائیلس والی جگہ سے گردے میں داخل ہوتی ہے اور تقسیم ہو کر بہت سی شریانیں بن جاتی ہیں تو ہر شریان میلپگیین کیپسول میں داخل ہو کر وہی گچھا بناتی ہیں۔ اب جب خون اس گچھے سے گزرتا ہے تو میلپگیین کیپسول خون سے بے کار مادّے مثلاً یوریا یورک ایسڈ کو علیحدہ کر لیتا ہے اور یہ بولی نالیوں میں چلے جاتے ہیں۔ بولی نالیاں کلیکٹنگ ڈکٹ سے مل جاتی ہیں اور پیشاب کلیکٹنگ ڈکٹ سے ہوتا ہوا یوریٹر میں پہنچ جاتا ہے اور یوریٹر اسے مثانے میں پہنچا دیتی ہے جہاں سے وقفہ وقفہ کے بعد وہ خارج ہوتا ہے۔

خون کی شریان میلپگیین کیپسول سے نکل کر بولی نالیوں کے اردگرد ایک جال بناتی ہیں اور مل کر ایک رینلی ورید بناتے ہیں جو خون کو واپس دل میں لے جاتی ہے۔

گردوں کے اوپر دو غدود ہوتے ہیں۔ انھیں ایڈرینل گلینڈ Adrenal Gland کہتے ہیں۔ ان کے بھی دو حصے واضح ہوتے ہیں یعنی کارٹیکس اور میڈولا۔ کارٹیکس اور میڈولا سے دو مختلف ہارمون خارج ہوتے ہیں۔ میڈولا سے خارج ہونے والے ہارمون کو ایڈرینالائن Adrenaline کہتے ہیں۔ یہ ہارمون اس وقت خارج ہوتا ہے جب کوئی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ایکسیڈنٹ یا کوئی اور خطرہ جس سے انسان کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ یہ ہارمون خون میں شکر کی مقدار کو زیادہ کرتا ہے۔

کارٹیکس سے بہت سے مرکبات افراز ہوتے ہیں۔ جن میں سے اہم کارٹی سول اور کارٹی ہیں۔ کارٹی سول سے گلوکوز کی مقدار یکساں رہتی ہے، یعنی نہ بڑھنے پاتی ہے نہ گھٹنے پاتی ہے۔ کارٹی سول جسم کے اندر نمکیات اور پانی کی شرح کو برقرار رکھتا ہے اور جلد کی حفاظت کرتا ہے۔ اس سے بہت سی ادویات بنتی ہیں جو جوڑوں کے ورم اور لیوکیمیا کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

گردوں کی بہت سی بیماریاں ہیں۔ مثلاً گردے میں پتھری

بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیشاب کے اندر جو مرکبات پائے جاتے ہیں وہ بہت ہی باریک ہوتے ہیں اور گردے کی چھوٹی چھوٹی نالیوں سے گزر کر جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سائز اور جسامت میں بڑے ہو جائیں تو گردے کے اندر جو چھوٹی نالیاں ہوتی ہیں وہ سکڑ جائیں تو ان مادوں کا اخراج نہیں ہو سکتا اور یہ گردے کے اندر ہی جمع رہتے ہیں اور ان پر دوسرے مرکبات کی تہیں چڑھتی جاتی ہیں، حتیٰ کہ وہ پتھری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ گردے کی پتھری کے اور بہت سے اسباب ہیں۔ گرم آب و ہوا کے ملکوں میں یہ بیماریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں گرمی کی وجہ سے جسم کا پانی پسینے کی شکل میں خارج ہوتا ہے۔ اگر بہت زیادہ پانی نہ پیا جائے تو فاسد مادے جسم کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ خوراک کا بھی اس بیماری سے گہرا تعلق ہے۔ پروٹینی اشیا زیادہ تعداد میں نہیں کھانی چاہئیں اور شمائز کا زیادہ استعمال بھی مفید نہیں۔ اگر خوراک اچھی طرح ہضم نہ ہوتی ہو تو گردے میں پتھری بننے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ گردوں کی سوزش اور مختلف بیماریوں سے فاسد مادوں کے اخراج میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور گردوں میں پتھری بننے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ عام طور سے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گردوں میں پتھری وراثت سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر خاندانوں میں یہ بیماری زیادہ پائی جاتی ہے۔

عام طور پر پتھری چھوٹے سائز میں ہوتی ہے لیکن اس کا سائز بڑا بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات پورا گردہ پتھری سے بھر جاتا ہے اور پتھری ایک سینگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پتھری کے مریضوں کا پیشاب ٹیسٹ کروایا جاتا ہے۔ اگر پیشاب میں خون یا پیپ کے چند ذرات نظر آ جائیں تو یہ شک ہو جاتا ہے کہ شاید مریض کو پتھری ہو۔ لیکن بعد میں مریض کا ایکسرے لیا جاتا ہے جس سے پتھری نظر آ جاتی ہے۔ بعض پتھریاں ایکسرے سے بھی نظر نہیں آتیں، ان کے لیے کچھ وریدی ٹیکے لگائے جاتے ہیں جس سے ان کی تشخیص کر لی جاتی ہے۔

ملت کے ملی تقاضوں سے غفلت کر کے ہر شخص اپنے کام میں مگن ہو، اپنی دولت اور تجارت کی فکر کرے، ملی مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو، اپنے ذاتی مفادات کو ملی مفادات پہ ترجیح دے۔ یہ خود غرضی اور انانیت قوموں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ظلم، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر برداشت نہیں کرتا۔ کسی معاشرے میں کسی بھی طبقہ پر ظلم ہو، خدا کی رحمت سے محرومی کا سبب ہے۔ بعض دفعہ ایک ظلم نے سلطنتوں کے تختے الٹ دیے ہیں، ایک بیوہ کی آہ اور ایک یتیم کی فریاد نے انقلاب برپا کر دیا ہے۔

[مولانا سید ابوالحسن علی ندوی]

محمد اختر [illegible]

صنعتی آلودگی

اور اس کے مضر اثرات

موجودہ دور صنعتی دور ہے۔ صنعتی ترقی کو ملکوں کی کایا پلٹ [illegible]رت انگیز مقام حاصل ہے۔ آج کسی بھی ملک کی صنعتی ترقی کا انحصار [illegible] اور اس کے فروغ پر ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے تو یہ نہایت [illegible]۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام ممالک صنعتی ترقیاتی منصوبوں پر اپنے بجٹ [illegible] کثیر حصہ خرچ کر رہے ہیں۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان نے بھی صنعتی میدان میں نمایاں [illegible]ہے۔ رات دن گردش کرنے والے مشینوں کے پہیے اور دھواں [illegible]لک بوس چمنیاں ہندوستان کی ترقی کا بین ثبوت ہیں۔ کیا شہر [illegible] دیہات ہر جگہ صنعتی مل، کارخانوں کی وسیع عمارتیں ہندوستان [illegible] انگیز ترقی کی شاہد ہیں۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں صنعتوں کا [illegible]پھیلا ہوا ہے کہ ان کو صنعتی شہر مان لیا گیا ہے۔

پہلے کی دہلی اور آج کی دہلی میں بڑا فرق آگیا ہے۔ دہلی [illegible]علاقے میں اندر پرستھ بجلی گھر کی اونچی چمنیوں نے ماحول کی [illegible]ر آلودگی میں جو اضافہ کیا ہے اس کا اندازہ ادھر سے گزرنے [illegible]ی کو آسانی سے ہو سکتا ہے۔ بجلی گھر کے آس پاس کے علاقے میں [illegible] تقریباً تین ٹن راکھ چمنیوں سے نکل کر پھیل جاتی ہے۔ یہ راکھ [illegible] تندرستی کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ دہلی میں پینے کے پانی [illegible]ت جمنا ندی سے پوری ہوتی ہیں لیکن گندگی اور آلودگی کی [illegible] جمنا کے پانی کی جو کیفیت ہے اس کے متعلق اندازہ لگایا گیا [illegible]س کروڑ لیٹر فضلہ جمنا کے پانی میں بہایا جاتا ہے۔ اس [illegible] سیکڑوں کی تعداد میں کارخانے تقریباً دو کروڑ لیٹر گندگی پانی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ پانی کی اس آلودگی کی وجہ سے آج دہلی کی آبادی مختلف قسم کی پیٹ کی بیماریوں اور یرقان وغیرہ کی شکار ہے۔ ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی اطلاع کے مطابق یہ عارضے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔

ماحول کو اس کثافت سے بچانے کے لیے مختلف قسم کے کام کیے جا رہے ہیں۔ بجلی گھر میں مشینری سے منسلک ہی کچھ ایسے آلات لگائے گئے ہیں جن کے ذریعے راکھ کو چمنی سے نکلنے سے پہلے ہی الگ کر لیا جاتا ہے۔ اس راکھ کو عمارتی سامان جیسے اینٹوں وغیرہ کے بنانے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ جمنا کی آلودگی کو روکنے کے لیے فضلہ اور گندے پانی کو سیدھے ہی جمنا میں ملنے سے روکنے کے لیے ترکیبیں استعمال میں لائی جا رہی ہیں۔

بمبئی کا مشہور علاقہ چیمبور صنعتوں کا گڑھ ہے۔ کھاد فیکٹری اور تیل صاف کرنے کے کارخانے کی وجہ سے چیمبور کا علاقہ اس قدر صنعتی گندگی سے آلودہ ہو چکا ہے کہ اگر اسے گیس چیمبر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ماحول کی کثافت کا یہ عالم ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کے لیے کچن گارڈن ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکانوں کی بالکنیوں پر پودے اگانا تقریباً ناممکن ہے۔ آج عظیم بمبئی کی تقریباً نصف آبادی صنعتی کارخانوں سے وابستہ ہے۔ ملک بھر میں کیمیائی صنعت سے متعلق آدھے کارخانے بمبئی میں ہیں۔ ان کارخانوں کی بدولت بمبئی کے چند علاقوں کی فضا اس قدر زہریلی ہو چکی ہے کہ اگر علاج ہی اس کا جلد نہ کیا گیا تو انسانی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

سید شفیق احمد

مسلم قدامت پسندی کی بنیادیں

چند مسلم رہنماؤں کی طرف سے اس تجویز پر شدید ردِّ عمل ہوا ہے
...ں میں ایک مشترکہ ضابطۂ دیوانی Common Civil Code
...یا جائے۔ ان کے ذہنوں میں شاہ بانو کیس کی یاد ابھی تازہ ہے اور
...ے وہ سمجھتے ہیں کہ مشترکہ ضابطے سے بڑا شر کوئی اور نہیں ہے۔ ان
...ل میں اس کو اختیاری بنانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ
...ملت کو اس سے نقصان پہنچنے کا زیادہ احتمال ہے۔ کچھ اردو اخبارات
...بھی لکھا ہے کہ اگر ایک بار بھی کوئی ایسا قانون بن کر نافذ ہوگیا تو
...ے دھیرے وہ ہر فرقے کے لیے لازمی قرار دے دیا جائے گا۔ اس
...ل میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ آزاد ہندوستان میں جب کبھی بھی اس
...کر خیال کا اظہار کیا گیا، مسلم رہنماؤں نے اس کی مخالفت میں بیانات
...کردی جن میں اس تجویز کی مذمت سخت ترین الفاظ میں کی گئی۔

ایسا کیوں ہے؟ کوئی پوچھ سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اسے
...مت کیوں ٹھہرایا ہے۔ شاید ایسا اس وجہ سے ہے کہ علماء یہ
...یں کہ غیر مسلموں کی حکومت میں مسلم معاشرے سے متعلق مجموعہ قوانین
...ے منافی ہوگا۔ اس کی ایک دوسری وجہ یہ خوف ہے کہ ایسے
...و قبول کرکے وہ اپنی مذہبی شناخت کھو دیں گے۔ کلکتہ سے
...نے والے قدامت پسند مسلمانوں کے ایک روزنامے نے اپنی
...اشاعت میں اس مسئلے پر لکھا ہے کہ ایک مشترکہ ضابطہ بنانے کا
...مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو ختم کرنا ہے۔

اگر مشترکہ ضابطۂ دیوانی کے خیال کو فی الحال چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے میں اس بات کا احساس ہے کہ ملت بہت سے معاشرتی عیوب میں گھری ہوئی ہے اور اس کے بہت سے رسم و رواج قرآن اور سنت کے منافی ہیں۔ بہت سے مسلمانوں کے اخبارات نے ماضی میں یہ لکھا تھا کہ فوری طلاق دینے کا مروجہ طریقہ اسلامی قوانین کے خلاف ہے۔

شاہ بانو کیس

سال کے شروع میں جب شاہ بانو کیس میں دیے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف احتجاج اپنے پورے شباب پر تھا، مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ نے مسلم پرسنل لاز کو مجموعۂ ضوابط بنانے کا کام شروع کیا۔ دراصل یہ قدم شریعت کے کچھ پہلوؤں پر کی گئی تنقید کا جواب دینے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن پارلیامنٹ میں مسلم خواتین کے بل پاس ہونے کے بعد اس سلسلے میں کچھ نہ سنا گیا۔ اس آسودہ خاطری کے خلاف شکایت کرتے ہوئے بمبئی سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامے نے طنزیہ انداز میں لکھا ہے کہ کیا مسلمان اب پھر کسی دوسرے شاہ بانو کیس کا انتظار کر رہے ہیں جو معاشرتی اصلاح کے میدان میں کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکے۔

مروجہ معاشرتی نظام میں اصلاح کی کوشش ہمیشہ سے ہی ایک مشکل کام رہا ہے اور مسلمانوں کے سلسلے میں تو یہ کچھ زیادہ ہی مشکل ہے۔ کیونکہ یہ امر کثر مذہبی علماء کی قرآن کے احکامات و اسنادی کی تفسیر پر دکریۓ کے

متلوث ہوگا۔ اس بات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو مسلم پرسنل لا میں اصلاح کی وکالت کرتے ہیں، انھیں بدعتی، ملحد، و مرتد کیوں کہا جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ شاہ بانو کیس میں کیے گئے احتجاج کے سلسلے میں کس طرح سے ترقی پسند مسلمانوں کو خشت باری برداشت کرنی پڑی تھی۔

دراصل یہ ایک پرانی فطرت ہے، تجدید پسندی کو ہمیشہ ہی قدامت پسندی کے غضب کا شکار ہونا پڑا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں قدامت پرست مولویوں نے مشہور مفکر شاہ ولی اللہ کے خلاف صرف اس لیے شور و غوغا اٹھایا تھا کہ انھوں نے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کر دیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ خدا کے کلام کا ترجمہ کرنا بے ادبی ہے جب کہ شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ قرآن پاک کو سمجھیں۔

یہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا جو سر سید احمد خاں کو انیسویں صدی میں جھیلنا پڑا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید نے مسلمانوں کو توجیہی رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا، جس کی زبردست مخالفت کی گئی۔ ان دنوں کے متنازع فیہ حالات کا سمجھنا اُن سبھی لوگوں کے لیے مفید و برمحل ہوگا جو مسلم پرسنل لا اور معاشرتی طریقوں میں اصلاح لانا چاہتے ہیں۔ علماء کی نظر میں سر سید کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے قرآن پاک کی توجیہی تفسیر پیش کی۔ سر سید کے الفاظ میں "خدا کے فرمان اور خدا کے کاموں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے"۔ لیکن روایت پرستوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور دیوبند کے علماء نے ان کے خیالات کو مسلمانوں کے لیے زہر ہلاہل تصور کیا۔

سر سید کا تجربہ

سر سید کا دوسرا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو انگریزی اور جدید سائنسی علوم کو سیکھنے کا مشورہ دیا۔ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج قایم کرنے سے بھی کئی سال قبل انھوں نے ایک اردو رسالہ "تہذیب الاخلاق" اسی مقصد سے شائع کیا تھا کہ ہم مذہبوں کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئے۔ رسالے میں ہاکی جیسے سے لے کر مذہب میں توجیہ پسندی اور مذہبی ڈھکوسلہ بازی تک سبھی طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

دراصل سر سید کی مخالفت تو ان کے رسالہ شائع ہونے سے بہت سال قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے [illegible] واپس تشریف لائے اور رسالہ نکالنے کا منصوبہ ابھی ان کے ذہن ہی میں تھا [illegible] زمانے میں بھی دہلی اور یو۔پی میں بڑے بڑے پوسٹر اور اشتہار چھاپے گئے میں سر سید کے معاشرتی بائیکاٹ پر زور دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو صدیوں [illegible] مروجہ خیالات اور طریقوں سے چھٹکارا دلانے کا کام سر سید کو اتنا ضروری [illegible] کہ انھوں نے رسالہ بند کرنے کو ترجیح دی تاکہ وہ تعلیمی پروگرام کے لیے چندہ اور معاونت حاصل کر سکیں۔ عتیق صدیقی کے الفاظ میں "کہانی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مذہبی اور معاشرتی اصلاح کا وہ کام جو سر سید نے کیا تھا، غیر مکمل رہ گیا اور آج سو برسوں کے بعد بھی وہی طور طریقے [illegible] کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں"۔

پچھلے چند مہینوں میں روشنی میں آنے والے واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ ابھی کتنا زیادہ کام باقی ہے اور یہ کہ کام کتنا مشکل ہے۔ مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔ کٹھ ملاؤں کو دقیانوسی خیالات کے لیے موردِ الزام ٹھہرانے سے بھی کچھ کام نہ بنے گا۔ مسلم معاشرے پر اگر تنقید کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس کا اثر الٹا ہو رہا ہے۔

قدامت پسند رہنما ہر ایسی گفتگو کو جس کا مقصد معاشرتی اصلاح ہو، مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی شکل دے دیتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل قدامت پسندی کی وجوہات کو دیکھا جائے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستانی [illegible] گرفت کی وجہ سے دقیانوسی خیالات اور رسم و رواج سے چپکے ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بذات خود اپنے زمانے کے مصلح تھے۔ وہ عربوں میں مکمل تبدیلی لائے تھے۔ وہاں کے مختلف قبائل [illegible] فعال افراد پر مشتمل ایک قوم میں ڈھال دیا جس نے گذشتہ صدیوں میں ہر پہلو۔ فلسفے سے سائنس تک۔ ہر ترقی میں اپنا قیمتی حصہ دیا۔ [illegible] میں وہ (رسول خدا) کتنی زبردست تبدیلیاں لائے تھے، اس [illegible] حقیقت سے ہوتا ہے کہ ۱۴۰۰ برس پہلے اسلام نے عورتوں کو جائداد [illegible] دیے تھے اور یہ وہ قدم تھا جو ہندو سماج نے ابھی حال ہی میں [illegible] تو پھر موجودہ مسلمانوں کے کچھ طبقوں میں یہ تبدیلی جمود کیوں

ل کرنے کے لیے ہیں [illegible] مدارس میں مسلمان بچوں کو مذہب کیونکر
ر کس طرح سکھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں مدارس کا ایک جال سا
بلا ہوا ہے۔ ایسے مدارس میں تعلیم بالکل مفت ہے اور طلبہ کی تعداد زیادہ
ریب بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایک تخمینے کے مطابق صرف یوپی کے
ہزار مدرسوں میں دو کروڑ روپے سالانہ مذہبی تعلیم پر صرف کیے جا رہے تھے۔
وقت سے اب تک تو یہ رقم اور بھی بڑھ گئی ہوگی۔

ان مدارس میں وہ نہیں پڑھایا جاتا ہے جو طلبہ کو حالات حاضرہ سمجھنے
مدد دے سکے۔ نہ تو انھیں سائنس میں کی گئی ترقی کے بارے میں کچھ بتایا جاتا
اور نہ ہی اُن مسائل سے طلبہ کو آشنا کرایا جاتا ہے جو آج عالم انسانیت
ر پیش ہیں۔ جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر مشیر الحق کے الفاظ میں "مدارس کے طلبہ
شاید ہی ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہوں جو ان کی موجودہ زندگی میں کام
یں۔ کوئی ایسی کوشش بھی نہیں کی جاتی جس سے ان طلبا کا ادراکی شعور
سکے۔ دینیات کی تعلیم میں بھی اس نصاب کا استعمال کیا جاتا ہے، جسے
ظام الدین نے سترھویں صدی میں مرتب کیا تھا"

دینیات کے مدارس

گذشتہ ایک صدی میں مدرسہ کی تعلیم کو جدید بنانے کی بہت سی
ششیں کی گئیں۔ سب سے پہلے ایک ایسی ہی کوشش قرونِ وسطیٰ کی
یخ کے ایک ماہر اور سر سید کے ایک زمانے کے ساتھی مولانا
نے کی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں انھوں نے لکھنؤ میں
رسہ (دارالعلوم ندوۃ العلماء) قائم کیا تھا جس کے نصاب میں
ی زبان بھی شامل تھی۔ ان کے الفاظ میں "علماء کی سب سے
ی کی ذمہ داری نئے علم الکلام کو بنانا ہے اور دینیاتی استدلال
جدید نظام کو مرتب کرنا ہے۔" لیکن یہ کوشش بری طرح سے
ب ہوئی۔

ایم مجیب کے الفاظ میں "وقت آنے پر انگریزی اور دیگر سیکولر
کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے وہ علماء بھی تیار نہ ہو سکے جنھوں
س تجویز کی تائید کی تھی۔"
ی سلسلے میں ایک دوسری کوشش مولانا آزاد نے کی تھی۔ وہ
سی جماعت تشکیل دینا چاہتے تھے جو زمانہ حال کی ضرورتوں
سے [illegible] ہو سکے۔ دو بار انھوں نے اپنا مدرسہ قائم کیا لیکن
سیاسی امور میں مشغولیت کی وجہ سے وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔
آزادی کے بعد جب مولانا وزیر تعلیم بنے تو انھوں نے دوبارہ کوشش
کی کہ علماء اس تجویز پر متفق ہو جائیں کہ مدارس کے نصاب میں ضروری
تبدیلیاں کرکے مدرسہ کی تعلیم کو ایک نیا رُخ دیا جائے۔ اس تجربے
کے لیے انھوں نے سرکار کی طرف سے مالی امداد کی پیش کش بھی کی لیکن
ندوۃ العلماء کے ٹرسٹیز نے اسے منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔
ان کا خیال تھا کہ اس طریقے کو اپنانے سے مدارس کے معاملات میں
سرکاری مداخلت کے راستے کھل جائیں گے۔

مولانا حامد حسین صدر مدرسۂ امینیہ اور ایک اور مشہور
استادِ دینیات نے کئی سال قبل اس بات کی تصدیق کی تھی کہ مدارس
میں اس وقت مروجہ نصاب فی زمانہ مسائل سے نمٹنے کے لیے ناکافی
تھا۔ نصاب اور دیگر امور میں ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ پرانے اور نئے
دونوں خیالات کے افراد کی مناسب ہمدردیاں حاصل نہ تھیں۔

غلط ماحول

اس پس منظر میں موجودہ حالات ذرا بھی تعجب خیز نہیں لگتے۔
مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا، اسلام کے بنیادی
اصولوں کو باہری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں جو فی زمانہ
بے ربط لگتے ہیں اور انھیں قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا
جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں معاشرتی اصلاح کو مسلم اقلیت کے
دیگر مسائل سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس سے کسی حد تک یہ وضاحت
بھی ہوتی ہے کہ مسلم دانشوروں کے ایک بڑے طبقے نے کیوں مسلم پرسنل لا
جیسے اُلجھے ہوئے مسئلہ پر مولویوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس حقیقت کو
بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ملک کا ماحول اس وقت اصلاحی
کاموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ آج جب کہ نفرت اور تفریق پھیلانے
کے لیے ہندو سینائیں تیار کی جا رہی ہیں تو یہ فطری امر ہے کہ اقلیتیں
بھی مذہب کی طرف زیادہ مرکوز ہوں۔ تاکہ وہ اپنی مذہبی شناخت
برقرار رکھ سکیں۔

اس طرح سے مسلمان ایک بڑی دشواری میں پھنس گئے ہیں
باقی صفحہ نمبر ۵۲ پر

اصف سوی

قدرتی وسائل کا تحفظ

ایک عالمی سوال

تمام قدرتی وسائل مٹی، ہوا، پانی، پیڑ پودے، معدنیات اور تمام
انور، ہمارے سیارے، زمین کا عظیم سرمایہ ہیں اور خود ہم انسان
بھی اسی کا ایک حصہ ہیں اور خود کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں۔ مگر ہم
سب کے عمل ہمارے اشرف المخلوقات ہونے کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔
یہ دیکھنا ہے خاص طور پر زمین کے وسائل کے تحفظ کے سوال کی روشنی
میں۔

پچھلے چند سو سال کی دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جہاں
انسان نے ایک طرف علم و فن سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں
بہت تیز رفتار ترقی کی ہے، وہاں دوسری طرف ان ہی چند سالوں میں
انسان نے اسی نام نہاد 'ترقی' کے نام پر زمین اور اس کے ماحول کے
بنیادی اجزا یعنی ہوا، پانی، اور قدرتی وسائل کو یا تو بے دردی سے
استعمال کیا ہے اور یا برباد۔ یہ بھول کر کہ آنے والی نسلوں کی ضروریات
کا کیا ہوگا۔ غرض انسانی سماج کی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ وہ
سنبھلنے اور رکنے کے طریقوں اور ضرورت ہی کو بھول گیا۔ بالکل اس
کلہاڑے کی مانند جو پیڑ کی شاخ کو اپنے استعمال کے لیے زور شور سے
کاٹ رہا تھا یہ بھول کر کہ وہ خود اسی شاخ پر بیٹھا ہے۔

ادھر پچھلے چند سالوں سے قدرتی وسائل کے تحفظ کے سوال
کو لے کر عالمی سطح پر فکر مندی کا اظہار کیا گیا ہے اور نتیجتاً آج بیسویں
صدی کے اواخر میں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ انسانی دماغ یا سمجھ جو
انسان کے لیے قدرت کا سب سے بیش قیمت عطیہ ہے اگر خود اس کے
وجود اور مستقبل کے لیے نقصان دہ اور خطرناک ہونے لگے تو پھر ایسی
سمجھ کا کیا فائدہ۔ کم ہی سہی مگر اب لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انسان جو
خود بھی قدرتی نظام کی ایک کڑی ہے تو پھر اس کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے
عمل سے اس نظامِ قدرت کو صرف اپنے فائدوں اور لالچ کے لیے
استعمال کرے اور اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرے، جیسا کہ انسان
کی اب تک نسلیں کرتی آئی ہیں۔ خاص طور پر پچھلے چند سو سالوں والی
نسلیں۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ ہم انسان زمین پر اپنی حیثیت
سمجھیں اور اپنے مقام، حقوق، فرائض اور قدرتی وسائل کے تحفظ
کی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ کیوں کہ یہ سوال صرف وسائل، یعنی
معدنیات، پیڑ پودوں، جانداروں اور ہوا پانی کے ہی تحفظ کا نہیں
بلکہ درحقیقت خود بنی نوعِ انسان کی بقا کا ہے۔

بین الاقوامی اقدامات

۱۹۴۰ء میں قدرتی وسائل کے تحفظ سے متعلق ایک بین الاقوامی
ادارے انٹرنیشنل یونین فار کنزرویشن آف نیچر اینڈ نیچرل ریسورسز
International Union for Conservation
of Nature & Natural Resources
(IUCN) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ
(WWF) World Wild Life Fund نام
ادارہ برطانیہ کے اشارے پر ۱۹۶۱ء میں قائم کیا گیا جو اپنی ۲۲ سال
شاندار کارکردگی سے ایک مثالی بین الاقوامی ادارہ بن گیا ہے۔
اب تقریباً ۲۰ ممالک اس ادارے کے سرگرم رکن ہیں جو کہ نہ صرف
قدرتی وسائل کے تحفظ کے سلسلے میں لیے گئے کسی بھی قدم یا

کرتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں صحیح معلومات اور تجاویز بھی مہیا کرتے
اس کے علاوہ اقوام متحدہ کا ایک ذیلی ادارہ 'یونائیٹڈ نیشن انیوائرنمنٹ
ام (United Nation Envcronmant Programme)
(UNE بھی پچھلے کئی سالوں سے قدرتی وسائل کے تحفظ اور ماولیات
ران میں سرگرم ہے۔ قدرتی وسائل کے تحفظ کے سلسلے کا ایک اور
جانوروں کی کھالوں اور ان سے بنائے گئے سامان کی تجارت کی روک
م کے سلسلے میں ۱۹۷۳ء میں امریکہ میں اٹھایا گیا جس کو
نشن اون انٹرنیشنل ٹریڈ ان انڈینجرڈ اسپیسز آف وائلڈ فلورا
فونا - Convention On International Trade In-
Edadangered Species of wild Flora & Fau
(CITE کے نام سے جانا جاتا ہے۔

قدرتی وسائل کے تحفظ کی ضرورت

الف۔ اخلاقی۔

اخلاق صرف انسانی سماج کا ہی امتیاز نہیں ہے۔ ہر ذی حیات میں کسی نہ کسی سطح پر اخلاقی قدریں پائی جاتی ہیں۔ مگر ان جو خود کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہوئے بھی یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اشرف ہے تو اس کے فرائض اور ذمہ داری بھی تو تمام مخلوقات زیادہ ہونی چاہیے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو معلوم کہ قدرت نے جو عظیم سرمایہ قدرتی وسائل کی شکل میں ہم کو بخشا اور اس کو ہمارے آباو اجداد نے "ترقی" کے نام پر نہ صرف ضرورت زیادہ استعمال کیا ہے بلکہ برباد بھی کیا ہے اور آج ہم کو اس مقام کھڑا کر دیا ہے کہ خود ہمارا وجود اور بقا داؤ پر لگ گئے ہیں۔ آپ بتایئے کہ ایسی صورت حال میں کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ اگر ہم اس رت حال کو بہتر نہیں بنا سکتے تو کم سے کم اور بگڑنے سے روک لیں قدرت کے وسیع سرمایہ کا باقی ماندہ حصہ ہی اگلی نسل کے لیے بچا کر سکیں۔ یوں بھی ہم کو حق نہیں ہے کہ ہم جس ماحول میں زندہ ہیں جس میں سانس لے رہے ہیں اس کو اپنی خود غرضی کے سبب آنے والے توں اور نسلوں کے لیے ناقابل استعمال بنا دیں۔

ب۔ جمالیاتی۔ دور دریا کے اس پار پھیلی شفق، ابھرتا ڈوبتا سورج، پہاڑوں کے درمیان اونچی نیچی گھاٹیوں سے گزرتا آبشار، اونچے آسمانوں میں قطار در قطار پرواز کرتے پرندے، خوبصورت پھولوں کے درمیان منڈلاتے بھنورے، نیم وا کلی پر شبنم کے قطرے، سمندر میں تیرتی خوبصورت مچھلیاں، دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار، گھنے درختوں کے درمیان چھنتی دھوپ، آم کے باغ میں کوئل کی کوک، یہ سب کس کو اچھا نہیں لگتا، مگر جنگل اگر اسی رفتار سے کٹتے رہے، اسی طرح اندھا دھند ہر دریا پر باندھ بندھتے رہے، پہاڑ ڈائنا مائٹ سے اڑتے رہے، ندیوں، دریاؤں میں آبادیوں اور کارخانوں کا فضلہ ملتا رہا، درخت کٹتے رہے اور پرندے بے گھر ہوتے رہے تو یہ سب باتیں صرف افسانوں، قصوں، کہانیوں، تصویروں اور فلموں میں ہی باقی بچیں گی۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا ہم کو حق ہے کہ ہم قدرت کے ان حسین مناظر اور پورے نظام کو بگاڑ دیں۔

ج۔ اقتصادی

جہاں تک انسان کی اقتصادی ضروریات کا سوال ہے، اس کے لیے زمین پر ابھی بہت کچھ ہے کہ دنیا کی تمام آبادی اپنا پیٹ بھر سکے مگر یہ بات خیال میں رکھ کر کہ زمین انسان کی ضروریات تو ضرور پوری کر سکتی ہے مگر لالچ نہیں۔ اس کے ساتھ ہم کو یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ زمین کی زرخیزی بھی برقرار رہے اور ہم ایسا کچھ نہ کریں جس سے زمین کی پیدا کرنے کی صلاحیت پر آنچ آئے اور وہ رفتہ رفتہ بنجر ہو جائے بدقسمتی سے انسان نے اب تک استعمال کے نام پر زمین کا استحصال کیا ہے۔

د۔ سائنسی۔ انسان 'عقل' کی بنا پر ہی اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور سائنس عقل و فہم کے ہی استعمال کا نام ہے، جس کے ذریعے انسان اپنے بارے میں اپنے گردوپیش کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سائنس کے نام پر اپنے گردوپیش کو قدرت کے بخشے ہوئے وسائل کو، پیڑ پودوں کو اور جانوروں کو تباہ کر دیں۔ ہم کو یاد رکھنا ہوگا کہ نظام قدرت میں انسان سمیت ہر چیز ایک دوسرے پر منحصر ہے اور ہر ایک کی نظام قدرت میں منفرد حیثیت ہے اور سائنسی تجربات کے نام پر جانوروں اور پودوں کو تباہ کرنے کا انسان کو کوئی حق نہیں ہے۔

ترقی بہ نام تباہی

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ، انسان، جانوروں بلکہ کل جانداروں
میں وہ واحد قسم ہے جو کہ نہ صرف جانوروں بلکہ خود اپنی تباہی کے
سامان اکٹھا کر رہا ہے اور خود کشی کے درپے ہے۔ شاید اس لیے کہ
وہ بھول گیا ہے کہ وہ اس نظام قدرت کا ایک جز ہے جس کو وہ جاننا
اور سمجھنا چاہتا ہے۔ انسان تو بس تجربات، ترقی اور تمدن کے نام پر اور
قدرت پر قابو پانے کے جوش میں تمام کرہ ارض کے ماحول کو خود اپنے
لیے اور دوسروں کے لیے ناکارہ بنانے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے آب و ہوا
کو کثیف کر دیا ہے، زمین کو بانجھ کر دیا ہے اور جو کچھ باقی بچا بھی ہے۔
اس پر بھی ایٹم بم کے خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں کیوں کہ انسان
اس بات سے قطعی بے خبر ہے کہ اس کی نام نہاد ترقی کی اگر یہی سمت
اور رفتار رہی تو اس کی ترقی پورے کرۂ ارض کے لیے تباہی و بربادی
کا سبب بن جائے گی۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ ہماری
آئندہ ترقی کی سمت کیا ہو اور اس کی رفتار ایسی ہو جس پر خود ہمارا
قابو ہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہی ترقی ہمارے اوپر سوار ہو کر ہم کو
بہا لے ڈوبے۔

انسانیت یا حیوانیت

انسانوں کی نہ جانے کتنی قسمیں، راجے مہاراجے، روسا،
اُمرا، نوابین لاٹ صاحبان وقت کے ساتھ گزر گئے اور اپنے پیچھے
چھوڑ گئے، اور بہت سی چیزوں کے ساتھ جانوروں کی کھالیں اور سر،
سینگوں اور دانتوں سے بنا سامان اور نہ جانے شکار کی کتنی کہانیاں۔
افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم اس ورثے پر نازاں ہیں نہ کہ شرمندہ۔ ذرا
غور کیجیے کیا یہ بے رحمی اور ظلم و استبداد کی داستانیں نہیں ہیں؟ استحصال
کے قصے نہیں؟ ذرا غور کیجیے کیا انسان کی عظمت اسی امر سے ہے کہ
اس نے کتنے جانور شکار کیے، کتنی کھالوں کے قالین بنوائے یا اس
بات سے کہ اس نے کتنی کتابیں لکھیں، کتنی تصویریں بنائیں۔ آپ ہی بتایئے
کہ قلم بڑی ایجاد ہے یا بندوق، آنکھ قدرت کے حسین نظارے دیکھنے کے
لیے ہے یا بندوق سے نشانہ لگانے کے لیے۔ ہاتھ تعمیری کاموں میں لگنے
چاہئیں یا پیڑ کاٹنے اور بلڈوزر چلانے جیسے تخریبی کاموں میں۔

یہ سچ ہے

۱۶۰۰ء سے اب تک یعنی ۳۸۶ برسوں میں ۳۶ دود[ھ]
پلانے والے جانوروں Mammals کی اقسام اور ۹۵ چڑیوں کی
قسمیں صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے
جانوروں Vertebrates کی ایک ہزار سے زائد قسمیں خطرناک
حد تک کم ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پیڑ پودوں کی بھی دو ہزار ایسی
قسمیں ختم ہونے کے قریب ہیں۔ اس پوری صورت حال کی تمام ذمہ د[اری]
انسان پر آتی ہے کیوں کہ یہ محض انسان کی ہی لالچ، جہالت، ہر چیز پر
حاوی ہونے اور قابو پانے کی خواہش اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے۔
خود ہمارے ملک ہندوستان میں ہی اس کی کئی مثالیں موجود
ہیں۔ مثلاً خشکی پر سب سے تیز رفتار جانور، چیتا، ہندوستان اور
افریقہ میں پایا جاتا تھا مگر اب صرف افریقہ میں ہی بچا ہے کیوں کہ
ہندوستانیوں نے اسے صرف قصوں کہانیوں میں ہی چھوڑا ہے
اور اصلی چیتے کی کھالوں سے اپنے ایوان سجا لیے ہیں۔ کہیں اس
برق رفتار جانور کی انسانوں کے ہاتھوں تباہی کا باعث انسان کا
احساسِ کمتری تو نہیں۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے انسان نے اس کو صرف
اس لیے ختم کر دیا ہے کہ وہ خود انسان سے تیز رفتار تھا۔
جنگل کی کہانیوں کا راجہ یعنی شیر ببر بھی جنگلوں کے سا[تھ]
ہی مٹتا جا رہا ہے اور اب ہندوستان میں ان کی کل تعداد تقریباً دو ہز[ار]
ہی بچی ہے۔ اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جانور جیسے کشمیری بارہ سنگھا،
مشک والا ہرن، ہندوستانی گینڈا، اڑنے والی گلہری، انڈین بسٹرڈ،
سفید بازو والی مرغابی، یہاں تک کہ بیچارہ جنگلی گدھا اور نہ جانے
کتنے چھوٹے موٹے جانور، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے کی بہت ہی کم تعداد
باقی بچی ہے۔ اگر اب بھی ہم صحیح اقدام کریں تو کم سے کم ان جانداروں کو تباہ
ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ وقت
دور نہیں کہ جب یا تو ہوں گے شہر، آبادیاں، عمارتیں، مشینیں، کارخانے،
چمنیاں، کھمبے یا پھر ریت ہی ریت صحرا ہی صحرا اور اس کے علاوہ اپ[نی]
اپنی پیٹھوں پر سانس لینے کے لیے اپنے اپنے آکسیجن سلینڈر ڈھو[تے]
انسان۔۔۔ اور اس سے اگلے دن مکمل تباہی اور ایک سناٹا۔

تین بنیادی خطرے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ دنیا کے تمام ذی حیات کسی نہ کسی
ایک دوسرے پر منحصر ہیں، جس کی مثال ایک زنجیر سے دی جا سکتی
کا آخری سرا مٹی اور زمین سے جڑا ہے اور خود انسان کی زندگی
ول شاعر

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

سان کی فطرت پر تسلط کے شوق اور ہوس نے فطرت کی اس ترتیب
اڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ خاص طور پر بیسویں صدی
از سے ہی انسان نے ٹکنالوجی کے ذریعے کرۂ ارض کے ماحول میں
ایک زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی اور آج صدی کے اختتام
پہنچتے پہنچتے زمین کے محدود قدرتی وسائل کے سوال کو لے کر
لاقوامی مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ آج کل انسان
پیش مندرجہ ذیل تین خطرے زیر بحث ہیں؛

. کثرت آبادی
. جنگلوں کی کٹائی
ا۔ ماحول کی آلودگی۔

کثرتِ آبادی

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ زمین کے وسائل محدود ہیں اور
سری طرف ان کی مانگ اور ضرورت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے
ں کہ ان وسائل میں حصہ داروں کی تعداد دن دوگنی اور رات
نی ہو رہی ہے اور خیال ہے کہ اگلے بیس سال میں جہاں دنیا کی آبادی
سے ڈیڑھ گنی ہو جائے گی وہاں وسائل اب سے صرف آدھے ہی
بچیں گے۔ اس لیے اب لازم ہو گیا کہ ہم بڑھتی ہوئی آبادی کی رفتار
روک لگائیں۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ
جودہ دنیا میں قدرتی وسائل کے استعمال اور ان کی تقسیم کا
سب کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک امریکن شہری غذا اور ایندھن
شکل میں اتنی توانائی Energy استعمال کرتا ہے جتنی
ہ دیش کے پچھتر رہنے والے ملا کر استعمال کرتے ہیں۔
ا طرح لکڑی، تیل، پھل وغیرہ کو لے کر کئی اور مثالیں دی جا سکتی
ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہی ملک کے مختلف سماجی درجوں میں بھی
کے اعداد و شمار کا فرق پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان اعداد و شمار سے
ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچوں، قوموں، ملکوں اور ایک ہی ملک
کے سماجی درجوں میں قدرتی وسائل کے استعمال یا کھپت میں تناسب
کثرتِ آبادی پر روک سے بھی زیادہ اہم اور فوری Urgent
سوال ہے اور ہماری فوری توجہ دنیا کی موجودہ آبادی میں بنا تفریق مذہب و
ملت، ملک و قوم قدرتی وسائل کی یکساں تقسیم اور کچھ ملکوں
اور درجوں کے ذریعے قدرتی وسائل کے غلط اور ضرورت سے زیادہ
ناجائز استعمال اور بربادی کی روک تھام پر ہونی چاہیے۔

ب جنگلوں کا کاٹا جانا۔

ماہرین کا خیال ہے کہ زمین پر زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے
مناسب آب و ہوا لازمی ہے۔ مناسب آب و ہوا اور ماحول کے
توازن کے لیے زمین پر کم سے کم تیس (۳۰٪) فیصد جنگلات کا
ہونا ضروری ہے اور اس وقت موجودہ تناسب اس سے کافی
کم ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے جنگلوں میں سے چالیس فیصد جنگل
کاٹے جا چکے ہیں جس کے اثرات موسموں کی تبدیلی اوقات اور شدت
کی شکل میں ظاہر ہونے لگے ہیں۔ آج کل جنگل پہلے سے کہیں زیادہ
تیز رفتار سے کٹ رہے ہیں اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک
میں 'ترقی' کی نظر ہو رہے ہیں۔ جس سے دن بہ دن ماحول کا توازن
بگڑ رہا ہے۔ موسموں کے اوقات بدل رہے ہیں اور وہ وقت
دور نہیں کہ جب جنگل ناپید ہوں گے اور زمین کا ماحول زندگی کش بن
رہے گا۔ جنگلوں کو بچانے اور پیڑ لگانے کی ذمہ داری انسان ہی
کی ہے۔ کیوں کہ خود وہی موجودہ صورتِ حال کا ذمہ دار ہے۔

ج۔ ماحول کی آلودگی۔

پچھلے چند سالوں میں انسان کی سائنس اور ٹیکنالوجی
کے میدان میں ترقی کا جو سب سے منفی پہلو سامنے آیا ہے وہ ماحول
کی آلودگی اور کثافت ہے۔ انسان نے اپنے طبعی ماحول یعنی زمین،
ہوا اور پانی سب میں اپنی ترقی کا فضلہ ملا دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں
کتنے ہی جانور پیڑ پودے اور خود ہزاروں بے قصور انسان بھگت

رہے ہیں ـــ گھروں، بستیوں، کارخانوں، فیکٹریوں سے
نکلتا دھواں، گندا پانی فضلہ ندی نالوں، دریاؤں، میدانوں اور
ہوا کو خراب کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات ہم کو خیال میں رکھنی چاہیے کہ
آب وہوا اور سمندر تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس
کو ملکوں، قوموں، رنگ و نسل اور سماج کے دوسرے درجوں میں
نہیں بانٹا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ملک کی
فیکٹریوں وغیرہ سے نکلا دھواں یا گندگی دوسرے ملکوں کی آب وہوا اور
پانی کو خراب کرتی ہے۔ اسی طرح جب ترقی یافتہ ممالک کیمیائی،
اٹامک یا کسی اور قسم کے کچرے (Waste) کو سمندر میں ڈال
کر مطمئن ہوجاتے ہیں تو اس کا اثر دوسرے ملک کو اپنے ساحل
سمندر پر بھگتنا پڑتا ہے۔ ان ہی تمام وجوہات کی بنا پر اب ضروری
ہوگیا ہے کہ تمام نسل انسانی مل کر غور کرے کہ ماحول کی آلودگی
اور کثافت پر کیسے قابو پایا جاسکتا ہے۔

ذمہ داری

تمام نسل انسانی کو بلا تفریق ملک و قوم اس عالمی
خطرے کا سامنا کرنا ہے کیوں کہ یہ سب کا مشترکہ مسئلہ ہے، اس
کے حل کے لیے صرف حکومتیں، ادارے قانون اور ماہرین ہی ذمہ دار
نہیں ہیں۔ اس کے لیے ہم سب کو انفرادی طور پر بھی سوچنا پڑے گا
کہ ہم اپنی ناک سے آگے بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں
کیوں کہ بقول شخصے قطرہ قطرہ کرکے ہی سمندر بنتا ہے۔ یہ
بھی استحصال کرنے والے گروہوں، قوموں، ملکوں اور لوگ
پر عوامی دباؤ سے زیادہ اور کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی
اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان سوالات کے حل کے لیے عوامی
سطح پر خود کو منظم کریں اور اپنے محلے، شہر، ضلع، اسکول
کالج غرض سماج کے ہر شعبے میں، اس سلسلے کے تمام مسائل
مراحل اور سوالات پر مل کر سوچیں، معلومات حاصل کریں
اور مسائل کے حل کی کوشش کریں۔ کیوں کہ یہ مسئلہ فرد اور
فطرت کے باہم تعلق کا ہے اور ہر فرد پہ انفرادی طور پر فطرت
کے تحفظ کا فرض عاید
ہوتا ہے۔

بقیہ "مسلم قدامت پسندی کی بنیادیں"

ایک طرف تو قدامت پسند ملا اور سیاست داں ہیں جو مسلم ملت
کو پیچھے کی طرف لے جارہے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی لگاؤ کا
استحصال کررہے ہیں۔ دوسری طرف اکثریتی فرقے کے مذہبی
جنگ جو وطن پرست ہیں۔ مسلم فرقے کے خلاف تفریقی سلوک اور
فرقہ وارانہ تشدد اس وقت عام ہیں اور یہ واقعات مسلم ملت کو
قدامت پسند ملاؤں اور سیاست دانوں کی گود میں ڈھکیل
رہے ہیں۔

اس منظر میں تیسرا عنصر ان ترقی یافتہ اور آزاد خیال
مسلمانوں پر مشتمل ہے جو فرقے کو اس حالت سے نکالنے کی
ایک موہوم سی کوشش کررہا ہے۔ لیکن یہ افراد ابھی تک
"آئی وری ٹاور" میں بیٹھے ہیں اور عوام سے ان کا
کوئی تعلق نہیں ہے۔ ماضی میں بھی اس طبقے نے ملت کی اقتص
فلاح وبہبود کے لیے بہت کم کام کیا۔ اب بھی وہ اپنے او
مقام سے ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو عام مسلمانوں کی
سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آج ایک
ایسے ترقی پسند عالم کی ضرورت ہے جو ابوالکلام آزاد اور عبیداللہ
سندھی کی سی بصیرت اور علم رکھتا۔ ان دونوں عظیم شخصیتوں
نے اس ملک میں مسلمانوں کے خیالات کو ایک نیا موڑ دینے
کی کوشش کی تھی۔

ڈاکٹر ایم۔ پٹھان
ترجمہ رئیس احمد ہاشمی

بیسویں صدی کا عظیم ریاضی داں

راما نوجن

عظیم مصنف میکسم گورکی نے لکھا ہے کہ
" انسانیت کی تاریخ یونان اور روم سے نہیں
بلکہ ہندوستان اور چین سے شروع ہوتی ہے۔"
نی کی تاریخ بھی ہندوستان سے ہی شروع ہوتی ہے۔ دور
ے سے ہی ریاضی اور سائنس کے میدان میں ہندوستان کا ایک
نام اور مقام رہا ہے۔ برہما گپت، آریہ بھٹ اور بھاسکر
ے عظیم ریاضی دانوں کے بعد چند وجوہات کی بنا پر ایک طویل
ت تک ہم کو ریاضی کے میدان میں کسی مشہور ہندوستانی
نام نظر نہیں آتا۔ تاہم اس صدی کے ریاضی داں "راما نوجن"
عرصۂ دراز سے چلے آ رہے اس خلا کو کسی حد تک پُر کر دیا۔

راما نوجن کی شخصیت اور کردار سے واقف انگلینڈ کے ایک عظیم
ضی داں پروفیسر ہارڈی کے بموجب " راما نوجن کی تمام زندگی
دجہد اور مخالفت سے بھری ہوئی تھی، لیکن اگر اس کی خدمات اور
ن کی زندگی اور عادات کا غیر جانب دارانہ طور پر جائزہ لیا جائے
اس بات پر متفق ہونا پڑتا ہے کہ 'راما نوجن' ایک عظیم ریاضی داں تھا۔

راما نوجن کی خدمات، کارنامے اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں
اجاگر کرنے کی کوشش نہ تو اُن کی حیات میں ممکن تھی اور نہ آج ہی
ممکن ہے۔ بارھویں کلاس میں متعدد بار فیل ہونے والا ۳۲ سالہ یہ نوجوان
کم عمری میں کس طرح عالمی شہرت یافتہ ریاضی داں بن گیا؟ اب
م صرف تصور ہی کر سکتے ہیں کہ اگر اتنی کم عمری میں وہ تپ دق
س وقت تک دق کا علاج نہیں تھا) جیسی مہلک بیماری سے
انتقال نہ کر گیا ہوتا تو آج اس کے ذریعے ریاضی کے میدان میں نہ جانے
کتنے نئے نئے انکشافات وجود میں آ چکے ہوتے۔

ہندوستانی سائنس دانوں میں 'راما نوجن' وہ پہلا شخص تھا
جو تیس سال سے بھی کم عمر میں ۱۹۱۸ء میں "فیلو آف رائل سوسائٹی"
منتخب ہوا۔ اسی سال وہ "فیلو آف ٹرینٹی کالج" کیمبرج بھی چنا گیا
۲۳ سال کی عمر میں اس کے ذریعے ایجاد کیے گئے ریاضی کے نئے نئے فارمولوں
نے پہلی بار مدراس کے بڑے ریاضی دانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔
مزید معلومات، علم اور رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے اس کو انگلینڈ
کے پروفیسر ہارڈی کے پاس بھیجا گیا۔ جہاں اس نے اپنے آپ کو پہلی بار
بطور ایک ریاضی داں کے متعارف کرایا، لیکن اس کے بعد وہ صرف چھ سال
تک ہی مزید زندہ رہ سکا۔ جب کہ ان چھ سالوں میں پانچ سال وہ کیمبرج
میں اور آخری ایک سال مدراس میں رہا۔ ۱۹۲۰ء میں جب اس کی
عمر صرف ۳۲ سال تھی وہ تپ دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر
لقمۂ اجل بن گیا۔ موجودہ زمانے یا مستقبل قریب میں جب ریاضی
کی دنیا میں ہندوستانی سائنس دانوں کی خدمات کا جائزہ لینا مقصود
ہوگا تو اس وقت 'راما نوجن' کے نام کی ایک خاص اہمیت ہوگی۔

راما نوجن کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۸۸۷ء کو تنجور ضلع کے ایک
چھوٹے سے گاؤں ایروڈ کے ایک غریب برہمن گھرانے میں ہوئی۔
کمبا کونم میں نو سال رہنے کے بعد اس نے مدراس یونیورسٹی سے ہائی
اسکول اوّل درجے میں پاس کیا۔ ۱۳ سال کی عمر میں ہی وہ بی۔ اے
میں پڑھائی جانے والی ٹریگنومیٹری کے سارے سوالات حل کر لیتا تھا

اور زمین کے خطِ استوا (Equator) کی لمبائی بھی نکال چکا تھا۔ وہ علمِ ریاضی میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ اس سے اونچی کلاس کے طلبا ریاضی کے سوالات حل کروایا کرتے تھے۔ وہ ریاضی میں زیادہ دلچسپی لینے لگا جس کی وجہ سے دوسرے مضامین پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ نتیجہ کے طور پر ۱۹۱۰ء میں ایف۔ اے کے امتحان میں فیل ہو گیا اور اس کے بعد بھی کئی کوششوں میں ناکام رہا۔

۱۹۰۹ء میں جب رامانوجن کی شادی جانکی کے ساتھ ہوئی تو اس کے لیے نوکری کرنا ضروری ہو گیا۔ لہٰذا وہ پڑھائی کو خیرباد کہہ کر مدراس کے پورٹ ٹرسٹ کے دفتر میں کلرک کی اسامی پر ملازم ہو گیا لیکن ملازمت کے دوران میں بھی ریاضی سے اس کی دلچسپی برقرار رہی۔ چنانچہ ریاضی کے مضمون میں وہ اس قدر ماہر ہو گیا کہ اس کے نئے نئے فارمولے سائنس کے تحقیقی رسالوں میں چھپے۔ اس کی غیر معمولی خدمات سے متاثر ہو کر اس وقت کے شعبۂ ریاضی کے پروفیسروں نیز وائس چانسلر کی کوششوں پر رامانوجن کو ایک خصوصی وظیفہ ریسرچ کے لیے منظور کیا گیا۔ اس طرح سے رامانوجن مئی ۱۹۱۳ء کو مدراس یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوا۔ رامانوجن کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر اس کو انگلینڈ کے پروفیسر ہارڈی کے ساتھ کام کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ تین سال تک رامانوجن نے پروفیسر ہارڈی اور پروفیسر لٹل ووڈ کے ساتھ کام کیا۔ اس کے پانچ تحقیقی مقالے انگلینڈ جانے سے قبل ہی شایع ہو چکے تھے۔ بعد میں انگلینڈ میں کام کرنے کے دوران ۳۲ تحقیقی مقالے مزید شایع ہوئے۔

ریاضی کے میدان جیسے Series, Integrals, Equations, Numbers اور الجبرا کے سوالات ان کے بنیادی حل اور ان کے Unifications دینے کے علاوہ رامانوجن کی دلچسپی Theory of Relativity فزکس اور علمِ نجوم میں بھی رہی۔ صفر اور Infinity کی تشریح کرتے ہوئے رامانوجن کا خیال تھا کہ ہندوستانی قدیم گرنتھوں میں بھی جدید ریاضی اور سائنس کے کئی قواعد اور مسئلوں کا حل موجود ہے۔ رامانوجن کی

تحریر کردہ چھوڑی ہوئی کچھ نوٹ بکیں (Note Books) اور ڈائری میں دیے گئے Lemmas کے Theorems کے ادھورے حل آج تک دنیا کے ماہر ریاضی داں پورے نہیں کر پائے ہیں۔ اس کی ڈائری میں دی گئی ادھوری Theorems کے حلوں پر دنیا کے مشہور معروف ریاضی داں جیسے بیلی، واٹ سن، کاپن وغیرہ کے بہت ریسرچ پیپرس چھپ چکے ہیں اور آج بھی پروفیسر اینڈریوز اور ریاضی دانوں کے پیپرس برابر چھپ رہے ہیں۔

۱۹۱۷ء میں رامانوجن پر تپ دق جیسے مرض کا حملہ ہوا۔ لہٰذا کچھ وقت کیمبرج، ویلس اور لندن کے اسپتال میں رہنے کے بعد آخر اسے مدراس واپس آنا پڑا۔ مدراس یونیورسٹی نے رامانوجن کو ۵ سال کے لیے غیر مشروط طور پر وظیفہ دینا منظور کیا۔ مزید ان کے اعلیٰ مرتبہ اور اعزاز کو برقرار رکھتے ہوئے شعبۂ ریاضی میں پروفیسر کی ایک نئی اسامی نکالی، لیکن قبل اس کے کہ وہ اس اعزاز کو قبول کرتا، ۲۶ اپریل کو یہ باصلاحیت نوجوان موت کی آغوش میں سو گیا۔

۱۹۳۰ء سے رامانوجن کی یاد اور ان کے اعزاز میں اعلیٰ ریسرچ کرنے کے لیے "رامانوجن انعام" دیا جاتا ہے۔ مدراس میں باقاعدہ "رامانوجن انسٹی ٹیوٹ" بھی قایم کیا گیا۔ ہند سرکار نے ۱۹۶۲ء میں رامانوجن کی پچھترویں سال گرہ کے موقع پر ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔

۱۹۸۷ء میں رامانوجن کی صد سالہ تقریبات کے لیے پورے ہندوستان میں بڑے زور و شور سے منائی جا رہی ہیں۔
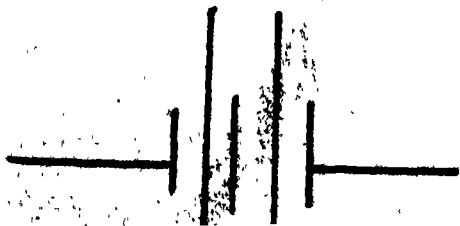
مزاج ادویہ، اس کی اہمیت اور مراتب قویٰ ادویہ

تمام مرکبات (موالید ثلاثہ: نباتات، حیوانات، جمادات)
[illegible] صورت نوعیہ (Specific Form) اور بنیادی اجزا (عناصر)
[illegible] ترتیب (Elementary Composition) کی بنا پر مختلف مزاجی
[illegible]فیت رکھتے ہیں اور اس مزاجی اختلاف ہی کی بنا پر ہر نوع یا ہر شخص
ہر مرکب اپنے طبعی افعال اور معمولات - Required Functions
and Properties - کو صحیح طریقے پر انجام دیتا ہے۔ اس لیے
ہر شے کا اپنا طبعی یا اصلی مزاج (Natural Temprament)
[illegible]ہی ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ شے اپنے تمام امور (طبعی افعال)
بخوبی انجام دے سکے۔ جب کسی جاندار شے کے مزاج طبعی میں کسی
سبب سے کسی قسم کا تغیر واقع ہو جاتا ہے تو اس شے سے سرزد ہونے
والے طبعی افعال کی انجام دہی میں فرق پڑ جاتا ہے اور وہ شے اپنے
قدرتی مزاج کو صحیح حالت میں قایم نہیں رکھ پاتی۔ کسی نوع یا کسی شخص
کے اس مزاج اصلی کو واپس لانے کے لیے جن اشیاء کا استعمال کیا
جاتا ہے، ان کو دوا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا
ہے کہ ایک طبیب کو جہاں انسان کے جسم کے مزاج و کیفیت کا مطالعہ
کرنا ضروری ہوتا ہے، وہیں ان اشیاء اور تدابیر کا مطالعہ بھی اس
کے لیے ضروری ہے جو مزاج غیر طبعی کو مزاج طبعی میں بدلنے کی صلاحیت
رکھتی ہیں۔ علاوہ بریں معالج کو مناسب مزاج کی تدابیر اور دواؤں
کو استعمال کرنے کے لیے مرض کی نوعیت کا لحاظ رکھنا بھی لازمی ہوتا
ہے یعنی مرض کی شدید حالت میں شدید کیفیت رکھنے والی دوائیں اور
خفیف مرض میں خفیف کیفیت رکھنے والی دوائیں قابل استعمال ہوتی
ہیں۔ اسی اصول کے تحت جہاں دواؤں کی مزاجی کیفیات کا مطالعہ
ضروری سمجھا جاتا ہے وہیں شدت اور کمی کے اعتبار سے مزاجی کیفیت
میں اختلاف کی بنا پر ان کی درجہ بندی اور دواؤں کی قوتوں کے
مراتب کا جاننا بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

یونانی نظام طب کے نظریے کے مطابق مزاج اس درمیانی کیفیت
کو کہتے ہیں جو چاروں عناصر (آگ، ہوا، پانی اور مٹی) اور ان کی
چاروں کیفیتوں (حرارت، برودت، رطوبت، یبوست) کے ملنے
سے حاصل ہوتی ہے۔ جس وقت عناصر کے اجزاء ریزہ ریزہ - صغار (Disin-
tegrates) - ہو کر آپس میں ملتے ہیں۔ ان اجزائے صغیرہ کا عمل
اور رد عمل (Action & Reaction) اس حد تک ہوتا ہے کہ ایک
عنصر کی کیفیت دوسرے عنصر کی تیزی اور تندی کو توڑ دیتی ہے۔
اس طرح ایک ایسی صورت وحدانی حاصل ہوتی ہے جس میں چاروں
عناصر اور ان کی متضاد الگ الگ کیفیات نہیں پائی جاتیں۔ دراصل
دواؤں کے مزاج کا اظہار چار کیفیات میں (In Terms of
qualities) کیا جاتا ہے یعنی جب کوئی دوا لی جاتی ہے تو بدن
میں داخل ہونے کے بعد وہ بدن کے اخلاط و رطوبات (Humours)
اور حرارت غریزیہ (Innate Heat of the Body) سے متاثر

ہوکر پھر علامات اور نشانیاں پیدا کرتی ہے جنہیں حرارت، برودت
رطوبت، یبوست کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح دوا
جسم کے مختلف استحالائی مراحل سے گذر کر اثر انداز ہوتی ہے۔

دوا کا مزاج دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ پہلا مزاج
اولی کہلاتا ہے جسے کسی دوا کا مزاج اصلی و طبعی بھی کہتے ہیں۔ وہ یہ
ہے کہ عناصر کے باہم ملنے اور ایک دوسرے میں اثر کرنے (عمل و
ردعمل) کے بعد ایک فیاض مزاج متنرج کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی وہ
مزاج اصلی وہ مخصوص امتزاجی کیفیت ہے جو کسی چیز میں چند عناصر
کے ملنے اور باہم عمل و ردعمل کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ دوا کا یہ
مزاج نفس ذات کے اعتبار سے ہے اور اسی مخصوص مزاج کی وجہ
سے ہر دوا کو علیحدہ علیحدہ صورت نوعیہ حاصل ہوتی ہے اور
ایک دوا دوسری دوا سے علیحدہ سمجھی جاتی ہے اور کیفیات اولیٰ
(گرمی، سردی، تری و خشکی) ظہور میں آتی ہیں۔ ایسی دوائیں
کو مفرد القوی (Single Potency Drug) بھی کہتے
ہیں۔ دوا کا دوسرا مزاج غیر طبعی ہے جو مزاج ثانوی کہلاتا ہے۔
مزاج ثانی ایسے اجزا سے مل کر بنتا ہے جن میں پہلے ہی سے مزاج اولیٰ
موجود ہو۔ یعنی ایسے اجزاء ترکیبیہ جن میں پہلے ہی سے مزاج اولی
موجود ہو، آپس میں مل کر ایک دوسرے میں اثر کرنے کے بعد
دوسرا مزاج بناتے ہیں جسے مزاج ثانی کہتے ہیں۔ یہ مزاج، دوا
کا بدن انسانی (Human Body) میں اثر کرنے کے اعتبار
سے ہوتا ہے۔ مزاج ثانوی والی دوا ایسی اجزاء سے مرکب ہوتی
ہے جن کو مزاج اولی مختلف الاثر حاصل ہے۔ جیسے بعض دواؤں
کا گرمی پیدا کرنا، بعض کا سردی پیدا کرنا، بعض کا تری پیدا کرنا
اور بعض کا خشکی پیدا کرنا۔ مزاج ثانوی رکھنے والی دوائیں خواہ
وہ نباتاتی ہوں یا حیوانی یا معدنی مرکب القوی (Multi potency-
drug) کہلاتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی دوائیں
مختلف قوتوں (Potency) اور افعال (Actions) کی مالک
ہوتی ہیں۔ طبیب اسی مزاج کی بنیاد پر دواؤں سے بحث کرتا
ہے۔ مثلاً کسی دواء کو اگر یہ کہا جائے کہ یہ گرم مزاج والی دوا
ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ یہ دوا ایسے مزاج سے مرکب
ہے جس کا مزاج گرم ہے اور یہ دوا جسم میں داخل ہونے کے
اس میں اتنی گرمی پیدا کر دیتی ہے جو اس کی معمول کی گرمی
(Innate heat) سے زائد اور جداگانہ ہوتی ہے۔ باالفاظ دیگر
دوا بدنی حرارت کو بڑھا دیتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جاتا ہے
کہ کوئی دوا سرد ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس دوا
کے استعمال سے انسان کے جسم میں اس قدر سردی پیدا ہو
ہے جو اس کے جسم کی موجودہ اعتدالی برودت سے زائد
ہے یا بالفاظ دیگر دواء سرد بدن میں حرارت کی تولید (Heat
Production) کو کم کر دیتی ہے کوئی دوا بالفعل (Actually)
یعنی چھونے پر اپنی حرارت کی بنا پر گرم یا سرد نہیں ہوتی بلکہ با
(Potentially) (یعنی بدن انسان میں حرارت غریزی سے متاثر
ہونے کے بعد ہی) گرم یا سرد ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ قوت
(Potentiality Transformed- فعل میں بدل جاتی ہے
Into actuallity) اسی سیاق و سباق میں کسی دوا کو تر یا خشک
بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ کسی دوا کو تر یا خشک کہنے کا مطلب
یہ نہیں ہوتا کہ اس دواء کے اندر (Water Contents
کم یا زیادہ ہوں گے بلکہ اس سے بھی مراد یہی ہوتی ہے کہ دوا
جسم میں داخل ہونے کے بعد گرمی و سردی ہی کی طرح تری یا
خشکی والی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک دوا
معتدل بھی ہوتی ہے۔ دواء کے معتدل ہونے سے مراد دوا کے
افعال میں اعتدال سے ہوتا ہے۔ ایسی دواء جسم میں داخل ہوکر
اور جسمانی حرارت سے متاثر ہونے کے بعد اپنے اندر پائے جا
والے اجزاء مؤثرہ سے جسم میں ایک اعتدالی کیفیت پیدا کرتی ہے
اور یہ کیفیت بدنی کیفیت و مزاج کے مطابق ہوتی ہے کم و بیش
نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دواء کا پہلی قسم کا جو مزا
ہوتا ہے وہ بدن انسانی میں اثر کرنے کے اعتبار سے دوسر
طور پر ہوتا ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ پہلے اعتبار سے جس دواء کا

سرد ہو وہ بدن انسان میں اثر کرنے کے اعتبار سے گرم ہو۔ اس
کی صورت یہ ہے کہ کسی دوا کے مزاج اصلی کا جزو سرد ایسا کثیف
اور غلیظ ہو کہ بدن کی حرارت غریزی سے کسی طرح اثر پذیر نہ
ہوسکے بلکہ اس کا جزو گرم حرارت غریزی سے اثر پذیر ہو جائے
یہی وجہ ہے کہ جو دوا باوجود کہ اپنے مزاج اصلی کے اعتبار سے تو
سرد ہوتی ہے مگر جسم میں داخل ہو جانے کے بعد بدن کی حرارت
سے بھڑک کر خود گرمی پیدا کردیتی ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے
کہ جو دوا مزاجی اعتبار سے گرم ہے۔ اس کے برعکس یوں بھی
ہوسکتا ہے کہ کسی دوا کا مزاج اصلی گرم ہے لیکن وہ انسان
کے بدن میں پہنچ کر سردی ظاہر کرتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے
کہ کسی دوا کے مزاج اصلی کے جزو ناری (جو گرمی پیدا کرتا ہے)
کی یہ حالت ہو کہ جب وہ وارد بدن ہو تو فنا ہو جائے اور جزو
ارضی یا جزو مائی (جو سردی کا باعث ہوتا ہے) باقی رہ جائے
اس لیے وہ دوا باوجود اس کے کہ مزاج اصلی اس کا گرم ہے
بدن میں پہنچ کر سرد ہو جاتی ہے۔

دوا کا مزاج ثانی دو طور پر ہوتا ہے
ایک طبعی دوسرا مصنوعی۔ مزاج طبعی طبیعت (Nature)
کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، اور تمام ادویہ
مفردیہ (SIMPLE DRUGS) اس
کی مثالیں ہیں۔

مثال کے طور پر تریاق (ایک مرکب دوا) کے ہر
جزو کا ایک خاص مزاج (طبعی) علیحدہ ہوتا ہے۔ جب وہ سب جزو
مل کر مرکب ہو جاتے ہیں تو ایک مزاج ثانی ظہور میں آتا ہے جو
وہ فعل صادر کرتا ہے جو مرکب کے ہر ایک جزو سے صادر نہیں
ہوسکتا۔ دوا کا یہ مزاج ثانی مصنوعی اجزائے ترکیبیہ کی ترکیب
ہونے کی کیفیت کے تعلق سے دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتا۔
یا تو وہ قوی ہوتا ہے یا ضعیف۔ قوی یہ ہے کہ مزاج ثانی
کے اجزاء ترکیبیہ باہم اس طرح مضبوطی سے مل جائیں کہ ان
کی تحلیل کرنا حرارت غریزی کے ذریعہ دشوار ہو یہاں تک کہ
شدید حرارت بھی ان کو جدا نہیں کرسکتی۔ مثلاً سونا، چاندی، تانبا
جست وغیرہ اس کو مزاج ثانی مستحکم بھی کہتے ہیں۔ دوسرا مزاج
ثانی کمزور ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ترکیب میں استحکام نہیں ہوتا
جس سے مراد یہ ہے کہ ایسی دواؤں کے اجزاء کی ترکیب اس
قدر پائیدار نہیں ہوتی کہ ان کو مختلف تدابیر سے علیحدہ نہ کرسکیں
اسی لیے اس طرح کے مزاج کو مزاج ثانوی غیر مستحکم بھی کہتے
ہیں۔ ایسا مزاج رکھنے والی دوا جب کھائی جاتی ہے تو اس
کے اجزاء (Ingredients) بدن کی حرارت غریزی سے منفعل
ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں اور ہر جزو اس کا ایک علیحدہ فعل صادر
کرتا ہے جس میں ایک فعل دوسرے کی ضد ہوتا ہے۔ اگر اطباء
کسی دوا کو یہ کہتے ہیں کہ یہ دوا متضاد قوتوں سے مرکب ہے تو
اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ دوا کا ایک ہی جزو سردی و گرمی
پیدا کرتا ہے یا قبض و اسہال کرتا ہے۔ بلکہ گرمی و سردی کی
قوتیں یا قبض و اسہال پیدا کرنے والی قوتیں علیحدہ علیحدہ اجزاء
رکھتی ہیں۔ ارضیت کی وجہ سے وہ دوا قبض پیدا کرتی ہے اور
جزو مائی کی وجہ سے اسہال لانے کا باعث ہوتی ہے۔ مثال
کے طور پر ریوندچینی (Rhubarb) میں دو متضاد افعال رکھنے
والے اجزاء (Constituents) پائے جاتے ہیں۔ ایک
(Astri- مادہ جو پہلے قبضیت پیدا کرتا ہے۔ (Gallic Acid
(Chrysophanol) اور دوسرا جزو -ngent Action)
جو اس کے بعد (Purgation) پیدا کرتا ہے۔ اس طرح کی دوا کا
مزاج ضعیف ہوتا ہے اور یہ کمزوری جتنی زیادہ ہوتی ہے
اسی قدر جلد اس کے اجزاء جدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی دواؤں
کی ترکیب اس قدر غیر مستحکم ہوتی ہے کہ کبھی ان کو صرف جوش
دینے سے ہی ان کی متضاد قوتیں اور اجزاء ایک دوسرے
سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کرم کلہ۔ اس کا جوہر دو چیزوں
سے مرکب ہے۔ ایک مادۂ ارضی، جو قبض پیدا کرتا ہے اور ایک
مادۂ لطیف جس میں شوریت اور نمکینی ہوتی ہے۔ اس طرح
عدس مقشر (مسور) کو پکانے پر اس کے اجزائے محللہ پانی میں آجاتے

اور اجزائے قابضہ مسوڑھی میں باقی رہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام دواؤں کو اسی لیے جوشاندہ کی صورت میں استعمال کراتے ہیں۔ کبھی ان دواؤں کے اجزاء کی علیحدگی کے لیے معمولی ترکیب بھی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً کاسنی کے سبز پتوں پر پایا جانے والا تلخ مادہ محلل جس اس کو دھو ڈالنے سے ہی علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس طرح کی دواؤں کو بطور خیساندہ (Infusion Form) استعمال کراتے ہیں۔ کبھی ان دواؤں کے اجزاء آگ پر پکانے سے بھی علیحدہ نہیں ہوتے لیکن اگر جلا دیا جائے تو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بابونہ اس کو پکانے پر اس کے دو جز محلل اور قابض پانی میں آجاتے ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ لیکن اگر بابونہ کو جلا دیا جائے تو اس کے یہ دونوں جزو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک یونانی طریقہ ہائے علاج میں استعمال ہونے والی ادویہ کے مزاج اور ان سے سرزد ہونے والے افعال کے لزوم کا تعلق ہے یکساں مزاج وکیفیات رکھنے والی دوائیں اپنے افعال اور خصوصیات میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں جیسے دوسرے درجے کی حار یابس دوائیں مختلف افعال وخواص والی ہوتی ہیں — وہ مدر بول بھی ہیں مسہل بھی ہیں اور مدر حیض وشیر بھی ہوتی ہیں اور اکثر محلل اورام بھی ہوتی ہیں اور اس کے برخلاف کبھی یکساں مزاج اور کیفیت رکھنے کے باوجود ایک حار یابس دوا گردوں پر اثر انداز ہو کر ادرار بول تو کرتی ہے لیکن امعاء پر اثر انداز ہو کر رطوبت معویہ اور حرکات دودیہ میں اضافہ کر کے تلیین اور اسہال کا باعث نہیں بنتیں۔ مثال کے طور پر سقمونیا اور خیار شنبر مسہل ہیں یعنی امعاء کی حرکات میں تحریک پیدا کر کے اسہال لاتی ہیں لیکن ادرار بول نہیں کرتیں جب کہ ان جیسی مزاج رکھنے والی دوسری دوائیں مثلاً تخم خربزہ اور خار خسک وغیرہ ادرار بول وحیض تو کرتی ہیں لیکن اسہال نہیں لاتیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سی دوائیں مزاج اور کیفیت اور اجزاء ترکیبی کے اعتبار سے تو یکساں ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی ہیئت ترکیبی کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف افعال

انجام دیتی ہیں۔ کیوں کہ کسی مرکب (Compound) کے مختلف اجزا ترکیبیہ کی ہیئت (اجزاء کی مخصوص ترتیب وتدوین -lementry- Composition) میں فرق آجانے سے اس مرکب کی خصوصیات (Characterstics) اور اس کے اثرات (fects) بدل جاتے ہیں۔

جہاں تک مفرد دواؤں کے مزاج کا سوال ہے قدرتاً پائے جانے والی نباتی حیوانی یا معدنی ادویہ (tur- ally Occuring Drugs) دراصل مفرد نہیں ہوتیں وہ کئی کیمیاوی اجزا (ganic & Inorganic Ing- redients) سے مل کر بنی ہوتی ہیں جو مختلف خواص (erse- dicinal Properties) اور افعال (qualities) رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اجزاء زیادہ فعال اور قوی (re- potent & action) ہوتے ہیں اور کچھ اجزاء کم فعال اور قوی ہوتے ہیں۔ جب مختلف مزاج رکھنے والے یہ اجزاء کسی دوا میں ایک ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو اس قدرتی مرکب کا نیا مزاج (Resultant Temprament) پیدا ہوتا ہے جو کہ تمام مفرد اجزاء کے مزاجوں کا کل (um Total) ہے اور جس میں جوہر فعال (Active Ingredient) کا غالب رہتا ہے اور اسی بنیاد پر کسی مفرد دوا کا مزاج متعین جاتا ہے۔ کسی مفرد دوا میں پائے جانے والے یہ مختلف دو طرح کا فعل انجام دیتے ہیں۔ کبھی ایک جز دوسرے فعل کو بڑھا دیتا ہے۔ یعنی (Synergistic Action) ہے اور کبھی دوا میں موجود ایک جز (lt-in- Antidote) دوسرے فعال جزو (Active Principle) کی مضرت کو دفع کا کام کرتا ہے یعنی اصلاح کن (rective Action) کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ یونانی طرز علاج میں علیحدہ جزو فعال (Isolated active Principle) کے استعمال میں دوا بوسالم (ude Drugs as a whole) استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے۔

جس طرح طبیبوں نے دواؤں کے مزاج کی تقسیم کی ہے اسی
طرح دواؤں کی قوت کی تقسیم بھی کی ہے۔ دوا کی قوت سے مراد وہ
سبب ہے جس سے دوا کے فعل کا ظہور ہوتا ہے۔ حقیقتاً قوت ممتزج
کی وہ کیفیت ہے جو اس کو پیدا ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے
قوی ادویہ کے مراتب تین ہوتے ہیں۔ پہلے درجہ میں وہ افعال
محسوسہ (گرمی، سردی، تری و خشکی) داخل ہیں جو اس کیفیت
(قوت) سے ظہور میں آتے ہیں۔ یعنی جب دوا کسی چیز سے آکر ملتی
ہے تو اس میں حرارت برودت رطوبت یبوست پیدا کر دیتی ہے۔
اس کی ایک قسم طبعی ہے جیسے گلاب کا پھول جو ایسے اجزاء سے مرکب
ہے جن کو مزاج اولی حاصل ہے۔ پھر ان اجزاء کے جمع ہونے سے
ایک ایسا مزاج ثانی اس کو حاصل ہو گیا جو اس کے علیحدہ علیحدہ
جز کو حاصل نہ تھا۔ اس کی ایک دوسری قسم صناعی ہے جب کہ
مفرد دواؤں کو جمع کرنے سے مرکب میں ایسا مزاج حاصل ہوتا
ہے جو اپنا ایک مختلف فعل صادر کرتا ہے۔ اس کی مثال تمام مرکبات
ہیں۔ دواؤں کی قوت کا تیسرا مرتبہ پہلے اور دوسرے مرتبہ کے
لازم سے ہے۔ اس مرتبے میں صورت نوعیہ سے افعال ظہور میں
آتے ہیں۔ مثلاً حجر الیہود کا پتھری کو توڑنا اس کے مزاج کی کیفیت
کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ گرمی اخلاط کو کاٹتی ہے اور اخلاط کا
کٹنا ہی پتھری کے ٹوٹنے کا سبب ہے۔

تمام ادویہ جو مزاجی کیفیت رکھتی ہیں ان کو اپنی کیفیات کی
قوتوں کے لحاظ سے — (According to the ... of their
Degrees) چار درجات (Grade of degree) میں
تقسیم کیا جاتا ہے۔ تاکہ مرض کی شدت و خفت کا اعتبار کرتے ہوئے
دوران کے علاج کی شدت و خفت کا خیال رکھتے ہوئے مناسب
مزاج کی دوائیں استعمال کی جا سکیں۔ پہلے درجے میں وہ دوائیں
شامل ہیں جن کی کیفیت کا اثر مقامی یا عمومی طور پر محسوس نہ ہو
یعنی اس طرح کی دواؤں کے استعمال سے روزمرہ کے معمولات
میں فرق نہیں آتا۔ دوسرے درجے میں وہ دوائیں رکھی گئی ہیں
جن کی کیفیات کا اثر محسوس ہوتا ہے لیکن ان کے استعمال سے
مضر اثرات رونما نہیں ہوتے لیکن اگر اس درجے کی دواؤں کو
بار بار یا متعینہ مقدار سے زائد استعمال کرایا جائے تو معمولات میں
فرق پڑ جاتا ہے۔ درجہ تین کی دوائیں وہ ہیں جن کی کیفیات کا
اثر دوسرے درجہ کی ادویات کے مقابلے زیادہ قوی ہوتا
ہے اور مضر اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ یعنی ایسی دواؤں کو
اگر پہلی بار استعمال کرائیں تو روزمرہ کے معمولات (سونا، جاگنا
وغیرہ) میں قدرے خلل واقع ہوتا ہے اور بار بار استعمال کرانے
پر تمام جسم میں یا مقامی طور پر اعضاء میں فساد لاحق ہو جاتا
ہے۔ آخری یعنی درجہ چہارم کی دواؤں کے اثرات بہت
زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور یہ دوائیں اپنی انتہائی شدید
گرمی یا سردی سے ہلاکت کی حد تک مضر ہوتی ہیں۔ ان کو
اسی لیے ادویہ سمیہ (Toxic Drugs) بھی کہا جاتا
ہے۔ کیوں کہ یہ دوائیں بھی بدنی نظام افعال کو درہم برہم
کر دیتی ہیں جیسے کچلا اپنی شدید مزاجی حرارت کی بنا پر خون
کے ذرات کو توڑ کر ہلاکت کا باعث بنتی ہے اسی طرح افیون
اپنی انتہائی برودت کی بنا پر دوران خون میں خلل انداز
ہو کر جسمانی حرارت کو کم کر دیتی ہے۔ یونانی طریقہ علاج میں
درجہ چار کی دواؤں کو ان کے انہیں اثرات کے بنا پر ان
کے زہریلے اثرات کو کم کر کے یعنی ایک خاص تدبیر کے بعد استعمال
کراتے ہیں۔ پہلے درجے اور دوسرے درجے کی دوائیں
تیسرے درجے کی دواؤں کی نسبت ہوتی ہیں ——
کیوں کہ تیسرے درجے کی دواؤں کے مضر اثرات ظاہر ہوتے
ہیں، جب کہ چوتھے درجے کی دوائیں جو مہلک اثرات کی
حامل ہوتی ہیں ضرر رساں ہوتی ہیں —— اس لیے
ان کو کمال احتیاط کے ساتھ استعمال کرایا جاتا ہے۔ مریض کے
مزاج کے مطابق Identical to the Temprament of
the Patient) علاج کے لیے درجات ادویہ کا لحاظ رکھنا
ضروری ہوتا ہے۔

* * * * * *

سید مشوف علی

یونی فارم سول کوڈ

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو نئی دہلی میں وکلاء کی قومی جماعت ۔ Nati
onal Bar Council ۔ کے زیر اہتمام قومی سطح پر ایک اجتماع
(CONVENTION) کا انعقاد ہوا۔ اس جلسے کا افتتاح مرکزی
وزیر برائے قانون جناب اے۔ کے۔ سین نے کیا۔ اس میں ملک کے
مختلف صوبوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ مقامی طور پر شریک ہونے
والوں میں ایم۔ ایچ۔ بیگ، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف
انڈیا، جناب کرشنا ایّر صاحب، سابق جج سپریم کورٹ
اور جناب یونس سلیم صاحب سابق مرکزی وزیر اور ایڈوکیٹ سپریم
کورٹ نمایاں ہیں۔ اس کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ بلا تفریق مذہب
اور مذہبی ضوابط و قانون ہندوستان کے تمام باشندوں کے
لیے یکساں معاشرتی نظام قایم کیا جائے یا یونیفارم سول کوڈ کی
تشکیل ہو اور نفاذ ہونا چاہیے۔ شریک ہونے والوں میں اکثریت
نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یونیفارم سول کوڈ پر عمل کرنے کی پابندی کو
اختیاری حیثیت دینا مناسب نہ ہوگا۔ چوں کہ ایسا کرنا دستور کے
بنیادی ضوابط اور مقاصد کے خلاف ہوگا۔ ان کے خیال سے ہندوستان
کا دستور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا معاشرہ
عالم وجود میں آئے جس میں سماجی انصاف، اتحاد، یکجہتی اور دستور کی اعلےٰ
قدروں کی فضا قایم ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یونیفارم سول کوڈ
کا ہونا ضروری ہے۔

اکثریت کے حضرات کے علاوہ اس پر بحث اور اظہار خیال دیگر
حضرات نے بھی کیا۔ یونس سلیم صاحب نے کہا کہ ہندوستان جب آزادی کی
جنگ لڑ رہا تھا اور اپنا دستور مرتب کرنا شروع کر دیا تھا اس وقت ا
کے پیش نظر اقلیت اور اس کے مذہبی عقاید کا تحفظ انتہائی اہم تھا
اسی وعدے پر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہر مذہب اور نظر
کے لوگ متحد ہو کر شریک ہوئے جس میں مسلمان، عیسائی، سکھ اور دیگر
زمرے کے لوگ بھی تھے۔ لہٰذا ان کے تحفظی اقدام کو دستور کی شکل اور گز
میں لانے کے لیے دستور کی بنیاد سیکولرزم پر قایم کرنا منظور ہوا اکثر
میں بیشتر نے مخالفت کی اور آخر میں ان نظریات کے قایم ہونے کے ب
اجلاس کا اختتام ہوا۔ اے۔ کے۔ سین صاحب کے مطابق مسلم
زیادہ تر نمائندوں نے کی کہ یونیفارم سول کوڈ کو اختیاری مقام د
جائے۔ اس رائے کی حمایت کرشنا ایّر صاحب نے بھی کی۔ جن
ایم۔ ایچ۔ بیگ صاحب نے ایک الگ رائے کا اظہار کیا۔ ان
مطابق اس پورے مسئلہ یعنی یونیفارم سول کوڈ پر عمومی طور پر تما
فرقوں کے لیے لازمی یا اختیاری نہ رکھا جائے بلکہ اس کو عدالت پر چھو
دیا جائے جو اپنے منصفانہ توجیہات اور شرح سے یونیفارم
کوڈ کو قایم کرے۔ کرشنا ایّر صاحب کے خیال کے مطابق
کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہ مناسب ہے کہ یونیفارم
کوڈ کو اختیاری ہی حیثیت دی جائے۔ یہی نظریہ کنونشن کا
قایم ہوا۔

یونیفارم سول کوڈ کی تشکیل اور اس کا نفاذ دو بہت
پہلو ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ اور اس پر عمل د
کے لیے ہندوستان کے لوگوں کا معاشرہ مذہبی اعتقادات

و گہرائی و گیرائی سے سمجھنا انتہائی لازمی ہے۔

ہندوستان ایک مخلوط آبادی کا ملک ہے۔ اس میں مختلف
ب، نظریات اور زبان کے لوگ صدیوں سے آباد ہیں۔ ان کے
ے اور طریقۂ حیات مذہبی عقائد سے مہیا ہیں جو ان کی ذاتی
ے کر سماجی زندگی میں منعکس ہیں۔ بعینہٖ تمام فرقوں کا طریقۂ
ا اور زاویۂ فکر ہے۔ مذہب کا زندگی اور طریقۂ زندگی کو حصار
ا فرقے کی تشکیل کرتا ہے اور علیحدگی کے جذبات کو جنم دیتا ہے
و تفریق کی فضا پیدا کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرقہ کا
ر علیحدگی پر قایم ہے۔ علیحدگی مذہب ہی کی بنیاد پر نہیں ہوتی
ہ اس کی متشدد جذبات کا باعث ہوتی ہے بلکہ جب مذہب
ا کے سارے شعبوں کو سمیٹ کر ایک ضوابط حیات کی تشکیل
ہے اس وقت فرقے کا وجود ظہور پذیر ہوتا ہے، اسی کو معاشرہ
ہیں۔ یہ معاشرہ ہر مذہبی ملک کے سماجی ساخت میں ہوتا ہے
دہاں نہیں ہوتا جہاں مذہب اور حیات انسانی کا اختلاط
ا ہے۔ فرقہ یقیناً علیحدگی کی دیوار قایم کرکے اُس زمرے کو
د جذبات مہیا کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ہندوستان کے دو فرقوں اور ان کے
ہب اور معاشرے کا تجزیہ کیجیے۔ ہندو اور مسلمان کی مثال سے حقیقت
دہ واضح ہو سکے گی۔ دونوں فرقے مذہب کو مانتے ہیں مذہب
بنیادی تصورات یقیناً مختلف ہیں۔ مگر اس پر اتفاق دونوں
ں کو ہے کہ خدا ہے، وہ عبادت کے لایق ہے اور ہم کو اس
عبادت کرنا فرض ہے، موت پر یقین ہے اور موت کے بعد کی
گی میں سزا و جزا کا تصور ہے۔ دونوں فرقوں میں یہاں تک
ا تصادم نہیں مگر جب مذہب زندگی کے دیگر معاملات اور
بات کو اپنے قابو میں لے کر ایک طرز زندگی قایم کرتا ہے تو
لف معاشرے وجود میں آتے ہیں جن کے ساتھ امتیاز و تفریق
عدیں تعمیر ہونے لگتی ہیں۔ معاشرہ مذہب اور زندگی کے
لاط کا نام ہے اور طرز حیات اس کا امتیاز ہے۔ مذہب اور
گی دونوں ایک دوسرے میں دودھ پانی کی طرح حل ہوتے

ہیں حل جانے کے بعد دونوں کی شکل ایک ہی ہو جاتی ہے۔ کسی
فرقے کا مذہب ہو یا معاشرہ۔ دونوں ان فرقوں کی مکمل عکاسی
کرتے ہیں۔ پوری زندگی مذہب کا قایم کیا ایک طریقہ ہوتی ہے۔
مثال کے طور پر مسلمانوں کا پرسنل لا۔ یہ قانونِ حیات ہے جس کا
تعلق بلکہ بنیادی اصول مسلمانوں کی مقدس و متبرک کتاب قرآن مجید
پر مشتمل ہے، ان کو زندگی میں برتنے اور اس طرح زندگی کو اسلامی
رکھنے کے لیے قرآن کریم کے اصولوں کو قانونی شکل دے کر ہر
مسلمان کو ان کا پابند کر دیا گیا۔ لہٰذا مسلم پرسنل لا مسلمانوں کے لیے
ایک طریقۂ حیات ہے، جس میں ان کو زندگی گزارنے کا طریقہ اور روحانی
تسکین دونوں حاصل ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو یا کسی فرقے کو کسی ایسے
قانون و ضوابط کا پابند کرنا کہ وہ مذہب اور اس سے وابستہ زندگی
کی قدروں سے دور ہو جائے۔ ایسا کوئی نہ گوارہ کرے گا۔ لہٰذا
یونیفارم سول کوڈ ہندوستان کے ماحول اور فضا میں کھپتا نظر
نہیں آتا۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب کبھی یہ مسئلہ اُٹھتا ہے، تو
تمام مذاہب و نظریات کے لوگ متحرک ہو جاتے ہیں اور اپنے کو
غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ بجائے یونیفارم سول کوڈ
یا اس طرح کے اور طریقوں پر فکر کریں، ہم ہندوستان کی یکجہتی
فرقہ وارانہ تشدد، اور سماجی فلاح و بہبود پر توجہ کریں۔ معاشرے
یا مذہبی اعتقادات پر ہلکی سی ضرب سے فرقہ کو شدید تکلیف
ہوتی ہے اور فوری عدم تحفظ کا احساس غالب ہونے لگتا ہے
ہمارے دستور کی بنیاد آپسی بھائی چارگی پر ہے۔ ایک قوت
اور ایک قوم کے تصور پر ہے جس کا استحصال دستور ہی میں
قایم سماجی انصاف اور اقتصادی برابری کے واضح عمل سے ممکن ہے۔

کنونشن میں خیالات کے اظہار، محرکات اور تاثرات کے
اعتبار سے سابق چیف جسٹس۔ ایم۔ ایچ۔ بیگ، اے۔ کے۔ سین
اور کرشنا ائیر کے نظریات متوازن ہیں۔ اس میں بیگ صاحب
کا خیال کہ اس مسئلے کو عدالتوں کے سپرد کر دیا جائے، موصوف
کا یہ خیال متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی جامع اور
وزنی ہے۔

عدالتوں کے ذریعے سماج میں اصلاح، مساوات، اقتصادی برابری اور دیگر قدروں کو قایم کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ عدالت مکمل طور سے غیر جانب دار ہو اور انصاف کی ترازو کو مضبوطی سے گرفت میں رکھے۔ تمام فرقوں کو چاہیے، وہ اکثریت ہو یا اقلیت کا انتہائی کمزور گروہ کہ دستور کی پابندی کریں اور عدالتوں کی شرح اور توجیہات پر پابندی سے عمل درآمد کریں۔ مگر اس کے ساتھ عدالت کا انصاف بلکہ اس انصاف جس کا تعلق مذہبی عقاید سے وابستہ ہو، انصاف اور دستور کی اعلیٰ قدروں پر منحصر ہونا چاہیے۔ مسئلہ کسی کا بھی ہو انصاف غیر جانب دارانہ حالات میں تبدیلی لانے کے لیے زبردست قوت فراہم کر سکتا ہے۔ اس طرز کا انصاف تشریح و توجیہات سے مکمل ہوگا اور ہر طرح کے اعتراضات سے محفوظ رہے گا۔ مگر یہ حقیقت ہے جو انتہائی جامع اور مستحکم ہے کہ مذہبی مسائل جب عوام کے اقتصادی اور سماجی حالات کی روشنی میں تشریح کیے جاتے ہیں تو یہ مسئلہ نازک ہی نہیں بلکہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ شاہ بانو کیس اس کی مثال ہے۔

ہندوستان کے باشندوں کا مزاج ہنوز مذہبی بنیادوں پر قایم ہے۔ مذہبی عقائد یہاں کے تمام فرقوں کے مشاغل کا بنیادی تصور ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو چھیڑنا ایک بہت بڑے مسئلے کا پیش خیمہ ہے۔ جس سے قومی نقصانات تک ممکن ہیں۔ ہمارے سماج اور ملک نے ایسے نقصانات برداشت بھی کیے ہیں۔ جب کبھی مذہبی مسائل کو سیاست کے اصولوں کے ذریعے حل کیا گیا تو مذہبی پختہ خیالی اور متشدد ہو گئی۔

اگر مقصد یہی ہے جیسا کہ کنونشن میں اکثریت نے ظاہر کیا کہ دستور کی روح کے اعتبار سے سماج میں برابری اور اقتصادی مساوات کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہو۔ اس زاویۂ خیال سے تو دستور کی [illegible] اور بنیادی اصول مجروح و محدود ہونے کے ساتھ مقصد بجائے حاصل ہونے کے ان شرح پر شدید ضرب لگے گی جن کی رو سے اقلیت کو مذہبی آزادی، اقتصادی و معاشرتی اور لسانیاتی تحفظ حاصل ہے۔ شرح ۴۴ [illegible] کی ایک شرح ضرور ہے مگر اس کی نوعیت دیگر ہے۔ یہ ایک اختیاری اور ضمنی شرح ہے، جس کا عمل درآمد امکانات اور موافق حالات پر منحصر ہے۔ یہ شرح ان شرحات جو 'بنیادی حقوق' کے باب میں شامل ہیں حاوی نہیں ہو سکتی اور نہ ان کی وسعتوں کو محدود کیا جا سکتا ہے۔ یونیفارم سول کوڈ کا ہونا ایک تصور ضرور ہے مگر شرح ۴۴ کے اعتبار سے مقصد نہیں۔ اگر مقصد بنا لیا جائے تو دستور کی بیشتر شرحات پر ضرب لگے گی جس سے اقلیت اپنے کو غیر محفوظ سمجھے گی۔ مقصد بھی نہ حل ہوگا۔ کوئی بھی ضمنی تصور مقصد نہیں بن سکتا بلکہ ضمنی بات کا عمل میں آنا حالات پر منحصر ہے۔ اگر حالات موافق ہوتے ہیں اور اقلیت کا مزاج بھی ویسا بن جاتا ہے تو یونیفارم سول کوڈ وقت کا تقاضہ ہوگا ورنہ ایک لاحاصل فکر ہے۔

دنیا میں کسی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔
ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں۔
اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔"
سر سید

اخلاق احمد

مُلّا نظام الدین محمد سہالوی

بہت سے عرب خاندان تجارت، تبلیغ اور فتوحات کے ساتھ ساتھ
، ممالک میں آباد ہوگئے۔ مسلمانوں کی یہ ہجرت اپنی مرضی اور ر
ں کے مطابق تھی۔ عباسی دورِ حکومت تک یہ بستیاں امن و سکون کے ساتھ
ہیں۔ لیکن تیرھویں صدی کے اندر منگول صرف عباسی حکومت کے
کے باعث ہی نہیں بنے بلکہ پورے وسط ایشیا میں تباہی اور
ی کے ذمّے دار تھے۔ ایک طرف وسط ایشیا برباد ہو رہا تھا تو
ی جانب ہندوستان کا دامن موتیوں سے بھر رہا تھا۔ مختلف ممالک
ں بھاگ کر ہندوستان آ رہے تھے اور ان کو پناہ دی
ی تھی۔ ان آنے والوں میں عام آدمی، شاعر، ادیب، سیاست داں
مذہبی لوگ، شہزادے وغیرہ شامل تھے۔ باہر سے آنے والوں
ے ہندوستان نے کبھی تنگ دامانی کا ثبوت نہیں دیا۔ سکتی ہوئی
یت کے چہرے کو مسکراتا دیکھ کر ہندوستان اپنی عظمت پر ناز کر رہا
یہ ملک صرف ایک پناہ گاہ ہی ثابت نہیں ہوا بلکہ مہاجرین کو
ے سنبھلنے، پنپنے اور ترقی کرنے کا بھرپور موقع دیا گیا۔

مسلمان جو ہندوستان میں باہر سے آئے تو بہت کچھ بھول چکے
لیوں کہ انسان اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہاں
ات پات کے طریقے پر سختی سے عمل ہو رہا تھا اس لیے مسلمانوں
نے خاندانی شجروں اور ناموں کی پاسبانی کو عزیز رکھا۔ یہ لوگ
ناموں کے ساتھ شیخ، سیّد، مغل، خان، صدیقی، فاروقی
، علوی، قریشی، انصاری، ایوبی، وغیرہ لگاتے تھے۔ یہ حقیقت ہے
باہر سے آنے والے مسلمان تعداد میں بہت کم
ے۔ زیادہ تر لوگوں نے یہیں پر اسلام

قبول کیا اور یہاں جن افراد نے اسلام قبول کیا وہ زیادہ تر نچلے طبقے سے
تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے وہاں کے
ناموں کا سہارا لیا۔ تاکہ وہ بھی اپنے آپ کو اونچی ذات والا کہنے میں فخر
محسوس کرسکیں۔ ہر آنے والے کی صحیح نشان دہی مشکل ہے۔ تحقیقات کی
کسوٹی پر پرکھنے اور اختلافات سے نمٹنے کے بعد یہ بات طے پا چکی ہے
کہ حضرت ایوب انصاری کے خاندان کے ایک بزرگ ہرات میں آکر
آباد ہوگئے۔ اسی شاخ کے کوئی دوسرے بزرگ علاء الدین انصاری
ہندوستان آکر متھرا کے قریب بس گئے۔ پھر کیا تھا شاخ در شاخ پھیلنا
شروع ہوگئی اس نسل سے تعلق رکھنے والے شیخ نظام الدین نے قصبہ
سہالی میں سکونت اختیار کی اور یہیں پر درس و تدریس کی مسند بچھائی
ان کے پرپوتے شیخ حافظ کو ان کی لیاقت اور علم و عمل کی بنا پر اکبر کی
جانب سے جاگیر مقرر ہوگئی۔[1] ملا قطب الدین شہید شیخ حافظ کی چوتھی
پشت سے تعلق رکھتے تھے۔ اب یہ بات صاف ہوگئی کہ اس خاندان کے
لوگ کیوں اپنے ناموں کے ساتھ انصاری لگاتے تھے۔

لکھنؤ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر کی دوری پر قصبہ سہالی ہے جہاں
دو خاندان خاص طور سے آباد تھے۔ ایک انصاری دوسرا عثمانی۔ یہ
دونوں خاندان تاریخی اور تحقیقی لحاظ سے حضرت ایوب انصاریؓ اور
حضرت عثمان غنیؓ سے تعلق رکھتے تھے لیکن مقامی اور عملی لحاظ سے
زمیندارانہ ماحول میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ شمالی ہندوستان میں
معمولی زمینداروں کا طبقہ قابلِ رحم تھا کیوں کہ ان کی نام نہاد زمینداری
کی مختصر آمدنی کا زیادہ تر حصّہ غلط اور تخریبی کاموں میں خرچ ہوتا تھا
مثلاً فوجداری جھوٹی شان پارٹی بندی، مقدمہ بازی وغیرہ آبادی کا

مختصر تعلیم اور نوکری کے پیشے میں دلچسپی لیتا تھا۔ قصبہ سہالی کے اندر انصاری
اور عثمانی خاندان زادے اور شیوخ پائے جاتے تھے۔ جن کے اندر زمیندارانہ
چشمک اور نزاع پائی جاتی تھی۔ ملاّ قطب الدین شہید سہالوی کا تعلق
انصاری خاندان سے تھا جو بانیٔ درسِ نظامی ملاّ نظام الدین محمد سہالوی
کے والد بزرگوار تھے۔ آپ انسانی خوبیوں سے مالا مال، علمی فضائل سے
بہرہ ور، قرآن پاک کے حافظ، پیشہ مدرسی، عبادت خداوندی اور
شوق تصنیف و تالیف تھا۔ تفسیر، حدیث اور اصول فقہ سے رغبت
تھی۔ ہم عصر علما، کے درمیان علوم عقلیہ اور نقلیہ میں برتری حاصل تھی
توکل نے دولت اور ثروت سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ گوشہ نشینی نے علوم
معرفت سے سرشار کر دیا تھا۔ شہنشاہ وقت اورنگ زیب نے ملا صاحب
سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شہنشاہ نے
سختی کے بجائے نرمی کا پہلو اختیار کیا۔ ملاّ صاحب سے سلسلۂ مراسلت
جاری رکھا تاکہ اس کی عقیدت مندی کو تسکین حاصل ہو۔ شاہی رجحان
کے مطابق امرائے شاہی کی آمد و رفت ملاّ صاحب کی خدمت میں برابر
جاری رہتی تھی۔

عثمانیوں اور انصاریوں کی خاندانی اور زمیندارانہ رنجشیں رنگ
لائیں۔ اس فقیر بے نوا، علم کے جویا، عرفان و معرفت کے شیدائی ملاّ
قطب الدین کو عثمانیوں اور ان کے ساتھیوں نے، ۲۶ مارچ ۱۶۹۲ء کو
قصبۂ سہالی میں شہید کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ عاشقِ
رسول کی تمنا تھی کہ شہادت نصیب ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم والی
عمر عطا ہو تو دونوں خواہشات پوری ہوئیں۔ مخالفین لاش کو اپنے ساتھ
لے گئے۔ ایک جگہ دفن کرتے تھے پھر نکال کر دوسری جگہ دفن کرتے تھے
یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا پھر دونوں ہاتھ کاٹ کر لاش کو وطنِ
مالوف بھجوا دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اوباشوں کے گروہ
سے تعلق نہیں رکھتے تھے تو ان کو شہید کیوں کیا گیا؟ شہادت کی وجہ
شیوخ عثمانی اور انصاری کا باہمی نزاع بھی قرار پا سکتی ہے۔ ملاّ صاحب
صبح کے وقت درس گاہ کے اندر طلبا، کو درس دے رہے تھے کہ یکایک
مکان کو گھیر لیا گیا۔ گھر کے اندر گھس کر ان کے اوپر حملہ کر دیا۔ تبر کا ایک
زخم، گولی کا ایک نشانہ، تلوار کے سات زخم پہنچا کر شہید کیا گیا طلوع اسلام
سے پہلے قبائلی جنگ کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ملاّ صاحب
کی شہرت اور شہنشاہی سلسلہ بندی کے لحاظ سے ان کی حیثیت شیخ قبیلہ
سے کم نہ تھی۔ اس لیے شیخ قبیلہ کو شہید کرنا مخالفین کی امتیازی شان رہی
ہو گی۔ یا شہنشاہی عقیدت اور امرائے شاہی کی آمد و رفت باعثِ حسد
ثابت ہوئی ہو۔ مقامی طور پر جو پارٹی بندی ہوتی ہے اس کے اندر وہ
ساری چیزیں عمل میں آتی ہیں جو حکومت اور قانون کی نظر میں غلط اور
خطرناک سمجھی جاتی ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے لیے انتظامیہ کی نظر سے بچنا
ضروری ہوتا ہے۔ ملاّ صاحب کی ذات سے ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہوتا
تھا کہ کہیں ان کا راز افشا نہ ہو جائے۔ ناسازگار حالات افواہوں
کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے یہ خبر پہنچائی ہو کہ
ملاّ صاحب نے ان کی شکایت بادشاہ کو لکھ کر بھیج دی ہے۔ یا اس بات
کا امکان پیدا ہوا ہو کہ ان کی شکایت بادشاہ کو لکھ دیں گے، یا انصاریوں
کے کچھ لوگوں نے اس بات کی ڈینگ ماری ہو کہ ہم ملاّ صاحب کے ذریعے
تم لوگوں کی بادشاہ کے پاس شکایت بھیج کر خبر لیں گے۔ کیوں کہ اگر
حالات کا جائزہ لیا جائے تو انصاریوں کی پوزیشن عثمانیوں کے مقابلے میں
کمزور نظر آ رہی تھی۔ ورنہ عثمانیوں کی یہ ہمت نہ ہوتی کہ دن دہاڑے
حملہ کر دیتے۔ کمزوری کی حالت میں کسی بڑی طاقت کا سہارا لینا اور
اس کی دھمکی دینا، انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اس قسم کے شبہات
اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ملاّ صاحب کی لاش کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے
گئے تھے۔ کیوں کہ انھیں ہاتھوں سے مخالفین کو زیادہ خطرہ محسوس ہوا
ہو گا۔

کسی کو کیا معلوم تھا کہ دیار لکھنؤ دیار کوفہ بن جائے گا۔ بہت دنوں
کی بات ہے کہ لکھنؤ دیار اجودھیا میں شامل تھا اور یہ حصہ راجہ دشرتھ
کے بیٹے اور رام چندر جی کے چھوٹے بھائی لچھمن کی جاگیر میں شامل تھا
جس کو لچھمن پورہ یا لچھمن پوری کہتے تھے۔ بعد میں اس جگہ جہاں آج لکھنؤ
آباد ہے، لچھمن کی نسبت سے لچھمنو کہا جانے لگا۔ پھر لکھنؤ بننے میں
اسے زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ اسی علاقے سے رامچندر جی،
لچھمن اور سیتا نے چودہ برس کا بن باس لیا تھا۔ ایک کہانی بن گئی۔
لیکن ملاّ قطب الدین کا لٹا ہوا کنبہ خانماں برباد گوشۂ عافیت کی تلاش

ہیں سہالی سے لکھنؤ کی جانب جا رہا ہے۔ یاد وطن ستا رہی ہے لیکن اس عزم میں کوئی فرق نہیں آ رہا ہے کہ اب یہاں واپس نہیں آنا ہے۔ بیکار وطن چودہ سال کے لیے بن باس لینے نہیں جا رہا تھا لیکن چودہ سالہ روایت اس طرح پوری ہو رہی تھی کہ اس کے اندر ایک چودہ سالہ یتیم ضرور شامل تھا جو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر پورے حادثے کی زبان خود بنا ہوا تھا۔ یہ تھے ملا نظام الدین محمد سہالوی یعنی بانی درس نظامی۔ غم نے اس بچے کو دبوچ لیا تھا۔ کیوں کہ یہ یتیم چار پانچ روز تک والد کی لاش کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے نرغے میں گھرا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے چھوٹ کر آیا۔ زندگی کے سناٹے اور غم کے سلتے میں کمسنی میں پختہ بنیاد پڑ گئی۔ یعنی صبر جمیل راہبر بنا اور زندگی گامزن ہوئی۔ ملا قطب الدین کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے ملا اسعد، منجھلے ملا محمد سعید اس کے بعد ملا نظام الدین اور چھوٹے محمد رضا تھے۔ دونوں بڑے بیٹوں کی تعلیمی تکمیل والد صاحب کے ذریعے ہوئی۔ ملا اسعد نے اورنگ زیب کے دربار میں نوکری حاصل کی لیکن بیوی اور نوزائیدہ بچہ غلام مصطفیٰ کو والد کے پاس چھوڑ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان سے دور رہتے ہوئے بھی خاندانی رابطہ قایم تھا۔ حالات سے بالکل غافل نہیں تھے۔ لیکن والد کی شہادت کے بعد وطن واپس نہیں ہوئے اور بعد میں برہان پور میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہو گئے لیکن علمی دلچسپی قایم رہی۔ بڑے بھائی کے بعد دوسرے بڑے بھائی ملا سعید والد کی شہادت کے وقت موجود تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے جو کہ بادشاہ کے پاس گئے جو ان دنوں دکن میں تھا۔ اس وقت رسل و رسایل اور خبر رسانی کی دقت کے باوجود ملا سعید کے پہنچنے سے پہلے ہی بادشاہ باخبر ہو چکا تھا۔ ملا سعید سے بات چیت کے بعد بادشاہ نے یہ محسوس کیا کہ اب یہ کنبہ سہالی کے بجائے لکھنؤ میں رہنا چاہتا ہے۔ ملا سعید کے ہاتھ حاکم لکھنؤ کو فرمان بھیجا کہ ملا قطب الدین شہید کے فرزند ارجمند ملا سعید اپنے اور ملا شہید کے دوسرے بیٹوں کے رہنے کے لیے جو مکان بھی لکھنؤ میں پسند کریں وہ ان کے سپرد کر کے ان پر قبضہ دلا دیا جائے۔ اتفاق سے اس وقت حاکم لکھنؤ [illegible] الدین تھے جو ملا قطب الدین کے ہم زاد بھائی تھے۔ ان کا بھی گھر سہالی میں تھا، جو قاتلوں کی زد میں آ چکا تھا اس لیے فرمان شاہی کو عملی جامہ پہنانے میں مزید آسانی ہوئی۔ ملا سعید کی انتخاب نظر ایک فرانسیسی کی اس کوٹھی پر پڑی جو اب سرکاری ملکیت بن چکی تھی۔ کیوں کہ فرانسیسی کے بعد اس کی جائداد کی مالک حکومت وقت تھی۔ فرانسیسی ایک بیرونی تاجر تھا۔ ان دنوں ملک میں اگر کسی رئیس کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ آصف خاں کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے ۱۹ کروڑ روپے وصول کیے۔ یہ کوٹھی حویلی فرنگی کہلاتی تھی۔ اس کے اندر تمام آسانیاں فراہم تھیں اس لیے اس کوٹھی میں خاندان والوں کو ٹھہرا کر ملا سعید نے پھر دوبارہ سرزمین دکن کا رخ کیا۔ تاکہ اس حویلی کے لیے دوبارہ بادشاہ سے فرمان حاصل کریں۔ فرمان کے اندر یک منزلہ حویلی فرنگی ہے۔ چوں کہ کوٹھی ایک فرنگی کی تھی اس لیے لفظ محل بڑھا کر فرنگی محل کر دیا گیا۔

ملا نظام الدین کی مسند درس اسی فرنگی محل میں بچھائی گئی اور علمی خدمتوں میں لگ گئے۔ تقریباً پچاس سال تک فرنگی محل میں درس دیتے رہے جس کی وجہ سے ان کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ ایک چھوٹے سے مرکز سے لامحدود دائرے بنتے گئے۔ اب یہ مدرسے کے بجائے اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئی۔ لیکن کم و بیش ایک صدی تک اس حویلی کی نسبت سے فرنگی محلی کا سراغ آسانی سے نہیں ملتا۔ خود ملا نظام الدین اپنے کو سہالی لکھتے تھے۔ انسان وطن چھوڑ سکتا ہے لیکن وطن کی یاد سے چھٹکارا پانا ناممکن ہوتا ہے۔ مولانا بحر العلوم، ملا مبین، ملا احمد عبد الحق وغیرہ بھی اپنے نام کے ساتھ فرنگی محلی نہیں لکھتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت یہ لکھنؤ کا ایک معمولی محلہ تھا۔ خاندان فرنگی محل کے ایک مورخ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ عمارت کے مختلف دوسرے حصوں پر لوگ قبضہ نہیں لینے دیتے تھے تو ملا احمد عبد الحق کی کوششوں سے کامیابی ہوئی۔ لوگ قابو میں آئے اور کرایہ داری کے سرخط لکھ دیے۔ سرخط ملا احمد عبد الحق کے نام لکھے تھے جو آپ کے بھتیجے تھے۔ مزاج کے لحاظ سے وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ کیوں کہ مالک مکان اور کرایہ دار کا رشتہ حسن و عشق کی داستا

سے کم نہیں ہوتا۔ ایک کی بے رخی اور دوسرے کی بے بسی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ ملا نظام الدین کے مزاج میں ہمدردی، مسکینی اور تواضع تھی اس لیے اپنے کو اس کام کے لیے بے بس پایا اور یہ کام ملا احمد عبدالحق کے سپرد کر دیا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فرنگی محل صرف ایک کوٹھی کا نام نہ تھا بلکہ اس میں اضافے ہوتے رہے جن میں کرایہ دار رہتے تھے اور اُن سے کرایہ وصول کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی میں مولانا قیام الدین محمد عبدالباری فرنگی محلی کی سرگرمیوں سے یہ سیاسی، سماجی، مذہبی، ملی اور خلافت تحریک کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔

ملا نظام الدین کی ابتدائی تعلیم باپ کی توجہ اور نگرانی میں ہوئی[۵] لیکن قسمت میں تو تیمی لکھی تھی۔ دریا کا رخ موڑا جا سکتا ہے، روکا نہیں جا سکتا۔ روکنے کی حالت میں دریا خود اپنی راہ بنا لیتا ہے۔ باپ کی شہادت کے بعد دونوں بڑے بھائیوں نے لکھنؤ کو خیرباد کہہ دیا۔ ملا سعید کو جب رہائش گاہ کے مقصد میں کامیابی ہو گئی تو وطن واپس آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد بادشاہ کے پاس واپس چلے گئے تاکہ بادشاہ کے التفات سے پورا ذاتی فائدہ اٹھایا جائے اور ایسا ہی ہوا کہ دوبارہ لکھنؤ واپس آنے کی نوبت نہ آئی۔ جب انسان کی زندگی میں کوئی مقصد اور اصول نہیں ہوتا تو مادیت کی معراج پیش نظر ہوتی ہے۔ بڑے بھائی پہلے ہی داغ مفارقت دے چکے تھے۔ دونوں بڑے بھائی اس نازک حالت میں خاندانی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔ خاندانی سربراہی مجبوراً ملا نظام الدین کے کندھوں پر آن پڑی۔ آپ نے ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ رہنے کے لیے فرنگی کی کوٹھی اس سے ملحق عمارتوں کا کرایہ، ایک اور دو روپیہ یومیہ کا روزینہ قصبۂ دیوی کی ایک سو بارہ بیگھہ زمین کی معافی کے سہارے کنبے کے نصف درجن لوگوں کے رہنے اور کھانے کا انتظام ہو گیا۔ حالات اعتدال پر آ گئے تو ملا نظام الدین تقریباً دو سال بعد اپنی تعلیم کو پورا کرنے کے لیے جائس، دیوہ اور بنارس جا کر تحصیل علم میں لگ گئے۔ فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس آئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً پچیس سال کی تھی اور فرنگی محل کے اندر آبائی پیشہ درس و تدریس شروع ہو گیا۔ شادی اور خانہ آبادی کی رسم بھی پوری ہوئی۔

روایت کے مطابق حسب نسب، خاندان اور بڑی کی تلاش کے بعد چودھری محمد آصف کی بیٹی سے شادی طے پائی۔ چودھری صاحب جو سہالی کے رہنے والے تھے[۶] آپ ملا قطب الدین شہید کی مدافعت میں مع اپنے نو ساتھیوں کے شہید ہوئے تھے۔ ملا نظام الدین کی ایک اولاد بھی ہوئی لیکن صغر سنی میں انتقال کر گئی۔ بھائیوں کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا لیکن وہ تسکین اور تشفی کہاں جو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ دوسروں کی اولاد کو پالنا ایسا ہی ہے جیسے مصنوعی آنکھ لگوا لی جائے جس سے دیکھا تو نہیں جا سکتا ہے لیکن دوسروں کو دکھایا جا سکتا ہے۔ لوگوں کے سمجھانے بجھانے اور خاص طور سے حضرت سید اسماعیل بلگرامی کے الہامی اشارے کے تحت کہ دوسری بیوی سے اولاد ہو گی تو ملا صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا نام عبدالعلی محمد رکھا گیا جو بعد میں بحر العلوم کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستانی ماحول میں اولاد نرینہ کی جو قدر و قیمت ہوتی ہے اسی انداز سے عبدالعلی محمد کی بھی پرورش ہوئی۔ بسم اللہ کی رسم تیموریہ خاندان کی روایت کے مطابق ادا کی گئی یعنی جب اکلوتے بیٹے کی عمر چار سال اور چار ماہ کی ہوئی تو قاضی محمد تقی نے اپنی زبان سے عبدالعلی محمد سے بسم اللہ پڑھوائی۔ تیموری روایت کے مطابق جب بچے کی عمر چار سال، چار ماہ اور چار دن کی ہوتی تھی تو بسم اللہ کی رسم ادا ہوتی تھی۔ عبدالعلی محمد کے سلسلے میں چار دن کا سراغ نہیں ملتا۔ بڑھاپے کی شادی میں صرف بیٹا پیدا ہونے کی خواہش پوری نہیں ہوئی بلکہ اس کی تعلیم و تربیت کی تمنا بھی بر آئی اور بیٹے کی شادی کی خوشی میسر آئی۔ بیٹے کی شادی کاکوری میں، بیٹی کی شادی خاندان میں سہالی کے اندر ہوئی۔ بیٹے کی شادی کے چھ ماہ بعد ملا صاحب انتقال کر گئے۔ فرزند ارجمند سترہ برس کی عمر میں مختلف علوم سے فارغ ہو چکے تھے۔ بیٹے کی تعلیم و تربیت نیک باپ کی نگرانی میں ہوئی۔ خود ہی معلم اور خود ہی مربی بنے رہے۔ حصول علم کے لیے اپنی دعاؤں کے ساتھ ساتھ دوسرے ملنے والوں اور ملاقات کرنے والوں کی دعائیں شامل حال رہیں۔ تاکہ بیٹا پڑھے لکھے اور عقلمند و صالح ثابت ہو۔ ملا نظام الدین کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری

مولانا عبدالعلی کے سر آئی۔ لیکن چوں کہ طبیعت میں لاأبالی پن تھا اس لیے ساری تعلیم و تربیت دھری رہ گئی اور مولانا عبدالعلی درس و تدریس میں دلچسپی لینے کے بجائے کبوتر اور بٹیر کا زیادہ شوق کرنے لگے جو ان دنوں لکھنؤ والوں کا خاص شغل ہوا کرتا تھا۔ لیکن جب متعدد ناخوش گوار واقعات پیش آئے تو زندگی کے نئے موڑ پر آگئے اور درس و تدریس کا کام شروع ہو گیا۔

ہندوستان میں لکھنؤ شیعہ حضرات کا مرکز ہے۔ یہاں تعزیہ داری اور باہمی جھگڑا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آج بھی جب کہ بیسویں صدی میں اقدار میں نمایاں تبدیلی آئی ہے، باہمی جھگڑا اپنی پرانی وضع پر قایم ہے مولانا بحرالعلوم بھی اس لپیٹ میں آگئے یہاں تک کہ ان کو قتل کرنے کا سازشی پروگرام مکمل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس وقت لکھنؤ کی عنانِ حکومت شیعہ حضرات کے ہاتھوں میں تھی جس کا مقابلہ کرنا مشکل تھا، اس لیے مولانا بحرالعلوم ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور دکن کی سرزمین راس آئی۔

جب ملا نظام الدین نے فرنگی محل کے اندر درس و تدریس کا کام شروع کیا، اس سے پہلے دریائے گومتی کے کنارے شاہ پیر کے مزار سے ملحق وسیع مسجد درس و تدریس کا مرکز تھی۔ ایک چشتی بزرگ شاہ پیر کا مزار ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ اس مزار اور مسجد کے قریب غلام نقش بند نے کچھ مکانات بنوائے اور وہیں پر مقیم ہو گئے۔ یہ علوم ظاہر اور علوم باطنی کے استاد تھے، جو ملا نظام الدین کے استاد تھے[۵]

غلام نقشبند کے بعد سے تعلیمی مرکز شاہ پیر کے ٹیلے سے منتقل ہو کر ملا نظام الدین کے آستانہ پر آگیا۔ لیکن ملا صاحب نے ٹیلے سے اپنا رشتہ قایم رکھا۔ ان کے پردیسی طلباء کا مرکز بنا رہا۔ اس ٹیلے کی مثال ایسی ہی تھی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں، ساتھ ہی ساتھ مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس جمع کر رہی ہوں۔

ملا صاحب سفید پوش رئیسوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے[۶] رہن سہن لباس اور بود و باش کے لحاظ سے کبھی امتیازی شان نہیں حاصل کی۔ اگرچہ آپ کی شہرت بیرونی ممالک میں بھی تھی۔ ملا ولی اللہ فرنگی محلی، ملا صاحب کے ہم عصروں کی روایت کے مطابق ملا نظام الدین کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔ "نیک خصائل، شریف، مہربان، بردبار، متقی، زاہد، پرہیزگار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی [illegible] پیرو، حق بات کہنے میں ہمیشہ نرم بات کہتے اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے مگر [illegible] کے قوتِ بازو، غریبوں کے مددگار اور گمراہوں کے راہنما۔ گذارہ مقرر کرانے کی خواہش لے کر کبھی کسی دولت مند یا حاکم کے پاس نہیں گئے۔ سوائے خدا کے اپنا حال کسی سے نہیں کہا۔" انھیں بزرگ کی یہ بھی روایت ہے کہ "انتہائی تنگ دستی کی زندگی گزارتے تھے عموماً تین تین روز تک گھر میں کھانا نہیں پکتا تھا، صرف ایک مٹھی چنے پر بسر ہوتی تھی، بلکہ ایک مٹھی چنے بھی میسر نہیں ہوتے تھے۔" چوں کہ جو کچھ آمدنی تھی وہ ملا صاحب کی تنہا نہ تھی۔ جیسے جیسے خاندان کے افراد بڑھتے گئے آمدنی کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ شروع شروع میں یہ آمدنی گذر بسر کے لیے کافی تھی لیکن بعد میں بڑی کمی محسوس ہونے لگی۔

ملا قطب الدین کا مشرب تصوف تھا۔ آپ شیخ عبدالرزاق ہانسوی کے مرید اور خلیفہ تھے[۷] جن کا سلسلہ قادریہ تھا۔ سید صاحب کے مورثِ اعلیٰ بدخشاں سے ہندوستان آنے کے بعد دلی میں آباد ہو گئے تھے۔ صوبۂ اودھ کے اندر سورج پور میں بغاوت پھیلی تو صوبہ دار کی مدد کے لیے اسی خاندان کے ایک فرد کو کمک کے ساتھ یہاں بھیجا گیا۔ بغاوت ختم ہونے کے بعد سید صاحب کے خاندان کو سورج پور کی جاگیر عطا ہوئی تو یہیں پر آباد بھی ہو گیا والد اپنی سسرال بانسہ (ضلع بارہ بنکی) میں منتقل ہو گئے۔ کیوں کہ والدہ کو کچھ زمین داری ترکے میں مل گئی۔ سید صاحب کا ننھیالی رشتہ قدوائیوں میں تھا۔ آپ کی پیدائش شاہجہانی دور میں ہوئی تھی۔ وہ زمانہ تھا کہ جب دنیائے علوم کی نادر ہستیاں پائی جاتی تھیں مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی، عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبدالسلام دیوی وغیرہ۔ لیکن تصوف کا زور بھی کچھ کم نہ تھا۔ کیوں کہ مجدد الف ثانیؒ کا وصال چند سال پہلے ہوا تھا۔ ان کے خلفاء اور اولاد تصوف کی سرگرمیوں میں مشغول نظر آتی تھی۔ شریعت اور طریقت کی خدمت برابر جاری تھی۔ سید شاہ عبدالرزاق بانسوی علوم ظاہری سے دست بردار رہے لیکن امور باطنیہ کی امتیازی شان

تھے۔ اس بدخشانی لعل کی پہچان کے لیے ملا نظام الدین جیسے جوہری کی ضرورت
تھی تاکہ اس کی اصلی قیمت لگائی جاسکے۔ چھوٹے بھائی ملا محمد رضا طعنہ
دیتے تھے کہ کہاں جاکر خاندان کی عزت ڈبوئی کہ ایک جاہل اور کلفے کے مرید
ہوگئے کیوں کہ ملا قطب الدین شہید قاضی صدر الدین کے مرید تھے جو ایک
عالم صوفی تھے۔ ملا نظام الدین نے اس خاندانی روایت کو توڑ دیا تھا
چھوٹے بھائی کی سخت کلامی سے غصہ کا اظہار نہیں کیا ضبط کے ساتھ
صرف اتنا کہتے، کہ کہیں اس کا جادو آپ پر بھی نہ چل جائے اور ایسا
ہی ہوا کہ ملا رضا بھی سید صاحب کے مرید ہوگئے۔

پہلے شرحوں کا علمی معیار بلند تھا لیکن بعد میں اٹھارھویں اور
انیسویں صدی میں شرحوں کی شرحیں اور حاشیہ علی الحاشیہ لکھنے کا
دور شروع ہوگیا۔ اس روش پر چل کر لوگ اتنی دور آگے نکل گئے
کہ اصل کتاب کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا۔ ملا نظام الدین کی تصانیف
بھی زیادہ تر شرحیں اور حاشیے تک محدود ہیں۔ لیکن مناقب رزاقیہ
اور "دربیان وضوء مسنون" جیسی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

ملا صاحب کی وفات ۷۲، یا ۷۳ سال کی عمر میں چہارشنبہ
کے روز لکھنؤ میں ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ فرنگی محل سے مشرقی جانب
خاندان فرنگی محل کے قبرستان میں ایک اونچے چبوترے کے باغ میں
ان کی قبر واقع ہے۔

ملا نظام الدین اپنی نیکی اور پارسائی ہی کی وجہ سے نہیں مشہور
ہوگئے، لیکن تقریباً تین سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اس کے
باوجود وہ ہمارے درمیان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی خاص
وجہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص نصاب کے بانی مانے جاتے ہیں، جس کو
درس نظامی کہا جاتا ہے، اس لیے ہم ان کو بانی درس نظامی کہتے ہیں
ملا صاحب نے اپنے کو اس درس کا بانی کبھی نہیں کہا۔ نہیں معلوم کس
نے ان کی جانب منسوب کر دیا۔ اگرچہ علامہ شبلی درس نظامی کے
اصل بانی ملا قطب الدین شہید کو مانتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ
یہ ہے کہ اس خاندان کے اندر درس تدریس کا سلسلہ برابر چلا آتا
[illegible]

درس نظامی کہا جانے لگا۔ ورنہ اس درس کے آثار ملا قطب الدین
سے پہلے بھی نظر آتے ہیں۔ اس طریقۂ درس کے تحت کتابیں منتخب کی
گئیں۔ ملا قطب الدین ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے
تھے۔ یہاں تک کہ طالب علم کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور حاصل ہوجاتا
تھا۔ ملا نظام الدین اور بحر العلوم نے اس پر اضافہ کیا۔ ملا نظام الدین
ہر علم کی دو دو کتابیں اور بعض ذہین طلباء کو ایک ایک کتاب پڑھاتے
تھے۔ بحر العلوم بعض کو ایک ایک اور بعض کو دو دو، بعض کو تین تین
کتابیں ہر علم وفن کی پڑھاتے تھے۔ کتابوں کا تعین طلباء کی استعداد
کے مطابق ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر طالب علم کو کتاب کا مطلب
سمجھنے اور علم وفن کے دوسرے پہلوؤں کے حصول کی استعداد
پیدا ہوجاتی تھی اور تحصیل علم سے جلد از جلد فراغت حاصل ہوتی
تھی۔ اس نصاب کے اندر ہر زمانے میں تغیر و تبدل ہوتا رہا کتابوں
اور مضامین میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی۔ اس سے انکار نہیں کیا
جاسکتا کہ یہ اپنے دور کا ایک ترقی پسند قدم تھا۔ مسلمان جب یہاں
آئے تو اپنے ساتھ بہت سی چیزیں بھی لائے۔ کیوں کہ وہ نہ خالی ہاتھ
تھے نہ خالی الذہن۔ درس و تدریس کا نظام اور کتابیں بھی ساتھ
لائے جو ان دنوں ایران، خراسان، بغداد، بلخ، بخارا وغیرہ میں
رائج تھیں گویا ان کے یہاں نصاب درس اور کتابیں موجود تھیں
تو پھر اس درس نظامیہ کو کیوں فوقیت حاصل ہوگی۔ اس کی خاص
وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا منظم نصاب نہیں پایا جاتا تھا۔ یہ اپنے عہد
کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ اس لیے اٹھارھویں صدی کے اندر پورے
ملک میں اپنا لیا گیا۔ دھیرے دھیرے خوبیاں کم ہوتی گئیں، خامیاں
بڑھتی گئیں۔ کیوں کہ اس نصاب کو تقلید کے کولڈ اسٹوریج میں
رکھ دیا گیا اور جدید نظریات سے پہلو تہی کی گئی۔ عہد وسطیٰ میں
تر فقہاء اور علم دینیات کے ماہرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا
تھا۔ ملا نظام الدین نے اپنے کو اس کشمکش سے دور رکھا
[illegible]

زوال شروع ہوا تو فرنگی محل سے ملا حسن جیسے کی سرپرستی سے محروم ہوتے گئے۔ اب قاضی مفتی سے زیادہ علم اور ضروریات زندگی کی جانکاری ضروری تھی، جس کی بہت کچھ تلافی اس نصاب کے ذریعے ممکن ہوئی۔ پہلے شخصیات بھی اپنی ذات سے ایک ادارہ اور نصاب ہوا کرتی تھیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت جب یہ ہستیاں نایاب ہونے لگیں تو ایسی حالت میں ایک ایسے نصاب کی ضرورت تھی جو شخصیات تک محدود ہونے کے بجائے صحت مند اصولوں پر مبنی ہو۔ تاکہ وقت کے تقاضے اچھی طرح سے پورے ہوتے رہیں۔ اسلام نے ہمیشہ سیکولر چیزوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ سوائے اسی کے کہ جن کا ٹکراؤ مذہبی اصولوں سے تھا۔ ملا نظام الدین نے ان سیکولر عناصر کا بھی لحاظ رکھا جس کی وجہ سے غیر سنی یا غیر مسلم کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ملا صاحب کو نہ دولت کی پرواہ تھی نہ شہرت کی خواہش۔ نہ رتبے کی طلب نہ نام و نمود کی خواہش، نہ کسی کی دل آزاری مقصد، نہ کسی کی بے جا حمایت۔ بلکہ درس و تدریس کو انھوں نے اپنی عبادت کا جزء بنا لیا تھا اگر عالم دینیات نے عبادت کا تصور عبادت گاہوں تک محدود کر رکھا تھا۔ ملا صاحب کی ریاضت اور عبادت کا نتیجہ تھا کہ یہ درخت صدیوں سے پھول پھل رہا ہے۔ آج پت جھڑ کے زمانے میں اس پر پتیاں تو نہیں نظر آرہی ہیں لیکن
پھل ضرور دکھائی پڑ رہے
ہیں۔

حواشی

ـ محمد رضا انصاری۔ بانی درس نظامی، لکھنؤ ۱۹۷۳ء ص ۳۵۔ اور شبلی نعمانی، مقالات شبلی۔ حصہ سوم۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء ص ۹۲، ۹۴، ۹۵
ـ بانیٔ درس نظامی، ص ۲۵ - ۲۶
ـ بانیٔ درس نظامی۔ ص ۵۴ ۵۵
ـ عنایت اللہ، تذکرہ علمائے فرنگی محل لکھنؤ ۱۳۴۹ھ۔ ص ۱۷۹
ـ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی۔ اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء ص ۴۸۴
اور عبدالحی۔ نزہۃ الخواطر۔ ملاخیرالدین السادس، حیدرآباد ۱۹۵۵ء۔ ص ۳۸۳ - ۳۸۵۔
ـ تذکرہ علمائے ہند ص - ۵۲۵ -
ـ مقالات شبلی حصہ سوم۔ ص - ۱۰۸
ـ مقالات شبلی۔ حصہ سوم ص ۹۴ اور مولوی رحمان' تذکرہ علمائے ہند' کراچی ۱۹۶۱ء ص ۵۱۵
اور آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۹۴ اور نزہۃ الخواطر' ص ۳۸۴
ـ مقالات شبلی حصہ سوم ص ۹۶ سبحۃ المرجان' بمبئی' ۱۳۰۳ھ ص ۹۵
ـ مقالات حصہ سوم ص ۹۴ اور سبحۃ المرجان بمبئی ۱۳۰۳ھ ص ۹۵
ـ بانیٔ درس نظامی ص ۲۰۲

مرکز فروغ سائنس

CENTRE for PROMOTION of SCIENCE

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH- 202001

سہ روزہ کانفرنس

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

۲۶ — ۲۸ مارچ ۱۹۸۷ء

یہ دور سائنس کا ہے۔ آج جس انسانی گروہ کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی ہے وہی ترقی یافتہ اور بالادست ہے، اور جس نے خود کو اس سے دور رکھا وہ عموماً پسماندہ اور سرنگوں ہے۔ اس بات سے باخبر ہونے کے باوجود سائنس کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی پیش رفت نہیں کے برابر ہے۔ اس تلخ حقیقت کے احساس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس کا قالب اختیار کیا جو ملک بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لیے شب و روز کوشاں ہے۔ اس سچائی کے پیش نظر کہ ہندوستانی مسلمانوں کی خواندگی بیشتر دینی مدارس کی مرہون منت ہے اور جب تک ان مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج نہ ہوگی ہندوستانی مسلمان سائنس کے میدان میں پسماندہ رہے گا، مرکز فروغ سائنس نے کچھ دنوں پہلے ایک سروے شروع کیا ہے جس سے عام انداز ے کے برخلاف یہ بات سامنے آئی کہ الحمدللہ ہمارے مدارس وقت کے تقاضوں سے بے خبر نہیں اور یہ کہ ان کی اچھی خاصی تعداد سائنس اور ریاضی کو اپنے نصاب میں داخل کرنے کو تیار ہے۔ اس انکشاف سے مرکز کو یہ حوصلہ ملا کہ وہ درج ذیل موضوعات پر اس کانفرنس کا انعقاد کرے۔

موضوعات

- مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت
- مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں
- مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی کا نصاب

اِن موضوعات پر مقالہ پیش کرنے کے خواہش مند حضرات اپنے مقالے کا عنوان اور خلاصہ پندرہ[15] مارچ ۸۷ء تک روانہ کردیں۔ کانفرنس میں شرکت کے خواہش مند حضرات "شرکت کے لیے درخواست" فارم پُر کرکے جلد از جلد روانہ کردیں۔

- وسائل کی کمی کی وجہ سے کانفرنس میں مدعوین اور شرکاء کی تعداد چالیس تک محدود ہوگی۔
- شرکاء کے انتخاب میں دینی مدارس کے سربراہان، اساتذہ اور مقالہ پیش کرنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔
- منتخب شرکاء کا سفر خرچ (سکنڈ کلاس ریل کا کرایہ) اور قیام وطعام مرکز کے ذمہ ہوگا۔

اسرار احمد

ڈائرکٹر، سینٹر فار پروموشن آف سائنس۔

ابتدائی اعلان

THE THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENCES
(TWAS)

سینٹر فار پروموشن آف سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اور

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ لشانہ

۱۹۸۶-۸۷ء کے تقریباً 12000.00 روپے کے انعامات

برائے

* ــــ عام فہم سائنسی مضمون نگاری ــــ *

(POPULAR SCIENCE WRITING PRIZES)

کا اعلان کرتے ہیں جو تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس (صدر: پروفیسر عبدالسلام) کے عطیہ سے قائم کیے گئے ہیں ________

* یہ انعامات یکم جولائی ۸۶ء سے ۳۰ جون ۸۷ء تک ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے / اشاعت کے لیے بھیجے گئے بنیادی سائنس (بشمول ریاضی) اور تاریخ سائنس کے موضوعات پر طبع زاد عام فہم سائنسی اردو مضامین کے لیے ہیں۔
* تقریباً دس ہزار روپے کے انعامات بہترین قرار پائے مضامین پر دیے جائیں گے۔ باقی رقم سے پسندیدہ قرار دیے جانے والے مضامین پر تشویقی انعامات (Consolation Prizes) دیے جائیں گے۔ تشویقی انعام کم سے کم دو سو روپیہ ہوگا۔
* مضمون تہذیب الاخلاق کے آٹھ صفحات (تقریباً ۲۰۰۰ الفاظ) سے زیادہ کا نہ ہو۔ مضامین آسان زبان میں ہوں اور ریاضیاتی فارمولوں و تکنیکی تفصیلات سے بوجھل نہ ہوں تاکہ ان مضامین کو وہ لوگ بھی سمجھ سکیں جو سائنس کے طالب علم نہ رہے ہوں۔
* مضمون کا مسودہ اسی شمارے کے پچھلے صفحہ پر دی گئی ہدایات کے مطابق تیار کریں۔ مسودہ کے ساتھ درج ذیل سرٹیفکیٹ بھی بھیجیں

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق،

تصدیق کی جاتی ہے کہ میرا / ہمارا مضمون بہ عنوان ________

____

طبع زاد ہے اور اس سے پہلے نہ تو کہیں شائع ہوا ہے اور نہ کہیں اشاعت کی غرض سے بھیجا گیا ہے

دستخط ________

اسرار احمد

ڈائریکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس اور ایڈیٹر تہذیب الاخلاق

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئیٹم ریٹ کی بنیاد پر کی بنیاد سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۱۰ر فروری ۱۹۸۷ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی روز شام چار بجے کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے کام کے دن دفتر کے اوقات میں کسی بھی روز حاصل کیے جاسکتے ہیں

ٹینڈر فارموں کی فروخت اس کی مقررہ وصولیابی کی تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مقررہ رقم	زر ضمانت	ٹینڈر کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	'A'- II ۶۰ کی چھتوں کی دوبارہ تعمیر۔ (ایس۔ ایس۔ ہال جنوبی) جو فنانس آفس کے ذریعے ابھی حال میں خالی کیا گیا ہے۔	۶۹،۸۶۰/- روپے	۱۷۵۰/- روپے	۵/- روپے	۳½ ماہ

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

(1005/2548)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت۔ ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر: ایس۔ کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

آئٹم ریٹ پرسنٹیج ریٹ کی بنیاد پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں جو کہ ۲۱ر فروری ۸۰ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی روز ساڑھے تین بجے دوپہر تک کھول دیے جائیں گے۔

ٹینڈر فارم یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے کام کے دن آفس ٹائم میں کسی وقت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت ٹینڈر وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کر دی جائیگی۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینی رقم	زر ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	ایم ایم ہال کے نزدیک ٹیچرز ہوسٹل کمپاؤنڈ دیوار کی تعمیر	۳۳,۶۹۵/- روپے	۸۴۵/- روپے	۵/- روپے	تین ماہ

ڈی ایس آر ۱۹۸۱ء کی بنیاد پر

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

(1017/2605)

سرپرست: جناب سید ہاشم علی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

جلد ۶ — مارچ ۸۷ء — شمارہ ۳

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شہاب الدین

تزئین
سرفراز

انچارج سرکولیشن ——— مستقیم احمد خاں

زرِ سالانہ : انڈیا ... Rs. 30.00
بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ہوائی ڈاک
US $ 8.00 عام ڈاک
اس شمارے کی قیمت : تین روپیہ

ترسیلِ زر کا پتہ : ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

* مقالہ نگاروں کے لیے *

تہذیب الاخلاق کے اغراض، مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابلِ قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ بڑے سائز (20cm x 30 cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب سے نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

* اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مہر ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ:
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔

دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرِ سالانہ اگلے ماہ ختم ہو رہا ہے یہ شمارہ ملتے ہی اپنا زرِ سالانہ ارسال کریں۔

مندرجات

آج کل مسلمانوں کے مسایل پر بحث کرتے ہوئے قیادت کے فقدان کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ جوہر قابل کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ شاید وہ اس بات کے متمنّی ہیں کہ آسمان سے کوئی ایسا شخص نازل ہو جو شکل وصورت تو انسانوں جیسی رکھتا ہو مگر انسانی خصائص سے عاری ہو۔ غالباً اسی وجہ سے ہم ہر فاتر العقل، دیوانے اور غیر متوازن شخصیت کے حامل فرد کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نیم برہنہ یا برہنہ رہنے لگے تو وہ مرجع خلایق بن جاتا ہے، بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تو اس سے آئندہ ہونے والی باتیں پوچھی جانے لگتی ہیں، ننگی ننگی گالیاں بکنے لگے تو ان سے فالیں نکالی جانے لگتی ہیں، فرائض کو ترک کر دے تو اس کا شمار عالمِ بالا کے حاملین میں ہونے لگتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اگر کوئی شخص ستر پوشی کا پورا اہتمام کرتا ہے، عقل ودانش کی باتیں بتلاتا ہے، غیر متوازن افکار و اعمال کا مرتکب نہیں ہوتا، فرائض کو تندہی سے ادا کرتا ہے تو اس کو ایک ناقابلِ توجہ انسان سمجھا جاتا ہے۔ جب ہماری پسند وناپسند کا معیار یہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہم کو زندگی کے ہر میدان میں قیادت کا فقدان ہی فقدان نظر آئے گا۔

سیاسی لیڈر ہوں یا مذہبی رہبر سب کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل یہی ہے۔ ہم اپنے لیڈروں اور رہبروں کو عام انسانی لباس میں دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ جب تک ان میں کوئی مافوق الفطرت بات نظر نہ آئے۔ ہماری توجہ ان کی طرف مبذول ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نہ تو کوئی متفقہ سیاسی لیڈر ہے نہ مذہبی رہبر۔ اگر ایک لیڈر کے گرد ہمارا ایک طبقہ جمع ہو جاتا ہے اور اس کے چند اوصاف کا گرویدہ ہو کر اس کی بصیرت وبصارت کی روشنی میں منزلِ مقصود کی تلاش کی کوشش شروع کرتا ہے تو دوسرا اس سے کہیں بڑا طبقہ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو کر اس کی اچھائیوں کو بھی برائیوں کی شکل میں پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی انجام مذہبی رہبروں کا بھی ہوتا ہے وہ مذہبی رہبر جو عام انسانوں سے الگ اور مختلف کوئی شے دکھائی دیتے ہیں، ان کی تو ہم کچھ آؤ بھگت کر لیتے ہیں لیکن جو ہماری ہی طرح کھاتا پیتا، ہنستا بولتا، انسانی جذبات سے متاثر اور مغلوب ہوتا ہے وہ ہم کو کبھی فاسق نظر آتا ہے تو کبھی فاجر، کبھی بدعتی نظر آتا ہے تو کبھی شاتم رسول۔ اس کی بات سننے والے کم اور اس سے خواہ مخواہ بدکنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہماری اس روش کا نتیجہ ہے کہ ہم مذہب سے لے کر سیاست تک کے میدانوں میں دھڑوں میں تقسیم ہیں اور یہ دھڑے بازی روز بہ روز بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اس موقع پر ہم کو ایک قصہ یاد آتا ہے جس کو ہم نے اپنے بچپن میں پڑھا تھا، قصہ یوں ہے کہ ایک مرد درویش تھے،

اپنا زیادہ تر وقت نیک کاموں اور عبادت میں بسر کرتے اور خاموش زندگی گذارنے کی کوشش کرتے مگر ان کی اہلیہ کو ان میں کوئی گن نظر نہ آتا اور وہ ان پر تنقید کی چنگاریاں برسایا کرتیں۔ ایک دن فجر کی نماز کے بعد جب وہ کسی ضرورت سے اپنی بیوی سے ہم کلام ہوئے تو وہ محترمہ اکھڑ گئیں اور کہنے لگیں کہ تم نکھٹو ہو تم سے عبادت و ریاضت میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا میں نے رات ایک مردِ بزرگ کو دیکھا تھا جو فضا میں اُڑتے جا رہے تھے، وہ مرد درویش زیرِ لب مسکرائے اور کہنے لگے۔ بھاگوان، تم نے غور نہیں کیا وہ تو میں ہی تھا۔ یہ سننا تھا کہ وہ محترمہ چنک کر بولیں۔ اے لو تب ہی تو میں سوچ رہی تھی کہ یہ مردُوا ٹیڑھا ٹیڑھا کیوں اُڑ رہا ہے ؟ اپنے رہبروں اور لیڈروں کے ساتھ ہمارا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔

اگر اپنے سوچنے کے انداز کا زاویہ تھوڑا سا بدل دیا جائے تو قیادت کے فقدان کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم انسان کو انسان ہی رہنے دیں، کوئی مافوق الفطرت ہستی نہ بنائیں۔ انسان کو اس کی تمام کمیوں، کجیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ گوارا کرنے کی عادت ڈالیں، اس سے مافوق الفطرت امور کے صدور کی قطعی توقع نہ رکھیں، اس کو اپنے ہی جیسا خطا و نسیان کا پُتلا سمجھیں، اس کی اچھی باتوں کو لے لیں اور اس کی بشری کمزوریوں کو اپنے لیے کوئی حجت نہ سمجھیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہماری سماجی، سیاسی اور مذہبی قیادت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہونے سے رہا، ہم ہی میں سے جو لوگ وقت اور زمانے کی نبض پہچانتے ہوں گے، سنت اللہ کے اسرار و رموز سے واقف ہوں گے، ماضی سے محرمانہ طور پر آگاہ، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے پُر امید ہوں گے، ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں گے، وہی ہماری قیادت کے اہل ہوں گے۔ لیکن ایسے لوگ نہ تو کوئی جادو جگا سکیں گے نہ ہی کوئی ایسا انقلاب برپا کر سکیں گے کہ مرغی کے انڈے سے بکری کے بچے پیدا ہونے لگیں نہ ہی کوئی ایسا پروگرام ہمارے سامنے پیش کر سکیں گے جس پر عمل کر کے ہم راتوں رات ساری دنیا کی قیادت کرنے کے اہل ہو سکیں یہ لوگ اسی وقت قوم کے سامنے کوئی لائحۂ عمل پیش کر سکیں گے جب ہم لوگ انسان کو انسان سمجھیں گے اور اس کی بشری کمزوریاں سے صرفِ نظر کر کے اس کی درست اور اچھی باتوں میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اگر ہم نے اپنے رہبروں اور لیڈروں میں مافوق الفطرت صفات کی تلاش کو ترک نہ کیا تو ہماری حالت روز بروز ابتر ہوتی جائے گی اور ہم تباہی کے اس دھانے پر پہنچ جائیں گے جس میں گر کر قومیں سنبھلا نہیں کرتیں بلکہ حرفِ غلط کی طرح لوحِ جہاں سے مٹ جایا کرتی ہیں۔

کبیر احمد عباسی

مسلم یونیورسٹی کے طلباء کے نام

SYED HASHIM ALI
VICE-CHANCELLOR

OFFICE : 5094
RESI. : 3173

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202001
U.P. INDIA

میرے عزیز بچو!

ایک عرصے سے میری خواہش تھی کہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ آپ سے مخاطب ہوں۔ یوں تو مجھ کو آپ کے ہالوں اور دوسری تقریبات میں آپ سے براہ راست مخاطب ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ مگر آج میں آپ سے تحریری طور پر خطاب کر رہا ہوں۔

آپ کا موجودہ تعلیمی سیشن اب ختم ہو رہا ہے۔ آپ کی مادرِ علمی کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ علی گڑھ کی نمائش کے ختم ہوتے ہی ہر طالب علم اپنی اپنی جگہ پر مستعدی کے ساتھ امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے بڑے بھائیوں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اب امتحانات کی تیاری کے لیے پوری طرح مستعد ہو چکے ہوں گے اور اپنے اپنے شعبوں کی سمینار لائبریریوں اور مولانا آزاد لائبریری سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہوں گے۔ آپ کی سہولت کے لیے مولانا آزاد لائبریری کا ریڈنگ روم دیر گئے رات تک کھلا رہتا ہے۔ آپ اس سہولت سے جس قدر فائدہ اُٹھا سکیں اس سے دریغ نہ کریں۔

عزیزو! خدا نے اس دنیا کی تخلیق اسباب و علل (Cause and Effect) کے اصولوں پر کی ہے اور اس نے جو اصول مقرر فرما دیے ہیں مشیت بھی اس کی مکمل پاسداری کرتی ہے۔ اس لیے خدا کے مقرر کردہ اصولوں کے ذریعے ہی اس اسباب و علل کی دنیا میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی ان اصولوں کی پابندی ترک کر دے گا تو اس کو صرف اس لیے کامیابی سے ہم کنار نہ کیا جائے گا کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کو بہرحال دل سے خدا کی وحدت و قدرت کاملہ کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مقرر کردہ اصولوں پر بھی زندگی گذارنی ہوگی تب ہی وہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

یہ دنیا دار العمل ہے اور وہ دنیا دار الجزا۔ اِس دنیا میں جس قوم نے بھی عمل سے کوتاہی برتی اور خود کو ڈسپلن کا پابند نہ کیا وہ زوال آمادہ ہونے لگتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں برابر پیش رفت کی راہ پر گامزن ہیں جو خدائی اصولوں کی پاسداری کرتی ہوئی عملِ پیہم میں مصروف ہیں۔ وہ مذہب ناآشنا یا مذہب بیزار قومیں بھی ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں جنہوں نے قادرِ مطلق کی طرف سے اپنی نگاہیں پھیر رکھی ہیں۔ قادرِ مطلق کی طرف سے نگاہیں پھیرنے کی سزا تو ان کو اس دنیا میں ملے گی لیکن چونکہ وہ اس دنیا کے حصول کے لیے خدائی قوانین کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتی ہیں

اس لیے آج دنیا کی سیادت ان کو بخش دی گئی ہے۔ ان کی یہ سیادت اس وقت تک قایم رہے گی جب تک وہ خدائی قوانین کی پابندی کرتی رہیں گی۔
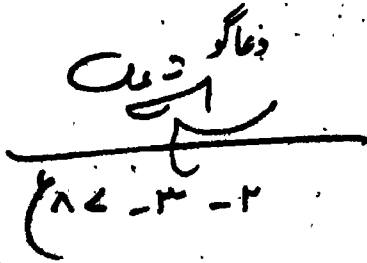
اسی لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیجیے، اس مضبوطی سے کہ دنیا کی کوئی آفت اس کو آپ کے ہاتھوں سے چھڑا نہ سکے۔ خدائی قوانین کو سمجھیے اور ان کی سختی سے پابندی کیجیے۔ جس فرد یا قوم نے خدائی قوانین کی خلاف ورزی کی اس کو کوئی بھی طاقت صراط مستقیم تک نہ پہنچا سکے گی۔

آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کے والدین نے اب ہمارے سپرد کی ہے۔ تعلیم کے حصول کے لیے آپ اپنے استادوں سے مدد لیجیے اور اپنے ذاتی مطالعے کے ذریعے علم کے امین بننے کی کوشش کیجیے۔ آپ کی تربیت کے لیے آپ کے ہالوں اور ہوسٹلوں کی اجتماعی زندگی ہے۔ آپ اجتماعی زندگی کی تمام پابندیوں کا اس طرح احترام کیجیے کہ آپ کو صحیح معنوں میں مرد آزاد کہا جا سکے۔ (یاد رہے کہ آزادی کے معنی آوارگی اور بدتمیزی نہیں ہیں)۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری ان نصیحتوں پر توجہ کرتے ہوئے آج ہی سے اپنے آپ کو اس قابل بنانے کی کوشش میں سرگرم عمل ہو جائیں گے کہ صرف امتحان ہی میں کامیابی نہ حاصل کریں بلکہ اپنے متعین کردہ مقصد زندگی کو حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو سکیں۔

اس یونیورسٹی نے سابق میں ہر میدان میں بڑے بڑے صاحب کردار لیڈر پیدا کیے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے اختیار کردہ پیشے میں صف اوّل کے ماہرین میں شمار کیا جائے اور اپنے اخلاق، کردار، شرافت، بے تعصبی، انصاف اور خوش معاملگی کی وجہ سے اپنی ترقی اور عزت کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرہ کے معیار کو بلند کرنے کا باعث بنے۔

آپ میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جو اپنے اپنے امتحانات میں کامیاب ہونے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھیں گے۔ میں ایسے تمام طلباء کو اس توقع کے ساتھ الوداع کہتا ہوں کہ وہ جہاں بھی رہیں گے، علی گڑھ کا نام روشن کریں گے۔

میں دست بدعا ہوں کہ خداوند کریم آپ کو دل خواہ کامیابیوں سے سرفراز کرے اور ملک و ملت کے لیے آپ کی ذات کو نافع بنائے۔ آمین

دعاگو

۲-۳-۸۷ء

دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش، اور ناراضی کے سوا، ایک اور جذبہ انسان میں ہے، جو خود اس شخص میں کمینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے۔ اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچاوے خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔

دشمنی اور عداوت کا منشا اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن یا زر، زمین یا خون، اس جذبے کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔ حسد کا منشار صرف وہ اوصاف حمیدہ ہوتے ہیں، جو محسود میں ہیں، اور حاسد ان کا خواہاں ہے، مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے سے ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے۔ اس کا منشار، نہ زر و زمین و زن کی دشمنی ہوتی ہے، اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصاف حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا، اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا منشار صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخالف رائے، یا عقل و سمجھ، دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔

یہ جذبۂ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر مہذب اور تربیت یافتہ اور نیک دل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے؛ اور نامہذب اور ناتربیت یافتہ، بدذات آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اٹھاتا ہے؛ اور دوسرا ان فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے، اور دنیا میں خود اپنے تئیں، بدطینت اور کذّاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے۔

دنیا میں یہ بات تو تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر، گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو، متفق ہو جائیں پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دل سے سوچتا ہے؛ اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو بھی لوں، اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں؛ اور جب کوئی ایسی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے، اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لیے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے، اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے، اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے۔ سخت کلامی و زشت گوئی، سب و شتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے، اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد "لعنت اللہ علی الکاذبین" بنتا ہے۔

پس انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دل کو کام میں لاوے، کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔

معراج نبوی۔ مقصد اور پیغام

[illegible]

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ تمام اولوالعزم پیغمبروں کو آیاتِ ربانی اور عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ "حضرت ابراہیمؑ کو سیر ملکوت سے نوازا گیا یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کرایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو طور پر حق کا پرتو نظر آیا۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے مشاہداتِ ربانی اور سیاحتِ روحانی کی تفصیل سے تورات معمور ہے۔" گویا ہمیشہ سے یہ سیر ملکوت پیغمبرانہ زندگی کا ایک جز رہا ہے۔ جماعت انبیاء کے سردار نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی صورت میں اس "سفر مبارک" سے مشرف کیا گیا اور آپ کو اس سفر کے دوران اُس مقام تک لے جایا گیا جہاں تک کسی فرزند آدم کی رسائی نہ ہو سکی۔

معراج کا یہ عظیم الشان واقعہ درحقیقت دنیا کے ان اہم واقعات میں سے ہے جو تاریخ انسانی پر اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئے اور ایک نئے دور کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس واقعہ کا مختصر بیان یہ ہے کہ رجب کی ستائیسویں تاریخ تھی۔ آپؐ حرم پاک میں آرام فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ حضرت جبرئیلؑ حاضر ہوئے۔ آتے ہی آپ نے آنحضورؐ کا سینۂ پاک چاک کر کے نور حکمت سے بھرا، پھر براق کے ذریعے بیت المقدس لے گئے۔ وہاں آپؐ نے قدرت کی عجیب و غریب نشانیاں دیکھیں اور انبیاء کرام کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کی۔ امامت کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ کو عالم بالا کی طرف لے جایا گیا۔ مختلف طبقاتِ سماوی میں جلیل القدر انبیاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر میں آپؐ کو "سدرۃ المنتہیٰ" تک پہنچایا گیا۔ جہاں بجز آنحضورؐ کے کسی کی رسائی نہ ہو سکی۔ آپ حریم خلوتِ گاہِ قدس میں باریاب ہو کر "قاب قوسین" (دو کمانوں کا فاصلہ) سے بھی قریب تر ہو گئے

اور اس خلوت گاہ میں راز و نیاز
وہ پیغامات ادا ہوئے جن کی لطا
نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں
ہو سکتی۔ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَ
اَوْحٰى ، (النجم آیت ۱۰) ا
مقدس سفر کے اختتام پر اللہ تع
نے آپ کو تین عظیم نعمتیں بطور سو
مرحمت فرمائیں۔

۱۔ بنی نوع انسان کی بخشش کا اعلان۔ اس شرط کے سا
کہ اس نے شرک کا ارتکاب نہ کیا ہو۔
۲۔ نماز پنج گانہ کی فرضیت
۳۔ سورۃ بقرہ کی آخری چند آیات جس میں اسلام کے عقا
ایمان کی تکمیل اور اس کے دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت

عہد نبوی کے اس یادگاری واقعہ کو معراج کے علاوہ لفظ اسر
سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دراصل "اسراء" کے معنی مطلق رات
لے جانے کے ہیں اور "عروج" کسی کو لے کر اوپر چڑھنے کے معنیٰ
مستعمل ہے۔ اسی لیے بعض لوگ حرم پاک سے بیت المقدس تک کے
کو 'اسراء' اور اس کے بعد کے احوال کو "معراج" سے تعبیر کرتے ہ
اس واقعہ کے بعد جو سورہ نازل ہوئی وہ "الاسراء" ہی کے نام
موسوم ہوئی۔ اس سفر میں آپؐ نے جو کچھ دیکھا یا آپ کے ساتھ جو
پیش آیا وہ بڑا حیرت انگیز ہے۔ مثلاً راتوں رات بیت المقد
کی زیارت، انبیاء کے ساتھ نماز کی ادائیگی، آسمان میں جلیل القد
سے ملاقاتیں، پھر سدرۃ المنتہیٰ پر قدم رکھنا اور بارگاہِ خ
میں باریابی۔ لیکن قرآن مجید نے ان تفصیلات سے تعرض نہیں ک
بلکہ صرف وقوع واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ قرآن نے جو تفصیلات
کی ہیں، وہ معراج کے مقاصد و پیغامات سے متعلق ہیں، اس لیے
کی حقیقی اہمیت و افادیت کو سمجھنے کے لیے کیفیت معراج اور بعض
اختلافات میں الجھنے کے بجائے ہمیں اس کے پس منظر، مقاصد
نتائج کا مطالعہ کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ بات

پیغام لائی ہے۔

معراج کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ مخالفتوں کی آندھیاں
ہوتی جا رہی تھیں۔ نبیؐ اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر لمحہ
مظالم کا سامنا تھا۔ حبشہ کی جانب ہجرت، طائف کا المناک
اور شعب ابی طالب میں محاصرہ جیسے دلدوز واقعات پیش آچکے تھے
انوں نے ان تمام مصیبتوں اور آزمائشوں کا بڑی دلیری اور صبر و شکر
ساتھ مقابلہ کیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ مصیبتوں کے بادل چھٹیں مسلمانوں
ن سخت گیر اور مصیبت بھری زندگی کا باب ختم ہو اور اطمینان و
ن کے ایک نئے دور کا آغاز ہو ، اسلامی ریاست کی تشکیل اور
شرتی زندگی کے اصول و آداب کی تفصیل و وضاحت کے ذریعے پیغمبرانہ
ن کے باقی مراحل طے کیے جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپؐ کو
ئی اعزاز و اکرام کے ساتھ بارگاہِ قدس میں طلب کیا گیا۔ اس موقع
راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، مستقبل میں کامیابی کی بشارت دی گئی اور
تمام اصول و مبادی سے روشناس کرایا گیا جو اسلامی ریاست کی
کمیل اور صالح اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لیے ناگزیر تھے۔ اسی
قع پر یہ وضاحت بھی کی گئی کہ حق کے غالب ہونے اور باطل کے نیست و
د ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔

"قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ
زَهُوقًا" (اسراء : ۸۱)

[اور اعلان کردو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور
باطل نابود ہونے والی چیز ہے]

معراج کی اہمیت و فضلیت اور اس کا مقصد سورۃ الاسراء سے بخوبی واضح
ہو جاتا ہے۔ یہ پوری سورہ بقول علامہ سید سلیمان ندوی "معراج کے
اسرار و حقائق، نتائج و عبر اور احکامات و اعلانات سے معمور ہے[۳]۔"
، احکام و ہدایات، عقاید، عبادات، اخلاقیات، سیاسیات، اقتصادیات
غرض زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے۔ ذیل میں اس سورہ کے مضامین کا
ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ خدا کی وحدانیت اور شرک سے اجتناب کی تاکید کی گئی۔ اس لیے کہ
شرک ایسا مرض ہے جو ایمان و عقاید کی بنیاد ہی کو کھوکھلی کر کے رکھ دیتا ہے۔

۲۔ نماز کی اہمیت دین میں مسلم ہے، شریعت کا انحصار نماز پر ہے، بندہ
اور خدا کے درمیان رشتہ استوار کرنے کا سب سے بہتر اور موثر
ذریعہ نماز ہے۔ نماز شخصی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر نہایت
قوی اثر ڈالتی ہے۔ اس لیے دن رات میں پانچ وقت نماز کی
ادائیگی کا حکم دیا گیا۔

۳۔ اس بات کی دو ٹوک انداز سے وضاحت کردی گئی کہ سیادت و
قیادت اور مقدس مقامات کی تولیت کی مستحق صرف وہ قوم
ہو سکتی ہے جو خدا کے احکام و فرامین کی پابند اور اس کے تقاضوں
کو پورا کرنے والی ہو۔ جس نے بھی احکام خداوندی سے روگردانی
کی وہ اس جلیل القدر منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے۔ یہ اللہ
کی سنت ہے۔ اس میں تغیر کا کوئی سوال نہیں۔

۴۔ حقوق العباد میں سب سے مقدم اور اہم حق والدین کا ہے۔ اس
لیے ان کی عزت و اطاعت کی تاکید کی گئی کہ یہ رضائے الٰہی کے حصول
اور معاشرے کے اخلاقی نظام کی درستگی کے لیے انتہائی ضروری ہے

۵۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی، حق شناسی اور حق رسائی جیسے
زرّیں اصول جاری و ساری رکھنے کا حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنے اعزہ
اقرباء، اور احباب و اصدقاء کا خیر خواہ ہو اور ہر صاحب دولت
اپنے مال میں غرباء و مساکین کا حق محسوس کرے۔

۶۔ اسراف یعنی فضول خرچی کی ممانعت کی گئی کہ فسق و فجور اور نام و نمود
کے لیے دولت کا بہانا اور اس کا بیجا استعمال کفرانِ نعمت
ہے۔ جو لوگ اس طرح دولت لٹاتے ہیں وہ گویا شیطان کے بھائی
ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ مال و دولت
پر سانپ بن کر بھی نہ بیٹھیں۔ بلکہ جائز مواقع اور ضرورت کے وقت
اس کا استعمال بھی ضروری ہے۔ صرف دولت کے سلسلہ میں بہتر
راہ اعتدال کی ہے۔

۷۔ رزق کی تقسیم خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں
سے اس میں دخل اندازی کرنے پر سخت نکیر کی گئی ہے کہ بعض لوگ
محض فاقہ مستی کے خوف سے نسل کشی جیسے گھناونے فعل کا ارتکاب
کر بیٹھتے ہیں۔ یہ خدائی نظام سے ٹکراؤ ہے۔

۸۔ معاشرتی نظام کے بگاڑ اور اخلاقی زوال میں سب سے زیادہ دخل زنا کو ہے۔ اس لیے کہ معاشرتی زندگی کی خوشگواری اور اسکا استحکام حمی رشتہ کی پاکیزگی پر منحصر ہے۔ اس لیے اس گناہ عظیم کے ارتکاب کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے جو صالح تمدن وصحت مند معاشرہ کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔

۹۔ ناحق انسانی جان کو ضایع کرنے سے روکا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو محترم ٹھہرایا ہے۔ خدا کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت اسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جب کہ خدا ہی کا مقرر کیا ہوا حق اس کے خلاف قایم ہو۔ اس میں حد سے تجاوز جائز نہیں۔

۱۰۔ یتیموں کے اموال کی حفاظت اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد معاشرہ ہی ان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ان کی تباہی و بربادی کا اندیشہ ہے جو یقیناً بہت بڑا خسارہ ہے

۱۱۔ عہد و پیمان کی تکمیل کی بڑی اہمیت ہے۔ خواہ یہ بندہ اور بندہ کے درمیان ہو یا بندہ اور خدا کے درمیان۔ اس سے ہر صورت میں ایمانداری کے ساتھ اسے پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے افراد کے باہمی عہد و پیمان کے علاوہ اس میں دو قوموں کے مابین معاہدہ کا پاس و لحاظ بھی شامل ہے۔

۱۲۔ لین دین میں ناپ تول کے پیمانے اور اوزان کو بالکل ٹھیک رکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس لیے کہ ناجائز طور پر منفعت کے حصول سے معاشی نظام کو فساد لاحق ہوتا ہے اور اس کا یقینی بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

۱۳۔ طرز معیشت، گفت و شنید اور چال چلن میں متکبرین کا طریقہ اپنانے سے روکا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ روش اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور معاشرتی زندگی کے لیے ضرر رساں ہے۔

معراج کے موقع پر عطا کردہ یہی وہ اصول و ضوابط تھے جن کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالی اسلامی ریاست قایم کی اور ایک بہترین معاشرہ کی تعمیر کی۔ حضور اقدسؐ کے بعد خلفائے راشدین، مجددین، علماء اور صالح سلاطین نے یہی اصول پیش نظر رکھے۔ سچ ہے کہ ان ہی احکام کی روشنی میں معاشرتی اصلاح اور انسانی فلاح و بہبود کے اہم امور انجام پا سکتے ہیں۔ اگر آج بھی اسلامی نظام اور اسلامی تعلیمات کا احیاء مقصود ہے تو ہمیں ان ہی کی روشنی میں جدوجہد کرنی چاہیے۔ واقعہ معراج کو یاد کرنے کا یہی حاصل ہے اور اسی میں ہماری 'معراج' بھی ہے۔

حواشی

لہ ارشاد ربانی ہے "وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (انعام: ۷۵)

لہ قرآن کریم نے اسے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے "فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا" (اعراف: ۱۴۳)

لہ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی۔ شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ ۳۹۴/۳

لہ روایات میں اختلاف ہے کہ آیا بیت المقدس کی زیارت آپؐ نے پہلے کی یا واپسی کے موقع پر۔ ہم نے راجح قول کو یہاں نقل کیا ہے اور یہی ترجیح

ھ سیرۃ النبی ۳/۴۱۴

لہ روایات میں اور بھی تفصیلات ملتی ہیں لیکن اختصار کی غرض سے ہم نے اسے حذف کر دیا ہے

شہ سیرت النبی ۳/۴۵۲۔

"امت پہ تری آکے عجب . . . .

سید حامد تلخیص: سید شفیق احمد

جس طرح فرد کے لیے احتساب ضروری ہے اسی طرح جماعت کے لیے بھی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ کام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنے سالانہ اجلاسوں میں کیا کرتی تھی۔ اب کوئی جائزہ لینے والا نہیں رہا کہ ہندوستانی مسلمان کس حالت میں ہیں۔ دوسری طرف جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے مردم شماری کے تحت فرقہ وارانہ تعلیمی حالت کے اعداد و شمار شایع کرنا بند کر دیے۔ اس وقت یہ حال ہے کہ اندھیرے میں ٹٹولتے رہتے ہیں کہ ہم کہاں پہنچ گئے اور زوال کو روکنے کی کوئی تدبیر ہے بھی یا نہیں؟ کچھ لوگ جنھوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا جلسے اور سمینار کرتے رہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت زیر بحث آتی ہے۔ نومبر ۸۶ء کے شروع میں بمبئی کی انجمن اسلام نے ایک سہ روزہ سمینار بلایا تھا، وہاں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ ملک کے مسلم تعلیمی اداروں میں ربط باہم اور ان کے معیار کی ترقی اور مسلمانوں کے تعلیمی احتساب اور پیش رفت کے لیے ایک ملک گیر اِدارے کی ضرورت ہے جس کا کام وفاق، نگرانی، نصاب کی تشکیل، معاینہ، منصوبہ سازی اور اشاعتِ علم ہونا چاہیے۔ ادارہ کی ضرورت کے احساس کو عام کیا جائے تاکہ اس کی تاسیس کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ ضرورت دراصل صرف تعلیمی اداروں کو وفاق کی لڑی میں پرونے کی نہیں ہے بلکہ ان انجمنوں کی شیرازہ بندی بھی لازمی ہے۔ بنارس میں اس کی ایک بہت اچھی مثال سوسیٹی سوسائٹی ہے جس نے گذشتہ چار سال کے عرصہ میں تعلیمی اور اصلاحی شعور کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بڑے اور اعلیٰ معیار کے پبلک اسکول کا منصوبہ بنایا ہے جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے گی۔ یہ بات حیرت اور افسوس کی ہے کہ بنارس کے پُرحوصلہ اور دردمند باشندوں نے اپنے بڑے کارِ خیر کے لیے ابھی تک سات لاکھ روپے کی ابتدائی رقم کا بھی انتظام نہیں کیا جس سے اعلیٰ اسکول کے لیے زمین خریدی جا سکتی۔

اعداد و شمار میسر نہ ہوں تو جائزوں، اشاریوں اور موٹے موٹے تاثرات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب ہم کو بتلاتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے وہ فرقہ جو ملک کی زندگی میں اکثریت کا ہم قدم تھا، اس حیثیت کو پہنچ گیا جسے کیمپ فالوور Camp Follower یا غبارِ کارواں کہہ سکتے ہیں۔ اس کی نیت و وفاداری اور سلامتی مشتبہ ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ اسے ایک ایسے جمہوری نظام کا سامنا کرنا پڑا جس میں اس کی حیثیت عضوِ ضعیف کی ہے۔ دوسری طرف اکثریت اور حکومت نے یہ رُخ اختیار کیا ہے کہ جو مسلمان، مسلمانوں کا ذکر کرے، ان کی دشواریوں اور شکایتوں کو منظرِ عام پر لائے یا ان کے ازالہ کے لیے فریاد کرے، متعصب اور فرقہ پرست، بنیاد پرست، رجعت پسند اور وطن دشمن سمجھا اور کہا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسلمان صالح متوازن اور معتدل رہنمائی سے یکسر محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کے روشن خیال طبقہ نے عافیت اسی میں دیکھی کہ زبان جب کھولیں تو نیشنل انٹگریشن اور نیشنل مین اسٹریم کی ستائش میں اور حکومت کو یہ بتانے کے لیے کہ مسلمان مطمئن اور خوش ہیں اور جو غیر مطمئن ہیں ان کی وفاداری مشتبہ ہے۔

دو باتیں یہاں نظر انداز نہ ہو جائیں۔ اوّل یہ کہ جمہوریت ہی سب سے بہتر نظامِ حکومت ہے اور دوم یہ کہ ہندوستان اگر ہندو جمہوریت کا اعلان کر دیتا تو اس وقت مسلمانوں اور دوسر

؎ ۲۲، ۲۳ نومبر ۸۶ء کو دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی چھٹی صوبائی کانفرنس بنارس میں پڑھے گئے خطبۂ افتتاحیہ پر مبنی تلخیص۔

فرقوں کی کیا حیثیت رہ جاتی۔ اس وقت وہ کھل کر برابری اور انصاف کا مطالبہ بھی نہ کر سکتے۔ غالباً شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کوئی جمہوریت دیر تک جائز مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تقاضہ کرتے وقت لہجہ میں نرمی اور شائستگی ہونی چاہیے لیکن انکسار نہیں۔ کیوں کہ یہ سوال نہیں ہے اپنے حق کی طلب ہے۔ ہماری بات اس لیے کم سنی گئی کہ ہم نے رائے عامہ بنائی ہی نہیں جمہوریت جس کا احترام کرتی ہے۔ ہمیں حکومت سے، اکثریت سے اور دوسرے فرقوں سے شکایت بعد میں ہونی چاہیے۔ پہلے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اپنی کمیوں اور محرومیوں کو دور کریں جو خود ہماری وجہ سے ہیں۔

قدرت کا قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی کمزوری پر قناعت کر لی موت نے اسی آن اسے آدبوچا۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ علم طاقت ہے۔ عربوں نے اوایل اسلام میں علم حاصل کیا اور دنیا کو تسخیر کر ڈالا۔ عربوں نے موجودہ دور میں علم ترک کر دیا تو ایک چھوٹے سے ملک نے ان کو زیر و زبر کر دیا۔ اس بڑی دولت کے باوجود جو عربوں کے پاس تھی اور جسے زر سیال کہتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت میں پامال نہ ہونے اور فیض یاب ہونے اور پیش قدمی کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں: پہلی باخبر اور متحد رائے عامہ کی تشکیل و اشاعت؛ دوسری اس طاقت کا حصول جسے علم اپنے ساتھ لاتا ہے۔ غور کیجیے تو ایک تیسری بات بھی درکار ہوگی: حکومت کے ایوان اور دفاتر میں ہماری قابلِ لحاظ موجودگی۔ اس کے لیے مقابلے کے امتحانوں میں شرکت لازمی ہے۔ ان تینوں مقاصد کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے تحصیلِ علم

اس وقت سماں یہ ہے کہ ہم تعلیمی اعتبار سے درماندہ ہیں۔ بچوں کو اسکول نہ بھیج کر گھریلو صنعتوں میں گھر کی آمدنی میں اضافہ کی خاطر جھونک دیتے ہیں اور یا پھر جلد ہی اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔ ان چند باتوں میں جن میں ہم نے امتیاز حاصل کیا ہے ایک بچوں کو اسکول چھڑوا دینے یا ڈراپ آؤٹ کی شرح ہے۔ آئندہ نسلوں کی تباہی میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے ہماری غفـ نے اسے پورا کر دیا۔ اس وجہ سے کہ اہلِ علم و فضل ہمارے یہاں آئیں گے نہ اہلِ اقتدار اور نہ اہلِ امتیاز۔ تلاش صلاحیت (ٹیلنٹ سرچ) مقابلے کے امتحانوں، ڈاکٹری، انجینیری، آئی۔ آئی۔ ٹی۔ ڈ بزنس مینیجمنٹ کے انسٹی ٹیوٹ، کوئز (عام باخبری کی آزمائش کے نتیجے نکلتے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ بڑی درمیانی صنعتوں میں ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس پر چھوٹی بات اور چھوٹی سطح حرام تھی، اب چھوٹے پن کے طلسم میں گ ہے۔ ڈیڑھ اینٹ سے ہمارا ناطہ جڑا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی راہ نکالتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہماری بیماریوں اور کمزوریوں او پسماندگیوں کا علاج صرف علم ہے۔ علم سے ہی فراست، بصیرت آگاہی ملے گی اور اس کے علاوہ آسائش، آرام، عافیت اور د بھی۔ علم سے مراد صرف دنیاوی علم نہیں، دینی علم بھی ہے۔ اگر اس ملک میں من حیث القوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سوائے ا کے کوئی چارہ نہیں کہ مدرسوں کا دفاع اور تقویت کی جائے گوشے گوشے میں مدرسے قایم کیے جائیں اور ان کو معقول ڈھ سے چلانے کا انتظام ہو اور کوئی مسلمان بچہ ایسا نہ رہ جائے دین کی تعلیم نہ ملی ہو۔

دینی تعلیم اور ذہنی آگہی کی حالت اس وقت عبرت نا ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تلاش صلاحیت کی ایک اسکیم شرو اس کے سامنے ایک بچی انٹرویو کے لیے آئی جس نے ہائی اسکو امتیازی نمبر حاصل کیے تھے؛ جس کی معلومات عامہ بہت اچھی تھ کا نام معراج فاطمہ تھا۔ پوچھا گیا کہ معراج کے معنی کیا ہیں؟ جو ملا "میرا لاج"۔ یہ جواب ملت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ انتہائی ہوگی اگر ہم یہ اہتمام نہ کریں کہ ہر مسلمان گھر میں اس زبان میں ج کے مکین بولتے ہیں ایک چھوٹا سا کتابچہ موجود ہو جس میں اسلا بنیادی باتیں، رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ اور خلفائے راشد سوانح اور دنیائے اسلام کی مختصر تاریخ دی گئی ہو۔ ہر مسا

بچے پڑھنا اور بچوں کو پڑھوا کر دھرواتے رہنا چاہیے۔ اس نفسیاتی
ملحوظ رکھیے کہ جو نقش بچپن میں بیٹھتے ہیں وہ حافظہ سے کبھی محو
ں ہوتے۔

اس تعلیم و تربیت کی دوسری سیڑھی محلہ کے گھر مسجد یا مدرسہ
قرآن کی تعلیم ہے۔ اس نظام کو پھر زندہ کرنا چاہیے جس کے تحت
ں بھی خواتین فی سبیل اللہ اپنے پڑوس کے بچوں کو دین کی تعلیم دیا
ی تھیں۔

تیسری سیڑھی دینی تعلیمی مدرسوں کے فروغ کی ہے۔ ان کی تعداد
ں اضافہ کی ضرورت ہے۔ مالی مشکلات کو عدیل عباسی صاحب مرحوم
سعیٔ بلیغ کی طرح دور کرنا چاہیے۔ ضلع بستی میں انھوں نے چٹکی
حریک چلائی۔ ہماری بہنوں نے وہاں یہ بات ٹھان لی کہ جب بھی آٹا
گوندھیں گی تو ایک چٹکی قولاً اور ایک مٹھی عملاً نکال لیں گی
یک ہفتہ میں جمع آٹے کو نقدی کی شکل میں دینی تعلیم کے لیے دے دیا
جاتا۔ یہ تحریک مغربی اضلاع میں خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوئی۔ بستی میں
بھی اب وہ گرمی نہیں رہی ہے۔ گذشتہ ماہ اکتوبر ۸۶ء میں سنبھل
ضلع مرادآباد میں دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جسے حضرت مولانا سیّد
ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے صدارت سے نوازا۔ امید ہے کہ
روشنی اور آگہی کی یہ تحریک مغربی یو۔پی میں بھی فروغ پائے گی۔
مدرسوں کی مالی مشکلات کو دور کرنا آرگنائزروں کو تلاش کرکے
انھیں معقول مشاہرہ دینا، صوبائی دینی تعلیمی کونسل کے مرکزوں کو
کرنا اور اس لائق بنا دینا کہ دینی مدارس کی نگرانی، امداد اور توسیع
کا کام بخیر خوبی انجام پا سکے۔ ایک کل ہند دینی کونسل کا قیام نہایت
ضروری ہے۔ یہ سارے امور ہم سب کی توجہ چاہتے ہیں۔ چٹکی تحریک
کے علاوہ ایک دوسرا طریقہ وسائل فراہم کرنے کا یہ قرار پایا ہے کہ آمدنی
کا ۱/۴ حصہ دینی تعلیم کی نذر کیا جائے۔ غور کیجیے کیا ہم اتنی چھوٹی
سی مدد بھی تعلیم دین کی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو
پھر ہمیں اس کا حق بھی نہیں کہ مسلمانوں کے حال زار پر افسوس کریں
تعلیم سے بیشتر لوگ بے بہرہ ہیں۔ ان کو تعلیم دلانا ضروری ہی نہیں
فرض ... ہے۔ ورنہ ہمارے دیس میں اسلام باقی نہیں رہے

گا۔ مسلمانوں کا تو نقصان ہوگا ہی خود ملک بھی ثقافتی افلاس سے
دوچار ہو جائے گا۔

مدرسے کھولنا اور چلانا ہی کافی نہیں ہے۔ کیونکہ دو ریاستوں
کیرالہ اور گجرات کو چھوڑ کر باقی ریاستوں میں یہ عالم ہے کہ بچوں کو عام
اسکولوں میں مذہب سے اونگھتی ہوئی آگاہی بھی نہیں ملتی۔ عربی
مدرسوں میں اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ اس کے طالب علم کسی مرحلے
میں عصری تعلیم کی طرف بہ آسانی منتقل ہو سکیں۔ یہاں انگریزی سائنس
اور حساب کی تعلیم درکار ہوگی۔ مدرسوں کے پاس وسائل کم ہیں۔
مذکورہ مضامین پڑھانے والے استادوں کو بڑی تنخواہیں دینا
ہوں گی۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ضلع اور ہر شہر میں ایک
انجمن تعلیم یا ایجوکیشن سوسائٹی قایم کی جائے جو مقامی تعلیمی مسایل کو
اجتماعی وسایل اور باہمی مشورے کے ذریعے حل کرے۔ مقامی اسکولوں
یا کالجوں سے مذکورہ مضامین کے استاد مدرسے میں آکر مضامین
کی جز وقتی تعلیم دیا کریں۔ لیکن یہ ہر جگہ اور ہر وقت ممکن نہ ہوگا۔
اس لیے بیرونی استادوں کے ذریعے انگریزی، ریاضی اور سائنس
کی تعلیم کا انتظام خود مدرسہ یا کسی مناسب جگہ پر کرنا ہوگا۔ یہاں
یہ مسئلہ بھی سامنے آئے گا کہ عربی مدرسوں کا نصاب پہلے ہی
سے گتھا ہوا گنجان اور بھاری ہے۔ زائد مضامین کے لیے وقت
کہاں سے آئے گا۔ اس مسئلہ کو دو طرح سے حل کر سکتے ہیں۔
اوّل تو ان مضامین کو حذف کرکے جن کا تعلق دین سے نہیں ہے
دوسرے کورس کی مدت میں سال یا دو سال کا اضافہ کرنے کے
ذریعے۔ اگر موجودہ طرز و نصابِ تعلیم کو بدلا نہیں گیا تو اس کے نتائج
بالآخر مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں نے ان
مدارس کی اسناد کو تسلیم کیا ہے۔ باقی یونیورسٹیوں سے بھی رجوع کرنا
چاہیے۔ عربی مدرسوں میں طلبا کی تعداد علماء کے خاندانوں کے
بچوں کو چھوڑ کر ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو ان اسکولوں میں
ذہانت یا مالی وسایل کی کمی کی وجہ سے داخل ہوتے ہیں۔ ان
طالب علموں کے سر پر جب دستارِ فضیلت باندھی جائے گی تو کیا
آپ سمجھتے ہیں کہ وہ عالم ہونے کا حق ادا کر سکیں گے۔ دینی مدارس

میں نہیں اوسط اور اوسط سے زیادہ ذہانت کے طلبار کے لیے کشش کا سامان پیدا کرنا ہے یعنی یہ امکان پیدا کرنا ہے کہ وہ دینی تعلیم مکمل کرکے یا ابتدائی حصّہ پر راسخ ہوکر جدید تعلیم کی طرف جب چاہیں چلے جائیں ہمارے اعلیٰ مدارس کے فارغین کو عصرِ حاضر کے علوم سے آگہی اس لیے بھی درکار ہے کہ وہ نئی نسل کو جو عقیدہ سے زیادہ عقل پر زور دے رہی ہے اور جو آغاز ہی شک و شبہ سے کرتی ہے دین کی صداقت اور فیوض کا قایل کرسکیں اور جب ضرورت پڑے تو اجنبیوں کو دینِ اسلام سے نئے حالات اور نئے علوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے روشناس کرسکیں اور دین پر جب الحاد یا دوسرے مذاہب کی طرف سے اعتراض ہو تو اس کا دفاع کرسکیں اور جواب دے سکیں۔ انگریزی حساب اور سائنس کے مضامین اختیاری ہوں۔ یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ دینی مدارس میں حکومت مداخلت نہ کرسکے۔ دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم اتفاقِ رائے سے ہو۔ دراصل یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ علمائے کرام کی مجلس شوریٰ کی توجہ کا مستحق ہے۔

دینی تعلیم کے ساتھ اردو کی تعلیم کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ اردو اتنی دلکش اور معنی خیز اور متمول زبان ہے کہ ہندوستان کی بدقسمتی ہوگی اور وہ مٹ گئی یا محدود ہوگئی۔ جو عرضداشت اور محضر وقتاً فوقتاً حکومت کو اردو کے سلسلہ میں دیے گئے ان کی حیثیت حرفِ غلط سے زیادہ نہیں سمجھی گئی لیکن اردو کا حق ملک سے ہم مانگتے رہیں گے۔ بچوں کو گھر پر اردو پڑھانا ایک موثر ذریعہ ہوگا۔ اردو کا محاذ مطالبہ سے زیادہ مجاہدہ کا خواہاں ہے۔ اردو کو بچانے کے لیے تین کام کرنے ہوں گے (۱) حکومت سے مطالبہ کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ختم ہونی چاہیے جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انکی ابتدائی تعلیم اردو میں ہی ہونی چاہیے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو شامل کرنا لازمی قرار دیا جائے (۲) اردو پڑھانے کا جزوقتی انتظام خواہ گھر پر ہو خواہ کسی دوسری جگہ (۳) ان اسکولوں میں جو مسلمانوں کے زیرِ اہتمام ہیں اردو کی پڑھائی کا خاص انتظام کیا جائے۔ نفاذ کی ضمانت پر اصرار کیا جائے۔ ایک ایسی تنظیم کا انعقاد کیا جائے جو تعلیم کے معیار اور نظم و ضبط بہتر بنا سکے۔

ہمارے کاریگروں کے ہاتھ میں ہنر ہے لیکن علم سے ان کے ہنر پر صیقل نہیں ہونے پاتی۔ وہ اپنے ہنر کو اور اپنی گھریلو صنعت کو ترقی نہیں دے پاتے۔ وہ ہر قدم پر سرمایہ کے دست نگر ہیں۔

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکاۃ

جن صنعتوں نے ہاتھ پر زیادہ تکیہ کیا اور دماغ کو نظرانداز کرد[یا] وہ پچھڑ گئیں، جن صنعتوں نے ہاتھ سے بھی زیادہ زور دماغ پر د[یا] وہ آگے بڑھ گئیں۔ ہمارے کاریگروں کے دستِ حسن آفریں کو اگ[ر] دماغ سے جو تازہ ترین علم و ہنر سے جلا پا چکا ہے، کمک ملتی رہے [تو] وہ آسمان سے تارے توڑ لائیں۔ انھیں اپنے بچوں کو اچھی تعلیم د[ینی] چاہیے۔ پیٹ کاٹ کر انھیں پڑھانا چاہیے تاکہ وہ علم حاصل کر[کے] اپنے خاندانی ہنر میں چار چاند لگا سکیں اور کچھ پشتینی کاروبار چھ[وڑ] کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نام پیدا کرسکیں۔

دین اور قوم کی خدمت میں صاحبِ خیر بننا ہے صاحبِ نا[م] نہیں۔ اگر آخرت کی سرخروئی مدّنظر ہے تو خدمت خلق اور کا[ر خیر] کو ذاتی اقتدار، وجاہت کا ذریعہ نہ بنایے۔ اپنی ڈفلی الگ الگ بجانے سے بہتر ہے کہ اہلِ خیر مل کر مقامی ملّی ضروریات پر غور فرمائیں اور انھیں کے مطابق متحد ہوکر اداروں کی بنا ڈالیں ان اداروں کو سہارا دیں جو پہلے سے قایم ہیں۔ سوال مقدار کا [نہیں] معیار کا ہے چھوٹے موٹے الٹے سیدھے اداروں کی تعدا[د] بڑھ بھی گئی تو کیا حاصل ہوا؟ نئے معیاری ادارے قایم کیجیے [اور] سر جوڑ کر قدم سے قدم ملا کر تعلیمی اصلاحی اور تعمیری کاموں میں [لگنا] ہوگا۔ خانہ جنگی کو ختم کرنا ہوگا۔ ذات برادری کے روگ کو د[ور] کرنا ہوگا۔

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک !
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

نفاق نے ہماری بدقسمتی سے ایک اور شکل اختیار کرلی۔ شیعہ سنّی، بریلوی دیوبندی آپس میں اس طرح گرم ستیز [ہیں] جیسے اسلام صرف خانہ جنگی کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر ہم نے اس [...] اور خود سوز خانہ جنگی کو ختم نہیں کیا تو ہماری بقا کے لالے پڑ جائیں

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ۔ ہو۔

ہمارے ملک میں پلانڈ ڈیولپمنٹ یا بہ جہت منصوبہ بند ترقی
ور ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا ۔ اسے ۳۵ سال گزر گئے ۔ اربول
پے قطرہ بندار تقاء پر صرف ہوئے ۔ ہمیں اس میں کیا ملا ؟ حصہ
ابھی نہیں ملا ، حالاں کہ وہ اقلیتیں جو بیدار ہوتی ہیں اپنے حصۂ رسدی
زیادہ پا جاتی ہیں ۔ اقلیتی صورتِ حالات کی منطق یہی یہی ہے کہ اکثریت
زیادہ محنت کریں اور ملک کی ترقی کے لیے خود کو اکثریت سے
دہ بکار آمد بنائیں ۔ نفاذ میں متعدد سطحوں پر امتیاز برتنے ،
بری ، بے حسی اور عصبیت کے اندیشوں نے ہمارے قدم پکڑ لیے
گزشتہ ۳۵ سالوں میں مسلمانوں نے سب سے پچھڑی قوم ہونے کا
ابلِ فخر امتیاز حاصل کرلیا ۔ اس سلسلے میں زیادہ مورد الزام اس
ہ کو ٹھہراؤں گا جس سے خود میرا تعلق ہے ۔ وہ لوگ جو وکاس کے
صوبوں سے واقف تھے انھوں نے کوشش ہی نہیں کی کہ ان آگاہی
اپنے بھائیوں تک پہنچائیں ۔ اس بار ساتویں پنج سالہ منصوبے کے
اتھ ساتھ پندرہ سال کا تناظری منصوبہ بھی بنا ہے ۔ اس کے
وگراموں اور اسکیموں کی تشریح اور تعبیر اور تعاقب ہم پر لازم
اہے ۔ یہ کام ہر شہر میں ہونا چاہیے ۔

فی الحال تو ہمیں نئی تعلیمی پالیسی کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہیئے ۔
ں کے نفاذ کی نگرانی اور خامیوں کو دور کرانا ہمارا فرض ہے ۔
۱۹۸۰ میں وزارت تعلیم نے تعلیم کے چیلنج کے نام سے ایک دستاویز
شائع کی ۔ سال بھر اس دستاویز پر ملک گیر بحث ہوتی رہی ۔ اس
بحث کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت نے اپنی نئی تعلیمی پالیسی بنائی
جو تعلیم کی قومی پالیسی کے نام سے پارلیمنٹ میں منظور ہونے کے بعد
شتہر کی گئی ۔ اس کے چند ماہ بعد ایک عملی پروگرام بھی پارلیمنٹ سے
منظوری کے بعد جاری کیا گیا ۔

قومی تعلیمی پالیسی کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے
ایک سطح پر تعلیم حاصل کرسکیں ۔ تعلیمی ڈھانچہ ۱۰+۲+۳ ہے ۔ نصاب
کا ایک مشترک جزو ہے جسے نصاب کا بطن یا کور کریکلم کہا گیا ہے ۔
اس کے بعد دوسرے اجزا مقامی حالات کے مطابق مختلف ہو سکتے
ہیں ۔ بطن نصاب میں ہندوستان کی جد و جہد آزادی ، آئینی فرائض
اور وہ مضامین شامل ہیں جو قومی تشخص سے قریبی ربط رکھتے
ہیں اور مشترک تمدنی ورثہ ، مساوات ، جمہوریت ، صنفوں کی برابری
ماحول کے تحفظ ، دیواروں سے آزاد سماج اور چھوٹے خاندان اور
سائنسی نقطۂ نگاہ کو فروغ دیتے ہیں ۔ برابری اور برابر مواقع
فراہم کرنا اور تعصبات اور بدگمانیوں کو دور کرنا اس نصاب کا اہم
نشانہ ہے ۔ ابتدائی تعلیم کی ہمہ گیری ، تعلیم بالغان ، سائنسی اور تکنیکی
تحقیق کی طرف نئے نظام تعلیم کا روئے سخن ہے ۔ اس کی ایک
اہم خصوصیت زندگی بھر ساتھ دینے والی تعلیم ہے ۔ خانہ دار عورتوں ،
نوجوانوں ، زرعی اور صنعتی محنت کشوں اور پیشہ وروں کو
مواقع ملنے چاہئیں ۔ زندگی بھر علم حاصل کرنے اور وہ بھی اپنی
پسند اور سہولت کے مطابق ۔ تعلیم کا موضوع مشترک فہرست
میں شامل ہو گیا ہے ۔ اس طرح مرکز ، تعلیمی نظام پر براہ راست
اثر انداز ہو سکتا ہے ۔

تعلیمی دستاویز نے ایک پورا باب وقف کیا ہے "برابری
کے واسطے تعلیم" کے لیے اس ضمن میں تعلیم نسواں ، اپاہجوں کی تعلیم
اور بالغوں کی تعلیم یہاں قابلِ ذکر ہیں ۔ ایک پیراگراف اقلیتوں
کی تعلیم کے بارے میں ہے :

"بعض اقلیتی جماعتیں تعلیمی اعتبار سے محروم یا پسماندہ ہیں
برابری اور سماجی انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان جماعتوں
کی تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ دھیان دیا جائے گا ۔ ظاہر ہے
کہ ان اقدامات میں وہ آئینی ضمانتیں شامل ہوں گی جن کے تحت
ان کو آزادی ہے کہ اپنے اسکول قائم کریں اور چلائیں اور اُن
کی زبانوں اور ثقافتوں کا تحفظ بھی کریں ۔ ساتھ ساتھ نصابی
کتابوں کی تیاری اور معروضی انداز سے کی جائے گی ۔ اسکولوں
کا پروگرام بھی غیر جانب دارانہ ہوگا ۔ مشترک قومی مقاصد اور
نصب العین کے عرفان کے ذریعہ ایسی یکجہتی کو فروغ دیا جائے
گا جو کہ بطن نصاب (کور کریکلم) کے مطابق ہو ۔"

تعلیم بالغان کا ایک وسیع پروگرام عمل میں لایا جائے گا تاکہ حرف ناشناسی کو ختم کیا جاسکے۔ خصوصاً ۱۵ سے ۳۵ تک کی عمر والوں کو فائدہ پہنچے۔ ٹی۔ وی، ریڈیو، فاصلہ سے تعلیم لائبریریاں اور خواندگی کے لیے امداد مہیا کی جائے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی چھوٹے بچے کے ارتقاء پر خاص زور دیتی ہے۔ اس کے لیے خوراک صحت اور سماجی، ذہنی، جسمانی اخلاقی اور جذباتی ارتقاء کی فکر ایک ساتھ کی جائے گی۔ ای۔ سی۔ سی۔ ای کے پروگرام میں مقامی لوگوں کو پوری طرح شریک کیا جائے گا۔ ان بچوں کے لیے جو پڑھائی کی پہلی سیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں، زائد تعلیم کا انصرام ہوگا تاکہ وہ کمزوری کی تلافی کرسکے۔ درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے بچوں اور کام کرنے والے بچوں کے لیے غیر رسمی تعلیم فراہم کی جائے گی اور این۔ ایف۔ ای سینٹرس کو جدید آلات سے لیس کیا جائے گا۔ مقامی سماج سے لایق اور خدمت آمادہ نوجوانوں اور خواتین کو بحیثیت معلّم کے چنا جائے گا۔ نصاب میں مقامی حالات کی رعایت کی جائے گی اور مذکورہ سینٹرس کو چلانے کی ذمہ داری رضاکارانہ انجمنوں اور پنچایتوں کو سونپی جائے گی۔

نئی تعلیمی پالیسی ان بچوں کے مسئلہ کے حل کو جو اسکول چھوڑ بیٹھتے ہیں، اولین ترجیح دے گی۔ بڑی دقت نظر اور جزرسی کے ساتھ ان بچوں کی بازیابی اور تعلیم کے لیے حکمت عملی مرتب کی جائے گی۔ اس بات کی ضمانت کی جائے گی کہ وہ سارے بچے جو ۱۹۹۰ء تک گیارہ سال کے ہوجائیں گے انہیں ۵ سال کی باقاعدہ تعلیم یا غیر رسمی (نان فارمل) تعلیم ضرور مل جائے اور ۱۹۹۵ء تک سارے بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم کا فیض پہنچایا جائے گا۔ ثانوی تعلیم میں زیادہ زور استحکام پر ہوگا۔ اسی دور میں بچوں میں تاریخ کا شعور اور قومی عرفان حاصل ہوگا۔ مثالی اسکول کھولے جائیں گے ان کا مقصد اکتساب فضیلت، عدل اور سماجی انصاف کا حصول ہوگا۔ انہیں کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں کے بچوں کو ایک ساتھ رکھ کر قومی یک جہتی کو فروغ دیا جائے گا اور ان میں بچوں سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جائے گی۔

ثانوی تعلیم کے بعد پیشہ وارانہ تعلیم کا اہتمام بہت دھیان اور سلیقے سے کیا جائے گا۔ صنعتی تربیت کے اسکول تعلیم کے ملک گیر نظا[م] میں پیوست ہوں گے۔ صحت، زراعت، مارکیٹنگ سماج سیوا وغیرہ کے لیے بھی ووکیشنل تربیت دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں حکومت عورتوں، دیہاتی اور قبائیلی طلبا اور معاشرہ کے محروم طبقات کا خا[ص] خیال رکھے گی۔ ووکیشنل کورس کے فارغین کے لیے آگے تعلیم کی راہیں کھ[ولی] جائیں گی۔ ۱۹۹۰ء تک ثانوی تعلیم کے طلبا کا دس اور ۱۹۹۵ء تک ۲۵ فیصد ووکیشنل کورس کر چکا ہوگا۔ انکے اپنے روزگار شروع کر[نے] کے جتن کیے جائیں گے۔

لائحہ عمل میں ان اقدامات کی صراحت کر دی گئی ہے جو نئی تعل[یمی] پالیسی کے لیے ضروری ہیں۔ مرکز اور ریاستوں، استادوں اور عوا[م] کا اشتراک عمل ضروری ہے۔ اسکولوں کا معیار اونچا کیا جائے گ[ا] تاکہ پرائیویٹ اسکولوں میں عام والدین کو اپنے بچوں کو نہ بھیجنا پڑے۔ اس مقصد کے لیے ضلع تعلیمی بورڈ، ضلع انسٹی ٹیوٹ اور دیہی تعلیم کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ ارادہ ہے کہ نگہداشت اطفال میں کام کر[نے] والوں کو بالآخر پرائمری اسکول کے استادوں کے برابر لے آیا جائے۔ اس پروگرام کے تحت جن طبقات کی طرف خصوصی دھیان دیا جائے گا۔ ان میں گندی بستیوں کے مکین، اہل حرفہ کے خاند[ان] اور غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور بچے شامل ہیں۔ ساتویں منصوبے کے خاتمے یعنی ۱۹۹۰ء تک کم از کم ڈھائی لاکھ مراکز مزید کھل جائیں گے۔ اس کے علاوہ قبل ابتدائی اور روزینہ نگہداشت کے مراکز کو اس ضمن میں بڑھاوا دیا جائے گا اور سرکار ان کی مدد کرے گی۔ میڈیا بھی علاقائی زبانوں میں پروگ[رام] تیار کریں گے۔

ان بچوں کا جو اسکول سے باہر ہیں ۷۵ فیصد ۹ ریاستو[ں] یعنی آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پرد[یش]، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں ہے کیو[نکہ] ان ریاستوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا گیا ہے۔ [نئے] اسکول اس جگہ کھولے جائیں گے جہاں پچاس بچوں کے داخلے [...]

مکان ہوگا۔ ان سارے خاندانوں کی لڑکیوں کو جو غریبی کی لکیر سے نیچے ہیں۔ مفت کتابیں، کاپیاں، دو جوڑے یونیفارم اور دوسری ہمت افزا امداد دی جائے گی۔ بسوں کی سہولت مہیا کی جائے گی ضرورت مند اور کام کرنے والے بچوں کو وظیفے بھی دیے جائیں گے۔

غیر رسمی تعلیم کا فائدہ خواتین کو زیادہ ہوگا۔ انسٹرکٹر خواتین اور ہر بیس پچیس مراکز پر ایک نگراں یا سپروائزر کا تقرر ہوگا۔ مذکورہ ۹ ریاستوں کو غیر رسمی تعلیم کے مراکز قایم کرنے اور چلانے کے لیے مرکز ریاست کو ۵۰ : ۵۰ کی شرح سے امداد دے گا۔ صرف لڑکیوں کے لیے نان فارمل مراکز کے لیے ۱۰ : ۹۰ کی شرح سے امداد دے گا رضاکارانہ ایجنسیوں کو غیر رسمی تعلیم کے مراکز کھولنے اور چلانے کے لیے مرکز ۱۰۰ فیصد امداد دے گا۔

ثانوی تعلیم اور نَو و دیالہ کھولنے کے سلسلے میں اس حقیقت کو دیکھا جائے گا کہ اسکول کہاں کہاں ہیں اور کون سی ایسی جگہیں ہیں جو اسکولوں سے محروم ہیں اور جہاں اسکول کھلنے چاہئیں۔ کوٹھاری کمیشن کی سفارش کے مطابق پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں کا تناسب ۱ : ۳ رکھا جائے گا۔ اوپن اسکول ان لوگوں کے لیے کھولے جائیں گے جن کی ابتدائی تعلیم غیر رسمی ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ ہر ضلع میں ہونہار بچوں کے لیے نو دیالہ کھولا جائے گا۔ اس میں ۷۵ فیصد بچے دیہات کے ہوں گے۔ ان میں ⅓ تعداد لڑکیوں پر مشتمل ہوگی۔

ہماری ان پڑھ آبادی کا ۵۷٪ عورتیں ہیں جو بچے اسکولوں میں داخلہ نہیں لیتے ان میں ۷۰٪ لڑکیاں ہیں۔ تعلیمی نظام پر نظر ثانی اور اس کی تنظیم نو کر کے عورتوں کو ہر طرح سے برابر لایا جائے گا۔ پروگرام نے عورتوں کے مرتبہ، طاقت، اہمیت اور اختیار کو بڑھانے کے لیے بہت سی تجاویز رکھی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اساتذہ کے تقرر میں عورتوں کو ترجیح دی جائے۔ ملک کے ۱۰۴ آئی۔ ٹی۔ آئی لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ۷۹۰ ونگ لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔

عملی پروگرام کا ایک باب اقلیتوں کی تعلیم کے لیے وقف ہے۔ یہ باب دستور کے آرٹیکل ۲۹، ۳۰ اور الف ۳۵۰ کے حوالے سے شروع ہوتا ہے اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ ان آرٹیکلوں میں دی ہوئی ضمانتوں کی تعمیل ناہموار رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق مذہبی اقلیتیں کل ملا کر ہندوستان کی آبادی کا ۱۷ر۴ فیصد ہیں۔ مسلمان ۴۲ر۱۱٪۔ وزارتِ داخلہ نے قومی سطح پر مسلمانوں اور نو بدھوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا ہے۔ خاص اقدامات کی ضرورت ہے کہ ان اقلیتوں کو بقیہ سماج کے برابر لایا جائے تاکہ وہ قومی ترقیاتی کارروائی میں پوری طرح حصہ لے سکیں۔

۱۹۸۶-۸۷ء میں تجویز ہے کہ دس پالی ٹیکنکوں کے ذریعے ان علاقوں میں ٹیکنیکل مہارت بہم پہنچائی جائے گی، جہاں اقلیتوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے نصاب کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ کام این۔ سی۔ آر۔ ٹی نے شروع کیا ہے۔ اقلیتی اداروں کے پرنسپلوں اور منیجروں کے زاویۂ نگاہ کو نیا رخ اور استادوں کی ترہیت کا پروگرام بھی این۔ سی۔ آر۔ ٹی بنائے گی۔ یو۔ جی۔ سی پسماندہ طلبا، کو مقابلے کے امتحانوں میں تیاری کے واسطے "کوچنگ اسکیم" کے تحت مالی امداد فراہم کریگی۔

ساتویں پلان کے بقیہ تین سالوں ۸۷-۸۸ تا ۸۹-۹۰ء میں مذکورہ بالا اسکیمیں جاری رہیں گی۔ علاوہ بریں صلاح و مشورہ جاری ہے کہ علی گڑھ، کشمیر، عثمانیہ اور مراٹھ ولوا یونیورسٹیوں میں مراکز وسایل و تدبیر قایم کیے جائیں جو اپنے حلقے کے اقلیتی تعلیمی اداروں کو تربیت و ہدایت دیں گے۔ ساتویں پلان میں ان مراکز کو چلانے کے واسطے ۶۵ لاکھ روپے کی مانگ کی گئی ہے۔ اس پلان میں اقلیتوں کی آبادی کے لیے ۵ مزید پالی ٹیکنک قایم کیے جائیں گے۔ اقلیتوں کی کثیر آبادی والے علاقوں میں ایسے ادارے قایم کیے جائیں گے جو سماجی اعتبار سے کارآمد اور پیداواری کام شروع کر دیں گے۔ اس سلسلے میں شعبۂ تعلیم ایک مرکزی اسکیم تیار کرے گا۔

پرائمری تعلیمی سہولتوں کے بارے میں لسانی کمشنروں کو ہمیں

اعداد و شمار کی ضرورت رہتی ہے، ان کی فراہمی کا مستقل انتظام کیا جائے گا۔ لسانی اقلیتوں کے لیے استادوں کی منظوری و تقرری کے اختیار کو اب ضلع کلکٹر کو تفویض کیا جائے گا۔ ریاستی حکومتیں اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں کی دستیابی نیز ان کے چھپنے کا انتظام بھی کریں گی۔ اقلیتی زبانوں کے استادوں کے لیے ٹریننگ کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ نصابی وقت کا ۱۵ فیصد مقامی حرفتوں اور ہنروں پر صرف کیا جائے اور اہل حرفہ اور مزدوروں کے بچوں کے لیے شام کے کلاس شروع کیے جائیں۔

متوسط اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اقلیتی اسکول کالجوں میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم، انگریزی اور کیریر کی رہنمائی والے استادوں کو مراکز وسایل و تدبیر ٹریننگ دیں گے۔ اقلیتی اداروں میں قومی یک جہتی کی خاطر علاقائی زبانوں کے استادوں کا تقرر سہ لسانی فارمولے کے تحت کیا جائے گا۔ اقلیتی اداروں میں طالب علموں کی کمزوری دور کرنے کے لیے کوچنگ کا کام بھی ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔ کمپیوٹر سے ابتدائی آگاہی کی اسکیم میں اقلیتی اداروں کو معقول حصہ ملے گا۔

تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کو خاص طور پر فیض پہنچانے والے ہایر سکنڈری اسکولوں میں ووکیشنل کورسوں کا اجراء کیا جائے گا۔ نیز اس بات کا بھی اطمینان کرنا ہوگا کہ مذکورہ کورسوں سے انھیں پورا فائدہ پہنچے۔ کرافٹ انسٹی ٹیوٹس کا قیام اقلیتی اکثریت والے علاقوں میں اس التزام کے ساتھ کیا جائے گا کہ ..فیصد جگہیں اہل حرفہ یا کاریگروں کے بچوں کے لیے محفوظ کر دی جائیں۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے جائیں۔ ہوسٹل، خواتین ٹیچرس اور یونیفارم وغیرہ کا انتظام کیا جائے گا۔ پروڈکشن سینٹر کھولے جائیں گے اور اس سلسلے میں وسائل کی فراہمی کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں کی ہوگی۔ لائبریریاں اور ریڈنگ روم بھی اقلیتی علاقوں میں کھولے جائیں گے اور توسیع کا کام پایلیٹ پروجیکٹ کے طور پر کیا جائے گا۔ اقلیتوں کے اسکولوں کی تسلیم شدگی کے واضح رہنما خطوط اور ہدایات اور پالیسی تیار بنائے گی اور اسے اچھی طرح مشتہر کرے گی۔ ان پروگراموں کی صحیح تعمیل اور نفاذ کے لیے مانیٹرنگ کا موثر انتظام ہونا چاہیے۔ نئے اسکول کھولتے وقت اقلیتی کثرت کے چالیس اضلاع کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ کمزور طبقات کے لیے صلاحیت اور ذرائع کی بنیاد پر اچھے اداروں میں داخلے کی ضمانت، وظایف یا فیس میں رعایت دینے کے لیے ریاستی حکومتیں انتظام کریں گی۔

انتظامی مسایل مثلاً ابتدائی جائزے، تحقیقی مطالعہ، اقلیتی علاقوں میں اسکولوں کا تناسب، پروگرام مانیٹرنگ، تعلیمی بورڈوں پر اقلیتوں کی نمائندگی، مرکز اور ریاست کے شعبہ تعلیم میں ایک سیل کا قیام اور پروگراموں پر نظر ثانی وغیرہ کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے وقفہ میں بالغان کی خواندگی کی شرح ۱۶٫۶۷ سے بڑھ کر ۳۶٫۲۳ ہوگئی ہے لیکن اسی عرصہ میں ان پڑھوں کی تعداد ۳۰ سے بڑھ کر ۴۳٫۳۴ کروڑ ہوگئی۔ نئی پالیسی ۱۵ سے ۳۵ سال کی عمر والے دس کروڑ انسانوں کو تعلیم بالغان کا فائدہ پہنچائے گی۔ کاروباری خواندگی فنکشنل لٹریسی کا ایک ہمہ گیر پروگرام شروع کیا جائے گا۔ مزدوروں کی تعلیم کے پروگراموں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ شرمک ودیا پیٹھ کھولے جائیں گے اور ایمپلائرس کو اپنے ورکرس کی خواندگی بڑھانے کے لیے کہا جائے گا۔ تعلیم کو جاری رکھنے کے پروگرام کے تحت دیہات میں پانچ ہزار کی آبادی کے لیے ایک جن (عوامی تعلیمی مرکز) کھولا جائے گا جسے تعلیم بالغان کے ساتھ م دیا جائے گا۔

میں نے نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر بالقصد تفصیل سے کیا۔ اقلیتیں ان کی روشنی میں براہ راست فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ مذکورہ اقدامات کے علاوہ بھی اور بہت سے امدادی اقدا کیے جانے چاہیے تھے۔ اس طرف توجہ علیحدہ کی جانی چاہیے۔ بہت جو کچھ نئی تعلیمی پالیسی اور عملی پروگرام میں راہ پا گیا ہے

ینا روں میں اس مسئلہ کو پے در پے اٹھانے کا نتیجہ ہے۔
۔ اہم سیمینار کی سفارشات اور کلیدی مضامین کا ترجمہ
یب الاخلاق کے جون اور نومبر کے شماروں اور نشانت کے
ی کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں) بڑی ضرورت اس وقت
بات کی ہے کہ لمحہ کی نزاکت اور تعلیمی پالیسی کی غیر معمولی اہمیت
حساس مسلمانوں کو ہو جائے اور وہ آگے بڑھ کر اس پالیسی
را پورا فائدہ اٹھائیں اور اس کے نفاذ میں حتی الامکان حصہ
۔ ابھی تک ایسی تمام پالیسیوں کا فائدہ ہمیں برائے نام ملا ہے
ہر اور ہر ضلع اور راجدھانیوں میں سبھی لوگ ایسے ہوں جو
وگرام کی ہر سطر سے واقف ہوں اور جو برابر نگاہ رکھیں کہ
ہی اور پروگرام کا پورا فائدہ ہمیں پہنچے۔ مقابلے کے امتحانوں
لیے کوچنگ اسکیم جو ہمارے لیے چلائی گئی تھی غلط ہاتھوں میں پہنچ
نے کی وجہ سے کچھ کام نہ آئی۔ ریسورس سینٹر کی اسکیم حکومت
مالی منظوری کا انتظار کر رہی ہے اور ایسی یونیورسٹیاں جیسے
گڑھ اور جامعہ بد دل ہونے لگی ہیں۔ اگر ہم نے تنظیمیں برپا نہیں
یں اور طرز نفاذ پر نظر نہیں رکھی تو ہم عمومی اور خصوصی دونوں
وگراموں کے فائدوں سے محروم رہ جائیں گے اور دوسرے فرقے
بقات ہم سے تعلیم اور اس کے نتیجے میں اور آگے نکل جائیں گے۔
ب اگر عزت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو علم کا دامن مضبوطی
ے پکڑ لیجیے اور تعلیمی پروگرام میں بڑھ چڑھ کر شرکت کیجیے اور ان
۔ اثر انداز ہوئیے۔ بعض تنگ نظر اہل کار دوران نفاذ پالیسی
ر پروگراموں کے آنے کو اس طرح موڑ دیتے ہیں کہ نفع کے بجائے
قصان پہنچے۔ یوپی کے بعض مراکز میں نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اخلاقی
لیم دینے کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ سخت قابل اعتراض ہے۔ اس
ا نتیجہ مسلمانوں کا جدید تعلیم سے برگشتہ ہو جانا ہے۔ نفاذ کے انحرافات
فوراً ریاستی اور مرکزی حکومت کے علم میں دلائل کے ساتھ
انا چاہیے۔ ان پروگراموں سے روزگار کے بہت مواقع نکلیں
ے۔ ان میں مسلمانوں کو پورا حصہ ملنا چاہیے۔
قومی یک جہتی، ثقافتی ورثہ اور جدوجہد آزادی کو اس نئی
پالیسی میں مرکزی مقام دیا گیا ہے۔ یہ برمحل اور قابل ستائش ہے
لیکن ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے کہ تنگ نظر ایسا مواد نہ داخل کر دیں
جو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا ہو۔ ہمیں باخبر لوگوں کی ایک
انجمن بنانی چاہیے اور اپنے مورخین اور روشن خیال غیر مسلم اہل قلم
سے لکھوانا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ جو باتیں اس وقت نصاب میں داخل
ہو جائیں گی وہ ہمارے بچوں کے ذہن اور عقاید پر براہ راست
اثر انداز ہوں گی۔ میڈیا کے پروگراموں میں اس طرح دخیل ہوں
کہ ہندوستان کے حسین و وسیع بوقلموں اور ملے جلے تمدن کا ان میں
انعکاس ہونے لگے۔ اس تہذیب و ثقافت کو بنانے میں مسلمانوں کا
جو حصہ ہے ان کو خوبصورتی کے ساتھ منظر عام پر لانا چاہیے۔
جن افراد کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا بہت بھی علم، شعور اور عصری
آگہی سے نوازا ہے وہ اس درماندہ ملت کے مقروض ہیں قرضہ
اتارنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کی رہبری کریں جنھیں
علم اور آگہی حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ اپنے آپ کو عامۃ المسلمین
سے کاٹ لینے سے بڑی بھول کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہی شجر برگ و بار
لاتا ہے جس کی جڑیں اسی زمین میں پھیلی ہوئی ہوں۔ درختوں
سے لپٹ کر پنپنے والی بے غیرت بیلیں بے سہارا ہوتی ہیں اور
کوئی بچہ بھی انہیں توڑ کر پھینک سکتا ہے۔

اقلیتوں کے جانبر اور سرخرو ہونے کے لیے تین شرطیں
ہیں اور ان تینوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اپنے
دین، مسلک، روایات، ثقافت اور زبان پر مضبوطی کے ساتھ
قایم رہیں۔ دوم یہ کہ اس کے افراد زیادہ محنت کرکے اپنی
کارگزاری اور لیاقت کا لوہا منوالیں۔ سوم یہ ہے کہ دوسرے فرقوں
کے ساتھ اپنے تعلقات خوش گوار اور شگفتہ رکھیں۔

ہندوستان کی جمہوریت مساوات اور سیکولر عقیدہ
کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مختلف طبقوں کو اپنے عقاید اور روایات کے
مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی میسر ہو۔ جو صاحبان ملک بھر
کے لیے ایک سول کوڈ کے نفاذ پر زور دیتے ہیں وہ ہماری سیکولر
جمہوریت کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور وطن کی سالمیت، وسعت نگاہ

اور سیکولرزم پر "کفتور الحمات" کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ انہیں سمجھائیں کہ عائلی قانون کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر براہِ راست مذہب سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب کہ ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ جب وہ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں تو انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ دو۔ اگر وہ جانتے تو کبھی ایسا نہیں کہتے۔

ایک اخبار نے اس قسم کی تصویریں چھاپنی شروع کر دیں جس سے ظاہر ہوا کہ مسلمان بادشاہوں نے بعض مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دیا جو رام جنم بھومی اور اس کے جلو میں کرشن جنم بھومی کے متعلق تنازعہ کو ہوا دینے لگے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ مورخین نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر تاریخ کے افعال کو ہم الٹنا چاہیں تو پھر ان مندروں کا کیا ہوگا جو بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہوں کی جگہ پر بنائے گئے تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ماضی کی پرچھائیں حال پر نہ پڑنے دیں۔

اگر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تلخی رہی تو مسلمان تو پسیں گے ہی لیکن خود ہمارے ہندو بھائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں گے اور ملک کی ترقی کی رفتار معکوس میں بدل جائے گی۔ ناانصافی، عصبیت اور تنگ نظری، جہالت اور الزام تراشی خواہ ہندوؤں کی طرف سے ہو خواہ مسلمانوں کی طرف سے، یکساں مذموم ہے۔ دور رہ کر بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے غلط فہمیاں مٹانے کے لیے غیر مسلم دانشوروں سے خطاب کا سلسلہ شروع کیا ہے اس کام کو اور بڑھانا چاہیے۔ ہمارے پاس کوئی انگریزی روزنامہ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ حضرت مولانا نے اس اہم ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ہر ریاست کے صدر مقام سے ایک روزنامہ مقامی علاقائی زبان میں بھی نکلنا چاہیے۔ ان اخبارات کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کے مسایل کو سارے ملک کے سامنے لایا جائے۔

ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں جو ٹیکنالوجی اور سائنس کی تازہ ترین ترقیوں سے ہم قدم ہو اور جو مغربی تہذیب کی لعنتوں اور مشرق کی بعض برائیوں سے بری ہو، مسلمانوں کو اہل وطن کے ساتھ پورا تعاون کرنا ہے۔ ناانصافی کا برتاؤ رواداری کے دعووں کو کھوکھلا بنا دیتا ہے، لیکن ہمارے پاس نکتہ چینی اور شکوہ سنجی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ لمحہ کمر کسنے اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کرنے کا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

(بروایت عبداللہ بن عمروؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس میں چار باتیں پائی جائیں وہ کھرا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات پائی جائے تو اس میں منافقت کی ایک خصلت موجود ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے باز آ جائے۔

۱۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت و بددیانتی کا مرتکب ہو۔ ۲۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ۳۔ جب عہد و پیمان کرے تو توڑ ڈالے ۴۔ جب کسی سے جھگڑا ہو تو فحش کلامی اور گالی گلوچ پر اتر آئے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶، شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۸۷ء) ۲۱

ہندوستانی مسلمانوں کا ردِّ عمل

۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے تناظر میں

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کو ایک غیر ملکی طاقت کے مقابلے میں ہزیمت اُٹھانی پڑی تھی اور اس ہزیمت کے نتیجے میں ان کی غلامی کی دستاویز مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے برخلاف ۱۹۴۷ء میں ان کی طویل جنگ آزادی کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی اور صفحۂ دہر پر ہندوستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے جلوہ نما ہوا تھا۔ بظاہر یہ دو تاریخیں دو مختلف صورتِ حال کی نمائندگی کرتی تھیں، لیکن جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے ان دونوں تاریخوں کے تناظر میں ان کی ذہنی کیفیت کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا اور اس آخری اور فیصلہ کن معرکے میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس لیے اس کا خمیازہ بھی سب سے زیادہ ان ہی کو بھگتنا پڑا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جہاں ہندوستان آزاد ہوا تھا وہاں پاکستان بھی معرض وجود میں آیا تھا اور پاکستان کے قیام میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کی جدّ وجہد کو دخل تھا۔ اگرچہ پاکستان برطانوی حکومت، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے کے نتیجے میں قائم ہوا تھا تاہم ہندوستانی عوام کی بھاری اکثریت نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا اور اسی لیے اس کے قیام نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے گوناگوں مسایل پیدا کر دیے تھے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء دونوں کے اپنے اپنے وقت میں ہندوستانی مسلمانوں سے کچھ مطالبات تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان مطالبات کا جواب انھوں نے کس طرح دیا اور اس میں انھیں کس حد تک کامیابی ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے فیصلہ کن معرکے کے بعد ہندوستانیوں کے سامنے بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے بالخصوص سب سے بڑا چیلنج جدید مغربی تمدن کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ یہ تمدن مغرب کے صنعتی انقلاب کی پیداوار تھا اور اس کے اثرات عالم گیر تھے۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق تھا، اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان کے دو مکتب ہائے فکر وجود میں آئے، جنھوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اس کا مقابلہ کیا۔ ایک مدرسۂ فکر نے، جس کا مرکز دیوبند تھا اور جس کے انداز فکر کا منبع شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات تھیں، احیائے دین میں اس کا سراغ ڈھونڈا اور دوسرے مدرسۂ فکر نے، جس کے بانی سید احمد خاں تھے اور جس کا مرکز علی گڑھ تھا، اس تمدن کے صالح عناصر کو جذب کرنے میں اس کا مداوا تلاش کیا۔ مغربی تمدن کی طرف ان دونوں مکتبہائے فکر کے رویّے کے ساتھ ان کا سیاسی مسلک بھی جڑا ہوا تھا۔ دیوبند اسکول غیر ملکی حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا جب کہ علی گڑھ اسکول اس کے ساتھ تعاون میں ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح دیکھتا تھا۔ یہ دونوں دھارے ساتھ ساتھ بہتے رہے اور کبھی کبھی باہم متعارض بھی ہوئے۔ تاہم میرے نزدیک اس سے انکار کی گنجایش نہیں کہ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق ہے، انیسویں صدی کے نصف آخر میں ان کے لیے روشنی کا سب سے بڑا مینار سید احمد خاں کی ذات تھی اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس دور میں ان کے مجوزہ علاج نے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لیے داروئے شفا کا کام کیا۔

سید احمد خاں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار کے ظاہری اسباب کے علاوہ بعض ایسے اسباب بھی تھے جن کی طرف بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا تھا۔ ایک طرف یورپ کا صنعتی انقلاب دوسری یورپین اقوام کی مانند انگریزوں کی برتری کا ضامن تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی ان کی پستی کا باعث تھی۔ سید احمد خاں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ مسلمانان ہند مغربی علوم وفنون سے استفادہ کر کے اپنا ذہنی [illegible]

اور حریت فکر پیدا کریں۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف جتن کیے مثلاً سائنٹفک سوسائٹی کی تشکیل کی، تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا، قرآن کی تفسیر لکھی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کی اور مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں اس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومت وقت کا تعاون ضروری تھا اور یہ تعاون اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کے شکوک رفع کیے جاتے۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھی۔ گویا سید احمد خاں نے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر جو لائحہ عمل بنایا تھا اس کا ایک جز غیر ملکی حکومت کے ساتھ اشتراک عمل بھی تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انھیں مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کا احساس نہیں تھا یا وہ انھیں مغربی تمدن میں ضم کر دینے کے حامی تھے۔ ہاں وہ مغرب سے استفادہ کرنے کے قایل ضرور تھے۔ اس طرح وہ قدیم و جدید میں توازن پیدا کر کے مسلمانوں کی ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جس کی جڑیں ماضی میں ہوں لیکن اس کی نظریں مستقبل کی طرف ہوں۔ سید احمد خاں ہر قسم کی مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف رہے، پھر بھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ دنیا کے بیشتر مصلحین اور رہنماؤں کی مساعی کا بالعموم یہی انجام ہوتا ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ اپنے وقت سے آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس طرح ان کی قوم و ملت نہیں رکھتی ہے۔ سید احمد خاں کا مدرستہ العلوم ان کی زندگی ہی میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بن گیا تھا اور آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا لیکن تہذیب الاخلاق انھیں بند کرنا پڑا اور سائنٹفک سوسائٹی کا منصوبہ برگ و بار نہیں لا سکا۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہوا کہ سید احمد خاں کے جانشینوں نے ان کے اصلی مقصد کو بڑی حد تک بھلا دیا اور اپنی ساری توجہ اس کے حصول کے ذریعے پر مبذول کر دی یعنی وہ سید احمد خاں کی سیاسی پالیسی پر تو عمل پیرا رہے لیکن بالعموم ان کی ذہنی ترقی پسندی سے دست بردار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ تحریک جلدی ہی اپنی توانائی سے محروم ہو گئی اور اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی۔ تاہم علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز ثقل بدستور بنا رہا اور اس کے آئینے میں ان کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی سرگرمیوں کا عکس برابر نظر آتا رہا۔ پھر علی گڑھ ہی کے بت خانے سے ایسے بت شکن پیدا ہوئے جنھوں نے برطانوی سامراج کو للکارا اور جی جان سے اس کا مقابلہ کیا۔ جہاد حریت کے ان سورماؤں کی فہرست طویل ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان میں سرفہرست مولانا محمد علیؒ کا نام ہے جنھوں نے اپنی زبان، قلم اور عمل سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا اور کارزار حیات میں نبرد آزما ہو جانے میں مسیحائی کا کام کیا۔

دیوبند اور علی گڑھ کے علاوہ دو اور ادارے، جنھوں نے اس ملک میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں قابل لحاظ کردار ادا کیا، ندوۃ العلماء لکھنو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ ان دونوں اداروں کو دیوبند اور علی گڑھ کی درمیانی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ندوۃ العلماء کے قیام کا اصلی مقصد عربی مدارس میں رائج نظام تعلیم میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ترمیم و تبدیلی اور اس کے ذریعے روشن خیال علماء پیدا کرنا تھا۔ ندوۃ العلماء کے بانی تو مولانا محمد علی مونگیری تھے لیکن اس کے مقاصد کے بہترین ترجمان اور نمائندے مولانا شبلی نعمانی تھے۔ مولانا نعمانی کی ذہنی تربیت علی گڑھ میں سید احمد خاں کے زیر اثر ہوئی تھی، لیکن وہ کئی معاملات میں سید احمد خاں سے مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے قدیم تہذیبی ورثے کا احساس اور پاس انھیں سید احمد خاں سے زیادہ تھا اور ان کی سیاست سید احمد خاں کی سیاست کے مقابلے میں قومی رجحانات سے زیادہ قریب تھی۔ علی گڑھ میں انھوں نے روشن خیالی کا سبق پڑھا تھا، اسے وہ ندوۃ العلماء میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے علماء، جو ندوۃ العلماء کی تحریک سے وابستہ تھے، ان کا ساتھ نہیں دے سکے اور انھیں بادل ناخواستہ ندوۃ العلماء سے کنارہ کش ہو جانا پڑا۔ نتیجتاً ندوۃ العلماء

مسئلہ نہیں ہو سکا بلکہ اس پر قدامت ہی کی چھاپ لگی رہی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہم اس لحاظ سے علی گڑھ ہی کا تتمہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے چند باغیوں کے فکر و عمل کا ثمر ہے۔ ان باغیوں کے سرخیل مولانا محمد علی تھے اور جامعہ ملیہ کو اس کا حقیقی رنگ و آہنگ عطا کرنے والا بھی علی گڑھ ہی کا ایک سابق طالب علم تھا جس کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین ہے۔ جامعہ ملیہ، تحریک ترک موالات کے پرجوش سیاسی دور کی پیداوار ہے اور مولانا محمود حسن دیوبندی کے الفاظ میں اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں سید احمد خاں بھی دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اسے اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد رکھنے پر تیار نہیں تھے۔ گویا تعلیمی پروگرام میں حکومت برطانیہ کی معاونت اور عدم معاونت علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کا نقطۂ انفصال تھا۔ علاوہ ازیں جامعہ ملیہ کے بانی سید احمد خاں اور ان کے رفقا کے مقابلے میں ماضی سے استفادے کے زیادہ قائل تھے۔ اس لیے میں نے جامعہ ملیہ کو علی گڑھ اور دیوبند کی درمیانی شکل بتایا ہے۔ لیکن جس طرح آہستہ آہستہ ندوۃ العلماء علی گڑھ سے دور اور دیوبند سے قریب ہوتا گیا، اسی طرح جامعہ ملیہ علی گڑھ کا چربہ بن کر رہ گیا۔ یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدیم و جدید کی آمیزش اس ملک میں مسلمانوں کا عرصے سے مطمح نظر رہا ہے لیکن اس کام میں مکمل کامیابی آج تک نہیں ہوئی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کو کسی جدید تمدن کا مقابلہ درپیش نہیں تھا لیکن ہندوستان کی ہیئت ترکیبی، ہماری تحریک آزادی کے بعض متضاد رجحانات اور تقسیم ملک نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جو ان کے لیے ایک چیلنج کا حکم رکھتی تھی۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے اور اس کے مسایل گوناگوں ہیں۔ ان میں سے بعض مسایل پوری قوم کے لیے مشترک ہیں اور بعض دوسرے مسایل اس کی مختلف اکائیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مسلمان اس ملک کی اقلیت ہیں اور تقسیم ملک نے ان کی تعداد کم کر دی ہے۔ پھر اس تقسیم کے نتیجے میں ایک کشمیر کو چھوڑ کر اور سب ایسی ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں، جہاں ان کی اکثریت تھی۔ ہماری تحریک آزادی ترقی پسند اور رجعت پرست عناصر کا مجموعہ رہی تھی اور اسی لیے حصول آزادی کے بعد ملک کا جو نقشہ بنا اس میں کوئی ایک رنگ ابھر کر نمایاں نہیں ہو سکا۔ تاہم ہمارے قومی رہنماؤں نے ہندوستان کے لیے جو آئین وضع کیا اس کی بنیاد جمہوریت اور سیکولرزم پر رکھی۔ جمہوریت اور سیکولرزم بلاشبہ ملک کی ترقی اور بالخصوص اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ جمہوریت اور سیکولرزم ان کے لیے کچھ مسایل بھی پیدا کرتے ہیں اور ان سے ان کے کچھ مطالبات بھی ہوتے ہیں۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں لوگوں کے ذہن میں ان کا مطلب واضح نہیں ہے بلکہ ہم میں سے ہر ایک ان کی ایسی تعبیر و تشریح کرنا چاہتا ہے جس سے خود اس کا مقصد پورا ہو، حقوق تو حاصل ہوں لیکن ذمہ داری سے جہاں تک بچا جا سکتا ہے بچا جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ جمہوریت اکثریت کی بالادستی کا نام ہے، لیکن اکثریت سے مراد کیا ہے مذہبی اکثریت یا سیاسی اکثریت؟ جب جمہوریت کے ساتھ سیکولرزم کو جوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ مذہبی اکثریت کا سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے اور اکثریت کا تصور سیاسی اور اقتصادی نظریات کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ کھٹکا مدت سے لگا ہوا تھا کہ حصول آزادی کے بعد ہندوستان کی ہندو اکثریت ان پر حاوی آجائے گی جس سے ان کے سیاسی، اقتصادی اور تمدنی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا یہ اندیشہ بالکل بے جا نہیں تھا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اپنے سیاسی اور طبقاتی اغراض کے پیش نظر اسے ان کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ برادران وطن کے ایک طبقے میں جارح قوم پرستی کے جذبات فروغ پا رہے تھے اور وہ اکثریت کی بالادستی کا مطلب مذہبی اکثریت ہی کی بالادستی سمجھتا تھا۔ حصول آزادی کے بعد بھی ہمارے ملک میں سیاسی جماعتیں کبھی ڈھکے چھپے اور کبھی علانیہ مذہب کی بنیاد پر بنتی رہیں اور ملک کی سیاسی و سماجی زندگی [illegible]

رہیں۔ اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ بیشتر سیکولر کہی جانے والی سیاسی جماعتوں کے اندر بھی فرقہ پرست عناصر پرورش پاتے رہے۔ خود مسلمانوں میں اس مسئلہ کو لے کر دو مکتبۂ فکر وجود میں آگئے۔ ایک کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو مشترکہ سیاسی جماعتوں سے وابستہ رہ کر اپنے حقوق کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے اور دوسرے کا اصرار تھا کہ ان کے لیے اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم کے بغیر چارہ نہیں۔

سیکولرزم کی بھی ہمارے ملک میں مختلف انداز میں تعبیر و تشریح کی جاتی رہی ہے لیکن اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا اور وہ مذہب کی بنیاد پر اپنے شہریوں کے درمیان تفریق و امتیاز نہیں کرے گی۔ یہاں سب سے زیادہ دشوار مرحلہ مذہب اور سیاست کے حدود کے تعین کا ہے اور اس سے جڑا ہوا تمدن کا سوال ہے۔ مسلمان اپنے مذہب اور ثقافت سے کسی قیمت پر بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اسی کے ساتھ انھیں ایک سیکولر ریاست کے شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ گویا انہیں جام شریعت اور سندان عشق ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ یہ بات کہہ دینا آسان ہے لیکن اس پر عمل دشوار ہے کیوں کہ جب عملی زندگی میں مختلف مسائل پیش آتے ہیں تو ان کا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک نازک مسئلہ مسلم پرسنل لا کا ہے جو آج کل مختلف حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ہمارے آئین کے رہنما اصولوں میں کہا گیا ہے کہ حکومت ملک میں مشترک سول کوڈ رائج کرنے کی کوشش کرے گی۔ اکثریت کے ایک طبقے کا کہنا ہے کہ جب ریاست مذہب کی بنیاد پر اپنے شہریوں کے درمیان تفریق نہ کرنے کی پابند ہے تو اسے ملک میں مشترک سول کوڈ جلد از جلد لاگو کر دینا چاہیے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا کہنا ہے کہ جس آئین میں مشترک سول کوڈ کی بات کہی گئی ہے اسی آئین نے اپنے شہریوں کو ان کے مذہب اور ثقافت کے تحفظ کی یقین دہانی کی ہے۔ چوں کہ مسلمانوں کے نزدیک پرسنل لا کا تعلق شریعت سے ہے اس لیے وہ اس میں حکومت کی مداخلت کے روادار نہیں ہو سکتے۔ یہاں کئی مسئلے سر اٹھاتے ہیں

پہلا سوال یہ ہے کہ اگر ہم حکومت اور اکثریت سے یہ منوا بھی لیں کہ واقعی یہ خالص مذہبی مسئلہ ہے تو کیا ہم خود اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ ہندوستان میں رائج مسلم پرسنل لا پوری طرح شریعت کے مطابق ہے؟ میرے خیال سے یہ دعویٰ کوئی مشکل ہی سے کر سکتا۔ نتیجتاً ہمیں یہ رویّہ اختیار کرنا ہوگا کہ اس قانون میں ترمیم تو ہونی چاہیے لیکن وہ ترمیم ہم خود کریں گے، نہ کہ حکومت۔ یہاں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس بارے میں ہماری نیت کے خلوص پر اسی وقت اعتماد کیا جا سکے گا جب ہم اس سمت میں عملی اقدام کریں۔ آخر متعدد مسلم مملکتوں میں مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے؟

اوپر عرض کیا گیا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانان ہند کو کسی جدید تمدن کا مقابلہ درپیش نہیں تھا، لیکن یہ بات صرف جزوی طور پر درست ہے۔ تمدن کا تعلق مذہب اور سماج دونوں سے ہوتا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں تمدن کی تشکیل میں مختلف مذہبی، تاریخی، جغرافیائی اور لسانی عوامل کار فرما رہے ہیں اور اسی لیے ہمارے تمدن کے بعض اجزاء مشترک ہونے کے باوجود ہندوستانی وحدت کی مختلف اکائیوں کا تمدن اپنے بعض انفرادی اجزا بھی رکھتا ہے۔ یہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر بھی ہے اور علاقوں کی بنیاد پر بھی۔ خود ایک مذہب کے ماننے والوں کا، جو مختلف علاقوں میں رہتے ہیں، تمدن بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کشمیر اور کیرل کے مسلمانوں کے تمدن میں کئی باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانانِ ہند کے تمدن میں بہت سی باتیں باہم مشترک ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ باتیں ان کا رشتہ بیرونِ ہند کے مسلمانوں سے بھی استوار کرتی ہیں۔ یوں تو تمدن کا ایک عالمی تصور بھی ہے جو مختلف ممالک کے باشندوں کے درمیان مشترک ہے اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ لیکن دنیا کے مسلمانوں کو، جو مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، جو چیز سب سے زیادہ جوڑتی ہے وہ میرے نزدیک اسلام کا تصور توحید اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا تعلق خاطر ہے۔ ان معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمدن کا مذہبی عنصر بہرحال قابل لحاظ ہے اور جب اس عنصر پر کسی طرح سے زد پڑتی ہے تو اس مذہب کے ماننے والوں

یش بالکل بجا ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے اکثریتی فرقے میں بدقسمتی
بعض ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو اپنے تمدن کو دوسروں پر ٹھونسنا
تے ہیں۔ اگر بات اتنی ہی ہوتی تب بھی قابل برداشت تھی لیکن جب
مت بھی بعض ایسی حرکات کی مرتکب ہوتی ہے جن سے اکثریتی فرقے کے تمدن
بالادستی کا اظہار ہوتا ہے تو اقلیتوں کی تشویش بلاشبہ بڑھ جاتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، مسلمانوں کے تمدن کے بعض اجزاء ان کا رشتہ
سرے ممالک کے مسلمانوں سے استوار کرتے ہیں۔ اس رشتے کی استواری
ندر چند مسائل پیدا کرتی ہے۔ ایک طرف خود مسلمان بعض اوقات اس
شتے کے حدود قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور دوسری طرف برادران وطن
کی طرف سے شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب اور
است میں تصادم محض ایک خیالی چیز ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق
یں ہے۔ اگر ہمارے ذہن میں دونوں کے حدود واضح ہوں تو اس
صادم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اخوت اسلامی کا مطلب یہ
رگز نہیں ہے کہ ہم کسی بھی ملک کے مفاد کو، چاہے وہ ملک اسلامی
و یا غیر اسلامی، خود اپنے ملک کے مفاد پر ترجیح دیں۔ ہاں اس
مطلب یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی خوشی سے خوش
ران کی تکلیف اور پریشانی سے رنجیدہ ہوں اور یہ بات صرف
مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ آج عالمی برادری کا تصور ابھر رہا
ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ہر انسان کو دوسرے انسان کے، چاہے
س کا تعلق کسی ملک سے ہو، رنج و خوشی میں نہ صرف شریک ہونا
ہیے بلکہ ایسا [illegible]مات کرنے چاہییں جو پورے عالم انسانیت کے
فلاح و مسرت کا باعث ہوں اور ایسے اقدامات سے باز رہنا
ہیے جو دوسروں کو پریشانی اور مصیبت میں مبتلا کر دیں۔

عرض کیا [illegible] ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانان
ہند کو قیادت [illegible]ستی، عیش کوشی، بے عملی جیسی
ائیوں سے نجات دلانے اور ترقی پسندی، روشن خیالی اور
ت نشانی جیسی اقدار اپنانے کے معاملے میں سب سے زیادہ
سید احمد خاں نے کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی
[illegible] کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے سب سے بڑھ

کہ جس شخصیت کی طرف نظر اٹھتی تھی وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت
تھی۔ وہ دل و دماغ کی ایسی صلاحیتوں سے متصف تھے کہ ان سے
بڑھ کر مسلمانوں کی رہنمائی کا کوئی حق دار نہیں تھا۔ "الہلال"
کے دور ادارت میں اور اس کے بعد تحریک آزادی کے دوران
یہ فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام بھی دے چکے تھے۔ جس طرح
انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانان ہند کی سب سے
بڑی شخصیت سید احمد خاںؒ تھے اسی طرح بیسویں صدی کے نصف
اول میں مولانا آزاد تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ
کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کا موقف یہ بیان کیا تھا
کہ انھیں اپنی اسلامیت اور اپنی ہندوستانی قومیت پر یکساں
فخر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان اپنی تیرہ سو برس کی شاندار
روایتوں سے کسی حالت میں بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی اسلام کی روح انھیں ہندوستان کی متحدہ
قومیت کا ناگزیر عامل (فیکٹر) ہونے سے روکتی نہیں۔ بلکہ
راہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ حصول آزادی کے بعد انھوں
نے دہلی کی شاہجہانی مسجد سے مسلمانوں کو خودداری اور
خوداعتمادی کا درس دیا اور لکھنؤ کے اجتماع میں انھیں
فرقہ وارانہ سیاست سے دست کش ہو جانے کی تلقین کی
جیسا کہ معلوم ہے، سید احمد خاںؒ مسلمانوں میں روشن خیا
اور سائنٹفک نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ گویا موجود
دور کا مسلمانان ہند سے سب سے بڑا تقاضا یہ ہے
کہ ایک طرف وہ اپنی انفرادیت اور تشخص کا تحفظ کر
اور دوسری طرف اپنے اندر روشن خیالی اور سائنٹفک
نقطۂ نظر پیدا کر کے ملک کی قومی
زندگی میں بھرپور
حصہ لیں۔

۔۔۔ویں قسط

خالد بن ولید

قاضی عبدالستار

"میں قباد کا بیٹا — انوشیروان کا بھتیجہ ہوں۔"

عراق میں آباد عربی قبایل میں بولی جانے والی تھوڑی عربی میں
رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔ جملہ پورا ہوتے ہی سیف اللہ نے اسے چونک کر
دیکھا اور آنکھوں میں میدان جنگ کے نقشے گھوم گئے۔

"مجھے شہنشاہ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

"شہنشاہ؟"

"شہنشاہِ ایران۔ کوئی تحریر اس لیے نہیں دی کہ اگر
گرفتار ہو جاتی تو میری جان بھی سلامت نہ رہتی۔"

"تم یہاں — کس طرح پہنچے۔"

"میرا قافلہ قراقر کے لیے اٹھ رہا تھا جب خبرداروں نے
خبر دی کہ آپ دمشق سے سوار ہونے والے ہیں تو میں
تبوک پر آگیا کہ یہاں سے آپ کے گزرنے کا یقین تھا
شہنشاہ نے ستے پر اپنا پرچم کھول دیا اور حکم ہوا کہ
میں آپ کی خدمت میں پیام شاہی پہنچاؤں کہ ایک لاکھ
سپاہی آپ کے حکم کا منتظر گھوڑوں پر سوار کھڑا ہے
جہاں اور جس وقت آپ طلب فرمائیں گے موت کی دیوار
سے راستہ نکال کر آپ کی رکاب میں حاضر ہو جائے گا
اور یہ بھی کہ شہنشاہ نے آپ کو ہر تعظیم اور خدمت سے
مستثنیٰ کر دیا اور یہ بھی کہ پورے عراق کے علاوہ وہ
تمام علاقے جو فارس اور . . . ."

"تم جا سکتے ہو۔"

قباد کا بیٹا سیف اللہ کا منہ دیکھنے لگا۔ ان کے پہلو بدلتے ہی
کھڑا ہو گیا۔

"میری گزارش ہے کہ سیف اللہ میری خطرناک سفارت
صیغۂ راز میں"

"تم پورے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ جا سکتے ہو۔"

ابھی مدینے سے ایک منزل کے فاصلے پر تھے کہ سارا مدینہ
کے کوچ و قیام کے افسانوں سے بھر گیا۔ فیاضی اور سخاوت
سے چھلکنے لگا۔ ذوالقصہ کے اسی میدان میں اترے جہاں
رسول نے رخصت کیا تھا۔ اسی مقام پر خیمہ نصب کرنے کا حکم د[illegible]
کو آنکھوں نے نائبِ رسول کے قدموں سے مشرف پایا تھا۔ شا[illegible]
میں آیا ہوا تانبے کا صندوق کھولا۔ چاندی کی ڈبیہ سے موئے مب[illegible]
کر زیارت کی۔ سیاہ عمامے کی پیت کا پردہ دیا۔ وہ خود نکالا[illegible]
جنگ موتہ کی تلواروں کے گھاؤ تھے۔ اسی طرح کی سفید قبا اور[illegible]
سے آراستہ ہوئے۔ وہی بکتر، وہی جوشن وہی دستانے اور ا[illegible]
کے سرخ موزے پہنے اور اسی طرح کی تلوار ڈال کر حکم دیا کہ وہ[illegible]
گھوڑا حاضر کیا جائے جس پر چڑھ کر سیف اللہ ہوئے تھے۔
مہاجرین و انصار اور قبایل عرب کے مشہور گھرانوں کے تین س[illegible]
کو گھوڑوں پر چڑھایا اور محمدی علم کے سایے کو چھتر سپہ سالا[illegible]
سوار ہوئے۔ باقی لشکر کو کمر کھولنے کا حکم دے کر گھوڑے کو چ[illegible]
راستوں اور گلیوں کے نعروں اور سلاموں کی عقیدت پر [illegible]
ادا کرتے اس مقام پر آ گئے جہاں سے مسجد نبوی کے آثار [illegible]
آنے لگے تھے۔ گھوڑے سے اتر پڑے۔ دروازۂ مبارک [illegible]
بن خالد قریش کے ستاروں کے ساتھ پیشوائی کو حاضر تھا۔ ا[illegible]
کا پہرہ دے کر روضۂ اطہر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دیر کے [illegible]
زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے بازوؤں پر ہاتھ رکھ د[illegible]
کی باہوں سے نکل کر مہاجرین نامی اور انصار گرامی کی عنایتو[illegible]
شفقتوں میں ڈوب گئے۔ ابی سفیانؓ کو ساتھ لے کر باہر نکلے تو د[illegible]
ہو چکی تھی۔ عبدالرحمٰن بن خالدؓ کو کیمپ پر جانے کا حکم دیا اور خ[illegible]
سرائے ابی سفیان میں داخل ہو گئے۔ پانی کا کٹورہ ہاتھ [illegible]
امیر المومنین کا عیسائی غلام حاضر ہو گیا۔

"امیرالمومنین کا خیال تھا کہ آپ روضۂ اطہر کی حاضری
کے بعد۔"

"سنو ۔ مجھے امیر شام نے مطلع کیا تھا کہ امیرالمومنین
کا حکم ہے کہ جس طرح ممکن ہو مجھے مدینہ بھیج دیا جائے ۔
امیر شام کو کسی آزمائش میں مبتلا کیے بغیر میں جوار رحمت
میں موجود ہوں ——— اور سنو
اپنے آقا سے کہنا کہ میں نے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر
خدائے ذوالجلال سے صرف ایک دعا مانگی ہے کہ وہ
اپنے محبوب کے تصدق میں اپنے محبوب کی امت کو اس
وقت سے محفوظ رکھے جب ایک تلوار کو دوسری تلوار
کے سامنے علم ہونا پڑے ۔"

غلام ساکت کھڑا رہا۔ ابی سفیان کا گھر جو قریش کے نام آوروں
کی چھاونی بنا ہوا تھا سناٹے میں آگیا۔ ابھی غلام کھڑا تھا کہ ابی سفیان
کی آواز آئی ۔

"مدینے میں ایک ذوالفقار ہے اور وہ ذات اقدس
جو ذوالفقار پر حاکم تھی، رخصت فرما چکی۔ ذوالفقار
آزاد ہے۔ ایک مدت سے آزاد ہے ۔"

رومی شمعوں کی روشنی میں پورا صحن ایرانی قالینوں سے سجا ہوا
تھا۔ زرد چمڑے کا دسترخوان بچھا تھا۔ سفید کنیزوں کا پورا ایک
پرا خدمت پر مامور تھا اور قریش کے سردار اونٹ کے گوشت کی قاشیں
گھسیٹ رہے تھے کہ آواز آئی ۔

"آدھا مدینہ سیف اللہ کے خیمے کا دیدار کر چکا۔"

"کیا مطلب ؟"

سیف اللہ نے حیرت سے پوچھا۔ ابی سفیان نے جواب دیا۔

"جان عم ۔ عبدالرحمانؓ (بن خالد) نے اپنے حکم سے
وہ تمام جھنڈے اور پرچم جو عرب و عراق و شام میں
آپ کے سامنے سرنگوں ہوئے اسی طرح آراستہ
کر دیے ہیں جس طرح آپ نے یرموک کے میدان میں
کھڑے کیے تھے۔ بلکہ [illegible] اس سے زیادہ شوکت [illegible]

نظر آئی۔ ایک دنیا ہے کہ سیف اللہ کے نام پر مفتون
ہوئی جاتی ہے۔"

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پیشانی کی شکن دیکھ کر فرمایا۔

"آبرومند باپ کے غیور بیٹے جب جوان ہو جاتے ہیں
تو باپ کی عزت اور حرمت کی حفاظت میں شمشیر و سنان
ہو جاتے ہیں۔ میں نے مدینے میں سیف اللہ سے زیادہ
عبدالرحمان (بن خالد) کی ہیبت محسوس کی ۔"

سیف اللہ کی آمد کا سہرہ بلند ہوا تو طایف سے مکہ تک اور بنو تمیم
سے بنو حنیفہ تک عزیزداروں اور قرابت داروں، سرداروں اور
شہسواروں کے قافلے اترنے لگے۔ ذوالقعدہ کا تاریخی میدان ایک
نئی تاریخ کا دیباچہ معلوم ہونے لگا۔ دور دور تک خیموں کا شہر کھڑا
تھا۔ اعرابیوں نے بازار لگا دیا تھا۔ اور غنیمت سے مالدار ہاتھ
منہ مانگی قیمتیں پھینک رہے تھے کہ وہ رات آگئی جس کی صبح کے جلو
میں وہ دن نمودار ہونے والا تھا جس کا مدینے کو انتظار تھا۔ ہر قبیل
کو انتظار تھا۔ عید کی نماز کی طرح اس جمعے کی تیاریاں شام ہی سے
شروع ہو گئی تھیں۔ گھوڑے اور اونٹ سجائے جا رہے تھے۔ زین
اور پالان بدلے جا رہے تھے۔ تلواریں صیقل کی جا رہی تھیں۔ نیزے
چمکائے جا رہے تھے نیام اجلے جا رہے تھے۔ مغفر اور بکتر اور جوشن
اور دستانے اور موزے انتخاب کیے جا رہے تھے۔ عبدالرحمان بن
خالدؓ نے عماموں اور قباؤں اور ازاروں کے ڈھیر لگا دیے تھے کہ
جس کو جس چیز کی ضرورت ہو منتخب کرلے۔ سیکڑوں اونٹوں اور مینڈھوں
کی دعوتِ عام ختم ہو چکی تھی اور لوگ عشاء کی نماز کے لیے اٹھنے لگے تھے
خیام سیف اللہ کے پردے بندھے ہوئے تھے اور دور تک
قالینوں کا فرش تھا جو منتشر ہو گیا تھا کہ عرب کے بڑے بڑے ناموں
کا مجمع حدود سے تجاوز کر گیا تھا۔ قعقاع اور عمرو بن معدیکرب جیسے
نام آور جو آج ہی فارس سے آئے تھے، حاشیوں پر بیٹھے تھے اور
کھری چاندنی میں ہتھیاروں سے جگمگا رہے تھے کہ شاہراہ پر ایک سوار
چمکتا نظر آیا۔ گھوڑے سے اتر کر تیر کی طرح ابوسفیانؓ تک پہنچا۔

"مجلس شوریٰ ابھی تک برپا ہے۔"

عبدالرحمان بن عوف نے اس خبر کو سن کر آسمان کی طرف دیکھا جس
قندیل ڈھلکنے لگی تھی۔
"انشاء اللہ صبح تک برپا رہے گی۔"
ابوسفیان نے اپنی ترشی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ تکیے سے ابھرے
اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولے۔
"قبل اس کے کہ سیف اللہ مدینے سے واپس آئیں
میں تمہارے سامنے اپنا کلیجہ کھول کر رکھ دینا چاہتا
ہوں۔"
سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ہمہ تن گوش ہو گئے۔
"اے معشر قریش ــــ مہاجرین اور انصار نے اپنی
مرضی سے خلیفۂ اول کا انتخاب کر لیا۔ خلیفہ دوم کو ان
کا جانشین نامزد کر دیا، ہم نے تسلیم کر لیا۔ ہم خاموش
رہے کہ قبولیت اسلام کی اولیت ان کے حق میں تھی
اور ہم اس حق سے محروم تھے۔ زبیرؓ اور عبدالرحمانؓ
مدینے میں نظر بند کر دیے گئے، ہم خاموش رہے کہ
اجماع امت کا تحفظ ان کے حقوق سے بلند تھا۔ ان کو
جہاد تک سے محروم کر دیا گیا ہم خاموش رہے کہ یہ
خلافت کا فیصلہ ہے۔ خلیفۂ اکبر کے حکم نامے کو چاک
کر کے یرموک کے میدان کارزار میں سیف اللہ کو
صدر سپہ سالاری سے معزول کیا گیا ہم خاموش رہے
کہ خلیفۂ وقت کی سیاست کا اظہار ہے ــ لیکن
سیف اللہ کی یہ توہین آمیز معزولی اگر ایک طرف
ارشاد رسالت کی نافرمانی ہے، خلافت کبریٰ کی حکم عدولی
ہے تو دوسری طرف ایسی آمرانہ اور قاہرانہ مثال سے ایران و
روم کی شہنشاہوں کی تاریخ بھی خالی ہے۔ نہ صرف
یہ بلکہ اگر تم نے آج یہ جبر برداشت کر لیا تو اسلام کی
جمہوری حکومت فارس و روم کی شہنشاہی میں تبدیل
ہو جائے گی اور تصور کرو کہ عمر بن خطاب جیسے بدمزاج
تندخو اور سخت گیر آمر کی شہنشاہی میں تمہاری حیثیت
کیا ہو گی۔
اس وقت اسلامی دنیا کی عسکری صورت حال
یہ ہے کہ اسلامی لشکر کا کمزور بازو سیکڑوں کوس کے
فاصلے پر فارس کے قلب میں دھنسا پڑا ہے۔ یزدگرد
کے پاس ابھی تلواریں موجود ہیں اور گھوڑے سلامت
ہیں۔ دوسرا طاقتور بازو شام میں موجود ہے۔ یزید
بن ابوسفیانؓ اور عمرو بن العاصؓ کے طاقتور ہاتھوں
میں محفوظ ہے اور خود مدینے کا راز تم پر فاش ہے
مشکل سے ہزار تلوار ہو گی جو خلافت اپنے حکم پر بے نیام
کر سکتی ہے، چوں کہ سیف اللہ کے ساتھ جو سلوک
کیا گیا وہ مجلس شوریٰ کی منظوری کے بغیر عمل پذیر ہوا
اس لیے یقین کیا جا سکتا ہے کہ خاندان نبوت اور بنو ہاشم
اور بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب رسول اللہ خلیفۂ
وقت کے احکام کی پابندی پر مجبور نہیں ہو سکتے۔
اس لیے اگر میرے مشورے پر عمل کرو تو فرمان رسالت
اور احکام خلافت اوّل کی حفاظت کو اپنا چھلا بنا لو
اور تلواریں ٹیک کر کھڑے ہو جاؤ ــ مجھے نہیں معلوم کہ
مسجد نبوی میں سیف اللہ کے خطبۂ خلافت پر کون
تلوار کھینچ کر کھڑا ہو سکتا ہے۔"
ابوسفیانؓ کے خاموش ہوتے ہی قبیلۂ خزرج کا سردار کھڑا ہو گیا
"اے امیر قریش! ہم نے دنیا کی بڑی بڑی تلواروں کا
مزہ چکھا ہے۔ خدا کی قسم سیف اللہ کے سوا کوئی تلوار
نہیں جو ہم کو خوف دلا سکتی ہو۔ لیکن اس کا خیال
رکھو کہ کہیں بنو ہاشم اور بنو امیۃ کے نیزے تیرے
خلاف نہ کھڑے ہو جائیں۔"
حضرت زبیرؓ نے اس کا دامن پکڑ کر کھینچ لیا۔
"اے خزرج کے سردار ــــ بیٹھ جا۔"
بنو ہاشم کے پاس ایک تلوار ہے جو تلوار نہیں تلواروں
کی تلوار ہے۔ ذوالفقار ہے اور میں اسے نیام میں رکھنے

کی ضمانت دے چکا۔ رہ گئے بنی امیہ تو اُن کے خاندانی اختلافات اپنی جگہ پر مسلم لیکن ابی سفیان کے منہ پر نیزہ کھینچ کر کون کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر اے سردار بنی ہاشم۔ مشورت کا جلسہ برخاست کر اور گھوڑے پر سوار ہو جا کہ رات اپنی انتہا سے گذر چکی۔"

"تو نے سچ کہا۔ رات اپنی انتہا سے گزر چکی۔ تھوڑا اور انتظار کر۔ مینارۂ نور طلوع ہونے والا ہے۔ سیف اللہ پہنچنے والا ہے۔"

یان نے سلسلۂ کلام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

" گھوڑے پر تو ہم تجھ سے پہلے سوار ہو جائیں۔ لیکن سارے معاملات کا دار و مدار سیف اللہ پر ہے اور سیف اللہ ابھی تک ہمارے قابو سے باہر ہیں۔

"جب طیلسان خلافت شانوں پر ڈال دی جائے گی اور منبر خلافت پر کھڑا کر دیا جائے گا تو خطبۂ خلافت پڑھنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

بدالرحمان بن عوفؓ کھڑے ہو گئے۔

" اے سردار تو نے خالدؓ کو میدان جنگ میں لشکروں کو زیر و زبر کرتے دیکھا ہے۔ لیکن تو خالد کو نہیں جانتا خالدؓ وہ شخص ہے کہ خطبۂ خلافت دینے کھڑا ہو تو سب سے پہلے خود ہماری مشکیں کسنے کا حکم دے ڈالے اور طیلسان خلافت اتار کر ہمارے منہ پر دے مارے۔"

بھی یہ گفتگو جاری تھی کہ زیاد بن ابی سفیانؓ نے سیف اللہ کی آمد کا ر دیا۔ ساری محفل تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی کہ سیف اللہ رت زبیرؓ اور عبدالرحمان بن عوفؓ اور ابی سفیانؓ چند دوسرے لر کے ساتھ خیمے کے اندرونی درجے میں گفتگو کر رہے تھے اور رحمان بن خالدؓ کے غلام حاضرین کی میزبانی کر رہے تھے۔ پھر ابی سفیانؓ ہے۔

"اے برادران ملت! اے نامورانِ امت سپہ سالار اسلام کا قول ہے کہ اتمام حجت سے پہلے کوئی قدم اٹھانا نفی ایمانی

کے خلاف ہے۔ ہم کو جمعے کے خطبے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی کسی اقدام۔"

سردارانِ ازد اور خزرج سب سے پہلے کھڑے ہو گئے اور گرجے۔

"ہم کو امید ہے کہ بنی مخزوم کا آفتاب اقبال کسی خوف کے بادل میں غروب نہیں ہو سکتا۔"

حضرت زبیرؓ نے تندی سے جواب دیا۔

اے سردار تو نے یہ کیا کہہ دیا۔ خالدؓ کی ذات قبائل کی تقسیم سے بالاتر ہے۔ وہ بنی مخزوم کا نہیں بنی حجاز کا آفتاب ہے۔ فرزندان اسلام کا اقبال ہے۔ دنیا نے کوئی خوف ایسا پیدا نہیں کیا جو خالد پر اپنا منحوس سایہ ڈال سکے۔"

لوگ اُٹھنے لگے۔ بڑے بڑے لوگ اُٹھ گئے۔ ہتھیاروں اور گھوڑوں اور اونٹوں کی آہٹیں تک سماعت سے دور ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ خلوت ہو گئی جس کے بطن سے سیف اللہ نے مہمات عظمیٰ کے منصوبے اور بڑی بڑی تاریخ ساز لڑائیوں کے نقشے پیدا کیے تھے۔ وہ تخت پر تکیے سے لگے نیم دراز تھے۔ سامنے رومی شمع کی روشنی میں سرخ پردے پر نگاہیں جمی تھیں۔ پھر جیسے تصویریں سی پیدا ہونے لگیں۔ تصویریں حرکت کرنے لگیں یہ تو قصر خلافت تھا۔ وہی قصر خلافت جس کی دہلیز پر اس نے ایک دنیا کی بڑی بڑی مغرور طاقتوں کے جھنڈے فتح کر کے گھوڑے کی دم میں باندھ کر ڈال دیے تھے؟ اسی قصر خلافت کے سامنے عمر بن خطابؓ بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب رسول اللہ کے ساتھ تلواریں کھینچ کر نکل آئے تھے۔ آستینیں چڑھی ہوئی۔ داڑھیاں دانتوں میں دبی ہوئی تلواروں سے بجلیاں برستی ہوئی لیکن ایک یلغار میں، وہ یلغار جس کے سامنے نوّے نوّے ہزار کی تربیت یافتہ پیشہ ور فوجیں بے دست و پا ہو گئیں، اس ایک یلغار میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ اسم ہائے معظم جو آقائے دو جہاں کے اعتبار سے غنی تھے جو شریعت اور طریقت کے ستون اعظم تھے۔ جو توحید اور رسالت کے مبلغان اکبر تھے۔ اس کی تلواروں کی مار سے ڈھیر ہو کر گر پڑے تھے۔ وہ سینے جو کلام الٰہی کے محافظ تھے۔ مسجد نبوی کے دروازے پر گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے جا رہے تھے وہ جسم ہائے اقدس جن

سے دوزخ کی آنچ پناہ مانگتی تھی، لوہے کی پیٹوں سے خاکستر ہو رہے تھے اور ان کے درمیان سے اشقر گزر رہا تھا۔ مسجد نبوی کے سامنے گھوڑے سے اترا تو محمدی علم کے پھریرے سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے اور اس کی داڑھی خون سے بھیگ گئی۔ آستین کے رومال سے داڑھی پاک کی۔ علم زمین پر گاڑ دیا تو ایسی چیخ بلند ہوئی کہ وہ ڈر گیا جس سے دنیا ڈرتی تھی، وہ ڈر گیا جس کی تلوار کا قبضہ موت کا آشیانہ تھا وہ ڈر گیا۔ زخموں سے چور کسی صحابیِ رسول نے فریاد کی۔

"شمشیر الٰہی کی مار سے دینِ اسلام چیخ اٹھا۔"

"امت کا مستقبل لہو لہان ہو گیا۔"

"ملت کی تنظیم ذبح ہو گئی۔"

وہ آہستہ آہستہ مسجد نبوی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بھری ہوئی مسجد نے اس کی پیشوائی کی۔ وہ منبر خلافت پر کھڑا ہوا تو جیسے کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نرم نورانی معطر ہاتھ جس کے لمس کی لذت اور رحمت ہڈیوں کے مغز تک اتر گئی۔ پھر آواز آئی۔

"خالد"

"خالد بن ولید — سیف اللہ — شیر اسلام علمدار محمدؐ، سپہ سالارِ اعظم۔ ہم نے یہ بے نظیر خطابات جن کی گونج کے سامنے صور اسرافیل بھی حقیر ہے، اسی دن کے لیے عطا کیے تھے؟ یہ جلال و اقبال جس کی ہیبت قیامت تک قایم رہے گی اسی دن کے لیے بخشا گیا تھا؟ تو اسی دن کے لیے پیدا ہوا تھا۔"

اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں۔ دیر کے بعد جب آنکھ کھولنے کی ہمت پیدا ہوئی تو ایک دوسرا ہولناک منظر کھلا پڑا تھا۔ بازنطینی پرچموں کی طاغوتی اڑانوں کے سامنے پورا مدینہ بے دست و پا تھا۔ گلیوں میں رومی سوار گشت کر رہے تھے اور دروازوں میں سولیاں کھڑی تھیں اور مسجد نبوی کے سامنے درفش کاویانی کے سایے میں یزدجرد کھڑا تھا اور ایرانی گھوڑے عربوں کی لاشوں پر سے گزر رہے تھے۔ کہیں سے آواز آئی۔

"یہ انجام ہے"

"منطقی انجام"

تو خلافت پر اس طرح سوار ہو سکتا ہے جس طرح اشقر پر سوار ہوتا ہے تیری زندگی تک ہرقل اور یزدجرد دونوں تیرے نام سے کانپتے رہیں گے۔ لیکن جب تو مرے گا اور تیرا جانشین کسی دوسرے خالدؓ کے ہاتھوں معزول ہو گا، اور جو تجھ جیسا نہیں ہو گا اور اس کا جانشین تیسرے خالد کے ہاتھوں معزول ہو گا جو اس جیسا بھی نہیں ہو گا تو امت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ملت کی تنظیم کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ تب تیری بے مثال فتوحات کا ان بے گناہوں سے انتقام لیا جائے گا، جبار رحمت سے انتقام لیا جائے گا۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پوری زندگی میں پہلی بار خوف سے ملاقات ہوئی۔ خوف اتنا قریب آ گیا کہ اس کی ٹھنڈک سے ہڈیاں جمنے لگیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیمے کے دوسرے درجے میں آ گیا رومی قالینوں کے فرش سے ایک دیوار پر نگاہ اٹھ گئی تو دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن خالدؓ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور وہ دوزانو بیٹھا ہوا ہے اور ویران آنکھیں اسے ڈھونڈھ رہی ہیں۔ پھر عمر بن خطابؓ کے ہاتھ کی ایک جنبش پر ایک حبشی نے اس کی آنکھوں کے سامنے عبدالرحمٰن بن خالدؓ کی گردن اڑا دی۔ وہ تڑپ گیا کہ خون کی چھینٹوں سے تمام دامن بھیگ گیا تھا۔ وہ دامن دیکھ رہا تھا کہ آواز آئی۔

"اے ابراہیم کے فرزند"

تیرے اسماعیل کی قربانی قبول ہوئی۔"

"مقبول ہوئی"

وہ اسی آواز کے انتظار میں کان لگائے کھڑا تھا کہ فجر کی اذان بلند ہونے لگی۔

—(جاری ہے)—

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے شہرت اور نمائش کا لباس زیب تن کیا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔"

…دآباد میں پانچ سال میں کیا ہوا؟

احمد رشید شیروانی

مرادآباد شہر کے چار مسلم اداروں کے ہائی اسکول بورڈ امتحان
۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۶ء کے اعداد چارٹ میں درج ہیں جن سے یہ دیکھا
تا ہے کہ پچھلے پانچ سال میں ان اداروں میں ہائی اسکول بورڈ امتحان
لے پر مسلم بچوں کی تعلیم کو کتنا فروغ ہوا۔ ان میں سے تین اداروں سے
سلم بچے بورڈ امتحان میں شریک ہوئے۔ ایک ادارے (انصار کالج)
یک غیر مسلم طالب علم بھی شریک ہوا۔ مگر ہم نے چارٹ میں صرف مسلم بچوں
نتائج لیے ہیں۔

ہاں تو کیا ہوا؟ ان چاروں سے ملا کر ۱۹۸۱ء میں تین سو چوبیس (۳۲۴)
ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے اور ایک سو چوراسی
ستاون فیصد پاس ہوئے تھے۔ سات عدد یعنی دو فیصد فرسٹ
ڈویژن لائے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں چار سو تہتر شریک ہوئے۔ تین سو بائیس (۳۲۲)
یعنی اڑسٹھ فیصد پاس ہوئے اور چھبیس عدد یعنی پانچ فیصد فرسٹ
ڈویژن لائے۔ شریک ہونے والوں کی تعداد میں ایک سو انچاس عدد کا
اضافہ ہوا جو چھیالیس فیصد ہے۔ یعنی پانچ سال میں تعداد قریب ڈیڑھ گنی
ہو گئی۔ پاس ہونے والوں کی تعداد میں ایک سو اڑتیس عدد کا اضافہ ہوا
جو پچھتر فیصد ہے۔ یعنی پاس ہونے والوں کی تعداد پونے دوگنی ہو گئی۔ فرسٹ
ڈویژن لانے والوں کی تعداد سات سے بڑھ کر چھبیس ہو گئی۔ یعنی پونے
چار گنی۔

جہاں مسلمان اپنے اداروں میں معیار تعلیم بلند تر کر کے بورڈ امتحان
کے نتائج بہتر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہاں اللہ کے فضل و کرم
سے ان کو کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ مرادآباد شہر کے ان مسلم اداروں
سے وابستہ تمام بھائیوں اور بہنوں کو ہم دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں
مرادآباد کے مسلم اداروں میں ماحول بہتر بنانے میں وہاں کی مسلم تعلیمی
کمیٹی نے بھی بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے عہدیداران اور کارکنوں
کو بھی ہم دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

مرادآباد شہر کے چار اسکولوں میں کتنا اضافہ؟

شریک امتحان ۱۹۸۱ء	شریک امتحان ۱۹۸۶ء	تعداد پاس ۱۹۸۱ء	تعداد پاس ۱۹۸۶ء	فرسٹ ڈویژن ۱۹۸۱ء	فرسٹ ڈویژن ۱۹۸۶ء	ادارہ کا نام	پاس فیصد ۱۹۸۱ء	پاس فیصد ۱۹۸۶ء
۵۶	۶۸	۳۶	۴۱	۴	۵	فلاح دارین اسکول	چونسٹھ	ساٹھ
۲۴	۶۵	۱۲	۴۵	—	—	عباس اسکول	پچاس	انہتر
۸۹	۹۹	۳۶	۴۹	۱	۱	انصار اسکول	چالیس	پچاس
۱۶۹	۲۳۲	۸۴	۱۳۵	۵	۶	تین بوائز اداروں میں	پچاس	اٹھاون
۱۵۵	۲۴۱	۱۰۰	۱۸۶	۲	۲۰	عبدالسلام مسلم گرلز کالج	پینسٹھ	اٹھہتر
۳۲۴	۴۷۳	۱۸۴	۳۲۲	۷	۲۶	چاروں کا ٹوٹل	ستاون	اڑسٹھ
ڈیڑھ گنی		پونے دوگنی		پونے چار گنی		تعداد بڑھ کر کتنے گنی ہو گئی۔		

جواب دوست

کوچہ ہائے رسوائی ۵۶۔ ۱۹۴۷ء

نسیم انصاری

کلکتہ میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہوا تھا۔ ہندوستان بلکہ ایشیا کا سب سے پرانا میڈیکل کالج تھا۔ پہلے دن کلاس جانا ہوا تو جو بات علی گڑھ سے بالکل مختلف دیکھی وہ یہ تھی کہ جب استاد لکچر ہال میں داخل ہوئے تو کوئی کھڑا نہیں ہوا بلکہ سب نے ڈسک تھپتھپا کے پروفیسر کا استقبال کیا۔ وہ ایک وجیہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے اور سفید سلک کا کوٹ پہنتے تھے۔ ان کے پیچھے کی دیوار پر ان ہندوستانی لڑکوں کے نام لکھے تھے جنھوں نے ۱۸۳۶ء میں پہلی دفعہ انسانی بدن کا ڈسکشن کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب ان طالب علموں نے ڈسکشن شروع کیا تو فورٹ ولیم سے توپوں کی سلامی دی گئی۔ بہت بعد کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں ڈسکشن کا رواج زمانۂ قدیم میں بھی تھا اور سشرت نے اپنی سشرت سمہتا میں انسانی جسموں کو ڈسکشن کے لیے تیار کرنے کے بارے میں تفصیلی ہدایتیں دی تھیں۔

سشرت سمہتا سرجری کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ اصل سنسکرت نظم کی صورت میں ہے۔ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ دیکھا ہے۔ سشرت کے زمانے کا یقین کے ساتھ تعین نہیں کیا جاسکتا غالباً کتاب موجودہ شکل میں آٹھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا زمانۂ تالیف آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ بہرحال پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ کس قسم کی سرجری کرتے تھے۔ پلاسٹک سرجری سے چہرے کے عیوب ٹھیک کرنے کے بہت سے طریقے ایسے درج ہیں کہ تقریباً اسی طرح آ[ج] بھی یہ عمل ہوتا ہے۔ ویسے جس زمانے میں یہ علم ہندوستان میں [...] ہوا ہوگا اس زمانے میں جادو اور طب وجراحت میں کوئی حد فا[صل] نہیں تھی۔ اور دھونتری کو طب کا دیوتا مانا گیا ہے جیسے یونان [میں] اپولو کو۔

پڑھائی اسی ہال میں شروع ہوئی جس میں ایک سو دس بر[س] پہلے انگریزی میں طب جدید کی تعلیم شروع ہوئی تھی۔ لکچر بہت دلچ[سپ] تھا، لیکن لکچر کے بعد لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بنگالی میں باتیں کرنے لگے جو میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ اس روز مجھے پہلی دفعہ کا[لج] میں تنہائی کا ایسا احساس ہوا کہ دل بھر آیا۔ یا اللہ! یہ پا[نچ] سال کیسے کٹیں گے، لیکن بہت جلد کلاس کے لڑکے اور لڑکیو[ں] سے میری دوستی ہوگئی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونی[ورسٹی] کا ایک غیر بنگالی مسلمان طالب علم بھی کمیونسٹ ہے تو وہ بہت تعج[ب] سے مجھے دیکھنے کے لیے آئے۔ رفتہ رفتہ میں ان سے اور وہ مجھ سے مانوس ہوگئے اور میں بہت جلد بنگلہ سمجھنے لگا اور تھوڑے د[نوں] میں بولنے بھی لگا۔

داخلہ کے تقریباً ایک مہینہ کے بعد تازہ واردان کالج کے لیے ایک تقریب ہوئی جس میں ہمارے استقبال کے لیے پرانے لڑ[کوں] اور لڑکیوں نے ایک گانا گایا جو اس طرح شروع ہوتا تھا۔

آج بھی ایلو نوجوان، نوجوان۔

یعنی آج شاید نوجوان ہماری محفل میں آئے ہیں۔ میں کیا بتاؤ[ں] کیسی دلکشی تھی ان کی آواز میں۔ آج تک اس نغمہ کی تانیں دل میں چٹکیاں لیتی ہیں۔

اس رات کے بعد جیسے کسی نے یہ بات دل میں بٹھا دی کہ ا[ب] کلکتہ نہیں چھوٹے گا۔

رہنے کے لیے جگہ رینج ہوسٹل میں ملی جو کالج سے متصل ا[یک] چار منزلہ عمارت تھی، میرا کمرہ تیسری منزل پر تھا اور جب شام سمندر کی طرف سے ہوائیں آتی تھیں تو جیسے دل کی محفل میں ہلچل سی مچ جاتی تھی، بے اختیار زبان سے نکل جاتا

پگلا ہوا بادل دستے، پاگل ہوا رموں بھیگے اُٹھے؟

یعنی اے پاگل ہوا، ایسی برسات میں کیوں میرے دل کو اور دیوانہ بنا رہی ہے۔

ہائے اس کافر دل میں کیسی کیسی امنگیں تھیں۔ وطن کو ابھی ابھی آزادی ملی تھی۔ پیارے وطن کو اپنے ہاتھ سے سنوارنے کے کیسے کیسے ارمان تھے۔ جلدی سے پڑھائی ختم کر کے نیو تھیٹرس کے کسی ہیرو کی طرح ایک چھوٹے سے شہر میں جا کر زخمیوں کی مرہم پٹی کریں گے، دکھی دلوں کو تسلی دیں گے، نوجوانوں کے ساتھ مل کر پیار کے ایسے گیت گائیں گے کہ ابھی حال میں ہوئی تلخیاں فراموش ہو جائیں گی اور بھی بہت کچھ تھا اس دل میں۔

ہونے کو تو اس میں سے بہت کچھ ہوا لیکن شاید اس طرح نہیں جس طرح سوچا تھا۔

پڑھائی جاری رکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ میری سیاست سے دلچسپی تھی، میں کلکتہ کے طالب علموں کی سیاست میں جیسے کھو سا گیا۔ میں نے اوپر کہیں لکھا ہے کہ علی گڑھ کے اسکول والوں نے جی بھر کے مجھے تباہ کرنے کی کوشش کی، جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ میڈیکل کالج والوں نے پوری کر دی۔ جس سال میرا کالج میں داخلہ ہوا اسی سال ان لوگوں نے مجھے اسٹوڈنٹس یونین کی ایگزیکیوٹو کمیٹی کا ممبر منتخب کر لیا اور اگلے سال اسسٹنٹ جنرل سکریٹری، وہ مجھے اپنی ناچ گانے کی محفلوں میں لے جاتے اور سیاسی جلسوں میں مجھ سے تقریر کرنے کو کہتے، انگریزی میں تقریر کرنے کی مشق مجھے کلکتہ ہی میں ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ علمی مباحثے بھی ہوئے جن میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتیں۔

میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا سامان انیسویں صدی کلکتہ کی داستانیں تھیں۔ راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین، مائیکل مدھوسدن دت، ودیا ساگر، بنکم چٹرجی اور ٹیگور خاندان کے دانشور، مصور، ادیب، شاعر، موسیقار، رقاص اداکار۔ غرض ہندوستانی تہذیب کا ایک نیا روپ سامنے آتا تھا۔ میں اس میں کچھ ایسا کھو گیا کہ کئی کئی دن گزر جاتے اور

اردو فارسی کا ایک شعر بھی زبان پر نہیں آتا تھا۔ آہستہ آہستہ پڑھائی سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ یہ عجیب بات تھی کیوں کہ بچپن سے ڈاکٹری پڑھنے کی زبردست خواہش تھی اور اب جب موقع ملا تھا تو طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی تھی، کلکتہ کی دلفریبیوں نے جیسے آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہوں۔

اسی سال دسمبر میں بمبئی میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس ہوا۔ شرکت کے لیے ہم سب ایک اسپیشل ٹرین سے بمبئی گئے۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی کے پالٹ بیورو کے ممبر بی ٹی رندیوے نے ہم لوگوں سے خطاب کیا اور کمیونسٹ پارٹی کی ایک بالکل نئی پالیسی پیش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگست ۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کو آزادی نہیں ملی ہے بلکہ ہندوستانی اور برطانوی سرمایہ داروں میں ایک سمجھوتہ ہوا ہے جس کے نتیجہ میں انگریزی سامراج ایک نئے طریقہ پر ہندوستانیوں کا استحصال کر رہا ہے اسی سازش کے نتیجے میں دنگے ہوئے اور ملک کا بٹوارہ ہو گیا، ایسی حالت میں ہندوستان کے کمیونسٹوں کا فرض ہے کہ وہ اس سازش کو بے نقاب کر کے عوام کو انقلابی جدوجہد کے لیے تیار کریں۔ انقلاب کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا ہے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں نے سرمایہ داری کا جوا اتار کر پھینک دیا ہے اور ایشیا کی انقلابی لہر میں چین، انڈوچائنا اور انڈونیشیا سب جگہ لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ اب ہندوستان کو بھی اس لڑائی میں شریک ہونا ہے۔

ہم نوجوانوں کے لیے یہ شراب بہت تند اور تیز تھی بمبئی سے آ کر انقلاب کی تیاریاں کی
[illegible]
سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا گیا اسی سال فروری میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس کلکتہ کے محمد علی پارک میں ہوئی۔ یہ پہلے ہالیڈے پارک کہلاتا تھا جہاں تقریر کرنے کی بنا پر والد مرحوم کو ۱۹۲۰ء میں سال بھر قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ہم لوگ بھی اس کانگریس میں والنٹیر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر اشرف بھی آئے تھے۔ ان کی طبیعت خراب

تھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق علی گڑھ سے بھی رہا ہے تو
انھوں نے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ اب ارادہ
ہے کہ میڈیکل کالج کی پڑھائی چھوڑ کر پوری طرح سیاسی کاموں
میں لگ جاؤں۔ بگڑ کر بولے تو کیا پھر نان کو آپریشن شروع
کرنے کا ارادہ ہے؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن ان کی سرزنش
کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

مارچ ۴۹ء میں آل انڈیا ریلوے اسٹرائک کا نعرہ
دیا گیا۔

۹ر مارچ کو کیا ہوگا
ریل کا پہیہ بند ہوگا

ہم لوگوں سے کہا گیا کہ شاید اسٹرائک انقلابی مظاہرے کی
شکل اختیار کرے۔ اگر ایسا ہوا تو سب کو مسلح اقدام کے لیے تیار
ہونا پڑے گا۔ چنانچہ تیاریاں شروع ہوگئیں۔

تیاری کے سلسلے میں ہم میں سے بہت سے لوگ روپوش
ہوگئے۔ میرے لیے یہ روپوشی عجیب طرح کی تھی، ایک طرف تو مجھے
گوریلا لڑائی کے طریقے سکھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف
مزدوروں کے جلسوں میں تقریر کے لیے بھی کہا جاتا تھا۔ لڑائی
کے طریقوں میں سب سے اہم ٹریننگ نہتے ہو کر مسلح دشمن سے مقابلہ
کرنے کی تھی۔ اس میں مجھے بہت جلد مہارت حاصل ہوگئی۔

اسٹرائک سے چند روز پہلے کلکتہ کے میدان
میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ میں نے اس سے اردو میں خطاب
کیا، کیوں کہ کلکتہ کے زیادہ تر مزدور غیر بنگالی تھے اور بنگالی
مزدور بھی اردو سمجھ لیتے تھے۔ اس تقریر سے مزدوروں میں
بہت جوش پیدا ہوا۔ اس لیے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ مجھے عنقریب
گرفتار کر لیا جائے گا۔ مجھے حکم ملا کہ میں بالکل روپوش ہو جاؤں۔

لیکن ۹ر مارچ کو اسٹرائک فیل ہوگئی۔ اتنے بڑے
پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں کہ اسٹرائک کی لیڈرشپ بالکل بے دست و پا
ہوگئی۔ مسلح بغاوت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کمیونسٹ پارٹی کی نئی
پالیسی کا یہ گویا پہلا امتحان تھا اور اس میں پارٹی کی پالیسی
ناکامیاب رہی۔

ہم لوگوں کا جوش لیکن ختم نہیں ہوا، تھوڑے د
کے بعد خبر آئی کہ کینٹن پر چینی کمیونسٹوں فوج کا قبضہ ہو گیا ہے
اس کی خوشی میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہم لوگو
نے ایک جلوس نکالا۔ پولس نے جلوس کو روکنے کی کوشش کی
لوگوں نے اس کوشش کو ناکام بنانا چاہا۔ پولس نے طاقت آ
کی اور ہم لوگوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ ایک طرف پولس ک
تھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر طالب علم۔ بیچ میں ٹرام گاڑیاں
تھیں۔ پولس نے گولی چلائی۔ ہم لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ جو دستہ
کمان میں تھا میں اسے لے کر پریسیڈنسی کالج میں آگیا۔ پولس
کپتان نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے سپاہیوں کو میری طرف اشا
کرکے گولی چلانے کا حکم دیا۔ میں ایک کھمبے کی آڑ میں ہو گ
گولیاں میرے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ اتنے میں
سے آواز آئی "کامریڈ نسیم! آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آ
سے ہٹ آئیں۔" چنانچہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میں چلا آ
دیر کے بعد چاروں طرف سے پولس پریسیڈنسی کالج میں گ
وہ لوگ شاید مجھے تلاش کر رہے تھے لیکن میں ان کی زد سے د
جا چکا تھا۔

پولس سے یہ آنکھ مچولی بہت دن نہیں چلی، ایک روز
ہوسٹل سے نکل رہا تھا کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا اور قریب
ہوئی ایک گاڑی میں بٹھا کر لال بازار کے تھانے لے گئے۔ دو
روز مجھے سیالدہ اسٹیشن سے مرشد آباد لے جایا گیا
مغربی بنگال کے گورنر کا ایک حکم نامہ دیا گیا جس کے تحت مجھے
ثانی برہام پور جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ وہی جیل تھی
اٹھائیس برس پہلے میرے والد قید کیے گئے تھے۔ ان
جیل میں قاضی نذر الاسلام بھی تھے۔ انھوں نے قاضی
کو غزل کی نوعیت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد نذرالاسلام
بنگالی میں بہت سی غزلیں کہیں۔

جیل میں نظر بندوں کے ساتھ بہت

۔ رہنے کے لیے کشادہ اور ہوادار کمرے، خدمت کے لیے
ر (جو جیل کے عام قیدیوں میں سے تھے) پڑھنے کے لیے
اخبار اور اپنی پسند کی جو کتابیں جی چاہے ایک خاص
، اندر اُن کو خریدنے کا انتظام، سب سے بڑی بات تو
ط لکھنے کی سہولتیں بھی تھیں اور ملاقات کی بھی۔ میرے
یکڑوں میل کا سفر کر کے مجھ سے ملنے تشریف لائے۔
پہلے تین چار دن تو میں خوب سویا۔ مہینوں کی تھکن جو تھی،
بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے گفتگو شروع کی، معلوم ہوا
جیل میں ہم سب بیس اکیس آدمی ہیں۔ میں عمر میں سب سے
تھا۔ ساتھیوں میں کچھ وکیل، کچھ اسکول کے ماسٹر، دو
ستانی بحری بیڑے کے افسر، دو طالب علم اور چار پانچ
لیڈر تھے۔ جیل کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور مجھے اس کا لیڈر
سکریٹری منتخب کیا گیا۔ صبح کو ناشتے کے بعد پڑھائی ہوتی۔ پڑھانے
میرے سپرد تھا۔ میں انھیں مارکسٹ فلسفہ، اقتصادیات
یاست کی تعلیم دیتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ میں تھوڑی دیر انگریزی
لتا اور میرے ایک ساتھی ہر دھن سنیاسی میرے کہے ہوئے کو
میں دہراتے تھے۔ جب تک میں جیل میں رہا، سبق کا یہ سلسلہ
رہا۔ مجھے بھی اس میں بہت لطف آنے لگا۔ سبق تیار کرنے
گھنٹے لگتے۔ چوں کہ ضرورت کی سب کتابیں تھیں، اس لیے کسی
ی مشکل نہیں ہوتی تھی۔

تھوڑے دنوں کے بعد جیل کی زندگی مجھے کھلنے لگی،
نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا ان کی بھی رائے تھی کہ میں جیل
باہر رہ کر زیادہ مفید کام کر سکتا ہوں۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ
یل سے فرار ہو جاؤں۔ فرار ہونے کی ترکیب یہ کی گئی کہ میں جیل
ربابِ حل و عقد سے کہوں کہ مجھے بر ہام پور کی مرطوب آب و ہوا
فق نہیں آ رہی ہے، اس لیے مجھے کلکتہ بھیج دیا جائے۔ اسی قسم کی
رخواست میرے ساتھی پرشانیو گی نے بھی کی، یہ لیفٹیننٹ
زادی سے قبل ہندوستانی بحری بیڑے کے ایک افسر تھے۔ طے
پا کر سیالدہ اسٹیشن پہنچ کر اگر موقع ملے تو پرشانیو گی کسی طرح

پولس کو اپنی طرف متوجہ کریں اور راستے میں میں راہ فرار اختیار کروں۔
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم لوگ چھ مسلح سپاہیوں کی حراست میں ریل
کے ذریعے سیالدہ اسٹیشن لائے گئے اور وہاں سے میں غائب
ہو گیا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تو میں کلکتہ میں روپوش رہا۔ پھر مجھے
سیاسی کام کرنے سرحد پار ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ ڈھاکہ میں بھی میں
روپوش رہا اور اس کوشش میں رہا کہ وہاں اسٹوڈنٹس فیڈریشن
کی طرح کی کوئی تنظیم بن جائے۔ میرے ساتھی بار بار آ کر یہ کہتے تھے
کہ ہم جب بھی تنظیم کی کوشش کرتے ہیں شیخ مجیب الرحمٰن اسے ختم
کر دیتے ہیں۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مجیبر کہتے تھے۔ تین چار مہینوں
کے بعد مجھے کلکتہ بلا لیا گیا۔

یہ ۵۰ء کے وسط کا زمانہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی
میں بحران آ گیا تھا۔ ایک طرف تو بی۔ ٹی۔ رانا دیوے کی پالیسی ناکام ہو گئی
تھی، دوسری طرف کمیونسٹوں کے بین الاقوامی اخبار ”فار اے
لاسٹنگ پیس، فار اے پیپلس ڈیماکریسی“ کے ایک مضمون میں
اس کا اشارہ تھا کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی غلط ہے۔
بس پھر کیا تھا چاروں طرف سے لے دے شروع ہو گئی۔

اب اس بحران میں مجھے اپنے پیارے یاد آئے اور میں نے
طے کیا کہ کچھ دنوں کے لیے وطن چلا جاؤں۔

کیسا وطن اور کس کے پیارے؟ میں نے دیکھا کہ دنیا ہی
بدل گئی تھی۔ لیکن یہ باتیں بالکل ذاتی نوعیت کی ہیں اور ان کا اس
سرگزشت سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ اکتوبر ۵۰ء سے ستمبر ۵۱ء
کا وقت بڑا سخت تھا جس سیاست نے میری پوری زندگی کو اپنی لپیٹ
میں لے لیا تھا۔ جب وہ ناکام ہوئی تو وہ ساری عمارتیں بیٹھ گئیں جو
اس کے سہارے کھڑی تھیں۔ میری حیثیت صرف ایک آوارہ اور
خانماں برباد نوجوان کی سی رہ گئی جس سے ہر کوئی دامن بچانا چاہتا تھا
میں فتنہ یا، دل شکستہ کلکتہ واپس آ گیا۔ غالباً اسی قسم کی واردات
عرفی کے ساتھ بھی پیش آئی ہو گی، جب ہی تو کہا
تھا ؂

از در دوست چہ گویم بہ چہ ساماں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم
دوستاں اخوں بگیرید کہ رفتم ناکام
دشمناں زہر بخندید کہ گریاں رفتم

زخموں پر پھایہ رکھنے والوں میں میرے چچا حیات اللہ انصاری بھی تھے۔ وہ جواہر لال نہرو کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مولانا سلامت اللہ کا پوتا بہت پریشان ہے۔ وہ بڑی مروّت کے آدمی تھے۔ فوراً حکم دیا کہ میرے پڑھنے کا دوبارہ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ باوجود کالج کے پرنسپل اور حکومت مغربی بنگال کی مخالفت کے میرا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو گیا اور اس طرح کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور دوبارہ ہاتھ میں آ گئی۔

کلکتہ واپس تو آ گیا لیکن دل کے زخم بہت دنوں تک رستے رہے۔ میرے استاد پروفیسر پُو شو پتی بوس نے میرا ہاتھ پکڑا وہ اناٹمی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے ایک پورا انسانی جسم میرے حوالے کیا کہ صبح سے شام تک جتنی دیر چاہو اس کا ڈسکشن کر کے اناٹمی پڑھو۔ یہ بہت ہی غیر معمولی رعایت تھی جو مجھے دی گئی اور میں اس کے لیے تمام عمر ان کا شکر گزار رہوں گا۔
میرے پاس اب کرنے کو تھا ہی کیا۔ سارا دن میں اناٹمی ڈپارٹمنٹ میں گزارتا اور امتحان کی تیاری کرتا۔ اپریل ۵۲ء میں میں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا پہلا امتحان پاس کر لیا۔ جو لوگ میرے ساتھ کالج میں داخل ہوئے تھے انھوں نے اسی سال فائنل کا امتحان دیا اس طرح میں اپنے ساتھیوں سے تین برس پیچھے رہ گیا۔ بہرحال۔ این ہم اندر عاشقی۔

میں نے اپنے دل سے پوچھنا شروع کیا کہ غلطی کہاں پر ہوئی تھی۔ عمر رفتہ کا جائزہ لیا تو بس اتنا سمجھ میں آیا کہ جو انقلابی لہر ساری دنیا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد آئی تھی، وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی بہالے گئی۔ دنیا کے باقی حصوں میں تو حالات ایسے تھے کہ وہاں انقلابی تحریکوں میں عوام شامل ہو گئے، لیکن ہندوستان میں حالات مختلف تھے۔ یہاں انقلابی تحریک کی بنیاد حقیقت سے زیادہ رومان پر تھی۔ چنانچہ تحریک کچل دی گئی۔ اب ان واقعات کو ۴۵ سال ہو چکے ہیں، لیکن اس طویل عرصے میں کوئی اشتراکی انقلاب کی تحریک نہیں اُٹھی اور نہ مستقبل قریب میں کسی ایسی تحریک کے اُٹھنے کی کوئی توقع کی جا سکتی ہے۔

کیمونسٹ پارٹی کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے حالات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی اور اس کی پالیسی ان مفروضو پر بنائی گئی تھی جو بالکل علمی نوعیت کے تھے اور جنھیں یورپ کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا اور جن کا کوئی تعلق ہندوستان کے حقی حالات سے نہ تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شر کے کیمونسٹ لٹریچر میں مزدوروں کے سوشلسٹ انقلاب کے لیے مارکس اور اس کے بعد لینن کا خیال تھا کہ پہلے جمہوریت کے لیے لڑا ہوگی اور اس میں سرمایہ دار بھی ایک حد تک شریک ہوں گے۔ لینن خیال تھا کہ جمہوری انقلاب کی ایک منزل کے بعد سرمایہ دار انقلا تحریک سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس کے بعد سے سوشلسٹ انقلاب مزدوروں کی پارٹی کو انقلابی تحریک کی ذمہ داری لینا پڑے گی۔ کیمونسٹ انٹرنیشنل کی رائے محکوم ملکوں کی تحریک آزادی متعلق بھی اسی سے ملتی جلتی تھی۔ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی نے یہ سمجھا کہ اب جب کہ جمہوری تحریک ایک منزل پر پہنچ گئی ہے مزدوروں کی پارٹی کو انقلابی تحریک کی رہنمائی کرنا چاہیے۔ لیکن سی انقلابی تحریک؟ اس قسم کی کسی تحریک کا وجود ہندوستان میں نہیں تھا۔ ابھی تو پورا شمالی ہندوستان تقسیم ملک شعلوں سے نکل رہا تھا۔

ہندوستان کے سرمایہ داروں کے پاس جنگ کے د اتنی دولت اکٹھا ہو گئی تھی کہ وہ اب مکمل سیاسی اقتدار حا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی سیاسی جماعت کانگریس اس قدر مض اور منظم جماعت تھی کہ سارے ملک میں کوئی جماعت اس کے اق کو چیلنج نہیں کر سکتی تھی سوائے مسلم لیگ کے۔ ہندوستان تقسیم پر راضی ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ را سے ہٹ گئی تو سارے ملک میں کانگریس کا اقتدار مکمل ہو جا

ادھر مسلمان سرمایہ داروں نے بھی کچھ سرمایہ لڑائی کے دوران جمع کر لیا تھا لیکن ہندو سرمایہ داروں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لیے ان کی بقاء کا دار و مدار اس پر تھا کہ ملک کے کسی حصے پر انھیں سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے۔ چنانچہ تقسیم دونوں کے مفاد میں تھی اور اس کے بعد جو حکومتیں ہندستان اور پاکستان میں بنیں وہ کٹھ پتلی حکومتیں نہیں بلکہ آزاد و خود مختار حکومتیں تھیں۔ ان حکومتوں کو ہندوستان اور پاکستان کی غالب اکثریت کی پرجوش حمایت حاصل تھی اور انہیں ہٹا کر کوئی دوسری حکومت بنانا خارج از امکان تھا۔ ایسے وقت میں انقلاب کا نعرہ لگانا سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔ چنانچہ ۱۵ء کے بعد سے ہندوستان میں کوئی انقلابی تحریک نہیں بڑھ سکی۔ کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور ایک کی جگہ دو پارٹیاں بن گئیں۔ لیکن اب دونوں میں اتنی سیاسی سمجھ تو آ گئی ہے کہ دونوں میں سے کوئی انقلاب کی بات نہیں کرتی۔ کچھ ریاستوں مثلاً بنگال، تری پورہ اور کیرالا میں مارکسٹ پارٹی مقامی پیڑوا پارٹیوں کی طرح بہت کامیاب سیاست چلا رہی ہیں، لیکن ہندوستان میں کسی سوشلسٹ انقلاب کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

ایک اور بات جو ہندوستان میں ہوئی اور جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی وہ یہ کہ ہندوستانی سرمایہ دار کا طبقاتی مفاد اب سوویت یونین سے وابستہ ہو گیا ہے۔ سوویت یونین کی مدد سے وہ اس قابل ہے کہ امریکی سرمایہ داروں کے تسلط سے بچا ہے۔ کیوں کہ اگر وہ سیاسی طور پر امریکہ کے ساتھ جاتا ہے تو اسے اپنے ملک کے دروازے باہر کے مال کے لیے کھولنا پڑیں گے لیکن اس سے اس کی اجارہ داری اتنے بڑے ملک میں ختم ہو جائے گی، جو اجارہ داری ہندوستان کے سرمایہ دار کو حاصل ہے۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اتنا بڑا بازار جس میں دوسرے کسی بڑے ملک کے سرمایہ داروں سے کوئی مقابلہ نہ ہو، آج تک کسی کو میسر نہیں آیا۔ اس بازار کی حفاظت کے ضامن انڈو سوویٹ تعلقات ہیں اور دہلی میں کوئی بھی حکومت ان تعلقات کو بگاڑنا نہیں چاہے گی۔ ادھر سوویٹ یونین کے مفاد میں بھی یہی ہے کہ موجودہ طرز کی حکومت ہندوستان میں قایم رہے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں کسی انقلابی تحریک کو سوویٹ یونین کی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینے کے گورنر بنائے گئے تو اُن کا زر و مال اتنا زیادہ تھا کہ اسے تیس اونٹوں پر لاد کر مدینے پہنچایا گیا۔ خوش پوشاک ایسے تھے کہ لوگ ان کے بدن پر جس لباس کو ایک بار دیکھ لیتے اسے پھر نہ پہنتے تھے۔ پسند ایسی تھی کہ قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی بمشکل پسند آتا تھا۔ مشک و عنبر کا ایسا شوق تھا کہ جس کوچے سے گزر جاتے وہ دیر تک مہکتا رہتا۔ لیکن جس دن خلافت کی ذمہ داری قبول کی، اسی دن سارا ساز و سامان، محلات، لونڈی اور غلام، سواریاں سب بیچ کر روپیہ بیت المال میں جمع کر دیا۔

ان کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا، جب وہ میلا ہو جاتا تو دھو کر پہن لیتے۔ مرض الموت میں مبتلا تھے تو ان کے برادر نسبتی نے اپنی بہن اور ان کی بیوی فاطمہ سے کہا کہ قمیص میلی ہو گئی ہے، لوگ برابر عیادت کو آ رہے ہیں۔ اسے بدل دو۔ وہ چپ ہو رہیں۔ انھوں نے پھر اپنی بات دہرائی تو جواب ملا۔ ان کے پاس دوسری قمیص ہے ہی کہاں کہ بدل دوں۔ ایک بار عید کے لیے پاس لباس نہیں تھا۔ فرمایا: ابھی میرے پاس گنجایش نہیں ہے، فرش پھاڑ کر اس کا کرتہ بنا دیا جائے۔

راجر بیکن

حمید عسکری

یورپ میں احیائے علوم کی تحریک اگرچہ تیرھویں صدی عیسوی ہی میں شروع ہو چکی تھی مگر ابتدا میں اس کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ اس صدی میں علوم کی اشاعت کے معنیٰ صرف یہ تھے کہ یونانی حکماء بالخصوص ارسطو اور جالینوس کی تعلیمات کو زندہ کیا جائے۔ اندھی عقیدت نے ارسطو کو معلم دوراں اور جالینوس کو حکیم زماں بنا رکھا تھا جن کے اقوال کے خلاف زبان کھولنا گناہ کے مترادف تھا۔ ان دونوں یونانی دانشوروں کی تصانیف کو ازبر کر لینا تحصیل علوم کی انتہا تھی۔ اس سے آگے کچھ سوچنا تحصیل حاصل تھا کورانہ تقلید کی اس فضا میں تجربے کی نہ کوئی ضرورت محسوس کی جاتی تھی اور نہ اسے کوئی اہمیت دی جاتی تھی۔ اچانک اس فضا میں تجربے اور مشاہدے کی تائید میں ایک آواز بلند ہوئی۔ یہ انگلستان کے ایک عیسائی عالم راجر بیکن کی آواز تھی جسے اس کے دوست سائنسی نظریات کی بنا پر مغربی دور کا پہلا سائنس داں خیال کرتے ہیں۔

انگلستان کے جنوب مشرق میں ایک علاقہ "سوم سیٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ایک قصبے ایل چیسٹر میں راجر بیکن کی ولادت ۱۲۱۴ء میں ہوئی۔ اس کے ماں باپ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور فارغ البال آسودہ حال تھے۔ اس لیے انھوں نے راجر بیکن کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے آکسفورڈ میں بھیجا جہاں چند سال پیشتر آکسفورڈ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگلستان میں پڑھے لکھے لوگ صرف پادری ہی ہوتے تھے اور تعلیم سے بھی زیادہ تر عیسائیت ہی کی تعلیم مراد لی جاتی تھی۔ بیکن نے بھی آکسفورڈ سے انھی علوم میں سند فضیلت لی جو ایک پادری کے لیے ضروری تھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھا اور عیسائی مذہب سے اس کی شیفتگی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ علم کے حصول کے ساتھ ساتھ ان تحریکوں میں بھی عملی طور پر نمایاں حصہ لیتا تھا عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے جاری تھیں۔ اس زمانے میں عیسائی راہبوں کی ایک مشہور تنظیم جو فرانسسکن تنظیم کہلاتی تھی آکسفورڈ میں قائم ہو چکی تھی۔ اس تنظیم کو اٹلی کے ایک راہب فرانسس نے ۱۲۱۰ء میں قائم کیا تھا اور اس کا نصب العین غریبوں کی خدمت کرنا تھا۔ ۱۲۲۳ء میں پوپ نے اس تنظیم کو منظوری کا پروانہ دے کر اس کی حیثیت مسلم کر دی تھی۔ جس کے بعد اس تنظیم کو سیاسی اثر و رسوخ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ بیکن ۲۳ء کے لگ بھگ اس تنظیم میں شامل ہوا اور اس نے عمر بھر کے لیے اس تنظیم کے اصولوں کی پیروی کرنے اور اس کی اعلیٰ کمان کی فرمانبرداری کرنے کا عہد اٹھایا۔ آکسفورڈ میں اس نے ۱۲۳۴ء تک اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ طالب علمی کے اس زمانے میں اگرچہ اس کا زیادہ وقت عیسائیت کی مخصوص تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہوتا تھا، لیکن ساتھ ساتھ وہ یونانی دانشوروں بالخصوص ارسطو کے فلسفے کا بھی مطالعہ کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ارسطو کا فلسفہ بھی آکسفورڈ کے تعلیمی نصاب میں شامل ہو چکا تھا۔ بیکن کی رائے ان اساتذہ کے متعلق اچھی نہیں تھی جو یونیورسٹی میں ارسطو کے فلسفے کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنی ایک تصنیف میں وہ رقمطراز ہے:

> "آکسفورڈ میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو ارسطو کی تصنیفات پر عبور رکھتا تھا لیکن یہ شخص گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں یونیورسٹی کے جو لوگ یونانی علوم کے ماہر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، وہ حقیقت میں بے علم ہوتے تھے اور اپنے افلاس علم کو لاف زنی کے پردے میں چھپاتے تھے۔"

یہ شخص، جس کے علمی تجر کا بیکن کو اعتراف تھا، ابرٹ گراسی ٹسٹ
ی ایک روشن دماغ عالم تھا۔ وہ سائنسی تحقیقات کا بہت دلدادہ تھا،
ر اس نے بیکن کو بھی سائنس اور ریاضی کے مطالعے کی طرف راغب کردیا
ھا۔

بیکن نے عیسائی مذہب کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت کو اپنی
ندگی کا نصب العین بنالیا تھا اور وہ عیسائی علوم میں فضیلت کی اعلیٰ
سند حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ ان دنوں عیسائیت کی اعلیٰ تعلیم کے
لیے پیرس کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے ۱۲۳۴ء میں بیکن پیرس میں
آیا اور وہاں کی یونیورسٹی میں اس نے داخلہ لے لیا۔ آکسفورڈ میں
مذہبی تعصب دوسرے شہروں کی نسبت بہت کم تھا۔ آکسفورڈ میں ریاضی
اور سائنس کی تعلیم ممنوع نہیں تھی اور تجربے کرنے کی بھی اجازت تھی لیکن
پیرس میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہاں ریاضی اور سائنس سے نفرت
زوروں پر تھی۔ صرف چند سال پہلے ارسطو کے پڑھنے کی اجازت مل گئی
تھی۔ البتہ پیرس کے کتب خانوں میں علمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود
تھا، جن میں مسلمان سائنس دانوں کی کتابوں کے بعض لاطینی تراجم بھی
موجود تھے، جو اس سے تھوڑا ہی عرصہ پیشتر بعض یورپی مصنفوں کی
کوشش سے عربی سے لاطینی میں منتقل کیے گئے تھے۔ پیرس کے قیام کے
دوران میں بیکن کو ان تراجم کے مطالعے کا موقع ملا، جس کے باعث اس کے
دل میں مسلمان دانشوروں بالخصوص بوعلی سینا، ابن الہیثم اور ابن الرشد
کی عظمت کے گہرے نقش مرتسم ہو گئے۔ یہ وہ مسلمان عالم تھے جن کی کوششوں
سے یونانی علوم و فنون کو نہ صرف حیات نو نصیب ہوئی تھی بلکہ انھوں نے
اپنی دماغی کاوشوں سے ان علوم میں قابل قدر اضافہ کر کے انھیں باقاعدہ
سائنس کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ چرچ کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں
منسلک ہو جانے کے باوجود بیکن کا دل تعصبات سے خالی تھا، اس لیے وہ
نہ صرف مسلمان سائنس دانوں کی تصنیفات کا مطالعہ کثرت سے کرتا تھا بلکہ
ان کی علمی لیاقت کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہ لیتا۔ اس کا یہ طرز عمل
عام عیسائی علما کی روش کے خلاف تھا کیونکہ عام عیسائی پادری تو مسلمان
دانشوروں کی تصنیفات کا نام لینا بھی گناہ سمجھتے تھے۔

پیرس میں بیکن نے تقریباً سولہ سال حصول علم میں بسر کیے اور عیسائیت
میں ڈاکٹری کی ڈگری لی جو عیسائی علوم میں فضیلت کی سب سے اونچی سند
تھی۔ ۱۲۵۰ء میں وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر انگلستان واپس
آگیا اور آکسفورڈ میں مقیم ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۶ برس کی تھی۔
آکسفورڈ میں آکر اس نے تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا، لیکن
اس کی یہ تقریریں عیسائیت پر نہ تھیں بلکہ ان کا موضوع سائنس تھا۔
سائنس کے بارے میں اس کے خیالات بڑے ترقی پسندانہ تھے۔ وہ
اس بات کا شدید مخالف تھا کہ قدما جو کچھ لکھ گئے ہیں انہیں من و عن تسلیم
کر لیا جائے۔ اس کا قول تھا کہ ہمیں قدیم مصنفوں کے بیانات کو ہمیشہ
تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے اور ان کے جو بیانات تجربے پر پورے
نہ اتریں انہیں ترک کر دینا چاہیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان میں
عوام بالکل ان پڑھ تھے اور پادریوں کے سوا دوسرے لوگ معمولی نوشت و
خواند سے بھی ناآشنا تھے۔ ادھر پادریوں کا یہ حال تھا کہ وہ لکھنے پڑھنے
کی استعداد تو رکھتے تھے لیکن جہاں تک ریاضی اور سائنس کا تعلق
تھا ان کی اکثریت نہ صرف ان علوم سے نابلد تھی بلکہ انھیں بر ملا شیطانی
علوم کا نام دیتی تھی۔ علاوہ ازیں قدامت پرستی ان پادریوں کی گھٹی میں
پڑ چکی تھی، جس کے باعث وہ قدیم مصنفوں کے خلاف کوئی لفظ سننا
گوارا نہ کرتے تھے۔ ان پادریوں کی نگاہ میں بیکن کا جرم دوگنا تھا۔ وہ
ایک تو سائنس پر لیکچر دیتا تھا جو ان کے نزدیک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی
تھی۔ دوسرے وہ قدما کی غلطیاں نکالتا تھا جن کے ساتھ ان کو اندھی
عقیدت تھی۔ ان دونوں وجوہ سے آکسفورڈ کے مذہبی حلقوں میں
بیکن کے خلاف تھوڑے ہی عرصے میں نفرت کی آگ پھیل گئی۔ چرچ کی
ملازمت میں، جس کے ساتھ بیکن منسلک تھا اس کا افسر اعلیٰ ایک
پادری بوناوینٹورا نامی تھا۔ یہ شخص قدامت پسند عقاید رکھتا تھا، اس
لیے جب اس کو بیکن کے لیکچروں کے متعلق دوسرے پادریوں کی شکایات
موصول ہوئیں تو اس نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت بیکن کو
سائنسی موضوعات پر تقاریر کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے ساتھ
ہی فرانسسکن ادارے میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیکن کے دوستوں
نے مشورہ دیا کہ وہ پیرس نہ جائے کیوں کہ انگلستان میں اس کی
صرف زبان بندی ہی ہو سکتی تھی، اس کی زندگی کو کسی نقصان کا احتمال

نہ تھا، لیکن پیرس میں خود اس کی زندگی بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بیکن کو اپنے دوستوں کی اصابت رائے کا اعتراف تھا مگر فرانسسکن تنظیم میں شامل ہوتے وقت وہ اپنے اعلیٰ افسروں کی فرماں برداری کا حلف اٹھا چکا تھا، اس لیے پیرس جانے سے اس کا انکار اس حلف کو توڑنے کے مترادف ہوتا ہے اس کا ضمیر گوارا نہ کرتا تھا۔

وہ آکسفورڈ میں تین سال کا قلیل عرصہ گذارنے کے بعد ۱۲۵۷ء میں پیرس چلا گیا مگر جس خطرے کی نشان دہی اُس کے دوستوں نے کی تھی وہاں پہنچ کر وہ خطرہ حقیقی ثابت ہوا۔ پیرس میں اسے پوپ کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا اور جیل خانے بھیج دیا گیا۔

بیکن دس سال تک پیرس کے جیل خانے میں قید رہا اور یہ تمام مدت اس نے بڑی مصیبتوں میں گزاری۔ اس کو قیدِ تنہائی میں رکھا جاتا تھا اسے مطالعے کے لیے انجیل مقدس کے سوا کسی کتاب کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے لکھنے کے لیے قلم دوات اور کاغذ مہیا نہیں کیا جاتا تھا وہ اپنے محافظوں کی موجودگی کے بغیر کسی شخص سے بات چیت نہیں کر سکتا تھا اور نہ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھ سکتا تھا، اُسے خوراک بھی ردی قسم کی دی جاتی تھی۔

بیکن کو اس قید سے رہا ہونے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا لیکن دس سال کی صبر آزما مدت کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث اسے اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس مل گئی۔ دس سال پیشتر جب وہ آکسفورڈ میں مقیم تھا اور سائنسی موضوعات پر لیکچر دیتا تھا تو "گی ڈی فولکس" نامی ایک عیسائی عالم پوپ کے نمائندے کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم تھا، وہ سائنس سے دلچسپی رکھتا تھا اور بیکن کی لیاقت کا معترف تھا۔ ۱۲۶۵ء میں جب وہ ترقی کرتے کرتے کلیمنٹ چہارم کے نام سے پوپ کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوا تو اس نے بیکن کی سائنسی تحریریں پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب اسے پتہ چلا کہ بیکن پوپ کے حکم سے پیرس میں قید ہے تو اس نے اپنا خاص حکم بھیج کر بیکن کو رہا کروایا اور اس سے سائنس پر ایک جامع کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔

دس سال کی طویل مدت کے بعد بیکن کو جونہی اپنے وسیع علم کو حوالۂ قلم کرنے کا موقع ملا، اس نے محض حافظے کی مدد سے اُن تمام سائنسی علوم کو جو اس کے ذہن میں محفوظ تھے، کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا اور دو سال سے بھی کم عرصے میں تین جلدوں میں ایک "قاموس سائنس" لاطینی زبان میں تصنیف کی۔ اس کتاب کا نام قاموس سائنس Opus majus تھا اور یہ اپنے دور کی ایک نادر تصنیف تھی۔ یہ ایک مجمل کتاب تھی جس کے بعد انہیں خطوط پر ایک جامع انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بیکن کے ذہن میں تھا۔ لیکن دوسری بار زنداں میں قید ہو جانے کے باعث، جس کا ذکر آگے آئے گا، اسے اس علمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ مل سکا اور سائنسی انسائیکلوپیڈیا کی تالیف تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

قاموس سائنس، بیکن کا تصنیفی شاہکار ہے اور اس کا شمار مغربی دورِ اول کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب	انسان کی جہالت اور گمراہی کے اسباب
دوسرا باب	سائنس اور مذہب
تیسرا باب	غیر ملکی زبانوں کی تعلیم
چوتھا باب	ریاضی اور اس کی اہمیت
پانچواں باب	روشنی
چھٹا باب	تجرباتی سائنس
ساتواں باب	فلسفۂ اخلاق

اس کتاب کا چھٹا باب سب سے زیادہ ضخیم ہے جسے ایک مستقل اور علیحدہ جلد کی صورت میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تجرباتی سائنس ہے جس کا مغربی دور میں بیکن اولین نمائندہ تھا۔ اس باب میں وہ لکھتا ہے:

"علم کو حاصل کرنے کے صرف دو طریقے ہیں: دلائل اور تجربات۔ دلائل سے ہم بعض نتائج اخذ کر سکتے ہیں لیکن یہ نتائج صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ اس لیے علم کے حصول میں محض منطقی دلائل پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، البتہ جو علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے وہ یقینی ہوتا ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس

لیے علم حاصل کرنے کا یہ دوسرا طریقہ ہی صحیح اور قابل اطمینان
ذریعہ ہے۔"

اس زمانے میں عالموں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی بات کو ثابت
کرنے کے لیے سب سے اوّل ارسطو کے کسی قول کا حوالہ دیتے تھے اور پھر
منطقی دلائل سے اس کی تطبیق زیر بحث مسئلہ پر کرتے تھے۔ بیکن نے
بتایا کہ یہ طریقہ بہت غیر یقینی ہے اور اس میں غلطی کے امکانات قوی ہیں۔
زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ منطق کے بجائے تجربے سے کام لیا جائے۔ بیکن
کے یہ خیالات اہل یورپ کے لیے نئے تھے لیکن فی الحقیقت یہ ان مسلم دانشوروں
کے خیالات کا چربہ تھے جن کی تصنیفات سے اس نے استفادہ کیا تھا۔

قاموس سائنس کے دوسرے باب میں بیکن نے اس تعصب کو
کم کرنے کی ایک قابل قدر کوشش کی جو عیسائی پادریوں کو سائنس کے
خلاف تھا اس کی دلیل یہ تھی کہ انجیل مقدس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے
صرف زبان کا جاننا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لیے سائنس
کی تعلیم بھی لازمی ہے تاکہ مظاہر فطرت کے متعلق جو حوالہ جات اس مقدس
کتاب میں آتے ہیں انہیں صحیح طور پر سمجھا جاسکے۔ اس طرح اس نے
مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کو قریب لانے اور ان کی درمیانی
خلیج کو پاٹنے کی سعی کی۔ وہ ایک مذہبی عالم تھا اور عیسائیت میں اس کا
اعتقاد بہت راسخ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی تحریروں میں، جو سائنس
کی حمایت میں لکھی گئی تھیں کبھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا
اس نے عیسائی علوم کے توہمات کی تردید ضرور کی لیکن اس نے کبھی ان
کے خیالات کا مضحکہ نہیں اُڑایا۔ اس نے جب بھی سائنس اور مذہب
کا مقابلہ کیا، مذہب کی تقدیس کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ قاموس سائنس
میں اس اعتقاد کا خاص خیال رکھا گیا تھا کیونکہ یہ کتاب عیسائی
دنیا کے سب سے بڑے پیشوا پاپائے روم کے لیے اس کی خاص فرمائش
پر لکھی گئی تھی۔

یہ کتاب ۱۲۶۷ء میں تمام ہوئی۔ بیکن نے اس کی ایک عمدہ
جلد بنوائی اور پھر اپنے ایک خاص شاگرد "جان" کے ہاتھوں جو
نسلاً سائنس کی مہارت کے باعث شہرت رکھتا تھا۔ اسے پوپ کلیمنٹ
چہارم کی خدمت میں بھیج دیا۔ لیکن یہ کتاب ایسے وقت میں روم
پہنچی جب پوپ مرض الموت میں مبتلا ہو چکا تھا، اس لیے وہ اس کا
مطالعہ کرکے اس کے مصنف کی محنت کی داد نہ دے سکا، البتہ پوپ
کی نظر التفات سے بیکن کو پیرس کے زندان سے رہائی مل چکی تھی۔ اس لیے اس
نے پیرس کو خیرباد کہا اور آکسفورڈ میں چلا آیا۔

یہاں آکر اس نے تجرباتی سائنس پر عملی کام کرنا شروع کردیا اور
بعض حیرت انگیز ایجادات کیں۔ علاوہ ازیں اس نے سائنسی موضوعات
پر متعدد رسالے اور کتابیں لکھیں۔ اس کا ایک رسالہ روشنی پر تھا۔
اس رسالے کو لکھتے وقت اس نے ابن الہیثم کی کتاب "المناظر" سے
بہت قابل قدر مدد لی تھی جو روشنی کے موضوع پر دنیا میں پہلی کتاب تھی
بیکن کو ابن الہیثم سے خاص عقیدت تھی اور وہ اس کی لیاقت کا بہت
معترف تھا۔ اپنے اس رسالے میں بیکن نے ان اصولوں کی وضاحت کی
تھی جس کے تحت دو عدسوں کو پاس پاس رکھ کر دور کی چیزوں کو
نزدیک تولایا جاسکتا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس
نے ان عدسوں کو ملاکر دوربین کی کوئی عملی صورت ایجاد کرلی ہو۔
فی الحقیقت دوربین کی ایجاد کا سہرا گلیلیو کے سر ہے جو سولہویں صدی
میں گزرا ہے۔ البتہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دوربین کا
اصول بیکن نے تیرھویں صدی میں دریافت کرلیا تھا تو اس اصول کا
عملی اطلاق کرکے ایک حقیقی دوربین کے بنانے میں تین صدیوں کا طویل
عرصہ کیوں لگا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پوپ کے حکم سے بیکن کی دوسری
قابل ذکر تصنیف "مقدمۂ سائنس" ، جو اس کے مجوزہ سائنس
انسائیکلوپیڈیا کی ایک تمہید تھی۔ اس کتاب میں اس نے مصلحت کا
دامن چھوڑ دیا تھا اور اس کے قلم میں تنقید کی چبھن پیدا ہوگئی تھی۔
دراصل بیکن کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ اس کے زمانے کے اکثر
پادری افلاس علم میں گرفتار ہیں۔ اس لیے وہ بار بار اپنی تقریروں
اور تحریروں میں ان کو علم کی طرف رغبت دلاتا تھا اور ان کی غلطیوں
کی (جو بے علمی کا لازمی نتیجہ تھیں) نشاندہی کرتا تھا۔ لیکن اس کا یہ
طرز عمل پادریوں کے مفاد کے خلاف تھا جو ہر قسم کے دینی اور دنیوی
علوم میں عوام کے پیشوا بنے ہوئے تھے، اس لیے پادریوں نے بیکن کی
مخالفت میں ایک متحدہ محاذ بنالیا اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے

موقع و محل کا انتظار کرنے لگے۔ یہ موقع بھی جلد آ گیا۔ پوپ کے منصب پر اب نکولس سوم آ گیا تھا جو اپنے پیشرو کلیمنٹ چہارم کے برعکس سائنس کی تعلیم کا سخت مخالف تھا۔ اس نے پوپ کے کتب خانے میں بیکن کی کتاب "قاموس سائنس" دیکھی جو کلیمنٹ چہارم کے نام پر لکھی گئی تھی، اس کے متعلق استفسارات کیے۔ آخر کار اس نے انگلستان میں چرچ کے اعلیٰ عہدہ داروں کو حکم بھیجا کہ راجر بیکن کی تمام تحریروں کا محاسبہ کیا جائے۔ بیکن نے اپنی صفائی ایک رسالہ تحریر کیا جس میں اس نے اپنے محاسبوں کی طرف اشارہ کرکے یہ الفاظ لکھے۔

"سائنس کے یہ حقایق جو لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں وہ انہیں کالا جادو اور شیطانی عمل کا نام دے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقایق محض قدرت کے قوانین کی ترجمانی کرتے ہیں اور فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کے راز کھولتے ہیں۔ ان میں جادو یا شیطانی عمل کی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

اس قسم کے فقروں سے چرچ کے اجارہ دار اور زیادہ جھلاّ گئے اور انھوں نے بیکن کو اس گستاخی کی قرار واقعی سزا دینے کی ٹھان لی۔ کالے علم اور شیطانی عمل کو جاننے کا الزام تو پہلے بھی اس پر لگ چکا تھا اب کی بار اس کے جرموں کی فہرست میں یہ اضافہ کیا گیا کہ اس نے مسلمان دانش وروں کے عقاید اور خیالات کو عیسائیوں میں پھیلانے کی کوشش کی ہے اور اس لیے وہ چرچ کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوا ہے۔ اس احتساب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲۷۸ء میں جب بیکن کی عمر چونسٹھ برس کی ہو چکی تھی، اسے دوسری بار زنداں میں ڈال دیا گیا۔ یہ صرف اس کے بعض دوستوں کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ اس کو قید کرنے ہی پر اکتفا کیا گیا ورنہ اس پر جو شدید الزامات لگ چکے تھے ان کے پیش نظر یہ بعید نہ تھا کہ اس کو زندہ جلائے جانے کی سزا دی جاتی۔

قید خانے میں اب کی بار اس کے ایام بہت تلخ گزرے۔ اس کی صحت گر چکی تھی اور بڑھاپا اس پر پورے طور سے مسلط ہو چکا تھا کسمپرسی کے عالم میں وہ جیل کے ایک وارڈ میں مقید تھا جہاں نہ اسے اپنی محبوب کتابیں حاصل تھیں نہ اہل علم کی صحبت میسر تھی۔ اسے صرف ایسے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا پڑتا تھا جو جاہل اور اجڈ تھے اور اس کی تحقیر کرتے رہتے تھے۔ اس حالت میں اس نے چودہ سال قید خانے میں گزارے۔ آخر کار جب اس کا جسمانی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا، یہاں تک کہ اس میں چلنے پھرنے کی بھی سکت نہ رہی تو اس کے بعض بہی خواہوں نے کی درخواستیں بھیج بھیج کر ۱۲۹۲ء میں اسے قید سے رہا کرا دیا۔ اس کی عمر اس وقت اٹھتر برس تھی اور وہ ناقابل برداشت مصائب جھیلتے جھیلتے زندگی کے آخری کنارے تک آ پہنچا تھا۔ دو سال بعد ۱۲۹۴ء میں اسے موت کا بلاوا آ گیا اور اس نے قید زیست اور بند غم سے بیک وقت نجات پائی۔ اپنی اس اسّی سال کی عمر میں اس نے ابتدا چھتیس سال تحصیل علم میں صرف کیے تھے اور باقی چوالیس سالوں میں چوبیس برس کا طویل زمانہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے جھیلتے بسر کیا تھا۔

بیکن نے اپنی کتابوں میں دخانی جہازوں، ریلوں، موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کی ایجادات کے متعلق واضح طور پر پیشین گوئیاں کی تھیں جو اس کے صدیوں بعد پوری ہوئیں۔ بھاپ کے انجن کی ایک ابتدائی قسم تو اس نے بنا بھی لی تھی۔ اس نے اور بھی بہت سی نادر ایجادات کی تھیں جن کی بنا پر عوام میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ وہ جادوگر ہے اور شیطان کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ ہے۔ یہ خیال اس قدر جڑ پکڑ گیا تھا کہ بیکن کے دو صدیاں بعد اس کی جو سوانح حیات مرتب کی گئی وہ ایسی بے سروپا کہانیوں اور دور از کار واقعوں پر تھی جن میں اس کی جادوگری کے فرضی کارنامے تحریر کیے گئے تھے۔ اس کتاب میں ایک جگہ لکھا تھا:

"بادشاہ اور ملکہ نے بیکن کو طلب کیا تاکہ وہ انھیں جادو کے کھیل دکھائے۔ اس نے پہلی بار جادو کی چھڑی ہلا کر ایسے نغمے پیدا کیے جو انسانی کانوں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنے تھے۔ دوسری بار چھڑی ہلانے پر ہوا میں سے اچانک ناچنے والی پریاں اسٹیج پر نمودار ہوئیں اور اپنا رقص دکھا کر ہوا ہی میں غائب ہو گئیں۔ تیسری بار چھڑی ہلانے پر بادشاہ کے سامنے رکھی ہوئی میز طرح طرح کے پھلوں سے بھر گئی جن میں سے بعض پھل بادشاہ اور ملکہ نے تناول کیے۔"

ایک اور مصنف نے اپنی کتاب "شعبدہ بازوں کے کارنامے" میں لکھا ہے:

"راجر بیکن اور اس کے ساتھی پادری بنگے نے پیتل کا ایک انسانی سر بنایا تھا جس کی اندرونی ساخت اصلی انسانی سر کے مطابق تھی مگر وہ انسانوں کی طرح باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے سر کو بات چیت کرنے کے قابل بنانے کے لیے شیطان کی مدد لینے کا فیصلہ کر لیا وہ ایک گھنے جنگل میں گئے وہاں زمین پر جادو کا ایک دائرہ کھینچا اور شیطان کو بلانے کے لیے منتر پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں شیطان حاضر ہو گیا اور اس نے ان کو ادویات کا ایک نسخہ لکھ کر کہا کہ اس نسخے کو بنا کر پیتل کے سر میں ڈالنے سے وہ چند کلمات بولنے کے قابل ہو جائے گا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ جس وقت یہ کلمات اس کے منہ سے نکلیں اس کا جواب دیا جائے۔ انھوں نے گھر آ کر نسخے کے مطابق دوا تیار کی اور اسے پیتل کے سر میں انڈیل دیا۔ تمام دن اور رات وہ انتظار کرتے رہے۔ اگلی صبح کو نیند اُن پر غالب آ گئی اور وہ سو گئے عین اسی وقت پیتل کے سر نے آواز دی مگر وہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ اچانک آسمان سے بجلی چمکی جس کے بعد زور کی گرج سنائی دی اور پیتل کا سر زمین پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔"

سولہویں صدی میں بیکن کی زندگی پر ایک اور کتاب لکھی گئی تھی اس میں بھی دیگر فرضی واقعات کے ساتھ ساتھ پیتل کے اس سر کی کہانی درج تھی۔ یہ کتاب عوام میں بہت مقبول تھی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ ایک اور انگریزی مصنف نے اس صدی میں پادری بیکن کے جادو کے کارناموں پر مبنی ایک ڈراما تصنیف کیا تھا جسے انگلستان کے تھیٹروں میں کھیلا جاتا تھا۔

اوپر کے واقعات سے ظاہر ہے کہ بیکن کو زندگی میں سائنس کی خدمت کی پاداش میں ناقابل برداشت مصائب جھیلنے پڑے ہی تھے مگر اس کی موت کے بعد بھی چار صدیوں تک اس کے اہل وطن نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان چار صدیوں میں سائنس کی جنگ جیتی جا چکی تھی اور سائنس کے خلاف پادریوں کا تعصب شکست کھا چکا تھا مگر راجر بیکن کو سائنس داں کی صف میں جگہ نہ مل سکی تھی۔ اس کا شمار شعبدہ بازوں ہی میں کیا جاتا تھا۔ یہ صورت اٹھارھویں صدی کے آغاز تک قایم رہی۔ البتہ ۱۷۳۲ء میں جب راجر بیکن کی مشہور کتاب "قانون سائنس" شایع ہوئی تو اس کے مطالعے سے سائنس دانوں کو پہلی بار پتا لگا کہ راجر بیکن کوئی شعبدہ باز نہیں تھا بلکہ وہ اپنے زمانے کا ایک عظیم دانش ور تھا جس نے اہل یورپ کو تجربے اور مشاہدے کی اہمیت سے روشناس کرایا تھا اور مغرب میں تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی تھی۔

اپنے زمانے کے دیگر علما کی طرح راجر بیکن بھی علم نجوم اور کیمیا گری میں یقین رکھتا تھا۔ علم نجوم کے بارے میں قدیم زمانے سے اہل دنیا کا یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ اجرام فلکی، مثلاً سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کی گردش کا گہرا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ ہے۔ اس عقیدے پر نجوم کی بنیاد پڑی اور نجومیوں نے ستاروں کی گردش کو بنیاد بنا کر لوگوں کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں کرنی شروع کر دیں۔ اس قسم کی کوئی پیشین گوئی اگر اتفاق سے سچ ثابت ہو جاتی تو لوگوں کا نجوم پر اعتقاد بڑھ جاتا۔ لیکن اگر یہ پیشین گوئی درست نہ نکلتی تو کہا جاتا کہ نجومی سے حساب لگانے میں غلطی ہو گئی ہے ورنہ علم نجوم فی الواقع صحیح ہے۔ بیکن بھی اپنی روشن دماغی کے باوجود اپنے ماحول کی پیداوار تھا اور اس لیے نجوم پر بھی اسے پورا اعتقاد تھا۔

بیکن کو کیمیا گری پر بھی یقین تھا اور کیمیا گری کے متعلق اس کے بھی وہی خیالات تھے جو اس نے مسلم سائنس دانوں، بالخصوص جابر بن حیان اور زکریا رازی کی کتابوں سے اخذ کیے تھے۔ ان خیالات کا لب لباب یہ تھا کہ تمام دھاتیں پارے اور گندھک سے بنتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب پارہ اور گندھک دونوں بالکل خالص ہوں تو ان کے ملاپ سے سونا بنتا ہے۔ لیکن اگر ان میں کچھ کثافتیں مل جائیں تو ان کثافتوں کی مقدار اور نوعیت کے تفاوت سے دیگر دھاتیں، مثلاً لوہا، تانبا، سیسہ وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔ اس نظریے کے مطابق کم قیمت دھاتوں کو سونے

میں تبدیل کر لینا عین ممکن تھا۔ بیکن بھی اس نظریے کو درست سمجھتا تھا اور اس نے عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش میں اپنا بہت سا وقت اور روپیہ صرف کیا تھا۔ لیکن آخر میں ایک سچے سائنس داں کی طرح اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔

بیکن کے زمانے میں تمام عیسائی دنیا میں مشہور رومی حکمراں جولیس سیزر کا نافذ کردہ کیلنڈر رائج تھا جس کے مطابق شمسی سال ۳۶۵ اور ۶ گھنٹے کا لیا جاتا تھا۔ بیکن نے غالباً مسلم سائنس دانوں مثلاً البیرونی اور خیام کی تحریروں سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ شمسی سال کی صحیح لمبائی ۳۶۵ دن اور پورے چھ گھنٹے نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہ قدر ۱۱ منٹ کم ہے جس کے باعث جولیس کیلنڈر میں ہر سال گیارہ منٹ کی غلطی پڑ جاتی ہے جو ۱۳۰ برسوں کے بعد پورے ایک دن کی غلطی ہو جاتی ہے۔ بیکن کے حساب کے مطابق اس کے زمانے یعنی تیرھویں صدی تک یہ غلطی دس روز کی ہو گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پوپ گریگوری کے زمانے میں کیلنڈر کی اصلاح کے لیے جو قدم سولھویں صدی میں اٹھایا گیا تھا اس کی داغ بیل یورپ میں بیکن کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ لیکن اسلامی دور میں شمسی کیلنڈر کی یہ اصلاح بیکن سے دو صدیاں پہلے خیام عمل میں لا چکا تھا۔

راجر بیکن کے ساتھ بارود کی ایجاد بھی منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بارود چین میں کئی صدیاں پہلے ایجاد ہو چکا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بیکن نے اپنے تجربے سے بارود کا کوئی بہتر نسخہ دریافت کیا ہو۔

نوجوانی پھر کہاں ...؟

"اے لڑکو! یہ فراغت کا وقت جو تم کو اب میسر ہے اسے بس غنیمت سمجھو، اب نہ تو تم کو کھانے کی فکر ہے نہ کپڑے کا سوچ، جو کچھ تم سے سیکھنے اور حاصل کرتے بن پڑے لگ لپٹ کر جلد جلد سیکھ ساکھ لو کہ آئندہ تمہارے کام آئے ورنہ پھر کہاں تم، کہاں یہ فراغت۔ اس وقت تم سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے اور رونا کچھ سودمند نہ ہوگا، تب بہت پچھتاؤ گے اور پچھتانا کچھ فائدہ نہ بخشے گا، بہت افسوس کرو گے، کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

{مولوی نذیر احمد}

آبادی کا مسئلہ

طارق سعید

ایک زمانہ تھا جب انسان کی یہ زمین بھیانک اور گھنے جنگلات وحشی اور خوفناک درندوں اور طرح طرح کی سنگینی و بیانیوں کے قبضے میں تھی۔ انسانوں نے اس وقت جنم لیا جب زمین پر زندگی محض رینگنے اور حرکت کا نام تھی۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کمزور اور ناتواں انسان ابتدائی زندگی کی شدید مشکلات اور رکاوٹوں پر حاوی ہو سکے گا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انسان کے دل میں انسان ہی کی قدر و قیمت تھی بلکہ انسان کی تعداد کی اہمیت اس کے دل میں جڑ پکڑ گئی۔ گو وہ شخصیت کی اہمیت اور انفرادیت کو اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت گردانتا تھا لیکن انسانوں کی مجموعی تعداد بھی اس کے لیے ہر ممکن وجوہ کی بنا پر اہم تھی۔ اسے اپنی حفاظت کے لیے اپنے سے زیادہ ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ خونخوار جانوروں اور موسمی شدائد کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ رفیقوں کا محتاج تھا۔

مل جل کر رہنا جو انسان کی ابتدائی مشکلات اور مصائب کا مداوا تھا اس کے لیے ایک مسئلہ بھی بننا شروع ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ تعداد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رقابت یا عدم اتفاق بذات خود ایک مصیبت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ تعداد کے ساتھ ساتھ اخلاقی مسائل کی تعداد بھی بڑھتی ہے۔ انسان میں وحشت پہلے سے جبلّی طور پر موجود تھی۔ اختلاف کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش میں وحشت نئے نئے رنگ اختیار کرنے لگی۔ خدا کا شکر ہے کہ تخریب کے ساتھ انسانی ذہن تعمیر بھی کم نہیں۔ اختلافات نے جہاں نااتفاقی اور جنگ و جدل کو جنم دیا وہیں ذہن کے تعمیری پہلو نے انسان کو یہ سمجھایا کہ اختلاف کو حل کرنے کا طریقہ صرف لڑائی ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ مختلف الخیال لوگ اپنے ہم خیال انسانوں کے ساتھ گروہ بندی کر کے اپنے تصورات کے مطابق ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ قبیلوں کی ابتدا تھی جو بعد میں کم و بیش انہیں کی وجوہات کی بنا پر قوموں اور ملکوں کی تقسیم اور قیام کا باعث ہوئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس تقسیم کے بعد بھی انسانی تعداد پھر ایک دوسرا مسئلہ بن گئی۔ جو قوم جتنی زیادہ آبادی کی حامل ہوتی وہ اپنے آپ کو اتنی ہی طاقتور اور برتر سمجھتی اور اس طرح تعداد کی زیادتی کی اہمیت انسان کے لاشعور میں مستقل جگہ پا کر اس کی فلاح و بہبود کا مظہر قرار پا گئی۔

اور پھر یہ ہوا کہ جب کسی قوم کی تعداد کم ہوئی تو اسے بڑھانے کی فکر رہی اور جب آبادی بڑھی تو نصب العین کے اختلاف نے اسے پھر تقسیم کر دیا اور اسی چکر کی وجہ سے قوموں کی تعداد قوت اور ان کی ملکیت کا علاقہ گھٹتا بڑھتا رہا لیکن آبادی کی زیادتی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم رہی۔

انسان کے لاشعور میں دبی ہوئی چیزوں کی اس وقت تک کوئی اہمیت معلوم نہیں ہوتی جب تک انہیں دور کرنے کے لیے کوئی موقع پیدا نہ ہو۔ اسی طرح انسانی تعداد کی زیادتی کی لاشعوری پختگی اس وقت تک ظاہر نہ ہوئی جب تک اس کے خلاف حالات پیدا نہ ہوئے اور ان حالات کے خلاف آواز پیدا نہ ہوئی۔

سترھویں صدی تک انسان اپنی خوراک کے لیے نئی نئی جگہیں ڈھونڈتا رہا اور اسے نئے نئے ملک ملتے رہے لیکن جب وہ اس کرۂ ارض کے چپے چپے سے واقف ہو گیا اور اس کے بعد اسے کوئی نئی زمین ملنے کا امکان باقی نہ رہا تو وہ تمام ملکوں میں جہاں زندگی کو برقرار رکھنا موسم اور خوراک کی موجودگی کی وجہ سے ممکن تھا، آباد و متصرف ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔

آبادی کے بڑھنے سے اس کی لڑائی جھگڑے کی جبلت میں کسی کمی کا امکان تو کسی طور پیدا نہ ہوا، البتہ ملک گیری کی ہوس اور بعض اقوام میں اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے دوسری اقوام پر جنگی نقطۂ نظر سے قبضہ کرنا پڑا۔ کچھ نہ کچھ اپنے قبضے میں رکھنا ہر بڑے ملک کے لیے ضروری سا ہو گیا۔

سترھویں صدی میں یورپ کے حالات مستقل ابتری کے شکار تھے گو انسانی قیادت مختلف اقوام مثلاً چین، مصر، یونان،

دم، ایران کی تہذیبوں سے نکل کر اسلام کے راستے یورپ کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ لیکن خود یورپ کی اقوام میں آپس میں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصے پر اپنی نوآبادیات قایم کرنے اور ان پر اپنا اقتدار جمانے کی دوڑ میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ جنگیں نہ صرف یورپ بلکہ ان کی نوآبادیات تک میں بھی پھیل گئیں۔

۱۷۴۴ء سے ۱۸۳۴ء تک کا زمانہ وہ ہے جب صنعتی انقلاب نیا نیا آیا تھا اور یورپ کی معیشت ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ زرعی معیشت بتدریج صنعتی معیشت بنتی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ ہوتا تھا کہ زرعی پیداوار کی طرف سے توجہ ہٹتی جا رہی تھی بلکہ زیادہ لوگ صنعتوں میں جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ صنعتوں کے قیام نے کوئی قابل ذکر اثر نہ کیا لیکن خودکار مشینوں نے انسانی ہاتھوں کی جگہ لینی شروع کی تو بیکاری بڑھنی شروع ہوئی اور بیکاری کے ساتھ ساتھ نفسی بے چینی بھی بڑھتی گئی اور نئی نئی ملازمتوں کا ملنا دشوار اور زندگی کے لیے بنیادی ضروریات مہیا کرنا انتہائی مشکل کام بننا شروع ہو گیا۔

اسی زمانے میں نپولین کی جنگوں نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس سے ذرا پہلے انقلاب فرانس نے لوگوں میں بے چینی اور خوف پیدا کر رکھا تھا۔

ان تمام حالات کے نتیجے میں انسانی ذہن نے سوچنا شروع کیا کہ اگر آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو اس کے نتیجے میں اقتصادی وجوہات کی بنا پر جنگیں (جو اس وقت ہو رہی تھیں) ایک مستقل عذاب

بن جائیں گی اور پھر ہر ملک کی آبادی کو اس کو اپنے داخلی وسایل سے ضروریات کا کفیل بنانا بھی ممکن نہ تھا۔

قوت آزمائی اور بد دلی کے اس دور میں مالتھس اس لیے مشہور رہے کہ اس نے آبادی کے اصول پر ایک مقالہ لکھا۔ اس نے کہا کہ ہر ملک کی آبادی مسلمہ طور پر بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔ یعنی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے اس رفتار سے خوردنی اشیا کی پیدائش نہیں ہوتی۔ معاشی ابتری اور غربت و افلاس کی وجہ یہی ایک بات ہے۔ اسی لیے انسانی کوششیں بے کار ثابت ہوتی رہی ہیں۔

مالتھس کا نظریۂ آبادی یہ ہے کہ خوراک کے مقابلے میں ملکوں کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھی۔ ہر ملک میں آبادی کا رجحان مستقلاً ایک مسلسل اضافے کی طرف ہے۔ عام حالات میں آبادی جیومیٹری کی تدریجی رفتار یعنی ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲، ۶۴ وغیرہ کے مطابق بڑھتی ہے۔ لیکن خوراک کی رفتار حساب کی تدریجی رفتار یعنی ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ وغیرہ کے مطابق بڑھتی ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے ایک وقت ایسا آتا ہے جب خوراک کی رسد سے آبادی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ بھوک اور افلاس کے سوا کچھ نہیں۔

آبادی کا اضافہ ہی افلاس کی بنیاد اور مشکلات کی وجہ ہے اور ان مشکلات کو دور کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ آبادی کے اضافے کے رجحان کو روکا جائے اور آبادی کو ایک حد کے اندر رکھا جائے۔ اس کے لیے مالتھس عمر بھر تجرد کی زندگی گزارنے کو بہتر سمجھ

دنیا کی آبادی میں اضافے کی شرح

براعظم	۱۹۵۰ء	۱۹۷۰	۱۹۷۵ء	۱۹۸۰	۱۹۸۱	اوسط سالانہ اضافہ ۱۹۷۰-۱۹۸۱ء
افریقہ	۲۱۹	۳۵۴	۴۰۶	۴۶۹	۴۸۴	۲ء۹ فیصد
امریکہ	۳۳۰	۵۰۹	۵۵۹	۶۱۵	۶۲۲	۱ء۸
ایشیا	۱۳۸۰	۲۰۹۱	۲۳۱۹	۲۵۵۸	۲۶۲۵	۲ء۱
یورپ	۳۹۲	۴۶۰	۴۷۴	۴۸۴	۴۸۵	۰ء۵
اوشنیا	۱۳	۱۹	۲۱	۲۳	۲۳	۱ء۸
روس	۱۸۰	۲۴۳	۲۵۴	۲۶۷	۲۶۸	۰ء۹
پوری دنیا	۲۵۱۳	۳۶۷۸	۴۰۳۳	۴۴۱۵	۴۵۰۰	۱ء۸

یہ آبادی ملین میں ظاہر کی گئی ہے (ایک ملین = دس لاکھ)

اور شادی کے بعد کم پیدائش اولاد کو محدود کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

مالتھس کے اس نظریۂ آبادی پر جتنی نکتہ چینیاں کی گئی ہیں وہ "تنقید برائے تنقید" کا درجہ رکھتی ہیں۔ اصل مسئلے اور اس کے حل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ مثلاً نقادوں نے مالتھس کے اس فارمولے جو اس نے جیومیٹری اور حساب کی تدریجی رفتار سے وضع کیا، بہت اہمیت دی اور بے جا نکتہ چینی کی۔ سوال مثال کا نہیں بات کا تھا۔ اگر بات سچ ہے تو مثال اور سمجھانے کا انداز تو قابل ترمیم ہو سکتا ہے، اصل بات ہی قابل مذمت نہیں ہو جاتی۔

اس نظریے پر مخالف آرا کے باوجود ایک بات مسلم ہے کہ اس نظریے نے یورپ کے ممالک اور تعلیم یافتہ اقوام کے اذہان پر کافی اثر ڈالا۔ اس کے نتیجے میں وہاں ایک اور نظریہ بنا دیا گیا۔ جسے "مناسب ترین آبادی کا نظریہ" کا نام دیا گیا ——— اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ آبادی کی زیادتی یا کمی بذات خود کوئی چیز نہیں۔ کسی ملک کی آبادی میں اضافہ اس کے لیے باعث رحمت بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس سے اس ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوگا لیکن یہ ایک حد تک ہوگا اور جب ملک کی آبادی اس ملک کے تمام دستیاب وسایل کو کام میں لے آئے گی تو آبادی میں اضافہ اس حد تک بہتر اور اس حد کے بعد نقصان دہ ہوگا۔ لہٰذا اگر ابھی کچھ وسائل ہیں تو آبادی میں اضافہ مفید ہے ورنہ نقصان دہ۔ ہر وہ آبادی جو ملک کے وسائل میں اضافے اور اس کی فی کس آمدنی بڑھانے کی وجہ بن سکے۔ بہتر اور باعث برکت ہے۔ اب یہ ہر ملک کے اپنے حالات پر منحصر ہے کہ اس کی آبادی کی یہ "مناسب حد" کیا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے نا آشنا تھے...... آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خود کشی کا موسم کہلاتا ہے۔ ان امتحان کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے درمیان میں بچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ اسٹرائکیں نہیں ہوتیں اور امتحان کے سینٹروں کے دروازے اور شیشے نہیں توڑے جاتے۔

——— عبدالسلام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے'،

صحابہؓ نے جواب دیا کہ

'اللہ اور اس کا رسول زیادہ باخبر ہیں۔'

آپ نے فرمایا:

"تمہارا اپنے بھائی (مسلمان) کے بارے میں ایسی باتیں بیان کرنا جنھیں وہ ناپسند رکھتا ہو، غیبت ہے۔"

سوال کیا گیا اگر واقعی کوئی عیب موجود ہو اور اس کا اظہار کیا جائے تو کیا یہ بھی غیبت ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

"ہاں! اگر کسی واقعی عیب کو بیان کیا جائے تو یہ غیبت ہے اور اگر یہ عیب موجود نہیں ہے تو پھر اس قسم کا طرزِ عمل بہتان تراشی ہے۔"

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ٦، شمارہ ۳ (مارچ ۲۰۰۷ء)

راجہ مہندر پرتاپ سنگھ

[illegible]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جہاں تعلیمی اور ثقافتی میدان میں ملک کی شاندار خدمت انجام دی ہے وہیں اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے ایسے عظیم مجاہد پیدا کیے ہیں جن کے نام ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ انھیں مجاہدوں میں ایک قابلِ قدر نام راجہ مہندر پرتاپ کا بھی ہے جو اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ ایک واقعہ سے زیادہ ایک تاریخ تھے۔ ان کی زندگی جد وجہد اور قربانی کی زندہ کہانی ہے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اپنی جاگیر کو ٹھکرایا اور انگریز سرکار کے خلاف ایک باغی کا روپ لے کر ملک کو آزاد کرانے کے لیے نکل پڑے۔

راجہ مہندر پرتاپ ۱۸۸٦ء کو مرسان (علی گڑھ) میں پیدا ہوئے اور تین سال کی عمر میں ہاتھرس کے راجہ ہرنام سنگھ نے ان کو گود لے لیا اور آٹھ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۹۴ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل کرایا گیا جہاں ان کی تمام تر تعلیم اسی ادارے میں رہ کر ہوئی۔ جناب اشرف علی اور میر ولایت حسین جیسے استادوں کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ یہاں رہ کر انھوں نے مسلم تہذیب اور اسلام کی خوبیوں کو سمجھا اور مسلمانوں سے اچھے تعلقات قایم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے سرسید تحریک کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کی پوری زندگی پر سرسید تحریک کی بہت گہری چھاپ تھی۔ ایک مرتبہ بورڈنگ ہاؤس میں جب ان کے بڑے بھائی ان سے ملنے آئے تو وہ انگریز پولیس افسر سے ملاقات کرانے کے لیے راجہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر راجہ جی نے اپنے بھائی کی طرح اس انگریز پولیس افسر کی تعظیم میں سر نہیں جھکایا، بلکہ ہاتھ بڑھا کر اس کے ساتھ مساوی سلوک کیا۔

ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور ماریسن سے بھی ان کے نظریاتی اختلافات تھے۔ کیوں کہ مسٹر ماریسن طلبہ کے سیاسی تحریک میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے۔ اس کے علاوہ ہی مسٹر ماریسن حکومتِ برطانیہ کے مفاد کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور اس سلسلے میں بہت ہی حساس اور جذباتی واقع ہوئے تھے۔ جب کہ راجہ مہندر پرتاپ غیر ملکی تسلط کے سخت خلاف تھے۔

راجہ مہندر پرتاپ نے انھیں کی طرح کے سر پھرے والوں کے ساتھ مل کر آزادی کی ایسی شمع روشن کی جس میں آہستہ آہستہ حکومتِ برطانیہ جل کر خاک ہو گئی۔ وہ آزادی کے دیوانے تھے، اس دیوانگی میں انھوں نے اپنی عیش و آرام کی زندگی کو ترک کر دیا اور نکل گئے آزادی کی مشعل جلانے۔ اور مشعل بھی ایسی کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کا ایک ایک واقعہ روشن ہو گیا۔

سرسید کی طرح انھوں نے بھی ۲۴ مئی ۱۹۰۹ء کو متھرا کے قریب بندرا بن میں ایک اسکول قایم کیا جو ایک آزاد قومی تعلیمی ادارے کے روپ میں بہت مقبول ہوا۔ اس اسکول میں صنعتی اور تیکنیکی تعلیم کی مفت سہولت تھی۔

اسکول کے قیام کے لیے انھوں نے ۲۵ ہزار روپے عطیے کے ساتھ ہی اپنی ریاست کے پانچ گاؤں کی آمدنی سے ایک ٹرسٹ بنایا اور اس اسکول کا نام "پریم ودیالیہ" رکھا۔ اس اسکول کی تعریف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے ایک جگہ کہا ہے کہ

"۱۹۱۵ء سے راجہ مہندر پرتاپ کے لیے میرے دل میں بہت قدر پیدا ہو گئی۔ اس سے بھی پہلے جب میں افریقہ میں مقیم تھا تو مجھے راجہ مہندر پرتاپ کی عظمت کے بارے میں پتہ چلا۔ میں جب بندرا بن آیا اور میں نے جب اس عظیم ادارے کو دیکھا تو ان کے لیے میرے دل میں اور بھی زیادہ قدر بڑھ گئی۔ ان کی قربانی اور قومیت دونوں ہی ناقابلِ فراموش ہیں۔"

۱۹۰۹ء میں کلکتہ میں منعقد جب کانگریس کے اجلاس میں شرکت
کرنے کا ارادہ کیا تو اُن کے خسر نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ
دیا تھا کہ اگر اس اجلاس میں شرکت کی تو جیند کے دروازے ہمیشہ کے
لیے ان پر بند ہو جائیں گے۔ لیکن انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت
کو زیادہ عزیز سمجھا۔ یاد رہے کہ ان کی شادی طالب علمی کے زمانے
میں ہی جیند (پنجاب) کے مہاراجہ رنویر سنگھ کی چھوٹی بہن سے ہوئی
تھی۔ جیند کے مہاراجہ دوسرے راجاؤں کی طرح انگریزوں کے
بہت بڑے وفادار تھے۔

راجہ مہندر پرتاپ کو جب یہ یقین ہوگیا کہ آزادی
کی جدوجہد صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر کی جانی
چاہیے تو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں سات سمندر پار تحریک آزادی کو
حقیقی روپ دینے کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز کیا
اپنی زندگی کے ۳۲ سال انھوں نے ملک سے باہر گزارے اور
اس غیر ملکی سفر کی لمبی مدت میں وہ دنیا کے ایک کونے سے
دوسرے کونے تک آزادیٔ ہند کا پیغام لے کر گھومتے رہے
اور اس طرح پانچ مرتبہ پوری دنیا کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران
انھوں نے قیصرِ جرمنی، افغانستان کے شاہ امان اللہ خان، روسی
انقلاب کے عظیم لیڈر لینن، چین کے چیانگ کائی شیک، ترکستان
کے سلطان رشید، تبت کے چیف لامہ فاگ فالہ وغیرہ سے ملاقات
کی۔

اس غیر ملکی سفر کے دوران انھوں نے پہلی
جنگ عظیم اور روسی انقلاب کا بھی بہت گہرائی سے مطالعہ کیا۔
جرمن سرکار نے ان کا استقبال ہندوستان کے ایک انقلابی
لیڈر کے روپ میں کیا تھا۔ شہنشاہِ قیصر سے ملاقات کے
بعد راجہ جی کو برلن کے سفیر کی حیثیت سے افغانستان بھیجا گیا
اور مولوی برکت اللہ بھوپالی جو جرمن یونیورسٹی میں فارسی
کے استاد تھے، وہ بھی ان کے ساتھ افغانستان گئے

افغانستان میں راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی
یوم سالگرہ کے موقع پر یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو جلاوطنی کی زندگی
میں آزاد ہندوستان کی حکومت کا اعلان کر دیا اور اس کے وہ خود
صدر جمہوریہ مقرر ہوئے۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور مولانا
عبید اللہ سندھی کو وزیر داخلہ بنایا گیا۔ اس آزاد ہندوستان کی
حکومت کے قیام کے بعد انھوں نے افغانستان کے شہنشاہ سے ایک
معاہدہ بھی کیا۔

انھوں نے ۱۹۱۸ء کو ترکستان کے قاسم بیگ اور مولوی
برکت اللہ بھوپالی کے ہمراہ روس میں لینن سے ملاقات کی اور
ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے تعاون کی درخواست کی۔ لینن
سے ملاقات کے بعد وہ افغانستان لوٹ آئے اور انھوں نے افغانستان
کے شہنشاہ پر روس کی حکومت کو تسلیم کیے جانے کا دباؤ ڈالا
کیوں کہ افغانستان کے حکمرانوں پر ان کا بہت گہرا اثر تھا —
افغانستان دنیا کا واحد ملک تھا جس نے روس کو سب سے پہلے تسلیم
کیا۔ آج روس اور ہندوستان کے درمیان جو تعلقات ہیں وہ راجہ
مہندر پرتاپ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ جسے بعد میں پنڈت جواہر
لال نہرو، مسز اندرا گاندھی اور اب جناب راجیو گاندھی مزید مستحکم
بنا رہے ہیں۔

راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ
امریکہ بھی گئے جہاں انھوں نے غدر پارٹی کے لیڈران سے ملاقات
کی اور اس پارٹی کے جلسوں کو خطاب بھی کیا۔ امریکہ میں اپنے قیام کے
کے دوران مولوی برکت اللہ بھوپالی نے "اسلام کا اسلحہ" نام
کا ایک اخبار بھی نکالا اور کیلی فورنیا میں ہی ان کا انتقال ہوگیا
اور وہ وہیں دفن بھی ہوئے

راجہ جی نے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے نامور لوگوں
کو خطوط لکھے، اخبار نکالے اور کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء
میں "ورلڈ فیڈریشن" نام کا ایک اخبار نکالا جس کا خیال تہران
(ایران) میں پیدا ہوا اور منصوبے کو تحریری شکل ماسکو (روس)
میں دی گئی اور یہ اخبار امریکہ، چین اور جاپان سے ایک ساتھ شائع
ہوا۔ بعد میں ۱۹۴۶ء میں اس اخبار کو ہندوستان سے دوبارہ جاری
کیا گیا۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر تین درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ چار اخبارات کی ادارت بھی کی جن میں دو انگریزی میں اور دو ہندی میں تھے۔

وہ اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کی طرح ایک نیا مذہب چلانا چاہتے تھے اور اس مذہب کا نام انھوں نے "دین محبت" رکھا۔ دین محبت کا بنیادی مقصد تمام مذاہب کے درمیان میل ملاپ اور مساوات کو اجاگر کرنا تھا۔ ان کا دماغ ہندوؤں کے فرسودہ رسم و رواج سے بھی بغاوت کرتا تھا۔ وہ ہریجنوں کو مساوی درجہ دیتے تھے۔ کرشن جی کی جنم بھومی بندرابن کے مندر میں جب وہ داخل ہو رہے تھے تو مندر کے پجاری نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ جس پر انھوں نے اپنے کو ہریجن بتایا۔ ہریجن بتلانے پر ان کو مندر میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ اس مندر میں ہریجن کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی پجاری کو حقیقت کا علم ہوا اور ان سے مندر میں جانے کی درخواست کی۔ تب انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ میں ایسے بھگوان کے درشن کرنا نہیں چاہتا جہاں انسان، انسان کے درمیان تفریق ہو۔ وہ مُردوں کو جلائے جانے کے بھی سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت پہلے وصیت کر دی تھی کہ انھیں جلانے کے بجائے دفن کیا جائے۔

راجہ مہندر پرتاپ نے قومی یکجہتی کے ساتھ ہی عالمی برادری کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا۔ وہ پوری دنیا کو ا ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے تاکہ جنگ کے خطرات تمام ملکوں کو بچایا جا سکے۔ ہندوستان کو وہ آریائی صو چاہتے تھے۔

۳۲ سال کی جلاوطنی کے بعد جب وہ ۹ اگست ۱۹۴۶ اپنے مادر وطن واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ملک تشد فرقہ واریت کی آگ میں بری طرح جھلس رہا تھا۔ انھوں نے کی یہ حالت دیکھ کر عوام کو امن و محبت سے رہنے کا مش دیا لیکن ہندوستان کے لیڈروں اور عوام نے انھیں سمجھا۔

راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی مادر درس گاہ کو ہمیشہ عزیز سمجھا اور اس کے مفادات کو ترجیح دی۔ وہ اولڈ ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے بزرگ ترین اولڈ بوائے ہونے کی وجہ سے ان جلسوں کی بھی فرماتے تھے۔ پروفیسر علی محمد خسرو صاحب کی وائس چا میں جب یونیورسٹی کی صدسالہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا تو بھی وہ آخری بار شریک ہوئے اور آخر دم تک مسلم یونیور اپنے دیرینہ رشتہ کو برقرار رکھا۔

جب کسی ہم عصر مولوی نے البیرونی پر کفر کا فتویٰ اس وجہ سے لگایا کہ انھوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس میں نماز کا وقت معلوم کرنے کے لیے بازنطینی جنتری سے مدد لی گئی تھی تو البیرونی نے بگڑ کر کہا: "بازنطینی تو روٹی بھی کھاتے ہیں تو کیا آپ روٹی کے خلاف بھی مذہبی اعتراض کریں گے۔"

کائنات: تخلیق اور زندگی

ابرار حسین ترجمہ صغیر افراہیم

زمین جس پر ہم رہتے ہیں، آفتاب کے گھرانے کی ایک خاص رکن ہے۔ آفتاب کے کنبے کو ہم نظام شمسی کہتے ہیں۔ آفتاب کے چہار جانب ہماری زمین ہر وقت گردش کرتی ہے۔ زمین کی طرح آٹھ اور بھی سیارے ہیں جو آفتاب کے گرد مختلف دائروں میں چکر لگاتے ہیں آفتاب سے فاصلوں کے حساب سے دوسرے سیاروں کے نام اس طرح ہیں!۔

عطارد یا کاتب فلک، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، ہرشل نیپچون اور پلوٹو۔

ان سیاروں کے علاوہ سیارچے بھی نظام شمسی کے ممبر ہیں تقریباً ہر سیارے کے کچھ سیارچے ہیں۔ سیاروں اور سیارچوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ سیارے آفتاب کے چاروں طرف گھومتے ہیں اور سیارچے اپنے سیاروں کے چہار جانب گردش کرتے ہیں۔ آفتاب کے کنبے کی طرح کئی اور خاندان اس کائنات میں موجود ہیں۔ چوں کہ آفتاب کا گھرانہ زمین سے قریب تر ہے۔ اس لیے آفتاب کے کنبے کے علاوہ ہم دوسرے نظام کے بارے میں کم واقفیت رکھتے ہیں۔ صحیح پوچھیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے نظام شمسی کے بارے بھی بہت کم جانتے ہیں۔

ذہن انسانی میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ اس نظام شمسی نیز ساری کائنات کی تخلیق کب، کیسے اور کیوں ہوئی؟ اور کیا زمین کی طرح زندگی دوسرے سیاروں پر بھی ہے یا نہیں؟ مذکورہ سوالوں کے جوابوں کے لیے انسان برسہا برس سے تلاش میں مصروف ہے۔ اور آج یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سیاروں پر زندگی موجود ہے کہ نہیں؟ اس بارے میں جو معلومات حاصل ہوسکی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ماہرین فلکیات اور اعلیٰ توانائی طبیعیات کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کائنات کے سارے سیارے اور سیارچے نہ صرف متحرک ہیں بلکہ ٹوٹتے پھوٹتے بھی رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نئے نئے آفتاب سیارے اور سیارچے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو آپ آسمان پر دیکھتے ہوں گے کہ یکایک بہت تیز روشنی یا آگ سی پیدا ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ کچھ حصوں میں منقسم ہو گئی۔ دراصل اس طرح ایک بڑے دھماکے کے ساتھ کوئی آفتاب، سیارہ یا سیارچہ ٹوٹ جاتا ہے جس کو بالانو تارہ کہا جاتا ہے۔ اس انشقاقی عمل سے اس نظام میں ناپائیداری آجاتی ہے جس کی وجہ سے سیارے اور سیارچے آپس میں ٹکراتے ہیں اور نئے سیارے، سیارچے وجود میں آتے ہیں۔ بہرحال یہ سوال غور طلب ہے کہ کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس کا جواب سائنسدانوں نے مختلف اصولوں کی بنا پر دیے ہیں جن میں سب سے زیادہ قبولیت بڑے دھماکے کے 'نظریے' کو حاصل ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفتابوں کی درمیانی دوری وقت کے ساتھ بڑھ رہی ہے، جس کی وجہ سے کائنات وسیع ہو رہی ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی بعید پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تمام آفتاب کبھی نہ کبھی بہت قریب رہے ہوں گے۔ تقریباً بارہ سے پندرہ ارب سال پہلے کا تصور کریں تو احساس ہوگا کہ اس وقت نہ صرف یہ سب آفتاب، سیارے اور سیارچے بیحد نزدیک بلکہ ایک ہی رہے ہوں گے۔ بارہ سے پندرہ ارب سال پہلے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا جس کی وجہ سے نظام (اس وقت جو بھی رہا ہو) درہم برہم ہوا اور پھر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر آپس میں ٹکرایا۔ رفتہ رفتہ ان ٹکڑوں کے بیچ کی دوری بڑھتی گئی۔ آج جو کائنات ہم دیکھ رہے ہیں وہ بارہ سے پندرہ ارب سال پہلے سے مختلف ہے۔ ماہرین فلکیات اور اعلیٰ توانائی طبیعیات کے سائنس دانوں کے مطابق بڑے دھماکے کے ۱۰-۴۳ سیکنڈ = ۱/۱۰۰۰۰ بعد

حصّہ کا درجۂ حرارت تقریباً 10^{12} [1] ڈگری کیلون رہا ہوگا۔ اور اس حصّہ میں پروٹان، نیوٹران، الکٹران، پوزیٹران، میوآن، اینٹی میوآن اور دوسرے ذرّے موجود رہے ہوں گے۔ یہ وہ ذرّے ہیں جن کو آج ہم بنیادی ذرّوں کے نام سے جانتے ہیں۔

بڑے دھماکے کے 10^{-2} سکنڈ بعد اس حصّہ کا درجۂ حرارت ۱۰ ڈگری کیلون رہا ہوگا اور میوآن اور اینٹی میوآن آپس میں مل کر فوٹان میں تبدیل ہوگئے ہوں گے۔ مذکورہ دھماکہ کے دس سکنڈ بعد الکٹران اور پروٹان آپس میں ملنے گئے اور یہ عمل تقریباً بیس منٹ تک چلتا رہا اور اس کے بعد کچھ الکٹران باقی رہ گئے ہونگے۔

مذکورہ دھماکہ کے تین منٹ بعد اس حصّہ کا درجۂ حرات تقریباً ۱۰ ڈگری کیلون رہ گیا ہوگا Deuterium کے مرکز میں ایک پروٹان اور ایک نیوٹران ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس طرح ایک نیوٹران اور ایک پروٹان کے اور شامل ہوجانے سے ہیلیم کا وجود ہوا ہوگا۔ اس وقت اس حصّے میں تقریباً ۲۶ فیصد ہیلیم اور ۷۴ فیصد ہائیڈروجن رہی ہوگی۔

اس عظیم دھماکے کے سات سال بعد یہاں کا درجۂ حرارت تقریباً چار ہزار ڈگری کیلون رہ گیا ہوگا۔ اس درجۂ حرارت پر ہائیڈروجن اور ہیلیم کے مرکزوں کے چاروں جانب کسی بھی دائرے میں الکٹران رہ سکتے ہیں لہٰذا مادّوں کی دوری آپس میں بڑھتی گئی اور درجۂ حرارت میں کمی آتی گئی۔

بڑے دھماکے کے تقریباً ایک ارب سال بعد اس حصّہ کے مادّوں کا درجۂ حرارت پہلے سے بہت کم ہوتا گیا اور ہائیڈروجن اور ہیلیم کے جوہر کائنات میں پھیلتے گئے۔ تناسب کی زیادتی کی بنا پر کہیں ہیلیم اور کہیں ہائیڈروجن زیادہ مقدار میں جمع ہوتا گیا۔ جہاں جہاں ان مادّوں کے جوہر زیادہ ہوں گے وہاں ان کے مرکزوں کے درمیان قوت بھی بڑھتی گئی ہوگی۔ لہٰذا نتیجے کے طور پر ان کے جوہر قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور سحابیہ (نیبولا) کی شکل بنتی گئی۔ چوں کہ سحابیہ کی کثافت بہت زیادہ تھی، اس لیے ان کے جوہر آپس میں ٹکراتے ہوں گے۔ ٹکرانے کی وجہ سے ان کی حرکی توانائی کم ہوتی گئی۔ یہ بھی گمان ہے کہ مذکورہ صورت حال میں یہ حصّہ گھومتا رہا اور کسی ایک موقع پر جوہروں کے بیچ کی تجاذبی توانائی کافی مقدار میں ایک دھماکے کے ساتھ نکلی اور اس حصّے کے سارے مادّے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ نیز طرح طرح کے کثافت کے حصّے آفتاب، سیّارے اور سیارچے کی شکل میں سامنے آئے۔ اس طرح ہماری کائنات کی تخلیق ہوئی، ایسا سمجھا جاتا ہے۔

انسان یہ جاننے کا متمنی رہا ہے کہ جو سیّارے یا سیارچے ہمارے نظامِ شمسی میں موجود ہیں، ان میں زندگی ہے یا نہیں؟ ماہرین فلکیات اس راز کو فاش کرنے کے کوشاں ہیں وہ آج بھی اس سراغ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

آفتاب سے قریب تر سیارہ عطارد (کاتبِ فلک) ہے۔ اس سیّارے کی آفتاب سے دوری تقریباً ۵۸ ملین کیلومیٹر ہے۔ اس کا درجۂ حرارت 700 °K سے 1000 °K تک رہتا ہے۔ اس سیارے کے اندر تجاذبی قوت بہت کم ہے۔ اس درجۂ حرارت اور کم تجاذبی قوت کی وجہ سے کوئی بھی گیس اس کے اندر نہیں رہ سکتی ہے۔ اسی لیے یہاں زندگی ناممکن ہے۔ ۱۹۷۴ء میں Mariner 10 خلائی گاڑی کے ذریعے عطارد کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس گاڑی کے ذریعے لی گئی تصویروں سے معلوم ہوا ہے کہ کاتبِ فلک کی سطح ماہتاب کی سطح جیسی ہے اور اس کا رنگ پیلا سا ہے۔ سیارے کے اندر ہائیڈروجن اور ہیلیم کے کچھ نشانات موجود ہیں۔ مختلف تجربوں سے ظاہر ہوا ہے کہ عطارد کے اندرونی حصّہ میں لوہے اور نکل کے ذخائر ہیں جن کی کثافت بہت زیادہ ہے۔ یہ سیارہ آفتاب کے گرد ایک مکمل چکّر ۵۹ دن میں پورا کرتا ہے۔

عطارد کے بعد آفتاب سے دوری میں زہرہ کا نمبر ہے۔ زہرہ کی آفتاب سے دوری تقریباً ۱۰۹ ملین کیلومیٹر ہے۔ نیز اس کا درجۂ حرارت تقریباً 577 °K ہے۔ اس سیّارے کو خالی آنکھ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ہمیں اس کا صحیح وقت اور رُخ معلوم ہو۔ زہرہ زمین سے بہت قریب ہے۔ دوربین سے دیکھنے پر پتا چلا ہے کہ یہ سیارہ ٹھوس نہ ہوکر مختلف گیسوں سے مل کر بنا ہے۔ کیوں کہ سیارہ

---

[1] 10^{12} برابر ہے دس کھرب 1000000000000 کے

چہار جانب گیس موجود ہے۔ اسی بنا پر زہرہ کے اندر کی باتیں معلوم بنا بے حد مشکل ہے۔ یہ سیارہ آفتاب کے گرد ایک چکر ۲۲۵ دن اور گھنٹے میں پورا کرتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں روس نے سوویت پروب وینرا۔ 8 کو زہرہ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے خلاء میں بھیجا تھا۔ اس کھوج کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ زہرہ کے مرکز میں پوٹیشیم، یورینیم اور تھوریم کے ذخائر موجود ہیں اور اس کا مرکز ٹھوس ہے۔ دوسرے تجربوں سے پتا چلا ہے کہ پوٹیشیم، یورینیم اور تھوریم کے علاوہ کاربن ڈائی آکسائیڈ نائٹروجن، آکسیجن اور بہت کم مقدار میں پانی بھاپ کی شکل میں موجود ہے۔ ماضی قریب میں سائنس دانوں نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس سیارے پر جوالامکھی ہیں جن سے سلفر ڈائی آکسائیڈ نکلتی ہے۔ حالانکہ یہ جوالامکھی آج کل خاموش ہیں۔ اس سیارے کو زمین کا ہمزاد بھی کہا جاتا ہے۔

آفتاب سے دوری میں زہرہ کے بعد زمین کا شمار ہے۔ یہ وہ سیارہ ہے جس پر ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ زمین آفتاب کا ایک چکر ۳۶۵ دن میں پورا کرتی ہے۔ اس سیارے کی آفتاب سے دوری تقریباً ۱۴۹ ملین کیلومیٹر اور درجۂ حرارت +59 °F ہے۔ ماہتاب زمین کا اکلوتا سیارچہ ہے۔

زمین کے بعد مریخ کا نمبر ہے جو آفتاب سے تقریباً ۲۲۶ ملین کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اس کا درجۂ حرارت °F ۵۰ رہتا ہے۔ اس درجۂ حرارت پر زندگی ممکن ہے۔ سائنس دانوں کا شروع سے خیال ہے کہ چوں کہ مریخ کا درجۂ حرارت ایسا ہے کہ اس پر زندگی کے آثار ہونے چاہئیں۔ لہٰذا روس اور امریکہ کے سائنس دانوں نے اس کی تلاش کے امکانی جتن کیے۔ دونوں ملکوں کے سائنس دانوں کا یقین ہے کہ اگر زندگی کا وجود نہ بھی ملا تو ان گاڑیوں کے ریکارڈ یہ بتائیں گے کہ اس سیارے پر کبھی زندگی رہی ہے یا نہیں؟ اسی تجسس کی بنا پر مریخ کو سائنس دانوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۶ء تک مریخ کے مطالعہ کے سلسلے میں کئی خلائی مشنس بھیجے گئے جن میں Mariner-10 اور وائی کنگ ۱ اور ۲ اہم ہیں۔ ان مشنوں کے نتائج کے ذریعے جو معلومات فراہم ہوئی ہیں، ان کے مطابق مریخ کی ساخت ماہتاب جیسی ہے۔ اس کے جغرافی اور موسم زمین سے بڑی حد تک ملتے ہیں۔ جس طرح زمین پر پانی سے بھاپ اور پھر بادل بنتے ہیں، اسی طرح کا عمل مریخ پر بھی ہوتا ہے۔ موسمی بارش اور بڑے بڑے طوفان اُٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ طوفان اتنی بھیانک شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ سارا سیارہ اس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ موسمی وجوہات کی بنا پر جو قلمی چٹانیں مریخ پر تقریباً ۴،۶ بلین سال پہلے بنی تھیں وہ ٹوٹ پھوٹ کر پاوڈر کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ مریخ کا درجۂ حرارت اور اس کی ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے وہاں پانی اصل شکل میں نایاب ہے۔ وہ بھاپ کی صورت میں برف کے تودوں کی طرح ملتا ہے۔ خلائی گاڑیوں کے ذریعے لی گئی تصویروں سے معلوم ہوا کہ مریخ پر واٹر بیڈ کے روپ میں بڑے بڑے میدان ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ بہت پہلے اس سیارے پر پانی یا کوئی رقیق چیز موجود تھی۔

۱۹۷۲ء میں Mariner - 4 کو مریخ پر بھیجا گیا اور دوربین کے سہارے بہت سی تصویریں لی گئیں۔ ان تصاویر سے وہاں کا سطحی دباؤ تقریباً ۸۵ ملی بار شمار کیا گیا ہے جو زمین کے سطحی دباؤ سے تقریباً دس فیصد کم ہے۔ مذکورہ خلائی مشنوں کے ذریعے جو اطلاعات ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیارے پر نائٹروجن کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی موجود ہے۔ Mariner-4 کے مطابق یہاں ۸۷ فیصد کاربن ڈائی آکسائڈ، ۲.۵ فیصد نائٹروجن ۱.۵ فیصد آرگن، ۰.۱ فیصد آکسیجن اور کرپٹن کے علاوہ زینون نیون اور ہیلیم بھی موجود ہے۔ کبھی کبھی انسانی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ جب مریخ کی فضا زمین سے مشابہت رکھتی ہے تو پھر زندگی کیوں نہیں ہے؟ وائی کنگ مشن کا اولین مقصد مریخ پر حیاتیاتی تجربہ کرنا تھا لیکن اس کے نتائج بھی زندگی سے متعلق نفی میں ہیں۔

وائی کنگ خلائی گاڑی کو ۱۹۷۵ء میں Cap Canaveral سے چھوڑا گیا تھا جو جولائی ۱۹۷۶ء میں مریخ پر پہنچا تھا۔ وائی کنگ ۱ ۲۰ جولائی کو اور ۲ اس کے چھ ہفتے بعد مریخ پر پہنچا تھا۔ دونوں

فلائی گاڑیاں ایک مخصوص دوری اور مقام پر اتاری گئی تھیں۔ تاکہ وہاں سے پورے سیارے کی واقفیت حاصل ہوسکے۔ لیکن یہ بھی زندگی کو تلاش کرنے میں ناکام رہی ہیں، یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ سائنس داں اس پر مصر ہیں کہ مریخ کا مطالعہ اور زیادہ گہرائی سے کیا جائے۔ ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ ضروریات زندگی کے موجود ہونے کے باوجود اس کے آثار نہ ہوں؟ مریخ کے دو سیارچے ہیں جو اس کے گرد گھومتے ہیں۔

مشتری، آفتاب سے دوری کے حساب سے پانچویں نمبر پر ہے۔ اس کا فاصلہ تقریباً ۷۸،، ملین کیلو میٹر اور درجۂ حرارت 200 °F- ہے۔ مشتری، زمین سے تقریباً ۳۱۸ گنا وزن میں زیادہ بڑا ہے۔ مذکورہ سیارے میں قوت کشش زیادہ ہے۔ یہاں ہائیڈروجن گیس دھات کی شکل میں ملتی ہے۔ اس کی سطح اور فضا ہائیڈروجن، ہیلیم، امونیا نیز دوسری گیسوں سے مل کر بنی ہے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مشتری کا ایک سال صرف بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اگر سیارے کو بغور دیکھا جائے تو اس پر ایک بہت بڑا سرخ نشان نظر آئے گا۔ یہ لال دھبہ تقریباً پچاس ہزار کیلو میٹر پر مشتمل ہے۔ اس کی اصلیت جاننے کے لیے سائنس داں کوشاں ہیں۔ Pioneer 10 سے لی گئی تصاویر کے بموجب سرخ نشان کا درجۂ حرارت بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے جو گیس اور دھات یہاں موجود ہے وہ منجمد شکل میں ہے۔ اس سیارے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ نور افشانی بھی کرتا ہے۔ اس سے نکلنے والی شعاعیں آفتاب سے حاصل شعاعوں سے تقریباً دوگنی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشتری میں قوت مہیا ہوتی ہے جب کہ دوسرے سیارے اس صلاحیت سے مبرا ہیں۔ اس سیارہ کے بارے میں یہ بھی گمان ہے کہ اس کے مرکز میں تجاذبی بیٹھاؤ ہے جس کی وجہ سے قوت نکلتی ہے۔ مشتری کے بارہ سیارچے ہیں۔

فاصلوں کے لحاظ سے مشتری کے بعد زحل کا شمار ہوتا ہے۔ یہ سیارہ مشتری سے بڑی مشابہت رکھتا ہے لیکن اس کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ اس کے چہار جانب چند چھلے رقص کرتے رہتے ہیں۔ زحل کی کثافت تقریباً ۰.۶۵ گرام / سینٹی میٹر کیوب ہے۔ یہ جسامت میں مشتری سے چھوٹا ہے۔ اس طرح اس کا وزن اس کی جسامت کے حساب سے بہت کم ہے۔ اسے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے پاس پانی کا ایک بہت بڑا ٹب ہو اور اس میں زحل کو ڈال دیا جائے تو وہ ٹب میں تیرتا نظر آئے۔ اس سیارے پر تقریباً ۶۵ فیصد ہائیڈروجن ۱۰ فیصد ہیلیم اور ۱۵ فیصد وزنی دھاتیں موجود ہیں۔ اس سیارے کو مردہ سیارے کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ زحل کے تقریباً دس سیارچے ہیں۔

ہوشل آفتاب سے تقریباً ۲۸۵۲ کیلو میٹر کی دوری پر ہے اور اس کا درجۂ حرارت ۲۸۰ °F- ہے۔ اس درجۂ حرارت پر زندگی ممکن نہیں ہے۔ اس سیارے کا ایک سال زمین کے ۸۴ سال کے برابر ہے۔ ہوشل کا قطر ۵۱۸۰۰ کیلو میٹر مانا گیا ہے۔ سائنس دانوں نے مختلف تجربوں کی بنا پر دریافت کیا ہے کہ اس کی فضا میں امونیا اور میتھین گیسیں موجود ہیں جو زندگی کے لیے بہت نقصان دہ ہیں۔ یہ واقفیت ۱۹۵۲ء میں INFRARED - SPECTROSCOPY - سے حاصل کی گئی ہے۔

نیپچون آفتاب سے دوری میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اس کا فاصلہ تقریباً ۴۴۹۶ ملین کیلو میٹر، قطر ۴۹۵۰۰ کیلو میٹر اور درجۂ حرارت 320 °F- ہے۔ نیپچون کی فضا میں بھی امونیا اور میتھین گیسیں پائی گئی ہیں۔ اس لیے مذکورہ سیارے کو ہوشل کا ہمزاد کہا جاتا ہے۔ نیپچون پر بھی زندگی ممکن نہیں ہے۔ اس کے دو سیارچے ہیں۔

یمراج آفتاب سے تقریباً ۵۸۹۶ ملین کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔ اس کا درجۂ حرارت 350 °F- بتایا جاتا ہے۔ یمراج کا قطر ۶۰۰۰ کیلو میٹر اور سال ۲۴۸ زمین کے سال کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سیارہ ۶.۳۹ دن کے بعد نظر آتا ہے۔ اس بات کا علم اس کے چمکنے سے ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ سیارہ گھومتا رہتا ہے۔ یمراج زمین سے سب سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس لیے سائنس داں اس کا عمیق مطالعہ ابھی تک نہیں کر سکے ہیں۔ یمراج کی فضا میں کیا ہے؟ ماہرین فلکیات جاننے کے لیے بیقرار ہیں اور بعید طاقتور دوربین بنانے میں مصروف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یمراج کے بعد بھی ایک سیارہ ہے جس کو ایکس سیارہ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہم مستقبل میں

باقی صفحہ ... پر

عہدِ منصور کے نامور اطبّاء اور منجمین

عبد الباری بیگ

عروج وزوال دو ایسے حقایق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں
سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو فرد، قوم یا سلطنت بامِ عروج کو پہنچی
، وہ زوال وانحاط کا بھی شکار ہوتی ہے۔ دولت بنی امیّہ کا آفتاب
ب غروب ہوا تو خلافت بنی عباس کا آفتاب ۱۳۲ھ/ ۷۵۰ء میں
وع ہوا اور ۲۴۶ھ/ ۸۶۱ء میں اس کا بھی زوال ہوا۔ یہاں تک
۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں یہ غروب ہوگیا[1] اس مدّت میں ۳۷ تخت نشین
زرے۔ پہلا تخت نشین اگرچہ ابوالعباس سفاح تھا جس نے صرف
ار سال حکومت کی۔ لیکن پہلا نامور حکمراں اس کا بھائی ابوجعفر منصور
قا جو ۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء میں مسند خلافت پر متمکن ہوا اور ۶ دن کم ۲۲
سال تک حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں علمی ترقی بہت زیادہ
وئی۔ گو وہ بخل یا حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری میں بدنام تھا — لیکن
س نے علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے لیے شاہانہ حوصلہ کا مظاہرہ
یا اور خزانوں کا منہ کھول دیا۔

علم وفن کے مختلف میدانوں میں جو ترقی ہوئی اس کا اصل سبب یہ
تھا کہ منصور خود بہت بڑا عالم اور صاحبِ فضل وکمال تھا۔ امام مالکؒ
نے ایک موقع پر فرمایا[2]

"منصور نے میرے ساتھ علمائے اولین اور سلف صالحین
کے متعلق گفتگو کی تو میں نے اسے سب سے زیادہ ذی علم
پایا۔ فقہ اور دوسرے علوم پر باہم مذاکرہ ہوا تو یہ
تمام متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل کا بہت بڑا عالم
ثابت ہوا۔ تمام روایتیں اسے ازبر تھیں، مرویات
پوری طرح حفظ تھیں۔"

منصور کے علمی ذوق اور اشاعت علم سے دلچسپی کا حال یہ تھا
کہ یونان کے علوم وفنون کا جو سرمایہ خود اس کے ملک میں پہنچ سکتا تھا
اس پر اس نے اکتفا نہیں کیا بلکہ قیصرِ روم کو خط لکھا کہ وہ کتب تعلیم
کی اہم کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کر کے بھیجیں۔ چنانچہ شاہ نے
اقلیدس اور طبیعیات کی بعض کتابیں منصور کے پاس بھیج دیں۔ جن کو
مسلمانوں نے پڑھا اور ان میں جو کچھ تھا ان سے واقف ہوئے۔ اس سے
شوق اور بڑھا اور بقیہ علوم کے فتح باب کی لگن ان کے دل میں سمائی۔[3]

چوں کہ منصور خود ایک اچھا اسکالر تھا۔ اس لیے علم داں حضرات
کی قدر بھی کرتا تھا۔ ماہرین علم وفن میں معتد بہ تعداد عجمیوں کی تھی۔ اس کے
دربار میں ایرانیوں، یہودیوں اور نسطوریوں کا بہت زیادہ اثر ورسوخ
تھا اور انھوں نے سائنس کی ترقی میں اور مختلف زبانوں سے عربی میں
تراجم کے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ جارج سارٹن لکھتا ہے[4]

"جہاں تک مسلم علماء، مثلاً القاضی، ابو یوسف، مالک بن
انس، ابن اسحٰق وغیرہ کا تعلق ہے وہ اصلاً تاریخ داں
اور ماہرین دینیات تھے نہ کہ سائنس داں۔ صحیح معنوں میں
جن کو سائنس داں کہا جا سکتا ہے وہ یا تو ایرانی تھے یا
یہودی یا عیسائی۔"

علم طب: — بنو امیّہ کے زمانے میں تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی
تھی۔ باقاعدہ تصنیف وتالیف کا کام منصور کے دورِ خلافت میں شروع
ہوا۔ منصور نے سریانی، یونانی، فارسی اور سنسکرت میں لکھے ہوئے جو علوم

سے عربوں کو روشناس کرایا ان میں سے ایک علم طب بھی تھا۔ اس پر جن
کمار اور مصنفین نے کام کیا ہے ان میں سے قابلِ ذکر افراد درج ذیل ہیں۔

۱۔ جورجیس بن جبرئیل بن بختیشوع

یہ وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے دولتِ عباسیہ میں طب کی تصانیف
کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ نسطوری عیسائی فرقہ سے متعلق تھا[۵]۔ منصور کے
دور کا مشہور مترجم تھا۔ ترجمہ کے علاوہ اس نے ایک کتاب بھی لکھی جو
کتاب الکناش کے نام سے مشہور ہوئی[۶]۔

جورجیس ۷۶۵ء تک جندیشاپور کے اسپتال کا نگراں اور
ذمہ دار تھا۔ ۱۴۸ھ/۷۶۵ء میں جب منصور کو ضعف معدہ، بدہضمی اور
قلت جوع کی شکایت پیدا ہوئی۔ تب اس نے تمام اطباء کے مشورے
سے جورجیس ہی کو اپنے علاج کے لیے طلب کیا۔ پہلے تو جورجیس نے لیت ولعل
سے کام لیا لیکن شاہی حکم کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ بالآخر وہ اپنے
دو شاگردوں، ابراہیم اور سرجیس، کے ساتھ جانے کے لیے تیار
ہوگیا اور اپنے بیٹے بختیشوع کو شفاخانے کا نگراں بنا دیا۔ روانگی
کے وقت بختیشوع نے اپنے والد سے کہا کہ آپ کی عدم موجودگی میں
عیسٰی بن شہلافا مریضوں کو تنگ کرے گا۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ لے
جائیے اور سرجیس کو چھوڑ جائیے۔ چنانچہ اس نے اسی پر عمل کیا۔

جب جورجیس مدینۃ السلام (بغداد) پہنچا تو اس نے پہلے
دربارِ منصور میں پہنچ کر بادشاہ کے لیے فارسی اور عربی میں دعا کی۔
بادشاہ اس کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور جب صحت
مند ہوگیا تو اس نے خوش ہوکر انعام و اکرام سے نوازا۔

جورجیس جندیشاپور ۷۶۹ء میں پہنچا اور اس کا انتقال
۷۷۱ء میں ہوا۔ یہ خاندان منصور کے عہد سے لے کر ۱۰۵۹ء تک عباسی
خلفاء کے دربار سے وابستہ رہا اور برابر علوم طبیہ کی خدمت انجام
دیتا رہا۔ اس خاندان سے آٹھویں اور نویں صدی میں طبِ اسلامی
پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے[۷]۔

جورجیس کے مشہور شاگرد جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے
وہ صرف چار تھے۔ بختیشوع بن جبرئیل (۲) عیسٰی بن صہاربخت
(چہاربخت، صہربخت) (۳) ابراہیم (۴) عیسٰی بن شہلانا۔
لیکن ان میں سے صرف دو منصور کے دربار سے وابستہ رہے اور
طب کی خدمت کرتے رہے۔

(الف) عیسٰی بن شہلانا

یہ بہت ہی ماہر طبیب تھا اور جورجیس کے ساتھ منصور
کے دربار میں گیا تھا۔ جب جورجیس بیمار ہوکر اپنے وطن واپس آنے لگا
تو منصور نے درخواست کی کہ وہ جندیشاپور پہنچنے کے بعد اپنے لڑکے
بختیشوع کو بغداد روانہ کردے۔ لیکن جورجیس رضامند نہ ہوا اور
کہا کہ چونکہ جندیشاپور میں اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے
میں اپنے شاگرد عیسٰی بن شہلافا کو مقرر کرتا ہوں جو کہ طبیب حاذق
ہے۔ اس طرح وہ منصور کے دربار میں ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن بعد
میں بداعمالی کے نتیجے میں نکال دیا گیا[۹]۔

(ب) ابراہیم:

دوسرا شاگرد جس کو جورجیس نے منصور کی خدمت میں
بھیجا اس کا نام ابراہیم تھا۔ جورجیس پہلے عیسٰی بن صہاربخت کو
بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن بادشاہ کے انکار کرنے پر ابراہیم کو بھیجا اور
عیسٰی جندیشاپور کے شفاخانے ہی میں فرائضِ طبابت انجام دیتا رہا[۱۰]۔

عبداللہ بن المقفع:

جن لوگوں نے منصور کے لیے کتابیں فراہم کیں اور طب کی
کتابوں کے ترجمے کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا، ان میں ایک عبداللہ
بن المقفع بھی تھا۔ یہ عربی زبان کا بہت ہی فصیح و بلیغ شخص تھا۔
اس کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد عربی
میں کمال پیدا کیا پھر اس نے فارسی سے عربی میں کئی کتابوں کو
منتقل کیا۔ ابن ندیم لکھتا ہے[۱۱]

"اہلِ ایران نے زمانۂ قدیم میں منطق اور طب کی کچھ
کتابیں فارسی زبان میں منتقل کی تھیں، جنھیں عبداللہ
بن المقفع نے عربی کا جامہ پہنایا۔"

یہ فارسی الاصل تھا۔ بغداد میں پروان چڑھا۔ جہاں اس کو ۷۵۰-۷۵۶ء
میں قتل کردیا گیا تھا[۱۲]۔ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابو عمرو
تھی اور قبولِ اسلام کے بعد اس نے اپنی کنیت ابو محمد رکھ لی۔

ابو یحییٰ بطریق:

یہ بھی عہد منصور کا بہت مشہور مترجم گزرا ہے۔ یہ غالبا ...سائی تھا۔ اس کی وفات تقریباً ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء میں واقع ہوئی ...نے منصور کے حکم سے یونانی علم و فن کی بہت سی کتابیں عربی ...منتقل کیں۔ بقراط اور جالینوس کی جن کتابوں کے ترجمے کیے وہ ...تویں صدی ہجری تک متداول رہے۔ بطلیموس قلوذی کی تصنیف ...کتاب الاربعۃ" کا ترجمہ اسی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

ابن اللجلاج:

منصور عباسی کے دور میں ایک مشہور طبیب تھا۔ اس ...طب کی خدمت میں اپنی پوری عمر گزار دی۔ جب منصور آخری حج ...جس میں منصور کی وفات ہو گئی تھی) کے لیے گیا تو اس کے ساتھ ...نجوں میں سے ابوسہل بن نوبخت اور اطباء میں سے ابن اللجلاج تھا۔

علم نجوم

یہ علم بھی منصور کی توجہ کا مرکز تھا اور اس کے عہد میں محض ...س کی اس علم سے دلچسپی کی وجہ سے کافی ترقی ہوئی۔ علامہ جلال الدین ...پنی تاریخ الخلفاء میں محمد بن علی الخراسانی کا یہ قول نقل کرتے ...یں:

> " منصور وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو مقرب بنایا اور نجوم کے احکام پر عمل کیا اور سب سے پہلے اسی کے لیے سریانی اور عجمی کتابوں کے ترجمے عربی میں ہوئے۔"

علم نجوم کی طرف منصور کی توجہ کا سبب یہ تھا کہ اس کو احکام نجوم ...پر بہت زیادہ اعتقاد تھا۔ چنانچہ وہ جب اپنی خرد اور تدبیر سے کوئی ...کام کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو پہلے اس سلسلے میں منجمین سے رائے اور ...مشورہ لیا کرتا تھا اور پھر ان کے احکام پر عمل کرتا تھا۔ بعد کے عباسی ...خلفاء نے اس معاملے میں منصور ہی کی پیروی کی۔

عہد منصور میں جو مشہور منجم تھے اور جن کی بدولت یہ علم آگے بڑھا ...وہ زیادہ تر ایرانی تھے۔

۱) نوبخت: یہ ایک مشہور ایرانی منجم اور انجینیر گزرا ہے

منصور کے دربار میں اس کا مرتبہ کافی بلند تھا۔ یہ بہت بڑا صاحب علم و فضل تھا۔ اس کی وجہ سے فارسی زبان کے بہت سے ذخیرے عربی میں منتقل ہوئے اور اعلیٰ صلاحیت کی وجہ سے مترجمین کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ ذبیح اللہ صفا لکھتا ہے:

> نخستین فرد این خاندان نوبخت کہ در تاریخ تمدن اسلامی مقامی بزرگ دارد نوبخت از مردم اہواز بود و خود را از نژاد گیو پسر گودرز میدانست و در علم نجوم و احکام آن استاد بود نوبخت تا وقتیکہ بخدمت منصور درآید بر آئین زرتشتی بود و پس از آن باسلام گرایید۔"

نوبخت خلافت منصور کے آخری دور تک زندہ رہا اور تقریباً ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء میں دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ماشاء اللہ کے ساتھ مل کر بغداد (۱۴۵ھ / ۷۶۲ء) کی تعمیر سے متعلق ابتدائی پیمائش کی۔ دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم نجوم پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام کتاب الاحکام ہے۔

ابوسہل بن نوبخت:

یہ علم نجوم میں بہت ماہر تھا۔ ستاروں کے ملاپ اور اس ملاپ کے نتائج سے بخوبی واقف تھا۔ جب نوبخت بہت ضعیف ہو گیا تو منصور کے حکم کے مطابق اس نے اپنے لڑکے ابوسہل ہی کو اپنی جگہ مقرر کیا۔ چنانچہ جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو منصور نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام " خرشاذ ماہ طیماذاہ باذار دباد خسرو انشاہ" بتایا۔ خلیفہ نے پوچھا یہ سارا نام تمہارا ہی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں! منصور ہنس پڑا اور کہنے لگا تمہارے والد کو تمہاری پرواہ نہیں تھی۔ اب دو باتوں میں سے ایک بات مان لو یا تو اپنا نام مختصر کر کے صرف طیماذ رکھو یا ابوسہل کنیت کو منتخب کر لو تاکہ تمہیں پکارنے میں آسانی رہے۔ اس نے یہ کنیت پسند کر لی اور اب وہ اسی نام سے موسوم ہے۔

ابن ندیم کے مطابق " یہ ہارون رشید کے خزانۃ الحکمت

بلکران تھا (اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی نے
نک وفا کی) اس نے فارسی سے عربی میں ترجمے بھی کیے۔ اس کا
دار و مدار اہلِ فارس کی کتابوں پر ہے"[۳۳]
اس کی مشہور تصنیفات حسبِ ذیل ہیں[۳۴]

۔ کتاب النہطان فی الوالید
۔ کتاب الفال النجومی
۔ کتاب الموالید
۔ کتاب تحویل سنی الموالید
۔ کتاب التشبیہ والتمثیل
۔ کتاب المنتحل من اقاویل المنجمین فی الاخبار والمسائل و الموالید وغیرھا۔

سہل کے فرزندوں میں سے بعض مثلاً اسماعیل، ابو العباس
عبداللہ سہل اور سہل حسن نے علم نجوم میں مہارت پیدا کی اور
کتابیں بھی لکھیں۔

ماشاء اللہ:

یہ ایک مشہور مصری یہودی تھا۔ عہد منصور میں پیدا
ہوا اور مامون کے دور تک زندہ رہا۔ اس کی وفات تقریباً ۸۱۵ء یا
میں ہوئی[۳۵] ذبیح اللہ صفا نے اس کے متعلق یوں لکھا ہے۔

"از جملہ دانشمندان معروف شہر مرو در آغاز عہد عباسی و
اوایل دورہ نقل علوم یکی ماشاء اللہ بن اثری است کہ
در عہد منصور میزیستہ و از مشاہیر منجمین بودہ است"[۳۶]

سارٹن نے لکھا ہے کہ:

"اس کا اصلی نام عربی میں میشا تھا۔ لاطینی مترجمین
نے اس کو MESSAHAL کے نام سے موسوم کیا اور
ماشاء اللہ میشا کا اختصار ہے"[۳۷]

ابن القفطی نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ
بیان کیا ہے جس کو بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے۔
ایک دفعہ سفیان ثوری اور ماشاء اللہ کی ملاقات ہوئی۔
انہوں نے کہا تم زحل سے خوف کھاتے ہو اور میں ربِ زحل سے ڈرتا
ہوں۔ تم مشتری سے امیدیں رکھتے ہو اور میں رب المشتری سے۔ تم
آئندہ کے متعلق ستاروں پر اعتماد رکھتے ہو اور میں استخارہ پر۔
تمہارے اور میرے درمیان کتنا فرق ہے۔ ماشاء اللہ نے کہا "بے شک
ہم جوتشیوں کے مقابلے میں تم بہت کامیاب زندگی بسر کرتے ہو اور
تمہیں جو اطمینان حاصل ہے اس سے ہم محروم ہیں"[۳۸]

ماشاء اللہ جو احکام نجوم میں یکتائے روزگار تھا ۷۶۲ء
میں بغداد کی تعمیر کا ابتدائی سروے کرنے میں ایرانی نجم نوبخت کے ساتھ
تھا۔ اس کی مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں[۳۹]

۱۔ کتاب الموالید الکبیر
۲۔ کتاب القرانات
۳۔ کتاب مطرح الشعاع
۴۔ کتاب صنعۃ الاصطرلاب والعمل بہا۔
۵۔ کتاب ذات الحلق
۶۔ کتاب الامطار والریاح
۷۔ الکتاب المعروف بالسابع والعشرین

یہ کتاب کئی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی کتاب کا نام ابتداء الاعمال
ہے۔ دوسری کا نام 'فی دفع التدبیر' اور تیسری کا نام 'فی المسائل'
چوتھی کا نام 'فی شہودات الکواکب' اور پانچویں کا نام فی الحروب ہے۔
یہ آخری کتاب دور وسطیٰ میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس
کا ترجمہ GHERARO GEMONESE نے De Scientia motus Orbis کے نام سے کیا ہے۔

محمد بن ابراہیم الفزاری

اس کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم الفزاری
تھا۔ اس کا شمار ایران کے عظیم منجموں میں ہوتا ہے۔ یہ عباسی خلیفہ
منصور کے عہد میں پروان چڑھا اور ۷۹۶ء اور ۸۰۶ء کے درمیان
فوت ہو گیا[۴۰] اس کا باپ ابراہیم بن حبیب الفزاری پہلا شخص تھا
جس نے دورِ اسلامی میں اسطرلاب اور اس کو مبطح اور مسطح دونوں
شکلوں میں پیش کیا[۴۱] باپ اور بیٹے دونوں نے پہلی بار ہندوستانی
علم نجوم سے استفادہ کیا[۴۲]

ذبیح اللہ صفا لکھتا ہے:

" جب منصور کی توجہ احکام نجوم اور حرکات کواکب کی طرف زیادہ بڑھی تو ایران، روم اور ہندوستان سے ماہرین علم نجوم جوق در جوق آنے لگے۔ ان ہی میں سے ایک ہندوستانی منجم "سندہند" جو روش نجوم (معروف بہ سیدھانتا) میں مہارت تامہ رکھتا تھا ۱۵۶ھ / ۷۷۳-۷۷۲ء میں منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب علم نجوم سے متعلق پیش کی۔ منصور کو یہ کتاب بہت پسند آئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو عربی زبان میں منتقل کیا جائے اور اس طرح کی ایک کتاب بھی تصنیف کی جائے۔ اس کام کو محمد بن ابراہیم فزاری نے انجام دیا اور اسی ترتیب سے کتاب تیار کی جس کو منجمین نے " السندہند الکبیر" کے نام سے موسوم کیا عہد مامون تک لوگ اسی سے استفادہ کرتے رہے[۳۳]
بعد میں ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اس کی تلخیص تیار کی اور حذف و اضافہ کے ساتھ ایسی ہی ایک تقویم تیار کی۔

یعقوب بن طارق

یہ غالبًا ایرانی النسل تھا۔ تقریبًا ۷۰۰ء میں بغداد میں پروان چڑھا اور ۷۹۶ء میں فوت ہوگیا۔ یہ اپنے دور کا ماہر منجم تھا۔ بہ گمان یہ ہے کہ منصور کے دربار میں کنکہ (یا منکہ؟) سے اس کی ملاقات ہوئی تھی جو کہ اپنے ساتھ سیدھانتا لے گیا تھا۔[۳۴]

اس کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

۱۔ کتاب تقطیع کردجات الجیب
۲۔ کتاب ما ارتفع من قوس نصف النہار
۳۔ کتاب الزیج فی السندہند درجہ درجۃ[۳۵] یہ دو کتابیں ایک علم الفلکیات کے موضوع پر اور دوسری کا تعلق علم الدول سے ہے۔

مذکورہ بالا سطروں میں میں نے اُن ہی لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنے میدان میں کافی شہرت حاصل کی اور عہد منصور میں علم طب اور علم نجوم کے فروغ و ارتقاء میں یا تو کتابوں کے تراجم یا طبع زاد تصانیف کے ذریعہ اہم رول ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ اول) از ثروت صولت، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۲۱۰
۲۔ تاریخ الامت (حصہ چہارم) از محمد اسلم جیراجپوری، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ص ۷۹
۳۔ تاریخ ملت (حصہ پنجم) از مفتی انتظام اللہ، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۰ء ص ۱۲۷
۴۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی (حصہ دوم) اردو ترجمہ از انتظار احمد بلخی، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۳ء ص ۳۲۴
۵۔ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس (حصہ اول) از جارج سارٹن مطبوعہ نیویارک، ۱۹۷۵ء ص ۵۲۴۔
۶ ایضًا ص ۵۳۷
۷ تاریخ الحکماء از جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی (اردو ترجمہ) مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۵ء ص ۲۲۹
۸۔ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس ص ۵۳۷
۹ تاریخ الحکماء (اردو ترجمہ) ص ۳۴۰
۱۰ ایضًا ص ۳۳۹
۱۱ الفہرست لابن الندیم، اردو ترجمہ از محمد اسحٰق، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۱۹۶۹ء ص ۶۸۰
۱۲ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس (جلد اول) ص ۵۴۰
۱۳ ایضًا ص ۵۲۴
۱۴ تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی از ذبیح اللہ صفا، مطبوعہ تہران، بار چہارم ص ۶۲
۱۵ تاریخ الحکماء ص ۵۶۵۔
۱۶ تاریخ افکار و علوم اسلامی (حصہ دوم) ص ۳۲۴۔

١٧ تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی ص ۴۰
١٨ ایضاً ص ٥٨
١٩ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس ص ٥٣١
٢٠ ایضاً
٢١ تاریخ الحکماء ص ٥٢٦
٢٢ الفہرست لابن الندیم ص ٦٣٦
٢٣ ایضاً
٢٤ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس - ص ٥٣١
٢٥ تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی ص ٢٤
٢٦ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس ص ٥٣١
٢٧ تاریخ الحکماء ص ٢٢٤
٢٨ ایضاً ص ٢٢٥
٢٩ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس ص ٥٣١
٣٠ ایضاً ص ٥٣٠
٣١ الفہرست لابن الندیم ص ٦٣٥
٣٢- تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی ص ٦٣
٣٣- ایضاً ص ٤٠
٣٤ انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس ص ٥٣٠
٣٥- القفطی (تاریخ الحکماء ص ٢٨) کا خیال ہے کہ علم الافلاک اور علم ا
دو الگ الگ کتابیں ہیں اور اس اعتبار سے اسکی کل ٥ تصانیف ہیں -

اعلان بابت ملکیت

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
قومیت: ہندوستانی
حصہ دار: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ایڈیٹر: پروفیسر اسرار احمد
قومیت: ہندوستانی
پرنٹر و پبلشر: پروفیسر اسرار احمد
قومیت: ہندوستانی
پریس: ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس۔
اشاعت کی مدت: ماہانہ
مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

اسرار احمد

ریاکاری

ایک ریاکار شخص جو صرف دنیا کو دکھا۔
کے لیے نیکیاں کرتا تھا، ایک دن بادشاہ کا مہمان ہو
اس نے بادشاہ پر اپنی بزرگی کا رعب ڈالنے کے لیے با
تھوڑا کھانا کھایا لیکن نماز میں کافی وقت لگایا۔ ج
یہ شخص بادشاہ سے رخصت ہوکر اپنے گھر آیا تو آتے
کھانا طلب کیا۔ اس کے بیٹے نے کہا، کیا آپ نے بادشا
کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا؟ اس نے کہا، وہاں میں
اس خیال سے کم کھایا تھا کہ بادشاہ کو میری پرہیزگاری
اعتبار آجائے اور اس کے دل میں میری عزت زیادہ ہو۔
بیٹے نے کہا، پھر تو آپ نماز بھی دوبارہ پڑھیں ک
وہ بھی آپ نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے ہی پڑھی تھی۔
[گلستان سعدی]

لیم یافتہ بے روزگاروں کے لیے فراہمیِ روزگار کی اسکیم

عبدالعلیم

۱۵ر اگست ۱۹۸۳ر کو آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہند
لیم یافتہ بے روزگاروں کی فلاح کے لیے لال قلعہ کے میدان سے ایک نئی
یم کا اعلان حکومت ہند کی طرف سے جس کے تحت ہر سال ڈھائی لاکھ
م یافتہ بے روزگاروں کو بینکوں کے ذریعے ۲۵۰۰۰ روپے تک قرض بلا کسی
نت کے دیا جاتا ہے جس سے وہ کوئی بھی صنعت، کاروبار یا سروس کا کام
ں بھی شروع کر سکتے ہیں۔ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اب اس اسکیم کو ساتویں
سالہ منصوبہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

اس اسکیم سے ہر وہ تعلیم یافتہ بے روزگار فائدہ اٹھا سکتا ہے جو
ب ذیل شرائط پوری کرتا ہو۔

لف) میٹریکولیشن یا اس کے مساوی امتحان پاس کیا۔ صنعت یا سروس
شروع کرنے کے لیے آئی۔ ٹی۔ آئی کے پاس شدہ نوجوان بھی
اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ب) ۱۸ سال سے ۳۵ سال کی عمر ہو۔

ج) اس کا تعلق صاحبِ حیثیت طبقہ سے نہ ہو اور اس کے کنبہ
کی آمدنی ۱۰۰۰۰ روپے سالانہ سے زائد نہ ہونا چاہیے۔ اس
کا حلف نامہ داخل کرنا ہوگا۔

یہ اسکیم ان شہروں کو جہاں کی آبادی ۱۹۸۱ء کی
ردم شماری کے اعتبار سے دس لاکھ یا اس سے زائد ہو، چھوڑ
ہندوستان کے طول و عرض میں چل رہی ہے اور اس کی
ہ داری ضلع صنعتی مرکز جو ریاستی حکومت کے تحت ہے، کو
نپی گئی ہے۔

اس اسکیم کے تحت کوئی بھی تعلیم یافتہ بے روزگار
نوجوان ضلع صنعتی مرکز سے
امداد کی درخواست کر سکتا
ہے اور اس کے لیے کسی
فارم بھرنے یا رجسٹریشن
کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔
درخواست کے ساتھ یہ بتانا
ضروری ہوگا کہ وہ نوجوان
روزگار کی فراہمی کے لیے کیا کرنا چاہتا ہے۔ اسکیم بنانے کے لیے ضلع
صنعتی مرکز، اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ اور دیگر سرکاری
ادارے اس سلسلے میں نوجوانوں کی پورے طور پر مدد کریں گے۔
درخواست ضلع صنعتی مرکز کی ٹاسک فورس کے سامنے پیش ہوگی۔ اس
کمیٹی کے ممبر جنرل منیجر اور کریڈٹ منیجر ضلع صنعتی مرکز، اسمال
انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ، رہبر (لیڈ) بینک کے نمائندے
ضلع ایمپلائمنٹ افسر اور ضلع کے دو بڑے بینکوں کے نمائندے
ہوں۔ یہ کمیٹی درخواستوں پر تکنیکی و مالیاتی اعتبار سے غور کر کے
اپنی سفارشیں مختلف بینکوں کو بھیجے گی اور اس کے مطابق بینک
قرضے منظور کریں گے اور درخواست دہندگان کو تقسیم کریں گے
اس اسکیم کے تحت درخواست کنندہ سے بینک کسی قسم کی ضمانت
یا سیکورٹی مانگنے کا مجاز نہ ہوگا۔

۴۔ یہ قرض بینک آسان شرائط پر منظور کریں گے۔
پسماندہ اضلاع میں شرح سود دس فیصدی سالانہ اور غیر پسماندہ
اضلاع میں ۱۲ فی صدی ہوگی۔ قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں
بینک اور سرکاری ادارے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں
سے ہمدردی اور لچک دار رویہ رکھیں گے اور ہر مرحلے پر ان
کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔

۵۔ ہر قرض کی رقم کا ۲۵ فیصدی حکومتِ ہند
سبسیڈی یا رعایت کی شکل میں دے گی جو قرض دینے والا
بینک، تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان کے نام سے اس کے قرض
کی مدت کے مطابق معینہ مدت کے لیے اکاؤنٹ میں جمع کرے گا

اورجب وہ قرض کا ۳/۴ حصہ ادا کر دے گا تو اس رقم سے بقایا قرضہ ادا کرکے باقی منافع اس نوجوان کو دے دیا جائے گا۔

۲۔ خواتین اور تکنیکی تربیت یافتہ افراد کو اس اسکیم میں خصوصی درجہ دیا جائے گا

۳۔ صنعت چلانے کے لیے ۳۵۰۰۰ ہزار روپے، سروسنگ کے کام کے لیے ۲۵۰۰۰ ہزار روپے اور چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے ۱۵۰۰۰ ہزار روپے تک کا قرض دیا جاسکتا ہے۔

یہ اسکیم گذشتہ تین سالوں سے ملک میں چل رہی ہے اور اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے پہلے سال تیرہ لاکھ سے زیادہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں نے درخواستیں دیں۔ بینکوں نے دو لاکھ ۴۲ ہزار نوجوانوں کو ۵۴۴ء ۴۰۱ کروڑ روپے کے قرض دیے۔ اس طرح ۹۶٪ کا نشانہ پورا ہوا۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں دو لاکھ ۲۹ ہزار بے روزگار نوجوانوں نے اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا اور بینکوں نے ۵۳ء ۴۲۹ کروڑ روپے کا قرض منظور کیا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں تقریباً دو لاکھ بیس ہزار تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو اس اسکیم کے تحت قرضہ دیا گیا۔

اس نئی اسکیم سے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو بڑی مدد ملی ہے اور ان میں نیا حوصلہ اور امنگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بہت سی ریاستوں اور عوامی اداروں نے مختلف انتظامی اور خاص کر مالی ملنے والی رقم کے بڑھانے کا مطالبہ کیا ہے مگر مختلف انتظامی امور اور خاص کر مالی دقتوں کے پیش نظر سر دست ایسا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ پھر بھی امید کی جاتی ہے کہ ا[illegible] بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر جہاں تک گنجائش ہوگ[illegible] کو اور بڑھاوا دیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے [illegible] ہر کونے میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا جائے اور ا[illegible] نجی ادارے اور فلاحی انجمنیں بھی خاص کردار ادا کر سک[illegible] زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوا[illegible] سے فائدہ اٹھا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکی[illegible] مسلمانوں میں اس اسکیم کو زیادہ سے زیادہ [illegible] کی ضرورت ہے۔

ضروری معلومات اور ا[illegible] ضلع صنعتی مرکز سے رجوع کرنا چاہیے۔ [illegible] ہند کی وزارت صنعت کے اسمال انڈسٹ[illegible] انسٹی ٹیوٹ یا اس کی شاخیں ہیں وہاں [illegible] اور رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جن ا[illegible] قرض دیا جاتا ہے ان کی ٹریننگ کا بھی معق[illegible] صنعتی مرکز کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

"جو شخص اپنے پاس موجود چیزوں سے راضی اور مطمئن نہیں ہے، اگر اس کو پوری دنیا کا مالک بھی بنا دیا جائے پھر بھی اسے خوشی اور اطمینان نہ ہوگا۔"

ڈیل کارنیگی۔

مسلم یونیورسٹی کی تہذیبی قدریں

(ماضی اور حال کے آئینے میں)

امتیاز احمد

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نام ہے ایک روایت کا اور یہ روایت، شرافت، سخاوت، نجابت، مروت اور معلوم نہیں کتنی خوبیوں سے متصف ہے۔ مسلم یونیورسٹی اینٹ گارے سے بنی ہوئی محض ایک عمارت نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے جس نے نہ معلوم کتنی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جس کا کوئی نام نہیں، کوئی مذہب نہیں اور اس کے بہت سے نام ہیں اور بہت سے مذہب ہیں۔ وہ ایک ایسا باغ ہے جس میں رنگا رنگ قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اس رنگا رنگ تہذیب نے ایک وحدت کا رنگ پیدا کیا جس کا نام مسلم یونیورسٹی ہے۔"

لہٰذا ظہیر صاحب کے اس بیان کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہے کہ علی گڑھ کی وہ تہذیبی قدریں کیا ہیں جن کا کوئی مذہب اور کوئی نام نہ ہونے کے باوجود بھی بہت سے مذہب اور بہت سے نام ہیں۔ آئیے! علی گڑھ کی تہذیبی قدروں کا ماضی اور حال کے آئینے میں جائزہ لیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہم کس بلندی سے کس پستی کی طرف مائل ہو رہے ہیں؟ اور ہمارا کیا مقام ہے؟

تہذیب کے بنیادی اور خاص اجزا ہیں: طریق بود و باش، ایک دوسرے سے برتاؤ، ایک نسل سے دوسری نسل کا رشتہ، اپنے عہد کی معروف قدروں کی پاسداری، مذموم باتوں سے اجتناب، اور ادبیات و ذرائع تفریح۔

طریق بود و باش میں مادر درس گاہ کی اعلیٰ روایات کا پابندی سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بغیر مکمل لباس پہنے ہال سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ انگریزی بوٹ کے علاوہ کوئی اور جوتا پہننا، کھلی ہوئی چپلیں استعمال کرنا، شیروانی کے بٹن یا ہک کھلے رکھنا، شکن آلود کپڑے پہننا، بغیر پالش کے جوتے استعمال کرنا، بے ترتیب بال رکھنا، چوڑی مہری کے پائجامے پہننا، ہوسٹل میں پائجامے کرتے کے علاوہ کچھ اور پہننا، بغیر کرتہ پہنے ہوئے کمرے میں رہنا، مہمانوں، دوستوں اور ساتھیوں کے حقوق ادا نہ کرنا، ہر بات میں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرنا اور شین قاف درست نہ ہونا وغیرہ سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ تہہ بند پہننا یا پائجامے کے ساتھ شرٹ پہن کر ہوسٹل میں گھومنا، شریک دسترخوان کے کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے کھانے کی ٹیبل سے اٹھنا اور ڈائننگ ہال کے کھانے سے بچنے یا اس کا نسخہ بدلوانے کی کوشش کرنا وغیرہ جیسی باتیں جو آج کل عام طور سے دیکھنے میں آتی ہیں، علی گڑھ کی شریعت میں حرام تھیں۔ شیروانی پر ٹوپی پہننے کی سخت پابندی کی جاتی تھی جو آج کل صرف ڈائس پر ملحوظ رکھی جاتی ہے اور بعض اوقات وہاں بھی نہیں رکھی جاتی۔ اقامتی ہالوں کے اندر بھی ریڈنگ روم، کامن روم اور ڈائننگ ہال وغیرہ میں جانے کے لیے مکمل لباس پہننا نہایت ضروری تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مطابق اگر اتفاق سے کبھی کبھی کوئی طالب علم بغیر مکمل لباس کے نظر آجاتا تھا تو لوگوں کو اسے پہچاننے میں دشواری ہونے لگتی تھی کہ یہ وہی شخص ہے یا کوئی دوسرا ہے۔ کمرے سے باہر کسی کھلی جگہ پر کوئی چیز کھانا یا پینا فعل مذموم سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سڑک

کے کنارے بنی ہوئی چائے کی دوکانوں پر بھی پردے لگا دیے جاتے تھے جو اب صرف رمضان کے مہینے میں لگائے جاتے ہیں۔ بازار سے کوئی سامان کھلا ہوا ہاتھ میں لانا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ مزدریات کے ہلکے پھلکے اور چھوٹے چھوٹے سامانوں کے علاوہ کوئی وزنی یا بڑا سامان خود اٹھا کر لانے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ ان کاموں کے لیے خدمت گار مقرر تھے، جو اب بھی ہیں لیکن ان کا کام محض کھانے ناشتے پہنچانا اور چائے کے برتن وغیرہ دھونا رہ گیا ہے۔ کسی کمرے میں بے اجازت داخل ہونا کمرے میں داخل ہونے والے کا کھڑے ہو کر خیر مقدم نہ کرنا، کھانا کھاتے وقت موجود دوسرے لوگوں کو کھانے پر مدعو نہ کرنا اور کسی قسم کی میزبانی کیے بغیر آنے والے کو واپس کر دینا، بہت برا مانا جاتا تھا۔ ہر شخص کو لازم تھا کہ وہ جس کمرے میں داخل ہو اجازت لے کر داخل ہو اور صاحب کمرہ احسن انداز میں اسکا خیر مقدم کرے اور طبیعت کتنی ہی بدخط یا افسردہ کیوں نہ ہو کھانے کی ٹیبل پر شرفا کے طور طریقے ملحوظ رکھے۔ بیڑی، کھینی اور پان کا استعمال خلافِ تہذیب تھا۔ اسی پان کھانے اور پاندان رکھنے کی وجہ سے حسرت موہانی کو خالہ اماں کا ٹائیٹل دیا گیا تھا لیکن آج ان تمام خلافِ تہذیب باتوں کو علی گڑھ والوں نے اپنا لیا ہے اور اب یہ بری نہیں سمجھی جاتی ہیں — قدیم تہذیب کے معدودِ چند عناصر اپنی خستہ حالی میں کسی طرح زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں۔

سلام کو طریق بود و باش میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ کسی سے ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن نظر پڑتے ہی زبان سے بے ساختہ سلام علیکم نکل جاتا تھا اور چونکہ ہر شخص اس میں پہل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے اکثر دونوں آدمی سلام علیکم ہی کہہ جاتے تھے۔ اس میں قوتِ ارادی کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ ٹریڈیشن بن گیا ہے اور آج کل قصداً سلام علیکم کے جواب میں سلام علیکم ہی کہا جاتا ہے اور جو شخص وعلیکم السلام کہتا ہے وہ جونیر سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ علی گڑھ میں کبھی السلام علیکم نہیں کہا جاتا ہے بلکہ ہمیشہ الف کو حذف کر کے صرف سلام علیکم ہی کہا جاتا ہے اور اب یہ سلام علیکم سے آہستہ آہستہ سام علیکم ہوتا جا رہا ہے۔ بعض لوگ کچھ کہے بغیر صرف ہاتھ اٹھا دیتے ہیں، کچھ سر ہلا دیتے ہیں اور بعض آنکھیں جھکا لیتے ہیں، یہی ان کا سلام ہو جاتا ہے۔ ہوسٹل میں جو نئے طلبہ سلام کرنے کے عادی نہیں ہوتے تھے ان کو اس طرح عادت ڈلوائی جاتی تھی کہ جس وقت وہ کمرے سے نکلتے تھے دو چار سینیر اپنے اپنے کمروں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے اور جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلتے تھے ہر طرف سے فرشی سلام ہونے لگتے تھے یا پھر جہاں ملاقات ہو جاتی تھی، فرشی سلام کر دیا جاتا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ تین چار روز کے اندر اندر رہنا طالب علم خواہ وہ کتنے ہی غیر متمدن دیار سے کیوں نہ آیا ہو سلام کرنے کا عادی ہو جاتا تھا لیکن آج کل بڑے سے بڑے متمدن دیار و امصار کے لوگ بھی اس کے عادی نہیں ہو پاتے بلکہ اس میں عار محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی کو سلام کریں۔

علی گڑھ کی تہذیب کے بانی مبانی اور قایم رکھنے والے یہاں کے طلبہ ہیں۔ ان طلبہ میں سینیر اور جونیر کی دو اصطلاح شروع سے ہی رائج رہی ہے اور یہاں کی اقامتی زندگی میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے وہ سینیر اور جونیر کی تفریق ہے۔ لیکن یہ صرف تفریق ہی نہیں بلکہ ایک رشتہ بھی ہے۔ ایک رشتہ جو محبت، ہمدردی، یگانگت اور بھائی چارہ وغیرہ جیسی خصوصیات سے متصف ہے۔ اگرچہ یہ دونوں الفاظ انگریزی تہذیب کی دین ہیں لیکن ہندوستان خصوصاً علی گڑھ والوں نے اسے اس طرح اپنا لیا ہے کہ اس میں کسی قسم کی ملکی، غیر ملکی یا اپنے پرائے کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ یہ نہیں یہ اس لفظ کا اثر ہے یا علی گڑھ کی سرزمین کا کہ ایک سے ایک متمدن اور غیر متمدن دیار سے آئے ہوئے لوگ علی گڑھ کے اس رشتہ میں بندھ جانے کے بعد اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ الّا ماشاء اللّٰہ جو قسم کھا کر آئے ہوں۔

علی گڑھ میں جیسا کہ لفظ سینیر سے ظاہر ہے، سینیر کا ایک خاص وقار اور رعب و دبدبہ ہوتا تھا۔ کسی طالب علم کی اہمیت عظمت ثابت کرنے کے لیے صرف اتنا بتا دینا کافی ہوتا تھا کہ وہ اتنے سال کے سینیر ہیں۔ ہر سینیر طالب علم جونیر طلبہ اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کسی جونیر طالب علم کو اپنے کسی کام کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا، بلکہ اس کی ساری ذمہ داری

یہ ہوتی تھی۔ جونیر طلبہ سینیرس کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے، مانتے اور
مطابق پاس و ادب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سینیرس کے سامنے ہنسنا
نچی آواز سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے بعض اوقات
ے بھائیوں کی حیثیت حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ جاتی تھی۔
ں بھی جونیر طلبہ کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیش آتے
ہر ضرورت کے وقت ان کی مدد کرتے تھے اور زندگی کی صحیح
تعین کرنے میں ہر ممکن مدد بہم پہنچاتے تھے۔ کسی سینیر کی
دگی میں کوئی جونیر کسی قسم کا بل نہیں ادا کرسکتا تھا بلکہ ہمیشہ سینیر
ادا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مناسب موقع پاکر جونیرس اس کا ناجائز
ہ بھی اُٹھالیا کرتے تھے لیکن وہ بھی اس سلیقے سے کہ کسی کو ناگوار
نا تو کجا احساس بھی شاید ہی ہوتا تھا۔ یہ سینیرس ضرورت کے وقت
و سہارا دیتے تھے، دل دہی اور دل آسائی کرتے تھے، جونیرس
ی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ، جونیرس کی موجودگی میں بہت سوچ
کر باتیں کرتے تھے اور اس بات کی احتیاط کرتے تھے کہ جونیرس
وجودگی میں زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جس کا ان کے
دار پر بُرا اثر پڑے۔ کیونکہ نئے طلبہ میں عموماً اخذ و قبول کی قوت
ہت زیادہ ہوتی ہے لیکن قوتِ میزہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ یہی
تھی کہ اُس وقت کا علی گڑھ ہر طالب علم کے لیے آغوشِ مادر اور بازوے
ادر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ اِن تمام باتوں
باوجود کوئی کسی پر احسان نہیں جتاتا تھا۔ انہیں سینیرس کو دیکھ کر
ے طلبہ خربوزے کی طرح رنگ پکڑتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے علی گڑھ
رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ سینیرس یہاں کی بہترین روایات کے
سدار ہوتے تھے۔ لیکن آج کل نہ صرف جونیرس سینیرس کی عزت
ہیں کرتے بلکہ اُن کے ساتھ نہایت بے ہودہ اور ناشائستہ
فعال و حرکات میں شریک رہتے ہیں۔ سینیرس بھی جونیرس کا کچھ
ماظ نہیں رکھتے۔ یہاں تک علی گڑھ کی تہذیبی قدروں کا جنازہ نکالنے
والے اکثر آج کل کے سینیرس ہی ہوتے ہیں جو اپنی سینیرٹی کے جوش میں
ہر وہ فعل کر گذرتے ہیں جو یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے۔ اسی وجہ
سے جونیرس میں ان کی اہمیت، عزت اور عظمت بھی بالکل ختم ہوتی جارہی

ہے۔ اور وہ اُن کی نگاہوں سے گرتے جارہے ہیں اور سینیر جونیر
کا یہ پاکیزہ رشتہ اب صرف سینیر جونیر کی تفریق بن کر رہ گیا ہے۔ اس
زمانے کے طلبہ کے باہمی اختلاط و ارتباط اور محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا
کہ مذہبی اور لسانی اختلافات کے باوجود بھی اس بات کا اندازہ لگانا
دشوار تھا کہ کون مسلم ہے کون غیر مسلم۔ کسی ساتھی کی طبیعت خراب ہوجانے
کی صورت میں دوسرے تمام ساتھی اس کی تکلیف سے اس طرح
پریشان ہوجاتے تھے جیسے انسانی جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف
ہونے سے اس کے تمام اعضاء فوراً اس سے متاثر ہوجاتے ہیں۔
زیادہ طبیعت خراب ہونے کی صورت میں اس کی تیمار داری میں کئی کئی
راتیں جاگ کر گذار دیتے تھے اور اسے کسی قسم کی کمی یا تکلیف کا
احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تبدیلیوں کے
باوجود آج بھی کسی ساتھی طالب علم کی علالت کی خبر ملنے کی صورت میں
اس کی عیادت کے لیے بہ نفسِ نفیس جانا یہاں کی روایت بن چکا ہے۔

آپس کی گفتگو کا آغاز عموماً کسی نہ کسی دلچسپ جملے یا فقرے سے
اس طرح کیا جاتا تھا کہ طبیعت باغ باغ ہوجاتی تھی۔ لیکن اس میں بھی
روز بروز تبدیلی ہوتی جارہی ہے اور اب گفتگو کا آغاز کرنا تو دور
کی بات ہے مخاطب ہی اس برے، بھونڈے، بے ہودہ اور ناشائستہ
انداز اور کلمات سے کیا جاتا ہے کہ طبیعت مکدر ہوجاتی ہے اور آدابِ
تکلم کا تو سرے سے ہی فقدان پایا جاتا ہے جو علی گڑھ کے طلبہ کی بہت
بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی نچلے درجے
کے ملازمین کے ساتھ سخت کلامی یا بدکلامی علی گڑھ میں کبھی جائز نہیں
رہی اور اس کے مرتکب کے لیے سخت سزائیں متعین تھیں۔ لیکن آج
کل ہر بے ہودگی روا ہے اور اسے ہم اپنی ترقی سمجھتے ہیں۔ کیا ترقی یہی ہے!

جہاں تک ادبیات اور ذرائع تفریح کا تعلق ہے، اس کا جتنا
ستھرا اور شائستہ مذاق علی گڑھ کے طلبہ میں شروع سے رہا ہے
کم از کم ہندوستان کی شاید ہی کسی یونیورسٹی میں دیکھنے کو ملے۔ اردو
اور فارسی ادبیات کا طلبہ میں نہایت پاکیزہ ذوق پایا جاتا تھا۔ اسی
لیے رشید صاحب کے زمانے میں مشہور تھا کہ: اگر پڑھے لکھے شخص
سے شعر و ادب کے بارے میں کوئی زیادتی وقوع میں آئے تو اسے

نالائقی، ملا مولویوں سے ہو تو بد توفیقی اور عام لوگوں سے ہو تو بد مذاقی کہنا چاہیے۔

علی گڑھ کے طلبہ کے پاکیزہ ذوق کا اندازہ یہاں کے مشاعروں اور اُن میں ہونے والی فی البدیہہ پیروڈیوں، یونین کے مباحثوں، الکشن کے اینٹی پمفلٹس، ہوسٹل اور شعبوں میں دیے جانے والے ٹائٹلس، انجمن اردوئے معلّٰی کے جلسوں، علی گڑھ منتھلی یا علی گڑھ میگزین اور ہال میگزینوں کے ذریعے شایع ہونے والے مضامین اور مختلف موقعوں پر لکھے جانے والے پمفلٹس سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر کسی ہال کے طلبہ نے ایک پمفلٹ لکھا تھا جس میں طلبہ کی پریشانیوں اور ہال انتظامیہ کی کمزوریوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اُس کا عنوان تھا:

" قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم "

اور شاید اس کے لیے اس سے زیادہ بہتر، مناسب اور برمحل عنوان تجویز نہیں کیا جاسکتا۔

ذرایع تفریح میں کرکٹ، ہاکی اور ٹینس کے کھیل کو اہم مقام حاصل تھا۔ اِن کھیلوں میں نہ صرف شریک ہونا بلکہ انھیں دیکھنا بھی ذرایع تفریح میں شامل تھا۔ رشید صاحب کے زمانے میں چار سال تک مسلسل کرکٹ کے کھیل میں علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی اس سے پہلے کا ریکارڈ ان کے مطابق اُس سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ اس طرح کرکٹ میں علی گڑھ کی فتح نے ایک حد تک ٹریڈیشن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ لیکن افسوس کہ اب یہ سب کچھ مفقود ہے ان کے علاوہ میرس روڈ اور شمشاد مارکیٹ ابتدا سے ہی طلبہ کی تفریح کا ذریعہ رہے ہیں جو اب بھی قایم ہیں۔ ساتھ ہی ایک دوسرے پر کومنٹ، فقرے چسپاں کرنا، وغیرہ بھی تفریح کا ذریعہ رہے ہیں۔

یہ تھیں اس مادر درس گاہ کی وہ تہذیبی قدریں جن سے سید الاحرار مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، محمد علی، شوکت علی، شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور رشید احمد صدیقی جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

لیکن افسوس کہ آج ہم اپنی تمام تہذیبی قدروں کو آہستہ آہستہ بھلا بیٹھے ہیں۔ ہم نے انھیں فرسودہ اور دور از کار رفتہ سمجھ رکھا ہے اور وہ تمام بے ہودہ عامیانہ اور سوقیانہ باتیں اپنالی ہیں جو کبھی علی گڑھ کی تہذیب کا جز نہیں رہیں۔

ان تہذیبی تبدیلیوں کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اب ایسا کوئی فورم نہیں رہا جس کے ذریعے باقاعدہ طور سے طلبہ کی تربیت ہو سکے اور وہ اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کرسکیں۔ دوم یہ کہ ہماری پوری زندگی پر سیاست اور سیاسی افراد کا اس طرح غلبہ ہوگیا ہے کہ ہم نے ان کی تمام خرابیاں اپنالی ہیں اور اسی رنگ میں رنگنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے ہیں۔ جب طلبہ یہ دیکھتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کے افراد اپنے مطالبات منوانے کے لیے دھرنا دیتے ہیں، بے ہودہ اور فحش نعرے لگاتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، عوامی املاک کو تباہ وبرباد کرتے ہیں تو اُن کے نزدیک یہ تمام ذرایع انتہائی اہم اور موثر ٹھہرتے ہیں اور وہ اسے اختیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور بھلا کیوں نہ کریں ان کا ماحول ان کو سبق ہی یہ سکھاتا ہے۔

فیصلہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ معاملے کو سنتے وقت صبر سے کام لے، غور و فکر کے بعد بولے، تجزیہ کرتے وقت بصیرت سے کام لے اور فیصلہ کرتے وقت بے طرفی، ناوابستگی اور غیر جانبداری کا ثبوت دے

سقراط۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

عبدالواسع

ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی جو اقلیت ہے وہ مسلمانوں کی ہے۔ ملک کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ کل ہند پیمانے پر ان کی مجموعی تعداد کا اندازہ بارہ کروڑ سے سولہ کروڑ تک لگایا جاتا ہے۔ بہت سی ریاستوں میں بہت سے اضلاع مسلم اکثریت کے ہیں اور ایک ریاست ایسی بھی ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کرۂ ارض پر بہت سے مسلم اور غیر مسلم ممالک کی مجموعی آبادی بھی اتنی نہیں ہے جتنی اس ملک میں ان کی ہے۔ ان کے ماسوا سرزمین ہند میں ان کی آبادی آج جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی۔ مغل دورِ حکومت میں بھی نہیں اور انگریزی دورِ اقتدار میں بھی نہیں۔ علامہ شبلیؒ نے ۱۹۱۱ء میں مسلمانوں کی تعداد غیر منقسم ہندوستان میں کل چھ کروڑ بتائی ہے۔ اپنے مضمون تعلیم جدید و قدیم میں حامیان تعلیم قدیم و جدید کے متعلق رقم کیا ہے:

"اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد مل سکتی ہے۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد اور ان کے پھیلاؤ کے پیشِ نظر ان کو اقلیت کہنے میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور ان کے مسائل گونا گوں ہیں۔ شاید ہندوستان کی دوسری اقلیتوں سے بھی سوا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی طور پر وہ دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں پس ماندہ ہیں۔ معاشی پسماندگی نے ان کو تعلیمی پسماندگی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کی حالت میں اس عہد سے لے کر اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ محنت سے وہ بھاگتے ہیں، مشقت سے وہ جی چراتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں وہ پسماندہ ہیں۔ معاشی بہتری کے لیے ان کا واحد سہارا سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ملازمتیں تھیں۔ سو وہ بھی اُن کے لیے عنقا ہیں۔ نیم سرکاری اور نجی ملازمتوں میں اُن کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور سرکاری ملازمتوں میں اُن کی تعداد قبل سے ہی تشفی بخش نہیں ہے۔ معاش کی بہتری کے لیے ملازمتوں پر ان کا انحصار اور ملازمتوں کا تعلیم پر انحصار یہ ایک ایسی گردش ہے جو ہر لمحے مسلمانوں کو پستی میں ڈھکیل رہی ہے۔ انہی حالات کے پیشِ نظر مولانا نانوتویؒ اور سرسیدؒ نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت سے خصوصی دلچسپی لی۔ اگرچہ ان کی راہیں جداگانہ تھیں۔ مولانا قدیم تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہتے تھے۔ مناظر احسن گیلانی نے رقم کیا ہے:

"ایک مرتبہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ دیوبند کا مدرسہ استاد رحمۃ اللہ علیہ نے محض تعلیم کے لیے تھوڑی قایم کیا تھا۔ نہیں بلکہ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ناکامی کی تلافی کے لیے قایم کیا تھا۔"

سرسید کی تعلیمی کوششوں کا مقصد بھی یہی تھا لیکن اس کی راہ ان کی نگاہ میں جدید تعلیم سے ہو کر گزرتی تھی۔ وہ مسلمانوں کو وہم و خیال کی دنیا سے باہر لانا چاہتے تھے اور حقیقت و عقلیت سے آنکھیں چار کرانا چاہتے تھے۔ رشید احمد صدیقی کے نزدیک ان کی یہ کوشش بھی مذہب سے بیگانہ نہ تھی۔ وہ رقمطراز ہیں:

" بذاتِ خود سرسید کا اعتقاد مذہب و ایقان و
وجدان تھا۔ لیکن ان کے سامنے مذہب کا مسئلہ اپنی
ذات واحد کو نہیں بلکہ اپنی قوم کے ہر چھوٹے بڑے
کو سمجھانے کا تھا۔ جب مذہب کی دنیا میں عقلیت اور
سائنسی طریقۂ فکر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آج
بھی یہ طریقہ اتنا نامعقول نہیں ہے جتنا بعض لوگ
خیال کرتے ہیں۔ زندگی سے متعلق مسائل کو
عقل اور تجربے کی روشنی میں دیکھنے پرکھنے کی
کوشش کرنا اسلام کی ایک روایت ہے، جس کو
سرسید نے قایم رکھا اور آگے بڑھایا۔"

علی گڑھ کالج میں سرسید اگر مذہبی تعلیم کو جگہ نہ دیتے تو
شاید ان کو کامیابی نہ ملتی۔ کیوں کہ مسلمان ہر حال میں مذہب کو
مقدم رکھتا ہے۔ شاید اپنی جان سے بھی زیادہ۔ اس کا مزید
ثبوت حالیہ دنوں میں فراہم ہوا ہے۔ جب شریعت بچاؤ مہم کے
تحت لاکھوں مسلمان اپنے کاروبار، تعلیم گاہوں اور دفتروں سے
باہر آکر سڑکوں پر مظاہرے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

فی الحقیقت مسلمان مذہب اور جدید تعلیم کے دوراہے پر
کھڑا ہے۔ ایک طرف مذہبی تعلیم اس کی نگاہ میں بہت ضروری ہے
تو دوسری طرف ابنائے وطن کے دوش بدوش چلنے کے لیے جدید تعلیم
کی اہمیت کا بھی شدید احساس ہے۔ سرسید کے عہد میں بھی
یہ مسئلہ اسی طرح تھا۔ مولانا نانوتوی قدیم تعلیم کی بنیادوں
کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ جب کہ سرسید کی نگاہیں جدید تعلیم اور
عقلیت پر مرکوز تھیں۔ چنانچہ قدیم و جدید تعلیم کا مناقشہ سامنے
آیا۔ علماء کا گروہ سرسید کا مخالف ہوا۔ بلکہ سرے سے جدید
تعلیم کا مخالف ہو گیا۔ یہ صورتِ حال تب سے لے کر آج تک مسلمانوں
کے لیے ایک مسئلہ لاینحل بنا ہوا ہے۔ وہ قدیم تعلیم چھوڑتا ہے
تو مذہب سے بیگانہ ہوتا ہے۔ جدید تعلیم سے بے توجہی برتتا ہے
تو دنیا جاتی ہے اور بقول سرسید: " دین

" دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے"

اس لیے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کو بہتر بنانا ہے تو اس کو اس مخمصے
سے باہر نکالنا ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید اور
مولانا نانوتوی جیسے بزرگ موجود تھے۔ آج دور دور ان کے جیسا
مخلص، ہمدردِ قوم، دھن کا پکا، بات کا دھنی کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لگ بھگ ۱۲ کروڑ کی اقلیت کے مسائل
کی طرف سے آنکھیں موند کر نہ تو ہم اپنا بھلا کریں گے اور نہ ملک کا ہی بھلا ملک
کی عظمت سے ہم عظیم ہیں اور ہماری شان سے ملک شاندار ہے۔ اس لیے ملک کو
عظیم بنانا ہے تو اس گلستان کے ہر گل کی تراش و خراش اور آبیاری کی فکر ہر
کو کرنی چاہیے۔ گلستاں کا ہر پھول باغبان کی یکساں توجہ کا طالب اور حقدار ہے

بقیہ "کائنات: تخلیق اور زندگی"

جان سکیں گے۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نظامِ شمسی میں دس
سیارے اور تقریباً ۳۲ سیارچے موجود ہیں۔ نہ جانے اور کتنے
نظامِ شمسی ہماری کائنات میں پنہاں ہیں، تحقیق طلب ہے؟ سائنسدانوں
کا یہ بھی خیال ہے کہ کائنات روز بروز وسیع ہو رہی ہے، اس لیے
دوسرے نظاموں کے متعلق جاننا بہت دشوار ہے۔

" جن لوگوں نے خدا کے سوا (اوروں کو) کارساز بنا رکھا
ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک طرح کا
گھر بناتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں سے
کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ اس بات کو
جانتے۔"

(العنکبوت ۴۱)

ایلومینیم

انور عباسی

ایلومینیم بطور ایک کیمیاوی عنصر، ۱۸۲۵ء میں دریافت ہوا تھا۔ اپنی [illegible]یافت کے پچھتر سال کے بعد اس کی صنعت و حرفت ہونے لگی اور اس [illegible] برتن وغیرہ بننے لگے۔ اس کے بعد کے پچھتر برسوں میں اس نئی نویلی پھلکی [illegible]ودھیا چمکدار دھات نے اتنی تیزی سے ترقی کی ہے کہ آج بنی نوع انسان [illegible] عملی خدمت کرنے میں اس کا نام اپنے بھائی لوہے کے بعد آتا ہے۔

جس قدر قیمتی دھات سے ہمارے استعمال کے گلاس، پلیٹیں، جگ [illegible]دیگچے وغیرہ بنتے ہیں (گزشتہ سال صرف امریکہ میں ۲ ارب مربع فٹ [illegible]ایلومینیم ظروف سازی پر استعمال ہوا) وہی دھات میدان جنگ میں لڑنے [illegible]الے ٹینکوں اور دوسرے اسلحے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ کرسیوں [illegible]گھریلو فرنیچر، کھیل کے سامان، ہوائی جہازوں اور خلائی سیاروں میں [illegible]ایلومینیم استعمال ہو رہا ہے۔ یہ دھات ان کے بڑے بڑے ڈھانچوں [illegible]میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ڈھانچوں کے اجزا آپس میں جوڑنے کے [illegible] کیل، پیچ اور ریٹ وغیرہ بھی اسی کے بنائے جاتے ہیں۔

گویا ایلومینیم کی اس قدر عالمی پذیرائی اور ہمہ گیر مقبولیت کا [illegible]سبب اس کی گوناگونی اور تنوع ہے۔ سونے کی طرح ایلومینیم یکطرفہ [illegible]دھات نہیں ہے کہ بس خزانے کا سانپ بنا بیٹھا رہتا ہے۔ اس سے [illegible]گھروں اور دفتروں کے کمروں کو گرم بھی کیا جا سکتا ہے اور ٹھنڈا بھی۔ [illegible] یا سارا ایرکنڈیشنگ کا نظام ایلومینیم پر مبنی ہے۔ ایلومینیم کا سفوف [illegible]کسی معتدل مائع میں ملا دیجیے، پائیدار رنگ تیار ہے، جس سے آپ [illegible]اپنے دروازے، کھڑکیاں اور دیواریں رنگین کر سکتے ہیں۔ اس کے [illegible]سفوف میں ایک خاص قسم کا مواد شامل کیجیے، خلائی راکٹ کا ایندھن [illegible]ہے۔ اس کے سفوف میں دوسری قسم کا مواد شامل کیجیے، یوں میں استعمال ہونے والا آتش گیر مسالہ تیار ہے۔

اپنے ارد گرد دیکھیے۔ یہ طلسماتی دھات موٹر گاڑیوں، ٹرکوں، ریلوے کے ڈبوں، مکان، اونچی اونچی بلڈنگوں میں صاف چمکتی نظر آ رہی ہے۔ سمندر کی طرف دیکھیے بڑے بڑے بحری جہازوں سے لے کر تفریحی کشتیوں تک میں ایلومینیم کی بہار دکھائی دے رہی ہے۔ اوپر کی طرف دیکھیے بجلی کے تار جو ملک کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، اس قیمتی دھات کے مرہون منت ہیں۔

ان حقایق کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ماضی میں انسانی تہذیب کے ارتقائی مراحل نے اپنے اپنے نام اس وقت کی دھات پر پائے ہیں، پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ، لوہے کا زمانہ۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور ایلومینیم کا زمانہ ہے۔ مشہور ماہر عمرانیات لیومس ممفورڈ لکھتے ہیں کہ

"جس طرح صنعتی انقلاب میں لکڑی کی مشینوں کو لوہے کی مضبوط تر مشینوں میں ڈھال لیا گیا تھا، اسی طرح آج کے فنیاتی دور میں بھاری آہنی مشینوں کو ایلومینیم کی ہلکی مشینوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔"

اس موقع پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ اتنی قیمتی دھات اتنی دیر تک انسانوں کی نظروں سے کیوں اوجھل رہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دھات میں اس قدر حیرت انگیز تضادات یکجا ہو گئے ہیں کہ کبھی اس کا ایک رخ سامنے آیا، کبھی دوسرا۔ اور یوں آدمی دھوکا کھاتا رہا۔ ... ۱۸۰۷ء تک کیمیا دانوں کو اس بات کا علم تھا کہ کوئی دھات ہے ضرور جو چکنی مٹی میں محسوس ہوتی ہے۔ لیکن وہ کیا ہے، اس کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد فرانس کے ایک قدیم قصبے "لا بوکسیو" کے قریب کچھ معدنیات دستیاب ہوئی ہیں، جن میں ایلومینیم بھی شامل تھا اس لیے تمام کچ دھاتوں کو "بوکسائیٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن تانبے یا لوہے کی طرح ایلومینیم خود بخود ایک قدرتی مفرد دھات کی صورت اختیار نہیں کر لیتا۔ یہ جب بھی ملتا ہے دوسرے عناصر کی آمیزش کے ساتھ ملتا ہے۔ ان دوسرے عناصر میں خاص طور پر آکسیجن اس کا لازمی جزو ہے۔ آکسیجن کے ساتھ مل کر یہ ایک سخت

اور ٹھوس آکسائڈ کا روپ اختیار کر لیتا ہے، جسے اصطلاح میں "ایلومینا" کہتے ہیں۔ جب دوسرے عناصر کی بھی ہلکی ہلکی سی آمیزش ہو جائے تو ایلومینا یاقوت اور نیلم جیسے جواہر کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

خاک کے ذرّوں سے اس دھات کو آزاد و جُدا کرنے کا چیلنج صدیوں سے درپیش تھا، اسے کامیابی سے کوئی بھی قبول نہ کر سکا۔ سترھویں صدی میں یورپ کے بڑے بڑے کیمیا دانوں نے اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۸۰۰ء میں انگلستان کے سر ہمفری ڈیوی نے اس گریز پا دھات کو ایک نام دیا: "ایلومینیم"۔ اس کی لکھی ہوئی ہجے امریکہ اور کینیڈا میں آج تک رائج ہے۔ ان دونوں ملکوں کے سوا دنیا کے باقی تمام ملکوں میں اس کا تلفظ اور ہجے "ایلومینیم" مستعمل ہے۔

۱۸۲۵ء میں ڈنمارک کے ایک ماہر طبیعیات نے اپنی پوری صلاحیت اس گستاخ دھات کو مٹی کے باقی اجزا سے جدا کرنے پر صرف کر دی۔ اس نے "ایلومینا" کے ساتھ کاربن اور کلورین اور پھر پوٹاشیم ملا کر کئی تجربے آزمائے۔ اسے ایک نئی بھرت مل گئی جس کا بیشتر حصہ ایلومینیم پر مشتمل تھا۔ لیکن اس میں پارہ بھی خاصی مقدار میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اس نئی بھرت کو تیز آنچ پر رکھا تاکہ پارہ جل جائے۔ پارہ تو کافور ہو گیا لیکن بھرت ایک ایسے مسالے میں تبدیل ہو گئی جو رنگ اور چمک میں بالکل ٹین سے مشابہ تھی۔

وہ پہلا سائنس داں جس نے ایلومینیم کو صنعت و حرفت میں استعمال کیا، فرانس کا ماہر کیمیا ہنری کلیر ڈیوائل تھا۔ اس نے ۱۸۵۵ء میں ایلومینیم کلورائیڈ کو خالص ایلومینیم میں تبدیل کرنے کا ارزاں طریقہ دریافت کیا تھا۔

اس دریافت سے فرانس کا بادشاہ نپولین سوم بہت خوش ہوا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کی فوج کے تمام سپاہیوں کے لیے خود اور زرہ بکتر ایلومینیم کے تیار کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے خزانے کے منہ کھول دیے۔ اس نے فرمائش کی کہ شاہی مہمانوں کے لیے ایلومینیم کے چمچے، کانٹے، چھریاں اور طشتریاں بنائی جائیں۔

ایلومینیم کلورائڈ سے خالص ایلومینیم بنانے سے بھی زیادہ آسان اور زیادہ ارزاں طریقہ ۱۸۸۹ء میں جرمنی کے سائنس داں کارل جوزف بائر نے دریافت کیا۔ ایلومینیم کی صنعت میں آج بائر کا طریقہ مستعمل چلا آ رہا ہے۔ اس طریقے میں ایلومینیم کو اس اصلی قدرتی سرچشمے یعنی بوکسائیٹ کچ دھات سے جدا کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے تمام دھاتوں میں سب سے زیادہ فراوانی کے ساتھ ایلومینیم فراہم کیا، لیکن یہ کہیں بھی اپنی خالص صورت دستیاب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ملاوٹی اور مصنوعی بھرت کی صورت میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسری دھاتوں بالخصوص آکسیجن کے مل کر فوراً مرکب صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور آکسیجن کا تو اس پر اتنی تیزی سے اثر ہوتا ہے جیسے جلد پر بجلی کا۔ کچ دھات کی صورت ایلومینیم کی کان کنی دنیا کے اکثر ممالک میں، بالخصوص جمیکا، سرینام روس میں ہوتی ہے۔

پہلے کچ دھات کو ۳۰۰ درجے فارن ہائیٹ پر گرم کیا جاتا ہے تاکہ گندھک نکل جائے۔ جب گندھک نکل جاتا ہے تو گویا کچ دھات سے ایلومینیم آکسائیڈ نکل آتی ہے۔

پھر ایلومینیم آکسائڈ کے کرسٹل (قلم) بنائے جاتے ہیں۔ ان قلموں میں ایسے کیمیات ملائے جاتے ہیں جو برقی موصل کا کام کرتے ہیں۔ اس نئے آمیزے کو بڑے کڑھاؤ میں ڈال کر تیز آنچ پر گرم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آمیزے کو برق پاشیدگی کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ جس کے تحت آکسیجن تو کڑھاؤ کے مثبت خانے (مثبتیرہ) جمع ہو جاتا ہے اور ایلومینیم آکسیجن سے جدا ہو کر منفی خانے (منفیرہ) میں جمع ہو جاتا ہے۔

برق پاشیدگی کے عمل سے جو ایلومینیم دھات الگ حاصل ہو گئی ہے، اب اسے سخت بلاکوں میں ڈال کر ڈھالا جاتا ہے۔ بلاکوں کو "انگوٹ" کہا جاتا ہے۔

نئے مرحلوں پہ انگوٹوں کو بھی خاص حرارت سے تپایا جاتا پھر ان کو بڑے بڑے رولروں اور شکنجوں کے ذریعے مختلف شکلوں میں ڈھالا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو تار بنائیں، چمچے بنائیں، طشتریاں بنائیں، چادریں بنائیں، ڈبے بنائیں۔ اب وہ آپ کی مرضی

بیشتر صورتوں میں خالص ایلومینیم کو پگھلاتے وقت اس میں دوسری
توں کی حسبِ ضرورت آمیزش کر لی جاتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے
ملف دھاتوں کے آمیزے کو "بھرت" کہتے ہیں۔

ایلومینیم کے ساتھ جن دھاتوں کو عام طور پر "بھرتی" کیا
ہے، اُن میں تانبا، سلیکان، کرومیم، جست، میگنیشیم، نکل، ٹائٹانیم
لوہا قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے کسی بھی دھات کی آمیزش سے ایلومینیم
طاقت بڑھ جاتی ہے اور اس کے دوسرے خواص میں بھی تبدیلی آجاتی
۔

مثال کے طور پر سلیکان کی معمولی آمیزش سے ایلومینیم کی ڈھلائی
سان ہو جاتی ہے۔ ایلومینیم سے بھاری مشین بنانا مقصود ہے تو
ھاتوں کی آمیزش کسی اور ترکیب سے کی جائے گی۔ بجلی کا تار بنانا
، تو دھاتوں کی ملاوٹ کا حساب کتاب کچھ اور ہوگا۔ رنگ بنانا
، تو دھاتوں کا آمیزشی تناسب بھی بدل جائے گا۔

کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی صنعت اب ایسی نہیں
ہا جس میں ایلومینیم استعمال نہ ہوتا ہو۔ امریکہ میں تو لوہے اور فولاد
کے بعد ایلومینیم سب سے زیادہ استعمال ہونے والی دھات ہے۔
اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہلکی ہونے کے باوجود
انتہائی مضبوط ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے خلا میں پرواز
کرنے والی چیزوں اور سڑکوں پر دوڑنے والی چیزوں میں ایلومینیم
کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

ایلومینیم کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ
پائیدار ہے۔ اسے زنگ نہیں لگتا۔ اس لیے کھانا پکانے کے برتن
اور کھانا کھانے کے ظروف دنیا بھر میں سب سے زیادہ ایلومینیم کے
بنے ہوتے ہیں۔ لوہے پر رنگ کرنا مقصود ہو یا لکڑی پر
یا ربر یا پلاسٹک پر رنگ کوئی سا بھی ہو اس میں ایلومینیم بطور جزوِ
لازم ضرور شریک ہوگا۔

ایلومینیم کی کیمیاوی علامت ہے: AL
اس کا ایٹمی نمبر ہے: ۱۳
اور بھولیے نہیں اس کا ایٹمی وزن ہے: ۲۶،۹۸

اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اس کی
تحقیقات آپ کی درسگاہ کی قدیمی روایت ہے مگر مجھے افسوس
کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید مرحوم کے دور کے بعد اسکی
سرگرمیاں بہت کچھ دھیمی پڑ گئیں اور علم و فن کا عام مذاق
بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا۔ یونی ورسٹی قائم ہوئی تھی تو آپ
اپنے قیام کے ساتھ نیا علمی دور لایا تھا لیکن اسی توقع کو بھی
ابھی تک انتظار ہی کرنا پڑا ہے آپ کا فرض ہے کہ اپنی درسگاہ
کی پرانی روایتوں کو از سرِ نو تازہ کریں اور یونی ورسٹی کے اندر
مطالعہ و تحقیقات کا اعلیٰ معیار پیدا کریں۔

مولانا آزاد

دانائی

کسی نے مشہور فلسفی اور معلم اخلاق حکیم لقمان سے
پوچھا کہ:

"آپ نے دانائی کی یہ باتیں کیسے حاصل کیں؟"

لقمان نے جواب دیا:

"نادانوں سے۔ وہ اس طرح کہ جب وہ کوئی
حماقت کرتے ہیں تو میں ان کے انجام سے
عبرت حاصل کرتا ہوں اور ویسی حرکت
کبھی نہیں کرتا۔"

ابتدائی اعلان

THE THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENCES
(TWAS)

سینٹر فار پروموشن آف سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اور

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانۃ

۱۹۸۶-۸۷ء کے تقریباً 12000.00 روپئے کے انعامات

برائے

* === عام فہم سائنسی مضمون نگاری === *

(POPULAR SCIENCE WRITING PRIZES)

کا اعلان کرتے ہیں جو تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس (صدر: پروفیسر عبدالسلام) کے عطیہ سے قائم کیے گئے ہیں ——————

* یہ انعامات یکم جولائی ۸۶ء سے ۳۰ جون ۸۷ء تک ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے / اشاعت کے لیے بھیجے گئے بنیادی سائنس (بشمول ریاضی) اور تاریخ سائنس کے موضوعات پر طبع زاد عام فہم سائنسی اردو مضامین کے لیے ہیں۔
* تقریباً دس ہزار روپیے کے انعامات بہترین قرار پائے مضامین پر دیے جائیں گے۔ باقی رقم سے پسندیدہ قرار دیے جانے والے مضامین پر تشویقی انعامات (Consolation Prizes) دیے جائیں گے۔ تشویقی انعام کم سے کم دو سو روپیہ ہوگا۔
* مضمون تہذیب الاخلاق کے آٹھ صفحات (تقریباً ۵۰۰۰ الفاظ) سے زیادہ کا نہ ہو۔ مضامین آسان زبان میں ہوں اور ریاضیاتی فارمولوں و تکنیکی تفصیلات سے بوجھل نہ ہوں تاکہ ان مضامین کو وہ لوگ بھی سمجھ سکیں جو سائنس کے طالب علم نہ رہے ہوں۔
* مضمون کا مسودہ اس شمارے کے پہلے صفحہ پر دی گئی ہدایات کے مطابق تیار کریں۔ مسودہ کے ساتھ درج ذیل سرٹیفکیٹ ہو:

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق،

تصدیق کی جاتی ہے کہ میرا / ہمارا مضمون بہ عنوان ——————

——————————————————

طبع زاد ہے اور اس سے پہلے نہ تو کہیں شائع ہوا ہے اور نہ کہیں اشاعت کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔

دستخط: ——————

اسرار احمد

ڈائریکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس اور ایڈیٹر تہذیب الاخلاق

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۳/۸۶-۸۷
مورخہ ۲۵ فروری ۸۷ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ ٹریننگ اینڈ پلیسمنٹ آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) ذاکر حسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹکنالوجی۔

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت:
۱۔ لازمی: انجینرنگ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں بنیادی ڈگری۔
۲۔ انجینرنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری۔
۳۔ دس سال کا تجربہ جس میں سے کم از کم تین سال کا تجربہ کسی انڈسٹری میں ہونا چاہیے اور دو سال کا تجربہ تدریس/تحقیق میں ہونا چاہیے۔ ساتھ میں کسی انڈسٹریل/تدریسی/تحقیقی ادارے میں کسی ممتاز جگہ پر فائز رہے ہوں۔

۲۔ پسندیدہ: کسی انڈسٹری میں انجینرنگ گریجویٹس کے انڈسٹری پلیسمنٹ/تربیت کا انتظام کرنے یا سپروائز کرنے اور طلباء کی بہبودی کی دیکھ بھال کا تجربہ۔

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۲/۸۶-۸۷ مورخہ یکم ستمبر ۸۶ء کے تحت اور اشتہار نمبر ۱۸/۸۶-۸۷ مورخہ ۱۹ دسمبر ۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ موزوں ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۲۔ سائنٹسٹ (ایک جگہ) (عارضی) ریموٹ سینسنگ ایپلی کیشن سینٹر آف ریسورس سائنس اینڈ انجینرنگ

ڈگری یا ڈپلوما۔

۲۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے بی۔پی۔ایڈ کی ڈگری۔
یا

۳۔ کم از کم ایک اکیڈمک سیشن کی ٹریننگ کے بعد کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی / ادارے سے ڈگری بی۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی ہو۔ اس ثبوت کے ساتھ کہ اس ڈپلوما میں داخلے کے واسطے کم از کم یونیورسٹی ڈگری ضروری ہو۔

۴۔ انگریزی یا اردو اور ہندی کے ذریعے تدریس کا تجربہ

پسندیدہ:۔ فزیکل ایجوکیشن ٹیچر برائے ہائی اسکول کی حیثیت سے تین سال کا تجربہ این۔سی۔سی ٹریننگ سرٹیفکٹ قابل ترجیح ہوگا۔

۔ ٹکنیکل اسسٹنٹ [آرکیالوجی] [ایک جگہ] [مستقل] ہسٹری ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ :۔ ۱۴۰۰۔۴۰۔۱۸۰۰۔ای بی۔۵۰۔۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت:

۱۔ لازمی تاریخ میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری ساتھ میں میڈیول انڈین ہسٹری یا آرکیالوجی میں تخصص۔

پسندیدہ: آرکیالوجی کے میدان میں کچھ تجربہ یا آرکیالوجی میں ڈپلوما۔

پوسٹ سے وابستہ فرائض اور ذمہ داریاں

۱۔ مرکزی / ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے تحت ہونے والے کھوج اور کھدائی کے کاموں میں شریک ہونا اور دیگر آرکیالوجیکل میدانی کاموں مثلاً مانومنٹ اور سائٹس کا سروے، آبجیکٹس کا اکٹھا کرنا، کتبوں کا اسٹیمپ پیجیس (Stamp Pages) لینا وغیرہ

۲۔ آثار قدیمہ اور ظروف سازی کا مطالعہ، اُن کی حفاظت، عام صفائی، جھاڑ پونچھ اور مرمت۔

۳۔ رپورٹ کی تیاری، کیمپ اور نمائش کا اہتمام وانتظام، اسٹور کی دیکھ ریکھ

دیگر کاموں میں مدد کرنا۔

۷۔ ٹکنیکل اسسٹنٹ و ڈرافٹسمین [ایک جگہ] [مستقل] ہسٹری ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای بی-۵۰-۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
۱۔ لازمی سول انجینرنگ یا آرٹ میں ڈپلوما۔
۲۔ پسندیدہ: ڈرائنگ / سروے انگ کا کچھ تجربہ۔
پوسٹ سے وابستہ فرائض اور ذمہ داریاں
ظرف سازی اور آثار قدیمہ سے متعلق ڈرائنگ، پلانس اور سیکشن کی تیاری، سروے، نمائش کے سامان، میوزیم اور آرکیالوجیکل کیمپ کو لگانے میں مدد۔ مرکز / ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے تحت ہونے والی کھوج اور کھدائی کے کاموں میں شرکت اور آرکیالوجی سے متعلق سپرد کیجانے والا کوئی بھی کام۔

۸۔ جونیر انجینیر [ایک جگہ] [عارضی] بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای بی ۵۰-۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: کسی تسلیم شدہ ادارے سے سول انجینرنگ میں ڈپلوما
مینٹننس اور بلڈنگس کنسٹرکشن کا کم از کم پانچ کا تجربہ۔

۹۔ جونیر انسٹرومینٹ میکنک [انجن فٹر] [ایک جگہ] [مستقل] مکینکل انجینرنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای-بی-۵۰-۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: ٹریڈ سرٹیفکٹ اور ساتھ میں موزوں فیلڈ میں کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔

یا

پڑھا لکھا اور ساتھ میں موزوں فیلڈ میں دس سال کا تجربہ۔

نوٹ۔ امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل امتحان دینا ہوگا۔

۱۰۔ الیکٹریشن-کم-ٹیوب ویل آپریٹر [ایک جگہ] [مستقل] سرسید ہال [نارتھ]

شرح تنخواہ: ۱۳۲۰-۳۰-۱۵۶۰-ای بی ۴۰- ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت

۱- الیکٹریشن ٹریڈ میں آئی-ٹی-آئی کا سرٹیفکیٹ۔

۲- الیکٹرک موٹرس اور دوسرے الیکٹرک آلات کی دیکھ ریکھ اور مرمت کرنے کا دوسال کا تجربہ۔

یا

امیدوار پڑھا لکھا ہو اور ساتھ ہی ساتھ الیکٹرک موٹرس اور دوسرے الیکٹرک آلات کی دیکھ ریکھ اور ان کی مرمت کا دس سال کا تجربہ ہو۔

نوٹ:
موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۱- پلمبر [ایک جگہ] [مستقل]
ایم-ایچ ہال-

شرح تنخواہ: ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰-ای-بی ۲۵- ۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:-

۱- لازمی: آئی-ٹی-آئی تسلیم شدہ ادارے [ٹیکنکل] پلمبر ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ۔ اور ساتھ ہی ساتھ بحیثیت فٹر کے پریکٹیکل تجربہ۔

یا

پڑھا لکھا اور کسی تسلیم شدہ ادارے میں متعلقہ میدان میں دس سال کا پریکٹیکل تجربہ۔ اور ساتھ میں الیکٹریکل پمپس موٹرس اور ان کی فٹنگ کی کچھ جانکاری

پسندیدہ: ٹریڈ میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت

نوٹ ۔
موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک
پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا ۔

۱۲۔ ٹریکٹر ڈرائیور ۔ [ایک جگہ] [مستقل]
بلڈنگ ڈپارٹمنٹ ۔

شرح تنخواہ: ۹۵۰ ۔ ۲۰ ۔ ۱۱۵۰ ۔ ای بی ۔ ۲۵ ۔ ۱۵۰۰ روپے اور دیگر
الاؤنسز ۔

قابلیت: پڑھا لکھا ہونا چاہیے اور لاگ بک بھرنے کی صلاحیت ہونی
ہونی چاہیے ۔
ساتھ میں بھاری گاڑی چلانے کا کارآمد لائسنس بھی ہو
ہونا چاہیے
ساتھ ہی ساتھ ٹریکٹر چلانے کا کم ازکم پانچ سال کا تجربہ
ہو ۔ روڈ رولر چلانے کا تجربہ قابلِ ترجیح ہوگا ۔

عمر: ۲۵ سال سے ۴۰ سال کے درمیان ۔

نوٹ ۔
موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک
پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا ۔

۱۳۔ ٹیلی فون اٹینڈنٹ ۔ [ایک جگہ] [مستقل]
ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ ۔

شرح تنخواہ ۔ ۱۲۰۰ ۔ ۳۰ ۔ ۱۵۶۰ ۔ [illegible] ۔ ۴۰ ۔ ۲۰۴۰ روپے
اور دیگر الاؤنسز ۔

قابلیت

۱- لازمی: سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائی اسکول پاس کیا ہو اور ساتھ میں کم از کم تین سال کا تجربہ متعلقہ میدان میں ہو۔

یا

ڈپلوما / ٹریڈ سرٹیفکیٹ (الیکٹرونکس / الیکٹریشن) اور ساتھ ہی متعلقہ میدان میں کم از کم دو سال کا تجربہ ہو۔

یا

پڑھا لکھا ہو اور متعلقہ میدان میں کم از کم دس سال کا تجربہ رکھتا ہو۔

۲- پسندیدہ:- ٹیلی فون لائن، وائرنگ اور آٹو ٹیلی فون سیٹ اور آٹومیٹک ایکسچینج کا تجربہ ہو۔

نوٹ:

موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱- جونیئر ریسرچ فیلو [ایک جگہ] [عارضی] - ڈی-ایس-اے پروگرام کے تحت [فزکس ڈیپارٹمنٹ]۔

شرح تنخواہ:- چھ سو روپے ماہانہ [مقررہ]

قابلیت

۱- لازمی: ایم ایس سی فزکس اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ۔

پسندیدہ:- نیوکلیر فزکس میں تخصص۔

۲۔ کاسمک ریز فزکس میں تحقیق کا تجربہ۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا، ان کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گڑھ کے دفتر سے ۵/- روپے (بجائے اسامی نمبر ایک تا ۵) اور ۳/- روپے (باقی ماندہ اسامیوں کے لیے) نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۱۰×۲۳ سینٹی میٹر کا اپنا پتہ لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ ارسال کرکے بذریعہ ڈاک حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواست کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۴ر اپریل ۸۷ء آفس ٹائم تک ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی
رجسٹرار

1064/2792

بانی : سرسید احمد خاں

جلد ۔ ۶ اپریل ۸۷ء شمارہ ۴

مقالہ نگاروں کے لیے

* تہذیب الاخلاق کے اغراض، مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔
* عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔
* ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
* مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
* مسودہ بڑے سائز (20cm x 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔
* مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔
* اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

زر سالانہ : انڈیا ... Rs. 30·00
بیرونی ممالک ... US # 20·00 ہوائی ڈاک
US # 8·00 عام ڈاک

اس شمارے کی قیمت : تین روپیہ

ترسیل زر کا پتہ : ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا۔

دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر سالانہ اگلے ماہ ختم ہو رہا ہے یہ شمارہ ملتے ہی اپنا زر سالانہ ارسال کریں۔

مندرجات

اداریہ

اس وقت دنیا میں جو مذاہب رائج ہیں ان میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب نظر آتا ہے جس کے پیرو ایک بہت بڑی تعداد میں مذہبی فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ شدید ترین سردی کا زمانہ ہو یا موسلا دھار بارش، اگر کوئی شخص فجر کے وقت کسی بھی مسجد میں چلا جائے تو نمازیوں کی صف میں وہ آٹھ سالہ بچے بھی ملیں گے جو اگر خواب خرگوش کا مزہ لوٹتے ہوتے تو چنداں تعجب کی بات نہ ہوتی، وہ اسی سالہ کھانستے کھکھارتے، ہانپتے کانپتے بوڑھے بھی نظر آئیں گے جو اگر اپنے اپنے گھروں پر فجر کی نماز ادا کر لیتے تو بھی ان کی نماز ادا ہو جاتی۔ یہ اجتماعی اہتمام عبادت دنیا کے شاید ہی کسی مذہب کے پیروؤں میں مل سکے۔

مسلمانوں میں من حیث القوم جو مذہبیت نظر آتی ہے وہ ان چھوٹے چھوٹے مکتبوں کی مرہون منت ہے جو مسجدوں یا ٹوٹے پھوٹے چھپروں میں ملک کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں قایم ہیں۔ یہ وہ مکتب ہیں جن میں ایک یا دو فلک زدہ معلم بچوں کو حرف شناس بنا کر ان کو قرآن پاک پڑھنا سکھاتے ہیں۔ یہ مکاتب وہ کانیں ہیں جن سے خام مواد نکل نکل کر دینی مدرسوں، سیکولر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر مختلف شکل صورت وضع قطع طور طریق میں ڈھل ڈھلا کر نکلتے ہیں اور ہمارے معاشرے کے گوشے گوشے میں پھیل جاتے ہیں جن سے علم کی روشنی بھی پھیلتی ہے اور مسلمان اپنی زندگی کے ہر ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں مذہب سے منسلک بھی رہتے ہیں۔

دینی مکتبوں کا ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا یہ جال مسلمانوں کی خواندگی کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور مسلمانوں کی بیشتر مذہبیت انہی مکتبوں کی ابتدائی تربیت کی مرہونِ منت ہے لیکن ان مکتبوں اور مکتب کے چلانے والوں کے ساتھ ہمارا سلوک ناخواستہ اولاد جیسا ہے۔ اس سنہ ۱۹۸۷ء میں جب کہ ایک چپراسی کی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار روپے کچھ زاید ہی ہو چکی ہے، ہم اپنے مکتب کے "میاں جی" اور "مولوی صاحب" کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھتے ہوئے ان کی خدمت میں ڈیڑھ سو اور حد سے حد دو سو روپے ماہوار پیش کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہم اپنے فرض سے ادا ہو گئے۔ ہمارے معاشرے کا "میاں جی" اور "مولوی صاحب" کا طبقہ وہ طبقہ ہے جو نہ تو اپنے مطالبات کی کوئی فہرست مرتب کرتا ہے، نہ جلسے کرتا ہے نہ جلوس نکال کر ہائے وائے کرتا ہوا سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے بلکہ ایک مشین بنا ہوا اپنے فرض کی ادائیگی میں مشغول رہتا ہے۔

جن "میاں جی" اور "مولوی صاحب" کا ذکر ہم نے درج بالا سطور میں کیا ہے اگر ان کی عسرت اور تنگ دامنی صرف انہی کی زندگی پر اثر انداز ہوتی تب بھی یہ بات پورے معاشرے کے لیے باعث شرم ہوتی چہ جائے کہ "میاں جی" اور "مولوی صاحب" کی تنگ دستی اور عسرت کا بھگتان ان کی بیوی اور بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی اہلی زندگی خراب

بن کر رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ پیٹ کی آگ دعظ و پند سے نہیں اشیائے خورد و نوش سے بجھتی ہے۔ ان کے بچوں کی صحیح نشوونما بھی اسی وجہ سے نہیں ہو پاتی کہ یہ تنگ دست ہوتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی یہ بچے صرف اس لیے بچھڑے رہ جاتے ہیں کہ معمولی نوشت و خواند کے بعد ان میں سے بیشتر کو کسی ایسے کام میں لگ جانا پڑتا ہے جس کی یافت سے پیٹ کا جہنم سرد ہوتا رہے۔ اس طرح ایک "میاں جی" یا "مولوی صاحب" کی عسرت و تنگ دامانی کا اثر کئی کئی نسلوں پر پڑتا ہے اور یہ نسلیں پس ماندگی کے غار میں اترتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اس سنگین صورت حال کو دیکھ کر بے اختیار ہادئ برحق سرور دو عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کانوں میں گونجنے لگتا ہے کاد الفقر ان یکون کفرا (قریب ہے کہ فقر کفر کی حد تک پہنچ جائے)۔

جو لوگ مصدق صادق کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، اور کون مسلمان ایسا ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا۔ کیا یہ اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اس فقر کو مسلمانوں کے معاشرے سے نیست و نابود کر دینے پر تل جائے جو کفر کے نزدیک کر دیتا ہے؟ اس کے لیے خواہ "چٹکی" یا "دس پیسہ" فنڈ کا نظم قایم کیا جائے، ماہانہ چندہ دیا جائے یا سالانہ کوئی رقم مقرر کر کے ان لوگوں کی یافت میں اضافہ کیا جائے جن کے دم قدم سے ہماری خواندگی کی شرح گرنے نہیں پا رہی ہے اور مذہب سے کمزور سا سہی، ہمارا لگاؤ زندگی کے ہر عہد میں باقی رہتا ہے۔ مکتبوں کے فلک زدہ معلموں کو کیا اس قابل بنانا ہم پر فرض نہیں ہے کہ وہ بھی ایک صاف ستھری زندگی گذاریں اور ان کے اہل و عیال بھی کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہ ہونے پائیں۔ معاشرے کی پیش رفت میں اس کے ہر فرد کا حصہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم پچھڑے لوگوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ معاشرے کی پیش رفت میں اپنا کردار انجام دے سکیں۔ معاشرے کی پیش رفت کی بات اگر کوئی خیالی بات محسوس ہوتی ہو تب بھی کیا ہم مسلمانوں پر یہ فرض عاید نہیں ہوتا کہ ہم ان تمام لوگوں کو فقر کے اس غار سے نکال لینے کی کوشش میں سرگرم عمل ہو جائیں جو ان کو کفر کے نزدیک کر سکتا ہے؟ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ہادئ برحق کے ارشاد پر کان نہ دھرا تو کہیں ہمارا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو جیسا ان امتوں کا ہوا تھا جنہوں نے اپنے رسولوں کی باتوں پر کان نہیں دھرا تھا اور آج ان کا وجود صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے۔

کاہلی

سید احمد خاںؒ

یہ ایک ایسا لفظ ہے، جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا؛ کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا، کاہلی ہے، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوئ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے؛ اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ بجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ، اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسرِ اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں، بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعتِ ثانی ہو جاتی ہے، مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قوئ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں، اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں؛ اور ہزاروں پڑھے لکھوں میں سے شاید کسی ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو فی الفور دنیا کے کام میں لا دے۔ لیکن اگر انسان ان عارضی مزدوریوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قوئ کو بے کار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔

انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے؛ اور جب کہ اس کے دلی قوئ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اندرونی قوئ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو، جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو، اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور تعلقہ داروں کا حال تھا؛ اور وہ اپنے دلی قوئ کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہ سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں؛ البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ، بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں، اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے؛ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا، اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل، بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں، جو ان دونوں میں ہے، کمی نہیں ہوتے۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں، جن میں ان کو قوائے دلی اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے؛ اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقعے بہت ہیں۔ اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے، یعنی اپنے دلی قوئ کو بیکار چھوڑ دیا ہے۔

اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوتِ عقل کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو؟ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اس کی کوشش اور فکر چاہیے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو؟ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں معروف رہنا لازم ہے۔ تاکہ ہم کو اپنی تمام عمر کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے؛ اور جب تک ہماری قوم کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوڑے گی، اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ

بے کار مباش کچھ کیا کر — گر کر نہ سکے، تو کچھ کہا کر

پُر فریب ظواہر

سید حامد

سنتے چلے آئے تھے کہ عبدالعزیز میمن صاحب خود بھی اتنے ہی بخیل ہیں جتنا اُن کا حافظہ۔ یعنی جو کچھ گرفت میں آگیا اس کو چھوڑنا دشوار۔ حافظہ کی گرفت کا یہ عالم تھا کہ عربی کے پچھتر ہزار سے زیادہ اشعار ازبر تھے اور مٹھی کی گرفت کی یہ کیفیت کہ شاہ خرچی کے دروازے اس طرح بند ہو گئے تھے کہ روشنی کا گزر بھی نہ تھا۔

جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے لوگ غیر معمولی حافظہ کی گرفت کو بھول گئے اور مٹھی کی گرفت یا جزرسی یاد رہی اور بات دراصل صرف حافظہ کی نہ تھی، زبان اور ادب کے ذوق کی تھی۔ زبان دانی اور ادب شناسی کا اس سے بڑا کمال کیا ہو سکتا تھا کہ عرب جو اپنی زبان کے بارے میں کسی کسرِ نفسی کو جائز نہیں سمجھتے۔ عبدالعزیز میمن سے زبان اور محاورہ کی سند لیتے تھے۔ اس نابغہ عصر کے سامنے ان کا زعمِ زبان دانی چکناچور ہو جاتا تھا۔ وہ عبدالعزیز میمن کے اس قدر معترف تھے کہ جب مسٹر محمد علی جناح پاکستان کے سربراہ بنائے گئے تو ایک عرب عالم نے حیرت میں بے ساختہ کہا کہ عبدالعزیز میمن کو سربراہ کیوں نہیں بنایا گیا؟ یہ سوال عرب عالم کی سادگی کا ثبوت تو فراہم کرتا ہی ہے یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ عبدالعزیز میمن کے تبحرِ علمی کی عرب دنیا کتنی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن ان سطور کا مقصد عبدالعزیز میمن کی زبان دا کو چراغ دکھانا نہیں ہے، کچھ اور ہی ہے۔

انھیں جب ایک دینی ادارے کی ضروریات کا علم ہوا تو ا ایک لاکھ روپے کی دو قسطوں میں زندگی کا سارا اندوختہ اس ا کے قدموں میں ڈال دیا۔ عطیہ دینے والے اور عطیہ پانے والے پر رحمت ہو۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ہمیں کسی کی کمزوری کے متعلق رائے کرنے میں جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ایسا بھی ہوتا۔ ظاہری کمزوری باطنی خوبی کا نقاب بن جاتی ہے۔ ایک شخص اپنے ا زندگی بھر تکلیف اور تنگی روا رکھتا ہے، اس لیے کہ جو کچھ بس ا ہو جائے اسے خلقِ خدا کی خدمت کے لیے صرف کر دے۔ سو آپ اسے بخیل کہیں گے؟

سنا ہے مولانا شوکت علی کو کسی انگریز نے کہا تھا کہ سرسید کی صورت اور وضعداری پہ مت جاؤ۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا باغی ہے اس کی تحریک کی ترقی کے ساتھ ہماری ہند کے [illegible] پورے ہو جائیں گے۔

—— مختار مسعود

حسنِ سلوک

(قرآن اور احادیث کی روشنی میں)

محمد بدیع الزماں

کسی بھی کام میں اگر اخلاقی زور موجود نہ ہو تو نہ اُس کا اثر
یر پا ہو سکتا ہے اور نہ وہ دوسروں کو متاثر کر سکتا ہے۔ کردار
ں اخلاقی قوت ہی لوگوں پر جلد اثر کرتی ہے۔ صحت مند معاشرے کے
یے جہاں ہر فرد میں بہت سی خوبیوں سے متصف ہونا ضروری ہے
وہاں اخلاق اور حسنِ سلوک کے بلند ترین مقام پر فائز ہونا بھی
تنا ہی ضروری ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کے لیے دوسروں کی
صلاح سے پہلے اپنی اصلاح مقدم ہے۔

حسنِ سلوک کسی بھی انسان کو خراجِ تحسین پیش کرنے والوں
کے دائرہ میں ہر وقت اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے حسنِ سلوک
سے مراد صرف اخلاقِ حسنہ ہی نہیں بلکہ نرم مزاجی اور شیریں کلامی
سے بھی ہے۔ کیوں کہ ایک میٹھا بول اور نرم مزاجی کڑے سے کڑے دشمن
کا دل موہ لیتی ہے اور لوگ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس شخص کے گرویدہ
ہو جاتے ہیں۔ حسنِ سلوک کی سب سے بڑی مثال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے جس کی وجہ سے خدا کا پیغام لوگوں
تک پہنچانے اور انہیں اپنی طرف گرویدہ کرنے میں آپؐ کو حیرت انگیز
کامیابی ہوئی۔ خدا کے تعالیٰ نے آپؐ کی اسی اخلاقی قوت کو آپؐ کے مشن
کی کامیابی کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا ہے:

"(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں
کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم
کہیں تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے
گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

[illegible] نے اس طرح
خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو (وَاِنَّكَ
لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ)"

اور فرمایا رسول اللہؐ نے کہ:

"میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین قسم کے اخلاق
کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔"

آپؐ کی نرم مزاجی کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت
ہے کہ:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ
اپنے تمام احکام میں نرمی کو زیادہ پسند فرماتا ہے۔"

مندرجہ بالا آیات میں نرم مزاجی کے ساتھ رحم دلی کے شیوے کو
بھی اہم قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم
دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے
منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق
لو۔"

متذکرہ بالا آیات ہر ہفتے جمعہ کے خطبے کے آخر حصہ میں ہم ساری زندگی
سنتے ہیں مگر کتنے آدمی اس کے معنی سے واقف ہیں اور جو واقف
ہیں ان میں سے کتنے اس پر عمل کرتے ہیں؟ حالاں کہ وہ جمعہ کی نماز کو
عید منزلہ سمجھ کر خشوع و خضوع سے ادا کرنے کے لیے صبح سے
اہتمام میں لگے رہتے ہیں اور جب نماز سے فارغ ہو چکتے ہیں تو بہت
بڑے فرض کی ادائیگی سے مسرت محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان

میں سے زیادہ لوگ مسجد سے نکلنے کے بعد وہ سب کچھ بھلا چکے ہیں جو انہوں
نے خطبہ میں سُنا اور جو اس کے معنیٰ سے واقف نہیں ان کے لیے تو سب دن
برابر ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں نرم مزاجی کے ساتھ رحم دلی کے شیوہ
کو بھی حسن سلوک کا اہم جزو قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اخلاقیات صرف چند میٹھے
بول کا نام نہیں بلکہ دوسروں کے کام آنے کا بھی ہے۔ ہر فرد سماج کا ایک
حصّہ ہے، وہ اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔ سماج میں رونما ہونے والے واقعات
کا اس فرد پر اثر انداز ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس موقع پر صرف چند
میٹھی بولیاں مداوا کا کام نہیں کر سکتیں۔ صلۂ رحمی کے متعلق حضرت
ابوہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ:

"(روزِ ازل میں) اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصّے کیے اس
میں سے ننانوے حصّے اپنے پاس رکھے اور ایک حصّہ زمین
کی مخلوق کو عنایت فرمایا جس کی وجہ سے وہ آس پاس
ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے۔ حتیٰ کہ گھوڑی اپنے بچّہ
سے کھُر علیحدہ کر کے رکھتی ہے کہ کہیں اس بچّے کو تکلیف
نہ پہنچے۔"

رحم دلی پر چند اور بھی روایات "تجرید بخاری شریف اردو" میں منقول
ہیں، جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

"حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول گرامی صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا
جاتا۔"

حسن سلوک میں اصولی طور پر جو چیز مقدم ہے وہ یہ ہے کہ

"ہرچہ خود را نپسندی، برای دیگران را مپسند"

یہ ترجمان ہے درج ذیل حدیث کا:

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک اپنے آپ کو مومن
نہیں کہہ سکتا جب تک وہ یہ عادت اختیار نہ کرے
کہ جو چیز اپنے واسطے پسند کرتا ہے وہ اپنے دوسرے
بھائی مسلمان کے واسطے بھی پسند کرتے۔"

قرآن ایک ضابطۂ حیات ہے۔ سماجی زندگی میں روزانہ رونما ہو
والے واقعات و حادثات جو ایک فرد پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں
سے نپٹنے کے لیے فرد کی ذمّہ داریوں میں حسن سلوک کی اہمیت ہر مو
پہ واضح طور پر قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔ ایمان کا تقاضہ یہ نہیں
کہ قرآن کے کسی حصّے پر ایمان لائیں اور کسی حصّے کے ساتھ کفر کر
چنانچہ بنی اسرائیل کے حسن سلوک سے پھر جانے کے متعلق فرمایا خد
تعالےٰ نے:

"یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا
کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ماں باپ کے
ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں
کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا،
نماز قایم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں
کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے
ہوئے ہو۔"

دوسری جگہ "حسن سلوک" کے متعلق ارشاد ہے:

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی
کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو
قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن
سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار، اجنبی ہمسایہ
سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں
سے جو تمہارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو،
یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو
اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔"

حسن سلوک چوں کہ ایک ضابطہ ہے اور قرآن ضابطۂ حیات
اس لیے انسان کی زندگی میں آنے والے ہر موقع پر حسن سلوک کی
پرجو ہدایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں جو
فرد کی اپنی شخصیت مرتب کرنے ہی کی ضامن نہیں بلکہ ان امو
پر اپنی شخصیت کو ترتیب دے سکے سماج اور معاشرہ کی فلاح

کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہوتی ہیں:

یتیموں کے ساتھ سلوک

"پوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرزِ عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔"

"اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔"

"مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔"

"مالِ یتیم کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے۔ بیشک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔"

"یتیموں کا مال ان کو واپس دو، اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

رشتہ داروں کے ساتھ سلوک

"رشتہ و قرابت بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کرتا ہے۔"

"رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین و مسافر کو اس کا حق .... اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو، تو انہیں نرم جواب دے دو۔"

"پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے دو اور مسکین اور مسافر کو (اس کا حق)، یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

بیوی کے ساتھ سلوک

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں، اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہے؟"

"اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے تم چاہو تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو، اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو

اور اگر تم اس سے بچتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

والدین کے ساتھ سلوک

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔"

"ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔"

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا۔ "اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔" اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔"

"اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا۔" اف تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے کوئی اٹھ کر نہ آیا)"

ماں باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں

"ارے بدنصیب مان جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔"

مگر وہ کہتا ہے۔

"یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں" یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔۔۔۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔ میری طرف ہی تجھے پلٹنا ہے۔"

آپس کے تعلقات و معاملات میں سلوک

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں۔ ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

"آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

"مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔"

امانت داری میں سلوک

"اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔"

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

...نوں کے ساتھ سلوک

" اور اے نبیؐ! اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مایل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے[30]"

...کتاب سے بحث میں سلوک

" اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں[31]"

...ں کے لین دین کے سلوک

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے[32]"

...تہمت نہ لگانے کے متعلق

" جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں، جب کہ ان کو اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا[33]"

حواشی

[1] آل عمران ۳ - رکوع ۱۷

[2] القلم [illegible]

[3] تجرید بخاری شریف اردو جلد ثانی "کتاب الادب" نمبر شمار [illegible]

[4] النحل ۔ ۱۶۔ رکوع ۱۳

[5] تجرید بخاری شریف اردو۔ جلد ثانی "کتاب الادب" نمبر شمار ۱۹۴۸

[6] تجرید بخاری شریف اردو ۔ جلد ثانی "کتاب الادب" نمبر شمار ۱۹۴۵

[7] تجرید بخاری شریف اردو۔ جلد اول "کتاب الایمان" نمبر شمار ۱۴)

[8] البقرہ ۲ ۔ رکوع ۱۰

[9] النساء ۴ ۔ رکوع ۶

[10] البقرہ ۲ رکوع ۲۷

[11] النساء ۴ ۔ رکوع ۱۹

[12] بنی اسرائیل ۱۷ ۔ رکوع ۴

[13] الانعام ۶ رکوع ۔ ۱۹

[14] النساء ۴ رکوع ۔ ۱

[15] " ۴ رکوع ۔ ۱

[16] بنی اسرائیل ۱۷ رکوع ۳

[17] الروم ۳۰ رکوع ۴

[18] النساء ۴ رکوع ۳

[19] " " رکوع ۱۹

[20] العنکبوت ۲۹ رکوع ۱

[21] النساء ۴ رکوع ۶

[22] الاحقاف ۴۶ ۔ رکوع ۲ [23] لقمان ۳۱ ۔ رکوع ۲

[24] الانفال ۸ ۔ رکوع ۶ ۔ [25] البقرہ ۲ ۔ رکوع ۳۱

[26] الحجرات ۴۹ ۔ رکوع ۱ ۔ [27] البقرہ ۲ ۔ رکوع ۳۹

[28] النساء ۴ ۔ رکوع ۸ ۔ [29] المؤمنون ۲۳ ۔ رکوع ۱

[30] الانفال ۸ ۔ رکوع ۔ ۸ ۔ [31] العنکبوت ۲۹ ۔ رکوع ۵

[32] النساء ۴ ۔ رکوع ۵ ۔

[33] النور ۲۴ رکوع ۳ ۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶- شمارہ ۴ (اپریل، ۸۶ء)

مُراقبے کی نفسیات یا سائنس

انور کلیم

پچھلے دنوں لندن میں ایک "مراقبہ کانفرنس" منعقد ہوئی، جس میں بدھ مت سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ یورپ کے دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے جوگیوں، بھکشوؤں اور مراقبہ کرنے والوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک نئی کتاب بھی پیش کی گئی، جس میں ماورائیت کے اس شعبے پر خصوصی مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں مراقبے کے علمی، فکری اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لندن کی "مراقبہ کانفرنس" میں جتنے بھی مضامین پڑھے گئے یا تقریریں کی گئیں، ان سب کا تعلق بہرصورت اس مراقبے سے تھا جو مغربی ممالک میں "مغربی اسٹائل" میں ہوتا ہے۔ اہلِ مشرق بھی قدیم زمانے سے مراقبے کے متلاشی اور عامل چلے آئے ہیں۔ پہلے ہم مراقبے کے مشرقی اسٹائل کے بارے میں کچھ باتیں کرلیں۔ پھر لندن کانفرنس کے حوالے سے باتیں ہوں گی۔ مشرقی اسٹائل پر گفتگو کرنے کے لیے ہمارے بزرگ خواجہ شمس الدین عظیمی سے بہتر شخصیت اور کون ہو سکتی ہے وہ مراقبے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"مراقبہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں انسانی شعور آہستہ آہستہ لاشعوری واردات و کیفیات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور لاشعور (روح کا شعور) متحرک ہو جاتا ہے۔ تصوف کے مختلف سلسلوں میں مختلف مشقوں کے ذریعے اس حالت کو پیدا کیا جاتا ہے۔ مقصد سب سلسلوں کا ایک ہی ہے، وہ یہ کہ ارادے کے ساتھ نیت بھی کام کرے۔ اس لیے کہ بغیر نیت کے ارادے میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

مراقبہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے۔ جس میں زمان مکان کی حد بندیاں نہیں ہیں۔ زمان و مکان کی حد بند ہی انسان کے ارادے اور نیت میں خلل پیدا کرتی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری زندگی میں حد بندیاں کن حالات میں زیادہ اور شدید ہوتی ہیں اور وہ کون سی صورت ہے جس میں ہم ان حد بندیوں سے آزاد ہوتے ہیں؟

انسانی زندگی دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک بیداری ہے اور دوسرا حصہ خواب۔ بیداری میں زمان و مکان کا پابند ہے لیکن خواب میں انسان ان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جاگتے کی نسبت سوتے انسان میں صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ مراقبے کے ذریعے خواب میں زمان سے آزاد کام کرنے والی صلاحیتیں بیداری میں ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے مراقبے میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کے اوپر بیداری کی حالت میں ایسی کیفیت طاری ہو جائے جو خواب سے قریب ترین ہے۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اپنی نیت اور ارادے سے بیداری کی طرح خواب کی زندگی طاری کرے۔

مراقبہ کس طرح کیا جاتا ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ے سے اپنے اوپر خواب کی زندگی کیوں کر طاری کی جاسکتی ہے؟
جواب تو خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے دیا ہے اور دوسرا جواب
ہوی نے اپنی کتاب "مراقبہ" (حصہ اوّل) میں دیا ہے۔

ں سلسلے میں چند سفارشات عالمگیر ہیں۔ اوّلاً جو شخص
اقبے میں کامیابی چاہتا ہے، اسے ہر روز ایک پرسکون
قت مقرر کر لینا چاہیے جو تقریباً آدھے گھنٹے کا ہو۔
تعین مستقلاً ہونا چاہیے کیوں کہ نتائج بتدریج
نمایاں ہوتے ہیں۔ مقام کا تعین بھی اہم ہے۔ بہت
ے لوگ خالی گرجاؤں کے تنہا گوشوں میں مراقبہ کرتے
ہیں۔ اس کے علاوہ قدرتی ماحول، مثلاً جنگل، ساحل
سمندر کے پُر سکون مقام کو بھی ترجیح دی جاتی ہے
ہر شخص کی زندگی کا مقصد تنہائی اور وسعت کا
احساس کرنا ہے۔ اس کے بعد اہم چیز آپ کا رجحان
بالتوجہ ہے۔ مراقبے کے تمام طریقوں میں ذہنی کشادگی،
باطنی سکون اور شعورِ ذات پیدا کرنے کی کوشش
کی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی شخص آلتی پالتی
مار کر ہی بیٹھے۔ اس کے بجائے آپ سیدھی پشت والی
کرسی پر پیٹھ سیدھی کر کے ساکت حالت میں بیٹھ
سکتے ہیں۔ ذہن کو ڈھیلا چھوڑنے کے لیے بکثرت
رائج طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اپنے بدن کے
کسی فعل، مثلاً تنفس پر توجہ مرکوز کریں۔ مراقبہ روزمرہ
زندگی سے فرار نہیں بلکہ اس کے لیے تیاری کا نام ہے۔"
جناب رئیس امروہوی نے پہلا سوال اٹھایا کہ ایک نقطے پر
ر رکھنے کے لیے کیا کیا جائے؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیا:
"یہ کہ خیالات و احساسات کے ہجوم کو کم کیا جائے۔ اتنا کم
اتنا کم کہ ذہن [illegible] سمٹ سمٹا کر صرف ایک
خیال [illegible] ایک نقطے پر [illegible]
[illegible]

باطنی حواس کے ذریعے کوئی نہ کوئی تاثر قبول کرتے رہتے
ہیں۔ ہر تاثر ذہن میں خیالات کے ایک نئے سلسلے کو
جگا دیتا ہے۔ دماغی عمل یا سلسلۂ خیال پر بحث کرتے
ہوئے یہ مثال عام طور پر دی جاتی ہے اور میں بھی
اس مثال کا اعادہ کروں گا کہ دماغ کی مثال
سنٹرل ٹیلی فون ایکسچینج کی سی ہے اور اعصابی نظام
تار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اعصاب برابر دماغ کو نئے
نئے پیغام بھیجتے رہتے ہیں اور دماغ کا ٹیلی فونی
مرکز دم لیے بغیر انہیں وصول کرتا رہتا ہے۔ جب ہر
وقت اعصابی نظام اور دماغ میں یہ ہنگامہ برپا ہو
تو انصاف کیجیے کہ آپ کس طرح دماغ
فقط ایک نقطے پر مرکوز کر کے توجہ یکجا کر سکتے
ہیں۔ بے شک یہ انتہائی مشکل اور دقت طلب کام
ہے۔ لیکن ارتکاز توجہ کی مشقوں (بے شمار) کے ذریعے
رفتہ رفتہ ہم ذہن کی اچھل کود اور شعور کی تیزی و
طراری پر قابو پا کر توجہ کی مرکزیت اور ذہن کی
وحدت حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی ذہن کو صرف ایک
نقطے پر لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ارتکازِ توجہ کی مشقوں
میں "شمع بینی" کی مشق کو درجہ اول کی حیثیت حاصل
ہے۔ شمع بینی کی مشقوں میں یہ ہوتا ہے کہ ہم تنہائی
میں خاموش بیٹھ کر اپنی توجہ ایک نقطے یعنی شمع کی لو
کی طرف مبذول کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل خیالات کا
ہجوم ہوگا۔ آپ ہجوم خیالات کو زبردستی ذہن سے
دھکیلنے کی کوشش نہ کریں۔ بہتر یہ ہے کہ آہستہ آہستہ
اس ہجوم کو کم کیا جائے۔ شمع کی لو پر نظریں جما کر نہ
صرف یہ تصور قائم کرنے کی کوشش کریں کہ صرف شمع
کی لو میرے سامنے ہے اور میں اس شعلے کے اندر
حسن، نور اور رنگ اور جاہ و جلال کی پراسرار
دنیا کی جھلک دیکھنے والا ہوں۔ جوں ہی آپ یہ تصور

قایم کرنے اور اس خیال کو جانے کی کوشش کریں گے
آپ پر ادھر اُدھر سے طرح طرح کے خیالات حملہ کردیں
گے۔ کبھی گھر کا خیال آئے گا اور کبھی دفتر کا، کبھی بازار
کا، کبھی کالج کا، کبھی کہیں کا، کبھی کہیں کا۔ آپ خیالات
کے اس دھارے سے پریشان نہ ہوں۔ نرمی اور آہستگی
کے ساتھ ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور
پھر اسی سلسلۂ خیال کو جانے کی کوشش شروع کر دیں کہ
صرف شمع کی لو میرے سامنے ہے اور میں اس شعلے
کے اندر حسن، نور، رنگ اور جاہ و جلال کی دنیا کو
دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

" ابتدا میں سخت الجھن اور مشکل پیش آئے گی بار بار
خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا، بار بار ادھر اُدھر
کے تصورات دماغ پر حملہ کریں گے۔ آپ ہر مرتبہ نرمی
کے ساتھ ان خیالات کو جھٹک کر پھر اپنی توجہ صرف ایک
مرکزی نقطے (شمع کی لو) کی طرف مبذول کر دیں۔ چند
ہفتے تک یہ کشمکش جاری رہے گی۔ یہی چند ہفتے آزمائش
کے ہیں۔ آخر آپ کی قوت ارادی انتشارِ خیال پر غالب
آجائے گی اور استغراق کی کیفیت طاری ہونے لگے گی۔
جب اس مشق کے نتیجے میں محویت طاری ہونے لگے تو سمجھ
لیجیے کہ آپ نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام
دے لیا ہے (یہی حال ارتکازِ توجہ کی دوسری مشقوں
کا ہے۔ استغراق (یا غیر منقسم توجہ) ذہن کی سب سے
بڑی طاقت ہے۔ جب آپ کا دماغ توجہ کو یکسو اور
یکجا کرنے پر قادر ہو جائے تو آپ اس قوت کو
روز مرہ کے چھوٹے بڑے کاموں میں استعمال کر کے
حیرت انگیز نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رئیس امروہوی کا رجحان
زیادہ تر نفسیات کی طرف ہے اور جناب خواجہ شمس الدین عظیمی کی طبیعت
تصوف کی طرف مائل ہے۔ اگرچہ یہ دونوں فاضل اہلِ فکر و نظر اپنی
تحریروں میں نفسیات اور تصوف کو سائنس کے دائرے میں نہیں
سائنس کے قریب ضرور رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ خواجہ صاحب تو رو
کو سائنس کے زیر سایہ یا سائنس کو روحانیت کے زیرِ اثر رکھ کر
اصطلاح "روحانی سائنس" کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ نف
روح کے درجہ اعلیٰ پر پہنچنے کے لیے ایک عملی طریقے یا مشق کا نام "م
ہے۔ مراقبہ کا سائنس سے کیا تعلق ہے، یہ دیکھنے کے لیے آیئے پہ
کی "مراقبہ کانفرنس" میں چلتے ہیں۔

اسٹیج پر بدھ بھکشو آلتی پالتی مارے، آنکھیں بند کیے م
میں مستغرق ہے۔ چہرے پر سکون ہے اور جسم ساکت ہے۔ محسوس
کہ جیسے پہنچا ہوا ہے۔ ایک نرس ایک سفید لباس میں ملبوس بھ
کھوپڑی پر برقیے لگا رہی ہے تاکہ برقی رسل و رسائل کے ذری
کی کیفیات کمپیوٹر پر ریکارڈ کی جا سکیں۔ مراقبے جیسی قدیم
نفسی چیز پر جدید سائنس زور آزمائی کر رہی ہے۔

یہ اسٹیج اور یہ منظر کارڈف یونیورسٹی کی لیبارٹری میں
ہے بلکہ یونیورسٹی ہال میں ہے جہاں ذہن اور نفس کے حوالے
مراقبہ کانفرنس برپا ہے۔ اس کانفرنس میں شہرت یافتہ ماہر نفس
شامل تھے۔ چپلوں والے نیم عریاں بھکشو بھی اور کندھوں پر زر
ڈالے جٹا دھاری جوگی بھی۔ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ یورپ اور ام
مغربی اسلوب میں مراقبہ کرنے والوں کے علاوہ بدھ، ہندو اور مس
کے مراقبی بھی ہوں۔ چنانچہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہونا،
بے خودی اور لاشعور، معرفت، دھیان، کشف جیسے موضوع
کھل کر گفتگو ہوئی۔ ایک موضوع "علاج بذریعہ مراقبہ" بھی تھا۔
نفسی کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں نے اس موضوع والے
میں خاص دلچسپی سے شرکت کی اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ جب
طبی مباحثہ تھا اُس دن ایک نئی کتاب "طبی سائنس سے ماو
رونمائی کانفرنس ہال میں ہوئی۔ یہ کتاب مراقبے کے بارے میں م
کا مجموعہ ہے۔ کانفرنس میں ان کے مضمون نگاروں کو بھی مد
کہ وہ سب سامعین کے سامنے خود آکر وضاحت کریں کہ مراقبہ
اور عملی پہلوؤں کا تعلق سائنس سے کہاں تک ہے۔

مغرب کے ماہرینِ نفسیات قابلِ پیمائش معیاروں کے عادی ہیں
لیے کہ انہیں ... (مقیاس ذہانت)
ان کے ریاضیاتی پیمانے ہیں۔ اس لیے مراقبہ ان کے لیے ابتدا ہی سے ایک
لہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اب تک کوئی ایسا ریاضیاتی پیمانہ وضع نہیں ہوا
سے مراقبے سے پیدا ہونے والی کیفیات کی پیمائش ہوسکے۔ دل کی رفتار
رکت کی پیمائش برقی قلب نگار (ای سی جی) سے ہونے لگی ہے۔
ے کی پیمائش کرنے کا ایک طریقہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مراقبہ شروع ہونے
دماغ کی حرکت کی برقی پیمائش کی جائے۔ چنانچہ کانفرنس میں دماغ
برقی پیمائش کا مظاہرہ سینٹ تھامس ہسپتال، لندن کے ماہرِ عصبیات
بھکشوؤں کے دماغوں پر برقیرے لگا کر کیا۔ اس تجربے پر گذشتہ
ن سال سے کام ہو رہا ہے لیکن ابھی تک قابلِ ذکر نتائج برآمد نہیں
ئے۔

مراقبہ کانفرنس میں جو لٹریچر تقسیم کیا گیا، اس کے مطالعے سے
لوم ہوتا ہے کہ مراقبے پر اب تک ایک ہزار سے زائد تحقیقی مقالات
ائع ہوچکے ہیں جن میں سے بیشتر کا موضوع نفسی کیفیت اور بدنی کیفیت
اباہمی تعلق دریافت کرنا ہے۔ مثلاً یہ کہ مراقبے کی حالت میں آدمی کے
لب کی رفتار کیا سے کیا ہوجاتی ہے، خون کا دباؤ گھٹتا، کم یا زیادہ ہوجاتا
ہے۔ بعض اسکالروں کا کہنا ہے کہ مراقبے اور نیند میں کوئی فرق نہیں
ہے۔ نیند میں عموماً آدمی لیٹ جاتا ہے اور مراقبے میں بیٹھا رہتا ہے۔
بعض دوسرے اسکالروں کی تحقیق کے مطابق مراقبہ ایک طرح کا آرام
ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مراقبہ دراصل حد سے بڑھی ہوئی بیداری
ہے۔ لیکن تمام مقالات میں دو باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ مراقبے کے وقت ... حرکت ہوتی ہے۔
۲۔ یہ حرکت دماغ کے دائیں حصے میں ہوتی ہے۔ خصوصاً کنپٹی کی ہڈیاں اس حرکت کا مرکز ہوتی ہیں۔

سینٹ تھامس ہسپتال کے ماہرِ عصبیات نے مراقبہ کانفرنس
کے چھ مراقبین کے ... کر دکھایا۔ یہ نقش
ہے Electro encephalo gram کا۔ یعنی برقی
دماغ نگار ... حرکت ایک کاغذ پر برقی طور پر منتقل
ہو جاتی ہے۔ ان چھ برقی دماغ نگاروں کا تجزیہ کرنے پر پتا چلا
کہ ہر صورت میں مراقبے کی حالت میں دماغ کے دائیں نصف حصے میں حرکت
واضح اور یقینی طور پر کافی زیادہ ہوگئی۔

برقی دماغ نگاروں کا رابطہ ایک کمپیوٹر سے قائم کرکے دیکھا
گیا تو برقی خطوط اتنے واضح اور صاف نکلے کہ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی
بھی ان کو سمجھ سکتا تھا۔ برقی قلب نگار میں تو لمبے لمبے کاغذوں پر ٹیڑھے
ترچھے خطوط آجاتے ہیں، جن کو ایک ماہر ڈاکٹر ہی پڑھ سکتا ہے،
لیکن کمپیوٹر نے ان خطوط کو چار بیضوی شکلوں میں ریکارڈ کیا تھا۔
ان چار شکلوں سے واضح ہوجاتا تھا کہ دماغ کے کس حصے میں امواج
کی حرکت زیادہ ہے اور کس حصے میں کم۔ خطوط کے علاوہ کمپیوٹر
نے رنگوں سے بھی کام لیا تھا۔

کانفرنس کے آخر میں شرکاء میں یہ احساس عام
طور پر پایا گیا کہ واقعی مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور
یہ دونوں آپس میں کبھی نہ مل سکیں گے۔ مشرق کا مراقبی سکونِ
قلب کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور اس حالت میں کہ وہ اپنے دماغ
میں ہونے والے تمام وسوسوں اور شکوک کو کچل دیتا ہے۔ مغرب
کا مراقبی بھی سکونِ قلب کے پیچھے پڑا ہوا ہے مگر اس حالت میں
کہ وہ اپنے دماغ میں اٹھنے والے ہر سوال، ہر وسوسے اور شک
کو ریاضی کے پیمانے سے ناپنا چاہتا ہے۔

"میں کون ہوں"؟
"میں کیا ہوں"؟
"میں کیوں کر بدل سکتا ہوں"؟

اس فرق کی وجہ سے غالباً یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مشرق میں
مراقبہ انسان کو نفس کی بھول بھلیاں سے گزار کر تصوف کی منزل
کی طرف لے جاتا ہے، اور مغرب میں مراقبہ انسان کو نفسیات
کے راستے سائنس کی طرف لے جاتا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۶ ۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۷ء)

۲۲ ویں قسط

خالد بن ولید

قاضی عبد الستار

صبح دیر سے اُٹھی۔ ابھی دوپہر کی دہلیز تک بھی نہ پہنچی تھی کہ مسجد نبوی کا سارا شامیانہ نمازیوں سے بھر گیا تھا۔ منبر کے سامنے سے دہلیز تک کوئی صف ایسی نہ تھی جس میں سیف اللہ کے جاں نثار ہتھیار پہنے موجود نہ ہوں۔ ابھی اذان کا آخری کلمہ گونج رہا تھا کہ امیر المومنین آگئے۔ صاحبِ ذوالفقار آگئے۔ وہ آگئے۔ جنہیں امیر المومنین کا جانشین ہونا تھا۔ وہ اسم ہائے معظم آگئے جن کے کاندھوں پر شریعت کھڑی تھی، طریقت کھڑی تھی کہ دروازے کا حاشیہ ایک شخص سے بھر گیا۔ سیف اللہ آ رہے تھے، تن تنہا آ رہے تھے۔ پرانے خود پر سیاہ ریشم کا نیا عمامہ، سفید ریشمی نئی قبا پر سیاہ چمڑے کا پرانا بکتر، سفید ریشمی ازار پر سرخ چرمیں موزے، داہنے شانے پر تلوار جھولتی ہوئی، قدم مضبوط اور بے نیاز، نگاہ مودب اور باخبر، جس صف کے سامنے ٹھہرتے اس سے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے برگزیدہ بزرگ آگے بلا لیتے۔ یہاں تک کہ وہ پہلی صف میں پہنچ گئے۔ امیر المومنین خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو پوری مسجد سکوت کی تجسیم ہو گئی۔ خطبہ دیتے دیتے فرمانے لگے۔

"میں ذاتی طور پر خالد کو پسند کرتا ہوں، عزیز رکھتا ہوں وہ اس لیے نہیں معزول کیے گئے کہ انہوں نے بیت المال میں خیانت کی تھی۔ وہ اس لیے بھی معزول نہیں ہوئے کہ اسراف کے مرتکب ہوئے۔ وہ اس لیے معزول کیے گئے کہ مسلمان ان کی سپہ سالاری کو ان کی ذات کو فتح کا مترادف سمجھنے لگے تھے اور یہ فہم امت کی صحت کے لیے خطرناک تھی۔ ان کو معزول کر کے امت کو تعلیم دی گئی کہ زندگی کا مدنی بازو عسکری ہاتھ پر غالب رہتا ہے اور اسے غالب رہنا ہی چاہیے۔ ان کی معزولی پر جس طرح حاشیہ آرائی کی گئی۔ جس طرح اضطراب کا اظہار کیا گیا، وہ غلط ہے، امت کی تنظیم کے خلاف ہے۔ امت کے مستقبل کے منصوبوں کے عین خلاف ہے۔"

حضرت عبد الرحمان بن عوف کھڑے ہو گئے۔

"خالد بن ولید موجود ہیں۔ انہیں بھی اپنی برأت میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہے۔"

مسجد نبوی کی تاریخ میں یہ پہلا خطبہ تھا جسے لقمہ دیا گیا۔ امیر المومنین نے تحمل کے ساتھ سنا اور تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔

"بے شک خالد کو کچھ کہنے کا حق حاصل ہے لیکن نماز کے بعد۔"

دروازوں پر مکبّر کھڑے ہو گئے کہ دور تک صفیں قایم تھیں آخری نمازی کے سلام پھیرنے کے بعد خالد بن ولید کھڑے ہوئے

برادران اسلام!

امیر المومنین کا حکم معزولی وہ بے ہنر سوار ہے جو دلیل کے گھوڑے بدلتا رہتا ہے اور منھ کے بل گرتا رہتا ہے۔ اسراف ۔ مخزوم کی اولاد جن کی دولت و ثروت کی کہانیاں عرب کی زبان پر تھیں اسراف کے کوڑوں سے ماری گئی۔ امیر المومنین بھول گئے کہ ایک شخص مکے سے سواری خرید کر شام کی آخری سرحد تک منزلیں مارتا میری ملاقات کے لیے پہنچتا ہے۔ شاعر ہے، چند شعر سناتا ہے

میں اسے سفر خرچ یا مدد معاش کے نام پر کچھ پیش کرتا تو اس کی غیرت انکار کر دیتی۔ اس لیے دس ہزار درہم انعام کے نام پہ نذر کر دیے اس نے قبول کر لیے۔ نہیں میرے پروانۂ معزولی پر دستخط کر دیے جب یہ دلیل لنگڑانے لگی تو کہا گیا کہ خالد بیت المال کا حساب نہیں رکھتا۔ جو لوگ خالد پر حساب کا الزام لگاتے ہیں وہ کان کھول کر سن لیں کہ خالد قلعوں اور شہروں کا حساب دیتا ہے۔ درہم و دینار کی ضرب تقسیم سے بلند ہے۔ حساب مانگنے سے پہلے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ اس نے حسابات رکھنے کا محکمہ قایم کیا۔ محرر اور منشی اور متصدی اور مہندس فراہم کیے۔ خزانچی بھیجے۔ اگر نہیں تو پھر یہ توقع کس طرح کی جاتی ہے کہ وہ سپہ سالار جو ایک ایک مہینے میں چار چار تاریخ ساز لڑائیاں فتح کر کے دربارِ خلافت کے قدموں میں ڈال دیتا ہو وہ درہم و دینار کے چٹھے کس طرح بناتا رہے گا۔ امیرالمومنین تحقیقات کریں کہ ولید کے بیٹے کو وراثت میں جو جائیداد ملی اس میں عرب و عراق و شام کی فتوحات کروڑوں کی فتوحات سے کوئی اضافہ ہوا۔"

لوگو — خالد نے سو سے زیادہ لڑائیاں لڑی ہیں۔ ہر لڑائی میں فتح پائی ہے اور غنیمت ملی ہے لیکن خالد کے پاس چالیس ہزار درہم جمع نہیں ہو سکے جو اپنی بیاہی کے مہر میں ادا کر سکتا۔ اس خالد پر بیت المال کی خیانت کے الزام نے جب عرب کو بدگمان کر دیا تو تلاش جستجو کے بعد یہ نئی دلیل میسر ہوئی کہ مسلمان خالد کی سپہ سالاری کو فتح کا مترادف سمجھنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ خالد کی خدمت شمشیر کو بھی فتح کے مترادف سمجھنے لگے جو امت کے لیے خطرناک ہے یعنی خالد کا وجود مقدس وجود خطرناک ہے۔

جس شخص نے امت پر منڈلاتے ہوئے ہر خطرے کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالا ہو۔ آج وہ شخص خطرناک ہو گیا۔ جس شخص نے مجوسی علم کی پرچھائیوں کے قدموں پر درفش کاویانی اور پرچم بازنطین کے غرور کو سجدوں میں ڈھکیل دیا ہو، آج وہ شخص خطرناک ہو گیا۔ فارس و روم کے شہنشاہ جس کے گھوڑے کی جھپٹ کے تصور سے کانپتے ہوں وہ شخص مدینۃ النبی کے لیے خطرناک ہو گیا۔ اگر سارا جہان متحد ہو کر مدینۃ النبی پر چڑھ آئے تو خدائے ذوالجلال کی قسم لشکرِ اسلام سے طلوع ہونے والی پہلی تلوار پر خالد کا نام لکھا ہو گا۔

حضرت زبیر کھڑے ہو گئے۔

"یہ مقام جس کی تقدیس کی فرشتے قسم کھاتے ہیں گواہ ہے کہ تو سچ کہتا ہے۔"

مرحبا مرحبا کے شور سے مسجد ہلنے لگی۔

"آخری دلیل میں پوشیدہ خطرے کے تصور سے میں ڈر گیا ہوں۔ وہ کون سا ملک ہے جس کا حاکم فوج کا بھی حاکم اعلیٰ نہیں ہوتا۔ کسریٰ ایران، ہرقل اعظم، عمر بن خطابؓ تینوں اپنے ملک کے دونوں بازوؤں کے حاکم اعلیٰ ہیں۔ نکتے کی بات یہ ہے کہ جب حاکم اعلیٰ کا عسکری بازو کمزور پڑ جاتا ہے تو مدنی بازو کی طاقت و صلابت کے باوجود حاکم اعلیٰ کی حکومت عالیہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ روم اور فارس دونوں کو دلیل میں پیش کرتا ہوں۔ اگر امیرالمومنین کی دلیل کا مطلب یہ ہے کہ عسکری بازو مدنی بازو کے ماتحت رہے تو وہ حاکم ہی کیا جس کو اپنے دونوں بازوؤں پر اختیار نہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ اگر مدنی بازو بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو عسکری بازو اسے کچل سکتا ہے اور اگر عسکری بازو بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو حکومت کا خدا حافظ۔

اگر سپہ سالار نے حاکم اعلیٰ کے کسی حکم کی تعمیل میں غفلت کی
تو اسے معزولی کی سزا دینی چاہیے۔ اگر ایسا کوئی جرم خالد
سے سرزد ہوا ہوتا تو خالد اپنے ہاتھ سے پروانہ سبکدوشی
لکھ کر دربار خلافت میں روانہ کر دیتا لیکن ہوا یہ کہ
منصف امیر المومنین نے سزا پہلے لکھ لی، وضاحت بعد
میں مرتب فرما رہے ہیں

مکہ کی تاریخ گواہ ہے کہ مخزوم کی اولاد سپہ سالاری
کے لیے پیدا ہوتی ہے اور سپہ سالاری کرتے مرتی ہے۔
خالد کو سپہ سالاری سے معزولی کا پروانہ ملا۔ اس
نے اس طرح عمل کیا جس طرح لشکر اسلام کے سپہ سالار
کو عمل کرنا زیب دیتا ہے۔ اگر قنسرین سے معزولی کا پروانہ
بھی ملتا تو خالد اپنا نائب مقرر کرتا اور مدینہ آکر بقیہ
عمر جوار رحمت کی جاروب کشی میں گزار دیتا۔

لیکن لوگو

خدا کی قسم یہ نہیں ہوا۔ دمشق کی مسجد میں خالد آج
ہی کی طرح نماز پڑھنے آیا، سنتیں پڑھ کر بیٹھا تھا کہ
اسے کھڑا کر دیا گیا۔ پوچھا گیا کہ دس ہزار کی رقم تو
کہاں سے لایا۔

لوگو

ولید کے بیٹے سے۔ عرب، عراق اور شام کے فاتح سے
پوچھا جا رہا ہے کہ تو دس ہزار درہم کہاں سے لایا جس
طرح چور سے پوچھا جاتا ہے کہ تو دس ہزار درہم کی
دولت عظمیٰ، دولت کثیرہ، دولت نادیدہ کہاں سے
لایا۔ خالد نے یہ نہیں کہا کہ اس نے اپنی کنیزوں کے
کنگن بیچ کر فراہم کیا کہ وہ گونگا ہو گیا تھا۔ پہاڑوں
کے کرداروں کی طرح پتھر ہو گیا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ اسی
کے سر سے عمامہ اتار لیا گیا اور اسی کے عمامے سے اسی
کے یہ دونوں ہاتھ باندھ دیے گئے۔"

دونوں ہاتھ پھیلا دیے

استغفار، استغفار کی آوازیں جو دب گئی تھیں، بلند ہونے لگیں

"اے امیر المومنین! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ
ختم المرسلین نے کس سپہ سالار کو اس ذلت کے ساتھ
معزول کیا؟

میں سوال کرتا ہوں کہ نائب رسول اللہ نے اس
توہین کے ساتھ کس سپہ سالار کو معزول کیا؟

ـــ نہیں جنہوں نے جمنے نہیں دیا کے ہاتھوں شکستیں کھائیں
ان کے ساتھ بھی کیا یہ سلوک روا رکھا گیا! نہیں تمہاری
امارت میں جس سپہ سالار نے عراق میں سات ہزار مسلمانوں
کی گردنیں اپنی نا اہلی پر قربان کر دیں، دامن امت کو
شکست فاش سے داغدار کر دیا اس کے ساتھ تم نے
کیا سلوک کیا؟

میں سوال کرتا ہوں کہ قرآن پاک کی کس آیت، خلیفہ اکبر کی
کس نظیر نے تم کو یہ حق فراہم کر دیا کہ تم خادمان امت
کو بے آبرو کرو۔

اے امیر المومنین اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہارا ہر فعل،
قول صادق ہے تو تمہارا یہ خیال باطل ہے۔

اے عمر بن خطاب! وہ دن یاد کرو جب تم نے اسی
مسجد میں قسم کھا کر اعلان کیا تھا کہ ذات رسالت زندہ
ہے تو اس نے جو تم سے افضل تھا تم کو ڈانٹا تھا اور
کہا تھا کہ اے قسم کھانے والے جلدی نہ کر اور تمہاری
قسم باطل ہو گئی تھی۔

وہ دن بھی یاد کرو جب اسی مسجد میں تم نے
اسامہ بن زید کے لشکر کی روانگی کے خلاف رائے دی تھی
اور تمہاری رائے باطل قرار دی گئی تھی۔

وہ دن بھی یاد کرو جب تم نے زکوٰۃ کی وصولی میں
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کرو جب تم نے اس کو جو تم پر فضیلت رکھتا تھا مشورہ دیا تھا کہ خالد کو سپہ سالاری سے معزول کر دو تو تم کو جواب ملا تھا کہ جس تلوار کو اللہ نے اپنی امت کے تحفظ میں علم کیا ہو اسے میں غلاف کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ لیکن جب تم خلیفہ ہوئے تو تم نے پہلا فرمان اس تلوار کو غلاف کرنے کے لیے لکھا۔

لیکن اس سے تمہاری تسلی نہیں ہوئی بالآخر تم نے اس تلوار کو توڑ ڈالا۔ بڑی ذلت کے ساتھ توڑ ڈالا۔ تم نے مجھے اس لیے معزول کیا کہ تم میری مقبولیت اور شہرت سے ڈرنے لگے۔ وہ عزت جو امت نے مجھے عطا کی تم اس سے خوف کھانے لگے۔ لیکن تم کو تمہارے مخبروں نے یہ خبر نہیں دی کہ خالد سپہ سالار ہے، قلعوں اور شہروں کا شکار اسے مرغوب ہو سکتا ہے لیکن بستیوں اور آبادیوں کا انتظام و انصرام اسے پسند نہیں اور یہ بھی کہ نبی آخر الزماں اور ان کے نائب نے خالد کو جو کچھ عطا کر دیا اس سے زیادہ کی اسے آرزو نہیں۔

تمہارے امیر المومنین ہوتے ہی میں سبکدوش ہو جاتا لیکن چالیس ہزار مسلمانوں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے آنا مردانگی کے خلاف تھا۔ تم کہتے ہو کہ تم امیر المومنین نہ ہوتے اگر کسی دوسرے میں امیر المومنین ہونے کی صلاحیت ہوتی۔ تمہارا قول ثبوت کا محتاج ہے لیکن میں اپنے قول کے ثبوت میں تمہارے معتمد سپہ سالار اور حاکم شام کو پیش کرتا ہوں۔ چالیس ہزار کا لشکر جار حیونوں سے یرموک کے میدان میں ایک انبوہ کی طرح پڑا تھا۔ میری سپہ سالاری نے انہیں چالیس ہزار شیروں میں منقلب کر دیا۔ ان چالیس ہزار شیروں کو چالیس ہزار کی عظیم [illegible] تبدیل کر کے مدینے [illegible] آجانا میری غیرت [illegible] کے خلاف تھا اور یہ بھی کہ میں نے آقائے [illegible] کے عہد مبارک میں قسم کھائی تھی کہ

ساری زندگی ان کا علم میرے شانوں پر قایم رہے گا اور اس طرح کہ اس کی پرچھائیاں آفتابوں کا شکار کھیلتی رہیں گی۔

حضرت عبد الرحمان بن عوف کھڑے ہو گئے اور جوش و خروش سے گرجنے لگے۔

"اے علمدار محمدؐ — اے سپہ سالار خلافت اکبر۔ جب تک تیرے آقا کی حیاتِ طیبہ کی یادگاریں قایم رہیں گی، جب تک خلیفۂ اکبر کے کارنامے جن پر امارتِ امیر المومنین کی بنیادیں کھڑی ہیں، سلامت رہیں گی جب تک تاریخ کی کتابیں زندہ رہیں گی۔ خالد — سپہ سالار رہے گا — خدا کی قسم سپہ سالارِ اعظم رہے گا۔"

ان کے بیٹھتے ہی سیف اللہ نے مخاطب کیا۔

"اے امیر المومنین عمر بن خطاب — تم نے مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی مجلس شوریٰ کے مشورے کے بغیر مجھ کو لشکر کی علمداری سے معزول کر کے جمہوریت سے آمریت کی طرف پہلا قدم رکھا۔

اے امیر المومنین عمر بن خطاب! تم نے اصحابِ کبار کو مدینے میں پابند کر دیا۔ یہ آمریت کی طرف دوسرا قدم تھا۔ تمہارے اس اقدام نے جلیل القدر افراد کو خدمتِ جہاد کے ثواب ہی سے محروم نہیں کیا بلکہ امتِ مسلمہ کے بلند ہوتے ہوئے وقار کو دھکا دے دیا کہ اگر (حضرات) زبیر اور عبد الرحمٰن بن عوف جیسے عالی مرتب لوگ فارس کے محاذ پر ہوتے تو لشکر اسلام کو وہ شکستیں نصیب نہ ہوتیں جن کے لیے تمہارا دورِ امارت یاد رکھا جائے گا۔ خدا گواہ ہے کہ فارس کی لڑائیوں میں اکیس ہزار مسلمان شہید ہو گیا۔ ایک معمولی سی لڑائی میں سات ہزار مجاہد ذبح ہو گئے، جو خلیفۂ اکبر کے پورے عہدِ مبارک میں

برانہ سے یرموک تک بڑے بڑے مرتدوں کے لشکروں کو تباہ کر دیا گیا۔ دو دو شہنشاہوں کی ہزاروں سال کی ناموس اعظم برباد کر دی گئی۔ تب بھی سات ہزار مجاہد شہید نہ ہو سکے۔ یہ اکیس ہزار مسلمان کسی لائق سپہ سالار کی رکاب میں ہوتے تو دومتہ الکبریٰ کے محلات عالیہ پر محمدی علم نزولِ اجلال فرما چکا ہوتا۔

تمہارا سپہ سالارِ فارس بالاخانے پر بیٹھ کر جنگ لڑاتا ہے اور جب لشکر اسلام پسپا ہوتا ہے تو اس کی زوجہ فریاد کرتی ہے۔ اے کاش آج مثنیٰ ہوا ہوتا۔ اپنے شوہر سپہ سالار کی موجودگی میں مثنیٰ کو یاد کرتی ہے۔ یہ وہ مثنیٰ جیسے میرے لشکر کے ایک بازو کی افسری اس لیے نصیب ہو سکی کہ اس کے شانے پر خلیفۂ اکبر کی سفارش کا علم لہرا رہا تھا خدائے ذوالجلال کی قسم میری رکاب کے کسی سالار کی بیوی کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا ہوتا تو وہ بکتر نوچ کر اپنا سینہ غنیم کے تیروں پر جھونک دیتا۔ تم تو سپہ سالار کا نہیں تمہارا ہے کہ تم نے معلیٰ کی تلوار کو گھوڑے پر چڑھا دیا۔ معلیٰ فریاد کرنے لگا اور گھوڑا بے آبرو ہو گیا۔ امت خسارے اور رفعت سے غریب ہو گئی۔ یاد رکھو کہ جس طرح آنکھ اور کان مختلف خدمتوں کو انجام دیتے ہیں اسی طرح امت کے جلیل القدر افراد مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے مختلف میدان ہوتے ہیں۔ جب سماعت بصارت کی خدمت پر مامور ہونے لگتی ہے اور اس عمل میں تکرار پیدا ہو جاتی ہے تو آسمان سے بلائیں نازل ہوتی ہیں اور زمین سے وبائیں پھوٹنے لگتی ہیں۔

(جاری ہے)

ایمانی اخلاق

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تین باتوں کا شمار ایمانی اخلاق میں ہوتا ہے۔

۱۔ جب غصہ آئے تو انسان (مغلوب ہو کر) باطل (کے جوہڑ) میں نہ ڈوب جائے۔

۲۔ جب خوشی ہو تو خوشی (کی بہتات) راہِ حق سے برگشتہ نہ کرے۔

۳۔ اور جب قدرت و اقتدار پائے تو وہ چیز نہ لے جس پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اجرامِ فلکی کی ابتدا

سید قاسم محمود

ہم اس دنیا میں رہتے سہتے، زمین پر چلتے پھرتے، کام کاج کرتے اور سوتے جاگتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے قدرت نے ایک دلچسپ و دلفریب سماں پیدا کر رکھا ہے۔ کہیں چرند، کہیں پرند، کہیں کوہ کہیں دریا، کہیں صحرا، کہیں سمندر، کہیں چاند کہیں سورج، کہیں بیل کہیں بوٹے، کہیں ترکاریاں کہیں سبزیاں، کہیں پھول کہیں پھل، کہیں دالیں کہیں غلّے موجود ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو خیال آتا ہوگا کہ ان کی اصل کیا ہے، اور یہ کہاں سے آگئیں؟ ہمارا کرۂ ارض کیسے وجود پذیر ہوا؟ اور کس طرح ہماری قیام گاہ بنا؟ ان میں موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات کب اور کیسے پیدا ہوئے اور ان کی حقیقت و اصلیت کیا ہے؟ پھر کیا کوئی طریق کار ہو سکتا ہے کہ ہم رازِ درونِ پردہ کی کوئی جھلک دیکھ پائیں۔

یہ صحیح ہے کہ انسان کی خلقت سے لاکھوں برس پہلے کرۂ ارض موجود تھا اور اس میں موالید ثلاثہ ہو چکے تھے۔ اس لیے انسان کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ یہ کائنات کن مادّوں سے بنی ہے اور کس طرح بنی؟ لیکن انسان کو بھی کرۂ ارض پر پیدا ہوئے صدہزار برس گزر گئے اس دیرینہ قیام اور طویل تعلق کی وجہ سے قدرت کی بہت سی باتیں ہمارے مشاہدے اور علم میں آئیں۔ جن کی بنا پر ہم نے رازہائے قدرت کی تحقیق کی کچھ بنیاد رکھی جس پر رفتہ رفتہ اب حقائق اشیا کی ایک شاندار عمارت استوار ہو گئی ہے اور موجودہ زمانے میں ہم اس قابل ہو رہے ہیں کہ قدرت کے کرشموں کی اصلیت و حقیقت کا کچھ دلچسپ مطالعہ اور نظر افروز مشاہدہ کر سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ خالق اکبر نے عقل انسانی میں غور و فکر تحقیق و تجسس اور [illegible] سے بہرہ کر ودیعت کر دیا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انسانی دماغ کو وہ عروج و کمال جو دورِ حاضر میں نظر آتا ہے لاکھوں برس کے ارتقائی نشو و نما اور تشحیذ اذہان سے حاصل ہوا ہے اور یہی قانونِ قدرت ہے۔ ابتدائی انسانوں کے ذہنی و دماغی قوام اتنے منجھے ہوئے نہ تھے کہ وہ حقائق و خواص اشیا کے صحیح عالم ہوتے اور صحیفۂ قدرت کا دقیق نگاہ سے مطالعہ کرتے جو اُن کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ یہ کام بعد کی نسلوں کا تھا جنھوں نے اپنے ترقی پذیر دماغ کی بدولت اس میں باری باری سے حصّہ لیا اور پھر وہ موجودہ عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ممد و معاون ہوئیں۔

دنیا کی پیدائش اور کائنات کی خلقت بھی انسان کے لیے ایک عجیب معمہ بنی رہی ہے۔ اس گورکھ دھندے کے کھولنے میں عقل انسانی نے بڑے بڑے زور مارے جو دورِ حاضر کے انسانوں کے لیے بہت دلچسپ اور عجیب و غریب ہیں۔ ہم انسانی دماغ کی ان دلنواز مساعی کی کوئی تاریخ یہاں بیان کرنا نہیں چاہتے جو آفرینش عالم کے بارے میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ کیونکہ وہ ایک بڑے دفتر کی محتاج ہیں البتہ یہ جتائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابتدائی انسانوں کی کوششیں اس بارے میں بار آور ہوا تھیں ان کے بعد کے انسانوں کی نقش برآب ہوئیں مگر جب مسیحؑ سے ہزاروں برس پہلے قدیم مصر و یونان میں تہذیب کا نور چمکا تو تخلیق و تکوین عالم کے بارے میں دنیا کے سامنے بعض ایسے نظریے آگئے جو صدیوں تک انسانی علوم و فنون کی بنیاد بنے رہے اور تحقیق و تفتیش کے موجودہ دور میں انہیں سے علوم جدیدہ پیدا ہوئے جن سے ہمارا یہ مضمون ماخوذ ہے۔

دنیا کی پیدائش کے بارے میں بعض قدیم قوموں میں عجیب و غریب عقیدے مروّج تھے جو سینہ بسینہ ہمارے زمانے تک چلے آئے ہیں اور اب بھی کسی نہ کسی

صورت میں بعض وحشی یا نیم وحشی اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی زبانی روایتوں اور کہاوتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہستی دنیا کی بنانے والی تسلیم کی جاتی تھی۔ ایسی ہستی بعض وقت کسی پرندے کی صورت میں بعض وقت کسی حیوان کی صورت میں اور بعض وقت کسی بوڑھے شخص کی وضع پر فرض کر لی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ ایسے خالق کے پاس کوئی خام مادہ موجود تھا جس سے اس نے ہماری زمین بنا ڈالی۔ بعض روایتوں میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ سمندر اور آسمان پہلے سے موجود تھے دستِ خالق نے سمندر میں سے خشک زمین نکال کر علیحدہ کر دی یا اسے بٹھا کر بیل کے ایک سینگ پر دھر دیا۔ اسی طرح بعض قدیم مذاہب میں عجیب و غریب عقیدے داخل تھے جو اس زمانے کی طبائع انسانی کے لیے موجبِ اطمینان سمجھے جاتے تھے

حکمائے یونان کا معقول نظریہ

قدیم یونان وہ سرزمین ہے جس پر پرانے زمانے میں سب سے پہلے آفتاب علوم و فنون چمکا اور اس کی کرنوں سے سارا جہان جگمگ جگمگ کر اٹھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس علمی خطے کے باشندوں نے صحیفۂ قدرت کا مطالعہ ایسی گہری نظر سے شروع کیا کہ ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ قدیم یونان میں علم الاصنام کی بنیاد پڑ گئی اور یہ علم ازمنہ سابقہ کی بہ نسبت معقولیت معنی خیزی اور حسن پرستی کا لامحالہ زیادہ سرمایہ دار بن گیا۔ یونانیوں نے قرار دیا کہ "یورے نس" (ہر شل) سب دیوتاؤں سے بڑا دیوتا ہے جس کے ہاں یکے بعد دیگرے لڑکا، پوتا اور پڑپوتا پیدا ہوا۔ دیوتاؤں کی ان تین نسلوں نے دنیا کی پیدائش میں حصہ لیا اور اس میں اتنے چھوٹے دیوتا اور پیدا کر دیے کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مظہرِ قدرت پر حکمران ہو گیا اور دنیا کا کاروبار چلانے لگا۔

قیامِ زمین کا نظریہ

مسیح سے چھ صدیاں پیشتر یہ قدیم نظریہ متروک ہو گیا کیونکہ اس میں دیوتاؤں کو انسانی شکل میں متشکل کرنے کا نقص موجود تھا۔ اس کی جگہ متعدد اور نظریے پیدا ہوئے، جن میں امپیڈوکلیس (۴۵۰ برس قبل مسیح) افلاطون (تقریباً ۴۲۷ سے ۳۴۷ برس قبل مسیح) اور ارسطو (۳۸۴ سے ۳۲۲ برس قبل مسیح) کے نظریوں کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی رو سے مادہ عناصرِ اربعہ یعنی خاک، باد، آتش اور آب کا مرکب ٹھہرا اور افلاطون کے قول پر ارسطو نے قرار دیا کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آتی۔ اس کا مادہ کسی نہ کسی

صورت میں پہلے ہی موجود ہوتا ہے صرف عناصرِ اربعہ کی ترتیب و ترکیب سے سب چیزیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ ان حکماء کے نزدیک گردش کی حرکت اعلیٰ حرکت تصور ہوتی تھی اور مدوّر شکل بھی جاتی تھی۔ اس بنا پر یونانی حکما کرۂ ارض کو قائم اور سارے عالموں کا مرکز قرار دیتے تھے جس کے اردگرد سورج، چاند اور دوسرے ستارے گھوما کرتے تھے اور اس سارے عالم کی انتہائی حد پر چھوٹے چھوٹے ثوابت محیط تھے۔

اس نظریے کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس نے ہماری زمین کو سارے عالموں یا کائنات کے مرکز کی ایک نرالی اور امتیازی حیثیت بخش دی۔ جس سے انسان کے کلاہِ تفاخر میں ایک مخصوص طرّے کا اضافہ ہو گیا مگر ساتھ ہی صحیح علم کی تحقیق و تفتیش کو پیامِ مرگ پہنچ گیا جب کرۂ ارض کی حیثیت خاص یا نرالی ٹھہری تو اس کی پیدائش کا کوئی سائنٹفک ثبوت یا جواز تلاش کرنا عبث نظر آیا۔ اگر دنیاؤں کی خلقت کا واقعہ اتنا عام ہوتا جتنا کہ کتے اور بلی کے بچوں کی ولادت کا واقعہ ہے تو ہم دوسری دنیاؤں کو اپنی آنکھ سے پیدا ہوتے دیکھ کر اپنی دنیا کی تکوین کا کچھ صحیح اندازہ کر لیتے لیکن ایسا آسانی سے ممکن نہیں۔

مسیحیت کی رکاوٹ

اس کے علاوہ صحیح معلومات کے حصول میں مسیحیت سنگِ راہ ہو گئی جس کا ایک عام عقیدہ یہ تھا کہ ہماری دنیا اور اس کی آفرینش سب سے نرالی اور امتیازی ہے۔ یورپ میں اگر کوئی شخص اس کے خلاف کوئی نظریہ پیش کرتا تو مذہب کی رو سے قابلِ مواخذہ اور لائقِ اذیت ٹھہرتا جس کی متعدد مثالیں یورپ کی مسیحی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن بعض حق پرست اور صاف گو ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو زبردست اخلاقی جرأت اور آزادیٔ رائے سے کام لے کر روایتی مذہب کی فضول قیود کو توڑ ڈالتے ہیں چنانچہ ایک شخص مسمی نکولس نے جو خود مسیحی کنیسہ کا ایک بڑا پادری تھا ۱۴۴۰ء میں یہ خیال ظاہر کیا۔

> "میرا مدت سے خیال ہے کہ زمین ساکن نہیں بلکہ دوسرے ستاروں کی طرح گردش کرتی ہے۔ میرے نزدیک زمین ایک رات دن میں اپنے محور کے گرد گھوم جاتی ہے"

یہ خیال اس زمانے میں اوکا مقصود تھا مگر ... تشریح ...

اس کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکا اور پھر پادری نکولس کی برگزیدہ شخصیت اس امر کے مانع ہوئی کہ کینسہ اس سے سختی کے ساتھ بازپرس کرے۔ لیکن پادری نکولس کے شاگرد واقعتیین مذہبی مواخذہ سے نہ بچ سکے۔

اور سولہویں صدی مسیحی میں جب پولینڈ کے ایک ماہر فلکیات مسمی نکولا کاپرنیکس (۱۴۷۳ تا ۱۵۴۳ء) کے ایک متبع برونو (۱۵۴۸ء تا ۱۶۰۰ء) نے فلکیات کے موضوع پر نئے نئے خیالات پیش کیے تو کنیسہ نے پہلے تو اسے ہفت سالہ قید کی سزا دی اور بالآخر اسے جلتی آگ میں جھونک دیا۔ اس مظلوم پر ایک الزام یہ تھا کہ وہ متعدد دنیاؤں کا قائل ہے۔

کاپرنیکس نے اپنی زندگی میں فلکیات پر ایک معقول مسودہ کتاب تیار کیا تھا، لیکن مسیحی کنیسہ کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے اس نے اس کی اشاعت آخر دم تک روکے رکھی۔ مسودہ کتاب مطبع میں چھپنے کو دیا بھی گیا تو ایسے وقت میں کہ کاپرنیکس بستر علالت پر دراز تھا۔ کتاب کا اولین مطبوعہ نسخہ مصنف کے پاس پہنچا اور اس نے ہاتھ میں تھام کر ایک گونہ تسلی قلب حاصل کرلی۔ مگر اس کے بعد وہ جلد ہی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ کتاب اشاعت پذیر ہوئی، لیکن دوسروں نے اس میں یہ دیباچہ لگا دیا کہ اس کے مسائل بالکل قیاسی اور نظری سمجھنے چاہیں۔

اس احتیاط کی بدولت کاپرنیکس مسیحی کینسہ کے ہاتھ نہ آیا لیکن موخرالذکر نے اس کی کتاب کی سخت مخالفت کی، جس میں کنیسہ روم کے ساتھ لوتھر اور کیلون جیسے پروٹسٹنٹ بھی ہمنوا ہو گئے۔ علوم صحیحہ کی تحقیق و تفتیش پھر بہت پیچھے جا پڑی مگر یہ رد دبنے والی نہ تھی، اس لیے مسیحیت کے دبائے بھی نہ دب سکی۔

دور بین کی ایجاد

۱۶۰۸ء میں دوربین ایجاد ہوئی اور ۱۶۰۹ء میں ایک اطالوی موجد گلیلیو نامی نے ایک چھوٹی سی دوربین بنائی جو اب تک محفوظ ہے اس دوربین کی بدولت گلیلیو نے سیارہ زہرہ کے مختلف مناظر اپنی آنکھ سے دیکھ لیے۔ کاپرنیکس کے فلکی نظریوں کے خلاف ایک اعتراض یہ تھا کہ سیارے آفتاب کے گرد گھومتے فرض کیے جائیں تو کسی وقت ان کے تاریک پہلو زمین کی طرف ہونے چاہئیں، جیسا کہ چاند کی گردش سے ظاہر ہے۔ گلیلیو نے [illegible] دوربین سے اعلان کر دیا کہ حقیقت میں زہرہ کا تاریک پہلو زمین کی طرف ہوتا ہے۔ اس سے کاپرنیکس کے قیاسات صحیح متصور ہونے لگے، جن میں زمین اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی بتائی گئی تھی۔

اس کے بعد ہی ایک اور اہم دریافت عمل میں آئی۔ مشتری کے ۹ چاندوں میں سے ۴ بڑے چاند مشاہدے سے معلوم ہو گئے۔ اگر دوربین کی مدد سے انسانی آنکھ کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ اپنے سارے نظام شمسی پر بیک وقت طائرانہ نگاہ ڈال سکے اور دیکھ پائے کہ آفتاب بڑی آن بان سے نظام شمسی کے مرکز میں ہے اور اس کے گرد کئی سیارے اپنے اپنے چاندوں سمیت طواف کر رہے ہیں، جس سے ہر روز ان کا مقام ادلتا بدلتا رہتا ہے تو کاپرنیکس کے فلکی نظریوں کی فوراً تصدیق ہو جاتی، مگر کرۂ ارض سے ایسا دلچسپ نظارہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے بہرنوع گلیلیو کی دوربین سے اتنا اور ثابت ہو گیا کہ گو ہم اپنے نظام شمسی کے سارے سیارے آفتاب کے گرد چکر کاٹتے نہیں دیکھ سکتے مگر بعینہٖ اسی قسم کا نظام گردش جو بعض محققوں کے قیاسات پر مبنی ہے بعض سیاروں سے والبتہ نظر آسکتا ہے۔

اس کی تائید میں گلیلیو نے ۱۶۱۰ء میں دریافت کیا کہ مشتری کے گرد چار بڑے چاند گردش کرتے ہیں، پھر کچھ مدت بعد یہ دریافت ہو گیا کہ زحل کے گرد بھی متعدد چاند گھوم رہے ہیں۔ ان دونوں نظام ہائے گردش کا معلوم ہونا تھا کہ محققوں اور ماہرین فلکیات کا ذہن اس طرف منتقل ہونے لگا کہ سیاروں کی گردش کا یہ دستور اتفاقیہ ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ خاص قوانین قدرت کے ماتحت ہے۔ اس پر طبائع میں خیال پیدا ہوا کہ ہماری زمین کا کرۂ کہاں سے آیا اور کیوں کر وجود پذیر ہوا جس سے یہ مسئلہ غلط قیاسات کی حد سے نکل گیا اور ساتھ ہی روایتی مسیحی مذہب کی فضول قیود سے آزاد ہو گیا۔

ہمارے نظام شمسی کی متحد الوقت پیدائش

ابتدا میں محققوں کی توقع تھی کہ افلاک کے مزید مشاہدوں سے شاید دوسرے سیاروں کی پیدائش یا تکمیل کی مثالیں نظر آجائیں گی کیوں کہ جب سارے سیارے یا ستارے ایک دم پیدا نہیں ہوئے تو بہت ممکن ہے ان میں سے کچھ ہنوز پیدا ہو رہے ہوں۔ کچھ اپنی عمر کی

ابتدائی منزل ہوں طے کر رہے ہوں اور کچھ حدِ تکمیل کو پہنچ چکے ہوں وغیرہ اگر
خلقتِ کواکب کے مختلف مدارج سامنے ہوں تو ان کی بنا پر کرۂ ارض
کی پیدائش کا کچھ صحیح اندازہ ہو جانا مشکل نہیں۔ لیکن یہ توقع چنداں پوری
نہ ہوئی اور تخلیق عالم کی گذشتہ تاریخ کا باب کچھ مدت کے لیے پھر دھندلکے
میں چھپ گیا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے نظام شمسی میں جتنے
سیارے داخل ہیں وہ تقریباً ایک ہی وقت میں وجود پذیر ہوئے ہیں اور
ان کی عمریں تقریباً یکساں ہی سمجھنی چاہئیں۔ اس لحاظ سے ہمیں اپنے نظام
شمسی میں کوئی سیارہ کرۂ ارض سے عمر میں چھوٹا یا بڑا دکھائی نہیں دیتا
ہاں سیاروں کے دوسرے نظاموں میں ہم سے چھوٹی یا بڑی عمر کے اجرام
فلکی ضرور موجود ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ موخر الذکر سیارے یا ستارے
ہم سے اتنے فاصلۂ بعیدہ پر ہیں کہ طاقتور سے طاقتور دوربین انہیں
اتنا بھی روشن ظاہر نہیں کرتی جتنا کہ مشتری ہے جو ہمارے سب سیاروں
میں سب سے بڑا سیارہ ہے۔ ایسی حالت میں لے دے کر یہی چارہ کار
رہ جاتا ہے کہ محقق اپنے حاصل کردہ علوم و فنون پر بھروسہ کریں اور
بعض مشاہدات دقیقہ کی بنا پر کوئی معقول نظریہ قائم کر لیں۔ محقق جانتے
ہیں کہ سب اجرام فلکی طبیعیات اور میکانکیات کے عالمگیر قوانین کے تابع
ہوتے ہیں اگر کسی سیارے یا کواکب کی موجودہ بناوٹ یا اجزائے ترکیبی
کا ہمیں پتہ معلوم ہو جائے تو قواعد مذکورہ کی بنا پر ہمیں اس سیارے کے
ماضی و مستقبل کا پتہ چل سکتا ہے اور یہی علم فلکیات میں موجودہ
تحقیق و تدقیق کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔

چمکیلے بادل کا ابتدائی نظریہ

خلقت کائنات کے پرانے نظریوں میں ایک فرانسیسی محقق کا نظریہ
نرالا تھا۔ اس شخص کا نام لیپ لیس تھا۔ ۱۷۹۶ء میں اس نے یہ خیال
ظاہر کیا کہ ہمارا آفتاب اور اس سے متعلق سیارے ایک چمکیلے بادل سے
پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ ذہن میں بھی سورج ہی کا ایک ٹکڑا گرا ہوا ہے۔ فضا میں
پہلا لاکھوں میل لمبا چوڑا ایک لطیف بادل پیدا ہوا، کچھ مدت بعد وہ کثیف
ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی گیسیں آپس میں مل گئیں۔ نئے مرکبات
بننے لگے۔ ذروں کے اتصال اور کشش سے اس میں [illegible] پیدا ہوئی اور
بڑھ کر شدید [illegible] اپنے

گرد تیزی سے گھومتا رہا۔ اس حالت میں کچھ تو گردش کی تیزی اور کچھ
سکڑنے سے بعض سیال حصے یوں اڑ کر الگ ہو گئے جس طرح موٹر گاڑی
کے پہیے سے کیچڑ کے چھینٹے اڑتے ہیں۔ یہ رقیق حصے رفتہ رفتہ ٹھنڈے
ہو کر جم گئے اور ہمارا نظام شمسی پیدا ہو گیا۔

لیپ لیس کی غلطی

لیپ لیس نے بات تو پتے کی کہی تھی لیکن نظام شمسی کی
پیدائش کی تفصیل میں وہ زیادہ چکرا گیا۔ اس نے سمجھا کہ چمکیلا بادل
جس سے سورج اور سب سیارے وغیرہ پیدا ہوئے، لمبائی چوڑائی میں
سیارہ "نیپچون" کے مدار سے بہت بڑا تھا جس کی بابت محققوں کا
خیال ہے کہ سورج سے اوسطاً ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے
طبیعیات کا قاعدہ ہے کہ جو اجرام فلکی جزواً یا کلاً گیس کی صورت میں ہو
اور اس سے روشنی اور حرارت نکلتی ہو تو ضرور ہے کہ اس کی مقدار
یا حجم میں تدریجاً کمی واقع ہو۔ چنانچہ اس حساب سے ہمارا سورج ابتدا
میں موجودہ حجم سے ہزارہا گنا بڑا تھا اور اس میں ذاتی گردش موجود
تھی جس سے کوئی جرم فلکی مستثنیٰ نہیں۔ سورج کی ایک گردش اپنے
محور کے گرد تقریباً ۲۵ روز میں ختم ہوتی ہے۔ لیکن لیپ لیس کا عقیدہ
تھا کہ سورج جب چمکیلے بادل کی صورت میں اور موجودہ حیثیت سے بہت
بڑا تھا تو اس کی گردش زیادہ تیز نہ تھی مگر جب اس میں زیادہ سکڑاؤ یا
کثافت پیدا ہوئی تو گردش تیز ہونے لگی اور سیال سورج کا ایک سیال
مادہ چھینٹ کی طرح اڑ کر علیحدہ ہو گیا جس سے نیپچون کا سیارہ وجود
پذیر ہوا اور موخر الذکر سیارے کے مدار سے جب سورج اور سمٹا
اور "یورینس" کے دائرہ گردش پر پہنچا۔ یورینس اور اس کے چار
چاند اڑ کر الگ ہو گئے۔ پھر سورج کے حجم میں مزید کمی واقع ہوئی اور وہ
زحل کے دائرہ گردش کے قریب پہنچا تو زحل اور اس کے متعدد چاند سورج
سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ غرض سورج کے حجم کی تخفیف کے ساتھ ساتھ اس
کی رفتار گردش بڑھتی رہی اور اسی سے سورج کا رقیق مادہ کیچڑ کے
چھینٹوں کی طرح اڑ اڑ کر بعد ازاں سیاروں کی صورت اختیار کرتا رہا
جس سے علی الترتیب مشتری اور چھوٹے سیارے، مریخ، کرۂ ارض، زہرہ
اور عطارد وجود میں آئے [illegible]

زمانہ حال کی تحقیق مذکورہ بالا نظریے سے بالکلیہ متفق نہیں۔ ہیئیات اور فلکیات کے مشترکہ انکشافات سے پتہ چلا ہے کہ ہماری زمین کی عمر تقریباً ۲ ارب برس ہے اور موجودہ زمانے میں یہ بھی بہت کچھ وثوق سے معلوم ہو چکا ہے کہ آج سے تقریباً ۲ ارب برس پہلے سورج کی کیا حالت تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت سورج کا حجم اور بناوٹ تقریباً ایسی ہی تھی جیسی کہ آج کل نظر آرہی ہے۔ ان حالات میں یہ بھولے سے بھی خیال نہیں ہو سکتا کہ سورج کا پھیلاؤ زمین کی پیدائش کے زمانے میں زمین کے مدار کے برابر تھا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سورج کی موجودہ گردش بھی اتنی تیز نہیں کہ وہ اپنا کوئی سیال یا آتشیں مادہ اِدھر اُدھر پھینک سکے۔ بھلا اربوں برس پہلے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

نظر کا فریب

بہر نوع علم افلاک لیپ لیس کا بہت ممنون احسان ہے کہ اس نے ستاروں اور سورجوں کی پیدائش کو پیچیدہ بادلوں سے بتا کر آئندہ تحقیقات کو صحیح شاہراہ پر ڈال دیا اور دوربین کی مزید ترقیات کی بدولت بعد کے ماہرین فلکیات نے بعض وہ باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جو پہلے چشم انسان سے اوجھل تھیں۔

ہماری ننگی آنکھ دیکھتی ہے کہ زمین چوڑی چکلی اور تقریباً مسطح ہے جس کے گرد ایک آفتاب عالم تاب اور ایک نورانی ماہتاب اور بے حد و بے شمار جگمگاتے سیارے یا ٹمٹماتے تارے گھوم رہے ہیں جو ہماری زمین کے سامنے بے حقیقت اور چھوٹے چھوٹے سے دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ نظر کا دھوکا ہے اور قدیم حکما بھی اس کا شکار ہوتے رہے ہیں جنھوں نے زمین کو ثابت اور قایم مانا اور ہر قسم کی گردش چاند سورج جیسے تاروں کے گلے منڈھ دی۔ اس کے لیے ہمارے اسلاف معذور تھے۔ زمانہ حاضرہ میں نکتہ رس اور حقیقت شناس محققوں نے ٹوہ لگائی ہے کہ زمین گیند کی طرح گول اور اپنے محور کے علاوہ آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔ آفتاب خود اپنی جگہ پر قایم لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔ اس کی حیثیت سارے نظام شمسی میں ایک مرکز یا قطب کی ہے۔ حجم میں وہ اپنے نظام کے سارے سیاروں سے بہت بڑا ان کا باپ ہے۔ اس کے آگے ہماری زمین کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اس وقت وہ ہم سے تقریباً ۹ کروڑ ۳ لاکھ میل اوسط کے فاصلے پر ہے۔ لیکن اگر وہ ہماری زمین سے قریب تر ہوتا تو کیا عجب ہے کہ زمین اپنی چھوٹائی کے لحاظ سے اس کی طرف کھنچی چلی جاتی اور آگ کے ان زبردست شعلوں میں جو سورج کی سطح پر ہمیشہ لپکتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ۲ لاکھ ۸۶ ہزار میل تک بلند ہو جاتے ہیں، گر کر یوں بھسم ہو جاتی جس طرح ڈھاک کا ایک پھول وسیع جنگل کی آگ میں گر کر راکھ ہو جاتا ہے۔

تاروں بھری رات میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھائیں تو گہری نیلی چادر پر سفید سے چاول بکھرے دکھائی دیتے ہیں اور ان گنت تارے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں لیکن رصدگاہوں کی بڑی بڑی جنگی دوربینیں بتاتی ہیں کہ کائنات کے جملہ نظارے یعنی سورج، چاند اور تارے وغیرہ حقیقت میں اتنے زیادہ ہیں کہ کوئی گنتی انہیں گن نہیں سکتی اور کوئی الفاظ ان کی وسعت بتا نہیں سکتے۔ ایک وقت تھا کہ کائنات میں ایک کرۂ ارض موجود نہ تھا۔ ہزاروں سورج شعلہ فشاں اربوں سیارے شب و روز سرگرداں تھے رفتہ رفتہ وہ جل بھن کر ملیامیٹ ہو گئے، یا چکرا کر معدوم ہو گئے یا ان کی شکست و ریخت سے دوسرے اجرام فلکی وجود پذیر ہو گئے۔ گویا قدرت میں شروع ہی سے تخریب و تعمیر کے عناصر ساتھ ساتھ موجود ہیں ہماری زمین بھی اسی قانون قدرت کی بدولت معرض وجود میں آئی ہے۔

روشنی کے سال کی اکائی

سورج کی روشنی زمین تک ۸ منٹ سے کچھ اوپر میں پہنچ جاتی ہے۔ کیوں کہ اس روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ اور سورج اور زمین کا اوسط فاصلہ ۹ کروڑ ۲ لاکھ میل کے قریب ہے۔ مگر فلکیات کے ماہر کہتے ہیں کہ کائنات میں بعض ستارے ہم سے اتنے فاصلہ عظیم پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ہزاروں لاکھوں برس میں ہم تک پہنچتی ہے اور بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی ابھی تک زمین پر پہنچی ہی نہیں یا پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس سے ستاروں کی دوری کا کچھ اندازہ لگا لینا چاہیے۔ یہ فاصلہ اتنا بڑا ہے کہ محققوں نے اس کے اظہار کے لیے معمولی ہندسے نہیں بلکہ روشنی کے سال یعنی نوری سال مقرر کیے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی روشنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے مسلسل چلتی رہے تو سال بھر میں جتنا فاصلہ طے کرے اسے ستاروں کے باہمی

ں میں زیادہ تر دو ہلکی گیسیں پاتے ہیں۔ ایک ہائیڈروجن اور دوسری
یم۔ یہ دونوں ہلکی پھلکی گیسیں ہیں اور بجائے خود چنداں عجیب و غریب
ب سمجھی جاتیں۔ مگر یہ حقیقت بے حد عجیب اور انتہائی حیرت افزا ہے
بیاد انوں کے نزدیک جتنے بھی عناصر پائے جاتے ہیں سب ان ہی
ون ہلکی گیسوں کے ننھے ذروں سے بنے ہیں۔ قدرت حقیقی منوّر بادل
یہ دونوں گیسیں تیار کرتی رہتی ہے کہ ان سے تمام وہ عناصر پیدا ہوں
ے سورج اور ستارے بنا کرتے ہیں۔

ابتدائی مرحلے پر چمکیلا بادل بہت پتلا ہوتا ہے۔ ہماری سانس
ی کی ہوا بھی لطافت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن جوں جوں
یں بنتی جاتی ہیں توں توں ان سے مختلف عناصر پیدا ہوتے جاتے
ں۔ فضا میں دوسرے سیاروں کی شکست و ریخت کے ذرّے بھی
جود ہوتے ہیں جو گیسوں میں داخل ہو کر رنگا رنگ کے عناصر کی تخلیق
موجب بن جاتے ہیں۔ گیسوں کے کثیف ہو جانے سے ذرّوں میں
یادہ اتصال اور انقباض پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کے سکڑ سے
زات میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے مختلف عناصر میں
ر و تاثیر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پھر کیمیائی فعل و انفعال سے

درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چمکیلا بادل سورج کی طرح شعلہ پذیر ہو جاتا ہے اور تمام مادہ پگھلی ہوئی حالت پر آ جاتا ہے مگر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے کہ جتنی جلدی حرارت پیدا ہوتی ہے، اس سے زیادہ جلدی حرارت خارج ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتشیں سورج ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں بھاری بھاری عناصر ہی پیدا ہوتے ہیں اور گیسیں ایک حد تک سیّال اور ایک حد تک ٹھوس ہونے لگتی ہیں۔

یہ کوئی خالی قیاس آرائی یا محض خیالی ڈھکوسلہ نہیں۔ فضا میں بیسیوں سورج ہوں گے جو اس مرحلے پر پہنچے ہیں۔ خاص خاص دوربینی آلات اور اسپکٹرو سکوپ (آلہ تحلیل النور) سے انہیں دیکھیں تو اُن میں بے شمار عناصر موجود نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوہا اور دوسری دھاتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ آتش فشانی کے خاتمے پر ایسے سورج ٹھنڈے اور تیرہ و تار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دکھائی دینے سے بھی رہ جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فضا میں ایسے مردہ سورج موجود نہیں اور اگر ہیں تو اُن کی تعداد اور مقدار کتنی ہے؟

"آیا ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آ جائے جب توپ اور دیگر خوفناک اسلحوں کو عجائب گھر میں رکھ دیا جائے اور لوگ انھیں حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر یہ خیال کریں کہ یہ تباہی اور نابودی کا ذریعہ ہیں۔"

وکٹر ہیوگو

اوپن ہارٹ سرجری کیا ہے؟

محمد عبد الرحمن اعجاز

وینٹریکیولر سیپٹل ڈفکٹ (Ventricular Septal - defect) ۔ نامی بیماری کو عام طور پر دل میں سوراخ پڑنا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ بچوں میں بہت ہوتی ہے۔ ۱۹۵۲ء تک ایسے بچوں کے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ مگر آج اللہ کے فضل سے سائنسی ترقی نے اس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ ایسے بچے عام بچوں کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔

دل :- یہ انسانی حیات کا سرچشمہ ہے، جو خون کو مختلف اعضا تک پہنچاتا ہے کہ میٹا بولزم (Metabolism) ہو کر قوت (Energy) حاصل ہو۔ آکسیجن (O_2) کی سپلائی خون کے ذریعے تمام اعضاء کو مسلسل ہوتی رہتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو مسلسل خارج کر دیا جاتا ہے۔

دل میں چار واضح خانے پائے جاتے ہیں۔ اوپری دو خانے خون جمع کرتے ہیں اور نچلے دو خانے خون پھینکتے ہیں۔ اوپر کے خانوں کو اٹریم (Atrium) اور نیچے کے خانوں کو وینٹریکل (Ventricle) کہا جاتا ہے۔ وریدوں کے ذریعے خون سیدھے اذن میں داخل ہوتا ہے پھر اذن (اٹریم) خون کو بطین (وینٹریکل) میں داخل کرتا ہے۔ جو خون کو پھیپھڑوں میں پھینک دیتا ہے۔ یہ خون پھر دل ہی کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ یہ خون سرخ صاف ستھرا اور آکسیجن سے لدا ہوا ہوتا ہے۔ بگر اب کی مرتبہ بائیں اذن میں۔

پھر یہ خون بطین سے ہوتا ہوا آرٹا (Aorta) کے ذریعے تمام جسم میں پھیل جاتا ہے۔ آرٹا جسم کی تمام شریانوں میں خون سپلائی کرنے والی سب سے بڑی آرٹیری (Artery) ہے۔

دل پر کیے جانے والا عمل جراحت بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ دوران خون کو جاری رکھنا بھی ضروری ہے مگر آپریشن کرنے کے لیے ڈاکٹر کو ضرورت ہے کہ وہ دل کی حرکات کو تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی روک دے۔ اسی ضرورت کی تکمیل نے قلبی ششی مشین (Heart- Lung Machine) کو وجود بخشا۔

پہلے پہل یہ آپریشن ایسے مریضوں پر کیے گئے جن کے قلب میں پیدائشی طور پر نقص تھا اور جو عام صحت مند آدمی کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور جن کے جینے کی بہت کم امید پائی جاتی تھی۔ بعد میں اس سے زیادہ پیچیدہ مسائل پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ دل کے ناقص والو کو بھی درست کیا جانے لگا۔

ریومیٹک (Rheumatic) بخار ایک خطرناک بیماری ہے جو ہندوستان کے ہر ۱۰۰۰ بچوں میں سے ۶ کو ہوتی ہے۔ اس بیماری کے خراب اثرات دل کی ساخت پر بھی پڑتے ہیں۔ اسٹریپٹو کوکائی (Streptococci) نامی بیکٹیریا کی وجہ سے یہ بخار پھیلتا ہے۔ جو مریض کی جلد اور جوڑ کے علاوہ قلب اور گردوں کو خاص طور پر متاثر کرتا ہے۔ ریومیٹک (Rheumatic) بخار غریب اور غیر صحت مند غذا استعمال کرنے والوں کو ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی عمر میں ہو سکتا ہے مگر ۵ تا ۱۵ سال کی عمر کے بچوں میں زیادہ ہوتا ہے۔

پہلے حلق میں درد ہونے لگتا ہے۔ پھر دو، تین ہفتوں کو بخار رہتا ہے۔ پھر جوڑوں میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگتا ہے اور وہ پھول جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ سینے اور پیروں پر لال دانے ابھر آتے ہیں۔ کہنی، سر کا پچھلا حصہ اور جوڑوں کی جلد پر گٹھلیاں ابھر آتی ہیں جن میں د

نہیں ہوتا ہے۔

رہیومیٹک (Rheumatic) بخار عام طور پر میٹرل والو (Mitral Valve) کو متاثر کرتا ہے یہ والو (Valve) بائیں اذن اور بائیں بطن میں پایا جاتا ہے۔ میٹرل والو (Mitral Valve) پھول جاتا ہے۔ اس میں سوراخ ہو جاتا ہے اور دوران خون فطری نہیں رہتا۔ اذن کو قوت کے ساتھ خون بطن میں پھینکنا پڑتا ہے۔ نتیجۃً اذن بڑا ہوتا رہتا ہے۔ کبھی تو یہ اپنی نارمل جسامت سے کئی گنا بڑا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات پھیپھڑوں میں پائی جانے والی خون کی نالیاں دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے پھٹ پڑتی ہیں اور مریض خون کی قے کرنے لگتا ہے، اور یہ رہیومیٹک ہارٹ ڈیزیز (Rheumatic Heart Disease) کی پہلی نشانی ہے اور خون پھیلے ہوئے بائیں اذن میں جمع ہونے لگتا ہے اور چھتا بن کر عام بہاؤ میں شامل ہو کر اعضائے حیوانیہ کی کارکردگی میں روڑے اٹکاتا ہے۔

رہیومیٹک (Rheumatic) بخار کا بچپن میں حملہ آرٹا والو کو متاثر کرتا ہے۔ یہ والو، آرٹا اور بائیں بطن کے درمیان پایا جاتا ہے۔ والو (Valve) کی خرابی کی وجہ بایاں بطن خون کو اچھی طرح آرٹا (Aorta) میں پھینک نہیں سکتا۔ اگر خون کی سپلائی دماغ کو اچھی طرح نہ ہو تو آدمی کو چکر آنے لگتا ہے اور وہ کالا پڑ جاتا ہے۔ اگر ایسا متعدد مرتبہ ہو تو دماغ کو بہت زیادہ نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔

رہیومیٹک ہارٹ ڈیزیز (Rheumatic Heart — Disease) کے لیے کوئی مکمل علاج نہیں ہے۔ اس لیے آدمی کو ہمیشہ دواؤں پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔ اگر کسی میں یہ بیماری کنٹرول نہ ہو سکے تو اس کا واحد راستہ سرجری ہے۔ اس آپریشن میں مٹرل والو کی تنگی کو ختم کیا جاتا ہے۔

بند سرجری میں ایک شل ڈائیلیٹر استعمال کر کے مٹرل والو (Mitral valve) کی تنگی کو ختم کیا جاتا ہے۔ مگر آج کل ناقص والو (Valves) کو سرجری سے درست کیا جا رہا ہے۔ کئی مریضوں کے [illegible] (Mitral Valve) یا آرٹک والو

والو یا کسی دوسرے آدمی کا والو لگایا جاتا ہے۔ عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ دل کے یہ والو (Valve) موٹے ہونے لگتے ہیں اور خون کو اچھی طرح نہیں پھینک سکتے۔ ایسی صورت میں اوپن ہارٹ سرجری (Open- Heart Surgery) کی جاتی ہے۔

آج کل ڈاکٹروں نے اپنی تمام تر توجہ کرونری آرٹیری ڈیزیز (Cronary artery Disease) کی طرف پھیر دی ہے۔ ہارٹ اٹیک اگرچہ کہ بعض وقت جان لیوا ہوتا ہے مگر مریض کو بروقت مدد پہنچا کر بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی آج نہیں تو کل ہارٹ اٹیک کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ یا پھر یہ کہ قلب اچھی طرح کام نہیں کر سکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کرونری آرٹریز کے موٹا ہو جانے کی وجہ خون کو قلب تک پہنچنے میں دقت ہوتی ہے۔ کرونری آرٹری، آرٹا (Aorta) کی شاخیں ہیں جو دل کو خون سپلائی کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں سرجن پیر کی ورید کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دل کی سطح پر، اس مقام پر جہاں تنگی پیدا ہو رہی ہے، اس طرح جوڑتا ہے کہ ایک سرا آرٹا (Aorta) سے ملا رہتا ہے اور دوسرا کرونری آرٹری سے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انجینا پکٹورس (Angina- — Pectoris) کے مریض کو جراحی کی ضرورت پیش نہیں آتی صرف دواؤں کے استعمال سے فائدہ ہو جاتا ہے۔

> "سب سے بڑا عیب خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔"
>
> سر سید احمد خان

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۴ (اپریل ۸۷ء)

ہماری زمین کتنی قدیم ہے

شاہ بانو جرنی

دو سو سال قبل اسکاٹ لینڈ کے ایک طبقات الارض کے ماہر جیمس ہٹن نے زمین کی عمر کے متعلق ایک سائنسی بحث کا آغاز کیا تھا۔ اس تنازعہ یا بحث سے کوئی خاطر خواہ حل تو دریافت نہیں ہو سکا، البتہ انیسوی صدی تک اس امر پہ اتفاق رائے تھا کہ دنیا کی تخلیق کی تاریخ کا تخمینہ انجیل شریف میں دیا گیا ہے وہ تقریباً درست ہے۔ ایک برطانوی عالم دین جان لائیٹ فٹ (۱۶۰۲ء - ۱۶۷۵ء) نے حساب لگایا تھا کہ دنیا کی تخلیق ٹھیک نو بجے شروع ہوئی تھی۔ ۱۶۵۴ء میں اینگلو آیرش نسل کے ایک بشپ اُسشر نے اندازہ لگایا کہ یہ واقعہ یعنی دنیا کی تخلیق کا واقعہ ۴۰۰۴ قبل مسیح میں پیش آیا۔ اس نے اسرائیل کی ہر نسل کو جمع کیا جن کی فہرست انجیل شریف میں دی ہوئی تھی اور پھر اس مجموعہ میں وہ سال جمع کیے جن کا تعلق تاریخی دور سے ہے۔ اُسشر کا یہ تاریخوں کا حساب انجیل شریف کے باضابطہ منظور شدہ حوالہ جات والے ایڈیشن میں بطور سرکاری تبصرہ کے شامل کیا گیا ہے۔ ہزار سال میں تاریخ دھندلی ہو جاتی ہے اور مستند و مضبوط حوالوں کا کمزور ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اس کے باوجود تہذیبی دور کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم دو ہزار سال میں قدیم بربریت سے نجات حاصل کر کے تہذیب کے دور میں داخل ہو گئے تھے تو پھر بربریت کے دور سے چار ہزار سال قبل کی مدت کافی معلوم ہوتی ہے جس میں تخلیق کے بعد دنیا وجود میں آئی ہوگی۔

جیمس ہٹن جنہوں نے دنیا کی تخلیق کی بحث کا آغاز کیا تھا، نے یکسانیت (Uniformism) کے اصول بھی وضع کیے تھے۔ ۱۷۸۵ء میں انھوں نے یہ کہا کہ جو زمین آج ہم دیکھ رہے ہیں، اس کو بھی ارضیاتی اور کیمیاوی عمل نے وضع کیا ہے جو ایک عرصۂ دراز تک آہستہ آہستہ مصروف کار رہا ہے اور جو اب بھی مصروف کار ہے۔ مثال کے طور پر بہتے ہوئے پانی سے پہاڑوں کے کٹاؤ کے اصول اس بات کی دلیل دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا ایسے حقائق کا سلسلہ قائم ہے اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ پہاڑوں کا [illegible] دریاؤں کے ذریعے بہتا رہا ہے۔ دریاؤں کے ذریعے پہاڑوں کے کٹاؤ کے عمل میں اس قدر طویل مدت درکار ہوتی ہے کہ انسانی تخیل اس طویل مدت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہٹن نے اس مدت کا کوئی اندازہ قائم نہیں کیا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ "ارضیات کے ریکارڈ میں نہ تو کوئی ابتدائی نشانی دیکھی اور نہ ہی اختتام کی کوئی علامت نظر آئی۔" اس کے کہنے سے ہٹن کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ہماری یہ زمین ایک لامحدود اور لامتناہی عرصہ سے قائم ہے بلکہ یہ مطلب تھا کہ ہماری زمین کے وجود کا عرصہ اس قدر طویل ہے کہ وہ انسانی اندازوں سے ماوراء ہے۔ اس قسم کے بیان سے کلیہ اور سائنس کے درمیان کوئی مخاصمت پیدا نہیں ہوئی اور مذہبی حلقوں کی جانب سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا لیکن اس کے [illegible] کی صدی میں چالیس ڈارون کے ساتھ تنازعہ ہو گیا۔

ڈارون کا یہ نظریہ ہے کہ جانور اور انسان ایک ارتقائی تسلسل سے تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ یہ تسلسل صرف چند ہزار سال کی مدت میں محیط نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈارون کے اس نظریہ کی مخالفت میں یہ خیال ظہور پذیر ہوا کہ اگر یہ سلسلہ ابدی ہے تو اس کی تبدیلیاں اس عہد میں بھی ہونا لازمی ہے مگر ہم آج اس قسم کی [illegible] ہوتے نہیں دیکھے اور نہ ہی ہم نے تاریخی دور میں ایسی [illegible] تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ مثلاً جنوں کے دور میں [illegible] تھیں، کتے [illegible] تھے اور آدمی آدمی تھے [illegible]

[illegible]تا کی نظریہ کی [illegible] ہو گیا کہ دنیا کی تخلیق کی جو تاریخ و
[illegible]انہ انجیل شریف میں [illegible] وہ [illegible] غلط ہے۔ ارضیاتی علم کی بنیاد پر
[illegible]ارون نے جو زمین کی [illegible] سال بتائی، اس کو طبقات الارض
[illegible] ماہرین نے "بے بنیاد اور [illegible]" قرار دیا۔ اس [illegible] ڈارون نے لاکھوں
[illegible]ال کی اصطلاح کا استعمال شروع کر دیا، جس کا صاف مطلب ایک
[illegible]ایت طویل مدت تھا [illegible] اعداد و شمار پر مبنی کسی مدت کو ظاہر کرنا۔
[illegible]س سلسلے میں ڈارون کے دلائل کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ماہرین
[illegible] طبقات الارض کے علم سے متعلق لوگوں کو اس کی ترغیب حاصل ہوئی
[illegible] وہ زمین کی عمر کے متعلق اندازہ سائنسی توجیہات اور اعداد و شمار کی
[illegible]یاد پر کریں۔

ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب۔ On The Origin
[illegible] (of species (تخلیق نوع انسانی) شایع کی۔ اس سال گلاسگو یونیورسٹی
[illegible] طبیعیات کے عالم دپروفیسر ولیم ٹامسن ۳۵ سال کے تھے اور دیکھتے سبح
[illegible] وجوہات و سوال پر کام کر رہے تھے۔ اس وقت تک دنیا کو سورج
[illegible] توانائی اور اس کی افادیت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا۔ بلکہ یہ خیال
[illegible]یا جاتا تھا کہ سورج بھی کچھ اسی قسم کی آگ سے جل رہا ہے جو زمین پر ہوتی
[illegible]ہے اور جو کیمیاوی آکسیجن کے عمل سے چلتی ہے۔ تاہم حساب کرنے سے معلوم
[illegible]وا کہ اس طرح جلتے رہنے سے سورج دس ہزار سال سے زائد عرصہ تک
[illegible]ہیں جل سکے گا۔ یہ انکشاف ٹھیک تھا اگر زمین کی عمر چھ ہزار سال تھی
[illegible]ریہ کریم نجات [illegible] سال [illegible] ہے لیکن اگر زمین کی عمر
[illegible]کھوں سال [illegible] نہیں ہو سکتا۔ چند سال
[illegible]ٹامسن جو بعد [illegible] اپنے وقت کے ایک سربرآوردہ
[illegible] طبیعیات تھے [illegible] برٹش ایسوسی ایشن کے ایک
[illegible]لاس میں ایک [illegible] یہ کہا تھا کہ سورج
[illegible] توانائی [illegible] شہاب ثاقب کے گرنے
[illegible]ے خارج [illegible] کے مددی
[illegible]
[illegible] زیادہ مناسب ذریعہ
[illegible] اندازہ ہو سکا ہے

وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے جس کا خاص اثر نہیں ہوتا لیکن ایسے شہاب ثاقب کا ایک مفروضہ مادہ ممکن ہے جو زمین کے راستے میں چکر لگائے۔ اس سے یہ نظریہ قایم ہوا کہ سورج کے ارد گرد ایک ہالہ ہے جس میں شہاب ثاقب آہستہ آہستہ لیکن متواتر شمسی فضا میں گھومتے رہتے ہیں اور ان کے چکر لگانے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہ شمسی توانائی کے اخراج کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ ہالہ سورج میں شہاب ثاقب لانے سے زیادہ کام انجام دے گا اور شہاب ثاقب کو نہایت تیزی سے چکر دے گا۔ کیلون کا یہ دعویٰ ہے کہ سورج کی جنبش کی وجہ اس کے چاروں طرف کا ہالہ اور شہاب ثاقب کی گردش ہے۔ اس ابتدائی تحقیق نکتے کی بنیاد پر وہ شہاب ثاقب کے حجم کا بھی اندازہ لگا سکے جو سورج کا اپنے محور پر چکر لگانے کا باعث ہے۔ اس حساب سے ایک براہ راست نتیجہ برآمد ہوا کہ شہاب ثاقب کے حجم کے گرنے میں کتنا وقت لگا ہوگا یا دوسرے الفاظ میں سورج کی عمر کیا ہے، ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوا کہ سورج کی توانائی ۳۲ ہزار سال سے خارج ہو رہی ہے اور یہ کہ سورج کی توانائی اس مدت سے دس گنا مدت سے زائد عرصے تک خارج نہ ہو سکے گی۔ لارڈ کیلون نے ۱۸۵۴ء میں اس خیال کو برٹش ایسوسی ایشن کے سامنے ایک تقریر کے ذریعے پیش کیا۔ یہ نظریہ دو اہم واقعات کے ہونے تک برقرار رہا جن میں سے ایک واقعہ تو ۱۸۵۹ء میں آن دی اوریجن آف اسپی سیز (تخلیق نوع انسانی) کی اشاعت تھی اور دوسرے ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیلون کی ٹانگ کا ٹوٹ جانا تھا۔ ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ مہینوں بستر پر پڑے رہے۔ اس مدت میں انھوں نے شمسی توانائی کے اخراج کے متعلق از سر نو غور کرنے کے ساتھ ڈارون کی مذکورہ کتاب کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا۔

۱۸۵۴ء میں ایک اور طبقات الارض کے ماہر ہنرچ وان ہیلمہولٹز نے سورج کی ممکنہ عمر کے متعلق اندازہ لگایا تھا جو مشہور فلسفی کانٹ (Kant) اور فرانس کے پایر کے لاپلیس کے نظریات پر مبنی تھا۔ ہیلمہولٹز نے ان کے خیالات کے مبہم الفاظ کو واضح الفاظ سے تبدیل کر دیا اور یہ کہ سورج پر شہاب ثاقب کا گرنا ہی سورج کی تخلیق کی بنیاد قرار دیا گیا۔ لارڈ کیلون نے اس کے متعلق یہ تصور قایم کیا تھا کہ سورج کو جو پہلے سے موجود تھا، شہاب ثاقب کے گرنے سے روشنی حاصل ہوئی۔ اس

نظریے کی رو سے سورج اور دوسرے ستارے شہاب ثاقب کی کشش ثقل
کے خاتمے سے بنتے ہیں اور بن جانے کے بعد وہ توانائی خارج کرتے ہیں جو اس
قدر کافی ہوتی ہے کہ اس سے گرمی اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔ کیلون کو بالآخر
اس کا یقین ہو گیا کہ یہ تصور صحیح ہے اور سورج کے حجم میں اس کی خارج کردہ
مدت اور روشنی کی شدت سے انھوں نے یہ حساب لگایا کہ توانائی کا ایسا
ذریعہ صرف ۳۰ ہزار سال تک ہی باقی نہیں رہے گا بلکہ ۲۵ ملین (ڈھائی
کروڑ) سال تک قایم رہے گا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کیلون نے ایک بالکل
مختلف نقطۂ نگاہ سے زمین کی عمر کا حساب لگایا۔ انھوں نے یہ دلیل
پیش کی کہ نظام شمسی میں صرف سورج ہی سب کچھ ہے اور تمام سیارے
مرکزی جسم یعنی سورج کے حصے ہیں جو یا تو سورج کے ساتھ ہی یا اور کسی
طریقے سے اس سے علیحدہ ہوئے۔ دونوں اعتبار سے زمین کی شکل ایک
دہکتے ہوئے لاوے کی مانند ہوئی جس کا درجہ حرارت ایک ہزار سینٹی
گریڈ (سی) تھا۔ ظاہر ہے آج زمین بہت زیادہ ٹھنڈی ہے اس لیے
اس بات کا حساب لگانا ممکن ہو سکتا ہے کہ زمین کو ٹھنڈا ہونے میں کتنا
عرصہ لگا۔

لارڈ کیلون کو اس نظریہ کو قایم کرنے میں اس مشاہدے سے مدد
ملی کہ کوئلے کی کانوں میں جس قدر گہرے جائیں، درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا
جاتا ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین کا اندرونی حصہ اس کی
اوپری سطح کے مقابلے میں زیادہ گرم ہے۔ گہرائی اور حرارت کے تعلق اور
تغیر کی پیمائش کو استعمال کرتے ہوئے اور نمک کی چٹانوں کی حرارت کا
اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے ارضی حرارت کے فرق کے تناسب کو قایم
کیا۔ اس فرق سے لارڈ کیلون نے یہ حساب لگایا کہ زمین سے مدت کس
رفتار سے خارج ہوتی ہے اور خلا میں شامل ہو کر حل ہو جاتی ہے یا ضایع
ہو جاتی ہے۔ اس پورے حساب و شمار سے کیلون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ
ہماری زمین کی عمر ۲۵ اور چار سو ملین (ڈھائی کروڑ اور چار ارب) سالوں
کے درمیان ہے۔ اس کے بعد کیلون اور دوسرے سائنس دانوں نے
انیسویں صدی کے آخر تک غلطی کے امکانات کو مختصر کر دیا اور آخر میں
اپنی مستقل کوشش سے یہ اندازہ قایم کیا کہ دنیا کی عمر تقریباً ۲۵ ملین سال
(ساڑھے تین کروڑ سال) ہے۔ دنیا کی عمر کا یہ اندازہ ان کی سورج کا
کے اندازے کے مطابق ہے۔

انیسویں صدی کے آخری سالوں میں آئرلینڈ کے ماہر ارضیات
جان جولی (John Joley) نے ایک نیا طریقہ اختیار کر کے
اور نظریہ قایم کیا۔ یہ طریقہ پانی کے دور چکر پر مبنی تھا اور جو
(Hutton) نے پہلی مرتبہ تجویز کیا تھا۔ جولی نے جو سوال
وہ یہ تھا کہ سمندر نمکین کس طرح ہوئے؟ انھوں نے اسی سوال
جواب کی تلاش میں اپنی تحقیق کا انحصار کیا۔ اس سوال کا جواب
سے ماہرین اور کارکنوں نے مدت، بتائی تھی پانی کے دور
کے مطابق پانی ہمارے ماحول میں سے متواتر گزرتا ہے۔ پانی سمند
سے بھاپ بن کر اڑتا ہے۔ بھاپ سے بادل بنتے ہیں جو بارش کی شکل
زمین پر برستے ہیں۔ جو بارش سمندروں پر ہوتی ہے وہ تو محض
واپسی ہے۔ لیکن کچھ بارش براعظموں پر ہوتی ہے۔ بارش کا یہ پانی
بہتا ہے، چشمے بناتا ہے اور دریاؤں سے مل کر ان کے پانی میں اضا
ہے اور آخر میں یہ دریا سمندروں سے مل جاتے ہیں جہاں یہ پانی
کے پانی میں حل ہو جاتا ہے لیکن پانی زمین کے اندر اور زمین کے ا
سارے سفر میں کئی کیمیاوی مادے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے
سادہ نمک سے لے کر پیچیدہ معدنیات بھی شامل ہوتی ہیں۔
جو پانی دریاؤں سے سمندروں میں گرتا ہے، اس میں کئی قسم کے
آیرن اور نمک شامل ہوتے ہیں۔ یہ آیرن بھاپ بن کر نہیں اڑ
ہوا میں بھاپ نہیں بنتے۔ جب سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے تو یہ آیـ
(Iron) سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اس عمل میں جیسے
گزرتا ہے سمندروں میں آیرن اور نمک زیادہ ہوتا چلا جاتا
سے سمندروں کا پانی نمکین ہوتا چلا جاتا ہے۔

جولی نے اس وقت یعنی ۱۸۹۰ء میں سمندر میں موجو
آیرن (Sodium Iron) کی پیمائش کی اور اسے در
سمندر میں گرنے والے پانی میں موجود آیرن سے تقسیم کیا اور حس
کر سمندروں میں آیرن جمع ہونے کا عمل تقریباً اسی تا سو ملین
سے دس کروڑ) سال سے جاری ہے، جس کے بعد ہی سمندر کو

ممکن ہو پایا ہے ۔ یہ ایک سرسری سی کوشش تھی۔ مزید تحقیق کے بعد علم ہوا کہ اس کوشش میں کچھ کمیاں تھیں۔ مثلاً وہ اپنے اندازے میں سوڈیم کے اخراج کے ممکنہ فرق کو شامل نہیں کر پائے جو کٹاؤ کی مختلف شرح سے ہوتا ہے نہ ہی وہ سمندری پانی کی سطح کے متعلق غور کر سکے اور نہ ہی زمین میں سوڈیم کی کمی کا خیال کر سکے جب کہ اس کو سمندر کا پانی دھوتا ہے ۔ یہ بات کسی کو بھی یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہے کہ سمندر میں بذات خود بھی دنیا بھر کے دریاؤں کا اخراج کس قدر رہے ۔ پھر جولی شوریت (نمکینیت) کی مقدار مقرر کرنے سے قاصر رہے ۔ کیوں کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ بلبلوں کے بننے اور ہوا کے چلنے کے ذریعے سوڈیم زمین کو واپس ہو جائے ۔ ان کا طریقۂ عمل کیمیاوی اور علم الارض کے مخلوط علم پر مبنی ہے جس کا مشاہدہ اور پیمائش صحیح طور پر ممکن ہے ۔ ان تمام تحقیقات اور حسابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جولی کا نظریہ لارڈ کیلون کے ۲۵ ملین (ڈھائی کروڑ) سال کے نظریہ کا نعم البدل تصور کیا گیا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دیگر ماہرین ارضیات نے زمین کی عمر کا اندازہ ایسے ارضیاتی عمل کی بنیاد پر لگانے کی کوشش کی تھی، جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان کے نتائج اعداد و شمار پر مبنی نہیں تھے جس کے باعث وہ کیلون کے حساب و شمار پر مبنی اندازوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ۔ اس قسم کی سب سے بہتر کوشش جان جی گڈ چائلڈ نے کی تھی جو ایڈنبرا میوزیم آف سائنس اینڈ آرٹ کے (کیوریٹر) مہتمم تھے ۔ گڈ چائلڈ نے ارضیاتی ادوار کی مدت کا اندازہ پہاڑوں کے بننے کی مدت ، چونے کے نکلنے کی مدت اور وادیوں کے کٹاؤ کی مدت سے لگایا ۔ انھوں نے ارضیاتی سطحوں کی طویل مدت شمار کی جن سے مختلف قسم کے فاسل (Fossils) یعنی قدیم زمانے کے پسماندہ اجزا و آثار ظاہر ہوئے اور انھوں نے بغیر کسی ثبوت کے یہ دلیل پیش کی کہ فاسل (Fossil) سے خالی پہری کمبرین' Pre Camb- rian دور ایک "طویل" عرصہ تک جاری رہے گا تاکہ بعد میں آنے والے پیچیدہ نوعیت کے فاسلوں (Fossils) کا ارتقا ممکن ہو سکے ۔ انھوں نے جو یہ اندازہ قایم کیا کہ زمین سات سو ملین (۷۰ کروڑ) سال پرانی ہے ۔ اس کا اثر اس لیے جاتا رہا کہ انھوں نے خود یہ تسلیم کر لیا کہ ان کے حساب میں غیر یقینی صورت حال بہت زیادہ ہے ۔

"ایسے لوگ جو ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اخبارات میں مسئلہ یونیورسٹی پر ایسی رائے ظاہر کرتے ہیں جس سے ان اصحاب کے بھی ہوش اڑ جائیں جنہوں نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے اور جو کسی حد تک اس مسئلے کی پیچیدگیوں کا اندازہ کرنے کے قابل ہیں ۔ میں نہایت زور سے قوم کو یہ مشورہ دوں گا کہ یونیورسٹی کا تمام مسئلہ تعلیمی ماہران کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے ۔ یعنی ایسے اصحاب کے ہاتھ میں جو اپنے تجربے اور تعلیم کے لحاظ سے اس مسئلہ پر زور دینے کے اہل ہیں اور ایسے ماہران سے میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا فرض دلیری اور دقیقہ رسی کے ساتھ کما حقہ انجام دیں

(جسٹس شاہ دین)۔

جوابِ دوست

کوچہ ہائے رسوائی ۵۶ ـــــ ۴۷ء

نسیم انصاری

جب میں کلکتہ واپس آیا تو میرے کالج کے ساتھیوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ ان کی دل جوئی سے بڑی تسکین ہوئی۔ واپس آنے کے چند مہینوں کے بعد انھوں نے مجھے میڈیکل کالج کی یونین کا جنرل سکریٹری بنالیا۔ اب میں عملی سیاست سے بالکل علیحدہ ہوگیا تھا۔ البتہ اسٹوڈنٹس یونین کا کام بڑے انہماک سے کرتا تھا۔ میں نے اپنے چند ساتھیوں کی کوشش سے کلکتہ کے چاروں میڈیکل کالجوں کی اسٹوڈنٹس یونینوں کو ملا کر ایک تنظیم بنائی۔ اس کے ساتھ ہی کلکتہ کے طالب علموں کے لیے ایک ہیلتھ ہوم اسکیم بنائی۔ ۱۹۵۴ء میں مجھے میڈیکل کالج اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بغیر مقابلہ کے منتخب کرلیا گیا۔

ہیلتھ ہوم اسکیم کی ابتدا ایسے ہوئی کہ میری ایک عزیز دوست اشوکا ٹی۔بی میں مبتلا ہوگئی۔ یہ لڑکی مجھے اس لیے اور بھی عزیز تھی کہ جب میں قید میں تھا تو وہ مجھے بڑی پابندی سے خط لکھتی تھی۔ اس زمانے میں ٹی۔بی کا علاج بہت مشکل تھا۔ اسٹریپٹومائی سین نئی نئی دریافت ہوئی تھی اور وہ اتنی قیمتی تھی کہ عام لوگوں کے لیے اس کا استعمال ناممکن تھا۔ ادھر اشوکا کی بیماری اتنی بڑھی کہ اسے سرجری کی ضرورت پیش آئی۔ ان دنوں پھیپھڑے کی سرجری کلکتہ میں نہیں ہوتی تھی، ویلور میں اس کا انتظام تھا۔ چنانچہ ہم سب نے کوشش کرکے اسے علاج کے لیے ویلور بھیج دیا اور وہ وہاں سے پوری طرح صحت یاب ہوکر واپس آگئی۔

اب یہ خیال ہوا کہ بہت سے ایسے بیمار آئندہ ہوں گے اور ان کے لیے کچھ انتظام کرنا چاہیے۔ میرے دوست ڈاکٹر ارون سین نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور میں نے اپنی یونین کی طرف سے ان کی پوری مدد کی۔ کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں کی شرکت سے ایک کمیٹی اسٹوڈنٹس ہیلتھ ہوم کی بنی اور مجھے اس کا ممبر بنایا گیا۔ ڈاکٹر بی۔سی۔ رائے کی حکومت نے بھی مدد کی۔ چیکوسلاویکیہ کے نوجوانوں نے اسپتال کے لیے بہت قیمتی ساز وسامان مہیا کیا اور چند برسوں میں ایک بہت بڑی عمارت بن کر تیار ہوگئی۔

۱۹۵۴ء کے آخر میں پیکنگ میں ایشیا اور افریقہ کے طالب علموں کے لیے وہاں کی حکومت نے ایک سینی ٹوریم بنایا۔ اس کے افتتاح کی رسم میں شرکت کے لیے ہندوستان سے ایک وفد گیا۔ وفد کی قیادت مشہور سرجن ڈاکٹر نہار رنجن منشی نے کی باقی دو ممبر طالب علم تھے۔ ایک آر۔جی۔کار میڈیکل کالج یونین کے صدر اور دوسرا میں۔ ہم لوگ ہانگ کانگ کے راستے سے چین میں داخل ہوئے۔ ہانگ کانگ سے بذریعہ ریل کینٹن ہوتے ہوئے پیکنگ گئے اور وہاں سے شنگھائی اور بالکل شمال میں تین زن کی بندرگاہ دیکھنے گئے۔ چینی حکومت نے مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہ ہندی چینی بھائی بھائی کا زمانہ تھا اور ہمارے جانے سے کچھ دن پہلے ہی جواہر لال نہرو وہاں ہوآئے تھے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگوں کی خاطر اور بھی زیادہ ہوئی۔

اب کالج میں میری پڑھائی کا آخری سال تھا۔ میں ہوسٹل چھوڑ کر اردو کے مشہور شاعر پرویز شاہدی کے ساتھ مٹ سرکس رینج میں رہنے لگا۔ پرویز صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۶۰ء میں حکومت مغربی بنگال نے اس راستے کا نام پرویز شاہدی رینج رکھا۔

پرویز شاہدی صاحب کا نام سید اکرام حسین تھا او

پرویز شفقلی۔ وہ پٹنہ کے ایک بہت معزز خاندان کے چشم و چراغ
تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے شریف النفس آدمی بہت کم دیکھے
ہیں۔ مجھ پر ہمیشہ کرم فرماتے تھے۔ بڑے اچھے اور خوش آواز شاعر
تھے۔ زبان کے بادشاہ اور فکر و نظر میں انقلابی۔ کلکتہ میں ان کا ڈرائنگ روم
شعر و ادب کا مرکز تھا۔ بنگالی اور اردو کے شاعر اور ادیب اکثر ان
کے پاس آتے اور ان کی گفتگو سے فیض حاصل کرتے۔

ایک دن جوش صاحب تشریف لائے۔ پرویز صاحب نے
ان کی ویسی ہی خاطر کی جو ان کی شایان شان تھی۔ مجھ سے بھی اصرار کیا
کہ میں بھی اس بزم میں شریک ہو جاؤں۔ میرے انکار پر جب ان کا اصرار
بہت بڑھا تو جوش صاحب نے فرمایا کہ پرویز صاحب آپ کیوں ضد
کرتے ہیں۔ یہ کبھی آپ کی بات نہیں مانیں گے۔ کیوں کہ میں ان کے والد
کا دوست ہوں۔ اس کے بعد والد صاحب کے علم و فضل کا تذکرہ
بہت دیر تک کرتے رہے۔ لیکن پرویز صاحب مجھ سے خفا ہوتے
گئے اور گفتگو میں ایک بہت خوبصورت فقرہ استعمال کیا

"دیس انٹلیکچول ارچنس! تھنک نو اینڈ آف دیم سیلویس

These intellectual Urchins Think

no end of themselves)

[یہ دانشور چھوکرے اپنے مقابل کسی کو سمجھتے ہی نہیں]

میں نے اور جوش صاحب دونوں نے انٹلیکچول ارچنس کا بہت دیر تک
لطف اٹھایا۔

۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ کلکتہ میں ایک بڑا آل انڈیا مشاعرہ ہوا
مشاعرے کا انتظام پرویز صاحب کی نگرانی میں ہوا تھا اور اس کے انعقاد
میں کلکتہ کے مارواڑی تاجروں نے بہت دل کھول کر مدد کی تھی۔ مشاعرے
میں جوش صاحب، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کے علاوہ بمبئی سے
نیاز حیدر بھی آئے تھے۔ جب مشاعرہ رنگ پر تھا تو نیاز حیدر صاحب
نے اپنی نظم سنانا شروع کی۔

"ٹاٹا برلا کا دھن، غرق گنگ و جمن
آج باغی ہے سارا وطن

ظاہر ہے بات مارواڑی تاجروں کو بہت بری لگی اور انھوں نے
اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ مشاعرہ درہم برہم ہو جائے
گا۔ اس نازک وقت میں سردار جعفری نے اسٹیج پر آکر ایسی تقریر کی کہ
سماں بندھ گیا۔ تقریر کے فوراً بعد جوش صاحب کو کلام پڑھنے کی دعوت
دی گئی۔ بس پھر کیا تھا سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور محفل آخر شب تک
قائم رہی۔

کلکتہ ہمیشہ سے اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ حالاں کہ لاہور
اور بمبئی کے مقابلے میں اس کا تذکرہ اس حیثیت سے زیادہ نہیں ہوتا۔
فورٹ ولیم کے زمانے سے اردو کے شاعر اور ادیب یہاں رہتے آئے
ہیں۔ وحشت صاحب کو تو میں نے خود کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ جب
میں نے کلکتہ کے مشاعروں میں جانا شروع کیا تو وہ مشرقی پاکستان جا چکے
تھے۔ البتہ پرویز صاحب کے ساتھ بیخود صاحب، سالک صاحب اور
مظہر امام صاحب بہت سے شعراء کو سمیٹے رہتے تھے۔ کلکتہ کے مارواڑی
تاجر بہت دنوں سے اردو کی سرپرستی کرتے تھے، اب نہ معلوم کیا
صورت ہے۔

جب میں شروع شروع میں کلکتہ پہنچا تو وہاں تین بہت اچھے
اردو کے روزنامہ اخبار نکلتے تھے۔ عصر جدید، ہند اور آزاد ہند۔
عصر جدید مسلم لیگی اور آزاد ہند مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے زیر
ادارت کانگریسی خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ پہلے مولانا ملیح آبادی کا
تعلق ہند سے تھا، لیکن کسی اختلاف کی بنا پر انھوں نے اسے چھوڑ کر
انھوں نے اپنا اخبار آزاد ہند نکالنا شروع کیا۔ آزاد ہند میں غالباً
ایک نفظی رعایت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کی بھی تھی جن سے مولانا
ملیح آبادی کو بڑی قربت حاصل تھی۔ ویسے اردو صحافت کا نام تو مولانا
آزاد ہی کے الہلال اور البلاغ نے اس صدی کے شروع میں وہاں
روشن کیا تھا۔ اس زمانے میں یا شاید اس کے کچھ عرصے کے بعد مرزا احمد
عسکری صاحب نے کلکتہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہ حکومت
ہند کے اردو ترجمہ سیکشن کے افسر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے رام بابو سکسینہ
کی کتاب کا ترجمہ 'تاریخ ادب اردو' کے نام سے شائع کیا تھا۔ کتاب
باتصویر تھی اور خوب تھی، مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے پہلے اور
بعد کے زمانہ کے شعراء کا اتنا اچھا تذکرہ میری نظر سے اور نہیں گزرا۔

کلکتہ آج تک ایک معنی میں ہندوستان کا تہذیبی دارالخلافہ ہے۔ اسی
شہر میں نئی ہندوستانی تہذیب کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ انگریزوں
کے تسلط کے بعد ہندو بنگالی نوجوان نئی حکومت کے قریب آنے لگے۔
خطرہ یہ ہوا کہیں یہ سب عیسائی پادریوں کے زیر اثر اپنا مذہب نہ
بدل لیں۔ سیکڑوں برس پہلے مسلمان فاتحین کے اثر میں ایک دخو بڑے
پیمانے پر مذہب کی تبدیلی ہو چکی تھی۔ راجہ رام موہن رائے کے برھمو
سماج کی تحریک گویا کہ اس کا تدارک تھی۔ میرا واسطہ جن برھمو
سماج کے ماننے والوں سے پڑا انھیں تہذیبی اعتبار سے بہت دلکش
پایا۔ وہ مغربی اور مشرقی تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔
زیادہ تر مغربی طرز کی بود و باش تھی۔ بایں معنی کہ میز کرسی پر کھانا
ہوتا تھا۔ گھر میں ایک پیانو گویا کہ لازمی تھا۔ خاندان کی بیٹیاں بے تکلف
انگریزی بولتی تھیں۔ ان کے کپڑے پہننے اور بالوں میں پھول لگانے
کا خاص مذاق تھا۔ یوں تو سب ہی بنگالی گھرانوں میں رقص و موسیقی
کا چرچا تھا لیکن برھمو سماج والے اس معاملے میں بھی نفاست اور
نزاکت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ عام گھروں کے برخلاف ان کے گھروں
میں بت نہیں دیکھے۔ عقیدتاً وہ لوگ موحد تھے۔ لیکن درگا پوجا
اور سرسوتی پوجا میں دوسروں کے ساتھ شامل ضرور ہوتے۔

بنگال کے نشاۃ الثانیہ میں ایک مذہبی اثر برھمو سماج کا تھا
اور میرے خیال میں دوسرا اثر عیسائیت کا بھی تھا کہ جیسے آج کل
ہم میں سے بہت سے لوگ لامذہبیت کا سہارا لے کر پرانے سماج سے
اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے عیسائی مذہب
اختیار کر کے قدامت پرست سماج سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوشش
کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ لیکن مائکل مدھو شدن دت
کے معاملے میں تو غالباً یہ صحیح ہے۔ سنا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی
ساغر بکٹ کالج اسکوئر میں بیٹھ کر انیسویں صدی کے پرانے سماج
کو للکارتے تھے۔ ہندوستانی تہذیب کی ہر چیز حتیٰ کہ بنگالی زبان
سے بھی اجتناب تھا۔ شاعری انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں
کرتے تھے۔ تھوڑے دنوں کے لیے انھوں نے وطن بھی چھوڑ دیا
اور فرانس میں جا کر بود و باش اختیار کی لیکن عجیب بات ہے کہ
جب اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہوئے تو بنگال کی قدیم تہذیب کے
علمبردار ایشور چندر ودیا ساگر نے ان کی دستگیری کی۔ انھیں
ہندوستان واپس بلایا۔ یہاں آکر مدھو شدن دت نے سنسکرت
سیکھی اور اس کے بعد بنگالی میں شاعری کرنے لگے۔ ان کے
شاہکار میگھ نات دت کے کچھ حصے میں نے سنے ہیں۔ ایسے تند اور
تیز جذبات کہ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے پیمانے پھٹ جائیں گے۔

ایشور چندر ودیا ساگر سماج کے بہت بڑے مصلح اور تعلیم کے
زبردست علمبردار تھے لیکن وہ قدیم وضع کے آدمی تھے۔ لوگ کہتے ہیں
کہ ان کی بنگالی طرز تحریر میں سنسکرت کی بہت آمیزش ہے۔ اتنی با
تو ہر شخص کی سمجھ میں آتی ہے کہ بول چال کی بنگالی تحریری بنگالی سے اتنی
مختلف ہے جتنی کہ بول چال کی ہندی کتابوں، اخباروں اور
آکاش وانی کی خبروں کی زبان سے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آ
یہ فرق کس طرح آیا۔ ایک وجہ تو میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ یہ فرق
ہندوستانی تہذیب کی پرانی روایت میں ہے۔ اہل علم کی زبان ہ
سنسکرت رہی اور عوام کی زبان دوسری رہی۔ کبھی پراکرت، کبھ
برج بھاشا اور کبھی اردو۔ گاؤں کے لوگوں کی زبان بھی ہمیشہ شہر وا
سے مختلف رہی۔ شاید یہی روایت ہندوستان میں اردو کی بقا کا
بن جائے۔

ٹیگور کی نثر اس معنیٰ میں مختلف ہے کہ انھوں نے اکثر بول
کی زبان استعمال کی ہے، لیکن ان کے نغموں اور گیتوں کی زبان
کلاسیکل طرز کی ہے۔ اس لیے ان کی بہت سی کتابیں آسانی سے پڑھ
لیتا ہوں، لیکن نظم کے معاملے میں مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے
یہ اس وجہ سے ہو کہ میں بنگالی نظم کی اندرونی بناوٹ سے ناواقف ہوں
لیے سمجھتا ہوں کہ ٹیگور کی نظم ان کی نثر سے مختلف ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر میں چلتا اور ٹیگور اس کی اجازت دیتے
بنگالی ہندو ان کی پرستش کرتے۔ کسی زبان میں کوئی ایسا شاعر کا
ہوا ہوگا جو نظم، گیت، ناول، ڈرامہ، افسانے، موسیقی، رقص،
مصوری، تعلیم اور سیاست میں سے ہر ایک پر یکساں قدرت رکھ
میں نے تو ان کی سائنس کی کتابیں بھی دیکھی ہیں۔ ایسی شخصیت صدیو

[illegible] ہے۔ ہندوستان میں تو شاید امیر خسرو کے علاوہ اور کوئی [illegible] ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا کوئی تذکرہ سوامی ویوکانند کے بغیر بالکل [illegible]نہ رہ جاتا ہے۔ وہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندو سماج پر ایک آندھی [کی] طرح چھا گئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ جب قدیم ہندو روایات [کے] ساتھ ہندو عقاید پر بھی حملے کیے جانے لگے تو انھوں نے سینہ سپر ہو کر [اپ]نے تصورات کی ایسی مدافعت کی کہ ویدک تعلیمات کا وقار اور بڑھ [گی]ا اور اس مذہب کے ماننے والوں کے دلوں سے احساس کمتری دور ہوگیا۔

بنگالی نشاۃ الثانیہ دراصل ہندو بنگالی کی نشاۃ الثانیہ تھی — مسلمان اس سے بہت دور رہے۔ حالاں کہ انیسویں صدی کے آخر میں سر سید، امیر علی اور ہوڑہ کے مولوی محسن کے نام لوگ لیتے ہیں۔ سر سید امیر علی نے بھی وقت کی ضرورت کے مطابق عیسائی حملوں سے اسلام کی مدافعت کی۔ انہوں نے نہ صرف اسلامی عقاید کا ادعا کیا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب کا ذکر چھیڑ کر لوگوں کو جتلانے کی کوشش کی کہ کبھی ہم بھی اس محفل رنگ و بو میں شریک رہ چکے ہیں۔ لیکن بنگالی مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کا ذکر تو فضل الحق صاحب کے نام سے شروع ہونا چاہیے۔ انہوں نے سب سے پہلے سوتے ہوئے ساتھیوں کو جھنجوڑا۔ آپ کہیں گے کہ سر سلیم اللہ نواب صاحب ڈھاکہ کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ بے شک ان کا نام ضرور آنا چاہیے کیوں کہ انھوں نے ہندوستان کی جمہوریت کے ارتقا میں ایک بڑا معنیٰ خیز قدم اٹھایا تھا اور ان کا شمار تو سارے ہندوستان کے لیڈروں میں ہوتا ہے۔ سر سلیم اللہ کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں بھی آنا چاہیے۔ گو یہ یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں ان کے انتقال کے بعد بنی اور اس طرح بنی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ لیکن بنگال کے عام مسلمانوں کو با عزت بنانے کا سہرا فضل الحق کے سر ہے کلکتہ میں اسلامیہ کالج اور لیڈی بریبورن کالج بنا کر انہوں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا۔ کرشک پرجا پارٹی بنا کر ہندو اور مسلمانوں کو سیاست میں ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا سبق سکھایا اور زرعی اصلاحات کے ذریعے غریب کسانوں کا بوجھ ہلکا کیا۔ وہ صحیح معنوں میں

[شیر] بنگال تھے اور بنگال کے مسلمان ہمیشہ ان کے احسانوں کے بوجھ سے دبے رہیں گے۔

پاکستان بننے کے بعد تو جیسے بنگال کی مسلم تہذیب پر شباب آگیا مسلمان نوجوان جو فنون لطیفہ سے ذرا دور ہی رہتے تھے، اب موسیقی، ادب اور سائنس غرض کہ ہر میدان میں رقصاں اور غزل خواں اتر آئے کچھ نادانوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ان باتوں میں اگر ملوث ہوئے تو مذہب چلا جائے گا۔ انھوں نے خسروؔ، حافظؔ، خیام اور سعدی کے نام لے کر پوچھا کہ کیا ان کی وجہ سے کسی کے مذہب میں خلل آیا؟ اگر مسلمان عربی زبان کے بجائے فارسی، اردو، پنجابی اور چینی زبانیں بول کر بھی اسلام کو بچائے رکھ سکتے ہیں تو بیچاری بنگلہ نے کیا قصور کیا ہے؟ جیسے عرب لوگ امراء القیس اور متنبی کو اپنا شاعر مانتے ہیں، ویسے انھوں نے بھی ٹیگور اور نذر الاسلام کے گانے گانا شروع کر دیے ہندوستان نے کسی خطے کے لوگوں کو اپنی نشاۃ الثانیہ کی اتنی قیمت نہیں ادا کرنا پڑی جتنی کہ بنگالی مسلمانوں کو۔ لیکن انہوں نے یہ قیمت ادا کی اور اس قصے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کہ کوئی پہلے مسلمان ہے یا پہلے ہندوستانی۔ اب برصغیر کے مسلمانوں سے کوئی بھی اس قسم کے فضول سوال کبھی نہیں کرے گا۔

ہندو مسلم اختلافات جتنا شدید بنگال میں تھا اور کہیں نہیں تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب انگریزوں نے سراج الدولہ کو شہید کر کے بنگال کے تخت کو تاراج کر دیا تو اس کے چند برسوں کے بعد لارڈ کارنیوالس نے اپنی پرمننٹ سیٹلمنٹ کی پالیسی کے تحت مسلمان زمین داروں سے ان کی زمینیں چھین کر ہندو ساہوکاروں کو دے دیں۔ اس طرح ایک طرف تو مسلمانوں پر افلاس کی مار پڑی اور دوسری طرف چوں کہ ابھی تک باقی ہندوستان میں ان کا اقتدار ختم نہیں ہوا تھا، اس لیے شاید انگریزوں نے خیال کیا کہ ان کو تو بالکل دبائے رکھنا ہوگا ورنہ باقی ہندوستان کو سر کرنے میں مشکلیں پڑ سکتی ہیں۔ چنانچہ بنگال کے مسلمان بس کھیتوں میں کام کرتے رہے اور علم کی پیاس اپنے مدرسوں میں بجھاتے رہے جہاں کے پڑھانے والے سارے دنیا سے بے خبر قال اللہ و قال الرسول کی گردانیں کرواتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب انگریزی پڑھ لکھ کر ہندو بنگالیوں نے حکومت کے متعلق سوالات کرنا شروع کیے تو ایک انگریز افسر ہیوم نے انہیں کانگریس بنانے پر آمادہ کیا۔ جب کانگریس بنی تو ان لوگوں نے ویسٹ منسٹر کے حزب اختلاف کا جیسا رویہ اختیار کرنا شروع کیا۔ انگریزوں نے اس کے تدارک کے لیے ایک طرف تو بنگال کی تقسیم کرکے ہندوؤں پر یہ واضح کر دینا چاہا کہ ان کی سماجی برتری انگریزی حکومت کی مرضی ہی سے قایم ہے اور اگر ان کی وفاداری میں کوئی کمی آئی تو وہ مسلمانوں کو بڑھاوا دینا شروع کر دیں گے۔ بنگال کے ہندوؤں پر اس سرزنش کا الٹا اثر ہوا اور ان کی پوری برادری بنگال کی تقسیم کی مخالفت میں کھڑی ہو گئی۔ کچھ نوجوان تو بم لے کر نکل آئے۔ دوسری طرف انگریزوں نے اب مسلمانوں کو اسی طرح کا راستہ دکھایا، جس طرح وہ بیس برس پہلے ہندوؤں کو دکھا چکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی تحریک پر شملہ ڈیپوٹیشن کا اہتمام کیا گیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ تقسیم بنگال کی مخالفت سے مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹیں پڑ رہی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج بڑھتی ہی گئی۔

جتنے دن میں کلکتہ میں رہا، مجھے یہ احساس رہا کہ بنگالی ہندو جیسے بنگالی مسلمانوں کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ غیر بنگالی مسلمانوں کی وہ عزت کرتے تھے لیکن بنگالی مسلمانوں کی حیثیت دوسری تھی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اسی وجہ سے بنگالی مسلمان مسلم لیگ کے اس قدر پرجوش حامی ہو گئے۔ جن علاقوں میں پاکستان بنا ہے ان میں سے کسی دوسرے علاقے کے مسلمان پاکستان کے نعرے سے اس طرح متاثر نہیں ہوئے جیسے بنگال کے مسلمان۔ ان کو تو جیسے کسی نے نئی زندگی کا پیغام دیا ہو۔

اس دفعہ کلکتہ میں میری ملاقات زینت سے ہوئی۔ اس کا داخلہ تو میڈیکل کالج میں میرے دو برس کے بعد ہوا تھا۔ لیکن چونکہ میں نے تین برس تک پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے ایک کلاس آگے ہو گئی تھی۔ دبلی پتلی، کامنی سی۔ مجھے بہت اچھی لگی اور پھر اس سے دوستی ہو گئی۔

زینت کے والد ڈاکٹر موسیٰ صاحب کلکتہ کے بہت کامیاب ڈاکٹروں میں سے تھے۔ ایڈنبرا سے جب وہ اسکول اور اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم ختم کر کے ہندوستان واپس آئے تو دیش بندھو سی۔ آر۔ داس سے ملاقات ہوئی۔ ان کی رائے ایک نیشنل میڈیکل اسکول کھولنے کی تھی۔ وہ اس زمانے میں کلکتہ کارپوریشن کے میئر بھی تھے۔ ڈاکٹر موسیٰ نے حامی بھری اور ان دونوں نے کچھ اور ڈاکٹروں کی مدد سے ایک میڈیکل اسکول کھول دیا۔ ۱۹۴۰ء میں اسے کالج کا درجہ مل گیا۔ ڈاکٹر موسیٰ اپنے آخری وقت تک اس کالج میں اناٹمی پڑھاتے رہے۔ آج کل اس ادارے کا نام نیشنل میڈیکل کالج ہے۔

تھوڑے دنوں کے بعد ان کے دوست ڈاکٹر آر۔ احمد امریکہ سے ڈینٹل سرجری پڑھ کر واپس آئے۔ دونوں نے مل کر ایک ڈینٹل اسکول کھولنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ وہ بھی کھل گیا۔ آج کل اس کا نام ڈاکٹر آر۔ احمد ڈینٹل کالج ہے۔ ڈاکٹر موسیٰ اس کالج میں فارماکالوجی پڑھاتے تھے۔

وہ اپنے کو بہت لیے دیے رہتے تھے۔ ہمیشہ ایک ہی وضع میں باہر نکلتے۔ کوٹ، واسکٹ، پتلون اور ہیٹ۔ منکسر المزاج ایسے کہ بہت کم لوگوں کو اندازہ تھا کہ انھوں نے کلکتہ میں ڈاکٹری تعلیم کی اشاعت میں اتنا کام کیا ہے۔

گھر میں خالص بنگالی وضع میں رہتے تھے۔ لنگی باندھتے اور کرتہ پہنتے تھے۔ ان کے بچوں کو جو کہ سب کے سب بہت فیشن ایبل تھے، یہ وضع بالکل پسند نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات تو اور بھی ناپسند تھی کہ جب وہ اپنے گاؤں جاتے تو شام کو گھر کے تالاب کے کنارے لنگی باندھے، بنیائن پہنے اور کندھے پر انگوچھا ڈالے پالتی مار کر بیٹھ جاتے گاؤں کے چھوٹے بڑے ان کے چاروں طرف جمع ہو جاتے اور وہ سب کو دیکھ دیکھ کر نسخے لکھتے اور جو دوائیں اپنے ساتھ شہر سے لاتے وہ بانٹ دیتے۔ اس وضع میں انہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے اسکول سے لے کر ڈاکٹری تک سب تعلیم ولایت میں حاصل کی تھی۔

زینت کی والدہ پٹنہ کے ڈاکٹر اسد علی خاں کی نواسی تھیں۔
اسد علی خاں سر سیّد امیر علی کے قریبی رشتہ داروں میں تھے بلکہ یہ صاحب

ے تھے کہ ڈاکٹر اسد علی خاں سے پٹنہ کے سب نوجوان ڈرتے تھے۔ اگر
ی لڑکا تنگ شیروانی یا انگرکھا پہن کر ان کی مجلس میں آجاتا تو اسے
ے پاس بلا کر بھری محفل میں قینچی سے شیروانی کاٹ دیتے اور کہتے کہ
ف کپڑے پہننے سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی چوں بھی
سکے۔

زینت کی سب سے بڑی بہن یوسف جمال بیگم نے کلکتہ یونیورسٹی
ے انگریزی میں ایم۔ اے پاس کر کے لیڈی بریبورن کالج میں پڑھانا
روع کیا۔ شادی کے بعد وہ پاکستان چلی گئیں۔ وہاں پہنچنے کے دو سال
اندر ہی انہوں نے ایک کتاب پوئٹس آف ایسٹ بنگال
ی۔ یہ گویا مشرقی بنگال کے رہنے والوں کا اعلان تھا کہ

خاکساران جہان را بحقارت منگر

اس کے بعد تو بنگال سے کتابوں پر کتابیں اس مضمون کی نکلنے
یں کہ مشرقی بنگال کی تہذیب مغربی پاکستان کی تہذیب سے بالکل
لف ہے اور وہ بھی اسی قدر احترام کی مستحق ہے جتنی کہ لاہور اور
اچی کی تہذیب۔ افسوس ہے کہ اس نکتہ کو ارباب حل وعقد نہیں
یں سمجھ سکے اور نتیجے میں وہی ہوا جو ہندوستان میں مسلمانوں کے
املے میں ہوا تھا۔ یعنی ملک کی تقسیم ہو گئی۔

برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کا قیام تاریخی اعتبار سے
ئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیشہ یہاں ایک سے زیادہ ریاستیں رہی ہیں
د ہر طاقتور ریاست کی خواہش یہ رہی کہ بقیہ ملک بھی اسی کے قبضہ
ں آجائے۔ ہماری ہزاروں برس پرانی تاریخ میں غالباً چار پانچ سو
س بھی کوئی ایسی زبردست حکومت نہیں رہی جس کے قبضہ میں شمال
نوب، اتر، دکھن سب ہو۔ چندر گپت، اشوک، وکرمادتیہ، ہرش
ردھن، علاء الدین خلجی، اکبر، اورنگ زیب اور اب انگریز۔ یہی نام
ڑی بڑی سلطنتوں سے متعلق ہیں۔ لیکن تین ہزار برس کی دستاویز
شدہ تاریخ میں ان بڑی سلطنتوں کا زمانہ بہت تھوڑا رہا ہے۔ اس
ے باوجود ہندوستان بہت حد تک ویسا ہی ایک وحدت رہا ہے جیسا
ر یورپ
آخر کیا چیز ہندوستان کو ایک کئے ہوئے تھی۔ کیا یہاں
کا ہندو مذہب تھا؟ اشوک، علاء الدین، اکبر، اورنگ زیب
اور انگریزوں کا زمانہ اقتدار ہندو مذہب والوں کا نہیں تھا۔ اس
کے باوجود ہندو مذہب ہندوستان کے اتحاد کا ایک بڑا ستون ہے اور
وہ ہیں ملت جن کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ مثلاً کنبھ میلے کے
اشنان یا پھر سنسکرت جو ہزاروں برس سے سارے ہندوستان
کی علمی زبان رہی ہے، اور بعد کے زمانے میں مسلمان صوفیاء نے ملک
کے ہر کونے میں ایسے مرکز بنائے کہ جہاں سارے ہندوستان
کے لوگ آنے لگے۔ یہ سب چیزیں ہماری وحدت کی ضامن رہی ہیں۔
یہ ہماری روحانی وحدت کی نشان دہی ضرور کرتی ہیں لیکن سیاسی
وحدت سے ان کا بہت زیادہ تعلق نہیں رہا ہے۔ حکومتیں چاہے
بدھ مت کے ماننے والوں کی رہی ہوں چاہے اہل اسلام کی
چاہے عیسائیوں کی۔ ہندوستان کی اس روحانی وحدت پر حکومتوں
کا بہت اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ آج بھی ہندوؤں کے تیرتھ استھان
مسلمانوں کی زیارت گاہیں اور سکھوں کے متبرک مقامات اس
برصغیر کی سیاسی تقسیموں سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔ ہندوستان
اور پاکستان کے تعلقات چاہے کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں
(سوائے جنگ کی صورت کے) اجمیر، ہردوار اور ننکانہ صاحب کی
رونق وہی رہتی ہے۔ ہمارے روحانی پیشواؤں کی حکمرانی عوام
کے دلوں پر ہمیشہ رہے گی چاہے دہلی کے تخت پر ہرش وردھن
بیٹھیں، چاہے اورنگ زیب، چاہے لارڈ ارون اور چاہے
جواہر لال نہرو۔

(باقی آئندہ)
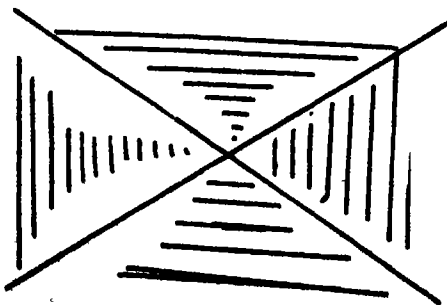
حضرت سید محمد جونپوری اور مولانا ابوالکلام آزاد

ابوعلی

سید محمد جونپوری جون پور کے رہنے والے تھے۔ ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے جو شدید مخالف تھے وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ علوم رسمیہ میں کمال کے ساتھ زہد درویشی اور ورع و تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شیخ علی متقی جو ان کے معاصر اور سخت مخالف تھے اور ان کے رد میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے، وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشف اور استغراق و استہلاک باطنی میں گزرا، سات سال تک ان کا یہ حال رہا کہ پے در پے روزہ رکھتے اور تن تنہا ایک گوشہ میں پڑے رہتے۔ اسی اثنا میں ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ اُن کو محسوس ہوا کہ کہیں سے صدا آرہی ہے کہ "انت المہدی" تم مہدی ہو۔ برسوں تک متامل اور سوچتے رہے کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب یہ آواز مسلسل سنائی دی تو انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کردیا۔ نویں صدی ہجری کا زمانہ جو اکبر سے پہلے گزرا وہ بڑا ہی پُرآشوب تھا۔ سخت بدامنی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ روز روز بادشاہتیں قایم ہوتیں اور ختم ہوجاتیں۔ کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی، جو احکام شرع کے اجرا اور قیام کی ذمہ دار ہوتی۔ علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وہ طرح طرح کے فتنے برپا کرتے رہتے تھے۔ دنیا طلبی اور مکر و زور کی گرم بازاری تھی۔ ان سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ جاہل صوفیا کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حال سید موصوف سے نہ دیکھا گیا اور انھوں نے بلا خوف لومۃ لائم احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کر دیا، اور لوگوں سے کہا کہ اس وقت مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و شغل کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ اور احکام شرعیہ کے اجرا کی راہ میں اپنی جانیں لڑا دو، اللہ تعالےٰ نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، اور متعدد فرماں روایانِ وقت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کے معتقدین کے طور و طریق ایسے عاشقانہ اور والہانہ تھے کہ ان کو دیکھ کر صحابۂ کرام کے خصایص ایمانی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ انھوں نے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی الفتوں کو ایمان اور محبتِ الٰہی کے رشتے پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہِ حق میں نکل پڑے تھے اور ایک دوسرے کے رفیق و غم گسار بن گئے تھے۔ اور بجز خلق اللہ کی ہدایت، خدمت اور احکام شرع کے اجرا کے دنیا کے اور کسی کام سے اُن کو واسطہ نہ تھا، جو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا، اس کو تین منزلوں سے گزرنا ضروری تھا۔ ایک یہ تھی کہ جو اس راہ میں قدم رکھے وہ قید وطن سے آزاد اور گھر بار چھوڑ کر، اپنے برادران طریقت کا ساتھی اور غم گسار ہو جائے۔ دوسری منزل ترک مال کی ہے۔ یعنی اس کے پاس جو کچھ ہو، وہ اپنے یارانِ طریقت میں بانٹ دے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تیسری منزل اس راہ کی ترک جان کی فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو یعنی ہر وقت راہِ خدا میں سر بکف رہو، اگر اعدائے شریعت سرنگوں نہ ہوں تو قوت حدید سے کام لو، فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ یہی چند باتیں تھیں جو پیران کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد عمل کرنا ضروری تھا اور یہ سب کی سب بالکل حق تھیں، عشق و محبت الٰہی کی راہ میں جاں سپاری کتنی بڑی سعادت ہے لیکن افسوس کہ آگے چل کر کہ خود ان کے معتقدوں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریق عشق اول منزل است

ان کی یہ تعلیمات تھیں جن کو ان کے موافقین اور مخالفین سب نے لکھا ہے لیکن ان کے معتقدین نے ان کو شرع کا رنگ دے دیا اور مخالفین کو ان کی مخالفت کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور بعض باتوں کو تکفیر و تفسیق کے لیے حجت ٹھہرا لیا۔ افسوس ہے کہ دنیا کی تاریخ ہدایت و اصلاح امم کی نصف گتھیاں اسی سوءِ فہم اور تاویل و تعبیر باطل کی الجھائی ہوئی ہیں۔ کہا کچھ گیا اور سمجھا کچھ گیا۔ معتقدین نے غلو کیا اور مخالفین نے تعصب و تشدد سے کام لیا۔ اور اس تاریکی میں اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا است

اس راہ کا سب سے بڑا فتنہ یہی سوءِ فہم ہے۔ بتلانے والوں نے کیا کہا تھا اور سمجھنے والوں نے سمجھا کیا۔ ان غلط فہمیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی۔ پہلے تفضیل و تکفیر کا سلسلہ چلا، پھر کشت و خون تک نوبت پہنچی۔ وہ سب سے زیادہ علمائے دنیا کو ان کی ہوا پرستیوں اور غفلت پر سرزنش کرتے تھے جب مخالفت کا بہت زور ہوا تو گجرات چلے گئے۔ سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا۔ لیکن علمائے سو نے ان کو وہاں بھی نہیں بخشا اور مخالفت شروع کر دی، مجبوراً حجاز و عرب کا رخ کیا، وہاں سے ایران گئے۔ سلطان اسماعیل صفوی کا زمانہ تھا، اس نے ان کے ارد گرد ہجوم خلائق دیکھا تو ایران سے نکل جانے کا حکم دیا، ہندوستان کی طرف دوبارہ واپس آ رہے تھے کہ فراہ میں انتقال ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۹۱۱ھ کے واقعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

دریں سال سید محمد جونپوری قدس سرہٗ از اعاظم
اولیائے کبار کہ دعویٰ مہدویت از سر برزدہ بود
هنگام مراجعت از مکہ معظمہ بجانب ہند در بلدۂ
فراہ داعی حق را لبیک فرمود۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ معظمہ ہو کر ہندوستان آ رہے تھے، اور جب فراہ میں پہنچے تو انتقال کر گئے۔ ان کی طرف طرح طرح کے دعاوی اور شطحیات منسوب کیے گئے ہیں۔ معتقدین کو تو چھوڑیے کہ وہ جس سے عقیدت رکھتے ہیں تو اس کو خدا بنائے بغیر نہیں رہتے۔ زیادہ احتیاط کی تو اس کو نبوت تک پہنچا دیا، لیکن ان کے معاملے میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی تک یہ لکھتے ہیں کہ:

"سید محمد جونپوری کا یہ اعتقاد تھا کہ جو کمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکھتے تھے، وہی کمال ان کو بھی حاصل تھا۔ فرق اتنا تھا کہ حضورؐ کو براہ راست خدا کی طرف سے یہ کمال حاصل ہوا تھا اور ان کو حضورؐ کے اتباع میں اور تبعیت رسول اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ روحانی کمالات میں اسی کی طرح ہو گئے۔"

لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ سید موصوف نے یہ بات کہی یا ان کے مریدین و معتقدین کی پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے۔ ام العقاید جو ان کی جانب منسوب ہے وہ اُن کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے۔ ہدیۂ مہدویہ نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں، لیکن ان کا انتساب سید محمد کی جانب مشکوک و محلِ نظر ہے۔ بہرحال اس قسم کی باتیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ معتقدین کا غلو، افراطِ عقیدت، سوءِ فہم اور زیغ نظر ہے، یا غلبۂ حال کا نتیجہ ہے جو اس راہ کے بڑے بڑے کاملین اور واصلین تک کو پیش آئے ہیں۔ کسی نے اس عالم میں "لوائی ارفع من لواء محمد" کہا اور کوئی "سبحانی سبحانی ما اعظم شانی" پکار اٹھا اور کوئی کچھ اور کوئی کچھ۔

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

تو اگر ان تمام حضرات کی طرف سے مغلوبیت سکر و حال کا نتیجہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے، اور ان کے اسلام و ایمان پر شک نہیں کیا جاتا تو پھر سید محمد جونپوری نے کیا قصور کیا ہے کہ کمال زہد و ورع اتباع شریعت، قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ایثار فی اللہ وغیرہ کی بنا پر جس سے موافق تو موافق، مخالف تک کو انکار نہیں۔ ان کو حسنِ ظن اسلامی کا مستحق نہ سمجھا جائے اور صرف چند کلمات غریبہ کی بنا پر جن کی اصلیت مشتبہ ہے ان کو مومن نہ سمجھنے پر اُتر آئیں۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق
داوری خواہم مگر یارب کرا داور کنم

مہدوی ان ہی بزرگ کی طرف منسوب ہے۔ اس کی بنیاد تو درحقیقت صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی، یعنی دعوتِ حق، احیائے شریعت، قیام فرض امر و نہی عن المنکر وغیرہ وغیرہ خود سید محمد اور ان کے پیرو بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست تھے، جن کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا لیکن افسوس کہ رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت غلو و محدثات میں گم ہو گئی اور فرقۂ مہدویہ کو مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں شامل کر لیا گیا اور اس وقت سے اس کے خلاف تکفیر شروع ہوئی تو اب تک قایم ہے۔ (ملخص از تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد)۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد پہلے بزرگ ہیں جو تاریخ کے حقایق کی روشنی میں اپنی اس کتاب 'تذکرہ' میں ان کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہیں اور ان کو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، احیائے شریعت اور دعوت حق کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید محمد جونپوری نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انھوں نے کبھی اپنے کو مہدیٔ موعود سمجھا۔ اگر عالم سکر میں یہ الفاظ ان کی زبان پر آگئے تھے تو سکر کی کیفیت دور ہو جانے کے بعد اس کی تردید بھی فرمادی، جیسا کہ خزینۃ الاصفیا اور تحفۃ الاکرام وغیرہ میں ہے۔ مراۃ محمدی کے مصنف نے بھی اسی کی تائید کی ہے، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ان کی دعوت حق کی جو تحریک ہندستان سے گزر کر ایران و عرب و حجاز تک پہنچ گئی تھی اور جس کے حلقۂ ارادت میں وقت کے بڑے بڑے سلاطین، علما، اور زہاد آگئے تھے۔ مولانا ابوالکلام کی قلم برداشتہ چند سطروں کے سوا جو ضمناً علمائے دنیاپرست کے ذکر کے سلسلے میں تذکرہ میں آگئی ہیں۔ اردو میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ایک صاحب نے الفرقان لکھنؤ میں فارسی کے بعض تذکروں کی مدد سے اس پر لکھنا شروع کیا، تو وہ بھی مواد کی کمی سے تشنہ رہ گیا۔ زیادہ تر انھوں نے اس تذکرہ کو اپنے مضمون کا ماخذ قرار دیا ہے، اپنی کوئی نئی تحقیق، جیسا کہ توقع تھی، پیش نہیں کی ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں۔ عربی، فارسی اور اردو میں سید محمد جونپوری اور ان کی تحریک مہدویت کے متعلق جو کچھ ہے، اس کو تلاش کر کے منظر عام پر لائیں۔ خود ابوالکلام صاحب نے بھی اس کو تذکرہ میں ضمناً ہی لکھا ہے، تحقیق کا حق جیسا کہ چاہیے تھا، ادا نہیں کیا ہے۔ شیر شاہی و سلیم شاہی عہد کے اکابر اولیا میں ایک بزرگ شیخ داؤد جہنی وال تھے۔ ان پر مہدوی ہونے کا شبہ تھا، اتنی ہی بات مخدوم الملک کی مخالفت کا سبب بن گئی جو اس وقت بڑے اقتدار کے مالک تھے اور جو چاہتے تھے، ان سوری فرمانرواؤں سے منوا لیتے تھے لیکن شیخ پر یہ الزام ثابت نہ ہو سکا، ورنہ ان کے لیے بھی جامِ شہادت تیار ہو جاتا جو مخدوم الملک کے ہاتھوں بعض دوسرے اہل اللہ کو پینا پڑا۔ ان ہی بزرگ کے ذکر کے سلسلے میں سید محمد جونپوری اور ان کی تحریک مہدویت پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

عہدِ مغلیہ پر اردو زبان کے معتبر مورخ سید صباح الدین عبدالرحمن اپنی کتاب بزم تیموریہ کے دوسرے ایڈیشن میں جو پہلے ایڈیشن سے کہیں زیادہ ضخیم ہے اور جو صرف بابر سے لے کر اکبر تک کے حالات پر مشتمل ہے اکبری دور کے امرا کے ذیل میں مخدوم الملک کے متعلق رقم طراز ہیں۔

"مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کا لقب تھا۔ یہ مضافاتِ لاہور کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان انصاری تھا۔ عربی، اصول فقہ، تاریخ اور علوم منقولات میں ان کو بڑی اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔ علوم دینی میں اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اس نے ان کو مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا۔ شریعت کی ترویج میں برابر کوشاں رہے۔ بہت متعصب سنی تھے۔ ملحدوں اور شیعوں سے ان کو سخت نفرت تھی۔ شیر شاہ کے مقابلے میں بدقسمتی سے جب ہمایوں کو شکست ہو گئی اور وہ بھاگ کر ایران چلا گیا تو مولانا عبداللہ سور خاندان کے حکمرانوں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ اس زمانے میں تحریک مہدویت کا بڑا

زور تھا، وہ اس کے سخت مخالف تھے۔ جس پر بھی ان کو مہدویت کا شبہ ہو جاتا ہے اس کو سزا دیے بغیر نہیں رہتے۔ سلیم شاہ سوری کے عہد کے دو جلیل القدر علماء شیخ علائی اور شیخ نیازی مہدویت کے علمبردار تھے۔ شیخ علائی کو پکڑوا کر ان کو اتنے درّے لگوائے کہ وہ جاں بحق ہو گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی ان کو اپنی تاریخ میں درویش آزاد سے یاد کرتے ہیں۔"

سلیم شاہ مخدوم الملک کی جس قدر عزت کرتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ وہ اور مخدوم الملک ایک ساتھ ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے ایک مست ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا مخدوم الملک نے جوش وفاداری میں آگے بڑھ کر ہاتھی کو روکنا چاہا تو سلیم شاہ نے ان کو روک دیا اور کہا کہ مجھ کو آگے بڑھنے دیجیے اگر میں ہلاک ہو گیا تو میری جرار فوج کے یہ نو لاکھ افغانی وہ جگہ پر سکتے ہیں اور سلطنت کو انتشار سے بچا سکتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپ جاں بحق ہو گئے، تو آپ کے ایسا ہندوستان میں ایک مدت مدید تک عالم پیدا نہ ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ وہ دربار میں آئے تو اُن کو اپنے تخت پر بٹھایا اور موتی کی ایک تسبیح ان کو پیش کی جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی۔

سوری خاندان کا خاتمہ ہو گیا تو مولانا عبداللہ اکبر کے دربار میں آ گئے جہاں انہوں نے اپنی علمی فضیلت اور دینی کمالات کی وجہ سے امارت کے ساتھ بڑا جاہ و جلال بھی حاصل کر لیا۔ ملک کی سیاست میں بھی ان کا بڑا عمل دخل ہو گیا اور اس سلسلے میں انہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ گجرات کی فتح تک ان کو بڑا عروج اور اقتدار حاصل تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے شیخ مبارک ناگوری پر مہدوی اور بدعتی ہونے کا الزام رکھ کر اکبر سے ان کی گرفتاری کی اجازت بھی لے لی۔ مگر رفتہ رفتہ جب شیخ مبارک ناگوری اور ان کے لائق لڑکوں ابوالفضل اور فیضی کا رسوخ دربار میں بڑھا تو مولانا عبداللہ پر زوال آ گیا۔

مولانا ابوالکلام نے اپنی اس کتاب میں ان کے مفتیانہ فقہی میل اور مہدویت کی مخالفت کی بنا پر علماء سوء میں شمار کیا ہے اور ان کے عجیب و غریب قصے لکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ باوجود دولت و تمول جو انھوں نے ایسی شیخ الاسلامی کے زمانے میں حاصل کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی قبروں میں چاندی سونے کی اینٹیں مدفون کر دی تھیں۔ عمر بھر کبھی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنا سارا اندوختہ ہر سال اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتے تھے اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کے نام بخش دیتی، اس طرح حول کامل دونوں میں سے کسی پر نہ گزرتا کہ ادائے زکوٰۃ کی شرط پر دونوں اترتے۔ یہی وہ ہمیشہ کرتے۔ اسی وجہ سے انھوں نے حج بھی نہیں کیا کہ حج کے فرض ہونے کی بھی یہی شرط ہے۔ لیکن جب ان پر زوال آیا تو ان کو زبردستی حج کے لیے بھیجا گیا۔ بلکہ ان کو وہیں جلاوطن بھی کر دیا گیا۔ لیکن ایک امیر کی سفارش سے ان کو پھر ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور انتقال کر گئے۔ معلوم نہیں ان کی دولت و ثروت کا کیا حشر ہوا۔ ان کو مہدویت کے استیصال میں بڑا دخل ہے اور وہ بالآخر ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کا لٹریچر بھی عام طور سے نہیں ملتا۔ حیدرآباد سے دو ایک رسالے اس کے متعلق شایع ہوئے ہیں لیکن وہ اتنے مختصر ہیں کہ ان کو پڑھ کر کوئی تشفی نہیں ہوتی۔ مولانا نے تو اپنے زمانہ نظربندی رانچی میں علمائے سوء کے تذکرہ کے سلسلہ میں ضمناً اس لیے اس پر کسی قدر روشنی ڈالی تھی کہ کوئی صاحب ہمت اس سے آگے بڑھ کر اپنی تحقیق کا مستقل موضوع بنائیں گے اور اس تحریک کے مالۂ و ماعلیہ پر اس کے تمام لٹریچر کو سامنے رکھ کر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے لیکن افسوس کہ آج تک اس پر ایک حرف کا اضافہ نہ ہو سکا اور یہ موضوع ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے۔ کیا یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے اسلامیات کے ریسرچ اسکالر، اور ندوہ و دیوبند و مرکزی دارالعلوم بنارس کے فضلاء اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں گے؟ اس میں محنت ضرور ہے لیکن اس سے ہندوستان کی اپنی تاریخ کا ایک گوشہ ضرور سامنے آ جائے گا۔

||

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۶ - شمارہ ۴ (اپریل ۸۷ء)

زحل

نظام شمسی کا دوسرا بڑا سیارہ جو مشتری اور یورانس کے درمیان واقع ہے۔ تمام اجرام فلکی میں زحل کا نظارہ، جو دوربین سے مشاہدے میں آتا ہے، سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ زحل کے گرد اگرد نہایت خوبصورت حلقے ہیں۔ یہ حلقے صاف شفاف اور مہین ذرّات سے بنے ہیں۔ زحل سے زمین پر آنے والی روشنی کا آدھا حصہ دراصل ان حلقوں سے چھن چھن کر آتا ہے۔ مشتری کی مانند زحل کی فضا بھی نہایت کثیف ہے۔ سورج سے بہت زیادہ دور (۸۸۶،۰۰۰،۰۰۰ میل) ہونے کی وجہ سے سورج کی شعاعوں کی حرارت بہت کم ہو جاتی ہے۔ یعنی زمین پر آنے والی شعاعوں کی حرارت کا صرف ۱/۹۰ حصہ۔ درجۂ تپش نہایت کم ہے۔ اسی وجہ سے زحل پر زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ دوربین سے دیکھنے پر زحل سنہری رنگ کی ایک چپٹی بڑی طشتری کی سی شکل میں نظر آتا ہے۔ [illegible] کے گرد سفید حلقے ہیں۔ اس کی کثافت پانی کی کثافت سے بہت کم ہے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر ہائیڈروجن پر مشتمل ہے۔ کچھ ہیلیم بھی ہے۔ اس کے مرکز کی سطح چٹانی ہے۔ بالائی سطح میں ہائیڈروجن میتھین اور ایتھین دریافت ہوئے ہیں۔ درجۂ حرارت اتنا کم ہے کہ پانی اور امونیا جم جائے۔

زحل کی خاص بات اس [illegible] حلقے ہیں، جن کا مشاہدہ سب [illegible] پہلے گلیلیو نے ۱۶۱۰ء میں کیا [illegible] ان کی ساخت و ہیئت کی وضا[illegible] ماہر فلکیات کرسچین ہائیگن[illegible] اپنی تصنیف "نظام زحل" [illegible] کی تھی، جو ۱۶۵۹ء میں شائع [illegible] تھی۔ تین روشن حلقے تو [illegible] زمانے میں دریافت ہو گئے [illegible] تین مدھم حلقے اس زمانہ [illegible] دریافت ہیں۔ تین روشن حلق[illegible] میں بیرونی حلقہ "A" ہے جو [illegible] ہلکے سفید رنگ کا ہے اور [illegible] [illegible] حلقہ "B" سفید رنگ کا [illegible] [illegible] ہلکے نیلے رنگ [illegible] تین مدھم حلقوں میں [illegible]

زحل [illegible]

حلقہ "D" [illegible] [illegible]

ہوا۔ دو مدھم حلقے بیرونی روشن حلقے "ؤ" سے بھی باہر کی طرف موجود ہیں اور ان کو ۱۹۷۹ء میں خلائی سیارے "پائینیر ۱۱" نے دریافت کیا تھا۔ یہ حلقے نسبتاً کم کثیف ہیں۔ مدھم حلقے برفانی گرد اور چٹانی اجزاء کے ذرات سے بنے ہیں اور زحل کے گرد سیارچوں کی طرح گھومتے ہیں۔ زحل اور اس کے حلقوں کے بارے میں بنیادی معلومات ذیل میں درج ہیں۔

حلقہ "ا" اور حلقہ "ب" کے درمیان ۰۰ ۲۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے، یہ بات ۱۶۷۵ء میں ماہر فلکیات بی۔ ڈی کاسینی نے دریافت کی تھی اور "کاسینی تقویم" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۴۳ء میں ماہر فلکیات جوہان اینکے نے حلقہ "ا" کے چاروں طرف گہرے رنگ کی ایک ہلکی سی پٹی دریافت کی تھی۔ جو "اینکے تقسیم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حلقہ "ج" ۱۸۵۰ء میں ڈبلیو سی بونڈ اور جی پی بونڈ نے دریافت کیا تھا، اس کا مشاہدہ بہت مشکل ہے کیوں کہ یہ حلقہ "ا" اور "ب" کے مقابلے میں بہت پتلا ہے۔ ہر حلقے کی موٹائی ۱تا ۲۵ کلومیٹر ہے۔

زحل کے گرد سیارچے بھی گردش کر رہے ہیں، جن کی تعداد اب تک دس ہے۔ اگرچہ مصنوعی سیارے "پائینیر ۱۱" نے چند اور سیارچوں کی بھی خبر دی ہے۔ سیارچہ ششم "ٹائٹن" سب سے بڑا ہے اور پورے نظامِ شمسی میں واحد سیارچہ ہے، جس کی فضا میں میتھین موجود ہے۔ یہ دریافت ۱۹۴۴ء میں ماہر فلکیات جیرارڈ کوئیپر نے کی تھی۔ پائینیر ۱۱ جب زحل سے فقط ۲۲۰,۰۰۰ میل کے فاصلے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ ٹائٹن کی فضا سرخ رنگ کی ہے۔ زحل کا سب سے بیرونی سیارچہ فوبی ہے۔ یہ پہلا سیارچہ تھا جو زمین کے جنوبی نصف کرے سے دریافت ہوا تھا۔ نیز یہ پہلا سیارچہ تھا جس کے فوٹوگراف لیے گئے تھے۔ اس کی حرکت رجعتی (الٹی) ہے۔

بنیادی معلومات

قطر (استوائی)	119,300 کلومیٹر
قطر (قطبی)	107,700 کلومیٹر
کثافت (پانی = ۱)	0.71 گرام فی سنٹی میٹر-3
کمیت	5.81×10^{29} گرام
حجم	8.2×10^{17} کلومیٹر3 (زمین سے 95 گنا زیادہ)
محوری گردش	۱۰ گھنٹے 14 منٹ
سالانہ گردش	10759 دن
درجۂ تپش	127 کیلون
حلقہ ؤ کا قطر (بیرونی)	272,300 کلومیٹر
حلقہ ؤ کا قطر (اندرونی)	239,600 کلومیٹر
حلقہ ب کا قطر (بیرونی)	234,400 کلومیٹر
حلقہ ب کا قطر (اندرونی)	181,000 کلومیٹر
حلقہ ج کا قطر (اندرونی)	149,300 کلومیٹر

۱۹۰۰ء میں ماہر فلکیات ولیم پکرنگ نے زحل کا ایک اور سیارچہ دریافت کیا تھا جس کا نام "تھیمس" تجویز ہوا تھا۔ یہ ۱۸ درجے کی مقدار پر تھا اور اس کی محوری گردش ۲۰ دن اور ۲۰ گھنٹے اور ۲۵ منٹ کے برابر تھی اور زحل سے پندرہ لاکھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لیکن یہ اس وقت سے لے کر اب تک دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اس لیے اہلِ فلکیات یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید کوئی اور چیز ہوگی۔

(ماخوذ)

ٹیپو سلطان کی علمی خدمات

ظفر الاسلام

ایک عظیم محب وطن اور مجاہد آزادی کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کو عام شہرت حاصل ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کم ہی لوگ واقف ہیں کہ حریت وطن کی پاسبانی کی خاطر بے مثال قربانیاں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس جاں باز سپاہی نے علوم و فنون کی اشاعت میں بھی دلچسپی لی اور اپنے مختصر سے عہد حکومت میں بیش بہا علمی خدمات انجام دیں۔ ٹیپو سلطان کی ان خدمات کا جائزہ اہمیت اور افادیت سے خالی نہ ہوگا، اس سے نہ صرف سلطان کی شخصیت کا دوسرا رخ بے نقاب ہوگا بلکہ یہ حقیقت بھی واشگاف ہوگی کہ تخت و تاج کی مصروفیات اور میدان کارزار کی سرگرمیوں کے باوجود بعض مسلم سلاطین نے عوام کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ دی اور علم و فن کی بھرپور خدمت انجام دی۔

ٹیپو سلطان ۱۰ر نومبر ۱۷۵۰ء میں دیون ہلی کے مقام پر پیدا ہوئے جو بعد میں یوسف آباد کے نام سے معروف ہوا۔ ارکاٹ کے ایک مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی سے اظہار عقیدت کے طور پر نواب حیدر علی نے بیٹے کا نام ٹیپو منتخب کیا تھا۔ اس وقت کی روایت کے مطابق نواب حیدر علی نے شہزادے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اس کے لیے باصلاحیت اور تجربہ کار اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ ان کے زیر نگرانی ٹیپو نہ صرف مروجہ علوم اور عربی و فارسی زبان سے بہرہ ور ہوئے، بلکہ بعض دوسرے فنون اور انگریزی و فرانسیسی زبان سے بھی روشناس ہوئے۔ ایام شاہزادگی سے انہیں علم و فن کا جو شوق پیدا ہو گیا تھا، وہ تخت نشینی کے بعد نہ صرف باقی رہا بلکہ اور پروان چڑھا اور علم دوستی اور اہل علم و فن کی قدر دانی و حوصلہ افزائی ٹیپو سلطان کی خاص صفت قرار پائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین اس کے دربار سے منسلک ہوئے اور تالیفی و تصنیفی سرگرمیاں اس کے عہد میں اور تیز ہوئیں۔

ٹیپو سلطان کی علمی خدمات کو موٹے طور پر دو حصوں میں [illegible] جا سکتا ہے۔ تعلیم کے رواج کے لیے انتظامی اقدامات اور علوم کی اشاعت کے لیے تالیفی و تصنیفی سرگرمیوں میں دلچسپی۔ تعلیم کی خاطر سلطان نے اپنی قلمرو کے مختلف حصوں میں مکاتب و [illegible] قایم کیے اور ان کے نظم و انصرام کے لیے حکومت کے خزانے [illegible] رقم فراہم کی۔ قاضیوں کے نام سلطان کے متعدد حکم نامے سے [illegible] ہے کہ ان کی ذمہ داریوں میں تعلیمی امور کی نگہداشت بھی شامل [illegible] کی تعلیم کے سلسلے میں سلطان کے خصوصی اہتمام کا ثبوت قاضی [illegible] حکم نامے سے ملتا ہے جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسجد کے استاد [illegible] کہ تمام اہل اسلام کے بچوں کو جمع کر کے ہر روز سبق دے اور [illegible] تمام بچوں کے نام بقید ولدیت اور ان کتابوں کے نام جنھیں [illegible] ہیں، درج کیے جائیں اور سلطان کو اس کی اطلاع دی جائے [illegible] کے بچے پڑھنے نہ آئیں تو استاد اطلاع دے اور اس اطلا[ع] [illegible] علاقے کے تعلقدار کو چاہیے کہ بچوں کو طلب کر کے استاد [illegible] کرے۔ گرچہ بعض جدید دانشوروں نے سلطان کے اس [illegible] "جبری تعلیم" سے منسوب کیا ہے لیکن واقعہ ہے کہ اسے [illegible] لیے سلطان کے شدت اہتمام سے تعبیر کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ا[س] [illegible] دلیل اس سے فراہم کی جا سکتی ہے کہ سلطان نے تعلیم کی [illegible] کو خطیب و موذنین کی ذمہ داریوں کا بھی ایک حصہ قرار دیا [illegible] صاف صاف لفظوں میں یہ ہدایت جاری کی تھی کہ مسجدوں [illegible]

موذنوں کو اپنے مفوضہ کام سے فراغت پانے کے بعد بچوں کو درس دینے میں مستعد رہنا چاہیے۔ تعلیم کے رواج کے لیے سلطان کی یہ کوشش کسی خاص طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص نہ تھی، بلکہ وہ بچے، جوان و بوڑھے سبھی میں اس کو رائج کرنا چاہتا تھا اور اسی مقصد سے اس نے سلطنت کے مختلف حصوں میں مدارس قایم کیے اور ان سب کی دیکھ بھال قاضیوں کے سپرد کی۔

روایتی و مذہبی تعلیم کے اہتمام کے ساتھ ٹیپو سلطان نے جدید علوم میں بھی دلچسپی لی، اس نے اس دلچسپی کا مظاہرہ سب سے پہلے فوجی تعلیم کے ضمن میں کیا۔ اس نے یورپین اقوام سے مقابلہ کے لیے جدید فن جنگ اور نئے آلاتِ حرب کی ضرورت و اہمیت کو بخوبی محسوس کیا۔ اسی کے پیش نظر اس نے فوجی تعلیم و تربیت کے نئے مراکز قایم کیے اور اس کے لیے ملکی و غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ٹیپو سلطان نے تعلیم و تربیت کے علاوہ کتابوں کے ذریعے بھی جدید اصول حرب کی ترویج کی کوشش کی۔ اس کی زیر نگرانی مرتب کی جانے والی کتاب "فتح المجاہدین" کے پانچ ابواب صرف جنگی اصول و آداب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں فوجی نقل و حرکت اور طریقہ ہائے جنگ سے متعلق نہ صرف وہ اصول و آداب درج ہیں جنھیں سلطان نے وضع کیے تھے، بلکہ ان قواعد وضوابط کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو اس وقت یورپ میں رائج تھے۔ سلطان کی توجہ سے طبی تعلیم کے نظام میں بھی بہتری آئی۔ اس نے دارالسلطنت سرنگاپٹم میں "جمع الامور" نام سے ایک ادارہ قایم کیا تھا جس میں دیگر فنون کے ساتھ طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیق و تجربہ کا بھی ایک مرکز تھا جو محل کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں دواسازی کا ایک الگ سے شعبہ قایم تھا۔ میڈیکل سائنس کی توسیع و ترقی کی خاطر اس نے یورپی ماہرین فن سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس کے لیے سلطان کی جانب سے شاہ فرانس کے یہاں ایک خصوصی سفارتی مشن بھیجے جانے کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات میں سلطان ٹیپو کی دلچسپی اس سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے یورپ سے مقیاس الہوا (AEROMETER) سے متعلق ایک انگریزی کتاب فراہم کی اور فارسی میں اس کا ترجمہ کرایا۔

ٹیپو سلطان کو ذاتی طور پر فن انجینئرنگ سے خاص رغبت تھی۔ پورے سرنگاپٹم میں زمین دوز نہروں کی تعمیر، دریائے فرات سے نجف اشرف تک ایک نہر نکالنے کی پلاننگ اور دریائے کاویری پر ایک بند کی تعمیر کا منصوبہ اسی شوق کے اہم مظاہر تھے۔ سلطان کی بابت عام طور پر یہ مشہور رہے کہ وہ ان جہازوں کے ڈیزائن خود بناتا تھا جو سلطنت کے قایم کردہ کارخانوں میں تیار کیے جاتے تھے۔ فن انجینئرنگ اور ڈیزائننگ سے سلطان کی دلچسپی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس کی شہادت کے بعد جب انگریزوں نے شاہی محل پر قبضہ کیا تو سلطانی میز پر پرکار اور اقلیدس (EUCLID) کے نقشے پائے گئے۔ مزید برآں سلطان کی اختراع پسندی بھی اس کے تخلیقی ذہن کی غماز تھی۔ اس نے لگان کی تحصیل میں حساب و کتاب کی آسانی کے لیے "سنہ محمدی" کے نام سے ایک نیا کلنڈر جاری کیا جو سال نبوت ۶۰۹ء کے آغاز سے شروع ہوتا تھا۔ اس نے مہینوں کے نئے نام بھی متعین کیے جن میں فصلی مہینوں سے مطابقت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ مہینوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے اس طرح مرتب کیے گئے تھے (مثلاً احمدی، بہاری، تقی وغیرہ) کہ ہر مہینہ کا پہلا حرف ابجد سسٹم کے لحاظ سے کلینڈر میں اس کی جگہ متعین کرتا تھا۔ ٹیپو سلطان نے سونے، چاندی اور تانبے کے سکے جاری کیے اور ان کے لیے احمدی، صدیقی، فاروقی، عثمانی و حیدری جیسے ناموں کا انتخاب کرکے اپنی اختراع پسندی کا مزید ثبوت پیش کیا۔

مقناطیسی پہاڑوں سے جہازوں کو بچانے کے لیے لوہے کے بجائے تانبے کے استعمال کا طریقہ خود سلطان کا ایجاد کردہ تھا۔ نئی وضع کی بندوقوں، توپوں اور ڈھالوں کی ایجاد بھی سلطان سے منسوب کی جاتی ہے۔ ان اختراعات سے سلطان کے ذہن کی تیزی کے ساتھ ساتھ اس کی جدت پسندی بہرحال ظاہر ہوتی ہے۔

مذکورہ باتوں کے علاوہ ٹیپو سلطان کی علمی دلچسپیوں کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی فراہمی اور تالیفی و تصنیفی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سلطان کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل میں اس نے کثیر رقمیں خرچ کیں اور سفارتی مشن کے ذریعے یورپی ممالک کے حکمرانوں

سے رابطہ قایم کیا۔ جو کتابیں بہت اہم یا سلطان کی پسندیدہ ہوتی تھیں وہ ان کی متعدد نقلیں تیار کر کے ان کی جلد بندی کا خصوصی اہتمام کرتا تھا۔ کتابوں کی فراہمی میں سلطان کی دلچسپی و کوشش ایک بہترین لائبریری (سلطانی کتب خانہ) کے قیام کا سبب بنی جس میں مختلف علوم و فنون کی بیش بہا و نایاب کتابیں دستیاب تھیں۔ سقوطِ سرنگاپٹم کے بعد سلطانی کتب خانہ کی کچھ کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور آکسفورڈ و کیمبرج کی لائبریریوں کے لیے مخصوص کی گئیں اور باقی تمام فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) منتقل کر دی گئیں۔ ۱۸۳۰ء میں اس کالج کے بند ہونے کے بعد یہ کتابیں ہند و برطانیہ کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ کی گئیں۔ سلطانی کتب خانے کے فہرست نگار میجر اسٹوارٹ کے بیان کے مطابق اس میں صرف مخطوطات کی تعداد دو ہزار تھی جو زبان و موضوع کے اعتبار سے مختلف النوع تھے[۱]۔

ٹیپو سلطان کو نہ صرف کتابیں جمع کرنے اور انہیں محفوظ رکھنے کا شوق تھا بلکہ اس نے کتابوں کے ترجمہ اور ان کی تالیف میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ معاصر و غیر معاصر مورخین کے بیانات سے یہ شہادت ملتی ہے کہ کم از کم ۴۵ کتابیں اس کی ایما سے لکھی گئیں یا اس کے زیر نگرانی مرتب کی گئیں۔ دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ یہ کتابیں قرآن، حدیث و فقہ، تاریخ و تصوف، سائنسی علوم، اخلاقیات و سماجیات اور شعر و ادب جیسے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ سلطان کے زیر اہتمام جو تالیفی و تصنیفی کارنامے انجام پائے وہ زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس وقت کے ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو فارسی سے زیادہ روشناس ہیں۔ اس لیے علوم و فنون کی اشاعت کے لیے اسی زبان کو اختیار کرنا زیادہ مفید و موثر ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے فارسی میں کتابیں لکھوانے کے علاوہ متعدد عربی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کرایا۔ تعلیماتِ اسلامی کی اشاعت اور علم کے فروغ کے لیے وہ اس پہلو پر اتنا زور دیتا تھا کہ اس نے جمعہ کے خطبات کا مجموعہ بھی فارسی زبان میں مرتب کرایا جو "موید المجاہدین" کے نام سے موسوم ہوا[۱]۔

قرآن کریم سے متعلق جو کتابیں سلطان کی ایما سے لکھی گئیں ان میں علم قرأت پر ایک رسالہ (قراۃ محمدیہ) کے علاوہ "جواہر القرآن" نام

کی ایک تالیف بھی شامل ہے۔ اس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے آ[یات]
کو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہر آیت کے بارے میں بآسانی [پتہ]
چل جاتا ہے کہ وہ کس سورہ اور پارہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مزید [برآں]
سورتوں اور آیتوں کی تعداد اور دیگر متعلقہ تفصیلات کی بابت د[و]
رسالے سلطان کی ہدایت پر لکھے گئے۔ "طاعات سنیہ" اور "احا[دیث]
در ماکول و مشروب" میں حدیث کی روشنی میں بالترتیب مخصوص [عبادات]
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے پینے کے معمولات کی وضا[حت کی]
گئی ہے۔ فقہ اسلامی کے موضوع پر جو کتابیں سلطان کی نگرانی میں [لکھی]
گئیں۔ ان میں "فتاوی محمدی" (فارسی) اور "خلاصۂ سلطانی" [کو]
زیادہ شہرت حاصل ہے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا [کہ سلطان]
نے خاص طور سے عورتوں کے مسائل سے متعلق اردو میں ایک ر[سالہ مرتب]
کرایا تھا جس کا نام "احکام النساء" تھا۔ گرچہ "زاد المجاہد[ین]"
بنیادی طور پر جہاد کی فضیلت اور اس کے مسایل اور "فتح المجا[ہدین]"
فوجی اصول و ضوابط سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی شروع
میں دین کی ضروری باتوں اور فقہ کے اہم مسایل سے بحث کی گئی [ہے۔]
تصوف کے موضوع پر "عروس عرفان" اور "رسالہ تصوف" عہ[د سلطانی]
کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ تاریخ اسلامی بھی سلطان کی دلچسپی [کا موضوع]
تھا۔ ذاتی مطالعہ کے علاوہ وہ اپنے اہل علم درباریوں سے گزشتہ
ملوک اور بزرگوں کے حالات اکثر بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔ اس
پر دو کتابیں (مثمر النوادر اور صحیفۃ الاعراس) اس کے عہد[...]
ہیں۔ اوّل الذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، خلفائے [راشدین]
اور بزرگانِ دین کے حالات میں ہے اور موخر الذکر میں حضور [اکرم]
صلی اللہ علیہ وسلم، صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی تار[یخ وفات]
مرقوم ہے۔ اسی لیے یہ کتاب "تاریخ وفات بزرگان" کے نا[م سے]
مشہور ہے۔ اس زمانے کے حالات کے تقاضے سے اور کچھ [...]
کی وجہ سے سلطان نے جنگ کے اصول و قوانین کی ترتیب ا[ور]
تشہیر پر بھی توجہ صرف کی۔ سلطان کی ہدایت سے اس مو[ضوع پر]
متعدد کتابیں و رسالے لکھے گئے۔ ان میں "فتح المجاہدین"، "رسا[لہ ...]"
"رسالہ در آداب تفنگ" اور "ضابطہ سواری" کو خاص اہمیت[...]

ہے۔ عہد سلطانی کی تالیفی و تصنیفی سرگرمیوں سے سائنسی علوم بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ طب کے موضوع پر "بحر المنافع" اور "تحفۂ محمدی" اور علم ہیئت سے متعلق "زبرجد" اس عہد کی قابل ذکر کتابیں ہیں اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سلطان نے مقیاس الہوا سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا۔ سلطان کے پسندیدہ فنون میں فن خطاطی بھی شامل تھا، اس نے خطاطی کا ایک اپنا طریقہ "طرز محمدی" کے نام سے ایجاد کیا تھا۔ اسی کی وضاحت میں "رسالہ درخط طرز محمدی" لکھا گیا۔ فن موسیقی کی ایک مشہور فارسی کتاب "مفرح القلوب" کا دکنی ترجمہ سلطان کے درباری شاعر حسین علی نے کیا اور اسے سلطان کے نام معنون کیا۔ مذکورہ بالا تراجم و تالیفات کے علاوہ اردو اور فارسی اشعار کے کئی ایک مجموعے جو سلطان کی ایما پر مرتب کیے گئے۔ اس کی علمی دلچسپی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ خود سلطان کی اپنی تالیف کردہ کتابوں میں فتح المجاہدین کے علاوہ تزک ٹیپو، خواب نامہ اور رسالہ درخط طرز محمدی شامل ہیں۔

علوم و فنون کی اشاعت کے لیے ترجمہ و تالیف کے کام میں دلچسپی لینے کے علاوہ ٹیپو سلطان نے ایک اور مفید طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اس نے اپنی پسند کے مطابق بعض کتابوں کی متعدد نقلیں تیار کرائیں اور سلطنت کے مختلف حصوں میں ان کی تقسیم کا انتظام کیا۔ اس ضمن میں فخر الشیوخ (فرائض و واجبات، جہاد اور اصول حکمرانی پر ایک رسالہ) اور فتح المجاہدین کے حصۂ اوّل (جو عقاید و عبادات، اوامر و نواہی اور جہاد کے مسائل پر مشتمل تھا) کا خصوصی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ سلطان کے حکم سے اول الذکر کی ۴۰ نقلیں تیار کی گئی تھیں جب کہ دوسری کتاب کی ہزاروں کاپیاں نکلی گئیں اور انہیں وسیع پیمانہ پر تقسیم کا اہتمام کیا گیا۔[۱۸] سلطان کا یہ عمل نہ صرف علم کی اشاعت کا سبب بنا بلکہ مذہبی و اخلاقی تعلیمات کے فروغ کا ایک موثر ذریعہ بھی ثابت ہوا۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فوجی مدبر، حریت و آزادی کے پاسبان اور حکمراں کی حیثیت سے ٹیپو سلطان نے جو نمایاں کارنامے انجام دیے ان سے قطع نظر تعلیم و تربیت کی بہتری اور علوم و فنون کی ترویج و ترقی کے لیے بھی اس کی خدمات کافی اہم اور قابل قدر ہیں۔ اس اعتبار سے ان خدمات کی اہمیت اور زیادہ مسلم ہے کہ وہ ایسے سلطان سے تعلق رکھتی ہیں جس کے مختصر سے عہد حکومت کا بیشتر حصہ غیر ملکی تسلط کے خلاف نبرد آزمائی میں صرف ہوا اور جس کے کارناموں کو عام طور پر میدان جنگ کی دلیرانہ سرگرمیوں اور چند انتظامی اصلاحات تک محدود سمجھا جاتا ہے۔

حوالہ جات

[۱] مجاہد آزادی کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے کارناموں کے لیے دیکھیے خاکسار کا مضمون "مجاہد آزادی ٹیپو سلطان" سہ ماہی فکر و نظر (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) تحریک آزادی نمبر، جلد ۲۲، شمارہ ۴، ص ۱۲۶—۱۳۷۔

[۲] عبد الرحیم، کارنامہ حیدری، کلکتہ مشن پریس، ۱۸۴۸ء، ص ۸۶۴

[۳] میر حسین علی خاں کرمانی، نشان حیدری (انگریزی ترجمہ از کرنل مائلس) دہلی ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۷—۱۸۸۔ [۴] محمود خاں محمود بنگلوری، صحیفۂ ٹیپو سلطان دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۶۱۱—۶۱۲۔ [۵] ایضاً۔ [۶] نشان حیدری، ص ۱۸۲۔

[۷] فتح المجاہدین کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (حبیب گنج ۵۶/۲) میں دستیاب ہے۔ [۸] محمود خاں بنگلوری، سلطان شہید، بنگلور، طبع اول (بلا تاریخ) ص ۵۱۔ [۹] صحیفۂ ٹیپو سلطان ص ۴۹۰۔

[۱۰] ایضاً، ص ۵۰۹۔ [۱۱] ایضاً ص ۳۱۱، ۵۴۵،۵۴۴؛ لیوس بی بورنگ، حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان، دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۲۱۴۔

[۱۲] تفصیل کے لیے دیکھیے صحیفۂ ٹیپو سلطان، ص ۱۱۰-۱۱۱۔ محب الحسن، ہسٹری آف ٹیپو سلطان، کلکتہ، ۱۹۷۱ء، ص ۳۹۹—۴۰۰۔

[۱۳] ملاحظہ کریں ڈاکٹر ہدایت حسین کا مضمون "دی لائبریری آف ٹیپو سلطان" اسلامک کلچر، حیدر آباد، ۱۴/۲، اپریل ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۹—۱۴۰

[۱۴] صحیفۂ ٹیپو سلطان، ص ۳۸۱-۳۸۳، غیر عربی زبان میں جمعہ کے خطبہ پر فقہ کی روشنی میں ایک عالمانہ و محققانہ بحث کے لیے دیکھیے مولانا عبد الماجد ندوی کا مضمون "غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبہ جمعہ کی شرعی حیثیت" حیات نو (بلریا گنج، اعظم گڑھ ۲/۲-۳ (فروری و مارچ ۱۹۸۷ء)

[۱۵] فتاویٰ محمدی کے مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (نمبر ۱۰۵۵) اور انڈیا آفس (نمبر ۲۶۱۸) کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

[۱۶] نشان حیدری ص ۱۸۸۔ [۱۷] صحیفۂ ٹیپو سلطان۔ ص ۳۶۹-۳۷۰، ۴۲۸

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶۔ شمارہ ۴۔ (اپریل ۱۹۸۷ء)

شور اور آلودگی

محمد اجمل

شور ایک شور ایسی آواز کو کہتے ہیں جو ناقابل برداشت ہو اور جس ...ت میں جھنجلاہٹ پیدا ہو اور جو صحت پر برا اثر ڈالے۔ دنیا میں دن بدن ...مقدار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اس سے جو نقصانات ہو رہے ...پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر ان پر فوری توجہ نہ کی گئی تو یہ ایک ...خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں جس کو حل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ...ڈسیبل (ڈسیبل آواز کی طاقت کو ناپنے کی اکائی ہے) سے زیادہ ...از کوئی عام انسان برابر سنتا رہے تو اس کے کانوں کو مستقل ...ان پہنچتا ہے اور جس کا علاج بھی ممکن نہیں ہے۔ شور ہماری شہری زندگی ...یک بڑی لعنت ہے جس کا عام آدمی کو کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔ یہ بات ...کافی عرصے کے بعد معلوم ہوئی ہے کہ شور بھی آلودگی کا ایک اہم ذریعہ ہے ...ماغ اور جسم کو نقصانات پہنچاتا ہے۔ غیر ضروری اور ناپسندیدہ تکلیف دہ ...شور سے نہ صرف یہ کہ انسان برہمی اور جھنجلاہٹ محسوس کرتا ہے ...طبی ماہرین کی رائے میں شور پیٹ کی آنتوں کے زخم السر، اعصابی ...الرجی (Allergy)، دل کی بیماری (Cardiac Desies) تنفس ...(Respiratory) اور دوران خون سے متعلق کئی بیماریاں پیدا کرتا ...اگر یہ بیماریاں پہلے سے ہیں تو ان کو اور سنگین کرتا ہے۔ حالانکہ عام ...کو شور اور بیماری میں کسی تعلق کا ہونا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس ...سے تو قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لگاتار شور میں رہنے سے چڑچڑاپن ...جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے جو دوسری ...بیماریوں کو راہ دکھاتی ہے۔ شور موت کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ مگر ایسا ہرگز ...نہیں ہوتا کہ بہت زیادہ شور سن کر انسان فوراً مر جائے بلکہ اس سے ہر ...دل اور دماغ کے بعض حصے مستقل طور پر متاثر ضرور ہو جاتے ہیں۔

جن کا علاج ممکن نہیں ہے۔ یہ بات تحقیقات سے ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۴۰ ڈسیبل کا شور مستقل طور پر سنتے رہنے سے انسان کا اعصابی نظام نروس سسٹم (Nervous System) اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ہمارے روزانہ کے تجربے میں آتی ہے کہ بازاروں کے زیادہ شور والے علاقوں میں مستقل طور پر رہنے والے دکاندار بہت بدمزاج اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بیماری ہے۔ ۱۹۸۲ء میں پردو یونیورسٹی کے ایک ماہر نفسیات نے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ عام طور پر گھروں میں زیادہ ہونے والا شور سات ماہ سے دو سال کے بچوں کے CONGNATIVE DEVELOPMENT کو کم کرتا ہے۔ نیشنل اکیڈمی آف سائنس کی ایک تحقیقات کے مطابق حاملہ عورتوں کو بھی شور سے بہت نقصان پہنچتا ہے ان سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، کسی نہ کسی طرح سے معذور ہوتے ہیں۔ شور سے فیکٹریوں میں کام کرنے والے لوگوں کی چستی میں کمی ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کی صحت بھی خراب ہوتی ہے۔ اس بات کا اندازہ کام کرنے والوں کو بعد میں ہوتا ہے جب کہ وہ کسی موذی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر سماعت میں کمی کا پتہ کافی مدت تک انسان کو چلتا ہی نہیں کیوں کہ یہ کام بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں تقریباً ۱۶۰-۹۰ لاکھ کام کرنے والے ایسے حالات میں کام کرتے ہیں جس سے ان کی سماعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی تک کوئی اندازہ ہی نہیں ہے کیوں کہ شور اور اس کے مضر اثرات کو ہمارے ملک میں ابھی تک کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ باہر کے ممالک میں بہت پہلے اس کو اہمیت دی جا چکی ہے۔ وہاں شور کے مضر اثرات کو بہت پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے بہت سی [illegible]

نے رات کے وقت رتھوں کی دوڑ پر پابندی عاید کی تھی اور یہ بھی جاننا بہت دلچسپ ہے کہ ملکہ الیزبتھ نے اپنے ملک میں شوہروں پر پابندی عاید کی تھی کہ وہ رات کے دس بجے کے بعد اپنی بیویوں پر نہ چیخیں نہ چلائیں اور نہ ان کو ماریں۔ (ہندوستان ٹائمز ۸۳۔ ۱۰۔ ۱۰)۔ کارخانے، مشینیں، ذرایع نقل و حمل اور دوسری قومی اور مذہبی سرگرمیاں آلودگی شور کے خاص اسباب ہیں۔ یہ کہنا بھی مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ ہم ہندوستانی ایک شور پسند قوم ہیں جو ہر ایک موقع کو زور شور سے مناتے ہیں چاہے وہ مذہبی موقع ہو ایلکشن ہو، یا کوئی خاندانی تقریب ہو، لاؤڈ اسپیکر کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ دُکانوں پر، ہوٹلوں میں بہت زور سے ریکارڈنگ کرتے ہیں اور اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ اس کے نقصانات کیا ہیں اور اس سے ہمارے کسی پڑوسی کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہے یا نہیں۔ یہ مواقع تو گزر جاتے ہیں مگر اس شور کی قیمت ہمیں اپنی صحت اور سکون سے چکانی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں بیاہ شادیوں کی تقریبات تکلیف دہ حد تک پُر شور ہوتی ہیں۔ عام طور پر ان میں بجائی جانے والی موسیقی نہ صرف ناپسندیدہ ہوتی ہے بلکہ اس حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس سے گزرنے والے ہر شخص کو غصہ آتا ہے اور جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ اس کے کان کے پردوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ دوران خون بڑھتا ہے جس سے اس کی صحت خراب ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا اپنی خوشی کے اظہار کا صرف یہی ایک طریقہ ہے اور وہ بھی دوسروں کو پریشان کرکے اور تکلیف پہنچا کر اور ان کو بیمار کرکے۔

الیکشن بھی ہمارے ملک میں شور کی آلودگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ الیکشن آیا اور عام انسانوں کا اطمینان اور سکون غائب ہوا اور اس کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا ہے۔ یہ مہم آدھی رات کو یا رات کو دس بجے کے بعد شروع کی جاتی ہے۔ کیوں کہ عام طور پر دس بجے کے بعد ہی لوگ اپنے اپنے گھروں پر آرام کے لیے واپس آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو شور اتنا زیادہ اور اونچا ہوتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ اس بات کا قطعاً خیال نہیں کیا جاتا کہ اس شور کا اثر بیماروں اور ضعیفوں پر کیا ہوگا اور جو طالب علم اپنی پڑھائی میں مصروف ہیں ان بیچاروں کا کیا اثر ہوگا اور جو حضرات اس شور سے متاثر ہوکر آتے ہیں وہ ہمارے ملک کے قوانین جانتے

کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق جو کہ نیشنل فزیکل لیبارٹری کے سائنس دانوں نے لیا تھا معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کا سب سے زیادہ شور والا شہر بمبئی ہے اور وہاں سب سے زیادہ شور کا ذریعہ ذرایع نقل و حمل ہیں۔ اس معاملے میں پولس بھی اپنے فرائض کو پورے طور پر انجام نہیں دیتی یا تو پولس حکام قوانین سے واقف ہی نہیں ہیں اور اگر علم ہے تو وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے ہیں اور لاپرواہی برتتے ہیں۔ ہر شہر میں کچھ خاموشی والے علاقے بھی ہوتے ہیں جیسے ہسپتال یا نرسنگ ہوم اور اسکول اور کالج وغیرہ کے قریب کے علاقے، مگر یہ صرف اسی حد تک ہوتے ہیں کہ ان جگہوں کے قریب موٹا موٹا لکھا ہوتا ہے "سائیلنس زون" اس کی پابندی شرط نہیں ہے۔ اگر کبھی کبھی پولس ایسے مقامات پر ایک دو چالان قانون کی پابندی نہ کرنے والوں کا کر دیا کرے تو اس کی پابندی ہونے لگے گی اور اس طریقے سے وہاں کی یہ آلودگی کم ہو سکے گی۔

بہت سے ترقی یافتہ ممالک نے شور کی اس لعنت اور خطرات سے بچنے کے لیے قوانین بنائے ہیں۔ اس سلسلے میں ۱۹۶۰ء کے انگلستان کے ایک قانون کا ذکر جو کہ آلودگی شور میں تخفیف کی خاطر بنایا گیا ہے، بے محل نہ ہوگا۔ (Noise and Abatement Act-1960) اس قانون کے سیکشن ۲ کے مطابق "لاؤڈ اسپیکروں کا استعمال نہیں کیا جائے گا (الف) کسی بھی کام کے لیے شام نو بجے اور صبح آٹھ بجے کے درمیان (ب) تفریح کاروبار اور تجارت کو مشتہر کرنے کے لیے کسی بھی وقت" پولس اور آگ بجھانے والوں کو اس قانون سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

امریکہ میں بھی شور کے نقصانات سے بچنے کے لیے اور اس کی آلودگی کو کم کرنے کے لیے ایک قانون ہے جو کہ ۱۹۷۰ء میں بنا ہے (Noise - Pollution and abatement act-1970) ہمارے ملک میں شور کی آلودگی سے بچنے کے لیے ابھی تک کوئی واضح قانون نہیں ہے۔ حالاں کہ آلودگی سے بچنے کے لیے ایک بہت اچھا قانون ۱۹۸۱ء میں بنا ہے مگر اس قانون کا اطلاق شور سے متعلق آلودگی پر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں صرف شور کی آلودگی سے بچنے کے لیے ایک واضح اور جامع قانون کی سخت ضرورت ہے اور اس بات کی بھی پابندی کرائی جائے۔

ہمارے ملک میں موٹر گاڑی کے ایکٹ ۱۹۳۹ء (Motor Vehicle Act 1939) کے مطابق سڑکوں کے کچھ خاص علاقوں سے گزرتے

ہارن کے استعمال پر مزدور کچھ پابندیاں عاید کی گئیں ہیں مگر یہ اس

ہ کا حل نہیں ہے۔ موٹر ایکٹ کی دفعہ (۲) ۱۴۹ کے تحت کان کے پردے

نے والے ہارن شہر کی حدود میں بجانا ممنوع ہے اور اس پر ڈرائیور

ان کیا جاسکتا ہے۔ مگر چوراہے پر ٹریفک پولس کا سپاہی کھڑا رہتا

ر ڈرائیور اس کے کان پر یہ ہارن بجاتا ہے اور اس پر کوئی اثر تک

ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی میں اس کی پابندی باقاعدگی سے ہوتی ہے اور

بتانا بہت ضروری ہے کہ زیادہ تر یہ ہارن دہلی ہی میں بنتے ہیں۔ ہندوستان

ری قوانین (Indian Penal code) میں کچھ ایسا اہتمام ہے جس

لیے اس تکلیف دہ کام کو روکا جاسکتا ہے۔ اس کے سیکشن ۲۶۸

ابق۔

"وہ شخص لوگوں کو تکلیف پہنچانے کا قصوروار ہے جو
کوئی ایسا کام کرتا ہے یا کوئی ایسی بھول کرتا ہے جس سے
لوگوں کو نقصان پہنچے یا خطرہ ہو یا انھیں ناگوار گزرے
یا تکلیف دہ ہو"

قانون کے سیکشن ۲۹۰ کے مطابق

"اس شخص پر دو سو روپیہ تک جرمانہ کیا جاسکتا ہے جو
کوئی بھی ایسا کام کرے جس سے پبلک کو تکلیف ہو۔"

کے علاوہ ضلع مجسٹریٹوں کے پاس ایسے اختیارات ہیں جن سے وہ کچھ علاقوں

یا تمام علاقوں میں کچھ خاص اوقات میں لاؤڈ اسپیکروں کے استعمال پر

بندی عاید کرسکتے ہیں۔ یہ اختیارات بہت ناکافی ہیں اور وہ ان کا

ستعمال بھی نہیں کرتے۔ اگر ممانعت ہوتی بھی ہے تو اس کی پابندی نہیں

جاتی کیونکہ صحت عامہ کے مسئلہ پر کوئی توجہ ہمارے ملک میں نہیں کی

۔

مندرجہ ذیل جدول میں نقل و حمل کے دوران شور کی مختلف سطحیں دی

ہیں:

گاڑیاں	سطح شور
موٹر سائیکلیں اور اسکوٹر	۸۲-۸۶
۲- کاریں	۸۴
۳- ۳٫۵ ٹن وزن کے ٹرک	۸۰
۴- ۳٫۵-۱۲ ٹن وزن کے ٹرک	۸۹
۵- ۱۲ ٹن وزن سے زائد کے ٹرک	۹۲
۶- ۳٫۵ ٹن وزن کی بسیں	۸۰
۷- ۳٫۵ ٹن وزن سے زائد کی بسیں	۹۲

اگر ایک آدمی کو dB (A) ۹۵ کا شور دس سال تک سننا پڑے تو اس کے سننے میں dB (A) ۱۵ کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ انسانی صحت کے لیے مضر ہونے کے علاوہ زیادہ شور عمارات اور دیگر ساز و سامان کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ dB (A) ۱۲۵ شور کے دباؤ سے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک مقدمہ کا ذکر بھی ضروری ہے ایک رہائشی علاقے کے لوگوں نے ایک دھات کی فیکٹری کے مالک کے خلاف دفعہ ۲۹۰ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ دایر کیا اور شکایت کی کہ فیکٹری سے پیدا شدہ شور ان کے آرام اور سکون میں خلل پیدا کرتا ہے۔ ٹرائل کورٹ نے فیکٹری کے مالک کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس پر پچاس روپے جرمانہ کی سزا سنائی اور یہ سزا ہائی کورٹ تک برقرار رہی۔

(کروری مل درسنز پنجاب اسٹیٹ ۱۹۸۵ء)

لیکن یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ کسی معاملے کو عدالت میں لے جانا بہت پریشان کن اور مہنگا ہے اور اس میں وقت بھی بہت لگتا ہے۔ عام طور پر اس پریشانی سے بچنے کے لیے یہ قوانین ناکافی ہیں اور پریشانی اٹھانے والوں کو کوئی خاص راحت نہیں مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے شور کی آلودگی کو کم کرنے کے لیے کچھ اقدامات بھی فوری طور پر کرنے کی ضرورت ہے۔ ذرایع نقل و حمل سے ہونے والے شور کی دو وجوہات ہیں ایک تو ان کے ہارن اور دوسرے ان کے انجن کا شور جو کہ ان کی تکنیکی خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہارن بجانے پر فوری طور پر پابندی اور اس پر سختی سے عمل کی بہت ضرورت ہے۔ انجن کی تکنیکی خرابی کے لیے ہر گاڑی کے انجن کی جانچ ہونا بہت ضروری ہے

باقی صفحہ نمبر ۵۴ پر ملاحظہ فرمایے۔

پانچویں مادّی طاقت

رضوان علی شاہ

" پانچویں طاقت " آج کل اس قدر زور پکڑے ہوئے ہے کہ ذہن فوراً " پانچویں قومیت " سے ہوتا ہوا سیاست کے کوچے میں مٹر گشت کرنے لگتا ہے، حالاں کہ بات ہو رہی ہے اس پانچویں قوت کی جسے طبیعات میں ممتاز مقام حاصل ہونے کی امید ہے، بشرطیکہ واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر افرائم کا یہ نظریہ پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ جائے کہ مادّے کی چار قوتیں نہیں، بلکہ ایک پانچویں قوت بھی ہے۔

یاد رہے کہ تمام بنیادی ذرات، یعنی تمام مادّے کا عمل اُن چار قوتوں پر مبنی ہے، جو ان ذرّات کے مابین کام کرتی ہیں۔ ان کو توانائی کی بنیادی قوتیں بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔ کشش ثقل :

تمام مادّی ذرّات ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ قوت ذرے کی کمیت کے تناسب سے ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو کہ ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا باعث ہوتی ہے۔ گویا تمام کائناتی صفات کی بنیادی وجہ یہی قوت ہے۔ گریویٹان ذرّے کا تبادلہ اس قوت کا دو ذرّات کے درمیان پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

۲۔ برقناطیسی قوت :

یہ قوت کشش اور مزاحمت دونوں طرح کی ہو سکتی ہے دو ذرات کے درمیان یہ قوت ان کے برقی چارج کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ اس قوت کی وجہ سے ایٹم قایم و دایم ہے اور یہی قوت زمین پر زندگی کے تمام عمل و اثرات کی بنیادی طور پر ذمہ دار ہے دو برقی ذرّات کے درمیان قوت کی ذمہ داری فوٹون ذرّے کے تبادلے پر ہے۔

۳۔ شدید نواتی قوت :

ہیڈران ذرّات ایک اور طرح کے چارج یعنی شدید نکلیر قوت کے بھی حامل ہوتے ہیں اور جب یہ ذرات بہت قریب تقریباً 10^{-13} سینٹی میٹر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے پر کشش انداز ہوتے ہیں یہ قوت مرکزے (نوات) کو قایم اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے انشقاق اور گداخت (فیوژن) کے عمل اسی قوت کے مظہر ہیں۔ کوارک کے مابین گلوآن کا تبادلہ اسی قوت کا ذمّہ دار سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ ضعیف نواتی قوت :

ہیڈران اور لیپٹان کے درمیان ایک اور بہت تقریباً 10^{-16} سینٹی میٹر دائرہ عمل رکھنے والے ضعیف (بہ نسبت شدید نواتی) قوت ہوتی ہے جو کہ ذرّات کی تابکاری کی وجہ ہے اس کو ضعیف نواتی قوت کہتے ہیں جو کہ ذرّات کے ضعیف چارج سے نسبت رکھتی ہے زمین اور کائنات میں بھاری عناصر کے وجود کی خاص وجہ یہ قوت ہے بوسان ذرات ڈبلیو اور زیڈ کے تبادلے اس قوت کا سبب بنتے ہیں۔

پاکستان کے نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی پوری علمی و عملی زندگی ان چار قوتوں کے مابین وحدت تلاش کرنے میں صرف کر دی ہے۔ وہ اب تک یہ تو ثابت کر چکے ہیں کہ برقناطیسی قوت اور ضعیف نواتی قوت دراصل ایک ہیں اور اس کارنامے پر انہیں ۱۹۷۹ء کا طبیعات کا نوبل انعام بھی دیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں اس ضمن میں آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں کہا تھا کہ

ہماری پیشین گوئی کہ یہ چاروں قوتیں ایک ہی حال میں

ں جنیوا کی سرن لیبارٹری میں انتہائی شاندار طریقے سے
ابت ہو چکی ہے اور مزید تجربے ابھی جاری ہیں۔ ہماری
یلیو اینڈ زیڈ تھیوری اب دوسرے نظریات اور
تحقیقات کے لیے ایک لازمی پس منظر بن چکی ہے اب
ہمارا دوسرا مقصد ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا کہ توانائی کی
اقی دو قوتیں یعنی زبردست توانائی قوت اور تجاذبی قوت
بھی اصل میں ایک ہیں۔ تب خود بخود یہ ثبوت مل جائے
گا کہ یہ چاروں قوتیں دراصل ایک ہیں اور توانائی کا
سرچشمہ ایک اور صرف ایک ہے۔ لیکن تجربے کرنے
میں کچھ وقت لگے گا۔ ممکن ہے چند برس لگ جائیں لیکن
ثابت ضرور ہوگا اور انشاء اللہ میری زندگی میں ثابت
ہو جائے گا۔"

۔اب پروفیسر افرایم کے تجربوں نے نیوٹن کی طبیعات اور چار
وتوں کے نظریے ہی کو شبہ میں ڈال دیا ہے۔ ماہرین طبیعات اُن
ے کے بعد ششدر رہ گئے ہیں کہ پانچویں قوت کیسے ممکن ہو سکتی
تک بڑے "یقین" سے کہا جاتا رہا ہے کہ تمام اجسام وزن
کے بغیر یکساں رفتار سے نیچے گرتے ہیں (کشش ثقل)، لیکن
یں قوت" کے دعوے نے اس "یقین" کو شک میں بدل ڈالا ہے۔

پروفیسر افرایم نے جو دلائل دیے ہیں، ان کے
ان کا مفروضہ بھی اتنا ہی قوی نظر آتا ہے، جتنا گلیلیو کا نظریہ
لوہے کے دو باٹ لے کر، جن میں ایک پانچ سیر کا اور دوسرا ایک
اس مینار پر چڑھا نیچے لوگوں کا ایک کثیر انبوہ اس تجربے کو
کے لیے جمع تھا۔ گلیلیو نے مینار کی بلندی پر چڑھ کر دونوں
کو ہاتھوں میں تولا۔ اشارے سے انہیں حاضرین کو دکھایا اور
نوں باٹوں کو ایک ساتھ گرا دیا۔ باٹ برابر ساتھ ساتھ گرنے
ں اُن میں سے آگے پیچھے نہ تھا۔ ان کی رفتار بالکل یکساں رہی
نکہ ایک دھماکے کے ساتھ وہ دونوں بیک وقت زمین سے
ٹکرا گئے۔

اس ایک تجربے کے علاوہ گلیلیو نے غالباً اور کوئی تجربہ نہ

کیا تھا۔ اب پروفیسر افرایم اور اس کے رفقائے کار نے دعویٰ
کیا ہے کہ زیادہ وزنی چیز کو نسبتہً "ہلکی چیز کے مقابلے میں" بعد میں"
گرنا چاہیے۔ اُن کے اس دعوے کی بنیاد گزشتہ ساٹھ برسوں کے
دوران میں کیے گئے تجربات ہیں۔

ابھی تک تو "پانچویں قوت"، کی آواز کو پذیرائی حاصل نہیں
ہے، لیکن ان کے حامیوں کے تجربات جاری ہیں۔ اگر اس میں کچھ بھی
صداقت ہوئی تو پھر کائنات کے بارے میں طبیعات والوں کے مسلّمہ
نظریات کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ چار بنیادی قوتیں جن کو وحدت کی
لڑی میں پرونے کی کامیاب کوشش ہو رہی ہیں، وہ پانچ ہو جائیں
گی۔ پانچویں قوت کا نام فی الحال "ہائپر چارج" رکھا گیا ہے۔ اس کا
دائرہ عمل ۲۰۰ میٹر ہے اور یہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ
کر دیتی ہے۔

اب دونوں طرف کے ماہرین طبیعات بھی اور طلباء بھی اس
امر کا بے چینی سے انتظار کریں گے کہ پانچویں قوت کو نظریۂ وحدت
سے کیوں کر ہم آہنگ کیا جائے گا۔

بقیہ "شور اور آلودگی" متعلقہ صفحہ نمبر ۵۲

یہ کام سال میں دو یا ایک بار ضرور ہونا چاہیے۔

شور کو کم کرنے میں درختوں کا بھی ایک اہم رول ہے اور
یہ شور کو کم کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ زیادہ شور والے
علاقوں میں سڑکوں کے کنارے گھنے زیادہ پتوں والے درخت لگانے
چاہییں۔ اس سے شور بھی کم ہو جائے گا اور ماحول کی دوسری آلودگی
بھی کم ہوگی۔

اس سلسلے میں اگر کوئی فوری قدم نہ اٹھایا گیا اور ایک
واضح قانون نہ بنایا گیا تو اس کے اثرات بہت خراب ہو سکتے ہیں اور
ملک کے باشندے شور سے پیدا ہونے والے امراض میں اور زیادہ
مبتلا ہو سکتے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶ شمارہ ۴ (اپریل ۸ء)

مسدسِ حالیؔ کے چند بند

بشیر احمد طاہر

الطاف حسین حالیؔ کی مسدس "جزر و اسلام" ظہور اسلام سے قبل اور بعد کی تاریخ کا اور تمدن اسلام کے عروج و زوال کی داستان کا ایک شاہکار ہے جس کو حالی نے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر ۱۸۰۰ء میں پہلی بار تصنیف کیا تھا۔ مسدس کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے جس کے بارے میں سرسیّد نے کہا تھا کہ روز محشر نامۂ اعمال کی پرسش ہوگی تو اپنی شفاعت کے لیے کہوں گا کہ میں نے حالیؔ سے مدو جزر اسلام لکھوائی تھی۔ یہ مسدس اس زمانے میں ایسی مقبول عام ہوئی کہ مولود شریف کے جلسوں میں اس کے بند پڑھے جاتے جس کو سن کر لوگ بے اختیار روتے تھے اور واعظوں کی زبان پر اس کے بند ہوتے تھے۔ حالیؔ نے یہ مسدس جس محبت اور دلسوزی سے لکھی ہے وہ قوم کے لیے عبرت انگیز ہے جس کے آئینہ میں بقول ان کے مسلمان اپنے خدو خال دیکھ سکتے ہیں۔"

دیباچہ کے آخر میں انھوں نے از راہ عجز لکھا ہے کہ"

" اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے اگر دیکھیں پڑھیں سمجھیں تو ان کا احسان ہے۔ ورنہ شکایت کچھ نہیں۔"

آج کل کے نوخیز نوجوانوں نے اس مسدس کا پڑھنا تو ایک طرف اس کا نام ی نہیں سنا ہوگا۔ یہاں بمصداق گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ " چند منتشر بند قوم کی نیند سے بیداری کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔

ور اسلام سے پہلے عرب کا یہ حال تھا ؎

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزا پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابر ظلمت میں تھا مہر انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

فاران سے مراد مکہ معظمہ کا پہاڑ ہے۔ اس عالم میں رحمۃ اللعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ تھا کہ ؎

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اور اس کا نبی بھی

مگر آج کل مسلمان اس خالص توحید کی تعلیم کو بھلا کر کیا کچھ کر رہے ہیں ؎

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

پھر آج کل مسلمان صرف نماز، روزے، حج کو ہی خدا کی عبادت سمجھے ہوئے ہیں وہ اس طرح کہ ؎

عمل واعظوں کے اگر قول پر ہے
تو بخشش کی امید بے صرف زر ہے
نماز اور روزے کی عادت اگر ہے
تو روز حساب ان کو پھر کس کا ڈر ہے
اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی
تو فردوس میں نیو اپنی جما دی

بقول ایک مغربی دانشور، اصل عبادت اور خدا سے محبت خدا کے ہم صفات ہو جانا ہے۔ غالباً ان ہی معنوں میں مشہور صوفی منصور حلاج نے جس کو پھانسی دی گئی انا الحق کہا تھا (۹۲۲ء) اصل عبادت روزے نماز کے علاوہ خلق اللہ کی خدمت اور ہمدردی وانسانیت ہے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا
خلائق سے جس کو ہے رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے
مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب ایک اک کے باہم مددگار ہوتے
عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیرالامم ہم

مگر افسوس کتنے مسلمان ان صفات و اخلاق کے حامل ہیں!؟ بقول حالی جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے علمائے سلف علمی شوق میں اہل و عیال اور وطن کو بھول جاتے تھے اور تحصیل علم کے لیے سیکڑوں میل پیادہ پا طے کرتے تھے، مگر اب یہ حال ہے ؎

ہنر ہے نہ تم میں فضیلت ہے باقی
نہ علم و ادب ہے نہ حکمت ہے باقی
نہ منطق ہے باقی، نہ ہیئت ہے باقی
اگر ہے تو کچھ قابلیت ہے باقی
اندھیرا نہ چھا جائے اس گھر میں دیکھو
پھر آگسا دو اس ٹمٹماتے دیے کو

نہ اہل حکومت کے ہم راز ہیں ہم
نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم
نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہ ہیں ؎

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل ان کی ہادی نہ دیں ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا
نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا
تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خواب غفلت میں بے ہوش رہنا
دم نزع تک خود فراموش رہنا

شاعری اور ادب حیاتِ انسانی کے تابع ہونے چاہئیں نہ کہ تک بندی کے لیے۔ حالی نے تک بندی کرنے والے شاعروں پر یہ چوٹ کی ہے ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

غرض عیب کیجے بیاں اپنے کیا کیا
کہ بگڑا ہوا ہے یاں آوے کا آوا
فقیر اور جاہل ضعیف اور توانا
تاسف کے قابل ہے احوال سب کا
غرض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

اقبال کی نظم "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کو حالی کی مسدس کا ہی بہ انداز دیگر نقش ثانی سمجھنا چاہیے۔ مسدس کے چند منتشر بند جو پیش کیے گئے ہیں وہ آج کل کے مسلمانوں پر ویسے ہی صادق آتے ہیں جیسے حالی کے زمانے کے حالات پر صادق آتے تھے۔ اگر کسی کو توفیق ہو تو وہ مسدس کو شروع سے آخر تک پڑھ کر دیکھے تو غیرت و شرم کے مارے یہ محسوس کرے گا کہ اپنی اور قوم کی اصلاح کے لیے مجھے کچھ کرنا چاہیے ارشاد الٰہی ہے کہ

"خارجی دنیا نہیں بدلتی جب تک باطن میں
تبدیلی نہ آئے۔"

(بشکریہ سیاست حیدرآباد)۔
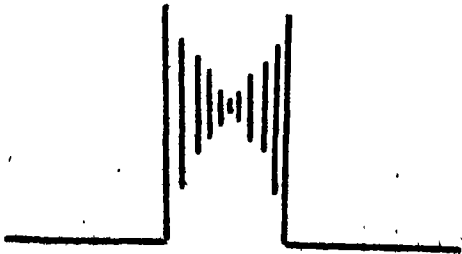
دس مثبت دو مثبت تین

تعلیمی پروگرام کی درمیانی منزل

بدر الاسلام

۱۰+۲+۳ تعلیمی پروگرام کا آغاز سب سے پہلے درجہ نہم میں ۷۵-۱۹۷۶ء کے تعلیمی سال سے سینٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن دلّی کے ذریعے کیا گیا۔ اس پروگرام میں زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حساب، سائنس، سماجی علوم (سوشل سائنس) ہنر (Work Exp.) اور حفظانِ صحت جیسے اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

تنوع

تعلیمی اسکیم کے اندر مثبت دو (+۲) منزل کی نمایاں خصوصیت اس کا تنوع ہے جس کا اصل مقصد طلباء پر زبردستی اور دباؤ ڈالنے کے بجائے انہیں اپنی مرضی اور صلاحیت کے مطابق مضامین منتخب کرنے کے لیے پوری آزادی مہیا کرنا ہے۔ اس کے نتیجے میں جب وہ فارغ ہو کر نکلیں گے تو یقینی طور پر اُن کے سامنے معاش کا مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔

(+۲) منزل کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ علمی و ادبی Academic اور (ب) پیشہ وارانہ - Vocational- ہر دو خانے متنوع اور مختلف مضامین کورس مہیا کرتے ہیں اس منزل کی تعلیم کمیشن متعلقہ کی سفارش کے مطابق "سمسٹر" کے طریقے پر مبنی ہے۔ گیارہویں اور بارہویں درجے میں ہر سال دو سمسٹر میں پوری دو سالہ تعلیم مکمل ہوگی۔

سمسٹری سسٹم

ایک سمسٹر کو کل ۹۰ دن دیے جائیں گے، اس میں وہ وقت جو داخلوں، تفریحات اور تعطیلات میں گزرے گا وہ شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تعلیم دی جائے گی۔

۱- فیلڈ ورک (میدان میں کام) (ب) پروجیکٹ ورک (کسی خاص موضوع مخصوص کام) (ج) اصلاحی تعلیم Remedial (د) سماجی بھلائی (خدمت خلق کی تعلیم)

مذکورہ موضوعات بالترتیب ۱۰ دن، ۲۱ دن اور ۱۰ دن پہلے تین سمسٹرس میں ختم کیے جائیں گے۔ مجموعی طور پر پورے تعلیمی سال میں کسی بھی صورت میں کام کے دنوں کی تعداد ۲۲۰ دن سے ہرگز کم نہ ہونا چاہیے۔ پہاڑی مقامات پر واقع اسکولوں کے علاوہ تمام اسکولوں کے لیے سمسٹر کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ پہلا مرحلہ یکم جولائی سے ۳۰ نومبر تک اور دوسرا مرحلہ یکم دسمبر سے ۳۰ اپریل تک ہوگا اور اس کے بعد موسم گرما کی تعطیل ہوگی۔ پہاڑی مقامات پر پہلا مرحلہ ۱۶ اپریل سے ۱۵ ستمبر تک اور دوسرا مرحلہ ۱۶ ستمبر سے ۱۵ اپریل تک رہے گا۔ اور موسم سرما کی سرکاری تعطیل بھی اسی میں شامل ہے۔

نظام الاوقات

چوں کہ مختلف تعلیمی ادارے مقامی حالات اور ضروریات کے تحت چلتے ہیں۔

مثلاً کچھ اسکول دو شفٹوں میں چلتے ہیں اور کہیں وقفہ کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے تمام اسکولوں کے لیے یکساں ٹائم ٹیبل نہیں بنایا گیا تاہم تمام اسکولوں میں تعلیمی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے تدریسی گھنٹوں کی میعاد ۴۰ منٹ سے ۵۰ منٹ یا ۵۰ منٹ سے ۵۵ منٹ تجویز کی گئی ہے تاکہ تمام اسکولوں میں تعلیم پر جو وقت صرف کیا جائے اس میں یکسانیت رہے اور طلباء کو غیر تدریسی

مصروفیات EXTRA CURRICULAR ACTIVITIES کے
لیے معقول وقت مل سکے۔ نیز گھر پر جو کام کرنے کو دیا جائے یعنی ہوم ورک
(Home work) کی جانب بھی پوری توجہ دی جا سکے۔ اس
سلسلے میں کمزور طلباء کے لیے اس بات کی سہولت دی گئی ہے کہ وہ
ہوم ورک اسکول میں رہتے ہوئے یا گھر جا کر پورا کر لیں۔

کلیدی سمسٹر
Master Or Cumulative Semister

اس منصوبے کا خاص مقصد یہ ہے کہ تعلیمی مضامین کے اختیار
کرنے میں طلبہ کو اس درجہ سہولت مہیا کر دی جائے کہ اگر وہ علمی
ادبی دھارے کو چھوڑ کر پیشہ وارانہ دھارے اپنانا چاہیں تو ان کو پورا
اختیار ہو۔ نیز اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر طالب علم
ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں تبادلہ کرنا چاہے تو وہ اپنے ہمراہ
سابق اسکول میں حاصل کیے ہوئے نمبر credits لے جا سکتا ہے

کورس کی ہیئت Course Structure

+۲ منزل Stage 2+ کے لیے مندرجہ ذیل شکل میں کورس
ترتیب دیے جائیں گے۔

۱۔ علمی یا ادبی Academic اور معاشی یا پیشہ وارانہ
Vocational دونوں شاخوں کے طلباء کے لیے ایک مخصوص
کورس جس کا نام انگریزی میں Core Course یعنی ایسا کورس
جس کی حیثیت "مغز" کی ہوگی۔ تجویز کیا گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے ہم
"مرکزی کورس" کہہ سکتے ہیں۔ اس کورس پر جملہ اوقات میں سے ۲۵
فیصد صرف کیا جائے گا۔

۲۔ باقی ۷۵ فیصد دونوں قسموں کے طلباء کے دیگر مضامین پر
الگ الگ صرف کیا جائے گا۔

۳۔ متذکرہ معاشی قسم کے اوقات میں سے ۲۵ فیصد وقت
بنیادی اور سماجی سائنس کے مضامین پر اور ۵۰ فیصد وقت حقیقی "عملی
کام" پر (جو بالآخر طلباء کو ہنر سکھائے گا) صرف ہوگا۔ یہ کام ان
کی ٹریننگ کے بہت معاون ہوگا۔ اسی طرح مرکزی کورس Core
Course میں ایک زبان کی تدریس لازمی ہوگی۔ اس کے بعد
طالب علم کوئی ایک اور مزید زبان پڑھ سکتا ہے، جس کا اگر ممکن ہوا تو
ٹائم ٹیبل کے اندر ورنہ باہر انتظام کیا جانا چاہیے اور اس کام پر جو
وقت صرف ہوگا وہ ۱۰ فیصد سے زیادہ نہ رہے گا۔ دوسری زبان
سیکھنے کے لیے طلباء کو اسکول کی طرف سے پوری سہولت مہیا کی جائے
گی۔

اس مرکزی کورس Core Course میں ہی "عام علوم" کے تحت

۱۔ عصری ہندوستان ب۔ ہندوستان کی تہذیب
ج۔ سائنس اور سماج اور د۔ دیہی ترقی کے مسائل پڑھائے
جائیں گے۔ ان مضامین کی تدریس پر ۱۵ فیصد وقت صرف کیا
جائے گا اور یہ تمام مندرجہ بالا کورس (ا) سے (د) تک
صرف ایک ہی سمسٹر میں ختم کر دیے جائیں گے۔

حاصل کردہ نمبر CREDITS

ہر طالب علم کو ۹۲ نمبر یا کریڈٹ جمع کرنا ہوں گے۔ اس کے
لیے انہیں اسکول کے ۲۴ گھنٹوں فی ہفتہ یہ مضامین پڑھنا ہوں
گے اور یہ گھنٹے اس طرح تقسیم ہوں گے کہ موٹے طور پر فی ہفتہ ایک
گھنٹہ سمسٹر صرف کرنا ہوگا جو ایک کریڈیٹ کے برابر ہوگا۔ لیکن "عملی
کام" Practical work اس کا دونا وقت
یعنی دو گھنٹہ کے حساب سے صرف کرنا ہوں گے۔

مندرجہ بالا طریقہ کی روشنی میں نیچے دیے ہوئے نظام کے
تحت "کریڈیٹس" جمع کر دیے جائیں گے۔

۱۔ مرکزی مضامین Core Subjects کے
لیے ۲۴ کریڈٹس۔ زبان کے لیے اور ۱۰ دیگر علوم کے لیے۔ ب۔ علمی و
ادبی Academic Stream کے لیے ۷۲ کریڈٹس
(س) پیشہ وارانہ Vocational Stream کے لیے
۷۲ کریڈٹس۔ ان میں سے ۲۴ کریڈیٹس سائنس، سوشل سائنس
اور دیگر علوم کے لیے اور ۴۸ کریڈٹس پیشہ وارانہ عملی کام کے لیے
ہوں گے۔

ایک لائن Stream سے دوسری لائن میں

طلبا کو اجازت ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک لائن STREAM سے دوسری لائن میں اپنے کو منتقل کر سکتے ہیں اور یہ اجازت ہر دو سمسٹر کے آخر میں مل سکتی ہے۔ اوّل سمسٹر کے آخر میں ادارہ کا پرنسپل خود اس کی اجازت دے سکتا ہے اور دوسرے سمسٹر کے آخر میں وہ اجازت کی سفارش بورڈ کو بھیجے گا اور بورڈ عام حالات میں اجازت دے دے گا۔ بظاہر تو یہ منتقلی بڑی آسان نظر آتی ہے لیکن درحقیقت یہ اجازت کچھ بڑی سخت شرائط کو پورا کرنے پر ہی ملتی ہے۔

پیشہ وارانہ تربیت

ہایر سکنڈری یا ثانوی مرحلے کو پیشہ وارانہ سہولتوں کے قریب لانے کے لیے اس مرحلے کی تعلیم میں ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ مضامین شامل کر لیے گئے ہیں۔ جیسے زراعت، کامرس، انجنیرنگ، امور خانہ داری، حفظان صحت وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ہمراہ آرٹس کے مضامین لیے جا سکتے ہیں۔

مقامی حالات اور ضروریات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ اختیار اسکولوں کو دیا گیا ہے کہ وہ مندرجہ بالا مضامین میں سے جو چاہیں پڑھائیں لیکن اس کا خیال رکھیں کہ کن مضامین کو پڑھ کر طالب علم مقامی حالات کے تحت معاش کی سہولت کے قریب ہو تا ہے۔ یہاں جن پیشہ وارانہ مضامین کی جن تدریس کا ذکر کیا جا رہا ہے، اس کا منشا صرف روایتی پیشہ وارانہ تربیت نہیں ہے بلکہ مکمل پیشہ وارانہ تعلیم ہے اور یہی حقیقی نشانہ سازی منزل دو کے تعلیمی پروگرام کا ہے۔

یہ بات اس لیے رکھی گئی ہے کہ روایتی تربیت سیکھنے والے کو محض معمولی معاش کمانے کا ہنر سکھاتی ہے۔ جب کہ دوسرا طریقہ معاشی تیاری کے لیے مکمل "ذہنی نشو و نما" کرتا ہے۔ اسی لیے بجا طور پر اس سلسلہ کے کریڈٹس منتقل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ ابتدا میں صرف ایسے ہی کورس چلائے جائیں جو صرف دو سال کی ہی تعلیمی مدت میں طالب علم کو معاش کی سہولت کے قریب ہو جانے کی تربیت دے دیں اور بعد کو اگر ضرورت ہو تو مزید "تفصیلی تربیت" کے لیے تربیت یافتہ طلبا، کو کمپنیوں وغیرہ میں بھیج دیا جائے۔ ان پیشہ وارانہ کورسوں کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ تجربہ کار اور پہلے سے تربیت یافتہ حضرات کی خدمات بھی بحیثیت "تھوڑے وقت کے استادوں" کے لی جائیں۔ مزید یہ کہ مقامی اسپتالوں، ورک شاپوں، زراعتی مقاموں تجارت کے مرکزوں اور بینکوں وغیرہ کو اس تربیت کے لیے استعمال کیا جائے۔

طریقۂ امتحان EXAMINATION SYSTEM

+۲ منزل 2Stage+ کے لیے امتحان کا مندرجہ ذیل طریقہ رکھا گیا ہے؛

۱۔ قدیم یا روایتی طریقہ یعنی ایک۔ دو سال کے اختتام پر ہونے والا امتحان ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بجائے طالب علم کی لیاقت کا اندازہ مسلسل جائزے یا EVALUATION کیا جائے گا

۲۔ اول اور سوم سمسٹر کا امتحان خود اسکول لے گا۔ لیکن دوم اور چہارم کا امتحان بورڈ کے ذریعے ہوگا۔ تاہم اوّل و سوم سمسٹر کے پرچے بورڈ ہی بھیجے گا تا کہ اس تعلیمی پروگرام کے تمام اسکولوں میں امتحان لینے کے طریقے میں یکسانیت رہے۔

۳۔ تجربہ گاہ اور دیگر عملی کاموں کا امتحان خود اسکول لے گا اور اس کے پرچے بورڈ نہیں بھیجے گا۔

۴۔ چوں کہ اس طریقۂ امتحان کا خاص مقصد یہ بھی ہے کہ طالب علم زیادہ سے زیادہ اور اپنی نجی خوشی سے سیکھے۔ اس لیے ان تمام امتحانات کی، جو اسکول لے گا، جانچی ہوئی کاپیاں طالب علموں کو دکھائی جائیں گی تا کہ ان کی اپنی صلاحیت اور غلطیوں کا پورا اندازہ ہو سکے

۵۔ یہ جانچی ہوئی کاپیاں اسکول میں کم سے کم چھ ماہ محفوظ رکھی جائیں گی۔ کیوں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ بورڈ یا وہ تنظیمیں جن کے تحت اسکول چل رہا ہے، ان کاپیوں کا معائنہ کرائیں۔

۶۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ قرب و جوار کے اسکولوں میں سے مختلف مضامین کے سینئر اساتذہ کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو باہم مشورہ سے طریقۂ امتحان کے سلسلے میں ضروری مسائل طے کریں۔ ان کمیٹیوں کی باقاعدہ اوپر سے یعنی بورڈ وغیرہ سے منظوری لینی ہوگی۔

۷- دوم اور چہارم سمسٹر میں قلم بہ پیشہ وارانہ مضامین کے عملی کام کا جائزہ ایک بورڈ کی طرف سے لیا جائے گا۔ اور ممتحن بھی بورڈ ہی مقرر کرے گا۔ لیکن یہ ممتحن اسکول کے مقرر کیے ہوئے ممتحنوں کے ساتھ مل کر کام کرے گا از خود آزادانہ طور پر نہیں۔

۸- اول اور سوم سمسٹر کا امتحان نومبر کے تیسرے ہفتہ میں اور دوم و چہارم کا اپریل کے پہلے ہفتہ میں ہوگا لیکن پہاڑی مقامات کے اسکولوں کا امتحان ستمبر اور مارچ کے پہلے ہفتہ میں ہوگا۔

امتحان کا نتیجہ

امتحانات کے نتیجے پرانے طریقہ سے یعنی ہندسوں (۱-۲-۳) کے بجائے گریڈ کے حساب سے مندرجہ ذیل طریقے سے مرتب کیے جائیں گے۔

۱- اے = اعلیٰ ترین
۲- بی = بہت اچھا
۳- سی = اچھا
۴ ڈی = درمیانی
۵ ای = مناسب/بہتر
۶- ایف = بالکل آخری مناسب
۷- جی = کمزور

یہ گریڈ ہر سمسٹر میں ہر مضمون میں دیے جائیں گے اور طالب علم کو اختیار ہوگا کہ وہ ایک یا ایک سے زیادہ کورس میں ایک وقت میں امتحان دے لے۔ جو طالب علم کسی وجہ سے اوّل اور دوم سمسٹر کے کورسوں کے امتحان دوبارہ دینا چاہیں اس کو ایسا سوم اور چہارم سمسٹر کے طلباء کے ہمراہ ہی موقع ملے گا۔

ان تمام طلباء کو جو دوبارہ امتحان دینگے، امتحان اُسی کورس میں دینا ہوگا جو کہ اس وقت رائج ہوگا۔

پاس ہونے والے طالب علم کو چوتھے سمسٹر پاس کرنے پر بورڈ سرٹیفکیٹ (گریڈ کارڈ) دے گا اور اس میں یہ درج ہوگا کہ طالب علم نے کن کن کورسوں میں گریڈ حاصل کر لیا ہے، اس کی تفصیل بھی کارڈ میں درج رہے گی اور یہ بھی نوٹ رہے گا کہ طالب علم نے کن کن غیر تعلیمی مشاغل میں حصہ لیا ہے۔ مزید یہ کہ جو طالب علم سینیر اسکول سرٹیفکیٹ حاصل کرے گا۔ اس کو اجازت ہوگی کہ اگر وہ چاہے تو مزید اضافی کورسوں میں امتحان دے لے۔

انعامات

"انعامات" MERIT کا تصور بھی نئے پروگرام میں بالکل بدل گیا ہے۔ انفرادی انعام کم کر کے "ٹیم" کو انعام زیادہ دیے جائیں گے۔ لہٰذا بورڈ اب کوئی بھی "میرٹ لسٹ" Merit List نہ نکالے گا۔

نئے تعلیمی پروگرام (۱۰+ ۲+ ۳) دس مثبت دو مثبت تین اور بالخصوص درمیانی منزل (+ ۲) کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ تین سال بعد تجربات کی روشنی میں پورے پروگرام پر نظر ثانی کی جائے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو مزید تبدیلیاں کی جائیں۔

مجموعی طور پر نیا تعلیمی منصوبہ بالعموم اور اس کی درمیانی منزل (+۲) بالخصوص بہت کامیاب اور موثر ہو سکتی ہے۔ طلباء کو واقعی اس سے پیشہ وارانہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ کمیشن متعلقہ کی سفارشات بالخصوص کہ +۲ منزل اسکولوں میں چلنا چاہیں کیوں کہ +۲ کی منزل میں پڑھنے والے طلباء کے ذہن بھی کچے ہوتے ہیں وہ یونیورسٹیوں و کالجوں کے پکے اور پختہ ذہن والے لڑکوں کے ہمراہ نفسیاتی طور پر میل نہیں کھا سکتے۔ اگر مقامی پیشہ وارانہ ضروریات کو بھی ترجیح دی گئی تو بھی یہ منصوبہ بہت کامیاب ہو سکتا۔ غرض یہ کہ اگر اس منصوبے اور +۲ منزل کو "مکمل" اور "صحیح" طریقہ پر نافذ کیا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ پروگرام کامیاب نہ ہو۔

"خدا کی یاد سے خالی قلب کی مثال ایسی
ہے جیسے بغیر قاضی کے عدالت گاہ ہوتی ہے۔"

وامارتین ۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۶، شمارہ ۴ (اپریل ۱۹۸۶ء)

سائنس ترقی و تنزلی کے دوراہے پر

انسان نہ صرف اپنی فطرت کے اعتبار سے عجیب و غریب ہے بلکہ قدرت کی بنائی ہوئی مخلوقات اشرف و افضل ہے۔ اس کے سر پر افضلیت کا یہ تاج اس کی فہم و فراست اور بصیرت و اہلیت کے سبب ہے تجسس اور جستجو کے ساتھ وہ کامیاب زندگی کی تلاش میں ہمیشہ سے سرگرداں رہا اور اسے حاصل کرنے کے لیے مستقل طور پر جد و جہد بھی کرتا رہا ہے۔ انسانی تجسس اور عملی جد و جہد کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج اس کے قدم لامحدود خلا میں مریخ تک جا پہنچے ہیں۔

پتھر کے عہد سے ایٹمی عہد تک کی تاریخ پر طایرانہ نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کا انسان تیزی کے ساتھ ارتقا کی منزلوں کو عبور کر رہا ہے۔ آج اس نے کرۂ ارض پر مشرق و مغرب کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے زندگی کے مادی مسایل کا حل تلاش کیا۔ آج کا ترقی یافتہ انسان جسمانی کمزوریوں اور بیماریوں کا علاج ہی نہیں بلکہ ناکارہ اعضائے بدن کو تبدیل کرنے کا فن دریافت کر کے ایک عظیم فتح مندی سے ہمکنار ہوا۔ غرض زراعت سے لے کر جوہری توانائی تک کے میدان میں حیرت انگیز انکشافات و انقلابات سامنے آئے ہیں۔ آج کے انسان نے دنیا کو جس ڈھنگ سے سجایا اور سنوارا ہے۔ وہ پرانے زمانے کے قصوں کہانیوں سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

Science Surpasses The Old Miracles On Mythology

بیسویں صدی بے پناہ علم و آگہی کا سرچشمہ ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کو ہمہ گیر سطح پر متاثر کیا ہے۔ کیوں کہ انسانی زندگی کے ماضی پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان بڑی ہی حقیر اور دہشت زدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ آگ، سیلاب اور خشک سالی کی قدرتی طاقتوں کو قابو میں لانا انسان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بستیوں کی بستیاں وبائی امراض اور قحط کی نذر ہو جاتیں۔ لیکن آج سائنس کی بدولت انسان اس لائق ہو گیا ہے کہ مذکورہ آفات سماوی کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے اتنا ہی نہیں اس کوشش میں کامیاب بھی رہتا ہے۔ انسان توہمات سے آزاد ہو کر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ قدیم انسان کے لیے فطرت پرستش کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ پھر انسانی ذہن نے غور و خوض کے بعد سوچا کہ یہ پرستش کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز ہے۔ اس کے آگے جھکنا نہیں بلکہ اس کو مسخر کرنا ہے پھر وہ تحقیق کا موضوع بنی۔ مثال کے طور پر چاند کے متعلق مختلف خیال آرئیاں تھیں لیکن جب ستمبر ۱۹۵۹ء میں روس کا راکٹ چاند پر اترا اور امریکی خلاباز نیل آرام اسٹرانگ نے جولائی ۱۹۶۹ء میں چاند پر اپنے قدم رکھے اور اس کی علمی تحقیق کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ محض ریت اور پتھر کا مجموعہ ہے۔ آج سائنس دانوں نے ہر شعبۂ صنعت میں تجربہ گاہیں کھول لیں، جن سے ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ قایم ہے۔ روزمرہ زندگی میں کام آنے والی چیزیں اسی سائنس کی بدولت دستیاب ہیں۔ مثلاً بجلی کا سامان، ٹیلیفون، گراموفون، ٹیپ رکارڈر، لاؤڈ اسپیکر، کمپیوٹر، ٹیلی پرنٹر، ٹیلی ویژن، تھرمامیٹر، بیرومیٹر، ریفریجریٹر، ریلوے، ڈاک، تار، فوٹوگرافی، پٹرولیم، ڈیزل گیس، ریڈیو، موٹر کار، گھڑ، قلم، کاغذ وغیرہ۔ آج معمولی سوئی سے لے کر سٹلائٹ تک سب میں سائنس کا فخر جھلکتا ہے اور انسانی دماغ کی فتح مندی کا یقین مستحکم تر ہو جاتا ہے۔

جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب نے زندگی کے ہر شعبے پر گہرے اور جامع اثرات ڈالے ہیں۔ ٹکنالوجی نے طب کی دنیا میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان کے بڑے ہی دور رس نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ ممکن ہے انسان کے اعضاء سپر مارکیٹ میں فروخت ہونے لگیں یا فرمایش اور ضرورت کے مطابق تیار کیے جانے لگیں۔ "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" سے لے کر "قتل عام" اور "فاتح نسل" کا سوال بھی ہیومن جنیٹک انجینرنگ سے منسلک ہے۔ مصنوعی رحم میں جنین اور نطفہ کی نشو و نما پر جس طرح کی تحقیقات ہو رہی

ہیں ان میں اگر کامیابی ملی اور انسان نے اگر تولیدی امور کا سحر کر لیا
تو پھر اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا؟

آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں انسان کی تخلیقی قوت
اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ الکٹرونک دور میں داخل ہو گیا ہے۔ خلائی ٹکنالوجی اور
کمپیوٹر کا ایک نئے انقلاب کے روپ میں ورود ہوا ہے۔ کمپیوٹر جدید عہد کی
سب سے اہم ایجاد ہے۔ کیوں کہ خلائی سفر کے لیے چھوڑے جانے والے
راکٹ، چاند پر اترتے ہوئے انسان کی ٹیلی اسکرین، ٹریفک کنٹرول
سائنس کے شعبوں کی اطلاعات، یہ سب کچھ کمپیوٹر کے ذمے ہے۔ ایسا
بھی ممکن ہے کہ جدید کمپیوٹر مفکر اور شاعر کا کام بھی کرے مصنوعی ذہانت کا
کمپیوٹر سے سائنس دانوں کو یہی توقع ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس نے انسان کو مادی ماحول پر
جو تصرف بخشا ہے اس سے زندگی باوقار بنی ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت
میں زبردست اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مادہ پر
انسانی تصرف کا جس قدر اضافہ ہوا ہے اتنی ہی انفرادی اور معاشرتی
زندگی مسرت سے خالی نظر آتی ہے۔ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور
دن رات مشین کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے بالکل مشین ہوتے جا رہے
ہیں۔ زندگی ایک مشین بن گئی ہے ——— علاوہ ازیں صنعتی تمدن
میں ہر آدمی ایک خود ساختہ حصار میں بند ہے۔ اس کے اندر تنہائی
اکیلا پن، بیگانگی کا احساس گہرا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ بھیڑ کے درمیان
بھی وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ہمدرد، مونس، جلیس، ندیم اور دوست
نہیں۔ کیوں کہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد انسانیت کے شرف و
وقار کو بڑھانا ہے۔ یہ مقصد سائنس کی ترقی کے باوجود نظروں سے
اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ آج انسان فطرت کا آقا بننے کے لیے کوشاں تو
ہے لیکن وہ غلام بنا ہوا ہے کبھی مادہ کا کبھی الیکٹرک پاور کا کبھی نیوکلیر
پاور کبھی کمپیوٹر اور کبھی مشین کا جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے
بنایا ہے۔

جدید انسان ایک عجیب مشکل سے دوچار ہے، کیوں کہ اس کے
پاس ٹکنالوجی ہے مگر فلسفۂ حیات نہیں، جسمانی سفر کے لیے مشین ہے لیکن
روحانی سفر کے لیے [illegible] نہیں۔ بجلی کے قمقمے کو جلا کر اندھیرا دور کرنے
کی صلاحیت تو ہے لیکن انسانیت کے اندھیرے دل میں محبت کی ایک کرن
اجاگر کرنے کی توفیق نہیں۔ خلائی سفر کرنے والے ترقی یافتہ انسان میں
زمین پر چلنے کا سلیقہ نہیں۔

آج سائنس کی طاقتوں نے انسان کے تخریبی امکانات میں اس
قدر اضافہ کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایٹم سے اگر بجلی
بنائی جا رہی ہے تو دوسری طرف توپ، مزائیل، ٹینک، سب میرین
مہلک سریع الاثر جراثیم اور ہلاکت خیز اسلحے بھی بن رہے ہیں۔ آج
بات طاقتور ایٹمی ہتھیاروں اور ہائیڈروجن بموں سے گذرتے ہوئے
نیوٹرون بم سے بھی آگے نکل چکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا ایک خطرناک موڑ
پر پہنچ گئی ہے۔ گذشتہ برسوں میں امریکہ اور روس میں ایٹمی ٹکنالوجی
کی جو ترقی ہوئی ہے، اس نے دنیا کے سارے ہوش مند انسانوں کو تشویش
میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ایٹمی جنگ یا Star wars جسے ہم
"انجمی جنگ" کہہ سکتے ہیں کی جو دھمکیاں چل رہی ہیں اس کی نوبت اگر
آئی تو کوئی فاتح اور مفتوح نہ ہوگا بلکہ پوری دنیا کے نیست و نابود
ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ محوری طاقتیں اور بالخصوص امریکہ اور روس
کے کچھ ہوس پرستوں نے اسلحوں کی جو دوڑ جاری رکھی ہے، اس نے
پوری دنیا کو موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

The world is Teetering on Sharp knife-
edge of Deluge.

بیسویں صدی کے مشہور سائنس داں آئن اسٹائن سے ایک بار
استفسار کیا گیا کہ تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی اس
نے جواب دیا:

"مجھے علم نہیں کہ تیسری جنگ کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی
لیکن چوتھی جنگ کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ پتھروں
سے لڑی جائے گی۔" (بحوالہ انسان نے کیا سوچا، مطبوعہ
ادارہ طلوع اسلام، لاہور)۔

اس جواب میں ایٹمی جنگ کی مکمل تباہ کاریوں اور انسانی تہذیب و
تمدن کے ملیامیٹ ہو جانے کے جس خطرے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ آج
نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔

آج جہاں انسان کی دسترس [illegible] ستاروں تک ہے وہاں فضائی آلودگی ایک بھیانک رُخ اختیار کر چکی ہے۔ معاشی خوش حالی، لامحدود وسائل اور آسائیوں نے آلودگی کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ آلودگی کے باعث موسم اپنا حسن کھو رہے ہیں۔ پیڑ پودے اور حیوانات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ نیلگوں آسمان زہریلی گیسوں سے پُر ہے اور انسان بھی زہریلی غذائیں کھانے، جراثیم زدہ پانی پینے اور زہریلی ہوا میں سانس لینے پر مجبور ہے۔

جنگ اور آلودگی کے علاوہ بھی ہلاکت خیزی کے نمونے وقتاً فوقتاً سامنے آ رہے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۴ء میں یونین کاربائیڈ بھوپال سے نکلی زہریلی گیس نے ہزاروں شہریوں کو چشم زدن میں لقمۂ اجل بنا دیا۔ روس کے ایٹمی پلانٹ میں آگ لگنے کے سانحے نے پوری دنیا کو نہ صرف متحیر کیا بلکہ تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے یہ غور و فکر کا مقام ہے کہ یہ ایٹمی طاقتیں دنیا کو آخر کہاں لے جانا چاہتی ہیں۔ اطلاعات کے مطابق صرف روس اور امریکہ کے پاس اس قدر ایٹمی توانائی ہے کہ موجودہ دنیا کو اس سے لاکھوں بار تباہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید میں انسان پہلے مٹ جانے کے خوف سے پریشان و ہراساں ہے۔ جس طرح قدیم آدمی فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو گیا تھا؛ اسی طرح موجودہ دور کا انسان اپنی خود ساختہ سماجی، صنعتی اور ایٹمی قوتوں کے سامنے بے بس سا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش کے وسایل مہیا کر لینے کے باوجود آج کا انسان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کی زندگی بے معنی ہو گئی ہے وہ اپنی ذات کے عرفان سے شاید محروم ہے

ماضی میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں انسان غلام نہ بن جائے۔ آج خطرہ یہ ہے کہ کہیں انسان روبوٹ (Robot) نہ بن جائیں۔ ابھی مشینیں جذبات نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر کل ان میں کسی حد تک انسان کی سی فطرت پیدا ہو جائے تو یہ عین ممکن ہے کہ یکسانیت سے گھبرا کر وہ بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں اور اپنے ساتھ ساری کائنات کو فنا کر دیں۔ اگر خوش اعتقادی سے کام لے کر تیسری جنگ عظیم کے امکان، روبوٹ (Robots) کی بغاوت اور کمپیوٹر کی حکمرانی کو نظر انداز بھی کر دیا جائے، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید انسان کرۂ ارض پر خود کار مشین کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ میکانکی طرز حیات، انسانی اقدار کا انحطاط، انسان کو جس انجام کی طرف لیے جا رہا ہے وہ ایٹمی جنگ کی ہلاکت آفرینیوں سے کم خطرناک نہیں۔

آج انسانیت خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی کچلی ہوئی مصروف آہ و فغاں ہے۔ کیوں کہ سائنس کی صداقتوں کا زندگی کی حکمت کے ساتھ امتزاج نہیں ہو پایا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آج انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کی داخلی نا بصیرتی، نشۂ اقتدار اور طاقت کی دیوانگی ہے جس کا مظاہرہ آئے دن حکومتیں کر رہی ہیں۔ انسان اس بات کو فراموش کر چکا ہے کہ نسل، مذہب، قومیت اور وطنیت سے بلند ترین قدر انسانیت کی ہے۔ جس دن ساری دنیا انسانیت کے اس اونچے مینارے پر خود غرضی سے دور دوستی، اتحاد اور باہمی ہمدردی کے دھاگے میں بندھ جائے گی اس دن سائنس کی ساری ترقیاں کارآمد ثابت ہوں گی اور یہ دنیا امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے گی۔

خوشامد تین نفرت انگیز برائیوں کا مجموعہ ہے

- جھوٹ۔
- غلامی
- فریب کاری

کارلائل۔

دینی تعلیمی ادارے اور سائنس

عارف الاسلام

آج کے ہندوستانی مسلمان کی پسماندگی کی داستان کو لکھنا بار بار لکھی گئی بات کو دہرانا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آج ملتِ اسلامیہ تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی پسماندگی کے انتہائی تاریک دور سے گزر رہی ہے۔ سر سید احمد خاںؒ اور ان کے رفقاء نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ مسلمانوں میں سائنسی مزاج اور تعلیم کو فروغ دینے کی جو کوششیں کیں وہ اپنا اثر ایک خاص طبقے تک ہی پہنچانے میں کامیاب ہوئیں۔ بلاشبہ یہ بھی ایک انتہائی بڑا کام تھا اور اس کے نتائج بھی ہم سب کے سامنے ہیں۔ تحریری نہ سہی لیکن عملی طور سے سر سید کے اس مشن کی مخالفت آج بھی مسلم سماج میں جاری ہے۔ نتیجتہً عام مسلمان سائنسی طریقۂ استدلال اور تعلیم کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں پاتا۔ اور اسی مزاج کے فروغ نہ پانے کی وجہ سے مسلمان بچے ابتدائی اور ثانوی درجات سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور تعلیم ادھوری چھوڑنے والوں میں مسلم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چونکہ خاندان اور مسلم سماج کا عام رجحان اس تعلیم کو حاصل کرنے کی صلاحیت کو کم تو کرتا ہے، بڑھاوا نہیں دیتا، مسلم یونیورسٹی کے ماحول میں طالب علم سیکولر طریقۂ تعلیم کو اپنے سے جدا نہ سمجھنے پر مجبور پاتا ہے اور غالباً اسی لیے یہاں کامیاب مسلم طلباء کی شرح دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ ہے۔ [illegible] کہ ایک یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قطعاً قاصر ہے اور یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ جب تک عام مسلمان تعلیم یافتہ نہ ہوں گے ان کو تنزلی سے نکلنے اور ترقی یافتہ اور باعزت بنانے کی بات سوچنا ہی فضول ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجوہات پر اگر غور کیا جائے تو اور بہت سی وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ مسلم سماج میں دوہرے تعلیمی نظام کی موجودگی ہے۔ دوہرے تعلیمی نظام سے ہمارا مطلب ہے دینی اور دنیوی یا سیکولر تعلیم کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا اور ان کے لیے جدا جدا تعلیمی اداروں کا ہونا۔ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فرق کو مٹانے کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن وہ بھی دینی علماء کو ندوہ میں سائنس اور دیگر جدید علوم کو داخل کرنے پر راضی نہ کرسکے۔ لاچار وہ اپنے وطن اعظم گڑھ چلے گئے جہاں انھوں نے شبلی نیشنل کالج اور دار المصنفین قایم کرکے ملت کا ایک اور بہت اہم کام انجام دیا۔ لہٰذا ایسے اداروں کی ضرورت وقت کی پکار ہے کہ جن میں دینی اور دنیوی علوم کو ساتھ ساتھ پڑھایا جاسکے۔

الحمد للہ کہ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبہ میں دینی ادارے اور مدارس چل رہے ہیں۔ ان کے پاس عمدہ عمارتیں، چندہ وصولیابی کا ایک اچھا انتظام اور صدقہ، فطرہ، زکوٰۃ اور چرم قربانی کو جمع کرنے کا ایک بہترین طریقۂ کار موجود ہے۔ صرف ہمارے چھوٹے سے قصبے میں ہی چرم قربانی کی قیمت تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ ہے۔ ملت کا یہ تمام پیسہ ان اداروں کو چلانے کے کام آتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس پر آشوب دور میں بھی یہ ادارے اپنی بیشتر طاقت فقہی اور فروعی اختلافات

لو ہوا دے کر ملت کو مختلف گروہوں میں بانٹنے میں صرف کرتے ہیں۔ ہر ایک اس کوشش میں معروف نظر آتا ہے کہ اس کے گروہ کی طاقت میں اضافہ ہو تاکہ وہ اپنے تعلیمی ادارے کی آمدنی میں اضافہ کرسکے۔

یہ کشمکش ملک کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں سے لے کر بڑے سے بڑے شہروں تک میں جاری ہے۔ نتیجتاً ملت اپنے مجموعی مستقبل اور فلاح وبہبود کے کاموں سے یکسر غافل ہے۔ اس کے علاوہ ان مدارس سے فارغ طلباء کے سامنے ایک مایوس مستقبل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر صرف یہ کوشش کرلی جائے کہ ان اداروں کی انتظامیہ میں مقامی جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہوں اور ان میں سائنس اور دیگر جدید علوم کو بھی داخل نصاب کیا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اس دوسرے نظام تعلیم اور کشمکش کے دور سے نکل سکتا ہے اور پوری ملت کو یک دم سائنسی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاسکتا ہے دوسری طرف جو جدید تعلیمی ادارے مسلمان چلا رہے ہیں ان میں دین کی تعلیم کے مناسب انتظام کے لیے دینی علماء کو انتظامیہ میں شامل کیا جانا چاہیئے۔

ہماری پہلی تجویز پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا جدید تعلیمی ادارے یا جدید تعلیم یافتہ لوگ دین کی خدمت کرسکتے ہیں؟

یہ سوال چار یا پانچ دہائی پہلے یقیناً کچھ اہم تھا لیکن آج جب کہ تمام دنیا میں یہ طبقہ اسلام کی خدمت کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اس سوال کی اہمیت پروپیگنڈے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی اور دوسرے جدید تعلیمی اداروں کے فارغین کی ملت مسلمہ کے لیے عظیم الشان خدمات اس شک وشبہ کی پرزور
تردید کرتی
ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہوجاتے ہیں مگر تین قسم کے عمل باقی رہ جاتے ہیں۔

۱۔ صدقہ جاریہ یعنی خیرات کی ایسی عام شکل جس سے لوگ طویل عرصہ تک فائدہ اٹھاتے ہیں

۲۔ ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے

۳۔ ایسی نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے"

مولانا آزاد لائبریری

وقار الزماں خاں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری برصغیر پاک و ہند ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے چند عظیم کتب خانوں میں سے ایک ہے اور قدیم یونیورسٹی لائبریریوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب علی گڑھ کو ہندوستان کا استانبول[۱] کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

"مشہور جرمن پروفیسر ہلمٹ ریٹر نے لکھا ہے کہ ترکی کے شہر استانبول میں جس قدر کتابیں عربی، فارسی اور ترکی کی موجود ہیں، دنیا کے کسی شہر میں نہ ملیں گی۔ یہی بات میں علی گڑھ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ عربی، فارسی اور اردو کی جس قدر اور جیسی مطبوعہ کتابیں علی گڑھ میں محفوظ ہیں ہندوستان میں کسی یونیورسٹی یا کسی شہر میں موجود نہ ہوں گی اس لیے میں علی گڑھ کو ہندوستان کا استانبول کہتا رہا ہوں[۲]"

اس لائبریری کا نقشہ حیدرآباد کے مشہور ماہر فن تعمیرات جناب فیاض الدین بہزاد صاحب کا بنایا ہوا ہے جس میں مشرقی اور جدید فن تعمیر کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ غالباً اسی لیے خواجہ حسن ثانی نظامی نے مولانا آزاد لائبریری کو ایک علمی معبد قرار دیا ہے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"بہزاد دکن نے کتابوں اور کتاب خوانوں کے لیے ایک خوبصورت معبد تیار کر دیا ہے[۳]"

اس کتاب خانے کی عمارت کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۲ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری کے دور میں رکھا [illegible]

سے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کو کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے وائس چانسلری کے دور میں ہوا۔

پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کتاب خانہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن (جس نے ۱۸۷۷ء میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا) کے نام پر "لٹن لائبریری" کہلاتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب یونیورسٹی کے کتابخانے کی نئی عمارت کا افتتاح ہوا تو کتاب خانے کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام نامی سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام "مولانا آزاد لائبریری" رکھا گیا۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا آزاد لائبریری کی تاریخ خود مسلم یونیورسٹی سے بھی پرانی ہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں ڈالی گئی تھی مگر یہ لائبریری کالج سے تین برس پہلے عالم وجود میں آچکی تھی۔ کہتے ہیں ۱۸۷۲ء میں یونین کلب کے قریب بھونس کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں سرسید اور جسٹس سید محمود کے ذاتی ذخیرۂ کتب سے اس کا قیام عمل میں آیا۔ پھر ان کے احباب اور دوسرے مخیر حضرات کی مدد اور توجہ سے جلد ہی یہ لائبریری تحقیقی مسودوں کا اہم ذخیرہ بن گئی۔ سرسید احمد خاں نے خود عنایت اللہ دہلوی کو اس کا لائبریرین مقرر کیا تھا[۴]

اس لائبریری کے ذخائر کو مالا مال کرنے میں کئی قابل احترام شخصیتوں کا حصہ ہے، جنہوں نے اپنے عطیات سے نواز کر اس لائبریری کو مزین کرنے کے ساتھ اپنے ذہنوں کو بھی محفوظ کر لیا۔ ان میں سے چند ذخائر کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ سبحان اللہ کلکشن علیہ گورکھپور ۲۔ جواہر عبد زمیم علیہ

یہ کالج اٹاوہ۔ (۴) سلیمان کلکشن عطیہ سرشاہ محمد سلیمان۔
بیب گنج کلکشن عطیہ جناب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ۵۔ احسن
ہ عطیہ احسن مارہروی (۶) رام بابو سکسینہ کلکشن وغیرہ وغیرہ۔
ان نایاب اور بیش بہا علمی موتیوں کی بدولت یہ لائبریری مشرقی
خانوں میں ممتاز و مفتخر بن گئی ہے۔

یہاں پر نوادرات کا ایسا انمول خزانہ موجود ہے جو کسی دوسری
شکل ہی سے دستیاب ہو سکے گا۔ ان میں قرآن حکیم کے سنہری حروف
لکھے ہوئے وہ نسخے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے
پر شاہان مغلیہ کے ہاتھوں کی تحریریں اور دستخط موجود ہیں۔ یہ وہ
ہیں جو مغلیہ کتب خانوں کی زینت رہے ہیں۔ ان میں شہنشاہ
گ زیب عالمگیر سے منسوب کلام پاک کا نسخہ بھی ہے اور سب سے
دہ اہم اور قابل قدر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دست مبارک
ہرن کی کھال پر لکھا ہوا قرآن کریم کا آدھا پارہ بھی ہے۔ ان ہی
درات میں ایک چاول پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم سابق وائس
سلر کی نہایت عمدہ تصویر بھی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔
ابھی حال ہی میں لائبریری میں محفوظ مغل آرٹ کا
نادر نمونہ "انڈیا فیسٹیول" نامی نمائش منعقدہ امریکہ میں رکھا
' جسے سیکڑوں لوگوں نے دیکھا اور بے حد پسند کیا۔
ان نوادرات کا ایک اہم جز دبھگتی کال کی وہ ہندی کتابیں
ہیں جو فارسی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ علاوہ بریں ہندو خوش نویسوں
ہاتھوں کی لکھی ہوئی فارسی کتابیں بھی قابل دید ہیں جو ہماری گنگا جمنی
زیب کی یاد دلاتی ہیں۔

یہاں پر بہت سی ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن پر سرسید اور
شبلی کی تحریریں اور یادداشتیں درج ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت
ایسی چیزیں ہیں جو دید کے قابل ہیں۔
اس وقت اس لائبریری میں چھ لاکھ سے زائد کتابیں پندرہ
ار کے قریب مخطوطات اور دنیا کے تمام ملکوں سے شائع ہونے
لے دو ہزار سے زائد سائنسی اور ادبی میگزین، مصور، مرصع، منقش،
مل آرٹ کے نادر نمونے، خطاطوں کی دیدہ زیب وصلیاں، فرامین

سکے، روٹوگراف، مائکروفلم، گراموفون ریکارڈ وغیرہ موجود ہیں۔
آج سے چند سال پیشتر صرف دو دارالمطالعے صبح سے رات کے دس بجے تک
کھلا کرتے تھے۔ لیکن ان چند سالوں میں لائبریری کے پانچ دارالمطالعے کھول دیے
گئے ہیں اور ان کے اوقات صبح ۸ بجے سے رات کے ۲ بجے تک کر دیے گئے ہیں۔ شاید ہی
ہندوستان میں کوئی دوسری لائبریری ہو جو اتنی رات گئے تک اور مسلسل ۱۹ گھنٹے
تک کھلی رہتی ہو۔ یہ لائبریری پورے سال کھلی رہتی ہے اور صرف ۸ دن بند
ہوتی ہے جن میں خاص خاص قومی و ہندو مسلم تہوار شامل ہیں۔ لائبریری میں
روزانہ پانچ ہزار طلبا مطالعہ کے لیے آتے ہیں اور اکثر ان کی تعداد اتنی زیادہ
ہو جاتی ہے کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں رہتی۔ چنانچہ حال ہی میں جب اتر پردیش کے
وزیر اعلیٰ وی پی بہادر سنگھ لائبریری میں تشریف لائے تو انہیں جگہ کی قلت
کا احساس ہوا اور موصوف نے ایک مزید دارالمطالعہ کے لیے ۱۰ لاکھ
روپیے کی رقم کا عطیہ عنایت فرمایا۔ اس نئے دارالمطالعہ کی تعمیر کا کام آج کل
تیزی کے ساتھ چل رہا ہے۔

موجودہ دور کی ساری توسیع جناب سید ہاشم علی صاحب وائس
چانسلر کی ذاتی کاوش اور خصوصی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔
لائبریری کے منتظمین اور عملہ بھی طلبا کو ہر امکانی امداد اور سہولت
دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ کتب خانے تعلیمی نظام کا ایک اہم جز
خیال کیے جاتے ہیں اور ان کا رشتہ جسم و روح کا ہوتا ہے۔ علمی زندگی
کے لیے ایک اچھے کتب خانے کا ہونا ضروری اور لازمی سمجھا جاتا ہے۔
اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر زمانہ میں ہی مسلمانوں
کو تحصیل علم اور مطالعے کا شوق رہا ہے۔ وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اپنے دور
عروج و اقبال میں دنیا میں "ایک زبردست کتابی تہذیب" کی بنیاد ڈالی تھی۔
ہم کو قوی امید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اس کتابی تہذیب کے
اعلیٰ ترین نمائندے بن کر دنیا کے سامنے آئیں گے۔

ل۱ آل انڈیا ریڈیو کا جریدہ "آواز" یکم نومبر ۱۹۹۰ء
ل۲ ماہنامہ "منادی" جلد ۳ شمارہ ۷، ۸۔ ۱۹۹۵ء
ل۳ مرقع تاریخ مسلم یونیورسٹی از منظر جلیسوی مرحوم
ل۴ اسلامی کتب خانے از ڈاکٹر ادلگا پنٹو مترجمہ [illegible]

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈرز پرسنٹیج کی بنیاد پر مطلوب ہیں جو کہ ۹ر اپریل، ۱۹۸۰ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے۔ ٹینڈر اسی تاریخ کو ساڑھے تین بجے دوپہر کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے کام کے دن آفس ٹائم میں کسی بھی وقت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت اس کی وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے مختص رقم	زر ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱	اے۔ایم۔یو کے انجینیرنگ کالج میں نئی تعمیر شدہ لڑکوں کی ورکشاپ میں Cable Srain کا کانسٹرکشن اور الماریوں کا اہتمام اور ان کی تنصیب	-/۲۶،۰۵۰ روپے	-/۶۵۵ روپے	-/۵ روپے	۲½ ماہ

ڈی۔ایس۔آر ۱۹۸۵ء کی بنیاد پر

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

(1092/2060)

بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ٹینڈر نوٹس

سربمہر ٹینڈرز پرسنٹیج کی بنیاد پر مطلوب ہیں جو کہ ۱۸ر اپریل ۱۹۸۷ء ایک بجے دوپہر تک وصول کیے جائیں گے ٹینڈر اسی روز ساڑھے تین بجے دوپہر کھول دیے جائیں گے۔ ٹینڈر فارم یونیورسٹی انجینیر کے دفتر سے کام کے دن آفس ٹائم میں کسی بھی وقت حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

ٹینڈر فارم کی فروخت اس کی وصولیابی کی مقررہ تاریخ سے ۲۴ گھنٹے قبل بند کردی جائے گی۔

نمبر شمار	کام کا نام	ٹینڈر کے لیے متوقع رقم	زر ضمانت	فارم کی قیمت	تکمیل کی مدت
۱-	۲۰۰ ویمنس ہوسٹل میں اضافے اور تبدیلیاں	۲۴۴,۸,۳۵/- روپے	۵۰۰۰/- روپے	۱۵/- روپیہ	تین ماہ-

ڈی- ایس- آر ۱۹۸۵ء کی بنیاد پر

لفٹننٹ کرنل حسن مظفر
یونیورسٹی انجینیر

(۱۱۰/۲۰۴۵)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۵/ ۸۶-۸۷
مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ سیکشن آفیسرس
شرح تنخواہ: ۲۰۰۰-۶۰-۲۳۰۰-ای بی ۷۵-۳۲۰۰-۱۰۰-۳۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: ۱۔ اچھی ڈویژن سے یونیورسٹی ڈگری
۲۔ ایڈمنسٹریشن/ اکاونٹس/ سیکریٹریل ورکس میں سات سال کا تجربہ۔ یونیورسٹی میں جونیئر سپروائزری پوسٹ/ گورنمنٹ/ پبلک انڈرٹیکنگ/ مشہور پرائیویٹ انڈرٹیکنگ پوسٹ پر کام کا تجربہ لائق ترجیح ہوگا
۳۔ امیدواروں کو سیلیکشن کمیٹی کے سامنے انٹرویو دینے سے قبل درج ذیل تحریری ٹیسٹ کوالی فائی کرنا ہوں گے۔
ا۔ ایسیز، آفس پریسیس ڈرافٹنگ اینڈ ایپلائیڈ انگلش گرامر۔
ب۔ جنرل آفس پروسیجر، سروس رولز، اور فنانشیل ریگولیشنس
ج۔ "یونیورسٹی ایڈمینسٹریشن"

۲۔ اسسٹنٹ آرکایوسٹ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکاڈمی۔
شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۹۰۰-ای بی-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت۔۱ تاریخ یا فارسی میں ایم-اے
۲ آرکائیول اسٹڈیز میں ڈپلوما۔
۳۔ فارسی اور اردو کی جانکاری
۴ کسی آرکائیوز یا کسی لائبریری کے اورینٹل ڈویژن میں کام کا تجربہ۔

۶۷

۳ کنزرویشنسٹ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکاڈمی
شرح تنخواہ:- ۱۴۰۰- ۴۰- ۱۸۰۰- ای-بی-۵۰- ۲۳۰۰-روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:
۱- لازمی- ۱- کیمسٹری میں ایم-ایس سی-
۲- نیشنل لیباریٹری فار کنزرویشن آف کلچرل پروپرٹیز واقع لکھنو (ڈپارٹمنٹ آف گورنمنٹ آف انڈیا) سے ایک سالہ ڈپلوما-

یا

نیشنل آرکائیوز، گورنمنٹ آف انڈیا، نئی دہلی سے ڈپلوما-
۲- پسندیدہ ۱ کلچرل آبجیکٹس یا ایم ایس ایس کے پریزرویشن کے لیے کسی ادارے میں کام کا کچھ تجربہ-
۲- اردو/فارسی کی جانکاری-

۴- مائیکروفوٹوگرافسٹ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکاڈمی
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰- ۴۰- ۱۸۰۰- ای-بی- ۵۰- ۲۳۰۰روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت- ۱- فزکس میں ایم-ایس سی
۲ کسی تسلیم شدہ ادارے سے فوٹوگرافی میں ایک سالہ ڈپلوما یا فوٹوگرافی میں سرٹیفکیٹ کے ساتھ مائیکروفلمنگ کا پانچ سال کا تجربہ-
۳- اردو/فارسی کی جانکاری-

۵ سینئر کیوریٹر- (ایک جگہ) (مستقل) ہسٹری ڈپارٹمنٹ-
شرح تنخواہ:- ۱۶۴۰- ۶۰- ۲۶۰۰- ای-بی- ۷۵- ۲۹۰۰روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:
۱- لازمی: ہسٹری میں ایم-اے (گڈ سکنڈ ڈویژن)
۲-پسندیدہ آرکیالوجی میں ڈپلوما یا کیوریٹر کی حیثیت سے کچھ تجربہ-

یا

۱- لازمی: فرسٹ ڈویژن میں بی-اے (آنرز) جس میں ہسٹری بطور ایک مضمون کے رہا ہو اور کم از کم دس سال کا فیلڈ تجربہ-
۲پسندیدہ سول انجینیرنگ میں ڈپلوما یا آرکیالوجیکل نمائش آرگنائز کرنے کا مناسب تجربہ-
اس امیدوار کو ترجیح دی جائے گی جو کہ سنسکرت یا فارسی میں کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو-

۶- فورمین (الیکٹریکل) (ایک جگہ) (مستقل) یونیورسٹی پولی ٹیکنک
شرح تنخواہ:- ۱۶۴۰ - ۶۰ - ۲۶۰۰ - ای-بی-۷۵ - ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:
۱- لازمی الیکٹریکل انجینیرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ میں پانچ سال کا تجربہ
یا
ٹریڈ سرٹیفکیٹ کے ساتھ دس سال کا تجربہ۔
۲- پسندیدہ:- الیکٹریکل مشینوں کے ناپنے والے آلات اور الیکٹرونک آلات کی دیکھ بھال اور مرمت کا تجربہ۔
نوٹ:- موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۷- ٹکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) اوٹو رہنیو لارنگالوجی (ای-این-ٹی)
شرح تنخواہ:- ۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۸۰۰ - ای-بی - ۵۰ - ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:-
۱- لازمی:- بی-ایس سی یا اس کے مساوی تسلیم شدہ ڈگری
۲- پسندیدہ:- ان حضرات کو ترجیح دی جائے گی جو ای-این-ٹی میں ریسرچ سے واقف ہوں اور بحیثیت لیبوریٹری اسسٹنٹ کام کیا ہو۔
نوٹ:- اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا

۸- ٹکنیکل اسسٹنٹ (پروگرامر) (ایک جگہ) (مستقل) (ڈی-ایس-اے پروگرام کے تحت) فزکس ڈپارٹمنٹ
شرح تنخواہ:- ۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۸۰۰ - ای بی ۵۰ - ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت ۱- فزکس اور میتھمیٹکس کے ساتھ بی-ایس سی
۲- فورٹران پروگرام کی جانکاری

۹- جونیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (عارضی) فزکس ڈپارٹمنٹ (ڈی-ایس-اے پروگرام کے تحت)
شرح تنخواہ:- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۵۶۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)
قابلیت:-
۱- لازمی: فزکس کے ساتھ بی-ایس سی
اسپکٹرو فوٹو میٹرس / اسپکیٹروس کاپک انسٹرومینٹس کو چلانے کا تجربہ۔

۱۰۔ اسٹاف نرسنز (۲۷ جگہیں) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ :۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت : میٹریکولیشن یا اس کے مساوی۔
کسی تسلیم شدہ ادارے سے نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلوما۔ اور کسی ریاست میں رجسٹریشن۔
بحیثیت جنرل ڈیوٹی نرس ایک سال کا تجربہ۔

۱۱ سینئر لیباریٹری اسسٹنٹ (اسٹور) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آرتھوپیڈک سرجری
شرح تنخواہ :۔ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت :۔ سائنس میں ہائر سکنڈری / انٹرمیڈیٹ (سائنس)۔ اور ساتھ میں کسی میڈیکل کالج / اسپتال میں اسٹورس کی دیکھ ریکھ کا کم از کم تین سال کا تجربہ۔
نوٹ :۔ اعلیٰ تجربے کے حامل افراد کے سلسلے میں قابلیت میں نرمی برتی جائے گی۔

۱۲ پرائمری ٹیچرس (۲ جگہیں) (مستقل) عبداللہ نرسری
شرح تنخواہ :۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)
قابلیت :۔ میٹرک ٹرینڈ
یا
ہائر سکنڈری اور ساتھ میں جے۔بی۔ٹی ۲ سال
یا
انٹرمیڈیٹ (یا ۱۰+۲ کورس) اور ساتھ میں ایک سال جے۔بی۔ٹی
یا
گریجویٹ اور ساتھ میں کسی پرائمری اسکول میں ۵ سال کا تدریسی تجربہ

۲۔ انگریزی / ہندی / اردو کے ذریعہ تدریس کا تجربہ۔

۱۳۔ پبلسٹی اسسٹنٹ (ایک جگہ۔ مستقل) پبلک ریلیشنز آفس۔
شرح تنخواہ :۔ ۱۲۰۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی ۴۰۔ ۲۰۴۰۔ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت :۔ عمومی گریجویٹ یا اس کے مساوی کوئی قابلیت۔ ہندی اور اردو کی جانکاری۔ کسی پبلک ریلیشنز آفس یا معروف پبلسٹی تنظیم میں کام کرنے کا کچھ تجربہ۔

نوٹ: غیر معمولی تجربہ کی صورت میں تعلیمی لیاقت میں رعایت دی جاسکتی ہے۔

۱۴۔ سینیئر ریسرچ فیلو (ایک جگہ۔ عارضی) (ڈی۔ایس۔اے پروگرام کے تحت) فزکس ڈپارٹمنٹ
شرح تنخواہ : ۔/۱۰۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ)
۔/۸۰۰ روپے ماہانہ (مقررہ) (ان امیدواروں کے لیے جو اعلیٰ قابلیت کے حامل ہوں)

قابلیت:

۱۔ لازمی۔ فزکس میں ایم ایس سی یا بی۔ٹیک (الیکٹریکل انجینرنگ/الیکٹرونکس میں) یا ایم اے (لینگوئسٹکس) ان کے ساتھ ڈیجیٹل سگنل پروسسنگ میں تحقیق کا کم سے کم دو سال کا تجربہ۔ یا
(الیکٹریکل انجینرنگ/الیکٹرونکس میں) ایم ٹیک۔
۲۔ پسندیدہ ایم۔فل یا پی ایچ ڈی کی تھیسز جمع کی ہو۔

۱۵ الیکٹریشن۔کم۔ٹیوب ویل آپریٹر۔ (ایک جگہ) (مستقل) دی۔ایم ہال۔
شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:۔ ۱۔ الیکٹریشن ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی سرٹیفکٹ
۲۔ الیکٹرک موٹروں اور دوسرے الیکٹرک کے آلات کو دیکھ ریکھ کرنے اور ان کی مرمت کرنے کا دو سال کا تجربہ۔

یا

پڑھا لکھا ہو اور الیکٹرک موٹروں اور دوسرے الیکٹرک کے آلات کو دیکھ ریکھ کرنے اور ان کی مرمت کرنے کا دس سال کا تجربہ ہو۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۶ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ اور دیگر الاؤنسز
قابلیت
۱۔ لازمی سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری اور ساتھ میں سابقہ تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کو پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن ڈپارٹمنٹ/پبلک ہیلتھ لیب کے کام کا تجربہ ہو۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

ریکارڈ کیپر (ایک جگہ) (مستقل) جے۔ این۔ ایم۔ سی۔ اسپتال

شرح تنخواہ: ۵۹۰ - ۹۵۰ - ۲۰ - ۱۱۵۰ - ای بی ۲۵ - ۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت۔ لازمی: ا۔ میٹریکولیٹ یا اس کے مساوی قابلیت۔ ٹائپنگ میں ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار۔ اور اس کے لیے امیدوار کو ادارے کی طرف سے ایک ٹیسٹ کوالی فائی کرنا ہوگا۔

۲۔ میڈیکل ریکارڈ کیپنگ کی ایک سال کا تجربہ۔

پسندیدہ: ا۔ اسٹیٹسٹکس/میتھیمیٹکس میں گریجویٹ۔

ii میڈیکل ڈاٹا کو جمع، تدوین اور تجزیہ کرنے کا تجربہ۔

۱۱۔ سپروائزر اسٹرلائیزیشن (ایک جگہ) (مستقل) جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ: ۵۰۵ - ۲۵ - ۹۰۰ - ۱۱۵۰ - ای بی ۳۰ - ۱۵۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت: کسی تسلیم شدہ اسپتال میں اسٹرلائیزیشن میں ٹریننگ۔ سرجری کے آلات وغیرہ کے اسٹرلائیزیشن کا پانچ سال کا عملی تجربہ۔ نرسنگ میں آئی۔ ایس۔ سی کی سرٹیفکیٹ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتداء ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو بطور ٹی۔ اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ دیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دفتر سے ۵/- روپے برائے اسامی نمبر ۱ تا ۶ اور ۳/- روپے (باقی ماندہ اسامیوں کے لیے) نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کر کے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا، بذات خود حاصل کرسکتے ہیں ڈاک سے منگانے کی صورت میں ۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر کا اپنا پتہ لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ ارسال کر کے حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۲۰ر اپریل ۱۹۸۰ء آفس ٹائم تک ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی
رجسٹرار

(1088/2056)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۹/ ۸۵-۸۶
مورخہ ۲۳ مارچ ۸۶ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پرنسپل۔ ویمنس پالی ٹیکنک
شرح تنخواہ — ۱۵۰۰—۶۰—۱۸۰۰—۱۰۰—۲۰۰۰—۱۲۵/۲—۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت۔ انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں ماسٹرس ڈگری

یا

انجینئرنگ/ٹیکنالوجی کی کسی برانچ میں کم از کم سکنڈ کلاس میں بیچلرز ڈگری۔

یا

بی۔ ایچ۔ ڈی/ فرسٹ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری اور ساتھ میں ویمنس پالی ٹیکنک ڈپارٹمنٹ سے متعلق موضوعات میں سے کسی میں تخصص۔

ii کم از کم دس سال کا تدریسی تجربہ۔

iii ان حضرات کو ترجیح دی جائے گی جو کسی انجینئرنگ کے شعبے کا انتظامی تجربہ رکھتے ہوں۔

نوٹ: وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۴۶/۸۵-۸۶ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۸۶ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی ہونے کی صورت میں ان کی پہلی درخواست کی بنیاد ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

ریڈرس

شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰—۵۰—۱۳۰۰—۶۰—۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
۲۔ ریڈر ان سول انجینئرنگ (سوئل میکینک) سول انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ

۳۔ ریڈر ان مکینکل انجینئرنگ (عارضی) مکینکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔
۴۔ ریڈر ان کیمیکل انجینئرنگ کیمیکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔
۵۔ ریڈر ان کیمیکل انجینئرنگ / پٹرولیم پروسسنگ۔ انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اینڈ کیمیکل انجینئرنگ

قابلیت:

۱۔ لازمی اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ——— تدریس اور / یا تحقیق و ترقیات کے سلسلے میں پانچ سال کا تجربہ۔

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ پی ایچ۔ڈی کی ڈگری نہیں ہے لیکن اس کے معیار کا مطبوعہ تحقیقی کام ہے یا ڈیزائن / ڈیولپمنٹ میں کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں انتہائی اعلیٰ معیار کا ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنھیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہو گا کہ امیدوار کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں، جن میں نئی ایجادات / تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۲۔ پسندیدہ:۔ برائے اسامی نمبر ۳ ریڈر ان کیمیکل انجینئرنگ

مشہور و معروف رسائل میں مطبوعہ تحقیقی کام اور پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ۔

خصوصی مہارت کا میدان

اسامی نمبر ۴ ریڈر ان کیمیکل انجینئرنگ کے لیے۔

فلوئیڈ مکینکس / ہیٹ ٹرانسفر / ماس ٹرانسفر / ری ایکشن انجینئرنگ / ٹرانسپورٹ فینومینا / پٹرولیم ٹیکنالوجی۔

درج بالا میدانوں میں سے کم از کم دو میں خصوصی مہارت ہو اور مشہور اور معروف رسائل میں مطبوعہ تحقیقی کام اور پوسٹ گریجویٹ کلاس کو پڑھانے کا تجربہ۔

اسامی نمبر ۵ ریڈر ان کیمیکل انجینئرنگ / پٹرولیم پروسسنگ

درج ذیل میدانوں میں سے کسی ایک یا زیادہ میں خصوصی مہارت۔
ٹرانسفر پروسس، ری ایکشن انجینئرنگ، کیمیکل انجینئرنگ، تھرموڈائنامکس کمپیوٹر ایڈڈ ڈیزائن اینڈ اوپٹیمائزیشن، پٹرولیم ریفائننگ، پٹروکیمیکل۔

نوٹ: پٹرولیم ریفائننگ کی اچھی جانکاری (صرف ایک جگہ کے لیے)

لیکچررس

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ ـ ۴۰ ـ ۱۱۰۰ ـ ۵۰ ـ ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

۹۔ لیکچرر ان الیکٹریکل انجینئرنگ سیکشن (عارضی) یونیورسٹی پولی ٹیکنک

قابلیت ا۔ انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے متعلقہ میدان میں ماسٹرز ڈگری۔

ب۔ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ انجینئرنگ/ٹیکنالوجی میں بیچلرز ڈگری۔ بیچلرز ڈگری میں فرسٹ کلاس ہو اور/یا پھر ماسٹرس ڈگری ہو۔

ج۔ تعلیمی/تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ ورانہ تجربہ۔

انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے موضوعات میں نامیاتی بین الوضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے۔

ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتے ہوں یا ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربے کے حامل ہوں، لیکن وہ تقرر کے لیے موزوں تصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کردیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

اگر ایم ٹیک/ایم ای کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب خیال نہ کیے جائیں تو اس صورت میں لازمی تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جاسکتا ہے۔ اور فرسٹ ڈویژن میں پاس شدہ انجینئرنگ گریجویٹ کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار تقرر کے پانچ سال کے اندر ایم۔ ٹیک یا ایم۔ ای کی سند حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے محروم کردیا جائے گا جب تک کہ وہ مذکورہ قابلیت کی شرط کو پورا نہ کردے۔

۱۰۔ لیکچررس ان آرکیٹکچرل اسسٹنٹ شپ۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔

قابلیت:

آرکیٹکچر میں بیچلرز ڈگری اور اس کے ساتھ دو سال کا متعلقہ میدان میں پروفیشنل تجربہ۔

یا

آرکیٹکچر میں ماسٹرس ڈگری اور اس کے ساتھ ایک سال کا متعلقہ میدان میں پروفیشنل تجربہ۔

اگر امیدوار کے پاس آرکیٹکچر میں ماسٹرس ڈگری نہ ہو اور پروفیشنل تجربہ بھی نہ ہو یا وہ تقرر کے لیے مناسب خیال نہ کیے جائیں تو اس صورت میں تقرری پانے والے امیدوار کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ تقرری کے بعد سے پانچ سال میں ضروری پروفیشنل تجربہ حاصل کرلے۔ بصورت دیگر اسے اس وقت تک انکریمنٹ نہ ملے گا جب تک کہ وہ یہ لیاقت حاصل نہ کرلے۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے -/۵ روپے نقد فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے۔ایم۔یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو بذات خود جمع کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔

ڈاک سے منگانے کی صورت میں ۴×۹ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۴ مئی ۱۹۸۰ء آفس ٹائم تک ہے نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

نوٹ: موزوں امیدواروں کو آئندہ انتخاب کے لیے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

جاوید عثمانی

رجسٹرار

(1107/2902)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس: ایس۔کے۔آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

جلد ۶ مئی ۸۷ء شمارہ ۵

زر سالانہ: انڈیا ... Rs. 30·00
بیرونی ممالک .. US $ 20·00 ہوائی ڈاک
US $ 8·00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ: ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

✱ مقالہ نگاروں کے لیے ✱

✱ تہذیب الاخلاق کے اغراض، مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابلِ قبول ہوں گے۔

← عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

← ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

← مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

← مسودہ بڑے سائز (20cm x 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

← مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

✱ اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ: ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا۔

حاشیے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زر سالانہ اگلے ماہ ختم ہو رہا ہے یہ شمارہ ملتے ہی اپنا زر سالانہ ارسال کریں۔

افتتاحی اجلاس

(دائیں سے) ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی، ڈاکٹر فرحان مجیب، پروفیسر وصی الرحمٰن (پرو وائس چانسلر)

جناب سید ہاشم علی (وائس چانسلر)، جناب سید حامد (مہمان خصوصی) اور پروفیسر اسرار احمد

اطلاع :

بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر کانفرنس میں پیش کیے گئے چند مقالے اس روداد میں شامل نہیں کیے جا سکے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ مندوبین نے اپنے مقالوں کے مسودوں پر اپنا نام صاف صاف درج نہیں کیا ہے۔ ایسے تمام حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے نام، مقالے کا عنوان واضح الفاظ میں تحریر کر کے جلد از جلد روانہ کریں۔

جو مقالے اس روداد میں شامل نہیں کیے گئے ہیں انھیں تہذیب الاخلاق کے آئندہ شماروں میں شائع کیا جائے گا۔

— ادارہ

مکتوب شیخ الجامعہ

SYED HASHIM ALI
VICE-CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202001
U.P. INDIA

محبی پروفیسر اسرار احمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہے کہ ادارۂ تہذیب الاخلاق نے مرکز فروغ سائنس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی سہ روزہ کانفرنس "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کی روداد کو ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے ایک خصوصی شمارے کی شکل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مفید اور مجتہدانہ تجربہ ہے جس کے لیے میں آپ اور آپ کے رفقائے کار کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مذکورہ کانفرنس وقت کی پکار تھی۔ اس میں پیش کیے گئے خیالات اور منظور ہونے والی تجاویز اس بات کی متقاضی ہیں کہ کانفرنس کی مکمل روداد زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے آئے۔

آپ کو بخوبی علم ہے کہ کچھ دنوں پہلے میں نے دینی مدارس کے نام ایک اپیل جاری کی تھی جس کے ذریعے انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی میدان میں پیش رفت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے دینی مدارس میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم کی ترویج ہو۔ عام اندازے کے برخلاف مدارس نے جن پر تحسین الفاظ میں اس اپیل کا خیر مقدم کیا اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ بحمد اللہ ہمارے مدارس اسلاف کی علمی روایات اور موجودہ زمانے کے تقاضوں سے بے خبر نہیں۔ وہ اصولی طور پر سائنس اور ریاضی کو داخل نصاب کرنے کے حق میں ہیں مگر مالی وسائل کی کمی اور مناسب اساتذہ کی کمیابی ان کی راہ میں حائل ہیں۔ اب یہ ملک و قوم کے دردمندوں کا کام ہے کہ وہ مدارس کو درپیش ان دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں اور اس کے رجحانات سے نا آشنا ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت جدید تعلیم سے بے بہرہ ہے اس لیے ہوشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ جذباتی اور وقتی نوعیت کے مسائل میں الجھ کر توانائی صرف کرنے سے گریز کیا جائے اور جدید تعلیم کے میدان میں ہندوستانی مسلم اقلیت کی پیش رفت کو منصوبہ بند طور پر آگے بڑھایا جائے۔ میں پر امید ہوں کہ تہذیب الاخلاق کا یہ خصوصی شمارہ اس احساس کو عام کرنے میں ایک اہم رول ادا کرے گا۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

مخلص

تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے نام

محترمی و مکرمی۔

سلام مسنون

ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا یہ شمارہ آپ کے ادارہ کو ہماری جانب سے تحفتاً پیش کیا جارہا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ آپ ہمارے اس تحفہ کو نہ صرف قبول فرمائیں گے بلکہ پسند بھی کریں گے۔

تہذیب الاخلاق ایک رسالے کا نہیں، ایک تحریک کا نام ہے جو تقریباً ایک صدی قبل صدیوں پر محیط عظمت کے حامل سر سید کے ہاتھوں عالمِ وجود میں آئی تھی۔ اس سے وابستہ ایک لمبی داستان ہے مایوسیوں میں امید کی ایک کرن کی اور روایتوں کی زنجیروں سے انسانیت کو آزادی دلانے کی۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ پچھلی صدی کے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی بچا لینے کی اور انھیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں نہلانے کی۔ لیکن افسوس! صدیوں کی تیرگی سے مانوس ہندوستانی مسلمان تہذیب الاخلاق کی روشنی برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں بلکہ پرزور مخالفتوں کی وہ آندھیاں اٹھائیں کہ یہ شمع کچھ دنوں جلتی بجھتی رہی اور پھر مدتوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

دورِ حاضر میں ملک، بالخصوص ہندوستانی مسلم اقلیت جن حالات سے دوچار ہے ان کے پیشِ نظر اربابِ علی گڑھ کے اس شدید احساس نے کہ فی زمانہ تہذیب الاخلاق کی ضرورت سر سید کے زمانے سے کچھ کم نہیں اس رسالے کو دوبارہ جاری کیا۔ اپنے دوبارہ اجراء کے وقت سے یہ رسالہ نہ صرف پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے بلکہ مستقل ترقی اور بلند معیار کی طرف گامزن ہے۔ اب یہ ایک مقبول عام رسالہ ہے اور ملک کی بیشتر لائبریریوں کی زینت بھی ہے۔

اس یقین کے ساتھ کہ آپ تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے پوری طور پر متفق ہوں گے ہم آپ سے درخواست گزار ہیں کہ آپ اپنے ادارہ کی جانب سے زرِ سالانہ روانہ کر کے اس رسالے کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ ہم آپ سے یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے دوست، احباب اور قرب و جوار کے تعلیمی اداروں کو تہذیب الاخلاق (یا ۲۰ کے ہندی روپے نشانتہ) کا خریدار بننے کی ترغیب دیں گے۔

خریدار بننے کے لیے اگلے صفحہ پر دیئے گئے خریداری فارم پُر کر کے بھیجیے یا بذریعہ پوسٹ کارڈ ہمیں مطلع کیجیے۔

نیاز کیش

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانتہ

تہذیب الاخلاق کے خریداروں سے گزارش

* ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا نیا خریدار بننے یا تجدید خریداری کے لیے براہ کرم نیچے دیے ہوئے فارم میں کوپن کر کے بھیجنے کی زحمت کریں
* پرانے خریدار ادارے سے تجدید خریداری کی درخواست کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ یہ نمبر رسالے کے لفافے پتے کے اوپر درج ہوتا ہے (منی آرڈر بھیجتے وقت خریداری نمبر بدل دیا گیا ہے اس لیے نئے خریداری نمبر کا ہی حوالہ دیں
* منی آرڈر بھیجتے وقت اس کے کوپن پر اپنا پورا نام، پتہ اور پن کوڈ نمبر صاف صاف تحریر کریں۔ پرانے خریدار اپنا خریداری نمبر بھی لکھیں۔
* زرسالانہ درج ذیل پتہ پر روانہ کریں:

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202001

- - - - - - - - - - - - - یہاں سے کاٹیے - - - - - - - - - - - - -

فارم خریداری

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 202001

مہربانی فرما کر میرا نام تہذیب الاخلاق کے خریداروں کی فہرست میں ایک سال کے لیے درج فرمائیں۔

رسالے کو نیچے دیے ہوئے پتہ پر بھیجیں:۔

نام ____________________

پورا پتہ ____________________

پن کوڈ نمبر ________ □□□□□□

(الف) زرسالانہ بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ (نمبر) جا رہا ہے ___ یا

(ب) رسالے کو بذریعہ وی۔پی۔ بھیجنے کی زحمت کریں جسے میں وصول کر لوں گا۔

(درج بالا میں جو آپ پر لاگو نہ ہو اسے کاٹ دیں)

دستخط ____________

خریداری نمبر (پرانے خریداروں کے لیے) ____________

روداد

سہ روزہ کانفرنس
دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

۲۶ — ۲۸ مارچ ۸۷ء

✱

سرپرست

جناب سید ہاشم علی (وائس چانسلر)

منتظمین

اسرار احمد ، سید ابوالہاشم رضوی ، فرحان مجیب اور شوکت علی

کانفرنس سکریٹری — حکیم الطاف احمد

پروگرام

۲۶ مارچ

افتتاحی نشست: ۱۱ تا ۱ بجے دن
صدر: جناب سید ہاشم علی

پہلی نشست: ۳ تا ۵ بجے شام
صدر: مولانا محمد تقی امینی

✱

۲۷ مارچ

دوسری نشست: ۸½ تا ۱۰½ بجے صبح
صدر: مولانا محمد تقی امینی

تیسری نشست: ۱۱ تا ۱ بجے دن
صدر: ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

چوتھی نشست: ۳ تا ۵ بجے شام
صدر: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

✱

۲۸ مارچ

پانچویں نشست: ۸½ تا ۱۰½ بجے صبح
صدر: مولانا محمود الحسن

چھٹی نشست: ۱۱ تا ۱ بجے دن
صدر: ڈاکٹر محمد اجمل

اختتامی نشست: ۳ تا ۵ بجے شام
صدر: مولانا محمد تقی امینی

✱

زیر اہتمام

سینٹر فار پروموشن آف سائنس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

فہرستِ مقالات

اداریہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا یہ خصوصی شمارہ، یونیورسٹی کے سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی سہ روزہ کانفرنس "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کی مکمل روئداد ہے۔ اس خصوصی شمارے کو پیش کرتے ہوئے ہمیں بجا طور پر خوشی ہے کہ اردو رسالوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی ماہنامہ کسی ایسی کانفرنس کی روئداد کو اپنے خصوصی شمارے کا موضوع بنائے جس کا تعلق سائنسی تعلیم سے ہو۔ ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ قارئین ہمارے اس تجربے کی کتنی پذیرائی کریں گے، لیکن ہمیں یہ یقین ضرور ہے کہ لوگ ہماری اس آواز کو، جسے ہم اس خصوصی شمارے کے واسطے سے بلند کر رہے ہیں، آج نہیں تو کل سنیں گے اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے۔

جس کانفرنس کی روئداد کو ہم نے اس خصوصی شمارے کا موضوع بنایا ہے، اس کا انعقاد بذاتِ خود ایک بنیادی اہمیت کا تجربہ ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہوا جب دینی اور سائنسی علوم کے ماہرین نے سر جوڑ کر مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کی ترویج و اشاعت کی بابت ایک دوسرے کے موقف کو جاننے اور نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ اس کانفرنس میں جہاں سائنسی علوم کے ماہرین پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مدارس کے اساتذہ سائنس کی روز افزوں اہمیت سے بے خبر نہیں اور وہ سائنس اور ریاضی کو داخلِ نصاب کرنے کے حق میں ہیں وہیں دینی علوم کے ماہرین پر بھی یہ انکشاف ہوا کہ سائنس داں بھی سائنس کی حدود سے آگاہ ہیں اور وہ دینی علوم کو انسان کے لیے عصری علوم سے کم اہم نہیں سمجھتے۔ مسلم سائنس داں یہ کبھی نہ پسند کریں گے کہ مدارس میں سائنسی علوم کی ترویج سے کسی طور ان مدارس کے بنیادی مقصد کو ٹھیس پہنچے۔ کانفرنس انتہائی خوش گوار اور افہام و تفہیم کے ماحول میں اختتام کو پہنچی اور جیسا کہ اختتامی اجلاس کی رپورٹ سے معلوم ہوگا، اس میں بڑی مفید اور کارآمد تجاویز منظور ہوئیں۔

آج بھی بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سائنس سے مذہب بیزاری آتی ہے۔ ہم اس خیال کی تردید پر زور الفاظ میں کریں گے۔ اس لغو خیال کی بنیاد سائنس کی تاریخ سے لاعلمی، سائنس کی بابت غلط فہمی اور بے جا تعصب ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عظیم سائنس دانوں اور سائنسی تخلیق کے شہسواروں کی بڑی اکثریت مذہب اور روحانیت کی قایل رہی ہے۔ وہ سائنس کے محدود میدانِ عمل سے نہ صرف آگاہ رہے ہیں بلکہ انہیں سائنس کی تنگ دامانی کا بھی احساس رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف رہے ہیں کہ سائنس اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود روحانیت کے بغیر انسانی مسایل کا حل پیش کرنے سے لاچار ہے۔ ثبوت کے طور پر نیوٹن، آئن اسٹائن اور عبدالسلام جیسے تاریخ ساز سائنس دانوں کا نام پیش کرنا کافی ہوگا۔ ہاں! اس بات سے ہمیں بھی انکار نہیں کہ فلسفہ زدہ نیم سائنس دانوں کا ایک طبقہ ضرور ایسا رہا ہے جس میں مذہب بیزاری کے جراثیم پائے جاتے رہے ہیں، لیکن ان کی مذہب بیزاری کی بنیادی وجہ کسی مادی فلسفۂ زندگی سے وابستگی رہا ہے نہ کہ سائنس۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نیم سائنس دانوں [illegible] کے طبقے میں

ہے شاید ہی کسی فرد نے سائنسی تخلیق کا کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہو۔ دراصل یہ لوگ سائنس کے بدعتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے خیالات کو پرکشش بنانے اور اسے جدیدیت کا رنگ دینے کے لیے سائنس کا سہارا لیا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی نیم مذہبی گروہ پاک روایتوں کو اپنا من پسند مفہوم دے کر عوام کے لیے گمراہی کا دروازہ کھول دے۔ یا جیسے کوئی آزاد روشوں کا گروہ شاعری کی زمین میں مذہب کا کھلم کھلا مذاق اڑائے۔ ہمارے اپنے معاشرے میں یہ دونوں قسم کے گروہ پائے جاتے رہے ہیں لیکن ان کی وجہ سے کسی سنجیدہ ذہن نے نہ تو کبھی پاک روایتوں کی صداقت اور مسلمانوں کے لیے ان کی رہنمائی کی افادیت پر شک کیا اور نہ ہی شاعری کی زمین میں اظہار خیال سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تلقین کی۔ پھر سائنس غریب نے کیا قصور کیا ہے جو اس کے بدعتیوں کی مثال پیش کرکے یہ کہا جائے دیکھو سائنس مذہب بیزاری سکھاتی ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سائنس پر مذہب بیزار ہونے کے الزام کی بنیادی وجہ مغرب میں سائنس اور مذہب کے نام پر ماضی میں ہونے والا ٹکراؤ ہے۔ اس ٹکراؤ کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھے بغیر بعض مسلم دانشوروں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کرلیا کہ سائنس فطرتاً مذہب کے خلاف ہے۔ دراصل یہ ٹکراؤ سائنس اور روایتی عیسائیت کے مابین تھا نہ کہ سائنس اور اسلام کے۔ اس ٹکراؤ میں شدت اور سائنسی حلقے کے چند افراد کی مذہب کے معاملے میں انتہا پسندی اس دور کے کلیسا کے انتہائی آمرانہ اور ظالمانہ رویہ کا ردعمل تھی۔ کلیسا کی علمی معاملات میں سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی قسم کے نئے خیال کے اظہار کا مطلب تھا مستقل ایذا رسانی اور موت تک کو دعوت دینا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سائنس اور روایتی عیسائیت کے مابین چھڑی ہوئی اس وقت کی جنگ میں اکثر اختلافات کی نوعیت وہی تھی جو اسلام کی روشن خیالی اور روایتی عیسائیت کی تنگ نظری میں پہلے رہ چکی تھی۔ کیا المیہ ہے کہ چند مسلم دانشوروں نے سائنس اور روایتی عیسائیت کے مابین اختلاف کو سائنس اور مذہب کا اختلاف کہہ کر اسے سائنس اور اسلام کا اختلاف بنا لیا ہے، جب کہ بقول موریس بوکائے (Maurice Boucaille) قرآن پاک میں ایک بھی ایسی آیت نہیں ہے جو سائنس کے حتمی طور پر تسلیم شدہ حقائق سے ٹکرائے۔

چند مسلم دانشور اس خیال کے بھی حامل ہیں کہ چونکہ موجودہ سائنس کی نشوونما مغرب میں ہوئی ہے اس لیے وہ غیر اسلامی اقدار سے بوجھل ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ موجودہ سائنس کی ترویج سے اسلامی قدریں متاثر ہوں گی۔ ان کا مشورہ ہے کہ موجودہ سائنس سے یا تو بس واجبی سا تعلق رکھا جائے یا اسے مسلمانوں کی تعلیم کا جز بنانے سے پہلے اسلامی افکار سے ہم آہنگ کیا جائے۔ البتہ موجودہ مغربی ٹکنالوجی کے بارے میں ان کا رویہ یکسر مختلف ہے۔ وہ اسے مسلم معاشرت کا جز بنانے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے۔ ہمیں یہ کہنے میں چنداں تامل نہیں کہ ان خیالات کے حاملین بھی سائنس کی بابت اسی غلط فہمی اور اس کی تاریخ سے لاعلمی کے شکار ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان دانشوروں کا یہ واہمہ ہی بے بنیاد ہے کہ موجودہ سائنس مغربی تہذیب کی دین ہے اور اس لیے اس کی فکری اساس لازماً غیر اسلامی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ سائنس بنیادی طور پر مسلم تہذیب کی دین ہے۔ اس کی ابتدا مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے اسے بطور علوم عقلیہ کی ایک شاخ کے کافی حد تک آگے بڑھایا۔ مغرب کا کارنامہ محض یہ ہے کہ اس نے اپنی عرق ریزیوں سے سائنس کو وہ تناوری بخش دی ہے کہ آج خود اس کے موجد اس کی شناخت سے قاصر ہیں۔ یہ ہمارے قومی تعصب کی ڈینگ نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے۔ ذرا سنیے بریفالٹ ([illegible]) اس بابت کیا کہتا ہے:—

> "جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں، اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

اور دیگر مشہور مورخ جارج سارٹن (George Sarton) کس طرح رقم طراز ہے:—

"قرونِ وسطیٰ کا اصلی لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقہ کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو بارہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔"

کتنے افسوس کی بات ہے کہ دنیا پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ موجودہ سائنس اساسی طور پر اسلامی سائنس ہے اور یہ کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن چند مسلم دانشوروں کا گروہ ہے کہ وہ اپنے اس قیمتی ورثہ کی شناخت سے ڈر رہا ہے اور اس خوف سے کانپ رہا ہے کہ موجودہ سائنس کی ترویج سے مسلمان "صراطِ مستقیم" سے ہٹ جائیں گے، ان کے عقاید بگڑ جائیں گے اور ان کا کلچر تباہ ہو جائے گا۔

جہاں تک ان کے اس مشورے کا تعلق ہے کہ موجودہ سائنس "نہ" مگر ٹکنالوجی "ہاں"، ہمیں یہ کہتے ہوئے دکھ ہے کہ یہ ایک طفلانہ اور راہ سے ہٹانے والا مشورہ ہے۔ ایک عام سوجھ بوجھ کا فرد بھی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا چولی دامن کا رشتہ ہے اور یہ کہ آج کی سائنس کل کی ٹکنالوجی ہے۔ یہ کسی طور ممکن ہی نہیں کہ کوئی ملک یا قوم سائنس میں مضبوط بنیاد بنائے بغیر ٹکنالوجی میں خودکفیل ہو سکے۔ ایسے اتفاق کہیے یا مغرب سے مرعوبیت یا کچھ اور کہ اس قسم کے مشورے دینے والے مسلم دانشوروں میں سے بیشتر مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں قیام پذیر ہیں اور ان کے مشورے اور ترقی یافتہ ممالک کی اس پالیسی میں کہ ترقی پذیر ممالک میں (جس میں اکثریت مسلم ممالک کی ہے) سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے انہیں جدید ٹکنالوجی برآمد کی جائے، کتنی مماثلت ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ترقی یافتہ ممالک چاہے وہ سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترقی پذیر ممالک کو روز بروز بدلتی ہوئی جدید ٹکنالوجی کے لیے دست نگر رکھنا چاہتے ہیں۔

ہمیں احساس ہے کہ بات کچھ طویل ہو گئی لیکن کیا کریں مسلمان اپنی علمی تاریخ سے اتنے نابلد ہیں اور ان کے بعض حلقوں میں سائنس کی بابت کچھ ایسی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ یہ وضاحت ضروری تھی کہ موجودہ سائنس بنیادی طور پر اسلامی تہذیب کا گمشدہ ورثہ ہے، اور اس لیے مسلمانوں میں اس کی ترویج سے اسلامی تہذیب کے تشخص پر آنچ آنے کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس روئداد کے کئی مقالوں میں اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخر میں ہم اس کانفرنس میں منظور شدہ تجاویز کے مدنظر ملک و ملت کے رہنماؤں کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے کہ آج مدارس کی اکثریت سائنس اور ریاضی کو اپنے تعلیمی نصاب کا جز بنانے کے لیے تیار ہے۔ اب یہ ذمہ داری ان کی ہے کہ وہ اس سلسلے کی ضروری سہولتوں کی فراہمی میں ان مدارس کی مدد کریں۔

اسرار احمد

استقبالیہ اور تعارفی خطبہ

اسرار احمد

جناب صدر، مہمان خصوصی جناب سید حامد، جناب پرو وائس چانسلر، علمائے کرام، خواتین و حضرات

آج کا دن میرے لیے انتہائی فخر و مسرت کا دن ہے اور کیوں نہ ہو؟ آج مجھے مرکز فروغ سائنس کے ایک کارکن کی حیثیت سے ان اکابر اور بزرگان دین کو خوش آمدید کہنے کا فریضہ ادا کرنے کا موقع ملا ہے جن کی علمی اور عملی قد آوری کے سامنے ہر بالا قدی ہیچ ہے۔ میں اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے مہمان خصوصی جناب سید حامد کانفرنس کے مندوبین اور دوسرے مہمانوں کو خوش آمدید کہوں۔ اس کے علاوہ مزید سعادت کی بات یہ ہے کہ آج مجھ جیسے سائنس کے طالب علم کو ایک ایسی مجلس کے سامنے اظہار خیال کا موقع ملا ہے جس کے شرکاء میں سے بیشتر حضرات اس پیغام حق کے حامل اور وارث ہیں جس کی حفاظت کا خود ہمارے خالق برحق نے وعدہ فرمایا ہے۔

آج ہمارے خوش ہونے کی ایک بڑی وجہ اور بھی ہے۔ اس افتتاحی نشست میں وہ شخصیتیں موجود ہیں جن کے دردِ ملی، قومی خدمت کے جذبے کی فراوانی اور دور اندیشی کے باعث مرکز فروغ سائنس قائم ہوا، پروان چڑھا اور رجادۂ ترقی پر گامزن ہے۔ اس مرکز کے قیام کی تجویز ہمارے مہمان خصوصی جناب سید حامد کے وائس چانسلری کے دور کے آخری ایام میں پیش ہوئی جسے انہوں نے بخوشی شرف قبولیت بخشا۔ لیکن چوں کہ اس وقت مرکز کے لیے کوئی فنڈ مختص نہ کیا جا سکا

تھا اس لیے یہ منظور شدہ تجویز بے روح رہتی اگر ان کے جانشی[ن] ہمارے موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے فنڈ فر[اہم] کر کے اس کی مسیحائی نہ کی ہوتی۔ جناب سید ہاشم علی اور ان [کے رفقائے] کار پروفیسر وصی الرحمان صاحب نے نہ صرف اس مرکز کو اپ[نے پیروں] پر کھڑے ہونے میں مدد دی بلکہ ہر ہر قدم پر کارکنان مرکز کی [رہنمائی] بھی کی۔

اس کانفرنس کے موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب [ہوگا کہ] اس مرکز کے قیام کا پس منظر اور اس کی غرض و غایت آپ کے [سامنے پیش] کروں۔

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے، ہندوستان میں ... والے نیوکلیر فزکس کے سمپوزیم کے موقع پر ایک گفتگو کے د[وران] ایک ساتھی سائنس داں نے یہ اظہار خیال کیا "یہ بات ... لگتی ہے کہ ملک کے کسی بھی سائنسی مذاکرے میں مسلم شرکا[ء] ایک یا دو فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی جب کہ ملک میں مسلما[نوں کی تعداد] دس فیصدی سے بھی زیادہ ہے۔" پھر اس نے یہ سوا[ل کیا کہ کیا] اسلام سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کا مخالف ہے؟ ... کا جواب جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا میں نے دیا، لیکن اس ... غیر رسمی گفتگو نے ذہن کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ... ساتھی سائنس داں کے اس معصومانہ سوال نے مہمیز کیا ... علمی ماضی پر نظر ڈالی جائے۔ اس شوق و جستجو نے جب

تو معلوم ہوا کہ تقریباً تیرھویں صدی عیسوی تک اس زمانے کے
یدہ بشمول سائنس اور ریاضی کے میدانوں میں تابندگی ہی تابندگی
دورہ تھا اور اس کے بعد تن آسانی، کورانہ تقلید، علمی تکبر، تعصب
بندیوں کا اندھیرا ہی اندھیرا۔ میرے ساتھی کے سوال سے
بھی سامنے آئی کہ کس طرح کسی مذہب کے پیروکاروں کی کسی
دان میں نا اہلی اُس مذہب کے حقیقی خدوخال کو دوسروں کی
سے اوجھل کر دینے کا باعث بن سکتی ہے۔
میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا فرانس میں لگا جہاں یہ لطیفہ سننے

"کسی خیالی بازار میں ایک صاحب انسان کا دماغ خریدنے گئے
ں پر ہر مذہب کے ماننے والوں کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔
ت کرنے پر دوکان دار نے انہیں بتایا کہ ایک یہودی دماغ
ت ایک ڈالر، عیسائی دماغ کی چار ڈالر اور مسلمان دماغ کی
۱۰ ڈالر ہے۔ خریدار حیرت سے بولا۔ عجیب بات ہے یہودی جو
وقت دنیا میں اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے لیے مشہور
ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا۔ دوکاندار
اب دیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد
بعد سے اپنے دماغ کو خرچ ہی کب کیا۔ ان کے دماغ کا سارا مغز
ظ ہے۔"
ملاحظہ فرمایا آپ نے کتنی شدید چوٹ ہے اس لطیفے کے
م کوڑوں کی۔
یہ ہیں وہ ذہنی جھٹکے اور ہمارا اپنا خود کا مشاہدہ کہ ہندوستانی
مان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ملک کے دوسرے فرقوں کے
بلے میں بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے ہوتے چلے جا رہے ہیں جس نے مجھے اور
رفقائے کار ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی اور ڈاکٹر فرحان مجیب کو یونیورسٹی
یر انتظام ایک ایسے مرکز کے قیام کی تجویز پیش کرنے کی راہ پر لگایا
کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان
ماندگی کو منصوبہ بند طور پر دور کیا جا سکے۔
[illegible] کے ترجمہ اگست ۱۹۸۱ء

کے سکشن (c) (2) 5 کے تحت مارچ ۱۹۸۵ء کے اواخر میں قائم کیا گیا
بنیادی طور پر اس مرکز کے قیام کی غرض و غایت، ہندوستانی مسلمانوں
پر سائنسی علوم کی تحصیل و تخلیق کی اہمیت کو واضح کرنا، انہیں اس طرف
راغب کرنا اور مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں بشمول دینی مدارس میں سائنس کی
تعلیم کو فروغ دینے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ اپنے قیام
کے وقت سے اب تک یہ مرکز گوناگوں مشکلات کے باوجود مسلم اسکولوں کے
سائنسی مضامین کے اساتذہ کے لیے پانچ تربیتی کورسوں کا انعقاد کر چکا
ہے جو کافی کامیاب ہوئے۔ گذشتہ سال مرکز نے ایک کانفرنس کا بھی
انعقاد کیا تھا جس میں ملک کے چیدہ چیدہ مسلم سائنس دانوں اور ماہرین
تعلیم نے شرکت کی اور جنہوں نے مرکز کے منصوبوں پر غور و خوض کے
بعد اسے زیادہ مفید اور قابل عمل شکل دی۔ اس کے علاوہ مرکز
مسلم تعلیمی اداروں کی ایک ڈائرکٹری تیار کرنے اور ان کے سروے کا
کام بھی کر رہا ہے۔ اس موقع پر میں اس امر کو ریکارڈ میں لانا چاہوں
گا کہ مرکز کے تحت چلنے والے مختلف پروگراموں کی کامیابیوں میں مجھ
سے کہیں زیادہ میرے رفقائے کار اور سائنس فیکلٹی کے اساتذہ کا
ہاتھ ہے۔
مرکز کے اس مختصر تعارف کے بعد اب میں اس کانفرنس کے اصل
موضوع کے بارے میں چند باتیں گوش گزار کرنا چاہوں گا۔
ہندوستان میں مسلم زیر انتظام جدید تعلیمی اداروں کے مقابلے
میں دینی تعلیمی اداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر صرف
صوبۂ یو۔پی میں ایسی دینی درس گاہوں کی تعداد تخمیناً پانچ سو کے قریب
ہے جہاں درجہ آٹھ کے مساوی یا اس سے اونچی سطح کی تعلیم دی
جاتی ہے اور جن میں دو سو سے لے کر چند ہزار تک مسلم طلباء زیر تعلیم
ہیں۔ وہ دینی مکاتب جن میں پرائمری سطح کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن کی
تعداد ہزاروں میں ہے ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلم ہائی اسکول
اور کالجوں کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے اور ان میں مسلم طلباء کی تعداد
اوسطاً ۶۰ فیصد سے زیادہ نہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال صوبہ بہار
کی ہے۔ بلکہ وہاں پر دینی درس گاہوں کی تعداد مسلم سیکولر اسکولوں
کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ چوں کہ سرکاری اور غیر مسلم سیکولر

اسکولوں میں عموماً مسلم طلباء کی تعداد ملک میں مسلم آبادی کے تناسب سے کافی کم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلم خواندگی کا کم سے کم پچاس فیصد دینی تعلیمی اداروں کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں [illegible] کے کسی بھی منصوبہ بند کام میں دینی مدارس کو نظر انداز کرنا ایک [illegible] حقیقت پسندانہ عمل ہوگا۔

بات اتنے پر ہی نہیں ختم ہوتی، جونیر ہائی اسکول اور [illegible] اسکول میں داخل ہونے والے مسلم طلباء کی اکثریت دینی مکاتب کی راہ سے آتی ہے۔ ان مکاتب میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ نتیجتہً مکاتب کی راہ سے آنے والے مسلم طلباء یا تو خود کو کلاس میں کمزور پاکر تعلیم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا گھسٹتے ہوئے چلتے ہیں اور جیسے ہی موقع ملا ان مضامین بالخصوص ریاضی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ دورِ حاضر میں ریاضی کی اہمیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ سائنسی مضامین کی بات تو درکنار عصری علوم کی ہر شاخ میں کسی نہ کسی سطح پر ریاضی میں عبور حاصل کیے بغیر مہارت حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب خالص ادبی مضامین کے طلباء کے لیے بھی ریاضی کی کچھ نہ کچھ جانکاری ضروری ہو جائے گی۔

اس پس منظر میں دیکھیے اور ماتم کیجیے کہ آج ریاضی میں ہماری کمزوری ضرب المثل بن چکی ہے۔ اس کمزوری کے نتائج کی ایک مثال کے طور پر میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ سائنس کی ایک اہم شاخ فزکس کو پڑھنے سے اکثر مسلم طلباء کتراتے ہیں کیوں کہ اس مضمون کے لیے ریاضی میں مضبوط بنیاد ہونا ضروری ہے۔ شمالی ہند کے تین مسلم تعلیمی اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شبلی کالج اعظم گڑھ، سیفیہ کالج بھوپال میں فزکس کے پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں مسلم طلباء کی تعداد عموماً بالترتیب پچیس فیصد، پندرہ فیصد، اور دس فیصد سے زیادہ شاید ہی کبھی رہی ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں مرکز نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لیے دینی مدارس میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم کی ترویج کی کوشش انتہائی ضروری ہے اور یہ کہ جتنی جلد اس سمت میں عملی قدم اٹھایا جا سکے بہتر ہوگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ابتدا کیسے ہو۔ کیوں کہ ہم اس اندیشے کے اسیر تھے کہ کہیں بعض حلقوں [illegible] ہماری کو دینی معاملات میں مداخلت نہ سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے [illegible] لوگوں سے مشورہ بھی کیا مگر کوئی بات واضح طور پر سامنے نہ آسکی۔ [illegible] کی تفصیل سے قطع نظر میں یہ ضرور بیان کرنا چاہوں گا کہ جب ہمارے [illegible] ساتھیوں نے ہم کو اس سمت قدم نہ اٹھانے کا مشورہ اس خیال [illegible] دیا کہ دینی مدارس ایک انتہائی مفید اور نیک کام کر رہے ہیں اور [illegible] سائنسی تعلیم سے جدیدیت پھیلے گی۔ تو ہم نے جواباً یہ عرض کیا کہ ہم بھی [illegible] کی افادیت کے قایل ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم آپ نے اپنے بچوں کو مدارس میں کیوں نہ بھیجا اور کیوں ہم اس بات کے لیے برابر کوشاں ہیں کہ ہمارے بچے سائنسی مضامین لیں۔ اس سوال کا جواب ان کے اس کے سوا کیا ہو تا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء کا [illegible] مستقبل نہیں۔

قصہ مختصر یہ طے [illegible] کہ قیاس آرائیوں کی بھول بھلیوں میں [illegible] بجائے کیوں نہ ایک سوالنامے کے ذریعے خود دینی مدارس سے یہ [illegible] کر لیا جائے کہ سائنس کو داخلِ نصاب کرنے کے بارے میں ان کی کیا [illegible] ہے۔ ہمارے موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے نہ صرف [illegible] خیال کی پذیرائی کی بلکہ انہوں نے اس بابت دینی مدارس کے نام [illegible] پُر اثر اپیل بھی جاری کی جو یقیناً آپ کی نگاہوں سے گزری ہوگی۔ سوا[illegible] کے ذریعے اس سروے کا کام ابھی جاری ہے لیکن اب تک جتنے [illegible] آئے ہیں ان سے کھل کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ عام قیاس [illegible] مدارس کی ایک اچھی خاصی تعداد سائنس اور ریاضی کو اپنے نصاب میں [illegible] کرنے کے لیے تیار ہے۔

ہمارے سامنے اکثر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مدارس میں سائنس کی ترویج کا فائدہ کیا ہے؟ چوں کہ کانفرنس میں اس موضوع پر [illegible] پُر مغز مقالے پیش ہوں گے اس لیے اس سوال [illegible] گا مگر قطع نظر اس حقیقت کے کہ ملک میں ایک سائنسی [illegible] اور جب کبھی نگاہ نے اس انقلاب سے چشم پوشی کی اس [illegible] [illegible]

ے وہ ذرات ہو، صنعت و حرفت ہو، بزنس ہو، انڈسٹری ہو یا
ر، ہو، سائنس سے آراستگی کے بغیر دلخواہ کامیابی محال ہے۔ اور
یات سے بھی قطع نظر کر سائنس سے رشتہ استوار کیے بغیر مسلمانوں
بھرے دنیائے علم و دانش کے منصب امامت پر فائز ہونا
درکنار عالمی برادری میں ایک باوقار مقام حاصل کر لینا بھی ممکن نہیں۔
مدارس میں سائنس کی ترویج کو اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ انسان
روشن دماغی اور بلند خیالی پیدا کرتی ہے۔ یہ بُرے بھلے کے امتیاز کی
لاحیتوں کو جلا بخشتی ہے اور ان سب سے سوا اس لیے کہ نت نئے سائنسی
نشافات اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے سماجی، معاشی اور سیاسی
بات کے اس دور میں مدارس سے فارغ علماء سائنسی علوم اور
سائنسی طریقۂ کار سے گہری واقفیت حاصل کیے بغیر مسلم کمیونٹی کی دانشورانہ
رہبری کے اپنے فریضے کو بخوبی انجام نہ دے پائیں گے۔

اس کانفرنس کے بلانے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جدید تعلیمی
اداروں اور مدارس سے وابستہ افراد یکجا ہو کر سائنسی تعلیم کی بابت
یک دوسرے کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہوں اور مدارس میں سائنسی تعلیم
سلسلے میں حائل دشواریوں کا حل تلاش کریں۔ ہمارے سروے نے یہ واضح
کر دیا ہے کہ مدارس کی اکثریت سائنس کی پذیرائی نہ کرے گی
اس لیے اب ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح مدارس کے
بنیادی مقصد پر اثر انداز ہوئے بغیر ان کے نصاب میں حسب ضرورت
سائنس کو داخل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ کانفرنس اس
بنیادی مسئلہ کا حل تلاش کر لینے میں کامیاب ہوگی اور ہم یہ جان سکیں گے کہ
مدارس کے مختلف درجات میں سائنس اور ریاضی کے لیے کتنی گنجائش نکل
سکتی ہے۔ اس کانفرنس کے مذاکرات سے جو نتیجے نکلیں گے اس کی روشنی
میں مرکز مدارس کے لیے سائنس کی کتابوں کی تیاری کا فریضہ بھی انجام دے
گا اور مدارس کے اساتذہ کے لیے طویل مدتی تربیتی کورس بھی منعقد
کرے گا۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں مرکز کی جانب سے اس کانفرنس
کے تمام مندوبوں، مقالہ نگاروں اور شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کرتا
ہوں۔ بالخصوص ہم مہمان خصوصی جناب سید حامد کے تہ دل سے شکر گزار
ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کانفرنس میں
شریک ہونے کے ہمارے دعوت نامے کو قبول کیا۔ ہم اپنے شیخ الجامعہ
جناب سید ہاشم علی کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس
کی بھرپور سرپرستی فرمائی اور اپنی گہرائی مصروفیات کے باوجود اس
نشست کی صدارت کرنا قبول فرمایا۔ ہم اپنے پرو وائس چانسلر
پروفیسر وصی الرحمٰن صاحب کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے قدم قدم
پر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

یہ عین ممکن ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری اور افراد و وسائل کی کمی
کے باعث آپ ہماری مہمان نوازی میں کچھ کوتاہی محسوس کریں، اس
کے لیے ہم پیشگی معافی کے خواستگار ہیں۔

مدارس اور سائنسی تعلیم

سید حامد

زندگی میں بہت سی چیزیں ' ناقابل تقسیم' ہیں۔ مثال کے طور پر شخصیت سچائی اور عدل کو لیجیے ۔ انہیں کے زمرے میں علم آتا ہے۔ مسلمانوں سے اپنے طویل دورِ انحطاط کے آغاز میں بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے علم کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔

دینی علم ' عصری علم

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب علم کی دو خانوں میں تقسیم تھی تو اس بات کی تصدیق تاریخ کرے گی۔ اوائل اسلام کے دور میں مسلمانوں کی تسخیرات، علم اور ایمان کی رہین منت تھیں ۔ امتدادِ ایام نے اوّل الذکر کو ضعیف اور خود مسلمانوں نے، حسن نیت کے ساتھ دفاعی جذبے کے تحت، مفلوج کر دیا اور دینی اور عصری علوم اس حد تک الگ ہوگئے کہ ان کے طالب تک بٹ گئے ، دونوں کی دنیائیں الگ ہوگئیں اور ملت دو لخت ہوکر رہ گئی ۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کے اقبال مندی کے دور میں جغرافیائی فتوحات ذہنی اور علمی تسخیرات کے شانہ بشانہ چلیں۔ سائنس کا مشہور مورخ جارج سارٹن کہتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک ساری دنیا کے علوم میں جو اضافے ہوئے وہ عربوں اور مسلمانوں کی بدولت ہوئے۔ بارہویں صدی سے ڈھلان کا زمانہ شروع ہوا جس کی رفتار سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے بہت تیز ہوگئی۔ علمی پیش رفت کا نتیجہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں؛ اس وقت ہم علمی پسماندگی اور بازگشت کے نتائج سے دوچار ہیں۔ ہم نے اپنے مدارس کے نصاب کو یا تو دینی تعلیم تک محدود رکھا یا اس میں ان غیر دینی مضامین کو شامل رکھا جن کو دنیا میں علوم کی ترقی نے فرسودہ اور از کار رفتہ کر دیا تھا۔ یہاں اس خوردہ گیری سے مدعا ان بزرگوں کی نیت پر شبہ کرنا [illegible] ان کا حسنِ نیت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، مدعا صرف یہ ہے کہ حسنِ نیت کے ساتھ ان سے فیصلہ کرنے میں سہو ہوا۔ ان کی منشا یہ تھی کہ بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے مسلمانوں کی کشتی کو محفوظ کیا جائے۔ ان کا [illegible] دفاعی تھا اور دفاع نقطۂ نگاہ کی شکل اختیار کرلے تو وہیں پسپا[ئی] اور تنزل شروع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ صدیوں سے یہی ہوتا آیا اور اب یہ عالم ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر مسلمان تعلیمی اعتبار سے دنیا کی پسماندہ ترین جماعتوں میں سے ہیں۔ ایک جائزے نے یہ عبرت [انگیز] انکشاف بھی کیا ہے کہ اسلامی ممالک کی عام معاشی پسماندگی کے علاوہ ان ممالک میں جہاں مذہب کے اعتبار سے آبادی مخلوط ہے ان کا شمار آبا[دی] کے تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ترین طبقے میں ہوتا ہے ۔

دنیا کی ترقی کی رفتار دن بدن تیز ہوتی جا رہی ہے یہ سب [illegible] سائنس یعنی علوم اور ٹکنولوجی کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ علوم کے ذخیرے کو دوگنا ہونے میں قرنہا قرن لگتے تھے اور اب یہ عالم ہے کہ عالمی علوم ہر سات سال کے اندر دوچند ہوجاتے ہیں۔ اس دور میں [illegible] ہونے کے لیے ضروری ہے کہ علوم کی ترقی کی اس رفتار کا ساتھ دیا [جائے] درآں حالیکہ ہم ان غیر دینی مضامین کو جن کی حیثیت اب تقویم پارینہ [سے] زیادہ نہیں ابھی تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بہت کھلی ہوئی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب کی تشکیل نو اس طرح سے ہو کہ ان کا دینی عنصر محفوظ رہے اور ان کے غیر دینی مضامین کو [illegible] کے ساتھ ہم قدم کر دیا جائے ۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ادیان و مذاہب میں جتنا زور
صیل علم پر اسلام نے دیا ہے اتنا زور کسی دین یا مذہب نے نہیں
یا۔ نصوص قرآن و احادیث رسولؐ تدبر و تفکر، تحصیل علم و آگہی کی
لید کرتی ہیں۔ نفس دین کا تعلق ان دوامی حقیقتوں سے ہے جو تغیر ناپذیر
ں، بقیہ علوم ہر آن بدلتے رہتے ہیں، آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ ان بقیہ علوم میں
ہمارا واسطہ علوم کی ممیوں سے نہ ہونا چاہیے جو ہزارہا سال سے زندگی سے
محروم ہیں، بلکہ زندگی پر استہزا کی شکل میں اہرام مصر یا ان کے باہر محفوظ ہیں
، بات بھی غالباً تشریح طلب نہ ہوگی کہ زندگی کی طرح علوم کا کارواں بھی ہر لمحہ
آگے بڑھ رہا ہے اور کارواں کے جو افراد ایک لمحہ بھی تلووں سے کانٹا نکالنے
کے لیے رکتے ہیں وہ شاعر کی زبان میں صدہا سال پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھیے
، اس کائنات میں جہاں ہر شے حرکت میں ہے، اس گنبد دوّار کے نیچے جہاں
حرکت و نہضت کا دور دورہ ہے اور خود اس ارض پر جو کہ ہمہ وقت نہ صرف
خورشید کے گرد گردش کرتی ہے بلکہ اس طرح کی حرکت سے مطمئن نہ ہو کر
اپنی دھری پر بھی رقصاں رہتی ہے، کوئی جواز اس بات کا نہیں ہے کہ انسان
آرام اور سکون اور توقف و تأمل اور پسپائی اور بازگشت کو ریاضت و
حرکت، عمل اور پرواز اقدامیت اور پیش رفت پر ترجیح دے۔
اوّل الذکر حالتیں موت کی نشاندہی کرتی ہیں اور آخر الذکر زندگی کی
غماز ہیں۔

اوپر کی گفتگو سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہوگی کہ تحصیل علم سے کوئی مفر
نہیں، یہ بھی کہ علم ہمہ گیر اور ناقابل تقسیم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ علم کی ترقی کی رفتار
خوش خراموں اور سست رووں کی متحمل نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا ہمارے دینی
مدارس بھی اس آگہی کو جذب کیے بغیر جو مختلف علوم نسل انسانی کو بخش رہے
ہیں اور اس رفتار کو اختیار کیے بغیر جو زندگی نے اپنائی ہے، فرسودہ
اور دور از کار ہو جانے سے بچ نہیں سکتے۔

ایک دوسرے زاویے سے بھی جو خالصتاً دین کے مقاصد کو اپنی گرفت
میں لاتا ہے، اس مسئلے کو دیکھیے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل
ضابطۂ حیات ہے، نتیجہ لامحالہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا دین زندگی کے سارے گوشوں
کو محیط ہوگا۔ وہ خانقاہوں میں جا بیٹھنے کی تعلیم دینے کے بجائے عملی زندگی میں
ہماری رہنمائی ہر قدم پر کرے گا۔ ہم جانتے ہی ہیں کہ عملی زندگی میں دنیا

تو آتا ہی ہے دنیا اپنی ساری وسعتوں، پیچیدگیوں اور رعنائیوں کے
ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور انسانوں
کی مختلف بستیوں کے ایک دوسرے پر انحصار کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری
ہو جاتا ہے کہ ہمارے مدارس میں وہ اہم علوم بھی پڑھائے جائیں جنہوں
نے گذشتہ دو سو سال میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور
جن کے ہمہ گیر اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے اثرات سے کوئی متنفس محفوظ نہیں
رہ سکتا۔ اگر ہمارے علما عہد حاضر کے بے شمار پیچیدہ مسائل سے
دوران تعلیم واقفیت حاصل نہیں کریں گے تو وہ ملت کی موثر اور بر جہت
رہنمائی کس طور پر کر سکیں گے۔

ایک پہلو یہاں اور بھی لائق توجہ ہے۔ یہ دور دین سے بے تعلقی
کا دور ہے؛ جو گہری وابستگی دین سے اس صدی کے آغاز تک باقی
تھی وہ اب تقریباً تار تار ہو چکی۔ وسائل کے ذریعے دین پر یلغار کب
نہیں ہوئی۔ ایک طرف الحاد کی طاقتیں دوسری طرف دوسرے مذاہب اس
پر کمربستہ نظر آ رہے ہیں کہ دین اسلام کو جو پہلے سے ہی غلو گزیں ہو گیا
ہے یورشیں کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ امید یہ کی جاتی ہے کہ ہمارے
مدارس کے فارغین معاندین کے حملوں اور اعتراضوں کا جواب دیں گے
مگر کیا ہم نے ان کو یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا بھی ہے؟ کیا ان
کی عام آگہی اور دوسرے متعلقہ علوم سے ان کی واقفیت اس معیار
کی ہے کہ وہ الحاد اور دوسرے مذاہب کے مبلغین کے ساتھ برابر
کی سطح پر استدلال کے انداز میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ
جس کسی سے یہ سوال کیا جائے گا وہ بنا تامل اور بنا آنکھ جھپکائے یہ کہے
گا کہ سوال کا جواب نفی میں ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تیز رو
اور پُرخطر زمانے میں جب کہ نہ صرف افراد بلکہ جماعتیں ملتیں اور
قومیں یا تو آتش فشاں کے منھ پر یا باڑھ کی زد میں ہیں، ہمیں خود کو سنبھالنے
میں ایک لمحے کی دیر بھی کرنی چاہیے یا نہیں؟ اگر ہم اس روش کے قایل
ہیں جس پر ہم ایک عرصے سے چلے آ رہے ہیں تب تو سیلاب میں بہہ جانا یقینی
ہے اور اگر ہم پرانی روش ترک کر کے خود میں زندگی سے عہدہ برآ ہونے
کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دو کام کرنے چاہییں۔

۱۔ اپنی اس جہالت کو جو ایک موٹے تخمینے کے مطابق ہماری آبادی

کے ۰۰ فیصد کو گھیرے ہوئے ہے جلد سے جلد پوری ملی کوشش کے تحت دور کیا جائے۔

۲۔ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اہم عصری مضامین بھی پڑھائے جائیں۔

ایک اور پہلو اس مسئلہ کا غالباً اس کی اہمیت کو منظرِ عام پر لے آئے۔ انسان نے ہمیشہ مادی وسائل کی کشش محسوس کی ہے موجودہ زمانے میں ٹکنالوجی اور صنعت اور پیداواری صلاحیتوں کی ترقی اور توسیع نے اس طلب کو بہت تیز کر دیا، صارفیت کا بول بالا ہے اور انسان انواع واقسام کے سامان نمائش وآسایش کی ترغیب کے مقابلے میں سپر انداز ہو چلا ہے۔ اس کا ایک بہت بُرا اثر ہمارے دیکھتے دیکھتے دینی مدارس پر یہ پڑا کہ مستثنیات کو چھوڑ کر ان مدارس میں والدین ان بچوں کو ہی بھیج رہے ہیں جن کی تعلیم کے اپنے مالی دشواریوں کی وجہ سے وہ کفیل نہیں ہو سکتے یا جن کی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے انھیں یہ توقع نہیں ہے کہ وہ انگریزی اسکولوں میں کامیاب ہو سکیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اس وضع کے طالب علم دستارِ فضیلت باندھیں گے تو وہ مسلمانوں کی رہنمائی کیوں کر کریں گے اور دوسرے مذاہب والوں کو اسلام سے متعارف کیوں کر کرائیں گے اور ادیان پر بالعموم اور اسلام پر بالخصوص آئے دن جو اعتراضات ہوتے رہتے ہیں ان کا شافی اور مسکت جواب کیسے دیں گے؟

میں نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ ہمارے دینی مدارس کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کے اہم مضامین ضرور پڑھانے چاہئیں، پڑھائے جائیں تو کیوں کر؟ پہلے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ موجودہ نصاب کے کن اجزاء کو حذف کیا جائے تاکہ ایسے اہم مضامین جیسے کہ ریاضی، سائنس اور انگریزی کے لیے جگہ مل سکے اس سلسلے میں غیر دینی مضامین میں زبردست تبدیلی کرنا پڑے گی اور غالباً کل نصاب میں ایک یا دو سال کی مدت کا اضافہ بھی کرنا ہو، اس سے بھی ایک اہم سوال وسایل کا ہے۔ ہمارے بیشتر دینی مدارس مالی مشکلات سے دوچار ہیں اور ان میں سے بیشتر ملت کی بے التفاتی کا شکار ہیں۔ وہ اپنے معلمین کو بہت قلیل تنخواہیں دے کر کسی طرح گزر کر رہے ہیں اور یہ طبقہ اس وابستگی کی بنا پر جو اسے دین کے ساتھ ہے بلاعذر کے قلیل تنخواہیں قبول کر لیتا ہے۔ لیکن گرانی اور مادیت کے اس دور میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ محض دین کی خاطر اساتذہ قلیل تنخواہوں کو قبول کریں گے اور جہاں تک کہ سائنس اور ریاضی اور انگریزی کا تعلق ہے اس کو پڑھانے والے بازار کی شرح کی پیروی پر اصرار کریں گے۔ کچھ ادارے شاید ایسے بھی ہیں جو اس مطالبے کو مان لیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انہیں ایک اور مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑے گا، کیا ایک ہی ادارے کے اساتذہ کو دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے؟ ایک وہ جو دینی مضامین پڑھاتے رہیں گے اور قلیل تنخواہوں پر صبر وشکر کے ساتھ زندگی گزار دیں گے، دوسرے وہ جو جدید مضامین پڑھانے کے لیے عصری تعلیمی اداروں میں مروجہ شرح مشاہرہ لینے پر اصرار کریں گے۔ تنخواہوں میں اس قسم کا فرق رکھنا بہت سی ناروا رنجشوں اور چشمکوں کو جنم دے گا۔ علاوہ بریں یہ طریق کار کسی کو بھی، خصوصاً دینی مدارس کو، زیب نہیں دیتا کہ قدر وقیمت کے لحاظ سے غیر دینی تدریس کو دینی تعلیم پر فوقیت دی جائے، اس طرح دین اور اس کی تعلیم کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

مذکورہ دشواری کے حل کی طرف پہلا مثبت قدم سید ہاشم علی صاحب شیخ جامعہ کے زیر ہدایت اور پروفیسر اسرار احمد صاحب پروفیسر شعبہ طبعیات کے اہتمام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اٹھایا۔ اس طرح اس نے ان توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے عظیم بانی سید والا گہر نے ابتداً اس سے وابستہ کی تھیں اور حسنِ اتفاق سے جس قسم کی خدمت کے لیے یونیورسٹی کو اس کے نئے چارٹر نے مکلف کر دیا ہے۔ ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کی ایک دفعہ کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی وثقافتی ترقی کے لیے کوششیں کرے، موجودہ کوشش جس نے آپ کو آج یہاں جمع کیا ہے، اسی اختیار کو استعمال کرنے کا ایک مبارک ثبوت ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم مدارس میں ان اساتذہ کو بڑے بڑے مشاہروں پر رکھیں جو عصری شرح مشاہرہ کے عادی ہو چکے ہیں یونیورسٹی کی طرف سے یہ اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اسلامی مدارس کے فارغین اور ان کے موجودہ اساتذہ کو کچھ مدت کے کورس

ذریعے اس قابل کر دیا جائے کہ وہ سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھا سکیں، یہ
پہلا قدم ہے، ابھی کئی قدم اور اٹھانے ہوں گے اور خود پہلا قدم عجب نہیں کہ ہموار
سطح پر نہ پڑے۔ ہمیں اس ہفت خواں کی دشواریوں کی توقع اور اُن کی تیاری
ابھی سے کرنا چاہیے۔ ہمیں ان دشواریوں، رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا ذکر
کرکے آپ کو نہ بددل کرنا چاہوں گا نہ بے کیف، اس حوصلے پر جس کا
مظاہرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا ہے کسی قسم کی ضرب اندیشہائے دور و
دراز سے نہ پڑنی چاہیئے۔ ہم پوری ملت کو اس بے حد اہم کام میں جو یونیورسٹی
نے اپنے ذمّے لیا ہے تعاون دینا چاہیے۔ دراصل ہمارا فرض ہے کہ شہر شہر
قریہ قریہ کوشش کر کے وسائل فراہم کریں تاکہ ہمارے مدارس کو عام طور پر
جو موسمی دشواریاں پیش کر رہی ہیں ان سے انہیں نجات ملے، اور اس سے بڑھ
کر وہ اہم عصری مضامین کو اپنے نصاب میں داخل کر کے چلانے کے متحمل ہو سکیں
مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے بیدار مغزی اور دوراندیشی سے کام نہیں لیا اور
اس مستحسن اسکیم کو زبانی خراج ادا کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے، تو ان عزائم
کو جنہیں لے کر یہ عظیم یونیورسٹی اٹھی ہے، ٹھیس پہنچ جائے گی، خدا نہ کرے کہ
ایسا ہو۔ آپ کے علم کے لیے میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ دینی تعلیم کے اداروں
کو ایک لڑی میں پرونے کی خاطر اتر پردیش میں ایک انجمن "دینی تعلیمی کونسل"
کے نام سے قایم کی گئی تھی، اس انجمن نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو ہم
کم ہمتوں کے تصور سے بھی آگے ہے۔ حال ہی میں اس انجمن کا سالانہ اجلاس
بنارس میں ہوا جس میں یہ طے پایا کہ دینی تعلیمی اداروں کو ایک لڑی میں
پرونے کے لیے اور دینی تعلیم کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے
کہ ہر ریاست میں ایک دینی تعلیمی کونسل بنائی جائے اور پھر مرکزی فیڈریشن
معرضِ وجود میں لایا جائے جو اس نظام کی نگرانی اور نگہبانی اور دستگیری
کرسکے۔ میری گذارش یہ ہوگی کہ اس اجلاس میں اس قرارداد کی تائید کی جائے
اور ان اقدامات کی نشاندہی بھی جس کے ذریعے ہم اس تنظیمی مقصد کو حاصل
کرسکیں۔

دینی اداروں میں انگریزی اسکولوں کے مساوی انگریزی، سائنس
اور ریاضی کے مضامین کو داخل کرنا ایک انقلابی اور عہد آفریں قدم ہوگا۔ اس
قدم کو اٹھانے کے لیے تیاری کے بہت سے مراحل طے کرنے پڑیں گے۔ مبادا
کہ ہم اصلاح و تجدید کے جوش میں تیاری کے مراحل کو ایک چھلانگ میں طے کرنا
چاہیں۔ حزم کا تقاضہ ہے کہ پہلے ایک چھوٹی بساط پر تجربہ کر کے دیکھا جائے
اور تجربے کی روشنی میں ضروری ترمیمیں کرنے کے بعد اس پروگرام کو
پھیلایا جائے۔ ہمیں دانستہ یا نادانستہ ایسی صورتِ حال پیدا کرنے سے
پرہیز کرنا چاہیے جو اکثر دینی مدارس کے طلبا میں نئے مضامین کے شمول کے
لیے ضابطہ سوز اور اطمینان شکن بے تابی پیدا کر دے۔ خطبہ دینے والا خود
ایک عرصے سے عصری مضامین کے شمول پر مصر رہا ہے؛ وہ خوش ہے کہ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی نے اس ضمن میں ایک قابل قدر مثبت قدم اٹھایا ہے لیکن وہ
یہ سمجھتا ہے کہ اس تصور کو عام کرنے اور اس پروگرام کو توسیع دینے سے
پہلے ملک گیر سطح پر مالی، افرادی اور تربیتی وسائل کا اہتمام بے حد ضروری
ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نفع کے بجائے نقصان کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ ہمیں اپنے اکابر علماء سے اجتماعی طور پر یا فرداً
فرداً اس اہم مسئلہ اور اس کی تفصیلات اور جزئیات پر مشورہ کرنا
چاہیے۔ وہاں سے مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا ہے، لیکن اتنا اہم فیصلہ ان
کے بیٹھ پیچھے کرنا روا نہ ہوگا۔ اچھا ہو اگر اس کانفرنس کی دوسری کڑی
کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علمائے عظام اور دینی جامعات کے
اربابِ اہتمام کو ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے دعوت دے جو موجودہ
کانفرنس کے نتیجے کے طور پر ترتیب پائیں۔

معلوم نہیں ایسا ہو بھی سکے گا یا نہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ مذکورہ
عصری مضامین کے داخلِ نصاب ہونے کے بعد بھی عربی جامعات اور مدارس
میں سنجیدگی، انہماک، شائستگی اور ریاضت، ادب اور لحاظ اور
بے طمعی کی وہ فضا قایم رہے جو انہیں عصری اداروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جامعہ ہدایت جے پور کے ایک سمینار میں اس کم سواد کو یہ تجویز
رکھنے کا موقع ملا تھا کہ ان عربی مدارس اور جامعات میں جنہیں ضروری
وسایل دستیاب ہیں؛ تین طرح کا نصاب بیک وقت چلایا جاسکتا ہے
ایک صرف دینی؛ دوسرا دینی اور سائنسی (بشمول انگریزی و ریاضی) اور
تیسرا دینی اور حرفتی۔ لائحہ عمل کو بالآخر طے کرتے وقت اس تجویز پر بھی
غور ہو سکتا ہے۔

جن لوگوں کو کھیل کی دنیا سے شناسائی ہے (اور یہ کہنے
کی چنداں ضرورت نہیں کہ کھیل زندگی کی نقل کرتے ہیں اور اپنے ڈھنگ

سے گزارنے کی تربیت دیتے ہیں) وہ جانتے ہیں کہ ہر اچھا کھلاڑی خود کو پہلے اسی عمل سے گزارتا ہے جسے گرمانا کہتے ہیں۔ اس عمل کے باعث ایک طرف دوران خون بتدریج تیز ہوتا ہے دوسری طرف ساری شخصیت اپنے جسمانی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ مقصد پر مرکوز ہوتی ہے۔ بازی گاہ کے باہر زندگی کے دوسرے مقاصد، مشاغل اور منصوبوں کی کامیابی کے لیے بھی گرمانے کا عمل ناگزیر ہے اور وہاں اس عمل سے مراد ہے جزئیات کے ساتھ تیاری اور پہلے چھوٹے پیمانے پر تجربہ۔

ہمارے دینی مدارس میں ایک عرصے سے جمود کا عالم ہے۔ جناب سید ہاشم علی صاحب کی حوصلہ افزا قیادت اور پروفیسر اسرار احمد صاحب اور ان کے رفقائے کار کی بالغ نظری، جرأت اور ریاضت نے اس جمود کو توڑنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ قدم اور اس کے بعد میں آنے والے اقدامات ہماری ملت کی دو لخت کیفیت کو مٹائیں گے اور مدارس کے فارغین کی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ کریں گے۔

ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے عوام اس اہم اور عصر آفریں مہم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مشورہ اور تعاون دیں۔

سرسیدؒ کی آرزو

"یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم، قوم نہ رہے۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو و پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قایم رکھنے ہی سے ہماری قوم، قوم ہے۔

اے عزیز بچو! اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام کو قایم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قایم رکھو گے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاویں گی۔"

سرسیدؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۹، شمارہ ۵ (مئی ۲۰۰۰ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

الطاف احمد اعظمی (علیگ)

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت پر اظہار خیال سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں دینی مدارس میں مروج نصاب تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس عہد کے نصاب تعلیم کے اجزائے ترکیبی کیا تھے اور اس میں عہد بہ عہد کس نوع کے تغیرات و اضافات ہوئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے باضابطہ عہد اقتدار کی مدت تقریباً چھ سو سال ہے جو بارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک قایم رہا۔ اس طویل عہد کو تفہیم نصاب کے لیے میں پانچ ادوار میں تقسیم کر رہا ہوں۔

دور اول

یہ دور ساتویں صدی ہجری یعنی شمس الدین التمش (۱۲۱۰—۱۲۳۵ء) کے عہد حکومت سے شروع ہوا اور تقریباً ڈھائی سو برس تک چلا۔ اس دور میں علوم آلیہ و نقلیہ مثلاً نحو، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف، منطق اور کلام جیسے علوم اکثر مدارس میں داخل درس تھے[1] لیکن معیار کمال فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فاتحین ہند کا تعلق غزنی اور غور جیسے علاقوں سے تھا، جہاں ان علوم کو رتبہ بلند حاصل تھا اور ان کی تحصیل کو سند فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستان میں بھی ان علوم پر زیادہ توجہ صرف کی گئی اور ان ہی کو معیار فضیلت تسلیم کیا گیا۔ اس دور میں حدیث کی حیثیت فقہ کے بالمقابل ثانوی تھی اور صرف ان ہی احادیث کو در خور اعتنا سمجھا جاتا تھا جو فقہ حنفی کی موید ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں فقہی عصبیت عروج کے نصف النہار پر تھی اور فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے مسالک فقہ کے خلاف شدید بغض و عناد کا رویہ رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحئی اپنی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الهند میں لکھتے ہیں:

اس دور میں فتاوی کی کثرت ملتی ہے اور کتاب و سنت پر فقہ کو تفوق حاصل تھا اور سنن ماثورہ سے مجتہدات کو تطبیق دی جاتی تھی۔ حدیث میں علماء کوتاہ نظر واقع تھے۔ مشارق الانوار سے آگے ان کی نظر نہ جاتی تھی اور جو شخص بغوی کی مصابیح السنہ پر عبور حاصل کر لیتا تھا وہ خود کو محدث سمجھتا تھا، فقہی عصبیت درجۂ عروج پر تھی۔ غیاث الدین تغلق اس عہد کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ غنا کے شوقین تھے، علماء نے اس پر اعتراض کیا، مقدمہ بادشاہ مذکور کے سامنے پیش ہوا۔ بادشاہ نے شیخ کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور علماء سے کہا کہ وہ اس مسئلہ میں شیخ سے مناظرہ کریں۔ جب شیخ نے اپنے مسلک کی تائید میں مروی احادیث پیش کیں تو علماء نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ "ہمارے وقت میں فقہ کو حدیث پر برتری حاصل ہے" اور بعض علماء نے یہ تک کہہ دیا کہ ہم ان احادیث کو سننا بھی نہیں چاہتے۔ کیوں کہ ان سے شافعی نے استدلال کیا ہے اور وہ ہمارے مذہب (فقہ حنفی) کا دشمن ہے۔"[2]

دور دوم

یہ دور سلطان سکندر لودی (۱۴۸۸ - ۱۵۱۰ء) کے عہد حکومت سے متعلق ہے۔ اس دور میں فقہ کے پہلو بہ پہلو علوم عقلیہ کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ اس سلسلے میں شیخ عبداللہ طلبی اور شیخ عزیز اللہ کی مساعی کو بڑا دخل

۴۔ یہ دونوں بزرگ ملتان کی خانہ ویرانی کے بعد دہلی اور سنبھل میں وارد ہوئے اور منطق اور علم کلام کو فروغ دیا۔ ملّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

"واز جملہ علماءِ کبار عہد سکندری شیخ عبداللہ طلبی در دہلی
و مولانا عزیز اللہ در سنبھل بودند۔ این ہر دو عزیز در
ہنگامِ خرابیِ ملتان بہندوستان آمدہ۔ علم معقول را دران
دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح
صحائف از علم منطق و کلام در ہند شایع نہ بود۔"

اس دور میں خراسان سے جو علماء آئے وہ علامہ میر سید شریف، علامہ تفتازانی اور عارف جامی کے تلامذہ میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے اساتذہ کی کتب معقولات کو درس میں داخل کیا اور اس طرح علوم عقلیہ کو مزید فروغ ملا

دور سوم

اس دور کا تعلق عہد مغلیہ (۱۵۲۶ - ۱۷۰۷ء) سے ہے۔ اس عہد زریں میں مغل سلاطین کی علم دوستی، علماء نوازی اور اُن کے غیر معمولی جود و سخاوت کی شہرت سن کر ایرانی علماء و فضلاء بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور اسی سرزمین کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔ ان نو واردین میں جلیل القدر اطباء و شعراء مشاہیر معقولات اور دانایان رموز مملکت شامل تھے۔ اس سلسلے میں خطیب ابوالفضل گازرونی، ملّا عماد الدین محمد طاری اور امیر فتح اللہ شیرازی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر شہر گجرات میں وارد ہوئے اور مؤخر الذکر شہنشاہ اکبر کی دعوت پر دکن سے آگرہ میں فروکش ہوئے۔ یہ تینوں علماء ذی شان جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ ایرانی اساطین علم و فن کی کتابیں بھی لائے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ متاخرین ایرانی علماء کی کتابوں کو جو شخص ہندوستان لایا اور اسے درس میں داخل کیا وہ امیر فتح اللہ شیرازی تھا اور اسی کی کوششوں سے ہندوستان میں معقولات کی اشاعت ہوئی۔ انہی کے الفاظ میں:

"تصانیف علماء متاخرینِ ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین
و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و
در حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حلقہ نشینان محفل میر استفادہ
کردند و از ان عہد معقولات را رواجی دیگر پیدا شد۔"

اس دور میں فلسفہ و منطق سے اہل علم کے شغف و انہماک کا جو عالم تھا اس کی تصویر مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

واعلم ان الناس کانوا یتہافتون علی
المنطق والحکمۃ تہافت الظمآن علی الماء
[لوگ منطق و فلسفہ پر اس طرح (دیوانہ وار) ٹوٹے پڑتے
تھے جیسے تشنہ لب پانی پر ٹوٹتا ہے۔']

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اس دور کے آخری نامور عالم دین تھے۔ الجزء اللطیف میں انھوں نے اپنی درسیات کی جو فہرست دی ہے اس میں نحو، منطق، فلسفہ، کلام، فقہ، اصول فقہ، بلاغت، ہیئت، حساب، طب، حدیث، تفسیر اور تصوف و سلوک جیسے علوم شامل تھے۔

دور چہارم

یہ دور ملّا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی علمی مساعی سے عبارت ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ہم عصر تھے۔ ہندوستان میں درسِ نظامی کی تشکیل جدید کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ انہوں نے دینی مدارس کے لیے جو نصاب تعلیم مرتب کیا اس میں علوم عقلیہ کو علوم نقلیہ پر برتری حاصل تھی۔ چنانچہ فقہ کی تعلیم صرف ہدایہ اور تفسیر کی تعلیم جلالین اور بیضاوی کے چند پاروں تک محدود تھی۔ حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح شامل درس تھی۔ تصوف و سلوک جو شاہ ولی اللہ کی درسیات میں شامل تھے، نکال دیا گیا۔ علوم عقلیہ میں منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت نصاب میں شامل تھے اور ان علوم سے متعلق درسی کتب کی تعداد علوم نقلیہ کی نسبت زیادہ تھی۔ فلسفہ میں دیگر کتابوں کے علاوہ ملا محمود جونپوری کی شمس بازغہ داخل درس تھی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے اصحابِ علم علوم عقلیہ کی طرف بہت زیادہ جذب و میلان رکھتے تھے اور ان کی تحصیل کو لازمۂ کمال سمجھتے تھے۔

دور پنجم

اس دور کا تعلق انگریزی عہد اقتدار سے ہے جو دراصل مسلمانوں کے سیاسی و علمی زوال کا نقطہ آغاز ہے۔ اس دور میں دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم مروج تھا وہ چند ترمیمات و اضافات کے ساتھ قدیم

سا جو دور چہارم میں تھا، معقولات کی طرف اہل علم کی توجہ درسی کتب کی حد تک زیادہ رہی۔ صرف منطق کی پندرہ کتابیں درس میں شامل تھیں۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان میں علوم جدیدہ داخل ہوئے اور قدیم و جدید علوم کے درمیان ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا۔

سطور بالا میں ہم نے ہندوستان کے عہد اسلامی میں مروج نصاب تعلیم کا اختصار کے ساتھ جو جائزہ لیا ہے اس سے یہ امر بالکل واضح ہوگیا کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں فقہ، حدیث اور تفسیر جیسے خالص دینی علوم کے ساتھ منطق، فلسفہ، علم ہیئت، ریاضی اور طب جیسے خالص دنیوی علوم کی تعلیم کو نہ صرف ملحوظ رکھا گیا بلکہ ان کو علوم نقلیہ پر فوقیت حاصل رہی۔ اس عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس میں دینی اور دنیوی علوم کے نام پر الگ الگ مدارس قایم نہ تھے بلکہ جملہ مروجہ علوم کی تعلیم ایک قسم کے مدرسے میں دی جاتی تھی، بالفاظ دیگر علوم کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن فرنگی اقتدار کے استحکام بالخصوص ۱۸۵۷ء کے خونچکاں حادثہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں نے جو مدارس قایم کیے اور ان کے لیے جو نصاب تعلیم مرتب کیا اس میں علوم نقلیہ وعقلیہ میں صحیح توازن قایم نہ رہ سکا۔ حتی کہ اکثر مدارس کے نصاب تعلیم سے علم ہیئت، ریاضی اور طب کو نکال دیا گیا۔ منطق و فلسفہ جزو نصاب تو رہے لیکن وہی قدیم فلسفہ و منطق جس کے اکثر مسایل کو فلسفۂ جدید نے رد کر دیا تھا، اس کے علاوہ منطق و فلسفہ کی تعلیم کی طرف اہل علم کا وہ میلان باقی نہ رہا جو پہلے تھا۔ اس کی جگہ فقہ اور حدیث جیسے علوم نے لے لی اور اب تک یہی علوم دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے طغرائے امتیاز ہیں۔

چوں کہ انگریزی اقتدار میں سرکاری ملازمت کا حصول، علوم جدیدہ کی تحصیل کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لیے دینی مدارس کے علاوہ ایسے مدارس بھی قایم کیے گئے جن میں خالص دنیوی تعلیم کا طریقہ رائج ہوا اور اس طرح دینی اور دنیوی علوم کے جداگانہ مدارس وجود میں آگئے، اور یہی صورت ابتک قایم ہے۔ دنیوی مدارس علوم دینی سے اور دینی مدارس عصری علوم سے بے بہرہ ہیں۔ ایک نے دینی دل کا نور کھویا اور دوسرا تعقل اور جدت فکر کی روشنی سے محروم ہوا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اندوہناک صورت حال تابکے قایم رہے گی اور ہم خود فریبی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ابھی کتنے دن اور بھٹکیں گے۔

دینی مدارس کے ارباب حل و عقد نے اب تک جن وجوہ سے سائنسی علوم کو نصاب تعلیم میں شامل نہیں کیا ہے ان میں سے دو سبب قابل ذکر ہیں۔ ایک سبب یہ خیال ہے کہ دینی علوم کی تحصیل کی غرض کچھ اور ہے اور دنیوی علوم کی تحصیل کی غرض کچھ اور۔ اس لیے دینی اور دنیوی علم کا اجتماع نامناسب ہوگا۔ دوسرا سبب یہ خیال ہے کہ سائنسی علوم الحاد و بے دینی کے داعی و مبلغ ہیں، اس لیے دینی مدارس میں ان کی تعلیم سخت مضرت رساں ثابت ہوگی۔

یہ دونوں ہی باتیں صداقت سے بڑی حد تک خالی ہیں۔ یہ خیال کہ سائنسی علوم چوں کہ دنیوی علوم ہیں، اس لیے دینی علوم کے ساتھ ان کا اجتماع نامحمود ہے۔ سرتاسر قلت علم و تدبر کی دلیل ہے۔ گذشتہ ادوار میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں منطق، فلسفہ، ریاضی، علم ہیئت اور طب جیسے دنیوی علوم شامل تھے اور ان میں سے بعض اب بھی شامل درس ہیں۔ یہ ایسے دنیوی علوم ہیں جن کے خالق و مربی یونان جیسی مشرکانہ سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس ظاہری قباحت کے باوجود ان کو نصاب تعلیم کا جزو بنایا گیا صرف اس لیے کہ وہ وقت کے اہم علوم تھے اور ان کی تحصیل اسلامی عقائد کے تحفظ کے لیے ضروری تھی۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ہمارے اسلاف نے اس عصری ضرورت کو بروقت محسوس کرتے یونانی علوم کو پورے ذوق و شوق کے ساتھ نہ صرف حاصل کیا بلکہ ان میں شاندار اضافات بھی کیے جن کا اعتراف مغرب کے ارباب حل و عقد کو بھی ہے۔ فلسفۂ یونان کی شرح و تفصیل میں فارابی، ابن سینا اور ابن رشد نے جو علمی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ تاریخ فلسفہ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ مغرب کو فلسفہ ارسطو سے آگاہ کرنے والے یہی عظیم المرتبت مسلم حکماء تھے۔ مسلمان، فلسفۂ ارسطو کے عقیدت مند شارح ہی نہیں بنے بلکہ اس سے اختلاف بھی کیا اور اس کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی۔ ہمارے بعض علماء نے اسے زبردست تنقید کا نشانہ بھی بنایا اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے

فلسفہ ارسطو کو پامال کر ڈالا تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں امام غزالی، امام رازی اور امام ابن تیمیہ کے مجتہدانہ کارناموں سے کون صاحبِ علم ناواقف ہوگا۔ مسلم حکماء نے منطق و فلسفہ کی طرح دوسرے یونانی علوم مثلاً ہیئت اور طب میں بھی یونانی حکماء کی غلطیوں کو واضح کیا اور ان میں مفید اضافات کیے جن کو مغرب کے منصف مزاج مورخین سائنس بھی تسلیم کرتے ہیں۔

حقایق بالا کی روشنی میں علماء خود غور فرمائیں کہ اگر ماضی میں دینی علوم کے ساتھ یونانیوں کے دنیوی علوم کا اجتماع ممکن تھا اور اس سے مذہب اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کی نظری بنیادوں کو استحکام ملا تو عصرِ حاضر میں دینی علوم کے ساتھ سائنسی علوم کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ اگر ماضی میں دینی عقاید کے تحفظ کے لیے یونانی علوم کی تحصیل ضروری تھی تو دورِ جدید میں اس مقصد کے لیے سائنسی علوم کی تحصیل بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عصرِ حاضر میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام وہی شخص بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے جو دینی علوم کے ساتھ جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ سائنس کے ذخیرۂ معلومات میں ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے جسے ہم کامیابی کے ساتھ اسلامی عقاید و نظریات کے اثبات و احقاق میں بطور دلائل علمی استعمال کر سکتے ہیں اور مذہب اسلام کے خلاف ملحدین و متشککین اور اشتراکیت کے علم برداروں کے مہمل اعتراضات کے مسکت جواب دے سکتے ہیں۔

اس مذہبی ضرورت کے علاوہ سائنسی علوم کی تحصیل کی ایک دوسری اہم غرض بھی ہے جس سے اب مزید چشم پوشی خودکشی کے مرادف ہوگی اور وہ غرض ہے مسلمانوں کی معاشی وبہبود۔ موجود دور صنعت و حرفت کے عروج کا دور ہے اور کسب معاش کے مختلف ذرائع کا اس سے گہرا تعلق ہے صنعت و حرفت کے میدان میں آج انسان ترقی کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے جس کو دیکھ کر خود عقل انسانی انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ صنعت و حرفت کی یہ گرم بازاری دراصل سائنسی علوم کی مرہونِ منت ہے۔ آج اگر کوئی شخص سائنسی علوم سے واقف نہیں ہے تو اس کے لیے اس میدان میں دو قدم چلنا مشکل ہے۔ آج مسلم اہل مدارس جن مشکلات کا شکار ہیں اس کی ایک بڑی

وجہ سائنسی علوم سے ان کی بے خبری ہے۔ صنعت و حرفت کے ساتھ سائنسی علوم کے اس لاینفک تعلق کا تقاضا ہے کہ دینی مدارس میں بھی سائنسی علوم پڑھائے جائیں تاکہ ان کے فارغین زندگی کی معاشی جدوجہد میں عضوِ مفلوج ثابت نہ ہوں اور دین کو ذریعۂ معاش بنانے کے بجائے اپنے علم و فن سے قوت لایموت کا سامان فراہم کریں اور بے لوث خدمت دین کا فریضہ انجام دے کر خدا اور اس کے بندوں کی نظروں میں معزز و محترم قرار پائیں۔

یہ سن کر آپ میں سے بعض لوگوں کو حیرت ہوگی کہ امام غزالی نے طب، حساب، علم سیاست، پارچہ بافی، زراعت، بال بری (ہیر کٹنگ) اور خیاطی (ٹیلرنگ) کو فرض کفایہ علوم کا درجہ دیا ہے۔ ایک جگہ غیر شرعی علوم کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فرض کفایہ وہ علوم ہیں جن کی حاجت امور دنیا کے قیام میں پڑے جیسے طب کہ بدن انسان کی صحت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح حساب جو معاملات، وصیتوں اور ترکوں کی تقسیم وغیرہ میں ضروری ہیں۔ . . . اس میں تعجب نہ کرنا کہ ہم نے طب اور حساب کو فرض کفایہ کہہ دیا اس لیے کہ اس اعتبار سے تو اصل صنعتیں بھی فرض کفایہ ہیں۔ مثلاً نوربافی، کاشتکاری اور سیاست بلکہ حجامت، پچھنا لگانا اور سینے پرونے کا کام بھی فرائض میں داخل ہیں[۵]"

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس بات پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ جب علوم دینیہ کی طرح بعض علوم دنیوی بھی فرض کفایہ ہیں تو لوگ دنیوی علوم کی تحصیل کی طرف کیوں رخ نہیں کرتے۔ ان کے عہد میں دنیوی علوم بالخصوص طب سے مسلمانوں کی بے توجہی کا جو حال تھا اس کا ذکر ایک جگہ نہایت کرب انگیز انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

بعض شہر ایسے ہیں کہ جن میں ذمی کافروں کے سوا کوئی طبیب نہیں ہے۔ فقہ کے وہ احکام جو طبیبوں سے متعلق ہیں ان میں ذمی کافروں کی شہادت معتبر نہیں۔ لیکن اس

کے باوجود ہم کسی شخص کو نہیں دیکھتے کہ وہ طب کی تحصیل
میں مشغول ہو بلکہ اس کے برعکس لوگ فقہ کی تعلیم میں مبالغہ
کرتے ہیں۔"[۱۱]

عام طور پر دینی حلقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیوی علوم کی تحصیل
دین کے لیے چنداں سودمند نہیں ہے لیکن امام غزالی نے اس سلسلے میں
جو کچھ لکھا ہے اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

"دین کا انتظام دنیا کے انتظام کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس
لیے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور جو شخص دنیا کو آخرت کا
آلہ اور فرودگاہ جانے اس کے حق میں دنیا وصول الی اللہ
کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا کا انتظام آدمیوں کے اعمال
سے ہے اور آدمیوں کے اعمال و کاروبار کی تین قسمیں
ہیں:

اوّل اصول ہیں کہ ان کے بغیر عالم کا قیام ممکن نہیں ہے
اور اصول میں چار چیزیں شامل ہیں (۱) زراعت جس پر
کھانا موقوف ہے (۲) نوربافی لباس کے لیے (۳) سیاست
اسباب معیشت (۴) تعمیر۔

دوسرے وہ اعمال ہیں جو ان چاروں امور کے
خادم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آہنگری جو زراعت کی
خادم ہے اور اس سے دوسری صنعتوں کے آلات بنتے
ہیں اور دھننا اور کاتنا دونوں نوربافی کے خادم
ہیں وغیرہ۔ تیسرے وہ اعمال جو اصول کو پورا کرتے ہیں
اور ان کی زینت کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً پیسنا اور پکانا
زراعت کے لیے اور سینا نوربافی کے لیے۔"[۱۲]

اقتباسات بالا میں امام غزالی نے دنیوی علوم کا دین سے جو ربط و
تعلق دکھایا ہے اور اس کی تحصیل کو فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے اس
سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دینی و دنیوی تعلیم یا دوسرے
لفظوں میں دینی اور سائنسی تعلیم میں کوئی منافرت نہیں ہے، بلکہ دونوں
کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دنیا اور آخرت دونوں میں سعادت و
کامرانی کا حصول ان کے صحیح امتزاج پر موقوف ہے۔

دینی مدارس کے ارباب حل وعقد اور علمائے کرام کا یہ خیال بھی صحیح
نہیں ہے کہ سائنسی علوم سے الحاد اور بے دینی پیدا ہوتی ہے۔ الحاد کی
تاریخ نہایت قدیم ہے۔ تاریخ انسانی کے تقریباً ہر دور میں انسانوں کا
ایک گروہ اپنی نفس پرستی اور کج روئی فکر و نظر کی وجہ سے الحاد کا داعی و
مبلغ رہا ہے لیکن اس کا تعلق کسی خاص طرز کی تعلیم سے کبھی نہیں رہا۔ ماضی
کی طرح حال میں بھی ملحدین کا گروہ موجود ہے اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس
میں مذہبی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لیے کسی خاص علم کو الحاد
کا سبب قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے تاریخ سائنس کا مطالعہ کیا
ہے وہ جانتے ہیں کہ اکثر نامور سائنس داں خدا کے وجود کے قائل رہے ہیں
آئن سٹائن جیسا عظیم المرتبت سائنس داں ان الفاظ میں خدا کے وجود
کی شہادت دیتا ہے:

"I believe in God who reveals himself in the orderly harmony of the Universe."

"میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں جو اس کائنات کی باضابطہ
ترتیب اور ہم آہنگی کے پردے میں جلوہ گر ہے۔"[۱۳]

یہ ماضی کے ایک عظیم سائنس داں کی بات تھی۔ آج ملک میں ہزاروں
لوگ سائنس کی تعلیم پا رہے ہیں۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سب ملحد و بے دین
ہیں۔ دور کیوں جائیے خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو لے لیجیے، کیا یہاں جو لوگ
سائنس کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں وہ سب ملحد و بے دین ہیں،
یقیناً ایسا نہیں ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سائنسی علوم کے معلمین میں ملحد
بے دین لوگ بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد دین پسندوں کے مقابلے میں بہت
کم ہے۔

چلیے میں تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ بعض سائنسی علوم سے
الحاد پیدا ہو سکتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی تحصیل شجر ممنوعہ بن
جائے۔ کیا قدیم یونانی فلسفے سے الحاد کی بو نہیں آتی۔ کیا آپ یونانی فلسفے
کے اس ملحدانہ خیال کو مانتے ہیں کہ آسمان فاعل مختار ہے اور اسکی حرکات
کے زیر اثر عالم اور ساکنان عالم کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے؟ کیا آپ یہ
تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کے افعال ارادہ و اختیار سے خالی ہیں اور کیا آپ یہ

ملتے ہیں کہ عالم قدیم ہے وغیرہ ۔ اگر نہیں تو پھر آپ نے ان مسایل کے مبلغ فلسفہ کو کیوں ہاتھ لگایا اور فعل کفر کا ارتکاب کیا۔ اگر آپ نے اسے اس لیے ہاتھ لگایا تھا کہ اس کے دلائل کے ضعف کو واضح کرکے اس کے اثرات بد سے اسلامی عقاید کو محفوظ رکھ سکیں تو یہی کام آپ سائنسی علوم کی تحصیل کرکے انجام دیں۔ تاکہ ایک طرف ملحدین کی غلطیاں ان پر واضح ہوسکیں اور دوسری طرف اہل ایمان کے قلوب ریب و شک سے مامون ہوجائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علوم سے الحاد و بے دینی تو کجا خالق کائنات کی معرفت کا دروازہ کھلتا ہے اور اس علیم و خبیر ہستی کے بے پایاں علم و حکمت کی کرشمہ سازیاں اور اس کے حسنِ تخلیق کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں انفس و آفاق کے مختلف مظاہر کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کی دعوت بکثرت دی گئی ہے اور اسے ایک مومن صادق کا ”طغرائے امتیاز قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

”بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں نشانیاں ہیں ان ارباب عقل و دانش کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور پہلوؤں پر اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور (جب غور و فکر کے نتیجے میں ان پر اصل حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) خدایا تو نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ بے کار و عبث نہیں پیدا کیا ہے۔ یقیناً تیری ذات اس عیب سے پاک ہے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہم کو عذاب نار سے بچالے“۔

مظاہر فطرت پر غور و فکر سے متعلق آیات قرآن مجید میں جس کثرت سے موجود ہیں، ان سے علمائے کرام یقیناً واقف ہوں گے۔ میں یہاں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ عصر حاضر میں ان آیات کی حقیقی تفہیم سائنسی علوم کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں اس کی یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل و النہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون

(سورۃ بقرہ ۱۶۴)

مذکورہ بالا آیات میں جن مظاہر فطرت کا ذکر ہوا ہے ان کو اہل دانش و بینش کے لیے خداشناسی کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے (لآیٰت لقوم یعقلون) کیا کوئی عالم دین بتا سکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کیوں کر ہوئی ہے، اختلاف لیل و نہار کا نظام کس طرح قایم ہے، سمندر کی پشت پر انسانوں کے لیے راحت بخش ساز و سامان اٹھائے ہوئے کشتیاں کس طرح غرقابی سے محفوظ رواں دواں رہتی ہیں۔ بارش کے پانی اور زمین پر حیات کی متنوع نمود میں کیا رشتہ ہے، ہواؤں کی گردش کا قانون کیا ہے، آسمان و زمین کے درمیان بادل کس قانون طبعی کے تحت مسخر ہیں؟ ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا تو للہ مجھے بتا ئیں کہ قرآن مجید میں سر توحید کی گرہ کشائی کے لیے جن واقعات و مظاہر فطرت سے استدلال کیا گیا ہے، ان کی حقیقی تفہیم اس دور میں سائنسی علوم کے بغیر کس طرح ممکن ہے؟

ہم نے اوپر مظاہر فطرت سے متعلق سورہ بقرہ کی جس آیت کا تذکرہ کیا ہے، تنہا یہی ایک آیت اس دور کے علماء کے ذہن و فکر کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھی بشرطیکہ وہ اس میں برابر تدبر کرتے رہا کرتے ہوئے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن مجید پر فکر کا کام عرصے سے بند کر رکھا ہے۔ اگر انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ قرآن مجید کی آیات میں تدبر کیا ہوتا تو یہ خیال ان کے دل و دماغ میں کبھی راہ نہیں پاسکتا تھا کہ دینی اور سائنسی علوم میں اجتماع محال ہے اور نہ انہیں یہ غلط فہمی لاحق ہوسکتی تھی کہ سائنسی علوم الحاد کے سرچشمے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ دینی مدارس کے ارباب نظم و نسق اور علماء، عصری تقاضوں سے چشم پوشی کی قدیم سنت کو ترک کرکے حقیقت پسندانہ روش اختیار کریں۔ یہ بڑی عبرتناک بات ہے کہ ہم سائنسی

ائد وثمرات سے جو تمام تر غیر مسلموں کی دماغی کاوشوں اور عرق ریزیوں
بہ ہیں، مستفید تو ہوں لیکن خود اس شجر علم کی آبیاری میں کوئی حصہ نہ لیں
غیرت، قومی عظمت، مذہب اسلام کی سربلندی اور معاشی فلاح و
دسب کا تقاضا ہے کہ دینی مدارس میں سائنسی علوم کی ترویج کے لیے ہر
ن اقدام کیا جائے. عجب نہیں کہ ایک دن یہی دینی مدارس ہندی مسلمانوں
شاۃ ثانیہ کے نقیب و ترجمان بن جائیں۔

حواشی

ے اس عہد کا نصاب تعلیم درج ذیل علوم وکتب پر مشتمل تھا:

نحو: مصباح، کافیہ، لب الالباب مولفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی، ارشاد مولفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی

فقہ: ہدایہ

اصول فقہ: منار، شرح منار، اصول بزدوی

تفسیر: مدارک، بیضاوی، کشاف

تصوف: عوارف، فصوص الحکم، نقد النصوص، لمعات بعد کے ادوار میں

حدیث: مشارق الانوار، مصابیح السنہ (یعنی مشکوٰۃ المصابیح کا متن)

ادب: مقامات حریری۔

منطق: شرح شمسیہ

کلام: شرح صحائف

ے مولانا عبدالحی حسنی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، مطبوعہ دمشق ۱۹۵۸ء، ص ۱۲

ے ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۴ء ج ۱ ص ۴۴-۳۲۳

اس دور کا نصاب تعلیم تقریباً وہی رہا جو دور اول میں تھا، صرف بعض کتابوں کا اضافہ کیا گیا، جن میں مطالع و مواقف اور ان کی شرحیں مثلاً مطول، مختصر، تلویح، شرح عقاید نسفی، شرح وقایہ اور شرح جامی قابل ذکر ہیں۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام مطبوعہ آگرہ ۱۹۱۰ء ص ۲۳۸

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۴

ے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی درسیات میں درج ذیل کتب شامل تھیں۔

نحو: کافیہ۔ شرح جامی

منطق: شرح شمسیہ، شرح مطالع

فلسفہ: شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام: شرح عقاید نسفی مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف

فقہ: شرح وقایہ، ہدایہ (کامل)

اصول فقہ: حسامی، قدرے توضیح تلویح

بلاغت: مختصر و مطول

ہیئت و حساب: بعض رسایل مختصرہ

طب: موجز القانون۔

حدیث: مشکوٰۃ المصابیح (مکمل) شمائل ترمذی (مکمل) کسی قدر صحیح بخاری۔

تفسیر: مدارک، بیضاوی

تصوف: عوارف، رسایل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

ے اس دور کا نصاب تعلیم درج ذیل علوم وکتب پر مشتمل تھا:

صرف: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ،

نحو: نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی

منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب قطبی مع میر، سلم العلوم

حکمت: میبذی، صدرا، شمس بازغہ

ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالہ اولی، تشریح افلاک، شرح چغمینی باب اول

بلاغت: مختصر معانی، مطول تا ما انا قلت

فقہ: شرح وقایہ اولین، ہدایہ اخیرین

اصول فقہ: نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

کلام: شرح عقاید نسفی، شرح عقاید جلالی، میر زاہد شرح مواقف

تفسیر: جلالین ، بیضاوی۔
حدیث : مشکوۃ المصابیح۔

[9] اس دور کا نصاب تعلیم حسب ذیل علوم و کتب پر مشتمل تھا۔
صرف: میزان ، منشعب ، پنج گنج ، زبدہ ، دستور المبتدی ، صرف میر ، فصول اکبری ، شافیہ بعد کے ادوار میں
نحو: نحو میر ، مائۃ عامل ، شرح مائۃ عامل ، ہدایۃ النحو ، کافیہ ، شرح جامی۔
بلاغت: مختصر معانی کامل ، مطول تا ما انا قلت
ادب : نفحۃ الیمن ، سبعہ معلقہ ، دیوان متنبی ، مقامات حریری حماسہ
فقہ : شرح وقایہ اولین ، ہدایہ اخیرین
اصول فقہ: نور الانوار ، توضیح تلویح ، مسلم الثبوت
منطق : صغری ، کبری ، ایسا غوجی ، قال اقول ، میزان منطق تہذیب ، شرح تہذیب ، قطبی ، میر قطبی ، ملاحسن ، حمد اللہ ، قاضی مبارک ، میر زاہد رسالہ ، حاشیہ غلام یحیٰی بر میر زاہد ، ملا جلال ، بعض مدارس میں بحر العلوم ، شرح سلم ، حاشیہ عبد العلی بر میر زاہد اور شرح سلم بھی نصاب میں داخل تھیں۔
حکمت : میبذی ، صدرا ، شمس بازغہ
کلام : شرح عقاید نسفی ، خیالی ، میر زاہد امور عامہ
ریاضی : تحریر اقلیدس مقالہ اولی ، خلاصۃ الحساب شرح چغمنی۔
فرائض۔ شریفیہ۔
مناظرہ : رشیدیہ
تفسیر: جلالین بیضاوی تا سورہ بقرہ
اصول حدیث: شرح نخبۃ الفکر۔
حدیث : بخاری ، مسلم ، موطا ، ترمذی ، ابو داؤد ، نسائی ، ابن ماجہ۔

[10] ابو حامد محمد الغزالی ، احیاء العلوم الدین مطبوعہ ج ۱ ، ص ۹۔
[11] ایضاً ص ۱۰
[12] " ص ۱۰
[13] الطاف احمد اعظمی ایمان و عمل کا قرآنی تصور مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۶
[14] آل عمران ۔ ۱۹۰ ، ۱۹۱۔

زیادہ تر لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کے خیالات کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ارسطو کے خیالات میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں حالانکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارسطو نے صرف اپنی بساط بھر ہی نتیجے اخذ کیے۔

* ——— البیرونی

دینی اداروں میں عصری تعلیمات کے لیے مشکلات

عبدالسبحان خان

دینی تعلیم کا اولین اور بنیادی مقصد ایمان کا تحفظ اور اسلام کی
تناعت ہی نہیں بلکہ نوع انسانی کے سامنے ایک ایسا صالح معاشرہ پیش کرنا ہے
تمام پہلوؤں سے انسانیت کے تحفظ و لقا کا ضامن ہو۔ اس میں کوئی دو رائے
ین کر علم دین نے اپنے اس فرض منصبی کو ہر دور میں بڑی تابناکی سے نبھایا ہے۔

علم دین کے ساتھ علم سائنس کا جوڑ آج کے دور میں عجیب سا
سوس ہوتا ہے مگر یہ دونوں علوم اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک ہی سمندر
دو موجیں ہیں جو بظاہر ٹکراتی ہیں مگر جستجو دونوں کی ایک ہی ہے۔ علم دین
ل کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے والے ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام
جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے
ہے اور علم سائنس اس محسوس دنیا کے مطالعے کا نام ہے (جس میں
زندگی گزار رہے ہیں) جو رات دن ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی
ہے یا آسکتی ہے۔ اس معنی میں دونوں کے موضوعات نہایت وسیع ہیں،
دونوں علوم نے اپنے دور آغاز میں حیرت انگیز انقلاب برپا کیا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں علم دین نے دورِ
ہلیت کی پسی ہوئی اور پراگندہ انسانیت کو کس طرح سرخ رو اور
بلند کیا، تاریخ کے اوراق میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

علماء دین کی دریافت سے دیگر وہ عصری علوم بھی نہ
سکے جو کسی بھی حد تک اس کے لیے مفید بن سکتے تھے۔ چنانچہ آنحضور
اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر وہ علوم جو مسلمانوں
لیے مفید یا مضر ہو سکتے ہیں ان کے حصول کی آپ نے ہدایت فرمائی۔ آپؐ
جنگ بدر میں قید کیے گئے یہودیوں کے آزاد کرنے کا فدیہ یہ طے
فرمایا کہ ہر ایک قیدی دو مسلمانوں کو اپنی مادری زبان عبرانی سکھائے تاکہ
مسلمانوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ عبرانی زبان کے ذریعے مسلمانوں کی کیا خدمت
ہو سکتی ہے۔ تیسری صدی ہجری میں ہی علماءِ اسلام نے عصری علوم کی
اہمیت کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا، جب یونانی، ہندی، ایرانی علوم
کے تراجم مسلمانوں کے اندر آئے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ ان علوم کے
منفی اثرات سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ازالے کے لیے علماء امت نے
ان ہی علوم کے ذریعے ان کے بطلان کا فیصلہ فرما کر اسلام کی آفاقیت
کو برقرار رکھا "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" کے اصول کے
مطابق فلسفہ و منطق اور دیگر علوم عقلیہ کو اسلامی کورس میں شامل
کر لیا۔

آج بعینہٖ وہی صورت حال اہل اسلام کے سامنے علم
سائنس کی ہے۔ نت نئے سائنسی ترقی کے انکشافات نے اسلام کی
آفاقیت کو چیلنج کیا ہے اور اقوام عالم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کا ترجمان قرآن

قرآن اپنے پیروکاروں کو عقاید، عبادات، معاملات، حیات
بعد الممات کے سلسلے میں جہاں واضح ہدایات دیتا ہے وہیں پر اسرار کائنات
کو جاننے کے لیے تعقل و تدبر جیسے پُر معنی کلمات سے خطاب فرماتا ہے
خدا کی پُراسرار کائنات کی کھوج ہی موجودہ سائنس کا اصل منشور رہے
خالص مادیت پرست قوموں نے قرآن کے ایک ایسے جز پر تحقیقات
(ریسرچ) کی جو مادی دنیا کے لیے ایک نئی دریافت کے طور پر سامنے
آیا اور خالص مذہب پرست قومیں اُس جز کو صرف عقیدت پر

محمول کرتی ہیں۔

دراصل یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے زیراثر آج ہمارے موجودہ دینی ادارے ایک خاص علمی نصاب پر گامزن ہیں۔ دینی اداروں میں سائنس کی اجنبیت کی وجہ دراصل وہ ابتدائی ٹکراؤ ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ سائنس کی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک خدا کو ماننے کی ایک بڑی وجہ دوسری وجہوں کے ساتھ یہ تھی کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں بنتی۔ مخالفین مذہب نے کہا کہ اب اس مقصد کے لیے ہم کو خدائی مفروضے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کرسکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ اس طرح خدا پر عقیدہ ان کی نظر میں ایک ناپسندیدہ چیز بن گیا اور جو چیز ناپسندیدہ سمجھ لی جائے، اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ فاسد نظریہ تھا جس کی وجہ سے اہلِ مذہب ضرورت سے زیادہ محتاط ہوگئے اور دینی اداروں میں سائنس کا داخلہ شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا۔

اجنبیت کی دوسری وجہ دینی اداروں کی مسلسل وہ جدوجہد ہے جو سائنس کے مضر نظریات کے دفاع کے لیے ایک صدی تک جاری رہی، سائنس کے مثبت پہلو بھی مشتبہ نظر آنے لگے، ملت کی ایک خاص نسل مسلسل ایک صدی تک اسی مریضانہ ذہنیت کی شکار رہی۔ دینی اداروں کے سربراہان موجودہ مروجہ دینی نصاب میں ادنیٰ سا رد و بدل کرنے پر بھی آمادہ نظر نہیں آتے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو وہی غلط فہمی ہے کہ دین اور سائنس بحیثیت نظریات کے مختلف ہیں۔

دوسری وجہ دینی اداروں کے انتظامیہ میں ہمیشہ وہی لوگ دخیل رہے ہیں جو اختیاری یا غیر اختیاری طور پر یک فیصد بھی جدید سائنس حامی نہیں۔

ارباب فروغ سائنس کی خدمت میں مخلصانہ رائے

موجودہ دینی اداروں میں جدید سائنس کا نفاذ بظاہر مشکل ضرور ہے مگر ترغیبات افہام و تفہیم کا ایک حکیمانہ طریقہ کار طے کیا جائے جس سے کہ مُلّا اور بابو میں جو ذہنی خلیج پڑ چکی ہے، اسے پاٹا جاسکے۔ مثلاً دینی اور دنیوی اداروں کے مسلم طلباء کے مشترکہ سمینار کرائے جائیں جس میں انگریزی دان طلباء دینی مقالہ پیش کریں اور دینی طلباء عصرِ حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر جدید سائنس کی ضرورت کا شدت سے احساس دلائیں۔ ازسرِنو ایسے ادارے قائم کیے جائیں جہاں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم اس طرح دی جائے جس سے دینی اداروں کا تشخص بھی مجروح نہ ہو اور عصری تعلیم کا معیار بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

قرآن عظیم

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں

محمد مستان عمری

ہماری بات یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور ایک عالمگیر مذہب
۔ سارے ادیان میں صرف مذہب اسلام ہی ہے جو خالق کائنات کے
دیک محبوب ہے، کیوں کہ یہ اپنے اسی اصل مرقع میں موجود اور محفوظ ہے
یہ محسن انسانیت رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ مذہب
سلام میں حصول تعلیم پر جتنا زور دیا گیا ہے، شاید ہی کسی مذہب میں ایسی
ید ہوگی۔ احمد مجتبےٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر
۔

" طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم

رید فرمایا:

" اطلبوا العلم و لو کان بالصین "

تھا، یہ کہ

العلم من المهد الى اللحد

ول رسولؐ میں "العلم" کہا گیا تو مطلب یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان بالخصوص
سلمان ہر اس علم کے حصول کی کوشش کرے جو اسے اپنے خالق کی پہچان
ے اور اس کو دائرۂ انسانیت سے خارج نہ کرے۔ ایسا ہی علم
بوب و مطلوب ہے۔

شعبہائے سائنس میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے
ں، اس کی مخالفت کی جائے تو اس کے جواب میں مسلمانوں کی اپنی تاریخ
ی اس کی تردید کرتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ابتدائی
دور میں مسلمانوں نے سائنس کے شعبوں میں زبردست ترقی کی۔ حتیٰ کہ جس
ـانے میں یورپ کی ... نے سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں
بڑھایا تھا، اس وقت مسلمانوں نے سائنس کی راہ میں شاندار ترقیاں حاصل
کرلی تھیں" (ماہنامہ الرسالہ، مولانا وحیدالدین خاں، جولائی ۸۶ء)

جیسا کہ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ دور سائنس کا ہے
وہی انسانی گروہ آج ترقی یافتہ ہے اور بالادست ہے جس کے پاس سائنس
اور ٹکنالوجی ہے۔ اس تلخ حقیقت کے احساس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ میں "مرکز فروغ سائنس" کا قالب اختیار کیا جو ملک بالخصوص
ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لیے سہ روزہ کانفرنس کا
انعقاد کیا ہے، قابل تحسین ہے۔ اس کانفرنس میں راقم الحروف اپنی کم مائیگی کا
اعتراف کرتے ہوئے "مدارس عربیہ میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی
راہ میں دشواریاں" عنوان کے تحت چند باتیں پیش کرنا چاہے گا، جن
سے جزئی اختلاف تو ممکن ہے، کلی اختلاف ممکن نہیں۔

۱۔ سائنسی شعور کا عدم وجود

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ اگر مختصر
طور پر بتانی ہو تو وہ صرف ایک ہوگی، مسلمانوں میں سائنسی شعور کا نہ ہونا۔
اس کی ایک واضح مثال وہ فرق ہے جو مسلمانوں کے درمیان دینی تعلیم اور
سائنسی تعلیم کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کی اہمیت
کا شعور موجود تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کا پورا اہتمام کیا۔ اس کے برعکس
موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور موجود نہ تھا، اس لیے
وہ اس کا اہتمام نہ کرسکے، جس کے بغیر کسی قوم میں سائنسی تعلیم نہیں آسکتی۔
مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں جہاں بڑے بڑے دینی مدارس قائم کیے، وہیں
ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کا نظام پھیلا دیا جو بڑے بڑے مدارس کو غذا فراہم

کرتے ہیں۔ یہی بات جدید سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھنے کی تھی ہندوستان میں مثال کے طور پر ہندو اور عیسائی بہت بڑے پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا نظام قائم کر رہے ہیں، مگر مسلم رہنماؤں نے اس مثال سے کوئی سبق نہیں لیا۔ انہوں نے کالج اور یونیورسٹیاں بنانے کے لیے زبردست کوشش کی مگر ابتدائی اسکول قائم کرنے کی طرف اتنا کم دھیان دیا کہ وہ نہیں کے برابر ہے۔ لہٰذا ہمیں اس شعور خفتہ کو پھر سے بیدار کرنا ضروری ہے۔" (ماہنامہ الرسالہ مولانا وحید الدین خاں جولائی ۸۹ء)

۲ ہندوستان کے عربی مدارس کی سائنس کی افادیت سے بے خبری۔

بالعموم یا یوں کہیے کہ بیشتر فی صد ایسے افراد جو مدارس عربیہ کے ذمہ دار ہیں وہ سائنس کی افادیت اور اس کی صحیح ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اب ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں سائنس کی اہمیت اور اس کی ضرورت مدارس عربیہ میں اس کام کے لیے اولین شکل میں مذاکرات اور جلسے کیے جائیں، تاکہ سائنس سے بدگمانیاں اور دور جدید کی ان خامیوں کو کہ جنہیں سائنس کی پیداوار سمجھ لیا گیا ہے ایسی ذہنیت کا ہمیں اخلاق و محبت کے مشترکہ جذبے سے قلع قمع کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر مدارس عربیہ کے نصاب میں سائنسی کتب کے نصاب کا نفوذ ناممکن ہے۔

۳۔ مسلمانوں کا طبقہ اور ان کا ذہنی ارتقاء۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کے احساسات، معیشت کے تصور سے حد درجہ متاثر ہیں جس کی وجہ سے مسلمان دینی تعلیم سے ہٹ کر دنیوی تعلیم کے لیے کوشاں ہیں۔ اس ارتقائی شکل کے خلاف مسلمانوں کی کافی تعداد جو افلاس، غربت، تنگ دستی سے دوچار ہے وہ عربی مدارس میں دینی تعلیم کے لیے آجاتی ہے۔ اب ایسے لوگوں کا مستقبل کے لیے سوچنا اور ان کے آگے معیشت کا وہ تصور جو اسلام سکھاتا ہے پیش کرنا ایک ناممکن سی بات ہو جاتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے کہ جس سے دین و دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ہمیں عمدہ اور صحیح طریقے سے اس فرق کو مٹاتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے ذریعے سائنس کی اہمیت و ضرورت اور اس سے مستفید ہونے کی راہیں بتلانا ضروری تھا۔

کشمکش اس بات کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ لب و لہجہ اور وہ اسلوب وہ طرز بیان جس کے ذریعے ہم یہ اہم کام کر سکیں اس کے لیے خاص طور پر ایک کتاب جو قرآن و حدیث کی روشنی میں سائنس کو لازم بتلائے، کسی مفکر اور قابل ترین شخص سے لکھوائی جائے یا چیدہ چیدہ اہم مضامین اکٹھا کیے جائیں اور انہیں کتابی شکل دی جائے اور صحیح آراء، مذاکرات اور خصوصی سیمینار وغیرہ کے ذریعے صحیح استصواب کیا جائے۔ یہ کام بہت اہم اور ضروری ہے اور یقین ہے کہ "مرکز فروغ سائنس" اس کو باحسن الوجوہ انجام دے گا۔

ناواقفیت ایک ایسی چیز ہے جس سے اہمیت اور ضرورت معلوم نہیں ہوتی؛ صحیح بات معلوم نہ ہو تو تاثرات کی بنیاد پر غلط فہمی ذہنوں میں جنم لیتی ہے اور ایک مخالفت کی عمارت تیار ہو جاتی ہے۔ ایسی بہت سی طرح کی وجوہات ہیں جس سے عربی مدارس سائنسی تعلیم کے خلاف ہیں

۴ سائنس کی افادیت کا پس منظر اور پیش منظر

کسی بھی چیز میں جاذبیت کے معروف و موثر عناصر جب نہ قائم کیے جائیں تب تک اس کے اندر دلآویزی اور دلکشی نہیں ہو سکتی۔ ماحول کا صحیح جائزہ و حالات کا صحیح تقاضا اور مستقبل روشن خاکہ واضح مرتب نہ کیا جائے تو یہ دشواری حائل ہوتی ہے ہم اپنے احساسات جو کہ سائنس کی ترویج کی راہ میں ضروری اور رکھتے ہیں، انہیں کیسے عمل میں لایا جائے۔

پس منظر جتنا مفید اور ضروری ہوگا، اپنے صحیح منہاج پر اس کی مناسب و ضروری تشکیلی حیثیت آشکارا کرنا ضروری ہے۔ اب جب کہ پس منظر جو اپنی حیثیت اور وقعت رکھتا ہے سے باخبر کرنے کے لیے مذکورہ کام پوری توجہ سے انجام دیا

پس منظر کا جو رشتہ و تعلق پیش منظر سے جاہیے وہ کمزور رہا تو، پس منظر کی تاثیر یا یوں کہ اس کی اثر پورے طور پر نہ ظاہر ہوگی اور نہ مطلب کی وضاحت کا کام ہو گا ـــــ یہ دو پہلو اپنی اپنی انفرادیت کے با وجود آپس میں ایک صحیح مشترک اور حسین ربط رکھتے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ خاکے کو صحیح خطوط پر ڈھال دیا جائے اور اس سلسلے

شعبۂ سائنس کے ماہرین سے استصواب کر کے اس خاکے میں ایسی رنگ آمیزی کی جائے کہ جس سے منفعت اور ضروریاتِ انسانی سائنس سے اپنا تعلق رکھتی ہے، یہ واضح کیا جائے۔

یہ صورت حال جب صحیح طور پر اور صحیح نہج پر ظاہر ہوگی تو منکرین سائنس کے انکار میں اضمحلال پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہوگا ـــــ آج تک سائنس کی افادیت بتلانے والے یا سائنس کی حمایت کرنے والے اس اہم اور ضروری پہلو سے جو کہ مذکورہ خاکے میں دینی مزاج کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہے، شاید کسی نے ایسی کوشش کی ہو، لیکن کوئی منظم بات ایسی نظر نہیں آتی۔

دین کا جو وسیع مفہوم ہے، اس وسعت کے صحیح تقاضے کے اظہار میں سائنس کسی طرح جدا نہیں بلکہ داخل و شامل ہے۔ قدرت الٰہی کا جو مشاہدہ سائنس کے ذریعے ہوتا ہے وہ ایک ایسی بات ہے جس سے ہمارے دین حنیف کی بنیادی اور اساسی خوبی کا پتہ چلتا ہے جو

سیروا فی الارض الخ

کی ایک تفسیر اور تشریح ہے۔

"ہر قوم کے کچھ اپنے قومی علوم ہوتے ہیں، ان قومی علوم سے دوسری قوموں کو دلچسپی نہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ایک علم کو لے کر اٹھتی ہے، مگر حقیقتاً وہ اس کا قومی علم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہوتی ہے۔ یہ علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام قوموں کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ کسی ایک قوم کے لیے، وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہوتا ہے، نہ کہ کسی قوم کا انفرادی ورثہ۔

مسلمانوں نے جب مغربی اقوام پر فتح حاصل کی تو وہ فتح کے جوش میں مبتلا ہو گئے۔ اس جوش نے انہیں سائنس کی تحقیق سے غافل کر دیا۔ اس کے بعد موجودہ زمانے میں یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ مسلمان مغربی قوموں کے مقابلے میں مفتوح ہوئے، ان کے اندر مغربی اقوام کے خلاف نفرت جاگ اٹھی۔ وہ نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر مغربی سائنس کی طرف سے بے رغبت ہو گئے، جس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہے۔ یک لحظہ غافل گشتم صد سالہ راہم دور شد۔

سب سے بڑی دشواری جو سدباب بنی ہوئی ہے اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو وہ یہ ہوگی۔ مسلمان انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔"

(مولانا وحید الدین خان، الرسالہ، جولائی ۱۹۸۶ء)

مذکورہ بالا جو باتیں میں نے اپنے مضمون میں پیش کی ہیں، اس پر غور و خوض توجہ اور التفات ماہرین آراء مختلفہ اور عملی تدابیر کے لیے جستجو، مختلف النوع سطح اور مزاج کو ملحوظ رکھ کر کی جانی ضروری ہے اور میں ارباب مرکز فروغ سائنس مسلم یونیورسٹی سے متوقع ہوں کہ وہ ضروری توجہات مبذول فرمائیں گے۔

"جو انسان اپنی پوری لیاقت اور قابلیت سے کام لینے کا ارادہ کر لیتا ہے وہ ایک دن کچھ نہ کچھ ہو کر رہتا ہے۔"

مولوی وحید الدین سلیم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶، شمارہ ۵ (مئی ۱۹۸۸ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد زبیر احمد رضوی

اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لائے چودہ سو سال سے زائد زمانہ گزر رہا ہے۔ اس عرصے میں مختلف ادوار میں مختلف قسم کے نظریاتی و عملی، علمی و فنی اسلام مخالف انقلابات رونما ہوئے۔ جنہوں نے اسلام کو بے دست و پا اور کمزور سمجھ کر مسل ڈالنے کی کوشش کی اور ایسا تصور کیا جانے لگا کہ اسلام کا وجود ان کے بحر ظلمات میں غرقاب ہو جائے گا لیکن اسلام کے جاں نثاروں کی صالح قیادت جب آگے بڑھی ہے تو اُن علوم و فنون کو اِسلام کے دامن میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا علوم فلسفہ اس کی زندہ مثال ہیں۔

یہ دور سائنس کا دور ہے۔ سائنس حکمت اسلام کا ہی ایک فرزند ہے جو سقوط غرناطہ کے ہنگامہ محشر خیز میں غیروں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس وقت یہ علم طفل شیر خوار تھا۔ عیسائیوں میں کچھ اس طرح اس کی تعلیم و تربیت ہوئی کہ جب جوان العمر ہوا تو اہل اسلام کو قدرے اجنبی سا لگنے لگا اور وہ اپنی درس گاہوں میں اس کو عزت کا مقام دینے میں پس و پیش کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیروں میں ہی رہ کر اس نے اپنی طاقت و قوت اس قدر بڑھائی کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس کی حکمرانی نہ ہو اور زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جو اس کے عمل و دخل سے باہر ہو۔ حتی کہ فضائے بسیط میں تیرنے والے بعض سیارے بھی اس کے باجگذار بن گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ خوف زدہ معلوم ہو رہے ہیں۔ اس کی ہمہ گیری اس امر کی متقاضی ہے کہ اہل اسلام اس کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس کی اسلامی حیثیت کا جائزہ لیں اور ممکن ہو تو اپنے سے قریب تر کر کے فرنگیت کا رنگ اتار

کر صبغۃ اللہ کے رنگ سے دیدہ زیب و دلکش بنائیں۔

الحمد للہ ہمارے حساس طبقے نے اب اچھی طرح اس عصری تقاضے کا احساس کر لیا ہے اور قابل مبارک باد ہیں دانش گاہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد دانشور احباب جنہوں نے مرکز فروغ سائنس قائم کر کے اس عقدہ کشائی کا بیڑہ اُٹھا لیا ہے اور کانفرنس منعقد کر کے علمائے امت کو ترویج سائنس کی ضرورت، اس راہ میں درپیش دشواریوں اور نصاب تعلیم کی تجدید پر غور و فکر کرنے کے لیے دعوت دی۔

اس مقالے کا موضوع "دینی مدارس میں ترویج سائنس کی ضرورت" ہے جس میں سائنس کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مقالہ تین حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ مبادی
۲۔ مقاصد
۳۔ مشورے

فالتوکل علی ربی الجلیل وھو حسبی و نعم الوکیل

یہ حقیقت ہے کہ ہر نبی کو اس کے اقتضاء زمانہ کے مطابق معجزہ عطا فرمایا گیا ہے تاکہ قومیں اس کے اعجاز کو دیکھ کر اس پر ایمان لائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو علم جادو کا زور تھا اس لیے آپ کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو علم طب عروج پر تھا اس لیے آپ کو یہ معجزہ عطا فرمایا گیا کہ آپ مادر زاد اندھوں کو بینا اور مُردوں کو زندہ فرما دیتے تھے۔

چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم اور قیامت
تک کے لیے نبی ہیں۔ اب کوئی نبی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضرور ہے کہ آپ
کو ایسا معجزہ عطا فرمایا گیا ہو جو عالم خشک و تر میں قیامت تک پیدا ہونے
والے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا اعجاز اور اسلام کی حقانیت منوا سکے
اور وہ معجزہ ہے قرآن سراپا برہان جو انقلابات عالم سے مقابلہ کر کے اپنا تفوق و
برتری قایم رکھتا ہے۔

سورہ انعام ع ۴ میں ہے۔

مَا فرطنا فی الکتاب من شئ

[ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔]

سورہ نحل ع ۱۲ میں ہے

و نزلنا علیک الکتٰب تبیانًا لکل شئ

[اور ہم نے تم پر قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے]

ـ ابن ابو الفضل مرسی نے کہا

" اولین و آخرین کے تمام علوم قرآن حکیم میں ہیں۔"

ـ ابوبکر بن مجاہدؒ نے ایک روز فرمایا:

" عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قرآن شریف میں نہ ہو"

اس پر کسی نے کہا سرائوں کا ذکر کہاں ہے ؟

فرمایا:

اس آیت میں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا
غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ

ان شواہد و براہین سے معلوم ہوا کہ عالم ماکان و مایکون کی کوئی شئ
ایسی نہیں ہے جو قرآن حکیم میں بیان نہ کی گئی ہو اور بشمول الٰہی و ریاضی،
فلسفہ و سائنس کوئی علم ایسا نہیں ہے جو اس کتاب حکمت مآب میں نہ ہو۔

سورہ رحمٰن ع ۱ میں ہے۔

الرحمٰن علّم القرآن

[رحمٰن نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھایا]

سورہ مائدہ ع ۱۰ میں ہے:

بلّغ ما اُنزل الیک

[محبوب تمہاری طرف جو اُتارا گیا اسے لوگوں تک پہنچا دو]

سورہ بقرہ ع ۱۸ میں ہے

کَمَا اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ
اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ
وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔

[جیسا ہم نے بھیجا تم میں ایک رسول تم میں سے کہ تم پر
ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے
اور کتاب و پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم دیتا ہے
جس کا تمہیں علم نہ تھا۔]

یہ آیات اس امر پر برہان قاطع ہیں کہ حکیم مطلق نے جملہ علوم عقلیہ نقلیہ قدیمہ و جدیدہ
نہ صرف قرآن پاک میں بیان فرمایا بلکہ اپنے حبیب پاک صاحب لولاک
صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتے ہوئے ان کی ترویج و اشاعت کا حکم دیا
اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں اس پر عمل پیرا رہے۔

اس اجمالی بیان کے بعد یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

ـ سائنس کسے کہتے ہیں ؟
ـ اس کے متعلق قرآن کریم میں مزید تفصیلات بھی ہیں یا نہیں؟
ـ اس کا منتہائے اثر اسلام کے حق میں مثبت ہے یا منفی ؟

ان کے جواب میں عرض کروں گا۔

ھُوَ عِلْمٌ باحوال الموجودات المادیہ علی ماھی
علیہ فی نفس الامر بحیث انہا کیف یتعلق بعضہا
ببعض اٰخر فی نفس الامر لقدر الطاقة البشریة

[سائنس کہتے ہیں موجودات مادیہ کے حالات واقعیہ کو بقدر
طاقت انسانی جاننا باین حیثیت کہ ان احوال و خواص کا باہم
دگر تعلق نفس الامر میں کیسا ہے اور علت و معلول کے سلسلے
میں وہ کس طرح مرتب و منظم ہیں]

خلاصہ یہ کہ

سائنس کا موضوع بحث مادی عالم اور اس کے اندر کار فرما قوانین
فطرت کا مطالعہ کرنا ہے اور اس مطالعہ سے ان کے متعلق جب کوئی پختہ
علم حاصل ہو جائے تو اسے سائنس کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قوانینِ فطرت میں نظر و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسلامی عقاید پر سائنٹفک دلائل قائم کیے گئے ہیں۔

سورہ یونس ع ١٠ میں ہے۔

' قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض۔

[تم فرماؤ! غور کرو آسمانوں اور زمین میں کیا ہے]

سورہ روم ع ٥ میں ہے

فَانْظُرُوا اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا

[رحمت خداوندی کی نشانیوں پر غور کرو۔ کیونکہ وہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ فرماتا ہے]۔

سورہ انعام ع ١٢ میں ہے۔

اُنْظُرُوا اِلٰی ثَمَرِہٖ اِذَا اَثْمَرَ وَیَنْعِہٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ

[اس کے پھل پر غور کرو جب پھلے اور پکنے پر بیشک اس میں یقیناً مومن قوم کے لیے نشانیاں ہیں]۔

سورۂ عنکبوت میں نشاۃ ثانیہ پر اللہ کی قدرت کی یہ سائنٹفک دلیل دی گئی ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ۔

[کیا انہوں نے نہ دیکھا اللہ کیوں کر خلق کی ابتداء فرماتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا بیشک یہ اللہ کو آسان ہے]

اس میں عقل انسانی کو تنبیہ کی گئی کہ وہ ابتدائے آفرینش کے حقایق اور ان کے اسباب و مدارج میں غور و فکر کرے کہ اس نے کیسے کیسے قوانین فطرت بنا دیے ہیں جن کے عمل در آمد سے تخلیق ربانی کا سلسلہ جاری ہے اور جو ایسی عظیم شئی پر قادر ہے۔ وہ یقیناً عالم کے اعادہ پر قادر ہوگا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

" حکیم وہ ہے جو اشیاء کے حقایق سے واقف اور اپنے ارادے کے مطابق اس پر چلانے والا ہو"۔

علامہ ابن رشد کا قول ہے کہ:

" اسبابِ ظاہری کی معرفت کو علم اور اسبابِ باطنی کی معرفت کو حکمت کہتے ہیں "

اور قرآن سورۂ بقرہ ع ٣٧ میں ہے

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔

[جو حکمت دیا گیا وہ خیر کثیر دیا گیا]

حضور سید یوم النشور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

بلغوا عنی ولو اٰیۃ۔

" اے لوگو! میں نے جو علوم و حکم تمہیں سکھائے ہیں اسے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔

یہ وہ بینات واضح ہیں جو اس پر دال ہیں کہ علم سائنس نہ صرف قرآن کے مطابق ہے بلکہ عام بندوں کو اس کے حاصل کرنے پر آمادہ بھی کیا گیا ہے

تیسرے سوال کا جواب ماسبق و مالحق سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کی مزید تحقیق و تفصیل پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

اسلام کے حق میں سائنس کا افادہ یا عدم افادہ یا تو نفسِ علم کے اعتبار سے ہوگا یا نتائج و ثمرات کے لحاظ سے۔ دونوں حیثیتوں سے وہ مفید ہی ہے غیر مفید نہیں۔

سائنس کی تعریف پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کا مرکزی نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواص اشیاء میں غور و فکر کرتے ہوئے ان میں علت و سبب و مسبب کے سلسلے کی تسخیر و دریافت کی جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک عالی دماغ سائنس داں اگر اپنی دریافت میں کامل ہے تو یقیناً وہ ایک ایسی علت تک پہنچے گا جو آخری ہوگی۔ پھر جو تحقیقات و تجربات نے یہی بتایا ہے کہ ماقبل کے خواص کسی علت کے ا[illegible] سے ہیں۔ اس لیے اس کے ذہن میں یہ سوال و جواب پیدا ہونا فطری ہوگی۔

کیا یہ اپنے ماقبل کے خواص جیسا نہیں؟

یقیناً انہیں جیسا ہے!

تو پھر اس کی بھی کوئی علت ہونا چاہیے مگر وہ ہے کون؟

قوت ادراک خاموش۔

کیا وہ تحقیقات و تجربات غلط ہیں؟
ایسا تو نظر نہیں آتا۔
پھر کیا معاملہ ہے؟
جواب صفر، عقل بے بس ولاچار۔
لازمی طور پر یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ اس کے پرے کچھ اور
زور جو ہمارے ادراک کے احاطے سے باہر ہے اور علت و معلول کا
سل خود مستلزم ہے۔ علت العلل واجب الوجود کے وجود کو۔ غالباً
وہ مقام ہے جس کے پیش نظر امام الائمہ سراج الامۃ سیدنا ابوحنیفہ رضی
عنہ نے فرمایا:

لو لم يبعث الله تعالیٰ رسولا لوجب علی
العقلاء معرفته

(اگر اللہ تعالیٰ کوئی رسول نہ بھیجتا جب بھی عقلاء پر اس
کی معرفت واجب ہوتی)

سورہ نحل ع ا میں ہے

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً
وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

مالا تعلمون میں وہ تمام چیزیں آگئیں جو آدمی کے
م آتی ہیں اور اس وقت تک موجود نہیں ہوئی تھیں۔ لہذا سائنس کے جن
ر بھی نتائج و ثمرات ایجادات و اختراعات کی شکل میں ظاہر ہوئے اور
ں گے، اس آیت کی شرح و تفسیر ہیں اور یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ جو
زیں اب ایجاد ہو رہی ہیں قرآن ان کی خبر پہلے ہی دے چکا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي
النَّاسِ

(لوگوں کے اپنے کردار کی بنیاد پر خشکی و تری میں فساد
ظاہر ہو چکا ہے)

سائنس کا علم اگرچہ اسلام کے حق میں ہے مگر اس سے بھی انکار
ہیں کیا جا سکتا کہ قرون میں اس کی ترویج و ترقی سے کچھ اسلام مخالف
فاسد نظریات بھی جنم لے چکے ہیں۔ مثلاً آسمان کا وجود ایک امر حقیقت ہے
[illegible]

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
[ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا]
جب کہ اہل سائنس اس جہل مرکب کے شکار ہیں کہ آسمان کا وجود ہے نہ اس
کی کوئی حقیقت۔

جہاد فی سبیل اللہ، اپنی جان و مال اور سلطنت اسلامیہ کی
حفاظت واجبات سے اور اس میں کما حقہ کامیابی اسی صورت میں متصور ہے
جب کہ ہر دور میں اس کے حالات کے پیش نظر اسباب و علل اور اسلحہ جات
بروئے کار لائے جائیں۔
مصر کے مملوکی سلطان سلیم عثمانی کی فوج سے زیادہ بہادر ہونے
کے باوجود اس لیے شکست کھا گئے کہ ان کے پاس صرف تلواریں تھیں جب
کہ سلطان کے ساتھ بندوق اور توپ خانے تھے۔

کسی بھی قوم کی سربلندی و برتری کا راز بنیادی طور پر یہ
ہے کہ اس کے داخلی و خارجی امور خوب مستحکم ہوں اور یہ جبھی ممکن ہے کہ
مقتضائے حال کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ وسائل حاصل ہوں۔ یہ وقت
کا کس قدر جانکاہ المیہ ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب یورپ کی کوئی
عیسائی حکومت ایسی نہ تھی جو سلطنت عثمانیہ کی باجگذار نہ ہو اور آج یہ
حال ہے کہ کوئی بھی مسلم حکومت ایسی نہیں جو یورپ کے کسی پسماندہ ملک
کے برابر بھی کھڑا کر سکیں۔
اس کی وجہ جہاں ہماری ایمانی کمزوری، روحانی سقم اور عملی
بے راہ روی ہے وہیں اس سے بھی انکار کی گنجایش نہیں کہ سائنس و
ٹکنالوجی کی بھی کمی ہے۔

قوموں کی تاریخ ان کا عظیم سرمایہ ہوتی ہے لیکن یہ افسوس ناک
حقیقت ہے کہ سائنس کے باب میں اسلامی تاریخ پر ایسا پردہ پڑ گیا ہے
کہ لوگ اہل یورپ کو اس کا باوا آدم سمجھنے لگے ہیں۔ حالاں کہ امر واقعہ یہ ہے
کہ وہ اس سلسلے میں اہل اسلام کے شاگرد ہیں جس کا اعتراف بعض مغربی
انصاف پسند دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ ایک برطانوی مصنف اوڈویل

…لکھا ہے:

"اہلِ یورپ کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ قرآن کا مرہونِ منت ہے۔ قرآن ہی تھا جس نے یورپ میں آفتابِ علم و دانش طلوع کیا۔"

یہ وہ حقائق اور واقعات ہیں جو علم سائنس کی تعلیم و ترویج کو جواز و …احت کی حد سے نکال کر اہم واجبات کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں اور …مقاصد و مطالبات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

- علم سائنس کو حاصل کر کے اسلام مخالف عقاید و نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا ابطال اور احقاق حق کیا جائے۔
- سائنٹفک اندازِ فکر پر اسلامی عقاید و نظریات کی وضاحت کر کے اہلِ سائنس کو اسلام سے قریب تر ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔
- ایجاداتِ سائنس اور قرآن کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے قرآن کا اعجاز اقوامِ عالم کے سامنے نمایاں کیا جائے۔
- سائنس کی تعلیم و تعلم کو رواج دے کر اس قدر عروج پر لایا جائے کہ انسانی زندگی کے جملہ شعبہ جات میں عصری تقاضے کی تکمیل ہو سکے اور اہلِ اسلام غیروں کے دستِ نگر نہ رہیں۔
- سائنس کے باب میں مسلم پیش رفت اور ان کی ایجادات کی تفتیش و تحقیق کر کے ان کی تاریخ مدوّن و مرتب کی جائے۔

اب یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں کر ہو؟ اس کا ابتدائی طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دینی مدارس میں سائنس کو رواج دیتے ہوئے اس کو اہم مقام دیا جائے۔ لیکن اس راہ میں کیا دشواریاں ہیں اور کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ اس موضوع پر مقالہ نگار حضرات پیش فرمائیں گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علومِ جدیدہ کی وہ درس گاہیں جو کسی حد تک مسلم اقلیت کے زیرِ اثر ہیں، ان میں سائنس کو ترقی دیتے ہوئے مسلم طلبا کے لیے علومِ دینیہ کی ایسی مقدار مرحلہ وائز لازم کر دی جائے کہ جب وہ یونیورسٹی سے نکلیں تو علومِ جدیدہ کے ڈاکٹر و پروفیسر ہی نہ ہوں بلکہ اسلام کے محقق و مبلغ بھی ہوں۔

یہ دو مشورے ایسے ہیں کہ شاید کسی کو اس سے انکار نہ ہوگا۔ لہٰذا بقدرِ استطاعت ان پر عمل ہونا چاہیے اور اس تال میل سے امید کہ ان شاء المولیٰ تعالیٰ ثم رسولہ الاعلیٰ عز و جل و صلی اللہ علیہ وسلم خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

"شرافت کے بارے میں گفتگو کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ شرافت و افتخار کی منزل طے کرتے وقت ہمارے اندر اتنی جرأت ہونا لازمی ہے کہ حقایق کا بے باکی سے اظہار کریں۔"

- مارشل ٹیمن۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد جان مفتاحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

حضرات

اس سہ روزہ کانفرنس میں ہمارے مقالے کا عنوان ہے

"دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت"

یہ حقیقت ہے کہ افراد کی طرح اقوام بھی باہم ایک دوسرے [illegible] علوم وفنون، افکار و خیالات سے استفادہ کیا کرتی ہیں اور اس استفادہ [illegible] یکسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض نقطۂ نظر سے قومی زندگی کے لیے [illegible]نی ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کی نوعیت یکساں نہیں ہوا کرتی۔ ہر قوم اپنی ذہنی [illegible]ری، ملی اور سیاسی حالات کے لحاظ سے دوسری اقوام عالم سے استفادہ [illegible]تی ہے اور جس قوم کی فکری بنیاد پائیدار اور مستحکم ہوتی ہے اور اسے اپنے [illegible]ریات و خیالات پر یقین محکم ہوتا ہے وہ دوسرے کے علوم وفنون کو من و عن [illegible]ول نہیں کر لیتی بلکہ ان پر ہر پہلو سے ناقدانہ نظر ڈالتی ہے... لیکن جب اس [illegible] بنیاد کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے نظریات و خیالات پر پختہ یقین نہیں [illegible]تا تو وہ ہر فکر و خیال پر اندھوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد آئیے تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ ہمارے [illegible]سلاف نے نئے علوم وفنون سے کس طرح کسب کمال کیا ہے۔ تو اس سلسلے [illegible] ہم دیکھتے ہیں کہ [illegible] تاریخ کے فتوحات میں یونانی علوم سے استفادہ [illegible] قریب [illegible] علوم سے مگر ان دونوں ادوار میں قدرے فرق ہے اور استفادہ کا انداز بھی بدلا ہوا ہے۔ یہاں ہم مختصراً اس کا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

دور بنو امیہ اور دور بنو عباسیہ میں جب یونانی علوم منتقل ہو رہے تھے، اس وقت مسلمانوں کا ایک طبقہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے اسلام کی روشنی میں ان نظریات کا جائزہ لینے کے بجائے ان نظریات سے اسلام کو پرکھا اور ان سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نامعقول کوششیں کیں مگر عام مسلمانوں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ حالاں کہ ان میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ کسی بھی فکر و خیال کا صحیح اور معقول طور پر جائزہ لے کر اسے قابل قبول ہونے کا فیصلہ کرتے۔ اس وقت بات یہ بھی تھی کہ مسلمان سیاسی نقطۂ نظر سے حکمران تھے۔ انھوں نے یونانی علوم وفنون کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا جس نظر سے محکوم قوم دیکھتی ہے۔ انھیں دنیا کی تمام قوموں پر برتری حاصل تھی۔ وہ پوری دنیا کو درس دینے کی پوزیشن میں تھے کسی سے درس لینے کو تیار نہ تھے

اس وقت یونانی علوم کی جو بحثیں تھیں ان کا تعلق ذات باری تعالیٰ صفات باری تعالیٰ، وحی و رسالت، حشر و نشر، مادہ و روح، جبر و قدر اور اسی نوعیت کے دیگر مسائل... یقیناً یہ مسائل اہم ہیں ان کا تعلق زندگی کے ہر گوشے سے ہے مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یونانی علوم کا اسلام کی تہذیب، معاشرت، اخلاق، سیاست اور قانون وغیرہ سے براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے یونانی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ان کی ایسی جامع اور مستند تشریح کی جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں ایسی ہستیاں بکثرت عالم وجود میں آئیں،

بسطرف یونانی علوم پر وسیع وعمیق نظر رکھتی تھیں تو دوسری طرف اسلامی میں بھی مجتہدانہ امامت کا مقام حاصل تھا۔ ایسے مسائل جن سے اسلامی عقاید پر آرہی تھی ان کا تحقیقی انداز سے جواب دیا۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ یونانی علوم کا زہر مسلمانوں میں پھیلا تو اس کا تریاق بھی ساتھ ہی ساتھ فراہم ہوتا چلا گیا۔

ادوار میں کتاب وسنت کی روشنی میں مختلف تقاضوں کی تکمیل کے لیے نئے نئے علوم وجود میں آئے ان کو مدون و مرتب کیا گیا۔ ان کی شرح وتفسیر کی گئی، ان پر تحقیق وتنقید ہوئی، کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے کے اصول وضع کیے گئے۔ چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، علم کلام، ادب اور لغت کے بڑے بڑے امام اس دور میں پیدا ہوئے۔ مسلمانوں نے یونانی علوم کے علاوہ ان علوم کی طرف بھی توجہ کی جو فارس، مصر اور ہندوستان وغیرہ میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ منطق، فلسفہ، ریاضی، طب اور کیمیا وغیرہ ان میں بھی نہ صرف حذف و اضافہ کیا بلکہ اپنی مجتہدانہ کاوشوں سے ان میں نئی روح پھونک دی۔

آیئے قدرے مغربی علوم کا جائزہ بھی لیتے چلیں تاکہ بات اور واضح ہو جائے اور پھر ہمیں سائنسی علوم سے استفادہ کی طرف ایک ذہن ملے۔ مغربی علوم مسلمانوں میں اس وقت آئے جب حالات کافی بدل چکے تھے۔ انہیں اپنے یقین وعقائد میں وہ پختگی نہیں رہ گئی تھی جو دور اول کے مسلمانوں میں تھی مذہب کا وہ صحیح اور واضح تصور ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا تھا، مذہب سے علمی وفکری بے خبری اور عملی دوری نے اس بات کو آسان سے آسان تر بنا دیا تھا کہ کوئی بھی فلسفہ ان کے یقین کی دیوار کو ہلا کر رکھ دے۔ ۔ ۔ ۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی علوم کا سیلاب آیا تو وہ اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ ساتھ ہی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مغربی علوم کی حیثیت ایک فاتح قوم کی تھی۔ مسلمان مغرب کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ان سے ذہنی طور پر مرعوب ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے بغیر تحقیق وتنقید کے من وعن اس کے فلسفے کو قبول کر لیا۔

یہاں ایک بات اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یونانی علوم نے بعض خالص عقلی مسائل اٹھائے تھے مگر مغرب نے پوری زندگی سے بحث کی مغربی علوم محض عقلی فلسفے کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایک [illegible] دیا تھا اور اس کے مسائل کو بہت [illegible]

دیا تھا۔ مسلمانوں میں یونانی علوم کے ماہرین تو بکثرت پیدا ہوئے کیونکہ دانشوروں نے اپنے اداروں میں ان علوم کو داخل نصاب کر کے ان کی ترویج کی ضرورت کو فوری طور پر محسوس کر لیا تھا مگر جب مغربی علوم کا دور دورہ ہوا تو ایسے افراد بہت کم رہ گئے تھے جو مغربی فکر و فلسفہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے اور ان کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتے۔ سائنسی چیلنجوں کو قبول کر کے اس کی افادیت سے روشناس کراتے اور ان کے منفی پہلو کا مدلل جواب دیتے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب یہ ہے کہ مغربی علوم کے آنے کے بعد مسلمان اہل علم دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ طبقہ جو مغربی علوم پڑھتا اور پڑھاتا اور اس سے مرعوب ومتاثر تھا۔ دوسرا وہ طبقہ جو دینی علوم کی درس وتدریس میں لگ گیا۔ مختلف وجوہات سے دونوں کے مطالعہ وتحقیق کے میدان ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ جو لوگ مغربی علوم پڑھتے پڑھاتے تھے وہ مذہبی علوم سے نابلد اور دینی علوم کے ماہرین مغربی افکار وخیالات سے بے خبر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں الگ الگ راستے پر چل پڑے۔ نہ تو پہلا طبقہ اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکتا تھا اور نہ ہی دوسرا طبقہ مغربی علوم کا جائزہ لے کر ان کے افادی پہلو سے روشناس کرا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پر مغرب کی طرف سے پے درپے حملے ہوتے رہے اور اسلام کی صحیح معنوں میں ترجمانی نہیں ہو سکی اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس میں مغربی علوم خصوصاً سائنسی علوم کو ترویج دی جائے۔ پھر دینی تعلیم سائنسی تعلیم کے منافی تو نہیں قرآن حکیم میں خداوند قدوس نے متعدد جگہوں پر تدبر اور تفکر کا لفظ استعمال کیا ہے اور آج سائنسی ایجادات تدبر اور تفکر کا نتیجہ ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ

اس ارشاد نبوی سے مراد بالخصوص دینی علوم ہیں مگر بالعموم تمام علوم ہیں جیسا کہ اس کی تشریح آپ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

اطلبوا العلم ولو کان بالصین

قرآن حکیم کا فرمان

وسخر لکم الشمس والقمر

ان آیات کا [illegible]

احصول اسلامی عقیدے کے منافی نہیں۔ یہ خیال غلط رواج پاگیا کہ
ں پڑھنے سے عقیدہ بگڑ جاتا ہے۔ اس خیال کا حقیقت سے کوئی واسطہ
۔ قدرت کا یہ زبردست کارخانہ جو ہمارے سامنے پھیلا ہوا ہے ہم ان
نکھیں کیسے بند کرسکتے ہیں۔ آخر اس نے ہمیں دیکھنے، سوچنے اور
، کی قوتیں بیکار تو نہیں دی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عجائبات عالم پر جتنا
ا غور کیا جائے گا، عقیدہ اتنا ہی پختہ ہوگا۔ دین کے کام کرنے والوں کو
ں کا مینڈک نہیں بننا چاہیے۔ دینی مدارس میں سائنسی علوم کی ترویج کی
رت اس لیے بھی ہے کہ دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت
لق ایسے طبقے سے ہے جو معاشی بحران کے ساتھ پسماندگی کا شکار رہے انہیں
نت کے مابعد معاش کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ وہ مزید اپنے ذہن کو
ی بھی تعمیری کام میں نہیں لگا پاتے۔ مسلم معاشرت کی اکثریت جو فارغ البال
ا ہے وہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنا اپنے لیے توہین سمجھتی ہے یہی وجہ
ہ دور حاضر میں اسلام کے پاس بہترین ذہنوں کا فقدان ہوتا جارہا ہے
جب تک دینی مدارس میں سائنسی علوم کی ترویج نہ ہوگی، تب تک مسلم
شرت سے پسماندگی دور نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے اندر سے پسماندگی دور
نے کے لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس میں سائنسی علوم کو عام کیا جائے

تاکہ دور حاضر کے سائنسی چیلنجوں کا جواب دیا جاسکے۔

بقول شخصے: "طریقۂ تعلیم صرف دین غلط ہے۔ کیوں کہ جینا دنیا میں ہے اور طریقۂ تعلیم صرف دنیا غلط ہے کیوں کہ مرنے کے بعد بھی زندگی کا تصور ہے۔ اس لیے دین و دنیا دونوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دونوں علوم میں مہارت ضروری ہے۔ چنانچہ ادارے ایسے ہوں جن میں دین و دنیا دونوں کا سنگم ہو" اور اس کے لیے دینی مدارس ہی مناسب ہیں۔

لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ساعت مسعود کب آئے گی کہ ہم اپنے دینی مدارس میں سائنسی علوم کو ترویج دے کر اپنے سماج کی پسماندگی کو دور کرکے اور اپنے بخت خفتہ کو بیدار کرکے ملت کے اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی کریں گے۔ وقت ہمیں پکار رہا ہے، ماضی کی کوتاہیاں ہمیں تنبیہ کر رہی ہیں، مستقبل کے اندیشے ہمیں دھمکا رہے ہیں اور ہاتف غیبی کی آواز آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

خدا کرے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یہ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ آمین۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم، ایک آدمی نے دریافت کیا، یا رسول اللہؐ مظلوم ہونے کی حالت میں تو میں اس کی مدد کرسکتا ہوں، لیکن جب کہ وہ ظالم ہو تب اس کی مدد کیسے کرسکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تمہارا اس کو ظلم سے روک دینا ہی اس کی مدد ہے۔"

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ج ۶، شمارہ ۵ (مئی ۸۷ء)

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کے مسائل

کبیر احمد جائسی

اگر ہم مسلمانوں کے نصاب تعلیم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو یہ بات انتہائی واضح انداز میں نظر آئے گی کہ مسلمانوں کا مرتب کردہ نظام تعلیم قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں عصری علوم سے عاری نہیں رہا ہے۔ ان ادوار میں جو تعلیم دی جاتی وہ آج کی اصطلاح میں دینی اور دنیوی دونوں علوم کا احاطہ کرتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اختصاص بالعموم علم کی ایک ہی شاخ میں حاصل کیا جاتا۔ ابتدا میں تو سب ہی طالب علم قرآن پاک، حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ، ریاضی، علم کلام، منطق، ہیئت، کیمیا وغیرہ کی اتنی تعلیم حاصل کرتے کہ ان علوم کے مبادی سے واقف ہو جائیں۔ بعد ازاں آخر کے چند سالوں کی تعلیم میں کوئی علوم نقلیہ میں اختصاص حاصل کرتا تو کوئی علوم عقلیہ میں لیکن آج کی طرح ایسا نہ تھا کہ علوم نقلیہ کا ماہر علوم عقلیہ سے بیگانہ ہوتا یا علوم عقلیہ کا ماہر علوم نقلیہ سے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جس زمانے تک ہماری یہ حالت رہی اللہ نے ہم کو دینی سیادت کے ساتھ ساتھ دنیوی سیادت سے بھی سرفراز رکھا اور جب ہم نے اس کے حکم تدبر، تفکر اور تعقل سے سرتابی کی تو دنیا کا تو رونا ہی کیا دین بھی معرض خطر میں نظر آتا ہے۔

عباسیوں کے عہد خلافت کے بارے میں عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ یونانی کتابوں کے ترجموں نے بہت سے مسلمانوں کو ذہنی ارتداد میں مبتلا کر دیا تھا ہمارے نزدیک عباسیوں کے عہد کی یہ تصویر یکسر غلط ہے کیونکہ ان کے عہد حکومت میں جو تمام اہم تفسیریں یعنی طبری کی جامع البیان، زمخشری کی کشاف اور رازی کی تفسیر کبیر لکھی گئی ہیں وہ آج بھی ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں کسی نہ کسی شکل میں شامل ہیں۔ یہ تفسیریں اس خیال کو غلط ثابت کرنے [illegible] کے مسلمان علوم عقلیہ سے مستفیض ہوتے رہے تھے [illegible] اس وقت پیدا ہوا جب علوم [illegible]

اور علوم عقلیہ کو ایک دوسرے کے مخالف خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ا[illegible] ایک شاخ کے ماہر کے لیے دوسری شاخ سے واقف ہونا ضروری نہیں [illegible] وجہ سے علم کی ان دونوں شاخوں کے ماہرین میں فاصلہ بڑھنے لگا [illegible] بڑھتے اس حد کو پہنچ گیا کہ اس کا ختم ہونا بظاہر ممکن نہیں معلو[illegible]

یہاں پر ایک اور بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ہما[illegible] مدارس میں علوم عقلیہ کے جو قدیم نصابات شامل درس ہیں ان[illegible] حضرات معترض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان مدارس میں وہ ق[illegible] منطق، ہیئت اور دوسرے علوم درس میں شامل ہیں جو اس [illegible] از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ جو حضرات دینی مدارس کی اس روش [illegible] ہیں۔ ان کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں نے عا[illegible] ایک آلہ (Tool) کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ آج بھ[illegible] دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل ہیں ان کا تقاضا یہی [illegible] کے طلبا اس منطق و فلسفہ سے واقف رہیں جن کے رد عمل [illegible] تفسیریں معرض وجود میں آئی ہیں۔ مذکورہ تفسیروں کے [illegible] ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طالب علم اس قدیم یونا[illegible] سے آگاہ ہو جس کے رد میں مفسرین نے اپنی تفسیریں لکھی [illegible] ہے کہ زمخشری کے تفسیری مباحث کو سمجھنے کے لیے ڈیکا[illegible] ہیوم یا لاک جیسے مغربی فلسفیوں کے فلسفے سے مدد لی[illegible]

ہمارے نزدیک موجودہ عہد کے دینی مدارس [illegible] چیز نصاب میں داخل ہونی چاہیے [illegible] علوم نقلیہ [illegible] ہے یہ بات [illegible]

بی ان علوم پر ایک سے ایک اعلیٰ کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اگر ان کتابوں
سے بھی چند کتابوں کو دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم میں داخل کر لیں
مجبور ہوں گے کہ اپنے علوم عقلیہ کے نصاب میں بھی تبدیلی کریں کیونکہ
عقلیہ کا ان کا قدیم نصاب تعلیم، علوم نقلیہ کی جدید اور جدید تر کتابوں
صاب میں شامل ہونے کے بعد از کار رفتہ ہو جائے گا۔ اس لیے ہمارے
لامیہ دینی مدارس میں عصری علوم اس لیے شامل نصاب نہیں ہو پاتے
کہ ان کا علوم نقلیہ کا نصاب تعلیم ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

دوسری بڑی رکاوٹ جس کی بنا پر عصری علوم کو دینی مدارس
، داخل کرنا دشوار ہو گیا ہے علم کی تقسیم ہے میرا اشارہ دینی اور
وی علوم کی تفریق کی طرف ہے۔ میں اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں
ہنے کی جرأت کروں گا کہ ہمارے مذہب نے علم کی اس طرح کی کوئی تفریق
کے کسی بھی علم کے حصول پر قدغن نہیں لگائی ہے۔ ہماری مقدس
باب، کلام پاک، ہم سے قدم قدم پہ تدبر، تفکر اور تعقل کا تقاضا
رتی ہے۔ کیا اس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم اونٹ کی پیدائش پر، آسمان
بلندی پر، پہاڑوں کے استحکام پر اور زمین کی پرتوں پر غور و فکر
، نظر ڈالیں[1] یہ اللہ کی نشانیوں میں وہ نشانیاں ہیں جو ہر لمحہ ہماری
نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ اگر ہم کلام پاک کے احکامات کی بجا آوری
رتے ہوئے مذکورہ بالا چیزوں پر غور و فکر کر سکتے ہیں تو آخر ان باتوں
پر غور و فکر کیوں نہیں کی جا سکتی کہ روشنی کی رفتار کیا ہے؟ آواز کس
سیلے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے؟ قوت و حرارت کا رشتہ
یا ہے اور کیوں ہے؟ دو عناصر (ELEMENTS) کو اگر ایک دوسرے
سے ملا دیا جائے تو اُن میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اُن عناصر کی اپنی
پنی خصوصیات کس حد تک برقرار رہتی ہیں اور کس حد تک بدل جایا کرتی
ہیں؟

قرآن پاک نے ہم کو بتلایا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک اچھلتے ہوئے
پانی سے کی گئی ہے جو اس کے سینہ اور پشت کے درمیان سے نکلتا ہے[2]
کیا قرآن کے اس مجمل بیان کا تفصیلی مطالعہ منشائے قرآن کے خلاف
قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر حیاتیات کا مطالعہ کس طرح
از روئے شرع ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہماری نمازیں موقتہ ہیں اور
ہم یہ نہیں کر سکتے کہ فجر کی نماز دن کے آٹھ بجے پڑھ لیں اور عصر کی نماز ڈھائی
بجے۔ اسی طرح روزے کی ابتدا اور افطار بھی موقت ہیں اگر ایک منٹ بھی
پہلے روزہ افطار کر لیا جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا یا ایک منٹ کی
سحری میں تاخیر کر دی جائے تو بھی ہمارا روزہ درست نہ ہوگا۔ ہمارے
اسلاف نے اپنے علم اور استعداد کے مطابق اپنے اپنے عہد میں تعیین
وقت کی پوری پوری کوشش کی اور زیادہ تر سلیے کی مدد سے
نمازوں کے نظام الاوقات مقرر کیے۔ اب اس ایٹمی دور میں ایسے ایسے
آلات ایجاد کر لیے گئے ہیں جن کی مدد سے سکنڈ کے بھی حصّے کیے جا سکتے
ہیں۔ اپنی نمازوں کو وقت مقررہ پر ادا کرنے، روزوں کو صحیح وقت
پر شروع کرنے اور متعینہ وقت پر افطار کرنے کے لیے اگر عصری علوم و
آلات کا سہارا لیا جائے تو اس کو کس بنیاد پر خلاف شرع قرار دیا جا سکتا
ہے؟ اس لیے ہمارے نزدیک علم کو خانوں میں تقسیم کرنا کوئی معنی نہیں
رکھتا۔ ہر دنیوی علم، دینی علوم کا معاون و مددگار بلکہ خادم بن کر سامنے
آ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُس کو اِس خدمت کا موقع دیا جائے۔ اگر ہمارے
ذہنوں سے علم کی یہ تفریق ختم ہو جائے تو دینی مدارس میں بھی عصری علوم
کے وہ اجزا داخل نصاب کیے جا سکتے ہیں جو دینی علوم کی تحصیل کے لیے
ایک آلۂ کار بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ
ہو کہ ہم انگریزی خواں، دینی مدارس میں بڑی بڑی سائنسی تجربہ گاہیں قایم
کرنے کی دعوت دے رہے ہیں یا ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے
وابستہ گان قرآن پاک، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ،
اور علم الکلام سے دستبردار ہو کر اپنے نصاب تعلیم میں صرف عصری علوم
داخل کر لیں۔ ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ دینی مدارس میں ہر ہر لمحہ
قال اللہ اور قال الرسول کی ایمان پرور صدائیں گونجتی رہیں لیکن اسی کے
ساتھ ساتھ ہماری خواہش یہ ضرور ہے کہ قال اللہ اور قال الرسول

---

[1] سورۃ الغاشیہ آیت ۱۷ ـ ۲۰۔ [2] سورۃ الطارق آیت ۵ ـ ۷

کی مداومت کرنے والے حضرات آیات اللہ پر بھی ہر ہر لحظہ غور و فکر فرماتے رہیں اور جس طرح ان کے اسلاف نے اپنے اپنے عہد کے علمی فتنوں کو سرد کر کے رکھ دیا تھا، اسی طرح آج کے علمائے کرام بھی یہ فریضہ انجام دیں۔

اس سلسلے کی سب سے بڑی اور شاید سب سے اہم رکاوٹ کی جڑیں معاشی مسئلہ میں پیوست ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر دینی مدارس مسلمانوں کی مالی اعانت سے اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جن کا نہ تو کوئی مستقل ذریعہ آمدنی ہے اور نہ ہی مستقل بجٹ۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جن حضرات سے فتوی لیتے ہیں، نماز کی امامت کرواتے ہیں، جن سے رمضان میں کلام پاک سنتے ہیں، اپنے مردوں کی نماز جنازہ پڑھواتے ہیں، غرض کہ جن کو ہم اپنے دینی امور کی انجام دہی کے لیے اپنا پیشوا بناتے ہیں، ان کی خدمت میں تنخواہ کے نام پر ہم جو رقم پیش کرتے ہیں وہ سیکولر اداروں کے درجۂ چہارم کے ملازمین کی تنخواہ کا چوتھائی بھی نہیں ہوتی۔ آج بھی نہ جانے کتنے اللہ کے دین کی روشنی پھیلانے کا فریضہ انجام دینے والے حضرات، ڈیڑھ سو یا دو سو روپے ماہوار میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو ہم مسلمانوں کے معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات انگشت شمار ہی ہوں گے جو ایم۔ اے یا ایم۔ ایس سی اور پی ایچ۔ ڈی کی سندیں لینے کے بعد اس قلیل مشاہرہ پر دینی مدارس کی خدمت پر آمادہ ہوں۔ یہ ہمت تو غالباً دینی مدارس کے وہ فاضلین بھی نہیں کر سکتے جو ایم اے یا ایم۔ ایس سی اور پی ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد چار چار، پانچ پانچ ہزار روپے ماہانہ پا رہے ہیں۔ اپنی مالی بے چارگی کی وجہ سے وہ دینی مدارس بھی جو عصری علوم کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہتے ہیں، اپنی خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب تک علوم نقلیہ کا جدید نصاب تعلیم مرتب نہ کیا جائے گا، علم کو خانوں میں بانٹنے کا دستور نہ ختم ہوگا، ہم دینی مدارس کے اساتذہ کی اعانت میں معتد بہ اضافہ نہ کریں گے، دینی مدارس میں عصری علوم کو داخل نصاب کرنا دیوانے کا خواب بنا رہے گا۔

زمانے کے مطابق علوم و فنون

اے صاحبو! اب زمانہ ایسا نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے ہونہار پودوں کی پرورش کرنے پر بس کریں بلکہ زمانہ مقابلے کے میدان میں بہت قوی اور زبردست پہلوان لایا ہے۔ پس جب تک کہ ہم بھی اپنی قوم کے جوانوں کو میدان میں نہ لائیں، ہماری کامیابی ممکن نہیں۔ اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اس زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں، سربرآوردہ ہوں۔

سرسید

تقریر اجلاس دوم محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، لکھنؤ۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمود الحسن فیض آبادی

تعلیمی لائن سے تعلق رکھنے والے ارباب فکر و نظر کے لیے ضروری ہے کہ علمی رجحانات میں ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نگاہ رکھیں اور تعلیم کو قت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے جو اقدامات ضروری ہوں ان پر کھلے ہوئے دل و دماغ سے سوچیں اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل متعین کریں۔ اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب ہے کہ مدارس کے موجودہ نصاب پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اب سے پہلے مدارس اسلامیہ کے لیے جو نصاب تعلیم تجویز کیا گیا ظاہر ہے کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی ترتیب دیا گیا ہوگا۔ مثلاً درس نظامیہ کا رائج الوقت نصاب جسے اب سے تقریباً تین صدی پہلے حضرت ملاّ نظام الدین فرنگی محلی نے مرتب کیا تھا وہ آج بھی ہمارے تمام مدارس اسلامیہ میں بعینہٖ رائج ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نصاب کے فارغین تمام مطلوبہ صفات میں درجۂ کمال تک پہنچے اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل ثابت ہوئے۔ لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات نے کچھ ایسے جدید تقاضے پیدا کر دیے ہیں جنہیں نظر انداز کر کے ترقی کی اس دوڑ میں دوسروں کے دوش بدوش آگے بڑھنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ قدیم نصاب تعلیم میں گنجائش کی حد تک مناسب ترمیم کے امکانات پر غور کیا جائے اور جدید نصاب کو ایسے بنیادی اصولوں پر ترتیب دیا جائے جو موجودہ ترقی پذیر معاشرہ سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ملی و مذہبی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم نئے حالات کی پیدا کردہ ضروریات پر روشنی ڈالیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ نصاب کے اجزائے ترکیبی پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیں تاکہ نصاب مذکور کے ضروری اور کم ضروری علوم و فنون روشنی میں آجائیں اور ان میں ترمیم و تبدیل کا فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔

اجزائے نصاب قدیم

اس نصاب کے جزو غالب علوم قرآن و حدیث اور اس کے متعلقات ہیں، جیسے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، فرائض وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان میں کسی طرح کی ترمیم و تنسیخ نہ ضروری ہے نہ مفید۔ رہے دوسرے فنون جو اُن کے معاون و ذرایع کی حیثیت سے جزو نصاب رکھے گئے ہیں جیسے قدیم فارسی، منطق، فلسفہ، صرف و نحو، انشاء وغیرہ یہ البتہ محل فکر و نظر ہیں اور ان میں حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے۔ آیئے ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ جائزہ لیں۔

۱۔ قدیم فارسی ہمارے عربی نصاب کا ابتدائی لازمی جزو ہے، مگر آج جو فارسی زبان رائج ہے اور جس پر جدید فارسی ادب کی بنیاد ہے اس کو قدیم فارسی زبان سے کوئی مناسبت نہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس کی حیثیت جدید فارسی کے مقابلے میں جنس متروک کی ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں مناسب ہوگا کہ قدیم و جدید فارسی کی آمیزش سے ایک ایسا ہلکا پھلکا نصاب مرتب کیا جائے جو حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ قدیم فارسی کتابوں سے استفادہ کی صلاحیت بھی پیدا کر سکے۔

۲۔ فلسفہ و منطق۔ ایک دور تھا جب علمی مباحث

کےلیے فلسفہ ومنطق کی ضرورت واہمیت مسلّم تھی مگر آج کے بدلے ہوئے حالات میں علمی تقاضے بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ اس دور میں علمی اصطلاحات کی افہام وتفہیم کی حدتک تو فلسفہ ومنطق کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس سے زیادہ ان فنون پر انحصار کرنا اور اس سے نصاب کو خواہ مخواہ گرانبار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۴۔ صرف ونحو و انشاء

عربی زبان وادب پر عبور حاصل کرنے کے سلسلے میں صرف ونحو وانشا کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ابتک کے نصاب میں صرف ونحو وغیرہ کی جو متعدد کتب داخل ہیں اور جن کی غیر ضروری تکرار سے طلباء کا اچھاخاصہ وقت صرف ہوجاتا ہے اگر ان بہت سی کتابوں کے بجائے ہر فن کی ایک ایسی جامع کتاب مرتب کردی جائے جو جدید طریقہ تعلیم کی روشنی میں اس فن کے تمام گوشوں پر حاوی ہو اور جس میں تحریر وانشاء پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا ہو تو اس کی قوی امید ہے کہ طلباء کا بہت سا وقت بچایا جاسکتا ہے۔

دورِ جدید میں سائنس کی اہمیت

اس طرح نصاب میں مناسب ترمیم کرکے سائنس وغیرہ علوم جدیدہ کی گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کی جو اہمیت ہے کوئی بھی حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والا باشعور آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا، زندگی کے ہر میدان میں گوناگوں ترقیات کا سہرا سائنس ہی کے سر ہے، قدرت نے کائنات کے اس بے کراں سمندر میں فوز وفلاح انسانی کے جو بے پناہ امکانات چھپا رکھے ہیں، یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ سائنس اس کے ہزارویں حصے کو بھی دریافت کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے۔ تاہم اب تک سائنس کے زیر سایہ جو ایجادات واکتشافات منصۂ شہود پر آچکی ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے یہ پیشین قیاسی تو کی ہی جاسکتی ہے کہ فکر انسانی کائنات کے ان پوشیدہ خزانوں کا سراغ لگانے اور انہیں بروئے کار لانے میں آج نہیں تو کل ضرور کامیاب ہوگی، اسی لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سائنس آج کے انسانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس سے کسی طرح بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی قوم اپنی آئندہ نسل کو اس سے محروم رکھتی ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ وہ ترقی کی اس دوڑ میں اپنے بچوں کو پیچھے رکھنے کی ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے جس کی تلافی شاید مستقبل میں کبھی ممکن نہ ہو۔

اس لیے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی مدارس میں بھی سائنس کی ضروری تعلیم کا انتظام بغیر کسی ادنیٰ تامل کیا جائے، انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے ایک عظیم ملی ادارہ "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" نے اس ضرورت کا احساس کیا اور مسلم دانشوروں تک اس پیغام کو پہنچانے اور باہمی تعاون کے ذریعے اس عظیم مقصد کے حصول کی دعوت دی، یقیناً کسی بھی اصلاحی اقدام میں دشواریاں ہوتی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ راہ کی مشکلات منزل تک پہنچنے کا عزم وحوصلہ بھی عطا کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے عروج وزوال کا پیمانہ دوسروں سے بہت مختلف ہے۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول

آج تک جو بیشمار مادّی دولتیں علم انسانی کے دائرہ میں آچکی ہیں یا آئندہ صبح قیامت تک آتی رہیں گی جنہیں دوسری قوموں نے مقصد زندگی بنا رکھا ہے وہ سب کچھ ہمارے لیے اس شرط کے ساتھ مسخر ومنقاد ہیں کہ اس روئے زمین پر خدا کے خلیفہ بن کر اپنی تخلیق کا حقیقی مقصد پورا کریں اور وہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔ یہی ہماری صلاح وفلاح کا وہ حقیقی معیار ہے جس کے وجود وعدم پر ہمارے زوال وکمال کا فیصلہ پہلے بھی ہوا اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مری قوم کے جسور وغیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم

میر محمود علی قیصر

تعلیم ایک جامع لفظ ہے جس میں خداشناسی اور خودشناسی دونوں
ا ہیں۔ جس تعلیم میں یہ دونوں عناصر شامل نہ ہوں نہ تو وہ موزوں کہلا سکتی
اور نہ متوازن۔ اس لیے کہ اس میں انسانی افادیت کے کسی نہ کسی پہلو کی
ہ جاتی ہے۔ خداشناسی میں سارے دینی علوم شامل ہیں تو خودشناسی
سخیر کائنات، فطری تقاضوں کی تکمیل کے وسائل، انسانی ضروریات
ہر شاخ شامل ہے۔ اس طرح تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات
تجربات بھی داخل ہیں جو مہد سے لے کر لحد تک آدمی باضابطہ یا بے ضابطہ
کول، ماحول اور گرد و پیش سے حاصل کرتا ہے۔ علم انسان کی قدرتی صلاحیتوں
دریافت کرتا، نشو و نما دیتا اور معتدل و متوازن شخصیت و معاشرے
جنم دیتا ہے۔ اس لیے اس کے حصول میں ان تمام امور کو پیش نظر رکھنا
ہیے جو انسانی شخصیت کی ہمہ گیری کو پروان چڑھائے اور کسی ایک رخ
جھک پڑنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے، اس سے دور رہے۔

پچھلی چند صدیوں سے یہ انحطاط ہمارے معاشرے میں آگیا ہے کہ
م بالکلیہ طور پر کسی ایک پہلو سے لگ گئے ہیں اور جس کے نتیجے میں ہمارا اسلامی
اج ادھورا سا رہ گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم وقت اور انسانی
زورت اور سب سے اہم ارشادات الٰہی کی روشنی میں ایسے تعلیمی نصاب
ر غور کریں جو ان سارے امور کو احاطہ کرتا ہو اور جو دین و دنیا کی
سرخروئی کی طرف رہنمائی کرتا ہو۔

موجودہ وقت میں ہمارا معاشرہ حصول علم کے چند اداروں کے تحت
ہے جو اپنی کیفیت و کمیت میں بڑا خلا رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خداشناسی و
د شناسی کے دونوں پہلوؤں کی تکمیل نہیں کرتے۔ میں اس وقت تاریخ کے

ان بے شمار واقعات پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا، حالاں کہ وہ ایک تابناک
ماضی کی اطلاع دیتے ہیں اور ہمارے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے
کہ ہم ان سے واقف ہیں لیکن ان سے صرف نظر کیے ہوئے ہیں۔ اس عالم میں
ایسے اداروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو ان دونوں امور کی تعلیم دیتے ہیں۔ خواہ
ان کا مکتب فکر کچھ ہی ہو۔ اسلامی جامعات ساری کی ساری صرف اور صرف
دینی علوم سے آراستہ ہیں اور دنیوی علوم سے مکمل طور پر صرف نظر کیے ہوئے
ہیں۔ نتیجتاً ان کا فارغ التحصیل کسی مسجد کا پیش امام یا ایک شعلہ بیان مقرر
تو بن سکتا ہے لیکن ایک عملی شخصیت نہیں جو انسانی فلاح و بہبود کے لیے
کچھ کارنامے انجام دے سکے۔ چونکہ فکر و عمل ساتھ ساتھ ہیں اور وہ
فکر جو صرف خیالات کا ایک تانا بانا ہے، عمل کے اس جوہر سے کوئی وابستگی
نہیں رکھتی جو انسانی ضروریات کی تکمیل میں نت نئے انداز سے ایک سلسلہ
اختراعات و ایجادات بن جائے۔ اس کی وسعت نظر کوتاہی خیال و عمل کی
ایک ختم نہ ہونے والی داستان کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ یہاں اس امر کی شدید
ضرورت ہے کہ ہم ان طلباء کو دنیا کے کیف و کم سے واقف کروائیں اور
ان کو ایک عملی انسان کا پیکر دیں۔

ہمارا تجربہ ہے کہ یہ جامعات اپنے اس تعلیمی نصاب میں کسی طرح کی
تبدیلی نہیں چاہتے، حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کی ادھوری تعلیم
ان کے طلباء کو کشمکش حیات میں تنکے کی طرح بہائے رہی ہے۔ ضرورت اس
امر کی ہے کہ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدید اور عملی تعلیم بھی دی جائے
تاکہ قرآن مجید کی فکر و تدبر و تعقل کی دعوت کی تکمیل ہو سکے۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا
ہے کہ یہ تمام ادارے کسی بھی تبدیلی کو خواہ وہ نتائج کے اعتبار سے کتنے ہی

ں میں سے جن حضرات کو سائنس سے ممارست ہوئی ان میں سے بہتوں
لامی علوم وعقائد سے نابلدی اور عدم رسوخ کی بنا پر اپنا اسلامی
ہذیب بلکہ اسلامی تشخص کو فنا کرکے انہیں میں ضم ہو جانے کو فخر
نیمت یہ ہوئی کہ آج کل سائنس الہیات سے کم اور مادیات و
مات سے زیادہ بحث کرتی ہے لیکن پھر بھی بہت سے اقوال سائنسدانوں
یسے ہیں جو اسلامی مسلمات کے خلاف ہیں اور سب سے اہم منتہائے
جاب و موثر حقیقی کائنات میں خدا کو نہ ماننا ہے۔ ان تمہیدی کلمات
جداب اصل مدعا یہ ہے کہ اگر ایسی صورت میں اگر دینی مدارس
سائنسی تعلیم کی اشاعت کی گئی اور طلباء کے ذہن میں انہیں سائنس دانوں
ران کے اقوال کو بٹھایا گیا اور جہاں انہوں نے اسلامی احکام وعقائد
خلاف باتیں کہی ہیں ان کا رد نہ کیا گیا تو نتیجہ وہی نکلے گا جو اس سے
ہلے فلسفۂ یونان سے نکلا تھا کہ طلباء ان سائنس دانوں سے مرعوب
ہو جائیں گے اور انہیں کے اقوال مزعومہ کو حرف آخر تصور کرنے کی
جہ سے اسلامی مسلمات کی جگہ ان کے اندر باقی نہ رہے گی تو یہ مدارس
اسلامیہ کے مقصد کے بالکل خلاف ہوگا ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

تو دین دار مسلمان اس کی مخالفت کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس میں
رسہ کشی ہو پھر یا تو مسلمانوں کی اکثریت تہہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے
دین سے بیزار ہو جائے اور دین داروں کا ساتھ چھوڑ دے یا مذہبی
مسلمان اس کا شدید بائیکاٹ کریں۔ لہذا ایسی صورت میں طریقۂ کار وہی
مناسب ہے جو علمائے سلف نے فلسفۂ یونان کے ساتھ کیا کہ امام غزالی و
امام رازی جیسے علماء نے پہلے فلاسفہ کے اصل مدعا کو ثابت کیا بلکہ اس
طرح ان کا اصل مقصد پوری دیانت اور مکمل قوت استدلال کے ساتھ
ثابت کیا کہ خود وہ فلاسفہ بھی اپنے مدعا کو اتنے احسن طریقے اور قوی
دلیلوں سے ثابت کرنے سے قاصر تھے اور فلسفے کو نہایت سہل الحصول
بنا دیا۔ لہذا چاہیے کہ راسخ العلم پختہ کار علماء کا طبقہ ضرورت کا احساس
کرتے ہوئے سائنس کی طرف متوجہ ہو اور جن مسائل میں آناد سائنسدانوں
نے مذہب کے خلاف دعاوی پیش کیے ہیں ان کا رد کرکے احقاق حق و
ابطال باطل کا فریضہ انجام دے اور مذہب کے فرامین کی حقانیت
واضح کرکے طلباء کے ذہنوں کو مطمئن اور مذہب کی حقانیت ان میں راسخ
کرے لیکن اس راہ میں دشواری یہ ہے کہ مدارس سے جو علماء متعلق ہیں،
وہ کئی طرف سے الجھنوں میں ہیں کبھی تو کمیٹی کی نادرشاہی اور نااہلی انہیں
پریشان کرتی ہے اور کبھی عوامی تعلقات سے وہ کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔
الغرض اس کام کی انجام دہی کے لیے جو سکون و اطمینان خاطر ہونا چاہیے
وہ انہیں حاصل نہیں۔ ؎ پراگندہ روزی پراگندہ دل۔ یہ دشواریاں
ہیں جن کا ملحوظ رکھنا نہایت اہم ہے۔

۲۔ دوسری دشواری مادی و وسائلی: عموماً مدارس کے
ذرائع آمدنی نہایت محدود ہے جن پر کہ ان کے مصارف ہی کی کفالت
بھاری پڑتی ہے اور سائنسی تعلیم کے لیے مستقل ایک علیحدہ شعبہ قائم
کرنا پڑے گا جس کے لیے اساتذہ، سائنس روم، آلات تعلیم سائنس لابدی
ہوں گے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مصارف بڑھیں گے جو مدارس کے تحمل
سے اوپر ہوں گے۔

نیز یہ کہ مدارس میں زیر تعلیم طلبا ٪۹۵ فیصد ایسے تنگدست
گھروں سے تعلق رکھتے ہیں کہ رائج عربی و دینیات کا کورس بھی پورا نہیں
کر پاتے ہیں کہ گھر کی کفالت جواب دے دیتی ہے اور انھیں خانگی ذمہ داریاں
پابہ زنجیر کر دیتی ہیں۔ موجودہ نصاب میں سائنس داخل کرنے کے لیے نصاب
میں ایسی ترمیم ضروری ہوگی کہ جس سے داخل نصاب مضامین بھی کم نہ
ہوں۔ ایسی صورت میں مدت تعلیم میں اضافہ کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار
نہیں۔ اس مدت کے بڑھنے کی وجہ سے مذکورہ بالا دشواری اور مزید
ہوگی اور اگر مدت نہ بڑھا کر مضامین ہی کم کر دیے جائیں تو اصل مقصد
یعنی تعلیم دینیات میں معتدبہ خلل پڑے گا کیوں کہ یہ حقیقت ہے
کہ درس نظامیہ کا جو کورس آج سے چوتھائی صدی بیشتر رائج تھا
تعلیمی پستی کو دیکھتے ہوئے تقریباً سبھی مدارس نے اگر کوئی
باضابطہ طور پر نہیں تو عملی طور پر ضرور اس کے بہت سے حصے ترک
کر دیے، اس حد تک کہ اب باقی ماندہ میں اور کمی نقص خلل کے سوا
کچھ اور نہیں ہو سکتی۔

مدارس دینیہ میں سائنسی تعلیم کیوں

سید شرافت علی ندوی

بعثتِ نبوی سے قبل جس دور کو دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے وہ صرف اہلِ عرب کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ ساتویں صدی عیسوی کی جملہ آباد دنیا اس میں مبتلا تھی، نہ صرف مذہبی اور اعتقادی لحاظ سے بلکہ علمی اور تمدنی نقطۂ نظر سے بھی یہ دنیا صرف اوہام و روایات پر کاربند تھی۔ کائنات کا علم و مطالعہ صرف اتنا تھا کہ چاند سورج اور دیگر ستاروں کے طلوع و غروب سے وہ ضروری حد تک واقف تھے اور اپنے لیل و نہار اور ماہ و سال کو ان کی گردشوں سے مرتب کر لیا کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں دنیا کو ایک عقیدہ ایک مذہب اور ایک نظامِ زندگی دیا، وہیں اس نے کائنات کے تحقیقی مطالعے و مشاہدے کا دروازہ بھی کھولا۔ اس لحاظ سے اسلام کی آمد کو موجودہ دور کی سائنس کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے اور عرب مسلمانوں کو دنیا کے پہلے تسلیم شدہ سائنس دانوں کی حیثیت سے جانا گیا ہے۔ جنھوں نے اپنے مشاہدات اور اس کے نتائج سے دنیا کو فلکیات ریاضی اور طب جیسے فنون بخشے لیکن اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں جب کہ ساری دنیا سائنس کی جادوگری سے متاثر ہو گئی تھی اور اس کے عواقب میں مذاہب غیر مقبول ہونے لگے تھے۔ پہلی بار مذہب اور سائنس کا تصادم ہوا اور سائنسی تحقیقات سے مذہبی معتقدات دقیانوسی نظر آنے لگے۔ نتیجتاً بڑی عجلت میں سائنس دانوں نے اپنے نظریات میں مذہب کو مسترد کر دیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ مذہب زندگی کے ایک مستقل نظریے کی حیثیت رکھتا تھا اور سائنس کائنات کے مخصوص مشاہدے و تحقیق سے عبارت تھی۔ دونوں میں بظاہر تضاد تھا جو اس وقت حل نہیں کیا جا سکا۔ لیکن اب دورِ جدید کی سائنسی تحقیقات و مشاہدات سے انسان ایک اعلیٰ ترین ذہن اور ایک اعلیٰ ترین قوت کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور کائنات کے موجد تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے جیسا کہ انگلینڈ کے مشہور ریاضی داں اور ماہرِ فلکیات سر جیمس جینز (Sir James Jeans) نے لکھا ہے۔

> "اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ذہن کا عالمِ مادی کے خالق اور حکمراں کی حیثیت سے استقبال کریں یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی اور یہ سب ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے۔ ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمراں کی شہادت دے رہا ہے۔"

بحوالہ اسلام اور عصرِ حاضر صفحہ ۲۵۔ (مولانا وحید الدین خاں)

اسی طرح برٹرینڈ رسل نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "جدید علم یہ ثابت کرتا ہے کہ کائنات میں ڈزائن ہے اور اس سے ڈزائنر کو بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔"

اس طرح سائنس اور مذہب کا وہ تضاد جو اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، اب بیسویں صدی میں تقریباً ختم ہو چکا ہے مگر انکم اسلام

کے معاملے میں تو یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ اس کے معتقدات اور تعلیماتِ روحانی
آمیزش کے ساتھ ساتھ عقلیت کے اس معیار پر بھی پورے اترتے ہیں جو جدید
سائنس کا قایم کردہ ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس طرح گذشتہ صدیوں
میں سائنس نے مذہب کو مسترد کیا تھا، اسی طرح مذہب نے بھی سائنس کو
مسترد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہی سائنس جب مطالعہ وتحقیق اور
نظریات سے متجاوز ہو کر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دخیل ہوگئی
تو اہل مذاہب کو بھی اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑی جب کہ اسلام جو سائنس کی
راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا تھا، نہ پہلے سائنس کا مخالف تھا اور نہ اب ہے
لیکن مسلمان اہل علم نے سائنس سے علمی واقفیت حاصل کیے بغیر اور اس
کے انکشافات اور مشاہدات کو سمجھے بغیر سائنسی علوم اور فنون سے بعد کو برقرار
رکھنے میں اسلام اور اہل اسلام کی عاقبت بھی جو اس طرح ایک غلط اقدام
تھا جس طرح کہ ماضی میں صلیبی جنگوں کے بعد سائنس سے مسلمانوں نے اپنے
آپ کو دور کر لیا تھا جب کہ وہ بغداد اور دمشق سے نکل کر پہلی بار
یورپ میں قدم رکھ رہی تھی۔ اب جب کہ سائنس کے نظریات اور اسلام کے
معتقدات میں تفاوت ختم ہوتا جارہا ہے، اسلامی علوم وفنون کے حامل
افراد وشخصیات کو بھی سائنس کی مقبولیت کا علمی اعتراف کر لینا چاہیے
ممکن ہے مستقبل میں سائنسی تحقیقات اسلامیات کے سب سے بڑے
مادی شواہد کی حیثیت سے سامنے آجائیں جیسا کہ بعض تحقیقات سے
ظاہر بھی ہو چکا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان
ایک قدر مشترک "معقولیت" ہے۔ سائنس مشاہدہ اور تحقیق ہے
جب کہ قرآنی آیات جو اگرچہ غیر مرئی لیکن محسوس طریقے پر دنیا میں آئی
ہیں وہ بھی انسان کو مشاہدہ اور تدبر اور تفکر کی دعوت دیتی ہیں اور
اس کی عقل کو چیلنج کرتی ہیں۔ اسی طرح سائنسی معیار کے مطابق صرف اسلام
کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے دعوے اور دلیل کے درمیان حقیقی ربط
ہے، جب کہ دوسرے مذاہب میں یہ ربط مفقود ہے۔ آج ارضیات اور
فلکیات کے متعلق سائنسی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اسلامی
مسلمات کے عین مطابق ہیں اور ان میں کوئی تضاد واختلاف نہیں ہے۔
قرآن مجید سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی
یتبین انہ الحق او لم یکف بربک انہ علی کل شیء شہید
کا اعلان کر کے اس علم جدید کی نہ صرف توثیق کرتا ہے بلکہ اس کے لیے سندِ
جواز بھی دیتا ہے۔ غیر جانب دارانہ نظر سے سائنس اور دنیا کے دیگر مذاہب
کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہوگا جس کو دور
جدید کا سائنٹفک مذہب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کو یوں سمجھا جا سکتا
ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم توحید ہے جو فطرت کے مظاہر کی پرستش
کے صریح انکار اور مذاہبِ فطرت کو وجود میں لانے والے کے اقرار
پر مشتمل ہے۔ اس طرح سائنس بھی فطرت کے مشاہدے کا نام ہے اس کی
پرستش کا نہیں۔ دیگر مذاہب میں یہ پرستش موجود ہے جب کہ اسلام
اس آلودگی سے پاک ہے۔ قرآن

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ
الذی خلقھن

کہہ کر فطرت کو معبودیت سے ہٹا کر خالق اور مخلوق کے فرق کو واضح
کرتا ہے۔

سائنس اور اسلام کے درمیان یہ سب توافق اور
تطابق اپنی جگہ پر لیکن یہیں یہ تلاش کرنا ہے کہ مسلمان آخر اس قیمتی علم
سے ایک عرصۂ دراز سے کیوں محروم ہیں اور ان کے دینی تعلیمی اداروں
میں سائنس بحیثیت ایک علم وفن کے داخل کیوں نہیں ہے؟ اور اس کو
شجر ممنوعہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے؟ تفصیل میں جائے بغیر اس کی دو
وجہ معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ اسلام کو محض روحانیت اور سائنس کو محض مادیت سے
تعبیر کرنے کا نظریہ۔
۲۔ ذہنی مرعوبیت جس کے نتیجے میں ملت نہ صرف دینیات سے
کما حقہ مستفید ہوئی بلکہ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ اقوام کی طرح
اس میں انقلابی شعور پیدا نہ ہو سکا۔ یہ دونوں سبب آج تک
کارفرما ہیں۔ لیکن اب زیادہ دیر اس حالت پر قایم رہنا
مستقبل کو تاریک بنانے کے مترادف ہوگا۔ دینی تعلیمی ادارہ
میں سائنس اور اس کے متعلقات کی بنیادی اور ضروری تعلیم آج
وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعلیم صرف بقدر ضرورت اور

بطور وسیلہ اور ذریعہ کے ہو تاکہ مقصود اور منزل کے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

اعمل الدنیا بمقدار بقائک فیہا واعمل الآخرۃ بمقدار بقائک فیہا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری منزل تو آخرت ہے لیکن اس منزل کے لیے جو راہ بنائی گئی ہے اس کے علم وطلب اور جد وجہد بھی بے اجر نہیں ہے۔

قاری محمد طیبؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں

"سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام معنوی کا مادی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لیے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بنا کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا۔ مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔"

(اسلام اور سائنس صفحہ ۱۰۴)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمۂ خبیثہ ہے جس کے لیے کوئی ثبات وقرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور ذریعہ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمۂ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی"

(اسلام اور سائنس۔ صفحہ ۱۰۳)

اس قسم کی وضاحتوں کے بعد دینی اداروں کے ارباب نظم ونسق کے لیے سائنس کو نظام تعلیم کا ایک جزء بنانے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے یوں بھی ہم اپنے نصاب تعلیم میں شعر جاہلی، منطق، فلسفہ، علم کلام اور بین الاقوامی زبانوں کو شامل کیے ہوئے ہیں، جن کا براہ راست اسلام اور اس کی کلیات سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ہم ان کو اپنے کام کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے طلباء قرآن وحدیث کی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے زمانہ جاہلیت کے اس ادب کا بھی مطالعہ کریں جس میں ادب کم اور نفسانیت زیادہ ہے۔ عقیدے کے دلائل کو سمجھنے کے لیے اس فلسفہ اور علم کلام سے واقف ہوں جو اس دور میں تضیع وقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمارے طلباء ہندی اور انگریزی سے بھی باخبر ہوں کہ وہ اشاعت دین میں خود کفیل ہو جائیں جب کہ ان دونوں زبانوں میں ہماری کوئی دینی میراث نہیں ہے۔ یہ سب ہم برسوں سے کر رہے ہیں تو پھر ہم عقل ونقل کے ارتباط کے لیے مادیت اور روحانیت کے فطری اور قدرتی امتزاج کو واضح کرنے کے لیے سائنس کو اپنے نصاب کا ایک حصہ کیوں نہیں بنا سکتے؟ ہماری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہم نے بحیثیت مسلمان جس چیز کو اپنایا ہے، اس کو مسلمان بنایا ہے، چاہے وہ ملک ہو، قوم ہو، زبان ہو، یا دنیا کا کوئی علم اور فن۔ ہم نے دنیا کی ہر خود مختار اور خود سر چیز کو اپنا کر اسے اسلام کا مطیع اور خادم بنایا ہے۔ یہ فلسفہ اور علم کلام، یہ فارسی، ترکی، اردو اور ہندی زبانیں۔ یہ شعر وادب کی گمراہ وادیاں یہ عمرانیات و ریاضیات کے ادق فنون ہم نے ان کو اپنایا، گلے لگایا اور مسلمان بنالیا۔ ہم سائنس کو بھی مسلمان بنا سکتے ہیں، اسے رخ شر سے خیر کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ ہم واضح کرسکتے ہیں کہ مادیت کو بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے اور آخرت تک پہنچنے کے لیے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس کا ایک مخصوص کردار اور مزاج ہوتا ہے۔ منقولات اور دلنشیں اسلامیات کی درس وتدریس سے قلب وذہن کو جو جِلا ملتی ہے وہ اپنے آپ میں بے بدل اور بے نظیر ہوتی ہے۔ سائنس جیسے مشاہداتی اور مخصوص سبجیکٹ سے ان مدارس کو ربط قائم کرنے میں ایک مدت لگ سکتی ہے اور کسی حد تک مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے لیکن آج ہمارے سامنے عالم اسلام کی مثال موجود ہے، جہاں کے جامعات اور کلیات میں سائنس ایک عرصے سے داخل ہے اور دینی معاہد میں بھی ایک ضروری عنصر کی طرح اس کو جگہ دی جا چکی ہے۔

عالم عرب کے سب سے قدیم اور سب سے بڑے تعلیمی ادارہ جامعہ ازہر مصر میں سائنسی علوم و فنون ایک عرصۂ دراز سے پڑھائے جا رہے ہیں۔ یہیں کے ایک نامور عالم علامہ طنطاوی نے ۲۲ جلدوں میں تفسیر جواہر القرآن لکھی ہے۔ جس میں قرآن کی آیتوں اور موجودہ سائنسی تحقیقات میں حیرت انگیز مطابقت بتلائی گئی ہے۔ اب جب یہ اسلامی ممالک جو ایک طرح سے ہمارے مذہبی اعلام ہیں اور جہاں کے مقدس ادارے اور مقامات ہمارے دینی مزاج اور روح کے ماخذ اور مصدر ہیں' اس علم کو اختیار کر سکتے ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے ؟

ویسے بھی ہمارے ہندوستان میں مدارس کا نصاب تعلیم ہمیشہ وقت اور زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر متعین کیا جاتا رہا ہے۔ اس دور میں اس میں اصلاح تغیر کی بڑی گنجایش ہے۔ ہم اس میں سے بہت سی غیر ضروری اجزا کو نکال کر علم جدید کو داخل کر سکتے ہیں۔

سائنس کی طرف ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید نے پیش قدمی کی تھی اور ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں منقولات کے ساتھ جدید علوم کی طلب اور اکتساب کو ضروری قرار دیا تھا۔ مخالفتوں کے باوجود انہیں اس بارے میں کامیابی مل ہی گئی تھی آج انہیں کے قایم کردہ ادارہ سے یہ آواز اٹھی ہے! امید ہے کہ یہ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔

ہمارے علماء مدارس کے لئے دل و نظر کی وسعت رکھتے ہیں اور عصری تقاضے بھی اکثر ان کو بے آرام کیے رہتے ہیں۔ وہ ملت کے بہتر مستقبل کے لیے سائنس کو حسب ضرورت نصاب تعلیم کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری ملت میں ایسے دانشوروں اور سائنس دانوں کی کمی نہیں ہے جن کے دلوں اور دماغوں میں سائنسی فتوحات کے علم کے ساتھ ایمان کا نور بھی ہے ان کے تعاون اور مشورہ سے ایسا نظام تعلیم بنایا جانا ممکن ہے۔

یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے نظام تعلیم کے نتیجے میں اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کی کئی راہیں کھلیں گی اور دنیا جو رفتہ رفتہ تشنہ ہوتی جا رہی ہے اس دعوت و فکر سے اپنی تشنگی کو دور کر سکے گی اور آج کے انسان کو اپنی حقیقی منزل کی طرف گامزن ہونے میں ایک سہارا مل جائے گا۔

گر خدا کی ذات نے امریکن پر رزق کھولا اور ایک براعظم سے نوازا تو کیا یہ اس کے اس عزم کا بدلہ نہ تھا جس نے اسے بے کنار سمندروں میں نئے براعظم کی دریافت میں طوفانوں سے لڑا دیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی انڈسٹری کی دھاک ساری دنیا پر بٹھا دی ہے تو اس میں جاپانی نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے کے لیے نازل نہیں ہوتے۔

—— عبدالسلام

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶، شمارہ ۵ - (مئی ۸۷ء)

مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی کا نصاب

عبدالجلیل

میں ان ہستیوں کا تہِ دل سے مشکور ہوں، جن کی زیر سرپرستی اور زیرنگرانی اس کانفرنس کا مسلم یونیورسٹی میں انعقاد عمل میں آیا اور مجھے "مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی کا نصاب" پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا

میں نے اس موضوع کو بہتر طریقے پر واضح کرنے کے لیے پانچ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے

۱- نصاب کا مفہوم اور مقصد
۲- مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی کا نصاب
۳- مجوزہ نصاب کی غرض و غایت۔
۴- نصاب کے نفاذ کی صورتیں اور موانع کا حل۔
۵- ایک دینی درس گاہ میں سائنس اور ریاضی کے نصاب کا عملی نفاذ۔

نصاب کا مفہوم اور مقصد

مفہوم

کسی معاشرے کے فرد یا افراد کو کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے ایک متعین مدت میں کوئی متعین معلومات یا علم بہم پہنچانے کا نام نصاب ہے۔ درس و تدریس میں نصاب (Curriculum) کا مفہوم یہ ہے کہ کسی معاشرے کے ماضی کے علم و دانش، حکمت و دانائی، تہذیب و تمدن اور اقدار حیات کو حال کی روشنی میں اس کی نوخیز نسل کو بتدریج ذہنی اور جسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اس طرح منتقل کیا جائے کہ اس کی ارتقاء ہو اور مستقبل میں رب کائنات کی مرضی کے مطابق ایک اسلامی معاشرے کی ارتقائی تشکیل میں مفید ہو۔

نوخیز نسل ایک سادہ ذہن کے ساتھ عالم وجود میں آتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

"اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اس نے تمہیں کان دیے آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے اس لیے کہ تم شکر گزار بنو" (النحل ۸۰)

سورۂ الاعراف آیت ۱۷۹ میں ارشاد ہے:

"اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے، ان کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔"

ان آیات الٰہی کی روشنی میں یہ بات خود بخود واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ نوخیز نسل کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ اس کے اندر سمع بصر اور فواد (Hearing, Sight and reasoning faculties) سے بدرجہ اتم کام لینے کی صلاحیت پیدا ہو اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہو، یعنی ماضی کا ورثہ حاصل کرے، پھر زمانہ حال میں خود مشاہدہ کے ذریعے معلومات بہم پہنچائے اور پھر ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی صلاحیت سے قوت استدلال (Reasoning) کے ذریعے نتائج اخذ کرے۔

بچے کی ان فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے اس کے شعو

تقاء کو مد نظر رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے اس لیے مطالعہ بعلم و فن بچے کے فہم و
ر کے لحاظ سے مختلف ادوار میں اس طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق بچے
معلومات میں بتدریج معیار مطلوب تک اضافہ ہوتا چلا جائے ۔
نصاب طالب علم کی ایک ایسی شاہراہ ہے جس کے ذریعے وہ آسانی علم و
دانش کی منزل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ نصاب اور علم و دانش جامد نہیں
بلکہ ارتقاء پذیر ہیں

مقصد

کسی نصاب میں تعلیمی مقاصد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی
بھی نصاب تعلیم محض فلسفہ، سائنس یا سیاسی اور معاشی تصورات کی مجرد عکاسی ہی
نہیں کرتا بلکہ ان عقاید و نظریات کا مظہر بھی ہوتا ہے جو اس کائنات میں انسان
کی حیثیت کو متعین کرتا ہے۔ وہ معاشرہ کے افکار و نظریات اور کلچر کے
ورثے کو ضرورت کے مطابق اس کے افراد تک منتقل کرنے کا ذریعہ بھی ہوتا
ہے۔ اس نتیجے میں معاشرے کے وہ افراد جو اپنے عقاید و نظریات، تہذیب و
تمدن اور روایتی اقدار حیات کے لحاظ سے مختلف لیکن اقلیت میں ہوتے ہیں
بڑی مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ موجودہ جمہوری دور میں ریاستی
تعلیمی پالیسی میں اکثریتی افراد کے نظریات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس لیے تعلیمی
پالیسی کے سلسلے میں اکثریت اور اقلیت کے مابین مخفی کشمکش شروع ہو جاتی
ہے جس کا فطری نتیجہ ان افراد کے زوال کی شکل میں رونما ہوتا ہے جو تغیر پذیر
حالات پر علمی اور فکری حیثیت سے اثر انداز ہونے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں
نصاب تعلیم ہی پر معاشرے کے استحکام اور عدم استحکام کا انحصار ہوتا ہے۔
کوئی بھی نصاب تعلیم کسی معاشرے کی نوخیز نسل میں مکمل حکمت و دانائی
و تہذیبی ورثہ منتقل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم و دانش ـــــ جو عطیہ خداوندی
ہوتا ہے ـــــ کے حصول میں فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک خاص
مدت کے بعد انتخاب کرنا ہوتا ہے، اس انتخاب کے ذریعے گوناگوں صلاحیتوں کے
حامل طالب علم کی تربیت ہوتی ہے، جو اپنی منفرد صلاحیت کے لحاظ سے معاشرے
کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں اور معاشرے کے ان سیاسی، معاشی اور
تمدنی عوامل پر جو ناقابل تسخیر نظر آتے ہیں، اثر انداز ہو کر ایک مستحکم معاشرے
کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔
یا مقصد نصاب تعلیم ہی طالب علم کی مکمل شخصیت کی تعمیر میں ممد و معاون
ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے حال میں وہ معاشرے میں اپنا مقام پیدا کر کے مستقبل کے
خاکے میں رنگ بھر کر منصب قیادت پر فائز ہوتا ہے اور معاشرہ ارتقائی منازل
طے کرتا ہے۔
نصاب تعلیم کے سلسلے میں مجھے صرف "مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی
کے نصاب" ہی پر روشنی ڈالنا ہے۔

۲- مدارس کے لیے ریاضی اور سائنس کا نصاب

کافی غور و فکر کے بعد میں نے سائنس اور ریاضی کے نصاب کو تین
مدارج الف- بے- ج میں تقسیم کیا ہے

الف (A) ابتدائی اور ثانوی درجات کے لیے نیشنل کونسل آف
ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا جونیئر ہائی اسکول کا مکمل نصاب۔

ب (B) عالیت کے درجات میں تین سال کی مدت تک نیشنل کاؤنسل
آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا ہائی اسکول کا مکمل نصاب ۔

الف A اور ب B نصاب کی تعلیم لازمی (Compulsory) ہو۔

ج C عالیت کے آخری دو سالوں میں نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل
ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا انٹرمیڈیٹ کا نصاب Optional یعنی
اختیاری ہو

اس سلسلے میں U.P. Board کا بھی نصاب سامنے رکھا جائے اور
اگر داخلی سینٹر مناسب سمجھے تو دونوں میں جو کمی یا زیادتی ہو یا ترمیم کے بعد
مزید اضافے کی ضرورت ہو وہ کرے تاکہ مسابقت (Competition)
اور B.Sc. کے داخلے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

۳- مجوزہ نصاب کی غرض و غایت

مجوزہ نصاب کی غرض و غایت اچھی طرح سمجھنے کے لیے اگر قرآن کریم
میں اللہ تعالیٰ کے چند ارشادات کو سامنے رکھا جائے تو بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔

"اللہ بڑا وسیع العلم ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے
جسے حکمت ملی حقیقتاً اسے وافر بھلائی مل گئی۔ ان باتوں
سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانش مند ہیں"

(البقرہ۔ ۲۶۸-۲۶۹)

"زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات دن کے باری
باری آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں

ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں
اور آسمان وزمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔"

(آل عمران ۱۹۰)

"حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں
ایمان لانے والوں کے لیے اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور
ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے، بڑی
نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور
شب وروز کے فرق واختلاف میں اور اس رزق میں
جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے
سے وہ مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے اور ہواؤں کی گردش
میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام
لیتے ہیں۔" (الجاثیہ ۳-۵)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر
کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اللہ
کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور
آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا
ہے، سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں
ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرنے والے ہیں۔"

(الجاثیہ ۱۲-۱۳)

"وہ (اللہ) اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے
ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔"

(یونس ۵)

"ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسے
آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

(یونس ۱۰۱)

'ان کا رب (ان سے) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو
جھٹلا دیا۔ حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہیں کیا۔"

(النمل ۸۴)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی روشنی میں سائنس اور ریاضی کے
نصاب کی غرض وغایت کھل کر واضح انداز میں سامنے آجاتی ہے اور اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچے کے اندر خالق کائنات کی تخلیق کی ہوئی اپنے گرد وپیش کی
اشیاء کا مشاہدہ کرنے، غور وفکر کرنے اور تیزی کے ساتھ نتائج اخذ
کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ کیونکہ جب طالب علم کو مشاہدے کے
نتیجے میں انتہائی چھوٹی اشیاء کے بارے میں حیرت انگیز تفصیلات کا علم
بڑھتا ہے تو اس سے ایک واحد خالق کائنات کے وجود کی تائید میں ٹھوس
اور قوی دلائل ہاتھ آتے ہیں جس سے اس کا ایمان بڑھتا ہے اور اس کے اندر
عجز وانکساری کی صفت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے
والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔" (فاطر ۲۰)

سائنس اور ریاضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دورِ جدید میں
Social Sciences ہوں یا Natural Sciences
ہر شعبے میں ریاضی کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ٹھوس سائنٹفک
نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی، اسی کے ذریعے محیر العقول
ایجادات واکتشافات کا ظہور ہوتا ہے۔ آج الیکٹرانک انقلاب، مختلف
سیاروں تک رسائی، تخریبی اور پُرامن مقاصد کے لیے اٹامک انرجی
کا استعمال وغیرہ بے شمار کارنامے ریاضی ہی کے اعجاز کے مرہون منت
ہیں۔

عربی زبان سے مکمل واقفیت ہی بذات خود قرآن کی تقریباً ان ساڑھے
سات سو آیات کی تفہیم وتشریح کے لیے کافی نہیں ہے جو مختلف سائنسی
علوم وموضوعات کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ مثلاً تخلیق، فلکیات، زمین سے
متعلق بعض مادے جیسے لوہا، تانبا، سیسہ وغیرہ کی تشریح، عالم حیوانات،
نباتات، انسان کی تولید، تسخیر کائنات وغیرہ۔ ان کی تفسیر کے لیے متنوع
قسم کی سائنسی معلومات لازمی ہے۔ میرے نزدیک مجوزہ نصاب عربی دانی
میں اس کمی کو دور کرنے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ہر دور میں علم و دانش کے فہم وشعور کی متعین قدریں (Values)
ہوتی ہیں، انہیں قدروں (Values) کے پیمانوں کی روشنی میں اہل علم ونظر
حقائق کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ دور حاضر چونکہ سائنس اور اعداد وشمار
کا دور ہے، اس لیے قرآن کریم کی آیات کی تفسیر وتفہیم جدید سائنسی اصطلاحات

کی روشنی میں دورِ حاضر کے ذہین طبقہ کو متاثر کرنے کا سبب ہوگی۔

سائنس اور ریاضی کے ذریعے قرآن کریم کے اسرار و رموز عیاں کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

مجوزہ نصاب مدارس سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ذہین طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں معاون ہوگا۔ انجینئرنگ، میڈیسن نیز اعلیٰ سائنسی تعلیم کے حصول کے مواقع فراہم ہوسکتے ہیں اور مجھے یقین محکم ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے مزین سائنس داں اور انجینئر اختراعات و انکشافات کی دنیا میں دوسروں سے سبقت لے جائیں گے۔ کیوں کہ خالقِ کائنات کے تصورِ توحید کی بنا پر انہیں نہ تو قیاسیات کی وادی میں بھٹکنا پڑے گا اور نہ ہی ان کی قوت و توانائی اور وقت کا ضیاع ہوگا۔ بلکہ دھیرے دھیرے ان کے اندر علمی فوقیت پیدا ہوگی اور جلد ہی وہ اسلام کے سلسلے میں مدافعانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے اقدامی رویّہ اپنانے کی پوزیشن میں ہوں گے اور یہی نہیں بلکہ جب کسی قوم کے اندر علمی و عملی برتری پیدا ہوجاتی ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق قیادت اور امامت کے منصب پر وہی فائز ہوا کرتی ہے۔

مجوزہ نصاب کے نفاذ کی صورتیں اور موانع کا حل۔

مجوزہ نصاب کے نفاذ کی صورتوں کے متعلق غور و فکر کرنے سے پہلے عربی مدارس میں مدتِ تعلیم اور دیگر تعلیمی امور کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہندوستان میں معروف عربی مدارس کی مدتِ تعلیم کے تین درجے ہیں

۱۔ ابتدائی پانچ سال۔ ثانوی تین سال۔ اعلیٰ ۵+۲= ۱۵ سال

۲۔ ابتدائی ۶ سال۔ اعلیٰ ۵+۲= ۱۳ سال

۳۔ ابتدائی ۵ سال۔ ثانوی ۳ سال۔ اعلیٰ ۸+۲= ۱۸ سال

ان مدارس میں ابتدائی سے ثانوی تک اردو، ہندی، فارسی، دینیات، حساب، تاریخ، جغرافیہ اور کہیں کہیں انگلش اور عام معلومات کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ درجات میں صرف و نحو، عربی ادب، قرآن و حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور کہیں کہیں انگریزی، علم تمدن، معاشیات میں سے ایک یا تینوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور انگریزی، تمدن اور معاشیات کو سیکولر مضامین کا نام دیا جاتا ہے۔ عربی سے متعلق یعنی غیر سیکولر مضامین پر تقریباً چھ گھنٹیاں صرف کی جاتی ہیں۔ ایک سے ڈیڑھ گھنٹی تک سیکولر مضامین کے لیے وقف کی جاتی ہے۔ ابتدا میں نحو و صرف پر تین گھنٹی اور عربی ادب و انشا پر تین گھنٹی تعلیم ہوتی ہے۔ اہلِ علم و دانش ماہرینِ تعلیمات اور نفسیات کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس طرح کی تعلیم طالب علم کے اندر اکتاہٹ اور عدم دلچسپی پیدا کرنے کا سبب ہوجاتی ہے جس کی بنا پر نہ تو تعلیم موثر ہوتی ہے اور نہ ہی مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ عملی حیثیت سے وقت کا بھی نقصان ہوتا ہے اور معلم کے اندر بھی ایک ہی مضمون کو ایک ہی کلاس میں مسلسل پڑھانے کی وجہ سے یکساں اسپرٹ برقرار نہیں رہتی۔ متعلم اور معلم کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے تنوع ضروری ہے۔ عربی کے سال دوم سے عموماً صرف و نحو، انشاء اور ادب کے ساتھ فقہ کی بھی ابتدا کردی جاتی ہے، جس کی تعلیم مسلسل پانچ سال تک ہوتی رہتی ہے۔ مختلف انواع و اقسام کی ایسی فقہی گتھیاں پیدا کی جاتی ہیں اور پھر انہیں سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وقت کے لحاظ سے طلباء کے اندر ایسی فقہی صلاحیت بھی نہیں پیدا ہو پاتی جس کے ذریعہ دورِ جدید کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا کو اصولِ فقہ اور ان مسائل سے واقف کرایا جائے جن کی عملی زندگی میں ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر مجتہدانہ بصیرت پیدا کی جائے۔ اس طرح اس مضمون کی مدتِ تعلیم میں کافی کمی کی جاسکتی۔

عربی سوم سے احادیث کی تعلیم شروع ہوجاتی ہے۔ پوری مدت احادیث کی منتخب کتابوں سے منتخب الواب پڑھائے جاتے ہیں۔ احادیث کا کوئی نصاب متعین نہیں ہوتا ہے بلکہ مکمل کتابوں کا نام ہوتا ہے جن سے چند الواب پڑھائے جاتے ہیں اور وہی روایتی انداز ہوتا ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے اور انہیں الواب کے تحت تعلیم بھی دی جاتی ہے جو صدیوں پہلے مصنف نے ترتیب دیا ہے۔ حالاں کہ اگر حدیث کا باقاعدہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے تحت نصاب متعین کیا جائے اور جدید عنوانات کے تحت منتخب احادیث کی تعلیم ایک فن کی حیثیت سے دی جائے تو مفید نتائج برآمد ہوں گے اور وقت کی کافی بچت ہوگی۔

دورِ حاضر میں [illegible] کی وسعت کے پیشِ نظر اگر ایک [illegible] کے بعد حدیث، فقہ، قرآن [illegible] ادب میں تخصص کے لیے [illegible] برآمد ہوں گے

منطق اور فلسفہ کی تعلیمی ضرورت سے اگرچہ انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن قدیم منطق اور فلسفہ کی ضرورت دورِ جدید میں باقی نہیں رہتی۔ اب وہ دور بھی ختم ہو چکا جب اسلام کا دفاع منطقی دلائل سے کیا جاتا تھا، آج کا دور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اگر اسلام کی کچھ خدمت کرنا ہے تو اس دور میں اپنا مقام پیدا کرنا ہوگا۔ میں جب اس سلسلے میں ذمہ داران مدارس سے گفتگو کرتا ہوں تو مجھے بتایا جاتا ہے کہ تفاسیر وغیرہ میں منطق کی پرانی اصطلاحیں آ جاتی ہیں، اس لیے انہیں سمجھنے کی غرض سے قدیم مبادیات منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھانا ضروری ہے۔ میرے نزدیک قدیم اصطلاحوں کو متعلقہ مضمون کے دوران استاد اگر وضاحت کر دے تو اس کے لیے علیحدہ پیریڈ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس تجزیہ کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر مدارس میں عربی ادب، قرآن کریم حدیث اور فقہ سے متعلق چار سے پانچ پیریڈ تک تعلیم ہو اور تین سے ساڑھے تین پیریڈ سائنس، ریاضی نیز دیگر علوم کی تعلیم ہو تو عصری اور دینی علوم میں کافی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ ان کے عملی نفاذ کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ پرائمری سے ثانوی درجات تک یعنی ابتدا سے آٹھ سال کی مدت تک اردو، دینیات، ناظرہ، ہندی، تاریخ اور آرٹ کے ساتھ سائنس، ریاضی، جغرافیہ اور انگریزی کی تعلیم دی جائے جس میں سائنس، ریاضی اور جغرافیہ کا N.C.E.R.T کا مکمل نصاب اور انگریزی کا یو۔پی بورڈ کا نصاب ہو۔ یعنی سائنس اور ریاضی کے لیے مجوزہ نصاب کا جز "الف" ہو۔

عربی اول سے عربی سوم تک سائنس اور ریاضی کا مجوزہ نصاب کا جز "ب" نیز اس کے ساتھ یو۔پی بورڈ کا ہائی اسکول کی انگلش کا نصاب اور علوم عمرانیات کا ہائی اسکول کے مساوی نصاب پڑھایا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں سائنس اور ریاضی کے لیے روزآنہ ڈیڑھ پیریڈ، انگلش کے لیے روزانہ ڈیڑھ پیریڈ اور علوم عمرانیات کے لیے ہفتہ میں تین پیریڈ آسانی کے ساتھ دیے جا سکتے ہیں۔

عربی سوم کے بعد سائنس اور ریاضی کے لیے مجوزہ نصاب کا جز "ج" اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ کا انگریزی کا نصاب پڑھایا جائے تو اس کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے روزآنہ دیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح طالب علم عالمیت کے آخری سال تک انٹرمیڈیٹ کی اچھی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر طالب علم اپنی صلاحیت اور دلچسپی کے اعتبار سے مزید سائنس اور ریاضی کی تعلیم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک یہ سوال زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ کیوں کہ ترقی یافتہ اور کچھ ترقی پذیر ممالک کے بچے ان سے زیادہ مضامین پڑھتے ہیں اور اچھی استعداد کے مالک ہوتے ہیں۔ میں یہ بات اپنے ذاتی مشاہدے نیز اخبارات و رسائل کے مطالعے کی بنا پر کہتا ہوں لیکن اگر صلاحیت اور دلچسپی کے سوال کو تسلیم کر لیا جائے تو دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ تین مضامین

۱۔ سائنس اور ریاضی۔ مجوزہ نصاب کا جز "ج"
۲۔ معاشیات Economics
۳۔ سیاسیات (Political Sciences)

میں سے کوئی ایک مضمون اختیاری حیثیت سے ہو اور (۲) انگریزی لازمی ہو۔

میں نے سائنس، ریاضی اور انگریزی وغیرہ کے لیے گھنٹیوں کو جو تقسیم کی ہے اور یہ بھی بتلانے کی کوشش کی ہے کہ اس سے متعلقہ مضامین میں قرآن کریم، حدیث اور فقہ وغیرہ کی مطلوبہ تعلیم کو متاثر کیے بغیر طلبا کے اندر انٹر میڈیٹ کی استعداد پیدا ہو جائے گی۔ کچھ لوگوں کو محض شیخ چلی کا منصوبہ معلوم ہوتا ہو تو ان کی تشفی کے لیے میں دوسرا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔ انگریزی مدارس میں میرے حساب کے مطابق پورے سال میں تعلیم کے سو دن ملتے ہیں بقیہ ایام تعطیلات، Home Examinations، بورڈ کے امتحانات Evaluations، نتائج کی تیاری، داخلہ اور فیس کی وصولیابی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جب کہ عربی مدارس میں ان سب کو وضع کر کے پورے سال میں تعلیم کے دو سو دن ملتے ہیں۔ اس طرح انگریزی مدارس کی بہ نسبت ان کو دوگنا اوقات ملتے ہیں۔ یہ حساب کسی مبالغے پر مبنی نہیں ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ زیر بحث مضمون کو کتنی آسانی کے ساتھ مکمل کیا جا سکتا ہے۔

زیر بحث مضمون کے نفاذ کی راہ میں دوسری دشواری یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو زبان میں متعلقہ مضامین کی کتب کا حصول ممکن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں لوگوں کی معلومات کم ہیں۔ کیوں کہ دہلی اور مہاراشٹر میں مجوزہ نصاب کی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔

تیسرا شکوہ یہ کیا جاتا ہے کہ کتابیں اگر مل بھی جائیں تو ان کے مواد اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں تحریر ہوتے ہیں، بلکہ کچھ ایسے مواد بھی ہو۔تے ہیں جو اسلامی عقائد و نظریات سے ٹکراتے ہیں، اس کا اثر طلبا کے ذہنوں پر خراب ہوگا اور وہ دہریت کا شکار ہو جائیں گے۔ بلاشبہ ان کا یہ شکوہ اپنی جگہ درست ہے جیسا کہ "بائیبل، قرآن اور سائنس" کا مصنف مورس بوکائی رقم طراز ہے۔

"نشاۃ ثانیہ کے بعد۔۔۔۔ مغرب میں جو شخص سائنسی حلقوں میں رہتے ہوئے خدا کا نام لیتا ہے اس کو برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرز عمل سے مسلمانوں سمیت ان تمام نوجوانوں کی ذہنیت متاثر ہوتی ہے جو یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں۔

۔۔۔۔۔ ایک نوبل پرائز حاصل کرنے والے سائنس دان نے۔۔۔ یہ لکھ کر لوگوں کو ورغلایا ہے کہ جاندار مادہ میں ایک صلاحیت ہے کہ وہ کئی بنیادی عناصر کی مدد سے اتفاقیہ طور پر بھی تولید کا عمل کر سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ابتدائی جاندار مادہ سے شروع کر کے اور مختلف بیرونی عوامل کے زیر اثر باقاعدہ ذی حیات اشیاء کی تشکیل ہوئی، جس کے نتیجے میں وہ مرعوب کن پیچیدہ وجود ظہور پذیر ہوا جو انسان کہلاتا ہے۔

یقیناً ہم عصری سائنسی معلومات کے یہ عجوبے جو حیات کے میدان میں رونما ہوئے ہیں، ایک غور و فکر کرنے والے انسان کو مخالف نتیجہ اخذ کرنے کی جانب بھی لے جا سکتے ہیں؟۔ (ص ۱۸۹)

یہی نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے ایک ذہین سائنس دان ڈارون نے نظریۂ ارتقاء Theory Of Evolution پیش کر کے خدا کے وجود اور خلاق کا منکر ہوا۔ ایک دوسرے سائنس داں فرائڈ نے انسان کو جنسیات Sexuality کا غلام بنا دیا اور ایک تیسرے عظیم مفکر "نیست پیغمبر لیکن دارد کتاب" یعنی کارل مارکس نے انسان کو معاشی اعتبار سے حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ بلاشبہ ان نظریات نے مسلم ذہنوں کو حیرت انگیز طور پر متاثر کیا ہے، جس سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اگرچہ ان نظریات کو نظری اعتبار سے رد کیا جا چکا ہے، لیکن اس کی سمیت اب بھی باقی ہے بلکہ ۱۹۶۲ء میں ایک نوبل پرائز یافتہ سائنس داں F.H.C.Crick نے "Theory Directed Panspermia" پیش کر کے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ لیکن اس کی تحریروں میں بھی خدا کے وجود کا اثبات نہیں ملتا۔ ان سب دشواریوں کے باوجود اس کا کیا جواب ہے کہ عربی مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء جنھیں علمائے کرام کہا جاتا ہے، کی معتدبہ تعداد اسلام کی ترجمانی کرنے کے بجائے اشتراکیت نیز دوسرے نظریات کا علم بلند کرنے لگتی ہے۔ یہ خرابی دراصل قدیم اور روایتی نصاب تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ جب تک اسلامی نظریے کی بنیاد پر کتابیں نہیں تیار ہو جاتی ہیں، اس وقت تک ہمیں میسر کتابوں ہی سے کام چلانا ہوگا۔ داعی سینٹر سے میری گزارش ہے کہ وہ ایسی کتابیں تیار کریں جن سے غیر اسلامی مواد خارج ہو کر اسلامی نظریات جگہ لے لیں۔ مثلاً ڈارون کے نظریہ ارتقا کی جگہ پر اسلام کا نظریۂ تخلیق وغیرہ۔

چوتھی دشواری مضامین زیر بحث کی تعلیم کے لیے لائق اساتذہ کی عدم دستیابی ہے کیوں کہ مدارس میں مشاہرہ کم ملتا ہے، بلاشبہ یہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے لیکن اگر مدارس میں عصری تقاضوں کے ساتھ عمدہ تعلیم ہو تو اس ملت سے مزید مطالبہ کیا جا سکتا ہے جو اپنے بے پناہ ایثار و قربانی کے جذبات کے تحت ان مدارس کو اپنے خون جگر سے غذا فراہم کرتی ہے اور جب آمدنی میں اضافہ ہو تو اساتذہ کے مشاہرے کی رقم بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن فی الحال اگر کوشش کی جائے تو متعلقہ مضامین کے اساتذہ سات سو روپے ماہانہ مشاہرے تک دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر مطلوبہ صلاحیت پیدا کرنے کے ایک قلیل مدتی پروگرام کے تحت ٹریننگ کا انتظام ہونا چاہیے۔ وقتاً فوقتاً Home work کا بھی پروگرام روبہ عمل لایا جائے۔ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مدارس کی نظر داعی سینٹر یعنی مسا کے علاوہ اور کہاں جا سکتی ہے۔

سائنس کی لیبوریٹری کے لیے ذمہ داران مدارس چاہیں تو مطلوبہ رقم آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔ Requiring مزدیات فیس کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

۵ ایک دینی درس گاہ میں سائنس اور ریاضی کے نصاب کا نفاذ۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک معروف عربی درس گاہ میں کس طرح عصری علوم کی تعلیم گزشتہ "تیس" سالوں سے دی جارہی ہے۔ بلریا گنج ضلع اعظم گڑھ میں جامعۃ الفلاح ایک معروف دینی درس گاہ ہے جس کا قیام ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ لیکن یہ ادارہ اس سے قبل ایک مکتب سے ترقی کرتا ہوا ۱۹۵۸ء میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس وقت اس کے ذمہ داروں نے دینی اور عصری علوم کو یکجا کر کے ایک چودہ سالہ نصاب تعلیم کا خاکہ مرتب کیا جس میں دینی علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی، ریاضی اور جنرل سائنس (جس کو عام معلومات کے نام سے موسوم کیا گیا) کی تعلیم دی جانے لگی۔ وقت کی کروٹ کے ساتھ یہ ادارہ جامعۂ اسلامیہ سے ۱۹۶۲ء کے اواخر میں جامعۃ الفلاح کے نام سے معروف ہوا۔ اب اس میں دینی علوم کا غلبہ ہوا لیکن ابتدائی اور ثانوی درجات میں جن کی مدت تعلیم ۸ سال ہے، دینیات کے ساتھ مکمل عصری علوم کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور عربی درجات جن کی مدتِ تعلیم ۶ سال ہے عربی ادب نیز دینی علوم کے ساتھ روزانہ دو پیریڈ عصری علوم کی تعلیم کے لیے مختص ہیں۔

۱۹۸۵ء کے اواخر میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر محترم جناب سید حامد صاحب اپنے چند اساتذہ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فزکس ڈپارٹمنٹ، جناب ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب فزکس ڈپارٹمنٹ، جناب اشتیاق ظلّی صاحب اور میرے محترم ساتھی جناب علی اختر صاحب ریڈر ان ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ وغیرہ کے ہمراہ اس ادارے میں تشریف لائے اور جب موصوف کو بتایا گیا کہ یہاں ثانوی درجات میں سائنس کی بھی تعلیم ہوتی ہے تو موصوف نے اظہار مسرت کیا اور سائنس اور ریاضی کی مزید تسلیم کا قیمتی مشورہ بھی دیا۔ یہی نہیں بلکہ موصوف نے ذمہ داران جامعہ کی اس سلسلے میں ہمت افزائی کے لیے ثانوی درجات میں سائنس لیب کے لیے پانچ ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ بھی عنایت فرمایا۔ موصوف کے اس پرخلوص تعاون کے لیے ذمہ داران جامعہ مشکور و ممنون کرم ہیں۔ اب تک جنرل سائنس کی تعلیم عام معلومات کے نام سے ہوتی رہی ہے۔ لیکن تقریباً ایک ماہ قبل جامعہ کی تعلیمی کمیٹی نے ثانوی درجات تک سائنس، ریاضی اور جغرافیہ کی تعلیم کے لیے نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا جونیر ہائی اسکول کا مکمل نصاب منظور کیا ہے۔ عربی درجات میں انگریزی کا ہائی اسکول یوپی بورڈ کا نصاب اور انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نصاب منظور کیا ہے۔ اس کے علاوہ عربی کے ابتدائی دو سالوں میں علم تمدن لازمی مضمون کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد عربی کے بقیہ پانچ سالوں میں اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ بی۔ اے کے مساوی معاشیات اور سیاسیات میں سے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے منظور کیا گیا ہے۔ اس کے نصاب کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہم رہنمائی کے متمنی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے قبل میری بنائی ہوئی اسکیم کے تحت سائنس اور ریاضی کی مزید تعلیم کے لیے کوشش کی جائے گی۔ ہمارے یہاں ایک بی۔ ایس سی۔ بی۔ ایڈ اور ایک انٹرمیڈیٹ سائنس کے استاد بھی ہیں، ان کی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اگر ذمہ داران مدارس وسیع النظری سے کام لیں تو اسی نہج پر عصری علوم کو دینی علوم کے ساتھ سمویا جا سکتا ہے۔

اب میں ذمہ داران مدارس کی توجہ قرآن کریم کی سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۰ اور الجاثیہ کی آیات ۳ تا ۱۳ جس کا ترجمہ میں نے پیش کیا ہے، نیز قرآن مجید کی چند دیگر آیات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نیچرل سائنسز کے ساتھ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور آرٹ وغیرہ کا علم حاصل کرنا ضروری ہے ورنہ اللہ تعالیٰ آپ سے پوچھے گا کہ آپ نے اللہ کی آیات کا علمی احاطہ نہیں کیا تو اور کیا کر رہے تھے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوگی بلکہ آپ عجلت سے ملت کے بچوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے مہلت مانگتے ہیں، اس وقت کیا ہوگا جب احکم الحاکمین کی عدالت میں ملت اسلامیہ کے افراد اور بچے اپنے مقدمات پیش کریں گے اور فریاد کریں گے کہ اے رب العالمین یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے علم کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

نی اور عصری یا سیکولر اور ہم کو تیسری آیات کے مطابق علمی
احاطہ کرنے سے یہ کہہ کر باز رکھا گیا کہ ان سے عقائد میں خرابی پیدا ہوگی۔ اس
کے برعکس ہم کو قرآن سمجھنے کے لیے عرب کے جاہلی دور کے شعراء کے
کلام کا علمی احاطہ کرنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اے ارحم الراحمین! ہم بے قصور
ہیں۔ ہم نے تو علم حاصل کرنے کے لیے ذمہ داران مدارس کو اپنا سب کچھ
سونپ دیا تھا۔ اس وقت کا تصور کیجیے آپ کے پاس اس کا کیا جواب
ہوگا؟ آپ غور کریں اور اپنے اندر وسیع النظری، وسیع القلبی پیدا
کریں اور تعلیم کے سلسلے میں ان لوگوں کے مشوروں کو قبول فرمائیں جن کو
اللہ نے صلاحیت بخشی ہے اور وہ اسلامی ذہن بھی رکھتے ہوں۔

اب آخر میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شفیق اور
محترم وائس چانسلر صاحب نیز ان کے ان اساتذہ کرام کا دل کی اتھاہ گہرائیوں
سے شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کا پرخلوص
ملی درد کے احساس کے تحت اہتمام کیا۔ موصوف سے نہایت مودبانہ
گزارش ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی
شکل میں ایک وسیع وسائل و ذرائع کا ذمہ دار بنایا ہے۔ آپ قرآن
اور حدیث کی اچھی تعلیم کے ساتھ بہترین انجینیر، ڈاکٹر اور مفکر
پیدا کر سکتے ہیں۔

امید ہے آپ اس پر ہمدردانہ غور فرمائیں
گے۔

کلام پاک میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے
ایک تفکر یعنی قوانین فطرت پر غور اور ان
کی دریافت میں دوسرے تسخیر یعنی فطرت پر
اپنے فن کی مدد سے قابو پالینے میں۔ اس ارشادِ
خداوندی اور آج کل کے حالات کے پیشِ نظر
پہلی بات جو امت کے کرنے کی ہے وہ یہ کہ
سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی ہمت
افزائی ثانوی، آخری اور یونیورسٹی کے درجوں
تک کی جائے۔

— — عبدالسلام

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت

سراج اللہ خان

زمانہ قدیم ہی سے ہمارے معاشرے کے روایات، طور طریق، رسم ورواج ہمارے مذہبی عقاید پر قایم ہیں اور ان کو آئے دن فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ہم آج جس قدر مذہبی ہو گئے ہیں، شاید ہی تین دہے قبل یہ جذبہ ہم میں کارفرما تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل موجودہ طرز تعلیم اور انگریزی ماحول سے اپنے مذہب سے ناآشنا نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسی نئی پود کو مذہبی تعلیمات سے آگاہ کرانا وقت کا تقاضا سمجھا جا رہا ہے۔ اسی سے ہر مذہب کے سرپرستوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنے مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہبی عقاید سے واقف کرائیں۔

اسی لیے آج ہمارے ملک میں مذہبی جنون اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذاہب سے نفرت، بغض، کینہ پرور ی کریں۔ ہر مذہب کی بنیادی تعلیمات کس حد تک مشترک ہیں۔ ہر مذہب میں چوری، قتل وغارت گری کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ آپسی بھائی چارگی قایم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ شراب نوشی، چھوت چھات کو ایک سماجی برائی تسلیم کیا گیا وغیرہ۔ اس لیے دن رات مذہبی راگ الاپنے سے دنیاوی کاروبار نہیں چل سکتے۔

اگر دین کے ساتھ دنیا داری کا بھی خیال رکھیں تو ہماری محدود خوشیوں اور سکون سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے دینی مدارس یا امدادی مدارس میں سائنس کی بنیادی تعلیم کو بڑھاوا دیا جائے، تاکہ ایک عام آدمی اپنی زندگی بہتر بنا سکے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کو ہماری زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ سائنس نہ صرف دائرہ انسانیت وسیع کرتی ہے بلکہ ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جس سے انسان قدرت کو کھوجنے اور قدرتی وسائل سے استفادہ کرنا سیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس کی روشنی میں اپنے مذہب کو صحیح انداز میں سمجھ سکتا ہے۔ مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے گوشت اور ناخن کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مشہور سائنس داں آئن اسٹائن کا قول ہے کہ

"سائنس کے بغیر مذہب لنگڑا ہے، اور مذہب کے بغیر سائنس اندھی ہے۔"

سائنس ہمارے قدرتی وسائل کی نشاندہی کرتی ہے، جب کہ ٹکنالوجی ان وسائل کو دولت میں تبدیل کرنے کا ذریعہ ہے۔ سائنس ٹکنالوجی کی بنیاد ہے اور ٹکنالوجی سائنس کی ترقی کا ذریعہ اور ہمارے معاشرے کے معیار کو بلند کرنے کی ضامن ہے۔ سائنس انسان کے فطری تجسس کا نتیجہ ہے، جس سے ایجادات وجود میں آتے ہیں۔ سائنس ہماری تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر سائنس وہ طاقتور حربہ ہے جس سے حالات زندگی میں تغیر برپا کیا جا سکتا ہے۔

آج کل افرادی وسائل کی تعمیر وتشکیل پر زور دیا جا رہا ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے طریقہ تعلیم اور ... امور اپنائے جائیں جن سے ہمارا معاشی سدھار ممکن ہو سکے

اور مسلمانوں سے غریبی دور کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوسکے۔
یہ کام ہمارے انداز فکر میں تبدیلی لائے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا
اس لیے سائنسی شعور پیدا کرنا، سائنسی مزاج بنانا اور سائنسی
ذوق و شوق پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب
کہ ہمارے مدارس میں چاہے وہ خانگی ہوں کہ امدادی ہوں' ان
میں سائنسی تعلیم کو فروغ حاصل ہو۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے
کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے بغیر ہماری قوم دوسری قوموں
کی صف میں شامل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے سائنسی تعلیم ہی ہم کو ترقی یافتہ
قوموں کا درجہ دے سکتی ہے۔

طلباء کو ان کی ذہانت کے اعتبار سے دینی مدارس میں روزگار
سے مربوط ٹکنکی تعلیم کا بندوبست کیا جانا چاہیے تاکہ اگر ان کو اعلیٰ تعلیم
کے حصول کے مواقع نہ ملنے کی صورت میں بھی وہ اپنا ذریعہ معاش پیدا
کرسکیں۔ طلباء کو سائنس کے مختلف شعبے جیسے الیکٹرانک، کمپیوٹر، زراعت
صنعت، تجارت سے روشناس کیا جانا ضروری ہے۔ اس لیے
اچھے قابل استادوں کا تقرر' ان کی ٹریننگ کے لیے اسکولوں
کا قیام اسکولوں میں کم وقتی پیشہ وارانہ نصابات کی شروعات' ہوسٹلوں کا
کا قیام اور درسی کتابوں کی علاقائی اور خاص کر اردو زبان میں دستیابی
وغیرہ چند ایسے امور ہیں جن سے سائنسی تعلیم کو بڑھاوا مل سکتا ہے۔
مدارس میں سائنسی تعلیم کے ذریعے بچوں میں سائنسی انداز فکر
پیدا کیا جاسکتا ہے۔ خود داری اور خود اعتمادی کا جذبہ بحال
ہوسکتا ہے' جس سے بچے اپنے ماحول کا صحیح تجزیہ کرکے اپنے
کو تابناک بنا سکتے ہیں۔ وہ سائنسی تعلیم سے اپنے مسائل کو
سے حل کرنا سیکھ سکتے ہیں' وہ اصول حفظان صحت سے وا
ہوسکتے ہیں اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا پیشہ
ہوسکتا ہے۔ ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ڈاکٹر یا انجینیر
بلکہ وہ چھوٹی اور دیہی صنعتوں جیسے دستی پارچہ بافی' مرغبانی' گلہ با
لوہاری' نجاری' خیاطی' چمڑے کی دباغت' شکر سازی' کیمیا
کھاد سازی وغیرہ کے ذریعے بھی سماج میں ایک اچھا مقام حا
کرسکتا ہے۔ غرض دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کے حصول
لیے توجہ دی جانی چاہیے تاکہ ہماری نئی نسل معاشی پستی کا
نہ ہو بلکہ ایک اچھے شہری کی طرح زندگی گزار سکے۔

مختصر میں اپنے مقالے کو علامہ اقبال'
اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو
یہی مٹی سنورتی ہے یہاں ذرّے ابھرتے ہیں۔

عزیز نوجوانو! اگر تم بھی چاہتے ہو کہ ناموری اور
کامیابی کی بلندی پر پہنچو تو جلوت میں رہنا ترک
کر دو، جلسوں اور مجلسوں میں زندگی بسر کرنا چھوڑ
دو۔ خلوت میں پاؤں سمیٹ کر بیٹھو اور دل و دماغ
سے کام لو کیوں کہ تنہائی ترقی کا انتہائی زینہ ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم

مدارس میں سائنسی تعلیم کے مسائل اور ان کا تجزیہ

ظفر الاسلام

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں دینی ادارے مسلمانوں کے قیمتی اثاثے اور اسلامی قلعے ہیں جو نہ صرف دینی تعلیمات کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔ بلکہ اس مادّی دور میں دین و مذہب مخالف سرگرمیوں کو روکنے کے لیے دفاع کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ دینی و مذہبی تعلیم کی اہمیت و افادیت کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا ہے اور آج کے نئے ماحول میں بھی ان کی افادیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ اس تعلیم کا امتیازی پہلو اس کا مخصوص نصاب اور منفرد طرزِ تدریس ہے جس میں اسلام کے اساسی علوم (تفسیر و حدیث و فقہ) پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اس خصوصیت کے باوجود ان مدارس کے نصاب کو زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت کا اظہار بار بار کیا جاتا رہا ہے۔ کم از کم ہندوستان کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے علماء و دانشوروں میں اس احساس کی بازگشت ۱۹ویں صدی عیسوی سے مستقل سنائی دے رہی ہے اور مختلف گوشوں سے متعدد بار یہ آواز اٹھتی رہی ہے کہ دینی مدارس کا نصاب اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ وہاں سے فارغ ہونے والے طلبا ایک جانب اسلامیات کے ماہر بن کر نکلیں اور دوسری جانب وہ جدید علوم سے آشنا ہوں تاکہ وہ زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں دین و مذہب کی خدمات انجام دے سکیں اور علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں ترقی کے منازل طے کر سکیں۔ بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا یہ ایک اہم پہلو ہے لیکن یہ مسئلہ جس قدر اہمیت کا حامل ہے اسی قدر مشکلات و موانع سے بھرپور بھی۔ قابل مبارکباد ہیں مرکز فروغ سائنس کے سرپرست اور منتظمین کہ انھوں نے اس کانفرنس کے ذریعے ہمیں اس اہم مسئلہ پر باہمی تبادلۂ خیال کا موقع عنایت فرمایا۔

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کے ضمن میں سب سے پہلا مسئلہ مختلف خانوں میں علوم کی تقسیم کا تصور اور اس کا ازالہ ہے۔ عام طور پر علوم کو دو بڑے بڑے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، خواہ اسے دینی و دنیوی، مذہبی و سیکولر کا نام دیں یا اس کے لیے روایتی و عقلی کی اصطلاح استعمال کریں یہ ایک غیر ضروری تقسیم ہے جو دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہیں۔ اس تصور کی وجہ سے عصری علوم یا سائنس سے خاطر خواہ رغبت و دلچسپی پیدا نہ ہو سکی کہ ان کا دینی علوم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن و حدیث و فقہ ہمارے اساسی علوم ہیں اور دوسرے علوم سے ان کا موازنہ کسی بھی قیمت پر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علوم جو ان کی تحصیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں یا جو عملی زندگی میں ان علوم کی افادیت بڑھانے کا ذریعہ بنتے ہیں، انہیں یکسر غیر دینی قرار دیا جائے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر وہ علم محمود اور لائق استفادہ ہے جسے خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے استعمال کیا جائے اور جس سے انسان کی فلاح و بہبود مقصود ہو۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ دینی و دنیوی علوم کی تقسیم اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں نہیں

لتی۔ ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ "الحکمۃ ضالۃ المؤمن" کے اصول
پر مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری سے آگے کئی صدیوں تک مختلف علوم و
فنون کی تحصیل میں بشوق حصہ لیا، جن میں آج کل کی اصطلاح کے مطابق دینی و
عصری علوم دونوں شامل تھے۔ انہوں نے اسلام کے بنیادی علوم کے ساتھ
ساتھ یونانی منطق وفلسفہ، ریاضی و ہیئت اور کیمیا و طب وغیرہ کو اپنی
درسیات کا جز بنایا۔ انہوں نے نہ صرف دوسری قوموں کی علمی میراث سے
فائدہ اٹھایا بلکہ خود بھی تحقیق و جستجو کی راہ اختیار کی اور اپنے تجربات و
مشاہدات کی روشنی میں انہوں نے یونانیوں کے سائنسی نظریات و تصورات
کو جانچا و پرکھا۔ مزید براں انہوں نے علم و فن میں اپنی دلچسپی و انہماک
سے تحقیقات و انکشافات کے ایسے چشمے جاری کیے کہ دانشوران یورپ بھی
ان سے سیراب ہوئے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ علوم جنہیں ہم مجموعی طور
پر سائنس کا نام دیتے ہیں، ان کی بنیادیں خود مسلمانوں کی فراہم کردہ ہیں
لیکن بعد کے دور میں مسلمان ان علوم سے دور ہوتے چلے گئے جو خود ان
کے ذریعے پروان چڑھے تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ میرے خیال میں
دینی و دنیوی علوم کی مصنوعی تقسیم تھی۔ سائنس اور سائنسی علوم کو چھوڑ دیجیے
یہاں کم از کم ہندوستان میں کافی عرصے تک انگریزی زبان کے تئیں سرد مہری
دکھائی گئی اور اسے دینی مدارس کے نصاب سے خارج رکھا گیا۔ ۱۸ ویں
اور ۱۹ ویں صدی کے فتاویٰ کے مجموعوں کو دیکھیے تو ان میں بے شمار استفتاء
انگریزی زبان کی تعلیم کی شرعی حیثیت سے متعلق ملیں گے۔ ان سے بلا شبہ زندگی
کے مختلف مسایل میں شرعی حیثیت معلوم کرنے میں دلچسپی ظاہر ہوتی ہے لیکن
یہ تقسیم علم کے تصور کی بھی غمازی کرتے ہیں۔ ورنہ ہماری نظروں سے یہ حقیقت
اوجھل نہیں ہو سکتی کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کو عبرانی زبان
سیکھنے کی ہدایت کی تھی تاکہ ان قوموں سے باہمی معاملات اور روابط میں
آسانی ہو جن کی زبان عبرانی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علم کے بارے میں دینی و دنیوی
کی نسبت محض ایک ظاہری نسبت ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ
ان علوم سے بھی دین متین کی ترویج و اشاعت اور اسلامی اقدار کے فروغ
کی خدمات لی جا سکتی ہیں اور لی جا رہی ہیں جنہیں ہم خالص غیر مذہبی
تصور کرتے ہیں۔ اگر سائنس کی تعلیم سے اسلام کی ترجمانی کی صلاحیت
کو مزید جلا بخشنا مقصود ہو یا اس کی تحقیقات و تجربات سے انسان ہم

خدائے تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کی دریافت پیش نظر ہو تو بھلا کون ہے
جو ایسے علم و عمل پر غیر دینیت کا لیبل چسپاں کرے گا اس لیے میرے
خیال میں مدارس میں سائنسی علوم کی ترویج کے لیے سب سے پہلے اس کے
تئیں عام نقطۂ نظر میں تبدیلی لانی ہوگی اور مختلف خانوں میں علم کی تقسیم کے
تصور کو ذہنوں سے مٹانا ہوگا۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک تجویز یہ ہے کہ
مختلف مدارس میں اس موضوع پر سمینار و مذاکرات کا اہتمام کیا جائے
اور اس کے لیے مرکز فروغ سائنس (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اپنا ہر ممکن
تعاون پیش کرے۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے ضمن میں دوسرا اہم مسئلہ
ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ کس سطح کی سائنسی تعلیم نصاب میں شامل کی جائے
اور اس کے لیے موجودہ نصاب میں کس نوع کی ترمیم و تخفیف درکار
ہوگی۔ اس مسئلہ کے پہلے حصہ پر غور کرتے وقت یہ ذہن نشین رکھنا
بہت ضروری ہے کہ قرآن و حدیث و فقہ دینی مدارس کے کلیدی مضامین
ہیں اور ان میں استعداد و مہارت پیدا کرنا ان کا مقصود اصلی ہے جیسا کہ
پہلے واضح کیا گیا اور باقی تمام کی حیثیت یا تو مضامین آلیہ یا معاون و ضمنی
(subsidiary) سبجکٹ کی ہے۔ لہذا سائنسی مضامین کو بقدر ضرورت یا
بس اس حد تک شامل نصاب کرنا چاہیے کہ طلبا سائنس کے اصول و
مبادی سے واقف ہو جائیں اور اس کی خاص اصطلاحات سے مانوس
ہو جائیں۔ سردست مدارس میں سائنس کا ایک مختصر سا نصاب ہی قا[illegible]
عمل ہو سکتا ہے جس سے بس طلباء میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اگ[illegible]
وہ اپنی دلچسپی سے سائنسی علوم کا ذاتی مطالعہ جاری رکھنا یا اپنی سائن[illegible]
معلومات کو مزید وسیع کرنا چاہیں تو انہیں کوئی اجنبیت نہ محسوس ہو
اگر کوئی سائنس کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے دین و شریعت
کسی مسئلے پر گفتگو کرے تو مدارس کے فارغین کو اس کی باتوں کو سمجھنے
ان کا جواب دینے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حقیقت یہ
کہ عصر حاضر کے اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم اتنی ترقی
ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ مدارس کے بنیادی کردار کو باقی رکھتے ہوئے
اس سطح کی سائنسی تعلیم کا انتظام کیا جائے کہ طلبا ان مدارس سے
کے بعد اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سائنسی مضامین میں داخلے کے اہل

اور ان طلبا کے ساتھ اپنے کو ایڈجسٹ کرسکیں جو شروع سے سائنس پڑھتے
چلے آرہے ہیں۔ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی درسیات میں
اس وقت کے اعتبار سے عصری علوم کی شمولیت بقدرِ ضرورت یا ان کی حیثیت
کے تناسب سے تھی۔ اس زمانہ میں جن لوگوں نے سائنسی علوم کے میدان
میں کارہائے نمایاں انجام دیے انھوں نے محض اسی نصاب کی تکمیل پر
اکتفا نہیں کیا بلکہ اس تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی دلچسپی کے فنون میں
مطالعہ و تحقیق جاری رکھا، ماہرینِ فن سے انفرادی طور پر استفادہ کیا
اور "بیت الحکمۃ" جیسے تحقیقی اداروں سے منسلک ہوکر یا تجربہ گاہوں
اور معمل میں بیٹھ کر متعلقہ فن میں اپنی علمی تحقیق کو آگے بڑھایا اور اس میں
ناموری حاصل کی جیساکہ ان کے حالاتِ زندگی شاہد ہیں۔ مختصر یہ کہ
اگر مدارس کے نصاب کو سائنسی مضامین سے غیر متناسب انداز میں
گراں بار کیا گیا اور ایک اعلیٰ سطح کی سائنسی تعلیم ان میں رائج کی گئی تو
پھر ان کی امتیازی خصوصیت باقی نہیں رہ سکے گی اور نہ ان کا اصل مقصود
حصول پذیر ہو سکے گا جیساکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مدارس
گواہ ہیں جہاں حکومت کی نگرانی میں قدیم نصاب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ
کرنے کے لیے پہلے اصلاحی و ترمیمی نوعیت کے اقدامات کیے گئے لیکن رفتہ
رفتہ عصری علوم کا عنصر اتنا غالب آگیا کہ انھوں نے جدید طرز کی جامعات
کی شکل اختیار کرلی اور مدارس کا اصل مزاج تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس
لیے مدارس میں سائنسی تعلیم شروع کرتے وقت نصاب میں اس انداز
سے ترمیم و تخفیف کی جائے کہ اساسی علوم کی تعلیم متاثر نہ ہونے پائے
اور نہ مدارس کے بنیادی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں کوئی خلل واقع ہو۔

جہاں تک دینی مدارس میں عصری علوم یا سائنس کی ترویج کے
لیے موجودہ نصاب میں تخفیف کا سوال ہے یہ بہرصورت ضروری ہے
اس لیے اس میں کچھ کمی کیے بغیر کوئی مزید اضافہ طلبا پر ایک غیر ضروری
بار ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تخفیف منطق، فلسفہ اور علمِ کلام کے قدیم مباحث
سے کی جاسکتی ہے جن کی افادیت و معنویت اب چنداں باقی نہیں رہی
اس کے علاوہ نصاب کے مزاج اور طرزِ تعلیم میں کچھ تبدیلی سے بھی اس
مسئلہ کے حل میں مدد مل سکتی ہے۔ اس وقت مدارس میں جو
نصاب رائج ہے وہ زیادہ تر کتابی بنیاد پر ہے۔ ہر فن کے منتخب
مضامین کے اعتبار سے نصاب تیار کرنے کے بجائے ہر فن کی کئی کئی کتابوں
کو مکمل یا جزوی طور پر ختم کرنے کو نصاب کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس
میں شبہ نہیں کہ ابتدائی درجات میں نحو و صرف اور زبان کی تعلیم و
مشق کے لیے یہ طریقہ مفید ثابت ہوتا ہے لیکن اگر اوپر کے درجات
میں ہر فن کے اہم مضامین منتخب کرکے شامل نصاب کیے جائیں اور
انہیں مضامین کے اعتبار سے طلبا کے سامنے درس دیا جائے اور
مزید براں ان مضامین کی تیاری کے لیے ہر فن کی بنیادی و معاون کتابیں
تجویز کی جائیں تو اس طرح کم سے کم وقت میں زیادہ مضامین پڑھائے
جاسکتے ہیں اور دوسرے سائنسی یا عصری علوم کے طرزِ تعلیم سے مطابقت
پیدا کرنے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ورنہ
اگر قدیم مضامین کو پرانے طرز سے پڑھایا جاتا رہا اور نئے علوم کے
لیے نیا طریقہ اختیار کیا گیا تو تعلیمی نظام میں ہم آہنگی برقرار نہیں رہ
سکے گی۔

موضوعِ زیرِ بحث کے ضمن میں ایک تیسرا اہم مسئلہ سائنسی
نصاب کی تشکیل اور متعلقہ مواد کی فراہمی ہے۔ میرے خیال میں اس
کے لیے سب سے مقدم و ضروری کام اس نصاب کو اسلامی مزاج
عطا کرنا یا ہمارے محترم رفیق ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کی مخصوص اصطلاح
میں اسے اسلامی رنگ و آہنگ دینا ہے۔ اسی عمل کو ہم دوسرے لفظوں
میں (Islamization of Science) یا سائنسی علوم کی تشکیل
اسلامی کہہ سکتے ہیں۔ یہ کام بلاشبہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ اس لیے
کہ اس وقت اسکولوں، کالجوں یا یونیورسٹیوں میں عصری علوم یا سائنس
کا جو نظام رائج ہے وہ اہلِ مغرب سے مستعار ہے اور ایک مخصوص
زاویۂ نگاہ کا حامل ہے۔ وہ اس نصاب تعلیم سے میل نہیں کھا سکتا
جس کے مزاج میں اسلامی فکر اور مذہبی روح جاری و ساری ہے۔
اسلام مغربی علوم و فنون یا اہلِ یورپ کی سائنسی تحقیقات و تجربات کے
فی نفسہ مخالف نہیں ہے لیکن ان نظریات و تصورات کو گوارا نہیں کرسکتا
جو اسلامی فکر کے خلاف علوم و فنون یا علمی کارناموں میں سرایت کیے
ہوئے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی فرد یا قوم سے ہو۔ اس کو ذرا واضح
انداز میں ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر سماجی و سائنسی علوم

انداز سے پڑھائے جائیں کہ شروع سے آخر تک کہیں خدا کا نام نہ
ہ اور نہ طبعی قوانین کو اس طرح گوش گزار کرایا جائے کہ یہ سب قادرِ
لق کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، اگر آفاق و انفس کے عجائبات پر اس نقطۂ
رسے نہ غور کیا جائے کہ یہ سب قدرتِ خداوندی کی نشانیاں ہیں، اگر
ہ و تجرباتی علوم میں یہ غرض و غایت کہیں کار فرما نہ نظر آئے کہ ان سب کے
اگ کو رضائے الٰہی میں استعمال کرنا ہے اور اگر واقعات و حادثات
ا تجزیہ اس پیرایہ میں نہ کیا جائے کہ ان میں کسی غیبی طاقت کا ارادہ و
منشا سرگرم عمل ہے تو ظاہر ہے کہ اس نوع کی تعلیم سے مختلف علوم کا
یک ایسا ہیولیٰ ذہن میں تیار ہوگا جو خدا کے تصور سے بالکل خالی
ہوگا۔ اس لیے ان سائنسی نظریات و تصورات کی تطہیر و تنقیح ضروری ہوگی
جو اسلام کے اصول و افکار سے منطبق نہ ہوں۔ قرونِ اولیٰ کے تدریسی
نصاب میں یونانی فلسفہ اور دوسرے علوم شامل کیے گئے لیکن ان باتوں
سے صرف نظر کرتے ہوئے جو اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف تھے، فیلسوف
اسلام امام غزالی کا ایک اہم کارنامہ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے
علوم عقلیہ بالخصوص فلسفہ یونانی کو اسلامی رنگ عطا کیا۔ اس لیے بہتر
یہی ہوگا کہ جدید علوم و فنون کو نصاب میں شامل کرتے وقت ہر فن کی
مناسبت سے اس میں اسلامی فکر پیوست کی جائے۔

سائنسی تعلیم کے نصاب سے ملتا جلتا مسئلہ ان اساتذہ کی تربیت و
تیاری ہے جو اس نوع کی تعلیم کے لیے درکار ہوں گے۔ یہ مسئلہ بھی اس لحاظ
سے اہم ہے کہ سائنس کے عام اساتذہ کے برخلاف ایسے اساتذہ کی
خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو مدارس کے ماحول، وہاں کے طرزِ تعلیم
اور طلبا کے مزاج سے مناسبت رکھنے والے ہوں۔ سائنسی مضامین
کی تدریس میں مہارت کے ساتھ ان میں اردو زبان بالخصوص سائنسی
اصطلاحات کے اردو مترادفات سے بخوبی واقفیت حاصل ہو اور سب
سے بڑھ کر یہ کہ وہ ذہنی اور فکری طور پر اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے
ہوں۔ ظاہر ہے کہ سائنس کے اساتذہ کی فراہمی کے لیے ہمیں جدید جامعات
کے فارغین کا سہارا لینا پڑے گا اور اگر ان میں سے کچھ مذکورہ معیار
پر اتر بھی آئیں تو یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مشاہرے کی اس
قلیل مقدار کے عوض یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں گے جس پر

ہمارے مدارس کے اساتذہ قناعت کرتے ہیں اور اگر ان اساتذہ کے لیے کوئی علیحدہ
گریڈ متعین کیا جائے تو پھر مختلف مضامین کے اساتذہ کے گریڈ میں عدم
تناسب کی وجہ سے مزید خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی
ہے کہ مدارس کے فضلاء کو سائنسی مضامین پڑھانے کے لیے قلیل المیعادی
(Short Term) یا طویل المیعادی (Long Term)
کورس کے تحت ٹریننگ دی جائے۔ لیکن یہ بھی غور طلب ہے کہ کیا وہ حضرات
جنہوں نے ان علوم کی بنیادی تعلیم نہ حاصل کی ہو وہ محض تربیتی کورس
کے ذریعے سائنسی علوم کی استادانہ صلاحیت پیدا کر لیں گے۔ ابتدائی
سطح کی سائنسی تعلیم کے لیے استاد کی تربیت میں یہ کورس مفید ثابت
ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے بلند معیار کی سائنسی تعلیم کے لیے یہ تربیتی کورس
شاید کافی نہ ہو سکے۔ بہر حال شروع میں دینی مدارس میں سائنس کے اساتذہ
کی فراہمی کا مسئلہ یقیناً ایک اہم رکاوٹ بن کر سامنے آئے گا۔ اس لیے
یہ مسئلہ علماء و دانشوروں اور زیر بحث موضوع میں دلچسپی رکھنے والوں
کی خصوصی توجہ اور غور و فکر کا طالب ہے۔

یہ ہیں وہ خاص خاص مسایل جو مدارس میں سائنسی تعلیم کو رواج
دینے میں درپیش ہوں گے۔ اس لیے اس سمت میں قدم بڑھانے سے قبل
ان پر غور و فکر اور ان کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے علماء و
جدید دانشوروں میں باہمی مشورہ و مذاکرہ یقیناً مفید ثابت ہوگا —
مذکورہ مسایل کے تجزیاتی مطالعے کو ختم کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا
اظہار بھی ضروری تصور کرتا ہوں کہ مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت
و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن آج کے دور میں اسلام کی موثر ترجمانی
اور معاشرتی و معاشی زندگی کے نئے مسایل کو سمجھنے اور ان پر اسلامی
تعلیمات کی روشنی میں اظہار خیال کے لیے تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات
سیاسیات جیسے سماجی علوم اور انگریزی زبان کی اہمیت سے بھی کوئی
انکار نہیں کر سکتا۔ مدارس کے نصاب میں ان علوم کی شمولیت کی وجہ
سے ان طلبا کے لیے مذکورہ مضامین میں اپنی استعداد بڑھانا بھی آسان
ہوگا جو مدارس سے فراغت کے بعد یونیورسٹیوں میں بی اے میں داخلہ
لیتے ہیں اور خصوصی یا اختیاری سبجکٹ کی حیثیت سے سوشل سائنس
(سماجی علوم) کے مضامین منتخب کرتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی زبان کا

سوال ہے کم ازکم ہائی اسکول سطح تک کی تعلیم کا اہتمام اس لیے بھی ضروری ہے کہ مدارس کے طلبا کو یونیورسٹی میں (بالخصوص ایم۔اے عربی اور ایم ایم۔ فل، پی ایچ ڈی کے کلاسوں میں) داخلہ لینے کے بعد انگریزی زبان کے کورس کا جو ۱۰+۲ کے میعار کا ہوتا ہے، پورا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی معمولی واقفیت سے ان طلبا کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ خود ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے دوہرے اور غیر مرتب نظام تعلیم کی وجہ سے دینی مدارس کے طلباء کو ایک بہت بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف ان کا یہ فریضہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مدارس سے اسلام کے بنیادی علوم کے فاضل و ماہر بن کر نکلیں تاکہ وہ ان علوم میں اپنی مہارت و استعداد کے ذریعے مذہب و ملت کی خدمت انجام دے سکیں۔ دوسری جانب ان سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ عصری علوم سے بھی اپنے آپ کو بہرہ ور کریں تاکہ زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق وہ دین و شریعت کی ترجمانی کرسکیں۔ یہ بات ہم سب کے لیے قابل غور ہے کہ مکتب کی تعلیم کو چھوڑ کر سات آٹھ سال کی قلیل مدت میں ان دونوں نہج پر تیار ہونا کس قدر وقت طلب ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ابتدائی سطح سے لے کر اعلیٰ درجات تک ایک مسلسل و مربوط تعلیمی نظام مرتب کیا جائے۔ جس میں مذکورہ دونوں تقاضوں کی رعایت کی جائے۔ عالمیت کی سطح تک اساسی و عصری علوم کا عمومی نصاب تشکیل دیا جائے۔ اس کے بعد فاضل کے نام سے دو سال کا اختصاصی کورس بنایا جائے جس کے تحت تفسیر، حدیث، فقہ اور عربی ادب کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی اہم شاخوں میں اختصاص کی سہولت فراہم کی جائے۔ ورنہ ہماری و آپ کی پیوندکارانہ کوششوں سے قدیم و جدید علوم کی خلیج شاید کچھ کم ہو جائے، لیکن بالکل ختم نہیں ہوسکتی یہاں یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکتی کہ ایسے افراد پیدا کرنے میں جو اسلامی و عصری دونوں علوم کے ماہر ہوں، ہماری جدید مسلم جامعات بھی موثر رول ادا کرسکتی ہیں۔ جس طرح قدیم و جدید علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مدارس میں سائنس اور دوسرے عصری علوم کی ترویج کی ضرورت ہے، اسی طرح ان جامعات میں جہاں عصری علوم پر خاص زور دیا جاتا ہے، اسلام کے بنیادی علوم کی تعلیم پر مزید توجہ درکار ہے تاکہ ان علوم سے طلباء کی واقفیت میں اور وسعت و گہرائی پیدا ہوسکے۔ قدیم و جدید علوم میں مہارت کا سنگم صحیح معنوں میں اسی وقت ہوسکتا ہے جب عصری تقاضوں کے تحت مدارس کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کے ساتھ ساتھ جدید مسلم اداروں میں علوم اسلامیہ کے فروغ کے نقطۂ نظر سے وہاں کے تعلیمی نصاب میں مناسب تبدیلی بروئے کار لائی جائے۔

اب آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دینی مدارس میں سائنس و عصری علوم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں و مشکلات ضرور ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پیش نظر اس راہ کا سفر منقطع کر دیا جائے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عزم محکم، خلوص نیت اور توفیق الٰہی کی طلب کے ساتھ درپیش مسایل سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی جائے۔ شوق و ہمت اور جہد مسلسل سے مشکل سے مشکل کام آسان بن جاتے ہیں اور منزل مقصود سے ہم کنار نصیب ہوتی ہے۔

راہِ عمل میں شوقِ فراواں کی شرط ہے
جاتی نہیں ہے سعیِ طلب رائیگاں کبھی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۲۰۔ شمارہ ۵ (مئی ۲۰۰۱ء)
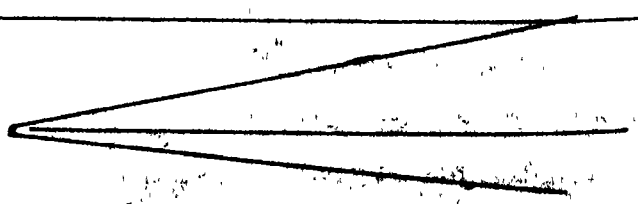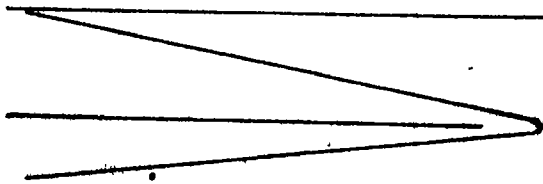
مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

ممتاز احمد قاسمی

علماء کی مجلس اور پھر علی گڑھ جیسی علمی جگہ کچھ بولنا میرے جیسے بے بضاعت کے لیے خاصا مشکل کام ہے۔

میرے مقالے میں ادبی اعتبار سے یقیناً بہت سی کمیاں ہوں گی مگر یہ الفاظ میرے دل کی آواز ہیں۔ میں اپنے زمانۂ طالب علمی سے اس بات پر کوشاں رہا ہوں کہ ہمارے مدارس عربیہ میں علوم عصری کو داخل نصاب ہونا چاہیے تاکہ ہمارے فارغین میدان عمل میں آکر خود داری، لگن سے دین کی دعوت کا کام کر سکیں۔ سچی بات یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس موضوع پر یہ کانفرنس منعقد کر کے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے ملت اسلامیہ کے عربی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کو ایک نئی راہ عمل ملے گی جس کی آج ضرورت ہے۔

دینی مدارس کی اہمیت

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

" اے پیغمبر! تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تمہارے اوپر اتارا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔" (سورہ مائدہ ۶۷)

آیت کا خطاب اگرچہ بظاہر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر درحقیقت اس کا حکم پوری امت مسلمہ کے لیے ہے۔ تبلیغ اسی کا نام ہے کہ اللہ کے احکام اس کے بندوں تک بغیر کمی بیشی کے پہنچا دیے جائیں۔ یہی کام اللہ کو مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ یہ وہ فرض منصبی ہے کہ اگر امت مسلمہ اس سے غفلت کرے گی تو یقیناً اللہ کے عذاب اور اس کے غضب کی مستحق ہو گی۔ جیسے کہ قرآن پاک میں سورہ آل عمران آیت ۱۸۷ تا ۱۸۸ تک فرمایا گیا ہے۔

" اور جب اللہ نے اقرار لیا اہل کتاب سے کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ پھر انہوں نے اس اقرار کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں مول لے لیا تھوڑا پس کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔"

کوئی جماعت جو آسمانی کتاب کی حامل ہو وہ اللہ کی نظر میں اس وقت معتوب ہو جاتی ہے جب وہ اللہ کے احکام کو چھپاتی ہے یا اس کو غلط انداز میں بیان کرتی ہے۔ گویا دعوت الی اللہ اس امت مسلمہ کی خاص ڈیوٹی ہے۔ سرور کائنات نے بھی اپنے مختلف اقوال میں اسی کی ہدایت کی ہے۔ یہی دعوت الی اللہ کا فریضہ دور اول کے مسلمانوں نے ادا کیا اور وہ پوری دنیا پر چھا گئے۔ صحابہ کرامؓ جس ملک میں گئے، چاہے وہ تجارت کے لیے گئے یا کسی دوسرے کام کے لیے، اس فریضے سے غافل نہیں ہوئے۔ ہمارے اس ملک میں بھی اسلام کی دولت اسی تبلیغ سے آئی نہ کہ حکومت کے ذریعے سے۔ اولیاء اللہ اور علمائے کرام نے اپنے اپنے ماحول سے عوام کو متاثر کیا اور ان کو دعوت الی اللہ کا پیغام دیا۔ اسی مقصد کے تحت ہندوستان میں دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ ان دینی مدارس کا اس ملک میں ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ جتنے دینی مدارس اس ملک میں ہیں شاید ہی کسی دوسرے اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں ہوں۔ ان مدارس سے ہزاروں کی تعداد میں طلباء فضیلت اور عالمیت کی

حاصل کرکے ملک کے طول و عرض میں دین کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، مگر ایک کمی وہ محسوس کرتے ہیں کہ دورِ حاضر میں سائنسی اور دیگر علوم عصری سے وہ ناواقف رہے جس کی وجہ سے دین پر ہونے والے حملوں کا کماحقہٗ دلائل سے جدید ذہن کو مطمئن کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ان میں کچھ تعداد ایسے فارغین کی بھی ہوتی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر ان کی تعداد کم ہے۔

آیئے ذرا غور کریں کہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی ترویج و ترقی کے دورِ اول میں جو کہ تیرھویں صدی عیسوی سے (یعنی ساتویں صدی ہجری) سولہویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) تک رہا ہے اس وقت کے علماء نصاب تعلیم کے ماہرین و فارغین ملک کے اہم عہدوں پر بھی فائز ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے شیخ المشائخ، پیرِ طریقت، عوام و خواص میں پوری ذمہ داری سے اس ماحول کے مطابق اشاعت دین کے فرض منصبی کو ادا کرتے تھے۔ آج بھی ان مدارس عربیہ کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر رفتار زمانہ کے مطابق عصری علوم کو داخل نصاب کرنا بہت ضروری ہے تاکہ وہ اس مقصدِ اصلی کو عملی جامہ پہناتے رہیں اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ان کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں علماء کا فرض۔

اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نسل انسانی کو اللہ نے روشناس کرانے کے لیے جتنے بھی صحیفے بھیجے وہ اس وقت کے ماحول کے مطابق تھے اور اس وقت کے انبیاء کرام نے ماحول کے مطابق اس پیغام کو انسانوں تک پہنچایا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ دیکھیے۔ اس زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت کی پوری انسانیت توحید کے نام (مفہوم) سے ناآشنا ہو گئی تھی۔ شرف انسانی اور مساوات انسانی کا تخیل لوگوں کے ذہن سے بالکل فراموش ہو گیا تھا۔ اللہ کے ساتھ محبت و عشق کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے توحید کو ثابت کرایا۔ کہیں حضرت ابراہیمؑ کی عقل و دانش کے ذریعے توحید کا سبق دیا گیا، کہیں باپ اور بیٹے کے مکالمے سے توحید کو ثابت کرایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جادو کا زور تھا آپؑ کے ذریعے جادو پر یقین کو ختم کرا کر اللہ کی وحدانیت کا سبق دیا گیا۔ غرض یہ کہ سب انبیاء علیہم السلام کی تاریخ جو قرآن پاک کے ذریعے ہم تک پہنچی اس سے یہ تمام باتیں ظاہر ہیں۔ آخر میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ کے لیے جس دور کا انتخاب فرمایا گیا وہ دور ہے انسانی ترقی کی وسعت کا اور علوم و فنون سے انسانوں کے خاص شغف کا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قیامت تک آپ کی تعلیمات کو باقی رہنا تھا۔ اس لیے انسانی زندگی اور انسانی نسل کو اپنے اندر تمام ودیعت شدہ صلاحیتوں، توانائیوں و کامیابیوں کا گویا ترکش خالی کر دینا تھا اور اس کے لیے اپنے پورے جوہر دکھلانے تھے۔ اب اس کے بعد سوائے قیامت کے کوئی دور آنے والا نہیں تھا۔ اس لیے انسان کو اپنی ذہانت، اپنے امکانات اپنے یافت و دریافت اور وسعتوں کا پورا اظہار کرا دینا تھا۔ اس لیے کہ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی آنے والا تھا نہ کوئی امت پیدا ہونے والی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید جیسی مکمل کتاب آپ کو عطا فرمائی جو ایک طرف تو ادب و بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس کا جواب کوئی انسان نہیں لا سکتا۔ دوسری طرف قرآن مجید کے اندر علم کی وسعت کے لیے ایسے امکانات رکھے گئے اور ایسے اشارے کیے گئے کہ جب کبھی علم انسانی کی تحقیقات خواہ کسی میدان کی ہو اپنی انتہا کو پہنچے تو قرآن مجید نہ صرف یہ کہ ان امکانات کو ثابت کرتا ہے بلکہ وہ ان کے حقوق کو بھی بتاتا ہے۔ چنانچہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ اور رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کے ذریعے علم کی عظمت، وسعت اور اس کے لامحدود ہونے کو جو بیان کیا گیا ہے وہ صرف قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس امت میں بڑے بڑے علماء، مفکر و سائنس داں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے علم و عمل سے دنیا کو فیضیاب کیا ہر دور میں علمائے اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ پامردی اور علم و عقل کے ذریعے دلائل سے کیا۔ جب تک علم کا سفر جاری رہے گا مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ خواہ ان کا تعلق تمدنی و علمی، معاشرتی اور اقتصادی اور سائنسی امور سے ہو۔ مذہب کی روشنی میں ان مسائل کو برابر حل کیا جاتا رہے گا۔ مثال میں ہم صحابہ کرامؓ، ائمہ اربعہؒ اور

مت کے دیگر مجتہدین کو پیش کر سکتے ہیں اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہی جا سکتی کہ صحابۂ کرامؓ ایسے ذہین انسان تھے کہ انہوں نے روم و ایران جیسی ترقی یافتہ اقوام کے دور میں ایسی صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ جس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں مل سکتی۔ اسی طرح ائمۂ اربعہؒ ایسے قانون ساز تھے کہ انہوں نے زندگی اور دین کے رہنما اصولوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ اس پورے عہد میں یہ صلاحیتیں نہ رومیوں میں تھیں نہ ایرانیوں، نہ یونانیوں اور نہ کسی اور قوم میں۔ ان کے کارنامے صدیوں پر محیط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اور دیگر عظیم شخصیتوں کو اپنے اپنے وقت پر پیدا کیا جنہوں نے زمانے کے رُخ کو پھیرا، خطرات کا انہوں نے مقابلہ کیا نوجوان نسلوں کے دل و دماغ کو شکوک و شبہات سے پاک کر کے ایمان و یقین کی بنیادیں از سر نو فراہم کیں۔ علماء نے یونانی علوم کا ترجمہ عربی زبان میں کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ یورپ میں نشاہ ثانیہ کے دور میں اسلامی فکر و سائنس، حکمت و ادب نے ایک نیا انقلاب پیدا کیا۔ مسلمانوں نے صرف علم و ادب ہی میں کام نہیں کیا بلکہ آرٹ و فنِ خطاطی اور تعمیراتی کاموں میں نمایاں کارنامے انجام دے کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ مسلم سائنس دانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کارناموں کی ایک لمبی تاریخ ہے جو اہلِ علم پر پوشیدہ نہیں۔

نئی سائنسی ایجادات نے اسلام کی اشاعت کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ سائنس نے اسلامی دعوت کے لیے ثبوت فراہم کر دیے ہیں۔ سائنس کی نئی ایجادات نے جہاں اسلام کی اشاعت کے امکانات کو مزید مستحکم بنایا ہے وہاں نئے نئے مسائل شرعیہ کو سمجھنے سمجھانے کے مواقع بھی پیدا کر دیے ہیں۔

جب دینی مدارس کا مقصد اسلام کی اشاعت، دعوت الی اللہ ہے تو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے دینی مدارس سائنسی علوم کو داخل نصاب کریں۔ اس سے انشاءاللہ قوم و ملت کی عظیم خدمت ہوگی۔ اگر مدارس عربیہ نے اس وقت سائنسی علوم کے پڑھانے سے غفلت برتی تو اس سے اشاعتِ دین میں رکاوٹ ہوگی اور آنے والی نسلیں ہم کو معاف نہیں کریں گی۔

اختتامیہ

میں نے آپ کا کافی وقت لیا ہے، اس کے لیے معافی چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کانفرنس دینی مدارس میں فروغ سائنس کے لیے سنگ میل ثابت ہوگی اور اداروں کے ذمہ داروں کو اس بات کا مکمل احساس دلائے گی۔

....

> "چینیوں، جاپانیوں یا روسیوں کو یہ ڈر نہیں لگتا کہ مغربی سائنس اور ٹکنالوجی سے ان کا مخصوص کلچر تباہ ہو جائے گا۔ وہ اپنی روایتوں کو اتنا حقیر اور کمزور جان کر ان کی توہین نہیں کرتے۔"
>
> ـــــ عبدالسلام

دینی مدارس اور سائنس

فرید احمد الاعظمی

عربی مدارس میں سائنس اور جدید علوم کی تعلیم کی ضرورت کے سلسلے
ہمیں تعلیم یافتہ طبقات میں دو طرح کے خیالات کے لوگ ملتے ہیں۔ ایک تو وہ
، تعداد نسبتاً کم ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم دینا مناسب نہیں
ےبقول کالجز اور یونیورسٹیاں کس کے لیے قایم کی گئی ہیں۔ سارے علوم کی
مدارس ہی پر ذمہ داری ہے۔ اور دوسرا طبقہ ایسے لوگوں کا کے برعکس
ل کا حامی ہے۔

لہذا مدارس میں جدید تعلیم کی ضرورت کے منکرین ذرا ان مدارس
ـدرس گاہوں پر غور کریں جو دین تو سکھاتی ہوں لیکن کار دنیا کا
، نہ بناتی ہوں، تو ان اداروں اور درس گاہوں کی کیا افادیت۔ ظاہر
، کہ دینی تعلیم راہبوں کو نہیں دی جا رہی ہے، بلکہ اس دنیا میں رہنے والوں
ِمسائل حیات سے پنجہ آزمائی کرنے والوں کو دی جا رہی ہے۔ دینی تعلیم
اس مخصوص نظام کا جو وقت کے علوم و فنون سے آنکھیں بند کر لے
سلام سے جوڑ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیوں کہ اسلام ایسے تصور دین سے
مف نہیں جو انسان کی دنیا سے دور اور غیر متعلق ہو۔ دورِ نبوی اور
.رِ خلافت میں مسلمان جتنے دینی علم و بصیرت اور اخلاق و کردار کے
مل تھے، اتنے ہی مسائل عالم کو سمجھنے کی لیاقت اور حل کرنے کی صلاحیت
ھتے تھے، جس کے نتیجے میں ایک مختصر سی مدت میں متمدن دنیا کے بہت بڑے
ے پر چھا گئے" اور ایسی آئیڈیل اسٹیٹ قایم کی جس کی مثال اس کے
د تاریخ کو نہ مل سکی۔

مسلمان خلافت راشدہ کے دور کے بعد ایک عرصے تک امامت و
ادت عالم کے منصب پر فائز رہے۔ انہوں نے کتاب و سنت کے علم و عمل
کے ساتھ ہر مفید اور صحیح علم و فن سیکھا ہی نہیں بلکہ اس کو ترقی کی آخری
حدود کو پہنچا دیا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یونان، روم، مصر اور
ہندوستان کے علوم و فنون کو سیکھ کر انہیں محفوظ کیا اور اس حد تک
ترقی دی کہ وہ موجود علمی و سائنسی ترقیات کی بنیاد بن گئے۔ چنانچہ آج
بھی یورپ کے انصاف پسند مورخین اس بات کے معترف ہیں کہ موجودہ
علمی و سائنسی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کا فلسفہ، سائنس، ریاضی، علم
ہیئت، فن طب اور دوسرے فنون ہیں۔

جب ہم اپنے اسلاف پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں یہی صفت
ملتی ہے جس نے ان کے آگے عالم انسانی کے سر کو جھکا دیا، وہ سب پر حکمراں
بنے، زمام قیادت کو سنبھالا اور دنیا کو صحیح راہ دکھانے کا کام انجام دیا۔
وہ یہ کہ انہوں نے وقت کی آواز اور اس کے تقاضوں کو سمجھا اور معاصرین
کو ان کے زمانے کی زبان میں سمجھایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہاں ہمارے اسلاف
میں قرآن و حدیث پر گہری بصارت و بصیرت تھی وہیں موجودہ جدید علوم پر
بھی ان کا قبضہ تھا۔

اگر ہم صرف اندلس کی تاریخ کے اوراق پلٹیں تو دیکھیں گے کہ وہاں
کے علماء نے جہاں قدیم علوم میں تفوق حاصل کیا وہیں جدید علوم، علم الادویہ
اور سائنس میں بھی ترقی کی اور وہ وقیع خدمات انجام دیں جس کا دنیا کئی
صدیوں تک اعتراف کرتی رہی ہے۔ یہاں کے اکثر علماء ادیب و فلسفی ہونے
کے ساتھ سائنس داں اور طبیب بھی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ابن رشد
ابن طفیل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ
ماہر طبیب بھی گزرے ہیں۔ مشہور زمانہ ادیب ابن خطیب بھی ایک

سائنس داں تھے جنہوں نے بیماریوں کا چھوت چھات کے ساتھ بڑھنا ثابت کیا تھا۔

اندلس کے اہم ترین سائنس دانوں میں الزہراوی، جس کا پورا نام ابوالقاسم الزہراوی، تھا۔ یورپ میں اس کو Abulcasis کہتے تھے اس نے ایک اہم کتاب التصریف کے نام سے لکھی جس کے آخری صفحات میں اس نے اس وقت کے علاج کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب یورپ کے میڈیکل کالجوں میں صدیوں تک اہم ترین کتاب سمجھی جاتی رہی ہے اور درسی نصاب بھی تھی۔ اس میں اس نے سرجری کے بے شمار آلات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی تفصیل لکھی ہے۔ اسی کتاب کے صدقے نے یورپ کو سرجری کا سبق بتایا اور اسی کی بدولت سرجری کی بنیاد پڑی۔

اسی طرح ابو مروان ابن زہر جس کو یورپ میں Avenzoar کے نام سے جانا جاتا تھا، سرجری میں ماہر اور مشہور تھا اور اندلس میں میڈیسن میں شہرت رکھتا تھا۔ یہی وہ پہلا طبیب ہے جس نے ہڈیوں میں قوتِ حس کا تجربہ کیا اور بتلایا کہ ہڈیاں بھی قوت حس رکھتی ہیں۔ اسی طرح طب کے دیگر مسائل میں بھی اس کے تجربات و خیالات نادر و بیش قیمت ہیں۔

اندلس کے مسلمانوں نے جہاں شعبہ علم الادویہ اور سائنس میں ترقی کی وہیں پر انہوں نے علم نباتات، حیاتیات، حساب اور علم نجوم میں بھی کافی ترقی کی۔ جیسے علم نباتات میں قرطبہ کے مشہور سائنس دان ابوجعفر احمد بن محمد الغافقی نے اندلس اور افریقہ کے بہت سے پودوں پر تحقیق کی اور تفصیلی شرح پیش کی۔ ان کی کتاب ادویات مفردۃ بڑے پائے کی کتاب ہے اسی طرح کھیتی کے معاملات میں رسالہ "الفلاحۃ" ہے جس میں ۵۸۵ پودوں کا ذکر ہے اور ۵۰ سے زائد پھل دار پودوں کے لگانے کے طریقے کے ساتھ ساتھ زمین کی قسمیں، زرخیزی، پودوں کے امراض اور ان کا علاج تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی طرح عبداللہ احمد ابن البیطار اندلس ہی کا نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کا سب سے عظیم ماہر نباتات (Botanist) تھا جس کی کتاب المغنی اور الجامع بہت اہمیت کی حامل ہے۔ الجامع میں تو اس نے جانوروں اور دوسری چیزوں کی مدد سے بہت سی بیماروں کا علاج لکھا ہے۔ تقریباً چودہ سو دواؤں کا تذکرہ ہے جس میں سے بیشتر دوا اس زمانے کے لحاظ سے بالکل نئی ہیں۔

نیز یہ علم نجوم میں ماہر ہونے کے ساتھ حساب میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے حتیٰ کہ ان کو لوگ حاسب کہنے لگے تھے اور فلکیات میں الزرقالی اپنے دور کا مشہور ترین ماہر فلکیات تھا

۲۔ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال

امتِ مسلمہ اس صدی میں اپنے علمی بحران، تعلیمی و فکری انحطاط ذہنی پستی اور احساس کمتری کے جس مقام کو پہنچ گئی ہے، شاید اس سے قبل کبھی نہ پہنچی تھی۔ اپنی انہیں پستیوں، محنت کا عدم شوق، عزائم کے [illegible] اور قائدانہ صلاحیت سے عاری ہونے کی وجہ سے اس کو جتنی شکست [illegible] رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس سے پہلے یہ حالت اس کے حاشیۂ خیال میں نہ تھی۔ وہ خود اپنی سرزمین پر ایک بوجھ محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر اپنے کو اہلِ عالم کے لیے ناگزیر بنانے کا عزم و ارادہ جاتا رہا۔ ایک وقت [illegible] کہ یہی امت اور اس کے کارناموں، علمی بلندیوں، فکری و تحقیقی خدمات کو عالم انسانی نگاہ اوپر اٹھا کر دیکھتا تھا اور اسی وجہ سے ہمارے اسلاف تھوڑی سی مدت میں عالم پر چھا گئے اور قیادت و سیادت کی ذمہ داری کو انجام دیا۔ چنانچہ یہ امت صدیوں تک انہیں اسلاف کے بچھائے ہوئے بستر پر فکری اجتہاد، تحقیقی کاوشوں سے الگ ہو کر اسلاف ہی کی تلوار قلم کو پہلو میں رکھ کر سوتی رہی۔ دفعتاً اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا پہلو سے تلوار و قلم غائب، مغرب انہیں کی تلوار و قلم کو لیے ان کے خلاف برسرِ [illegible] ہے۔ چنانچہ یہ امت مغرب کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی اپنے اندر [illegible] نہ پا سکی اور پستی سے پستی کی طرف بڑھتی چلی گئی اور اس نے اسلاف [illegible] تمام سرمائے کو مغرب کے ہاتھوں صرف نیند کے عوض فروخت کر [illegible]

چنانچہ ہمارے اسلاف نے علم کے ہر میدان اور ہر شعبے میں [illegible] اور نہایت حکیمانہ انداز سے اس کو اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے [illegible] کیا لیکن مسلمانوں ہی کی غفلت سے غیر مسلموں نے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ورثے کو اچک کر اس میں مزید اضافہ کر کے ان کو اپنی غیر آفاقی غرضانہ، مفاد پرستانہ مقاصد کے لیے اور ہمارے خلاف استعمال شروع کیا۔ نتیجۃً آج جدید علوم جن کی بنیاد ہمارے اسلاف نے [illegible] کی سینچائی اور دیکھ ریکھ ہمارے اسلاف نے کی اور جن کی پیداوار [illegible] ان پر تمام غیر مسلم قابض ہیں۔

یم مدارس کے لیے ایک لمحۂ فکریہ

انگریزوں کے اقتدار سے پہلے جو طریقہ تعلیم رائج و عام تھا، اس میں
بھی قدیم و جدید میں کوئی تفریق نہ تھی۔ دینی عالم اور جدید تعلیم یافتہ
ں امتیاز نہ تھا۔ صرف دو طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ عالم اور جاہل۔
آج جدید تعلیم یافتہ، انجینئر، ماہر طبیعیات، ڈاکٹر، وکیل اور سائنسداں
شامل سمجھا جاتا ہے اسی طرح پہلے عالم کا مفہوم قدیم و جدید تمام
پر حاوی تھا اور سب کے لیے عالم ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔
ے مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ وقت کے مروجہ علوم
بھی پڑھائے جاتے تھے اور جس طرح آج تحقیق کے لیے لوگ امریکہ و
کا رُخ کرتے ہیں، اس وقت ایک علم و فن کا امام ایک ادارہ ہوتا تھا
کے مشتاق طلباء دور دراز سے وہیں پہنچتے تھے۔ اس طرح ان مدارس
تعلیم کا مقصد دینی ہوتا تھا وہیں علمی بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ان کے
جہاں قرآن کے مفسر، محدث اور فقیہ بنتے تھے اور مفتی کے منصب
ز ہوتے تھے اور ان میں بعض مورخ، فلسفی، ماہر طبیعیات، ریاضیات
ب ہوتے تھے تو ان ہی میں سے سیاست داں، جو امارت، وزارت
کے دوسرے شعبوں کو بھی سنبھالتے تھے۔ پھر ان میں ادیب، شاعر،
اور مبلغ و خطیب بھی ابھرتے تھے۔ غرض یہ کہ ان رائج علوم میں
ں ایسا گوشہ نہ ہوتا تھا جس میں مدارس کے فارغین ید طولیٰ نہ رکھتے
یہی وجہ ہے کہ ہندو بھی ان مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ تعلیم حاصل
تھے۔ خلاصہ یہ کہ مدارس عربیہ کا مقصد وجود صرف دینی ہی نہیں بلکہ
ہوتا تھا۔ اس موقع پر سر راد ھا کرشنن یونیورسٹی کمیشن کی
کا ایک اقتباس کافی ہوگا

"پھر جب مسلمانوں کی حکومت قایم ہوئی تو انہوں نے ہندوستان
میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت اور ان کی درس و تدریس
کے لیے مدارس، مختلف شہروں، مثلاً لاہور، دہلی، رامپور
لکھنؤ، الہ آباد، جون پور، اجمیر وغیرہ میں کھولے۔ شیر شاہ
جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا اس نے جون پور
کے مدرسے ہی میں تعلیم پائی تھی اور وہاں اس نے جو مضامین
پڑھے تھے ان میں تاریخ، فلسفہ، عربی، فارسی ادب بھی شامل تھا۔
ان مدارس کا نصاب یورپ کی تعلیم گاہوں کے متوازی اور
مساوی ہوتا تھا اور اس نصاب میں صرف، نحو، بلاغت
منطق، قانون، علم ہندسہ، فلسفہ، علم نجوم، جنرل سائنس
ما بعد الطبیعیات، دینیات یہ سب مضامین شامل ہوتے
تھے۔ علاوہ بریں شعر و شاعری تو ایک ایسا مضمون تھا جس
سے ہر ایک دلچسپی لیتا تھا" (برہان۔ جنوری ۱۹۰۵ء)

برطانوی سامراج کے قیام کے بعد مدارس عربیہ بُری طرح متاثر ہوئے
ان کے اندر وہ ہمہ گیری اور جامعیت نہ رہ سکی، ان کا شیرازہ بکھر گیا، جس کا
اثر مسلمانوں کے ہر گوشۂ حیات پر پڑا۔ ان میں تعلیم کی کمی کے سبب انہیں حکومت
کے عہدوں سے بے دخل کر دیا گیا، جس کا اثر ان کی معاشی زندگی پر گہرا
پڑا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ پستی کی طرف جانے لگے۔ یہاں تک کہ اس
کا احساس برطانوی حکومت کو ہوا اور وارن ہسٹنگز نے جو کہ ہندوستان
کا پہلا گورنر جنرل تھا، کلکتہ میں (کلکتہ مدرسہ) کے نام سے ایک مدرسہ
قائم کیا، جس کا سنگ بنیاد ۱۷۸۰ء میں رکھا گیا تھا اور اس میں جو نصاب
مقرر کیا گیا وہ علوم دینیہ اور غیر دینیہ سب پر مشتمل تھا۔

اس عہد میں جو مسلم دینی ادارے قایم ہوئے ان میں اولیت کا سہرا
دار العلوم دیوبند کے سر ہے لیکن اس ادارے کے لوگ پہلے کی روایت
کے مطابق اپنے نظام تعلیم کو جامع، وسیع اور ہمہ گیر نہ بنا سکے اور اس کے
کچھ دنوں بعد ہندوستان میں اس نہج کے کئی ادارے قایم کیے گئے اور دوسری
طرف انگریزی اسکول اور کالج کھلنے شروع ہوگئے جس سے تعلیم جدید کا آغاز
ہوگیا اور یہی وہ وقت تھا اور جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہونا تھا کہ
تعلیم یافتہ گروہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا اور باہم ایک دوسرے کے حریف
بن گئے۔

بالآخر یہی مدارس دینی مقاصد ہی تک محدود ہو کر رہ گئے اور
ایک زمانے میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ جدید تعلیم کے حصول کے جواز و
عدم جواز پر لوگ استفتاء کرتے تھے۔ ان مدارس نے بلا شبہ ہندوستان
ہی میں نہیں بلکہ تقریباً پورے عالم اسلامی کو روشنی دینے کی کوشش
کی اور جلیل القدر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ ان مدارس کا دینی حدود
تک محدود رہ جانا طبعی اور قدرتی بھی تھا جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جم جانے کے بعد بعض دوربین آنکھوں، دوراندیش اور دردمند علماء نے یہ محسوس کیا کہ اس اجنبی حکومت اور اس ملک کے انقلاب کا سب سے بڑا اثر مسلمانوں کے دین و مذہب، شریعت اور تمدن پر پڑ سکتا ہے، کیوں کہ نئی حکومت اب نئی زبان، نئے علوم و فنون، نئے نصاب کی ترویج و اشاعت کا سروسامان کرے گی۔ چنانچہ اس نازک موقع پر اگر مسلمانوں کے دین و مذہب کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کے بُرے اثرات پوری ملت پر رونما ہوں گے۔ اس خطرے کے سدّباب کے پیشِ نظر ان علماء نے مدارس و معابد کا زور شور سے اجراء کیا۔ چنانچہ انہی مدارس نے انقلابِ حکومت سے ابھرنے والے خطرات کا انسداد و تحفظ کیا اور یہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ علمائے کرام کی مبارک کدّ و کاوش اور اُن کی مساعی بارآور ہوئیں۔ انہیں کے اثرات آج ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں دین داری، خداپرستی، اسلامی روایات و کلچر کے احترام کی صورت میں باقی ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جنہوں نے مدارس کو پہلے جیسی جامعیت، وسعت اور ہمہ گیریت کو تنگی اور عدمِ وسعت میں بدل دیا۔

بلاشبہ ہر ادارہ اپنے اپنے وقت میں مفید اور موثر ہی نہیں بلکہ اس کا قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد دیوبند، علی گڑھ اور پھر جامعہ ملیہ اور ندوہ نے مسلمانوں کی تہذیبی و تعلیمی تربیت اس طرح کی کہ گویا کہ ان کی نشاۃِ ثانیہ بن گئی۔ انہوں نے مذہب کی حفاظت کی، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ نے جدید علوم سے مسلمانوں کو لیس کر کے میدانِ سیاست کا ان کو لائق بنایا، قومی تعلیم کا اہتمام کیا، اصحابِ قلم و لسان پیدا کیے۔ چنانچہ مسلمانوں کی قومی زندگی میں مجموعی طور پر اُبھرنے والے نقوش انہیں درس گاہوں کی کوشش کے ثمرات ہیں۔

یہ درس گاہیں درحقیقت صرف تعلیم گاہیں ہی نہ تھیں بلکہ چار مختلف تحریکیں تھیں جو خاص مقصد لے کر اٹھی تھیں لیکن ہر تحریک کا قاعدہ ہے کہ وہ خاص حالات میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اُبھرتی ہے۔ چنانچہ اس کی مکمل افادیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ حالات موجود ہوں ورنہ حالات کے رخ کے بدلنے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس تحریک کے رُخ [illegible] اور

خاص طور سے کسی جمہوری ملک کی اقلیت کے لیے ضروری ہے کہ جدید تقاضو[ں] کو پورا کرنے کی طرف ان کا قدم بھی اٹھے اور بعض داخلی و خارجی حالات ا[ور] حادثات سے بددل اور مایوس ہونے کے بجائے اپنا ایک نصب العین متعی[ن] کر کے خود اعتمادی، صبر و عزم اور ہمت کے ساتھ گامزن رہے تاکہ وہ اپنے تشخص کی حفاظت ملّی وجود کے بقاء کے ساتھ وہ اپنے جمہوری نظامِ حکو[مت] میں اپنے کو ناگزیر بنا دے اور اس کے نقشے میں اپنے لیے بہترین مقام حاصل کر سکے۔

۴۔ سائنس اور جدید علوم کی ضرورت

آج یورپ اور امریکہ اور پورے عالمِ مغرب نے جدید علوم [illegible] قطع نظر، اسلامی علوم و فنون کے میدان میں جو کاوشیں کیں اور خدما[ت] انجام دی ہیں، انہوں نے اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، اسلامی نقا[illegible] علم الکلام ان میں سے ہر ایک کے متعلق بحث و تحقیق اور طریقۂ است[illegible] کو بدل دیا ہے اور اس کو اس قدر وسیع بنا دیا ہے کہ جب تک کوئی اس نہج و طریقے سے واقف نہ ہوگا، اسلام کی علمی خدمت کرنے سے قا[صر] تاریخ میں کل تک جس کی حقیقت نیم افسانہ تھی، آج وہ نہایت مربوط ا[ور] منضبط سائنس بن گیا ہے۔ جغرافیہ کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ [illegible] علوم و فنون کی واقفیت کے بغیر اس کا عالم بننا مشکل ہے، اسی طرح [illegible] کا دائرہ پہلے ہی کافی وسیع تھا، اب اس کا یہ عالم ہے کہ سائنس کے عل[وم] اس میں ہر چیز شامل ہے اور پھر بحث و تحقیق کی تیز رفتاری کی یہ حالت [illegible] کہ کل تک جو باتیں فلسفہ میں مسلمات کی حیثیت رکھتی تھیں آج اُن کی [illegible] واضح ہے۔ خلاصہ یہ کہ علوم و فنون کی اس تیز رفتار دنیا میں ہمار[ے] [illegible] اس وقت تک اسلام کو ایک زندہ، متحرک، جامع اور کامل نظ[ام] کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے، جب [illegible] ان کا ہاتھ زمانہ کا نبض شناس نہ ہو اور عہدِ جدید کی علمی زبان [illegible] کرنے کے اہل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت زمانے کی زبا[ن] [illegible] کرنے سے عاجز رہی تو اس کا نتیجہ ہے کہ مذہب کا تعلق زندگی [illegible] ہو گیا اور وہ ایک رسمی چیز بن کر رہ گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس [illegible] کی نبض شناسی اور اس کی زبان میں باتیں کرنے کی اہلیت اہلِ علم، [illegible]

اسلام ابھی آب و تاب کے ساتھ نہ ہوتا۔
س بنا پر جب ہم مدارس کے نصاب میں کچھ تبدیلی کے سلسلے میں یہاں
یں تو اس کا ہرگز ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مولانا کو مسٹر بنا دیا جائے یا ان
، دور کر دیا جائے بلکہ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ علماء بھی اپنے ان
ے کارناموں کو دہرانے اور عالم کے لیے ناگزیر اور اس پر غالب آنے
ل اور اسی شراب کہنہ کو جام نو میں پیش کرنے پر قادر ہوں اور آج
انے صحیح اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔
دیم زمانے میں لوگ فلسفہ کو بہت اہمیت دیتے تھے جو کہ فی الواقع
ے دور تھا اور اس سے اسلام کو بہت نقصانات بھی پہنچے ہیں
ر موجودہ سائنس بقول انور شاہ کشمیریؒ کے اسلام سے بہت قریب
ں کا قول ہے جو کہ عربی زبان و ادب میں تو امام اور اس کے ساتھ
سائنس فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ یہاں
نس کے طلباء کے درمیان درس دیتے تھے، ان میں مولف ترجمان
ولانا بدر عالم بھی رہتے تھے۔
پھر اسی سائنس کا صدقہ ہے کہ خدا کے وجود کا یقین اپنے تمام
لوہیت کے ساتھ جس قدر آج عقل کے لیے قطعی اور یقینی ہو گیا
ید اس سے پہلے اتنا نہ ہو سکا تھا۔ اس سلسلے میں وہائٹ ہیڈ کا
طور سے لیا جا سکتا ہے، جس نے ریاضی کے اصول سے خدا کے وجود
ں صفات کا اثبات کیا اور غالباً سائنس ہی کی دین تھی جس کے اثر
، بعید میں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر خروشچیف بھی دریا
ساختہ خدا کا نام لے پڑے اور اُن کی انگلیاں آسمانوں کی طرف
ا۔

ہذا آج دنیا فکری، عملی اور تاریخی لحاظ سے اسلام سے کافی
ت ہے اور کیوں نہ ہو کیوں کہ ہر تلخ تجربہ کر چکی اور اس کے
اور مہلک نتائج کا بھی مشاہدہ کر لیا۔
سلامی سائنس ایک ضرورت۔
یوں کہ اسلام ایک جامع نظام حیات ہے اس لیے وہ ایک
ے کر معاشرے تک کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے والے
سے علم کے استفادہ سے نہیں روکتا جو اسلامی تصورات کائنات

سے ماخوذ ثقافتی و روحانی اقدار و روایات پر استوار ہو۔
اسلامی تصور علم میں مطلق مشاہدے سے مابعد الطبیعیات تک
ہر ذریعۂ علم داخل ہے اور اسلام ہر اس تحصیل علم کو ضروری قرار دیتا
ہے جس سے مقصود اللہ کی فرماں برداری اور رضا جوئی ہو۔ اس طرح
علم کے عبادت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کے احکام
سے انحراف نہ کیا جائے اور چوں کہ انسان امین اور خلیفہ ہے اس لیے وہ
ایسے علوم کی تحصیل نہیں کرتا جو کائنات کی بقا کے لیے مضر ہو۔
الغرض یہ کہ یہ کائنات اللہ کی رحمت و نعمت ہے۔ اس کی تخلیق کا
ہر جزء اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اس عالم کے موجودات
و کائنات کا مطالعہ ایک مسلم کے لیے بہت ضروری ہے اور اس کی تخلیق کے
مطالعے کا ہر قدم انسان کو قربت الٰہی سے سرفراز کرتا ہے۔
اسلامی سائنس سے مراد وہ علم جو اللہ کی پیدا کردہ کائنات
کے بارے میں غور و فکر اور تدبر و تجربے کے ذریعہ اس کے راز، حقیقت
اور ماہیت تک پہنچ جائے۔ پروفیسر عبد السلام صاحب نے سائنس کے
سمجھنے کے لیے ایک بہترین تعبیر تفقہ استعمال کر کے سائنس کے مفہوم کو آسان
سے آسان تر بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے ایک مسلمان کا اس کائنات کے بارے میں
غیر مسلم سے الگ نظریہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک علامہ اقبالؒ کی زبان میں
جہاں ہے تیرے لیے نہ تو جہاں کے لیے
لہذا یہ کائنات جب ہمارے لیے پیدا کی گئی ہے تو ہمیں اس کے راز کو جاننا
چاہیے اور پیش آنے والے مسائل کا اس سے حل دریافت کرنا چاہیے۔
ایک مسلمان اپنی تحقیق اس زاویۂ نگاہ سے کرے گا کہ اس میں کون
سا جزء انسانیت کی بہبود، خوشحالی اور کامیابی کے لیے مفید ثابت ہو گا
اگر مسلم سائنس دانوں نے آج کے دور جدید میں ترقی کی ہوتی تو
الکوحل کے امتزاج سے تیار ہونے والی ادویہ کی جگہ کسی دوسرے مادہ
کے امتزاج سے تیار ہونے والی دواؤں کو تلاش کر لیتے اور عین ممکن
تھا کہ اس سے کہیں بہتر دوا دریافت ہو جاتی اور مسلم ہی کے لیے نہیں بلکہ
پورے عالم کے لیے مفید ہوتی۔ ایک مسلم کی تحقیق میں عقیدۂ توحید بنیادی
حیثیت رکھتا ہے اور وہ اپنی تحقیق میں قرآن و حدیث سے معلوم شدہ
کائنات کے راز کو مدنظر رکھ کر تجربہ کرے گا۔ حتی کہ وہ اس کی ماہیت

کو سمجھے گا، اس کے برعکس مغرب کے پاس نہ کوئی عقیدہ ہے نہ اخلاقیات
کا سایہ، ان کے یہاں کائنات کا تصور ہی الگ ہے اور نہ ان کے لیے حقیقت
کائنات کے معلوم کرنے کا منبع ہے۔ اگر کچھ معلوم ہے تو اس پر عقیدہ نہیں
وہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور تجربہ کرتا ہے اور ایمان لاتا
ہے۔

بعض سائنس داں سائنس کے ساتھ لفظ اسلامی لگانے پر اعتراض
کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ مرعوبیت کی علامت ہے۔ لیکن شاید میری سمجھ
سے ہمارے اسلاف مسلم سائنس دانوں کے بعد جدید مغربی سائنس نے جب سے
ترقی کی ہے مسلمانوں کا حصہ اس میں نہ کے برابر رہا ہے۔ سائیکل سے لے
کر ہوائی جہاز و راکٹ تک شاید ہی انہوں نے کچھ تنہا اہل عالم کو دیا ہو۔
اگر کہیں سکوں کا رواج نہ ہوا ہوتا اور مال و زر کا مبادلہ ابتدائی
دور کی طرح عام نہ ہوتا، ہر ایک کو اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں خود سے
تیار کرنی ہوتیں تو ہم مجبوراً دین کے ساتھ سائنس سے ہمیشہ تعلق رکھتے
لیکن کم سے کم مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے مغرب کے تسلط سے آزاد
ہونے کے لیے آج بھی سائنس میں تفوق حاصل کرنے سے چھٹکارا نہیں ہے
یہ وقت کی ضرورت ہے۔

انہوں نے سائنس میں عدم اشتراک سے اپنا وقار نگاہ عالم
کھو دیا ہے اس لیے کہ ہر قدر داں یہ دیکھتا ہے کہ سامنے والا ہم کو کیا
دے رہا ہے اور اس سے ہم کو کیا حاصل ہو رہا ہے اور اس میں مسلم
صفر ہیں۔ دوسرے موجودہ مسلمانوں کے ناسازگار حالات بلکہ پستی سے
پستی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم انہیں لفظ اسلام کے لیبل سے خوفزدہ
کر رہے ہیں اور شاید سائنس کے ساتھ لفظ اسلام کے لگانے کو مرعوبیت
کی علامت سے تعبیر کرنے والے خود مغرب سے مرعوب ہیں۔

ماضی میں تقریباً ہر تمدن کے زیر اثر ایک خاص تصور کائنات کی
حامل سائنس کا فروغ ہوا۔ بقول ڈاکٹر ضیاء الدین سردار کے کہ:

"جس طرح آج ہم مغربی سائنس کو عیسائیت و یہودیت کا
آئینہ دار پاتے ہیں، اسی طرح ماضی میں اسلامی سائنس
کا ایک مخصوص مزاج اور منفرد ماہیت تھی"

درحقیقت اسلامی سائنس تحقیق محض کا نام نہیں بلکہ تلاش حق
اور حقیقت مطلق سے ادراک سے متعلق ایک منظم اور معروضی عقلی سرگر
کا نام ہے۔ اس سائنس کی جامعیت اور امتزاج ایک نمایاں خصوصیت
ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی سائنس حقیقت کی کلی تحقیق و تفہیم ہے۔ دوسرے
لفظوں میں مکمل جستجو سے عبارت ہے۔

آج اسلامی معاشرہ اسلامی سائنس کی شدید ضرورت محسوس
کر رہا ہے، جو اس کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چوں کہ مغربی سائنس غیر مذ
کی ضروریات سے وابستہ ہے اور اخلاقیات کے سائے سے عاری ہے تو
ثقافت و تمدن کو کیسے پورا کرے۔ دوسرے مسلم معاشرے کو لاحق ضروریا
اور جدید سائنس کے پیش کردہ حل کے درمیان زبردست تفاوت ہے
اس کی ایک دلیل کافی ہے کہ مسلم ممالک میں مزدوروں کی بہتات اور
کی کمی ہے جب کہ مغربی سائنس کی رو سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ او
مزدوروں کی کم سے کم ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری طرف مغربی سائنس پورے عالم کے لیے مہلک اور
ہے۔ اس کی نمایاں مثال کہ جنگی امور سے متعلق دنیا بھر کے کم سے
پچاس فیصد سائنس داں متعلق ہیں اور دنیا کی تمام بڑی قو
اپنی دولت کا بیشتر حصہ جنگی سائنس کو فروغ دینے پر خرچ کر
ہیں اور اسلحوں کی صورت میں کوشش تحقیق کے نتائج کو ذریعہ
بنائے ہوئے ہیں۔

چنانچہ اب وہ سائنس جو اسلام کے سایے میں پروان چڑ
دیکھا آج عالم اسلامی کی ضروریات ہی کو صرف پورا نہیں کر سکتی بلکہ
انسانی کے مسائل کا حل پیش کر کے اسے تباہی سے نجات دلا سکتی
چوں کہ اسلامی سائنس کے اغراض و مقاصد اسلامی اخلاقیات ک
اور اس کے ذرائع اور طریق کار احکام قرآن کے زیر نگیں ہو
اس طرح مغرب کے برعکس اسلامی سائنس داں ملت کا جذبہ اور
آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان ہوتا ہے اور یہ سائنس چیدہ
کے بجائے عوام کے مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش کر
لہذا اسلام کو داعی ہونے کی حیثیت سے اور دنیا کو ہلاکت
بچانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اسلامی سائنس کو فروغ د
اپنا فریضہ اور وقت کی ضرورت دونوں کو پورا کریں

مدارس کا نصاب تعلیم اور سائنس

اب اگر ہم نے دینی اداروں کے لیے سائنس کی اور جدید علوم کی
ی ضرورت کو محسوس کیا ہے اور ہم کچھ دینی مضامین کو کم کرنے اور جدید
م کے داخل کرنے پر آمادہ ہیں تو اس موقع پر ازہر کے نصاب سے
رہ اٹھائیں اور مدد لیں تو مناسب ہوگا جو کہ دنیائے اسلام کا سب
قدیم عظیم تعلیمی مرکز رہا ہے اور ہے، جس کی زندگی کے نشیب و فراز میں
اسلامی کے جدید و قدیم علوم کے حاملین کا سایہ رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے
س طرح کی تبدیلیوں اور نصاب کی اصلاحات کے لیے آج ہماری مسلم یونیورسٹی کی
آواز اٹھی ہے، غالباً ازہر کی تاریخ میں الامام عبدہٗ اور شیخ
عبدالکریم نے ازہر کے نصاب میں اسی طرح کی اصلاحات کی کوشش کی
ں اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ بقیہ اس کے بعد الامام عبدہٗ
شاگرد رشید شیخ المراغی ۱۹۳۶ء میں جب ازہر کے ایڈمنسٹریٹر
مقرر ہوگئے تو انہوں نے الاستاد کی تمناؤں کو پورا کیا اور حقیقت میں جامعہ
ازھر کو مکمل جدید یونیورسٹی بنانے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ انہوں
۱۹۳۶ء میں اس کے نصاب میں کافی تبدیلیاں کیں اور غالباً آج بھی
نصاب جاری ہے۔ اس کے مطابق

منزل ابتدائی: منزل ابتدائی ۴ سالوں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں
ی زبان، گرامر، قرآن، اصول شریعت، جغرافیہ، ریاضی، اصول صحت،
رائنگ اور خوش خطی ہے۔ ہر سال کے آخر میں زبانی و تحریری امتحانات
تے ہیں اور چوتھے سال کے آخر میں عام امتحان ہوتا ہے۔

منزل ثانوی: اس میں پانچ سال کا کورس ہوتا ہے جس میں اصول
شریعت، تفسیر، روایت، قرآن کا متن، اصطلاحیات، سیاسیات، عربی
ادب، عروض، گرامر، فن خطابت، انشاء، منطق، فزکس، کیمسٹری،
بیالوجی اور جغرافیہ شامل ہیں۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد طالب علم
سندی یعنی بی۔ اے آنرس کے مختلف شعبہ جات میں سے کسی شعبہ میں
داخلہ لے سکتا ہے۔

اس ابتدائی دور میں ہمیں ابھی ثانوی ہی تک غور کرنا ہے۔ اس
کے بعد یونیورسٹیاں معاون ہوں گی۔ اس لحاظ سے ہمارے لیے مناسب
ہے کہ مدارس میں درجہ پنجم تک جدید علوم میں تقریباً یو۔ پی بورڈ یا اس کے
مساوی کا کورس پڑھایا جاتا ہے۔ اصل مسئلہ پرائمری کے بعد ثانوی کا
ہے جس کی مدت میں ہمارے مدارس عالمیت اور فضیلت دونوں کی تعلیم
دیتے ہیں۔

ثانوی کورس کی مدت کو نصاب ازہر سے زائد یعنی ۸ سال کا ہو
تو بہتر ہوگا جس میں علوم دینیہ میں قرآن کریم، حدیث شریف، فقہ، اصول
فقہ، نحو، صرف، عربی ادب، انشاء ہوگی۔ جدید علوم میں علم سیاسیات،
معاشیات، جغرافیہ، تاریخ، انگریزی، حساب، فزکس، کیمسٹری، بیالوجی
ہوگی۔

اس آٹھ سال کی مدت کو ۳ حصوں میں کرنا بہتر ہوگا پہلے کے
دو سالوں میں نحو، صرف، عربی انشاء، گرامر اور انگریزی حساب ہو
اور سائنس کے لیے N.C.E.R.T کی درجہ ۶ و ۷ کی کتابوں سے فائدہ
اٹھایا جائے اور معاشیات و سیاسیات میں سے ایک لینے کا اختیار
ہو۔

اس کے بعد تیسرے سال سے چھٹے سال تک کے درمیان قرآن،
حدیث، فقہ، انشاء کے ساتھ بلاغت اور عربی شاعری ہو اور علوم جدیدہ
میں علم معاشیات و سیاسیات میں سے ایک اختیاری ہو۔ اور جغرافیہ
تاریخ اور انگریزی لازمی ہو۔ اس کے ساتھ سائنس میں کیمسٹری، فزکس
اور بیالوجی کے ساتھ حساب بھی ہو اور ہفتہ میں کم از کم دس گھنٹے
پریکٹیکل PRACTICAL کے لیے ہوں۔

اوقات اور گھنٹوں کی تقسیم انصاف پسندی کے ساتھ نصف
علوم دینیہ اور نصف غیر دینیہ یعنی علوم جدیدہ سائنس، حساب وغیرہ
کے لیے ہوں۔ اس کا حل یوں کیا جا سکتا ہے کہ ۸ گھنٹوں میں سے ۴ میں
علوم دینیہ کی تعلیم ہو۔ جیسے پہلا گھنٹہ روزانہ قرآن کریم کے لیے، دوسرا
ہفتہ میں ۵ دن حدیث اور ایک دن اصول حدیث کے لیے، اسی طرح تیسرا
گھنٹہ ہفتہ میں تین دن فقہ کے لیے اور تین دن بلاغت کے لیے۔ اسی طرح
چوتھا گھنٹہ ہفتہ میں ۳ دن عربی انشاء کے لیے اور ۳ دن عربی شاعری کے
لیے ہو۔ اس طرح یہ چار گھنٹیاں یعنی نصف علوم دینیہ کے لیے خاص ہوں۔

اور بقیہ چار گھنٹے جدید علوم یعنی معاشیات، سیاسیات میں سے
ایک اختیاری اور جغرافیہ، تاریخ، انگریزی اور فزکس، کیمسٹری، بیالوجی

اور حساب ہے جنہیں مضمون کے حسب وسعت اوقات ملیں گے۔

اور آٹھ سال کے آخری دو سالوں میں دو شعبوں کے درمیان اختیار ہوگا۔ ایک شعبہ ان طلباء کے لیے جو جدید یعنی غیر دینی علوم کی تحصیل کا رجحان رکھتے ہوں اور ادھر جانا چاہتے ہوں' ان کے لیے دینی علوم میں قرآن کی تفسیر، علم حدیث، فقہ اور عربی شاعری ہوگی۔ ان کے لیے صرف ۳ گھنٹے ملیں گے اور غیر دینی مضامین کے ۵ گھنٹے ملیں گے۔ ان غیر دینی یعنی جدید علوم میں انگریزی لازمی ہوگی اور علم معاشیات اور علم سیاسیات، جغرافیہ اور تاریخ ہوگی۔ لہذا جو طلباء آرٹ سائڈ کے خواہاں ہوں گے وہ ان چاروں میں سے تین جدید مضامین کو چن لیں گے اور انگریزی کا لازمی بھی ہوگی۔ اس طرح دینی علوم کے ساتھ ۴ جدید مضامین ان کے درس نصاب ہوں گے۔

اور سائنس سائڈ کی طرف جو طلباء جانا چاہیں اس میں بھی ان کے لیے اختیار ہوگا جیسا کہ Ten + Two میں کالجز کے طلبا کرتے ہیں کہ اگر میڈیکل کی جانب رجحان ہو تو وہ بیالوجی، کیمسٹری، فزکس لیں اور جو انجینئرنگ کی جانب جانا چاہیں وہ بیالوجی کی جگہ Mathmatic (حساب) پڑھیں گے۔ یہ آخری دو سالوں کا پہلا شعبہ ہوا۔

دوسرا شعبہ ان طلباء کے لیے ہوگا جن کا رجحان دینی علوم کی طرف زیادہ ہے۔ ان کے لیے علوم اور وقت کی تقسیم، جدید علوم یعنی پہلے شعبے کے برعکس ہوگی۔ یعنی اس میں علوم دینیہ کے لیے ۵ گھنٹے اور جدید علوم کے لیے تین گھنٹے ہوں گے۔ اس طرح دینی علوم میں ایک گھنٹہ روزانہ قرآن کریم، دوسرا حدیث، تیسرا فقہ اور چوتھا ہفتہ میں ۳ دن اسلامی تاریخ اور تین دن عربی ادب کے لیے اور پانچواں ۳ دن اصول فقہ کے لیے اور تین دن اصول جرح و تعدیل کے لیے خاص کیا جاسکتا ہے اور جدید علوم میں ایک گھنٹہ سائنس دوسرا انگریزی تیسرا معاشیات یا سیاسیات کے لیے خاص کرسکتے ہیں۔

اس شعبے کے لیے ہر مدرسہ بقدر استطاعت مختلف فنون کے لیے اختصاص کا شعبہ اپنے مطابق دینی علوم میں اختصاص کرنے والے طلباء کے لیے کھول سکتا ہے۔

اس طرح ثانوی درجات کی آٹھ سال کی مدت کے آخری دو سال میں ہر طالب علم کے لیے اس کے علمی رجحان کے مطابق پانچ گھنٹے تعلیم کا نظم کرسکتے ہیں جس میں وہ مہارت حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ اس مضمون کے علاوہ اوروں سے نابلد نہ رہے گا بلکہ زمانے کے ساتھ چل سکنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے قابل رہے گا۔

اس طرح کسی حد تک ممکن ہے کہ ہم دینی علوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں زمانے کی دوڑ میں حصہ لے سکیں اور من السابقین الاولین کی صفوں میں شامل ہوسکیں اور دنیا اور آخرت میں اپنا مقام پیدا کرسکیں۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۴۴

اور وہ مرکز فروغ سائنس کی سرپرستی میں چلیں گے، انہیں مرکز کی جانب سے کیا سہولتیں ملیں گی؟ کیا آٹھویں کلاس کے پاس شدہ طلباء کو مسلم یونیورسٹی کے ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھنے کا موقع ملے گا؟ کیا داخلے کے سلسلے میں مزید کچھ تسہیلات فراہم کی جائیں گی؟ جس سے مدارس کے طلباء مسلم یونیورسٹی کے تجربے کراں سے مستفید ہوسکیں؟

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶ شمارہ ۵ (مئی ۱۹۸۷)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں

غلام یحییٰ انجم

مدارس میں جو نصاب رائج ہے وہ اپنی جگہ بالکل مستحکم ہے۔ یہ نصاب ایک منظم فکر و تدبر کے تحت عمل میں آیا تھا۔ بلاشبہ اس نصاب کو پڑھنے والے ہر شخص کے اندر سوچنے، سمجھنے اور اپنی گفتگو کو دلائل و براہین سے مضبوط کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جہاں اس نصاب کا صالح اور اپنی جگہ مستحکم ہونا برحق ہے وہیں اس بات سے بھی گریز نہیں کیا جا سکتا کہ زمانے کی تبدیلی سے زمانے کے اقدار، پیمانے میں بھی تغیر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نئے زمانے میں نئے زمانے کی پیدا شدہ چیزوں کو نئے اصول و ضوابط اور نئے آئین و مصطلحات میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی بات میں نہیں کرتا البتہ ترقی یافتہ ممالک کا یہی دستور ہے کہ وہ اپنے مزاج تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو زمانے کے دوش بدوش کر کے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ مستشرقین کی کارکردگی اور ان کے طرز فکر اور طریقۂ تعلیم سے آپ کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ بالآخر دو لفظوں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو کام ہمیں کرنا چاہیے اس کی ذمہ داری مستشرقین نے اپنے سر لے رکھی ہے اور اچھی طرح اسے نبھا رہے ہیں۔ نوبت بایں جا رسید کہ اسلام کی حق و صداقت کا آفاقی پیغام جو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ہم اسے زمانے کے پیمانوں میں اتار کر اس دور کے ارباب فکر و نظر تک نہیں پہنچا سکے۔ جب کہ اسلام کو ہر دور میں نسل انسانیت کا رہنما رہنا چاہیے اور ایک وہ ہیں کہ اسلام کے معائب پیغمبر اسلام کے بیانات میں تلاش کر کے مذہب بیزاری کا ثبوت دے رہے ہیں اگر ہم اسلام کو اپنے طرز فکر کا سہارا لے کر موجودہ زمانے کے پیمانوں کے مطابق پیش کرتے تو شاید مستشرقین اس قسم کی نازیبا حرکت کی جرأت نہیں کرتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے مدارس میں ایک ایسا نصاب بنائیں جس میں دینی علوم کو دنیاوی علوم میں اس طرح اتار دیں کہ وہ اس کا دوران خون، اس کی روح رواں، اس کی بینائی اور شنوائی اس کا احساس ادراک اور اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بنا لے جب اپنے اس مقصد میں ہم کامیاب ہو جائیں گے اور اس نئے نظام تعلیم کے ساتھ مدارس میں تعلیم رواج پیدا کریں گے تو یقیناً ایسے باکمال مسلمان فلسفی، مسلمان سائنس داں، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین اور دیگر تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہرین پیدا ہوں گے جن پر دنیا رشک کرے گی۔ ایسے لوگ ہر اعتبار سے مستشرقین کے ہفوات و اباطیل کا بھرپور جواب دیں گے اور پھر وہ ایسے نہج سے اسلام کی اشاعت کریں گے کہ اسلام عصری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر ان کے دل و دماغ کو متاثر کر سکے جن سے وہ کوسوں دور ہیں۔

آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ عقلی علوم جو ہمارے نصاب کی روح اور اصل تو نہیں مگر جزء لاینفک ضرور ہے۔ علماء انتہائی دلچسپی اور لگن کے ساتھ ان علوم کو حاصل کرتے تھے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ عقلی علوم صرف منطق و فلسفہ میں سمٹ کر رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان علوم کی اس دور میں ضرورت نہیں تھی، بلکہ ہمارے علماء نے اس سے بے اعتنائی اس لیے برتی کہ ان علوم کی تعلیم صحیح اور واضح طور پر کچھ وسائل کی کمی کی وجہ سے نہیں ہو سکتی اور ایک بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے اس زمانے میں ضرورت بھی نسبتاً کم تھی لیکن اس زمانے میں ان عقلی علوم کا جس طرح غلبہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ تو

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جن علوم کی تحصیل کو ہم نے درخور اعتنا نہیں
سمجھا ہے اسے دوبارہ اعلیٰ پیمانے پر اپنے مدارس میں رائج کریں اور پھر
اس سے بھرپور استفادہ کریں۔ آپ ان عقلی علوم کی نصاب درس میں شمولیت
سے اجنبیت کا اظہار کریں گے مگر کیوں؟ جس طرح منطق و فلسفہ جنھیں ہم
عقلی علوم کہہ کر بڑی شد و مد سے حاصل کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح سائنس
کو بھی عقلی علوم کہہ کر محبت اور لگن کے ساتھ حاصل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ جس
طرح منطق و فلسفہ عقلی علوم کا ایک حصہ ہیں ٹھیک اسی طرح سائنسی علوم
بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کا تعلق "قیاسیات" سے ہے جنھیں ہم
اپنی زبان میں منطق و فلسفہ کہتے ہیں اور دوسرے کا تعلق "تجربات" سے
ہے جسے ہم موجودہ سائنس کی زبان میں فزکس (طبعیات) کیمسٹری
(کیمیا) باٹنی (نباتیات) زولوجی (حیوانیات) جیولوجی (ارضیات)
وغیرہ کہہ سکتے ہیں تو درحقیقت ان علوم سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ عقلی
علوم کا ایک حصہ سمجھ کر ان کی تحصیل کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔ ہمارے لیے
یہ اقدام کوئی نیا نہیں ہے بلکہ عہد وسطیٰ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو بیشتر افراد
ملیں گے جنھیں دینی علوم کے علاوہ ہر قسم کے دنیوی علوم میں بھی ید طولیٰ حاصل
تھا۔ دور کہاں جایے۔ ابھی ماضی قریب میں مولانا احمد رضا خاں فاضل
بریلوی (متوفی ۱۹۲۱ء) کی شخصیت اور ان کے شاگرد ملک العلماء فاضل
بہار مولانا ظفر الدین قادری (متوفی ۱۹۶۲ء) کی شخصیت اور ان کے علاوہ
مولانا انور شاہ کشمیری ہمارے اس قول کی بین دلیل ہیں۔ اوّل الذکر بزرگ
نے تو سائنس کے متعدد گوشوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یادگار
تصانیف بھی چھوڑی ہیں اسی سلسلے میں ان کی کتاب "حاشیہ تحریر اقلیدس"
"معین مبین بہر دور شمس و سکون زمین" "فوز مبین در رد حرکت
زمین" "نزول قرآن بسکون زمین و آسمان" اور "الکلمۃ الملہمۃ"
جیسی اہم کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ملک العلماء مولانا ظفر الدین قادری جو ہیئت و توقیت
کے فنون مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی سے سیکھ کر ان میں کمال
پیدا کیا تھا، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھیں ہیئت و توقیت کے
علوم میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد کتابیں
لکھیں جن میں "توضیح التوقیت" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ
ہمارے علماء کے یہاں اس قسم کا شوق ملتا ہے جنھوں نے سائنس کو حاصل
کیا اور پھر اس کی روشنی میں قرآن کا مطالعہ کیا اور حسب ضرورت
توضیح و تشریح سے کام لیا جو اسلام سے منکر انسان کے لیے موثر ہونے
کے ساتھ دل پذیر ہوگی۔

سائنسی تعلیم جسے ہمارے علماء دہریت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں آج
ہماری ضرورتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ اپنے بچوں کا مستقبل روشن کرنے کے
لیے انہیں دینی علوم کے بجائے اسی سائنس کے شعبوں میں بھیجیں اور اس
کے لیے ہم لوگ اپنے تقویٰ و تدین کے باوجود جو کوشش کرتے ہیں اور جس طریقہ
سے اپنے بچوں کا انجینئرنگ (علم ہندسہ) یا میڈیکل میں داخلہ کراتے ہیں
وہ ڈھکی چھپی بات نہیں تو پھر کیوں نہ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے
کہ وہ سائنس پڑھ کر اپنے دنیوی مستقبل کو روشن کر سکیں اور اسی کے
ساتھ ساتھ دینی علوم پڑھ کر اپنی عقبیٰ و آخرت سنوار سکیں اور اس طرح
دنیا کے سامنے ایک انسان کامل کا نمونہ پیش کر سکیں۔ اس مختصر سی گفتگو
سے میرا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ دینی علوم کو بدلتے ہوئے زمانے کا
غلام بنا دیا جائے لیکن یہ ضرور چاہیں گے کہ عصر جدید کے ساتھ ایک معنوی
موزونیت قائم کی جائے اور وہ اس طرح کہ قرآن کو سائنس کی روشنی
میں دیکھنے کے بجائے سائنس کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے۔

کسی اصول کا مرتب کرنا اور کوئی خاکہ بنانا جس قدر آسان
ہوتا ہے، اس میں رنگ بھرنا اسی قدر مشکل۔ کون سے وہ اصول اپنا
جائیں جس سے ہمارے خواب و خیال کی عملی تصویر ہمارے سامنے آسکے
اس سلسلے میں قدیم و جدید علماء کی ایک نشست ضروری ہے مگر سوال
پھر آکر یہاں سر ابھارے گا کہ جیسے نصاب بھی مرتب ہو گیا، اب اس
کی ترویج کیسے ہوگی۔ مدارس میں اس کے نفاذ کا بندوبست کیسے ہو،
اساتذہ کی فراہمی کہاں سے ہوگی، سائنسی آلات کہاں سے میسر آئیں۔
تجربہ گاہ اور جگہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ یہ سارے
ہیں جو بیک وقت ہمارے سامنے آتے ہیں ان تمام پیش آمدہ مسائل
کا جواب صرف وسائل کی فراہمی ہے وہ مدارس جو ہمیشہ عوام کے دست نگر
رہتے ہیں جب ان کا تعاون ہوتا ہے تو مدرسین کی تنخواہوں کا مسئلہ
حل ہوتا ہے۔ ایک یونیورسٹی کا تربیت یافتہ [illegible] مدارس میں یہ مالی

کیوں کر برداشت کرے گا۔ اب ایسی صورت میں یہ مسئلہ کس قدر دشوار بن جائے گا جس کا اظہار مناسب نہیں۔

درس عالیہ جس کے امتحانات حکومت اترپردیش کے زیر نگرانی ہوتے ہیں۔ اس کے نصاب تعلیم میں کچھ امتحان مثلاً منشی، مولوی، عالم، کامل میں انگریزی اور ریاضی وجغرافیہ جیسے مضامین شامل ہیں۔ اب آپ یقین سے بتائیں کہ کسی اہل خیر کی کوششوں سے وہ مضمون تو وہاں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا، مگر قوم کتنا اس سے مستفید ہوئی یہ ہم آپ سب ہی جانتے ہیں۔ اس مضمون سے بیٹھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ البتہ اس امتحان میں اختیاری مضمون ریاضی لے کر وہی طلباء شریک ہونے کی جرأت کرتے ہیں جو مدارس کے علاوہ کسی طرح اسکول سے وابستہ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی اس کا سبب لائق اساتذہ اور وسایل کی کمی ہے۔ یہاں ایک سوال یہ ضرور اٹھتا ہے کہ اگر اس بورڈ کے نصاب میں یہ مضامین اختیاری کے بجائے لازمی کا درجہ رکھتے تو مدارس کے ارباب حل وعقد کسی طرح بھی اس کی تعلیم کا بھی انتظام کرتے تو ہمارے لیے اور بھی آسانیاں فراہم ہو جاتیں۔

ایک دوسری بات جو میں یہاں بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ سائنسی تعلیم یا سائنسی علوم جو یونیورسٹی کے ارباب فکر ونظر کے ذہن کی پیداوار ہے اور دوسرے دینی علوم کی تاریخ کی ترویج جو مدارس میں چٹائی پر بیٹھ کر قال اللہ و قال الرسول کا درس دینے والے متدین علماء کا طرز فکر ہے تو جس طرح سائنسی علوم کی اشاعت ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح دینی علوم کی ترویج بھی ناگزیر، پھر کیوں نہ یونیورسٹی والے دینی علوم کی نشر و اشاعت عام و تام کریں اور مدارس کے لوگ سائنسی علوم کو اپنے نصاب کا جز سمجھیں۔ اس کے برخلاف اگر مدارس میں سائنسی علوم کو نصاب درس کا ضمیمہ اور یونیورسٹی میں دینی علوم کو نصاب درس کا تتمہ بنا کر پیش کیا گیا تو ایسی صورت میں نتیجہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ ثابت ہوگا۔ ہاں یہ سوال ضرور ابھرے گا کہ یونیورسٹی اور کالج حکومت ہند کے زیر اقتدار چلتے ہیں۔ لہذا یونیورسٹی میں دینی علوم کو اتنا فروغ نہیں مل سکتا جتنا کہ ملنا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح کی امید سائنسی علوم کے بارے میں مدارس سے بھی رکھنی چاہیے۔ یہ مسلّم ہے کہ جس قدر سائنسی علوم کی اشاعت یونیورسٹی اور کالجز میں ممکن ہے مدارس میں نہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی ایسی چیز ہے جو دینی اداروں میں کسی علم کے فروغ دینے میں مانع ہے۔ بات آکر وسائل پر ٹھہر جاتی ہے۔ ہاں اس مسئلہ کو صرف ایک صورت میں ممکن بنایا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ تمام دینی مدارس میں تو نہیں البتہ ضلع کے کسی ایک یا دو بڑے ادارے میں جسے یونیورسٹی کے ارباب اقتدار اس ادارے کی کارکردگی نصاب تعلیم اور دیگر انتظامی امور کے لحاظ سے مناسب سمجھیں یونیورسٹی سے اس وقت تک کے لیے سائنس کی تعلیم کے لیے اساتذہ بھیجیں جب تک کہ ادارے کے اراکین کے دل و دماغ پر اس علم کی اہمیت راسخ نہ ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ ادارہ سائنسی تعلیم دینے کا خود کفیل نہ ہو جائے، ہمارے خیال سے یہ ایک مشکل مسئلہ ضرور ہے لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اسی قدر آسان بھی۔

ایک دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ چند منتخب اداروں کے اساتذہ کو یونیورسٹی میں بلایا جائے اور مرکز فروغ سائنس کے زیر اہتمام چھ ماہ یا اس سے زائد کا تربیتی کورس کرایا جائے جس میں اس انداز سے سائنس کی تعلیم دی جائے کہ مختصر سی مدت میں آسانی کے ساتھ اساتذہ اس علم پر قابو پا سکیں اور ثانوی درجات تک کے طلباء کی اس سلسلہ میں صحیح رہنمائی کر سکیں، جہاں تک ان کے اخراجات کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ مدارس اس سلسلے میں خود کفیل ہوں اور دوسرے یہ کہ یونیورسٹی اپنے کسی فنڈ سے وظیفہ مقرر کرے، جس سے وہ اساتذہ کسی قسم کے ذہنی الجھن کا شکار ہوئے بغیر دلچسپی کے ساتھ سائنسی تعلیم کی تدریس کا تجربہ حاصل کر سکیں ظاہر ہے کہ جب تک مالی فراہمی نہ ہوگی نہ تو یہ علوم ہی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی علماء میں اس علم کی رغبت دلائی جا سکتی ہے۔ جب ایسا نہیں ہوگا تو مدارس میں اس علم کی ترویج کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔ کہنے کو تو بہت اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ مدارس کے لوگ ان علوم سے مسلسل لاپرواہی برت رہے ہیں اور سائنسی علوم کے ساتھ سوتیلا پن کا برتاؤ کر رہے ہیں اور وقت کی اہم ضرورت سے انحراف کر رہے ہیں، مگر درحقیقت ایسا نہیں ہوش وخرد رکھنے والا کون شخص ایسا ہے جو نہیں چاہتا کہ اسلام کو موجودہ سائنس کی زبان میں پھیلایا جائے۔ مگر اس سلسلے میں جو دشواریاں

ہیں وہ وہی سمجھ سکتے ہیں جن کا کسی طرح مدارس سے ربط رہا ہے۔ یونیورسٹی کے خوشحال ماحول میں رہ کر مدارس کا بہر صورت جائزہ لینا قدرے مشکل ہے۔

بہرحال سائنسی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ہزار دشواریوں کے باوجود توجہ کرنے کی ضرورت ہے مدارس کے اراکین کی دلچسپی اس میں ضروری نہیں، ہاں طریقۂ کار میں انہیں ضرور شامل مانا جائے مگر ان پر پورا اعتماد نہ رکھا جائے۔ تاکہ علماء حسب منشا اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ جہاں تک ان وسائل کا مسئلہ ہے جو اس امر کی ترویج میں سدِ راہ ہوتی ہیں تو یہ اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ مدارس میں سائنسی تعلیم کی ابتدا اسی طرح کر دی جائے جس طرح مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم کی ابتدا ہو چکی ہے۔ پھر بتدریج سائنسی علوم کے ضروری مصطلحات کے ذریعے کائنات کے اشیاء کی افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع کیا جائے

میرا اپنا نظریہ ہے کہ پورے نصاب درس پر سائنس کا حاوی رہنا ضروری نہیں، البتہ ثانوی درجات کے طلبہ کے لیے سائنس لازمی مضمون کی حیثیت سے ٹھیک اسی طرح پڑھائی جائے جس طرح درس نظامی کے دیگر مضامین پڑھائے جاتے ہیں تو یہ تبدیلی طلباء کو سائنس کی روشنی میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں معاون ثابت ہوگی اور وہ ارضیات یا فلکیات سے متعلق آیات قرآنی کی افہام و تفہیم کے مسائل سے بھی پوری طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ مگر دشواری پھر یہ درپیش آجاتی ہے کہ یہاں تک کے نصاب کا بندوبست کیا اور کیسے ہو؟ تو اس سلسلے میں کچھ اشارہ کر چکا ہوں۔ بروقت اس کا انتظام اس یونیورسٹی کے ذمہ ہوگا۔ یا تو وہ یہاں سے اساتذہ بھیجے یا جن ادارہ میں سائنسی علوم کے نصاب کا نفاذ ممکن ہو، اس اطراف کے مسلم اسکولس کے اساتذہ کو اس امر کی تکمیل پر مامور کیا جائے۔ اگر وہ یومیہ اس کی ذمہ داری نہ لے سکیں تو ہفتہ میں تین یا چار دن اپنی خدمات پیش کریں۔ اس صورت میں ہمارا آپ کا اور سب کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔

بقیہ مقالہ میر محمود علی قیصر

سبب بن گئی ہے کہ وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح خود ویڈیو ([illegible]) میں آجائیں۔ گویا اجتماعی حیثیت سے سارے طلباء میں تعلیم کا ذوق و جذبہ پیدا ہو گیا ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔

ابتدائی جماعتوں کے لیے بار بار دہرانے کے لیے سادے کیسٹ بھی تیار کیے گئے ہیں جو بڑی حد تک بچوں کے لیے مفید ہیں۔

بڑی جماعت کے لڑکوں کے لیے سائنسی اسباق کو قرآنی آیات کے ساتھ ویڈیو کیسٹ کیا گیا ہے جن کو طلباء ہی نہیں ان کے استاد بھی دلچسپ، معلوماتی سمجھتے اور پسند کرتے ہیں۔

غرض اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے معاشرے کو بھر عملی طور پر دورِ جدید کے علوم و فنون سے واقف کروانا ہر باشعور مسلمان کا فرض ہے۔ تاکہ ہم سب من حیث الکل ترقی کر سکیں۔

بقیہ مقالہ شبیر احمد خان غوری

کہ یہ نصاب اچھا ہے یا نہیں اور اگر ناقابل عمل ہے تو پھر اسے کس طرح عمل بنایا جا سکتا ہے۔

غالباً یہ دقت مرکز فروغ سائنس کے ارکان کو بھی رہے گی شاید وہ ٹریننگ کالج کا تعاون حاصل کر لیں مگر اصل اعانت صرف مدارس عربی کے مہتممین و صدر مدرسین اور ان سے بھی زیادہ وہ مدرسین ہی کر سکتے ہیں جنہیں اس کے پڑھانے کا فرض تفویض کیا جاتا ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ایک انتہائی فریضہ کی انجام دہی یعنی دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم کا ایک متوازن اور [illegible] [illegible] نصاب اور اس کی تعلیم، جس میں نہ تو سائنس کی خاطر تعلیمات کو نظر انداز کیا جائے اور نہ سائنس کی تعلیم ہی کو اتنا [illegible] کیا جائے کہ موضوع تضحیک بن کر رہ جائے۔ بلکہ ان مدرسوں سے فارغ ہو کر جو طالب علم فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ بیک وقت دین دار مسلمان اور خوشحال شہری بھی۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

جلال الدین وزیر آبادی

یہ دور نت نئی ایجادات، سائنسی انکشافات اور صنعتی انقلاب کا ہے آج محیر العقول اور حیرت انگیز ایجادات و اسباب مواصلات کی کثرت ہے بجلی، تار، ٹیلی فون، وائرلیس، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، ہوائی جہاز، لڑاکا طیارے، میزائل، راڈار، طب و جراحت کے ترقی یافتہ آلات جنھیں ہم ترقی کی علامت اور پیش قدمی کا نیک شگون تسلیم کرتے ہیں اور ان کی افادیت سے انکار بھی نہیں۔

ہمارا ملک بھارت جس اسلامی ثقافت کا آئینہ دار ہے وہ دراصل مدارس اسلامیہ کی مرہون منت ہے جہاں پر براہِ راست قرآن و سنت کا لافانی پیغام دیا جاتا ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ قرآن و سنت پر جس فرد بشر کی نگاہ زیادہ گہری ہوگی، سائنسی تعلیم پر گہری بصارت کا طالب ہوگا۔

آج مدارس اسلامیہ دینیہ میں کم از کم ۱۲ سال کورس کے حصول میں طلباء عزیز کی عمریں ان مضامین و مواد میں ضایع کی جاتی ہیں جن میں دراصل اسلامی زندگی کا پیغام نہیں ہوتا اور نہ ہی اس راہ میں ان کی چنداں ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ فلسفہ، منطق، علم مناظرہ سے اب کیا سروکار؟ ملاحسن، صدرا، میبذی، سلم العلوم کی عبارت سبحانہ ما اعظم شانہ لا یحد ولا یتصور پر ایک ہفتہ کا لکچر کیا معنی رکھتا ہے؟ فلسفہ کے مسئلہ الہیات اور فلکیات نیز جزء الذی لا یتجزیٰ، برہان سلمی، لمی، انی، نفس ناطقہ حادث ہے یا قدیم کے مباحث سے کیا تعلق؟ منطق کے جزئیات، کلیات، نتائج صغریٰ و کبریٰ سے اب کیا غرض؟

اقبال نے پہلے فرمایا تھا:

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

چوں کہ مدارس اسلامیہ میں جو نصاب رائج ہے وہ بالعموم کتاب و سنت، کی تشریح و وضاحت کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اس کتاب الٰہی میں کم و بیش ۵۰، مقامات پر انسانوں کو عقل و تدبر اور ان کے مشتقات کو دعوت فکر دیتا ہے اور حکمت و دانائی کا ذکر کرتا ہے۔ یہ کائناتِ آدم کے لیے مسخر ہے اور حکمت انمول دولت ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

لوح بھی تو قلم بھی تو، ترا وجود ام الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ، ترے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں ترے وجود سے فروغ
ذرہ ریگ کر دیا تو نے طلوع آفتاب

آج طلباء و مدرسین قال اقول کی حد تک اپنی درسیات میں الجھے ہیں اور دور حاضر کے انکشافات، اختراعات، ایجادات کی روشنی میں دو قدم بھی چلنا مشکل ہے اور یہ صدی اسلام کی صدی سے موسوم ہے' اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام علوم و فنون میں بالا دستی کے حصول کی ترغیب دی ہے اور سود و ماول سے اب تک بہت سارے اہل دل اس میدان کے شہسوار بن چکے ہیں۔ علوم حاضرہ سے آگاہی ان مدارس میں ۱۵٪ بھی نہیں اور دینی معلومات ۲۵٪ اوسط ہے لکیر کے فقیر زیادہ۔

آج الحاد کا دروازہ کھلا ہے۔ نت نئے نئے مسلوں کی تیاریاں ہو رہی ہیں اعتراضات کا شمار نہیں اور ہم قال اقول کے بحر محیط میں غوطہ زن ہیں۔ عمل کی بانگاہ

سے کوسوں دور۔ آج بھی مدارس میں منطق و فلسفہ کے قدیم و نایاب ابواب داخل درس ہیں۔ اگر دیوبند کا مکتبہ ترجمہ نہ کرے تو طالب و متکلم زبان یارمن ترکی و من ترکی نمی دانم کے مستحق ہوں گے۔

سبوئے خالکاہاں خالی از مے
کند مکتب رمطے را طے !!

قومیں اپنی آگہی کے بقدر طاقتور ہوتی ہیں۔ علم وہ طاقت ہے جو انسان کو طاقتور بناتا ہے اور اگر یہ علم ہم آہنگ نہ ہو تو کیا قوت دے گا؟ بولیے وقت قیمتی سرمایہ ہے عرب اول نے گلے لگایا تو دنیا کو مسخر کرلیا اور آج اہل عرب نے علم کو خیرآباد کہدیا تو پاسنگ کے برابر بھی نہیں۔

افسوس! ہم حرم کے نگہباں، بت خانے کے پاسباں بن بیٹھے ہیں ان کا یقین مردہ مضمحل ہے اور نگاہ مستعار اور رہین منت اغیار ہے۔ آج سائنسی آلات کی مدد سے اذان دی جارہی ہے۔ گھروں میں ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ کی آواز گونجتی ہے، تقاریر کا سیٹ و قرأتوں کی سیریز سنی جاتی ہے مگر افسوس مدارس اسلامیہ کا نصاب پہلے ہی سے بوجھل ہے اور سائنس و ریاضی کا اضافہ مزید بارگرانی کا موجب ہوگا مگر بقول شاعر

چلنے والوں کو وہیں آتا ہے چلنے کا مزہ
جب کہیں راستہ ہموار نہیں ہوتا ہے

اس ضمن میں ہماری دو رائے پیش خدمت ہے ۱۔ غیر متعلقہ و غیر مفیدہ علوم و فنون کو نصاب سے خارج کردیا جائے ۲۔ نصاب کے اندر وسعت دے دی جائے یعنی مدت میں اضافہ۔

اسلام محض روحانی عقیدہ، اخلاق کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کا ایک عملی نظام ہے اور زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ قرآن ایک خدائی قانون کی کتاب ہے اور سائنس خدا کے قانون کا ایک جزء لاینفک ہے جس کے بغیر نظام حیات بے ربط ہے۔

آیئے دیکھیں کہ مظاہر قدرت میں کیا کیا راز، اسرار ہیں جن میں تدبر کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً فلینظر الانسان مما خلق وخلقناکم ازواجاً سے سراجاً وھاجاً میں کیا مباحث ہیں؟

پانی:۔ پانی جو دراصل ہائیڈروجن (H) اور آکسیجن (O) کا مرکب ہے خود حضرت انسان کی تخلیق بھی پانی سے ہوئی ہے۔ ایک مادہ آگ بھڑکاتا ہے اور دوسرا بجھاتا ہے ایسا کیوں؟ جب کہ ان دونوں کی ترکیب سے جو مادہ پیدا ہوا وہ ان دونوں کو بجھاتا ہے۔ مدارس دینیہ سے اس سوال کا جواب کیا ملے گا۔ وہ وجعلنا من الماء کل شئ حی (الانبیاء) کی تشریح کیسے کریں گے؟

سورج:۔ سورج کا قطر زمین سے ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے ۲ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ ہے، اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ سورج زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے۔ اس کی تپش سے درجہ حرارت ۱۴۰ ڈگری فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ سارا نظام شمسی اسی کے مرہون منت ہے۔ ابخرات، فصلوں کی پختگی وغیرہ اسی سے قایم ہے۔ الشمس والقمر بحسبان (رحمان) والقمر قدرنا لا منازل (یٰسین) میں کیا بات ہے؟ کشاف، مدارک، بیضاوی، خاموش اور چپ!

چاند: شاعروں کا محبوب، اقبال کا تلمیحی علامت اور القمر خود ایک سورہ ہے۔ معجزہ شق القمر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہ ایک عالمگیر جنتری ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر کیوں ہے۔ ہلال، قمر، بدر کامل کس کے نام ہیں؟ یہ پورا کیوں صرف ۲ ہی دن دکھائی دیتا ہے۔ چاند ہماری زمین سے چھوٹا ہے۔ اگر زمین کے ٹکڑے کیے جائیں تو ۱۲۔ ۱۳ چاند بنیں گے اور چاند پھر بھی ہمارے ملک بھارت سے بڑا ہی ہے۔

زمین:۔ وفی الارض آیات للموقنین (الذاریات) والارض وما طحاھا (الشمس) آیات کیوں وارد قرآن ہیں۔ زمین ایک نظام شمسی ہے، اس کا مرکز سورج، چاند سے ۲ لاکھ گنا بڑا ہے۔ اگر ہوٹر کو بعید ترین سیارہ تسلیم کرلیا جائے تو وہ سورج سے ۴ ارب ۶۰ کروڑ میل دور ہے یہ ایک کہکشاں (Galaxy) کا چھوٹا سا حصہ ہے جس کہکشاں میں ہمارا سارا نظام شمسی شامل ہے۔ اس میں اب تقریباً تین ہزار ملین (۳ ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں جن کا سب سے قریبی آفتاب کی روشنی زمین پر پہنچنے پر چار سال صرف ہوتے ہیں اور

ہوا:۔ فارسلنا علیہم ریحاً صرصرا (قصص) ھو الذی ارسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ (بنی اسرائیل) جیسے ان موا نے اور فرق ذمشرہ بیوٹ ہو رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ مدارس عربیہ کیا جانیں اس لیے کہ اللہ اعلم بالصواب کا منتر گلے کا ساتھ لگا ہوا ہے ہوا دو گیسوں کا آمیزہ ہے ۱۔ آکسیجن ۲۔ نائٹروجن اور اس کے علاوہ اس میں

یت تیسری گیس بھی شامل ہے جس کا نام کاربن ڈائی آکسائڈ ہے۔ آکسیجن جلنے
ں مدد دیتی ہے۔ اگر آکسیجن نہ ہو تو آدمی کا دم گھٹ جائے، پودے سوکھ
ئیں، اناج، پھل، بے رونق و بے مزہ ہوں۔ آکسائڈ آکسیجن کے بجھانے میں
مدد دیتی ہے، نائٹرجن اعتدال کا کام کرتی ہے اور

پہاڑ، والجبال ارسٰھا (النازعات) لو انزلنا علی جبل
ر رواسی شامخات، جیسی آیات کس کی شاہد ہیں؟ طور، فاران،
ہمالیہ آخران کا وجود کیوں ہے۔ طور ایک انقلابی مقام ہے۔ ایک قوم جو
دبی تھی اٹھائی گئی اور دوسری پست ہوئی اور یہ سب (Physical Law)
قانون طبعی کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانون اخلاق (Moral Law) اور قانون
مکافات (Law of) کی بنیاد پر ہے

ایک طرف آپ کو پہاڑ میں ابرک، سونا، چاندی، لوہا، تانبا، کوئلہ ملے گا تو
دوسری طرف پہاڑوں پر تیز بارش ہوتی ہے اور دشمنوں سے حفاظت ہے۔ کوہ طور
پر موسیٰ ملے، فاران پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمالیہ پر گوتم بدھ۔ کیا صرف
یہی ایک تاریخی حقیقت ہے اور کچھ نہیں۔ انسانی زندگی سے ان کا کیا واسطہ و
رابطہ۔ صرف جلوہ ہی یاد ہے اور کچھ نہیں!

اسی طرح لیل ونہار، ابر و باد، برق و شرر، سمندر و بحار، شبنم و کہرہ
شجر و حجر، شاخ پتیاں، چرند پرند قرآن میں مجملاً و اشارۃً موجود ہے۔ کیا
ان کی ماہیت، فوائد، اثرات، رموز و نکات سے دینی مدارس کے طلباء و مدرسین
واقف ہیں؟ کیا تلاوت کے وقت ان کے دل پر ان آیات بینات کے نزول کا اثر پیدا ہوتا ہوگا؟

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف
نہیں کتاب سے ملکو تجھے فراغ کر تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں (اقبالؒ)

اب رہا ریاضی، تو سورہ ص، فاطر، صافات، یوسف، معارج، نساء، بنی
اسرائیل دیکھ لیں کہ کتنی سندسوں سے بحث کی گئی ہے۔ علم میراث جو نصف علم ہے جس
کا سارا دار و مدار علم ریاضی ہی پر ہے۔ مثلاً "رد عول" کی بحث کیسے حل ہوتی ہے۔ سہ

لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق (اقبالؒ)

اب سوال یہ ہے کہ سائنس کیا ہے؟ علم سائنس اللہ کی

ایک بڑی نعمت ہے۔ ہر چیز کے متعلق جاننا اور اسے صحیح طریقے سے استعمال کرنا اللہ کی
عبادت ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ اللہ کی ان نعمتوں کا ذکر آتا ہے ان میں دو باتیں
پوشیدہ ہیں ١۔ ان نعمتوں کو دیکھ کر ان کے پیدا کرنے والے اور بنانے والے کی بڑائی و
عظمت کی پہچان ٢۔ ان چیزوں کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا۔

اگر یہ دو مقاصد پیش نظر رہیں تو علم سائنس بڑا کارآمد مضمون بن جاتا ہے
آج دنیا کو ایسی سائنس کی ضرورت ہے جس سے اللہ کا منشا پورا ہو تاکہ اللہ کے
بندے ہر وقت شکر ادا کریں اور انسانوں کے دکھوں کا مداوا بن سکیں۔

اسی علم کی بدولت مسلمانوں نے ماضی میں کتنے عظیم الشان کام کیے۔

١۔ ابو موسیٰ جابر کو انگریزوں نے "گبر" کے نام سے موسوم کر دیا ہے جو
ریاضی و سائنس کا ماہر تھا۔ جدید علم کیمیا کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے۔

٢۔ ابو الحسن کے نام کو الہیزن ([illegible]) کر دیا گیا۔ بصرہ کا رہنے
والا مشہور ریاضی داں، ماہر فلکیات تھا۔

٣۔ ابن زکریا رازی کا نام بگاڑ کر رہزس [illegible] کر دیا گیا جو
ایک بڑا ڈاکٹر، چیچک مرض کا محقق گزرا ہے اور تقریباً دو سو کتابوں کا مصنف بھی ہے۔

آج یورپ میں جو سائنس کی ترقی نظر آرہی ہے یہ سب مسلمانوں کے
طفیل ہے مگر آج مسلمان غافل ہے، مردہ ہے، فکر و تدبر سے عاری اور
مایوسی کا شکار ہے۔ مدارس عربیہ کا راستہ اگرچہ دشوار گذار ہے مگر
دشوار تر نہیں۔ عزم و حوصلہ سے یہ کام بڑھ سکتا ہے

غم راہے نشاط آمیز تر کن۔ فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے ساربان راہ درازے مرا سوز جدائی تیز تر کن

تا مسلماں باز بیند خویش را
از جہاں برگزیند خویش را

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

خدائے کائنات سے دعا ہے کہ ملت اسلامیہ میں وہ
مرد مومن پھر پیدا فرما جو ایمان و یقین سے تہذیب جدید کے سحر و
اثر کی طلسم توڑ دے۔

مدارس میں جدید نصاب کی ضرورت

بدرالدین

دنیا کے تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، چاہے تفسیری خیالات میں اختلاف ہوتا رہا ہو۔ اس کے بعد صحیح احادیث ہمارا دوسرا مخزن علم دین ہے اور تیسرے نمبر پر فقہی مسائل۔

گویا ابتدائے اسلام میں صرف یہی اسلامیات کا نصاب تعلیم تھا جو کچھ اضافہ ہوا وہ بعد میں ہوا، لیکن بنیادی حیثیت ان ہی تین مضامین کو حاصل رہی۔ عباسی عہد میں جب یونانی علوم عربی میں منتقل ہوئے اور معقولات کا دور آیا تو منطق، فلسفہ، علم کلام اور طب وغیرہ اسلامی علوم میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ براہ راست اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

یہاں یہ بات بھی نہیں بھولنی نہ چاہیے کہ ابتدائی مرحلہ میں ضرور مسلمانوں نے فلسفہ وطب کی روشنی یونان سے حاصل کی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یونان سے ایک ذرہ پایا تھا جس کو اپنی ذہانت اور قابلیت سے آفتاب بنا دیا۔ علم ہیئت کو ترقی دی، طبیعیات میں ارسطو کی بہت سی غلطیاں دریافت کیں منطق کو نئے سرے سے ترتیب دیا، آلات رصدیہ ایجاد کیے، کیمسٹری کی بنیاد ڈالی، بوٹنی میں اپنے تجربات سے دو ہزار پودوں کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ بہت سی طبی ایجادات کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی میں جب اسلامی تعلیمات اور درس وتدریس کا ہندوستان میں رواج ہوا تو عربی زبان میں یونانی علوم داخل ہوچکے تھے فلسفہ اور علم کلام کا دور تھا۔ چنانچہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری تک ہی ہندوستانی مدارس کا نصاب صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تفسیر اور حدیث پر مشتمل تھا۔

دوسرے دور میں جو دسویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے، مقتضائے وقت کے مطابق میر سید شریف کے تلامذہ نے علم کلام کی اعلیٰ سطح کی دو کتابیں شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا، علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے بلاغت ومعانی میں مطول و مختصر المعانی کی بنیاد ڈالی۔ اصول فقہ اور عقائد میں تلویح و شرح عقاید نسفی کو داخل درس کیا۔

غرض رفتہ رفتہ اسلامی نصاب میں ایسے علوم کا اضافہ ہوتا رہا جن کا بنیادی دینی نصاب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اسی دور میں ہندوستان میں بہت سے علماء منطق وفلسفہ کے سامنے آئے جن میں مشہور منطقی کتاب سلم العلوم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری، ملا حسن کے مصنف حسن سہالوی، قاضی مبارک کے مصنف مبارک گوپاموی، مرقات کے مصنف فضل امام، شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود جونپوری، فن ریاضی کے ماہر اور تصریح کے مصنف امام الدین لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد تیسرے دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور آخر میں شاہ ولی اللہؒ نے علم حدیث کو فروغ عطا کیا اور نصاب کو نئے سرے سے منظم کیا۔

بارہویں صدی ہجری کے چوتھے دور میں ملا قطب الدین ملا نظام الدین نے جس درس نظامی کی نئے سرے سے بنیاد ڈالی کم وبیش ہندوستان کے طول وعرض میں مقبول ہوا۔ مگر اس نصاب میں منطق وفلسفہ، علم کلام اور ہیئت کی جو کتابیں میر زاہد، ملا صدرا، شمس بازغہ، شرح چغمینی، احمد اللہ بحث باب ہی ...

داخل درس کی گئیں تھیں وہ چودھویں صدی تک بڑی آب و تاب کے ساتھ پڑھائی جاتی رہیں اس کا تذکرہ خود مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کیا ہے کہ وہ ۱۵-۱۶ سال کی عمر میں صدرا وغیرہ کا درس دیتے تھے۔ گویا یہ چودھویں صدی یعنی بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی بات ہے۔ رفتہ رفتہ ان کتابوں کی مقبولیت کم ہوئی مگر اب بھی بعض بڑے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

چوں کہ یہ علوم حکمراں طبقہ میں مقبول تھے اور معقولی علماء کی شاہی دربار میں خاصی رسائی تھی اس لیے ان کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا اور مشہور عالم فن پیدا ہوئے۔

ان علماء میں ملا طاہر دکنی اور صدر شریف ریاضی اور نجوم کے ماہر تھے، ان سے بادشاہ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔

پھر فلکیات اور طب ہی سے دلچسپی رکھنے والے نہیں بلکہ فن موسیقی کے ماہر بھی موجود تھے۔ شیخ ضیاء الدین نخشبی کو علوم دینیہ میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ طب اور موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ملّا عبدالقادر بدایونی خود اکبر کے نزدیک متعصب فقیہ تھے مگر فن موسیقی میں خاصی دسترس رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تک کے لیے مستند ذرایع سے نقل کیا جاتا ہے کہ فنی حیثیت سے آپ کا شمار موسیقی کے ماہرین میں ہوتا تھا۔

مذکورہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض لوگوں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ جب سے ہندوستان میں مدارس کا نصاب بنا اس میں معقولات کی کتابیں اور فارسی زبان جو حکمراں طبقہ کی زبان تھی چھائی رہی اور بنیادی دینی کتابیں منطق و فلسفہ کے انبار میں دبی رہیں۔ اس میں شک و شبہ کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ معقولات کی اس فراوانی کے پس پردہ حکمراں طبقہ کے ذوق کی تسکین کا جذبہ کارفرما تھا۔

مگر میرا خیال یہ ہے کہ الناس علی دین ملوکھم کے تحت اس دور کے علماء نے جو روش اختیار کی وہ تقاضائے وقت کے مطابق بالکل درست تھی۔ وقت کی نبض پر ان کا ہاتھ تھا وہ اس دور کے عصری علوم سے خود کو پوری طرح آراستہ کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک عالم دین زمانے کے مروجہ اور متداول علوم کے حاصل کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انہوں نے نہایت کشادہ دلی اور وسعت نظری سے ہر اس فن کو حاصل کیا جو اس وقت کے لیے ضروری تھا اس طرح انہوں نے حکمراں طبقے سے بھی خراج تحسین وصول کیا اور علمی دنیا میں بھی اپنا لوہا منوا لیا۔

پھر آج کے عالم دین کے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ وہ اپنی دینی صلاحیتوں کے ساتھ اپنی مخصوص وضع قطع اور ماحول میں رہتے ہوئے آج کے مروجہ عصری علوم حاصل کرنے میں پیچھے رہے اور قدم قدم پر بازار میں، تجارت میں، سفر میں، ملازمت میں گوناگوں دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی کم علمی کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔

ذرا یہ سوچیے یہ آئین نو سے ڈرنے اور طرز کہن پر اڑنے کی کوشش آخر کب تک ہمارے پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔

ان حالات کے پیش نظر آج ہمارے نزدیک قرآن و حدیث اور فقہ کو بنیادی مضامین قرار دینے کے بعد زندگی سے مربوط دوسرے مضامین کو شامل کرنا نہایت ضروری ہے۔ عربی ادب میں کلاسیکی ادب کے چند تعارفی اقتباسات کے علاوہ جدید عربی ادب کو شامل کرنا چاہیے تاکہ طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ تقریر و تحریر کی صلاحیت بھی پیدا ہو اور وہ آج کے عرب ہند روز افزوں تعلقات میں معاون ثابت ہو سکے۔ پھر معاشی دشواریوں کے حل کا ایک نیا راستہ مل سکے۔

عقاید کے معاملے میں آج ہمارا مقابلہ خوارج، معتزلہ اور باطنیہ سے نہیں ہے جس کے لیے ہم شرح عقاید نسفی اور جلالی پڑھتے رہیں آج ہمارے اوپر دہریت کا حملہ ہے، انکار حدیث کا فتنہ ہے، ڈیکارٹ کے نظریۂ شک کو قرآن و حدیث اور اسلامی عقاید میں بیت کر دینے کی مہم جاری ہے ان کو پڑھنے اور جواب دینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

اور جہاں تک منطق و فلسفہ کا سوال ہے تو ان کو مدارس کے نصاب سے نکالا تو نہیں جا سکتا کیوں کہ بعض تفسیری نکتے اور خاص طور پر تفسیر بیضاوی منطق و فلسفہ کے بغیر سمجھنا مشکل ہے مگر معقولات کے غیر ضروری انبار کو کم کیا جانا چاہیے تاکہ دوسرے مضامین کے لیے وقت مل سکے۔

اس کے بعد سائنس کی تعلیم کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ مدارس میں اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں اہل مدارس کو نہیں کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ خود ہمارے علماء میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۹۳۰ء سے قبل سائنس اور اسلام نامی کتاب لکھ کر اس ضرورت کی طرف اشارہ فرما چکے ہیں کہ اسلامی ارکان و اعمال کو سمجھنے کے لیے سائنٹفک طریقے پر سوچنا کتنا ضروری ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ قرآن کریم میں مذکورہ واقعات اور ان کے محل وقوع کو سمجھنے کے لیے تو مشرق وسطیٰ بلکہ ایشیا کا جغرافیہ جاننا ضروری ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے قصص القرآن میں تاریخی اور جغرافیائی تشریحات خود ان علوم کے حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ قرآن کریم جو ہماری بنیادی کتاب ہدایت ہے اس کا مطالعہ کما حقہ اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک سائنس کی تمام شاخوں سے واقفیت نہ ہو۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات سائنسی علوم سے بھری ہوئی ہیں میں صرف ایک سورہ الرحمٰن کی چند آیات بطور مثال پیش کروں گا۔

والارض وضعها للانام فيها فاكهة والنخل
ذات الاكمام والحب ذو العصف والريحان

[اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لیے زمین کو بچھایا، اس میں میوہ غلاف والی یا بہت والی کھجوریں، بھس کے ساتھ اناج اور خوشبودار پھول ہیں۔]

مذکورہ آیت میں علم نباتات یا بوٹنی سے متعلق اشیاء کا تذکرہ ہے

رب المشرقين ورب المغربين

[اللہ تعالیٰ مشرقین اور مغربین کا رب ہے]

یعنی سورج کے طلوع و غروب میں موسم کے لحاظ سے جو جگہیں تھوڑی بہت تبدیل ہوتی رہتی ہیں، ان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ آیت جغرافیائی علوم سے واقفیت کا احساس دلا رہی ہے۔

مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان

[اللہ تعالیٰ نے دو ملے جلنے والے دریا بہائے اس دونوں میں] ایک پردہ حائل ہے تا کہ دونوں ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں]

مذکورہ آیات کا ہیڈرولوجیکل اسٹڈیز کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

يخرج منهما اللؤلؤ والمرجان۔

[ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے]

مرجان کی تعریف میں جہاں مفسرین کی مختلف رائیں ملتی ہیں، وہاں پتھر یا مونگا قرار دیے جانے کے بعد یہ جیولوجی یا زولوجی کا موضوع بن جاتا ہے کہ سمندر سے نکلنے والے مونگے یا پتھر کن اقسام پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں خالق کائنات کی حسن کاری کے بے پناہ نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پورے قرآن کریم کا مطالعہ کرنے میں جو مختلف جانوروں، کیڑوں، پرندوں اور زمین و آسمان، آب و ہوا وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے سائنس کی تعلیم کتنی ضروری ہے، اس کے علاوہ زبان کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔

تقریباً چوصدی تک مدارس میں نحوی صرفی قواعد کی قریب قریب تمام کتابیں فارسی زبان میں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ اب بھی عربی سیکھنے کا خواہش مند پہلے ایک غیر مادری زبان فارسی کو اس لیے سیکھے کہ اس میں عربی قواعد پڑھتے ہیں پھر عربی کی طرف متوجہ ہو۔ اس طویل عمل کی بجائے عربی کی تعلیم کے لیے ڈائرکٹ میتھڈ پر غور کیا جانا چاہیے۔ جو اب عرب ممالک کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں مروج ہو چکا ہے اور کامیاب ہے۔

لیکن اگر عربی قواعد مکمل ہی پڑھانے ضروری ہیں تو کیا ضروری ہے کہ وہ فارسی میں ہوں اگر اُس وقت حکمراں طبقہ کی زبان کو مدارس نے گلے لگا لیا تھا تو آج بھارت کی قومی زبان ہندی اور بین الاقوامی زبان انگریزی سے معانقہ کر لینے میں کیا حرج ہے جب کہ یہ دونوں زبانیں آج ہر ہندوستانی کے سماج اور معاش کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور پھر ہماری مادری زبان اردو اگر اس جمہوری دور میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی 'غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم یہ زہر گوارہ کب تک ہو' تو وہ کتنا حق بجانب ہوگی۔

چند شعبہ کی فرصت کے [illegible] مولانا [illegible] کے

خیالات تو یہ ہیں کہ جب قدیم نصاب تعلیم کے ذریعے منطقی ملاّ، فلسفی ملاّ، مہندس ملاّ ادیب ملاّ، شاعر ملاّ الغرض باوجود ملاّ ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن کر نکلتے رہے تو آج اپنے نصاب میں جدید مضامین کو شامل کرکے بجائے فلسفی ملاّ، کے سائنٹسٹ ملا اور منطقی مُلاّ کے سائیکلوجسٹ مُلاّ وغیرہ کیوں نہیں پیدا ہو سکتے۔

مگر میرے نزدیک دینی مدارس کا اپنا ایک مقصد، روایتی ماحول اور طریقۂ تعلیم ہے جس میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم جو لاکھوں روپے کی لیب اور تجربہ گاہوں کی ضرورت رکھتی ہے، ~~ہونی~~ ہونی مشکل ہے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ مدارس میں سائنس کی تعلیم شروع کرکے یہاں سے سائنٹسٹ نکلیں تو ہماری یہ توقع مناسب نہ ہوگی کیوں کہ پھر مدارس کا اپنا مقصد ختم ہو جائے گا، چند برسوں میں مدرسے کالج بن کر رہ جائیں گے۔ جس طرح قدیم دلی کالج جو اب ذاکر حسین کالج کے نام سے موسوم ہے، اسے آصف جاہی خاندان کے مورث اعلیٰ غازی الدین فیروز جنگ نے ایک دینی مدرسے کی شکل میں [illegible]ء میں قایم کیا تھا۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں اسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج کے نام سے موسوم کر دیا اور انگریزی کی تعلیم شروع کر دی گئی۔ آج یہ کالج دلی یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے۔ دینی مدرسہ کی کوئی نام و نمود اس میں باقی نہیں رہی ہے۔

مگر دینی مدارس میں بہر حال سائنس کی بنیادی تعلیم ضرور ہونی چاہیے اس حد تک کہ پریکٹیکل کا مسئلہ ان کے لیے دشواری نہ پیدا کرے۔

اس سلسلے میں میری ایک تجویز یہ ہے کہ مرکز فروغ سائنس کے ذمہ دار حضرات جنہوں نے اس عظیم الشان کانفرنس کا اہتمام کیا ہے، ایک کمیٹی بنائیں جو مدارس میں جدید مضامین کی تعلیم کے لیے مثبت نظریہ رکھنے والے چند علما اور سائنس کے پروفیسرز حضرات پر مشتمل ہو۔

یہ کمیٹی مدارس کے نصاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو اس طرح سے ترتیب دے کہ ابتدائی تین چار سال کے نصاب انگریزی، سائنس، جغرافیہ اور تاریخ اسلام کے اسباق کو حسب ضرورت شامل کیا جائے جب ایک مرتبہ نصاب پر کمیٹی کا اتفاق ہو جائے تو اس کی اشاعت کی جائے کہ دور دراز کے مدارس کا ردعمل معلوم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ مدرسے ضرور قبول کریں گے جو آئندہ اس کی مقبولیت کی بنیاد بنیں

تاریخ جغرافیہ کی اردو کتابیں تو آسانی سے مل جاتی ہیں سائنس کی اردو کتابوں کی فراہمی میں بھی اب کوئی دشواری نہیں ہے کیوں کہ دہلی میں حکومت کے دو ادارے ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے سائنس کی بہت عمدہ کتابیں نہایت ارزاں قیمت پر شایع کی ہیں۔

میں نے طبیعیات، علم کیمیا، حیاتیات اور سائنس سیکھنا کئی حصوں میں دیکھی ہیں جو دو سو صفحات کے قریب ہونے کے باوجود ۵/- روپے کی قیمت میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ان کے علاوہ جنرل سائنس کی اردو کتاب مولانا عزیز احمد قاسمی بی۔اے کی لکھی ہوئی کمال بکڈپو سہارنپور سے شایع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب کی کتاب دہلی سے شایع ہوئی ہے۔

ان کتابوں پر غور کرکے مدارس کا نصاب مرتب کیا جا سکتا ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مرکز فروغ سائنس کو اپنا حتی الامکان تعاون دینا چاہیے، جس نے اس مقصد کے لیے اس کانفرنس کا انعقاد کیا ہے۔

آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اس جملے پر میں مضمون ختم کرتا ہوں۔

"دنیا کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ مگر بے اعتدالی سے بچو، معصیت کا سرچشمہ دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال ہے۔"

کتب حوالہ

۱۔ ہندوستانی مسلمان۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مجلس تحقیقات و نشریات لکھنؤ ۱۹۹۱ء

۲۔ مقالات شبلی سوم۔ معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء

۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم جلد اول۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۶ء

۴۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم جلد اول۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۶ء

۵۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ جلد اول۔ سید محبوب رضوی۔ ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۷ء

۶۔ ترجمان القرآن جلد دوم۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ شیخ مبارک علی اینڈ سنز، تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد یعقوب قاسمی

تاریخ اسلام کا عمیق مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقوام عالم میں مسلمان اپنے عروج کے زمانے میں علم و صحافت کے زرین میدان میں اور قوموں کے مقابلے سب سے آگے رہے ہیں اور عرصہ دراز تک کائنات عالم کی علمی قیادت کی ہے۔ مذہبی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے اندر بھی تفوق و کمال کا درجہ حاصل کیا ہے اور اپنے زمانے کے جملہ علوم کے ذخائر سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ نیز علوم قدیم کی تعلیم حاصل کرکے اس کو اعلیٰ قسم کی ترقی سے ہمکنار کیا اور دیگر قوموں کے واسطے اس سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کیے اور سیکڑوں ایسے نئے نئے علوم ایجاد کیے جس سے آج بھی دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے جیسے علم منطق، علم فلسفہ، علم طبعیات، علم جغرافیہ، علم ریاضیات علم تاریخ، علم ہئیت، علم تفسیر، علم فقہ، علم عقاید، علم طب کے اندر بہت سے ماہرین فضلا اور حکماء پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے علمی کمالات سے طرح طرح کے تجربات و اختراعات کیے اور ان علوم کے اندر مسلمان دیگر قوموں کے سیکڑوں سال تک استاد رہے۔ مسلمانوں کی تالیف و تصنیف کردہ کتابیں صدہا برس تک یورپ کے کالجوں و یونیورسٹیوں میں داخل نصاب رہیں۔ مسلمانوں نے اگر ان علوم کو نہ سیکھا سکھایا ہوتا اور اس کے اندر قسم قسم کے تجربات و انکشافات نہ کیے ہوتے اور اہل یورپ نے اس سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو حالات حاضرہ میں علمی ترقیوں اور ایجادات اشیاء کی رنگینیوں و دلفریبیوں کا ذرہ برابر وجود کا تصور نہ ہوتا۔ سابقہ مسلمانوں کی رکھی ہوئی بنیاد ہی پر موجود سائنس کی ترقیات سحر آلود ہوکر عالم وجود میں آئی ہے۔

علامہ حالی نے کیا خوب کہا ہے۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

جب سے دنیا آباد ہے ہر زمانے میں کسی نہ کسی فن کا عروج رہا ہے ا[illegible]
اس ترقی و تمدن کے دور میں سائنس کا عروج ہے۔ ہر سمت سائنس کا ہی
تذکرہ کیا جاتا ہے۔ دیگر فنون کے مقابلے میں سائنس کو ترجیح دی جا[illegible]
ہے اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا نے جو ترقی کی ہے وہ سائنس [illegible]
کی مرہون منت ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

دنیاوی تعلیم کے حصول کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں کہیں
ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ قرآن و احادیث میں جگہ جگہ دنیاوی [illegible]
کے حصول کے واضح اشارات ملتے ہیں۔ البتہ ایسی تعلیم سے قرآن و احادی[illegible]
میں ضرور ممانعت وارد ہوئی ہے جو تعلیم کی ایمان و اسلام کے لیے مض[illegible]
رساں ہو تاہم سائنس کی تعلیم ایمان و اسلام کے لیے نقصان دہ نہیں۔

جس طرح کالجوں و یونیورسٹیوں میں سائنس کی تعلیم باضابطہ د[illegible]
ہے، اسی نہج پر مدارس میں بھی اس کی ترویج کی اہم ضرورت ہے۔ اس ک[illegible]
کے اجراء کے لیے ارباب مدارس کو بر وقت صحیح اقدام کرنا نہایت ہی ضرو[illegible]
ہے۔ کیوں کہ آج کل مسلمان طبقہ دیگر قوموں کے مقابلے میں ترقیات وا[illegible]
اختراعات کے زریں میدان میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اگر عربی مدارس میں [illegible]
روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم کا بھی معقول انتظام
کر دیا جائے تو وہ دن دور نہیں کہ مسلمان اپنے اسلاف کی عظمت
کو زندہ کر دیں اور موجودہ ترقی یافتہ قوموں کو ترقیات کے میدا[illegible]
پس پشت ڈال دیں۔

عربی مدارس کے اندر سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس کے اندر سائنس
کے اساتذہ بالکل مفقود ہیں اور اساتذہ کا نہ ہونا ہی علم سائنس کے اجراء کے لیے
اہم رکاوٹ ہے۔ مدارس میں سائنس کی تعلیم اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ
اس کے اساتذہ مذہبی تعلیم پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ علم سائنس میں بھی ملکۂ تامہ
رکھتے ہوں۔ سائنس کے اساتذہ تیار کرنے کے لیے ابتدائی طور سے ایسے سنٹروں
کے قیام کی ضرورت ہے جس میں اساتذۂ عربی کو سائنس کی تعلیم دی جائے اور تعلیم
کا پہلے مرحلے میں ایک ایسا مختصر کورس رکھا جائے جس کی تحصیل کے لیے اساتذہ
بآسانی تیار ہو جائیں اور ان کے لیے حصول تعلیم کے وقت ایسی مراعات ملحوظ
رکھی جائیں جو کہ ان کو عربی مدارس کی زندگی میں حاصل تھے۔

مدارس میں سائنس کی تعلیم کے لیے ایک آسان نصاب مقرر کیا جائے
اور اسی نصاب کے مطابق ہر جگہ تعلیم کا اجراء کیا جائے اور سالانہ امتحان کے لیے
ہر ضلع میں کم از کم ایک امتحان کا مرکز متعین کیا جائے تاکہ اسی مرکز کے
ماتحت طلباء مدارس امتحان میں شرکت کریں۔

عربی مدارس میں سائنس کے کورس کی تکمیل کر لینے کے بعد طلباء کو اس
کے مساوی درجات میں کالجوں و یونیورسٹیوں خصوصاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخلہ لینے کا مجاز قرار دیا جائے۔

اگر اس طرح کے انتظامات کی تکمیل ہو جائے تو عربی مدارس میں سائنس
کی تعلیم کے اجراء کی کوئی بھی رکاوٹ درپیش نہ ہوگی بلکہ جملہ سربراہان مدارس
اسے قبول کرنے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات معلوم
ہوتی ہے کہ عہد ماضیہ کے مسلمانوں نے دینی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ
دنیاوی علوم کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا بلکہ اس کو بھی کما حقہ حاصل کیا
جس کی وجہ سے وہ درخشندہ ستارہ بن کر دنیا میں ہر سمت چمکے اور آج بھی
ان کے عجیب و غریب محیر العقول کارنامے اوراق تاریخ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت
ہیں جو کہ کسی پر مخفی نہیں بلکہ ہر ذی شعور انسان پر روز روشن کی طرح عیاں
ہیں۔ نمونے کے طور پر اسلاف کے چند کارنامے ذکر کیے جاتے ہیں۔

اندلس کے اندر مسلمان عربوں کے دور اقتدار میں ۱۰۱۵ء میں
اشبیلیہ کے اندر سولہ ہزار کارخانے عمدہ قسم کے کپڑے تیار کرتے تھے جس
میں ایک لاکھ تیس ہزار ماہر فن بننے والے اور مزدور کام کرتے تھے۔
(غابر الاندلس ص ۷۰)

کاغذ کے متعلق عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کے کارخانے کے
موجد اہل یورپ ہیں مگر تاریخ بینی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موجد اول اور
اس کو درجۂ کمال تک پہونچانے والے شاطبہ کے باشندے ہیں۔ اندلس میں
شاطبہ ایک شہر کا نام ہے۔

وفی شاطبہ یعمل الکاغذ الجید ویحمل منہا الی سائر
بلاد الاندلس۔ غابر الاندلس۔

: شہر شاطبہ میں بہترین کاغذ بنایا جاتا ہے اور وہیں سے
تمام بلاد اندلس میں جاتا ہے۔

چھپائی مشین اور مطابع کا موجد عام طور پر گوٹنبرگ کو قرار دیا جاتا ہے
لیکن یہ درست نہیں۔ بلکہ اس کے اول موجد اندلس کے مسلمان ہیں۔ تاریخ
اندلس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے سلطان ناصر کے وزیر اعظم
عبد الرحمن بن بدر شاہی فرامین کو لکڑ چھپنے کے لیے بھیجتے تھے اور چھپ جانے
کے بعد ایک ایک کاپی اپنی قلمرو میں بھیجا کرتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ گوٹنبرگ
سے چار سو سال پہلے مسلمان اس کو ایجاد کر چکے تھے۔

علم ہیئت و ریاضی میں عرب اندلس ایک عرصے تک دنیا کے مسلم استاذ
رہے ہیں، انہیں میں سے عباس فرناس حکیم اندلس نے ایک مکان کے
اندر زمین و آسمان اور ستاروں کی ہیئت بنائی تھی، جس میں رعد و برق
اور ابر باراں کی پوری نقل دکھلائی تھی اور بادلوں کے بننے اور برسنے کا
مشاہدہ کرایا تھا۔ اسی حکیم اندلس نے انسانوں کے فضا میں پرواز کرنے
کے لیے سب سے پہلے ایسے پر ایجاد کیے تھے جس کو انسان اپنے بازوؤں میں
باندھ کر باطمینان ہوا میں پرواز کر سکتا تھا۔

گھڑی کی ایجاد بھی ہارون رشید کے عہد خلافت میں ہوئی
عباس فرناس نے ایک ایسا گھنٹہ ایجاد کیا تھا جو کہ تکلی سے چلتا تھا اور صحیح
وقت دینے میں بے نظیر مانا گیا تھا۔

توپ اور بارود کے موجد اول عرب اندلس ہیں اور آج
بھی ان کی بنائی ہوئی توپیں اسپانیہ کے عجائب گھر میں موجود
ہیں۔

فن کیمسٹری معدنی دھاتوں کی تحلیل و تجزیہ گندھک اور
پارہ نکالنے کی ترکیب پانی کا تجزیہ اور تحلیل دودھ پھاڑ کر اسے طبی

ضروریات کے مطابق استعمال کرنے کی ترکیب الکحل کے جوہر کو خیرہ اُٹھانے اور اسی طرح کی دوسری کیمیاوی چیزوں کا انکشاف ابو موسیٰ جعفر کوفی کی تالیفات سے ملتا ہے جو آٹھویں صدی کا مشہور عالم گزرا ہے۔ غرض کہ سائنسی ریسرچ کی بنیاد مسلمانوں نے ہی رکھی۔

ابن سینا نے تاریخی کے درختوں کی معلومات کی۔ محمد بن زکریا رازی نے سرجری اور ڈاکٹری ٹیوب کا سب سے پہلے ایجاد و استعمال کیا۔

فن سرجری اور جراحی کا پہلا موجد اسپین کا مشہور عالم خلف بن عباس ہے۔ یورپ والے اس کو بوقارس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابو مروان بن عبدالملک اندلسی نے فن جراحی میں تنفس کے دونوں شعبوں کو کھلے رہنے کا فن ایجاد کیا۔

البیطار اندلسی نے معدنی اشیاء، قیمتی پتھروں و حیوانات کے طبی خواص کا انکشاف کیا۔ علامہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے نویں صدی عیسوی کے آخر میں میڈیکل سائنس کی نئی ایجاد رکھی اور یہ اپنے زمانے میں طب، کیمسٹری و طبعیات کا سب سے بڑا ماہر تھا۔

علامہ رازی ہی نے نسوانی امراض حمل اور آنکھوں میں لاحق بیماریوں پر تجربات کیے جو کہ تمام دنیا کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ابو منصور موفق ہروی نے ۴۶۶ دوائیاں نباتات اور ۵، دوائیاں معدنیات، ۲۴ دوائیاں حیوانات سے حاصل کیں اور ان کی تحقیق کی۔ اس نے اشیاء کے تجزیہ کا مضمر راز بھی بتلایا۔

الموفق کو سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ کا فرق معلوم تھا اور وہ تانبے اور سیسے کی زہریلی تاثیر سے بھی بخوبی واقف تھا۔

مسلمانوں ہی نے فلسفۂ جدید یعنی موجودہ سائنس کو ایجاد کیا ہے جس کا کھلے لفظوں میں سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اعتراف کیا ہے۔

فارابی نے سائنس کے اصول اور اس کی درجہ بندی پر لاطینی زبان میں اپنی ریسرچ کے نتائج پیش کیے۔ مسعود مظاہر نے سائنس کے سلسلے میں ۹۶۵ء کے زلزلہ اور معدنی تحقیقات کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے۔

منصور موفق نے ٹکنالوجی میں ریسرچ کی اور معدنی اشیاء کا کھوج لگایا۔ علامہ نے حیوٰۃ الحیوان نامی کتاب لکھ کر زولوجی میں ایسا بڑا کارنامہ انجام دیا جو کہ ساری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ اس کتاب میں ہر قسم کے جانوروں کی خصوصیات کو بھی تحریر کیا ہے اور آج بھی انہیں یورپ کے سائنس داں بوفون کے برابر گردانتے ہیں۔

مسلمان عربوں نے آگ، پانی، ہوا، خلا، چاند، سورج ستارے اور زمین کے طبقات کی تحقیقات کی۔ یعنی جیالوجی علم طبقات الارض کو ایجاد کر کے اسے اعلیٰ قسم کی ترقی دی۔ انہوں نے زراعت کے آلات ایجاد کیے اور آب پاشی کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے جس پر آج بھی یورپ والے عمل پیرا ہیں۔

مسلمانوں نے علم ہندسہ، حساب، جبر مقابلہ، روشنی اور نظر کی رفتار کے متعلق مختلف علوم و فنون بھی ایجاد کیے۔

ایک مشہور فرانسیسی عالم موسیو سیدیو نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ایشیا اور یورپ میں اس وقت علم اور سائنس کا اجالا پھیلایا ہے جب یورپ میں جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ عباسیوں نے بغداد میں، امویوں نے دمشق میں اور فاطمیوں نے قاہرہ میں علم اور سائنس کو اجاگر کیا۔ ان کے پاس سائنسی اور صنعتی تحقیقات کا جو ذخیرہ تھا، اس سے عیسائیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ہندوستان کے سابق صدر رادھا کرشنن نے بھی مذہب اسلام کے متعلق ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء میں ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کھلے طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یورپ میں علم اور سائنس کا احیاء مسلم سائنس دانوں ہی کی بدولت ہوا ہے۔

آج کل کی یورپ زدہ نظریں جو حق و صواب کی نئی تشکیل

ان کی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک معمولی سا نمونہ اس کا بھی
ے کہ مسلمانوں نے جس وقت اپنی محرومی و بے نصیبی سے عہد سلف کا
بق بھول کر ایجادات و صنائع کو ترقی سمجھ لیا تھا تو ایک ہی حرکت
ن کا قدم ساری دنیائے تمدن سے آگے تھا اور آج بھی ماہرین
ن کو ان کا لوہا ماننے سے چارہ نہیں۔ موجدین یورپ ان کی جدت
ی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

جس طرح عصر ماضیہ میں اسلام پر جب فلسفہ یونان و لوربود
ن کے ذریعہ قسم قسم کے اعتراضات شروع ہوئے تو اسلاف نے
ں کی نزاکت کے پیش نظر بروقت منطق و فلسفہ جدید کو اپنے تعلیمی
ب میں داخل کیا اور اسے سیکھ کر اسی کے ذریعے اسلام پر وارد
نے والے اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا جس سے اہل یونان و
ہ میں گھبراہٹ پڑ گئی۔

آج بالکل وہی کیفیت سائنس کے جدید نظریات
پیدا ہو گئی ہے۔ اسلام کے دشمن ناواقف اشخاص بذریعہ
ن اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور مذہب
لام کو اپنے نظریات کے اعتبار سے دقیانوسی مذہب شمار
ہیں۔ ادھر مسلمانوں کی اکثریت نے اسلامی علوم کی طرف
ی اختیار کر لی ہے اور دنیاوی علوم کے حصول کو ترک کر دیا۔
، وجہ سے وہ اسلام کے اوپر ہونے والے اعتراضات کی
، مدافعت سے قاصر ہیں۔

وقت کا اہم تقاضا ہے کہ اس پُر آشوب دور
سلاف کے کارہائے طریق کو گلے سے لگایا جائے اور اسلامی
نصاب کے اندر سائنس کو داخل کیا جائے اور سائنس کو سیکھ
سلام کے خلاف ہونے والے اعتراضات کی مدافعت کی جائے اور
ں کے فوائد سے اسلام کی روشنی میں حتی الامکان استفادہ کیا
تاکہ مسلمان دیگر قوموں کے مقابلے میں سائنسی میدان کے اندر
رہیں۔ اگر مسلمانوں نے اسلاف کے طریق کو نسیاً منسیاً نہ کیا ہوتا

تو آج یہ خستہ حالت درپیش نہ آتی بلکہ موجودہ مسلمان ترقی و تمدن
کے میدان میں موجودہ ترقی یافتہ قوموں کے آگے ان کے قدم ہوتے، مسلمانوں
کو اس کمی کا احساس ہونا چاہیے اور انہیں سائنس کی تعلیم کے حصول
کے لیے پرجوش و احتساب کے ساتھ آمادہ ہونا چاہیے۔ تاکہ موجودہ
کمی کا جلد از جلد سدباب ہو سکے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کی
طرف مراجعت کر سکیں۔

سائنس کی تعلیم اور اس کے استعمال نے انسان
کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور اس سے انسانی زندگی میں بہت سہولتیں
پیدا ہو گئیں۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ آج سائنس قومی
ترقی کے لیے ایک اہم وسیلہ ہے۔ نہ صرف جدید ٹکنالوجی اور صنعت
بلکہ زراعت کو بھی فروغ دینے کے لیے سائنس کی ضرورت ہے۔ ہمارے
ملک میں بالخصوص آزادی کے بعد اس سمت میں اقدامات کیے گئے ہیں
مثال کے طور پر ضابطۂ تعلیم میں سائنس پر اب ہمارے یہاں خاصا زور
دیا جا رہا ہے۔ سائنس لوگوں کے رویے میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرے
گی، جس سے ہمارے روایتی ساکن سماج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ
جائے گی۔ ہمارا سماج جس میں توہم پرستی اور تاریک اندیشی کا دور
دورہ ہے سائنس کے بغیر نہ خاطر خواہ سماجی ترقی کر سکتا ہے، نہ
اقتصادی ترقی۔

ہندوستان میں خصوصاً مسلمانوں میں سائنس کی روشنی پھیلانے
کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسی طرح رجعت پسندانہ روایات کے نقصان دہ
اثرات کو ختم کیا جا سکے گا اور ترقی کی نئی راہیں نکل سکیں گی۔

ویسے دیکھا جائے تو ہمارے مدرسوں میں خاصی مدت
سے سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے مگر اسے تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔
نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں ناقص ہیں۔ ہمارے طبعی اور سماجی ماحول
سے اس کا بہت کم رابطہ ہے۔ ہمارے ملک میں ۸۰٪ لوگ دیہات
میں رہتے ہیں۔ نصاب کو دیکھیے تو گاؤں کے مدرسوں میں وہی ہے جو
شہری اسکولوں میں رائج ہے۔ کتابیں یکساں ہیں، گاؤں کی بیشتر آبادی
کا پیشہ کھیتی باڑی ہے اس لیے مناسب ہو تاکہ دیہی مدرسوں میں
سائنس کی تعلیم کا ذریعہ زراعت کو بنایا جائے اور سائنس پڑھانے

میں موادِ تعلیم کو زراعت کے مختلف عوامل اور متعلقہ چیزوں سے مربوط کرکے
پیش کیا جائے۔ بچّوں کو ترغیب دی جائے کہ چیزوں کا بغور مشاہدہ کریں، احتیاط
کے ساتھ تجربہ کریں اور پھر اس کا نتیجہ اخذ کریں اور پھر اس اصول کو مناسب
مواقع پر برتیں۔ یہ سائنس کی تعلیم کا صحیح طریقہ ہے جو کہ ہمارے مدرسوں
میں نہ ہونے کے درجے میں ہے۔

ہمارے مدرسوں میں عموماً سائنس پڑھانے کا جو طریقہ ہے، اسے
نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور سائنس پڑھانے والے استاذ دوسرے
مضامین کے استادوں کی طرح میکانکی ڈھنگ سے سائنس پڑھاتے ہیں
اور سائنس سے متعلق حقایق اور جو بھی باتیں خاص ہوتی ہیں وہ طلباء رٹ
لیتے ہیں اور جیسے تیسے امتحان پاس کر لیتے ہیں، ان میں موادِ تعلیم کو صحیح طور
پر سمجھنے اور اسے زندگی کے کاروبار میں استعمال کرنے کی قابلیت
پیدا نہیں ہو پاتی۔

جس طرح دیہی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو بچّوں کے قدرتی
ماحول اور زراعت کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے، اسی طرح شہر کے
مدرسوں میں شہری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس کو مربوط کرنا
چاہیے۔ مثلاً شہر میں طرح طرح کی صنعتیں، بجلی کا سامان و روشنی، پانی،
سڑکیں اور طرح طرح کے ذرایع پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح دیہاتوں
میں بھی ذرایع فراہم ہونا چاہیے۔ یہ سب چیزیں تعلیم کا ایک موثر اور
بامعنیٰ ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ اس طرح طلباء میں تلاش و جستجو کی لگن پیدا کی
جا سکتی ہے، جو سائنس کی تعلیم ہی کی نہیں بلکہ عصرِ جدید میں انسانی زندگی
کی بنیادی قدر ہے۔ اب انسان کے عقیدے اور عمل کی بنیاد کسی بیرونی
قوت کے فرمان پر نہیں بلکہ اس کے اپنے تجربے پر قایم ہے۔ سائنس
کے نزدیک کسی بھی چیز کی سچائی قطعی اور آخری نہیں بلکہ آزمائشی چیز
ہے اور ثبوت کی محتاج ہے، آج تک جس چیز کو سچائی سمجھا جا رہا ہے،
ہو سکتا ہے کہ تجربے کی بنا پر اس میں شبہ پیدا ہو جائے اور اس
کی جگہ کوئی دوسری سچائی لے لے۔

ویسے اگر دیکھا جائے تو سائنس کی ترقی کے لیے
کئی تنظیمیں ہیں۔ پرائمری اسکولوں اور مڈل اسکولوں میں سائنس
کی ترقی کے لیے طرح طرح کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ سائنس کے
ٹریننگ اسکول کھول دیے گئے ہیں۔ بچوں میں بھی اس کا اچھا خاصا اثر
پڑا ہے اور بچے سائنس کو اچھی طرح سے اپنانے لگے ہیں اسے سرکار
ترقی بھی دے رہی ہے۔

اب یہاں ہم کو یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ سائنس کی ترقی
ہمارے دینی مدرسوں میں نہیں ہو رہی ہے۔ کیوں کہ ان مدرسوں میں
سرکار کا کوئی دھیان نہیں ہے اور نہ ہی ہماری سرکار کو مدارس سے
کوئی خاص دلچسپی ہے۔ اگر آج ہمارے دینی مدرسوں میں سائنس کا
فروغ ہونے لگے تو ان مدرسوں کے بچے بھی ترقی کی طرف گامزن ہونے
لگیں گے۔ ان کو بھی علم سائنس سے لگن پیدا ہو اور اسکولوں کی ترقی کا
راستہ کھل جائے۔ اس طرح سے اب ہم کو اپنے مدرسوں میں سائنس کی
تعلیم جاری کرنا ہے اور سب کو مل کر اس کی ترقی پر دھیان دینا ہے
تاکہ مدرسوں میں سائنس کی تعلیم باضابطہ شروع ہو جائے اور یہ
مدرسے سائنس کی ترقی کی طرف شب و روز بسرعت بڑھتے
رہیں۔

اب ہم کو مختصراً آگے یہ پھر کہنا پڑ رہا ہے کہ بچوں
کی تعلیم و تربیت میں سماج اور گھر کا بڑا حصّہ ہے۔ اگر بچے
مدرسوں میں سائنسی تعلیم و طریقہ سیکھ بھی لیں اور مدرسوں
کے باہر کا ماحول اس کے لیے تیار کار نہ ہو تو مدرسے کی تعلیم
اثر کمزور پڑ جائے گا۔ اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ باہر
میں بھی سائنسی نظریہ پیدا کرنے کی اسکیم چلائی جائے۔ اس سلسلے
میں ان تمام ذرایع کو پورے طور پر استعمال کرنا چاہیے جو تعلیم
بالغان کے لیے کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس معاملے میں ریڈیو او
ٹیلی ویژن وغیرہ کا استعمال خاص طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے
قصے، کہانی، ڈرامے وغیرہ کی شکل میں بھی اسے موثر کیا جا سکتا ہے
اور عوام کو سائنسی طریقۂ فکر سے روشناس کیا جا سکتا ہے
یہ سب ٹھیک طرح کیا جائے تو امید قوی ہے کہ ہمارے
بڑے ہو کر ان تعصبات سے پاک صاف ہوں گے جو مذہب
فرقہ یا زبان کے نام پر ہمارے سماج میں جاری ہیں۔ ان
ذہن لچک دار ہوں گے اور وہ دلیل اور ثبوت کی

میں اپنی رائے میں تبدیلی کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اس طرح ہمارا ملک بھی جدید عالمی تہذیب کو ترقی دینے میں قابل قدر حصہ لے سکے گا۔

اس طرح سے ان تمام باتوں کے باوجود ہم کو آخر میں یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ مدرسوں کی ترقی کے لیے وقت کے ماحول کے مطابق نئے اقدامات کیے جائیں اور جس طرح سے بھی ہو سکے دینی مدرسوں میں سائنس کو باقاعدہ داخل کیا جائے اور اس کے لیے سرتوڑ کوشش کی جائے اور باضابطہ ایک تنظیم کی تشکیل کی جائے اور وہ وقتاً فوقتاً مدرسوں کا معائنہ کرے۔ اس کے بعد جہاں جیسی ضرورت ہو ویسا مناسب قدم اُٹھائے۔ گورنمنٹ سے باضابطہ گرانٹ دلوائے اور اس کے لیے بھی باقاعدہ ٹریننگ اسکول کھلوائے، تب ہی ہمارے مدارس حقیقی معنی کے اعتبار سے شاہراہ ترقی کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کر سکتے ہیں۔

اب موجودہ حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی بھولی ہوئی تحقیقی روش کو اپنائیں اور مفید و بامقصد طریقے پر سائنس وصنعت کو فروغ دیں علمی وسائنسی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کریں اور مسلمان ماہرین فن سائنس دانوں کی فنی و علمی تحقیقات کا جائزہ لیں اور ان سے استفادہ کر کے تحقیق وجستجو اور تجربہ و مشاہدے کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

گیلیلیو کے وقت سے آج تک سائنسی نظریات میں اس معنی میں پختگی آئی ہے کہ سائنسداں اپنے حدود سے واقف ہو گئے ہیں انہوں نے یہ جان لیا ہے کہ بعض مسائل ایسے ہیں جو آج بھی ان کے دائرہ کار سے باہر ہیں اور مستقبل میں بھی یہی صورت رہے گی۔ سائنس کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنا دائرہ عمل ایک خاص قسم کی تحقیق تک محدود کر لیا ہے اور اس محدود دائرہ میں بھی آج کا سائنس داں جانتا ہے کہ وہ کہاں سے قیاس کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس میدان میں وہ کبھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔

— عبدالسلام

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

عبدالحق خان

خلافتِ آدمؑ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ زیورِ علم سے آراستہ ہوتے۔ پس خداوند قدوس نے علم سے آدمؑ کو فضیلت بخشی۔ ورنہ قادرِ مطلق جسے چاہتا اور جیسے چاہتا اپنا خلیفہ مقرر کر دیتا۔ فرشتوں کی فرماں برداری، عبادت و ریاضت دھری کی دھری رہ جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج کی سائنس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بخشی گئی سرفرازی کا کیا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں پہلے سائنس ہی سے پوچھا جائے کہ وہ کیا ہے؟

سائنس:

"کسی شے کے متعلق منظم اور مربوط مطالعے کو سائنس کہتے ہیں۔"

سائنس کی تعریف کی روشنی میں یہ بات آزادی سے کہی جا سکتی ہے کہ حضرت آدمؑ کو اوّلاً سائنس ہی پڑھائی گئی تھی۔ قرآن حکیم اس کا ثبوت ہے اور اسی علم اشیاء (مع ان کے افعال و خواص یعنی سائنس) کو سند بنا کر انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا اور بطور انعام جنت پیش کی گئی اور "معلم الملائکہ" جسے اپنی عبادت و ریاضت اور ناری ہونے پر ناز تھا، کو حکم ہوا کہ

"اس خاکی (سائنس داں) کی تعظیم کرو۔"

یہی رشتہ ہے سائنس اور انسان کی فضیلت اور سرفرازی کا۔

اسلام اور سائنس

اسلام اور سائنس میں کیا رشتہ ہے؟ ایک بنیادی سوال ہے۔ سائنس کا موضوع کائنات اور مقصد تلاشِ حق ہے جب کہ اسلام سچائی کا پیروکار ہے اور کائنات کو انسان کے تصرف میں دینے کا اعلان کرتا ہے۔ قرآن حکیم کائنات میں بکھری ہوئی خدا کی نشانیوں پر غور و فکر کی متعدد جگہوں پر دعوت دیتا ہے اور سائنسی نظریہ یہی ہے کہ کائنات کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اصولی طور پر دنیا کی ابتدا سے انتہا تک تمام عمل سائنسی ہے، لیکن اسے سمجھنے کے لیے سائنسی بصیرت چاہیے۔ پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ ہم تمام سائنس سے واقف ہی ہو جائیں۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور ایک مکمل اور سائنٹفک نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ نئی سائنسی دریافتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہی (یعنی اسلام) وہ مذہب ہے کہ سائنس جس کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یہ قربت اور یہ رشتہ بہت پرانا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی پکار کو دنیا کے ہر فرد تک پہنچانے کا وعدہ کیا، مگر ہم اس تکنیک سے ایک عرصے تک ناواقف تھے کہ یہ پکار سب تک کیسے پہنچتی رہے گی؟ جدید سائنس نے ہماری یہ پریشانی حل کر دی کہ

"آواز تباہ نہیں ہوتی، اس لیے وہ رہتی دنیا تک پھیلتی رہے گی اور ہم تک پہنچتی رہے گی خواہ ہم مکہ میں ہوں یا جاپان میں۔"

مدارس عربیہ میں سائنسی تعلیم کی ضرورت۔

قدرت کے کارخانے میں کوئی چیز بلاوجہ نہیں ہے۔ ہر شے کا کچھ نہ کچھ مقصد ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا [illegible]

لوازمات کو خدا نے انسان کے تصرف میں دے دیا ہے۔ اب انسان کو ان میں سے وہ چیزیں اپنانی ہیں جو اس کے لیے مفید ہیں اور ان سے بچنا ہے جو غیر مفید ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سائنس ہمارے لیے بہت ہی کارآمد چیز ہے تو ہم اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں! کسی مفید اور جائز چیز سے پہلو تہی کفران نعمت بھی ہو سکتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر لمحہ اور ہر پل ہمارے ساتھ ہے۔ مدارس عربیہ میں اس کی افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا پہلو

عربی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ کچھ ایسے گروہ بھی ہیں جو سائنس کی آڑ لے کر مذہب کے بنیادی عقاید پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب موجودہ سائنس کا زمانہ نہ تھا اور علمی دنیا میں یونانی فلسفہ کا سکہ رواں تھا، اس زمانے میں بھی بنیادی عقاید پر زور آزمائی کی گئی تھی اور ہتھیار یونانی فلسفے ہی کو بنایا گیا تھا۔ مگر اس وقت کے مسلم فلاسفہ نے ان حملوں کا جواب اسی ہتھیار سے دیا تھا مگر آج معاملہ فلسفۂ قدیم کا نہیں ہے، اسی وجہ سے ہم نئے فتنوں کا جواب پرانے فلسفہ سے نہیں دے سکتے۔ آج کے نام نہاد سائنسی اعتراضات مادہ پرستوں نے اٹھائے ہیں۔ مثلاً ان کا قول کہ

"مادہ لافانی ہے صرف اس کی شکل تبدیل ہوتی ہے"

وغیرہ۔ اب ان نئے حالات میں جب ہم مدارس سے پرانا فلسفہ پڑھ کر نکلتے ہیں تو ایک اجنبی دنیا کے مسائل ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ ہمارا پرانا فلسفہ اور جواب ہمارے ذہنوں میں دھرا رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ فلسفہ، مادیات کچھ اور ہی گل کھلائے بیٹھا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہم ان اعتراضات کا جواب دینے سے قاصر کیوں رہ جاتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ ہم نے سائنس چھوڑ دی۔ اسے نہیں پڑھا ورنہ اسی سے ہم ان اعتراضات کا جواب دے دیتے۔ جب [illegible] چھوٹی سی فوج لے کر ہندوستان جیسے عظیم ملک پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ ایک نیا اسلحہ "توپ خانہ" بھی تھا۔ ہندوستان کے بہادر اور جنگجو سپاہیوں کی بھاری جمعیت اس نئے توپ خانے کی تاب نہ لا سکی اور اپنے ہی ملک و سرزمین پر پسپا ہو گئی۔ "کیوں"؟ اس لیے کہ اس نے توپ دیکھی ہی نہ تھی اور نہ اس کے استعمال سے واقف تھے۔ ورنہ کیا ہندوستان میں لوہا اور بارود نہ تھا؟

بس معلوم ہوا کہ اگر سائنس کے ذریعے فتنے جگائے جا سکتے ہیں تو ان کا تدارک بھی اسی سائنس سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے سائنس کا پڑھنا ضروری ہے اور ہندوستان جیسے جمہوری نظام والے ملک میں تو اور بھی ضروری ہے کیوں کہ یہاں کی حکومت لامذہب ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے مذہب کی حفاظت خود کرنی ہوگی اور یہ بھی ضروری ہے کہ طریقہ کار جمہوری اور پرامن ہو۔

ہمارا اخلاقی فریضہ

اگر کسی عورت کو بازار میں آوارہ چھوڑ دیا جائے تو بہت زیادہ خطرہ ہے کہ وہ سماج کو گندہ کر دے اور بالاخانہ آباد کر دے۔ لیکن اگر ان برائیوں سے بچنا اور دوسروں کو بچانا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس عورت کو آوارہ چھوڑنے کے بجائے اس سے رشتہ قایم کر لیا جائے۔ اس طرح وہی عورت سماج و خاندان کے لیے اور اپنے لیے بھی باعث برکت و مسرت ہوگی۔ بالکل یہی حال سائنس کا بھی ہے۔ اگر اسے آوارہ چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسروں کو خراب و برباد کر دے گی اور اس کے خطرات تو قیامت ہی ہیں۔ لہذا ہمارا اور مدارس عربیہ کا یہ فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ آگے آئیں اور نسل انسانی کو سائنس کے خطرات سے محفوظ کرنے میں حصہ لیں۔

حصول رزق حلال

حصول رزق حلال میں سائنس ہماری مددگار ہے۔ ایک ایسے کام کا ذریعہ ہے جو عبادت ہے۔ "کیا آدمی کے لیے یہ باعث برکت و ثواب نہیں کہ وہ ایک نہر جاری کرے اور لوگ اس نہر سے سیراب ہوں؟"

حقوق العباد :

بیمار کی عیادت کرنا اخلاقی فریضہ ہے تو اس کی تیمارداری اور اس کا علاج کرنا اور علاج کے طریقے دریافت کرنا کیا ہے؟ کیا یہ کارِ ثواب نہیں ہے؟ کیا عوام کے لیے صاف ستھری سڑکیں بنانا اور ان پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں بنا دینا تاکہ لوگ آرام سے سفر کریں کارِ ثواب نہیں ہے؟ کیا لوگوں کے لیے روشنی کا انتظام کرنا ثواب نہیں ہے؟ یقیناً ایسے تمام کام باعث رحمت و ثواب ہیں جو عوام کی فلاح کے لیے کیے گئے ہوں اور ان سب کاموں میں سائنس کی تعلیم ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس چہار دیواری سے باہر نکل آئیں جو ہم نے اپنے گرد گھیر رکھی ہے

اسلامی مدارس ہی کیوں :

ملک کے بے شمار تعلیمی ادارے تو سائنس پڑھا ہی رہے ہیں تو پھر اسلامی مدارس میں اگر نہیں بھی پڑھائی جاتی تو کیا قباحت ہے؟ قباحت ہے اور بہت ہے۔ اس لیے کہ مسلم طلباء کا ایک بڑا حصہ عربی مدارس (اسلامی مدارس) میں زیر تعلیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عربی مدارس میں جہاں سائنس کی تعلیم دی جائے گی وہیں اسلامی اخلاقی تعلیمات بھی لازماً دی جائیں گی اور اس ماحول سے نکلنے والا طالب علم معاشرے کو وہ کچھ دے سکے گا جو معاشرے کا حق ہے۔ اس لیے کہ مدارس کے فضلاء سے ایمانداری، سچائی، دیانت داری، فرض شناسی، انصاف پسندی، خلوص اور انسانی ہمدردی کی زیادہ توقع ہے۔ جب کہ دوسرے اداروں سے اس کی کم ہی امید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مدارس کے فضلاء قوم و ملت کے بے روزگاری جیسے مشکل مسئلے کو حل کرنے میں مددگار ہوں گے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح وہ بچے بھی عربی مدارس کی طرف رجوع ہوں گے جو صرف سائنس نہ ہونے کی وجہ سے مدارس اور اسلامی تعلیم سے دور رہتے ہیں۔ اس طرح مسلمان پھر سے ایک ہی تعلیمی دھارے میں آ جائے گا اور یہ بہت ضروری ہے کہ دینی اور دنیاوی تعلیمی گروہوں کے درمیان ہر پل بڑھنے والی کھائی کو پاٹ دیا جائے، ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے ہی جائیں گے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہوگی کہ ہم اب بھی نہ جاگ اٹھیں۔ ویسے میں پُر امید ہوں اور خدائے بزرگ و برتر سے دعاگو ہوں کہ اس تحریک کو

کامیاب بنائے۔

آمین۔

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔"

(الحشر ۲۱)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت

محمد شریف خان

اس سے قبل کہ میں اس مضمون پر کوئی لب کشائی کروں، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری معلومات مدارس کی تعلیم کے سلسلے میں بہت محدود ہیں۔ مجھ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ میں کسی مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرتا اور اس سے مستفید ہوتا۔ میں نے اس مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی تحقیق کا نتیجہ بھی نہیں ہیں بلکہ کسی موضوع کے دوچار مضمون پڑھنے والے کی جو اہلیت کسی شخص کی ہوتی ہے وہی میری ہے۔ لہٰذا اگر میں اپنے اظہار خیال میں کوئی بنیادی غلطی کروں تو ایک مبتدی کی غلطی سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔

میں مدارس کے نصاب پر کچھ کہنے سے قبل یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ جو یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھاتے ہیں ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس نے ہمیشہ سے اور آزادی ہند کے بعد جو اسلام کی خدمت کی ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے اساتذہ نے جن قربانیوں کا ثبوت دیا ہے، یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے جو طلباء تیار کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، جب کہ ہم یونیورسٹیوں اور کالجوں سے جو طلباء تیار کر رہے ہیں ان پر اظہار خیال کرنے کی بھی میں ہمت نہیں کر سکتا۔

مگر حضرات نصاب تعلیم کے سلسلے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ دینی مدارس کے نصاب میں وقت کے تقاضوں اور زمانے کی ضرورت کی طرف ہمیشہ توجہ دی گئی ہے۔ عبرانی زبان جو دین اسلام کا حصہ نہیں مگر جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ اس کی ناواقفیت سے مسلمانوں کو فریب دیا جا سکتا ہے تو آنحضرت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا۔

ابتدا میں ہندوستان کے دینی مدارس کے نصاب کا مرکز فقہ اسلامی تھا۔ اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ یہاں کا انتظام اسلامی حکومت کی طرح ہوتا تھا اور شریعت محمدی کا قانون چلتا تھا اور زمان و مکان کی ضرورت نے فقہ اسلامی پر گہری نظر نصاب تعلیم کا جز بنا دیا۔

جب ہندوستان میں ایران کا اثر بڑھا تو ہمارے نصاب تعلیم میں فقہ اسلامی کے ساتھ اصول فقہ پر بھی زور دیا جانے لگا۔

مولانا علی میاں صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"جب ہندوستان میں ایک ہی حکومت تھی یعنی صرف مسلمان حکومت کر رہے تھے صرف خاندان بدلتے تھے خاندان غلاماں آیا، پھر تغلق آئے، لودھی آئے، پھر سوری آئے، پھر مغل آئے۔ تو جب تسلسل تھا اسلامی حکمرانی میں، اقتدار اعلیٰ مسلمان کا تھا۔ اقتدار اعلیٰ ایک تھا، اس کا دین ہی نہیں بلکہ مذہب فقہی بھی ایک تھا یعنی حنفی۔ آئین بھی ایک تھا یعنی شرع محمدیؐ، اس کی زبان ایک تھی یعنی فارسی اور مذہبی زبان عربی تھی، اور تہذیب بھی ایک تھی یعنی ایرانی، عربی یا ہندوستانی تہذیب کا آمیزہ۔ سب میں وحدت تھی اور تسلسل تھا اس وقت تو نصاب تعلیم سو سو برس میں بدلتا رہا اور جب نہ وہ آسمان بدل گئے اور نہ وہ حکمرانی رہی اور

نہ وہ تہذیب رہی اور نہ وہ آئین رہا اور مذہب
تزلزل میں پڑ گیا۔ اس وقت اسے ایسی مہر لگی کہ کوئی
اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ کیا اس کی بنا پر ایک مورخ
یہ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ ہمارے اسلاف ہم
سے زیادہ وسیع النظر تھے اور ہم سے زیادہ حقیقت
پسند اور زمانہ شناس تھے۔"

امام غزالی کے عہد تک فلسفہ، معقولات نصاب تعلیم کا جز نہیں تھے مگر مسلمانوں کے ایک گروہ نے ان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو دینی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ غیر دینی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے تعلیم یافتہ لوگوں میں بے راہ روی پیدا ہوئی اور مذہبی عقائد اور عمل سے غیر متعلق ہونے لگے۔ ان لوگوں نے فلسفہ اور منطق کی تعلیم کی بنیاد پر اسلامی عقاید پر حملے کرنے بھی شروع کر دیے۔

امام غزالی پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی جائے۔ تاکہ ان تعلیمات سے ان دلائل کو رد کیا جا سکے جو اس کے مطالعے کی بنیاد پر نئے تعلیم یافتہ لوگ پیش کر رہے تھے۔ اس لیے امام غزالیؒ نے ان مضامین کا خود مطالعہ کیا اور ایک کتاب مقاصد الفلاسفہ، لکھی، جس میں فلسفہ کو سادہ زبان میں سمجھایا گیا انہوں نے ایک اور کتاب تہافتہ الفلاسفہ لکھی جس میں منطق اور فلسفہ کی قلعی کھولی۔ اس طرح منطق اور فلسفہ نصاب تعلیم کا جزا اس پس منظر میں ہوئے، مگر ان کو نصاب میں ذیلی حیثیت تھی۔ فقہ اسلامی اور اصول فقہ اسلامی کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔

ہندوستان کے دینی مدارس کے نصاب میں فلسفہ کی کتابوں کو سکندر لودھی کے زمانے میں پہلی بار ملا عبداللہ تلنبی نے کیا۔ دوسرا اضافہ اکبر کے عہد میں مولانا فتح اللہ شیرازی نے کیا۔ تیسرا اضافہ ملا نظام الدین فرنگی محلی کے عہد میں اور اس سے فوراً بعد کے عہد میں ہوا۔

مولانا سید عبدالحی حسنی اپنے مشہور رسالے "نصاب درس اور اس کی تاریخ" میں فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں جو نصاب رائج ہے وہ درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے کیوں کہ درس نظامی میں منطق میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ بغیر غور و فکر کے خود بخود ہو گیا۔ غلام یحییٰ، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک اور بعض مقامات میں شرح سلم عبد العلی، عبد العلی، بحرالعلوم اور حاشیہ بر میر زاہد امور عامہ کہیں کہیں شرح سلم ملا مبین بھی۔"

یہ تاریخی ارتقا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ منطق اور فلسفہ جو خصوصی حالات اور ضرورت کے تحت نصاب میں شامل کیے گئے تھے ان کو اس وقت نصاب سے خارج ہو جانا چاہیے تھا۔ جب وہ حالات اور ضرورت نہ رہی مگر ایسا نہ ہوا، تو نصاب کی تبدیلی زمانے کی ضرورت اور تقاضوں کے ساتھ ہوتی رہی۔

مولانا سید رابع حسنی ندوی نے اپنے مضمون "نصاب تعلیم پر غور کیوں" میں لکھا ہے:

"اسلام پر اپنے نئے طریقے و انداز سے حملہ آور ہونے لگے۔ اس نے اپنے اس حملے میں اپنا اصل اصول لامذہبیت، معروضیت اور تاریخی استناد اور زندہ اسلوب بیان کو بنایا ہے۔ لہذا ہم کو زمانے کے اس بدلے ہوئے انداز کا لحاظ کرنا ہوگا۔ ورنہ ہماری مثال اس فوج کی مثال بن جائے گی جو صرف اس سمت پر ساری توجہ لگا دے جس سمت سے سابق میں حملہ ہوتا رہا ہے اور ادھر دشمن دوسری خالی سمت سے حملہ آور ہو کر تباہی مچا دے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا تبدیلیاں ہیں جو ہم کو اپنے نصاب میں کرنی ہیں۔ تاکہ وہ زمانہ اور حالات کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس میں موجودہ زمانے میں جو سب سے بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم غیر دینی مضامین کو نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ سائنس اور ریاضی کو شامل کر لیں۔

سائنس اور ریاضی کو آج کی تعلیم میں جو اہمیت حاصل ہے اس [illegible]
[illegible]

چکے ہیں۔ مجھ کو اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ سائنس اور ریاضی پڑھانے کا مقصد ہرگز ان کو ماہر ریاضیات یا سائنس داں بنانا نہیں ہے بلکہ ان طلباء کو سائنس اور ریاضی پڑھانے کے مندرجہ ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ جان دار اور بے جان چیزیں جو طلباء کے ماحول میں ہوں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی دل چسپی پیدا کرنا۔

۲۔ علت اور معلول کے تعلق میں یقین پیدا کرنا۔

۳۔ قدرتی قانون میں یقین پیدا کرنا۔

۴۔ ہماری زندگی میں جو سائنس کے اثرات پڑے ہیں، ان کی قدر دانی پیدا کرنا۔

۵۔ اس میں یقین پیدا کرنا کہ انسان سائنس کی معلومات سے اپنے ماحول کو متاثر کرسکتا ہے۔

۶۔ صحت مند زندگی گزارنے کی عادتیں پیدا کرنا۔

۷۔ بڑے سائنس دانوں کی زندگی اور کارناموں کی قدردانی کرنا۔

۸۔ مشاہدہ کی قوت بڑھانا۔

۹۔ حقائق کو جمع کرنا، تقسیم کرنا اور ان کی بنیاد پر اصول مرتب کرنا۔

۱۰۔ سائنس کے حقائق، اصولوں اور عمل کی عملی معلومات حاصل کرنا۔ تاکہ اپنے گرد کی دنیا کو سمجھ سکیں اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل کو حل کرسکیں۔

۱۱۔ طالب علموں کو یہ ذہن نشین کرانا کہ روزمرہ کی زندگی کے لیے ریاضی کی کیا اہمیت ہے اور اس ضرورت کے مطابق ریاضی کی تعلیم فراہم کرنا۔

۱۲۔ ریاضی کے ذریعے طلباء میں مسئلہ کی تفہیم، امکانی حلوں کا تعین، مختلف حلوں کی جانچ پڑتال اور ثبوت کی بنیاد پر صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

امید ہے کہ ہمارے مدارس کے ارباب حل و عقد اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

شاہراہ عمل سامنے آگئی
اور ضرورت ہے اب عزم کی ساتھیو
شیش محل میں سوتے رہے دیر تک
کچھ ضرورت ہے اب کام کی ساتھیو
عزم و ہمت کے سیلاب کے سامنے
راہ کے خار و خاشاک بہہ جائیں گے
کام جرأت سے تم نے اگر کچھ لیا
ریگ کے قصر و ایواں یہ ڈھ جائیں گے
لیکن احساس یہ بھی رہے ساتھیو
شاہد آرزو سے ابھی دور ہو
راہ میں اب بھی تاریکیاں ہیں بہت
لطف جب ہے یہ ظلمت بھی کافور ہو

بدقسمتی سے جو ترک برصغیر میں آئے، علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی وہ اپنی یادگاریں، مزار اور مقبرے تو چھوڑ گئے، مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں

—— عبدالسلام

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶ شمارہ ۵ (مئی ۸۷ء)

مدارس کے نصاب میں سائنس کی اہمیت

شبیر احمد خاں غوری

مدارس میں سائنس کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہماری تعلیمی روایات کا جزو لاینفک رہا ہے۔ مگر اس کی تفصیل سے بیشتر کچھ بنیادی حقیقتوں کی یاددہانی ضروری ہے۔

۱۔ سواد اعظم کا فیصلہ ہے کہ ہمیں ہر حالت میں اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنا ہے اور اس کی واحد ضمانت دین مبین کا اتباع ہے۔

۲۔ دین سے واقفیت یا علی الاقل اس کے فی الجملہ شعور کا ذریعہ صرف قدیم انداز کے دینی مدارس ہیں جو ہر طرح کے موانع اور دقتوں کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں۔

۳۔ مگر اس صورت حال کا زیادہ عرصے تک برقرار رہنا بیش از خوش فہمی نہیں ہے۔ اس کا تدارک وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جس سے اغماض و بے اعتنائی عربی مدارس ہی کو نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو بڑی مہنگی پڑے گی۔

۴۔ ان اداروں کو قومی چندوں یا حکومت کی مالی اعانت کے سہارے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ان میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہی ان کی بقا کا ضامن ہو سکتا ہے اور اس کی طرف اکابر ملت کو توجہ دینا ہے۔

اس قسم کی ایک کوشش ۱۹۴۶ء میں مولانا آزاد عربی کمیٹی نے کی تھی مگر اس میں غیر شعوری طور پر ایک بنیادی چوک ہو گئی جس کے نتیجے میں اس کمیٹی کی ساری کی ساری سعی مشکور

نشستند و گفتند و برخاستند

کا مصداق ثابت ہوئی۔ مقام شکر ہے کہ آج وہ حالات نہیں ہے۔ اس لیے پچھلی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے بچتے ہوئے نیا لائحہ عمل مرتب کرنا ہے اور ان مدارس میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اور اس کا ایک منصوبہ مرکز فروغ سائنس نے بنایا ہے، اس پر آپ کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مدارس میں سائنس ہمیشہ سے ہماری تعلیمی روایات کا جزو لاینفک رہا ہے۔ ہماری ان تعلیمی روایات کا آغاز اس دن ہوتا ہے جب کہ اس آیت کریمہ کا نزول ہوا تھا؛

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ

اس کے معنی ہیں:

[بے شک اللہ تعالی نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اس کی آیات کو تلاوت فرماتے ہیں، انہیں پاک بناتے ہیں اور انہیں کتاب (قرآن کریم) اور حکمت سکھاتے ہیں]

پھر از روئے فرمودات قرآنی؛

"ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا"

[جس کو حکمت ملی، اسے خیر کثیر عطا ہوئی]

حکمت ہی خیر کثیر یا زندگی کی قدر اعلیٰ ہے اور اسی لیے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت کو مومن کا متاع گم گشتہ بتایا ہے، جسے وہ جہاں ملے، دوسروں کے مقا

لینے کا زیادہ حق دار ہے:

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن، اینما وجدھا فھو احق بھا۔

سائنس کیا ہے، صرف قوائے فطرت کا منظم علم اور انھیں انسان و انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا اور یہی تسخیر کائنات ہے جس کے لیے قرآن کریم بار بار حوصلہ افزائی کرتا ہے:

"الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ وباطنۃ"

[کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور پوری کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں کھلی ہوئی اور چھپی ہوئی]

"اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون"

[اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے لیے دریا کو کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو (شکر ادا کرو)]

"وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون"

[اور مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب کچھ اپنی طرف سے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو غور و فکر کرتے ہیں]

اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے سائنس کے ساتھ اعتناء شروع کر دیا۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں ریاضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے دو اہم رکن ہیں، حساب اور ہندسہ اور دونوں کے ساتھ مسلمانوں کا اعتناء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے شروع ہو گیا تھا:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المال قایم ہوا۔ اس کی نگہداشت و تنظیم نیز متوفیوں کے ترکے کی سائنٹفک تقسیم کے لیے حساب میں تبحر و تمہر ضروری تھا۔ اسی لیے وہ بار بار مسلمانوں کو تاکید کیا کرتے

اذا لھوتم فالھوا بالرمی واذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض

[جب تم کھیلو تو تیر اندازی کے ذریعے نشانہ بازی کی مشق کیا کرو اور جب آپس میں بات چیت کیا کرو تو فرائض یعنی متوفیوں کے ورثاء کے حصوں کی تعین کے بارے میں گفتگو کیا کرو]

اور پھر اسی متوفیوں کے ترکے کی واقعی اور مفروضہ تقسیم کے نتیجے میں علم الجبر والمقابلہ کی بنیاد پڑی جس نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی کے یہاں ایک واضح اور منظم فن کی حیثیت حاصل کی۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے دوسرے درجے کی مساوات کو سائنٹفک انداز میں حل کیا اور پھر عمر خیام نے مخروطات کی مدد سے تیسرے درجے کی مساوات کو حل کیا اور کہتے ہیں کہ ابو الوفا نے چوتھے درجے کی مساوات کو حل کیا۔ مزید تفصیل اسلامی سائنس کے مورخ کا منصب ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کا زرخیز علاقہ فتح ہوا جسے انھوں نے مقررہ خراج کے بالعوض مفتوحین ہی کے پاس چھوڑ دیا۔ تشخیص خراج کے لیے زمین کی پیمائش کرائی گئی اور اسی مساحت نے مسلمانوں میں اقلیدس کی اصول الھندسہ سے واقفیت کا شوق پیدا کیا۔ اسی شوق کی تکمیل کے لیے دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے اپنے ہم عصر بادشاہ روم کو ریاضیات و طبیعیات کی کتابوں کو ترجمہ کرا کر بھیجنے کی فرمائش کی۔ انھیں کتابوں میں اقلیدس کی اصول الھندسہ بھی تھی جس کا بعد میں پہلے ہارون الرشید کے عہد میں اور پھر اس کے بیٹے مامون کے عہد میں حجاج بن یوسف بن مطر نے اس کتاب کا باقاعدہ عربی میں ترجمہ کیا۔

اور پھر مامون کے زمانے میں یہ علمی تحریک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی اور یونانی علم و حکمت کے جواہر پارے اونٹوں پر لد لد کر حریم خلافت میں آنے لگے، بقول مولانا حالی ؎

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے روم و یونان کے دفتر

لیکن فضلائے اسلام نے یونانیوں کی علمی و حکمی تصانیف کے ترجمے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خود مختلف علوم حکمیہ میں مستقل تحقیقات کیں، جہاں تک ان کے پیش رو نہیں پہنچ سکے تھے، پہنچنے کی کوشش کی اور اکثر حالات میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

اور پھر علمی ترقی کی یہ تحریک پوری آب و تاب کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ امام غزالی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانے سے فلسفہ جو نام ہے جملہ علوم حکمیہ کے مجموعے کا مدارس کے نصاب کا جزء بننا شروع ہوا۔ انھوں نے ریاضیات کی خصوصیت سے اور منطق اور طبیعیات کی عام طور سے تعریف فرمائی ہے۔ ہاں وہ یونانی فلسفہ کی صرف اس کوہ کندن و کاہ بر آوردن قیاس آرائی سے بیزار تھے جس کا نام مابعد الطبیعیات ہے مگر اس بیزاری میں وہ منفرد نہیں ہیں۔

کیں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند

عہد حاضر بھی اس گناہ بے لذت سے بیزار ہے اور اسی بیزاری نے اوگسٹ کومٹے کے یہاں Logical Positivism کی شکل اختیار کی۔

اس علمی تحریک کی پیش رفت کو فتنۂ تاتار بھی نہ روک سکا۔ جس زمانے میں خون آشام تاتاری ایران و وسط ایشیا میں آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے تھے، محقق طوسی علوم حکمیہ کی تہذیب و ترقی میں معروف تھے۔ انہوں نے نہ صرف ابن سینائی فلسفہ کی تجدید کی، بلکہ اسلامی سائنس کو بھی ایک نیا موڑ دیا۔ انہوں نے اصول اقلیدس اور کتاب المجسطی کے نئے ایڈیشن مرتب کیے جنہوں نے سابق کے تراجم و شروح کو گوشۂ خمول میں ڈھکیل دیا۔ علم ہیئت میں ان کے تذکرہ فی الھیئۃ، زیج ایلخانی اور بست باب" نے بعد کے ماہرین کے لیے نمونۂ عمل کا کام دیا۔ اسی زمانے سے نصاب پر معقولات چھانے لگا جس نے محقق دوانی کے یہاں اپنی آخری شکل اختیار کی۔ مگر یہ معقولات محض شرح اشارات و محاکمات اور حواشی قدیمہ و جدیدہ ہی کا نام نہ تھا بلکہ ان میں وہ علوم بھی مشمول تھے، جنہیں جدید اصطلاح میں سائنس کا نام دیا جاتا ہے یعنی ریاضیات و طبیعیات۔

اور یہی سرمایہ لے کر محقق دوانی کے تلامذہ و مستفیدین ہندوستان آئے۔ ان میں اہم نام امیر فتح اللہ شیرازی کا ہے۔ انہیں کے مشورے سے اکبر نے نئی تعلیمی پالیسی وضع کی کہ

وحکم شد کہ الٰہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نکنند"

امیر فتح اللہ شیرازی کے تعلیمی مشن کی تکمیل عہد شاہجہانی میں ملا مرشد شیرازی نے کی۔ اسی زمانے سے شیخ بہاء الدین عاملی کی "تشریح الافلاک" اور "خلاصۃ الحساب" کا ریاضی و ہیئت کی تعلیم میں رواج ہوا۔ ان کے مستفیدین میں استاد احمد معمار کے خاندان بالخصوص عطاء اللہ رشدی، لطف اللہ مہندس، امام الدین ریاضی اور خیر اللہ مہندس کا خصوصی مقام ہے۔

یہ ہے ایک مختصر جائزہ اسلام میں سائنس کی ترقی کا۔ لیکن اصل مسئلہ عربی مدارس میں سائنس کی تعلیم کا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسلامی سماج میں دو طرح کی درس گاہیں رہی ہوں۔ ایک دینی علوم کی تدریس کے لیے دوسری سائنسی علوم کے لیے۔ آخر تو راویان حدیث صرف حدیث ہی کی روایت کرتے تھے اور شیخ بوعلی سینا رات کی تنہائی میں صرف فلسفہ اور طب ہی پڑھاتا تھا۔ میں عرض کرتا ہوں امام غزالی سے پہلے کا تو علم نہیں مگر ان کے زمانے ہی سے فلسفہ مدارس کے نصاب میں داخل ہوا۔ انہوں نے اس موضوع پر مقاصد الفلاسفہ لکھی اور منطق کو اصول فقہ میں داخل کیا۔ اس بات کی شہادتوں کی کمی نہیں کہ ایک ہی چھت کے نیچے دونوں طرح کے علوم پڑھائے جاتے تھے، صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔

چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ لکھی۔ وہ اس کے اندر دیوان کتابت کے کتاب اور دبیروں کے لیے علم الحساب میں تبحر و تمہر حاصل کرنے کے واسطے دو کتابوں کی سفارش کرتا ہے: تکملہ ابو منصور بغدادی کی اور صد باب سجزی کی۔ سجزی، احمد بن عبد الجلیل صف اوّل کا ریاضی داں تھا اس نے یہ علوم بشمول علم حساب کے اپنے زمانے کے سائنس دانوں ہی سے حاصل کیے ہوں گے۔ لیکن ابو منصور عبد القاہر بغدادی الفرق بین الفرق اور اصول الدین کے مصنف کٹر قسم کے متعلمین الدین عالم تھے۔ فلاسفہ کے حلقوں میں جا کر ان کا یہ علم حاصل کرنا متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے یہ علم جن میں دستگاہ عالی کی شہادت نظامی عروضی سمرقندی دیتا ہے، انہیں اساتذہ سے حاصل کیا ہوگا جن سے فقہ و اصول فقہ اور کلام و اصول الدین کی تعلیم پائی تھی۔ دوسری شہادت خود اپنے ہی ملک کے ایک عظیم عبقری امیر فتح اللہ شیرازی کے بارے میں ہے۔ ان کے تحصیل علم کی تفصیل ابوالفضل نے بدیں طور دی ہے۔

" در دانش گاہ خواجہ جلال الدین محمود و مولانا کمال الدین

ر والی دعوائی احمد کرد خرد ان خنسا سائی اندوخت "
، سائنسی کمالات کی تفصیل ابو الفضل کے معاصر نظام الدین بخشی
ت اکبری" میں اس طرح دی ہے:-
، علوم غریبہ از نیرنجات و طلسمات نیز بہرہ مند بود،
انچہ آسیای ہوا را بر ساخت کہ خود حرکت می کرد و
رد می شد و آئینہ ساخت کہ از دور و نزدیک اشکال
رببہ مرئی می گشت و بیک چرخ دوازدہ بندوق سر ی
ند "

ہے امیر فتح اللہ شیرازی ایک با وجاہت خاندان سادات کے
غ تھے۔ وہ نہ بڑھئی تھے نہ لوہار جو انھوں نے صنعتیں گی
سلسلہ کی دستکاری کسی نجار یا آہن گر سے سیکھی ہو۔ انہوں
پڑھا اور جو کچھ سیکھا، خواجہ جمال الدین محمود، مولانا کمال الدین
مولانا احمد کرد اور امیر غیاث الدین منصور ہی کے حلقۂ درس
ا اور ان بزرگوں میں سے کبھی نہ کوئی پیشہ ور بڑھئی تھا نہ لوہار۔
، اپنے حلقہ ہائے درس میں جہاں وجود و ماہیت کے نازک مسائل
ثنات کے مسئلہ یا باری تعالیٰ کے علت موجدہ اور علت موجودہ
ایق و غوامض سے بحث ہوتی تھی۔ ریاضی و سائنس کے وہ اہم
اخذ کیے جن کی عملی ٹکنالوجی صنعت و کاریگری اور ٹکنالوجی
، و دستگاہ عالی بخشتی تھی اور یہ صرف انہیں بزرگوں کے حلقہ ہائے
تدریس کی خصوصیت نہ تھی، وقت کا عام دستور ہی یہ تھا کہ جن
ہوں میں تفسیر و حدیث کے افادات، فقہ و اصول فقہ کے نکات
لسفہ کے دقائق اور ریاضی و ہیئت کے مشاکل و غوامض کی تعلیم
، سائنس و ٹیکنالوجی کے اصول میں بھی طلبا تبحر و تمہر حاصل کرتے

یہ صورت حال اٹھارہویں صدی کے آخر تک انیسویں صدی کے
ت برقرار رہی مگر جب برطانوی استعمار ملک پر مسلط ہو گیا تو
حال منقلب ہو گئی۔ نئے آقاؤں کو محکوموں کے ثقافتی ماضی سے
لچسپی نہ تھی۔ وہ لا اس کی یاد بھی ان کے ذہن سے نسیاً منسیا
چاہتے تھے کہ محکوم ملت ماضی کا احساس انہیں اس غلامی کا

جوا اتار پھینکنے کا حوصلہ نہ بخش دے۔ اس لیے خاموشی سے مشرقیوں
کے قدیم علوم و فنون کی ناکارگی و ہیچ مقداری کا پروپیگنڈا کیا گیا اور اس
شدت سے کیا گیا کہ عامی و عالم سبھی اس طلسم فرنگ میں پھنستے چلے گئے۔ میں
اپنی معروض کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال دوں گا۔ یہ ایک ایسے شریف
انسان کا ذکر ہے جو نہ صرف اپنے علم و فضل بلکہ اپنی شرافت نفس اور
ثقاہت و سنجیدگی میں بھی مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ میرا اشارہ مولوی
ذکاء اللہ خاں کی طرف ہے جو سینٹرل میور کالج الہ آباد میں استاد تھے
وہ ریاضی کے ماہر تھے اور اس فن کی متعدد انگریزی کتابوں کا اردو میں
ترجمہ کیا تھا۔ حال ہی میں مجھے ان کی دو تین کتابوں کی زیارت کا موقع ملا
جو مخروطات یا Conic Section پر تھیں۔ ان کتابوں کے مصنف
انگریز ہیں اور جن لوگوں کے نام ان کتابوں میں آئے ہیں وہ انگریز یا یورپین
ہیں، گویا یہی فضلاء اس علم کے ٹھیکیدار ہیں۔ الہ آباد سے انگلینڈ اور یورپ
ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے۔ لکھنؤ صرف ۱۲۶ میل اور جونپور صرف
۴۰ میل ہے۔ لکھنؤ میں خان تفضل حسین خاں کا نبوغ ہوا اور جونپور
میں مولوی غلام حسین جونپوری کا۔ یہ دونوں فاضل مشرق میں فن
مخروطات کے آخری دانائے راز تھے جس کی شہادت جامع بہادر خانی سے
ملتی ہے۔ مگر مولوی ذکاء اللہ ہزاروں میل دور بسنے والے یورپین
سے متاثر ہیں لیکن اپنے پڑوس میں رہنے والے خاں تفضل حسین خاں
اور مولوی غلام حسین جونپوری کو درخور اعتنا تک نہیں سمجھتے۔ جن میں سے
موخر الذکر غالباً ان کے ہم عصر تھے اور مقدم الذکر نے پچھلی صدی کے
آغاز میں وفات پائی تھی۔ یہ کرشمہ تھا استعماری طاقت کی دسیسہ کاری
کا جس میں بڑے بڑے عقلائے روزگار بھی پھنسے بغیر نہ رہ سکے —
والی اللہ المشتکی۔

ایسے حوصلہ شکن حالات میں مدارس کے اندر سائنس کی تعلیم اپنی
سابق آب و تاب کے ساتھ باقی رہ سکتی تھی۔ لہذا بہی خواہان ملت نے جو
جو قدیم ثقافتی ورثہ کی بقا و تحفظ کے خواہاں تھے، بقول "ما لا یدرک
کلہ، لا یترک کلہ" اس ورثے میں سے جو کچھ بھی بچ سکے، بچانے کی
تدبیر کی۔ اس میں سے علوم دینیہ کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی اس
لیے اس کے تحفظ و بقا کو اولیت دی گئی۔ رہے علوم عقلیہ تو ان کے ساتھ

سابقہ کے اہتمام کو ملحوظ نہ رکھا جاسکا۔ پھر دنیوی ترقی کے فقدان کی وجہ سے ان مدارس میں اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک طلباء کے لیے بھی کوئی دلکشی نہیں رہی۔ نتیجہ یہی ہوا جس کے حالات متقاضی تھے اور سائنسی علوم کے ساتھ بے اعتنائی بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاضی و ہیئت میں اس صدی کی ابتدا تک متعدد کتابیں داخل درس تھیں، قوشجیہ، سبع شداد، تصریح، باب تشریح الافلاک، شرح چغمینی بست باب۔ زیادہ شوقین طالب علم شرح تذکرہ و تحریر المجسطی نیز رسائل متوسطات بھی پڑھتے تھے۔ لیکن آخر میں صرف تصریح اور شرح چغمینی رہ گئیں موخر الذکر کاغذ پر اور مقدم الذکر امتحانی ضرورت کے طفیل میں۔ کیونکہ یہ کتاب اتر پردیش کے امتحان عالم کے نصاب میں مقرر ہے۔

یہ صورت حال تھی کہ امید کی ایک کرن چمکی۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت یوپی نے امداد پانے والے عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کے لیے مولانا آزاد کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی۔ مگر ۱۹۴۲ء تک اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس اثنا میں مولانا ضیاء الحسن علوی انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی کا انتقال ہوگیا اور اُن کی جگہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو میں نے اس جگہ کا چارج لیا۔ میرا نظریہ تھا اور آج بھی یہی نظریہ ہے کہ جب تک ان مدارس کے طلبا کے سامنے کوئی روشن مستقبل نہ ہو ان کی بقا ناممکن ہے لہٰذا میرا مطالبہ تھا کہ نصاب میں جو کچھ تبدیلی کی جائے ہم اسے نافذ کرنے کے لیے تیار ہیں مگر اس کے بعد ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوں جو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا کو ہوتی ہیں۔ انہیں بھی سول سروس کے مقابلے کے امتحانات میں شرکت کا حق حاصل ہو، نیز اعلیٰ ٹیکنیکی اداروں یعنی میڈیکل اور انجینئرنگ کی درس گاہوں میں بھی داخلہ لینے کا حق حاصل ہو۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں آگرہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ صاحب زادہ لیاقت علی خاں صدر تھے۔ میری [illegible] سنتے ہی آگ بگولہ ہوگئے مگر میں اڑا رہا۔ آخر میں جھلا کر کہا کہ لیجیے [illegible] صاحب کہہ رہے ہیں۔ ایک جسٹس صاحب نے سنا تو فرمایا یعنی [illegible] وزکات پر گزر کرنے والے ہمارے بچوں کے ساتھ آئی سی [illegible] کے امتحانات میں شرکت کریں گے۔ یہ تو اغیار کا ردعمل تھا۔ اپنوں نے [illegible] کہ حکومت عربی مدارس کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے علی گڑھ

سے ایک ملحد داڑھی منڈے کو بلا کر رجسٹرار بنا دیا ہے کہ جب ان مدارس کے طلبا اس اونچے معیار پر پاس نہ ہوسکیں تو ناکارگی کا الزام لگا کر ان کی امداد بند کر دی جائے اور اس طرح یہ مدارس خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

خدا کا شکر ہے اگلے سال مرکز میں کانگریس منسٹری بن گئی۔ مولانا آزاد وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور ان کے زیر صدارت مولانا آزاد عربک کمیٹی کام کرنے لگی۔ مجھ سے کسی کو کوئی عناد نہ تھا، اس لیے مجھے بھی اس کا ممبر بنا دیا گیا۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۴۶ء کو مولانا کے دولت کدہ پر کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا۔ مولانا نے میری تجویز کو سنا تو فوراً تیار ہوگئے اور میں طلبا کے لیے جس مستقبل کا [illegible] تھا، انھوں نے اس کا وعدہ کیا۔ مجھے آج بھی یقین واثق ہے کہ اگر حالات [illegible] رخ اختیار نہ کرتے جو انہوں نے اختیار کیا تو مولانا اس وعدہ کو ضرور [illegible] کراتے۔ بہرحال اس امید کے ساتھ میں نصاب سازی میں لگ گیا۔ ابتدائی درجات کا نصاب پہلے ہی بنا چکا تھا۔ اعلیٰ درجات کا نصاب اس انداز [illegible] بنایا کہ علوم دینیہ کے ساتھ جو عربی مدارس کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں علوم جدیدہ بھی بشمول سائنس اور ریاضی کے جن کا معیار یونیورسٹی [illegible] گریجویٹ درجات کے برابر ہو، باقاعدہ پڑھائے جائیں۔ ظاہر ہے [illegible] کی تکمیل کے لیے طلبا کے روشن مستقبل کے ساتھ ساتھ مادی وسائل کا سوال بھی تھا اور اللہ تعالیٰ مولانا کی روح پر فتوح کو اپنی رحمت [illegible] نوازے انہوں نے اس کا بھی یقین دلا دیا۔ ان کا خیال مدارس [illegible] UP-Grade کرنے کے علاوہ ایک عربی یونیورسٹی قایم کرنے [illegible] تھا اور اس کے نصاب کے لیے اس کے ابتدائی اور [illegible] Training [illegible] اخراجات کا بجٹ بھی انہوں نے ہم لوگوں سے بنوا لیا اور یہی امید [illegible] دن دور نہیں جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن اعلان نے نہ صرف ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، عربی مدارس کی قسمت کا بھی بالواسطہ فیصلہ کر دیا [illegible] خوابوں کا محل منہدم ہوگیا۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ مولانا آزاد اب بھی [illegible] وہ اب بھی پنڈت جی کے دست راست تھے مگر خود انہیں بھی اپنی حیثیت [illegible] زیادہ احساس تھا۔ ۹ر نومبر ۱۹۴۸ء کو کمیٹی کا آخری اجلاس ہوا [illegible] کارروائی کے [illegible]

اور پھر آج تک یہ نہ چل سکا کہ وہ کالعدمات آخر کے کہاں
ہنگا آمیز فوٹو کے خشیوں کے جگہ جگہ پر چھونے کی داستان سنانے کا
ہسپتال کے [illegible] کی بہت مشکل نہیں ہے بلکہ انہیں اور
سط سے آپ حضرات کو بتا ئے فاعتبروا یا اولی الابصار ۔
ود ہے کہ ہماری ناکامی کے اسباب وعلل کا تجزیہ کرکے بیا لائحہ عمل اس
بنائیں کہ اس میں ان غلطیوں اور چھوٹی آشناؤں کا اعادہ نہ ہونے پائے
غیر شعوری طور پر سرزد ہوئی تھیں۔ ویسے بھی

یہ کیا ضرور ہے کہ ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

ہے جو اپنی کوتاہیوں کا تجزیہ کیا ہے وہ آپ کے سامنے اس امید سے
ہاہے کہ

من نکردم شما حذر بکنید

سے پہلی چیز یہ ہے کہ مولانا آزاد کمیٹی کی تاسیس مثبت سے زیادہ
ت کا نتیجہ تھی۔ لہذا جب ان منفی جذبات کی تشفی کا امکان نہ رہا تو پھر
لیے کمیٹی میں کوئی دلکشی نہیں رہ گئی اور پھر اس سرد مہری کی تلافی نئے
کے خلوص اور گرم جوشی سے بھی نہ ہو سکی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کے مقابلے میں مرکز فروغ سائنس کے منتظمین کے پیش نظر کسی کے خلاف
ی تو درکنار، ذاتی منفعت کے حصول کا بھی خیال نہیں ہے۔ صرف
مہ کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر اصلاح حال کی مخلصانہ جدوجہد ہے
اہم بازو ہیں جو اصولاً اس کی ملی بقا کا ضامن ہے، خود اپنے بل بوتے
رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

دوسرا سبب وہ بلند مقاصد تھے جو مولانا آزاد کمیٹی کے نئے کارکن
میٹی میں شامل ہوئے تھے۔ مگر وہ کوئی شیخ چلی کا منصوبہ نہ تھا بلکہ

بہت بلند اوکر نزد خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

تھا اور پھر اس بلند ہمتی کی نصرت وقت کے مدبر اعظم یعنی
اسے بھی [illegible] کی بجا اس کے بعد کار۔

فلسفے کے لیے اپنی فعال حمایت کا یقین بھی دلایا تھا لیکن حالات و واقعات پر کسی
کا زور نہیں چلتا؛ نحن فی التفکیر واللہ فی التقدیر۔ حالات سے مجبور
کروشلی تو نصاب سازی کے بلند مقاصد بیش از

این خیال است و محال است و جنون

نہیں رہ گئے لہذا ناکامی ناگزیر تھی۔

مگر مرکز فروغ سائنس کے پیش نظر اتنے بلند مطالبے نہیں ہیں۔ وہ تو
صرف اتنا چاہتا ہے کہ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کا مستقبل

کار ملا فی سبیل اللہ فساد

کے تنگ دائرے میں مقید ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ سماج کے لیے Para-
sites اور طفیلیے بننے کے بجائے دوسرے ہم وطنوں کی طرح زندگی کی جدوجہد میں اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور اگر ہمت و حوصلہ ہو تو اپنے کام میں ترقی
کرکے اپنے اور اپنے متعلقین کے معیار زندگی کو بلند سے بلند تر بنا سکیں۔

تیسرا سبب ہمرہان مردہ نفس کا عدم تعاون تھا۔ نصاب اور اس کے
خوش آئند مقاصد کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ضرور ملا دیے مگر
اس باب میں کہ مجوزہ نصاب کہاں تک قابل عمل ہے، کسی نے دقت نظر کے
ساتھ تبصرہ نہیں کیا۔ اعلیٰ درجات کے نصاب کے نفاذ کا تو موقع ہی نہیں آیا
ابتدائی درجات کا نصاب البتہ بورڈ آف عربک اینڈ پرشین انگزامینیشنز اصولی
طور پر پہلے ہی نافذ کر چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ جن مدرسین کو اسے پڑھانے
کا فرض تفویض کیا گیا تھا وہ باقاعدہ تجربہ کرکے بتائیں کہ

۱۔ اس کے پڑھانے میں کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔
۲۔ طالب علموں پر [illegible] Load قابل برداشت ہے یا متوسط الاذہان طلبا کی برداشت سے باہر ہے، اور
۳۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ علوم جدیدہ اور سائنس پڑھانے کی وجہ میں عربی اور دین کی تعلیم جو ان مدارس کا مقصد اولین ہے نظر سے اوجھل ہو گئی یا متعلقہ مدرسین کے تساہل و کاہلی کی وجہ سے سائنس کی تعلیم محض کے ستو بن کر رہ گئی ہو۔ مگر آخر میں پتہ چلا کہ منتظمین مدارس تو درکنار صدر مدرسین نے بھی اس بات پر نظر نہیں رکھی کہ ابتدائی درجات میں، مدارس عربیہ کے لیے منظور شدہ نصاب پڑھایا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد میں کس طرح جانتا

باقی صفحہ غالب ۸۴ پر

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

احمد جمال

گذشتہ دو صدیوں کا اگر ہم ایک سرسری جائزہ لیں تو ہمیں یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے علوم نے جس تیز رفتاری سے ترقی کی ہے دوسرے علوم اس کا ساتھ نہ دے سکے اور اس راہ میں بہت پیچھے رہ گئے۔ یہاں یہ ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ گذشتہ ۵۰ سالوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے علوم نے دنیا میں ایسا انقلاب برپا کر دیا، جس نے انسانی، حیوانی، نباتاتی دنیا کے ہر گوشے کو متاثر کیا ہے۔ سائنسی تحقیق اور اس سے برآمد ہونے والے اصول و قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں جو آسانیاں اور آسائشیں میسر ہیں، آج سے قبل کا انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سائنسی علم درحقیقت اشیاء کی ہیئت و کیفیت، ان کے اندر پوشیدہ طبعی و کیمیاوی قوتوں اور ان کی اصل حقیقت و دیگر طبعی و کیمیائی عوامل کی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کو احساس و ادراک، فہم و فراست، تدبر و تعقل کی نعمتوں سے غالباً اس لیے نوازا ہے کہ وہ مناظر فطرت میں نہاں اسرار کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو برہنہ کر دے۔ کائنات کی پُراسراریت کو سمجھنے والے شخص کے لیے خدا کی برگزیدگی کی شناخت انتہائی آسان اور اس کے قادر مطلق ہونے پر یقین مستحکم ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ دین اسلام کی آمد کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان جاہلیت سے نکل کر خود کو حقائق کی روشنی سے منور کرنے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور سائنسی علوم ایک ہی مقصد کے حصول کی دو راہیں ہیں۔ علم کی تحصیل کے لیے اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سارے مناظر قدرت اور دیگر عوامل کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے اشارہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ علم کا حصول اسلام کی منشا کے عین مطابق ہے۔ علم کسی فرد، ادارے یا قوم کی میراث نہیں

ہے۔ یہ زندگی کی روشن آگ ہے اور ظاہر ہے کہ زندگی کسی مقید یا
کیفیت کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ کسی فرد یا ادارے کو خالصتاً علم
حصول کے لیے پابند کر دینا نہ صرف یہ کہ منشائے قدرت سے میل
بلکہ آزاد انسان کے حقوق کی پامالی کے قریب لے جاتا ہے۔

علوم سائنس نے نہ صرف یہ کہ کائنات کے اسرار و
وا کیا بلکہ توہم پرستی اور جہالت کو بھی کاری ضرب لگائی۔
کی جڑیں انسانی زندگی میں اس طرح گھر کر چکی تھیں کہ حقیقت کے سا
پر بھی لوگ اسے بے یقینی سے دیکھتے تھے۔ اس ضمن میں یہ بیان
ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض بیماریوں کو ایک عرصے تک مافوق ا
اسباب کا نتیجہ قرار دیا جاتا رہا اور وباؤں کا پھیلنا ایک
سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان سے بچنے کے واسطے لوگ خدا کے حضور
پیش کرتے تھے۔ سائنس قربانیوں، کے دافع بلا ہونے کی منک
یہ ایک علیحدہ بحث ہو سکتی ہے مگر سائنس نے ہی بیماریوں کے
شناخت کی۔ توہم پرستی اور جہالت کی ایک جھلک آج بھ
میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً فلپائن میں بعض مسلم گھرانوں کے
میں مبتلا کسی شخص کو اس کی بدکرداری پر محمول کیا جاتا ہے۔
پھونک اور دیگر غیر منطقی طریقوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ ہ
ہندوستان میں آج بھی چیچک کا باعث دیوتاؤں کا قہر سمجھا
اسی لیے اس کی پوجا ہوتی ہے۔ عرصۂ دراز تک جذام، طا
کو قہر الٰہی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے مگر آج کے دور میں
مہلک بیماریوں کی اصل حقیقت کا پتہ لگا کر ان کا تدارک

کے طریقے دریافت کر کے ان پر قابو پالیا ہے اور وہ پرانے فرسودہ خیالات جن کے تحت بیماریوں کو قہر الٰہی یا دیوتاؤں کا غم و غصہ تصور کیا جاتا تھا باطل قرار ہو چکے ہیں۔ مذہبی عقیدے کی رُو سے تمام بیماری و آزاری خدا کی جانب سے ہوتی ہے اور اسے ہمارے تمام افعال کا بخوبی علم بھی ہے۔ لہٰذا تنبیہاً یا امتحان کی غرض سے وہ ہم کو بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سائنس کو اس حقیقت سے بحث ہے ہی نہیں بلکہ وہ تو بیماریوں کے اسباب اور ان کی حقیقت کی شناخت کرتا ہے۔ اسباب بھی یقیناً خدا کے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں۔

سائنسی علوم نے جہاں توہم پرستی اور جہالت کا خاتمہ کیا ہے وہیں طب، ٹیکنالوجی، زراعت اور دیگر صنعتوں میں بھی تہلکہ مچا دیا۔ ذرا غور فرمائیں کہ نیوٹن کو پھل کے زمین پر ٹپک پڑنے کے ایک معمولی سے عمل میں قانون فطرت کے غیر معمولی اصول پوشیدہ نظر آئے جو آج کی خلائی سائنس کی بنیاد ہیں۔ یہاں یہ اندازہ لگانا بالکل مشکل نہیں ہے کہ اگر نیوٹن بھی سیب کو فوراً اٹھا کر کھا لیتا تو آج کی خلائی سائنس کا کیا حشر ہوتا۔
الیگزنڈر فلیمنگ نے ایک تجربے کے دوران اتفاقاً پنسلین کی دریافت کی جس کی وجہ سے دنیائے طب میں زبردست انقلاب آیا۔ اس اتفاق کو الیگزنڈر فلیمنگ نے اگر کوئی توجہ نہ دی ہوتی تو آج بہت سارے امراض لاعلاج رہ جاتے۔

زراعت کے میدان میں دنیا نے آج جو ترقی کی ہے کہ اس کی وجہ سے اناج پھلوں اور دیگر تغذیے کی بہتر اقسام ہم کو میسر ہیں۔ یہ ممکن نہ ہوتا اگر ایک معمولی راہب جسے آج دنیا مینڈل کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ایک خانقاہ میں رہ کر مٹر کے پودوں میں ان اصول وراثت کا مشاہدہ نہ کرتا جن کے تحت والدین کی صفات اولاد میں منتقل ہوتی ہیں۔ خانقاہ میں رہ کر ایک معمولی راہب قوانین فطرت کی شناخت کر کے وہ اصول مرتب کر سکتا ہے جن پر کہ آج کی زراعتی تحقیق اور نسل کشی کا دار و مدار ہے اور ساتھ ہی اپنے دین کو بھی اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے تو پھر مسلمانوں کے لیے کیوں کر سائنسی علوم کی تحصیل ناپسندیدہ شئے قرار دی جا سکتی ہے۔ ہمیں بے شک اپنے دین پر آنچ نہیں آنے دینی چاہیے مگر حصول سائنس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ

سائنسی علوم کی مدد سے ہم اپنے دین کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں۔ آج کے ترقی کے دور میں اسلام پر تنقید اور اعتراض اٹھانے والوں کی تعداد روز افزوں ہے اور وہ اپنے اعتراض سائنس کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے طلباء پیدا کرنے ہوں گے جو اچھے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے سائنس داں بھی کہلائیں۔ مسلمانوں میں سائنسی علوم سے گریز کا سبب غالباً یہ رہا ہے کہ غیر مذہبی سائنس دانوں نے جو سائنسی نظریات پیش کیے ان میں لادینی عنصر شامل رہا۔

علاوہ ازیں سائنسی علوم کی جیسے جیسے ترقی ہو رہی ہے، کائنات کے مختلف گوشے منور ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر آج بھی لاتعداد ایسے اندھیرے گوشے موجود ہیں جن کو سائنس منور کرنے سے اب تک قاصر رہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ان تاریک گوشوں کو ہمارے ہونہار مسلم طلبا روشن کر دیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنسی علوم کی ترویج مسلمان طلباء میں عام ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ ابتدا دینی مدارس سے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان گھرانوں کے بچے بالعموم اپنی تعلیمی ابتدا مکاتب و مدارس سے کرتے ہیں۔ ان کے اندر سائنسی شعور پیدا کرنے کا کام دینی مدارس سے شروع ہونا چاہیے تاکہ ان کو سائنسی فکر کی راہیں ابتدا سے مل سکیں اور سائنسی و دینی علوم ایک دوسرے کو جلا دیتے ہوئے شانہ بشانہ پروان چڑھیں۔ اس کے بعد عصری علوم کی تحصیل ان طلبا کے لیے کچھ زیادہ دشوار نہ رہے گی۔

نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے
اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے۔ سب اپنے
اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔
* ——— سورہ یٰسین

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

عبدالعلی فاروقی

مدارس دینیہ کے سلسلے میں اس حقیقت کو تسلیم کرکے آگے بڑھیے کہ
ملت اسلامیہ کے لیے ان مدارس کی اہمیت آج بھی وہی ہے جو جسم انسانی کے لیے
ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے۔
یہ بحث اپنی جگہ الگ ہے کہ ہمارے دینی مدارس عصری تقاضوں کی
طرف پوری توجہ کر رہے ہیں یا نہیں؟ اور اگر اس سلسلے میں ان کی طرف سے کچھ
کوتاہی ہو رہی ہے تو اسے کیوں کر دور کیا جا سکتا ہے؟ تاہم مدارس کی ٹھوس
خدمات اور ہندوستانی مسلمانوں کی خواندگی کے سلسلے میں اسلامی مکاتب و
مدارس کے اہم و موثر رول سے کسی صاحب بصیرت کو مجال انکار نہیں ہو سکتی
اس جگہ ایک تلخ حقیقت کا اظہار کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ مغربی تہذیب
اور مغربی افکار و نظریات سے بے تحاشا مرعوبیت نے ہمارے بہت سے
اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور اچھے دماغوں کو نہ صرف تہذیب و معاشرت بلکہ علم کے
میدان میں بھی "قدامت" اور "جدیدیت" کی غیر فطری تقسیم قبول کر لینے
پر مجبور کر دیا اور وہ "ملّائے قوم" اور "بے فیض دینی مدارس" کی
کڑی تنقید بلکہ تنقیص کو ہی خدمت علم اور خدمت قوم قرار دینے لگے۔
ردّ عمل کے طور پر دوسری طرف سے ان ناقدین کے افکار و اعمال
کو نمونے میں پیش کرتے ہوئے نہ صرف ان کی معاشرت بلکہ ان کے ذریعے پیش
کیے جانے والے علم کو بھی مجموعۂ زیغ و ضلال قرار دے کر اسے ناقابل اعتنا
گردانا گیا۔
نتیجہ میں "علوم قدیمہ" اور "علوم جدیدہ" کی غیر منطقی و غیر فطری اصطلاحیں
اپنے ہمہ گیر اثرات کے ساتھ وجود میں آئیں اور مدارس دینیہ نے اپنے کو علوم
قدیمہ کے محافظ کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا

اور علوم کی اس تاریخی نہیں بلکہ اصطلاحی "قدامت و جدیدیت" کی تقس
ایک عالم دین کے مکمل عالم اور ایک مسلمان کے سچا مسلمان بننے کی راہ م
دشواریاں پیدا کر دیں۔
سائنس چوں کہ اس اصطلاحی تقسیم کے لحاظ سے جدیدیت کے خانہ
علم قرار پایا اس لیے ہمارے بیشتر دینی مدارس بلکہ تمام ہی کلیدی مدا
میں اس کی باقاعدہ تعلیم غیر ضروری اور عبث قرار پائی۔
اس پس منظر میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذمہ داروں کی ط
اس "فرض کفایہ" کی ادائیگی پر ہم سب کو شکر گزار ہونا چاہیے۔ ا
نے نہ صرف مسلمانان ہند میں سائنس کے فروغ پر توجہ دی بلکہ اس کی
راہ بھی تلاش کر لی کہ اصطلاحی قدامت و جدیدیت کی غیر فطری تقسیم
کرکے مدارس دینیہ کے ذریعہ سائنسی تعلیم کو ترویج دیا جائے۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کی تعلیم مدارس کے مق
کی راہ میں مانع ہے یا اس کے لیے ممد و معاون؟ تو اس سلسلے م
اور مدارس کے مقصد تاسیس دونوں کی جانکاری ضروری۔
راقم الحروف ان دونوں چیزوں کے سلسلے میں اپنے نتیجہ
کو چند نپے تلے الفاظ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ مدارس کا
خدا آشنا اور خود آگاہ افراد تیار کرنا ہے اور سائنس انف
میں غور و فکر کرکے ان کو ان کے مقصد تخلیق پر لگا دینے کا نا
اگر اصولی طور پر اس تشریح کو قبول کر لیا جائے تو ہم
کو تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ سائنس کی تعلیم مدارس کے
کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف [illegible]

خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیتے ہوئے اپنی
تمام مخلوق کو اس اشرف المخلوقات کی خدمت اور تابع داری کا پابند کیا۔ گویا
تقسیم یوں ہوئی کہ انسان کا مقصدِ تخلیق خالق کی رضا جوئی اور کائنات کی
دیگر مخلوقات کا مقصدِ تخلیق انسان کی خدمت اور اسے نفع پہنچانا۔

اس تقسیم کے لحاظ سے خالق کی معرفت اور اس کی رضا جوئی کا حصول
ہو یا مخلوق سے خدمت لینے کا معاملہ، دونوں ہی کے لیے انسان پر لازم
ہوگا کہ وہ کائنات کی اشیاء کی حقیقت اور ان کے فطری اعمال کی صحیح طور
پر واقفیت حاصل کرے۔ چنانچہ خود خالق کائنات کا ارشاد ہے کہ

إن في خلق السموات والأرض واختلاف
الليل والنهار لآيات لأولي الألباب
الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى
جنوبهم ويتفكرون في خلق السموات
والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلا

(آل عمران ١٩٠ ـ ١٩١)

[بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دنوں کے
اختلافات میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں، وہ جو اللہ
کا ذکر کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور لیٹے اور غور و فکر کرتے
ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں (تو پکار اُٹھتے ہیں
کہ) اے ہمارے پروردگار تم نے یہ سب بے کار نہیں
پیدا کیا]۔

مندرجہ بالا آیات میں حق تعالیٰ نے دو باتیں فرمائیں۔ اوّل تو یہ کہ
زمین و آسمان کی پیدائش میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ دوسرے
یہ کہ جو لوگ زمین و آسمان کے مقصدِ تخلیق پر غور و فکر کر کے ان کے منافع
تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں وہی عقل مند ہیں۔

زمین کی شکل کیا ہے، وہ کروی ہے، چپٹی ہے یا کسی اور شکل میں
اس میں حرکت ہے یا سکون؟ وہ ہموار ہے یا ناہموار؟ اور پھر وہ
ایسی کیوں ہے ویسی کیوں نہیں ہے؟ اگر زمین جیسی ہے ویسی نہ ہوتی تو کیا ہوتا
زمین کے بنانے والے نے اس میں اپنی کاریگری کا کس کس طرح ثبوت دیا
ہے؟ اسی طرح آسمانوں کی شکلیں، ان کی حرکت و سکون کے احوال اور
بے ستون کی اس سارے عالم پر محیط چھت میں اس کے کاریگر کی کیا کیا کاریگری
نظر آتی ہیں؟ اور یہ زمین و آسمان انسان کے نفع و ضرر میں کیا کردار ادا
کرسکتے ہیں اور ان کو کیوں کر انسان اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے؟۔
یہی تمام چیزیں تو سائنس کا موضوع ہیں اور ان ہی چیزوں پر غور و فکر کرنے
والوں کو خالق دوجہاں نے عقل مند قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف
کی ہے۔

پھر کیا یہ سمجھنا بے جا ہوگا کہ آج دنیا جسے سائنس کے نام سے
جانتی ہے اس علم کا حاصل کرنا منشائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کے سب
سے زیادہ حق دار مسلمان ہیں؟

خالق کائنات انسان کو اپنی طرف سے دی جانے والی نعمتوں کا شمار
کراتے ہوئے فرماتا ہے۔

الله الذي خلق السموات والأرض وأنزل
من السماء ماء فأخرج به من الثمرات رزقا
لكم وسخر لكم الفلك لتجري في البحر بأمره و
سخر لكم الأنهار وسخر لكم الشمس والقمر
دائبين وسخر لكم الليل والنهار وآتاكم
من كل ما سألتموه وإن تعدوا نعمة الله
لا تحصوها (ابراہیم۔ ٣٢-٣٣-٣٤)

[اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور
آسمان سے پانی اُتارا پھر اس سے پھل برآمد کیے جو تمہارا
رزق ہیں اور تمہارے لیے سمندر میں چلنے والی کشتی کو
اپنے حکم سے مسخر کیا اور تمہارے لیے نہریں مسخر کیں اور
تمہارے لیے گردش کرنے والے سورج و چاند کو مسخر کیا
اور تمہارے لیے رات و دن کو مسخر کیا اور تم نے اس
سے جو کچھ مانگا اس نے تم کو دیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں
کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

ان آیات میں زمین و آسمان، چاند و سورج۔ پانی اور اس کے فیض
ہونے والی کاشت، سمندری سواریاں، رات و دن اور پانی بھری نہریں
ان تمام چیزوں کے بارے میں اللہ کے خالق نے فیصلہ سنایا کہ یہ نہ صرف

انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں بلکہ خود خالق نے ان پر انسان کو دسترس بھی عطا فرما دی ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان کو اپنے منافع کے لیے استعمال کرے۔ یہی نہیں بلکہ خالق کائنات نے ان اہم ترین نعمتوں کا ذکر کرکے یہ بھی فرمایا کہ تمہاری ضرورت کی ہر مانگ کو ہم نے پورا کر دیا ہے اور تم کو اتنی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے کہ تم ان کو شمار بھی نہیں کر سکتے۔

اب غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ اس چاہ و محبت کے ساتھ اپنے انعامات کی بارش کرنے والے کا تقاضا کیا ہوگا؟

کیا وہ یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ اس کی اس بیش بہا نعمتوں کو انسان استعمال کرے؟ اور ان کے نفع و ضرر کے تمام پہلوؤں سے صحیح طور پر واقفیت حاصل کرکے ان کا ٹھیک ٹھیک مصرف دریافت کرے؟

کسی بادشاہ کی طرف سے کسی شخص کی قدر افزائی میں بطور انعام کوئی خوب صورت سی موٹر دے دی جائے اور وہ انعام پانے والا شخص اس موٹر کو لاکر اپنے دروازے پر کھڑی کرے، موٹر کھڑی رہے وہ بتاتا رہے کہ یہ موٹر ہم کو بادشاہ کی طرف سے انعام میں ملی ہے۔ اس کو کبھی استعمال نہ کرے، اس پر کبھی خود سواری نہ کرے۔ اور بادشاہ کو علم ہو کہ موٹر کے پرزے کھڑے کھڑے زنگ آلود ہو گئے، اس کے ٹائر گل سڑ گئے اور وہ یوں ہی رائیگاں اور بے کار گئی۔ تو سوچیے کہ بادشاہ کے دل پر کیا گزرے گی؟ اسے کس قدر ملال ہوگا اور بندے کے ہاتھ میں اور رکھنے پر اس کو کس قدر کوفت ہوگی؟

کچھ اسی قسم کا معاملہ انسان اور اس کو اس کے خالق کی طرف سے دی جانے والی نعمتوں کا ہے کہ اگر انسان ان نعمتوں کا مصرف دریافت کرکے انہیں اپنے کام میں نہ لائے تو نعمتیں عطا کرنے والے خالق کو اس سے کسی طرح خوشی نہیں ہو سکتی!

ہمارے دینی مدارس کا بنیادی مقصد جب خداشناسی اور خود شناسی ہے تو اُن کو منشائے ربانی سمجھ کر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور خالق کائنات کے شکر گزار ہونے کا سامان بہم پہنچانے کی طرف بھی پوری طرح متوجہ ہونا چاہیے۔

راقم الحروف کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مدارس دینیہ میں جن علوم کی تعلیم دی جا رہی ہے، ان کی افادیت و اہمیت پر کچھ کمی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان ہی علوم کو بنیاد مان کر ان کا تقاضا و مطالبہ ہی سائنس کو سمجھتے ہوئے سائنسی تعلیم کے رواج کو مدارس میں ضروری خیال کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہمارے مدارس میں جن علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان میں اصل علوم قرآن و حدیث ہی ہیں۔ باقی تمام علوم کی تعلیم قرآن و حدیث کی فہم حاصل کرنے یا ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں قرآن کو سمجھنے اور اس کے مطالبوں کو پورا کرنے دونوں ہی کاموں کے لیے سائنس کی تعلیم ضروری ہے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ نے جا بجا قرآن مجید میں اپنی مختلف قسم کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف ان پر غور و فکر کا حکم فرمایا ہے بلکہ انہیں عالم انسانیت پر اپنا احسان عظیم قرار دیا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ احسان شناسی اور اس کے نتیجے میں شکر کے جذبات اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب انعامات خداوندی کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کا علم ہو اور جس علم کے ذریعے ان چیزوں کی جانکاری حاصل ہوتی ہے، اسی کا نام سائنس رکھا ہے۔

یہ بھی ایک المیہ ہے یا دوسرے لفظوں میں ہماری غفلت کوشی کا نتیجہ ہے کہ سائنس کے ذریعے مذہب کے ابطال کی کوشش کی جانے لگی ہیں اور مذہبی حلقوں میں سائنسی تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ جانے لگا ہے کہ سائنس مذہب کی مخالف ہے، حالاں کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے اور سائنسی تحقیقات جوں جوں آگے بڑھ رہی ہیں مذہب اسلام کی حقانیت اسی قدر واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر انسانی تخلیق کے تدریجی مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خالق انسان نے ارشاد فرمایا:

ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحما ثم انشأنٰه خلقا آخر (مومنون ۱۴)۔

[پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں بنا دیا۔]

میڈیکل سائنس نے قرآن کی بیان کردہ اس تدریجی تخلیق کی مکمل طور پر
تصدیق کرتے ہوئے پوری تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے کہ ماں کے پیٹ
میں بچے کو ان ہی مراحل سے گزرنا ہوتا ہے جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے
اور یقیناً یہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی ایک سچی اور واضح دلیل ہے۔

آج کے دور میں خدا کی نعمت لوہے کا استعمال کس قدر عام ہے
اسے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لوہے کے خالق نے اس کے نفع و
ضرر دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع
للناس (الحدید - ۲۵)

[اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں شدید خطرہ بھی ہے اور
لوگوں کے لیے بہت سے فوائد بھی ہیں]

سائنس نے لوہے کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے کھول کر رکھ دیا
اور آج دنیا کے سامنے یہ بات آشکارا ہو چکی ہے کہ لوہے سے زیادہ خطرناک
اور اس سے زیادہ مفید کوئی دوسری دھات نہیں ہے۔ اس کی خطرناکی یا
اس کی نافعیت اس کے طریق استعمال پر منحصر ہے۔

یہ اور اس جیسی بہت سی دوسری آیات قرآنی کی موجودگی میں کسی کا
یہ کہنا کہ سائنس مذہب کی مخالف ہے کتنی کھلی دھاندلی اور ہمارا اس پر
اعتبار کر لینا کتنی بڑی نادانی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ہوا جیسی نعمت کا ذکر کرتے
ہوئے اس کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

اللہ الذی یرسل الریح فتثیر سحابا فیبسطہ
فی السماء کیف یشاء ویجعلہ کسفا فتری الودق
یخرج من خلٰلہ فاذا اصاب بہ من یشاء من
عبادہ اذا ھم یستبشرون (الروم - ۴۸)

[اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ بادلوں کو ابھارتی
ہیں۔ پھر اس کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور
تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے مینہ
نکلنے لگتا ہے پھر وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اسے
برسا دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں]

ہوا اور بارش کے تعلق کو حق تعالیٰ نے کس خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے
مگر افسوس یہ ہے کہ اس تعلق کی مکمل تشریح ہمارے مدارس میں صرف اس
وجہ سے نہیں کی جا سکتی ہے کہ اس کے لیے سائنس کا علم ہونا ضروری ہے۔ بس
کیا قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ کی تشریح اور خداوند قدوس کی ایک عظیم اور
ہر جگہ دستیاب نعمت "ہوا" کی حقیقت کو جاننے کے لیے بھی ہم کو سائنس کی
تعلیم نہ حاصل کرنا چاہیے؟ کیا ہم کو اس بات کا علم نہ ہونا چاہیے کہ ہوا میں چراغ
بجھ کیوں جاتا ہے اور آگ بھڑک کیوں اٹھتی ہے؟

پانی خداوند قدوس کی کتنی وافر اور انسانی زندگی کی بقا کے لیے کس
قدر ضروری نعمت ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا

وجعلنا من الماء کل شیء حی (انبیاء ۳۰)

[اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو پیدا کیا]

سائنس نے ہم کو بتایا کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن ان دو قسموں کی گیسوں
کا مرکب ہے اور یہ دونوں گیسیں اپنی اپنی جگہ انتہائی خطرناک ہیں بلکہ مہلک
ہیں۔ مگر خداوند قادر نے ان دونوں گیسوں کو پانی میں اس طرح جمع فرما دیا
کہ پانی میں ۲ حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہوتی ہے اور اس مقدار
سے جو محلول تیار ہوتا ہے وہ نہ صرف حیات بخش اور لازمۂ حیات ہوتا ہے
بلکہ بفرمان خداوندی بنیاد حیات ہوتا ہے۔

پانی جیسی منفعت بخش چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہائیڈروجن اور
آکسیجن کی مقررہ مقداروں میں ترکیب ہی ضروری ہے۔ اگر اس ترکیب سے
رتی برابر انحراف کیا گیا تو پانی نہیں بلکہ زہر ہلاہل دستیاب ہوگا۔

پانی پینے کو تو سب ہی پیتے ہیں لیکن جو پانی کی اصل حقیقت اور خداوندی
ترکیب کو جان کر پیے گا تو کیا وہ بے ساختہ تبارک اللہ احسن الخالقین
نہ پکار اٹھے گا؟

ہمارے مدارس میں جن علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے وہ دو قسم کے
ہیں۔ ایک علوم عالیہ یعنی مقصدی علوم، دوسرے علوم آلیہ یعنی وہ علم جو مقصدی
علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اگر علوم آلیہ میں سے منطق اور فلسفۂ قدیم
کی تعلیم ہمارے مدارس میں صرف اس وجہ سے ہو سکتی ہے کہ کلامی مسائل میں
ان علوم سے واقفیت ضروری ہے اور معقولی مسلمات کے ذریعے دینی احکام کو
ثابت کرنے سے ضعیف پرستوں کو تسکین ہوتی ہے اور وہ منزل تسلیم سے آشنا

ہونے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ فلسفہ جدیدہ یعنی سائنس کی بھی تعلیم ہمارے مدارس میں نہ ہو جس کے ذریعے بے شمار فتنوں اور پندارِ علم میں گرفتار لوگوں کی زباں بندی تو ہو ہی سکتی ہے، خالق کائنات کے تخلیقی اسرار اور حکمتوں پہ اطلاع، ایمان میں جلا اور یقین میں زیادتی کا سبب بھی بنے گی۔

مدارس میں سائنس کی تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟ اس پہ ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے۔

موجودہ دور میں سائنس کی افادیت و اہمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس کارگہ عالم میں امن و جنگ، دوستی و دشمنی، سروری و نکبت، امامت و اقتدا اور علم و جہالت جیسی متضاد کیفیتوں و حالتوں کا رہنا ہی منشائے خداوندی ہے جس کی طرف خلّاق عالم نے واضح طور پر یوں ارشاد فرمایا ہے۔

تلک الایام نداولہا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

[یہ دن ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں]۔

لوگوں پر ان حالتوں کے طاری ہونے میں سائنس کا جو رول ہے، اس کا آسانی کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قہرِ خداوندی کے مستحق اور وجودِ خداوندی کے منکر لوگ، خدا آشنائی اور خدا پرستی کے دعوے دار لوگوں کے سردار صرف اسی علم سائنس کے ذریعے بنے ہوئے ہیں۔

پھر کیا نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ خدا اپنے اس وعدے سے پھر گیا ہے کہ

وَلا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (آل عمران ۱۳۹)

[اور نہ تم غمگین ہو اور نہ رنجیدہ، تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو]۔

ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! ——— پھر سعودی عرب ہو یا پاکستان، شام ہو یا اردن، ایران ہو یا عراق، ان سب کا خدا بیزار روس یا خدا ناشناس امریکہ سے لو لگانا اور اعلانیہ یا خفیہ طور پر ان کی بالادستی کو تسلیم کرنا کیا اس کے سوا کسی دوسرے سبب سے ہے کہ یہ اپنے کو مومن کامل ظاہر کرنے کے باوجود خالق کائنات کے اشارات کو مکمل طور پہ سمجھنے سے قاصر و عاجز ہی ہیں؟ اور اسی لیے یہ خدا کے مطلوب وہ مومن نہیں ہیں جن کو سربلند اور غالب کرنے کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔

خدا نے اپنی کائنات میں غور و فکر کرنے اور اپنی خلاقی و صناعی کی حکمتوں کا سراغ لگانے کو تقاضائے عقل و ایمان قرار دیا ہے اور یہ بالکل مسلم حقیقت ہے کہ جو لوگ خدا شناسی کے لیے نکلتے ہیں انہیں ہی خود شناسی کے تجربات سے بھی گزرنا ہوتا ہے۔

پھر جو لوگ خدا شناسی اور خود شناسی کے لیے کوشاں نہ ہوں ان کو یہ حق کہاں سے مل سکتا ہے کہ وہ خدا سے اس کی نصرت کا وعدہ پورا کرنے کا مطالبہ کرسکیں؟

اس عالم رنگ و بہار میں مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک [illegible] یہ کہ وہ خدا کے مطلوب بندۂ مومن بن کر اور کائنات خداوندی میں بکھری ہوئی اشیاء کو اپنا تابع فرمان بنا کر طاغوتی طاقتوں سے اپنے غلبہ کو [illegible] کرائیں اور خدا کے وعدۂ نصرت کی عملی تفسیر بن کر خدا بیزار اور خدا نا آ[illegible] طاقتوں کو اپنے نقوش قدم پہ چلنے پر مجبور کر دیں۔

دوسرے یہ کہ وہ فطرت کے اشاروں کو نظر انداز کر کے سائنسی ا[illegible] اختراعات کو حیرت کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنے پر اکتفا کر[illegible] ——— اور حاکم کے بجائے محکوم، امام کے بجائے مقتدی اور متبوع کے ب[illegible] تابع بنے رہنے کو گوارہ کرلیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سائنس بھی دیگر علوم کی طرح ایک علم ہے او[illegible] بلا شبہ مومن ہی کی میراث ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان سائنس جیسے اہم[illegible] حصول کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہوں جب کہ ان کے لیے پیغمبر اعظم صلی اللہ [illegible] وسلم کا یہ صاف اور تاکیدی ارشاد موجود ہے کہ

اطلبوا العلم من المہد الی اللحد

[علم کو ماں کی گود سے قبر کی منزل تک طلب کرتے رہو]

چوں کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہمارے مدارس نے جن حفاظت کا ذمہ لیا ہے وہ مخالفت کے ہزار طوفانوں کے باوجود [illegible] جس کے لیے ہمارے آزاد ہندوستان میں اردو زبان کو بطور [illegible] کیا جاسکتا ہے کہ وعدہ خلافیوں اور حوصلہ شکنیوں ہی نہیں بلکہ زبان اور اردو کلچر کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کی منظم کوششوں کے

اگر اردو زبان اور اردو تہذیب آج بھی زندہ ہے تو بلا شبہ یہ دینی مکاتب اور دینی مدارس ہی کا کارنامہ ہے۔

اس لیے ہم اس بات کی امید ہی نہیں رکھتے بلکہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمارے دینی مدارس سائنس کو ترویج دینے کا بیڑا اٹھالیں تو آئندہ چند سالوں ہی میں اس ملک کا نقشہ بدلا ہوا نظر آئے گا اور ایک مرتبہ پھر بوعلی سینا، فخرالدین رازی، شعرانی اور البیرونی جیسے لوگ دنیائے سائنس کی قیادت و امامت کرتے ہوئے نظر آئیں گے اور ایسا کیوں نہ ہو — قیادت و امامت تو مسلمانوں ہی کے لیے مقدر ہے۔

آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کچھ لائق استناد اور قابل احترام بزرگوں سے منسوب ایسے واقعات سننے کو ملتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں نے دینی مدارس میں "علوم جدیدہ" کی تعلیم کی زور دار مخالفت کی ہے۔ چنانچہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے منسوب ایک واقعہ راقم الحروف کے کانوں میں بھی پڑا ہے کہ ایک مرتبہ دار العلوم دیوبند میں انگریزی زبان کی تعلیم کی تحریک بعض دوسرے اکابر کی طرف سے ہوئی تھی تو اسے حضرت گنگوہیؒ نے سختی کے ساتھ یہ کہہ کر رد فرما دیا تھا کہ "ہمارے دینی مدارس کے قیام کا مقصد ہی دوسرا ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے لیے بہت سے دوسرے ادارے موجود ہیں، پھر مدارس دینیہ کو اس کے لیے کیوں استعمال کیا جائے"۔

اس قسم کے واقعات کو بطور سند پیش کر کے بعض ارباب مدارس یہ عذر کر سکتے ہیں کہ اپنے اسلاف کی روش سے ہٹ کر ہم فائدہ کی امید سے زیادہ نقصان کے خطرات سے دوچار ہوں گے۔ اس لیے فراست کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی خطرہ نہ مول لیا جائے۔

تو ان کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ اگر اسلاف کی اتباع کا یہی مطلب ہوتا تو دار العلوم دیوبند میں انگریزی زبان کی تعلیم کا رواج ہرگز نہ ہوتا جب کہ وہاں ابتدائی سطح ہی کی سہی انگریزی اور سائنس دونوں چیزوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ ہوں یا دیگر اسلاف کرامؒ ان سب ہی نے مدارس میں "علوم جدیدہ" کی تعلیم کی مخالفت صرف اسی بنیاد پر کی ہے کہ ان علوم کو دنیا طلبی کا وسیلہ بنایا جائے۔ چنانچہ جیسا میں نے سنا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے دور میں دار العلوم دیوبند کے نصا تعلیم میں انگریزی کی شمولیت کی تحریک اس بنیاد پر ہوئی تھی کہ ایک والی ریا نے اپنی ریاست میں فضلائے دار العلوم کو اچھی ملازمتیں دینے کی پیشکش کر ہوئے یہ شرط رکھ دی تھی کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب فضلائے دارا انگریزی زبان سے ناواقفیت کی کمی پوری کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کا اس پیشکش کے جواب میں انگر تعلیم کی مخالفت میں اتنا سخت رویہ اختیار کرنا صرف اسی لیے تھا کہ مدارس تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کا بنیادی مقصد دنیا طلبی نہیں ہوا کرتا۔

راقم الحروف نے اپنے اس مقالے میں جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم حصول دنیا کے لیے نہیں بلکہ کائنات خداو کے اسرار و حکم پر مطلع ہونے، خدا کی دعوتِ غور و فکر کو قبول کرنے آیات قرآنی میں بیان فرمودہ قدرت کی حیرت انگیز صناعی کا ادراک حا کرنے اور خدا کے مطلوب بندۂ مومن بن کر کائنات پر اپنا قبضہ جما کرنے کے لیے ضروری ہے۔

اس لیے اگر ہمارے بڑے مدارس اپنے نصاب تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت سے سائنس کی تعلیم کو بھی شامل کر لیں تو ان سے وابستہ چھوٹے مدارس بھی اپنے طلباء کو سائنس کی تعلیم دی پر مجبور ہوں گے اور پھر ان شاء اللہ اس کے ایسے خوش گوار نتا برآمد ہوں گے جن کی افادیت سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔

> دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں
> ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا
> ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش
> کریں۔
>
> *—— سر سیدؒ

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

عبدالحمید رحمانی

فروغ سائنس کے لیے کوشاں اس مرکز میں یہ مضمون پیش کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم لفظ "سائنس" اور لفظ "ٹیکنالوجی" کے مفہوم کو اپنے ذہن میں تازہ کرلیں۔

سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ علم کے ہیں۔ مشاہدات و تجربات کی بنا پر حاصل ہونے والے علم کو سائنس کہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی یونانی کے دو الفاظ ٹیکنی (Teckne) اور لوگوس (Logos) سے مرکب ہے۔ ٹیکنی کے معنیٰ: آرٹ، کرافٹ اور لوگوس کے معنیٰ تقریر کے ہیں۔ سترہویں صدی میں ٹیکنالوجی صرف آرٹ کی بحث کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ علی الاطلاق چیزوں کی بناوٹ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ دورِ حاضر میں اسے مشین اور اوزار بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بنجمن فرینکلن کا قول ہے کہ "انسان" اوزار بنانے والا حیوان ہے۔

انیسویں صدی عیسوی سے سائنس کا زریں دور شروع ہوا اور سائنس نے پوری کامیابی کے ساتھ علم طبعیات، ریاضیات، کیمیا اور حیاتیات کے فنی (تھیوری) اور عملی (پریکٹیکل) میدان میں ترقی کی لیکن سائنس و ٹکنالوجی کے موجودہ محیر العقول ترقی و عروج میں ماضی کے مسلم علماء کی کامیاب جد وجہد کا بہت بڑا حصہ ہے۔

دینی مدارس اور سائنس کی تعلیم کے زیر عنوان اس کانفرنس میں اظہار خیال کے لیے میں نے جو موضوع پسند کیا ہے، وہ ہے "مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت"

یہ موضوع مرکز فروغ سائنس کی جانب سے موصولہ جس اطلاع نامہ میں درج ہے۔ اس میں تمہید کے طور پر چند جملے لکھے گئے ہیں۔ ان میں یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر درج کی گئی ہے کہ "یہ دور سائنس کا ہے۔ آج جس انسانی گروہ کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی ہے، وہی ترقی یافتہ اور بالادست ہے اور جس نے خود کو اس سے دور رکھا وہ عموماً پسماندہ اور سرنگوں ہے"

اس جملے میں دو باتوں کو مسلّمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۔ یہ دور سائنس کا ہے

۲۔ سائنس سے دور رہنے والا پسماندہ اور سرنگوں ہے۔

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔ پہلی بات کے بارے میں میرا یہ سوال ہے کہ کیا یہ دور سچ مچ سائنس ہی کا ہے؟ واضح رہے کہ یہ سوال کرتے وقت میرے ذہن میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا ہے۔ وہ دنیا جس کا ایک انتہائی ترقی یافتہ حصہ اپنی جملہ سائنسی فتوحات کے بعد کچھ ایسے گوشے تلاش کرنے لگا ہے جو اسے سائنسی فتوحات سے امان دے سکیں۔ کیوں کہ دنیا کے اس انتہائی ترقی یافتہ حصے کو اس کی اپنی ہی سائنسی ترقی نے اپنا قیدی بنالیا ہے اور اسی قید کی شدت نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی انسانی سرشت کے تحفظ کے لیے کوئی گوشہ امان تلاش کرے، تاکہ اس کے اندر جو ہر انسانیت پھر سے انگڑائی لے سکے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے متلاشی قدم جن سمتوں میں سفر کر رہے ہیں، ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنہیں عرف عام میں "روحانی" یا مذہبی عقیدہ کہا جاتا ہے۔

مرکز فروغ سائنس کی جانب سے لکھی گئی تمہید کی جو دوسری بات ہم مسلمانوں کے لیے ایک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے وہ یہ ہے۔

"سائنس سے دور رہنے والا پسماندہ اور سرنگوں ہے"۔

جملے کی اس ساخت کی وجہ یہ ہے کہ مرکز فروغ سائنس نے اپنی بات کا اصل مخاطب ہندوستان کے مسلمانوں کو بنایا ہے۔ اس وضاحت کی شاید ضرورت نہیں کہ کانفرنس کے لیے وضع کیے گئے موضوع میں "دینی مدارس" کے الفاظ اولین حیثیت رکھتے ہیں۔ ان گزارشات کی روشنی میں دیکھا جائے تو میرے موضوع کی صورت یہ بنتی ہے "کیا دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت ہے"؟

میں اپنے ہی قایم کردہ سوال کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ یہ دور اب صرف سائنس کا نہیں ہے اور مسلمان کے نزدیک پسماندہ و سرنگوں ہونے کا تصور وہ نہیں جو دین کے دائرہ سے باہر والوں کا ہوتا ہے اور آج بھی ہے[۱]۔

سائنٹفک سوسائٹی کے بانی سرسیّد احمد خاںؒ کی قایم کردہ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس نے یقیناً کچھ سوچ سمجھ کر ہی اس میدان عمل میں قدم رکھا ہوگا اور امید ہے کہ ان کی نیت بھی نیک ہی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ مرکز کے ذمہ دار اپنے قدم آگے بڑھائیں، انہیں چند باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ا۔ وہ اپنے اس خیال پر نظرثانی فرمائیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی خواندگی بیشتر دینی مدارس کی مرہون منت ہے (کاش ایسا ہوتا) دینی مدارس کے منتظم تو اس بات کے شاکی ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد دینی تعلیم کو نظرانداز کر رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مرکز فروغ سائنس نے اس خیال کے اظہار میں دینی مدارس و مکاتب میں کوئی فرق روا نہیں رکھا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہندوستان میں مکاتب کی تعداد کافی ہے۔ بالخصوص قصبوں اور دیہاتوں میں جہاں ناظرہ قرآن اور اردو اسلامیات کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ رہے دینی مدارس جہاں علوم قرآن و علوم حدیث اور عقاید و فقہ کا باقاعدہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، ان چھوٹے بڑے اسکول کالجوں کے مقابلے میں انتہائی قلیل ہیں، جہاں بالعموم مسلمان بچوں کو داخلہ مل ہی جاتا ہے[۲]۔

مرکز کے ذمہ داران غالباً مدرسہ و مکتب کو باہم خلط ملط کرنے کی بناپر ہی یہ سوچنے لگے ہیں کہ مسلم یا ... دو میڈیم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے اور پڑھانے والے طلباء و اساتذہ کے بجائے دینی مدارس میں اپنا مخصوص دینی کام کرنے والے افراد کو سائنس کے فروغ کی

---

[۱] رحمانی صاحب کو مرکز فروغ سائنس کے سرکلر میں محل نظر آنے والی درج بالا دو باتوں کی بابت مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر اسرار احمد نے مباحثے کے دوران درج ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

ا۔ اس حقیقت کا ادراک آج ہر ذی ہوش کو ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اب اگر اس سے کوئی چشم پوشی کرنے کا فیصلہ ہی کرلے تو چارہ کار کیا ہے۔ ایک ادنیٰ سی مثال کے طور پر یہیں رحمانی صاحب کی اس کانفرنس سے دلچسپی کا علم صرف چند روز پہلے ہوا تھا۔ ہم نے فوراً بذریعہ ٹیلی گرام انہیں مدعو کیا۔ جواباً وہ جدید ترین ذرایع سے سفر کرکے آج ہمارے درمیان نہ صرف موجود ہیں بلکہ بذریعہ مائیکروفون اپنے خیالات بھی ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ سائنس کے فروغ اور اس کے استعمال سے پہلے ممکن تھا۔ اب اگر ہم اس دور کو جس میں پتھر کے اوزار استعمال ہوتے تھے، پتھر کا دور کہتے ہیں تو کیا اس دور کو جس میں سائنسی ایجادات کا دخل زندگی کے ہر شعبے میں ہوگیا ہے سائنسی دور نہ کہیں گے۔

ب۔ محل نظر آنے والی دوسری بات گرچہ ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے کہی تھی، لیکن اس کا اطلاق سارے عالم اسلام پر ہوتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بالادستی کی ہی وجہ سے چالیس لاکھ اسرائیلیوں کے سامنے ساڑھے چار کروڑ عرب مسلمان سرنگوں رہتے ہیں۔ دیکھنے والا دیکھتا ہے اور حساس دل تڑپ اٹھتا ہے جب اسرائیلی ہوائی جہاز عرب ممالک کے جس مقام کو چاہتے ہیں بلا مزاحمت اپنا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ کیا اس بات میں سچائی نہیں کہ مسلم ممالک زمین میں دفن اپنے قدرتی ذخائر کو نکالنے تک کے لیے مغرب سے ٹیکنالوجی اور مہارت کی بھیک مانگتے ہیں اور جنہیں وہ اس عیاری سے دیتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی دولت کے بیشتر حصے سے مسلم ممالک کو محروم کردیتے ہیں۔ کیا اس بات سے کوئی انکار کرسکتا ہے کہ روزمرہ کی جدید ٹیکنالوجی سے لے کر دفاعی ہتھیار تک کے لیے مسلم ممالک مغرب کے دست نگر ہیں۔ یہ سب سرنگوں ہونا نہیں ہے تو کیا ہے؟

[۲] مسلم خواندگی سے متعلق ہمارا بیان کسی قیاس پر نہیں بلکہ اعداد و شمار پر مبنی ہے جیسا کہ خطبۂ استقبالیہ میں کہا گیا ہے۔

جانب لایا جائے۔

علوم و فنون کے تخصص (specialization) کے اس دور میں یہ سوچنا کہ دینی مدارس اپنے یہاں سائنس کا نصاب بھی پڑھائیں، ہر صاف ذہن شخص کو بہت عجیب محسوس ہوگا۔ ایسا ہی عجیب جیسا کہ کہا جائے کہ لغیات پڑھنے والے کو پلاسٹک سرجری کا نصاب بھی پڑھنا چاہیے۔ یا موسیقی کی اعلیٰ تعلیم کے کورس کے ساتھ کمپیوٹر سائنس کے پرچے بھی لازمی ہوں گے۔ اس احساس کو میں نے عجیب اس لیے کہا کہ محض دینیات اور محض سائنس کی تعلیم تخصص کے ساتھ ملک کے بہت سے اداروں میں صدیوں سے پورے نظم کے ساتھ جاری ہے مگر باکمال عالم اور صاحب ایجاد سائنس داں کا وجود انکار کیے جانے کی حد تک کمیاب ہے۔ اب اگر ان کمزوریوں کا پتہ لگانے اور ان پر قابو پانے کے بجائے ایک کو دوسرے میں شامل کرکے ایک نئے تجربے کا آغاز کیا جائے تو ظاہر ہے کہ نتیجہ بہتر نہ ہوگا اور بے چاری نوجوان نسل

نہ دیں ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

کا مصداق ہو جائے گی اور امت مسلمہ اور اس کے نونہالوں پر ہمارا یہ کوئی احسان نہ ہوگا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی خیرہ کن ترقی کو اپنا مرکز و محور بنانے والے افراد بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی اس عقل محض کو فروغ دیتی ہے جو ممکن ہے کہ اول اول تو نہایت برتر اور بالادست نظر آئے لیکن انجام کار بالعموم وہ صرف "چنگیزی" ہی بن جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دینی مدارس میں سکھائے جانے والے علوم نہ تو صرف عقل محض کے فروغ کا سبب بنتے ہیں اور نہ صرف جذبات کے، بلکہ قرآن و سنت کی روح کے عین مطابق وہ اپنے طلباء میں ایسی عقل اور ایسے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ایک مرحلے پر یہ دونوں آمیز ہو کر وہ بصیرت بن جاتے ہیں، جسے "مومن کی بصیرت" بھی کہا گیا ہے اور "اتقوا فراسۃ المؤمن" کہہ کر جس کی بالادستی بھی ظاہر کی گئی ہے۔

ہیں ممکن ہے کہ اس کانفرنس میں کسی جانب سے مجھے یہ یاد دلایا جائے کہ کچھ دینی مدارس کے نصابوں میں بہت پہلے سے منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور جغرافیہ وغیرہ مضامین جو اپنے زمانے کی سائنس کہے جاتے تھے، شامل رہے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اب بھی شامل نصاب ہیں۔ اس سلسلے میں یقین جانو ... گا کہ ہمارے احباب پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اس پہلو پر غور فرمائیں کہ دینی مدارس کے نصابوں میں ان علوم عقلیہ کی شمولیت نے علم قرآن، علم حدیث اور توحید و فقہ کے جامع و کامل حصول کو کس کس طرح متاثر کیا ہے؟ یہ ایک طویل قصہ ہے جسے میں یہاں چھیڑ کر منتظمین مرکز کی مزید حوصلہ شکنی نہیں کرنا چا... لیکن یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک ایسے تجربے سے آگاہ کر دوں جو عرصہ قبل ہمارے یہاں ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر نئی دہلی میں کیا گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب مولانا سعید احمد اکبرآبادی بقید ... تھے۔ ہم نے مولانا اکبرآبادی مرحوم اور مولانا محمد تقی امینی صاحب وغیرہم او... مرکزی حکومت کے ادارہ N.C.E.R.T سے وابستہ کچھ افراد ... تعاون سے حساب، سائنس اور جغرافیہ وغیرہ کا ایک ایسا نصاب ترتیب ... جو مذکورہ بالا سینٹر کے مڈل سے ثانوی مرحلے تک کے طلباء کو پڑھایا جا... عربی زبان و ادب اور علوم قرآن و حدیث کے نصاب کے ساتھ جب ہم نے ... وغیرہ کا مذکورہ نصاب پڑھایا تو چند ہی ماہ میں محسوس ہونے لگا کہ ہم ... طلباء کو اس منزل کی جانب لے جانے میں سست رو ہو گئے ہیں جس کے لیے ہمارے اداروں میں داخل ہوئے تھے۔ اس برس کے امتحانی نتائج نے ... کہ طلباء کی بڑی تعداد اپنے اصل نصاب کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں ... اور وہ اپنے اس عمل پر متاسف ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی اندازہ ہوا ... سائنس اور حساب وغیرہ میں بھی وہ معیار حاصل نہیں کر سکے جس کی ... انہیں مرحلۂ متوسط کا طالب علم کہا جا سکے۔

اس حوصلہ شکن تجربہ کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ ادارے جو طلباء کو حقیقتاً جامع و پر وقار علم دین سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں، ا... میں سائنس وغیرہ کی خاطر خواہ تدریس کی گنجائش نکالنا تقریباً ناممکن ہے ... تجربے کو حوصلہ شکن اور سائنس کے نصاب کی گنجائش کو ناممکن قرار دینے ... بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم ایسے طلبا کو بھی ابتداءً عربی و فارسی اور اردو کی ت... ہیں جو عام طور پر ایسے مکاتب سے آتے ہیں جن کے نصاب میں عربی و فا... ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملک کے غیر ہندی و اردو داں ... مثلاً تامل ناڈ، کرناٹکا، کیرلا، اڑیسہ، ناگالینڈ اور تبت وغیرہ ... دینی طلب میں آتے ہیں۔ اس لیے [illegible] ہوتا ہے کہ انہیں ...

عربی و فارسی پڑھا کر اس معیار تک پہنچایا جائے کہ جہاں وہ علم قرآن و حدیث کی حامل دقیق عربی و فارسی کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔

واضح رہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں تین چیزیں تو ہر حال میں ملحوظ رہتی ہی ہیں۔

اولاً: دینیات یعنی علوم قرآن، علوم حدیث، علوم فقہ اور عقائد۔

ثانیاً: عربی زبان و ادب و بلاغت۔

ثالثاً: دیگر ضروری زبانیں مثلاً فارسی، انگریزی، اردو، ہندی اور طالب علم کی علاقائی زبان۔

علم قرآن و حدیث کے اعلیٰ معیار کو حاصل کرنے کی تمنا ہیں وہ طریقہ بھی اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے جو ملک کے عام اسکولوں میں رائج ہے۔ یعنی درجہ دہم تک جملہ مضامین کی تعلیم اور گیارہویں جماعت سے آرٹس اور سائنس کی تخصیص۔ یعنی اعلیٰ دینی معیار کے خواہاں مدارس اپنی ابتدائی جماعتوں کے بعد تو کسی بھی صورت میں سائنس کی تعلیم کو شامل نصاب نہیں کر سکتے اور ابتدائی جماعتوں میں سائنس کے لگ بھگ مروجہ نصاب کی شمولیت کا انجام جو کچھ ہوا، اس کا ذکر آپ کے سامنے کر ہی چکا ہوں۔

علم دین میں تخصص جس توجہ اور مرکزیت کا طالب ہوتا ہے، اس کا اندازہ آپ اس حقیقت سے بھی کر سکتے ہیں کہ عرب دنیا کے طلباء اپنی مادری زبان یعنی عربی میں ہائی اسکول تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کالج میں پہنچتے ہیں تو ان کا نصاب تین حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ علمی، ادبی اور دینی۔ ان ممالک میں علمی تعلیم سے مراد سائنس کی تعلیم ہوتی ہے۔ جب کہ ہمارے ہندوستانی اسلامی مدارس پہلے دونوں حصوں (ادبی و دینی) کو لازمی قرار دینے پر پہلے ہی سے مجبور رہیں۔

جہاں تک عصری تقاضوں کا تعلق ہے وہ دنیا کی جملہ اقوام و ملل کی طرح مسلمانوں کے سامنے بھی آتے رہتے ہیں اور انہوں نے ان کو پورا بھی کیا ہے۔ اسی لیے علوم و فنون کی تاریخ شاہد ہے کہ طب کے میدان میں ابن سینا کی کامیاب تحقیق، یورپ کی سائنسی ترقی کے لیے نشان راہ بنی، ابوبکر رازی نے "خسرہ" کے سلسلے میں جو کتابچہ "الحصباء" کے نام سے لکھا تھا وہ آج بھی مستند مانا جاتا ہے۔ طب پر ابن سینا اور رازی کی لکھی ہوئی کتابیں پندرہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل تھیں۔

یہاں پر میں علم طب کے بعض دیگر مشہور علماء کی جانب بھی اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ ظہور اسلام سے قبل حارث بن کلدہ الثقفی جسے طبیب العرب کہا جاتا ہے۔

۲۔ ابن ابی رمثۃ التمیمی

اس علم میں مسلمانوں میں صرف مردوں ہی نے نہیں بلکہ عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ اندلس کی ایک مشہور خاتون "اخت الحفید ابوبکر بن زہر الاندلسی جو اشبیلیہ کی تھیں اسی طرح ان کا نام تاریخوں میں درج ہے۔

۳۔ مختلف بیماریوں کے علاج میں مختلف علماء اسلام اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔

(۱) حنین بن اسحاق نے آنکھ کی بیماریوں کے سلسلے میں "العشر مقالات فی العین" نام کی کتاب تصنیف کی۔

۲۔ علی بن عیسیٰ نے "تذکرۃ الکحالین" لکھی۔

۳۔ صلاح بن یوسف الکحال جنہوں نے "موسوعۃ فی امراض العیون وعلاجہا" تالیف کی۔

۴۔ طب بیطرۃ (علاج حیوانات) مسلم اطباء ہی کی ایجاد ہے۔

۵۔ مشہور اطباء میں ابن سینا ہے، جس کی چیر پھاڑ، سل کی بیماری اور اعضائے جسم وغیرہ کے سلسلے میں معلومات افزا مباحث "القانون لابن سینا" میں تفصیل سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

۶۔ عمل جراحی میں ابو القاسم خلف بن عباس الزہراوی (م ۱۱۰۷ء) دانت، آنکھ اور ولادت کے ماہر معالج نیز پتھری و مثانہ وغیرہ کے ماہر جراح اور طبیب شمار کیے جاتے ہیں۔

۷۔ پھیپھڑے اور دل کے درمیان دوران خون کے انکشاف کا سہرا ابن النفیس (م ۶۸۶ھ) کے سر بندھا ہے۔

۸۔ ابن سینا اہل یورپ کے "دو بینی الطائی" سے تقریباً نو سو سال پہلے یہ انکشاف کر چکا تھا کہ اکثر بیماریں کیڑے ہوتے ہیں۔

علم صیدلہ

علم صیدلہ میں مسلمان علماء نے کثیر تعداد میں تصانیف چھوڑی ہیں ابن البیطار (ابو محمد عبد اللہ بن احمد المالقی (م ۶۴۸ھ) نے

اپنی مشہور تصنیف "الجامع فی الادویہ المفردۃ" جہاں تکلیف کے علاج کے مطابق ترتیب دی ہے۔

۲۔ ابن رشد (م ۱۱۹۰ء) نے مختلف امراض کے لیے مختلف دوائیں تجویز کی ہیں۔

۳۔ رشید الدین ابوحلیقہ کی کتاب (المختار فی الف عقار) اسباب مرض اور ان کی دواؤں کی معلومات کا ذخیرہ ہے۔

ریاضیات

ابوالقاسم الزہراوی اندلس میں پانچویں صدی ہجری میں طب میں ریسرچ کر رہے تھے۔ الخوارزمی نے ریاضیات میں وہ کمال حاصل کیا کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا بھی ان کی ذہانت کی داد دیتی ہے، ریاضیات میں الگورزم (ALGORIZM) الخوارزمی ہی کی طرف منسوب ہے۔

علم الحساب

علم حساب میں صفر سے استفادہ کرنے کا اصول عربوں کا تیار کیا ہوا ہے۔

خوارزمی علم حساب کا وہ ماہر شخص سمجھا جاتا ہے۔ اہل یورپ جس جدید اعداد و شمار کو اپنائے ہوئے ہیں یہ خوارزمی ہی کی دین ہے۔

علم الجبرا۔

یہ اپنے نام ہی سے اپنے موجد کو ثابت کر رہا ہے۔ یعنی عرب کے ماسوا اس علم کا موجد کوئی اور نہیں ہو سکتا اور یہ سہرا موسیٰ بن خوارزمی کے سر ہے۔ ویسے اس علم میں جن دیگر علماء کے نام آتے ہیں ان میں شہرت درج ذیل علماء کو بھی حاصل ہے۔

۱۔ ابوبکر محمد بن حسن الکرخی (م ۱۰۱۹ء) ان کی کتاب "الفخری فی الجبر والمقابلہ" ہے۔

۲۔ خوارزمی کی کتاب کا نام "الجبر والمقابلہ" ہے

۳۔ عمر بن ابراہیم الخیام (م ۱۱۲۱ء)

۴۔ ابوالوفاء البوزجانی (م ۹۹۸ء)

علم الہندسہ

ہندسہ کو مستقل علم قرار دینے والے ابوعبداللہ محمد بن جابر البتانی (م ۹۲۹ء) ہیں۔

۴۔ ابوالوفاء البوزجانی (م ۹۹۸ء)

ہندسہ کے مشہور مصنفین یہ ہیں۔ خوارزمی، ثابت بن قرۃ، خازن بصری، ابن الہیثم، بیرونی، جن کی کتاب "استخراج الاوتار فی الدائرۃ" ہے۔ طوسی، جن کی کتاب "شکل القطاع" ہے۔

ابن خلدون نے مسلمانوں کی عقلی پستی کے دور میں بھی ان علوم کے اصولوں کی نشاندہی کی، جن کی طرف اس وقت کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی اور جو بعد میں چل کر انسان کی ترقی کی راہ میں زبردست معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ مثلاً سوشیالوجی: اکنامکس، علم التاریخ، علم السیاسۃ، علم تزاید السکان وغیرہ۔ امام ابن حزم اندلسی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہم کی علمی و فکری اور اجتماعی خدمات اور ان کے مثبت عقلی کارناموں کا یورپ کے پاس کوئی جواب نہیں۔

علم الفلک اور علم الہیئۃ کے میدان میں مسلمانوں کی ریسرچ اس وقت کے لوگوں کے لیے محیر العقول تھی۔ اگر ان کی ریسرچ کا سلسلہ جاری رہتا تو بہت پہلے فضا کو مسخر کر لیا گیا ہوتا۔

جغرافیہ اور تاریخ کے میدان میں البیرونی، مسعودی، بلاذری طبری وغیرہ کے نام سنہری حروف سے لکھے جاتے ہیں۔

علم کیمیا۔

مواد کیمیا تک پہنچنے میں نیز مالح اور حامض (نمکین اور ترش) کے مابین تمیز کرنے میں، اسی طرح کیمیاوی مواد کی تاثیر کے سلسلے میں علماء نے جو علمی خزانہ جمع کیا ہے وہ اہل یونان کی فراہم کردہ معلومات سے کہیں زیادہ صحیح اور معلومات افزا ہے۔

۱۔ جابر بن حیان الکوفی (م ۸۱۵ء) نے اپنی تصنیفات (جن میں سے اکثر لاطینی زبان میں مترجم ہیں) کتاب الرحمۃ، کتاب التجمیع، کتاب الزئبق الشرقی، کتاب الاستتمام، کتاب ترکیب الکیمیا وغیرہ میں پانی، تیل، سرکہ، خون سبزی اور میوہ کے نچوڑ جیسی سائل اشیاء پر جس تفصیل سے بحث کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

۲۔ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (م ۹۲۵ء) نے اپنی کتاب "کتاب الاسرار" اور کتاب سر الاسرار میں ان آلات اور ادوات کا وصف بیان کیا ہے جو کیمیاوی مادے کے تجرباتی عمل میں مدد لیا جا سکتا ہے۔

۔ حسن الرماح نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں بارود دیکھنے کے بعد جو مضر اثرات برآمد ہو سکتے ہیں ان کی پوری معلومات اپنی تصنیف میں جمع کر دی ہیں۔ بعد میں اہل مغرب نے اس سلسلہ میں جو جدید انکشافات کیے ہیں وہ اسی حسن الرماح کی کتابوں اور معلومات پر مبنی ہیں۔

علم کیمیا کے سلسلے میں جن علمار نے اپنے علمی آثار بعد کے لوگوں کے لیے چھوڑے ہیں ان میں چند کی جانب میں یہاں اشارہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۔ مسلمہ بن احمد المجریطی اندلسی (م ۳۹۸ھ) ان کی کتاب "غایۃ الحکیم" ہے۔

۲۔ ابن الذھبی اندلسی

۳۔ ابن السمح اندلسی (م ۴۲۶ھ)

۴۔ ابن الصفار

۵۔ ابو القاسم العراقی (ساتویں صدی ہجری)

ماہر کیمیا، علامہ عزالدین بن محمد بن ایدمر علی جلدکی (م ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء) "نتائج الفکر فی احوال الحجر" "البدر المنیر فی معرفۃ اسرار الاکسیر" اور "اسرار المیزان" وغیرہ جیسی اہم اور بے نظیر کتابوں کے مصنف ہیں۔

جلدکی وہ پہلا شخص ہے جس نے کیمیاوی تاثیر سے پیدا ہونے والے بخار اور بھاپ کے مضر اثرات سے انسان کو آگاہ کیا اور اس سلسلہ میں احتیاط و تدبیر کے ہر اس طریقے کو اپنانے پر زور دیا جو مناسب اور مفید ہو۔ کیمیاوی تجربے کے وقت ناک کو روئی یا چیتھڑے سے ڈھانپ لیا جائے، یہ بھی اسی کی رہنمائی ہے۔ ممکن ہے اسی رہنمائی نے موجودہ دور کے علمار کو اس بات پر آمادہ کیا ہو کہ وہ کیمیاوی تجربے کے وقت پلاسٹک کے لفافوں کا استعمال کریں۔

سوڈا کاسٹک جس کی صابن میں کثیر مقدار کپڑے کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے، صابن کی صنعت میں جلدکی نے ایسے کیمیاوی مادہ کا اضافہ کیا جو اس ضرر کو روک سکے۔

علم اصوات و الفاظ اور ہوا و پانی کی حرکت جیسے امور میں اپنا تحقیقی کارنامہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ علم طب اور میڈیکل سائنس کے ریسرچ و تحقیق میدان میں بھی اس نے بھرپور حصہ لیا۔

علم فزیا (فزکس) میں مسلم علماء کو اولیت کا درجہ حاصل رہا ہے کہا جا سکتا ہے کہ اہل مغرب نے جدید ادوار میں جو کچھ کیا وہ انہیں مسلم ماہرین کا منت پذیر ہے [illegible]

۱۔ روشنی آواز سے پہلے پہنچتی ہے۔ (علمائے اسلام نے یہ نظریہ سب سے پہلے پیش کیا)

۲۔ "قوس و قزح" کی بابت سائنٹفک معلومات قطب الدین شیرازی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "نہایۃ الادراک" میں درج کردی ہیں اور یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی معلوماتی کتاب شمار کی جاتی ہے۔

۳۔ استاد ڈیٹیرکی (DIETRICI) کا کہنا ہے کہ نیوٹن سے صدیوں پیشتر قوانین کشش کی معرفت حاصل ہو چکی تھی۔ نیوٹن سے پہلے اس سلسلہ کی معلومات مہیا کرنے والے علمار میں سے (۱) محمد بن رازی (۲) ثابت بن قرہ (۳) الخازن البصری وغیرہ ہیں۔ انہیں علمار ہی کی معرفت کی بنیاد پر بعد میں نیوٹن نے اپنی عمارت کھڑی کی۔

۴۔ حسن ابن الہیثم (م ۱۰۳۹ء) کی شخصیت مسلم سائنس داں علماء میں نگینہ کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ انعکاس ضوء کے سلسلے میں بطلیموس سکندری کے نظریات کو جس علمی اور تحقیقی و معلوماتی پیرایے میں انہوں نے اپنی بے نظیر کتاب المناظر میں غلط ثابت کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ علم ضوء اور بصریات کے سلسلے میں دور جدید کے علماء مغرب ابن الہیثم کی تصنیفات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ خصوصاً "راجر بیکن" اور "کیبلر" وغیرہ

۵۔ محمد بن احمد البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے اپنی کتاب "الجماہر فی الجواہر" میں کثافت نوعیہ کے سلسلہ میں جو اصول و قواعد وضع کیے ہیں، آج تک اہل مغرب ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

۶۔ خازن البصری (م ۱۰۳۸ء) نے اپنی کتاب "میزان الحکمۃ" میں معادن، سوائل، اجسام صلبہ، ضغط جوی، وغیرہ جیسے محیر العقول امور پر جو معلومات فراہم کی ہیں وہ قابل تحسین ہیں مذکورہ مصنف کی لاطینی اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ شدہ کتابوں سے (۱) روبرٹ جرسٹسٹ (Robert Grosteste) (م ۱۲۷۵ء) اسقف للکولون، لولی وتلو وغیرہ نے استفادہ کیا ہے پھر ان لوگوں سے راجر بیکن مستفید ہوا۔

فزکس پر ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) نے شفاء النفوس، خوارزمی نے مفاتیح العلوم وغیرہ تصنیفات چھوڑی ہیں۔

۷۔ عبدالرحمٰن الخازنی (م ۵۵۵ھ ۱۱۰۰ء) صرف اپنے دور کا نہیں بلکہ پہلے اور بعد کے دونوں ادوار میں فزکس کا امام مانا گیا ہے اور اس فن کے ماہرین

نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ وہ اپنے اساتذہ، ابن سینا اور بیرونی سے بھی آگے نکل گیا ہے۔

خود قرآن کریم میں جن قوانین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، خواہ وہ انسان کے تخلیقی مراحل سے متعلق ہوں یا زمین و آسمان کی گردش سے یا زمین پر بسنے والے حیوانات اور اگنے والے نباتات سے یا بارش سے سب کے سب آج کی سائنسی تحقیقات سے کہیں آگے ہیں۔ جس کا تجزیہ موریس بوکائی (Maurice Bucaille) نے اپنی کتاب (The Bible, The Quran and Science) میں ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی نے اپنی کتاب "دوالشافیین وقامع المشککین" میں اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم وغیرہ نے گہرائی اور تفصیل سے کیا ہے۔

قرآن کریم کی ان آیتوں کو جن میں ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے وہی عالم سمجھ سکتا ہے جس کو سائنس کے مبادی کا علم ہو۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ میں کبھی بھی کسی سائنس داں کو اپنی سائنسی تحقیقات کی وجہ سے حکام یا عوام کے ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔ مجموعی طور پر میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں آج اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ اپنے ارادوں اور منصوبوں پر عمل کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح محسوس کریں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے عمل سے ہمارے دین اور ہمارے ایمان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ورنہ انسانیت کے سامنے صراط مستقیم کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہیں بچے گا۔ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ اصل معیار دین ہو نہ کہ کوئی اور شے۔ کیوں کہ علم دین فرض عین ہے، فرض کفایہ نہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کی خاص مسلم آبادی کے لیے ایک ڈاکٹر کافی ہو سکتا ہے لیکن ایسی پوری آبادی کے ہر فرد کے لیے دین کی بنیادی باتیں جاننا ضروری ہے، ہر شخص کا ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں۔ میری ان گزارشات کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دینی مدارس میں علم حاصل کرنے والوں کو دنیا سے بے خبر رہنا چاہیے۔ انہیں یقیناً وہ سائنسی معلومات حاصل ہونی چاہییں جو عام انسانی زندگی کا جزو بنتی جا رہی ہیں۔ بلکہ بالکل ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ہر مسلمان سائنس داں کو دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ ہونا چاہیے۔ یعنی دونوں کا اپنا اپنا تخصص بھی مجروح نہ ہو اور باہمی تصادم بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ مکاتب کی حد تک بچوں کو حساب، انگریزی اور سائنس وغیرہ عام طور پر پڑھائی ہی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے پرائمری و مڈل اسکولوں میں دینی تعلیم کو لازمی بنایا جائے۔ تاکہ اسلام کا وہ حقیقی مقصد پورا ہو کہ مسلمان کو دنیا میں آخرت کے تصور کے ساتھ رہنا ہے اور اپنے خالق کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنا رشتہ استوار کرنا ہے اور پوری زندگی اسی کی عبادت کے لیے وقف کرنی ہے اور اسی کی عبادت کا تقاضا ہے کہ اس کی مخلوقات کی خدمت اور خیر خواہی کو ہم اپنی زندگی کا وطیرہ بنائیں۔ ان تقاضوں کی تکمیل ضروری ہے۔ مرکز فروغ سائنس ان یونیورسٹیوں (مثلاً جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی وغیرہ) کے ماہرین تعلیم کو یکجا کرے جن میں اسلامیات، دینیات اور عربی زبان کے شعبے قائم ہیں۔ یہ ماہرین قرآن اور سنت کے علما کے ساتھ مل جل کر تین طرح کے نصاب تیار کریں۔

١۔ ایسا دینی نصاب جو اسکول و یونیورسٹی درجات کے تمام مسلم طلباء کو حقیقی اسلام اس کے عقیدے کی آگہی عطا کر سکے۔ یہ نصاب بی۔ اے پاس کورس میں لازمی پرچہ اور آنرز کورسوں میں اضافی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔

٢۔ ایک ایسا نصاب جو ہندی سنسکرت اور سائنسی علوم پر مشتمل ہو۔ یہ نصاب ایسا ہو کہ ملک کے تمام دینی مدارس کی ابتدائی جماعتوں میں اس طرح بہ آسانی پڑھایا جا سکے کہ ان مدارس کا خصوصی نصاب قطعاً متاثر نہ ہو۔

٣۔ ان ذہین طلباء کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک نصاب تیار کیا جائے جنہوں نے عربی زبان اور دینیات یعنی حدیث و قرآن اور عقائد و فکر کی تکمیل امتیازی حیثیت سے کی ہو اور جن کے دل و دماغ اسلام اور اس کی تعلیمات سے پورے طور پر مطمئن ہوں۔ اس کو پڑھانے کے لیے معیاری انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جائیں تاکہ ان میں تعلیم و تربیت حاصل کر کے یہ فضلاء دین مستقبل کی دنیا میں آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ کوشش کی جائے کہ ان طلباء کو معاشی مسائل سے بے فکر بنایا جائے تاکہ ایسے سائنس داں عالم سامنے آسکیں جو خود بھی صحیح العقیدہ مسلمان ہوں اور اپنے علم و قدم سے دیگر اقوام کے سامنے حقیقی دینی و دنیاوی کامیابی کا نمونہ بن سکیں۔ غالباً یہی وہ لوگ ہوں گے جو خود سمجھیں گے اور دوسروں کو سمجھائیں گے کہ ہمارا ایمان، قرآن، اللہ، رسول اور قیامت پر ہے اور ہماری بعثت اس دنیا میں ایک مقصد کے لیے ہوئی ہے جس کا اظہار قرآن پاک نے "کُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ" "وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" "جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" میں کیا ہے۔

اس لیے خواہ سائنس ہو یا ٹیکنالوجی یا کوئی اور علم، اسے ہم وسیلے کے طور پر قبول کریں گے، مقصد کے طور پر نہیں۔ کیوں کہ ایک مسلمان اپنی زندگی کا بنیادی مقصد کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اگر وہ نظر انداز کرتا ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مسلمان نہیں۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

مظفر بلخی

عالمی حالات کے پس منظر میں اگر مسلمانوں کا سطحی جائزہ بھی لیا جائے تو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ مسلمانوں کے ملی تشخص کی بازیابی اور وقار کی بحالی کا مسئلہ نہایت سنگین ہے۔ انحطاط کی منزلوں سے دن بدن گزرتے آج ہم اس جگہ آپہنچے ہیں جہاں ہماری شناخت بھی اب مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دینی و اخلاقی احساسات کا قطعی فقدان نیز اس کے برعکس درد ماندگی و محکومی اب ہمارا شعار ہے۔

ہندوستانی مسلمان بھی اسی صورت حال کا ایک حصہ ہے۔ اگر یہی حالت پروان چڑھتی رہی تو شاید ہمیں وہ وقت بھی دیکھنا نصیب ہوگا جب ہم اپنے سارے دینی و ملی اثاثے سے محروم ہو چکے ہوں گے۔ ایسے وقت میں نہ ہماری کوئی واضح شناخت ہوگی، نہ ہی وسائل اور نہ قوت نفاذ۔ سوائے چند حسرتوں کے۔ ملی زندگی کے لیے یہ مقام نہایت المناک ہے۔

مگر اس وقت سے پہلے اب بھی ہمارے پاس ایسے وسائل موجود ہیں جو ہماری ملی زندگی کا سہارا بن سکیں۔ البتہ ان وسائل کو مصرف میں لانا اور کارآمد بنانا ہی ایک اہم کام ہے جس کے لیے ہماری جد و جہد اور دانش مندی دونوں مطلوب ہیں۔ دانش مندی یہ کہ وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اس کے مطابق اور اس کے تناسب میں وسائل یکجا کیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وقت کی ضرورت کچھ اور ہو اور ہماری راہیں کچھ اور۔ دور میں زمانے کے تقاضے کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق اپنا جائزہ اور کامیاب راہیں متعین کی جائیں۔ آج معاشی و اقتصادی، اخلاقی و سیاسی برتری کے لیے ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کے ساتھ سائنسی پیش رفت کے لیے ہماری کامیابیاں کچھ نہیں یا بہت کم ہیں۔ حالاں کہ آج دنیا میں سائنسی تعلیم نے ہی اپنی بالادستی ثابت کر رکھی ہے۔ جن ملکوں کا اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ ہو چکا دنیا کی قیادت اور سرپرستی ان ہی کے ہاتھوں ہے۔ شدید اخلاقی زوال کا شکار ملک امریکہ کے ایک سروے جائزے میں ستر فیصد وہاں کے عوام اپنا سماجی زندگی کو کسی بھی خطرناک حادثاتی انجام کا پیش خیمہ قرار دیا۔ لیکن وہی عوام آج کے صحت مند سماج کی تکمیل اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ یہ صرف اعلیٰ سائنسی اور غیر معمولی تکنولوجی کی ترقیات کا ہی کرشمہ ہے اور پھر ان غیر اخلاقی قوتوں کے آگے مسلمانوں کا ملی تشخص بھی جھکا ہوا ہے۔

آج مسلمانوں نے اپنی ترقی کو سماجی نوعیت کے علوم کے ساتھ وابستہ کر کے سائنسی و تکنیکی علوم کو صرف تعلیم گاہوں، تحقیقی اداروں اور کل کارخانوں کا محدود علم تصور کر لیا اور اس کے دوسرے فائدوں سے بے فکر ہو گئے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ سائنس اپنے محدود میدان میں اس ترقی کا نام ہے جس کا زندگی کے آرائش و آسائش سے تو تعلق ہے لیکن حقیقی ترقی سے نہیں۔ جب تک کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں مسلمانوں کی خلافت شام، اسپین اور عراق میں رہی سائنسی تعلیم کی باقاعدہ ترویج دینی ضرورت کی حیثیت سے ہوتی رہی۔ لیکن اس کے زوال کے بعد مسلمانوں نے سائنس کو ایسا علم سمجھ لیا جس کا سماجی زندگی سے تعلق نہیں۔ روح اور اخلاق کی بالیدگی میں صرف سماجی نوعیت کے علوم کی ضرورت ہے۔ یہ خیال رفتہ رفتہ راسخ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آج یہ اور بھی جڑ پکڑ چکا ہے۔ مسلمانوں کی سائنس سے دوری کی یہ واضح تبدیلی تھی جس کا احساس اسلام کے ممتاز عالمی قائدین کو ہوا ہے۔ اس دور کے عظیم مفکر و ادیب علامہ شکیب ارسلان نے کئی جلدوں میں لکھی گئی کتاب "هٰذہ العالم الاسلامی" میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں ایک بڑی وجہ ترک سائنس کو بھی قرار دیا ہے۔ واقعات کی

مدت میں انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ جب عرب میں ریل گاڑیاں اور ٹیلی فون رابطے پہلی بار متعارف ہوئے تو علمائے وقت سے ان کے جائز یا ناجائز ہونے کے فتوے دریافت کیے گیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ان کارناموں سے ان کی حیرانی بڑھ گئی تو ٹیلی فون کے متعلق انھوں نے یہ خیال قایم کیا کہ اس میں شیطان بولتا ہے۔ (الشَّیطَانُ یتکلم فیہ) اور ریل گاڑی کو دجال سے تعبیر کیا۔ حالیہ دنوں ہی کی عظیم انقلابی اسلامی شخصیت علامہ جمال الدین افغانی نے دینی مدارس کے مروجہ نظام تعلیم میں سائنسی معلومات کی کمی کا نمایاں ذکر کیا ہے۔ العروۃ الوثقیٰ کے ایک شمارے میں وہ لکھتے ہیں کہ درس نظامیہ کے طلباء قندیل کی روشنیوں میں فلسفہ کی اونچی اونچی درسی کتابیں صدرہ اور شمس بازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اسی سامنے کی قندیل کے متعلق یہ بھی غور نہیں کرتے کہ اگر اس پر شیشہ ہٹا دیا جائے تو دھویں کی افزائش نمایاں اور زیادہ کیوں ہو جاتی ہے۔

سائنسی تعلیم سے آج مسلمانوں کی بے رغبتی کا جائزہ لیا جائے تو اس کی بڑی وجہ اسلام پسند حلقوں اور مدارس دینیہ میں سائنسی تعلیم کا فقدان ہے۔ کل کی تاریخ میں ایک ایسی فہرست ان علماء کی بھی نظر آتی ہے جو ایک طرف مفسر، محدث، فقیہ اور فلسفی تھے تو دوسری طرف ماہر طبعیات، کیمیا، فلکیات، ارضیات، ریاضی و اقلیدس اور ماہر طب بھی۔ اس قیادت نے مسلمانوں کی سائنسی تعلیم کے احساسات کو بیدار کرنے میں اہم حصہ لیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کا ایک ایسا زریں اور پر وقار دَور گزرا جب وہ دینی علوم کے ساتھ خود مرکز علم سائنس تھے۔ آج مسلمانوں کی دینی قیادت سائنسی تعلیم سے بیگانہ ہے۔ اس لیے مسلم ملت شعوری اور غیر شعوری طور پر اس تبدیلی سے بھی متاثر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج سائنسی علوم کا معیار بہت بلند ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی کیا عجب کہ ہمیں کل کی بھی سائنسی کتابوں کے معیار کا علم نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ فارغین علوم دینیہ کے اندر آج بھی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک مستند عالم دین ہونے کے ساتھ ممتاز سائنس داں اور اعلیٰ تکنیکی ماہرین بن کر ابھر سکیں۔ پیش آئندہ وضاحتوں سے اس بات کو تقویت حاصل ہے۔

صفحۂ ہستی پر مسلمان وہ خوش نصیب ملت ہے جسے تمام سماجی علوم خدا کی طرف سے ملے ہیں اور جامع کمالات صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی ذات

ان علوم کی اعلیٰ ترین اور نادر ترین تشریح ہے۔ کسی ماہر دین کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ سماجیات، اقتصادیات، سیاست و قانون جیسے علوم کا ایسا نظام رائج کرے جو دینی احکام و بندشوں سے باہر ہو۔ جیسا کہ مغرب کے خود ساختہ علوم سماجیہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ بات ان کی حق آزادی سلب ہونا نہیں بلکہ آزادی کی ایک نئی راہ میں آسانی فراہم کرنا ہے۔ پابندی مسلمانوں کے ذہنی سکون کا سامان ہے۔ وہ سماجی علوم کے میں خدائی قوانین کو اپنا نصب العین بنائیں اور اس طرف سے ایک بے فکر ہو کر سائنسی علوم کی تلاش میں مصروف ہو جائیں۔ جہاں ا مبادیات کے ساتھ وضع علم کا سارا اختیار مسلمانوں کو حاصل ہے وہ فطری قوانین اور اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں غلطی کے م ہوں تو کوئی خدائی گرفت نہیں۔ اسلام نے سائنس کے صرف بنیا رہنمائیاں دی ہیں۔ جن کی اصل اخلاقی ہی نوعیت ہے۔ فنی حیثیت کا سارا معاملہ مسلمانوں کی ذاتی دلچسپیوں کے حوالے کر دیا حدیث اپنے تمام ضروریات کے ساتھ فی الاصل سماجی علوم ہی کسی مفکر کی یہ بات تحصیل علم کے لیے کس قدر قرین عقل ہے کہ ا علم الابدان وعلم الادیان۔ علم تو دو ہی ہیں۔ بدن کا علم کا علم۔ اس خیال کی روشنی میں سماجی علوم دین کے زمرے میں شا جب کہ بدن کا علم سائنس کی حیثیت سے الگ سبب حصول بنا۔ میں بدن مخصوص مفہوم کے ساتھ ایک جامع اور کثیر الا

تحصیل سائنس کی اتنی واضح، جامع اور آسان فہم ترغ باتیں اسکول و کالج کے طلباء کو میسر نہیں آتیں۔ یہ رہنمائی دینی تعلیم سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ آج مدارس دینیہ روایتی بن گئی ہے اور اس وجہ سے سائنسی تعلیم کی بھی کمی ہے۔ منطق، علم کلام، معانی و بیان اور علم المناظرہ کو آج ہندوستا مدارس میں جگہ دی گئی لیکن نصاب تعلیم میں سائنسی علوم کی کوئی ہندوستان میں ملا نظام الدین کا رائج کردہ ڈھائی سو سا کا طریقہ آج بھی جزوی ترمیم و اضافے کے ساتھ اسی طرح م کو مبادیات و سائنس کا بھی علم نہیں ہوتا۔ سائنس سے خاطر خو کوئی سوال ہی نہیں ہے جب کہ مدرسے میں اس کی فرصت ا

رکھتی ہے۔ اس کے وجوہات میں مندرجہ ذیل باتیں قابل توجہ ہیں۔

آج سائنس وقت کی ایک ضرورت ہے۔ سائنسی ایجادات و اختراعات نے اپنا وجود آخرت و توحید کے اسلامی تصورات سے الگ ہو کر قایم کیا ہے۔ ان سائنسی قوتوں کے لیے حالات اس طرح ساز گار ہیں جیسے توحید و آخرت کے مقابلے میں موجودہ سائنس کوئی نئی بیعت کی ہو۔ اس نہور کو غلط کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سائنسی علوم کو توحید و آخرت کی نگاہ سے بھی دیکھنے کی کوشش کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے ہر دور میں اپنی ضرورت کا ثبوت دیا ہے۔ آج کی سائنسی ضرورت میں بھی یہ ہماری مدد کے لیے تیار ہے۔ معرفت خداوندی اور اقرار آخرت کے لیے سائنسی حقائق پر توجہ ایک اہم تقاضہ ہے۔ معرفت الٰہی کا طالب جس قدر سائنسی علوم کی گہرائیوں میں اترتا جائے گا، ایمان کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں گی۔ امام غزالی نے احیائے علوم میں صرف ایک علم فلکیات کا علم نہ رکھنے والوں کو معرفت الٰہی میں نامرد قرار دیا ہے۔ من لیس لہ علم فی الافلاک فھو عنین فی معرفۃ اللہ۔ قرآنی آیات کے بغور مطالعے سے ہی پوشیدہ حقائق کھلتے ہیں۔ موافق حالات میں غیر موافق باتوں کی کثرت سے نشان دہی ہے۔ ان نشاندہی کا جائزہ لینے کے لیے سائنسی علوم کی ضرورت ناگزیر ہے۔ مدارس کے طلبا نہ جانے کتنے واقعات پر اپنی توجہ مرکوز کرنے میں صرف اس لیے قاصر رہتے ہیں کہ انہیں آیتوں کی متعلقہ معلومات نہیں ہیں۔ آیتوں کا اخلاقی منشا جو اس کی اصل غایت ہے وہ تو واضح ہو جاتا ہے لیکن سائنسی رموز اسی طرح تشنہ اور پوشیدہ۔ اگر سائنس کی ابتدائی اور اساسی معلومات بھی انہیں فراہم کر دی جاتیں ہیں تو ممکن ہے بعد فراغت مدرسہ طلباء کی ایک تعداد سائنس کی تحصیل کو منتہائے مقصود بناتی۔ قرآن کی بہت سی آیتیں تو براہ راست تحصیل سائنس سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ صرف ایک جامع آیت کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں بیک وقت تسلسل فلکیات، ارضیات طبعیات، زراعت، صنعت و حرفت، نباتیات اور حیوانیات کی تعلیم کی تلقین کی گئی ہے۔ اور ان علوم کے صاحبان درک کو عقل مند قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

[یقیناً زمین و آسمان کی ساخت میں، رات اور دن کے ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کی نفع بخش چیزیں لیے سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، اس بارش کے پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے اور پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور پھر اس کے ذریعے ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ان ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، اہل عقل کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں] (البقرہ آیت ۱۶۴)

آیت کے علیحدہ علیحدہ جملوں اور لفظوں کی تفصیل میں جانے کے لیے طوالت درکار ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اس آیت کی بدرجہ انتہا غایت تحصیل علوم سائنس ہے۔ ظاہر ہے سائنسی تعلیم کی اس قدر ترغیب اور ہدایت سے زیادہ قریب دینی مدارس کے طلبہ ہی ہیں۔ طلب سائنس کے لیے جو جذبات ان کے سینوں میں موجزن ہونے چاہئیں، اسکول و کالج کے طلبہ کو وہ بات نہیں مل سکتی۔

مدارس دینیہ کے طلباء کو سائنسی تعلیم کے حصول اور دلچسپی کے لیے اس حیثیت سے مواقع بھی دستیاب ہیں کہ ان کی تمام فکر کی یکسوئی سائنس کی تحصیل کے لیے یکجا ہو سکتی۔ سماجی علوم جیسے دوسرے علوم میں شریعت کیا جائے، اس کا تضاد واضح خدا ہے۔ اس معاملے میں ملت اسلامیہ کا کوئی انحصار مغربی اقدار فکر پر نہیں۔ معلومات کی فراہمی ایک دوسری بات ہے، مسلمان اگر مغربی مفکرین کی فلسفیانہ موشگافیوں کے شکار نہ ہوں تو ان کی صحت وسالمیت پر ذرہ برابر فرق نہیں آئے گا۔ انہیں سماجی علوم کی ایسی کسوٹیاں حاصل ہیں جن پر مغربی اقدار فکر خود پرکھے جائیں گے نہ کہ مغربی طرز فکر پر شریعت اسلامیہ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ سماجی علوم

کے الٰہی قوانین پر اعتقاد ہے اس لیے دوسری طرف انکی تمام یکسوئی سائنسی علوم کی تحصیل پر صرف ہو سکتی ہے۔ یقیناً دینی و شرعی علوم اپنی حیثیت میں ایک بڑا سرمایہ ہیں لیکن اسکی واضح، مدون اور متعین شکل ہے۔ طالبان دین کے لیے یہی بات ان کو ذہنی انتشار و پراگندگی سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ مغربی مفکرین اپنے وضع کردہ سماجی علوم کے خم و پیچ کے شکار رہیں۔ ان کے اپنے ہی علم انکے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ علمی سرمایے میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس اضافے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں سوائے مزید بحران کے۔

لیکن یہی پراگندہ سماجی زندگی دنیا کی قائد ہے۔ صرف سائنسی علوم کی بدولت۔ اس ذہن نے سائنسی حقائق میں جس تشریح کو جنم دیا ہے یا جس کو صرف نظر کیا ہے اس کی بھی حقیقت لادینیت اور پراگندگی سے ملتی ہے۔ اسی لیے سائنس کی حقیقی برکتوں سے انسانیت کا دامن خالی ہے۔ اسکول و کالج کے طلبا اس کے مضر اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ حقائق کی فراہمی میں جو وسائل اختیار کیے گئے ہیں ان کی کڑیاں عقائد کی درستگی سے متصل نہیں ہوتیں۔ دینی مدارس کے طلباء اپنے دینی علوم کے ساتھ اس میدان کو بھی اپنے لیے ذریعۂ تحصیل بنائیں اور اس میں روز بروز اضافہ کی بھی شکلیں استوار ہوتی جائیں تو وہ سائنس کی غلط تشریحات سے خود بھی محفوظ رہیں گے اور دوسروں کے لیے بھی مفید ثابت ہوں گے۔

دینی تعلیم ایک ایسا ذہن بنانے میں معاون ہے جسے سائنسی کہا جائے۔ سائنس کو لایعنی اور غیر متعلق مباحث سے گریز ہے۔ اسلام بھی اپنی تشریح میں واضح اور غیر مبہم الفاظ کا قائل ہے۔ اسلام نے حقائق کو دو اور دو چار کے الفاظ میں سمجھایا ہے۔ اگرچہ فلسفہ کو اسلام نے غیر پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا لیکن اپنی تشریح میں اس کا انداز غیر فلسفیانہ اور فلسفیانہ طریقۂ بیان کے برخلاف اس کا انداز بیان سائنسی ہے۔ دینی تعلیم کے براہ راست حصول سے ایک ایسا ذہن تشکیل پاتا ہے جسے سائنسی کہا جائے۔ اس لیے یہ بات دینی مدارس کے طلباء کو میسر ہے۔ اس ذہن کا مصرف اگر فلسفیانہ پیچیدگیوں سے بچا کر سائنسی تعلیم کے حصول میں لیا جائے تو وقت کی ایک ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ دینی مدارس کے طلباء کے تحصیل علم کا بھی تقاضا ہے۔ آج مدرسے کے طلباء عموماً فلسفیانہ نوعیت کی تعلیم کی طرف لپکتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے بنتے ہوئے سائنسی ذہن کے لیے تقویت کا سامان فراہم نہ ہو سکا۔ جس کا ایک بڑا حصہ خود انہیں اسلامی تعلیم بھی دینے کے لیے تیار تھا۔

مدارس کے طلباء اگر مدرسہ کی سائنسی تعلیم سے کوئی بڑ[illegible] سائنس داں نہ بھی بن سکیں جب بھی سائنس دانوں میں ان کی ضرورت [illegible] احساس باقی رہے گا۔ سائنس نے آج جتنے مشاہدات و تجربات کو آخری شک[illegible] دے دی ہے، ان کے آخری اور قطعی ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ سائن[illegible] نظریات میں اکثر تبدیلی ہوتی ہے۔ بسا اوقات اساسی اور کلی نظریا[illegible] یک لخت کالعدم قرار پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس میں ڈالٹن ا[illegible] جیسے بڑے سائنس دانوں کا اختلاف ہے۔ نیوٹن اور آئن سٹائن [illegible] اختلاف ہے اور جالینوس اور ہاروے کا اختلاف۔ بسا اوقا[illegible] نظریات ناقص ایجادات و تجربات کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ لیکن قرآ[illegible] فی الاصل سائنس کی کتاب نہیں ہے اس کے نظریات آج بھی حرف آخر [illegible] دینی مدارس کے طلباء کو اس سے رہنمائیاں ملتی ہیں۔ جیسے قرآن میں

"زمین اور آسمان باہم ملے ہوئے تھے۔"

قرآن میں چاند کے لیے مستعار روشنی کا لفظ ہے جب کہ سورج [illegible] ذاتی روشنی کا۔ ان حقائق کو سائنس نے بھی جرح و قدح کے تسلیم کر لیا ہے۔ اسی طرح کی دوسری بہت سی مثالوں میں دینی سائنس دانوں کو بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں۔ اگر دینی ماہرین خود سائنس کے ماہر ہوں تو اور بھی بڑی بات ہے۔

ہندوستان میں علمائے دین اور مدارس دینیہ کی ا[illegible] تعداد ہے پورے ہندوستان میں دینی درسگاہیں جال کی [illegible] ہیں جہاں لاکھوں لاکھ طلباء زیر تعلیم ہیں۔ اگر ان کی ایک تعداد ماہر دین[illegible] ہے تو دوسری تعداد ماہر سائنس بھی۔ آج سائنس وقت کی ایک نا[illegible] بن کر ہمارے سامنے ہے۔ جب ہمارا تشخص اور شناخت ہی ختم [illegible] تو قرآن و حدیث اور فقہی احکامات کہاں نافذ ہوں گے، لیکن ا[illegible] قوانین سے آراستہ ایک ایسی جماعت سامنے آتی ہے جس کا [illegible] سائنسی شعبوں میں بھی ہو تو اس کے نتائج خوش آئند ہوں [illegible] ذ[illegible] یعے سے ہم ملک میں اپنی ایک ضرورت پیش کر کے اس کا [illegible] کی بحالی کی شکل بھی حاصل کر سکیں گے

اصلاح ماحول کے معاملے میں مسلمان اس کا [illegible]

ہے کہ وہ قلبی احساسات کو بھی بدل دے۔ اسے قلب کے تسخیر کی تکلیف
ہیں دی گئی ہے۔ ہاں اس بات کا مکلف ضرور ہے کہ وہ ذہنی ساخت کو
بدل دے۔ سائنسی علوم اور ان علوم کے سائنسی طرز استدلال سے ذہنوں
کی تسخیر یقیناً ممکن ہے اور یہ تسخیر غلبہ و حاکمیت تک جا پہنچتی ہے۔ صحت مند
اخلاقی سانچوں میں ڈھلے افراد کی ایک طرف سائنسی ترقی ہوگی جب کہ دوسری
طرف غیر سائنسی قوتیں مقابلہ آرائی میں ناکام ثابت ہو کر چار و ناچار زیر
ہوتی جائیں گی۔ اس طرح اخلاقی علوم و اقدار کی بالادستی سائنسی وسائل
سے ثابت ہو جائے گی۔ یہی بات شاید ان الفاظ میں کہی گئی ہے ؎

تسخیرِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک

اس کام کو بطریقہ احسن انجام دینے کی زیادہ سے زیادہ امید دینی مدارس
کے طلباء ہی سے کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ اس کام کو تاحدّ آخر خود نہ بھی کریں
جب بھی رہبرانہ کردار یقیناً ادا کرسکتے ہیں۔

ان تفصیلات کا یہ مقصد قطعی نہیں ہے کہ دینی مدارس کو
کوئی ایسا اعلیٰ سائنسی تعلیمی ادارہ بنادیا جائے جہاں تمام تعلیمات تو سائنس
کی ہوں لیکن دینی تعلیم رخصت ہو جائے۔ سائنسی کتابیں اس حد تک داخل
نصاب ہوں جو طلباء کے مطالعاتی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ سائنسی کتابوں
کی زیادتی سے دینی درسی کتابیں متاثر نہ ہوں۔ جو کتابیں اور عملی تجربات
شامل نصاب ہوں اس میں مبادیات سائنس تو بہرحال ہوں لیکن معیار
کے تعین میں سنجیدہ غور کیا جانا ضروری ہے۔ سائنسی کتابوں کو دینی کتابوں
کا ایک حصہ تصور کرتے ہوئے پڑھایا جائے تاکہ متضادانہ نظریات کی پیدائش
کا موقع نہ رہے۔ تدریجاً معیار کو بڑھایا جائے اور آخری درجات
تک اس کا التزام رہے۔ تاکہ سائنس سے مناسبت ختم نہ ہونے پائے
اس سے بعد فراغت تعلیم مدرسہ مزید تحصیل میں آسانی فراہم ہوگی۔ سائنس
کی تعلیم کے لیے سائنس شناس اساتذہ ہی طلباء کے لیے مزاج ساز ثابت
ہو سکتے ہیں۔

مطلوبہ سبھی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر دینی مدارس کے
طلباء کو سائنسی خدمات کی بھی ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے تو وہ نہایت
گراں قدر کام انجام دے سکیں گے۔ کیوں کہ یہ ذمہ داری ان کے حق
کی زیادہ ہے اور حق بہ حق دار رسید کا مصداق۔ اخلاقی فضائل سے
آراستہ افراد کی بالادستی قایم ہوتی ہے تو اس میں پورے معاشرے
کی فلاح ہے۔ نیز ان لوگوں کی بھی جو اخلاقی برتری کو گوارا نہیں کرنا
چاہتے۔ دینی جماعت کی بالادستی میں انہیں بھی مجبوراً اخلاقی فیوض و
برکات سے مستفید ہونا پڑے گا جو ان کے لیے بھی بہتر ہے۔ لیکن اس کے برعکس
اگر غیر اخلاقی اور غیر دینی جماعت کی برتری ثابت ہوتی ہے تو یہ شدید انتشار
و ہلاکت کا باعث ہے۔ مستقبل میں جو ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی! اس وقت
اس غیر اخلاقی اور بے دین سائنس نے جو فتنہ ہائے روز و شب برپا
کیے ہیں وہ ہر ایک کے مشاہدے کی بات ہے۔ ہلاکت کے اس انجام میں
دینی مدارس کا کردار نفع بخش ہو سکتا ہے۔

"پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے
جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور
انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو
علم نہ تھا"

[العلق ۳-۴-۵]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۲۰۔ شی ۵۔ (مئی ۲۰۰۱ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

عبدالمعید فتحپوری القاسمی

افہام و تفہیم کے وہ اصول وضابطے اور انداز وطریقۂ کار جو زمانہ کے مزاج ومذاق سے ہم آہنگ ہوں، وہ کلی طور سے مفید و موثر ہی نہیں بلکہ انسانی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ مخاطب جس ماحول کا پروردہ ہے، اس کی ساخت و پرداخت میں جس سوسائٹی کے اثرات ہیں اس کی رعایت ضروری اور انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ بات بے اثر اور غیر مفید ہوگی۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان، انداز بیان اور طرز استدلال سب کچھ وہی اختیار کیا جس سے اہل عرب مانوس تھے۔ ایک طرف تو اس نے جو کچھ کہا عربی مبین میں کہا، بہترین اسلوب میں اور وقت کی معیاری اور واضح زبان میں کہا تاکہ بات سمجھنے میں عبارت اور طرز بیان کی کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔ دوسری طرف اس نے استدلال کے لیے عقل کے مسلمات، فطرت کے اشارات، آفاق وانفس کے مشاہدات سے کام لیا کیونکہ یہ طرز استدلال بجائے خود تو صحیح، مفید اور کارگر تھا ہی، اس کے علاوہ عرب ذہن کو اس سے ایک خاص مناسبت بھی تھی اور اسی حقیقت کو عملی شکل دینے کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ دعوت وتبلیغ کا انداز وطریقۂ کار ہر شخص کے مزاج وخیال کے مطابق ہونا چاہیے۔ فرمایا:

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ
وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔

یعنی اپنے پروردگار کی راہ پر لوگوں کو حکمت سے یا اچھی نصیحت سے بلانا چاہیے اور جو لوگ جھگڑالو ہیں ان کو انہیں کے طور پر اچھی طرح سمجھانا چاہیے چنانچہ خدا کے اس ارشاد کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت، موعظت جادلہ تینوں طریقوں پر دعوت اسلام کے اصول قائم کیے۔ علمائے [illegible] پاسبان ملت نے ان اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا [illegible]

کا چرچا نہ تھا، لوگوں کے دل سادہ اور خیالات علمی سے صاف تھے تو افہام و تفہیم کا انداز بھی سادہ اور صاف تھا۔ لیکن جب زمانہ بدلا اور وہ دور آیا جس پر حکمت وفلسفہ کی حکمرانی تھی، ذہن ودماغ پر یونانی علوم وفنون کا تسلط تھا تو غور وفکر اور سوچنے سمجھنے کا انداز یکسر بدل گیا، وہی بات قابل توجہ سمجھی جاتی جو حکمت وفلسفہ کی روشنی میں ہو، فلسفیانہ انداز و فلسفیانہ اصطلاحات میں کہی گئی ہو۔ اس وقت علمائے کرام نے علم وحکمت سے کام لیا، حکماء وفلاسفہ کو انہیں کے مزاج ومذاق کے موافق علم وحکمت سے سمجھانا شروع کیا، مذہب اسلام کو علم وحکمت کے عین مطابق ہونا ثابت کیا۔ خدا کے کلام کے حقائق ودقائق اور نکات واسرار کو فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا کہ حکماء وفلاسفہ بھی حیرت میں پڑ گئے۔

اگر اس وقت علمائے کرام اس پہلے ہی طریقہ پر قائم رہتے، علم وحکمت اور فلسفہ جاننے والوں کو عرب وحجاز کے ناخواندہ بدویوں کی طرح ظاہری باتوں کے سمجھانے پر اکتفا کرتے تو غالباً بلکہ یقیناً فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا اور اسلام ان کی نگاہوں میں جہالتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا۔ یہ ہمارے بااقبال اسلاف کا وہ عظیم الشان مجددانہ کارنامہ ہے جو ہمارے لیے قابل فخر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم فخر تو کرتے ہیں لیکن وقت کے تقاضے کے مطابق اس "قابل فخر تقلید" کو نبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

آج سائنس کی حیرت انگیز ایجادات واختراعات واکتشافات نے ذہن کو کچھ ایسے رخ پر ڈال دیا ہے کہ عام طور پر لوگ اور با مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ ہر چیز کو آج کے مشینی وسائنسی دور کے مطابق سمجھنے کا عادی ہو گیا [illegible]

تبدیلی پیدا کریں۔ بحث و استدلال کا وہ انداز اختیار کریں جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہے۔ زمانے کے چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تعلیم و نصاب تعلیم میں اصلاحات و اضافے کریں۔ ورنہ ایک فلسفی کے قول کے مطابق:

"زمانہ ایک تیز تلوار دھار ہے۔ اگر ہم اس کو کاٹنے کی
صلاحیت پیدا نہیں کرتے تو وہ ہمیں خود کاٹ دے گا۔"

زندہ قومیں ہمیشہ اس کا خیال رکھتی ہیں کہ علوم حاضرہ و علوم عصریہ میں ان کا کیا پایہ اور کیا مرتبہ ہے۔ ہمارے علوم و فنون مزاج زمانہ کے مطابق ہیں یا نہیں اس پر ان کی ہمیشہ نظر ہوتی ہے، نصاب تعلیم میں کیا کیا اضافے اور اصلاحات ہوتی رہنا چاہئیں وہ اس کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ ہمیشہ جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ ایک زندہ قوم کی طرح ہمارے اسلاف کی نظر ہمیشہ ان چیزوں پر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طریقۂ تعلیم، علوم درسیہ کی تعین، کتابوں کا انتخاب۔ یہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہی ہیں۔ اسی لیے جب مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے یعقوب کندی حکیم فارابی، بو علی سینا، قطب الدین رازی کے نصابات بدلتے رہے تو آج ہم اپنے دینی مدارس کے قدیم مروجہ نصابات میں حذف و اضافے سے کیوں گھبراتے ہیں۔ نصاب تعلیم کی تنظیم جدید وقت کا ایک اہم مسئلہ ہے، لیکن اس سے جس طرح ہم انحراف کر رہے ہیں یہ وقت کا بہت بڑا المیہ بھی ہے۔ علوم حاضرہ اور سائنس کی اہمیت و افادیت کو کلی طور سے تسلیم کرنے کے باوجود اس سے بے اعتنائی کی ہماری یہ موجودہ روش علمی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

مفید عصری علوم کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کے سلسلے میں اس وقت ہم ایک عظیم تذبذب اور کشمکش کے شکار ہیں، اس تذبذب و کشمکش کی بنیادی وجہ قدیم علوم سے جذباتی و روایتی گہری وابستگی ہے اور یہی چیز عصری علوم کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قدیم علمی ورثے سے وابستگی انتہائی مستحسن و قابل قدر ہے لیکن اس سلسلے میں ہم بے اعتدالی اور افراط کے شکار ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ قدیم علم کلام جو فلسفۂ یونانی کے مقابلے میں ایجاد و مدون ہوا تھا آج تک بعینہ اسی طرح داخل درس ہے۔ حالانکہ جو اعتراضات حال کی تحقیقات سے پیدا ہوئے ہیں ان کا علم کلام میں کوئی حل نہیں ہے کیونکہ علم کلام [illegible] اعتراضات پیدا ہی نہیں ہوئے تھے

مثلاً یونانی آسمان کے وجود کے معترف تھے، صرف خرق و التیام سے ان کو انکار تھا، مسلمانوں کو نزول ملائکہ اور واقعۂ معراج کے اثبات کے لیے خرق و التیام کے امکان کے ثبوت کی ضرورت تھی چنانچہ علم کلام میں یہ امکان ثابت کر دیا گیا لیکن آج سائنسداں سرے سے آسمان کے وجود ہی سے انکار کر رہے ہیں۔ اس لیے اس وقت ہم کو مذہبی حیثیت سے آسمان کے وجود کو ثابت کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں سیکڑوں جگہ آسمان کا ذکر ہے۔ ایسی صورت میں علم کلام کو دانتوں سے پکڑے رہنا اور جدید فلسفہ و سائنس اور اس کے مذہب مخالف نظریات کے رد و ابطال کی طرف کوئی توجہ نہ دینا کہاں کی دانشمندی ہے ـــــ تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ وقت کے تقاضے کو محسوس کریں اور بے اعتدالی کی موجودہ روش سے ہٹ کر ایک ایسا متوازن نصاب تعلیم تیار کریں جس میں حسب ضرورت قدیم و جدید، ابدی و عصری دونوں علوم کی نمائندگی ہو، یعنی ایک ایسا نصاب تعلیم جو دین کے محکمات پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ مفید عصری علوم پر بھی حاوی ہو۔ اس سلسلہ میں زیادہ پس و پیش کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آج جس حالت سے ہم دوچار ہیں، ماضی میں عالم اسلام بعینہ اسی حالت سے دوچار ہو چکا ہے اس وقت کامل علمی و دینی بصیرت رکھنے والے بزرگوں نے جو انداز و طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ انتہائی مفید، نتیجہ خیز اور کارگر ثابت ہوا ہے اور آج وہ ہمارے لیے بہترین مشعل راہ ہے۔ عباسیوں کا اول اول زمانہ تھا کہ فلسفۂ یونانی کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کا طوفان آگیا۔ اکثر فقہاء اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھایا ہی نہ جائے لیکن یہ علاج فطرت انسانی کے خلاف ہونے کی وجہ سے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ آخر علماء نے دوسرا علاج سوچا یعنی فلسفے کے مسائل و مباحث اور اسرار و رموز پر مجتہدانہ بصیرت اور مکمل عبور حاصل کر کے اس کے رد و ابطال کے لیے علم کلام ایجاد کیا۔ اس علاج کے مجوز امام غزالی، امام رازی اور ابن رشد وغیرہ تھے۔ ان کی یہ تدبیر انتہائی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ ان بزرگوں کا یہ مجتہدانہ اقدام ہماری علمی تاریخ کا زریں باب ہے اور آج سائنسی تعلیم کی ترویج و اشاعت اور اس کو پڑھنے و پڑھانے کے سلسلے میں بہترین نمونہ اور مشعل راہ ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم نئے عزم نئے حوصلے اور کامل خندہ علمی کے ساتھ علمی میدان میں پھر قدم رکھیں اور سائنس اور فلسفۂ جدید سے دور رہنے کے بجائے اس کے جگر میں قینچی بنائیں تاکہ رازی و غزالی کی روحیں پھر تازہ ہوں اور ہم وہ علمی مقام حاصل کر سکیں جو خدائی کلام اور آسمانی مذہب کے امین و علمبردار ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ج ۶ ش ۵ (مئی ۱۹۸۷ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی راہ میں دشواریاں

محمد طاہر اعظمی

تعلیم کی اہمیت اور افادیت ایک مسلم حقیقت ہے۔ افراد کی سیرتوں کو نکھارنے، ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے، اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہیں کھولنے کا یہی سب سے موثر ذریعہ ہے۔ جو ملتیں اپنے افراد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتی ہیں اور اس کے لیے بہتر انتظامات کرتی ہیں وہ ترقی کے راستے پر گامزن ہوتی ہیں اور جو قومیں اس سلسلے میں غفلت کوشی اور کوتاہی کا مظاہرہ کرتی ہیں انحطاط اور پستی کے قعر مذلت میں انہیں گرنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اور نہ صرف یہ کہ زندگی کے تقاضے میں وہ دیگر اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہیں، بلکہ اپنے ماضی سے غافل اور اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہمہ جہتی پسماندگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ خاص طور سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ عہد میں تو تعلیم و تربیت کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔ آج تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقوام کچل کر رکھ دی جاتی ہیں اور دوسروں کی تابع اور دست نگر بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

اسلام اور تعلیم:- تعلیم کی اسی اہمیت کی وجہ سے اسلام نے اسے بہت اونچا مقام دیا ہے۔ قرآن مجید کا پہلا لفظ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا وہ لفظ "اِقرأ" ہے جس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ابتدائی آیات ہی میں بطور خاص قلم کا ذکر ہے جو حصول علم کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اسلام پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا نام ہے اور ظاہر ہے علم کے بغیر عمل کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے نزدیک تعلیم انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کی سات سو آیات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور متعدد آیات میں علماء کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ سورہ آل عمران میں فرشتوں اور خود ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اہل علم کی شہادت وحدانیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

> "اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے" (آل عمران ۱۸)

سورہ الزمر میں اہل علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

> "ان سے پوچھو کیا اہل علم اور علم سے بے بہرہ دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو صرف عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔" [الزمر ۹]

متعدد احادیث میں علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فہم عطا کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

> "جو شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔" (مسلم)

تعلیم و تربیت اسلام کی نگاہ میں کارِ عبادت ہے اور تعلیم و تدریس میں مشغول استاذ و شاگرد کارِ عبادت میں مصروف اور ساجد و ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسلام کی انہی تعلیمات کا ثمرہ تھا کہ ابتدائی

کی غیر متمدن آبادی جو علمی میدان میں اقوام عالم سے پیچھے تھی، دائرۂ اسلام
میں داخل ہونے کے بعد، اس کے اندر ایسی تبدیلی رونما ہوئی اور اتنے ذوق و
شوق کے ساتھ علوم و فنون کو اس نے حاصل کیا کہ علمی میدان میں امامت و
قیادت کے مقام پر فائز ہو گئی۔

اسلام کا تصور تعلیم:۔ اسلام میں تعلیم و تربیت کی اہمیت کی
وضاحت کے بعد اسلامی تصور تعلیم کی توضیح بھی ضروری ہے۔ مغرب کی لادینی
اور مادی تہذیب میں تعلیم کا مفہوم اور تصور محض یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون
کی معلومات حاصل کر لی جائیں۔ مختلف امتحانات پاس کر کے اسناد
جمع کر لی جائیں تاکہ اچھی ملازمت اور عمدہ روزگار مل سکے اور عیش و عشرت
کی زندگی بسر ہو سکے۔ اس تہذیب میں زندگی کا تصور خالص مادی ہے اور
موت کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کامیابی کا مفہوم اس تہذیب
میں صرف دنیوی زندگی تک محدود ہے جب کہ اسلام کے نزدیک اصل
زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیوی زندگی محض آزمائش کے لیے ہے۔ جہاں
اس بات کا امتحان ہو رہا ہے کہ انسان کس حد تک اپنے خالق کی اطاعت و
فرمانبرداری کرتا ہے۔ اُخروی زندگی کی کامیابی اسی اطاعت و فرمانبرداری
پر موقوف ہے۔ اس لیے اسلام کا تصور تعلیم یہ ہے کہ انسان کو اس
طریقے سے علم سے آراستہ کیا جائے کہ اسے اپنے خالق کی معرفت حاصل
ہو جائے اور وہ کائنات میں اپنے صحیح مقام و مرتبے کو پہچان سکے۔ زندگی
اور تعلیم کا یہ تصور انسان کی عقل محدود سے ماوراء ہے۔ چنانچہ خالق کائنات
نے اپنی کرم نوازی سے بذریعہ وحی یہ تعلیم دی جو انبیائے کرام کے توسط سے
انسان کو ملی۔

ہندوستان میں مسلم اداروں کے قیام کا پس منظر:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمان
شدید خطرات سے دو چار ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا خطرہ جس کا انہیں
سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ ان کے ملی تشخص اور تہذیبی ورثے کو ختم کر دینے
اور ماضی سے ان کی نئی نسلوں کا رشتہ کاٹ دینے کی منظم کوشش فرنگی
سامراج کے ہاتھوں شروع ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اقتدار سے محرومی
کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا لیکن
ملت کے اندر احساس زیاں باقی تھا، کچھ درد مند اٹھے، ملت نے
ساتھ دیا اور دیوبند میں قدیم طرز کا ایک مدرسہ اور علی گڑھ میں جدید
طرز کا ایک اسکول قایم ہوا اور پھر یہ تعلیمی تحریک آگے بڑھتی رہی اور
رفتہ رفتہ پورے ملک میں مدارس اور اسکولوں کا ایک جال بچھ گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے
سلسلے میں یہی دو مکاتب فکر پیدا ہوئے، ان میں سے اوّل الذکر نے
اگرچہ تحفظ دین اور حمایت عقاید اسلامی کی خدمت کس حد تک انجام دی
تاہم اس نے مسلمانوں کو جدید علوم سے دور رہنے کا مشورہ دینے کی
زبردست غلطی کی۔ دوسری طرف سرسید احمد خاںؒ مرحوم نے علی گڑھ میں
جس مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی، اس نے اگرچہ مسلمانوں کو جدید علوم
سے آشنا کیا لیکن اسلامیات کو کماحقہ اہمیت نہ دینے کی وجہ سے ایک
ایسا نظام تعلیم وجود میں آیا، جس کا مقصد صرف حصول معاش اور معاشرت
میں مغرب کی نقل قرار پایا۔

دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان جو فاصلہ تھا اسے ختم کرنے اور
جدید و قدیم علوم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ندوۃ اور
جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا لیکن دونوں اس مقصد کے حصول میں ناکام
رہے۔ جامعہ ملیہ میں اگرچہ جدید علوم کو غلبہ حاصل ہوا تو ندوۃ نے اس کی
طرف سے بے اعتنائی کا ثبوت دیا اور مسلمانوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی
کہ ان کے ادارے دین و دنیا کی تعلیمی ضرورتوں کو بیک وقت توازن
کے ساتھ پورا کریں۔

البتہ اس سلسلے میں جامعۃ الفلاح (بلریا گنج، اعظم گڑھ یوپی) کا
نام لیا جا سکتا ہے کہ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے ابتدائی کوشش
کی ہے اور ایک ایسے نصاب تعلیم پر عمل کی تدریج کوشش کر رہا ہے
جو جدید و قدیم علوم کا سنگم اور بہترین امتزاج ہو۔ چنانچہ جامعۃ الفلاح
میں اسلامیات کے ساتھ ساتھ، مبادی سائنس، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ
کے علاوہ B.A. کے مساوی انگریزی، پولیٹیکل سائنس اور معاشیات
داخل نصاب ہے اور اس سلسلے میں مزید پیش رفت جاری ہے۔
دردمندان ملت کا بھرپور تعاون اگر اس ادارے کو حاصل رہا تو
انشاء اللہ مستقبل قریب میں یہ ادارہ ملت کی دیرینہ آرزو کی تکمیل
کا ذریعہ بن سکے گا۔

سائنس آثارِ فطرت کے مشاہدے اور قوانینِ فطرت کی دریافت کا نام ہے۔ کائنات کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے جو کھلی ہوئی کتاب انسانوں کے سامنے رکھ دی ہے انسان سائنس ہی کے ذریعے اس کتاب کو کما حقہ پڑھنے کے لائق ہوتا ہے۔ سائنس خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ شاید یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت لطیف اشارہ کر رہی ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۲۸)

[بے شک خدا سے اس کے ذی علم بندے ہی ڈرتے ہیں]

عصر حاضر میں سائنسی تعلیم کی اہمیت و افادیت اور مسلمانوں کی اس سے غفلت کی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب لکھتے ہیں:

دورِ حاضر میں سائنس سے بے تعلقی کسی قوم کی ذہنی موت کے مماثل ہے، ماضی بعید میں جس قوم نے سائنس کی اس درجہ سرپرستی کی ہو کہ تقریباً ۵، ۶ سو سال تک پوری دنیائے انسانیت پر اس کی علمی برتری کا پرچم لہراتا رہا ہو اور دنیا کی تمام قوموں نے سائنس اور اس سے متعلق فنون کا مدتوں تک جس سے درس حاصل کیا، آج ہندوستان میں اس کی نوجوان نسلوں کے لیے افسوس کا مقام ہے کہ سائنس کی تعلیم کا حصول اس کے لیے ایک مسئلہ لاینحل بن جائے، ہندوستان کو چھوڑیے پوری دنیائے اسلام پر نظر ڈالیے تو وہاں بھی اسی اندوہناک صورتحال سے آپ دوچار ہوں گے۔۔۔۔

مسلم ملکوں میں کسی طرح کی فنی مہارت نہیں ابھر رہی ہے، وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن غلامانہ اور تاجرانہ ہے اور سائنس کی تعلیم کے لیے جس جگر کاوی مشقت اور جس صعوبت ریاضی کی ضرورت ہے اس کا ہم اپنی نئی نسلوں کو عادی نہیں بنا سکے ہیں۔"

(ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیمی مستقبل ڈاکٹر سید عبدالباری، ماہنامہ زندگی)

لیکن سائنسی تعلیم کی اس اہمیت اور افادیت کے باوجود مدارس اسلامیہ کی اس کی طرف سے بے اعتنائی قابل افسوس ہے۔ ان مدارس میں معقولات کے دور از کار مباحث اور فقہی و اصولی موشگافیوں کے لیے تو کافی گنجائش ہے لیکن سائنس اور ریاضی جیسے مفید علوم کے لیے ان کا دامن تنگ ہے اور یہ بات صرف سائنس اور ریاضی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام جدید علوم کے ساتھ مدارس کا یہی رویہ ہے، الا ماشاء اللہ۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس ایسے فارغین پیدا کرنے سے قاصر ہیں جو موجودہ دور میں اسلام کی صحیح اور مناسب ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ مدارس اسلامیہ کے فضلاء عصر حاضر کے فتنوں اور تحریکوں سے ناواقف، جدید معیار تحقیق و تنقید سے ناآشنا اور تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر کے جدید اسالیب سے نابلد ہونے کی وجہ سے اسلامی عقاید و تصورات کی کما حقہ حمایت اور غیر اسلامی نظریات و افکار پر علمی تنقید کا کام کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے احساسات قابل ذکر ہیں، لکھتے ہیں:

"عیسائی سنائندوں کی استعداد، صلاحیت اور انداز بحث و گفتگو خاص طور سے ہمارے مذہبی حلقے کے لیے قابل غور ہے۔ راقم الحروف کو خود کئی بار بین المذاہب کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے اور ہر مرتبہ یہی احساس ہوا کہ ہمارے مذہبی رہنما دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے مقابلے میں، نہ صرف عصر حاضر کے علوم سے کم واقف ہیں بلکہ تحقیق کے جدید معیار اور تعبیر کے نئے انداز سے بھی زیادہ باخبر نہیں ہیں اور اکثر مواقع پر علماء کے بجائے اسلام کی وکالت یونیورسٹیوں کے پروفیسروں ہی کو کرنی پڑی۔ یہ صورت حال مذہبی مدارس کے لیے قابل غور ہے نصاب و نظام تعلیم میں ضروری تبدیلیوں کے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے" (معارف، اگست ۱۹۸۴ء ص ۱۲۴)

مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم نے جس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی اس پر ذمہ داران مدارس اسلامیہ کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور نصاب و نظام تعلیم میں مطلوبہ تبدیلیوں کے لیے تیار ہونا چاہیے تاکہ یہ ادارے اسلام کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد

ثابت ہو سکیں۔

سائنس کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کے بعد آیئے ان دشواریوں کا جائزہ لیا جائے جو مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں۔

دشواریاں:

۱۔ مناسب نصاب تعلیم کا فقدان۔ مدارس کے لیے سائنس کے ایک ایسے نصاب کی ضرورت ہے جو اسلام کے تصورات اس کے مزاج اور اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو، جب کہ دستیاب نصاب اس پہلو سے اپنے اندر خامی رکھتا ہے۔ موجودہ سائنس کائنات کی گتھی کو خالق کائنات کے بغیر حل کرنا چاہتی ہے اور انسان کو معقولات سے دور کرکے صرف محسوسات کا غلام بنانا چاہتی ہے۔ لہٰذا سائنس کا ایک ایسا نصاب جو قرآنی نقطہ نظر سے مرتب کیا گیا ہو، مدارس اسلامیہ میں سائنس کی ترویج کے لیے ایک بنیادی اور اولین ضرورت ہے۔

۲۔ لائق اساتذہ اور وسایل تدریس کی فراہمی:

اس سلسلے میں ایک دشواری لائق اساتذہ اور وسائل تدریس کی فراہمی کی ہے۔ جہاں تک اساتذہ کا مسئلہ ہے اس سلسلے میں یہ بات باعث مسرت ہے کہ "مرکز فروغ سائنس" دینی مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کا اہتمام کرے گا، اس طرح یہ مشکل حل ہو جائے گی اور جہاں تک وسایل کی بات ہے تو ملت میں اہل خیر حضرات کی کمی نہیں ہے اگر اپنے حسن کارکردگی سے ان کو اعتماد میں لیا جا سکے تو یہ مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا ہے۔

۳۔ اندیشے اور خدشات

جب مدارس میں سائنسی تعلیم یا دیگر عصری علوم کو شامل کرنے کی بات آتی ہے تو اس سلسلے میں مختلف قسم کے خدشات اور اندیشوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور بعض کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگتا ہے حالاں کہ اگر تجربہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اندیشے بے بنیاد ہیں۔

الف۔ ایک خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو اسلامیات کا عنصر مغلوب ہو جائے گا اور اس طرح دینی مدارس کا بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا۔ [illegible]

یہ خدشہ بالکل بے بنیاد ہے۔ ابتدائی اور ثانوی درجات میں اگر ناظرہ، اسلامیات، اردو زبان وغیرہ کے ساتھ سائنس اور ریاضی کو شامل نصاب کر لیا جائے تو اسلامیات کا عنصر مغلوب کیسے ہو جائے گا؟ اور جہاں تک عربی درجات کا سوال ہے تو کوئی شخص یہ نہیں کہتا ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ اسلامی اور سیرت و تاریخ اسلام جیسے اہم مضامین کی گھنٹیاں کم کر دی جائیں بلکہ بات صرف اتنی کہی جا رہی ہے کہ اسلامیات کو اساسی حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے اور اس کا مکمل طور سے تحفظ کرتے ہوئے عصری علوم کے لیے گنجائش نکالی جائے اور وہ اس طرح کی معقولات کی از کار رفتہ بحثوں کو خارج کر دیا جائے اور عربی قواعد کی تدریس کے فلسفیانہ طرز کو ترک کر دیا جائے اور طریقہ تدریس میں تبدیلی کی جائے تو بہت آسانی کے ساتھ عصری علوم کے لیے خاطر خواہ گنجائش نکل آئے گی۔ اب اگر کوئی شخص معقولات کی فرسودہ بحثوں یا نحو و صرف کی فلسفیانہ کتابوں اور فقہی اور اصولی موشگافیوں ہی کو اسلامیات سمجھتا ہے تو یہ اس کی کج فکری ہے۔

ب۔ ایک خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان علوم کو شامل کرنے کی وجہ سے طالب علم کی شخصیت پر بہت بار پڑ جائے گا اور وہ طلب السکل فوت الکل کا مصداق بن جائے گا۔

یہ خدشہ اس لیے غلط ہے کہ دینی مدارس سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلامیات کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے بھی ماہرین پیدا کریں۔ بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو عصری علوم سے ضروری حد تک روشناس کرا دیا جائے تاکہ وہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور جن فارغین کو دلچسپی ہو وہ مزید تعلیم حاصل کر سکیں اس ضمن میں ایک دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو "طلب الکل فوت الکل" کہہ کر عصری علوم کو شامل نصاب کرنے کی تجویز کی پرزور مخالفت کی جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک طالب علم کو بیک وقت، مفسر، محدث اور فقیہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہیں بن پاتا حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ایک خاص مرحلے تک تمام ضروری علوم کی تدریس کے بعد مختلف شعبہ ہائے تخصص کا انتظام ہو، جن میں طلبا اپنے ذوق اور دلچسپی کے مطابق داخلہ لیں اور کسی ایک فن میں ماہرانہ صلاحیت پیدا کریں۔

ج۔ ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر سائنس کو مدارس

میں داخل کیا گیا تو اس کی وجہ سے الحاد و دہریت کا زہر مدرسوں میں داخل ہو جائے گا۔

یہ اندیشہ صحیح نہیں ہے۔ توقع تو اس بات کی ہے کہ سائنس کے ذریعے ایمان کو اور بالیدگی حاصل ہو گی۔ دوران کانفرنس ذمہ داران کی جانب سے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ مدارس کے لیے سائنس کے نصاب کی تیاری کا کام "مرکز فروغ سائنس" انجام دے گا اور وہ نصاب اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ہو گا۔ لہٰذا اس خدشے کے باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۴۔ ذمہ داران مدارس اسلامیہ کی سائنسی تعلیم کی اہمیت سے بے اعتنائی:

میرے خیال میں سب سے بڑی دشواری جس پر تمام دیگر دشواریوں کا حل موقوف ہے وہ یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے ارباب حل و عقد سائنسی تعلیم کی اہمیت کا پورا احساس نہیں رکھتے۔ اگر یہ احساس پیدا ہو جائے تو تمام دشواریوں کا ازالہ ممکن ہے۔ کیوں کہ سچے احساس کے بعد سنجیدہ کوشش ناگزیر ہے اور سنجیدہ کوشش کے سامنے دشواریوں کا باقی رہنا محال ہے۔ اس ضمن میں یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کے نظریے پر کاری ضرب لگائی جائے۔ کیوں کہ موجودہ اندوہناک صورت حال کا اصل سبب یہی نظریہ ہے۔ آج سے ۴۶ سال قبل دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک مقالہ پیش کیا تھا جس میں نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انقلابی اصلاح کی دعوت دی تھی اور ایک نئے نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا تھا جس کی پہلی خصوصیت مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے:

> "سب سے پہلی چیز جو اس نئے نظام میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں تقسیم کرنا، دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے اور یہ تصور بنیادی طور پر ایک غیر اسلامی تصور ہے۔" (تعلیمات ص ۴۹)

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ آج سے برسوں پہلے مولانا مودودی نے جو دعوت دی تھی اور نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کو جس مدلل انداز میں واضح کیا تھا آج تک سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ مولانا کے معتقدین نے بھی اس ضمن میں کوئی قابل ذکر اقدام نہیں کیا۔ دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نظریہ اب بھی رائج اور زیر عمل ہے اور مدارس کی تعلیمی گاڑی جس پٹری پر چل رہی تھی، اس سے اترنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مدارس اسلامیہ کے ایک وفاقی بورڈ کی ضرورت:

ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سیکڑوں مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے مختلف خطوط پر یہ مدارس چل رہے ہیں۔ نہ تو آپس میں گہرے روابط کا کوئی شکل ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی ذریعہ۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ تمام مدارس اسلامیہ کا ایک وفاقی بورڈ تشکیل دیا جائے جس کے ذریعے تمام مدارس کو ایک لڑی میں پرونے، ان کے درمیان یکسانیت پیدا کرنے اور باہمی تعاون کے ذریعے مسائل کے حل کا کام انجام دیا جائے۔ مدارس کی ترقی اور استحکام کے لیے اس طرح کے ایک مضبوط ادارے کا قیام اشد ضروری ہے لیکن ظاہر ہے اس کے لیے گروہی، جماعتی اور مسلکی تعصبات سے اوپر اٹھ کر ملت کے وسیع تر مفاد کو اپنے سامنے رکھنا ہو گا۔

نصاب تعلیم اور مدارس کا ارتقاء:

یہ حقیقت ذہنوں میں بالکل واضح ہونی چاہیے کہ کوئی نصاب یا نظام تعلیم بجائے خود مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے احوال زمانہ کے مطابق اپنی اساسی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے نصاب میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پسماندگی کا بڑا سبب دراصل یہی ہے کہ انہوں نے برسوں پرانے نصاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا ہے۔ اس کی افادیت یا عدم افادیت پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی امامت کا منصب ان سے چھن گیا اور اس پر وہ اقوام فائز ہو گئیں جو علمی میدان میں ان سے آگے ہیں۔ مسلمانوں کی اس حالت کا نقشہ

ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب نے بڑے موثر انداز میں اس طرح کھینچا ہے:

"تاریخ انسانی کے اس عبرت ناک المیہ یعنی ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے علمی زوال اور حیرت ناک علمی پسماندگی پر نگاہ ڈالیے تو اگر حساس انسان ہیں تو آپ کی آنکھوں کے پیمانے لبریز اور دل کا ساغر چکنا چور ہو جائے گا اور آپ کو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ کوئی بھی انسانی گروہ جب اپنی اصل اور اساس سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے تو تباہی اور ذلت کے قعر مذلت میں گرنے سے اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اس موقع پر میرے ذہن کے افق پر اسلام کی تاریخ کے ابتدائی ادوار کے وہ تابناک چہرے اور حرکت و انقلاب سے بھرپور پیکر ابھرتے ہیں، جنھوں نے اپنی روشن ضمیری اور عالی دماغی سے انسانی تہذیب و تاریخ کے قافلوں کی امامت کی تھی، میں سوچتا ہوں کہ وہ ملت جس نے مملکت اسپین کے مراکز علم، قرطبہ و سالرنو میں مغرب کو سائنس کا پہلا سبق دیا تھا اور جس کے علمی ذوق و تجسس کا یہ عالم تھا کہ اس نے ۷۵۰ء سے ۱۲۵۰ء تک ۵ سو سال کی مدت میں رازی، عطار، غزالی، مسعودی، ابوالوفار، البیرونی، بوعلی سینا، ابن الہیثم، ابن رشد، طوسی اور ابن نفیس جیسے بے شمار مفکر، فلسفی، سائنس داں اور مورخ پیدا کیے اور بقول پروفیسر عبدالسلام "مغرب نے اپنی درسگاہوں میں علم کی شمعیں ان قندیلوں سے جلائیں جو عالم اسلام میں روشن تھیں" اس ملت کو زوال و انحطاط کے یہ دن بھی دیکھنے پڑے کہ اس نے علوم دینی و علوم دنیاوی کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور کچھ دنوں تک دنیا کے سامنے تقریباً آنکھیں بند کیے ہوئے، انہیں لکیر [illegible] کو [illegible] کے بزنگ علم و دانش کے میدان میں چھوڑ گئے تھے، سائنس اور علوم دنیا سے بھی ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا اور دین بھی فقہی موشگافیوں اور منطقی بحثوں میں الجھ کر اپنی انقلابی صلاحیت کھو بیٹھا اور زندگی کے تنگ و تاریک دائروں میں محدود ہو کر رہ گیا، اور یہ بات ذہنوں سے محو ہو گئی کہ علم و حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں کے علمی زوال اور ذہنی انتشار کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ خدا نے مغرب کو قیادت و امامت کے منصب پر فائز کر دیا اس لیے کہ انہوں نے فطرت کی قوتوں پر قابو حاصل کیے ان سے بنی نوع انسان کی تمدنی زندگی کو دلکش بنانے کی کوشش کی اور مشرق اپنے بوسیدہ جبہ و دستار کی پیوند کاری میں معروف رہا۔"

(زندگی۔ جنوری ۸۰ء ص ۳۲-۳۴)

خدا کا شکر ہے امت کے اندر بیداری پیدا ہو رہی ہے اور اہل علم و دانش تعلیمی پستی کے اسباب و عوامل پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ آخر میں میں "مرکز فروغ سائنس" کے ذمہ داروں کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے وقت کے اہم موضوع پر کانفرنس کا اہتمام کر کے ایک اچھے سلسلے کا آغاز کیا ہے جس کے لیے وہ پوری ملت کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بار آور کرے۔

> اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے، اس کو خدا کے یہاں پا لو گے۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھتا ہے۔
>
> —سورۃ البقرۃ ۱۱۰—

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کیلئے لائحہ عمل

محمد اسلم پرویز

میں نے اس کانفرنس کے لیے جو مقالہ تیار کیا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں میں نے دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصے میں ان عملی اقدامات کا ذکر کیا ہے جو کہ اس عظیم مقصد کی بازیابی کے لیے ضروری ہوں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ گذشتہ پانچ نشستوں میں جو مقالات پیش کیے گئے ان میں ہمارے فاضل فہر کا ہے نے دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت کو روز روشن کی طرح عیاں اور واضح کردیا۔ قابل مبارکباد ہیں یہ سب ہی حضرات کہ انھوں نے کس باریک بینی، بالغ النظری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائنسی علوم کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ وہ اُن کے استقبال کے لیے تیار اور ان کو رائج کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ میرے جیسا کوئی سائنس کا طالب علم اگر سائنس کی اہمیت اور افادیت بیان کرے تو ایک عام اور متوقع بات ہے لیکن اگر یہ پیش رفت ان اصحاب کی طرف سے ہو جن تک ہم یہ پیغام لے جانا چاہتے ہیں تو میری نظر میں یہ نہایت مبارک فال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرکز فروغ سائنس کے پیغام کی اس سے بہتر پذیرائی نہیں ہو سکتی تھی۔

آپ کا وقت قیمتی ہے۔ لہذا میں اپنے مقالے کے پہلے حصہ کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کے ہر پہلو پر بخوبی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سائنسی تعلیم کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے سامنے پہلا مسئلہ یہ آتا ہے کہ کس نوعیت کی سائنسی تعلیم ان مدرسوں میں فروغ دی جائے کہ [illegible] میں وہی روایتی تعلیم رائج ہو جو ہمارے سائنسی اسکولوں میں ہوتی ہے یا پھر صرف اس کا عملی پہلو ہی لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال ہمارے دینی مدارس روایتی تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ہم کو عملی سائنس کے ماڈل کو چننا ہوگا جس کے تحت نہ صرف یہ کہ وہ سائنس سے واقف ہوں بلکہ اس کی مدد سے اپنا کچھ روزگار بھی چلا سکیں۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کے لیے روزگار کے مواقع کتنے مفقود ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے لیے مناسب روزگار کا بھی انتظام ہو سکے تو اس سے دینی تعلیم کی تبلیغ و فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی بلکہ دینی مدارس کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں میری کچھ تجاویز اور پلان ہیں جو میں آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ دینی مدارس میں تعلیم کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بنیادی سطح پر جو تعلیم دی جائے اس میں سائنسی علوم لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہوں اور ان میں ہم جنرل سائنس اور ریاضی کو دو مضامین کی حیثیت سے لے سکتے ہیں۔ جنرل سائنس میں طلباء کو سائنس کی بنیادی باتوں اور اصولوں سے ان کے گرد و پیش کے پس منظر کے ساتھ روشناس کرایا جائے۔ یہ کام اس طرح ہونا چاہیے کہ بچے اپنے چاروں طرف پائی جانے والی چیزوں کی حقیقت دیکھ کر ان سے واقف ہو سکے تاکہ ان میں نہ صرف مشاہدے کی قوت بلکہ تجربے کی صلاحیت بھی پیدا ہو۔ اس بنیادی تعلیم کے بعد ہم طالب علم کے سامنے دو راستے رکھیں گے۔ اگر وہ دینی تعلیم ہی کو مکمل حاصل کرنا چاہتا ہے تو [illegible] کے بعد [illegible]

تذہ کا بھی یہ کام ہوگا کہ جو بچے دینی تعلیم کے لیے زیادہ کوشاں اور
دں ہوں، اس کی رہنمائی اس سمت میں کی جائے۔ اس طرح فارغ التحصیل
نے والے طلباء میں سے ہم کو مبلغ، عالم، خطیب، امام حضرات اور
مجاہدین دین ملیں گے، جن کی کاوشیں دین کی تبلیغ و ترویج میں مددگار
ں گی۔ بنیادی سطح کی تعلیم کے بعد دوسرا راستہ ان طلباء کے لیے ہوگا
ینی تعلیم کے ساتھ کوئی ایسا دنیاوی علم و ہنر سیکھنا چاہیں گے جو ان
باعزت روزگار فراہم کرسکے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان
ء کو ہم اپنے دیگر اسکولوں میں مروج اعلیٰ نصاب سائنس سے روشناس
ئیں یا ان کو عملی کام یا پالی ٹیکنک کے انداز کا سکھایا جائے۔ یہاں یہ
ھتا ہوں کہ اگر ان کو روایتی سائنسی نصاب میں تعلیم دی جائے" جیسا کہ کچھ
ضل مقالہ نگاروں کی رائے ہے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہائی اسکول یا
ر کی سطح کی سائنسی تعلیم کا اگر ہم نے انتظام کر بھی دیا تو اس تعلیم کے بعد
ہوگا؟ کون سا کالج یا یونیورسٹی ان طلبا کو لے گی؟ علاوہ ازیں اس
ہاب تعلیم کو اپنانے میں کئی اور دشواریاں آئیں گی۔ ہمارے زیادہ تر
یا معاشی طور سے کمزور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اکثریت قصبات
ر دیہات میں ہے جہاں حد سے حد اسٹر تک کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے
ان طلبا سے یہ امید نہیں کرسکتے کہ یہ دوسرے شہروں میں جاکر
یم حاصل کرنے کے متحمل ہوں گے۔ اس کے علاوہ چوں کہ ان مدارس
ں داخلے کے واسطے عموماً عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اس لیے یہاں سے فارغ
با اُس عمر کے دائرے میں نہیں آئیں گے جن کو کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ
ملے۔ اگر بفرض محال کسی طرح یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ان کو داخلہ
ل جائے گا تو ان کی تعلیم و تربیت دوسرے قسم کے ماحول میں اُر
دو زبان میں ہوئی ہوگی، اس لیے یہ کالج میں ہونے والی انگریزی
لیم اور اس کی سطح کے مطابق اپنے آپ کو نہ پاکر نہ صرف یہ کہ احساس
تری کا شکار ہو جائیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ اُن میں منفی رجحانات بھی پیدا
و جائیں اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے جس کا مختلف انداز سے بیان
ر ہو چکا ہے کہ ہمارے پاس وسائل کی فی الحال اتنی کمی ہے کہ ہم اس
لسد سے کی ... سائنسی ... کو انٹر یا ہائی اسکول کا نصاب پڑھانے
لیے نہیں ... اس پس منظر میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روایتی

ہائی اسکول اور انٹر کی سائنس ہمارے مدرسوں کے لیے فی الحال غیر ضروری
ہے۔ چونکہ معاشی صورت حال کا روزگار سے گہرا تعلق ہے، اس لیے اگر
ہم سائنسی تعلیم و تربیت کو روزگار سے جوڑ سکیں تو یہ دوہری خدمت
ہوگی جس سے بیک وقت دو مسائل حل ہوں گے۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں
کہ ہم اپنی دوسری سطح کی سائنسی تعلیم کو صرف عملی شکل دیں۔ یعنی ان
طلباء کو مختلف قسم کے ایسے ہنر سکھائے جائیں جو اُن کے علاقوں میں ان
کے لیے مفید ہوں۔ مثال کے طور پر آلات زراعت کی مرمت جن میں
عام اور مشینی ہل، تیل، اور بجلی کے پمپ اور ٹریکٹر دیہاتوں میں عام
ہیں۔ اس کے علاوہ اسکوٹر، موٹر سائیکل مرمت ریڈیو اور ٹیلی ویژن
میکینک کے کام کے علاوہ گھریلو صنعت اور دست کاری کا کام بھی ان کو
سکھایا جاسکتا ہے۔

ان راہوں کا تعین کرنے کے بعد دوسرا مسئلہ نصاب اور اساتذہ
کا آتا ہے۔ بنیادی سطح کی سائنس کے لیے بھی یہ عرض کروں گا کہ NCERT
کی کتابوں کے بجائے اس مقصد کے لیے الگ کتابیں تیار کی جائیں کیوں کہ
NCERT کی کتابوں کا پس منظر دوسرا ہے۔ وہ اس نظام تعلیم کے لیے
تیار کی گئی ہیں جو کہ کم از کم بارہ سال تک چلتا ہے جب کہ ہماری بنیادی تعلیم
حد سے حد تک آٹھویں درجے تک کی ہوگی۔ علاوہ ازیں ہمارے مدارس
کی کتابوں میں قدرت کی صناعی کی تفصیل کے ساتھ قادر مطلق کا بیان بھی
ہونا چاہیے۔ تاکہ نہ صرف یہ کہ بچے کا ذہن دو حصوں میں تقسیم نہ ہو بلکہ اس
کو معبود حقیقی کی قدرت کو پہچاننے اور سمجھنے کا بہتر موقع ملے۔ اس سطح
کی تعلیم کے لیے ہر بالغ النظر معلم کو چند ماہ کی تربیت کے بعد تیار کیا جاسکتا
ہے اور اس طرح کا انتظام مجھے یقین ہے کہ مرکز فروغ سائنس اور علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی کے زیر نگرانی ہوسکتا ہے۔ دوسری سطح پر جو تربیتی نصاب
استعمال ہوگا اس کی تیاری بھی ہم کو اس طرح کرنی ہے کہ ہر اہم اور متعلقہ
ہنر کی کتاب عام فہم اردو زبان میں دستیاب ہو۔

اب سوال تربیت کا آتا ہے۔ اس کے لیے میرے پاس کچھ تجاویز ہیں
ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ ہر اہم علاقے میں جہاں ایسے طالب علموں کی خاصی
تعداد ہو، وہاں پر متعلقہ آبادی اور اہل خیر کی مدد سے ایسے تربیتی مراکز
کھولے جائیں جہاں نہ صرف یہ کہ تربیت دی جائے بلکہ ان مراکز کا تعلق

استعمال بھی ہو۔ مثلاً اگر گھڑیوں کی مرمت کی تربیت گاہ بنے تو وہاں نہ صرف یہ کہ طلباء کو گھڑیوں کی مرمت سکھائی جائے بلکہ وہاں کے رہنے والوں کی گھڑیاں مناسب اجرت پر درست کی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے علاقوں میں جو ورکشاپ اور نجی مراکز پہلے سے قایم ہیں، ان کے مالکان سے رابطہ قایم کر کے ایک ایک دو دو طالب علم کو تربیت کی غرض سے وہاں لگا دیا جائے جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ Apprenticeship کا ماڈل ہے جس کا استعمال آج ہر بڑی کمپنی کرتی ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے تربیتی مراکز علی گڑھ اور دیگر اُن اداروں میں کھولے جائیں جو اس سے متفق ہوں ان مراکز میں صرف دینی مدارس سے آئے طلباء کی تربیت کا اہتمام ہو۔

تیسرا اہم مسئلہ وسائل کا ہے۔ وسائل و ذرایع کی ضرورت ہم کو ہر ہر قدم پر ہو گی اور اس سلسلے میں، مَیں نے کچھ ذہنی اور کچھ عملی کاوشیں کی ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نصاب بنیادی سطح کا ہو یا اعلیٰ درجات کا، اس سے متعلق کتابیں ہم کو آسان اردو زبان میں طلباء کو فراہم کرنا ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو ان دیگر اداروں کے وسائل اور تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو اردو کے فروغ کا کام کر رہے ہیں۔ میرا اشارہ خاص طور سے ترقی اردو بیورو کی طرف ہے۔ یہ ادارہ اردو میں نصابی اور غیر نصابی کتابوں کی تیاری پر کثیر رقم صرف کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے ہر سائنسی مضمون کی اردو میں لغات تیار کی ہیں اور یہ کام ابھی جاری ہے۔ ایسی ہی ایک کمیٹی سے میں وابستہ ہوں اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ محض کاغذی کارروائی یا خانہ پُری نہیں ہے بلکہ صدقِ دل سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اردو کے ذریعے سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے بھی یہ ادارہ کوشاں ہے۔ اس ماہ کی ۱۹ اور ۲۰ تاریخ کو نئی دہلی میں اسی ادارے کے زیر انتظام ایک سمینار کا انعقاد ہوا تھا جس کا موضوع تھا کہ سائنسی اور تکنیکی تعلیمات کو اردو کے ذریعے کیسے پھیلایا جائے۔ راقم الحروف بھی اس سمینار میں شریک تھا۔ میں پروفیسر اسرار صاحب سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ان کی اجازت کے بغیر اس سمینار میں مرکز فروغ سائنس کے مقاصد سے وہاں کے شرکار کو روشناس کرایا۔ مجھے یہ لالچ اس لیے آئی کہ اس کل ہند اجلاس میں ملک کے ہر بڑے شہر میں واقع سائنس اور انجینئرنگ کے اداروں کے سربراہ

اور عالم جمع تھے۔ میں نے وہاں یہ تجویز بھی رکھی کہ ترقی اردو بیو[رو]
مرکز فروغ سائنس سے رابطہ قایم کرے۔ تاکہ دونوں ادارے م[ل کر]
اردو اور سائنس کی خدمت کر سکیں۔ مجھے یہ بتلاتے ہوئے خوشی [ہوتی]
ہے کہ اس اجلاس نے جس میں الامین ایجوکیشن سوسائٹی سے لے کر
صدیق انجینئرنگ کالج تک اور IIT دہلی سے لے کر انجینئرنگ کالج بنا[رس]
تک کے نمائندے موجود تھے، نہ صرف یہ کہ اس رائے کا خیر مقدم [کیا]
اس کو اجلاس کی منظور شدہ قرار دادوں میں شامل بھی کیا۔ اگر
فروغ سائنس کے اراکین بھی اس تجویز سے متفق ہوں تو میرے خیا[ل]
کم از کم نصاب کی تیاری میں ترقی اردو بیورو سے ہم کو کافی م[دد مل]
سکتی ہے۔

جہاں تک تربیتی مراکز قایم کرنے کا سوال ہے، ا[س سلسلے]
میں مَیں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ساتویں پنج سالہ پلان اور نئ[ی تعلیمی]
پالیسی کے تحت حکومت نے غیر شہری علاقوں میں تربیتی مراکز قا[یم کرنے]
پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اس کے لیے کافی سرمایہ بھی فراہم [کیا ہے]
ان کو حکومت نے Community Polytechnic کا نام د[یا ہے]
میں ایک بات یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کی تیا[ری میں]
آر۔ کے۔ سید صاحب نے کافی کردار ادا کیا ہے، جو کہ حکومت
اہم وزارت میں ایڈیشنل سکریٹری ہیں۔ گذشتہ دنوں موصو[ف نے]
ایک نشست میں بذات خود اس بات کی وضاحت کی تھی کہ یہ پا[لیسی]
پسماندہ طبقوں کو نظر میں رکھ کر بنائی گئی ہے اور جو چار اقلیتو[ں کو]
پسماندہ تصور کیا گیا ہے، اُن میں پہلا نمبر ہمارا ہی ہے۔ اس با[ت]
میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو ہمارے قصبا[ت اور]
دیہات میں ایسے تربیتی مراکز چلانے کے لیے حکومت کی مدد ہم [کو حاصل]
ہو سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے اگر میں یہ کہوں [کہ ہماری]
پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم مواقع سے فائدہ نہیں [اٹھاتے]
ہماری قوم میں اب بھی لاتعداد کاریگر اور صنعت کار موجود [ہیں]
ان میں سے بہت کم شکار حکومت کی مدد لیتے ہیں کیوں کہ ان کو
ان سے واقف ہی نہیں ہے۔ یہ پیش رفت بہر حال اراکین

ہوگی۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ حکومت اور اس کی
پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ قدم محض وقتی ضرورت کو پورا
کرنے کے لیے ہوگا۔ طویل مدتی پلان کے تحت ہم کو اپنے یہاں جنوبی
ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح تعلیمی ٹرسٹ قایم کرنا ہوں گے۔
جس سے ہم اپنے تعلیمی ادارے چلاسکیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے
لیکن اس کے لیے بہت اعلیٰ قسم کی تنظیم کی ضرورت ہے، جو بدقسمتی سے
ہمارے یہاں مفقود ہے۔ لیکن اگر ہم کو ایک زندہ قوم کی طرح جینا
ہے تو ہم کو منظم ہونا ہوگا اور شہر شہر گاؤں گاؤں ایسی تنظیمیں بنانی
ہوں گی جو ٹرسٹ کو قایم کرنے میں مدد کریں۔

خلاصے کے طور پر میں یہ دہرانا چاہوں گا کہ سائنسی
تعلیمات کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے سامنے تین اہم مسائل
مناسب نصاب کی تیاری، اساتذہ کی تربیت اور وسایل کا انتظام
ہیں۔ آپ سب حضرات سے گذارش ہے کہ ان مسایل کے حل تلاش کرنے
میں اراکینِ مرکز کی مدد کریں۔ اپنی رائے، اپنے خیالات کا اظہار
کریں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں چھپی کوئی بات ہم سب کو ایک
نیا راستہ دکھادے۔ لیکن معذرت کے ساتھ یہ گذارش بھی کروں گا
کہ اس وقت ہمارا مقصد ان مسایل کا حل ڈھونڈنا ہے۔ اس لیے
اپنی تمام تر فکر و صلاحیت کو اسی جانب موڑیے تاکہ ہمارے یہاں
آنے اور جمع ہونے سے مرکز اور اس کاز کو کچھ فائدہ پہنچے۔

آخر میں، میں پروفیسر اسرار احمد صاحب اور دیگر
اراکین مرکز فروغ سائنس کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے
وقت کی ضرورت کو پہچانتے ہوئے ایک خوش آئند ابتدا کی ہے
شروعات ہمیشہ مشکل اور پہلا قدم ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔ لیکن
جس نے پہلا قدم اُٹھالیا اللہ تعالیٰ اس کا پورا سفر آسان
کردیتا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ کارواں اپنی منزلِ مقصود
کو پہنچے۔

کامیابی کا راز

کسی نے سکندر اعظم سے پوچھا کہ آپ نے دنیا کے اتنے
ملک کس طرح فتح کر لیے؟ آپ سے پہلے جو بادشاہ گزرے
ہیں، ان کے پاس بھی خزانوں اور لشکروں کی کمی نہ تھی لیکن
ایسی شاندار فتوحات ان میں سے کسی کو بھی حاصل
نہیں ہوئیں۔

یہ سوال سن کر سکندر نے جواب دیا، اللہ
پاک کی مہربانی سے۔ اس کے بعد یہ کامیابی مجھے اس وجہ
سے بھی حاصل ہوئی کہ میں نے جن ملکوں کو فتح کیا اُن کے
عزت والے لوگوں کی عزت کی اور وہاں کے اچھے لوگ جو
کارنامے انجام دے گئے تھے انھیں باقی رکھا اور ان
کا نام ہمیشہ عزت سے لیا اور سب سے بڑی بات
[illegible]

مدارس اور سائنس

نفیس احمد ندوی

ہم مسلمانان ہند کے لیے خصوصاً اور تمام مسلمانان عالم کے لیے عموماً نہایت خوشی و مسرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے علوم جدیدہ سائنس اور ٹکنالوجی کو فروغ دینے کی از سر نو جدوجہد شروع کی ہے اور "مرکز فروغ سائنس" قائم کرکے عملی قدم اٹھایا ہے جو نہایت خوش آئند اور مبارک قدم ہے۔ خدا اسے کامیاب کرے۔

اس سے زیادہ پر مسرت و حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مدارس اسلامیہ کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی اور ذمہ داران مدارس کو احساس دلایا کہ وہ میراث جو انھوں نے اپنے اسلاف سے پائی تھی، آج اس پر غیروں کا قبضہ ہے، اسے دوبارہ واپس لینے کی سعی کریں اور سائنس کو داخل نصاب کرکے اس کی صحیح سمتوں میں خدمات انجام دیں اور اس میں جو فساد آگیا ہے اسے دور کرکے سائنس کو صالح و کارآمد بنائیں اور اسے اپنا گراں قدر مال سمجھیں"

"الحکمۃ ضالۃ المؤمن"

دینی مدارس خصوصاً مدارس اسلامیہ ہندیہ میں اگرچہ علم سائنس اب تک داخل نصاب نہیں کیا گیا، البتہ ایک عرصے سے سائنس کو بحیثیت مستقل مضمون کے داخل نصاب کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ عملی اقدام قدیم صالح اور جدید نافع کے حسین امتزاج سے استفادہ کرنے کا زریں موقع فراہم کرتا ہے اور اسلامی فکر و شعور، سائنس و ٹکنالوجی، علمیت اور دور جدید کی تاریخ کے ایک حسین اور دلآویز درخشاں باب کا افتتاح کرتا ہے، خدا اسے سدا بہار رکھے۔

سائنسی تحقیقات و تجربات سے نہ تو مذہب و ایمان کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی یہ مقاصد قرآن سے متصادم ہے بلکہ قرآن خود آیات ربانی پر تدبر و تفکر اور تسخیر کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَسَخَّرَ لَکُم مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُوْنَ۔

وفی انفسکم افلا تبصرون۔

ایک جگہ ارشاد ہے کہ ارض و سماء کی تخلیق اور لیل و نہار کی تبدیلی میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں

"اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِاُولِی الْاَلْبَابِ"

ایک دوسری جگہ خالق کائنات نے انسان کو غفلت سے بیدار ہو کر کائنات کے ذرہ ذرہ پر غور و فکر کرنے کی توجہ دلائی ہے

"وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ، لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَدُنَّا اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ۔

(ہم نے آسمان اور زمین اور کل کائنات کو محض کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا، اگر ہم کو کھیل بنانا منظور ہوتا تو ہم اپنی تجویز (کھیل کی طرح کا کوئی) کھیل بناتے (لیکن) ہم کو ایسا کرنا منظور ہی نہیں تھا۔)

یعنی اگر یہ سب کچھ کھیل ہوتا تو کارخانہ عالم میں یہ توافق، تدبر، نظام [illegible]

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے
لآیات لاولی الباب ۔ لآیات لقوم یتفکرون
لآیۃ لکم ۔ لآیات لقوم یعقلون ۔

ان قرآنی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ تدبر و تفکر کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی سے کسی قوم کی بیداری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ترقی کے بڑے سے بڑے مدارج طے کیے جا سکتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق روحانیت سے ہو یا مادیت سے، دونوں میدانوں میں بغیر غور و فکر کے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جب یہ بات کھل کر واضح طور پر سامنے آچکی کہ تسخیر کائنات کے لیے جو غور و فکر کیا جائے یا سائنسی تحقیقات و تجربات کیے جائیں، مذہب سے متصادم نہیں ہیں تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم دینے سے ایمان و عقیدہ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بشرط کہ اعلیٰ نظام درسیات کے ساتھ بہترین نظام تربیت بھی فراہم کیا جائے۔

آج ذمہ داران مدارس اسلامیہ بچوں کو سائنس کی تعلیم دینے سے ہچکچاتے ہیں جب کہ سائنس کے اصل موجد مسلمان ہیں۔ قطب نما کس نے ایجاد کیا؟ جس کے سہارے کولمبس امریکہ تک پہنچ گیا، جس کا اعتراف یورپین کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ یورپ کا ایک مشہور فاضل مورخ لکھتا ہے کہ

> "اگر اہل اندلس قطب نما ایجاد نہ کرتے تو کولمبس جیسا عالی دماغ شخص بھی اٹلانٹک کی بھیانک موجوں سے زندہ نہ بچ پاتا اور اسی میں بھٹکتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار دیتا۔"

یورپ کو جو کچھ ملا ہے وہ سب مسلمانوں کی دین ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جس وقت اندلس فتح کیا، یورپ جسے آج سائنس و ٹکنالوجی ایجادات و اکتشافات کا امام تصور کیا جاتا ہے، جہالت و سفاہت کی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا تھا، علم و حکمت کی باتیں ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ یورپ کے تمام ممالک علوم و فنون کی روشنی سے محروم اور تہذیب و ثقافت سے کافی دور تھے۔ وحشیانہ زندگی گزارنا ان کے لیے سرمایہ فخر تھا۔ مسلمانوں نے انہیں علم و تمدن اور تہذیب و ثقافت کی شمعوں سے منور کر دیا۔ جہاں علم و تحقیق کا ایک ذرہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اس ملک میں ہر ہر شہر، ہر ہر گاؤں کو علماء، فضلاء، ماہرین فن ادباء و اطباء، ریاضی داں و سائنس داں سے بھر دیا۔

مسلمان چھ سو برس تک مشرق و مغرب سارے یورپ کے استاد رہے ہیں، لیکن افسوس آج ہم بے گانہ ہیں اور یہی احساس زیاں کا نہ ہونا ناکامی متاع کارواں جاتا رہا۔

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مسلمانوں کی سائنس اور ٹکنالوجی، ایجادات و اکتشافات میں حیرت انگیز کامیابی دراصل قرآن مجید کی اُن آیات پر غور و فکر کرنے جو انسان کو کائنات کی تحقیق و جستجو کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ اُن ہی آیات کا ثمرہ تھا کہ اندلسی دور میں مسلمانوں نے جہاں میں تحقیق و تفتیش کی جس کی بدولت موجودہ سائنس کی بنیاد پڑی۔ مسلمان سائنس دانوں نے جغرافیہ، ریاضی، فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، طبعیات، حیاتیات میں شاندار کامیابی حاصل کی اور تمام عالم کو علوم و فنون سے مالا مال کر دیا۔ اس دور کے مشہور سائنس دانوں میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابو القاسم زہراوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن کی بلند پایہ تحقیقات اور شہرۂ آفاق تصنیفات ہی کی وجہ سے یورپ نے علم جدید کی بنیاد ڈالی۔

ایک ہلکا سا خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ سائنسی تعلیم اپنے طالب کو الحاد اور دہریت کی طرف مائل کرتی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اگر اعلیٰ تربیتی انتظام نہ کیا جائے تو کسی بھی غیر دینی علوم کے حاصل کرنے والے طالب کا رجحان اور میلان جو ہر ابر بنتا اور بگڑتا رہتا ہے، بگڑ سکتا ہے، اس مختصر مرحلے میں اگر اس طالب علم کے ذہن و دماغ کی، علم دین سے آبیاری کی نہ کی گئی تو کوئی بعید نہیں کہ وہ دہریت کی طرف مائل ہو جائے اور الحاد کا شکار ہو جائے۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح سائنس کے ذریعے دہریت کا خراب اثر اسلام یا متبعین اسلام پر نہیں پڑا۔ اگر تھوڑا بہت اثر آیا بھی تو وہ ان لوگوں پر جو اپنے مذہب سے بالکل ناواقف تھے یا اس قدر واقفیت نہ رکھتے تھے جو اسلام اور سائنس کو پہلو بہ پہلو لے چلنے کے لیے کافی ہوتی۔

اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے تمام مذاہب و ادیان کا اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف مذہب اسلام ایک ایسا ہی مذہب

ہے جو سائنس کے ہم پہلو چلنے کی اہمیت رکھتا ہے۔ یورپ کی اکثریت عیسائیت کی پیروکار ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ سائنسی تحقیقات کے بعد یورپ میں جو طوفان برپا ہوا اور بڑے بڑے محققین و سائنسدانوں کو جو تہہ تیغ کیا گیا یا زندہ جلا کر بھسم کر دیا گیا اس کے اصل اسباب کلیسا کی حکومت اور اس کے ظلم وستم تھے۔ ۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء دس سال کے قلیل عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار انسانوں کو محض اس لیے تہہ تیغ کر دیا گیا یا جلا دیا گیا کہ وہ علم وحکمت کی باتیں نوک زبان یا نوک قلم پر لائے تھے۔ مثلاً وی بی.ٹی کو مسئلہ ارتقاء پر ایمان رکھنے کی وجہ سے آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ برونو کو ذہنی ترقی کے سبب دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ کوپرنیکس کو زمین کی گردش اور آسمان کو ساکت بتانے کی وجہ سے تہہ تیغ کر دیا گیا اور گلیلو کو اس کے نظریے کی حمایت کرنے کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا۔ آج بھی عیسائیت دو بڑے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے جس کے برے اثرات اہل دانش کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔

دینی مدارس میں علم سائنس کو ترویج دینے کا ایک عظیم فائدہ یہ ہوگا کہ مغرب نے علم سائنس پر قبضہ کر کے اسے جو الحاد، بے دینی، مادیت کے فروغ اور خلق خدا کے استحصال کا ذریعہ بنایا ہے۔ اعلیٰ نظام تربیت اختیار کر کے مسلم علماء طبیعات، محققین سائنس دانوں کے ذریعے خدا پرستی اعلاء کلمۃ اللہ، خلق خدا کی خدمت اور انسانی فلاح وبہبود کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے جو اسلاف کی یاد رفتہ کو تازہ کر دے۔

لہٰذا مسلمانوں کی عقل مندی اور اقبال مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ ماضی کی طرح آج بھی مدارس اسلامیہ علم کی ہمہ گیری کو تسلیم کریں اور سائنس و ٹکنالوجی کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اپنائیں اور اس میں سبقت و پیش قدمی کو اپنا دینی و ملی فریضہ خیال کریں۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ سائنس کی تعلیم و ترویج کی ضرورت کا احساس تمام مدارس اسلامیہ ہندیہ کو ہو چلا ہے لیکن مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم میں سائنس کو کہاں پر جگہ دی جائے۔ ایک غور طلب مسئلہ ہے، اس لیے کہ مدارس اسلامیہ ایک خاص نہج پر چل رہے ہیں، جن کا اصل مقصود ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں جہاں لادینیت کا غلبہ ہے۔ اسلام کی نشر واشاعت کرنا ہے، مدارس کے لیے سب سے بڑی دشواری کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے نصاب میں سے دین کے بنیادی اور اساسی مضامین کو نکال نہیں سکتے، اس لیے کہ دین کے بنیادی اور اساسی مضامین کا نصاب سے خارج کرنا مدارس کو اپنی افادیت کھو دینے کے مرادف ہوگا اور مدارس کا اپنی افادیت کھو دینے کا مطلب بدقسمت ملک ہندوستان میں اسلامی تشخصات کو پامال کرنا اور دین کے ستون کو متزلزل کرنا ہوگا۔

البتہ مدارس کے مروجہ نصاب میں علوم عالیہ اساسیہ یعنی قرآن حدیث و فقہ کے افہام و تفہیم کے لیے علوم آلیہ فلسفہ و منطق و علم کلام میں تبدیل کر کے ان کی جگہ پر سائنس کو رکھ دیا جائے تو کوئی دشواری نہیں ہوگی اور نہ ہی اصل مقصود پر کوئی حرف آئے گا بلکہ ٹکنالوجی اور صنعت کے بطن سے پیدا ہونے والے بہت سے اقتصادی، معاشی، معاشرتی مسائل کے استنباط میں مدد ملے گی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اہم اور نازک مسئلہ جو سائنس اور مدارس کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتا ہے۔ وہ ہے وسائل قلت، سائنس کا تعلق ہے مشاہدات و تجربات سے، سائنس کی کسی تھیوری کو پڑھانے کے بعد اگر اس کا تجربہ و مشاہدہ نہ کرایا جائے تو وہ تھیوری بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تجربہ و مشاہدے کے لیے لیبس (تجربہ گاہ) کی بھی ضرورت پڑے گی جس میں بقدر ضرورت سامان کا مہیا ہونا ضروری ہے جو مدارس کے لیے ایک اہم مسئلہ ہوگا اس کے حل کے لیے ہمارے ذہنوں میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہونی چاہیے۔

مندرجہ بالا دقتوں اور پریشانیوں کا جو تذکرہ کیا گیا، اس کا تعلق خاص طور سے جونیر ہائی اسکول سے اوپر کا ہے۔ آٹھویں کلاس تک بہرحال ہر صورت میں ریاضی وسائنس داخل نصاب کیا جا سکتا ہے اور اس کی سخت ضرورت ہے، یہ ماہر فن کے مشورے سے بحسن و خوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس میں لیت و لعل سے کام لینا مسئلے کو الجھانے کے سوا کچھ نہیں، البتہ ذمہ داران مرکز فروغ سائنس سے میں درخواست کروں گا کہ جن مدارس میں آٹھویں کلاس تک ریاضی و سائنس داخل نصاب ہوگا

باقی صفحہ نمبر ۸۰ پر ملاحظہ فرمائے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۲۶ - شمارہ ۵ - (مئی ۲۰۰۷ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد صدر الحسن رحمانی قاسمی

مدارس اسلامیہ میں سائنسی تعلیم کی ترویج و اشاعت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تاریخ ماضی کے اوراق پتا محفوظ ہے۔ اس کی ضرورت سے کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اب یہ ضرورت بحث و نظر کی منزل سے گزر کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جو چیز بدیہی ہو اس کے لیے استدلال کی ضرورت نہیں ہے لیکن جب "مرکز فروغ سائنس" نے مدارس اسلامیہ کے لیے اس کی ضرورت اور عدم ضرورت کی بحث چھیڑدی ہے تو پہلے ہم تاریخ ماضی کا ایک مختصر جائزہ لیں۔ پھر اس کی ضرورت وافادیت کو آپ کے سامنے رکھیں۔

امت اسلامیہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے اہم مظہر رہا ہے۔ زمانۂ ماضی میں ہمیشہ مسلمانوں کی درس گاہیں مختلف علوم و فنون کا مرکز رہی ہیں اور علوم و فنون میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ درس گاہیں حکومت کے تعاون اور حکومت کے بغیر تعاون کے دونوں طرح چلتی رہی ہیں۔ ان درس گاہوں نے اگر ایک طرف مذہبی تصورات اور عقاید کی تعلیم کو رائج کیا تھا تو دوسری طرف قومی تشکیل میں سائنس کو بھی اپنے پہلو میں جگہ دی ہے۔ جس کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ افراد کو ان کے ذوق و استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں رستوں کے لیے تیار کریں اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی صلاحیت پیدا کریں۔

چنانچہ ایک انگریز سیاح لکھتا ہے کہ "عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و مذہب اگر کہیں پھلا پھولا تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر باقی دنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا"۔ ایچ۔ جی۔ ویلس لکھتا ہے کہ "سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ حاصل تھا تو عربوں کو منہ بولا باپ کہنا چاہیے۔ جدید زمانے کو علم کی روشنی لاطینی کے ذریعے سے نہیں بلکہ عربوں کے توسل سے ملی ہے۔ صدیوں کے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے مہمیز ملی اور عرب بیدار اور متجسس ہو کر دنیا میں سب سے زیادہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کیے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کیے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں ہے۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست خدمت کی اور یورپ کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی۔ جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بدنظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب اس وقت ساری دنیا کی ذہنی و دماغی رہنمائی کا منصب ادا کر رہا تھا اور چار سو برس تک کرتا رہا"۔

عراقی ماہر تعلیم کا قول ہے کہ یورپ کی "نشاۃ ثانیہ" مسلمان عربوں نے کی، افلاطون، ارسطو اور اقلیدس ہم نے یورپ کو دیے اور یورپ کو ایک متمدن براعظم بنا دیا۔

مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے وسط سے گیارہویں صدی کے آخر تک دوسرے تمام مذاہب اقوام پر سبقت لے جانے کا ثبوت پیش کیا اور گیارہویں صدی مسلمانوں کو تمام دنیا کے علم و حکمت کا رہنما بنا کر ختم ہوئی۔ فتح اللہ شیرازی جن علوم میں مہارت رکھتے تھے اس میں آپ،

علم جرِ اثقال" کو بھی پائیں گے۔ یہ فن بھی حکمت کا جزو تھا۔ اس کی مصنوعات میں
کچھ چیزیں ایسی تھیں جو خود بخود حرکت کرتی تھیں اور اس سے آٹا پیسا جاتا تھا
اسی طرح ایک آئینہ حرکت بھی تھا جس میں دور و نزدیک کے عجیب و غریب تماشے ہوتے
تھے اور ایک بندوق تھی جو ایک گردش میں بارہ آوازیں کرتی تھی۔

حکیم علی نے وہ مشہور تالاب بنایا تھا جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی
کو سیڑھیاں ملتی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے بعد فرش در فرش
سے سجائے کمرے میں آدمی داخل ہو جاتا تھا جس میں دس بارہ آدمی کے
بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دسترخوان چنا ہوتا اور طاقوں میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں
حکیم علی کا طلسمی تالاب میں اکبر بادشاہ بھی گیا تھا۔

حکیم علی کا وہ چراغ بھی مشہور ہے جس سے حمام (غسل خانہ) چوبیس
گھنٹے گرم رہتا تھا اور چراغ بھی نہیں بجھتا تھا۔ اسی طرح حکیم علی نے ایک ایسی
دوا ایجاد کی تھی جس سے پانی برف بن کر جم جاتا تھا۔

فیروز تغلق کے زمانے میں لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہندوستان میں ایجاد
ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس گھڑی سے ہر گھنٹہ پر نغمے
کے ساتھ ایک مترنم آواز پیدا ہوتی تھی اور یہ شعر سنائی دیتا تھا ؎

ہر ساعتے کہ بر در ایں شاہ می زنند
نقصان عمر می شود آں یاد می دہند

ترجمہ [بادشاہ کے دروازے پر ہر گھنٹہ میں جو گھڑیال بجاتے ہیں،
یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہو گیا]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد میں کیا کیا چیزیں یہی مدرسہ کے حاشیہ
نویس ملّا ایجاد کر چکے تھے۔ اسلامی سلاطین کا کوئی زمانہ ہو، نہروں، تالابوں،
اور پلوں کی تعمیر کے ذریعے سے جو حیرت انگیز کام انجام دیے گئے اور تعمیرات کا
جو سلسلہ ان بادشاہوں کے عہد میں نظر آتا ہے اور باغبانی و کاشتکاری کے
متعلق جو اصلاحات مسلمانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان میں جاری کیں شاید
ان کی نظیر اس زمانے میں بھی پیش نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ باضابطہ انجینئروں
اور ماہروں کے بغیر ایسے کام کا انجام پانا ناممکن ہے۔

آج جب کہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال پھیلا ہوا ہے
اور اس میں مسلمان بچے ہی تعلیم پاتے ہیں تو سماج اور قوم کی تعمیر و تشکیل میں
ان کا بھی حصہ ہے۔ یہ بچے قوم کے لیے اور مذہب و ملّت کے لیے اسی وقت
سود مند ثابت ہو سکتے ہیں جب ان کی استعدادی قوت اور صلاحیت کو
جدید تقاضوں کی روشنی سے اجاگر کیا جائے اور ان کو ہمہ جہت علم سے آراستہ
کیا جائے جیسا کہ زمانہ ماضی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

آج مدرسوں کا حال یہ ہے کہ اُن کا نصاب اور طرزِ تعلیم، اساتذہ
کا انداز فکر، طلبا کا انداز نظر، زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے ناآشنا
معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اپنا چولا بدل چکی، علوم و فنون بدل گئے، ہمارے مسائل
کی نوعیت دوسری ہو گئی، طرزِ فکر اور انداز نظر نیا ہو گیا۔ ہر چیز قانون ارتقاء
کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی۔ دنیا کے جن جن اداروں نے زندگی کا
ساتھ دیا اور اس کی ارتقاء میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی
کرتے رہے۔ کائنات کی ترقی پذیر روحِ حیات کو جذب کیے بغیر کوئی چیز
زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔

مدارس اسلامیہ کی پہلی درسگاہ "صفہ" ہے جس میں صحابہؓ کے
سامنے نہ صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے مسایل بیان کیے جاتے تھے
بلکہ عصری علوم سے بھی اُن کو آراستہ کیا جاتا تھا۔ نیزہ بازی، تیر اندازی،
اور فنون حرب کے دیگر طریقوں سے بھی ان کو واقف کرایا جاتا تھا اور قرآن
نے بھی ان کو ہوشیار اور مستعد رہنے کے لیے خبردار کیا ہے۔

اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّۃٍ

[ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے سامان
درست رکھو] —— (بیان القرآن)

اب اس ایٹمی دور میں نیزہ بازی، تیر اندازی اور فنون حرب کے پرانے
طریقے بیکار ہو گئے، لیکن قرآن کا ابدی پیغام اپنی جگہ پر باقی ہے کہ تمہیں
اپنی قوت کے اکٹھی کرنے کے لیے استعدادی صلاحیت کو بروئے کار لانا ہوگا
تو اب ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ دشمنوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے
کے لیے ہم اپنے اندر ایٹمی قوت اور صلاحیت پیدا کریں۔ اس کے لیے اپنی
اقتصادی حالت کو مضبوط کرنا ہوگا اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے
مدارس میں ایسی تعلیم کا بھی انتظام ہو جو جدید تقاضوں کو پورا کر سکے اور
یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں
ہے" چنانچہ انسانی تہذیب و تمدن کی دنیا میں اسی ضرورت کے پیشِ نظر
مغربی ممالک نے حیرت انگیز انقلاب برپا کیا۔ انھوں نے اپنے کارناموں

اور اپنی ذہنی و دماغی تحقیقات کے ذریعے نہ صرف اپنے ملکوں کا بلکہ ساری
دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ انھوں نے انسانی تہذیب و تمدن کو ایک نئی زندگی
بخشی ہے اور فطرت کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کرکے فکر و نظر کے لیے
وسعتیں اور نئی فضائیں پیدا کی ہیں۔ آج ان ہی لوگوں کی کوششوں کا
نتیجہ ہے کہ مغربی ممالک سیاسی اعتبار سے ایشیائی اقوام کے تعاون و
اشتراک کا خواہ کتنا ہی محتاج ہوں لیکن پوری دنیا پر اس کی ذہنی و دماغی
گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ ابھی عرصے تک اس سے نجات پانا ناممکن ہے۔
اگر آج ہم بھی اپنی ضروریات کے لیے خود کفیل ہونے کا عہد کرلیں تو
ہندوستان روزانہ کی ایجادات سے بریز ہوجائے گا ـــــ

ایجاد و تحقیق میں کسی چیز کا پیدا کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس ایجاد
کے ذریعے حقیقت میں ہزاروں برس کی جہالت کا اعتراف ہے۔ یعنی جو
چیزیں ہزاروں برس سے عالم میں موجود تھیں اور ہم اس سے جاہل اور
ناواقف تھے اب اس کا علم ہوا اور اسی کا نام سائنس ہے۔ عالم میں ہزاروں
حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں لیکن اس کا علم اور اس کی ترتیب کا سہرا ہمیشہ
اسی کے سر بندھا ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور جد و جہد جاری
رکھتا ہے۔ ناکامی پر ہمت نہیں ہارتا اور کامیابی پر ہتھیار نہیں ڈالتا ہے
بلکہ ہر تحقیق کے بعد ایک نئی تحقیق اس کے سامنے آتی ہے۔ لہٰذا سائنس
سے اسلام کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے اور اسلام کی حقانیت
واضح ہوتی جاتی ہے۔ اسی بنا پر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
نے فرمایا کہ

"فلسفۂ قدیم اسلام سے بہت دور ہے اور سائنس
یعنی فلسفۂ جدید اسلام سے بہت قریب ہے"

اور فرمایا کہ

"سائنسی انکشافات کو اسلام کے لیے بطور تائید استعمال
کیا جاسکتا ہے"

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاشرتی و معاشی
اخلاقی و سیاسی اور تہذیبی و تمدنی وغیرہ تمام چیزوں کے احکام موجود
ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قیام و بقا کے لیے ان
سب چیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دوسری یہ کہ قرآن کی نظر میں
صاحبِ صلاحیت قوم وہی ہوسکتی ہے جس نے مجموعی حیثیت سے انھی
بیان کردہ چیزوں میں اہلیت و صلاحیت پیدا کی ہے۔ اگر زندگی کے ایک
گوشے میں جد و جہد کرنے سے قرآنی صلاحیت کا سرٹیفکیٹ مل جاتا تو پھر
اسے اس قدر تفصیل سے بیان کرنے اور تمام گوشوں کے احاطہ کرنے کی
ضرورت نہ تھی۔

اتنا عظیم الشان وسیع و عریض آسمان اور اس میں آفتاب و ماہتاب
اور دوسرے سیارے جن میں کچھ تو ثوابت ہیں اور کچھ ایسے سیارات ہیں
جن کے دورے نظامِ شمسی و قمری کے انداز میں نہایت محکم و مضبوط قانون کے تحت
مقرر اور متعین ہیں۔ اسی طرح زمین کا پورا کرہ، اس کے دریا اور پہاڑ
دونوں میں طرح طرح کی مخلوقات، درخت اور جانور، زمین کی تہہ میں چھپی
ہوئی معدنیات، زمین و آسمان کے درمیان چلنے والی ہوا اور اس کے
مخصوص نظام یہ سب چیزیں عقل والوں کو دعوتِ فکر دے رہی ہیں۔ اسی لیے
قرآن پاک میں عقل والوں کی صفات میں ذکر کیا گیا ہے

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران)

[اور آسمان اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں] (بیان القرآن)

اور اس نظام فلکیات و ارضیات پر جب کوئی بندہ غور و فکر کرتا ہے تو
بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران)

[اے ہمارے رب! تو نے اس کو لایعنی نہیں پیدا کیا۔]

چونکہ دنیا اس وقت مادی لحاظ سے ترقی کرتی جارہی
ہے، اس لیے قرآنی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے زمانے کے تقاضے کی
مناسبت سے جد و جہد کرنا لازمی اور ضروری ہے اور یہ قرآنی تعلیمات
کے منافی نہیں ہے بلکہ آدم کی تخلیق کے عین منشا کے مطابق ہے جس وقت
سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو فرشتوں نے اشکال پیش کیا تھا۔
اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا امتحان
لیا:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا

[اور آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کا علم دے دیا]

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے

خواص، اس کے آثار اور اس کی ماہیت کا علم دیا گیا تھا، خواہ وہ چیزیں موجود تھیں یا آئندہ اس کا ظہور ہو۔

اگر ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی چاہے وہ کیسی ہی حالات وظروف میں ہو اس کو اسلامی بنایا جا سکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لیے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا۔ مدرسوں میں عصری روح کو جذب کرنا ہوگا۔ تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ ان درس گاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا کہ طلبہ کو یہ درس گاہیں اسلام کی متحرک قوتوں سے آشنا کریں گی۔

قیام وبقا کی جدوجہد میں قومی زندگی میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اگر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں دوسری قوموں سے مل جاتی ہیں تو ہمیں اس کے لینے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے اور اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا ہے۔

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن الخ

(حکمت کی باتیں مومن کا گمشدہ متاع ہیں جہاں کہیں اس کو پائے، لے لے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اس میں کسی قسم کا دریغ نہیں فرمایا۔ آپ جس صالح معاشرے اور سوسائٹی کے قیام وبقا کی ضمانت لے کر آئے تھے۔ اخلاقی تربیت کے ساتھ اس زمانے کے لحاظ سے تہذیب وتمدن کی تمام ضرورتوں کو جزی قرار دیا تھا بشرطیکہ اس کا تصادم اسلام اور مسلمانوں سے نہ ہو۔ آپ نے تعلیم پر بہت زور دیا اور اس کو عام کرنے کے لیے مختلف انتظامات کیے۔ آپ نے صحابہؓ کو دوسری زبان سیکھنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی زبانیں سیکھ لی تھیں اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کثیر زبانوں کے ماہر تھے۔

اسی طرح مختلف علوم وفنون کے سیکھنے کی تاکید فرمائی ریاضی، طب، علم ہیئت، علم انساب، نشانہ بازی، تیراندازی، تیراکی شہسواری وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے تقاضے کے مطابق "مدارس اسلامیہ" میں بھی عصری علوم وفنون کو جگہ دینی چاہیے بالخصوص سائنس کو ترجیحی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

ماخذ

۱ مسلمان حکومتوں کی موجودہ زبوں حالی
۲ عروج وزوال کے الٰہی قوانین۔
۳ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت
۴ حکمائے اسلام حصہ اول
۵ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ دوم
۶ ماہنامہ برہان دہلی، مارچ، نومبر ۱۹۵۳ء
۷ معارف القرآن۔
۸ رسالہ دارالعلوم جنوری ۱۹۵۷ء

دینی اور دنیاوی علوم

ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی وکوشش کریں اور ایک کو دوسرے کا آلہ سمجھیں۔

سید سلیمان

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد عالم انصاری

دنیا کی تاریخ پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ بات بالکل
روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ہر عہد میں انسان کی ترقی کا سبب وہ
یا فن رہا ہے جو اس وقت لوگوں میں زیادہ رائج ہو اور ہر فرد کے ذاتی ارتقا
لیے اس مروجہ علم یا فن کا حصول حتمی و لابدی قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جب
ی اس میں لگ جاتا تھا اور پورے انہماک کے ساتھ اس کو حاصل کرتا
ہا تھا تو رفتہ رفتہ وہ کامیابی کے منازل طے کر کے اس کی اعلیٰ بلندی پر
ئز ہو جاتا تھا اور پھر وہ ہر جگہ داد و دہش کا مستحق رہتا تھا اور
ں کی قدر و منزلت کا پارہ عروج پر پہنچ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر بعثتِ
مدینہ سے متصلاً قبل کا زمانہ اعلیٰ معیار کی شعر و شاعری اور سخن گوئی کا
مانہ تھا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے اور قدیم عرب
ماعری سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ ایک خوش گو شاعر کی کیا حیثیت ہوتی
ی۔ مطالعہ کتب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر اپنے وقت کا بادشاہ
ا کرتا تھا اگر وہ چاہتا تھا تو ایک اعلیٰ اخلاق کی حامل شخصیت کو ذلت
ے گہرے گڑھے میں گرا دیتا تھا اور اگر چاہتا تو ایک ذلیل و کمینہ شخص کو
خلاق حسنہ کی بلند چوٹیوں پر لے جا کے کھڑا کر دیتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی ایک
چے حکمراں کو عام رعایا کی سطح سے بھی نیچے گرا دیتا تھا اور کبھی تو اپنے
لام کے ذریعے دو قبیلوں میں ایسی جنگ کرا دیتا جو مدتوں جاری رہتی
ور کبھی تو سخاوت جیسے افعال حسنہ پر لوگوں کو ایسا ابھارتا کہ خدا کے
استے میں خرچ کرنے کے لیے مال کا انبار لگ جاتا اور غریب پرور ی
ا ایک بہترین موقع ملتا تھا۔ ایک اچھا شاعر ماحول کے اس خاص رنگ کو
پنا کر نمایاں ترقی حاصل کرتا اور کافی انعامات سے نوازا جاتا۔ کیوں کہ
اس نے ایسی چیز کو حاصل کر لیا تھا جس کا اس وقت دور دورہ تھا
لہٰذا وہ ہر جگہ جیتا جاگتا انسان تھا۔

بالکل اسی طرح آج جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اور اپنی
زندگی کے لیل و نہار گزار رہے ہیں وہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔
ہر طرف اسی کی صدائیں فضا میں گونج رہی ہیں۔ ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ
ہے۔ کیوں کہ آج کا انسان اسی سائنس اور ٹکنالوجی کے ماحول میں پیدا ہو کر
اسی میں اس کی نشو و نما ہو رہی ہے اور اس کی تربیت کا بیشتر حصہ انھیں سے
وابستہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ زندگی کے اندر پیش آنے والی ضروریات
کے حل کا ذریعہ سائنس اور ٹکنالوجی کو سمجھتا ہے اور اس کے سامنے یہ بات
اظہر من الشمس ہے کہ دنیا کے ہر معاملات میں ان دو چیزوں کو کافی دخل
ہے۔ بلکہ ہماری اپنی نظریں جس طرح اس گردش لیل و نہار اور نظامِ
عالم کا مشاہدہ کر رہی ہیں اس سے یہ نتیجہ مستنبط کرتی ہیں کہ یہ سب سائنس
اور ٹکنالوجی کے بغیر ناقص رہیں گی بلکہ توحید سے صرف نظر یہ کہنا درست
ہوگا کہ سارا نظام اور انسانی کاروبار ان دو چیزوں کے معدوم ہونے
سے جامد نظر آئے گا۔ حتیٰ کہ بشریت کی مرگ و زیست اور وجود و عدم
کا مدار اسی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ روشنی، پانی، ہوا وغیرہ جیسی
تمام تر اشیاء ضروریہ ہیں سائنس کے مطابق دستیاب ہوتی ہیں۔
یہی وجہ آج انسان سائنس اور ٹکنالوجی کا خوگر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ
انسان کو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ سائنسی ایجادات کے بغیر ہماری زندگی کا
شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہماری بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

اب یہاں پہنچ کر افسوس صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ جو علم و فن

انسانی زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے اور آگے بڑھنے کے لیے اس ظلمت میں قندیل کا کام کرسکتا ہے۔ آج ہمارے دینی مدارس اس سے بالکل خالی ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس کو وہ ایک خارجی ولادینی علم قرار دیتے ہیں اور اس سے ایسی روگردانی کرتے ہیں گویا اس علم سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور اسلام و سائنسی علوم کی دو الگ اور متضاد راہیں متعین کر دی ہیں جب کہ ہمارا مذہب اس کی تعلیم بالکل نہیں دیتا اور قرآن شریف جو ہماری شریعت و مذہب کا منبع ہے وہ علم سائنس سے بھرا ہوا ہے۔ اگر اس کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ آج سائنس داں حضرات تحقیق کر کے نئی نئی ایجادات کرتے ہیں اور دنیا اس سے متاثر ہوتی ہے وہ قرآن میں چودہ سو سال پہلے ہی بتلا دی گئی تھیں۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ آج ہم سائنس و ٹکنالوجی سے اتنے خائف ہیں اور ان علوم سے اتنی غرابت ہو گئی ہے کہ ان کا پڑھنا تو درکنار ان کے قریب بھی جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ انہیں وجوہات کی بنا پر ان علوم کی ہمارے مدارس میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی نصاب تعلیم میں ان کا شمول پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ جس کا اثر یہ مترتب ہوتا ہے کہ ایک طالب علم جو اپنا قیمتی وقت صرف کر کے پورے انہماک و مستعدی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ وہ علوم دینیہ کے ایک بحر بیکراں کو اپنے اندر اکٹھا کر لیتا ہے لیکن دنیا کے اس وسیع میدان میں اور ترقی کے راستے پر وہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور اپنے آپ میں وہ ایک کمی محسوس کرتا ہے کیوں کہ جس ادارے یا احاطے میں اس نے تعلیم حاصل کی ہے وہاں ان علوم کا وجود نہیں تھا جن سے اس کو ادارے کی چہار دیواری کے باہر سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اسے اپنی ان کاوشوں کے ثمرات نظر نہیں آتے جن میں اس نے اپنی گراں قدر چیزیں یعنی وقت، پیسہ اور جان کھپائی تھی۔

ہمارے عربی مدارس میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم میں سائنس کو بھی داخل کریں۔ تاکہ ان مدارس سے نکلنے والا فرد زندگی کے ہر میدان میں دوڑ سکے اور ترقی کی راہ میں جو موانع ہیں سینہ سپر ہو کر ان کا مقابلہ کر سکے اور ان کے اندر پیدا ہونے والے احساسات کا ازالہ ممکن ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو مسلمان جو اس چند روزہ زندگی جس میں وہ اب تک پیچھے رہا ہے، آگے بڑھ سکتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو کامیاب ترین انسان سمجھے گا۔ کیوں کہ گزشتہ عہدوں میں مسلمان سائنسی نقطۂ نظر سے ہمیشہ کامیاب رہا ہے اور سائنس میں محنت کر کے عجیب عجیب چیزیں اس نے ایجاد کر کے دنیا کے سامنے پیش کیں جن کو دیکھ کر انسان کی نظریں حیران رہ گئیں اور وہ تعجب میں پڑ گیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی سے ہماری اس قدر دوری ہو گئی کہ ان چیزوں کا جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں، فقدان ہو گیا اور آج جب وہی چیزیں اعادہ کے طور پر غیروں کے ذریعے ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم ان سے بہت متحیر ہو جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جدید ترین ایجاد ہے اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہم علم سائنس کو نہ پڑھ کر اپنے اسلاف کی جدّ و جہد کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سائنس کے حصول میں علوم دینیہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے اور نہ یہ کہ ان علوم پر اعتماد کر کے خدا کی قدرت کاملہ کے منکر ہو جائیں۔ بلکہ اصل مرجع و مربی وہی ذات واحد ہے لیکن اسباب کے طور پر ان علوم کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے چوں کہ خدا نے اسباب کے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے لہذا اس عالم میں رہ کر اسباب کو اختیار کرنا ہی پڑے گا اور جن اسباب کے اختیار کرنے کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے انہیں اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کا علم حاصل کیا جائے اور مدارس دینیہ میں اس کو رائج کیا جائے۔

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مرکز فروغ سائنس علی گڑھ کے اراکین صاحبان مدارس عربیہ کا سروے کریں اور ان کے حالات و خیالات اور دشواریوں کا جائزہ لیں اور بعدہٗ کے نصاب مرتب کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

محمد ادریس

جب ہم کسی ملک کی سائنسی ترقی کا حال پڑھتے ہیں تو ہمیں رشک ہوتا ہے کہ کاش مسلم ممالک بھی سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے ہوتے۔ انہیں دوسرے ممالک سے ٹکنالوجی درآمد نہ کرنا پڑتی۔ آج سائنس میں طرح طرح کی ایجادیں ہو رہی ہیں لیکن جب ایجاد کرنے والوں کو دیکھا جاتا ہے تو کسی مسلمان کا نام ان میں نہیں ملتا۔ ہر مسلمان جس کو اخبار و رسائل اور سائنسی میگزین سے دلچسپی ہے اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ کسی مسلمان کا نام بھی نئی دریافت کرنے والوں میں ملے لیکن زیادہ تر اس کو ناکامی ہوتی ہے۔

کیا مسلمانوں کے پاس ذہانت نہیں یا اُن کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا؟ آخر کیا بات ہے کہ آج مسلمان سائنس کے ہر شعبے میں پیچھے ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں سائنس کی مخالفت ہوئی جس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دماغ میں ایک بات سما گئی ہے کہ یہ ایسا علم ہے جو انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے یہ علم خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے اور انسان خدا کو بھول کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ مگر آج ہم سائنس کی بہت سی نئی دریافتوں کا مطالعہ کریں تو ہم پائیں گے کہ یہ ایجادیں اور دریافتیں نئی چیز نہیں ہیں۔ یہ تو ہم آج سے چودہ سو سال پہلے جان چکے ہیں۔ اگر ہم خدا کے پاک کلام میں تلاش کریں تو زیادہ تر نئی تحقیقات کے بارے میں تذکرہ ملے گا۔ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میڈیکل سائنس کے لیے نمونہ ہے۔

خدا نے کلام مجید میں کئی جگہوں پر کائنات میں بکھری ہوئی چیزوں کے مشاہدے اور اس پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے اور سائنس بھی مشاہدہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

سورہ آل عمران میں ہے

"بلاشبہ زمین و آسمان کی تخلیق اور دن رات کے ہیر پھیر میں دانشمندوں کے لیے یقیناً بہت سی واضح نشانیاں موجود ہیں۔"

سورہ یونس (۱۰۱) میں ہے؛

"غور سے دیکھو کہ زمین اور آسمان میں کیا کیا چیزیں پھیلائی گئی ہیں۔"

سورہ ذاریات (۲۰-۲۱) میں خدائے وحدہٗ لاشریک فرماتا ہے:

"اور یقین کرنے والوں کے لیے روئے زمین میں بہت سے نشانات اور دلائل (بکھرے ہوئے) ہیں اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی۔ کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔"

آج کا مسلمان سائنس کی نئی نئی تحقیقات پر رشک کرتا ہے۔ اگر ہم اپنے ماضی میں جھانک کر دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ ہمارے اسلاف ہی اصل سائنس کے بانی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے یونانیوں سے استفادہ حاصل کیا ہے مگر یونانیوں نے صرف نظریہ پیش کیا تھا اس پر عمل نہیں کیا تھا جبکہ مسلمانوں نے یونانیوں کی تھیوری کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا اور ان کی بہت سی تھیوریوں کو مسلمانوں نے غلط ثابت کر دیا۔

وہ دور ایسا تھا کہ سارے عالم پر مسلم مفکروں، حکیم اور سائنس دانوں کی حکومت تھی۔ جابر بن الحیان، ابن الہیثم، البیرونی، ابن سینا، رازی، مسعودی، الکندی، ابن رشد، الادریسی اور ابن النفیس جیسے فرزندان اسلام نے اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے سارے عالم میں نام پیدا کیا اور چار صدیوں تک علم کا بیش بہا خزانہ پیش کیا۔

بریفالٹ (Briffault) رقم طراز ہے:

"یونانیوں نے تدوین کا کام کیا، عام اصول بنائے اور انہیں علمی زبان میں پیش کیا۔ لیکن طویل اور مسلسل مشاہدات کا مشکل اور صبر آزما طریقہ اور تجربہ کی کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی فطرت کے خلاف تھا، جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

ایک دوسرے سائنس کے نامور مورخ جان سارٹن نے لکھا ہے:

"قرون وسطیٰ کا اصلی لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقے کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جو بارہویں صدی تک جاری رہا۔"

آج عالم اسلام میں نظر دوڑائی جاتی ہے تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ عالم اسلام سائنس اور ٹکنالوجی میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہیں۔ ایران و عراق کی ساڑھے پانچ سالہ جنگ بھی ہماری پسماندگی کی علامت ہے۔ موجودہ دور میں جہاں بھی جنگ ہو رہی ہے وہ پسماندہ ممالک ہیں۔ اگر مسلم حکومتیں بھی سائنس و ٹکنالوجی میں آگے رہتیں تو آپس میں برسرپیکار نہ ہوتیں۔

ترقی یافتہ ممالک ایک سے ایک خطرناک اور مہلک اسلحہ تیار کرتے ہیں جن کے فروخت کے لیے بازار چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ ان کو اپنے ہتھیاروں کی عملی کارکردگی بھی دیکھنی ہوتی ہے، جس کے لیے غریب اور پسماندہ ممالک موزوں ہوتے ہیں۔ زیادہ تنازعات بھی پسماندہ ممالک میں پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ترقی یافتہ ممالک کو اسلحوں کے لیے بازار مہیا ہو جاتا ہے اور ان کی کارکردگی کی جانچ بھی ہو جاتی ہے۔

ان ترقی یافتہ ممالک کو ان جنگوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ برسرپیکار ممالک کی ذہانت صرف جنگ کی طرف متوجہ رہے گی جس سے یہ ممالک سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی نہیں کریں گے۔

آخر ہم مسلمان سائنس و ٹکنالوجی میں کیوں پسماندہ ہیں۔ جنہیں سے علم حاصل کرکے دوسری قومیں آگے نکل گئیں۔ مگر مسلمان (چاہے وہ کسی ملک کا ہو) پیچھے رہ گیا۔ بارہویں صدی کے بعد مسلم سائنس دانوں میں زوال آنا شروع ہوا اور آج تک مسلمان سنبھل نہ سکا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ خلیفہ اور بادشاہوں کی سائنس، طب، ہیئت و نجوم اور دیگر شعبوں میں دلچسپی کا ختم ہو جانا۔ دوسری بڑی وجہ مذہب اسلام میں بہت سے فرقوں اور گروہوں کا پیدا ہو جانا۔ جس کی وجہ سے سائنس کی مخالفت ہوئی اور اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔

میرا اندازہ ہے (جو غلط بھی ہو سکتا ہے) کہ یورپ میں عیسائی پادریوں نے سائنس والوں کی کھل کر مخالفت کی اور بہت سے سائنس والوں اور مفکروں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ کہیں ان کا اثر تو اس وقت کے مسلم حکمرانوں اور عالموں پر نہیں پڑا؟

مسلمان عالموں نے اپنی ساری توجہ تحصیل علم قرآن، حدیث و فقہ میں صرف کر دی لیکن آج ہم فخر کر سکتے ہیں کہ حدیث و فقہ کا جو سرمایہ مسلمانوں کے پاس ہے، اتنا دیگر مذاہب میں دستیاب نہیں ہے۔

آج سائنس کائنات کے اسرار سربستہ کو جیسے جیسے بے نقاب کرتی جاتی ہے، اہل اسلام کے ایمان و یقین میں مزید پختگی ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ان تمام اسرار سربستہ کا بیان کتاب الٰہی میں ربانی انکشافات کی شکل میں مل جاتا ہے۔

اگر ہم بغور دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ پاکستان اور انڈونیشیا کے علاوہ سارے مسلم ممالک سائنس و ٹکنالوجی میں بے حد پسماندہ ہیں اور یہ دونوں ممالک بھی ترقی یافتہ ممالک کے سامنے بہت زیادہ پسماندہ ہیں۔ ہر سال دنیا کا معزز ترین نوبل پرائز تقسیم ہوتا ہے سیکڑوں محققین کو مختلف شعبوں میں نئی تحقیق کے لیے دیا جاتا ہے مگر ان میں کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ اب تک صرف ایک ہی مسلمان کو یہ ایوارڈ ملا ہے اور اس عظیم ہستی کا نام پروفیسر عبدالسلام ہے۔ یہ ایوارڈ انہیں ۱۹۷۹ء میں ملا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔

اگر مسلمانوں کو سائنس کے معاملے میں دوسری قوموں کی برابری کرنا ہے تو ہمیں اس کے لیے ہم کو شش کرنی ہوگی مجھے پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے "مستقبل سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جو سائنس کے دوست ہیں۔"

ہمیں اپنے دینی مکتبوں میں ابتدائی درجوں سے مسلم حکما، اور سائنس دانوں کے اوران کے کارناموں کو پڑھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ مدرسوں میں سائنسی تعلیم کے ساتھ چھوٹی سی تجربہ گاہ بھی ہونی چاہیے۔ تاکہ طلبا کم سے کم سائنسی آلات کو اپنے ہاتھ سے سکیں۔ دینی مدارس کے پرائمری درجات میں یوپی گورنمنٹ سے منظور شدہ سائنس کی ابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ جس میں بچوں کو درجہ حرارت ناپنے کا آلہ، قیف، سیفون، فلٹر ، امتحانی نلی، بیکر اور دیگر بہت سے آلات کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن بچوں ان آلات کو دیکھا نہیں ہے۔

بچوں میں سائنسی ذہن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی درجات سے بچوں کو سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربات بھی دکھائے جائیں۔ تاکہ آگے چل کر یہ اچھے انجینئر اور سائنس داں بن سکیں۔ صرف درسی کتابیں پڑھانے سے کوئی بات سمجھ میں آتی بلکہ انہیں عملی طور پر تجربہ کرکے دکھانے سے علم مستحکم ہوتا ہے اور طلبا کے ذہن پر اچھا پڑتا ہے۔ طلبا کو صرف گلوب کی تصویر دکھا کر پڑھایا جاتا ہے تو وہ اچھی طرح نہیں سمجھ ۔ اگر گلوب ان کے سامنے ہو تو استاد اور شاگرد دونوں کو پڑھنے پڑھانے میں آسانی ہے۔ اسی وجہ سے زمین کبھی سورج کے قریب ہوتی ہے تو کبھی سورج سے دور ہٹ جاتی ہے سے موسم بدلتا ہے، کس طرح دن رات ہوتا ہے، یہ بھی بچہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

دینی مدارس میں فرزندان توحید کے کارناموں کی تاریخ بھی انی چاہیے کہ ایک زمانے میں صرف ہم ہی تھے جو چار صدیوں تک پوری دنیا میں نس و ٹکنالوجی، طب، جغرافیہ، علم نجوم اور دیگر علوم کے میدان میں چھائے ے تھے لیکن اس وقت ہم سائنس و ٹکنالوجی میں دوسری قوموں سے بے حد رے ہوئے ہیں۔ ہمیں پھر دوسری قوموں سے آگے نکلنا ہے تاکہ ہم غیر قوموں ست نگر نہ رہیں۔ بقول سر سید احمد خاں:

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے۔"

دینی مدارس سے بچے درجہ پانچ پاس کرکے سرکاری اسکولوں میں تعلیم کے لیے داخلہ لیتے ہیں۔ ان بچوں کو ذہن نشین کرا دینا چاہیے کہ سائنس پر خصوصی توجہ دیں اور آگے چل کر سائنس کا مضمون ضرور لیں۔ رح ہماری آئندہ آنے والی نسلیں سائنس و ٹکنالوجی میں ترقی کر سکتی ہیں۔ والدین بھی اپنے بچوں کو سائنس کی اہمیت سے واقف کرائیں تاکہ مکے نونہالوں کے دلوں میں اس کی تنا بیدار ہو جائے اور مستقبل میں وہ پوری ملتِ اسلامیہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں اور ہمیں دوسری قوموں کے سامنے فخر سے سر اٹھانے کا موقع ملے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ریاضی پر بھی زور دینا چاہیے۔ کیوں کہ آگے چل کر بچوں کو سائنس کے اصول کو حل کرنے میں کسی طرح کی پریشانی نہ ہو۔ سائنس کے فارمولے ریاضی کے ذریعے ہی حل کیے جاتے ہیں۔ اس لیے مدارس میں بچوں کے جدید ٹیم [illegible] پر زور دینا چاہیے۔

اسکولوں میں وقتاً فوقتاً سائنس و ٹکنالوجی پر تقریریں بھی ہونی چاہیے جس میں مسلمان سائنس دانوں، دواسازوں اور ماہرین فلکیات کے کارنامے بیان ہوں اور عصر حاضر میں سائنس کی ترقی پر بھی روشنی ڈالی جائے تاکہ بچے سائنس کی طرف راغب ہوں۔ بچوں کو یہ بھی بتایا جائے کہ بہت سے عرب سائنس دانوں کا نام بگاڑ کر انہیں انگریز ثابت کیا جا رہا ہے۔

بہت سے ذہین طلبا ایسے بھی ہیں جن کی مالی حالت انہیں آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی جس کی وجہ سے انہیں بیچ میں ہی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دینا پڑتا ہے۔ اگر یہ مرکز ذہین اور نادار طلبا کی سرپرستی قبول فرمائے تو بہت سے سائنس داں اور انجینئر اس ملک میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے وقف ادارے بھی سائنس، انجینئرنگ اور ڈاکٹری کے طلبا کو مالی امداد دے کر ان کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔

عربی فارسی بورڈ کے فوقانیہ اور عالیہ کے نصاب میں سائنس کو بحیثیت اختیاری مضمون رکھنا چاہیے اور یہ کوشش ہونی چاہیے کہ منشی، کامل عالم اور فاضل پاس طلبا کا داخلہ ملک کے سبھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہو سکے۔

دینی مدارس میں تکنیکی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے، جہاں بچے پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر سکیں اور مدرسے سے نکلنے کے بعد ذریعہ معاش کے لیے پریشان نہ ہونا پڑے۔

سینٹر فار پرموشن آف سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے ہر ضلع میں ایک انسپکٹر کی تقرری ہو جو ضلع کے سبھی دینی مدرسوں میں سائنس کی تعلیم کا جائزہ لے اور اس کی رپورٹ ہر مہینہ یا تین مہینے میں مرکز کو بھیجتا رہے۔

سائنس کا بہتر طریقۂ تدریس

فرید احمد نظامی

نہ تو میں عالم دین ہوں نہ سائنس داں کہلانے کا مستحق۔ ریش سفید کی وجہ سے اپنے جوان ساتھی کی طرح یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ابھی طفل مکتب ہی ہوں کیوں کر ۔۔۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

آج اور پچھلے دو دنوں میں یہاں ہم نے مقالے سنے۔ بحث ومباحثے میں حصہ لیا جس سے مختلف زاویہ ہائے نظر اور انداز فکر سامنے آئے۔ زیادہ تر گفتگو کارآمد وموثر رہی۔ کبھی کبھی جب کانفرنس کے موضوع سے ہٹ گئے تو ایسی باتیں بھی ہوئیں جو مرکز فروغ سائنس کے دائرہ کار سے باہر تھیں۔ نہ صرف دائرہ کار سے بلکہ دائرہ اختیار سے بھی۔ مثلاً مسلم زیر انتظام اسکولوں میں دینی تعلیم (دینیات۔ اسلامیات عربی) کا لازمی ہونا۔ ظاہر ہے کہ اگر وسائل و اختیار ہمیں حاصل نہیں تو اس متعلق گفتگو بھی لاحاصل ہے۔

تین موضوعات جن پر خاص طور سے توجہ مرکوز رہی۔

دینی مدارس میں سائنس کی ترویج کی ضرورت۔

دینی مدارس میں سائنس کی ترویج کی راہ میں دشواریاں

دینی مدارس کے لیے سائنس اور ریاضی کا نصاب

ایک بات جو ابھر کر سامنے آئی وہ یہ کہ شرکاء کانفرنس میں سے اکثریت کی رائے ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کو داخل نصاب کیا جائے، کس مرحلہ پر سائنس کا نصاب کتنا ہو، یہ آپ کا فیصلہ ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ تمام دینی مدارس میں سائنس کی مقدار بہ لحاظ وقت اور بہ لحاظ نصاب ایک ہی ہو۔ نہ یہ لازم ہے کہ ہم C.B.S.E.، یوپی بورڈ یا کسی اور بورڈ کا نصاب اختیار کریں۔ بلکہ میں تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ دینی مدارس کا نصاب سائنس "سائنس برائے زندگی" (Science for living life.) کے اصول پر بنایا جائے جس طرح ایک زمانے میں ۴۵ سال قبل ادب کے دو حصے کر دیے گئے تھے۔

۱۔ ادب برائے ادب ۲۔ ادب برائے زندگی۔

ہر چند کہ یہ اصطلاحات اب رائج نہیں۔ اسی طرح سائنس برائے سائنس تو وہ ہوسکتی ہے جس میں محققین (Researchers) مصروف کار ہیں۔ سائنس برائے زندگی کی اس دور میں رہنے والے ہر شخص کو ضرورت ہے اور یہ ضرورت بڑھتی ہی جائے گی۔

تو اس پر تو ہمیں اختیار ہونا چاہیے کہ ہم سائنس کب شروع کریں اور کس مرحلے پر کیا نصاب رکھیں، لیکن اس کی اجازت نہ ہونی چاہیے کہ سائنس کو جس طریقے سے چاہیں پڑھائیں۔ اب آپ خود ہی سوچیے کہ کیا طالب علم کی مشقت اور استاد کی محنت کا زیادہ حصہ اس طریقۂ تدریس سے ضائع نہیں جاتا۔ ماہرین تعلیم اس پر اصرار کرتے ہیں کہ بولنا سب سے پہلے پڑھنا نمبر ۲ اور لکھنا بہ الفاظِ دیگر ہجے و قواعد سب سے آخر میں سکھانا چاہیے۔

مختصراً یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ نامناسب یا ناقص طرز تدریس سے طلباء کی دیدہ ریزی اور اساتذہ کی محنت میں اضافہ ہوتا ہے وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور طلباء مضمون سے کبھی بددل اور کبھی متنفر تک ہو جاتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مضمون جتنا خشک اور مشکل ہوگا اور جتنا طالب علم کو اس کے حصول کے لیے محنت کرنا پڑے

گی اتنا ہی طالب علم کے ذہن و دماغ کے لیے بہتر ہوگا Mental Training
دور حاضر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی مضمون کے پڑھنے سے
طالب علم کو اطمینان، خوشی اور فخر حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کی تدریس
بیکار ہے۔ اسی وجہ سے اختیاری مضامین کی فہرست طویل اور لازمی
مضامین صرف چند رکھے گئے ہیں اور یہ لازمی مضامین بھی اگلے مرحلوں
میں اختیاری ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو داخل نصاب کریں تو
کیوں نہ بہترین طریقہ ہائے تدریس جو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ درجات
کے لیے موزوں ترین ہوں، اختیار کیے جائیں۔ اس کے غور و فکر کا موقع بھی
یہی ہے جب کہ ہم سائنس کی ترویج کی ضرورت، اس کی دشواریوں اور
نصاب کے بارے میں غور کر رہے ہوں۔ سائنس بہت سے طریقوں سے پڑھائی جاسکتی ہے۔

درسی کتب کے ذریعے — Text Book Method
لکچر کے ذریعے — Lecture Method
تحقیق کے ذریعے طالب علم کو محقق فرض کرکے — Heuristic/Lab Method
مسائل اور ان کا حل۔ — Problem Method
پراجیکٹ کے ذریعے۔ — Project Method

"سائنس کی تدریس کے لیے بدترین طریقہ درسی کتب کا ہوگا اس
لیے کہ سائنس مشاہدہ (Observe) تجربہ (Expt) زندگی
میں عمل (Application) اطلاق کے امتزاج کا نام ہے۔ مطالعہ
بیشتر اسی میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن ثانوی درجات میں اس کی اہمیت زیادہ
ہے۔

بچے کے ہاتھ میں ایک پھول دے کر اس کی حرکات و سکنات کا
مشاہدہ کیجیے، کچھ دیر دیکھنے، سونگھنے، لوٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد
وہ اس کو چیر پھاڑ کر دیکھے گا۔ اس کے بعد اس کے اجزاء کو یکجا کرنے
کی بھی کوشش کر سکتا ہے۔ گویا مشاہدہ تجربے کے ذریعے مطالعہ کر رہا
ہو۔ اسی کو انگریزی میں Analysis, Synthesis کہتے ہیں
یعنی پہلے کسی چیز کے اجزاء کو دیکھ اور سمجھ لیا جائے جس میں مشاہدہ اور
تجربہ دونوں ہی آگئیں۔ پھر ان دونوں کے نتائج کو یکجا کر کے کلیہ یا Synthesis
پہ پہنچا جائے۔ اسی قسم کے طریقہ کار کو سائنس کا طریقہ Scientific Method
کہتے ہیں۔ جس میں ہم

From	To	
Easy	Difficult	آسان سے مشکل
Simple	Complex	معلوم سے نامعلوم
Concrete	Abstract	محسوسات سے تصورات
Facts	Generalization	حقائق و مشاہدات سے اصول
Analysis	Synthesis	جزئیات سے کلیات

کی طرف چلتے ہیں۔

ان شبہات کا بھی اظہار کیا گیا کہ سائنس کو داخل نصاب کرنے
سے مالی مشکلات ناقابل برداشت ہو جائیں گے۔ اس لیے ایسا کرنا ممکن نہ
ہو سکے گا۔ اس کا جواب اثبات و نفی دونوں میں ہی دیا جاسکتا ہے۔

اگر جواب اثبات میں دینا ہے تو تجربہ گاہ کا قیام اور متعلقہ مصارف
بتدریج مرحلہ وار طے کیے جاسکتے ہیں۔ مزید یہ کہ صرف اشد ضروری
ساز و سامان اور کیمیاوی اجزاء Apparatus & Chemicals
سے کام لیا جاسکتا ہے۔

پھول، مکھی، مچھر } کتاب سے بھی بڑھایا جاسکتا ہے اور سائنٹفک طریقے سے بھی
Hand Lens — آتشی شیشہ

اور اگر جواب صرف نفی میں ہی دینا ہے تو میں اس مصرعہ پہ اکتفا کروں
گا کہ

تیرا ہی دل نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

سائنس کی تدریس سے ایک طرز فکر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔
جان ڈوئی امریکہ کے ماہر فلسفۂ تعلیم کا کہنا ہے کہ زیادہ ضرورت اس
کی ہے کہ طلباء میں استعداد و لیاقت پیدا ہو کہ وہ کس طرح سوچیں۔ اگر
یہ لیاقت پیدا ہو گئی تو "کیا سوچیں" نسبتاً آسان ہوگا

How to Think, what to Think

اساتذۂ سائنس ہندوستان میں سائنس کی تدریس سے مطمئن
نہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ۹۰% اسکولوں میں مناسب طریقہ تدریس
استعمال نہیں کیے جاتے، حالاں کہ بی۔ ایڈ اور اسی قسم کی تربیت کو دسوں

میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عربی مدارس کے لیے یہ لمحۂ فکر ہونا چاہیے، جہاں سائنس کی تعلیم شروع ہوا چاہتی ہے۔ کیوں نہ شروعات بہترین طریق سے ہو؟

کسی بھی مضمون کو موثر طور سے پڑھانے کے لیے کچھ طریقہ ہائے تدریس مقرر کیے گئے ہیں جو طالب علم کی ذہنی صلاحیت، عمر، گذشتہ معلومات، متن سبق کے لحاظ سے مناسب یا غیر مناسب ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی طریقۂ تدریس ابتدائی مرحلے کے لیے نہایت موزوں اور ثانوی یا اعلیٰ تعلیم کے لیے اتنا ہی غیر موزوں ہو سکتا ہے۔

مناسب طریقۂ تدریس کو زبان اور خاص طور سے غیر ملکی زبان کی مثال لے کر دیکھا جائے تو شاید آسانی ہو۔ اسکولوں میں انگریزی اور مدارس میں عربی غیر ملکی زبانیں ہیں جو پڑھائی جاتی ہیں۔ غیر ملکی زبان پڑھانے کے مندرجہ ذیل طریق ہیں۔

۱۔ قواعد اور اس کے بعد ترجمہ پر مبنی طریقہ

1- Grammar Translation Method

۲ بلا واسطہ (مادری یا دوسری زبان) تدریس۔ مثل مادری زبان بغیر مادری زبان

2. Direct Method, like mother Tongue, without mother Tongue

۳۔ الفاظ/جملوں کی تشکیل کا طریقہ

3. Structural Method (Based on Grammar)

۴ بنیادی ضروریات کی زبان

4. Basic Language

۵۔ رابطے کی زبان

5- Communicative Language - verbal/written

آپ کا نام کیا ہے؟

what is your name?

پہلا طریقہ تا چیز / قادم کو ..... کہتے ہیں۔ محمد حسین آزاد

غالب - حالی - سرسید کے زیر اثر......

مندرجہ بالا طریقہ ہائے تدریس میں ۱ و ۳ میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے اور نمبر ۲ نمبر ۴ و نمبر ۵ میں بھی کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم ابتدائی مراحل میں بلا واسطہ تدریس سے غیر ملکی زبان کی تدریس کا آغاز کرتے۔ اس کے بعد بنیادی ضروریات کی زبان سکھاتے اور اس کے بعد رابطہ کی زبان کا نمبر آتا۔ جب ان تینوں مراحل میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو قواعد اور ترجمے پر مبنی طریق استعمال ہوتے اور آخر میں محاسن زبان اور اس زبان کے ادبی سرمایے کا نمبر آتا۔۔ فائدہ اس کا یہ ہوتا کہ کم عمر طلبا بھی غیر ملکی زبان، انگریزی ہو یا عربی بول سکتے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ انگریزی یا عربی کا گریجویٹ اس زبان کو پڑھ اور لکھ تو سکتا ہے لیکن بے تکان بول نہیں سکتا اور جب ہم کسی زبان کو استعمال ہی نہیں کر سکتے تو اس کی افادیت نہایت درجہ محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

غیر ملکی زبان کی بلا واسطہ تدریس کی افادیت کا جیتا جاگتا ثبوت اس یونیورسٹی میں غیر ملکی طلباء ہیں۔ خاص طور سے برّاعظم افریقہ سے تعلق رکھنے والے بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ وہ ہندوستانی زبان کس طریقہ تدریس سے سیکھ رہے ہیں۔ وہ بنیادی ضروریات کی زبان سیکھ لیتے اور دوکانداروں، رکشہ والوں وغیرہ سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ترجمہ کا طریقہ۔ Translation Method غیر ملکی زبان کے لیے کم از کم ابتدائی و ثانوی سطح پر اسکول اور مدارس میں عام ہے۔ طالب علم کو اس میں دوہری مشکل ہے۔ وہ سوچتا اپنی مادری زبان میں ہے۔ پھر اس کا ترجمہ انگریزی یا عربی میں کرتا ہے۔ تب کوئی جملہ کہہ سکتا ہے یا لکھ پاتا ہے۔ یہی محنت اس کو غیر ملکی زبان کو پڑھنے میں کرنا پڑتی ہے، طالب علم پڑھتا ہے، انگریزی یا عربی لیکن مطلب انگریزی یا عربی میں نہیں بلکہ اردو میں سمجھتا ہے

مدارس میں سائنس کی تعلیم اور اردو

محمد شکیل

آج ہر قوم اور ہر ملک کی ترقی کا دار و مدار سائنس کی ترقی
ر ہے۔ جو قومیں سائنسی تحقیقات اور ایجادات میں پیش پیش ہیں، وہی ترقی
فتہ ہیں اور جو اس نعمت اور دولت سے محروم ہیں وہ پسماندہ اور دوسری
ہموں کی دست نگر ہیں۔ نتیجہ کے طور پر آج دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی
ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک — یہ خلیج اتنی وسیع ہے
شاید ہی اس صدی میں پُر ہو سکے۔ ہمیں چلنا ہی نہیں بلکہ دوڑنا ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سائنس کی روشنی مغرب کے
ریعے ہی ہم تک پہنچی ہے۔ مشرق کبھی بھی تاریکی میں لپٹا ہوا نہیں تھا بلکہ
مبالغہ نہیں ہے کہ سائنس کی اولین شعاعیں مشرق سے ہی پھوٹی تھیں۔
ں وقت یورپ تاریکی میں لپٹا ہوا تھا اور توہمات کے اندھیرے میں بھٹک
رہا تھا، اس وقت مسلمانوں نے شمع علم کو اس شان سے فروزاں کیا کہ
مشرق وسطیٰ سے لے کر اسپین اور فرانس تک روشنی پھیل گئی۔ حقیقت
ہے کہ یورپ میں دورِ نشاۃ ثانیہ کبھی آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر مسلمان
سائنس داں، اہل علم اور اہل دانش تاریکی کے بادلوں کو غرناطہ اور قرطبہ
نہ چھانٹتے۔ عربوں سے سائنسی علوم و فنون یورپ پہنچے اور وہاں ان کی
ترقی کے لیے کوششیں ہوئیں اور اس کے بعد دوبارہ مشرق میں سائنس
روشنی طلوع ہوئی۔ یورپ میں فی الحقیقت سائنسی ترقی عربوں ہی کی
ت ہے۔ ان کا دورِ جدید و ترقی وجود میں نہیں آ سکتا تھا، اگر مسلمان
سائنس داں تاریک راہوں کو روشن نہ کرتے۔

سلطنت روما کے زوال کے بعد تقریباً چار سو سال تک علوم و
فنون کی ترقی کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا۔ خلفائے راشدین کے عہد
میں سائنس دانوں کی قدر و منزلت کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا
جا سکتا ہے کہ:

> " ان کے عہد کے ایک سائنس داں کی
> سالانہ آمدنی تقریباً ۳۶ لاکھ درہم تھی "

(ماہنامہ برہان - دہلی - جون ۱۹۸۲ء : مضمون: مسلمانوں میں سائنسی ترقی کے زوال کے اسباب : مضمون نگار - ڈاکٹر عرفان احمد)

آٹھویں صدی میں خلیفہ منصور نے سائنسی تحقیقات کا ایک ادارہ قایم کیا تھا اور سائنسی کتابوں کے ترجمے بھی کرائے تھے
خلیفہ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں گھڑی ایجاد ہوئی اور عربوں نے لکڑی کے بلاک بنا کر چھپائی کا کام شروع کیا جو عالم سائنس کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس دور کے مشہور سائنس دانوں میں الخوارزمی (ماہر علم ہندسہ) عمر خیام (مشہور شاعر اور ماہر فلکیات) اور ابن سینا (ماہر طب) کے نام سر فہرست ہیں۔

سائنسی ترقی کی دولت دھیرے دھیرے عرب سے یورپ کی سمت منتقل ہونے لگی۔ عرب سائنس کے میدان میں سستی کا شکار ہو گئے اور یورپ نے تازہ دم ہو کر سائنسی میدان میں پیش رفت دکھائی۔ یہاں تک کہ ان کی سائنس ترقی کی راہ پر سب سے آگے نکل گئی۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے خصوصاً دیندار طبقے نے سائنس کے میدان میں بہت کچھ کر دکھایا ہے
کیوں آج ہمارے دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو اہمیت ... جا سکتی

اب دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر مدرسوں میں سائنس کس زبان میں پڑھائی جائے میرا جواب ہے اردو ۔ اردو میں سائنس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کا وجود اقلیدس کے فرضی نقطے سے زیادہ نہیں ہے :

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں بہت سی ہندوستانی زبانوں سے پہلے سے سائنسی لٹریچر موجود ہے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو صرف رات اور زلف کی کہانی ہے اور اس میں بجز نظارۂ جمال اور شوق وصال کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اردو میں یہ صلاحیت شروع سے ہی موجود ہے کہ وہ ایک طرف تو حسن وعشق کی رنگین داستانوں کو نظم ونثر کے حسین ترین قعون کی صورت میں پیش کر سکتی ہے. منطق وفلسفہ اور تصوف ومعرفت کے باریک اور نازک مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے تو دوسری طرف علمی وفنی اور سائنسی وتکنیکی موضوعات کی بھی آئینہ دار ہے۔ اس سے مقصود رخ روشن کے سامنے شمع رکھنا نہیں ہے اور نہ یہ بتانا ہے کہ اردو سائنسی ادب میں یورپ کی زبانوں کے ہم سر اور ہم پایہ ہے بلکہ اردو میں سائنسی مضامین پر اچھا بڑا لکھا جا رہا ہے۔ اردو کے سائنسی ادب کا مقابلہ انگریزی یا جرمن سے کرنا نا انصافی ہوگی لیکن جب اس کا مقابلہ ہندوستان کی کسی زبان سے کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اردو اتنی بے مایہ یا تہی دامن بھی نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔

کسی ملک اور قوم کی ترقی کی رفتار کا اندازہ اس کے ادبی اور علمی ذخائر سے لگایا جاتا ہے۔ قومیں عمارتوں سے نہیں افکار تازہ سے بنتی ہیں۔ سائنس وٹیکنالوجی کی تصنیفات کا سروے کرنے سے معلوم ہوا کہ ہر دس سال میں اس کی کتابیں دگنی ہو جاتی ہیں۔ باوجود دشواریوں کے اردو بھی سائنسی ادب کی اس دوڑ میں ہندوستان کی کسی زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سی دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں سائنس کا سرمایہ بہت پہلے سے موجود ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ اس ذخیرے کو ٹٹولا جائے اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

" مدارس میں سائنس کی تعلیم اور اردو " سے متعلق میری یہ گفتگو محض زبانی جمع خرچ نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان مدارس اور اداروں کا مختصر تعارف بھی کرا دوں جو اردو کے ذریعے سائنس کی تعلیم کی عملی مثال پیش کر چکے ہیں۔

مدرسہ غازی الدین حیدر ۱۶۹۲ء میں دہلی میں قایم ہوا۔ یہاں کے طلباء اور اساتذہ میں سائنسی بیداری بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروپ نے مولانا نانوتوی کی قیادت میں دارالعلوم دیوبند قایم کیا اور دوسرے گروپ نے جس میں سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی ۔

۱۸۲۵ء میں انگریزوں نے مدرسہ غازی الدین کی قدیم عمارت میں ایک جدید کا[…] دہلی کالج قایم کیا۔ ۱۸۲۸ء سے سائنسی علوم اردو میں پڑھانے کا سلسلہ شروع[…] اور سائنسی کتابیں اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے ۱۸۴۱ء میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی[…] کی گئی ۔

ماسٹر رامچندر نے تفرقی احصاء کا ایک نیا طریقہ ۔ New Method of Differential Calculas) ایجاد کیا جس کے لیے انہیں گورنر جنرل نے[…] خلعت سے نوازا۔ ان کی کتاب جزئیات وکلیات (Maxima-Minima) یو[…] کی کئی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب تھی۔ ۱۸۵۷ء تک اس ادارے نے پچاس[…] زیادہ سائنسی کتابیں اردو میں شایع کیں، جن میں مندرجہ بالا دو کتابوں[…] اصول علم مثلث وتراشہائے مخروطی وہندسہ با الجبرا ۔ ([…]ements of […]igonometry, Conic Section and Analytical Geometry) عجائبات روزگار، اصول علم حساب، الجبرا، اصول مقابلہ، رسالہ علم ہیئت اور رسالہ اعمال جراحی زیادہ اہم ہیں۔

اردو میں سائنس پڑھانے کا دوسرا مدرسہ[…] فخریہ" نواب فخر الدین شمس الامراء کبیر ثانی نے ۱۸۲۹ء میں حیدر[…] میں قایم کیا اور اس سے قبل ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کا لیتھو[…] سنگی مطبع قایم کیا۔ شمس الامراء لندن سے چھپنے والے سائنسی ر[…] برابر منگاتے تھے اور ان کا ترجمہ اردو میں کروا کے اپنے مطبع سے[…] کرتے تھے۔ اسی غرض سے ۱۸۳۴ء میں دارالترجمہ کی بنیاد ر[…] ______ ۱۸۴۶ء میں ہندوستان کا پہلا میڈیکل[…] قایم ہوا تو اسی مدرسے کے طلباء کو داخلہ مل سکا۔

۱۸۷۷ء تک اس ادارے نے چالیس کتابیں شا[…] جن میں ستہ شمسیہ (جو چھ رسالوں پر مشتمل ہے جس میں علم جر ثقیل، عل[…] علم ہوا اور علم مقناطیس ہے)۔ ترجمہ شرح چغمنی ۔ ا[…] حساب ۔ شمس الہندسہ، کسور اعشاریہ اور رفیع الہ[…] اہمیت کی حامل ہیں ۔

اختتامی اجلاس

الطاف احمد

کانفرنس کا اختتامی اجلاس جسے تجاویز اور عملی اقدامات پر غور وخوض اور مباحثے کے لیے مختص کیا گیا تھا ۲۸ مارچ ۸۶ء کو شام تین بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر اسرار احمد نے ایک موثر تقریر کی اور کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالوں کی روشنی میں شرکا کانفرنس کو مرکز کے آئندہ عزائم اور لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد صدر اجلاس مولانا محمد تقی امینی (سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں موصوف نے دینی مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم کی خامیوں کو اجاگر کیا اور اس کی اصلاح کی طرف دینی مدارس کے ارباب بسط وکشاد اور ان کے معلمین کو متوجہ کیا۔ مولانا نے اس امر پر زیادہ زور دیا کہ مدارس کے نصاب تعلیم سے از کار رفتہ اور دینی علوم کو نکال کر ان کی جگہ ریاضی اور سائنس جیسے علوم کو داخل کیا جائے۔ کیوں کہ یہ مفید عصری علوم ہیں اور ان کی تحصیل میں مسلمانوں کی دنیوی اور دینی دونوں طرح کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔

اس تقریر کے بعد بعض علما نے کانفرنس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مرکز فروغ سائنس کی جانب سے مسلمانان ہند میں سائنسی علوم و فنون کی ترویج کے لیے کی جانے والی کوششوں پر کارکنان مرکز کو مبارکباد دی اور اس سلسلے میں اپنے اپنے مدارس کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ بعد ازاں راقم نے مدارس میں دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کی ضرورت [illegible] اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

نے اتفاق رائے سے منظور کرلیا۔

تجاویز

۱۔ کانفرنس کے جملہ شرکاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ریاضی اور سائنس کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

۲۔ کانفرنس اس توقع کا اظہار کرتی ہے کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مستقبل میں عربی مدارس کو جو بھی دشواریاں پیش آئیں گی، ان کے ازالے کے لیے مرکز فروغ سائنس ہر ممکن تعاون دے گا۔

۳۔ کانفرنس کو یہ بھی توقع ہے کہ مرکز فروغ سائنس مدارس کے ارباب حل و عقد کے مشورے سے سائنسی نصاب کی تیاری اور اس کے اساتذہ برائے سائنس کے لیے تربیتی کورس کا انتظام کرے گا۔

۴۔ کانفرنس کا یہ خیال ہے کہ مرکز فروغ سائنس مسلم معاشرہ بالخصوص اس کے تعلیمی اداروں میں سائنسی طرز فکر کے فروغ کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گا۔

کلمۂ اختتامیہ

فرحان مجیب

مرکز فروغ سائنس کی جانب سے شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری مجھے سپرد کی گئی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شکریہ ادا کرنے سے پہلے میں چند جملوں میں اس کانفرنس کے خوش اسلوبی سے اختتام پذیر ہونے پر اپنے اور اپنے رفیق کار سید ابوالہاشم رضوی کے تاثرات پیش کرنا چاہوں گا۔

جس افہام وتفہیم کے ماحول میں یہ کانفرنس اختتام کو پہنچی اور اس میں جو مفید تجاویز منظور ہوئیں ان پر ہمیں چنداں تعجب نہیں ہے اس لیے کہ شرکاء میں اکثریت اساتذہ کی ہے، خواہ ان کا تعلق دینی مدارس سے ہو، یا کسی کالج یا یونیورسٹی سے۔ ہم سب کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے۔ جو بھی علم ہمارے پاس ہے وہ آنے والی نسلوں کو دیں۔ اس لیے جب ہم اساتذہ اس بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر مسائل پر بات چیت کریں گے تو اتفاق رائے کا ہونا لازمی ہے۔

ہمیں امید بھی ہے اور یقین بھی کہ آئندہ جب بھی ہم لوگ دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اکٹھا ہوں گے تو بحث و مباحثہ کا نتیجہ اتفاق رائے ہی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

اب میں مرکز فروغ سائنس کی جانب سے تمام مدعوئین اور کانفرنس کے شرکاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنے قیمتی خیالات سے نوازا۔ ہم مولانا (پروفیسر) محمد تقی امینی کے خصوصی طور پر ممنون ہیں کہ انہوں نے قدم قدم پر ہماری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی اور نہایت ہی خوش اسلوبی سے اس آخری نشست کی صدارت کے فرائض کو انجام دیا۔ ہم حکیم الطاف احمد صاحب کے بھی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس کے سکریٹری کی حیثیت سے بہت سارا کام اپنے ذمّے لیا۔

ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ان تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلباء کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کی اور مباحثوں میں حصّہ لیا۔

ادارۂ تہذیب الاخلاق کے ایک رکن کو نقوش ادبی ایوارڈ

ہمارے قارئین کو یہ خبر سن کر خوشی ہوگی کہ ادارۂ تہذیب الاخلاق کے ایک رکن ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو حکومت پاکستان کے نقوش ادبی ایوارڈ ۱۹۸۶ (برائے تحقیق) کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اس سال اس ایوارڈ کے مستحق جو حضرات قرار دیئے گئے ہیں ان میں مرزا ادیب، ممتاز مفتی، عبدالعزیز خالد اور ڈاکٹر نجم الاسلام جیسے ممتاز اور صف اوّل کے ادیب شامل ہیں۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی وہ واحد ہندوستانی ادیب ہیں جن کو اس سال کا یہ ادبی اعزاز ملا ہے۔

نقوش لاہور کا شمار اردو کے ان چند تاریخ ساز رسائل میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب کو ایک نیا سمت سفر دیا ہے۔ نقوش کے بانی مدیر محمد طفیل مرحوم رسم و رہ عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے۔ انہوں نے نقوش کے جو خاص نمبر مرتب کرکے شائع کیے ہیں ان میں شخصیات نمبر، غزل نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، ادبی معرکے نمبر، منٹو نمبر ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر گھر گھر پھیل چکے ہیں۔ محمد طفیل مرحوم کا عظیم ترین کارنامہ نقوش کا رسول نمبر ہے جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ سعی بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی اور اس کی ترتیب و اشاعت کے بعد ان کے خالق مطلق نے ان کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے کر ان کی سعی کے مشکور ہونے کا اعلان فرما دیا۔ خدا ان کی تربت کو اپنے نور سے معمور فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو جس موضوع پر یہ ایوارڈ ملا ہے، اس کا عنوان "ابوالقاسم لاہوتی۔ ایک مطالعہ" ہے۔ ڈاکٹر جائسی اصلاً فارسی زبان و ادب کے طالب علم ہیں انھوں نے فارسی ادبیات کا مطالعہ کرتے وقت، ہندوستانی، افغانستانی اور تاجیکی فارسی ادبیات کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ انہی ادبیات کے مطالعے کے توسط سے وہ فارسی ادبیات کے بہت سے تاریک گوشوں کو منوّر کرتے رہے ہیں۔ تاجیکی ادبیات کے بارے میں انہوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لحاظ سے اہم اور منفرد ہے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی مواد نہیں ملتا۔ ایوارڈ کمیٹی کے اراکین نے ڈاکٹر جائسی کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کرکے ان تمام ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جو بیگانۂ سود و زیاں ہو کر خاموشی سے علم و ادب کا چراغ روشن کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔

ادارۂ تہذیب الاخلاق، ایوارڈ کمیٹی کے اس فیصلہ پر اس کا شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ ڈاکٹر جائسی اسی طرح آئندہ بھی علم و ادب کے تاریک گوشوں کو منوّر کرتے رہیں گے۔

اسرار احمد

[illegible]

۱ . جناب سید ہاشم علی ، وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

۲ . پروفیسر وصی الرحمٰن ، پرو وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

۳ . جناب سید حامد (مہمان خصوصی)
ہمدرد نگر ، دہلی ۔

۴ . مولانا پروفیسر محمد تقی امینی ، شعبۂ دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

۵ . حکیم الطاف احمد ، آئی۔ایچ۔ایم۔آر
ہمدرد نگر ، دہلی ۔

۶ . مولانا عبد السبحان
صدر ادارۂ اسلامیات سبحانیہ، نالہ گڑھ (سولن) ہماچل پردیش

۷ . مولانا محمد مستان عمری ، مدرسۂ ضیاء الاسلام
اسلام آباد ۔ رامپی چرلا کنلم چتور۔ آندھرا پردیش

۸ . مولانا زبیر احمد رضوی ،
دار العلوم فاروقیہ ۔ مدرسہ نگر دھوائی ۔ گونڈہ ۔ یوپی

۹ . مولانا محمد جان مفتاحی ،
مدرسہ رفیق الاسلام ۔ کورلیا دشاہ پور ۔ جونپور ۔ یوپی

۱۰ . مولانا سلطان احمد اصلاحی
ادارۂ تحقیقات اسلامی ، پان والی کوٹھی ۔ علی گڑھ

۱۱ . ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
شعبۂ مطالعات اسلامیہ ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۲ . مولانا محمود الحسن
مدرسہ کنز العلوم ۔ محلہ حیات گنج ۔ ٹانڈہ ۔ فیض آباد یوپی

۱۳ . جناب میر محمود علی قیصر ۔ نیو ماڈل اورینٹل اسکول
21-4-1189 .NN مولی باؤلی ۔ حیدر آباد ۔۲۔ آندھرا پردیش

۱۴ . مولانا زین العابدین شمسی
جامعہ اہل سنت ، امداد العلوم ۔ مہنا ۔ کھنڈسری بازار اعلم بستی یوپی

۱۵ . مولانا شرافت علی ندوی
دار العلوم ، تاج المساجد ۔ بھوپال ۔ ایم ۔ پی

۱۶ . جناب عبد الجلیل
شبلی نیشنل انٹر کالج ۔ اعظم گڑھ ۔ یوپی

۱۷ . مولانا سراج اللہ خان ۔ مدرسہ تعلیم الاسلام واردو ۔
مسجد شام بیگ ۔ دبیر پورا ۔ کومٹ واڑی ۔ حیدر آباد ۔ ۲۴

۱۸ . ڈاکٹر (مولانا) ظفر الاسلام
شعبۂ اسلامیات ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

۱۹ . مولانا ممتاز احمد قاسمی
مدرسہ نصرت الاسلام ۔ مسجد بالوگنج ۔ شملہ ۔ ہماچل پردیش

۲۰ . مولانا اولیس القاسمی ۔
جامعہ عربیہ اشرف العلوم ۔ کنہواں ۔ وایا پر بہار ۔ سیتا مڑھی بہار ۔

۲۱ . مولانا فرید احمد فلاحی ندوی ، شعبۂ معاشیات ، ایم ایس کالج

۲۲ . ڈاکٹر عبید اللہ فراہی
شعبۂ عربی ، لکھنؤ یونیورسٹی ۔

۲۳ . مولانا (ڈاکٹر) غلام یحییٰ انجم
شعبۂ عربی ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۴ . مولانا جلال الدین وزیر آبادی
الجامعۃ الاسلامیہ ۔ تلکینہ ۔ شیو پتی نگر ۔ بستی ۔ یوپی

۲۵ . حافظ بدر الدین
شعبۂ عربی ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دلی ۔ ۲۵

۲۶ . مولانا یعقوب قاسمی
جامعہ عربیہ امداد العلوم ۔ زید پور
بارہ بنکی ۔ یوپی ۔

۲۷ . جناب عبدالحق خان
علی علی ہاؤس - ۴۹ قاضی لین امرگڈھ ٹولہ جونپور - یوپی

۲۸ . مولانا حفیظ اللہ نعیمی
دارالعلوم فضل رحمانیہ بچپڑوا - گونڈہ - یوپی

۲۹ . ڈاکٹر شریف خان
شعبۂ تعلیمات، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

۳۰ . جناب شبیر احمد غوری
معرفت فزکس ڈیپارٹمنٹ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۱ . جناب احمد جمال،
ایس - ٹی - ہائی اسکول - مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

۳۲ . مولانا ثمین الدین مظاہری - مدرسہ جامعۃ الفلاح
مقام و پوسٹ - جریڈیہ - ضلع گریڈیہ - بہار

۳۳ . مولانا عبدالعلی فاروقی۔
دارالعلوم فاروقیہ - کاکوری - لکھنؤ - یو - پی

۳۴ . مولانا عبدالحمید رحمانی۔
التعلیمی اسلامی - جوگابائی - جامعہ نگر - نئی دلی - ۲۵

۳۵ . مولانا سید مظفر بلخی۔
عالم گنج پوسٹ گلزار باغ - پٹنہ - بہار

۳۶ . مولانا عبدالمجید فتح پوری قاسمی - جامعہ حسینیہ
شاہی مسجد لال دروازہ - جونپور - یوپی۔

۳۷ . مولانا طاہر اعظمی - جامعۃ الفلاح - بلریا گنج اعظم گڈھ یوپی

۳۸ . ڈاکٹر محمد اجمل۔
اپلائڈ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۹ . ڈاکٹر اسلم پرویز شعبۂ نباتیات۔
ذاکر حسین کالج - اجمیری گیٹ - دہلی۔

۴۰ . مولانا نفیس احمد ندوی - مدرسہ عربیہ - مدینۃ العلوم
مقام چھا پیرن بجرے - پوسٹ سوراؤں ضلع الہ آباد - یوپی

۴۱ . مولانا محمد عالم انصاری
مدرسہ ضیاء الاسلام - تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی یوپی

۴۲ . مولانا محمد ادریس۔
جامعہ نور الاسلام، ولید پور - اعظم گڈھ - یو - پی۔

۴۳ . مولانا غلام کبریا آرزو
مدرسہ عربیہ قاسم العلوم - قصبہ چھرہ - ضلع علی گڈھ - یوپی

۴۴ . جناب سید کمال رضوی
شعبہ حیاتیات، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

۴۵ . مولانا محمد عمر
مدرسہ تعلیم الاسلام، دبیر پورہ، کورٹ داڑی - حیدرآباد۔

۴۶ . ڈاکٹر محمد شکیل
۲۵ - ڈاکٹرس کورٹ، دہلی یونیورسٹی

۴۷ . ڈاکٹر فرید احمد نظامی،
شعبۂ تعلیمات، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

۴۸ . مولانا مفتی نظام الدین - جامعۃ الاشرفیہ - مبارکپور - اعظم گڈھ

۴۹ . مولانا محمد طیب، مدرسہ ضیاء العلوم، چنڈی گڈھ

۵۰ . مولانا مختار احمد قادری
جامعہ اہل سنت، امداد العلوم، ٹہنا، کھنڈ سری بازار، بستی

۵۱ . ڈاکٹر حبیب احمد قدوائی، شعبۂ تعلیمات
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

۵۲ . ڈاکٹر شوکت علی، سنٹر فار پروموشن آف سائنس
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

۵۳ . ڈاکٹر فرمان مجیب، سنٹر فار پروموشن آف سائنس ایم یو

۵۴ . ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی،
سنٹر فار پروموشن آف سائنس - مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

۵۵ . پروفیسر ایم ایم احمد
سنٹر فار پروموشن آف سائنس - مسلم یونیورسٹی - علی گڈھ

اعلان برائے داخلہ

جامعۃ الہدایۃ ——— رام گڑھ روڈ ——— جے پور (راجستھان)

جامعہ اعلیٰ دینی تعلیم اور ساتھ ہی تکنیکی تعلیم کیلئے ایک مخصوص ادارہ ہے اس میں مندرجہ ذیل درجات میں داخلے کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

(ا) برائے سال اول۔ نصاب عالی:۔ یہ کورس ۵ سال کا ہے اور گریجویشن کے مساوی ہے اس میں داخلہ کے امیدواروں کیلئے ضروری ہے کہ انہوں نے کسی معروف دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہو اور انکی عمر داخلہ کے وقت کم سے کم ۱۵ سال اور زائد سے زائد ۱۷ سال ہو، ان کا داخلہ مندرجہ ذیل کتب میں امتحان لیکر کیا جائے گا۔

(۱) فقہ میں نور الایضاح کی سطح تک (۲) ادب عربی میں القراءۃ الراشدہ حصہ سوم کی سطح تک (۳) نحو میں ہدایۃ النحو کی سطح تک (۴) انگریزی میں درجہ نہم کی سطح تک۔

(ب) برائے سال دوم عالی:۔ اس میں مندرجہ ذیل کتب میں امتحان لیکر داخلہ منظور کیا جائیگا (۱) ادب عربی میں منثورات کی سطح تک (۲) فقہ میں قدوری کی سطح تک (۳) نحو میں قطر الندیٰ یا اسکے مساوی کتاب کی سطح تک (۴) انگریزی میں درجہ دہم کی سطح تک۔ بروقت داخلہ کم سے کم عمر ۱۶ سال اور زائد سے زائد ۱۸ سال ہونا چاہئے۔

(ج) برائے سال اول۔ اعدادیہ: یہ کورس عصری تعلیم گاہوں سے آنے والے طلباء کو نصاب عالی میں داخلہ کا اہل بنانے کیلئے رکھا گیا ہے اس میں داخلہ کے امیدواروں کیلئے ضروری ہے کہ وہ (۱) کم از کم درجہ ہشتم پاس ہوں (۲) درجہ ہشتم تک اردو کی تعلیم حاصل کی ہو (۳) قرآن کریم کم از کم ناظرہ بصحت لفظ پڑھا ہو (۴) اور بوقت داخلہ عمر کم از کم ۱۳ سال اور زائد سے زائد ۱۵ سال ہو۔ داخلہ امتحان لیکر دیا جائے گا۔

برائے درجہ حفظ و قرأت:۔ اس میں داخلہ کے امیدوار کو ضروری ہے کہ اس نے ناظرہ قرآن بصحت لفظ پڑھا ہو، اور بوقت داخلہ عمر کم از کم ۸ سال اور زائد سے زائد ۱۲ سال ہو۔

آخری تاریخ:۔ درخواست وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۰ر شوال ۱۴۰۸ھ ۸ر جون ۱۹۸۸ء ہے درخواست داخلہ جامعہ کے مقررہ فارم پر ہی قابل قبول ہوگی، درخواست داخلہ، نصاب تعلیم اور فیس کی تفصیل آٹھ روپے کا منی آرڈر یا کراس پوسٹل آرڈر بنام JAMEA HIDAYAT جامعہ ہدایت جے پور بھیکر منگائی جاسکتی ہیں نیز مقامی طور پر دفتر جامعۃ الہدایۃ رام گڑھ روڈ جے پور سے صبح ۱۰ بجے تا شام ۴ بجے نقد پانچ روپیہ جمع کرا کر حاصل کی جاسکتی ہیں

طلباء کے لئے جامعہ میں قیام و طعام کا معقول انتظام ہے

مراسلت کا پتہ } جامعۃ الہدایۃ پوسٹ باکس ۲ جے پور ۳۰۲۰۰۱ (راجستھان)

JAMEA-TUL-HIDAYA, P O. BOX No 2, JAIPUR - 302 001 (INDIA)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۶ — جون ۱۹۸۷ء — شمارہ ۶

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شہاب الدین

تزئین
سرفراز

انچارج سرکولیشن ——— مستقیم احمد خان

زر سالانہ:	انڈیا ...	Rs. 30·00
	بیرونی ممالک ...	US $ 20·00 ہوائی ڈاک
		US $ 8·00 عام ڈاک

اس شمارے کی قیمت: تین روپیہ

ترسیل زر کا پتہ: ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سرپرست: **جناب سید ہاشم علی**
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

✻ مقالہ نگاروں کے لیے ✻

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

- عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالات کو ترجیح دی جائے گی۔
- ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
- مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
- مسودہ بڑے سائز (20cm x 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔
- مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔
- اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ: ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا۔

مالک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس: ایس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی لازماً ان سے متفق ہو۔]

اداریہ

وہ ماہ مبارک رخصت ہوا جس کی برکتوں سے مسجدیں نمازیوں سے معمور تھیں اور گھر تلاوت کلام پاک سے گونجا کرتے، وہ مبارک مہینہ رخصت ہوا جو قیام لیل کا مہینہ تھا، اہتمام افطار و سحر کا مہینہ تھا، تلاوت و ضبط نفس کا مہینہ تھا، باہمی ہمدردی و ایثار کا مہینہ تھا، نظافت و پاکیزگی کا مہینہ تھا، عفو طلبی کا مہینہ تھا، رحمتوں کی بارش کا مہینہ تھا۔ رمضان المبارک کے اس پورے ایک مہینے میں مسلمانوں نے من حیث القوم جس اجتماعی عبادت کا بر سر عام مظاہرہ کیا، اس کی مثال کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ اس گئی گذری حالت میں جب کہ مسلمانوں میں اعلانیہ کھانے پینے، سڑکوں پر سگریٹ کا فخریہ دھواں اڑانے، پانوں سے اپنی باچھوں کو لال کیے ہوئے اکڑ کر چلنے والوں کی کمی نہیں ہے، مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے نے رمضان المبارک کے پورے روزے رکھ کر، راتوں کو تراویح پڑھ کر، دنوں میں تلاوت کر کے اپنے عامل مسلم ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو لوائے احمدیؐ کے سایے میں پناہ گزیں رکھا۔

دوا سے امراض ختم ہو جایا کرتے ہیں، آگ میں تپ کر سونے کا کھوٹ نکل جایا کرتا ہے اور وہ نکھر نکھر کر کوئی خوبصورت سا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ بھٹی کی تیز اور روشن آگ میل کچیل کا خاتمہ کر دیتی ہے اور اس پر چڑھائے گئے سارے کپڑے، چادر مہتاب بن کر نکلتے ہیں۔ خراد پر چڑھ کر بد وضع و بد قوارہ برتن، سبک اور سجیل بن جاتے ہیں۔ سان پر چڑھ کر زنگ خوردہ تلوار، تیغ برّاں و دو دم بن جایا کرتی ہے۔ یہ وہ مسلمات ہیں جن سے کوئی بھی عقل سلیم و دیدۂ بینا رکھنے والا انکار نہیں کر سکتا لیکن حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ روزہ جو ہمارے مرض گرفتہ روح کے لیے تریاق کی سی حیثیت رکھتا ہے ہماری شخصیت پر کوئی بھی اثر نہیں ڈالتا۔ ہم ایک ماہ کی مسلسل عبادت و ریاضت کی بھٹی میں تپنے کے باوجود کندۂ ناتراش ہی رہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو روزہ رکھتے نہیں اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ روزہ رکھنے کے معنی یہ نہیں ہے کہ انسان بد مزاج ہو جائے، اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کرے، روزے کا نام لے کر ناجائز مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ روزہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خوش خلق ہو جائے فرائض منصبی کو انتہائی ذمہ داری سے ادا کرے اور سراپا تسلیم و نیاز بن کر عبودیت کا پیکر مجسم بن جائے۔ اصل اور حقیقی روزہ مؤمن کی تخلیقی اور عملی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، سلاتا نہیں۔ اگر کوئی شخص روزے کی وجہ سے یہ محسوس کرے کہ اس کی تخلیقی اور عملی قوتیں خوابیدہ ہو گئی ہیں تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ فاقہ زدگی کا شکار ہے روزہ دار نہیں۔

اس برکتوں والے مہینے میں بھی ادھر کلام پاک ختم ہوا، ادھر تراویح پڑھنے والوں کی تعداد گھٹنے لگی۔ چاندرات آتے آتے تک یہ تعداد گھٹ گھٹا کر ادر کم ہو گئی، پھر عید کا دن آیا، یار دوستوں سے ملنے اور سیر و تفریح کی وجہ سے پہلے ہی دن نماز گنڈے دار ہو گئی

پھر دھیرے دھیرے یہی عادت پڑنے لگی۔ گھٹتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب مسجد سے صرف جمعہ [illegible]
پانچوں وقت پابندیٔ وقت کے ساتھ مسجد میں آنے کی جو عادت ڈالی گئی تھی وہ دو ہی دن میں ہوا ہوتی نظر آنے لگی۔ احترام رمضان میں
ہم نے کسی حد تک اپنے آپ کو بدگوئی، غیبت، بہتان طرازی، چغل خوری اور بدخواہی سے بچا رکھا تھا لیکن چوں کہ ہمارے روزے، روزہ
کی اصل و حقیقی روح سے عاری تھے، اسی لیے عید کا دن آتے ہی چغل خوری، بہتان طرازی، بدگوئی، بدکلامی اور غیبت کی وہ گرم بازاری ہوئی
کہ گویا کہ ہم روزے کے فیوض و برکات سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوا کے تیر بہدف ہونے میں تو کوئی کلام نہیں، مگر بیمار
اتنا بدپرہیز، خود رائے ہے کہ تیر بہدف دوا بھی اس کے مرض کے ازالہ میں خاطر خواہ کامیاب نہیں۔

اس وقت پورے مسلم معاشرے کی مثال اسی بیمار جیسی ہے جس کے پاس تیر بہدف دوا تو موجود ہے مگر وہ اپنی
خود غرضی، ہوس، جہالت اور خود سری کی وجہ سے ایسی ایسی بدپرہیزیوں کا مرتکب ہوتا ہے کہ دوا اپنا کوئی اثر کر ہی نہیں پاتی۔ رمضان
المبارک کے فیوض و برکات سے مجالِ انکار نہیں لیکن پورے ایک ماہ کے روزے رکھنے، تراویح پڑھنے، مستقل تلاوت کرنے کے
باوجود اگر مسلمان اپنے آپ کو بدگوئی، غیبت، بہتان، حسد، جلن، بے جا فخر و غرور، الزام تراشی سے نہ بچا سکیں تو یہی سمجھنا چاہیے
کہ ان کا روزہ اصلاً روزہ نہ تھا بلکہ فاقہ تھا۔ روزہ تو انسان کو تمام برائیوں سے روکتا ہے، اچھے اعمال کی ترغیب دیتا ہے
باہمی اخوت اور بھائی چارگی کے راستے پر چلاتا ہے۔ اگر روزہ رکھنے کے باوجود کوئی شخص ان تمام چیزوں کو حاصل نہ کر سکے تو ہم خدانخواستہ
روزے کے فیوض و برکات پر کوئی شک و شبہ نہ کریں گے بلکہ برملا یہ سمجھیں گے کہ روزہ رکھنے والے نے روزہ کے نام پر پندرہ گھنٹوں
کا فاقہ کیا ہے۔ کیوں کہ اگر اس نے روزہ رکھا ہوتا تو اس کو وہ تمام چیزیں حاصل ہوتیں جن کی بشارتیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم نے دی ہیں۔

رمضان المبارک تو رخصت ہوا مگر احتساب نفس کا وقت اب بھی باقی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک
موت کا فرشتہ ظاہر نہ ہو۔ اس لیے عید کی خوشیاں مناتے وقت ہم کو احتساب نفس سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ یہ احتساب نفس
اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ہماری فطری ٹیڑھ یا نافہمی کی وجہ سے اسلام کے بہت سے سچے اصولوں پر آنچ آتی ہے اور اغیار کی
نگاہوں میں ان کی وقعت ماند پڑتی ہے۔ اس لیے ہم اپنے لیے نہ سہی تو کم از کم اسلام کی حقانیت کے لیے ہی ایسے کام کرنے سے گریز
کریں جو ہمارے انفرادی اعمال ہونے کے باوجود ہمارے مذہب کی حقانیت کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔ ایک ماہ کی اجتماعی عبادت کے
بعد آیے اپنے خالق برحق سے رو رو کر دعا کریں

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۝

[illegible]

زبان گویا

الطاف حسین حالی

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیٔ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں رس کی گانٹھیں اور کہیں تیرے بول زہر کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو [illegible]

[illegible]

تکلیفیں، ہمارے سیکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ، صرف تیری ایک "ہاں" اور ایک "نہیں" پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوا دئے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ! اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت اور روح کے پیغام پر حاشیہ نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم کی ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے جا نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا مجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ کبھی نہ بولے اور طوفان کبھی نہ اٹھائے

غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منھ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت بھلے کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا، کسی نے گستاخ اور منھ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھیرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بد عہد بنایا اور کسی نے غماز غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام جھگڑا اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھیرے۔ اے زبان! یاد رکھ! ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں، گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"!

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار رہے
تو زبان راست گفتار دے اور اگر
دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان
پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک
دنیا میں رہیں، سچے کہلائیں
اور جب تیرے دربار
میں آئیں تو سچے
بن کر آئیں۔
آمین

"یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے منھ مشرق اور مغرب کی طرف کرلو بلکہ حقیقی
نیکی اسی کی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور انبیاء پر ایمان لائے
اور محبت خدا میں مال رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سائلوں کو دے اور گردنیں
آزاد کرانے میں لگائے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب معاہدہ کرلیں تو معاہدہ
کو پورا کرنے والے ہوں۔ اور تنگ دستی اور بیماری میں اور لڑائی کی سختی کے وقت
صبر کرنے والے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے مجملاً سچ بولا اور یہی متقی ہیں"
(سورہ بقرہ آیت ۱۷۷)

خطبۂ صدارت

(افتتاحی اجلاس سہ روزہ کانفرنس دینی مدارس اور سائنسی تعلیم)

سیّد ہاشم علی

برادر بزرگ و محترم جناب سیّد حامد صاحب، جناب پرو وائس چانسلر صاحب، پروفیسر اسرار احمد صاحب، ڈاکٹر سیّد ابوالہاشم رضوی صاحب، ڈاکٹر فرحان مجیب صاحب، محترم علمائے کرام، کانفرنس کے مندوبین اور حاضرین!

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے آپ تمام حضرات کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی وہ واحد جگہ ہے جہاں جدید تعلیم یافتہ مسلمان دانشور اور مسلمان طلباء اکثریت میں ہیں اور شاید کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ادارہ اس وقت ہندوستان میں وہ واحد مرکز ہے جہاں سے ہماری فلاح و ترقی کا دوسرا دور شروع ہو سکتا ہے۔ کئی چالیس سال پہلے تک جامعہ عثمانیہ نام کا ایک ایسا ہی مرکز اور بھی تھا جو یونیورسٹی کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دو سال قبل قائم ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی یونیورسٹی تھی جہاں ہندوستان میں پہلی مرتبہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا اور جہاں اردو بازاروں اور محلوں کی زبان کے درجے سے ترقی کر کے سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان تھی۔ اگر یہ دونوں ادارے ہندوستان میں قائم نہ ہوئے ہوتے تو ہم تعلیمی پسماندگی کی انتہا پر ہوتے۔ ہم میں سے کوئی بھی نچلی سطح کی ملازمتوں پیشیوں سے آگے نہ بڑھ پاتا جیسا کہ سرسیّدؒ نے ذکر کیا تھا۔ بدقسمتی سے سرسیّدؒ کے سو سال بعد بھی ہم لوگ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہیں، بلکہ تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہے ہیں اور ہر میدان میں ہم لوگ درج فہرست اقوام سے کم از کم پچاس سال پیچھے ہیں۔ ہندوستان میں جتنے بھی تقررات ہوتے ہیں ان میں سے سترہ فیصد درج فہرست فرقے کے لوگ اور قبائلی ہوتے ہیں۔ اگر یہ صورت حال آئندہ دس بارہ سال تک اور جاری رہی تو ہندوستان میں شاید ہی کسی بڑے عہدے پر کوئی مسلمان نظر آئے۔

اس لیے میری تمام تر توجہ کا مرکز یہ امر ہے کہ جو سترہ ہزار لڑکے اس وقت میری ذمہ داری میں ہیں ان کا مستقبل درخشاں ہو، وہ ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب علی گڑھ میں امن و سکون رہے اور یہاں کے اساتذہ جی جان سے تدریس و تحقیق میں مصروف ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ملّت کے لوگ اس بات کو سمجھیں کہ اس تعلیمی ادارے میں سیاست کے عمل دخل سے قوم و ملک کی خدمت نہیں بلکہ بدخدمتی ہوگی۔ میں آپ تمام حضرات سے درخواست کروں گا کہ آپ لوگ اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس بات کی کوشش کریں کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی پیش رفت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ آئے کیونکہ جب علی گڑھ میں تعلیم و تدریس ہوگی تبھی یہاں سے نکلنے والے طلباء مستقبل میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں گے۔ میں اس اہم قومی و ملّی کام میں آپ تمام حضرات کی مدد کا خواستگار ہوں اور مجھے یہ امید ہے کہ مجھے آپ کا بھرپور تعاون حاصل رہے گا۔

ابھی ابھی حامد صاحب اور اسرار صاحب نے بڑے عالمانہ انداز میں ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن کا ہم سامنا کر رہے ہیں۔ عامۃ الناس بالخصوص ہمارے زیادہ تر سیاسی قائدین ان بنیادی مسائل کے بارے میں غور ہی نہیں کرتے، بلکہ فروعات میں الجھے رہتے

ہیں جس کی وجہ سے ہماری ترقی شاید ممکن نہ ہوسکے۔ نتیجتاً ہم تیزی سے تنزلی کی طرف جارہے ہیں۔ جب تک ہم میں جہالت رہے گی، تعلیم کا فقدان رہے گا اور غربت رہے گی، ہم کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ اس لیے ہم کو آئندہ ایک سو سال تک خاموشی سے سخت محنت کرنی ہے اور اگر ہم خاموشی سے آپس میں مل کر کام نہیں کریں گے تو خدا ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ سچ تو یہ ہے خدا برسوں سے ہمارا ساتھ چھوڑ چکا ہے اور ہم اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ ہم تیزی سے تنزلی کی طرف کیوں جارہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان اوصاف حمیدہ سے عاری ہیں جو ہمارے اسلاف میں تھیں۔ آج "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا" کی ہلکی سی جھلک دکھانے کے لیے آپ کے سامنے چند واقعات بیان کرنا چاہوں گا۔

پہلا واقعہ ایک یہودی سے متعلق ہے۔ یہ ان دنوں کا ہے جب میں ورلڈ بینک سے وابستہ تھا۔ وہ یہودی جو کسی اسرائیلی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور جس کا نام داؤد کارمیلی (David Karmeli) تھا میرے ساتھ پندرہ بیس روز دورے پر رہا۔ ایک دن دوران سفر اس نے مجھ سے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ چونکہ سفر تین چار گھنٹے کا تھا اس لیے میں نے ذرا تفصیل کے ساتھ اسے اسلام کے بارے میں موٹی موٹی باتیں بتائیں۔ بالخصوص میں نے اسے اعلیٰ اسلامی اقدار کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ انسانی نسل کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ کسی قوم سے دشمنی نہ رکھو، عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، ناانصافی نہ کرو ہر حال میں انصاف کرو چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ آخر میں میں نے اس سے کہا کہ آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔ آپ لوگ عربوں سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ کم از کم آپ جیسے ذہین آدمی کو تو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کس سے نبرد آزما ہیں۔ اس پر وہ ہنسنے لگا اور اس نے یہ کہا۔ مجھے عربی آتی ہے۔ میں نے قرآن کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں عربوں میں جاکر رہتا ہوں، اس طرح کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ لیکن جس اسلام کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اس پر تو شاید ہی کوئی مسلمان عمل کرتا ہو۔ اس اسلام پر ہم نسبتاً زیادہ عمل کرتے ہیں۔ اس قرآن پر ہم نسبتاً زیادہ چلتے ہیں۔ غور کیجیے جس عمل کا ہم ذکر کرتے رہتے ہیں وہ یہودی کہتا ہے کہ اس پر وہ نسبتاً زیادہ عمل پیرا ہیں۔ اس لیے کچھ تعجب کی بات نہیں جو وہ آج ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

دوسرا واقعہ عیسائیوں سے متعلق ہے۔ آج سے تقریباً ستر سال پہلے انگلستان میں ولیم ہاروے کا تین سو سالہ جشن پیدائش کی تقریبات کے منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ ولیم ہاروے وہی ہیں جن کے بارے میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ انہوں نے دوران خون کا نظام معلوم کیا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں حیدرآباد کے ایک سرجن زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے منتظمین کو یہ بتایا کہ دوران خون کے نظام کی دریافت ولیم ہاروے کی نہیں بلکہ اس سے تین سو سال قبل کے طبی سائنس داں ابن النفیس کی ہے اب ان لوگوں کی علمی ایمانداری ملاحظہ کیجیے کہ اوّل تو انہوں نے یہ جشن ملتوی کیا۔ پھر جب تحقیق کے بعد ان کو یہ معلوم ہوا کہ اس دریافت کا سہرا دراصل ابن النفیس ہی کے سر ہے تو انہوں نے یہ جشن منسوخ کر دیا۔

تیسرا واقعہ جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا وہ ایک ہندو مت کے ماننے والے سے متعلق ہے۔ آج سے کوئی ستائیس اٹھائیس سال پہلے جب میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا اپنے کارِ منصبی کے تحت میں نے ایک سندھی رفیوجی کی مدد کی۔ اس کو الاٹ ہونے والی زمین پر لوگ اس کا قبضہ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ میں نے اس زمین پر اس کا قبضہ دلا دیا۔ آخر میں جب وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا تو کہنے لگا کہ صاحب آپ تو مسلمان نظر نہیں آتے۔ میں نے کہا یہ کیا بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ مسلمان اتنا انصاف پسند کب ہوتا ہے۔ سندھ سے تو ہم کو مار کر نکال دیا گیا تھا اور آپ نے میری اتنی مدد کی کہ میری زندگی بن گئی۔ میں نے کہا بھائی تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی تھی۔ میں نے حتی المقدور تمہارے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ مگر وہ پھر بھی یہی کہتا رہا کہ آپ مسلمان معلوم نہیں پڑتے۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں۔ بتلا خلق خدا آج ہم کو کیا سمجھتی ہے اور ہم اپنے آپ کو کیا کہتے ہیں؟ یہ لمحۂ فکریہ ہے، اس پر غور کرنا اور اس کا حل ڈھونڈھ نکالنا ہمارا قومی فرض ہے۔

میں آج اس کانفرنس کے [illegible]

لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے دونوں سابق مقررین نے ان پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انہیں باتوں کو دہرانے کے بجائے میں ان چند باتوں کو آپ کے سامنے اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ ہم میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ ایماندارانہ طور پر اپنا جائزہ لے سکیں، ایمانداری سے اپنا احتساب کر سکیں اور ایمانداری سے ان مسائل کا حل تلاش کر سکیں جن کی وجہ سے ہم ساری دُنیا میں پسماندگی اور رخواری میں مبتلا ہیں۔ یوگوسلاویہ کے مسلم اکثریتی صوبے ہوں یا فلپائن کے یا کہیں اور کے ہر جگہ مسلمان سب سے زیادہ غریب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ اوّل تو تمام دنیا میں ہم اقلیت میں ہیں اور جہاں کہیں بھی ہیں تعلیم میں، انڈسٹری میں، شرافت و اخلاق میں دوسروں سے بلا استثنا پیچھے ہیں۔ میں نے دنیا کا دُو بار دورہ کیا ہے اور کل ۲۷ ممالک میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ دوران سفر مجھے سب سے زیادہ تکالیف مسلم ممالک میں جھیلنی پڑیں۔ ان سب باتوں کے کہنے کا مطلب خود اپنی دل آزاری نہیں ہے بلکہ اپنے سامنے اس آئینے کو رکھنا ہے جو ہمیں ہمارا صحیح چہرہ دکھا سکے۔

اب میں نفس موضوع پر آتا ہوں۔ سائنس کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ اسلام کی رو سے ناجائز ہے۔ گذشتہ دنوں صلیبی جنگوں کے بارے میں ایک انگریز کی دلچسپ کتاب نگاہ سے گزری۔ یہ جنگیں کوئی سو سال چلیں۔ مصنف کے مطابق یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ان جنگوں میں ہر معاملے میں عرب یا مسلمان عیسائی فوجوں سے سائنسی طور پر ترقی یافتہ تھے۔ معمولی چیزوں پر نظر ڈالیں تو یہ تفاوت بدیہی طور پر سامنے آتا ہے۔ عیسائیوں کی تلوار لمبی سیدھی اور وزن دار ہوتی تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھالنا پڑتا تھا۔ اس لیے آٹھ دس وار کے بعد بازو شل ہو جاتے تھے۔ اس کے بر خلاف عربوں کی تلوار ہلکی اور خمیدہ ہوتی تھی جو ایک ہاتھ سے بآسانی چلائی جا سکتی تھی۔ اسی طرح ان کی ڈھال بھی سبک تھی۔ تیر و کمان بھی زیادہ بہتر تھے۔ ایک مرتبہ مسلمانوں نے کسی قلعہ کا محاصرہ کیا۔ محصور عیسائی فوجیں کسی طور ہتھیار نہیں ڈال رہی تھیں۔ اس پر انہوں نے بجلی کی گندھک کو گھڑے میں بھر کر اس کو منجنیق کے ذریعے اندر پھینکا اطرح انہوں نے دنیا کا پہلا میزائل یا ان سنٹیفک بام (آتشیں بم) [illegible]

استعمال کیے گئے، اس طرح کے میزائل کو یورپی اقوام سے چھ سو سال پہلے عربوں نے ایجاد کر لیا تھا۔

اسی طرح ایک دفعہ دشمن کے ایک قلعہ میں پانی کا وافر ذخیرہ تھا اور قلعہ کسی طور فتح نہیں ہو پا رہا تھا۔ مسلمانوں نے اطراف کے جو جھرنے تھے انہیں اس طرح کاٹ دیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں قلعہ کے اندر کی باولی خشک ہو گئی اور محصور عیسائی فوجیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑا۔ مسلمانوں کو اس وقت سائنس کے ہر مضمون میں فوقیت حاصل تھی۔ ان واقعات کو تحریر میں لاتے ہوئے وہ انگریز لکھتا ہے کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ عیسائیت میں تو مذہبی لوگ عامۃ الناس سے الگ تھے۔ ان کا ایک مخصوص لباس ہوتا تھا اور ہر کام کے لیے ایک الگ مذہبی آدمی ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں وہی کمانڈر انچیف، وہی سپہ سالار فوجوں کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ امامت بھی کرتے تھے۔ غرض مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہ تھا مذہب اور زندگی میں کوئی فرق نہ تھا اور ایک سو سال کی لڑائیوں کے بعد ہوا یہ کہ ہم لوگوں میں بھی مذہبی لوگ اور عام لوگ الگ الگ ہو گئے عیسائی سماج نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا۔ مگر مسلمانوں نے ان کی مذہبیت اختیار کر لی۔ مصنف نے اس کتاب میں مسلمانوں کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ ان چیزوں کا بھی ذکر ہے جو عیسائیوں نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کے بعد سیکھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ تاریخی واقعات سے ہم کو سبق لینا چاہیے۔

آپ حضرات جس مقصد کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں، اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ گذشتہ سال میں نے یہاں چارج لینے کے بعد مختلف مذہبی مدارس کو کوئی ۵۰۰ خطوط لکھے لیکن خاطر خواہ نتیجہ ظاہر نہیں ہوا مگر اس سال جو خطوط میں نے لکھے، جیسا کہ اسرار صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں روشنی ڈالی، اس کا بہت اچھا اور خاطر خواہ اثر پڑا۔ اخبارات میں جب سے ہمارے اس پروگرام کی خبر آئی ہے تو دور دراز کے علاقوں سے اتنے خوبصورت اور حوصلہ افزا خطوط آئے ہیں کہ بس۔ انہوں نے تحریر کیا کہ ہم بہت پچھڑ گئے ہیں اور آپ نے جو تحریک شروع کی ہے خدا اس میں آپ کو کامیابی عطا کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بیداری جو قوم میں

کوشش کرتا ہے اور جو کوئی بھی اس کوشش میں مزاحم ہو اس کی مخالفت کرتی ہے۔

سرسید نے جو تحریک شروع کی تھی اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم بالخصوص سائنس کا فروغ ہو، مسلمان اس وقت کی سرکاری زبان جو سرکاری دفاتر اور انتظامیہ میں راہ پا رہی تھی سیکھیں مگر مسلمانوں کی اکثریت نے ان کی ان کوششوں کی مخالفت کی۔ نتیجتاً اس دور کی سرکاری زبان کو سیکھنے میں مسلمانوں نے دو سو سال لگا دیے اب ایک نئی سرکاری زبان آئی ہے اگر ہم اسی رویے پر قائم رہے تو انشاء اللہ ہم اس کو سیکھنے میں بھی دو سو سال لگائیں گے۔ لیکن ہم کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ جو قوم اپنے آپ میں وہ چھوٹی موٹی تبدیلیاں نہیں لاتی جس سے نہ مذہب پر اثر پڑتا ہے اور نہ ایمان پر، وہ دوسری قوموں کی تیز گامی کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ زبان کا معاملہ تو یہ ہے کہ یہ خدا کی دین ہے۔ چین کے مسلمانوں کی زبان چینی ہے، آندھرا کے مسلمانوں کی زبان تیلگو ہے، تامل ناڈو کے مسلمانوں کی زبان تامل ہے، غرض کہ ہر زبان کا بولنے والا مسلمان ہو سکتا ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جن تبدیلیوں کا آنا ضروری ہے جو نہ تو ہمارے اسلام سے ٹکراتی ہیں، نہ ہمارے ایمان کو کمزور کرتی ہیں، نہ ہمارے عقاید کو مجروح کرتی ہیں اور نہ ہی ہماری کسی اور چیز پر اثر انداز ہوتی ہیں، انہیں قبول کرنے میں ہم کو کوئی ہچکچاہٹ اور تذبذب نہ ہونا چاہیے۔

سائنس کی ہم پہلے مخالفت کرتے تھے جب کہ ہم کو مخالفت کی چنداں ضرورت نہ تھی، جیسا کہ میں نے مدارس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ خدا کی کتاب کا علم، علم دین ہے تو خدا کی کائنات کا علم سائنس ہے قرآن میں جیسا کہ لوگوں کو اس کے مطالعے نے رہنمائی دی ہے اور وہ آج یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس میں ایسی بہت سی چیزوں کا ذکر ہے جو کل تک عقل کی رسائی سے بہت پرے تھیں اور آپ بھی جب غور و فکر کی دعوت دیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ خدا کی مرضی کیا ہے۔ خدا کی تخلیق کی غایت کیا ہے۔ خدا نے جو کائنات بنائی ہے اس کی وسعت کیا ہے؟

اس وقت یہ دریافت ہوا ہے کہ دس کھرب کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں دس کھرب ستارے ہیں۔ ہمارا سورج اس میں ایک چھوٹا سا ستارہ ہے اور ہماری زمین اس میں ایک چھوٹا سیارہ۔ اب ہم اس خدا کی عظمت کے بارے میں سوچیں جس نے یہ اتنی وسیع و عریض کائنات بنائی ہے۔ اب دوسری طرف آپ ایک چھوٹی چیز کی طرف آئیے تو دیکھیے کہ جو بیماری آپ کے زکام کا سبب بنی ہے، اس کا وائرس ایک ایسا جاندار جرثومہ یا یونٹ ہے کہ جو اگر دس لاکھ گنا بڑا کر دیا جائے تو وہ آپ کے دس کے صفر کا ایک چھوٹا سا نقطہ نظر آئے گا۔ تو جب تک خدا کی کائنات کی وسعت اور اس کی عظمت کا تصور نہ ہو خود خدا کی عظمت کا تصور محال ہے۔ لہذا ہم کو خدا کی کائنات کے سمجھنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کائنات کو سمجھے بغیر ہم خدا کی عظمت نہ سمجھ سکیں گے۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب ہم اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا احتساب کریں اور اس کے ازالے کی قرار واقعی کوشش کریں ہندوستان کے بیشتر اخبارات ہم کو پسماندہ، قدامت پسند، بنیاد پرست اور دوسرے تضحیکی خطابات سے نوازتے رہتے ہیں اور اکثر وہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں مگر ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خرابیوں سے باخبر رہیں ـــــ اپنی خرابیوں کا احساس ہم کو ہونا چاہیے اور پھر اپنی سعیٔ مسلسل سے اور مثبت رویہ کو بنیاد بنا کر اپنی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

میں آپ سے عرض کروں گا کہ ہر نئی چیز کی مخالفت کوئی سمجھداری کی بات نہیں۔ بجلی ایجاد ہوئی ہم نے مخالفت کی۔ مائکروفون ایجاد ہوا، اس کے استعمال میں ہم کو ہچکچاہٹ ہوئی۔ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ سائنس کی کون کون ایجادات سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جب ہم ان کا استعمال کر رہے ہیں تو ان کے سمجھنے اور حصول میں تاخیر کیوں؟

ابھی گذشتہ سال میں جے پور گیا تھا۔ وہاں جامعۂ ہدایت کا ایک بڑا اچھا ادارہ قائم ہوا ہے۔ جہاں دینی مدرسہ میں کتابی علم

کے ساتھ کچھ عملی تعلیم بھی ہو رہی ہے۔ جیسے سائیکل کی مرمت اور ریڈیو کی درستگی۔ جب آپ وہاں عالم دین کی حیثیت سے چھوٹی سائنس سیکھ سکتے ہیں تو بڑی سائنس سیکھنے میں کیا اعتراض۔ جب آپ وہاں تعلیم حاصل کر کے سائیکل مکینک بن سکتے ہیں تو سائیکل یا اس کے مختلف پارٹس بنانے والا کارخانہ کیوں نہیں لگا سکتے۔ اگر آپ ریڈیو مرمت کر سکتے ہیں تو ریڈیو بنانے کا فن کیوں نہیں حاصل کر سکتے۔ اگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ چھوٹی چیزیں آپ قبول کر رہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک عالم دین چھوٹی تنخواہوں پر قانع رہے، چھوٹے مقامات پر کیوں رہے۔ کیوں نہیں ایک عالم دین وزیر اعظم بن سکے۔ کیوں نہیں ایک عالم دین سپہ سالار بن سکے۔ جس طرح ماضی میں ہمارے علماء اپنے علمی فرائض کے ساتھ دوسرے کام بھی کامیابی سے انجام دے رہے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو فرق ہم نے اپنے ذہنوں میں پیدا کر لیا ہے کہ اس وقت دو دھارے ہیں ایک قدیم تعلیم والوں کی ہے اور ایک جدید تعلیم والوں کا دھارا۔ جن کا لباس بھی الگ ہے، طرز فکر بھی الگ ہے، گفتگو اور مخاطب کرنے کا طریقہ بھی الگ ہے، سوچنے کا طریقہ الگ ہے۔ کیا یہ دو دھارے مل کر کام نہیں کر سکتے۔ کیا خود ہمارے دور میں ایسا نہیں ہوا کہ ایک قدامت پسند والدین کا بچہ ایک بہت بڑا سائنس داں بنا۔ جب قدیم و جدید کی یہ آمیزش جب ہمارے گھروں میں ممکن ہے تو اُن کا دائرہ ان اسکولوں میں جہاں ہم بچوں کو دینی تعلیم دے رہے ہیں کیوں نہیں بڑھایا جا سکتا کیا ہم اپنے بچوں کو پسماندہ رکھیں گے یا ان کی ترقی کے لیے کوشش کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ایماندار ہیں اور ہمیں ایمانداری سے اپنی آئندہ نسل کے بچوں کے مستقبل سے دلچسپی ہے تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دنیا میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

سائنس کے بارے میں جو اعتراض ہو سکتا تھا وہ عیسائی پادریوں کا تھا اس لیے کہ بائبل جو میری دانست میں حدیث عیسوی ہے جو بنیادی راہوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روپوشی کے ڈھائی سو سال بعد انجیل کی چار کتابوں کی حیثیت سے مدون ہوئی۔ اس بائبل میں بعض بیانات ایسے ہیں جو سائنس کی جدید تحقیقات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا پادریوں نے ان نظریات کی مخالفت کی لیکن ایک یورپین نے ایک کتاب لکھی ہے۔ " بائبل، قرآن اور سائنس " یہ کام ہم کو کرنا تھا۔ کاش یہ کام ہم کر سکتے۔ اس نے لکھا ہے کہ جو جدید ترین ایجادات ہیں اور جو جدید ترین سائنٹفک انکشافات ہیں ان کے بارے میں قرآن شریف میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ صحیح ہیں اور بائبل میں جو چیز لکھی گئی ہے وہ غلط ہے۔

قرآن شریف میں ہے کہ سورج اور چاند اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ چاند کی گردش کا تو معلوم تھا لیکن سورج کا یہ مدار بیسویں صدی میں تحقیق ہوا۔ یعنی دو کروڑ پچاس لاکھ سال میں سورج کا ایک چکر پورا ہوتا ہے۔ تو جو بات ۱۴۰۰ سو سال بعد سائنس نے دریافت کی قرآن شریف میں پہلے سے موجود ہے۔ ہمارے علمائے دین کو سائنس کی مخالفت کرنے کی میری دانست میں تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن شریف میں کوئی بیان ایسا نہیں ہے جس کے شواہد جدید ترین سائنس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے فرمایا کہ یہودی قوم جو تعداد میں ایک کروڑ سے بھی کم ہیں، عددی حیثیت سے ان کا ہم سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ہم لوگ کوئی ۸۰ کروڑ ہوں گے لیکن اب سے تین سال قبل میں نے نوبل انعام یافتگان کا شمار کیا تو ۱۵۱ انعام یافتگان یہودی تھے اور ہمارے حصہ میں اب تک صرف ایک انعام آیا۔

آپ ٹی۔ وی پر جو پروگرام دیکھتے ہیں اس میں کوئز کا ایک مقبول عام پروگرام ہوتا ہے کہ ذہین لڑکوں سے مختلف النوع سوالات پوچھے جاتے ہیں اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ کسی مسلمان لڑکے کا نام اس پروگرام میں سننے کی مجھے حسرت ہی رہی۔

اپنے فرائض منصبی کے دوران میں اکثر اعلیٰ افسران کی آل انڈیا میٹنگوں میں شریک ہوتا تھا۔ ڈیڑھ سو سے دو سو افراد کے اجتماعات میں یا تو شاید حامد صاحب اکیلے ہوں گے یا میں۔ تو یہ صورت حال کب تک چلے گی۔ وہ ملت جس نے اس ملک کو فن تعمیر میں کلچر و ثقافت میں اور ایک خوبصورت زبان کے علاوہ مختلف بیش قدر Contribution دیے ہوں تو سوال [illegible]

یا ہماری صلاحیتیں جاتی رہیں اور ہماری ذہانت کے سوتے خشک ہو گئے یا ہم اس قابل نہیں رہے کہ اس ملک کو ترقی دینے میں ہمارا کوئی حصّہ ہو۔

ایک چیز میں آپ سے اور عرض کروں گا کہ اصل مسائل سے ہم تھوڑا سا گریز کرنے لگے ہیں۔ اصل مسئلہ تعلیمی مسئلہ ہے اور جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اور جیسا کہ ابھی حامد صاحب نے فرمایا کہ دینی مدارس نے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں بیش قرار خدمات انجام دی ہیں جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ ہزاروں دینی مدرسے ہیں جن میں چند شریف النفس لوگوں نے کوشش کی ہے کہ انہیں جو بھی علم آتا ہے اس کو بچّوں کو سکھا دیں۔ اگر یہ مدرسے نہ ہوتے تو ہم لوگوں میں خواندگی کا جو مفید تناسب ہے وہ ۲۰ سے گھٹ کر ایک فیصد بھی نہ ہوتا۔ ہم کو مرہون منت ہونا چاہیے ان دینی مدارس کا جنہوں نے علم کی شمع کو روشن رکھا۔ مگر اب شمع کا دور ختم ہوا بجلی کا زمانہ آگیا ہے۔ تیز روشنی کے لیے ٹیوب لائٹس آگئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان مدارس میں اب شمع نہ جلے بلکہ ٹیوب لائٹ ہو اور وہاں پرانے علوم کے ساتھ ساتھ نئے علوم بھی آجائیں۔ جب ہم ارسطو اور افلاطون کو اپنے قدیم نصاب میں شامل کر سکتے ہیں تو آئن اسٹائن اور سی۔ وی۔ رمن کی جدید سائنٹفک تحقیقات کو کیوں نہیں شامل کر سکتے۔ اگر آپ اس چیز کو پڑھا سکتے ہیں جس کو دقیانوسی اور از کار رفتہ ہوئے پانچ سو سال گزر گئے۔ اگر آپ ارسطو اور افلاطون کے خیالات کو داخلِ نصاب کر سکتے ہیں جو غیر مسلم تھے اور اسلام سے بے بہرہ تو آج کی سائنس کیوں نہیں پڑھائی جا سکتی؟

ایک حدیث میں علم کو مومن کی میراث کہا گیا ہے۔ دوسری احادیث میں علم کے حصول کو مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے اور علم کے حصول کے لیے چین کا سفر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ گزشتہ دو سو سال میں ہم نے کیا کیا، دنیا کو کیا دیا۔ انسان کی [illegible] سے نہیں دینے سے ہوتا ہے۔ اگر بنیادی کا موجد ہے تو [illegible] موجد ہے تو یہودی۔ اضافیت کے نظریہ کو معلوم کرنے والا ہے تو ایک یہودی۔ اگر کسی نے Common Sense سے [illegible] [illegible]

کی ترقی، انسانیت کی مدد میں ہمارا کیا حصّہ ہے۔ اگر ہمارا کوئی contribution نہیں ہے تو ہمارے سر شرم سے جھک جانے چاہئیں اور ہم میں سے ہر ایک کو یہی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم پھر سے وہی مقام حاصل کر سکیں جو ہم کو پہلے حاصل تھا۔ ہم کو غور و فکر کی ضرورت ہے، جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے، ہم کو سوچ سمجھ کی ضرورت ہے ہم کو نعرے لگانے شور و غوغا کرنے اور جلوس نکالنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ ہماری ساری تگ و دو صرف جلوس نکالنے اور نعرے لگانے تک ہی محدود ہے؟ یہ کیوں نہیں کہ ہم اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیں اور اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں پڑھائیں۔ کیا وجہ ہے کہ اس ادارے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت طلباء میں بھی ہے اور اساتذہ میں بھی، درجہ اول کے لوگ کم نکلتے ہیں۔ وجہ صاف ہے جہاں ہم کو دوگنی لگن اور دلچسپی سے کام کرنا چاہیے ہم شاید ہی ۵۰ فیصد دلچسپی سے کام کرتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ پیچھے رہ گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہوتی۔ یہاں سے نوبل انعام یافتگان نکلتے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ملک کی سیکڑوں یونیورسٹیوں میں سے ہماری بھی ایک یونیورسٹی ہے۔ اس کے معنیٰ اس کے سوا کیا ہیں کہ نہ تو یہاں کے طلباء میں اور نہ اساتذہ میں محنت، لگن اور قربانی کا وہ جذبہ آسکا ہے جس سے تعلیمی ادارے اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔ اگر ہم میں آج سے وہ جذبہ پیدا ہو جائے اور ہم سخت محنت شروع کر دیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہم کو اوپر جانے سے نہیں روک سکتی۔ اس لیے کہ محض تعداد سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہودی دنیا میں ۳/۲ فیصد بھی نہیں لیکن وہ دنیا میں ہر شعبۂ زندگی میں چھائے ہوئے ہیں ہماری بھی تعداد کم ہے لیکن اگر ہم میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے جو خدا کے کلام کے زیر اثر ہو تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ترقی سے نہیں روک سکتی۔ ہم میں ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم مل کر کام نہیں کر سکتے۔ اگر اس وقت کوئی ادارے تعلیم کی اونچائی کے لیے کام کر رہے ہیں تو بیشتر عیسائی ادارے ہیں۔ آپ ان کے مقابلہ کا کوئی ایک اسکول بتایئے جو ہمارے پاس ہو [illegible] ہندوستان میں اگر [illegible] [illegible]

سکولوں کی وجہ سے نہ کہ مسلمان مدرسوں کی وجہ سے ان ہی کو نمونہ بنا کر
بلک اسکول اور سرکاری اسکول آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا
بہ ہے مسلم یونیورسٹی میں جو اساتذہ ہیں ان میں سے بیشتر کے بچے یونیورسٹی کے
سکولوں میں نہیں بلکہ مشنری کے لیڈی فاطمہ اسکول میں پڑھتے ہیں؟ وجہ
ہر ہے ہمارے اسکولوں میں لوگ محنت سے کام نہیں کرتے۔ ہم لوگوں
۔ اپنے اداروں کے اساتذہ پر وہ بھروسہ نہیں ہے جو ان کرسچن اسکولوں
، اساتذہ پر ہے۔

ایک بات میں آپ سے اور عرض کروں گا کہ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں
ا جو پسماندگی ہے اس سے اگر ہم واقف ہو جائیں تو پھر شاید ابھرنے کا وہ
بہ پیدا ہو جائے جس کی سخت ضرورت ہے۔ حامد صاحب نے خوب فرمایا کہ
لک میں مردم شماری کے جو اعداد و شمار ہیں اس میں مذہب کا ذکر نہیں آتا
دں کہ مذہب کا اندراج نہیں آتا اس لیے ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کس قدر
یچھے رہ گئے ہیں۔

شہاب الدین صاحب نے مسلم انڈیا نکالا ہے، اس میں کچھ اعداد و
ار آنے لگے ہیں، اس کی وجہ سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کس قدر پیچھے
گئے ہیں اور جب تک آپ کو اپنی پسماندگی کا تنزلی کا اور اپنی عدم صلاحیت
احساس نہ ہو، ترقی نہیں ہو سکتی۔

میں آپ تمام صاحبان سے جو یہاں تشریف لائے ہیں یہ درخواست
وں گا کہ جدید تعلیم کی سمت میں ہم کو اپنی کوششیں مرکوز کر دینا چاہیے
گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کام میں مدد دینے کے لیے تیار ہے اور آپ میں
ہر ایک یہ کوشش کرے کہ اپنے طالب علموں کو اپنی قوم کو اور اپنے
مدوں کو اونچا کرے۔ جس خلوص اور جس محنت کی ضرورت ہو، اس میں
جائے۔ خدا محنت کرنے والوں کا ضرور ساتھ دیتا ہے، جاہلوں اور
کاہلوں کا نہیں۔ اگر ہمارا اس چیز پر ایمان ہے کہ خدا ہماری اس
لاپرواہی کو معاف نہیں کرے گا جس کی وجہ سے مسلمان تنزلی میں ہیں تو
میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو خدا سے ڈرتا ہے، اس راستے پر
لگ جائے گا جو ملک و قوم کی ترقی کا سچا راستہ ہے نہ کہ اس
راستہ پر لگے گا جو تنزلی کا ہے۔

ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ مصر کے سابق سربراہ جنرل
نجیب کی ایک کتاب ہے EGYPTS DESTINY اس میں انہوں
نے ایک جگہ اپنے حج کا ذکر کیا ہے کہ میں نے غلاف کعبہ پکڑ کر دعا
کی کہ اے اللہ ہم جس جگہ بھی ہیں ذلیل و خوار ہیں جہاں اپنی
حکومتیں ہیں وہاں بھی ذلیل و خوار ہیں اور جہاں اپنی حکومتیں نہیں
ہیں وہاں بھی ذلیل و خوار ہیں۔ تو ہم سے بہت دیر سے منہ پھیرا
چلا ہے۔ اب ہماری طرف رُخ کر۔" وہ لکھتے ہیں کہ باہر آکر
میں نے سوچا کہ ہم لوگ ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ شاید اس لیے
کہ خدا کو غرور پسند نہیں اور ہم اپنے آپ کو دنیا میں سب سے
بہتر سمجھتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جنرل نجیب کی دعا ہم سب کی دعا
ہونی چاہیے۔ جنرل نجیب کا طرز فکر ہم سب کا طرز فکر ہونا چاہیے
آخر میں میں یہ کہوں گا کہ ہم سب ایک گہری نیند میں مبتلا ہیں
اور اقبال کے اس مصرعہ پر

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

محاسبہ

راحت کے وقت بستر پر قدم رکھنے سے قبل ہر فرد بشر کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ آج میں نے ایسا کیا کام کیا ہے جس کی وجہ سے مجھے کل بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ ——— (شواتیزر)

ایک لمحہ میں دو انکشاف

سید حامد

کوئی بات، کوئی راز کھل جائے تو یہ انکشاف ہوا، لیکن کبھی کبھی انکشاف سے آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ اس طرح کہ پہلی والی حالت پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔

فراز چار ہفتے کی چھٹی ختم کرکے ہانگ کانگ واپس جا رہا تھا۔ میری طبیعت چند روز سے خراب تھی لیکن میں نے ہوائی اڈے تک اسے پہنچانے پر اصرار کیا۔ دہشت گری[1] نے زندگی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھین لی ہیں، ان میں سے ایک خوشی یہ بھی تھی کہ جسے چاہتے ہو، اسے دور سے اس وقت تک دیکھتے رہو جب تک کہ وہ طیارہ کے زینے کے پاس پہنچ کر ایک بار مڑکر ہاتھ کو الوداعی جنبش نہ دے دے۔ آہستہ آہستہ محبت کے اس معصوم اظہار کی حدود تنگ ہوتی گئیں اور نوبت اب یہاں تک پہنچی کہ ایرپورٹ میں داخل ہونے کی اجازت سرے سے چھن گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سرد مہر ہوا یورش کر رہی تھی۔ فراز اندر چلا گیا اور ہم اس انتظار میں رکے رہے کہ طیارہ اڑان بھرے تو ہم واپس ہوں۔ دو راتوں سے واجبی ہی نیند آئی تھی۔ دو دن بہت قلیل اور محتاط غذا پر گزارے تھے۔ تھکن محسوس ہونے لگی۔ شیشہ کی دیوار سے خفیف سا سہارا لیا۔

یہاں دل ہی دل میں ہمیشہ روتنی کا زعم رہا تھا (زعم بھی کیوں کہیے کہ دل میں جب کبھی صحت پر گھمنڈ نے سر اٹھایا، شکر سرزنش کے لیے آن پہنچا) کل ہی انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ (طب کی تاریخ اور طب کی تحقیق کا ادارہ" ہمدرد نگر) میں ایک وفد (ڈیلیگیشن) آیا تھا۔ اس سے ملنے گیا تو دو منزلیں دوڑتے ہوئے طے کیں، علالت کے باوجود۔ آج صبح ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ نے اپنے جسم کے خطوط کو ابھی تک واضح اور استوار رکھا، شکر کرتے ہوئے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے ثبوت کے طور پر، میں نے کہا کہ "شادی کی شیروانی ابھی تک میرے ٹھیک آتی ہے۔" چالیس سال کے ڈیوڑھے سے زیادہ طے کرنے کے باوجود طفلی کی یاد دل سے اور طفلی کا انداز جسم سے محو نہیں ہوا۔

چشم زدن میں یہ زعم مسمار ہو گیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نہیں معلوم کیا ہوا۔ دیکھا تو خود کو فرش پر دراز پایا۔ میرا سر ایک نوجوان کے زانو میں تھا۔ ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ ثریا فکرمند پاس کھڑی تھیں۔ دو بار کھڑا ہوا کہ سرِعام بے بسی کا یہ انداز میرے وہم و گمان سے دور تھا۔ دونوں بار تھوڑی دیر کے لیے آنکھ بند ہوئی، کھلی تو بے ارادہ اور بے بس۔ استراحت کے شکنجہ میں اس آہنی جسم کو پایا۔ اس سرافرازی سے سرتاسر محروم جو انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔

آج یکم مارچ ۸۷ء کو اچانک یہ انکشاف ہوا کہ کھیلنے اور سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے دن گئے۔ لوہے میں زنگ لگتا ہے اور چھید بھی ہو جاتے ہیں۔ دوام صحت کا پٹّہ میں کہاں سے لے آتا۔ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ "میاں سید حامد اب سنبھل کر رہو، زندگی کی رفتار دھیمی کردو، قدم پھونک پھونک کر رکھو۔ زندگی کے ہر دور کا ایک الگ اسلوب ہوتا ہے، اس

---

[1] میں سمجھتا ہوں کہ 'دہشت گری' کی اصطلاح صحیح ہے اور 'دہشت گردی' کی مروّجہ اصطلاح غلط۔

دورکے لیے وہی مناسب ہے؟

اسی لمحہ ایک اور انکشاف ہوا جس نے پہلے انکشاف کی افسردگی کو دور کر دیا۔ جس لڑکے نے میری ٹائی کھولی اور اپنے زانو پر میرا سر رکھا اور وہ لڑکا جس نے میری نبض پر ہاتھ رکھ کر اطمینان دلایا' وہ دونوں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ انہوں نے اپنے سابق شیخ الجامعہ کو پہچان لیا اور دوڑ کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا جو محبت اور احترام سے مملو تھی۔ میرے دل سے ایک پھانس نکل گئی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اپنے طالب علموں کے لیے میرے دل میں جو محبت تھی وہ سراسر یک طرفہ نہیں تھی۔

میرے وصایا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب یہاں سے جانے کا وقت آئے تو میری تجہیز و تدفین میں دیر نہ کی جائے اور نہ میرے بیٹوں کا (جو خدا کے فضل سے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں' اور جو بیرونی ممالک میں رہتے ہیں) انتظار کیا جائے میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ تصور کی دنیا میں مجھے جیتا جاگتا شاد اور شگفتہ دیکھیں۔ میں نے یہ وصیت بھی کی ہے کہ میری قبر پختہ نہ بنائی جائے۔ سفالیں اور گیاہ پوش ہو اور اب یہ بھی طے کیا ہے کہ اس پر کتبہ بھی نہ لگے۔ یہاں میں اس بات سے انحراف کر رہا ہوں جو میں نے عثمان ادھمی صاحب سے کہی تھی' مجھے امید ہے کہ وہ اسے معاف کر دیں گے۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ انھوں نے شاید بلٹز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "سید حامد نے اصولوں سے کبھی کسی قسم کی مفاہمت گوارا نہیں کی۔" یہ پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے انہیں لکھا کہ یہ بات میری لحد کی لوح پر لکھنی چاہیے۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ بھی انا اور آرزوئے بقا کی ایک شکل ہے۔

لیکن اب مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں جب آخری سفر پر نکلوں گا تو جس طرح کہ آج نہ معلوم کہاں سے میرے طالب علم میری دستگیری کے لیے نکل آئے' علی گڑھ کا کوئی نہ کوئی طالب علم اچانک کندھا دینے کے لیے نمودار ہو جائے گا۔ یہ روح جب 'یومِ نجات' منائے گی تو پہلے یوم نجات کی خلش سے بیگانہ ہوگی۔

عِلم و مذہب، تہذیب و تمدن، ملک و سلطنت، ہر مہذب قوم کا سرمایۂ حیات ہیں اور اِن ہی چیزوں کی ترکیب و امتزاج سے ہر قوم کا تاریخی مواد تیار ہوتا ہے، اِس بنا پر ہر متمدن قوم اپنا تاریخی سرمایہ اپنے ساتھ لاتی ہے اور اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اُس کو محفوظ رکھتی ہے. وہ اِس مواد کی تیاری اور پختگی میں کسی مورخ کی ممنونِ احسان نہیں ہوتی بلکہ مورخ خود اُس قوم کا گراں بار منت ہوتا ہے

(عبدالسلام ندوی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۶ (جون ۸۷ء)

خالد بن ولید

قاضی عبد الستار

"لوگو! دنیا جانتی ہے کہ برکت کے لیے خالد اپنے "خود" میں رسالت پناہ کے موئے مبارک رکھتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایک دنیا خالد کے قتل کے منصوبے بناتی ہے اور دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ خالد کا محکمۂ جاسوسی پوری دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا اور وہ اپنے قتل کے منصوبوں سے باخبر رہتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی میدان جنگ کے باہر بھی وہ اپنے خود میں موئے مبارک رکھتا ہے جیسے اس وقت بھی میرا عمامہ موئے مبارک کی دولت سے امیر ہے اگر اس تاریخی جمعے کی نماز کے وقت بھی آج ہی کی طرح موئے مبارک موجود ہوتے اور کسی ہرقل اور کسی کسریٰ کی تو خیر کیا مجال، خالد کے باپ ولید نے بھی "خود" پر ہاتھ ڈال دیا ہوتا تو خدائے قہار کی قسم ولید کے شانوں پر ولید کا سر سلامت نہ رہتا۔"

" بھائیو! تم سوچتے ہوگے کہ وہ کون سی طاقت تھی جس کے خوف میں سیف اللہ نے یہ توہین گوارہ کر لی محبوب خدا کے خطاب اقدس کی توہین گوارہ کرلی۔ نائب رسول اللہ کے خطاب اکبر کی تذلیل گوارہ کرلی۔ تو سنو — دنیا نے کوئی طاقت ایسی پیدا نہیں کی جو اشقر کے سموں کی دھول نہ بن چکی ہو۔ تم جانتے ہو کہ بڑے بڑے شہنشاہوں کی بڑی بڑی طاقتیں تمہاری چراگاہیں بن چکیں جہاں تمہارے گھوڑے چر رہے ہیں۔ تاہم ایک طاقت ہے جس نے مجھے توڑ دیا، چور چور کر دیا۔ وہ میرے ایمان کی طاقت ہے۔

محبوب خدا کی امت کو منظم رکھنے کی تمنا کی طاقت ہے۔ خلیفۂ اکبر کی کمائی ہوئی خلافت کو موجود اور مضبوط رکھنے کی آرزو کی طاقت ہے۔

اجماع امت کے تحفظ کی جستجو کی طاقت ہے۔

تمہارے دلوں کو شاداب اور راتوں کو منور رکھنے کی حسرت کی طاقت ہے۔

یہی وہ طاقت ہے جس کے سامنے میں نے یرموک کی سپہ سالاری کے علم کو خم کر دیا تھا۔ دمشق کی بھری مسجد میں سر جھکا دیا تھا۔ یہ مقام تو وہ مقام اقدس ہے جس کی ایک چٹکی خاک خالد اور اس کے اجداد کی ہڈیوں سے زیادہ مقدس ہے۔ یہاں تو خالد اگر اپنا اور اپنی تمام اولاد کا سر کاٹ کر ڈال دے تو بھی کم ہے۔

اے برادران اسلام — میں شام سے اس لیے آیا ہوں کہ اس مقام مقدس پر تم کو گواہ بنا کر اعلان کروں کہ امت کے تئیں اپنی مکمل اور غیر مشروط وفاداری کے نام پر میں نے اپنا مقدمہ دنیا سے اٹھا کر عقبیٰ کے سپرد کر دیا۔ کل جب قیامت برپا ہوگی اور میزان عدل کھڑی ہوگی اور رحمتِ دو عالم کا سامنا ہوگا تو تم دیکھ لوگے کہ خالد محمدی علم کے سایے میں سر سے پاؤں تک سوال بنا کھڑا ہوا ہے۔

اور اب امیر المومنین کی سماعت مبارکہ توجہ فرمائے۔ امیر المومنین کی خدمت بابرکت میں گزارش

ہے کہ امت کی قوت برداشت کو اس حد تک آزمائش
میں مبتلا نہ فرمائیں کہ وہ جھکتے جھکتے ٹوٹ جائے اور
ان کے بعد ان کا جانشین خلافت کے اونٹ پر اس
طرح سوار نہ ہو سکے جس طرح سوار ہونا خلیفہ کا حق ہوتا
ہے۔ خدا حافظ و ناصر۔"

سیف اللہ کے بیٹھتے ہی حضرت طلحہؓ کھڑے ہو گئے۔ امیر المومنین کی
اجازت حاصل کر کے گویا ہوئے۔

"اے برادران اسلام! ایک بات میری بھی
سن لو کہ سیف اللہ نے اپنی زبان کو ایک شرف
کے اظہار سے محروم رکھا۔
شام کے محاذ پر صدر سپہ سالار کے حکم پر سیف اللہ
گنتی کے چالیس سواروں کے ساتھ ایک مہم پر روانہ
ہوئے۔ غنیم کے دو لشکروں کے درمیان گھر گئے۔ ہزارہا
سواروں کے نرغے میں سارا دن تلوار چلاتے رہے،
یہاں تک کہ رات ہو گئی اور غنیم نے سیف اللہ کی خفیہ
کمین گاہ کی ناکہ بندی کر لی اور اپنے مرکز سے مزید کمک
بھی طلب کر لی کہ صبح ہوتے ہی خدانخواستہ خالد کا
فیصلہ کر دیا جائے۔ صدر سپہ سالار امین الامت
ابو عبیدہ بن الجراحؓ اپنی قیام گاہ پر عشاء کی نماز کے
بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ آنکھ جھپک گئی۔ دیکھا کہ خاتم
النبیین صلعم حکم فرما رہے ہیں کہ خالد کو فلاں مقام پر دشمنان
اسلام نے گھیر لیا ہے، فوراً اس کی مدد پہ پہونچو۔ امین الامت
مصلے سے اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے
جب اپنے لشکر کے ساتھ میدان کارزار میں پہنچے تو ہزاروں
تلواروں کے درمیان اللہ کی تلوار موت سے کھیل رہی تھی،
صدر سپہ سالار کا نعرۂ جہاد سنتے ہی اسلام کے دشمن فرار
پر مجبور ہو گئے اور اللہ نے اپنی تلوار کو محفوظ کر دیا۔"

اے برادران اسلام! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ
رسالت پناہ کے وصال کے بعد اسلام کو اتنی مدت ہو گئی امت
کس کس طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہوئی کیسے کیسے ہولناک
میدان جنگ آراستہ ہوئے، کیسے کیسے مقربان بارگاہ رسالت
اسلام کے نام پر قربان ہو گئے، لیکن رسالت پناہ کی یہ
عنایت خاص کس کے نصیب میں لکھی گئی؟ کس کے مقدر کا
زیور ہوئی؟ یہ فقید المثال اعزاز یہ عدیم النظیر اکرام
بھی اسی شخص اعظم کو میسر آیا جسے سیف اللہ کے
جلیل الشان خطاب سے نوازا جا چکا تھا۔"

سکوت سکتے کے حدود سے گزر گیا۔ جب خطابت کا سحر ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ
سیف اللہ جا چکے۔ سب سے پہلے صاحب ذوالفقار اٹھے، ان کے ساتھ ہی دوسرے
بڑے بڑے نام کھڑے ہونے لگے۔ تحمل اور تجمل کا ایک پیکر تھا جو امیر المومنین
کی صورت میں بیٹھا ہوا تھا سب کچھ اس انداز بے نیازی سے سن رہا تھا جیسے
امیر المومنین کوئی دوسرا شخص ہے اور امت اس کے اعمال کا محاسبہ کر رہی
ہے۔ نہ ہرقل کا غرور نہ کسریٰ کا تجبر مگر ایک ایسے ادائے جبروت و جلال جس
کے سامنے پہاڑوں کا ثبات حقیر معلوم ہونے لگے۔ شخصیت کی رفعت و عظمت
الفاظ کے شہپروں کی رسائی سے بلند ہو جائے۔

اٹھے تو معلوم ہوا زمانہ کھڑا ہو گیا۔ چلے تو زمین نے محسوس کیا کہ فرمان
الٰہی حرکت کر رہا ہے۔ سیڑھیوں پر پھٹے ہوئے جوتے اس طرح پہنے جیسے قیصر و کسریٰ
کے تاج پیروں میں ڈال رہے ہوں۔ ہاتھوں میں جھولتے کوڑے کی ہر جنبش پر
گردش ایام کانپ رہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ایک خوف بھی تھا۔ میزان قیامت
کی تنصیب کا خوف۔ اجماع امت کی تقسیم کا خوف۔ اتنا خوف کہ ہڈیوں کا جگر
دو نیم ہونے لگے۔ جوار رحمت کا تاریخی میدان جو غنیمت میں آئے ہوئے رومی
اور ایرانی خیموں، بارگاہوں، شامیانوں اور قناتوں سے ایک شہر کی طرح
آباد تھا۔ اچانک اجڑنے لگا کہ سیف اللہ مکہ معظمہ کے لیے سوار ہو چکے تھے۔
چھوٹی چھوٹی منزلیں کرتے بڑی بڑی آبادیوں اور بستیوں سے تحسین و تعظیم وصول
کرتے خدا کے گھر کے سامنے اتر پڑے۔

عمرہ ادا کیا۔ اعزہ اور اقربا سے ملاقاتیں کیں۔ پھر
اٹھے۔ املاک و جائیداد کا معاینہ کرنے طائف تک چلے گئے۔
انتظام و انصرام سے فراغت پاتے ہی دمشق کے لیے سوار ہوئے

جنسیاتی ہارمون اور اس کے اثرات

محمد فہیم نعمانی

انسانی جسم میں مختلف نظاموں کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے جسم کے مختلف اعضاء میں صحیح نشوونما و بالیدگی ہوتی رہتی ہے۔ اگر کسی بھی نظام میں کوئی خامی ہو جاتی ہے تو مشین کی طرح کام کرنے والے جسم میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کے جسم میں دو اقسام کی گلٹیاں موجود ہوتی ہیں ایک کو نلی والی گلٹیاں مثلاً جگر، لبلبہ (Pancreas) جن کا خصوصی کام غذاؤں کو ہضم کرنا ہے۔ دوسرے کو بغیر نلی والی گلٹیاں مثلاً خصیے (Testis) بیضہ دانی (Ovary)۔ بغیر نلی والی گلٹیوں سے ایک کیمیاوی مرکب کی تشکیل ہوتی ہے جو براہِ راست خون کی نلیوں میں داخل ہو کر سارے جسم میں اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے اور جسم کے تمام اعمال کے درمیان باہمی ہم آہنگی اور توازن کو قایم رکھتا ہے جیسے ہارمون کہا جاتا ہے۔ ویسے انسانی جسم میں ہارمون خارج کرنے والی بہت سارے غدود ہوتے ہیں مگر یہاں میں صرف ایسی گلٹیوں کو دائرہ تحریر میں پیش کر رہا ہوں، جن کا تعلق صرف مرد اور عورت کی جنسیاتی بالیدگی، اثرات خواہشات و جذبات و جنسی آسودگی سے تعلق ہے۔

مردوں میں خصیے (Testis) ایک تھیلی (Scrotum) میں موجود ہوتا ہے۔ یہ تعداد میں دو ہوتے ہیں۔ جب بچہ شکم مادر میں مختلف بالیدگی کے مرحلوں سے گزرتا رہتا ہے، اس وقت یہ نر بچے کی شکم میں رہتا ہے اور بعد میں دھیرے دھیرے پیدائش کے وقت تک اتر کر تھیلی (Scrotum) میں پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے بچوں میں (Testis) پیدائش کے بعد بھی اس کے شکم میں رہتا ہے اسے (Undescended-Testis) کہا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالغ مردوں میں بھی کبھی کبھی (Testis) چڑھ جاتا ہے جیسے (Inguinal Hernia) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی ذکر کر دینا ضروری ہوگی کہ خصیے (Testis) ایک نلی کے ذریعے جیسے (Inguinal Canal) کہا جاتا ہے — تھیلی (Scrotum) میں داخل ہوتا ہے۔

خصیے سے ایک خاص قسم کا ہارمون پیدا ہوتا ہے جو دراصل خصیوں میں پائے جانے والے خلیوں (Interstitial Cells) سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ عام طور سے Testosterone یا Androgen کہلاتا ہے۔ یہ مادہ منویہ کی پیداوار کے لیے از حد ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مردوں میں ثانوی جنسیاتی خصوصیات، اعضائے رئیسہ کی بالیدگی مردانہ جسمانی ساخت کے لیے از حد ضروری ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ Hydroxylation (ایک کیمیاوی عمل) کے ذریعے یہ Dihydrotestosterone میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ Androgens پروٹین کے استحالہ کو تیز کر ڈالتا ہے اور عضلات میں پروٹین کی مقدار کو بڑھا دیتا ہے۔ ہڈیوں کی بالیدگی بھی تیز تر ہو جاتی ہے لیکن ایک ہڈی Epiphyses کے جڑنے کے عمل کو تیز کر دیتی ہے بہت سے افراد میں خصیے کے خلیے صحیح طریقے سے اپنا عمل انجام نہیں دے پاتے ہیں۔ یا تو یہ خصیے بنیادی خرابی کی وجہ سے یا ثانوی خرابی کی وجہ سے اور خصوصی طور پر اس کے دماغ میں پائے جانے والے ایک غدود Pituitary Gland سے ایک ہارمون Pituitary Gonadotrophins کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دونوں معاملے میں مصنوعی Androgens کے استعمال کے ذریعے پیدا شدہ خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے نامردی

کے علاج کے معاملے میں اب تک کوئی خاص کامیابی نہیں ملی ہے۔
یہ اور بات ہے کہ اس کے استعمال سے خواہشات میں اضافہ اور ثانوی خصوصیات مثلاً داڑھی یا مونچھ کا نکلنا وغیرہ میں کافی حد تک کامیابی ملا ہے۔ اگر نامردی کا تعلق نفسیات سے ہے تو ایسے معاملے میں مریض کے نفسیاتی علاج سے اس مسئلے کو حل کیا جاتا ہے لیکن اگر اعضائے رئیسہ کے خلیے ہی بیکار ہو جائیں تو مشکل کام ہے۔ اگر کسی لڑکے میں جوانی کے اثرات صحیح وقت پر ظاہر نہیں ہو پا رہے ہیں تو ایسی حالت میں لڑکے کو انڈروجن استعمال کرایا جاتا ہے، جس کے استعمال سے جنسیاتی بالیدگی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن لڑکے کی عمر اگر ۱۷ سال سے کم ہے تو ایسی حالت میں انڈروجن ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ کبھی کبھی دماغ میں پائی جانے والی گلٹی (Pituitary Gland) سے خارج ہونے والا Gonadotrophins دیر سے بھی خارج ہوتا ہے۔ دماغ سے خارج ہونے والے Gonadotrophins کے اندر یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ مردوں کے جنسیاتی گلٹی ٹسٹس اور عورتوں کی جنسیاتی گلٹی بیضہ دانی کو متاثر کرتا ہے اور اس کے اعمال میں تیزی لاتا رہتا ہے۔ اگر کسی مرد کو سوزشِ جگر کی بیماری (Cirrhosis of Liver) ہو جاتی ہے تو ایسی حالت میں ایسٹروجن (Oestrogen) کی مقدار خون میں بڑھ جاتی ہے اور مردوں میں نسوانی اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں یرقان کے مریضوں میں جب جھنجھلاہٹ بڑھ جاتی ہے تو انڈروجن Androgen کا استعمال فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ انڈروجن Androgen اگر نہایت ہی کم مقدار میں استعمال کیا جائے تو نئے بافتوں کی تشکیل ہونے لگتی ہے مثال کے طور پر Osteoporosis کے مرض میں۔

ہڈیوں کے کینسر اور عورتوں میں ماہواری کے بند ہونے سے پہلے اگر چھاتی کا کینسر ہو جائے تو ایسی حالت میں چھاتی کے سائز اور درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے زیادہ مقدار میں انڈروجن ہارمون کو استعمال کیا جا رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کے استعمال سے عورتوں میں مردوں کی بہت سی خوبیاں مثلاً چہرے پر بالوں کا نکلنا وغیرہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کلیشیم کی اگر زیادتی ہو جائے تو زیادہ مقدار میں استعمال کرایا جاتا ہے Adrenal Steroid زیادہ مقدار میں ہارمون ہے جو گردے کے اوپر مثلث نما گلٹی Adrenal سے خارج ہوتا ہے۔ اس ہارمون سے تیار کردہ Steroid دورِ جدید میں کسی بھی دوا کے ردِّ عمل Anaphylactic Shock میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ عام لفظوں میں اسے "زندگی بچانے والی دوا" کے نام سے ساری دنیا میں پکارا جاتا ہے۔ انڈروجن کو مختلف چھاتیوں کی بیماری میں صرف استعمال نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ Bone Marrow (ہڈی کے گودہ) میں خرابی اور خون کی کمی (Anaemia) کی حالت میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ بازار میں Testosterone کے تین اقسام Testosterone Propionate، Methyl Testosterone اور Testosterone Oenanthate دستیاب ہیں جو علم کیمیا کی ترقی کے مرہونِ منت ہیں۔ گرچہ انڈروجن کے استعمال سے بہت سے فائدے ہوتے ہیں لیکن کچھ خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حد درجہ جنسیاتی خواہشات کا بڑھ جانا۔ خاص طور پر کمزور اعصابی مریضوں میں اور عورتوں میں Virilisation کا ہو جانا۔ Methyl Testosterone کے استعمال سے یرقان کا مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ چھاتی کے کینسر میں اس ہارمون کو استعمال کرنے سے خون میں کلیشیم کی مقدار کی زیادتی ہو جاتی ہے اور پھر جسم پر کلیشیم کی زیادتی کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

انڈروجن کو پروٹین کے تعمیری اعمال میں استعمال کرنے سے بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن عورتوں میں اس کے استعمال سے مردوں جیسی خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ماہرین علم کیمیا اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایسا انڈروجن تیار کیا جائے جس کے استعمال سے مضر اثرات کم سے کم ہوں تاکہ Osteoporosis کے معاملے میں ایسے مرکبات کو استعمال میں لایا جا سکے۔ پیشاب میں کلیشیم اور نائٹروجن کی کمی کو روک کر طویل عرصے تک بستر پر پڑے مریض کی ہڈی کے ٹوٹنے کے معاملے میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ جن بچوں میں ایسے ہارمون کی کمی کی وجہ سے صحیح بالیدگی نہیں ہو رہی ہے یا قد چھوٹا ہے تو Steroids استعمال کرو...

کرنا بہتر ہے۔

گردے کے فیل ہو جانے (Acute Renal Failure) کی حالت میں اس کے استعمال سے Haemodialysis کی ضرورت کم ہو جاتی ہے لیکن اس بات کو ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جسم اگر دن بدن لاغر ہوتا چلا جا رہا ہے تو ایسی حالت میں وزن کو بڑھانے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ہارمون کی زیادتی سے چہرے میں (Acne) اور جلد میں چکناہٹ ہو جاتی ہے بعد میں جسم میں نمک اور پانی جمع ہونے لگتے ہیں۔ بازار میں دستیاب ہونے والے انڈروجن کچھ سستے اور کچھ مہنگے داموں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ فی الحال بازار میں انجکشن کے طور پر Nandrolone اور ٹکیوں کی شکل میں Oxnatolin حاصل ہوتا ہے۔

Osteoporosis کے مریض میں انڈروجن اور ایسٹروجن دونوں ملا کر دینے سے مرض میں کافی جلدی افاقہ ہوتا ہے۔ عورتوں کے معاملے میں ایسٹروجن کا cyclical استعمال ہونا چاہیے۔ کیوں کہ عورتوں میں اندام نہانی کے کینسر کا سب سے بڑی وجہ غیر ضروری ہارمون کا استعمال ہے۔

OESTROGEN (ایسٹروجن)

بیضہ دانی سے خارج ہونے والے ہارمون کو ایسٹروجن کہا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کے اندام نہانی کے مختلف حصوں کی بالیدگی و نشو و نما کے لیے از حد ضروری ہے۔ عورتوں میں چھاتی کا ابھار اور ثانوی خصوصیات اس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ خون میں اس ہارمون کی مقدار Critical-Level سے زیادہ ہونا چاہیے جو رحم کی دیوار کی رطوبت کے خارج کرنے کے لیے از حد ضروری ہوتا ہے۔ جب اس ہارمون کا Level گھٹ جاتا ہے تو اس وقت ماہواری جاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح عارضی طور پر اگر ہم چاہیں تو اس کے زیادہ استعمال ماہواری کی اوقات سے پہلے دینے سے ماہواری کو روکا جا سکتا ہے مگر اس کا استعمال ترک کر دینے سے دوبارہ ماہواری جاری ہو جاتی ہے جسے Oestrogen-withdrawal bleeding کہتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس ہارمون کو طویل عرصہ تک استعمال کے باوجود بھی ماہواری دوبارہ ہو سکتی ہے۔ یہ ہارمون حمل کو برقرار رکھنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ یہ ہارمون بازاروں میں Ethinyl-Oestradiol و Oestradiol اور Stilboestrol کے نام سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس ہارمون کی بنی ہوئی کریم کو اندام نہانی کی سوزش میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں دودھ کو تیار ہونے سے روکنے کے لیے اور مردوں میں پروسٹیٹ گلٹی کے کینسر میں اس کا استعمال عام طور سے کیا جا رہا ہے۔

ہارمون اور برتھ کنٹرول:

بڑھتی ہوئی آبادی اور وسایل کی کمی و غلط استعمال نے انسانی حیات کو تنگ کر دیا ہے۔ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو انسانی ہوس نے اس قدر پامال کرنا شروع کر دیا ہے کہ دور جہالت میں بھی ایسا نہ تھا۔ آج فضا کی بڑھتی ہوئی آلودگی اور Soilerosion نے انسان کو برتھ کنٹرول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ برتھ کنٹرول کے لیے ہارمون کی بنی ہوئی مختلف اقسام کی گولیاں بازاروں میں دستیاب ہیں۔ برتھ کنٹرول کے مختلف طریقوں میں سب سے قابل اعتبار یہی ہے۔ ہارمون کو مردوں میں استعمال کرنے سے مادہ منویہ کو پیدا ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ یہ ہارمون انسانی دماغ کی ایک گلٹی - Pituitary Gland پر اثر انداز ہو کر اس کے اثرات کو جنسیاتی گلٹی سے روک دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مردوں میں Oestrogen ہارمون دینے سے جنسیاتی خواہش کافی کم ہو جاتی ہے جبکہ Testosterone کے استعمال سے مردوں میں شہوانی خواہش میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر ثانوی درجے میں خواہش کی کمی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ Immunological طریقے سے دماغ کی گلٹی Pituitary سے خارج ہونے والے ہارمون Gonadotrophins کو بیکار کر دیا جائے مگر اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔ عورتوں کے ہارمون کے استعمال سے انڈے کے اخراج کو روکا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں عورتوں میں ایک ہارمون Leutinising Hormone کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا پھر بالفاظ دیگر بیضہ دانی کو اس قابل کر دیا جاتا ہے کہ اس

ہارمون یعنی (L.H) Leutinising Hormon کا کوئی خاص اثر اس پر نہ ہو۔

Fertilization زیرگی کے عمل کو روکنے میں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی ہے۔ ہاں اس سلسلے میں عورتوں کی خاص نلی کے PH کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ مادہ منویہ داخل ہوتے ہی ختم ہو جائے۔

انڈے کا (Implantation) ہونے کا جہاں تک تعلق ہے عورتوں میں Oestrogen + Progestrone کے خاص توازن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس توازن کو بگاڑ دیا جائے تو ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔

Oral Contraceptive دنیا میں سب سے پہلے ۱۹۵۶ء میں شروع کیا گیا ہے۔ دوران حمل Progestogen کے استعمال سے مادہ بچے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ماہواری میں کوئی گڑبڑی ہونے سے بھی ہارمون کی ٹکیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ سرجری کرتے وقت اگر کوئی مریض برتھ کنٹرول کی ٹکیاں استعمال کرتی ہے تو کم از کم چار ہفتے پہلے ترک کر دینا چاہیے ورنہ خطرناک بیماری Thrombo Eembolism ہوسکتا ہے

جو عورتیں اس قسم کی ٹکیاں استعمال کرتی ہے ان میں گلوکوز کو برداشت کرنے کی خوبی کم ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شکم سے خارج ہونے والے لبلبہ (Pancreas) سے انسولین کے اثرات کو جنیاتی ہارمون کم کر دیتا ہے۔

Oestrogen کے استعمال سے متلی، قے، سینے کی تکلیف، ذہنی انتشار جسم میں نمک اور پانی کا جمع ہونا، سر درد، سستی، پیٹ کی تکالیف، جلد کی رنگت میں Patches کا ہو جانا عام ہے۔ اس قسم کے ہارمون استعمال کرنے سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ جو عورتیں ماضی میں اندام نہانی کے کینسر میں مبتلا رہی ہوں وہ ہارمون کی ٹکیاں استعمال نہ کریں ورنہ دوبارہ کینسر ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔

جنسیاتی ہارمون اور جلد

انڈروجن کا استعمال جلد کی اہم گلٹی Sebaceous Gland کے اعمال میں تیزی لا دیتا ہے۔ اس لیے اس کے استعمال سے Acne اور Seborrhoea جیسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ Oestrogen کا اس کے برخلاف اثر ہوتا ہے۔ اس کا استعمال نہایت ہی کم مقدار میں ایسے امراض سے متاثر مردوں میں کرنا چاہیے۔ جدید دور میں ایسٹروجن کی بنی ہوئی کریمیں (Creams) عورتیں چہرے کی چمک دمک کے لیے استعمال کرتی ہیں، تاکہ چہرے کی جھریوں کو ختم کرسکیں۔ ماہواری بند ہونے سے قبل یعنی چالیس سال سے کم عمر کی عورتوں میں اس کے استعمال سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا ہے لیکن ماہواری کے بند ہونے کے بعد عورتوں کی جسمانی چمک دمک میں کافی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ اس لیے وہ اس قسم کے ہارمون کے بنے ہوئے کریم آرائش و زیبائش کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

"انسان آپ اپنے لیے سب سے بڑا استاد ہے۔ دنیا کے تمام واقعات اس پر گزرتے ہیں اور ان کے اثروں سے جیسا وہ واقف ہوتا ہے دوسرا کوئی واقف نہیں ہوتا اور اُن سے اس کو عبرت پکڑنے کا سب سے زیادہ موقع ہوتا ہے۔"

"سر سید"

جوابِ دوست

کوچہ ہائے رسوائی ۵۶ ــــــ ۴۷ء

نسیم انصاری

آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ ناسمجھ لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے لیکن میں اسے ایک منٹ کے لیے بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ میرے سامنے تو کراچی، دہلی، بمبئی اور ڈھاکہ سب اسی وحدت کے حصے ہیں۔ میرے بہت قریبی رشتہ دار ان سب شہروں میں ہیں اور یہ سب شہر اسی وحدت کا حصہ ہیں جن سے ہمارا اور ہماری نہ جانے کتنی پشتوں کا روحانی رشتہ رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ گرونانک، فریدالدین گنج شکر، اجمیر کے خواجہ، خواجگان نظام الدین اولیا، غالب، ٹیگور، اقبال اور پریم چند کی قومیت ہندوستانی ہے یا پاکستانی یا بنگلہ دیشی۔ ۴۷ء اور ۷۱ء کے سیاسی حادثات تو ضرور ہوئے اور بہت سخت ہوئے لیکن ان سے ہماری روحانی وحدت نہیں ختم ہوئی۔

میں نے سر کر تہذیبی وحدت کا نام نہیں لیا کیوں کہ ہندوستان میں تہذیبی وحدت کبھی نہیں رہی اور نہ آج کے ہندوستان اور پاکستان میں یہ وحدت موجود ہے۔ مجھے اپنی تہذیب ویسی ہی عزیز ہے جیسے کسی کشمیری کو اس کی تہذیب۔ میں اگر چاہوں کہ ہمارے تہذیبی فرق مٹ جائیں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا، نہ کشمیریوں کو لکھنؤ کا مزعفر اچھا لگ سکتا ہے اور نہ لکھنؤ والوں کو سری نگر کا گوشتابہ۔ کشمیر کے صوفیانہ کلام کا لطف تو اسی وادیٔ جنت نظیر کے لوگوں ہی سے پوچھیے یہ نعمت بہار شریف کے علما کی قسمت میں کہاں۔

ہماری تہذیبی بوقلمونی تسلیم، اس کا ہر رنگ اپنی جگہ دلفریب چاہے کشمیری دوشالہ ہو یا بنارسی ساری، حیدرآباد کی جامہ دار (ہائے اب یہ نہیں ملتی) ہو یا ڈھاکہ کی ململ، لکھنؤ کی چکن ہو یا میسور کی سلک۔

لیکن ذرا یہ بھی تو دیکھیے کہ اس تہذیب کے بعض تانے بانے ایک ہیں۔ خیال، راگ درباری، ٹھمری اور دادرا تو ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کی سرحدوں کے آر پار سب جگہ سنائی دیتے ہیں۔ اقبال بانو کی گائی ہوئی غزلیں ہوں یا لتا منگیشکر کے گانے۔ سب کی بنیاد تو وہی راگ ہیں جو ہزاروں برس سے یہاں کے مرغزاروں اور کہساروں میں گونج رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی محفل میں جب آواز آتی ہے۔

"خواجہ پیا، رنگ دے موری چندریا
اور رنگ کبھی چوکھا آئے
دھبیا دھوئے ساری عمریا؟

تو پھر دیکھیے کیسے کیسے گریبان چاک ہوتے ہیں اور کیسے کیسے بادقار صاحب دل حضرات بے قرار ہوکر منھ ڈھانپ لیتے ہیں کہ کہیں ان کے دل کا معاملہ سرِ محفل نہ کھل جائے۔

برصغیر کے باہر ایسی محفلوں کا رواج کسی جگہ نہیں ہے۔ وہاں نہ کوئی خواجہ پیا کو سمجھتا ہے اور نہ چندریا کے رنگ کی جذباتی معنویت کو آج سے دس گیارہ سو برس پہلے جنوبی ہند کا ایک نوجوان سادھو سارے ملک کی یاترا پر نکلا اور شنکر اچاریہ کا درجہ پایا اور ملک کے چاروں کونوں میں ایک ایک مندر اپنی یادگار چھوڑا۔ یہ مندر آج بھی ہندوستانی وحدت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ہندوستان میں اسلام آیا تو ایک ہی سلسلے کے لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ شمال میں حضرت فریدالدین گنج شکر، گجرات میں عبدالصمد

گلبرگہ میں بندہ نواز گیسودراز، ردولی میں شاہ عبدالحق کہ

بر تخت سلیماں پا نہ دہد شد ہر کہ غلام عبدالحق
یا ساغر جم کہ رغبت نکند سرمست زجام عبدالحق

پانڈوا بنگال میں شاہ عطاء الحق اور دہلی میں خود حضرت سلطان جی

ہماری وحدت یورپ کی وحدت سے ذرا مختلف ہے یورپ میں تو عیسائی مذہب، یونانی فلسفہ اور رومی قانون کی بنیادوں پر ایک طرح کی وحدت نے جنم لیا ہے اور پچھلے چار پانچ سو برسوں میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ آپ مارکسزم کا ذکر کریں گے۔ میرے خیال میں مارکسزم نے یورپ کی بنیادی وحدت میں کوئی خلل نہیں ڈالا ہے۔ مارکس کی فلسفیانہ مادیت تو یونانی فلسفہ ہی کی ایک شاخ معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ کا مادی تجزیہ بھی اتنا ہی نیا ہے جتنا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا اگر ڈارون یورپ کے علمی ڈھانچے میں کھپ سکتا ہے تو پھر مارکس کو اس سے الگ کیوں سمجھا جائے؟

ہندوستان کا معاملہ ذرا سا الگ ضرور ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آمد تک تو ایک ہی روحانی دریا بہتا تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ ایک دوسرا دریا لے آئے جو کئی اعتبار سے خالص ہندوستانی روحانیت سے مختلف تھا۔ سب سے بڑا اختلاف توجیہات بعد الموت کے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ آواگون کے قایل تھے اور مسلمان اپنے ساتھ روز جزا کا تصور لائے دوسری بات جو غالباً زیادہ اہم تھی وہ صحیفوں سے متعلق تھی ان صحیفوں کی شریعتیں منو کی شریعت سے بالکل مختلف تھیں۔ انسانی مساوات کا تصور بھی ہندوستان کے لیے بالکل نیا تھا۔

یورپین تہذیب کا اثر ہندوستان کی روحانی زندگی پر بالکل سطحی ثابت ہوا۔ یہاں تو ہندو مسلم گنگا جمنی روحانیت باقی رہی۔ ہندو مذہب پر اسلام کے کسی اثر پڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس لیے کہ ہندو مذہب اس معنی میں کوئی مذہب نہیں ہے جن معنوں میں اسلام، یا عیسائیت یا یہودی مذہب ہے۔ ان مذاہب میں خدا کا تصور، سزا اور جزا کا ایمان اور وحی کے ذریعے خداوندی احکام کا علم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی کوئی پابندی ہندو مذہب میں نہیں ہے۔ بدھ اور جین مذاہب کے ماننے والے ہندو دھرم سے یکسر قلم

خارج نہیں قرار دیے جا سکتے۔ لیکن یہ لچک اسلام کے ماننے والوں کے لیے ہندومت کے دروازے نہیں کھولتی۔ غالباً ہندوستان کے لیے یہ مقسوم ہے کہ یہاں دونوں دھارے ساتھ ساتھ بہیں گے لیکن ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوں گے۔ اکبر نے انہیں ضم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی کوششوں سے ہندو اور مسلمان دونوں ڈر گئے۔

اگرچہ اکبر کی کوشش ناکام رہی لیکن ان سے کچھ پہلے گرونانک اس تصور کو حقیقت کا جامہ پہنا چکے تھے۔ انہوں نے اس چمن میں وحدت کا گیت گایا اور بابا فریدالدین گنج شکر کے کلام کو الہامی درجہ دیا۔ ان کے متعلق مسلمانوں کی روایت تو یہ ہے کہ جب وہ خانۂ کعبہ کی زیارت کو تشریف لے گئے تو وہاں نیند آ گئی اور سو گئے۔ سوتے سے کسی نے اٹھایا اور کہا کہ بھائی دیکھیے آپ کعبہ کی بےحرمتی کر رہے ہیں کہ سوتے میں آپ کے پیر خانۂ خدا کی طرف ہو گئے۔ گرو صاحب اٹھ بیٹھے اور اعتراض کرنے والے سے بولے کہ بھائی غلطی ہو گئی۔ اب یہ بتلایئے کہ خدا کا گھر کس طرف نہیں ہے کہ میں اس کی طرف پیر پھیلا کر لیٹ جاؤں۔

سکھوں کی روایت یہ ہے کہ گرو صاحب نے اپنے پیر دوسری طرف موڑ لیے اور اعتراض کرنے والے کو نظر آیا کہ خانہ کعبہ بھی ادھر ہی کو مڑ گیا۔ اس نے حیرت سے گرو صاحب کو دیکھا تو انھوں نے فرمایا کہ خدا تو چپے چپے میں موجود ہے اور کوئی سمت ایسی نہیں جہاں وہ جلوہ گر نہ ہو۔

لیکن گرونانک کی یہ تحریک مغلوں کی سیاست کا شکار ہو گئی۔ خانہ جنگی میں شاید کسی باغی شہزادے کو سکھوں نے پناہ دی تھی۔ اس کے بعد وہ مغل غصہ کا ایسا نشانہ بنے کہ پیار محبت اور بھائی چارہ کا پیام دینے والے یہ لوگ مسلح جنگجو اور مغلوب الغضب جماعت بن گئے۔ وحدت کے گیت ان کے گردواروں میں اب بھی گائے جاتے ہیں لیکن ہندو مسلم اتحاد کے سر اب ان گیتوں میں ذرا مدھم پڑ گئے ہیں۔ سنا ہے کہ ملک کی تقسیم سے پہلے جناح صاحب نے ان لوگوں سے سیاسی گفتگو کرنا چاہی تھی لیکن سکھ رہنماؤں کو یہ سمجھایا گیا کہ مغل بھی مسلمان تھے، انھوں نے گرو صاحبان کے ساتھ کیا کیا کہ ان کے ہم مذہب لوگوں سے کس انصاف کی توقع کرتے ہو چنانچہ سکھ پاکستان کے سخت مخالف ہو گئے اور تقسیم کے زمانے میں وہ

اور مسلمان ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے تھے۔ اس دشمنی میں ایسا خون خرابہ
ہوا کہ پنجاب کے دریاؤں کا پانی سرخ ہو گیا۔

ذکر میرے دوبارہ کلکتہ جانے کا تھا اور بات کہاں سے کہاں
پہنچ گئی۔ کلکتہ میں میرے شروع کے دو برس یعنی ۴۸ء سے ۴۹ء تک
تو آندھی اور طوفان کی طرح گزر گئے تھے کہ اس میں سیاسی جلسے، علمی مباحثے
ناچ رنگ، پولیس کی سنگینیں، قید، فرار، روپوشی اور رسوائی سب ہی کچھ
ہو گیا۔ لیکن ۵۱ء کے بعد کی دنیا اتنی تلاطم خیز نہیں تھی اس میں نرمی آ گئی
اور کلکتہ کے دلفریب مکھڑے سے گھونگھٹ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ غالب نے جو دامان باغبان اور کف گلفروش
کا ذکر کیا ہے ان کی مراد اسی شہر سے تھی۔ ذرا یہ شعر پھر سے سنیے۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

انہوں نے ہم جیسے گنہگاروں کی کتاب دل کی تفسیریں لکھی ہیں
ان پر کلکتہ میں وہی سب گزری جو ان کے بعد کے آنے والوں پر
آج تک گزر رہی ہے لیکن ان کا انداز بیان اور کسی کو کہاں نصیب!

ان کے مزاج میں انکسار تھا اسی وجہ سے انہوں نے اپنے
اردو مجموعہ کو ننگ من است کہہ کر اسے نظر انداز کرنے کو کہا۔ آپ
کہیں گے کہ یہ بھی ایک شان تعلی تھی۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ
ان کے فارسی کلام کی بعض بلندیاں ایسی ہیں جہاں ان کی اردو نہیں
پہنچتی۔ اردو میں کہاں کہا گیا۔

جاناں تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہریمنی
نہ بردم زکس مایہ در رہزنی
گرفتے کہ آتش بگورم ازدست
بہ ہنگامہ پروانہ خوردم از دست

اور اس کے بعد

حساب مے رامش و رنگ و بو
زجمشید و بہرام و پرویز جو

نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ
بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

یا اپنے اسیر پہ جس طرح ان پہ مجبوری کا ذکر کیا ہے۔

نہ پسندم کہ کس آید نہ توانم کہ روم
جانب در بچہ حسرت نگرانم در بند

اور پھر مصطفیٰ خاں شیفتہ سے مخاطب ہو کر جو کہا ہے

یار دیرینہ قدم رنجہ نما کہ این جا
آن نہ گنجد کہ تو در گوئی و من باز کنم

اور غزل میں

آن راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار توان گفت و بہ ممبر نہ توان گفت

یہ چیزیں اردو میں کہاں ملیں گی۔ لیکن ایک بات ہے چاہے اردو ہو
چاہے فارسی، اگر غالب کلکتہ نہ آتے تو ان کا انداز بیان اتنا دلنشیں
نہ ہوتا۔ کلکتہ میں ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی اور غالب پر اس
کا رد عمل بھی ہوا۔ وہ اتنے ذہین، فہیم اور حساس تھے کہ نئے ہندوستان
کو نہ صرف پہچان لیا بلکہ اس کا استقبال بھی کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ
آئین اکبری پر جب سرسید نے چاہا کہ غالب اس کی اشاعت کی
تاریخ لکھیں تو غالب نے ان سے کہا کہ آئین اکبری کا قصہ لے کر
کہاں بیٹھ گئے۔ اب جو نیا آئین آ رہا ہے وہ تمام آئینوں سے کہیں زیادہ
جامع اور نافع ہے۔ سرسید کو شاید یہ بات ناگوار گزری اور ایک
عرصے تک تعلقات کشیدہ رہے۔ صفائی کی صورت اس وقت ہوئی
جب غالب ایک دفعہ رامپور سے واپسی میں مراد آباد ٹھہرے اور
ان کے مہمان ہوئے۔

غالب، سرسید اور شیفتہ کے ساتھ اگر حالی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی
نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا شبلی کو شامل کر لیجیے تو
شمالی ہندوستان کی اس تہذیب کی نشاۃ الثانیہ کا نقشہ بن جائے
گا جس کا تعلق اردو زبان سے تھا۔ اگر تھوڑے دنوں کے بعد
اردو ہندی کا جھگڑا نہ شروع ہوا ہوتا تو یہ تحریک کسی طرح بنگال
کے نشاۃ الثانیہ سے کم محترم نہ سمجھی جاتی۔ ذرا غور فرمائیے اس

وقت اردو کے دامن سے کیسے کیسے لوگ وابستہ تھے۔ دلی اور لاہور کے علاوہ لکھنؤ کو بھی تو دیکھیے وہاں کے میرانیس، مرزا دبیر، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست کو بھی اگر ملا لیجیے تو پورا گلدستہ بن جائے گا۔ ادھر مائیکل مدھوسودن ادھر میرانیس، ادھر بنکم چٹرجی تو ادھر عبدالحلیم شرر، ادھر رام موہن رائے تو ادھر سرسید۔ بس اس کے بعد گاڑی اٹک جاتی ہے۔ بنگال میں نہ کوئی غالب پیدا ہوا اور نہ حالی اور نہ اردو میں کسی ٹیگور نے جنم لیا۔ پریم چند اور شرت چندر تو بیسویں صدی کے لوگ تھے۔

مولانا حالی کا نام سرسید اور غالب کے ساتھ اس طرح آیا کہ خود ان کی شخصیت بہت نمایاں نہ ہو سکی۔ حالاں کہ مولانا نے جو خدمت کی ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی اردو میں کوئی اور شخصیت ایسی نہیں ملتی۔ خلوص ایسے کہ نعت میں بھی اپنے لیے نہیں اپنی قوم کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ میری نظر سے تو جتنی نعتیں گزری ہیں ان سب میں شاعر نے اپنا ذاتی رشتہ خلوص ظاہر کیا ہے اور اسی کے صدقے میں اپنی روحانی تسکین کا سامان مانگا ہے۔ حالی نے اپنے لیے نہیں اپنی قوم کے لیے دستِ طلب بڑھایا؛

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

میں مدّ و جزرِ اسلام کا تذکرہ نہیں کروں گا کہ اس پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں تو حالی کی غزلوں کا ذکر آپ سے کروں گا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

ذرا ملاحظہ فرمایئے یہ سوجھ بوجھ اس کوچہ میں بہت دن رہنے کے بعد آتی ہے۔ اور پھر وہ غزل جو ہم نے اور آپ نے اسکول میں پڑھی تھی

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

آپ خود بتایئے کہ اس سے اچھا چراغ سرِ راہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اور اس کے بعد آپ فرمائیں کہ یہ بات ظلم کی ہے یا نہیں کہ جب مرزا فرحت اللہ بیگ دلی کا آخری یادگار مشاعرہ آراستہ کریں تو اس میں حالی شریک محفل نہ کیے جائیں۔ اس وقت وہ چاہے کتنے ہی کم عمر کیوں نہ ہوں داغ کے برابر تو ہوں گے ہی۔ شاید حالی کی شرکت سے حقیقت نگاری میں فرق آتا کیوں کہ میں نے کہیں نہیں پڑھا ہے کہ حالی کبھی کسی ایسی محفل میں شریک ہوئے ہوں جس میں بہادر شاہ کی غزل پڑھی گئی ہو۔ بہرحال دہلی مرحوم کے آخری شعرا میں حالی کا نام ضرور آئے گا۔ اسی کمبخت شہر کے شعرا کی فہرست میں جس کے لیے کہتے تھے

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو بھی لوگ بھول سے گئے ہیں، لیکن غزل میں کیا اچھے اچھے شعر نکالے ہیں؛

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اور پھر وہ قطعہ تو یاد ہوگا جس کے آخر میں ہے۔

یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف
جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا
ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

آپ کہہ رہے ہوں گے کہ "عہدِ پیری شباب کی باتیں" میں کہوں گا کہ اس کمبخت کا تو اب نام بھی نہیں لیا جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں اور آپ سے گفتگو کرتے وقت تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں پھر آفتاب ہوسٹل پہنچ گیا اور الیکشن لڑا جا رہا ہے، پھر میں احسان بھائی یعنی احسان رشید کے ساتھ آپ کی کنویسنگ کے لیے نکلا ہوں۔ احسان بھائی لوگوں سے پوچھ رہے کہ آخر آپ کا ووٹنگ

کے لیے کرائی ٹیڑھا کیا ہے؟ قریب سے کوئی بولتا ہے کہ ہاں بھائی کچھ صورت شکل کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس پر فریق مخالف کے کیمپ کی طرف اشارہ کر کے کوئی آہ سرد بھرتا ہے " اللہ غلام بنائے غلام صورت نہ بنائے "۔ بہرحال۔ اب تو یہ باتیں" ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں"

۵۶ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی تعلیم ختم کر کے چھ مہینے تک میڈیکل کالج کے اسپتال میں کام کیا اور اس کے بعد ستمبر کے مہینے میں علی گڑھ آگیا۔ اس دفعہ زینت بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہماری شادی مئی میں ہو گئی تھی۔ علی گڑھ یوں آنا ہوا کہ پڑھائی کے زمانے میں ذاکر صاحب نے میڈیکل کالج فنڈ سے مجھے اس شرط پر وظیفہ دیا تھا کہ ڈاکٹری پڑھنے کے بعد میں اپنی خدمات یونیورسٹی کو پیش کروں گا اور یونیورسٹی کو اختیار ہوگا کہ وہ مجھ سے جس طرح کا کام جی چاہے لے۔ یونیورسٹی میں ابھی میڈیکل کالج کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ یونیورسٹی کے آف تھلمک انسٹی ٹیوٹ میں کام کرو وجہ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر موہن لال کے اشتراک سے شروع کروا دیا تھا۔ میں نے وہاں صرف چند مہینے کام کیا۔ اس کے بعد سرجری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا۔ مارچ ۵۷ء میں زینت کے ساتھ اطالوی جہاز وکٹوریہ پر بمبئی سے اٹلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اٹلی سے ریل کے ذریعے فرانس اور وہاں سے اسٹیمر سے انگلش چینل پار کر کے ہم دونوں لندن پہنچ گئے۔

یہاں سے سفر کی چوتھی منزل شروع ہوتی ہے۔ پہلی منزل فرنگی محل دوسری علی گڑھ تیسری کلکتہ اور اب چوتھی منزل برطانیہ کی ہے۔

رَو میں ہے رخشِ عمر دیکھیے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

باقی آئندہ

گریجویٹ اور تجارت

یہ امر بلاشبہ غور طلب ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص اسٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے واسطے کیا بہتر ہوگا... گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ ان سب لوگوں کو دے سکے جو انگریزی میں تعلیم پاتے ہیں۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے... تجارت کے لیے بہت بہت کچھ وسعت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان نوجوان لائق اور صفات حمیدہ سے معمور اور ان عادات و افعال سے بری ہو جاویں جو تجارت کے منافی ہیں تو اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں۔"

سرسید

سرسید اور مسلمانوں کی تعلیمی نشاۃ الثانیہ

علی اختر خاں | ترجمہ | سید مشفیق احمد

۱۷ر اکتوبر بروز جمعہ انیسویں صدی کے بلند مرتبہ مصلح معاشرہ و تعلیم اور بانی ایم۔ اے۔ او کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، سر سید احمد خاں کی ایک سو اُنہتّرویں سالگرہ تھی۔ کھوکھلے الفاظ سے اجتناب کرنے والے، عمل پیہم کے پیرو، اپنی زندگی میں ہی وہ ایک روایتی کردار بن گئے تھے۔ ان کی زندگی ایک تحریک (علی گڑھ تحریک) تھی۔ ایک مشن جسے تعلیمی اور معاشرتی انقلاب سے پرجوش عقیدت تھی۔ زمانہ حاضرہ میں اس وجہ سے ان کے خیالات اور ان کی خدمات زیادہ قریب سے دیکھے جانے کی مستحق ہیں۔

سر سید کے عزیز ترین مقاصد یہ تھے۔

۱۔ ہندو مسلم اتحاد

۲۔ سائنس اور مذہب کا امتزاج اور اس کی پیہم ترقی اور

۳۔ پسماندہ ہندوستانی مسلمانوں کی بحیثیت ہندوستانیوں کے ایک جز کے، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی پیش روی اور ان کی جدید سائنسی تعلیم۔

ایک دیو پیکر شخصیت کی مانند سر سید، ۱۸۵۷ء کے بعد کے المناک حالات سے نبرد آزما ہوئے۔ ہم وطنوں کو عملی خدمت کرنے کا فلسفہ دیا اور مسائل کے حل تلاش کرنے کے کام میں ایک نئی روح پھونکی۔ ذہنی یکسوئی عقیدت اور ایک مسیحا کے جوش و جذبہ کے ساتھ وہ قوم کے آنسو پونچھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ مسلمانوں کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر سکیں۔ ان کے منتشر خوابوں کو عملی جامہ پہنا سکیں اور انھیں ملک میں عزت، وقار اور امن کی ضمانت دلا سکیں۔

ہر پہلو سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی اپنے دیگر ہم وطنوں کے بالمقابل پسماندہ تھی اور یہ فرق انھیں بہت نمایاں اور تکلیف دہ لگا۔ ان کے اندر چھپے ہوئے معاشرتی اور سیکولر صاحب کشف نے دیکھ لیا کہ آنے والے وقتوں میں ہندوستان کے دو بڑے فرقوں میں اتنا زیادہ تضاد خود ملک کے مفاد میں نہ ہوگا۔ کیوں کہ اگر اسے تیزی سے روکا نہ گیا تو یہ سماجی تناؤ اور غلط فہمیوں کا باعث بنے گا اور دشمن اس صورت حال سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ایک پیغمبر کی طرح چشم بینا سے انھوں نے دیکھ لیا کہ اگر غیر محفوظیت کا جذبہ ہندوستانی مسلمانوں میں بڑھتا ہے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ عالم مایوسی میں غیر ذمہ دار اور غیر محتاط سیاسی اور مذہبی عناصر کے منصوبوں کا شکار ہو جائیں۔ ملک کی تقسیم اور اس سے قبل کی سیاست جسے انگریزوں نے پروان چڑھایا تھا ان کے شکوک کو صحیح ثابت کرتی ہے۔

اس لیے سر سید نے مصیبت زدہ اور قابل توجہ پسماندہ مسلمانوں کے مسائل کو سلجھانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ خیالات سے متاثر ہو کر اور انھیں اقدار کو رہنمائی کا ذریعہ بنا کر انھوں نے وہی کام کیا جو راجہ رام موہن رائے نے پہلے اور مہاتما گاندھی نے بعد میں ہندو قوم کے پسماندہ طبقوں کے لیے کیا تھا۔ انھوں نے کثیر المقاصد اصلاحی تحریک شروع کی جسے علی گڑھ تحریک کے نام سے بہتر طور پر جانا جاتا ہے۔ (جس کا پہلا حصہ ایم۔ اے۔ او کالج کا قیام تھا)، اور جو کم و بیش راجہ رام موہن رائے اور دیگر حضرات کے "ہندو سماج سدھار اندولن" کے خطوط پر تھی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ سے متاثر ہو کر بے یار و مددگار مسلمان ملک کی بیچ دھار میں آنے کے لیے بے قرار تھے اور جو اقتصادی و سیاسی بدحالی سے بھی پریشان تھے ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے ان میں تعلیمی نشاۃ ثانیہ لانے کے لیے انھوں نے علی گڑھ تحریک کو ذریعہ بنایا۔

انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اس خاص مقصد سے قائم کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو جدید سائنسی تعلیم کے روشن اور آزاد خیال

سر سید اور مسلم ایجوکیشن ـــــ پیٹریٹ۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۶ء

پہلوؤں سے روشناس کرا سکیں اور انھیں قرونِ وسطیٰ سے چلی آرہی قدامت پسندی کی جھاڑیوں سے باہر نکال کر جدید ترقی کے بیکراں دستوں سے ہم کنار کرا سکیں۔ انھیں قوی امید تھی کہ اگر ایک بار بھی مسلمان جدید سائنسی تعلیم کے خلاف ذہنی تاملات و تعصبات سے آزاد ہو جائیں اور جدید سائنسی تعلیم کو روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ حاصل کرنے کی فوری ضرورت سمجھ لیں تو پسماندگی کے خلاف نصف جنگ جیت لی جائے گی اس کے بعد کچھ مدت میں ہی وہ دھیرے دھیرے قدم بہ قدم وقت کے ساتھ چلنے لگیں گے۔ اس لیے نہایت اہم بات یہ تھی کہ ان کے خیالات اور رجحانات میں بنیادی تبدیلی ہو جس سے صدیوں سے چلے آرہے جمود کو توڑا جا سکے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام سے بھی قبل سرسید نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کو قائم کیا تھا اور تہذیب الاخلاق (رسالہ برائے اصلاح المسلمین) جاری کیا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے خیالات میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔

سرسید کا فلسفہ مشرق کی مادیت پسندی اور مغرب کی توجیہ اور حریت پسندی کا ایک خوشگوار امتزاج پیش کرتا ہے۔ مذہبی معاملات میں توجیہ پسند، سیاست اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ارتباط کے معاملات میں سیکولر، روزمرہ کے مسایل میں باعمل اور مسایل زندگی کے حل کرنے میں وہ ایک بہترین انسان تھے۔ آج کے ہندوستان میں ان کا شمار عظیم المرتبت، مذہبی، معاشرتی، تعلیمی رہنماؤں میں کیا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی کی طرح سرسید بھی ایک نہایت مذہبی انسان تھے۔ انھیں کی طرح وہ آپسی تعلقات، معاشرتی اور تعلیمی نظریات اور حکمت عملی میں مکمل طور پر سیکولر تھے۔ مذہب کے معاملات میں ان کا رویہ توجیہ پسند تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مذہب، اخلاقیات اور توجیہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط کریں۔ وہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ سائنس اور مذہب ایک ہی حقیقت کو دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور اس وجہ سے وہ متناقض نہ ہو کر ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ ان کا یقین تھا کہ مذہب، سائنس اور توجیہ کے بغیر اپنی ہویت کھو دیتا ہے اور علم الاساطیر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور سائنس بغیر مذہب اور اخلاقیات کے فیشلزم کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ وہ مذہب کو محض عبادت کا ایک ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک مکمل طرزِ حیات جس کا ایک مقصد خداوند کریم سے رابطہ قایم کرنا تھا اور دوسرا اہم بدلتے ہوئے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔ مذہب میں توجیہ اور انسانیت کا راستہ اپنانے کا مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو اپنے عقاید کے ضروری عناصر کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے۔ اس کے باوجود انھیں زندگی کے ہر معاملے میں وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ انھوں نے ضعیف الاعتقادی، تقلید پسندی اور کلیسائی انداز کی مذہبی پیروکاری کو بند کرنے اور سائنس، جدیدیت اور اختراع یا اجتہاد کو اپنانے پر زور دیا۔

سرسید احمد خاں سیکولرازم کو ہندوستان جیسے مختلف المذاہب اور تعددی معاشرہ رکھنے والے ملک کے لیے بہترین پالیسی سمجھتے تھے۔ دل کی گہرائیوں سے سرسید ہمیشہ ہندو اور مسلمانوں کو عروس نو (ہندوستان) کی دو حسین آنکھوں سے تشبیہ دیتے تھے۔ انھوں نے سیکولرازم میں صرف نظریاتی انداز کا یقین نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے زندگی وقف کر دی۔ ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام سے لے کر ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی بننے۔ یعنی کلی سے پھول کھلنے تک۔ اور پھر اس وقت سے آج تک کی تاریخ عالی مرتبہ اور قابل تقلید بانی درس گاہ کے سیکولر عقیدے اور اس نظریے میں اعتبار کرنے اور اعتماد رکھنے کی تابناک یادوں اور مثالوں سے پُر ہے۔

اگرچہ بنیادی طور پر مسلمانوں کی تعلیمی و تمدنی ترقی کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن اس یونیورسٹی کے در ہمیشہ ہی ہندوستانی معاشرے کے ہر طبقے کے لیے کھلے رہے ہیں۔ اس کا سیکولر اور وسیع المشرب کردار دوسرے تعلیمی اداروں کے لیے باعث رشک [illegible] عظیم المرتبہ بانی درس گاہ

کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک کا مقصد

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی، سیاسی و تعلیمی اصلاح اور ان میں نئی زندگی کے لیے روح پھونکنا تھا۔ ان کے لیے یہ قابلِ فخر اور بیش بہا ترکہ ہے۔ ایسا ترکہ جو مسلسل محنت کا نتیجہ تھا اور ان مقاصد کے لیے جو انھیں عزیز از جان تھے اور جنھیں ہمیں اور آگے لے جانا ہے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ اے۔ ایم۔ یو کو سیکولرازم کی ایک تجربہ گاہ، ملک کی تعمیر نو کی ایک نشانی، اعلیٰ تعلیم کے ایک ملجا اور ہر ممکن پہلو سے افضلیت کا ایک نمونہ بنائے رکھا جائے۔

توجیہ، تبدیلی اور جدیدیت کی وہ قوتیں جن کو انھوں نے انتہائی عزم اور مستقل مزاجی سے جاری و ساری کیا تھا ان کو دوبارہ جامد و ساکت نہیں ہونا چاہیے۔

اعلان

بابت

سینٹر فار پروموشن آف سائنس اور تہذیب الاخلاق انعامی مقابلہ

برائے

عام فہم سائنسی مضمون نگاری

سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے بارہ ہزار روپیے کے انعامی مقابلے میں عام فہم سائنسی مضامین کو قبول کرنے کی تاریخ ۳۰؍ جون ۱۹۸۷ء سے بڑھا کر ۱۵؍ ستمبر ۱۹۸۷ء کر دی گئی ہے۔

تفصیل کے لیے تہذیب الاخلاق کے فروری اور مارچ ۱۹۸۷ء کے شماروں کو دیکھیے۔

اسرار احمد

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

ڈائرکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس

ہندوستان میں سائنس کی ترقی اور مسلمان

صغیر افراہیم

۲۳ر جون ۱۷۵۷ء کی شکستِ فاش کے بعد ہندوستانیوں کو اپنی ناکامی کے اسباب تلاش کرنے میں سنتّو سال لگ گئے۔ ۱۹ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب ملک پر باقاعدہ غیر ملکیوں کا قبضہ ہو گیا تو انہیں احساس ہوا کہ انگریزوں کے پاس منظم فوج اور جدید سامانِ حرب ہے جس کی بدولت انہوں نے وطنِ عزیز کو روند کر پھینک دیا ہے مگر یہ احساس اتنی دیر میں بیدار ہوا کہ اپنی دھرتی کو آزاد کرانے میں نوّے سال بیت گئے۔

ہمارے دانشوروں نے ملک کی شرمناک پستی اور اس سے پیدا شدہ حالات کے نتائج کا عمیق مشاہدہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانیوں کو باعزت رہنے اور ترقی کرنے کے لیے حالات سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ عوام میں ذہنی بیداری اور فکر و شعور کی رَو پیدا کرنی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر توجہ معاشرہ کو نئی قدروں سے متعارف کرانے، ادب کو نئے زاویوں اور نئے حقائق سے روشناس کرانے، زبان کو عام فہم بنانے اور اسے روزمرّہ کا رنگ دینے پر صرف کی، تاکہ زبان میں وسعت پیدا ہو اور مغربی علوم و فنون کو عوامی سطح پر ملکی زبانوں میں منتقل کیا جا سکے۔

ملک غلام تھا۔ انگریزوں کی حکمرانی تھی اور انگریزی زبان کا تسلط۔ مفکرین کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ انگریزی زبان سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے جدید رجحانات اور صنعتی انقلاب سے ہندوستانیوں کو روشناس کرائیں۔ انگریزی تعلیم کا رجحان اکثریتی فرقے میں پہلے پیدا ہوا۔ وہ ۱۸۱۶ء میں "ہندو کالج" اور ۱۸۲۳ء میں "اورینٹل سینٹری" کے نام سے ادارے قائم کر چکے تھے۔ راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین اور رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندوؤں کی تعمیرِ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر، جدید تقاضوں کے مطابق شروع کی۔ سوامی دیانند سرسوتی، سوامی دویکانند اور شری رام کرشن پرم ہنس نے مذہبی اور سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ تعلیمی اہمیت پر بھی خاص زور دیا۔ متعدد مقامات پر اسکول اور کالج کھولے۔ ویدک علوم کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق پیش کیا۔ علم کی اہمیت کے سلسلے میں "تھیوسوفیکل سوسائٹی" سب سے اہم ہے جس کے زیرِ اہتمام ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے بنارس میں سنٹرل ہندو کالج قائم کیا جو بعد میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی سرگرمی میں ترقی کر کے 'ہندو یونیورسٹی' میں تبدیل ہو

مسلم دانشور اور مصلحِ قوم انگریزی تعلیم اور سائنس و ٹکنالوجی کی طرف مذکورہ فرقہ کی بہ نسبت بعد میں متوجہ ہوئے۔ اُن کو شدید مشکلات کا سامنا بھی تھا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا اور بااثر طبقہ ایسے قدامت پرستوں پر مشتمل تھا جو اُن کو ملعون کر رہا تھا لیکن جدید نظریات کے حامل اپنی کاوشوں میں لگے رہے اور بڑی حد تک کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے۔ ایسے اولوالعزم لوگوں میں نمایاں نام سر سید احمد خاں کا ہے جنہوں نے ۹ر جون ۱۸۶۳ء کو غازی پور میں "سائنٹیفک سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ مراد آباد اور علی گڑھ میں مدرسے قائم کیے۔ صحت مند ادب اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے 'کمیٹی خواستگارانِ ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند' بنائی۔ بنگال میں نواب عبداللطیف نے "محمڈن لٹریری سوسائٹی" اور سید امیر علی نے "سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی۔ ان انجمنوں کا مقصد بھی مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب اور مغربی رجحانات پر آمادہ کرنا تھا۔ غرض مختلف گوشوں سے، مختلف فرقے کے مفکرین نے قوم کو ترقی پسندانہ افکار و نظریات اور مغربی ثقافت سے متعارف کرانے کے لیے مختلف

وسائل کا سہارا لیا۔

ملک آزاد ہوا۔ آزاد ہندوستان نے آزادی کی چھاؤں تلے علوم و فنون پر بھرپور توجہ دی۔ آج وہ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کج کلاہی شان سے شامل ہو چکا ہے۔ اس نے نہ صرف ادب (رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۱۳ء) اور امن (مدر ٹریسا و اگنیس ۱۹۷۹ء) کے میدان میں نوبل پرائز حاصل کیا ہے بلکہ ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن (طبعیات میں، شعاعوں کے اثرات کے متعلق ۱۹۳۰ء)، ڈاکٹر ہرگوبند سنگھ کھورانہ (موروثی سائنس (جینٹکس) ۱۹۶۸ء) اور ڈاکٹر سبرامینین چندر شیکھر (ایسٹرو فزکس میں، ستاروں کے ریاضیاتی طرز عمل پر ۱۹۸۳ء) نے سائنسی علوم پر یہ عظیم انعام حاصل کر کے ہندوستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

آزادی سے قبل بنگلور سائنس اکیڈمی (۱۹۳۴ء) اور سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی۔ ایس۔ آئی۔ آر ۱۹۴۲ء) کا قیام عمل میں آچکا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ملک تیزی سے سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف گامزن ہوا ہے۔ کئی اہم سائنسی مراکز قائم ہوئے ہیں اور ملک کی متعدد نیشنل لیبارٹریز میں تحقیقات ہو رہی ہیں۔ تارا پور (مہاراشٹر ۱۹۶۹ء) میں نیوکلیئر پاور اسٹیشن کے قیام کے بعد ملک میں چار اور نئے پاور اسٹیشن (راجستھان اٹامک پاور اسٹیشن، کوٹہ، اندرا گاندھی اٹامک پاور کلپاکم (مدارس)، نرورا۔ اے۔ پی۔ (بلند شہر) اور کاکراپارا اے۔ پی۔ (گجرات) تقریباً تعمیر ہو چکے ہیں۔ ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو پوکھرن (راجستھان) میں ہوئے نیوکلیائی تجربے میں مہارت اور اس کے پُرامن استعمال میں کامیابی حاصل کر کے ہندوستان نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے ہمارے سائنس داں انرجی پرابلم کے مدّنظر کچھ خاص اور اہم نیوکلیائی آلات بنا رہے ہیں۔ انٹارکٹکا (بحر منجمد) کی مہم پر بھیجے گئے تحقیقی بیڑول نے بحری ترقیات میں نئے افق تلاش کیے ہیں۔ یہ برفانی براعظم تقریباً ساٹھ کھرب ٹن کرل مچھلیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے علاوہ برف کی دبیز تہوں میں یورینیم، سونا، چاندی، جست، لوہا، بریلیم، میگنیشیم، فاسفورس اور کوبالٹ وغیرہ کے ذخائر بھی موجود ہیں۔ فروری ۱۹۸۱ء میں۔ این۔ آئی۔ او۔ کے تحقیقی جہاز "گویشنی" نے بحر ہند میں ناڈیولس (Nodules) تلاش کر کے معدنیات کے خزانے میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ ایک ملین ٹن ناڈیولس سے پندرہ ہزار ٹن نکل، بارہ ہزار ٹن تانبہ، ساٹھ ہزار ٹن میگنیز کے علاوہ دوسری مختلف دھاتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تیل کی تلاش و حصول، کاشت و ادویات اور پہاڑوں کی سینہ شگافی سے لے کر سمندر کی اندرونی تہوں کی چھان بین میں ہمارے سائنس داں برسر عمل ہیں۔ وہ تلاش و جستجو اور ایجاد و اختراع میں نمایاں ہو کر مدغم و ممتاز ہوتے جا رہے ہیں۔ جوہری و شمسی توانائی، برقیات اور کمپیوٹرز کے شعبوں نے گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ جدید ترین توپیں، ٹینک، فائٹر جہاز، میزائل اور گولہ بارود اب وافر مقدار میں تیار ہونے لگا ہے۔ ریڈیو آئسوٹوپ تیار کر لیا گیا ہے، تصویری پلیٹ کی جگہ سادے کاغذ پر بھی ایکسرے لینے کے طریقے کی ایجاد نے تہلکہ مچا دیا ہے۔ چنڈی گڑھ کے سائنس دانوں نے ایکسرے کی تصویر کو چھ ہزار گنا بڑا کر کے منعکس کرنے والا آلہ تیار کر لیا ہے جس کی بدولت نہ صرف مریض خطرناک شعاعوں سے محفوظ رہتا ہے بلکہ اس کا فوٹو مختلف زاویوں سے ٹیلی ویژن پر روشن ہو کر دوسروں کی نظروں میں بھی آجاتا ہے۔ مواصلاتی نظام، موسمی دریافت ٹیلی ویژن اور دوسرے ٹیلی کمیونیکیشنز میں بھی نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔ مہنگے سیمنٹ کی جگہ بھوسی سے سستا اور پائدار سیمنٹ تیار کر لیا گیا ہے ریشوں پر پلاسٹک چڑھانے کی وائنڈنگ مشین تیار کر لی گئی ہے بنگلور کے سائنس دانوں نے دنیا کا پہلا برتھ کنٹرول ٹیکہ بنا لیا ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب سے بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ سرجری، لیزر سرجری اور ریڈیائی تابکاری کے توسط سے موذی و مہلک امراض کو دور کرنے میں ہمارا ملک قابل داد پیش رفت کرتا جا رہا ہے۔

خلائی سفر میں ہم ستاروں پر کمند ڈال چکے ہیں۔ ہمارا پہلا مصنوعی سیارچہ (آریہ بھٹ) ۱۹ر اپریل ۱۹۷۵ء کو سوویت انٹر کاسماس راکٹ کے ذریعے فضائے بسیط کے عرض و طول میں بھیجا جا چکا ہے۔ دوسرا مصنوعی سیارچہ (بھاسکر) ۷ر جون ۱۹۷۹ء کو خلا میں چھوڑا گیا جس کو مارچ ۱۹۸۱ء میں بند کر دیا گیا۔ روہنی مصنوعی سیارچہ ۱۸ر جولائی ۱۹۸۰ء کو، ایپل سیارچہ ۱۹ر جون ۱۹۸۱ء کو اور آر۔ ایس ڈی ٹو ۱۷ر اپریل ۱۹۸۳ء کو خلائی مدار میں اتارے گئے۔ انسیٹ سیریز میں ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ [illegible]

کو خلا میں نصب کیا گیا مگر کچھ تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے اُسے ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۲ء کو بے مقصد قرار دے دیا گیا۔ اس منصوبے کی ناکامی نے ہندوستانی سائنس دانوں کو بد دل کرنے کے بجائے ایک نئے عزم سے ہم کنار کیا اور انہوں نے جلد ہی انسیٹ ون، بی منصوبے کا اعلان کر دیا۔ یہ مصنوعی سیارچہ ۳۰ر اگست ۱۹۸۳ء کو امریکی خلائی گاڑی کے ذریعے چھوڑا گیا۔ انسیٹ ون، بی کی تسلی بخش کارکردگی کے تحت حکومت ہند نے ۱۱ر فروری ۱۹۸۴ء کو اسے قوم کے نام وقف کر دیا۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کے پہلے خلائی مسافر راکیش شرما کے آٹھ دن کے کامیاب خلائی سفر کے بعد خلائی تحقیق ادارہ جلد ہی دوسرے خلائی مسافر کو بھیجنے والا ہے۔ امریکی ایجنسی "ناسا" کی پیش کش کے مطابق انسیٹ ون، سی میں خلائی سائنس دان کو روانہ کرنے کا ارادہ تھا مگر ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کو امریکی شٹل چیلنجر کے بیچ فضا میں پھٹ جانے کی وجہ سے انسیٹ ون، سی کی تکمیل کو ملتوی کرنا پڑا۔ اب ہمارے سائنس داں انسیٹ ون، ڈی کی تیاری میں مصروف ہیں جو ۱۹۸۹ء میں نئی آن بان کے ساتھ خلائی حد تک میں داخل ہوگا۔ مصنوعی سیارچوں کی بدولت تین ہزار میل چوڑے اور ڈھائی ہزار میل لمبے ملک کو ایک دھاگے میں پرو دیا گیا ہے۔ اب ہم ملک کے دور دراز علاقوں سے فی الفور رابطہ قایم کر سکتے ہیں، من پسند پروگراموں کو گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ان سیارچوں کا دائرہ کار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ قدرتی آفات سے باخبر کرتے ہیں، موسم کی پیش گوئی کرتے ہیں، بحری، برّی اور فضائی اطلاعات دیتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے کام آتے ہیں اور مواصلاتی نظام کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مذکورہ تجربات اور سائنسی فروغ میں ملک کا سب سے بڑا اقلیتی فرقہ بے توجہی کا شکار رہا ہے۔ ترقی کی دوڑ میں مسلمان تعلیمی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے پسماندہ ہیں اور احساس پسماندگی نے انہیں عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک طرف مذہبی اقدار کا تحفظ تو دوسری طرف سائنس کے بڑھتے ہوئے قدم اسے تذبذب کی کیفیت میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ تقلید پسندی اور توہم پرستی نے ملت کے ایک بڑے حصے کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ اگر دینی تعلیم کی جانب سے غفلت برتی تو مذہب ہاتھ سے چلا جائے گا اور اگر جدید علوم و فنون میں کوتاہی ہوئی تو دنیو[illegible] اعتبار سے پستی اور ذلت نصیب ہوگی۔ ہمارے سنجیدہ رہبرو[illegible] فرض ہے کہ وہ اس کشمکش و پیچ کے ماحول کو دور کرتے ہوئے مذ[illegible] نظریوں کے مابین ایک توازن برقرار کریں اور علم کے کارواں کو با[illegible] طور پر آگے بڑھانے کے لیے سر سید کے تعلیمی نقطۂ نظر کو یاد دلائیں جب

> "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس
> ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا تاج
> ہمارے سر پر ہوگا"

تو ہم ترقی کے ہر میدان میں کامیاب ہوں گے۔

نت نئے سائنسی تجربات سے بے خبری، تنگ نظری اور معا[illegible] بدحالی مسلمانوں کی پستی کے خاص اسباب ہیں۔ اعداد و شمار کے مط[illegible] اُن کی آبادی کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل حصہ میں[illegible] شامل ہیں جنہوں نے معاشی مشکلات سے گھبرا کر تعلیم سے کنارہ کشی اخ[illegible] کر لی ہے یا پھر وہ جنہوں نے اپنی تمام تر توجہ مذہبی تعلیم پر مذکور کر رکھ[illegible] اسی طرح دوسرے حصے کے بھی دو گروہ بنتے ہیں۔ ایک وہ جو تعلی[illegible] کو محض معاش کا ذریعہ سمجھ کر عمل پیرا ہے جب کہ دوسرا جدید علوم و فن[illegible] کے حصول و فروغ میں لگا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا آخر الذکر طبقہ تنا[illegible] کے اعتبار سے بہت ہی مختصر سا ہے جن میں نمایاں نام ڈاکٹر سید حبی[illegible] ظہیر، پروفیسر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر سید ظہور قاسم، ڈاکٹر عبد[illegible] صدیقی، پروفیسر اے۔ رحمٰن، پروفیسر ابرار مصطفیٰ، پروفیسر وح[illegible] الدین ملک، پروفیسر صالح محمد اللہ دین، پروفیسر محسن قریشی، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر ایم۔ ایم تقی خاں، پروفیسر صلاح الد[illegible] پروفیسر مہدی حسن، پروفیسر نسیم انصاری، پروفیسر ایس۔ ایف۔ ج[illegible] پروفیسر ایچ۔ سید علی، پروفیسر محمد ولی الدین، پروفیسر فضل الرحمٰ[illegible] پروفیسر اسرار احمد، ڈاکٹر احسن نعیم صدیقی، ڈاکٹر حبیب الرحمان قدوا[illegible] ڈاکٹر جلیل الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر سید محمد ابراہیم، ڈاکٹر محمد شعیب[illegible] ڈاکٹر رضا الحق، ڈاکٹر حمزہ پارڈی والا، ڈاکٹر احسان اللہ خاں[illegible] ڈاکٹر احمد فاروقی، ڈاکٹر عبد الجلیل، ڈاکٹر محمد علی، ڈاکٹر عابد حسین[illegible]

ڈاکٹر مظفر احمد، ایس. ایچ. ہاشمی اور محمد مسلم وغیرہ کے ہیں مگر یہ تعداد اکثریتی فرقے کے سائنس والوں کے شمار میں تقریباً صفر کے برابر ہے۔

آج ہندوستان سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں چین، جاپان اور اسرائیل کے ہم پلّہ ہونے کے قریب ہے، لیکن امریکہ، روس، برطانیہ فرانس اور مغربی جرمنی کی صف میں شریک ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اکثریتی فرقہ بارہ کروڑ مسلمانوں کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دے۔ انہیں نیک نیتی کے ساتھ دوش بدوش لے کر چلے کیوں کہ جب تک ملک کی یہ سب سے بڑی اقلیت ان کے ساتھ سر جوڑ کر، قدم سے قدم ملا کر رواں دواں نہ ہوگی اس وقت تک ایک نئے ہندوستان کی تشکیل ممکن نہ ہوگی۔

حکومت کی حق تلفی کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرہ اپنی کمیوں، خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے بھی دن بدن بچھڑتا جا رہا ہے۔ اس کی درماندگی میں مذہبی گروہ بندی اور صحیح قیادت کا فقدان بھی شریک ہے۔ وہ غیر صحت مند رسومات کی اندھی تقلید میں نئے نئے فرقوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے۔ شیعہ سُنّی، بریلوی دیوبندی، عمل ردِّ عمل کی ضد میں پڑ کر وہ نہ جانے کتنے خانوں میں بٹ چکا ہے۔ باشعور مسلم قائدین کا فرض ہے کہ وہ ملّت کو اس نفاق سے محفوظ رکھتے ہوئے فرقہ بندی اور ذات برادری کے مہلک مرض سے نجات دلائیں۔ روایت پرستی نے علم کی جانب سے جو لاعلمی اور بے تعلقی پیدا کر دی ہے، اُسے دور کریں۔ بقول سرسید احمد خاں:

"ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو اُن کے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے، وہ اور ہیں ——— ان میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعالِ مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں، حالاں کہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔"

سرسیّد کے سنہری خواب کی تعبیر ملک کی عظمت اور مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے لیے ہمیں سب سے پہلے توہم پرستی کا خاتمہ کرنا ہوگا، صدیوں سے طاری جمود کو توڑنا ہوگا، اسے تن آسانی اور سہل پسندی سے نجات دلانا ہوگا۔ انسانی فلاح کے نظریے کو اجاگر کرتے ہوئے ملّت میں سائنسی علوم کے فروغ پر زور دینا ہوگا۔ ان میں پیدا تشکیک اور بے یقینی کے احساس کو ختم کرتے ہوئے عزم و یقین پیدا کرنا ہوگا۔ محض جذباتی رویہ اختیار کرنے والی تقریروں اور تحریروں کی جگہ تخلیقی طرز فکر کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ کیوں کہ موجودہ زندگی میں سائنسی رویہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بقول جواہر لال نہرو:

"مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور اُن کے جو سائنس کے دوست ہیں۔"

تم اپنا وقت ایسے لوگوں کی صحبت میں ضایع نہ کرو جن کی معلومات تمہاری معلومات سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ تم پر فرض ہے کہ اپنی عقل سے کام لو مگر نہ ایسی حقیر باتوں میں کہ تمہارا فیشن کیا ہونا چاہیے۔ تمہارا لباس کس رنگ اور کس وضع کا ہو، تمہارے ملاقات کے کمرے کا فرنیچر کیسا ہو۔

(مولوی وحید الدین سلیم

انسان اور حیوان کا فرق

محمد عمران قریشی

مادی کائنات کے محکم نظام پر غور و فکر کرنے سے مظاہر فطرت کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ آفاقی کائنات کی ہر چیز اپنے مخصوص مقام پر مقررہ قوانین فطرت کے عین مطابق سرگرم عمل ہے۔ یہاں ایک اٹل اور ناقابل شکست قانون کارفرما ہے جس سے کوئی چیز سرمو انحراف یا تجاوز نہیں کر سکتی۔ کائناتی نظام میں جن اٹل اصولوں کی حکمرانی قائم ہے، انھیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے جو خدا تعالٰے کے مقرر کردہ ہیں۔ گویا کہ مادی کائنات کی ہر چیز احکام خداوندی کی اطاعت اور قوانین فطرت کی فرمانبرداری میں بے چوں و چرا منہمک ہیں۔ ان کا سر تسلیم مزاج یار کے آگے خم ہے۔ یہی مفہوم ہے قرآن کریم کی اس آیت کا

لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

(زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالٰے کے آگے ہر وقت سربسجود رہتا ہے)

بہر حال یہ تو حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر چیز احکام الٰہیہ اور قوانین فطرت کے مطابق کام کر رہی ہے۔ لیکن یہ اطاعت اور انقیاد سراسر لاشعوری طور پر ہو رہا ہے۔ کیونکہ مادی کائنات میں کوئی شئی عقل و شعور اور اختیار و ارادہ کی مالک نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہے کہ قوانین الٰہیہ کے مطابق عمل کرے وہ ان سے بغاوت اور سرکشی کرنے کا شعور بھی نہیں رکھتی۔ یہ اس کی جبلت Instincts میں ہے۔ گویا کہ یہ اطاعت و فرمانبرداری محض جبلی طور پر ہو رہی ہے۔

جبلت کا ظہور بھی حرکت سے وابستہ ہے۔ جمادات میں حرکت نہیں ہے۔ اس لیے یہ جبلت کے ادنٰی مقام پر ہیں۔ نباتات میں حرکت موجود ہے جس کو نمو کہا جاتا ہے۔ یعنی نشو و نما۔ وہ نیچے سے اوپر بڑھتے ہیں اور اپنے حجم میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ جبلت میں جمادات سے آگے ہیں۔ حیوانات میں نقل مکانی یعنی حرکت موجود ہے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے کی طاقت ان میں موجود ہے۔ زندگی کے بنیادی تقاضے بھوک، پیاس، غیض و غضب، رنج و غم اور شہوت وغیرہ ان میں موجود ہیں۔ ان میں احساس بھی موجود ہے لیکن ادراک اور شعور سے عاری ہیں۔ وہ بھوک پیاس اور شہوت کا احساس تو کر لیتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ان کا احساس صرف وجدان تک ہے۔ وہ کھاتے پیتے، سوتے، جاگتے اور اولاد پیدا کرتے ہیں، ان کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان میں تعقل و ادراک یعنی نفسِ ناطقہ نہیں ہے۔ یہ نفسِ ناطقہ انسان کے پاس ہے۔ اسی لیے انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے۔ پس حیوانات کی حدود تک سب کچھ جبلی اور وجدانی طور پر ہو رہا ہے جو بالکل اضطراری کیفیت ہے۔ یعنی طوعاً و کرہاً۔ لہٰذا ان کا نظام بالکل بطریق احسن اور بغیر کسی خرابی یا فساد کے چل رہا ہے۔ قانون قدرت کے مطابق بکری کا بچہ جبلی طور پر گھاس کھاتا ہے۔ شیر کا بچہ گوشت کی طرف لپکتا ہے۔ اس قانون کو توڑنے یا اس سے سرکشی اختیار کرنے کا ان میں شعور اور ملکہ ہی نہیں ہے۔ اسی قانون کا نام سنت الٰہی ہے اور یہی وہ سنت الٰہی ہے کہ

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔

(اللہ تعالٰی کی سنت اور طریقہ کار کبھی تبدیل نہیں ہوتا)

علامہ اقبالؒ نے اسی لیے قرآنی احکام کے مطابق فطرت کا مطالعہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

اب ذرا حضرت انسان کو دیکھیے۔ یہ جب ایک نرم و نازک اور ضعیف و ناتواں بچے کی صورت میں اس بزم امکان میں تشریف لاتے ہیں تو جبلی تقاضوں یعنی بھوک، پیاس اور نیند وغیرہ کو ساتھ لاتے ہیں ان کو وجدان بھی مرحمت ہوتا ہے جس کے مطابق وہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود ماں کے دودھ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حصول غذا کے لیے کسی تربیت کی ان کو ضرورت نہیں ہوتی۔ گویا کہ زندگی کے فطری تقاضوں کے لیے ان کی جبلت اور وجدان ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مصیبت بھی ہے حضرت انسان ادراک و شعور کی طاقت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ لہذا دودھ یا غذا نہ ملنے کی صورت میں رو رو کر قیامت برپا کر دیتے ہیں اور جب خوش ہوجاتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ ایک فلاسفر نے انسان اور حیوان میں یہ امتیاز کیا ہے کہ حیوان رونے اور ہنسنے کی طاقت سے محروم ہیں۔

بہرحال جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ یہ شعور و ادراک بھی بڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اختیار و ارادہ کی وہ قوتِ خداوندی جو خدا نے حضرت انسان کو عطا کی ہے ان کے احساس و شعور اور ادراک کا امتحان بن جاتی ہے۔ قلب انسانی جو جذبات کی آماجگاہ ہے، اس کے لیے عقل انسانی اسباب و ذرائع مہیا کرتی ہے۔ لیکن عقل انسانی کا فریضہ انسان کے ذاتی مفادات اور منفعت کی نگہداشت کرنا ہے لہذا ہر انسان کی عقل صرف اسی کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ بچہ لینا تو جانتا ہے لیکن دینا نہیں جانتا کوئی بھی چیز خواہ وہ اس کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو اس کے چھن جانے پر وہ روتا چلاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے شیر خوار بچے کو بالکل صحیح کہا تھا ؎

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مگر نامہرباں سمجھا ہے تو

انسانی بچہ امتیاز نیک و بد نہیں کر سکتا، بلکہ تجربات سے سیکھتا ہے پہلے کوئلہ کی آگ سے ہاتھ جلاتا ہے، اس کے بعد وہ آگ سے اجتناب کرنا سیکھتا ہے۔ اگر اس تجربے سے پیشتر اس کو روکا جائے تو مچل جاتا ہے۔ یہ عقل انسانی کا خاصہ ہے

قدرت نے بچے کی حفاظت کے لیے والدین کو مقرر کر دیا۔ والدین کی الفت بچے کی ہر مقام پر نگہداشت کرتی ہے۔

یہی انسانی بچہ جب قوانینِ فطرت کے مطابق نشوونما پاکر جسمانی طور پر بالغ ہو جائے لیکن اس کی عقل کی نشوونما اخلاقی تعلیم اور روحانی تزکیہ کی غذا سے نہ کی جائے تو وہ نوعِ انسانی کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوتا ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس کو ملائکہ نے تخلیقِ آدم میں سمجھ لیا تھا اور خداوند تعالےٰ سے عرض کی تھی کہ یہ انسان خلافتِ ارضی سے کس طرح شرف یاب ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ اپنی خلقت کے پیشِ نظر زمین پر فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ ملائکہ کو اب تک اس امر کا علم نہ تھا کہ مشیتِ ایزدی عقلِ انسانی کی رشد و ہدایت اور وجدانی لغزشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی طرف سے بذریعہ وحی تعلیم دینے کا بھی انتظام کر چکی ہے۔ احسن الخالقین نے احسن تقویم پر پیدا شدہ انسان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

(اے نسلِ انسان تمہاری راہنمائی کے لیے میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی پس جس نے میری ہدایت پر عمل کیا اس کو کسی قسم کا غم یا خوف نہیں ہوگا)

لیکن اس کے برعکس:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(جن افراد نے میرے احکام و قوانین سے کفر و سرکشی کی روش اختیار کی اور ان کو جھٹلایا تو وہ یقیناً آگ میں جلیں گے اور اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے)

انسانوں کی دنیا میں یہ وحی برگزیدہ انسانوں (رسولوں) کی معرفت ملتی رہی اور اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہوتا تو پھر وہ اشرف المخلوقات نہ ہو سکتا۔ اس کا تمام شرف یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے قوانین الہیّہ پر عمل کرے۔ اسے سَمِیۡعٌ و بَصِیۡر بنا کر قلب و دماغ بنا کر عطا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کو اختیار و ارادہ کا مالک بنا دیا گیا۔

اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا

(ہم نے شکرانِ نعمت اور کفرانِ نعمت کے دونوں راستے اس پر واضح کر دیے کہ جو چاہے اختیار کرے)۔

عقل انسانی کو وجدانی غلطیوں سے محفوظ رکھنے کا قدرتی نظام وحی خداوندی کہلاتا ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں نبوت کہتے ہیں۔ یہ وحی خداوندی ہر دور کے انسانوں کو ملتی رہی۔ جس نے مانا کامیاب ہو گیا جس نے کفر کیا برباد ہو گیا۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَا وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا۔ یہ وحی خداوندی اپنی آخری اور مکمل شکل میں آخری دفعہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی شکل میں نوع انسانی کو عطا کر دی گئی اور رسولؐ نے اپنے عمل سے اس کا عملی نتیجہ بھی ظاہر کر دیا۔

اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عصرِ حاضر میں نوع انسانی کی ہدایت کے لیے اگر کوئی مکمل ضابطۂ حیات ہے تو وہ صرف قرآن مجید ہے اور اس کا عملی نمونہ سنتِ رسولؐ۔ احکامِ الہیٰ کی کماحقہٗ اطاعت اور سنتِ رسول کی پیروی 'اسلام' ہے جو دین فطرت ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

تو اگر خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

[اے مسلمان! اگر تو زندہ رہنا چاہے تو قرآن کے بغیر زندگی حاصل کرنا ناممکن ہے]۔

گویا کہ اب قرآنی ارشادات کی تعمیل اور سنتِ رسول کا اتباع درحقیقت زندگی کا بہترین راستہ ہے اور یہی مشکل ہے یہ کیوں ضروری ہے اور اس سے کیا اثر ہوتا ہے یہ ایک طویل بحث ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ وحی کی تعلیم عقل انسانی کو دوسروں کا خادم بنا دیتی ہے۔ جسم کی نشو و نما "لینے" سے ہوتی ہے اور شخصیت انسان کی نشو و نما یعنی اخلاق کا حسن 'دینے' اور 'عطا' کرنے سے ہے قرآن ہمیں دوسروں کا فائدہ ملحوظ خاطر رکھنا سکھاتا ہے۔ خود غرضی سے دور رکھتا ہے۔ وہ انسانیت سے محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ نفرت نہیں سکھاتا اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے انسان خود غرضی اور محبت سے عاری رہتا ہے۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
"حسد سے بچو، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو ہڑپ کر جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو نگل جاتی ہے۔"

تدریس کے تقاضے

عبدالرحمن خان — ترجمہ — محمد سالم قدوائی

آج کل ہر سمت نئی تعلیمی پالیسی پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے، لیکن اس پر عمومی بات چیت بہت کم ہوتی ہے کہ تعلیم کس طرح سے دی جائے، جب کہ تعلیمی پالیسی لاگو کرنے کا یہی سب سے اہم ذریعہ ہے۔ سوسائٹی میں استاد اور اس کا کردار مختلف النوع حیثیت رکھتے ہیں، وہ قوم کا معمار اور اپنے شاگردوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کی ترغیب دینے والا، ان کے ذہنوں میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے والا اور ان میں پوری ذمہ داری اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ جس چیز کے بارے میں بالکل نہیں سوچا جاتا وہ یہی روح اور اس کے فرائض ہیں، جن کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تعلیم پر تو پورا زور صرف کیا جا رہا ہے، لیکن اچھی تعلیم دینے کے آرٹ کو ابھی تک بڑھاوا نہیں ملا ہے۔

ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ ایک اچھے استاد میں کون سی بنیادی خوبیاں ہونی چاہییں۔ اس کا خود علم حاصل کرنا، علم کا اپنے اندر پیدا کرنا، علم کو دوسروں میں تقسیم کرنا اور تعلیم دینے کا مقصد، ان تمام باتوں کے مجموعے کا نام استاد ہے۔ یہی وہ شخصیت ہے جو تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

ایک استاد کو اپنے مقام تک پہنچنے کے لیے تقریباً بیس سال لگتے ہیں، اس کی ڈگریاں، سرٹیفکٹ اور مضمون سے دلچسپی اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ وہ سیکھنے کے دور سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے اور اب اپنے آپ کو تعلیمی پیشہ اختیار کرنے کے قابل سمجھتا ہے لیکن اپنے اس یقین کو ثابت کرنے کے لیے اسے ایک انتخابی طریقہ کار سے گزرنا پڑتا ہے، انتخاب کا یہ طریقہ مثبت نہیں ہوتا ہے یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے، کیوں کہ علم کا حصول اس حد پر ختم نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں انتخاب کا طریقہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں علم کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ مغربی ممالک میں انتخابی طریقۂ کار ایسا ہوتا ہے جس میں علم کی وسعت کو پوری طرح سے جانچا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت ان اداروں میں جو بنیادی طور پر تعلیمی ہیں ان اداروں کے مقابلے میں جو ریسرچ سے تعلق رکھتے ہیں پوری طرح سے مختلف ہوتی ہے۔

ہمارے معاملے میں کسی قسم کا مناسب Feed back طریقہ کار اب تک تیار نہیں ہو سکا ہے، طلباء کو پرکھنے کا اختیار دیا جانا اب تک محض خواب کی سی بات ہے۔ مقصد کا فقدان، سزا پانے کا خوف اور بہت سے دوسرے سماجی اور نفسیاتی پہلو ایک اچھے اور قابل اعتماد طریقۂ انتخاب کو رائج کرنے میں مانع ہوتے ہیں جو انتخاب کے وقت ایک اچھے استاد کا انتخاب کرنے میں استعمال ہو سکے۔ یہاں تک کہ جب ایک استاد پروموشن کے لیے جاتا ہے تو وہاں بھی اس کے تحقیقی کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی معلمانہ صلاحیتوں کو تقریباً نظر انداز کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک استاد اپنے کیریر کو بنانے کے چکر میں اپنے اصل کام یعنی تعلیم دینے اور علم کو پھیلانے کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس قسم کے رجحانات کا نتیجہ کیا نکلے گا یہ سب کے لیے غور کرنے کی بات ہے۔

چوں کہ تحقیق کو انتخاب کے وقت غیر ضروری طور پر اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے لیے اساتذہ زیادہ سے زیادہ مطبوعہ کام پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے قطع نظر کہ اس کی حیثیت کیا ہے، چونکہ علم کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے اس لیے ایک خاص مضمون میں مطالعہ کا دور بھی بڑھ گیا ہے۔ اس لیے کسی بھی شخص کے مطبوعہ کام کی افادیت پر تبصرہ کرنا اور پرکھنا دوسرے کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

ریسرچ کے سلسلے میں جو اخراجات ہو رہے ہیں وہ بھی ایک بحث طلب موضوع ہے۔ ہمارے قومی حالات اور محدود ذرائع کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ریسرچ کے سلسلے میں کئے گئے کروڑوں روپیوں کے اخراجات کی افادیت پر بھی نظر ڈالی جائے۔

چوتھی خصوصیت جس کی ایک استاد سے توقع کی جاتی ہے وہ طالب علم کو بامقصد تعلیم کی طرف آمادہ کرنا ہے چونکہ استاد کی حیثیت ایک معمار قوم کی ہوتی ہے اس لیے یہ پہلو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے طالب علم کو تحصیل علم کی طرف مائل کرنے کی صلاحیت استاد کی وہ خوبی ہے جسے ہمارے بزرگ بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے لیکن ہمارے سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات کے تحت یہ خوبی بالکل مفقود ہو گئی ہے اور شاید یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے اہم اقدار رکھنے والے سماج کو پوری طرح سے الٹ پلٹ دیا ہے۔

اس قسم کی خوبی کسی استاد میں بھری نہیں جا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو نہ صرف راستہ دکھائے گا بلکہ اس کو اس راستے پر چلائے گا بھی۔ یہ دونوں باتیں نہ تو اتنی آسان ہیں کہ وہ ہر استاد میں موجود ہوں اور نہ ہی ان لوگوں کو بلایا جا سکتا ہے

یقیناً کوئی بھی یہ بات نہیں بھول سکتا ہے کہ آج کے دور کا استاد بھی اسی زمانے کی پیداوار ہے لیکن اس کے باوجود اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو پھر کیا ہو؟ غالباً اس کا بھی جواب ہمارے تقرر کے طریقۂ انتخاب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں داخل ہونے کے لیے فطری میلان کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن تعلیم کے میدان میں آنے کے لیے اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا جاتا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایسے اساتذہ ملتے ہیں جو پڑھانے کے پیشے کے علاوہ ہر دوسرے پیشے میں پوری طرح فٹ ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں معلمی کا پیشہ بڑی حد تک پسند کے بجائے مجبوراً قبول کیا جانے والا پیشہ بن گیا ہے۔ اس بات سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس پیشے میں کیا خرابی ہے؟

ملازمت کی شرائط غیر پسندیدہ ہیں، حکومت کا تعاون اور ترغیب برابر کم ہوتی جا رہی ہے (اس کا اندازہ ہمارے سالانہ بجٹ کے تعلیمی تخمینوں سے کیا جا سکتا ہے) پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کو پورے بجٹ کا ۶ء۴ فیصد حصہ ملا تھا، اب ساتویں پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے صرف ۴ء۲ فیصد رقم مخصوص کی گئی ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ہم کتنی اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم اس کے لیے کیا قیمتی سرمایہ خرچ کرتے ہیں۔

قومی مفاد کی خاطر تعلیمی پیشے کے معیار کو اونچا کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی آگے بڑھنے والی تعلیمی پالیسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی موثر طریقہ کار کو بھی اپنانا ہوگا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم معلم کو صحیح معنوں میں معلم سمجھیں اور اس کے حالات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے پیشوں کی طرح تعلیم کا پیشہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے، لیکن عام طور سے دوسرے پیشوں کے مقابلے میں اسے فخر کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کا فخر محض خودداری اور عزتِ نفس تھی، لیکن ترقی پذیر صنعتی سماج کے مادی وسائل نے ہماری اخلاقی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ استاد جو سماج کا ایک معزز فرد مانا جاتا تھا اب اس کی حیثیت بہت گر گئی ہے۔ اگر اس پیشے کی پرانی قدروں کو نہ بچایا گیا تو یہ محض صنعتی اداروں کی شکلوں میں باقی رہ جائے گی جہاں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں میکانیکی انداز پر تقسیم ہوتی رہیں گی جن کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔

ایک حالیہ سروے جو مختلف پیشوں کے درجات کے تعین کے لیے ایک مرکزی یونیورسٹی کے پانچ سو انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طالب علموں نے کیا تھا۔ اس میں معلم کا درجہ توقع کے خلاف بہت نیچے تھا۔ اس سروے میں بیس پیشوں کا انتخاب کیا گیا تھا جو آئی۔ اے۔ ایس سے بینکر تک تھے۔ اس میں معلم کا پیشہ آٹھویں نمبر پر آیا تھا، جو پولیس سروس، منصفی، انجینئر وغیرہ کے بعد تھا۔ سوسائٹی میں اتنے نیچے معیار پر ہونے کے باوجود کیا یہ پیشہ اپنے آپ سے انصاف کر سکتا ہے؟

خدا کی یاد سے غافل قلب کی مثال
ایسی ہے جیسے [illegible]
[illegible]

مُسلمانوں کا جذبۂ خدمت

چند مہینے پہلے کی بات ہے، میں ایکسپریس ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ڈبے میں کل تین آدمی تھے جو خوب آرام سے لیٹ بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ہر شخص اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی اسٹیشن پر ٹرین رکی تو ایک پختہ عمر کا نوجوان جو پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا، ہاتھ میں کنڈ یا لیے اسی ڈبے میں سوار ہوا اور میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر خاموشی سے ایک کتاب پڑھنے لگا۔ چند ہی منٹ میں اسی اسٹیشن پر ایک کوڑھی بھکاری ہمارے ڈبے میں داخل ہوا اور ایک سیٹ کے نیچے گردن جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ اسے دیکھتے ہی کتاب پڑھنے والا شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھکاری کے قریب، سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس سے سیٹ کے اوپر بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اُس کے لیے بھکاری کسی طرح راضی نہ ہوا اور اپنے بے انگلیوں کے ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔ اُس سے شاید اُسے یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ کوڑھی ہے، سیٹ پر کس طرح بیٹھ سکتا ہے۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو خدا کی دی ہوئی بیماری ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا چاہے تو تم تندرست ہو سکتے ہو اور تندرست لوگوں کو یہ بیماری لگ سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تندرست لوگوں کو تم سے نفرت کرنا یا تم سے بچنے کی کوشش کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ تم خود کو سماج کا ایسا ہی فرد سمجھو جیسا کہ میں ہوں۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ تم سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہو، جس سے ناراض ہو کر خدا نے تمہیں اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہو لیکن وہ تو بالکل تمہارے خدا کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے کسی شخص کو تم سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور گناہ تو سب ہی لوگ کرتے ہیں، پھر ایک گناہ گار دوسرے گناہ گار سے نفرت کیوں کرے"۔

بھکاری نے اس شخص کو ہمدردانہ انداز میں اپنی طرف متوجہ دیکھا تو وہ اس سے کھل کر باتیں کرنے لگا۔ بات کچھ آگے بڑھی تو اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

"بابو جی! گنگا گھاٹ پر"۔

"سمجھے ہم تو اُدھر تم لوگوں میں جاتے رہتے ہیں۔"

اس نے وہاں قیام کرنے والے کچھ لوگوں کے نام بھی بتائے اور یہ بھی بتایا کہ ایک کوڑھی کی مڑھیا میں بیٹھ کر اس نے اُسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے بھی پی تھی تو اس کا مخاطب بھکاری اس سے اور زیادہ مانوس ہو گیا اور دونوں خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ بھکاری اسے اپنی تکلیفوں اور محرومیوں کی مفصل داستان سنانے لگا اور وہ شخص اُسے تسلی دیتا رہا۔

دورانِ گفتگو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں اور حضرت کو مریضوں کا علاج کرنے اور ان کے دکھ دور کرنے سے جو دلچسپی اور شغف تھا اس کا بھی ذکر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ شخص کسی عیسائی مشن کا نمائندہ تھا اور کوڑھیوں میں بیٹھ کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنا اس کا مشن تھا۔ اس نے دورانِ گفتگو یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ عیال دار کوڑھیوں کو سمجھا بجھا کر ان کے نو عمر بچے حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں بچہ گھروں کو بھیج دیتے ہیں جہاں ان کی تعلیم و تربیت اور بڑے ہونے پر روزگار

کا معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ کوڑھیوں کے پریشان حال بچے عیسائی مشنریوں کے بچہ گھروں کو بھیجے جاتے ہیں اور وہاں انہیں عیسائی عقائد کی تعلیم دے کر اپنے سماج میں جذب کر لیا جاتا ہے۔

عیسائی مشنریوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی جن تعلیمات اور طریقوں کو بنیاد بنا کر بیماروں کے علاج معالجے کا جو منظم اور ٹھوس نظام قایم کیا ہے، اور اسے اپنے مذہب کی کارگر تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا ہے، اس سے زیادہ واضح ہدایات محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اور بہترین عملی نمونے حضور ؐ کی مقدس زندگی میں ملتے ہیں اور اسی کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان بیمار، پریشان حال، درماندہ اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو اپنے سینے سے لگاتے۔ دردمندی سے اُن کے آنسو پونچھتے اور ان کے دکھ درد دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور اس میدان میں دنیا کی ہر قوم سے منزلوں آگے ہوتے۔ دوسرے لوگ ان کے نشانات قدم سے رہبری حاصل کرتے اور ان سے یہ سبق سیکھتے کہ مجبوروں اور لاچاروں کی دل سوزی اور دردمندی سے کس طرح خدمت کی جا سکتی ہے۔

مسلمان جس دور میں ایک زندہ اور تابندہ ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے میں رنگ بھر رہے تھے اور خدمت خلق کے نئے نئے گوشے تلاش کر کے انہیں روشن کر رہے تھے۔ اُس دور میں بیماروں اور معذوروں کی دردمندی اور دل سوزی سے بامعنیٰ خدمت کرنا اُن کی فردِ عمل میں جلی عنوان کے ساتھ شامل تھا۔

مسلمانوں کی مرکزی حکومتوں۔ خلافت راشدہ، خلافتِ بنی امیہ اور خلافت عباسیہ — اور اس کے بعد علاقائی و ملکی سلطنتوں کے دور میں، حکومتوں کے دائروں میں بھی اور شخصی دائروں میں بھی اس میدان میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے گئے ہیں۔ اُس دور میں بلا تخصیص مذہب و ملت، ملک و قوم اور رنگ و نسل محض انسانوں کی خدمتوں کے لیے بڑے بڑے شفا خانے قائم کیے گئے، مریضوں کی شفقت آمیز تیمارداری اور دل دہی کے نئے نئے طریقے نکالے گئے اور علاج معالجے کو مالی فائدوں سے بلند ہو کر محض خدمت کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ مریضوں کی راحت رسانی اور خدمت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا بہترین ذریعہ قرار دے کر اُسے عبادت کا درجہ دیا گیا۔ مسلمان اطباء نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بڑے ٹھوس اور بامعنیٰ اصول و ضابطے متعین کیے اور اُن پر خوش دلی اور اخلاص سے عمل بھی کیا۔ غریبوں اور لاچاروں کے علاج معالجے کو خصوصی اہمیت دی۔ انہیں لاچاری اور ناامیدی کے غار میں گرنے سے روکا گیا۔ اسلامی اصولوں کی روشنی میں مسلم سماج نے مریضوں کی عیادت اور ان کی دل دہی کو وقت کا بہترین مصرف تصور کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔

مسلمانوں کے لیے مریضوں کی خدمت کو عبادت کا درجہ دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ خالص مذہبی دائروں میں بھی، جن کا علاج معالجے سے عملاً ذرا سا بھی تعلق نہ تھا، مریضوں کی نگرانی اور اُن کے علاج کا اہتمام کیا گیا اور بزرگوں کی خانقاہیں اور درویشوں کے تکیے بھی اس عظیم الشان خدمت سے محروم نہ رکھے گئے۔ ان حلقوں میں بعض مخصوص امراض کے لیے مؤثر دوائیں بڑے اہتمام سے تیار کر کے رکھی جاتیں اور ضرورت مندوں کو مفت تقسیم کی جاتیں تھیں اور یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہتا تھا۔

بہت سے فقیر اور درویش اس جستجو میں عمریں گزار دیتے تھے کہ انہیں کوئی ایسا نسخہ ہاتھ آ جائے جس سے مریضوں کو فائدے حاصل ہو سکیں اُن کی پُرخلوص محنتیں بارآور ہو جاتیں تو وہ لوگ ان دواؤں کو خود بھی ضرورت مندوں کو دیتے اور سخت شرائط کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اُن دواؤں کو تیار کر کے مریضوں کو تقسیم کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ اس کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہوتی تھی کہ اس کام سے ذرا سا بھی مالی فائدہ حاصل نہ کیا جائے اور اسے محض فیض رسانی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ اس قسم کی دواؤں کے اجزا عموماً مفت یا انتہائی کم قیمت میں حاصل ہو جاتے، اس لیے غریب لوگ بھی اس خدمت کو بہ خوشی قبول کر لیتے اور اسے اپنی اُخروی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

ہمارے علاقے میں کار بنکل پھوڑے کا علاج کرنے کا ایک سو فیصد کامیاب طریقہ رائج ہے۔ اُس کے لیے ایک جنگلی گھاس سے سکائی کی جاتی ہے جس کا سلسلہ کئی کئی دن جاری رہتا ہے۔ اس علاج کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک اجنبی فقیر نے اس علاقے کے کسی شخص کو اس دواء کے استعمال کی اس شرط پر اجازت دی تھی کہ وہ اس سے ذرا سا بھی مالی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا، یہاں تک کہ جس مریض کا علاج کرے گا اس کے گھر کا کھانا تو کیا پانی بھی نہیں پیئے گا۔ [illegible] سے انکار نہ کرے گا

علاج کے دوران ذرا سا بھی انقباض محسوس نہ کرے گا اور یہ علاج کرنے کی صرف ان ہی لوگوں کو اجازت دے گا جو ان شرائط کے ساتھ کام کرنے کے اہل ہوں گے چنانچہ ہمارے علاقے میں یہ طریقہ اب بھی اسی انداز پر رائج ہے اور اس سے مخلوقِ خدا کو بڑا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

خود میرے گھرانے میں تقریباً سو برس سے ایک سرمہ بنوا کر مفت تقسیم کیا جا رہا ہے جو بہت ہی کم پیسوں میں بڑی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی متعدد بیماروں میں بے حد مفید ہے۔ بیرون جات کے ضرورت مند بہت بڑی تعداد میں یہ سرمہ لے جاتے اور اس سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ اس سرمے کے بارے میں بھی یہی روایت ہے کہ کسی فقیر نے مفت تقسیم کرنے کی شرط پر اس کا نسخہ ہمارے مورث کو دیا تھا۔

مسلمانوں کے عروج اور حرکت و عمل کے دور میں مریضوں کی خدمت اور فیض رسانی کا جو اجتماعی اور انفرادی نظام قائم تھا وہ بڑی حد تک اُن سچے دین دار لوگوں کے ہاتھوں میں تھا کہ جن کی زندگیاں دین داری کا موثر نمونہ تھیں۔ وہ خود دین پر عمل کرتے اور اس کے پیغام کو بڑی حکمت اور دل سوزی سے پورے اہتمام کے ساتھ دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ اسی لیے جو لوگ اپنی ضرورتیں لے کر ان کے قریب آتے وہ ان کی زندگی کے طور طریقوں، ان کے بہترین اصولوں اور خدمتِ خلق کے سچے جذبات سے بھی متاثر ہوتے اور ان کی زندگیوں کو اس راستے پر لگانے والے دین کی عظمت ان کے دلوں میں جگہ بنا لیتی اور ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کے دائرے میں شامل ہو جاتے تھے۔

مسلمانوں کے بزرگوں نے علاج معالجے کے شعبے کو کیا سمجھا اور اس کا حق کس طرح ادا کیا، اس کی ایک جھلک دہلی کے شریفی خاندان کے اطباء کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا یہ عام طریقہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے مطب میں بلکہ دہلی کی میونسپل حدود میں کسی مریض سے فیس نہیں لیتے تھے، خواہ وہ لکھ پتی سیٹھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس رعایت کے ساتھ اُن کا یہ اصول بھی کہ کوئی مصیبت کا مارا مریض رات کے بارہ بجے بھی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اُٹھ کر اسے لازماً دیکھتے اور ضرورت ہوتی تو اس کے گھر بھی چلے جاتے تھے۔

حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اپنے خاندانی اصولوں اور فن کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے اتنی عظیم قربانی پیش کی کہ ان کا وہ عمل تاریخ کا جزو بن گیا۔ مرحوم کو قلب کا [illegible] انہوں نے سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے کی ممانعت کر دی تھی اور موصوف اپنی گھریلو سہولت کے پیش نظر بالا خانہ پر رہتے اور نیچے آنا جانا بالکل موقوف کر دیا تھا۔ اسی دوران ایک مریض شدید تکلیف میں کراہتا ہوا ان کے مطب پر آیا تو لوگوں نے اس سے کہہ دیا کہ حکیم صاحب بیمار ہیں، مطب نہیں کرتے۔ اتفاق سے حکیم صاحب نے اس کی کراہٹ سن لی اور اس کی نبض دیکھنے پر اصرار کیا اور یہ فرمایا کہ مریض کی کراہیں سننے کے بعد میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس کی نبض نہ دیکھوں۔ وہ مریض اپنے مرض کی شدت کی بنا پر سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکتا تھا لہٰذا حکیم صاحب خود ہی نیچے آ گئے اور مریض کی نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیا۔ لیکن سیڑھیاں اترنے چڑھنے سے خود ان کی حالت بگڑ گئی اور اسی عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے اور اُن کے خاندان کے دوسرے حکماء کے ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ جنہیں ظاہر کرنے کے لیے بڑا وقت درکار ہوگا۔

دہلی کے شریفی خاندان اور مسلمان طبیبوں کے دوسرے لاتعداد خاندانوں میں خدمت خلق اور انسان دوستی کے جو جذبات و احساسات تقریباً ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں وہ اسلامی اصولوں کی برکات اور بزرگوں کی زندگیوں کے عملی نمونوں کے ورثے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے بیماروں کی بے لوث خدمت کرنے کا جو حکم دیا ہے اسے مسلمانوں نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا اور اسے اپنا مقصد زندگی قرار دیا۔

لیکن افسوس کہ آج کے دور کا مسلمان ان اصولوں اور طریقوں کو چھوڑ چکا ہے جو اس کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کی توقیر اور کامرانی کے ضامن ہیں۔ دوسری قوموں کے لوگ اس انداز پر کوئی کام کرتے نظر آتے ہیں تو انہیں بڑی حیرت سے دیکھتا اور اسے عجوبہ تصور کرتا ہے وہ اپنے دین کے حقیقی تصور کا ادا شناس نہ رہنے کی وجہ سے ہر خیر و خدمت کے کام سے دست بردار ہو کر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی فکر میں الجھ کر رہ گیا ہے اور یہی اُس کی بدبختی اور ذلت و خواری کا بنیادی سبب ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶ شمارہ ۶ (جون ۸۷ء)

ایک شیخ خانقاہ نشین اور سائنسی علوم

محمد اسلم صدیقی

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ایک خانقاہ نشین شیخ طریقت اور عالم دین تھے۔ جن کی وفات کو چوتھائی صدی گزری ہے آپ کی زندگی کے بیشتر اوقات، ذکر و فکر اور طالبین حق کی تعلیم و تذکیر میں صرف ہوتے تھے۔ اس کے باوجود آپ طبعاً حقیقت پسند اور حالاتِ زمانہ سے باخبر رہتے تھے۔ چنانچہ آپ اسلامی ممالک کے لیے مادی ترقی نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی بہت ضروری سمجھتے تھے اور عام طور پر اپنی مجالس میں اور خصوصاً مجلس میں جدید تعلیم یافتہ حضرات اور فضلاء تشریف رکھتے تو اُن کو اس جانب متوجہ فرماتے رہتے تھے۔

ایک دن مئی ۱۹۵۴ء (واقع کوہ مری گھوڑا گلی) کی ایک مجلس میں عالم اسلام کے اس بارے میں بے توجہی و غفلت اور جمود کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"مسلمان اپنے اغراض میں مبتلا ہو کر کچھ ایسے سوئے ہیں کہ جاگنے کا نام نہیں لیتے۔ جس وقت یورپ جاگ اُٹھا تھا مسلمان ترک گہری نیند سو رہے تھے۔ اس (یورپ) نے ہر قسم کا سامانِ جنگ بنایا لیکن مسلمان غفلت میں پڑے رہے۔ جب تک سامان پاس نہ ہو لڑائی کس طرح لڑی جا سکتی ہے؟ مسلمانوں کی ساری سلطنتیں اسلامی بھی بن جائیں تو جنگ کے لیے ایک دن کا خرچ دینے کی بھی طاقت نہیں۔"

ایک مرتبہ فرمایا:

"اسلامی نظام، خالی باتوں سے نہیں قائم ہو سکتا، اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم و فنون سیکھنے ہوں گے۔"

پھر فرمایا:

"جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، اس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

آپ اکثر اسلامی ممالک خصوصاً حجاز کے متعلق بڑے افسوس ساتھ اظہار خیال فرمایا کرتے تھے کہ

"انھوں نے ابھی تک صنعت و حرفت اور اپنی ضروریات کو ملک ہی میں پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور ان کی دولت زیادہ تر باہر سے ضروریات زندگی کی درآمد پر صرف ہوتی ہے۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کا بیان ہے کہ:

"جنوری ۱۹۶۲ء میں چند رفقاء کے ساتھ میں نے کویت اور قطر وغیرہ کا سفر کیا۔ جب میں آپ سے اجازت اور رخصت کے لیے رائے پور حاضر ہوا تو آپ نے بڑی عنایت و محبت سے رخصت فرمایا چلتے وقت خصوصیت کے ساتھ یہ فرمایا کہ،

"اُن بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں۔ کارخانے لگائیں اور صنعتوں کو رواج دیں۔"

ہندوستانی مسلمانوں کو بھی زمین داری کے خاتمے کے بعد صنعت کو اختیار کرنے اور اپنی اولادوں کو کوئی ہنر یا صنعت سکھانے کی

ہی تاکید فرماتے تھے"۔ زمیندار طبقے کے لوگوں کو ہمیشہ مشورہ دیتے
تھے کہ:

"اپنے سرمایہ کو کسی تجارت یا صنعت میں لگاکر کمپنیاں
بنائیں۔"

بعض لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی کہ آپ جیسے شیخ طریقت
اور بظاہر دنیاوی علائق سے لاتعلق انسان کو زمانہ کے حالات اور
تقاضے، سائنسی تحقیقات اور ایٹمی ایجادات اور انکشافات سے کیا غرض و
دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن آپ کی مجلس میں شریک رہنے والے حضرات پر یہ
بخوبی واضح تھا کہ آپ ان باتوں کو کس درجہ توجہ اور انہماک سے
سنا کرتے اور ملنے والوں سے اکثر تازہ حالات اور رفتار بتلانے
کی فرمائش کیا کرتے۔ سائنس کی کھوج اور تحقیق اور معلوماتی خبروں
سے آپ کو خاص شغف تھا۔ "مصنوعی سیاروں کی زمین کے مدار
پر گردش اور چاند تک پہنچنے کی کوششوں کے متعلق ہر خبر کو وہ بہت
غور سے سنتے۔ ایٹمی آلات، میزائل، راکٹ اور نئی نئی
سائنسی ایجادات وغیرہ کے متعلق معلوماتی خبروں
کی طرف پورا دھیان دیتے۔ مختلف ایجادات اور ایٹمی سرگرمیوں کو
عالمی بھلائی کے کام میں لانے کی خبر سے وہ بہت مسرور اور مطمئن
ہوتے۔

ایک بار ارشاد فرمایا کہ،

"یہ مغربی لوگ اولوالعزمی اور ہمت کے لحاظ سے جن
ہیں جو دن رات نئے تجربات سے کھوج اور تحقیق میں
لگے رہتے ہیں اور عجیب و غریب کارہائے نمایاں
سرانجام دینے کے لیے مشکل اور جان جوکھوں مہمات
سے ذرا نہیں گھبراتے۔"

سائنس کی موجودہ تحقیق و ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے آپؒ انسان
کی چاند تک رسائی کو بعید از قیاس تصور نہیں کرتے تھے"۔ (اور
بالآخر انسان چاند تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے)۔
اجرام فلکی کی گردشیں، فاصلے، ان کے نظامات اور اس
کے بارے میں سائنس والوں کے حیرت انگیز انکشافات سے بھی
آپ کو بے حد دلچسپی تھی۔

آپ مختلف علوم اور فنی امور میں مسلمانوں کی
تعلیم و ترقی کو زمانہ کی ضرورت اور تقاضے کے مطابق لازمی خیال
کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میدان میں مسلمان کسی سے پیچھے
نہ رہیں۔" اگر کوئی آپ کی خدمت میں آکر یہ عرض کرتا کہ

بچوں کو سائنس کی تعلیم کے لیے کسی فنی ادارے میں
داخل کرنا ہے یا مزید تعلیم کے لیے کہیں باہر کے ملک
میں بھیجنے کا خیال ہے۔

تو آپ بہت مسرور ہوتے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ آپ
کچھ شعبوں میں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کو بھی ایک ضابطے کے اندر ضروری
خیال فرماتے تھے خاص کر ڈاکٹری کے پیشے کے لیے عورتوں کے علاج کی
خاطر اس تعلیم کو عورتوں کے لیے مفید خیال فرماتے تھے"۔

سطورِ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ
ثابت ہوتا ہے کہ حضرتؒ بے حد کشادہ ذہن، مفکر، بیدار مغز
اور حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں پر نظر رکھنے والے شیخ طریقت تھے
اس کے علاوہ، اس سے اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ
علمائے دین اور شیوخ طریقت، سائنسی علوم و فنون کے حصول
میں مانع اور سدِ راہ ہیں۔

[مندرجہ بالا بیشتر عبارت "سوانح حضرت
مولانا عبدالقادر رائے پوری" تالیف جناب
سید ابوالحسن علی ندوی سے شکریہ کے ساتھ
مستعار ہے۔]

"اگر تم ایک دوسرے کے ساتھ رقابت
رکھنے کے لیے مجبور ہو تو اچھی اور مرغوب
عادتوں اور خصلتوں کے سلسلے میں رقابت سے
کام لو جو عظمت اور سربلندی کا باعث ہیں"
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

جہیز — لعنت اور قانونی راحت

ایم۔ ایس۔ رحمٰن

اتر پردیش میں ۱۹۸۴ء میں ۱۸۲، ۱۹۸۵ء میں ۳۲۳ اور ۱۹۸۶ء میں ۳۸۶ جہیزی اموات ہوئیں جہیزی اموات میں یہ اضافہ ہمارے سماج میں تیزی سے بڑھ رہے جہیز کے لالچی لوگوں کی درندگی کی دردناک تصویر کھینچتا ہے خاندان کو مسرت و شادمانی دینے والی دلہن کے گجرے کی خوشبو کی جگہ جب اس کے ادھ جلے جسم کی سراندھ آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جس جسم پر لال جوڑا ہوتا تھا وہ جسم سفید کفن سے لپٹا ہو، یہ نظارہ کتنا دردبھرا ہوگا، محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دولت، ٹی۔وی، فریج اور موٹر سائیکل سے جب جہیز کے لالچی دلہن کو تولنے لگے اور مقدس آدرشوں کی دہائی دینے والا سماج خاموش تماشائی بنا رہے تو دلہن کے آنسو، چیخ اور ادھ جلے جسم ہی ملیں گے۔

اتر پردیش ہی نہیں ملک کے ہر صوبے اور مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں جہیزی موتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہریانہ میں ۱۹۸۴ء میں ۵۴، ۱۹۸۵ء میں ۹۹ اور ۱۹۸۶ء میں ۱۸۰۔ دہلی میں ۱۹۸۴ء میں ۳۰، ۱۹۸۵ء میں ۳۳ اور ۱۹۸۶ء میں ۶۴۔ مہاراشٹر میں ۱۹۸۴ء میں ۱۲۴، ۱۹۸۵ء میں ۱۳۶، ۱۹۸۶ء میں ۱۸۰۔ ۱۹۸۶ء میں راجستھان میں ۴۸۔ پنجاب میں ۵۴۔ کرناٹک میں ۵ جہیزی اموات ہوئیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اتر پردیش میں ہر ۲۲ گھنٹے میں ایک اور ہریانہ میں ہر ۴۸ گھنٹے میں ایک دلہن سفید کفن میں لپٹی نظر آتی ہے۔ ناز و نخرے سے پالی گئی لڑکی، زندگی بھر کی جمع پونجی کو شادی میں خرچ کرکے ڈولی میں بٹھائی گئی دلہن کے جنازہ یا ارتھی کو باپ جب کندھا دیتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے دور میں نہیں بلکہ قدیم وحشی دور سے گزر رہے ہیں۔ رادھا اور ممتاز کی سرزمین پر آئے دن ادھ جلا جسم ملے، حیرت ہوتی ہے، جس مقدس سرزمین پر کرشن نے سات سو اشلوکوں میں ارجن کو کائنات و حیات کا پوشیدہ راز ہو، جس مقدس سرزمین پر نند اکنی اور بھگیرتی کی روانی ہو، وہاں اس قدر لہو لہان ہوگی، یہ گمان سے بھی باہر کی بات ہے۔

رجنگل بیل سے صدائیں گونجتی ہیں کہ اب کسی کو صلیب پر نہیں چڑھایا جائے گا مگر زر پرست معاشرے کی صلیب ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ ہم کبھی اس سے بچ نہیں پاتے۔ ہم لاشوں کو دیکھتے ہیں، دو آنسو بہاتے ہیں لیکن معاشرے کی صلیب کو توڑ نہیں سکتے۔ پھر بھی ہمیں فخر ہے کہ ہم آج ہیں، تہذیب و تمدن کو جلا بخشنے والی نسل۔

پورا جہیز نہ ملنے پر دلہن کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی کہانیاں بے شمار ہیں۔ ہریانہ میں ۱۵ فیصد عورتیں، مدھیہ پردیش میں ۱۶ فیصد عورتیں، پنجاب میں ۱۷،۶ فی صد عورتیں علیحدہ زندگی گزار رہی ہیں دو ہزار سے زیادہ مقدمات دہلی کی عدالتوں میں، ۳ ہزار مقدمات ہریانہ کی مختلف عدالتوں میں اور ۷ ہزار سے زیادہ مقدمات اتر پردیش کی بڑی عدالتوں میں عدلیہ کے حکم کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں

اتنے سنگین اور اہم مسئلہ کو روکنے کے لیے سرکار نے کئی قوانین بنائے۔ عورتوں کو جہیز کی لعنتوں سے نجات دلانے کے لیے سب سے صوبۂ بہار نے پہل کی۔ بہار ریاستی قانون ساز اسمبلی نے ۱۹۵۰ء میں جہیز مخالف قانون پاس کیا۔ بہار ریاستی قانون ساز اسمبلی کا یہ قدم تاریخی قدم مانا جائے گا جس نے معاشرے میں پنپ رہی ایک نئی برائی کو روکنے اور اسے قانونی گرفت میں لینے کی پہلی کوشش کی ۸ سال بعد ۱۹۵۸ء میں آندھرا پردیش نے بھی ضرورت محسوس کی کہ صوبے میں تیزی سے بڑھ رہی جہیز کی رسم کو غیر قانونی قرار دیا جائے

[ج]س سے کہ خواتین کو اس بھیانک اور غیر انسانی رسم سے چھٹکارا ملے۔ اسی سال [ر]یاست کی قانون ساز اسمبلی نے جہیز مخالف قانون پاس کیا۔ چھ کی دہائی میں یہ وبا قومی سطح تک پھیل چکی تھی اور ملک کے مختلف گوشوں میں اس کے بُرے نتائج رونما ہونے لگے تھے۔ عوامی بہبود سے منسلک جمہوری نظام حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ قومی سطح پر ایک ٹھوس اور با اثر قدم اُٹھائے۔ اس لیے ہندوستانی پارلیمنٹ نے جہیز مخالف قانون ۱۹۶۱ء میں پاس کیا اِس قانون کے پاس ہونے پر ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ذریعے پاس کیا گیا جہیز مخالف قانون رد ہو گیا۔ بدلتے ہوئے وقت، بدلتے ہوئے نظریۂ فکر اور پیدا شدہ قانونی پیچیدگی نے قومی ایوانوں کو جہیز مخالف قانون پر بحث و غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ قومی ایوانوں نے جہیز مخالف قانون کو اور بھی با اثر اور تم آور بنانے کے لیے جہیز مخالف ترمیمی قانون ۱۹۸۵ء پاس کیا یہ ترمیم بھی مسئلہ کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اور بھی ٹھوس اور با اثر بنانے کے لیے جہیز مخالف قانون ترمیم ۱۹۸۶ء پاس کیا گیا۔ اس طرح جمہوری نظام حکومت سماج کی اس بُرائی کو دور کرنے کے لیے اور خواتین کو راحت دلانے کے لیے کافی کوشاں نظر آتی ہے جس کے نتیجے میں قومی ایوانوں میں بار بار اس مسئلے کو اٹھایا گیا لیکن افسوس صد افسوس یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

۵ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جہیز ترمیمی قانون میں جہیز کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ شادی کے وقت یا شادی کے پہلے ایک فریق دوسرے فریق کو یا کسی دوسرے فرد کو پہلے یا شادی کے وقت یا بعد میں اگر ایک فریق دوسرے کو یا کسی دوسرے فرد کے ذریعہ کسی قسم کی دولت، قیمتی چیز، بانڈ یا نقد سرٹیفکیٹ وغیرہ شادی کے متعلق دیا ملے تو وہ جہیز کہلائے گا۔ اس کے تحت کسی شکل میں جہیز کا طالب مجرم مانا جائے گا۔

تاہم شادی کے وقت بغیر کسی مانگ کے بھینٹ یا تحفہ دولہا دلہن کو اس کے والدین یا رشتہ دار دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ تحفہ عام رسم و رواج کے مطابق ہو۔ تحفہ کی قیمت اس شخص کی معاشی حیثیت کے مطابق ہو۔ تحفہ کی مکمل فہرست بنانی ہوگی۔ یہ فہرست شادی کے وقت یا بعد میں جلد تیار کی جانی چاہیے۔ شادی کے وقت جو تحفہ دلہن کو دیا گیا ہو وہ فہرست دلہن رکھے گی اور جو تحفہ نوشہ کو دیا جائے گا اس کی فہرست نوشہ رکھے گا۔ ان فہرستوں میں ہر تحفہ کا مختصر تذکرہ، اس کی قیمت، دینے والے شخص کا نام اور دولہا و دلہن سے اس کے رشتے کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اس پر دولہا و دلہن کے دستخط ہوں۔

۱۹۸۵ء کے ترمیم کے مطابق مجرم کو دولہا دلہن یا اس کے والدین سے جہیز مانگنے کے جرم میں کم سے کم چھ ماہ کی سزا دی جا سکتی ہے جو دو سال تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ دس ہزار یا جہیز کے برابر کی رقم دونوں میں سے جو زیادہ ہو کا جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی فرد کو چھ ماہ سے کم مدت کی سزا دی جاتی ہے تو عدلیہ کے حاکم کو فیصلے میں کم مدت کی وجہ کا بھی ذکر کرنا ہوگا۔ ترمیم قانون ۱۹۸۶ء میں سزا کی مدت کو ۶ ماہ سے بڑھا کر ۵ سال کا کر دیا گیا ہے اور جرمانہ کی رقم دس ہزار سے بڑھا کر پندرہ ہزار کر دی گئی ہے۔ اس طرح سزا کی مدت اور جرمانے کی رقم کو بڑھا کر قانون کو سخت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۹۸۵ء کے ترمیم کے مطابق عدالت اپنی جانکاری پر، پولس رپورٹ پر یا جس شخص پر زیادتی ہوئی ہے اس کی شکایت پر، یا اس کے والدین یا رشتہ دار یا سماجی تنظیمی اداروں کی طرف سے شکایت ملنے پر کارروائی کر سکتا ہے۔ سماجی تنظیمی اداروں کا مرکزی حکومت یا ریاستی حکومت سے منظور شدہ ہونا ضروری ہے۔

اِنڈین پینل کوڈ کھنڈ ۴۲ میں درج معاملات کو چھوڑ کر دوسرے تمام معاملات میں جہیزی جرم کاگنیزنس مانا جائے گا۔ اس طرح اس جرم کو پولس کی دخل اندازی کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ اِس کے مطابق پولس بغیر اعلیٰ افسر کے حکم کے بھی دخل انداز ہو سکتی ہے۔

۱۹۸۵ء کے ترمیم کے مطابق اگر جہیز دلہن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص شادی سے پہلے لے لیتا ہے تو وہ شادی ہونے کے تین ماہ کے اندر دلہن کو واپس کر دے گا۔ اگر دلہن نابالغ ہے تو دلہن کی عمر ۱۸ سال ہونے کے بعد ۳ ماہ کے اندر جہیز دلہن کو واپس کر دے گا۔ اگر جہیز کا تبادلہ ہوتا ہے تو وہ دلہن یا اس کے جائز وارث کو ہی دیا جانا چاہیے۔

عدالت کے ذریعے تحریری شکل میں حکم نامہ جاری کیا جانا چاہیے کہ مجرم دلہن کو مقررہ وقت میں جہیز واپس کر دے۔ اس حکم کی تعمیل نہ ہونے پر جہیز کی قیمت جرمانہ کی شکل میں مجرم سے وصول کی جائے گی جو دلہن

کو دے دیا جائے گا۔

۱۹۸۶ء کی ترمیم کے مطابق اب یہ ذمّہ داری مجرم پر عاید کی گئی ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس نے جہیز نہیں لیا ہے۔ اس سے قبل یہ ذمہ داری دلہن کے رشتے داروں پر تھی کہ وہ ثابت کریں کہ انہوں نے کتنا جہیز دیا ہے اس ترمیم سے عورتوں کو سہولت پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۸۶ء کا جہیز ترمیمی قانون کا اہم دفعہ قابل قدر مانا جائے گا جس کے تحت انڈین پینل کوڈ ۱۹۶۰ء میں ایک نئی دفعہ ۳۰۴ اِی کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس کے مطابق اگر شادی کے ۷ سال کے اندر کسی شادی شدہ عورت کے جلنے یا جسمانی اذیت وغیرہ کی وجہ سے اس کی موت ہوتی ہے اور اگر یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے شوہر یا دوسرے رشتہ داروں کے ذریعے تکلیف دی جاتی تھی یا ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا تو ایسی موت کو جہیزی موت کہا جائے گا۔ جن رشتہ داروں یا شوہروں کی وجہ سے موت ہوئی ہے اُن سب کو کم سے کم سات سال جیل کی سزا دی جائے گی جو عمر قید تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس دفعہ کا اضافہ جہیز مخالف قانون کی تاریخ میں ایک نیا سنگ میل مانا جائے گا۔ اس دفعہ کے ذریعے ملک میں تیزی سے بڑھ رہی جہیزی اموات کو قانونی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہیز کی کمی یا نہ ملنے پر عورتوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک ہو رہا ہے جو دماغی، جسمانی اذیت پہنچائی جا رہی ہے اس سے نجات دلانے کے لیے جمہوری و فلاحی نظام حکومت نے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ اس قانون میں یہ بھی صاف طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ کرمنل پروسیجر کوڈ ۱۹۷۳ء اور گواہ قانون کو زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکے۔

اس ترمیم کی رو سے کسی بھی فرد کے ذریعے لڑکا یا لڑکی کی شادی کسی اخبار یا رسالے میں یا کسی ذرایع سے دولت کی جانکاری دینے والے اشتہار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا اخبار اس قسم کے اشتہارات کو شایع کرتا ہے تو غیر قانونی مانا جائے گا۔

۱۹۸۶ء کی ترمیم کے مطابق جہیز مخالف آفیسر اور اس کی مدد کے لیے ایک بورڈ قایم کیا جائے گا جو جہیز کے متعلق معاملات کی تفتیش کرے گا اور اس بدنما داغ کو سماج سے دور کرنے کی پوری کوشش کرے گا جہیز مخالف افسر کو یہ اختیار ہوگا کہ جہیز کی روک تھام کے لیے ہر ممکن اقدامات اُٹھائے اس افسر کی بحالی سرکار کے ذریعے ہوگی۔

اس طرح ہم پاتے ہیں کہ قومی ایوانوں نے سخت، ٹھوس اور باا ثر قانون بنا کر ہندوستانی سماج میں تیزی سے بڑھ رہے اس رد کنے کی کوشش کی ہے لیکن ۱۹۸۴ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک ا خواتین جہیز اموات کا شکار نہیں۔ ۱۹۸۰ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک د خواتین کی جلنے سے اموات ہوئیں۔ آخر کیوں؟ ایک ٹھوس اور با اثر کے باوجود بھی جہیز سے وابستہ جرائم و زیادتیوں میں اضافہ کیوں؟ ایک سے زیادہ سالوں کے عدالتی تجربات کے باوجود ہندوستانی عدلیہ ا کو روکنے میں ناکامیاب کیوں؟

جہیز کا لین دین کرنے والا سماج کا ہی فرد ہوتا ہے کی بھوک، مادیت کی بڑھتی ہوئی غلامی اور سماجی شان و شوکت جہیز کو بڑھاتی ہے۔ نوشہ کا اعلیٰ نسبی ہونا' اچھی تعلیم اور اچھی نوکری کا ہونا او معاشی حالت کا بہتر ہونا دلہن کے رشتہ داروں کی سرگرمی کو بڑھا دیا ہمارے اندر چھپا حرص و طمع جب سماجی شان و شوکت کا غلاف اوڑ تو جہیز کی بنیاد شروع ہو جاتی ہے۔

کل ہند جہیز مخالف سمیلن ۱۹۸۵ء میں میں نے کہا تھا کہ

"جہیز پسند کی ایک قیمت ہے"

ہمارے سماج میں ہر کوئی اپنی پسند کی چیز خریدتا ہے۔ ادنیٰ سے ا شخص بھی اپنی لڑکی کے لیے معاشی طور سے خود کفیل گھر کی تلاش کرتا اس طرح کے رشتے کم ہیں' اس لیے جہیز کا وزن بھی بڑھنے لگتا ہے۔ اپنی جھوٹی شان و شوکت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنا سب کچھ کر بھی سماج میں یہ رعب برقرار رکھنا پسند کرتے ہیں کہ ہم زیادہ خرچ کرنے کی وسعت رکھتے ہیں۔ شاہی طرز کی بارات، اعلیٰ قسم کے کا انتظام، کہکشاں کی طرح بجلیوں کی سجاوٹ اور ڈسکو کی دھن پر ناچتے براتیوں کا رواں دواں قافلہ ہمارے معاشرے کو نہ جانے کہاں۔ جانا چاہتا ہے۔ ہم صرف نقل ہی نہیں کرتے بلکہ حدود کو پار کرنے میں باز نہیں آتے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

جہیز کی نمایش اور سماج کا خوشی خوشی دیکھنا اور تعریف کر جہیز کو سماج کی خاموش منظوری دلاتی ہے۔ جہیز نہ ملنے پر عورتوں ذریعے کی گئی تنقید اور سماج میں اس شخص کی گرتی ہوئی ساکھ ہر فرد کو اپنا زمین گروی رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مقدس آدرشوں کی دل

دینے والے سماج کے سامنے جب آدرشوں کو عملی جامہ پہنا جاتا ہے تو یہی سماج اسے دقیانوسی، کٹر پنتھی اور غیر مہذب جیسے ناموں سے پکارتا ہے۔

ہندوستان میں عورتیں جہیز کی شکار رہتی ہیں، جب کہ عورتیں ہی اس کو روغ دیتی ہیں۔ جہیز نہ ملنے یا کم ملنے پر شکایت کا سلسلہ عورتیں ہی شروع رتی ہیں۔ بامہذب اور پڑھے لکھے خاندان کی لڑکیاں خود اپنے والدین سے ہیز کے انتخاب پر اصرار کرتی ہیں۔ دلہن کو اذیت اور ذہنی پریشانی بڑھانے الی عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

دانش وروں کی رائے تھی کہ علم جہیز کی لعنت کو روک دے گا لیکن ہیز کی مانگ پڑھے لکھے لوگوں میں بہت تیزی سے پنپ چکی ہے۔ علم اور ا شی طور سے خود کفالت بھی جہیز کی لعنت کو روک نہ سکا۔

جہیز مخالف تحریک کی رہنمائی وہ کرتے ہیں جو خود شادی شدہ ہوتے ہیں اور اپنے بچوں کی شادی میں جہیز لے چکے ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۸ء اور ۱۹۸۶ء کے جن ایوانوں میں اس عظیم قانون کو پاس کیا گیا ا ایوانوں میں شریک بیشتر لوگوں نے پانچ ستارہ طرز کی شادی میں حصہ ا۔ کیوں کہ قانون تو صرف نسلی لوگوں کے لیے گویا بنا ہے، اُن کے لیے نہیں جو بلند مقام رکھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج ایسے منظوری نہ دے جہیز کی نمائش یا تعریف کرنے کی جگہ شرعی یا ویدک یا بالکل یا سناتنی شادی کو سماجی منظوری ملے۔ مادیت اور زر پرستی کی چمک سے دور ہو کر سماجی بیداری پیدا کرنی ہوگی جس میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ جہیز سے پیدا شدہ خطرناک نتائج سے عوام کو آگاہ کرنا ہوگا، جو ہمارے سکھ اور سکون کو پریشانیوں میں بدل دیتا ہے۔ خواتین میں بیداری بہت ضروری ہے۔

خواتین کو مل کر اس لعنت کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔ ایر کنڈیشنڈ روم میں قید و محدود تحریک نسواں آزادی کو محلوں کی گندی بستیوں میں لانا ہوگا جہاں عورتوں کے دامن میں صرف آنسو ہی آنسو ہیں۔

دانا عابد

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عابد و زاہد اور شب بیدار شخص کئی سیر غذا کھاتا اور ہر شب میں ایک قرآن کریم ختم کرتا تھا

کسی دانا نے سنا تو کہا
"کاش وہ آدھی روٹی کھایا کرتا اور ساری رات سویا کرتا۔"

— (از گلستان سعدی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ——— ترقی کی راہ پر

راحت ابرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض برصغیر کی ایک عظیم الشان دانش گاہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک رواں دواں تحریک ہے اور اس تحریک کی کامیابی صرف علی گڑھ برادری کی ہی کامیابی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے تابناک مستقبل کی ضمانت بھی ہے۔ سر سید احمد خاں کے جانشین کی حیثیت سے اس ادارے کے سربراہ جناب سید ہاشم علی نے اپنے دو سال کے مختصر عرصے میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور یہ ادارہ ماضی کی طرح حال میں بھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

جناب سید ہاشم علی نے ۸ر اپریل ۱۹۸۵ء کو اس ادارے کی سربراہی قبول کرنے کے بعد پُرامن ماحول اور تعلیمی اصلاحات کے لیے جو ... مرتب کیے تھے، ان کے نتائج اب سامنے آنے لگے ہیں اور ملک کی غالباً یہ واحد یونیورسٹی ہے جو اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں سے پوری طرح محفوظ ہے اور یہاں کا پُرامن اور تعلیمی ماحول خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ادارے کی عظمت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے

کسی بھی یونیورسٹی کی ساکھ اور اس کی شہرت محض اس یونیورسٹی کی عظیم الشان عمارتوں سے نہیں بلکہ لائق اور قابل اساتذہ کی تحقیق اور ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں سے بنتی ہے جن کی بنا پر یونیورسٹی کو علمی دنیا میں وقار حاصل ہوتا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر سید ہاشم صاحب نے ایک اکیڈمک مانیٹرنگ کمیشن (Academic Monitoring Commission) مقرر کیا جس میں مختلف شعبہ جات کے سینیر اساتذہ کو اس کام پر معمور کیا کہ وہ اس بات کا پتہ لگائیں کہ تعلیمی معیار کو بلند و بہتر بنانے میں کیا کیا طریقے اپنائے جائیں۔

اس کمیشن کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ درس و تدریس تحقیق کے کام میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا بروقت از[الہ] کیا جا سکے۔

اس کمیشن کے قیام سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ امسال [۱۸۰] دن سے ۲۰۰ دن تک پڑھائی ہوئی جب کہ ماضی میں صرف سال میں ا[یک سو] ۱۲۰ دن تک ہی پڑھائی ہوتی تھی۔ سال بھر تک باقاعدہ حاضری کے سا[تھ] ہی بغیر کسی شور شرابے کے امتحانات بھی انتہائی باقاعدگی کے ساتھ پُرا[من] ماحول میں چل رہے ہیں۔ اس طرح کمیشن کی اب تک کی نشستوں سے جو ن[تائج] برآمد ہو رہے ہیں وہ بہت امید افزا ہیں اور علی گڑھ برادری میں ا[ب] یہ احساس بھی عام ہوتا جا رہا ہے کہ اقلیتی فرقے کو اکثریتی فرقے کے مقا[بلے] میں زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب یہا[ں] کے لڑکے اپنی تعلیمی استعداد کا لوہا پورے ملک میں تسلیم کرا لیں گے۔

گذشتہ برس اساتذہ اور ان سے متعلق سہولتوں پر خصوصی توجہ دی گئی تاکہ بلندی تعلیم کے ساتھ ہی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے سائنس فیکلٹی کے لیے نو کلاس روم، آرٹ اور سوشل سائنس کی فیکلٹیوں کے لیے ۲۸ لاکھ کی رقم سے کلاس روم کی تعمیر کا پروگرام شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی شعبۂ دینیات کے لیے بھی دو بڑے کلاس روم گزشتہ برس تعمیر کرائے گئے۔ موجودہ تعلیمی سال میں لیبارٹریز، کلاس روم اور اساتذہ کے کمروں کی جو کمیاں ہیں انہیں دور کیا جا رہا ہے۔

علم کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کانفرنس، سیمینار

مذاکروں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ صرف ایک سال کے دوران ہی
ٹھ سے زائد کل ہند اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا اہتمام کیا گیا جن
ں ملک و بیرون ملک کے ممتاز دانش وروں کو مدعو کیا گیا
علمی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے توسیعی خطبات کا جو سلسلہ ہے
ے کو مزید فعال اور مستحکم بنایا گیا ہے اور مختلف موضوعات پر
طبات کے لیے ملک و بیرون ملک کے نامور اصحاب کو مدعو کیا جاتا رہا
ہ تاکہ یہاں کے اساتذہ اور طلباء ان دانش وروں کے خیالات
ر تجربات سے استفادہ کر سکیں۔

گذشتہ دو برس کے عرصے میں کئی نئے شعبہ جات بھی قایم
ے جن میں ڈینٹل سرجری، میوزولوجی، وائلڈ لائف، ریموٹ سینسنگ
ساتھ ہی یونیورسٹی پولی ٹکنک میں فن تعمیرات سے متعلق ڈپلوما کورس
ی شامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انجینرنگ کالج میں الیکٹرانکس کا ایک
شعبہ بھی ہاشم صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے فیکلٹی آف لائف سائنس
ر فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے ساتھ ہی کلیات اور معالجات میں اعلیٰ
ہ کی تعلیم کا بھی اضافہ کیا گیا ہے

مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں اب تک صرف
اس طلباء کو ہی ایم۔ بی۔بی۔ ایس کے سال اول میں داخلے کی سہولت تھی
۔ اب پچاس سیٹوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے اور طلباء کی دوگنی
اد کی وجہ سے ہسپتال میں ساٹھ بستروں کا انتظام کیا گیا ہے جس
، قرب وجوار کے اضلاع کے مریض ہسپتال کی خدمات کا استعما
طور پر کر رہے ہیں۔ اسپتال کے تمام وارڈوں میں زندگی بچانے سے
لق ضروری دواؤں کا خصوصی بندوبست کیا گیا ہے۔

ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں رات آٹھ
ہی تالا ڈال دیا جاتا ہے، خود کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی
ریریاں بھی رات بارہ بجے ہی بند کر دی جاتی ہیں مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ولانا آزاد لائبریری غالباً دنیا کی واحد لائبریری ہے جو صبح ۸ بجے سے
۲۰ بجے تک کھلی رہتی ہے اور وہاں ایک بڑی تعداد میں طلباء اس لائبریری
ستفادہ کر سکتے ہیں۔ یونیورسٹی میں طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے
نظر اس لائبریری کی توسیع کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی

تھی جس پر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ویر بہادر سنگھ نے ۲ر دسمبر ۸۵ء
کو اپنی علی گڑھ آمد کے دوران اس لائبریری کی توسیع و ترقی کے لیے دس لاکھ
روپے کا عطیہ منظور فرمایا۔ صوبائی حکومت کی جانب سے مسلم یونیورسٹی
کے لیے یہ اب تک کی سب سے بڑی امداد ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیمپس جو اپنی شاندار تاریخی عمارتوں کے لیے
ملک و بیرون ملک میں مشہور ہے مگر اس یونیورسٹی میں کھانا کھانے اور
چائے وغیرہ کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں تھا بلکہ قرب وجوار کے گندے
ہوٹلوں کی سیاست بھی ہوسٹلوں میں داخل ہونے لگی تھی۔ اس کمی کو شدت
سے محسوس کرتے ہوئے جناب سید ہاشم علی نے ایک تھری اسٹار ہوٹل کے
معیار کی ایک سینٹرل کینٹین بھی قایم کرادی ہے جہاں سستے داموں پر عمدہ
کھانا مہیا کرایا جا رہا ہے۔

دو سال کے عرصے میں طلباء کی سہولتوں کے لیے ۴ لاکھ روپیہ
خرچ کیا گیا جو علی گڑھ کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ ہر ہوسٹل کے ہر کمرے
میں بجلی کے پنکھے لگوانے پر سولہ لاکھ، سینٹرل کینٹین کی توسیع و تعمیر پر سترہ
لاکھ روپے اور اقامت گاہوں کی بعض بنیادی ضرورتوں پر چودہ لاکھ
روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ جن اقامت گاہوں میں جنریٹرس نہیں ہیں وہاں
وہاں اب جنریٹرس لگوائے جا رہے ہیں۔ تاکہ بجلی کی خرابی کی صورت میں کم از کم
ہال لائبریری، کامن روم میں روشنی رہے تاکہ طلباء اپنی پڑھائی کو جاری
رکھ سکیں۔ ہر ہال میں ایک بک بینک (Book Bank) بھی قایم کی جا رہی
ہے تاکہ ہوسٹلوں میں بھی کتابوں کی فراہمی ممکن ہو سکے۔

مسلم یونیورسٹی میں گیارہویں اور بارہویں درجات کی تعلیم کے لیے
ایک الگ کالج قایم کیا جا رہا ہے جس کی عمارت کی تعمیر کے لیے یونیورسٹی گرانٹس
کمیشن سے ۶۸ لاکھ روپے کی منظوری مل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کینڈی
ہال میں میوزیم کی توسیع کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کی رقم اور
ویمنس کالج میں کیریر پلاننگ سینٹر کی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے
کی امداد یو۔جی۔سی سے امسال حاصل کی گئی۔ بایوٹیکنالوجی میں ایم۔ایس سی سطح
تک کی تعلیم کی منظوری بھی حاصل ہو گئی ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایک اقامتی ادارہ ہے مگر یہاں صرف پندرہ فیصد
کے قریب اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کو ہی یونیورسٹی کے مکانات کی سہولت

حاصل تھی بقیہ لوگوں کو اپنے ذاتی مکانات کی تعمیرات کے لیے یونیورسٹی قرض بھی دیتی ہے۔ اب تمام اساتذہ اور ملازمین کی رہائش کے اس پیچیدہ ترین مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تین کروڑ روپے کا ایک پروجیکٹ منظور کیا گیا ہے۔

غیر تدریسی عملے کے وہ ملازمین جو آٹھ سال سے کسی بھی ترقی سے محروم تھے، ان کی تنخواہوں میں اضافے کے لیے کیڈر ریویو سیل قایم کیا گیا جس کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مرکزی صحت عامہ منصوبے کے تحت یونیورسٹی کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے لیے مفت طبی امداد اسکیم کو پہلی مرتبہ یونیورسٹی میں نافذ کیا گیا ہے تاکہ ملازمین کو بہتر طور پر علاج کی سہولتیں مفت فراہم ہو سکیں۔ ابھی تک یونیورسٹی کے تمام تر ملازمین اس ہیلتھ اسکیم سے محروم تھے۔

ملک بھر میں تعلیمی اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے اس ادارے کا دامن سمٹتا جا رہا تھا اور اس یونیورسٹی کی حالت بھی ایک ریجنل یونیورسٹی کی سی ہوتی جا رہی تھی۔ اس ادارے کے کل ہند کردار کو برقرار رکھنے کے لیے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے ملک کے دور دراز علاقوں میں سات مراکز بھی قایم کیے ہیں تاکہ ان ریاستوں کے ذہین اور لایق طلبا کو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے فارم اور دیگر معلومات مقررہ وقت پر فراہم ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں اور بھی کچھ خصوصی رعایات دی گئی ہیں تاکہ اس یونیورسٹی کا کل ہند کردار محفوظ رہ سکے۔

دفتری معاملات میں بہتری کے لیے یونیورسٹی ایکٹ کے تحت قواعد و ضوابط کو تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے تاکہ یونیورسٹی کے تمام کارکنان کے فرائض منصبی اور دیگر امور کا تعین کر کے ہر معاملے پر قواعد ضوابط (Statutes - Ordinances) کی کتابیں شایع کی جا سکیں۔

اسٹوڈنٹس یونین کو پیشہ ورانہ سیاست سے دور رکھنے کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق متعین کیا گیا ہے جس کے تحت ہر وہ طالب علم جو ڈسپلن شکنی کے الزام میں قصوروار قرار دیا گیا ہو یا کبھی فیل ہوا ہو اس کے اس یونین کے انتخاب میں حصہ لینے پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔

یونیورسٹی کی قدیم اور اعلیٰ روایتوں کو پھر بحال کیا جا رہا ہے۔ پھر کنٹونیل مانیٹر سسٹم کو پھر جاری کر دیا گیا ہے تاکہ نظم وضبط اور امن وقانون

کو برقرار رکھنے میں یہ طلباء ماضی کی طرح پھر حصہ لے سکیں۔ اس
ہی ہال کو نسلوں کو بھی بحال کر دیا گیا ہے تاکہ طلباء ہال کے معاملات
میں اور طلباء کے بعض مسائل کو طلباء کے ذریعے ہی حل کیا جائے۔

دس سال کے تعطل کے بعد گزشتہ برس تقسیم اسناد جلسے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں صدر جمہوریہ عزت مآب گیانی ذ
نے خطبۂ اسناد پیش کیا۔ گزشتہ برس سر سید ڈے ت
کا اہتمام بھی آٹھ برس کے بعد کیا گیا جس میں سولہ ہزار سے زائ
کو عشائیہ بھی دیا گیا جو علی گڑھ کی تہذیب، شائستگی اور مزاج
کا آئینہ دار تھا۔

یونیورسٹی میں غیر درسی مشاغل پر بھی پوری توجہ دی جا
اس برس ٹینس کی انٹر ورسٹی کا انعقاد بھی کیا گیا۔ اتر پردیش حکو
مالی تعاون سے این سی سی کے طلباء کو ہوائی جہاز اور گلائڈر کی ٹر
کرانے کے لیے یونیورسٹی کیمپس کے نزدیک ہی ایک ہزار بیگھہ پختہ زمین
بڑا ٹریننگ سینٹر قایم کیا جا رہا ہے۔

یونیورسٹی احاطے کو اور بھی خوبصورت بنانے کے لیے کینڈ
اور آرٹس فیکلٹی میں رنگ برنگ کے فوارے لگائے گئے اور سڑ
کے دونوں طرف مختلف اقسام کے پھولوں کے پودے بھی لگا
ہیں یہ کام اس سال بھی جاری رہے گا۔

مسلم دستکاروں کو جدید تکنیکی تربیت کے لیے یونیور
پالی ٹیکنک میں صوبائی سرکار کے مالی تعاون سے ایک پروڈکشن سینٹر
کیا گیا ہے تاکہ تعلیم کے دوران ہی یہ طلبا تکنیکی مہارت حاصل کر کے اپ
اپنے خاندان کی معاشی پسماندگی کو دور کر سکیں۔

نئی تعلیمی پالیسی سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ ایک ایسے منصو
کو آخری شکل دے رہے ہیں جس کے تحت ملک کے تمام مسلمانو
ناخواندگی کو دور کرنے میں مدد مل سکے۔ اس خیال سے "اوپن یونیو
کا ایک ریجنل سینٹر یہاں قایم کیا جا رہا ہے تاکہ مراسلاتی کورس کے ذری
اردو کی تعلیم دی جا سکے۔

مسلم یونیورسٹی میں ذہین، مستحق اور نادار مسلم طلباء کی تع
ضرورتوں کو پورا کرنے اور ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی تعلیمی

اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے وہ ایک فنڈ بھی قایم کر رہے ہیں جس کے تحت دس ہزار لوگوں سے دس دس ہزار روپیے کی رقم کو وصول کرکے کے بعد مسلمانوں کی فلاح سے متعلق منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ڈیولی سوسائٹی کو بھی مزید فعال بنایا گیا ہے تاکہ کوئی بھی نوجوان محض غربت کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہ رہ سکے۔ گزشتہ دو سال کے دوران دس لاکھ روپیے سے زائد عطیات وصول کیے گئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱، کی دفعہ ۵(۲) (ت) کے تحت اس اقلیتی ادارے پر "ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی فروغ کی خصوصی ذمہ داری عائد کی گئی ہے"۔ یونیورسٹی کے اس آئینی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ملک بھر کے پانچ سو سے زائد دانشوروں کو خطوط لکھے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور منتظمین سے رابطہ قایم کیا جا رہا ہے کیوں کہ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے جس پر ان کی عزت، صحت اور بقاء کا انحصار ہے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک سہ روزہ کانفرنس کا بھی انعقاد حال ہی میں کیا گیا جس میں ملک بھر کے ممتاز دانشوروں نے حصہ لیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔

یونیورسٹی کے ایک گوشے سے یہ سوال بھی اُٹھایا گیا ہے کہ یہاں مسلم طلباء کے داخلوں میں ریزرویشن کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں مدارس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب محمد اسماعیل اور سینٹرل ویجیلنس کے چیرمین جناب محمد رفیع الدین احمد انصاری کے علاوہ اٹارنی جنرل سے قانونی صلاح و مشورہ بھی کیا جا رہا ہے۔

سرسید نے اپنی اصلاحی تحریک کے ترجمان کے طور پر ۰، میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کو جناب حامد نے اپنی وائس چانسلر شپ میں دوبارہ جاری کیا اور اس کا روپ لشانت بھی شایع کیا گیا جس کو اب موجودہ وائس چانسلر نے بجٹ پر لے لیا ہے اور اس کی اشاعت میں دوگنا سے بھی زیادہ اا ہو گیا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں سائنسی اور ریاضی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے مرکز فروغ سائنس بھی قایم کیا گیا ہے، تک پانچ تجدیدی کورسوں کا انعقاد بھی کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی د مدارس میں سائنسی علوم کو شامل کیے جانے سے متعلق ایک اپیل بھی سوا کے ساتھ ان مدارس کے ذمہ داروں کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی۔ سوا کے جواب میں سیکڑوں خطوط مثبت انداز میں وصول ہوئے۔ اس کے بع ہی دینی مدارس کے علماء اور فضلاء کی ایک کانفرنس کا انعقاد بھی جس میں جملہ شرکاء نے سائنس اور ریاضی کو داخل نصاب کرنے پر رضا کا اظہار کیا اور یونیورسٹی سے اپیل کی کہ وہ مدارس میں سائنسی علو کی ترویج میں ان کی رہنمائی کرے اور ان کے اساتذہ کو سائنس تدریس کا اہتمام کرے۔ دینی اور عصری علوم کو ایک دوسرے قریب تر لانے کے لیے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے دارالعلوم دیوبند کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے ارباب حل و عقد سے ملاقاتیں کیں۔

"شیطان انسان کے لئے بھیڑیا ہے اور یہ بھیڑیا انہیں بکریوں کو پکڑتا ہے جو الگ جا بھاگتی ہیں یا دور نکل جاتی ہیں۔" (حضرت محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم)

کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ (آل عمران)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۴
سیشن ۸۸-۱۹۸۷ء

سیشن ۸۸-۱۹۸۷ کے لیے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس میں تکمیل شدہ درخواست فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ہر کورس کے سامنے تحریر ہے۔

نمبر شمار	کورس کا نام	درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ
۱	بی۔اے (آنرز) / بی۔ایس سی (آنرز) / بی۔کام (آنرز) فیکلٹیز آف آرٹس، سوشل سائنسز، سائنس، لائف سائنسز اور کامرس کے تین سالہ ڈگری کورس کا پہلا سال	۱۸ر جون ۱۹۸۷ء
۲	ا۔ ایم۔اے (فیکلٹی آف آرٹس): عربی / انگریزی / فائن آرٹ / ہندی / لسانیات / ملیالم / فارسی / فلاسفی / سنسکرت / اردو۔	
	ب۔ ایم۔اے۔ (فیکلٹی آف سوشل سائنسز): اکونامکس / ایجوکیشن / تاریخ / اسلامک اسٹڈیز / سیاسیات / پبلک ایڈمنسٹریشن / سائیکلوجی / سوشیالوجی	۲۰ر جون ۱۹۸۷ء
	ج۔ ایم۔ایس سی (فیکلٹی آف سائنس): کیمسٹری / جغرافیہ / جیالوجی / میتھ میٹکس / آپریشن ریسرچ / فزکس / سٹیٹکس۔	

(د) ایم۔ ایس سی (فیکلٹی آف لائف سائنسز)

بائیوکیمسٹری / بوٹنی / وائلڈ لائف / زولوجی۔

(ہ) ایم۔ ایس سی (ایگریکلچر) سینٹر آف ایگریکلچر

انٹومولوجی / لینڈ یوز اینڈ واٹر مینجمنٹ / مائیکرو بائیولوجی / نیماٹولوجی

پلانٹ پیتھالوجی۔

(و) فیکلٹی آف کامرس

۱۔ ایم کام۔

۲۔ ڈپلوما اِن بینک ایڈمنسٹریشن۔ (ڈی۔ بی۔ اے)

۳۔ ڈپلوما اِن سیکریٹیریل ورکس۔ (ڈی۔ ایس۔ ڈبلیو)

(ز) فیکلٹی آف تھیالوجی

۱۔ بیچلر آف تھیالوجی (B. Th.)

۲۔ ماسٹر آف تھیالوجی (M. Th.)

(ح) فیکلٹی آف لا:

۱۔ ایل ایل۔ بی (آنرز)

۲۔ ایل ایل۔ ایم

۲۰ جون ۱۹۸۷ء

(ط) سینٹر آف پروفیشنل کورسز

ڈپلوما اِن پروفیشنل کورسز۔

(الف) الیکٹرانکس ڈاٹا پروسسنگ اینڈ مشین آپریشن

(ب) پیسٹ مینجمنٹ

(ج) میوزیولوجی۔

(د) کمپنی لا، بینکنگ اینڈ انشورنس

(ہ) لیبر لا اینڈ لیبر ریلیشن

(و) کریمنالوجی اینڈ کریمنل ایڈمنسٹریشن

(ز) لیباریٹری ٹکنالوجی (فزیکل اینڈ کیمیکل)

(ح) جیم ٹیسٹنگ اینڈ آرٹ آف لیپڈری

(ط) میڈیکل لیب ٹکنالوجی (ریڈیالوجی)

(ی) جرنلزم۔

(ک) اپلائیڈ آرٹ۔

(ل) انسٹرومنٹ ٹکنالوجی۔

(ن) میڈیکل لیب ٹکنالوجی (کلینکل پیتھالوجی)
(س) کارٹوگرافی
(ع) آرتھوپیڈکس
(ف) پسّی کلچر
(ص) اورل ہائی جین

۲۰ رجون ۱۹۸۷ء

کورسز کے بارے میں تفصیلات، داخلے کے واسطے کم سے کم تعلیمی قابلیت، داخلے کے متعلق قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ٹو ایڈمیشن نمبر ۲ (Guide to admission no 2) میں دیے گئے ہیں۔

درخواست داخلہ فارم اور گائڈ برائے داخلہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲ ۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

داخلہ فارم ڈاک سے منگانے کی صورت میں -/۱۲ روپے (اس میں فارم کی قیمت اور رجسٹریشن فیس دو مضامین کے انتخاب کے لیے) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے. ایم. یو کے نام واجب الادا ہو اور ایک "۶×"۹ سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور چار روپے ساٹھ پیسے (۴.۶۰ روپے) کے ڈاک ٹکٹ (صرف ایک درخواست فارم کے لیے) چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں اپنے پتہ لکھے ہوئے لفافے پر نو روپے دس پیسے (۹.۱۰ روپے) کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کرکے ارسال کریں۔

اگر ایک سے زائد درخواست فارم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ہر ایک کے واسطے علیحدہ علیحدہ مطلوبہ لفافہ اور درخواست بھیجنا ہوگی۔

ایڈمیشن فارم ڈاک سے منگانے کے خواہش مند حضرات کو چاہیے کہ وہ فارم حاصل کرنے کے لیے درخواست مقررہ تاریخ سے کم سے کم ایک ہفتہ پہلے تک آفس میں بھیج دیں۔

درخواست فارم جمع کرنے کا طریقہ

۱. طالبات امیدواروں کے لیے

بی. اے (آنرز) (آرٹس اور سوشل سائنسز) اور بی. ایس سی (آنرز) (سائنس اینڈ لائف سائنسز) کورسز میں داخلے کی خواہش مند ایکسٹرنل طالبات اپنی ہر طرح سے مکمل درخواستیں جس میں مطلوبہ تمام دستاویزات اور داخلے کے لیے ضروری پاس شدہ امتحان کی مارکس لسٹ کی [illegible]

اور اضافی انتخاب مضامین کے لیے، اگر کوئی ہو، تو رجسٹریشن فیس پرنسپل ویمنز کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کرادیں۔

ایکسٹرنل ویمنز طالبات برائے پوسٹ گریجویٹ اور دیگر کورسز کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے مکمل درخواستیں جس میں مطلوبہ تمام دستاویزات اور داخلے کے لیے ضروری پاس شدہ امتحان کی مارکس لسٹ اور مطلوبہ فیس اور اضافی انتخاب مضامین کے لیے، اگر کوئی ہو، فیس تمام چیزوں کے ساتھ ڈپٹی رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کردیں۔

انٹرنل امیدوار

تمام انٹرنل طالب علموں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے مکمل داخلہ درخواستیں جس میں تمام مطلوبہ کاغذات اور داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس کی مصدقہ نقل ہو اور ساتھ میں انتخاب مضامین کے لیے اضافی انتخاب، اگر چاہیں تو، بمع مطلوبہ رجسٹریشن فیس کے اپنے متعلقہ پرووسٹ آفس میں فارم جمع کیے جانے کی آخری تاریخ سے دو روز قبل جمع کردیں۔

دوسرے

دیگر باقی طلباء کو چاہیے کہ وہ اپنی تکمیل شدہ درخواستیں اور ان کے ساتھ دیگر مطلوبہ کاغذات، داخلے کے لیے لازمی امتحان کی مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل مزید دو سے زائد اضافی انتخاب مضامین (اگر چاہیں تو) کے لیے مطلوبہ رجسٹریشن فیس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک پہنچادیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل قبول نہیں ہوں گی اور نہ ہی ان کے سلسلے میں کوئی خط و کتابت کی جائے گی۔

این۔ موئیدین
کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

مورخہ ۹ر مئی ۱۹۸۷ء (159/257)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

داخلہ اشتہار نمبر ۵
سیشن ۸۷- ۸۸ء

برائے سال ۸۷- ۸۸ء درج ذیل کورسوں میں مقابلہ جاتی ٹیسٹ / ٹیسٹ اور انٹرویو کی بنیاد پر اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ داخلے کے لیے کم سے کم اہلیت ، کورس کی مدت، فارم وصولیابی کی آخری تاریخ اور داخلہ ٹیسٹ کی تاریخیں ہر کورس کے سامنے دی گئی ہیں۔

نمبر شمار ۱	نام کورس اور مدت ۲	کم از کم قابلیت برائے داخلہ ۳	فارم وصولیابی کی آخری تاریخ ۴	ٹیسٹ کی تاریخ ۵
۱	**فیکلٹی آف انجینیرنگ**			
۱	بی۔ایس سی انجینیرنگ (کیمیکل / سول / الیکٹریکل / مکینکل / الیکٹرونکس) ۴ سالہ	سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ / انٹرمیڈیٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان، انگریزی، فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر نہ ہوں۔ یا کم از کم سکنڈ ڈویژن میں اسی یونیورسٹی سے ڈپلوما انجینیرنگ کیا ہو۔	۳۰ر جون ۱۹۸۷ء	۲۶-۲۷ جولائی ۸۷ء
	فیکلٹی آف میڈیسن۔			
۲	ایم۔بی۔بی۔ایس ۴½ سالہ کورس	سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ / پری میڈیکل امتحان اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو اور یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو اور انگریزی	۳۰ر جون ۱۹۸۷ء	۲۶-۲۷ر جولائی ۸۷ء

۱	۲	۳	۴	۵
		میں ۵۰٪ فیصد نمبر اور فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں۔ یا بی۔ایس سی آنرز اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو یا اس کے مساوی کوئی ایسا امتحان جس میں کیمسٹری، زوولوجی اور باٹنی میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر سائنس کے مضامین میں حاصل نہ کیے ہوں اور صرف انگریزی میں بھی ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں اور اس بات کا ثبوت کہ امیدوار نے فزکس میں پی۔ ایم۔سی کے معیار کا امتحان پاس کیا ہو یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو۔		
III	فیکلٹی آف یونانی میڈیسن			
۳.	پری طب (جو ۵½ سالہ کامل طب و جراحت (BUMS) کے کورس کا لیڈنگ کورس ہے) ۲ سال	سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ/ہائی اسکول امتحان یا اس کے مساوی کوئی ایسا امتحان جو یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو۔ یا عالم (عربک) کامل (فارسی) ادیب، کامل (جامعہ اردو علی گڑھ) امتحان یا کسی درس نظامی مدرسے کا فارغ التحصیل۔	۱۲ر جون ۸۷ء	۱۴ر جولائی ۸۷ء
۴	ایم۔ ڈی (علم الادویہ/کلیات وعلم الامراض/معالجات ۳ سالہ کورس	بی۔یو۔ٹی۔ایس/بی۔یو۔ایم۔ایس/بی۔یو۔ایم۔ایم کامل طب و جراحت (بی یو ایم ایس) امتحان اس یونیورسٹی سے پاس کیا ہو	۲۵ر جون ۸۷ء	۱۷۔۱۸ر جولائی ۸۷ء

۱	۲	۳	۴	۵
		یا اس کے مساوی کوئی امتحان جو اس یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو پاس کیا ہو اور ایم ڈی کے لیے متعلقہ موضوع میں ۶۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ ۲۔ ہاؤس جاب / انٹرن شپ چھ ماہ سے کم نہ ہو یا بی۔یو۔ایم۔ایس کرنے کے بعد کم از کم دو سال کا کلینکل یونانی مطب کے تجربہ کی شہادت یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس کے بارے میں چیرمین آف دی ڈپارٹمنٹ اور ڈین آف یونانی میڈیسن مطمئن ہو۔ ایم ڈی (معالجات) کے لیے معالجات میں چھ ماہ کا ہاؤس جاب لازمی ہے۔		

۱۷ فیکلٹی آف کامرس

۱	۲	۳	۴	۵
۵	ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (ایم۔بی۔اے) ۲ سال کا کورس	بی۔ اے / بی۔ ایس سی / بی کام / بی۔ ایس سی انجینئرنگ / بی۔ ایس سی (ایگریکلچر) یا اس کا مساوی کوئی امتحان جس میں مجموعی نمبر ۵۰٪ فیصد سے کم نہ ہوں	۲۷ر جون ۸۷ء	۱۶ر جولائی ۸۷ء
۶	پی۔جی ڈپلوما ان پورٹ فولیو منیجمنٹ ایک سال کا	بیچلرز ڈگری جس میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر نہ ہوں۔	۲۷ر جون ۸۷ء	۲۹ر جولائی ۸۷ء
۷	پی۔جی ڈپلوما ان کوآپریشن اینڈ رورل ڈیولپمنٹ ایک سال کا	بیچلرز ڈگری جس میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں۔	۲۷ر جون ۸۷ء	۲۹ر جولائی ۸۷ء

نوٹ:۔ وہ امیدوار جن کے پاس بی۔ایس سی ڈگری (ایگریکلچر) اور ڈپلوما یا گورنمنٹ آف انڈیا ہائر رورل ایجوکیشن کا ہو وہ بھی ڈپلوما ان کوآپریشن اینڈ رورل ڈیولپمنٹ میں داخلہ کے لیے درخواست دینے کے اہل ہیں

۱	۲	۳	۴	۵
۸	ڈپلوما ان انٹرپرینیورشپ ایک سال کا	بیچلرز ڈگری جس میں مجموعی طور پر ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔	۲۷ر جون ۸۷ء	۲۹ر جولائی ۸۷ء

	۲	۳	۴	۵
	فیکلٹی آف سائنس			
۹	ماسٹرز ان کمپیوٹر سائنس اینڈ ایپلی کیشن (ایم۔سی۔اے) ۲ سال کا کورس	بی۔ ایس سی ڈگری جس میں مجموعی طور پر ٪۶۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ فزکس اور میتھ/ اسٹیٹسٹکس بحیثیت خصوصی یا پھر اضافی مضمون کے رہے ہوں	۲۹ر جون ۸۷ء	۱۸ر جولائی ۸۷ء
۱۰	پوسٹ بی۔ ایس سی ڈپلوما ان کمپیوٹر سائنس اینڈ ایپلی کیشن (پی ڈی سی اے) ایک سال کا کورس	بی۔ ایس سی ڈگری جس میں مجموعی طور پر کم سے کم ٪۶۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور فزکس اور میتھ میٹکس/ اسٹیٹسٹکس بطور خصوصی یا پھر اضافی مضمون کے رہے ہوں۔	۲۹ر جون ۸۷ء	۱۸ر جولائی ۸۷ء
۱۱	پی۔جی۔ ڈپلوما ان ہائیڈرو۔ جیالوجی ایک سال کا کورس	ایم۔ ایس سی یا ایم ٹیک جیولوجی/ اپلائیڈ جیولوجی یا جیو فزکس میں اور اس میں مجموعی طور پر ٪۵۵ فیصد سے کم نمبر حاصل نہ کیے ہوں یا بی۔ ایس سی انجینئرنگ (سول) جس میں مجموعی طور پر ٪۶۵ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں	۲۹ر جون ۸۷ء	۲۰ر جولائی ۸۷ء
۷	**فیکلٹی آف سوشل سائنس**			
۱۲	بی۔ ایڈ ایک سال کا کورس	(۱) بی۔ اے/ بی۔ ایس سی/ بی۔ کام یا ان کے مساوی کوئی امتحان جس میں مجموعی طور پر کم از کم ٪۵۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں اور درج ذیل دو اسکول سبجکٹس انگریزی/ اردو/ سندی/ ہسٹری/ جغرافیہ/ سوکس/ اکونومکس/ فزیکل سائنسز/ بائیولوجیکل سائنسز/ میتھ میٹکس/ ہوم سائنس/ کامرس گریجویشن میں رہے ہیں۔ (۲) اگر گریجویشن میں مجموعی نمبر ٪۵۰ فیصد سے کم ہوں تو کسی اسکول سبجکیٹ میں ماسٹرز ڈگری ہونی چاہیے	۲۲ر جون ۸۷ء	۲۵ر جولائی ۸۷ء
۱۳	ایم۔ ایڈ ایک سال کا کورس	بی۔ ایڈ یا اس کے مساوی کوئی امتحان۔ بی۔ ایڈ کے تھیوری کے پیپرس میں مجموعی نمبر ٪۵۰ فیصد حاصل کیے ہوں یا بی ایڈ کے مساوی امتحان میں۔	۳۰ر جون ۸۷ء	۲۴ر جولائی ۸۷ء
۱۴	بی۔ لب سائنس ایک سال کا کورس	اس یونیورسٹی سے بی۔ اے/ بی۔ ایس سی/ بی۔ کام امتحان یا اس کے مساوی جس میں کم از کم ۴۸ فیصد	۲۰ر جون ۸۷ء	۲۴ر جولائی ۸۷ء

۱	۲	۳	۴	۵
		نمبر حاصل کیے ہوں۔ یا بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام میں ۴۵٪ فیصد نمبر کے ساتھ کسی تسلیم شدہ لائبریری میں لائبریری کا پانچ سال کا تجربہ۔ یا بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام میں ۴۵٪ فیصد نمبر کے ساتھ اس یونیورسٹی سے یا کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی/ادارے سے سکنڈ ڈویژن میں ماسٹرز ڈگری ہو۔		
	ایم۔لب۔سائنس ایک سالہ کورس	(۱) بی۔لب سائنس اور یا اس کے مساوی کوئی امتحان پاس کیا ہو اور اس میں مجموعی طور پر کم سے کم ۴۸٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں (۲) ایسے مستند اداروں کے لائبریرین جو ذمہ دارانہ پوزیشن پر فائز ہوں اور انہوں نے بی۔لب سائنس سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہو وہ بھی داخلے کے لیے اہل تصور کیے جائیں گے۔	۳۰ جون ۸۷ء	۲۲ جولائی
VII	انسٹی ٹیوٹ آف بائیو ٹکنالوجی۔			
۱۶	ایم۔ایس سی (بائیوٹکنالوجی) ۲ سالہ کورس	بائیولوجیکل سائنسز، فزیکل سائنسز، ایگریکلچر ویٹرنری سائنسز میں بیچلرز ڈگری اور یا انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی (بی۔ٹیک) یا میڈیسن (ایم۔بی۔بی ایس) میں بیچلرز ڈگری۔ ان میں مجموعی طور پر کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔		
VIII	سینٹر آف پروفیشنل کورسز			
	ڈپلوما ان کمپیوٹر پروگرامنگ ایک سالہ کورس	اس یونیورسٹی سے بیچلرز ڈگری یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس کو یہ یونیورسٹی بیچلرز ڈگری کے مساوی تسلیم کرتی ہو اور ان میں	۲۹ جون ۸۷ء	۱۷ جولائی ۸۷

۲	۳	۴	۵
	مجموعی طور پر کم از کم ۵۰٪ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں		
اسکول آف نرسنگ۔			
ڈپلوما ان جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری کورس ۳½ سالہ کورس	سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفیکٹ کورس/انٹرمیڈیٹ یا ایک ایسا امتحان جس کو یونیورسٹی ان کے مساوی تسلیم کرتی ہو، پاس کیا ہو (وہ امیدوار جنہوں نے مذکورہ بالا امتحانات سائنس کے مضامین اور انگریزی کے ساتھ پاس کیے ہیں اُن کو داخلے میں اولیت دی جائے گی)	۲۰ جون ۸۶ء	۲۱ جولائی ۸۶ء

شمار نمبر ۲، ۴۳ اور ۴۴ کے کورسز میں داخلے کے لیے تحریری مقابلہ جاتی ٹیسٹ ہوگا اور باقی ماندہ کورسوں میں داخلہ تحریری مقابلہ جاتی ٹیسٹ اور انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا۔

کورس کے بارے میں جملہ تفصیلات، فیس کی ادائیگی، درخواست فارم بھیجنے کے قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ایڈمیشن ٹیسٹ نمبر ۳ میں دی گئی ہیں۔ درخواست داخلہ فارم اور گائڈ برائے داخلہ ٹیسٹ بذریعہ ڈاک ڈپٹی رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے بذریعہ ڈاک انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر اے۔ ایم۔ یو کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے ایک خود کا پتہ لکھا ۹×۶ سائز کا ایسا لفافہ جس پر (۵-۴۰ روپے) کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجا جانا ضروری ہے

اگر امیدوار درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک منگانا چاہیں تو اس صورت میں پتہ لکھے ہوئے لفافہ پر ۹/۹۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہونا ضروری ہیں۔ اگر ایک سے زیادہ درخواست فارم مطلوب ہوں تو مندرجہ بالا طریقے پر درخواست کے ساتھ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ لفافہ بھیجا جانا ضروری ہے۔

داخلہ فارم منگانے کے لیے درخواست میں صاف صاف یہ بیان کیا جائے کہ کس کورس کے واسطے داخلہ فارم طلب کرنا چاہتے ہیں۔

وہ حضرات جو داخلہ فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی داخلہ فارم کے لیے درخواستیں اس صورت میں ہی قبول کی جائیں گی جب کہ وہ مقررہ تاریخ سے جو ہر کورس کے سامنے تحریر ہیں کم از کم ایک ہفتہ قبل اس آفس میں پہنچ جائیں۔

بیرونی امیدوار (جو اے۔ ایم۔ یو کے طالب علم نہ ہوں) کے داخلہ فارم جو ہر طرح سے مکمل ہوں اور ساتھ میں کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جس کی ہدایت گائڈ ٹو ایڈمیشن میں دی گئی ہے (/۲۵ روپے برائے کورس نمبر ۲، ۶، ۷، ۸، ۱۲، ۱۴، ۱۶ اور ۱۸ کے لیے اور -/۳۵ روپے باقی ماندہ کورسوں کے لیے) بطور رجسٹریشن اور

ایڈمیشن ٹیسٹ فیس (نا قابل واپسی) جو کہ فنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، ڈپٹی رجسٹرار (ایڈم، پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں شام پانچ بجے تک اس آخری تاریخ میں جو کو، کے سامنے تحریر ہے پہنچ جانی چاہیئے۔

اے۔ ایم۔ یو کے طلباء اپنے ہر طرح سے مکمل فارم مطلوبہ فیس اور دیگر کاغذات، داخلہ کے لیے ضروری امتحان مارکس کی مصدقہ نقل آخری تاریخ سے (جو ایڈمیشن آفس میں پہنچنے کے لیے مقرر ہے) دو روز قبل اپنے متعلقہ ہال پرووسٹ کے یہاں جمع کر دیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں نا قابل قبول ہوں گی اور اُن کے سلسلے میں مزید کوئی خط وکتابت نہیں کی جا سکے گی۔

این۔ موئیدین

کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشنز

(225/-A/338)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۶

سیشن ۸۸-۱۹۸۷

سیشن ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے مقررہ فارموں پر موزوں اور اہل امیدواروں سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس میں تکمیل شدہ درخواست فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ ہر کورس کے سامنے تحریر ہے۔

نمبر شمار	کورس کا نام	وصولیابی کی آخری تاریخ
۱	ویمنز پولی ٹیکنک میں ڈپلوما کورسز ۱۔ الیکٹرانکس انجینیرنگ ۲۔ الیکٹرونکس انجینیرنگ (ٹی۔ وی ٹیکنالوجی) ۳۔ کاسٹیوم ڈزائننگ اینڈ ڈریس میکنگ ۴۔ آفس اسسٹنٹ شپ اینڈ سکریٹریل پریکٹس	۱۵ جون ۱۹۸۷ء

نمبر	کورس	تاریخ
۲	ڈپلوما آف ٹیچنگ [اردو میڈیم]	
۳	بی۔ای (ایوننگ)	۱۵رجون ۱۹۸۷ء
۴	ڈرافٹس مین شپ میں سرٹیفکیٹ (سول/مکینکل)	۱۷رجون ۱۹۸۷ء
۵	ڈپلوما ان اسٹینوٹائپنگ	۱۸رجون ۱۹۸۷ء
		۱۸رجون ۱۹۸۷ء
۶	انگریزی زبان اور ادب میں پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما	۲۰رجون ۸۷ء
۷	اردو ٹرانسلیشن میں پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما	۲۰رجون ۸۷ء
۸	پرسنل منیجمنٹ میں ڈپلوما۔	۲۰رجون ۸۷ء
۹	مارکیٹنگ منیجمنٹ میں ڈپلوما۔	۲۰رجون ۸۷ء
۱۰	ڈرافٹنگ اینڈ ڈزائننگ (سول/میک) میں ڈپلوما	۲۵رجون ۸۷ء
۱۱	ایم۔ایس سی انجینرنگ (سول/الیکٹریکل/مکینکل)	۳۰رجون ۸۷ء
۱۲	پٹرولیم پروسسنگ میں پی۔جی ڈپلوما	۳۰رجون ۸۷ء

کورسز کے بارے میں مکمل تفصیلات، داخلے کے واسطے کم سے کم صلاحیت، داخلہ فارم بھیجے جانے کے قواعد وضوابط وغیرہ گائڈ ٹو ایڈمیشن نمبر ۲ میں دیے گئے ہیں۔

درخواست داخلہ فارم اور گائڈ درخواست دینے پر ڈپٹی رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پن کوڈ نمبر ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے ۳/- روپے کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو کہ فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اور ساتھ میں اپنا ایک پتہ لکھا ۴x۹ سائز کا لفافہ جس پر ۴/۶۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں ارسال کریں۔

اگر درخواست داخلہ فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک حاصل کرنا چاہیں تو اس صورت میں اپنے پتہ لکھے ہوئے لفافے پر ۱۰۔۹ روپے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں کریں۔

اگر ایک سے زائد داخلہ فارم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہر درخواست کے ساتھ علیحدہ علیحدہ مطلوبہ لفافے ارسال کریں۔

وہ حضرات جو داخلہ فارم بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی داخلہ فارم کے لیے درخواستیں اس صورت میں ہی قبول کی جائیں گی جب کہ وہ مقررہ تاریخ سے، جو ہر کورس کے سامنے درج ہیں، کم ازکم ایک ہفتہ قبل اس آفس میں پہنچ جائیں۔

درخواست فارم جمع کرنے کا طریقہ۔

۱۔ طالبات کے لیے۔

وہ لڑکیاں جو ویمنز پالی ٹیکنک کے ڈپلوما کورسوں میں داخلے کی خواہش مند ہوں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر طرح سے

تکمیل شدہ درخواستیں، مطلوبہ کاغذات، داخلے کے لیے لازمی امتحان کی مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کی کاپی اور رجسٹریشن فیس وغیرہ پرنسپل یونیورسٹی ویمنز پالی ٹیکنک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کرادیں۔

ب) انٹرنل طلباء

اس یونیورسٹی کے طلباء کو چاہیے کہ وہ اپنا ہر طرح سے تکمیل شدہ درخواستیں، مطلوبہ کاغذات کے ساتھ جس میں داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل اور رجسٹریشن فیس وغیرہ اپنے متعلقہ ہال کے پرووسٹ آفس میں درخواست جمع کیے جانے کی مقررہ آخری تاریخ سے دو روز قبل جمع کردیں۔

ج) دیگر

دیگر تمام امیدوار اپنی درخواستیں جو ہر طرح سے مکمل ہوں، مطلوبہ کاغذات جس میں داخلے کے لیے لازمی امتحان کے مارکس لسٹ کی مصدقہ نقل کی کاپی اور رجسٹریشن فیس ڈپٹی رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے یہاں مقررہ تاریخ تک جمع کردیں۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی اور اس سلسلے میں کوئی خط وکتابت بھی نہیں کی جائے گی۔

این موئیدین

کنٹرولر آف اگزامس اینڈ ایڈمیشنز

(258/365)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲/ ۸۷ — ۸۸

مورخہ یکم مئی ۱۹۸۷ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسرس

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنس

۱- پروفیسر آف اسکن اینڈ وی۔ڈی۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

قابلیت: ایم۔ڈی (ڈرماٹولوجی اینڈ وینیریولوجی)

ایم۔ڈی (میڈیسن) ساتھ میں ڈی۔وی۔ڈی۔ ڈی۔ڈی

تدریس/ تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان وینیریولوجی اینڈ ڈرماٹولوجی پانچ سال کا تجربہ۔

نوٹ:- وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۱۹/ ۸۶ ۸۷ مورخہ ۱۰ دسمبر ۸۷ کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر ہی امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۲- پروفیسر آف بائیوکیمسٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری۔ جے۔این۔ میڈیکل کالج۔

قابلیت

۱۔ لازمی ایم۔ڈی (بائیوکیمسٹری)/

ایم۔بی۔بی۔ایس ساتھ میں

ایم۔ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)/

پی ایچ۔ ڈی۔ (میڈیکل بائیوکیمسٹری)/

ڈی۔ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)

تدریس/ تحقیق کا تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بائیوکیمسٹری میں بحیثیت ریڈر چار سال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ اگر میڈیکل کوالیفیکیشن کا اہل امیدوار میسر نہ آئے یا وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو ایسے امیدوار جو بائیوکیمسٹری میں پی ایچ۔ڈی ہوں اور مطلوبہ تدریسی تجربے کے حامل ہوں ان کو امیدوار تسلیم کیا جائے گا۔

پسندیدہ :۔ امیدوار ایونولوجی/ میلیکولر بائیولوجی کے میدان میں قابل قدر اضافے کے اہل ہونے چاہئیں۔

ریڈرس

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۴۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

۳۔ ریڈر ان ای۔ این ٹی ڈپارٹمنٹ آف اوٹوریںو لارینگالوجی۔

قابلیت :۔

لازمی۔ ایم۔ایس (اوٹوریںو لارینگالوجی)
تدریس / تحقیق کا تجربہ۔
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر اوٹوریںو لارینگالوجی پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ :۔ مطبوعہ تحقیقی کام۔

۴۔ ریڈر ان آرتھوپیڈکس۔ ڈپارٹمنٹ آف آرتھوپیڈکس سرجری۔

قابلیت

۱۔ لازمی ایم۔ایس (آرتھوپیڈکس)/
ایم۔سی ایچ (آرتھوپیڈکس)
تدریس / تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان آرتھوپیڈکس پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ:۔ ۱۔ تحقیق اور مطبوعات
۲۔ آرتھروس کاپی میں تجربہ۔

نوٹ: وہ حضرات جو اشتہار نمبر ۶/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۱۸ جون ۸۶ء اور اشتہار نمبر ۱۹/ ۸۶ - ۸۷ مورخہ ۱۷ دسمبر ۸۶ کے تحت درخواستیں دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۵۔ ریڈر ان نیورو سائیکیٹری (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

قابلیت

۱۔ لازمی ایم۔ ڈی (سائیکیٹری)/
ایم ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/
ایم۔ڈی اِن میڈیسن ساتھ میں سائیکالوجیکل میڈیسن میں ڈپلوما۔
تدریسی/تحقیقی کا تجربہ۔
کسی میڈیکل کالج میں نیورو سائیکیٹری میں بحیثیت لکچرر پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ:۔ خصوصی میدان میں مطبوعہ تحقیقی کام
نوٹ:۔ یہ ریڈر کی تمام پوسٹوں کے لیے۔

وہ حضرات جو ۱۹۸۲ء کی ریکمنڈیشن کے تحت پہلے سے بحیثیت لکچرر منتخب کیے جاچکے ہیں ان کا لکچرر اور رجسٹرار کی حیثیت سے تدریسی تجربہ شامل کیا جائے گا اور وہ ریڈر کی حیثیت سے منتخب کیے جانے کے لیے اہل تصور کیے جائیں گے۔

۶۔ ریڈر ان میتھ میٹکس (عارضی) میتھ میٹکس سیکشن، ذاکرحسین کالج آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔
قابلیت: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام اس بات کا ثبوت کہ امیدوار انتہائی انہاک کے ساتھ (۱) تحقیق یا (۲) انوویشن اِن ٹیچنگ میتھڈ یا (۳) پروڈکشن آف ٹیچنگ میٹریل میں مصروف ہے
تدریسی اور/یا تحقیق کا تقریباً پانچ سال کا تجربہ جس میں سے کم سے کم تین سال متعلقہ مضمون میں بحیثیت لکچرر یا اس کے مساوی پوزیشن پر کام کرنے کا ہو۔
اگر امیدوار تدریس/تحقیق میں اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوے تو اس صورت میں مندرجہ بالا شرائط میں نرمی کی جاسکتی ہے۔

۷۔ ریڈر اِن الیکٹریکل انجینرنگ (انسٹرومینٹیشن) یونیورسٹی پولی ٹیکنک
۸۔ ریڈر اِن الیکٹریکل انجینرنگ الیکٹریکل انجینرنگ سیکشن یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔
قابلیت:۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تقریباً پانچ سال کا درس و تدریس اور/یا تحقیق اور ترقیاتی تجربہ۔
ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری نہیں ہے لیکن اس کے معیار کا مطبوعہ تحقیقی کام ہے۔ یا ڈیزائن/ڈیولپمنٹ میں کسی تعلیمی ادارہ یا انڈسٹری میں انتہائی اعلیٰ معیار کا ترقیاتی کام ہو۔

ایسے اشخاص کی صورت میں جنہیں کسی صنعت یا پیشہ ورانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں، جن میں نئی ایجادات / تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۹۔ لکچرار ان جرنلزم (ہندی)

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

قابلیت

۱۔ لازمی اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کم از کم سکنڈ کلاس میں (کمیونیکیشن / ماس کمیونیکیشن / جرنلزم وغیرہ) مضامین میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

(سیون پوائنٹ اسکیل میں بی) سوشل سائنسز / سائنس / ہیومینٹیز میں کم از کم سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری ہو اور ساتھ ہی ساتھ کم از کم سکنڈ کلاس میں جرنلزم میں بیچلرز ڈگری ہو یا کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے جرنلزم میں ڈپلوما ہو / کسی تسلیم شدہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ہو۔

۲۔ پسندیدہ۔ ۱۔ یونیورسٹی یا کالج کے معیار کا تدریسی تجربہ۔

۲۔ ماس کمیونیکیشن کے ایریاز (نیوز پیپر، میگزین، نیوز ایجنسی، پبلک ریلیشن، ایڈورٹائزنگ، ریڈیو یا ٹی وی جرنلزم وغیرہ) میں سے کسی میں کام کا تجربہ۔

۱۰۔ کونسلر (دو جگہیں) (ایک عارضی) ڈینس کالج۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

قابلیت

۱۔ لازمی اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کم از کم ایم۔فل ڈگری سائیکلوجی میں ہو۔

پسندیدہ ۱۔ ا۔ کیریر انفارمیشن کا ڈیسیمینیشن، کیریر ٹاکس کا اریجنٹ اور ٹریننگ پروگرام کی ڈیزائننگ کا تجربہ۔

ب۔ میزرنگ ایپٹیچیوڈ، انٹریسٹ اینڈ پرسنالیٹی کا وافر تجربہ۔

ج۔ کیریر گائیڈنس میں تحقیق کا تجربہ۔

د۔ گائیڈنس اینڈ کونسلنگ میں ڈپلوما۔

۱۱۔ ریسرچ ایسوسی ایٹس (دو جگہیں) (عارضی) ہسٹری ڈپارٹمنٹ

مفصلہ ذیل مقررہ اعزازی مشاہرہ پر

کیٹگری	ویلیو
اے	۱۴۰۰/- ماہانہ
بی	۱۶۰۰/- 〃
سی	۱۸۰۰/- 〃
ڈی	۲۰۰۰/- 〃

قابلیت

۱۔ لازمی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور میڈول انڈین ہسٹری کے میدان میں سے کسی میں انڈی پینڈنٹ مطبوعہ کام

۲ پسندیدہ ۴۵ سال سے کم عمر (مردوں کے لیے)
۵۵ سال سے کم عمر (عورتوں کے لیے)

۱۲۔ ریسرچ ایسوسی ایٹ (ایک جگہ) (عارضی) (انٹر ڈسپلینری سنٹر آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز) فیکلٹی آف سوشل سائنس۔

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰/- روپے ماہانہ (مقررہ)

قابلیت

۱۔ لازمی ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اسی پایہ کا اعلیٰ تحقیقی کام اور
ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کم سے کم سکنڈ کلاس (سیون پوائنٹ اسکیل میں سی) متعلقہ موضوع میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ماسٹرز ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری

۲۔ پسندیدہ: ا کمپیوٹر سائنس میں ڈپلومہ۔
ب سروے ریسرچ کا تجربہ۔
ج اسٹیٹسٹیکل ڈاٹا کو انٹرپریٹ کرنے کی قابلیت۔

ریسرچ اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) سینٹر فار پروموشن آف سائنس۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت ا پوسٹ گریجویٹ ڈگری سائنس یا سوشل سائنس کے مضامین میں اور ساتھ میں اچھے ڈویژن کے ساتھ سائنس کے مضامین میں بیچلرز ڈگری

(ب) ریفریشر کورس/کانفرنس/ورکشاپ وغیرہ کے انعقاد سے متعلق انتظامی امور میں مدد کرنے کا عملی تجربہ

ج تحقیق کا کچھ تجربہ۔

۱۴۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر [اردو] (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید
اے۔ ایم یو۔ گرلز ہائی اسکول

شرح تنخواہ ۱۶۴۰ - ۶۰ - ۲۶۰۰ ای۔ بی ۷۵ - ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت

۱۔ لازمی ۱۔ ایم۔ اے (اردو)
۲۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے ایجوکیشن میں ڈگری

۲۔ پسندیدہ ۱۔ اردو میں ایم۔ فل / پی ایچ۔ ڈی
۲۔ کسی تسلیم شدہ اسکول / کالج میں پانچ سال کا تدریسی تجربہ۔

۱۵۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) (ایک جگہ) (عارضی)
اے ایم یو گرلز ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ ۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۶۰۰ - ۵۰ - ۲۳۰۰ ای بی ۶۰ - ۲۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت

۱۔ لازمی ۱۔ سائنس میں گریجویٹ جس میں میتھمیٹکس بطور ایک مضمون کے رہا ہو۔
۲۔ ایجوکیشن میں ڈگری / ڈپلوما۔
۳۔ ہندی / اردو / انگریزی میں پڑھانے کی لیاقت

پسندیدہ ۱۔ میتھمیٹکس میں ماسٹرس ڈگری
۲ کسی تسلیم شدہ ادارے میں ہائی اسکول کی کلاسوں کو پڑھانے کا تجربہ۔

۱۶۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (فزکس) (ایک جگہ) (مستقل) اے ایم یو گرلز ہائی اسکول

شرح تنخواہ -/۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۶۰۰ - ۵۰ - ۲۳۰۰ - ای۔ بی - ۶۰ - ۲۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت: ۱۔ متعلقہ مضمون میں گریجویٹ ساتھ میں ایجوکیشن میں تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلوما۔

یا

بی۔ ایس سی / بی ایڈ آف ریجنل کالج آف ایجوکیشن، این سی۔ ای آر ٹی

یا

بی۔ ٹیک، بی۔ ایڈ آف ریجنل کالج آف ایجوکیشن، این سی ای آر ٹی۔

۲۔ اردو، ہندی اور انگلش میڈیم کے ذریعے پڑھانے کی لیاقت

۱۷۔ پرائمری ٹیچر (ایک جگہ) (مستقل) اے۔ ایم۔ یو سٹی برانچ اسکول۔
شرح تنخواہ۔ ۱۲۰۰ ۔ ۳۰ ۔ ۱۵۶۰ ۔ ای۔ بی۔ ۴۰ ۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت ۱۔ میٹرک ٹرینڈ
یا
ہائر سکنڈری ساتھ میں دو سال کا جے۔ بی۔ ٹی۔
یا
انٹرمیڈیٹ (یا ۲+۱۰ کورس) ساتھ میں ایک سال کا جے۔ بی۔ ٹی۔
یا
گریجویٹ اور ساتھ میں پانچ سال کا کسی پرائمری اسکول میں تدریس کا تجربہ (اس شرط کے ساتھ کے امیدوار آئندہ تین سال کے اندر تسلیم شدہ فارمل ٹریننگ کورس مکمل کرے گا/کرے گی۔
۲۔ اردو/ ہندی/ انگریزی میڈیم کے ذریعے تدریس کی قابلیت۔

۱۸۔ کمپیوٹر آپریٹر (سینیئر) (ایک جگہ) (مستقل) کمپیوٹر سینٹر۔
شرح تنخواہ۔ ۱۶۴۰ ۔ ۶۰ ۔ ۲۶۰۰ ۔ ای بی ۷۵ ۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱۔ لازمی سائنس میں بیچلرز ڈگری۔ ڈاٹا پروسسنگ مشین اور کمپیوٹر آپریشن کی دیکھ ریکھ کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔ آپریٹنگ ملٹی پروگرامنگ اینڈ ٹایم شیئرنگ سسٹم کا کم از کم ایک سال کا تجربہ۔
پسندیدہ:۔ پروگرامنگ کی جانکاری۔
نوٹ ۱۔ یونیورسٹی قوانین کے تحت تعلیمی لیاقت ان افراد کے سلسلے نرم کی جاسکتی ہے جن کو فل ٹایم کمپیوٹر آپریٹر ٹھیک اس سے نیچے کے گریڈ میں کام کرنے کا کم از کم دس سال کا تجربہ ہو۔

۱۹۔ فورمین (ایک جگہ) (مستقل) کیمیکل انجینرنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ۔ ۱۶۴۰ ۔ ۶۰ ۔ ۲۶۰۰ ۔ ای بی ۔ ۷۵ ۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱۔ لازمی۔ متعلقہ برانچ میں ڈپلوما اور ساتھ میں مختلف کیمیکل انجینرنگ لیباریٹریز میں ایکسپیریمنٹس کو آرگنائز اور کنڈکٹ کرنے کا ۸ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ: سائنس سے گریجویٹ اور کیمیکل پروسس کے ایکوپمنٹس کے اپریشن اور کمیشننگ، انسٹالیشن، فیبریکیشن کا تجربہ۔ لیتھ اور دوسری ورکشاپ مشین پر کام کرنے والے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ نمبر ا۔ غیر معمولی حالات میں امیدوار کی تعلیمی لیاقت میں نرمی برتی جاسکتی ہے جب کہ امیدوار کو طویل اور خصوصی مہارانہ تجربہ ہو۔
نوٹ نمبر ۲۔ اہل امیدوار کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (کلینکل پیتھالوجی) (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ ۔ ۱۵۱۰-۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای۔بی-۷۵-۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت بی۔ ایس سی اور ساتھ میں کسی منظور شدہ اسپتال کے کلینکل پیتھالوجی میں تین سال کا عملی تجربہ۔
نوٹ ا۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف اناٹومی۔
شرح تنخواہ ۔ ۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای بی -۷۵-۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
ا۔ لازمی۔ بی۔ ایس سی بائیولوجیکل سائنس کے ساتھ۔
۲۔ پسندیدہ ا۔ لیبارٹری ٹیکنک کے سبجیکٹ کی ٹریننگ/تجربہ مختلف ہسٹولوجیکل ٹیکنک اور اسپیشل نیورولوجیکل میتھڈس کا وسیع تجربہ۔
نوٹ۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا

۲۔ سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (نیفرولوجی) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔
شرح تنخواہ ۔ ۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای بی ۷۵-۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
ا۔ لازمی ا۔ بی۔ ایس سی۔
۲۔ کسی میڈیکل کالج کی بائیوکیمیکل لیب میں کام کرنے کا کم ازکم تین سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ ۔ ا۔ میڈیکل لیب ٹیکنالوجی میں ڈپلوما۔
۲۔ نیفرولوجی یونٹ میں کام کرنے کا تجربہ۔
نوٹ، اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۳۔ کارڈیو تھوریسک لیب ٹیکنیشن (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱۔لازمی بی۔ایس سی (بایولوجی گروپ)
ڈپلوما ان میڈیکل لیب ٹکنالوجی
۲۔پسندیدہ۔ پرفیوشنسٹ کی اعانت کا تجربہ (اوپن ہارٹ سرجری کے دوران)۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۴۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (انسٹرومینٹ ٹیکنالوجی) (ایک جگہ) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریکل انجینرنگ
شرح تنخواہ:۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت: الیکٹریکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور/ یا انسٹرومینٹ ٹیکنالوجی اور ساتھ ہی ساتھ الیکٹریکل انجینرنگ لیب میں الیکٹریکل انجینرنگ کے اسٹوڈنٹس کی پریکٹیکل کے سلسلے اعانت کا دو سال کا تجربہ۔

یا

صرف آٹھواں درجے پاس اور ساتھ میں الیکٹریکل انجینرنگ لیب میں الیکٹریکل انجینرنگ اسٹوڈنٹس کے پریکٹیکل کے سلسلے میں اعانت کا ۸ سال کا تجربہ۔

یا

بحیثیت الیکٹریشن/ وائرمین/ انسٹرومینٹ میکینک ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور ساتھ ہی ساتھ الیکٹریکل انجینرنگ لیب میں الیکٹریکل انجینرنگ اسٹوڈنٹس کے پریکٹیکل کے سلسلے میں اعانت کا پانچ سال کا تجربہ۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۵۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (اسٹورس) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت ۱۔ بی۔ایس سی
۲۔ اسٹورس، میڈیکل ایکویپمنٹس وغیرہ، خصوصیت سے اگر کسی میڈیکل کالج میں ان کی دیکھ ریکھ کا تجربہ۔

۲۶۔ سینئر انسٹرومینٹ میکینک (ایک جگہ) (مستقل) سینٹر آف میرین ... [illegible]

شرح تنخواہ:- ۱۴۰۰- ۴۰- ۱۸۰۰- ای بی- ۵۰- ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:- موٹر مکینک میں آئی۔ٹی۔آئی ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں آٹوموبائل انجینئرنگ میں پانچ سال کا پریکٹیکل تجربہ۔

یا

پڑھا لکھا (آٹھواں کلاس پاس) اور ساتھ میں آٹوموبائل انجینئرنگ میں دس سال کا پریکٹیکل تجربہ۔
نوٹ:- اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۷۔ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (دو جگہیں) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔
شرح تنخواہ:- ۱۳۲۰- ۳۰- ۱۵۶۰- ای بی ۴۰- ۲۰۴۰ اور دیگر الاؤنسز
قابلیت:-
۱- لازمی ہائر سکنڈری یا اس کے مساوی امتحان سائنس کے مضامین کے ساتھ۔
۲۔ پسندیدہ فزیالوجی لیب میں کام کرنے کا تجربہ۔
نوٹ:- اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۸- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (اسٹورس) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف ای این ٹی
شرح تنخواہ ۱۳۲۰- ۳۰- ۱۵۶۰- ای بی ۴۰- ۲۰۴۰- روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت ۱- ہائر سکنڈری (سائنس)
۲- کسی میڈیکل کالج/اسپتال میں اسٹورس کی دیکھ ریکھ کا تین سال کا تجربہ۔

۲۹ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف انستھیالوجی
شرح تنخواہ:- ۱۳۲۰- ۳۰- ۱۵۶۰- ای بی ۴۰- ۲۰۴۰- روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت- سائنس کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ اور ساتھ میں انستھیالوجی ریکارڈ میں تین سال کا تجربہ۔

۳۰- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آفتھلمولوجی
شرح تنخواہ ۱۳۲۰- ۳۰- ۱۵۶۰- ای-بی ۴۰- ۲۰۴۰- روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱- لازمی ۱- سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری
۲- کیمیکل/پیتھالوجی لیب کا یا کسی آئی ڈپارٹمنٹ کے فوٹوگرافی سیکشن میں کام کرنے کا سابقہ تجربہ۔

۲۔پسندیدہ : کسی میڈیکل کالج یا کسی آئی اسپتال کے ڈپارٹمنٹ آف آفتھلمالوجی میں کام کرنے کا تجربہ۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۱۔ ریسیپشنسٹ (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔
شرح تنخواہ ۱۲۰۰۔۳۰۔۱۵۶۰۔ای بی ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱۔لازمی ۔ گریجویٹ۔
اردو/ہندی/ انگریزی روانی کے ساتھ بولنے کی اہلیت۔
۲۔پسندیدہ ریسیپشنسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ۔
کلاسیفیکیشن، کیٹلاگنگ اور کمپیوٹرس کی جانکاری۔

۳۲۔ فٹر۔کم۔مستری (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن۔
شرح تنخواہ۔ ۹۷۵۔ ۲۵۔ ۱۱۵۰۔ای بی۔۳۰۔ ۱۵۴۰روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت
۱۔لازمی امیدوار ہائی اسکول پاس ہونا چاہیے اور متعلقہ برانچ آئی ٹی آئی کا سرٹیفیکیٹ رکھتے ہوں اور ساتھ میں کسی ورکشاپ میں کام کا تین سال کا تجربہ ہو۔
۲۔پسندیدہ ۔ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کو ریفریجریشن کورس اور ایرکنڈیشنر وغیرہ کی مرمت کا تجربہ ہو۔
نوٹ نمبر۱ منتخب امیدوار کو آر ایچ ٹی سی۔ جواں میں رہنا ہوگا۔
نوٹ نمبر۲ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۳۔امام (ایک جگہ) (مستقل) دفتر ناظم دینیات سُنّی
شرح تنخواہ۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۶۰۰۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰روپے ای بی ۶۰۔ ۲۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: ۱۔مستند عالم
۲۔ مستند قاری
پسندیدہ حافظ قرآن۔

۳۴۔ سینیر ٹکنیکل اسسٹنٹ (مائیکرو بایولوجی) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آفتھلمالوجی۔
شرح تنخواہ ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰۔ای بی ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت۔ ۱۔ لازمی۔ بی۔ ایس سی۔

ب مائیکرو بایولوجیکل لیب ٹیکنک کی جانکاری۔

پسندیدہ۔ لیب ٹیکنالوجی (مائیکرو بایولوجی) میں ڈپلوما۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۵۔ سینیر لیباریٹری اسسٹنٹ (اسٹورس) (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ۔ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔

قابلیت سائنس میں ہائر سکنڈری / سائنس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ۔ کسی میڈیکل کالج / اسپتال کے اسٹورس کی دیکھ ریکھ کا کم از کم تین سال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ اعلیٰ تجربے کے حامل افراد کے سلسلے میں تعلیمی لیاقت میں چھوٹ دی جاسکتی ہے۔

۳۶۔ کارپینٹر (ایک جگہ) (مستقل) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔

شرح تنخواہ ۹۷۵۔ ۲۵۔ ۱۱۵۰ ای بی ۳۰۔ ۱۵۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز

قابلیت ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی اور ساتھ میں پانچ سال کا تجربہ۔

یا

پڑھا لکھا اور دس سال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتداء سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے ۵/- روپیے (تمام اسامیوں کے لیے سوائے نمبر ۳۲ اور ۳۶ اسامی کے واسطے) اور تین روپیے (برائے اسامی نمبر ۳۲ اور ۳۶ کے لیے صرف) نقد ادائیگی فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے ایم یو کے نام واجب الادا ہو، بذات خود یا ۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر کا اپنا پتہ لکھا اور ٹکٹ چسپاں لفافہ ارسال کرکے بذریعے ڈاک حاصل کرسکتے ہیں

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۰ر جون ۸۷ء (آفس ٹائم تک) ہے
نامکمل اور تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی (آئی۔اے۔ایس)

رجسٹرار

(۱۰۰/۱۱۰)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس: ایس کے انٹرپرائزیز پریس دہلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۶ جولائی ۸۷ شمارہ ۷

مقالہ نگاروں کے لیے

* تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔
* عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔
* ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
* مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
* مسودہ بڑے سائز (20cm x 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے
* مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانیوالی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔
* اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھی ہو۔

زر سالانہ: انڈیا	...	Rs. 30.00
بیرونی ممالک	...	US $ 20.00 ہوائی ڈاک
		US $ 8.00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ: ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ:
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا۔

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارۂ تہذیب الاخلاق مسلم یونیورسٹی علیگڑھ: پریس: الیس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی

مندرجات

اداریہ

جب کسی قوم کی بداعمالیاں اس حدتک بڑھ جاتی ہیں کہ وہ مجموعۂ خیر ہونے کے بجائے شر کا پوٹ بن جاتی ہے تو عذاب الٰہی اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ عذاب الٰہی کبھی اُس شکل میں نازل ہوتا ہے جس شکل میں قوم عاد وثمود، صالح و لوط، بنی اسرائیل اور فرعون پر نازل ہو چکا ہے اور کبھی اِس شکل میں کہ پوری کی پوری قوم ریا، نفاق، ناشکری اور ناخداترسی کی زندہ تصویر بن کر رہ جاتی ہے۔ اِس وقت اگر دنیا کے مسلم معاشرے پر غائر نظریں ڈالی جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ معاشرہ عذاب الٰہی کی سخت گرفت میں ہے اور پوری کی پوری مسلم قوم الا ماشاء اللہ اُن مذمومات کا شکار ہے جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا جا چکا ہے۔

جب پورے مسلم معاشرے کا یہ عالم ہو تو نظریں بے اختیار اس طبقے کی طرف اٹھتی ہیں جن کو محرم شرع مبین سمجھا جاتا ہے اور ان سے بجا طور پر یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ اس عالم میں جب کہ پوری کی پوری قوم عذاب الٰہی کی گرفت میں ہے، یہ طبقہ منارۂ نور کا کام دے گا اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ دکھائے گا۔ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم اس طبقے کی روش پر انگشت نمائی کریں لیکن اسی طبقے کے ایک اہم اور معتبر فرد شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کے درج ذیل الفاظ ہمارے لیے تازیانۂ عبرت کا کام کرتے ہیں اس لیے ہم ان کو نقل کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:

> "یہ دینی طبقہ، دنیا اور عوام کالانعام کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتا، جاہ کا مظاہرہ اپنے ہی طبقہ کے لوگوں میں کرتا ہے، انہیں کی غیبت، عیب جوئی، تحقیر اور ان میں سے بعض کو گرانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ان پر اپنی بڑائی، عزت، اپنے تقوے اور تزکیے کے اظہار کے لیے راستہ صاف ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے ہمیں بڑا بنا کر رکھیں، ہماری بات مانیں، ہم پر کوئی اعتراض نہ کریں یا تو نظامت، امارت ہمارے ہاتھ میں ہو یا ہمارا عہدہ بے شک کوئی نہ ہو لیکن قوت حاکمہ ہمارے ہاتھ میں ہو اور شیطان اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ان قلبی شیطانی امور سے وہ متقی، زانیوں، شرابیوں اور چوروں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔"

اس بھیانک تصویر کو دیکھ کر ہمارے جیسے دنیا دار صرف یہی کہہ سکتے ہیں ع

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

جہاں تک ہم دنیا داروں کے معاشرے کا تعلق ہے اس کے مفسدات کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہاں چوری ہے مگر دانشوری کا لبادہ اوڑھے، جہالت ہے مگر علمیت کی نقاب ڈالے، ریاکاری ہے مگر خوش خلقی کا پیرہن پہنے، حسد ہے مگر تبسم دنداں نما کی ردا اوڑھے، بغض وعناد ہے مگر

اصولوں کے لطف فریب لفافوں میں ملفوف ایک دوسرے سے جلنے اور کڑھنے کا شدید جذبہ ہے مگر تحقیق و تدقیق کے چھوٹے ناموں میں پردہ پوشی، ایک دوسرے کو پھلتے پھولتے، ترقی کرتے اور آگے بڑھتے نہ دیکھ سکنے کا جذبہ ہے مگر قواعد و قوانین کی عبائے رنگین میں ملبوس۔ یہ سب عذابِ الٰہی کی وہ شکلیں ہیں جن سے ہمارا معاشرہ اس وقت دوچار ہے۔

۔ اسی عذاب الٰہی کے نتیجے میں چند برسوں قبل ہمارا ایک ایسا دینی مدرسہ دو حصوں میں منقسم ہو چکا ہے جو عالمگیر شہرت و عظمت کا حامل تھا۔ اسی پایے کا ایک اور دینی مدرسہ آپسی کشاکش و کشمکش کا شکار ہے جس کا شکار ہو کر اوّل الذکر مدرسہ تنِ بے جان بن چکا ہے۔ ایسے ہی تباہی کے بادل ہمارے ایک موقر اور شاندار ماضی رکھنے والے ایک علمی ادارے پر بھی منڈلا رہے ہیں جو اَب سے بہتر برس قبل بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ قایم کیا گیا تھا وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب اس کے بھی دو ٹکڑے ہو جائیں۔ وہ تمام دینی اور سیکولر مدرسے اور اسکول جو صرف مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں آپسی مناقشے، اختلافات، مقدمہ بازی، پارٹی بندی اور معاملہ نافہمی کی وجہ سے تباہی کے دھانے پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا تعلیمی ادارہ ہو جو صرف مسلمانوں کے زیر انتظام ہو اور اس عذاب الٰہی سے بچا ہوا ہو۔

ہم جس معاشرے میں بود و باش رکھتے ہیں وہ سوسائٹی کے کریم پر مشتمل کہا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مفسدات کی کریم بھی دستیاب ہونے کی کان یہی ہے۔ اسی لیے یہاں ناانصافی ہے، ناخداترسی ہے، جانتے بوجھتے دوسروں کا حق غصب کر لینا ہے۔ کسی کی پیشرفت کو ترقی معکوس میں بدل دینے کا جذبہ ہے۔ جو چیز خود کو حاصل نہیں ہو سکی ہے اسے کسی دوسرے کو نہ ملنے دینا کا ہوکا ہے۔ اگر کسی کی تصانیف ہم سے زیادہ ہیں تو ہم اس کی مطلق کوشش نہ کریں گے کہ ہم دن رات محنت کر کے اس شخص کے ہم سر بن جائیں بلکہ ہماری ساری کوشش یہ ہوگی کہ ایسے شخص کے لکھنے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ وہ شخص جن کتابوں سے مواد لے رہا ہے ان کو لائبریری سے اپنے نام جاری کروا کے مہینوں کے لیے غایب کر دیں گے خواہ ان کو پڑھیں خواہ صرف الماری کی زینت بنائے رکھیں۔ ہم اس شخص کو ایسے مسایل میں الجھا دیں گے کہ وہ ان ہی سے نبرد آزما ہوتا رہے اور اپنے اصل و حقیقی مقصد کو فراموش کر بیٹھے۔ اور اگر کوئی شخص "بے حیائی کا لوٹا" باندھے کام کرتا ہے جاتا ہے تو پھر اس کے کاموں کی تخفیف کی جائے، اگر اس کو کوئی علمی اعزاز ملے تو اس کا نہ صرف یہ کہ مذاق اُڑایا جائے بلکہ اس انعام کو توہین یا دشنام کا مصداق بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

اگلے زمانوں میں افراد عذاب الٰہی کی گرفت میں ہوتے قوم اس سے محفوظ و مامون ہوتی مگر ہمارے زمانے کا تو یہ عالم ہے کہ جو شخص اس عذابِ الٰہی کی گرفت سے محفوظ ہے وہ ہمارے معاشرے کا فرد ہی نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ وہ بغض و عناد، حسد اور جلن، ریاکاری اور نفاق کے اُس "جوہر خصوصی" سے عاری ہوتا ہے جو ہمارے معاشرے کی پہچان ہے۔ خدا جانے اس عذابِ الٰہی کی گرفت سے ہم کب آزاد ہوں گے اور ہمارے معاشرے میں سچی للّٰہیت، خدا ترسی اور شکر گزاری کی کرن کب پھوٹے گی؟

کبیر احمد جائسی

مکتوب

پروفیسر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ) بنام شیخ الجامعہ

IMPERIAL COLLEGE OF SCIENCE AND TECHNOLOGY

Abdus Salam FRS
Professor of Theoretical Physics

Department of Physics Prince Consort Road, London SW7
Telephone 01-589 5111 Telex: 261503

[illegible]

[illegible]

یہ معلوم کرکے مجھے ازحد خوشی ہوئی کہ آپ کی زیر سرپرستی مسلم یونیورسٹی کا سینٹر فار پروموشن آف سائنس "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے عنوان سے ۲۹ مارچ ۸۷ء سے ایک سہ روزہ کانفرنس کا انعقاد کرنے جا رہا ہے بلاشبہ ایک انتہائی مفید دانشمندانہ اور جرأت مندانہ قدم ہے جس کے لیے میں آپ اور سینٹر دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

میری دعا ہے کہ یہ کانفرنس اپنے مقصد کے حصول میں نہ صرف کامیاب ہو، بلکہ اپنے دیرپا اثرات بھی چھوڑ جائے۔

میں آپ کی ذات گرامی کو یہ بھی یقین دلانا چاہوں گا کہ ہمارے دونوں ادارے تھرڈ ورلڈ اکاڈمی آف سائنس اور سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس، کانفرنس میں منظور ہونے والی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپکے سینٹر فار پروموشن آف سائنس کو ہر ممکنہ تعاون اور امداد دینے کی کوشش کریں گے۔

میری طرف سے کانفرنس میں شریک ہونے والے علمائے کرام اور دوسرے مہمانوں کو ہدیہ سلام خلوص پیش کرنے کی زحمت کیجیے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
[illegible]

طریقۂ زندگی

سرسید احمد خاںؒ

قوموں کی عزت یا ذلت، اُن کی رسم و رواج، اور ان کے طریقۂ زندگی اور کبھی کبھی ان کے مذہب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔ تمام قوموں میں بہت سی رسمیں وحشیانہ اور ناتربیت یافتہ زمانے کی اب تک چلی آتی ہیں۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے ان رسموں کو تراش خراش کر ایسا کر لیا ہے کہ ان میں وحشیانہ پن مطلق نہیں رہا۔ بلکہ نہایت فرحت بخش اور دلکش ہو گئی ہیں؛ اور ناتربیت یافتہ قومیں اب تک بدستور وحشیانہ طور سے ان کو برتتی آتی ہیں؛ اور اسی لیے پہلی قومیں پچھلی کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

اکثر قوموں نے قدیم زمانے میں طریقۂ زندگی بمقتضائے آب و ہوا ہر ایک ملک کے اختیار کیا تھا، جو اکثر نہایت سادہ و حقارت آمیز تھا۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے اس میں اصلاح کرتے کرتے اعلیٰ درجے کی ترقی اور شائستگی پر پہنچا دیا؛ اور ناتربیت یافتہ قومیں اسی جہالت میں پڑی رہیں اور اس لیے پہلی قوموں کی آنکھ میں ذلیل و خوار ہیں۔

یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے کہ بسبب نہ ہونے فن و ہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقہ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا وہ اس زمانے میں حقیر نہ تھا، مگر حال کے زمانہ میں ذلیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس قدر فن و ہنر اور صنعت کاری نکلتی آئی، اسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز و سامان سے اپنے طریقۂ زندگی کو آراستہ کیا؛ اور جنھوں نے ایسا نہ کیا، وہ ویسے ہی حقیر و ذلیل ناتربیت یافتہ ہیں۔

طریقۂ زندگی سے قوموں کی ذلت اور عزت کا ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر ہم چند مثالوں سے اس کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کنجروں کی قوم کو د
ایک لنگوٹی باندھے رہتی ہے، اور نہایت میلا بدن اور نجس ہاتھ پا
رکھتی ہے، اور نہایت میلے بدبودار برتن استعمال میں لاتی ہے۔ ؛
ان کی نہایت کثیف ہے اور طرز کھانے کا بھی ایسا بُرا ہے، جسے د
گھن آتی ہے۔ پس وہ قوم صرف اپنے طریقۂ زندگی کے ذلیل ہو
سبب ہماری آنکھ میں کیسی ذلیل و خوار معلوم ہوتی ہے۔

اب ان قوموں کو دیکھو جو اُن سے درجہ بدرجہ طریقۂ زن
اصلاح میں ترقی کرتی گئی ہیں، مثلاً چمار جن کا لباس اور طریق زند
سے بدرجہا اچھا ہے وہ ہماری آنکھ میں ایسے ذلیل نہیں ہیں۔ چمار
کی بہ نسبت عام غریب گنواروں کا لباس اور طریقہ زندگی بدرجہا
عمدہ اور اچھا ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں چنداں ذلیل نہیں۔ ہم کبھو
کے گھر بھی جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کا پانی بھی پیتے ہیں۔ ان کے گھر کی پکی ہو
روٹی بھی کھاتے ہیں، اور کچھ نفرت نہیں کرتے۔ علاوہ ان کے، تین قو
اور ہندوستان میں ہیں جو اپنے تئیں مؤدب و مہذب، تربیت یافت
شائستہ، سمجھتی ہیں۔

ہندو، مسلمان، انگریز، ان تینوں قوموں کا جو طر
لباس، اور طرزِ زندگی، اور کھانے پینے کی رسم، اور اُٹھنے بیٹھنے کی عاد
ہے، اس سے تمام لوگ ہندوستان کے بخوبی واقف ہیں مگر اس م
کچھ شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں سے جس قوم کا طریقہ اعلیٰ ہے
وہ قوم باقی دو قوموں کو ایسا ہی ذلیل اور ناتربیت یافتہ اور قابل
نفرت کے سمجھتی ہے جیسے کہ ہم اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتے ہیں۔

مسلمان اپنی دانست میں اپنے لباس اور اپنی مجلس میں نہایت آراستگی اور شان و شوکت کرتے ہیں اور اپنے دسترخوانوں کو انواع انواع طرح کے لذیذ کھانوں سے اور خوبصورت خوبصورت سونے اور چاندی اور چینی کے برتنوں سے آراستہ کرتے ہیں مگر جو قوم کہ ان سے بھی زیادہ لباس اور کھانے پینے کے طریق میں زیادہ صفائی رکھتی ہے، وہ ان کو اسی حقارت اور ذلت سے دیکھتی ہے۔

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں، اور ہر دفعہ رکابیاں اور چھری، کانٹے، چمچے بدلتے جاتے ہیں، جب وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کو نہایت نفرت و کراہت آتی ہے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے، اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہونچا دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر کر کر اس کو تسلیم کرتے ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعث ذلت ہے، اگر مسلمان یہ گوارا کریں کہ مرغن کھانے، جس سے ہاتھ اور منھ بھر جاتا ہے، اور جو باعث نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے، چھوڑ دیں، اور جو کے بن چھنے آٹے کی سوکھی روٹی، ککڑی یا کھجور سے کھالیا کریں، تو ان بزرگوں کی پوری پیروی ہوگی، اور اس وقت میں کوئی بھی ہاتھ سے کھانے پر نفرت نہ کرے گا۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔

ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو اپنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ہم ان کو استعمال کریں، اور عملی طور پر اس کا شکر بجا لاویں؛ اور جب کہ ہم یہ خیال کریں کہ ان نعمتوں کی چیزوں کا ہم بنظر تکبر و غرور استعمال نہیں کرتے، بلکہ بطور ادائے شکر ولی النعم استعمال کرتے ہیں اور مسلمانوں کی قوم کی غیر قوموں کی نگاہ میں جو ذلت ہے، اس سے نکالتے ہیں جس میں اسلام کی بھی عزت ہے، تو اس وقت تو ہم چمچہ اور چھری کانٹے سے کھانا مندوبات اور مستحبات سے کم نہیں سمجھتے۔

اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر معدنی اور دیگر وسائل رکھنے کے اپنی ساری قوم میں فنی مہارت پھیلا سکتا ہے، اگر چین والے اپنی قوم کو اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی فنی مہارت سیکھے گا اور اسے بڑھائے گا۔ اگر یہ سب قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لیے سبق نہیں ہے۔

——— عبدالسلام

گفتند یافت می نشود ـــــ

سید حامد

انسان کا خمیر آرزو اور جستجو سے اٹھا ہے۔ اُسے انسان کیوں کہیے جس کا دل جستجو کی بے تابی اور آرزو کے تلاطم سے محروم ہو؟ حرارت زندگی کی نشانی ہے حرارت نہیں رہتی تو زندگی کہاں رہتی ہے؟ لہو بدن میں دوڑتا رہتا ہے، ہر بُنِ مُو کو سیراب، سرگرم اور شاداب کرتا ہوا، گرماتا ہوا، غذا فراہم کرتا ہوا۔ لہو نے دوڑنا اور بدن کے کونے کونے کو کھنگالنا بند کر دیا تو بدن ایک آن میں سرد ہو گیا؛ مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ ہوا نے جیوں ہی پھیپھڑوں میں آنا جانا ترک کر دیا وہیں سانس کا ڈورا جس پر زندگی نرکھبر ہے لوٹ گیا۔ دماغ نے جیسے ہی احساس کے ان ہزارہا قاصدوں پر اپنے دروازے بند کر دیے جو ہر آن اُس رابطے کی تصدیق کرتے ہیں جو انسان کو کائنات سے ہے ویسے ہی زندگی یا کم ازکم باشعور زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ خون کے سفید ذرّات پہرہ داروں کی طرح ہر وقت مستعد رہتے ہیں کہ اگر چوری چھپے جراثیم جسم میں داخل ہو جائیں تو اُن کو دوڑ کر پکڑ لیں، تحلیل کر دیں۔ دل جو کہ زندگی کی رزم گاہ میں سپہ سالار کی حیثیت رکھتا ہے (آپ کہیں گے کہ یہ سپہ سالاری تو دراصل دماغ کے حصّے میں آئی ہے، آپ کا اعتراض تسلیم لیکن جسم کے لشکر کو رسد تو دل ہی فراہم کرتا ہے) اپنی بے خوابی اور بے تابی بند کر دے اور سکون پاکر خاموش ہو جائے تو زندگی کے نقش قدم بھی دستیاب نہ ہوں گے۔

ظاہر ہوا کہ زندگی عبارت ہے حرکت سے آرزو سے جستجو سے۔ جہاں ان تینوں میں سے کسی کا سراغ نہ ملے تو جان لو کہ وہاں موت کی قلمرو شروع ہو گئی۔ جس انسان کے دل میں آرزو نہیں، جس کو جستجو نہیں، جو آگے بڑھنے کے لیے بے چین نہیں وہ انسان نہیں مٹی کا ڈھیر ہے۔

زندگی نے ارتقا کی منزلیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں۔ کی ہیں۔ اس نے جو کچھ پایا ہے جستجو کے پرچم کے تلے پایا ہے۔ انسان نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر مظاہر قدرت کو جاننے اور سمجھنے کی کوششیں کی ہیں، لگاتار، لامتناہی کوششیں۔ اس نے پہلے اپنے گرد و پیش کو دیکھا، برتا سمجھا اور پھر آگاہی اور جانکاری کے دائرے کو وہ بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔ اس کا علم کائنات کا احاطہ کرنے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتا رہا ہے۔

بڑھاپے میں اکثر جوڑوں میں درد ہونے لگتا ہے، جسمانی نقل و حرکت دوبھر ہو جاتی ہے، سفر سے جی گھبراتا ہے۔ دماغ بھی بوڑھی ہڈیوں کی روش اختیار کر لیتا ہے۔ علم اور روشنی سے اسے خفقان ہونے لگتا ہے۔ وہ بے حرکتی اور آرام طلبی اور تقلید میں عافیت دیکھتا ہے۔ موٹے طور پر انسان اگر نقل و حرکت سے جی چرانے لگے تو سمجھ لو کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے؛ کوئی جماعت اگر اگلوں کے تجربے یا اُن کے افکار کو مدّنظر بنا لے تو جان جاؤ کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے اور اب لمحہ اس کی منزلِ مقصود ہے گزرنے والا ہر نیا دن اسے مدعو موت کے قریب لا رہا ہے۔ مسلمانوں کو بے شمار صدیاں اس حالت میں گزر چکی ہیں۔ کوئی آٹھ سو سال ہو چکے انھوں نے دفاع کا حوصلہ شکن اور دانش دشمن طریقہ اختیار کر لیا اور بالآخر آگاہی، جستجو، ابتکار، اختراع، ارتقا، آرزو، حرکت

ریشی قدمی سے انہوں نے منہ موڑ لیا۔ نادانی میں انہوں نے اپنے
ین کی تحقیر کی۔ ایسی ویسی تحقیر! گویا وہ گرم خانہ کا پودا ہے جو
زہ ہوا کو چھوتے ہی مرجھا جائے گا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھنے سے کبھی کوئی
اعت آگے نہیں بڑھی۔ بڑھتی بھی کیسے کہ اس کی صورت حالات کو ہی
یش رفت سے بیر تھا۔

زندگی نام ہے نہضت کی آگہی کا، جستجو کا دریابی اور
بے تابی کا، جستجو نہ صرف خوب سے خوب تر کی بلکہ دور سے دور
تر کی در اصل جستجو کا ہدف جتنا عسیر الحصول ہو، جستجو کو اتنی
ہی زیادہ مہمیز لگتی ہے۔ جستجو میں زندگی ہے، آرزو میں تابندگی
ہے، حرکت میں برکت ہے، جستجو نفع نہیں ڈھونڈتی نہ نقصان سے
گریز کرتی ہے۔ جستجو کی دُنیا میں جو کچھ رکھا ہے، وسیلے میں رکھا
ہے، کوشش میں رکھا ہے۔ حصول مقصد سے جستجو کا رشتہ
ضمنی اور ثانوی ہے۔ حصول مقصد ایک بہانہ ہے حرکت، آرزو
اور جستجو کو سرگرمِ عمل رکھنے کا۔ جستجو منتہا ہے، جستجو مدّعا ہے

جستجو در اصل قایم بالذّات ہے۔ مقصد کے حصول پر جو شے منحصر
ہو، اسے جستجو کون کہے گا۔ وہ جستجو کا خاکہ ہے پھیکا اور
بے آب و رنگ۔ جستجو سفر ہے اور منزل ٹھہراؤ ہے اور
موت، جستجو کی بے تابی۔ اس کی سیمابی کیفیت کا نقشہ پیر رومی
نے کھینچا ہے:

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آن کہ یافت می نشود آنم آرزو است

لوگوں نے کہا کہ "ہم نے لاکھ ڈھونڈا کہیں سراغ نہیں ملا"
اس نے جواب دیا کہ جس کا سراغ نہ ملے اسی کی تو ہم کو
آرزو ہے۔"

کتنا دلکش، کیسا حوصلہ انگیز ہے یہ نصب العین، کتنا
ہوش ربا اور جمود شکن ہے عمل اور جستجو، حرکت اور آرزو
کا یہ منشور۔

اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اسی کام کے
کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی
اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی
ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ جیشِ اُسامہؓ
کی تیاری کے لیے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیقؓ نے
حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ
احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سچا اصول مذہب
اسلام کا ہے۔

—— سرسید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد نمبر ۶ - شمارہ ۷ (جولائی ۸۷ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریۂ تعلیم

عتیق احمد صدیقی

قومی تعمیر کا کام ٹھوس تعلیمی بنیادوں پر ہی انجام دیا جاسکتا ہے جیسا تعلیمی نظام ہوگا، ویسے ہی ذہن تیار ہوں گے اور تعلیم گاہوں میں جیسے ذہن تیار ہوں گے ویسی ہی معاشرے کی اُٹھان ہوگی۔ آج کی تعلیم گاہیں کل کے ذمّہ دار شہریوں کی سمت و رفتار کا تعین کرتی ہیں۔ آزاد، بیدار اور باشعور قوموں نے اگر ایک طرف معاشرے کی نبض پر انگلیاں رکھی ہیں تو دوسری طرف تعلیم گاہوں کے نظام اور ان کی کارکردگی کو بھی قومی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ نظامِ تعلیم اور تعلیم گاہوں کو نہ صرف اپنی روایات اقدار اور نظریات کی پاسبانی کا ذریعہ بنایا ہے، بلکہ مستقبل کے خوابوں کی تعبیر بھی اُنہیں کے ذریعے تلاش کی ہے۔ اپنے حوصلوں، امنگوں اور خواہش تعمیر کی صورت گری کے لیے تعلیم گاہوں کا ہی سہارا لیا ہے۔

مگر کسی بھی مفید نظام کی طرح نظامِ تعلیم بھی خود رو نہیں ہوتا اور ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ زمانۂ دراز سے کسی نظامِ تعلیم کے قایم کرنے میں ہمارا اختیار نہ رہا۔ اٹھارویں صدی ملک میں افراتفری کی صدی تھی۔ سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی سبھی ادارے بدنظمی اور ابتری کا شکار تھے۔ ان میں سے کسی بھی ادارے سے مفید ثمرات پیدا نہیں ہو رہے تھے۔ گویا پورا نظام کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو استحکام نصیب ہوا، ایک علاقے میں سیاسی غلبہ حاصل ہوگیا اور پورے ملک پر اپنی حکمرانی کے آثار نظر آنے لگے تو انہوں نے تعلیم کی طرف بھی توجہ کی، تاکہ اس سمت سے بھی اپنی گرفت کو مضبوط کیا جاسکے۔ فارسی اور ادب کی تعلیم کے لیے وارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں سے عام مشرقی علوم سے (جن میں سنسکرت بھی شامل تھی) دلچ ۱۷۹۱ء میں جانتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج قا پرانے ہی نظامِ تعلیم کی تجدید تھی جو غیروں کے ہاتھوں عمل میں آ کے مقاصد دوگونہ تھے:

۱۔ یہاں کے باشندوں کی تعلیم کا انتظام ہو اور ان
قدیم ذہنی شائستگی حاصل ہو

۲۔ انگریزوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو یہ علوم سے واقف ہو، ہندو مسلم تہذیب، ان کے ع اور رسم و رواج کو سمجھے اور اس طرح ملکی زندگی م ہو کر اپنی حکومت کے استحکام کا سبب بنے۔

انہیں میں مستشرقین کی ایک جماعت بھی پیدا ہوئی جو ہند علوم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، ان میں یورپی علوم پیوند کاری کرنا چاہتی تھی تاکہ دونوں قوموں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کی راہیں ہموار ہوں اور ہندوستان کے لوگ ی کے علوم مفیدہ سے بہرہ یاب ہوں۔ لیکن انیسویں صدی کے شر میں ہی اس نقطۂ نظر میں تبدیلی آگئی۔ مستشرقین کی اس حکمت سخت مخالفت شروع ہوگئی۔ اس میں کئی عوامل کارفرما تھے۔ عیسائی مشنری جماعتوں کو اپنی تہذیب، مذہب اور علوم کی بر

احساس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی، اخلاقی اور سماجی گمراہی میں مبتلا ہیں اور انہیں سچے مذہب میں لانا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حکمرانوں کو خدشہ پیدا ہوا کہ اگر مشرقی نظام تعلیم قایم رہا تو ان کے سیاسی عزائم کی تکمیل میں دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں اور اس کے ختم کرنے کے بعد مغربی اثرات کے ذریعے ہندوستانی جسم و روح کو تسخیر کرنا آسان ہوگا۔ دکھاوے کے لیے الزام یہ تراشا گیا کہ مشرقی علوم بیکار محض ہیں (اور مادّی تہذیب کی پیش قدمی میں اب اُن کی حیثیت مشتبہ ہو بھی گئی تھی) اور ان سے ہندوستان کی جہالت، تعصب اور توہم پرستی میں اضافے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جس نئی تعلیمی حکمت عملی کا آغاز ہوا اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کیا جائے۔ لارڈ میکالے کے الفاظ میں:

"ایک ایسا طبقہ جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق
کے درمیان جس پر ہم حکمراں ہیں، ترجمان بن جائے —
ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے
ہندوستانی مگر اپنے مذاق، اخلاق، خیالات
اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہوں۔"

کوئی بھی نظام تعلیم حکومت یا مذہب ہی کی قوت پر قایم کیا جاسکتا ہے۔ اس مجوزہ نظام کی پشت پر حکومت کی قوت نے کام کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کی واقفیت ضروری قرار دی گئی۔ رفتہ رفتہ تعلیمات کے محکمے قایم کیے گئے اور ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک کا ایک مربوط نظام پورے ہندوستان کے لیے مرتب کیا گیا۔

یہ امر صرف حکومت اور انگریزوں تک ہی محدود نہیں رہا۔ زمانے کی ہوا کا رُخ دیکھ کر بہت سے دور اندیش اور جدت پسند ہندوستانیوں نے بھی اس نئے نظام کو اختیار کیا، بلکہ اس کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔

جزوی طور پر انگریزوں کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ اُن کے سیاسی غلبہ کو استحکام حاصل ہوا، یورپ کا تمدن ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہماری تہذیب کے سوتے خشک ہونے لگے، ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا تعلق اپنی تاریخ اور تہذیب سے منقطع ہو گیا، اقدار پامال ہو گئیں۔ مادیت کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تمام روحانی رجحانات رخصت ہو گئے۔ مذہب بھی زد میں آیا، لیکن ان نقصانات کے ساتھ ہی نئے علوم کی برکات بھی نمودار ہونے لگیں۔ روشن خیالی، وسیع النظری، جمہوریت پسندی نے آزادیٔ وطن کی خواہش کو جنم دیا۔ غلامی اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کو محسوس کیا جانے لگا۔ مغربی تہذیب کے تضادات اور مضرات عیاں ہونے لگے۔ ماضی کی بازیافت اور مذہب و تہذیب کے تحفظ کا احساس بڑھنے لگا۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے حالات نے بالکل نیا رُخ اختیار کر لیا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر اور ایسے ہی دوسرے رہنماؤں کی قیادت میں ہندوستانی عوام ایک نئی منزل کی جانب گامزن ہو گئے۔

گاندھی جی صرف ایک سیاسی تحریک کے رہنما نہیں تھے، بلکہ وہ صحیح معنی میں مدبر اور قائد تھے۔ سیاسی رہنمائی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی تربیت، وسیع تر بنیادوں پر قومی تعمیر اور ایک نئے مستقبل کی تشکیل کے پروگرام بھی چلا رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک عدم تشدد، عدم تعاون اور سول نافرمانی وغیرہ کے تصورات کافی مقبول ہو چکے تھے۔ خلافت تحریک نے ان کو اور زیادہ عام کر دیا۔ انگریزی نظام تعلیم سے پہلے ہی بد دلی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے ناقص اور ضرر رساں ہونے کا احساس بھی دلوں میں تھا۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے آزاد قومی تعلیم کا نعرہ دیا کہ یا تو تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں اور قومی تعمیر کے نئے تقاضوں کے مطابق نیا نظام تعلیم قایم کریں یا طلباء امدادی اداروں کا بائیکاٹ کریں۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد یہ پیغام لے کر علی گڑھ پہنچے۔ طلبا پس و پیش میں تھے۔ اتنا بڑا فیصلہ کیسے کریں۔ اس فیصلے کے نتائج بھی کچھ کم مہیب نہ تھے لیکن علی برادران کے پر جوش خلوص نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ذاکر حسین خاں جو اس وقت ایم۔ اے کے طالب تھے اور جونیئر لکچرر بھی، خود اس طوفان

میں کو دپڑے اور طلباء کی ایک بڑی تعداد کو کالج چھوڑنے پر آمادہ کرلیا۔ لیکن طلباء کا بجا طور پر یہ مطالبہ تھا کہ اگر اس ناقص تعلیم کو ترک کرنا ہی ہے تو قوم پر لازم ہے کہ وہ بہتر متبادل تعلیم کا انتظام کرے اور ایسے ادارے قایم کرے جہاں یہ طلبا داخل ہو کر اپنی تعلیم کی تکمیل کرسکیں تحریک خلافت کے اکابر ایسا ایک ادارہ قایم کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی جامع مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح مولانا محمود الحسن صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اگرچہ عالم بے سروسامانی کا تھا لیکن مقاصد بلند تھے۔ یہ عام درس گاہ نہیں تھی بلکہ حریت پسندوں کا قلعہ، قومی نظریات اور قومی تشکیل نو کی تجربہ گاہ تھی۔ "سارے ملک سے جوشیلے نوجوان قومی تعلیم کے اس ادارے کی خدمت کرنے کے لیے بڑی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے تھے۔"[1] خود مولانا محمد علی جوہر یہاں اسلام اور وطن کے تصورات پر لکچر دیتے اور نوجوانوں میں نیا ولولہ پیدا کر دیتے۔ باضابطہ کلاسیں نہیں تھیں، لیکن:

> "تقریباً ایک سال تک طلبا کو چھ ہفتے کے ایک کورس میں شرکت کرنا پڑتی جس میں انھیں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے اصول اور طریق کار کی تعلیم دی جاتی تاکہ وہ ملک میں دورے کرکے ان تحریکوں کی تبلیغ واشاعت کرسکیں۔ اس کورس کو ختم کرکے وہ وفود کی شکل میں ملک کے مختلف حصوں میں جاتے تھے۔"[2]

ذاکر صاحب ان سیاسی وفود میں کبھی نہیں گئے لیکن اس تربیت نے ان کے قومی جذبات کی سرشاری کو پختہ تر کر دیا۔ وہ جلد ہی جامعہ کے اساتذہ میں شامل ہوگئے۔ جامعہ کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی بن گئے اور شعبۂ نشرواشاعت کے انچارج بھی۔ یہیں سے ان کے تعلیمی تجربات کا وہ دور شروع ہوا جو مسلسل ۳۶ سال تک جاری رہا تاآنکہ وہ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے۔

یہ طویل دوران کے تعلیمی تجربے، تعمیر و تشکیل، نظریہ سازی اس کے عملدرآمد کا دور تھا۔ ساتھ ہی یہ بے لوث خدمت، بے ایثار و قربانی، غیر متزلزل ایمان و یقین اور کڑی آزمائشوں کا دور تھا۔ انہوں نے اس تمام مدت میں خود کو سیاست سے، عہدے، مادی منفعتوں سے دور رکھا۔ یوں ہی نہیں کہ مواقع نہیں لیکن تعلیم اور جامعہ ملیہ سے انہوں نے جو عہد استوار کیا تھا وہ اس وقت تک قایم رہے جب تک ان کی صحت نے ہی جواب دیا۔ یہ مستقل مزاجی ان کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ نے اپنی عمر کے چودھویں سال میں جو مضمون لکھا، اسی میں ان کی نظر نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> (طالب علم) اس دنیا میں کچھ ترقی نہیں کرسکتا، وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا، جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی مشکلوں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالب علم کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا خیال کرے گا تو وہ کچھ بھی نہ کرسکے گا بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کیے جانا چاہیے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا۔"[3]

اور آگے چل کر انہوں نے جو ایک کہانی لکھی "مرغی کا نرالا بچہ" اور جو بعد میں مکتبہ جامعہ کی اردو ریڈر میں شامل ہے اس میں بھی انہوں نے اسی خیال کو بچوں کے ذہن نشین کرایا۔ مرغی کا بچہ اپنی ناتواں چونچ سے انڈے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آتا ہے نتیجہ! "کھٹ کھٹ کرتے رہو، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا!" تعلیم بھی کھٹ کھٹ کرنے ہی کا عمل ہے کہ اس میں جلدی نہیں کی جاسکتی۔ بچوں کے ذہن کی تشکیل ایک خاص رفتار سے ہی ہوسکتی ہے۔ الغرض

---

[1] محمد مجیب: ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۲۸ [2] ایضاً ص ۲۹ [3] ایضاً ص ۱۳

اجتماعی تعلیمی کوششوں کے نتائج فوری برآمد نہیں ہوتے۔ صبر و تحمل کے ساتھ متواتر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب نے بے انتہا نامساعد حالات میں اپنے کام کو جاری رکھا۔ وہ آزمائش کی دھیمی آنچ میں تپتے رہے، کڑھتے رہے اور سنورتے رہے۔ اس پس منظر کے ساتھ ان کے تعلیمی نظریات محض ان کے تخیّل کی پیداوار نہیں، بلکہ ۱۹۲۰ء کے بعد پیدا ہونے والی قومی آرزوؤں اور امنگوں، آزاد ہندوستان میں ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے خواب، سچّے اسلامی اخلاق، گاندھی واد اور وسیع المشرب انسانی اقدار کے آئینہ دار ہیں۔ ان تعلیمی نظریات کو ہم جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے آئینہ میں، "بنیادی تعلیم" کی قومی دستاویز میں اور تعلیم کے مسائل پر ان کے مقالات و خطبات میں دیکھ سکتے ہیں۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا، ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس ادارے کی بنیاد میں ہی قربانی، حریت پسندی، تجدد فکر، تعلیم کے فرسودہ نظام سے بغاوت اور نئے نظام کی تشکیل کے جذبات موج زن تھے۔ خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد مسلم سیاسئین مایوسی میں بھی مبتلا ہوئے اور سیاسی جھیلوں میں بھی پھنس گئے تو جامعہ کا وجود ڈانوا ڈول ہونے لگا اور یہ سوچا جانے لگا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ اس وقت جرمنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے تین نوجوانوں کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ جرمنی سے اپنی واپسی تک جامعہ کو بند نہ کرنے کی درخواست کی اور خود کو جامعہ کے لیے وقف کرنے کا عہد کر لیا۔ یہ تین نوجوان تھے ــــ ذاکر حسین خاں عابد حسین اور محمد مجیب اور پھر تینوں نے ہی ــــ اپنے اور بہت سے رفیقوں کے ساتھ ــــ اس عہد کو پورا کر دکھایا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے آزاد ہونے تک جامعہ کو مادّی وسائل کی آسودگی حاصل نہیں ہوئی اس کے وابستگان کی تاریخ مثالیت پسندی اور ایثار کی شمعوں سے روشن ہے۔ ذاکر صاحب اس گروہ کے سرخیل تھے۔ تعلیم، تعلیم کے نئے سانچوں کی تشکیل اور مخصوص تصورات کے ساتھ نئی نسل کی تربیت ان کا نصب العین بن گیا۔ جامعہ ایک تعلیم گاہ بھی تھی، اعلیٰ تعلیمی نصب العین کی نقیب بھی اور نئے تصورات کی تجربہ گاہ بھی ــ

وسائل کی فراوانی کے ساتھ تجربوں کی نوعیت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے لیکن بے سر و سامانی کے عالم میں وہی تجربے کیے جا سکتے ہیں جن کی صحت اور افادیت پر یقین کامل ہو اور انسان اسے عقیدے کا درجہ دے دے۔ ذاکر صاحب نے یہاں بہت سے تجربے کیے۔ ان تجربوں کے لیے جو ماحول پیدا کیا، پہلے اسے پروفیسر محمد مجیب کی زبانی سنیے:

"جامعہ ملّیہ نے اسلامی روایات اور تمدن کی نمائندگی کرنے میں مسلمانوں کی اکثریت کے تعصبات کو راہ نہیں دی اور نہ اسلام کی تعلیمات کی رسمی یا سیاسی صورتوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ سچ پوچھیے تو اس نے اپنا ایک الگ اسلامی کردار پیدا کیا اور اس عمل میں مسلمانوں کی رسمی روایات اور نظریات کی پابندی کرنے سے زیادہ ان سے گریز کیا۔ ذاکر صاحب نے اس کے باوجود کہ جاندار چیزوں کی تصویر کشی مسلمانوں کے مروجہ عقیدے کی رُو سے ناجائز ہے، مدرسے کے نصاب میں مصوری کے مضمون کو داخل کیا۔ ڈرامے لکھوائے اور اسٹیج کرائے۔ مدرسۂ ابتدائی میں بچیوں کو داخل کر کے مخلوط تعلیم کے رواج کے لیے راستہ ہموار کیا۔ غرض مذہبی تشدّد کو کسی حالت میں راہ نہیں دی۔ قرآن کی ایک آیت لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے مطابق رواداری سے متعلق ان کے عمل سے ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں لوگ آزادی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتے تھے اور ایک دوسرے کی رائے اور عقیدے کے باب میں افہام و تفہیم سے کام لیتے تھے۔ ذاکر صاحب کی نظر میں کوئی مسلمان اچھا اور سچا مسلمان نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ اچھا اور سچا ہندوستانی نہ ہو ــ مسلمان کے لیے اچھا اور سچا مسلمان ہونے کے اس معیار پر پورا اترنے کے معنی یہ تھے کہ قومی ترقی

کے لیے جو کچھ بھی ضروری ہے وہ سب کا سب اصولاً اور عملاً تسلیم کرے۔ مشین کو تسلیم کرے، کارخانے کے شور وغل اور دھویں دھکڑ کو تسلیم کرے۔ ان تمام تکنیکی تدبیروں کو تسلیم کرے جو کارخانے اور مشین کے لیے ضروری ہیں اور یہ اس لیے کہ ایک صنعتی سماج میں بھی اپنے پیشے سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا یا مذہبی زبان میں ان تمام فرائض کو انجام دینا ہوگا جو اس نے جماعت کے مفاد میں اپنے اوپر عاید کیے ہیں۔" [1]

۱۹۳۸ء میں جامعہ کے مقاصد کی خود ذاکر صاحب نے وضاحت کی۔ اس مضمون میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔

۱۹۲۰ء میں جامعہ کچھ تصورات کے ساتھ وجود میں آئی تھی لیکن دھیرے دھیرے اس میں کام کرنے والوں نے ذاکر صاحب کی سرکردگی میں کچھ آئیڈیل بنا لیے۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفیق ان کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ کے مقاصد کی جو توضیح ذاکر صاحب نے کی، اس سے ان کے تصور تعلیم کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مقاصد کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جامعہ ملیہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔

۲۔ اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک ایسا مکمل نصاب بنایا جائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ . . .

وہ (جامعہ) علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر وقیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لیے مفید ہو . . . . جامعہ کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا 'اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا رکن بنے۔" [2]

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ابتدائی درجات میں پروجیکٹ میتھڈ اور اسائن منٹ میتھڈ کو اختیار کیا گیا۔ طلبا کو انتظامی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں کہ ان میں اخلاقی آزادی' ذمہ داری قانون اور ضابطہ کی پابندی کے احساسات پیدا ہوں۔ ابتدائی درجوں سے ہی مذہب، فطرت اور انسانی زندگی کے مطالعہ کو نصاب کا محور بنایا گیا۔ مادری زبان ذریعہ تعلیم کے اصول کے تحت اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ طلبا کے لیے مفید پیشوں اور حرفہ کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ ان میں بھی معلمی کی تربیت پر خاص توجہ دی گئی تاکہ یہاں کے سند یافتہ طالب علم "تعلیمی مجاہدوں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح و اشاعت کر سکیں۔" [3]

---

[1] محمد مجیب: ذاکر صاحب۔ ص ۹۲-۹۳۔ [2] ڈاکٹر ذاکر حسین: جامعہ ملیہ کیا ہے؟ مضمون مشمولہ جامعہ ۱۹۳۸ء ص ۸۲-۴۸۱۔ [3] ایضاً ص ۴۸۴

"کتابی مدرسہ" کے بجائے "کامی مدرسہ" کا تصور ذاکر
ب جرمنی سے لے کر آئے اور ۱۹۲۵ء کے بعد انہوں نے اس
رکو جامعہ میں عملی شکل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ بدیہی نظر
ہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے جس تصور کو ملک گیر
نے پر عام کرنے کے لیے قدم اُٹھایا، وہ چھوٹے پیمانے پر جامعہ
کئی سال پہلے سے جاری تھا۔ البتہ حرفوں کی مدد سے تعلیم گاہوں
مالی طور پر خود کفیل بنانے کے تصور سے ذاکر صاحب کو شدید
ختلاف تھا، جس کا اظہار انہوں نے ۱۹۳۷ء کی واردھا کانفرنس میں
یا۔ اگرچہ انہوں نے گاندھی جی کے استدلال کے سامنے سپر ڈال دی
لیکن بعد کے تجربے نے بھی ثابت کر دیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

جامعہ کی ان خصوصیات کا امرناتھ ودیا لنکر نے ان الفاظ میں
اعتراف کیا:

"Jamia was one of the first institutio
to try the project method to develop a
community approck in living and learn
ing, to encourape self-government
amongst students and train them for
responsible citizenship, to arouse
interest in art and above all inculcate
in the students and the teachers a spirit
of idealism and social and national
service"(1)

ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانوں نے جو نظام تعلیم قایم کیا تھا، اس
کے نقائص و مضرات کا بہت جلد احساس کر لیا گیا تھا: اس کا ہمارے
مذہب و تہذیب پر بُرا اثر پڑ رہا ہے؛ تمدن تباہ ہو رہا ہے اور نوجوانوں
کا اخلاق بگڑ رہا ہے؛ نئی نسل لارڈ میکالے کے خواب کی تعبیر پیش کر رہی

ہے اور ہندوستانی روح سسک رہی ہے۔ یہ تصور کیا گیا کہ جب
تک نظام تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں نہ ہو، اس صورت حال کا مداوا نہیں
ہو سکتا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے ادارے قایم کرنا شروع
کیے لیکن یہ بھی تعلیم کے نظام میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے
کوئی مختلف نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ابتدا میں اگر اس نظام کی تمدنی خرابی
سامنے تھی تو جلد ہی اس کے معاشی اور اقتصادی نقصانات کا بھی احساس
کیا جانے لگا، یہ صرف کتابی تعلیم ہے اور شہری آبادی تک محدود ہے
دیہات کے رہنے والے کروڑوں باشندے تعلیم سے محروم ہیں اور
حکومت کے پاس سرمایہ نہیں کہ ان کی ضرورت کے لیے نئے مدارس کھولے
جا سکیں؛ اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے نوجوان نہ دیہات میں رہنا
چاہتے ہیں نہ اپنے آبائی پیشوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان کی شخصیت
کی تعمیر نہیں ہو پاتی اور ان کی بیشتر صلاحیتیں ضایع ہو جاتی ہیں؛ دستکاری
کے کاموں سے اُن کو عار آتی ہے وہ خود کوئی مفید روزگار اپنے لیے
پیدا نہیں کر سکتے ہیں اور بے روزگاروں کی فوج میں برابر اضافہ
ہو رہا ہے، بڑے کارخانوں اور مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال
سے کثیر آبادی روزگار سے محروم ہو رہی ہے، تعلیم یافتہ نوجوان صرف
سرکاری ملازمتوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ تعلیمی
ادارے غلام سازی کے کارخانے بن گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں سرکاری
تعلیمی اداروں کے مقاطعہ اور آزاد تعلیمی اداروں کے قیام کا نعرہ انہیں
احساسات کا ردّ عمل تھا اور کچھ ایسے ادارے قایم بھی ہوئے۔ جامعہ
ملیہ ان میں سے ایک تھا لیکن ان کی کفالت خود ایک مسئلہ بن گیا۔ ساتھ
ہی یہ بھی کہ ایسے چند اداروں کے قیام سے کروڑوں بچوں کی تعلیم کی ضرورت
کو پورا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں گاندھی جی نے تعلیم کے ایک
نئے تصور کی تبلیغ شروع کی۔ یہ تصور بھی حالات کا پیدا کردہ تھا۔
ملک کے مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بنیں تو عام تعلیم کا سوال

1- Amar Nath Vidyalankar: Consumation of National Values Trough Education: Zakir Husain Educationist and

بھی تھا۔ یعنی بنیادی تعلیم کو عام کرنے کی پابندی تھی۔ اب ایک طرف تعلیم کے مقصد و منہاج کو بدلنے کا سوال تھا تو دوسری طرف اتنے بڑے پیمانے پر تعلیم کے انتظام کے لیے سرمایہ کا۔ لیکن اگر کسی طرح تعلیم گاہیں اپنا خرچ خود اٹھانے کے قابل ہو جائیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ ابتدائی اسکولوں میں کتابی تعلیم کے ساتھ دستکاری کی تعلیم و تربیت کو شامل کیا جائے بلکہ دستکاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہو اور ان تعلیم گاہوں میں اتنا مال پیدا کیا جائے کہ اس کی فروخت سے جملہ اخراجات پورے ہو جائیں۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے واردھا میں ایک کانفرنس بلا کر اپنے خیالات کو مباحثے کے لیے پیش کیا یعنی یہ کہ دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ تعلیمی نصاب کا مرکز کسی دستکاری کو بنایا جائے اور باقی تمام مضامین اس کے وسیلے سے پڑھائے جائیں۔ ان تصورات پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ اب تک جامعہ ملیہ میں تعلیم، تربیت، دستکاری اور قومی تصورات کے امتزاج کا کام کسی حد تک کیا جاتا رہا تھا۔ خود ذاکر صاحب نے ان مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی نیا تصور نہیں اور دنیا کے دوسرے ممالک میں اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے کھل کر اس تصور سے بھی اپنے اختلاف کا اظہار کیا کہ طالب علموں کی دستکاری پیداوار کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے اور اس سے مدرسے کے اخراجات کی کفالت کی جائے۔ ان کی اس مخالف رائے کو بھی توجہ کے ساتھ سنا گیا اور بالآخر انہیں کی صدارت میں ایک کمیٹی بنادی گئی کہ وہ کانفرنس کے مباحث اور تجاویز کی روشنی میں بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار کر دے۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک مربوط اور جامع اسکیم پیش کر دی گئی۔ اس اسکیم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں ان کا ذہن کتنا صاف اور نگاہ کتنی گہری ہے۔

یہ اسکیم چار بنیادی تصورات پر مبنی اور پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ بنیادی تصورات یہ ہیں:

۱۔ ابتدائی لازمی تعلیم کی مدت سات سال ہو۔
۲۔ تعلیم مادری زبان میں ہو۔
۳۔ کوئی ایک دستکاری تعلیم کی بنیاد بنے۔
۴۔ اسکولی بچوں کے تیار کردہ مال سے اسکول کا خرچ پورا ہو۔

ابتدائیہ میں اس اسکیم کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے کہ نظام تعلیم میں (۱) بچے ہاتھ اور دماغ دونوں کے ذریعے کام سیکھ لیں گے؛ (۲) طبقاتی اور ذات پات کی تفریق ختم ہو گی؛ آمدنی میں اضافہ ہوگا؛ (۴) کام کے ذریعے تعلیم سے بچوں کا علم ہوگا اور (۵) بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہوگا اور [illegible] کر کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔

اس اسکیم پر ہر طرف سے اعتراضات ہوئے۔ ذا[illegible] اس کے پر جوش وکیل بن گئے۔ اپنے چھوٹے پیمانے کے تجربے کو وہ سطح پر بروئے کار آتا دیکھ رہے تھے اس لیے جی جان سے کی تائید کر رہے تھے۔ بقول پروفیسر محمد مجیب ان کا ڈیڑھ سا[ل] تعلیم کے اصولوں کی تشریح و توضیح اور ان کے اطلاق کے معاملے رہنمائی [1] کرتے گزر گیا۔ مارچ ۱۹۳۸ء کے رسالہ "جامعہ" انہوں نے تمام اعتراضات کو سمیٹ کر اس اسکیم کے بارے میں و[ضاحتیں] کیں۔ ان وضاحتوں سے ذاکر صاحب کے دلی رجحانات اور تعلی[م کے] بارے میں ان کے نظریات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ بچوں کی ذہنی تہذیب اس[ی وقت] ممکن ہے جب تعلیم ان کے رجحانات کے مطابق ہو۔

"جو فرد فطری طبیعت رکھتا ہو اس کے لیے اپنی قوم یا کل نوع انسانی کے تہذیبی خزانے کی کنجی نظری تعلیم کے سوا اور کوئی چیز نہیں لیکن اگر کسی عملی طبیعت کے نوجوان کو جو کسی خاص صنعت سے مناسبت رکھتا ہے، اس کی مرضی کے خلاف نظری یا جمالی تعلیم دی جائے تو اس پر تہذیبی زندگی کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔" [2]

بنیادی تعلیم کی اسکیم میں دستکاری کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی پیشہ ورانہ عملی تعلیم کو تعمیر شخصیت کا وسیلہ قرار دیا گیا تھا۔ ذاکر صا[حب] لکھتے ہیں:

"بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے بچوں کے رجحانات

---

[1] محمد مجیب: ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۲۱
[2] جامعہ مارچ ۱۹۳۸ء ص ۲۳۷

زیادہ تر عملی ہوتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعے سے
سوچتے ہیں اور کرنے کے ذریعے سے سیکھتے ہیں۔ گویا
وہ نوع انسانی کی تاریخ کو دہراتے ہیں اس لیے کہ
حقیقت میں دماغ کا کام رفتہ رفتہ ہاتھ ہی کے کام سے
پیدا ہوا ہے۔ ہاتھ کا کام نہ صرف کل فنون کی بلکہ کل علوم
کی بھی بنیاد ہے۔۔۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی مفید
ہاتھ کا کام یعنی کوئی صنعت بچے کی تعلیم کا مرکز قرار
دی جائے۔" [1]

انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں اس پر زور دیا کہ ہمارے "کتابی مدرسوں" کو "کامی مدرسوں" میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ شوق کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر ہاتھ کا کام کرنے سے بچے کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح اس کی ذہنی اپج، تخلیقی صلاحیت اور فطری جوش بڑھے گا اور اس کی شخصیت کی صحیح نشو و نما ہو سکے گی۔ وہ یہاں "خود رو فعالیت"، "آزاد عمل" اور "بے قید نشو و نما" کے خطرات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ صرف ایسے مشاغل کو تعلیمی کہتے ہیں جو ایک معروضی مقصد رکھتے ہوں۔ ان کے الفاظ میں

"معروضیت ہر سچے تعلیمی عمل کی خصوصیت ہے۔ محض تفریحی
فعالیت جو محض بے مقصد ہو یا اس کے مقصد کا تعین نہ
کیا جائے، تعلیمی معنی میں فعالیت نہیں کہی جاسکتی۔" [2]

ذاکر صاحب نے ایک عمر بچوں کے ساتھ گزاری تھی، ان کی نفسیات کو سمجھا تھا، ان کی دلچسپیوں اور خوشیوں میں شریک رہے تھے، ان کی تعلیمی سرگرمی کا ان کو بخوبی اندازہ تھا۔ عمر کی مختلف منزلوں میں جو تبدیلیاں بچوں میں واقع ہوتی ہیں وہ ان سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے اس پر توجہ کی گئی کہ بچہ بنیادی تعلیم کس عمر تک ختم کرلے اور نتیجے میں عملی طفلانہ شوق کی حد بارہ / چودہ برس قرار دی گئی۔ جہاں بچوں کے قوائے ذہنی میں تفریق شروع ہو جاتی ہے اور اسی وقت انہیں آئندہ تعلیم اور پیشے کے متعلق مفید مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ اسی وقت ان کے عنفوان شباب کے رجحانات اور دلچسپیوں پر اثر ڈالا جاسکتا ہے۔" [3]

غرض کہ انہوں نے گفتگو میں، تقریروں میں، تحریروں میں اس اسکیم کی بھرپور وکالت کی اور اس کے ذیل میں ان کے بہت سے تعلیمی تصورات واضح ہو کر سامنے آگئے۔ اس وقت کے ایجوکیشن کمشنر سر جان سارجنٹ نے اس کو Dynamic Scheme سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ مجوزہ نظام تعلیم افسر شاہی کی خود غرضیوں اور پرانے نظام سے ہماری ناروا محبت کا شکار ہو کر رہ گیا اور اس کا نہ پوری طرح نفاذ ہو سکا اور نہ اس کے حقیقی نتائج سامنے آسکے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ۱۹۸۶ء کی نئی تعلیمی پالیسی میں اس اسکیم کی بعض باتوں کو سمو لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجے کے لیے ابھی انتظار کرنا ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کی ایک ایثار پیشہ مخلص جماعت کی تعلیمی منصوبہ بندی میں عملی رہنمائی کی، صرف یہ نہیں کہ انہوں نے جامعہ ملیہ کی شکل میں ایک مثالی تعلیم گاہ کو وجود بخشنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا، صرف یہ بھی نہیں کہ انہوں نے گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے مبہم سے تصور کو ایک مرتب نظام تعلیم کی شکل دی اور بعد میں اس کی وکالت کرتے رہے بلکہ انہوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو ایک نظریاتی شکل دی۔ وہ اپنے خطبات میں، مقالات میں، ریڈیائی تقریروں میں غرضکہ جہاں ان کو موقع ملا اپنے خیالات کا پرچار کرتے رہے۔ یہ نظریات ایک آسودہ سوچنے والے ذہن کی ترنگ نہیں تھے بلکہ ان بے تاب تجربوں کا نچوڑ تھے جو ایک خاص مقصد کے تحت جامعہ ملیہ میں کیے جا رہے تھے اور یہ بے تابی تھی ایک نئے سماج کی تعمیر کی، اس سماج کے لیے مثالی شخصیتیں ڈھالنے کی، استخلاص وطن کی آرزو کی اور اہل وطن میں محبت و رواداری کے تصور کو عام کر دینے کی۔ تجربے کی آنچ میں تپ کر ان کے یہ تصورات منقح ہوتے رہے، ان میں پختگی آتی گئی اور ساتھ ہی بلندی بھی پیدا ہوتی گئی۔

ہماری تعلیم گاہوں نے جس طرح کتاب اور معلومات پر زور دیا اس کے نتیجے میں تعلیم کا تصور ہی دھندلا گیا۔ بغیر سوچے سمجھے (اور ثانوی تک کم از کم ایسا ہی ہوتا ہے) کچھ معلومات کے ذہن میں محفوظ کر لینے کو تعلیم

---

[1] جامعہ مارچ ۳۸ء ص ۲۳۷۔ [2] ایضاً ص ۲۳۹۔ [3] ایضاً ص ۲۴۰

تعلیم سمجھ لیا گیا اور تعلیم گاہیں اور معلم طلبا کو یہ معلومات فراہم کرکے سمجھتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ ذاکر صاحب اس تصور کو مسترد کرکے تعلیم کا رشتہ راست سماج سے جوڑتے ہیں:

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس کی جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کرسکیں۔" [1]

اور پھر اس تعلیم کو تعمیر شخصیت کا فرض بھی ادا کرنا چاہیے:

"تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کل توانائے جسمانی و ذہنی کی تربیت کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کے لیے تیار کیا جائے۔ لہٰذا تعلیمی نظام کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے کہ جماعت کے سامنے کوئی تمدنی نصب العین ہو۔" [2]

جس جماعت کے سامنے کوئی تمدنی نصب العین ہوگا وہ اس کے بقا اور استحکام کے لیے اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا اس طرح انتظام کرے گی کہ فرد کے ذہن کی پوری پوری پرورش ہوجائے۔ اس کی ذہنی ترقی کا جتنا امکان ہو، وہ اسے حاصل کرلے لیکن یہ ترقی صرف انفرادی ہو تو اس سے اجتماعی مفید نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔ اس لیے

"جب ثانوی منزل میں طالب علم کے ذہن میں تفریق پیدا ہو تو اس کی ذہنی نشو و نما ان اشیائے تمدنی کے ذریعے کی جائے جو اس کی مخصوص ذہنی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اور مناسب ہوں۔" [3]

اسی طرح تعلیم کے ذریعے نہ صرف نئے ذہنوں کی ساخت و پرداخت ہوتی رہتی ہے بلکہ سماجی ذہن کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ یہ عمل کس طرح ہوتا ہے، اس کو بھی ذاکر صاحب کی زبانی سنیے:

"تمدن کی گوناگوں چیزیں کہ یہ خود ذہن انسانی کی تخلیقات ہوتی ہیں، ان میں ذہن انسانی اپنی توانائیوں کو محفوظ کردیتا ہے۔ جب کوئی نیا ذہن انہیں اپنے اندر لیتا ہے، انہیں اپناتا ہے تو یہ توانائیاں پھر سے ابھر کر اس نئے ذہن کی تربیت کا کام کرتی ہیں۔" [4]

اس تربیت ذہنی کا مطلب یہ نہیں کہ معلم طالب علم کی انگلی پکڑ کر چلا اور ہر ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرے بلکہ صحیح تعلیم کا وظیفہ یہ ہے کہ عقل و شعور کو پختگی بخشے، جس کے ذریعے فرد خود اپنی راہیں تلاش کر ذاکر صاحب کے الفاظ میں:

"تعلیم کا پہلا کام یہ ہے کہ صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرے، اس کے دھوکوں سے بچنے اور صحیح مشاہدوں سے صحیح نتیجوں پر پہنچنے کی مشق کرائے۔ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا سکھا دیجیے تو آپ نے تعلیم کا تہائی چوتھائی کام کر دیا۔" [5]

فکر انسانی ذہنی شکل تک محدود رہے تو اس میں بھٹکنے کا امکا بھی رہتا ہے اور دھوکے کا بھی۔ لیکن عملی شکل اختیار کرلینے کے بع مشاہدے کے ذریعے اس کی صحت و عدم صحت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے جامعہ ملیہ میں ابتدائی درجات سے ہی بچوں کو مختلف عملی کام سے روشناس کرایا جاتا، ان کو ذمہ داریاں دی جاتیں تاکہ معلمین ک نگرانی میں وہ خود بہت سی باتوں کے تجربے کرلیں اور ان کی شخصی صلا کو بروئے کار آنے کا موقع ملے اور ہر بچے میں شخصیت کی تکمیل کے ان گنت امکانات ہیں، ان میں سے کسی ایک کی یا کچھ کی پرورش ہوجا صرف یہی نہیں، بلکہ

"تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار — ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کی پرورش

---

[1] ذاکر حسین: تعلیمی خطبات ص ۱۸۔
[2] ایضاً ص ۳۹
[3] ایضاً ص ۴۹
[4] ایضاً ص ۲۷۹
[5] ایضاً ص ۶۷۔

کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلے میں تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔"

یہیں سے فرد کی وہ سیرت بنتی ہے جو اسے اگر ایک طرف سماجی بہبود ذریعہ بناتی ہے تو دوسری طرف مصاف زندگی میں نبرد آزما ہونے کا ملہ دیتی ہے۔ اگر یہ سیرت سازی نہ ہو تو ہر نظام تعلیم اور تمام تعلیم ہی بے سود ہیں مگر دور غلامی میں اور آج بھی کہ آزادی کے چار عشرے رچکے ہیں، ہمارے تعلیمی اداروں نے سیرت سازی پر کوئی توجہ نہیں۔ صرف معلومات کو علم اور تعلیم کا وظیفہ سمجھ لیا گیا۔ مستقبل کے مدرسوں جو تصور ذاکر صاحب کے ذہن میں تھا اس میں سیرت کی تربیت کو ہر چیز پر ترجیح حاصل تھی۔ اپنے اس خواب کو انہوں نے کبھی (۱۹۳۷ء) ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی خود مختار آبادیاں ہوں گے، جن میں نئی نسل اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کا عملی تجربہ حاصل کرے گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو قایم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لیے تیار ہوں گے۔" [۵]

اس سیرت کی انہوں نے پھر یہ توضیح کی:

"ایک مسلمان تعلیمی کام کرنے والے کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نظام کے بنانے میں سب سے اہم اصول یہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ متعلم کی خداداد صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچیں، پوری طرح نشو و نما پائیں، اس کی انفرادیت میں یک جہتی پیدا ہو اور اس سے ایک یک سو سیرت بنے اور یہ یک سو سیرت اعلیٰ اخلاقی اقدار کی خادم بن کر شخصیت کے مرتبۂ بلند کو پہنچ سکے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے اخلاقی شخصیت۔ صحیح تعلیم کا یہی راستہ مجھے اسلامی راستہ معلوم ہوتا ہے۔" [۶]

یہ اخلاقی شخصیت بنے گی ہاتھ سے کام کرنے میں، اپنے من پسند کام کو اختیار کرنے میں، مل جل کر کاموں کو انجام دینے اور زندگی بسر کرنے میں، کام کو کسی اعلیٰ مقصد کے ساتھ جوڑنے اور اس کو نصب العین بنا لینے میں۔ وہ آرزومند ہیں تو اس بات کے لیے کہ ہماری آئندہ نسلوں کی تربیت انہیں اثرات کے تحت ہو۔ یہ کام "کتابی مدرسوں" میں نہیں ہو سکتا، صرف "کامی مدرسوں" میں انجام پا سکتا ہے۔ بنیادی تعلیمی کانفرنس کے خطبے میں انہوں نے کہا:

"تعلیمی کام وہی ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے، مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے، وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا۔" [۷]

غرض جتنا ہم اُن کے خیالات کو اور اُن کے عملی تجربوں کو دیکھیں، اتنا ہی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم گاہوں کی مروجہ کتابی تعلیم کو نہایت ناقص قرار دیتے ہیں۔ تعلیم کو وہ دستکاری کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں۔ تعلیم ان کے نزدیک ایک سماجی اور قدر نہاد عمل ہے، جس کے ذریعے ہم مل جل کر کام کرنا، تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، تنگ نظریوں اور خود غرضیوں کو ترک کر دینا، اعلیٰ اقدار حیات پر یقین کرنا سیکھتے ہیں۔ اس تعلیم کے ذریعے وہ بچے کی بھرپور اور توانا شخصیت کی نشو و نما ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی شخصیت جو ہر اعلیٰ انسانی معیار پر پوری اترے اور دکھوں سے بھری ہوئی خدا کی اس وسیع دنیا کے لیے رحمت بن جائے۔

---

[۵] ذاکر حسین: تعلیمی خطبات ص ۱۸۴۔
[۶] ایضاً ص ۹۷۔
[۷] ایضاً ص ۵۵
[۸] ایضاً ص ۲۴۹

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۷ (جولائی ۸۷ء)

ہندوؤں کا تصور الٰہ

کتاب فی تحقیق ما للهند : ابو ریحان البیرونی
(الباب الثانی : ذکر اعتقادهم فی الله سبحانه)

مترجم
الطاف احمد اعظمی (علیگ)

ہر قوم کے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ (خاص و عام) افراد کے اعتقادات میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اوّل الذکر معقولات (Abstract ideas) کے فہم میں کوشش کرتے ہیں اور اصول (Principles) کی تحقیق ان کا مقصود ہوتا ہے اور موخر الذکر محسوسات کے دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالتے۔ فروع پر قانع رہتے ہیں اور تفصیل و تدقیق کی طرف مائل نہیں ہوتے بالخصوص ان مسائل میں جن میں آراء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

خدا کی ذات کے بارے میں اہل ہند کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد اور ازلی (One, eternal) ہے، نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا، اپنے فعل میں مختار، قادر مطلق (Almighty) حیّ و قیوم (Living, life giving) مدبر (Ruling) مبقی (Reserving) مقتدر اعلیٰ (Sovereign) جس کے شل کسی دوسرے کا اقتدار نہ ہو۔ وہ نہ کسی شئے سے مشابہ ہے اور نہ کوئی شے اس سے مشابہت رکھتی ہے۔ ان خیالات کی شرح و تفصیل کے لیے ہم ان کی کتابوں سے چند اقتباسات پیش کریں گے تاکہ کو یہ گمان نہ ہو کہ ہمارا بیان محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل

کتاب "پاتنجلی" میں شاگرد پوچھتا ہے:

"وہ معبود کون ہے جس کی عبادت باعث خیر و سعادت ہے؟"

استاد جواب دیتا ہے:

"یہ ازلیت و وحدانیت کی حامل وہ ہستی ہے جس کا فعل جزا (مکافات Recompense) سے مستغنی ہے خواہ اس جزا کا تعلق راحت سے ہو جس کی تمنا کی جاتی ہے اور خواہ کسی ایسی چیز سے ہو جس سے خوف کھایا جاتا ہے وہ خیالات کی گرفت سے باہر ہے اس لیے کہ وہ ناپسندیدہ اضداد۔ Abhorrent Unlikeness) اور پسندیدہ انداد (Favourite likeness) دونوں سے بالاتر ہے

ملہ البیرونی کی کتاب کی اس فصل کے ترجمے و اشاعت سے میرا مقصود اس تاریخی حقیقت کا اظہار ہے کہ دنیا کی تقریبًا تمام قوموں کی مذہبی کتابوں میں توحید الٰہ کا تص موجود ہے۔ بعض کتابوں میں یہ تصور امتداد زمانہ کے باوجود اب تک دھندلا نہیں ہوسکا ہے لیکن ان مذہبی کتابوں پر اعتقاد رکھنے والوں کی اکثریت فکری او عملی دونوں اعتبار سے شرک میں مبتلا ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت اہل علم سے مخفی نہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب یعنی قرآن مجید مشرکانہ افکار و اعمال کی تردید تغلیط میں تمام مذہبی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے لیکن اس تفوق نظری کے باوجود آج مسلمانوں کا سواد اعظم کسی نہ کسی نوع کے شرک میں مبتلا ہے۔ حتیٰ کہ شرک کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی مظاہر پرستی پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اپنے افکار و اعمال کا دیانت دارانہ جائزہ لیں جن کے سبب سے وہ آج قعر مذلت میں گر چکے ہیں۔ (مترجم)

اس کی ذات علم سرمدی کی مالک ہے۔ انسانی زبان میں اس شے پر علم کا اطلاق ہوتا ہے جس کا علم پہلے سے حاصل نہ ہو جب کہ خدا کی ذات پر عدم علم کا اطلاق کسی حال اور کسی وقت میں کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔"

گردمند یہ پوچھتا ہے:

"خدا کی جن صفات کا آپ نے تذکرہ کیا، کیا ان کے علاوہ بھی اس کی کچھ صفات ہیں؟"

استاد کہتا ہے:

وہ ذات نہایت بلند و بالا اور عظیم المرتبت ہے، بے مکان ہے کیوں کہ وہ تمکن کی صفت سے پاک ہے، وہ خیر مطلق (Absolute Good) ہے جس کی کل موجودات عالم مشتاق ہیں، وہ علم ہے اور اس کا علم سہو اور قلت کے نقص سے پاک ہے۔"

شاگرد پوچھتا ہے:

"آپ اسے صفت کلام سے متصف کرتے ہیں یا نہیں؟"

استاد کہتا ہے:

"جب وہ صفت علم رکھتا ہے تو لامحالہ متکلم بھی ہوگا"

شاگرد پوچھتا ہے:

"اگر وہ علم کی بنا پر کلام کرتا ہے تو پھر اس میں اور ان حکماء و عارفین میں کیا فرق ہے جو اپنے علوم کی بنیاد پر کلام کرتے ہیں؟"

استاد کہتا ہے:

"ان کے درمیان زمانہ کا فرق ہے اس لیے کہ انہوں نے زمانے کے اندر ہی علم حاصل کیا اور اسی کے اندر کلام کیا جب کہ وہ پہلے علم اور کلام دونوں سے بے بہرہ تھے اور کلام کے ذریعے انہوں نے اپنے علوم کو دوسروں تک منتقل کیا۔ اس لیے ان کا کلام اور حصول علم دونوں وقت کے اندر ہی وقوع پذیر ہوئے۔ اس کے برخلاف امور الہیہ (Divine Matters) کا زمانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ ازل سے صاحب کلام ہے۔ وہ اوائل سے برہم (برہمن) اور اس کے علاوہ دوسروں سے بھی مختلف طریقوں سے ہم کلام ہوا ہے کسی کو اس نے کتاب عطا کی اور کسی سے بغرض ربط و تعلق دروازہ کھولا اور کسی کی طرف اس نے وحی کی پس اس نے غور و تدبر سے وہ چیز حاصل کر لی جو اس نے اسے بخشی تھی۔"

شاگرد پوچھتا ہے:

"خدا کو علم کہاں سے حاصل ہوا؟"

استاد کہتا ہے:

"ازل سے اس کا علم یکساں حالت میں ہے اس کے علم کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو اسے پہلے سے حاصل نہ رہا ہو جیسا کہ اس نے وید میں جسے اس نے برہمن پر نازل کیا، فرمایا ہے!

'اس کی تعریف و تمجید کرو جس نے بید (وید) کی صورت میں کلام کیا اور وہ وید سے پہلے بھی تھا۔'

شاگرد پوچھتا ہے:

"تم اس کی عبادت کس طرح کر سکتے ہو جو ماورائے محسوسات ہے؟"

استاد کہتا ہے:

"اس کا نام ہی اس کے وجود کی دلیل ہے جس طرح خبر کے لیے اس شے کا وجود ضروری ہے جس کی طرف اس کی نسبت کی جا سکے، اسی طرح مسمّٰی کے بغیر اسم کا وجود ناممکن ہے۔ بلاشبہ وہ مخفی اور حواس کے ذریعے ناقابل ادراک ہے، لیکن نفس کے لیے وہ قابل فہم ہے اور تصور اس کی صفات کا احاطہ کر سکتا ہے اور یہی سچی اور خالص عبادت ہے اور اس پر مواظبت باعث خیر و سعادت ہے۔"

ان کی ایک دوسری کتاب گیتا ہے جو دراصل مہابھارت (بھارت) کا ایک حصہ ہے جس میں باسدیو[1] اور ارجن کے درمیان مکالمہ ہوا ہے:

---

[1] یہاں البیرونی کو مغالطہ ہوا، مکالمہ شری کرشن جی اور ارجن کے درمیان ہوا تھا۔ (مترجم)

... ہے ... کی ... مبدا و منتہا کے بغیر یعنی نہ میرے
لیے کوئی ولادت ہے اور نہ وفات۔ میرے کسی فعل کا مقصود
کوئی مکافات (جزا) نہیں ہوتی۔ میں کسی خاص گروہ انسانی
سے کسی دوسرے گروہ کے مقابلے میں نہ تو دوستی کا تعلق
رکھتا ہوں اور نہ عداوت کا۔ میں نے اپنی مخلوقات میں
سے ہر ایک کو وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو اس کے کام کی
انجام دہی کے لیے ناگزیر تھا جس نے اس صفت کے ذریعے
میرا عرفان حاصل کیا اور عمل کو طمع سے دور رکھ کر (یعنی
کسی غرض کے بغیر عمل کر کے) مجھ سے مشابہت اختیار
کی تو گویا اس کی گرہیں کھل گئیں اور اس کی آزادی
اور نجات کا معاملہ آسان ہو گیا۔"

مزید برآں واسدیو اس کتاب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"یہ محض تکمیلِ حاجات کی خواہش ہے جو اکثر انسانوں
کو خدا کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ اگر تم ان کے
معاملہ کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لو تو معلوم ہوگا
کہ وہ خدا کی معرفت سے بہت دور ہیں۔ کیوں کہ خدا
ہر شخص پر اس طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس کو حواس کے
ذریعے جان لے اس لیے وہ اس کے عرفان سے قاصر رہتے
ہیں۔ ان میں بعض افراد تو وہ ہیں جو دائرۂ حواس سے
آگے نہیں جاتے اور بعض اس حد سے آگے جاتے ہیں لیکن
قوانینِ فطرت کے علم (مطبوعات) تک پہنچ کر رک جاتے
ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ ان کے
اوپر بھی ایک ہستی ہے جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور
نہ خود اس کو کسی نے جنا ہے (مَنْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ)
اور جس کی ذات کا علم و احاطہ کسی شخص کے لیے ممکن نہیں
ہے جب کہ وہ اپنے علم کے ذریعے ہر شے کا احاطہ کیے
ہوئے ہے۔"

فعل (Action) کے مفہوم کے تعین میں ہندو ارباب علم
اختلاف پایا جاتا ہے جو لوگ فعل کو اس کی ذات کی طرف نسبت
دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فاعل (Agents) کا وجود اسی
سے ہے۔ اس لیے دراصل وہی ان کے فعل کی علت ہے اور
طور پر یہ خود اس کا فعل ہے جو ان کی وساطت سے ظاہر ہوتا
اور جو لوگ فعل کی نسبت خدا کی طرف نہیں کرتے بلکہ اس کو
غیر خدا کو ٹھہراتے ہیں ان کی بنائے استدلال اس بات پر۔
فعل ادنیٰ وجود کی صفت ہے (اور خدا کی ذات اس سے بالا
کتاب "سانک" (سمکھیا) میں عابد (ناسک) سوال کر

"فعل اور فاعل میں اختلاف ہے یا نہیں؟"

حکیم جواب دیتا ہے:

"مادہ اور روح (نفس) دونوں فعل و حیات سے
محروم ہیں۔ یہ اللہ مستغنی کی ذات ہے جو ان دونوں کو
متحد کرتی ہے اور جدا بھی کرتی ہے اس لیے وہ خود
فاعل ہے۔ اس سے فعل کا صدور اس طور پر ہوتا ہے
کہ وہ روح اور مادہ دونوں کو حرکت دیتا ہے بالکل
اس طرح جیسے زندہ اور طاقت ور، مردہ اور عاجز و
ناتواں کو حرکت دیتا ہے۔"

"بعض کا قول ہے کہ روح اور مادہ دونوں کو نیچر
(طبائع) متحد کرتا ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہر
اس چیز میں جاری و ساری ملتا ہے جو گھٹتی اور بڑھتی
ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ روح ہی فاعل ہے جیسا کہ وید
میں آیا ہے: جو کچھ موجود ہے وہ "پورش" کے سبب
سے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ فاعل زمانہ ہے اور
عالم اس سے بالکل اس طرح مربوط ہے جیسے بھیڑ ایک
مضبوط رسی سے بندھی ہوتی ہے اور اس کی حرکت اس
بات پر منحصر ہوتی ہے کہ رسی مسترخی (ڈھیلی) ہے یا سختی سے
کھینچی ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ فعل، عمل متقدم کی مکافات
(Recompense) کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

"یہ تمام نظریات غلط اور ناصواب ہیں۔ امر حق یہ
ہے کہ فعل کا تمام تر تعلق مادہ سے ہے اس لیے کہ مادہ

ہی روح کو مربوط کرتا ہے اور اسے مختلف صورتوں میں گردش دیتا ہے اور پھر آزاد کر دیتا ہے۔ اس لیے فاعل مادہ ہے اور وہ سب جو اس کے نیچے ہیں، تکمیلِ فعل اور مختلف قوتوں سے نفس کو آزاد کرانے میں اس کے اعوان و انصار کی حیثیت سے اس کی مدد کرتے ہیں، اس لیے وہ غیر فاعل ہیں۔"

"یہ وہ خیالات ہیں جو ہند و اربابِ علم (خواص) خدا کے بارے میں رکھتے ہیں اور اسے "الیشفر" (الیشور) کہتے ہیں یعنی مستغنی و جواد، جو دیتا ہے لیکن کسی سے کچھ لیتا نہیں وہ صرف خدا کی وحدت (Unity) کے قائل ہیں اور اس کے ماسوا جو وحدت ہے وہ اُن کے نزدیک حقیقی نہیں ہے بلکہ اس کا سبب کثرتِ اشیاء ـ (Plurality of Things) ہے۔ وہ صرف اسی کے وجود کو حقیقی وجود قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ تمام موجودات کا قیام اسی کی ذات پر منحصر ہے۔ یہ سوچنا تو غیر ممکن نہیں کہ موجودات نہ ہوں لیکن وہ موجود ہو، لیکن یہ ناممکن الخیال ہے کہ وہ نہ ہو اور اشیاء موجود ہوں۔"

خدا کے بارے میں ہندوؤں کے طبقۂ خواص کے خیالات بیان کرنے کے بعد اب ہم ان کے عوام کی طرف آتے ہیں۔ اس باب میں ان کے خیالات بھی مختلف ہیں۔ ان کے اکثر عقاید قبیح و شنیع ہیں جیسا کہ دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام بھی اس سے پورے طور پر محفوظ نہیں ہے۔ لازم ہے کہ ہم پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید و تغلیط کریں۔ مثلاً تشبیہ، فرقۂ جبریہ کی تعلیمات اور مذہبی موضوعات پر مذاکرہ کی ممانعت وغیرہ۔

ہر وہ مذہبی بات جس کا تعلق عوام سے ہو اس کا اظہار واضح الفاظ اور محتاط اسلوب میں ضروری ہے۔ مثلاً ہند و اربابِ علم (خواص) نے خدا کو ایک نقطہ قرار دیا جس سے اُن کا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ صفاتِ جسمانی سے منزّہ ہے لیکن جب اسی بات کو ان کے عام لوگ پڑھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ اس کی عظمت اس کی تصغیر یعنی چھوٹا ہونے میں ہے۔ ان کا فہم نقطہ کی اصل حقیقت کے ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ وہ تعظیم خدا کے اثبات میں تشبیہ و تحدید کی بُرائی کی آخری حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

"وہ بارہ انگل لمبا اور ۱۰ انگل چوڑا ہے"

خدا کی ذات اس تحدید و تعدید سے بہت بلند ہے۔

اسی طرح جب کہا جاتا ہے کہ خدا پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور کوئی شے بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے تو عوام اس سے یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ سارے کام قوتِ باصرہ (EYE SIGHT) سے انجام دیتا ہے۔ چونکہ فعل بصر آنکھوں ہی سے ممکن ہے اور دو آنکھیں ایک آنکھ سے افضل ہیں اس لیے وہ ہزار آنکھیں رکھتا ہے۔ اس سے ان کا مقصود اس کے کمالِ علم کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری خرافاتِ شنیعہ ان کے ہاں موجود ہیں۔ اس طرح کی چیزیں ہندوؤں کے ان طبقات میں زیادہ ملتی ہیں جن کے لیے علوم کی تحصیل ممنوع ہے۔

"تیر اندازی بہادروں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ ہمیں وطن کے سب سے بڑے اس فتنہ کے خلاف محاذ آرا ہونا چاہیے اور ابھی ہونا ہے۔ اپنے بچوں کو دین سے آگاہ کرنا ہے، دین کی تعلیم دینی ہے ہر بستی، ہر قریہ، ہر محلّہ اور ہر گھر میں"

(سیّد حامد)

جوابِ دوست

مغرب کی وادیاں

نسیم انصاری

یوروپین تہذیب سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ اب تک تو ہندوستان میں اس کی مسخ شدہ نو آبادیاتی صورت دیکھی تھی، اب آزاد فضا میں وہ سب کچھ دیکھنے کو ملا جو بس کتابوں میں پڑھا تھا۔

جس چیز نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ شخصی آزادی تھی جب تک کوئی ان میں رہے نہیں اندازہ نہیں کر سکتا کہ یورپ کے لوگ اس آزادی کو کیسا عزیز رکھتے ہیں۔ اپنی ذاتی خوشی اور رنج کو وہ اس طرح چھپائے رکھتے ہیں کہ جیسے کوئی انہیں چھین لے گا۔ اسی کے ساتھ اجتماعی معاملات میں گو اپنی رائے پوری آزادی سے بغیر کسی ڈر کے دیں گے لیکن عملاً کریں گے وہی جو اجتماعی طور پر طے ہو چکا ہو۔

اس روش کا اندازہ انگلستان پہنچنے کے فوراً بعد ہو گیا تھا۔ کچھ ہی روز پہلے مصر کے جواں سال حکمراں کرنل ناصر نے نہر سوئز کو مصری قبضے میں لے لیا تھا۔ اس کے جواب میں انگریزی، فرانسیسی اور اسرائیلی فوجوں نے مصر کے خلاف فوجی اقدامات شروع کر دیے۔ ساری دنیا میں اس پر لے دے ہونے لگی، امریکی حکومت نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ذلیل کیا۔ بعد کے واقعات نے بتایا کہ اس سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو مشرق وسطیٰ کی سیاست سے نکال کر وہاں اپنی اجارہ داری قایم کرنا مقصود تھا۔ اسرائیل پر بھی یہ واضح کر دیا گیا کہ اُسے حکم لندن یا پیرس سے نہیں واشنگٹن سے ملیں گے۔ اِدھر سوویت یونین نے بھی انگریزوں، فرانسیسیوں اور اسرائیل کو دھمکایا چنانچہ مجبوراً ان کی فوجوں کو مصری علاقہ خالی کرنا پڑا اور نہر سوئز پر کرنل ناصر کا قبضہ ہو گیا۔ موجودہ زمانے میں مغربی شہنشاہیت کے خلاف عربوں کی یہ پہلی فتح تھی۔ ورنہ دو سو برسوں سے تو بس شکست کھاتے چلے آ رہے تھے۔

ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے یہ سب کچھ ہو چکا تھا لیکن برٹش پارٹی جو حزب مخالف میں تھی اور بی۔ بی۔ سی کے رویّے پر بڑی بحث تھی کہ برطانوی سیاست کے یہ دونوں اہم ادارے اس ہنگامے گورنمنٹ کی پوری طرح حمایت نہیں کر رہے تھے۔ بی۔ بی۔ سی پر تو ان مظا کی خبریں بھی سنائی جاتی تھیں جو لندن اور لندن کے باہر حکومت پالیسی کے خلاف کیے جاتے تھے۔ اس بحث میں دوسری عالمگیر جنگ سے آکسفورڈ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے اس ریزولیوشن کا بھی ذ آیا جس میں کہا گیا تھا کہ جنگ کی صورت میں یونیورسٹی کے طالب علم ملک کی حکومت کی طرف سے لڑنے نہیں جائیں گے لیکن جب لڑائی چھڑی تو بقول مسٹر چرچل کے ان باغی طالب علموں میں سے بہت سے وطن کی خاطر جان دینے والوں کے ہراول دستے میں تھے۔ یہ آزادئ رائے گویا جمہو کی جان ہے اور اس کو پوری طرح اپنانے میں کئی پشتیں گزر جاتی ہیں۔

انگریزی تہذیب کی مضحکہ خیز صورت تو وہ تھی جس کا مذاق برنارڈ شا نے اڑایا ہے کہ انگریز ہر کام کسی اصول کے ماتحت کرتے ہیں — وہ شہنشاہیت کے اصول پر غیر ملکوں پر قبضہ کرتے ہیں اور جمہوریت کے اصول پر اپنے بادشاہ کا سر کاٹتے ہیں۔ دوسروں کے معاملے میں عدم مداخلت کے اصول پر جرمن اور اطالوی سامراجیوں کو اپنی افریقی نو آبادیوں میں گھسنے نہیں دیتے اور نئی تہذیب کو فروغ دینے کے اصول پر وہ ایشیا اور افریقا کے لوگوں کے خلاف جدید ترین وضع کی توپیں استعمال کرتے

انہیں سب باتوں کی وجہ سے انگریز برنارڈ شا سے بہت خفا تھے۔ میرے انگریز دوست کہتے تھے کہ شا کی طبیعت میں کمینہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ...ر ہے جب برنارڈ شا ایسی باتیں لکھیں گے تو انگریز ان کی محبت میں تو ...تار ہونے سے رہے۔

ویسے محبت کے معاملے میں برنارڈ شا ہمیشہ بہت محتاط رہے۔ ...ب خاتون نے جب اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ترغیب ...ی کہ اگر ہم دونوں ساتھ رہنے کا عہد کرلیں تو انشاء اللہ آئندہ ...سل میرا حسن اور آپ کی ذہانت ورثے میں پائے گی۔ شا نے متفکر ہوکر پوچھا کہیں اگر اس کا الٹا ہوگیا تو ؟ میری صورت اور آپ کی ذہانت لے کر کوئی کہاں جائے گا ؟"

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے بھی برنارڈ شا کے کمینہ پن کا پتہ چلتا ہے۔ بھلا ہم اور آپ اس طرح حسن کو رسوا کرسکتے تھے ؟ اور لکھنؤ والے تو مروت میں ہر قسم کے خطروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

لندن پہنچتے ہی ملازمت کی فکر شروع کی۔ اس زمانے میں ملازمت ملنا بہت آسان تھا۔ تار دے دے کر بلایا جاتا تھا اور اس کے بعد آپ کو حق تھا کہ جس جگہ کا چاہیے انتخاب کیجیے۔ چنانچہ میں نے یارک شایر کے ہیلی فیکس کے جنرل اسپتال میں ملازمت قبول کرلی۔

اسپتال کے سینیر سرجن مسٹر ڈیچ تھے۔ پہلے ہی دن مجھے حکم ملا کہ ان کی ماتحتی میں آپریشن میں شرکت کروں۔ جب میں آپریشن تھیٹر پہنچا وہاں وہ موجود تھے۔ پہلے تو انہوں نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر پوچھا:

"کچھ سرجری جانتے ہو ؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا بولے :

اچھا ! تب شاید تم کچھ سیکھ لو "

پھر سسٹر سے مخاطب ہوکر بولے کہ

"ذرا ان کو ہاتھ دھونا سکھا دیجیے "

ہاتھ دھلوانے کے بعد انہوں نے بنفسِ نفیس مجھے کپڑے اور دستانے پہننے کی ہدایت کی اور اس طرح سرجری سے میرا تعارف ہوا۔

اتفاق کی بات کہ اس روز مسٹر ڈیچ نے تھائی رائڈ گلانڈ کا آپریشن کیا تھا۔ وطن واپس آکر جب میں نے خود سرجری شروع کی تو اس آپریشن سے میری دلچسپی ایسی بڑھی کہ میرے کالج والے اس آپریشن کے ساتھ میرا نام لینے لگے اور سب سے پہلی بین الاقوامی سرجری کانفرنس جس میں مَیں نے شرکت کی اس میں میرا مقالہ بھی تھائی رائڈ گلانڈ کی سرجری کے بارے میں تھا اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر جن یونیورسٹیوں میں مَیں پڑھانے جاتا ہوں وہاں کے طلبا کو بھی بہت جلد اندازہ ہوجاتا ہے کہ بدن کے اس حصّے کی سرجری سے مجھے خاص دلچسپی ہے، شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ محبت پہلی نظر میں ہوتی ہے اور پہلی محبت دائمی ہوتی ہے۔

سرجری میں میری مصروفیت اتنی بڑھی کہ رفتہ رفتہ اس نے میری زندگی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس زمانے میں ہم جونیر ڈاکٹروں کا نظام اوقات ایسا تھا کہ کسی اور معاملے سے دلچسپی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہفتہ میں صرف ایک روز آدھے دن اور ساری رات کی چھٹی ملتی تھی اور ہر تیسرے ہفتے جمعہ کی دوپہر سے دوشنبہ کی صبح تک کی چھٹی ہوتی۔ باقی سارا وقت درد میں کراہتے ہوئے مریض، ان کے وہ زخم جن کی چارہ جوئی کے لیے وہ اسپتال آتے تھے اور وہ زخم جو ہم ان کی بیماری دور کرنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں لگاتے تھے، بس انہیں سے سابقہ تھا۔ پھر ان زخموں کے بھرنے تک ان کی دلجوئی، دن رات موت اور زیست کی کشمکش کا نہ صرف تماشا بلکہ فرشتۂ موت سے ہر وقت مقابلہ اور مجال نہیں کہ کوئی غلطی ہوجائے۔ سرجری کے استادوں سے زیادہ وارڈ سسٹر کی سخت گیری اور پھر جو وقت بچے اس میں کتابوں کی ورق گردانی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سمجھ میں بھی آئے، واللہ بڑی سخت زندگی تھی۔ نرم آواز، دل فریب مسکراہٹ اور اس سے دلفریب تر ہنسی اور حُسن و جمال کا سہارا اگر نہ ہو تو یہ زندگی عذاب بن جائے۔

بس کرسمس کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جب اسپتالوں کی سنگین فضا میں کچھ نرمی آتی ہے۔ ان دنوں میں ہم لوگ اپنے انگریز دوستوں کی مروت میں ان کی ڈیوٹی کر دیتے تھے چونکہ ڈیوٹی پر ہوتے اس لیے

ہیں یا ہوش بھی رہتا ہوتا۔ ڈاکٹروں کی رہائش گاہ میں ہونے والی ضیافتوں کا اہتمام بھی ہم ہی لوگوں کے سپرد ہوتا۔ ایک دفعہ میں یہ خدمت انجام دے رہا تھا کہ میرے سرجری کے استاد حالت سرور میں کمرے میں داخل ہوئے۔ جلو میں بتانِ خود آرا۔ میں تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور بعد تسلیمات کے بہت ادب سے پوچھا:

"آپ کا تابعدار کیا پیش کرے؟"

بگڑ کر فرمایا:

"شراب پلانا چاہتے ہو؟"

میں نے عرض کیا:

"معاذ اللہ! حضور کے علم میں شاید یہ بات نہیں لائی گئی کہ خاکسار مسلمان ہے اور اس قسم کی چیزیں اس پر حرام کردی گئی ہیں!"

مسکرائے اور فرمایا:

"اچھا تب ٹھیک ہے، لاؤ کیا دینا چاہتے ہو"۔

میں نے مشروب سلیقے سے پیالے میں انڈیل کر باادب پیش کیا۔ پوچھا

"کیا ہے؟"

کسی نے کہا:

"خالص جن اور لیمو کا شربت"۔

پوچھا کہ:

الکحل کا آمیزش تو نہیں"؟

عرض کیا:

"یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی؟"

پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ سے پیالہ لے لیا اور بتانِ خود آرا میں سے ہر ایک سے باری باری ایک گھونٹ پینے کو کہا اور اس کے بعد بھی جب تک خود ہر طرح سے اطمینان نہیں کر لیا، مشروب چکھا تک نہیں ہائے کیسے بااصول لوگ تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں دیکھنے کو ملیں گے۔

لیکن اس معاملے میں انگریزوں کی کوئی خصوصیت نہیں۔ غبارِ خاطر میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ شہزادگی کے زمانے میں شاہجہاں نے اسے دکن اپنے ہم زلف کے پاس بھیجا جو وہاں کے صوبے دار تھے۔ ایک روز شاہزادہ باغ میں ٹہل رہا
سامنے سے خالہ اپنی کنیزوں کے ساتھ آرہی ہیں۔ کنیزوں
ایک نے ہاتھ اٹھا کر کوئی پھل درخت سے توڑ لیا۔ نہ معلوم
نے کیا دیکھا کہ قلب کی عجیب حالت ہو گئی۔ باغ سے واپس آکر
اختیار کرلی اور کھانے پینے سے بھی کسی رغبت کا اظہار نہیں کی
خالہ نے بہت دیر تک نہیں دیکھا تو خیریت کے لیے بھیجا۔ انہ
واپس آکر شاہزادہ کا حال بیان کیا اور کہا کہ زین آبادی کا
رہے ہیں۔ خالہ نے کہا۔ ارے ایسی کون سی بات ہے۔ زین آ
شہزادے کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ کی دنیا آباد ہو گئی۔ و
بہت اچھا تھی۔ شہزادہ وقت نکال کر گانا بھی سنتا تھا۔
زین آبادی نے شراب پینے کی فرمائش کی۔ اورنگ زیب کے
اس کا بھی انتظام کیا گیا۔ لیکن اب یہ ضد کہ شہزادہ بھی پیے۔ م
کیسے انکار کر سکتا تھا، لیکن زین آبادی صرف محبت کا امتحا
چاہتی تھی جب شہزادہ اس میں پورا اترا تو پھر اور ضد

غالباً انشاء اللہ خاں انشاء نے اسی واقعہ کو اپنے
میں پیش کیا ہے ؎

بادہ ہو، کنج باغ ہو، ساقی ہو ماہ وش
اور واں کوئی محل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
کھینچے ہنسی سے منہ
یہ ریشمی بھی پہ غازہ ہے رنگ خضاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
جو پی نہ جائے جلد یہ ساغر شراب کا
اس وقت قبلہ میں کروں پھر آپ کو سلام
جو کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا

شیراز میں بھی یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ زرا دیکھیے کس طرح بیان کی

زلف آشفتہ و خوے کردہ و خنداں لب و مست
پیرہن چاک و غزل خوان و صراحی در دست

نرگسش عربدہ جوی و لبش افسوں کناں
نیم شب مست بہ بالین من آمد بنشست
سر فرا گوشِ من آورد و بہ آوازِ حزین
گفت کای عاشقِ شوریدۂ من خوابت ہست
عاشقے را کہ چنیں بادۂ شبگیر دہند
کافرِ عشق بود گر نہ شود بادہ پرست

آپ گواہ رہیے گا، میں نے صرف واقعات نقل کیے ہیں اور نقلِ کفر کفر نہ باشد۔ میں نے اپنی ذاتی رائے کو اس میں دخل نہیں دینے دیا ہے۔ لیکن جہاں تک اورنگ زیب کا معاملہ ہے اگر مولانا آزاد کی روایت صحیح ہے تو غالباً تخت نشیں ہونے کے بعد ایسی ہی یادوں نے اسے اپنی سلطنت میں نشہ بندی سے روک دیا تھا۔ میں نے ایک دن عرفان حبیب صاحب سے پوچھا تھا کہ ہندوستان میں اتنے دن مسلمان حکمراں رہے، نشہ بندی کب کب ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے علم میں ہندوستان میں تین دفعہ نشہ بندی کی کوشش کی گئی۔ ایک دفعہ علاؤ الدین خلجی نے اس لڑائی سے پہلے جس میں ملک گیری کے علاوہ رانی پدمنی دیوی کبھی داؤں پر تھیں، فوج میں جب ہچکچاہٹ دیکھی تو اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نشہ بندی کا اعلان کر دیا تھا۔ دوسری دفعہ بابر نے رانا سانگا سے لڑائی سے بیشتر اسی طرح اپنے سپاہیوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لیے توبہ، استغفار اور نشہ بندی کا اعلان کیا تھا اور دوسری کانگریسی حکومت کے زمانے میں ایسی کوششیں کی گئی۔ ایک دفعہ مرارجی ڈیسائی اور کامراج نے اپنے اپنے صوبوں میں نشہ بندی نافذ کردی، لیکن اس کا اثر الیکشن پر خاطر خواہ نہیں پڑا۔ شاید دونوں جگہ ناکامی ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ بلٹز نے ایک کارٹون کی شکل میں صورت حال واضح کی تھی۔ ایک بوتل میں مرارجی اور دوسری میں کامراج کو قید دکھایا تھا۔ مرارجی پوچھ رہے تھے "نشہ بندی؟" کامراج نے جواب دیا "جی ہاں، نشہ بندی!" اس واقعے سے مرارجی کو ایسی عبرت ہوئی کہ جب وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھے تو انہوں نے اپنی وضع کا تو اعلان کر دیا لیکن ہندوستان کے عوام کے لیے نہ تو ان مشروب کو لازم کیا جسے وہ بے حد پسند کرتے تھے اور نہ ہی کسی مقبول عام مشروب پر پابندی لگائی۔

انگلستان پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد چچا صدیق کے ذریعے بی۔بی۔سی ہمارا تعلق پیدا ہو گیا۔ اس زمانے سے یہ تعلق اب تک قایم ہے۔ جب بھی میرا اور زینت کا لندن جانا ہوتا ہے، وہ لوگ اکثر ہمیں اپنے نشریاتی پروگراموں میں شریک کرتے ہیں۔ میں نے نشریاتی پروگراموں کا نام سہ کر لیا کیوں کہ اس کے علاوہ بھی وہاں مختلف قسم کے پروگرام رہتے ہیں اکثر ان میں بھی شرکت کے لیے اصرار ہوتا ہے۔

کرسمس کا زمانہ تھا اور مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔ اتفاق سے کاؤنٹری کے ایک اسپتال میں عارضی جگہ مل گئی۔ چوں کہ چھٹیاں تھیں اس لیے حسب معمول میں ڈیوٹی پر تھا۔ سال بھر کی ایک بچی کو اس کے والدین اسپتال لائے کہ وہ شیشہ کی ایک بوتل سے کھیل رہی تھی کہ بوتل ٹوٹ گئی اور اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو زخم گہرا آیا تھا۔ فیصلہ کیا کہ بے ہوشی دے کر ٹانکے لگائے جائیں۔ جب میں آخری ٹانکہ لگا رہا تھا تو دفعتاً بے ہوشی دینے والی ڈاکٹر نے بتایا کہ بچی کی حرکت قلب بند ہو گئی ہے۔ میں نے وہی کیا جو ایسی حالت میں کیا جاتا ہے کہ پہلے تو سینہ تھپک تھپک کر قلب میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو بچی کا سینہ چاک کر کے اپنے ہاتھوں سے دل کو چلانے کی کوشش کی، اس میں کامیابی ہو گئی، لیکن جب سینے کا زخم بند کرنے جا رہا تھا تو پھر حرکت قلب بند ہو گئی۔ پھر وہی عمل کیا اور پھر قلب حرکت کرنے لگا۔ سینے کے زخم میں ٹانکے لگانے کے بعد میں نے بے ہوشی دینے والی ڈاکٹر سے کہا کہ اب میں بچی کے نرخرے میں شگاف لگا کر ایک عارضی راستہ سانس لینے کے لیے بنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ آخر اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ بچی کو متلی ہو اور چوں کہ بے ہوشی میں غیر معمولی حالات پیدا ہو چکے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ رطوبت حلق میں اٹک جائے اور سانس لینے کا راستہ بند ہو جائے نرخرے کے عارضی شگاف سے یہ خطرہ نہیں رہے گا۔ وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی تھیں اور عہدے کے اعتبار سے بھی سینیر۔ ان باتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیکھیے آپ اپنا کام کر چکے۔ اب سانس کو جاری رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میرے خیال میں

نرخرے میں شگاف لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کوچے میں نو وارد
تھا اس لیے اصرار نہ کرسکا۔

بچی کو وارڈ میں بھیج کر میں اپنے کمرے آگیا۔ دل میں بہت خوشی
تھا کہ دوبارہ ایک ننھی سی جان کو موت کے چنگل سے چھڑا لایا۔ رات کے
تین بجے ٹیلی فون پر نرس نے فوراً وارڈ بلایا۔ جا کر دیکھا تو بچی ختم
ہو چکی تھی۔ میں افسوس کناں واپس آگیا۔ تیسرے دن عدالت میں مقدمہ
پیش ہوا کیوں کہ یہ موت قدرتی نہیں تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ
پڑھ کر جج نے بھری عدالت میں اظہار تاسف کرکے کہا کہ ہائے کیسی
بدقسمتی کہ دو دو ٹومی اور دو دفعہ زندہ کی گئی اور آخر میں متلی سے سانس
کی نالی بند ہوئی اور ختم ہو گئی۔

کارروائی کی تفصیل شام کے اخبارات میں شایع ہوئی اور دوسرے
دن اس گروپ کے ایک اسپتال میں مجھے باقاعدہ ملازمت پیش کی
گئی۔ ٹریننگ کے جس درجے میں مَیں تھا اس میں باقاعدہ ملازمت
کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چھ مہینے یا سال بھر کی ملازمت بحیثیت ہاؤس
سرجن کے مل جائے۔ نئی ملازمت کیژوالٹی آفیسر کی تھی جس کا عہدہ
سینیر ہاؤس سرجن کا تھا۔ رہنے کے لیے آراستہ مکان مل گیا۔ اس
ملازمت کے دوران پڑھنے کا موقع بھی ملا اور چند مہینوں میں مَیں
نے لندن کے رائل کالج سے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کا پرائمری امتحان
پاس کر لیا۔

اب تک اسپتال میں سب لوگ مجھے ڈاکٹر انصاری کہہ کر بلاتے
تھے۔ اب پرائمری امتحان پاس کرنے کے بعد مسٹر انصاری کے نام سے
مخاطب کرتے۔ اس عجیب روایت کی بھی ایک تاریخ ہے۔ انگلستان
میں قرون وسطیٰ میں سرجری باعزت پیشہ نہیں تھا۔ عربوں کی تقلید میں
فصد کھلوانے کا رواج تو تھا لیکن یہ کام اور زخموں پر مرہم پٹی
حجام کرتے تھے۔ عربوں نے سب سے پہلے سرجری کو علم کا درجہ دیا۔ چنانچہ
ابوالقاسم زہراوی کی تصنیف یورپ میں شایع ہونے والی سب سے
پہلی سرجری کی کتاب ہے۔

ابوالقاسم زہراوی کا زمانہ ۹۳۶ء سے ۱۰۱۳ء کا ہے۔
وہ اسپین میں پیدا ہوئے اور وہیں سرجری کی تعلیم دیتے تھے اور
سرجری کی پریکٹس کرتے تھے۔ ان کی کتاب "التصریف" سرجر
پہلی بالتصویر کتاب ہے جو تاریخ میں ملتی ہے۔ میں نے کئی سا
اس کا اردو ترجمہ دیکھا تھا جو میرے ایک ننہالی عزیز حکیم نثا
صاحب علوی نے کیا تھا۔ دو برس ہوئے میں نے اس کا انگریزی
بھی دیکھا جو ویلکم فاؤنڈیشن والوں نے لندن سے شایع کیا ہے
کتاب پانچ سو برس تک یورپ کے طبی نصاب میں داخل رہی۔ سو
صدی میں فرانس کے سرجن ایمبروس پیری نے ایک کتاب سرجری
لکھی اور یورپ میں آج کل اسے سرجری کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے
ابھی کچھ دن ہوئے جب میں نے ایمبروس پیری کی کتاب کا
ترجمہ مینچسٹر کی ڈینس گیٹ کی لائبریری میں دیکھا۔ دیکھ کر میرا ما
ٹھنکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زہراوی کی کتاب کا چربہ اُتارا
اور لطف یہ کہ کہیں اس کا تذکرہ تک نہیں ہے کہ زہراوی کی کتا
سے کوئی بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں دو
کتابوں کو ساتھ ساتھ پڑھوں گا۔

میں کہہ رہا تھا کہ چوں کہ انگلستان میں سرجری طب کا حصہ
تھی بلکہ اس قسم کے علاج حجام کرتے تھے۔ اس لیے طبیب لوگ ان
اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ طبیب ڈاکٹر کہلاتے اور اُن کی تعل
کا باقاعدہ انتظام تھا۔ سرجری والے صرف اپنے پیشے میں تربیت حا
کرتے اور اگر ان کی بہت عزت کی گئی تو وہ مسٹر کہلاتے تھے۔

انگلستان میں سرجری کو باعزت بنانے کا سہرا جان ہنٹر کے
ہے جو ۱۷۲۸ء میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور اپنی وفات
(۱۷۹۳ء) تک لندن میں سرجری کرتے پڑھاتے اور اس پر مضا
لکھتے رہے۔ ہنٹر دیکھنے میں بہت وجیہ نہیں تھے۔ ان کے بڑے بھائی و
ہنٹر بہت کامیاب اور قبول صورت ڈاکٹر تھے۔ اس لیے چھوٹے
کی حیثیت کچھ ثانوی سی تھی۔ ولیم پرائیوٹ طور پر ڈاکٹری پڑھا
بھی تھے۔ انسانی بدن کی تشریح کے لیے وہ اپنے چھوٹے بھائی
مدد لیتے۔ چھوٹے بھائی جان کا ہاتھ اس کام کے لیے بہت اچھا تھا
چنانچہ اس نے تشریح میں مہارت حاصل کرلی اور تھوڑے دنوں
میں اس نے طب کی تعلیم بھی مکمل کرلی۔ پھر تو اس نے اپنے فن میں ا

ترقی کی کہ لوگ خوبرو سپاہی کے بجائے اُس بدصورت استاد کی شاگردی کے لیے کوشاں رہنے لگے۔ جان ہنٹر نے بڑی شان سے سرجری کی پریکٹس شروع کر دی۔ لندن کے مشہور سینٹ جارج اسپتال میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔

اسے صحیح معنوں میں سرجری کا امام مانا جاتا ہے کیوں کہ اس نے جانوروں پر تجربوں کی مدد سے طب اور سرجری کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں تشریح یا ڈسکشن کی عام اجازت نہیں تھی۔ صرف ان مجرموں کی لاشیں اس کام میں لائی جاتی تھیں جنھیں پھانسی دی جاتی۔ چوں کہ پھانسی سرعام دی جاتی جسے دیکھنے کے لیے ایک خلقت جمع ہوتی اس لیے جن لوگوں کو ڈسکشن کے لیے لاش کی ضرورت ہوتی وہ اپنے گرگے اُس مجمع میں بھیج دیتے اور جیسے ہی آدمی پھانسی پر لٹکنے لگتا یہ لوگ دوڑ کر اس کی لاش کو اپنے قبضے میں کرتے اور وہاں سے فرار ہو جاتے۔ اس میں کبھی کبھی چھینا جھپٹی بھی ہوتی بلکہ نوبت کشت و خون تک پہنچتی۔ جان ہنٹر خود اس سلسلے میں کئی بار پولس کی گرفت سے بال بال بچے ہیں۔

میں نے جان ہنٹر کے کچھ لکچر دیکھے ہیں۔ اکثر و بیشتر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کسی حکیم کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ وہی بلغم، سودا اور صفرا کا تذکرہ اور وہی فاسد مادّے کے غلبہ کا بیان اور اس کے بعد دواؤں کی ہدایات کے ساتھ تبدیلیٔ آب و ہوا کے مشورے۔ البتہ آپریشنوں کا بیان بڑی تفصیل سے ہے اور اس بات کا برابر احساس ہوتا ہے کہ مصنف علم کی نئی وادیوں میں قدم رکھنے بالکل نہیں جھجکتا اور اس راستے میں وہ ذاتی مشاہدات ہی کو مشعلِ راہ بناتا ہے۔

ہمارے یہاں کے طبیب یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں کہ موجودہ ڈاکٹری اور سرجری عربوں کی طب کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ عربوں کی طب اور یورپ کی ڈاکٹری بالکل مختلف چیزیں ہیں اور ڈاکٹری کو طب کی ترقی یافتہ صورت بتانے والوں کی نیت خراب ہے۔ وہ اس طرح ہماری طب کو پس پشت ڈال کر اپنی ڈاکٹری کو اصل طب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا لیکن اپنے کو اس قابل نہیں پایا کہ طبیبوں کی رائے سے اتفاق کرسکوں۔

میرے خیال میں یہ بہت ضروری ہے کہ ہم عربوں کی سائنس کا تعلق جدید سائنس سے سمجھ لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں نے ایک طرح سے جدید سائنس کی بنیادیں رکھیں۔ بایں معنیٰ کہ انہوں نے مشاہدات پر زور دیا اور اپنے نظریات کی بنیاد انہی مشاہدات پر رکھنا چاہی۔ چنانچہ فزکس میں روشنی کی شعاع فضاؤں میں سمت بدلنے کا مشاہدہ انہوں نے کیا اور اس کے قوانین دریافت کیے۔ میرا اشارہ ابن ہیثم کی طرف ہے، جن کا زمانہ ۹۶۵ء سے ۱۰۴۰ء کا ہے اور جن کی کتاب المناظر کا شمار مدت تک فزکس کی بنیادی کتابوں میں ہوتا رہا۔ اگر وہ اسپین میں اپنی سلطنت کی تباہی کے بعد بھی علمی جدوجہد جاری رکھتے تو یقیناً اُن کے نام بھی فزکس اور کیمسٹری کے عالموں میں لیے جاتے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہیں لکھا ہے کہ پندرھویں صدی کے بعد غیر مذہبی علوم کی طرف ایسی بے توجہی رہی کہ مسلمانوں کا تعلق نہ صرف سائنس سے بلکہ دنیا کے سب تہذیبی دھاروں سے تقریباً منقطع ہو گیا۔

اور مذہبی دھاروں میں بھی کاش کوئی قابل ذکر کام کیا ہوتا۔ آپ یقیناً اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ اور عبدالوہاب نجدی کے نام لیجیے گا۔ بےشک ان دونوں نے اہل سنت کے مذہب کو غیر مذہبی رسوم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے تو بعض بنیادی مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے اقتصادی پہلو پر بھی گہری نظر ڈالی لیکن نہ تو ان عالموں میں سے کسی نے اجتہاد کا دعویٰ کیا اور نہ اُن کے بعد کے دو سو برسوں میں کسی نے مذہب کے کسی معاملے میں اجتہاد کا دعویٰ کیا (سوائے مولوی غلام احمد صاحب قادیانی کے)، صرف یہی نہیں بلکہ عام تاثر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تدوین حدیث کا کام زمانۂ رسالت کے کئی سو برس بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا لیکن اس کے بعد بھی ضعیف حدیثیں اب تک رائج ہیں۔ اب جب تحقیق کے نئے نئے طریقے نکل رہے ہیں آخر یہ ہمت کوئی کیوں نہیں کرتا کہ بخاری شریف کی احادیث کا دوبارہ جائزہ لیا جائے۔ اگر امام بخاری اس کام کو اس وقت کر سکتے تھے جب نہ تو بجلی کی روشنی تھی نہ چھپی ہوئی کتابیں اور نہ آمد و رفت کی وہ سہولتیں جو آج میسر ہیں تو آج کوئی ادارہ ایسے عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھانے کی ہمت کیوں نہیں کرتا؟

باقی آئندہ۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۷ (جولائی ۸۷ء)

شمس الامرا کی سرپرستی میں تصانیف و تراجم

محمد انصار اللہ

اٹھارہویں صدی عیسوی کے خاتمے تک ہندوستان میں عام طور سے انگریزوں کی بالادستی قایم ہو چکی تھی اور انہوں نے اس ملک پر اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے انتظامات شروع کر دیے تھے۔ اس وقت ان کی فوری ضرورت یہ تھی کہ اُن کے پاس ان کے ہم قوموں کی ایک ایسی جماعت ہو جو ہندوستانیوں کے طرز فکر اور ان کے مزاج سے بخوبی واقف ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا جس میں کمپنی کے انگریز ملازموں اور حاکموں کو ہندوستان کی معاشرت اور معاملت سے کما حقہٗ متعارف کرایا جاتا تھا۔ کالج میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا شعبہ بھی قایم تھا اور وہاں صرف ایسے موضوعوں اور کتابوں کا انتخاب کیا جاتا تھا جن کا تعلق براہ راست اور بالواسطہ طور پر ہندوستان کے مخصوص تہذیبی، معاشرتی اور فکری ماحول سے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے جو کتابیں چھپ کر سامنے آئیں، چوں کہ بنیادی طور پر وہ انگریزوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی گئی تھیں، ضمناً ان میں انگریزوں کے انداز فکر و نظر کی جھلک بھی ملتی ہے، لیکن ان میں جو موضوعات و مسایل زیر بحث آئے ہیں وہ سب اپنی کیفیت اور حقیقت کے اعتبار سے خالص ہندوستانی ہیں۔

انیسویں صدی کے عشرۂ پنجم تک انگریز ہندوستان کے دل یعنی دلّی تک پر عملاً قابض ہو چکے تھے اور ان کی انتظامی ضرورتیں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ان حالات میں انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی شرکت ناگزیر ہو گئی تھی ضرورت اس بات کی تھی کہ باصلاحیت اور ذہین ہندوستانی نوجوانوں کی تربیت اس انداز پر کی جائے کہ وہ مزاجاً انگریزوں کے مفادات کے مطابق عمل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے حکام انگریزی نے مدرسہ غازی الدین کی از سر نو تنظیم کی اور اس طرح دہلی کالج وجود میں آیا۔ اس کالج میں ہندوستانی نوجوانوں کو اس طرح تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ انگریزی خیالوں بلکہ ان کی زبان اور مذہب سے بھی آشنا ہو جائیں۔ دہلی کالج میں ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ریڈریں اور دوسری نصابی کتابیں براہِ راست پرنسپل کی نگرانی میں تیار کی گئیں۔ وہ پرنسپل زبان اردو میں تیار ہونے والی کتابوں کے مباحث اور مشمولات ہی پر نہیں بلکہ ان کی زبان اور طرز بیان پر بھی نظر رکھتا تھا۔ اس کالج کے فارغ التحصیل بہترین نام ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال آشوب اور مولانا ذکاء اللہ وغیرہ کے ہیں جو انگریز پرستی میں بے مثال تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے بعد ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی حمایت میں ان حضرات کی خدمات کا جواب نہیں۔

شمالی ہندوستان میں محمد شاہ بادشاہ کے بعد ہی فکری اعتبار سے جمود یا تعطل کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی اور عواقب و نتایج کو سمجھنے اور ان کے مطابق مثبت انداز سے اقدام کرنے کی صلاحیتیں بھی تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر آصف جاہ نے سلطنتِ دہلی سے علاحدگی اختیار کر لی اور دکن کے علاقے کو اپنے طور پر فروغ دینے میں مصروف ہو گئے۔ جنوب کے علاقے میں یورپ کے مختلف زندہ قوموں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کی آپس کی رقابت بھی اس علاقے کے لیے بہتری کا سبب بن رہی تھی۔

زمانی اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کے کسی قدر بعد میں لیکن مکانی

وہاں سے بہت دور یعنی حیدر آباد میں ایک ہندوستانی رئیس نے
وی ہمدردی کے جذبے سے اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و ترقی کی
اپنی زبان یعنی اردو میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف، تالیف
جمے کا سلسلہ جاری کیا اور نتیجے کے طور پر اس زبان کو جو مجموعی حیثیت
شعر و سخن اور داستان سرائی تک محدود تھی، ہندوستانی علوم ہی
بلکہ مختلف النوع یوروپی سائنسی علوم کی بھی ترویج و اشاعت کے لائق
یا لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس کا احسان مند ہونے اور اس کے
م کو آگے بڑھانے کے بجائے اردو زبان و ادب کی ساری ہی تاریخیں،
ہ وہ شمال میں لکھی گئی ہوں یا جنوب میں، اس کے ذکر سے کم و بیش خالی ہیں۔
یس مذکور کا تعارف کراتے ہوئے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

"شمس الامرا کے مورثِ اعلیٰ ابو الخیر خاں تیغ جنگ ہیں۔
اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں آپ شاہی ملازمت
میں داخل ہوئے اور خانی کے خطاب سے ممتاز کیے گئے۔۔۔
آخر ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔
آپ کے دو فرزند تھے۔ بڑے ابو البرکات خاں امام
جنگ۔۔۔ کا عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ ابو الفتح خاں کو باپ
کی زندگی میں ہی ابو الخیر خاں تیغ جنگ کا اور کچھ عرصے بعد
شمس الدولہ، شمس الملک اور شمس الامرا کے خطابات
سے سربلندی حاصل ہوئی۔۔۔ ۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ
(۱۷۹۰ء) کو آپ نے انتقال کیا۔
آپ کے فرزند محمد فخر الدین خاں تیغ جنگ شمس الامرا
ثانی امیر کبیر ہیں۔ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں آپ کی پیدائش
برہان پور میں واقع ہوئی۔۔۔ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں آپ کا انتقال
ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ صاحب حیدر آباد میں دفن ہوئے
آپ بہت بڑے علم دوست اور اہلِ علم و فن کے قدر
دان تھے۔ اپنے صرفہ سے حیدر آباد میں بیسیوں مدرسے
قایم کیے جن میں مدرسہ فخریہ نواب معین الدولہ بہادر
امیر پائیگاہ کی پایہ گاہ میں اب تک باقی ہے۔"

(دکن میں اردو ص ۳۵۹ تا ۳۶۱)

یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ مدرسۂ فخریہ کا قیام کب عمل میں آیا تھا لیکن
اس کے قیام کے بعد ایسی کتابوں کی جستجو ہوتی جو نصاب میں شامل کی جا سکتی
ہوں۔ اردو میں اس وقت شاعروں کے دواوین، تذکروں اور داستانوں
کے علاوہ قواعد اور مذہب و معاشرت سے متعلق دو ایک کتابوں کے
سوا اور کیا تھا۔ شمس الامرا نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ
کیا کہ وہ خود اپنی سرپرستی میں اپنی زبان میں جدید اور قدیم علوم سے متعلق
حسبِ ضرورت کتابیں تیار کرائیں گے۔ اس طور پر جو کتابیں تیار ہوں گی
ان کو چھپوانے کے لیے انہوں نے ایک سنگی پریس لگوایا۔ تصنیف، تالیف
اور ترجمے کے کام کے لیے ملک کے مختلف مراکز کے علاوہ مختلف یوروپی
اقوام کے لوگوں کو بھی انہوں نے ملازم رکھا۔ اس طرح ان کا مدرسہ
فخریہ ایک تعلیمی درس گاہ کی سطح سے بلند ہو کر ایک اچھے علمی ادارے
کی حیثیت اختیار کر گیا جس میں ایک دارالترجمہ بھی تھا۔ شمس الامرا کی
خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

آپ کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ جو تاریخ اردو
میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا یہ ہے کہ آپ نے ہی
سب سے پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابیں ترجمہ
کرائیں۔ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء اس کام کا آغاز ہوا۔"

(دکن میں اردو ص ۳۶۱)

معلوم نہیں کہ ہاشمی صاحب نے زمانے کا تعین کس طرح کیا؟ انہوں نے
کوئی سند پیش نہیں کی۔ خود انہوں نے اس سے پہلے کی سائنسی موضوعات سے
متعلق اسی نوعیت کی ایک سے زاید کتابوں کے مخطوطات کی نشاندہی کی ہے
جیسے شمس الامرا کے دارالترجمہ میں لکھی جا رہی تھیں۔ مثال کے طور پر:

"رسالہ علم ہیئت۔ تاریخ تصنیف قریب ۱۲۲۵ھ، کتابت
۱۲۲۹ھ، ناقص الاول۔۔۔ اس رسالے میں بطور سوال و
جواب علم ہیئت کے بعض مسایل کا بیان کیا گیا ہے۔ کتاب
جو بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ آفتاب، چاند، اور جملہ سیارگان
فلک اور ان کی رفتار کا بیان ہے۔" (آصفیہ ج ۱/ ص ۲۸۷)

اس میں اکثر انگریزی اصطلاحوں سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ایک سوال ہے
کہ "سیارے کا ایرشن کیا ہے؟" شمس الامرا نے غالباً انیسویں صدی

عیسوی کا دوسرا عشرہ شروع ہونے سے بھی کسی قدر پہلے علم و دانش کی سرپرستی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور ان کی توجہ سے تصنیف و تالیف کا کام جاری ہو گیا تھا۔ ہاشمی صاحب نے شمس الامرا سے وابستہ ایک شاعر قیس کے بارے میں لکھا ہے:

محمد صدیق قیس المتوفی ۱۲۳۰ (۱۸۱۵ء) شیر محمد خاں ایمان کا ہمشیر زادہ اور شاگرد تھا۔ راجہ چندو لال اور شمس الامرا نے یومیہ مقرر کر دیا تھا۔ وقائع نگاری کی خدمت بھی سپرد تھی۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی ضخیم دیوان موجود ہے۔" (دکن میں اردو ص ۳۲۰)

عبدالجبار ملکاپوری نے لکھا ہے کہ:

نواب امیر کبیر شمس الامرا بہادر نے بھی خاص اپنی سرکار سے دو روپے یومیہ معین فرمایا تھا۔ ۱۲۳۰ھ میں جاں بحق ہوئے" (محبوب الزمن ج ۲ ص ۹۴۲)

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شمس الامرا نے مغرب کے جدید علوم کی طرف توجہ ضرور کی تھی لیکن ان علوم کی وجہ سے وہ کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہو گئے تھے۔ وہ علوم جدیدہ کی ترویج چاہتے تھے تاکہ اہلِ قوم ان سے کماحقہ فیض یاب ہو سکیں لیکن وہ مشرقی علوم کو نظر انداز کرنے یا اُن کو کم حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اس نکتہ سے واقف تھے کہ ع

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

کوئی بھی قوم اپنے ماضی سے بیگانہ ہو کر ترقی کرنا تو کجا، اپنی انفرادیت کو بھی باقی نہیں رکھ سکتی۔ شمس الامرا نے مشرقی علوم کی بھی سرپرستی میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ محمد صدیق قیس کے لیے یومیہ کا مقرر کیا جانا ہمارے اس دعوے کی دلیل ہے۔ قیس علومِ جدیدہ سے ناواقف تھا، لیکن شاعر کی حیثیت سے باصلاحیت تھا۔ اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ ریختی، رباعی اور قصیدے بھی ہیں۔ اس نے شمس الامرا اور چندو لال کی مدح میں بھی قصیدے لکھے تھے۔ (آصفیہ ج ۱/ص ۳۵)

نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامرا امیر پائیگاہ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کم عمری میں یتیم ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود ان کا علمی شغف ان کی سلامتیِ مزاج کا غماز ہے۔ غلام امام خاں نے اپنی تصنیف 'مدحِ شمسیہ' میں ان کے حالات اور اقوال جمع کیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "نہ صرف امیر کبیر تھے بلکہ ایک عالم بھی۔ انگریزی، فرانسیسی زبان سے ترجمہ کے لیے ایک دارالترجمہ کے مدرسۂ فخریہ انہوں نے قائم کیا تھا جس میں علوم سائنس کی تعلیم ہوتی تھی۔" (آصفیہ ج ۱/ص ۲۱۹)

باہر سے آ کر جن لوگوں نے شمس الامرا کا توسل حاصل کیا، آفاق اور شہرت کو تقدم حاصل ہے۔ آفاق کے بارے میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے:

"آفاق تخلص میر فرید الدین است . . . ایں میر فرید الدین جوانے ست لبس متین، نہایت رنگین . . . از چندے در ممالکِ جنوبیہ ملازمِ مشیر الملک شدہ، قصایدِ چند در مدحِ او گفتہ جائزہائے نمایاں یافتہ۔"

(مجموعہ نغز ج ۱/ص ۳۸)

یہ تذکرہ مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں مکمل ہوا تھا۔ اس سے کچھ مدت قبل آفاق حیدرآباد آ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے ماموں زاد بھائی شہرت اور بعض دوسرے اعزا بھی آئے تھے۔ چنانچہ قاسم ہی نے لکھا ہے:

شہرت تخلص نوجوان سعادت نشان امیر بخش خاں است اصلش از خطۂ جنت نظیر کشمیر و مسقط الراس خاکِ پاکِ شاہجہاں آباد . . . از چندے با والدِ ماجد و فرزندارجمند ہمشیرۂ پدر والا قدر میر فرید الدین آفاق سلمہ اللہ الخلاق بنواحِ ممالکِ جنوبیہ شتافتہ" (ایضاً ج ۱/ص ۳۵۴)

آفاق کے والد کا نام بہاء الدین اور شہرت کے والد کا عیسیٰ خاں تھا۔ آفاق اور شہرت دونوں ثناء اللہ خاں فراق کے شاگرد تھے۔ لالہ سریرام

ــه ـ چندو لال اس زمانے میں شمس الامرا کی ملازمت میں تھے۔ چنانچہ شاد نے لکھا ہے: "شمس الامرا کی جمعیت پائیگاہ اُن کے سپرد ہو گئی اور اس خدمت کو بھی بڑی سرگرمی و قابلیت سے انجام دیا"۔ (دیوان شادان، دیباچہ ص ۷)

بارے میں لکھ دیا ہے کہ :

"دکن پہنچ کر راجہ چندو لال کے ملازم ہوئے ۔"

(خمخانہ ج ۵/ص ۱۹۰)

یہ صحیح نہیں ہے۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد ابتدا میں آفاق اور شہرت ابوالقاسم مشیر الملک کے ملازم ہوئے تھے۔ پھر اپنی علمی کارکردگی کے واسطے یہ دونوں شمس الامرا کی خدمت میں پہنچے۔ عبد الجبار ملکاپوری نے دونوں کے شمس الامرا کے یہاں ملازم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ آفاق کے بارے میں اطلاع بھی دی ہے کہ ان کی تنخواہ "دوسو روپے ماہوار" مقرر تھی۔ (محبوب الزمن ج ۱/ص ۲۴۷)۔

آفاق اور شہرت نے مل کر ملا حسین کاشفی کی مثنوی کلیلہ و دمنہ کا اردو منظوم ترجمہ کیا اور اس کا نام مثنوی دانش افروز رکھا:

"مثنوی دانش افروز از فرید الدین آفاق باہمکاری امیر
بخش شہرت بہ سال ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) سرودہ شدہ
تعداد ابیات بیش از پانزدہ ہزار است"۔

(مثنوی فارسی ص ۲۵۴)

چند سال کے بعد دونوں دوستوں نے مل کر فارسی مثنوی منطق الطیر کا کا نام سے منظوم ترجمہ کیا:

"ترجمہ منطق الطیر منظوم از فرید الدین آفاق دہلوی باہمکاری
امیر بخش شہرت در سال ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) در چہار
ہزار بیت سرودہ شدہ" (ایضاً ص ۳۱۶)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ترجمہ شدہ مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ ان کے قلمی نسخے کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد اور کتبخانۂ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں اب بھی محفوظ ہیں۔ ان مثنویوں نے شہرت اور آفاق کی صلاحیتوں کو عام طور سے منوالیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آفاق کی صلاحیتوں کی وجہ سے شمس الامرا ان کی قدر کرتے تھے اور انہوں نے آفاق سے ترجمے ہی کا کام لیا۔ پہلے آفاق نے شیخ سعدی کی گلستاں کو اور پھر بہار دانش کو اردو میں منتقل کیا۔ پہلی مثنوی کا نام تو انہوں نے وہی رکھا لیکن دوسری کو گلزار دانش کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

"گلستان اردو منظوم۔ از فرید الدین آفاق دہلوی
بہ سال ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) در چہار ہزار بیت سرودہ
شدہ"۔ (مثنوی فارسی ص ۲۴۸)

اور

"گلزار دانش از فرید الدین آفاق دہلوی در ۱۲۳۵ھ
(۱۸۲۰ء) بہ اردو گردانیدہ شدہ" (ایضاً ص ۲۵۸)

ان دونوں مثنویوں کے نسخے بھی کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ گلزار دانش کے بعد بھی آفاق علمی کاموں میں مصروف رہے ہوں گے لیکن ان کے بارے میں اب کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔

گلزار دانش میں آفاق نے شمس الامرا کی مدح بھی شامل کی ہے یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ۱۲۳۵ھ سے پہلے وہ شمس الامرا کی ملازمت اختیار کر چکے تھے[ھ]۔ عبد الجبار ملکاپوری کے تذکرے میں ہے کہ فیض نے آفاق کے مرنے کی تاریخ ذیل کے مصرعے سے نکالی تھی ؎

زاقصائے آفاق آفاق رفت
۱۲۵۳

(محبوب الزمن ج ۱/ص ۲۴۷)

اور یہ کہا گیا ہے کہ شمس الامرا آفاق کو عزیز رکھتے تھے، چنانچہ مذکور ہے کہ:

"رتن لال مست فرید الدین آفاق کے توسط سے شمس الامرا
کے دربار میں پیش ہوئے۔ شمس الامرا جو ہر قابل کے قدرشناس
تھے۔ رتن لال پر عنایت امیرانہ مبذول فرمائی"

(آصفیہ ج ۱/ص ۲۳۸)

اس رتن لال کے بارے میں تفصیلات آگے آئیں گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں شمس الامرا نے اپنے مدرسہ فخریہ میں تدریس کے لیے جو کتابیں تیار کرائی تھیں ان کا تعلق مذہب اور

ھ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے: "آفاق ذات کے برہمن شمس الامرا کے ملازمین میں شامل اور دوسو روپے ماہوار پاتے تھے" دکن میں اردو (ص ۳۴۴) لیکن اس آفاق کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔

سوم سرجیہ سے لکھا چنانچہ اِس زمانے کی چند قابلِ ذکر تصانیف یہ ہیں:

ترجمہ مصباح الصلوٰۃ

یہ کتاب اصلاً عربی زبان میں تھی مولوی قادر علی کمترؔ نے اِسے ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں اردو میں منتقل کیا۔ اِس کتاب میں فقہ کے ستاسی عنوانوں پر صراحت سے گفتگو کی گئی ہے۔ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں اِس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ کتاب میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ شمس الامرا سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ البتہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ کتاب درس میں داخل رہی ہو۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا جو نسخہ ہے اس کے کاتب کا کہنا ہے کہ:

"واسطے اپنے پڑھنے کے لکھا ہوں بیسویں تاریخ کو ماہ محرم ۱۲۴۹ھ" (آصفیہ ج ۲/ص ۱۱۹)

اور جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس کتاب کا ذکر شمس الامرا سے متعلق تصانیف کے ساتھ ہی کیا ہے۔

رسالہ حساب

کتب خانہ آصفیہ میں اس کا جو نسخہ ہے وہ ناقص الآخر ہے اس لیے اس سے متعلق تفصیلات کا علم نہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے بعد تصنیف کیا گیا ہوگا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس میں علم ریاضی کے مسایل کا بیان کیا گیا ہے۔ (آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۶)

رسالہ ریاضی:

یہ رسالہ بھی اسی زمانے کا ہے۔ مصنف وغیرہ کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں۔ خط، زاویہ، سطح، مثلث، مساحت اجسام، مکعب، جرثقیل وغیرہ کا اس میں بیان ہوا ہے۔ بقول مصنف یہ رسالہ "مبتدیوں" کے لیے ہے۔ (آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۶) یہ رسالہ بطور سوال وجواب کے ہے اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں بھی ہے۔ (انجمن ج ۳/ص ۳۳۔)

کسور اعشاریہ

یہ رسالہ شمس الامرا کے دار الترجمہ میں ترجمہ ہوا تھا۔ رسالے کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دیباچے میں کہا گیا ہے کہ:

"یہ رسالہ مختصر اردو زبان میں بطریق سوال وجواب تلمذ اور استاد کے اصول علم، کسورات عشرین (کے ہے) ... اور یہ مشتمل ہے اوپر چار گفتگو کے۔" (آصفیہ ج ۱/ص ۲۹۱)

یہ کتاب ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں مکمل ہوئی تھی اور ۱۲۵۵ھ میں نواب شمس الامرا کے سنگی چھاپے خانے میں طبع ہوئی تھی۔ کتب آصفیہ اور سالار جنگ حیدر آباد میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شمس الامرا نے مختلف علوم وفنون سے کتابیں عموماً سوال وجواب کی صورت میں لکھوائی تھیں تاکہ تدریس میں [illegible] ہو۔

شمس الامرا کا علوم جدیدہ کی طرف متوجہ ہونا بجائے خود بات کی دلیل ہے کہ وہ نہ صرف صاحب علم تھے بلکہ صاحب نظر بھی انہوں نے مختلف لوگوں سے ان کے مزاج اور صلاحیت کے مطابق کام لیے۔ اس لیے یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ انہوں نے خود بھی کچھ نہ کچھ علمی کام ضرور کیے ہوں گے۔ ستۂ شمسیہ کے نام سے ایک کتاب اُن سے منسوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی ایک مربوط کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کہ اِس کے نام سے بھی اندازہ ہوتا ہے، یہ الگ الگ موضوعوں سے متعلق چھ مختلف رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ستۂ شمسیہ میں شمس الامرا نے کہا ہے

"نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامرا اِس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں ـــ میری سماعت میں آئیں۔ یعنی علوم فلاسفہ زبان عرب وعجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علم جرثقیل اور علم المناظر وغیرہ مگر اس قدر ستے نہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے اُن کو دلایل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعض علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنے۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ ... بر حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال وجواب کے لکھے ہوئے ـــ بہم پہنچے" (دکن میں اردو ص ۳۶۲)

ستۂ شمسیہ کا جو نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں ہے، ناقص الآخر

البتہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

"یہ کتاب علم طبعیات کے چھ شعبوں پر مشتمل ہے جو حسب ذیل ہیں۔ علم جر ثقیل، علم ہیئت، علم آب یعنی مائیات، علم ہوا، علم مناظر۔ انعکاس نور اور نور کے اجزا کا بیان، علم برق اور مقناطیس۔" (آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۴)

کتب خانہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ستہ شمسیہ کے چند رسالے محفوظ ہیں ان کی کیفیت اس طرح ہے:

جلد اول۔ جر ثقیل کے بیان میں۔ ۱۲۰ صفحے

جلد سوم علم آب میں۔ اس میں آلۂ غوطہ خوری اور پمپ کے اقسام کا بیان بھی ہے۔ ۱۸۵ صفحات۔

جلد پنجم۔ علم الانظار میں۔ ۱۰۴ صفحے

جلد ششم۔ علم مقناطیس کے بیان میں۔ ۱۶۳ صفحے

ان رسالوں کے خاتمے میں ہے کہ "سوالات اس کے داخل کرنے میں یہ ہے، تا استاد ہر علم کے، تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں سے سوالات کرے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو" پانچویں جلد میں "تمت بالخیر" کے بعد "تبدیل صورت کے بیان" میں تین صفحے ہیں۔ آخری صفحہ پر "علمی گفتگو" نام کی ایک کتاب کا اشتہار ہے جسے ریورنٹ چارلس کی انگریزی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (انجمن ج ۳/ص ۳۰)۔

کتاب ستہ شمسیہ کی بابت لکھا ہے:

"ستہ شمسیہ۔ ریونڈ چارلس، ترجمہ غلام محی الدین حیدرآبادی، موسیٰ تندری وغیرہ، حیدرآباد دکن، مطبع سنگی شمس الامرا ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) یہ کتاب جر ثقیل علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم الانظار اور علم برق سے متعلق چھ رسایل کا مجموعہ ہے۔" (کتابیات تراجم ص ۲۰۵)

لیکن شمس الدین فیض نے شمس الامرا کے دار الترجمہ کے اس ترجمہ کی تاریخ "تالیف نواب شمس الامرا" (۱۲۵۳) سے نکالی ہے (آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۴) کیفیت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ستہ شمسیہ کی تالیف کا مقصد تدریسی تھا اس لیے امکان ہے کہ سوالات خود نواب نے مرتب کیے ہوں اور اُن کے جواب اُن کے متوسل یورپی علما سے اُن کے ایسے ہندوستانی ملازمین نے حاصل کیے ہوں گے جو یورپی علما کی زبان سمجھتے تھے۔ پھر ان سوالوں اور جوابوں کو مربوط کتاب کی صورت نواب نے دے دی ہوگی اس طرح فیض کا اس کتاب کو نواب کی "تالیف" کہنا صحیح ہے۔

کتاب ستہ شمسیہ بہت مقبول رہی ہے اور بار بار زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ:

"ستہ شمسیہ حیدرآباد، مدراس اور دہلی میں چار مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۵۶ھ میں خود نواب شمس الامرا کے پریس سے جو سنگی چھاپے خانے سے موسوم تھا، طبع ہوئی۔ دوسری مرتبہ بھی اسی پریس میں ۱۲۶۶ھ میں طبع ہوئی تیسری مرتبہ ۱۲۷۲ھ میں مدراس میں طبع ہو کر شایع ہوئی اور چوتھی مرتبہ دہلی سے ۱۸۸۰ء میں شایع ہوئی ہے"۔ (آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۴)

اس کتاب کے مطبوعہ اور قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے زبان اور بیان کے اس طرز کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو نواب شمس الامرا رائج کرنا چاہتے تھے۔

شمس الامرا کے مقربین میں سب سے اہم شخصیت حافظ میر شمس الدین فیض دہلوی کی ہے۔ فیض کے دادا مولوی رحمت اللہ خاں دہلوی بہ عہد آصف جاہ حیدرآباد آئے۔ فیض کے والد میر امیر الدین خاں نے برار کے علاقے میں بمقام ایلیچپور سکونت اختیار کی۔ وہیں ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں میر شمس الدین فیض پیدا ہوئے۔ فیض نے حافظ تاج الدین مشتاق میرٹھی شاگرد درد سے اصلاح لی اور صاحب دیوان ہوئے۔ اُن کے دیوان کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہیں۔

میر شمس الدین فیض شمس الامرا کے تقریباً ہم سن تھے۔ انہوں نے شمس الامرا کے علمی پروگراموں میں کما حقہ، تعاون کیا اور کئی کتابیں خود بھی مرتب کیں۔ چند یہ ہیں:

تمیز القوافی: شمس الامرا کے چھوٹے صاحب زادے نواب بدر الدین خاں معظم الملک تمیز کے لیے یہ رسالہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں مرتب کیا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مختصر رسالے میں عروض و قافیہ کے مسایل کا بیان ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

یہ ج ۱/ص ۳۷۱)

خزاین الامثال عرف دستور الشعرا۔ اس رسالے میں زبان اردو
مرے، محاورے اور امثال جمع کیے گیے ہیں۔ سال تکمیل ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء
لف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے محفوظ ہیں (انجمن ج ۶/ص ۱۶۴)

فیض القرآن۔ اس رسالے کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال
ت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء معلوم ہوتا ہے۔ بقول مصنف یہ رسالہ مختصر بیان
بقت ناسخ و منسوخ کے ہندی محاورہ میں لکھا ہے،، (انجمن ج ۲/ص ۴۴)

فیض کی تصانیف میں شمس الصرف، شمس النحو، جدول نصف النہار
بد الاحکام حلت و حرمت کے نام بھی ملتے ہیں (محبوب الزمن)
سے اوّل الذکر دو کے ناموں میں شمس الامرا سے نسبت ظاہر ہے۔

فیض کے اثر سے ان کے کئی شاگرد شمس الامرا کی سرکار میں ملازم
تھے۔ ان میں غلام امام ترین سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ یہ مشہور
بیٹے تھے اور شاعری میں امام اور ہجر تخلص کرتے تھے۔ ان کی
ت یہ ہیں:

تبیین العناصر: مصنف کا کہنا ہے کہ "چند مسایل فلسفۂ عنصریہ
تب حکمیۂ عربیہ سے استنباط کر کے ۱۲۵۴ھ بارہ سے چوبن ہجری نبوی
اء) میں زبان اردو معلیٰ میں (لکھے)۔۔۔ اور نام اس رسالے کا
عناصر رکھا"۔ اس کا انداز وہی ہے جو ستۂ شمسیہ کا ہے یعنی مسایل
وجواب کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رسالے کے مباحث درج

لی گفتگو۔ تعریف اور تقسیم اور انقلاب عناصر میں۔
دوسری گفتگو۔ ان چیزوں کے بیان میں جو زمین و آسمان کے درمیان حادث
ہوتی ہیں۔
سری گفتگو۔ معدنیات
تھی گفتگو۔ نباتات۔
نچویں گفتگو۔ حیوانات، اور
ٹی گفتگو۔ انسان کے بیان میں ہے (انجمن ج ۳/ص ۳۶)
ب کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ ہے۔

شہادات ابراہیمی۔ مصنف نے ابراہیم علی شاہ نامی ایک بزرگ سے
بیعت کی تھی۔ مذہب و عقیدے سے متعلق جو امور اس نے ان سے معلوم
کیے تھے ان کو سوال و جواب کی صورت میں قلم بند کر لیا اور اس طرح یہ رسالہ
۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں مکمل ہوا۔ (انجمن ج ۲/ص ۲۳۴)

مدح شمسیہ۔ اس کتاب میں نواب فخر الدین خان شمس الامرا
امیر پایگاہ کے حالات اور ان کے بعض اقوال قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس کتاب
کو ان کی سوانح اور روز نامچہ کہا جا سکتا ہے۔ رسالہ کی ضخامت انتالیس
صفحہ کی ہے اور یہ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں مکمل کیا گیا تھا۔

تاریخ رشید الدین خانی۔ مدح شمسیہ کی تکمیل کے بعد غلام
امام ہجر نے شمس الامرا کے بیٹے رشید الدین خان اقتدار الملک اقتدار الدولہ
کے نام پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں شاہان ہند و دکن کے حالات لکھے ہیں۔ کتاب
کی تالیف کا کام ۱۲۶۹ھ میں شروع ہو کر ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مکمل ہوا۔
یہ کتاب دو جلدوں میں چھپ چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتبخانوں
میں محفوظ ہیں۔ (آصفیہ ج ۱/ص ۲۴۱)

مثنوی قصہ حضرت مریم: ہجر نے اس مثنوی کا قصہ قرآن پاک سے
اخذ کیا ہے اور ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء سے پہلے کسی وقت اس کی تکمیل کی۔
(آصفیہ ج ۱/ص ۹۲)

تاریخ خورشید جاہی: شمس الامرا ثانی نواب فخر الدین خاں کے
پوتے تیغ جنگ نواب محی الدین خاں سر خورشید جاہ امیر کبیر رالجہ کے نام پر
غلام امام خاں ہجر نے تاریخ کی یہ کتاب ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں مکمل کی
تھی۔ یہ شاید ان کی آخری تصنیف ہے۔ اس میں غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات
کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (آصفیہ ج ۱/ص ۲۴۸)

ہجر کی ایک اور تصنیف ضیاء خورشید کا نام بھی ملتا ہے لیکن اس
کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔ شاید خورشید جاہ کی سوانح ہو
امکان ہے کہ ان کے علاوہ ہجر کی تصانیف اور بھی ہوں۔

شمس الامرا کے دار الترجمہ میں بعض ہندو بھی تھے۔ چنانچہ رائے
منوّ لال نامی ایک شخص نے ٹاڈ ہنٹر کی کتاب کا ترجمہ "کتاب ہندسہ" کے نام
سے کیا۔ یہ ترجمہ شمس الامرا کے مطبع سنگی سے ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں چھپ کر
شائع ہوا۔ ٹاڈ ہنٹر کی کتابیں شمالی ہندوستان میں نسبتاً بعد میں مقبول رہی ہیں
چنانچہ مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب نے بھی اس کی کم سے کم پانچ کتابیں الجبرا

وغیرہ سے متعلق ترجمہ کی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ راے منوّ لال خوش نویس تھا اور کتابوں کی نقل کرنے کا کام بھی اُس سے متعلق تھا۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے کتب خانے میں ایک پرانے رسالے انتباہ الطالبین کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کے آخر کے چند اوراق "منوّ لال متصدی" نے خطِ شکست میں لکھے ہیں۔
(انجمن ج ۲/ص ۲۱۸)

شمس الامرا کے ہندو متوسلین میں رتن لال مست کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص حافظ شمس الدین فیض کا شاگرد تھا اور غالبًا انہیں کے اثر سے ملازم بھی ہوا تھا۔ شمس الامرا نے اس کو اپنے صاحبزادے عمدۃ الملک محمد رفیع الدین خاں بہادر کی فارسی کتاب رفیع البصر کو صاف کرنے پر مامور کیا۔ بعد میں یہ دار الترجمہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس حیثیت سے رتن لال مست نے کتاب رفیع البصر کو اردو میں منتقل کیا اور اِس کا نام اُس نے منتخب البصر رکھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ اس کی کیفیت اس طرح ہے۔

"منتخب البصر۔ تاریخ ترجمہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء)
اس میں علم دوربینا یعنی انظار کے مسایل لکھے ہیں۔ یہ رسالہ بطور سوال و جواب مرتب کیا گیا ہے۔ یہ نواب شمس الامرا کے سنگی چھاپے خانے میں چھپا تھا۔ ضخامت ۲۰۴ صفحوں کی ہے۔"
(آصفیہ ج ۱/ص ۲۷۳)

رتن لال مست نے ترجمے کے علاوہ تصنیفی کام بھی کیے ہیں۔ اس کی ایک کتاب عمدۃ التواریخ ہے جو ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں مکمل ہوئی تھی اس میں ہند اور دکن کے حالات مختصراً بیان ہوئے تھے۔ کتاب کے آخر میں ہندوستان میں پائے جانے والے ہیروں کا حال صراحت سے لکھا ہے اور ایک نقشہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریزوں نے کس ملک پر کس سال میں قبضہ کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ اس کے نام میں رتن لال نے اپنے مربی عمدۃ الملک کے خطاب کی رعایت رکھی ہے۔

عمدۃ الملک محمد رفیع الدین خاں بہادر بھی صاحب علم و فضل شخص تھے۔ انہوں نے بھی تصنیف و تالیف کے کام سے دلچسپی لی۔ چنانچہ فارسی کی کتاب رفیع البصر کے علاوہ اردو میں ان کی ایک کتاب "لوگارثم" کے بارے میں لکھا ہے:

"لوگارثم (رفیع الحساب) ترجمہ: محمد رفیع الدین شمس الامرا،
حیدر آباد دکن، مطبع سنگی شمس الامرا ۱۸۳۶ء (۱۲۵۲ھ)
لوگارثم ریاضی کا انگریزی سے ترجمہ" (تراجم ص ۴۰)

عمدۃ الملک نے بھی اپنے والد کی طرح تصنیف و ترجمے کے کام کی سرپرستی کی تھی۔ وصل تخلص کے ایک شاعر نے ایک مثنوی چراغِ باطن لکھی تھی۔ اس میں ہے:

ہے چراغِ باطن اِس کا نام بھی ۔۔۔ مادّہ تاریخ کا بھی ہے یہی
نام اِس کا یہ رکھا ہوں اس لیے ۔۔۔ تا کہ اِس سے جان و دل روشن رہے۔

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء ہے۔ اس میں ایک زاہد و متقی شخص بادشاہ وقت کو راہِ حق بتانے کے لیے کچھ حکایتیں سناتا ہے۔ مثنوی کے درمیان میں عمدۃ الملک محمد رفیع الدین خاں کی مدح بھی شامل ہے۔ (آصفیہ ج ۲/ص ۲۹۳)

میر عبدالغفور موسوی نامی دہلی کے رہنے والے ایک شخص حیدر آباد میں آ کر عمدۃ الملک کی خدمت میں پہنچے اور اپنے مربّی کی فرمایش پر ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء میں انہوں نے ایک رسالہ قواعد فارسی لکھا۔ اس رسالے کے نسخے دستیاب نہیں ہیں۔ صرف ایک آصفیہ میں ہے (آصفیہ ج ۱/ص ۳۶۸

شمس الامرا کے سنگی چھاپہ خانے سے ان کے زمانے میں جو رسالے اور شائع ہوئے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں؛

رسالہ نافع الامراض: رامزے فاربز، ترجمہ ڈاکٹر ولیم میکنزی حیدر آباد دکن۔ مطبع شمس الامرا ۱۸۴۶ء۔ ادویہ کے خواص اور طریقہ علاج، بنگالی سے ترجمہ" (تراجم ص ۱۹۶) غالبًا اِسی کا ذکر اِس طرح بھی آیا ہے۔

نافع الامراض۔ میکنزی ولیم، ترجمہ: مترجمین شمس الامرا، حیدر آباد دکن۔ مطبع سنگی شمس الامرا ۱۸۴۶ء انگریزی سے ترجمہ (ایضًا ص ۱۸۰)

رسالہ کیمسٹری؛ تاریخ ترجمہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) شروع میں رسالہ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔ "یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر دام اقبالہٗ کے ترجمہ کیا گیا۔۔۔۔ روریڈر جالنٹایم کے مختصر رسالہ کا اردو ترجمہ انگریزی زبان سے اردو عبارت میں لکھا گیا"۔ اس رسالے میں بارہ ابواب ہیں۔

(آصفیہ ج ۱/ ص ۲۰۲)

رسالہ چیچک: میکلین ڈاکٹر ڈبلیو، ای. ترجمہ ڈاکٹر عمر، حیدرآباد دکن، مطبع شمس الامرا ۱۸۴۹ء۔ چیچک کی احتیاطی تدابیر سے متعلق کتابچہ، طبع دوم، مدراس ۱۸۵۷ء" تراجم ص ۱۸۶)

تعریفات اور کیفیات علم آب: چارلس ریورنڈ، مترجمہ، مترجمین شمس الامرا حیدرآباد دکن. شمس المطابع، طبعیات کی کتاب سوال و جواب کے انداز میں انگریزی سے ترجمہ" (تراجم ص ۲۱۹)

مجموعہ تعلیم الصبیان: یہ سترہ رسالوں کا مجموعہ ہے جو مختلف حضرات کے تصنیف کردہ ہیں۔ نواب شمس الامرا امیر کبیر کے سرکاری مطبع میں طبع ہو چکا ہے۔ اس میں غلام حسین خاں جوہر حیدری کی فرہنگ سے جدول ربط کلام فارسی بھی چھٹے نمبر پر منقول ہے (انجمن ج ۴/ ص ۱۰۰) اس مجموعے کا سال طبع ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء ہے۔

شمس الامرا نے اپنے طور پر کتابیں لکھوانے کے علاوہ دوسرے اداروں کی بعض مفید کتابوں کو بھی اپنے مطبع سے چھپوایا۔ ایسا ایک رسالہ مفتاح الافلاک ہے۔ یہ رسالہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کی فرمائش سے عبدالسلام لکھنوی نے فرانسیسی زبان سے اردو میں منتقل کیا تھا یہ رسالہ علم ہیئت سے متعلق ہے اور اس میں بارہ فصلیں ہیں۔ ہر فصل کو "گفتگو" کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ رسالہ بھی شمس الامرا کے دوسرے رسالوں کی صورت میں ہے اور سوال و جواب کے انداز پر تعلیم دی گئی ہے۔ یہ رسالہ پہلی بار کلکتہ میں ۱۸۳۳ء (۱۲۴۹ھ) میں چھپا تھا۔ پھر شمس الامرا نے اسے ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں چھپوایا تھا (آصفیہ ج ۱/ ص ۲۰۵)

شمس الامرا محمد فخر الدین خاں بہادر کے بعد ان کے صاحبزادے اقتدار الملک اقتدار الدولہ محمد رشید الدین خاں رشید شمس الامرا ثالث ہوئے۔ تصنیف و ترجمہ کا سلسلہ ان کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ ان کے زمانے میں کتابوں کی تیاری کے معاملے میں سید شاہ علی نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ یہ قصبہ ادھونی کے رہنے والے تھے۔ ان کی چند کتابیں یہ ہیں۔

شمس الہدایت ترجمہ شرح چغمنی۔ یہ رسالہ عربی کی کتاب شرح چغمنی کا ترجمہ ہے۔ اس میں ایک مقدمہ اور چوبیس فصلیں ہیں۔ ہر فصل کو شمس الامرا کے طریقے کے مطابق "گفتگو" کہا گیا ہے اور رسالہ کو سوال و جواب کی صورت میں لکھا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں مکمل ہوئی۔ کوئی پونے تین سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ (آصفیہ ج ۱/ ص ۲۰۴)

تذکرہ رشیدیہ۔ اقتدار الملک رشید الدین خاں نے مصنف سے کہا کہ "علم ہندسہ میں کوئی نسخہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی تعلیم سے مبتدیوں کو فی الجملہ بصیرت حاصل ہو" اس لیے شاہ علی نے ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء کے بعد کسی وقت یہ رسالہ تصنیف کیا۔ اس میں "اقلیدس کے اشکال کا حل" اور ان کی تعریفیں بیان کی ہیں۔ (آصفیہ ج ۱/ ص ۲۰۷)

ترجمہ بحر الحیواۃ (حیات سمندر) یہ کتاب محمد غوث حسینی گوالیری کی فارسی تالیف "بحر الحیواۃ" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ شاہ علی نے کسی حاجی عبدالکریم کی فرمائش سے ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء کے قریب کسی وقت کیا تھا۔ (آصفیہ ج ۲/ ص ۲۷۵) غالباً یہ حاجی عبدالکریم "صدر منشی" تھے (انجمن ج ۲/ ص ۲۲۰) اور شاہ علی سے ان کے مراسم رہے ہوں گے۔

انوار بدیہ۔ اس کتاب میں اقلیدس کی شکلوں اور ان کی نسبتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء ہے۔ مصنف نے اس کو شمس الامرا ثانی کے بیٹے معظم الدولہ، معظم الملک محمد بدر الدین خاں رفعت جنگ تمیز تخلص کے نام سے منسوب کیا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے شاہ علی کو معظم الدولہ ہی کا متوسل بتایا ہے۔

شمس النصایح۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء ہے۔ مصنف کا تعین نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ شاہ علی ہوں گے (آصفیہ ج ۲/ ص ۱۵۷) مصنف کا بیان ہے کہ "یہ ایک رسالہ چند حکایات نصیحت آمیز حسب الحکم نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر مدظلہ العالی کے سن بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں مرتب ہوا"

افضل الآداب آصفیہ۔ یہ غالباً شاہ علی کی آخری تصنیف ہے جسے انہوں نے ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء میں مکمل کیا تھا۔ بقول مصنف اس میں انہوں نے چند مسایل علم آداب و اخلاق جمع کیے ہیں۔ مسایل کا یہ بیان حکایتوں کی صورت میں ہے۔ (آصفیہ ج ۲/ ص ۳۳۳)

شمس الامرا کے تیسرے بیٹے معظم الدولہ محمد بدر الدین خاں تھے جو ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء میں انتقال کر گئے۔

ؤ قرآن تھے۔ عربی فارسی کی اچھی لیاقت رکھتے تھے اور انگریزی
جانتے تھے۔ تمیز تخلص کرتے تھے اور حافظ شمس الدین فیض سے اصلاح
تھے۔ صاحب دیوان و تصنیف تھے۔ ان کی ایک تصنیف شجرۂ آصفیہ
نام سے بتائی گئی ہے۔

شمس الامرا نے زبان اردو میں علمی کتابوں کے لکھوانے کا جو سلسلہ
وع کیا تھا بالآخر اس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور مختلف
قلم اور صاحبان علم اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں نواب فیاض الدین
ن فیاض شاگرد حافظ فیض میر احمد علی موسوی، حکیم ذوالفقار علی وغیرہ
نام قابل ذکر ہیں۔

حکیم ذوالفقار علی نے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے قریب ایک
الہ "سوال و جواب طب" کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں گیارہ "گفتگو"
ضامین ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا جو نسخہ ہے ناقص الاول ہے
اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ حکیم صاحب کا تعلق کسی صورت میں شمس الامرا
ے تھا یا نہیں۔

حسن مرزا نامی ایک شخص نے جو قصد تخلص کرتا تھا اور حافظ
مس الدین فیض کا شاگرد تھا لخلخہ کے نام سے ایک رسالہ ۱۲۶۵ھ/
۱۸۴ء میں لکھا۔ اس میں ہر قسم کے عطر تیار کرنے اور اگر بتیاں بنانے
طریقے بیان ہوئے ہیں۔ (انجمن ج ۳/ص ۲۰)

فیاض نے ۱۲۷۸ھ/۶۲-۱۸۶۱ء میں رسالہ قطاع (علم و عمل) لکھا
الاصل یہ شمس الامرا کے فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جو فیض کے حکم
ے فیاض نے کیا تھا کہ خود فیاض نے لکھا ہے کہ تطاع ایک نادر آلہ ہے
ر یہ رسالہ ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے (آصفیہ
/ص تراجم ۲۸۹) فیاض کی ایک دوسری تصنیف غرایب حسابی
ہے جو سوال و جواب کی صورت میں ہے (انجمن ج ۳/ص ۳۵) فیاض
ی ایک کتاب لطایف فارسی بھی بتائی گئی ہے۔

میر احمد علی موسوی نے مختلف طبی سائنسی موضوعات سے متعلق
ئی کتابیں لکھی ہیں۔ چند یہ ہیں:-

اناٹمی۔ شروع ان لفظوں سے کیا ہے: علم اناٹمی یعنی تشریح میں
یان جسم انسان کے اسٹرکچر یعنی عمارت کا ہے اور تشریح سے واقف ہونا
جراح اور طبیب دونوں کو ضرور ہے۔" یہ کتاب پانچ سو سے زاید صفحوں
پر شعبان ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں مکمل ہوئی۔

جراحی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے پہلی جلد ۱۲۷۳ھ میں قریب تین سو اور
دوسری جلد ۱۲۷۶ھ میں سوا سو سے زاید صفحوں میں مکمل ہوئی۔

پراکٹس آف فزک۔ اس میں ایک سو سے زاید عنوانوں کے تحت
امراض اور ان کے اسباب اور تشخیص و علاج کا بیان کیا گیا ہے۔ کتاب ساڑھے
چار سو سے زاید صفحوں پر ۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔

فزیالوجی (اناٹمی) یہ کتاب در اصل طبیہ کالج حیدرآباد کے
پرنسپل ڈاکٹر ونڈو کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ تاریخ ترجمہ ۱۲۷۳ھ
ہے۔ خیال ہے کہ شاید اس کا مترجم بھی میر احمد علی موسوی ہی ہو۔
(آصفیہ ۱/۳۰۳)

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شمس الامرا کی تحریک سے زبان اردو میں
مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ایک قابل قدر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا اور یہ
زبان ہر قسم کے علمی مطالب کے ادا کرنے پر قادر ہو گئی تھی۔

مآخذ

اردو مخطوطات (کتابخانۂ آصفیہ حیدرآباد) مرتب نصیر الدین ہاشمی جلد اول مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۶۱ء (= آصفیہ)
ایضاً جلد دوم۔ اعجاز مشین پریس حیدرآباد ۱۹۶۱ء (آصفیہ)
ایضاً۔ جلد ششم مرتب محمد اکبر الدین صدیقی و ڈاکٹر محمد علی اثر ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد ۱۹۸۳ء۔ خمخانۂ جاوید مولفہ لالہ سری رام جلد ۳ تا ۵۔
کتابیات تراجم مرتب ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد مئی ۱۹۸۴ء (تراجم)
مجموعۂ نغز۔ قدرت اللہ قاسم۔ مرتب حافظ محمود خاں شیرانی
محبوب الزمن۔ عبد الجبار ملکاپوری جلد ۱، ۲۔
مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان، جلد ۲، ۳۔ انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۷ء (انجمن)
ایضاً۔ مرتب۔ افسر امروہوی جلد ۳۔ ایضاً ۱۹۷۵ء
ایضاً مرتب ایضاً جلد ۵ ایضاً ۱۹۷۸ء
ایضاً مرتب " جلد ۶ ایضاً ۱۹۸۲
ترجمہ ہائے متون فارسی بہ زبانہائے پاکستان مرتب افتر راہی۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی۔ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۶ء

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد نمبر ۶ شمارہ ۷ - (جولائی ۸۷ء)

دھوپ گھڑی
SUNDIAL

عبدالحکیم

دھوپ گھڑی کا قدیم ترین تذکرہ بائبل یسعیاہ نبی کی کتاب کے اندر اس طرح ملتا ہے۔

Behold I will bring down the shadow of the degrees which is gone down in the sun-dial of Ahaz ten degrees backward (XXXVIII 8)

(دیکھ میں آفتاب کے ڈھلے ہوئے سایے کے درجوں میں سے آخز کی دھوپ گھڑی کے مطابق دس درجے پیچھے کو لوٹاؤں گا (چنانچہ آفتاب جن درجوں سے ڈھل گیا تھا اُن میں کے دس درجے پھر لوٹ گیا)

روم میں پہلی دھوپ گھڑی ۱۶۴ قبل مسیح میں ملکہ مارسیس فلپس (Queen Marcius Philippus) کے حکم سے بنائی گئی تھی لیکن عرب دھوپ گھڑی کی ساخت میں کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ انہوں نے Gnomics کو بڑی اہمیت دی مختلف قسم کی سطوح مثلاً بیلن، مخروطی یا کروی وضع کی سطوح پر دھوپ گھڑی کے خطوط و نقوش خالص ریاضیاتی اصولوں کے تحت ترتیب دینے کا فن Gnomics کا خصوصی موضوع ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ یونانیوں نے کی تھی لیکن عربوں نے اپنی تحقیقات اور اختراعات کی بدولت اسے بڑی ترقی دی اور دھوپ گھڑی کی مختلف شکلیں تیار کیں۔ مشہور عرب عالم ابو الحسن تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں مخروطی بیلن نما اور کروی سطوح پر دھوپ گھڑی کے خطوط و نقوش کھینچنے کے اصول وضوابط سکھاتا تھا۔ دن کے گھنٹوں کی مقدار برابر اور ایک جیسی مقرر کرنا اسی کا عظیم کارنامہ تھا۔ ابو الحسن سے پہلے گھنٹوں کی مقدار مختلف موسموں میں مختلف ہوا کرتی تھی۔ گھنٹوں کی برابری کا اصول ابو الحسن کی فکری کاوش کا نتیجہ تھا مگر دنیا نے اسے تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے میں تیرھویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک یعنی ۳۰۰ سال لگادیے اس طویل مدت کے گزرنے کے بعد ہی یہ اصول قبولیت عام حاصل کر سکا جدید قسم کی دھوپ گھڑیوں اور مشینی کلاک کا بنانا اس کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔

میل آفتاب کے ہمیشہ بدلتے رہنے سے آسمان میں مقامات آفتاب سے صحت کے ساتھ روزانہ اوقات شماری کا کام لینا تقریباً ناممکن سا نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ عام طور پر مشہور ہے The Sun is not a good time keeper (اوقات شماری کے مسئلے میں سورج کوئی اچھا رہنما نہیں ہے) ابتدائی دور میں اوقات شماری کے سلسلے میں آدمی کی کوششیں کچھ اس طرح کی تھیں کہ زمین میں ایک لکڑی گاڑ دیا کرتے تھے

اور اس کے چاروں طرف ایک دائرہ بناکر اسے برابر حصّوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس طرح لکڑی کا سایہ وقت کے پیمانے کا ایک کام چلاؤ ذریعہ بن جاتا تھا لیکن لکڑی کے سایے کو کوئی بھی غور سے دیکھنے والا یہ حقیقت پا جاتا تھا کہ سایہ دائرے کے تقسیم کیے ہوئے حصّوں کو پار کرنے میں وقت کی برابر مقدار نہیں لیتا تھا۔ کسی حصّے کو وہ ایک موسم میں جلد پار کر جاتا تھا مگر دوسرے موسم میں اسی حصے کو پار کرنے میں زیادہ وقت لیتا تھا۔ مگر اب سے تقریباً تین ہزار سال پہلے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اگر لکڑی اس طرح نصب کی جائے تو وہ زمین کے محور کے متوازی ہو تو اس کا سایہ برابر وقت کے وقفے سے حرکت کرے گا میلِ آفتاب خواہ کچھ بھی ہو، دھوپ گھڑی تیار کرنے کا اصلی نکتہ یہی ہے۔

استوائی دھوپ گھڑی

دھوپ گھڑی کی سادہ ترین شکل وہ ہے جسے ہم استوائی دھوپ گھڑی کہتے ہیں۔ اس میں ڈائل جس پر گھنٹوں کے خطوط کھینچے جاتے ہیں۔ خط استوا کے پلین (Plane) کے متوازی ہوتا ہے۔
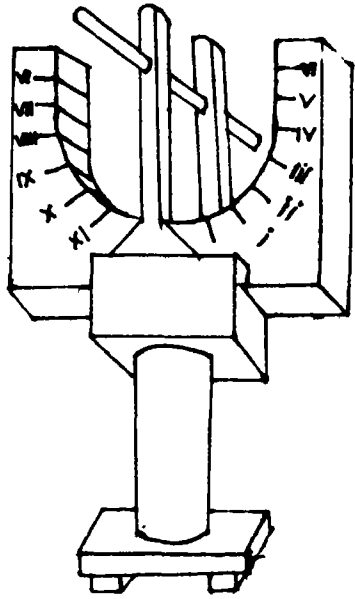
(استوائی دھوپ گھڑی)

اس طرح ڈائل کے مرکز سے گزرتی ہوئی پتلی سلاخ اس پلین پر عمود ہوتی ہے۔ سلاخ کا سایہ ایسے پلین پر ہر گھنٹہ ۱۵ درجے کا زاویہ طے کرتا ہوا گزرے گا۔ اب سلاخ جس نقطے سے گزرتی ہے اسے مرکز مان کر ایک دائرہ کھینچ لیجیے۔ سورج جب نصف النہار پر ہوگا تو ڈائل پر جہاں سلاخ کا سایہ پڑ رہا ہو اسے ۱۲ بجے تصور کر لیجیے اور اسے ایک خط کے ذریعے مرکز سے ملا دیجیے۔ پھر مرکز ہی سے ۱۵، ۱۵ درجے کے زاویے کھینچیے جن کے سرے محیط دائرہ کو مس کرتے ہوں، یہی دن کے گھنٹوں کے نشانات ہوں گے۔ شکل نمبر ۱ میں گھنٹوں کا شمار ایک ترتیب سے مندرج ہے۔ دیکھیے ڈائی گرام ۱

افقی دھوپ گھڑی۔

اس دھوپ گھڑی کا ڈائل ایک کاغذ کا مربع ٹکڑا ہونا چاہیے۔ کاغذ کے بڑے تختے پر ایک بڑا مربع بنائیے۔ اسے دو برابر حصوں میں لائن A-B کے ذریعے تقسیم کر دیجیے۔ (شکل ۲) A-B ڈائل پر ۱۲ بجے کا خط ظاہر کرتی ہے۔ اسی لائن پر کسی مناسب مقام پر

اسٹائل قایم کرنے کے لیے ایک نقطہ لے لیجیے۔ شکل میں اس کا نام O ہے۔ اس نقطے سے ایک دوسری لائن کھینچیے جو A-B پر عمود ہو۔ یہ C-D لائن چھ بجے کی لائن ہے۔ O.F ایک اور خط کھینچیے جو A-B کے ساتھ ایسا زاویہ بنائے جو مقامی عرض البلد کے برابر ہو۔ نقطہ E سے ایک لائن کھینچیے جو O.F سے اس طرح ملے کہ F پر ایک زاویہ قائمہ بن جائے۔ E کو مرکز مان کر اور EF نصف قطر کے ساتھ ایک نصف دائرہ کھینچیے جو A-B کو G پر قطع کرے۔ اس نقطے سے ۱۵، ۱۵ درجے کے زاویے بنایے جو لائن A-B کے دونوں جانب پہنچ رہے ہوں۔ یہاں تک کہ زاویے کے یہ خطوط ڈائل کے خطوط سے نہ مل سکیں۔ اب G سے دو خطوط کھینچیے جو ڈائل کے کونوں سے گزرتے ہوں اور چھ بجے خط سے I اور H پر ملتے ہوں۔ ان دونوں نقطوں سے ۱۵، ۱۵ درجے کے زاویے بنایے یہ زاویے ڈائل کے خطوط کو مس کریں گے۔ جہاں جہاں یہ مس کرتے ہوں انہیں ہم O سے ملا دیں گے۔ اس طرح دھوپ گھڑی کے ڈائل پر گھنٹوں کے نشانات مل جائیں گے۔

اس ڈائل کا سائز کیا ہو قطعاً غیر اہم ہے۔ یہی بات ڈائل کی شکل اور وضع کے حق میں صحیح ہے۔ کسی بھی مقررہ عرض البلد کے لیے نقطہ O سے گھنٹوں کے نشانات جو خطوط بتائے جاتے ہیں وہ ڈائل کی شکل اور سائز کے خیال کیے بغیر ہر جگہ یکساں ہوں گے اور ایک بار جب وہ بن گئے تو مختلف وضع قطع کی گھڑیاں بنانے کے لیے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ ان میں تبدیلی صرف عرض البلد کی تبدیلی سے آئے گی۔

شکل نمبر ۲
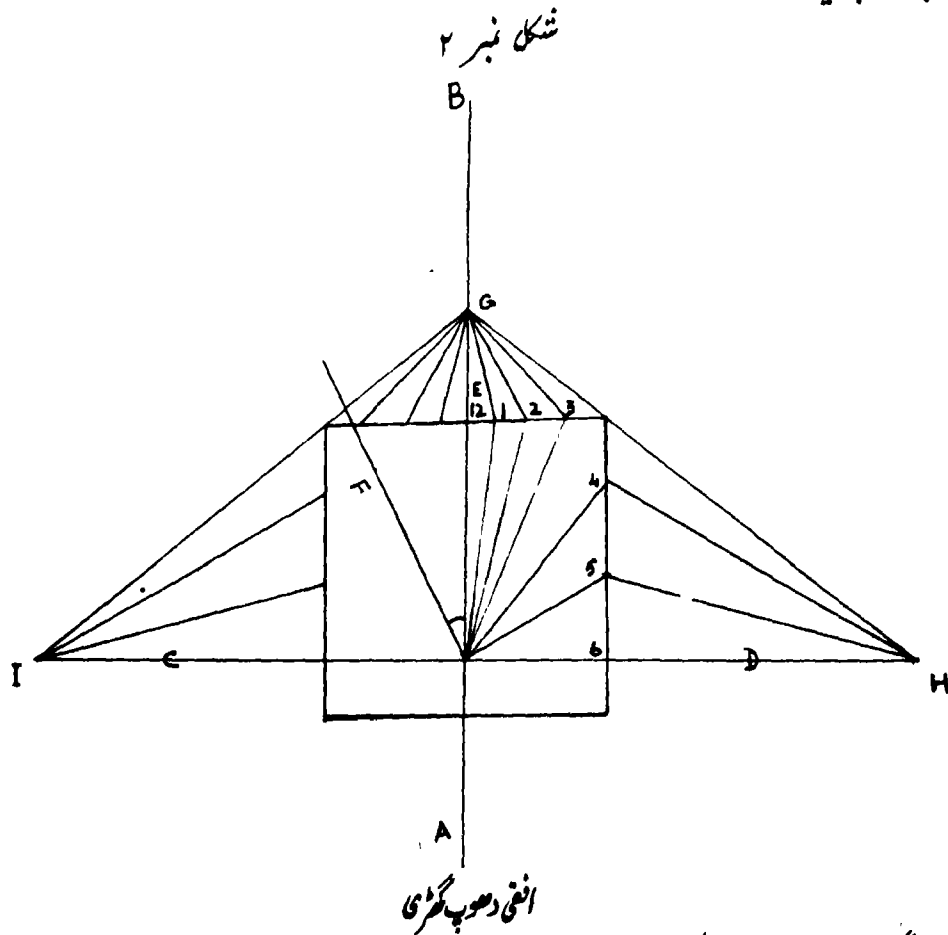
افقی دھوپ گھڑی

افقی دھوپ گھڑی تیار کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ ——— دو خطوط O M اور O C ایک دوسرے کے ساتھ

زاویہ قائمہ بناتے ہوئے کھینچیے OM پر کسی مناسب مقام پر ایک زاویہ φ بنایئے جو مطلوبہ شہر یا مقام کے عرض البلد کے برابر ہو۔ اس زاویہ کا ایک خط OC کو D پر کاٹتا ہے اب O کو مرکز مان کر AD کے برابر نصف قطر لے کر ایک نصف دائرہ بنائیے۔ پھر O کے مرکز کے ساتھ OD نصف قطر لے کر ایک اور دائرہ بنائیے قوس MC کو چھ برابر حصوں میں تقسیم کر دیجیے اسی طرح قوس DN کو بھی چھ برابر حصوں پر تقسیم کر دیجیے۔ قوس MC کے نقطۂ ہائے انقسام سے OM کے متوازی خطوط کھینچیے جو OC تک پہنچ کر ختم ہو جائیں۔ اب O کو نے سے ملا دیجیے۔ L، ND نقطہ ہائے انقسام میں سے ایک نقطہ ہے۔ اس طرح زاویہ LOD °15 کا ہوگا۔ L سے OC کے متوازی ایک خط کھینچیے جو قوس MC کے آخری نقطہ تقسیم سے کھینچے ہوئے خط پر M عمود ہو اور اسے نقطہ K پر مس کرے۔ اب O کو سے ملا کر اتنا آگے بڑھایئے کہ قوس MC کو نقطہ K پر مس کرے۔ یہی OK وہ خط ہوگا جس پر اگر گھڑی کے اسٹائل کا سایہ پڑے تو دن کے ۱۱ بجیں گے۔ اس طرح کے جتنے خطوط چاہے کھینچ لیے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو شکل نمبر ۳۔

$LD = KC \quad OM = AD,\ OD = AD \sin\varphi$

$\tan LOD = \frac{LD}{OD} \qquad \tan 15^\circ$

$\tan KOC = \frac{KC}{OC} \qquad \tan Q$
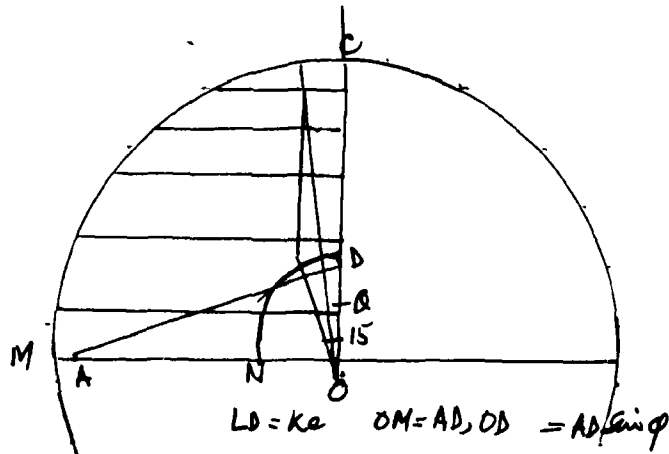
$$\frac{\tan Q}{\tan 15^\circ} = \frac{KC}{OC} \times \frac{OD}{LD} \quad \text{but } KC = LD$$

$$= \frac{LD}{OC} \times \frac{OD}{LD} = \frac{OD}{OC} \quad \text{but } OC = OM = AD$$

$$= \frac{OD}{AD} = \sin\varphi$$

$$\frac{\tan Q}{\tan 15^\circ} = \sin\varphi$$

$$\tan Q = \sin\varphi \tan 15^\circ$$

$$= \sin\varphi \tan R$$

خلیجی یونیورسٹی اور عربی اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس

عبد السلام — مترجم — حیات اللہ انصاری

بحرین میں ۱۱ مئی ۱۹۸۳ء کو "عربی خلیجی یونیورسٹی کا آئندہ لائحہ عمل" کے موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا جس میں پروفیسر عبد السلام نے ذیل کا مقالہ پیش کیا۔

اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان
محمداً عبدہٗ ورسولہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اللہ ہی نے تم کو اس قابل بنایا کہ تم سمندروں پر قابو حاصل کرو تاکہ اللہ کے حکم سے تمہارے سفینے اس پر چل سکیں۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین اور آسمان کی ہر شے پر حکمرانی عطا کی ہے۔ یہی ہیں وہ نشانیاں جن میں اصحابِ فکر کے لیے اللہ کے اشارے موجود ہیں۔"

(قرآن حکیم ۴۵-۱۲/۱۳)

تفکر اور تسخیر (سائنس اور ٹکنالوجی)

میں نے قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ اس میں تفکر اور تسخیر دونوں تصورات کا ذکر ایک ہی جگہ آگیا ہے۔

تفکر کہتے ہیں قوانین فطرت پر غور وفکر کرکے ان کی حقیقت کے دریافت کرنے کے عمل کو۔ یعنی سائنس۔ اور تسخیر یہ ہے کہ ٹکنالوجی کے ذریعے فطرت پر قابو حاصل کیا جائے۔ یہی دونوں چیزیں یعنی تفکر اور تسخیر ہمیشہ سے بنی نوعِ انسان کے لیے بنیادی محرکات رہی ہیں۔ یہ عظمت ہے اسلام کی کہ قرآن پاک نے بار بار اس بات کی تکرار کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ ان دونوں مشاغل میں منہمک رہے اور جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تفکر اور تسخیر یعنی سائنس اور ٹکنالوجی یہ دونوں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی مظہر کے دو جز ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو ابھی ستر سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمان قرآن کریم کے مذکورہ احکام کی تعمیل کے ماتحت اس دور کے سائنسی علوم کی تحصیل میں نہایت تیز رفتاری اور سرگرمی سے لگ گئے۔ انہوں نے بہت باقاعدگی سے اپنے زمانے کے علوم کے سارے دفتروں کو دوسری زبانوں سے اپنی مذہبی زبان عربی میں منتقل کر ڈالا۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں مثلاً بیت الحکمۃ کی اور نظامیہ ایسی باوقار یونیورسٹیوں کی بنیاد ڈال کر دنیا کے اس خطے میں انہوں نے سائنس کے میدان میں وہ بلندی حاصل کرلی جو صدیوں تک قایم رہی۔

اسلام میں سائنسی تخلیق کی سطح

ان ترقیوں کا تھوڑا بہت اندازہ جارج سارٹن کی عظیم الشان کتاب "تاریخ سائنس" سے کیا جاسکتا ہے۔ سارٹن نے سائنس کا ناول کی کہانی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے جس کا ہر دور پچاس سال کا ہے

در ہر دور کو ایک مرکزی شخصیت سے منسوب کیا ہے۔ اس طرح ۵۰۰
سے ۳۵۰ ق م افلاطون کا دور ہے جس کے بعد ارسطو، اقلیدس،
رشمیدس وغیرہ کے ادوار آتے ہیں۔ ۷۵۰ تا ۱۱۰۰ صدی عیسوی
ں مسلسل جابر خوارزمی، رازی، مسعودی، ابوالوفا، البیرونی
ور عمر خیام کے ادوار ہیں۔ ان ۳۵۰ برسوں تک سائنس کی دنیا
پر دولت مشترکہ اسلامیہ کے عرب، ترک، افغان اور ایرانی ماہران
یسٹری، ریاضی داں، طبیب، جغرافیہ داں، طبعیات اور ہیئت
کے ماہرین چھائے رہے۔ سارٹن[1] کے بیان کے بموجب گیارہویں صدی
عیسوی کے بعد جاکر مغربی نام آنے لگتے ہیں لیکن وہ بھی اس طرح کہ
گلے ڈھائی سو برس تک ابن الرشد، نصیر الدین طوسی اور ابن النفیس
یسی اسلامی شخصیتوں کے ساجھے دار بن کر چلتے ہیں۔

اسلام میں سائنس کی ترقیوں اور مسلمانوں کی اُپج کے کارناموں
کو نمایاں کرنے کے لیے میں اپنے خاص موضوع طبعیات کی مثال دوں
گا۔ یونانیوں کے نظریوں کے بر خلاف ابن سینا (۹۸۰ تا ۱۰۳۷ صدی
عیسوی) کا خیال تھا کہ روشنی دراصل مبداء نور سے ایک مقررہ رفتار
سے خارج ہونے والے ذرّات سے پیدا ہوتی ہے۔ ابن سینا تاپ، قوت
ور حرکت کی نوعیت سے بھی واقف تھا۔ یہ اقتباس میں نے ایچ۔ جے۔
پی۔ ونٹر کی کتاب "مشرقی سائنس" سے دیا ہے۔ ابن سینا کا ایک
معاصر ابن الہیثم (۹۶۵ تا ۱۰۳۹ صدی عیسوی) بھی تھا جس کا شمار
ہر زمانے میں عظیم ماہرین طبعیات میں کیا جائے گا۔ جس نے بصرہ میں
کام کی ابتدا کی اور پھر مصر منتقل ہوگیا۔ اس نے بصری نور یا آپٹکس
ں بہت اعلیٰ پیمانے پر تجربہ گاہی تحقیق سے نتائج اخذ کیے اور یہ نظریہ پیش
کیا کہ

"ایک شعاع نور جب کسی واسطے (میڈیم) سے گزرتی ہے
تو سہل ترین اور زود ترین راستہ اختیار کرتی ہے"

اس طرح اس نے فرما کے "کم ترین مدت کے اصول"[2] کو کئی صدیوں
قبل دریافت کر لیا تھا۔ اس نے قانون نا تبدیلی (انرشیا) کا نظریہ
بھی پیش کیا تھا جو آگے چل کر نیوٹن کے نظریے حرکت کا پہلا قانون بنا۔

اس نے انعطافِ نور کے عمل کی میکانکی اصطلاحوں میں تشریح کی
اس کا نظریہ یہ تھا کہ جب روشنی کا کوئی ذرہ دو شفاف واسطوں سے
گزرتا ہے تو اس کا رہگزر قوتوں کے مستطیل کے اصول کا پابند ہوتا ہے
اسی چیز کو آگے چل کر نیوٹن نے دریافت کیا اور زیادہ واضح کیا۔

مرو کے الخزینی (بارھویں صدی عیسوی) نے اپنی کتاب "کتاب
توازن علم و حکمت" میں ایک ایسی عام کشش ثقل کا نظریہ[3] پیش کیا جس کا
رجحان زمین کے مرکز کی طرف ہوتا ہے۔ یہ مفروضہ بھی کہ ہوا میں بھی وزن ہے
انہیں سے منسوب ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی اپنی خاص دریافت بھی کہ
پتلی نلکیوں میں پانی خود بخود چڑھتا ہے اور اس عمل میں ایک خاص طاقت
کارفرما ہے جسے آج کل کیپلیری طاقت کہتے ہیں۔

قطب الدین شیرازی (۱۲۳۶ تا ۱۳۱۱ عیسوی) اور ان کے
شاگرد کمال الدین نے قوس و قزح کی پہلی تشریح کی اور بیان کیا کہ
روشنی کی رفتار بصری نور کے معکوس تناسب سے ہوتی ہے نہ کہ مادی
راہ داں کی کثافت کے تناسب سے۔ اور یہ کہ بیضوی محدب عدسوں[4] کے
ذریعے کروی انعطاف سے بچا جا سکتا ہے۔

ان کارناموں کو آنکنے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان حضرات
میں بیشتر جز وقتی طبیعاتی ماہرین تھے ورنہ یہ حضرات تو تھے جامع العلوم
بہ یک وقت طبیب بھی ہیئت داں بھی، خطاط بھی اور شاعر بھی
حتیٰ کہ مذہبی عالم بھی۔

اس تفصیلی بیان سے میں نے البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۴۸ عیسوی)
کا ذکر نہیں کیا جو موجودہ افغانستان میں کام کرتے رہے۔ وہ اپنے معاصر
الہیثم کی طرح عظیم تحقیقی تجربہ گاہی محقق تھے۔ ان کے نقطۂ نگاہ میں ویسی
ہی جدیدیت تھی اور دور وسطی کے مفروضات سے ویسی ہی بغاوت
تھی جیسی کہ چھ صدیوں بعد گیلی لیو میں پائی گئی اور ان کے بیان کردہ
"قوانین فطرت کی یکسانیت" کے نظریہ کی کہ (زمین پر اور دوسرے اجرام
فلکی پر طبعیات کے قوانین یکساں طور پر کارفرما ہیں) دریافت میں الہیثم

---

1. George Sarton. 2. Farmats Principle. 3. Universal Gravity.

پیش رو کے ساجھے دار تھے۔

اوپر میں نے مسلمانوں سے منسوب طبیعیات کے چند عظیم جدید نظریات کا تذکرہ کیا ہے لیکن تمام علوم کی طرح اسلام میں کیے گئے سائنس کے کام کا خاص حصہ مشہور عالم شخصیتوں کے صرف درخشاں کارنامے ہی نہیں ہیں' بلکہ یہ بھی ہے کہ کیسی کیسی محنتوں اور جانفشانیوں سے انہوں نے سابق اور ہم عصر معاصروں کے تجربوں اور نظریوں کو اکٹھا کیا، ان کا تجزیہ کرکے تنقیدی کسوٹی پر کسا اور نتائج اخذ کیے براؤن سٹاک نے وقیع تبصرے ابتدائی دور وسطیٰ میں سائنس ٹکنالوجی اور اقتصادی ترقی میں ان امور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سائنس کسی نہ کسی شکل میں مفکرین کی ایک بہت بڑی تعداد کا جزو قتی یا ہمہ وقتی مشغلہ مسلسل بنی رہی۔ اس ضمن میں الندیم کے سائنس دانوں کے کیٹلاگ الفہرست میں موجودہ اقلیدس کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل اقتباس پر غور فرمایئے۔

" عناصر کا ترجمہ الحجاج بن یوسف بن مطر نے دو بار کیا۔ پہلا ترجمہ ہارونی کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا مامونی کہلاتا ہے اور وہی قابل اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ اسحاق بن حنین نے بھی اس کا ترجمہ کیا پھر اسی ترجمہ پر ثابت بن قرہ الصابی نے نظر ثانی کی مزید یہ کہ عثمان الدمشقی نے اسی سلسلے کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ میں نے اس کا دسواں ترجمہ مفصل میں علی بن احمد العمرانی کے کتب خانے میں دیکھا۔

(ان کے ایک شاگرد ابو الصقر القبیصی تھے جو ہمارے زمانے میں المحسنیت پر تقریر کرتے ہیں) التبریزی نے بھی اس کی تشریح لکھی ایک اور شرح اس کی پانچویں جلد پر الماہانی نے لکھی۔ مزید یہ کہ ابوجعفر الخزینی الخراسانی نے اقلیدس کی کتاب کی شرح تیار کی اور یہی ابو الوفا نے کیا مگر ان کی شرح پوری نہیں ہو سکی۔ تب ایک شخص نے جس کا نام ابن الراہانی تھا دسویں جلد پر شرح لکھی۔ ابو القاسم الانطاکی نے پوری کتاب کی شرح لکھی۔ پھر ایک شرح سند ابن علی نے لکھی اور دسویں جلد پر ابو یوسف الرازی نے شرح لکھی۔ ایسی دقت نظر اور تحقیق کے پس منظر میں وہ پہلا سائنس داں جس نے حکیم اقلیدس کے خطوط متوازی کے نظریہ پر جو بدیہی سمجھا جاتا تھا' غور و فکر کیا' وہ نصیر الدین طوسی تھا تو یہ بات حیرت کی نہیں۔

جیسا کہ اسٹاک کا کہنا ہے'

" الندیم کی فہرست مکمل ہے مگر ریاضیات کا ایک خاص پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ ہے اس کا عملی پہلو۔ ندیم نے یہ نہیں بتایا کہ ہندی عربی ہندسوں کو اور اعشاریہ کے نظام کو تجارت نے عام کیا۔ نہ اس نے یہ بتایا کہ مسلمان ریاضی دانوں نے یونانی ریاضی دانوں سے زیادہ حساب در یاضی کو روز مرہ کے معاملوں میں استعمال کرنے میں دلچسپی لی۔ ممتاز نجومی ماشاء اللہ (۸۱۵ تا ۸۲۰ عیسوی) استعمالی اشیاء کی قیمتوں کے متعلق ایک مقالے کا مصنف تھا۔ ابو الوفاء نے اقلیدس اور ڈیا فینٹس پر اپنے تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ ایسی کتابیں بھی لکھیں جن کے عنوان اس قسم کے تھے جیسے کہ فن کاروں کے لیے جیومٹری کی کون کون شکلیں ضروری ہیں۔ ان کتابوں میں اصول تو پرانے تھے مگر مثالیں نئی تھیں کہا جا سکتا ہے کہ کہاں نازک ترین نظریات اور کہاں تجارتی حلقے۔ مگر ایسے کام سے اتنا ضرور ہوا کہ تجارت سے دانشوروں کو حوصلہ ملا اور انہوں نے نظریات کو عملی پہلوؤں کی طرف موڑا۔ یہ تھا مزاج اسلامی سائنس کا۔ یعنی بنیادی سائنس کو عام زندگی سے مربوط کر دینا۔ یہی ہے تفکر اور تسخیر۔ اس پس منظر میں دیکھیے سارٹن کا یہ اقتباس۔

" دور وسطیٰ کا خاص کارنامہ اور ایسا کارنامہ کہ جس کی طرف نظر کم جاتی ہے' یہ ہے کہ اس دور نے تحقیقات کا شوق پیدا کر دیا اور اس عمل کا سہرا بارہویں صدی تک مسلمانوں کے سر بندھا رہا۔"

خلیجی ریاستوں کے لیے ایک عظیم یونیورسٹی کا منصوبہ بناتے وقت ہم نے کل اس نشست میں اس کی روپ ریکھا کے بارے میں ایک تفصیلی بیان سنا۔ جس میں اس امکان کا اظہار کیا گیا تھا کہ نیا ادارہ ترقی کر کے ٹکنالوجی (تسخیر) کی یونیورسٹی بن سکتا ہے۔ آج میں اس کے دوسرے پہلو پر خاص توجہ دلاؤں گا یعنی تفکر کے پہلو پر جو کہ تمام جدید ٹکنالوجی کی جان ہے۔ عربی اسلامی اقوام کی دولت مشترکہ کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف خاص طور سے دلانا چاہتا ہوں کہ ہمیں سائنسوں کی تخلیق کو سب باتوں

پر مقدم رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مَیں چند تجویزیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہم کو اگر اقوام عالم کی صف میں وہی پہلا سا وقار حاصل کرنا ہے تو بحرین کی عظیم یونیورسٹی کو اپنی اندرونی اور بیرونی ترقیوں کے لیے ان تجویزوں کو قبول کر لینا چاہیے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ بحرین کی مجوزہ یونی ورسٹی کو ایسے مواقع حاصل ہیں وہ سائنس میں بھی اعلیٰ ترین درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ ٹکنالوجی میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی پہلی شرط ہے اس لیے سائنس پر زور دینا ضروری ہے۔ بحرین نے ایک مختصر سے عرصے میں ماہرانہ بینک کاری میں اعلیٰ ترین روایات قایم کر لی ہیں۔ اس بات کو دیکھ کر مجھے یقین ہوتا ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی میں اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ وہ سائنس میں اعلیٰ ترین ترقی کر سکے۔ بحرین پرانے زمانے میں تہذیبوں اور تمدنوں کی گزرگاہ رہا ہے اور یہاں کی یہ روایات رہی ہیں کہ نئے خیالات اور حوصلوں کو رواداری سے قبول کیا گیا ہے یہی وہ باتیں ہیں جو سائنس کی نشو و نما کے لیے بنیادی شرطیں ہیں۔

۲۔ اسلامی ممالک میں سائنس کی موجودہ صورت حال

اسلامی دولت مشترکہ میں اس وقت سائنس کی صورت حال کیا ہے اس کو یوں دیکھیے کہ عربی اسلامی قوم میں چھ جغرافیائی خطوں میں واقع ہیں اور سب سے پیش پیش ہیں جزیرۃ العرب اور خلیج کی ۹ مملکتیں، یہ ہے پہلا خطہ — دوسرا خطہ ہے شمالی عرب کی ریاستوں کا جو کہ شام، اردن، لبنان اور فلسطین پر مشتمل ہے۔ تیسرے خطے میں ترکی، مسلم وسطی ایشیا، ایران، افغانستان اور پاکستان واقع ہیں۔ چوتھا اور سب سے زیادہ آبادی والا خطہ وہ ہے جس میں بنگلا دیش، ملیشیا، انڈونیشیا (بشمول ہند اور چین کی اقلیتیں) آجاتی ہیں۔ پانچویں خطے میں شمالی افریقہ کے عربی ممالک ہیں اور چھٹے میں غیر عربی افریقی ممالک ہیں۔

اگر ہم اعلیٰ سائنسی اہلیت ناپنے کا پیمانہ یہ قرار دیں کہ ۱۸ سال کی عمر سے لے کر ۲۳ سال کی عمر کے کتنے طلبا یونیورسٹیوں کے سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں تو اسلامی ممالک کے طلبا دو فیصدی نکلیں گے اور ترقی یافتہ ممالک کے بارہ فی صدی۔ یہی ایک اور چھ کا تناسب پایا جاتا ہے ملکی اخراجات میں جو سائنس اور ٹکنالوجی پر اسلامی ملکوں اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہو رہے ہیں۔

اسلام آباد میں ۱۰ مئی ۸۳ء میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی پہلی نشست میں جو پس منظری مقالہ پیش کیا گیا اس میں تحقیق و ترقی میں لگے سائنس والوں اور انجینروں کی تعداد تمام عالم اسلام میں تقریباً ۴۵۱۳۶ دکھائی گئی تھی جس کے مقابلے میں صرف روس کی تعداد پندرہ لاکھ اور جاپان کی چار لاکھ ہے۔

زہلن کے مطابق اس قسم کے اور دیگر اعداد و شمار کے بھی تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک طبعیات کا تعلق ہے بین الاقوامی معیاروں کو دیکھتے ہوئے عربی اسلامی ملت رقبے کے اعتبار سے دسواں حصہ ہے اور سائنسی تخلیق کے مطبوعہ مواد کے حساب سے صرف سواں حصہ ہے۔ پاکستان جو اسلامی ملکوں میں طبعیات میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، وہاں ۱۹ یونی ورسٹیاں ہیں لیکن طبعیات کے صرف ۱۳ پروفیسر ہیں اور اس کی تمام یونیورسٹیوں میں کل ۴۲ طبعیات کے پی ایچ۔ ڈی استاد اور تحقیق میں لگے افراد ہیں۔ جب کہ کل پاکستان کی آبادی آٹھ کروڑ ہے۔ اس کے مقابلے میں یو۔ کے میں ایک یونیورسٹی کے سائنس اور ٹکنالوجی کے صرف امپریل کالج میں ۱۲ پروفیسر ہیں اور سو افراد تحقیق کے کام میں منہمک ہیں۔

یہ اعداد و شمار بہت مایوس کن ہیں اور اس سے زیادہ مایوس کن یہ ہے کہ سائنس کے سلسلے میں ہماری تمام کوششیں بین اقوامی سائنس سے بے نیاز ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ مصر کو چھوڑ کر جو ۱۶ انجمن کا ممبر ہے کوئی دوسرا عربی یا اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو پابندی سے سائنس کے مختلف مضامین کی بین الاقوامی سائنسی انجمنوں میں پانچ سے زیادہ کا چندہ ادا کرتا رہا ہو۔ یہ بات حیرت کی ہے ہمارے حدود میں سائنسی تحقیق کے ایک بھی بین الاقوامی مرکز کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے اور یہاں بہت کم بین اقوامی سائنسی کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں۔ ہم اپنے ملکوں میں تو کام کرتے ہیں لیکن بہت کم ایسے ہیں جن کو دوسرے ممالک کے سائنسی اداروں میں جانے اور وہاں کی علمی نشستوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہو۔ عام طور پر ایسے سفروں کا شمار فضول خرچی اور رفیشی میں کیا جاتا ہے۔ تیل برآمد کرنے والے عربی ممالک میں حالات کچھ بہتر ہیں۔ لیکن غیر عرب

اسلامی ملکوں کے حالات اور بھی مایوس کن ہیں۔ اس علیحدگی پسندی کو ختم کرنے کے لیے میں نے نظریاتی طبیعیات کے بین اقوامی مرکز کی تجویز پیش کی تھی تاکہ جو لوگ اپنے مضمون میں نئی ترقیوں سے بہرہ ور رہنا چاہتے ہیں انہیں ملک بدر نہ ہونا پڑے۔ یہ مرکز اقوام متحدہ کی دو ایجنسیوں آئی۔ اے۔ ای اے اور یونیسکو کی ملکیت ہیں۔ اس سے تقریباً ۱،۵ عربی اور مسلم ماہرین طبیعیات کو (جو ترقی پذیر ممالک سے آئے ہوئے ۱۰۰۰ طلباء میں شامل ہیں) وہاں قیام کے زمانے میں وظایف دیے جاتے ہیں ان میں ۲۵ کو کویت اور قطر کی یونیورسٹیوں اور کویت کی سائنسی امدادی فنڈ سے امداد دی جاتی ہے اور باقی طلباء کو آئی۔ اے۔ ای۔ اے اور یونیسکو سے مہیا کی ہوئی رقوم یا ان عطیات سے جو میں اٹلی یا سویڈن سے حاصل کر سکتا ہوں وظائف دیے جاتے ہیں۔

ایک غیر متعلق شاہد کا اندازہ پیش کر رہا ہوں۔ باوقار سائنسی ماہنامے نیچر کے ۲۴ مارچ ۸۳ء کے شمارے میں فرانسس گائڈ نے اپنے مضمون میں یہ سوال اٹھایا ہے "اسلامی سائنس کو کیا ہوا ہے" وہ کہتا ہے ایک ہزار سال پہلے جب اسلام اپنے انتہائی عروج پر تھا تب عالم اسلام نے سائنس کی غیر معمولی خدمت کی تھی۔ خصوصاً علوم ریاضی اور طب میں۔ اس نے اپنے عروج کے زمانے میں بغداد اور جنوبی ہسپانیہ میں یونیورسٹیاں قایم کیں جن میں ہر طرف سے ہزاروں طالب علم آتے تھے۔ وہاں کے حکمرانوں نے اپنے گرد سائنس دانوں اور فنکاروں کا جمگھٹ لگا لیا تھا اور ایسی رواداری کی فضا قایم کی تھی جس سے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو ساتھ کام کرنے کا حوصلہ ملتا تھا۔ آج یہ سب باتیں یاد گزشتہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی پر مصارف ممکن ہے آج بڑھ گئے ہوں۔ یہ اضافہ تیل کی دولت والے ملکوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ ممالک جنگوں میں مبتلا ہیں، جن میں اربوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے پاس سائنس کو دینے کے لیے وقت کہاں اور رقوم کہاں۔ ان کی تجارت کا تانا بانا درآمد کی ہوئی ٹکنالوجی کا مرہون منت ہے اور بیشتر ممالک کا اقتصادی اور سائنسی نظام نئی تحقیق کے بجائے نقالی کی طرف راغب ہے۔

تیل کی برآمد سے حاصل حالیہ دولت سے بھی حالات میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ بہت سے سائنس دانوں کو اس بات کا بہت دکھ ہے کہ شرق وسطیٰ میں سائنس اور سیاست کا گٹھ جوڑ ہے۔ اس علاقے پر آمرانہ حکومت کا چاہے وہ مربیانہ ہو یا غیر مربیانہ، راج ہے اس سے سائنس کی مقامی نشوونما میں الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جب ایسے حالات ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے کہ ان ملکوں کے دانشور حضرات مسلسل صنعتی ملکوں کو چلے جا رہے ہیں اور پورے شرق وسطیٰ کی ذہنی و فکری زندگی میں اضمحلال واقع ہو گیا ہے جو کہ بڑھتا جا رہا ہے۔

نیچر کے اسی شمارے میں ایک دوسرا مضمون اسرائیل میں تحقیق میں لگے افراد پر ہے جس کا میں اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"اس بات کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ تحقیق و ترقی میں لگنے والے عالمانہ تربیت یافتہ افراد کی تعداد میں کافی اضافے کی ضرورت ہے۔ تحقیق و ترقی کی قومی کونسل نے سفارش کی ہے کہ ملک کو ۱۹۸۵ء میں ایسے ۸۶،۰۰ افراد کی ضرورت ہوگی جب کہ ۱۹۷۴ء میں ان کی تعداد صرف ۳۴۸۰۰ تھی۔"

یعنی ڈیڑھ سو فی صدی کا اضافہ ہونا چاہیے۔ آپ ۳۴۸۰۰ کی تعداد کا مقابلہ تمام اسلامی ممالک میں تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ۴۵۱۲۴ افراد سے کیجیے (آبادی کا تناسب لگ بھگ ایک اور ۲۰۰ کا ہے۔)

فاعتبروا یا اولی الابصار

اس مضمون میں مزید لکھا ہے کہ "۱۹۶۰ء کے دہے میں تیل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈریک ڈی سولا پرائس نے مختلف ممالک میں سائنسی افرادی قوت کا تخمینہ لگانے کا ایک طریقہ نکالا ہے۔ وہ ایسے تحقیق کرنے والوں کی تعداد پر مبنی ہے جنہوں نے اپنے مقالے بڑے پیشہ وارانہ جریدوں میں چھپوائے ہوں۔ اس تخمینے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کے ملک اسرائیل میں دوسرے ملکوں کی آبادی کو دیکھتے ہوئے سائنس دانوں کی تعداد پانچ گنا موجود ہے۔ ہمارائنس کا دعویٰ ہے کہ آج بھی حالات کچھ مختلف نہیں ہیں۔ اس ملک میں آج

تربیت یافتہ لوگوں کا جس قدر عظیم ذخیرہ موجود ہے اس کے لیے اسے شکر ادا کرنا چاہیے کیوں کہ اس کے سائنس دانوں اور ٹیکنیکی ماہرین تیل اور معدنیات کی کمی کو صرف پورا ہی نہیں کر دیتے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دے دیتے ہیں۔

نئی خلیجی یونیورسٹی ۔

عربی اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کی ترقیاں جب اتنی مایوس کن ہیں تو ایسے میں اگر عربی اسلامی ملکوں میں ایک بڑی یونیورسٹی کے قیام کی خبر نے مجھ میں جوش اور ولولہ بھر دیا تو حیرت کی کیا بات ۔

موجودہ حالات میں پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ گذشتہ حالات کی تلافی کے لیے روایتی بنیادی سائنسوں یعنی طبعیات، کیمسٹری، ریاضیات اور حیاتیات کی اعلا سطح تک تحصیل کی جائے جو کہ عملی سائنس کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔

میرے سامنے مستقبل کی ایک تصویر ہے جس میں سائنس کی ابھرتی ہوئی باوقار یونیورسٹیاں ہیں۔ شاید چھ اسلامی علاقوں میں سے ہر ایک میں ایک ایک۔ ان میں خلیجی یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک سے زیادہ سائنسوں کے نظری اور عملی ۔۔ دونوں قسم کے ایسے ایسے فاضلانہ مرکز ہیں جو دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی کے مرکزوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان مرکزوں کے دروازے بین الاقوامی برادری کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں جو سہولتیں پائی جاتی ہیں ان کا شمار دنیا کی بہترین سہولتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان یونیورسٹیوں کی کارکردگی دفتری پابندیوں سے آزاد ہے۔ ان مرکزوں کی طرف سے عربی اسلامی دولت مشترکہ کے ان باشندوں کو جو تحقیقات کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، مالی امداد کی پوری ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔ اس طرح غریب ترین عربی اسلامی ممالک کے غریب ترین سائنسی شعبوں کو بھی ان سہولتوں کی بدولت تازہ ترین سائنس سے بہرہ ور رہنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ ان سہولتوں کے عملے کے لیے افرادیوں تو دنیا کے سب ہی ملکوں سے آئیں گے مگر خصوصیت سے عربی اسلامی سائنس کے ساتویں علاقے سے آئیں گے۔ زعلن کے حساب سے یہ ساتواں علاقہ عربی اسلامی ممالک کے ان بیس ہزار افراد پر مشتمل ہے جو آج کل یورپ اور امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں مستقبل کی جو تصویر ہے اس میں یہ لوگ بحرین اور دوسری بڑی یونیورسٹیوں میں کم از کم جز وقتی معاونوں کی حیثیت سے ضرور ہی آئیں گے تاکہ اپنے عملی اشتراک سے ہماری دولت مشترکہ میں سائنس کو نوجیون عطا کریں۔ آپ میرے اس تصور کو ہوائی قلعہ نہ سمجھیے۔ یہ ہو کر رہے گا۔ بس شرط ہے کہ ہم اس علاقے میں خصوصاً سائنس کے لیے وہی حالات پیدا کر دیں جیسے کبھی اسلامی دور کی ابتدا میں تھے ۔

۵ ۔ ۱۰۰۰ اصدی عیسوی سے قبل سائنسوں میں مسلمانوں کے تفوق اور پھر زوال کے اسباب

کیا حالات تھے جنھوں نے آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں صدی میں مسلمانوں کو سائنس کو اس سرعت سے ترقی دینے پر آمادہ کیا تھا کہ وہ دوسروں سے آگے نکل گئے۔ اس کے اسباب کیا تھے ؟

اس کے تین سبب نظر آتے ہیں۔ پہلا سبب جو کہ سب سے اہم ہے وہ یہ کہ مسلمان قرآن پاک میں آئی ہوئی آیتوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد اعجاز الخطیب کہتے ہیں کہ سائنس کی اہمیت کو اس بات سے زائد کون چیز واضح کر سکتی ہے کہ کلام پاک میں جہاں قانون وضع کرنے والی ۲۵۰ آیات ہیں وہاں ۷۵۰ آیتیں جو کہ قرآن پاک کا تقریباً آٹھواں حصہ ہیں، ایسی ہیں جو مسلمانوں کو فطرت کا مطالعہ کرنے کی ہدایت دیتی ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ فطرت پر غور و فکر کرو اور عقل و شعور کا بہترین استعمال کرو۔ اس طرح وہ سائنسی حوصلہ مندی کو اسلامی زندگی کا جزو لاینفک بنانے کی طرف رہبری کرتی ہیں۔

دوسرا سبب جو کہ پہلے سے منسلک بھی ہے وہ ہے وہ مرتبہ جو صاحبان علم و دانش یعنی عالموں کو اسلام نے عطا کیا ہے۔ قرآن پاک نے عالموں یعنی صاحبان علوم اور سائنس کے مرتبہ کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے کہ کہا ہے

> "کہ وہ لوگ جن میں ایسے خواص نہیں ہیں وہ کیسے ان لوگوں کی ہمسری کر سکتے ہیں جو ان خواص کے حامل ہیں۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

> "علم اور سائنس کی تحصیل ہر مسلمان مرد اور عورت

کے لیے فرض ہے۔"

انہوں نے اپنے پیروؤں کو علم حاصل کرنے کی ہدایت کی ہے، خواہ اس کے لیے انہیں دور دراز ملک چین تک سفر کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ چین کے تذکرے سے وہ سائنس کی طرف توجہ دلانا چاہتے تھے ورنہ چین میں مذہبی علوم کہاں تھے۔ اس قول سے انہوں نے تحصیل سائنس کی بین اقوامی پہلو کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔

اب ہمارے سامنے وہ تیسرا سبب آگیا جس نے اسلام میں سائنسی مہم جوئی کو ابھارا، وہ ہے تحصیل علم کا بین اقوامی کردار۔ اسلامی دولت مشترکہ قوموں اور رنگوں کی سرحدوں سے بالاتر رہی ہے۔ ابتدائی اسلامی سماج میں بیرونی اقوام کے لیے اور ان کے خیالات و نظریات کے لیے بے انتہا رواداری پائی جاتی تھی۔

اسلام میں سائنسوں کے لیے احترام رہا ہے اور عربی اسلامی دولت مشترکہ نے ان کی مسلسل سرپرستی کی ہے۔ ایچ۔ اے۔ آر گب نے جو کچھ عربی ادب کے لیے لکھا ہے اگر اس کی روشنی میں سائنس کو دیکھا جائے تو اُن کے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

"دوسری جگہوں کے مقابلے میں اسلام میں سائنسوں کا پھلنا پھولنا بہت حد تک اس بات کا مرہون منت رہا ہے کہ اعلا مرتبوں پر فائز صاحبان سائنسی علوم پر اپنی داد و دہش نچھاور کرتے رہے ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی سماج مائل بہ انحطاط ہوا، وہاں سائنس بھی بے جان اور کمزور ہو گئی۔ لیکن جب تک ایک بھی دارالسلطنت ایسا رہا جہاں بادشاہوں اور وزیروں کو سائنس کی سرپرستی کرنے میں لطف آتا تھا یا اس سے ان کو شہرت یا منفعت حاصل ہوتی تھی تب تک مشعل روشن رہی۔"

مگر سائنس کی ترقی اسلامی دنیا میں قایم نہیں رہی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے اس کا انحطاط شروع ہو گیا۔ ۱۲۵۰ تک زوال تقریباً مکمل ہو گیا لیکن کیوں ہوا ایسا؟

اس سوال کا یقینی طور پر کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا ہے۔ خارجی اسباب ضرور خراب تھے جیسے منگولوں کی تباہ کاری۔ وہ تباہ کن ضرور تھی لیکن ایسا شاید صرف ایک دفعہ ہوا تھا۔ کیوں کہ چنگیز کے صرف ساٹھ سال کے بعد ہی اس کے پوتے ہلاکو نے مراغہ میں ایک رسدگاہ کی بنیاد ڈالی جہاں نصیر الدین طوسی کام کرتے تھے۔ میرے خیال میں اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کی موت کی وجہیں زیادہ تر داخلی تھیں جیسے تقلید جو کہ جدت پسندی کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور سائنسی مہم جوئی میں علیحدگی پسندی کا آجانا۔

اس کو واضح کرنے کے لیے امام غزالی (۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱ء) کی عظیم کتاب احیاء علوم الدین کے پہلے باب میں دی ہوئی ہدایت پر غور کیجیے امام غزالی ان سائنسوں کی تخلیق اور تحصیل پر زور دیتے ہوئے جو اسلامی سماج کے نشو و نما کے لیے ضروری ہیں خاص طور سے ریاضیات اور طبی علوم کا نام لیتے ہیں۔ ان سائنسوں کا شمار وہ فرض کفایہ میں کرتے ہیں یعنی ایسا فرض جو عاید تو ہوتا ہے پوری امت پر لیکن چند افراد بھی اگر اسے ادا کر دیں تو پورا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی نہیں ادا کرتا ہے تو پوری امت گناہ گار اور مورد عذاب ہوتی ہے۔ پھر امام اپنی کتاب المنقض من الضلال میں کہتے ہیں

"وہ شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ریاضیاتی علوم کے انکار سے اسلام کا دفاع ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو حقیقتیں نازل ہوئی ہیں، ان میں سائنسوں کی نہ تو نفی ہے نہ اثبات اور نہ ان سائنسوں میں کوئی بات مذہب کی صداقتوں کے خلاف ہے۔"

باوجود ان احکام کے امام غزالی کی تحریروں کے تھوڑے ہی دن بعد زمانے کا مزاج سائنس سے دور ہٹ کر تصوف اور ترک دنیا کی طرف اور غیر رواداری اور سائنس میں اور تحصیل علم کے دوسرے میدانوں میں تقلید کی جانب مائل ہو گیا۔

مثال کے طور پر میں ابن خلدون (۱۳۳۲ تا ۱۴۶۰ء) کا ایک اقتباس پیش کروں گا۔ ابن خلدون ایک عظیم سماجی مورخ اور اپنے میدان میں ہر عہد کے دانشوروں میں ممتاز درجہ رکھنے والا ہے۔ وہ اپنے مقدمے میں لکھتا ہے۔

> "کچھ دن ہوئے ہم نے سنا کہ فرنگیوں کے ملک میں اور بحیرۂ روم کے شمالی ساحل پر فلسفے کی سائنسوں کو بہت فروغ دیا جا رہا ہے۔ وہاں ان کا مطالعہ پھر شروع ہو گیا ہے اور ان کی تعلیم متعدد درجات میں دی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی موجودہ تشریحات بہت جامع ہیں۔ ان کے ماننے والے بے شمار اور ان کے طالب علم لاتعداد ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں ہے کیا۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ طبعیات کے مسائل کی ہمارے مذہبی معاملات میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔"

ابن خلدون کی اس بات سے نہ تو کسی قسم کے تجسس کا اظہار ہوتا ہے اور نہ کسی آرزومندی کا۔ اس کے الفاظ میں جو بے رغبتی پائی جاتی ہے، اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا وہ ہے علیحدگی پسندی اور یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ علیحدگی پسندی اور مسلّمات پرستی وہ بلائیں ہیں جو معقولیت کے لیے پیغام موت ہوتی ہیں۔

نویں اور دسویں صدی میں جو کہ ہماری عظمت کا زمانہ تھا تب ہم لوگوں نے بغداد اور قاہرہ میں اعلا تعلیم کے بین اقوامی ادارے جیسے کہ بیت الحکمت قایم کیے جہاں تمام قوموں کے ماہروں کو اکٹھا کیا گیا تھا لیکن چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے یہ سب کام رُک گیا۔ اس زمانے میں جو علوم بھی ابھرے وہ مذہبی بحث و مباحثے میں جہاں روایت کی درایت سے اور مسلّمات کی ایجادات سے زائید   ابھی تک اسلام میں سائنس کی وسعت بے قید و بند تھی لیکن اسی دور میں آکر علمی نظر ایک مخصوص چار دیواری کے اندر گھر کر رہ گئی۔ اس صحت مند تنقید کی جس سے تحقیق کا شایق نوجوان جو سیکھتا ہے اس کو پرکھتا بھی ہے اور نئے سرے سے اس کا جائزہ بھی لیتا ہے اور پھر کچھ نئے خیالات لے کر آتا ہے ان کی اس دور میں ہمت افزائی کرنا کیا، ان کو گوارا تک نہیں کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ ابن خلدون کے زمانے سے عقلی کنارہ کشی چلتی رہی۔ یہاں تک کہ عظیم اسلامی سلطنتوں، ترکی عثمانی، ایرانی صفوی اور ہندوستان کی مغل حکومتوں کے دور میں بھی وہی حالت رہی۔ یہ بات نہیں تھی کہ سلطان اور شہنشاہ یورپ میں ہونے والی ترقیوں سے ناواقف تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں توپیں ڈھالنے کے فن میں وینس اور جنیوا کے لوگوں کی افضلیت کا علم نہ ہو یا یہ کہ وہ نہ جانتے ہوں کہ پرتگالی جہاز سازی اور جہاز رانی میں اتنے آگے ہیں اور وہ دنیا کے سمندروں پر قابو حاصل کیے ہوئے ہیں حتّیٰ کہ اسلامی ممالک کے گرد کے سمندروں پر اور نیز حاجیوں کے بحری راستوں پر بھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ پرتگالیوں کی فن جہاز رانی میں مہارت محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس کی نشو نما میں تاریخ کی مسلسل کارفرمائیاں شامل ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ شاہزادہ ہنری ملقب بہ جہاز راں کے ایما پر ۱۴۱۹ء میں سیگرس کے مقام پر ایک ادارۂ تحقیق قایم کیا گیا اور وہاں سائنٹفک طرز پر بڑے خلوص اور لگن سے فن جہاز سازی اور جہاز رانی پر مسلسل کام کیا گیا۔ اسلامی حکمرانوں کو ان مہارتوں پر رشک تو ضرور آتا تھا اور اس کے حصول کے متمنی بھی تھے لیکن اس کی ٹکنالوجی اور اس کی سائنس کے درمیان جو بنیادی تعلق تھا اس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ مثال کے طور پر ۱۷۹۹ء میں سلیم سوم نے ترکی میں الجبرا، مثلثات، میکانیات اور توپ سازی اور دھات سازی کی جدید تعلیمات شروع کیں اور فرانسیسی اور سوئیڈنی استادوں کو درآمد کیا تاکہ توپ سازی میں یورپی مہارت کا مقابلہ کیا جا سکے مگر چوں کہ ان فنون سے متعلق بنیادی سائنس اور تحقیق پر زور نہ دے سکے اس لیے ترکی کبھی بھی یورپ کے برابر نہ پہنچ سکا۔

تیس سال بعد مصر کے حکمراں محمد علی نے اپنے آدمیوں کو سونے اور کوئلے کی کانوں کی تلاش کرنے اور کان کنی کی تربیت دلائی لیکن ان کے جانشینوں کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مصریوں کو ارضیات کی بنیادی سائنس کی بھی تعلیم و تربیت دلائی جائے۔ آج بھی جب ہم اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ٹکنالوجی میں قوت اور بقا کا سہارا ہے، تب بھی ہم یہ نہیں سمجھ پائے ہیں کہ ان کے حصول کے راستے جو ہیں ان کو مختصر نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہم یہ سمجھ پائے ہیں کہ سائنس کے عملی فوائد اور ٹکنالوجی پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی سائنس اور اس کی تحقیق ہمارے تمدن کا جز بن جائیں۔ میکاویلی کو سمجھنے والوں کو ان لوگوں کے ارادوں میں ضرور کھوٹ نظر آجائے گا جو ہم کو ٹکنالوجی کو

مہر بند کرکے ٹکنالوجی منتقلی کے نام سے دینے کو تیار ہیں لیکن سائنس کی منتقلی کی بات نہیں سنتے۔

تبادلۂ سائنس اور تبادلۂ ٹکنالوجی۔

میں اس بحث کو اور واضح کردوں۔ کیوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، یہی اس کا مرکزی خیال ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کہ سائنسی تحقیق کس طرح جدید ٹکنالوجی پر اثر انداز ہوتی ہے، چند تاریخی اور کچھ حالیہ امور کی مثالوں سے کروں گا۔

میری پہلی مثال فیراڈے کا برق اور مقناطیسیت کے ایک ہونے کا نظریہ ہے، جس کی تکمیل گذشتہ صدی میں ہوئی۔ فیراڈے کے نظریے سے پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ برق اور مقناطیسی توانائیاں دو الگ الگ توانائیاں ہیں جن میں کوئی آپسی رشتہ نہیں ہے۔ برق طوفانی مظاہرے سے وابستہ تھی اور مقناطیس لوہے کی چھڑیں تھیں جو زمین کے مقناطیسی اثر سے متحرک ہوتی تھیں۔ فیراڈے نے پکیڈلی (لندن) کے امپیریل ادارے کی بنیادی سائنسوں کی تجربہ گاہ میں کام کرتے ہوئے ان دونوں مختلف توانائیوں کے درمیان حیرت انگیز رشتہ دریافت کرلیا وہ یہ کہ برقی رو والی کوئی شے اگر مقناطیس کے قریب لائی جائے تو مقناطیس اپنی جگہ سے ہٹتا ہے۔

اس تجربے اور اسی قسم کے دوسرے تجربوں سے جو نتیجہ نکلا وہ غیر مشکوک اور سنسنی خیز تھا وہ یہ کہ مقناطیسی توانائی کوئی الگ توانائی نہیں ہے۔ برقی رَو والی اشیاء جب ساکت ہوتی ہیں تو برقی قوت پیدا کرتی ہیں اور جب وہ حرکت کرتی ہیں تو مقناطیسی قوت پیدا کرتی ہیں، پھر تو برقائی اور مقناطیسیت ملاکر ایک کردی گئیں یعنی ان کو ایک توانائی قرار دے دیا گیا۔ طبعیات کی یہ سب سے عظیم دریافت تھی اور ہے جب فیراڈے اپنے تجربے کررہا تھا تو کون سمجھتا تھا کہ لندن کے ایک فیشن ایبل اور نمائش پسند علاقے کی تجربہ گاہ میں ہونے والی اس سیدھی سادی دریافت کا نتیجہ بجلی کی توانائی کی پیداوار کے پورے نظام کی بنیاد بنے گا۔

فیراڈے کے کام کو اس کے ہم عصر کس قدر بیکار سمجھتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ایک صاحب چارلس برٹن موسیقی اور برق کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "برق تمام عالم میں بہت دلچسپ اور حیرت انگیز مظہر قدرت مانی جاتی ہے مگر لوگ اکثر اس کے بارے میں افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابھی تک اس بات کا یقین نہیں کہ اس کو کسی مفید کام میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ یہ کہنا کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ موسیقی کو انسان کی اہم خدمتوں میں استعمال کیا گیا ہے، تیموں کا اس سے غم غلط کیا جاسکتا ہے اور دردِ زہ کی تکلیفوں کو گھٹایا اور کم خطرناک بنایا جاسکتا ہے"۔

برق اور مقناطیسیت کو ایک کر دینے کی مہم میکسوئل نے جاری رکھی جو فیراڈے کے فوراً بعد ہی آیا۔ میکسوئل نے اپنے سے سوال کیا کہ فیراڈے نے یہ دکھایا کہ متحرک برق پارے مقناطیسی قوت پیدا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر برق پارے ایک ہی رفتار سے چلنے کے بجائے برابر بڑھتی ہوئی رفتار سے چلیں تو کیا ہوگا۔ میکسوئل نے اس سوال پر نظریاتی طور پر غور و خوض کیا۔ اسے فیراڈے کی مساواتوں میں اونچ نیچ ملی۔ کیوں کہ اگر برق پارے بڑھتی ہوئی رفتار سے چلتے تھے تو مساواتوں میں تبدیلیاں کرنا پڑتی ہیں۔ دانشوری کی تاریخ کا سب سے عظیم عرفانی عمل تھا جو میکسوئل نے انجام دیا۔ مساوات میں اس نے مناسب تبدیلیاں کرلیں تب اس کو اپنی دریافت سے انتہائی حیرت ہوئی کہ بڑھتی ہوئی رفتار والی حرکت ترقی یافتہ اشیاء سے برقی مقناطیسی شعاع ریزی ہوتی ہے۔ پھر وہ اس شعاع ریزی کی رفتار کی شرح نکالنے میں بھی کامیاب ہوگیا اور اسے یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ حساب سے نکالی ہوئی یہ شرح روشنی کی رفتار سے جو کہ اب تک تجربوں سے خاصی صحت سے نکالی جاچکی تھی مماثل تھی۔ کیا روشنی برقی مقناطیسی شعاع ریزی ہے جو روشن مادے کے اندر مہم برق پاروں کی بڑھتی ہوئی رفتار سے حرکت میں آنے سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم تجربہ گاہ میں برق بار والے ذروں کو بڑھتی ہوئی شرح رفتار سے متحرک کرکے روشنی پیدا کرلیں۔ کیا میکسوئل نظریہ کی تصدیق براہ راست تجربہ گاہ میں ہوسکتی ہے؟"

۱۸۷۹ء میں میکسوئل کی وفات کے چند سال بعد ہی جرمنی میں ہرٹز نے ایسے تجربے بڑھتی ہوئی رفتار سے متحرک برق پاروں سے کیے میکسوئل کی ہر ایک پیش گوئی صحیح پائی گئی۔ میکسوئل کی پیش گوئی والے شعاع کے خوردبینی عکس میں صرف روشنی کی لہریں ہی نہیں پائی گئیں

بلکہ طویل الوقفہ لہریں یعنی ریڈیائی لہریں اور قصیر الوقفہ لہریں یعنی ریڈیائی
لہریں بھی پائی گئیں۔ اس طرح کیونڈش تجربہ گاہ (ایک تجربہ گاہ جو ریاست
کی امداد سے نہیں بلکہ نجی فرد لارڈ کیونڈش اور ان کے خاندان کی قایم
کی ہوئی ہے) کے ایک غیر معروف پروفیسر کے اکیلے بنائے ہوئے نظریاتی
حساب کے نتیجے سے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور جدید رسل و رسائل کے نظام
کے محیر العقول وسائل پیدا ہوگئے اور نیز جسم انسانی کے آر پار دیکھنے کے
لیے ایکس رے کی بھی سہولت مہیا ہوگئی۔ ہم اپنے عربی اسلامی ملکوں
میں تمام عالم کے دوسرے ملکوں کے ساتھ اُن خدمات سے مستفید ہو رہے
ہیں اور شاید ہی اس احسان کا اعتراف کرتے ہوں جو انسانیت پر
ایک معمولی ماہر طبیعیات میکسوئل اور تنہائی میں کی جانے والی اس تحقیق
نے کیا ہے۔ میکسوئل کی صد سالہ سالگرہ ۱۹۷۹ء میں گلاسگو یونیورسٹی
کی طرف سے اس طرح منائی گئی کہ صرف چھ افراد اس کی قبر پر اکٹھا ہوگئے
یہ ہے وہ خراج عقیدت جو دنیا نے اس عظیم سائنسی محقق کی خدمت میں
پیش کیا۔

میری دوسری مثال ہے شکستگی (فشن) کی۔ یہ زیادہ بھاری
ایٹمی مرکزوں کو جیسے یورینیم کے ہیں، اس وقت دو حصوں میں ٹوٹنے کو
کہتے ہیں جب اس پر کسی سست حرکی مادے کی جیسے حراری نیوٹران سے
چوٹ لگے۔ کوئی بھی اس کی جستجو میں نہیں تھا نہ کسی کو اس کی توقع تھی۔ عظیم
اطالوی ماہر طبیعیات فرمی جب روم کی یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعیات کی ٹوٹی
پھوٹی تجربہ گاہوں میں کام کر رہا تھا تو اس کو اپنے پرکھ نلی میں شکستگی
کے اجزاء دوسرے ملبے میں ملے ہوئے حاصل ہو سکتے تھے، لیکن نہیں
ہوئے کیوں کہ وہ اُن کی کھوج میں نہیں تھا۔ اس مظہر کا انکشاف دوسری
بار ہوا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں بنیادی سائنسوں کی قیصر ولیم ادارے جرمنی
میں کسی ماہر طبیعیات نے نہیں بلکہ دو نیوکلیائی کیمیادانوں ہان اور
اسٹراس مان نے یہ انکشاف کیا۔ ان دونوں مصنفوں نے اپنے مقالے
میں کہا "نیوکلیائی کیمیاگر ہوتے ہوئے بھی ہم ماہرین طبیعیات کے قریب
ہیں اس لیے ہم کو ایسا اعلان کرنے میں تکلف ہو رہا ہے جو پہلے کے تمام
طبیعیاتی تجربوں کی تردید کرتا ہے۔ اس منکسرانہ اعلان کے ساتھ
جنگ اور امن کے لیے نیوکلیائی توانائی کے عہد کا آغاز ہوا۔ اس کے
لیے جس سامان اور آلات کا استعمال کیا گیا وہ اس قدر سادہ اور
معمولی تھے کہ غریب عربی اسلامی ملکوں کی حقیر تجربہ گاہوں میں بھی
دستیاب ہو سکتے ہیں۔ آج نیوکلیائی توانائی کے سیاق میں یورپی
امریکی، روسی، جاپانی اور چینی تجربہ گاہیں شکستگی کے مظہر کے تجربے
کر رہی ہیں۔ ہائیڈروجن کے دھماکے سے رہا ہونے والی توانائی کو
قابو میں لانے کے تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ ابھی تجربے صرف تجربہ گاہی
تجربے ہیں اور صنعتی ٹکنالوجی تک نہیں پہنچے ہیں۔ یورپی اقوام نے مل کر
ایک مشترکہ تجربہ گھر "دولت متحدہ" کے تحت قائم کیا ہے،
اقوام متحدہ کی ایجنسی۔ آئی۔ اے۔ ای۔ اے تمام عالم کے لیے ایک
مشترکہ وسیلہ گاہ بنا رہی ہے۔ مگر میرے خیال میں ابھی تک کسی عربی
اسلامی ملک نے اس میں شرکت کی درخواست نہیں کی ہے۔ لیبیا
نے دوراندیشی سے کام لے کر اس میدان میں تجربے کرنے کے لیے
روسی امداد سے ترپولی میں ایک چھوٹا ٹوکامک وسیلہ گاہ کا
منصوبہ تیار کیا ہے لیکن ابھی تک ایسا طریقہ کار وضع نہیں کیا گیا ہے جس
کے تحت عربی اسلامی اور افریقی ممالک سے تجربہ کرنے والے افراد
کے گروہ اس وسیلہ گاہ میں کام کرنے کے لیے آسکیں۔ ٹرسٹ
کے مرکز میں ایسے کاموں کے لیے نظریاتی کارگاہیں (ورکشاپ) موجود
ہیں جہاں تمام عالم کی باوقار تجربہ گاہوں کے ماہرین رہنمائی کے
لیے موجود ہیں۔ آج کل تو یہ ان چند مراکز میں سے ایک ہے جہاں
اس میدان میں کام کرنے والے عربی اسلامی ماہرین طبیعیات کو
خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

میری دوسری مثال ہے حیاتیاتی ٹکنالوجی کے میدان کا
ایک کارنامہ۔ جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ نسلیات کی
جدید ترقیاں اس وقت شروع ہوئیں جب واٹسن اور کوک نے
تناسلی اسرار کی گتھی کھول دی۔ اس انکشاف نے تمام معلوم
زندگی کی بنیاد ظاہر کر دی۔

بیسویں صدی کا بلکہ تمام زمانے کا یہ سب سے زیادہ
عقدہ کشا انکشاف ہے۔ حیاتیات کا یہ عظیم انکشاف کیمبرج میں

اپریل ۱۹۵۴ء میں میرے دو ہم عصروں نے جن میں ایک امریکی تھا اور دوسرا برطانوی، بنیادی طبیعیات کی کے ون ڈش تجربہ گاہ میں کیا۔ میرے امریکی شاگردوں میں سے ایک والٹر گلبرٹ جو نظریاتی طبیعیات میں پی ایچ۔ ڈی کر رہے تھے وہ تناسلی اسرار کے انکشاف میں شریک کار جے۔ ڈی۔ واٹسن کے کیمبرج میں پڑوسی تھے۔ جب گلبرٹ مجھ سے ۱۹۵۶ء میں پی ایچ۔ ڈی کے بعد رخصت ہوگئے تو وہ اور واٹسن دونوں ہارورڈ چلے گئے۔ اس کے بعد اپنے شاگرد گلبرٹ سے امریکہ میں ۱۹۶۱ء میں ملا، خیال کرتے ہوئے کہ وہ اب بھی طبیعیات کے کسی مسئلے میں لگے ہوئے ہوں گے، میں نے پوچھا: اس کام میں کہاں تک پہنچے،، وہ کچھ شرمندہ سے نظر آئے اور کہنے لگے: "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو یہ سن کر خوشی نہیں ہوگی کہ میں اب بکٹریا کی پرداخت میں لگا ہوا ہوں"۔ واٹسن نے انہیں نسلیات کے لیے توڑ لیا تھا۔ گلبرٹ نے جلد ہی تناسلی اسرار کی گتھی حل کرنے کے لیے ایک بہت عمدہ طریقے کار کا ڈھونڈ نکالا۔ حتی کہ اس کام کے لیے انہیں ۱۹۸۰ء کا کیمیا کا نوبل انعام ملا۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے ہارورڈ کی اپنی کرسی چھوڑ دی اور ایک کمپنی قایم کی جو دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانی انسولین بنانے کے لیے تناسلی تنظیم کے طریقوں کا استعمال کرتی ہے۔ اس کمپنی کا نام بائیوجن Biogen ہے اور سوئٹزرلینڈ میں رجسٹرڈ ہے۔ حال ہی میں وہ پبلک کمپنی بن گئی ہے۔ بظاہر گلبرٹ کا سرمایہ جو انہوں نے کمپنی میں لگایا تھا (وہ اس کے صدر بھی ہیں) وہ صرف ۶۰۰۰ امریکی ڈالر تھا۔ اس وقت اس کمپنی کی مالیت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے۔

دیکھیے سائنس اور ٹکنالوجی کا ایک دوسرے پر انحصار اور یہ بھی دیکھیے کہ سالمائی حیاتیات کی سب سے عظیم دریافت طبیعیات کی تجربہ گاہ میں ہوئی اور ان لوگوں نے کی جن کی تربیت بہت معمولی سامان سے ایکسرے کے استعمال میں ہوئی تھی۔

یہ بھی دیکھیے کہ گلبرٹ کس طرح نظریاتی طبیعیات تحقیق کی راہ سے بنیادی نسلیات میں اور اس سے عملی تناسلی انجینئرنگ میں چلے گئے۔ جس نکتے کی طرف میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ہے مسئلے کی دو نہیں اول یہ کہ جدید زمانے میں سائنس اور ٹکنالوجی ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور دوسرا یہ کہ ہمارے تمدنوں میں جو کہ باہمی چشمک سے بھرپور ہیں۔ صد افضلیت ملتا ہے دماغی توانائی کو۔ ہمیں اپنے سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا ہم اپنے بہترین نوجوانوں کو اس طرح سے اُبھرنے کے مواقع فراہم کرسکتے ہیں کہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہمارے تمدن کے لیے کار آمد ہو۔ ہم اُن کو مواقع فراہم نہیں کر رہے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ان کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر ضائع ہو رہی ہیں۔ ان میں کچھ نوجوانوں کو اگر سائنس کا ایسا ہی شوق ہے اور اس میں لگ چکے ہیں تو وہ ترک وطن کر کے امریکہ اور یورپ چلے جاتے ہیں تاکہ ان ملکوں کو اپنی صلاحیتوں اور اپنی خدمات سے مالا مال کریں۔

شاید میری مثالیں بہت زیادہ دور افتادہ نظر آئیں۔ حالاں کہ حیاتیاتی ٹکنالوجی والی مثال کچھ ایسی دور کی نہیں ہے۔ شاید اتنی صدیوں سوتے رہنے کی وجہ سے ہم مایوسی کا شکار ہوگئے ہیں اور سوچنے لگے ہیں کہ سائنسی تخلیق کی دوڑ میں کبھی آگے جانے والوں کے برابر نہیں آسکتے ہیں اور اس لیے کوشش کرنا ہی عبث ہے۔ میں نے اپنی مثال میں فیراڈے اور میکسویل کی فطرت کی دو بنیادی توانائیوں برق اور مقناطیسیت کی یکسانیت کے نظریے سے ابتدا کی تھی جو گزشتہ صدی میں ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ اس یکسانیت سے برقی توانائی کا عہد آیا اور پھر بے تار کی ترسیل کا عہد آیا۔ جب میکسویل کے سو سال بعد اور دین برگ اور اس عاجز نے آزادانہ الگ الگ قدم اُٹھایا کہ ہم ثابت کریں کہ فطرت کی دو اور توانائیاں برقی مقناطیسیت اور اشعاع کی کمزور نیوکلیائی قوت بھی ایک ہی ہیں تو لندن کے اکنامسٹ نے اس کی طرف توجہ دلائی اور ہوشمند تاجروں کو مشورہ دیا کہ اسں نئے نظریے کے امکانی اقتصادی نتائج سے غافل نہ ہوں۔

ہمارے نظریے کے نتائج کی بالواسطہ تصدیق نیوکلیائی اور ایٹمی طبیعیات کی متنوع مظاہر سے ہو چکی تھی۔ اس سال جنوری میں جنیوا کی عظیم مشترک یورپی تجربہ گاہ نے ہمارے نظریے کی براہ راست تصدیق کر دی۔ ہم نے پیشن گوئی کی تھی کہ کمزور نیوکلیائی توانائی کے تین ذریعہ کار پائے جاتے ہیں W+ ، W- و Z0۔ ایک ہونے کے نتیجے میں ان کی متوقع کمیتوں کی بھی صراحت کر دی تھی۔ جنوری کے تجربوں نے ثابت کر دیا کہ واقعی W+ اور W- کا وجود ہے اور ان کی کمیت بھی وہی ہے

جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اس ہفتے میں آخری [illegible] کی بھی شناخت ہوگئی۔ وہ سرن Cern کے چھ کلومیٹر والے مسرع (بڑھتی ہوئی رفتار سے چلانے والا) میں مثبت برق پارون اور ضد مثبت برق پارون کے ٹکراؤ سے حاصل ملبے میں ملا۔ ضد مثبت برق پارون کی شعاع حاصل کرنے کے لیے تجربہ گاہ کو ضد مثبت برق پارون کی قیاسی تبرید کا نیا دستورِ عمل ایجاد کرنا پڑا اور اس کو تقریباً ۵ کروڑ ڈالر کے خرچ سے انتہائی اعلیٰ درجے کی تکنیکی مہارت سے عمل میں لانا پڑا۔ یہی تجربہ گاہ اب ہمارے نظریے پر مزید تجربے کرنے کے لیے جنیوا کے جورا پہاڑوں کے سلسلے میں ۲۷ کلومیٹر کے دائرے کا ایک نیا مسترع تعمیر کرانے میں مصروف ہے۔ انہیں اس پر نصف ارب ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے اور اس کی تکمیل ۱۹۸۷ء میں ہوگی۔

ان دریافتوں پر عربی اسلامی جریدوں میں سے صرف ایک نے جو لندن سے شائع ہوتا ہے ایک عدہ تبصرہ کیا ہے۔ اس جریدے نے ایک الزام لگایا ہے، اور وہ تبصرہ صرف اسی حد تک ہے کہ میں بنیادی قوتوں کے ایک ہونے کی تحقیق میں صوفیوں کے وحدت الوجود کے متشرکہ مسلک کی پیروی کر رہا ہوں۔ إنّا للہ وإنا الیہ راجعون۔

اس جریدے نے یہ حکیمانہ مشورہ دیا ہے کہ ہم لوگوں کو جو عالم اسلام کے ہیں سائنس کی ترقیوں سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیے کیونکہ سائنس اعتزال کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمیں محض ٹکنالوجی کی نقالی میں لگے رہنا چاہیئے۔ اس جریدے کا موقف یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ملک بہترین ٹکنالوجی کو ہمارے ہاتھ فروخت کر دے گا۔ اس سلسلے میں کچھ ایسا بھی فرض کیا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے ایسا ہی کیا ہے اور وہ ٹکنالوجی کی نقالی ہی سے کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جاپانیوں کو سائنس میں چار نوبل انعام مل چکے ہیں۔ تین طبیعیات میں اور ایک کیمسٹری میں۔ اتنی مضبوط ہے ان کی بنیاد بنیادی سائنس میں بلکہ بعض پہلوؤں سے تو مغربی ملکوں سے زائد مضبوط ہے۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ان کی یہی بنیاد ہے جس کا نہ کہیں تذکرہ ہوا ہے نہ راگ گائے گئے اور جس پر انہوں نے ٹکنالوجی میں اپنی ایجاداتی کامیابیوں کی تعمیر کی ہے۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ سرن میں جو مسرع بنایا گیا ہے اس کی ایسی کارگاہیں ٹکنالوجی کو ترقی دے کر انتہا تک پہنچا دیتی ہیں۔ میں اس بات کی وکالت نہیں کر رہا ہوں کہ اسلامی ممالک اپنے لیے فی الفور ایک سرن کی تعمیر کریں مگر میں اس بات کو رشک سے دیکھنے پر مجبور ہوں کہ یونان جیسا نسبتاً غریب ملک سرن میں شرکت کر رہا ہے اور اپنی کل قومی آمدنی سے جے۔ ان۔ پی کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق چندہ دے رہا ہے۔ میں اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا ہوں کہ ترکی یا خلیجی ممالک یا ایران یا پاکستان میں اس بات کا ذرا بھی احساس یا حوصلہ نظر نہیں آتا کہ وہ سائنس کے اس سرچشمے میں شریک ہوکر اس بات سے خوش ہوں کہ ان کے باشندے جدید ترین ٹکنالوجی کی مہارت کی اگلی صف میں جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ مسئلے کے اس پہلو کو محسوس کرنے کی صلاحیت صرف یونان کو نصیب ہوئی۔

آپ کی اجازت سے میں اپنی بحث کے اس حصہ کو جس کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی کے باہمی رشتے سے ہے، ایک مثال دے کر جو شمسی توانائی سے متعلق ہے، ختم کر دوں گا۔ یہ ایسا میدان ہے جس میں خلیجی یونیورسٹیوں اور نیز شمالی افریقی اور اسلامی ممالک کی وسطی ایشیائی یونیورسٹیوں میں بھی تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ سستے کیمیاوی برقی آلات کی فوری پیداوار اور ترقی یہ سب بنیادی مسئلے ہیں مادی سائنسوں کے۔ شمسی توانائی کو ایسی اشیاء جمع کرتی اور منقلب کرتی ہیں جو بصری اور نوری یا نوری برقی صلاحیت کے اعتبار سے موزوں ہوتی ہیں، یہ ضروری ہے کہ بصری نوری منقلب کار کم سے کم سامان خرچ کرے یہ خرچ کتنا کم ہوا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ شمسی روشنی کتنی گہرائی تک داخل ہوتی ہے اور جس التہابی کیفیت پر تنفیر کی بنیاد ہے اس کی طول رو کتنی ہے۔ اس کا تعین یوں آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان بنیادی تدریجی اعمال کے مقرر حدود اور متعین مقداروں کے اعتبار سے سامان موٹائی میٹر کے دس لاکھویں حصوں کے پیمانے کی ہوگی۔ اس طرح یہ کام ہو جاتا ہے۔ بہت باریک جھلیوں کا۔ ایسی جھلیاں سستے میں بن جاتی ہیں مگر اس قدر صحت اور کمال کے ساتھ ان کا بنانا ممکن نہیں جیسا کہ شیشے کی ایک تختی کا بنانا ہوتا ہے۔ جھلیاں یا تو اونچ نیچ والی ہوتی یا رنگ دار ہوتی ہیں اور ان میں بہت سے گہرے نقائص ہوتے ہیں۔ اب تک ان ہی نقائص کے باعث پتلی جھلیوں والے تقلیب کار آلوں کی کارکردگی بہت ہی نیچی سطح تک محدود رہتی ہے۔ اس طرح بنیادی ٹکنالوجی میں کوئی اصلاح

کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے بنیادی جامدی طبیعیات کے مسائل حل کیے جائیں۔ اس غرض سے درجہ بندی کرنا ہوگی ان بڑے عیب دار مظہروں کی جن کے اثرات برقیاتی حرکیات اور ایسے نشو و نمائی میکنزم پر پڑتے ہیں جو ان کو بے عیب بنا سکتے ہیں اور ان کے کیمیاوی عمل کے مسائل کو حل کرنا ہوگا۔

میں جو کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کارگزاریوں پوری برقیات کا انحصار اس بات پر نہیں کہ کوئی انجینیر جامد حالتی آلات کو اس طرح یا اس طرح استعمال کرنے۔ بلکہ یہ مسئلہ ہے جامد حالتی طبیعیات کا اور یہی ہے بنیادی سائنس کا وہ مسئلہ جس کے حل کرنے پر آج کل جاپان کے جامد حالتی طبیعیات کے ماہرین باقاعدگی سے لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے ماہروں سے پہلے جاپان کامیابی حاصل کرے۔ اس لیے نہیں کہ وہ زیادہ محتاط اور باریک بیں ٹکنالوجسٹ ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ با اصول ماہرین طبیعیات ہیں اور ان کے پاس ایسی سائنسی سہولتیں ہیں جو متعدد پہلوؤں سے ان کے مدمقابل قوموں سے اچھی ہیں۔ میں جو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ خلیجی یونی ورسٹی اگر چاہتی ہے کہ نوری برقیات کی تحقیق میں جد و جہد کر کے کچھ پیش رفت حاصل کرے تو اس میں جس چیز کی خاص ضرورت ہوگی وہ ہے بنیادی طبیعیات کی سطح والی تجربہ گاہ جس کے سہارے کے لیے ٹکنالوجی بھی موجود ہو۔

لندن کے جریدے "اکنامسٹ" نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں کیا تھا۔ اس نے شمسی توانائی پر قابو پانے کی جد و جہد کے بارے میں لکھا تھا "اگر شمسی توانائی کو ایندھن کے عالمی بحران کا حل مہیا کرنا ہے تو وہ چھت پر لگائی جانے والی دھوپ والی تڑپ کی اس معمولی ٹکنالوجی سے نہیں نکل سکتا ہے جس کا انحصار بیسویں صدی کی سائنس پر ہے بلکہ اس غرض سے نئی دریافتوں کو جیسے کہ طبیعیات کا نظریہ مقادیر برقیات ہے یا حیاتیاتی کیمیا ہے یا اور سائنسیں ہیں ان کو کام میں لانا ہوگا۔ آج کل وہ صنعتیں جو ٹکنالوجی پر چلتی ہیں ان کا انحصار نئی سائنس پر ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں آپ کو قایل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ آج کے حالات میں کسی اعلیٰ ٹکنالوجی کا وجود اعلا ترین قسم کی سائنس کے بغیر ممکن نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹکنالوجی تو غیر جانب دار ہے جب کہ سائنس اقدار سے لدی ہوئی ہے۔ جدید سائنس لوگوں کو عقلیت کی جانب حتیٰ کہ الحاد تک لے جا سکتی ہے اور یہ کہ اندیشہ ہے کہ سائنس میں تربیت یافتہ ہمارے تہذیب کے مابعد الطبیعیاتی معتقدات سے انکار کر دیں گے۔"

ایسے انداز فکر کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدارا ماضی کی لڑائیاں حال میں نہ لڑیے۔ وہ زمانہ گیا جب نویں اور دسویں صدی عیسوی میں استدلالی فلسفی ارسطو سے ورثے میں ملے ہوئے کائنات کے بارے میں خلاف عقل تصورات کی اندھی تقلید میں گھر گئے تھے اور انہیں اپنے مذہبی عقاید اور ان تصورات میں مطابقت لانے میں دشواریاں محسوس ہوتی تھیں۔

یہ وہ بحثیں تھیں جو قرون وسطیٰ میں عیسائی معلموں کے درمیان ہم سے بھی زیادہ جوش سے لڑی گئی تھیں۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا جیسا کہ مورس بکیل نے اپنی کتاب انجیل، قرآن اور سائنس میں دکھایا ہے۔ قرون وسطیٰ سے عیسائی معلموں کو جن مسئلوں کا سامنا تھا وہ تھے کائنات کا علم کے اور مابعد الطبیعیاتی مسائل۔ وہ یہ کہ کیا دنیا غیر متحرک ہے اور ایک جگہ پر قایم ہے؟ کیا اس کے آگے بھی کوئی شے ہے؟ کیا ایک سے زیادہ عالموں کا وجود ہے؟ کیا سیارے اور ستارے اپنے مداروں میں جڑے ہوئے حرکت کر رہے ہیں؟ کیا خدا افلاک کی حرکت کا براہ راست محرک ہے اور فاعلانہ طاقت رکھتا ہے یا وہ محض منتہی سبب ہے۔ افلاک کو حرکت دینے والی ذات ایک ہی ہے یا کئی ہیں؟ کیا افلاک کو گردش میں رکھنے والی شے عقل ہے یا خود مادے میں بھی کوئی ایسا بنیادی عنصر موجود ہے جو انہیں گردش میں رکھتا ہے؟ کیا اجرام فلکی میں کبھی کان پیدا ہوتا ہے؟ کیا تمام افلاک ایک ہی ماہیت کے ہیں؟ کیا وہ سب زمین کو مرکز مان کر ہم مرکزی دائروں میں گھومتے ہیں جن کے مرکز دوسرے بڑے دائروں کے محیطوں میں واقع ہیں؟ آسمانی مادے کی کیا ماہیت ہے؟ کیا وہ زمینی مادے کی طرح اپنے اصلی ہیولے کا مالک ہے اور اس کے اپنے خواص ہیں جیسے گرم ہونا، سرد ہونا، نم ہونا یا خشک ہونا؟ ایسے سوالوں کے جواب تو الہامی کتابوں کی تفسیروں میں ڈھونڈے جاتے تھے یا ارسطو کے ارشادات میں

سی وجہ سے جب گیلیلیو نے اس بات کی کوشش کی کہ پہلے تو ان مسئلوں کی جو طبعیات کی
لیم میں تھے درجہ بندی کرے اور پھر ان کے جواب طبعی تجربوں کے ذریعے تلاش کرے
ردہ اس کو ظلم و تعدی کا شکار بنایا گیا اس کی تلافی اب ساڑھے تین سو سال بعد کی جا رہی ہے۔

یں گزشتہ دنوں ایک تقریب کی ایک مخصوص مذہبی رسم میں شریک ہوا۔ جب
قدس مآب پاپائے اعظم نے ۳۴ نوبل انعام پانے والوں اور ۳۰۰ دوسرے سائنسدانوں
ی موجودگی میں فرمایا "گیلیلیو کے معاملے اور اس کے بعد کے تجربوں نے کلیسا کے شعور میں
لوغیت پیدا کر دی ہے۔ کلیسا بھی تجربے اور تفکر سے سبق حاصل کرتا ہے۔

ایسے معاملات میں اب کلیسا کی سوجھ بوجھ بڑھ گئی ہے اور وہ سمجھ گیا ہے کہ
تحقیق کی آزادی سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیق انسان کی بہترین خصوصیتوں
میں سے ایک ہے۔ تحقیق ہی کے ذریعے انسان حقیقت تک پہنچتا ہے ... " اسی بنا پر
آج کلیسا کا موقف یہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا ہے۔
چنانچہ بغور مطالعہ کر کے کلیسا نے آج یہ سبق سیکھا ہے کہ خاص دور کے سائنسی نظریات
سے اہم مذہبی معتقدات کو الگ رکھنا ضروری ہے اور یہ کہ کسی خاص وقت کے علمی نظریات
پر بائبل کے مطالعہ اور اس کی تفسیر کی بنیاد رکھنا درست نہیں"۔

پاپائے اعظم نے اپنے اس ارشاد سے اس بات پر زور دیا کہ جہاں تک
سائنس کا تعلق ہے کلیسا اب اپنے رویے میں بلوغیت حاصل کر چکا ہے۔ وہ اس کے
برعکس اس بات کی طرف توجہ دلا سکتے تھے کہ گیلیلیو کے بعد سائنس دانوں نے اپنے
سائنسوں کی معذوریوں کا کس طرح اعتراف کیا۔ سائنس والے معترف ہیں کہ ایسے
سوالات بھی ہو سکتے ہیں جن کا جواب سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم ایسے سوالات
کے بارے میں قیاس آرائی تو کر سکتے ہیں مگر ان کے بارے میں جو نظریات قائم کریں ان
کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ عملی تجربے ہی میں سائنس کی روح ہے۔ جہاں عملی تجربہ ممکن نہیں
وہاں سائنس کچھ نہیں کر سکتی۔ آج کا سائنس داں سمجھتا ہے کہ اپنے علم کے بارے میں ہمیں
اتنا ہی احساس معذوری ہے جیسا کہ ابن رشد کو تھا بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ ابن رشد
بہت بڑے طبیب تھے۔ بخار اور آنکھ کے پردے کے مطالعے میں ان کی بے مثل خدمات
تھیں۔ سائنس میں ایسی خدمات کی بنا پر وہ حیات ابدی کے مستحق ہیں لیکن ایک
دوسرے شعبہ یعنی علم کائنات میں وہ ارسطو کی قیاس آرائیوں کے قایل تھے۔ اس حد تک کہ
انہیں یہ بھی شبہ نہیں ہوا کہ ارسطو کا کہنا قیاس آرائیوں تک محدود ہے جن کو آگے کے عملی
عملی تجربے غلط ثابت کر سکتے ہیں۔ آج کا سائنس داں یہ جانتا ہے کہ کب اور کہاں
وہ قیاس آرائی کر رہا ہے اور وہ اس کے متعلق اپنی فکر کو مختتم نہیں قرار دیتا ہے۔

تسلیم شدہ باتوں کے لیے بھی ہم یہ مانتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ نئی باتوں کی دریافت موجودہ
دریافتوں کو غلط ثابت کیے بغیر ایسے کلیے بنانے میں مدد کرے جو ہمارے تصورات
اور عالمی نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلیاں ناگزیر کر دیں۔ طبعیات میں اس صدی کی
ابتدا میں نظریۂ اضافیت اور نظریہ مقادیر
برقیات کی دریافتوں میں ایسا ہی ہوا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے موجودہ
نظریاتی نظام میں نئے تصورات نہیں سما سکتے ہیں اس لیے مزید وسیع اور ہمہ گیر
تصور کی ضرورت ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے نظریات کو ترک کر دیں
اور ان کی جگہ دوسرے نظریات لے آئیں۔

یہ بات میں پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ سائنس کی معذوریاں جاننے کے لیے
بھی یہ ضروری ہے کہ جاننے والا موجود سائنس کو اندرون خانہ جانتا ہو ورنہ
ہم کل کی فلسفیانہ لڑائیاں آج لڑتے نظر آئیں گے۔ ہمارے سائنس والوں
کو اپنی ثابت کی ہوئی صلاحیتوں کے ذریعے سائنس کی تخلیق کرنے والے اشرافیہ
کا فرد ہونا چاہیے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ کی اور آپ کی صلاحیت کے مطابق
قدر ہوتی ہے اور جہاں ایسے فرد کے لیے تمام دروازے کھلے ہوئے ہوتے
ہیں جو اندر جانے کا مستحق ہے۔ انسانی سرگرمی کے دوسرے پہلوؤں کی
طرح سائنس میں عربی اسلامی دولت مشترکہ کو جس بات کی ضرورت ہے
وہ ہے ایسے سائنس دانوں کی۔ یعنی ایک ایسے سربرآوردہ طبقے کے افراد کی
جو اس فخر میں ساجھے دار ہوں کہ انہوں نے سائنس کے کسی نہ کسی حصے کی تخلیق
کی ہے۔ ہمارے نوجوان اس بڑے کو اٹھانے کے لیے بے چین ہیں۔ یہی
چیلنج ہے جو انہیں ترک وطن کر کے مغربی یونیورسٹیوں اور اداروں میں
جانے پر مجبور کرتا ہے۔ ان پر بھروسہ کیجیے ان میں اعلیٰ ترین امکانی صلاحیت
موجود ہے۔ اگر خلیج کی نئی یونیورسٹی ان کو سائنس میں تخلیق کے مواقع
فراہم کرے گی تو وہ کبھی ترک وطن نہیں کریں گے۔ پھر انہیں سہولتیں مہیا
کرنے کے بعد ان سے عجلت کے متقاضی نہ ہونا چاہیے۔ زندہ سائنس کی
روایات وقت طلب ہیں۔ کام کے لیے ایک دہے بلکہ اس سے بھی
زیادہ دہوں کی استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

فارمیسی (دواسازی) میں طبِّ یونانی کی خدمات

نعیم احمد خان

انسان جس طرح کسی مرض سے نجات پانے کے لیے دوا کا محتاج ہوا، بالکل اسی طرح ایک دوا کے بجائے چند ادویہ کو ملا کر یعنی مرکب (Compound) شکل میں استعمال کرنے کی اس نے ضرورت محسوس کی۔ اس کا سبب خواہ بیک وقت کئی امراض کی موجودگی یا مرض کی مناسبت سے دوا کا ضعیف ہونا یا اس طرح دوسرے اسباب و وجوہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادویہ کی ترکیب کا مسئلہ فن طب کے اولین مسائل میں رہا ہے۔ دوا کی ترکیب اور استعمال کا تعلق قدیم ترین طبی اعمال میں ہے۔ ارتقاء اور ضروریات کی کثرت نے طبِّ یونانی میں بھی طرح طرح کے ایجادات و اختراعات کے مواقع پیدا کیے۔

علم الصیدلہ (فارمیسی) کی ابتدا مصر سے ہوتی ہے۔ ایڈون سمتھ پیپرس اور ایبرس پیپرس جن کا تعلق ۱۶۰۰ قبل مسیح سے ہے۔ [illegible] طور پر علم الادویہ سے متعلق ہے ان سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں وہ ورثے میں ملیں جو اطباء یونان کے لیے بنیادی حیثیت [illegible]

[illegible] کے لحاظ سے دوا کی ترتیب

صدی [illegible]

۲. مرکب دوا (Compound Drug) کی ترکیب تیاری۔

۳. دوا کے استعمال کا طریقہ۔

۴. دانتوں کے تحفظ کے لیے کیمیاوی عمل۔

۵. عطر سازی، رنگ ریزی اور دیگر کیمیاوی اعمال۔

۶. سفوف (Powder)، شیاف (Suppositories)

مرہم (Ointment) اور ضماد (Lotions) کی اختراع۔

یونانی عہد جس کی ابتداء ۵۰۰ سال قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عہد کا پہلا طبیب بقراط (۴۶۰ قبل مسیح) ہے پہلی صدی عیسوی میں دیسقوریدوس نے مفرد ادویہ پر ایک میٹریا میڈیکا سپرد قلم کیا جس میں تقریباً ۶۰۰ دواؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اطباء یونان نے اشکال ادویہ کے سلسلے میں مختلف تجربات کیے اور درج ذیل مرکبات کی اختراع کا سہرا انہیں کے سر ہے جو آج بھی رائج ہیں۔

۱. شربت (Syrups) موجد فیثاغورس

۲. حب (Pills)

۳. قرص (Tablet) موجد اندروماخس

۴. کحل یا سرمہ موجد فیثاغورس

۵. سعوط (Snuff) موجد جالینوس

۶. ادویہ مشمومہ (Inhalations)

۷. نباتات سے نمک حاصل کرنا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی سے عربوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے جہاں سے علمی کاموں کی ابتدا ہوتی (عباسی عہد ۷۴۹ء ــــ ۱۲۵۸ء) جو اس عہد کا سنہرا دور تھا جس میں مختلف علوم و فنون کے علاوہ طب پر خصوصی توجہ رہی اور اس کے تعلق سے اہم کام انجام پائے جس کا مرکزیت بغداد کو حاصل تھی جہاں یونانی کتب کے ترجمے کیے گئے۔ فارمیسی میں انہوں نے نمایاں

ـــــــــ

۱. پیپرس اس قدیم مصری تحریر کو کہتے ہیں جو کاغذ کی شکل کی جھلی پر لکھی ہوئی تھی ہیں۔

کارنامے انجام دیے۔ عرب اطباء نے علم طب (Medical Science)
میں اپنی تحقیق اور ریسرچ سے علم کیمیا کو دواسازی سے جوڑ کر نئی راہیں
کھولیں۔ انہوں نے کیمیکل فارمیسی (Pharmaceutical
Chemistry) کی بنیاد ڈالی۔ ان کے درج ذیل اضافات محسوس
کیے جانے کے قابل ہیں۔

۱۔ ادویہ کی قوت کی دریافت کا طریقہ۔

۲۔ تاثیر ادویہ

۳۔ عمل تقطیر (Distillation) عمل تصعید
(Sublimation) عمل تعریق (Extraction)
عمل تبلور (Crystalization) اور عمل ترشیح
(Percolation) جیسے اعمال کی دواسازی کے لیے
دریافت

۴۔ عمل جراحی میں استعمال ہونے والے مراہم اور پلاسٹر کی دریافت

۵۔ اطباء عرب نے سب سے پہلے ٹنکچر (Tincter) کو دریافت
کیا۔

۶۔ خوشبو دار عرقیات کا استعمال۔ Scented water
e.g. Rose water

۷۔ تخدیر بذریعہ شموم۔ (Anaesthesia by inhalation)

۸۔ الکوہل کا استعمال شروع کیا۔

۹۔ عرق (Distilled Medicinal water) اور
محلول (Suspension) سے طبی دنیا کو روشناس
کرایا۔

عربی عہد کے ان محققین اور ماہرین دواسازوں کا ذکر بھی
ضروری ہے جنہوں نے فن دواسازی (Pharmaceutical
Science) میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

۱۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی (۸۴۱-۹۲۶ء) اس
نسبتاً پہلے اس نے سب سے پہلے شراب اور عرقیات کو دوائی مقصد
کے لیے استعمال کرایا۔ پارہ (Mercury)
کے مرہم کو تیار کیا۔ رازی نے دواؤں کے اثرات
معلوم کرنے کے لیے انسانوں کے ساتھ حیوانوں پر
تجربات کی ابتدا کی۔ چیچک اور خسرہ پر سب سے
پہلے اس نے تفصیلات پیش کیں۔ بخار کے سلسلے میں
یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ خود کوئی مرض نہیں بلکہ دوسرے
امراض کے نتیجے میں لاحق ہوتا ہے۔ رازی کے دارالتجربہ
میں درج ذیل اشیاء اور آلات دواسازی کی
نشاندہی کی گئی ہے۔

"بیکر۔ فلاسک۔ چھوٹی شیشیاں۔ بیسن۔ جگ
بھٹی (Furnaces) سینڈ باتھ۔ واٹر باتھ قرنبیق۔
قیف۔ کھرل۔ ہاون دستہ اور ادویہ کے نمونوں کے علاوہ
مختلف معدنیات۔"

۲۔ ابوالقاسم الزہراوی (۹۳۶-۱۰۱۳ء)
زہراوی نے معدنی ادویات اور قیمتی حجریات کو
دوائے استعمال کرنے کی ابتدا کی۔ اس نے عرقیات
حاصل کرنے والے آلات کو بہتر بنانے کی کوشش کی
سرکہ حاصل کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی۔

۳۔ ابو منصور (۹۷۰ء)
اس نے پوٹاشیم کی خصوصیات اور حاصل کرنے
کے طریقوں سے روشناس کرایا۔ حفظان صحت کے
نقطۂ نظر سے پانی کے اچھے اور خراب ہونے کے فرق
پر روشنی ڈالی۔ اس نے سب سے پہلے Plaster
of Paris ہڈیوں کے کسر کو ٹھیک کرنے کے
لیے استعمال کر کے اس کی افادیت سے طبی دنیا کو
متعارف کرایا۔

۴۔ ابو ریحان البیرونی (۹۷۳-۱۰۵۰ء)
اس نے فارمیسی اور شناخت ادویہ کی سب سے
اہم کتاب "الصیدنۃ فی الطب" تصنیف کی،
جس سے اس فن کو بے حد فائدہ پہنچا۔

۵۔ شیخ بوعلی سینا (۹۸۰ - ۱۰۳۷ ء)

چاندی اور سونے کو حَبّ کی شکل میں سب سے پہلے استعمال کرانے کا سہرا ابن سینا کو ہے تیزاب گندھک اور الکوہل کے طبی افعال و خواص کو پیش کیا۔ الکوہل سے زخموں کی ڈریسنگ کرنے کے فائدے بتائے۔

۶۔ علی بن عباس (۹۹۴ء)

اس نے امراض کے علاج کے سلسلے میں دواؤں پر تجربات کے لیے جانوروں کی ضرورت اور اہمیت کے علاوہ تجربات کے لیے احتیاطی تدابیر کو پیش کیا۔

۷۔ ابو مروان عبد الملک بن زہر (۱۱۱۳ - ۱۱۶۲ء)

ابن زہر نے غذا پر ایک اہم تصنیف "الاغذیہ" سپرد قلم کیا جس میں غذا کی معالجاتی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے ٹھنڈے پانی کو بخار کم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اچھی اور خراب ہوا کے صحت پر مرتب ہونے والے اثرات کو بتایا۔

۸۔ ضیاء الدین مالقی ابن بیطار (۱۱۹۷ — ۱۲۴۸ء)

اس کی سب سے اہم تصنیف "جامع المفردات الادویہ و الاغذیہ" ہے جس میں ۱۴۰۰ دواؤں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اس نے عمل تقطیر کے ذریعے عرق گلاب تیار کرنے کے طریقوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔

۹۔ ابو القاسم العراقی (۱۳ ویں صدی عیسوی)

اس نے سب سے پہلے مخدر سفوف Anaesthetic (Powder) تیار کیا جس میں کافور، اجوائن خراسانی بھنگ، افیون بطور خاص شامل تھیں۔

یونانی اطباء، خصوصی طور پر مسلم اطباء نے فن دواسازی کی ترقی کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کیا جو طب یونانی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ہندوستان میں حکیم علی گیلانی نے روغن دیودار حاصل کرنے کے طریقے اور افادیت کو پیش کیا جو جدید طریقۂ علاج میں آج بھی بکثرت مستعمل ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ Pharmaceutical Science اور فارمیسی کی ترقی میں طب یونانی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

میرا اعتقاد یہ ہے کہ جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین کرتے ہیں اُن کا ایمان اور اُن کا یقین بہ نسبت ان لوگوں کے جو دلیل و حجت فلسفہ سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے۔ یہی لوگ اہل جنت ہیں جو سیدھے بہشت جاویں گے۔

—— سید احمد خاں

ضلع بدایوں کے سات جونیر ہائی اسکولوں سے بورڈ امتحان دینے والے مسلم بچوں کی تعداد کم۔ فرسٹ ڈویژن زیادہ

احمد رشید شیروانی

ضلع بدایوں کے سات جونیر ہائی اسکولوں کے پچھلے سال یعنی ۱۹۸۶ء اور اس سال یعنی ۱۹۸۷ء کے بورڈ امتحان میں مسلم بچوں کے نتائج چارٹ میں درج ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ پچھلے سال ان سب اسکولوں سے ملا کر ۳۵ مسلم بچوں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ اس سال یہ تعداد بڑھ کر چالیس ہو گئی۔ یہ بہتری لائق ستائش ہے۔ جعفری بیگم اسکول میں مسلم بچوں کی حاصل کردہ فرسٹ ڈویژن کی تعداد تین سے گھٹ کر دو رہ گئی۔ آزاد اسکول ککرالہ میں بھی تعداد کم ہوئی۔ یعنی ۲۲ سے گھٹ کر ۱۸ رہ گئی۔ سید منور علی گرلز اسکول بدایوں میں تعداد صفر کی صفر رہی۔ سلیم مبشر اسکول سے اس سال پہلا بیچ بورڈ امتحان میں بیٹھا ہے۔ البتہ باقی تین اسکولوں میں تعداد بڑھی۔ قاضی شہاب الدین اسکول سکھانو میں پانچ سے بڑھ کر چھ، مومن انصار اسکول سہسوان میں

جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان

شریک امتحان	تعداد پاس	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	جونیر ہائی اسکول	مقام	شریک امتحان	تعداد پاس	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد
۱۲	۱۲	۱	آٹھ	رحمانیہ گرلز	بدایوں	۹	۹	۷	اٹھہتر
۱۰	۱۰	-	صفر	سید منور علی گرلز	بدایوں	۹	۹	-	صفر
-	-	-	-	سلیم مبشر	بدایوں	۳	۳	-	صفر
۱۳	۱۳	۵	اڑتیس	قاضی شہاب الدین	سکھانو	۸	۸	۶	پچھتر
۱۸	۱۷	۳	سترہ	جعفری بیگم	سنگرام پور	۹	۹	۲	بائیس
۲۶	۲۴	۴	پندرہ	مومن انصار	سہسوان	۱۷	۱۶	۷	اکتالیس
۳۱	۳۰	۲۲	اکہتر	آزاد	ککرالہ	۳۴	۲۸	۱۸	ترپن
۱۱۰	۱۰۶	۳۵	بتیس	سات اسکولوں میں		۸۹	۸۲	۴۰	سینتالیس

چار سے بڑھ کر سات اور سب سے زیادہ اضافہ رحمانیہ گرلز اسکول بدایوں میں ہوا یعنی ایک سے بڑھ کر سات۔ مسلم بچّوں کی فرسٹ ڈویژن کی تعداد میں اضافہ جتنی خوشی کی بات ہے اس سے کہیں زیادہ افسوس اور تشویش کی بات ہے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچّوں کی تعداد میں کمی۔ سیّد منور علی گرلز اسکول سے بورڈ امتحان دینے والی طالبات کی تعداد دس سے گھٹ کر ۹ رہ گئی۔ یہ کمی دس فیصد ہے۔ مومن انصار سے بورڈ امتحان میں بیٹھنے والے مسلم بچوں کی تعداد پچھلے سال ۲۶ تھی۔ (۲۰ مسلم لڑکے اور ۶ مسلم لڑکیاں) اس سال یہ تعداد گھٹ کر صرف سترہ رہ گئی (۱۲ مسلم لڑکے اور ۵ مسلم لڑکیاں) یہ کمی ستائیس فیصد ہے۔ رحمانیہ اسکول سے بورڈ امتحان دینے والی لڑکیوں کی تعداد بارہ سے گھٹ کر نو رہ گئی۔ یہ کمی ۳۳ فی صد ہے۔ قاضی شہاب الدین اسکول سے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم لڑکوں کی تعداد تیرہ سے گھٹ کر آٹھ رہ گئی۔ یہ کمی اڑتیس فی صد ہے۔ سب سے زیادہ کمی جعفری بیگم اسکول میں ہوئی جہاں سے پچھلے سال ۱۸ مسلم بچّوں (چودہ مسلم لڑکوں اور ۴ مسلم لڑکیوں) نے بورڈ امتحان دیا تھا۔ اس سال صرف نو مسلم بچّوں (آٹھ مسلم لڑکوں اور ایک مسلم لڑکی) نے امتحان دیا یعنی کل تعداد اٹھارہ سے گھٹ کر نو رہ گئی۔ گویا آدھی ہو گئی۔ ان پانچوں اسکولوں کے ذمّہ داران سے التماس ہے کہ تعداد گھٹنے کی وجوہات پر غور فرما کر مجھ کو مطلع فرمائیں، نوازش ہوگی۔

صرف ایک اسکول میں بورڈ امتحان میں شرکت کرنے والے مسلم بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ آزاد اسکول ککرالہ جہاں سے پچھلے سال ۳۱ مسلم بچّوں (۲۹ مسلم لڑکوں اور ۲ مسلم لڑکیوں) نے بورڈ امتحان د تھا، اس سال مسلم لڑکی تو کوئی شریک نہیں ہوئی مگر مسلم لڑکوں کی تعداد ۳۴ ہو گئی۔ یہ اضافہ دس فیصد کہا جا سکتا ہے۔

تمام سات اسکولوں میں ملا کر یہ پوزیشن بنی کہ پچھلے سال ایک سو دس مسلم بچوں نے بورڈ امتحان میں شرکت کی تھی۔ اس سال نواسی نے۔ اکیس عدد کی یہ کمی انیس فیصد ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مسلمان کے اپنے اسکولوں سے بھی بورڈ امتحان دینے والے مسلم بچوں کی تعداد سال بہ سال گھٹتی جائے گی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ مسلمان پہلے ہی دور کی بہ نسبت تعلیم میں کافی پیچھے ہیں۔ کہیں پانچ گنا پیچھے کہیں دس گنا پ اگر کہیں بورڈ امتحان دینے والے مسلم بچوں کی تعداد یوں ہی گھٹتی گئی تو پھر جس شہر یا قصبے یا علاقے یا ضلع میں مسلمان تعلیم میں سال بہ سال ا پیچھے اور پیچھے ہوتے جائیں گے وہاں کے مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا؟ ا سوال پر سب مسلمانوں کو سوچنا چاہیے اور کم سے کم ان مسلمانوں کو تو سو ہی چاہیے جن کو اللہ تعالے نے سوچنے کی صلاحیت اور توفیق دی

بہر حال ضلع بدایوں کے مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کی بابت یہ مختصر رپورٹ پیش ہے۔ امید ہے کہ یو۔پی کے دیگر ضلعوں کے مسلم جونیئر ہائی اسکول بھی جلدی سے اپنے ۱۹۸۷ کے نتائج بھیج دیں گے۔

لوگو، بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اُس
دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے
گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ
دینے والا ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا وعدہ
سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے
میں نہ ڈالے اور نہ دھوکا باز تم کو اللہ کے
معاملے میں دھوکا دینے پائے۔

(سورۃ لقمٰن آیۃ ۳۳)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

اویس القاسمی

سب سے پہلے حمد وشکر ہے اس خالق کائنات کے لیے جس نے موجودات ہستی میں ہمیں سب سے زیادہ ممتاز اور اشرف واکرم اور اپنی حکمت وصناعی اور شان ایجاد کا مظہر کامل بنایا اور ساری اشیائے عالم کو ہماری بقاء و تربیت اور تحفظ وجود' وارتقائے مادی ومعنوی کے اسباب ووسائل اور خدمت گار وتابعدار بنا دیے۔

یہ اس ذات یکتا و بے نیاز کا محض فضل واحسان ہے اور رنگارنگ نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا یہ اس کا کرم ہی کرم ہے اور ان سب پر افضل عطیہ بے بہا دبے مثال یہ عظیم احسان کہ خلاصۂ انسانیت' محسن اعظم' نبی امی' رحمت عالم حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جیسا مونس وغم خوار' ہادی وپیغمبر ہماری طرف مبعوث فرماکر عالم کے تمام طبقات وامم پر ہمیں فضیلت وفوقیت بخشی۔ جس امی پیغمبر کا دین ہی علم وحکمت کا دین ہے' تہذیب وتمدن اور انسانی شرافت کا معیار ہے۔ ہزار ہا ہزار صلوۃ وسلام ہو اس ذات اقدس حبیب خالق دوجہاں پر جس نے اس حیات مستعار اور ہستئ ناپائیدار کی پُرپیچ راہوں میں چلنے کے آداب سکھائے اور انداز خاص عطا فرمایا۔ جس نے زندگی کے اسرار سربستہ وا شگاف کر دیے اور الجھے الجھے مسائل حیات کی گتھیاں سلجھا دی جو کہ حکمائے عالم کا حصہ و وظیفہ نہیں بلکہ یہ خاص خاتم پیغمبراں کا منصب ومقام ہے۔

وہ دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

اور ثانیاً حسب ارشاد نبیٔ خاتم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہ۔ جس نے ادائے شکر کے موقع ومحل پر انسانوں کا شکریہ نہیں ادا کیا' اس نے خدا کا شکر نہیں ادا کیا۔ اس لیے آپ اصحاب فکر دردمندانِ ملتِ اسلامیہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہوں کہ علمی وفکری' تعلیمی وتدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ملت کے اہم مسائل سے گہری دلچسپی اور خدمت کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔

اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ قدرت کی عطاکردہ صلاحیتوں سے قائدانہ عزائم اور بلند حوصلوں کے ساتھ پچھڑے ہوئے اور میدان زندگی کے گویا شکست خوردہ افراد وجماعت کو باعزت و باعظمت زندگی کا احساس اور انہیں اپنی قدر وقیمت پہچاننے کا موقع فراہم کر رہے ہیں اور اپنی فکرو عمل کی نوعیت کا تعارف "مرکز فروغ سائنس" کے عنوان سے ایک پرکشش اور قابلِ توجہ انداز تعارف ہے۔ مرکز فروغ سائنس' کا قیام وانعقاد وقت اور ماحول کی پکار ہے اور اگر سوچیں' غور کریں تو دورِ موجودہ کے چیلنج کا جواب بھی ہے۔ مدت دراز سے پیش آمدہ شدید ملی ضرورت کی تکمیل ہے۔ درد مند دلوں کی آواز ہے۔

مجھے اس اعتراف میں کوئی عار اور کوئی خوف نہیں کہ عموماً مدارس کے ذمہ داروں نے نصاب میں سائنس کو داخل کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی اور نہ ہی ذہن وفکر کے کسی گوشے میں یہ بات آئی کہ سائنس بھی مدرسوں میں تدریسی موضوع بن سکتا ہے بلکہ یوں سمجھا جاتا رہا ہے کہ سائنس اسکولوں کالجوں' یونیورسٹیوں کی خاص چیز ہے۔ ممکن ہے تجسس وفکرمند حضرات کے جائزوں میں ملک میں پھیلے ہوئے دینی درس گاہوں کا سروے کرنے سے کچھ مدرسے ایسے نکل آئے ہوں جہاں باضابطہ اس موضوع کا اہتمام وانتظام

معقول طور پر ہو۔ البتہ ایسے عالی حوصلہ اساتذہ و منتظمین مدارس کی کمی نہیں بلکہ
خاصی تعداد ہے جو آج سائنسی ترقی کے دور میں اس موضوع کے ساتھ تعلق
ایک ناگزیر ضرورت سمجھتے ہیں اور اس ضرورت کو تسلیم کرنا تو عہد حاضر میں
ظاہر ہے، مزید تفصیل کا محتاج نہیں اور اب تک مدارس میں سائنس کے لیے کوئی
بات کیوں نہیں آئی اور کیوں نہیں سوچی گئی۔ اس کے چند مختلف وجوہ ہو سکتے
ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قرآنی و حدیثی علوم کی تشریح و توضیح اور اس کے سمجھنے
سمجھانے میں کسی درجے میں معاون اور وسیلہ نہیں سمجھا گیا جیسا کہ علم کلام و
فلسفۂ قدیم و منطق وغیرہ کو ابھی تک معاون سمجھا جا رہا ہے اور قریبی تعلق و
رشتہ سائنس کا علوم شرعیہ کے ساتھ نہیں محسوس کیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ
شعبۂ سائنس کے اضافے کی مدارس کے بجٹ اجازت نہیں دیتے ہوں اور یہ
بھی احتمال ہے کہ تقسیم کار کے طریقے پر اعتماد کر لیا گیا کہ ہمارے ذمے شرعی و
مذہبی علوم کی کفالت ہے اور ریاضی، سائنس، اقلیدس، کیمسٹری وغیرہ کے
لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر طالب و مشتاق
اس کی طرف رُخ کر سکتا ہے۔

لیکن دور حاضر میں جدید اذہان کے لیے اور بہت سارے مسائل
میں مستقل طور پر بہت پہلے سے سائنسی تشریحات اور معلومات بے حد
ضروری ہیں اور قرآن کی تفسیر سائنسی علوم و مسائل کو سامنے رکھ کر کی جائے
تو اسلام کے سمجھنے میں ہر قوم اور ہر طبقہ کو کافی سہولت ہوگی۔ صرف تعبیر و
ترجمانی کی زبان بدلنے کی ضرورت پڑے گی اور دور کے لحاظ سے قرآنی مرادات
کی تعبیر و تفسیر دراصل تدریس کے ساتھ تبلیغ و اشاعت دین بھی ہوگی۔

رہ گئی یہ بات کہ سائنس اور عصری علوم کے لیے طلبا کالجوں کی طرف
یونیورسٹیوں کی طرف رخ کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک اشکال عمر کے اوقات
کی رعایت کا ہے کہ قوت و شباب ہی کا زمانہ تحصیل و طلب کا بھی ہے اور
یہی وقت تحصیل و طلب کے بعد قوم و ملت کے لیے فلاحی اور رفاہی خدمات
پیش کرنے کا بھی۔ اگر عمر کا زیادہ حصہ دو طرز کی تعلیم گاہوں میں گزر گئے تو
ارتقاء کے مدارج طے کرنے میں پچھڑ جائیں گے۔ اس لیے میری نظر میں سائنسی
علوم اور ٹکنالوجی کے فروغ و ارتقاء کے لیے یہ فکر اور سعی کی کہ مدارس کی زیر
نگرانی سائنسی شعبے قایم کیے جائیں اور "مرکز فروغ سائنس" کی سرپرستی
اور قیادت میں پروان چڑھیں۔ اس صورت میں کامیابی کی توقع غالب اور
ہر مصلحت کا لحاظ ظاہر ہے اور بلاشبہ یہ تحریک صالح اور مفید ہے۔

ایسے فکر مند حضرات تحسین اور مبارک بادی کے مستحق ہیں، جنہیں
مدت سے ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے درد و کرب نے بے چین
اور مضطرب رکھا اور بالآخر منجمد اور خاموش فضا میں ایک صدا لگائی ہے
اور پیغام بیداری دیا کہ وہ رفیقان سفر غفلت کی نیند سے بیدار متحرک اور
ہوشیار ہو جائیں جن کی منزل مقصود کافی دور ہے۔ بہت سے قافلے
آگے بڑھ چکے اور یہ کافی پچھڑ گئے ہیں۔

اور حسن ظن یہ ہے کہ فکر و بصیرت کی گہرائی، ملی درد، عزم کی بلند
اور اخلاص و پاکیزگی ہی اس دعوت و تحریک کے پردہ میں کار فرما ہے اور ا
میر کارواں بلاشبہ امت مرحومہ پر انعام خداوندی ہے۔

اگرچہ انفرادی طور پر ملک میں منتشر علمی و فکری صلاحیتیں اور شمہ
گاہے گاہے اس نوع کے مضامین کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں جرائد و
مجلوں اور رسائل و اخبارات کے کالموں میں اظہار خیال ضرور کیا کرتی ہیں
لیکن تنظیمی و اجتماعی ڈھنگ سے ایک نقطۂ اتحاد پر ملت کو جمع کرنے کا
اور تدبیر و سعی، ملی ارتقاء کے لیے "مرکز فروغ سائنس" کا نہایت ہی
مبارک و میمون اور اوّل و اہم اقدام ہے جس کے لیے ذمہ داران مرکز
شکریے کے مستحق ہیں۔

جس طرح آج مسلم معاشرہ اور گھرانوں میں عموماً مذہبیت اور
روحانیت سے صحیح اور قابل اعتبار وابستگی کا فقدان ہے، اسی طرح
اسلامی اخلاق سے بیگانگی اور شرعی احکام و مسائل سے عملی بے اعتنائی
کے سبب اسلام کے برکات و ثمرات سے محرومی کا شکوہ ارباب فکر، خواص
امت اور ملت اسلامیہ کے دردمندوں کو بجا طور پر ہے وہیں یہ بات
بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا شعور و احساس
اس باب میں بھی پختہ اور بیدار نہیں کہ سائنسی انکشافات و ایجادات کے اس
تیز رفتار ترقی کے دور میں کم از کم ہندوستانی قوموں ہی کے درمیان، ایک
باعزت مقام اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے انہیں سائنسی علوم کے ساتھ
کتنا انہماک اور کیسا گہرا ارتباط چاہیے۔

بعنوان دیگر دنیاوی و مادّی لحاظ سے ترقی میں ملت کے وقار ا
ساکھ جینے کا راز مضمر ہے اور مادی ارتقاء کے وسائل اختیار کرنا ترقی پسند

در بامقصد قوم ہونے کی دلیل ہے اس کے برعکس اس عالم اسباب میں مادہ
سے بے تعلق اپنے وجود اور بہتر انجام سے غفلت اور بے خبری کا ثبوت۔ چوں کہ
زندگی دراصل سانس اور اعضا و جوارح کی حرکات کی طرح عملی اور علمی حرکت
کا نام ہے، اس لیے ظاہری زندگی وسیلہ اور عملی و علمی حرکت خواہ آخرت کے خطوط
پر یا حصول دنیا کے صحیح خطوط پر ہو، اہم مقصدِ حیات ہے اور یہی زندگی کا حقیقی
فائدہ اور خلاصہ و ماحصل ہے۔

لیکن وسائل اور مقاصد کا احساس و ادراک اور ان کی افادیت کا
یقین اعلیٰ معیاری فکر اور علم و بصیرت ساتھ ہی صدق و اخلاص کا سرمایہ چاہتا
ہے تاکہ وہ افکار خاص افراد کے ساتھ لازم و محدود ہو کر نہ رہ جائیں اور جماعت
کی طرف متعدی ہو کر اس کے مفید ثمرات و نتائج عام ہو سکیں۔ چوں کہ اسلامی
قوانین میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ جس کی وجہ سے یہ دین ہر زمانے میں
قابلِ عمل اور ہر مقام پر نافذ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور زمانے کے بدلنے
کے ساتھ احوال و ظروف بدل جاتے ہیں، محاورات امثال بدلتے ہیں اور زبان و
ادب میں جو تبدیلی آتی ہے، سوچنے سمجھنے کے انداز اور پیمانے بدل جاتے ہیں اور
ظاہر ہے کہ آج سائنس نے اس کی تیز رفتار ترقیات نے، کھلی ہوئی تبدیلیاں
فکر اور زبان اور مثالوں محاورات میں پیدا کر دی ہیں۔ لہٰذا ان امور کو
ملحوظ رکھ کر اسلام کو پیش کرنے کی ضرورت اہم ضرورت ہے۔

ہمارے اسلاف و اکابر جنہیں قدرت نے مجتہدانہ اور ایجادی ذہن و
فکر اور صلاحیتوں سے مالا مال اور خوشحال فرمایا تھا اور جنہیں حال سے زیادہ
مستقبل کو تابناک و درخشاں بنانے اور اپنی نوع و نسل کی حفاظت اور
بقا و ترقی اور کشاکشِ حیات میں زندگی گزارنے کے خاص انداز اور انسانی
عزت و شرف کے ساتھ بڑھنے اور پروان چڑھنے کی فکر تھی۔ انہوں نے
علم و دانش اور حکمت و سائنس کے ایسے ایسے اسرار سربستہ وا شگاف و منکشف
کیے جن کے مجموعے علم و حکمت کے مختلف فنون اور مختلف شعبے ٹھہرے اور آج
تو فنون و صناعات کا موجد ذہن اقوام و ملل کو میسر نہیں بلکہ ان ہی
متقدمین اور موجدین فنون کے خوشہ چین اور شاگرد بن کر کچھ نہ کچھ جیک
حاصل کرتے ہیں لیکن استاذ زماں اور امام فن کے مقام پر نہیں نظر آتے
اور بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغربی دنیا نے ذوق ایجاد ان ہی ماہرین
علوم و فنون کی بدولت پایا اور افسوس کہ تیرہویں صدی عیسوی میں وہ
بیش بہا علمی خزانے ظلم و سفاکی اور تاتاریوں کے قاہرانہ ہاتھوں دریا برد
اور نذرِ آتش ہو گئے اور سارے عالم اسلام کو تہذیبی، تمدنی، جانی
مالی عظیم تباہی اور بربادیوں سے دوچار ہونا پڑا۔

غرض یہ کہ تاتاریوں نے غارت گری اور خوں ریزی کا میدان عالم
اسلام کو بنایا اور یہ وہی زمانہ تھا جب کہ غازی صلاح الدین ایوبیؒ نے
مسیحیت کو عبرت ناک شکست دی تھی لیکن صلاح الدین ایوبی کی وفات کے
تقریباً بیس سال سے بھی کم عرصے میں تاتاریوں نے اسلامی دنیا میں زبردست
اودھم مچائی اور تابڑ توڑ حملے کر کے ظلم و سفاکی کی حد کر دی۔

اور اب جو کچھ قدیم و جدید بنیادیں اجاگر ہیں، جن پر دیوار اونچی
اٹھائی جا سکتی ہے وہ بھی ہم اصاغر اور نسل جدید نے اپنی غفلت و جمود
سے پردۂ ظلمات میں مستور کر رکھا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے انہیں علمی و
تہذیبی اثاثے اور میراث کے برباد و تباہ ہونے پر گہرے رنج و الم اور
صدمہ و قلق کا اظہار کیا ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو رونا کیا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ دور سائنس کا آغاز یورپ
میں نہیں بلکہ اندلس اور صقلیہ میں نویں اور دسویں اور گیارہویں صدی
عیسوی میں ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت مذہب اور سائنس میں
کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ سائنس اس زمانے میں مذہب کے خادم و معاون
کی حیثیت سے ترقی کر رہا تھا مگر ترکوں نے پندرہویں صدی میں جب آستانہ
اور قسطنطنیہ سے بیزنطینی علماء کو نکالا جن کے بعد وہ ہجرت کر کے اٹلی
پہنچے اور علوم فطرت میں تحقیق کا کام مسلم دنیا سے یورپ کی طرف منتقل
ہو گیا تو سائنس کی تاریخ نے بالکل نیا رخ اختیار کیا۔ اب سائنس کا مقابلہ

ایک ایسی دنیا سے تھا جہاں مسیحیت کو اقتدار حاصل تھا اور مسیحیت نے ہی سائنس کو اسلام سے متصادم کرنے کی غلط کوشش کی۔ ایسا ہی خیال ایک بالغ نظر مفکر اور صاحب تحقیق شخصیت کا ہے جن کی معلومات کا ماخذ قدیم اسلامی تاریخ ہے۔ وہ اس طرح اس سلسلے میں باتیں آگے بڑھاتے ہوئے صراحت کے ساتھ راقم ہیں کہ سائنس اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی "تدبیر امر" کا مطالعہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس کائناتِ فطرت میں تدبیر اور عمیق النظری سے ظاہری و عملی دنیا میں مادی حیثیت سے کچھ ایسے امور کا ادراک دیتا ہے جن سے اس مستعار و ناپائیدار زندگی میں فائدہ اور تعاون حاصل ہو اور دوسرا رخ اس تدبیر کا یہ ہے کہ وہ حقیقت الحقایق جو موجودات عالم کی حیاتیات کا مرکز اور سرچشمہ ہے، اس کی نشاندہی بھی ہو جائے۔ چنانچہ عالم فطرت کی جستجو اور چھان بین کے درمیان سائنس نے کائنات کی جو حکمتیں دریافت کی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کر رہی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی قوت ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کو کنٹرول کر رہا ہے"۔

عقائد اسلام کی زبان میں اسی کو واجب الوجود خالق و موجد سب اور مربی یعنی عدم سے وجود میں لانے والی طاقت اور ایجاد کے بعد اسباب بقا کو سازگار بنا کر نوعی ارتقاء کی ممکن حد تک پہنچانے والی ذات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور مثلاً اسلامی مسلّم عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں ہماری قوتِ بصارت خدا اور آخرت کے جملہ مناظر کو نہیں دیکھ سکتی۔ سائنس نے انکشاف کیا اور تجزیاتی مراحل سے گزر کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ حقیقت اپنی آخری شکل میں ناقابل مشاہدہ ہے۔ البتہ اس حقیقت کے آثار و مظاہر عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور پتہ ملتا ہے جیسا کہ اسی حقیقت کا اظہار شاعر نے اس طرح کیا ہے کہ ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

اور مظاہر فطرت کی وساطت سے دل کیفیت یقین سے اور یقین کی لذت سے اس طرح آشنا ہو جاتا ہے کہ وہ یقین کبھی کسی مشکک کی تشکیکی مساعی سے زائل نہیں ہو سکتا بلکہ زبان اور اعضاء و جوارح اس یقین کا ترجمان بن جاتے ہیں۔ بالفاظ دگر ہماری ہر ادا، ہر حرکت فطرت آواز بن جاتی ہے اور دل کے ساتھ زبان بھی ہم نوا اور ہم صدا بن جاتی۔ خواہ وہ حقیقت اپنی انتہائے لطافت اور علومِ تبت کے سبب ادراک سے ماوراء ہو لیکن اس کی نشان دہی مظاہر فطرت کی راہوں سے ہو جاتی۔ اس مضمون کو بڑی بے تکلفی اور سادگی سے ایک شاعر نے یوں واضح کیا

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

اسی طرح سائنس یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانوں کی تمدنی و معاشرتی عائلی اور خاندانی تعلقات کے سلسلے میں قانون الٰہی خود ساختہ وضعی قانون پر فوقیت رکھتا ہے۔

مثلاً قانونِ اسلامی میں خلقی حیثیت سے مرد برتر صنف ہے اور عورت اس کے مقابلے میں کمزور۔ اسی بنیاد پر مرد انسانی معاشرے میں بہت ساری اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل قرار دیا گیا اور جن نو کی ذمہ داریاں اس کے لیے خاص کی گئی ہیں۔ اس مقام پر عورتوں کی صنف نہیں آسکتی۔ لیکن انسانی وضع کردہ قانون میں عورت اور مرد میں مساوات اور برابری کو معاشی و معاشرتی لحاظ سے مفید سمجھا جا رہا ہے۔ اس برخلاف سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ پیدائشی طور پر عورت کمزور ہے اور مرد برتر۔ اور قرآن کا عین فطرت کے مطابق واضح فیصلہ ہے کہ

الرجال قوامون علی النساء
[مرد عورتوں پر نگران اور ذمہ دار ہیں]

اور سائنسی تجزیے نے قرآنی فیصلے کو فطرتِ صحیحہ کا ترجمان بنایا۔ بسلسلۂ تمثیل اس مقام پر یہ واقعہ بھی سائنس کی مذہبی ا سے بھی افادیت کو واضح کرتا ہے۔ اس لیے جزوی مثال کے طور پر قابل ذکر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
فر من المجذوم فرارک من الاسد
[جذامی مریض سے دور بھاگو شیر سے بھاگنے کی طرح]

اس قول اور خطاب سے آپ کا مقصد خدا کے فا

ہونے کے عقیدہ کی حفاظت تھا کہ کمزور فہم و خیال کے لوگ کہیں تقدیر الٰہی کے مطابق اس خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائیں تو ایسا نہ سوچ سکیں کہ فلاں جذامی مریض کے نزدیک بیٹھنے اور اس کے ساتھ کھانے پینے سے ہی ہمیں یہ مرض لگ گیا۔ اس لیے آپؐ نے ایسے خیال باطل کا استیصال ہی فرما دیا کہ لوگو! ایسے مریض سے الگ تھلگ رہا کرو۔

اور آپؐ نے خود ایسے سخت مریضوں کے ساتھ کھایا ہے جب کہ سامنے صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور عثمان غنیؓ جیسے راسخ الاعتقاد حضرات صحابہ موجود تھے۔ چوں کہ ان سے اعتقاد میں کمزوری یا فساد لانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

غرض ہم اہل اسلام صدیقی انداز سے اس روایت کی تشریح و تفصیل کرتے ہیں تاکہ حدیث نبوی کا مصداق بلاشک ہر طرح کے اعتراض اور جرح سے پاک ہو کر متعین ہو جائے۔ لیکن ایک عیسائی مفکر کی فکر کا انداز ملاحظہ ہو۔ اس نے اس مثال کو سمجھنے اور راز معلوم کرنے پر زور صرف کیا کہ پیغمبر اسلامؐ نے شیر ہی کی مثال کیوں اختیار کی۔ آگ یا تلوار یا کسی اور خوف و ہیبت کی چیز کو مثال میں لاسکتے تھے۔

بالآخر اس نے آلۂ خردبین اور دیگر سائنسی آلہ کے ذریعے جذام کے زخم کو جانچا اور اچھی طرح غور کرکے دیکھا تو یہ دیکھا کہ جراثیم بے مقدار ذروں جیسے ہیں مگر اس کی شکل و صورت شیر جیسی ہے۔ بہت ہی حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ جس پیغمبر کی نظر اتنی باریک بیں ہے کہ جس شے کا انکشاف ہم آج سائنس کے ارتقائی دور میں آلات کی مدد سے کرسکے ہیں، اس اُمّی پیغمبر نے صدیوں پیشتر مشاہدہ کرکے منکشف کر دیا تھا، یقیناً اس کا لایا ہوا دین اور مذہب حق ہے اور نور یقین سے اس کا وجود جگمگا اُٹھا کہ اس کا حقیقی روشنی انجام دل و نگاہ میں رقص کرتا ہوتا نظر آنے لگا ہے۔

یہ ایک بڑی چھوٹی اور ہلکی سی مثال ہے جس سے بھی سائنس کی افادیت نمایاں ہے۔

شیخ علی طنطاوی نے بڑی جامع بات کہی جس کی روشنی میں اسلامی اعمال و عقائد پر گہری نظر ڈالی جائے تو تمام مذاہب عالم کے بیچ اسلام ہی کا یہ امتیاز ٹھہرتا ہے کہ اسلام علم و سائنس کا دین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام عبادت بھی ہے اور شہری، تعزیری اور بین الاقوامی قانون بھی۔ دفتری نظام بھی ہے اور فطری مذہب بھی، علم و سائنس بھی ہے اور سیاست بھی۔ عمل بھی ہے اور جہاد بھی۔

اس مدعا پر کہ اسلام علم بھی ہے اور سائنس بھی، اس طرح استدلال کیا ہے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلا لفظ جو نازل ہوا وہ اقراء کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں پڑھ۔ پھر ہر وہ علم جس کی اسلامی معاشرے کو ضرورت ہو، اس کا سیکھنا اور پڑھنا از روئے اسلام ہر مسلمان پر جو سیکھنے کی قدرت رکھتا ہو، فرض کفایہ ہے۔ غور کیجیے کیا دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی دین ایسا ہے جو کیمسٹری، طب، ہوابازی وغیرہ کا سیکھنا دینی فریضہ قرار دیتا ہو؟

جب ہندوستان پر انگریزوں کی جابر و ظالم حکومت کا تسلط و اقتدار ہو گیا تھا اور وہ خاص کر اسلام کے استیصال کے درپے ہو چکے تھے، قرآنی علوم اور دین کے مٹانے پر اتر چکے تھے تو اس دور ناہموار میں ہمارے علمائے سلف نے بقاء اور احیائے دین کی خاطر عامۃ المسلمین کے تعاون سے ملک میں مدارس کے جال پھیلائے تھے اور ان کے خلاف ہر طرح قربانی دینے کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔

اور آج جب کہ اقتصادی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے عالمی برادری کے بیچ ملت اسلامیہ کا کوئی مقام نہیں رہ گیا ہے۔ ساتھ ہی قومی و ملی اعتبار سے ہماری موت و زیست کا سوال ابھر آیا ہے اور ہم عزت و عظمت کی ساکھ بھی قائم کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں اور ملی وجود بھی معرض خطر میں ہے۔ کیا ایسے میں اگر سائنس و ٹکنالوجی کی راہ سے ہم قوت حاصل کرسکتے ہیں اور یہ تعلق علوم سائنس کے ساتھ ہمارے مسئلے کا حل اور خطرات کا دفاع بن سکتا ہے تو پھر آج کے سنگین و پُرخطر ماحول میں دور جدید کے چیلنج کا جواب کیوں نہیں دیا جاسکتا؟ کیوں ان علوم سے ہم آراستہ نہیں ہوسکتے؟ اور کیا ہم راہ کی مشکلات کو دور نہیں کرسکتے؟

ہاں ضرور ہوسکتا ہے کہ ہم دور حاضر کے چیلنج کا جواب دیں مگر اجتماعی و ملی پیمانے پر سعی و عمل کا دائرہ وسیع کیا جائے تو کامیابی سہل ہے۔ مدارس کے نصاب میں کوئی فرق نہیں لانا بلکہ ایک مفید اور اہم اضافہ کرنا ہوگا۔

آج سائنسی ارتقاء کے ماحول میں یہ بھی قابل تسلیم امر ہے کہ سائنسی معلومات
اور انکشافات وایجادات سے تبلیغ وتفہیم دین اور تشریح و وضاحت میں کافی
مدد مل سکتی ہے اور سائنس اسلامی معتقدات اور حقایق فطرت کو نئے انداز
میں موثر طریقے پر ذہن نشین کرانے اور قرآنی اعمال و عقائد اور جملہ شعائر اسلام
کو عین فطرت سلیمہ کا تقاضا باور کرانے میں نہ صرف یہ کہ بڑا ہی مدد معاون
ہے بلکہ آج سائنسی مسائل اور جدید علوم سے بے گانگی و ناآشنائی قرآن و
حدیث کو کما حقہٗ سمجھنے سمجھانے سے قاصر رہ جانا اور محرومی ہے۔ مثلاً قرآن
ارباب عقل و بالغ نظر انسانوں کو انفس و آفاق میں تدبر اور تفکر کی دعوت
دیتا ہے اور یوں توجہ دلا رہا ہے کہ

إن في خلق السموٰت والارض واختلاف
الليل والنهار لآيات لاولي الالباب

[بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات، دن کے
آنے جانے اور متغیر و مختلف ہونے میں عقل والوں کے
واسطے قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں]

آیات قرآنی وجود باری اور اس کی توحید سے متعلق ہے اور
محسوسات سے دلیل پیش کی گئی ہے جو تفہیم و اطمینان دلانے کا سہل
اور دل نشین انداز ہوا کرتا ہے۔

استدلال اس طرح ہے کہ موجوداتِ عالم خواہ ارضی اجسام اور
اس کے احوال ہوں یا فلکی اجرام، اس کی نوعی صورتیں اور اس کے آثار و
افعال ان سبھی امور سے بحث وکھیں اور تجزیہ کے بعد ہی ان کے حقائق،
ان کی افادی حیثیات اور عجیب وغریب حکمت و مصلحت پر مبنی وجود ظاہر و
بے نقاب ہو سکتے ہیں اور انسانی ذہن و دماغ میں یہ بات اتر سکتی ہے
کہ ایسی چیزوں کا خالق و موجد انسان نہیں ہو سکتا اور خود بخود بھی بخت و
اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتی۔

آفاق سے ہٹ کر انسان اپنے نفوس میں بھی ڈوب کر جھانکے تو یعنی
تجزیاتی طریقے پر ایک ایک عضو بدن اور اس کے افعال و خصوصیات اور شکل و
صورت میں گہری نظر کرے تو بھی وجود باری اور توحید کا مضمون ذہن نشین
ہو جائے گا۔ کیوں نہیں انسان بھی تو عالم اصغر ہے۔ کسی نے اس مطلب کو
اس طرح ادا کیا ہے کہ

کمال عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلووں پر
مرے مذہب میں خودبینی کو کہتے ہیں خدا دانی

فخر امت علامہ فخر الدین رازیؒ نے توحید سے متعلق مذکورہ بالا آ
کی تشریح و توضیح میں اتنا طویل و عریض تفصیلی کلام اپنی مشہور عالم مایہ نا
تفسیر "تفسیر کبیر" میں کیا ہے کہ بات بات پر دل و زبان داد تحسین دیے
نہیں رہ سکتے اور اللہ کی توحید سے دل و دماغ میں شگفتگی اور اطمینان
حاصل ہو جاتا ہے۔

انفس و آفاق میں ہمارے اسلاف نے تجزیاتی عمل کر کے
اور واقعی حقیقت کو اس کے اصلی رنگ و ہیئت میں سمجھنے اور علم یقین حاص
کرنے کا راستہ کھولا اور ڈگر بنایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سائنسی تجزیات
تحقیقات ان اسلاف کی رکھی ہوئی بنا پر عمارت اونچی اٹھائی جانے کے م
ہے تو یہ تعبیر مناسب ہے اور آج تو یہ تجزیہ و تحقیق ایجاد و اکتشاف کی
تک ترقی کر چکا ہے اور فکر و عمل تک پہنچی اور نتیجۂ عمل مجسم پیکر بن کر منظ
پر آچکا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سائنسی ایجادات واکتشافات
پیدا شدہ شکوک و شبہات، جو اسلام کے کسی بھی مسئلے سے متعلق ہو
ان کا جواب سائنسی معلومات اور جدید علوم میں رسوخ کے بغیر ممکن نہیں
نیز مثبت طور پر تفہیم و تبلیغ دین بھی جدید ذہنوں پر موثر نہیں ہو سک
اگر کوئی جدید علوم سے خالی الذہن ہو اور مدارس ایسے اذہان کی تعمیر او
افراد سازی کا کام سائنس کے موضوع کو نصاب میں داخل کر کے او
تدریسی عمل کے ذریعے ہی انجام دے سکتے ہیں۔

سائنس صرف مطالعاتی موضوع نہیں ہے اور نفسیاتی بات ا
تجربہ یہ ہے کہ تدریس اور صرف مطالعے کے اثرات میں فرق ہے۔ تدر
سے کسی بھی فن کے ساتھ تعلق قوی اور رسوخ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

اور مثلاً یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی دماغ جو موجوداتِ عالم ا
کائنات کے لاکھوں امور کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح دل
میں ہزاروں آرزوئیں احساسات وجذبات اور شعور و خیال جنم لیتے
جن میں کچھ لطیف و پاکیزہ بھی ہوتے ہیں اور کچھ کثیف و قابل نفرت
ہر چند کہ دل بھی ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اور دماغ بھی ایک ٹکڑا

دماغ ادراک کا مرکز ہے اس میں کیا خاص بات ہے اور دل احساس و شعور کا محل اور مسکن ہے۔ اس میں دماغ سے مختلف کیا کچھ کیفیات ہیں اور کون سی خوبی ہے دونوں کے فرق کو سائنسی عملیاتی تجزیے کے ذریعے ہی بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے اور تجزیے کے بعد ہی یہ نتیجہ برآمد ہو سکے گا کہ ان دونوں لطیف جوہروں کی تخلیق انسان کی قدرت سے خارج اور ماوراء ہے اور محض نظریاتی تجزیے کے الفاظ و مضامین انشراح قلب اور یقین محکم کی کیفیت نہیں حاصل کرا سکتے۔ نتیجتاً قرآن و حدیث کا فہم ادھورا رہ جائے گا یعنی جدید ذہنوں میں اسلام کو موثر اور دل نشیں طریقے سے نہیں اتارا جا سکتا۔

اگر علم و عمل میں ہم آہنگی اور ارتباط پیدا کر دیا جائے تو عین الیقین اور حق الیقین کے درجے پر پہنچنا سہل ہو سکتا ہے۔

سائنس خارجی اور واقعی ثبوت کسی مدعا پر پیش کرتا ہے اور مشاہدہ و ظاہری ثبوت سو دلیلوں کی ایک دلیل ہوا کرتا ہے، جس کے بعد مزید دلیل و شہادت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔

ارشاد رسول اکرمؐ

بہت مشہور حدیث ہے۔ آپؐ نے فرمایا اور طرز تکلم و طریقہ، گفتگو کا ایک موثر انداز ہمیں عطا فرمایا کہ

کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم

[لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق باتیں کرو]

یعنی اونچے فہم والوں سے اونچے معیار کی باتیں اور کم فہم اور کم عقل سے ہلکی اور نیچی سطح کی باتیں کرنی چاہئیں۔ تاکہ ذہن پر اس بات کا فائدہ مرتب ہو۔

اگر نیچی سطح کے لوگوں سے ان کے ظرف و معیار سے بڑھ کر باتیں کی جائیں گی تو صدا بصحرا ثابت ہوں گی اور گفتگو بے سود ہو گی۔

ارشاد نبویؐ کی اس مختصر سی تشریح کا اشارہ یہ ہے کہ اونچے اور ترقی یافتہ ذہنوں سے ان کے مناسب حال گفتگو ہی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد پر اس سائنسی ارتقاء کے دور میں جدید ذہنوں کو کوئی بھی مسلّم اسلامی مسئلہ جب ہی سمجھایا جا سکتا ہے کہ سمجھانے والا خود سائنسی معلومات سے بہرہ مند ہو اور سائنسی علوم سے آراستہ ذہن ہی آج کے جدید سائنس سے قریب ذہنوں کو مطمئن کر سکتا ہے اور یہ طرز کلام آپؐ کی رہنمائی کے مطابق ہو گا۔ قدیم منطقیانہ طرز استدلال اور فلسفیانہ اعتباری اصولوں اور فارمولوں سے ترقی یافتہ ذہنوں کو مطمئن کر دینا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ اور اس طرح بالکل سادہ دلیل و ثبوت سے عاری دعوے بھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتے۔

علامہ اقبالؒ کی سنیے ؎

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

مختصراً یہ کہ جتنا بھی سائنسی ایجادات پر غور و فکر کیا جائے تو وہ ایجادا اسلام کے بہت سارے عقاید و اعمال کو واضح کرنے اور سمجھانے میں معاو ہی ثابت ہو رہے ہیں۔ مخالفت اور حقائق فطرت سے تصادم کا کوئی بھی پہلو نمایاں نہیں ہوتا کہ شجر ممنوعہ کی طرح اس سے دور دور رہنا ہی ضرو قرار دیا جائے۔

کسی شے کا بے محل استعمال

یہ ان افراد انسانی کا قصور ہے کہ کوئی سائنسی ایجاد کو اس غیر محل میں استعمال کریں۔ اس ایجاد سے جس ضرورت کی تکمیل اور سہولت رسا مقصود ہے وہ اپنی جگہ کسی طرح ممنوع اور ناقابل استعمال نہیں۔ جیسے ریڈ ٹیلی فون، ٹیپ ریکارڈر، کمپیوٹر وغیرہ۔

اجمال بعد التفصیل

اب تک کی پیش کردہ تفصیلات کا ماحصل اتنا ہے کہ مدارس میں جو تدریسی موضوعات ہیں ان کی تدریسی افادیت کا دائرہ وسیع دلکش اور موثر ہونے کے ساتھ دور حاضر کے جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے کہ سائنسی شعبے کا اضافہ مدارس میں کیا جائے۔ قدیم نصاب کوئی مسلک یا عقیدہ نہیں کہ اس میں ہی انحصار اور تحدید لازم سمجھی جائے۔ بلکہ قدیم علوم کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے، جب جدید علوم ان کے معاون اور خادم کی حیثیت سے داخل کیے جائیں۔

سائنسی انکشافات و ایجادات سے توحید، رسالت، آخرت، زندگی مابعد الموت اور زندگی کے اعمال کا محاسبہ، ان امور کی بہتر توضیح و تشریح اور ان کا اثبات کافی محکم و مدلل طور پر ہو جاتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں کی یہ فکر قابل عمل ہے

کہ موجودہ دور میں جو سب سے بڑی غلطی ہوئی ہے کہ دور حاضر کے فکری معیار کے مطابق قرآن کا اظہار نہ کیا جا سکا۔

موجودہ دور میں ہماری تمام ناکامیوں کی جڑ اسی ایک کوتاہی میں
چھپی ہوئی ہے اس لیے ایک ایسا اسلامی مرکز ہو جس کا سب سے پہلا کام یہ
ہو کہ وہ تمام اعلیٰ ترین تحقیقی ذرائع کو استعمال کر کے اسلام کی تعلیمات
کو وقت کے علمی معیار پر مدلل کرے ۔ اس کے تمام شعبوں کا اولین نشانہ
اسی اہم ترین کام کو ہونا چاہیے ۔

فکر کا دوسرا انداز

علوم سائنس ٹکنالوجی کی بابت ارباب مدارس کے سوچنے کا ایک
دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ عموماً دینی درس گاہوں میں جو مروجہ علوم وفنون
پڑھائے جاتے ہیں' ان سے اقتصادی و معاشی مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا
چوں کہ علوم دین دنیا کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ
میں وہ شخص مذموم ہے جو قرآن وسنت کے علوم کو وسیلۂ معاش بنائے
دینی مدارس میں تنخواہیں شرعی حیلوں سے دی جاتی ہیں ورنہ عزیمت تو نہ
لینے ہی میں ہے مگر قرآن کریم اور فقہ وحدیث کی تصریحات ونصوص سے
یہ بھی ثابت ومسلم ہے کہ رزق حلال کا حصول اور اس کے بہتر اور جائز وسائل
بروئے کار لانا اللہ کا فرض ادا کرنے کے بعد فرض ہے اور قوی و کامیاب
وسیلۂ معاش جو عالمی برادری کے درمیان ملت اسلامیہ کی ساکھ قائم
کر دے وہ دور حاضر میں ٹکنالوجی اور سائنس کا علم ہے اور عقل وفطرت
کا قاعدہ ہے کہ اس عالم اسباب میں روحانی و مذہبی کاموں کا ظہور بھی
مادی وسائل ہی سے ہوا کرتا ہے۔ مادہ سے انقطاع اور کنارہ کشی اس
عالم میں اپنی بقاء اور وجود سے بے خبری اور ہلاکت کو دعوت دینے کے
مرادف ہوگا۔

اس لیے ارباب مدارس بھی اقتصادی و معاشی مسائل میں غلطاں و
پیچاں رہنے کے بجائے اپنی ذمہ داریوں کو کامیابی کے ساتھ نبھانے میں
ٹکنالوجی و سائنسی علوم کے محتاج ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے کسب ید
یعنی دست و بازو کی حاصل کردہ روزی سے معاش حاصل کرتے تھے۔

اور آیت قرآنی

قل أرأیتم ما تدعون من دون اللہ أرونی
ماذا خلقوا من الارض أم لهم شرك في
السموات ائتونی بكتاب من قبل هذا
أو أثارة من علم إن كنتم صادقين ۔

پیغمبر سے اللہ رب العزت کا خطاب ہے کہ
"کہو جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا دکھلاؤ مجھ کو
انہوں نے کیا بنایا زمین میں یا ان کا کچھ ساجھا ہے آسمانوں
میں"

آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں کسی مدعا کے
اثبات کی دو استدلالی بنیادیں ہیں۔

ایک مستند آسمانی کتاب
دوسرے کوئی علم جو وقت کے ارباب عقل کے نزدیک مسلم ہو
یہی دونوں چیزیں دعوت حق کے سلسلے میں بھی فراہم کرنا ہیں۔
ایک تو قرآنی علوم کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنا ہے
دوسرے مروجہ علمی معیار پر اسلام کو مدلل کرنا ہے۔

علمائے کرام کی توجہ کا مستحق ۔

یہ امر بھی ذمہ داریاں مدارس کے لیے توجہ طلب ہے کہ اس مقدس
علم کے محصلین عموماً ذہنی جمود اور احساس کمتری کی قید میں اس لیے بھی
گرفتار ہو جاتے ہیں کہ مادی اقتصادی و معاشی لحاظ سے ان کے دل
قوی نہیں ہوتے۔ نتیجۃً آج اسلامی علوم کو جن اجتہادی و ایجادی اذہان
و افکار کی ضرورت ہے' میسر نہیں آپاتے اور اس علم دین کو جس قوت کے
ساتھ جدید ذہنوں پر پیش کرنے کی ضرورت ہے' اس میں تقصیر اور سستی
نمایاں ہے۔

قرآن کریم میں مال کو خیر کے لفظ سے اور فضل کے
لفظ سے متعدد مقامات پر تعبیر کیا گیا ہے۔

انہ لحب الخیر لشدید
[انسان مال و دولت کی محبت میں سخت طریقے سے مبتلا ہے]

اور اسی طرح وصیت کے بیان میں آیا ہے۔

ان ترک خیراً
[اگر وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا ہو]

مال و دولت کا حصول شرعاً قبیح نہیں بلکہ حصول کے ذرائع اگر

قبیح ہیں تو اسلام کی نظر میں ویسا مال قابل نفرت ہے۔ ہاں حصول کے ذرایع جائز ہونے چاہئیں۔ مال مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئے اور صحیح مصارف میں استعمال ہو، دل میں نہ گھس بیٹھے۔ مال اور کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ انسان مسلمان ہونے کی حیثیت سے محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اور تابع فرمان ہے اور اسی ناطے مسلمان اس پوری کائنات کا مالک ہے اور اس پر اس طرح اختیار رکھتا ہے جس طرح کوئی مالک و آقا اپنی مملوک و مقبوض چیز پر اختیار رکھتا ہے۔

ایک مفکر اسلام نے یہ مواد فراہم کیا ہے کہ پانچ سو سال پہلے مسلمان دنیا کی اقتصادیات پر چھائے ہوئے تھے، مگر آج وہ اقتصادی قیام سے محروم ہے۔

قرآن کریم میں مال و دولت کو قیام کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما

قیام کے معنی قایم رہنے کا ذریعہ، سہارا کے آتے ہیں

قام علی اھلہ یا قام باھلہ

ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ یہ بتانا ہو کہ فلاں شخص اپنے اہل و عیال کے لیے سہارا ہے۔

تعلیم گاہوں میں با حوصلہ طلبا کے لیے علم کی پیاس بجھانے کے لیے اور تسخیر کائنات کے منصوبے اور اشیائے کائنات میں تدبیر و تصرف زوال و انحطاط کے سرد اور سست ماحول سے بیزار ہو کر نئی خوش گوار دنیا کی تعبیر کا خواب اور اس کی تعبیر اور طرح طرح کے ارتقائی امکانات کی تلاش و جستجو اور مظاہر فطرت کے تمام گوشوں کو عقل و فکر اور تجزیہ و تجربہ کی روشنی میں سمجھنے اور معلوم کرنے کے لیے دور حاضر کے انسانوں کو عموماً اور قرآن کریم کے خطوط پر زندگی گزارنے والوں کو خصوصاً ٹکنالوجی اور سائنسی علوم سے گہرا ربط و تعلق اس دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔ چوں کہ اس ارتباط و تعلق سے قرآنی زندگی گزارنے میں مزید درخشندگی تابندگی اور استحکام و قوت کا حصول وابستہ ہے۔

نظر کو ہے انتظار کب سے کہ زیست کا اہتمام بدلے
نئی ہے منزل، نئی ہیں راہیں، نہ کیوں سفر کا نظام بدلے

جب کسی ہم عصر مولوی نے البیرونی پر کفر کا فتویٰ اس وجہ سے لگایا کہ انھوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس میں نماز کا وقت معلوم کرنے کے لیے بازنطینی جنتری سے مدد لی گئی تھی تو البیرونی نے بگڑ کر کہا: "بازنطینی تو روٹی بھی کھاتے ہیں تو کیا آپ روٹی کے خلاف بھی مذہبی اعتراض کریں گے"۔

... ... عبد السلام

ہماری کچھ ایجنسیاں

* مسکین بک ڈپو
موتی ڈونگری ۔ جے پور
راجستھان

* صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ ۔ کامٹی

* ایجوکیشنل بک ہاؤس
یونیورسٹی مارکیٹ
علی گڑھ ۔

* میسرز آزاد بک اسٹور
ساکچی بازار ۔ جمشید پور

* میسرز مکتبہ معارف الاسلام
نظام پورہ
بھیونڈی ۔

* میسرز نسیم بک ڈپو
ٹاور چوک ۔ دربھنگہ
بہار ۔

* میسرز حنیف بک ڈپو ۔
مومن پورہ
ناگپور ۔

* میسرز کتاب منزل
سبزی باغ ۔
پٹنہ ۔

* مسٹر طالب حسین
ایف ۔ ڈی ۔ ہائر سکینڈری اسکول
کاٹھ دروازہ ۔
مراد آباد ۔ یو۔ پی۔

* انوار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ ۔
علی گڑھ ۔

* ظفر بک سیلر ۔
یوسف آنس جھریا ۔
ضلع دھنباد ۔

* فردوسی کتاب گھر
بک سیلر اینڈ پبلشر
بھوسیا چوک ۔ دھارواڑ

* طارق نیوز ایجنسی
مکتبہ معصوم شاہ ۔
مومن پورہ ۔ ناگپور

* آزاد اسٹور ۔
اردو بازار ۔ دربھنگہ ۔

* میسرز تنویر بک ڈپو ۔
جی ۔ ٹی روڈ ۔ نیو سٹی
آسنسول ۔

* میسرز پبلی کیشن ۔ ایچ ۳۲ ۔ گارڈن
ریچ روڈ ۔ کلکتہ ۔ بنگال

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد ۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق امیر نشاں علی گڑھ ۔ مطبع: مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۔ ایڈیٹر: الحاج [illegible] حنفی ۔

زرسالانہ : انڈیا ... Rs. 30·00
بیرونی ممالک ... US # 20·00 ہوائی ڈاک
US # 8·00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ : ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، انڈیا۔

مقالہ نگاروں کے لیے

- تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔
- عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔
- ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
- مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
- مسودہ کا بڑے سائز (20 cm x 30 cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور نامکمل مسودات رد کر دیے جائیں گے۔
- مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔
- اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مہر لگا لفافہ بھی ہو۔

مالک : مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پرنٹر پبلشر : اسرار احمد ۔ مقام اشاعت : ادارۂ تہذیب الاخلاق مسلم یونیورسٹی علیگڑھ : پریس : الیس کے آفسیٹ پریس ۔ دہلی

مندرجات

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال اُن سے متفق ہو)

اداریہ

اب سے چونتیس پینتیس سال قبل چند شکست خوردہ، اقتدار سے محروم، خود بین و خود سر نام نہاد سیاسی لیڈروں نے فرقہ وارانہ منافرت کی جو گیلی لکڑی سلگائی تھی وہ اب جنگل کی آگ بن کر پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے، حکومت ہو یا امن و امان کا انتظام کرنے والے ادارے، سیاسی لیڈر ہوں یا عوام، اس آگ پر جتنا بھی پانی ڈالتے ہیں وہ نہ جانے کیوں تیل بن جاتا ہے اور آگ کو مزید بھڑکانے کا سبب بنتا ہے۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ پر دم بخود ہیں کہ یہ آگ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے اور اس پر قابو پانے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمانہ سب ہی کو اپنے سیل رواں کی لپیٹ میں لے کر بڑھتا جا رہا ہے اور انسان بے بس تنکوں کی طرح اس کی موجوں میں ڈوبتے اُبھرتے اپنی سانسوں کو گن رہا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ نجانے کب کدھر سے کوئی گولی آئے اور اس کی شمع حیات گل کر دے۔ لوگ اب سفر سے بھی گھبرانے لگے ہیں۔ خواہ وہ ہوائی سفر ہو یا زمینی ان کو اس کا ہر لمحہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ ان کا ہوائی جہاز اغوا کر کے کالے کوسوں دور لے جایا جا سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو وہ ہاتھ گولی مار دیں جن سے نہ تو ان کا کوئی اختلاف ہے نہ تنازعہ۔ جب سے پنجاب، ہریانہ اور میرٹھ کے بے گناہ بس مسافروں کا بہیمانہ قتل ہوا ہے، اس وقت سے سفر کرنے والوں پر ایک لرزہ سا طاری رہتا ہے اور ان کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے یا اپنے گھروں میں دوبارہ واپس آسکیں گے۔ نفرت اور تشدد کی جو آگ بھڑکائی گئی تھی اگر اس کو شروع ہی میں آہنی ہاتھوں سے دبا دیا جاتا تو شاید آج ہم اس بے یقینی کی فضا میں اپنی زندگی نہ گزارتے اور نہ ہی اس طرح معصوم بے گناہوں کا قتل عام ہوتا۔

شروع شروع میں بدی کی ابتدا بڑے چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے اور اس سے لطف و لذت لینے والوں کی تعداد بھی انگشت شمار ہوتی ہے، لیکن حکمت عملی کی ذراسی غلطی، انتظامیہ کی ذراسی ڈھیل، دانشوروں کی ذراسی چوک اس کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں وہ ایک عفریت بن کر پورے سماج کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے اور پھر اس سماج کا ایک ایسا جزو لاینفک بن جاتی ہے کہ صدیوں کی انتھک محنت اور کوشش کے بعد ہی اس سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ جو سماج بدی کے عفریت سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہیں کرتا وہ برگ خزاں دیدہ کی طرح بکھر کر رہ جاتا ہے اور آنے والی نسلیں اس کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا مطالعہ صرف درس عبرت حاصل کرنے کے لیے کرتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں جو بدیاں فرقہ وارانہ منافرت، آپسی دشمنی، رشوت ستانی، نااہل نوازی، اقربا پروری

زبردست کا زیر دست پر ظلم وستم کے عنوان سے سکۂ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں وہ ہم کو کشاں کشاں اسی منزل کی طرف لیے جا رہی ہیں جہاں پہنچ کر تو ہمیں نیست و نابود ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ بدی بجائے خود ایک مسلک ہے، ایک مذہب ہے، ایک طریق فکر و عمل ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی خاص مذہب سے ہے نہ مسلک سے اور نہ ہی کسی مخصوص طریق فکر و عمل سے۔ اس کا فلسفہ دنیا کے فلسفے سے نرالا ہے اور اس کی گھاتیں ایسی شاطرانہ ہیں کہ بڑے بڑے سیانے بھی اس کی گھاتوں کی تھاہ پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

ابھی ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ مل جائیں گے جو بدی کو بدی سمجھتے ہیں اور برملا اس کے بد ہونے کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر اس کے خلاف صف آرا بھی ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کے پاس جو بھی ہتھیار ہیں وہ یکسر کند ہو چکے ہیں اور ان کی بارود اتنی رسیل چکی ہے کہ کوئی بھی آگ اس کی بارودی خصوصیت کو جگانے سے قاصر ہے۔ دوسری طرف بدی جدید ترین آلات سے لیس جدید تر فلسفوں کا لبادہ اوڑھے پوری نسلِ انسانی کی تباہی کے درپے ہے اور اس کو اپنے مشن میں ہر ہر قدم پر کامیابی ملتی ہی چلی جا رہی ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو گا جب صبح اٹھ کر اخبار میں یہ خبر نظر سے نہ گزرے کہ آج دس مارے گئے، آج بیس نے ملک عدم کی راہ لی، آج عورتوں کو چلتی بس سے کھینچ کر باہر نکالا گیا اور انتہائی "بہادری" سے نہتی بے قصور عورتوں کو "ذبح" کر دیا گیا تاکہ کل کا مورخ ہمارے اس طرز عمل کو "زریں حروف" میں تحریر کرے کہ ہم قتل کرنے کے سلسلے میں بھی عورتوں اور مردوں میں کسی تفریق کے قایل یا عادی نہ تھے۔ اس بدی کے خلاف جو لوگ آواز اٹھا رہے ہیں وہ نہ تو متحد ہیں اور نہ منظم۔ نہ ہی ان آلات سے لیس جن سے بدی کی فوج آراستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز مدھم پڑتی جا رہی ہے اور بدی کا عفریت اپنا جبڑا کھولے ہوئے ہمارے وجود ہی کو ہڑپ لینے کا درپے ہے۔

جب زندگی اس عالم میں بسر ہو رہی ہو تو کہاں کی عید کہاں کی خوشی؟ اسی لیے ہم بھی اپنے قارئین کو نہ تو یوم آزادی کی مبارک باد دے پا رہے ہیں اور نہ ہی عید قربان کی۔ ہم اپنی یہ مبارک باد اس وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جب سب لوگ مل جل کر بدی کے عفریت کو اس طرح زیر کر لیں کہ عرصہ دراز تک وہ اپنا سر نہ اٹھا سکے اور نہ ہی ہمارے سماج میں بس کا بیج بو سکے۔ یوم آزادی اور عید قربان کے موقع پر ہم اپنے قارئین سے صرف یہی درخواست کریں گے کہ آپ میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اگر بدی کے خلاف سینہ سپر ہو جائے تو ممکن ہے کہ جلد ہی بدی کے عفریت کو زیر کیا جا سکے۔ اگر ہم آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے یوں ہی حالات کے خاموش تماشائی بنے رہے تو بہت ممکن ہے کہ بدی کا پہلا نوالہ اب ہم ہی آپ ہوں۔

کبیر احمد جائسی

خطاب بہ طلبا

وحیدالدین سلیم

عزیز نوجوانو! کتابوں کی دنیا ایک خیالی دنیا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اس دنیا سے نکل کر اصلی دنیا میں قدم رکھنا چاہیے۔ جب وہ اصلی دنیا میں جو خیالی دنیا نہیں ہے بلکہ ایک زندہ دنیا ہے قدم رکھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے چاروں طرف خطرات ہیں، مشکلات ہیں۔ وہ ان خطرات و مشکلات کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھیں تو اُن کے لیے اس زندہ دنیا میں کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ اگر ان کو زندہ رہنا ہے اگر ان کو کارآمد اور مفید شہری بننا ہے تو وہ پھر کمر باندلیں کہ اپنے گرد وپیش کے خطرات و مشکلات کے پہاڑوں کو کاٹ ڈالیں گے اور ان کے درمیان چلنے کو ایک کشادہ رستہ بنائیں گے ورنہ پھر ان کو انہیں کتابوں کے قبرستان میں جن کو وہ پڑھتے رہے ہیں، دفن ہو جانا چاہیے اور ترقی اور کامیابی کا کبھی نام نہ لینا چاہیے۔

کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس روشن خیال ایڈیٹر کی تقریر پر غور کرنا چاہیے۔ کتابوں کو پڑھ کر گزشتہ ناموں انسانوں کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ ان کو خدا نے غیر معمولی قوتیں عطا کی تھیں یا ان کے زمانے کے لوگ ایسے شایستہ اور شریف تھے جن سے اپنی کامیابی اور ترقی کے رستے میں کسی خلل کا اندیشہ ان کو پیدا نہ ہوا۔ حاشا وکلا! جس طرح ہمارا زمانہ خطرات و مشکلات سے لبریز ہے، جس طرح مخالف طاقتیں ہمیں اب ہر طرف دباؤ ڈالتی نظر آتی تھیں، جس طرح قدم قدم پر زحمتوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہمیں اب کرنا پڑتا ہے جس طرح تعصب و حسد کے دیو ہمارے سامنے سینہ تانے اب کھڑے ہیں، یہی حال پہلے بھی تھا مگر جن لوگوں نے ترقی اور کامیابی حاصل کی اور شہرت اور ناموری کی بلندی پر پہنچے انہوں نے لاجب ارادے اور اٹل ہمت سے کام لیا۔ وہ مصیبتوں کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھے۔ ان کے عزم راسخ کے سامنے پہاڑ پانی ہو کر بہہ گئے۔ مشکلات کی سنگین چٹانیں پاش پاش ہو گئیں۔ ان کو بارہا ناکامیاں ہوئیں مگر مایوسی ا[ن]
[کے چہرے] پر شکن نہ ڈال سکی۔ انہوں نے بہت دفعہ شکست کھائی مگر وہ ہر دفع[ہ]
آگے بڑھے اور آخر کار اس منزل پر پہنچ گئے جہاں اُن کو پہنچنا تھا۔
دنیا میں جس طرح خود غرض، حاسد، متعصب اور عیار آج موجود ہیں
تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے درمیان وہ ناموران بھی گھرے ہوئے تھے
دھن میں وہ محو تھے اس سے کوئی چیز ان کو نہ ہٹا سکی۔ جس نشے م[یں]
مست تھے اس کو کوئی ترشی نہ اُتار سکی۔

ہمارے کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تعلیم ختم کرنے ک[ے بعد اصلی]
اور زندہ دنیا میں داخل ہونا ہے اگر وہ اس کے لیے تیاری نہ کر[یں تو]
ان کا ناکام ہونا اور شکست پانا ضروری ہے۔ اس دنیا میں کام[یاب]
ہونے کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے وہ کالجوں کے احاطے م[یں]
نہیں جاتے۔ موجودہ طرز تعلیم سے وہ اخلاقی تربیت نہیں ہو س[کتی جو ان]
کو اصلی اور زندہ دنیا میں کامیاب کرے۔ یہ تربیت ہوشیا[ری کے]
ساتھ خود اصلی اور زندہ دنیا ہی میں داخل ہونے سے مل سکتی ہے
[ف]رنگ نے ایسی انجمنیں قایم کی ہیں جن کے ارکان تعلیم یافتہ نوجوانوں ک[و]
لے کر گھر بیٹھے ایسے اصولوں کی تعلیم دیتے اور اصولوں کی مشق کرا[تے ہیں]
جن کے سبب وہ کامیاب ہوں مگر وہ تعلیم بے کار ہے۔ اگر سبق لینے [والے]
طلبا سوسائٹی میں ان اصولوں کی مشق عملی نہ کریں یہ اصول کوئی انوکھ[ے]
نرالے اصول نہیں ہیں۔ دنیا میں جن لوگوں نے کامیابی اور ترقی
کی ہے ان کو پیش آنے والے خطرات اور مشکلات نے یہی اصول [سکھائے]
اگر وہ زحمتوں اور مصیبتوں میں پڑ کر ان اصولوں کی عملی مشق نہ کر[تے]

منزلِ مقصود تک کبھی پہنچ نہیں سکتے تھے۔ غور کرنے والوں نے کامیاب اور
ترقی یافتہ انسانوں کی زندگیاں پیشِ نظر رکھ کر چند اصول مرتب کر لیے ہیں
اور ان کو وہ تمام دنیا میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر نوجوان
جو زندہ دنیا میں قدم رکھتا ہے اور کوئی مطمحِ نظر اس کے سامنے ہے ان اصولوں
کی مشق و مزاولت کرے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ میرے نزدیک ہر
سوچنے والا دماغ ان اصولوں تک ضرور پہنچے گا اور ہر غور کرنے والا دل ان
کی صداقت کو محسوس کرے گا۔ یہ ہر انسان کے دل کے اندر پوشیدہ ہیں —
ضرورت ہے کہ سمجھ کر فراموش نہ کیے جائیں۔ ضرورت ہے کہ ان پر یقین کیا
جائے۔ ضرورت ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔

جو پیغام میں تعلیم یافتہ نوجوانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، اس میں
انہیں فطری اور ابدی اصولوں کی روح ہے جو ایشیا کے ہر مفکر کے
قلب میں اسی طرح موجزن ہیں جس طرح یورپ کا ایک ہوش مند اور مفکر
انسان اس کو محسوس کرتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر نوجوان کو اپنے دل میں کوئی عمدہ
خواہش پیدا کرنی چاہیے۔ خواہش کا ماخذ کوئی ایسا فائدہ ہے جو ہونا
چاہیے مگر ہے نہیں۔ یعنی فائدہ غیر موجود کے احساس کا نام خواہش ہے
مسرت اور انبساط کی تلاش کا نام خواہش ہے۔ یہ ایک محرک ہے جو
ہمیں فعل یا ترکِ فعل پر مجبور کرتا ہے۔ یہ محرک ہماری تمام قوتوں کو اکساتا
ہے اور ہمیں کام کرنے کے جذبات کو ابھارتا ہے جو جذبات اس
عمدہ خواہش کی تکمیل میں موجزن ہوں ان کو مرنے دینا نہیں چاہیے، اپنے
تمام دل و دماغ کو اس میں منہمک کر دینا چاہیے۔ اپنی خواہش کو اس
قدر بار بار سوچنا اور دل میں لانا چاہیے کہ کوئی چیز اس کے سوا کا شائبہ
دل میں نہ رہے۔ ایک بڑے نامور انسان کا قول ہے کہ جیسا ہو گے
ویسا کرو اور جیسا کرو گے ویسا بنو گے اور جیسا بنو گے ویسے نتیجے حاصل
کرو گے۔ ایک عالی خیال انسان کی نصیحت ہے کہ

"اپنی خواہشوں اور ان کے جذبات کو پژمردہ نہ ہونے
دو ان کا احترام کرو، ان کو پیش گوئیاں سمجھو جو پوری
ہونے کے لیے تیار ہیں۔"

خواہش ایک زبردست محرک ہے جو ارادے میں توجہ پیدا کرتا
ہے۔ پرجوش خواہش اور مصمم ارادہ وہ اوصاف ہیں جو ناممکن کو ممکن کر
دکھاتے ہیں۔ جوش کیا ہے ایک متعدی بخار ہے جو اپنی گرم اور بیقرار
لہروں کا جال اپنے گرد و پیش پھیلا دیتا ہے اور خود بیچ میں بیٹھ جاتا ہے
اس لیے کہ تمنا کو مسخر کرے اور مراد کو شکار کرے۔ جب الہامِ ربانی
ہماری ذاتی دلچسپیوں اور ہمارے فطری رجحانوں کو اپنے سایۂ عاطفت
میں لیتا ہے، اسی حالت کا نام جوش ہے۔ یہ قوت ہر کس و ناکس کے اندر
ودیعت کی گئی ہے مگر بہت کم ہیں جو اس کے اظہار کی خواہش کرتے ہیں
جوش ایک قسم کی بھاپ ہے جو ہماری دماغی مشین کو چلاتی اور ہمیں کامیابی
اور کامرانی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ مجنونانہ جوش شخصیت کی جان اور کامیابی
کی روحِ رواں ہے۔ پرجوش خواہش کے ساتھ مصمم ارادے کی ضرورت ہے
ارادہ کارخانۂ دنیا میں ایک عظیم الشان قوت ہے۔ انسان ایک برقی ٹرام
ہے۔ دماغ برقی چھڑی ہے۔ ارادہ برقی تاروں کا ایک سلسلہ ہے جو
اس کے اوپر پھیلا پڑا ہے۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ برقی چھڑی
سے ارادے کے تاروں کو چھو لے، حرکت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ پُرزور
خواہش اور اٹل ارادے جس انسان کے اندر موجود ہیں وہ عالی ہمت اور
بلند حوصلہ انسان کے آگے آخر کار سرِ تسلیم خم کر دیں گے جو اُن کے سامنے
انسان کے آگے آخر کار سرِ تسلیم خم کر دیں گے جو اُن کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاتا بلکہ
مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔

عزیز نوجوانو! یاد رکھو کہ ایسا انسان دنیا کے ناگوار واقعات سے
نہیں گھبراتا۔ وہ ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو بے پروائی کی نظر سے
دیکھتا ہے۔ وہ یقین کرتا ہے کہ جو امور بظاہر ناگوار اور ناقابلِ برداشت
معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں دیگر خوش آیند امور کا پیش خیمہ
ہوتے ہیں

ایک بڑے تجربہ کار حکیم کا قول ہے کہ

مصیبتیں مصیبتیں نہیں ہیں۔ وہ ایک امتحان ہیں جس کا
نتیجہ کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی مگر کامیاب صرف
وہی لوگ ہوتے ہیں جو اُن سے مغلوب نہیں ہوتے۔"

ایک اور دانشمند مصنف لکھتا ہے کہ

"زور و شور کی بارش ایک نعمت ہے جس سے کائنات کی زندگی

کا مدار ہے۔ اگرچہ ایک صاحبزادے کی قیمتی اور پرتکلف پوشاک اس کی چھینٹوں سے بھیگ جائے کیا اس سے بارش کے فوائد میں کمی واقع ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح مصائب اور آلام خدا کی نعمتیں ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ظاہری جوش و خروش سے ہم ناک بھوں نہ چڑھائیں۔"

علمِ اخلاق کے ماہرین نے ہدایت کی ہے کہ مصیبت کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھنا چاہیے اور اپنے مطمحِ نظر پر جو یقین ہے اس میں کسی طرح کا تزلزل نہیں آنا چاہیے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ مصیبت کا بادل چھٹ جانے کے بعد کامیابی کی روشنی ضرور جلوہ گر ہوگی۔ کسی مصیبت یا کسی تکلیف کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے کہ شکایت اور شکست دونوں لفظوں کے ایک معنیٰ ہیں۔ یعنی اگر شکایت کرتے ہو تو یقین کر لو کہ تم اپنے پیشِ نظر میدان سے ہٹ گئے اور تم نے اپنی شکست مان لی۔ شکایت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تم جو اپنے مقصد پر یقین رکھتے تھے اب اس یقین میں خلل آگیا۔ حالاں کہ یقین وہ چیز ہے جس میں کامیابی کا راز مضمر ہے —

کارپردازانِ قضا و قدر نے قلوبِ انسانی میں ایک زندہ چنگاری مخفی رکھی ہے جو خواہش کی تحریک سے مشتعل ہوتی ہے۔ اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے تو وہ چنگاری کجلاتی اور بالآخر بجھ جاتی ہے۔ اس چنگاری کے زندہ رکھنے کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ یقین اور اعتقاد ہے۔ ارادہ اس کا ایندھن ہے۔ جب یہ غذا اس کو ملتی ہے تو اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں رہتی۔ مزاحمت کی لوہا لاٹ دیواریں اور رکاوٹ کی سنگلاخ چٹانیں یقین اور اعتقاد کے مقابلے میں پرِ کاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہمت اور استقلال اسی حالت کا نام ہے۔

اگر منزلِ مقصود پر پہنچنے کی آرزو ہے تو اس سے پہلے ہر نوجوان کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں کوئی شے مفت نہیں ملتی۔ باقاعدہ اور جاں کاہ محنت کے بغیر کامیابی ایک خواب ہے جس کی تعبیر ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہر نوجوان اپنے اوقات کو کام میں مشغول رکھے، بے کاری میں زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو یقین کرنا چاہیے کہ کام زندگی ہے اور بے کاری موت ہے۔ سکون اور افسردگی حرام ہے۔ نچلا بیٹھنا خطرناک ہے۔ ہر نوجوان کو اپنے پیشِ نظر مقصد کے لیے ہمیشہ ہمت اور کوشش میں مشغول رہنا چاہیے۔ یہ کوشش مجنونوں کی سی ہو۔ گزشتہ زمانے میں بھی جو نامور انسان اپنے مقصد کے لیے ایک خاص دھن میں مشغول رہے ہیں، ان کو دنیا نے مجنوں کہا ہے اور مجنوں سمجھا ہے مگر ایک انشا پرداز لکھتا ہے کہ

"ایسے ہی مجنونوں کی ضرورت دنیا کو ہے۔"

تمدن کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد انہیں مجنونوں نے اٹھائی تھی۔ اگر یہ مجنوں نہ ہوتے تو دنیا ترقی کی منزل میں ایک قدم آگے نہ بڑھتی۔ ایسے ایک مجنوں کی دھن پر ہزاروں ہوشیاروں اور عقل مندوں کی عقل و حکمت قربان کر دینی چاہیے۔ قافلے کے قافلے گہری اور میٹھی نیند میں پڑے ہوتے ہیں مگر یہ مجنوں اس وقت بھی تگ و دو میں سرگرم نظر آتے ہیں ان کو آوازِ جرس کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کی آواز ہی ان کو ہر وقت جگاتی اور آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ رستے کے خطرات سے نہیں گھبراتے بلکہ خطرات کو خود طلب کرتے ہیں تاکہ ان میں پڑ کر نفس کی تربیت ہو۔ وہ مشکلات سے خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ مشکلات کو خود دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور اُن کو زندگی اور گرم جوشی کا سبق دیں ناکامیوں کا وسوسہ ان کے دلوں میں نہیں آتا۔ اگر ناکامیاں ان کو پیش آتی ہیں تو وہ ان سے لڑتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی دھن میں موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ذوقِ طلب میں وہ برابر آگے بڑھتے ہیں اور اپنے سفر سے نہیں اکتاتے۔ جوں جوں چشمۂ زندگی کے قریب پہنچتے ہیں ان کی پیاس تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ غم اور مایوسی سے کبھی دوچار نہیں ہوتے۔ ان کی نظر اُمید کے ستارے پر رہتی ہے جو ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے افق پر چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔

عزیز نوجوانو!

یاد رکھو کہ ہماری خوشی اور ناخوشی بلکہ خود ہماری ہستی خیال کے تابع ہے۔ ہم کیا ہیں؟ سر سے پاؤں تک خیال کے پتلے ہیں۔ کائنات میں خیال سب سے بڑی قوت ہے اور جس چیز کا نام عمل ہے وہ اس کا پیرو ہے جو سایہ کی طرح اس کے جلو میں چلنا اپنے لیے باعثِ فخر جانتا ہے۔ ہر خیال اپنے موافق خیال کو اپنی طرف کھینچتا ہے

ہمت افزا خیالات میں کامیابی کا راز مضمر ہے اور ہمت شکن خیالات نامرادی اور ناکامی کے ذمہ دار ہیں۔

گارفیلڈ کا قول ہے:

"اس مغالطے میں نہ رہو کہ قسمت تمہاری تلاش کر رہی ہے
سچ یہ ہے کہ تم خود قسمت کی تلاش میں ہو۔ اگر تم وہ تمام
شرطیں پوری کر دو جو خوش قسمتی کے لیے ضروری ہیں پھر
قسمت کی دیوی ضرور تم پر مہربان ہوگی۔"

یاد رکھو کہ کامیابی اتفاقی اور اضطراری نہیں ہے بلکہ قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہے۔ لوگ جس کو محض بخت و اتفاق کہتے ہیں، قوانین فطرت کی فہرست میں اس کا کہیں نام نہیں۔ تم جو کچھ ہو کسی نہ کسی قانون کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہو۔ لازم ہے کہ خود اپنی ذات پر بھروسہ کرو۔ غیر تمہیں نہ بنا سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ تمہاری کامیابی اور ناکامی کی کنجیاں خود تمہاری جیب میں ہیں۔ اگر تم مسرت و انبساط کی تلاش میں ہو، اگر تم فارغ البالی اور خوش اقبالی کا سراغ لگا رہے ہو تو یہ سب کچھ تمہارے دل کے اندر موجود ہے۔ دل کے دروازے پر دستک دو فوراً تمہاری دستک کا جواب ملے گا الہامی صدا بھی یہی ہے کہ ہر آن انسان کی کامیابی اس کی ذات پر ہے۔ ہر انسان جیسی کوشش کرے اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل کرتا ہے۔

اے شریف نوجوانو!

جب تم اپنی دھن میں مشغول ہو، غم اور خوف کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ کسی کو آزار پہنچانے کا خیال دل میں ہرگز نہ لاؤ۔ محبت سے ہر شخص کو یاد کرو۔ عداوت اور حسد کے خوفناک جذبات کو اپنے سے دور رکھو، نیکی سے ہر شخص کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ بدی سے کسی کے ساتھ نہیں۔ تمہارے نغمۂ زندگی کے الفاظ حسب ذیل ہونے چاہیں۔

"میں اس عالمگیر شعور کا ایک جزو ہوں جو روح عالم ہے اس
لیے میں زندگی ہوں، میں صحت و تندرستی ہوں۔ میں اتحاد و
اتفاق ہوں، میں موسیقی ہوں، میں مسرت و انبساط ہوں
میں کامیابی اور خوش نصیبی ہوں، میرا قلب بلند خیالات
کا خزانہ ہے۔ اس لیے اغیار کے پست خیالات مجھے کچھ
نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میرے دل میں کسی کی طرف
سے کدورت نہیں۔ اس لیے میں نہ تو کسی کو آزار
پہنچانا چاہتا ہوں اور نہ کسی سے خائف ہوں۔ میں ہر
شخص کو محبت سے یاد کرتا ہوں۔ میری خواہش اور
میرا یقین دونوں زبردست ہیں، اس لیے میں کامیاب
ہوں۔ میں اپنی خواہش اپنے ارادے اور اپنے خیالات
کا نتیجہ ہوں۔ میرے اعمال و افعال، میری خواہش،
میرا ارادہ اور میرے خیالات مستقبل کا فیصلہ
کرتے ہیں۔ ترقی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اگر
ہے تو یہ میرا تصور ہے۔"
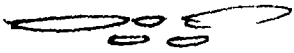
"انسان فطرتاً مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اس لیے وہ تمدنی، مالی، اخلاقی، غرض متعدد حیثیتوں سے دوسرے افراد کے تعاون کا محتاج ہے۔ امانت باہمی کا یہی اصول تمدن کا سنگ بنیاد ہے اور یہ اصول جس قدر منضبط اور مستحکم ہوتا ہے، اسی قدر انسانی زندگی پُر لطف، خوشگوار اور دلچسپ بلکہ دیرپا ہو جاتی ہے۔ اگر کشمکش حیات میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے تو دفعتاً حیات انسانی خطرے میں پڑ جائے"

مولانا عبدالسلام ندویؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۷۔ شمارہ ۸ (اگست ۸۷ء)

قومی یک جہتی

(قومی یک جہتی کاؤنسل کے سب گروپ کو دیا گیا نوٹ)

سید ہاشم علی
ترجمہ
سید شفیق احمد

یہ تاثرات ایک ایسے ہندوستانی شہری کے ہیں جس نے بیالیس سال تک ایک استاد، ایک اعلیٰ سرکاری افسر اور ہندوستان کی دو عظیم درس گاہوں کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں (اور دے رہا ہے) اور جو ماضی میں جھانک کر فخریہ کہہ سکتا ہے کہ "میں نے اپنے ملک کی خدمت دل و جان سے کی ہے"۔

قومی یک جہتی کیا ہے؟ اس کی تعریف بیان کرنے کے بجائے میں یہ کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ قومی یک جہتی کی تعریف اور اس کے حصول کے ذرائع خواہ کچھ بھی ہوں اُس کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں ہر شہری کو تحفظ، اپنائیت اور شمولیت کا احساس ہو اور یہ یقین ہو کہ قومی زندگی میں شریک ہونے کے مواقع اسے بھی میسر ہوں گے۔

ایسی حالت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے:

ا۔ جب ہر اس شہر میں جہاں فرقہ وارانہ فساد ہوا ہو، ہندو اُن مسلمانوں کی مدد کریں جو بربریت اور ظلم کا شکار ہوئے ہوں اور اسی طرح ہر مسلمان، مصیبت زدہ ہندو کی مدد کرے۔ دونوں فرقوں کے افراد متعلقہ فرقے کے قاتلوں اور مجرموں کا ساتھ نہ دیں۔

ب۔ جب ایک ہندوستانی شہری اپنے انتخابی حلقے میں اپنی ذات یا فرقے کے بجائے اپنے پورے علاقے کی نمائندگی کرنے کو ترجیح دے اور اسے سب کی توجہ اور اعانت حاصل ہو۔

پ۔ جب چناؤ لایق لوگوں پر مشتمل ایک فہرست کی بنیاد پر ہوں جس سے متعصب ...[illegible]... فرقہ پرست اور بددیانت سیاستدانوں کو خارج کر دیا جائے کیوں کہ وہ چناؤ جیتنے کے لیے ذات پات مذہب، زبان اور علاقائی تعصب پر مبنی جذبات کو اپنے ذاتی اور پرعیب مقاصد کے لیے بھڑکاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو لوگ اس پارٹی کو ووٹ دیں گے جس کے پاس بہتر پالیسی ہوگی۔

ت۔ جب وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کو سازشیوں کے رحم و کرم پر نہ رہنا پڑے جو ہمہ وقت ذات پات، علاقائی تعصب، اور فرقہ وارانہ تعصبات پر مبنی اپنے ذاتی مفاد کے لیے جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں۔ سیدھے منتخب شدہ وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کو زیادہ استحکام میسر ہوگا اور وہ اپنے قیمتی وقت کا بیشتر حصہ تعمیری کاموں میں صرف کر سکے گا۔ انھیں یہ حق حاصل ہو کہ وہ پارٹی سے باہر کے بھی کسی لایق شخص کو اپنی کابینہ میں شامل کر سکیں۔

ٹ۔ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ہر ہندوستانی دستور میں دی ہوئی تعریف کے بموجب ایک مکمل شہری ہے اور وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ ہے جو ہندوؤں مسلمانوں سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے صدیوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔

ج۔ جب ہر ہندوستانی ایک دوسرے کو بلا تفریق مذہب وملت زمان و مکان، برابر سمجھے اور اس پر اعتماد کرے اور اس پر کسی قسم کا لیبل نہ لگائے۔

اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ چند عام طور پر مستعمل الفاظ کی دوبارہ تشریح کی جائے۔ مثلاً

ا۔ فرقہ پرستی — حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ ایک فرقے

کے افراد دوسرے فرقے کے افراد کو متعصب اور صرف اپنے لوگوں کو ہی وطن پرست اور سیکولر سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اقلیتی فرقے کے کٹر وطن پرست جن کی وطن سے محبت اور سیکولر اندازِ فکر سے سبھی واقف تھے، ملک کی اہم سیاسی پارٹی سے محض اس لیے علیحدہ ہو گئے، کیوں کہ اکثریتی گروپ سے تعلق رکھنے والے افراد کا اندازِ فکر شاید صحیح نہ تھا۔ نہ صرف انہوں نے دوسروں کی نیت پر شبہ کیا بلکہ اپنے گروپ کی کوتاہ خیالی، تفریق اور ترجیحی عمل کو نظر انداز کیا۔ اقلیتی فرقے کے کسی فرد نے اگر اپنے جائز حقوق کی بھی مانگ کی تو اسے فوری طور پر فرقہ پرست اور متعصب قرار دے دیا لیکن پھر بھی اسی فرد کی پارٹی سے اس لیے گٹھ جوڑ کیا تاکہ سرکار بنانے میں اس کی مدد لی جائے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ بنا دوسری جماعت کی مدد کے سرکار بنانا ممکن نہ تھا۔ اسی سیاسی کوتاہ نظری کی وجہ سے بہت سی سیاسی غلطیاں بھی ہوئیں جن کی وجہ سے نہ صرف ملک کا بٹوارہ ہوا بلکہ بہت سے صوبوں کو بھی زبان اور دوسرے حالات کے تحت تقسیم کرنا پڑا۔

قومی لسانی، مذہبی، علاقائی اور غذائی اعتبار سے جداگانہ جماعت یا فرد کے جائز حقوق کو تسلیم نہ کرنا ہی میرے خیال میں فرقہ پرستی ہے۔ اپنی ذات یا فرقے کی زبان کو فروغ دینے کو فرقہ پرستی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ ایسی کوشش جو اس مقصد کے منافی ہو، فرقہ پرستی کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ دستور میں دیے گئے حقوق کو نہ تسلیم کرنا سازشوں کے ذریعے ملک کی ترقی کی رفتار کو روکنا یا کم کرنا یا دوسروں کی زندگیوں یا ملکیت کو نیست و نابود کرنا یقیناً فرقہ پرستی ہے۔ موجودہ مخدوش حالات میں زندگی اور ملکیت کی غیر محفوظیت پر اظہارِ تشویش کرنا فرقہ پرستی نہیں کہلائی جا سکتی۔ دوسروں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا یا دہشت پھیلانا البتہ فرقہ پرستی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ سیاسی جماعتیں، اخبارات، رسائل، ریڈیو اور دوردرشن لفظ "فرقہ پرستی" کا استعمال مناسب اور صحیح ڈھنگ سے کریں تاکہ ملک کی سالمیت کو خطرہ نہ پیدا ہو سکے۔ کسی ہندوستانی فردِ واحد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ صرف خود کو یا اپنی پارٹی کو ہی دستور اور ملک کا محافظ سمجھے اور دوسروں کو وطن دشمن قرار دے۔

اگرچہ کہ اعلیٰ سرکاری افسران سیکولر ذہن رکھتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی ایک بڑی تعداد فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ وہ لوگ فلاح و بہبود کے کاموں اور پروگراموں کو خلوص دل سے نافذ نہیں کرتے۔ ایک سرکاری کمپنی کے جنرل منیجر کو اس بات پر سخت تشویش تھی کہ ۹ میں سے ۴ جگہوں پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ مسلمان امیدواروں کا تقرر کیسے ہو گیا؟ دراصل ایسے افراد نہ صرف قومی یک جہتی کے تصور کے خلاف ہیں بلکہ بجا طور پر وطن دشمن کہلانے کے مستحق ہیں۔ ظاہر ہے ہندوستان کے دستور سے ان کو کیا عقیدت ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کو ہٹایا جائے جس سے سرکار پر فرقہ پرست ہونے کا الزام نہ لگے۔

ہندوستان میں تاریخ کے اس موڑ پر قومی یک جہتی کو سب سے اہم مقام ملنا چاہیے۔ یہی اکثریتی اور اقلیتی دونوں فرقوں کے حق میں ہے پنجاب، آسام اور مشرقی صوبوں میں چند مٹھی بھر دہشت گردوں نے کیا کر رکھا ہے اور اس سے ملک میں کس قدر بے چینی محسوس کی جا رہی ہے اندرونی اختلافات، نفرت، عدمِ اعتماد، اور فسادات اکثریتی اور اقلیتی دونوں فرقوں کے لیے مضر ہیں۔ امن کو بحال رکھنے کے لیے کیاب مالی وسائل کا بڑا حصہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں سب سے بڑی الجھن ہے۔

حکمراں گروپ کی دانشمندی، سیاسی سوجھ بوجھ، کشادہ دلی عدل اور حق پسندی ہی کمزور اقلیتی فرقوں کے طرزِ عمل اور اندازِ فکر کا تعین کرتی ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ تنازعات کو جلد از جلد ختم کرنا چاہیے۔ تاخیر ہونے پر حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ہندوستان کے لوگ کٹر مذہبی عقاید رکھتے ہیں لیکن جس طرح سے آج کل مذہب کو سمجھا جاتا ہے یا عقاید پر عمل کیا جاتا ہے، اس نے انسانوں کو تقسیم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ قومی کردار، اخلاقی اقدار اور تلاش امن نے اب ثانوی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ "میرے آدمی! صحیح یا غلط" کا نعرہ اب مشعلِ راہ بنا ہوا ہے۔ ایک مذہب کے ماننے والے بھی پاکستان جیسے ملک کو متحد نہ رکھ سکے۔ ہندوستان میں بھی بہت سے صوبوں کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنا پڑا۔ اگرچہ

یہاں بھی اُن صوبوں میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اور صرف مذہب ہی لوگوں کو متحد رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ حالیہ لسانی بنیادوں پر بنے صوبوں میں بھی صرف زبان ہی لوگوں کو متحد رکھنے میں ناکام رہی ہے۔ آندھرا اور تلنگانہ مرٹھ واڑا، ودربھا اور ریّانے بمبئی کے علاقے اب بھی پوری طور پر یکجا نہ ہو سکے۔ مختلف رسم ورواج، شادی بیاہ اور وراثت کے مختلف قوانین کے باوجود بھی ملک ہزاروں سالوں سے برقرار ہے۔ یہ دلیل کہ ایک مشترکہ ضابطۂ دیوانی ملک کو متحد رکھنے کے لیے ضروری ہے نہ صرف دھوکا ہے بلکہ بددیانتی پر مبنی ہے اور حکمرانی کے اصولوں کے بھی منافی ہے۔ مشترکہ ضابطۂ دیوانی کو بنانے اور نافذ کرنے کی ضد نے پہلے ہی ملک میں ناخوشگوار اور ہنگامہ آرائی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ایسے ناقابلِ محیط معاملات کو تو مستقبل کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے جب لوگوں میں حالیہ سیکولر تعلیم حاصل کرنے کا نہ صرف جذبہ پیدا ہو جائے بلکہ لوگ اسے حاصل بھی کریں اور جب لوگوں کو حکمران گروپ کی نیک نیتی، عدل اور منصف مزاجی پر اعتماد ہو جائے اور لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگیں۔

تمام مذاہب کی بہترین اقدار پر مبنی جدید سیکولر تعلیم کو اولیت ملنی چاہیے تاکہ لوگ اسے جلد حاصل کر سکیں۔ سرکار کو تمام دینی اسکولوں میں انگریزی، سائنس، ریاضی اور سماجی سائنس کے علوم کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ شروع کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔ تاکہ دینی مدرسے الگ تھلگ نہ رہ کر ترقی اور ارتقاء کی بیچ دھارا میں آسکیں۔

ہندوستان کے حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سیکولرزم کے معنی ہیں کہ ہر مذہب سے مساوی عقیدت رکھی جائے۔ ایک عام ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو بنیادی طور پر مذہبی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ کس قدر اپنے مذہب کو سمجھتا ہے اور مذہب کی اصل تعلیمات پر عمل کرتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ تمام مذاہب کے روشن خیال حضرات مل کر یہ کوشش کریں کہ کم از کم آئندہ نسلوں کے لوگ اپنے اپنے مذہب کی صحیح تعلیم حاصل کر سکیں۔ حیدرآباد کے ڈاکٹر ابوالفضل نے ہندوازم اور اسلام، عیسائیت اور اسلام، بدھ ازم اور اسلام کے نام سے چھوٹے چھوٹے کتابچے چھپوائے تھے۔ ان کتابچوں میں مختلف عنوانات جیسے سچائی، ایمانداری، رحم دلی، خیرات وغیرہ کے تحت انہوں نے متعلقہ مذاہب کی مقدس کتابوں سے اخلاق اور اعلیٰ اقدار سے متعلق تعلیمات کو اخذ کیا تھا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی اجتماعی کوشش کی جائے تو نئی نسل کے نوجوانوں کو مذاہب کی ان تعلیمات سے آگاہ کیا جا سکتا ہے جو اتحاد پیدا کرتی ہیں اور اس وقت انسانوں کو انسانوں سے جدا کرنے والی طاقتوں کا مختلف مذاہب کی تعلیمات کی روشنی میں بہتر اور قابلِ قبول جواب دیا جا سکتا ہے۔

مفلسی بذاتِ خود سیکولر ہے اور ہر غریب شہری کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے لیکن اسے دور کرنے کے طریقے اور ذرائع مذہبی اور مخصوص طبقوں کو ذہن میں رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ ان طریقوں سے ایک مخصوص مذہب کی کچھ ذاتوں کے افراد کو ہی فائدہ پہنچا ہے۔ حال ہی میں اقتصادی اور سماجی اعتبار سے پسماندہ لوگوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا ہے۔ جو مصیبت زدہ افراد اس طبقاتی نظام میں فٹ نہیں بیٹھتے وہ نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی مفلسی دور نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے میری رائے ہے کہ

۱۔ مفلسی کو دور کرنے کے لیے ہر ہندوستانی کو ایک اکائی مانا جائے۔ اس لیے ملازمتوں میں کوئی تعصب نہ برتا جائے۔

۲۔ تمام بینکوں، مالی امداد دینے والے اداروں اور غیر سرکاری اداروں کو ہدایت دی جائے کہ پریشان حال لوگوں کو ملازمت اور قرض کی سہولتیں میسر کی جائیں اور اس کام پر مسلسل نظر رکھی جائے۔

۳۔ مالی امداد فراہم کرنے والے اداروں کو مخصوص مذہبی گروہ تک محدود کرنا قومی یکجہتی کے لیے مہلک ہے۔ سبھی کو بینکوں سے قرض کی سہولت میسر ہو اور انہیں "راجدھانیوں" کے چکر نہ کاٹنے پڑیں۔

۴۔ اگر حکومت کو "غریبی ہٹاؤ" بھرے گراموں میں سے مذہب کی شرط ہٹانے میں کوئی قباحت نظر آتی ہے تو پھر مذہب سے

سیاست کو الگ کرنے کی بات ہی لغو ہے۔

۵۔ ایسی صورت میں مناسب ہوگا کہ سالانہ جائزہ لیا جائے۔ اگر کسی مخصوص ذات یا طبقے کو ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے کم جگہیں ملی ہیں تو اس کمی کو فوری طور پر پورا کیا جائے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک ان کا تناسب درست نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔

قومی یک جہتی سے متعلق واقعات کو تاریخ کی کتابوں سے نکال کر یکجا کرنا چاہیے۔ اسکول لیول کی تاریخ کی کتابوں کی اڈیٹنگ مشہور اور سیکولر ذہن رکھنے والے مورخین سے کروانی چاہیے۔ اور ان کتابوں میں قومی یک جہتی پر زور دینا چاہیے۔ ہندوستان کی تاریخ حکمرانوں کی جنگی کارروائیوں سے بھری ہے۔ رعایا کی حالت اور حکمرانوں کا ان کے ساتھ سلوک کیسا تھا اس پر کم ہی لکھا گیا ہے۔ واقعات کو قلم بند کرنے کی اس تبدیلی سے شاید بہتر نتائج نکل سکیں۔

یونیورسٹیوں میں قومی یک جہتی کیمپ لگنے چاہییں جن میں مختلف فرقوں کے طلبا کو دوسری درس گاہوں سے مدعو کرنا چاہیے۔ اس میل جول سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس مقصد کے حصول میں نیشنل سروس کور اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج لینے کے فوراً بعد میں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک مراسلہ بھیجا تھا۔ اس خط میں میں نے ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تھی کہ اگر ان دو بڑی یونیورسٹیوں کے دانش ور قریب آئیں تو انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی اور یہ خیر سگالی ملک کو اور آگے لے جانے میں مدد کرے گی۔ اس کام کو دیگر یونیورسٹیوں میں بھی کرنا چاہیے۔ اس وقت ملک کے حالات بہت الجھے ہوئے ہیں جنہیں صرف سیاست داں اور مذہبی رہنما نہیں سلجھا سکتے۔ اس لیے یونیورسٹیوں کے دانشوروں اور پیشہ ور ماہرین مثلاً انتظامیہ کے اعلیٰ افسران، صنعت کار، ڈاکٹر اور انجینیروں کو بھی اس میں حصہ لینا چاہیے۔ ان میٹنگوں میں مختلف فرقوں، لسانی طبقوں اور علاقوں کے افراد مل کر ملک کے مشترکہ مسائل کا حل تلاش کریں اور اس کے نفا... میں مدد دیں۔ ایسے لوگ ان لوگوں سے بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں جو "جزیرت" میں پھنسے ہوئے ہیں اور جنہوں نے کبھی دوسروں کے ساتھ ... کبھی کام نہیں کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میرے خیال میں ہندوستان کا سب سے بڑا سیکولر ادارہ ہے جس میں یونیورسٹی کے قیام کے وقت سے غیر مسلم طلباء کا تناسب ۳۰ فیصد سے زیادہ رہا ہے۔ بانی درسگاہ سر سید احمد خاں نے ہندو اور مسلمانوں کو دلہن (ہندوستان) کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی تھی۔ اسی طرح تدریسی عملے میں غیر مسلموں کی تعداد ہمیشہ سے ہی کافی رہی ہے۔ بہت سے ہوسٹلوں کے نام بھی غیر مسلم پروفیسروں یا سیاست دانوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہمیشہ تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے جو صداقت سے ہٹا ہوا ہے۔ پریس ان غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جو یہاں کبھی کبھار ہو جاتی ہیں اگرچہ کہ ایسی ہی غلطیاں دوسری جگہ پر بھی ہوتی ہیں۔ طلباء کو موجودہ سرکاری نظام پر اعتماد نہیں ہے۔ ان کی تجربات پر مبنی زیادہ تر شکایات انتظامیہ کے ان سرکاری افسران سے ہیں جو فرقہ پرست ذہنیت رکھتے ہیں اور جن سے بھی طلباء کے احساسات کو ٹھیس پہنچی ہے یا پہنچتی رہتی ہے۔ پی۔ اے۔ سی سے تو بے حد شاکی ہیں۔ کیوں کہ پی۔ اے۔ سی فرقہ پرستی کی وجہ سے کافی بدنام ہو گئی ہے جیسا کہ فسادات سے متعلق بہت سی کمیٹیوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ نئی نسل کو محرومی اور نفرت کے احساس سے دور کیا جائے۔ سرکار اور حکمراں گروپ کو یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ معاشرے میں سب سے زیادہ خطرناک ... ہوتا ہے جسے کچھ کھونے کا غم نہ ہو۔

قومی یک جہتی کونسل بنانے کا خیال سب سے پہلے ۱۹۶۲ میں گورنروں کی کانفرنس میں ظاہر کیا گیا تھا، لیکن چینی حملے کے بعد یہ تصور کر لیا گیا کہ اب پوری قوم متحد ہو گئی ہے۔ شاید اس وجہ سے قومی یک جہتی کونسل ایک سوتا ہوا ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ فائر بریگیڈ کی طرح فسادات کے بعد ہی اس کی میٹنگ ہوتی ہے۔ پچھلے سال دو...

سادات کے بعد نہ تو مالی امداد ہی فراہم کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی بحالی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ مجرموں کو تو سزا ملنے کا تو سوال ہی نہیں ہے، سزا اُن بے گناہوں کو ملتی ہے جو اپنے گھروں کو حملہ آوروں سے بچانے کی سعی گرفتار ہوتے ہیں۔ شہر میں باہر سے آئے ہوئے افراد پر مشتمل لوٹ آتش زنی کرنے والی جماعت کو سزا دینے کا کبھی کوئی سوال نہیں اُٹھتا۔ س کی وجہ شاید یہ ہے کہ خفیہ پولس کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ لوگ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ فساد کی ذمہ داری صرف اقلیتوں پر رہی ہے جب کہ سبھی کمیشنوں کی رپورٹوں سے یہ ظاہر ہے کہ ذمہ داری رف اقلیتوں کی ہی نہیں ہے۔ اس لیے میری رائے میں:

۱۔ پولیس اور خفیہ پولیس دونوں میں سبھی فرقے کے لوگوں کو بھرتی کرنا چاہیے۔ برطانیہ کے نسلی فسادات کے بعد جناب اٹل بہاری باجپئی نے یہ کہا تھا کہ برطانیہ کی پولیس میں رنگ دار لوگوں کا تناسب بڑھایا جانا چاہیے جس سے اقلیتوں میں اعتماد بحال کیا جاسکے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس مشورے کو ہندوستان میں نافذ نہ کیا جاسکے۔

۲۔ اگر مخصوص حالات میں کوئی مرکزی سرکار صوبائی حکومتوں کے نام ایک خاص کمیونٹی کے افراد کو چند خاص ملازمتوں میں نہ بھرتی کیے جانے کا خفیہ سرکلر جاری کرنے کو جائز سمجھ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے مخصوص حالات میں ہماری مرکزی حکومت "دیکھو! ذہن نشین کرلو!! اور تلف کردو!!!" جیسے ایک سرکلر کے ذریعے مسلمانوں کو پولیس میں مناسب تعداد میں بھرتی کرنے کی ہدایت نہ جاری کرسکے۔ اس کے لیے دستور کی دفعات میں یا قانون کی کتابوں میں ترمیمات کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ امر لوگوں میں اعتماد بحال کرنے جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں نیز امن و امان اور ملک کی ارتقا میں مددگار ہوسکتا ہے۔

۳۔ قومی یک جہتی کونسل کی سفارشات پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جائے۔ اعلیٰ افسران پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو وقتاً فوقتاً عمل درآمد کا جائزہ لیتی رہے۔ یہ کمیٹی وزیراعظم کی نگرانی میں اپنا کام کرے۔ اگر ایسا ہو گیا تبھی مزید انحطاط کو روکا جاسکے گا۔ اس وقت بھی قومی یک جہتی کونسل میں سرکاری عہدہ داران کو چھوڑ کر ستر میں سے صرف پانچ اقلیتی فرقوں کے نمائندے ہیں۔ اقلیتی فرقوں کے دانش وروں، وائس چانسلروں، مورخین اور سائنسٹ حضرات کو بھی قومی یک جہتی کونسل میں بحیثیت ممبر شامل کرنا چاہیے تاکہ کمزور طبقوں کے حقوق کی حفاظت کی جاسکے۔ فرقہ وارانہ فسادات ملک کے لیے ایک بدنما داغ ہیں۔ میں نے تقریباً پچیس بیرونی ملکوں کا سفر کیا ہے اور ہر جگہ سب سے پہلے یہی سوال پوچھا گیا کہ ہندوستان میں فسادات کی کیا حالت ہے؟ کیا اقلیتیں محفوظ ہیں؟

صوبائی حکومتیں فسادات کو روکنے میں ناکام رہی ہیں۔ دوسری وجوہات کے علاوہ شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان فسادات کے پیچھے مقامی سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ مقامی پولیس ان کے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کرتی ہے اور اس طرح انسانیت سوز جرائم کرنے والے سزا سے محفوظ رہتے ہیں۔

فسادات کو ملک دشمنی سے تعبیر کرنا چاہیے اور اس لیے امن و امان کی بحالی کو دستور کی متوازی فہرست میں شامل کرنا چاہیے۔ جانچ مرکزی پولیس کے ذریعے کرائی جائے لیکن شرط یہی ہے کہ مرکزی پولیس میں بھی سبھی فرقے کے نمائندے ہوں اور وہ تمایل سے مبرّا ہوں۔ پولیس میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی میں تاخیر اب ملک کے مفاد میں نہ ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سکھوں کی طرح دوسری اقلیتوں میں بھی انتہا پسند گروپس پیدا ہوجائیں۔

بیمہ کی ایک ایسی اسکیم جاری کی جائے جس کے تحت فساد میں متاثر لوگوں کو معاوضہ کی شکل میں مکان اور روزی کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ صوبائی حکومتوں کو بھی اپنے بجٹ سے ایک چھوٹی رقم نکال کر اس کام میں صرف کرنا چاہیے۔ ریل، بحری و بری سفر میں حادثوں کے شکار لوگوں کو جب بڑی بڑی رقومات معاوضے کی شکل میں مل سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ فساد سے متاثر لوگوں کو معاوضہ دینے میں کوئی قباحت ہو۔ انہیں ان کی حالت پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ زندگی بھر بدحال رہیں گے اور نفرت کا جوالامکھی ان

کے دلوں میں پھوٹتا رہے گا جو معاشرے کی صحت کے لیے مضر ہے۔ ڈی
ایم کو سوگوار خاندانوں کے پاس جاکر نجی طور پر اظہار ہمدردی کرنا چاہیے
اور انہیں یقین دلانا چاہیے کہ سرکار کو ان کے فلاح و بہبود کا خیال ہے
وہ اکیلے نہیں ہیں۔ مقامی ریڈیو سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ لوگ افواہوں پر
یقین نہ کریں۔ حقیقت ان کو بتائی جائے اور انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ
انتظامیہ ان کے جان و مال کی حفاظت کے لیے کیا کر رہا ہے۔

فایر برگیڈ کی طرح مسایل کو حل کرنے کا طریقہ زیادہ مفید
نہیں ہے۔ مسلسل کوشش کرنی چاہیے کہ معاشرے کے ناپسندیدہ افراد
جو لوگوں کے دلوں میں اپنے ناپاک مقاصد پورے کرنے کے لیے خوف و
ہراس پھیلاتے ہیں، نفرت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوں کیونکہ
ایسی صورت میں معمولی سا واقعہ بھی ایک بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جاتا
ہے۔ لاؤڈ اسپیکروں کے استعمال پر پابندی لگانی چاہیے اور
رات کو دس بجے کے بعد کسی صورت میں بھی ان کو استعمال نہ کرنے
دیا جائے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک
ہندو طالب علم نے اپنی درخواست میں لکھا کہ وہ تمام رات مندر میں ہونے
والے کیرتن کے گانوں کی وجہ سے تیاری نہ کر سکا اور اس وجہ سے امتحان
کو ملتوی کرانے یا دوران امتحان ہوسٹل میں رہنے کی اجازت چاہی۔

ہر شخص واقف ہے کہ پنڈت نہرو دیوناگری رسم الخط میں لکھی
ہوئی ہندوستانی کو قومی زبان بنانے کے حق میں تھے۔ کانسٹی ٹیوینٹ
اسمبلی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا
جائے تب بھی دستور کی دفعہ ۳۵۱ میں یہ صاف لکھا تھا کہ ہندی کو
ایک مخصوص طریقے سے فروغ دیا جائے گا۔ نہ صرف ہندوستانی بلکہ
مختلف زبانوں خصوصاً سنسکرت سے الفاظ اخذ کیے جائیں گے۔
جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹ، سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش نے
اپنی کتاب "اے نیشن ودھ آوٹ اے نیشنل لینگویج" — A Nation
Without a National Language) میں اس مسئلے کو قانونی زاویے
سے بھی دیکھا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دفعہ ۳۵۱ کا نفاذ
سرکار نے صحیح ڈھنگ سے نہیں کیا ہے۔ علاقائی ہندی کو سرکار
نے قومی زبان کی شکل میں تمام ہندوستانیوں کے سر تھوپا ہے۔

• آزادی کے چالیس سال بعد بھی حالت یہ ہے کہ ہندی کے نام
پر آج دو زبانیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔

ا۔ ایک وہ زبان ہے جسے سرکاری ہندی کہا جا سکتا ہے
اور جس کے بارے میں تقریباً ہر وزیر اعظم نے اور
پرانی نسل کے بزرگوں نے کہا ہے کہ وہ اس زبان
کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ب۔ دوسری زبان لوک ہندی ہے جسے ہندوستان
کے لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے
ہیں۔ فلمیں، ڈرامے، گانے، ٹی وی پروگرام سبھی
لوک ہندی میں ہوتے ہیں۔ یہ وہی زبان ہے
جسے دفعہ ۳۵۱ کے تحت قومی زبان کا درجہ ملنا
چاہیے تھا اور جسے لوگ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔

زبانیں پنڈت اور حکومتیں نہیں بناتیں بلکہ زبانیں لوگوں کے
آپسی میل جول سے جنم پاتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ سرکار ہر اس
ہندی کو جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے سرکاری زبان کا
درجہ دے دے کیوں کہ تمام پروگراموں کے سرٹیفکیٹس میں زبان
کے خانے میں ہندی لکھا جاتا ہے۔

یہ تبدیلی کچھ صدیوں پہلے کی تاریخ دہرانے کے مصداق ہو گی
جب ہندو حضرات نے برج بھاشا/کھڑی بولی کو فارسی کے رسم الخط
میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان
فارسی تھی۔ برٹش افسران نے سمجھنے کے لیے رومن رسم الخط کا استعمال
کیا تھا۔ یہی موجودہ دور میں بھی ہو سکتا ہے چونکہ اس زبان کو
ہندو اور مسلمانوں نے مل کر بنایا ہے۔ لہذا یہ تبدیلی شاید خوشگوار
ہو اور آپس کے تعلقات کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو۔

سبھی ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ پرائمری تعلیم
بچے کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اگر سہ لسانی طریقہ تعلیم کا
انتظام صوبائی حکومتیں حسب ذیل طریقے سے کریں تو انہیں زبردست
مقبولیت حاصل ہو۔

ا۔ ہندی بولے جانے والے صوبوں میں جہاں ہندی نہ

بولنے والے بھی رہتے ہیں ان کی مادری زبان
میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ ہندی جو صوبائی اور مرکزی سرکار کی زبان ہو،
اس کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔

۳۔ انگریزی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

کچھ تنگ نظر لوگوں کی پالیسی کی وجہ سے سرکار نے اس
سہ لسانی طریقہ تعلیم کو نافذ نہ کر کے غلطی کی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں
میں اپنائیت، خیرسگالی اور اعتماد پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اب بھی
وقت ہے کہ اس غلطی کا ازالہ کر لیا جائے اور اس ماحول کو
جو نفرت، شبہ، شکایت اور عدم اعتماد سے پُر ہے خوشگوار
ماحول میں تبدیل کر لیا جائے۔

یہ طریقہ مقبولیت حاصل کرنے کے دیگر ذرائع سے
بہتر ہے۔ کیوں کہ اور طریقوں میں پائیداری نہیں ہے۔ ہندی
نہ بولے جانے والے صوبوں میں لسانی بنیادوں پر مبنی اقلیتوں
کو چار زبانیں سیکھنے کے علاوہ
کوئی اور چارہ
نہ ہوگا۔

حضرت شیخ سعدیؒ بیان فرماتے ہیں کہ بچپن میں مجھے عبادت کا بہت
شوق تھا۔ میں اپنے والد محترم کے ساتھ ساری ساری رات جاگ کر قرآن
مجید کی تلاوت اور نماز میں مشغول رہتا تھا۔ ایک رات والد محترم
اور میں حسب معمول عبادت میں مشغول تھے اور ہمارے قریب ہی
کچھ لوگ فرش پر پڑے غافل سو رہے تھے۔ میں نے ان کی یہ حالت
دیکھی تو اپنے والد صاحب سے کہا کہ

"ان لوگوں کی حالت پر افسوس ہے! ان سے اتنا بھی نہ
ہو سکا کہ اٹھ کر تہجد کے نفلیں ہی ادا کر لیتے۔"

والد محترم نے میری بات سنی تو فرمایا:

"بیٹا دوسروں کو کم درجہ خیال کرنے اور ان کی
برائی کرنے سے بہتر تو یہ تھا کہ تو بھی پڑ کر
سو جاتا۔"

مخلص اور کامیاب کارکنوں کا طریقِ کار

۔ سیّد حامد

حال ہی میں علی گڑھ کے ایک فعّال اور ایثار پیشہ فرزند سیّد محمد شفیق نے، جو کریمیہ ٹرسٹ کے تحت بہت سے تعلیمی اداروں کو جمشید پور (بہار) میں حسنِ انتظام کے ساتھ چلا رہے ہیں، بہار کے مسلم تعلیمی اداروں کی ایک کانفرنس منعقد کی (۲۵ اور ۲۶ اپریل ۸۶ء) دوسرے دن ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے مندوبین سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں علمی اور اقتصادی اور اصلاحی میدانوں میں بڑا امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج کھولے اور بہت سے تعلیمی اداروں کی بنا ڈالی۔ امانت بینک قایم کیا۔ الامین سوسائٹی کے تحت صنعتیں کھولیں۔ ان کی تقریر کو حاضرین نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا کہ ان کے ہر لفظ کے پیچھے عمل اور تجربہ تھا۔ تقریر محاسن بیان سے آراستہ نہ ہونے کے باوجود مؤثر اور دلنشیں تھی۔

انہوں نے کہا کہ جب آپ کوئی تعمیری مہم لے کر اٹھیں گے تو پہلے آپ کے گرد بہت سے ایسے لوگ جمع ہوں گے جن کا مقصد ہے فائدہ اٹھانا انھیں پہچاننے اور جھٹک دینے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں آپ کو دقت بھی ہوگی اور وقت بھی لگے گا۔

ایک دوسرا گروہ ایسے اشخاص کا ہوگا جو آپ کے خلاف بولتے رہیں گے۔ وہ آپ پر اپنے آپ سے قیاس کریں گے۔ چوں کہ وہ ذاتی نفع کی طمع کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اس لیے جب وہ آپ کو کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ آپ بھی یہ سب کچھ ذاتی مفاد کے تحت کر رہے ہیں۔ آپ ان کی بدگمانیوں اور الزاموں کو نظر انداز کر دیں، ان کا کوئی جواب نہ دیں۔ اگر آپ جواب دیں گے تو آپ کا وہ وقت ضایع ہوگا جو آپ تعمیری کاموں میں صرف کرتے اور ان کو غیر ضروری اہمیت ملے گی۔ یہ لوگ آپ کے خلاف بولتے رہیں گے۔ بولتے بولتے تھک جائیں گے تو خاموش ہو جائیں گے۔

۳۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو دور سے آپ کے کام اور آپ کی اٹھان کو دیکھتے رہیں گے اور جب آپ کے طریق کار اور حسن نیت کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے تو آپ کے نزدیک آئیں گے اور آپ کی مہم میں آپ کے مضبوط مددگار ثابت ہوں گے۔

ڈاکٹر ممتاز نے یہ بھی کہا کہ آپ دشمن کو چاہے دوست بنالیے لیکن کبھی کسی بزدل کو دوست نہ بنلیے، وہ آپ کے حوصلے کو اندیشہ ہا۔ دور و دراز سے پست کر دے گا اور آپ کی رفتار کے آڑے آ۔ گا۔ یہ نکتہ بھی دراصل عملی زندگی میں اہم ہے کہ نو من تیل والی ذہنیت کو پاس نہ پھٹکنے دیا جائے۔

تیسری اہم بات ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے یہ کہی کہ پیسہ پیسہ کا حسا رکھنا چاہیے اور ہر سال اس کا آڈٹ ہونا چاہیے۔ حساب آئینہ کی طر رکھیے تاکہ آپ کو قوم کا اعتماد حاصل ہو۔

چ نھا نکتہ محنت کرتے رہنے اور انجام کو خدا پر چھوڑ دی سے متعلق تھا۔ یہ نہ سمجھیے کہ آپ خود کوئی کام انجام دے رہے ہیں جس وقت آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو کسی کام انجام دینے کا وسیلہ بنایا ہے، اس وقت سے آپ فکر اور تشو

اور بد دلی اور مایوسی سے محفوظ ہو جائیں گے۔ آپ نہ افسردہ ہوں گے نہ اترائیں گے۔

امانت بینک کا تذکرہ کرتے ہوئے کارآزمودہ مقرر نے کہا کہ امانت بینک کا آغاز ۱۹۷۷ء میں بہ مشکل تین لاکھ روپے سے کیا گیا تھا۔ اب ہر ماہ ۱۵ لاکھ بطور امانت اس میں آتے ہیں اور اب اس کا سرمایہ ۱۵ کروڑ روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ الامین کی انڈسٹریل فائننس کارپوریشن کی بنا بھی ڈال دی گئی۔

انہوں نے مشورہ دیا کہ چھوٹے چھوٹے چندے کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے کام کا تعارف ہوتا ہے اور عوام اس مہم سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ انہیں اطمینان ہو جائے تو وہ دل کھول کر اور پیٹ کاٹ کر حتیٰ کہ زیورات اور گھڑیاں تک اتار کر مدد کرتے ہیں۔

ملت کے محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے یہ بات اہم ہے کہ تعلیمی اور تربیتی ادارے ضرورت کی تشفی کے لیے کھولے جائیں انا کی تشفی کے لیے نہیں۔

منزل مقصود تک پہنچنے کے بعد راہی یا رہبر کا اس میں بیٹھنا ناروا ہوگا۔ ایک مقصد پورا ہوگیا اب اسے ذرہ دار ہاتھوں میں دے کر دوسرے مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ منزل کو مسافر خانہ سمجھیے اور جلد اسے چھوڑ کر آگے کی راہ لیجیے۔

قارئین کرام ایک ممتاز خادم خلق اور ایک فعال ادارہ ساز اور ایک مخلص تعلیمی اور اقتصادی رہنما کے مذکورہ بالا اقوال پر غور فرمائیں گے تو عمل اور خدمت کے لیے تحریک ہوگی اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق۔

ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔

——— عبدالسلام

اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ــــ رشید احمد صدیقی

آل احمد سرور

برنارڈ شا نے کہا ہے کہ "بات کا بھرپور ہونا ہی اسٹائل کی ابتدا اور انتہا ہے"۔ جس طرح رزم کا انداز اور ہے بزم کا اور اُسی طرح نثر اور نظم کے اسلوب جُدا جدا ہیں۔ نظم میں الفاظ آتش گیر مادے کی طرح بھک سے اُڑ جانے والے ہیں یا اس سیلاب کی طرح جو سب کچھ بہا لے جائے۔ نثر میں بجلی کے اس بٹن کی طرح جو فوراً روشنی کر دے۔ نظم عشق کی ایک جست ہے جو قصہ تمام کر دیتی ہے۔ نثر اس منظم فوج کی طرح ہے جو باقاعدہ مارچ کرتی ہے۔ ترتیب سے صفیں قایم رکھتی ہے اور دستور کے مطابق لڑتی یا پسپا ہوتی ہے۔ نظم ہمالیہ کی بلندی ہے جس کی کشش اور عظمت مسلم لیکن جس پر ہم آپ لو کیا تین سنگھ اور ہلیری بھی زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے۔ نثر اس وادی کی طرح ہے جس میں رہنا بسنا، خواب دیکھنا اور حقایق کی چکی میں پسنا غرض زندگی کا سارا بیوپار ہوتا ہے۔ نظم تخلیقی اظہار ہے۔ نثر تعمیری اظہار ہے۔

اچھا نثر نگار وہ نہیں ہے جو اپنی سحر بیانی یا خطابت کے جھنڈے گاڑ دے، یا الفاظ سے زیادہ اوقاف سے کام لے۔ اچھی نثر کے معنی آئینے کی طرح روشن اور بھرپور بات کے ہیں۔ اچھے شعر کی طرح اچھی نثر بھی خونِ جگر سے لکھی جاتی ہے یعنی اس کے لیے خلوص اور ریاض دونوں ضروری ہیں۔ شخصیت کی آب و تاب نظم و نثر میں مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے ایک میں یہ شعلے کی لپک اور لہو کی دھار ہے۔ دوسرے میں کسی حسینہ کا وہ دلنواز تبسم جو آئینۂ رخسار کو جلا عطا کرتا ہے، اردو میں نثر کے حسن کو پہچاننے اور برتنے والے نظم کے مقابلے میں کم ہیں۔ ہماری نثر کے بانی سرسیدؔ، حالیؔ اور شبلیؔ ہیں۔ انہیں کے چراغوں سے موجودہ دور کے نثر نگاروں نے اپنی شمع روشن کی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں علیحدہ علیحدہ بہت سے اسالیب فکر و فن کی کارفرمائی ملے گی مگر مجموعی طور پر وہ اپنا ایک خاص طرز رکھتے ہیں۔ شخصیت مختلف اثرات و محرکات کا مجموعہ ہوتی ہے مگر اس میں ایک انوکھا پن اور انفرادیت ضرور ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی نسل اچھی خاصی رومانی نسل تھی۔ اس نے ادب اور سیاست کو بہت سے خواب دیے اس کے زمانے میں بقول سجاد انصاری "پیر دفا کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہو رہا تھا"۔ سرسید کے ادارے پر شبلی کا اثر ہو چلا تھا۔ غالب کی عظمت دریافت ہو چکی تھی۔ آسکر وائلڈ اور چسٹر ٹن کی مقبولیت ہندوستان پہنچ گئی تھی۔ رشید صاحب کی طالب علمی کا علی گڑھ، سیاست میں نیازمند اور ادب میں خاصا دلیر تھا۔ اس تضاد نے اور طالب علمی میں ہی زندگی کے تقاضے خاصے تجربوں نے ان میں وہ نظر پیدا کی جو خوابوں کی خامی، حقایق کی سخت جانی اور جذبات و خیالات کے سیلاب میں کیچڑ دیکھ لیتی ہے۔ ان کی مشرقیت کی بنیاد خاصی مضبوط تھی۔ مغربی خیالات کا طوفان ان کی زندگی کو نہ بدل سکا۔ ہاں انہیں اس طوفان پر ہنسنا اسی مشرقیت نے سکھایا۔ وہ غالب کی رعنائی خیال کے دلدادہ ہو گئے مگر مسلک انہیں اکبر ہی کا عزیز رہا۔ اردو اور فارسی ادب کے گہرے مطالعے نے انہیں افسردا سیما کے ڈھنگ سکھائے۔ اپنے ادارے کی محبت نے انہیں ایک مرکز اور محور بنا دیا۔ انسان دوستی، شرافت اور مقبولیت کی مروجہ قدروں کے سہارے انہوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اردو نثر کو ایک اکبر کی منتظر تھی۔ رشید احمد صدیقی نے یہ کمی پوری کر دی۔

اب تک ان کی متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ طنزیات و مضحکات اردو میں اس رنگ کا ایک جائزہ ہے۔ جائزہ نہ محققانہ ہے نہ مکمل۔ مگر اس میں نکتہ سنجی بھی ہے اور شوخی بھی۔ ان کی بلاغت کی وجہ سے یہاں بھی دریا کوزے میں بند ہو گیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے مضامین رشید اور خنداں کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔ "گنج ہائے گرانمایہ" ان محبوب شخصیتوں کا مرقع ہے جو اب مرحوم ہیں۔ اس میں اقبال، اصغر، سجاد حیدر، شاہ سلیمان، احسن مارہروی جیسی ادبی شخصیتیں بھی ہیں اور سلیمان، مولانا ابوبکر، ایوب اور نصیر الدین علی جیسے اشخاص بھی جن کے دل آویز نقش رشید صاحب کی بدولت محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی کتابیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ذاکر صاحب۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی پرسوز تابناک اور دلکش شخصیت کا تاثر ہے۔ دوسری شیخ نیازی جو یوں تو ایک بچے کی کہانی ہے اور بچوں کے لیے ہے مگر جس میں روزمرہ زندگی کے اتار چڑھاؤ، بچوں کی نفسیات، والدین کے رکھ رکھاؤ کی بڑی شوخ و شنگ تصویر ہے۔ شیخ نیازی اس انسان کی علامت ہے جس سے دوسرے انسان بیزار ہیں مگر جس کی چنگاری سے خدا مایوس نہیں ہے۔

رشید صاحب اردو کے ممتاز مضمون نگاروں میں سے ہیں۔ مضمون صحیح معنی میں من کی موج اور شخصیت کی آزاد رو ہے۔ یہاں نظام سے زیادہ نظر کی اہمیت ہے۔ رشید صاحب کی بے ربطی ہندوستانی تہذیب کے جلوہ صد رنگ کی طرح ہے، دونوں میں ایک اندرونی وحدت ہے جو جلووں کی کثرت میں سطحی نظر رکھنے والے کو نہیں سوجھتی۔ ان کے بہکنے میں ایک رمز اور ان کے تشابہے میں ایک منطق ہے۔ ان کی مزاح نگاری، مہذب انسان کی وہ نکتہ چینی ہے جو ہر قصر میں روزن دیکھ لیتی ہے۔ خواہ وہ رومانیت کا رنگ محل ہو یا جذباتیت کا جادو۔ اقبال کی طرح وہ قدیم اور جدید دونوں سے متاثر ہوئے ہیں اور اقبال ہی کی طرح وہ قدیم کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ ان کے اس نظریے سے کیسے اختلاف ہو گا کہ کوئی نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون لطیفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں؟ مگر یہاں معقول اور شریف بڑے پرفریب لفظ ہیں۔ رشید صاحب کے نزدیک ان کے معنی متعین ہوں۔ زندگی میں ان کی تعبیریں بدل جایا کرتی ہیں۔ رشید صاحب کو اصولوں سے زیادہ اشخاص سے، اداروں سے زیادہ افراد سے، نئے حسن کی دریافت کے مقابلے میں مانوس اور جانے پہچانے حسن سے۔ یہی ان کی طاقت اور یہی ان کی کمزوری ہے۔ اسی نے ان میں انفرادیت اور بانکپن پیدا کیا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ جدید دور کے درد و داغ اور سوز و ساز" سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہونے پائے۔ وہ اس بزرگ کی طرح ہیں جو بچوں کے گھروندوں کو دلچسپی اور ہمدردی سے مگر ذرا دور سے دیکھتا ہے حالاں کہ کسی خلیل کی طرح بے دھڑک کود پڑنے سے آتش نمرود آج بھی گلزار ہو سکتی ہے۔

رشید صاحب کا ذہن انیسویں صدی کی ساری عظمتیں رکھتا ہے اس کی انسان دوستی۔ اس کا اعتدال، اس کی وضع داری، اس کی وفاداری، اس کی پختگی، اس کا استقلال، یہ نہ مدح ہے نہ قدح ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

رشید صاحب کو لکھنا کسی نے نہیں سکھایا۔ ہنس کو تیرنا کون سکھاتا ہے ہاں انہیں غالب، اکبر اور شبلی سے سہارا ملا اور جیرٹن، آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا سے رموز فن۔ ان کے یہاں بڑی پختگی، رچاؤ اور نکھار ہے۔ اس کے پیچھے اردو فارسی شعر و ادب کی صالح روایات کا بھرپور احساس ہے اور اس میں کتنی ہی کلاسیکل آوازوں کی گونج بھی۔ ان کا تخیل عجیب و غریب چیزوں میں ربط ڈھونڈھ لیتا ہے اور ایک چابک دست کمہار کی طرح مٹی کے معمولی مسالے سے حسن و عشق کی پتلیاں بنا لیتا ہے۔ "ندی اور عورت دونوں کا ایک ہی بیوہار ہے۔ دونوں طاقت اور رفاقت پسند کرتی ہیں"۔ "پولیس اور یونیورسٹی دونوں تحقیقات پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک سزا دلواتی ہے، دوسری سند دیتی ہے"۔ "کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا تھا" ان جملوں میں قول محال PARADOX نے بڑی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی تشبیہات بڑی خیال انگیز ہوتی ہیں۔ ان کی حیثیت ایک پھل جھڑی کی سی ہے۔ "شیخ ہیرو کا قد ایک ببول کے تنے کی مانند ہے"۔ "صدر کرسئ صدارت پر اس طرح رونق افروز ہیں جیسے ڈیوٹ پر پیمانو"۔ "شراب کی بوتل اس طرح جیب سے باہر نکلے جیسے دلھن حجلۂ عروسی

ہ باہر نکلے یا بہادر کی تلوار نیام سے باہر آئے یا شباب کا خواب طلسم ہوجائے" یورپ سے کالا کاجل سا بادل اُٹھا، گھٹتا، جھومتا، پھنکارتا، بل کھاتا ہوا یسے انگریزوں کا ڈایڈ نا ٹ کہیں پیام صلح لیے جا رہا ہو یا کسی چارن پر جوانی مار رہی ہو۔" "محمد علی کی تحریر و تقریر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔" کس بلا کے ولنے والے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابو الہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ٹپ خانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں، یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔" مارواڑی عورتوں کے متعلق ان کا یہ تبصرہ کہ یہ گھونگھٹ، گندگی اور گہنے کا مجموعہ ہیں۔" ان کی ایک اور خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ہم آواز الفاظ سے بڑا کام لیتے ہیں اور اُن کی نثر میں ترصیع بہت نمایاں ہے۔

ان کی تحریروں میں بلاغت کے ساتھ ساتھ ندرتِ تخیل کی بڑی دلکش چاندنی ملتی ہے۔ شیطان کی آدم کے متعلق رائے ہے۔ اخی ادم میرے بڑے بھائی تھے لیکن نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل، ذرا یہ کرشمہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ نہ بندوق اپنی نہ نشانہ اپنا۔ نہ ارادہ اپنا نہ مقصد اپنا صرف اپنے کندھے پر رکھ کر چھوڑ دالی۔ یہ نہ سمجھے کہ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب جو کہتا ہوں کہ میاں یہ کیا کیا تو کہتے ہیں کہ ہم خلاصۂ کائنات ہیں۔"

اسی مضمون میں لکھتے ہیں "آدم نے قوائے الہیہ کو مضمحل کر دیا تھا۔ انکار ابلیس نے اسے شگفتہ بنا دیا۔ انکار ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا۔" ایک موٹر کے متعلق گہر افشانی ملاحظہ ہو۔" رکی رہتی تو معلوم ہوتا کوئی سنیاسی حبس دم کیے ہوئے ہے چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا جاپان میں زلزلہ آ رہا ہے چلتی تو پھر

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

رشید صاحب نے ہماری سماجی زندگی کی بڑی روشن تصویریں پیش کی ہیں تھرڈ کلاس کی کھڑکی ہمارے عوام کی تصویر ہے "سر پر گٹھری اور بغل میں بستر ہے۔ کاندھا انگنی کا کام دے رہا ہے۔ انگلی بچے کے ہاتھ میں ہے۔ تسلو کے بندھے ہوی بندھی ہوئی ہے۔ کوئی ہانپ رہا ہے، کوئی کانپ رہا ہے، عورتیں کوس رہی ہیں مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں، بچے بلبلا رہے ہیں"

اخبار نویس کے لیے دستور العمل ملاحظہ ہو۔

اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہیے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے۔ اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا رہے۔ اخبار نویسی اس طرح شروع کرنی چاہیے جیسے دین خطرے میں ہے۔ قوم فنا ہو رہی ہے، حکومت ناشدنی اور گردن زدنی ہے لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا اور بنک میں حساب کھول دیا۔ ان کے نزدیک عورتوں کی تین قسمیں ہیں، بعض تو ایسی ہیں جنہوں نے سورج اور آسمان کبھی نہیں دیکھے ہیں گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، بچّے پالتی ہیں اور چکّی پیستی ہیں یہاں تک کہ دیوار کی چکّی خود انہیں پیس ڈالتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جو بہت پان کھاتی ہیں، چھالیا کترتی ہیں، شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں، لیکن اب ایک قسم اور پیدا ہو گئی ہے۔ یہ انگریزی بولتی ہیں، ساڑی پہنتی ہیں اور سینما دیکھتی ہیں، شوہر اُن کی خدمت کرتے ہیں اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔ نظام تعلیم پر تبصرہ دلچسپ ہی نہیں غور طلب بھی ہے۔" یہاں پر ہر ایک کو ایک ہی قسم کا منتر پڑھاتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں۔ ایک قسم کا راتب دیتے ہیں، ایک ہی قسم کا کام لیتے ہیں۔ شکار پر گزران کرنے والوں کو مردار کھلاتے ہیں کھیت جوتنے والے کو گورکنی سے واقف کراتے ہیں، ہرن پر گھاس لاد دیتے ہیں۔ نقش نگینے کا کام کرنے والے سے مگدر ہلواتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے کو یورپ کا خواب دکھاتے ہیں۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور ایک راستے پر چلاتے ہیں۔"

رشید صاحب نے ہمیں کئی کردار دیے ہیں۔ مُرشد، حاجی بغلول، ماتا بدل، مجرد، انہیں ہندوستانی دیہات اور قصبوں کے حسن اور بدصورتی دونوں کی ہمدردی سے تصویر کھینچنی آتی ہے۔ وہ مکالمے کی کھنک اور اس کے لوچ کو تحریر میں منتقل کر سکتے ہیں۔ وہ اشعار میں تصرف کر کے یا ان کی طرف اشارہ کر کے حسن آفرینی اور اختصار دونوں کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری معلومات میں اضافے کے ٹھیکیدار نہیں۔ ہمارے تاثرات میں تنوع، تناسب اور صحت مندی پیدا کرنے کے دعوے دار ہیں۔ ان کی مزاح نگاری، مرقع نگاری اور تنقید تینوں میں وزن و وقار ان کی انشا پردازی سے آیا۔

جَوابِ دُوسْت

مغرب کی وادیاں

نسیم انصاری

بہر حال۔ میں پھر بہکنے لگا۔ بتا یہ رہا تھا کہ پرائمری ایف۔آر۔سی ایف کے امتحان میں کامیابی کے بعد لوگوں نے مجھے ڈاکٹر کے بجائے مسٹر کہنا شروع کر دیا۔ ہندوستان واپس آکر بھی بہت دنوں تک میرے پیڈ پر نام کے آگے مسٹر ہی لکھا جاتا رہا۔ اب تو صرف نسیم انصاری رہ گیا ہے۔

میں نے سات برس تک انگلستان کے مختلف اسپتالوں میں سرجری کی تربیت حاصل کی اور جنرل سرجری کے ہر گلی کوچے سے واقفیت ہو گئی اور لطف یہ ہے کہ جب اتنی طویل تربیت کے بعد ایف۔آر۔سی۔ایس کا ڈپلوما ملا تو مجھ سے کہا گیا کہ سند اس بات کی دی جا رہی ہے کہ اب آپ سرجری سیکھ سکتے ہیں اور واقعہ بھی یہی تھا۔ میری تعلیم بدستور جاری ہے کہ

"یہ وہ رستہ نہیں جس میں کہیں منزل ہو جائے۔"

انگلستان کے دوران قیام میں دو باتیں ایسی ہوئیں کہ جن کا ذکر کیے بغیر یہ حکایت پوری نہیں ہو سکتی۔

پہلی اہم بات تو سوویت یونین والوں کا خلا میں داخلہ تھا۔ اس کے بعد خلائی سفر کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو اب جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ امریکہ والے روسیوں سے پیچھے کیسے رہتے۔ انہوں نے بھی خلا میں آنا جانا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں میرے ایک دوست نے ازراہِ مذاق کہا کہ فضا میں روسی اور امریکی جہاز جو سگنل ایک دوسرے کو دیتے ہیں وہ جرمن زبان میں ہوتے ہیں کہ ان دونوں نے خلائی اقتدار ان جرمن سائنسدانوں کی مدد سے حاصل کیا جو لڑائی کے بعد ان دونوں کے ہاتھ لگے۔

بیسویں صدی سائنس کے لیے قیامت کی صدی ہے۔ انیسویں صدی تک تو یہ نیک، سلیقہ شعار لڑکی کی طرح گزر بسر کر رہی تھی، جتنی دریافتیں ہوئیں وہ سب یونان کے فلسفیانہ مفروضات کی تشریح کرتی تھیں۔ کائنات کا تصور ایک مشین کا سا تھا کہ جو قابلِ احترام قوانین کے ماتحت حرکت میں تھی۔ اس کی حرکت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی محرکِ اوّل ہے یا نہیں۔ لیکن کوانٹم نظریے کے بعد سے تو ایسا معلوم ہوا کہ پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہے اور اس کے بعد نظریۂ اضافیت نے تو کام ہی تمام کر دیا۔ طب اور سرجری کے میدان میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ ابھی چالیس برس تک ہم سب مطمئن تھے کہ لو اب سرجری ٹھیک سائنس کی بنیادوں پر آ گئی ہے۔ انسانی بدن کے افعال کیمیاوی زبان میں بیان کیے جانے لگے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی۔ اب معاملہ بائیو کیمسٹری سے بایو فزکس تک پہنچا ہے۔ ایکسرے اور ریکارڈیوگرام تک کی بایو فزکس بھی تسلیم۔ لیکن اب نیوکلیر میگنیٹک ریسونینس [illegible] اور الٹرا ساؤنڈ نے تو دنیا ہی بدل دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید سب ہی بنیادی مفروضے نظرِ ثانی کے محتاج ہو جائیں۔ محسوس تو یہ یورپ کے زمانۂ قیام ہی میں ہونے لگا تھا، لیکن ہندوستان واپس آکر تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی آندھی طوفان میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ بہر حال۔ اس طوفانی دھارے کا بھی ایک لطف ہے۔ کم از کم پانچ سو برس سے ساحل پر کھڑے سمندر کی موجوں سے منہ موڑنے کی جو عادت پڑ گئی تھی، اس سے تو طوفان کے تھپیڑے کھانا کہیں بہتر ہے۔

دوسری بہت اہم بات جو ان سات برسوں میں یعنی [illegible] سے [illegible] تک کی مدت میں ہوئی وہ سوویٹ اور چین کے تعلقات میں

۔جیسے آج جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد سرزمین کے ان حصوں میں ہوئے
ہر سرخ فوجوں کی پیش قدمی کرکے جرمن نازیوں کو شکست دی تھی
لڑائی کے بعد سب سمجھے کہ آزادی کا سرخ سویرا آگیا اور اب آزادی
ر اور بیان پر پابندی لگانے کی جرأت کوئی بھی نہیں کرے گا، لیکن پراگ
ن اور بوڈاپیسٹ کی سڑکوں پر ان کے یہ خواب چکنا چور ہو گئے۔ یورپ
ہ پچھلے چالیس برسوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ
سانی سماج کی گتھیاں کسی ایک فارمولے سے نہیں سلجھ سکتیں۔ معاملہ نہ
ف اقتصادی ہے اور نہ سیاسی، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں نئے نئے
الات اُٹھتے رہیں گے اور یہی ان کے جواب ہر زمانے میں تلاش کرنا ہوں۔
۔ کوئی فلسفہ یا کوئی مذہب ہر گتھی کو نہیں سلجھا سکتا۔

میں نے خود بار بار اپنے سے پوچھا ہے کہ آخر یہ ایسی کون سی بات تھی جو
اری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بس یہی جواب ملتا ہے کہ سرمایہ داری کا جو بھیانک
وپ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی پہلی چار پانچ دہائیوں میں
ارے سامنے آیا۔ اس نے یہ بات دل میں بٹھا دی تھی کہ ایسے نظام سے
بھوتہ تہذیب، تعلیم، مذہب اور شرافت کے ہر تقاضے کے خلاف ہے۔
ں لیے اس کے خاتمے کے واسطے سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ یہ آواز
ملک کے ہر کونے سے اٹھی اور سرمایہ داری کے خلاف ایک متحدہ محاذ بننے
ا۔ ہم نوجوانوں کے لیے اس تحریک میں ایسی کشش تھی کہ ماں، باپ، بھائی،
ن، دوست اور محبوب سب کی خوشیاں قربان کر دی گئیں۔

یہ تو نہیں ہوا کہ سرمایہ داری ختم ہو گئی ہو البتہ اس کا وہ روپ بدلا
ا جس نے ہم میں سے بہتوں کو آمادۂ پیکار کیا تھا اور پھر وہ متحدہ محاذ بھی
ہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا جو اس کے خلاف بنایا گیا تھا۔

کمیونسٹ تحریک کے اندرونی تضاد نمایاں ہوئے اور یہ پورا کمیونزم
کے ذریعے راستے کا پیچ و خم سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ مجھے تو یقین
ا ہے کہ عنقریب کمیونسٹ دنیا کے اندرونی نظام میں زبردست تبدیلیاں
ہونے والی ہیں۔ ریاست کا جبر اور عوام کی مجبوری شاید بہت دنوں تک
قائم نہ رہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ پاکستان میں کیا صورت ہے لیکن ہندوستان
میں تو ابھی تک یہ طرزِ فکر قابلِ تصور نہیں سمجھا جاتا۔ اگرچہ یہاں کی
کمیونسٹ پارٹیاں عملاً یہ تسلیم کرتی جا رہی ہیں کہ انقلاب کا ابھی کوئی پروگرام
نہیں بن سکتا، لیکن ان کی تحریروں کی زبان ابھی تک پرانی ہے۔

ہاں ایک نئی بات البتہ ہوئی ہے۔ پچھلے دس بارہ برسوں سے ایک
اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے جسے مذہبی بنیاد پرستی کہا جاتا ہے۔ میں نے
اپنے ایک واقف کار اور عالم کرم فرما سے پوچھا کہ (ان کا نام میں مصلحتاً نہیں
لکھ رہا ہوں کیوں کہ شاید ان کے مخالف اس بیان سے انہیں نقصان پہنچانے کی
کوشش کریں) آخر یہ فنڈامینٹلزم کا لفظ کہاں سے آیا۔ کہنے لگے کہ شاید
اسے سب سے پہلے اسمتھ نے اسلام کے سلسلے میں استعمال کیا تھا جس پر
میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ بھائی اسلام میں تو ہم چودہ سو برس سے اس کے
گنہگار نہیں ہیں لیکن شاید اس اصطلاح کو امریکن امپیریلزم کی پوری حمایت
حاصل ہے۔ کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کو بدنام کرنے کے لیے یہ اصطلاح
بہت کارآمد ہے۔"

مسلمانوں کے سلسلے میں میں اس اصطلاح کے قطعی خلاف ہوں بقول
میرے کرم فرما کے۔ پچھلے چودہ سو برسوں کی تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ اسلامی
معاشرے میں بنیاد پرستی کبھی مقبول نہیں ہوئی۔ علماء، مجتہدین اور شیوخ کی
ہر زمانے میں بہت عزت ہوتی رہی لیکن عام طرزِ معاشرت میں علماء کی پیروی
نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بات شیعہ مسلمانوں میں سب سے نمایاں ہے، وہ مجتہدین
کی بہت عزت کرتے ہیں، ان کی مجلسوں میں مودب بیٹھتے ہیں، لیکن زندگی
عموماً آزادانہ بسر ہوتی ہے۔ سنی مسلمانوں کے لیے تو ایک دروازہ اور بھی
کھلا ہے۔ وہ خانقاہوں اور درگاہوں میں جا کر اپنے کو مذہبی سخت گیریوں
سے بچاتے ہیں۔ یہ جو عام تصویر کھینچی جاتی ہے کہ اصلی مسلمان ٹخنوں سے
اونچا پائجامہ اور لمبا کرتا پہنے، داڑھی بڑھائے اور لبیں تراشے، لاحول و
لاقوۃ پڑھ پڑھ کر خشک اور بنجر گفتگو کرتا ہے۔ اس مسلمان کا ہمارے
معاشرے میں وجود نہیں کے برابر ہے۔ عام مسلمان اپنے ستار العیوب
اور غفور الرحیم معبود پر بھروسہ کر کے اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے
کا سلیقہ رکھتے ہیں اور پھر آزادئ فکر و تخیل کا جیسا اظہار اردو
اور فارسی شاعری میں ملتا ہے، اس کی مثال مسلمانوں کی زبان کے
علاوہ کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے مزاج میں
ایسی رنگینی ہو ان پر فنڈامینٹلزم کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔

یدگی تھی۔ یہ ایسی بڑھی کہ بہت دنوں تک ایک دوسرے کو انقلابی
ے کا غدار کہنے لگے تھے۔ اس خلیج کے پیدا ہونے سے دو تین برس پہلے
ے ایک انگریز دوست نے پیشن گوئی کر دی تھی کہ چین اور روس کے
قات خراب ہو جائیں گے۔ میں نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے
، ؟ جواب دیا کہ آج تک تاریخ میں دو بڑی سلطنتیں ہمسایہ ہوتے ہوئے
ست نہیں رہی ہیں۔ اس وقت یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ کیوں کہ
، وقت تک کمیونسٹ تحریک کے تضاد بہت حد تک نظروں سے اوجھل
ے اور اس عالمی تحریک کی طرف ویسا ہی رویہ تھا جیسا کسی مذہب کی
ف ہوتا ہے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے روس اور چین کے تعلقات خراب ہی
تے گئے۔ ان خراب تعلقات کا اثر کمیونسٹ تحریک پر ویسا ہی پڑا جیسا
مسلمانوں کی تہذیب پر پندرھویں صدی عیسوی میں اس وقت پڑا تھا
ب تیمور نے ترکی کے سلطان بایزید کی حکومت پر حملہ کر دیا تھا (۱۴۰۲ء)
بایزید بڑا اولوالعزم بادشاہ تھا۔ اس کے تحت مشرقی یورپ کا بہت
علاقہ آگیا تھا اور اس کی فوجیں ویانا کے دروازے پر کھڑی تھیں۔
ب ترکی میں یہ خبر آئی کہ تیمور حملے کی تیاریاں کر رہا ہے تو وہاں جشن منائے
ئے کہ ایک اور موذی کو زیر کرنے کا موقع ملے گا۔ ادھر تیمور کے یہاں بھی
ری تیاریاں ہو چکی تھیں۔ حملے سے ایک رات پیشتر تیمور کے حکم سے
شطرنج کی بساط بچھائی گئی۔ امرا میں سے ایک نے ہمت کر کے پوچھا کہ
ضور! کل دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے اور آج یہ کھیل؟ تیمور نے
اب دیا کہ میرا کام تو پورا ہو گیا۔ اب کل تو میدان فوج کے کمان داروں
ہاتھ میں ہو گا۔ میں اس کی فکر کر کے کیا کروں گا۔

چنانچہ دوسرے دن گھمسان کی لڑائی ہوئی اور فتح تیمور کو حاصل
ہوئی۔ بایزید زخمی ہو کر گرفتار رہا، اس کی آنکھ پر زخم آیا تھا اور پٹی بندھی
تھی۔ جب اسے تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو تیمور بڑی زور سے ہنسنے
لگا۔ بایزید نے ناگواری سے کہا کہ جناب، ہنسی کا کیا موقع ہے؟ فتح
ور شکست تو نصیبوں سے ہے۔ میں بھی دنیا کے بڑے حصے کو تلوار سے فتح
ر چکا ہوں۔ تیمور نے جواب دیا کہ میں سلطان پر نہیں بلکہ تقدیر پر ہنس رہا
ہوں کہ اس نے دنیا میں دو فاتح پیدا کیے۔ ایک آنکھ سے معذور اور
دوسرا پیر سے۔

"شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی!"

اس لڑائی نے دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور یورپ میں مسلمانوں
کی پیش قدمی ہمیشہ کے لیے رک گئی۔

مارکسزم کو مذہبی حیثیت دینے کی مخالفت سب سے پہلے میں نے
ہمارے اور آپ کے استاد سید محمد صاحب ٹونکی سے سنی تھی۔ جیسا کہ آپ کو
معلوم ہے وہ خلافت تحریک سے کانگریس اور کانگریس سے کمیونسٹ پارٹی
میں آئے تھے۔ ۵۱ء میں جب میں مارا مارا پھر رہا تھا تو علی گڑھ بھی
آیا تھا۔ اس زمانے میں بخارسٹ سے کمیونسٹ تحریک کا بین الاقوامی اخبار
"فار اے لاسٹنگ پیس، فار اے پیپلس ڈیماکریسی" (For a Lasting Peace, For a Peoples Democracy) نکلتا تھا۔ ایک
دن انہوں نے جھنجھلا کر اخبار میری طرف بڑھا دیا کہ "دیکھیے قال اللہ و
قال الرسول یہاں بھی شروع ہو گیا۔ اب اگر کوئی بات کہنا ہو تو بس مارکس
اینجلز یا لینن کا قول نقل کر دیجیے بس کافی ہے۔ سائنٹفک سوشلزم کا
تو بس صرف نام ہی رہ گیا ہے۔ سائنس میں ہر نظریہ عارضی طور پر قبول کیا جاتا
ہے۔ اگر وہ مشاہدات کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ باطل۔
مارکسزم کے متعلق یہ کہنے کی ہمت اب کسی کی نہیں پڑتی ہے۔ بھائی اس مذہب
کو تو قبول کرنے کو تو جی نہیں چاہتا"

ٹونکی صاحب کی ساری زندگی شجاعت اور بہادری کی تصویر تھی
اسی لیے انہوں نے اپنی رائے بے خوف و خطر دے دی۔ اس وقت تک
بہت کم کمیونسٹ یہ جرات کر سکتے تھے۔

یورپ میں اس مذہبی طرز فکر کے خلاف بغاوت کی آگ بہت دنوں سے
سلگ رہی تھی۔ یوگوسلاویہ کے ٹیٹو اور ان کے ساتھی جیلاس نے کھلم کھلا ماسکو
کی چند پالیسیوں کی مخالفت کی شروع کر دی تھی لیکن یہ روش عام نہیں تھی۔
گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں یورپ میں ایک نئی تحریک یورو کیمونزم کے
نام سے شروع ہوئی۔ اب کچھ کمیونسٹ پارٹیوں نے قومی سطح پر اعلان کر دیا
ہے کہ کمیونزم کا واحد راستہ انقلاب اور مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ نہیں
ہے بلکہ سماجی حالات بدلنے کے اور طریقے بھی ہیں۔

یورپ کے کمیونسٹ دانشوروں کے اندازِ فکر میں یہ تبدیلی ان واقعات

یورپ کے دوران قیام میں یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ ایشیا کے
۔ اب افریقہ میں بھی شہنشاہیت کا چل چلاؤ ہے۔ جو موکنیاٹا، پیریٹرک
ا اور کینتھ کاونڈا سیاہ فام افریقیوں کے رہنما ہوکر سامنے آ رہے تھے ۔
رق وسطیٰ میں نئی انقلابی لہر جو جمال عبدالناصر کی قیادت میں شروع ہوئی
ی اس نے عراق کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا تھا اس طرح اسلامی ممالک
غیر بادشاہی حکومتوں کی فہرست میں ایک نام اور بھی لکھا گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا
ا کہ اقبال کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو جائے گی ۔

قید ہے دربار سلطان و شبستان وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیر طلائی کا اسیر

۱۹۶۳ء کے آخر میں امریکہ کے صدر کینیڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا
ں طرح ایک سیاسی دہشت گردی کا سلسلہ شروع ہوا جو آئندہ بیس
یس برسوں میں ساری دنیا میں پھیل جانے والا تھا۔ یہ حالات تھے جس
ں ہم لوگوں نے وطن واپس آنے کا ارادہ کیا۔ اب ہمارے کنبہ میں پانچ
راد ہو گئے تھے۔ زیبا، زویا اور سلیم کی پیدائش انگلستان میں ہوئی تھی۔
ندن سے زینت نے ڈی۔سی۔ایچ اور ڈی۔آر۔سی۔او۔جی کے اسناد
اصل کیے اور میں نے ایف۔آر۔سی۔ایس کی سند لی۔

جب ہم لوگوں نے وطن میں اپنے عزیزوں کو واپسی کی اطلاع دی تو
زینت کی بہن کشور کا خط آیا کہ آپ لوگ وطن واپس آنے کا ارادہ نہ کیجیے
ب یہ وطن وہ نہیں رہا جس میں آپ رہتے تھے۔ اب یہاں مسلمانوں کے
لیے زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں خوفناک فساد ہو رہے ہیں جس میں
حکومت کھل کر فسادیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ مسلمانوں کی بستیاں
جلائی جا رہی ہیں۔ جب کسی محلّے پر حملہ ہوتا ہے تو اس سے قبل ٹیلیفون کا
سلسلہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ پولس اور آگ بجھانے والے جب آتے
ہیں جب سب کچھ راکھ ہو چکا ہوتا ہے۔ خدا کے لیے آپ لوگ نہ آیے
اگر اپنا نہیں تو اپنے بچوں کا خیال کیجیے ۔

مجھ پر اس خط کا بہت اثر ہوا۔ بڑی مشکل سے آنسوؤں پر
قابو پایا اور لکھا "کشور! میرے ملک کے لوگ اس وقت پاگل
ہو گئے ہیں۔ یہ نہ ہمیشہ پاگل تھے اور نہ ہمیشہ پاگل رہیں گے۔ میں اپنا وطن
چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں۔ میرے بچوں کا وہی حشر ہوگا جو کروڑوں مسلمانوں
کے بچوں کا۔"

چنانچہ اسی ہنگامے میں ہم لوگ مارچ ۶۴ء میں وطن کے لیے روانہ
ہو گئے۔ بمبئی سے سیدھے علی گڑھ آئے اور میں نے وائس چانسلر مسٹر
بدرالدین طیب جی کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کچھ دنوں کے بعد میرا تقرر
سرجری کے شعبہ میں لکچرر کی حیثیت سے کر دیا گیا اور زینت بچوں کے
علاج کے محکمے سے منسلک ہو گئیں۔ میں نے جانا کہ اب داخلہ عرصۂ محشر میں
ہے اور جو کچھ فرنگی محل، علی گڑھ، کلکتہ اور برطانیہ سے حاصل
کیا ہے، اس کا حساب دینا ہوگا۔

(باقی آئندہ)

زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے، پیکر بناتی ہے اور انھیں توڑتی ہے۔
روح ایک ایسی شمشیر ہے جس کے لیے بقول اقبال جسم کی نیام سنگ فساں کا کام کرتی ہے۔
شاہ آرتھر کی تو تلوار ہی سمندر میں ڈال دی گئی تھی، ہم نیام کو لے کر گھومتے ہیں۔
چڑیا اُڑ گئی اور پنجرے کی نمائش ہو رہی ہے۔ چمکتا اور دمکتا ہوا، خوش خرام،
خاموش، تیز رو، لچک دار، سانچے میں ڈھلا ہوا خوبصورت سانپ، کینچلی اُتار کر
آگے بڑھ گیا۔ ہم ملگجی کینچلی کو سینے سے لگا رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ
سانپ یہی ہے۔

—— سید حامد ——

ستانوے فیصد پاس چھیالیس فیصد فرسٹ ڈویژن

احمد رشید شیروانی

اتر پردیش کے جن پچیس[۲۵] مسلم جونیر ہائی اسکولوں سے ۱۹۸۷ء کے رزلٹ سب سے پہلے آئے، وہ چارٹ میں درج ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے دس اسکولوں سے کوئی فیل نہیں ہوا اور کسی کی تھرڈ ڈویژن کبھی نہیں آئی۔ تین سو تین طلبا و طالبات سب کے سب یعنی سو فیصد پاس۔ دو سو بائیس یعنی چوہتر فیصد فرسٹ ڈویژن اور باقی اکیاسی یعنی چھبیس فیصد سکنڈ ڈویژن۔

تمام پچیس اسکولوں سے ملا کر سات سو چورانوے شریک، سات سو اٹھتر یعنی ستانوے فیصد پاس۔ تین سو اٹھتر یعنی چھیالیس فیصد فرسٹ ڈویژن۔ تین سو چورانوے یعنی پچاس فیصد سکنڈ ڈویژن اور چھ یعنی ایک فیصد تھرڈ ڈویژن۔

اس رپورٹ میں مسلم جونیر ہائی اسکولوں کے ٹوٹل رزلٹ لیے گئے ہیں یعنی مسلم بچوں کے رزلٹ الگ کرکے نہیں درج کیے گیے ہیں۔ باقی اسکولوں سے بھی رزلٹ آجائیں تو پھر یہ تجزیہ کیا جائے کہ پچھلے سال کے مقابلے میں کہاں کہاں آٹھویں کلاس کے بورڈ امتحان کی سطح پر مسلم بچوں کی تعلیم کو کتنا کتنا فروغ ہوا اور اگر کہیں فروغ کے بجائے اس سطح پر مسلم بچے تعلیم میں پیچھے گئے، تو کتنے۔

چونکہ مجموعی طور پر ستانوے فیصد بچے پاس ہوئے ہیں، اس لیے پاس فیصد سے زیادہ اہمیت فرسٹ ڈویژن کے تناسب کی ہے۔ جب پہلے دس اسکولوں سے ملا کر چوہتر فیصد بچے فرسٹ ڈویژن لائے ہیں تو پھر جن اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب کم ہے، ان کے ذمہ داران کو اس طرف سنجیدگی سے دھیان دینا چاہیے۔ چارٹ میں نتائج فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے اعتبار سے درج کیے گیے ہیں۔ یعنی سب سے پہلے سیتاپور کے ظفر میموریل گرلز جونیر ہائی اسکول کا رزلٹ ہے۔ جہاں سے سو فیصد طالبات فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئیں پھر الاصلاح اسلامیہ جونیر ہائی اسکول کمال پور ضلع بلند شہر جہاں سے ترانوے فیصد بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔ اس کے بعد تارا رشید شیروانی گرلز جونیر ہائی اسکول صلاچپور ضلع الہ آباد جہاں سے تراسی فیصد طالبات فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئیں۔

اور آخری تین اداروں میں فرسٹ ڈویژن صفر ہے۔ ان پچیس اسکولوں میں دونوں اعتبار سے (یعنی پاس فیصد کے اعتبار سے بھی اور فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے اعتبار سے بھی) سب سے خراب رزلٹ مسلم نیشنل جونیر ہائی اسکول دہرہ دون کا کہا جائے گا۔ جب کہ پہلے دس اسکولوں سے چوہتر فیصد بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔ دہرہ دون کے اسکول سے اتنے پاس بھی نہیں ہوئے۔ صرف اٹھتر فی صد پاس ہوئے۔ اس اسکول کے ذمہ داران کو اس طرف بہت سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ دہرہ دون کے باشعور علم دوست مسلم حضرات کو بھی متوجہ ہونا چاہیے۔

جن اسکولوں سے ابھی رزلٹ نہیں بھیجے گئے برائے کرم اب جلد بھیج دیے جائیں۔

یو۔پی کے پچیس ۲۵ جونیر ہائی اسکولوں کے نتائج ۱۹۸۷ء

شرکیہ	پاس	فرسٹ	سکنڈ	تھرڈ	جونیر ہائی اسکول	مقام	ضلع	فرسٹ فیصد
۱۲	۱۲	۱۲	-	-	ظفر میموریل گرلز		سیتاپور	سو
۱۴	۱۴	۱۳	۱	-	الاصلاح اسلامیہ	کمال پور	بلند شہر	ترانوے
۴۰	۴۰	۳۳	۷	-	تارا رشید شیروانی گرلز	صلاح پور	الہ آباد	تراسی
۳۹	۳۹	۳۲	۷	-	علی خاں	ہاپوڑ	غازی آباد	بیاسی
۱۵	۱۵	۱۲	۰۳	-	فیضان القرآن	ملک مقیم پور	بجنور	اسّی
۹	۹	۷	۲	-	رحمانیہ گرلز	—	بدایوں	اٹھہتر
۳۹	۳۹	۳۰	۹	-	ایک آنہ فنڈ	—	لکھنؤ	ستہتر
۳۶	۳۶	۲۵	۱۱	-	رسول باغ	مغل سرائے	وارانسی	انہتر
۱۲	۱۲	۸	۴	-	قاضی شہاب الدین	سکھانو	بدایوں	سڑسٹھ
۸۷	۸۷	۵۰	۳۷	-	مسلم نسواں	ٹانڈہ	فیض آباد	ستاون
۴۲	۳۵	۲۰	۱۵	-	آزاد	ککرالہ	بدایوں	اٹھتالیس
۴۹	۴۵	۲۰	۲۴	۱	پی۔ بی۔ جنتا	پورقاضی	مظفر نگر	اکتالیس
۴۰	۴۰	۱۵	۲۵		حمیدیہ گرلز		میرٹھ	اڑتیس
۴۲	۴۰	۱۵	۲۵		مومن انصار	سہسوان	بدایوں	چھتیس
۵۰	۴۸	۱۸	۲۹	۱	نیشنل	ددھیڑو	مظفر نگر	"
۳۵	۳۵	۱۲	۲۳	-	ذاکر میموریل	کیرانہ	"	چونتیس
۵۰	۴۹	۱۵	۳۱	۳	بایزید	چرّہ محمد پور	فیض آباد	تیس
۴۴	۴۳	۱۱	۳۱	۱	صابر میموریل	دریاباد	بارہ بنکی	پچیس
۴۴	۴۴	۱۰	۳۴	-	اکرام حسین گرلز	—	جون پور	تیئیس
۳۷	۳۵	۶	۲۹		مولانا محمد علی جوہر اسمارک	مدھوبنی	بستی	سولہ
۱۳	۱۳	۲	۱۱		پبلک نرسری	دیوبند	سہارنپور	پندرہ
۲۰	۱۸	۳	۱۵		جعفری بیگم میموریل	سنگرام پور	بدایوں	"
۳	۳	-	۳		سلیم منتشر ماڈل		بدایوں	صفر
۹	۹	-	۹		سید منور علی گرلز		"	"
۱۳	۹	-	۹		مسلم نیشنل		دہرہ دون	"
۷۹۴	۷۴۹	۴۶۹	۲۹۴	۶	تمام پچیس اسکولوں میں ملاکر			چھیالیس

انوکھا پودا انوکھی خوراک

محمد احسان الحق کوثر چندناروی

عموماً ایسا کہا جاتا ہے اور درست بھی ہے کہ دنیا میں دو قسم کی مخلوقات ہیں۔ ایک ذی روح یعنی جس میں جان ہو اور دوسری غیر ذی روح جس میں جان نہ ہو۔ اور انہیں دو حصوں میں ساری دنیا منقسم ہے۔ یوں تو عام لوگ صرف جانوروں جیسے چرند پرند وغیرہ کو ہی جاندار مانتے ہیں۔ باقی اس زمین پر اگنے والے کروڑوں قسم کے نباتات (پیڑ پودے) بے جان ہیں مگر جن لوگوں نے ان غریب پودوں کی زندگی اور ان کے ماحول کو پرکھا ہے یا اس پر غور و خوض کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ہرے بھرے سرسبز و شاداب بیل بوٹے اور پیڑ پودے بھی ذی روح ہیں اور ان کے اندر بھی ہماری طرح قوت احساس (Feeling Power) یا قوت تحریک (Movement) یعنی چلنے پھرنے کی طاقت پائی جاتی ہے جس طرح کوئی شے ہمارے جسم کو چھوتی ہے تو ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ان پودوں میں بھی احساس کا مادہ (Sensitiveness) پایا جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک ہی مثال کافی ہو سکتی ہے۔ دیہاتوں میں یا عام جگہوں پر ایک پودا ملتا ہے جسے چھوئی موئی (لجونتی) کہتے ہیں اس پودے کو قریب ہر شخص جانتا ہے کہ جب اسے مس کیا جاتا ہے تو اس کے پتے باہم سمٹ جاتے ہیں جسے دیہات میں لوگ لجانا یا شرمانا کہتے ہیں مگر اس کی اندرونی حالت (Anatomy) کو دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے کس طرح اپنی کاریگری کا کرشمہ اس پودے میں ودیعت کیا ہے۔ اس طرح مختلف خوبیوں والے مختلف پودے اس زمین پر پائے جاتے ہیں مگر یہاں ہم ایک ایسے پودے کی جانکاری دینا چاہتے ہیں جو خود بھی انوکھا ہوتا ہے اور اس کے خوراک حاصل کرنے کا طریقہ بھی انوکھا ہوتا ہے۔

جس پودے کے بارے میں ہمیں جاننا ہے اسے Pitcher Plant کہتے ہیں جسے گھڑا نما پودا کہہ سکتے ہیں بلکہ یہ ایک اصطلاحی ترجمہ ہوا۔ اس پودے کا کنبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کنبے کے مختلف افراد کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے جس میں سے صرف Nepenthes Khasiana ہندوستان کے صوبہ آسام میں پایا جاتا ہے۔ اس گھڑا نما پودے کو نباتات کی زبان میں Nepenthes ہی کہا جاتا ہے۔ اس پودے کا نچلا حصہ چوڑا ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے اوپر کی طرف پتلا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی گردن کی اندرونی حصے میں ایک طرح کی گانٹھ (غدود) پائی جاتی ہے

پتیاں — Leaf
ڈھکن — Lid
منہ — Mouth
گردن — Neck
شکار یا غذا — Prey
گھڑا نما — Pitcher

تصویر گھڑا نما پودے کی

جسے سائنس کی زبان میں Nectariferous Gland کہتے ہیں جیسے عام

اصلاح میں آبِ حیات کی گانٹھ یا میٹھے رس کی گانٹھ کہہ سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کی گانٹھ دہانے (Mouth) کے قریب پائی جاتی ہے۔ گردن کے نیچے دو حصے ہوتے ہیں جس میں اوپری حصہ بغیر کسی گانٹھ کے ہوتا ہے مگر اس پر ایک طرح کی چکنی شئے کی پرت ہوتی ہے جس پر آئے ہوئے کیڑے کا پھسلنا آسان ہوتا ہے۔ اس حصے کے کچھ خلیے (Cells) بالوں جیسی شکل بناتے ہیں جو چکنی پرت پر ظاہر ہوتی ہے۔ ٹھیک اس کے نیچے غدود ہاضم (Digestive Glands) یعنی ایسی گانٹھ ہوتی ہے جو غذا کو ہضم کرانے میں مدد کرتی ہے۔ اس گانٹھ سے مختلف قسم کی کیمیاوی رطوبت نکلتی ہے جو آئی ہوئی ٹھوس غذا پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرکے اسے ہضم کراتی ہے جس طرح ہمارے اندر مختلف قسم کی کیمیاوی رطوبت (Enzymes) نکلتی ہے اور غذا کو ہضم کراتی ہے، ٹھیک اسی طرح قدرت نے یہاں بھی انتظام کیا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ پودا اپنی غذا کس طرح حاصل کرتا ہے اس کے منھ کے اوپر ایک ڈھکن ہوتا ہے جو خوش رنگ ہوتا ہے۔ جیسے ہی چھوٹے چھوٹے کیڑے اس کے منھ تک آتے ہیں، اس کے منھ والے غدود سے رسنے والی رطوبت میں پھنس جاتے ہیں اور ٹھیک اس کے نیچے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، چکنی پرت ہوتی ہے اس پر پھسلتے ہوئے کیڑے معدے (Cavity) میں آجاتے ہیں۔ اس کے آتے ہی ہاضم کیمیاوی رطوبت کا ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آئی ہوئی غذا کا پروٹین والا حصہ ایک دوسری کیمیاوی شکل میں بدل جاتا ہے، جیسے امینو ایسڈ کہتے ہیں۔ معدے کی دیوار اس کو جذب کر لیتی ہے، جس سے اس کی طاقت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ معدے کی ہاضم کیمیاوی رطوبت میں خوردبینی کیڑے ہوتے ہیں جس کو خوردبین (Microscope) سے دیکھا جا سکتا ہے۔ غذا کے بچے ہوئے حصے کا استعمال یہی کیڑے کرتے ہیں۔ اس پودے کی خوراک زیادہ تر ٹڈا (Grass-Hopper) اور چیونٹیاں (Ants) ہیں۔

اس طرح کے اور بھی کئی دوسرے پودے ہیں جو اپنی غذا اسی طور پر حاصل کرتے ہیں اور اپنی زندگی بحال رکھتے ہیں۔ قدرت نے اپنی کاریگری کا نمونہ ہر شئے میں پوشیدہ رکھا ہے۔ کاش ہماری آنکھیں ان نمونوں کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

اصلاح کی تحریک کا آغاز کیسے ہو؟

ہر شخص بھلائی چاہتا ہے ہر شخص کی تمنا ہے کہ معاشرے میں خیر و فلاح کا آغاز کدھر سے ہو؟

- حکومت کے ایوانوں سے؟
- واعظ کے منبر سے؟
- ادیب کے قلم سے؟
- تعلیمی اداروں سے؟
- مزدوروں اور کسانوں کی انجمنوں سے؟

اس کا نتیجہ خیز جواب ایک ہی ہے۔

اپنے آپ سے!

اگر آپ کسی لمحے یہ فیصلہ کر لیں ــــــــ کہ

- کسی پر ظلم نہیں کریں گے
- کسی کو دھوکا نہیں دیں گے
- برائی میں تعاون نہیں کریں گے

بلکہ بھلائی میں بھرپور تعاون کریں گے تو سمجھ لیجیے کہ اصلاح کی ایک ہمہ گیر تحریک کا آغاز ہو گیا!!

نوبل انعام

احرار حسین و صغیر افراہیم

نوبل انعام دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو ہر سال ماہ اکتوبر میں دنیا کے عظیم انسانوں کو ان کی عظیم خدمات کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ یہ انعام علم طبیعات (Physics) علم کیمیا (Chemistry) علم اجسام و ادویہ (Physiology & Medicine) علم معاشیات (Economics) علم ادب (Literature) اور امن (Peace) کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ نوبل انعام کے بانی الفریڈ برن ہارڈ نوبل سویڈن کے رہنے والے تھے، جنھوں نے ۱۸۶۶ء میں ڈائنامائٹ کی ایجاد کی تھی۔ اس کے علاوہ بغیر دھوئیں کا پاؤڈر بیلیسٹائٹ (Bellistite) بلسٹن جیلیٹن (Bellistine Gelatine) نائیٹرو سیلولوس (Nitrocellulose) اور مصنوعی گٹا پرچہ (Artificial Gutta Percha) کی بھی دریافت کی تھی۔

الفریڈ نوبل کی پیدائش ۲۱ر اکتوبر ۱۸۳۳ء کو اسٹاک ہوم سویڈن میں ہوئی تھی۔ نوبل کے والد ایمنیول نوبل خود بھی ایک عظیم محقق تھے۔ وہ روس میں سب میرین مائنس (Submarine Mines) اور ٹورپیڈائز (Torpedoes) بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دھماکے کے لیے گولہ بارود بھی تیار کرتے تھے۔

۱۸۴۲ء میں نوبل کے والد ان کو سینٹ پیٹرس برگ (لینن گراڈ، روس) لے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے نوبل کو امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ امریکہ میں نوبل نے انجینئرنگ کی تعلیم جون ارکسن کی نگرانی میں مکمل کی۔ جون ارکسن اپنے وقت کے مشہور آئرن کلیڈ نیول ویسیل مانیٹر Ironclad Naval Vessel – Monitor) کے ماہر مانے جاتے تھے۔

امریکہ سے تعلیم کی فراغت کے بعد نوبل روس واپس لوٹ آئے اور وہاں انہوں نے اپنی انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کو جاری رکھا۔ ۱۸۵۹ء میں الفریڈ نوبل اور ان کے والد سویڈن واپس آگئے۔ وطن آکر نوبل اور ان کے والد نے ہیلنبرگ میں ایک کیمیکل پلانٹ لگایا اور نائٹروگلسرین بنانے لگے۔ اتفاقاً اس پلانٹ میں کسی وجہ سے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا جس میں نوبل کے بھائی کی موت واقع ہوئی اور ان کے والد بھی زخمی ہو گئے۔

۱۸۶۶ء میں نوبل نے ڈائنامائٹ کی ایجاد کی۔ لیکن اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں دھماکے ہوئے جس کی بنا پر حکومت نے ڈائنامائٹ کی منتقلی پر پابندی عائد کر دی۔ ان ہی ایام میں نوبل نے نائٹروگلیسرین کی ملی جلی شکل تیار کر لی جو مذکورہ خطرے سے مبرا تھی۔ اس کو بے خطر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ اس دھماکہ خیز مادہ کا استعمال نہر کی تعمیر، چٹانوں کو توڑنا اور کھانوں کی کھدائی کے کام میں آتا تھا۔ نوبل کو اس کی تجارت میں

الفریڈ برن ہارڈ نوبل
۱۸۳۳ء – ۱۸۹۶ء

زبردست کامیابی ملی اور انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں بے پناہ دولت اور شہرت حاصل کر لی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ الفریڈ نوبل اپنے وقت کے دنیا کے امیر ترین لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ نوبل کو سیاحی کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے ان کا بیشتر وقت سویڈن سے باہر یورپ کے ممالک میں گزرتا تھا۔ مرنے سے ایک سال قبل ۱۸۹۵ء میں نوبل نے تاریخی وصیت نامہ لکھا جس میں انہوں نے اپنی تمام دولت کو محفوظ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس محفوظ دولت سے حاصل نفع کو ہر سال علم طبیعات، کیمیا، اجسام وادویہ، ادب اور امن کے میدان میں انعام دیے جانے کی وصیت کی۔ تقریباً ۹,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کی رقم نوبل نے اس عظیم مقصد کے لیے وقف کی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں سویڈش نیشنل بینک نے ایک چھٹا نوبل انعام علم معاشیات کے لیے مقرر کیا۔ اسی طرح ہر سال ماہ اکتوبر میں یہ اعزازات دیے جاتے ہیں۔ نوبل کے وصیت نامے میں اُن اداروں کے بارے میں بھی درج ہے جنہیں ان اعزازوں کے امیدواروں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ ادارے حسبِ ذیل ہیں:

(۱-۲) علم طبیعات اور علم کیمیا کے انعامات کے لیے رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز (اسٹاک ہوم، سویڈن)

۳۔ علم اجسام وادویہ کے انعام کے لیے رائل کیرولن انسٹی ٹیوٹ سویڈن۔

۴۔ ادب کے انعام کے لیے سویڈش اکیڈمی، سویڈن۔

۵۔ امن کے انعام کے لیے نوبل کمیٹی آف دانا رویزین اسٹورٹنگ پارلیامنٹ۔

۶۔ علم معاشیات کے انعام کے لیے (جو کہ سویڈش نیشنل بینک دیتا ہے) رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز، سویڈن

مذکورہ ادارے ہر سال چھ نوبل انعام پانے والوں کا انتخاب کرتی ہیں۔

ان انعاموں کو حاصل کرنے کے لیے امیدواروں کو خود درخواست نہیں دینا ہوتی ہے بلکہ سال رواں کے اہم کام کرنے والوں کے ناموں کی منظوری بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگ، سابق نوبل انعام یافتہ اور معزز انجمنیں مذکورہ اداروں کی سفارش کرتی ہیں۔

نوبل انعام پانے والوں کو سونے کے تمغے (یہ تمغہ تقریباً ۲۰۵ کیو ۲٫۵ انچ دائرہ کا اور ½ پونڈ وزن کا ہوتا ہے) کے ساتھ سند اور تقریباً ۱۰۰,۰۰۰ پونڈ رقم نقد دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اعزاز ایک سے زائد لوگوں کو بیک وقت دیا جاتا ہے۔

مذکورہ انعام ہر سال ۱۰ دسمبر کو الفریڈ نوبل کی یوم وفات کے موقع پر اسٹاک ہوم، سویڈن کے خصوصی تقسیمی اجلاس میں دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا نوبل انعام ۱۹۰۱ء میں منظور ہوا جو اگلے سال دیا گیا تھا۔ درج ذیل میں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء تک علم طبیعات، کیمیا، اجسام وادویہ کے نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں کے تحقیقی کارنامے کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

علم طبیعات کے نوبل انعام (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۶ء)

نوبل انعام علم طبیعات و علم کیمیا

۱۹۷۶ء کا نوبل انعام برٹن رچٹر (امریکہ) اور سیموئل سی ٹنگ (امریکہ) کو مشترکہ طور پر دیا گیا۔ انھوں نے "ساکی/ذرہ" کو ایجاد کیا تھا۔

۱۹۷۷ء کا نوبل انعام تین سائنس دانوں کو مشترکہ طور پر دیا گیا۔ فلپ ڈبلو۔ اینڈرسن (امریکہ)، سرنیویل ایف۔ موٹ (برطانیہ) جان ایچ۔ وین ولیک (امریکہ) کو "سولڈ اسٹیٹ فزکس" میں کام پر دیا گیا۔

۱۹۷۸ء کا نوبل اعزاز پیوٹر کیپٹسا (روس)، آرنی پینزیا (امریکہ) اور رابرٹ ولسن (امریکہ) کو مشترکہ طور سے دیا گیا۔ پیوٹر کی تحقیق "فنڈامینٹل میگنیٹزم اینڈ فزکس آف سوپر کولڈ...

پر تھی۔ آرنی اور ولسن کا کام "بگ بینگ تھیوری" کے بارے میں تھا۔

۱۹۷۹ء کا نوبل انعام پروفیسر عبدالسلام (پاکستان) شیلڈن ایل۔ گلیشو (امریکہ) اور اسٹیون وینبرگ (امریکہ) کو مشترکہ طور پر "یونائٹیڈ فیلڈ تھیوری" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء کا نوبل انعام جیمس کرونین (امریکہ) اور وال فچ (امریکہ) کو "سب اٹامک پارٹکلس ویٹ ہیلپس اکسپلین دا بگ بینگ تھیوری آف دی اوریجن آف دا یونیورس" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۱ء کا نوبل اعزاز نیکولس بیرگن (امریکہ)، آرتھور اسکاولو (امریکہ) اور کائی سیگ بجان (امریکہ) کو "لیزر بیم اسٹڈیز آف دا ایٹم" کی تحقیق پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۲ء کا نوبل اعزاز کین نیتھ جی۔ ولسن (امریکہ) کو "آن کریٹیکل فینومینن ان کنکشن ود دھ فیث ٹرانزیشن" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۳ء کا نوبل انعام سبرامنیم چندرشیکھر (امریکہ) کو "تھیوریٹیکل اسٹڈیز آف دا فزیکل پراسیز آف امپارٹنس ٹو اسٹرکچر اینڈ ایولیوشن آف دا اسٹارس" اور ولیم۔ اے فاؤلر کو تھیوریٹیکل اسٹڈیز آف دی نیوکلیر ری ایکشنز آف امپارٹنس ان دا فارمیشن آف دا کیمیکل ایلیمنٹس ان دا یونیورس" تحقیقی کاموں پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۴ء کا نوبل انعام سائمن ڈینڈرمیر (نیدرلینڈ) اور کارلو روبیا (اٹلی) کو "ڈبلو اور زیڈ زیرو (W، Z°) کی تلاش کے لیے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۵ء کا نوبل انعام کلاؤس وان کلیٹ زنگ (جرمنی) کو "کوانٹم ہال افیکٹ" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۶ء کا نوبل انعام ارنیسٹ روسکا (امریکہ)، زوڈ بلینگ (سوئزرلینڈ) اور ہانی نک روحیر (سوئزرلینڈ) کو "الکٹران مائیکرواسکوپی اور اسکیننگ ٹنلنگ الکٹران مائیکرواسکوپ" پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

علم کیمیا کے نوبل انعام:- (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۶ء)

۱۹۷۶ء کا نوبل انعام ولیم این۔ لیپس کومب (امریکہ) کو "اسٹرکچر اینڈ بانڈنگ میکینزم آف بورینس" تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۷۷ء کا نوبل انعام آیا پری گوگنی (بلجیم) کو "اسٹڈیز ان تھرموڈائنامکس" تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۷۸ء کا نوبل انعام پیٹر میٹ چیل (برطانیہ) کو "ہاؤ پلانٹ اینڈ اینیملس کنورٹ فوڈ انٹو انرجی" کے کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۷۹ء کا نوبل انعام ہربرٹ سی۔ براؤن (امریکہ) اور جارج وی ٹگ (جرمنی) کو "ڈولپمنٹ آف کیمیکل ایجنٹس فار سنتھیسائزنگ آرگینک کمپاؤنڈس" کے تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء کا نوبل انعام فریڈریک سینگر (برطانیہ) والٹر گلبرٹ (امریکہ) اور پال برگ (امریکہ) کو "جنیٹکس ڈسکوریز" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۱ء کا نوبل انعام رولڈ ہاف مین (امریکہ) اور فوکوئی کی نی چی (جاپان) نے "مائل اسٹون تھیوری آن کیمیکل ری ایکشنز" کاموں پر مشترکہ طور سے حاصل کیا تھا۔

۱۹۸۲ء کا نوبل انعام ایرون کلگ (برطانیہ) کو "آؤٹ اسٹینڈنگ کنٹری بیوشنس ٹو دا اسٹڈی آف وائرسینز، الکٹران مائیکرواسکوپی اور ایکسرے کرسٹلوگرافی" تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۳ء کا نوبل اعزاز ہنری ٹاؤب (امریکہ) کو "پاینیرنگ ورک ان دا میکینیزم آف الکٹران ٹرانسفر اسپیشلی آکسیڈیشن ریڈکشن ان میٹل کمپلیکسیز" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۴ء کا نوبل انعام بروس میری فیلڈ (امریکہ) کو "ڈولپمنٹ آف ٹکنیک فار سنتھیسائزنگ سیکشنز آف پروٹین مولی کیولس ایزی لی اینڈ ریپیڈلی ان دا لیبارٹری" کے کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۵ء کا نوبل انعام ہربرٹ ہاف مین (امریکہ) اور جیروم کارلے (امریکہ) کو "ڈولپمنٹ آف ڈائریکٹ میتھڈ آف ایکسرے کرسٹلوگرافی یوزڈ ان ڈٹرمننگ دا اسٹرکچرس آف آرگینک اینڈ ان آرگینک مولی کیولس اینڈ کرسٹلس" تحقیقی کاموں پر

مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۶ء کا نوبل انعام ڈوڈلے ہرسباچ (امریکہ) کو "اسٹڈیز آف کیمیکل ڈائنامیکس یوزینگ مولیکیولرس بیمس"۔ یو آن ٹسی لی (امریکہ) کو "اسٹڈیز آف مولیکیولر بیم ٹیکنیکس آف ہرسباچ" اور جان پولانئی (کناڈا) کو "انڈر اسٹینڈنگ آف کیمیکل ڈائنامکس ددھ فرام اے ڈفرینٹ روٹ" کاموں پر مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔

علم اجسام و ادویہ: (۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۶ء)

(نوبل انعام علم اجسام و ادویہ)

۱۹۷۶ء کا نوبل انعام بارو چ ایس۔ بلبرگ (امریکہ) اور ڈی۔ کیرلیٹن گیبز ڈیوسیک (امریکہ) کو "اوریجن اینڈ ڈیسمینیشن آف انفیکشیس ڈزیز" کے تحقیقی کام پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۷۷ء کا نوبل انعام روسا لین یالو (امریکہ) کو "یوز آف ریڈیو ایکٹیو سبسٹانس ٹو فائٹ اینڈ میزر ہارمونس اینڈ ادر مائی نیوٹ سبسٹانسیز ان دا باڈی اینڈ بلڈ ٹیشوز"۔ روژر گیول لی ایم (امریکہ) اور اینڈ رو وی اسکیلے (امریکہ) کو ریسرچ آن برین فنکشنس" کے تحقیقی کاموں پر مشترکہ طور سے دیا گیا۔

۱۹۷۸ء کا نوبل انعام ورنر ایربر (سوئزرلینڈ)، ہمیلٹن او۔ اسمتھ (امریکہ) اور ڈینیل ناتھنس (امریکہ) کو مشترکہ طور سے ان کے "ڈسکوری آف اے وے ٹو آئی سولیٹ جینس اینڈ اسٹڈی دیر رولس" کے تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۷۹ء کا نوبل انعام ایلان ایم۔ کارمیک (امریکہ) اور گوڈ فرے نیو بالڈ ہائی یونس فیلڈ (برطانیہ) کو "ڈویلپمنٹ آف کمپیوٹرائزڈ ایکسیل ٹوموگرافی (CAT) اینڈ ایکسرے ڈائیوگناسٹک ٹکنیک" پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء کا نوبل انعام جارج اسنیل (امریکہ)، باروج بینا سیراف (امریکہ) اور جین ڈائی سیٹ (فرانس) کو ڈسکوریزان امینولوجی دیٹ ہیلپ ایکسپلین ہاؤ دا اسٹرکچر آف سیلس ریلیٹس ٹو ڈزیزیز اینڈ آرگن ٹرانسپلانٹس" تحقیقی کام پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۱ء کا نوبل انعام روجر ڈبلو۔ اسپیری (امریکہ)، ڈیوڈ ایچ۔ ہیوبیل (امریکہ) اور ٹارسٹین۔ این۔ ویسیل (سویڈن) کو "بیسک ڈسکوریز آن ہاؤ دا برین فنکشن" کام پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۲ء کا نوبل انعام سُوُنے۔ کے۔ برگ اسٹران (سویڈن) بینگٹھ آئی سیمیولسن (سویڈن) اور جان۔ آر۔ وانے (برطانیہ) کو "پروسٹاک لینڈین ریسرچ" پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۳ء کا نوبل اعزاز باربیرا میک کلنٹک کو "اسٹڈ آف کروموسومل بیسز فار دا جینٹک فینامینا" کے تحقیقی کام پر دیا گیا تھا۔

۱۹۸۴ء کا نوبل انعام جارج کوچلر (جرمنی)، سیزار ملسٹائن (ارجنٹائن) کو "ٹکنیکس فار میکینگ مونوکلونل اینٹی باڈیز" اور نیلس جرنی (سوئزرلینڈ) کو "جرنیز درک ٹو پر بیپر دا دے دا میکینگ آف مونوکلونل اینٹی باڈیز" کے تحقیقی کاموں پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۵ء کا نوبل انعام مائیکل براؤن اور جوزف گو اسٹائن کو "ڈسکوری آف دا جینٹک میکنیزم ریسپانسبل فار ابنارمل ڈِلیبریبلیٹی ٹو اسٹروک اینڈ ہرٹ ڈزیز" کے تحقیقی پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

۱۹۸۶ء کا نوبل انعام ریتا لیوی مونالسینی (اٹلی) اسٹینلے کوہین (امریکہ) کو "نروگروتھ فیکٹرس" کے تحقیق

پر مشترکہ طور سے دیا گیا تھا۔

دنیا کا یہ عظیم اعزاز کرۂ ارض کے عظیم سائنس دانوں کی عظیم خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اگر ہم ان انعام یافتہ سائنس دانوں کی زندگی کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ تلاش و جستجو اور ایجاد و اختراع میں گزرا ہے۔ انسانی فلاح وبہبود اور امن و امان ان کے پیش نظر رہا ہے۔

نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں نے اپنے تحقیقی کاموں میں اپنا خون جگر صرف کر کے بنی نوع انسان کو ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے، اسے نئی راہیں دکھلائی ہیں اور نئے افق کی نشان دہی کی ہے۔ اسی بنا پر باشعور ابن آدم کی نظریں سال نو کی آمد پر ان سائنس دانوں پر مرکوز ہو جایا کرتی ہیں جو اس کے مستحق ہوتے ہیں الفریڈ برن ہارڈ نوبل کا عطا کردہ یہ انعام ۱۹۸۷ء میں کن سائنس دانوں کو ملے گا، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔
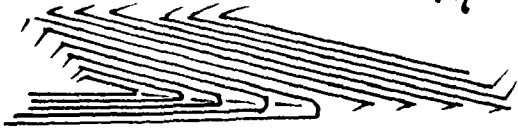
اعتذار

تہذیب الاخلاق دہلی کے جس علاقے میں طبع ہوتا ہے وہ علاقہ مسلسل کرفیو کی زد میں ہے جس کی وجہ سے ہماری تمام کوششیں بیکار ہو چکی ہیں اور ہم وقت معینہ پر رسالہ آپ کی خدمت میں پہنچانے سے قاصر ہیں۔ جب تک یہ غیر معمولی حالات برقرار رہتے ہیں، رسالہ شاید ہی اپنے وقت پر شائع ہو سکے۔ لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہر ماہ کی بیس تاریخ کے بعد رسالہ نہ ملنے کے سلسلے کے شکایتی خطوط ارسال فرمایا کریں۔

ادارہ

لیبارٹری میں انسانی جلد کی تیاری

محمد اصغر

شاید ہم میں سے بہتوں کو یہ نہیں معلوم کہ سائنس والوں نے تجربہ گاہ میں انسانی جلد (جسے عرف عام میں کھال کہہ سکتے ہیں) تیار کرلی ہے۔ جی ہاں، یہ وہی جلد ہے جو ہمارے اور آپ کے سارے جسم پر چڑھی ہوئی ہے۔ انسانی جلد جہاں ڈھیر سارے کام انجام دیتی ہے وہیں جسم سے اُن رقیق مادوں کو باہر نکلنے سے روکتی ہے جو انسان کی زندگی کے لیے لازمی ہیں۔ یہ جلد ہی ہے جو مختلف قسم کے خطرناک وائرس اور بیکٹریا کو بدن کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے اور اس طرح انسانی زندگی کا تحفظ کرتی ہے۔

ہم اور آپ اکثر سنتے یا دیکھتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ کوئی شخص جل کر مرگیا یا فلاں جگہ فلاں کو جلا کر مار ڈالا گیا۔ جلنے کی صورت میں یہی جلد تباہ ہوتی ہے اور جلد کے ختم ہونے کا مطلب یقینی طور پر موت ہوتا ہے۔ مگر سائنس والوں کی تحقیق اور جستجو نے بالآخر اس انہونی کو بھی ہونی کر دکھایا کہ لیبارٹری (Laboratory) میں انسانی جلد تیار کرلی گئی ہے۔

آیئے اس سلسلے میں اس واقعے پر نظر ڈالیں جس سے لیبارٹری میں تیار کردہ انسانی جلد کی بات وابستہ ہے۔

ریاست وائی یومنگ کے شہر "کیسپر" میں چھ سالہ گلن سیلی اپنے پانچ سالہ بھائی جمی اور ایک ننھے دوست کے ہمراہ ایک خالی مکان میں کھیل کود میں مصروف تھا۔ اچانک تینوں کی نظریں رنگ کے ایک ڈبے پر پڑیں۔ بس پھر کیا تھا، تینوں نے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کو برش کے ذریعے رنگ کر دیا۔ بچّے تو بہرحال بچّے ہوتے ہیں۔ کھیل کا بخار جب اترا اور گھر جانے کی فکر دامن گیر ہوئی تو سبھی نے اپنے اپنے بدن پر لگے ہوئے رنگ کو پونچھنا شروع کر دیا۔ مگر یہ کیا۔ رنگ تو چھوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پاس ہی پٹرول کا ڈبہ تھا۔ بچّوں نے پٹرول کا ڈبہ کھولا اور جلدی جلدی پٹرول نکال کر ایک دوسرے کے جسم پر ملنے لگے کہ شاید اس سے رنگ چھوٹ جائے مگر رنگ میں ذرا سا بھی ہلکاپن نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں پتہ نہیں سب سے چھوٹے بچّے کو کیا سوجھی کہ وہ قریب رکھی ہوئی ماچس کی ڈبیہ کھول کر تیلی جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتہً آگ کی ایک لپٹ نمودار ہوئی اور تینوں کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے شکنجے میں لے لیا۔ اب تینوں بچّے شعلوں میں لپٹے بُری طرح جل رہے تھے۔ چیخنے چلّانے کی آوازیں سن کر گھر والے دوڑے، کسی طرح آگ بجھائی اور فوراً سبھی کو اسپتال لے گئے لیکن اس وقت تک سب سے چھوٹا بچہ اللہ کو پیارا ہوچکا تھا۔ گلن سیلی اور جمّی اس بُری طرح جھلس چکے تھے کہ ان کے جسم کی ۹۸ فیصد کھال جل کر خاک ہوچکی تھی۔ ظاہر ہے جس انسان کے بدن سے ۹۸ فیصد کھال جل کر خاک ہو اس کا زندہ رہنا کیوں کر ممکن ہے مگر یہ دونوں بھائی خوش قسمت نکلے کیوں کہ سائنس والوں نے تلاش اور کوششوں سے وہ طریقہ معلوم کرلیا تھا جس سے انسان کی جلی ہوئی جلد کے نیچے سے ایک خاص قسم کے خلیے (Cells) حاصل کرکے لیبارٹری میں کیمیائی عمل کے ذریعے ان سے نئی کھال بنائی جاسکتی تھی۔ خلیہ (Cell) زندگی کی بنیادی اینٹ ہوتا ہے۔ انہی اینٹوں سے مل کر انسان کا جسم بنا ہوا ہے۔

ہارورڈ میڈیکل اسکول (Harvard Medical School) کے شعبۂ فزیالوجی (Department of Physiology) اور مائیکرو فزکس کے سربراہ ڈاکٹر ہوورڈ گرین نے اپنی محنت اور جستجو سے اس امر کا پتا لگا لیا تھا کہ صحت مند جلد سے چند خلیے حاصل کر کے ان سے لیبارٹری میں کس طرح بہت زیادہ نئی کھال تیار کی جاسکتی ہے انہوں نے اتفاق سے ایک ایسے خلیے کا پتہ چلالیا جسے فائبرو بلاسٹ (Fibro blast) کہتے ہیں۔ یہ خلیہ منتقل کرنے والی بافتوں (Tissues) میں ہوتا ہے جو جلد کی تہہ کے بالکل نیچے ہوتی ہیں۔

گلن سیلی اور رجی کو وائیومنگ انسانی نگہداشت کے مرکز میں لے جایا گیا۔ وہاں فوری امداد پہنچانے کے بعد دونوں کو کولوراڈو کے چلڈرن اسپتال میں لے جایا گیا۔ پھر وہاں سے بوئین کے سیریز برنز انسٹی ٹیوٹ میں بھیج دیا گیا۔ کیوں کر تمام ڈاکٹروں کا یقین تھا کہ ان بچوں کا علاج ڈاکٹر ہوورڈ گرین ہی کرسکتے ہیں سیریز برنز انسٹی ٹیوٹ میں تین پلاسٹک سرجنوں ڈاکٹر جی. گریگری گلیگو اور ڈاکٹر نکولائی او کوئرنے تقریباً پانچ مہینوں تک تاش کے پتوں کے برابر جلد کے ٹکڑے ان بچوں کے جلے ہوئے جسم پر لگائے جاتے ہیں یہ تاش کے پتوں کے برابر جلد کے ٹکڑے کہاں سے آئے تھے۔ یہ کھال ڈاکٹر گرین نے اپنی لیبارٹری میں اُن خلیوں سے اُگائی تھی جو فائبرو بلاسٹ کہلاتے ہیں۔ نفاءاُگائی سے یہ نہ سمجھیے کہ انہوں نے یہ خلیے زمین میں دبا دیے تھے اور یہ کھال وہا سے پیدا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر گرین نے ان خلیوں کو شیشے کی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں ڈال دیا تھا، جہاں کیمیائی محلول میں یہ خلیے بالکل اسی طرح نشوونما پا رہے تھے جس طرح انسان کے جسم میں پاتے ہیں۔ جب یہ جلد ۲/۱ انچ چوڑی اور چار انچ لمبی ہو جاتی تو ڈاکٹر گرین اسے فوراً بچوں کے جسم میں پیوند کر دیتے۔ یہ خلیے جن سے نئی جلد تیار کی گئی دونوں بچوں کی بغلوں کے اندر کی کھال کے ٹکڑے سے حاصل کیے گئے تھے۔

پانچ مہینے اسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد گلن سیلی اور رجی اب بالکل بھلے چنگے ہیں۔ یہ باقاعدہ اسکول جاتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں اور حسب معمول کھاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بچے کبھی اتنے بڑے حادثے کا شکار ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر گرین کا دعوٰی ہے کہ انہوں نے جو نیا ایجاد کیا ہے اس سے گنجے پن اور برص کا بھی علاج کیا جاسکے گا۔

انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ (اے نبیؐ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اُٹھا لے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔

(الزمر آیت ۸)

فلکیات کی تاریخ

سید قاسم محمود

قدیم زمانے میں فلکیات اس بنیادی تصور پر قایم تھی کہ زمین فرش ہے اور آسمان چھت ہے۔ اس چھت میں سورج، چاند، ستارے ٹنکے ہوئے ہیں اور یہ چھت رات دن گردش میں ہے جس کی وجہ سے یہ سب چیزیں بھی گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ پرانے ہیئت دانوں کے نزدیک دنیا فضا میں معلق تھی اور اس کے چاروں طرف آسمان تھا۔ ایک آسمان نہیں بلکہ سات آسمان خول درخول زمین کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان ساتوں آسمانوں میں سات سیارے چاند، عطارد، زہرہ، سورج، مریخ، مشتری، زحل یعنی ایسے اجرام فلکی، جو ستاروں کے درمیان اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں، جڑے ہوئے تھے۔ ان سات افلاک کے اوپر یا باہر آٹھواں فلک تھا جو فلک ثابتہ کہلاتا تھا۔ اس میں وہ ہزاروں ستارے تھے جو آسمان میں بکھرے ہوئے ہیں اور جو ہمیشہ ایک ساتھ اور ایک چال سے چلتے ہیں۔ یہ افلاک برابر جنبش میں تھے اور ان ہی کی گردش کے سبب سے سیارے اور ستارے مختلف طور سے حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ زمین جس پر ہم انسان رہتے ہیں تمام کائنات کا مرکز تھا اور باقی تمام چیزیں اسی کی آسائش یا زیبائش کے لیے بنی تھیں۔

بابلی فلکیات فلکیات کے بالکل آغاز کی کہانی تو اب تک پردۂ راز میں ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ عیسائیت اور اسلام سے پہلے چینیوں، ہندوؤں، کلدانیوں اور مصریوں نے اجرام فلکی کا باضابطہ مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا۔ فلکیات کی تاریخ کا سب سے پہلا اہم اور قابلِ ذکر انکشاف کلدانیوں نے کیا تھا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کئی صدیاں پہلے بتا دیا تھا کہ سورج اور چاند کے گرہن ایک خاص مدت کے بعد جسے "صاروس" کہتے ہیں، لگتے ہیں۔ صاروس ۶۵۸۵ دن (یعنی تقریباً ۱۸ سال ۱۰ دن) کے برابر ہوتا ہے۔ کلدانی اور مصری دونوں اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ ایک سال ۳۶۵ ¼ دن کے برابر ہوتا ہے۔ دریائے نیل کی طغیانی کا اندازہ کرنے کے لیے وہ باقاعدہ یوم شماری کرتے تھے۔ اہرام مصر کی صحیح پیمائشوں اور دوسرے بالکل درست حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معمار فلکیات کا کافی علم رکھتے تھے۔ مصریوں کے بعد یونانیوں کی باری آتی ہے۔ انہوں نے واقعی علوم کو سائنسی درجہ دینے میں تاریخ ساز کام کیا ہے اور فلکیات کو بھی ایک سائنس بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اگرچہ افلاک پر ان کی نظر سائنس داں کی نظر نہ تھی بلکہ فلسفی کی نظر تھی۔

یونانی فلکیات :- بابلی اور کلدانی ہیئت داں زیادہ تر مشاہدۂ افلاک سے غرض رکھتے تھے، لیکن یونان کے فلسفی مظاہر قدرت کی علّت وغایت پر زیادہ غور کرتے تھے۔ یونانی مفکروں میں ثالیس (۶۴۰ — ۵۴۶ ق م) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے مصری فلکیات کو یونان میں متعارف کرایا۔ اس نے سورج گرہن اور چاند گرہن کی اصل وجہ بیان کی مگر لوگوں نے اس کی رائے کا مذاق اڑایا۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے کامل سورج گرہن کے متعلق جو ۵۸۵ ق م کو ہونے والا تھا، حساب لگا کر اس کی صحیح تاریخ معلوم کی اور برسوں پہلے اس تاریخ کا اعلان کر دیا۔ لوگوں نے اس تاریخ کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا اور جب اس تاریخ کو عین دن کے وقت رات کا سا اندھیرا چھا گیا تو ثالیس کی عظمت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اہل یونان کے نزدیک سورج روشنی کا ایک بہت بڑا استھال تھا جس کا سائز وہ اتنا ہی سمجھتے تھے جتنا وہ ظاہری آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ ثالیس نے سورج کے متعلق پہلے پہل یہ انکشاف

کائنات کی وسعت، بناوٹ اور اجرام فلکی کی ماہیت اور فاصلوں کا آج تک صحیح اندازہ نہیں ہو سکا

کیا کہ وہ لاکھوں میل چوڑا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج کا قطر آٹھ لاکھ چونتیس ہزار میل ہے۔ اس لیے تالیس کے لیے، جس کے پاس پیمائش کے جدید آلات نہیں تھے۔ سورج کے قطر کو لاکھوں میل کا قرار دینا اس کی ہیئت دانی کا ایک شاہکار ہے۔ تالیس سے پہلے شمسی سال، جس کے مطابق موسم بدلتے ہیں، ۳۶۰ دن کا سمجھا جاتا تھا۔ تالیس پہلا شخص تھا جس نے اسے ۳۶۵ دن کا بتایا۔ تالیس کا خیال تھا کہ زمین ہی کائنات کا مرکز ہے۔ اس لیے چاند، سورج اور ستارے تمام کے تمام زمین ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس نے پانی کو تمام کائنات کا منبع قرار دیا۔

تالیس کے ہم عصر اناکسی مندورس (پ ۶۱۰ ق م) کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ہی دائرۃ البروج اور نقطۂ اعتدالین متعین کیا تھا۔ یعنی مشاہدے کے بعد یہ حقیقت بیان کی تھی کہ آسمان پر سورج کا ظاہری راستہ فلکی خط استوا کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اس نے فلکی قطب سے ۹۰ درجے کے زاویے پر آسمان پہ ایک قیاسی خط کھینچ دیا تھا اور وہ نقطہ متعین کر دیا تھا جس کے گرد افلاک گردش کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ جس بنیادی عنصر سے کائنات بنی ہے وہ پانی ہے۔ اس سلسلے میں وہ تالیس کا ہم خیال تھا۔ ان دونوں کے برعکس ان کا ہم عصر فلسفی اناکسی مینز پانی کو کائنات کا بنیادی عنصر خیال نہیں کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ کائنات ہوا سے بنی ہے۔ ہرقلیطس نے کہا کہ کائنات کا بنیادی عنصر پانی ہے نہ ہوا بلکہ آگ ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے فیثاغورث اور اس کے حواریوں نے فلکیات میں غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں۔ یہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے بتایا کہ دنیا گول ہے مگر وہ یہ نہ دریافت کر سکے کہ زمین اپنے محور پہ گھوم رہی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ کائنات کے مرکز میں آگ دہک رہی ہے۔ ہماری زمین اس آگ کے گرد دہک رہی ہے۔ زمین کے علاوہ چار سیارے اور بھی اسی طرح مرکزی آگ کے گرد گھوم رہے ہیں جن میں چاند اور سورج بھی شامل ہیں۔ زمین اپنی گردش ایک دن میں چاند ایک مہینے میں اور سورج ایک سال میں مکمل کر لیتا ہے۔ ہم اس آگ کو اس لیے نہیں دیکھ سکتے کہ ہم لوگ زمین پہ مخالف سمت میں رہتے ہیں. فیثاغورث کے ساٹھ سال بعد انکساغورث نے ۴۶۰ قبل مسیح میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ابتدا میں کائنات ایک بے حرکت، جامد، یکساں قسم کا مادہ تھی۔ پھر ایک روز اچانک مادے میں "ذہن" داخل ہو گیا اور یوں مادے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ گھومنے لگا۔ گھومتے ہوئے گرداب میں گھنا، کثیف، گاڑھا، ٹھنڈا مادہ تو مرکز میں جم گیا۔ اور یوں ہماری طشتری نما زمین

وجود میں آئے اور گرم خشک اور پتلا مادہ بیرونی اطراف میں پھیل گیا۔ یوں سورج، چاند اور ستارے وجود میں آئے۔

یونانی فلسفی اور سائنس داں ایمپیڈوکلیز (پ ۴۹۲ ق م) اپنے عناصر اربعہ کے نظریے کے باعث مشہور ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عناصر چار ہیں۔ مٹی، آگ، ہوا اور پانی۔ قوتیں دو ہیں۔ ایک محبت (قوت جاذبہ) دوسری نفرت (قوت مزاحمت)۔ اس نے کہا کہ یہ عناصر جدا جدا نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی ہر مادی چیز میں یہ بیک وقت کم و بیش موجود ہوتے ہیں۔

سقراط کے شاگرد افلاطون کے "مکالمات" میں فلکیات کے بعض واضح حوالے ملتے ہیں۔ افلاطون اجرام فلکی کی حرکات کے مشاہدے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا لیکن اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ فلکی حرکات دراصل یکساں مدوّر حرکات ہیں۔

اس وقت کی یونانی فلکیات کا مکمل بیان ہمیں ارسطو کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس نے زمین کے گول ہونے کے کئی ثبوت پیش کیے۔ مثلاً یہ کہ چاند گرہن کے وقت چاند پر زمین کا سایہ گول ہوتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ جب ہم شمال یا جنوب کی سمت سفر کرتے ہیں تو بعض نئے ستارے نمودار ہو جاتے ہیں اور بعض ستارے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تمام اجرام فلکی میں سے چاند ہماری زمین کے سب سے قریب ہے۔ پھر سیارے اور پھر ثوابت۔ اس نے زمین کی محوری گردش کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ ستاروں کے محل وقوع میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ وہ کہتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج، چاند اور دیگر سیارے زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔

ارشمیدس (پ ۲۸۷ ق م) ہیئت داں تو نہیں تھا لیکن ارسطو کے برعکس وہ درست طور پر جانتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان کے ایک ہیئت داں اور ارسطو کے ہم عصر ہرقلیدس (۳۸۸ - ۳۱۵ ق م) نے یہ خیال پیش کر کے اپنے زمانے کے تمام دانش وروں کو چونکا دیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے اور چوبیس گھنٹے میں ایک گردش پوری کرتی ہے جس سے دن اور رات ظہور میں آتے ہیں۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یونان کے ایک اور ہیئت داں ارسطارخوس (۳۱۰ - ۲۵۰ ق م) نے گردش زمین کے متعلق ایک اور انقلاب انگیز نظریہ پیش کیا جو ہرقلیدس کے مفروضے سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ زمین محض اپنے محور کے گرد گردش نہیں کرتی بلکہ وہ سورج کے گرد بھی گھوم رہی ہے۔ نیز زمین کی طرح دوسرے سیارے بھی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ارسطارخوس کے ایک سو برس بعد یونانی دور کا ایک اور مشہور ہیئت داں ابرخس پیدا ہوا۔

یونانی ماہرین فلکیات میں سب سے بڑا ابرخس (۱۶۰ - ۱۲۵ ق م) تھا جسے تاریخ انسانی کا پہلا باضابطہ اور مکمل ہیئت داں کہا جاتا ہے۔ اس نے استقبال اعتدالین کا پتا چلایا۔ چاند اور سورج کی حرکات کی وضاحت کی۔ چاند اور سورج کا درمیانی فاصلہ ناپنے کے طریقے معلوم کیے۔ طریق الشمس کی بے مرکزی کا سراغ لگایا۔ ۸۰۰ ستاروں کی فہرست مدوّن کی۔ زمین کے اہم شہروں اور مقامات کے طول بلد اور عرض بلد بتا کر اُن کے محل وقوع کی نشاندہی کی۔ اس نے علم المثلثات دریافت کیا۔

ابرخس نے فلکیات کو ایک باضابطہ اور قطعی سائنس میں چھوڑا تھا اس کے بعد ڈھائی سو تین سو سال گزر گئے۔ کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ سائنس کی دنیا میں یونان کی عظمت ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔ روما نے ان تمام علاقوں پر، جو پہلے یونان کے قبضے میں تھے، تسلط جما لیا۔ روما کے اس تسلط سے سائنس کا زوال بتدریج مکمل ہو چکا تھا لیکن مصر کے ساحل پر اسکندریہ کے شہر میں، جسے چار صدیوں پہلے سکندر اعظم نے بسایا تھا، علم کے چراغ کی مدھم روشنی میں دوسری صدی عیسوی کے نامور ہیئت داں بطلیموس نے آنکھ کھولی۔ وہ اسکندریہ کے مکتبِ فکر سے وابستہ ہونے کے باعث یونان کا آخری ہیئت داں تھا۔ بطلیموس نے کہا اور پورے زور سے کہا کہ زمین ساکن ہے اور سورج، چاند، سیارے اور ستارے اس کے گرد گھومتے ہیں آنے والی صدیوں میں بطلیموس نظریہ ہی مسلّمہ حقیقت بنا رہا۔ یہاں تک کہ کوپرنیکس نے چودھویں صدی میں اس کو غلط ثابت کیا۔ بطلیموس نے فلکیات کے تمام علم کو، جو اُس زمانے تک جمع ہو چکا تھا، ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ یہ کتاب "المجسطی" صدیوں تک فلکیات کی ایک مستند کتاب مانی جاتی رہی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں اس کتاب کا پہلی بار

ی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ مسلمان ہیئت دانوں پر اس کتاب کا اثر بہت گہرا
ا اور بطلیموس کے نظریۂ گردش افلاک کو پورے اسلامی دور میں صحیح سمجھا
ا رہا۔

اسلامی فلکیات :- مسلمان فلکیات کو ہیئت (کائنات کی
یت کا علم) اور علم الافلاک (اجرامِ فلکی کا علم) کہتے ہیں۔ ارسطو کی تقسیم
دم کی تقلید میں مسلمان ہیئت کو چار علوم ریاضیہ میں سے ایک تصور کرتے
یں۔ یونانیوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ علم ہیئت کا مقصد صرف ستاروں
ی ظاہری حرکات کا مطالعہ اور ہندسی نقطۂ نظر سے ان کی تعبیر ہے۔ اس لیے
اس علم پر مشتمل ہے جسے ہم ہیئتِ کروی کے نام سے موسوم کرتے ہیں
ں میں سیاروں کے مداروں کا حساب لگایا جاتا اور اس سے زیجوں
ی ترتیب میں کام لیا جاتا ہے)۔ آلات کے نظریے" بھی اس میں شامل ہیں۔
رسطو کے مفہوم میں شہابات (جن میں دم دار تارے اور ٹوٹتے ہوئے تارے
وغیرہ بھی شامل ہیں) اور اس علم کا مطالعہ جسے ہم ابتدائی فلکی طبیعیات اور
لکی میکانیات سے تعبیر کرتے ہیں، تمام تر طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے
دائرے میں شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ان تجربی معلومات کا ماحصل
ہے جو بذریعہ حساب، یا آلات کی مدد سے، زمانہ، شب و روز کے تعین کے
لیے ضروری ہیں۔

اسلام کے قرونِ اولیٰ میں عرب کے لوگ عملی ہیئت کا کچھ علم رکھتے تھے
بسا اوقات رات کے سفر میں بدوؤں کا چاند اور روشن ترین ستاروں
کے سوا کوئی اور راہنما نہ ہوتا تھا۔ وہ ان کے مقامات طلوع و غروب سے
واقف تھے اور ان سے رات کے اوقات کا تقریبی اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ
یکے بعد دیگرے نمودار ہونے والے ستاروں کے جھرمٹوں میں جنہیں منازل
القمر کہتے ہیں۔ چاند کے اضافی مقام کو دیکھ کر سالانہ فصلوں کا تعین بھی کر سکتے
تھے۔ عصری قبائل میں سے اکثر یہ سمجھتے تھے کہ فصلی موسموں اور موسمی پیشین گوئیوں
کا تعلق بھی بعض ستاروں کے سالانہ طلوع و غروب یا فضا میں منازل کے
غروب سے ہے۔

علم ہیئت کا مطالعہ علمی نقطۂ نظر سے دوسری صدی ہجری/آٹھویں
صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ یہ ہندوؤں کی دو کتابوں کے زیر اثر تھا
(۱) برہم سپھٹ سدھانت، جو برہم گپت نے ۶۲۸ء میں لکھی تھی اور
بغداد کے دربار میں شاید خلاصے کی صورت میں ۷۷۱ء میں لائی گئی۔ اسے ابراہیم بن
حبیب الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں ایک نمونہ سمجھ کر استعمال کیا۔
۲۔ آریا بھٹ کی کتاب (عربوں کی الارجبہد یا الارجبھر) جو ۵۰۰ء
میں تالیف ہوئی اور اس سے ابو الحسن اہوازی نے سیاروں کی حرکات کی جداول
تیار کیں۔ یہ کتابیں مختصر سے توضیحی متن پر مشتمل تھیں۔ جن کے بعد حرکاتِ سماوی
کی بہت سی جداول تھیں جو مفروضہ ہزار سالہ ادوار کے مطابق مرتب تھیں
ان کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ تکوینِ عالم کے وقت چاند اور دوسرے سیارے
سب ایک ہی درجۂ طول میں حالتِ اقتران میں تھے اور لاکھوں سال بعد پھر
اقتران میں ہوں گے۔ یہ طریق جو السند ہند (سنسکرت کتاب ہیئت سدھانت
کی تحریف) کے نام سے موسوم تھا، گیارہویں صدی کے آغاز تک مسلمان ماہرین
ہیئت کے ہاں رائج رہا۔ ہندوؤں کی کتابوں ہی کی مدد سے مسلمانوں نے
مثلثاتی جیوب کا استعمال سیکھا تھا۔ -

ہندوؤں کی کتابوں کے ان منتخبات پر بہت جلد پہلوی جداول
"زیک شتر دایار" (شاہی فلکی جداول) کے عربی ترجمے کا اضافہ ہوا۔ یہ ساسانیوں
کے آخری زمانۂ حکومت میں مدوّن ہوئی تھیں۔ نویں صدی عیسوی کے مسلمانوں
میں یہ عام طور پر رائج تھیں لیکن دو سو سال بعد ان کا رواج جاتا رہا۔

یونانی اثر کا درجہ بلحاظ زمانہ موخر لیکن بلحاظ اہمیت مقدم ہے۔
اسی سے اسلامی علم ہیئت میں حرکات سماوی کی ہندسی تعبیر رائج ہوئی جو
یونانی فطانت کا خاصّہ ہے۔ کتاب المجسطی" کا سب سے پہلا عربی ترجمہ جو زیادہ
قابل اطمینان نہ تھا، آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر یا نویں صدی عیسوی
کے اوائل میں ہوا۔ اس کے بعد دو ترجمے اور ہوئے۔ جو اس سے کہیں بہتر تھے
ایک حجاج بن مطر نے ۸۲۸ء میں ختم کیا۔ دوسرا حنین بن اسحاق نے نویں
صدی عیسوی کے وسط کے بعد کیا، جس کی تصحیح بعد میں ثابت بن قرہ نے کی
نویں صدی کے نصف اوّل ہی میں عربوں نے بطلیموس کے جغرافیہ، "دستی جداول"
سیّاروں کے اصول مفروضہ اور کرۂ مسطح کا بھی ترجمہ کیا۔ اسی زمانے
میں تاؤن اسکندری کی دستی جداول، سورج اور چاند کی جسامت اور
فاصلوں پر ارسطرخس کی تصنیف، اوطولوقس کے دو رسالوں، ذسیوس کے
تین اور ابسقلاوس کے ایک رسالے کا ترجمہ ہوا۔ بہت اغلب ہے کہ اسی صدی
میں امونیوس کی جداول اور کتاب موسوم بہ "کتاب المنشورات" کا بھی عربی میں

ترجمہ ہوا اجرام فلکی کی جسامت اور فاصلے سے متعلق اور غلط طور پر بطلیموس سے منسوب ہے۔

بظاہر نویں صدی کے اوائل میں اچھے خاصے صحیح آلات کی مدد سے باقاعدہ ترصید کا سب سے پہلا سلسلہ جندی ساپور (واقع جنوب مغربی ایران) میں شروع ہوا۔ اس سے احمد نہاوندی نے اپنے عمومی جداول "الزیج المشتمل" کی تالیف میں کام لیا۔ بہرکیف اسلامی علم ہیئت کے درخشاں ترین دور کا آغاز خلیفہ مامون الرشید کے عہد خلافت (۸۱۳ تا ۸۳۳ء) میں ہوا۔ بغداد کے محلہ شماسیہ میں جو رصدگاہ واقع تھی اس میں خلیفہ کے ماہرین ہیئت نے یحییٰ بن ابی منصور (م ۸۳۰ یا ۸۳۱ء) کے زیر نگرانی نہ صرف حرکات فلکی کا باقاعدہ مشاہدہ کیا بلکہ المجسطی کے تمام بنیادی ابتدائی اصولوں کی غیر معمولی طور پر صحیح نتائج سے تصدیق بھی کی۔ مثلاً طریق الشمس کا میلان، اعتدالین کا استقبال اور سال شمسی کا طول وغیرہ۔ ان مشاہدات کے بعد انہوں نے اپنی مصدقہ جداول مرتب کیں جو "الزیج الممتحن" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان جداول کی تدوین میں ان کے پیش نظر وہ سلسلۂ مشاہدات بھی تھا جو خلیفہ کی ایک اور رصدگاہ پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ رصدگاہ دمشق کے شمال میں ڈھائی میل دور کوہ قاسیان پر واقع تھی۔ المامون ہی کے عہد میں مساحت ارضی کے متعلق ایک نہایت مشکل اور دقیق عمل انجام دیا گیا جس میں تدمیر Palmyra اور الرقہ (جو بین النہرین کے میدانوں میں واقع ہے) کے درمیانی علاقے میں خط نصف النہار کی قوس کی پیمائش کی گئی۔ نتائج کے اوسط سے نصف النہار کے ایک درجے کا طول ۵۶⅔ عربی میل نکلا اور یہ قیمت حیرت انگیز طور پر صحیح ثابت ہوئی چونکہ عربی میل کی لمبائی ۶۴۷۳ فٹ ہوتی ہے، اس لیے یہ قیمت ۳۶۶۸۴۲ فٹ ہوگی۔ یہ عدد عرض بلد ۳۸ اور ۳۶ شمالی کے درمیان درجے کی اصل لمبائی سے صرف تقریباً ۲۸۷۷ فٹ زائد ہے۔

المامون کے زمانے کے فلکی حساب دانوں میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کا نام بھی قابل ذکر ہے جس کی مرتبہ زیج کا دو صدیوں تک بہت رواج رہا۔

۸۵۰ سے ۸۷۰ء تک موسیٰ بن شاکر کے تینوں بیٹوں نے اپنی رصدگاہ میں جو انہوں نے بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے باب الطاق پر اپنے مکان میں قائم کر رکھی تھی باقاعدہ مشاہدات کیے۔ نویں صدی ہجری کے نصف آخر میں بعض دوسرے ہیئت دانوں نے نہایت عمدہ آلات کی مدد سے شیراز، نیشاپور اور سمرقند میں مشاہدات کو جاری رکھا۔ مشہور ماہر فلکیات البتانی نے ۸۷۷ سے ۹۱۸ء تک دریائے فرات کے کنارے الرقہ کے مقام پر مشاہدات کیے۔ ثابت بن قرہ نے اپنے پیشروؤں کے مشاہدات کو سورج کی حرکات کے نظریے کی تصحیح میں استعمال کیا۔ الماہانی اور النیریزی نے افلاک کا براہ راست مطالعہ باقاعدہ جاری رکھا۔ ۹۱۳ء کے کچھ ہی بعد حبش نے بغداد میں اپنی اہم ترین کتاب تالیف کی جس میں مثلثاتی عمل کو غیر متوقع حد تک پہنچا دیا گیا۔ دسویں صدی کے نصف ثانی میں سلاطین آل بویہ نے اپنے ہی محل میں ایک رصدگاہ قائم کی۔ انہوں نے اپنے ہاں جن ہیئت دانوں کو جمع کیا ان میں عبدالرحمٰن الصوفی، ابن الاعلم، ویجن بن رستم الکوہی، احمد الصاغانی، ابوالوفاء وغیرہ شامل تھے۔ غزنہ (مشرقی افغانستان) البیرونی کی بیشتر علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جہاں تک طبیعی اور ریاضیاتی علوم کا تعلق ہے البیرونی اسلام کا سب سے زیادہ طباع اور مفکر تھا۔

مصر میں علم ہیئت کے سائنسی مطالعے کی ابتدا فاطمی خلیفہ العزیز (۹۷۵ تا ۹۹۶ء) کے عہد میں ہوئی۔ اس نے قاہرہ میں ایک مشہور رصدگاہ قائم کی جسے خلیفہ الحاکم نے بھی ایک بیش قرار وقف عطا کیا۔ یہیں ابن یونس نے اپنے مشاہدات کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری رکھا جو بعد میں اس کی مشہور جداول "الزیج الحاکمی" کی بنا قرار پایا۔ مصنفین علم ہیئت کے ضمن میں ابن الہیثم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ ایک مقبول عام چھوٹے سے کتابچے کا مصنف تھا۔

اندلس میں علم ہیئت کے مطالعے کا ذوق خاص طور پر دسویں صدی کے وسط سے پیدا ہوا۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کے رؤسا نے اس کی سرپرستی کی اور یہ عربوں ہی کے علم ہیئت کے طفیل ہے کہ قشتالہ کے الفانسو دہم کے حکم سے پہلے ہسپانوی اور پھر لاطینی زبان میں اس پر کتابیں لکھی گئیں۔ اندلس کے ممتاز ترین ہیئت دان حسب ذیل تھے۔ المجریطی، ابن السمح، جابر بن افلح اور بالخصوص الزرقالی، جو گیارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوا ہے۔ اسی طرح ہسپانیہ ہی کے فلاسفہ نے حرکات سماویہ کی بطلیموسی تعبیرات کی مخالفت کی۔ مصر کے مغربی جانب شمالی افریقہ میں کوئی باقاعدہ رصدگاہ نہ تھی۔ تاہم بعض ہیئت دانوں کا جنہوں نے اچھے مشاہدات کیے، ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ابوعلی المراکشی، جس کی تصانیف مراکش میں ۱۲۵۰ء کے قریب وجود میں آئیں۔

شمالی ایران کے سلجوقی سلاطین نے اپنے ہاں متعدد ہیئت دان جمع کر لیے خاص ان کے استعمال کے لیے ایک رصدگاہ موجود تھی جو سلطان جلال الدین ملک شاہ نے رے یا نیساپور میں قائم کی تھی۔ یہ وہی سلطان ہے جس نے سرکاری تقویم میں شمسی سال کے طول کی صحیح تخمین پر مبنی ایک نہایت اہم اصلاح نافذ کی تھی۔ اس کے ایک

جانشین کے لیے مشہور ہیئت داں الخازنی نے اپنی قابل قدر جداول مرتب کیں جو "الزیج السنجری" کے نام سے موسوم ہیں۔

بغداد کی تاخت و تاراج اور خلافت عباسیہ کو ختم کرنے کے ایک سال بعد مغول کے ایلخانی خاندان کے خان ہولاگو نے مغربی ایران میں جھیل ارمیہ کے قریب مراغہ کے مقام پر ۱۲۵۹ء میں ایک عظیم رصدگاہ کی تعمیر شروع کی۔ اس رصدگاہ کے ساتھ منتخب ہیئت دانوں کی ایک جماعت نصیرالدین طوسی کی سرکردگی میں وابستہ تھی۔ طوسی نے بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد زبان فارسی میں اپنی مشہور جداول شائع کیں جو "الزیج الایلخانی" کے نام سے موسوم ہیں۔ قطب الدین محمود شیرازی بھی جو نصیرالدین کا شاگرد تھا، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

قاہرہ میں ابن الشاطر نے اچھے مشاہدات کیے۔ اس کی تیار کردہ جداول مصر، شام اور تمام شمالی افریقہ میں بہت مشہور ہوئیں۔

مسلمانوں کا علم ہیئت سمرقند میں اپنے اوج کمال پر پہنچا۔ امیر تیمور کے پوتے سلطان الغ بیگ نے اس مقام پر ایک بہت بڑی رصدگاہ قائم کی۔ جہاں اُس نے اپنے زمانے کے ممتاز ہیئت دانوں مثلاً جمشید الکاشی قاضی زادہ، الرومی، علی القوشجی وغیرہ کو بلا بھیجا اور کئی سال تک بذات خود مشاہدات

چاند کا یہ فوٹو "سرویئر پنجم" نے ۱۳ جولائی ۱۹۶۷ء کو صبح سوا چھ بجے اس وقت لیا تھا جبکہ وہ ابھی چاند پر نہیں گیا تھا۔"

(بائیں ہاتھ تین بڑے کلاس نظر آرہے ہیں۔ تصویر کا شمال چاند کا شمال ہے یہ تصویر ۲۵ ایم ایم کے عدسے والے [illegible] کیمرے سے اتاری گئی تھی۔)

کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کی اپنی جداول اس کے علمی ذوق و شوق کی شاندار یادگار ہیں۔ نصیرالدین کی طرح الغ بیگ نے صرف حرکات سماویہ کی جدولوں کی اصلاح ہی نہیں کی بلکہ اس نے اپنے پیش روؤں کی تیار کردہ زیجوں کی بطور خود مکمل نظرثانی بھی کی، جو افلاک کے براہ راست مشاہدے پر مبنی تھی۔ سلطان نے ایک قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے چند ماہ پہلے اپنی کتاب کا مقدمہ فارسی میں خود لکھا تھا۔

الغ بیگ کی ذات کے ساتھ ہی تمام اسلامی دنیا میں فلکیات کی علمی تحقیقات ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ہمیں صرف چھوٹی چھوٹی ابتدائی کتابوں کے مصنف، زیجوں اور تقویموں کے مولف اور ربع العالم آلات رصد کے تشریح نگار ملتے ہیں۔ باوقار ہیئت داں نابود ہو گئے، صرف مسجدوں کے موقت باقی رہ گئے۔

مسلمان ہیئت دانوں نے بلاشبہ بطلیموسی نظام عالم کی بنیادی خصوصیات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی جدولوں میں ہمیشہ اسی کا اتباع کیا ہے۔ یعنی زمین کائنات کے مرکز پر مطلقاً بلاحرکت قائم ہے اور اجرام فلکی کی تمام حرکات مستدیر اور یکساں ہوتی ہیں اور ان کی ظاہری نامساواتوں کی توجیہ منطقۃ البروج کے ہم مرکز دائروں، خارج المرکز دائروں اور افلاک تداویر کے اجتماع سے کی جاتی ہے۔ چوتھی صدی ہجری ہی میں اس سوال پر بحث کی گئی تھی کہ آیا اپنے محور کے گرد زمین کی گردش کا امکان ہے؟ لیکن بعد کی صدیوں میں اس کا مطلقاً ساکن ہونا ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا۔ افلاک کی نوعیت کا سوال صرف فلاسفہ اور غیر استدلالی علمائے دین کے زیر بحث رہا۔ ابتدائی صدیوں کے ہیئت دانوں کو اس بحث سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے علم کی اغراض کے لیے انہیں محض ہندسی دائرے تصور کرنے پر ہی اکتفا کرتے رہے۔ علم ہیئت میں مجسم اور شفاف کروں کا تصور صرف ابن الہیثم کے زمانے میں داخل ہوا۔ اگرچہ خارج المرکز دائروں افلاک تداویر کے مفروضے سے سیاروں کی حرکات کا تصور نہایت پیچیدہ بن گیا تھا، تاہم بلا امداد دوربین) مشاہدے پر مبنی مقدمات کے ساتھ اس کی پوری تطبیق ہوتی تھی جو ایک حاسب کی ضروریات کے لیے کافی تھی اور ان کی بجائے ایسے مفروضات قبول کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی جن کی کوئی قابل اطمینان توجیہ طبیعی اس وقت تک موجود نہ تھی، ان کے ہاں ہمیں شمسی مرکزی نظام کا سراغ نہیں ملتا، جو بیک وقت بطلیموس کی سند، ارسطو کے فلسفے اور نجومیوں کے اعتقادات کے خلاف ہوتا۔ ہمیں یہ

بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک نظام کوپرنیکس ہمارے لیے محض ایک فلسفیانہ مسئلہ بنا رہا۔ مشاہدے پر مبنی علم ہیئت کے ساتھ اسے کچھ سروکار نہ تھا اور اس کی بنا پر کوئی فیصلہ کن یا اہم دلیل اس کی تائید میں پیش نہ کی جاسکتی تھی۔

عرب ہیئت داں اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے عام نظریے پیش کرنے کی بجائے جن کے لیے قدیم نظریوں ہی کی طرح کوئی عملی ثبوت پیش نہ کیا جاسکتا ہو یہ زیادہ ضروری ہے کہ صدیوں تک افلاک کا باقاعدہ مشاہدہ کیا جائے اور اس طرح "المجسطی" میں دیے ہوئے اعداد کی تصحیح کی جاسکے۔ یہ کام انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور اس میں وہ کبھی بطلیموس کے نام نہاد مغالطہ آمیز مشاہدات سے متاثر نہ ہوئے۔ انہوں نے یہ معلوم کیا کہ اوج شمس (جسے قدما غیر متحرک سمجھتے تھے اور جس کا مشاہدہ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق ہمیشہ طول بلد کے ایک ہی نقطے سے کیا تھا) استقبالِ اعتدالین کا تابع ہے۔ الزرقالی تو اس حد تک کامیاب ہوا کہ اس نے اوج شمس کی مخصوص خفیف حرکت کا بھی سراغ لگا لیا۔ انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ طریق الشمس کا میلان ناقابل تغیر نہیں، جیسا کہ یونانیوں کا فرضی مشاہدات کی بنا پر ادعا تھا۔ بلکہ آہستہ آہستہ دائماً کسی طرف مائل ہے جس کی حدود کا اندازہ قدرتی طور پر اٹھارھویں صدی کی فلکی میکانیات ہی سے ہوسکا ہے۔ سورج اور ایک حد تک چاند کے متعلق ابتدائی معلومات، شمسی اور کواکبی سال کی میعاد اور استقبالِ اعتدالین کی تحقیق انہوں نے حیرت انگیز صحت کے ساتھ کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ستاروں کی جدولوں کی بھی اصلاح کی۔ نصیرالدین طوسی نے بطلیموس کی ہندسی اشکال کو پیچیدہ تر بنا کر نظریہ سیارگان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عرب ہیئت دانوں نے یونانیوں کے خلاف زہرہ کے ادوار کا دویر (پلٹ) دیتا خروج المرکز اور تعدیل المرکز قرار دیا جو سورج کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا مفہوم بنیادی طور پر زہرہ کے مدار کو مدار شمس کی تدویر میں تبدیل کرنا ہے جس کا مرکز خود سورج ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زہرہ کو سورج کا تابع سیارہ قرار دیا جائے۔ عربوں کی مرتب کردہ کواکب ثابتہ کی فہرستوں کے لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ وہ محض بطلیموس کی فہرستوں سے ماخوذ نہیں۔ آخر میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علم مثلثات کے ضابطوں کے اطلاق اپنے آلات رصد کے اوصاف و تعداد اور اپنے مشاہدات کے طور طریق میں عربوں کو اپنے پیشرو یونانیوں پر نمایاں سبقت حاصل ہے مشاہدات کی تعداد، تسلسل اور صحت کے لحاظ سے یونانی علم ہیئت کے مقابلے میں اسلامی ہیئت کی برتری آشکارا ہے۔

کواکب ثابتہ کے اہتزاز یعنی ان کی آگے پیچھے حرکت کا مفروضہ، جسے ثابت بن قرہ نے صحیح تسلیم کیا تھا اور کسی قدر مختلف صورت میں الزرقالی نے بھی اسے قبول کیا تھا، غلط ہے، اسے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طریق الشمس کے میلان اور استقبال کے متعلق یونانیوں اور عربوں کے مشاہدات میں مطابقت پیدا ہو جائے۔

تیسری قمری عدم مساوات یا اختلاف کا اکتشاف غلط طور پر ابوالوفا سے منسوب کیا جاتا ہے حالاں کہ یہ پہلے پہل ٹائیکو براہے نے دریافت کیا تھا۔

سربرآوردہ عالم دین، فلسفی اور منجم فخر الدین الرازی نے کئی موقعوں پر ہیئت دانوں کے بنیادی مفروضات کے متعلق اپنے گہرے شکوک کا اظہار کیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہسپانیہ کا ہے کہ وہاں بعض فلاسفہ نے ارسطو کے نام پر حرکات سماویہ کی بطلیموسی تعبیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ان میں پیش پیش ابن باجہ تھا اس نے تداویر کو مسترد کر دیا اور دعویٰ کیا کہ خارج المرکز دائروں کے ذریعے جملہ امور کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ ابن طفیل نے تداویر اور خارج المرکز دائروں دونوں کو رد کر دیا۔ لیکن اس رائے کی کوئی تحریری وضاحت موجود نہیں۔

عظیم نبولا انڈرومیڈا میں ایک کہکشاں
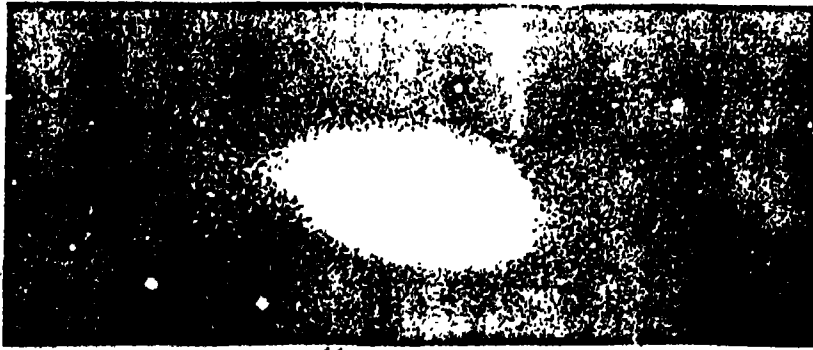
..رشد (م ۱۱۹۸ء) نے ہم مرکز کروں کے مفروضوں کو مع ان کی مرغولہ نما
سیاروی حرکات کے بڑی حد تک پھر زندہ کیا۔ جو لمبوتری شکل کے مانند طریق
شمس کے مطابق ہوتی ہیں اس کا نصف حصہ مشرقی نصف کرے اور دوسرا
نصف حصہ مغربی نصف کرے میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس نظام کی مکمل
تشریح کی مہلت نہ مل سکی۔ آخر میں البطروجی نے اس غرض سے کہ ہیئت مشائی
(ارسطا طالیسی) طبیعیات کے اصولوں کے مطابق ہو جائے۔ ابن رشد کی طرح نہ
صرف ایسے کرات کو تسلیم کر لیا جو زمین کے ساتھ ہم مرکز ہیں اور مختلف محوروں
پر گردش کرتے ہیں بلکہ اس نے ایک اور عجیب وغریب مفروضہ بھی قائم کیا جس
میں وہ اخوان الصفا اور فخر الدین رازی سے متفق تھا۔ اس کے بموجب اس
نے اجرام فلکی کی مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کے وجود کا انکار کیا یعنی اس
کا خیال تھا کہ سیاروں کی (مشرق کی جانب) براہ راست حرکت محض ایک فریب
نظر ہے جس کا باعث یہ ہے کہ سیاروں کی زاویائی سرعت اس سرعت سے
کم ہے جس سے کرۂ سماوی زمین کے گرد اپنی یومیہ گردش کی تکمیل کرتا ہے۔ ہسپانوی
فلاسفہ کے ان مفروضات کو ہیئت دانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا

تقریباً ۱۰۰۰ء کے بعد مسلمان ماہرین فلکیات کے ہاں کائنات کی
ہندسی شناخت کا جو تصور پایا جاتا تھا وہ بہت حد تک بطلیموس کے اس
نظریے کے مطابق تھا جو اس نے اپنی کتاب المجسطی میں پیش کیا۔ یعنی زمین
آٹھ کروں کے ایک سلسلے کے تقریباً مرکز میں غیر متحرک اور ساکن ہے اور
یہ کرے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ آٹھواں کرہ ثوابت سے پیوستہ ہے اور
روزانہ مشرق سے مغرب کی جانب گردش کرتا ہے۔ اس کی ایک حرکت مخالف
سمت میں بھی ہے جو قریب قریب استقبال اعتدالین کے برابر ہوتی ہے۔ ایک
اور نظریے کے مطابق یہ کرہ اپنی روزانہ گردش کے علاوہ ایک ارتعاشی حرکت
بھی کرتا ہے جسے اصطلاحاً اہتزاز طریق الشمس کہا جاتا تھا۔ زمین سے خارج
المرکز پانچ ثوابت کے کرے اس طرح گردش کرتے ہیں کہ ان کے مراکز گردشی
مراکز ہندسی کے مطابق نہیں ہوتے۔ عطارد کا نمونہ تیار کرتے وقت بطور
خاص گردانہ میکانیات سے کام لیا جاتا ہے اور یوں اس کے مدار میں دو
حضیض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کروں کی سطح پر سیاروں کے دو دو دائرۂ تدویر
واقع ہیں۔ شمس کے نمونے کی گردش صرف خارج المرکز دائرے کی صورت میں
ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قمر کے نمونے میں نہ صرف "گردانہ میکانیات" سے
کام لیا جاتا ہے جس کے باعث اس کا مرکز تدویر زمین کے مرکز کے گرد گھوم
سکتا ہے۔ بلکہ دائرۂ تدویر سے بھی، جس میں شمسی اوجی حرکت دائرۂ تدویر
کے اوج مدار سے نہیں بلکہ اس خط کے ایک نقطے سے شمار کی جاتی ہے
جو "گردانہ میکانیت" کے محیط پر واقع "نقطۂ مخالف" سے دائرۂ تدویر
میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ مسلمان ہیئت دانوں کی بیشتر مساعی اس نظام
کی پیچیدگیوں کی وضاحت اور مقادیر کی باریکیوں سے بحث کرنے پر مشتمل
رہیں، جن کی رو سے یہ حرکات فلکی کے ماہیتی سے کمیتی نمونے میں منقلب ہو جاتا
ہے۔ یہاں اس امر کا بیان بھی مناسب ہوگا کہ علم ہیئت پر ہندی اور
ساسانی کتابوں کے تراجم کے باعث مسلمانوں کے علم ہیئت نے اجرام فلکی
کے ہندسی نمونوں کے بجائے حسابی منہاجات، مقادیر معلومہ اور جداول
کو قبول کیا۔ اس طرح انہوں نے مذکورہ بالا بطلیموسی نظام افلاک میں
کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا۔

چکردار کہکشاں

• "المجسطی" کے مصنف کی تقلید میں مسلمان علمائے فلکیات کے
ہاں اس سارے نظام کا تصور ایک ایسی ریاضیاتی شکل کا تھا، جس کا
ضروری نہیں کہ کوئی طبیعیاتی مثنیٰ بھی ہو۔ بایں ہمہ ابن الہیثم نے اس روایت
کو آگے بڑھایا جس کا آغاز بطلیموس کی اپنی "فرضیات" کی کتاب دوم میں
ہو چکا تھا۔ ابن الہیثم کے نزدیک "المجسطی" میں دیے ہوئے فی الواقع طبیعیاتی

خارجیتیں۔ اس نظریے کو قبول کرنے والوں کے پیشِ نظر مسئلہ یہ تھا کہ ان
نمونوں کو ارسطاطالیسی طبعیات سے کیسے تطبیق دی جائے، جس کی رُو
سے اجرامِ سماوی کے لیے صرف ایسے غیر متبدل گردش ممکن ہے جو زمین کے مرکز
کے ساتھ ساتھ متحد المرکز ہو۔ اندلس کے فلاسفہ نے جن کے سلسلے کی
ابتدا ابن باجہ سے ہوئی اور ابن طفیل، ابن رشد اور ابن بطروجی کے
ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس مسئلے کو کچھ یوں حل کرنے کی کوشش کی
کہ یا تو دائرہ تدویر کو جزوی طور پر ختم کر دیا جائے یا کائنات کے اثیری اجرام
سے دائرہ تدویر اور خارج المرکز دائروں کو مکمل طور پر نکال دیا جائے
لیکن ان کی یہ کوشش فلکیاتی نقطۂ نظر سے بار آور ثابت نہیں ہوئی —
تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر اور چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں
اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں سے مراغہ، تبریز اور دمشق میں زیادہ
حقیقت پسندانہ کوشش کی گئی۔ وہاں مقصود محض یہ تھا کہ بطلیموسی نظام
سے غیر ارسطاطالیسی عناصر، یعنی غیر متبدل اور یکساں گردش کے مرکز اور
قمر کا نقطۂ مخالف، حذف کر دیے جائیں، تاکہ اجرام فلکی کی حرکات کو
یکساں گردشوں کے اجتماعات ہی کے ذریعے ظاہر کیا جا سکے۔

عربوں کو بطلیموسی فلکیات نے ہمیشہ سے متاثر نہیں کیا۔ زمانۂ جاہلیت
اور پہلی صدی ہجری میں عربوں کا علم ہیئت بس یہیں تک محدود تھا کہ وہ اٹھائیس
منازل قمر کے ذریعے اوقاتِ شب اور طلوع و غروبِ شمسی (انواع) سے موسمول
کے بارے میں سرسری سا اندازہ لگا سکتے تھے۔ دوسری اور تیسری ہجری میں یعنی
خلافت امیہ کے زوال اور خلافت عباسیہ کے پہلے ڈیڑھ سالہ دور میں علم
ہیئت (نیز علم نجوم، جس میں فلکیات کا علم بھی شامل تھا) پر سنسکرت، پہلوی،
یونانی اور سریانی زبانوں سے متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس دور
تراجم کے کم و بیش نصف اوّل میں عرب ہیئت دانوں انتخابیت کی طرف بعد
مائل تھے۔ انتخابیت کی جانب یہ رجحان بعض علاقوں مثلاً اندلس میں بہت
عرصے بعد تک بھی پوری شد و مد سے جاری رہا۔ نویں صدی عیسوی میں
بطلیموس کے منضبط منہاجات اور ہندی تصدیقات سے متعارف ہو جانے
کے بعد علم ہیئت میں بڑی تیزی سے ترقی ہونے لگی۔ پھر تو اس لیے وجود
میں آئی تھی کہ یونانی، ایرانی اور ہندی نظاموں کے تناقضات کی تحقیق کی
جائے اور پھر اس لیے کہ بطلیموسی مقادیر معلومہ کی اصلاح ہو سکے۔ اسلامی

ممالک میں یا یوں کہیے کہ کم از کم یونانی فکر سے متاثر علما، کے ہاں رفتہ رفتہ
بطلیموسی نظام کی برتری تسلیم کی جانے لگی اور یوں اکثر مسلمان ماہرین فلکیات
کی نظروں میں المجسطی کو جائز یا ناجائز طور پر ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہو گئی۔
۹۰۰ء کے لگ بھگ البتانی کی زیج الصابی کی اشاعت کے ساتھ اس عمل کی
تکمیل ہو گئی اور اندلسی علما، کی ہند نوازی، ارسطاطالیسیوں کے حملوں اور
دبستان مراغہ کی کامیابیوں کے باوجود زمانۂ حال میں یورپی علم ہیئت کے
وجود میں آنے تک بطلیموس ہی کا ڈنکا بجتا رہا۔

سنسکرت سے تراجم: معلوم ہوتا ہے کہ علم ہیئت پر سنسکرت
سے قدیم ترین عربی ترجمہ زیج الارکند ہے۔ یہ ۷۳۵ء کے کچھ ہی بعد سندھ
میں کیا گیا تھا۔ زیج الارکند کے زیادہ تر مندرجات تو کھنڈ کھاڈیکہ
ماخوذ تھے جو بھلا لہ کے برہم گپت نے ۶۶۵ء میں لکھی تھی۔ تاہم اس
یزدجرد سوم (۶۳۲ تا ۶۵۲ء) کی زیج شاہ کے اثرات بھی ملتے ہیں
جس کا تعلق کھنڈ کھاڈیکہ ہی کی طرح آریہ بھٹ (متولد ۴۷۶ء) کے دبستان
"آردھ راتریکہ" (آدھی رات) سے تھا۔

۷۴۲ء میں ایک اور سنسکرت زیج کا عربی میں ترجمہ ہوا سندھی
کتابوں کی پیروی میں، یہ ایک منظوم کتاب تھی، جس کا نام زیج الہرقو
گیا۔

سنسکرت سے عربی میں ہونے والے تراجم میں سے مہا سدھا
کا ترجمہ اہم ترین تھا جس کا تعلق دبستان برہمہ (براہم پکشہ) سے ہے
مہا سدھانت بنیادی طور پر وشنو دھرم اتر پران کی پیتا مہا سدھ
(جو پانچویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لکھی گئی) اور براہم سپٹ
جو برہم گپت نے ۶۲۸ء میں لکھی تھی) پر مبنی ہے، تاہم اس کے بعض مب
آریہ بھٹ سے بھی ماخوذ ہیں، جن کی شناخت اس کے بچے کھچے اجزا
ہے۔ اس ترجمے کی تقریب اس وقت پیدا ہوئی جب ۷۷۱ء میں
سے ایک سفارت بغداد میں المنصور کے دربار میں باریاب ہوئی
کہا جاتا ہے کہ اس کا مترجم الفزاری تھا جس کی زیج "السندھ
میں ایرانی اور ہندی نظریات خلط ملط ملتے ہیں۔ اس کے
الفزاری نے زیج اعلیٰ سنی العرب بھی مرتب کی تھی۔ یہ اس کی
الذکر کتاب پر مبنی ہے۔ اس زیج کو اولین فلکیاتی جداول قرار

ہے جو عربی تقویم تیار کرنے میں کام آتے تھے۔ یہ ۷۹۰ء کے لگ بھگ تالیف ہوئی۔ یعقوب بن طارق ایک اور عالم تھا جسے مہاسدھانت سے مستفید ہونے کا موقع ملا اس نے ۷۷۷ء میں ترکیب الافلاک لکھی۔ اس کے علاوہ اس کی تالیفات میں ایک اور زیج، نیز کتاب العلل بھی شامل ہے۔ ان سب میں ہندی اور ایرانی نظریات کا امتزاج ملتا ہے۔ الفزاری اور یعقوب بن طارق کی یہ تصانیف

اوریَن میں عظیم ہیولا

کریب نیبولا
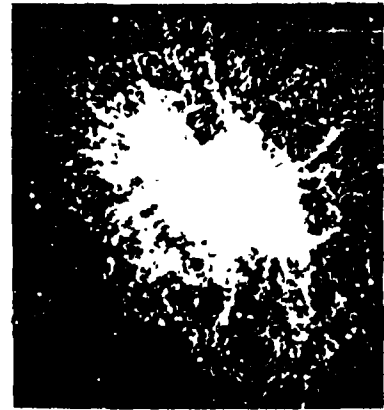
سند ہند روایت کے لیے بنیاد ثابت ہوئیں۔

پہلوی سے تراجم : ساسانیوں کی فلکیات اور علم نجوم دونوں عربی تراجم اور اقتباسات کے ذریعے ایران میں پہنچے۔ ان علوم پر ساسانیوں کی تصانیف یونانی اور ہندی نظریات کا ملغوبہ ہے۔ بطلیموس کی 'المجسطی' کا ایک پہلوی ترجمہ ابتدائی صدیوں میں بھی موجود تھا۔ ایک اور کتاب جس کا تعلق آریہ بھٹ کے دبستان "آردھ راتریکہ" سے ہے ۵۵۶ء میں دستیاب تھی۔ اسی طرح "براہمکپشہ" سے متعلق ایک تصنیف غالباً اس سے بھی قبل ۴۵۰ء میں موجود تھی۔ زیک شترو ایار (= زیج الشاہ) سے جس پر ۵۵۶ء میں انوشیروان کے لیے نظر ثانی کی گئی۔ ماشاء اللہ نے استفادہ کیا۔ (حدود ۷۰۰ تا ۸۱۰ء) لیکن اس کا شاید عربی میں کبھی ترجمہ نہیں ہوا آگے چل کر اس کا ایک نظر ثانی شدہ نسخہ یزدجرد سوم کے عہد میں ہوا ہوا جسے ایک شخص التیمی نے زیج الشاہ کے نام سے عربی میں منتقل کیا الفزاری نے اس کتاب سے (خصوصاً اس کی تعدیلاتِ سیارگان سے) نیز ابو معشر نے فائدہ اُٹھایا۔ البیرونی کے زمانے میں بھی اس کے نسخے مروج اور مستعمل تھے۔

یونانی اور سریانی سے تراجم : فلکیات پر یونانی سے جو اہم ترین تصنیف عربی میں ترجمہ کی گئی وہ بلاشبہ بطلیموس کی المجسطی تھی۔ اصل یونانی کتاب اور اس کا سریانی ترجمہ دونوں کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ یہ کام نویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں الحجاج کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔ اور ان علمائے فلکیات کے لیے بہت موثر ثابت ہوا جنھیں مامون الرشید نے اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا۔ بہر حال اس کتاب کا مستند ترین ترجمہ وہ ہے جو اسحاق بن حنین نے کیا تھا اور جس کی ثابت بن قرہ تصحیح و اصلاح کی تھی۔ نویں صدی عیسوی کے دوران میں فلکیات پر یونانیوں کی نسبتاً کم اہمیت نگارشات کے وہ مجموعے بھی عربی میں منتقل کر لیے گئے جو "ہیئۃ الصغریٰ" کے نام سے معروف تھے۔ آگے چل کر جب یہ طے ہو گیا کہ اقلیدس کی مبادیات پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہی علم الہیئۃ کا مطالعہ شروع کیا جائے تو یہ مجموعے "ہیئۃ الوسطیٰ" کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔ اسی طرح اصطرلاب پر متعدد رسائل جو یونانی اور سُریانی مآخذ پر مبنی تھے، شایع ہوئے۔ اس طرح فلکیات کا جو علم حاصل ہوا وہ کم و بیش سنسکرت اور پہلوی سے کیے ہوئے تراجم سے متاثر تھا (سب سے گہرا اثر علم المثلثات کی ترقی میں مسلمانوں کی مساعی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بطلیموس کے مقابلے میں مسلمانوں کا علم المثلثات کہیں زیادہ موثر ہے۔ کیوں کہ بطلیموس نے محض ہندی اثرات قبول کیے تھے، جہاں صرف جیب، جیب تمام اور جیب معکوس سے کام لیا جاتا ہے) اور نویں صدی ہجری کے بعد مسلمانوں کے ہاں علم الہیئت کا مرکزی تصور اسی پر مشتمل تھا۔

بطلیموسی روایت :- نظام سیارگان اور کائنات کی

ساخت کے بارے میں جو عربی تصانیف ملتی ہیں ان میں بطلیموسی نظام کی جھلک نظر آتی ہے۔ البتانی کی زیج الصابی' تمام تر بطلیموسی ہے۔ البتانی کی مقادیر معلومہ کو کوشیار بن لبیان نے استعمال کیا۔ حالاں کہ علم نجوم میں کوشیار نے ابومعشر کی تقلید کی ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک یہ اثر اس کی ازیاج میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ زیج الکبیر الحاکمی جو ابن یونس نے قاہرہ میں تالیف کی تھی، اپنی تاریخی معلومات کی بنا پر اہم سمجھی جاتی ہے۔ البیرونی کی تصانیف بھی تاریخی معلومات کی وجہ سے بے حد اہم ہیں۔ اس کی "القانون المسعودی" سے مصنف کی ہندی علم الہیئت سے دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔

سِندھند روایت: اس روایت کا آغاز الفزاری اور یعقوب بن طارق کی تصنیفات سے ہوتا ہے، جن میں کچھ ساسانی اور یونانی عناصر کا براہمپکشہ اور آریہ بھٹ سے ماخوذ معلومات سے امتزاج ہوچکا تھا۔ بہرحال اس روایت کی سب سے موثر نمائندگی الخوارزمی کی زیج السند ھند سے ہوتی ہے۔ اس کے اصل متن کے صرف چند قطعات ہی محفوظ رہ سکے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس المجریطی کے تصحیح کردہ نسخے کا ایک لاطینی ترجمہ موجود ہے۔ المجریطی نے ...۱ء کے لگ بھگ اس کتاب پر قرطبہ میں نظرثانی کی تھی۔ الخوارزمی کی زیج کی بعض شروح بھی ملتی ہیں۔ موخر الذکر کے صرف لاطینی اور عبرانی تراجم دستیاب ہیں جو اندلس میں کیے گئے تھے۔ اسی طرح الفرغانی کی شرح کے چند اجزا بھی محفوظ ہیں۔

اندلس میں اس روایت کو المجریطی کے شاگرد ابن السمح نے جاری رکھا۔ اس کی زیج اجزا، کی شکل میں دستیاب ہے۔ ابن الصفار کی زیج بھی غالباً ضائع ہوچکی ہے۔ تاہم قیاس ہے کہ پیرس کے ایک مخطوطے میں یہ شامل ہوگی۔ الزرقالہ کے "جداول طلیطلہ" کو عہد اسلامی کے اندلس کی ممتاز ترین زیج قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ الخوارزمی اور البتانی کے دیے ہوئے مواد کا مرکب ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک مغربی یورپ کے ماہرین فلکیات نے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا عیسائی اس سے اثر قبول کیا۔

دبستان مراغہ:۔ اندلس سندھند روایت ہی کا نہیں بلکہ بطلیموس کے ارسطالیسی معترضین کا بھی مرکز رہا۔ علم ہیئت کے نقطۂ نظر سے بطلیموسی نظریے کی اصلاح کی موثر ترین کوشش مراغہ کی رصدگاہ میں دیکھنے

مشتری اور اس کے بادل

میں آتی ہے جس کی بنیاد نصیر الدین طوسی نے ۱۲۵۹ء میں رکھی تھی۔ پھر تبریز اور دمشق کی رصدگاہوں میں جو اس کے بعد قایم ہوئیں، یہ کام جاری رہا۔ خود مراغہ میں، جہاں چینی ماہرین فلکیات اپنے مسلمان رفقا کی اعانت کرتے بطلیموسی فلکیات پر نظر ثانی کے سلسلے میں بنیادی توجہ اس مسئلہ پر رہی سیارے کی تدویر اس طرح تبدیل کر دی جائے کہ جملہ حرکات فلکی یکساں پر مدور ہوجائیں۔ "زوج طوسی" جسے نصیر الدین طوسی نے ایجاد کیا تھا کی وضاحت اس نے اپنے تذکرے میں کی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے جہت متعین کرتی تھی۔ آگے چل کر یہ حل اس کے شاگرد قطب الدین شیرازی ۱۳۵۰ء میں اور ابن الشاطر نے ۱۳۵۰ء کے لگ بھگ دمشق میں پیش اگرچہ ان دونوں نے دوائر تدویر کے اعداد و ابعاد اور ان کی تر رکھی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ بالآخر ابن الشاطر ہی نے دو دشو سیاروں عطارد اور قمر کے بارے میں ایک اطمینان بخش حل پیش کیا ج صدی عیسوی کے وسط میں کہیں جاکر مسلمان علمائے فلکیات نے کے ایسے نمونے تیار کیے جن کا انحصار یکساں طور پر مدور گردشوں پر تھا۔ البتہ انہوں نے امام خمسہ کے نمونوں سے دائرہ تدویر نمونے سے "گردانہ میکانیات" اور نقطۂ مخالف کو حذف کردیا دو صدیاں گزر جانے کے بعد کوپرنیکس نے جو نمونے تجو کئی باتیں ابن الشاطر کی ان مساعی کی مرہون منت ہیں۔ دونوں ہوئے عطارد اور قمر کے نمونے بالکل ایک جیسے ہیں۔ دونوں سے کام لیا ہے اور [illegible] دوائر تدویر کو اسا یکسا

کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ کوپرنیکس ابن الشاطر کے کام سے واقف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ Gregory Chioniades نے تبریز کی رصدگاہ میں تحصیل علم کے بعد تقریباً ۱۳۰۰ء میں قسطنطنیہ واپس آ کر جن متعدد عربی ازیاج کا یونانی میں ترجمہ کیا تھا، ان کے قلمی نسخے پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک اطالیہ میں موجود تھے اور ان میں ایسی اشکال موجود ہیں جن میں زوج طوسی کو پیش کیا گیا ہے لیکن ان میں قطب الدین شیرازی کے کام کی تفصیلات نہیں ملتیں اور ابن الشاطر کے اثرات قبول کرنے کا تو اس ابتدائی دور میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوپرنیکس تک معلومات پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ ہوگا۔

زمانہ مابعد کی رصدگاہیں : مراغہ کی رصدگاہ اور وہاں تیار ہونے والی زیج، یعنی زیج ایلخانی نے متاخر مسلمان علمائے فلکیات کے لیے نمونے کا کام دیا۔ تاہم بطلیموسی نظریے میں ہونے مذکورہ ترمیمات اور اصلاحات کے اثرات چودھویں صدی عیسوی کے بعد مسلمانوں کے ہاں نظر نہیں آتے۔ مراغہ کی سب سے کامیاب نقل وہ رصدگاہ تھی جو ۱۴۲۰ء میں الغ بیگ نے سمرقند میں قایم کی۔ یہاں الکاشی اور قاضی زادہ کی رہنمائی میں متعدد علمائے فلکیات نے زیج سلطانی تیار کی۔ الکاشی نے اپنی ایک زیج بھی شائع کی جو زیج خاقانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تینوں ازیاج بنیادی طور پر بطلیموسی ہیں۔ اگرچہ دوائرِ تدویر میں اور بعض جداول کی ساخت میں اصلاح کی گئی ہے اور جملہ فلکیاتی جداول میں ملنے والی تقویمی معلومات میں چینی اویغور تقویم کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی آخری اہم رصدگاہ تقی الدین کے لیے ۱۵۷۵ء کے مابین استانبول میں تعمیر ہوئی۔ سمرقند کی رصدگاہ کی نقل میں امبر کے مہاراجہ جے سنگھ ۱۶۹۳ء سے ۱۷۴۳ء تک جو پانچ رصدگاہیں (جنتر منتر) جے پور، اجین، دہلی، متھرا اور وارانسی میں تعمیر کیں، وہ بھی قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کا شمار بھی ہندی علم الہیئت پر نظرِ ثانی کر کے اسے اسلامی بطلیموسی روایت سے مطابقت دینے کی مساعی میں ہوتا ہے۔ تاہم یہ مساعی لاحاصل ہی رہیں۔ موخر زمانے کی اسلامی رصدگاہوں سے ہمسایہ ممالک کچھ زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ یورپی علم الہیئت میں مراغہ سمرقند اور استانبول کی رصدگاہوں کے بہت مفید اثرات قبول کیے گئے ہیں۔ ان اداروں کے متعدد آلات اور تنظیمی خصوصیات کو ٹائیکو براہے کی رصدگاہوں میں اپنایا گیا۔ بہرکیف ہم فلکیاتی رصدگاہوں کی ترقی، دبستان مراغہ کی سرگرمیاں، علم المثلثات اور جداول کی ساخت کے ارتقاء کو اور دوائرِ تدویر پر مسلسل نظرِ ثانی کو علم الہیئت میں مسلمانوں کے عظیم کارنامے قرار دے سکتے ہیں۔

بقول لی بان مسلمانوں کی ہیئتی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ حسابات میں مماسہ کا استعمال
۲۔ اجرامِ سماوی کی حرکات کی زیجوں کا مرتب کرنا۔
۳۔ اعوجاج منطقۃ البروج اور اس زاویے کی بتدریج کم ہونے کی نہایت درست تحقیقات
۴۔ استقبال معدل النہار کا ٹھیک معلوم کرنا۔
۵۔ سب سے پہلے سال کی درست مدّت معلوم کرنا۔
۶۔ چاند سے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف دریافت کرنا۔
۷۔ چاند کے اس تیسرے اختلاف کا معلوم کرنا جو آفتاب کے فاصلے سے پیدا ہوتا ہے اور جسے اختلافِ حرکتِ قمر کہتے ہیں۔ اور جس کا انکشاف ۱۶۰۱ء میں ٹیکو براہے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (ماخوذ)

> "آزادی بھی ایک نعمت ہے جس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ ہر آزادی نعمت ہے اور نہ ہر مقیدی قابل تحسین۔ موقع اور عمل کے لحاظ سے کبھی آزادی نعمت ہے اور کبھی مقیدی"
>
> تفسیری اصول از مولانا وحید الدین احمد خاں"

طلبا میں نشہ آور اشیا کا استعمال

چودھری نور احمد

انسانی تہذیب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے شعور کی ابتدائی منزلوں میں بھی نشیلی اشیاء مثلاً بھنگ، افیون وغیرہ کا عادی تھا مثال کے طور پر آریہ قوم میں 'سوم رس' نام کے مشروب کا رواج تھا جو کہ جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ ایک قسم کی شراب تھی۔ اسی طرح 'پرانوں' میں بھی بھنگ اور مدیرا (شراب) کا ذکر ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نشہ آور اشیاء کی تاریخ بھی انسانی تہذیب کے نشیب و فراز سے وابستہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ آج کل یہ نشیلی ادویہ عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں میں ایک وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ گو کہ ہمارے ملک میں نشیلی ادویہ کی لت مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے، لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے مغرب کی نقالی کا شوق بڑھتا جا رہا ہے، اسی تناسب سے ہندوستانی طلبا میں نشہ آور اشیاء کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے اخبار 'ڈان' کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر پندرھویں منٹ ایک شخص اس طرح کی نشیلی اشیاء کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسرے پڑوسی ملک نیپال کی حالت تو اس سے بھی بدتر ہے

حال ہی میں انگریزی روزنامہ 'ٹائمس آف انڈیا' میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو کہ متعدد تعلیمی اداروں کے طلباء کی گفتگو پر مبنی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے ساڑھے چار فیصد طلباء نشیلی اشیاء کے عادی ہیں۔ ان طلباء کی بڑی تعداد کا تعلق سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے سے ہے۔ ان میں سے ۶۱ فیصد طلباء معمولی ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہیں اور ڈھائی فیصد طلباء شدید ذہنی الجھنوں کا شکار رہیں۔

انگریزی روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' اپنے اداریے میں لکھتا ہے کہ ۵۲ فیصد طلبا جو نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں، ذہنی پراگندگی اور مایوسی کے ساتھ ناپختہ کار بھی ہیں۔ حال ہی میں مدھیہ پردیش کے شہر جبل پور میں نشہ آور اشیا کے عادی طلباء کا سروے کیا گیا، اس سے حاصل شدہ اعداد و شمار بڑے دلچسپ ہیں۔ اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے یہاں ۲۷ کالج ہیں اور ۱۵ ہزار طلباء زیر تعلیم ہیں۔ ان تعلیمی اداروں میں طلباء پوشیدہ طور پر ایل۔ ایس۔ ڈی، ہیروئن، کوکین، ایمفٹامائین (Ampetamine)، مینڈکس، کپوز کے علاوہ گانجا، چرس وغیرہ بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ کوکین، ایل۔ ایس۔ ڈی اور ہیروئن کو چھوڑ کر بقیہ تمام نشیلی ادویہ بآسانی شہر میں دستیاب ہیں اس طرح ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی اسی طرح کے اعداد و شمار سامنے آئے ہیں۔

مختلف نشہ آور اشیا

اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے طلبا کی معتدبہ تعداد اس بری لت میں مبتلا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کون کون سی نشہ آور ادویہ طلبا میں مروج ہیں۔ فیناسٹین (Penacetin) اپی ڈون (Apidon)، کولیتھی، ڈرشام، نیوفیبرین (Neofebrin) ویگنین (Vaganin) ویریڈون (Veridon) امیڈو پائرین (Amido Pyrene) او پٹلڈون (Optildon) ڈکساڈرن بلیک ڈائمنڈ، مینڈرس، افیون، مارفین، کوکین، ایل۔ ایس۔ ڈی ہیروئن (Heroin) بھنگ، بیڑی، سگریٹ اور مختلف اقسام

شراب ان نشہ آور اشیا میں شامل ہیں جو ہندوستانی طلبا میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔

نشیلی ادویہ کی لت کے لیے ذمہ دار عوامل

ان تمام اسباب کو جو طلبا میں نشہ آور اشیا کے فروغ دینے کے لیے ذمہ دار ہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ نفسیاتی عوامل :۔ کچھ طلبا یہ تصور کرتے ہیں کہ نشیلی اشیا مثلاً چرس کا استعمال کرنے سے ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ بہتر طور پر اپنے کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ کچھ طلبا چرس کے استعمال کے بعد ڈرامے میں حصہ لیتے ہیں تاکہ وہ بہتر طور پر اداکاری کرسکیں۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ہے اور یہ ایک طرح کی ذہنی بیماری ہے جو خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہورہی ہے۔ کچھ طلبا امتحانات کے دوران خود کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے بھی نشہ آور ادویہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان طلبا کا خیال ہے کہ نشہ آور ادویہ کے استعمال سے قوت ارتکاز بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ نشیلی اشیا کا براہ راست اثر اعصابی نظام پر ہوتا ہے اور وقتی طور پر انسان کی قوت ممیزہ اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس حالت میں اچھے اور برے میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ جو طلبا پورے سال گھومتے رہتے ہیں اور صرف امتحانات کے دوران پڑھائی پر توجہ کرتے ہیں، ان کی تیاری تسلی بخش نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیند خود بخود غائب ہوجاتی ہے اور دماغی تناؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ ان کی قوت برداشت سے باہر ہوجاتا ہے۔ آخر میں وہ خود کو اس تناؤ سے نجات دلانے کے لیے بھی نشہ آور اشیا کا سہارا لیتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ ان کے عادی ہوجاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور محدود قدرتی وسائل اس دور کے اہم مسائل ہیں جو کہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی حکومت تمام افراد کو روزگار فراہم نہیں کرسکتی۔ ایک تو اس قدر مہنگی تعلیم اور پھر روزگار کی کوئی ضمانت نہ ہونے سے طلبا ذہنی الجھنوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں پر ہر وقت ناامیدی اور مایوسی کے گھنے بادل چھائے رہتے ہیں وہ اس تناؤ کو دور کرنے کے لیے نشہ آور اشیا کا جھوٹا سہارا لیتے ہیں اور بظاہر کچھ دیر کے لیے دماغی تناؤ سے سکون حاصل کرلیتے ہیں۔

۲۔ ماحولیاتی عوامل :۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہونا انسان کی فطرت ثانیہ میں شامل ہے۔ ماحول کی مناسبت سے انسان میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ بچے کا ذہن خاص طور پر تقلیدی ہوتا ہے جو کچھ بھی اپنے ارد گرد دیکھتا ہے وہی سب کچھ عملی طور پر کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہے۔ جب ایک معصوم بچہ کسی شخص کو دھوئیں کے مرغولے اُڑاتے دیکھتا ہے تو وہ بھی ایسا کرنے کی سوچتا ہے۔ اپنے دوست اور اقارب کی حرکات کو بھی بغور دیکھتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہی سب کچھ کرنا وہ بھی شروع کردیتا ہے۔ ٹیلی وژن، ویڈیو، وی سی آر اور فیچر فلمیں اس ضمن میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جب طلبا اپنے محبوب فلمی اداکاروں کو نشہ آور ادویہ کا بے دریغ استعمال کرتے دیکھتے ہیں تو وہ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ فلمی اداکار طلبا کے آئیڈیل ہوتے ہیں وہ ان کی ہر نقل و حرکت پر غور کرتے ہیں اور پھر ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ غور نہیں کرتے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔

۳۔ سیاسی عوامل :۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہوتا ہے۔ سلیقہ مند اور باصلاحیت نوجوان ایک ملک کے لیے درخشاں مستقبل کی ضمانت ہیں۔ اگر کسی ملک کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لے جانا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نئی نسل کو دماغی اور نفسیاتی طور پر مفلوج کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سب سے آسان طریقہ نشہ آور اشیا کا استعمال ہے۔ اس کے بعد یہ مقصد خود بخود حل ہوجائے گا۔ ترقی یافتہ ممالک کی ہمیشہ یہ سازش رہتی ہے کہ دوسرے غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک ہمیشہ ان کے دست نگر رہیں اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جائز اور ناجائز ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً دو ملکوں کے درمیان تنازعہ پیدا کرادینا، خانہ جنگی کے حالات پیدا کردینا اور ان ہی سازشوں میں سب سے گھناونی سازش یہ ہے کہ کسی ملک میں نشہ آور ادویہ کی فراہمی اور وہاں کے طلبا، کو ان کا عادی بنادیا جائے۔ اس کے بعد فطری طور پر ان کا مشن پورا ہوجاتا ہے۔ دنیا کی منظم بین الاقوامی تنظیمیں مثلاً مافیا وغیرہ اس طرح کی نشیلی اشیا کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ نشہ آور چیزیں بے حد مہنگی ہوتی ہیں اس طرح یہ تنظیمیں نہ صرف ایک غریب ملک کے نوجوانوں کی صحت کو خراب کرتی ہیں بلکہ

وہ انہیں نفسیاتی اور ذہنی طور پر مفلوج بھی کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ طبیں ان ملکوں کو بالکل مفلوک الحال اور معاشی طور پر کمزور بھی بنا دیتی ہیں۔

نشیلی اشیا کے مہلک اثرات :۔

سگریٹ نوشی ایک عام وبا ہے۔ آیئے ہم سب سے پہلے اسی سے شروعات کرتے ہیں۔ سگریٹ پینا آج کل عین فیشن ہے۔ حالانکہ ہر پیکٹ پر "تنبیہ" درج ہوتا ہے کہ سگریٹ پینا صحت کے لیے سخت مضر ہے مگر پھر بھی لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے۔ حال ہی میں ہوئی تحقیق کے مطابق قلبی مرض آئی ایچ ڈی جس کی محرک سگریٹ ہے اور اس طرح کے ۶۲ اور ۵۲ فیصد مریض سگریٹ کے عادی ہیں۔ میڈیکل رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ سگریٹ سے کینسر کے جراثیم بھی پیدا ہوتے ہیں۔ متعدد ترقی یافتہ ملکوں میں انہیں اسباب کی بنا پر لوگوں نے سگریٹ نوشی کم کر دی ہے۔ مثال کے طور پر جاپان میں ۱۹۶۶ء میں ۷ر۸۰ فیصد لوگ سگریٹ پیتے تھے اور یہ تعداد گھٹ کر ۱۹۸۳ء میں ۱ر۶۰ فیصد رہ گئی۔ آج فرانس میں سگریٹ نوشی کرنے والوں کی تعداد ۹، ۵۵ فیصد اور امریکہ میں ایسے افراد صرف ۳۹ فیصد ہیں۔ ابھی تو ہم نے سگریٹ نوشی کے متعلق غور کیا تھا جو کہ ایک بہت ہی کم نقصان والی نشیلی شے ہے۔ جب یہ صحت کے لیے اس قدر مضر ہے تو دوسری قوی الاثر اشیا کا کیا حال ہوگا؟ اس ضمن میں ہیروئن (Heroin) سر فہرست ہے۔ اس کے استعمال کے ایک منٹ تک تو استعمال کرنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی جسم میں تساہلی اور سستی کا غلبہ ہو جاتا ہے

ایل ایس ڈی کے استعمال کے فوراً بعد انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب و غریب ہو جاتی ہے جسے سائنس کی زبان میں Hallucination کہتے ہیں۔ وہ اس ہذیانی حالت میں مجرمانہ حرکات مثلاً قتل، چوری، زنا وغیرہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ایل۔ ایس۔ ڈی کا اثر زائل ہونے کے بعد انسان خود بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اس نے اس کے زیر اثر کیا کیا ہے۔ اسی طرح دوسری نشہ آور اشیا بھی کچھ کم مہلک نہیں ہیں۔ ان سب اشیا کے استعمال سے انسان ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان قیمتی نشہ آور اشیا کو خریدنے سے پیسہ بھی ضائع ہوتا ہے، انسان اگر ان کا عادی ہو جائے تو وہ کسی قیمت پر ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ یہ قبول کر سکتا ہے کہ وہ بھوکا رہے، جسم ڈھکنے کو لباس نہ ہو، سر چھپانے کو جگہ نصیب نہ ہو مگر اس کی پسندیدہ نشہ آور شے اسے ملتی رہے۔

تدارک کی تدابیر :۔ طلبا کو اس لت سے نجات دلانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جائیں، یہ ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔ نشہ آور اشیا کے استعمال کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل تدارکی اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم :۔ اسکولوں میں فلسفہ اور سائنس، معاشیات سماجیات اور دیگر علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ میڈیکل اور انجینیرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے مگر مروجہ تعلیمی نصاب میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جب تک اس طرح کی تعلیم کو فروغ نہیں دیا جاتا یہ ناممکن ہے کہ آنے والی نسل کو نشہ کی وبا سے محفوظ رکھا جائے۔ اگر نئی نسل کی تربیت میں اخلاق اور مذہب کو مناسب اہمیت دی جائے تو بچوں کو اس وبا میں مبتلا ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔

۲۔ والدین کی ذمہ داری : نیپولین بونا پارٹ اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہے کہ اگر میرے ملک میں اچھی سلیقہ مند مائیں ہوں تو میں جنت کو زمین پر لا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور مفکر کا قول ہے کہ بچہ کا پہلا اسکول اس کا گھر ہوتا ہے۔ بچوں کی یہ نفسیات ہے کہ انہیں بچپن میں جو کچھ سکھایا جاتا ہے، جس چیز کے خلاف ان کے دل میں نفرت بھر دی جاتی ہے یا جس چیز کی خوبیوں سے ان کو روشناس کرایا جاتا ہے، وہ اس سے ساری زندگی ویسا ہی اثر لیتے رہتے ہیں۔ اب والدین پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی نشیلی چیزوں کے مضر اثرات سے آگاہ کرائیں اور ان کے خوفناک انجام بتا کر ان میں ان کے خلاف نفرت پیدا کر دیں۔ والدین خود بھی ایسی چیزوں سے سخت پرہیز کریں تاکہ بچے ان کی نقل نہ کریں۔

۳۔ ذرایع ابلاغ پر کنٹرول : طلباء جس چیز سے سب سے زیادہ اثر لیتے ہیں، وہ ذرایع ابلاغ ہیں۔ اب حکومت پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ ایسے تمام پروگراموں پر پابندی عاید کردے جن میں نشیلی اشیا کو استعمال کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ تمام فحش رسایل اور گندی کتابوں پر پابندی لگا دی جائے، فحش فلموں اور نغموں پر سنسر لگا دیا جائے تاکہ وہ طلباء جن کا شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا وہ ان مہلک چیزوں کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔

حکومت اس موذی وبا کی طرف فوری طور پر توجہ کرے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے توسط سے کم سے کم ایک ہفتہ میں دو دن ایسے بلیٹن نشر کیے جائیں جن میں عوام کو ان کے مہلک اثرات سے روشناس کرایا جائے۔ دنیا کی تمام حکومتوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس خوفناک وبا پر قابو پانے کے لیے مستحکم اقدامات کرنے چاہییں ورنہ یہ وبا نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی گرفت میں لے لے گی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ - ش ۸ - (اگست ۸۷ء)

آتشِ نمرود

محمد حنیف شاہد

وہ آگ جس کو نمرود نے ایک فرسنگ کے احاطے میں جلوایا تھا اور اس کی گرمی سے چار فرسنگ تک کوئی ذی حیات اس کے قریب نہ جاسکتا تھا (بحوالہ لغات ہیرا صفحہ ۳۹) اسے آتشِ نمرودی بھی کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ کی مکمل تفصیل قرآن کریم میں موجود ہے۔ مختصر طور پر قصہ یوں ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے، بابل پر نمرود کی حکومت تھی جس کو خدائی کا دعویٰ تھا۔ اس وقت بابل، شرک، بت پرستی اور کواکب پرستی کا مرکز تھا۔ سن، شمس، اشتار وغیرہ بتوں کی پوجا کی جاتی تھی سب سے بڑا بت شمس تھا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت سے پیشتر ہی نمرود نے خواب دیکھا تھا کہ ایک بڑا روشن ستارہ آسمان پر نکلا ہے۔ اس نے نجومیوں سے خواب بیان کیا اور اس کی تعبیر پوچھی، انھوں نے جواب دیا کہ "اس سال ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے سبب تیری سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ اس طرف سے نمرود نے اپنی دانست میں یہ انتظام کیا کہ اس سال اس کے ملک میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط نہ ہونے پائے۔ تاکہ کوئی بچہ پیدا نہ ہوسکے اور اگر ہو تو زندہ نہ رہنے پائے۔ لیکن خدا کے حکم کو روکنا نمرود کے بس کی بات نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے اور ماں نے اس ڈر سے کہ بچے کو مار نہ ڈالا جائے، آپ کو سات سال کی عمر تک تہ خانے میں پالا۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے آنکھ کھولی تو ہر طرف بتوں کی پرستش جاری تھی۔ شروع ہی سے آپ کا دل ایمان و عرفان کا خزینہ تھا۔ آپ کفر اور شرک برداشت نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے باپ آزر سے کہا

"تم کیا بتوں کو معبود بناتے ہو، میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہو"۔ (بحوالہ سورہ انعام ۵،)

اسی ضمن میں سورۂ مریم ۴۲ تا ۴۵ میں ارشاد ہے۔

"جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں۔ ابا! مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ میرے ساتھ ہو جایئے، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا۔ ابا! شیطان کی پوجا نہ کیجیے۔ بے شک شیطان خدا کا نافرمان ہے۔ ابا! مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آپکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں"۔

لیکن باپ پر اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ بگڑ گئے اور کہا:

"ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہے؟ اگر تو باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہوجا" (بحوالہ سورہ مریم ۴۶)

یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے باپ کو سلام کیا اور فرمایا:

"میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے بخشش طلب کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ خدا کے سوا پکارتے ہیں

اُن سے کنارہ کرتا ہوں اور اپنے پروردگار ہی کو پکاروں
گا۔ امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکار کر محروم نہیں
رہوں گا۔" (بحوالہ سورہ مریم ۴۴، ۴۸)

بعد ازاں حضرت ابراہیم نے گم کردہ راہ، گمراہ قوم کو پکارا۔ اسے غور و فکر کی دعوت دی اور توحید کی تبلیغ و اشاعت کی۔ قوم کے ساتھ آپ کے مکالمات کی پوری تفصیل سورہ انبیاء، شعراء اور عنکبوت میں موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے نہایت عمدہ، لطیف اور دل پذیر انداز میں قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ خدا پرستی کی راہ میں آباء و اجداد کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسی کی پرستش کرنی چاہیے جس کی پرستش پر علم و بصیرت اور عقل گواہی دے۔ آپ نے بتایا کہ زندہ اور ذی حیات مخلوق کا خدا کوئی اندھی، بہری، بے جان اور بے حس شے نہیں ہو سکتی۔ زندہ اشیاء کا خدا تو زندہ ہی ہو سکتا ہے جو سمیع اور بصیر بھی ہو اور علیم و خبیر بھی، جو ستار اور غفار بھی ہو اور حیّ اور قیوم بھی ہو۔ لیکن قوم پر اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ آپ کو مارنے کے درپے ہو گئی۔ بالآخر آپ نے چیلنج دے دیا کہ

"ہم تم سے اور ان بتوں سے جن کو تم خدا کے سوا
پوجتے ہو، بے تعلق ہیں اور تمہارے معبودوں کے
کبھی قائل نہیں ہو سکتے اور جب تک تم خدائے واحد
پر ایمان نہ لاؤ ہم میں اور تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت
اور دشمنی رہے گی۔" (بحوالہ سورۃ الممتحنہ ۴)

آپ نے دیکھا کہ قوم کی گمراہی اور جہالت حد سے بڑھ چکی ہے اور اب کوئی وعظ و نصیحت موثر ثابت نہیں ہوتا تو آپ نے فرمایا:

"اللہ کی قسم جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے
بتوں سے ایک چال چلوں گا۔" (بحوالہ الانبیاء ۵۷)

چنانچہ سالانہ تہوار کے موقع پر شہر کے باہر میلہ لگا۔ تمام لوگ میلے میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے اور وہ اس میں شریک نہ ہوئے بلکہ کہا:

"میں تو بیمار ہوں۔" (بحوالہ صافات ۸۹)

حضرت ابراہیم ان بتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"تم کھاتے کیوں نہیں؟ تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم بولتے نہیں؟" پھر ان کو دائیں ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا (بحوالہ صافات ۹۱۔۹۳) ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا لیکن ایک بڑے بت کو نہ توڑا تاکہ وہ لوگ اُس کی طرف رجوع کریں (بحوالہ الانبیاء ۵۸)

جب قوم کو پتہ چلا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور کہنے لگے، ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا؟ وہ تو کوئی ظالم ہے آپ سے اس ضمن میں پوچھا گیا۔

"ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام تو نے کیا ہے؟" آپ نے فرمایا:

"اُن کے بڑے بت نے کیا۔ اگر یہ بولتے ہوں تو ان
سے پوچھ لو۔" (بحوالہ الانبیاء ۶۳)

انھوں نے اپنے دل میں غور کیا اور آپس میں کہنے لگے۔ بے شک تم ہی بے انصاف ہو۔ پھر شرمندگی سے سر جھکا لیا اور ابراہیمؑ سے کہنے لگے "تم جانتے ہو، یہ بولتے نہیں"۔ آپ نے فرمایا:

"پھر تم خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جو
نہ تم کو کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں
افسوس ہے تم پر اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا
تم عقل نہیں رکھتے؟" (بحوالہ الانبیاء ۶۶۔۶۷)

نیز فرمایا:

"تم ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جن کو خود تراشتے ہو
حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو، اس کو خدا ہی نے پیدا
کیا ہے۔" (بحوالہ صافات ۹۵۔۹۶)

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم غیض و غضب سے اندھی ہو گئی اور چاروں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں کہ "اسے مار ڈالو یا جلا دو۔ اگر تم کو کچھ کرنا ہے تو اس کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔" (بحوالہ عنکبوت ۲۴ اور الانبیاء ۶۸)۔ وہ بولے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو (بحوالہ والصٰفٰت ۹۷)

اقبالؔ نے اس تلمیح سے دور جدید پر طنز بھی کیا ہے ۔ ؎

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

قصص القرآن میں لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جلادینے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن ابھی یہ طے نہ کر سکے تھے کہ اس پر عمل کس صورت سے کریں۔ آخر طے یہ ہوا کہ ایک بہت بڑی آگ جلائیں۔ اتنی بڑی آگ کہ ایک چنگاری بھی سارے شہر کو پھونک دینے کے لیے کافی ہو۔ چنانچہ انھوں نے ہر طرف سے لکڑیاں فراہم کیں۔ اس کام میں ہر شخص نے اپنی ہمت اور حیثیت کے مطابق حصہ لینے میں کوتاہی نہ برتی۔ تاکہ وہ اس عمل سے اپنے معبودوں کا تقرب حاصل کر سکے۔ یہاں تک کہ عورتوں نے بھی اس کام میں امکان سے زیادہ ہاتھ بٹایا تاکہ وہ معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں اپنے مردوں کے دوش بدوش حصہ لیں۔

چنانچہ ایک عرصۂ دراز تک لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے۔ انھوں نے ایک پہاڑ کے برابر لکڑیوں کا بلند ڈھیر لگادیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اونچی اور وسیع جگہ آگ جلانے کے لیے منتخب کی۔ اور وہاں آگ سلگادی۔ تھوڑی دیر کے اندر آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور کئی فرسخ دور سے آگ کے شعلے نظر آنے لگے اور اس کے بعد حضرت ابراہیم کے ہاتھوں کو باندھ کر بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

جیسے ہی حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا، کفار نے بڑے زور کا نعرہ لگایا اور ساری وادی ان کے خوشی کے نعروں سے گونج اٹھی۔

چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں نور ایمان بھرا ہوا تھا۔ خدا کی ذات پر آپ کو مکمل بھروسہ تھا۔ آپ کا اللہ تعالےٰ سے مکمل تعلق خاطر تھا اور آپ کی تمام تر توقعات اسی سے وابستہ تھیں۔ اس لیے بغیر کسی خوف وہراس کے انتہائی دلی اطمینان کے ساتھ وحی الٰہی کی طراوت وبہجت آپ پر طاری تھی۔ لہٰذا آپ نے ہنسی خوشی اپنے آپ کو آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ آگ کے طوفان میں ڈوب گئے۔ بھڑکتے ہوئے شعلے ہر طرف سے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ اب دیکھیے آگ نے کیا کام کیا۔ سب سے پہلے تو آگ کی تپش اور تیزی نے حضرت ابراہیمؑ کی رسیوں کو جن میں وہ جکڑے گئے تھے چشم زدن میں جلا کر آپؑ کو آزاد کر دیا اور لوہے کی زنجیروں کو پگھلا کر نابود کر دیا۔ ادھر اللہ تعالےٰ کے حکم سے آگ کی گرمی، سوزش کی خاصیت اور تپش وایذا مفقود ہو گئی اور آگ آپ کے لیے آرام دہ اور خنک ہو گئی۔ خدائے لم یزل کو آپ کا بال بیکا ہونا گوارا نہ تھا۔ بارگاہ خداوندی سے حکم صادر ہوا "اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیمؑ پر سلامتی بن جا۔" (سورہ الانبیاء ۶۹)

جب چند دنوں کے بعد شعلوں اور دھوئیں کا طوفان تھما تو قوم کے لوگوں نے عجیب وغریب منظر دیکھا کہ جتنے فرلانگ میں آگ جل رہی تھی، اس تمام علاقے میں گلزار کھل گئے ہیں۔ حد نظر تک سبزہ لہلہا رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نہایت آرام وآسائش سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ آپؑ نے پھر دعوت وتبلیغ شروع کر دی۔ جب حضرت ابراہیمؑ کا یہ عظیم الشان معجزہ ان لوگوں پر ظاہر ہو گیا تو وہ لوگ آپؑ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور الٹی سیدھی باتیں بنانے لگے۔ اگرچہ انھوں نے آگ کا سہارا لیا تھا مگر ان کا مکر ان پر الٹا پڑ گیا اور وہ خود ذلت وخواری کا شکار ہو گئے۔

بعض لوگ اس عظیم الشان معجزہ کو دیکھ کر قریب تھا کہ ایمان لے آئیں اور آپ کی رسالت اور نبوت کو تسلیم کر لیں، کیوں کہ اب ان کی مزید تشفی وتسلی اور اطمینان کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ایمان لے آئیں۔ لیکن ان میں کچھ اہل غرض اور وجاہت پرست دنیوی لذتوں اور مادی نعمتوں کی ہوس میں حق کو باطل پر ترجیح نہ دے سکے اور کچھ لوگ ان صاحب اقتدار لوگوں سے ڈر کر ایمان لانے سے قاصر رہے۔ البتہ معدودے چند لوگ آپ پر ایمان لے آئے تھے اور وہ بھی ظالموں کے خوف سے اپنے ایمان لانے کو ظاہر نہیں کر پاتے تھے۔ اس لیے ایسے لوگوں نے اپنے ایمان لانے کو قوم سے چھپائے رکھا۔

اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر نمرود سہم گیا اور اس کو اندازہ ہو گیا کہ ابراہیم واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔ لیکن اس کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کی مقبولیت سے میرے وقار کا قلعہ منہدم ہو جائے گا اور میرا سطوت اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنے

پاس بلایا تاکہ باتوں اور دلیلوں سے ان کو لاجواب کر دے۔ جب آپ دربار میں پہنچے تو اس نے کہا۔ تم نے یہ فتنہ پھیلا رکھا ہے اور چاروں طرف یہ کیسی آگ لگا رکھی ہے۔ آخر وہ کون سا ایسا خدا ہے جس کو تم نے میرے علاوہ معبود سمجھ لیا ہے اور میرے سوا وہ کون ہے جس کو تم عبادت کے لائق سمجھتے ہو۔ بھلا مجھ سے بھی درجے میں بڑھ کر کوئی اور ہو سکتا ہے کیا تم ان حقایق کو نہیں دیکھتے ہو کہ تمام مخلوق کا انتظام و انصرام اور ان کی اچھائی برائی میرے ہی دستِ قدرت میں ہے۔ میرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔ لوگ میرا حکم بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ میری اطاعت و فرمانبرداری کو دل و جان سے بجا لاتے ہیں۔ تمام دنیا کی مخلوق میری مہربانی کی امیدوار اور میرے غضب سے دم بخود رہتی ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے بھی تم میری خدائی سے انکار کرتے ہو؟ کیوں بلا وجہ تم لوگوں کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر رہے ہو۔ ان کے بتوں کو بے سبب تم نے توڑا۔ تم کس خدا کی طرف ان کو بلاتے ہو، اور کس پروردگار کی عبادت کے لیے کہتے ہو وہ کون ہے؟

حضرت ابراہیمؑ نے نہایت اطمینان و آرام سے نمرود کو جواب دیا کہ میرا خدا وہ ہے جو لوگوں کو جلاتا ہے، مارتا ہے اور بے شمار عالم اس نے پیدا کیے ہیں۔ ہر ایک کی عمر کے لیے ایک مدت مقرر کی ہے اور ہر ایک کی موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔"

اگرچہ نمرود کی تمام بڑائی اور شیخی کا محل ان دلائل کے آگے سرنگوں ہو چکا تھا، لیکن نمرود نے اپنے کبر و غرور کو سنبھالا دینے کے لیے مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ تو میں بھی کرتا ہوں۔ جس کو جب چاہتا ہوں اپنے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" گو نمرود نے بات بنا کر مغالطہ دینے کی کوشش کی لیکن نبوت و رسالت کی طاقت و دلیلوں کے سامنے اس کا کیا بس چل سکتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اس نے اس کو اپنے قبضہ قدرت میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ کوئی تغیر اس کے اس نظام میں نہیں آ سکتا۔ اگر تو خدائی کا دعوے دار ہے اور تجھ میں اتنی قدرت ہے تو ذرا سورج ہی کو بجائے مشرق کے مغرب سے نکال کر دکھلا دے۔"

اس مدلل جواب کے آگے نمرود سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور اس کو اپنے دروغ کا پول کھلتا نظر آنے لگا۔ وہ گھبرا گیا اور لاجواب ہو کر خوف و ہراس سے لرزنے لگا۔ آخر اس نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ نہ الجھے، اس لیے بظاہر اس نے آپؑ سے تعرض نہ کیا اور مناسب موقع کا منتظر رہا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے جاسوسوں کا جال پھیلا دیا تاکہ وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والوں کو نمرود کا خوف دلا کر باز رکھتے رہیں۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ تنگ آ گئے۔ لہٰذا آپؑ نے مجبوراً ہجرت کا ارادہ فرمالیا۔ کیوں کہ آپؑ نے اندازہ فرمالیا تھا کہ یہ ناپاک سرزمین آپ کی دعوت کو قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال آپؑ نے فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی۔

علامہ اقبال نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور بقول آتش ؎

مہرباں ہو دوست، کچھ دشمن کا چل سکتا نہیں
آتشِ نمرود ہے گلزار، ابراہیم کو

علامہ اقبال نے اس تلمیح سے دورِ جدید پر طنز بھی کیا ہے ؎

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

سائنس نامہ

حبیب الحق انصاری

بچوں کے کینسر کی سب سے عام قسم کے لیے ایک نئے طریقۂ علاج نے اچھے ہونے کی شرح ۶۸٪ سے بڑھا کر ۷۷٪ فیصد کردی ہے۔ بچوں کے لمفوبلاسٹک لیوکیمیا کے اس طریقہ علاج میں کئی دوائیں ایک ساتھ دی جاتی ہیں جس میں ایک دوا ایسپاراگینیز بڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ علاج کی مدت دو سال ہے۔ یہ علاج امریکہ میں دریافت ہوا۔

حاملہ عورتوں کے پیٹ میں پلتے بچوں کی جنس کی دریافت کے میڈیکل طریقوں کا بے جا بازاری استعمال مادہ جنین کو ضایع کروا دینے کی جاہلانہ صورت میں نکل رہا ہے، کیونکہ لوگ لڑکیاں نہیں لڑکے چاہتے ہیں۔ بمبئی کے ایک سوشل گروپ نے زچگی سے قبل جنس کی شناخت کے خلاف ایک عام مہم چلانے کا تہیہ کیا ہے اس کے برخلاف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان شناختوں کو عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خلاء سے لی گئی تصویروں کے ذریعے زمین کی سطح پر بڑے بڑے دریاؤں کی ہزاروں سال پہلے کی گذرگاہوں کا پتہ لگانا ممکن ہے۔ پتہ چلا ہے کہ یورپ کا سب سے لمبا دریا وولگا بحیرۂ کیسپئن میں ہزاروں سال پہلے مغرب سے آکر گرتا تھا نہ کہ شمال سے جیسا اب ہے۔ اسی طرح سوڈان اور مصر کے بعض بنجر علاقے بھی معلوم ہوا پہلے ایسی بڑی چوڑی دریائی وادیاں تھے، جیسے دریائے نیل کی وادیاں اب ہیں۔ ایسی دریائی وادیوں سے کئی علاقوں کی بڑے پیمانے پر اقتصادی تعمیر نو میں مدد ملنے کی امید ہے۔ روسی سائنس داں اس میدان میں نمایاں کام کر رہے ہیں۔

زچگی کے وقت لمبے عرصے تک ہوتے رہنے والے دردوں سے نجات دلانے کے لیے سُن کرنے والی دوا کو ایک پمپ سے رفتہ رفتہ دے کر صرف درد کم کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ آپریشن کی صورت میں آپریشن کے بعد کی شرح اموات بھی آدھی سے زیادہ کم کی جاسکتی ہے۔ اس دریافت کا سہرا آسٹریلیا کے ڈاکٹر کے سر ہے۔

خطرناک مرض ایڈس (AIDS) کے خلاف ٹیکہ دریافت کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ حال میں تجرباتی غرض سے بندروں کو کچھ ٹیکے لگائے گئے ہیں اور نتائج چند ماہ میں ظاہر ہونے کی امید ہے۔ یہ رپورٹ گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر رچارڈ نے برٹش ایسوسی ایشن فار اڈوانسمنٹ آف سائنس کی ایک حالیہ کانفرنس میں دی۔

کچھ قسم کے مچھر مفید بھی ہوتے ہیں۔ ارغوانی رنگ کے شکم والے ایک طرح کے مچھر چین کے جنوب مغربی صوبے سیچوان میں پائے جاتے ہیں جو بڑے ہوتے وقت اوسطاً ستر کا نقصان وہ چھوٹے کیڑے فی دن فی مچھر کھا کر ختم کر دیتے ہیں اور بعد میں بھی وہ محض پودوں کے رس پر گذارا کر لیتے ہیں۔ چینی سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ ان مچھروں کی بڑے پیمانے پر پرورش کی جائے تاکہ ان کا قابل قدر استعمال ہو سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۴/ ۸۷ — ۸۸
مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۷ ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۲۰۰۰-۲/۱۲۵-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)
پروفیسر آف فزکس۔ (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزکس
قابلیت: معروف و ممتاز اسکالر جس کی اعلیٰ درجے کی معیاری مطبوعات ہوں اور وہ تحقیق کے کام میں مشغول ہو۔ درس وتدریس اور/یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ رکھتے ہوں

یا

غیر معمولی مشہور و معروف اسکالر جس نے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔

ریڈرس
شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (پری ریوائزڈ)

۲ ریڈر ان یورولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔
قابلیت:- ایم۔سی ایچ۔
تدریس/تحقیق کا تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان یورولوجی پانچ سال کا تجربہ۔

۳ ریڈر ان پیتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔
قابلیت:
ا۔ لازمی:- ایم۔ڈی۔(پیتھالوجی)/
ایم۔ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹیریولوجی)/
ایم۔ڈی (پیتھالوجی وِد بکٹیریالوجی)/

پی۔ایچ ڈی (پیتھالوجی)/
ڈی۔ایس سی (پیتھالوجی)۔
تدریس/تحقیق کا تجربہ۔
کسی میڈیکل کالج کے پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ میں اور خصوصی طور پر ہیماٹولوجی کے فیلڈ میں بحیثیت لکچرر کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ:۔ ہندوستانی یا غیر ملکی رسائل میں اپنے خصوصی میدان میں اوریجنل تحقیقی مطبوعہ کام۔
نوٹ:۔ منتخبہ امیدوار کو ہیماٹولوجی کے کام کے ساتھ اضافی طور پر بلڈ بنک سروسز کی دیکھ بھال اور ان کا انتظام کرنا ہوگا۔

۴۔ ریڈر ان ڈولپمنٹل اناٹمی اینڈ جینٹکس ـــــ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی
قابلیت:
۱۔ لازمی: ایم۔ایس (اناٹمی)/
ایم۔بی۔بی۔ایس ساتھ میں ایم ایس سی (میڈیکل اناٹمی)/
پی۔ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی)/
ڈی۔ایس سی (میڈیکل اناٹمی)۔
تدریس و تحقیق کا تجربہ۔
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان اناٹمی پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: ہندوستانی/غیر ملکی رسائل میں ڈیولپمنٹل اناٹمی (ایمبریالوجی) اور جینٹکس میں اصلی تحقیقی مطبوعہ کام
ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے تسلیم شدہ تربیت حاصل کی ہو۔
نوٹ ریڈرس کی تمام جگہوں کے لیے
جو حضرات ۱۹۸۲ء کی سفارشات سے پہلے بہ حیثیت لکچرر تقرری پائے ہیں وہ بہ حیثیت رجسٹرار اور لکچرر کے تدریسی تجربے پر ریڈر کی جگہ کے لیے اہل متصور کیے جائیں گے۔

۵۔ لکچرر ان جنرل سرجری:۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔
شرح تنخواہ۔ ۷۰۰۔۴۰۔۱۱۰۰۔۵۰۔۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (بہ ری ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: ایم۔ایس (سرجری)/
ایم۔ایس (جنرل سرجری)
تدریسی/تحقیق کا تجربہ۔
امیدوار متعلقہ مضمون میں تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ کوالی فیکیشن رکھتا ہو
۲۔ پسندیدہ: پی۔جی کوالی فیکیشن حاصل کرنے کے بعد اچھا کلینکل تجربہ۔

ریڈرس :

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (پری ریوائزڈ)

۶- ریڈر ان فارماکولوجی - ڈپارٹمنٹ آف علم الادویہ - اے - کے طبیہ کالج

قابلیت:-

۱- لازمی: ۱- ایم - ڈی (فارماکولوجی)

۲- اردو کی جانکاری

۳- متعلقہ مضمون میں تدریس کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ -

۲- پسندیدہ - مطبوعہ کام

۷- ریڈر ان معالجات طب - ڈپارٹمنٹ آف معالجات - اے - کے طبیہ کالج -

قابلیت

۱- لازمی:- قانون کے تحت قایم کی گئی کسی یونیورسٹی یا اسٹیٹوٹری بورڈ / فیکلٹی / انڈین میڈیسن کی اگزامننگ باڈی کا یونانی میڈیسن میں ڈگری / ڈپلوما یا اس کے مساوی

۲- کسی تسلیم شدہ ادارے میں تدریس کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ -

۲- پسندیدہ ۱- کسی تسلیم شدہ ادارے / قانونی طور پر منظور یونیورسٹی سے یونانی میں پوسٹ گریجویٹ کوالیفیکیشن

۲ متعلقہ موضوع پر اوریجنل مطبوعہ پیپرس / کتابیں - عربی اور انگریزی کی جانکاری

لیکچررس -

شرح تنخواہ - ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (پری ریوائزڈ)

۸- لیکچرر ان علم الادویہ - ڈپارٹمنٹ آف علم الادویہ - اے کے طبیہ کالج

۹ لیکچرر ان منافع الاعضاء (فزیالوجی) ڈپارٹمنٹ آف کلیات - اے کے طبیہ کالج

قابلیت:

۱- لازمی ۱- قانون کے تحت قایم کی گئی کسی یونیورسٹی یا اسٹیٹوٹری بورڈ / فیکلٹی / انڈین میڈیسن کی اگزامننگ باڈی کا یونانی میڈیسن میں ڈگری / ڈپلوما یا اس کے مساوی

۲- کسی تسلیم شدہ ادارے میں تدریس کا تین سال کا تجربہ -

۲- پسندیدہ ۱ کسی تسلیم شدہ ادارے / قانونی طور پر منظور یونیورسٹی سے یونانی میں پوسٹ گریجویٹ کوالیفیکیشن

۲- متعلقہ موضوع پر اوریجنل مطبوعہ پیپرس / کتابیں

نوٹ: اگر مطلوبہ تجربے کا حامل امیدوار میسر نہ آئے تو مناسب صورت میں تجربہ کی شرائط میں سلیکشن کمیٹی کی سفارش پر نرمی کی جا سکتی ہے

ریڈرس:

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (بمی ریوائزڈ)

۱۰۔ ریڈرس ان کیمیکل انجینرنگ / پٹرولیم پروسسنگ۔ انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اینڈ کیمیکل انجینرنگ۔

۱۱۔ ریڈر ان کیمیکل انجینرنگ۔ ڈپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینرنگ۔

قابلیت:

۱۔ لازمی۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تدریس اور / یا تحقیق اور ترقیات کا پانچ سال کا تجربہ۔

اگر کوئی امیدوار پی۔ایچ ڈی ڈگری نہ رکھتا ہو لیکن اس کا مطبوعہ کام ریسرچ ڈگری کے میعار کا ہو یا ڈیزائن ڈویلپمنٹ میں کسی ادارے یا انڈسٹری میں اس کا انتہائی اعلیٰ پایہ کا کام ہو تو اس امیدوار کو بھی تقرر کے لیے موزوں تصور کیا جائے گا۔

یا

ان اشخاص کے لیے جن کا تقرر صنعت یا پیشہ وارانہ حلقوں سے کیا جائے گا ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے حامل ہوں اور اپنے میدان میں تقریباً سات سال کا تجربہ رکھتے ہوں جن میں تحقیق / ایجادات اور ڈویلپمنٹ بھی شامل ہے۔

۲۔ پسندیدہ: برائے اسامی نمبر ۱۰۔ ریڈر ان کیمیکل انجینرنگ / پٹرولیم پروسسنگ کے لیے۔

تخصص کا میدان۔

درج ذیل ایریاز میں سے کسی ایک یا زیادہ میں تخصص۔

ٹرانسفر پروسسز، ری ایکشن انجینرنگ، کیمیکل انجینرنگ، تھرموڈائنامکس، کمپیوٹر ایڈیڈ ڈیزائن اینڈ آپٹی مائیزیشن، پٹرولیم ریفائننگ، پیٹروکیمیکلس

نوٹ: پیٹرولیم ریفائننگ (صرف ایک جگہ کے لیے) کی بیک گراونڈ جانکاری۔

اسامی نمبر ۱۱ ریڈر ان کیمیکل انجینرنگ کے لیے

فلوئڈ میکینکس / ہیٹ ٹرانسفر / ماس ٹرانسفر، ری ایکشن انجینرنگ / ٹرانسپورٹ فینومینا / پٹرولیم ٹیکنالوجی۔

مندرجہ بالا میں سے کسی دو میں تخصص ہو مشہور و معروف رسائل میں مطبوعہ تحقیقی مضامین کے ساتھ پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھانے کا تجربہ ہو۔

لکچررس۔

شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (پری ریوائزڈ)

۱۱ لکچرر ان آرکیٹکچرل اسسٹنٹ شپ، یونیورسٹی پولی ٹکنیک۔

قابلیت: آرکیٹکچر میں بیچلرس ڈگری اور ساتھ میں دو سال کا مناسب پیشہ ورانہ تجربہ۔

آرکیٹیک میں ماسٹرز ڈگری اور پروفیشنل ورک کا ایک سال کا تجربہ
اگر کوئی امیدوار آرکیٹیکٹ میں ماسٹرس ڈگری اور پروفیشنل تجربہ نہیں رکھتا یا اگر وہ موزوں نہیں پایا گیا تو مقرر کیے جانے والے سے یہ امید کی جائے گی کہ وہ تقرری پانے کے پانچ سال کے اندر اندر مطلوبہ تجربہ حاصل کرلے۔ بصورت دیگر اسے اس وقت تک سالانہ ترقی نہ ملے گی جب تک کہ وہ مطلوبہ تجربہ حاصل نہ کرلے۔

لیکچرر ان سنی دینیات ۔ ڈپارٹمنٹ آف سنی دینیات

قابلیت:

۱۔ لازمی ا۔ تھیالوجی میں ماسٹرز ڈگری (ایم۔ٹی ایچ)

یا

ایم۔اے عربی یا اسلامک اسٹڈیز میں اور ساتھ میں کسی مدرسے کا فاضل

یا

مدرسے کا فاضل اور ساتھ میں تین سال کا تدریسی تجربہ/تحقیق کا ثبوت۔

یا

ماسٹرس ڈگری کے مساوی کوئی غیرملکی ڈگری

ب۔ انگریزی میں کام کرنے کی صلاحیت۔

۲۔ پسندیدہ۔ ا بی ایچ ڈی کی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا مطبوعہ کام

۲۔ کسی یونیورسٹی یا مشہور مدرسے میں تدریس کا تجربہ۔

لیکچرر ان کیمسٹری (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری

قابلیت ا

۱۔ لازمی ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس (ج، سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹر ڈگری یا کسی غیرملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الوضوعی پروگراموں کی ترقی کی ضرورت کے مد نظر مذکورہ بالا الف اور ب میں ڈگریاں متعلقہ مضامین میں درکار ہوسکتی ہیں۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسز یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے، بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا اس صورت میں ایم۔فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ پایے کا تحقیقی کام کے امیدوار کو وزن دیتے ہوئے تقرر کیا جائے

گا. بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سال کا تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال تک علمی کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

۲۔ پسندیدہ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ معیار کی اینالیٹکل کیسٹری پڑھانے کی صلاحیت

۱۵۔ کینزولٹی میڈیکل آفیسر (دو جگہیں) (مستقل)۔ جے۔ این ایم سی ایچ

شرح تنخواہ - ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی ۱۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس

۲۔ کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔

۳۔ کسی تدریسی اسپتال میں بحیثیت ریزیڈنٹ یا لیکچرار کے تین سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ کیزولٹی کام کا تجربہ۔

۱۶۔ اسسٹنٹ آرکیوسٹ (ایک جگہ)، (مستقل) (سرسید اکادمی)

شرح تنخواہ ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

قابلیت ۱۔ ہسٹری یا فارسی میں ایم۔ اے

۲۔ آرکیول اسٹڈیز میں ڈپلوما۔

۳۔ اردو اور فارسی کی جانکاری۔

۴۔ آرکائیوز یا لائبریری کے سینٹرل ڈویژن میں کام کرنے کا کچھ تجربہ۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۵/۸۷-۸۶ مورخہ ۱۲ مارچ ۸۷ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۷۔ سائنٹفک آفیسر۔ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

قابلیت۔

۱۔ لازمی۔ ۱۔ فزکس میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس کے ساتھ ماسٹرز ڈگری اور ساتھ میں الیکٹرونکس میں تخصص۔

۲۔ اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام

۲۔ پسندیدہ ۱۔ انڈر گریجویٹ کلاسسز کی تدریس کا پانچ سال کا تجربہ۔

(iii) ٹیچنگ میٹیریل بنانے یا تدریس کے نئے طریقوں سے متعلق رہنے کا ثبوت

پروگرامر - کمپیوٹر سینٹر (تین جگہیں)

شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

قابلیت ا- لازمی سائنس میں ماسٹرز ڈگری یا انجینیرنگ میں بیچلرز ڈگری اور ساتھ میں کم از کم تین سال کا بحیثیت پروگرامر تجربہ۔ یا اس کے مساوی کمپیوٹر سینٹر میں کام کرنے کا تجربہ۔

یا

کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما یا ڈگری اور ساتھ میں بحیثیت پروگرامر دو سال کا تجربہ یا اس کے مساوی کمپیوٹر سینٹر میں کام کرنے کا تجربہ۔

۲- پسندیدہ کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ ڈگری یا کمپیوٹر سافٹ ویر اور آپریٹنگ سسٹم کو مینٹین کرنے اور اس کی ڈویلپنگ کا تین سال کا تجربہ۔

کام کی نوعیت:ا- کمپیوٹر سسٹم کی دیکھ ریکھ اور کمپیوٹنگ سسٹم کے ملٹی پروگرامنگ بیچ اور ٹایم شیرڈ موڈ اور کمپیوٹر نیٹ ورک میں مدد دینا۔

۲- کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کی کمپیوٹر پروگرام بنانے میں مدد دینا۔

۳- سینٹر کی تدریسی اور دیگر علمی پروگراموں میں شرکت کرنا۔

۴- کمپیوٹر سینٹر کے عملی پہلو (Operational Aspects) میں مدد کرنا اور وقتاً فوقتاً تفویض کیے جانے والے فرائض کو انجام دینا۔

۱۹ سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (بیوکیمسٹری) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔ جے این میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ:- ۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای۔بی-۷۵-۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ اسکیل)۔

قابلیت ا- لازمی- بی۔ایس سی اور ساتھ میں کسی میڈیکل کالج کی بائیو کیمیکل/ پیتھالوجیکل لیباریٹری میں سابقہ کام کرنے کا پانچ سال کا تجربہ۔

پیشنٹ کیئر/میڈیکل ریسرچ میں کھوج کرنے کی کسی پیتھالوجیکل اور بائیوکیمیکل میں اچھی جانکاری۔

۲- پسندیدہ:- میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (پیتھالوجی) میں ڈپلوما۔

نوٹ:- اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۰ سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (تھیٹر) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ:- ۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای-بی-۷۵-۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ اسکیل)

قابلیت ا- لازمی آپتھلمک ٹیکنک میں بی۔ایس سی۔ کسی مشہور میڈیکل کالج کے آئی ہاسپٹل میں تھیٹر ٹیکنیشین کی

حیثیت سے کام کرنے کا اچھا تجربہ۔

یا

بی۔ایس سی کے ساتھ نرسنگ یا آپتھلمک ٹیکنیکس میں سرٹیفکیٹ/ڈپلوما۔ جیسے آپٹومیٹری میں ڈپلوما یا آرتھوپٹکس میں ڈپلوما۔ کسی مشہور آئی ہاسپٹل/میڈیکل کالج میں بحیثیت تھیٹر ٹیکنیشین کام کرنے کا دو سال کا تجربہ۔

یا

انٹرمیڈیٹ (سائنس) یا اس کے مساوی اور ساتھ میں نرسنگ یا آپتھلمک ٹیکنیک میں سرٹیفکیٹ/ڈپلوما جیسے کہ آپٹومیٹری/آرتھوپٹکس کا ڈپلوما اور کسی مشہور آئی اسپتال/میڈیکل کالج میں بحیثیت تھیٹر اسسٹنٹ کام کرنے کا پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔پسندیدہ:۔ او۔ٹی اور خصوصی طور پر دیہی آنکھوں کے ریلیف کیمپ میں کام کرنے کا تجربہ۔

نوٹ:۔ منتخب امیدوار کو بیس نکاتی قومی پروگرام رورل آئی کیر پروگرام کے تحت کام کرنا ہوگا

۲۱۔ سینیئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (دواساز گریڈ I) (ایک جگہ) (مستقل) اے کے طبیہ کالج اسپتال

شرح تنخواہ:۔ ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰ ای بی۔۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ اسکیل)

قابلیت:۔ لازمی:۔ ۱۔ ہائی اسکول یا اس کے مساوی اور ینٹل کوالی فیکیشن جو یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو۔

۲۔ اسٹیٹ/بورڈ/یونیورسٹی سے تسلیم شدہ یونانی میڈیسن، سہا یک حکیم میں ڈپلوما۔

پسندیدہ:۔ دواسازی (فارمیسی) میں تین سال کا تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو دواسازی (فارمیسی) میں اچھا تجربہ رکھتے ہوں اُن کو مناسب حالات کے تحت ٹیکنیکل کوالی فیکیشن میں چھوٹ دی جائے گی۔

۲۲۔ اسسٹنٹ سیکورٹی کم فائر آفیسر۔ میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ:۔ ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰۔ ای بی۔ ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ اسکیل)

قابلیت:۔ لازمی:۔ ۱۔ بیچلرز ڈگری

۲۔ کسی گورنمنٹ/سیمی گورنمنٹ/مشہور و معروف پرائیوٹ ادارے میں سیکورٹی کا پانچ سال کا تجربہ۔

۳۔ فائر فائٹنگ تکنیک کی جانکاری

پسندیدہ:۔ ۱۔ اچھی صحت اور تندرستی

۲۔ عمر ۴۰ سال سے کم

۲۳۔ ہیلتھ ایجوکیٹر۔ ڈپارٹمنٹ آف کمیونٹی میڈیسن

شرح تنخواہ:۔ ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰۔ ای بی۔ ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ اسکیل)

قابلیت ۱۔ لازمی ہیلتھ ایجوکیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔
۲۔پسندیدہ ہیلتھ ایجوکیشن میں تین سال کا تجربہ۔
نوٹ۔ منتخب امیدوار کو میڈیکل کالج اے۔ایم۔یو سے تقریباً ۱۵ کلومیٹر دور جواں میں
ڈپارٹمنٹ آف رورل ہیلتھ ٹریننگ سینٹر میں کام کرنا ہوگا۔

۲۴ سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ پلاسٹک برن اینڈ فیسیو میکسیلیری سرجری یونٹ (ایک جگہ) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری
شرح تنخواہ۔ ۱۶۴۰۔۶۰۔ ۲۶۰۰۔ ای بی۔ ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:۔ ۱۔ لازمی۔ بی ایس سی کے ساتھ پلاسٹک سرجری میں ٹریننگ کا تجربہ۔
۲۔پسندیدہ پلاسٹک سرجری آپریشن تھیٹر میں کام کرنے کا پانچ سال کا تجربہ
نوٹ: ان امیدواروں کے حق میں تعلیمی قابلیت میں نرمی برتی جائے گی جن کو
پلاسٹک سرجری میں کافی طویل تجربہ ہو۔

۲۵ مکینک۔ (موٹرس) سینٹر آٹو موبائیل ورکشاپ
شرح تنخواہ:۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت ۱۔ لازمی آٹو موبائل انجینرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ میں کسی معروف ومشہور ورکشاپ میں ۵ سال کام کرنے
سے کم کا تجربہ نہ ہو۔

یا

ii۔ موٹر مکینک ٹریڈ میں آئی ٹی آئی سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں کسی مشہور ومعروف ورکشاپ میں سات
سال سے کم کام کرنے کا تجربہ نہ ہو۔

یا

iii۔ ہائی اسکول کے ساتھ کسی مشہور ورکشاپ میں ۱۰ سال سے کم کام کرنے کا تجربہ نہ ہو۔

۲۔ اور
۲۔ بھاری گاڑی چلانے کا لائسنس بھی رکھتے ہوں۔
(ان ٹیکنیکل اسٹاف کے حق میں جو دس سال تک اس سے نیچے کے گریڈ میں یونیورسٹی
جاب / ٹریڈ میں کام کر رہے ہوں ان کے سلسلے میں تعلیمی صلاحیت میں مناسب
چھوٹ دی جائے گی)
تجربہ موزوں امیدواروں کے حق میں تجربے میں بھی چھوٹ دی جائے گی۔
نوٹ:۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۶۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (انسٹرومینٹیشن) (دو جگہیں) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریکل انجینرنگ۔
۱۔شرح تنخواہ:۔ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)

قابلیت :- لازمی الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما اور / یا الیکٹرونکس انجینئرنگ میں ڈپلوما۔ ساتھ میں کسی مشہور فرم یا کسی یونیورسٹی لیبارٹری میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں استعمال میں آنے والے آلات کی دیکھ ریکھ ان کی مرمت اور اُن کو چلانے کا دو سال کا تجربہ۔

یا

معمولی طور پر آٹھواں پاس اور مندرجہ بالا میں آٹھ سال کا تجربہ

یا

ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور مندرجہ بالا فیلڈ میں پانچ سال کا تجربہ

نوٹ :- امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۷۔ سینیر فارمیسٹ (ایک جگہ) (مستقل) اے۔کے طبیہ کالج۔

شرح تنخواہ :- ۱۴۰۰ – ۴۰ – ۱۸۰۰ – ای بی – ۵۰ – ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی تعلیمی۔ ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی اورینٹل قابلیت جسے یونیورسٹی تسلیم کرتی ہو۔

ٹیکنیکل۔ اسٹیٹ / بورڈ / یا یونیورسٹی سے تسلیم شدہ یونانی میڈیسن میں ڈپلوما یا سہائیک حکیم

۲۔ پسندیدہ۔ دواسازی (فارمیسی) میں تین سال کا تجربہ قابل ترجیح ہوگا

نوٹ : وہ امیدوار جن کو دواسازی (فارمیسی) میں اچھا تجربہ ہو ان کے لیے ٹیکنیکل قابلیت میں نرمی برتی جائے گی۔

۲۸۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (آٹوموبائیل اسٹور) (ایک جگہ) (مستقل) جنرل آٹوموبائل ورکشاپ

شرح تنخواہ :- ۱۴۰۰ – ۴۰ – ۱۸۰۰ – ای۔بی – ۵۰ – ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت :-

۱۔ لازمی ۱۔ بی اے / بی کام / بی ایس سی / ڈپلوما انجینئرنگ

۲۔ پرچیزنگ اور اکاؤنٹنگ آف انجینئرنگ اسٹورس جس میں کسی گورنمنٹ / سیمی گورنمنٹ یا کسی کمرشیل آرگنائزیشن کے آفس کا کام شامل ہے، کا سات سال کا تجربہ ہو۔

۲۔ پسندیدہ روڈ ٹیکس، انشورینس اینڈ فننس ٹیکس آف وہیکلس وغیرہ کے ڈیل کرنے کی جانکاری

نوٹ :- اس میدان میں اعلیٰ تجربے کی بنا پر تعلیمی صلاحیت میں نرمی برتی جائے گی۔

۲۹ اسٹینو ٹائپسٹ۔کم۔آفس اسسٹنٹ (ایک جگہ) (عارضی) کیریر پلاننگ سینٹر اے ایم یو ویمنس کالج۔

شرح تنخواہ – ۱۴۰۰ – ۴۰ – ۱۸۰۰ – ای۔بی – ۵۰ – ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔

قابلیت:

۱- لازمی۔ کم از کم بیچلرز ڈگری کے ساتھ ۱۰۰ الفاظ فی منٹ رفتار انگریزی شارٹ ہینڈ میں اور ۵۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار انگریزی ٹائپنگ میں ہونا چاہیئے۔

۲- پسندیدہ ۱- کسی کمرشیل / ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن میں بحیثیت اسٹینو تین سال کا تجربہ

۲- الیکٹرونکس ٹائپ رائٹر اور ورڈ پروسیسر کے استعمال کا تجربہ۔

۳- ٹیلیکس اور پی بی ایکس مشینوں کے استعمال کا تجربہ۔

۳۰ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (انسٹرومینٹیشن) (ایک جگہ) یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔

شرح تنخواہ ۔ ۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۸۰۰ - ای - بی - ۵۰ - ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱- لازمی الیکٹریکل / الیکٹرونکس میں پوسٹ میٹرک ڈپلوما۔ ساتھ میں دو سال کا تجربہ

یا

الیکٹریکل / الیکٹرونکس میں ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں کسی ادارے / ورکشاپ / مشہور فیکلٹی میں سات سال کا تجربہ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا

۳۱ پبلک ہیلتھ نرس، کمیونٹی میڈیسن ڈپارٹمنٹ جے۔ این۔ ایم۔ سی

شرح تنخواہ - ۱۳۲۰ - ۳۰ - ۶۰ - ۱۵۶۰ - ای۔ بی - ۴۰ - ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت

۱- لازمی - ا- ہایر سکنڈری یا اس کے مساوی

ب- کسی تسلیم شدہ ادارے سے پبلک ہیلتھ نرسنگ میں ڈپلوما

۲- پسندیدہ:- بی۔ ایس سی (پبلک ہیلتھ نرسنگ) یا اس کے مساوی

۳۲۔ کنزرویشنٹ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکاڈمی

شرح تنخواہ:- ۱۴۰۰ - ۴۰ - ۱۸۰۰ - ای بی ۵۰ - ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱- لازمی ۱- ایم۔ ایس سی کیمسٹری میں

۲- نیشنل لیباریٹری فار کنزرویشن آف کلچرل پراپرٹیز مقام لکھنو (ڈپارٹمنٹ آف گورنمنٹ آف انڈیا) سے ایک سال کا ڈپلوما۔

یا

نیشنل آرکائیوز، گورنمنٹ آف انڈیا، نئی دہلی سے ڈپلوما۔

۲۔ پسندیدہ ۱۔ کسی ادارے میں کلچرل آبجیکٹس یا ایم ایس ایس کو محفوظ رکھنے کے کام کا کچھ تجربہ۔

۲۔ اردو/فارسی کی جان کاری

۳۳ مائیکرو فوٹوگرافسٹ (ایک جگہ) (مستقل) سرسید اکاڈمی

شرح تنخواہ۔ ۱۴۰۰ — ۴۰ — ۱۸۰۰ — ای بی — ۵۰ — ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت ۱۔ ایم ایس سی فزکس میں۔

۲۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے فوٹوگرافی میں ایک سال کا ڈپلوما یا فوٹو گرافی میں سرٹیفکیٹ کے ساتھ مائیکرو فلمنگ میں پانچ سال کا تجربہ۔

۳۔ اردو/فارسی کی جان کاری۔

۳۴۔ سیمی پروفیشنل (consolidated) ایم۔اے لائبریری اور دیگر لائبریریز میں

شرح تنخواہ:۔ ۱۳۲۰ — ۳۰ — ۱۵۶۰ — ای بی ۴۰ — ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی بی۔اے/بی۔ایس سی/بی کام کے ساتھ بی۔لب۔ایس سی یا ایک سال کا لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔

۲۔ پسندیدہ اردو/انگریزی ٹائپ رائٹنگ کے ذریعے کیٹلاگ کارڈز تیار کرنے کی صلاحیت

۳۵۔ نسخہ بند (ایک جگہ)(مستقل) اے۔کے۔ طبیہ کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ ۱۳۲۰ — ۳۰ — ۱۵۶۰ — ای بی — ۴۰ — ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاونسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی تعلیمی۔ ہائی اسکول یا اس کے مساوی یونیورسٹی سے تسلیم شدہ اورینٹل امتحان پاس شدہ ٹیکنیکل اسٹیٹ/بورڈ/یونیورسٹی سے تسلیم شدہ کسی ادارے سے یونانی میڈیسن میں ڈپلوما یا سہایک حکیم

۲۔ پسندیدہ نسخہ بندی میں تین سال کا تجربہ قابل ترجیح ہوگا۔

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۱۳/۸۷-۸۶ مورخہ ۱۸ ستمبر ۸۶ء اور اشتہار نمبر ۲۲/۸۷-۸۶ مورخہ ۲۷ فروری ۸۷ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں، ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو پہلی

درخواست کی بنیاد پر امیدوار تسلیم کیا جائے گا

۲۶۔ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (آرکیٹکچر) (ایک جگہ) یونیورسٹی پولی ٹیکنک۔
شرح تنخواہ:- ۱۳۲۰-۳۰-۱۵۶۰-ای-بی-۴۰-۲۰۴۰روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت
۱۔ لازمی ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائننگ (آرکیٹکٹ/سول) میں ڈپلوما۔ اور اس کے ساتھ کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔

یا

ڈرافٹس مین شپ (آرکیٹکٹ/سول) میں سرٹیفکٹ کے ساتھ کم از کم سات سال کا تجربہ۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۷۔ لوور ڈویژن کلرک (ریکارڈز) مستقل) ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیالوجی۔
شرح تنخواہ- ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰-ای-بی-۲۵-۱۵۰۰-روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت
۱۔ لازمی ا۔ بی۔اے/بی۔ایس سی/بی کام
ب انگریزی ٹائپ رائٹنگ کے ساتھ جانکاری کے ساتھ ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار
۲۔ پسندیدہ ریکارڈ کیپنگ میں کم از کم تین سال کا تجربہ۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک ٹائپنگ ٹیسٹ دینا ہوگا وہ امیدوار جو ٹائپنگ ٹیسٹ میں کامیاب قرار دیے جائیں گے ان کو ہی انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔

۲۸ کلرک (ریکارڈز) ڈپارٹمنٹ آف بایوکیمسٹری - جے۔ ایم۔ ایم سی۔
شرح تنخواہ- ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰-ای بی-۲۵-۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی بی۔اے/بی۔ایس سی/بی۔کام
(الف) ایسے ڈپارٹمنٹ، جو تدریس/ریسرچ ان کیمسٹری یا بایولوجی میں معروف ہوں کے آفس میں کام کرنے کا دو سال کا تجربہ۔
ب کم سے کم ۳۰ الفاظ فی منٹ کے اعتبار سے ٹائپ کرنے کی صلاحیت جو کہ ٹائپنگ ٹیسٹ کے ذریعے جانچی جائے گی۔

کلرک (ریکارڈز) (مستقل) جے-این-میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ:- ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰-ای بی-۲۵-۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱- لازمی- بی اے / بی-ایس سی / بی کام

ل- کلکشن اینڈ کمپائلیشن آف میڈیکل ڈاٹا اینڈ انٹرپریٹیشن میں دوسال کا تجربہ-

ب- کم از کم ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ٹائپ کرنے کی صلاحیت جو کہ ٹائپنگ ٹیسٹ کے ذریعے جانچی جائے گی-

۴۰- الیکٹریشن کم پمپ آپریٹر (ایک جگہ) (مستقل) رجسٹرار آفس-

شرح تنخواہ:- ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰- ای بی ۲۵- ۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱- ہائی اسکول / جونیر ہائی اسکول اور آئی ٹی آئی کا سرٹیفکیٹ فٹر کے ٹریڈ میں یا مکینک یا الیکٹریشن کے ٹریڈ میں-

۲- بجلی کے ذریعے چلنے والے پمپنگ پلانٹ اور دوسرے انسٹالیشن جس میں ٹیوب ویل اور سمپ- ویل شامل ہیں، ان کے چلانے اور دیکھ ریکھ کرنے کا پانچ سال پریکٹیکل تجربہ-

امیدوار میں چھوٹی موٹی بجلی اور مشینی خرابیاں درست کرنے کی صلاحیت بھی ہو-

نوٹ: مناسب حالات میں تعلیمی صلاحیت (سوائے آئی-ٹی-آئی سرٹیفکیٹ کے) میں نرمی برتی جائے گی-

اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا-

اعلیٰ تعلیمی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کے ابتدا سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے افراد کو سکنڈ کلاس ریلوے کا ایک طرف کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دفتر سے، ۱۰ روپے برائے اسامی نمبر ۱-تا-۱۸ اور باقی ماندہ اسامیوں کے لیے ۷/- روپے نقد فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود جمع کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۹×۴ سینٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں، بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ
۱۷/ اگست ۱۹۸۷ء
(آفس ٹایم تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی
(آئی۔اے۔ایس)
رجسٹرار

(460/551)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار داخلہ نمبر ۷

سیشن ۸۷—۸۸

درج ذیل فیکلٹیوں کے تحت محکموں میں دوران سیشن ۸۷—۸۸ ایم۔فل/پی ایچ۔ڈی کورسز کے لیے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

۱۔ فیکلٹی آف آرٹس
ڈپارٹمنٹ آف انگریزی/فلاسفی/لسانیات/سنسکرت/اردو/ہندی/عربی/جدید ہندوستانی زبانیں۔

۲۔ فیکلٹی آف سوشل سائنسز
ڈپارٹمنٹ آف اکونومکس/ایجوکیشن/ہسٹری/سیاسیات/سائیکالوجی/سوشیالوجی/ویسٹ ایشین اسٹڈیز/اسلامک اسٹڈیز

۳ فیکلٹی آف سائنس
ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری/جغرافیہ/جیالوجی/اسٹیٹسٹکس/میتھمیٹکس/فزکس۔

۴ فیکلٹی آف لائف سائنس
ڈپارٹمنٹ آف بایوکیمسٹری/بوٹنی/زولوجی/سینٹر آف وائلڈ لائف اینڈ اورنیتھیالوجی۔

۵۔ فیکلٹی آف کامرس
ڈپارٹمنٹ آف کامرس/بزنس ایڈمنسٹریشن۔

۶ فیکلٹی آف میڈیسن
ڈپارٹمنٹ آف مائیکربیالوجی/بایوکیمسٹری/فارماکولوجی/اناٹمی۔

۷۔ فیکلٹی آف انجینیرنگ
ڈپارٹمنٹ آف سول/الیکٹریکل/مکینکل/کیمیکل انجینیرنگ۔

۸ فیکلٹی آف لاء
ڈپارٹمنٹ آف لاء۔

۹۔ فیکلٹی آف تھیالوجی
ڈپارٹمنٹ آف سنی/شیعہ تھیالوجی

۱۰ انسٹی ٹیوٹ آف بایوٹیکنالوجی۔

مطلوبہ قابلیت:

اس یونیورسٹی سے ماسٹرس ڈگری (ایم۔ اے، ایم ایس سی، ایم کام، ایم ایڈ، ایم۔ ٹی ایچ، ایل۔ ایل۔ ایم وغیرہ) یا اس کے مساوی ڈگری کسی دوسری یونیورسٹی سے جسے یہ یونیورسٹی تسلیم کرتی ہو۔ پاس شدہ امتحان میں ۵۰ فیصد سے کم نمبر نہ ہوں یا اس کے مساوی گریڈ۔ متعلقہ مضمون میں وقتاً فوقتاً متعلقہ سی۔ اے۔ ایس آر بورڈ آف اسٹڈیز کی طرف سے اگر کوئی مزید قابلیت درکار ہوگی تو وہ درج بالا کے علاوہ ہوگی

درخواست کیسے دیں۔

مجوزہ درخواست فارم ڈپٹی رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے مطلوبہ قیمت -/۳ روپے نقد یا فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادا کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر فارم بذریعہ ڈاک مطلوب ہو تو عام ڈاک کے لیے ۹ × ۶ سائز کا خود کا پتا لکھا لفافہ روانہ کریں جس پر تین روپے چالیس پیسے کے ڈاک ٹکٹ چسپاں ہوں۔

اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مطلوب ہو تو خود کے لکھے لفافہ پر نو روپے ستر پیسے کی ٹکٹیں چسپاں کریں۔

ہر اعتبار سے درخواستیں مکمل کر کے متعلقہ دستاویزات اور فنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام کراسڈ پوسٹل آرڈر کی شکل میں رجسٹریشن فیس -/۵ روپے (ناقابل واپسی) کے ہمراہ بتاریخ

۱۷ اگست ۱۹۸۷ء

کو یا اس سے قبل ڈپٹی رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو موصول ہو جانا چاہیے۔

نامکمل درخواستیں یا تاریخ نکل جانے کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور اس سلسلے میں مزید کوئی خط و کتابت نہیں ہوگی۔

داخلے کے لیے منتخب امیدواروں کو داخلے کی تاریخ سے مطلع کر دیا جائے گا۔

این موئیدین
کنٹرولر امتحانات اور داخلہ

(482/585)

مقالہ نگاروں کے لیے

- تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔
- عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔
- ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔
- مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔
- مسودہ بڑے سائز (20cm x 30cm) کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے
- مضامین وضاحت کے لیے دی جانیوالی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔
- اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

انچارج سرکولیشن
مستقیم احمد خان

زرسالانہ :		
انڈیا	...	Rs. 30.00
بیرونی ممالک	...	US $ 20.00 ہوائی ڈاک
		US $ 8.00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ : ایڈیٹر
تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، انڈیا۔

مالک : مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر : اسرار احمد۔ مقام اشاعت : ادارۂ تہذیب الاخلاق مسلم یونیورسٹی علیگڑھ : پریس : ایس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی

مندرجات

اداریہ

کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ؟ آپ کی کلائی پر بندھی ہوئی یہ گھڑی، آپ کی جیب میں لگا ہوا یہ قلم، آپ کی بینائی کو سہارا دینے والی یہ عینک، آپ کو جامہ زیب بنانے والے یہ مصنوعی کپڑے، یہ سائیکل، یہ اسکوٹر، یہ کار، یہ ریل گاڑی، یہ دخانی جہاز اور ہوائی جہاز جن سے آپ سفر کرتے ہیں کن لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں ؟

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ؟ بجلی کے یہ رنگ برنگے بلب، یہ ٹیوب لائٹ، یہ برقی پنکھے، یہ ٹیلی فون، یہ ریڈیو، یہ ٹیلی ویژن اور اسی قسم کی دوسری بے شمار ایجادات جن سے آپ کی زندگی کا سفر آسان ہو گیا ہے، کن لوگوں کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہیں ؟

کیا آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ؟ بنجر زمینوں کو غلّے کی کان بنا دینے والی انواع و اقسام کی کھاد، جانوروں اور مچھلیوں کی افزائش نسل کے نت نئے طریقے، باغات کو رنگ برنگے پھولوں اور مختلف قسم کے پھلوں سے بھر دینے والے تحقیقی نتائج اور زمین کا سینہ چیر کر پٹرول اور دیگر معدنیات نکالنے والی ٹکنالوجی کس انسانی گروہ کی شب بیداریوں کی دین ہے ؟

ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھیے! صرف چند دہائیوں پہلے طاعون اور چیچک سے بستیوں کی بستیاں ویران ہو جاتی تھیں، مگر آج ان بیماریوں کا نام و نشان تک نہیں۔ کالرا اور ٹی۔ بی کو موت کی دستک سمجھا جاتا تھا، مگر اب کوئی ان سے خوف نہیں کھاتا۔ پھول جیسے بچے موت کی تپش سے دیکھتے دیکھتے مرجھا جاتے تھے مگر اب یہ حادثات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کی بدولت آج صورت حال یہ ہے کہ بیشتر موذی بیماریوں پر قابو پا لیا گیا ہے، انسانی صحت اور تندرستی ہر آن بہتری پر ہے اور انسان کی اوسط عمر ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا کبھی آپ نے یہ جاننے کی زحمت کی کہ انسانی فلاح و بہبود کے ان چراغوں کو جن سے سبھی مستفید ہوتے ہیں، کن لوگوں نے اپنے خون سے جلایا ہے ؟

گمان غالب ہے کہ شب و روز کی مصروفیات نے آپ کو یہ موقع ہی نہ دیا ہو گا کہ آپ ان باتوں پر غور کریں، ان معاملات پر سوچیں یا اس بابت کچھ جاننے کی کوشش کریں۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ یہ انکشاف آپ کو تحیّر میں ڈبو دے کہ انسانی زندگی کے سفر میں آسانیاں، سہولتیں اور راحتیں پیدا کرنے والی ان جدید ایجادات میں چاہے جس کسی انسانی گروہ کا خونِ جگر شامل ہو، ہم مسلمانوں کے پسینے کے چند قطرے بھی شامل نہیں۔

کتنا تضاد ہے اس حقیقت حال میں اور بچپن سے ہمیں باور کرائی جانے والی اس بات میں کہ خدا کے آخری پیغام کے حامل ہونے کی حیثیت سے مسلمان نہ صرف اُس دنیا میں بلکہ اِس دنیا میں بھی سرخرو رہیں گے اور نسل انسانی کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود میں دنیا والوں کی پیشوائی کریں گے۔ اور کتنے مضر اثرات ہوتے اس تضاد کے اگر ہمارے سامنے یہ تاریخی حقیقت نہ ہوتی کہ تقریباً پانچ صدی پہلے تک خدا کے آخری پیغام کے حاملین نے مسلسل چار سو سال تقریباً ہر میدان میں دنیا کی رہنمائی کی اور انسان کے علمی ورثے کے لائق امین بنے۔ انہوں نے مختلف تہذیبوں کے علوم و فنون پر نہ صرف کامل دسترس حاصل کی بلکہ شب و روز کی محنت اور لگن سے ان میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ علوم و فنون کے میدان میں مسلمان پیچھے کیوں رہ گئے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ کیوں لگ گیا ؟ اگرچہ ان سوالوں کے جوابات پا لینا اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی یہ بات کچھ حد تک وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس صورت حال کی زیادہ تر ذمہ داری مسلمانوں کے اس طبقے پر آتی ہے جو اسلاف کے علمی اثاثے کا امین بنا اور جسے مسلم عوام کی اکثریت نے علمی معاملات میں اپنا رہنما مانا اور یہ طبقہ ہے ہمارے مذہبی علمائے کرام کا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ہمارے اس خیال سے اتفاق نہ کریں اور وہ مسلمانوں کے علمی زوال کو ان کے عام سیاسی اور اقتصادی زوال کی ایک کڑی

سمجھتے ہوئے اس کی زیادہ تر ذمہ داری ایک خاص طبقے کے سر ڈالنا صحیح نہ سمجھیں۔ ان کے سامنے ہم دو حقایق پیش کرنا چاہیں گے۔ اول مسلمانوں کا علمی زوال ان
، سیاسی زوال سے صدیوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں علمی تخلیق کا کاروبار تقریباً چودھویں صدی عیسوی سے زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا تھا جبکہ
ہ جودہ صدی کے اوائل تک دنیا کے اچھے خاصے علاقوں پر ان کو سیاسی برتری حاصل تھی۔ دوم دنیا کے کسی بھی خطہ میں شاید ہی یہ کبھی ہوا ہو جب مسلمانوں کی
ثریت نے علمی معاملات میں مذہبی علماء کی رہنمائی نہ تسلیم کی ہو۔ اس بات کا واضح ثبوت کثیر تعداد میں پھیلی ہوئی دینی درس گاہوں سے ملتا ہے جنہیں مسلم
وام اپنے پسینے کی کمائی سے چلاتے ہیں۔ خود ہمارے ملک کے صوبہ یو۔پی اور بہار میں ایسی درس گاہوں کی تعداد جن میں درجہ آٹھ یا اس سے اعلیٰ سطح کی
یلیم دی جاتی ہے، تقریباً دو ہزار ہے۔ دینی مکاتیب ان کے علاوہ ہیں۔

یقین کیجیے۔ درج بالا باتوں سے ہمارا مقصد مذہبی علماء کی تنقیص نہیں اور نہ ہی یہ ہمارا منصب ہے۔ ہمارے سامنے ان کا بے مثال ایثار ہے اور ان کی
ہ قابل قدر قربانیاں ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے کی ہیں۔ یہاں ہم محض اس حقیقت کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ علمی میدان میں علمائے کرام سے جس
صیرت اور دور اندیش قیادت کی توقع تھی، اس پر وہ پورے نہیں اترے۔ انہوں نے تحقیق و جستجو اور علوم کی تخلیق کے پرخار اور دقت طلب راستوں کو چھوڑ کر تقلید کے
ساف اور سہل راستوں کو اپنا لیا۔ انہوں نے اسلاف کے "علم کے خزانے جہاں کہیں بھی ہیں سمیٹ لو" والی روش کو ترک کر دیا اور مغرب میں آنے والے جدید سائنسی
علوم کے عظیم انقلاب کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے سائنس اور علم دو مختلف چیزیں ہوں۔ بدقسمتی سے یہ صورت حال ابھی تک برقرار ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی دینی
رس گاہ میں چلے جائیے وہاں آپ کو وہی طریقہ تعلیم اور نصاب ملے گا جو صدیوں پہلے تھا۔ جب کہ خود انہیں درس گاہوں میں لالٹین کی جگہ بجلی کے بلب، قلم اور دوات
کی جگہ فاونٹن پین، دھوپ گھڑی کی جگہ دیوار گھڑی، ہاتھ کے پنکھوں کی جگہ بجلی کے پنکھے، کنویں کی جگہ واٹر پمپ اور اذان دینے کے لیے لاوڈ اسپیکر ملیں گے۔ یہ
سب تبدیلیاں تو آئیں پر افسوس کہ جسے بدلنا چاہیے تھا وہی نہ بدلا، یعنی نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم۔

کہنے کی بات نہیں۔ آج کا زمانہ ناقابل یقین حد تک تیز رفتار ہے۔ سالوں کے سفر اب گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ حساب جسے سیکڑوں افراد
کی ٹیم سالوں میں حل کیا کرتی تھی، آج کمپیوٹر کی بدولت سکنڈوں میں حل کر دیے جاتے ہیں۔ کل تک جو کچھ ناقابل یقین تھا، آج قابلِ یقین ہے لیکن مسلمانوں کا حال یہ
ہے کہ علمی لحاظ سے جہاں وہ صدیوں پہلے تھے آج بھی تقریباً وہیں ہیں۔ جو تھوڑی بہت پیش رفت نظر بھی آ رہی ہے وہ فریب نظر ہے۔ کیوں کہ دوسرے ہمارے مقابلے
میں کافی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس طرح ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فاصلہ بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کیا یہ بات باعث شرم نہیں کہ
وہ امت جس کے امی پیغمبر پر سب سے پہلے وحی " اقرا، باسم ربک (پڑھو اپنے رب کے نام سے)" اتری ہو وہ علوم و فنون کے میدان میں پسماندہ رہے۔ اس
صورت حال کو بدلنا ہی ہوگا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے علماء اور ہماری دینی درس گاہیں علم کو اس کے وسیع تر معنیٰ میں لیں، متروک فکری ڈھانچے
سے نکلیں، محسوسات، مشاہدات اور تجربات کو بھی فکری ڈھانچے کی ایک اہم کڑی سمجھیں اور جدید سائنس کو جس نے انسانی فکر اور معاشرت میں ایک عظیم انقلاب
برپا کر دیا ہے اور جو کسی طور بھی مذہب کی نفی نہیں کرتی، مدارس کے نصاب میں مناسب مقام دیں۔ جب تک اس سمت پیش رفت نہ ہوگی، امت مسلمہ
کا پھر سے دنیائے علم و دانش میں ایک باوقار مقام پر فائز ہونے کا خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔

اسرار احمد

تعلیم و تربیت

سید احمد خانؒ

تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے، بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ انسان میں ہے، اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے؛ اور اس کو کسی کام کے لایق کرنا، اس کا تربیت کرنا ہے؛ مثلاً، جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے؛ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کو باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے، جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے؛ اور انسان کو تربیت کرنا، اس کے لیے سامان کا مہیا کرنا اور اس سے کام کا لینا ہے؛ جیسے جہاز طیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا پانا کچھ ضروری نہیں ہے۔ تربیت چاہو جتنی کرو اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو! مگر اس سے دل کی سرچشمے نہیں کھلتیں، بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔

اندرونی قویٰ کو حرکت دیے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے، مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو، اور تعلیم بہت بُری۔ یہی حال ٹھیک ٹھیک ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے؛ کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے، اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو، تو طمطراق بہت کچھ، مگر جب اصلیت ڈھونڈھو، تو کچھ نہیں۔ بھاری بھر کم تو عمامہ و دستار، جبّہ و کرتہ سے بہت کچھ مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو، تو کچھ بھی نہیں۔

نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے؛ بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جن میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو، جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔

ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں؛ کہ ان کے روحانی قولے بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں؛ اور صرف زبانی بک بک یا تکبّر و غرور، اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر، قابل ادب، سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا؛ زندہ ہوتے ہیں، مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مُردار ہوتے ہیں؛ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں ان سے بہم پہونچیں اُن کو اور زیادہ پڑھتے ہیں، اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے، اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی، بلکہ وہ کتابی علم خود اُن پر بوجھ ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہیں، یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل کو، اور اپنے اندرونی قویٰ کو، بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو عام کرتے ہیں، وہ بھی بعوض اس کے کہ روحانی قویٰ کو سرسبز و شاداب کرے، ان کو پژمردہ کر دیتا ہے؛ اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں، بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے؛ اور ہماری حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے کیا دنیا کے، خراب ہوتی ہی چلی جاتی ہے۔

پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہیے؛ اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ اور شاداب کرے، اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے، جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو۔

اسلام امن و آشتی کا مذہب

مولانا عبدالوہاب بخاری میموریل لیکچر۔ مدراس میں پڑھا گیا خطبہ

سید ہاشم علی | ترجمہ | سیّد شفیق احمد

اِسلامی عقاید اور اسلامی معاشرتی نظام کا سرچشمہ قرآن پاک ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تاکہ وہ ہم عصر عربوں کی اور تمام عالمِ انسانیت کی رہبری و رہنمائی کر سکیں۔ وہ لوگ بھی اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک بلاشبہ اسلام کی بنیادی کتاب ہے اور اس لیے اسے ہی مسلمانوں کے فکر و عمل کی بنیاد بھی ہونا چاہیے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مذہب میں کچھ ایسی رسومات شامل ہو گئی ہیں جن کا قرآنی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر غیر مسلموں کی نظروں میں تعلیماتِ قرآنی کی ہمہ گیری اور وسیع النظری کی وہ اہمیت نہیں ہے جو ہمارے دل میں ہے۔ اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے خیال سے میں نے اس مضمون میں حوالوں کو قرآن کریم تک ہی محدود رکھا ہے۔ حدیثوں، تفسیروں، علمائے کرام کے خیالات اور مغربی محققین کے فضائلِ اسلام سے متعلق مضامین سے استفادہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کا حوالہ دیا ہے (بجز ایک مقام کے جہاں ایک مشہور حدیث کا ذکر کیا گیا ہے)۔

لفظ اِسلام کے معنی ہیں امن اور سلامتی۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ راضی برضائے حق ہونا۔ قرآن حکیم میں جا بجا امن اور سلامتی کا ذکر ہے۔ اس بات پر نہایت زور دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان کو امن و سلامتی کا راستہ اپنانا چاہیے، "جیو اور جینے دو" دراصل قرآن کا یہی پیغام ہے۔ مسلمانوں کو نفرت اور انسان بیزاری سے پرہیز کرنے کو کہا گیا ہے۔ حقوق کی نامساویانہ تقسیم ہی انسانوں کے درمیان باعثِ تنازعہ رہی اور تاریخ اس کی مثالوں سے بھری ہے۔ اپنے کو نسلی، مذہبی یا سماجی اعتبار سے برتر سمجھنے کی خام خیالی نے بھی اختلافات کو بڑھاوا دیا ہے۔ ہر دور میں طاقتور افراد نے کمزوروں کا استحصال کیا ہے۔ مذہبی جنگوں میں تو سب سے زیادہ انسانی جانیں قربان ہوئی ہیں۔ اِسلام کا عقیدۂ وحدت باعثِ تنازعہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مختلف خداؤں کے ماننے والے بھی آپس میں جنگ و جدال سے باز نہیں رہے۔ وقت کی تنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن حکیم سے میں صرف ان آیات کو پیش کرنے کی جسارت کروں گا جن کا تعلق اللہ تعالیٰ انسان اور مذہب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کمال ذات و صفات کا ذکر حسبِ ذیل آیاتِ قرآنی میں تفصیل سے ملتا ہے۔

آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ یعنی اللہ اپنے کمالِ ذات و صفات میں ایک ہے۔ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں۔ اس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔ الاخلاص —
۴-۱ : ۱۱۳ —

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربّی ہیں ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔
الفاتحہ ۳-۱ : ۱

وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب۔ البقرہ ۲-۲۹
کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔ الشوریٰ ۴۲-۱۱
وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے۔ الحدید ۳-۵۷
میں نے جن اور انسانوں کو اس واسطے پیدا کیا کہ وہ میری

عبادت کیا کریں۔ الطور ۵۹- ۵۱

- جلاتا اور مارتا تو اللہ ہی ہے۔ آل عمران ۱۵۶- ۳

- اس کی کرسی نے سب زمین اور آسمانوں کو اپنے اندر لے رکھا ہے۔ البقرہ ۲۵۵- ۲

- جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو اپنی طرف سے ہدایت کر دیتے ہیں۔ الرعد ۲۷- ۱۳

- اور اللہ ہی کی ملوک ہیں سب (جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی جس طرف بھی منہ کرو، اُدھر ہی اللہ کا رخ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ محیط ہیں کامل العلم ہیں۔ البقرہ ۱۱۵: ۲

- اور آپ کے رب کو سب کی خبر ہے جو کچھ ان کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں۔ النمل ۷۴- ۲۷

- کیا یہ بات تم لوگوں کو معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اس نے تم پر نعمتیں ظاہری و باطنی پوری کر رکھی ہیں۔ لقمان ۲۰- ۳۱-

- ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ۔ ق ۱۶- ۵۰

- منظور کر لیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور درخواست دے۔ البقرہ ۱۸۶- ۲

- اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ الانعام ۱۲۳- ۶

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ کسی ایک فرقے کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ تمام عالم انسانیت کا خدا ہے وہ ایک عالم کا نہیں بلکہ عالمین کا خدا ہے۔ وہ ساری کائنات کا خدا ہے اگر سبھی لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ خدا تو سبھی انسانوں کا خدا ہے تو اختلافات اور تنازعات کی ایک بڑی وجہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کے بارے میں قرآن کا مطمعِ نظر حسبِ ذیل آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

- اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا ہے۔ النساء ۱- ۴

- اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین پر ایک نائب۔ البقرہ ۳۰- ۲

- سو میں جب اس کو پورا کر چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدے میں گر پڑو۔ ۲۹- ۱۵

- ہم نے انسان کو بڑی مشقت سے پیدا کیا ہے البلد ۴- ۹۰

- وہ پاک ذات ہے جس نے تمام متقابل قسموں کو پیدا کیا۔ یٰسین ۳۶- ۳۶

- انسان کچھ طبعاً ہی جلد باز ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل ۱۱- ۱۷

- اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ الحجرات ۱۳- ۴۹

- جو شخص کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے یا بدون کسی فساد کے قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جو شخص کسی شخص کو بچا لیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا۔ المایدہ ۳۲- ۵

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، اب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ایک اقتباس پیش کروں گا۔

"ایک عرب کسی غیر عرب (عجمی) سے بہتر نہیں ہے اور نہ ہی کسی دوسرے عرب سے۔ نہ ہی کوئی سفید فام کسی سیاہ فام سے اور نہ ہی کوئی سیاہ فام کسی سفید فام سے بہتر ہے۔ اگر کوئی کسی سے بہتر کہا جا سکتا ہے تو وہ ذاتی خوبیوں کی بنا پر جن کا اظہار وہ اپنے معاشرے

---

۱ اس مضمون میں آیات قرآنی کا ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے القرآن الحکیم مطبوعہ تاج کمپنی لاہور سے ماخوذ ہے۔ (مترجم)۔

کے افراد سے روزمرہ کے معاملات طے کرنے میں کرتا ہے۔"

انسان کے بارے میں قرآن کا زاویۂ نگاہ کسی نسلی یا معاشرتی بالادستی پر مبنی نہیں ہے۔ وہ مساوات کا سبق سکھاتا ہے۔ انسان کی بالاتری کا معیار کردار کی بلندی، دیانت داری اور منصف مزاجی کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس معیار پر صدق دل سے عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان اٹھنے والے اختلافات ختم نہ ہو سکیں۔ قرآن حکیم کی ہدایت تو یہ ہے کہ انسان کو امن و سلامتی برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ:

- ایمان والوں کو خوشی خبری سنا دیجیے اور اللہ کو اپنی قسموں کے ذریعہ ان امور کا حجاب مت بناؤ۔ تم نیکی، تقویٰ اور اصلاح فی ما بین خلق سے کام کرو اور اللہ سب کچھ جانتے ہیں۔ البقرہ: ۲۲۴ - ۲
- اے میری قوم تم ناپ اور تول پوری کیا کرو انصاف سے اور لوگوں کا ان چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے حد سے مت نکلو۔ ھود ۸۵ - ۱۱

بہت سے اختلافات محض غلط فہمیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن میں غلط فہمیوں کو دور کرنے اور آویزشوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر دوران جنگ یا اس سے قبل دشمن امن اور صلح کی پیش کش کرے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ قرآن میں آیا ہے کہ:

- اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر پہنچا دو۔ پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ الحجرات ۶ - ۴۹
- اگر کفار صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیے۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھیے۔ بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ الانفال ۶۱ - ۸
- اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہیں۔ وہ وہی ہیں جس نے آپ کو اپنی امداد سے اور ... کو قوت دی۔ الانفال ۶۲ - ۸
- اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرا دو۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے۔ پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔ الحجرات ۹ - ۴۹
- مسلمان تو سب بھائی ہیں۔ سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ الحجرات ۱۰ - ۴۹
- تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک واضح کتاب۔ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں، سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں۔ المائدہ ۱۶ - ۵
- اور دنیا میں اس کے بعد اس کی درستی کر دی گئی۔ فساد مت پھیلاؤ اور اللہ کی عبادت کیا کرو ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔ الاعراف ۵۶ - ۷
- عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جنھوں نے خلوق اللہ پر ظلم کر رکھا ہے۔ الشعراء ۲۲۷ - ۲۶
- اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعے سے دفع کرتے رہا کرتے ہیں تو سرزمین تمام تر فساد سے پُر ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔ البقرہ ۲۵۱ - ۲
- یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔ القصص ۸۳ - ۲۸

مندرجہ بالا آیات کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہشت کے دروازے

اس پسند لوگوں کے لیے کھول دیے گئے ہیں اور وہ اس کے مکین ہوں گے
فتنہ گروں اور شر پسندوں کا داخلہ اس میں ممنوع ہوگا۔ اسلام کے دو بنیادی
اصولوں یعنی اللہ سے اخلاص اور بندوں میں اتحاد پر اُن معاشروں میں
بھی اب عمل کیا جاتا ہے جو خدا کی وحدت اور مساوات پر یقین نہیں رکھتے۔
ان اصولوں کے عمل درآمد پر اُن مذاہب میں بھی زور دیا جا رہا ہے جو اپنے
ہی مذہب کی تعلیمات کو چھوڑ چکے ہیں۔ بعض غیر جانب دار اور غیر متعصب
محققین نے اسلام کی ان خوبیوں کا اعتراف کیا ہے اور دل سے سراہا
ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلام کا تیسرا بنیادی نظریہ کہ قرآن مجید
ایک آسمانی صحیفہ ہے اور وہ وحی کی شکل میں نازل کیا گیا تاکہ لوگ اس
سے رہنمائی حاصل کر سکیں، اس اہمیت اور توجہ کو حاصل نہ کر سکا جس کی
اشد ضرورت تھی اور ہے۔

قرآن مجید میں جا بجا اس بات کا ذکر ہے کہ رسول خدا حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وسلم سے قبل بھی اللہ تعالیٰ نے بہت سی مقدس کتابیں نازل فرمائیں
اور نبیوں اور پیغمبروں کے ذریعے لوگوں کو ان کی زبان میں ہدایت بہم پہنچائیں۔
یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ اسلام سابقہ آسمانی صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے۔
تنگ نظری اور خود کو برتر سمجھنے کی غلط فہمی نے انسانوں کے درمیان
تفرقہ ڈال دیا ہے۔ سیکولرزم کا وہ پہلو جسے ہندوستانی معاشرے میں
مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اخوت اور مساوات کا ضامن
سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم میں ہمیں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر ان
پر عمل کیا جائے تو ساری دنیا ایک ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے
اور عقیدت رکھنے والے مختلف مذاہب کے بندوں میں اتحاد برقرار
رکھنے کے لیے قرآن میں دو بنیادی باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔
اوّل یہ کہ قادرِ مطلق پر کامل یقین (اسے چاہے ہم جس نام سے بھی پکاریں)
اور دوم آخرت یعنی روزِ محشر، سزا و جزا پر مکمل یقین۔

قرآن حکیم کی ۶،۲۴۴ آیات میں سے تیرہ سو سے زیادہ آیات
دوسرے مذاہب اور اہلِ کتاب کے افراد سے متعلق ہیں۔ یعنی قرآن کا
تقریباً پانچواں حصہ دوسرے مذاہب، ان کے پیغمبروں اور صحیفوں سے
متعلق ہے۔ اگر قرآن کے اتنے بڑے حصے کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور
اس پر نیک نیتی اور پوری دیانت داری سے عمل کیا جائے تو یہ کوشش
تمام مذاہب کے مابین مفاہمت قائم کرنے کے لیے ایک تحریک کا درجہ
حاصل کر سکتی ہے۔ قرآن کا نظریہ تو یہ ہے کہ دین یا دھرم کے بنیادی
اصول اور قوانینِ قدرت سب انسانوں کے لیے ایک جیسے ہیں۔ زمانے
کے ہاتھوں تحریف، فروعات پر زور، جداگانہ رسم و رواج، زبان اور
عبادت کے طریق میں اختلاف کے سبب ایسا لگتا ہے جیسے مذاہب ایک
دوسرے سے بالکل ہی الگ تھلگ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

آپ فرما دیجیے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو
ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و
یعقوب اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰ
اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی
طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم اُن میں سے کسی ایک میں بھی تفریق
نہیں کرتے اور ہم تو اللہ کے ہی مطیع ہیں۔ آل عمران ۸۴-۳

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا ہے جس
کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے
ذریعے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو
(مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا اور ان کی امم کو یہ کہا
تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ الشوریٰ ۱۳-۴۲

اور ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو وہ ہیں کہ جن کا
قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا۔ بعضے وہ ہیں کہ جن کا قصہ ہم نے
بیان نہیں کیا۔ المؤمنون ۷۸-۴۰

اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا
نہ گزرا ہو۔ فاطر - ۲۴ - ۲۵

جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر اور روزِ
قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے۔ ایسوں کے لیے ان کا حق الخدمت
بھی ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ وہاں جا کر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں
آپڑا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ البقرہ ۶۲-۲

ہم نے رسولوں کو اُن کی قوموں میں اُتارا جو اُن کی ہی زبان بولتے
تھے۔ تاکہ پیغامِ خدا کو بہتر طور پر سمجھا سکیں۔

آپ فرما دیجیے کہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے

اور تمہارے درمیان برابر ہے اور وہ یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے سوائے خدا تعالیٰ کے۔ پھر اگر وہ لوگ حق سے اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے اس اقرار کے) گواہ رہو کہ ہم ماننے والے ہیں۔

آل عمران ۶۴ ـ ۳

- ہم نے ہر امت کے واسطے ذبح کرنے (رسومات) کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ وہ اس طریق پر ذبح (رسومات ادا) کیا کرتے تھے۔ سو اُن کو چاہیے کہ آپ سے جھگڑا نہ کریں۔ آپ اُن کو اپنے رب کی طرف بلاتے رہیے کیونکہ آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں۔ الحج ۶۷ ـ ۲۲

- تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے لیکن جو دین تم کو دیا ہے ان میں تم سب کا امتحان فرمائیں گے تو مفید باتوں کی طرف دوڑو۔ تم سب کو خدا کے پاس جانا ہے۔ پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ المائدہ ۴۸ ـ ۵۔

- دین میں زبردستی نہیں ہے البقرہ ۲۵۶ ـ ۲

- آپ کہہ دیجیے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میں سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ اپنے اور تمہارے درمیان میں عدل رکھوں۔ اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے۔ الشوریٰ ۱۵ ـ ۴۲

- تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو۔ ہاں جو اُن میں زیادتی کرے۔ اس سے یہ کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو تم پر نازل کی گئیں۔ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم تو اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ العنکبوت ۴۶ ـ ۲۹

- آپ فرما دیجیے کہ تم لوگ ہم سے حجت کیے جاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں۔ حالاں کہ وہ ہمارا اور تمہارا سب کا رب ہے اور ہم کو ہمارا کیا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ملے گا۔ ہم نے صرف

- حق تعالیٰ کے لیے اپنے دین کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے البقرہ ۱۳۹ ـ ۲

- آپ فرما دیجیے کہ ہر شخص اپنے طریقے سے کام کر رہا ہے۔ سو تمہارا رب خوب جانتا ہے اس کو جو زیادہ ٹھیک رستہ پر ہے۔ بنی اسرائیل ۸۴ ـ ۱۷

- اور ان اقوام کی کیا تخصیص ہے۔ اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (جب یہ بات ہوتی تو) کیا آپ اُن لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس سے وہ ایمان لے ہی آویں۔ حالاں کہ کسی شخص کا ایمان بدون خدا کے حکم کے ممکن نہیں۔ یونس۔ ۱۰۰ ـ ۹۹ ـ ۱۰۔

اور وہ یعنی اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کر دیتا ہے۔ یونس ۱۰۰ ـ ۹۹ ـ ۱۰

- ایک اللہ کا رسول جو اُن کو پاک صحیفے پڑھ کر سنا دے جن میں درست مضامین لکھے ہوں البینۃ ۳ ـ ۲ ـ ۹۸

- آپ کہہ دیجیے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جاوے گا اور نہ یہ معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جاوے گا۔ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعے آتا ہے اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ الاحقاف ۹ ـ ۴۶

- وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دے دی اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر اس دنیا میں بھیجا۔ تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور اللہ کافی گواہ ہے۔

الفتح ۲۸ ـ ۴۸

- اور اُن میں سے بہت سے ناخواندہ ہیں (یعنی اہل کتاب میں سے مراد یہودیوں سے ہے) جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن خوش کن باتیں بہت یاد ہیں اور وہ لوگ کچھ نہیں خیالات پکا لیتے ہیں۔

البقرہ ۷۸ ـ ۲

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام مذاہب کے معتقدین میں ایک لاعلمی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

کیوں نہیں؟ جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کی خطاؤں نے
اس کو اس طرح [آ] احاطہ کر لے [کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے] سو ایسے لوگ اہلِ
دوزخ ہوتے ہیں [اور] وہ اس میں ہمیشہ [ہمیشہ] رہیں گے۔ البقرہ ۸۱-۲

یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کا مذہب کسی بنیاد پر قایم نہیں اور
اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کا مذہب کسی بنیاد پر نہیں۔
حالانکہ یہ سب لوگ آسمانی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ
جو بے علم ہیں ان کا سا قول کہنے لگے۔ سو اللہ تعالیٰ ان سب کے
درمیان عملی فیصلہ کر دیں گے۔ قیامت کے روز ان تمام مقدمات
میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔ البقرہ ۱۱۳-۲

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کا مطالعہ اس طرح کریں
جس طرح کرنا چاہیے (بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے
رہتے، جس طرح تلاوت کا حق ہے)۔ ایسے لوگ اس پر ایمان
لے آتے ہیں اور وہ شخص جو نہ مانے گا (کسی کا نقصان کرے گا)
خود ہی ایسے لوگ خسارے میں رہیں گے۔ البقرہ ۱۲۱-۲

پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے حجتیں نکالیں تو آپ فرما دیجیے کہ
میں تو اپنا رُخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو تھے
وہ بھی اور کہیے اہلِ کتاب سے اور (مشرکین) عرب سے کیا
تم بھی اسلام لاتے ہو۔ سو اگر وہ لوگ اسلام لے آویں تو
وہ لوگ بھی راہ پر آ جائیں گے اور اگر وہ لوگ روگردانی کریں
تو آپ کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ تعالیٰ خود دیکھ اور
سمجھ لیں گے۔ آل عمران ۲۰-۳

اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس
انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ مانگنے کے ساتھ
ہی اس کو تمہارے پاس لا کر رکھ دیں گے اور اُن میں سے
بعض شخص ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی
امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کریں گے، جب تک تم
ان کے سر پہ نہ کھڑے رہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ
کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہلِ کتاب کے حال کے بارے میں کسی طرح
کا الزام نہیں اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں اور یہ دل میں
وہ بھی جانتے ہیں۔ آل عمران ۷۵-۳

تعلقات میں بد دیانتی کی وجہ سے اختلافات پہنچتے ہیں۔

حسب ذیل آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں ایفائے وعدہ کو
کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ دوسرے مذاہب
کے افراد سے کیے گئے معاہدوں پر مضبوطی سے قایم رہو۔ اگر قرآن
کی اس ہدایت پر عمل کیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اس دنیا میں
اختلافات اور نفرت کم ہو جائے اور امن و مفاہمت قایم کرنے میں مدد
مل سکے۔

- اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے زیادہ
اچھا ہوتا۔ ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں اور زیادہ حصہ ان میں
سے کافر ہیں۔ آل عمران ۱۱۰-۳

ان اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو قایم ہے
اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی
پڑھتے ہیں۔ اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے
ہیں۔ نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔
نیک کاموں میں دوڑتے ہیں۔ یہ لوگ شایستہ لوگ ہیں اور
یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس سے محروم نہ کیے جاویں گے اور
اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو خوب جانتے ہیں۔ آل عمران ۱۱۵-۱۱۳-۳

- اور بالیقین بعض لوگ اہلِ کتاب میں سے ایسے ہیں جو اللہ
تعالیٰ کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کتاب کے ساتھ
بھی جو تمہارے پاس بھیجی گئی ہے اور اس کتاب کے ساتھ جو اُن
کے پاس بھیجی گئی۔ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ کی آیات کے
مقابلے میں کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے۔ ایسے لوگوں کو ان کا نیک
عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس سے۔ بلاشبہ اللہ
تعالیٰ جلد ہی حساب کر دیں گے۔ آل عمران ۱۹۹-۳

اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رُخ
اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم
کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو
اپنا خالص دوست بنایا تھا۔ النساء ۱۲۵-۴

مذکورہ آیت اس وجہ سے بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں ماقبل اسلام کے ایک پیغمبر کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ قابل ستائش وہ لوگ ہیں جو راضی بہ رضائے الٰہی ہیں اور کردار و عمل میں دیانت دار ہیں۔

قرآن میں آیا ہے کہ:

— اے اہل کتاب! تم دین میں حد سے مت نکلو اور خدا کی شان میں غلط باتیں مت کہو۔ النساء ۱۷۱-۴

— یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور فرقۂ صابئین اور نصاریٰ میں سے جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالےٰ پر اور روزِ قیامت پر اور نیک کام کرے (کارگزاری اچھی کرے) ایسوں کو نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ المائدہ ۶۹-۵

— اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو مت کرو اور ان لوگوں کے خیالات پر نہ چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بہتوں کو غلطی میں ڈال چکے ہیں وہ لوگ راہ راست سے بھٹک گئے تھے۔

المائدہ ۷۷-۵

— جہان والوں کے لیے نشانی بنادی۔ یہ ہے تمہارا طریقہ جس پر تم کو رہنا واجب ہے اور وہ ایک ہی طریقہ ہے۔ میں تمہارا رب ہوں۔ حقیقی رب۔ سو تم میری عبادت کیا کرو۔ الانبیاء ۹۳-۹۲-۲۱

— اور ہم نے ایسے مضامین کے ساتھ کسی اور کے واسطے نہیں بھیجا۔ آپ کو بلکہ دنیا جہاں کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔ الانبیاء ۱۰۷-۲۱

• جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں محض اتنی سی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاتھوں زور نہ گھٹواتا رہتا تو اپنے اپنے زمانوں میں نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، سب منہدم ہوگئے ہوتے۔ بے شک اللہ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا۔ الحج ۴۰-۲۲

— نیک کام کرو۔ میں تم سب کے کیے گئے کاموں کو خوب جانتا ہوں۔ ہم نے ان سب سے کہا کہ یہ ہے تمہارا طریقہ اور وہ ایک ہی طریقہ ہے کہ میں تمہارا رب ہوں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے دین میں اپنا اپنا طریقہ الگ الگ کرکے اختلاف پیدا کر لیا ہے۔ ہر گروہ کے پاس جو دین ہے وہ اس میں خوش ہے۔ المومن ۵۳-۵۱-۲۳

مذکورہ آیات قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ مختلف مذاہب کے برگزیدہ افراد اخلاص اور اتحاد سے رہیں۔ کاش وہ ایک ایسی دولت مشترکہ بنائیں جس کا ہر رکن دوسرے رکن سے نیک کام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرے اور تفرقہ بڑھانے والے کاموں سے پرہیز کرے۔

اب تک اُن مذاہب اور افراد کا ذکر کرتا رہا جو ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ کم از کم دو باتوں یعنی خدا اور آخرت پر عقیدہ رکھنے والوں میں مفاہمت کی راہیں تلاش کی جا سکیں۔ اب کچھ گفتگو مشرکین کے بارے میں بھی ضروری ہے۔ اسلام کی رواداری کی اعلیٰ مثالیں خود قرآن حکیم سے ظاہر ہیں۔

— اور دشنام مت دو ان کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں۔ یعنی اُن کے معبودوں کو۔ کیوں کہ پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ ہم نے اس طرح سے ہر طریقے والوں کو ان کا عمل مرغوب بنا رکھا ہے۔

الانعام ۱۰۹-۶

— آپ کافروں سے کہہ دیجیے کہ نہ تو میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو اور نہ آئندہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرو گے۔ تمہارے لیے تمہارا اور ہمارے لیے ہمارا دین (تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا) الکافرون ۱۰۹

مندرجہ بالا آیات قرآنی نے کتنے سلجھے ہوئے ڈھنگ سے اپنے اپنے عقاید پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے۔ امن و سلامتی کی برقراری دکھائی ہے۔ اچھے انسان کا نصب العین رہی ہے۔ جنگیں بھی انسان کی تاریخ رہی ہیں اور مورخین نے ان کے بارے میں زیادہ ہی تفصیل سے لکھا

ہے۔ امن وچین کے لیے عرصوں کے بارے میں مورخین نے کم ہی لکھا ہے۔ جنگوں کے بجائے قرآن نے امن کو ترجیح دی ہے۔ جارحیت کے بجائے مدافعت کی تعلیم دی ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ:

۱ — اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے۔ صبر کرو۔ یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجیے۔ النحل ۱۲۴ – ۱۶

ایذا رسانی سے تنگ آکر جب رسول خدا مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تو مشرکین مکہ نے پناہ گزینوں کے خلاف حملہ بول دیا۔ اس وقت رسول خدا نے اللہ سے رہنمائی کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں:

— بے تکلف تم لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں مگر از خود معاہدے سے نہ نکلو۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ البقرہ ۱۹۰ – ۲

— ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد عقیدہ (شرک) نہ رہے اور ان کا دین خالص اللہ کا ہو جاوے اور اگر وہ لوگ باز آجائیں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی۔ بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔ البقرہ ۱۹۳ – ۲

— پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔ النساء ۹۰ – ۴۔

— اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔
الممتحنہ ۸ – ۶۰

قرآن کریم کی رو سے جہاد، جارحیت کے خلاف مدافعانہ دفاعی اقدام کی کوشش ہے جس کا مقصد انسانی بقاء کے لیے امن و سلامتی قائم کرنا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ناقدین اسلام نے اسے وہ معنی پہنادیے ہیں جن کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد کا مقصد تنازعہ کو ختم کرنا ہے۔ یہ ہدایت خاص طور پر کی گئی ہے کہ جارح کی قوت ٹوٹتے ہی جہاد کو ختم کر دینا چاہیے۔

چونکہ قرآن کلام اللہ ہے، اس لیے اس سے بہتر اور واضح کلام کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ تعلیمات قرآنی پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں وہ متعصب اور غیر روادار ہو ہی نہیں سکتے۔ اُس وقت کے دوسرے مذاہب کے افراد نیز مشرکین مکہ اس قدر غیر روادار تھے کہ قرآن کی بہترین تعلیم کا بھی اُن پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ ابتدا ہی میں دوستی اور سلامتی کی تجویزات کو مسترد کر دیا گیا۔ جب مسلمان ایک طاقت کے طور پر اُبھرے، اس وقت بھی دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ مفاہمت کی کوئی اجتماعی کوشش بھی نہیں کی گئی۔

قرآن میں جابجا ذکر ہے کہ اہل کتاب میں سے بھی بہت کم لوگ پرہیزگار تھے۔ قرآن میں زور صرف عقیدہ رکھنے پر ہی نہیں بلکہ عمل پر بھی دیا گیا ہے۔ یہ بات زمانہ حال کے مسلمانوں پر بھی چسپاں ہوتی ہے جو اپنے عقاید کا اظہار تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں مگر جن کے اعمال قرآنی تعلیمات، اعلیٰ اقدار، فراست منصف مزاجی، خیرسگالی، رواداری اور فراخ دلی سے کوسوں دور ہیں۔

کاش آج کے مسلمان قرآن کریم کی ان واضح ہدایات پر عمل پیرا ہوتے۔

اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات کہا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔
(بنی اسرائیل ۵۳ – ۱۵)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۹ (ستمبر ۸۷ء)

ہوا کا رُخ

سیّد حامد

۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء کی شام کو یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس کی طرف سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میکس مُلر مارگ، نئی دہلی میں معروف امریکن ناول نگار اور سوانح نگار مس رتھ ڈالرمپل ([illegible]) کے لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔

فاضل لیکچرار کو ملک گیر شہرت حاصل ہے۔ ان کے مضامین اور افسانے انتخابوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے ناولوں کو کثرتِ اشاعت اور قبول عام کی خلعت ملی ہے۔

لیکن یہاں بحث رتھ ڈالرمپل کے اکتسابات اور امتیازات سے نہیں ہے بلکہ ان باتوں سے ہے جو انہوں نے دورانِ تقریر ۲۸ اپریل کو کہیں۔ یہ باتیں امریکہ کی ادبی اور علمی صورت حالات اور وہاں کے ادبی ذوق سے متعلق ہیں لیکن وہ ہمارے واسطے اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ امریکہ میں جو کچھ آج ہوتا ہے وہ کل یا پرسوں باقی دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو امریکہ کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں، اس ہی کے طلسم میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ امریکہ کی ذہنی غلامی کے شواہد ڈھونڈھنے کے لیے ہمیں اپنے ملک بلکہ اپنے شہر سے باہر جانا نہیں پڑے گا۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

فاضل مصنفہ نے فرمایا کہ امریکی قاری کا پڑھنے کا حوصلہ اور دم بالعموم بیس منٹ سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس میں بڑا دخل مصروفیت اور تیز رفتاری اور ٹی وی کے چلن کا ہے۔ چنانچہ اب اسے طویل تخلیقات کے مطالعے کا نہ یارا رہا نہ ذوق۔ ناولوں کو جب تک کہ وہ غیر معمولی شہرت یا موضوعی اہمیت حاصل نہ کرلیں، وہ ہاتھ نہیں لگاتا۔ امریکہ اب پڑھے لکھے نہ پڑھنے والوں کا ملک ہوگیا ہے۔ طویل افسانے بھی برداشت نہیں کیے جاتے ان کو نچوڑنے اور سمیٹنے کا عمل جاری ہے سنجیدہ تخلیقی آثار کی اب کہیں پوچھ نہیں۔ افسانے بھی وہی مرغوب ہوتے ہیں جن کا تخاطب جسمانی ہوس پیشگی سے ہو۔ اس کے علاوہ عام امریکن قاری اطلاعات کے لیے حریص ہے۔

ادب عالیہ کی تخلیق کی راہ میں ایک اور دشواری حائل ہوگئی ہے۔ چھوٹے پبلشر تیزی سے ساتھ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ چند بڑی پبلشنگ کمپنیاں جیسے سی۔ بی۔ ایس اور کوکاکولا پبلشنگ کے کاروبار پر چھاگئی ہیں۔ کوئی کتاب چھپے گی اور فروخت کتب کے نیٹ ورک (جال) سے فائدہ اٹھاسکے گی یا نہیں، یہ بات بڑی پبلشنگ کمپنیوں کی صوابدید پر منحصر ہے۔ وہ دیکھتے یہ نہیں کہ کتاب چھپنے کے لایق ہے یا اس کا لکھنے والا ادبی ساکھ رکھتا ہے یا نہیں؟ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کتاب بڑی تعداد میں بکنے کے امکانات کیسے ہیں۔ اگر امکانات اچھے ہیں تو وہ کتاب کے معیار اور کوالٹی کی طرف سے آنکھ بند کرلیتے ہیں۔ اس روش کے نتیجے میں اچھی کتابوں کو دراصل حکومت کی امداد کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ پبلشر انہیں آسانی سے نہیں ملتے اور قارئین کے معیار اور ذوق کو گرانے اور پھر اس گرے ہوئے معیار اور ذوق کے مطالبات پورا کر

ك اس کی تصدیق ۱۹۸۵ء کی ان انعامی کہانیوں کے مجموعے سے ہوتی ہے جو حال میں اوہنری انعامات کے سلسلے میں چھپا ہے (مضمون نگار)

...جاری رہتا ہے۔

پبلشروں کی مطلق العنانی اور استبداد کا شکوہ کرنے کے بعد ...ڈالرمین ناقدوں کے متعلق شکوہ سنج ہوئیں جو کتاب کے جوہر کو ...نے اور مصنف کو اس کی کمزوریوں اور لغزشوں اور تاریخی تناظر سے ...گاہ کرنے کے بجائے طرح طرح کے نوساختہ اوزاروں سے کتاب ...حملہ کرتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ ہمارے نقاد ...ی مغرب کی کورانہ تقلید پر اُتر آئے ہیں، لیکن یہ ہمارا موضوع نہیں ...ہے۔

انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ اگر مصنف کوئی خاتون ہے تو اسے ...خاتون مصنفوں کے خانے میں بٹھا کر اہمیت سے محروم اور سنجیدہ اور ...غیر نسوانی موضوعات سے عہدہ برا ہونے کے نااہل قرار دے دیا ...جاتا ہے۔ مقررہ کی ہاں میں ہاں شریک محفل ان ہندوستانی خواتین ...نے ملائی جو خود اہلِ قلم ہیں۔

امریکیوں کی عام لاعلمی کا رونا روتے ہوئے لایق لیکچرار نے بتایا کہ ۸۰ فیصد امریکن ایسے ہیں جنہوں نے شیلر کا نام تک نہیں سنا

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ امریکہ کے ممتاز اہلِ قلم میں یہودیوں کے غلبے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کو مصائب اور شدائد کا سامنا کرنا پڑا اور وہ دل و دماغ کو ٹٹولنے اور حیات و کائنات کے ساتھ نئے رشتے ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے۔ ہم نے یہ عمل اب تک نہیں شروع کیا۔

اس لیکچر کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ ادب اور تخلیقات عالیہ امریکہ میں شدّت کے ساتھ زوال پذیر ہیں۔ لیکچرار مذکور کو زوال پذیر کے لفظ پر اعتراض تھا۔ ان کی دانست میں وہ زوال پذیر یا زوال آمادہ نہیں بلکہ زوال یافتہ اور زوال رسیدہ ہیں۔ تہ تک پہنچ گئے ہیں جس سے نیچے جانا اب ممکن نہیں۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ طاقت اور سرعت رفتار اور ٹکنالوجی اور دولت کے نشے میں امریکہ والے زندگی کی اٹل اور بنیادی قدروں، ان کی شرافتوں، لطافتوں اور نفاستوں کو بھول گئے۔ تہذیب نے پورا چکر لگا لیا اور اس کے سہرے اب اسی حیوانیت سے مل گئے جس سے نجات پانے کے لیے تہذیب نے صدیوں طویل یہ سفر طے کیا تھا۔ بے عنان اور بے مہار ہونے میں ایک نوع کا ولولہ ایک قسم کی لذت ضرور ہے لیکن اس کے نتائج کتنے ہولناک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہم امریکہ کے اس تصرّف اور تسلط سے لگا سکتے ہیں جو تہذیبی تنزل سے ہمکنار ہے اور یہ سلسلہ امریکہ تک محدود نہیں، یہ وبا عالمگیر ہوتی جا رہی ہے۔

"اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کی آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا، لیکن ہندو مسلم اتحاد نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اگر ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قایم نہ رہ سکا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہوگا۔"

مولانا آزادؔ

شمسی توانائی

محمود عالم خاں

انسان شروع ہی سے توانائی کا محتاج رہا ہے۔ سب سے پہلے اس نے دو پتھروں کو ٹکرا کر اُن سے نکلنے والی چنگاری کی شکل میں توانائی حاصل کی۔ مختلف اغراض کے لیے اس نے جانوروں کو استعمال کیا اور اُن کی توانائی سے فائدہ اُٹھایا۔ پھر بھاپ کی قوت، ہوا کی قوت، پٹرولیم اور بجلی کی قوت سے مسئلے حل کرتا رہا۔ اس کے بعد ایٹمی توانائی جس کے لیے تابکار اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً یورنیم سامنے آئی۔ انسان نے اسے بھی تخریبی اور تعمیری دونوں کاموں میں لگایا لیکن ان تمام توانائیوں سے کام لیتے ہوئے یہ احساس بھی برابر بڑھتا رہا کہ توانائی کے یہ ماخذ کوئلہ، پٹرولیم، یورنیم وغیرہ کی محدود مقدار کے ختم ہو جانے کے بعد یہ دنیا پھر تاریک دور میں پہنچ جائے گی؟ بالآخر انسان کی نگاہ توانائی کے اس عظیم سرچشمہ (شمس) کی طرف پہنچ ہی گئی جس کی رحمتوں سے ہم اوّل دن سے ہی مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کی برکتیں لازوال تو نہیں البتہ قیامت تک کے لیے ضرور ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان اس سے کتنا زیادہ فائدہ اُٹھاپاتا ہے۔

سورج میں حرارت کس طرح پیدا ہوتی ہے۔

سورج سورج درمیانی درجے کا زمین سے قریبی ستارہ ہے۔ اس کی کمیت ۲۰۰۴ ملین ٹن ہے اور اس کا قطر ۱۳۹۲۶۰۰ کلومیٹر ہے۔ ماہرین طیف پیمائی کے مطابق سورج پر دس فیصد چند کثیف عناصر ہیں۔ مثلاً کاربن، نائٹروجن وغیرہ اور ۹۰ فیصد ہائیڈروجن اور ہیلیم کا آمیزہ ہے۔ ماہرین طیف اس نتیجہ پر بھی پہنچ گئے ہیں کہ ابتدا میں ہیلیم موجود نہ تھی بلکہ ہائیڈروجن کے مرکزی عملِ احتراق یعنی (Thermo Nuclear Reaction) سے بنتی ہے اور بتدریج ہائیڈروجن کی کمی رہتی ہے اس احتراق کے نتیجے میں اس سے اتنی زبردست حرارت خارج ہوتی ہے۔ اس کی بیرونی سطح کا درجۂ حرارت ۶۰۰۰ کیلون ہوتی ہے۔ اس سے خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی اندرونی سطح کا درجۂ حرارت زیادہ ہوگا (تقریباً ۱۰۷ کیلون)

شمسی توانائی کا استعمال

کل شمسی توانائی جو زمین کی طرف آتی ہے وہ تقریباً 1.7×10^{14} کلوواٹ ہوتی ہے۔ اس توانائی کا ۳۵ فیصد واپس آسمان میں چلا جاتا ہے اور باقی ۶۵ فیصد (1.1×10^{14} ۸۵×) ہی زمین پر آپاتے ہیں۔ زمین پر آئی ہوئی توانائی کا ۲۳ فیصد سمندر اور ہواؤں کی لہروں جذب ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ اس توانائی کا استعمال ۰۳۰۰ فیصد کرتے ہیں۔ پیڑ پودے ۰۔۰۳۲ فیصد استعمال کرتے ہیں۔

قدرتی طور پر ہم اس توانائی سے شروع دن سے ہی مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اس کی روشنی کی موجودگی میں پیڑ پودے اپنی غذا تیار کرتے ہیں اور کلوروفل جذب کر کے ہرے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر شمسی توانائی نہ ہو تو یہ پودے مرجھا جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا انحصار پیڑ پودوں پر ہی ہے۔ سورج کی روشنی صرف پیڑ پودوں کے لیے ہی نہیں نہیں بلکہ یہ انسان کے لیے بھی اسی قدر ضروری ہے۔ اسی سے انسان کو وٹامن ڈی (D) کی نعمت حاصل ہوتی ہے جس سے ہڈیوں میں مضبوطی آتی ہے۔ خود زمین پر زندگی کا پایا جانا سورج کا ہی دین مرہونِ منت ہے۔

یہ تو شمسی توانائی کا قدرتی استعمال ہے۔ آیئے دیکھیں کہ لوگ اس توانائی کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ یونان کے مشہور

سائنس داں ارشمیدس نے دشمنوں کے جہازوں میں آگ لگادی تھی اس نے شہر کی دیواروں پر خمیدہ آئینے اس طرح نصب کیے تھے کہ سورج کی حرارت دشمنوں کے جہازوں پر مرکوز ہوگئی اور وہ جل کر خاکستر ہو گئے۔

جدید دور میں شمسی توانائی کے استعمال کرنے کا طریقہ کچھ الگ ہے۔ شمس کی شعاعوں کو مناسب Solar Collector کے ذریعے ایک نقطہ پر جمع کیا جاتا ہے اور مرکوز شدہ توانائی کو مختلف کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا زیادہ استعمال سمندری کھارے پانی کو بھاپ میں تبدیل کر کے پینے کے لائق بنایا جاتا ہے اور بھاپ کی مدد سے ٹربائن چلا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ روس میں اس قسم کا جدید پلانٹ لگایا گیا ہے۔ اس پلانٹ میں بڑے بڑے آئینے کمپیوٹر کے ذریعے کنٹرول ہوتے ہیں۔ اس شمسی توانائی سے پانچ ہزار کلو واٹ تک بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بجلی حاصل کرنے کا اسی طریقے کا پلانٹ اسپین میں لگایا گیا ہے لیکن اس میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے کہ پانی کے بجائے سوڈیم دھات استعمال کی جاتی ہے۔ یہ سوڈیم دھات ۲۷۵ سینٹی گریڈ تک گرم ہو جاتی ہے اور پھر ایک ذخیرہ ٹینک میں جمع ہو جاتی ہے۔ اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ رات میں بھی اس سے کام کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں نہانے کے تالابوں کو اسی توانائی کے ذریعے گرم رکھا جاتا ہے۔ اب شمسی چولہے، شمسی لیمپ، شمسی کیلکولیٹر اور شمسی آئرن وغیرہ بھی بنائے جا چکے ہیں۔ اب اس توانائی کو سرد ممالک میں مکانوں کو گرم رکھنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

شمسی توانائی کے استعمال کرنے کا دوسرا طریقہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ شمسی خانوں (سولر سیل) کے ذریعے بجلی پیدا کرنا۔ یہ سیل یا بیٹری ایک قدرتی عنصریت (Silicon) سے بنایا جاتا ہے۔ اسی طریقے سے ذخیرہ کی گئی توانائی اس وقت بھی استعمال کر سکتے ہیں جب کہ سورج کی روشنی موجود نہ ہو۔

کچھ عرصے قبل اسکائی لیب کا نام سننے کو ملا تھا، اس اسکائی لیب اور اس قسم کے دوسرے ستارے میں شمسی بیٹریاں ہی نصب تھیں جن سے یہ ستارے حرکت کرتے ہیں۔ ٦ جولائی ۱۹۸۲ء کو ایک ہلکے ہوائی جہاز کو فرانس سے انگلینڈ تک کامیابی کے ساتھ اڑایا گیا۔ اس ہوائی جہاز میں شمسی بیٹریاں ہی نصب تھیں جسے برقی توانائی سولہ ہزار شمسی خانوں کے ذریعے فراہم کی گئی تھی۔ اس جہاز کا نام تھا۔ یہ شمسی توانائی کے استعمال کا حیرت انگیز مثالیں ہیں۔

"اصل روما کو چھوڑ کر دنیا کی کسی قوم کے پاس اتنا عظیم الشان اور اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام نہیں جتنا کہ عربوں کا ہے۔"

(وان کریمر)

جوابِ دوست

شرحِ آرزو

نسیم انصاری

علی گڑھ میں میڈیکل کالج قایم کرنے کی اسکیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ہمت دلانے پر اس وقت بنائی تھی جب وہ دوسری دفعہ یعنی ۱۹۴۱ء میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ یہاں کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو انہوں نے سارے ملک میں بھیج کر کالج کے لیے چندہ جمع کروایا۔ اس مہم میں یونیورسٹی کے نامور پروفیسر ہادی حسن نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ جو چندہ ہوا اس میں ہاتھوں کی چوڑیاں، کانوں کی بالیاں اور ریزگاری کے سکے بھی شامل تھے۔ آغا خاں نے ایک لاکھ جیب خاص سے دیا۔ ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت میں سر چندری گر وزیر صحت تھے۔ انہوں نے ریلوے لائن کے اس پار مرہٹوں کے قلعے کے متصل زمین پر میڈیکل کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور حکومت کی طرف سے اعلان کیا کہ کالج کے لیے جتنا روپیہ یونیورسٹی اکٹھا کرے گی اسی کے بقدر حکومت بھی دے گی۔ کالج کا افتتاح فوراً اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ کوئی مناسب آدمی پرنسپل کی جگہ کے لیے ہندوستان میں کہیں نہیں ملا۔ ہائے کیسی بے مائگی تھی!

۱۹۴۷ء میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں ان کی وجہ سے میڈیکل کالج کا معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ ادھر ڈاکٹر سر ضیاء الدین بھی یونیورسٹی سے غیر متعلق ہو گئے تھے۔ اس پر آشوب زمانے میں اگر جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جی جان سے کوشش نہ کرتے تو یونیورسٹی بچ نہیں سکتی تھی۔ جو لوگ سرحد پار سے آئے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ ہم لاہور اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیاں چھوڑ کر آئے ہیں، یہاں علی گڑھ یونیورسٹی دے دی جائے۔ پر حکومت جمی رہی اور مسلم یونیورسٹی اسی طرح برقرار رہی، لیکن میڈیکل کالج نہ کھل سکا۔ جب ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب وائس چانسلر بنے تو انہوں نے ڈاکٹر موہن لال کے ساتھ مل کر آنکھ کی بیماریوں کے علاج کے لیے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قایم کیا، نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آپتھلمک انسٹی ٹیوٹ رکھا۔ اس میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پاس کرنے کے بعد طالب علم داخل کیے جاتے تھے۔ اس طرح گریجویٹ تعلیم پہلے شروع ہوئی اور گریجویٹ تعلیم بعد کو۔

اسی زمانے میں ذاکر صاحب نے اسکیم بنائی کہ میڈیکل کالج کا جو روپیہ جمع ہوا ہے، اس کے نفع سے یونیورسٹی کے لڑکوں کو ڈاکٹری پڑھنے کے لیے وظیفے دیے جائیں۔ چنانچہ مجھے بھی میڈیکل میں پڑھنے کے لیے وظیفہ ملا اور ایم۔بی۔بی۔ایس کی تعلیم ختم کرنے پر اسی مد سے مجھے ولایت میں سرجری کی تعلیم کے لیے بھی وظیفہ دیا گیا۔ یہ قرض حسنہ کی صورت میں تھے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد پوری رقم یونیورسٹی کو واپس مل گئی۔

کرنل بشیر حسین صاحب زیدی ۱۹۵۶ء میں وائس چانسلر ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ یو۔پی حکومت سے میڈیکل کالج کے لیے گفتگو کی۔ حکومت کو علی گڑھ میں میڈیکل کالج کھولنے پر اعتراض تھا۔ اس زمانے میں فضا ایسی تھی کہ لوگ علی گڑھ کے متعلق کوئی اچھی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ ملک کی تقسیم کے وقت جو تلخی ہوئی تھی اس میں یونیورسٹی پر یہ تہمت پڑتی تھی کہ اسی کی وجہ سے ملک کے ٹکڑے ہوئے تھے۔ بہرحال کرنل صاحب گورنمنٹ کے پیچھے لگے رہے۔ یو۔پی گورنمنٹ چاہتی تھی کہ کالج پر اس کا کنٹرول ہو اور میڈیکل کالج میں داخلے کے معاملے میں یونیورسٹی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔

معاملہ یوں طے ہوا کہ ۱۹۶۰ء میں بنارس میں ایک میڈیکل

کھل گیا اور بنارس والے اس پر اڑ گئے کہ وہ اپنے کالج کے اسپتال کا انتظام خود کریں گے۔ زیدی صاحب نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر صلح اس پر کی کہ کالج میں داخلے کے لیے یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے پچاس فیصد نشستیں محفوظ رکھی جائیں لیکن حکومت نے یہ شرط لگا دی کہ رعایت صرف پہلے دس برسوں کے لیے دی جائے گی اس کے بعد داخلہ عام مقابلہ کی بنیاد پر ہوگا۔ اسپتال کے کنٹرول کے معاملے میں زیدی صاحب یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ جو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہو گا وہی علی گڑھ میں بھی ہو گا۔

چنانچہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کالج کھل گیا۔ عمارت کوئی نہیں تھی اس لیے پڑھائی کا انتظام فزکس کی پرانی عمارت میں ہوا۔ اسپتال کی تعلیم چونکہ دو برس بعد شروع ہوتی تھی اس لیے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا بعد میں یہ طے ہوا کہ شہر کے ڈسٹرکٹ اسپتال میں اس وقت تک پڑھائی ہو گی جب تک کہ اسپتال کی اپنی کوئی عمارت نہیں بن جاتی۔

جب جولائی ۶۴ء میں میرا تقرر ہوا تو سب سے پہلے داخل ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں تیسرے تعلیمی سال میں تھے اور ان کی سرجری کی تعلیم شروع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ سرجری کا پہلا لکچر میں نے اس بڑے ہال میں دیا جس میں ۴۴ - ۴۵ء میں ہمیں فزکس پڑھائی جاتی تھی اور جہاں ۴۶ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے ہم بیالوجی پڑھنے والوں کو ریاضی پڑھائی تھی۔ انہوں نے دو یا تین لکچر ٹرگنامیٹری پر دیے تھے شاید ان کے دل میں یہ آرزو ہو کہ ان ہی لڑکوں میں سے کوئی کسی دن ان کے میڈیکل کالج سے بھی منسلک ہو جائے۔ جب میں پہلا لکچر دے رہا تھا تو ایسا لگا کہ جیسے ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے ساتھ سر سید بھی ہال میں موجود ہیں۔

سرجری کی عملی تعلیم دینے کے لیے میں رکشہ پر بیٹھ کر شہر کے اسپتال گیا۔ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں بھی سائیکلوں اور رکشوں پر بیٹھ کر وہاں پہنچے۔ میں نے پوچھا کہ سرجری کی پڑھائی کہاں ہو گی۔ ایک پرانا کمرہ دکھایا گیا کہ یہاں۔ اس کمرہ میں فرنیچر نام کی ایک پرانی میز تھی جس پر کسی زمانے میں مرہم پٹی کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اسٹول بھی تھا۔ میں نے پوچھا کہ مریض کہاں ہیں؟ جواب ملا کہ سرجری کے مریض اس اسپتال میں نہیں آتے۔ باہر برآمدے میں دیکھا کہ ایک عورت بیٹھی رو رہی ہے میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہا پیٹ میں درد ہے۔ میں نے اپنے طالب علموں کی مدد سے اسے میز پر لٹا کر انہیں مریض کے معائنے کا طریقہ سمجھانا شروع کیا۔ یہ گویا علی گڑھ یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں سرجری کا پہلا عملی سبق تھا۔ دل میں خیال آیا کہ سر ضیاء الدین نے انجینرنگ کالج بھی ایسے ہی بے سروسامانی میں کھولا تھا اور سر سید نے جب مدرسۃ العلوم بنایا تھا تو اُن کے پاس بھی اس سے زیادہ اور کیا سامان ہو گا۔ ایسا لگا جیسے دور سے کوئی بُلا رہا ہو۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

چند دنوں کے بعد میرے ایک عزیز دوست کی بیوی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آئیں اور ایک پرچہ لکھ کر چھوڑ گئیں کہ میری والدہ بہت بیمار ہیں، آپ فوراً آ جایئے۔ میں نے جب پرچہ پڑھا تو سوچا نہ معلوم کیسی حالت ہو اس لیے فوراً اُن کے یہاں چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ چپکے سے مجھے بتایا گیا کہ مریضہ کو کینسر ہے۔ میں نے دیکھا تو ایسی کوئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ ان کے گلے میں ایک رسولی تھی تھائی رائڈ گلانڈ کی۔ میں نے ان سے کہا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے لیکن اس کا علاج صرف آپریشن ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ چوں کہ علی گڑھ میں ابھی تک آپریشن کا رواج نہیں ہے، اس لیے شاید آپ میری بات نہ مانیں۔ آپ پہلے سب طرح کا علاج کر والیجیے اور جب کوئی فائدہ نہ ہو تو مجھے بلا بھیجیے۔ میں آپریشن کا انتظام کر دوں گا۔

مہینہ بھر تک انہوں نے دواؤں اور انجکشنوں اور شاید دعا تعویذ سے بھی اپنا علاج کروایا۔ جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو مجھے اطلاع دی گئی۔ میں نے یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں آپریشن کا انتظام کیا اور وہ اس طرح کہ آگرہ میڈیکل کالج کے بے ہوشی دینے والے ایک ڈاکٹر صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ علی گڑھ آ کر بے ہوشی دیں۔ گاندھی آئی ہاسپٹل کے ایک تربیت یافتہ کارکن نرس سے درخواست کی کہ وہ آپریشن کے لیے سامان ٹھیک کرے اور ایک نوجوان حکیم صاحب کو تیار کیا

کہ وہ اپریشن میں میرے ساتھ آئیں۔ حلیم صاحب کے لیے یہ مضمون بالکل نیا تھا میں نے اطمینان دلایا کہ آپ کو خود کچھ نہیں کرنا ہے۔ بس جو میں کہوں وہی کرتے جائیے۔ آپریشن کے اوزار وہی تھے جو ڈاکٹر ضیاء الدین نے بیس برس پہلے ایک امریکن فوجی اسپتال سے میڈیکل کالج کے لیے حاصل کیے تھے۔ یہ اوزار پریشر کوکر میں پانی کو جوش دے کر آپریشن کے لیے تیار کیے گئے۔ چنانچہ اس شان سے مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں پہلا آپریشن ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی کی اجازت اور طبیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلام الحق انصاری صاحب کی مدد سے طبیہ کالج اسپتال کا ایک حصّہ سرجری ڈپارٹمنٹ والوں کو دے دیا گیا۔ ڈپارٹمنٹ میں تھا ہی کون؟ میرے تقرر کے چند دنوں بعد پروفیسر عمار حسن صاحب ہڈیوں کے سرجن اور ڈاکٹر گیلاٹ صاحب میری طرح سرجری کے لکچرار مقرر کیے گیے۔ بس ہم تین ہی آدمی تھے، لیکن آہستہ آہستہ "لوگ ساتھ آتے گئے" اور کارواں بنتا گیا"۔

اسی زمانے میں ایک غریب ملازم کی بیوی اسپتال میں داخل ہوئی۔ اس کے بھی گلے کا آپریشن ہونا تھا۔ داخلے کے دوسرے روز ایک حادثے میں میرے ایسی چوٹ آئی کہ دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ داہنا بازو شانے سے اتر گیا اور بائیں کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ میں اور جمشید منیر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے جا رہے تھے کہ میرے گھوڑے نے ٹھوکر لی اور گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی نیچے آگیا۔ اتفاق کی بات کہ میرے سر میں چوٹ نہیں لگی اور ہوش وحواس قایم رہے۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ جمشید سے کہا کہ سب سے اچھا یہ ہو کہ تم رائڈنگ کلب سے میری موٹر لے آؤ اور اسی پر اسپتال لے چلو۔ انہوں نے یہی کیا اور مجھے طبیہ کالج اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر عباس علی خاں بلائے گئے، ان کا نیا نیا تقرر ہوا تھا اور وہ ہڈیوں کے سرجن تھے۔ انھوں نے میرے رجسٹرار ڈاکٹر مسعود حسن خاں کی مدد سے (جنھوں نے مجھے بے ہوشی سنگھائی) میری ہڈیاں ٹھیک سے بٹھلا دیں۔

یہ خبر جب مریضہ تک پہنچی تو اس نے آفت مچا دی۔ یہ بہت برا شگون ہے اور اللہ میاں کی مرضی نہیں ہے کہ آپریشن ہو۔ اسی لیے تو آپریشن کرنے والے کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ چنانچہ وہ گھر چلی گئی۔ بہت د
کے بعد اس کا شوہر اسے لے کر میرے مطب آیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا
کہ شاید آخری حالت ہے۔ سانس گلے میں اٹک رہی تھی۔ میں نے فوراً آ
کا انتظام کیا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ جب ہوش میں آئی تو ہاتھ جوڑ کر م
مانگی۔

اس وقت تک میڈیکل کالج کی عمارت تیار نہیں ہوئی تھی او
طبیہ کالج، شہر کے اسپتال، یونیورسٹی اسپتال اور گاندھی آ
ہاسپٹل میں طلبا کو میڈیسن اور سرجری وغیرہ کی تعلیم دینے میں مصر
تھے کہ میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا نے کالج کا معائنہ کیا اور سختی
سفارش کی۔ کہ اس کی دی ہوئی ڈگریاں تسلیم نہ کی جائیں۔ مجھ سے کہا
کہ پروفیسر نورالحسن صاحب کی مدد سے ان اعتراضات کا جواب تیا
کروں۔ پروفیسر نورالحسن اس زمانے میں یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ
سربراہ تھے، بعد کو وہ وزیر تعلیم، روس میں ہندوستانی سفیر اور آ
کل بنگال کے گورنر ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب تیار ہوا اور وائس چ
ڈاکٹر علیم مجھے اپنے ساتھ لے کر میڈیکل کاؤنسل کے صدر سے ملنے
اس ملاقات میں یہ طے ہوا کہ کالج اور اسپتال کی عمارات کے بننے تک
موجودہ انتظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن سے تعلیم و تربیت
معیار ہندوستان کے دوسرے میڈیکل کالجوں کے برابر ہو جائے
اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا کام میرے سپرد ہوا۔ میری ایک تجویز
تھی کہ طبیّہ کالج کے اس حصّہ کو جس میں پرنسپل صاحب کا دفتر شامل
میڈیکل کالج کی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ جب اس ک
خبر طبیّہ کالج کے لڑکوں کو ہوئی تو انہوں نے اسٹرائک کر دی۔ غصّہ
تھا کہ میڈیکل والے اُن کے کالج پر آہستہ آہستہ قابض ہوتے جا ر
ہیں۔ میں اپنے دوست رحمٰن علی خاں بیرسٹر کو ساتھ لے کر لڑکوں کے
جلسے میں پہنچ گیا۔ رحمٰن علی خاں نے لڑکوں کو بتایا کہ میڈیکل کالج کے لیے
چندہ کس طرح جمع کیا گیا تھا۔ ایک قصبہ میں شام کو جلسہ ہوا۔ چندہ دینے
والوں میں ایک جھوا اٹھانے والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس نے ایک
روپیہ یہ کہہ کر دیا کہ دن بھر میں دو کمائے تھے۔ ایک بیوی بچوں کے لیے ر
لیا اور ایک کالج کے لیے حاضر ہے۔ بیرسٹر صاحب کے بعد میں نے اپنی

تقریر میں صاف صاف کہا کہ جو اسکیم میں نے تیار کی ہے، اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ کچھ دنوں کے لیے آپ کی تکلیفوں میں اضافہ ہی ہو جائے گا لیکن اس کے باوجود آپ سے التجا ہے کہ آپ مخالفت نہ کیجیے اور اس میڈیکل کالج کو بن جانے دیجیے جس کے خواب ہم پچھلے پچیس برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب نے بیک آواز حامی بھر دی۔

اس کے ساتھ ہی کچھ موٹر گیراجوں کو مطب کے طور پر استعمال کرنے کا انتظام ہوا اور وہ تمام شرطیں کسی نہ کسی پوری کی گئیں جو میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا نے لگائی تھیں۔ چنانچہ ہماری ڈگری تسلیم کرلی گئی۔ بعد کو جب میڈیکل کالج اور اسپتال کی عمارتیں تیار ہو گئیں تو لوگ سمجھے کہ شاید اب ہم ایک باعزت ادارہ کہلانے کے لائق ہو جائیں۔

لیکن منزل ابھی دور تھی۔ کالج تو کھل گیا اور اسپتال بھی بن کر تیار ہو گیا۔ لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اسپتال کا خرچ کہاں سے چلے گا۔ اس کا انتظام یہ ہوا کہ یونیورسٹی نے اپنے خزانے کھول دیے کہ جتنے روپیے کی ضرورت ہو وہاں سے لے لیا جائے۔ لیکن خزانے میں تھا ہی کیا! اور پھر اسپتال میں کام کرنے کے لیے نرسیں، تربیت یافتہ کارکن، آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والے کہاں سے آئیں گے۔ ہم نے علی گڑھ کے غریب عوام سے اپیل کی کہ وہ ہماری مدد کریں۔ پڑھے لکھے غریب مرد اور عورتوں کو دو روپے ستر پیسے روز کی اجرت پر ملازم رکھا اور انہیں اسپتال میں کام کرنا سکھایا۔ ہم نے کہا کہ اسی قسم کے لوگ تو پولس اور فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔ کچھ دنوں کی ٹریننگ کے بعد وہ کیسے کارآمد بن جاتے ہیں۔ ہم بھی اسی طریقے پر عمل کریں گے۔ چنانچہ یہی ہوا' شروع شروع میں غریب عورتیں برقعہ پہن کر کام کرنے آتی تھیں، میں ان سے کہتا تھا کہ برقعہ پہن کر اسپتال میں کام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ برقعہ اتار کر کام کرتیں اور گھر جاتے وقت برقعہ پھر پہن لیتیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد برقعے کا رواج ختم ہو گیا۔ اب انہی غریب عورتوں کی بیٹیاں اسکول کی تعلیم ختم کر کے میڈیکل کالج کے نرسنگ اسکول میں تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ ایک دن انشاء اللہ ان ہی لڑکیوں میں سے کوئی اسپتال کی نرسنگ سپرنٹنڈنٹ اور نرسنگ اسکول کی پرنسپل بنے گی۔

اسپتال کے چلانے کے خرچ کا قصہ بھی اکتوبر ۱۹۶۹ء میں طے ہو گیا اور حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اسپتال کے خرچ کے لیے یونیورسٹی کو الگ سے روپیہ دیا جائے گا۔ اب گویا کہ ابتدائی سب رکاوٹیں دور ہو گئیں اور ایک دوسری آزمائش شروع ہوئی کہ اس ابتدائی ساز و سامان کے ساتھ علی گڑھ والے کرتے کیا ہیں۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ طے کیا گیا کہ اب ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ یعنی ہر مضمون میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا۔ چنانچہ یہ کام بھی شروع ہو گیا اور ۱۹۷۱ء سے ایم۔ ڈی اور ایم۔ ایس میں داخلے شروع ہو گئے۔

راستہ کٹھن تھا لیکن ہمتیں بلند تھیں اور اس بے سروسامانی میں بھی کام بہت خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور ایک سرور کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی کسی بڑے کام کا ارادہ کرے تو اس کی مخالفت ضرور ہوتی ہے تو کیا ہم جو کام علی گڑھ میں ایک اونچے درجے کا میڈیکل کالج بنانے کے لیے کر رہے ہیں وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ آخر ہمارے خلاف اب تک کوئی مورچہ کیوں نہیں لگا۔ ایک سر سیّد تھے کہ جب کالج بنایا تو قوم نے کفر کا فتویٰ دیا، غبن کا الزام لگایا۔ سر ضیاء الدین نے جب انجینئرنگ کالج کھولا اور میڈیکل کالج کا انتظام کیا تو لڑکوں نے اسٹرائک کی۔ انہیں برا بھلا کہا اور ایک ہم ہیں کہ ابھی تک ہر بلا سے محفوظ رہے۔ اب کس منہ سے کہیں گے کہ وفاداروں کی فہرست میں ہمارا نام بھی لکھا جائے۔

کیسی ہنسی اپنی ہوئی دیوانگانِ عشق میں
ہم جو ثابت لے کے اپنے جیب و دامن کو چلے

لیکن ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ چنانچہ طوفان بھی اپنے وقت پر آیا۔ جب ۱۹۷۵ء میں اسپتال پوری طرح کام کرنے لگا اور ہر مضمون میں اعلیٰ تعلیم یعنی ایم۔ ڈی یا ایم۔ ایس کی ڈگریاں دی جانے لگیں تو حملہ شروع ہوا۔

اس وقت کالج کے پرنسپل کرنل تاج الدین تھے اور میں سرجری کے شعبے میں ریڈر تھا لیکن اسپتال کا انتظام بھی میرے سپرد تھا۔ جب سے اسپتال بنا تھا میں نے کوشش کی تھی کہ وہاں کام کرنے والے اور نرسیں اپنی یونین بنا لیں تاکہ ان کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ ایک بہت مضبوط ٹریڈ یونین بن گئی۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھیے گا کہ

میں ٹریڈ یونین بنانے کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ٹریڈ یونین کے لیڈروں نے اسپتال میں یونین بنانا چاہی تو میں نے ان کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔

ایک دن جب میں اپنے طالب علموں کے ساتھ وارڈ میں مریضوں کو دیکھنے جا رہا تھا کہ دیکھا کہ سامنے سے یونین کے ایک سرگرم کارکن چلے آرہے ہیں۔ میں نے پوچھا خیریت ؟ اس وقت یہاں کہاں۔ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ پوسٹر ہیں جو وارڈ میں تقسیم کرنا ہیں۔ میں نے کہا کہ وارڈ میں اس قسم کا کام نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس سے مریضوں کی دیکھ بھال میں رکاوٹ پڑے گی اور پڑھانے میں بھی حرج ہوگا۔ وہ مجھ سے متفق نہیں ہوئے اور اصرار کیا کہ انہیں وارڈ میں جانے دیا جائے۔ میرے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ انہیں اس کام سے باز رکھوں۔

بس یہ ابتدا تھی طوفان کی، فوراً یونین کی میٹنگ ہوئی جس میں میرے خلاف سخت ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

ادھر یونیورسٹی کے طالب علم مجھ سے ایک اور معاملے میں ڈیڑھ دو برس سے کچھ خفا تھے۔ (معاملہ فزکس کے پروفیسر اور میرے عزیز دوست پروفیسر رئیس احمد کا تھا (اس کا ذکر تفصیل سے آگے آتا ہے) کچھ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے طلباء کے ایک حلقے کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ میڈیکل کالج کے انتظام کے خلاف تحریک شروع کر دیں۔ چنانچہ تحریک شروع ہوئی اور اس میں ٹریڈ یونین، اسٹوڈنٹس یونین اور خود میرے ساتھی چند اساتذہ شامل ہو گئے۔

اسی دوران میرا اسٹوڈنٹس یونین کے کچھ لیڈروں سے سامنا ہو گیا اتفاق سے ان میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ آپ کے اوپر اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ شاید ان سے آپ کی کارکردگی میں فرق آجائے۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور میں نے اسی وقت یونیورسٹی کے چیف میڈیکل آفیسر، میڈیکل کالج اسپتال کی ذمہ داری، رائڈنگ کلب کی صدارت اور رسالہ فکر و نظر کی مجلس ادارت سے استعفیٰ لکھ کر ان لوگوں کو دے دیا کہ اسے وائس چانسلر کی خدمت میں پیش کر دیں۔

وائس چانسلر ڈاکٹر علی محمد خسرو نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ فرمایا کہ صرف اسپتال کے کاموں سے آپ کا استعفیٰ منظور ہو سکتا ہے لیکن منظوری دینے کے چند دنوں کے اندر ہی مجھے سرجری میں ریڈر کے عہدے سے ترقی دے کر پروفیسر بنا دیا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ وائس چانسلر نے کسی استاد کو اپنے خصوصی اختیارات سے پروفیسر بنا دیا ہو، اس کے لیے میں خسرو صاحب کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کیوں کہ اس طرح مجھے کسی معاملہ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا پڑا اور سازشیں بے نقاب ہو گئیں۔

جب میں انگلستان میں سرجری سیکھ رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہندوستان پہنچ کر ان حالات میں سرجری کرنا پڑے گی کہ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" لیکن میری ہمت نہیں ٹوٹی مجھے انجینئرنگ کالج کا بننا یاد آگیا۔ وہ بھی تو اسی طرح بنا تھا۔ آج جب کہ میڈیکل کالج کو بنے چوتھائی صدی ہو چکی ہے اور اس سال ہم اس کی سلور جبلی منا رہے ہیں تو یہ باتیں یاد آتی ہیں۔ جو کالج اس کس مپرسی میں بنا تھا، آج وہاں کے پڑھے ہوئے لڑکے اور لڑکیاں ساری دنیا میں اپنا اور ہمارا نام روشن کر رہے ہیں۔ جب میں نے ۱۹۶۴ء میں پڑھانا شروع کیا تو پٹنہ میں گنگا پار کر کے پاکستانی سرحد تک میرے علاوہ مسلمانوں میں اور کوئی ایف۔ آر۔ سی۔ ایس نہیں تھا یہ بھی تو گویا ہماری پسماندگی کا ایک ثبوت تھا۔ آج میرے شاگردوں میں سے ۲۱ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کی سند حاصل کر کے انگلستان، امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں کامیابی سے سرجری کر رہے ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستانی معاشرے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کیا اہمیت ہے۔

جب ۶۴ء میں میں سرجری کی تعلیم ختم کر کے انگلستان سے ہندوستان واپس آیا تو حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھ پر کئی ذمہ داریاں پڑ گئیں۔ سب سے پہلے تو کالج میں پڑھانے مریضوں کا علاج کرنے اور اسپتال کے بنانے میں مدد دینے کے سوالات آئے۔ باقی دوسری اور باتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

پڑھانے کے متعلق تو میں نے اپنے گھر کی روایات پر عمل کیا، درس نظامی کا ایک اصول یہ ہے کہ مضمون سے متعلق اس کی بنیادی باتیں اچھی طرح سمجھا دی جائیں اور جہاں تک تفصیلات کا تعلق ہے چند مشکل مقامات تو ضرور سمجھائے جائیں لیکن باقی باتیں طالب علم پر چھوڑ دی

ئیں کہ وہ خود انہیں سمجھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ذمے شروع سے یہ کام لیا سرجری کے اصول تو تفصیل سے پڑھاتا ہوں اور روزمرہ کی تربیت میں لب علموں کی توجہ ان اصولوں کی طرف بار بار دلاتا ہوں۔ تفصیل کے متعلق امشورہ ہوتا ہے کہ مجھے علاج کرتے ہوئے دیکھو، تفصیل خود بخود ذہن نین ہو جائے گی۔

علاج کے سلسلے میں کوشش رہی کہ مشکل سے مشکل آپریشن کرکے بات طالب علموں کے دلوں میں بٹھا دی جائے کہ معمولی ساز و سامان سے ھی مشکل سے مشکل آپریشن ہو سکتے ہیں بشرطیکہ سرجن کو پیچیدہ کاموں میں اس سامان استعمال کرنے کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ باوجود اس بے سر و سامانی کے س میں میڈیکل کالج میں کام شروع ہوا تھا بہت جلد ہمارے یہاں تقریباً ہ سب آپریشن ہونے لگے جو جنرل سرجری میں دنیا کے کسی ہسپتال میں ہو سکتے تھے۔ پہلے تو میرے ساتھیوں کو یقین نہیں آیا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن جب اُن کے سامنے یہ سب کر کے دکھا دیا تو یقین کرنا ہی پڑا۔

۶۵ء سے ۶۹ء تک ہم لوگ طبیہ کالج کے اسپتال میں سرجری کرتے تھے۔ ۶۹ء میں جب اسپتال کی عمارت تیار ہو گئی اور ہم اس میں منتقل ہو گئے تو مریضوں کی تعداد بھی بڑھی اور نئی نئی بیماریوں کے مریض آنا شروع ہوئے۔ اب تک تو صرف جنرل سرجری کے مریض ہی آتے تھے اب سینہ اور سر کی بیماریوں کے مریض بھی آنا شروع ہوئے ان لوگوں کے علاج کا سامان بھی کرنا پڑا۔ یہاں میری انگلستان کی تربیت کام آئی اور میں نے بخوشی یہ ذمہ داری بھی پوری کی۔ پھیپھڑے اور اس کی جھلیوں، کھانے کی نالی اور دل کے غلاف کے آپریشن کامیابی سے کیے لیکن یہ فکر برابر رہی کہ کسی طرح ایسا انتظام ہو کہ ان امراض کے ماہر سرجن علی گڑھ میں آ جائیں تاکہ جنرل سرجری کے علاوہ دوسرے مخصوص آپریشن بھی ہو سکیں۔ میری مراد دل اور دماغ کے آپریشنوں اور بچوں کے پیچیدہ آپریشنوں سے ہے۔ میں نے اپنے تعلقات سے فائدہ اٹھا کر چنڈی گڑھ کے پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ کے دل اور سینے کے دوسرے امراض کے ماہر سرجن پروفیسر گجرال کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ہر مہینہ میں دو بار علی گڑھ آکر مریضوں کو دیکھیں اور اُن کا آپریشن کریں۔ ان کے جانے کے بعد مریضوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہماری ہو گی۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ہمیں ایک نوجوان سرجن ڈاکٹر حنیف بیگ کا پتہ چلا کہ انہوں نے اسی زمانے میں چنڈی گڑھ سے ایم۔ سی۔ ایچ کی ڈگری سینہ اور دل کے امراض کی سرجری میں حاصل کی تھی۔ کوشش یہ کی کہ اس نوجوان کا تقرر ہمارے محکمہ میں ہو جائے۔ بڑی مشکلیں پیش آئیں' لیکن ہماری ہمت ہر مشکل پر غالب آئی اور ڈاکٹر بیگ کا تقرر ہو گیا۔ جس نے سنا کہ علی گڑھ میں ایک اسپیشل یونٹ اس طرح کا کھل رہا ہے اس نے مذاق اُڑایا کہ کہیں اس طرح بھی کام ہوا ہے کہ ایک پروفیسر سیکڑوں میل کی دوری سے مریضوں کی دیکھ بھال کا انتظام کرے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی صورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ یہی ہوا اور سینہ اور دل کی سرجری کے سیکڑوں آپریشن آج تک ہو چکے ہیں۔

اسی طرح بچوں کی سرجری کا بھی ایک مخصوص انتظام کیا گیا۔ سر اور دماغ کی سرجری بھی ہو رہی ہے اور پلاسٹک سرجری تو اس وقت سے شروع ہو گئی جب سے ڈاکٹر مسعود حسن خاں لکھنؤ سے اس مضمون میں ایم۔ ایس کر کے واپس آئے ہیں۔

ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۳ء میں ہم اس قابل ہوئے کہ سارے یو۔پی کے سرجری کے پوسٹ گریجویٹ طالب علموں کے لیے ایک ہفتہ بھر کا کورس چلائیں۔ ہندوستان کے پندرہ چوٹی کے سرجن بلائے گئے کہ وہ اس کورس میں حصہ لیں۔ پچاس لڑکے اور لڑکیاں صوبے کے آٹھ دوسرے میڈیکل کالجوں سے آئے۔ اس کورس میں لکچر دیے گئے، آپریشن دکھائے گئے اور طلبا کو چھوٹے چھوٹے گروپ میں مریضوں کا معائنہ کرا کے عملی تعلیم دی گئی۔ پروگرام سب کو بہت پسند آیا چلتے وقت بہت سے لوگوں نے کہا کہ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ علی گڑھ میں یہ سب کچھ بھی ہو سکتا ہے

جو کالج بڑی بے سر و سامانی میں بنا تھا آج اس میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے ہندوستان کے ہر کونے سے نوجوان ڈاکٹر بڑے شوق سے آتے ہیں۔ کئی ڈپارٹمنٹ ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جس معیار کی پڑھائی یہاں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کی بہت کم درس گاہوں میں ہوتی ہے۔ یہاں کے استاد ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بہت سی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر اور ممتحن ہو کر جاتے

ں۔ قومی اور بین الاقوامی مجالس میں صدر نشین ہوتے ہیں۔ حکومت کے مختلف اداروں میں انہیں نامزد کیا جاتا ہے۔ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری ہے۔ بہت سے اساتذہ نے کتابیں لکھی ہیں اور ان مضامین کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جو قومی اور بین الاقوامی رسالوں میں چھپتے ہیں۔ ۸۵ء میں حکومتِ ہند نے مجھے میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا کا ممبر نامزد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کی اہمیت کا اعتراف کر لیا اور اس کے چند مہینوں کے بعد جب مجھے حکومت کی طرف سے اس کی پوسٹ گریجویٹ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا تو گویا کہ یہ مسلم ہو گیا کہ ملک کے تعلیمی معاملات میں ہماری ذمہ داریاں بڑھتی جائیں گی۔

۴۷ء میں جب وطن آزاد ہوا تو دل میں یہ امنگ جاگی تھی کہ لیلائے وطن کے گیسو سنوارنے والوں میں ہم بھی ہوں۔ اب جو گزشتہ زندگی پر نظر جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ قسمت نے ساتھ دیا اور تکمیلِ آرزو کے موقعے ملتے رہے۔ کلکتہ میں اسٹوڈنٹس ہیلتھ ہوم بنانے والوں کے ساتھ اور علی گڑھ میں میڈیکل کالج قایم کرنے والوں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ لیلائے وطن کی محبت کے بہت سے تقاضے اپنی دانست میں پورے کیے۔ کوشش یہ رہی کہ جو کچھ فرنگی محل، مسلم یونیورسٹی، کلکتہ اور انگلستان کے علماء کی صحبت اور ان کے کتب خانوں، شفاخانوں اور دانش گاہوں سے حاصل کیا ہے اسے اپنے وطن کے لوگوں میں لٹا دوں کہ اس دولت کا یہی ایک مصرف ہے۔

سو برس پہلے جب سر سید نے یونیورسٹی کا خواب دیکھا تھا تو ان کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مسلمان سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے سائنس پڑھی تو ان کا مذہب اُن سے چھوٹ جائے گا۔ آج یہ سب باتیں پرانی ہو گئیں ہیں۔ اب مسلمان سائنس سے بالکل نہیں ڈرتے تو پھر مسلم یونیورسٹی کاہے کے لیے قایم رکھی جائے؟ میرے نزدیک تو یہ یونیورسٹی محض ایک اعلیٰ درجے کے علمی مرکز کی حیثیت قایم رہ سکتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لوگ کہیں کہ اگر سرجری یا فزکس پڑھنا ہے تو علی گڑھ چلو۔

میں یہ بات جذبات کی رو میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ عزت سے رہنے کے لیے دانش وروں کی صف اول میں اپنی جگہ بنانا ہوگی۔

آج کی دنیا میں سیاسی برتری کے خواب دیکھنا بالکل بے سود ہے۔ اب حالات جس طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ ایک ایسی عالمی برادری ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم پر حکومت نہیں کرے گی۔ اب یہ بالکل ممکن ہو گیا ہے کہ ضرورت کی سب چیزوں میں عام آدمیوں کو میسر آسکیں، اس لیے اخوت اور بھائی چارے کی آرزو حقیقت سے بہت دور نہیں ہے اور آج کے حالات میں حکمرانی اور شہنشاہیت کے خوابوں کی تعبیر بہت بھیانک ہوگی۔ اب تو عزت اور برتری کا پیمانہ یہ ہوگا کہ کون سی جماعت انسانوں کی کتنی خدمت کرتی ہے۔ اس دنیا میں ہم سے کہا جائے گا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے اور تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(باقی آئندہ)

عناصر کی کمی اور ان سے پیدا ہونے والے امراض

کے۔ ایس۔ صدیقی

ابھی تک انسانی جسم میں تقریباً تیس عناصر پائے جانے کی تحقیق ہو چکی ہے جن میں سے ۲۵ اشد ضروری ہیں۔ گوشت پوست اور ان ہی عناصر سے مل کر انسانی جسم کی تخلیق ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم کچھ عناصر کی کمی سے ہونے والی بیماریوں کا بیان کرتے ہیں۔

نو عناصر آئرن، فاسفورس، سیلیکن، کیلشیم، میگنیشیم، پوٹیشیم سوڈیم، بورن اور کلورائڈ انسانی جسم میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو انسانی نشو و نما کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ ان کے علاوہ میگنیز کوبالٹ، نکل، تانبہ اور جست جیسے عناصر کی بھی تھوڑی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ بہت اہم ہیں کیوں کہ ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔

سیلینیم کی کمی سے ہونے والے امراض

دودھ پلانے والے وہ جانور جو جگالی نہیں کرتے سیلینیم کی کمی سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی کمی سے ان کے جگر خراب ہو جاتے ہیں۔ اور بھوک کم ہو جاتی ہے لیکن جگالی کرنے والے دودھار جانوروں میں جسمانی فساد ہو جاتا ہے جس سے ان کی ساخت پر اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر خون میں کیلشیم جمنے لگتا ہے۔ اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح کا اثر دل پر ہو تو کبھی کبھی حرکت قلب بند ہونے سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ سیلینیم کا خاص کام یہ ہے کہ ہاضمہ کے دوران جسم میں پیدا ہونے والے غیر ضروری اور نقصان دہ اشیاء کو جسم سے فوراً باہر نکال دے، قبل اس کے کہ ان اشیاء سے کوئی نقصان پہنچے۔ وٹامن (ای) بھی جسم کے خلیوں کو نقصان سے بچاتی ہے، لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ جسم میں سیلینیم کی کمی وٹامن ای کی زیادہ مقدار میں مہیا ہونے کی وجہ سے ہوتی ہو۔

جست کی کمیابی

جست کی کمی کا اثر انسان اور جانوروں کی صحت پر یکساں پڑتا ہے۔ بچوں اور حاملہ عورتوں میں اس کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس دوران بچے بہت تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اس کی کمی سے ہونے والے مضر اثرات بہت دیر میں معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی کمی کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب بھوک لگنا بالکل بند ہو جاتی ہے اور بھوک کے باوجود کھانے کی خواہش نہیں ہوتی بچوں میں نشو و نما رک جاتی ہے۔ اس کی شدید کمی کی وجہ سے جلد پر بھی اثر پڑتا ہے۔ جلد سخت، کھردری اور جھری دار بھی ہو جاتی ہے۔ مردوں میں اعضائے رئیسہ کی نشو و نما رک جاتی ہے اور عورتوں میں رحم مادر میں بچوں میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ جست پر بہت تحقیقاتی کام ہو چکا ہے لیکن جست کا اثر محض جسمانی ساخت اور اس میں ہونے والے کیمیاوی ردعمل سے ہی واضح نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ اضافی جسم کے لیے ایک اہم چیز ہے۔

میگنیز کی کمیابی

یہ بہت سے اینزائم میں پایا جاتا ہے اور اس کی کمی سے اینزائم کی کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ حالاں کہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ اینزائم ایسے ہیں جن کا عمل ہی میگنیز کی وجہ سے سستی آجاتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غالباً میگنیز کی کمی ایک دوسرا عنصر میگنیشیم پُر کر دیتا ہے۔ میگنیز کی کمی ایک خصوصی اینزائم کے عمل کو تقریباً بالکل کم کر دیتا ہے جس کا اپنا الگ اہم کردار ہے۔ عام طور پر میگنیز کی کمی سے ہونے والے نقصانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس سے انسانی ڈھانچے میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کان کے اندرونی حصے میں تشکیلی نقائص کی بنا پر سماعت میں دقت پیش آنے لگتی ہے

۲۔ چڑیوں میں انڈے کے خول کی تشکیل ناقص رہ جاتی ہے کیوں کہ اس کو بنانے والی پروٹین خود نہیں بن پاتی۔

۳۔ کاربوہائیڈریٹ کے ہاضمے میں دقت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس کی کمی سے مرغیوں میں بیماری پھیلتی ہے۔

۵۔ اکثر و بیشتر کیلشیم اور فاسفورس کے زیادہ استعمال سے بھی میگنیز کی کمی واقع ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ جذب نہیں ہو پاتا۔

مولبڈینم کی کمیابی

یہ عام طور پر اینزائیم کا ایک اہم جز ہے جس کی غیر موجودگی اینزائیم کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ یہ کچھ غیر ضروری کیمیاوی مادے کو جسم سے خارج کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس کی کمی سے چڑیوں کی کھال خراب ہو جاتی ہے۔ مولبڈینم سے پیدا ہونے والے مضر اثرات تقریباً بیس برس تک تحقیق ہونے کی وجہ سے کوئی معقول علاج بھی دریافت نہ ہو سکا۔ مرغیوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مولبڈینم کی کمی کی وجہ سے چوزے ناقص رہ جاتے ہیں اور پیر کی ہڈی اور پروں کی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔ جگالی کرنے والے جانوروں میں مولبڈینم کی شدید کمی تانبے کی کمی کا باعث بنتی ہے جو انسان اور حیوان کے لیے یکساں ضروری ہے۔

بنیادی کمی

انفرادی عناصر کے انفرادی اثرات ہوتے ہیں جب کبھی ضروری عنصر پودوں کی نشوونما تیزی سے کرتا ہے اور اس کی شدید کمی ہو جاتی ہے تو اکثر پوری فصل سوکھ جاتی ہے۔ عام طور پر عنصر ایک دوسرے کی کارکردگی پر منحصر ہوتے ہیں۔ مٹی کی ساخت کا فرق غذائی اجناس پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مٹی میں

مولبڈینم کی زیادتی سے جگالی کرنے والے جانوروں میں تانبہ کی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ پروٹین کے ساتھ جس شکل میں یہ ہوتے ہیں ا کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ لیکن جسمانی ساخت کے اعتبار سے عن کی دستیابی مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح جست اور سیلینیم سے مشت حیواناتی پروٹین بکثرت دستیاب ہے جب کہ نباتاتی پروٹین میں تانبہ کی وافر مقدار کچھ جانوروں میں بے ہوشی کی کیفیت پیدا کر ہے۔ مثال کے طور پر بھیڑوں کے بعض اقسام کمیاب عناصر کی باہ رسانی میں پروٹین کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ مثال کے طور پر انسانوں میں جست اور تانبے کی کمی کو انجکشن کے ذریعے قائم رکھ جاتا ہے کیوں کہ صفائی کے دوران یہ اجزاء پروٹین سے نکل جا ہیں۔

ان تجربات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ سبزیاں اور موسمی پھل ہمارے لیے اشد ضروری ہیں جو وٹامن کا خزانہ ہیں۔ دھات کے برتنوں میں کھانا کھانے سے بہت سے عناصر کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تھوڑی بہت مقدار تو کھانے میں مل ہی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تانبہ اور پیتل کے برتنوں میں کھانے سے جست اور تانبے کی کمی پوری ہو جاتی ہے اور اس سے ہم بہت سے غیر ضروری بیماریوں سے بچ جاتے ہیں۔

"انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو
وہ منہ پھیرتا ہے اور
اکڑ جاتا ہے۔ اور
جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے۔
تو
لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔"

(حٰم سجدہ ۵۱ — ۲۵)

دینی مدارس کے لیے جدید نصاب تعلیم کا ایک خاکہ

الطاف احمد اعظمی (علیگ)

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت کو ایک عرصے سے محسوس کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں متعدد مذاکرے بھی ہو چکے ہیں، ابھی حال میں مرکز فروغ سائنس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔ ان مذاکرات اور کانفرنسوں سے اب یہ بات واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم میں نہ صرف تبدیلی کی ضرورت ہے بلکہ اس میں مفید عصری علوم کا اضافہ بھی نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کس نوع کی ہو اور کس طرح اسے رو بہ عمل لایا جائے۔

اکثر اصحاب علم کا خیال ہے کہ مدارس کے مروجہ نصاب سے غیر ضروری علوم کو، جن کا دین سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً منطق و فلسفہ وغیرہ، نکال کر ان کی جگہ ریاضی اور سائنس جیسے عصری علوم پڑھائے جائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مدارس کے موجودہ نصاب میں بہت سے علوم اب از کار رفتہ ہو چکے ہیں اور ان کو نکالنے کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ ان از کار رفتہ مضامین کو نکال کر ان کی جگہ سائنسی علوم کو داخل کر دیا جائے۔ اس میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ کثرت مضامین کی وجہ سے طلبا کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی ہے کہ ان کی توجہ دینی علوم سے پھر کر جدید علوم کی طرف زیادہ ہو جائے اور اس طرح دینی علوم کو صدمہ پہنچے گا اور دینی مدارس کے قیام کے مقاصد مجروح ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ اس غیر مستحسن اختلاط کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس کے نصاب کی تشکیل نو کی جائے اور اس کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ریاضی اور سائنس کے اضافے سے نہ تو طلبا کے لیے کثرت مضامین کا مسئلہ پیدا ہو اور نہ ہی دینی علوم متاثر ہوں بلکہ اس سے دینی علوم کو مزید فروغ حاصل ہو اور مدارس سے جو طلبا تعلیم حاصل کر کے نکلیں وہ دینی علوم میں کامل دستگاہ کے ساتھ جدید علوم سے بھی ایک حد تک واقف ہوں۔ میں نے مدارس کے لیے ایک ایسا ہی نصاب مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی مل سکی ہے اس کا فیصلہ دینی مدارس کے معلمین اور ان کے ارباب حل و عقد کی بصیرت پر چھوڑتا ہوں۔ اس نصاب کو پیش کرنے سے پہلے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کی بعض اہم خصوصیات کا بیان تذکرہ کر دیا جائے تاکہ جدید اور قدیم نصاب کا فرق واضح ہو جائے اور جدید نصاب کی تشکیل کی جو غرض و غایت ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔

۱۔ ابتدائی مرحلے میں ہم نے ان تمام علوم کو رکھا ہے جو عام طور سے سرکاری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں، بعض دینی مدارس میں ہندی درجہ تین یا چار سے پڑھائی جاتی ہے۔ ہم نے اسے درجہ اول سے درجہ پنجم تک رکھا ہے یعنی پورے پانچ سال۔ اس سے طلبا کی ہندی کی استعداد میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ دو یا تین سال تک پڑھانے سے یہ مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ فارسی کا ہے۔ بہت سے مدارس میں یہ اب بھی گلستاں اور بوستاں کی سطح تک پڑھائی جاتی ہے لیکن بعض مدارس میں اس کی تعلیم صرف ابتدائی کے درجہ چار اور درجہ پانچ تک محدود ہے۔ اس مختصر مدت تعلیم سے طلبا میں فارسی کا صحیح مذاق پیدا نہیں ہوپاتا۔ اہل علم اس بات سے یقیناً واقف ہوں گے کہ فارسی زبان میں علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس لیے جب تک فارسی میں اچھی استعداد پیدا نہ ہو ان علوم و فنون سے خاطر خواہ استفادہ ممکن نہ ہوگا۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے ابتدائی کے علاوہ

ثانوی میں بھی دو سال تک فارسی کو نصاب میں شامل رکھا ہے۔

۲۔ ثانوی کے درجات میں ہم نے عربی زبان اور قرآن مجید کے ساتھ ریاضی، سائنس اور انگریزی کو نصاب میں شامل کیا ہے۔ اس نصاب کے متعدد فوائد ہیں: ثانوی تک تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ایک طالب علم جہاں ریاضی، سائنس اور انگریزی کی تعلیم سے بقدر ضرورت واقف ہوگا، وہاں عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیمات سے بھی بڑی حد تک آگاہ ہو چکا ہوگا ماہرین لسانیات کی متفقہ رائے ہے کہ ایک ذہین طالب علم کو ۵ سال کی مدت میں کوئی بھی غیر مادری زبان عمدہ طور پر سکھائی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ثانوی تک تعلیم پانے کے بعد ایک طالب علم عربی زبان سے پورے طور پر واقف ہو جائے گا۔ یہ بھی ایک لسانیاتی حقیقت ہے کہ اگر طالب علم کو کسی زبان پر عبور حاصل ہے تو اس زبان سے متعلق علوم کی تحصیل اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے اور صرف ذاتی مطالعے سے وہ ان علوم میں مہارت بہم پہنچا سکتا ہے۔

ثانوی تک معیاری تعلیم حاصل کرنے کے بعد اگر کوئی طالب علم دینی علوم کے بجائے عصری مضامین بالخصوص سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا ملک کے کسی اور جدید تعلیمی درسگاہ میں گنجائش نکل سکتی ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات سے باخبر ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے اذہان و قلوب پر انشاء اللہ کوئی غیر دینی اثر مرتب نہ ہو سکے گا بلکہ اس کا زیادہ امکان ہے کہ وہ سائنسی علوم کو خدمتِ دین کے لیے بطور آلہ کے استعمال کر سکیں۔ ثانوی کے درجات تک ریاضی اور سائنس کی تعلیم سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ذہین مسلم بچے جو عام طور پر انگریزی اسکولوں میں چلے جاتے ہیں، ان کا رخ دینی مدارس کی طرف ہو جائے گا اور اس طرح ہم ملت کے ہونہار نونہالوں کو دین کی خدمت کا اہل بنا سکیں گے۔

عالمیت کی سند حاصل کرنے کے بعد طلبہ ملک کے طبیہ کالجوں میں داخلہ کے لیے مجاز ہوں گے[1] دینی مدارس کے فارغین کو سائنس نہ جاننے کی وجہ سے جدید طبی مضامین کے بخوبی سمجھنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جدید نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قدیم طبی فن کے ساتھ جدید طبی مضامین کی تفہیم میں بھی کسی دقت سے دوچار نہ ہوں گے کیوں کہ وہ ثانوی میں سائنس پڑھ چکے ہوں گے

۳۔ عالمیت اور فضیلت کا جو نصاب تجویز کیا گیا ہے، اس میں عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے اور علوم آلیہ کو بقدر ضرورت رکھا گیا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اکثر عربی مدارس میں قرآن مجید کی تعلیم پر علوم آلیہ کو غلبہ حاصل ہے جو نتائج کے اعتبار سے انتہائی مہلک ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کو ہر حال میں علوم آلیہ پر برتری حاصل ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اس کی حیثیت نظام شمسی کے مرکزی سیارہ یعنی آفتاب جیسی ہے جس کے گرد دیگر علوم کے سیاروں کو گردش کرنا چاہیے اور اسی سے مستنیر ہونا چاہیے۔ فی الواقع علوم آلیہ میں نحو وصرف اور ادب کو چھوڑ کر باقی علوم کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے ان علوم پر زیادہ وقت صرف کرنے کے بجائے ہر فن سے متعلق ایک یا دو کتابیں یا ان کے منتخب ابواب پڑھائے جائیں اور اس کے بعد اصول کی تعلیم ہو۔ ہمارے مجوزہ نصاب میں اسی اصول کی پیروی کی گئی ہے۔

ہم نے ثانوی کے علاوہ عالمیت اور فضیلت کے درجات میں بھی انگریزی کو نصاب میں شامل رکھا ہے۔ تاکہ طلبا اس اہم زبان سے بھی پورے طور پر واقف ہو جائیں اور کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر انگریزی داں طبقے تک دین حق کی دعوت پہنچا سکیں اور ان ہی کی زبان اور اسلوب کلام میں اسلام کی حقانیت ان پر واضح کر سکیں۔

۴۔ ہم نے نصاب سے قدیم فلسفہ کو نکال دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیم اب بے سود ہے۔ کیوں کہ اس کے اکثر مسائل کو فلسفۂ جدید نے رد کر دیا ہے۔ جدید فلسفہ کی تعلیم یقیناً ضروری ہے۔ کیوں کہ عصر حاضر میں اس راہ سے الحاد بے دینی کو فروغ مل رہا ہے اور اس کا سد باب

---

[1] ابھی تک صرف اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں دینی مدارس کے فارغین کو داخلہ ملتا ہے لیکن جدید نصاب کے رائج ہو جانے کے بعد اس بات کے لیے کوشش کی جائے گی کہ ہندوستان کے تمام طبیہ کالجوں میں دینی مدارس کے طلبا کو داخلہ مل سکے۔

ضروری ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ عربی مدارس کے اساتذہ جدید فلسفہ کے پڑھانے پر قادر نہیں ہو سکتے اور مغربی درس گاہوں کے فاضلین کی خدمات مضرتوں سے خالی نہیں، لیکن اگر دینی رجحان کے حامل اساتذہ فراہم ہو سکیں تو جدید فلسفہ کو نصاب میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ ہم نے قدیم منطق کے ساتھ جدید منطق کو بھی نصاب میں شامل کیا ہے۔ منطق کی تعلیم اس اعتبار سے نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص اپنی معلومات سے صحیح طور پر کام نہیں لے سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر دلائل و براہین کی واجبی ترتیب اور ان سے ٹھیک طور پر استنباط نتائج منطق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۵۔ بہت سے مدارس میں اختصاصی تعلیم کا طریقہ رائج نہیں ہے جس کی وجہ سے طلبا کسی ایک فن میں کامل مہارت پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ہم نے کاملیت کے مرحلے میں اختصاصی تعلیم کا طریقہ اختیار کیا ہے اور یقین کرتے ہیں کہ اس سے بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔

۶۔ ہم نے نصاب میں مختلف مضامین سے متعلق کتابوں کے نام نہیں لکھے ہیں۔ کیوں کہ مدارس میں ایک ہی فن سے متعلق جدا جدا کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ راقم کے نزدیک اصل مسئلہ کتابوں کا نہیں بلکہ ذہین اور تجربہ کار اساتذہ اور موثر طریقہ تدریس کا ہے[1] اگر اساتذہ ذہین نہ ہوں اور طریقہ تدریس غیر موثر ہو تو اچھی سے اچھی کتابیں بھی بے سود و بے فائدہ ثابت ہوں گی۔ پھر بھی جو لوگ اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ شبلی نعمانی کا تیار کردہ وہ نصاب ملاحظہ کر سکتے ہیں جو انہوں نے دارالعلوم عثمانیہ، حیدر آباد کے لیے تجویز کیا تھا اور یہ نصاب حیاتِ شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) میں مندرج ہے۔

جدید نصاب تعلیم کا خاکہ

مرحلہ اوّل۔ ابتدائی۔ مدت تعلیم ۵ سال۔ مساوی پرائمری

اس مرحلے میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے:

- داخلے کے وقت طالب علم کی عمر ۵ سال سے کم نہ ہونی چاہیئے۔
- داخلہ تحریری اور زبانی امتحان کے ذریعہ لیاقت (میرٹ) کی بنیاد پر ہوں۔ امتحان کے لیے تاریخ پہلے سے متعین کر دی جائے اور اسے مشتہر بھی کر دیا جائے۔
- اگر کوئی طالب علم صلاحیت کے اعتبار سے درجہ اوّل کے بجائے کسی دوسرے درجے میں داخلے کا مستحق ہے تو اسے اسی درجے میں داخل کیا جائے۔
- بچوں کو حتی الامکان جسمانی سزا نہ دی جائے بلکہ تادیب کے دوسرے غیر ضربی طریقے اختیار کیے جائیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں شوق علم اور مطالعے کے فطری رجحان کو ہر ممکن طریقے سے پروان چڑھایا جائے اور ہر قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- دار الاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) میں رہائش لازمی ہونی چاہیئے۔

ابتدائی کا نصاب

سال اوّل

نمبر شمار	مضامین	ہفتہ وار گھنٹے
۱	اردو	۱۲
۲	دینیات	۶
۳	ریاضی	۱۲
۴	ہندی	۱۲
۵	کھیل	۶

سال دوم

نمبر شمار	مضامین	ہفتہ وار گھنٹے
۱	اردو	۱۲
۲	دینیات	۶
۳	ناظرہ	۶
۴	ریاضی	۶
۵	ہندی	۱۲
۶	کھیل	۶

[1] اب دینی مدارس میں قدیم طریقہ تدریس یعنی املاد (لکچر) رائج نہیں ہے۔ سارا وقت محض حل عبارات میں صرف ہو جاتا ہے اور طلبا کو فن کی ہوا تک نہیں لگتی۔ یہ طریقہ تدریس اب متروک ہونا چاہیے اور لکچر کا طریقہ رائج ہونا چاہیے۔ بقدر ضرورت نوٹس لکھائے جا سکتے ہیں۔

عربی زبان بھی سکھائی جائے تاکہ وہ قرآن مجید کو سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے ثانوی کے عربی کے گھنٹوں میں ان کی شرکت کو لازمی کر دیا جائے۔
تکمیل حفظ کے بعد اگر کوئی طالب علم مزید علم دین حاصل کرنے کا خواہش مند ہے تو وہ عالمیت کے سال اوّل میں داخلہ کے لیے مجاز ہوگا۔ بشرطیکہ وہ ثانوی میں ۵ سال تک عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کامیابی کے ساتھ حاصل کر چکا ہو۔ درجہ حفظ میں صرف انہی لڑکوں کو داخلہ دیا جائے جو اس بات کا عہد کریں کہ وہ قرآن مجید کو کبھی اور کسی حالت میں بھی ذریعۂ معاش نہیں بنائیں گے۔

مرحلہ دوم

ثانوی ـــ مدت تعلیم ۵ سال ـــ مساوی ہائی اسکول

اس مرحلہ میں درج ذیل امور کا لحاظ کیا جائے۔

۱ داخلے کے وقت طالب علم کی عمر ۱۰ سال سے کم نہ ہو

۲۔ داخلہ تحریری امتحان کے ذریعے ہو اور ساتھ ہی انٹرویو بھی لیا جائے۔ تحریری امتحان اردو، ریاضی اور دینیات پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۳۔ اس بات کے لیے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ ابتدائی دو سالوں میں طالب علم کے اندر عربی اور انگریزی کی اتنی استعداد ضرور پیدا ہو جائے کہ اگلے تین سالوں میں قرآن مجید کے ساتھ سائنس کی تفہیم اس کے لیے آسان ہو جائے۔

۴۔ سائنسی مضامین کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیے لیکن اصطلاحات کو انگریزی ہی میں پڑھایا جائے۔ تاکہ ثانوی کے بعد اگر کوئی طالب علم سائنس کی مزید تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے دشواری پیدا نہ ہو۔

ثانوی کا نصاب

درجہ عربی اوّل

نمبر شمار	مضامین	ہفتہ وار گھنٹے
۱	ادب عربی	۱۲
۲	عربی قواعد	۶
۳	عربی انشاء	۶

سال سوم

۱	اردو	۱۲
۲	دینیات	۶
۳	ناظرہ	۳
۴	فارسی	۶
۵	ریاضی	۶
۶	سوشل سائنس (تاریخ و جغرافیہ)	۹
۷	ہندی	۶

سال چہارم

۱	اردو	۱۲
۲	دینیات	۶
۳	ناظرہ	۳
۴	فارسی	۶
۵	ریاضی	۶
۶	سوشل سائنس (تاریخ و جغرافیہ)	۹
۷	ہندی	۶

سال پنجم

۱	اردو	۱۲
۲	دینیات	۶
۳	ناظرہ	۳
۴	فارسی	۶
۵	ریاضی	۶
۶	سوشل سائنس (تاریخ و جغرافیہ)	۹
۷	ہندی	۶

نوٹ: جو لڑکے پرائمری کی تعلیم کے بعد قرآن مجید حفظ کرنا چاہیں حفظ کے درجے میں داخلہ دیا جائے لیکن حفظ کے ساتھ انہیں

۴ فارسی ۶
۵ ریاضی ۶
۶ جنرل سائنس ۶
۷ انگریزی ۶

درجہ عربی دوم

۱ ادب عربی ۱۲
۲ عربی قواعد ۶
۳ عربی انشاء ۶
۴ فارسی ۶
۵ ریاضی ۶
۶ جنرل سائنس ۶
۷ انگریزی ۶

درجہ عربی سوم

۱ ادب عربی ۶
۲۔ عربی قواعد و انشاء ۱۲
۳ ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر ۶
۴۔ انگریزی ۶
۵ ریاضی ۶
۶ سائنس ۱۲
(طبعیات، کیمیا، علم نباتات وحیوانات)

درجہ عربی چہارم

۱ ادب عربی ۶
۲ عربی انشاء ۶
۳ ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر ۶
۴ انگریزی ۶
۵ ریاضی ۶
۶ سائنس ۱۸
(طبعیات، کیمیا، علم نباتات وحیوانات)

درجہ عربی پنجم

۱ ادب عربی ۶
۲ عربی انشاء ۶
۳ ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر ۶
۴ انگریزی ۶
۵ ریاضی ۶
۶ سائنس ۱۸
(طبعیات، کیمیا، علم نباتات وحیوانات)

مرحلہ سوم۔ عالمیت۔ مدت تعلیم دو سال۔ مساوی انٹرمیڈیٹ

اس مرحلہ میں درج ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ عالمیت میں صرف انہی طلبا کو داخلے دیے جائیں جن کے نمبر ثانوی میں ۵۵ فیصد سے کم نہ ہوں۔
۲۔ عربی میں مضمون نگاری کی مشق پر خصوصی توجہ دی جائے۔
۳۔ قرآن مجید کے مطالعے میں عربی لغات کے ساتھ شعرائے جاہلیت کے کلام اور قرآن مجید کے نظائر کو پیش نظر رکھا جائے۔ تاکہ طلبا میں تلاش و تفحص اور غور و فکر کی عادت پیدا ہو۔

عالمیت ــ سال اول

۱ ادب عربی (نثر و نظم) ۱۲
۲ عربی انشاء ۶
۳ بلاغت ۶
۴ ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر ۶
۵ حدیث ۶
۶ فقہ ۶
۷ تاریخ اسلام (ماقبل اسلام) ۶
۸ انگریزی ۶

عالمیت۔ سال دوم

نمبر شمار	مضامین	ہفتہ وار گھنٹے
۱	ادب عربی (نثر و نظم)	۱۲
۲	عربی انشا	۶
۳	ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر	۶
۴	حدیث	۶
۵	فقہ	۶
۶	تاریخ اسلام (عہد نبوی)	۶
۷	انگریزی	۶

مرحلہ چہارم۔ فضیلت۔ مدت تعلیم دو سال۔ مساوی بی اے

اس مرحلے میں درج ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ فضیلت میں صرف انہی طلبا کو داخلے دیے جائیں جن کے نمبر عالمیت میں ۵۵ فیصد سے کم نہ ہوں۔

۲۔ عربی میں مضمون نگاری کی مشق کے ساتھ تقریری مشق بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر ماہ کم از کم ایک بار پہلے سے متعین موضوع پر ہر طالب علم سے تقریر کرائی جائے۔ عربی ادب کے اساتذہ تقریر کی تیاری میں طلبا کی پوری مدد کریں۔

۳۔ قرآن مجید کی تعلیم میں کسی تفسیر سے مدد لینے کے بجائے یُفَسِّرُ بعضُہ بعضاً کے معروف تفسیری اصول کے مطابق عمل کیا جائے۔ تاکہ طلبا میں تفکر و تدبر کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ تقلید کے بجائے اجتہاد کے اہل بن سکیں۔ تفاسیر کا مطالعہ صرف کاملیت کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

۴۔ انگریزی میں مضمون نگاری کی مشق بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ قرآنی تعلیمات سے انگریزی داں طبقے کو آگاہ کیا جا سکے۔

۵۔ فضیلت کی سند صرف ان ہی طلبا کو دی جائے جو آخری سال میں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں کم از کم ۵۰ صفحے کا مقالہ لکھ کر پیش کریں۔

فضیلت۔ سال اوّل

۱۔	ادب عربی (نثر و نظم)	۱۲
۲	عربی انشاء	۶
۳	تاریخ ادب عربی	۳
۴	ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر	۶
۵	اصول حدیث	۳
۶	اصول فقہ	۳
۷	فرائض	۶
۸	تاریخ اسلام (اُموی عہد)	۳
۹	انگریزی	۶

فضیلت۔ سال دوم

۱۔	ادب عربی (نثر و نظم)	۱۲
۲	عربی انشاء	۶
۳	ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر	۶
۴	تاریخ فقہ	۳
۵	تاریخ حدیث	۳
۶	منطق قدیم و جدید	۶
۷	تاریخ اسلام (عباسی عہد)	۳
۸	انگریزی	۶
۱۰	انگریزی مضمون نگاری	۳

مرحلہ پنجم۔ کاملیت۔ مدت تعلیم دو سال۔ مساوی ایم اے

یہ مرحلہ اختصاصی تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں عر[بی]
تفسیر، فقہ اور حدیث میں سے کسی ایک فن کی دو سال تک تعلیم [دی]
جائے۔ تاکہ طلبا، کو کسی ایک فن میں مہارت اور درجۂ اجتہاد حا[صل]
ہو سکے۔ کاملیت کے آخری سال میں ہر طالب علم کے لیے اپنے فن سے م[تعلق]
سَو صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھنا لازمی قرار دیا جائے او[ر اس]
کے بعد ہی اسے کاملیت کی سند دی جائے۔

ہندوستانی مسلمان : ایک منظر نامہ

(زمان و مکان کے چیلنج اور جوابات کا مسئلہ)

اختر الواسع

(۱)

جدید ہندوستانی تاریخ میں مسلمان دو دفعہ سیلابِ بلا سے گزرے ہیں پہلے ۱۸۵۷ء میں اور پھر ۱۹۴۷ء میں۔ لیکن اگر پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں زمانوں میں ایسی قد آور شخصیتیں موجود تھیں، جنہوں نے اپنے اپنے انداز سے اس جاں بلب امت کی مسیحائی کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اگر ایک طرف سر سید اور ان کے رفقا تھے تو دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی اور اُن کے ساتھی۔ تیسری طرف ایک حلقہ وہ بھی تھا جو اکبر الہ آبادی سے متاثر تھا۔ ۱۹۴۷ء کی ۱۵ اگست کو طلوع آفتاب کے ساتھ جو سراسیمگی، اضطراب اور بے سر و سامانی کا عالم تھا اس میں مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، مولانا حسین احمد مدنی، حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمان نے ڈھارس بندھانے کا کام انجام دیا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ آزادی کے بعد کی مذکورہ بالا قیادت کا بڑا وقت اور توانائی "فائر بریگیڈ" کا رول انجام دینے میں گزرا۔ اس لیے کہ تقسیم وطن نے جس نفرت بھری فضا کو جنم دیا تھا، فسادات اس کا عملی مظہر تھے اور اپنے ہی وطن میں شک و شبہ کا شکار اور بار بار اجاڑے گئے اپنے ہم مذہبوں کی آباد کاری اور حوصلہ بنائے رکھنے کی ذمہ داری اس کے سر آ پڑی تھی۔

لیکن آج آزادی کے چالیس (۴۰) برس گزر جانے کے بعد جب ہم ہندوستانی سماج کے تناظر میں مسلم معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی سنگینی میں افاقہ کی جگہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ ایسا کیوں کر ہوا؟ یہی ایک سوال ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو عام طور پر دیا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد سے اس ملک میں مسلمان ہر سطح پر تعصب، ناانصافی، فرقہ واریت اور امتیازی سلوک کا شکار ہوئے ہیں اور انہیں دوسرے درجے کا شہری بنا دینے کی سازش ایک مخصوص ذہنیت کے حامل طبقہ نے منصوبہ بند طریقے سے کی ہے۔ ہم اس بات کو بے وزن، واہمہ یا بے بنیاد قرار دے کر مسترد نہیں کر سکتے۔ لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کر سکتے کہ آج مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا سبب خود ان کے بیچ ایک مثبت فعال، تاریخی شعور کی حامل ایسی قیادت کا فقدان بھی ہے جس کا سرمایۂ سفر بلندیٔ نگاہ، دلنوازیٔ سخن اور پُر سوزیٔ جاں ہوتا ہے۔

جب ہم قیادت کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ اس سے مراد صرف سیاسی قیادت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی قیادت ہے جو کہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کو باطن کی روشنی اور بصیرت عطا کر کے ایک باوقار، صحت مند اور افادیت کا باعث معاشرتی گروہ بنا سکے۔ ایک ایسی قیادت جو سیاسی رہنمائی اور سماجی اصلاح کا کام بیک وقت کر سکے ایک ایسی قیادت جس کے پاس باطنی توانائی بھی ہو، آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کا عرفان بھی اور اسی کے ساتھ پیغمبروں کا ظرف اور صوفیوں کا استغنا بھی۔ ماضی بعید اور قریب میں اس کی سب سے بہتر مثالیں ہمیں سر سید اور مولانا آزاد کی ذات میں ملتی ہیں۔

ہمارے ہم عصر ہندوستانی معاشرے کا المیہ یہی ہے کہ قیادت کے خلا یا اگر اس لفظ سے کسی کو اختلاف ہو تو بحران نے ہمیں ایک ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے جہاں سے سمت سفر کا سراغ نہیں مل پا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمان اگر کم ہمتی کا شکار تھے تو آج انتشارِ ذہنی اور گمرہی میں مبتلا ہیں

دونوں کا لازمی نتیجہ ایک ہی ہے ـــــ مایوسی۔ آزادی کے فوراً بعد کے برسوں میں سیاست، مذہب اور ثقافت کے میدانوں میں ہمارے پاس ایسی قدآور شخصیتیں موجود تھیں، جن کا احترام، مسلمانوں سے کھلے عام تکلّف یا تعصب برتنے والے بھی کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن آج کیا ہے ؟ لیکن آج ہمارے پاس افراد سے زیادہ تنظیمیں اور وہ بھی متوازی خطوط پر۔ جس کے نتیجے میں کسی دوسرے سیاسی، مذہبی، لسانی یا ثقافتی خطرے کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ خود آپس میں ہی ایک دوسرے کے دست وگریباں سے الجھے ہوئے ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیمیں ہونی چاہییں یا نہیں سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ فکر ونظر کی یکسانیت کی بات کرنے والوں کے یہاں اشتراکِ عمل تقریباً ہے ہی نہیں بلکہ تصادم کا معاملہ ہے۔ مثلاً مسلم عائلی قوانین کے تحفظ کے لیے اگر ایک طرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہے تو دوسری طرف آل اِنڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس۔ اگر ایک طرف امارت شرعیہ ہے تو دوسری طرف امارتِ ہندیہ اور تیسری جانب امارت اِسلامیہ۔ دینی تعلیم کے میدان میں اگر ایک طرف دینی تعلیمی کانفرنس ہے تو دوسری طرف دینی تعلیمی بورڈ عام مذہبی زندگی میں رہنمائی کی دعوے دار اگر ایک طرف جمعیۃ العلماء ہند ہے تو دوسری جانب سنّی جمعیۃ العلماء، اور تیسری جمعیۃ اہل حدیث۔ اگر ایک طرف جماعتِ اِسلامی ہے تو دوسری طرف تبلیغی جماعت۔

سیاسی میدان میں تو اور بھی نفسا نفسی ہے۔ ایک طرف قومی اور علاقائی پارٹیوں میں شریک مسلمان ہیں تو دوسری طرف اپنی اپنی جداگانہ سیاسی پارٹیوں کے مسلمان قائد۔ نظریات سے زیادہ اپنی ذات کو اہمیت دینے والے ان قائدین کے ٹکراؤ سے جو کشمکش سامنے آتی ہے وہ مسلمانوں کو اور بھی زیادہ اذیت دیتی ہے اور بے چارے مسلمان مایوسی اور انتشار کے گرداب میں اور زیادہ پھنستے چلے جاتے ہیں۔ پھر اس قیادت کا حال یہ ہے کہ وہ خود کوئی اجتہادی مسلک اپنا کر راہ دکھانے کے بجائے عوام کے مقلّد بنے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت اس طبیب کی سی ہے جو ذیابیطس کے چڑچڑے مریض سے خائف ہو کر اسے کریلے کا عرق دینے کے بجائے شکر کھلاتا ہو۔

اس صورت حال میں امید کی ایک کرن علماء اور دانشوروں سے ہو سکتی تھی لیکن ان کی ایک بڑی تعداد بھی مرکز جو ہونے کے بجائے مرکز گریز ہے اور عام سیاسی قائدین کی طرح یہ بھی حالات کا رونا روتے ہیں۔

ہیں۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے مسلمانوں میں وقت گزرنے کے ساتھ تعلیم عام ہوتی جائے گی، ویسے ویسے مسلم معاشرے میں بہتری کے آثار پیدا ہوتے چلے جائیں گے لیکن چالیس برس گزرنے کے بعد بھی ہمارے اکثر تعلیم یافتہ بزرگوں اور نوجوانوں کی مسلم مسائل پر گفتگو میں کم وبیش حاصلِ کلام یہی ہوتا ہے کہ چوں کہ مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہیں، اس لیے انتظامیہ میں ان کا عمل دخل نہیں کے برابر ہے اور انتظامیہ میں اثر ونفوذ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان معاشی مواقع سے بھی محروم ہیں اور اس معاشی پسماندگی کی بنا پر وہ تعلیم کے میدان میں بھی پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس منطقی استدلال کی اثر آفرینی اور کسی حد تک سچائی سے بھی ہمیں انکار نہیں لیکن اگر خوگر مدح کو تھوڑے سے گلہ کی اجازت دیں تو یہاں یہ ایک سوال اٹھانے کو جی چاہتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تو مسلمان غالب ترین اکثریت ہی ہیں اور یہاں چانسلر، وائس چانسلر، رجسٹرار، فیکلٹیوں کے ڈین، تدریسی شعبوں کے چیرمین اور دفتروں میں کام کر رہے انتظامی عملہ میں غالب ترین اکثریت بھی مسلمانوں ہی کی ہے۔ یہاں کا سب سے غریب آدمی بھی ایک ہزار روپے تنخواہ گھر لے کر جاتا ہے اور سب سے کم پڑھا لکھا بھی تقریباً ہائی اسکول پاس ہے اس سب کے باوجود یہاں بھی وہی انتشار ذہنی، وہی شک کی فضا، خوف کی نفسیات اور کشمکش جاری ہے جو بقیہ ہندوستانی مسلم معاشرے اور خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں کو اپنی جکڑ میں لیے ہوئے ہے۔

دونوں مذکورہ بالا اداروں میں مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت، انتظامیہ پر کنٹرول، بڑی حد تک معاشی فراغت اور تعلیمی معیار کے اطمینان بخش عوامل کے باوجود بھی غیر مطمئن صورتِ حال کا مزید تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو اچانک ایک عالم دین کا یہ قول یاد آیا کہ مادی وسائل اور سہارے جتنے بھی ہوں، دین سے مکمل وابستگی کے بغیر دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح کا حصول ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب دارالعلوم دیوبند کی طرف نظر گئی تو قال اللہ اور قال الرسول اللہ کے غلغلہ کے باوجود وہاں بھی یقین کے نور، توکل اور انبساطِ عافیت کی جگہ خلفشار، باہمی پیکار اور خود نائبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دوسرے کے تقدس اور تقویٰ کے جُبّہ ودستار کو تار تار کرتے ہوئے

ہی دیکھا۔ ہماری تاریخ میں متوازن تنظیموں کے ساتھ ہی ساتھ متوازی اداروں کے قیام کا پتہ چلتا ہے لیکن نئے ادارے قائم کرنے کے بجائے قدیم ترین جمے جمائے اداروں پر شب خون مار کر قبضہ کرنے کا ایک نیا رجحان اور رویہ موجودہ زمانے میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ غرض بقولِ اقبال:

کسی کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش

اس صورت حال کو مزید خطرہ اکثریت سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کے ان جارحانہ توسیع پسندانہ عزائم سے پیدا ہو گیا ہے جو کہ اس ملک کی اکھنڈتا اور اکھنڈتا کے لیے ایک ثقافت، ایک تہذیب، ایک زبان اور ایک قانون کو لازمی قرار دیتا ہے اور تاریخ کے نام پر دھاندلے بازی اور دھونس کے ذریعے مسلمانوں کے 'وقار' ان کی شاندار تہذیبی اقدار، مالدار اور توانا زبان، قانون کی مذہبی اساس اور قرآن حکیم و مساجد تک ختم کرنے، یرغمال بنانے اور اغوا کرنے کے منصوبوں کا ببانگِ دہل اعلان کرتا پھر رہا ہے۔ یو۔ پی سرکار کی فیض رسانی کے بل پر اجودھیا میں تو وہ بابری مسجد کا ہرن بھی کر چکے ہیں۔

٢

اس ملک میں ایسا بالکل نہیں ہے کہ ہر طرف مسلمانوں میں سناٹا ہو، خاص طور پر وندھیاچل کے نیچے کے علاقوں میں اور مہاراشٹر کے کچھ حصوں میں افراد اور تنظیمیں سرگرم عمل ہیں لیکن کیرالہ کے حالیہ انتخابات میں جس طرح ہندوؤں کی ایک انتہا پسند طبقے نے اپنے وجود کو منوانے کی سیاسی کوشش کی ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ اب وہاں بھی سب خیریت نظر نہیں آتی۔ پھر جنوبی ہند میں تعلیم، صنعت، تجارت اور ملازمتوں میں وہاں کے مسلمان اپنی آبادیوں کے تناسب سے اگر دیکھا جائے تو اپنے غیر مسلم بھائیوں کے مقابلے میں واقعتاً بہت پیچھے ہیں۔ شمالی ہند میں انفرادی سمجھیے یا اجتماعی ایک کوشش حکیم عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں ہمدرد وقف کی طرف سے ہو رہی ہے۔ ورنہ بقیہ توانائی تو ہم "سیاسی جست و خیز" میں صرف کرتے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہاں یہ سوال فطری طور پر اٹھتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے؟ ہمارے پاس اس کا جواب وہی ہے جو ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ ہمیں اپنے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی رویوں میں تبدیلی لانا ہوگی۔ مثلاً ماضی کے تاریک، گھنے اور خاردار جنگلوں میں بھٹکنے کے بجائے حال کے تلخ حقائق کی تپتی دھوپ میں ایک خوشگوار مستقبل کے لیے سرگرم عمل ہونا ہوگا۔ ماضی میں لاکھ روحانیت سہی اور اس پر ہمارا فخر بھی بجا سہی کہ ہم نے اس ملک کو قطب مینار کی بلندی، تاج محل کا حسن، لال قلعہ کی پختگی، شاہجہانی مسجد کا تقدس، معین الدینؒ اور نظام الدینؒ کا عرفان عطا کیا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ جب تک ہم نے یہ سب دیا تو ہمیں اس ملک میں ظلّ الٰہی تسلیم کیا گیا۔ آج ہم کیا دے رہے ہیں جس کے جواب میں کوئی ہماری طرف متوجہ ہو۔ جہاں تک کچھ لینے کا سوال ہے تو اس میں بھی ہم "نفلی انتقام" لے کر ہی سارا کاروبار چلا رہے ہیں۔

اگر ہم ہندوستان کو ایک سیکولر ریاست بنائے رکھنے کی تائید کرتے ہیں تو پھر ہمیں سیکولر ریاست کو بھی پوری طرح ماننا ہوگا۔ اس کے برعکس ہمارا ہر رویہ اس ملک میں پنپ رہی فسطائی قوتوں کو غذا، توانائی اور ان کے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔ ان فسطائی قوتوں کا مقابلہ ہم اکیلے نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستانی سماج کے تمام مظلوم اور استحصال کا شکار طبقوں کو ساتھ لینا ہوگا۔ ہمارا ایسا خیال ہے کہ اسلام کا مستقبل مسلمانوں کے مستقبل سے اور مسلمانوں کا مستقبل دیگر ہندوستانیوں کے مستقبل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں اپنا مذہب اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور ہمیں اس ملک میں اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ رہنا ہے۔ اسی طرح ہندو اکثریت کے اس ملک میں مسلم اقلیت میں اپنی پیدائش کو بھی ہم اپنے رب کی مشیت ہی سمجھتے ہیں اور اس کی رضا میں ہماری رضا ہے۔ وہ اس "دارالصلح" میں ہم سے شاید "قسط و عدل" کی قرآنی روح کو جاری و ساری کرانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم اپنے معاشرے کے اندرونی انتشار و خلفشار پر قابو پائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ:

شرعی امور میں رہنمائی اور نفاذ کے دستوری ضمانت

کے تحت ایک ایسی باڈی ہو جو مسلمانوں کے ذریعے منتخب علماء پر مشتمل ہو اور حکومت و پارلیمنٹ اس کی سفارش پر ہی شرعی معاملات میں کوئی فیصلہ کریں یا قانون بنائیں۔ خود ماضی میں جب غیر ملکی حکومت تھی شاہ عبدالعزیزؒ حکومت کے ایسا سے مسلمانوں کا شرعی معاملات کے لیے ایک امیر مقرر کیے جانے کا فیصلہ دے چکے ہیں اور اب جمہوری نظام میں ایسی باڈی منتخب ہو سکتی ہے لیکن اس کے ارکان کا سیاست سے کوئی عملی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کی معاشی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی رہنمائی کے لیے اپنے ایک زمانے سے چلے آرہے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ رہنمائی علمی اور نظری ہوگی۔
- زندگی کے علمی میدانوں میں رہنمائی کے لیے ہمیں "ماہرین کے گروپ" جگہ جگہ بنانے ہوں گے اور حیدرآباد وغیرہ میں جو کام ہوا اس کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اس میں محوری کردار ادا کر سکتی ہے۔
- فرقہ وارانہ تناؤ اور کشیدگی کی عام فضا اور ایک دوسرے کے مذاہب سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کے فروغ کو روکنے کے لیے اپنی یونیورسٹیوں، کالجوں اور مدرسوں میں ہندوستانی مذاہب اور ثقافتوں کا ہمیں ایک ایک پرچہ شاملِ نصاب کرنے پر غور کرنا چاہیے۔
- ہمیں ایک ایسا تحقیقی مرکز بھی قایم کرنا چاہیے جو یہ دیکھے کہ کن کن ملازمتوں کے لیے کل کتنے امیدوار تھے اور ان میں مسلمانوں کی تعداد کیا تھی اور وہ کس حد تک کامیاب رہے۔ اگر کامیابی میں کمی رہی تو اس کا آگے کے لیے تدارک کس طرح کیا جائے۔
- فکری و ذہنی تبدیلی لانے کے لیے ہمیں وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو علی گڑھ کے "پیر دانا" (سرسیّد) نے کیا تھا آج سرسیّد اور ان کے رفقاء کی پچھلی صدی سے بھی سے زیادہ ضرورت ہے۔ گو زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن ہم آج بھی سرسیّد کے پیچھے نہیں بلکہ ان سے بہت پیچھے ہیں۔
- آزاد جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی فکری رہنمائی آج بھی اتنی ہی معنویت و افادیت رکھتی ہے جتنی وہ آزادی کے فوراً کے بعد کے برسوں میں اہم اور ناگزیر تھی۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا کرنا مناسب بھی ہوگا؟ اس کا فیصلہ یا تو آپ کریں گے ورنہ پھر وقت کرے گا جس کی تلوار انہیں کاٹ دیتی ہے جو اسے نہیں کاٹتے۔

> ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف رسپیکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔"
>
> سرسیدؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۶ شمارہ ۹ (ستمبر ۸۷ء)

خلیجی یونیورسٹی اور عربی اسلامی دولتِ مشترکہ میں سائنس

عبد السلام | ترجمہ | حیات اللہ انصاری

(جولائی سے پیوستہ)

ہم کس طرح تاریخ کو لوٹا سکتے ہیں اور گزرا زمانہ واپس لاکر دوبارہ سائنس اور ٹکنالوجی میں افضلیت حاصل کرسکتے ہیں۔ کس طرح نئی خلیجی یونیورسٹی اس افضلیت کے بارے میں یقین دلاکر باہر چلے جانے والوں کو واپس کھینچ لاسکتی ہے۔

قرآن پاک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں ہمارے لیے اہم قرار دی ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے ہماری پوری ملت اور خصوصاً ہمارے نوجوانوں کو سائنس دانی میں نوجیون لانے کے لیے اپنے میں ایک پرجوش عزم پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی نصف سے زیادہ افرادی قوت کو سنجیدگی سے سائنسی تربیت میں لگادینا چاہیے۔ ہمیں بنیادی سائنس اور استعمالی سائنس دونوں کو اختیار کرنا چاہیے جس میں کم از کم ایک چوتھائی سے لے کر ایک تہائی تک بنیادی سائنس پر صرف ہو۔

ایسا ہی سوویت روس میں کیا گیا اور ایسا ہی جاپان میں انیسویں صدی کے میجی انقلاب کے بعد کیا گیا اور یہی کام آج ایک منصوبہ بندی اور دیوانہ وار عجلت کے ساتھ چین کی عوامی جمہوریہ میں کیا جارہا ہے۔ وہاں نشانے مقرر کیے گئے ہیں، خلائی سائنسوں، تناسلی سائنس، خوردنی ترقیات اعلا توانائی کی طبعیات، زراعت اور حراری نیو کلیائی توانائی کے میدانوں کے لیے اور ان کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ ان سماجوں میں اس بات کا واضح اعتراف ہے کہ بنیادی سائنس ہی ضروری سائنس ہے اور آج اس میں حاصل کی ہوئی آخری حد کل کے استعمالی سائنس یعنی ٹکنالوجی کی بنیاد ہوگی اور ہم کو آخری حد ہی پر رہنا ہے۔ انہوں نے محسوس کرلیا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں سبقت حاصل کرنے کے لیے صرف ایک راستہ ہے وہ یہ ہے کہ سائنس پر مکمل قابو حاصل کرو۔

ان سماجوں نے جاپانی سائنس، چینی سائنس یا ہندوستانی سائنس کے نعروں سے دھوکا نہیں کھایا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے حاصل کرنے میں ان کی قومی، تمدنی روایات کو کسی خطرے کا سامنا ہے۔ وہ اپنی قومی روایات کو اس قدر نازک سمجھ کر ان کی توہین نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی عربی قوموں کی کل آمدنی چین سے زیادہ ہے اور ان کے افرادی وسایل کچھ زیادہ کم نہیں ہیں اور چین کو اسلامی ممالک سے سائنس میں ایک درجے سے زیادہ سبقت حاصل نہیں ہے۔

اس سے قبل میں نے سائنسوں کی سرپرستی کی بات کہی تھی، اس کا سب سے اہم پہلو ہے تحفظ اور اطمینان اور استقلال کا احساس جو کہ سائنس کے طالب علم کو اپنے کام کے لیے ملنا چاہیے۔ تمام انسانوں کی طرح ایک سائنس داں یا ماہر ٹکنالوجی اپنی بہترین خدمات اس وقت پیش کرسکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ اسے تحفظ اور احترام حاصل ہے اور اپنے کام کے لیے اس کو مساوی مواقع ملیں گے یعنی وہ ہر قسم کے امتیازات اور اعتقادی فرقہ واریت اور سیاسی اونچ نیچ سے بالاتر رہے گا۔

میں ابھی تک کہتا آرہا ہوں کہ اسلامی اور عربی ممالک کے لیے سائنس کی ایک دولت مشترکہ ہو۔۔۔ حالاں کہ ان ممالک کی ابھی تک کوئی سیاسی دولت مشترکہ نہیں بنی ہے۔ مگر ایسی سائنسی دولت مشترکہ کا وجود

سلامی سائنس کے عظیم دور میں داخل رہ چکا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ابن سینا اور البیرونی ایسے ماہرین جو وسطی ایشیا میں رہ رہے تھے وراس کے باشندے تھے بالکل قدرتی انداز میں عربی زبان لکھتے تھے۔ ن ہی دنوں میں ان کے ہم عصر اور علم طبعیات میں میرے اخی) ابن الہیثم عباسی خلیفہ کی مملکت چھوڑ کر اور اپنے وطن بصرہ کو ترک کر کے فاطمی خلیفہ کے دربار میں جو کہ عباسی خلیفہ کا رقیب تھا، چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسی وقت گئے ہوں گے جب اُن کو یقین ہوگا کہ وہاں اُن کو پوری عزت اور وقار ملے گا۔ اس زمانے میں سیاسی اور اقتصادی اختلافات آج سے کم شدید نہیں تھے لیکن اس کے باوجود صاحب علم کی ہر جگہ بلا تفریق قومیت یا عقیدہ عزت کی جاتی تھی۔

آج اِس بات کی ضرورت ہے کہ سائنس کے میدان میں اسلامی دولت مشترکہ کا تصور واضح طور پر پیش کیا جائے تاکہ ایک بار پھر ہمارے سائنس داں اور حکومتیں دونوں اس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرلیں۔

آج ہم لوگوں کی یعنی اسلامی ممالک کے سائنس دانوں کی تعداد بہت چھوٹی ہے۔ اس کے وسائل اور سائنسی تحقیق کا درجہ بین الاقوامی پیمائش کی رو سے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابل سویں حصے سے لے کر دسویں حصے تک ہے۔ ہمیں اس لیے ضرورت ہے کہ متحد ہو کر ایک ملّت کی شکل میں اپنے وسایل کو اکھٹا کرلیں اور پھر کام میں لگ جائیں۔ ہمیں اس بات کی مثلاً ضرورت ہے کہ ہماری حکومتیں کھل کر صاف صاف اس عہد کا اعلان کریں کہ اس سائنس کی دولت مشترکہ میں کام کرنے والوں یعنی امت العلم کے افراد کو کم سے کم آئندہ ۲۵ سال تک فرقہ واریت یا قومیت کی بنا پر امتیازات کا شکار نہیں ہونے دیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ اسلامی دولت مشترکہ کے اندر سائنس میں نوجیون لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پانچ بنیادی شرائط پورے ہوں۔

۱۔ پرجوش عزم
۲ فراخ دلانہ سرپرستی
۳ ذاتی تحفظ کا اہتمام
۴۔ تفرقہ والے امتیازات سے امتناع اور
۵ ہماری سائنسی مہموں کے لیے بیرونی بین الاقوامی تعلقات اور اندرونی خود اختیاری۔

اب بتلایے کہ ایسی امت العلم کی مرکزیت اور پرورش کے لیے نئی خلیجی یونیورسٹی کیا اقدامات کرسکتی ہے۔

یہ فرض کر کے کہ یہ پوسٹ گریجویٹ یونیورسٹی ہوگی۔ اس سے پہلے اس کو اس بات کی کوشش کرنا ہوگی کہ بین الاقوامی معیار کے بنیادی سائنسوں کی تحقیق کے ایسے مرکز قایم کیے جائیں جو بین الاقوامی معیار کے ہوں۔ ان میں خاص توجہ تجرباتی جامدی طبعیات کے خوردبینی برقیات کی سائنس اور مقامی بحری اور ریگستانی سائنس اور ترسیلی نظامات پر دی جائے گی۔ یہ یونیورسٹی سرگرمی سے اس بات کی کوشش کرے گی کہ ان مرکزوں کی مدد سے بین الاقوامی معیار کی سطح پر جو بہترین دماغ موجود ہیں خاص طور پر عربی اِسلامی دولت مشترکہ میں ان دماغوں کو یکجا کرلے۔ اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے عربی اِسلامی دولت مشترکہ کے چھوٹے علاقوں کے اداروں اور تحقیق کرنے والوں کے گروہوں میں باہم وفاقی معاہدے ہوں گے۔ ایسے گروہوں کے سفر اور قیام کے لیے خلیجی یونیورسٹی فنڈ مہیا کرے گی۔ ایسے ہی طریقہ، کار پہ ٹریسٹی میں عمل کیا جا رہا ہے۔ جہاں کی وفاقی کڑیاں ترقی پذیر ملکوں کے ۲۰۰ سی اداروں سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان میں ۴۰ عربی اِسلامی دنیا کے ہیں جہاں کے ہم ہر ادارے کے محققین کو اپنے خرچ سے ۴۰ سے لے کر ۱۰۰ دنوں کے دوروں پر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ محققین میں ممتاز افراد ہوتے ہیں ان کے لیے ان کی لیاقت کے مطابق شخصی رفیق کار کی اسامیوں کا بھی منصوبہ چلایا جا رہا ہے۔ ہمارے وہاں بیک وقت ایسے ۲۰۰ رفیق کار رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی تقرری چھ سال کی مدت کے لیے ہوتی ہے۔ ان چھ سال کے دوران رفیق کار اپنے منتخب کیے ہوئے زمانے میں تین مرتبہ ٹریسٹ مرکز میں آسکتا ہے۔ جہاں وہ کم از کم چھ ہفتے اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہفتے تک قیام کرسکتا ہے۔ ہم رفیق کار کی آمد و رفت اور ٹریسٹ میں قیام کا خرچ دیتے ہیں مگر تنخواہ نہیں دیتے ہیں۔ ان کاموں کے لیے کوئی رسمی پابندی نہیں ہے۔ رفیق کار صرف ہم کو لکھ دیتا ہے کہ ہم آ رہے ہیں ایسا منصوبہ عربی اِسلامی دولت مشترکہ کے ان لوگوں کے لیے خاص طور

پر مفید ہوگا جو اس وقت میرے مذکورہ ساتویں حلقے یعنی یورپ اور امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی بحرین یونیورسٹی میں موجودگی اس کو دانشوری سے مالا مال کر دے گی۔ وہ نئے خیالات لے کر آئیں گے، جدید ترین ٹکنیک اور کام کرنے کے طریقے لائیں گے۔ کئی قسم کی جدوجہد لائیں گے اور یہ سب کام کم سے کم تاخیر سے ہوگا۔ اگر خلیجی یونیورسٹی ان کے لیے بلا کسی رسمی کارروائی کے دوسرا وطن بن جائے تو اسے بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔

میں نے بحرین کے لیے مادی سائنسوں کی ایک بین الاقوامی تجربہ گاہ کا تذکرہ کیا تھا، جس میں خوردبینی برقیات اور جدید برقیاتی ترسیل بشمول ترسیل بذریعے خلائی سیّارے کا خصوصی بندوبست ہو۔ ترسیل بذریعہ خلائی سیارہ سے بحرین کی بنک کاری کے مراسلات میں سہولت ہوگی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسی تجربہ گاہ کی تجویز جدّہ کی یونیورسٹی کے لیے کی گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ ٹکنالوجی کے حصول کے ساتھ سائنس کے حصول پر بھی زور دیا جائے اور مادی سائنسوں کے لیے بشمول سطحی طبعیات کے، بین الاقوامی تجربہ گاہیں قایم کی جائیں اور ایک تجربہ گاہ ایسی ہو جس میں سینکروٹن والے اشعاعی نور کا ماخذ موجود ہو (سینکروٹن ایک ایسا آلہ ہے جس میں برقی اور مقناطیسی قوتوں کی مدد سے برقیوں کا اسراع کیا جاتا ہے) جو سہولتیں بھی ہوں وہ بین الاقوامی معیار کے لحاظ سے اعلا ترین ہوں اور یہ تجویز کی گئی تھی کہ یہ تجربہ گاہیں بین الاقوامی محققین کے گروہوں کے لیے اس طرح کھلی رہیں جیسے آج کل ہم بیم برگ جنیوا اور پیرس کی تجربہ گاہیں رہتی ہیں۔

مگر یہ منصوبہ اس وجہ سے پورا نہ ہو سکا (جہاں تک میرا خیال ہے) کہ اس کا بوجھ برداشت کرنے کی ذمّہ داری ایک اکیلی یونیورسٹی پر آتی تھی، نہ کہ کئی یونیورسٹیوں کے اشتراک پر۔ مجھے امید ہے کہ وہ منصوبہ عظیم نئی خلیجی یونیورسٹی میں از سر نو زندہ کیا جا سکتا ہے اور اس کو بین الاقوامی سطح پر محققین کے لیے قابل رسائی بنایا جا سکتا ہے۔ خاص کر تمام خلیجی ممالک کی اور عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں کے لیے۔ میں نے ٹکنالوجی کی ایک عظیم تجربہ گاہ کا بھی بحرین کے لیے ذکر کیا تھا۔ اس سیاق میں میں یہ بھی بتا دوں کہ ٹریسٹ کے مرکز کی طرح کا ایک بین الاقوامی مرکز بنانے کی پیش کش یونیڈو تنظیم نے جو کہ ویانا میں واقع ہے، کی ہے۔ اس کے تعین مقام کے لیے ایک مقابلے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ چھ ملکوں نے سہولتوں کی پیش کش کی ہے وہ ہیں پاکستان، ہندوستان، کیوبا، تھائی لینڈ، بلجیم اور اٹلی۔ ابھی تک کسی عرب ملک نے اپنے کسی مقام کی پیش کش نہیں کی ہے۔ اگر پاکستان میں لاہور یہ مقابلہ جیت لیتا ہے تو وہاں یونیڈو کا بین الاقوامی مرکز قایم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ بحرین کی خلیجی یونیورسٹی سے قریبی تعلقات رکھے گا۔

میں سب سے آخر میں ریاضیات کے بین الاقوامی مرکز پر زور دوں گا جس کی شاخیں حسابیاتی سائنسوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ پر بغداد سے ت کی ابتدا جیسا کہ ہمارا علم ہے خلیجی علاقے کے اداروں ہی سے ہوئی تھی۔ خاص طور پر بغداد سے جہاں کہ آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں صدیوں میں الجبرا، مثلثات اور تحلیلی ہندسے کی تخلیق ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم کیوں ریاضیات میں افضلیت حاصل کرنے والے وہی پُرانے حالات پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔ کیوں نہیں؟ بحرین کو آپ اس معنوں کے لیے تمام عالم کا چوراہا بنا سکتے ہیں۔ آپ غالباً جانتے ہوں گے کہ تمام عالم میں اگلی صف والا ایک ریاضی داں جو آج کل آکسفورڈ میں پروفیسر ہے اور جس کو وہ سب سے بڑا باوقار اعزاز، جس کی کوئی ریاضی داں تمنا کر سکتا ہے، یعنی فیلڈ کا تمغہ، وہ اسے مل چکا ہے وہ ریاضی داں عربی نژاد ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں نہ ایسے لوگوں کو ایسی مشترکہ ملازمتیں ملیں کہ بیک وقت یورپی مقامات میں بھی اور بحرین میں بھی دونوں جگہ کام کر سکیں اور بحرین میں ریاضیات کا ایک جدید مدرسہ قایم کر دیں۔

اختتام

اب میں ختم کر دوں گا مگر اتنا بتا دوں کہ میں اس قدر جوش سے ترویج علوم کے لیے ہم جوئی کی سفارش کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے نہیں کہ اللہ نے ہم کو علم حاصل کرنے کے شوق سے مزین کیا ہے اور نہ صرف اس لیے کہ آج کے حالات میں علم طاقت ہے اور سائنس کا استعمال مادّی ترقی کا بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اس بین الاقوامی ملّت کا جز ہوتے ہوئے ہمیں ان لوگوں کی حقارت کی نظریں برداشت

نہیں ہوتیں جو علم کی تخلیق کرتے ہیں۔ حقارت خواہ زبان سے ادا ہو یا نہ ہو، مگر ہے وہ ضرور۔

مجھے وہ بات اب بھی یاد ہے جو چند سال قبل ایک یوروپی سائنس داں نے، جس نے طبعیات میں نوبل انعام حاصل کیا ہے، مجھ سے کہی تھی:

"سلام! کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ہم پر ایسی قوموں کی دستگیری کرنے اور زندہ رکھنے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے جنھوں نے دنیا کے علم کے ذخیرے میں ذرا بھی اضافہ نہیں کیا ہے"۔

اگر انھوں نے ایسی بات نہ کہی ہوتی تو بھی ہم کو اس بات کا احساس تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب میں کسی ہسپتال میں داخل ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آج کی تقریباً ہر کارگر اور جان بچانے والی دوا پنسیلین سے لے کر انٹرفرال کی تخلیق میں تیسری دنیا کا یا عربی اسلامی ممالک کا کسی کا بھی حصہ نہیں ہے۔ بیسویں صدی سائنس کی دنیا میں عظیم ترکیبی اعمال کی صدی ہے۔ مقادیر برقی کا نظریہ۔ نظریہ اضافیت اور رایک ین کے نظریے طبعیات میں، ادلین دھماکے والا نظریہ علم کائنات میں، تناسلی کوڈ حیاتیات میں اور طبقاتی تعمیر کے نظریۂ ارضیات میں؛ یہ سب اس کی مثالیں ہیں۔ اس طرح ٹکنالوجی میں خلا پر فتح حاصل کرنا اور جوہری طاقت پر قابو پالینا ہے یہ سب باتیں اس طرح کی ہیں جیساکہ سولہویں صدی میں یوروپ والوں نے نئے برّاعظم دریافت کیے تھے اور ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ آج سائنس کی سرحدوں پر فتحوں پر فتح حاصل کی جارہی ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آپ کے دلوں کو یہ تمنا کہ ہمارے عربی اسلامی ملکوں کے باشندے بھی ان فتوحات کی اگلی صف میں نظر آئیں، اس طرح بے چین نہ کررہی ہو، جس طرح میرے دل کو کررہی ہے۔

میں دو اپیلوں پر اپنی بحث کو ختم کردوں گا۔ ایک اپیل تو ہے ان لوگوں سے جو یونیورسٹی کے قیام کے ذمہ دار ہیں، خاص کر وہ جو اُن میں سے سائنس داں ہیں اور دوسری عرب ملکوں کے حکمرانوں سے۔ سب سے پہلے تو آتے ہیں سائنس کے منتظمین۔ ہمارے یہاں ایسے سائنس داں بہت کم ہیں جن کے سہارے پر آپ یونیورسٹی قایم کرسکتے ہیں۔ اگر آپ ایک امّت العلم تیار کرلے جائیں اور عام عربی اسلامی ملکوں ایک پُرخلوص سچے گروہ کی تشکیل کرسکیں، تو پھر یہ کام دشوار نہیں یقین کریں کہ حالات اس قدر مایوس کن نہیں ہیں۔ خاص کر اس میں کہ آپ ایسے حالات پیدا کرسکتے ہیں کہ ساتویں علاقے یعنی اور امریکا میں ہمارے ملکوں کے جو باشندے کام کررہے آکر اس مہم میں شریک ہوجائیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کمزوریوں کے باوجود ہمیں کم حوصلہ نہ بننا چاہیے۔ اپنے ارادوں کے منصوبوں میں ہم کو بھرپور حوصلے سے کام کرنا چاہیے۔ حوصلہ اور لگن ہی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ کیوں کہ خدا کا ان لوگوں، جو جدّوجہد کرتے ہیں، وعدہ ہے

اور سب سے آخر میں ان لوگوں سے اپیل کروں گا جو معاملات کے اور یونیورسٹی اور میرے مذکورہ منصوبوں فنڈ مہیا کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ سائنس کی اہمیت اس لیے۔ وہ ہمارے اردگرد کی دنیا کو سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو میں معاون ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ دریافتو ایجادات سے ہمیں مادی منفعت بھی حاصل ہوتی ہے اور سب آخر میں اس لیے کہ اس میں آفاقیت ہے۔ وہ تمام انسانیت امداد باہمی کا ذریعہ ہے۔ خاص کر کہ عرب اور اسلامی قوموں لیے۔ ہم بین الاقوامی سائنس کے مقروض ہیں اور یہ فرض اپنی خود کو قایم رکھنے کے لیے ادا کرنا ہے مگر سائنس کی یہ مہم بغیر آپ کی ہی فراخ دلانہ سرپرستی کے، جیسی کہ گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں دکھائی تھی، پنپ نہیں سکتی ہے۔ میں آج کل ایک چھوٹے سے شہر رہ رہا ہوں اور کام کررہا ہوں، جس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے نہیں ہے۔ اس شہر میں ایک بنیک ہے کاسا دی رسپارمو جس نے اس عمارت کی تعمیر کے لیے پچ لاکھ ڈالر کا عطیہ دیا جس میں میرا تشکیل کیا ہوا مرکز واقع ہے۔ ا

شہر نے اب وعدہ کیا ہے کہ حیاتیاتی ٹکنالوجی کے یونیڈو کے مجوزہ مرکز کے لیے اپنے علاقائی وسائل سے چار کروڑ ڈالر کا عطیہ دے گا۔ میں ان کی سوجھ بوجھ سے اور سائنس سے اور ٹکنالوجی سے ان کے عشق پر متحیر ہوں۔ کیا ہمارے شہر اور بینک اس مثال پر پورا اترنے کی ہمت نہیں کریں گے؟

کل قومی آمدنی کا ایک دو فیصد کے بین الاقوامی معیار کی جو میں بات کر رہا ہوں، اس کا مطلب عرب ممالک کے لیے دو سے چار ارب ڈالر سالانہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اسلامی دنیا کے لیے تحقیق اور ترقی پر جو صرف ہوگا وہ بھی لگ بھگ اتنا ہی ہوگا۔ ان میں سے ایک چوتھائی سے لے کر ایک تہائی تک بنیادی سائنسوں پر صرف ہوگا۔ حکومت پاکستان نے میرے مشورے سے ۱۹۷۳ء میں لاہور اسلامی چوٹی کانفرنس سے استدعا کی تھی کہ تمام اسلامی ملکوں میں سائنسی ترقی کے لیے فورڈ فاؤنڈیشن کے برابر کا ایک ارب ڈالر سے ایک فاؤنڈیشن قائم کر دیں۔ آٹھ سال بعد ۱۹۸۱ء میں آخر کار ایک فاؤنڈیشن کی تشکیل ہوئی۔ لیکن صرف ۵ کروڑ کا وعدہ ہوا اور اب تک صرف ساٹھ لاکھ ڈالر وصول ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم واقعی سائنس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو منا ما کا ایسا بینک اکیلا فورڈ کے عظیم عنایات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ایسے معاملوں میں تو اس علاقے کی بہت شاندار روایات ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گیارھویں صدی میں امام غزالی نے عراق کے ملک کو یہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا تھا کہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں ایک عالم کو اپنے بچوں کی کفالت کا انتظام کرنے میں یہاں سے زیادہ آسانی ہو۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ عزلت نشینی کا منصوبہ بنا رہے تھے اور دنیا ترک کرنے جا رہے تھے۔ ہمیں ایک نہیں سائنس کے لیے ایسے ایسے کئی فاؤنڈیشن چاہییں جیسے کہ مغرب میں ہیں جنہیں سائنس داں خود ہی چلاتے ہیں۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بین الاقوامی اعلیٰ مراکز یونیورسٹی کے اندر بھی اور باہر بھی چاہیے جو ہمارے سائنس دانوں اور ان کے خیالات کے لیے فراخ دلانہ، روادارانہ اور مسلسل جاری رہنے والا انتظام فراہم کریں۔ ایسا انتظام کیجیے کہ مستقبل کا کوئی گبن یہ نہ لکھ سکے کہ پندرھویں صدی ہجری میں سائنس داں تو موجود تھے، لیکن ایسے سوداگروں اور ایسے شاہزادوں کا فقدان تھا جو اپنی فیاضانہ سرپرستی سے وہ سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں جن کی سائنس دانوں کو اپنی تحقیق کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَة
إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَاد

(۱) ضمیمہ جدول

ٹرسٹ کے نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز پر آنے والے سائنس دانوں کی تعداد

ممبر ریاست	آنے والوں کی تعداد ۱۹۷۰ تا ۱۹۸۲ء	وفاقی عہدنامے	کل قومی آمدنی امریکی بلین ڈالر
۱	۲	۳	۴
گروپ اول			
بحرین	۲		۲۰۱
عراق	۸۱	۱	۳۰۰
کویت	۴۶	۲	۲۲۰۰
عمان			۲۰۶
قطر	۶	۱	۳۰۸
سعودی عرب	۴۴		۶۲۰۶
متحدہ عرب امارات	۱		۱۵۰۰
یمن (عرب جمہوریہ)	۲۳	۱	۲۴
یمن۔ (عوامی جمہوریہ)	۱	۱	۰۰۹

۱	۲	۳	۴
گروپ دوم			
اردن	۶۲	۲	۳۰۰
لبنان	۷۹	۲	نامعلوم
شام	۳۸	۳	۸۰۹
فلسطین (مغربی ساحل)	۵	۱	نامعلوم
گروپ سوم			۲۰۶
افغانستان	۱۰	—	۲۰۶
ایران	۹۹	۳	نامعلوم
مالدیپ	—	—	۰۰۳
پاکستان	۲۹۳	۲	۵۸۰۹
ترکی	۲۳۸	۷	۵۸۰۸
گروپ چہارم			
بنگلادیش	۱۳۴	۱	۸۰۳
انڈونیشیا	۸۲		۵۲۰۲
ملیشیا	۵۸		۱۴۰۹
گروپ پنجم			
الجیریا	۶۹	۱	۲۸۰۹
جبوتی			۰۱۴
مصر	۳۶۱	۱۱	۱۸۰۶
لیبیا	۴۳		۲۳۰۳
مراکش	۳۳	۱	۱۴۰۴
سوڈان	۸۳	۲	۶۰۶
گروپ ششم			
وسطی افریقہ	۲		۰٫۵

۱	۲	۳	۴
کامرون	۲۰		۴٫۶
چاڈ			۰٫۵
کورس			۰٫۱
ایتھوپیا	۵		۷٫۹
گابون	۴		۲٫۱
گیمبا			۰٫۱۵
گنی بساؤ			٫۲
گھانا	۴		۱٫۵
آئیوری کوسٹ	۷		۱٫۵
مالی	۲۴		٫۹
موری تانیا	۳	۱	۱٫۶
نائیجر	۷		۱٫۴
نائیجیریا	۱۵۷	۴	۵۵٫۳
سنی گال	۳۳		۲٫۴
سرالیون	۳۴		٫۸
سومالیہ	۴		برائے نام
ٹوگو	۱۶		٫۸
اپر وولٹا	۱۸		٫۱
	۲۳۶۴		

جدول دوم

ملک کا نام	سال	آبادی کروڑوں میں	تحقیق اور ترقی کے سائنسدان اور انجینیروں کی تعداد
الجیریا	۱۹۷۲ء	۱۶۶۸	۲۴۲
بحرین	۱۹۶۷ء	۰٫۳	
بنگلادیش	۱۹۷۳ء	۷٫۹	
کیمرون	۱۹۷۶ء	۷٫۵	
چاڈ	۱۹۷۱ء	۴٫۰	۸۵

۱	۲	۳	۴
روس			
[illegible]	۱۹۷۳ء	۰٫۱	
ن	۱۹۷۰ء	۰٫۰۵	۸
	۱۹۷۳	۵٫	
بساؤ			
شیا	۱۹۷۶ء	۱۴۰٫۰	۷۶۴۵
ک	۱۹۷۴ء	۱۴۰۰	۴۸۹۶
[illegible]	۱۹۷۲ء	۱۱٫۱	۱۴۸۶
ن	۱۹۷۷	۲٫۷	۴۵۲
ت	۱۹۷۵ء	۱٫۰	۶۰۶
[illegible]	۱۹۷۲ء	۲٫۵	۱۸۰
[illegible]	۱۹۸۰ء	۲٫۴	۵۰

۱	۲	۳	۴
ملیشیا	۱۹۷۰ء	۱۱٫۹	
جزائر مالدیپ			
موری تانیا			
مراکش			
نائیجیریا	۱۹۷۰	۶۵٫۰۷	۲۲۰۰
نائیجر	۱۹۷۶	۴٫۶	۹۳
عمان			
پاکستان	۱۹۷۹ء	۷۰٫۲	۵۱۴۴
قطر	۱۹۷۴	۰٫۲	
سعودی عرب	۱۹۷۴ء	۷٫۲	
سینےگال	۱۹۷۲ء	۴٫۵	۵۲۲
سومالیا	۱۹۷۵ء	۲٫۰	
سیرالیون۔			

"عالم انسانی کی رھبری کے لیے قرآن بہترین
رھنما ھے۔ اِس کے اندر تہذیب و سلیقہ
تمدن و معاشرت اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم ھے
اگر دُنیا میں محض یہ کتاب ھی ہوتی اور اس کے
علاوہ کوئی رھنما نہ آتا تو بھی یہ کتاب عالمی
ھدایت کے لیے کافی ہوتی"
(ٹالسٹائی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۹ ستمبر

تکوینی انجینرنگ

ایک جدید ترین حیاتیاتی سائنس

یوسف سعید

کائنات اور زندگی یہ دونوں قدرت کے ایسے بنیادی مظاہر ہیں کہ انسان جو علم حاصل کرتا ہے اور تحقیقات کرتا ہے انہی مظاہر کی حقیقت، مقصد اور وہ فطری توانین جن کی رو سے یہ دونوں اپنی اپنی گردش میں رواں دواں ہیں، جاننے کے لیے کرتا ہے اور اسی علم کو اس نے سائنس کا نام دیا۔ پھر انسان بنیادی سائنس کے ان ہی اصولوں کی مدد سے قدرت میں پائے جانے والی اشیاء کو کام میں لاتے ہوئے اپنی زندگی کو مزید آرام دہ اور سہل بنانے کے لیے جدید ترین طریقے اور آلات بناتا ہے جس کو وہ با مقصد سائنس یا ٹکنالوجی کہتا ہے۔

زندگی اور نظام زندگی کے طرز عمل اور اس کی نشو ونما کے مطالعے کو علم حیاتیات کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرے علوم کی طرح حیاتیات میں بھی کئی جز ہوتے ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے سے وابستہ ہیں۔ مثلاً حیوانوں اور پیڑ پودوں کے اجسام میں مختلف اعضاء کے عمل اور طریقوں کے مطالعے کو فعلیات یا PHYSIOLOGY کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی ایک خاص جگہ کے جاندار اور ان کے ارد گرد پائے جانے والے ماحول کے بیچ باہمی تعلق کے مطالعے کو ماحولیات یا Ecology کہتے ہیں۔

زندگی کے جس پہلو کا ذکر آج ہم کرنے جا رہے ہیں وہ ہے تکوینیات یا Genetics یہ یونانی زبان کے ایک لفظ Genesis سے بنا ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کی تخلیق تکوین ہونا اور اسی لحاظ سے تکوینیات وہ علم ہے جس میں جانداروں کی نسل در نسل چلنے والی موروثی خصوصیات کے طریقۂ کار کا مطالعہ کیا جائے یعنی یہ کہ تمام حیوانات اور نباتات کی مسلسل افزائش و پیدائش کے دوران ایک نسل کی خصوصیات اور وصف ہو بہو کس طرح دوسری نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانوں اور تمام جانداروں کا پورا جسم مختلف اعضاء پر مبنی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے الگ مخصوص کام ہوتے ہیں۔ ایک عضو مختلف قسم کے نسیجوں یا Tissues پر مشتمل ہوتا ہے اور نسیج بے شمار خورد بینی ذرات پر مبنی ہے جنھیں خلیات یا Cells کہتے ہیں۔ یہ جسم کا سب سے چھوٹا ذرہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایک خلیہ جسمانی اکائی مانا جاتا ہے۔

ایک خلیے کو اگر بے حد طاقتور خوردبین کی مدد سے دیکھا جائے تو اس کے بھی اندر اور کئی اشکال نظر آتے ہیں۔ عموماً ایک خلیے کی بناوٹ شکل گول یا انڈے کی طرح کی ہوتی ہے جس کے چاروں طرف ایک خلیائی دیوار ہوتی ہے۔ اندر ایک خول ہے جس کے بیچوں بیچ ایک مرکزہ یا Nucleus ہوتا ہے۔ اس خول میں اور بھی کئی طرح کے ذرات ہوتے ہیں جن کے مختلف افعال ہوتے ہیں لیکن مرکزہ ان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اندر دھاگے نما لونیے یا Chromosomes ہوتے ہیں جو مزید چھوٹے ذرات ارثیے یا Genes پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جس مخلوق کا وہ خلیہ ہے اس کے جسم کی تمام تر خصوصیات کی معلومات اسی لونیے میں محفوظ ہوتی ہے اور ہر ایک خصوصیت کی نمائندگی کے لیے ایک الگ جین یا ارثیہ اس میں موجود ہوتا ہے اور یہی کروموزوم کسی جاندار کی تمام جسمانی خصوصیات کو ایک نسل سے دوسری نسل میں لے جانے کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

اب اس قدرتی نظام کو بھی سمجھنا ضروری ہے جس کے ذریعے جاندار

ہونری یا افزائش و پیدائش ہوتی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کرۂ
طرح طرح کے جاندار ملتے ہیں جن میں ننھے سے ننھے یک خلیاتی جاندار جیسے
، وائرس اور پیرو ٹوزوا سے لے کر عظیم سے عظیم یعنی ہاتھی اور وہیل
غیرہ سب شامل ہیں۔ ان کے سائز اور دوسری تمام خصوصیات کی
سے ان سب کو الگ الگ زمروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اسی
سے ان سب کی افزائش و پیدائش کا طریقۂ عمل بھی مختلف ہوتا ہے
ور پر تمام جانداروں میں پیداوار کے تین طریقے پائے جاتے ہیں۔

۱۔ جنسیاتی۔
۲۔ غیر جنسیاتی۔
۳۔ نباتاتی۔

جنسیاتی افزائش سب سے زیادہ عام ہے اور عموماً کثیر خلیاتی
روں میں پایا جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ان جانداروں میں دو جنسیات
ور مادہ ہوتی ہیں جن کے جسم میں الگ الگ مادۂ تولید کا ارتقا ہوتا
یہ تولیدی خلیے آپس میں مل جاتے ہیں اور ان کی زرخیزیت کے نتیجے
ایک نیا منفرد جاندار وجود میں آتا ہے۔

غیر جنسیاتی افزائش کا طریقہ اکثر یک خلیاتی اور خوردبینی جاندار
ملتا ہے۔ ان میں بڑے جانداروں کی طرح دو جنسیات نہیں ہوتیں۔
ایک ایک خلیاتی جاندار کا پورا خلیہ ایک مرحلے پر آ کر دو یا دو سے
دہ حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور خلیے کے اندر کا مادہ بھی برابر
نوں میں بٹ جاتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر حصہ ایک نیا خلیاتی جاندار
جاتا ہے۔ اسی طرح نباتاتی طریقۂ افزائش میں بھی جنسیات نہیں ہوتیں
یہ ہوتا ہے کہ جاندار کے جسم کے کسی حصے سے کونپل کی طرح ایک نیا حصہ
ہونے لگتا ہے۔ کچھ بڑا ہونے پر وہ اس جسم سے الگ ہو جاتا ہے اور خود
الگ جاندار بن جاتا ہے۔

چوں کہ انسان اور دوسرے بڑے مخصوص جانوروں میں جنسیاتی
یقۂ افزائش ہی ہوتا ہے اس لیے ہم اسی کو تفصیل سے دیکھیں گے۔ اب تک ہم
ان کثیر خلیاتی جانداروں میں مجموعی پیداوار کا طریقہ دیکھا تھا اب ہم یہ
یکھیں گے کہ کس طرح علیحدہ علیحدہ ہر ایک جاندار کی جسمانی نشو و نما ہوتی ہے
جانداروں کا ہر ایک خلیہ مسلسل دو برابر حصوں میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔

اور ہر حصہ ایک نیا خلیہ یا سیل بن جاتا ہے یعنی اس طرح ایک جاندار
کی جسمانی نشو و نما اور افزائش و پیدائش جاری رہتی ہے۔

جب ایک خلیہ دو حصوں میں بنٹتا ہے تو جسمانی خصوصیات کی نمائندگی
کرنے والے ذرات لونئے یا کروموزوم بھی برابر برابر تقسیم ہو جاتے ہیں
یعنی تمام خصوصیات دونوں میں برابر پہنچ جاتی ہیں اور اس طرح ایک
نسل میں پائے جانے والے وصف دوسری نسل کے افراد میں ہو بہو منتقل ہو جاتے
ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جب تک ایک سیل دو حصوں میں تقسیم
نہیں ہوا ہوتا ہے، اس میں ہر خصوصیت کے لیے دو جین (ارثیے) کا ایک
جوڑا ہوتا ہے۔ ایسے سیل کو Diploid کہتے ہیں۔ پھر جب تقسیم ہو کر
ہر حصے میں ہر وصف کا ایک ایک جین چلا جاتا ہے تب اس سیل کو
Haploid کہتے ہیں۔

یوں تو تکوینیات میں بے شمار سائنس داں اپنے اپنے جوہر دکھا چکے
ہیں مگر اس کے بانی آسٹریا کے ایک پادری گریگر مینڈل سمجھے جاتے ہیں۔
انہوں نے مختلف خصوصیات رکھنے والے کئی مٹر کے پودوں کا بغور مشاہدہ
کیا اور خاص طور پر یہ دیکھا کہ کس طرح ایک نسل کے پودوں کی خصوصیات
دوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں، کون کون سی خصوصیات زیادہ نمایاں اور عام ہیں۔ اگر
ایک نسل کا کوئی وصف دوسری نسل میں نہیں آیا تو ایسا کیوں کر ہوا وغیرہ۔ پھر انہوں نے ان تمام
مشاہدات کے اعداد و شمار کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد جانداروں کی نسل
در نسل چلنے والی موروثی خصوصیات کے بارے میں چند قوانین پیش کیے
جو آج بھی تکوینیات کی بنیاد مانے جاتے ہیں اور حیوانوں اور نباتات
پر یکساں لاگو ہوتے ہیں۔

تو اس طرح ہم یہ جان گئے کہ ایک خلیے کی اندرونی تشکیل کیسی ہوتی
ہے اور یہ کہ اس کے مرکز میں موجود کروموزم اور جین ہی تمام موروثی خصوصیات
کو نسل در نسل منتقل کرتے ہیں۔ اب ہم اس ارثیے (جین) کی مزید گہرائی
میں پہنچ کر اس بات کو واضح کریں گے کہ آخر موروثی خصوصیات کی معلومات
کس طرح جین میں محفوظ رہتی ہیں اور وہ کیسے منتقل ہوتی ہیں۔

اس کے لیے پہلے ہمیں علم کیمیا کی چند بنیادی باتیں جان لینا ضروری
ہیں اور وہ یہ ہیں کہ دنیا اور کائنات کی ہر مادی شے جوہر یا ایٹم
سے مل کر بنی ہے یعنی ہر مادی شے کی اکائی ایٹم ہوتا ہے۔ یہ سیکڑوں قسم

کے ہوتے ہیں اور مختلف ایٹم مل کر ایک سالمہ یا Molecule بناتے
ہیں۔ اسی طرح سالمے بھی ہزاروں قسم کے ہوسکتے ہیں۔ جیسے پانی بھی ایک سالمہ
ہے جو دو مختلف ایٹموں یعنی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔
اسی طرح D.N.A نام کے کچھ مخصوص سالمے ہوتے ہیں جن سے مل کر ایک
جین بنتا ہے۔ کئی DNA سالموں کی ایک لڑی سی بنی ہوتی ہے اور ان
کی بالکل ایک جیسی دو لڑیوں سے مل کر ایک کروموزوم (لونیہ)
بنتا ہے۔

انسانی خلیے میں کروموزوم کے ۲۳ جوڑے ہوتے ہیں جن میں کل
ملاکر جینس کی تعداد پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک ہوسکتی ہے۔
اور ہم یہ جانتے ہی ہیں کہ ان میں ہر ایک جین ایک جسمانی خصوصیت کی
نمائندگی کرتا ہے۔ جب خلیے تقسیم ہوتے ہیں تو D.N.A کی دونوں
لڑیاں الگ ہوکر دو حصّوں میں بٹ جاتی ہیں اور نئے سیل میں پھر
سے دوگنی ہو جاتی ہیں اور ہر صفت کے جین دونوں میں برابر بٹ جاتے
ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ایک با مقصد سائنس کا تصور
دیا تھا کہ اگر انسان قدرت کے بنیادی اصولوں اور رازوں کو
دریافت کرلے تو ان کی مدد سے وہ فطرت میں پائے جانے والی
اشیاء کو استعمال کرکے اپنی بہت سی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔
اور اپنی زندگی کو آرام دہ بنا سکتا ہے۔ چوں کہ یہ بات سائنس کے
تقریباً ہر شعبے پر لاگو ہوتی ہے۔ اسی طرح تکوینیات پر بھی۔ تو اب ہمیں دیکھنا
یہ ہے کہ تکوینیات کو انسانی زندگی کی بھلائی کے لیے کس طرح بامقصد بنایا
جاسکتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ آج انسان زندگی کے راز اور حقیقت سے واقف
ہے۔ وہ یہ جان گیا ہے کہ کرۂ ارض پر پائی جانے والی زندگی کی بے شمار
شکلیں کس طرح مختلف مرکبات اور عناصر کی پیچیدہ ترتیب و اتصال
سے وجود میں آئی ہیں۔ آج اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس طرح ایک
جاندار کی جسمانی خصوصیات اس کی اگلی نسل میں پہنچتی ہیں تو آج انسان
کے لیے یہ بات مشکل سہی مگر ناممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی اور ضرورت
کے مطابق جانداروں کی بنیادی اور کیمیاوی اشکال میں مصنوعی طریقے
سے تبدیلی کرکے ایک نئی اور بہتر شکل کی تخلیق کرسکے۔

اور یقیناً ایسا ممکن ہے وہ اس طرح کہ اگر انسان یا کسی
کے تولیدی خلیے سے کسی مخصوص موروثی صفت کا جین ہٹا کر اس
دوسرا نیا جین ضرورت کے مطابق نصب کردیا جائے اور پھر
تولیدی خلیے کی زرخیزی Fertilization کی جائے تو اس
پیدا ہونے والی نسل میں وہ صفت نہیں ہوگی جس کا جین نکال دیا
ہے بلکہ نئے نصب کیے ہوئے جین کی صفت ہوگی۔ مثلاً اگر کسی شخص
کو کوئی موروثی بیماری ہے جس کا کوئی باہری علاج ممکن نہیں ہے تو اس
کے خلیے سے اگر وہ جین نکال لیا جائے جو اس مخصوص بیماری کی نما
کرتا ہے تو وہ بیماری ختم ہوسکتی ہے۔ جانداروں کے جسم میں اس طرح
بنیادی ردّ و بدل کا نام ہی تکوینی انجینئرنگ Genetic Engineering
ہے۔

تکوینی انجینئرنگ ایک جدید ترین حیاتیاتی سائنس
جس کی مدد سے انسانیت کی بھلائی کے لیے بے شمار کام لیے جاسکتے
مگر ابھی یہ سائنس اپنے عروج پر نہیں پہنچ پائی ہے۔ کیوں کہ اس کے
سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مصنوعی جین تیار
جائیں، پرانے جین کو پہلے سے بہتر بنایا جائے یا ایک جاندار
جین کو دوسرے جاندار میں منتقل کیا جائے۔ تو اب وجہ یہ ہے کہ آ
بیسویں صدی کی اس ساتویں دہائی تک کوئی ایسا طریقۂ عمل یا کوئی
مخصوص آلہ دریافت نہیں ہوپایا ہے جس کے ذریعے یہ کام با آسا
کیا جاسکے۔ اسی لیے تکوینی انجینئرنگ کا کوئی ٹھوس تجربہ ابھی تک نہ
ہوپایا ہے۔

ویسے اس زمرے میں امریکہ میں مقیم ایک ہندوستانی
سائنس داں جناب ہرگوبند کھورانہ قابلِ ذکر ہیں جو اپنی تحقیقا
کے نتیجے میں ایک مصنوعی جین مرتب کرنے میں کامیاب ہوگئے اد
ان کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی سائنسدا
اسی وقت تکوینیات کی تحقیق میں لگے ہیں اور ان کو یہ امیدیں ہیں
مستقبل میں یقیناً ایسے آلات ایجاد ہوجائیں گے جن کی مدد سے تکوینی
انجینئرنگ با آسانی ممکن ہوگی۔ اور تب اس سے کیا کیا کام لیے جاسکیں

اس کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے جو یقیناً آپ کو خواب و خیال محسوس ہوگا مگر وہ حقیقت بن سکتا ہے:

۱- انسان کو ہونے والی تمام خطرناک اور مہلک بیماریوں کا خاتمہ ہو سکے گا۔ افراد میں موروثی خامیوں جیسے اعضاء کی خرابی وغیرہ کو اگلی نسل میں ختم کیا جا سکے گا۔ اور اس کے علاوہ اپنی مرضی کے مطابق جسم میں کوئی نئی خصوصیت پیدا کی جا سکے گی۔ مثلاً ذہانت یا خوبصورتی کو بڑھایا جا سکے گا وغیرہ۔

۲- کھیتی باڑی میں: ایسی فصلیں اگائی جا سکیں گی جن میں کوئی جراثیم یا بیماری نہ لگ سکے اور جو کسی بھی قسم کے خراب موسم، سوکھے یا سیلاب وغیرہ کے باوجود بھی پھل پھول سکیں۔ مزید لذت، غذائیت اور توانائی سے بھرپور اناج، پھل اور سبزیاں، بہتر رنگ اور خوشبو والے پھول پیدا کیے جا سکیں گے۔

۳- پالتو جانوروں کی ایسی نسلیں تیار کی جا سکیں گی جو انسان کے لیے زیادہ کارآمد ہوں۔ مثلاً ایسے جانور جو زیادہ مقدار میں اور اچھی قسم کا دودھ، گوشت اور انڈے وغیرہ فراہم کر سکیں یا اپنی مرضی کے مطابق بالکل نئے قسم کے جانور یا پیڑ پودے مرتب کیے جا سکیں گے وغیرہ

اور اسی طرح تکوینی انجینرنگ کو انسانی بھلائی کے اور بھی بے شمار کاموں میں استعمال کیا جا سکے گا مگر ان تمام فوائد کے ساتھ ساتھ اس کی کچھ خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً اگر کبھی کسی جاندار کا تکوینی علاج کرتے وقت کوئی غلط جین اس میں شامل ہو جائے تو یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذریعے ایک ایسا خطرناک اور مہلک وائرس (ایک نہایت چھوٹا اور خطرناک جراثیم) بھی بنایا جا سکتا ہے جو ماحول میں پھیل کر ہر جاندار شے پر اثر انداز ہو جائے اور ان میں کوئی مہلک بیماری پھیلا کر سب کو ہلاک کر دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر کسی دوا کا اثر نہ ہو۔ اسی طرح اس سے کوئی بے حد خونخوار جانور پیدا کیا جا سکتا ہے جو دہشت پھیلا دے۔

غرض یہ کہ جس طرح تکوینی انجینرنگ سے بے شمار فوائد ہیں ویسے ہی خطرناک نقصانات بھی ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ ابھی سائنس کا یہ شعبہ صرف نظریاتی ہے اور ابھی اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا ہے اس لیے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ مستقبل میں اگر تکوینی انجینرنگ ممکن ہو سکی تو اس کو صرف انسانیت کی بھلائی اور امن کے کاموں کے لیے ہی استعمال میں لایا جائے گا۔

"اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے"
(سورۂ مائدہ آیت نمبر۸)

نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کی اہمیت

[یہ مضمون این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی قیادت میں منعقدہ ورکشاپ فار ٹیچرس اِن مائنورٹی انسٹی ٹیوشنس میں، اردو کے استادوں کے سامنے ۱۸ رجون ۱۹۸۷ء کو علی گڑھ میں پیش کیا گیا۔]

غلام حیدر

مجھ سے جب بھی اردو شناس حضرات کے سامنے بچوں کے ادب پر کچھ کہنے کی فرمائش کی جاتی ہے تو میں اس واقعے یا لطیفے سے بات شروع کرتا ہوں، جسے خواجہ غلام السیدین مرحوم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے کسی سفر کے دوران ایک نوجوان طالب علم سے گفتگو کرتے ہوئے اقبالؔ کا کوئی شعر پڑھا اور پوچھا "میاں سمجھے؟" نوجوان نے جواب دیا۔ "جی نہیں ۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں۔" سنا ہے اس پر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر یہی صورت ہے تو عمرانیات (آرٹس) کا طالب علم شاید یہ بھی نہ جانتا ہو کہ سانس لینے میں آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے یا کاربن ڈائی آکسائڈ کی۔

تعلیم، اس کے مقاصد، اس کے اصول و فروع اور اس کی تفصیلات، اسے بچوں تک بہتر سے بہتر طور پر پہنچانے کے طریقے، یہ تو آپ حضرات کے مخصوص میدان ہیں اور آپ انہیں مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ لیکن اتنی بات تو ہر ذی ہوش جانتا ہوگا کہ تعلیم حاصل کرنے یا کسی حرفے (کرافٹ) یا صنعت سیکھنے میں کچھ بنیادی فرق ہوتا ہے، یا ہونا چاہیے۔ کسی حرفے یا صنعت کے سیکھنے سے جسم اور ذہن کی ایک مخصوص تکنیکی انداز کی تربیت ہوتی ہے۔ دوسری طرف تعلیم جسم، ذہن، روح اور پوری زندگی کو ایک سمہ رُخ اور مکمل تربیت فراہم کرتی ہے۔ تعلیم انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارنے، ذہن میں وسعت پیدا کرنے اور اس کائنات کو زیادہ سے زیادہ جان لینے کا شوق، پیاس اور اس تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے اور یہی دنیا کی ترقی کی بنیاد ہے۔

اگر ان باتوں کو فلسفیانہ موشگافیاں، یا محض اصول طرازیاں، کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے ان سے قطع نظر کرکے، تعلیم کو صرف حصولِ معاش کا ایک وسیلہ ہی مان لیا جائے، تب بھی آج کے دور میں جسے Knowledge of Explosion کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت زیادہ طول طویل بیانات کی ضرورت نہیں ہے کہ بچوں کو ایک چوکنّا اور فعال (ACTIVE) ذہن دینے کے لیے کورس میں پڑھائے جانے والے چند اسباق سے آگے بھی کچھ اور معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جسے بچوں کا غیر درسی یا غیر نصابی (Non-Text Book) ادب ہی فراہم کرسکتا ہے۔ وضاحت کے طور پر اتنا اور عرض کردینا ضروری ہے کہ اس ادب میں وہ تمام قدیم و جدید وسیلے ۔ لوریاں، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، لوک کہانیاں، معلوماتی مضامین، کتابیں، ڈرامہ، نظمیں، فلم، ریڈیو پروگرام، ٹیلی ویژن پروگرام، ویڈیو کیسٹ وغیرہ وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔ جن کی تخلیق کا مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت، اُن کی دلچسپی اور ان میں چھپی ہوئی مختلف صلاحیتوں کو اُبھارنا ہو، ان تخلیقات کے ذریعے تخلیق کار کی آخری منزل نام و نمود یا محض پیسہ کمانا نہ ہو۔ لیکن میں اپنے اس مختصر سے مضمون میں اپنی توجہ بنیادی طور پر کتابی یا مطبوعہ ادب پر ہی

مرکوز رکھوں گا۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد میں بچوں کے ادب کی ضرورت اور اہمیت پر صرف اشارۃً چند نکتے آپ کے سامنے پیش کروں گا اور پھر بچوں کے ادب کی موجودہ صورتِ حال پر کچھ کہنا چاہوں گا۔

دنیا کی مادی ترقی میں، جس کا انفرادی پہلو حصول معاش ہے، اور اس سے وابستہ وہ تمام فرائض کیے جاسکتے ہیں جو ہم اپنی اور اپنے خاندان کے افراد کی پرورش کے لیے انجام دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہماری ہر نسل کا ایک اہم ترین فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس تہذیبی ورثے کو جو اسے پچھلی نسلوں نے سونپا ہے، اپنے دور کے اضافے کے ساتھ، اگلی نسل کو سونپ جائے۔ یہی دنیا کی ترقی کا سلسلہ ہے جس میں ہر نسل ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اہم ترین فرض کو 'پنچ تنتر' کی کہانیاں لکھنے والے بھی جانتے تھے اور کلیلہ و دمنہ کے روپ میں ان کا ترجمہ کرنے والے بھی، جانوروں کی کہانیاں تیار کرنے والا حبشی غلام ایسوپ بھی سمجھتا تھا اور وہ داستان گو اور داستان ساز بھی جنھوں نے دنیا کے ہر ملک میں انتہائی دلچسپ اور دلنشیں ایسی لوک کہانیاں اور پریوں کی کہانیاں لکھ دیں جن سے بنیادی انسانی قدروں کو نہ صرف ایک سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا کام آسان ہوگیا، بلکہ ان قدروں کو ہمیشگی اور دوام بھی مل گیا۔ اسی بات کو شیخ سعدی نے گلستاں کے دیباچے میں کچھ ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ 'میں نے سوچا کہ جو علم اور تجربہ میں نے پوری زندگی میں حاصل کیا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسے دلنشیں پیرائے میں کچھ لکھ دوں کہ جو دلچسپ بھی ہو اور سبق آموز بھی اور علم و فہم کا خزانہ بھی۔ یہی احساس وشعور تھا جس نے امیر خسرو جیسے صوفی شاعر سے ان گنت پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں لکھوائیں۔ اور اسی شدید ضرورت کا خیال تھا کہ جس نے شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے فلسفی شاعر سے 'اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا'، یا 'کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے'، لکھنے پر اکسایا اور اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی اور کتنے ہی ذی ہوش لوگوں کو اپنی پوری زندگی بچوں کے ادب کے لیے وقف کرنے پر مجبور کیا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں، دنیا کا ادب ایسے بے مثال شہپاروں سے مالا مال ہے میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بچوں کا ادب وہ پہلی، اہم اور مضبوط کڑی ہے، جس کے ذریعے ہم اپنی تہذیب، ثقافت یعنی کلچر، زبان، اچھی بری قدروں کا احساس وشعور اور وہ ساری پونجی اگلی نسل کو دیتے ہیں جس پر ہمیں اور ہماری پچھلی نسلوں کو ناز ہوتا ہے۔ کیا کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ سارا کام ان چند نصابی سبقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے جو آج کے نظام تعلیم کی تمام تر پابندیوں، مجبوریوں وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر تیار کیے جاتے ہیں، تیس پینتیس منٹ کے پیریڈ میں پڑھائے جاتے ہیں اور سال کے آخر میں موجودہ طریقۂ امتحان کی تمام تر کمزوریوں اور آلودگیوں کے ساتھ ان میں سے امتحان لیا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے ــ نہیں ــ! اور آج کا عام بچہ اس کا کافی ثبوت فراہم کرسکتا ہے۔ کلاس میں پڑھائے جانے والے سبق کے محدود احاطے میں وہ تمام باتیں نہیں سموئی جاسکتیں یا اس موضوع کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی جن میں ایک مخصوص کلاس اور علمی استعداد کے بچے کے دماغ میں دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے یا وہ دلچسپی اور تجسس ابھارا جاسکتا ہے اور ابھارا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر میرے پاس پبلک اسکول کا ایک بچہ آیا اور کہنے لگا۔ "انکل مجھے ایک مضمون 'ایک سکے کی کہانی' لکھنا ہے۔ آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ میں کیا لکھوں؟" اس بچے کی والدہ نے اسے میرے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اس موضوع پر میری ایک کتاب بہت پہلے پڑھ چکی تھیں۔

میں چوں کہ پیشے کے اعتبار سے سرکاری دفتر کی مشین کا گھسا ہوا ایک پرزہ ہوں، استاد نہیں ہوں۔ اس لیے میں اسے براہ راست یہ نہ بتا سکا کہ اسے کیا لکھنا چاہیے۔ صرف یہ سمجھنے کے لیے کہ اسے کس رخ سے بتایا جائے، میں نے پوچھا کہ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے؟ معاشی پہلو، یعنی آج کے لین دین میں پیسے کا کردار (Medium of Exchange) کی حیثیت سے، اس کا تاریخی پہلو ــ یعنی بارٹر دور سے پیسے کے دور تک کا ارتقاء، شاہی دور میں سکوں کی تاریخ، دھات کے سکوں کے علاوہ دوسرے میڈیم ــ کوڑی، ہاتھی دانت، کاغذی نوٹ، چیک وغیرہ یا آج کے کسی سکے کی سماجی کہانی کہ وہ کن کن ہاتھوں سے گزرتا ہے، کس کس کے کام آتا ہے۔ بچوں، فقیروں، غریبوں، عام آدمیوں، امیر اور اسمگلروں کے پاس کس کس طرح پہنچتا ہے یا پھر غیر ملکی زرمبادلہ

یعنی (Foreign Exchange) کی باتیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے کتنے ہی رُخ ہو سکتے ہیں جن میں بچہ دلچسپی لے سکتا ہے اور اس کی عام معلومات میں اضافہ اور مکمل ذہنی نشوونما کے لیے ان چیزوں کو عمر کے مختلف درجوں پر مناسب مقدار میں اس تک پہنچانا ہماری تعلیم اور استاد کا فرض ہے۔ خواہ وہ استاد جماعت ہو، بچے کا سرپرست، بزرگ، کچھ بھی ہو۔ بہرطور میں نے سکے کے ان مختلف پہلوؤں پر دلچسپ انداز میں جب اسے کچھ بتایا اور اس کے چہرے پر اکتاہٹ کے اثرات بھی نہ نظر آئے تو مجھے لگا کہ اس موضوع پر اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا: انکل آپ کی کتاب تو اردو میں ہے۔ آپ کوئی اور کتاب مجھے نہیں بتا سکتے شکر ہے کہ میرے پاس لیڈی برڈ سیریز (Lady Bird Series) کی ایک بہت اچھی بالتصویر کتاب اس موضوع پر موجود تھی۔ یہ کتاب وہ بچہ مجھ سے لے ہی نہیں گیا بلکہ کچھ دن بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ واپس کرنے بھی آیا اور کچھ اور دلچسپ کتابیں بھی مجھ سے لے گیا۔

ہم جانتے ہیں کہ جلدی ہی ہماری عام تعلیم مختلف شاخوں میں بٹتی چلی جاتی ہے۔ سائنس، آرٹس، کامرس، پھر انجینئرنگ گروپ، میڈیکل اور پھر اور زیادہ تخصیص (Specialization) لیکن عملی زندگی میں اس تخصیص کے ساتھ ساتھ وسیع معلومات اور مختلف موضوعات کی الگ الگ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ ایک سیلزمین کو ممکن ہے کچھ دن دواؤں کی بزنس کے بعد موٹر کے پرزوں یا رنگوں کی سیلزمین شپ اختیار کرنی پڑے۔ ایک انجینئر کو بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لینا پڑے۔ ڈاکٹر کو ضابطۂ فوجداری پر مہارت حاصل کرنی ہو، اب اگر ہم بچے کے ذہن کو شروع سے ہی اس ہمہ رُخ انداز پر تیار نہیں کریں گے تو تعلیم کے فلسفیانہ یا عمرانی پہلو سے قطع نظر صرف اور صرف مادّی اور معاشی پہلو سے بھی ہم اسے دنیا میں کامیابی کے راستے پر نہیں لگا سکیں گے اور بچے کے ذہن کی اس ہمہ رُخ اور مکمل نشوونما کے لیے اچھے ادب کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ شاید مثالی صورت تو یہ ہوگی کہ طالب علم اگر نیوکلیر فزکس یا الیکٹرانکس کا جدید ترین علم حاصل کر کے یونیورسٹی سے باہر آئے تو اس کے دماغ میں اپنے ملک اور دنیا کی مختلف تہذیبوں کے نقوش بھی موجود ہوں وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بکھری ہوئی ان گنت خوبصورتیوں کا تصور بھی ذہن میں رکھتا ہو اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی اس کے دل میں پیدا ہو چکی ہو۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو کہ دنیا میں کس کس طرز کی حکومتیں موجود ہیں اور اپنی سوسائٹی کے لیے کون سا نظام اس کے عوام کی بہتری کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہو سکتا ہے اور وہ اچھے شعر یا اچھے ادب سے بھی بے بہرہ نہ ہو۔ یہ کام اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب نصابی تعلیم کے ساتھ اسے عمر کے ہر حصے میں مفید، معلوماتی، دلچسپ اور مختلف موضوعات پر ادب ملتا رہا ہو۔

شکر ہے کہ اب اس ضرورت کو محسوس کیا جا چکا ہے۔ آج اچھے تعلیمی اداروں میں ان چیزوں پر پوری توجہ دی جا رہی ہے۔ میں نے بچے کی ہمہ رُخ اور مکمل ذہنی نشوونما کی جن ضرورتوں کی طرف اوپر اشارے کیے ان کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے بچوں کا اچھا ادب آج کی زندگی میں صرف ضروری ہی نہیں لازمی ہو جاتا ہے۔ آج بچے کے پاس تفریح طبع کے جو ذرائع ہیں ان میں بصری (Visuals) کے ذرائع بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ فلم، ٹیلی ویژن اور اس کے مختلف روپ شہری، قصباتی اور آہستہ آہستہ دیہی بچے کے ذہن پر بھی مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ان ذرائع کے مثبت پہلوؤں سے انکار نہیں کرتا، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے منفی پہلو ہماری آج کی سماجی کیفیات میں شاید ان سے بہت زیادہ ہیں۔ مگر اس بحث سے قطع نظر میں ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان بصری ذرائع کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ یہ بچے کے لیے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کے مواقع ہی نہیں چھوڑتے۔ پڑھنے میں رفتہ رفتہ جو لطف پیدا ہوتا ہے، رُک رُک کر سوچنے، کچھ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے جو تجسس ابھرتا ہے، حل مل جانے کے بعد اس کی مسرت یا افسردگی اور اچھے شہپاروں کو پڑھنے کے بعد جو عجیب سا روحانی کیف (Pathos) پیدا ہوتا ہے، بصری ذرائع میں اس کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ یہ ساری کیفیت بیس پچیس منٹ میں ہی برقی رفتار کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور اثرات ذہن کی اوپری سطح سے نیچے نہیں اتر پاتے۔ اس کے مقابلے میں اچھی کتاب، زبانی سنائی جانے والی اچھی کہانی، نظم، بعض موقعوں

پر ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے جو کبھی کبھی زندگی کے پورے دھارے
پر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ ٹی۔وی اور ان بصری ذرائع کے متعلق ڈاکٹر ملی
کا صرف یہی قول نہیں ہے کہ اگلی دو تین نسلوں بعد بچوں کی بینائی خراب ہو جائے
گی۔ ماہرین نفسیات کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کے اثر سے ہمارا بچہ سوچنے
غور کرنے، کسی مسئلے پر دلیلیں تلاش کرنے یعنی Reasoning کرنے
کی صلاحیتوں سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔ یہ شاید اہم ترین ضرورت ہے
بچوں کو اچھی، خوب صورت، دلچسپ، من پسند کتابیں دینے کی اتنی اچھی
کتابیں، اتنی دیدہ زیب، اتنی رنگین، اتنی مختلف موضوعات کی کتابیں
دینے کی جو ٹی۔وی اور فلم کا مقابلہ کرسکیں، بچے کو اپنی طرف کھینچ سکیں
اور اس کے تصور Imagination کو ابھارنے کا کام انجام دے
ظاہر ہے کہ یہ کام صرف نصابی کتابیں پورا نہیں کرسکتیں۔ غیر نصابی،
معاون نصابی، سپلیمنٹری، ریپڈ ریڈنگ یا پاپولر بکس، انجام دے
سکتی ہیں۔

اور بس ایک اشارہ اور۔ اب تک میں ذکر کر رہا تھا اُن
خوش نصیب بچوں کا جو اپنی پوری تعلیم اسکولوں میں حاضر رہ کر مکمل کرتے
ہیں لیکن ان کے علاوہ ہمارے ملک میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے
کم نصیب بچوں کی بھی ہے جو ابتدائی چند جماعتیں پڑھ کر اسکول کی
روایتی (Formal) تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ان کی
غیر روایتی (Informal) تعلیم کے لیے خصوصًا ایسے ادب کی
ضرورت ہے جسے یہ استاد کی بہت زیادہ مدد کے بغیر بھی پڑھ سکیں اور
چاہے انہیں کسی درجے کے پاس کرنے کا سرٹیفکیٹ نہ بھی ملے۔ ان کی
عام استعداد اور معلومات ان کو پڑھا لکھا بنا دے۔ یہ ضرورت بچوں کے
اچھے ادب کو ہماری سوسائٹی کے لیے ضروری نہیں لازمی بنا دیتی ہے۔

ایسی اچھی اور دیدہ زیب، دلچسپ اور مفید کتابوں کی
مثالیں کچھ دوسرے ملک کی کتابوں میں شاید آپ نے دیکھی بھی ہوں
برطانیہ، روس، امریکہ، جرمنی، جاپان اور کچھ دوسرے ممالک کی
کتابیں دیکھنے میں بھی اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ کتاب کا پہلا ورق کھولنے
پر ایک چھوٹا سا اسٹیج بن جاتی ہیں، جس کی مختلف تہوں میں پوری پوری
کہانیاں کاٹ کاٹ کر سجائی ہوئی ہوتی ہیں۔ بچہ انہیں دیکھ کر ہی ان کا
دیوانہ ہوجاتا ہے۔

اور پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ خواب ابھی صرف دوسرے ملکوں
میں ہی شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔ ہندوستان میں بنگالی، مراٹھی، ملیالم، ہندی
اور لگ بھگ تمام زبانوں میں بچوں کے لیے اچھے غیر نصابی ادب کی تیاری
کا کام شروع ہو چکا ہے اور بعض زبانوں پر بڑی خوبصورت،
دلچسپ اور کارآمد کتابیں ملنے بھی لگی ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا
ہے کہ صرف ہمارا اردو پڑھنے والا بچہ پچھلی دو تین دہائیوں میں ان
سے محروم ہوگیا ہے۔ اب آج کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی اسکول یا
ایک ہی علاقے میں پڑھنے والے وہ بچے تو بہت اچھی کتابیں حاصل کرسکتے
ہیں جو اپنی علاقائی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، لیکن اردو پڑھنے
والا بچہ اس علمی نعمت سے محروم ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح
ہم اردو پڑھا کر اس غریب کی مستقبل کی ان محرومیوں اور پریشانیوں میں
کچھ اور اضافہ کررہے ہیں جن سے وہ آئندہ زندگی میں دوچار ہوگا۔

میں چوں کہ بچوں کے اردو ادب پر پچھلے بیس پچیس سال سے
کام کر رہا ہوں اور مجھے کچھ دوسری زبانوں کا ادب اور اس کی ترقی کو
پڑھنے اور دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے، اس لیے میں بڑے افسوس
کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اردو میں بچوں کے اچھے ادب کی تخلیق، تیاری،
طباعت، اشاعت، تقسیم اور اس کے فروغ کو اردو والوں نے اپنے
ذہن میں منسوخ کردیا ہے۔ تیاری ختم، لکھنے والے بھول گئے کتابیں کس
عمر کے بچوں کے لیے کیا اور کیسے لکھنا ہے۔ چھاپنے والے یہ کہہ کر سبکدوش
کہ خریدنے والے نہیں رہے۔ خریدنے والوں کو آمدنی کی کمی کی شکایت
اور پڑھنے والوں کو یا اُن کے والدین کو اچھا ادب نہ ملنے کی شکایت
لیکن تمام شکووں اور شکایتوں کا آخری اور بدترین اثر اس طالب علم
پر جسے ہم نے اپنی تہذیب، زبان، کلچر وغیرہ وغیرہ کی محبت میں اردو
پڑھنے پر تو مجبور کردیا مگر اس سے اس کی ذہنی نشوونما کا سب سے
بااثر ذریعہ یعنی اچھا ادب چھین لیا۔

دہلی میں منعقدہ ایک تازہ ترین سیمینار میں صرف ۸۶-۱۹۸۵ء
میں اردو میں مطبوعہ بچوں کی کتابوں کے ایک مختصر سے جائزے میں میرے
ایک دوست نے جب یہ بتایا کہ اس دوران سال سائنس اور دوسری

معلومات پر کوئی کتاب نہیں چھپی، جو کہانیاں چھپیں وہ تمام غیر فطری اور بعید از قیاس پرانی داستانیں تھیں جنھیں آج کا بچہ تھوڑا سا پڑھ کر ہی رد کر دیتا ہے۔ یا ان کتابوں کی زبان عام طور پر دقیانوسی اور مشکل تھی وغیرہ وغیرہ تو میں بچوں پر گزرنے والے اس وقت کو سوچنے لگا جس سے وہ اب سے دس بارہ سال بعد دوچار ہوگا۔ آج کوئی الکٹرانکس، کمپیوٹر سائنس، خلائی سائنس وغیرہ نہ معلوم کہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ رہی سرکاری اداروں کی بات، تو یقین کیجیے ان سے دوسری زبانیں بھی بہت کم امید رکھتی ہیں اور اردو کا حال یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے ایک اہم ترین ادارے نے اپنی لگ بھگ ۲۵ برس کی زندگی میں کل ۸۲ کتابیں بچوں کے ادب پر چھاپی ہیں جن میں آدھی سے زیادہ یعنی ۴۷ کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ یا ماخوذ ہیں۔ صرف ۳۵ کتابوں کو اس لیے اوریجنل اردو کی کتابیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے لکھنے والوں نے انہیں اردو میں تصنیف کیا تھا۔ ورنہ ان میں بھی ۹ کتابیں مختلف افراد کی سوانح تھیں، ۵ پرانی لوک کہانیاں تھیں اور ان پچیس برس میں صرف ۴ کتابیں سائنس پر تھیں۔ ۷ کتابیں سماجیات اور کھیل کود پر، ۲ نظموں کے مجموعے اور صرف ۶ کتابیں نثری عام ادب پر تھیں۔ یہ اس ادارے کے صرف ظاہری اعداد و شمار ہیں (ان میں ان کے متن کی موزونیت اور معیار وغیرہ کا ذکر نہیں ہے) جس کا مقصد اردو کی مجموعی ترقی ہے۔ ایک اور قومی ادارہ جو ملک کی تمام زبانوں کی ترقی اور نشو و نما کے لیے کوشاں ہے، اس نے ۱۹۸۳ء تک کل ۷۶ کتابیں بچوں کے ادب پر اردو میں چھاپی تھیں، جن میں سے صرف دس کتابیں بنیادی طور پر اردو میں لکھی گئی تھیں۔ باقی ۶۶ کتابیں ترجمہ تھیں۔ اور ترجمہ! وہ بھی بچوں کے لیے ادبی کتابوں کا ترجمہ! اس کی خرابیوں کا اندازہ شاید آپ حضرات کو مجھ سے زیادہ ہوگا کیوں کہ آپ کچھ ترجمہ شدہ کتابوں کو پڑھاتے بھی ہیں۔

اور آخر میں چند جملے بچوں کے ادب کی تیاری کے سلسلے میں ضرور کہنا چاہوں گا جو میں نے پچھلے دو تین برسوں میں اس سلسلے میں کچھ تجربہ حاصل کیا ہے۔ ایک رضاکار ادارہ — بچوں کا ادبی ٹرسٹ جو ۱۹۸۴ء میں بنیادی طور پر بچوں کے ادب کی ترقی اور نشو و نما کے مقصد سے قائم کیا گیا ہے، اس کی طرف سے کیے گئے دو انعامی مقابلوں میں شامل تخلیقات کو پڑھ کر، اس کے ججوں سے گفتگو کر کے (جن میں سے ہر ایک میں ایک ایک نوخیز ادیب بھی جج مقرر کیا گیا تھا) اندازہ یہ ہوا کہ ہم بچوں کے لیے لکھنے والے عام طور پر ایک عمر کو خیالی طور پر سامنے رکھ کر صرف الفاظ، یا اگر ممکن ہو سکا تو کچھ پلاٹ آسان کر کے ہر چیز لکھ دینے کو بچوں کے لیے مناسب تحریر مان لیتے ہیں ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تمام مسئلوں کا کوئی مافوق الفطرت حل دے دیجیے، بچہ اسے خوشی سے قبول کر لے گا اور مطمئن ہو جائے گا۔ نہ ہم اس کی عمر کے مختلف دوروں کا خیال رکھتے ہیں نہ ان تقاضوں اور مانگوں کا جو ہر دور میں پورے کیے جانے چاہئیں بچوں کے لیے ہمارے ادبی شہپارے کو پند و نصیحت اور سبق کا ایک انمول خزانہ بھی ہونا ضروری ہے خواہ وہ اتنا غیر دلچسپ ہو جائے کہ بچہ چند لائنیں پڑھ کر ہی اسے چھوڑ دے۔ اسی شہپارے میں ہم لغت اور صرف و نحو وغیرہ کی تمام تعلیم مکمل کرنا بھی اپنا فرض تصور کرتے ہیں اور ایک ہی تحریر کو پانچ سال کے بچے کو سنائی جانے والی کہانی سے لے کر پندرہ سولہ سال کی الجھی ہوئی عمر کے مسائل کا تریاق مان لیتے ہیں۔

میری عرض ہے کہ اگر اس مسئلے کو اہم سمجھا جائے تو اس طرف پوری سنجیدگی اور صدق دلی سے توجہ دی جائے۔ ہمارے بچوں کو اچھی کتابوں کی ضرورت ہے اور ان کا فراہم کرنا ہم والدین کا، استادوں کا، ہمارے اسکول کا، ہمارے ملک اور ہماری حکومت کا فرض ہے۔ یہ فرض ہم میں سے ہر ماں اور ہر باپ کا ہے کہ ہم اپنی اسی آمدنی میں سے جس میں شادی بیاہ کی تقریبات پر، کبھی کبھی فلم دیکھنے یا کسی دوسری تفریحات پر، دوستوں کی دعوتوں پر اور ایسی ہی بہت سی مدوں پر خرچ کرتے ہیں کہ ان میں سے پیسے بچائیں اور اپنے بچوں کو اچھی کتابیں ضرور فراہم کریں۔ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بجٹ میں بچوں کے لیے لائبریریاں قائم کرنے اور ان میں کتابیں پڑھاتے رہنے کی مد رکھیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ بچوں تک پہنچانے کا انتظام کریں اور اگر بچوں کے پڑھنے سے وہ آہستہ آہستہ ضایع ہو رہی ہوں تو اسے خوشی سے برداشت کریں۔ یہ فرض استادوں کا ہے کہ وہ بچوں میں نصاب سے باہر کی چیزیں پڑھنے کا شوق پیدا کریں، اپنے سبقوں کے دوران ایسے حوالے دیں جہاں بچوں کو اس موضوع پر دلچسپ مواد پڑھنے کو مل جائے۔

عمر خیام اور علم ریاضی

محمود احمد پٹھان — مترجمہ — زاہدہ پٹھان

ایک سائنس کے طالب علم کا شاعری سے کیا تعلق؟ اس کا تعلق الجبرا، علم ہندسہ (Geometry) اور آپٹکس (Optics) سے تو ہو سکتا ہے لیکن ان مضامین کا تعلق اگر کسی شاعر سے ہو تو؟ کیا ایسے شاعر کو سائنس داں کبھی بھول سکتے ہیں؟ شاعر بھی ایسا جو ریاضی داں ہونے کے ساتھ ماہر طبعیات، جغرافیہ و طب اور فلسفی بھی ہو۔

عمر خیام بن ابراہیم، جو ۱۰۴۸ء کے لگ بھگ خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوا، ایک ایسا ہی شاعر تھا جس کا میلان طبع صرف شعر و شاعری تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ علم ریاضیات، طبعیات، جغرافیہ، علم طب، نجوم اور فلسفہ میں بھی ماہر تھا بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ یہ فلسفی شاعر جب اِن مضامین کی تحقیق سے تھک جاتا تھا تو تفریح طبع کے لیے اشعار کا سہارا لیتا تھا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس عظیم و معروف شاعر نے سائنس اور ریاضی کو کیا دیا؟

اگرچہ چند ریاضی کی تاریخ لکھنے والوں نے سائنس کے میدان میں مسلم سائنس دانوں کے کارہائے خصوصی کا ذکر کیا ہے اور ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کے بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے خواہ وہ الخوارزمی ہو، الکارائی ہو یا عمر خیام۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے مولفین نے ان کو نظرانداز بھی کیا ہے۔ کئی کتابیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مسلم ریاضی دانوں بالخصوص عرب ریاضی دانوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر ٹرن بال (H. W. Turnball) اپنی کتاب "The Great mathematicians (1929)" میں بالترتیب ریاضی دانوں اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے لیکن اسکندریہ کے ڈائی فانٹس (Diphantus) کے بعد مسلم ریاضی دانوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے نیپیر (Napier) اور کیپلر (Kepler) پر آجاتا ہے۔ ایک اور مصنف بیل (E.T. Bell) کی کتاب "The development of mathematics (1945)" میں مسلم ریاضی دانوں کے لیے اس سفاکانہ رویہ کا اظہار اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"If the work produced (by Moslems) be compared with that of Greek or modern European Writers it is, as a whole, second rate both in quantity and quality"

لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ:

"Their (The Moslems') work was chiefly that of transmission, although they developed consider-able orignality in Algebra and showed some genius in Their work of Trigonometry."

موجودہ دور کے تاریخ نویس اس واضح حقیقت کو مانتے ہیں کہ اہل عرب نے کچھ صدیوں کے اندر یونانی سائنس کو یکجا اور اس میں اپنی اختراعات اور ایجادات شامل کر کے اہل یورپ کو منتقل کر دیا۔

جس طرح ادب کی دنیا میں عمر خیام کی رباعیات اور ان کے تراجم کی شہرت میں کمی و زیادتی ہوتی رہی ہے، اسی طرح سائنس کی دنیا میں بھی عمر خیام کے کارناموں کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت میں کبھی کمی یا اضافہ ہوتا رہا ہے مثال کے طور پر ایڈورڈ فز جیرالڈ (Edward Fitz Gerald) کے خیام کی رباعیات کے انگریزی ترجمے — Rubaiat Of Omar Khayyam کی ۲۵۰ کاپیاں ۱۸۵۹ء میں چھپی تھیں۔ جب فروخت میں دشواری پیش آئی تو ان کی قیمت کم کر دی گئی لیکن اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کی ایک ایک کاپی امریکہ میں آٹھ ہزار ڈالر اور لندن میں ۱۴۱ پونڈ میں فروخت ہوئی۔ یہی حال سائنس کے میدان میں عمر خیام کے کارناموں کا رہا۔ چنانچہ ایک مدت تک عمر خیام کے علم ریاضی اور سائنس کے کارناموں پر پردہ پڑا رہا اور تحقیق کے نظریے سے اس پر توجہ نہیں دی گئی لیکن جب پھر ایک وقت آیا ہے کہ ریاضیات اور سائنس پر اس کی تصانیف پر اہل علم نے تحقیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ چنانچہ موجودہ صدی میں عمر خیام پر بے شمار تحقیقی اور سائنسی مضامین لکھے جا رہے ہیں۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ اب تک عمر خیام کی ریاضیات اور سائنس تخلیقات پر مسلم ادیبوں نے کچھ توجہ نہیں کی اور نہ ہی اس پر کوئی اہم تصنیف وجود میں آئی بلکہ زیادہ تر غیر مسلم (بالخصوص روسی، یورپین اور امریکن) ادیبوں نے ہی عمر خیام کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تصانیف کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی غیر مسلم ادیبوں نے اپنے نظریے سے کیا ہے جیسے Howard Eves (1958), CoalidgeVal dmir (1970), Dirk Struik (1949) وغیرہ۔

البتہ اس کی کتاب الجبرا کا انگریزی ترجمہ ۱۹۳۱ء میں ایک مسلم نبی داں Daud Kasir نے ضرور کیا ہے۔

قرون وسطیٰ میں جب عرب تہذیب اپنے عروج پر تھی اور الگزنڈرین نس کا زوال ہو رہا تھا اس وقت ریاضی کے مضمون میں نئی روح پھونکنے مشہور و معروف رباعی گو شاعر کی عظمت کا اندازہ خود اس کی مندرجہ رباعی سے ہوتا ہے۔

'Ah but my computations, people say
Have squared the year to human compass? eh?
If so, by striking from the calendar
Unborn tomorrow and dead yesterday'

دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر اور توبہ و استغفار سے ہٹ کر کہی گئی یہ رباعی فلاسفی اور ریاضی میں اس کی لگن اور دقت نظر کا اظہار تو کرتی ہی ہے ساتھ ہی پوری انسانی زندگی پر پُر معنیٰ اور دلچسپ تاثر بھی چھوڑ جاتی ہے۔ دراصل یورپ کے چودھویں اور پندرھویں صدی کے ادب اور سائنس کی ترقی میں عمر خیام جیسے مسلم عالموں کے علم و فضل نے بڑی رہنمائی کی ہے۔

ریاضی کے میدان میں انسان کی اہم ترین ایجاد 'صفر' ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ 'صفر' قدیم ہندوستانیوں کی دین ہے۔ صرف یہی نہیں ایک سے نو تک کی گنتی بھی ہندوستانیوں کی ہی ایجاد ہے۔ الخوارزمی کی کچھ کتابوں میں سب ہی نمبر حرفوں میں لکھے گئے تھے کیوں کہ اس وقت تک ہندوستانی نمبر سسٹم عرب تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ جس وقت الخوارزمی نے حساب (Arithmatic) پر کتاب لکھی تب پہلی بار ہندسی عربی نمبر اس میں دیے گئے جس سے مساوات (Equation) کے حل کرنے میں بہت مدد ملی اور Linear and Quadratic equations حل کیے گئے۔ حساب اور الجبرا میں ایک بیش قیمت تعلق قائم ہوا۔ اسی موضوع کو عمر خیام نے اور وسیع کیا اور الجبرا کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس نے LINEAR اور QUADRATIC مساوات کے بعد ایک مشکل مساوات یعنی مکعبی مساوات (Cubic Equation) کو بھی حل کیا۔ اس کے لیے اس نے الجبرا کی جگہ جیومیٹری کا سہارا لیا لیکن اس وقت تک جیومیٹری الجبرا کے کس سوال کو کس حد تک حل کر سکتی ہے اس کے حدود وہ بخوبی جانتا تھا۔ اسی وجہ سے جب اس طرح کے مساوات کا حل وہ الجبرا کے ذریعے نہیں دے سکا تو اس نے لکھا ہے کہ

"نہ تو میں نہ اور کوئی شخص جس کا کہ الجبرا سے تعلق ہے،
اس مساوات کو حل کر سکا ہے۔ شاید آنے والی نسل
اس کا حل ڈھونڈ سکے"

بعد میں اس مساوات کا الجبرا کے ذریعے حل تو نکلا لیکن چار سو ستر سال کے

رجب کہ اٹلی کے ایک ریاضی داں کارڈانو (Cardano - 1501—76)
پہلی بار اس کا حل شائع کیا۔ اس طرح کے مساوات کے حل کی جستجو اکثر
یاضی داں خیام کے زمانے تک کرتے رہے تھے۔ اس طرح کے مساوات
استعمال طبعیات (Physics) کے ایک موضوع آپٹکس (Optics)
ں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ Conic Section کا بھی خیام نے
ستعمال کیا۔ ساتھ ہی مکعب Cubic اور کسی زاویہ (Angle)
تین برابر کے حصوں میں تقسیم کرنے کے بارے میں نتائج دینا، عمر خیام کی
صوصیت تھی۔

آج خیام کی وفات کے نوسو سال بعد بھی خیام کے مخالف مصنفین بھی
س کی علم و فضیلت کے قائل ہیں۔ اسی لیے اس کے کارنامے موجودہ دور میں
بھی اپنی وقعت اور اہمیت نہ کھو سکے بلکہ ایک بار پھر موجودہ صدی میں
ب الجبرا کا جیومٹری سے تعلق قایم ہوا تو خیام کی اہمیت میں اور اضافہ ہوا

عمر خیام نے اپنے دو ساتھی حسن بن علی اور ابن صباح کے ساتھ اس
قت کے مشہور عالم نیشاپور کے امام موفق کے پاس تعلیم حاصل کی تھی۔
بعد میں حسن بن علی (جو نظام الملک بانی نظامیہ بغداد کے نام سے مشہور ہے)
سلطان الپ ارسلان (Alp Arsalan) کے وزیر بنے۔ عمر خیام
وزیر سے جب اصفہان میں ملے تو کسی اعلیٰ مرتبہ کی خواہش نہ کرتے ہوئے
دب اور سائنس کی ترقی کے لیے اپنی زندگی گزارنے کی تمنا ظاہر کی۔ چنانچہ
ن کو نیشاپور کی ۱۲۰۰ سونے کے مثقال سالانہ کی جاگیر عطا کی گئی۔

46 B.C. میں روم کے بادشاہ جولیس سیزر (Julius Ceaser)
نے جولین کلینڈر (Julian Calendar) قایم کیا جس میں پہلی بار ہر چار سال
کے بعد لیپ ایر (Leap year) کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے
ایک دن جوڑنے کے رواج کو کیلنڈر میں جگہ دی گئی۔ اس ترمیم شدہ صورت
میں نئے کیلنڈر میں ہر چار سال کے بعد ایک زائد دن کو شامل کر لیا گیا۔
پوپ گریگری (Pop Gregory) نے پہلی بار یہ جانتے ہوئے کہ شمسی
کیلنڈر (Solar Calendar) اور جولین کیلنڈر - Julian
(Calendar) میں ہر چار سو سال کے بعد پھر تین دن کا فرق ہوگا،
ایک بار پھر تبدیلی کی۔ اس طرح ۱۵۸۲ء میں گریگرین کیلنڈر - Grego
rian Calendar کی شروعات ہوئی۔ اکبر بادشاہ نے اپنے زمانے
میں حکم دیا تھا کہ اب سارے کام شمسی کیلنڈر Solar Calendar
کے مطابق ہوں گے۔ اس طرح جلالی دور کی ابتدا ہوئی۔

عمر خیام کے عہد کے سلطان ملک شاہ نے بھی اپنے زمانے میں ایک
رصدگاہ (Observatory) کی تعمیر اور کیلنڈر کی ترمیم کے لیے
آٹھ مشہور و معروف عالم اور منجم مقرر کیے۔ ان میں سے ایک اہم شخصیت
عمر خیام کی تھی۔ ان عالموں میں صرف خیام ہی منجم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک
ماہر ریاضی داں بھی تھا۔ اس نے کچھ (Astronomical Tables)
'زیج ملک شاہی' کے نام سے تیار کی تھیں۔ اس لیے کیلنڈر کی تکمیل میں اس کا
حصہ یقیناً سب سے زیادہ تھا۔ ان عالموں نے جو کیلنڈر تیار کیا وہ گبن
(Gibbon) کے مطابق عملی طور پر جولین (Julian) سے زیادہ
اچھا اور صحت و درستی کے اعتبار سے گریگرین (Gregorian)
کے برابر تھا۔ جلالی دور کی شروعات اسی کیلنڈر کی بنیاد بنا کر کی گئی تھی۔

شبلی نعمانی نے اپنی کتاب شعر العجم میں لکھا ہے:

"نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے لیکن یونانی حکماء عموماً اس کے
قایل تھے وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے خیام
اس فن میں کمال رکھتا تھا اور اس لیے منجم کہلاتا تھا۔"

کچھ فلسفیانہ خیالات اور کچھ نجوم جیسے زمین و آسمان کے تمام اجزاء
قطبین اور موسموں کے بارے میں پیشین گوئی کی وجہ سے مذہبی علما خیام کے مخالف
تھے چونکہ مذہبی گروہ کے رہنما اس وقت امام غزالی تھے۔ اس لیے خیام
سے ان کا ان موضوعات پر اختلاف رہتا تھا اور اکثر ان موضوعات پر بحث
ہوا کرتی تھی۔ عمر خیام چوں کہ ریاضیات، طبیعات، جغرافیہ اور علم نجوم جیسے
موضوعات میں ماہر تھا اس لیے اس کا اپنا الگ ہی نظریہ تھا جو اس نے
تفصیل سے اپنی کتاب "عرائس النفائس" میں پیش کیا تھا۔

الخوارزمی کو الجبرا کا موجد کہا جاتا ہے (الجبرا لاطینی زبان کا لفظ ہے)
یہ عربی کے لفظ الجبر اجو کہ الخوارزمی کی ۸۰۰ء کے قریب لکھی ہوئی کتاب
'الجبر والمقابلہ' کے پہلے لفظ سے لیا گیا ہے۔

الخوارزمی کے بعد ایک اور مسلمان کارائی (Ka-ra-yee) نے
ریاضی داں کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس کا میدان الجبرا کے علاوہ حساب
(Arithmatic) جیومٹری (Geomatry) اور استفادی علم

سٹہ معاصر تسا کی یہ داستان قطعی جعلی ہے۔ ملاحظہ ہو "خیام" از سلیمان ندوی - (ادارہ)

(Applied Science) بھی تھا۔ کاراکی ایک فارسی اسکالر تھا جس کا زیادہ تر کام دسویں صدی کے آخر اور گیارہویں صدی کے آغاز میں وجود میں آیا۔ اس ریاضی داں کو کئی ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جیسے Al Karkhi اور Karaji' Al Karaji جب کہ اس کا پورا نام محمد ابن الحسن الحسیب الکاراجی تھا۔ وہ بغداد کے قریب کے ایک شہر کاراکی میں پیدا ہوا تھا (جب کہ الخوارزمی کی ولادت خوارزم میں ہوئی تھی جو آج کل جدید شہر خیوہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ روس میں Aral Sea کے جنوب میں واقع ہے) کاراکی کا اہم کارنامہ الجبرا کے سوالوں اور کلیوں (Theorems) کو جیومیٹری کی مدد سے حل کرنا تھا۔ عمر خیام نے بھی اسی سلسلہ میں نہ صرف مشہور مکعب مساوات (Cubic Equations) بلکہ اور بھی کئی سوالوں کے حل جیومیٹری کے ذریعے دیے ہیں۔ آج کے دور میں بھی ہم مساوات کی تقسیم (Classification of Equations) اس کی ڈگری (Degree) دیکھ کر کرتے ہیں۔ کاراکی کے زمانے تک اس طرح کی تقسیم ہم کو کہیں نہیں ملتی۔ عمر خیام نے ہی پہلی بار اس طرح کی تقسیم کو اپنی کتاب الجبرا میں جگہ دی جو آج بھی قابل عمل ہے۔ اس میں دیے گئے سوالوں اور کلیوں (Theorems) کے حلوں پر کئی مانے ہوئے ریاضی دانوں کے تحقیقی مضامین اور شرحیں مسلسل شایع ہو رہی ہیں۔ اس وقت منفی اعداد (Negative Numbers) وجود میں نہیں آئے تھے اور ریاضی داں منفی اعداد کو (Negative Numbers) کو نقلی اعداد (False Numbers) کہہ کر رد کر دیا کرتے تھے۔ خیام نے بھی یہی کیا تھا۔ لیکن منفی اعداد (Negative Numbers) کی مدد کے بغیر مکعب مساوات (Cubic Equation) کو Hyperbola اور Inter Section کے تقاطع (Intersection) شکل میں پیش کرنا خیام کی قابلیت کا ثبوت ہے۔ الجبرا کے اور کئی سوال، کلیے (Theorems) اور تعریفیں (Definations) جو داؤد کبیر (Daud K...) نے اپنی کتاب "The Algebra of Omar Khayyam" میں دی ہیں، ان کے مطالعے سے عمر خیام کی ذہانت اور فلسفہ و سائنس سے دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مشہور ریاضی داں Pascal کی ایک کتاب "Traite du triangle Arithmetique" (Treatise on the Arithmetical Triangle) جو اس کے مرنے کے بعد ۱۶۶۵ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے حسابی تکون (Arithmetical Triangle) کا استعمال کیا جو آج اسی کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن یہ علم عرب کے ریاضی دانوں کو گیارہویں صدی میں ہی معلوم تھا وہیں سے یہ علم چین تک پہنچا۔ اس تکون (Triangle) کی کہانی ابھی تک زیر بحث ہے۔ ڈیوڈ ہوگبن (David Hogben 1942) نے اپنی کتاب (Mathematics For The Millions 1951) میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ حسابی تکون (Arithmetical Triangle) سب سے پہلے عمر خیام نے Pascal سے چھ صدی قبل معلوم کر لیا تھا۔ ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ چینی ریاضی داں Chu-Shekei نے اس کا ذکر اپنی کتاب (The Precious Mirror of Four Elements) میں کیا تھا لیکن Pascal نے اس کا استعمال کئی مختلف تکون (Triangles) کی خصوصیات میں کیا اور اس کی مدد سے Probability کے بھی کئی سوالات حل کیے۔ اسی لیے یہ اب Pascal Triangle کے نام سے ہی مشہور ہے۔ صرف Hogben کے مطابق ہی نہیں بلکہ حقایق کے مطابق بھی اس کا نام Khayyam Triangle ہونا چاہیے۔

ریاضی میں بائی نومیل کلیہ (Binomial Theorem) ایک اہم اور کامیاب کلیہ (Theorem) ہے۔ اس کی مختصر شکل Euclid (300 B.C) کے زمانے میں بھی رائج تھی۔ اس کے مفید استعمال کی وجہ سے اس کو ترقی یافتہ شکل میں لانے کی کوششیں لگاتار ہو رہی تھیں۔ عمر خیام نے پہلی بار اس کو اپنی کتاب الجبرا میں ارتقائی شکل میں پیش کیا۔ اس کے حل کرنے کے باوجود اس کے کوئی خاص اصول مقرر نہیں کیے تھے حالاں کہ اس نے یہ پر زور دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس کی زیادہ ارتقائی شکل سے واقف ہے اور ان کو حل کرنا بھی جانتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اصول و قوانین وہ اپنی دوسری کتاب میں دے رہا ہے لیکن اس کتاب کی کوئی کاپی ہم کو نہیں ملتی جس سے کہ اس کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

درس نظامیہ کی اصلاح و ترمیم اور اہل مدارس

عبدالحق خان

ہندوستان میں عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح اور عصری علوم (سائنس و ریاضی) کی ترویج کے لیے ماضی میں اہل مدارس نے کئی بار اقدامات کیے مگر کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں خاص طور سے دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ کی "تعلیمی و ملی کانفرنس" منعقدہ ۶ ر تا ۸ ر اپریل ۱۹۸۴ء قابل ذکر ہے۔ حالانکہ ابھی حال ہی میں "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے نام سے منعقد ہونے والی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کانفرنس اپنی جگہ آپ ہے مگر موخر الذکر کی تجاویز کے مقدمے کے طور پر میں دہلی والی تعلیمی و ملی کانفرنس کو پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لگ بھگ تمام مسائل پر غور کیا گیا تھا۔ مثلاً تعلیم (دینی و دنیاوی) روزگار، پرسنل لا، اوقاف، مذہبی آزادی، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ۔ مگر میرا موضوع ان میں سے صرف تعلیمی مسائل اور ان کی تفصیلات ہیں۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے ایک موقف کی وضاحت کرتا چلوں کہ دونوں کانفرنسوں سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ عصری علوم (سائنس، ریاضی، انگریزی وغیرہ) اب مسلمانوں اور عربی مدارس کی ناگزیر ضرورت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان مضامین کا نفاذ و تعلیم کیوں کر ہو؟ آیئے اس سوال کا جواب "تعلیمی و ملی کانفرنس" کی قرار دادوں میں تلاش کریں۔ کیوں کہ اس کانفرنس کے روح رواں ہندوستان کے معروف اور بڑے دینی مدارس (دیوبند، سہارن پور، ندوہ اور مرکزی دارالعلوم بنارس وغیرہ) تھے۔ ظاہر ہے ان مدارس کے علاوہ ان کے مسائل کو کون بہتر سمجھ سکے گا؟

چنانچہ مذکورہ کانفرنس کی تعلیمی امور کی قرار دادوں کی تجویز [۱۳] نے یہ طے کیا کہ ملک کے تمام عربی مدارس کے لیے ایک جامع اور جدید نصاب تعلیم مرتب کیا جائے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کمیٹی کے مندرجہ ذیل مدارس ممبر تھے۔

۱۔ دارالعلوم دیوبند۔
۲۔ مظاہر علوم سہارن پور۔
۳۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔
۴۔ مرکزی دارالعلوم بنارس۔

اس کمیٹی کے کنوینر جناب مولانا ارشد مدنی صاحب تھے۔ کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ جدید نصاب کے بارے میں تمام بڑے مدارس سے مشورہ طلب کرے اور تین ماہر تعلیم کی مدد سے نیا نصاب مرتب کرکے (جو کم از کم چار مرحلوں ابتدائی، ثانوی، عالیہ، تکمیل پر مشتمل ہو) مع اپنی رپورٹ وفاق المدارس [۱۴] (بورڈ آف عربی مدارس مجوزہ) کو پیش کر دے جس کے قیام کی سفارش تعلیمی امور کی تجویز [۱۲] میں کی گئی تھی۔ مجوزہ وفاق المدارس کی تنظیم اور قیام کی ذمہ داری حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی پر تھی۔

ارکان کمیٹی برائے تنظیم وفاق

۱۔ جناب مولانا مرغوب الرحمان صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲ جناب مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب
مظاہر علوم سہارن پور۔
۳ جناب مولانا رشید الدین صاحب۔ جامعہ قاسمیہ۔ مرادآباد
۴۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۵۔ جناب مولانا عبدالجلیل رحمانی صاحب گونڈہ
۶ جناب مولانا قمرالدین محمود صاحب گجرات
۷ جناب مولانا شاہ عون احمد قادری صاحب
۸ جناب مولانا سید اسعد مدنی صاحب دہلی۔

اس کمیٹی کو وفاق المدارس کا دستور مرتب کرنا تھا، نیز اس کے اجزائے ترکیبی پر اپنی رپورٹ ۲ ماہ میں دینی تھی۔ کانفرنس دہلی کی مقرر کردہ نصابی کمیٹی نے تجویز ۲ کے مطابق مدارس عربیہ کا سروے کیا اور ان سے ایک سوالنامے کے ذریعے مشورہ طلب کیا۔ سوال نامے میں کم سے کم نو سوال لکھے گئے تھے۔ اس کے جواب میں جون پور (یو۔ پی) کے ایک معروف و ترقی پذیر ادارے مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گورینی چوکیہ گھیتا سرائے جون پور کے ارباب درس نے جو کچھ کہا ہے اس کی تلخیص اختصار کے ساتھ نقل کرتا ہوں۔

س ۱۔ آپ موجودہ نصاب تعلیم سے پورے طور پر مطمئن ہیں یا نہیں؟ اگر مطمئن نہیں ہیں تو آپ کے نزدیک اس کے کیا اسباب ہیں؟

ج ۱ مروجہ نصاب سے ہم پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔

(الف) " مروجہ نصاب تقریباً وہی ہے جو سو برس پہلے مرتب ہوا تھا۔ مگر اب اس سے حکیم الامت، شیخ الہند، مفتی اعظم اور متکلم اسلام نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس طرح یہ نصاب بانجھ ہو گیا ہے۔"

(ب) " پہلے جب پڑھے لکھے لوگ کم تھے تو یہی علمائے مدارس ہی وکیل و مختار، منصف اور جج بن جاتے تھے لیکن آج ملک کا علمی معیار بلند ہو گیا ہے۔ عربی، فارسی کی جگہ ہندی اور انگریزی چھا گئی ہے اور ہمارے نصاب کا غیر دینی حصہ اب بھی وہی ہے۔ اس لیے ہم موجودہ ماحول پر قابو نہیں پاتے۔"

(ج) " ہمارا نصاب تعلیم ہمیں فرق باطلہ کی تردید کے لیے تیار نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنے عقاید کی تشریح سے ناواقف ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں صرف ہزار برس پہلے والے ان فرق باطلہ سے واقف کرا دیا جاتا ہے جن کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم دور حاضر میں اسلام پر ہونے والے حملوں کا جواب نہیں دے پاتے۔"

س ۲۔ کیا آپ نصاب میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

ج ۲ " جی ہاں! ہمارا زوردار تقاضہ ہے کہ اس میں ضرور ترمیم کی جائے۔"

س ۳ " یہ ترمیم آپ کے نزدیک کس حد تک ہونی چاہیے؟

ج ۳ الف " بعض مضامین کی کتابیں کم یا نامناسب ہیں اور بعض کی ضرورت سے زیادہ ہیں جیسے منطق۔"

(ب) " بعض مضامین کے لیے جن کتب کا انتخاب ہوا تھا وہ فنی تعلیم کے لیے ناقص ثابت ہوئی ہیں۔ اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔"

(ج) " شرح در شرح کے بجائے معتبر متون کا پڑھایا جانا ضروری ہے۔"

(د) " ہمارے نصاب کا موضوع متعین نمایاں اور موثر ہونا چاہیے۔"

س ۴ " کیا عصری علوم میں سے بعض علوم کو اپنے نصاب میں شامل کرنا مناسب ہوگا۔

ج ۴ " جی ہاں! دنیاوی مضامین میں تاریخ، جغرافیہ، حساب، سائنس، ہندی اور انگریزی جیسے مضامین کا شامل کرنا ضروری ہے۔ اس لیے پرائمری سے لے کر عربی ششم (بارہ یا تیرہ سال) تک تمام دنیاوی فنون کے مبادی سے واقف کرانا چاہیے۔"

س ۵ کیا موجودہ نصاب کو بدستور باقی رکھتے ہوئے نظام تعلیم میں تبدیلی مناسب نہیں ہوگی؟

ج " جی نہیں البتہ طریقہ کار کے طور پر سب سے پہلے نظام تعلیم کو مرحلہ وار تقسیم کرنا چاہیے۔ نیز چوں کہ عصری تقاضوں کی ہمارے نصاب میں کوئی رعایت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے جب تک دنیاوی مضامین کو نصاب میں شامل نہ کیا جائے، نظام تعلیم کی تبدیلی سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔"

(نوٹ) اس کے بعد چھٹے، ساتویں اور آٹھویں سوالات اور ان کے جوابات سے صرف نظر کرتے ہوئے آخری سوال دیکھیں۔

سؤ فلسفہ قدیم کی جگہ فلسفہ جدید رکھا جاسکتا ہے یا نہیں ؟

ج "فلسفہ قدیم بقول مولانا آزاد مرحوم وہ فلسفہ نہیں اس کی ہزار سالہ تاریخ ہے تو اس کے لیے جدید سائنس اور جدید علم فلسفہ اور جدید علم ہیئت کو داخل کرنا چاہیے۔ لیکن"

(الف) "سائنس اور ہیئت مشاہداتی فن ہیں"۔

(ب) "فلسفہ قدیم کی بنیاد یونان کے بت پرستوں نے رکھی تھی، اس لیے بت پرستی ان کے فلسفہ کا جز بن گئی تھی اور جدید فلسفہ کی بنیاد الحاد اور عقل پرستی پر ہے (میں الحاد والے نظریے کو نہیں مانتا : عبدالحق) اس لیے فلسفہ جدید کو داخلِ نصاب کرنے سے پہلے ان کے نظریات کو اسلام کی کسوٹی پر رکھ کر داخل کیا جائے۔"

ج "عقاید و کلام میں متون و شروح کی جس طرح سابق فرق باطلہ کی تردید کی گئی ہے، اسی طرح ضروری ہے کہ توحید و رسالت وغیرہ کے ہر موضوع پر آج کے فرقے جن دلایل و براہین کے ساتھ میدان میں کھڑے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے اور وہ جس عجیب وغریب اسلام کو پیش کرتے ہیں اس کی تردید کر کے اسلام کا صحیح تصور پیش کیا جائے۔" وغیرہ

مذکورہ سوال وجواب کے اقتباسات پر مجھے کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے۔ میں صرف اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ نصاب تعلیم (عربی مدارس) میں ترمیم ور اس میں عصری علوم (سائنس، ریاضی) کے رواج دینے کا خیال نیا ہیں ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ادارے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نا دعوت پر "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" نامی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے ان کی پکار بھی کچھ وہی ہے جو مرکز فروغ سائنس کی ہے۔ کیوں کہ نھوں نے اس طرف اقدامات کیے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نہج پر ۔ئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام مدارس اور مرکز فروغ سائنس ے۔ ایم۔ یو علی گڑھ مل کر ایک ایسا نصابِ تعلیم (جامع و مکمل) مرتب ریں جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور وقت اور ملت کی ضروریات بھی ۔ری کر سکے۔

آخر میں چند ضروری امور کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ مدارس کے لیے ایک جامع اور مکمل نصاب مرتب کیا جائے یعنی ابتدائی سے کر تکمیل تک کل مراحل پر حادی ہو۔ دوم یہ کہ سائنس و ریاضی اور انگریزی کم از کم ثانوی مرحلہ یعنی اول ۱۲۔ سالوں تک لازمی طور پر نافذ کیے جائیں تیسری بات یہ کہ نصاب مرتب کرتے وقت عربی زبان وادب کے لیے ہندوستان کے ماحول اور یہاں کے بچوں کے اذہان کو مدنظر رکھا جائے نہ کہ مصر کے جامعہ ازہر میں زیر تعلیم ان طلباء کو جن کی مادری زبان ہی عربی ہے۔ ہاں سائنس اور ریاضی کے لیے این سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کا ہایر سکنڈری کا نصاب ہی بہتر ہوگا۔

نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی میں بڑے دینی مدارس کے سربراہان و معلمین مثلاً دیوبند، سہارن پور، ندوہ، جامعہ سلفیہ بنارس وغیرہ کو ضرور مدعو کیا جائے اور اس کے علاوہ اترپردیش کے عربی فارسی بورڈ الہ آباد کے رجسٹرار کو بھی شامل کیا جائے۔ کیوں کہ صرف اسی بورڈ کے تحت لگ بھگ تیس سو عربی دینی مدارس چل رہے ہیں، اس لیے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چوں کہ عربی فارسی بورڈ الہ آباد کے ملحقہ مدارس میں درجہ آٹھ تک سائنس و ریاضی ہی کیا حکومت کے دیگر سیکولر اسکولوں میں نافذ تمام مضامین داخل نصاب ہیں۔ یہ شاید وہی نصاب[۵] ہے جو سابق انسپکٹر عربی مدارس الہ آباد جناب شبیر احمد خاں غوری صاحب کا مرتب نافذ کردہ تھا لیکن افسوس کہ وہ عالیہ درجات میں ایسی کوئی چیز نافذ نہ کر سکے۔ بہرحال اب یہ کارواں پھر سے اسی سمت سرگرم سفر ہے، خدا کامیاب کرے۔ آمین۔

نوٹ: اقتباسات مکمل نہیں ہیں بلکہ ان کا خلاصہ ہے۔

حوالہ جات [۱] ہفت روزہ نئی دنیا اردو جون پور ۲۴ اپریل ۹۴ء

[۲] " " " "

[۳] " " " "

[۴] الریاض سہ ماہی شمارہ ۱، اپریل، مئی، جون ۱۹۸۵ء مکتبہ ریاض العلوم گورینی چوکیہ کھیتا سرائے جون پور۔

[۵] مدارس کے نصاب میں سائنس کی اہمیت : از شبیر احمد خاں غوری تہذیب الاخلاق منقول علی گڑھ ج ۵ - ش ۵ - (مئی ۱۹۸۷ء) ص ۱۰۸ — ۱۰۹

نیوکلیائی توانائی ـــــ صنعتی ضرورت

ابراہیم خلیل جوہر

موجودہ صنعتی دور میں توانائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے توانائی ہی ہے جو فلک بوس مشینی انڈسٹری کو آگے پیچھے حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ تب کہیں جاکر روزمرہ کے بازاروں میں ضروریات کی وہ چیزیں دستیاب ہو پاتی ہیں جن کا وجود صنعتوں کا رہین منت بنا ہوا ہے۔

توانائی ایک نادیدہ قوت ہے۔ اس کی اہمیت سے لوگ زمانۂ قدیم سے آگاہ رہے ہیں۔ یہ جن ذرائع سے حاصل ہوتی ہے، ان میں اہم تر کوئلہ، تیل اور پانی ہیں۔۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ انرجی کی ضرورت باقی ہی رہ جاتی ہے اور ذرائع توانائی میں بتدریج کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔ یہ اہم مسئلہ توانائی کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور یہی مسئلہ اس مسئلے کا حل بنتا جا رہا ہے۔ یعنی جیسے جیسے ضرورتیں بڑھ رہی ہیں نئی نئی ایجادات اور دریافتوں کے پیدا ہونے کے راستے نظروں میں آ رہے ہیں۔ لہٰذا ذرائع توانائی کی جدید فہرست ترتیب دی جائے تو اُن میں شمسی توانائی، ہوا اور پانی کے بہاؤ کی تند و تیز توانائی اور زمین کے جگر سے اُٹھنے والی حرارت سے پیدا شدہ توانائی کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اس ضمن میں بائیو گیس کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو مویشیوں کے فضلات کو کارآمد بناکر حاصل کی جاتی ہے۔

ان سب کے علاوہ اور ان سب سے الگ تھلگ توانائی کا ایک اہم باب نیوکلیائی توانائی کی دریافت سے لکھا گیا ہے۔ نیوکلیر انرجی کی دریافت نے محدود وسائل توانائی سے پرے صنعتی ترقیوں کے افق پر امید کی کرن چمکا دی ہے۔ نیوکلیر انرجی کو مستقبل کے ایک ناقابل یقین و اعتماد وعدے کی حیثیت سے لیا جا سکتا ہے۔ نیوکلیائی توانائی ایک مرکب اور پیچیدہ کیمیادی عمل کے نتیجے میں وجود پذیر ہوتی ہے، جس کے مظاہرے کائنات میں صاف طور پر نظر آجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورج کو لیجیے۔

سورج بے پناہ گرمی اگلتا ہوا سب سے بڑا جسم ہے جو کائنات میں ہم سے سب سے قریب واقع ہے۔ زمین سے سورج کی یہ قربت بھی کچھ فاصلہ رکھتی ہے، یہ فاصلہ ۶ر۱۴۹ ملین کلومیٹر کا ہے۔ اتنی دوری کے باوجود بھی سورج اپنی پوری شدت سے اس غضب کی آنکھ دکھاتا ہے کہ حدت سے زمین تپنے لگتی ہے۔ دھوپ اور روشنی جس کے بغیر زندگی کا تصور تک محال ہے، اسی دور افتادہ مہربان سورج کے وجود سے قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ زمین پر زندگی کی نمود سورج کی رہین منت ہے۔

جب اتنے طویل فاصلے پر توانائی کا یہ عالم ہے تو سورج کے اندرون میں اس کی مقدار کیا ہوگی؟ اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ سورج میں یہ توانائی کیسے پیدا ہوتی ہے؟

دوسرے ستاروں کی طرح سورج بھی ہائیڈروجن سے مرکّب مادّہ ہے۔ ہائیڈروجن چوں کہ سب سے ہلکا عنصر ہے اس کے نیوکلیس آپس میں ٹکراتے ہیں، اس ٹکراؤ سے ان میں انضباط ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بے انتہا توانائی پھوٹ پڑتی ہے جس کا اثر دسیوں کروڑ میل کے دائرے تک پھیل جاتا ہے۔ سورج میں ہونے والے اس کیمیادی عمل انضباط Fusion میں، ۶۵ ملین ٹن ہائیڈروجن، ۶۵۲ ٹن ہیلیم (Helium) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ صرف ایک سکنڈ

کے وقفے میں ہو جاتا ہے۔ اس دوران ۵ ملین ٹن مادہ توانائی کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ "توانائی"، نیوکلیائی توانائی کی ایک قسم ہے۔ اس سے نیوکلیائی توانائی کے وسیع دائرۂ عمل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سائنسی ماہرین نے اس قسم کا عملی تجربہ کرنا چاہا... تو اسی اصول پر مبنی تجربے کو ہائیڈروجن بم کا نام دیا گیا جو ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ کیا گیا تھا۔ ہائیڈروجن بم کے کامیاب مظاہرے نے سائنس دانوں کو نئے امکانات فراہم کیے ہیں۔ قابو شدہ حالات میں اس قسم کے تجربات دہرائے جا سکتے ہیں۔ اب نیوکلیائی انرجی ایک مسلّمہ سائنس بن چکی ہے اور موڈرن سوسائٹی کی بہت سی ترقیاں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

نیوکلیائی انرجی کی تخلیق

نیوکلیائی توانائی دو طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۔ بھاری ایٹم کے بھاری جوہری مرکزے کا انشقاق (Nuclear Fission)

۲۔ مختلف ہلکے ایٹموں کے جوہری مرکزوں کو پگھلا کر آپس میں ملانا (Nuclear fusion)

(آئندہ مضمون میں حوالہ دینے کے لیے دونوں طریقوں کو بالترتیب جوہری انشقاق اور جوہری پگھلاؤ کا نام دیا جائے گا)

جوہری انشقاق ایسا عمل ہے جس میں ایک غیر مستحکم یا تغیّر پذیر بھاری نیوکلیئس ... ہلکے عناصر میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس تقسیم کے ساتھ بڑی زبردست توانائی وابستہ ہوتی ہے، کیوں کہ اس عمل میں حصّہ لینے والے عناصر (بھاری عنصر) کی کمیت منقسم شدہ عناصر (ہلکے عناصر) کی مجموعی کمیت سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دو عناصر میں کمیت کا جو فرق رہ جاتا ہے وہ انرجی کا روپ دھار لیتا ہے۔

جوہری انشقاق بھاری عناصر میں نیوٹران داخل کیے جانے کا نتیجہ ہے۔ جب مستحکم عناصر نیوٹران کو جذب کر کے غیر مستحکم ([illegible]) بن جاتے ہیں تو یہ تقسیم ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تقسیم کے عمل کے ساتھ ہی مزید نیوٹران وجود میں آتے ہیں جو ری ایکشن میں حصّے لے کر مزید انشقاق کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح جوہری انشقاق ایک مسلسل عمل کہلاتا ہے جس کی وجہ سے خارج ہونے والی توانائی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ تجربہ پہلی مرتبہ جرمنی میں ۱۹۳۰ء میں کیا گیا۔

نیوکلیر بموں میں جوہری مرکزوں کی تقسیم کا عمل مسلسل ہوتا رہتا ہے اس سے خارج ہونے والی توانائی بھی بے قابو ہو جاتی ہے۔ اس منہ زور طاقت کو قابو میں کر کے ہی اسے قابلِ استعمال بنایا جا سکتا ہے۔ نیوکلیر ری ایکٹرز کے ذریعے اس عمل کو کنٹرول میں لیا جا سکتا ہے اور وہ "توانائی" حاصل کی جا سکتی ہے جو وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے

یہ تو ایک طریقہ ہو گیا جو نیوکلیر انرجی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اب جوہری پگھلاؤ پر ایک نظر ڈالی جائے۔

یہ دوسرا طریقہ جس سے نیوکلیائی توانائی حاصل کی جاتی ہے، پہلے طریقے سے زیادہ طاقت کا مظہر ہے۔ جوہری پگھلاؤ کو کفایتی طریقہ قرار دیا گیا ہے کیوں کہ یہ بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ اس طریقے میں بہت کم عناصر کا حصّہ ضایع ہوتا ہے۔ جوہری انشقاق اور جوہری پگھلاؤ میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ جوہری انشقاق کے دوران جو نیوٹران وجود میں آتے ہیں وہ زیرِ عمل مستحکم نیوکلیئس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انہیں غیر مستحکم بنا دیتے ہیں۔ یہ غیر مستحکم جوہری مرکزے انشقاق پذیر ہوتے رہتے ہیں، اس طرح یہ عمل پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ مگر جوہری پگھلاؤ میں افزود نیوٹران مفقود ہیں۔ لہٰذا یہ عمل کسی طور پیچیدہ نہ ہو کر صاف ستھرا ہوتا ہے۔ جوہری انشقاق میں بے قابو عمل مسلسل۔ Chain Reaction کے سبب دھماکہ ہونے کے امکانات بہت ہوتے ہیں جب کہ جوہری پگھلاؤ میں ری ایکٹرز پھٹ پڑنے سے بچے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں نیوکلیئس غیر مستحکم ہو کر بے قابو مسلسل عمل پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ـــ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جوہری پگھلاؤ کے خام مواد کی دستیابی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ یہ اور ایسے بہت سے پہلو ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جوہری پگھلاؤ سستا اور فائدہ مند طریقہ ہے جس سے نیوکلیائی توانائی حاصل کی جا سکتی ہو۔

لیکن ایک اہم مسئلہ اس طریقے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ جوہری پگھلاؤ سے بے پناہ طاقت خارج ہوتی ہے اور یہ عمل قابو شدہ حالات کے تحت تجربہ گاہ میں کیا جانا بے انتہا مشکل ہے۔ جوہری پگھلاؤ وہ زبردست ذریعۂ توانائی ہے جس کا مظاہرہ سورج

اور ستاروں کی سطح پر ہوتا ہے، دوسرا مظاہرہ ہائیڈروجن بم ہے جس کی طاقت کے آگے ٹھہرا ہی نہیں جاسکتا۔ جس قدر شدید طاقت تخلیق پاتی ہے، اسی حد تک مشکل ہے کہ اس تجربے پر کنٹرول رکھا جائے۔

جوہری پگھلاؤ کیا ہے؟

وہ عمل جس میں توانائی خارج ہوتی ہے اور مختلف عناصر کے ہلکے نیوکلیئس ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک بھاری نیوکلیئس بناتے ہیں، اسے جوہری پگھلاؤ یا نیوکلیئر فیوجن کہا جاتا ہے۔ اس عمل کا ایک اہم خاصہ مختلف ہلکے جوہری مرکزوں کا ایک دوسرے کے نزدیک آکر آپس میں ضم ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ یہ جوہری مرکزے یکساں برقی چارج رکھنے کے باعث ایک دوسرے کو پرے ڈھکیلتے ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے خارجی قوت کا استعمال بہت ضروری ہے۔ چوں کہ ان جوہری مرکزوں کی اختلافی قوت (Force of Repulsion) انتہائی غیر معمولی ہوتی ہے اس لیے اس قوت کے دائرے کو توڑ کر ارتباط پیدا کرنے کے لیے جس خارجی قوت کی ضرورت ہے، اسے بھی یکساں حد تک غیر معمولی ہونا چاہیے۔ یہ خارجی طاقت غیر معمولی حرارت ہوسکتی ہے جو کئی ملین درجہ حرارت تک پہنچ سکتی ہے۔

اس بیان کی روشنی میں ہائیڈروجن بم کی تکنیک کو سمجھا جاسکتا ہے ہائیڈروجن بم کے میکانزم میں دو ہلکے عناصر ڈیوٹیریم (Deuterium) اور ٹرائی ٹیم (Tritium) کے ساتھ بھاری عناصر یورینیم کو شامل کیا گیا ہے۔ غیر مستحکم یورینیم ہلکے نیوکلیئس میں بٹ جاتا ہے تو وہ حرارت پیدا ہوتی ہے جو ہلکے عناصر کے مرکزوں کو پگھلا کر ایک بھاری نیوکلیئس تخلیق کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح ہائیڈروجن بم نیوکلیر انرجی پیدا کرنے کے دونوں طریقوں پر مشتمل ہے۔ یورینیم، جوہری انشقاق سے توانائی بہ شکل حرارت پیدا کرتا ہے اور یہ حرارت ڈیوٹیریم وٹرائی ٹیم کے جوہری مرکزوں کو پگھلا کر ایک بھاری نیوکلیئس تخلیق کرتی ہے۔ اس جوہری پگھلاؤ میں جو توانائی خارج ہوتی ہے وہ پہلے والے طریقے سے خارج ہونے والی توانائی سے تقریباً سوگنا زیادہ ہوتی ہے۔

یہ دو طریقے ہیں جن سے نیوکلیائی توانائی کی تخلیق اور اس کے مظاہر سمجھ میں آتے ہیں۔ تخلیقِ توانائی کے انہیں اصولوں کے پیشِ نظر کنٹرول شدہ انرجی کو بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ طریقہ نمبر ۱، یعنی جوہری انشقاق (Nuclear Fission) کے ذریعے صنعتی نقطۂ نظر سے کامیاب توانائی کا حصول ممکن ہوگیا ہے مگر جوہری پگھلاؤ (Nuclear Fusion) سے صنعتی فائدے کی توانائی کا حصول ہنوز ایک خواب ہے اور مستقبل کے تجربات اس اہم ذریعۂ توانائی سے دنیا کو روشناس کراسکتے ہیں۔ یہ نیا تجربہ صنعتی ترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ ثابت ہوگا۔

ہماری صنعتیں اور توانائی

آزادی کے چالیس سال گزرنے کے بعد ہندوستان نے انڈسٹریز کی دوڑ میں دسواں مقام حاصل کیا ہے۔ ہندوستان میں صنعتیں کافی پرانی ہیں گھریلو صنعتیں اور دست کاری یہاں کی قدیم تہذیب کا ایک حصہ ہیں، مگر ترقی یافتہ صنعتی مشینیں انگریزوں کی دین ہیں۔ ہندوستان نے غیر مانوس مشینی صنعت کے میدان میں جو ترقی انجام دی ہے وہ ایک خوش آئند بات ہے۔

ہندوستان بے شمار قدرتی وسائل رکھتا ہے۔ اس لیے انڈسٹریز کے لیے مشکلات کا امکان کم ہوگیا تھا مگر بغیر صحیح پلاننگ کے ان ذرائع کا بے دریغ استعمال ان کو ختم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ پھر جب اس قسم کے مسائل پیدا ہوئے تو پلاننگ کے اقدامات کیے جانے لگے

انڈسٹریز کی بنیادی ضرورت ایندھن یا توانائی ہے۔ توانائی کے دو اہم ذرائع تیل اور کوئلہ ہیں۔ ہندوستان تیل کی کمی کا شکار ہے مگر کوئلہ وافر موجود ہے۔ حالیہ ایام میں تیل کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ مستقبلِ قریب میں ہندوستان اس ضرورت کے لیے کسی دوسرے کا دستِ نگر نہیں رہے گا، اگرچہ کہ تحقیقات اسی دھڑلے پر جاری رہیں جیسی کہ آج کل ہو رہی ہیں۔ کوئلہ کی بات کیجیے تو کوئلہ ہماری صنعتوں کو جملہ توانائی میں دو تہائی ایندھن فراہم کرتا ہے۔ اس طرح دیگر ذرائع توانائی میں کوئلہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ہندوستانی صنعتوں کو سب سے زیادہ توانائی فراہم کرتا ہے۔

۱۹۷۳ء میں جب تیل کا بحران پیدا ہوا تو ضروری ہوگیا کہ توانائی سے متعلق پلاننگ اور مینجمنٹ کو ناگزیریت دی جائے۔ جملہ ذرائع سے حاصل ہونے والی توانائی کو استعمال کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ کم وبیش پچاس فیصدی توانائی انڈسٹریز کے کام میں لائی

جاری ہے... اس لیے توانائی کی کمی کو کافی حد تک صنعتوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت نے کئی طریقے اپنائے، الگ سے وزارتِ توانائی کا قیام عمل میں لایا گیا، ماہرینِ سائنس کی خدمات بھی حاصل کی گئیں مگر انرجی کی بجٹ کے متعینہ نشانے تک پہنچنے کی رفتار کچھوے کی رفتار کے مشابہ ہے۔

ان کشمکشی حالات میں وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جنھیں ایٹم کا نام دیا گیا ہے، انسانیت کے کام آسکتے ہیں اور نیوکلیر توانائی کو انڈسٹریز میں استعمال کر کے بے شمار مسائل سے ایک حد تک چھٹکارہ پایا جاسکتا ہے لیکن نیوکلیر توانائی جس قدر امید دلاتی ہے، اسی قدر خوف زدہ بھی کر دیتی ہے اب سائنس کو اپنی بہترین صلاحیتیں اس امر پر صرف کرنی چاہئیں کہ نیوکلیر انرجی کو انسانیت کا خادم بنایا جائے۔

نیوکلیر انرجی کا کنٹرول شدہ اخراج نیوکلیر ری ایکٹرز کے ذریعے عمل میں آتا ہے، نیوکلیئر ری ایکٹر جوہری مرکزوں کے انشقاق۔ (NUCLEAR FISSION) کے اصول پر کام کرتے ہیں۔

نیوکلیائی ری ایکٹر کی کارکردگی کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

انشقاق پذیر عناصر مثلاً یورانیم کو ایلومینیم کے ٹیوب میں لیا جاتا ہے عظیم قوت والی کائناتی شعاعیں اس میں سے گزرتی ہیں۔ تو نیوٹران یورانیم میں چھید لگاتے ہیں، یورانیم غیر مستحکم بن جاتا ہے اور عملِ انشقاق شروع ہوتا ہے پھر عملِ مسلسل شروع ہو جاتا ہے۔ اس ری ایکشن کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لیے موڈریٹر (Moderator) کا استعمال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے نیوٹران کی رفتار کو حسبِ مرضی رکھا جاسکتا ہے عام طور پر موڈریٹر، گرافائٹ (سُرمہ) کے بلاک ہوتے ہیں۔

انشقاق کے عملِ مسلسل کی وجہ سے ایک خودکار ری ایکشن شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ عنصر کا ایک ایک حصہ کام میں نہ آجائے۔ جب عنصر کی ساری کمیت انشقاق پذیر ہو جاتی ہے تو دھماکہ پیدا ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ری ایکشن کے دوران افزود نیوٹران کی پیدائش کو روکا جائے۔ اس مقصد سے کیڈمیم (Cadmium) کی راڈ ول کو ری ایکٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔ کیڈمیم نیوٹران کو جذب کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیڈمیم کی سلاخوں کو خودکار نظام کے ذریعے ری ایکٹر میں داخل کیا جاتا ہے اور باہر کھینچا بھی جاتا ہے۔ اس طرح ری ایکشن کی رفتار کو حسبِ منشا کم اور زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

چوں کہ ری ایکٹر میں ہونے والے جوہری انشقاق سے مقصود توانائی کا حصول ہے جب کہ انشقاق کی وجہ سے بے پناہ حرارت پیدا ہوتی ہے جس کو ہٹانا لازمی ہو جاتا ہے۔ چکر کھاتے ہوئے پانی کی بڑی ٹنکی میں ری ایکٹر کو ڈبو دیا جاتا ہے تو اس سے حرارت میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یا ری ایکٹر کے اطراف پائے جانے والے پائپوں میں گیس یا پانی داخل کر کے بھی حرارت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ سارے ری ایکٹر کو ۷ فٹ موٹے حفاظتی شیلڈ سے ڈھانپا جاتا ہے۔

یہ ری ایکٹر پاور پلانٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں جن سے بجلی تیار ہو سکتی ہے، کشتیاں اور آبدوزیں چل سکتی ہیں اور انڈسٹریز جاری ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلا ری ایکٹر ۱۹۴۲ء میں امریکہ میں ڈیزائن کیا گیا تھا۔

ایٹم کا پرامن استعمال موجودہ سائنس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس نے موجودہ سماج کی ضرورت کو پورا کر دینے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ہندوستان میں نیوکلیئر توانائی کا پلانٹ سب سے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں قائم ہوا جب کہ تارا پور اٹامک پاور اسٹیشن قائم کیا گیا اور دوسری جگہوں پر بھی اقدامات ہوئے لیکن ہندوستان میں پیدا ہونے والی جملہ توانائی میں نیوکلیئر انرجی کا حصہ اب تک پانچ فیصدی سے بھی نہ بڑھ سکا۔ نیوکلیر انرجی حاصل کرنے کے لیے انتہائی حد تک محتاط رہنے کی ضرورت ہے، مزید برآں یہ طریقہ کار کوئی سستا بھی نہیں ہے، جس حد تک یہ پیچیدہ ہے اسی حد تک مشکل بھی ہے۔ لیکن کبھی ختم نہ ہونے والی صنعتی ضرورت خاموش بیٹھنے نہیں دے گی اور سائنس کے تحقیقاتی تجربات کو اس رخ پر موڑ دے گی کہ ان ترقی یافتہ مگر سستے طریقوں کی دریافت ہو سکے جن کے ذریعے نیوکلیئر انرجی منظرِ عام پر آکر اس قابل بن سکے کہ عام و خاص کاموں میں استعمال کی جائے۔

تھرمو نیوکلیئر فیوجن (Thermo-Nuclear Fusion):

مستقل سائنسی شعبہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس میں تحقیقات کا دائرہ بہت وسعت اختیار کر چکا ہے۔ جاپان، امریکہ اور یورپ میں صنعتی

سطح پر اس قسم کی ریسرچ شروع ہو چکی ہے۔ امکانات یہ کہتے ہیں کہ نیوکلیئر فیوجن یا جوہری پگھلاؤ کے ذریعے سے حاصل ہونے والی نیوکلیائی توانائی بے انتہا سود مند ثابت ہوگی اگر اس کا عملی اطلاق شروع ہو جائے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی تاریخ سے ثابت ہے کہ جب بھی توانائی کی نئی شکلیں سامنے آتی ہیں تو صنعتی ترقیوں کے بے شمار راستے کھُل جاتے ہیں اسی لیے نیوکلیائی توانائی کے پس منظر میں بے شمار صنعتوں کا نئے نئے میدان تلاش کرنا صاف نظر آجاتا ہے۔

جوہری پگھلاؤ سے حاصل ہونے والی توانائی کا عملی مظاہرہ اب تک ناممکن بنا ہوا ہے۔ اس میدان میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کا سلسلہ ۱۹۵۰ء تک جا پہنچتا ہے مگر قابل قدر قسم کی کامیابی اب تک نہ ہو سکی۔ پھر بھی اب تک جو تجربات کیے گئے ہیں اُن کا ایک جائزہ لیں گے تو امیدوں کے چراغ جھلملاتے نظر آئیں گے۔

نیوکلیئر فیوجن کی تحقیقات کی ابتدا سے ہی یہ نظریہ رائج رہا ہے کہ پگھلاؤ پذیر ہلکے عناصر (Fusionable Plasma) کو مقناطیسی حدبندی میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ اس قسم کے تجربات کے لیے بنیاد بن گیا اور مقناطیسی حدبندی والے نیوکلیائی ری ایکٹر کو بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ روس کے سائنس دانوں نے اس بنیاد پر ڈیزائن کیے گئے خاکہ کو 'ٹوکاماک' (TOKAMAK) کا نام دیا۔ ٹوکاماک موٹر کار کے ٹائر کی شکل کا دائروی کھوکھلا جسم ہے جس کے اطراف برقی تاروں کو لپیٹا جاتا ہے۔ ان تاروں میں برقی رَو گزرتی ہے۔ کھوکھلے جسم میں موجود گیس جوہری منصر کو تخلیق دینے کا سبب بنتی ہے۔ ان جوہری عناصر کی سمت دائروی جسم کی وجہ سے مقرر ہو جاتی ہے۔ تاروں میں برقی رَو کے گزرنے کی وجہ سے مقناطیسی قوت پیدا ہو کر حدبندی کر دیتی ہے۔ اب پگھلاؤ پذیر ہلکے عناصر کو حرارت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے برقی چارج نہ رکھنے والی شعاعوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان شعاعوں سے چھید لگنے پر وہ حرارت پیدا ہوتی ہے جو جوہری پگھلاؤ میں معاون بنتی ہے۔

اس قسم کے ترقی یافتہ سائنسی تجربات کے ساتھ ایک اہم مسئلہ وابستہ ہوا کرتا ہے وہ یہ کہ توانائی حاصل کرنے کے لیے جتنا خام مواد فراہم کیا جاتا ہے اُس میں اور حاصل ہونے والی توانائی میں نمایاں تناسب موجود رہے۔ ایسا نہ ہو جائے کہ خام مواد کے مقابلے میں حاصل ہونے والی توانائی زیادہ مہنگی ثابت ہو جائے۔ یہی مسئلہ ٹوکاماک کے تجربات کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔

ٹوکاماک کے تجربات کے علاوہ دوسرے جو تجربے کیے گئے ہیں ان میں جموری پگھلاؤ (Inertial Confinement) کا نام لیا جا سکتا ہے جس میں پگھلاؤ پذیر عناصر کی کثافت (Density) کو ہزاروں گنا بڑھا دیا جاتا ہے ـــــ لیکن صنعتی نوع سے کارآمد توانائی حاصل کرنے کے لیے جس ری ایکٹر کا ڈیزائن مجوزہ ہے، اس کے لیے ٹوکاماک ہی کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

ان تحقیقات کے ساتھ ایک کامیاب منزل تک پہنچنے کے لیے بہت فاصلے طے کرنا باقی ہے، یہ قدم ستاروں تک پہنچ کر ستاروں کی توانائی کو قبضے میں لینے کے معنی رکھتا ہے ـــــ نیوکلیائی توانائی کی شکل میں حاصل ہونے والی صنعتی توانائی، کبھی ختم نہ ہونے والے ذریعۂ توانائی کا درجہ رکھتی ہے جس سے تمام انسانی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو
صبر سے کام لو
باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ
حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو
اور
اللہ سے امید کرتے رہو
امید ہے کہ فلاح پاؤ گے"

(آل عمران ۲۰۰ – ۳)

یو۔ پی کے پچیس جونیر ہائی اسکولوں کے چھیانوے طلباء و طالبات کو

شیروانی انعامات ۱۹۸۷ء

احمد رشید شیروانی

ہم نے ۵ رمئی کو یو۔ پی کے قریب سو جونیر ہائی اسکولوں کو ۱۹۸۷ء کے جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان کے نتائج کے لیے فارم بھیجے۔ بہت سے اسکولوں سے نتائج مستعدی کے ساتھ ہم کو بھیج دیے گئے۔ ہم ان اسکولوں کی ہیڈ مسٹریس صاحباؤں اور محترم ہیڈ ماسٹر صاحبان کے بہت مشکور و ممنون ہیں۔

الحاجّہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ) چیرمین جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے پچیس اسکولوں کے ۹۶ ہونہار طلباء و طالبات کو انعامات روانہ کر دیے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

مومن انصار جونیر ہائی اسکول سہسوان۔

۱۔ کماری عارفہ انجم سلمہا۔ ۲۔ راجو بر سنگھ سلمہٗ ۳۔ انیتا رانی سلمہا
۴۔ مظفر حسین سلمہٗ۔

آزاد جونیر ہائی اسکول ککرالہ۔ ضلع بدایوں

۱۔ ذاکر علی خاں سلمہٗ ۲۔ اندر دیو موریہ سلمہٗ ۳۔ محمد زبیر سلمہٗ
۴۔ رؤف احمد خاں سلمہٗ ۵۔ عمران رضا خاں سلمہٗ ۶۔ شاہنواز خاں سلمہٗ ۷۔ مظفر علی سلمہٗ ۸۔ اکرام علی خاں سلمہٗ۔

قاضی شہاب الدین جونیر ہائی اسکول۔ سکمانو۔

۱۔ کیف الحسن سلمہٗ ۲۔ ادم پرتاپ سلمہٗ ۳۔ غلام رضا سلمہٗ

جعفری بیگم میموریل جونیر ہائی اسکول۔ سنگرام پور

۱۔ اخلاق احمد سلمہٗ ۲۔ بشیر الدین سلمہٗ ۳۔ مکیش کمار سلمہٗ

رحمانیہ گرلز جونیر ہائی اسکول۔ بدایوں

۱۔ کماری شہناز بیگم سلمہا۔ ۲۔ کماری شبانہ پروین سلمہا۔
۳۔ کماری عروج فاطمہ سلمہا۔

ایس منور علی گرلز جونیر ہائی اسکول۔ بدایوں

۱۔ کماری ریحانہ بیگم سلمہا۔

سلیم مبشی اردو میڈیم جونیر ہائی اسکول۔ بدایوں۔

۱۔ کماری شرمیلا سلمہا۔

مسلم نیشنل جونیر ہائی اسکول۔ دہرہ دون۔

۱۔ فاروق بیگ سلمہٗ۔

ایک آنہ فنڈ جونیر ہائی اسکول۔ لکھنؤ

۱۔ کماری خدیجہ پروین سلمہا۔ ۲۔ کماری رانا پروین سلمہا۔ ۳۔ کماری ریحانہ پروین سلمہا۔ ۴۔ کماری ریتا دیوی سلمہا۔

حمیدیہ گرلز جونیر ہائی اسکول۔ لکھنؤ۔

۱۔ یاسمین پروین سلمہا۔ ۲۔ نازنین پروین سلمہا۔ ۳۔ شبانہ کوثر سلمہا۔ ۴۔ اسماء بانو سلمہا۔

الاصلاح اسلامیہ جونیر ہائی اسکول۔ کمال پور ضلع بلند شہر۔

۱۔ عمرو عالم سلمہٗ ۲۔ ضمیر عالم سلمہٗ ۳۔ محمد امجد سلمہٗ۔
۴۔ پرویز عالم سلمہٗ ۵۔ کماری عامرہ بیگم سلمہا۔

اکرام حسین (شیعہ) گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ جونپور

۱۔ کماری گوری دیوی سلمہا۔ ۲۔ کماری حسن صغریٰ سلمہا۔ ۳۔ کماری پونم جیسوال سلمہا۔

مولانا محمد علی جوہر اسمارک جونیئر ہائی اسکول شیو پتی نگر۔
ضلع بستی۔

۱۔ عتیق احمد خاں سلمہٗ ۲۔ سلمہا مشرا سلمہا۔ ۳۔ رضوان احمد سلمہٗ

علی خاں اردو میموریل جونیئر ہائی اسکول بالپور۔ ضلع غازی آباد

۱۔ شکر الدین سلمہٗ ۲۔ بابو خاں سلمہٗ ۳۔ ندیم احمد سلمہٗ

نیشنل جونیئر ہائی اسکول دودھیڑو۔ ضلع مظفر نگر۔

۱۔ محمد عابد سلمہٗ ۲۔ ریاض علی سلمہٗ۔ ۳۔ منظر عالم سلمہٗ
۴۔ راجیندر سنگھ سلمہٗ۔ ۵۔ کماری سگیتا دیوی سلمہا۔

جے جنتا جونیئر ہائی اسکول۔ پور قاضی۔
ضلع مظفر نگر۔

کماری سریتا رانی چوہان سلمہا۔ ۲۔ وپن کمار سلمہٗ ۳۔ اجے کمار سلمہٗ ۴۔ شمیم احمد سلمہٗ

نادار شید شیروانی گرلز جونیئر ہائی اسکول
صلاح پور۔ ضلع الہ آباد۔

۱۔ کماری قدسیہ خاتون سلمہا۔ ۲۔ کماری خدیجہ بی بی سلمہا
۳۔ کماری شیبا جعفری سلمہا۔ ۴۔ کماری انجم بانو سلمہا۔
۵۔ کماری میمونہ خاتون سلمہا۔ ۶ کماری صبیحہ لطیف خان سلمہا۔ ۷۔ کماری فوزیہ صدیقی سلمہا۔ ۸۔ کماری سائرہ خاتون سلمہا۔ ۹۔ کماری میتھلش کماری سلمہا۔ ۱۰۔ کماری بشریٰ بی بی سلمہا ۱۱۔ کماری سمینہ اختر سلمہا ۱۲۔ کماری منجو دیوی سلمہا۔

فیض القرآن جونیئر ہائی اسکول ملک حکیم پور ضلع بجنور

۱۔ عبد الجبار سلمہٗ ۲۔ محمد عارف سلمہٗ ۳۔ ندیم احمد سلمہٗ

ناظر میموریل جونیئر ہائی اسکول۔ سیتا پور

۱۔ کماری ریحانہ پروین سلمہا۔ ۲۔ افتخار عالم سلمہٗ ۳۔ انوار الحسن سلمہٗ ۴۔ کماری شاہ نیلا سلمہا۔ ۵۔ کماری نصرت جہاں سلمہا۔

بابو بید ماد ھیک ودیالیہ جیتن محمد پور۔ ضلع فیض آباد

۱۔ شیو کمار سلمہٗ ۲۔ رضوان احمد سلمہٗ ۳۔ دیپک سنگھ سلمہٗ۔

صابر میموریل جونیئر ہائی اسکول، دریا باد۔ ضلع
ضلع بارہ بنکی

۱۔ کماری عذرا یاسمین سلمہا۔ ۲۔ محمود احمد سلمہٗ ۳۔ رابعہ خاتون سلمہا۔

رسول باغ جونیئر ہائی اسکول۔ مغل سرائے
ضلع بنارس۔

۱۔ غلام رسول سلمہٗ ۲۔ اسرار احمد سلمہٗ ۳۔ راکیش کمار سنگھ سلمہٗ ۴۔ کماری شبانہ روبی سلمہا۔

پبلک نرسری جونیئر ہائی اسکول۔ کیرانہ
ضلع مظفر نگر۔

۱۔ محمد اکرم سلمہٗ ۲۔ محمد ہارون سلمہٗ۔ ۳۔ محمد عاکف صدیقی سلمہٗ۔ ۴۔ محمد اسماعیل سلمہٗ ۵۔ شاہنواز عالم سلمہٗ

مسلم نسواں جونیئر ہائی اسکول ٹانڈہ
ضلع فیض آباد۔

۱۔ کماری انجم آرا سلمہا۔ ۲۔ کماری رضیہ بانو سلمہا۔
۳۔ کماری نوشابہ انجم سلمہا ۴۔ کماری عائشہ خاتون سلمہا۔

جن مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کو فارم نہیں ملے ہیں، وہاں سے براہ کرم ایک پوسٹ کارڈ پر ۱۹۸۰ء کا رزلٹ ہم کو لکھ دیا جائے تو ان کو فارم بھیج دیے جائیں گے۔ جن کو فارم مل گئے ہیں، وہاں سے براہ کرم وہ فارم بھر کر جلد از جلد بھیج دیے جائیں تاکہ انعامات بھیجے جا سکیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۵/ ۸۷-۸۸
مورخہ یکم اگست ۱۹۸۷ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

شرح تنخواہ

پروفیسرس: ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

ریڈرس: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (" ")

لکچررس: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔ (" ")

۱۔ پروفیسر آف کیمیکل انجینرنگ / پٹرولیم پروسسنگ۔ انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اینڈ کیمیکل انجینرنگ۔
۲۔ پروفیسر آف مکینکل انجینرنگ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ۔

قابلیت:

۱۔ لازمی: معروف اسکالر جس کی اعلیٰ میاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ ڈاکٹریٹ کے میار کی تحقیق کی نگرانی کا دس سال کا تجربہ ہو

یا

ایک مشہور و معروف انجینر / ٹیکنالوجسٹ (Technologist) جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

۲۔ پسندیدہ: اسامی نمبر شمار ۱ کے لیے
تدریس کا تجربہ جو یونیورسٹی کے میار کا ہو۔

فیلڈ آف اسپیشلائزیشن

درج ذیل ایریاز میں سے ایک یا زیادہ میں تخصص
ٹرانسفر پروسسز، ری ایکشن انجینرنگ، کیمیکل انجینرنگ، تھرموڈائنامک، کمپیوٹر ایڈیڈ ڈیزائن

- اینڈ اپمانزیشن، پٹرولیم ریفائننگ، پٹروکیمیکلس۔

نوٹ: پٹرولیم ریفائننگ میں مناسب بیک گراؤنڈ۔

۴۔ ریڈر ان مکینکل انجینئرنگ۔ یونیورسٹی یا پالی ٹیکنک۔

قابلیت: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تدریس اور/یا تحقیق و ترقیات کے سلسلے میں پانچ سال کا تجربہ۔

ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے جن کے پاس اگرچہ کہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہیں ہے لیکن اس کے معیار کا مطبوعہ تحقیقی کام ہے۔ یا ڈیزائن/ڈیویلپمنٹ میں کسی تعلیمی ادارے یا انڈسٹری میں انتہائی اعلیٰ معیار کا ترقیاتی کام ہو۔

یا

ایسے اشخاص کی صورت میں جنہیں کسی صنعت یا پیشہ وارانہ میدان سے بھرتی کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کے پاس اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہو اور تقریباً سات سال کا پیشہ ورانہ تجربہ رکھتے ہوں، جن میں نئی ایجادات/تحقیقات اور ترقیات بھی شامل ہوں۔

۴۔ لکچرر ان مکینکل انجینئرنگ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینئرنگ۔

قابلیت ا۔ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے متعلقہ میدان میں ماسٹرس ڈگری۔

ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ انجینئرنگ/ٹکنالوجی میں بیچلرس ڈگری۔ بیچلرس کی سطح پر فرسٹ کلاس یا پھر ماسٹرس ڈگری۔

ج۔ تعلیمی/تحقیقی ادارے کے علاوہ ایک سال کا پیشہ ورانہ تجربہ۔

انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے موضوعات میں نمایاں بین الموضوعی پروگراموں میں ملازمتوں کے لیے دیگر حیثیتوں سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل امیدواروں کے حق میں انجینئرنگ اور ٹکنالوجی میں ڈگریوں کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے۔

ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتے ہوں یا ایسے امیدوار جو پیشہ ورانہ تجربے کے حامل ہوں لیکن وہ تقرر کے لیے موزوں تصور نہ کیے جائیں تو اس صورت میں جس شخص کا تقرر کیا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے تقرر کے پانچ سال کے اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کو سالانہ ترقی سے محروم کر دیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اس شرط کو پورا نہ کرے۔

اگر ایم ٹیک/ایم ای کی ڈگری کے حامل امیدوار دستیاب نہ ہوں یا تقرر کے لیے مناسب خیال نہ کیے جائیں تو اس صورت میں لازمی تعلیمی صلاحیت کی شرائط کو نرم کیا جا سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ امیدوار تقرر کے پانچ سال کے اندر ایم۔ٹیک یا ایم۔ای کی سند حاصل کرلے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ سالانہ ترقی سے

محروم کر دیا جائے گا۔ جب تک کہ وہ مذکورہ قابلیت کی شرط کو پورا نہ کر دے۔

۵۔ پروفیسر آف سائیکیاٹری۔ ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

قابلیت:

ایم۔ڈی (سائیکیاٹری)/
ایم۔ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/
ایم۔ڈی ان میڈیسن ساتھ میں ڈپلوما ان سائیکالوجیکل میڈیسن۔

تدریس/تحقیق کا تجربہ:

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان سائیکیاٹری چار سال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲۴/ ۸۶ — ۸۷ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۸۷ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں اُن کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ موزوں متصور رہنے کی صورت میں اُن کو پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار سمجھا جائے گا۔

۶۔ پروفیسر آف ریڈیالوجی۔ ڈیپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی۔

قابلیت: ایم۔ڈی/ایم۔ایس (ریڈیالوجی)/
ایم۔ڈی (ریڈیو ڈائیگنوسس)/
ایم۔ڈی (ریڈیو تھراپی)

تدریس/تحقیق کا تجربہ:

کسی میڈیکل کالج میں ریڈیالوجی میں بحیثیت ریڈر چار سال کا تجربہ۔

۷۔ ریڈر ان نیرو سائیکیاٹری (عارضی) ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ایم ڈی (سائیکیاٹری)/
ایم۔ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/
ایم۔ڈی ان میڈیسن ساتھ میں سائیکالوجیکل میڈیسن میں ڈپلوما۔

تدریس/تحقیق کا تجربہ:

کسی میڈیکل کالج میں نیرو سائیکیاٹری میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ: تخصص میں مطبوعہ تحقیقی کام۔

۸۔ ریڈر ان ای۔ این۔ ٹی ۔ ڈپارٹمنٹ آف اوٹو رینو لارینگالوجی

قابلیت :

۱۔ لازمی ایم۔ ایس (اوٹو رینو۔ لارینگالوجی)

تدریس/ تحقیق کا تجربہ :

کسی میڈیکل کالج میں اوٹو۔ رینو۔ لارینگالوجی میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ مطبوعہ تحقیقی کام ۔

۹۔ ریڈر ان نیونیٹا لوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس ۔

قابلیت :

۱۔ لازمی : ایم۔ ڈی (پیڈیاٹرکس)

تدریس/ تحقیق کا تجربہ :

کسی میڈیکل کالج میں پیڈیاٹرکس میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔ ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جو نیونا ٹل یونٹ میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں۔

۲۔ پسندیدہ :۔ ہندوستانی اور غیر ملکی رسائل میں تخصص کے میدان میں اوریجنل مطبوعہ تحقیقی کام

۱۰۔ ریڈر ان بائیو فزکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف بائیو کیمسٹری ۔ جے این ۔ میڈیکل کالج ۔

قابلیت :

۱۔ لازمی : ایم۔ ڈی (بائیو فزکس)/

پی۔ ایچ۔ ڈی (بائیو فزکس)/

ایم۔ ڈی (فزیالوجی) یا

ایم۔ ڈی (بائیو کیمسٹری) ساتھ میں بائیو فزکس میں ایک سال کی ٹریننگ۔

تدریس/ تحقیق کا تجربہ :

کسی میڈیکل کالج میں بائیو۔ فزکس میں لکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ : امیدوار بائیو فزکس/ بائیو فزیکل کیمسٹری اور خاص طور پر کنفارمیشن آف پروٹینس، نیوکلک ایسڈ کنفارمیشنل ٹرانزیشنز اور پروٹین فولڈنگ کے میدانوں میں قابل قدر اور نمایاں کام کیا ہو۔

کام کی نوعیت : منتخب امیدوار بائیو فزکس میں تدریسی اور تحقیقی پروگرام کو آرگنائز کرنے اور خصوصاً نیوکلک ایسڈ اور اسٹرکچرل اسٹڈیز آف پروٹینز میں پروگرام کو آرگنائز کرانے کا ذمہ دار ہوگا۔

نوٹ : اگر میڈیکل کوالیفکیشن کے امیدوار میسر نہ آئیں یا وہ موزوں خیال نہ کیے جائیں تو وہ امیدوار جو فزکس/ کیمسٹری میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں اور پی ایچ۔ ڈی

کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بائیو فزیکل پرابلمس پر پانچ سال
کام کیا ہو تو ان کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اگر مطلوبہ تحقیقی تجربہ پانچ سال
سے کم ہے تو ایسے امیدواروں کو بائیو فزکس میں بطور لیکچرر تقرری دی جا سکتی ہے۔

۱۱۔ ریڈر ان پیتھالوجی: (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔

قابلیت: ایم۔ڈی (پیتھالوجی)/
ایم۔ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)/
ایم۔ڈی (پیتھالوجی وِد بیکٹریالوجی)/
پی ایچ۔ڈی (پیتھالوجی)/
ڈی۔ایس سی (پیتھالوجی)

تدریس/تحقیق کا تجربہ:
میڈیکل کالج میں پیتھالوجی میں لیکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۱۲۔ ریڈر ان نیرو۔سرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ایم۔سی ایچ (نیرو۔سرجری)

تدریس/تحقیق کا تجربہ:
میڈیکل کالج میں نیرو سرجری میں لیکچرر کی حیثیت سے پانچ سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ:۔ کسی اچھے نیرو سرجیکل سینٹر میں کام کرنے کا تجربہ۔

نوٹ: میڈیکل کالج میں ریڈرس کی تمام جگہوں (نمبر شمار ، تا ۱۲) کے واسطے۔
۱۹۸۲ء کی سفارشات سے قبل لیکچرر مقرر ہونے والے امیدواروں کے بطور لیکچرر اور رجسٹرار تدریسی تجربے کو
بحیثیت ریڈر تقرری کے لیے مناسب سمجھا جائے گا۔

۱۳۔ لیکچرر ان بائیو کیمسٹری (ایک مستقل اور ایک عارضی)۔ ڈپارٹمنٹ آف بائیو کیمسٹری۔جے۔این میڈیکل کالج۔

قابلیت: ایم۔ڈی (بائیو۔کیمسٹری)/
ایم۔بی۔بی۔ایس ساتھ میں
ایم ایس سی (میڈیکل بائیو کیمسٹری)/
پی ایچ۔ڈی (میڈیکل بائیو۔کیمسٹری)/
ڈی۔ایس سی (میڈیکل بائیو۔کیمسٹری)

مضمون میں مطلوبہ منظور شدہ پوسٹ گریجویٹ کوالی فیکیشن ہو۔

نوٹ ۱۔ صرف وہی امیدوار درخواست دیں جو میڈیکل کوالی فیکیشن رکھتے ہوں۔

نوٹ ۲۔ منتخب شدہ امیدوار کلینکل بائیوکیمسٹری کی تنظیم اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور ایم۔ ڈی کلاسوں کے لیے میڈیکل بائیوکیمسٹری کے کورس چلانے کے ذمہ دار ہوں گے

۱۴۔ لکچرر ان مائیکروبیالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکروبیالوجی ۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ایم۔ ڈی (بیکٹریالوجی)/
ایم۔ ڈی (مائیکروبائیولوجی)/
ایم۔ ڈی (بیکٹریالوجی مع پیتھالوجی)/
ایم۔ ڈی (پیتھالوجی اور بیکٹریالوجی)/
ایم۔ بی۔ بی۔ ایس مع
ایم۔ ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/
ایم۔ ایس سی (میڈیکل مائیکروبیالوجی)/
پی ایچ۔ ڈی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/
پی ایچ۔ ڈی (میڈیکل مائیکروبیالوجی)/
ڈی۔ ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/
ڈی۔ ایس سی (میڈیکل مائیکروبیالوجی)

۲۔ پسندیدہ: مائیکروبیالوجی میں تدریس کا تجربہ۔

۱۵۔ پروفیسر آف لینگوئیسٹکس ۔ ڈپارٹمنٹ آف لینگوئیسٹکس ۔

قابلیت:

۱۔ لازمی ۔ معروف اسکالر جس کی اعلیٰ معیاری مطبوعات ہوں اور عملی طور پر تحقیقی کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس اور/یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو اور ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔

یا

ایک معروف و مشہور اسکالر جس نے علم کی ترقی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

۲۔ پسندیدہ:۔ اردو زبان پر ریسرچ کی ہو۔

۱۶۔ لکچرر ان جغرافیہ ۔ ڈیفنس کالج ۔

۱۷ لکچرر۔ ان فزکس ۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنک

۱۸۔ لکچرر ان رشین ہسٹری (Russian History) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔

قابلیت

۱۔ لازمی۔ ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام اور
ب متعلقہ موضوع میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (سیون پوائنٹ اسکیل میں 'سی') کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ماسٹرس ڈگری یا غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی ترتیاتی پروگرام کے لیے مذکورہ بالا الف و ب کے متعلقہ موضوع میں ڈگری اگر سیلکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے، یا اس کا مطبوعہ کام انتہائی اعلیٰ درجے کا ہے تو وہ (ب) کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم۔فل ڈگری یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ درجے کے تحقیقی کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سال کا تجربہ ہو یا اس کو کسی ریسرچ لیباریٹری میں یا کسی آرگنائزیشن میں عملی تجربہ ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلے یا اعلیٰ پایے کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

نوٹ۔ برائے اسامی شمار نمبر ۱۸ لکچرر ان روسی ہسٹری کے لیے
روسی ہسٹری یا یورپین ہسٹری (جس میں روسی ہسٹری شامل ہو) میں کم از کم فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا روسی ہسٹری یا یورپین ہسٹری کے کسی موضوع پر ایم۔فل یا پی ایچ۔ڈی کی ڈگری۔ یا اس کے مساوی تسلیم شدہ کوئی غیر ملکی قابلیت۔

۲۔ پسندیدہ: اسامی شمار نمبر ۱۶ لکچرر ان جغرافیہ کے لیے۔
۱۔ ڈگری/سینئر کالج میں ۲۔ ۳ سال کا تدریسی تجربہ۔
۲۔ خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۹۔ ریڈر ان لا ۔ ڈپارٹمنٹ آف لا۔

۲۰ ریڈر ان لا (مرکنٹائل لا) ڈپارٹمنٹ آف لا

قابلیت ۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام۔ اس بات کا ثبوت کہ امیدوار (۱) تحقیق یا (۲) اختراعات ان ٹیچنگ میتھڈ یا (۳) پروڈکشن آف ٹیچنگ میٹریل میں عملی طور پر مصروف ہے۔

درس وتدریس اور/ یا تحقیق میں کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔ اور اس بات کا ثبوت کہ امیدوار ان پانچ سال میں سے تین سال بحیثیت لکچرر یا اس کے مساوی پوزیشن پر رہا ہو۔
یہ کنڈیشن اس صورت میں نرم کی جا سکتی ہے جب کہ امیدواروں کا اعلیٰ درجے کا تدریسی/تحقیق ریکارڈ ہو۔

۲۱۔ سسٹم انجینیر (سافٹ ویر) (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)۔ کمپیوٹر سینٹر
شرح تنخواہ: ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (اَن ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: ماسٹرس ڈگری یا کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔ اور ساتھ ہی ساتھ سسٹم پروگرامر کی حیثیت سے کم از کم پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ ڈگری یا اس کے مساوی سافٹ ویر ڈویلپمنٹ پروجیکٹ میں کام کا تجربہ
کام کی نوعیت: ۱۔ کمپیوٹر سسٹم کو مینٹین کرنا اور ملٹی پروگرامنگ، بیچ اور ٹائم شیئرڈ موڈ اور کمپیوٹر نیٹورکنگ میں کمپیوٹنگ سسٹم کی بہتر کارکردگی کے لیے سافٹ ویر ڈولپ کرنا۔
۲۔ تدریس اور تعلیمی پروگرام برائے کمپیوٹر سائنس میں حصہ لینا
۳۔ ترتیباتی پروگرام کے استعمال کے لیے سہولیات مہیا کرنا۔
۴۔ اس کے چلانے کے طریقوں کی میں مدد کے ساتھ اُن امور کو انجام دینا جو وقتاً فوقتاً تفویض کیے جائیں۔

۲۲۔ اسسٹنٹ انجینیر (ایک جگہ) (مستقل) (بلڈنگ ڈپارٹمنٹ)۔
شرح تنخواہ: ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (اَن ریوائزڈ)
قابلیت
۱۔ لازمی ا کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے سول انجینیرنگ میں ڈگری یا اے۔ ایم۔ آئی۔ ای یا سول انجینیرنگ میں ڈپلوما۔
۲ بلڈنگ اور روڈ کنسٹرکشن، واٹر سپلائی ڈرینیج، آر۔ سی۔ سی کے کام کا ڈگری ہولڈرس اور اے۔ ایم۔ آئی۔ ای کے لیے پانچ سال اور ڈپلوما ہولڈرس کے لیے ۱۰ سال کا تجربہ
۲۔ پسندیدہ: اسٹوروں کو مینٹین رکھنے کا تجربہ۔

۲۳۔ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایک جگہ) (عارضی)
شرح تنخواہ: ۷۰۰- ۴۰- ۱۱۰۰- ۵۰- ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (اَن ریوائزڈ)

قابلیت: کسی اسٹیٹوٹری (Statutory) ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے ڈگری اور ساتھ میں کسی یونیورسٹی میں ایک ذمہ دار سپروائزری حالت میں اکیڈمک ایڈمنسٹریشن کا سات سال کا تجربہ۔

۲۴۔ ریسرچ ایسوسی ایٹس ۔(دو جگہیں) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔
شرح تنخواہ: درج ذیل فکسڈ آنریریم

کیٹگری	ویلیو
اے	۱۴۰۰/- روپیے ماہانہ
بی	۱۶۰۰/- روپیے ماہانہ
سی	۱۸۰۰/- روپیے ماہانہ
ڈی	۲۰۰۰/- روپیے ماہانہ۔

قابلیت:
۱۔ لازمی ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور میڈیول انڈین ہسٹری کے فیلڈ میں خود کا مطبوعہ کام
۲۔ پسندیدہ:۔ عمر ۴۵ سال سے کم مردوں کے لیے اور
عمر ۵۵ سال سے کم خواتین کے لیے۔

۲۵ میڈیکل آفیسرس (بلڈ بنک) (دو جگہیں) (مستقل) جے۔ این۔ میڈیکل کالج اسپتال
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰۔ ۴۰۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔ (اَن ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی (ا) ایم۔بی۔بی۔ایس
ب۔ پیتھالوجی میں پی۔جی ڈگری یا ڈپلوما۔
ج کسی تسلیم شدہ اسپتال میں بلڈ ٹرانس فیوژن آفیسر کی حیثیت سے تین سال کا تجربہ۔ یا کسی تدریسی اسپتال میں بلڈ بنک میں کام کرنے کا تین سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ کسی تسلیم شدہ ادارے سے بلڈ ٹرانس فیوژن میں خصوصی ٹریننگ

۲۶۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) (ایک جگہ) (مستقل) ایس۔ٹی ہائی اسکول
شرح تنخواہ: ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰ ای۔بی۔ ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔(ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی کم از کم سکنڈ کلاس میں (۴۵٪ فیصد مارکس سے اوپر اس کے مساوی شمار کیا جائے گا) متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری (میتھمیٹکس میں)

۲۔ ایجوکیشن/ تدریس میں یونیورسٹی کی ڈگری یا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما
۳۔ تسلیم شدہ ہائی اسکول/ ہایر سکنڈری اسکول یا انٹرمیڈیٹ کالج میں درس و تدرس کا تین سال کا تجربہ۔ اے ایم یو کے وہ نان ٹیچنگ ایمپلائز جو کہ ریگولر پانچ سال سے اے.ایم یو میں سروس کر رہے ہیں، ان کے لیے رعایت رکھی جائے گی۔
۴۔ انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعہ تدریس کی صلاحیت

نوٹ۔ ایسے امیدواروں کے سلسلے میں جن کے پاس فرسٹ کلاس میں ماسٹرس اور بیچلرس ڈگریاں ہوں، ضروری تعلیمی صلاحیت ۲ اور ۳ میں نرمی برتی جائے گی۔ ایسے امیدواروں کو جو کہ منتخب کر لیے جائیں اُن کو دو سال کے ٹرائل پر رکھا جائے گا اور جو کہ مزید ایک سال کے لیے بڑھایا جاسکتا ہے اگر وہ تدریس میں ڈگری یا ڈپلوما نہ حاصل کر پائیں۔

۲۷۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (میتھ میٹکس) (عارضی) احمدی اسکول فار دی بلائنڈ۔
شرح تنخواہ: ۱۶۴۰-۶۰-۲۶۰۰-ای بی-۷۵-۲۹۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔
قابلیت:
۱۔لازمی میتھ میٹکس میں ماسٹرس ڈگری۔
انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعہ پڑھانے کی صلاحیت۔
۲۔پسندیدہ تدریس میں یونیورسٹی کی ڈگری یا ڈپلوما اور کسی کالج یا ہائی کلاسز ان ہائی/ ہائر سکنڈری اسکول میں متعلقہ مضمون کی تدریس کا اچھا تجربہ۔

۲۸۔ جونیر انجنیر (ایک جگہ) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) (سیوریج اور سیویج ڈسپوزل اسکیم) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای بی-۵۰-۲۳۰۰ روپیے (ریوائزڈ) اور دیگر الاؤنسز
قابلیت: ۱۔ سول/ مکینکل انجنیرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ میں سیوریج اور سیویج/ واٹر سپلائی میں پانچ سال کا تجربہ۔
۲۔ موٹرس اور پمپس اور اُن کے انسٹالیشن کے کام کا تجربہ۔

۲۹۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (انسٹرومینٹ ٹیکنالوجی) (ایک جگہ) (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریکل انجنیرنگ
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای-بی-۵۰-۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت الیکٹریکل انجنیرنگ اور/ یا الیکٹرونکس انجنیرنگ میں ڈپلوما ساتھ میں کسی یونیورسٹی یا مشہور فرم کی لیباریٹری انجنیرنگ لیباریٹریز میں استعمال ہونے والے آلات کے آپریشن، ریپیر اور ان کے

مینٹیننس کا دو سال کا تجربہ

یا

آٹھ سالہ اسکولنگ اور درج بالا میں آٹھ سال کا تجربہ۔

یا

ٹریڈ سرٹیفکیٹ اور پانچ سال کا درج بالا تجربہ۔

نوٹ ۱۔ امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۔ وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۲/ ۸۷-۸۸ مورخہ ۱-۵-۱۹۸۷ کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ موزوں ہونے کی صورت میں اُن کو پہلی درخواست پر امیدوار سمجھا جائے گا۔

۳۰۔ اسٹاف نرس (ایک جگہ) (مستقل) اے۔کے طبیہ کالج اسپتال

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای-بی-۵۰-۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔(ریوائزڈ)

قابلیت: میٹریکولیٹ یا مساوی۔ کسی تسلیم شدہ ادارے سے جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلوما اور کسی اسٹیٹ میں رجسٹریشن۔ جنرل ڈیوٹی نرس کی حیثیت سے کم ازکم ایک سال کا تجربہ۔

۳۱۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (کارپینٹر) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف کمیونٹی میڈیسن جے۔این میڈیکل کالج۔

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای-بی-۵۰-۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاونسز (ریوائزڈ)

قابلیت: ۱۔ ووڈ ورک میں ڈپلوما (کیبنٹ میکنگ اینڈ کاروِنگ)

یا

ڈپلوما ان کارپینٹری (آئی۔ٹی۔آئی سے)

۲۔ تسلیم شدہ ادارے سے ٹریڈ میں تین سال کا تجربہ

نوٹ: امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۲۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (اسٹور) (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف مکینکل انجینرنگ۔

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای-بی-۵۰-۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت: کسی تسلیم شدہ ادارے سے مکینکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ میں کسی مشہور آرگنائزیشن میں مکینکل اسٹور کو ہینڈل کرنے کا پانچ سال کا تجربہ۔

یا

بی۔کام/بی۔ایس سی کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے پاس کیا ہو اور ساتھ میں مشہور آرگنائزیشن میں مکینکل اسٹور میں

کو ہینڈل کرنے کا ۸ سال کا تجربہ۔

۴۳۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (اسٹور): (ایک جگہ) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای-بی-۵۰۔ ۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: گریجویشن کے ساتھ سائنس ڈیپارٹمنٹ اور خصوصی طور پر کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے اسٹور کو مینٹین رکھنے کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: درج بالا میں پانچ سال کے تجربے والے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۴۴۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (اسٹور) (ایک جگہ) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف کیمیکل انجینرنگ
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای-بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: کسی تسلیم شدہ ادارے سے مکینکل/کیمیکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور ساتھ میں کسی مشہور و معروف تنظیم میں مکینکل اسٹورس ہینڈل کرنے کا پانچ سال کا تجربہ۔

یا

بی کام/بی۔ ایس سی کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے کیا ہو اور ساتھ کسی مشہور آرگنائزیشن میں مکینکل اسٹورس کو ہینڈل کرنے کا ۸ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: کیمیکل انجینرنگ ڈیپارٹمنٹ کے اسٹورس کو مینٹین رکھنے کا تجربہ اور پرچیز/امپورٹ آف ایکوپمنٹس/انسٹرومینٹس فار کیمیکل پٹرولیم پروسسنگ لیباریٹریز کا تجربہ رکھنے والے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۴۵۔ سینیر لیب اسسٹنٹ: (ایک جگہ) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف آبسٹیٹرکس اینڈ گائنا کالوجی جے۔ این میڈیکل کالج
شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای-بی-۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت: ا۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ ہایر سکنڈری یا اس کے مساوی۔
ب کسی تدریسی اسپتال کے آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں کام کا تین سال کا تجربہ۔

۴۶۔ سینئر لیب۔ اسسٹنٹ (دو جگہیں) (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف جنرل سرجری جے۔ این میڈیکل کالج
شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای-بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: سائنس سے انٹرمیڈیٹ/پی۔یو۔سی۔ کسی آپریشن تھیٹر جہاں کارڈیو۔تھوریسس کام روٹینلی

کیا جاتا ہو، میں کام کرنے کا کم ازکم تین سال کا تجربہ ہو۔

۲۔ پسندیدہ: کسی انٹینیو کیر یونٹ میں کام کا تجربہ۔

۳۷۔ الیکٹریشن۔کم۔ٹیوب ویل آپریٹر (ایک جگہ) (مستقل) ہادی حسن ہال۔

شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔۴۰۔ ۲۰۴۰۔ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی ۔۱ ہائی اسکول/جونیر ہائی اسکول اور فٹر یا مکینک یا الیکٹریشن کے ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی سرٹیفکیٹ۔

۲۔ بجلی سے چلنے والے پمپنگ پلانٹس اور دوسرے انسٹالیشن، جن میں ٹیوب ویل اور پمپ ویل شامل ہیں، کو چلانے اور اُن کی دیکھ ریکھ کرنے کا پانچ سال کا تجربہ۔

امیدوار کو چھوٹی موٹی الیکٹریکل اور مکینکل خرابیاں اور فالٹس جو کہ ان کے آپریشن کے دوران پیش آجائیں، دور کرنے کی صلاحیت ہو اور پلانٹس اور مشینریز کے فنکشنس کی اچھی جانکاری ہو۔

نوٹ: امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۸۔ سینیر لیب۔اسسٹنٹ (آرکیٹکچر) (ایک جگہ) یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔

شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)

قابلیت: ڈپلوما اِن آرکیٹکچرل اسسٹنٹ شپ/سول انجینیرنگ اور ساتھ ہی کسی پرائیویٹ فرم/انسٹی ٹیوشن/ گورنمنٹ کنسرن میں کم ازکم دوسال کا تجربہ۔

نوٹ:۔ امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۳۹۔ سینیر لیب۔اسسٹنٹ (تھیٹر) (ایک جگہ) (عارضی) جے این میڈیکل کالج اسپتال

شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت: ا سائنسی مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری یا اس کے مساوی

ب۔ کسی تدریسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں کام کرنے کا تین سال کا تجربہ۔

۴۰۔ ہیڈ پلمبر (ایک جگہ) (مستقل) ایم۔ایم۔ہال

شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: آئی۔ٹی۔آئی تسلیم شدہ ٹیکنیکل ادارے سے پلمبر ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں

فٹر/پلمبر کی حیثیت سے قابلِ لحاظ پریکٹیکل تجربہ۔

۲۔پسندیدہ: اعلیٰ درجے کی پروفیشنسی ٹریڈ میں۔

نوٹ: موزوں امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۴۱۔ وایرمین۔ (ایک جگہ) (مستقل) الیکٹریسٹی ڈپارٹمنٹ (ورکس اینڈ مینٹیننس سیکشن)

شرح تنخواہ: ۹۷۵۔ ۲۵۔ ۱۱۵۰۔ ای۔بی۔۳۰۔ ۱۵۴۰۔روپے اور دیگر الاونسز (ریوائزڈ)

قابلیت: ۱۔وایرمین کا لائسنس

۲۔ مختلف قسم کی انٹرنل وائرنگ کا دو سال کا تجربہ۔

نوٹ: امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۴۲ ریکارڈ کلرک۔(ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔جے۔این میڈیکل کالج

شرح تنخواہ: ۹۵۰۔ ۲۰۔ ۱۱۵۰۔ ای۔بی۔ ۲۵۔ ۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (ریوائزڈ)

قابلیت: ۱۔ لازمی: بی۔اے۔/بی۔ایس سی/بی۔کام

۲۔پسندیدہ: ۴۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ٹائپ کرنے کی صلاحیت۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک ٹائپنگ ٹیسٹ دینا ہوگا۔ وہ حضرات جو ٹائپنگ ٹیسٹ کوالی فائی کریں گے ان کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔

غیر معمولی لیاقت اور تجربے کے حامل افراد کے لیے ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا ان کو بطور ٹی۔اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا کرایہ طرف کا سنگل کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے -/۱۰ روپیہ نقد ادائیگی برائے اسامی نمبر شمار ۱ تا ۲۵ اور -/۷ روپے باقی ماندہ جگہوں کے لیے فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر اے۔ایم۔یو علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود حاصل کر سکتے ہیں یا ڈاک سے منگا سکتے ہیں۔ اس صورت میں ۲۴×۹ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں پوسٹل آرڈر کے ساتھ بھیجیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۲ر ستمبر ۱۹۸۷ (دفتری اوقات تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی

جاوید عثمانی (آئی۔اے۔ایس)
رجسٹرار

(536/696)

جلد ۶ — اکتوبر ۸۷ — شمارہ ۱۰

سرپرست: جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر

اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر

کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شہاب الدین

تزئین

سرفراز

انچارج سرکولیشن

مستقیم احمد خان

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا ... RS. 30.00

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

عام ڈاک US $ 8.00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا

مندرجات

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو)

اداریہ

جس وقت یہ شمارہ کتابت وطباعت کے مراحل طے کر کے قارئین تک پہنچے گا، دنیا کے کونے کونے اور چپے چپے میں بسے ہوئے علیگ برادری کے افراد بانیٔ درس گاہ سید احمدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے میں مشغول ہو چکے ہوں گے۔ کہیں پر سیمینار ہوں گے، جن میں ان کے افکار کی افادیت ومعنویت پر بحث ومباحثہ ہوگا، کہیں پر یک نشستی جلسوں کا اہتمام کر کے ان کی زندگی اور کارناموں کے کسی ایک پہلو کو موضوع مذاکرہ بنایا جائے گا، کہیں پر ان کے مذہبی تصورات پر بحث ہوگی تو کہیں پر ان کے سیاسی افکار کا جائزہ لیا جائے گا۔ کہیں پر ان کی جامعیت کا چرچا ہوگا تو کہیں پر "معروضی" انداز سے ان کے علمی، ادبی اور مذہبی آثار تنقید کی کسوٹی پر کسے جائیں گے۔ کم فرصت علیگ برادری کے افراد بانیٔ درس گاہ کو یاد کرنے کے لیے ایک شعری نشست پر اکتفا کریں گے یا صرف اکل وشرب کی محفل بپا کر کے علی گڑھ کی اپنی اقامتی زندگی کی یاد تازہ کریں گے اور دل میں یہ سوچ کر "خوش" ہو جائیں گے کہ ہم نے بانیٔ درس گاہ کا حق ادا کر دیا۔

یہ سب کچھ تو ہوگا اور اعلیٰ پیمانے پر ہوگا، برقی قمقموں سے سجے، خوب صورت قالینوں سے مزین، عطر اور سینٹ سے معطر فضا میں ہوگا لیکن یہ نہ سوچا جائے گا کہ وہ کون سا "نسخۂ کیمیا" تھا جس نے سید احمدؒ کو سر سید احمد خاںؒ بنایا؟ کس کے نقش قدم پر چل کر انہوں نے عزیمت، بلند ہمتی، فرض شناسی، راست گوئی اور نامساعد حالات سے نہ گھبرانے کی دولت بیدار پائی؟ وہ کون سی شخصیت تھی جس کے نقش قدم پر چل کر وہ بادِ مخالف میں گھری ہوئی، دوسروں کی نگاہوں میں ہی نہیں بلکہ واقعی پسماندہ، گم کردہ راہ، زمانہ ناشناس، حالات سے ہراساں وپریشان، وقت کے دوراہے پر کھڑی قوت فیصلہ سے محروم قوم کو طوفانوں کے تند وتیز جھونکوں کے درمیان سے نکال کر ایک ایسی شاہراہ پر لے آئے جہاں سے نشان منزل کے آثار دکھلائی دینے لگے۔

ہمارے نزدیک جس چیز نے سید احمدؒ کو سر سید احمد خاںؒ کے رتبۂ بلند تک پہنچایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا اتباع کامل تھا۔ ایسا معلوم ومحسوس ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ اور مقدس زندگی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی اور وہ زندگی کے کڑے کوس سیرت مبارکہ کے ہی خنک سایے میں طے کرتے۔ سر سید احمد خاں نے اپنے آقائے نامدار کی سیرت کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کاموں کا آغاز حالات کے اتھاہ پر سکون سمندر میں اپنے افکار کا ایک بھاری پتھر پھینک کر کیا جس کے نتیجے میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور لوگوں کی نظریں اس پر لگ گئیں۔ یہ سبق سر سید احمد خاںؒ نے اپنے آقائے نامدارؐ کے اس عمل سے سیکھا تھا جس کا مظاہرہ آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے اس اعلان سے کیا تھا کہ "اے لوگو ایک رب کی عبادت کرو"۔ اس وقت کے عرب کا معاشرہ ایک پر سکون سمندر کے مانند تھا، عرب کا بدو ایک بندھی ٹکی زندگی بسر کرتا۔ اپنے "معبودوں" سے اس کا تعلق بس واجبی ہی سا تھا۔ سال میں دو ایک بار "خدا کی بیٹیوں" کا دیدار کرنا، ان کے سامنے قربانی پیش کر دینا، بس اتنا ہی کافی تھا اس کے بعد وہ بندھی ٹکی زندگی

گزارتا، چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ایک دوسرے سے لڑتا جھگڑتا یا تو مخالف کو مار ڈالتا یا خود اس کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر جاتا۔ ایسے ساکت جامد حالات کے سمندر میں مدوجزر پیدا کرنے کے لیے ایک بھاری پتھر پھینکنا ضروری تھا اس لیے خداوند قدوس کے حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پہ چڑھ کر اپنا پیغامِ حق سنایا اور اس کے ذریعے صدیوں کے جمود کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے ہادیٔ برحق کا اتباع کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء کے حالات کی ماری ہوئی، بے بسی کا شکار، سسکتے سے دوچار، گومگو کے عالم میں مبتلا قوم کو اپنا پیغامِ بیداری سنا کر اس زمانے کے حالات میں ایک ہلچل پیدا کر دی، جس کی وجہ سے سوئی ہوئی قوم میں بیداری کے آثار نظر آنے لگے اور وہ سرسید سے چیں بہ جبیں ہونے لگی کیوں کہ اس کو گراں خوابی میں جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا تھا۔ یہ سنتِ مبارکہ پہ عمل کی طرف سرسید احمد کا پہلا قدم تھا۔

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سرسیدؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے مکّی دور کا بڑی گہری نگاہوں سے مطالعہ کر کے اس کے ایک ایک نقش پہ عمل پیرا ہونے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اہلِ نظر خود واقف ہیں اور اس بات کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ میں دعوتِ دین کا آغاز کیا تو منکرین نے نعوذ باللہ آپ کو کاہن، شاعر، مجنون، فاترالعقل اور اقتدار کا بھوکا کہنا شروع کیا۔ آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو کمال علم سے سماعت فرمایا اور ان باتوں پہ اپنے کسی ردّ عمل کا اظہار نہیں فرمایا۔ نہ کسی کو نامناسب جواب دیا، نہ کسی سے لڑے نہ ہی کسی کا مقاطعہ کیا بلکہ استقامت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔ سرسید احمدؒ نے سیرتِ مبارکہ کے اس پہلو کی پیروی اس طرح کی کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے رد میں بے جا زورِ صرف کرنے سے احتراز کیا اور اپنے اصلی وحقیقی کام کی طرف اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے متوجہ رہے۔ سرسید احمد نے جب اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی ابتدا کی تو ان کو کرسٹان، کافر، نیچری، دہریہ، لامذہب اور کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ انہوں نے سیرتِ مبارکہ کا اتباع کرتے ہوئے ان اتہامات پہ کسی شدید ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مخالفوں سے بے جا نبرد آزما ہونے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ خلوصِ دل اور نیتِ صالح کے ساتھ جس چیز کو وہ درست سمجھتے تھے، اس کی نشر واشاعت میں لگے رہے کیوں کہ یہی ان کے ہادیٔ برحق کی سنت ہے۔ سنتِ مصطفویؐ پہ عمل پیرا ہونے کا صلہ خداوند عالم نے ان کو یہ دیا کہ ان کا پیغام عام ہونے لگا۔ مخالفتوں کے بادل چھٹنے لگے۔ دلوں کا تکدر لبوں کے تبسم کا قالب اختیار کرنے لگا اور رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ گیا جب اُن کے شدید مخالفوں کی اولادوں نے ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنا موجبِ فخر جانا۔ اگر سرسید اپنے مخالفوں سے الجھنے میں ہی رہ جاتے، ان کو ان ہی کی زبان اور اصطلاحات میں جوابات دیتے اور ان کے خلاف جنگ وجدل کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے تو وہ سب کچھ ان کو حاصل نہ ہو پاتا جو تھوڑی ہی سی مدت میں ان کو حاصل ہوا۔ اپنے نفس اور اپنی ذات کی نفی کر کے مخالفین کی نامناسب باتوں کا جواب نہ دینے کا سرسید احمد کا عمل اس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی ابتدائی مکی زندگی کی سنت پہ عمل کیا اور اپنی بشریت کی جکڑبندیوں کے باوجود اپنے ہادیٔ برحق کے نقشِ قدم پہ گامزن ہونے اور اس کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کے لیے کوشاں رہے۔

غزوات وسرایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے روشن ابواب ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غزوات وسرایا ہی سے آپؐ کی حیاتِ مبارکہ عبارت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک زریں اور تابناک پہلو صلح حدیبیہ بھی ہے، وہ صلح جو بظاہر دب کر یا حالات کے مقابل سپر انداز ہو کر کی گئی تھی مگر بہ باطن اُس نے اسلامی تعلیمات کو اس طرح سرعت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جو غزوات وسرایا سے بھی ممکن نہ ہو سکا تھا۔ سرسید احمدؒ نے سنتِ نبوی کے دونوں پہلوؤں یعنی جنگ وصلح کی پیروی کرتے ہوئے اگر ایک طرف اپنے بعض مخالفوں سے قلمی جنگ لڑی، عقلی ونقلی دلائل کے انبار لگا کر ان کی زبانوں کو گنگ کیا اور فاتحانہ شان کے ساتھ اپنے

افکار و خیالات کی شمع روشن کیے رہے تو دوسری طرف ان کی زندگی میں جب بھی کوئی ایسا مرحلہ آیا جب صلح حدیبیہ کی سنت پر عمل پیرا ہونا ناگزیر معلوم ہوا تو انہوں نے پندارِ نفس اور ہٹ دھرمی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلا جھجک صلح کی سنت پر عمل کیا جس کی برکت سے ان کے وہ کام بھی بن گئے جن کا بننا بظاہر امر محال نظر آتا تھا۔ یہاں ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان کے قیام کے بعد سر سیدؒ نے دینیات کی تعلیم کو یہاں کے نصاب تعلیم کا لازمی جزو بنانا چاہا اور اپنے زمانے کے علما کو دعوت دی کہ وہ دینیات کا نصاب تعلیم مرتب کر دیں۔ سر سید احمد کے بعض تفردات کی بنا پر علما ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لیے اس گروہ کا کوئی بھی فرد سر سید احمد کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ سر سیدؒ نے صلح حدیبیہ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ وہ دینیات کے نصاب تعلیم میں کوئی مداخلت نہ کریں گے۔ علمائے کرام خود نصاب تعلیم مرتب فرمائیں اور جس عالم کا چاہے انتخاب کریں تاکہ وہی صاحب مدرسۃ العلوم مسلمانان میں تشریف لاکر دینیات کا درس دیں۔ سر سیدؒ کی بظاہر اس پسپائی کا جو نتیجہ نکلا وہ علی گڑھ تحریک کا ایک زرّیں باب ہے۔ اس زمانے کے علمائے کرام نے دینیات کا ایک نصاب تعلیم مرتب فرمایا اور مدرسۃ العلوم مسلمانان میں اس کی تدریس خود انہی کے منتخب کردہ عالم کی نگرانی میں ہونے لگی۔ علی گڑھ تحریک یا یوں کہیے کہ علی گڑھ کے تعلیمی ادارے سے جو بھی علما منسلک ہوئے انہوں نے اگر ایک طرف یہاں کے تعلیمی ادارے کو بہت کچھ دیا تو دوسری طرف ایک نئے ماحول کے نئے نئے مسایل نے ان کو بھی بہت کچھ دیا۔ وہ چاہے مولانا سالم انصاری ہوں چاہے مولانا سید سلیمان اشرف، چاہے مولانا ابوبکر شیث ہوں یا مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ سب ہی علی گڑھ کی جدید فضا سے اس طرح متاثر ہوئے کہ "چیزی دیگر" بن کر طبقۂ علما میں ممتاز و نمایاں ہوئے اور انہی حضرات کے ذریعے علما کے طبقے میں بھی ایک فکری مدّو جزر عالم وجود میں آیا جس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ اگر سر سیدؒ صلح کی سنت کی پیروی نہ کرتے اور اپنے کالج کے دینیات کا نصاب تعلیم اور تعلیم علما کے ہاتھوں میں نہ دیتے، اگر علمائے کرام انگریزی خوانوں سے مل جل کر ان کے مسایل سے آگاہ نہ ہوتے تو وہ اُن انقلابی افکار کے حامل شاید ہی ہو پاتے جنہوں نے آگے چل کر دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے احساس کو عام کیا۔

غرض کہ سر سید احمد خاںؒ کی زندگی کا خواہ کسی بھی پہلو سے جائزہ لیا جائے یہ بات روز روشن کی طرح واضح نظر آئے گی کہ ان کا ہر ہر قدم سنت مبارکہ کی پیروی میں اٹھتا تھا، جس کی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے اُن کے مشن کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائی اور ان کا مدرسۃ العلوم مسلمانان ، برگ و بار لایا۔ سر سیدؒ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس سنتِ مبارکہ کی پیروی کی جائے جس کی پیروی کر کے ایک عبد ضعیف، مخالفوں میں گھرا ہوا انسان، بشریت کا پیکر، اس رتبۂ بلند تک پہنچا جس کی بہت سے لوگ تمنا کیا کرتے ہیں۔

مکتوب شیخ الجامعہ

SYED HASHIM ALI
VICE - CHANCELLOR

OFFICE 3934
RES 173

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH - 202001
U P INDIA

عزیزم پروفیسر اسرار احمد صاحب السلام علیکم

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ یومِ سرسید کے موقع پر پھر تہذیب الاخلاق کا خصوصی شمارہ مرتب کر کے شایع کر رہے ہیں۔ میں اس موقع پر اپنی قوم کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ ہم لوگ اکیسویں صدی کی طرف بڑی تیزی سے پیش قدمی کر رہے ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس پیش قدمی میں ہم مسلمانوں کا کتنا حصّہ ہے اور کس جوش، ولولہ، لگن، محنت، ہمت اور عزم کے ساتھ جہانِ تازہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہیں؟ جب اس نقطۂ نظر سے ہم اپنی قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو آثار کچھ زیادہ اچھے نظر نہیں آتے ہماری قوم میں اگر تعلیم ہے بھی تو ادھوری، نظر ہے بھی تو محدود، فکر نام کی کوئی چیز اگر ہے بھی تو سطحی، نہ سینوں میں آرزوؤں اور امنگوں کا تلاطم ہے نہ نگاہوں میں وہ ہیجان جو آنے والے انقلابی اقدام کا پتہ دیتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ ہم میں سے چند افراد نے علم کی بلندیوں کو چھو لیا ہے دینی اعتبار سے بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کے تقدس اور پاکیزگی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ دنیوی اعتبار سے بھی ہم میں سے چند افراد ایسے ایسے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جن کو مادی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کیا چند افراد کی ترقی، قوم کی ترقی کہی جا سکتی ہے؟ کیا چند افراد کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے سے ہماری قوم کے مسایل حل ہو گئے ہیں؟ کیا چند افراد کی پاکیزگی و تقدس کے اثر سے قوم کی اخلاقی حالت اس طرح کی ہو گئی ہے جس طرح کی خیر الامت کی ہونی چاہیئے؟ جب ہم اس طرح کے سوالات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم کو بہت کچھ حاصل کرنا ہے، بہت لمبا سفر کرنا ہے، مصائب و آلام کی پُر خار وادیوں سے گزرنا ہے، حصولِ منزل کی سعی و جہد میں اپنے تلووں کو لہو لہان کرنا ہے۔ تب کہیں جا کر ہم واقعی خیر الامت بن کر ایک صدی کو خیر باد کہتے ہوے دوسری صدی کو خوش آمدید کہہ سکیں گے۔

سرسیدؒ نے اپنے دور کے پُر پیچ حالات کا پامردی اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کی ترقی کے لیے ایک راستہ منتخب کیا جس پر وہ خود اور اُن کے ساتھی چلتے رہے۔ ان کے بعد حالات نے جب جب نئے رخ اختیار کیے تو اُن کے جانشینوں نے راستے میں تھوڑی بہت تبدیلی کی، اسی طرح پون صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا اور ہم عہدِ حاضر میں داخل ہو گئے۔ عہدِ حاضر نے ہم کو ایک بار پھر حالات کے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اس نازک موقع پر ہم کو انتہائی دانش مندی کے ساتھ صحیح اور سیدھے راستے کا انتخاب

کرنا ہوگا، یہ راستہ مفاہمت کا ہوگا ٹکراؤ کا نہیں، جد وجہد کا ہوگا فرار کا نہیں، دل سوزی و دردمندی کا ہوگا بے حسی کا نہیں، ہوش مندی کا ہوگا جوش پسندی کا نہیں۔ اگر ہم نے صحیح راستے کا انتخاب کرلیا، وقتی اور آپسی چھوٹی چھوٹی رقابتوں کا شکار نہ ہوئے تو ہم بھی انشاء اللہ اسی دل جمعی، اسی عزم وہمت اور اسی بلندیٔ نگاہ کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں جس طرح ہمارے دوسرے ہم وطن داخل ہوں گے لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب طلبا اپنے فرائض کو ادا کریں اور اساتذہ اپنے فرائض کو، معاشرہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو اور انتظامیہ اپنے فرائض سے۔ اگر فرائض کی عہدہ برائی میں کسی بھی طبقے کی طرف سے کوئی کوتاہی ہوگی تو اس کا اثر پوری قوم پر پڑے گا اور ہماری پیش رفت متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ اس لیے میں یوم سرسید کے موقع پر تہذیب الاخلاق کے ذریعے وابستگانِ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو پیغام دیتا ہوں کہ آئیے ہم سب شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم ہو کر اس سعی میں مصروف ہو جائیں کہ جب ہماری قوم اکیسویں صدی میں داخل ہو تو وہ کسی دوسری قوم کے مقابلے میں اپنے آپ کو عاجز و ناتواں یا حقیر نہ سمجھے۔
میں دست بہ دعا ہوں کہ خداوند تعالیٰ آپ اور آپ کے رفقا کی سعی کو سعیٔ جمیل بنائے اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے آپ لوگ سرسیدؒ کے مشن کو جس طرح آگے بڑھا رہے ہیں، اس میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے آمین

دعاگو

[signature]

۲۳ر ۹ر ۸۷ء

مکتوب نائب شیخ الجامعہ

Phones : Office : 6727/229 Uny. Exh.
Res. : 5471 & 3881 /340 „ „

PROF. WASIUR RAHMAN
PRO-VICE-CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202001
U. P., INDIA

محبّی پروفیسر اسرار احمد صاحب   السلام علیکم۔

یوم سرسیّد کے مبارک موقع پر میں تہذیب الاخلاق کے ذریعے علیگ برادری کے تمام افراد تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے منسلک ہو، اس بات کو کبھی فراموش نہ کرے کہ وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جس کو علم و عمل دونوں ہی میدانوں میں ابھی خاصی پیشرفت کرنی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی قربانی دینی ہو یا جو بھی ایثار کرنا ہو اس سے دریغ نہ کرے کیوں کہ قومیں ایثار و قربانی کے جذبے کے بغیر پیش رفت کی راہوں پر نہیں چلا کرتیں۔

میری دعا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کی کاوشیں پھلیں پھولیں اور تہذیب الاخلاق لوگوں بالخصوص نوجوان طلبہ میں مقبول ہو اور ایک چراغ سے دوسرے چراغ کے جلنے کا عمل قایم رہے۔

والسلام
مخلص
وصی الرحمٰن

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ - ش ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)

التماس

درباب تعلیم کے سید احمد خاں صدر الصدور غازی پور کیطرف سے ہندوستان کے رہنے والوں کی خدمت میں

درج ذیل سطور میں سر سیدؒ کی ایک نادر تحریر شائع کی جارہی ہے جو کلکتہ کے ایک ہفت روزہ "دوربین" کے ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس اخبار کا اجراء اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا تھا اور اس کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس کا نصف حصہ فارسی میں ہوتا اور نصف اردو میں۔ سر سیدؒ کی یہ تحریر اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب وہ غازی پور میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشاندہی مسز کلثوم ابوالبشر، استاد شعبۂ اردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کا شکر گزار ہے جنہوں نے زحمت فرماکر سر سیدؒ کی اس تحریر کو تلاش کیا اور نقل کر کے تہذیب الاخلاق میں اشاعت کیلئے ارسال فرمایا ــــ (ادارہ)

دنیا کے اس دور میں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، ہمارے ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے کہ جب ہم اس پر بلحاظ مضمون تعلیم کے نظر کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔ بایں ہمہ ہم کو اس کی توقع رکھنے کی قوی دلیل ہے۔ کیوں کہ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال سے ہمارے ہم وطن تعلیم کے ہونے کو امر عظیم جان کر خواب غفلت سے جاگ اٹھے ہیں۔ ہندوستانی رئیسوں کو لیجس لیف کونسل میں داخل ہونے کی اجازت ملی ہے۔ یہ بات انتظام مملکت کا ایک ایسا نکتہ ہے کہ گو بخوبی اس کا مقصد اعلیٰ بالفعل حاصل نہ ہو لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک نئے دور کا شروع ہے اے میرے ہم وطنو! ہم کو میزان تربیت میں گراں سنگ ہونے کے لیے نہایت بڑی کوشش کرنی چاہیے۔

لیکن اس نہایت قابل تمنا مطلب کے حاصل ہونے میں بہت سے ہرج در پیش ہیں۔ اس لیے جن لوگوں کو اپنے ملک کی بہتری میں کوشش کرنے کے لیے مال یا دل ہے ان لوگوں پر اور گورنمنٹ پر جو بلا شبہ اپنے رعایا کی بھلائی چاہتی ہے، ان حرجوں کی رفع کرنے میں کوشش کرنا بڑا فرض ہے، پھیلنا علم کا اپنے وطن کے خیر خواہ کو ایسا ہی خوش ہونے کی جگہ ہے جیسا کہ ..... ہے۔ پائیداری گورنمنٹ کا۔

اور اب ہم بالاجمال ان وسیلوں پر غور کریں جن سے قوموں کی دانائی اور علوم اور عقل مندی کے اقبال کو ترقی ہوتی ہے، اس امر عظیم الشان کے مطلب کے صحیح نتیجے کے دریافت کرنے کیلیے ان کو ان قوموں کے اگلے اور پچھلے حال پر نظر کرنی چاہیے جو آج کے دن فنون و علوم کی کھیتی میں سب سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہیں، جب کہ ہم اگلے زمانے اور حال کی تاریخ پر متوجہ ہوتے ہیں تو اُن کو بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس کی طبیعت میں دوسری قوم نے تخم ریزی نہ کی ہو اور اس نے علوم و فنون میں بزرگی اور عظمت حاصل

کی ہو، ایسے شخصوں یا قوموں کی چند مثالیں ہیں، جنھوں نے خود آپ ہی اپنی طبیعت سے کوئی فن یا علم ایجاد کیا یا اس کو تحقیق کیا اور پھر اس کو بر تر درجہ میں پہونچاتے گئے اور آخر کار اس کو کاملیت کی بلندی پر پہونچا دیا مگر عموماً ہم کو یہ دریافت ہوتا ہے کہ ایک قوم کسی بات کو تحقیق کرتی ہے اور دوسری قوم اس تحقیقات کو اس سے لیتی ہے اور پھر اپنی محنت اور استقلال سے اس کو کاملیت کے درجہ تک پہونچا دیتی ہے اور ہم اپنی قوم مسلمان پر متوجہ ہوں۔ پہلے زمانے میں ہم کو فلسفہ اور حکمت کا کوئی علم نہ تھا۔ اوّل ہم نے ان کو یونانیوں سے لیا اور اپنی ہمت اور استقلال سے ان کو اعلیٰ درجہ پر پہونچایا۔ جس کی شہادت ہمارے مصنفوں کی کتابیں دے رہی ہیں۔ ہندو اگرچہ قدیم سے علم میں ایک بڑا درجہ رکھتے ہیں، لیکن معتبر پرانی تاریخوں سے جو اب بھی موجود ہیں اور اے کاش کہ مدت تک وہ ہمارے پاس رہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو درجۂ افتخار صرف انھیں کی ذاتی قوا ہی سے حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اس سبب سے ہوا تھا کہ ان کو ایک ہمسایہ کی قوم سے جو ان کے شمال مغرب کی سرحد پر تھی بخوبی راہ و رسم حاصل تھی۔ اپنے ملک سے قطع نظر کرکے ہم کو صرف تاریخ انگلستان پر جو اس زمانے میں تربیت کا ملجا و ماوا ہے نظر کرنی چاہیے۔ اس غرض سے کہ ہم دریافت کر لیں کہ انگریزوں نے جو کچھ ان کو حاصل ہے، اوس کو انھوں نے خود آپ نہیں سیکھا ہے بلکہ علوم و فنون کا جو ان کو علم ہے وہ بہت سی صورتوں میں ان کو دوسری قوم سے حاصل ہوا ہے اور انھوں نے اپنی تیز فہمی اور مستقل محنت سے کاملیت کے نہایت اعلیٰ درجہ پر جس میں اب رہے ہیں پہونچا دیا ہے۔

غرض کہ قوموں کی دانائی کی ترقی کچھ تو خاص انھیں کی اور کچھ اور قوموں کی محنتوں اور کوششوں سے ہوتی ہے۔ قومیں بھی اسی طرح جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پاتے رہیں، اس طرح کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے اوروں کو دیں اور جو کچھ ان کے پاس نہیں ہے اوروں سے لیں۔ اسی اصول پر دنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد ہے بس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن اپنی . . . . کے موجودہ ذخیرہ میں اور کچھ نہ بڑھا دیں گے اور کاہلی اور سستی اور خود مطلبی اور ہم وطنوں کی خیر خواہی سے بے پرواہی کی حالت میں جس میں اب وہ دکھائی دیتے ہیں اور جس میں بدبختی سے وہ آپڑے ہیں . . . . . بدستور راضی رہیں گے اوس وقت تک اُن کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی۔ پس آؤ ہم مستعد ہو اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے لینے اور اُ[ن کو] بخوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھا دیں اس مردہ پنے کی کاہلی حالت میں سے نکلنے کو جس کی روز بروز ہم ترقی معلوم ہوتی ہے۔ ہر برس جو گز[رتا] ہے ایک نئی شکل پیدا کرتا ہے اور ہر برس وقت کو زیادہ کرتا ہے۔ ا[ے] مسلمانوں تم ہمیشہ سے مستعدی اور چالاکی اور ذہانت اور علم و فضل [میں] نامی ہو، اے ہندوؤں قدیم الایام سے مشکل مشکل علوم کے ایجا[د] میں مشہور ہو۔ اب تم دونوں کو کس بدبختی نے گھیرا ہے، جس سے تم ان بزرگوں کے ناموں کو بھی ڈبوتے ہو۔ ایک نہایت جہالت کا دھبہ اپنے پر لیتے ہو۔ جاگو اور ہوشیار ہو اور اس پر امن وقت کو اور ایک آزاد قو[م] کی حکومت کو غنیمت سمجھو اور اپنے بزرگوں کی طرح علوم و فنون کے حاصل کر[نے] میں مستعد ہو کر اپنے بزرگوں کے ناموں کو آفتاب کی مانند روشن کرو۔

ہمارے ہم وطنوں کے علم کی ترقی ہونے میں جو حرج ایسے ہیں کہ گورنم[نٹ] سے علاقہ رکھتے ہیں، اُن پر غور کرنا کسی اور موقع پر چھوڑتا ہوں۔ اس گفتگو میں صرف اس طریق کو بیان کروں گا جس سے ہمارے ہم وطن خود ان حرجوں کو رفع کر سکیں۔

ایک بڑا قدرتی حرج ترقی علم میں اختلاف زبان کا ہے۔ اگر یہ اختلا[ف] نہ ہوتا اور تمام قومیں ایک ہی زبان بولتیں اور ایک ہی زبان لکھتیں تو کیا کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے اس نہایت قابل اور مطلب کے حاصل کرنے میں اس حرج کا دور کرنا ایک بہت ہی ضروری امر ہے۔

بلاشبہ آج کے دن فنون اور علم کی کھیتی؟ اور ترقی کرنے میں انگریزوں نے تمام قوموں سے برتر درجہ حاصل کیا ہے اور ان کے وہاں تمام مضامین علمی پر خواہ اصل خواہ غیر زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں بکثرت موجود ہیں اس لیے ہم میں سے جس شخص نے انگریزی زبان کی صرف (الف۔ب) ہی نہ سیکھی ہو بلکہ اس زبان سے بخوبی واقف ہو تو وہ شخص اور سب لوگوں سے بڑھ کر (اگر وہ ایسا کرے) اپنے ہم وطن ہندوستانیوں میں علم کے بڑھانے اور تربیت کے پھیلانے میں مددگار ہونے کا نہایت فائدہ مند اور نہایت عمدہ موقع رکھتے ہیں۔ لیکن ایسے شخص گنے چنے ہیں اور ہمیشہ ایسے لوگ بمقابل کروڑوں آدمیوں کے جو کرۂ دنیا کے اس حصے میں

آباد ہیں نہایت تھوڑے ہوں گے اور گو چند شخصوں کے سبب اپنے مقدور اور موقع اور محنت کے انگریزی زبان کی مشکلات پر غالب آنے میں اور اس قدر لیاقت حاصل کرنے میں کہ باسانی پڑھنے اور سمجھنے میں قابلیت ہو لیکن جو فائدہ ان کو حاصل ہوتا ہے وہ سب کو نہیں پہونچتا۔ بس نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کُل ملک کو فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ انگریزی کتابیں آئندہ کو بھی سینکڑوں برس تک سب لوگوں کو میسر نہ ہوں گی۔ پس اس وقت کے آنے تک کیا ہم ان کتابوں کو سب لوگوں کے استعمال کے لایق کرنے میں مجہول اور سست پڑے رہیں اور کچھ ارادہ نہ کریں، نہیں اے میرے دوستوں اور اے میرے پیارے ہم وطنوں! ایسا چال چلنا ہم کو اور قوموں کی نظروں میں ذلیل کرے گا اور خود ہمارے حق میں نہایت مضر ہوگا۔ اگر وہ کتابیں ہم کو میسر نہیں ہو سکتیں تو ہم ہی کو اون کے ہم پہونچانے میں کوشش کرنی چاہیے اور اگر وہ کتابیں اپنی موجودہ حالت میں ہمارے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں تو ہم کو جدّو جہد کرنی چاہیے اور کوئی ایسا بندوبست کرنا چاہیے جس سے وہ ہمارے سمجھنے کے قابل ہو جاویں۔ علاوہ اس کے اس بات پر غور کرو کہ ہمارے بہت سے عالم مصنفوں کی کتابیں جو کسی زمانے میں کیسے نامی تھے روز بروز معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ پس اس طرح ہر علم کے عمدہ ذخیرے جن کو ہمارے بزرگوں نے جمع کیا اور تحصیل کیا، ہماری کاہلی اور غفلت سے رفتہ رفتہ نسیاً منسیاً ہوتے جاتے ہیں اور وہ دن بہت دور نہیں ہیں کہ اگر ہم اُن کے بچانے میں کوشش نہ کریں تو پھر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گی! ایسے بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالنے اور ہمارے ہم وطنوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک سوسیئٹی (سوسائٹی) کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوگا، اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا دوسرے انگریزی زبان سے اور اور زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لیے مفید ہوں۔

آگے جو بیان ہوتا ہے وہ ایک مختصر کیفیت ہے اس طریق کی جس طرح سوسیٹی کا انتظام ہوگا۔

۱۔ سوسیٹی کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے گی

۲۔ ہندوستان میں ہندوؤں میں سے پنڈت اور اکثر مسلمان بہت کر ایک ہی زبان پڑھتے اور سمجھتے ہیں، یعنی وہ زبان جس میں اُن کی مذہبی کتابیں لکھی ہوئی ہیں، اس لیے اور قوموں کے علم سے ان کو فائدہ پہونچانے کے لیے یہ تجویز ہوتی ہے کہ چار مختلف زبانوں، یعنی ہندی، اردو، فارسی، عربی میں کتابوں کا ترجمہ کر کر کے چھاپہ ہوا کریں لیکن اس صورت میں کہ ممبر کمیٹی کسی خاص وجہ سے ان کا چھپنا ایک ہی زبان میں مطلب حاصل ہونے کو کافی سمجھیں۔

۳۔ اس کے لیے ایک منیجر اعظم مقرر کیا جاوے گا، جس کا جائے مقام اس مقام پر ہو جس جگہ سوسیٹی کا مقام مقرر کیا جاوے گا۔

۴۔ ایک سررشتہ سوسیٹی کے حساب کے جانچنے کے لیے بھی بنایا جاوے گا۔

۵۔ آنریری ممبر بھی سوسیٹی میں مقرر کیے جاویں گے جن میں سے ایک صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن موجودہ وقت ہوا کریں گے۔ ان کی رائے خاص کر بلحاظ اُن کتابوں کے جو انگریزی سے ترجمہ ہو کر چھاپی جاویں لے جاوے گی۔

۶۔ ممبروں کو دو روپیہ ماہواری بطور چندہ دینا پڑے گا مگر آنریری ممبروں کو کچھ چندہ دینا نہ پڑے گا۔

۷۔ کسی قسم کی مذہبی کتاب نہیں چھاپی جاوے گی۔

۸۔ جملہ ممبروں کو ایک کتاب جو چھپے گی بلاقیمت ملے گی اور باقی نسخے اُس کے فروخت کیے جاویں گے۔

۹ جو کچھ آمدنی ہوگی وہ سوسیٹی کے کاروبار میں صرف کی جاوے گی۔

۱۰ آمدنی میں سے ممبروں کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔

۱۱۔ ہر سال کا چندہ سوسیٹی کے کاروبار چلنے اور ضروری خرچوں کے لیے پیشگی دینا ہوا کرے گا۔

۱۲ صاحب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی مرضی اور اجازت سے جو کتابیں انگریزی زبان کی سرکاری مدرسوں میں پڑھائی

جاتی ہیں، ان کو سلسلہ وار ترجمہ کیا جاوے گا۔

۱۴۔ ممبروں کے انتخاب کرنے میں کسی طرح کا امتیاز ذات یا مذہب یا وطن کا نہ ہوگا۔

پس مجھے یقین ہے کہ یہ سوسَیٹی اس طرح بہت سے علموں کے پھیلانے کا وسیلہ ہوگی، لیکن یہ سوسَیٹی بہت سے لوگوں کی مدد اور شرکت کے بغیر قایم نہیں ہو سکتی، اس لیے میں تمام لوگوں کے ملاحظہ کے لیے اس امر کو پیش کرتا ہوں، اور آرزو کرتا ہوں کہ جن صاحبوں کو یہ تدبیر پسند آوے وہ اس سال کے ختم ہونے سے پیشتر اپنے ناموں سے ممبر ہونے کے لیے مطلع فرمادیں، تاکہ میں یہ بات دریافت کرسکوں کہ آیا سوسائٹی قایم ہونے کے واسطے کافی وسیلہ حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں اور

پھر نہایت شوق سے میں اس کو اپنے ہم وطنوں میں سے بالتخصیص ایسے صاحبوں کے سامنے پیش کروں گا جو اپنے ملک میں اسی طرح ہر ترقی کا ہونا چاہتے ہیں۔ جیسے اور ملکوں میں ہوئی ہے اور نیز ان صاحبان انگریز کو اطلاع دوں گا جن کو اس ملک کی بھلائی منظور ہے۔ اس نظر سے کہ اس ملک کے کروڑوں آدمیوں کو یورپ کے روشن ضمیر خیالات اور عمدہ تحریروں کا فائدہ پہونچے۔ اس بات کی بھی بکمال شوق تمام رئیسوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس امر کو اپنے تمام دوستوں اور ملاقاتیوں میں مشہور کریں اور ہندوستانی اور انگریزی اخباروں کے صاحب ایڈیٹر سے یہ درخواست ہے کہ اپنے اپنے اخباروں میں اطلاع عام کے لیے اس اشتہار کو جگہ دیویں۔

(اس مقالے میں جہاں جہاں نقوط ہیں وہ اخبار کی ناصاف طباعت کی وجہ سے پڑھے نہ جاسکے)

مکتوب سر سید بنام مولوی محمد مظہر اللہ مچھلی شہری

بشکریہ جناب افضال الرحمٰن صاحب

ہم جیتے ہیں یا مر گئے

الطاف حسین حالی

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ

"کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بیکار رہنا مردوں کو"۔ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے

اَیَّتُھا النفسُ اجملی جزعا + ان الذی تحذرین قد وقعا

[اے دل اپنی بے قراری کو کم کر کیونکہ جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی]

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اس کے افراد میں عموماً مستعدی محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے، جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے۔ لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اُس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحر قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا آج بحر منجمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔ ہم کو اپنے تنزل کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔

امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں ہم رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا ہونی چاہیے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چوا جائے۔

ہم توکل کو اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لیے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لیے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتلاتے ہیں مگر نہ اس لیے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس حیلہ جو لومڑی کی [illegible] انگور کے خوشوں سے اس لیے ناک

نہیں چڑھاتے کہ اُن کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں۔ ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے۔ ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت عملی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں۔

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم و بیش مصنف لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں، ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت اُن کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم (جو پریکٹیکل آدمی [عملی یعنی کام کرنے والے اشخاص] پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے) چشم بد دور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سیلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کیے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لیے اِدھر اُدھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگرداں و پریشان رہیں۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی میں منحصر جانتے ہیں۔ ان میں اور ایک غریب اورینٹل اسکالر (عربی یا فارسی کے عالم) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو چار ناچار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑتا ہے، ان کی مثال بعینہٖ اس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لیے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

مگر وہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری اُن کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیے جاتے تو کچھ کام بھی آتے، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے نہ اُن کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور رفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کرکے اپنی واقفیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں، کمال ادب سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کے ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمہ ہیں اُن پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پاکر آئے ہیں اور اس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حبِّ وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سایہ میں پرورش پاتا ہے مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

جب وطن اور قومی ہمدردی ان میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے، قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور

ہدوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے۔ جس حقارت
ے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ اُن سے بھی زیادہ حقارت کی
نامے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز اُن کو ہاف سویلائزڈ
نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ اُن کو اَن سویلائزڈ (وحشیٔ مطلق) کا خطاب دیتے
ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لیے اُن
کی بھلائی کے لیے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش
کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں
یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے ابال
سے بھی زیادہ خود بخود اُٹھتا ہے۔

کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن محض قوم
کی بھلائی کے لیے منعقد کرتے ہیں۔

کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم
کرتے ہیں۔

کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر اور کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لیے
کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کی محرک جہاں تک ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت
خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور اُن کا یہی ارادہ
ہوتا ہے کہ تادم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور اُن کو ترقی دیں
گے مگر در حقیقت ان کی حرکت ایک حرکت مذبوحی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی
دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ (الاماشاء
اللہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ
نہیں کر سکتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوتِ عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھ دار آدمی موجود ہیں جو پرانی
بیہودہ رسموں کو بُرا جانتے ہیں۔ شادی اور غمی میں جو بیدریغ روپیہ صرف
ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ
ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں، ان پر نہایت
افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں۔ مگر جب ویسا ہی موقع خود اُن کو پیش آتا
ہے تو آنکھیں بند کر کے اسی اندھے کوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں

اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت
ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب
اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص
کے لیے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں
مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا
وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں
باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیٔ معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان
ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں
بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں، اگر اپنے پاس کافی سرمایہ
نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں۔ لیکن سوا ان لوگوں
کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دوالہ
نکالتے ہیں، مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام
نہیں لیتے۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صیغۂ تعمیرات سرکاری میں
ٹھیکہ لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں
دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے اور اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان
اس کے سہارے پر فکر معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے
ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اُس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک
جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ مرغی اپنی جان
سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم میں قوتِ عمل
باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں
میں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ
اس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرتِ
رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے
تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں لیکن آج تک کانفرنس کی
ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا۔ بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل

میں شرمندہ ہوں لیڈ کانفرنس کی کارروائیوں پر نفریں کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتلاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح اُن میں قوتِ عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں اُن کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتلاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے ہم کو صرف وہاں کی فکر کرنی چاہیے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں ان میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو رداءتِ مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابلِ علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لیے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رایگاں خیال کرتے ہیں پہلے اس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لیے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ کر نہیں سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیوں کہ ؎

این شکم بے ہنر پیچ پیچ صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لیے خود نمونہ بن کر اس کو ترقی کی طرف مائل کریں۔ مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں اُن کو نظر آئیں صرف ان کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود اُن کو ترک کر کے قوم کے لیے ایک مثال قایم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسے دوکانداری یا صنعت و دست کاری اُن کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں، ان پر خود دکاندار بن قوم میں تجارت کا چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھ تاکہ اور لوگ بھی اُن کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے غرض ہر طرح کی کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہیے وہ اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لیے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بیکار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولوالعزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو قومی ترقی کا خیال ہے ان کو غور کرنا چاہیے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہیے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی، اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

بالفعل ہم اس مضمون کو یہیں ختم کر دیتے ہیں لیکن آئندہ ہم بتائیں گے کہ مسلمانوں میں عام سکون و انجماد کہاں سے آیا ہے؟ اور ان کے قوائے عملیہ کیوں معطل و بیکار ہو گئے ہیں؟ اس کے بعد ہم اپنی سمجھ کے موافق کسی موقع پر یہ بھی بیان کریں گے کہ وہ کون سی تدبیریں ہیں جن سے ہماری آئندہ نسلوں میں ایکٹوٹی (Activity) پیدا ہونے کی امید ہو اور ان کے قوائے عملیہ از سر نو شگفتہ و شاداب ہو سکیں۔

قومی عزّت

محسن الملک

ہم اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ کسی اگلے زمانے میں مسلمان علوم کے عالم اور فنون کے ماہر تھے اور تہذیب اور شائستگی اور انسانیت کو بذریعہ تعلیم و تعلّم کے انہوں نے بخوبی حاصل کیا تھا لیکن اب اُن کو غور کرنا چاہیے کہ آیا فقط اس بات کا ثابت کر دینا ہماری عزت کے لیے کافی ہے یا ہم کو اس پر فخر و ناز کرنا زیبا ہے یا دوسری قوموں کی نظروں میں یہی امر ہماری عزت کے لیے بس ہے یا تہذیب و شائستگی پر ہمارے یہی ثبوت کافی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ہم اپنی عزت کے ثبوت میں موٹی موٹی کتابیں لکھ دیں اور تمام دنیا کی قوموں کے اچھے اچھے نامی آدمیوں کی سند سے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیں لیکن حقیقت میں یہ کافی نہیں ہے بلکہ ہماری حالتِ موجودہ ہی عزت اور ذلت کی باعث ہے۔ اس لیے ہم کو اپنی حالت موجودہ پر نظر کرنی چاہیے کہ آیا آج ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس امر کے لیے ہمیں اپنی ملکی اور قومی تعلیم پر لحاظ کرنا چاہیے کیوں کہ علم ہی عزت اور ذلت کی کسوٹی ہے۔ پس اگر ہماری تعلیم آج کل اور قوموں سے بہتر ہو اور دنیا کے اور ملکوں کے رہنے والے ہمارے علوم کی قدر و منزلت کرتے ہوں اور ہمارے ملک سے علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہوں تو بے شک ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ملکی فخر اور قومی عزت کا ہم کو نام لینا بھی زیبا نہیں۔

ہم کو اپنی قومی عزت ظاہر کرنے کے لیے اتنی بات ثابت کر دینا ہی کافی نہیں ہے کہ جو علوم ہمارے بزرگوں نے نکالے یا اور قوموں سے لے کر اپنے ہاں جاری کیے تھے وہ ہم میں جاری ہیں۔ اور جن علوم و فنون کی اُن کے زمانے میں تعلیم ہوتی تھی وہی ہماری قوم میں رائج ہیں۔ کیوں کہ عزت اور ذلت اور ترقی اور تنزل امور اضافی ہیں۔ ان کا اطلاق بہ لحاظ حالاتِ زمانہ کے ہوتا ہے۔ پس ہمارے بزرگوں کو علوم و فنون کے سبب سے جو عزت تھی وہ اس زمانے کے موافق تھی۔ کیونکہ جو علوم و فنون اس وقت اور قوموں میں جاری تھے ان سب کو انہوں نے سیکھا اور علم و ہنر کے خزانے جو اور ملکوں میں گڑے ہوئے تھے اُن پر رسائی حاصل کی اور جو پُرانے جواہر تھے ان کی جلاکاری کی اور اُن کو تراش و خراش سے جگمگا کر خوبصورت بنایا اور پھر بہت سے بیش قیمت علم کے نئے جواہر خود تلاش کیے۔ آخر اُن کا خزانہ علوم و فنون کا ایسے شاہوار موتیوں اور نایاب جواہر سے بھر گیا جن سے اور قوموں کے خزانے خالی تھے۔ لیکن چوں کہ اب ہمارے زمانے میں علم و ہنر کو اور قوموں نے نہایت ترقی پر پہنچایا اور علوم و فنون کے نورانی چہرے سے پردہ اور حجاب اُٹھا دیا ہے اور اس دریائے ناپیدا کنار میں سے اور بہت سے نئے نئے اور عمدہ عمدہ موتی و جواہر ڈھونڈ کر نکالے ہیں پس اگر ہمارے علوم و فنون ان سے بڑھ کر ہوں اور ہمارے ملک اور قوم کے لوگ علوم و فنون میں اور قوموں پر فائق ہوں تو بے شک آج ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے لیکن چوں کہ یقینی معلوم ہے کہ بمقابل یورپ کے یہ فخر و عزت ہمارے ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ آیا مثل اُن کے علوم و فنون میں ہم کو دستگاہ بھی ہے یا نہیں اور جو صورت تعلیم کی اس ملک میں ہے وہ ہمارے ملک میں بھی ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہو تب بھی برابری کا دعویٰ ہم کر سکتے ہیں لیکن جب ہم اپنی ملکی تعلیم پر لحاظ کرتے ہیں اور اپنے ہاں کے علوم و فنون پر نظر کرتے ہیں تو ملکی فخر و عزت کا دعویٰ کرنا کیسا اپنی جہالت اور نادانی کا خیال سے اور اپنی بے تہذیبی کے لحاظ سے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ طبیعت بے اختیار چاہتی ہے کہ کاش ہم اس ملک سے منسوب نہ ہوں اور ہم کو

کوئی اس قوم سے نسبت نہ کرے۔ کیوں کہ ہم بجائے اس کے کہ کچھ پیدا کرتے اپنے بزرگوں کی کمائی ہوئی دولت کو کھو بیٹھے اور علم کی دولت میں ترقی کرنے کے بدلے بزرگوں کے پیدا کیے ہوئے سرمایہ کو بھی ہم نے ضایع کر دیا۔ ایسی غفلت کی نیند میں سوئے کہ ہمارے بزرگوں کے سرمایہ کو اور لوگ لوٹ لے گئے اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے اور دنیا کی اور اقبال مند قومیں تو علوم و فنون میں اعلیٰ درجے کی ترقی کر گئیں اور ہم ذلت اور نکبت کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔ پس اب ہم کو اپنی ذلت کی حالت پر رونا چاہیے نہ کہ اپنے بزرگوں کے ناموں پر مغرور ہونا۔

یہ ملکی ذلت اگرچہ نہایت قابل افسوس کے ہے مگر جب سلسلہ کلام کا قومی ذلت پر پہنچتا ہے اور خاص مسلمانوں کی تعلیم پر نظر کی جاتی ہے تو نہ زبان سے کچھ کہا جاتا ہے نہ قلم سے کچھ لکھا جاتا ہے کیوں کہ اور قومیں ہمارے ملک کی کچھ کچھ خواب غفلت سے بیدار ہوتی جاتی ہیں اور تعلیم اور تربیت پر اپنی مستعدی ظاہر کرتی ہیں گو ان کو اب تک کچھ کامل ترقی نہیں ہوئی۔ مگر بعض بعض قوموں کے آثار نیک نظر آتے ہیں اور اُن کی عزت اور بہتری کے سامان دکھلائی دیتے ہیں مگر مسلمانوں کے حال پر افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ ان کی آنکھوں میں غفلت کی نیند ویسی ہی بھری ہوئی ہے اور ان کے چونکنے اور جاگنے کی کوئی نشانی اب تک دیکھنے میں نہیں آتی کیسے افسوس کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ آج کیمبرج یونیورسٹی کے موافق مسلمانوں کا کوئی عربی مدرسہ علوم کا دلی میں ہوتا یا مثل آکسفورڈ یونیورسٹی کے ہماری تربیت کے لیے کوئی دار العلوم لکھنؤ میں ہوتا اور جو علوم و فنون ان یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان کے ذریعے سے سکھائے جاتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے مدرسوں میں بھی بذریعہ عربی یا دیسی زبان کے تعلیم دیے جاتے کوئی چھوٹا سا مکتب بھی تو نظر نہیں آتا جس میں کسی قسم کے علم و فن کی تعلیم ہوتی ہو اور کسی شہر میں ایک بھی مقام تو ایسا سننے میں نہیں آتا جہاں کچھ بھی تہذیب و شائستگی کی باتیں سکھائی جاتی ہوں۔

اگر ہم عربی یا دیسی زبان سے بھی قطع نظر کریں اور اپنے بھائیوں کو اس لائق بھی نہ جانیں لیکن اس غفلت کی کیا انتہا ہے کہ جو مدرسے گورنمنٹ نے ہماری تعلیم کے لیے جاری کیے اور جن میں علوم و فنون کی تعلیم ہمارے ملک کے فائدے کے لیے شروع کی ان میں بھی ہماری قوم کے آدمیوں کی صورتیں کم ہی دکھائی دیتی ہیں اور مسلمان لڑکے تعلیم کے لیے بہت ہی تھوڑے جاتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ ہم مسلمانوں کو اب علوم و فنون کے ایجاد کرنے کی قوت اور کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے موافق علوم کے مدرسے جاری کرنے کی قدرت باقی نہیں رہی بلکہ کسی ادنےٰ درجے کی تعلیم کے واسطے بھی ابتدائی مدارس کے مقرر کرنے کی ہمت نہیں ہے لیکن وہ کون سی چیز ہے جو سرکاری کالجوں اور گورنمنٹ اسکولوں میں جانے کے لیے مسلمانوں کے لڑکوں کے پاؤں کی زنجیر ہے اور وہ کون سی بات ہے جو ان کو اس ابتدائی تعلیم کے حاصل کرنے کی مانع ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ سب کے سب آنکھ پر پردہ غفلت کا ڈالے ہوئے اور منھ پر خاموشی کی مہر لگائے بیٹھے ہیں۔ نہ کسی کے دل میں تعلیم کے موانع کا خیال آتا ہے نہ کوئی زبان اپنی اس علمی تنزلات کے اسباب بیان کرنے کے لیے کھولتا ہے۔ سب کے سب چپ چاپ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک عبقری کے پوری طرح پروان چڑھنے
میں ننانوے فیصد اس کی عرق ریزی کا ہاتھ
ہوتا ہے اور صرف ایک فیصد انسپریشن کا۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ۔ ش ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)

تہذیب و شائستگی

وقار الملک

ہمارے زمانے میں شائستگی اور تہذیب پر بہت بحث ہو رہی ہے اور مسلمانوں میں اس کی نسبت ایک گرم مباحثہ قایم ہے اور لوگوں کی مختلف رائیں ہو رہی ہیں۔ کوئی طرز لباس کو شائستگی پر بہت کچھ موثر سمجھتا ہے اور کوئی کھانا کھانے کے طریقوں کی تبدیلی کرنا چاہتا ہے۔ کسی کو ایک بات مہذب اور شائستہ معلوم ہوتی ہے، دوسرا اُسی کو نامہذب و ناشائستہ ٹھہراتا ہے۔ کوئی اپنی گھیتلی جوتی اور جبہ و دستار میں خوش ہے کہ شائستگی راہمچنیں شاید۔ کوئی انگریزی بوٹ چڑھائے اپنے کوٹ و پتلون پر غش ہے کہ تہذیب ہمیں یک معنیٰ وارد۔ مگر میری دانست میں یہ سب قصے اور بکھیڑے ہیں اور اصل شائستگی خیال کی شائستگی ہے۔

تہذیب و شائستگی کا عمدہ اور اعلےٰ منشا یہ ہے کہ انسان اس طرح اپنی زندگی بسر کرے جس سے اپنی ذات بھی ہمیشہ آرام اور خوشی اور تندرستی کے ساتھ رہے اور دوسرے کو بھی اس سے فائدہ پہنچے اور ایسے وسیلے بہم پہنچائے جاویں جن سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آنا سہل اور ہر قسم کی خوشی اور راحت حاصل ہونا آسان ہو جاوے پس جس انسان کے دماغ میں ایسی قوت ہو کہ وہ ان تمام باتوں پر قادر ہو سکے اسی کو ہم شائستہ کہہ سکتے ہیں اور اسی کا نام خیال کی شائستگی ہے باقی وہ امور جو طرز معاشرت اور طریق تمدن سے علاقہ رکھتے ہیں وہ انسان کی بسر زندگانی کے ایسے خارجی اسباب ہیں جن پر ایک شائستہ اور مہذب آدمی ملک کے مختلف موسموں اور آب و ہوا وغیرہ کے لحاظ سے اس بات پر غور کر سکتا ہے کہ ان امور میں سے کس امر سے مجھ کو آرام ملے گا اور کس سے میں بخوبی تندرست رہ سکتا ہوں اور کون سی چیز میری خوشی کو بڑھا سکتی ہے اور میرا کون سا کام دوسروں کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور یہ جو رائے قایم ہو اس پر ہر عاقل انسان کو عمل کرنے کا حق ہے۔ لیکن خیال کی شائستگی اور دوستی سے پہلے اُن امور میں سے کسی کو تقلیداً اختیار کرنا اور کسی کو ترک کرنا انسان کو شائستہ نہیں بنا سکتا۔

جس آدمی کا خیال شائستہ ہے اس کے تمام کام خود بخود ایسی عمدہ ترتیب سے انجام پاتے ہیں جس سے وہ تمام خوشیاں اور آرام جو تہذیب و شائستگی کا نتیجہ ہیں بالضرور حاصل ہوں۔ نامہذب آدمی کے تمام کام ہمیشہ بے ترتیب ہوتے ہیں جن سے زندگی اور تلخ ہو۔ مہذب آدمی کی مثال بالکل انسان کی تندرستی کی سی ہے۔ جب تک انسان تندرست ہوتا ہے اس کے تمام اعضا اپنے اپنے موقع سے وہ تمام کام خود بخود کرتے رہتے ہیں جو انسان کی راحت اور خوشی بڑھانے کا ذریعہ ہوں اور رنجوں اور تکلیفوں کو دور کریں، جن آدمیوں کا خیال شائستہ نہیں ہوا ہے اور وہ کسی شائستہ اور مہذب قوم کی چند رسموں اور دستوروں کی تقلید ہی کو شائستگی سمجھتے ہیں اُن کی مثال بالکل ایک ایسے مریض کی سی ہے جو تندرستوں کی سی حرکتیں کرنا چاہتا ہو۔ مگر کسی طرح اس مریض کی یہ حرکتیں ایک تندرست آدمی کے کاموں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے ابھی خیال شائستہ نہیں ہوئے اُن کے بعض تقلیدی طریقے اُن کو مہذب اور شائستہ نہیں کر سکتے۔

پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ سب سے پہلے اپنے خیالات کو عمدہ کریں اور اگر ان کے خیال عمدہ ہو گئے تو سب ہی قسم کی ترقیاں خود بخود اُن میں ہو جاویں گی ورنہ تقلیدی شائستگی سے کچھ کام نہیں چل سکتا۔ کبھی ایک ٹہنی سے پھولوں کے کھلنے کی توقع نہیں ہو سکتی جس کا سلسلہ ایک مستحکم جڑ تک نہیں پہونچتا گو دیکھنے والوں کی نظروں میں وہ کیسی ہی سر سبز اور شاداب معلوم ہوتی ہو۔

اور خیالات اس وقت تک عمدہ نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے

خیالات سے معاوضہ نہ کیا جاوے جس طرح مال و دولت پھیر بدل سے بڑھتا ہے
اسی طرح خیالات کی بھی ترقی ہوتی ہے۔ جب آدمی تعصب کو چھوڑ کر دوسروں
کی رائے اور دوسروں کے خیال پر غور کرتا ہے اور اپنے خیالات سے دوسروں
کو مطلع کرتا ہے۔ پھر دونوں رایوں اور دونوں خیالوں کا باہم مقابلہ ہوتا
ہے اور ایک خیال صحیح اور دوسرا خیال غلط یا ایک کامل اور دوسرا لائق
اصلاح معلوم ہونے لگتا ہے، تب رفتہ رفتہ انسان کا خیال ترقی کرنے لگتا
ہے اور جب یہ ترقی کامل ہوجاتی ہے تو انسان مہذب اور شائستہ کہلانے
کا مستحق ہوتا ہے۔

انسان کے خیال کی ترقی بالکل اس طرح سے ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص درجہ
بدرجہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اور کسی بلند زینے کو طے کرتا ہے۔ فرق صرف یہ
ہے کہ زینہ کو طے کرتے وقت انسان خود بھی دیکھتا جاتا ہے کہ کس قدر دوری میں
طے کر چکا ہوں اور کس قدر دوری ابھی باقی ہے۔ خیال کی ترقی میں انسان
کو خود اچھی طرح معلوم نہیں ہوتا کہ میں نے کس قدر ترقی کی لیکن دیکھنے والوں
کو معلوم ہوجاتا ہے۔

انسان ایک وقت میں ایک عمدہ اور نہایت عمدہ کام کو اس
قدر بُرا جانتا ہے اور اپنے نزدیک اس کی برائی کا ایسا قطعی فیصلہ کرلیتا
ہے کہ اس رائے کے برخلاف تذکرہ کرنا بھی فضول سمجھتا ہے۔ خیال کی یہ
حالت اس وقت ہوتی ہے جب تک وہ ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھتا۔
مگر جب ایسی گفتگوئیں اس کے سامنے برابر جاری رہتی ہیں تو یہ شخص
اُن کو سن سن کر پیچ و تاب کھاتا ہے اور اپنی مخالف رایوں کو رد کرنے لگتا
ہے۔ بہت سے دلایل اپنے خیال کی تائید میں پیدا کرتا ہے اور بڑی جد و
جہد سے اپنی مخالف رایوں کے جواب دینے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہ حالت خیال
کی ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔

جب کوئی آدمی اس سیڑھی پر چڑھ گیا تو اب وہ ایک ایسے مباحثہ
میں پڑا جہاں بالضرورت موافق اور مخالف رائیں اس کو دیکھنی پڑتی ہیں۔ کچھ
عرصے تک وہ پہلی ہی سیڑھی پر قدم مضبوط گاڑے ہوئے کھڑا رہتا ہے۔ مگر
آخر کار اس کا خیال اس بات پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کون
سی صحیح ہے اور کون سی غلط۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی دوسری سیڑھی ہے۔
سچائی کا یہ ذاتی وصف ہے کہ اگر انسان اس پر بغیر کسی تعصب کے غور
کرتا ہے تو بیشک اس کو سچائی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اگر
سخت سے سخت تعصب کے ساتھ بھی کسی بات پر برابر غور اور مباحثہ جاری رہے
تو بھی ایک نہ ایک دن سچائی غالب ہوہی رہے گی مگر بہت دیر کے بعد۔ پس جن
رایوں پر انسان دوسری سیڑھی پر کھڑا ہوا غور کرتا ہے اگر ان میں سے وہ رائے
جن کو پہلے وہ بُرا جانتا تھا درحقیقت صحیح ہوتی ہے تو بلاشبہ انسان اس کو اپنی استعداد
کے موافق خواہ جلد خواہ بدیر قبول کرلیتا ہے اور یہاں وہ اِنَّمَا یَسْتَجِیبُ الَّذِینَ
یَسْمَعُونَ کا مصداق بنتا ہے۔ یعنی بات کو وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔
یہ حالت خیال کی ترقی کی تیسری سیڑھی ہے۔

اس سیڑھی پر پہنچ کر آدمی اس رائے کو جس کے برخلاف ایک دن
گفتگو تک کرنا فضول خیال کرتا تھا اب غلط سمجھنے لگتا ہے اور کچھ مدت تک
وہ اسی تیسری سیڑھی پر کھڑا رہتا ہے۔ وہ اوروں کو چوتھی سیڑھی پر چڑھتے
ہوئے دیکھتا ہے مگر خود ارادہ نہیں کرتا وہ اپنے ساتھیوں کو ایک کام کرتے
ہوئے دیکھتا ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کرچکا ہے مگر اس پر عمل کرنے کو وہ
اچھا نہیں جانتا۔ وہ اہل کتاب کے ساتھ مواکلت کو اب بُرا نہیں جانتا، اس
کو مستحق عذاب الٰہی نہیں سمجھتا اور آخر کار اس کی منفعتوں کا بھی اقرار
کرنے لگتا ہے مگر نہ آپ اس کے کرنے کی جرأت رکھتا ہے، نہ دوسروں
کے اس عمل کو پسند کرتا ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہ چوتھی سیڑھی پر چڑھتا
ہے۔ یہاں بھی وہ اس کام کو اختیار نہیں کرتا جس کو خود اچھا جان چکا ہے
مگر اتنا فرق ہوجاتا ہے کہ یہاں پہنچ کر وہ دوسروں کو بھی اُس کام کی
وجہ سے بُرا نہیں سمجھتا، اُن کو ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جو حقارت اور
نفرت اس کے دل میں اس کام کے اختیار کرنے کے سبب سے اوروں کی
طرف ہوتی ہے وہ اب باقی نہیں رہتی۔ ہمارے بعض دوستوں کا قول
ہے کہ جن لوگوں کے خیال کی ترقی اس چوتھے درجے تک ہوجاتی ہے، وہ
تہذیب و شائستگی کی یونیورسٹی یا دارالعلوم میں داخلہ کا امتحان
پاس کرلیتے ہیں۔

اس کے بعد جب آدمی دوسروں کو وہ کام کرتے ہوئے
دیکھتا ہے جس کا مفید ہونا اس کو تسلیم ہے اور اُن کا وہ فعل اس کو
ناگوار بھی نہیں معلوم ہوتا تو تھوڑی دیر دم لے کر اب وہ پانچویں سیڑھی
پر آتا ہے۔ یہاں وہ اس تردد میں پڑتا ہے کہ میں بھی اس کام کو کروں

یا نہ کروں دوسروں کو مفید مفید کام کرتے ہوئے دیکھ کر جی چاہتا ہے تا
ہے مگر جرأت نہیں پڑتی۔ عقل بالکل آگے چلنے کی رغبت دلاتی ہے۔ مگر مصلحت[1]
دامن نہیں چھوڑتی۔ اس پانچویں سیڑھی پر بڑی بے چینی سے گزرتی ہے صبح
کو ارادہ ہوتا ہے کہ آج تو مسلمان ہونا ہی چاہیے مگر شام پھر ویسی ہی
تاریک آتی ہے جیسی کہ گزری ہوئی شام تھی شام کو یہ قصہ ہوتا ہے کہ کل ہر چہ
بادا باد۔ مگر صبح کو آفتاب کا قہرناک چہرہ پھر ویسی ہی ہیبت طاری کر دیتا
ہے جیسی کل تھی۔

لیکن آخر کار ہمت مرداں مدد خدا ایک دن یہ مشکل مقام بھی طے
ہو جاتا ہے اور خدا کا نام لے کر آدمی اُن کاموں کو خود کرنے لگتا ہے
جن کو وہ ایک دن نادانی اور ناسمجھی سے بُرا سمجھتا تھا اور اب بہت سے مباحثوں
اور گفتگوؤں اور غور و تامل کے بعد اُن کو نہ صرف بُرائی سے بری خیال
کرتا ہے بلکہ ان کے مفید اور نہایت مفید ہونے پر کامل یقین کر لیتا
ہے۔ یہ حالت انسان کے خیال کی ترقی کی چھٹی سیڑھی ہے۔

اس سیڑھی پر قدم رکھتے ہی آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ زینہ
ختم ہو گیا اور اب وہ ایک ایسے بلند اور خوش فضا سطح پر پہنچ جاتا ہے جس کی
خوبیاں بیان سے باہر ہیں اور ہر ایک سیڑھی پر جتنی جتنی دیر ٹھہرنے کا اتفاق
ہوا تھا اُس پر افسوس کرتا ہے۔ اب وہ دیکھتا ہے کہ اُس نہایت ہی دلکش
میدان میں جا بجا صاف اور شیریں چشمے اور نہریں جاری ہیں۔ سبزہ نے تمام
میدان پر فرش زمردیں بچھا دیا ہے۔ مختلف قسم کے پھول اور پودے اور
درخت جُدا جُدا لطف دکھلا رہے ہیں۔ مرغان خوش الحان اپنی اپنی بولیوں
میں اپنے پروردگار کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہاں اگر کوئی ناہموار مقام بھی
ہے تو نہایت ہی دلچسپ دکھائی دیتا ہے اور وسط میں ایک چشمے کے کنارے
پر نہایت خوبصورت ایک مینار ہے اور اس پر موٹے موٹے طلائی حرفوں
میں عربی خط سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

دنیا میں خدا کی یہ رحمت خاص مسلمانوں کے واسطے ہے
جو چھؤں سیڑھیاں طے کر کے یہاں تک پہنچ جاویں۔

میں نے ایک مقابل کے اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اس تمام کیفیت کو دیکھا
میں نے دیکھا کہ اس گلستان ہمیشہ بہار میں جا بجا نہایت ہی قرینہ کے ساتھ
بہت ہی پر تکلف بہت سے تخت اور آرام چوکیاں بچھی ہوئی ہیں۔ بہت
سے لوگ مجھ کو ان تختوں اور آرام چوکیوں پر بیٹھے ہوئے معلوم ہوئے
لیکن نہ میں ان لوگوں کی صورت پہچان سکا نہ اُن کی بولی کچھ میری سمجھ میں آئی۔
عقل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ مصر اور قسطنطنیہ اور ٹونس وغیرہ
کی طرف کے مسلمان ہیں جو ان چھیوں سیڑھیوں کو طے کر چکے ہیں اور اب خدا
کی رحمت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

میں اُن بہت سے شخصوں میں سے صرف دو شخصوں کو پہچان
سکا جن کے تخت میدان کے کنارے پر اس مقام پر بچھے ہوئے تھے جہاں
وہ زینہ ختم ہوتا ہے۔ ایک تخت پر میں نے سید احمد خاں کو دیکھا کہ
تہذیب الاخلاق کی بہت سی نفیس نفیس اور سنہری جلدیں اُن کے سامنے
رکھی ہوئی ہیں ان میں سے وہ کسی کسی جلد کو اُٹھا کر کوئی کوئی مضمون ہندوستان
کے مسلمانوں کو سنا رہے ہیں اور جس عمدہ مقام پر وہ خود ہیں اور جس
کی خوبیاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس کو بڑی دلسوزی اور
محبت کے ساتھ ان لوگوں کو سمجھاتے ہیں جو اس زینہ کے نیچے گرد و غبار
نہایت بے ترتیبی اور بے سر و سامانی کی حالت میں اپنی زندگی بسر کرتے
ہیں اور زبان حال سے کہتے جاتے ہیں یَا لَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ

میں نے اس ٹیلہ پر سے دیکھا کہ کوئی مسلمان جس کے کان
میں سید احمد خاں کی آواز پہنچی، ایسا باقی نہ رہا تھا جس نے اپنی جگہ
حرکت نہ کی ہو۔ میں نے دیکھا کہ تمام مسلمان پہلی آواز پر اُٹھ کھڑے ہو
اور اس خیال کی ترقی کے زینہ کی طرف کو دوڑے اور جیسی جس کی استع
اور قوت تھی ویسی ہی اُس نے ترقی کی۔ بعض ضعیف الجثہ اور کم ہمت یا نا
اور لولے لنگڑے ابھی پہلی سیڑھی تک بھی نہیں پہونچے ہیں۔ باقیوں میں کو
پہلی سیڑھی پر ہے، کوئی دوسری سیڑھی پر۔ کسی نے تیسری سیڑھی تک ترقی
کر لی ہے اور کوئی چوتھی سیڑھی تک پہنچ گیا ہے اور بعض جو بہت ہی عقلمند
اور ذکی اور چست و چالاک تھے وہ پانچویں سیڑھی تک بھی پہنچ گئے ہیں
جو لوگ پانچویں سیڑھی پر پہنچ گئے ہیں اُن کو سید احمد خاں ہاتھ بڑھا

[1] یہ ایک ہنسی ہے اُن لوگوں کی جو کسی کام کی خوبی کو عقلاً تسلیم کرتے ہیں، مگر مصلحت کا عذر کرتے ہیں۔ حالاں کہ عقل اور مصلحت بالکل ایک ہے۔

اپنے برابر اوپر لے لیتے ہیں۔ چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے پانچویں سیڑھی پر سے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کو کھینچ لیا۔ وہ بھی اس پر فضا میدان کی راحتوں اور خوشیوں کا لطف حاصل کرنے لگا اور سیّد احمد خاں کی برابر اپنی آرام چوکی سے ہاتھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آہا یہ تو مولوی مہدی علی صاحب ہیں جو اپنی چستی اور رسائی عقل سے بہت جلد چھیوں سیڑھیاں طے کر گئے۔ ان کو میں اس عمدہ مقام پر پہنچا ہوا دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ مولوی سیّد مہدی علی صاحب نے بھی ایک جلد سید احمد خاں کے سامنے سے اُٹھالی اور انہوں نے بھی اس کے مضامین بآواز بلند اُن لوگوں کو سنانے شروع کیے جو یا تو زینہ طے کر رہے تھے یا زینے کے نیچے چڑھنے کی فکر میں کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے ایک اور مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو چوتھی سیڑھی سے پانچویں سیڑھی پر چڑھنے کی تیاری کر رہے تھے اور عنقریب پانچویں سیڑھی پر پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے دور سے اشارے سے منع کیا کہ میرا نام ابھی کسی سے نہ لینا۔ انہوں نے بھی سیّد احمد خاں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی اور جو بات وہ سیّد احمد خاں سے قریب ہونے کی وجہ سے اچھی طرح سنتے اور سمجھتے تھے، اس کو نیچی سیڑھیوں والوں کو سمجھانے لگے۔

پہلی اور دوسری سیڑھیوں والوں کی کیفیت دیکھ کر مجھ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ سیّد احمد خاں کی آواز سنتے ہی دوڑے اور کوئی پہلی اور کوئی دوسری سیڑھی اُس زینے کی طے کر گیا گویا سیّد احمد خاں کے منشا کی پوری تعمیل میں مصروف ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ سیّد احمد خاں سے مخاطب ہو کر زبان درازیاں کرتے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی کہتا ہے کہ سیّد احمد خاں کی ایک مت سنو۔ کوئی کہتا ہے کہ بالکل اس کے برخلاف کام کرو۔ یہ کہتے جاتے ہیں اور اوپر کو چڑھتے جاتے ہیں۔ سیّد احمد خاں بھی اُن کی اس حالت کو دیکھ کر مسکرا پڑے اور کہنے لگے کہ کیسے پاگل آدمی ہیں جس کام کو کرتے جاتے ہیں اسی کو بُرا کہتے ہیں۔ جس راستے کو بند کرتے ہیں، اسی طرف کو چلے جاتے ہیں۔ مگر تابکے۔ تین سیڑھیاں ان کو بھی طے کرنا باقی ہیں۔ سمجھ دار ہوتے جلد طے کر لیتے۔ نادان ہیں بدیر طے کریں گے۔

یہ مزے مزے کی باتیں دیکھ کر میں اس ٹیلے پر سے اُتر آیا اور اس وقت سمجھا کہ سیّد احمد خاں کے تہذیب الاخلاق نے ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا اثر پیدا کیا ہے اور آئندہ کیا اثر پیدا کرے گا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

"بے ادب اپنے ہی لیے بُرا نہیں ہوتا بلکہ اوروں کے لیے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے، گستاخی اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے"

محمد ذکاءاللہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - ج ۶ - ش ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)

علماء کے فرائض

شبلی نعمانی

"زمانہ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے علماء کے فرائض کیا ہیں؟" یعنی زمانۂ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے علماء پر کیا ذمہ داریاں ہیں، ملک اور جماعتِ اسلامی کا ان پر کیا حق ہے؟ قوم کے لیے ان کو کیا کرنا ہے؟ اور اس وقت تک انہوں نے قوم کے لیے کیا کیا ہے؟۔

یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ جماعتِ اسلام کی بہبودی کا بہت کچھ بلکہ تمام تر دار و مدار ان ہی سوالات پر ہے۔

اے حضرات! جس زمانے میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات علماء کے ہاتھ میں تھے نماز و روزہ وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علماء ہی ان کے مقدمے فیصل کرتے تھے۔ علماء ہی جرائم پر حدود و تعزیر کی سزا دیتے تھے، علماء ہی قتل و قصاص کے احکام صادر کرتے تھے۔ غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنان اختیار علماء ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اب جب کہ انقلاب حکومت ہو گیا اور دنیوی معاملات گورنمنٹ کے قبضۂ اختیار میں آ گئے تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قوم سے علماء کا کیا تعلق باقی ہے، یعنی گورنمنٹ نے کس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور کس قدر باقی رہ گئے ہیں، جو درحقیقت علماء کا حق ہے اور جس میں دست اندازی کرنی خود گورنمنٹ کو مقصود نہیں ہے۔

علماء کی موجودہ حالت، ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلا دیا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے، وہ صرف مذہبی تعلق ہے۔ یعنی یہ کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں باقی معاملات ان کی دسترس سے باہر ہیں اور ان کو اُن معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لیکن میرے نزدیک یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے، گورنمنٹ نے جو حقوق اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں، بے شبہ علماء کو ان سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن وہ حقوق ہیں کیا، مال گزاری کا وصول کرنا، امن و امان کا قائم رکھنا دنیوی معاملات کے فیصلے کے لیے عدالتوں کا قائم کرنا، عہدہ داران ملکی کا مقرر کرنا، یہ اور خاص اسی قسم کے امور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لیے ہیں، لیکن قوم کی زندگی کے اجزا صرف اسی قدر نہیں ہے۔

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے، قوم کی علمی حالت جس پر ترقی و تنزل کا مدار ہے، قومی مراسم و دستورات جن سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی، ان تمام اوصاف کے سرچشمے ہمارے علماء اور علماء کی تلقین و ہدایت ہے۔ شادی بیاہ وغیرہ کی وہ مسرفانہ رسمیں جنہوں نے سیکڑوں ہزاروں خاندان تباہ کر دیے ہیں، گورنمنٹ کا ان پر کچھ زور نہیں چل سکتا، لیکن الحمد للہ اس گئی گزری حالت میں بھی علماء کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علماء متفق ہو کر کمر بستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہو جائیں، قوم کے اخلاق جو روز بروز تباہ ہوتے ہیں، گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی تعلیم مطلق اس کی اصلاح نہیں کر سکی اور نہ کر سکے گی، لیکن اگر علماء آمادہ ہوں اور مناسب تدبیروں سے کام لیں تو قوم میں پھر وہ اخلاقی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں جو سو دو سو برس پہلے موجود تھیں۔

الحاد اور دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے، اس کا روکنا اگر گورنمنٹ کے لیے ممکن ہوتا تو وہ زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی، لیکن ہمارے علماء اگر معقول طریقہ

پر اس کو روکنا چاہیں تو اسی طرح اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں، جس طرح یونانی فلسفے کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، امام رازی، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ والحاد کا استیصال کر دیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علماء ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس کے حصے کی فرماں روائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علماء کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علماء کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیوں کہ علماء جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

لیکن ان اختیارات کے ہاتھ میں لینے کے وقت علماء پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور انہی ذمہ داریوں کو میں علمائے حال کے فرائض سے تعبیر کرتا ہوں جو میرے مضمون کا عنوان ہے۔ ان فرائض کو بدفعاتِ ذیل بیان کرتا ہوں۔

علماء کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی قوت پیدا کریں یعنی تمام ہندوستان کے علماء میں ایک خاص رشتۂ اتحاد قائم ہو۔ تمام علماء ایک دوسرے کے نام سے، مقام سے، حالات سے واقف ہوں آپس میں خط و کتابت ہو، مہتم بالشان امور میں تمام علماء مشاورت اور استصواب سے کام لیں، کبھی کبھی وہ صرف اجتماع واتحاد کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو جایا کریں۔

اے حضرات! علماء کے باہمی اتفاق کی نسبت بار بار کہا جا چکا ہے اور اگر مجھ کو بھی یہی کہنا ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ جو مضمون سیکڑوں دفعہ بیان کیا جا چکا ہے، میں بھی اسی کا اعادہ کروں، لیکن مجھ کو ایک خاص پہلو کی طرف خیال دلانا ہے۔

اتفاق واتحاد کا جو طریقہ اب تک لوگوں نے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ تمام علماء مسائل فقہیہ میں ہم مذہب و ہم خیال ہو جائیں اور اس وقت نہایت اعلیٰ درجے کا اتحاد واتفاق قائم ہو جائے گا۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا اتفاق کسی زمانے میں کبھی ہوا ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مبارک زمانے میں جب کہ تمام مسلمان کنفس واحدہ تھے، کیا مسائل میں اختلافِ آرا نہ تھا، جس شخص نے صحیح ترمذی مطالعہ کی ہے اور قریباً ہر مسئلے کے متعلق اس کے تراجم ابواب دیکھے ہیں کیوں کر اس بدیہی واقعہ سے انکار کر سکتا ہے۔

وضو، تیمم، قرآت اور دیگر واجبات وسنن کے متعلق کیا تمام صحابہ ہر مسئلہ میں قاطبۃً متفق الرائے تھے۔ کون ایسا غلط دعویٰ کر سکتا ہے؟ لیکن کیا ان اختلافِ مسائل کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی کدورت تھی؟ کسی طرح کا رنج تھا؟ کسی طرح کی اجنبیت تھی؟ حاشا اللہ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اتحاد واتفاق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپس میں کسی طرح کا اختلافِ رائے نہ ہو۔ اس لیے ہم کو اتفاق واتحاد کے حدود متعین کر لینے چاہیں۔ یعنی اختلاف واتفاق کے دائرے الگ الگ ہوں۔ ایک عالم کو کسی مسئلے میں دوسرے سے اختلاف ہے، تو اختلاف کا اثر اسی مسئلے تک محدود رہے، یہ نہ ہو کہ اس اختلاف کی وجہ سے اور تمام تعلقات بھی منقطع ہو جائیں جو اختلاف سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اس کی نہایت عمدہ مثال امام بخاری و امام مسلم کا واقعہ ہے۔ امام مسلم حدیث معنعن کے شرائطِ اتصال میں امام بخاری سے اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں امام بخاری کا مذہب بیان کر کے کہا ہے کہ

"یہ مذہب محض لغو اور باطل ہے، اور اس قابل نہیں کہ اس کے رد کی طرف توجہ کی جائے"

لیکن باوجود اس کے جب امام بخاریؒ سے ملنے گئے تو نہایت محبت اور تعظیم سے ان کی پیشانی چومی اور کہا کہ

دَعْنِیْ اُقَبِّلْ رِجْلَیْکَ

[اجازت دیجیے کہ آپ کے پاؤں چوموں]

قرون اولیٰ میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا، یعنی اختلاف و اتفاق کی جدا جدا حدیں تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں باوجود اختلاف کے اتحاد واتفاق کا نور پوری طرح قائم تھا۔ صحابہؓ بیسیوں مسائل میں مختلف الرائے تھے، لیکن عام اتحاد واتفاق میں اختلاف کا پرتو تک نہ تھا،

قرن ثانی اور اوائل قرن ثالث کا بھی یہی حال تھا۔

آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جس نے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے، جس کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی، جس کی وجہ سے مخالفین کو ہم پر شماتت کا موقع ملا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔

ہم نے بار بار سنا ہے کہ کوئی مجمع عام جماعت اسلام کے فائدے کی غرض سے منعقد ہوا، مثلاً دستاربندی کا جلسہ، کسی مدرسۂ عربی کا جلسہ، اصلاح تعلیم کا جلسہ وغیرہ وغیرہ تو وہ لوگ جلسہ میں شریک تک نہ ہوئے، جن کو بانیانِ جلسہ سے مسائل مختلف فیہا کے بارے میں اختلاف تھا۔

دوسرا بہت بڑا فرض جو علماء پر ہے وہ اس دہریت اور الحاد کے اثر کو روکنا ہے جو آج کل یورپ میں پھیل کر ہندوستان کی طرف بڑھتا آتا ہے غالباً اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ گفتگو جو کچھ ہے وہ علاج کے طرز و طریقہ میں ہے لیکن میرے نزدیک ہم کو اس باب میں زیادہ غور و فکر کی حاجت نہیں ہے۔ یہ بیماری پہلے بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے اور اطبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اس کے دفع کرنے میں کارگر ثابت ہوا ہے۔ عباسیوں کا اوّل اوّل زمانہ تھا کہ فلسفۂ یونانی کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کی ہوا چل گئی۔ اکثر فقہاء اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھایا نہ جائے۔ یہاں تک کہ علم کلام کو اس لحاظ سے ممنوع قرار دیا کہ اس میں عقلیات کی آمیزش تھی۔ امام شافعی کا قول ہے کہ

حکمی فی اہل الکلام ان یضربوا بالجرید ویطاف بھم فی القبائل

[اہل کلام کے بارے میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ ان کو درّے لگائے جائیں اور قبائل میں ان کی تشہیر کی جائے]

اس علاج نے بلحاظ حالت موجودہ کسی قدر فائدہ دیا۔ یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑھنے سے رُک گئے لیکن پورا نفع نہ ہوا۔ کیوں کہ سیکڑوں ہزاروں مسلمان منطق و فلسفہ پر ایسے فریفتہ ہو گئے تھے کہ اس کو بالکل چھوڑ نہ سکتے تھے۔ آخر علماء نے دوسرا علاج سوچا یعنی فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کر کے فلسفے کے رد کے لیے علم کلام ایجاد کیا، اس علاج کے مجوز امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، قاضی عضد وغیرہ تھے اور واقعی ان کی یہ تدبیر نہایت کارگر نکلی، اسی کا اثر ہے کہ اگرچہ درس نظامیہ میں تمام علوم و فنون سے زیادہ منطق و فلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں تاہم مذہبی عقاید کو اُن سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔

ہمارے زمانے میں بھی اسی مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بھی ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ علاج مفید ثابت ہو تو فبہا ورنہ دوسری قسم کا علاج شروع کیا جائے اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کی جائیں۔

تیسرا امر جس کی طرف میں علماء کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں، علوم اسلامیہ کے درس و تدریس میں وسعت پیدا کرنا ہے۔

اے حضرات! اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پچاس ساٹھ برس سے ہماری علمی حالت برابر تنزل کی طرف بڑھ رہی ہے جس درجے کے علماء پچاس برس پہلے موجود تھے، اس زمانے کے بعد اس درجے کے علماء نہیں پیدا ہوئے اور زمانہ مابعد میں جس رتبہ کے علماء پیدا ہوئے اُس زمانے کے بعد اس درجے کے بھی پیدا نہیں ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ عبدالقادر صاحب، مفتی محمد یوسف صاحب، مولوی فضل حق صاحب جیسے علماء کا پیدا ہونا، اب گویا ناممکن معلوم ہوتا ہے بلکہ اب تو یہ بھی توقع نہیں کہ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم، مولوی ارشاد حسین صاحب مرحوم، مولانا احمد علی صاحب مرحوم جیسے بزرگ بھی قوم میں پیدا ہوں۔ تصنیفات کا یہ حال ہے کہ عربی زبان میں اب بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اردو زبان میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ بھی کچھ محققانہ نہیں ہوتیں بلکہ صرف چند نزاعی مسئلوں کے متعلق اِدھر اُدھر کی خوشہ چینی ہوتی ہے۔ پھر کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ اب علوم عربیہ کی قدر دانی نہیں رہی، اور ان علوم کے پڑھنے والوں کو مناصب اور عہدے نہیں ملتے۔ لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ اس بات کی وجہ نہیں ہو سکتی۔

خدا کا شکر ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لیے نہیں پڑھا۔ علماء کسی زمانے میں بہت دولت مند صاحب جاہ و منصب نہ تھے۔ ملاّ نظام الدین، ملاّ حسن، ملاّ کمال، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب کو کون سی دولت و ثروت

حاصل تھی۔

پھر کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ علوم کی تحصیل کے سامان کم ہیں یہ بھی صحیح نہیں۔ اب جس کثرت سے ہندوستان کے ہر گوشے میں عربی مدارس موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ جس قدر کتابیں اب چھپ کر شایع ہو گئیں، اگلے زمانے میں کہاں دستیاب ہوتی تھیں۔ سفر کے وسائل اور ذرایع جیسے اب آسان ہو گئے ہیں، پہلے کب تھے؟

پھر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخیر زمانہ ہے، اور اس برے زمانے کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اگلی سی ہمتیں اور اگلی سی حوصلہ مندیاں زمانے سے مفقود ہو جائیں، لیکن اگر ایسا ہے تو زمانہ تمام دنیا کو محیط ہے۔ اس لیے دنیا کے ہر گوشے میں ایسی ہی پستی اور ایسا ہی تنزل پایا جانا چاہیے۔ حالاں کہ دنیا کے اور حصوں میں علوم و فنون کی بہار آ رہی ہے۔

اے حضرات! علما، کا ایک اور سب سے بڑا فرض بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے خدا نخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ وہ بڑی بڑی نوکریوں کی خواہش کریں، دولت کے جمع کرنے کی تدبیریں سوچیں، بلکہ میری مراد علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے۔ وہ حوصلہ مندی جس کا یہ اثر تھا کہ محدثین ایک ایک حدیث کے لیے ہزاروں کوس کا سفر کرتے تھے جس کا یہ اثر تھا کہ اندلس کے طلبا، ہندوستان میں تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ جس کا یہ اثر تھا کہ ابن بیطار نے نباتات کے دریافت کے لیے اندلس سے چل کر یونان اور بحر روم کے تمام جزائر کی خاک چھان ڈالی تھی۔ جس کا یہ اثر تھا کہ جغرافیہ کی تحقیقات کے لیے علامہ بشاری نے پورے اٹھائیس برس دنیا کے سفر میں صرف کر دیے تھے جس کا یہ اثر تھا کہ ابوالفرج اصفہانی نے پورے پچاس برس صرف کر کے کتاب الاغانی لکھی اور دنیا کو علم ادب کے بڑے بڑے کتب خانوں سے مستغنی کر دیا جس کا یہ اثر تھا کہ اصمعی محاورات عرب کی تحقیقات کے لیے عرب کے بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔

اے حضرات! کیا موجودہ زمانہ میں ان حوصلہ مندیوں کی ایک بھی مثال پائی جاتی ہے اور کیا ان حوصلہ مندیوں کے بغیر علما، اپنے فرض سے ادا ہو سکتے ہیں۔

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ علمی حوصلہ مندی اس قدر مفقود ہو گئی ہے کہ ہم اس کے امکان کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ وہ حوصلہ مندیاں دوسری قوموں میں موجود ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو میں مثال کے طور پر صرف ان عجیب و غریب کوششوں کا ذکر کروں جو دوسری قوموں نے خاص ہمارے علوم و فنون کی ترقی دینے میں کی ہے۔

۱۔ سب سے بڑا احسان جو یورپ کا عربی زبان اور عربی علوم و فنون پر ہے یہ ہے کہ عربی کی وہ کتابیں جو مسلمانوں کے لیے مایۂ فخر ہیں اور باوجود اس کے اس قدر نایاب تھیں کہ کہیں ان کا پتہ بھی نہیں لگتا تھا۔ یورپ نے نہایت تلاش سے بہم پہنچائیں۔ ان کی تصحیح کی، حاشیے چڑھائے، اختلاف نسخ قلم بند کیے۔ مضامین اور الفاظ کی فہرست مرتب کی، اور نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چھاپ کر مشتہر کیا۔

ان محنتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ جس جرمن پروفیسر نے کتاب الفہرست کی تصحیح و ترتیب کی اس کے پورے بیس سال اس کام میں صرف ہوئے۔ پروفیسر وائٹ ۱۸ برس سے جریر کے دیوان کے مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ برلن کی ایک کمیٹی نے لاکھ روپے صرف اس کام کے لیے وقف کر دیے کہ طبقات ابن سعد کا پورا نسخہ جو بارہ جلدوں میں ہے چھاپ دیا جائے۔ چنانچہ خاص اس غرض سے پروفیسر زاخو اپریل ۱۸۹۵ء میں مصر پہنچا اور اب تک وہیں مقیم ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ اس وقت تک عربی کی جس قدر نایاب کتابیں یورپ نے چھاپ کر شایع کیں، ان سب کا نام تو میں گنا نہیں سکتا، لیکن تاریخ کی تصنیفات کی ایک فہرست ذیل میں لکھتا ہوں جن میں سے اکثر خود میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو یورپ کے چھاپنے سے پہلے ناپید تھیں اور ہمارے ہندوستان کے علما اب بھی ان کے ناموں سے بے خبر ہیں۔ ان میں سے بعض مصر وغیرہ میں چھپی ہیں تو یورپ ہی کے نسخے سے منقول ہو کر چھپی ہیں۔

۱۔ تاریخ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری تمام و کمال ۱۲ جلد۔ ۲۔ اخبار الطوال ابوحنیفہ دینوری۔ ۳۔ کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی۔ ۴۔ انساب الاشراف للبلاذری۔ ۵۔ تاریخ یعقوبی۔ ۶۔ فتوح البلدان بلاذری۔ ۷۔ کتاب الفہرست ابن الندیم بغدادی۔ ۸۔ رحلہ ابن جبیر۔ ۹۔ المعجب۔ ۱۰۔ البیان المغرب فی اخبار المغرب للمراکشی ۱۱۔ سیرۃ صلاح الدین للقاضی بہاء الدین بن شداد۔ ۱۲۔ الفتح القسی للعماد الاصفہانی۔ ۱۳۔ مذیل للطبری۔ ۱۴۔ المشتبہ للذہبی۔

عجم ابن آبار ۔ ۱۶۔ اخبار مکۃ للازرقی ۔ ۱۷۔ المنتقی باخبار ام القریٰ۔
اعلام باعلام بیت اللہ الحرام ۱۹۔ استبصار فی عجائب الامصار ۔
۲۰۔ الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ۔ ۲۱۔ کتاب الاعتبار لابن منقذ۔
۲۲۔ الالمام للمقریزی ۔ ۲۳۔ البیان و الاعراب بما بارض مصر من الاعراب
۲۴۔ کتاب الہند للبیرونی ۲۵۔ الجز عن اول دولۃ من دول الاشراف العلویین
۲۶۔ عیون و الحدائق ۔ ۲۷۔ زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب ۔ ۲۸۔ تاریخ
آل سلجوق ۔ ۲۹۔ زبدۃ النصرہ فی اخبار الوزرار السلجوقیہ ۳۰۔ سلسلۃ
التواریخ ۔ ۳۱۔ اخبار العصر ۔ ۳۲۔ اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس ۔
۳۳۔ "تاج التراجم للقاسم بن قطلوبغا ۔ ۳۴۔ الفخری فی الآداب السلطانیہ
۳۵۔ مروج الذہب للمسعودی ۳۶۔ کتاب الصلۃ لابن بشکوال ۔
۳۷۔ تکملۂ کتاب الصلۃ ۔ ۳۸۔ بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس
۳۹۔ طبقات المفسرین للسیوطی ۔ ۴۰۔ اخبار ملوک مغرب و الفاس للمقریزی
۴۱۔ عجائب الہند بزرک بن شہریار ۔ ۴۲۔ کتبۂ صقلیہ ۔ ۴۳۔ تہذیب
الاسمار للنووی ۔ ۴۴۔ کتاب الانساب لمقدسی ۔ ۴۵۔ فتوح الشام
ملازدی ۴۶۔ ملخص طبقات الحفاظ للسیوطی ۔ ۴۷۔ معارف ابن
قتیبہ ۔

ان کتابوں کے علاوہ یورپ نے جغرافیہ کی تصنیفات کا پورا سلسلہ مرتب کرکے چھاپا۔ ہمارے خیال میں بھی نہ تھا کہ جغرافیہ کے فن میں جو اس ملک میں خاص انگریزوں کی بدولت آیا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے علما، اس سے بالکل ناآشنا ہیں مسلمانوں نے کوئی خاص کمال پیدا کیا تھا لیکن ان تصنیفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اس فن کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ۔ کس کو خیال تھا کہ تیسری صدی ہجری میں عرب کا ایسا جغرافیہ تیار ہوا ہوگا جو بالکل آج کل کی تحقیقات کے موافق ہے ۔ جس میں عرب کے ایک ایک گاؤں کی تفصیل ہے اور ہر ہر گاؤں کی پیداوار، عمارات، معدنیات، اشجار، نباتات، جانور، تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں ۔ عرب کا یہ جغرافیہ ابن الحائک ہمدانی نے ۳۳۴ھ میں لکھا جو یورپ میں بمقام لیڈن ۱۸۸۴ء میں چھاپا گیا ۔

جغرافیہ کے سلسلے میں جو نایاب کتابیں یورپ میں چھاپی گئیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں ۔

معجم البلدان یاقوت حموی چار جلد ۔ مشترک یاقوت حموی ۔ مراصد الاطلاع ۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ۔ جغرافیہ ابن حوقل بغدادی ۔ مختصر کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی ۔ کتاب البلدان للیعقوبی ۔ تقویم البلدان ۔ المسالک والممالک لابن خردازبہ مسالک الممالک للاصطخری ۔ نزہۃ المشتاق للشریف الادریسی ۔

یہ سب سے بڑی ضخیم کتابیں ہیں اور ان کے دیکھنے سے مسلمانوں کی علمی کوششوں کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

۲۔ دوسری تیسری صدی میں جو نئے الفاظ عربی تصنیفات خصوصاً تاریخ میں شامل ہوتے گئے لغت کی کتابوں میں کہیں اُن کا پتہ نہیں لگتا۔ تاریخ طبری و بلاذری و مقریزی میں سینکڑوں ہزاروں الفاظ ایسے موجود ہیں جو قاموس لسان العرب، شرح قاموس وغیرہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے اور مجھ کو اس کا خاص تجربہ ہو چکا ہے ۔ یورپ نے اس مشکل کی عقدہ کشائی کی، فرانس کے ایک پروفیسر نے جس کا نام دوزی ہے خاص اس قسم کے لغات پر ایک کتاب لکھی جو دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی ہے اور جس میں سترہ سو صفحے ہیں ۔ یہ کتاب میرے مطالعے میں ہے اور میں ہر دفعہ مصنف کی محنت اور تحقیق پر حیران رہ جاتا ہوں ۔ ہمارے ملک کے علما، شاید یورپ کی وسعت نظر اور کثرت معلومات کا اعتراف نہ کریں، لیکن مصر و شام کے فضلا ان تصنیفات کو پڑھ کر کیوں کر انکار کر سکتے ہیں ۔ علامہ حمزہ فتح اللہ جو مصر میں فن ادب کا استاد الکل ہے، اس نے اپنے رسالۂ باکورۃ الکلام میں علانیہ تسلیم کیا ہے کہ نحن فی اللغۃ العربیہ کا الملائکۃ علیہم یعنی عربی زبان میں ہم یورپ کے دست نگر ہیں ۔"

۳۔ عربی زبان میں ایسی کوئی تصنیف موجود نہ تھی اور نہ کبھی لکھی گئی جو مسلمان فلاسفروں کی تصنیفات کے ریویو کے طور پر ہوا اور جس سے یہ ظاہر ہو کہ یونانیوں کے کیا مسائل تھے اور حکمائے اسلام نے اس پر کیا ترقی کی ۔ یورپ میں اس قسم کی تصنیفات کثرت سے لکھی گئی ہیں اور برابر لکھی جا رہی ہیں ۔

ارسطو کی قاطیغوریاس جس کو حنین بن اسحاق نے عربی زبان میں ترجمہ

کیا تھا اصل یونانی زبان میں مع عربی ترجمے کے چھاپی گئی ہے اور اس کے * دیباچے میں اس امر پر بحث کی ہے کہ یہ ترجمہ کہاں تک صحیح اور اصل کے مطابق ہے۔

جرمنی کے ایک پروفیسر نے فارابی کی تمام تصنیفات اور مسائل پر تین سو صفحوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے یہ دونوں کتابیں دیکھی ہیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ جرمن زبان نہ جاننے کی وجہ سے ان سے متمتع نہیں ہو سکا۔

پروفیسر مونک نے فرنچ زبان میں خاص اس بحث پر کہ مسلمانوں نے یونانیوں کے علوم کی کیوں کر تحصیل کی اور ان سے یہودیوں نے کیوں کر سیکھا؟ ایک مستقل کتاب لکھی۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کے بعض مقامات سبقاً سبقاً پڑھے ہیں۔ پروفیسر رینان نے حکیم ابن رشد کے فلسفہ پر چار سو صفحوں میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی جس میں اس نے تفصیلاً بیان کیا ہے کہ جرمنی اور فرانس میں کئی سو برس تک خاص ابن رشد کا فلسفہ جاری رہا اور وہاں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے جو اپنے تئیں بجائے ارسطو و افلاطون کے ابن رشد کی طرف منسوب کرتے تھے۔

پارسال مقام جنیوا میں جو اورینٹل کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں ایک یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک کمیٹی قایم ہو جس میں عربی زبان کے بڑے بڑے کامل الفن ممبر مقرر کیے جائیں۔ اس کمیٹی کا یہ کام ہوگا کہ مسلمانوں نے فلسفہ، ہیئت، طب اور لٹریچر میں جو ترقی کی اس کی ایک مفصل انسائیکلوپیڈیا تیار کرے، چنانچہ اسی کانفرنس میں یہ کمیٹی قایم ہو گئی اور بڑے بڑے عربی داں پروفیسر اس کے ممبر مقرر ہوئے۔

اے حضرات علماء! جب کہ دوسری قومیں خود ہمارے علوم و فنون میں ایسی عجیب و غریب کوششیں کر رہی ہیں اور عربی زبان کے میدان میں اس قدر وسعت پیدا ہو گئی ہے، تو کیا ہم کو اسی پر قناعت کرنی چاہیے؟ کہ ایک محدود کورس کی چند کتابیں پڑھائی جائیں اور تمام عمر اسی محدود دائرے میں بند پڑے رہیں؟

علمی حوصلہ مندی جس کو میں نے علماء کا فرض بتایا ہے، اس کا یہ اقتضاء ہے کہ اگلوں نے ہمارے لیے جو سرمایہ چھوڑا تھا، دنیا سے ہم جائیں تو اس میں اضافہ کر کے جائیں، یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے کہ علمی کارخانے میں کام کرنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ ابھی بہت کچھ وسعت ہے اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں نیز کنند انچہ مسیحا می کرد
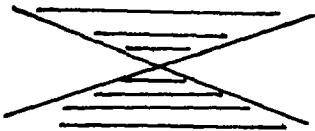
نوٹ: علامہ شبلی مرحوم نے ۱۸۹۴ء کے اجلاس ندوہ میں جو مقالہ پڑھا تھا، اس کے وہ حصے درج بالا صفحات میں نقل کیے گئے ہیں جن کا تعلق براہِ راست علماء کے فرائض سے ہے۔

"اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انھیں کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

از تہذیب الاخلاق ج ٦ ش ١٠ - (اکتوبر ١٩٨٧ء)

سرسید اور ہم

آل احمد سرور

سرسید کے متعلق موجودہ علی گڑھ کا رویہ زبانی عقیدت واحترام
رعملی بے توجہی اور غفلت کا ہے۔ موجودہ علی گڑھ سے میری مراد، علی گڑھ
، اساتذہ، طلبہ اور قوم کے اُن سربرآوردہ حضرات سے ہے جن کا تعلق
لی گڑھ سے ہے۔ ہر سال اکتوبر میں یہاں یوم سرسید منایا جاتا ہے، ایک
رسید اکیڈمی بھی ہے۔ سرسید کے کام کے کسی پہلو پر ریسرچ بھی ہوتی
ہتی ہے لیکن کیا ہم ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے سرسید کے مشن
وسمجھا ہے اور اس سے روشنی اور گرمی لے کر اُن کی تحریک کو آگے
بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیک نیت انسان اس طرف
توجہ بھی دلاتا ہے، مگر اس کی آواز جلد آج کی مصروفیات میں گم ہو جاتی
ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر غور کرنا چاہیئے۔

پہلے مختصر طور پر یہ بیان کر دیا جائے کہ سرسید کا حقیقی پیغام کیا ہے
ان کی تحریک کی معنویت کیا ہے؟ اس کے بعد اسے عام کرنے کے لیے چند باتیں
عرض کی جائیں گی۔

سرسید کو صرف ایم۔ اے۔ او۔ کالج کا بانی یا انگریزی کے ذریعے
سے تعلیم کا مبلغ سمجھنا، ان کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ سرسید ان عہد آفریں
شخصیتوں میں سے ہیں جو قوموں کی تاریخ کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ پہلے تو اس سرسید
کو ذہن میں رکھنا ہے جس نے آثار الصنادید لکھی، آئین اکبری اور تاریخ
فیروز شاہی کے نئے ایڈیشن مرتب کیے۔ غدر کے بعد اسباب بغاوت ہند
لکھی اور حکومت وقت کی بدگمانی کی پرواہ کیے بغیر اپنا تجزیہ پیش کیا پھر
اس سرسید کو یاد کرنا ہے جس نے سائنٹفک سوسائٹی اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ
کے ذریعہ سے سائنسی علوم اور مفید معلومات کو اردو میں عام کرنے کی سعی
کی۔ اس کے بعد اس سرسید کو بھی جس نے ورناکیولر یونیورسٹی کی اسکیم
مرتب کی۔ گو انگلستان سے واپسی کے بعد نئے حالات کے احساس کی وجہ
سے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا ہمیں اس سرسید کو خاص طور سے
یاد رکھنا ہے جس نے سر ولیم میور کی "لائف آف محمد" کی غلط بینی اور غلط
اندیشی کا جواب دینے کے لیے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں زیادہ تر
اسی کام میں مصروف رہے۔ یعنی مخالفوں کی سطحیت اور عصبیت کا پول
کھولا، محض مخالفوں کے خلاف نعرے نہیں لگائے یا ہنگامہ نہیں کیا۔ سرسید
کو انگلستان میں وکٹورین عہد کی شان وشوکت اور جاہ وجلال، علمی معیار
اور ادبی میلانات دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے سمندر پار کے خطوط اس کے
شاہد ہیں مگر وہیں سے وہ تہذیب الاخلاق نکالنے کا خیال لے کر آئے اور
وہیں سے آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر ایک کالج کے قایم کرنے کا
منصوبہ۔ تہذیب الاخلاق کا ہماری ذہنی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ اس
نے ہمارے تہذیب کے تصور کو وسیع کیا، اس نے ہماری معاشرت کی
خرابیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے مذہب اور سائنس یعنی خدا کے قول
اور فعل میں مطابقت دیکھی اور دکھائی۔ اس نے عقلیت کو اپنا رہبر بنایا
اس نے ادب میں جو جمود آگیا تھا، اس کی طرف اشارہ کیا اور نئے اور
عالمی معیاروں سے اسے آشنا کیا۔ بلاشبہ اس میں مغرب سے مرعوبیت بھی
تھی مگر جدید کاری کے ہر عمل میں مغرب کی راہ پر کچھ دور چلنا، ایک عام طریقہ
ہے۔ تہذیب الاخلاق کا یہ کارنامہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ
اس نے مذہب کا مطالعہ انسانی عقل واخلاق کی رو سے کیا۔ اس میں ان
سے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئیں، مگر یہ کوشش ضروری تھی۔ مولانا آزاد
نے یہ اعتراف کیا ہے کہ سرسید کی تفسیر نے انہیں تشکیک سے نکالا اور
تحقیق کی راہ دکھائی۔ سرسید کے ان کارناموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے

پھر ان کی تعلیمی کوششوں خصوصاً ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی اہمیت اور معنویت کو دیکھنا ہے۔ یہ کالج دراصل تین کالجوں کا مجموعہ ہوتا۔ ایک کالج انگریزی کے ذریعے سے تعلیم کے لیے، دوسرا اردو کے ذریعے سے تعلیم کے لیے اور تیسرا دینی اور عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے۔ صرف پہلا کالج پھلا پھولا، دوسرا چند سال بعد بند کرنا پڑا اور تیسرا تو وجود میں آیا ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی کے ذریعے سے جدید علوم کی تعلیم پر تو سب ہی متفق تھے مگر اردو کے ذریعے تعلیم کے فواید اور امکانات اس دور کی سراسیمہ نسل کے لیے چنداں اہمیت نہ رکھتے تھے اور سرسید کے مذہبی خیالات کی وجہ سے تیسرے کالج کا سوال ہی نہ اُٹھ سکا۔ وہ دور صرف یہ یا وہ کا قایل تھا۔ اب جاکر یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ہمیں یہ اور وہ دونوں کی ضرورت ہے

بہرحال میرے نزدیک حقیقی سرسید ہمیں تک ہمارے لیے اپنی بھرپور جامعیت اور معنویت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی آخر زمانے کی سیاست اصولی نہیں وقتی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مستقل پالیسی نہیں وقتی پروگرام ہے علی گڑھ ایک تعلیمی، تہذیبی، ادبی، علمی، مذہبی فکر لے کر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ایک سیاسی شعور بھی تھا لیکن ایک علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی ادارے کو دوررس سیاست، حقیقی سیاست، اچھی زندگی بسر کرنے کی سیاست کا علم بردار ہونا چاہیے نہ کہ وقتی سیاست کی لہروں میں ڈوبنے والی ناؤ کا۔ اس لیے میرے نزدیک جس طرح ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ ایک نامکمل عمل رہی اور وہ ذہنی بیداری جو راجہ رام موہن رائے سے شروع ہوئی تھی بالآخر نئی حکومت کی مشین کا پرزہ بننے اور ایک متوسط نیا طبقہ پیدا کرنے میں لگ گئی۔ اسی طرح سرسید کی تحریک صرف انگریزی تعلیم، ایک طبقے کی خوشحالی، جنٹلمین، کھلنڈرے اور اچھے منتظم پیدا کرنے میں مصروف ہوگئی۔ یہ اس تحریک کی اندرونی حرارت تھی جس کی وجہ سے بقول سجاد انصاری بیسویں صدی کے آغاز میں "پیرِ وفا کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر نکلا۔"

عقلیت سائنسی نقطۂ نظر، عالمی معیار، تہذیب کا ایک جامع تصور اردو ادب میں حقیقت نگاری کا فروغ، اردو نثر کی ترقی، یہ ہیں سرسید کے مشن کے بنیادی عناصر۔ اس کے علاوہ ایک پہلو اور بھی ہے۔ سرسید نے اپنے گرد چند ایسے رفقا جمع کر لیے تھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک عالم تھا۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد شبلی کے رول کو تو سب جانتے اور مانتے ہیں مگر آفتاب احمد، عبدالحق مولانا طفیل احمد، غلام الثقلین، مولانا محمد علی، محفوظ علی، ظفر علی خاں، حبیب اللہ، شیخ عبداللہ، سجاد حیدر، ڈاکٹر ضیاء الدین اور ایسے ہی دوسرے حضرات کے اندر جو سرسید کے مشن سے وابستگی، جو اپنے اپنے دائرے میں کام کر کے پوری بساط کو رنگین کرنے کا جذبہ تھا اور جو لو انھیں سینہ تا اب انھیں برابر بے قرار رکھتی تھی، اسے بھی تو آج کی نسل کو پھر سے حاصل کرنا چاہیے۔

آج کتنے اساتذہ ہیں جن کے لیے ان کا کام صرف پیشہ نہیں ایک مشن بھی ہے؟ کتنے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے اس کے بدلے میں ہم نے طلبہ، ادارے اور ملک و قوم کو بہت کچھ دیا بھی ہے؟ کتنے ہیں جو کام کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں، کتنے فرض شناس ہیں اور کتنے صرف حقیقی یا فرضی حقوق کے لیے لڑنے والے؟ کتنے اساتذہ نے اپنے علمی اور ادبی کام کو عالمی معیار تک پہنچایا ہے؟ کتنے طلبہ پر اور درس و تدریس کی ضروریات پر صدق دل سے توجہ کرتے ہیں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اس طرح طلبہ کے سلسلے میں بھی یہ سوال اُٹھتا ہے۔ یوں تو طلبہ داخلے کے لیے پوری کوشش کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ وسائل محدود ہونے کی وجہ سے یہ ادارہ نسبتاً کم معیار کے طلبہ کی نگہداشت نہیں کر سکتا۔ پھر کتنے صرف تعلیم سے غرض رکھتے ہیں، یہاں کی سہولتوں کی وجہ سے ہنگامہ آرائی میں نہیں پڑتے۔ کتنے صرف ناک کی سیدھ اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں؟ باقی ادارہ کی روح، اس کے مشن، اُس کے درد، اس کے خوابوں اور راز کی ہمہ گیر نظر سے کتنے واقف ہیں؟ ان کے سامنے ایک طور ہے مگر وہ دیکھ کسی اور سراب کو رہے ہیں۔ یہ لوگ لمحے میں گرفتار ہیں، وقت کا شعور اُن میں کہاں؟

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اب ایک بڑا ادارہ ہے اور اس میں خاصا کام بھی ہو رہا ہے مگر میں سرسید کی روح کا واسطہ دے کر موجودہ علی گڑھ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ کیا وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں سائنس والوں کو اعزاز ملتا ہے تو علی گڑھ کے سائنس والوں کا کہیں ذکر

نہیں ہوتا۔ شاید اب تک دو تین افراد کے نام اخباروں میں آئے ہیں۔

۲۔ اگر ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے مختلف علوم و فنون کے ایسے اساتذہ کے سو نام لیے جائیں جو اپنے دائرے میں عالمی معیاروں پر پورے اترتے ہیں اور بین الاقوامی حلقوں میں اُن کا احترام ہے تو یہاں کے کتنے اساتذہ اس فہرست میں آئیں گے؟

۳۔ باوجود حالیہ کوششوں کے مقابلے کے امتحانوں میں ہمارے طلبہ کی تعداد کیوں اطمینان بخش نہیں ہے۔

۴۔ ہمارے اساتذہ اور طلبہ میں ایک طرف بنیاد پرستی اور دوسری طرف مغرب زدگی کا میلان کیوں بڑھ رہا ہے؟ اسلام میں تو دراصل بقول ڈاکٹر فضل الرحمٰن بنیاد پرستی رہی نہیں اور یہ خیر الامور اوسطہا کی تعلیم دیتا ہے۔ رہی مغرب زدگی تو اب مغرب بھی اس کی وجہ سے مشکل میں پڑ چکا ہے۔

۵۔ کیا ہمارے ۔تنہ میں ملک و قوم کی صلاح و فلاح بھی اہمیت رکھتی ہے؟

۶۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ایک کالج اردو کے ذریعے سے بی اے تک تعلیم دینے کے لیے شروع نہیں کر سکتے؟ اس کی وجہ سے انگریزی کی پوزیشن یا ہندی کی پوزیشن پر اثر نہ پڑے گا اور پڑنا بھی نہیں چاہیے۔

۷۔ کیا کسی کو یہ خیال آیا ہے کہ سرسید کی ساری تصانیف کا ایک معیاری ایڈیشن شایع ہونا چاہیے جو جدید علمی معیار کے دیباچے اور حواشی کے ساتھ تیار ہو؟

۸۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ سرسید کے افکار چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعے سے طلبہ میں عام کیے جائیں اور ہر طالب علم کو کوئی نہ کوئی مجموعہ داخلے کے وقت مفت دیا جائے؟ یہ کتاب اردو، ہندی، انگریزی تینوں میں مہیا ہو جیسا بہت سے کالج میں بائبل داخلے کے بعد طلبا کو دی جاتی ہے۔

۹۔ اس میں کیا دقت ہے کہ ہر فیکلٹی آزادی کے چالیس سال گزر جانے کے موقع پر اپنے یہاں کی ریسرچ کے خلاصے تیار کرے تاکہ آج کی ریسرچ کے معیار اور وسعت کا اندازہ ہو سکے۔

۱۰۔ کیا ادارۂ علوم اسلامیہ میں ایک سکشن صرف ان طلبہ کو جدید تحقیق کے معیاروں سے آشنا کرانے کے لیے نہیں ہو سکتا جو عربی مدارس سے آئے ہوں؟

۱۱۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات صابن، روشنائی، کاغذ، بال پین، دوائیں خود تیار نہیں کر سکتے، بازار کے محتاج رہتے ہیں؟

۱۲۔ کیا وجہ ہے کہ ہم صارفیت کی طرف جا رہے ہیں۔ صرف مالی آسودگی ہمیں مطمئن نہیں کرتی۔

۱۳۔ کیا ہم آس پاس کی گندی بستیوں کو صاف رکھنے کے لیے طلبہ کو رضاکارانہ طور پر کام کرنے کے لیے مایل نہیں کر سکتے؟

۱۴۔ کیا سترہ اکتوبر کو سرسید کا تذکرہ کافی ہے؟

یوم سرسید کے موقع پر ہم میں سے ہر ایک کو یہ اور ایسے بہت سے سوال کرنے چاہئیں۔ دراصل ہم سرسید کی فکر اور سوز و گداز کو بھول گئے ہیں۔ ابھی اس میں بجلی کا اتنا خزانہ ہے کہ ہم برسوں اس سے روشنی اور گرمی حاصل کر سکتے ہیں۔ رسالہ تہذیب الاخلاق تو نکالا ہی اس لیے گیا تھا کہ سرسید کی معنویت آشکار ہو۔ امید ہے کہ اس کے مضامین کے ذریعے سے ہم سرسید کے مشن کو اپنے دل کی دھڑکن بنا سکیں گے۔

آخر میں میں یونیورسٹی کے ارباب اغنیاء کو ایک ضروری کام کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ہمارا رابطہ علی گڑھ کے پرانے طلبہ سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت علی گڑھ کے فارغ التحصیل ...یورپ، امریکہ، افریقہ، ایشیا اور آسٹریلیا کے بہت سے شہروں میں ملیں گے۔ ان میں سے بہت سے خدا کے فضل سے مالی اعتبار

وہ ہیں۔ اُن سے رابطہ قایم کرکے انھیں اس بات پر مایل کرنا
علی گڑھ میں اعلیٰ علمی کاموں کے اعتراف کے لیے کچھ انعامات
سرسید کے نام سے مقرر کریں۔ اس غرض سے دس لاکھ روپیہ آسانی
سے جمع کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا آدھا تو صرف ہندوستان ہی سے جمع
ہو سکتا ہے۔ اس روپیے سے دس دس ہزار کے دس انعامات ہر سال
طبعیاتی سائنس، حیاتیاتی سائنس، میڈیسن، انجینرنگ، سماجی علوم، ادبیات،
قانون، کامرس، علوم اسلامیہ اور تعلیم میں سب سے ممتاز تحقیق کے
لیے دیے جائیں جو اساتذہ یا یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے ہوں
انعام کے لیے پروفیسر عبدالسلام اور پروفیسر کوٹھاری اور ایسے
ہی دوسرے حضرات کی جیوری ہو۔

یونیورسٹی کا قریب قریب سارا خرچہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
سے آتا ہے مگر ہمیں اس کے باوجود اپنے طور پر بھی اچھے کاموں کے لیے
قوم سے روپیہ جمع کرنا چاہیے۔ امریکہ کی بیشتر اچھی یونیورسٹیاں
عطیات پر چل رہی ہیں۔ عطیات بڑے ہوں یا چھوٹے ان کے ذریعے
پرانے طلبہ سے گہرا رابطہ قایم ہو سکتا ہے۔ آج کل تو صرف کچھ اولڈ بوائے
کورٹ کی ممبری کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور بس۔ اُن سے بجا طور پر
یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مادر درس گاہ کے نام کو علمی دنیا میں بلند
کرنے کے لیے اور نئی نسل کو آگے بڑھنے کا موقع دینے کے لیے بھی
سرگرم عمل ہوں۔

چوں کہ اِدھر سماجی علوم اور ادبیات میں اچھے طالب علم کم آرہے
ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے لیے ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی
دونوں مرحلوں پر معقول وظایف ہوں۔ ابتدا میں ہر شعبہ میں ایک
مخصوص وظیفہ ہو۔ ایم۔اے کی تعلیم کے لیے چار سو روپیہ ماہوار
اور پی ایچ۔ڈی کے لیے ایک ہزار روپیے ماہوار کا۔ اس کے لیے
بھی آسانی سے چندہ کیا جاسکتا ہے۔ ہماری ترقی یک طرفہ نہیں
ہونی چاہیے۔ سائنس کی ترقی پر توجہ تو اس وقت سب سے زیادہ
ضروری ہے مگر ہمیں سماجی علوم، فلسفے اور ادبیات کو نظر انداز
نہیں کرنا چاہیے اور ان شعبوں میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت رکھنے
والے طلبہ کے لیے راہ ہموار کرنی چاہیے۔ آج سو دو سو روپے
کے وظایف سے کام نہیں چلتا۔ ان کی رقم اتنی ہونی چاہیے کہ ایک
طالب علم یک سوئی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہ سکے۔ اس
کے ساتھ ان شعبوں میں داخلوں کی شرط یہ ہونی چاہیے کہ بی۔اے
میں پچاس فی صد سے کم نمبر نہ ہوں۔ طلبہ کی تعداد کم ہو جائے
مگر معیار تو بڑھ جائے۔ یونیورسٹیوں کی کامیابی تعداد سے
نہیں معیار سے جانچی جاتی ہے۔ اب خط وکتابت کے ذریعے
سے تعلیم کا انتظام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی
پچاس فی صد سے کم نمبر لانے والوں کے لیے اس قسم کی تعلیم کا بڑے
پیمانے پر انتظام کرسکتی ہے
اور اسے کرنا بھی چاہیے۔

" وہ دوست صادق نہیں جو اپنے دوست کی وفا پر شبہ کرے، زمانہ
خود ہر شخص کی خاصیت کھول دیتا ہے۔ پھر ہم کیوں اپنے دوست کی نسبت
بدگمانی کریں، جب تک ممکن ہو، اس کو اپنا دوست سمجھیں اور اگر آخیر کو وہ
بدباطن نکلے تو صرف خاموش اور علیحدہ ہو جاویں۔"

سید محمود

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)

آثار الصنادید کے آئینے میں

سرسید کا اسلوبِ نگارش

نادر علی خان

تقلید محض عقلِ محض سے کم خطرناک نہیں کیوں کہ کائنات کی ہر لحظہ تغیر پذیر فضا میں تلوّن تجدد میں اور جمود تقلید کے پیکر میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فعّال اور متحرک قوتیں کج روی کا شکار ہو کر فریب اجتہاد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور دانش و بینش سے محروم، مجاہدہ اور مشقت سے عاری طلسمِ تقلید میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اگر عظیم شخصیات کی گرفت کبھی سخت ہو تو پھر نجات کا امکان بھی سلب ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے احوال اور کارنامے افراط و تفریط سے منزّہ نہیں، کہیں تفریط کا پیکرِ جمیل جنت نگاہ بنا ہوا ہے تو کہیں تنقیص کا عفریت زہرہ گداز نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ علمی اکتسابات میں بھی ذاتی پرخاش تنقید فن پر غالب آگئی ہے۔ چنانچہ فن کار کی شخصیت جس درجے رفیع، پہلو دار اور ہمہ گیر ہو گی اسی کے بقدر ستائش و تردید کی گرم بازاری ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید جو انیسویں صدی میں بین الاقوامی شہرت کے حامل، ملتِ اسلامیہ کے جانباز شہسوار، تجدد و اجتہاد کے علم بردار اور مختلف النوع علوم و فنون کے قافلہ سالار ہیں، مدح و ذم کے باب میں توازن و اعتدال سے یکسر محروم ہیں۔

سرسید کی سیاست اور مذہب، صحافت اور تاریخ نویسی، تعلیمی تحریک اور مہارتِ فنِ تعمیر سے ہمارا براہِ راست تعلق نہیں، البتہ سرسید کی ادبی حیثیت متقاضی ہے کہ امعانِ نظر سے موصوف کی رفعت و جدت، تنوع اور امتیاز کا تجزیہ کیا جائے مگر اس راہ میں ایسی آہنی دیواریں حائل ہیں کہ لب کشائی فتنہ پردازی سے کم نہیں اور ممکن ہے کہ دفاع میں کوربا طنی اور تنگ نظری کا فتویٰ بھی لگ جائے۔

سرسید پر علامہ شبلی کا مضمون جس درجہ مستند اور جامع سمجھا جاتا ہے، اسی کے بقدر فیصلہ کن بلکہ گمراہ کن بن گیا ہے۔ ہر جملہ ایک قولِ فیصل اور کلیہ ہے کہ جس نے تحقیق و تنقید کی راہیں مسدود کر دی ہیں حتیٰ کہ گزشتہ پون صدی میں موصوف کی آراء سے انحراف یکسر معدوم ہے۔[1] جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سرسید کا امتیاز و انفرادیت مرزا غالب اور امام بخش صہبائی کے کمالات کا مظہر و عکس بن گئے ہیں۔ علامہ شبلی کا بیان ہے :

”لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو (سرسید) شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لیے وہ بہت جلد اس کوچے سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ چوں کہ حقایق اور واقعات کی طرف ابتداء سے میلان تھا اس لیے دلّی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت اور کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔“

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے خصوصاً میر امن صاحب کی چہار درویش جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی اور جس کی سادگی اور روانی و طرازی آج

---

[1] ۱۸۵۰ء غالب نے اردو خطوط نویسی کا آغاز کیا اور پہلی مرتبہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے اثر سے سادہ، آسان اور بے تکلف عبارت کا رواج عام ہوا لیکن ان کے زمانے میں بھی پرانا انداز قایم و برقرار رہا۔ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں انشا کا وہی پرانا اور فرسودہ انداز ہے۔ سرسید نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ کتاب پر صہبائی کی اصلاح ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر پوری پوری عبارت انہیں کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔

(شبلی ایک دبستان ص ۱۸ - ۲۱۷)

بھی موجودہ تصنیفات کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ
جو مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف
اور آورد سے اِبا کرتا تھا تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل
اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام
بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانا موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ
تھے کہ اُن کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے
تھے۔ سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے
بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے
ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے
تھے۔ بہرحال اس کتاب میں جہاں جہاں انشاء پردازی کا زور
دکھایا ہے، اس کا نمونہ یہ ہے:

" ان حضرات کی طبع رسا، تشکل رابع سے پہلے اس سے
نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم و
ذکا اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا
ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا، معنی فہمی اس دلجے
کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور
رمز شناس اس مرتبے کو، واقعی معلوم ہو گیا کہ نگاہ نرگس
نے کیا اشارہ کیا، اگر اُن کی رائے روشن معجز نما ہو تو
نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزیٰ
کو دو نیم۔"

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے
والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک
پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا
نام سید الاخبار تھا اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے اقتضا
سے سادہ اور صاف ہوتی تھی۔ تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی زبان
نہ سمجھی جاتی تھی، اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا
تھا، اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اس وجہ سے
آثار الصنادید میں جہاں جہاں انشاء پردازی سے کام لیا اسی
طرز کو برتا۔

آثار الصنادید جس زمانے میں نکلی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں
کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو
کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے۔ چونکہ
وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال رہتے تھے۔ اس
لیے انھوں نے تمام ہمعصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا،
مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے کہ جیسے
دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں، اسی کے ساتھ بہت
سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، مسرت و خوشی،
حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات
کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے
سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو
انشاء پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام
سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے
رکھا تھا۔

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے اس لیے
شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے
اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو
اخبارات جاری ہو گئے اور انشاء پردازی کی روز بروز ترقی ہوتی گئی
اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسایل سے کام
پڑتا تھا اس لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔"

اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن اس کا اندراج ناگزیر تھا چنانچہ اس
کی روشنی میں حسب ذیل تنقیحات قایم ہو سکتی ہیں:

۱۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور
ابنیہ کی تاریخ، وہ تکلف اور آورد سے اِبا کرتا تھا
تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ
نظر آتا ہے۔

۲۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا
امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانا موصوف بیدل کے

ایسے دلدادہ تھے کہ اُن کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے اسی طرز میں لکھتے تھے۔

۳۔ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ اس وقت تک یہ (اردو) علمی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں جہاں جہاں انشاپردازی سے کام لیا' اسی طرز کو برتا۔

۵۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے' اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا' سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے اس لیے شبہ نہیں ہوسکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

۶۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہوگئے' اور انشاپردازی کی روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا اس لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔

اگر امعانِ نظر سے مذکورہ بالا الزامات کا تجزیہ کیا جائے تو علامہ شبلی کے انداز بیان، طرز استدلال اور قدرت استنباط کی داد دینا پڑے گی، کیوں کہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ آثار الصنادید باوجود تاریخی شاہکار ہونے کے تکلف اور آورد کا مرقع ہے اور اس میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے صحیح نہیں ہے کیوں کہ آثار الصنادید طبع اول دیباچے کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے جس کے ابتدائی تین ابواب میں تکلف اور آورد کا شائبہ تک نہیں ملتا البتہ دیباچے کے دو صفحات کے علاوہ چوتھے باب کے بعض مقامات پر جو عمارات اور ابنیہ کی تاریخ پر نہیں بلکہ اہل دہلی کے سوانحی مرقعوں پر مشتمل ہیں' انشا پردازی کا رنگ ملتا ہے لیکن رنگ مولانا فخرالدین اور اُن کے متوسلین' سید احمد شہید (بانی تحریک جہاد) اور اُن کے بعض متعلقین' مفتی صدرالدین آزردہ اور مرزا غالب کے احوال ہی میں ملتا ہے مگر بقول مولانا شبلی اگر یہ مقامات بھی مولانا صہبائی کا فیضان ہیں تو سرسید نے کسی مقام پر بھی انشاپردازی اور تکلف و آورد سے کام نہیں لیا۔

بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ آثار الصنادید طبع اول اور ثانی میں زبردست اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ کیوں کہ طبع اوّل کی زبان ثقیل اور مغلق رنگین اور پر تکلف ہے اور طبع ثانی کی سادہ' رواں اور سلیس ہے لیکن موجودہ حقائق کی روشنی میں یہ مفروضہ درست نہیں' کیوں کہ طبع ثانی میں دیباچے کی چند سطروں کے علاوہ زبان اور بیان کا کوئی اختلاف نہیں ملتا — البتہ حسب ذیل نکات قابل توجہ ہیں۔

اے' اے' رابرٹس کلکٹر دہلی نے انگلستان سے واپسی کے بعد اس خاکسار (سرسید) کی شرکت میں اوس کتاب (آثار الصنادید) کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اگر از سرنو یہ کتاب بہت اچھی طرح مرتب کی جائے اور جو خرابیاں کہ پہلی کتاب میں ہوگئی ہیں وہ سب درست کی جائیں تو بہت اچھی بات ہے۔ الحمدللہ خداوند تعالیٰ نے اوس آرزو کو پورا کیا اور جس طرح کہ دل چاہتا تھا اوس طرح پر یہ کتاب پوری ہوئی۔ پہلی کتاب سے یہ کتاب بہت سی باتوں میں اچھی ہے۔

۱۔ اس کتاب کا پہلا باب جس میں مختصر ہندوستان کی آبادی اور پرانی اور نئی عمل داریوں کا ذکر ہے پہلی کتاب میں نہ تھا۔

۲۔ پہلی کتاب کے دوسرے باب میں صرف شاہ جہان آباد کے قلعے کا ذکر تھا۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں اوس قلعے کا بھی پہلی کتاب سے بہتر بیان ہے اور علاوہ اس کے ابتدائی آبادی سے آج تک جس قدر قلعے بنے اور شہر بسے ان سب کا ذکر ہے۔

۳۔ پہلی کتاب کے پہلے اور تیسرے باب میں جس قدر مطالب تھے وہ سب اس کتاب کے تیسرے باب میں اکٹھے ہیں'

بلکہ بعض پرانے مکانات کا اور حال جو دریافت ہوا ہے وہ
زیادہ ہے۔

۴۔ پہلی کتاب میں دو نقص تھے ایک یہ کہ بعضے پرانے مکانات کا
اصل حال دریافت نہ ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ پہلی کتاب میں
بعضی جگہ کے بیان حال میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ اس کتاب میں یہ
دونوں نقص دور کیے گئے۔

۵۔ پہلی کتاب میں عمارات کا بیان متفرق اور غیر منظم تھا، اب کی
دفعہ سب عمارات کا حال بہ ترتیب سال بنا انتظام سے لکھا
گیا۔

۶۔ پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا' اس کی سند نہ تھی اب
کے کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے اکثر اس کی سند کے لیے نام
اس کتاب تاریخ کا جس سے وہ حال لکھا گیا ہے' حاشیے
پر مندرج ہے۔

۷۔ بڑی عمدہ بات اس حال کی کتاب میں یہ ہے کہ جس قدر کتبے
پرانی عمارتوں پر ہیں وہ سب اصلی قطع اور اصلی خط کے مطابق
اس کتاب میں مندرج ہیں۔ خاتمہ' اردو زبان کے نکلنے اور
مروج ہونے کے بیان میں۔

سرسید کے تجدد اور امامت کے بارے میں علامہ شبلی کا یہ احتجاج
کہ یہ موصوف کا حق نہیں بلکہ یہ تاجِ اولیت مرزا غالب کے سر پر زیب دیتا ہے
مناسب نہیں' ہمیں مرزا غالب کے امتیازات اور علمی اکتسابات' طرز ادا کی
انفرادیت اور ندرت و جدت سے انکار نہیں لیکن یہ مفروضہ سرسید کی آثار
الصنادید اور اس سے قبل کی علمی کاوشوں سے عدم واقفیت یا غلط فہمی پر مبنی
ہے۔ کیوں کہ آثار الصنادید کے اسلوب کی غالب صفات دور کمال کی رفعتوں
سے چشمک کرتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ذیل میں طبع اول سے چند اقتباسات نقل کیے
جاتے ہیں۔

پہلا باب

شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں۔

واضح ہو کہ سابق میں آبادی اس شہر کی جانب جنوب تھی
اور جتنے قدیم مکان ہیں وہ اسی جانب واقع ہیں۔ جس بادشاہ
نے اپنے عہد سلطنت میں قلعہ بنایا اور شہر بسایا وہ شمال کی
طرف ہٹتا آیا۔ اس سبب سے اس شہر کے اور طرف مکانات
قدیم بہت کم ہیں مگر تغلق شاہ اور عادل نے قدیم آبادی
کے جنوب کی طرف قلعہ بنوایا تھا۔ اس جہت سے گویا انتہائی
عمارات قدیم جانب جنوب کو تغلق آباد کا قلعہ ہو گیا ہے۔

اب کہ ہم نے شہر کے باہر کی عمارتوں کا حال لکھنا شروع کیا
مناسب معلوم ہوا کہ انتہائی عمارت سے یعنی قلعہ تغلق آباد سے جملہ
عمارات قدیم کا حال لکھیں تاکہ اس سے دنیائے ناپائیدار بہ
عبرت ہو اور اس بوقلمونی روزگار پر بصیرت' اہلِ بصیرت کے لیے
یہ ایک آئینہ ہے کہ اس سے عبرت بڑھتی ہے اور بے بصیرتوں
کو بصیرت ہوتی ہے۔

چوتھا باب

دلّی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں

اگر میں یہ ارادہ کروں کہ ابتدا سے دلّی کا حال لکھوں اور
ہندوؤں کی تاریخ کے موافق اس کا بیان کروں' اس کو تو
ایک دفتر چاہیے اور اس مختصر میں کہاں گنجائش کہ وہ سب
آسکے۔ اس واسطے تھوڑا تھوڑا اس کا حال لکھ دیتا ہوں
کہ دلّی کو تیسری اقلیم میں گنتے ہیں۔

آب و ہوا کا بیان

اگلے زمانے کی آب و ہوا کی بہت تعریف سنی جاتی تھی لیکن
اس زمانے میں میرے نزدیک خاص شہر کی آب و ہوا اچھی
نہیں' شہر میں عموماً سب کنویں کھاری ہیں لیکن جو جو کنویں
شہر کے کنارے پر ہیں اُن کا پانی میٹھا ہے۔ دریا کے پانی
کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں کہ جیسا دریا کا پانی ہوتا ہے
ویسا ہی ہے بلکہ اس سبب سے کہ اب دریا میں پانی بہت
کم رہ گیا ہے اور جا بجا نہروں میں کٹ گیا ہے' دریا کا پانی
بھی اچھا نہیں رہا۔ کنووں کا پانی گرمیوں میں بہت سرد ہوتا
ہے اور برف اور شورے کے پانی کو بھی مات کرتا ہے
اور ہلکا بھی ہوتا ہے لیکن جیسا چاہیے ویسا ہاضم نہیں'

اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ پانی کچھ مضر ہے، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ تعریف کے قابل نہیں۔

ہوا یہاں کی بہت مرطوب ہو گئی ہے اور بہت آدمی بلکہ تمام شہر کے لوگ امراض ضعف معدہ اور نزلے میں گرفتار رہتے ہیں۔ باعث ان خرابیوں کا بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ آبادی شہر کی بہت کثرت سے ہے اور حرفہ کے لوگ رہتے ہیں اور اگلے زمانے کی نسبت گلیاں اور بازار بھی بہت تنگ ہو گئے ہیں اور شہر کی صفائی بھی جیسی چاہیے، ویسی نہیں رہی۔ اس وجہ سے آب و ہوا کے مزاج میں اختلاف ہو گیا ہے۔ گرمیوں میں گرمی اگرچہ بہت شدت کی نہیں ہوتی لیکن امراض وبائی اکثر شہر میں پھیل جاتے ہیں شہر کے باہر کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ پانی بھی ہاضم اور ہوا بھی بہت خوب۔ بیماری بھی بہت کم، خصوصاً قطب صاحب کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ اگرچہ اب وہ بھی اس سبب سے کہ بادشاہ وہاں بہت جا کر رہتے ہیں اور اژدحام خلقت کا ہو جاتا ہے اور کوڑا کرکٹ پھیلتا ہے جیسی پہلے تھی ویسی نہیں رہی لیکن پھر بھی غنیمت ہے باوصف ان سب باتوں کے یہاں کی آب و ہوا اور شہروں سے ہزار ہزار درجے بہتر ہے کوئی مرض مخصوص یہاں کی آب و ہوا کا نہیں۔ خدا کے فضل سے سب لوگ اچھے اچھے گورے چٹے خوبصورت خوبصورت ہوتے ہیں اور اپنی اپنی جوانی میں عجب عجب جوبن دکھاتے ہیں۔

شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان۔

اگرچہ لوگ یہ خیال کریں گے کہ میں نے جو شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطنی ہوگا لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے۔ ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے ہی سے ذوق ہے۔ ہر ایک کی جبلت میں اخلاق ایسا سمایا ہے کہ اگر ایک ایک بات ان کی لکھی جاوے اور ہزار ہزار اخلاق کی کتاب بن جاوے اس پر حلم ویسا ہی ہے، مروت ویسی ہی ہے دوست پرستی کا کچھ بیان نہیں، ہزارہا آدمی ہوں گے جنہوں نے تمام مکروہات ترک کر کر اور خواہش نفسانی کو چھوڑ کر طریقہ سنت محمدؐ کو اختیار کیا۔ بس اس پر خیال کر کر جو خوبی طریقہ محمدیؐ کی ہے وہی خوبی یہاں کے آدمیوں میں ہے۔

اگرچہ بعض بعض نوجوان آزاد مزاج آوارہ طبع بھی ہیں آوارہ مزاج اور لہو و لعب میں بھی مصروف ہیں اور بجز عشق بازی اور واہیات کے اور کچھ کام نہیں رکھتے، لیکن اس پر بھی سب باتیں ایک حیا کے ساتھ ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں۔ این ہمہ غنیمت است کہ کچھ تو حیا ہے۔ ہزاروں جوان سادہ رو نیک خو ایسے ہیں کہ باوصف جوانی اور عالم شباب کے مطلق واہیات کی طرف متوجہ نہیں۔ وہ طریقہ سلامت روی اور نیک طینتی اختیار کیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق ہے۔"

آثار الصنادید کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا شبلی کا مذکورہ دعویٰ عدم واقفیت شکر رنجی پر مبنی ہے اور موصوف کے متبعین نے شخصیت سے م یا سہل انگاری اور تن آسانی کی وجہ سے اصل سے رجوع ہی نہیں ایمان کی بات یہ ہے کہ جمہور نے اصل ماخذ کا بالاستیعاب مطا کر دیا ہے اور ثانوی ذرائع پر اعتماد کر کے بے محابا خامہ فرسا بنا لیا ہے۔ اس کے علاوہ اصل نثری شاہکار، کلیات اور دواو صرف نظر کر کے انتخابات پر قناعت کر لی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ فن پارے کے بھرپور جلوے کے بجائے چند جھلکیاں ہی مقصود ہو چنانچہ سرسید کے آئینۂ کمال پر غبار کا اصل سبب یہی ہے۔

آثار الصنادید کی تالیف سے قبل سرسید کی علمی کاوشوں

جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء) تسہیل فی جرالثقیل (۱۸۴۴ء)
اور فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (۱۸۴۶ء) کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہ تینوں
کتابیں اپنے موضوعات کی اہمیت اور افادیت، ندرت اور تنوع کے علاوہ اپنے
اسلوب نگارش کے باعث خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں معاصر اسالیب بیان
کی تقلید کے بجائے سادہ سلیس اور رواں انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کے لیے مروجہ طرز نگارش کا تتبع آسان تھا، لیکن انہوں
نے عمداً اس سے انحراف کیا اور اپنی غیر معمولی بصیرت سے روحانی موضوعات
اور علمی مباحث کے لیے مسئلہ ابلاغ کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کیا
اور خالص علمی حقایق کو عام فہم انداز میں پیش کیا۔ ان کی کتابوں میں اظہار
ذات کے بجائے موضوع کی وضاحت اور صراحت کا زیادہ اہتمام نظر آتا ہے۔

جلاء القلوب بذکر المحبوب طبع زاد کتاب نہیں بلکہ سرور المحزون سے
ماخوذ ہے اور مدارج النبوت سے چند مطالب کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اخذ و
ترتیب میں اصل کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ چوں کہ یہ اپنے موضوع کی رفعت و
عظمت، متانت و وقار اور تقدس کی وجہ سے خیر الامم کے زخم دل کا
مرہم تھی۔ اس لیے اظہار کمال کے بجائے افادہ عام کا جذبہ غالب نظر آتا
ہے۔ چنانچہ ہر جملے سے سادگی اور صفائی، سلاست اور روانی ٹپکتی ہے۔

" جناب پیغمبر صاحب بہت خوبصورت اور حسین تھے۔ آپ کا
میانہ قد تھا، سرخ و سفید رنگت تھی اور آپ کا سینہ
مبارک چوڑا تھا اور آپ کے دونوں شانوں میں تھوڑا
سا فاصلہ تھا اور آپ کے موئے مبارک کان تک پہنچتے تھے
اور آپ کے سر اور داڑھی میں کل بیس بال سفید تھے اور
آپ کا چہرہ مبارک چودھویں تاریخ کے چاند سے زیادہ
روشن تھا اور آپ کا بدن متوسط تھا۔ نہ بہت موٹا نہ
بہت دبلا۔ اگر جناب پیغمبر خدا چپ رہتے تو بہت ہیبت
اور شان و شوکت معلوم ہوتی تھی اور اگر آپ بات کرتے
تو لطافت اور تازگی ظاہر ہوتی تھی۔ اگر کوئی آپ کو دور
سے دیکھتا تو کمال حسن و جمال نظر آتا اور اگر پاس سے دیکھتا
تو ملاحت اور شیرینی معلوم ہوتی تھی۔ آپ کی باتیں بہت
میٹھی میٹھی تھیں اور آپ کشادہ پیشانی تھے اور باریک اور
لمبی بھویں تھیں اور دونوں بھوؤں میں کچھ فاصلہ بھی تھا
اونچی، بہت خوبصورت ناک تھی، دہانہ کشادہ تھا پر بہت
خوبصورت، دانت بہت روشن اور صاف موتی سے بہتر،
اور آپ کے شانوں کے بیچ میں مہر نبوت تھی اور جن لوگوں
نے آپ کو دیکھا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے کبھی پہلے اور
نہ پیچھے ایسا کوئی شخص حسن و جمال میں نہیں دیکھا، اور آپ
بہت وسیع الاخلاق تھے اور اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ
نہ لیتے تھے مگر جو شخص کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا تھا اس
سے بدلا صرف خالصاً للہ لیتے تھے اور جب کہ آپ خفا
ہوتے تھے تو کسی شخص کو آپ کی خفگی اٹھانے کی طاقت
نہ تھی اور آپ حد سے زائد اور سب سے زیادہ شجاع
اور سخی تھے جس نے جو چیز مانگی اسی وقت آپ نے دیدی
اور کبھی نہیں کہا کہ میں نہیں دیتا اور رات کو آپ کے گھر
میں ایک کوڑی بھی نہ رہتی تھی اور اگر اتفاق سے رہ جاتی
تھی تو جب تک وہ خرچ نہ ہوتی آپ دولت خانے میں
تشریف نہ لاتے تھے[1]

موخر الذکر دونوں کتابوں کے موضوعات خالص علمی اور دقیق ہیں
لیکن اپنی فکری بصیرت اور قدرت اظہار سے مغلق اور ثقیل مضامین
سیّال کر دیا ہے اور ایسی سریع الفہم اور رواں عبارت تخلیق کی۔
کہ جس کا تصور بھی معاصرین کو دشوار نہیں محال تھا۔ اگرچہ دونوں کتابیں
مترجم ہیں لیکن الفاظ کی نشست، جملوں کی ساخت اور بیان کی روانی
سے اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ تسہیل فی جرالثقیل فتح پور سیکری کے زمانہ
قیام میں ترجمہ ہو کر آگرہ سے شایع ہوئی لیکن دلی کی ٹکسالی زبان اور
معاصر روزمرہ کا زندہ نمونہ ہے۔

" آدمی کو لازم ہے کہ دن رات اپنے پروردگار کی تعریف
کرے جس نے ایک چٹکی خاک سے طرح طرح کی صورتیں
بنائیں اور اپنے بندوں کو دین کی سیدھی راہیں

---

[1] جلاء القلوب بذکر المحبوب ص۔ ۲۰۔

بتائیں اور اللہ کی رحمت ہو اس کے پاک پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ اس کے سبب سے ہم گمراہوں نے دوزخ کی آنچ سے نجات پائی اور پروردگار کی اس نے راہ دکھائی۔

اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی حمد و نعت کے بعد سید احمد حسینی الحسنی المخاطب بخطاب جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ فتح پور سیکری ضلع آگرہ کا منصف سب بزرگوں اور عقل مندوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جر ثقیل کا علم بہت عجیب و غریب ہے۔ ساری دنیا کے کارخانے اسی پر موقوف ہیں۔ حق یہ ہے کہ اگر یہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا کارخانہ نہ چلتا اور یہ علم بہت تھوڑا ہے کل اصل اصول اس کی پانچ کلیں ہیں اور باقی سب صورتیں انھیں پانچ کلوں سے توڑ جوڑ سے نکلتی ہیں اور اس علم کو پہلے پہل ابوذر نام حکیم نے عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا تھا بعد اس کے ابوعلی نام ایک شخص عالم نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ بطور خلاصہ کے کیا اور معیار العقول اس کا نام رکھا۔

ایک دفعہ جارج ولیم ہملٹن صاحب بہادر کہ برنجا کی پلٹن میں ۴۴ رجمنٹ کے کپتان اور بہت ذی علم اور رئیس دوست ہیں اور پادری جان جیمس مور صاحب بہادر سے کہ بہت خدا پرست ہیں، اس علم کا کچھ ذکر آیا اور اس رسالے کے بعض بعض قواعد میں نے ان دونوں صاحبوں کے سامنے کہے انھوں نے بہت پسند کیے اور اس کے اردو میں ترجمہ ہونے کے باعث ہوئے۔ چنانچہ میں نے ۱۲۵۹ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۸۴۳ء میں اس رسالے کے قواعد کا اردو میں ترجمہ کیا اور اپنے استاد جناب مولوی محمد نور الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی اصلاح سے صحیح اور درست کیا اور اس رسالہ کا نام تسہیل فی جر الثقیل رکھا۔

جاننا چاہیے کہ جر ثقیل کے علم سے تین کام پڑتے ہیں ایک یہ کہ بڑی بھاری بھاری بوجھل چیزوں کو تھوڑے زور سے اُٹھانا یا کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، دوسرے یہ کہ سخت سخت چیزوں کو چیرنا، تیسرے یہ کہ جو چیزیں کہ ان کا دبانا یا نچوڑنا مشکل ہو، ان کو دبانا اور نچوڑنا، ان تینوں کاموں کے واسطے کل پانچ کلیں ہیں ایک کا نام محور ہے کہ ہندی میں اس کو دھرا کہتے ہیں، دوسری کا نام محل ہے کہ ہندی میں اس کو ڈبلک کہتے ہیں اور ڈھینکلی بھی اسی قسم سے ہے اور تیسری کا نام بکرہ ہے کہ ہندی میں اس کو چرخی کہتے ہیں اور گھرنی اور پہیہ بھی اسی قسم سے ہے چوتھی کا نام لولب ہے کہ ہندی میں اس کو پیچ کہتے ہیں اور پانچویں کا نام اسفین ہے کہ ہندی میں اس کو پھینی کہتے ہیں اور چھینی بھی اسی قسم سے ہے۔

حکیم ابوذر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر میرے تئیں زمین کے سوا اور کوئی ایسی جگہ ملتی کہ اس پر جر ثقیل کی کلیں کھڑی ہو سکیں تو میں ساری زمین کو ادھر اُٹھا لیتا۔[1]

فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" سرسید کے نانا فرید الدین احمد خاں[2] کی علمی کاوشوں کا شاندار مرقع اور موروثی کمالات کی عظیم الشان یادگار ہے۔ ایک ایک لفظ سے موصوف کی جودت ذہن، درّاکی فہم، جدتِ فکر اور حسن ایجاد تراوش کرتی نظر آتی ہے اور ذہن ہندی کا زندہ شاہکار ہے جس نے دانش وران یورپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کا بیان ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی حمد و نعت کے بعد کمترین سید احمد خاں بیٹا سید محمد تقی خاں بہادر اور پوتا جواد الدولہ جواد علی خاں بہادر اور نواسہ وزیراعظم دستور معظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کا سب بزرگوں اور عقل مندوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ پرکار متناسبہ ایک آلہ ہے قدیم اور اس سے اکثر نجوم کے عمل اور ہندسے کی شکلیں اور حساب کے مسئلے آسانی سے

---

[1] تسہیل فی جر الثقیل۔ مطبوعہ تیموں کا چھاپہ خانہ۔ آگرہ
[2] مرحوم اکبر شاہ ثانی کے وزیراعظم اور کمپنی کے متعملیہ تھے۔

نکلتے ہیں۔ چنانچہ بعضی بعضی پچھلی کتابوں اور اگلے حاشیوں میں اس آلہ کا ذکر لکھا ہے لیکن اس سبب سے کہ اس آلہ کا بنانا اور عمل کرنا بہت کٹھن تھا۔ یہ آلہ ہم لوگوں میں بالکل ناپید ہو گیا یہاں تک کہ کوئی نہیں جانتا کہ پرکار متناسبہ کس ہتھیار کا نام ہے جب کہ ہمارے نانا مرحوم نے بعض کتابوں میں اس آلہ کا ذکر دیکھا تو اس کو دیکھنے کے نہایت مشتاق ہوئے اور جو لوگ کہ بڑے ریاضی داں مشہور تھے اون سے اس آلہ کا حال پوچھا تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ دھر اور کہا کہ اس آلہ کو نہ ہم نے دیکھا نہ سنا، ہم نہیں جانتے پرکار متناسبہ کس جانور کا نام ہے۔

۱۲۱۲ ہجری مطابق ۱۷۹۶ء کے ہمارے نانا صاحب مرحوم لکھنؤ میں وارد ہوئے اور جنرل مارٹین صاحب اور مسٹر گوراوزلی صاحب سے ملاقات ہوئی اُن صاحبوں نے ایک آلہ دکھایا اور کہا اس آلہ سے بہت عمل ہوتے ہیں مگر میرے تئیں دو تین عمل اس کے معلوم ہیں اور باقی عمل مجکو کیا بلکہ اکثر صاحبان انگریز کو بھی نہیں معلوم، چنانچہ ان صاحبوں نے ہمارے نانا صاحب مرحوم کے روبرو تقسیم خط اور وتر اور جیب لگانے کے عمل کیے اور کہا ہم کو تو صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ تھوڑے دن بعد ہمارے نانا صاحب مرحوم مسٹر جان بیلی صاحب اور مسٹر لوت صاحب پاس کلکتے میں گئے اور وہاں نیلام میں سے ایک گنج پرکاروں کا لیا کہ اس میں یہ آلہ بھی تھا۔ پھر انھوں نے غور و فکر کی اور سوچ سوچ کر اس آلہ کے اپنی فکر اور ذہن سے سب اعمال نکالے اور جانا کہ پرکار متناسبہ یہی آلہ ہے کہ پہلے عرب میں عجم میں رائج تھا اب صرف انگریزوں اور فرانسیسی میں مروج ہے۔ وہ مسودے ایک جگہ پڑے ہوئے تھے اور اور ان کے سرے پر یہی نام لکھا ہوا تھا کہ "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" اتفاقاً ایک دفعہ کپتان جارج ولیم ہملٹن صاحب بہادر کہ مرد عالم اور با اخلاق اور اشراف دوست الاہریکا کپلٹن کے ۳۴ ویں رجمنٹ کے کپتان ہیں اور پادریکا جان جمیس مور صاحب بہادر کہ بہت مرد خداپرست اور صاحب علم

اور آگرہ کے پادری ہیں، میں نے اس رسالہ کا تذکرہ کیا انہوں نے بہت پسند کیا اور کہا کہ اگر یہ رسالہ اردو میں ترجمہ ہو جاوے تو اسکول بک سوسائٹی بہت پسند کرے۔ چنانچہ میں نے ان مسودوں کو جمع کر کے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور مناسب طور پر مرتب کیا۔

اس رسالے میں بعضے بعضے عربی کے الفاظ جو اس علم میں مستعمل ہیں آدیں گے، اُن کا ترجمہ کرنا اردو میں مناسب نہ جانا۔ اس واسطے وہ الفاظ بہت مشہور ہیں اور اس سے قطع نظر آدمی کو لازم ہے کہ جس علم کو پڑھے اُس کی اصطلاحات سے واقف ہو[1]

مندرجہ بالا دلائل اور اقتباسات کی روشنی میں اصل حقائق تک رسائی مشکل نہیں، کیسے کیسے عالی استعداد اور باصلاحیت افراد نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے مگر تقلید محض کی کرشمہ سازی اور ستم ظریفی دیکھیے کہ ناحق، حق کے روپ میں جلوہ گر ہے اور احساس عرفان و آگہی معدوم عہد جدید کی وبائے تحقیق نے ہر کس و ناکس کو اس وسیع و عمیق سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ چنانچہ اکثریت فن غواصی سے نابلد، تلاطم خیز سمندر کی موجوں کے تھپیڑوں سے دوچار موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ البتہ معدودے چند اس عرصہ ناپید کنار کے جانباز شہسوار ہیں، لیکن وہ بھی تنقید کی گرم بازاری کے باعث نیم جان ہیں۔

---

[1] فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مطبوعہ ۱۸۴۶ء

ایک کارآمد صداقت کو ثابت اور دریافت کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے سب سے منوایا جائے اور عملی جامہ پہنایا جائے۔

یوم سرسید

اسرار احمد

یہ خوش گمانی نہیں، ایک حقیقت ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز اپنی مادر علمی اور اس کے بانی سرسید احمد خاںؒ سے جو بے پناہ عقیدت اور جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی قابل ذکر تعداد میں مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز (علیگ) ہیں وہاں ان کی ایک انجمن قائم ہے جو چاہے اور کچھ کرے یا نہ کرے ہر سال، ۱۷ اکتوبر کو یوم سرسید کا اہتمام ضرور کرتی ہے۔ اس موقع پر ایک یادگاری جشن منایا جاتا ہے۔ سرسیدؒ کے بے مثال ایثار اور قربانیوں کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ ان کے قائم کیے ہوئے ادارے کا ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر احسان گنایا جاتا ہے، انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کیا جاتا ہے۔ آخر میں یہ تقریب انواع واقسام کے کھانے اور مشروب پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہر سال ہوتا ہے، جگہ جگہ ہوتا ہے اور اس تقریب میں ہزاروں علیگ حصہ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اے چمن سرسید کے آغوش میں تربیت پانے والو اور سرسید کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرنے والو! تم لوگوں نے غربت وافلاس اور جہالت کے دلدل میں پھنسی ہوئی اپنی کمیونٹی کے لیے کتنا ایثار کیا؟ اس کے غم میں کتنی بار آنکھیں نم کیں، اس کو اس دلدل سے نکالنے کی فکر میں کتنی رات جاگے اور کتنے دن اس کی ترقی اور فلاح کی تدبیر کی تلاش میں دھول پھانکی؟ تو ہم علیگوں کے پاس ندامت سے سر جھکا لینے کے علاوہ دوسرا جواب کیا ہو سکتا ہے؟

ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے، گزرے ہوئے اکابر کی یاد تازہ کرنے اور ان کے کارناموں کے ذکر کے لیے جشن کا اہتمام کرنا بلاشبہ ایک مفید کام ہے۔ بشرطیکہ اس کا مقصد روشنی پانا، رہنمائی حاصل کرنا اور بلند حوصلگی سے سینوں کو معمور کرنا ہو، مگر جب اس کا مقصد کسی تیوہار کے موقع کی طرح سجنے سجانے اور دعوتیں اڑانے کا، کہا یا ان کہا بہانہ ہو تو یہ کام مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر بن جاتا ہے آج ملک کے کونے کونے میں علیگ پھیلے ہوئے ہیں اس کے باوجود تعلیمی میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی پیش رفت نہ کے برابر ہے اور وہ مختلف سماجی برائیوں کے شکنجے میں جکڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اس بات کا واضح ثبوت نہیں ہے کہ ہر سال یوم سرسید منانے کے باوجود ہم علیگ برادری سرسیدؒ کی زندگی سے کوئی روشنی حاصل نہیں کرتی

سچ تو یہ ہے کہ ہم علیگ آج جس انداز سے اور جس جذبے کے تحت یوم سرسید کا اہتمام کرتے ہیں اور جس طرح اس کے دوسرے ہی دن سرسید کے مشن کو بھول جاتے ہیں، اس پر سرسید کی روح تڑپ تڑپ جاتی ہوگی۔ اپنی زندگی میں قوم کی حالت زار پر چھپ چھپ کر آنسو بہانے والا عالم بالا میں بھی اپنے آنسو نہ روک پاتا ہوگا۔ سوچنے کا مقام ہے جس عظیم شخص نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر دعوت ولیمہ کی مد کا روپیہ کالج کے فنڈ میں دے دیا اور جس نے احباب کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں کے بدلے میں کالج کے لیے روپیے لیے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہوگا کہ اس کے قائم کردہ ادارے سے فیض پانے والوں نے اس کے یوم پیدائش کو ایک روایتی تیوہار بنا

ہے تو کیا اس کی روح خوش ہوتی ہوگی ؟

آج سرسیدؒ کی روح ہر علیگ سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

" اے میرا نام لینے والو ! اے مجھ پر عقیدت کے پھول برسانے والو !! مجھ کو اس بات سے قطعاً سکون نہ ملے گا کہ تم میری قصیدہ خوانی کرو یا میری خدمات کو الفاظ کے خوب صورت لباس میں پیش کرو یا میری آبلہ پائی پر رقت طاری کر دینے والی تقاریر کرو یا میرے نام پر پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام کرو۔ اگر تم حقیقتاً یہ چاہتے ہو کہ مجھے سکون نصیب ہو تو وہ روشنی جو تمہیں تمہاری مادرِ علمی نے بخشی ہے، اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی اپنی قوم میں بکھیر دو۔ خوش حال اور باوقار زندگی کا وہ نسخہ جو تمہیں یہاں سے ملا ہے اپنے مریض بھائیوں میں عام کر دو۔ تم سے میری یہ طلب نہیں کہ تم اپنے گھر بار کو تج کر اپنے آرام و آسایش کو یکسر بھول کر میری طرح دیوانے بن جاؤ۔ البتہ اتنی طلب ضرور ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو یا جاؤ حالات کے مارے ہوئے اپنے بھائیوں کو سمجھاؤ کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا نہ رہیں، جہالت کی تاریکی سے نکلنے کی کوشش کریں، زمانے کے تقاضوں کو پہچانیں اور اس برق رفتاری کے زمانے میں بیل گاڑی پر قانع نہ رہیں۔ ان کو یہ ذہن نشین کراؤ کہ وہ اپنے بچوں کو علومِ جدیدہ سے آراستہ کریں۔ چاہے اس کے لیے ان کو اپنا پیٹ ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ کیوں کہ یہی فلاح کی راہ ہے۔

اے میرے چمن کے پروردہ نوجوانو ! مجھے حقیقی خوشی اس وقت ہوگی جب تم اپنے وقت کا کوئی حصہ چاہے وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، اور اپنی کمائی کا کوئی جز چاہے وہ کتنا ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو، حالات کے شکنجے میں گرفتار ان نونہالوں کو آگے بڑھانے پر صرف کرو جن کے آباء و اجداد کی گاڑھی کمائی سے علی گڑھ کے اس باغ کی آبیاری ہوئی۔ جس میں پرورش پا کر تم اس قابل ہو سکے کہ ایک بہتر زندگی گزارو اور زمانے کی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کر سکو۔ مجھے تم پر فخر اس وقت ہوگا جب تم قوم کے نونہالوں کے لیے نرسریاں قایم کروگے اور جو نرسریاں قایم ہیں ان کی آبیاری کروگے۔ تاکہ وہاں سے تندرست و توانا پودے نکل کر تمہاری مادرِ علمی کے باغ کو آکسفورڈ اور کیمبرج جیسا قابلِ رشک باغ بنا دیں۔

یاد رکھو ! تم چاہے کتنے ہی بالا قد کیوں نہ ہو جاؤ، اگر تمہارے بھائی بونے رہ گئے تو تمہاری عزت حقیقی عزت نہ ہوگی۔ حقیقی عزت کا راز کمیونٹی کی عزت میں ہے، قوم کی عزت میں ہے اور ملک کی عزت میں ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، اگر ہے تو دین کے علم و عمل اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے۔ سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے۔"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی — ارتقاء اور کردار

سید شفیق احمد

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو بابائے قوم "سید والا گہر" کی ایک سو سترویں سالگرہ ہے۔ سرسید احمد خاں جیسی عظیم اور عہد ساز شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۱۲ سال کے اس طویل عرصہ پر نظر ڈالی جائے اور جائزہ لیا جائے کہ اُن کے "بوئے ہوئے بیج" نے کب پودے کی شکل اختیار کی، وہ کب اور کیسے پروان چڑھا اور اب وہ کتنا بڑا تناور درخت بن چکا ہے، اس کی گھنیری چھاؤں میں کتنوں نے دم لیا اور تازہ دم ہو کر "ستاروں سے آگے" جانے کا حوصلہ پایا ہے۔ اس بات کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آنے والے کل میں اس "بڑے درخت" کی کتنی 'نئی اور مضبوط شاخوں' کے نکلنے کا امکان ہے۔ ایک صدی سے بھی زائد مدت میں ہونے والے واقعات اور اعداد و شمار کو چند صفحات میں محیط کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں اس مواد کو یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے جو دستاویزی شکل میں محفوظ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جائزہ اجمالی ہی ہو سکتا ہے تفصیلی نہیں۔

کسی تعلیمی ادارہ کی ارتقاء کا جائزہ اس کی مالی حالت' طلباء اور اساتذہ نیز شعبوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ادارہ کے معیار کا اندازہ کامیاب طلباء کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے سیکولر کردار کا اندازہ غیر مذاہب کے افراد کی شمولیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حالات اور حقائق کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اصولوں پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارتقاء کا جائزہ اس کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کر کے لیا جائے۔ پہلے دور کی مدت ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۹ء تک متعین کی جا سکتی ہے۔ یعنی اسکول سے یونیورسٹی کے قیام تک۔ دوسرے دور کا شمار ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا جا سکتا ہے

تیسرے دور کا آغاز آزادی کے بعد سے ہوتا ہے۔ اس مقالے میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک یعنی ساتویں منصوبے کے اختتام تک کے اعداد و شمار شامل کر کے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر' بھی دکھائی جا سکے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی اپنے دیگر ہم وطنوں کے بالمقابل ہر پہلو سے پسماندہ تھی۔ ایک ماہر طبیب کی مانند سرسید نے بیمار قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر علالت کا پتہ لگایا اور کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی پیش رفت اس وقت تک ممکن نہیں ہوگی جب تک اُن کی جدید تعلیم کا خصوصاً انگریزی اور سائنسی علوم کی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہو۔ سائنس اور مذہب میں انہوں نے توجیہ پسندی کی تلقین کی اور دونوں کے امتزاج کی راہیں تلاش کیں۔ ان مقاصد کے حصول میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ ایک قوم کی تقدیر بدلنے والے مرد کامل کو اس کے اپنے دور میں بھی غلط سمجھا گیا اور آج بھی کچھ حضرات دانستہ طور پر انہیں غلط سمجھنے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مشہور انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے کچھ ماہ قبل سرسید کو "فادر آف سیپریٹ موومنٹ" یعنی تحریک تقسیم ملک کا بانی قرار دیا تھا۔ ایڈیٹر موصوف کی اس زیادتی کو بھی سرسید کی عظیم روح نے اسی طرح معاف کر دیا ہوگا جیسے کہ خود وہ اپنی حیات میں اپنے مخالفوں کو ناسمجھ جان کر معاف کر دیا کرتے تھے۔ وہ عظیم انسان تھے یہی عمل ان کے شایان شان تھا لیکن علی گڑھ سے محبت رکھنے والے افراد کے لیے یہ زیادتی کسی تازیانے سے کم نہیں ہے، ردّ عمل ضروری ہے۔ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے لکھا ہے کہ "سرسید نہ تو

ہندوؤں کے مخالف تھے اور نہ ہی فرقہ وارانہ علیحدگی کے قایل "کسی سیاسی جماعت سے کسی حصول مقصد کے طریق کار پر اختلاف کو وطن دشمنی قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ ایڈیٹر موصوف بھی بخوبی جانتے ہیں۔ تحریک آزادی کے چند اور بڑے رہنماؤں نے کانگریس کے طریق کار سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ کیا وہ سب بھی وطن دشمن اور تحریک تقسیم ملک کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں؟ صحت مند اختلاف تو دانشوری کی نشانی ہے اور جمہوریت کی جان ہے۔ سرسیدؒ کا مقصد تو اپنے قوم کے افراد کو خصوصاً اور سبھی لوگوں کو عموماً تعلیم جدید سے روشناس کرانا تھا۔ کسی کی مخالفت یا وطن سے دشمنی ان کا منشا ہرگز نہ تھا۔ یہ بغیر حکمران سرکار کی مدد کے ممکن نہ تھا۔ چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے انہیں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر تاراچند نے بھی کہا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔

سرسید کا نصب العین تو یہ تھا کہ

"یہ کالج ایک یونیورسٹی کی شکل میں پروان چڑھے گا، جس کے طالب علم ملک کے طول و عرض میں پھیل جائیں گے اور آزادانہ تحقیق، وسیع القلبی رواداری اور اچھے اخلاق کی تعلیم پھیلائیں گے۔"

۱۸۷۵ء میں وہ کس ملک کا تصور کر سکتے تھے۔ تقسیم ملک کی کسی تحریک کے بارے میں سوچ سکتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان کے دماغ میں غیر منقسم ہندوستان تھا۔ انہیں گنگا جمنا سے پیار تھا۔ ہندو مسلمانوں کو وہ "دلہن" کی آنکھیں کہا کرتے تھے۔ انہیں، ایڈیٹر موصوف کی طرح سیکولرزم میں نظریاتی یقین نہ تھا بلکہ وسیع القلبی کی ہزارہا عملی مثالیں پیش کر کے انہوں نے ہمیشہ عملی سیکولرزم کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنی مسلمان قوم کے لیے وہی کیا جو پہلے راجہ رام موہن رائے نے اور بعد میں گاندھی جی نے ہندو مذہب کے پسماندہ طبقوں کے لیے کیا تھا۔ انہوں نے وہی کیا جو بعد میں پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندوؤں کے لیے کیا تھا۔ ان کی تحریک کا مقصد اصلاح اور صرف اصلاح تھا۔

انیسویں صدی کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا اندازہ حسب ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے:-

یونیورسٹی	سال	نام امتحان	کامیاب طلبا کی تعداد	پاس مسلمان طلبا کی تعداد
کلکتہ یونیورسٹی	۱۸۶۷	انٹرنس	۱۳۵۰	۸۳
۱	۲	۳	۴	۵
جو اُس وقت شمالی	۱۸۸۱	انٹرنس	۱۶۶۴	۸۳
ہندوستان میں واحد یونیورسٹی تھی	"	ایف اے	۳۹۸	۱۶
جسے امتحان لینے	"	بی۔ اے	۱۳۴۳	۳۰
کا مجاز تھا۔	"	ایم۔ اے	۳۲۶	۵

اس صورت حال میں سرسید کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ سرکار کی مدد سے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے افراد خصوصاً ہندو ہم وطنوں کے تعاون سے ایک کالج قایم کریں جو مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ ان کی نیک نیتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عطیات دینے والوں میں خاصی بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی۔ اسکول قایم کرنے کے لیے مسلمانوں کے علاوہ سر ولیم میور، لارڈ نارتھ بروک، ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر، ٹھاکر گرپرشاد سہنا، کنور جگت سنگھ، رائے داس، بابو سیتارام، مہاراجہ آف پٹیالہ اور مہاراجہ آف دزیانگرم کے قابل ذکر ہیں۔ اگر ہندو حضرات کے دل میں شکوک و شبہات ہوتے وہ سرسید کی تحریک کی اتنی پرجوش پذیرائی نہ کرتے۔ تمام عطیات مہاراجہ آف وزیانگرم کا عطیہ مبلغ تین ہزار روپیہ کا سب سے بڑا تھا۔ اپریل کے وسط میں عطیات کی مجموعی رقم ۲ لاکھ تک پہنچ گئی۔ عطیات کی وصولیابی کی تفصیلات اخبارات میں بھی چھپتی تھیں۔ ۲۴ رمئی ۱۸۷۳ء کے پانیر اخبار میں اس طرح کی بہت سی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسی یوپی سرکار نے ۷۴ بیگہ زمین بھی کالج کو الاٹ کی۔

۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا افتتاح ہوا۔ سرسید نے اپنی تقریر میں کہا کہ

"لیکن مجھے جو خوشی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ہندو بھائی ہمارے اس کام میں دل سے شریک ہیں اور دل سے مدد کر رہے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں ایک دوسرے کا خون مل جاتا ہے۔ خدا نے صدہا سال سے ہمارا سابقہ ان سے کر دیا ہے۔ یہی زمین ہمارے مرنے کو ہے، یہی زمین ان کے مرنے کو ہے۔ اسی زمین کی پیداوار ان کے جینے کو ہے اور اسی زمین کی پیداوار ہمارے جینے کو ہے" اسی گنگا

ہمارے پینے کو ہے، اسی گنگا کا پانی اُن کے پینے کو ہے۔ یہی ثبوت
ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ وہ بھی اپنے بھائیوں کے اس بھلائی کے
پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس کے انجام کے لیے چندہ دیا ہے اور
بات کو ہم اپنے ہندوستان کے لیے نہایت نیک فال سمجھتے ہیں۔"

پیسہ کی فراہمی کو مدنظر رکھتے ہوئے کالج کا سالانہ بجٹ بنانے
ہائے ماہانہ مصارف کی حد ۹۸۹ روپیہ مقرر کی گئی جس میں ۵۷، روپیہ
اہوں کے لیے اور ۱۳۲ روپیہ وظائفِ طلباء کے لیے منظور کیے گئے۔ اس
یعنی ۱۸۷۵ء میں طلباء کی تعداد ۱۱ تھی اور اساتذہ کی تعداد سات تھی
ہیں دو غیر مسلم تھے۔ سڈنس صاحب کے بعد شری بیج ناتھ صاحب کی
اہ سب سے زیادہ تھی یعنی ۱۲۰ روپیے ماہوار۔ مسلم اساتذہ کو
دوں سے بہت کم تنخواہیں ملتی تھیں۔ سرسید کے سیکولرازم کی یہ
مثال ہے۔ سر راس مسعود کی رسم بسم اللہ راجہ جے کشن داس کی گود
ادا کی گئی۔ اس وقت کے معاشرتی حالات میں یہ ایک اہم بات تھی —
رسید کی مذہبی رواداری کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو اسکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ لارڈ
ن نے رسمِ افتتاح ادا کی۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے علاوہ اس موقع پر موجود
قابل ذکر افراد میں بھوانی چند چکرورتی، راجہ شمبھو نرائن سنگھ، راجہ جے کشن
داس اور رائے کشن کمار کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس سال کالج کے چار
طالب علم انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ چاروں طالب علم امتحان میں
کامیاب ہوئے۔ لیکن ایک بات اہم ہے کہ ان چار طالب علموں میں بھی ایک ہندو
طالب علم تھا۔ اس کا نام ہرناتھ سنگھ تھا اور جس کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔
۱۸۷ء میں ایف۔ اے اور ۱۸۸۱ء میں بی۔ اے کی تعلیم کا آغاز ہوا۔
اے کے امتحان میں پہلی بار صرف چار طالب علم شریک ہوئے جن میں صرف
ایشوری پرشاد کامیاب ہوئے۔ اس طرح کالج کے پہلے گریجویٹ بھی ایک
ہندو تھے۔ کالج کے پہلے پوسٹ گریجویٹ شری امبا پرشاد تھے۔ کیا مذہبی
رواداری کی اس سے روشن مثال کہیں اور مل سکتی ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی مناسب
ہوگا کہ ایم۔ اے۔ او کالج کا الحاق ۱۸۸۶ء تک کلکتہ یونیورسٹی سے تھا۔
۱۸۸۷ء سے اس کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے ہوا۔

۱۸۸۷ء کے بعد کالج کی ضروریات بڑھیں۔ بانیٔ درس گاہ کے ذہن
میں بورڈنگ ہاؤس کی باؤنڈری بنانے کا پلان تھا۔ باوجود بورڈنگ ہاؤس
کی فیس بڑھانے کے اور اپنی جیب خاص سے ۲۰۰ روپیہ ماہوار دینے کے
وسائل کی از حد کمی تھی۔ سرسید کی اپیل پر اس بار بھی مسلمانوں اور انگریزوں
کے علاوہ ہندو بھائیوں نے دل کھول کر مدد کی۔ عطیات دینے والے کشادہ
دل ہندو حضرات کے نام گرامی ہیں کاشی ناتھ بسواس، رائے رنجیت سنگھ، چودھری
شیر سنگھ، رائے کشن کمار، راجہ ادے پرتاپ سنگھ، راؤ کرن سنگھ اور
لالہ گنگا رام وغیرہ۔

۸۴-۱۸۸۳ء میں کالج کی سالانہ آمدنی ۴۴۹۶۴ روپیے ہوئی
تھی جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱	سرکاری امداد	۱۰,۵۰۰
۲	ٹیوشن فیس	۵,۶۰۰
۳	عطیات و کرایہ	۱۰,۳۶۴
۴	کالج فنڈ سے امداد	۱۸,۵۰۰
	میزان	۴۴۹۶۴/-

بورڈنگ ہاؤس کی فیس کئی بار پہلے بھی بڑھائی گئی تھی۔ مذکورہ بالا
سال میں سنگل سیٹیڈ کمروں کا کرایہ و طعام ۱۲/- روپیے ماہوار برائے
کلاس "اے" مقرر کیا۔ سب سے کم فیس ۶/- روپیے ماہوار مقرر
کی گئی۔ غریب طلباء سے بورڈنگ ہاؤس کی فیس بھی نہیں لی جاتی تھی۔

۱۸۹۵ء تک طلباء کی تعداد ۵۶۵ ہو گئی جس میں ۱۰۹ ہندو تھے۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو وہ گوہر قوم و ملک مٹی کی تہوں میں چھپ
گیا۔ تعزیتی پیغاموں میں ایک پیغام جناب ستیش چند بنرجی، ایڈوکیٹ
الہ آباد کا بھی ہے۔ انھوں نے سرسیدؒ کی موت کو سارے ہندوستان
کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان بتایا تھا۔ مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات
ثابت ہوتی ہے کہ سرسید نے ہر موقع پر اپنے ہم وطن ہندو بھائیوں سے
مل کر پسماندہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے علی گڑھ تحریک چلائی تھی جس کا مقصد
صرف یہی تھا کہ ہندوستان میں ہی مسلمانوں کے لیے پہلے کالج اور بعد میں
یونیورسٹی بنائی جائے۔ دیگر مذاہب کے افراد نے خصوصاً ہندوؤں
نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا۔ سرسید کے سیکولرزم کا اور ان کی نیک
نیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی

اولین تاریخ بھی ایک انگریز تھیوڈر ماریسن اور دوسری ایک ہندو سرکاری افسر شری ایس۔ کے بھٹناگر نے لکھی۔ بھٹناگر صاحب نے سرسید کی مذہبی رواداری، وطن پرستی، وسیع القلبی کی ہزارہا مثالیں دی ہیں۔ پیش لفظ کا اختتام وہ اس جملے پر کرتے ہیں،

"مجھے اپنی محنت کا صلہ مل جائے گا اگر میں لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ علی سیکولرزم کسے کہتے ہیں۔"

اسے دیکھنا ہے تو سرسید کی زندگی میں دیکھو۔ ۹ر جون ۱۹۱۲ء کو مہاراجہ دربھنگہ نے اپنی ایک تقریر میں علی گڑھ کو جمنا اور بنارس کو گنگا کہا تھا۔ اس جملہ سے مکمل اتحاد ظاہر ہوتا ہے۔

ایڈیٹر موصوف کو شاید "سیکولرزم" اور "سیپریٹزم" میں فرق کرنے کے لیے بیرون ملک کی کتابوں کی نہیں بلکہ ہندوستانی کتابوں کی ضرورت ہے۔ اُن ادیبوں اور مورخوں سے ملنے کی ضرورت ہے جنھوں نے سرسید کی گنگا کا پانی پیا ہو۔

۱۸۹۸ء تک ایم۔ اے۔ او کالج کی ترقی کا اندازہ حسب ذیل اعداد سے لگایا جاسکتا ہے:

i آمدنی ۷۶۷۴۷

خرچ ۷۸۵۷۷

ii اساتذہ

یوروپین پروفیسر	(۲)	یوروپین پرنسپل	(۱)
ہندوستانی پروفیسر	(۲)	پرشین ٹیچر	(۱)
عربی ٹیچر	(۱)	پروفیسر آف لا	(۲)
سنسکرت ٹیچر	(۱)		
کل تعداد	۱۰		

iii طلباء کی تعداد

اسکول کے طلبا	۱۷۹
کالج کے طلبا	۱۶۴
کل تعداد	۳۴۳

ہندو طلباء ۵۳

(۱۷) امتحان کے نتائج

	تعداد شرکاء	تعداد پاس طلباء
انٹرنیس	۱۴	۵
انٹرمیڈیٹ	۴۴	۱۳
بی۔ اے	۳۶	۲۰
ایم۔ اے۔	۳	۲
ایل۔ ایل۔ بی	۲۰	۵

کالج کا اس زمانے میں بھی آل انڈیا کردار تھا۔ تقریباً سبھی صوبوں سے طلبا علی گڑھ پڑھنے آتے تھے، جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے:

۱۔ یو۔ پی۔ ۱۳۶ (۲) بنگال ۶ (۳) پنجاب ۹۱
(۴) مہاراشٹر ۸ (۵) آندھرا پردیش ۲ (۶) تامل ناڈو ۲
(۷) راجستھان ۵ (۸) مدھیہ پردیش ۱۳ (۹) بلوچستان ۱

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے کتنے کالج آفاقی کردار کے ساتھ ساتھ آل انڈیا کردار بھی رکھتے تھے؟ سارے ہندوستان کو یکجا کرنا ہی کیا سیپریٹزم کہلاتا ہے؟ ایڈیٹر موصوف کے مذکورہ بالا جملہ سے اس صاحب کشف اور حکیم دانا کی شخصیت پر تو کوئی آنچ نہیں آتی ہاں البتہ اخبار کی تنگ نظری کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔

سرسید نے اپنے زمانے میں ہی ڈائرکٹر آف سیکولر اسٹڈیز کی بھی جگہ قایم کی تھی۔ محمڈن سول سروس فنڈ بھی قایم کیا تھا تا کہ سرکاری نوکریوں کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جاسکے۔ اپنی مدد آپ کرو (جسے اب شرمدان کہا جاسکتا ہے) کا بھی تصور انہوں نے دیا تھا۔ انہوں نے ایک کنواں اسی اسکیم کے تحت کھدوایا تھا۔ بہت سی عمارتیں سرسید کی زندگی میں ہی تعمیر ہو چکی تھیں۔ اُن میں اسکول بورڈنگ ہاؤس، ظہور وارڈ اسٹریچی ہال (۱۲ر نومبر ۱۸۹۴ء) انگلش ہاؤس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نظام میوزیم بھی ۱۸۷۷ء میں بن گیا تھا۔

سرسید کی زندگی میں ہی کالج کو یونیورسٹی بنانے کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد تحریک نے زور پکڑا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

[کا]نفرنس کے لاہور اجلاس میں ۱۸۹۸ء میں مسٹر ماریسن نے کالج کو یونیورسٹی [بنا]نے کا ایک ریزولوشن پیش کیا جسے پاس کر دیا گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء [کو] آغا خاں کی قیادت میں ایک وفد لارڈ منٹو سے ملا جس نے یونیورسٹی کے قیام [کے] واسطے حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ ۱۹۱۱ء میں نواب وقار الملک [کی] صدارت میں کمیٹی تکمیلِ محمڈن یونیورسٹی تشکیل دی گئی تاکہ دربار تاج پوشی [سے] قبل ۳۰ لاکھ روپے جمع کیا جاسکے اور جس کی بنیاد پر ملک المعظم سے [یو]نیورسٹی کا چارٹر حاصل کیا جاسکے۔ ایک اور کمیٹی مجوزہ یونیورسٹی کے [کا]نسٹی ٹیوشن مرتب کرنے کے لیے تشکیل دی گئی۔ اس مقصد کے لیے سر سید [م]یموریل فنڈ بھی قایم کیا گیا

اس سے قبل کہ ایم۔ اے۔ او کالج کی ارتقاء کے دوسرے دور [کا] جائزہ لیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آخری سال یعنی ۱۹۱۹ء [کی] پوزیشن کا تجزیہ کیا جائے۔ کالج کی مالی حالت کا اندازہ اُس سال کے بجٹ [او]ر حسابات کی تفصیلات سے ملتا ہے۔ کالج کی تخمیناً آمدنی برائے سال [۱۹۱۸]ـ۱۹۱۹ء، ۲۳۶۷۲۹ روپیے تھی۔ اخراجات کی مجوزہ رقم ۲۸۱۴۲۳ [رو]پیے تھی۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

تفصیل آمدنی ـــــ

		روپیہ	روپیہ
۱	امدادِ سرکاری	۱۴۴۰۰	
۲	برنسلی اسٹیٹ	۴۹۲۰۰	
۳	میونسپل بورڈ	۱۳۲۰	۶۴۹۲۰
۴	انوسٹ منٹ سے آمدنی		۱۵،۶۶۸
۵	فیس		۵۵۹۵۰
۶	جائیداد اور کرایہ سے آمدنی		۳۹۶۰
۷	عطیات برائے وظیفہ		۹۹۳۴
۸	کنٹریبوشن / متفرقہ		۳۵۸۳۷
۹	میزان		۱۸۶۲۶۹
۹	پرنس آف ویلیس سائنس اسکول		۲۲۳۰۰
۱۰	اسکول کے طلبا کی فیس		۲۶۱۶۰
	کل میزان		۲۳۶،۷۲۹

تفصیل اخراجات

		تنخواہ	دیگر اخراجات	کل خرچ
۱	کالج			
۱	آرٹس۔ سائنس۔ لا انجینئرنگ، دینیات، بورڈنگ ہاؤس	۱۳۴،۷۷۰	۳۴۹۵۹	۱۶۹،۷۲۹
۲	اسکول	۳۶،۶۱۹	۴۵۲۴	۴۱،۱۴۳
۳	انگلش ہاؤس	۲۳۳۵		۲،۳۳۵
۴	ہسپتال (ڈسپنسری)	۸،۴۰۲	۲،۷۸۶	۱۱،۱۸۸
۵	دفتر آنریری سکریٹری	۶،۱۳۹	۳،۷۹۶	۹،۹۳۵
۶	رجسٹرار و اکاؤنٹس آفس	۷،۵۹۶	۲،۹۸۷	۱۰،۵۸۳
۷	باغات وجائداد کے محکمے	—	۶۰۵۰	۶۰۵۰
۸	بلڈنگ ڈپارٹمنٹ	۴۰۰۰	۲۱،۸۰۰	۲۵،۸۰۰
۹	متفرق		۴،۶۶۰	۴۶۶۰
	کل میزان	۱۹۹،۸۶۱	۸۱۵۶۲	۲،۸۱،۴۲۳

برنسلی اسٹیٹ حیدر آباد کی سالانہ امدادی رقم سب سے زیادہ تھی یعنی ۲۴۰۰۰ روپیے سال۔ چوں کہ کابل اور آغا خاں صاحب سے امدادی رقوم وصول نہ ہونے کی امید تھی اس لیے بجٹ میں ۶۲۶۹۳ روپیے کا خسارہ متوقع تھا جسے یونیورسٹی کے کیپٹل فنڈ سے پورا کرنے کی امید ظاہر کی گئی تھی یونیورسٹی کے کیپٹل فنڈ میں اس وقت ۳۲،۴۹۴۰۰ روپیہ تھا جو گورنمنٹ سکورٹیز اور شیئرز وغیرہ میں جمع تھا۔ کالج ہال، لکچر روم لائبریری وغیرہ کی عمارتوں کے علاوہ ۹۷ رہائشی مکان تھے جو مختلف اساتذہ کو کرایہ پر دیے گئے تھے اسی سال منٹو سرکل کی نئی عمارت بن کر تیار ہوئی۔ سوئمنگ پول، پرنس آف ویلیس اسکول کی بھی تعمیر ہوئی۔ سلیمان ہال کی موجودہ عمارت کا کچھ حصہ جو اس وقت سرکاری ملکیت تھا اسے بھی سرکار نے یونیورسٹی کو منتقل کر دیا اسی سال اعلیٰ حضرت نظام آف حیدر آباد نے عثمانیہ ہوسٹل بنوانے کے لیے عطیہ کا اعلان کر دیا۔ یونیورسٹی کے حسابات کی جانچ اس وقت تک لولاک لیوس اینڈ کمپنی ہی کرتی تھی۔ بجٹ اور اکاؤنٹس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کالج بجٹ

ریباً ۷۰ فیصدی خرچ تنخواہوں پر تھا اور فی طالب علم خرچ تقریباً ۳۰۷ پیہ سالانہ پڑتا تھا۔

طلبا کی کل تعداد ۹۲۵ تھی (اسکول ۳۲۴۔ کالج ۵۹۹) اور ں میں سے ۴۰۹ بورڈرس تھے۔ امتحان میں شریک ہونے والے اور کامیاب کی تفصیل اس طرح ہے:

نام امتحان	شرکا	پاس۔
ایم۔ اے	۴۶	۳۴
ایل۔ ایل۔ بی	۱۱۹	۸۲
ڈگری کورس	۱۲۹	۵۵
انٹر	۱۷۷	۷۲

میٹریکولیشن کا نتیجہ ۳۷٪ تھا۔ کالج سے ۴۰ طلبا کو مختلف قسم کے امات و میڈلس ملے تھے۔ اُن میں ۱۱ طالب علم ہندو تھے۔ ان کے نام فی سروپ، جگناتھ، پرشاد ماتھر، نرمل سروپ، گجادھر سنگھ ارے لال گپتا اور روشن لال ہیں۔ بشن سروپ کو ۵ انعامات ملے تھے[1]۔

کالج میں ۳۵ اساتذہ تھے اس میں اسکول کے اساتذہ کی تعداد امل نہیں ہے۔ ان ۳۵ میں سے ۵ غیر مسلم تھے۔ ان پانچ میں سے دو ہندو ساتذہ شری ہر ہر شرما اور شری کے۔ ایم پانیکر تھے۔ پرنسپل/ پروفیسر ۱۰۰۰ روپیے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ سینیر ٹیچر کو ۴۵۰ اور جونیر ٹیچر کو ۱۵ روپیے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ اساتذہ کو ۳۰۰ روپیے ماہوار تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اس وقت تک کل ۱۳ مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔

لٹن لائبریری میں کتابوں کی تعداد ۱۷۔۱۶ ہزار کے درمیان تھی۔ لائبریری میں اس وقت بھی ڈیوی ڈسمل سسٹم آف کلاسی فیکیشن رائج تھا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ۱۸۸۱ء میں شمالی ہندوستان سے کل ۵ مسلمانوں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا جب کہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں صرف علی گڑھ سے ایم۔ اے پاس کرنے والے طلبا کی تعداد ۳۴ تھی۔ یہ سرسید کا عظیم کارنامہ تھا۔

اس دور میں شیخ محمد عبداللہ نے تعلیم نسواں کی طرف دھیان دیا۔ انہوں نے پہلا نسواں کالج ۱۹۰۷ء میں کھولا جو ۱۹۲۱ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۳۰ء میں انڈر گریجویٹ کالج بن گیا۔ اسکول اور کالج دونوں میں ہندی اور سنسکرت پڑھانے کا بھی انتظام ہے۔ اسکول اور کالج دونوں میں کئی پرنسپل غیر مسلم رہ چکی ہیں مثلاً مس رام اور مس تھامس۔

دوسرے دور میں گزشتہ ۲۲ سالوں میں کی جانے والی کوششیں بار آور ہوئیں۔ کانسٹی ٹیوشن مرتب کرنے والی کمیٹی (جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے) نے مسودہ پیش کیا۔ چوں کہ ۳۰ لاکھ روپیہ اس سے قبل ہی جمع ہو چکا تھا سر ہارکورٹ بٹلر نے گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی۔ آخر کار ۱۴ ستمبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ سینٹرل اسمبلی نے پاس کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں گولڈن جبلی منائی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں طلباء کی تعداد ۲۹۰۰ سے بھی زاید تھی جس میں تقریباً ۱۰۰ لڑکیاں تھیں۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء تک مختلف مضامین میں ایم۔ اے، ایم ایس سی اور بی۔ اے (آنرس) کرنے والوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

مضمون/شعبہ	ایم۔ اے/ ایم ایس سی			بی۔ اے (آنرس)		
	مسلم	ہندو	کل تعداد	مسلم	ہندو	کل تعداد
انگریزی	۶۵	۱۶	۸۱	۳	۱	۴
اکنامکس	۸۸	۱۱	۹۹	—	—	—
ہسٹری	۱۱۴	۱۹	۱۳۳	۱۳	—	۱۳
فلاسفی	۴۱	۷	۴۸	۴	—	۴
ریاضی	۲۰	۱	۲۱	۲	—	۲
عربی	۳۴	—	۳۴	۳	—	۳
فارسی	۷۶	۲	۷۸	۱	—	۱
سنسکرت	—	۱۴	۱۴	—	—	—
جغرافیہ	۴	—	۴	۷	۲	۹
فزکس	۳۱	۳	۳۴	۱۶	۱	۱۷
کیمسٹری	۲۷	۱	۲۸	۳	—	۳
بوٹنی	۳		۳			
زولوجی	۳	—	۳			
میزان	۵۰۹	۷۳	۵۸۰	۵۲	۴	[illegible]

اسی مدت میں اعلیٰ حضرت نظام آف حیدر آباد، سرسید میموریل فنڈ فنڈ و دیگر عطیات کو ملا کر ایک پرمانٹ رزرو فنڈ بھی قائم کیا گیا ہے۔

---

[1] سرسید کے قائم کردہ انعامات آج بھی برقرار ہیں۔ تعلیمی سال ۱۹۸۴ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے امتحان میں سردار مندیپ سنگھ کو چھ میڈل عطا کیے گئے

کل رقم ۲۰ لاکھ روپیہ تھی۔ یہ اب بھی برقرار ہے اور اس کی آمدنی بھی پرمانٹ اینڈاومنٹ (۳۰ لاکھ) کی آمدنی طرح یونیورسٹی کے مصارف کے لیے وقف ہے پرمانٹ رزرو فنڈ کی جمع رقم کو اور بھی بڑھایا گیا ہے۔

ملک کی سیاسی کشمکش اور اندرونی اختلافات کا اثر یونیورسٹی کی ترقی کی رفتار پر بھی پڑا۔ بدعنوانیاں بھی بڑھیں۔ ۱۹۲۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات کی جانچ کرنے کے لیے چانسلر نے وائسرائے کے مشورے سے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی جس کے ممبران سر ابراہیم رحمت اللہ سر جارج اینڈرسن ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب اور سر فلپ ہرٹوگ اور مسٹر ایف رحمان تھے۔ قدم پھر بھی اٹھتے رہے۔

۱۹۲۸ء میں شعبۂ طب کھلا جو بعد میں طبیہ کالج بنا۔ ۱۹۳۱ء میں یونیورسٹی میں بجلی لگوائی گئی۔ کچھ نئے ہوسٹل اور شعبے وجود میں آئے۔ ۱۹۴۴ء میں فیکلٹی سسٹم نافذ کیا گیا۔ سب سے پہلے ۳ فیکلٹیز تھیالوجی، سائنس اور آرٹس) بنائی گئیں۔ ۱۹۴۵ء میں میڈیکل کالج بنانے کی مہم تیز تر کر دی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں طلباء کی تعداد ۶۰۷۱ تک پہنچ گئی لیکن ۱۹۴۸ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۱۱۳۸ رہ گئی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فیکلٹی آف آرٹس ۸۹۶ (۲) فیکلٹی آف سائنس ۱۱۷۵
(۳) فیکلٹی آف انجینرنگ ۲۲۵ — (۴) ڈپلوما اِن انجینرنگ ۹۵
(۵) ویمنس کالج ۱۵۵ (۶) گرلس ہائی اسکول ۲۵۷
(۷) سٹی اسکول ۵۹۳ (۸) یونیورسٹی ہائی اسکول ۴۱۵

۱۹۴۷-۴۸ء میں اساتذہ کی تعداد ۲۵۷ اور غیر تدریسی عملہ کی تعداد ۴۱۹ تھی۔ اس طرح سے کل ملازمین کی تعداد ۶۷۷ تھی۔ یونیورسٹی کی بیلنس شیٹ کے مطابق کل آمدنی برائے سال ۱۹۴۷-۴۸ء ۳۶۲ر۸۰،۱۴،۱ روپیہ تھی جب کہ کل خرچ ۵۳۵ر۱۹،۱۶،۱ تھا۔

تیسرے دور کا آغاز بڑے نامساعد حالات میں ہوا۔ ایک طرف تو یونیورسٹی کے مالی ذرائع بہت کم ہو گئے دوسری طرف زبردست کوشش کی گئی کہ اس ادارہ کو فرقہ پرستی کا گڑھ اور ملک کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ کچھ حلقوں سے یہ کوشش اب بھی جاری ہے۔ یونیورسٹی کے رواداری اور سیکولر کردار کو اجاگر کرنے کے خیال سے ہی راقم الحروف نے اس ادارے کی ترقی و پیش رفت میں غیر مسلموں کے تعاون کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کی اور مسلمانوں کے اداروں

مثلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور ڈیوٹی سوسائٹی وغیرہ کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے۔ ان کی خدمات کا ذکر کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس مضمون میں اس کا موقع بھی نہیں۔ آزادی کے بعد تنگ نظری کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اکابرین یونیورسٹی اور وائس چانسلر بھی بخوبی اس ذہنیت سے واقف تھے۔ لہٰذا سروجنی نائیڈو، پنڈت نہرو، راج گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند بلبھ پنت، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے علاوہ بہت سے تحریک آزادی کے رہنماؤں کو وقتاً فوقتاً مدعو کر کے انہیں حقائق سے آگاہ کرایا گیا۔ مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور ذاکر صاحب کی دانش مندی نے حالات کو زیادہ بگڑنے نہ دیا۔ پنڈت نہرو کے تعاون سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ علی گڑھ نے نہ صرف فرقہ پرستی اور تقسیم ملک کی ذمہ داری کے بدنما الزام کو دھو دیا بلکہ وہ تو ہندوستان کے تعمیر نو کے پروگرام میں پیش پیش نظر آنے لگا ہے۔ ۱۹۴۹ء کے کانوکیشن میں ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ

> "یونیورسٹی علمی حدود کو متواتر آگے بڑھانے میں کسی دوسری درس گاہ سے پیچھے نہیں ہوگی۔ وہ ملک کی اعلیٰ اقدار کی محافظ ہوگی، وہ ملک کو جمہوریہ بنانے کے اس نیک کام میں زبردست مددگار ثابت ہوگی جس کا مقصد ایک مکمل اور ترقی پذیر معاشرے کی تعمیر نو ہوگا۔ اس متبرک کام کے لیے علی گڑھ ایسے طلباء وطالبات پیدا کرے گا جن میں روحانی اتحاد، وفا شعاری، لگن ہوگی اور جو اعلیٰ اخلاقی اقدار اپنے عمل اور کردار سے مادر وطن کو عظمت اور ناموری دلائیں گے۔"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دستور ہندوستان کی دفعہ ۲۴۶ کے تحت ساتویں ضمیمہ میں شامل کرا کر اور سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ دلوا کر مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مادر درس گاہ کا حق ادا کر دیا۔ یہ ایک طرف تو مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا مظہر ہے تو دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو کے عملی سیکولرزم، جمہوری نظام میں ان کے یقین محکم اور وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔

سیاسی بحران کے بعد یونیورسٹی کو مالی بحران سے بھی گزرنا پڑا۔ اس کا

اظہار ۵۲-۱۹۵۱ء کے بجٹ سے ہوتا ہے جو کہ ۱۱۴٫۸۱۲۱۲ روپیے کے خسارے سے پاس کیا گیا۔ لہٰذا اخراجات میں زبردست تخفیف کی گئی۔ اسی دوران حسابات کا آڈٹ بھی اے۔جی۔یو۔پی کے دفتر سے ہونے لگا۔ چونکہ شمع کو فروزاں رہنا تھا اس لیے اسباب بھی پیدا ہوئے۔ یو۔جی۔سی عالم وجود میں آئی اخراجات کو مدّنظر رکھتے ہوئے یو۔جی۔سی نے ایک ریولونگ کمیٹی مقرر کی۔ پچھلے تین سالوں کے خسارے کو پُر کرنے کے لیے اور ضرورتوں کے مطابق گرانٹس دینے کے لیے سفارشیں کی گئیں۔ ضروری اخراجات کا تخمینہ لگا کر اس میں سے یونیورسٹی کی آمدنی منہا کر کے بلاک گرانٹ کا تعین کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ حدود اخراجات کا تعین فنانس کمیٹی کرے گی جس میں سرکار کے دو افسر ہوں گے (یہ تعداد اب تین ہو گئی ہے) یہ بھی طے کیا گیا کہ ڈیفسٹ بجٹ یا خسارہ کا بجٹ نہیں بنایا جائے گا۔ لہٰذا ۵۲-۱۹۵۱ء سے ہی اس کا لحاظ رکھا گیا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں کل آمدنی تخمینہ ۲۱٫۳۴٫۲۰۰ روپیہ تھا جب کہ مجوزہ اخراجات کی رقم ۲۱٫۳۲٫۰۹۴ تھی۔ "پلان" میں ملنے والی رقومات علیحدہ سے دی گئیں۔

سرکار یعنی یو۔جی۔سی کے توسط سے دی جانے والی گرانٹس کی وجہ سے یونیورسٹی میں پہلے پلان میں انجینرنگ کالج، پالی ٹیکنک، اسٹاف کوارٹرس، مولانا آزاد لائبریری، فیکلٹی آف آرٹس وغیرہ کی عمارتیں تعمیر ہوئیں دوسرے پلان میں بھی بہت زیادہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ تعمیرات کی کثرت کو دیکھتے ہوئے بہت سے حضرات نے ۶۰-۱۹۵۶ء تک کی مدت کو دورِ شاہجہانی کہنا شروع کر دیا۔ یو۔جی۔سی اور سرکار کے ہمدردانہ اور مثبت رویہ کی وجہ سے یونیورسٹی بہت جلد ترقی کی راہ پر تیزی سے چلنے لگی۔ یونیورسٹی کا صرف نان پلان خرچ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۴۴٫۲۶۹۲۵ ہو گیا۔ پلان کا خرچ اس سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ ظاہر ہے لوگوں کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا، مالی بدانتظامی کے علاوہ دیگر بدعنوانیوں کے الزامات تراشے گئے۔ آڈٹ کے اعتراضات کا سہارا لیا گیا۔ بدعنوانیوں کی چھان بین کے لیے فروری ۱۹۶۰ء میں ایگزیکٹیو کونسل نے گورنمنٹ کی ایما پر معاملات کی جانچ کے لیے جی۔سی چٹرجی کی سربراہی میں ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی۔ کمیٹی نے کچھ بدعنوانیوں کی نشاندہی کی اور کچھ تعمیری سفارشات بھی کیں جن پر عمل کیا گیا۔

کہتے ہیں کہ کندن کا پتہ کسوٹی پر ہی لگتا ہے۔ ایک طرف تو یونیورسٹی اتنے سنگین مسائل سے دوچار تھی تو دوسری طرف ترقیاتی پروگراموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ میڈیکل کالج بنانے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔ سر ضیاء الدین اور پروفیسر ہادی حسن نے مل کر آزادی سے قبل چندہ جمع کیا تھا تاکہ میڈیکل کالج قائم کیا جا سکے۔ چندہ وعطیات کی کل رقم ۵۳٫۰۸٫۵۹۴ روپیے تھی (پرنسلی اسٹیٹس سے ۱۶٫۰۵٫۰۰۰، مختلف افراد سے ۲۲۹۹٫۴۴۹، شاہ عرب سے ۱۰٫۰۰٫۰۰۰، روسی ستری ۳۹۶۸۰، مسز ای جی۔ ایورسٹ انگلینڈ ۱۳٫۲۳٫۷)۔ اس رقم کے منافع سے ہونہار طلبا کو میڈیکل اسٹڈیز کے لیے قرضے بھی دیے گئے تاکہ جب میڈیکل کالج بنے تو یونیورسٹی کے پاس پڑھانے کے لیے لائق لوگ پہلے ہی سے موجود ہوں۔

آخر کار کوششیں ثمر بار ہوئیں۔ یو۔جی۔سی نے ۲۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ۵٫۳۰٫۰۰۰ روپیے کی منظوری دی تاکہ بلڈنگ، لیبس، اسٹاف کوارٹرس ہوسٹل، اکویپمنٹ، کتابیں وغیرہ خریدی یا بنائی جا سکیں۔ پانچویں پلان تک یہ رقم ۳٫۰۶٫۸۷۵٫۲۰ روپیے ہو گئی۔ اسٹاف کی تنخواہیں اس سے علیحدہ تھیں جن کے لیے الگ سے رقومات دی گئیں۔ چوں کہ معاملات طے ہو چکے تھے، اس لیے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں پروفیسر ہادی حسن نے ہی کالج کا افتتاح کیا۔ اسپتال کے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ طے ہوا کہ یو۔جی۔سی ۲۵۰۰ روپیے فی بیڈ اور یوپی گورنمنٹ ۱۰۰۰ روپیے فی بیڈ دے گی۔ بعد میں ۲۵۰۰ کی شرح بڑھا کر ۳۷۰۰ کر دی گئی۔ یوپی گورنمنٹ نے کچھ ایسی شرائط لگائیں جو یونیورسٹی کو قابل قبول نہیں تھیں۔ اب تنخواہوں کے علاوہ اسپتال کے دیگر اخراجات کے لیے ۶۰۰۰ فی بیڈ فی سال کی شرح سے یو۔جی۔سی سے گرانٹ ملتی ہے۔

اسپتال کے بیڈوں کی تعداد پہلے ۳۵۰ رکھی گئی تھی جسے ۱۹۷۹ء میں بڑھا کر ۵۰۰ کر دیا گیا۔ طلبا کے داخلے کی تعداد ۵۰ رکھی گئی تھی۔ یونیورسٹی نے طلبا کے داخلے کی تعداد اب ۱۰۰ کر دی ہے اور اسی لحاظ سے بیڈوں کی تعداد ۷۰۰ ہو گئی۔ ابھی میڈیکل کونسل کی منظوری نہیں مل سکی ہے۔ یو۔جی۔سی نے میڈیکل کونسل کی بتائی ہوئی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ۴۰ لاکھ کی گرانٹ دی ہے۔ زیادہ تر شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز بھی ۷۸-۱۹۷۷ء سے چل رہی ہیں۔

۱۹۶۰ء میں ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ آزادی سے قبل چلے آرہے

خسارے کو پورا کیا جاسکے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء تک ۲،۲۷،۷۴۹ روپیہ ہوگیا تھا اور جس کی وجہ سے یونیورسٹی کی مالیات پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ شری آر کے چھابرا، ڈپٹی سکریٹری (بعد میں سکریٹری) یو۔جی۔سی اور شری آر۔ بی۔ کھرے، اکاؤنٹس افسر بنارس ہندو یونیورسٹی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کی سفارشات پر دھیرے دھیرے سرکاری امداد سے اس خسارے کو پورا کیا گیا۔ یہی صورت حال ۱۹۷۴ء میں پھر ہوگئی اور اس بار شری ڈی۔ ڈی۔ ڈھنگرا کو انکوائری افسر بنایا گیا جو اس وقت ایڈیشنل ڈپٹی کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل کے عہدے سے رٹیائر ہوئے تھے، ان کی سفارشات کی روشنی میں اس خسارے کو بھی سرکاری امداد سے پورا کیا جو مجموعی طور پر میڈیکل کالج کے لیے گرانٹ نہ ملنے یا ناکافی گرانٹ ہونے کی وجہ سے ہوا تھا، ان کی سفارشات کو بھی عملی جامہ پہنایا گیا۔

۱۹۵۹ء میں یہ طے ہوا کہ یونیورسٹی کے ملازمین اور اساتذہ کو سینٹرل گورنمنٹ کے اسکیل اور مراعات دی جائیں گی۔ لہٰذا جولائی ۱۹۵۹ء، جنوری ۱۹۷۳ء اور جنوری ۱۹۸۶ء میں پے کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ملازمین یونیورسٹی کی تنخواہیں اور اسکیل مقرر کیے گئے۔ ۱۹۸۶ء سے نافذ ترمیم شدہ اسکیل ابھی اساتذہ اور افسران یونیورسٹی کے لیے لاگو نہیں کیے جاسکے ہیں۔ اس سلسلے میں گفت و شنید جاری ہے۔

سینٹرل گورنمنٹ کے پے اسکیل دینے کی وجہ سے یونیورسٹی کے بجٹ میں زبردست اضافہ ہوا ہے، اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ اپریل ۱۹۶۴ء سے پنشن اسکیم، ۱۹۶۸ء سے ہاؤس بلڈنگ لون اسکیم اور ۱۹۸۷ء سے گروپ انشورنس کی اسکیم بھی نافذ کی گئیں۔ اسکے علاوہ علاج کے لیے بھی اخراجات کی رقم اسٹاف کو ملتی ہے۔

یونیورسٹی تیزی سے ارتقا پذیر ہے۔ ایسے شعبوں اور سینٹرس کھولنے کی طرف زیادہ توجہ کی گئی جن کی موجودہ زمانے میں زیادہ اہمیت اور ضرورت ہے۔ ایک نہایت ہی جدید کمپیوٹر (ویکس ۱۱) ۱۹۷۹ء میں خریدا گیا۔ ریسرچ کی ضروریات کے علاوہ ایم۔ سی۔ اے اور پی۔ ڈی۔ سی کے کورس بھی کھولے گئے، تاکہ کمپیوٹر کے استعمال کے لیے تربیت یافتہ اور لائق لوگ دستیاب ہو سکیں۔ بایو کیمسٹری، سینٹر آف آرتھالوجی، کیمیکل انجینرنگ ڈپارٹمنٹ بھی کھولے گئے۔ پٹرولیم اور کیمیکل انجینرنگ کی تعلیم کے لیے متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان نے ۲ ملین امریکی ڈالر (تقریباً ۱۰۱ لاکھ روپیہ) کا عطیہ دیا۔ اس وقت یو۔جی۔سی اور پی۔ ایل۔ ۴۸۰ اسکیم کے تحت انسٹی ٹیوٹ آف بایوٹیکنالوجی زیر تعمیر ہے۔ ایم۔ ایس سی (آپریشنز ریسرچ)، ایم ایس سی (ایگری کلچر)، ایم ایس سی (انزائم) کی کلاسز بھی شروع کی گئی ہیں۔ ریموٹ سنسنگ سینٹر بھی قایم ہو چکا ہے۔

یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں آرٹیزن اپ لفٹ منٹ اسکیم کے تحت یو۔ پی گورنمنٹ نے ۳۸ لاکھ روپیہ ۱۹۸۵ء میں منظور کیے تاکہ تربیت یافتہ کاریگر میسر ہوں۔ یہ اسکیم اقلیتی فرقے کے کاریگروں کے لیے خاص طور پر بنائی گئی ہے۔ کمیونٹی پالی ٹیکنک کی اسکیم کے تحت بھی سینٹرل گورنمنٹ سے کافی بڑی گرانٹ ملتی ہے۔ اس سال ۱۹۸۷ء میں انجینرنگ کالج میں شعبۂ الکٹرونکس کھولا گیا۔

حال ہی میں گنگا کی صفائی سے متعلق ایک اسکیم بھی سینٹرل گورنمنٹ منظور کی ہے۔

شعبۂ تاریخ کو یو۔جی۔سی نے سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈی کا درجہ دیا ہے۔ اسی طرح فزکس، میتھ میٹکس، جغرافیہ اور کامرس کے شعبوں کو سینٹر آف اسپیشل اسسٹنس کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ فیکلٹی آف سائنس میں ایک سینٹر آف انٹر ڈسپلنری ریسرچ بھی قایم کیا گیا ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن انڈین لینگویجز کا قیام بھی ہوا ہے۔ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز بھی کافی پہلے قایم ہو چکا ہے۔

دو نئی فیکلٹیاں حال ہی میں بنائی گئی ہیں جن کے نام فیکلٹی آف لائف سائنس اور فیکلٹی آف یونانی میڈیسن ہیں۔ یونانی میڈیسن کی فیکلٹی میں جراحات، کلیات اور معالجات کھولے گئے ہیں۔ اس سے قبل شعبہ علم الادویہ کھولا جا چکا تھا۔

اڈلٹ ایجوکیشن سینٹر، سرسید اکیڈمی ہابیز ورکشاپ بھی کھولے گئے۔ چھٹے پلان میں ایک کیریر پلاننگ سینٹر بھی ویمنس کالج میں کھولا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جنرل ایجوکیشن سینٹر کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جس کے لیے فورڈ فاونڈیشن نے ۲۲ لاکھ روپیے کا عطیہ دیا۔ ۱۹۷۵ء میں ایک کوچنگ اینڈ گائیڈنس سینٹر کھولا گیا۔ یو۔جی۔سی نے اس کے لیے ۸۴-۸۵ سے گرانٹ دینا منظور کیا ہے۔ اس کا مقصد طلباء کو سرکاری نوکریوں کے مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تیار کرنا ہے۔ اسی سال ۱۹۸۷ء میں اکیڈمک اسٹاف

ز کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء میں اب تک ۱۵ بار ترمیمات کی گئی ہیں۔ ان
رمیمات کا جائزہ لینا سردست ممکن نہیں ہے۔ ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ
ٹ کو پھر سے قایم کرنے کا قانون بنایا گیا۔ آنریری ٹریزرار کا عہدہ جو
ربن ختم کر دیا گیا تھا، پھر سے بحال کر دیا گیا ہے ایکٹ کی دفعہ ۵ (۲)
نت یونیورسٹی کو یہ بھی استحقاق دیا گیا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے
ور تہذیبی بیش روی کے لیے مناسب اقدام کرے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں
فار پرموشن آف سائنس اس مقصد کے لیے کھولا گیا تاکہ مسلمانوں کو
ہ گی تعلیم کی اہمیت کا احساس دلایا جاسکے اور مسلمانوں کے زیر انتظام
وں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم کا انتظام کیا جاسکے۔ دینی مدرسوں
ائنس اور ریاضی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ اسی دفعہ کے تحت
ب الاخلاق کو بھی یونیورسٹی کے بجٹ پر ۸۷-۱۹۸۶ء میں لیا گیا۔ یہاں
ت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ تہذیب الاخلاق بانی درس گاہ
انے میں جاری تھا، اسے پھر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں اسے دوبارہ
ع کیا۔ اب تک اس کے ۱۸ شمارے نکل چکے ہیں۔ ایک اور رسالہ نشانت
ی بھی نکالنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ تہذیب الاخلاق کا ہندی
ہے۔

یونیورسٹی میں لائبریری کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا غیر ضروری
ولانا آزاد لائبریری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فنکشنل
یری" ہے جو رات کے دو بجے تک کھلتی ہے۔ ریڈنگ روم بھرے
ہیں۔ مارچ ۱۹۸۶ء تک کتابوں کی تعداد ۷۷،۴۱۹۶ تھی۔ اب
د ایک اندازے کے مطابق ۷ لاکھ سے بھی اوپر ہو گی۔ رسایل اور
اور مخطوطات اس کے علاوہ ہیں۔ یونیورسٹی اپنے نان پلان بجٹ سے
۳۳ لاکھ روپیہ کتابوں اور جرائد کی فراہمی کے لیے منظور کرتی ہے
اس کے علاوہ ہے جو پلان میں کتابوں وغیرہ کی فراہمی کے لیے ملتی ہے
ورنمنٹ نے ۱۰ لاکھ روپیہ تقریباً ۲ سال قبل منظور کیا تھا اس سے
یڈنگ روم کی تعمیر کی جا رہی ہے۔ جلدی ہی یہ طلبا کے استعمال کے
ل دیا جائے گا۔ ابھی حال ہی میں محمد امجد علی (مرحوم) جو کہ برطانیہ میں
تھے، اپنی ایک وصیت کے ذریعے یونیورسٹی کو ۲،۵۰،۰۰۰ روپیہ کی
گرانقدر رقم کا وارث قرار دے دیا ہے۔ ان کے مکان وغیرہ کی فروخت
کے بعد تقریباً ۸۰،۰۰۰ روپیے اور ملنے کی امید ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ یونیورسٹی کس منزل پر ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء
کے پاس شدہ بجٹ سے حسب ذیل اعداد ملتے ہیں:

تخمیناً آمدنی

۱۔ نان پلان	روپیے
۱۔ انوسٹ منٹ سے آمدنی	۶۲۶۰۰۰
۲ طلباء کی فیس سے آمدنی	۴۰،۵۰،۰۰۰
۳ مکانات کے کرائے وغیرہ	۱۸،۱۶،۰۰۰
۴۔ یو۔پی گورنمنٹ کی گرانٹ	۲۶۲،۰۰۰
۵ بجلی کی سپلائی	۹۰،۶۴،۰۰۰
۶ میڈیکل کالج ہاسپٹل	۳۰۰۰۰۰
۷۔ تہذیب الاخلاق	۱۸۳۰۰۰
۸۔ یو۔جی۔سی سے ملنے والی مینٹیننس گرانٹ	۲۰۹۶۲۵۰۰۰۰
کل میزان	۲۲،۵۹،۲۵۰۰۰
۲۔ پلان گرانٹس	۲۰۷۹۷۱۰۶
۳۔ (ا) طلبا کے وظائف کے لیے گرانٹ	۹۴۵۳۰۰۰
(ب) وقف اور عطیات کی آمدنی سے وظائف	۸۴۶۱۵
(ت) یونانی میڈیسن (آئی۔سی۔یو۔ایم۔آر)	۶۰۰۰۰
۴۔ ڈیپٹ ڈپازٹ	۲۷،۵،۵۶۳۵۰

تخمیناً اخراجات

مد	روپیہ
تنخواہیں	۱۵۴۱۳۲۰۰۰
پی۔ایف و پینشن	۹۴،۴۶۰۰۰
طلبا کے وظائف	۱۸،۰۰،۰۰۰
میڈیکل کالج کی دوائیں اور دیگر خرچ	۳۰،۰۰،۰۰۰
کتابوں کی خرید	۳۳،۰۰،۰۰۰
عمارتوں کی تعمیر اور مرمت	۴۹،۰۰،۰۰۰

لیب سے متعلق اخراجات	۴۳,۰۰,۰۰۰
امتحانات پر اخراجات	۳۷,۶۴,۰۰۰
کونٹینس ایڈوانس اور میڈیکل کیر اسکیم	۱۶,۰۰,۰۰۰
	۱۸۶۲۴۲۰۰۰

(۱)	۲۲,۵۹,۲۵,۰۰۰
(۲)	۲,۰۷۹۷۱۰۶
(۳)	۹۵۱۷۶۱۵
(۴)	۲۷۵۵۶,۳۵۰
کل میزان	۲۹۳۸,۲۶,۰۷۱

۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء کو یونیورسٹی کا کل انوسٹ منٹ ۱۸۱۲۷۲۶۶۵ روپیے تھا۔ یہ رقم فکسڈ ڈپازٹ یا گورنمنٹ سیکوریٹیز میں جمع ہے۔

پہلے پلان (پنج سالہ منصوبہ) سے لے کر مارچ ۱۹۸۷ء تک ملی یو۔جی سی گرانٹس کی تفصیل حسب ذیل ہے؛

ا۔ عمارتوں کی تعمیر کے لیے ملی امداد ۱۲۶۹,۶۲,۷۴۳ روپیے
(ب) اکویپمنٹ کی خرید کے لیے ملی امداد ۹۷۲۶۷,۵۲۲ "
(پ) کتابوں کی خرید کے لیے ملی امداد ۱۴۱۲۲۸۷۷ "
(ت) فرنیچر کے لیے ملی امداد ۵۷,۵۷۲۸۸ "

اب صباء اور فیکلٹیز کی تعداد حسب ذیل ہے:

ا فیکلٹی کا نام	طلبا	طالبات	کل تعداد	شعبوں کی تعداد
۱۔ آرٹس	۷۸۷	۳۴۳	۹۸۰	۹
۲۔ سوشل سائنس	۱۱۵۲	۶۳۲	۱۷۸۴	۹
۳۔ سائنس	۲۸۸۵	۷۱۰	۳۵۹۵	۷
۴۔ لائف سائنس				۴
۵۔ کامرس	۸۴۱	۲۰	۸۶۱	۲
۶۔ انجینیرنگ	۲۱۹۳	۲۰۶	۲۲۹۹	۴
۷۔ میڈیسن	۳۰۰	۱۲۰	۴۲۰	۱۸

۸۔ یونانی میڈیسن	۲۳۵	۶۲	۲۹۷	۴
۹ لاء	۴۴۷	۱۶	۴۶۳	۱
۱۰ دینیات	۳۴	۰۶	۴۰	۲
۱۱ پارٹ ٹائم	۵۹۲	۲۰	۶۱۲	
میزان	۹۲۱۶ —	۲۱۳۵	۱۱۳۵۱	۶۷

(۲ پولی ٹیکنک + ۳ انجینیرنگ کے سیکشن۔ کل شعبے ۷۲

اسکولوں کے طلبا	۵۸۸۵
کل میزان	۱۷۲۳۶

اس وقت ۲۴ صوبوں کے طلبا و طالبات یہاں تعلیم پا رہے ہیں ان میں :—

اروناچل پردیش سے	(۳)	آندھرا پردیش	(۲۱۶)
انڈومان نکوبار	(۱۳)	آسام	(۵۶)
بہار	(۱۸۲۱)	دہلی	(۲۵۹)
گجرات	(۱۵)	چنڈی گڑھ	(۱)
ہریانہ	(۲۶)	ہماچل پردیش	(۱۰)
جموں وکشمیر	(۸۸)	کرناٹکا	(۱۱)
کیرالا	(۹۴)	مدھیہ پردیش	(۵۸)
مہاراشٹرا	(۷۵)	منی پور	(۱۷)
میگھالیہ	(۶)	ناگالینڈ	(۱)
اڑیسہ	(۱۰)	پنجاب	(۱۲)
راجستھان	(۴۳)	تامل ناڈو	(۲۳)
یوپی	(۷۸۲۲)	مغربی بنگال سے	۲۷۱

ہیں۔

اسی طرح ۳۰ بیرونی ممالک کے طلبا و طالبات یہاں تعلیم پا رہے ہیں ان میں

افغانستان سے (۲۸) عمان سے (۳) بحرین سے (۱) بنگ
دیش سے (۱) برطانیہ سے (۱) اتھوپیا سے (۲) مصر سے (

[ا]یران سے (۳۳) عراق سے (۱۷) اسرائیل سے (۱) فجی سے (۴) [ا]ردن سے (۴۷) کویت سے (۹) کینیا سے (۲) لبنان سے ۱ [ملی]شیا سے (۸) ماریشس سے (۳) نائجیریا سے (۲۰) نیپال سے (۱۲) [فل]سطین سے (۷) صومالیہ سے (۶۵) سوڈان سے (۶۲) [سائ]یریا سے (۴) نارتھ افریقہ سے (۱) تھائی لینڈ سے (۲) تنزانیہ سے (۲) عرب امارات سے (۱) یوگانڈا سے (۱) یمن سے (۵) [ز]مباوے سے (۱) (کل ۴۰۰) ہیں۔ انجینرنگ، میڈیسن اور کمپیوٹر سائنس میں غیر مسلم طلباء کی تعداد ۵۰ فیصدی سے زائد ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ کے سیشن میں کل ۶۶۲۸ طلبا مختلف امتحانوں میں شریک ہوئے ان میں سے ۴۳۸۸ طلبا پاس ہوئے۔ اس طرح پاس ہونے والے طلباء کا فیصد تقریبًا ۶۶٫۷ رہا۔

۸۷-۱۹۸۶ء میں اساتذہ، افسران اور ملازمین کی کل تعداد ۶۱۹۶ تھی (اساتذہ ۱۲۲۹- غیر تدریسی عملہ ۴۹۶۷) یونیورسٹی کے اساتذہ اور افسران کے اسکیل ریویزن کے لیے زیر غور ہیں۔ بی-سی اور ڈی کیٹگریز کے اسکیل جنوری ۱۹۸۶ء سے ریوائز ہو چکے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پری ریوائزڈ اسکیل	ریوائزڈ اسکیل
۱۹۶- ۲۳۲	۷۵۰- ۹۴۰
۲۱۰- ۲۹۰ اور ۲۶۰- ۴۳۰	۸۰۰- ۱۱۵۰ اور ۹۷۵- ۱۵۴۰
۳۳۰- ۵۶۰ اور ۴۲۵- ۸۰۰	۱۲۰۰- ۲۰۴۰ اور ۱۴۰۰- ۲۶۰۰
۵۵۰- ۹۰۰ اور ۶۵۰- ۱۲۰۰	۱۶۴۰- ۹۰۰ اور ۲۰۰۰- ۳۵۰۰

اقامتی ہوسٹلوں کی تعداد طلباء کی تعداد کی مناسبت سے کم ہے۔ علامہ اقبال ہال کی تعمیر کے لیے تو وزیر اعظم کی مداخلت کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے اقامتی ہالوں کی تعداد بڑھ کر ۱۳ ہو گئی۔ اس کے علاوہ ایک غیر اقامتی طلبا کا سینٹر بھی ہے جسے این-آر-ایس-سی کہتے ہیں۔ ۱۴ ہالوں میں سے ۲ ہال طالبات کے لیے ہیں۔ عبداللہ ہال میں ۲۰۰ لڑکیوں کے لیے ایک ہوسٹل پچھلے سال ہی تعمیر ہوا ہے۔ کیمپس کو خوبصورت بنانے کے لیے بھی کوشش کی گئی ہے۔ آرٹس فیکلٹی اور جنرل ایجوکیشن سینٹر میں فوارے بھی لگائے گئے ہیں۔ طلباء کی سہولت کے لیے ہر کمرے میں ابھی حال ہی میں ۳۰۰۰ سے زاید پنکھے لگوائے گئے ہیں۔ ایک بہترین کینٹین بھی بنوائی گئی ہے تاکہ طلبا کو کھانے پینے کی سہولت ہو۔ اسٹوڈنٹ ویلفیر فنڈ بھی قایم کیا گیا ہے جس کا مقصد ہونہار طلبا کی مالی امداد کرنا ہے۔

۱۹۹۰ء تک یعنی ساتویں پلان کے آخر تک کے لیے فیکلٹیز آف آرٹس سائنس، کامرس، لا، اور دینیات کے لیے اب تک دی گئی منظوریوں کے علاوہ حال ہی میں ۱۵،۸۰،۰۰۰ روپیے کی منظوری اور یو-جی-سی نے دی ہے۔ اس رقم سے ورکنگ ویمنس ہوسٹل، پرانی عمارتوں اور سڑکوں کی مرمت، کلاس روم، کتابوں اور اکویمنٹ کی خرید کے علاوہ اسٹاف کی نئی اسامیوں کا خرچ پورا کیا جائے گا۔ فیکلٹیز آف میڈیسن ویمنس کالج وغیرہ کی تجویزات ابھی کمیشن کے زیر غور ہیں۔ انجینرنگ فیکلٹی کی تجویزات پر کمیشن سے گفتگو ہو چکی ہے۔ امید ہے جلدی ہی اس کی منظوری مل جائے گی۔

ایڈمنسٹریٹو بلاک بن چکا ہے لیکن ابھی کچھ کام باقی ہے جس کے لیے بھی ساتویں پلان میں منظوری ملی ہے۔ باقی ماندہ فیکلٹیز کے لیے امید ہے گرانقدر رقومات ملیں گی جس سے یونیورسٹی مزید ترقی کرے گی۔ یو-جی-سی کی مدد سے ایک رہائشی کمپلکس بنانے کی بھی اسکیم زیر غور ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے کہ حکومت ہند نے یو-جی-سی کی معرفت یونیورسٹی کی کھلے دل سے مدد کی ہے۔ جب بھی ضرورت ہوئی یو-جی-سی اور حکومت ہند نے تجاویز پر نہایت ہمدردی سے غور کیا اور راہیں تلاش کیں کہ کس طرح سے یونیورسٹی کی مدد کی جائے یو-پی سرکار نے بھی حال میں یونیورسٹی کو کافی مالی امداد دی ہے۔ اقلیتی فرقے کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں تو تجویزات کو فورًا مان لیا گیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ کبھی یونیورسٹی نے فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کا ثبوت دیا ہے اور نہ ہی حکومت نے اس کو کبھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ آخر پھر لوگ کیوں اس بات پر تلے رہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کے کردار کو داغدار بنا کر دکھایا جائے اور ایڈیٹر موصوف کی طرح بے بنیاد الزامات لگائے جائیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ہمیشہ ہی قومی یک جہتی کو مد نظر رکھا ہے۔ یہ ادارہ مذہبی رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو قایم رکھنے میں سب سے پیش پیش ہے۔ مذہبی رواداری کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی میں تین ہندو پروفیسر ہربنس لال شرما، پروفیسر بی۔ آر۔ شکلا اور پروفیسر جے۔ این۔ پرشاد قایم مقام وائس چانسلر رہ چکے ہیں جس ادارے میں ۲۲ صوبوں اور ۳۰ بیرونی ممالک کے طلبا زیر تعلیم ہوں وہ نہ صرف قومی اور ملکی یک جہتی بلکہ بین الاقوامی یک جہتی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ کسی سیپریٹسٹ اور فرقہ وارانہ رجحانات کی آماجگاہ نہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ سر سیّد کی اصلاحی کوششیں کسی تحریک کا درجہ نہیں رکھتیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تحریک کی نوعیت برہمو سماج، آریہ سماج اور پرارتھنا سماج کی تحریکوں سے جداگانہ ہو۔ لیکن تعلیم کے ذریعہ معاشرہ میں اصلاح کرنا بذات خود ایک تحریک ہے۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اگر تعلیم سے بے بہرہ رہ جاتی تو کیا ملک کی اس قدر ترقی ممکن تھی۔ تعلیمی اصلاح کے بغیر سماجی یا معاشرتی اصلاح ناممکن ہے۔ علی گڑھ نے ملک کی تعمیر نو میں اپنا حصّہ ہمیشہ دیا ہے۔ انشاء اللہ مستقبل میں بھی سر سیّد احمد خاں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود میں علی گڑھ کا حصّہ سب سے نمایاں نظر آئے گا۔

نوٹ: اس مقالے میں جناب سیّد حامد، پروفیسر کے۔ اے نظامی، شری ایس۔ کے سبھٹناگر، ڈاکٹر شان محمد، للی ویلڈ کی کتابوں اور ڈاکٹر علی اختر خاں، عشرت علی قریشی، فرخ جلالی کے شایع شدہ مضامین سے استفادہ کیا گیا۔ مقالہ نگار ان کا شکر گزار ہے۔ مقالے میں زیادہ استفادہ یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹس، بجٹ اور بیلنس شیٹ اور پی۔ آر۔ او کے دفتر سے شایع شدہ کتابچوں سے کیا گیا ہے۔

سرسید کا سفر پنجاب

محمد رضا انصاری

"تہذیب الاخلاق" کے اپریل کے ایک شمارے میں عنوان "سرسید کا سفر پنجاب" نظر سے گزرا اور ایک پرانی الجھن تازہ ہو گئی۔ یہ سرسید کے عربی کے ایک استاد اور ممتاز عالم مولانا فیض الحسن صاحب سے متعلق ہے

جیسا کہ 'حیات جاوید' میں ہے کہ سرسید نے، جب وہ فتح پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آئے وہ درسی کتابیں جو پڑھ کر بھول گئے تھے، مولوی نوازش علی مرحوم سے دہرائیں اور کچھ اور کتابیں فقہ اور اصول فقہ کی پڑھیں اور ۔۔۔

"مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے۔"

سرسید کے استاد مولانا فیض الحسن مرحوم سرسید کے سفر پنجاب کے وقت، جو جنوری ۱۸۸۴ء میں شروع ہوا، پنجاب میں بلکہ خاص لاہور میں معلم کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔

"دوسری فروری کو وقت شب جناب مسٹر پارکر صاحب بہادر [جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی] نے یونیورسٹی ہال میں ایک ایوننگ پارٹی کا ہونا قرار دیا۔ سید صاحب سے بعض بزرگوں نے کہا کہ اس ایوننگ پارٹی میں ۔۔۔۔ جناب مولوی فیض الحسن صاحب اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ کچھ اپنے اشعار سید صاحب کے سامنے پڑھیں گے۔ سید صاحب ایسے موقع پر اشعار مدحیہ کا پڑھا جانا نہایت ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا ۔۔۔۔ مولوی فیض الحسن کو میں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ میں نے ان سے ایک کتاب مسمیٰ "منار الاصول" فقہ کی اور چند مقالے مقامات حریری کے پڑھے ہیں مجھ کو ہرگز گوارا نہیں ہونے کا کہ وہ میرے سامنے اس طرح پر اپنے اشعار پڑھیں۔"

(سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب ص ۲۰۵-۲۰۶ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی)۔

مولوی فیض الحسن سہارن پوری (وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) ذہانت فطانت اور علم میں خاص کر نحو، لغت، اشعار، ایام عرب وغیرہ میں اپنے زمانہ میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آخر عمر میں اورینٹل کالج لاہور میں ملازم ہو گئے تھے۔ علوم و فنون ادب میں سرداری اپنے وقت میں ان ہی کو حاصل تھی (نزہۃ الخواطر جلد آٹھویں ص ۳۶۶)

سرسید کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی بھی مولانا سہارن پوری کے ادب میں شاگرد تھے۔ مولانا سہارن پوری عربی کے شاعر تو تھے ہی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ یہ شعر جو رنگ تغزل میں بہت خوب ہے، ان ہی مولانا سہارنپوری کی طرف منسوب ہے

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت ؟
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی!

سفرنامہ پنجاب سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سرسید نے مولانا سے "منار الاصول" (فقہ کی نہیں اصول فقہ کی مشہور کتاب) بھی پڑھی تھی محض مقامات حریری اور سبعہ معلقہ ہی نہیں پڑھی تھیں جیسا کہ حیات جاوید میں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ:

سید صاحب کا ارادہ تھا کہ اگر ایسا موقع ہوا تو اس مجمع

میں سیدصاحب مولوی فیض الحسن صاحب کے ہاتھ سے
کاغذ لے لیں گے اور کہیں گے کہ آپ کرسی پر بیٹھیں اور میں
آپ کے سامنے کھڑا ہو کر پڑھوں۔ میں ان سبقوں کو بھول
نہیں گیا ہوں جو آپ نے مجھے پڑھائے ہیں۔۔۔۔
مگر اس پارٹی میں مولوی فیض الحسن صاحب کسی سبب سے
تشریف نہیں لائے ۔۔ (ص ۲۰۶ سفرنامۂ پنجاب مذکورہ بالا)

"تشریف نہیں لائے" یہ سفرنامۂ پنجاب" کی چشم دید روئیداد
قلم بند کرنے والے کا بیان ہے اور کسی متأخر برعکس روایت کے مقابلے
میں یقیناً زیادہ معتبر ہے۔

اس سلسلے میں برعکس اور متاخر روایت "خطوطِ سرسید" مرتبہ
ڈاکٹر سید راس مسعود کے مقدمہ نگار مولوی عبداللہ جان وکیل سہارن پور
نے قلم بند کی ہے۔

مولوی عبداللہ جان بھی سرسید کے معاصر تھے۔ اس کا ثبوت
ان ہی کے تحریر کردہ مقدمے میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے کانفرنس کے اجلاسوں میں بارہا دیکھا ہے کہ کسی
صاحب کمال کو اگر کانفرنس میں آنے کا اتفاق ہو گیا ہے تو
سرسید نے سب سے زیادہ ان کے بزرگ داشت اور
عظمت کو ملحوظ خاطر رکھا۔۔۔۔"

اسی مقدمے میں مولوی عبداللہ جان نے لکھا ہے:-

۸۳-۱۸۸۴ء میں جب سرسید علیہ الرحمہ نے پنجاب
کا دوسرا دورہ کیا تو انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے
حضرت مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم نے ایک عربی قصیدہ
سرسید کے استقبال و تعریف میں بطور سپاس نامہ کے
لکھا تھا جس کے پڑھنے کا حق خود مولانا ممدوح کو حاصل
تھا۔ جب مولانا نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر وہ قصیدہ
پیش کرنا چاہا تو سرسید نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مولانا
کے ہاتھ سے وہ قصیدہ چھین لیا اور فرمایا کہ مولانا آپ
تشریف رکھیے، میں آپ کے سامنے قصیدہ پڑھتا ہوں
اور ان کو وہ قصیدہ، باوجود تمام تر اصرار احباب
کے نہیں پڑھنے دیا۔۔۔"

"خطوطِ سرسید" مرتبہ ڈاکٹر سید راس مسعود کا یہ مقدمہ، مولوی عبداللہ
جان نے ۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو قلم بند کیا تھا۔ خطوط سرسید کا دوسرا ایڈیشن
پیش نظر ہے جو ۱۹۳۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔

کیا دونوں متضاد روایتیں اپنی اپنی جگہ مطابق واقعہ ہیں؟
"تشریف نہیں لائے" کا واقعہ مسٹر پارکر کی ایوننگ پارٹی کا ہوا اور
انجمن اسلامیہ لاہور میں "تشریف لائے" ہوں اور سرسید نے اپنے
اس ارادے کو عملی جامہ وہاں پہنایا ہو جو مسٹر پارکر کی ایوننگ پارٹی میں
کیا تھا؟ مگر یہ تطبیق تاریخ کسوٹی پر کھری نہیں اترتی۔

اوّل تو سرسید کے "دوسرے سفر پنجاب" (جنوری-فروری
۱۸۸۴ء) کی مکمل روئیداد منصۂ شہود پر آ چکی ہے اور ۱۸۸۴ء ہی
میں مشتہر ہو چکی ہے۔ اس میں انجمن اسلامیہ لاہور کے جلسہ کی بھی روئیداد
ہے۔ مولانا فیض الحسن کا اس میں کہیں ذکر نہیں ہے نہ کسی قصیدے کا پڑھا
جانا مذکور ہے۔ جب کہ "ایوننگ پارٹی" میں جس میں مولانا فیض الحسن صاحب
کسی سبب سے تشریف نہیں لائے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور ایک تیموری
شاہزادے مرزا عبدالغنی صاحب ارشد نے منظوم اشعار پڑھے تھے۔

دوسرے یہ کہ مولانا فیض الحسن کا سرسید کی تحریک یا سرسید کی
ذات سے متعلق جو رویہ تھا اس کا اظہار محض "تشریف نہیں لائے" کے
ذریعے انہوں نے نہیں کیا بلکہ ۱۵ر فروری ۱۸۸۴ء کے عربی اخبار "شفاء
الصدور" میں جو لاہور سے مولانا ہی کے اہتمام میں نکل رہا تھا، سرسید
کے عقائد و نظریات پر کڑی نکتہ چینی کر کے بھی کیا۔ سرسید کے سفرنامۂ
پنجاب" میں یہ عربی تحریر بھی برائے عبرت شامل ہے۔ عربی عبارت کا ترجمہ
تو نہیں ہاں "خلاصہ" پڑھیے اور "سرسید کی شان میں قصیدہ" کہنے اور
انجمن اسلامیہ لاہور میں اس کے پڑھے جانے کی روایت کو اس سے
مطابق قرار دینے کا امکان دکھائیے

"اہل پنجاب نے جس طرح سید احمد خاں کی تعظیم و توقیر،
پیش کش رقومات اور ان کی درس گاہ کے لیے جان و مال
سے اعانت کا مظاہرہ کیا جسے میں نے خود دیکھا، یہ صاف
بتاتا ہے کہ سید احمد خاں نے اب تک جو کچھ فرمایا ہے

یا جو آئندہ فرمائیں گے، ان باتوں پر ان سب کا بھی ایمان ہے۔ واللہ! اگر یہ شخص ولی ہونے کا یا نبی ہونے کا یا خدا ہونے کا دعویٰ بھی کرے گا، یہ لوگ دل و جان سے اس پر ایمان لے آئیں گے۔ مگر وہ ولی کیوں بنے۔ ولی کی کیا حقیقت ہے اس کی نظر میں؟ نبوت کا دعویٰ بھی کیوں کرے۔ وہ نبی کی تصدیق کو ضروریات دین میں کب سمجھتا ہے؟ اور خدائی کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ بشریت اور الوہیت میں بدیہی تضاد ہے۔ یہاں کچھ ہندوؤں نے بھی اس کی درس گاہ کو مالی امداد دی ہے، جس پر ایک ہندو نے سخت اعتراض کیا ہے کہ اس درس گاہ سے جو مسلمان پڑھ کر نکلیں گے وہ مثل شیر کے ہوں گے اور ہندوؤں کا شکار اس طرح کرتے رہیں گے جس طرح اُن کے آباؤ اجداد کرتے رہے تھے، میرا خیال ہے کہ اس ہندو کو اس درس گاہ کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ درس گاہ میں ایسی کوئی چیز پڑھائی کب جاتی ہے جو ہندو مت کے خلاف جاتی ہو۔ اس درس گاہ کا نفع تو دنیاوی منافع کے اندر گھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ وساوس شیطانی سے مجھے بچائیں۔"

مولانا فیض الحسن نے یہ بھی لکھا کہ،

"میرے اور سید احمد خاں کے درمیان ربط وضبط بہت زمانے سے ہے، میں اُن کو اور وہ مجھے خوب جانتے ہیں، میرا ان پر کچھ حق بھی ہے جو سب ہی جانتے ہیں اور سید احمد خاں بھی اس حق کے معترف ہیں، اس لیے کہ وہ ذات کے کھرے اور نسباً شریف ہیں۔"

"خطوطِ سرسید" کے مقدمہ نگار مولوی عبداللہ جان وکیل سہارن پور نے مقدمے کے آخر میں اپنے دستخط کے ساتھ "لودیانہ" بھی لکھا ہے، خیال ہوتا ہے کہ "لدھیانہ" کا املا ہو۔ سرسید کے سفرِ پنجاب میں "لدھیانہ" کے ایک مولوی عبداللہ صاحب کا ذکر بھی ہے۔ اگر یہ وہی مقدمہ نگار عبداللہ جان ہیں تو ایک حد تک اس سفرِ پنجاب کے چشم دید گواہ بھی ہوئے؟

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں، بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔ علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائباتِ قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصولِ معاش اور دنیاوی عزت و تمول، مثل تجارت وغیرہ کے، وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ۔ ش ۱۰ ۔ (اکتوبر ۱۹۸۷ء)

سقراط اور سرسیدؒ

دو اشخاص ایک کہانی

علی اختر خاں

سقراط (۴۷۰ تا ۳۹۹ ق م) اور سرسیدؒ (۱۸۱۷ تا ۱۸۹۸ء) میں بظاہر کوئی نسبت نظر نہیں آتی؛ بجز اس کے کہ دونوں کا تعلق اس نسل انسانی سے تھا جو اشرف المخلوقات کہلاتی ہے اور جسے اس خطۂ زمین کو اپنی اصلاحی و فلاحی کاوشوں سے بہشت ارضی بنانے پر مامور کیا گیا ہے۔ ہم وطن، ہم مذہب، ہم زبان ہونا تو کجا وہ ہم عصر بھی نہیں تھے۔ ان کے درمیان بیس صدیوں سے زاید کا فاصلہ تھا۔ زمان و مکان کی اس دوری کے سبب ان کے درمیان کسی قربت یا تعلق کی تلاش دور کی کوڑی لانے کی سی بات لگتی ہے۔

لیکن جب ہم ان کی حیات، حالات اور کارناموں پر ذرا گہری نظر ڈالتے ہیں تو ان میں بڑی مماثلت ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ صدیوں پر محیط ایک دوسرے کی بازگشت ہوں، انسانی خدمت اور ایثار کے ازلی سلسلے کی دو عظیم کڑیاں، وقت کی لامتناہی شاہراہ پر طویل فاصلے سے ثبت دو مشابہ اور درخشاں نقش پا جو جادہ پیماؤں کو ایک ہی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ ان دو عہد ساز و عہد آفریں شخصیتوں کی کہانیاں بنیادی طور پر ایک جیسی لگتی ہیں ـــ دو افراد کی ایک کہانی۔ اور وہ کہانی اپنے دو الگ الگ منظر ناموں کے ساتھ مختصراً یوں ہے۔

(۱)

قدیم یونان کے شہر ایتھنز (ATHENS) میں ایک شخص سقراط تھا یکتائے زمانہ، اپنی مثال آپ۔ عالم ایسا کہ دھاک اس کی ایک عالم پر تھی معلم ایسا کہ ارسطو کے استاد افلاطون کو بھی برسہا برس تک اس کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنا پڑا تھا اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کا علم اور فن معلمی دونوں ہی کسی اعلیٰ مدرسے کے مرہون منت نہ تھے۔ پوری کائنات اس کی درس گاہ تھی اور اس کا تجسس اور حواس خمسہ اس کے معلم۔ قدرت نے وہ باریک بین نظر، وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس جا کھڑے ہو کر چشم ادراک وا کرتا، رموز کائنات اس پر منکشف ہونے کو مچل مچل اٹھتے۔ اس زمانے میں دوربین، خوردبین جیسے سائنسی آلات تو تھے نہیں اور نہ ہی رسل و رسایل، نقل و حمل اور اظہار و ترسیل کے موجودہ ذرایع ہی میسر تھے۔ انسان کا سارا انحصار اپنے حواس خمسہ، اپنی فکر و تخیل، پر تھا۔ اپنے محسوسات، مشاہدات، تجربات، تجزیات و توضیحات کی روشنی میں، اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی کے لیے نئی راہیں، نئے معیار تلاش کرنا اس زمانے میں آج سے کہیں زیادہ دشوار اور پتا ماری کا کام تھا۔ کم لوگ تھے جو اس دشت بلا نورد میں اترنے کی صلاحیت اور سکت رکھتے تھے۔ جن جیالوں نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اپنے آپ کو اس آبلہ پائی پر آمادہ کیا ان ہی میں ایک سقراط بھی تھا ـــ یونانی فلسفیوں کا میر کارواں، ازلی و آفاقی حقیقتوں کا جویا، ایک بہشت ارضی کا متلاشی۔ اس کی حساس طبیعت اور زرخیز ذہن سے فہم و ادراک کی وہ قندیلیں پھوٹی ہیں جن کی دمک آج تک ماند نہیں ہوئی ہے۔

ستم ہائے روزگار نے خود سقراط کو تو اپنے حالات و خیالات قلم بند کرنے کی مہلت دی نہیں، لیکن اس کے شاگرد رشید افلاطون نے حق شاگردی ادا کر دیا ہے۔ ـــــــ 'مکالمات افلاطون

خاص کر اپنے دور اوّل کے مکالمات* (DIALOGUES OF PLATO)
(Apology, Protagoras, Crito, Phaedo) میں اس نے اپنے
مرشد کے اعلیٰ کردار اور سائنسی و فلسفیانہ افکار و نظریات کو اتنے دلکش
انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھیے اور سر دھنیے۔ سقراط کی شخصیت ماورائی
بن کر ابھرتی ہے اور بسا اوقات گمان ہوتا ہے جیسے وہ گوشت پوست
کا انسان نہ ہو کر محض ایک افسانوی کردار ہے جسے افلاطون نے اپنے
'مکالمات' کے مرکزی کردار کے بطور تخلیق کیا ہے اور جس کے وسیلے سے
اس نے خود اپنے فلسفیانہ خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس سے سقراط کی شخصیت
اور افلاطون کے فن دونوں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

سقراط کے ایک تاریخی کردار ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش یوں نہیں نکلتی
کہ افلاطون کے جن 'مکالمات' میں سقراط کا ذکر صراحت کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ
اس کے دور اوّل کے تخلیق کردہ ہیں جب اس کے اپنے فلسفہ کے تار و پود بھی
ٹھیک سے نہیں نکلے تھے۔ دوسرے افلاطون کے دو ہم عصروں۔ (Xenophon
اور Aristophanes) کے یہاں بھی سقراط کا تفصیلی ذکر ملتا ہے
گو سقراط کے تئیں ان کا رویہ افلاطون کے برخلاف عقیدت مندانہ نہیں،
بلکہ ناقدانہ اور معاندانہ ہے۔

سقراط نے جس ایتھنز میں آنکھ کھولی وہ سخت افراتفری کا شکار
تھا۔ انحطاط کے مہلک جراثیم اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے۔
معاشرتی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ان کی گزند سے محفوظ نہ رہ گیا تھا۔ اس کے
ہم قوم لہو و لعب میں پڑ کر طرح طرح کی سماجی آلائشوں اور آلودگیوں کا شکار
ہو چکے تھے۔ مادیت پرستی اور تعیش و آرام طلبی میں پڑ کر وہ زندگی کی
اعلیٰ قدروں کا احساس کھو چکے تھے۔ خدمت خلق، تعاون، ایثار، احترام
قانون، سماجی انصاف جیسے اخلاقی تصورات ان کے لیے الفاظ سے زیادہ
نہیں رہ گئے تھے۔ ان کے سیاسی نظام کا ڈھانچہ تو اس حکمران ٹولے نے
تباہ کر دیا تھا جو تیس جابروں کا ٹولہ کہلاتا ہے۔ رہی سہی کسر اس
نام نہاد جمہوریت نے پوری کر دی تھی جو 'تیس جابروں' کی حکومت کے
خاتمہ پر قائم ہوئی تھی اور جو دراصل موبو کریسی (MOBOCRACY)
یعنی 'مقتدر بے مہار انسانی اژدہام کی حکومت' تھی۔

دوسری طرف 'علم فلسفی' کہلانے والوں کے گروہ سوفسٹس
(SOPHISTS) نے اپنے نت نئے اور عوامی طور پر دل پسند
نظریات کے ذریعے مروجہ مذہبی و فکری نظام کو شدید بحران اور کشمکش
دوچار کر دیا تھا۔ خاص طور سے اس گروہ کے سرغنہ پروٹاگورس
(PROTAGORAS) کے اس تاریخی قول نے کہ:

MAN IS THE MEASURE OF ALL THINGS;
OF WHAT IS THAT IT IS; OF WHAT IS
NOT, THAT IT IS NOT.

(ہر چیز کا پیمانہ انسان کی اپنی ذات ہے جو اس کے تئیں
ہے وہ ہے، اور جو اس کے تئیں نہیں ہے وہ نہیں
ہے۔)

یہ نظریہ بڑا انتشار آور ہے۔ فرد کو سماج سے، پتہ کو شجر سے، الگ کر دینے
والا، انسان کو سکڑ سمٹ کر اپنی ذات کے خول میں بند ہو جانے کی ترغیب
دینے والا، اس مہلک خود فریبی میں مبتلا کر دینے والا کہ اخلاق و
اقدار کی دنیا میں ہر فرد آپ اپنا خدا، پیغمبر اور صحیفۂ آسمانی ہے۔ اس
کی اپنی طریقت ہی سب کچھ ہے۔ اس پر نافذ کی گئی شریعت کچھ بھی نہیں۔
اقدار زندگی کے معاملے میں خدائی اور پیغمبری کی لذتوں سے آشنا کرانے والے
اس دلفریب فلسفے نے یونانیوں کی اچھی بھلی تعداد کو اپنی گرفت میں لے
لیا تھا اور وہ اپنے اسلاف کے اخلاقی و فکری نظام کو خیرباد کہہ کر اور
جواب دہی کے ہر تصور سے آزاد ہو کر سخت سماجی اور اخلاقی انارکی
میں مبتلا ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ پروٹاگورس کا نظریہ جس کی جھلک
ہمیں کہیں کہیں صوفیوں کی 'شریعت پر طریقت کو ترجیح' دینے کے رجحان
میں بھی ملتی ہے۔ اور جس نے بیسویں صدی کے دو اہم فلسفوں یعنی پرگمیٹزم
(Pragmatism) کو ایک حد تک اور وجودیت (Existentialism)
کو بڑی حد تک ایک مضبوط اساس مہیا کی ہے۔ بڑا طرح دار
اور تہہ دار نظریہ ہے۔ اپنے ماننے اور نہ ماننے والے دونوں ہی کے لیے
بڑا شہ زور اور چنوتی دینے والا۔

یوں تو اس نظریے کے بہت سے معانی و مفہوم نکالے جا سکتے ہیں
لیکن بنیادی طور پر یہ ایک شخصی، لامذہبی، غیر سماجی، غیر جمہوری اور
لاعقلی (Un-intellectual) نظریہ اور نصب العین ہے۔

ح پر فرد کو، مذہب اور معاشرے کے متعین اور نافذ کردہ
بر فرد کے من کی موج کو عوام الناس کی تصدیق و توثیق پر فرد واحد
د ناپسند کو، اور زندگی کے تمام معاملات میں انسان کی عقل و
اس کے جذبات و احساسات (Feelings) کو فوقیت دیتا ہے
سے کسی بھی روایتی، مذہبی اور جمہوری طرز کے معاشرے کے لیے
یے کا قبول عام مہلک اور جان لیوا ہو سکتا ہے۔ سقراط کا ایتھنز
ح اس کی ہلاکت آفرینیوں کی زد پہ تھا۔

ہوش سنبھالتے ہی سقراط اپنے معاشرے کے تضادات، پیچیدگیوں
یوں سے آگاہ ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے سنگ تراشی
آبائی پیشہ اختیار کیا اور پتھروں میں جان ڈالنے اور حسن جگانے
شش کرتا رہا۔ پھر فوج میں بھرتی ہو کر راستی، احترام قانون اور حق و
ت کے لیے پیکار کی۔ پھر بقول اس کے اسے غیبی طور پر یہ احساس
یا کہ وہ صرف علم و دانش کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اور اس نے سب
وڑ چھاڑ کر ایک خدائی مشن کے طور پر معلمی کا پیغمبرانہ پیشہ اختیار
اور انسانی ذہنوں کو علم و دانش سے منور اور معطر کرنے کے لیے
ری زندگی وقف کر دی۔ وہ آہنی ارادوں اور نہایت مضبوط
کردار کا مالک تھا۔ اس کی زندگی سادہ اور ہر قسم کے تصنع سے پاک
۔ اس کی مادی ضروریات بے حد مختصر تھیں۔ وہ پھٹے حال رہنے اور
ت محنت اور جفاکشی کا عادی تھا۔ اس لیے کوئی بھی خوف یا لالچ اس
ے استقلال میں تزلزل نہیں لا سکتا تھا۔ وہ موت کے سامنے بھی
لحت پسندی اور اصولوں پر سمجھوتے کا قایل نہیں تھا۔ اس کی
العقیدگی ضرب المثل تھی۔

سقراط کی مادی بے مایگی نے اسے کوئی مدرسہ قایم کرنے کی
ت نہیں دی۔ اس لیے وہ خود مجسم مدرسہ بن گیا، ایک چلتا پھرتا دانشکدہ۔
لوگوں میں علم و دانش کی جوت جگانے کے لیے ایک مجذوب کی طرح مارا
را پھرتا۔ کسی بازار یا چوک میں ذرا اونچائی پر کھڑا ہو جاتا، علم کے پیاسے
ے اپنے نرغے میں لے لیتے، وہ زندگی کے کسی پہلو کے متعلق کوئی چبھتا سا
ال کر دیتا جس کے جواب سے سوالات و جوابات کا دائرہ در دائرہ
وسیع ہو جاتا اور علم و دانش کے سوتے ابلنے لگتے۔ زندگی کی گتھیاں سلجھنے

لگتیں اور ذہنوں سے مکڑیوں کے جالے چھٹنے لگتے۔ اس کا طریقہ، تدریس تعلم،
یا 'مکالمہ بازی' تھا۔ یہ سقراطی طریقہ Socratic Method علمی دنیا کو
سقراط کی ایک بڑی دین ہے۔ جسے آج بھی ہم ٹیوٹوریل Tutorial
(System) کے نام سے اپنے گلے سے لگائے ہوئے ہیں اور آج بھی اسے
سب سے اچھا اور موثر طریقہ تدریس و تعلیم سمجھتے ہیں۔

سقراط نے پروٹاگورس کے نظریے کی فسوں کاری کا سد باب
کرنے کے لیے نوجوانوں کے اخلاق و کردار کی تہذیب و تربیت کی طرف خاص
توجہ دی۔ دراصل تہذیب الاخلاق ہی اس کے اصلاحی اور فلاحی مشن کا
مقصد اعلیٰ تھا۔ علم الاخلاقیات کو اس نے سب سے اعلیٰ وارفع علم قرار دیا۔
ہر معاملے میں عقلیت (Rationality) کو جذباتیت (Emotionality)
پر ترجیح دینے کی تلقین کی۔ احساسات (Feelings) کو منطقی استدلال
(Reason) کا تابع قرار دیا۔ شخصی تاثرات Personal Per-
(cepts) کے بجائے ازلی و آفاقی تصورات Eternal and
(Universal Concepts) جیسے سچائی، خوب صورتی، اچھائی
وغیرہ (Truth, Beauty, Goodness etc) کو ہی اس نے حقیقی علم
تسلیم کیا۔ اس نے علم کو نیکی (Virtue) اور نیکی کو علم قرار دیا اور یہ
متنازع فیہ خیال بھی ظاہر کیا کہ چوں کہ نیکی علم ہے، اس لیے علم (Knowledge)
ہی کی طرح اسے تعلیم و تعلم سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک اخلاق
علم پر منحصر ہے۔ اور جہل بدی کی جڑ ہے۔ اس لیے اس نے تحصیل علم و دانش
کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا۔

مذہبی معاملات میں بھی سقراط نے توہمات، کورے عقیدے اور
اندھی تقلید کو عقلیت کی کسوٹی پر کسنے اور پرکھنے کی رائے دی تاکہ جذبات
کے ملمع میں لپٹا ہوا اعتقاد، شعور (Understanding) کی بھٹی میں
تپ کر ایمان (Belief) کا کندن بن جائے۔ اس نے اولمپس Olum-
(pus) پہاڑ پر رہنے والے یونانیوں کے ان گنت دیوی دیوتاؤں
کے بجائے صرف ایک خدا جو خالق کائنات اور قادر مطلق ہے کی پرستش
کرنے لیکن ساتھ ہی ایک خدا میں یقین نہ رکھنے والوں کے مذہبی جذبات
کا احترام کرنے کی تلقین کی۔

اس طرح سقراط نے عقلیت، علم و دانش، عملی اخلاقیات اور

مذہبی رواداری پر مبنی ایک خدا پرستانہ سماجی جمہوریت' جس میں فرد کو آزادیٔ فکر و رائے اور اپنی صلاحیتوں کی بالیدگی اور بھرپور استعمال کے مواقع اور ذرائع حاصل ہوں' کا خواب دیکھا اور مرتے دم تک نہ صرف یہ کہ اس خواب کو سینے سے چپٹائے رکھا بلکہ نوجوانوں کو اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے علمی اور عملی طور پر تیار کرنے کا عمل بھی جاری رکھا۔

لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ سقراط کے اس حسین خواب اور اس کی تلاشِ تعبیر کے سبب بہت سے لوگ اس کے دشمن بن گئے۔ جابر حکومت وقت سخت خفا ہو گئی۔ چنانچہ ستر سالہ سقراط کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے اوپر الزام تھا کہ وہ یونانیوں کے اساطیری و دیومالائی مذہب کے تئیں کفر و الحاد کی باتیں کرتا ہے اور یہ کہ وہ نوجوانوں کو علم و دانش اور عقلیت پسندی کی طرف راغب کر کے ان کے اخلاق کو تباہ کر رہا ہے۔ ان مہمل الزامات کی بنیاد پر اس کو سزائے موت سنائی گئی۔ وہ چاہتا تو معافی مانگ کر یا رشوت دے کر چھوٹ سکتا تھا جو کہ اس زمانے کا دستور تھا' یا پھر قید خانے کے کھلے دروازے سے فرار ہو سکتا تھا جو چنداں مشکل نہ تھا۔ لیکن ایسا کرنا اس کے نزدیک سخت اخلاقی جرم' بزدلی اور راس کی توہین کے مترادف تھا۔ اس لیے اس نے نہایت ثابت قدمی اور سکون سے زہر کا پیالہ پی لیا اور سچائی کا شہید بن کر ابدی نیند سو گیا۔

(۲)

منظر بدلتا ہے تو ہمیں نظر آتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہندوستان۔ سرسیدؒ کا پُرآشوب ہندوستان۔ سخت سراسیمگی' انتشار اور مایوسی کا شکار۔ سقراط کے ایتھنز کو تو صرف 'تیس جابروں' نے تاراج کیا تھا' لیکن سرسیدؒ کے ہندوستان اور خاص کر اس کے دل یعنی دلی' کو تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'ان گنت جابروں' نے بڑی بے دردی سے روندا اور کچلا تھا۔ ہر طرف تباہی اور بربادی کا ننگا ناچ تھا۔ جدھر دیکھو آرزوؤں اور تمناؤں کا ملبہ ہی ملبہ تھا۔ اور اس ملبے میں بری طرح دھنسے اور چیخ و پکار کرتے نظر آ رہے تھے ہندوستانی مسلمان، اپنے کاندھوں پر اپنے تابناک ماضی اور تاریک مستقبل کا تابوت اُٹھائے اور پھر اس بیکس و لاچار امتِ محمدیؐ کو اس ملبے سے نکالنے کے لیے اپنی انگلی پکڑاتے نظر آتے ہیں سرسید احمد خاںؒ۔ سقراط کے مقابلے میں بہت ہی قد آور اور قوی الجثہ اور اس کے ہی جیسے بلند و آہنی ارادوں اور سیاسی و سماجی بصیرت والا ایک سودا ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے سنسان و تاریک کھنڈروں میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا دیوانہ وار پھرتا نظر آتا ہے' تاکہ جہاں کہیں بھی جو کچھ اس قیامت خیز لوٹ کھسوٹ سے بچ گیا ہے، اسے جھک کر اُٹھالے اور پھر اسے اپنے دامن سے پونچھ کر، اپنے آنسوؤں کی گوند سے جوڑ کر' نئے سرے سے زندگی کے طاق میں سجا دے۔

یہ کام اس کام سے کہیں مشکل تھا جس سے سقراط کو سابقہ پڑا تھا۔ کیوں کہ سقراط کے ایتھنز میں تو دانشوری کی ہلکی ہی سہی ایک روایت موجود تھی' جس کی لو مدھم ضرور پڑ گئی تھی' لیکن معدوم ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف سرسیدؒ کے ہندوستان میں اکثریتی فرقہ کے یہاں تو راجہ رام موہن رائے اور ان سے پہلے اور بعد کے لوگوں کی کوششوں کے طفیل دانشوری کی روایت ضرور جڑ پکڑ چکی تھی لیکن مسلمانوں کے یہاں وہ صرف کہیں کہیں' جل کُھمبی' کے مانند سطحِ آب پر تیرتی نظر آتی تھی۔ کیوں کہ ایک عام روش کے مطابق مسلمانوں کے بہترین ذہن تو زیادہ تر شاعری اور انشا نگاری حتیٰ کہ قصیدہ گوئی اور مرثیہ نگاری کی طرف مایل ہو جاتے تھے اور خالص علمی طلب و تحقیق سے کنّی کاٹ جاتے تھے۔ شاعری کو شعار بلکہ ایک معنیٰ میں راہِ فرار بنا کر ہندوستانی مسلمان علوم جدیدہ' خاص طور سے سائنس و ٹکنیکی کے تئیں مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوتے چلے گئے اور جب ہوش آیا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے' کیوں کہ اس دوران دنیا ان سے میں کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مسلمانوں کے یہاں کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی اور اُن سے بھی بدتر 'بازیوں' کا قصہ جڑا نظر آتا ہے۔ وہ ان بازیوں میں ایسا کھوئے رہے کہ زندگی کی بازی ہی ہار گئے۔ مغلیہ سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔ جو 'تاجر' بن کر آیا تھا وہ ان کا حاکم بن بیٹھا اور پھر ۱۸۵۷ء کی ہولناکیاں ان کو روندتی' کچلتی گزر گئیں اور وہ پیوست زمین ہو کر آہ و بکا کرنے کو رہ گئے۔ یہ صورت حال سقراط کے ایتھنز کی صورت حال سے ہزار گنا بدتر تھی۔

سقراط ہی کی طرح سرسیدؒ کو بھی اپنے معاشرے' بالخصوص مسلم معاشرے کے تضادات، پیچیدگیوں اور کمزوریوں کا جلد ہی شدید احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک اللہ کے

ہم مذہب اپنے مذہب و کلچر کی حرمت و تقدیس کو قایم رکھتے ہوئے علوم جدیدہ کو نہیں اپنائیں گے، علم و دانش کے شیدائی نہیں بنیں گے، توہمات کو، اعتقادات اور اندھی تقلید کے بجائے حریت فکر اور عقلیت پسندی کو نہیں اختیار کریں گے، اور عملی اخلاقیات اور عظمت کردار سے آراستہ ہوکر جان توڑ محنت نہیں جفاکشی نہیں کریں گے وہ تباہی کے تحت الثریٰ سے اوپر نہیں اُٹھ پائیں گے۔

کسی اچھے کام کو سرانجام دینے کا سب سے آسان اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے اور دوسروں کا انتظار کرنے کے بجائے اللہ کا نام لے کر اسے شروع کر دیا جائے۔ باقی مدد تو دیر یا سویر اللہ کی طرف سے ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ سقراط ہی کی طرح سرسیدؒ نے بھی منصفی کی اپنی سرکاری ملازمت ۱۸۷۶ء میں ترک کی، ہر طرف سے منھ موڑا اور اپنے دل میں اُٹھنے والی ایک (غیبی) آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے ہم وطنوں اور بھائیوں کی چو مکھی پسماندگی دور کرنے اور ان کو زندگی کی شاہراہ پر ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ دوبارہ گامزن کرنے کے خدائی مشن میں پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ لگ گئے۔

انہوں نے سقراط ہی کی طرح نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ کیوں کہ نوجوان ہی کسی قوم کی حقیقی قوت اور اس کی آبرو ہوتے ہیں۔ ویسے مذہب، ادب اور سیاست جیسے میدانوں میں بھی ان کی اصلاحی، تخلیقی اور رفاہی سرگرمیاں ساتھ ساتھ جاری رہیں۔ جس طرح افلاطون نے اپنے 'مکالمات' کے ذریعے سقراط کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی نے سرسیدؒ کی 'حیات جاوید' لکھی ہے۔ لیکن سقراط کے برخلاف سرسیدؒ نے خود اتنا کچھ لکھا ہے کہ اردو ادب مالامال ہو گیا ہے۔

سقراط تو خواہش کے باوجود کوئی مدرسہ نہیں قایم کر سکا تھا لیکن سرسیدؒ نے ہمت اور دور اندیشی سے کام لے کر ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرستہ العلوم (M.A.O. College) قایم کیا اور خود بھی ایک چلتا پھرتا ادارہ، ایک رواں دواں تحریک بن گئے۔ مدرستہ العلوم اور اپنے دوسرے اصلاحی و فلاحی کاموں کے تعارف اور ان کے لیے لوگوں کی معاونت کی خاطر انہوں نے سقراط ہی کی طرح اپنے ملک کے گوشے گوشے کا دورہ کیا۔ لوگوں سے کہا اور ان کی سنی۔ لوگوں کے سامنے جھولیاں پھیلائیں۔ ان کی الزام تراشیوں اور دشنام طرازیوں کے تیر و نشتر سہے، لیکن سقراط ہی کی طرح اپنے ملک اور مشن پر بڑی پامردی سے مرتے دم تک قایم رہے۔

سقراط نے تو نوجوانوں کے اخلاق و کردار کی تہذیب و تربیت کے لیے عوامی گفتگو (Public Dialogue) کے طریقہ و ذریعہ پر ہی اکتفا کیا تھا لیکن سرسیدؒ نے تو اس کام کے لیے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو باقاعدہ ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا تاکہ مسلمانوں کے مختلف مسایل پر ان کے خیالات زیادہ منظم اور مربوط شکل میں لوگوں تک پہنچ سکیں اور وہ عوامی بحثوں کے ذریعے ان کا ردّ عمل بھی جان سکیں۔

سقراط نے علم کو فرد مخصوص کے محسوسات کے بجائے ازلی و آفاقی تصورات پر مبنی قرار دے کر انسانی فکر و عمل کو ایک معروضی و سائنسی اساس فراہم کی تھی۔ سرسیدؒ نے بھی توہمات و بدعات کے مارے ہوئے اپنے ہم وطنوں بالخصوص مسلمانوں میں سائنسی رجحان، رویہ اور طرز فکر پیدا کرنے کے لیے ۱۸۶۴ء میں باقاعدہ ایک سائنٹفک سوسائٹی ہی قایم کر دی جس کا خاص مقصد علوم جدیدہ پر انگریزی کی معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا تاکہ ان علوم تک عام لوگوں کی رسائی آسان ہو جائے۔ انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کا بھی اجرا کیا تاکہ سوسائٹی کا سائنسی پیغام تیزی سے پھیل سکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی قایم کی تاکہ ان کا تعلیمی پروگرام جو دراصل مذہب اور سائنس یا یوں کہیے کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کے حسین امتزاج پر مشتمل تھا۔ مدرستہ العلوم کو مرکز اور کلیدی حیثیت دیتے ہوئے پورے ملک میں چھوٹے بڑے مدرسے کے ایک جال کی صورت پھیل جائے اور ان کے پسماندہ بھائیوں کی ذہنی، سیاسی اور سماجی بیداری کی ایک ہندوستان گیر اور توانا تحریک بن جائے۔

سقراط ہی کی طرح سرسیدؒ نے بھی مذہب کو اساطیری و توہماتی عناصر اور فرسودہ اور غیر مذہبی رسموں اور رواجوں سے پاک کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کا اصلی روپ نکھر کر سامنے آسکے

انسان سے اس کا رشتہ جذباتیت کے بجائے عقلیت کی بنیادوں پر استوار ہو سکے۔ مذہبی رواداری کی تلقین کے سلسلے میں تو وہ سقراط سے میلوں آگے تھے۔ یہ کثیر المذاہب ہندوستانی معاشرہ کا عصری تقاضا بھی تھا اور ان کی اپنی فطری رواداری کا مظہر بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مدرستہ العلوم کی تاسیس سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اب تک کی تاریخ اور سرسیدؒ کی پوری تحریک مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

لیکن ستم ظریفی تو دیکھیے کہ سقراط ہی کی طرح سرسیدؒ کے جدید اصلاحی خیالات و نظریات کو بھی ان کے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں نے اپنی کوتاہ نظری کے سبب غلط معانی پہنائے۔ ان کے اوپر کفر و الحاد اور نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ اور ان کو گمراہ کرنے کے سنگین الزامات لگائے گئے۔ ان کو طرح طرح کی مخالفتوں، صعوبتوں اور ذہنی جراحتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سقراط پر تو خیر جھوٹا مقدمہ ہی چلا کر قید خانے میں اسے زہر کا پیالہ پکڑا دیا گیا تھا جسے وہ ایک سانس میں پی کر سکون کی نیند سو گیا۔ لیکن سرسیدؒ پر تو کوئی جھوٹا مقدمہ بھی نہیں چلایا گیا مگر تا زندگی موت مسلسل کی سزا دے دی گئی اور وہ ان دیکھا زہر کا پیالہ گھونٹ در گھونٹ زندگی بھر پیتے رہے۔ سقراط کی موت گھر کے بجائے قید خانے میں ہوئی تھی۔ سرسیدؒ نے بھی اپنے انتقال سے دو ماہ قبل سے اپنے آپ کو گویا قید خانے میں ہی تصور کر لیا تھا اور موت کی سی چپکی سادھ لی تھی اور مرنے سے دس روز قبل شدید ذہنی اور روحانی کرب کے عالم میں اپنے اکلوتے بیٹے کے گھر کا قید خانہ چھوڑ دیا تھا اور چوں کہ انہیں کبھی اپنا کوئی گھر بنانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا، اس لیے دیارِ غیر میں یعنی ایک دوست کے مکان پر گویا زہر کا آخری اور لمبا گھونٹ پی کر موت کو گلے لگا لیا اور سقراط کی روایت کو تازہ کر گئے۔

آج ہم سقراط اور سرسیدؒ دونوں ہی کو سچائی کا شہید اور محسنِ انسانیت مان کر ان کی شان میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ جب کہ زندگی میں ان کے لوگوں نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تو کیا یہ ہمارا تاریخی احساسِ جرم ہے جسے ہم دھوتے رہتے ہیں؟ کیا اپنے محسنوں کا قتل اور پھر ان کی پرستش کرنا ہماری سرشت میں داخل ہے؟ کیا ہم صرف اشکِ ندامت بہاتے رہنے کے لیے ہی دنیا میں آئے ہیں؟ کیا ہم صحیح کام صحیح وقت پر صحیح ڈھنگ سے نہیں کر سکتے؟

"جو تعلیم کہ حسبِ احتیاجِ وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہے
ایک عقل مند آدمی کا قول ہے کہ اگر حسبِ احتیاجِ وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اوّل مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار، پھر چور اور بدمعاش ہو جاتے ہیں۔"

——— سرسید احمد خان

سرسید احمد خان - تحریر فی اصول التفسیر

سید بہاء الحق رضوی (علیگ)

تفسیر القرآن کے سلسلے میں سرسید نے ایک رسالہ تحریر فی اصول التفسیر، تصنیف فرمایا جو اس مضمون کا موضوع ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۲ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام میں شایع ہوا۔ اس رسالے کی تصنیف کی وجہ سرسید احمد خاں نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب ان کی تفسیر کا ایک بڑا حصہ شایع ہو چکا تو اس کی تردید میں مختلف کتابیں، مضامین اور رسالے شایع ہوئے لیکن سرسید نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد اُن کے قریبی دوست اور مددگار محسن الملک نے بھی تفسیر کے سلسلے میں ان کی رایوں سے اختلاف کیا اور اپنے خطوط میں اپنے اختلافات اور شبہات کا اظہار کیا۔ اس لیے سرسید کو رسالے کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ دراصل سرسید یہ چاہتے تھے کہ اپنی تفسیر کی تکمیل کے بعد اپنی تفسیر کے اصول قلم بند کریں لیکن محسن الملک کے خطوط کی وجہ سے مزید انتظار کی گنجایش نہ رہی اور یہ رسالہ عالم وجود میں آیا۔ سرسید کا اس سلسلے میں زیادہ اہم رول یہ ہے کہ انہوں نے محسن الملک جیسے ارادت مند کے وہ خطوط شایع کر دیے جن میں ان پر سخت اور کڑی تنقید کی گئی تھی۔ یہ سرسید کی بہت بڑی عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کے نجی خطوط کو، جن میں اُن پر چوٹیں کی گئی تھیں منظرِ عام پر لانے میں دریغ نہیں کیا۔ اس لیے کہ اُن کو اپنی رائے کی صداقت اور اپنی نیک نیتی پر پھر پور یقین تھا اور اپنے مخالف کی کوئی بات بھی چھپانا نہیں [illegible] تھے۔

[illegible] کے ابتدائی حصے میں محسن الملک کا خط مورخہ ۹ راگست ۱۸۹۲ء [illegible] جو سرسید کی جانب سے ہے خط مورخہ ۱۰ راگست ۱۸۹۲ء [illegible] اور سرسید کے دو خطوط مورخہ ۱۹ رستمبر ۱۸۹۲ء [illegible] اور ۸ راکتوبر ۱۸۹۲ء شامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت تک سرسید اور محسن الملک جیسے دو دوستوں بلکہ دوست سے زیادہ ایک معتقد اور ارادت مند محسن الملک اور دوسری طرف ایک مخدوم اور بزرگ سرسید کے درمیان باوجود محبت اور عقیدت کے تفسیر کے بارے میں سخت اختلاف رائے تھا۔ محسن الملک کے خطوط اور اُن کے جوابات طنز اور طعن و تشنیع سے بھرے ہوئے ہیں۔ محسن الملک نے سرسید کی تفسیر کی بنیاد پر بڑا سخت حملہ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ یہ ایسی تفسیر ہے جو قائل (باری تعالیٰ) کے منشاء کے بالکل خلاف ہے (تفسیر القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ) اس جملے سے سرسید کے پورے کارنامے کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ سرسید نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ فیصلہ کہ یہ تفسیر منشائے مولیٰ کے خلاف ہے، کوئی دوسرا ذریعہ سوائے وحی کے نہیں کر سکتا اور وحی آپ پر آتی نہیں ہے۔ لیکن اس کے جواب میں محسن الملک نے بھی یہی بات کہی ہے کہ وحی آپ پر بھی نہیں آتی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہہ سکیں کہ پرانی تفسیریں رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں اور منشائے قرآن کے خلاف ہیں۔ سرسید نے اپنے جوابی خط میں محسن الملک کے خیالات کی توجیہ کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ چوں کہ بچپن کی سنی سنائی باتیں آپ کے دماغ میں راسخ ہو چکی ہیں اور دوسرے علماء اور مفسرین کی رایوں سے آپ اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اپنے ذہن کو ان باتوں سے خالی کرنے کے بعد تحقیقات قبول کرنے کے لیے آپ کا دماغ آمادہ نہیں ہے اور آپ نے اب تک کے تمام مفسرین کے اقوال کو حرف آخر سمجھ رکھا ہے۔ محسن الملک نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ آپ کے یہ الزامات صحیح نہیں ہیں۔ میں ہر نئی بات کو قبول کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ نئی تحقیق مجھے ضلالت اور

گمراہی کے غار میں نہ ڈھکیل دے۔ اس کے جواب میں انہوں نے سرسید پر بھی الزام لگایا ہے کہ جس طرح بقول آپ کے میں نے پرانے مفسرین اور علماء کی رائے کو حرفِ آخر سمجھ لیا ہے، اسی طرح آپ نے بھی یورپ کے مذہب کے غیر پابند اور بدعقیدہ لوگوں کی جدید رایوں کو حرفِ آخر قرار دے دیا ہے اور قرآن کی تفسیر ان کی رایوں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط میں یہ بحث پیدا ہوگئی ہے کہ موجودہ علوم کا مذہب کے خلاف ہونا ثابت ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ مذہب اور علوم جدیدہ میں سخت اختلاف اور تضاد ہے یا نہیں۔ سرسید کی رائے ہے کہ صحیح علوم جدیدہ اور صحیح تفسیر القرآن اور اسلام میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہے۔ علوم جدیدہ کا تضاد مذہب کی ان غلط اور رائج روایتوں اور قصوں اور رسم و رواج سے ہے۔ مذہب عقلِ انسانی کے خلاف نہیں ہو سکتا ہے اور عقلِ انسانی کے خلاف جو باتیں مذہب میں شامل کرلی گئی ہیں وہ مذہب نہیں ہیں بلکہ غلط اور بے بنیاد قصّے اور کہانیاں ہیں جو مذہب میں شامل کیے گئے ہیں اور تفاسیر میں یہودی روایتوں اور قصوں کو شامل کردیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ سے جب اسلام کا مقابلہ ہوا تو علمائے اسلام نے علم کلام کی بنیاد ڈالی اور اپنے دلائل سے قیاسی فلسفیانہ دلائل کو ٹکراتے رہے۔ یونانی فلسفہ کے مطابق اسلام کو ثابت کیا یا یونانی فلسفہ کے دلائل کو غلط ثابت کیا یا مشتبہ ثابت کر دیا لیکن آج چوں کہ یونانی فلسفہ کے بہت سے مسلمات موجودہ سائنس کے علوم نے غلط ثابت کر دیے ہیں اس لیے اسلام کے وہ نظریات جو یونانی فلسفہ کی بنیاد پر قایم کیے گئے تھے غلط ثابت ہو جاتے ہیں، لیکن آج کا دور چوں کہ سائنس کا دور ہے اور سائنس مشاہدہ کی رو سے ہر بات کو ثابت کر دیتی ہے۔ اس لیے وہ تمام باتیں جو صرف قیاسی تھیں غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج علوم جدیدہ کی سچائی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اسی کے مقابلے میں اسلام کو اپنی سچائی اور عقلِ انسانی کے مطابق ہونا ثابت کرنا ہے۔ سرسیّد نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ صحیح مذہب کا کوئی شعبہ عقلِ انسانی کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

سرسید اور محسن الملک کے خطوط میں علوم جدیدہ اور مذہب کے ٹکراؤ کا شدّت سے اظہار ہے۔ محسن الملک کے خط میں سرسیّد کی قوتِ بیانیہ کے دلنشین ہونے کے انداز کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ چوں کہ سرسیّد اظہارِ خیال کی بے پناہ طاقت رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے بعض انہونی باتوں کو ثابت کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ محسن الملک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ تفسیر کے اختلافی مسائل چھوڑ کر تفسیر قوتِ ایمانی میں اضافہ کرنے اور تقرب الی اللہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ان کے متصور قول کے بموجب مذہب کے تمام اصول اور فروع کو عقلِ انسانی کی منطق سے ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن سرسید نے اپنے خطوط میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم مذہب کے ہر شعبہ کو عقلِ انسانی سے ثابت کر سکتے ہیں۔ سرسیّد نے یہ بھی لکھا ہے کہ عقلِ انسانی اور عقلِ شخصی میں بہت بڑا فرق ہے۔ عقلِ شخصی کو لوگ عقلِ انسانی سمجھ بیٹھے ہیں۔ سرسید کو امید تھی کہ ان کے دوسرے خط کا بھی جواب محسن الملک تحریر کریں گے اور یہ رسالہ دونوں کے خطوط سے ہی مکمل ہو جائے گا لیکن محسن الملک اپنی مصروفیات کی وجہ سے کوئی اور خط سرسیّد کو اس وقت نہ لکھ سکے۔ اس لیے سرسیّد نے باقی رسالہ میں اپنی تفسیر کے اصول تحریر کر دیے ہیں۔

سرسیّد نے اپنی تفسیر کے بارے میں اس کے بعد پندرہ اصول تحریر فرمائے ہیں جن میں بعض ابتدائی اصولوں کے سلسلے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہے۔ مثلاً انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور خدا کا قادرِ مطلق اور خالقِ کائنات اور اس کا حیّ لایموت ہونا مسلّم ہے اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کی رہبری اور رہنمائی کے لیے پیغمبر مبعوث فرمائے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں اور اس کے بعد یہ بھی اصول تحریر کیا ہے کہ قرآن مجید قلبِ رسولؐ پر نازل ہوا ہے اور بلفظہٖ اترا ہے یعنی الفاظ قرآن بھی خدا کے ہیں اور بعض علماء کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مفہوم نازل ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ قرآن سچا ہے، اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ حق ہے لیکن جو حکایات کسی بات کو ثابت کرنے یا کسی قول کی تردید کرنے یا رائج عقیدے کو جھٹلانے کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ ان حکایتوں کا سچا ہونا ضروری نہیں لیکن حکایتوں سے جو استدلال کیا ہے اور نتیجہ نکالا گیا ہے وہ سچا ہے اور برحق ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ کی صفات کے عین ذات ہونے کا اقرار کیا گیا ہے۔ لیکن ان ابتدائی اصولوں میں دو اہم باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلّمات قوم کو تسلیم کرنے کے بعد جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ نتیجہ بھی صحیح ہیں اور مسلمات قوم کی حق ہیں۔ عام طور پر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جو واقعہ بطور حکایت یا بطور روایت بیان کیا گیا ہے وہ واقعہ حرف بحرف سچا ہے۔ سرسید کی رائے یہ ہے کہ ان حکایتوں کا سچا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ان حکایتوں سے جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ نتائج حق ہیں۔ مسلمات قوم کو تسلیم کرکے ان سے نتائج نکالے گئے ہیں۔ ان مسلمات قوم کا بالکل سچا ہونا یا حکایتوں کا سچا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عام طور پر علماء اور مفسرین نے خرقِ عا

نظام حیات ہے لیکن اگر اس سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ زندگی کے ہر شعبہ کی جزئیات کے متعلق مذہبی ہدایات موجود ہیں تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی ۔ ہوائی جہاز چلانے والے کو بڑی محنت اور مشقت سے ہوائی جہاز چلانا سیکھنا ہوگا ۔ اس کے لیے اسے سائنس پڑھنا ہوگی، کل پرزوں کو سمجھنا ہوگا اور مسلسل مشق سے فیصلہ لینے کی قابلیت پیدا کرنا ہوگی ۔ اسی طرح موجودہ تنظیموں کی رہنمائی میں جزئیات پر پورا عبور حاصل کیے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے چاہے یہ تنظیمیں ریلوے کی ہوں یا فوج کی یا اسپتال کی یا ریاست کی۔ کوئی مذہبی فارمولا جزئیات پر عبور کا بدل نہیں ہو سکتا ۔

ایک بات بہت زمانے سے کہی جا رہی ہے ۔ سائنس کے ہر نظریہ کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے ۔ اگر سائنس کا کوئی نظریہ قرآن کے خلاف جاتا ہے تو سائنس کو غلط سمجھنا چاہیے ۔ بظاہر یہ بات نہ صرف بے ضرر معلوم ہوتی ہے بلکہ ہر عقیدت مند مسلمان کے لیے مشعل راہ بھی ۔ لیکن ذرا غور فرمایئے کیا معنی نکلتے ہیں اس نظریے کے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن بھی ایک سائنس کی کتاب ہے، معمولی کتاب نہیں بلکہ ریفرنس بک ۔ سائنس کے نظریات تو روز بروز بدلتے رہتے ہیں، ہر نظریہ عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ جب اس کے مطابق عمل کرکے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نظریے میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو بخوشی یہ تبدیلی قبول کر لی جاتی ہے ۔ لیکن قرآن کی تو کوئی بات عارضی نہیں ہے ۔ اس میں جو لکھا ہے وہ بدلا نہیں جا سکتا ۔ اس لیے اس کا اور سائنس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ قرآن کی کسوٹی پر سائنس کے عارضی نظریات کو پرکھنا ویسا ہی ہے جیسا کہ الجبرا کے سوالات کو موسیقی کی تانوں کے ذریعے حل کرنا ۔

اس خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے بہت نقصان اٹھایا ۔ اوّل تو وہ سائنس سے ڈرنے لگے کہ کوئی ایسی بات نہ پڑھ لیں جو اُن کے عقاید کو متزلزل کر دے ۔ اب تو نہیں میں نے اپنے بچپن میں ضرور سنا تھا کہ ڈارون کی تھیوری اسلام کے خلاف ہے ۔ بھلا بتلایئے قرآن میں تو یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے قصص اس لیے بیان کیے ہیں تا کہ تمہاری سمجھ میں بات آجائے" اور یقیناً یہ اسی زبان میں بیان کی گئی ہے جو اس زمانے میں رائج تھی اور اس میں وہی مثالیں دی گئی ہیں جن سے اس زمانے کے لوگ واقف تھے ۔ بہر حال اوریجن آف دی سپیشیز اور ایڈاپٹیشن کا نظریہ انیسویں صدی کی پیداوار ہے جب سائنس کا میکانکی دور اپنے عروج پر تھا ۔ اب اس قسم کے کسی نظریے کا ذکر اگر قرآن میں آتا تو انیسویں صدی سے پہلے کے لوگ کیسے کچھ سمجھ پاتے ۔ سائنس میں مشاہدات کی بنیاد پر نظریات قائم کیے جاتے ہیں ۔ اور اس پر ہوتا ہے کہ مشاہدات بالکل صحیح طور پر بیان کیے جائیں ۔ ظاہر ہے کہ کوئی مذہب خاص کر اسلام مشاہدہ سے ہرگز منع نہیں کرتا ۔

لیکن ذرا غور فرمایئے کہ کیا نقصان ہوا ۔ بجائے اس کے کہ ہمارے سائنس داں ڈارون کے نظریے کو مزید مشاہدات کی بنیاد پر پرکھتے بہت لوگوں نے یہ کہہ کر اسے نظر انداز کر دیا کہ یہ تو قصۂ آدم کی نفی کرتا ہے اس لیے ہمارے مذہب کے خلاف ہے اور اس لیے ہم اس پر کوئی توجہ نہیں کریں گے ۔ ظاہر ہے کہ جو جگہ بیالوجی کی سائنس میں ہم نے خالی کی اس پر دوسروں نے قبضہ کر لیا ۔ ہم پھر پس پشت ڈال دیے گئے ۔

غرض آج یہ بات بہت زور دے کر کہنا ہوگی کہ قدرت کا مشاہدہ کرنے کی کہیں ممانعت نہیں آئی ہے بلکہ اس کی تو ترغیب دلائی گئی ہے ۔ یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہونا چاہیے اور جو نتیجے ان مشاہدات سے نکلیں انہیں بغیر کسی خوف کے بیان کرنا چاہیے کہ یہی سائنس کا میدان ہے ۔ عقاید کا معاملہ دوسرا ہے ۔ اگر ان میں کوئی شک ہو تو سائنس داں کے بجائے کسی مرشد اور عارف سے رجوع کرنا چاہیے ۔

آخر میں میں آپ کی توجہ مغربی تہذیب کی طرف دلانا چاہتا ہوں ۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کافی مغایرت ہے ۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟ مغربی تہذیب کا ایک تجزیہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بنیاد یونانی فلسفہ، مشرق وسطیٰ کے مذہبی تصورات اور رومن قانون پر ہے ۔ غالباً بہت حد تک یہ تجزیہ صحیح ہے ۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ مسلمانوں کا کیا رشتہ ہے ۔ ان تینوں چیزوں سے اول تو یونانی فلسفے کو مسلمانوں نے کبھی نہیں ٹھکرایا بلکہ ان کے علماء تو سقراط، افلاطون، ارسطو، بقراط اور اقلیدس کو اپنا استاد مانتے تھے اور قرون وسطیٰ میں تمام علمی کارنامے گویا کہ یونانی علوم ہی کو بنیاد رکھ کر انجام دیے گئے تھے ۔ ان لوگوں کا جب یونانی، ہندی، مصری اور رومن علوم سے واسطہ پڑا تو انہیں ان کو اپنانے میں کوئی ذہنی رکاوٹ نہیں محسوس ہوئی ۔ غالباً وہ یہ سمجھے کہ علم الانسان مالم یعلم کی تفسیر یہی ہے ۔ صدیوں بعد جب انیسویں صدی میں مسلمانوں کا سابقہ

پھر یونانی فلسفہ کی ترقی یافتہ شکل یعنی مغربی علوم سے پڑا تو مسلمانوں کا رویہ بالکل دوسرا تھا۔ گذشتہ تین چار سو برسوں سے ان کا رشتہ عالمی علم سے بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ انہیں جان ہنٹر، گلیلو، کوپرنیکس اور نیوٹن کے کارناموں کا بالکل علم نہیں تھا۔ جب فاتح یورپین قومیں اپنے ساتھ ان علوم کو بھی لائیں تو مسلمانوں نے یہ سوچ کر ان سے اپنا منہ موڑ لیا کہ ملک پر تو فرنگیوں نے قبضہ کر ہی لیا ہے، اب نیت ہمارے دین کو تباہ کرنے کی ہے۔ لیکن سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے ایک طویل کشمکش کے بعد مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اس ہچکچاہٹ پر قابو پالیں۔ چنانچہ اب کوئی شکوہ نہیں کرتا "جان سپرد ڈاکٹر، عقل سپرد ماسٹر اور مال سپرد آنجناب"۔ چنانچہ یورپین تہذیب کے ایک اہم ستون یعنی سائنس کو اپنانے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی ہے۔

یورپین تہذیب کا دوسرا بڑا رکن مشرق وسطیٰ کے مذہبی تصورات ہیں۔ مسلمانوں کی اساطیری روایات بھی حضرت عیسیٰؑ تک تو وہی ہیں جو یورپ کے لوگوں کی، سزا اور جزا کا تصور بھی وہی ہے اور روز قیامت بھی دونوں جگہ مشترک ہے۔ یورپ اور مسلمانوں کے مذہبی اختلافات میں صلیبی جنگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اب تو ان جنگوں کو ختم ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ اس لیے عیسائیت اور اسلام میں اتنی مذہبی دوری تو نہیں ہونا چاہیے جتنی آج سے پانچ چھ سو سال قبل تھی۔

قانون کا تمام باشندوں پر یکساں اطلاق رومن قانون اور اسلامی شریعت دونوں جگہ موجود ہے۔ اس لیے یورپین تہذیب کے اس ستون کے بارے میں آپس میں بہت اختلاف نہیں ہے۔

رہ گئی جنسی بے راہ روی سو یہ ایک بد اقداری ہے جسے کوئی نہیں سراہتا۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یورپی تہذیب اور جنسی بے راہ روی ہم معنی نہیں ہیں۔ یورپی تہذیب کو جو چیز قدیم تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہے وہ شخصی اور قومی آزادی، مساوات اور اخوت کے یہی تین نعرے فرانس کے انقلابیوں نے اٹھارھویں صدی میں لگائے تھے اور ان ہی کی گونج ساری دنیا میں سنائی دیتی ہے ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول ہو۔ آخر انہیں بھی تو یہی باتیں سکھائی گئی تھیں۔ مغربی تہذیب کی وہ صورت جو نوآبادیاتی تہذیب کی شکل میں فاتح اقوام نے مشرق والوں پر تھوپی تھی وہ ختم ہو چکی ہے اور اب دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ یورپین تہذیب کے پسندیدہ پہلوؤں کو آپ ومبلڈن کے ٹینس مقابلوں اولمپک کھیلوں، اقوام متحدہ کے جلسوں، نوبل انعام یافتہ لوگوں کے جھرمٹ، تپ دق، آتشک اور طاعون جیسی موذی بیماریوں پر قابو پانے والے ڈاکٹروں کی مجلس اور ہوا بازوں اور خلا بازوں کی محفلوں میں دیکھیے۔ اب یہ تہذیب مغربی نہیں عالمی ہو گئی ہے اور مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جلد از جلد اس میں اپنے لیے باعزت جگہ بنا لیں۔

کہیں اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اہل مغرب کے رسم و رواج، آداب مجلس اور خورد و نوش کو زبردستی اقوام مشرق پر تھوپنے کی وکالت کر رہا ہوں۔ حاشا و کلا تہذیب کے یہ ظاہری مظاہر تو ہر جگہ الگ الگ ہوں گے۔ مجھے ہرگز یہ منظور نہیں کہ اپنے یہاں کے کھانے، اردو فارسی کی غزلیں، قوالی کی محفلیں، دادرا، ٹھمری اور کتھک کے رقص ختم کر دیے جائیں اور صرف موزارٹ اور شوپین کی موسیقی، شیلے اور کیٹس کے نغمے سنے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ تہذیب کا روپ ہر جگہ مقامی ہوگا لیکن اس کی روح عالمی ہوگی اور یہ خدا کی تمام مخلوق کو ایک رشتے میں پرو دے گی۔

"بے علمی مفلسی کی ماں ہے۔ جس قوم میں علم و ہنر
نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے
تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کا باعث ہوتی ہے۔"

——— سرسید احمد خاں

اِس شمارے کے مقالہ نگار

پروفیسر آل احمد سرور۔ سابق صدر شعبۂ اردو اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ، سابق ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر۔ سرسید نگر، علی گڑھ

پروفیسر نسیم انصاری۔ سرجری ڈپارٹمنٹ، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر اسرار احمد۔ شعبۂ طبعیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مفتی محمد رضا انصاری۔ سابق استاد شعبۂ سنّی دینیات، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔ چیرمین اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ لکھنؤ۔

ڈاکٹر نادر علی خاں۔ ریڈر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید شفیق احمد۔ ڈی۔ ایف۔ او۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علی اختر خاں۔ ریڈر شعبۂ تعلیمات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید بہار الحق رضوی (ایڈوکیٹ) ——— محلہ راجدوارہ۔ رامپور یو۔پی

سید شکیل احمد۔ اسٹیٹ آرکیوسٹ، آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز، حیدرآباد

افضال الرحمٰن ——— مرکزی دفتر جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔

ہماری کچھ ایجنسیاں

۱۔ محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱۔ کالوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ 700073

۲۔ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
نظام پورہ۔ بھیونڈی۔ تھانے

۳۔ میسرز بک ایمپوریم۔
سبزی باغ۔ پٹنہ۔

۴۔ میسرز نصرت بک ایجنسی
کوئین روڈ، انجمن بلڈنگ ہبلی

۵۔ میسرز آزاد بکس اسٹور
اردو بازار۔ دربھنگہ۔ 846006

۶۔ میسرز احمد حسین
جال بک ڈپو۔ باری روڈ گیا۔

۷ میسرز جنتا بکس ہاؤس
مین روڈ رانچی 834001

۸۔ میسرز اعظم خاں
ٹاؤن اینڈ پوسٹ تھریا نجابت خاں۔ بریلی۔ 243127

۹ میسرز طالب حسین
ایف۔ ڈی۔ ہائر سکنڈری اسکول۔ کاٹھ دروازہ۔ مرادآباد

۱۰۔ میسرز صدیق اختر انصاری۔ اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ۔ کامٹی 441001

۱۱ میسرز محمد پرویز اقبال۔ میگزین ایجنٹ
دوست محمد میموریل پرائمری اسکول
۲۱۔ جی۔ ٹی روڈ۔ بانس تگان
پوسٹ۔ ٹیٹاگڑھ۔ 748188
۲۴۔ پرگنہ نارتھ (ویسٹ بنگال)

۱۲۔ میسرز ایم۔ ایچ بک سیلر
معرفت محمد شعیب۔ سیلز ٹیکس آفس
پوسٹ آفس لہریا سرائے 846001
دربھنگہ۔ (بہار)

۱۳۔ میسرز ایم۔ ایچ بکس سیلر
دیسی دوا خانہ۔ کاٹکی بازار۔
دربھنگہ 846006

۱۴ میسرز عبدالستار بک سیلر
کمپنی باغ۔ مظفرپور

۱۵۔ میسرز عبدالقدیر بک اسٹال
مین روڈ، موتی ہاری۔ ڈسٹرکٹ چمپارن۔

۱۶۔ میسرز نیو نیوز ڈیلرز
بھولی موڑ۔ دھنباد۔ 826001

۱۷۔ میسرز اسلامیہ بک ڈپو۔
تیتر پور چوک۔ بھاگلپور سٹی 812002

۱۸ میسرز آزاد بکس اسٹور
ساکچی بازار۔ جمشید پور (بہار)

۱۹۔ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بغیہ۔ فیروزآباد۔ ضلع آگرہ

۲۰۔ میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسز بلڈنگ۔ ای۔ آر روڈ
بمبئی

۲۱۔ میسرز کتاب محل۔
تکیہ۔ اعظم گڑھ
یو۔پی

۲۲- میسرز بکس ہاؤس۔
دریاپور پٹنہ ۴
۲۳- میسرز مختار الحق
ہاؤس نمبر ۱۰- اسٹریٹ نمبر ۵-
کانت کنار ناز ۲۴ پرگنہ - کلکتہ،
(ناسلھ) ویسٹ بنگال۔
۲۴- میسرز سیمانی بکس ڈپو۔
تیرانہ قلعہ - سیوان (بہار)
۲۵ میسرز محمد اسعد۔
معرفت مسٹر منصور (موٹر سائیکل مکینک)
روڈویز- سرائے میر
اعظم گڑھ 276306
۲۶- میسرز نسیم بکس ڈپو۔
ٹاور چوک - دربھنگہ 846004
۲۷- آفتاب بکس ڈپو
سبزی باغ پٹنہ
۲۸ میسرز حامد نیوز ایجنسی -
بالا پورا
شیو پور کلاں - 27.6337.
(ایم-پی)
۲۹- میسرز طارق نیوز ایجنسی
مکتبہ معصوم شاہ
مومن پورہ
ناگپور
۳۰- میسرز محمد القیوم
اردو لائبریری - تحصیل لیٹے - گھنٹہ گھر مبارکپور۔

۳۱- میسرز مکتبہ عمر۔
بکس سیلرز اینڈ نیوز پیپرس
مدینہ مسجد کمپلکس
میناکشی سرکل۔ بیجاپور- 586101
۳۲- میسرز فردوسی کتاب گھر۔
بکس سیلرز اینڈ پبلشرز
بھوسیا چوک دھرواڑ-
۳۳- میسرز سپر ہیلی کیشنز
ایچ نمبر ۳۲- گارڈن ریچ روڈ
کلکتہ 700024
۳۴- میسرز کمالیہ بکس ڈپو۔
تاتار پور- بھاگلپور- 2۔
۳۵- میسرز سب رنگ بکس۔
انجمن بلڈنگ۔
مین روڈ-
رانچی۔
۳۶- میسرز ایجوکیشنل بکس ہاؤس
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
علی گڑھ۔
۳۷- میسرز انوار بک ڈپو۔
شمشاد مارکیٹ-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی-
علی گڑھ۔
۳۸- میسرز کتاب سنٹر
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۹- مظہر حسین، حسین بک ہاؤس - راؤجی پیٹھ
پوسٹ سرونج - ڈسٹرکٹ ودیشا (ایم پی) 464228

"انٹرمیڈی نیوڈیل اسٹڈیز ان بیک ورڈ ریجن اینڈ ویکر سیکشن"

اسامی شمار نمبر ، کے لیے۔

امیدوار کا درج ذیل ایریا میں تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

"انرجی اینڈ واٹر مینیجمنٹ"

۲۔ پسندیدہ: (آسامی شمار نمبر ۵ کے لیے)

مطبوعہ تحقیقی کام۔ سالڈ اسٹیٹ کیمسٹری یا سالڈ اسٹیٹ فزکس، بحیثیت اسٹڈی سبجیکٹ کے، ساتھ میں ایم۔ ایس سی کی ڈگری۔

۔ لکچرر ان شیعہ تھیالوجی ، ویمنس کالج۔

قابلیت:

ا۔ شیعہ تھیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام اور؛

ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون (شیعہ تھیالوجی) میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس (ع' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کسی مشہور شیعہ مدرسے سے فاضل ساتھ میں انگریزی کی اچھی جانکاری یا اس کے مساوی کسی غیر ملکی یونیورسٹی کی ڈگری۔

۹۔ لکچرر ان تامل، ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن انڈین لینگویجز

قابلیت۔

ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام؛ اور

ب اچھے تعلیمی ریکارڈ کے متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس (ع' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الموضوعی پروگراموں کی ترقی کی ضرورت کے مدّنظر مذکورہ بالا الف اور ب میں ڈگریاں متعلقہ مضامین میں درکار ہو سکتی ہیں۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے، بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں نرمی کی جا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل انسان میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا اس صورت میں ایم۔ فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کے امیدوار کو وزن دیتے ہوئے تقرر کیا جائے گا لیکن شرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سال کا تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیبارٹری [illegible] آرگنائزیشن میں دو سال تک عملاً کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اپنے تقرر کے آٹھ سال کے اندر [illegible]

حاصل کرلے یا اعلیٰ پائے کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

۱۰۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ۔ جے۔این۔میڈیکل کالج اسپتال ۔

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی: کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے ایم۔بی۔بی۔ایس اور ساتھ میں کسی کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ کوالیفکیشن ۔ کسی سینٹرل یا صوبائی گورنمنٹ کے اسپتال، قابل ترجیح تدریسی اسپتال میں، اسپتال ایڈمنسٹریشن کا سپروائزری کی جگہ پر کام کرنے کا کم از کم تین سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ: اسپتال ایڈمنسٹریشن میں ڈگری/ڈپلوما۔

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۳/ ۸۷-۸۸ مورخہ یکم جون ۱۹۸۷، کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کی پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۱۱۔ کیجولٹی میڈیکل آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) جے۔این میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۹۰۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (اَن ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: ۱۔ ایم۔بی۔بی۔ایس۔

۲۔ کسی کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری یا ڈپلوما۔

۳۔ کسی تدریسی اسپتال میں بحیثیت ریذیڈنٹ یا رجسٹرار تین سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ۔ کیجولٹی کے کام کا تجربہ۔

۱۲ سیکورٹی آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) پراکٹر آفس

شرح تنخواہ: ۲۰۰۰-۶۰-۲۳۰۰-ای-بی-۷۵-۳۲۰۰-۱۰۰-۳۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: ۱۔ بیچلرس ڈگری۔

۲۔ اعلیٰ سطح پر حفاظتی اور انتظامی کام کا کم از کم ۱۰ سال کا تجربہ۔

۳۔ صحت اور جسمانی ساخت اچھی ہونی چاہیے۔

پسندیدہ: قانون کی ڈگری یا کریمنل لا اور اس کے طریقہ کار کا عملی تجربہ اور فوج یا پولس میں حفاظتی امور کی انجام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۶/۸۷-۸۸ء

مورخہ یکم ستمبر ۱۹۸۷ء

درج ذیل جگہوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں:

شرح تنخواہ

پروفیسرس : ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

ریڈرس :- ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (پری ریوائزڈ)

لکچررس :- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاونسز (پری ریوائزڈ)

۱- پروفیسر آف نیوروسرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری۔

قابلیت: ایم-سی ایچ (نیوروسرجری)

تدریس/تحقیق کا تجربہ۔

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر ان نیوروسرجری چار سال کا تجربہ۔

۲- پروفیسر آف ہسٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری۔

۳- پروفیسر آف کامرس (ڈی۔ ایس۔ اے پروگرام کے تحت) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف کامرس۔

قابلیت: معروف و ممتاز اسکالر جن کی اعلیٰ درجے کی معیاری مطبوعات ہوں اور وہ تحقیق کے کام میں مشغول ہو۔ درس و تدریس اور یا تحقیق کا دس سال کا تجربہ ہو۔ ڈاکٹریٹ کے معیار کی تحقیق کی نگرانی کا تجربہ رکھتے ہوں گے۔

یا

غیر معمولی مشہور و معروف اسکالر جس نے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔

نوٹ شمار نمبر ۳ پروفیسر آف کامرس کے لیے۔

درج ذیل تھرسٹ ایریاز میں سے کسی ایک میں امیدوار کو قابل لحاظ تحقیق کا تجربہ ہونا چاہیے۔

۱- انٹر پری نیوریل اسٹڈیز ان بیک ورڈ ریجن اینڈ ویکر سیکشن۔

۲- انرجی اینڈ واٹر منیجمنٹ۔

۴- ریڈر ان الیکٹریکل انجینیرنگ۔ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریکل انجینیرنگ۔

قابلیت: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری۔ تدریس اور/یا تحقیق اور ترقیات کا پانچ سال کا تجربہ۔

اگر کوئی امیدوار پی۔ایچ ڈی ڈگری نہ رکھتا ہو لیکن اس کا مطبوعہ کام ریسرچ ڈگری کے معیار کا ہو یا ڈیزائن ڈویلپمنٹ میں کسی ادارے یا انڈسٹری میں اس کا انتہائی اعلیٰ پایہ کا کام ہو تو اس امیدوار کو بھی تقرر کے لیے موزوں تصور کیا جائے گا۔

یا

ان اشخاص کے لیے جن کا تقرر صنعت یا پیشہ ورانہ حلقوں سے کیا جائے گا، ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے حامل ہوں اور اپنے میدان میں تقریباً سات سال کا تجربہ رکھتے ہوں جن میں تحقیق/ایجادات اور ڈویلپمنٹ بھی شامل ہے۔

۵۔ ریڈر ان میٹریل سائنس، کیمسٹری سیکشن - ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی

۶۔ ریڈر ان کامرس تھرسٹ ایریا ان انٹرپرینیوریل اسٹڈیز ان بیک ورڈ ریجن اینڈ ویکر سیکشن (ڈی۔ایس۔اے پروگرام کے تحت) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف کامرس۔

۷۔ ریڈر ان کامرس، تھرسٹ ایریا ان انرجی اینڈ واٹر منیجمنٹ (ڈی۔ایس۔اے پروگرام کے تحت) (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف کامرس۔

قابلیت:

ا۔ لازمی: اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام۔ اس بات کا مکمل ثبوت کہ امیدوار عملی طور پر (۱) تحقیق یا (۲) انوینشن ان ٹیچنگ میتھڈ یا (۳) پروڈکشن آف ٹیچنگ میٹریل کے کام میں مصروف ہے۔

تدریس اور/یا تحقیق کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ جن میں کم از کم تین سال بحیثیت لکچرر یا اس کے مساوی عہدے پر کام کا تجربہ ہو۔

۔ اس شرط میں اس وقت نرمی برتی جا سکتی ہے جب کہ امیدوار کو تدریس/تحقیق کا اعلیٰ درجہ کا تجربہ ہو۔

نوٹ۔ ریڈر ان میٹریل سائنس کی اسامی کے لیے (شمار نمبر ۵ پر)
میٹریل سائنس یا فزیکل میٹالرجی میں ماسٹرس ڈگری ہونا چاہیے۔
نوٹ اسامی شمار نمبر ۶ کے لیے۔
امیدوار کو درج ذیل تھرسٹ ایریا میں تحقیق کے کام کا ہونا چاہیے۔

"انٹر پری ٹیوریل اسٹڈیز ان بیک ورڈ ریجن اینڈ ویکر سیکشن"

نوٹ: اسامی شمار نمبر ، کے لیے۔

امیدوار کا درج ذیل ایریا میں تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

" انرجی اینڈ واٹر منیجمنٹ "

۲۔ پسندیدہ: (آسامی شمار نمبر ۵ کے لیے)

مطبوعہ تحقیقی کام۔ سالڈ اسٹیٹ کیمسٹری یا سالڈ اسٹیٹ فزکس' بحیثیت اسٹڈی سبجکٹ کے' ساتھ میں ایم۔ایس سی کی ڈگری۔

- لکچرر ان شیعہ تھیالوجی ، ویمنس کالج۔

قابلیت:

ا۔ شیعہ تھیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام اور؛

ب۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون (شیعہ تھیالوجی) میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس (ج' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کسی مشہور شیعہ مدرسے سے فاضل ساتھ میں انگریزی کی اچھی جانکاری یا اس کے مساوی کسی غیر ملکی یونیورسٹی کی ڈگری۔

- لکچرر ان تامل' ڈپارٹمنٹ آف ماڈرن انڈین لینگویجز

قابلیت۔

ا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام؛ اور

ب اچھے تعلیمی ریکارڈ کے متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے کم از کم سکنڈ کلاس (ج' سیون پوائنٹ اسکیل میں) میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

بین الوضوعی پروگراموں کی ترقی کی ضرورت کے مدنظر مذکورہ بالا الف اور ب میں ڈگریاں متعلقہ مضامین میں درکار ہو سکتی ہیں۔

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے' بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں نرمی کی جاسکتی ہے۔

اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل انسان میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں تصور نہ کیا جائے تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا اس صورت میں ایم۔فل یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کے امیدوار کو وزن دیتے ہوئے تقرر کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سال کا تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال تک علمی کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے آٹھ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری

حاصل کرلے یا اعلیٰ پائے کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرلے۔

۱۰۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ۔ جے۔این۔ میڈیکل کالج اسپتال ر

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (پری ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی: کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور ساتھ میں کسی کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ کوالی فیکیشن ۔ کسی سینٹرل یا صوبائی گورنمنٹ کے اسپتال، قابل ترجیح تدریسی اسپتال میں، اسپتال ایڈمنسٹریشن کا سپروائزری کی جگہ پر کام کرنے کا کم از کم تین سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ: اسپتال ایڈمنسٹریشن میں ڈگری / ڈپلوما۔

نوٹ: وہ امیدوار جو اشتہار نمبر ۳/ ۸۷۔۸۸ مورخہ یکم جون ۱۹۸۷ء کے تحت درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہونے کی صورت میں ان کی پہلی درخواست کی بنیاد پر امیدوار تصور کیا جائے گا۔

۱۱۔ کیجولٹی میڈیکل آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) جے۔این میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ: ۷۰۰۔ ۴۰۔ ۱۱۰۰۔ ۵۰۔ ۱۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (اَن ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: ۱۔ ایم۔بی۔بی۔ایس۔

۲۔ کسی کلینکل سبجیکٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری یا ڈپلوما۔

۳۔ کسی تدریسی اسپتال میں بحیثیت ریذیڈنٹ یا رجسٹرار تین سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ۔ کیجولٹی کے کام کا تجربہ۔

۱۲ سکیورٹی آفیسر (ایک جگہ) (مستقل) پراکٹر آفس

شرح تنخواہ: ۲۰۰۰۔ ۶۰۔ ۲۳۰۰۔ ای۔بی۔۷۵۔ ۳۲۰۰۔ ۱۰۰۔ ۳۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: (۱) بیچلرس ڈگری۔

۲۔ اعلیٰ سطح پر حفاظتی اور انتظامی کام کا کم از کم ۱۰ سال کا تجربہ۔

۳۔ صحت اور جسمانی ساخت اچھی ہونی چاہیے۔

۲۔ پسندیدہ: قانون کی ڈگری یا کریمنل لا اور اس کے طریقۂ کار کا عملی تجربہ اور فوج یا پولس میں حفاظتی امور کی انجام دہی

کا تجربہ ہو۔

عمر: ۴۵ سال سے کم (عمر کی حد میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے اگر امیدوار میں کوئی خاص یا اعلیٰ درجے کی موزوں صلاحیت پائی گئی تو امیدوار کی عمر میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے۔

ذمہ داریاں: واچ اینڈ وارڈ سیکشن کی دیکھ بھال اور ایسی تمام ذمہ داریاں جو پروکٹر کی طرف سے تفویض کی جائیں۔

نوٹ: ملٹری یا پولیس کے ایسے افسران جو بیچلرس ڈگری نہ رکھتے ہوں لیکن جو گزیٹیڈ جگہوں پر رہے ہیں / وہ بھی اس جگہ کے لیے درخواستیں دے سکتے ہیں اور اُن کے سلسلے میں عمر کی حد میں چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے لیکن اُن کو یہ جگہہ صرف کنٹریکٹ کی بنیاد پر دی جائے گی۔

۱۳ سینیر ٹکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری۔

شرح تنخواہ: ۱۶۴۰۔ ۶۰۔ ۲۶۰۰۔ ای۔بی۔ ۷۵۔ ۲۹۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: بی۔ایس سی اور ساتھ میں لیب ٹیکنک آف دی سبجیکٹ میں ٹریننگ کا تجربہ

۲۔ پسندیدہ: الیکٹرونکس ایکویپمنٹس اور دوسرے آڈیو وژول ٹیچنگ ایڈیڈ اینڈ میٹیریلس کی دیکھ ریکھ اور مرمت کا تجربہ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۱۴ ریسرچ ایسوسی ایٹس۔ (دو جگہیں) انسٹی ٹیوٹ آف پٹرولیم اسٹڈیز اور کیمیکل انجینئرنگ۔

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰ روپے ماہانہ مقررہ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: اینالیٹکل / فزیکل کیمسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی اور ساتھ میں جدید اینالیٹکل انسٹرومنٹس کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ۔

یا

کیمیکل انجینئرنگ میں ایم۔ایس سی یا اس کے مساوی ساتھ میں ماڈرن اینالیٹکل انسٹرومینٹس کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ۔

۲ پسندیدہ: ا اچھا تعلیمی ریکارڈ۔

ب تھرمل اینالائسز فیلڈ (ایک جگہ) میں کام کرنے کا تجربہ

یا

ب پٹرولیم ریفائننگ فیلڈ میں (ایک جگہ) کام کرنے کا تجربہ۔

ج کمپیوٹر پروگرامنگ کی جانکاری۔

۱۵ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (ٹیلرنگ (ایک جگہ) (مستقل) اے. ایم یو سٹی ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۶۰۰-۵۰-۲۳۰۰-ای.بی-۶۰-۲۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)

قابلیت: ۱ گریجویٹ ساتھ میں

(ا) درج ذیل اداروں میں سے کسی ایک سے ٹیلرنگ ورک اینڈ ایمبرائیڈری میں ڈپلوما۔

۱۔ لیڈی اِروِن کالج۔ نئی دہلی۔

۲۔ گورنمنٹ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی۔

۳۔ پنجاب گورنمنٹ ٹیکنیکل ٹریننگ سینٹر، شملہ۔

یا

(ب) ٹیلرنگ کورس اِن ویمنس اینڈ چلڈرن گارمینٹس ڈپارٹمنٹ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن، مہاراشٹر سے سرٹیفکیٹ

یا

(ج) سوشل ویلفیر اینڈ ری ہیبلیٹیشن ڈائرکٹوریٹ، نئی دہلی سے کرافٹ میکنگ (ٹیلرنگ) میں ڈپلوما۔

یا

(د) سینٹرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فار ویمنس انسٹرکٹرس، نئی دہلی سے کٹنگ اینڈ ٹیلرنگ فار ویمن انسٹرکٹرس میں نو ماہ یا ایک سال کا ٹریننگ کورس سرٹیفکیٹ۔

یا

(ہ) بورڈ آف ٹیکنیکل اگزامینیشن، مہاراشٹر سے نیڈل کرافٹ میں ٹیچرس ٹریننگ کورس اور ایمبرائیڈری اینڈ فینسی میں سرٹیفکیٹ۔

یا

(و) گورنمنٹ آف مدراس سے گروپ سرٹیفکیٹ نیڈل ورک اینڈ ڈریس میکنگ اور اگزامینیشن اِن ٹیلرنگ اینڈ ٹیک۔ ٹیچرس سرٹیفکیٹ۔

یا

۲۔ بی۔ ایس سی (ہوم سائنس)/ بی۔ ایڈ

یا

۳ لیڈی اِروِن کالج سے ہوم سائنس میں تین سالہ کورس کا ڈپلوما۔ اور اس بات کا ثبوت کہ ٹیچر کسی تسلیم شدہ بورڈ/ یونیورسٹی سے میٹریکولیٹ ہے۔

یا

۴۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اکنامکس نئی دہلی سے ہوم سائنس میں ڈپلوما

۱۶۔ جونیئر انجینئرس (دو جگہیں) (عارضی) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت: کسی تسلیم شدہ ادارے سے سول انجینئرنگ میں تین سال کا ڈپلوما اور ساتھ میں بلڈنگ اور روڈس کنسٹرکشن اور مینٹننس کا پانچ سال کا تجربہ۔

۱۷۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) آفس آف دی کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشنز
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای۔بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: بی۔ ایس سی اور ساتھ میں ڈاٹا پروسیسنگ مشینس کو ہینڈل کرنے کا ۵ سال کا تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: ڈیجیٹل کمپیوٹرس پر ایڈمیشن اور اگزامینیشن ورک کے پروسسنگ کا تجربہ۔

۱۸ پیش نماز (شیعہ) ڈپارٹمنٹ آف شیعہ تھیالوجی۔
شرح تنخواہ ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۶۰۰۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰۔ ای بی ۶۰۔ ۲۶۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت: کسی معتبر دینی مدرسہ کی سند جیسے فاضل، سند الافاضل یا اس کے برابر کوئی دوسری دینی سند، نیز اس کے ساتھ کسی معتبر عالم دین کا اجازہ پیش نمازی اور احکام شرعیہ کی ایسی پابندی جس سے عدالت کا پتہ چلے۔

۱۹۔ جونیئر انجینئر (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف الیکٹریسٹی (سپلائی سروس سیکشن)
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت: ۱۔ الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما۔
۲۔ الیکٹریکل انسٹالیشنز کے مینٹیننس یا کنسٹرکشن میں دو سال کا تجربہ۔

۲۰ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (آرکیالوجی) ایک جگہ (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری
شرح تنخواہ: ۱۴۰۰۔ ۴۰۔ ۱۸۰۰۔ ای۔بی۔ ۵۰۔ ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: آرکیالوجی / ہسٹری میں سکنڈ ڈویژن میں ماسٹرس ڈگری اور ساتھ میں آرکیالوجی یا ہسٹری انڈین میڈیول ہسٹری یا آرکیالوجی میں تخصص۔

یا

پی ایچ۔ ڈی / ایم فل یا آرکیالوجی کے فیلڈ میں مطبوعہ تحقیقی پیپرس
۲۔ پسندیدہ: آرکیالوجی کے فیلڈ میں کچھ تجربہ یا آرکیالوجی میں ڈپلوما۔

اسامی سے متعلق فرائض اور ذمہ داریاں

۱۔ سینٹر/ ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری کے ایکسپلوریشن اور ایکسکیویشن کے کاموں میں شمولیت اور آرکیالوجی میں فیلڈ آپریشن مثلاً مانومنٹس، اور سائنٹس، نادر اشیاء کا جمع کرنا اور کتبوں کا عکس لینا، وغیرہ

۲۔ نوادرات اور ظروف کا مطالعہ اور ان کو محفوظ حالت میں رکھنا جس میں روزمرہ کی صفائی، جھاڑپونچھ اور مرمت شامل ہے۔

۳۔ رپورٹ کی تیاری، نمائش اور کیمپوں کا اہتمام اسٹور کی دیکھ بھال وغیرہ اور کسی ایسے ہی کام میں مدد کرنا

۲۱۔ لائن مین (مستقل) الیکٹریسٹی ڈپارٹمنٹ (سپلائی سروس سیکشن)

شرح تنخواہ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت: الیکٹریشن ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی سرٹیفکیٹ اور الیکٹریکل وائرمین میں لائسنس اور ساتھ میں کنسٹرکشن اور الیکٹریکل انسٹائیلیشن کے مینٹنس کا دو سال کا تجربہ۔

یا

وائرمین ٹریڈ میں آئی۔ٹی۔آئی سرٹیفکیٹ اور ساتھ میں وائرمین کا لائسنس اور ساتھ میں کنسٹرکشن اور/یا الیکٹریکل انسٹائیلیشن کے مینٹیننس کا چار سال کا تجربہ۔

یا

وائرمین میں لائسنس اور ساتھ میں کنسٹرکشن اور/یا الیکٹریکل انسٹائیلیشن کے مینٹننس کا چھ سال کا تجربہ۔

نوٹ ا۔ اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۲۔ ہیڈ پلمبر (ایک جگہ) (مستقل) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:۔ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت:

لازمی: آئی۔ٹی۔آئی، تسلیم شدہ ٹکنیکل ادارے سے پلمبر ٹریڈ میں سرٹیفکیٹ۔ ساتھ میں بحیثیت پلمبر پانچ سال کا تجربہ۔

پسندیدہ: ٹریڈ میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت۔

عمر: ۲۵ سال سے کم نہ ہو اور ۴۰ سال سے زیادہ نہ ہو۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۳ سینیر لیب اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔ جے این میڈیکل کالج۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔بی ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپے اور دوسرے الاؤنسز۔

قابلیت: لازمی ا۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری۔

۲۔ کسی میڈیکل کالج کی پیتھالوجی/بائیوکیمسٹری لیب میں کام کرنے کا سابقہ تجربہ
۲۔ پسندیدہ: ڈی۔ ایم۔ ایل۔ ٹی (پیتھالوجی اور آر آئی۔ اے ٹیکنکس اور ساتھ میں بائیو کیمیکل اسیمیشنس میں پروفیشنسی کے حامل امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔
نوٹ: امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۴ سینیر لیبارٹری اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف کمیونٹی میڈیسن جے این میڈیکل کالج۔
شرح تنخواہ: ۱۳۲۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای۔ بی۔ ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱۔ لازمی: سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائیر سکنڈری اور ساتھ میں سابقہ تجربہ۔
۲۔ پسندیدہ: ان امیدواروں کو جن کو پبلک ہیلتھ لیبارٹری ورک/ڈپارٹمنٹ آف پری وینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن میں تجربہ ہو، ترجیح دی جائے گی۔
نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۵۔ پرائمری ٹیچر (ایک جگہ) (مستقل) عبداللہ نرسری پرائمری اسکول۔ اے۔ ایم۔ یو۔
شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی۔ ۲۰۴۰۔ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت:
۱ لازمی ۱۔ میٹرک ٹرینڈ
یا
۲ ہائیر سکنڈری اور ساتھ میں بے۔ بی۔ ٹی ۲ سال
یا
۳ انٹرمیڈیٹ (۱۰+۲ کورس) اور ساتھ میں جے۔ بی۔ ٹی ایک سال
یا
۴ گریجویٹ اور ساتھ میں کسی انگلش میڈیم اسکول میں پانچ سال تدریس کا تجربہ۔ (اس شرط کے ساتھ کہ وہ مرد/عورت تین سال کے عرصے میں مطلوبہ تسلیم شدہ ٹرننگ حاصل کرلے)
۲۔ پسندیدہ: ۵ انگریزی زبان میں پڑھانے کی صلاحیت
پسندیدہ ۵ گیمس اور ڈرامہ وغیرہ آرگنائز کرنے کی صلاحیت

۲۶ ریسپشنسٹ (ایک جگہ) (مستقل) جے۔ این۔ میڈیکل کالج۔ اسپتال
شرح تنخواہ: ۱۲۰۰۔ ۳۰۔ ۱۵۶۰۔ ای بی ۴۰۔ ۲۰۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)
قابلیت: ۱۔ لازمی: گریجویٹ۔

روانی کے ساتھ اردو/ ہندی/ انگریزی بولنے کی صلاحیت

۲۔ پسندیدہ: ریسپشنسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ۔ کلاسی فیکیشن/ کیٹلاگنگ اینڈ کمپیوٹرس کی جانکاری۔

۲۷۔ جونیر لیب اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ: ۹۷۵-۲۵-۱۱۵۰-ای بی-۴۰-۱۵۴۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت: میٹرک یا اس کے مساوی ساتھ میں سابقہ تجربہ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۸۔ ڈرائیور: (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی جے این میڈیکل کالج

۲۹۔ ڈرائیور: (ایک جگہ) (عارضی) اے۔کے طبیہ کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ: ۹۵۰-۲۰-۱۱۵۰-ای بی-۲۵-۱۵۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز۔ (ریوائزڈ)

قابلیت:

۱۔ لازمی: (۱) خواندہ۔

۲۔ ہلکی/ بھاری گاڑیاں چلانے کا لائسنس

۳۔ ہلکی و بھاری گاڑیاں چلانے کا کافی تجربہ۔

۴۔ اردو اور ہندی میں کام کرنے کی لیاقت۔

۲۔ پسندیدہ: موٹر میکینک کا تجربہ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

۲۹۔ فزیسسٹ (ایک جگہ) (مستقل) جے این میڈیکل کالج اسپتال۔

شرح تنخواہ: ۱۴۰۰-۴۰-۱۸۰۰-ای بی ۲۳۰۰ روپے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت

۱۔ لازمی: بی ایس سی۔ جس میں فزکس بطور ایک مضمون کے رہی ہو۔

۲۔ ریڈیالوجیکل فزکس میں ڈپلوما۔

یا

کسی تدریسی اسپتال کے ریڈیالوجی/ ریڈیو تھراپی سیکشن میں کام کرنے کا ایک سال کا تجربہ۔

۲۔ پسندیدہ: ایم ایس سی (فزکس) جس میں ریڈی ایشن فزکس/ نیوکلیر فزکس بحیثیت ایک پیپر کے رہی ہو۔

۳۰۔ نرسنگ اسسٹنٹ (دو جگہیں) (مستقل) یونیورسٹی ہیلتھ سروس۔

شرح تنخواہ ۱۵۰ ۹۷۵-۲۵-۱۱۵۰- ای بی -۳۰- ۱۵۴۰ روپیے اور دیگر الاؤنسز (ریوائزڈ)

قابلیت

۱- لازمی: ۱- ہائی اسکول

۲- آکزیلیری نرس اور مڈوائفری میں سرٹیفکیٹ

۳- متعلقہ دفاتر سے رجسٹریشن

۲- پسندیدہ: ۱- کسی تسلیم شدہ اسپتال میں کام کرنے کا تین سال کا تجربہ۔

۲- ان مرد امیدواروں کی تعلیمی لیاقت میں نرمی برتی جائے گی جو کسی سرجیکل سیکشن/ انڈور سیکشن/ لیبارٹری میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں۔

۳۱- سینیر ٹکنیکل اسسٹنٹ (ایک جگہ) (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔

قابلیت ۱- لازمی ۱- بی۔ ایس سی (بائیولوجی)

۲- ڈپلوما ان میڈیکل لیب ٹکنالوجی (پیتھالوجی)

۳- کسی تدریسی اسپتال کے پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے کا تجربہ۔

۲- پسندیدہ: سائٹو پیتھالوجی/ ہسٹو پیتھالوجی/ ہیماٹولوجی لیبارٹری آف پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے کا تجربہ۔

نوٹ: اہل امیدواروں کو انٹرویو سے قبل ایک پریکٹیکل ٹیسٹ دینا ہوگا۔

اعلیٰ تعلیمی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے افراد کو ایک طرف کا سکنڈ کلاس ریلوے کا کرایہ بطور ٹی۔ اے دیا جائے گا۔

درخواستوں کے لیے مقررہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے ۱۰/ روپیے برائے اسامی نمبر ۱ تا ۱۲ اور باقی ماندہ اسامیوں کے لیے ۷/ روپیے نقد فنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فنانس آفیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو، بذات خود جمع کرکے حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۴ × ۹ سینٹی میٹر سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور مطلوبہ ٹکٹ چسپاں ہوں بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔

درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۲ / اکتوبر ۱۹۸۷ء (آفس اوقات تک) ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے ملنے والی درخواستیں ناقابل قبول ہوں گی۔

جاوید عثمانی (آئی۔ اے۔ ایس)

رجسٹرار

(576/ 749)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۶ — نومبر ۸۷ء — شمارہ ۱۱

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT, ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا ... RS. 30.00

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو۔]

اداریہ

آپ سے اگر کوئی یہ کہے کہ ایک کسان پرانے طریقے سے کھیتی کرتا ہے، اپنے باپ دادا ہی کی طرح کھیت کو جوتتا اور بوتا ہے نہ تو نئے قسم کا بیج ڈالتا ہے اور نہ ہی نئی قسم کی کھاد کا استعمال کرتا ہے، سینچائی کے لیے قدرتی بارش پر انحصار کرتا ہے، اس کے باوجود وہ ہر سال جدید طریقے سے کھیتی کرنے والوں کے برابر غلہ پیدا کر لیتا ہے تو کیا آپ اس بات پر یقین کر لیں گے؟

یا اگر کوئی یہ کہے کہ ایک شخص دور دراز کا سفر، ہاتھی، اونٹ یا گھوڑے سے کرتا ہے ویسے ہی جیسے اس کے بزرگ کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کار، ریل یا جہاز سے سفر کرنے والوں کے برابر ہی وقت لیتا ہے، تو کیا آپ اس بات کو مان لیں گے؟

یا یہ کہے کہ ایک آبادی اپنا دفاع تیر و کمان، برچھی، بھالے اور تلوار سے کرتی ہے اس کے باوجود جدید اسلحوں سے لیس حملہ آور گروہ کو پسپا کر دیتی ہے تو کیا آپ اس بات کا اعتبار کر لیں گے؟

یقیناً نہیں، پھر یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ انسان کی خوب سے خوب تر اور تیز سے تیز تر کی فطری جستجو نے علوم و فنون میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے (اور ہر آن کرتی چلی جا رہی ہے) اور تعلیم و تدریس کے زیادہ جامع اور اثر آفریں طریقے وضع کر دیے ہیں، اگر ہماری ایک قابل ذکر تعداد اپنے قول یا عمل سے یہ اظہار کرے کہ جو تعلیمی نظام اور نصاب ہمارے بزرگوں نے وضع کیا تھا وہ اس دور میں بھی اتنا ہی بامعنیٰ اور نتیجہ خیز ہے جتنا کہ پہلے تھا تو اس بات کو کیسے تسلیم کر لیا جائے اور کیوں نہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ بزرگوں کی تقلید کے نام پر جس تعلیمی نصاب کو ہماری ایک بڑی اکثریت نے سینے سے لگا رکھا ہے، اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ ہو۔

بزرگوں سے عقیدت اور ان کی تقلید کے ہم مخالف نہیں، بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ شجر سے ٹوٹ کر شاخ ہری نہیں رہ سکتی۔ سوکھ جاتی ہے۔ جس بات کے ہم مخالف ہیں اور جس کے برے اثرات قوم کو مفلوج کیے دے رہے ہیں وہ ہے نافہمی عقیدت اور سطحی تقلید۔ کیا خود ہمارے ان بزرگوں نے جن کی تقلید کے نام پر آنکھوں پر پٹی باندھ لی گئی ہے، اپنے اپنے دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب تعلیم میں ترمیم و تنسیخ نہ کی تھی؟ کیا عباسیوں کے دور میں وہی نظام تعلیم اور نصاب رائج تھا جو امویوں کے عہد میں تھا؟ کیا ترکی خلفاء کے دور میں تعلیم کا وہی نصاب تھا جو عباسی دور میں تھا؟ اور کیا ملا نظام الدین نے

جو نصاب تعلیم وضع کیا وہ اس سے پہلے کے نصاب سے مختلف نہ تھا؟ پھر بزرگوں کی یہ کیسی تقلید ہے کہ وہ تو اپنے عمل سے ہمارے لیے یہ سبق چھوڑ جائیں کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر تعلیمی نصاب میں ترمیم و تنسیخ ضروری ہے اور ہم اس سبق کو بھول کر اس تیز رفتار زمانے میں بھی صدیوں پرانا نصاب اور طریقۂ تعلیم سینے سے لگائے رہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ بات بزرگوں کی تقلید کی ہے ہی نہیں، کیونکہ اگر ہم اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلے ہوتے تو علوم و فنون کے میدان میں ہمارا حشر یہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ اصل بات ہے بے حسی کی، کاہلی اور تن آسانی کی، خود اعتمادی اور بلند حوصلگی کی کمی کی، خدمت خلق اور قومی تعمیر کے جذبے کے فقدان کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تبدیلیوں سے گھبراتے ہیں کیوں کہ ہمیں خود پر اعتماد نہیں رہا۔ جدید سے کتراتے ہیں کیوں کہ انجان راستوں پر چلنے کی ہم میں ہمت نہیں رہی، نئی چیزوں کو نہیں سیکھتے کیونکہ محنت کرنا چھوڑ بیٹھے ہیں، قوم کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے کیوں کہ حقوق العباد کا سبق بھول گئے ہیں اور اپنی ان سب کمیوں کو چھپانے کے لیے ہم نے بزرگوں کی تقلید کی آڑ لے رکھی ہے۔

زمانہ، ماضی سے مستقبل کی سمت بہنے والا سیل رواں ہے۔ یہ ایک تیز بہاؤ ہے جس کا رُخ قدیم سے جدید کی طرف ہے اور جو کبھی نہیں رکتا۔ جس انسانی گروہ نے اس بہاؤ کے رخ کو نہ پہچانا، وہ ناپید ہوا۔ جنھوں نے اس کے مطابق اپنی کشتیوں میں مستقل تبدیلی کا عمل جاری نہ رکھا وہ کناروں پر پھینک دیے گئے۔ مستقبل ان کا ہے جو ماضی سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے حال میں رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علوم و فنون کی دنیا میں آئے ہوئے انقلاب اور تعلیم کے جدید طریقوں کو نظر انداز کر کے آنے والی نسل کو دنیا سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کر سکیں گے اور انسانیت کو ایک بہتر مستقبل دے سکیں گے، تو یہ ایک مہلک غلطی ہے۔ مدتوں سے ہم اس غلطی کے مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں، اس کے ازالہ میں مزید تاخیر تباہ کن ہوگی۔ زمانے کا تیز بہاؤ ہمیں نہ جانے کب اور کس ریتیلے کنارے پر پھینک کر آگے بڑھ جائے۔

اسرار احمد

اسپیچ جو سرسید نے پینیسی ریڈنگ تھیٹر میں جو واسطے نفع مدرسۃ العلوم قایم کیا تھا، اسٹیج پر کھڑے ہو کر ۱۶ فروری ۱۸۸۹ء کو حاضرین کے سامنے کی۔

کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا۔ وہی جن کے دل میں اپنی قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ۔ اُس قوم پر جو ان باتوں کو جن سے انسان کو شرم اور حیا اور غیرت ہونی چاہیے۔ اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ۔ اس قوم پر جو قوم کہ انسان کی بھلائی کے کاموں کو جو نیک نیتی سے نیکی کے لیے کیے جاویں، بے عزتی کے کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو خدا کو دھوکہ دینے کے لیے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقعے کو اپنے منھ پر ڈالے مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچے۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارہ پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانہ ایسی بے شرمی اور بیحیائی کے کام کرے جس سے بے شرمی و بیحیائی بھی شرما جاوے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفریں کا کام سمجھے۔

اے رئیسو اور دولت مندو۔ تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کیسی ہی بدحالت میں ہو ہمارے بچوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا بھی خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جن کے لیے آج ہم اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

اے صاحبان۔ ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم مفلس ہو گئی ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل و رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں اعانت پہونچے۔ مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ بہت ہی قلیل ملی۔ والنٹیر بنانے چاہے۔ بہت ہی کم بنے اور جو بنے اُن سے بھی کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اس اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ——— ایک خط کے آئینے میں

(نیچے حکومتِ ہند کے وزیراعظم شری راجیو گاندھی کے نام یونیورسٹی کے بارے میں بھیجے گئے شری روی چترویدی کے ایک مراسلے کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس مراسلے کی ایک فوٹو کاپی حکومت ہند کے شعبۂ تعلیم (منسٹری آف ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ) نے بحوالہ نمبر ایف ۳-۴/۸۷ (ڈسک یو) بتاریخ ۲۴ اگست ۱۹۸۷ء وائس چانسلر صاحب کے نام برائے اطلاع بھیجی ہے۔) [ادارہ]

شری روی چترویدی کے خط کا اُردُو ترجمہ

روی چترویدی
اے-۳۱/ایف منیرکا
ڈی۔ڈی۔اے فلیٹس
نئی دہلی۔ 110067

صدر شعبۂ زولوجی
ڈاکر حسین کالج
(یونیورسٹی آف دہلی)
دہلی۔ 110006
مورخہ: ۸ اگست ۱۹۸۷ء

شری راجیو گاندھی
وزیراعظم۔ جمہوریہ ہند
۷۔کورس روڈ۔ نئی دہلی۔ 110011

عزت مآب راجیو جی

خلل اندازی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ابھی حال ہی میں مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کا (پرخلوص) حول دیکھ کر بے اختیار جی چاہا کہ یہ مراسلہ آپ کی خدمت میں بھیجوں۔

وہاں کے اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کے افراد باہر سے آنے والوں کے ساتھ جس خلوص، گرمجوشی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں، میں اس سے ازحد متاثر ہوا ہوں۔ میرے ایک دوست کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے شائع شدہ تحقیقی جرائد کی بابت کچھ اطلاعات درکار تھیں۔ ان تمام رات نے جن کا تعلق اس مسئلہ سے تھا، نہ صرف اپنے تعاون سے نوازا بلکہ نہایت ہی ہمدردی اور غور سے ہماری باتیں بھی سنیں۔ آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں) ایسا طرزِ عمل شاذ ہی دیکھنے کو ملتا ہے اور ایسے کم ہی واقعات سننے میں آتے ہیں۔

روزمرّہ کے مشاغل میں الجھ کر لوگ اس قسم کی اچھی باتوں کو جلد ہی بھول جاتے ہیں، جب کہ یہی وہ دلوں میں گھر کر لینے والی انسانی قدریں ہیں جن سے ایک ازگار ماحول اور بہتر معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ انسانی فرشتوں کی یہ کہانی لکھ کر آپ کی خدمت میں ملاحظے کے لیے پیش کردوں۔

نہایت ادب کے ساتھ
آپ کا مخلص
(دستخط) (روی چترویدی)

خطائے مرکب

سید حامد

لوگ غلطیاں کرتے ہیں؛ غلطیاں کس سے سرزد نہیں ہوتیں؛ لیکن اعتراف، اور اس سے زیادہ، معذرت کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ غلطی کو تسلیم کرنے میں آخر قباحت کیا ہے؟ ایسا کرنا تو اپنے انسان ہونے کا اعلان کرنا ہے۔ انسان کی سرشت میں خطا اور نسیان داخل ہیں۔ لیکن اچھے انسان کی پرکھ یہ ہے کہ خطا کرے تو یاد رکھے اور اچھائی کرے تو بھول جائے ہم نے اس ترتیب کو الٹ دیا ہے۔ خطا کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں، بھلا کرتے ہیں تو یاد رکھتے ہیں اور جتاتے ہیں، یا کم از کم یہ امید ضرور رکھتے ہیں کہ جس کے ساتھ بھلائی کی تھی وہ عمر بھر اسے یاد رکھے گا، اور اس کا اعتراف بار بار کرتا رہے گا۔ یہ بہت چھوٹی باتیں ہیں؛ یہ سارے شیوے تنگ دلی کے ہیں۔ جس آدمی کا دل (انگریزی محاورہ میں) صحیح جگہ پر ہے۔ وہ غلطی کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔ کھلے دل کے ساتھ اپنی خطا مان لے گا۔ ایسا کرنے سے اس کا دل ہلکا ہو جائے گا اور اس تذبذب اور ادھیڑ بن اور پشیمانی سے اس کو چھٹکارا مل جائے گا جو کردار، اطوار اور نیک و بد کے شعور اور جرأت حق گوئی کو مسمار کر دیتی ہے۔ اعتراف خطا اقبال گناہ سے ضمیر کی آبیاری ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنی غلطی کی تاویل اور توجیہ کے خوگر ہو گئے تو ضمیر دھندلا جائے گا۔ اس کے پاس جو عقاب کی نگاہ ہے وہ چمگادڑ کی طرح تاریک بیں ہو جائے گی۔ اچھے اور برے، دن اور رات، تیرہ اور روشن میں امتیاز کرنا ضمیر کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ ضمیر مرجھا جائے گا اور نفس توانا اور فربہ ہو جائے گا۔ ہوس کو فروغ ہوگا آنکھوں پر چربی چڑھ جائے گی۔ اس طرح بصیرت اور روزمرہ کے امور پر نظر رکھنے کی صلاحیت (بصارت) سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔ اپنی خطا کو پہچان لینے اور مان لینے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان میں انصاف کا جذبہ اور غیر جانب داری اور بے رو رعایتی کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ جو اپنے خلاف انصاف کر سکتا ہے، وہ دوسروں کے ساتھ لامحالہ انصاف کرے گا۔ وہ کسی قرب، کسی سفارش کسی دباؤ کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اس کی نگاہ خارا شگاف ہوگی۔ اس کا پائے نگاہ صراط مستقیم پر پڑے گا۔ جناب شیخ کے نقش قدم کی طرح "یوں بھی اور یوں بھی" کی لعنت اور خلفشار اور بے عملی سے بچ جائے گا۔ چوں کہ اس نے قوت ممیزہ پر خود کو ہدف بنا کر بارہا سان رکھی ہے، اس لیے اسے متبادلات کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی دیر نہیں لگے گی۔ غور کیجیے تو زندگی بھر یہی کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہر چند قدم چلنے کے بعد کئی راستے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کس راستے پر چلیں؟ اس فیصلے پر ہمارے مستقبل کا اور اگر مستقبل کا نہیں، تو ہماری امروزہ پیشرفت اور خوشحالی کا انحصار ہوتا ہے۔ آئندہ صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نے ماضی میں جو فیصلے کیے ہیں جو قدم اٹھائے ہیں اور ہم سے جو حرکتیں سرزد ہوئی ہیں، انہیں ہم انصاف کی ترازو میں تولیں۔ اپنے حق میں ڈنڈی مارنے کی زنہار کوشش نہ کریں۔ انسان دراصل وہی اچھا ہے جو ناپ تول میں کھرا ہو۔ چرب زبان اور شیریں کلام انسان اگر وہ زبان کو فریب اور ناانصافی کا آلۂ کار بناتا ہے تو وہ کھوکھلا انسان ہے۔ اسے انسان بھی کیوں کہیے۔

ایسی خطائیں بھی بسا اوقات ہم سے سرزد ہوتی ہیں جہاں صرف اعتراف سے کام نہیں چلتا۔ ان خطاؤں کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ انہیں جراحت پہنچتی ہے۔ سر محفل ان کی سبکی ہوتی ہے، انہیں تکلیف پہنچتی ہے، ان کا وقت ضایع ہوتا ہے، انہیں ناروا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کی شہرت اور شبیہ کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمیں بغیر تامل اور تاویل

جیہ کے اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھلے دل اور نمناک آنکھوں
لجاجت اور انکسار کے ساتھ معذرت کرنی چاہیے، معافی مانگنی چاہیے
گر ہم نے سرِ بزم کسی کی تحقیر کی ہے تو یاد کر کے انھیں لوگوں کے سامنے
ں مانگنی چاہیے جو اس تحقیر کے شاہد ہیں جو ہم نے ایک ساتھی کے ساتھ
کی تھی۔ اللہ تعالیٰ وہ خطائیں معاف کر دیتا ہے جو اس کے ساتھ
ان نے کیں، وہ ان خطاؤں کو جو دوسرے انسانوں کے ساتھ ہم نے
یں معاف نہیں کرتا تا وقتیکہ خود وہ انسان ہمیں معاف نہ کر دیں۔ ہمیں
ال میں انتہائی ضبط سے کام لینا چاہیے اور کسی کا دل کبھی نہ دکھانا چاہیے
اگر غصہ کے عالم میں ہم آپے سے باہر ہو گئے تو غصہ کی باڑھ جیوں ہی
ے ہمیں اس شخص کی خدمت میں، خواہ وہ ہم سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو،
ا چاہیے اور اس سے عاجزی کے ساتھ، التجا کے ساتھ معافی مانگنی
ہیے۔ ورنہ یاد رکھیے کہ وہ خطائیں جن کے لیے صمیم قلب سے معافی
ں مانگی گئی، نامہ اعمال کو سیاہ کر دیں گی۔ یہ تو رہی عاقبت کی بات۔
د اس دنیا میں ایک طرف ہم ہٹ دھرم اور بے درد ہونے کی شہرت اختیار
ریں گے، دوسری طرف ہم دل شکنی اور من مانی میں پکے ہوتے چلے جائیں
۔ آپ جانتے ہی ہیں جہلِ مرکب کسے کہتے ہیں۔ انسان نہ جانے اور جانے
سب کچھ جانتا ہے۔ اسی کے وزن پر 'خطائے مرکب' اس خطا کو کہہ سکتے
یں جو کی جائے اور سمجھی اور مانی نہ جائے۔ ہم خطا کریں اور اسے صواب
سمجھیں تو خطا سے بچنے کے سارے راستے ہم پر بند ہو جائیں گے جہلِ مرکب
کی طرح خطائے مرکب کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ خطائے مرکب سے
زیادہ تباہ کن کیوں کہ یہ جہلِ مرکب کی بہ نسبت زیادہ عام ہے۔

اگر جراحت پہنچائی ہے تو مرہم بھی آپ ہی رکھیے۔ یہ کیا کہ زبان
سے گھاؤ لگا دیا بہت گہرا اور سرسری انداز سے اندمال کی کوشش
کرتے ہوئے چلے گئے۔ اسے تالیفِ قلب نہیں کہتے، یہ تو گھاؤ کو گہرا بنا
ہوا۔ گویا الفاظ یا افعال سے جو زخم لگا، اسے زخم لگانے والا کوئی خاص
اہمیت نہیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی بڑائی اور فراخ دلی اور شائستگی
ہے کہ افسوس کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سطحی اظہار سے تو خاموشی بہتر
تھی۔ وہ معذرت کیا جو خطا کرنے والے کو نیچا نہ دکھائے۔ وہ معافی
کیسی جس کے پس پشت یہ ارادہ نہ ہو کہ ایسی حرکت اب آئندہ نہیں
کروں گا۔

جراحت افعال سے کبھی پہنچتی ہے اور الفاظ سے کبھی اور الفاظ
کی بھی یہاں دو قسمیں ہیں: وہ الفاظ جو سامنے کہے گئے؛ وہ الفاظ
جو بیٹھ پیچھے کہے گئے۔ کسی کے منہ پر اس کی بُرائی لوگ بالعموم طیش میں
آکر ہی کرتے ہیں۔ ایسے طیش سے کیا فائدہ جو غصہ اور نفرت و عداوت
کے بوجھ کو ذرا دیر کے لیے ہلکا کر دیتا ہے اور انسان کو پہروں اس کے نتائج
بھگتنے کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ بہادری، زبان درازی اور بدگوئی
میں نہیں، غصہ اور زبان پر قابو پانے میں ہے۔

بیٹھ پیچھے بُرائی لوگ یا تو بزدلی کی بنا پر کرتے ہیں، یا لطیفِ صحبت
اور زبان کے چٹخارے کے لیے۔ غیبت کا شمار بدترین معائب میں ہوتا ہے
اس سے ہر حال میں دامن بچایئے، اپنے دل اور زبان کو داغ دار کیوں
کیجیے۔ جس طرح پانی اپنی سطح ڈھونڈ لیتا ہے، اسی طرح کسی کے بیٹھ پیچھے
کی ہوئی برائی اس شخص تک پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ
کسی کی غیر موجودگی میں اس کی بُرائی کریں اور اسے خبر نہ ہو۔ اسے خبر
ہو کر رہتی ہے اور اس تک بُرائی کی زبانوں سے ضرب لگی ہوئی پہنچتی ہے
ایسی بے مصرف بات سے کیا حاصل جو انسان کو سرنگوں کر کے چھوڑے، اسے
دوسروں کے سامنے شرمندہ کرے، یا بصورتِ دیگر اسے ڈھیٹ اور
ہٹ دھرم اور بے حِس بنا دے۔

کسی کی خطا کی ہے خواہ گفتار سے خواہ کردار سے، تو معذرت
ضرور کیجیے لیکن عذر نہ کیجیے۔ عذر خطا سے بدتر ہوتا ہے۔ عذر کرتے
ہوئے ہم بہ یک وقت خود کو اور اس کے مخاطب کو دھوکا دیتے ہیں
اپنے گناہ، اپنی خطا کا اقبال کھل کر کیجیے۔ اپنی معذرت کو اگر مگر اور
تاویل و توجیہ اور تخفیف سے برباد نہ کیجیے۔ خطا کا کھلا ہوا اقبال
اور معافی کی بے دریغ التماس فریقین کے دلوں کی کدورت کو دھو ڈالتی
ہے۔ اس طرح تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ مفرد خطا
کو بے حسی یا تاویل یا بے اعتنائی سے مرکب نہ کیجیے۔ سادہ کو جس نے
پیچیدہ بنایا وہ گرہوں میں الجھ کر رہ گیا۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷۔ ش ۱۱۔ (نومبر ۸۸ء)

حمید الدین فراہی - اور ـــــ علی گڑھ

اقبال احمد خان سہیل

(اقبال احمد خان سہیل (م ۱۹۵۶ء) ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ایک نامور فرزند، رشید صاحب اور ذاکر صاحب کے ہم درس تھے۔ وہ اپنے زمانے کے ایک مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ اصغر گونڈوی مرحوم کے مجموعۂ کلام نشاط روح پر ان کا مقدمہ آج بھی اہل ادب کی نگاہوں کا سرمہ ہے ــــ اقبال سہیل صاحب کی ایک نادر مگر ناتمام تحریر خوش قسمت سے ہمارے ہاتھ لگ گئی ہے جس میں انہوں نے مولانا حمید الدین فراہی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اس دور کے علی گڑھ کے بارے میں بھی بعض معلومات فراہم کی ہیں جس کی وجہ سے اس تحریر کی قدر و قیمت دوبالا ہوگئی ہے۔ ادارہ سہیل صاحب کے نواسے جناب عارف صاحب کا شکر گزار ہے جن کی وساطت سے سہیل صاحب کی یہ غیر مطبوعہ تحریر تہذیب الاخلاق میں شایع ہو رہی ہے۔)ــ

[ادارہ]

میرے عزیز بھائی پروفیسر رشید احمد صدیقی کا حکم ہے کہ میں علی گڑھ میں اپنے زمانۂ قیام کے حالات لکھوں اور مولانا حمید الدین فراہی کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالوں اور جہاں تک میرا حافظہ کام دے کچھ حالات ضبط تحریر میں لاؤں۔

حسن اتفاق سے علی گڑھ کالج میں داخلے سے قبل بھی علی گڑھ میں رہنے کا اتفاق مجھے نصیب ہوا تھا۔ چوں کہ میرا قیام اس زمانے میں حمید الدین فراہی کی معیت میں تھا۔ اس لیے کالج اور اس کے متعلقات سے ایک طرح سے کافی واقفیت ہوگئی تھی بلکہ کالج کے بعض طلبا سے دوستانہ راہ و رسم بھی پیدا ہوگئی تھی۔

حضرت مولانا حمید الدین قبلہ مشہور پروفیسر ہارویز کے زمانۂ پروفیسری میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور فرائض متعلقہ کے علاوہ ایک نہایت اہم خدمت بیگاری کے طور پر ان سے متعلق تھی، جو بجائے خود ایک بڑی سعادت ہے۔ یعنی عربی زبان میں چند مستشرقین یورپ کے طبقات ابن سعد کے متعدد قلمی نسخے فراہم کرنے کے بعد بڑے اہتمام سے طباعت شروع کر دی اور پروف (Proofs) کی تصحیح جن اہل علم حضرات کے سپرد تھی، ان میں ایک خود پروفیسر ہارویز تھے۔ ہر ہفتے تقریباً ایک جزو چھپ کر علی گڑھ آتا تھا۔

ظاہر ہے یہ کام پروفیسر ہارویز کے بس کا نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے مولانا مرحوم کو یہ خدمت سپرد کر دی تھی۔ ڈاک یہ براہ راست مطبوعہ پروف مولانا کو دے جاتا اور مولانا پوری توجہ اور انہماک سے تصحیح

سے لینے کے بعد وہ اجزا مسٹر ہانوویز کے پاس پہنچا دیتے تھے۔

مولانا مرحوم کا قیام، علی گڑھ کے مشہور قدیم محلہ 'بنی اسرائیل' میں تھا اور مالک مکان بھی ایک بنی اسرائیل تھے جو اچھے خاصے صاحب علم بزرگ تھے۔ مولانا مرحوم کی معیت میں ان کے دونوں صاحب زادگان برادرم سجاد اور عباد کے علاوہ یہ نیاز مند اور مولوی حکیم محمد یوسف صاحب بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ اس محلہ کے قریب "مطبع فیض عام" کے مالک عبدالسلام صاحب کا سکونتی مکان بھی تھا اور ان کے مطبع کے پاس ایک خوش نویس بھی رہتے تھے۔ یہ منشی اسماعیل صاحب فن کتابت میں میرزی علی محمد خاں صاحب کے تلمیذ خاص تھے اور مولوی علی محمد خاں صاحب اپنے زمانے کے خطاطوں میں غالباً اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور غالباً پورے ہندوستان میں احمد حسن صاحب سبز رقم کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ان کا حریف و مقابل نہ تھا۔ نستعلیق کی خطاطی میں ان کا مقابلہ نہیں تھا اور حافظ منشی شمس الدین اعجاز رقم لکھنوی کی شان خط سے کہیں بہتر ان کا خط تھا جو مشہور خطاطان ایران کے مقابلے میں بھی بازی لے جاسکتا تھا۔

مولانا حمیدالدین قبلہ رحمۃ اللہ نستعلیق میں ایرانی خط کو ترجیح دیتے تھے اور مولانا شبلی کو حافظ شمس الدین اعجاز رقم کا طرز تحریر زیادہ پسند تھا۔

شعر العجم کی طباعت مولانا حمید الدین کی ہی خواہش سے فیض عام کو اسی بنا پر سپرد کی گئی کہ منشی علی محمد خاں صاحب ایرانی نستعلیق میں اس کی کتابت کردیں اور میں پروف دیکھ لیا کروں گا۔ اس طور پر مطبع فیض عام سے ایک خاص سا ربط پیدا ہو گیا۔

مالک مطبع منشی عبدالسلام صاحب نے مجھ سے اسباق النحو وغیرہ اور چند عربی کتابیں بھی پڑھنی شروع کردیں اور میں نے مولانا حمید الدین قبلہ کی تعمیل حکم کے بموجب منشی علی محمد خاں صاحب سے ایرانی طرز کتابت بھی سیکھنا شروع کردیا۔

اسی زمانے میں شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا مرحوم نے وہاں سے رسالہ مخزن شایع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مخزن کے اکثر پرچے یہیں چھپتے تھے۔ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی بھی اس مطبع کے قریب ہی رہتے تھے اور شعر و ادب میں دلچسپی کی بنا پر مجھ سے بھی دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر تھے اور یہ اخبار بھی اس وقت تک علی گڑھ سے شایع ہوتا تھا۔

مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم جو عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرنے میں مشہور صاحب فن بزرگ تھے، رسل گنج میں رہتے تھے اور شام کو بالعموم مولوی وحید الدین سلیم کی معیت میں بالائے قلعہ تشریف لاتے تھے اور شام کی چائے مولوی حمید الدین کے ہی ساتھ پیتے تھے۔

اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں ہونے والی تھی اور حضرت مولانا الطاف حسین حالی کی صدارت کا شرف کانفرنس کو ہونے والا تھا۔ مولانا مرحوم اپنا خطبۂ صدارت مرتب کرنے کے خیال سے چند ہفتے علی گڑھ میں گزارنے کے لیے آئے تھے اور یہیں مولوی وحید الدین سلیم کے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت میں فروکش تھے۔ مولانا کی زیارت پہلے پہل مجھ کو اسی زمانے میں نصیب ہوئی اور مجھے فخر ہے کہ ان کی زبان مبارک سے اپنی ناچیز شاعری پر چند کلمات تحسین سننے کا شرف بھی حاصل ہوا اور مولانا نے اپنے خاص شفقت آمیز اور سراپا پُر خلوص لہجے میں چند دعائیں بھی میرے متعلق فرمائیں۔

اسی زمانے میں مجھے حضرت حمید الدین کی ذات مقدس کے چند واقعات بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا اور گو اسے ایک مزید عرصہ گزرا پھر بھی یہ واقعات آنکھوں کے سامنے نظر آتے ہیں اور ان کی یاد اب تک تازہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں ضبط تحریر میں لاؤں تاکہ میرے علیگ بھائی اگر اس سے فیض حاصل کرسکیں تو میرے لیے بھی ایک سرمایۂ سعادت ہوگا۔

ہم لوگ، جنھیں مولانا کی ہم وطنی کا فخر حاصل ہے، ان کے سامنے ان کے ورع و تقوی اور خشیت الٰہی کا تذکرہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، لیکن عام طبائع انسانی سے بالکل علیحدہ عملی دنیا میں جن واقعات کا قصہ سنانا چاہتا ہوں وہ اس قدر عجیب و غریب ہیں جن کو سننے والے یا تو مبالغہ طرازی پر محمول کریں گے یا کوئی اور تعبیر فرمائیں گے اور ان کی صحت کو بمشکل ہی باور کرسکیں گے۔

بہر حال میں اپنے تاثرات کو کیا کروں وہ آج تک ویسا ہی تازہ ہے
یا کہ بروز واقعہ تھا۔ البتہ چوں کہ متفرق واقعات ہیں۔ اس لیے انہیں کسی
ملقی یا نفسیاتی رشتہ میں منسلک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی تاریخی حیثیت
، ان کی کوئی ترتیب دی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اس وقت دماغ میں
ہونا نہیں ہیں اور فطری طور پر میرے دماغ میں یہ ایک کمزوری ہمیشہ
، رہی ہے کہ اکثر واقعات کا تاریخ وقوع سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔
ں لیے تاریخیں میرے دماغ سے محو بھی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ کمزوری
لب علمی کے زمانے میں بھی قایم رہی اور تاریخی سنوں کو یاد رکھنے کے
، مختلف ترکیبیں ایجاد کرنی پڑیں۔ مثلاً شہاب الدین غوری کی تخت نشینی کا
ن بارہ سو چھ (۱۲۰۶ء) غور کے اَبْجَدِیْ۔

محمود غزنوی کا حملہ جو ۱۰۰۱ عیسوی میں ہوا تھا، اس کے لیے "اِدھر
دھر دو ڈنڈے بیچ میں دو انڈے" کا فقرہ گڑھ لیا تھا۔

شیکسپیر کا سن وفات یاد کرنے میں بڑی دماغی کاوش کی ضرورت
ں آئی۔ کیوں کہ ۱۵۶۴ء میں مرا تھا۔ اس لیے سولہویں صدی عیسوی
تعین تھی۔ اس لیے تو یقیناً ۱۵۰۰ اور اب صدی کے بعد اکائی دہائی
ا ہوگی اس لیے سو کا اسکوائر روٹ نکال کر چار سے ضرب دے دیا۔

غرض اس طرح مختلف سنین یاد رکھنے کے لیے بڑی زحمتیں مجھے
یں آتی تھیں اور اب جب کہ سفر آخرت درپیش ہے دماغ میں اتنی
اوشوں کی قوت باقی نہیں رہی۔ اس لیے صحیح تاریخ تو نہیں بتا سکتا غالباً
۱۹۰ ء میں مولانا اپنی ملازمت مدرسۃ الاسلام کراچی سے ترک
ہونے کے بعد علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ میں بھی ہم رکاب تھا۔ چند مہینوں
ر مولانا نے ایک روز مجھے عربی کتابوں کی جدید مطبوعات کی ایک فہرست
ی اور حکم دیا کہ میں ۱۰۰۰ (ایک ہزار) روپے قیمت تک کی کتابیں کو
تخب کرلوں۔ میں چوں کہ بہت ہی گستاخ تھا۔ اس لیے میں نے مولانا
، وجہ دریافت کی۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ بارہ سو روپیوں کی
ر بونس کی رقم کراچی سے آئی ہوئی ہے۔ روپے بیکار پڑے ہوئے
، ۔ اس لیے اس کی کتابیں خرید لی جائیں۔

مزید استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ رقم پہلے والد بزرگوار کی خدمت
بھیج گئی تھی جسے انہوں نے واپس کر دیا۔ اس کے بعد رشید چچا کو بھیجی

جو الہ آباد میں کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ مگر انہوں نے بھی اس بنا پر اسے
قبول نہیں کیا کہ وہ اب دکان کو توڑ دینا طے کر چکے تھے اور بچا ہوا
سامان نکالنے کی فکر میں تھے اور مولانا اس رقم کو خود محفوظ رکھنے میں یہ
معصیت سمجھتے تھے کہ خدانخواستہ ذہن میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ کسی
غیر متوقع ضرورت پر یہ رقم محفوظ کام دے گی اور اس طرح خدا کے
بجائے چند سکوں کو قاضی الحاجات سمجھ لیا جائے۔ اس طور پر گویا
ایک شرک خفی کا اندیشہ تھا۔

مولانا کے دونوں صاحبزادے سجاد اور عباد زیر تعلیم تھے اور
ابھی ناکتخدا تھے۔ ان حالات میں بے ضرورت کتابوں کی خریداری مجھے گراں
گزر رہی تھی اور میں نے یہ تحریک پیش کی کہ کیوں نہ یہ رقم ان بچوں کے نام
جمع کر دی جائے۔ اس پر مولانا سخت برافروختہ ہوئے اور مجھ کو خوب نصیحتیں فرمائیں
اسی کی بنا پر میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مولانا اسے "شرک خفی" سمجھتے ہیں۔

توکل علی اللہ اور خشیت الٰہی کا ایک دوسرا واقعہ جو اس سے
بھی عجیب تر ہے تقریباً اسی واقعہ کے چند ماہ بعد واقع ہوا۔

میں محلہ بنی اسرائیل میں رہتے رہتے اکثر اشخاص سے واقف ہو گیا
تھا۔ چنانچہ ایک صاحب بظاہر بہت متقی، پرہیزگار اور شریف زادے
تھے جو ہمارے مالک مکان کے قریبی رشتہ دار بھی ہوتے تھے اور جو
ہمیشہ بہت صاف اور پرتکلف کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔ ان سے
بھی شناسائی ہو گئی تھی۔ ان صاحب کو بنو اسرائیل ہونے پر اور علی گڑھ
کے قدیم رئیس زادوں میں شمار ہونے پر بے انتہا فخر تھا۔ کبھی کبھی اپنے
آبا و اجداد کے قصے بھی سنایا کرتے تھے۔ ان کا نام نہ اپنے حافظے میں یقینی
طور پر محفوظ پاتا ہوں اور نہ اُن کی صورت ہی۔ بہر حال وہ اس وقت کچھ
فلاکت زدہ ہو گئے تھے اور ایک مہذب گداگر کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔
اکثر غلط واقعات بیان کر کے مثلاً کبھی ماں کے کفن اور کبھی کسی اور ضرورت
کا حیلہ کر کے اپنے شناسا لوگوں سے طالب امداد ہوتے تھے اور اُن
کا طریقہ سوال اتنا شائستہ اور خوددارانہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے
مقصد میں کامیاب ہو کر ہی واپس ہوتے۔ یہ حضرت مولانا کی خدمت میں
بھی کبھی کبھار آتے اور اپنا مقصد حل کرنے کے بعد واپس جاتے۔ ایک
روز صبح آٹھ بجے کے قریب تقریباً اسی وضع و لباس کے ایک صاحب

ہمارے یہاں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک مزدور کچھ سامان سر پر اٹھائے تھا۔ حسنِ اتفاق سے مولانا بھی باہر تھے۔ انہوں نے مولانا کی خدمت میں عرض کی کہ ان پر ایک سود خوار مہاجن کی ڈگری جاری ہے۔ جس میں ان کی تقریباً کل آبائی جائداد نیلام ہو چکی ہے۔ اب صرف سکونتی مکان باقی رہ گیا ہے۔ اس لیے مکان کے فرش و فروش لے کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اگر یہی سامان فروخت ہو سکے تو وہ مطالبہ ادا کر کے کچھ دنوں کے لیے وقت پا جائیں تو پھر آئندہ کے لیے کوئی اور سبیل کریں۔

ان کے سامان میں ایک پرانا ایرانی قالین بھی تھا جو گو بہت استعمال شدہ تھا مگر تھا نہایت خوش رنگ اور بہترین فرش کے کام میں آسکتا تھا۔ مولانا سے انہوں نے اس قالین کو خریدنے کے لیے بڑی لجاجت سے التجا کی۔ اس وقت تک مولانا کو کالج کا مشاہرہ نہیں ملا تھا۔ غالباً مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں۔ مولانا نے قالین پسند فرمائی لیکن مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ یہ علی گڑھ ہے۔ یہاں مسلمان رئیسوں کی کمی نہیں کسی کو بھی دکھلایئے گا تو وہ معقول قیمت دے سکے گا۔ ان صاحب نے فرمایا کہ "بار برداری میں اور خرچ ہو گا اور یہاں کے لوگ میری مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور ایک رئیس تو خود میرے مکان کی تاک میں ہیں، بلکہ نیلام کی بولی بھی بول چکے ہیں، وہ کاہے کو یہ قالین خریدیں گے۔ وہ تو دوسرے رئیسوں کو بھی روک دیں گے۔ مولانا نے فرمایا کہ ایرانی قالین تو جتنی ہی مستعمل ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ قیمتی ہوتی جاتی ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ جو دو چار روپے آپ کے قلی کے باربرداری کے میں ادا کر دوں اور آپ اسے لوگوں کو دکھلائیں۔ شاید آپ کو اس قالین کی معقول قیمت مل جائے۔ انہوں نے عرض کی لوگ اس قالین کی قیمت دس روپے بھی نہیں دیتے حالانکہ میں نے آخری قیمت پندرہ روپے لگا دی تھی۔ اس پر بھی کوئی صاحب تیار نہیں ہوئے۔ اور قلی کی قیمت اپنے پاس سے دینے کے لیے کس سے مانگنے جاؤں گا۔ اس وقت مولانا نے مجھ کو پکارا اور استفسار فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے۔ میں نے عرض کی کہ تیس روپے گھر سے آئے تھے جس میں سے دو تین خرچ ہو چکے ہیں بقیہ محفوظ ہیں۔ آخر کار مولانا نے ان سے فرمایا کہ آپ پچیس روپیوں میں یہ قالین دے دیں اور بقیہ قیمت میرے حق میں معاف کر دیں تو میں خرید لوں۔ مولانا کے اس ارشاد پر غریب کو اس قدر تعجب ہوا کہ مالک صاحب آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ معافی کس چیز کی دوں؟ آپ تو میری مانگ سے دس اور زیادہ دے رہے ہیں۔ بہرحال مولانا کے اصرار پر انہوں نے تعمیل ارشاد کی اور اس وقت مولانا نے چھبیس روپے مجھ سے لے کر ایک روپیہ اپنی جیب میں ڈالا اور پچیس ان کے حوالے کیے اور وہ ایک روپیہ بھی اس خیال سے نکالا تھا کہ مولانا کالج تک جانے کا ایک روپیہ کرایہ ایک شکرم والے کو دیا کرتے تھے اور مولانا کے کالج جانے کا وقت قریب ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ تو مکان کے اندر تشریف لے گئے، اور ادھر مہذب گداگر جس کا تذکرہ ابھی چند سطروں میں کیا جا چکا ہے، نے ایک خط مولانا کے نام کا مجھے دیا کہ میں یہ کسی سے اندر بھجوا دوں۔ میں چونکہ ان بنو اسرائیلی بزرگ سے واقف تھا، اس لیے سمجھ گیا کہ غالباً حسب معمول کوئی فرضی قصہ تراشا ہو گا۔ خط بھیجنا کوئی ضروری کام نہ تھا، اس لیے میں نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ مولانا جب زنان خانہ سے کپڑے بدل کر آئے اور کالج جانے کے لیے باہر نکلے تو یہ سفید پوش گداگر پھاٹک کے پہلو سے لگے ہوئے کھڑے تھے اور اس بات کی انہوں نے شکایت کی کہ مولانا نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس پر مولانا نے تعجب کا اظہار فرمایا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ خط ایک دبلے پتلے لڑکے کو جو آپ کے مکان میں رہتا ہے دیا گیا تھا کہ آپ تک پہنچا دیا جائے انہوں نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مولانا کو یقین ہو گیا کہ وہ گنہگار میں ہی ہوں۔ فوراً بلایا گیا اور حاضری پر مجھ سے پوچھا کہ کوئی خط تمہیں دیا گیا تھا۔ میرے تسلیم کرنے پر مجھ سے خط طلب کیا گیا جسے میں نے پیش کر دیا۔ اسے دیکھ کر مولانا نے فرمایا۔ "تم نے اور ہم نے اس وقت حرام کھایا ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک مسلمان ہمسایہ فاقہ کرے تو متعلق ہمسایہ پر غذا حرام ہوتی ہے اور جب میں نے ان صاحب کے متعلق اپنی معلومات کے مطابق کچھ بتانا چاہا تو مولانا نے فوراً روک دیا اور فرمایا کہ اگر ایک شخص دس بار بھی جھوٹ بولے تو بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ وہ آج بھی جھوٹ کہہ رہا ہے۔ اگر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے تو ہم لوگوں نے بڑی

معصیت کی۔ میں نے کھالیا اور تم نے بھی۔ اس پر میں نے عرض کی آپ
کو اس وقت تک نہ تو فاقہ ملا تھا اور نہ آپ میں استطاعت تھی۔ کیوں
کہ آپ کے پاس صرف ایک روپیہ تھا جو گاڑی کا کرایہ ہوتا۔ اس پر
مولانا نے فرمایا کہ میں غیر مستطیع تھا لیکن تم تو نہیں تھے۔ اس پر میں نے
کہا کہ میں نے وہ روپیے اس لیے چھوڑ رکھے تھے کہ اس کی شکر منگواؤں
گا۔ کیوں کہ چائے پر روزانہ وحید الدین سلیم وغیرہ کی نشست مولانا
کے یہاں ہوتی تھی۔ اس پر مولانا نے فرمایا۔ میں پیدل بھی یہاں سے
کالج جا سکتا تھا۔ اور وہی روپیہ نکال کر ان صاحب کے حوالے کیا
اور کہا کہ فوراً جایئے اور بال بچوں کی غذا کا سامان کیجیے۔ میں کالج جا رہا
ہوں۔

مولانا ابھی چند قدم بھی نہ چلے ہوں گے کہ ڈاکیہ آیا اور
مولانا کے نام کا ایک منی آرڈر ۷۰ روپیے کا بتایا۔ مولانا نے منی آرڈر
کو دیکھنے کے بعد بھی پہلے تو انکار فرمایا کہ یہ منی آرڈر میرا نہیں ہے کسی
اور کا ہوگا۔ مگر ڈاکیہ کے اس عرض کرنے پر کہ آپ کے سوا کوئی اور
دوسرا شخص مکتوب الیہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اپنا انکار تحریر کر دیں تو
میں منی آرڈر واپس لے جاؤں۔ اس پر مولانا نے منی آرڈر کو بہت
غور سے پڑھا تو ارشاد فرمایا کہ ہاں یہ میرا ہی منی آرڈر ہے۔ میرے
استفسار پر یہ ارشاد ہوا کہ ایک کابلی مولوی مع اپنے صاحبزادے
کے کراچی میں مسافرانہ وارد ہو گئے تھے اور چند مہینے قیام پذیر رہے۔
جاتے وقت انہوں نے مولانا سے ستّر روپیے بطور قرض حسنہ
لیے تھے اور چوں کہ اس واقعہ کو برسوں گزر گئے تھے، اس لیے مولانا
کے ذہن سے یہ بات اتر گئی تھی اور وہ ذہن سے اس واقعہ کو محو
کر چکے تھے لیکن وہ مولوی صاحب سچے آدمی تھے انہوں نے
چھ سات سال گزشتہ کا قرض استطاعت کے زمانے میں ادا کر دیا
تھا۔ اب اگر مولانا اس رقم کو واپس کرتے ہیں تو معلوم نہیں انہیں
واپس ملتی ہے یا نہیں اور نہ ملنے کی صورت میں ان کی خفگی لازمی
ہے۔ لہٰذا وہ رقم قبول
کر لی۔

" کیا ہماری قوم میں جن کے اسلاف کے ناموں کی شہرت دنیا کے
ہر ایک حصہ میں گونج رہی تھی اور جن کے سیف و قلم کی نام آوری کے نشان
ہسٹری میں اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ اتنی عزت
اور ہمت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اپنی قوم کی تباہ حالت کی درستی پر توجہ
کریں "۔

سرسید

جبری جہیز کی لعنت

محمد نظام الدین حسین رضوی

ہمارے اس عظیم ملک میں مسلم معاشرہ ہو یا غیر مسلم، دونوں میں نکاح جیسے پاکیزہ رشتے کا استحکام ایسے رسوم وخرافات پر موقوف تصور کیا جاتا ہے جو نہ صرف وہمی و غیر عقلی ہیں بلکہ بعض اوقات انسانی زندگی کی تباہی و فساد کا سبب ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ نہ ہوا تو باہمی روابط میں تلخی و ناہمواری تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ شادی بیاہ سے مختلف طبیعتوں، لیکن ایک دوسرے سے سکون حاصل کرنے کے لیے بے چین و بے قرار زندگیوں کو ایک رشتے میں جوڑ کر خانگی زندگی کے خوش گوار تعلقات کے لیے راستہ ہموار کیا جاتا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابتدا ہی سے بربادی کے اسباب بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ ان بری رسموں سے عقد نکاح کو اس طرح مشروط کیا جاتا ہے یا ایسے جبر و لزوم کے ساتھ ان کی ادائیگی ہوتی ہے کہ گویا لڑکے اور لڑکی کے درمیان کامل یک جہتی اور رفاقت و مصاحبت اسی وقت ممکن ہے جب کہ یہ رسمیں ادا کر لی جائیں۔ یہ بدترین قسم کے عقاید و خیالات پر مبنی ہوتی ہیں جن کی جڑیں سماج میں بہت مضبوط ہوتی ہیں بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔

اسلامی طریقے پر شادی بیاہ کے لیے خیالی رسوم بے معنیٰ و عبث ہونے کے باوجود مسلمانوں کے مختلف فرقوں و ذاتوں کے درمیان یہ وہمی چیزیں اس طرح پائی جاتی ہیں کہ گویا عقدِ شرعی کے لوازمات ہیں حالاں کہ اسلام نہایت سادگی کے ساتھ مسنون آئین و طرز پر ایجاب و قبول کے ذریعہ نکاح کو وجود میں لانے کا حکم دیتا ہے۔ جیسے ہی یہ معاہدۂ ایجاب و قبول شرعی طور پر انجام پا گیا، طرفین ایک دوسرے کے لیے جائز و حلال ہو گئے۔ یعنی دو ہستیاں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ مراحل زندگی کے طے کرنے میں رفیقانہ زندگی اور مہر و محبت کی پابند ہو گئیں۔

لیکن مسلمانوں کی بہت بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ مختلف علل و اسباب کی بنا پر اُن میں بھی ایسے غلط رسوم و خرافات پیدا ہو گئے ہیں کہ جس ڈھرے پر ہمارے برادرانِ وطن صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور مصلحین کے جہد و سعی کے باوجود اس پر سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ اسی راستے پر قوم مسلم بھی چل پڑی ہے اور ازدواجی زندگی کے رشتے میں منسلک کرنے کے لیے بہت سے ایسے طریقے مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں جو ان کو تباہی و بربادی کی طرف لے جاتے ہیں اور جن پر بے دریغ پیسے صرف کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ رسوم ایسی پابندی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت اپنے سارے لوازمات و خصوصیات کے ساتھ جو اسلام کے عہدِ زریں میں ناپید ہو چکے تھے، پھر سے وجود میں آنے والا ہے۔

ان تمام رسموں میں بدترین رسم نمائشی و جبری جہیز کی لعنت ہے۔

وہ بچیاں جن کو زندہ ہی دفن کیا جاتا تھا یا پیدائش کے بعد بڑی بے رحمی و سخت دلی کے ساتھ جن کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا، جن کی ولادت کنبہ و خاندان کے لیے باعث ننگ و عار خیال کی جاتی تھی جن کا پاک وجود سماج میں ناپاک تصور کیا جاتا تھا، زندگی کے میدانوں میں جن کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں تھی جن کو دنیا کی بیشتر آبادی بلکہ اس زمانے کی ترقی یافتہ قومیں کنیزانہ زندگی کے لیے مجبور کرتی تھیں۔ اِسلام کے برکات سے ان کو بلند رتبہ ملا، احترام کی زندگی نصیب ہوئی، تقریباً لڑکوں کے برابر مختلف حیثیتوں سے وراثت سے حصہ ملا۔ ان کی ذات سے وابستہ خیالی نحوست کا ازالہ ہوا اور ان کو ایسی حقیقی زندگی عطا کی گئی کہ اقوام عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن زمانے کی گردش سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری

میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ دورِ ظلمت کی واپسی کے اسباب پیدا ہو چکے ہیں۔
آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ عورتوں کو احترام و توقیر کی بلند سطح
سے گھسیٹ کر پھر ذلت کی پستی میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس ظلم و استبداد کے
رنگ و آہنگ بدل چکے ہیں کیوں کہ زمانے کی تبدیلی و انقلابات سے ہر چیز
کی ظاہری شکل و صورت میں تبدیلی آگئی ہے لیکن حقیقت اِن تبدیلیوں کے
پس پردہ مستور و برقرار ہے۔ عہدِ جاہلیت میں عورتوں پر جو مظالم روا
رکھے گئے اور ان کی جیسی تحقیر ہوئی تھی، میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ وہی
سب کچھ ہونے والا ہے بلکہ ہو رہا ہے۔

اگر حالات کا صحیح ڈھنگ سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح
ہو کر سامنے آئے گی کہ جب تک انسانوں کے اندر جذبۂ بوالہوسی و نفس پرستی
کا رجحانات برقرار رہیں گے اور اخلاقی احساس و شعور بیدار نہیں ہوں
گے ان میں غیرت و خودداری کا جذبہ ابھارا نہ جائے گا۔ اس وقت تک
جبر و ظلم کا یہ چکر چلتا رہے گا۔ پست جذبات کی وجہ سے مرد و عورت کو
یہ ترغیب دیتا ہے یا خود عورتوں میں یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ وہ جب
تک اپنی نسوانیت کھو کر مردانہ صلاحیت نہ پیدا کریں گی اس وقت تک ان
کو ترقی و آزادی کے باغ و بہار سے فوائد و ثمرات حاصل نہ ہوں گے۔
انہیں کی تسکین کے لیے ان کی خرید و فروخت کا کاروبار اس روشن زمانے
اور دورِ حریت میں جاری ہے اور کبھی انہیں کی وجہ سے ازدواجی زندگی
کے رشتے میں منسلک کرنے کے لیے ایسے قید و بند کی طرف ان کو مائل
کرتے ہیں جن کا کوئی عقلی جواز نہیں اور نہ قانون کے اعتبار سے ان کی
ضرورت ہے۔ نہ ہی انسان کی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انسان
کے اندر کا یہی دیو پری پیکر ہے جو اس کو جلوہ ہائے رنگا رنگ دکھا کر جہیز و
نمائشی جہیز کی صورت میں رشوت ستانی کے لیے مجبور کرتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ و جستجو سے ہم کو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ
دورِ ظلمت میں کوئی ایسی قوم گزری ہے جس نے شادی بیاہ میں رشوت جیسی
حرام و ناجائز شئے کو لازم قرار دیا ہو کہ اس کے بغیر شادی کا وجود ناممکن
ہو گیا ہو لیکن عہدِ جدید کی ذہنی پستی اور نفس پرستی کا یہ افسوس ناک المیہ
ہے کہ ذرائع آمدنی میں سے نکاح جیسا پاک رشتہ جبری جہیز کی صورت
میں بڑا آسان ذریعہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ عقدِ مناکحت میں رشوت لینے
کا زور بڑھ رہا ہے۔ اخلاقی احساس و شعور کے فقدان سے اس سیلِ
بلا پر بند نہیں باندھا جا سکا۔ حالاں کہ اگر غور کیا جائے تو انسانی اور
اسلامی نقطۂ نظر سے قبل نکاح یا بعد نکاح مرد کے خاندان سے یا عورت
کے خاندان سے ایسا مالی دباؤ ڈالنا کہ مطالبات نہ پورے ہونے کی صورت
میں رشتۂ نکاح کو جبراً توڑ دیا جائے گا یا اس کی راہ میں ایسے موانع
پیدا کیے جائیں گے جن سے نکاح وجود میں نہیں آئے گا یہ بدترین قسم
کی رشوت کا مطالبہ ہے جس کے ناجائز ہونے میں شاید ہی کوئی عقل مند
آدمی شبہ کرے۔

جبری جہیز کا رواج ہمارے سماج میں اعلیٰ پیمانے پر جاری ہے
جس کے برے اور المناک نتائج سے روحِ انسانی کانپ اٹھتی ہے۔
کتنے خاندان ایسے ہیں کہ اس جبر سے تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ
گئے۔ اخبار و جرائد میں آئے دن عورتوں کے بارے میں یہ خبریں پڑھی
جاتی ہیں کہ اپنی مظلومانہ زندگی سے تنگ آکر انہوں نے خودکشی کر لی
لاڈ و پیار کی مستحق کتنی بچیوں کو نہایت بے رحمی و سنگ دلی کے ساتھ
زندہ جلا ڈالا گیا، کتنی لڑکیوں کو ظلم کے اس دیو کے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔
کتنے خاندانوں کے درمیان اس سے منافرت و تفریق کی آگ بھڑک اٹھی
یہ ہے دورِ جہالت کی واپسی! جس کو میں نے پہلے بیان کیا ہے لیکن اس
جبری جہیز کی لعنت کے خلاف کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس سے انسان
کے اخلاقی احساسات کو اس طرح بیدار کیا جا سکے کہ طبیعتوں میں خود نفرت و
کراہت پیدا ہو جائے۔ کچھ آوازیں ضرور بلند ہوتی ہیں وہ بھی اخلاقی حس
کے مردہ ہونے کی وجہ سے دب کر رہ جاتی ہیں۔

عہدِ قدیم میں لڑکی والوں کی طرف سے مالی تعاون کا مطالبہ ہوتا
تھا کہ معقول مقدار میں لڑکی کے عوض وہ مال ادا کریں تو ہم اپنی بہن یا
لڑکی کا نکاح کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اب دورِ جدید میں عام طور
پر بعض خاندانوں اور ذاتوں میں پیشگی رقم کی ادائیگی پر عقدِ نکاح کو موقوف
کر دیا گیا ہے یا جہیز کے کثیر سامان کا شدت کے ساتھ مطالبہ ہوتا ہے
بلکہ یہ عزت، آبرو و فخر و مباہات کا ذریعہ بن گیا ہے۔ بلفظ دیگر حصولِ
زر کے لیے عورتوں کی تحقیر بڑی بے دردی کے ساتھ کی جا رہی ہے اس
لیے ہم جہیز کے متعلق اسلام کا واضح نقطۂ نظر پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے

ہیں کہ ایسا مالی مطالبہ خواہ سامان کی شکل میں ہو خواہ نقد کی صورت میں چاہے
لڑکی کی طرف سے ہو یا لڑکے کی طرف سے، قبل نکاح ہو یا بعد نکاح ہر حالت
میں رشوت ہے جو قطعاً ناجائز و حرام ہے ——— چنانچہ عصر حاضر
کے بلند پایہ فقیہ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے
مغربی بنگال سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا کہ

"عام طور پر اس علاقہ میں لڑکے والوں سے قبل نکاح کچھ
رقم وصول کی جاتی ہے اور اس بارے میں دو طریقے
رواج یافتہ ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کو اسی پر موقوف کیا جاتا
ہے۔ دوسرے یہ کہ نکاح کے لیے یہ شرط لازمی نہیں قرار
پاتا لیکن یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ نکاح کا پیغام دینے
والا، یا اس کا سرپرست کچھ نہ کچھ مال نقد کی صورت میں
ادا کرے جسے وہ نکاح کے مصارف کے سلسلے میں خرچ
کرتے ہیں۔ بعض علماء بنگال اس کو رشوت قرار دے
کر ناجائز بتلاتے ہیں۔ آپ جواب باصواب سے آگاہ
فرمائیں"

فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"پست ذہنیت کے لوگوں یا پسماندہ ذاتوں میں جو یہ
رائج ہے کہ اس وقت تک اپنی بہن یا بیٹی کو کسی کی زوجیت
میں نہیں دیتے جب تک نکاح کے پیغام دینے والے سے
کچھ مال وصول نہیں کر لیتے۔ یہ سرتاسر ناجائز و حرام ہے
کیوں کہ یہ رشوت ہے۔"

فاضل بریلوی نے اپنے اس فتوے کے ثبوت میں فقہ اسلامی کی
معروف کتاب "فتاویٰ بزازیہ" سے یہ بھی نقل فرمایا کہ:

"اگر کسی بھائی نے اپنی بہن کا نکاح کرنے سے انکار
محض مال حاصل کرنے کے لیے کیا اور عقد کرنے والے
کی طرف سے اس کو مال دے دیا گیا تو چاہے وہ مال
موجود ہو یا ضائع ہو جائے، اس کو واپس لینے کا حق
حاصل ہوگا۔ کیوں کہ یہ رشوت ہے۔"

اسی فقہی عبارت سے ثابت ہوا کہ قبل نکاح مال کا وصول کرنا رشوت
ہے جو ناجائز و حرام ہے۔ البتہ یہ ضرور مباح ہے کہ آپس میں میل و محبت
پیدا کرنے کے لیے اگر کچھ چیزوں کا تبادلہ ہو جس میں فریقین میں سے کسی
اوپر اس بارے میں کوئی جبر و دباؤ نہ ہو بلکہ بطیب خاطر یہ ہدیہ و تحفہ
ہو تو شریعت اسلامی کے نزدیک اس کے جواز میں شبہ نہیں کیا جا سکتا،
کیوں کہ یہ رشوت کے دائرے میں نہیں آتا۔

مخزن العلوم فرنگی محل کے مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم سے
سوال کیا گیا کہ وہ رقوم جو لڑکے والے لڑکی والوں سے نکاح سے پہلے
نسبت طے کرنے کے وقت وصول کرتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے
بیشتر علاقوں میں رائج ہے ان کا کیا حکم ہے؟

آپ نے جواب میں فقہ اسلامی کی مختلف کتابوں کے حوالے
سے تحریر فرمایا کہ:

جب لڑکی والے لڑکے والوں سے کوئی رقم جبراً وصول
کریں یعنی لڑکی کے معاوضہ میں وصول کریں تو رشوت
ہونے کی بنا پر قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ حالاں کہ یہاں
عقلی جواز کا وہم ہو سکتا تھا تو لڑکی والوں پر دباؤ ڈال
کر نسبت طے کرنے کے وقت روپیے پیسے کا وصول
کرنا یا جہیز کے لیے کسی خاص مقدار کا متعین کرنا یا جہیز
کے گراں قدر سامانوں کا پہلے سے طے کرنا کیوں کر
ناجائز و حرام نہ ہوگا جب کہ اس میں رشوت کا پہلو
واضح طور سے نمایاں ہے" (تلخیص)

ہمارے قارئین نے ان دونوں فقہائے وقت کے فتوؤں سے
بخوبی معلوم کر لیا ہوگا کہ ایسا مالی مطالبہ جس میں کسی طرح کا دباؤ ہو
خواہ مرد کی جانب سے ہو یا عورت کی جانب سے نکاح سے پہلے ہو یا بعد
نقد کی صورت میں ہو یا سامان کی شکل میں، ناجائز و حرام ہے۔ اس لیے کہ یہ
رشوت کے دائرے میں آتا ہے جس کا لینا دینا دونوں قابل مواخذہ جرم ہے۔ اسی
لیے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انسانوں کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے ارشاد فرمایا کہ:

"رشوت کے دینے والے اور لینے والے دونوں پر
خدا کی لعنت ہو۔"

اور لعنت کا مطلب اسلامی شریعت میں یہ ہے کہ خدا کی رحمت

معصوں و نرم سے محروم ہو۔

لیکن ہمارے معاشرے کی اخلاقی حس اس قدر مردہ ہو چکی ہے کہ اس زمانے میں رشوت کو اپنا جائز حق تصور کر کے اس کے لیے کوشش کی جاتی ہے مگر جبری اور نمائشی جہیز کے مسئلے میں ہم کو اسی حیثیت پر اکتفا نہیں کرنا ہے کہ وہ رشوت ہے بلکہ یہ غور کرنا ہے کہ نکاح کے بلند مقاصد سے کس قدر متصادم ہوتا ہے۔ نکاح کا ایک بڑا مقصد دو ہستیوں کے درمیان باہمی الفت و مودت کا خوش گوار ماحول پیدا کرنا ہے تاکہ زندگی سکون کے ساتھ گزرے، بے کیفی اور تلخی کی زندگی سے رہائی حاصل ہو۔ قرآن مقدس کے اندر ارشاد فرمایا گیا کہ

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا
لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

(الروم)

"اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ تمہاری بیویوں کو پیدا کیا۔ تاکہ اپنی قربتوں میں ان سے سکون حاصل کرو۔ یہ اللہ ہی کی شان قدرت ہے کہ تمہارے درمیان رحمت و مودت پیدا کی۔"

نکاح کا دوسرا عظیم مقصد یہ ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سی صفات اور ایسی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر اس کے اوپر اخلاقی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ اپنے جائز حدود میں رہ کر اپنی عصمت و پاکبازی کی حفاظت کرے۔ کیا کوئی عقل مند آدمی ان دونوں مقاصد سے انکار کر سکتا ہے۔ میں ان عجوبۂ روزگار انسانوں کی بات نہیں کرتا جو عقل و خرد کے دعوی کے باوجود انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند رکھنا نہیں چاہتے بلکہ اس کو بھی ایک ترقی یافتہ حیوان قرار دے کر جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

ان دونوں مقاصد پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، جہیز کی لعنت ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس سے جنسی بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ سکون قلب اور باہمی الفت و مودت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس سے عورت دماغی الجھن میں مبتلا ہو کر خودکشی کے جرم کی مرتکب ہو جاتی ہے اور یہ وہ آفت ہے جسے شوہر کے خاندان والے عورت کے اوپر نازل کرتے ہیں اور وہ ان کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنے کو زندہ جلا ڈالتی ہے۔ اس لیے ہمارے تمام ہم وطنوں کو چاہیے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مرد ہوں یا عورت، جوان ہوں یا بوڑھے دیہات کے رہنے والے ہوں یا شہر کے، امیر ہوں یا غریب، تاجر پیشہ ہوں یا زراعت پیشہ سب کو یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ اس لعنت کے ختم کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں اور اس فلاحی کام کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کریں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ انسان غیرت و حمیت کا علم لے کر انسان کی اخلاقی حس کو بیدار کریں کیوں کہ یہ مشترکہ آفت ہے۔ اس بلائے عظیم میں پوری قوم درماندگی اور بے بسی کی حالت میں مبتلا ہے۔

ہمارے معزز ناظرین اس بات پر غور فرمائیں کہ اگر اپنے اندرون شیطان کے وسوسے سے اس غرور میں ہم مبتلا ہیں کہ ہم لڑکے والے ہیں ہمارا جائز و ناجائز مطالبہ پورا ہونا چاہیے اور ہم بے رحمی کے ساتھ جہیز کے لیے تنگ کریں تو کیا ہمارے اوپر یہی بلا کسی دوسرے وقت مسلط نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم نے کسی ذریعے سے پتہ لگا لیا ہے کہ ہمارے خاندان میں لڑکی کی پیدائش نہیں ہوگی، جس ظلم اور جبر کے ساتھ رشوت یعنی جہیز کا مطالبہ ہم دوسروں سے کرتے ہیں وہی جبر و تشدد کا دیو ہمارے اوپر بھی مسلط ہو سکتا ہے۔

یہ مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح مسئلہ جہیز میں بھی شرعی احکام کی پاسداری کا احساس ان میں باقی نہیں رہ گیا۔ ورنہ مقام غور یہ ہے کہ جہیز کے جملہ سامان پر حق ملکیت صرف عورت کو حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام چیزوں میں سوائے عرفاً مستثنیٰ چیزوں کے سب پر تصرف کا حق جب صرف لڑکی ہی کو حاصل ہے تو دوسرے کو اس میں پڑنے سے کیا فائدہ؟ جب چاہے وہ بیچ سکتی ہے، دوسرے کو ہبہ کر سکتی ہے۔ کوئی اس کو ان تصرفات سے منع نہیں کر سکتا۔ اگر جہیز کی اس حیثیت کا لحاظ رکھا جاتا تو بھی اس جبری لعنت سے رہائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ لڑکے والے اس میں مگن رہتے ہیں کہ جو کچھ لڑکی کو ملا ہے وہ سب انہیں کا ہے۔ وہ جب چاہیں اس

بیچ سکتے ہیں یا اپنے مصرف میں لاسکتے ہیں۔ اس میں لڑکی کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ شریعت اسلامی عورت کو وہ حقوق مالکانہ عطا کرتی ہے کہ بالفرض اگر وہ مطلقہ ہو جائے اور جہیز کے سامان اس کی مرضی کے بغیر لڑکے والے اپنے مصرف میں لے آئیں تو ان کو اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ موجود سامانوں کی واپسی میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم ذیل میں ماضی قریب کے ایک بے مثال فقیہ اور یگانۂ روزگار عالم امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ کے فتاوی کا اقتباس پیش کر رہے ہیں جس سے مذکورہ بالا مسئلے پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

ایک شخص نے آپ کی خدمت میں یہ سوال کیا ہے کہ زید نے زیور اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا۔ اس کا مالک دختر زید ہے یا اس کا شوہر؟ اور اگر شوہر بیوی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرے تو نافذ ہو گا یا نہیں! بَیِّنُوا تُوجَرُوا۔

آپ نے اس کا یہ جواب ارقام فرمایا:

"زیور وغیرہ جہیز کہ زید نے اپنی بیٹی کو دیا خاص ملک دختر ہے شوہر کو کسی طرح کا استحقاق مالکانہ اس میں نہیں۔ نہ اس کا تصرف بغیر بیوی کی اجازت اور اس کی رضا کے نافذ ہو سکے۔"

پھر فاضل موصوف نے اس شرعی مسئلے کے ثبوت میں فقہ حنفی کی ایک عظیم الشان کتاب درمختار کا یہ اقتباس پیش کیا۔ فرماتے ہیں:

جَهَّزَ ابْنَتَهُ بِجَهَازٍ وَسَلَّمَهَا ذٰلِكَ لَيْسَ لَهُ الِاسْتِرْدَادُ مِنْهَا وَلَا لِوَرَثَتِهِ بَعْدَهُ إِنْ سَلَّمَهَا ذٰلِكَ فِي صِحَّتِهِ بَلْ تَخْتَصُّ بِهِ وَبِهِ يُفْتٰى۔

باپ نے اپنی بیٹی کو جہیز دیا تو اب نہ باپ کو بیٹی سے یہ جہیز واپس لینے کا حق ہے نہ اس کے بعد اس کے ورثہ کو، بلکہ لڑکی اس سامان کی مالک خاص ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

یہی فاضل موصوف اسی نوع کے ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں

"جہیز ہمارے بلاد کے عرف عام شائع سے خاص ملک زوجہ ہوتا ہے جس میں شوہر کا کچھ نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے لے گی اور مر گئی تو اس کے ورثا پر تقسیم ہو گا۔ ردالمحتار میں ہے، کُلُّ اَحَدٍ یَعْلَمُ اَنَّ الْجِهَازَ لِلْمَرْأَةِ اِذَا طَلَّقَهَا تَاْخُذُهٗ کُلَّهٗ وَاِذَا مَاتَتْ یُوْرَثُ عَنْهَا۔ (سب ہی جانتے ہیں کہ جہیز کی مالک عورت ہے شوہر اسے طلاق دے گا تو جہیز کا سارا سامان واپس لے لے گی اور اگر یہ مر جائے تو اس کے قرابت دار اس سامان کے وارث ہوں گے) ہاں مرد بلکہ بحالت ہم خانگی اس کے والدین بھی بعض اشیاء جہیز مثل ظروف و فرش وغیرہ اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور عرفاً اس سے ممانعت نہیں ہوتی اس کی بنا ملک شوہر یا والدین شوہر پر نہیں۔ بلکہ باہمی انبساط پر ہے کہ زن و شوہر کی ملک میں تفاوت نہیں سمجھا جاتا۔" (فتاویٰ رضویہ جلد پنجم۔ ص ۳۴۹)

ہمارے معزز قارئین پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہو گی کہ جہیز کا سارا سامان خاص عورت کی ملک ہے اور بغیر عورت کی اجازت یا رضا کے کسی کو بھی اس میں تصرف کرنے کا حق نہیں بلکہ یہ حرام و گناہ ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کے اسباب جہیز میں کچھ بھی تصرف کیا جائے یا اپنے استعمال میں لایا جائے۔ جب شریعت اسلامیہ کا فرمان یہ ہے تو پھر ایک مسلمان شریعت کے حدود کو پار کر کے جبری جہیز کی لعنت میں گرفتار ہونا کیسے پسند کرتا ہے اور کثرت جہیز کا منحوس مطالبہ کر کے غیر قوموں کی خلاف شرع ہمنوائی کیسے گوارہ کرتا ہے۔

ہم کو دنیا کے بڑے انسانوں کی بہو بیٹیوں کو دیکھنا چاہیے، جنھوں نے اس زمین پر سماج کو سدھارنے کے لیے انتھک کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے جہیز میں کون سا قیمتی سامان دے کر اپنے جگر پاروں کو اپنے سے جدا کیا تھا۔ کیا وہ بیٹیاں اپنی سسرال پہنچ کر جہیز کے لیے تنگ کی گئی تھیں۔ اس بارے میں تمام انسانوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا جہیز ایک بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو اپنے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جوابِ دوست

تلاشِ سحر

نسیم انصاری

اسی زمانے میں یعنی ۶۵ء سے ۷۰ء تک سارے ملک میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کوئی اقلیتی ادارہ ہے یا نہیں۔ اس بحث کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۶۵ء میں جب نواب علی یاور جنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ایک طبقے نے ان کی مخالفت شروع کردی۔ مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ انجینئرنگ کالج کے داخلے میں یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے طلباء کی تعداد پچھتر فیصد سے گھٹا کر پچاس فیصد کرنا چاہتے تھے لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۴۷ء کے بعد جب حیدرآباد کے ہندوستان سے الحاق کا معاملہ زیرِ غور تھا تو انہوں نے الحاق کے حق میں رائے دے کر معاہدہ کا ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ اس زمانہ میں نظام حیدرآباد کے وزیرِ اعظم میر لائق علی تھے جو اتحاد المسلمین سے ہمدردی رکھتے تھے اور جن کی رائے میں حیدرآباد کو آزاد ریاست کا درجہ ملنا چاہیے تھا۔ نواب علی یاور جنگ سمجھتے تھے کہ اس زمانے کے حالات میں یہ پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور اگر اس پر عمل کیا گیا تو سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ نواب علی یاور جنگ کی رائے بالکل درست تھی لیکن ۴۷ء اور اس کے بعد کے زمانے میں ان کی بات نظام دکن نے نہیں مانی۔ نتیجہ میں بڑا خون خرابہ ہوا اور نظام حیدرآباد کی فوجوں کو پولس ایکشن میں سخت شکست ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس غلطی کی سزا حیدرآباد کے مسلمان شرفاء کو بھگتنا پڑی اور الحاق کے بعد وہ بہت سی مشکلوں میں گرفتار ہوگئے۔ ۶۵ء میں علی گڑھ میں نواب علی یاور جنگ کے خلاف جو تحریک چلی اس میں حیدرآباد کے مسلمان شرفاء کی مشکلوں کو اس رنگ میں پیش کیا گیا کہ ان کی سب ذمہ داری نواب صاحب پر تھی نہ کہ نظام حیدرآباد کے ناعاقبت شناس مشیر پر۔ اس کے نتیجے میں کورٹ کی میٹنگ میں ہنگامہ ہوا اور اس میں نواب یاور جنگ پر حملہ کر کے انہیں سخت زخمی کر دیا گیا۔

یہ واقعہ ۲۵ راپریل ۱۹۶۵ء کا ہے۔ اسی دن مونس رضا صاحب کے چھوٹے بھائی جدن (احمد رضا) کی شادی تھی اور میں اپنی گاڑی میں دلہن کو رخصت کرا کے دولہا کے گھر لیے جا رہا تھا۔ وکٹوریہ گیٹ پر یونیورسٹی کی ایمبولینس گاڑی کا سامنا ہوا۔ اس گاڑی سے ڈاکٹر عباس علی خاں نے اتر کر مجھ سے کہا کہ وائس چانسلر سخت زخمی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ انہیں ان کے گھر لیجایئے میں اپنی سواریاں اُتار کر فوراً ان کا معائنہ کرنے آؤں گا۔ چنانچہ میں دولہا دلہن کو ان کے گھر پہنچا کر سیدھا وائس چانسلر کے گھر پہنچا۔ نواب صاحب کے زخموں کو صاف کر کے ان میں ٹانکے لگائے۔ ستر بہتر ٹانکے لگانا پڑے۔ بس اللہ نے رحم کیا اور ان کی جان بچ گئی۔

ایسا سخت واقعہ یونیورسٹی کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ میرا ردِّ عمل بہت شدید تھا۔ ایک دن اسٹاف کلب میں ان کے مخالفین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ نواب صاحب خورد و نوش میں بھی بہت محتاط نہیں ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ جملہ بُرا لگا۔ اس وقت میرے اسکول کے استاد فاروق صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے مخاطب ہوکر کہا کہ آپ میرے استاد ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ اپنا شمار گنہگاروں میں کیا ہے۔ میں اس کا مستحق نہیں کہ میرے پیچھے کوئی نماز پڑھے لیکن اگر آپ کے بچوں میں سے کسی کو سرجری سیکھنا ہے تو وہ میری ہی طرح کے لوگوں سے سیکھیں

میری گنہگاری کا کوئی ذکر میری سرجری کے سلسلہ میں نہیں آئے گا۔ ذاتی
ملات کا ذکر پبلک کام کرنے والوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے
طرح بھی درست نہیں اور کوئی تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتی۔

۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کے واقعہ سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلم
یونیورسٹی پر قوم دشمن فرقہ پرست عناصر کا قبضہ ہوگیا ہے اور ان کے
گل سے اس ادارہ کو نکالنا ضروری ہے ورنہ یونیورسٹی بھی تباہ ہوگی
اور ہندوستان کے مسلمان بھی۔ بظاہر حکومتِ ہند نے بھی اس رائے
مان لیا اور مسلم یونیورسٹی کے اس دستورالعمل کو معطل کر دیا جو ۱۹۵۲ء
ں پاس ہوا تھا اور اس کے بجائے صدر جمہوریہ کی طرف سے ایک آرڈی
ننس جاری کر دیا جس کے مطابق یونیورسٹی پر حکومت کا براہ راست
کنٹرول ہوگیا یعنی کہ کورٹ کو ختم کر دیا گیا اور ایکزیکٹو کونسل کے
تمام ممبر گورنمنٹ کے نامزد کیے ہوئے لوگ بنائے گئے۔

اس آرڈی ننس کی مخالفت یونیورسٹی اور اس کے باہر بڑے
پیمانے پر شروع ہوئی۔ اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ نکلا کہ کچھ لوگوں
نے ملک کے سپریم کورٹ میں حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا کہ
موجودہ انتظام دستورِ ہند کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ملک کے دستور
میں اقلیتوں کو اپنے ادارے چلانے کی اجازت دی گئی ہے اور اس
آرڈی ننس کے ذریعے یہ حق چھین لیا گیا ہے۔ میری رائے اس مقدمے
کے خلاف تھی کیوں کہ اگر مقدمہ خارج ہوگیا تو پھر یہ بات ایک عرصے کے
لیے طے ہو جائے گی کہ مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کا اجتماعی طور پر کوئی
حق نہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔

اب یونیورسٹی کے اندر اور اس کے باہر حکومت کے خلاف تحریک
نے شدت اختیار کر لی اور ایسی مخالفت ہوئی کہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں جو
تقاریب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی صد سالہ جشن کے سلسلہ میں منائی
جانے والی تھیں وہ بھی ملتوی کرنا پڑیں۔ ۱۹۷۲ء میں پارلیمنٹ نے
ایک ایکٹ یونیورسٹی کے دستور کے لیے پاس کیا۔ اس کے خدوخال بھی
۱۹۶۵ء کے آرڈی ننس سے ملتے جلتے سمجھے گئے۔ چنانچہ مخالفت جاری رہی
سارے ملک کی مختلف مسلمان تنظیمیں حکومت پر زور ڈالنے لگیں کہ
وہ یونیورسٹی ایکٹ میں ایسی تبدیلی کر دے جس کی بنا پر اسے اقلیتی
ادارہ مان لیا جائے۔

اس فضا میں فزکس کے پروفیسر اور میرے عزیز دوست
ڈاکٹر رئیس احمد نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس
یونین کی جو رائے یونیورسٹی بل کے متعلق ہے وہ متفقہ رائے نہیں ہے
اور طلبا کی ایک بڑی تعداد اس معاملہ میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے
بس طلباء خفا ہوگئے اور پروفیسر رئیس احمد سے سائنس کے ڈین کے
عہدے سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور اپنے اس مطالبہ کی حمایت میں
کچھ لڑکوں نے مارچ ۱۹۷۳ء میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

میرے خیال میں یہ بہت نامناسب بات تھی۔ اب تک دوسری
یونیورسٹیوں کے مقابل ہمارے یہاں طلباء اپنے استادوں کی بہت
عزت کرتے تھے۔ میرا خود کا کئی دفعہ کا تجربہ تھا کہ میں جب کوئی بات
ان سے کہتا تھا چاہے انہیں کیسی ہی بُری کیوں نہ لگے، وہ مان لیتے تھے
اور میری خفگی کو سر جھکا کر برداشت کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اب
یہ سب ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے میں نے یونین کے صدر کو ایک خط لکھا
جس میں کہا کہ استادوں اور طالب علموں کے جن رشتوں پر ہم فخر کرتے
تھے وہ ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے آپ کی بھوک ہڑتال سے بہت تکلیف ہے
اور میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ بھوک ہڑتال پر رہیں گے میں
بھی کچھ نہیں کھاؤں گا۔

یہ ایک بالکل نئی صورت تھی لیکن میرے احتجاج سے کوئی فائدہ
نہیں ہوا۔ معاملہ الجھتا ہی گیا۔ آخر میں یونیورسٹی کچھ دنوں کے لیے بند کر دی
گئی۔ کچھ اساتذہ اور طلباء کے خلاف تادیبی کارروائیاں بھی کی گئیں اور
پروفیسر رئیس احمد یونیورسٹی سے چلے گئے۔ لیکن تلخیاں باقی رہیں۔

یونیورسٹی کے اندر اور باہر ایکٹ میں تبدیلی کے لیے تحریک
نے زور پکڑا۔ علی گڑھ شہر کے غیر مسلم حضرات ایسی کسی تبدیلی کو پسند
نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایسی کوئی تبدیلی کر دی گئی تو
پھر ان کے بچے اس یونیورسٹی سے وہ فائدے نہیں حاصل کر سکیں
گے جو اب تک حاصل کرتے رہے ہیں۔ سرسید کے زمانے سے غیر مسلم
طلبا کے داخلے پر کبھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے
ایک حلقہ میں یہ خیال تھا کہ یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ میں تبدیلی کرنے

کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان قومی دھارے سے نکل جائیں گے اور ان کے
خلاف ملک میں تعصب بڑھ جائے گا اور انہیں نہ تو دوسرے قومی اداروں
میں ملازمتیں ملیں گی اور نہ پڑھنے کے لیے داخلے ۔

تیسری طرف عام مسلمانوں میں یہ خیال تھا کہ اگر اس موقع پر مدافعت
نہیں کی گئی تو مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے ویسی ہی جگہ رہ جائے گی
جیسے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں ۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر اقلیت کا درجہ
اسے نہ دیا گیا تو بہت جلد یہاں کے طلبا اور اساتذہ کی اکثریت غیر مسلموں
کی ہو جائے گی ۔

میری اپنی رائے یہ تھی کہ کسی قانونی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے صرف
حکومت پارلیمنٹ میں یہ اعلان کر دے کہ یونیورسٹی کے مقاصد وہی
رہیں گے جو سرسید احمد خاں کے قایم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے تھے
اور یونیورسٹی میں بدستور مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ
دی جائے گی۔ میں نے اپنی رائے ایک تحریری صورت میں حکومت کو پیش
کر دی تھی لیکن اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں
کی اکثریت کانگریسی حکومت کے خلاف ہو گئی۔ ۱۹۷۷ء میں مسز گاندھی
کی الیکشن میں شکست کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی ۔ ان کی شکست
کے بعد جو حکومت بنی وہ اخلاقی طور پر مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں مسلمانوں
کی مرضی کے مطابق تبدیلی کرنے کی پابند تھی۔ اسی شرط پر مسلمانوں کی بہت
سی تنظیموں نے اس کی حمایت کی تھی لیکن قبل اس کے کہ کوئی قانون پاس
ہو سکے وہ حکومت ختم ہو گئی اور مسز گاندھی ایک مرتبہ پھر الیکشن جیت
گئیں ۔

اس دفعہ مسز گاندھی نے الیکشن کے وقت یہ وعدہ کر لیا تھا کہ
وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قانون میں مسلمانوں کی مرضی کے مطابق
تبدیلی کر دیں گی ۔ مسلمان خوش ہو گئے اور مسز گاندھی الیکشن میں کامیاب
ہو گئیں ۔ ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ایسی تبدیلی کر دی گئی جس
سے عام مسلمان مطمئن ہو گئے ۔ اب یہ ایکٹ گزشتہ پانچ برسوں سے نافذ
ہے لیکن وہ خدشات جو غیر مسلموں کو تھے ، غلط ثابت ہوئے اور اسی
طرح یہ بھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف تعصب بڑھ گیا ہو۔ وہ اب بھی
دوسرے اداروں سے اسی قدر فائدہ اٹھاتے ہیں جتنا کہ موجود ایکٹ
کے نفاذ سے قبل اٹھاتے تھے ۔

غالباً مسز گاندھی کی حکومت کو الیکشن سے پہلے ہی یہ اح
ہو گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں اسے اپنی پالیسی بدلنا ہو
چنانچہ ۷۴ء میں پروفیسر علیم کے بعد نئے وائس چانسلر کے تقر
وقت ایک ایسے صاحب کا انتخاب ہوا جن کا دامن اس اختلافی مس
آلودہ نہیں تھا اور پرو وائس چانسلر خلیق احمد نظامی صاحب کو
کیا گیا جن کے کندھوں پر حکومت کی یونیورسٹی ایکٹ سے متعلق پا
کو نافذ کرنے کی اہم ذمہ داری تھی۔ اس سے بس یہی نتیجہ نکلتا
ہندوستانی جمہوریت میں اگر ایک بڑی اقلیت اپنے معاملات
متعلق کوئی رائے قایم کرے تو اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
کے ساتھ یہ ہوا کہ قبل اس کے کہ اسے مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں
پالیسی بدلنے کا موقع ملتا الیکشن آ گئے اور اقلیت نے خلاف د
سابق بہت بڑی تعداد میں کانگریس کے خلاف ووٹ دے کر
شکست کا سامان کر دیا ۔

مسز گاندھی کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد جب نیا
پاس ہو گیا تو اس طرح وہ جھگڑا ختم ہوا جو ۱۹۶۵ء میں شروع
تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے ایکٹ کے پاس ہو جانے سے
لوگوں کو تعجب ضرور ہوا (جن میں میں بھی شامل تھا) جو یہ سمجھے تھے
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف اسی صورت میں کامیابی سے چل سکتی
جب تک یہاں اس پالیسی پر عمل ہوتا ہے جو حکومت کے نزدیک
ہے۔ غالباً ہم لوگوں نے ہندوستانی جمہوریت کی اندرونی بنیاد
نظر انداز کر دیا تھا۔ جو بات اب سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی
جمہوریت میں برسر اقتدار پارٹی کا سب سے اہم مقصد یہ ہوتا
کہ وہ اقتدار میں رہے۔ باقی تمام باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔
یونیورسٹی کے معاملے میں جب حکومت نے دیکھا کہ اگر ایسی پالی
اختیار کی جائے جس سے مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ مطمئن ہو جا
تو اس طرح اس کے آئندہ اقتدار کی ضمانت ہو جائے گی۔ اس
بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی پالیسی بدل دی۔ جو بات سمجھنے کی ہے و
ہے کہ حکومت کوئی ایسی پالیسی ہرگز نہیں اختیار کر سکتی جو عام ہند

کے مفاد کے خلاف ہو۔ اگر عام ہندوؤں کے مفاد پر کوئی ضرب نہیں پڑتی
ہے تو ہر پالیسی میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ
اقلیتوں کو ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے کہ اکثریت ان کے ساتھ رہے
مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں حکومت اپنی پالیسی بدلنے میں اس وجہ سے
کامیاب رہی کہ ایکٹ بدلنے سے عام ہندوؤں کے مفاد پر کوئی اثر
نہیں پڑتا تھا۔

چند برسوں کے بعد ۱۹۸۵ء میں اسی طرح کا ایک اور مسئلہ کھڑا
ہو گیا۔ ایک بہتّر سالہ مسلمان خاتون شاہ بانو نے اپنے سابق شوہر پر
نان نفقہ کا دعویٰ کیا۔ دلیل یہ تھی کہ طلاق کے بعد بھی سابق شوہر نان نفقہ
کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچا جس نے شاہ بانو کا
دعویٰ تسلیم کر لیا اور اپنے فیصلہ میں جواز کے طور پر احادیث کا حوالہ
دیا اس کے ساتھ ہی گویا کہ یہ رائے بھی دی کہ ہندوستان کے تمام
شہریوں کے لیے بلا تفریق مذہب ایک سول کوڈ ہونا چاہیے مسلمانوں
کا ایک طبقہ پھر اس کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ یہ لوگ وہی تھے جو یونیورسٹی
کے معاملے میں بھی ۶۵ء سے ۸۱ء تک حکومت کے خلاف تھے، دوسری
طرف مسلمانوں کا وہ طبقہ جو یونیورسٹی کے معاملے میں مختلف رائے رکھتا
تھا۔ اس دفعہ بھی مسلمانوں کے اس احتجاج کے خلاف تھا۔ غنیمت یہ ہوا
کہ کشمکش نے طول نہیں کھینچا اور حکومت نے ایک قانون کے ذریعہ اس
طبقہ سے صلح کر لی جو سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف تھا۔

اس دفعہ بھی وہی ہوا جو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں ہوا
تھا۔ یعنی مسلمانوں کا وہ مطالبہ جو کسی طرح عام ہندوؤں کے مفاد کو
نقصان نہیں پہنچاتا تھا، تسلیم کر لیا گیا۔

بس یہی گر ہے ہندوستان میں اقلیتوں کی سیاست کا۔ جہاں
تک ممکن ہو سکے کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہونے دیں جس میں ان کے مطالبے
عام غیر مسلم ہندوستانیوں کے مفاد سے ٹکرائیں۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو سوائے
خرابی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

ہم سب یعنی ہندوستان کی اکثریت (جس میں ہندو اور مسلمان
دونوں شامل ہیں) کا فائدہ اس میں ہے کہ یہ ملک اجارہ داری کی
گرفت سے نکلے اور یہاں حقیقی سیاسی اور معاشی جمہوریت ہو۔ اس کے
لیے مسلمانوں کو اپنے ہم وطن لوگوں کی اکثریت سے مل کر ایسی فضا تیار
کرنا پڑے گی جس میں موجودہ اجارہ داری کی جگہ اصلی جمہوریت لے لے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہندوستان کی تقریباً پانچ فیصدی آبادی کو ہر
میدان میں اجارہ داری میسر ہے۔ چاہے وہ اخبارات ہوں، چاہے
صنعت و حرفت، چاہے تجارت ہو یا تعلیم اور اب تو انتظامیہ اور فوج
میں بھی رفتہ رفتہ یہی حالت ہوتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجارہ
داری صرف اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک ہندوستانیوں
کی اکثریت کو ان میدانوں میں ان کے حقوق نہ ملیں۔

لیکن ہندوستانیوں کی اکثریت ابھی تک اصلی بات نہیں سمجھ
سکی ہے۔ مختلف قسم کے نعرے لگا کر اصلیت کو چھپانے کی کوشش کی
جا رہی ہے۔ ایک نعرہ یہ لگایا جا رہا ہے کہ ہندوستان میں چوں کہ
اکثریت ہندوؤں کی ہے، اس لیے اس کی تہذیب، سیاست اور
پوری معاشرت پر ہندو مذہب کی چھاپ ہونا چاہیے۔ بظاہر یہ
بات ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب ان
معنوں میں کوئی مذہب نہیں جن میں اسلام یا عیسائیت یا یہودیت
ہے۔ اصل میں یہ ایک تہذیبی تصور ہے اور اس تصور کی چھاپ ہندوستان
پر ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس تصور میں ساون کی کالی گھٹائیں
ہیں۔ یہاں کے راگ راگنی، ہیر رانجھا اور نل دمن کی داستانیں ہیں۔
طبلہ، سارنگی، بنارس کی ساریاں، لکھنؤ کے کرتے اور راجستھان
کی چنری کے دوپٹے، بنگال کی مٹھائیاں، مدراس کے دوسے اور
پنجاب کے لسّی کے گلاس سب شامل ہیں۔ اس تہذیب کا شباب اگر دیکھنا
ہو تو چلیے کسی میدان میں رام لیلا دیکھیں، اجمیر چلیے بندہ نواز گیسودراز
کے یہاں چلیے اور دور کیوں جایے اپنے گھر کی شادیاں دیکھیے۔ وہاں
دلہن کو مانجھے بیٹھا ہوا دیکھیے ان کی رخصتی پر بابل سینے اور ماں کی
ہچکیوں، باپ کے آنسوؤں اور بھیّا کے پچھاڑوں میں ہندوستانی
تہذیب اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر دکھائی دے گی۔ یہ تہذیب ہم
سب ہندو مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔

لیکن سیاست میں ہندو مذہب کو ایسا پردہ بنایا جا رہا ہے
جس کے پیچھے اجارہ دار اپنا جنگ زرگری اطمینان سے جاری رکھتے ہیں

ذرا گجرات کو دیکھیے وہاں سماج کے نسبتاً کمزور طبقوں کی حکومت کو ہٹانے کی یہ
ترکیب کی گئی ہے کہ اخباروں اور سیاسی جلسوں کے ذریعے ثابت کیا جائے
کہ گجرات میں اصل خطرہ تو ہندوؤں کو مسلمانوں سے ہے۔ اس لیے مسلمانوں
کے خلاف مہم چلائی گئی ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے لگاتار ہندو مسلم فساد ہو رہے
ہیں۔ ان فسادوں کے پیچھے یہ سازش ہے کہ اجارہ دار ہندو سماج کے محافظ بن کر آئیں
تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا سیاسی اقتدار دوبارہ حاصل کرلیں۔

میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تجزیہ نامکمل ہے اور اس سے وہ
تمام باتیں سمجھ میں نہیں آسکتیں جو ہمارے ملک میں ہو رہی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ
یہ باتیں بہت حد تک سمجھ میں آجائیں گی اگر ہم اس خاکے میں تھوڑا سا رنگ بھرنے
کی کوشش کریں بشرطیکہ وہ رنگ اصلی ہو۔

ہندوستان پر حکومت اجارہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ حکمران پارٹی
کی جتنی اور جس طرح مدد کرتے ہیں اس سے یہ بات یقینی ہو گئی ہے کہ ان کے
خلاف حکمران پارٹی کبھی کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکتی۔ معیشت کی بنیاد بہت
حد تک ایسی دولت پر ہے جو قانون کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ حکومت
کو اس کا علم ہے لیکن وہ اس معاملے میں بے بس ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک
محکمہ حتیٰ کہ محکمۂ دفاع بھی رشوت اور اقربا پروری کے شکنجوں میں پوری
طرح جکڑا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قانون کا بندوبست بھی اس سے نہیں
بچا ہے۔ رہیں قانون ساز اسمبلیاں، ان کے متعلق کچھ نہ کہیے ورنہ بات بہت
دور تک جائے گی۔ سنا ہے کہ کشمیر اسمبلی میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی
حکومت کو گرانے کے لیے ایک ایک ووٹ پر ایک ایک کروڑ روپیہ تک خرچ
کیا گیا تھا۔

جب ملک کی سیاست اور معیشت اس درجہ گر جائے تو اس کی
روحانی بقا بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام قدریں جن پر ہم صدیوں
سے ناز کرتے تھے آج سسکیاں لے رہی ہیں اور طرح طرح کے بہروپیے
عجیب عجیب لباس پہن کر ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے جب کسی نے کہا تھا:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
اور تو سمجھا کہ یہ آزادی کی ہے نیلم پری

تو بڑی مشکل سے اس کے معنی سمجھ میں آتے تھے۔ آج اس کی تفسیر کے لیے
کسی محقق کی ضرورت نہیں۔

میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیا کہنے کے لیے پہلو بدل رہے ہیں۔ آپ کہنے
والے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب دوست نہیں۔ کسی بائیں بازو
سیاسی پارٹی کا الیکشن مینی فیسٹو ہے۔ آج کل یہ تو سبھی کہتے ہیں کہ سرما
داری کے خاتمے کے بغیر اقلیتوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اس بات
دہرانے سے کیا فائدہ؟ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ سیاسی مسائل کے
کے لیے کوئی فارمولا ایسا نہیں ہے کہ جس کے دہرانے سے مسائل حل
میں نے تو صرف دو مثالیں دی ہیں جن سے شاید اس راستے کا پتہ چلتا
جس پر ہمیں جانا ہے۔ جن مشکلوں میں ہم گھرے ہوئے ہیں ان سے با
نکلنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی سیاسی پارٹی بنائے اور
ایسی ترکیبیں سوچے کہ جس سے اس کا اقتدار دوسروں پر ہو جائے
لیے مسلمان بھی آر ایس ایس۔ ایس کی طرح اپنی کوئی پارٹی بنا کر یہ کوشش
کہ اپنی بات دوسروں سے منوالیں۔ یہ طریقہ لڑائی کا ہے اور شک
کا۔ کیوں کہ موجودہ حالات میں اس کا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ملک کے دوسرے محروم لوگوں کے سا
مل کر موجودہ نظام کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ راستہ لمبا بھی ہے ا
پر پیچ بھی۔ لیکن کامیابی کی امید اسی راستہ پر چلنے میں ہے۔

ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ بات مجھ پر روشن ہے کہ
ملک کے دس بارہ کروڑ لوگ بحیثیت ایک جماعت کے یہ سمجھنے لگیں کہ
کا وجود نہ تو ملک کے انتظام کے لیے ضروری ہے اور نہ اس کے دفا
کے لیے تو یہ ایک خطرناک صورت ہوگی۔ اس کثیر آبادی کی انرجی اگر تعمیر
اور مثبت کاموں کے لیے استعمال نہیں ہوتی تو یہ تخریب کی طرف ما
ہوں گے اور ملک کا استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔ تھرموڈائنا
کا دوسرا قانون تو یہی کہتا ہے کہ اگر کسی سسٹم میں ایسی انرجی موجود ر
ہے جو اس سسٹم کو برقرار رکھنے میں کام نہ آئے تو وہ سسٹم مستحکم
رہ سکتا۔ اس لیے مسلمان نوجوان اگر فوج میں بھرتی نہیں کیے جاتے
پولس میں نہیں لیے جاتے، دفتروں میں ملازمت نہیں پاتے اور اسکولو
اور کالجوں میں نہ پڑھتے ہیں اور نہ بڑھاتے ہیں تو آخر یہ لوگ جھنا
ڈاکہ، بدمعاشی، جعل سازی اور اسمگلنگ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے

فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں بھی بے کار نوجوان دنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں گے کہ اسی طرح وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اپنے عزیزوں اور دوستوں کی نظر میں اپنی ضرورت محسوس کرا سکیں۔

دیکھیے زندگی کیا کہتی ہے۔ بنگال میں جیوتی باسو کی کمیونسٹ حکومت کے قیام میں مسلمانوں کی طرف داری کو بہت کچھ دخل ہے۔ وہاں کے مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس حکومت میں کم از کم ہندو مسلم فساد سے تو وہ محفوظ ہیں۔ اگر یہی صورت باقی رہی تو شاید آہستہ آہستہ بنگال میں ہندو مسلم سوال کا کوئی نیا حل بھی نکل آئے۔

اب ذرا اس تصور کو کھلی چھوٹ دے کر دیکھیے کہ کیا نظر آتا ہے ہندی اور اردو بولنے والے علاقوں میں ایک ایسی جماعت بنتی ہے جو مسلمانوں کو کسی طرح یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ وہ ان کی جان، مال اور عزت کی اسی طرح قدر کرے گی جیسے کہ جیوتی باسو کی حکومت بنگال میں کرتی ہے تو بھلا کون سی طاقت ہے جو اس پارٹی کو برسر اقتدار آنے سے روک سکے؟

"۱۹۷۷ء میں جب کانگریسی حکومت کی شکست کے بعد ہندوستان کے حالات بہت غیر یقینی ہو گئے تھے تو میں نے دہلی میں اپنے چند دوستوں کو جمع کیا، ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر، ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک ممبر، ایک ریاستی اسمبلی کے اسپیکر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اور مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر بھی تھے۔ ہم لوگ اس پر متفق تھے کہ وقت کی بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہندو مسلم تعلقات بہتر ہوں۔ ایک رائے یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل پر اگر ہم لوگ کچھ اور دانشوروں کے مشورہ سے ایک منشور تیار کر سکیں تو اسے چند اہم ہندو دانشوروں کے سامنے پیش کر کے ان کی رائے معلوم کریں۔ اگر ہم سب کسی منشور پر متفق ہو سکیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس منشور کو ہم ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش کریں گے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ایسا کوئی منشور تیار ہو گیا تو ملک کی اہم سیاسی پارٹیوں کے لیے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔

ہم لوگ تین بار آپس میں ملے لیکن قبل اس کے کہ کوئی نتیجہ خیز بات نکلے ہندوستان میں الیکشن ہوئے اور مسز گاندھی دوبارہ برسر اقتدار آ گئیں۔ اس کے بعد سیاست بڑی تیزی سے بدلنے لگی۔ یہاں تک کہ جون ۱۹۸۴ء کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا جس میں ہندوستانی فوج نے امرت سر کے گوردوارہ پر پیش قدمی کر دی چند مہینوں کے بعد مسز گاندھی قتل کر دی گئیں اور ان کے بڑے صاحبزادے نے حکومت سنبھال لی۔ اب حالت یہ ہے کہ ہندو مسلم فسادات بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں سکھ اور ہندو اختلافات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک طرف تو پنجاب میں دہشت گردی کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف بہار میں اونچی ذات والوں سے نیچی ذات والوں کی لڑائی کی خبریں بھی ملتی ہیں۔ غرض "تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے۔"

اس اندھیرے میں امید کی کرن وہی منشور ہے جو ہم ۱۹۷۷ء کے بعد نہ تیار کر سکے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کی تیاری کے لیے پھر اپنے ساتھیوں کو آواز دوں۔

"اے میرے دوستو! اگر تم نماز چھوڑ دو گے تو میں افسوس سے کہتا ہوں کہ اس وردی کو اتار پھینکو گے اور خدا کی فوج میں یا ہماری قوم میں شامل نہ رہو گے۔ ہر ایک رجمنٹ، ہر ایک پلٹن کا کچھ نہ کچھ نشان ہوتا ہے کسی کے ہاتھ پر کسی کی بانہوں پر کسی کے کندھے پر۔ ہماری رجمنٹ یا خدائی پلٹن کا نشان ہمارے ماتھے پر ہے جب کہ وہ خدا کی عظمت کے آگے زمین پر ٹکا ہوا ہو۔"

سر سید

میڈم کیوری

اختر حسین آفتاب

دنیا میں کچھ عظیم سائنس داں پیدا ہوئے ہیں۔ ہم انہیں یاد رکھتے ہیں، انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کی برسی مناتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ ان کے ایجادات اور انکشافات سے انسان کو فائدہ پہنچا اور سماجی تغیر (SOCIAL CHANGE) میں مدد ملی۔ میڈم کیوری بھی ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھیں۔ وہ پہلی عورت تھی جنہیں نوبل پرائز (NOBEL PRIZE) ملا اور واحد سائنس داں تھیں جنہیں دوبار نوبل پرائز ملا، ایک فزکس میں اور دوسرا کیمسٹری میں۔

میڈم کیوری کی پیدائش ۷ نومبر ۱۸۶۷ء کو وارسا (WARSAW) میں ہوئی تھی جو کہ پولینڈ (POLAND) کی راجدھانی تھی۔ میڈم کیوری کا اصلی نام ماریا کلوڈووسکا (MARYA SKLODOVSKA) تھا۔ ان کے والد کا نام ولاڈسلاو کلوڈووسکی (VLADISLAV - SKLODOVSKI) تھا جو کہ وارسا کے ایک اسکول میں فزکس کے ٹیچر تھے۔

سائنس کی ابتدائی تعلیم میڈم کیوری نے اپنے والد سے حاصل کی۔

میڈم کیوری کا داخلہ اسکول میں ہوا۔ وہ بہت اچھی طالب علم تھیں ان کی یادداشت بہت بہتر تھی۔ وہ اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل آتیں۔ ۱۵ سال کی عمر میں انہوں نے اسکول کی تعلیم ختم کی اور انہیں کئی سونے کے تمغے بھی ملے۔

ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن یہ بڑا ہی مشکل امر تھا۔ پولینڈ اس وقت روس یعنی زار کے ماتحت تھا۔ لڑکیوں کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ کالج میں داخلہ حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ عزم میں بہت بڑی طاقت ہے۔ میڈم کیور[ی] کا عزم پختہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم فرانس [میں] حاصل کریں گی۔ مگر پیسے کہاں سے فراہم ہوں گے! وہ غریب تھیں ان کے پاس پیسے نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے چند سال ٹیچر اور گورنس [کی] حیثیت سے ملازمت کی اور ضرورت بھر روپے حاصل کیے۔

۱۸۹۱ء میں میڈم کیوری نے وارسا چھوڑ دیا اور فرانس [کے] لیے روانہ ہوگئیں۔ قدرت نے بھی ان کی مدد فرمائی۔ ظاہر ہے کہ قدرت بھی اسی کی مدد کرتی ہے جو کہ خود اپنی مدد آپ کرنے کو تیا[ر] ہوتا ہے۔ میڈم کیوری کا داخلہ فرانس کے سوربون یونیورسٹی (SORBONNE UNIVERSITY) میں ہوا۔ یہاں انہوں نے دو ماسٹرز ڈگریز (TWO MASTER'S DEGREES) کی تیاری کی، ایک فزکس [میں] اور دوسری میتھ میٹکس میں۔ ظاہر ہے کہ انہیں دن رات محنت [کرنی] پڑتی تھی۔

میڈم کیوری کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ نہ تو انہیں کوئی اسکا[لر] شپ ملی تھی نہ اور کسی بھی طرح کی کوئی دوسری مدد۔ ایک انتہائی معمولی کمرہ ان کی رہائش گاہ تھا۔ ان کا کھانا بہت معمولی تھا۔ کبھ[ی] کبھی تو صرف پاؤ روٹی کی دو سلائس اور ایک کپ چائے پر پو[را] دن گزر جاتا لیکن کام میں دلچسپی اور عزم میں وہی پختگی باقی ر[ہی]۔ سوربون یونی ورسٹی میں جتنے بھی امتحان انہوں نے دیے، وہ س[ب] میں اوّل آئیں۔ اب اُن کی عمر ۲۶ سال کی ہو چکی تھی۔

اسی دور میں میڈم کیوری کی ملاقات پائرے کیوری (PIERRE CURIE) سے ہوئی۔ سائنس کی دریافت کی جستجو

دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ پائرے کیوری پیرس
میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک ڈاکٹر تھے۔
پائرے کیوری پیرس شہر کی فزکس اور کیمسٹری لیباریٹری (LABO-
RATORY) کے ہیڈ (HEAD) تھے۔ کرسٹل (CRYSTAL)
کا مطالعہ جو انہوں نے کیا تھا۔ اس کے لیے انہیں کافی مقبولیت حاصل
ہو چکی تھی۔ سائنس کی کڑی نے ماریا اور پائرے کو اور بھی نزدیک
کر دیا اور ۱۸۹۵ء میں اُن دونوں کی شادی ہو گئی۔ سچ مچ یہ شادی
سائنس کی دنیا میں عظیم پاٹنر شپ (PARTNER SHIP) تھی۔

ماسٹر ڈگری تو مل گئی لیکن صرف اسی سے ذہن کی پیاس کیسے
بجھتی! آگے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ کم از کم ڈاکٹورل ڈگری تو
حاصل کی ہی جائے۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ سائنس
کی دنیا میں کوئی نئی تحقیق پیش نہ کی جائے۔

فرانس کے ایک سائنس داں جن کا نام ہنری بیکیرل
(Henri Becquerel) تھا ان کی یہ دریافت تھی کہ کوئی
سولڈ میٹر (Solid Matter) جس کے اندر یورینیم کا جز
ہو وہ ایکس رے (X-Rays) جیسی شعاعیں خارج کرتا ہے لیکن
ایسا کیوں؟ یہ وہ پتہ نہ لگا سکے۔ میڈم کیوری نے اسی دریافت کا
بیڑا اٹھایا۔ ریڈیم کی دریافت کی سنگِ بنیاد یہیں سے شروع ہوتی
ہے۔

سائنسی تحقیق کے لیے تجربہ گاہ (Laboratory) ضروری
ہے۔ میڈم کیوری کو بھی اس کی سخت ضرورت پڑی۔ بہت ساری
کاوشوں کے بعد انہیں فزکس اسکول کا ایک گرا پڑا اسٹور روم ملا۔
یہی ان کی لیباریٹری تھی۔ تجربے کے لیے سامان نہ تھے۔ کمرہ سرد اور
مرطوب تھا لیکن عزم کی روشنی نے کمرے کی تاریکی کو دور کر دیا۔ یہی
وہ کمرہ تھا جس میں ریڈیم کے انکشاف کا آغاز ہوا۔

تجربے نے یہ ثابت کیا کہ یورینیم سے نکلنے والی شعاعیں عجیب و
غریب ہوا کرتی ہیں۔ کیوری نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ کیا دوسرا
کیمیائی شئے (CHEMICAL SUBSTANCES) بھی اسی طرح کی شعاعیں
خارج کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے بہتری کیمیائی اشیاء کا
بغور مطالعہ کیا۔

تجربہ جاری رہا۔ اسی دوران کیوری کو علم ہوا کہ پچ بلانڈے
(PITCH BLENDE) جو کہ ایک منرل ہے، بہت تیز شعاعیں
خارج کرتا ہے۔ یہ منرل (MINERAL) بھورے اور کالے دونوں ہی
رنگ کا ہوتا ہے جس میں خصوصی طور سے یورینیم آکسائڈ (Uranium
Oxide) پایا جاتا ہے۔

اب کیوری کے مطالعے نے ایک نیا موڑ اختیار کیا — جز
(Element) تو وہی ہے جس سے مزید توڑ کر دوسری شئے
(SUBSTANCE) کوئی حاصل نہ کی جا سکے۔ کیوری نے تو سبھی طرح کے
جز کا مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ پچ بلانڈے سے جتنی
تیز شعاعیں ملتی ہیں اتنی تیز شعاعیں کسی بھی دوسری شئے میں نہیں ملتیں
اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پچ بلانڈے کے اندر کوئی نیا جز
(ELEMENT) ضرور ہے۔ شئے (SUBSTANCE) سے خارج
شعاعوں کے خارج ہونے کے سلسلے کو ریڈیو ایکٹیویٹی (RADIO -
ACTIVITY) کہتے ہیں۔ میڈم کیوری جس جز (ELEMENT)
کی تلاش میں تھیں جو کہ زیادہ سے زیادہ تیز شعاعیں نکال سکے، اسی کا
نام انہوں نے ریڈیم (RADIUM) رکھا۔

۱۸۹۸ء میں میڈم کیوری نے اس نئے جز پر ایک مضمون شائع
کیا جسے ریڈیم کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے سائنس داں اسے تسلیم کرنے
کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے میڈم کیوری سے ریڈیم کا مطالبہ کیا
میڈم کیوری نے ان کے چیلنج کو قبول کیا۔ کام بڑا ہی مشکل تھا مگر عزم
بھی اتنا ہی ٹھوس تھا۔

سائنس کی دنیا کے اس سخت امتحان میں پائرے کیوری نے
بھی میڈم کیوری کا ساتھ دیا۔ اس وقت میڈم کیوری ایک بچی کی
ماں بن چکی تھیں۔ تجربے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے میڈم
کیوری نے پیرس کے نزدیک لڑکیوں کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔
پیسوں کا سامان تو کسی طرح ہو سکا، لیکن ایک بڑے تجربہ گاہ
کے لیے جگہ کیسے حاصل کی جائے! کاوش جاری رہی اور میڈم کیوری
کی پہلی تجربہ گاہ کے نزدیک ایک لکڑی کا شیڈ انہیں دیا گیا۔ اس میں

سامان نہ تھا جس سے تجربہ کیا جاتا۔ بارش ہو جانے پر پانی بھی ٹپکتا رہتا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں میڈم کیوری نے ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک دن رات اپنا تجربہ جاری رکھا۔

اب ضرورت اس بات کی پڑی کہ زیادہ سے زیادہ پچ بلانڈے حاصل کیا جائے تاکہ تجربے میں اس کا استعمال کثرت سے کیا جاسکے۔ تلاش شروع ہوئی۔ پتہ چلا کہ بوہیمیہ (BOHEMIA) کے لوگ جو کہ شیشہ کا سامان بنایا کرتے وہ کافی مقدار میں پچ بلانڈے کا استعمال کرتے۔ وہ یورینیم نکال لیا کرتے اور پچ بلانڈے کی گرد پھینک دیا کرتے۔ میڈم کیوری کو تجربے کے لیے اس بیکار پچ بلانڈے کی گرد کی ضرورت پڑی۔ گاڑیوں پر لدوا کر میڈم کیوری نے اس گرد کو تجربہ گاہ میں منگوایا۔ چونکہ پیسے بہت کم تھے اس لیے کھانا بھی کم کر دیا۔ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا سب کچھ تجربہ کی نذر ہو گیا۔

دن رات میڈم کیوری پچ بلانڈے کی گرد کو ایک بڑے برتن میں گرم کرتی رہتیں اور اسے لوہے کے ایک بڑے ڈنڈے سے چلاتی رہتیں کھانے کے وقت بھی ان کا یہ کام جاری رہتا۔ میڈم کیوری کا یہ خیال تھا کہ پچ بلانڈے کی ۱۰۰ گرام گرد انہیں ایک گرام ریڈیم دے دے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ دس لاکھ گرام پچ بلانڈے سے ایک گرام ریڈیم حاصل کیا جاسکتا۔ لیکن وہ اپنے تجربے میں لگی رہیں۔

خدا مدد اُن ہی لوگوں کی کرتا ہے جو کہ اپنی مدد خود کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر بڑا کام کرنا ہے تو پہاڑ جیسا عزم چاہیے۔ قوت خود ارادی کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہیے، قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور ذاتی نفع کے تصور کو خیرباد کرنا چاہیے۔ کام بڑا ہے تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ تو سامنے آئے گا ہی مگر کرنے والے کو اس کا فائدہ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ فائدہ تو ملے گا ہی مگر وہ وقت جو کہ فائدہ ڈھونڈنے میں صرف ہو، اگر کام پر ہی صرف ہو تو حصول مقصد میں زیادہ آسانی ہوگی اور کامیابی بھی شاندار ہوگی۔

۱۹۰۲ عیسوی تھی۔ شام کا وقت تھا، آفتاب آغوش آسمان میں محوِ خواب ہو چکا تھا، شب کی تاریکی اپنی چادر پھیلا رہی تھی، اچانک میڈم کیورے اور پائرے کیوری کی نگاہ ایک شیشہ کے کنٹینر۔ (GLASS CONTAINER) پر پڑی جس کے اندر سے نیلی روشنی نکل رہی تھی۔ میڈم کیوری بے ساختہ بول اٹھیں "روشنی مت کرو۔ وہ دیکھو اس ٹیبل پر! ایک چھوٹی سی نیلی روشنی تاریکی میں جگمگا رہی ہے"۔ یہی وہ روشنی تھی جس کی تلاش میں میڈم کیوری نے اپنا سب کچھ لگا دیا تھا یعنی ریڈیم۔

شعاعیں تو ریڈیم اور یورینیم دونوں سے ہی نکلتی ہیں لیکن ریڈیم کے ذریعہ نکلنے والی شعاعیں یورینیم کے ذریعہ نکلنے والی شعاعوں کے مقابلے میں بیس لاکھ گنا زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ ریڈیم کا اثر انسانی جلد پر پڑتا ہے۔ پہلے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے پھر جلنے لگتا ہے۔ اسی لیے ریڈیم کو لیڈ کیس (LEAD CASE) میں رکھا جاتا ہے۔ چمڑے کی متعدد بیماریوں کے لیے ٹیومر کے لیے اور کینسر کے لیے ریڈیم بہترین علاج ہے۔

ریڈیم کی ایجاد نے میڈم کیوری اور پائرے کیوری کو عالمی مقبولیت بخشی۔ انسانی خدمت کے لیے ریڈیم دنیا کے لیے ایک بہت بڑی دین ہے۔ لندن کی رائل سوسائٹی نے میڈم کیوری اور پائرے کیوری کو ڈیوی میڈل (DAVY MEDAL) سے نوازا۔ میڈم کیوری وہ پہلی عورت تھیں جنہیں رایل سوسائٹی نے لکچر دینے کے لیے دعوت پیش کی۔ سویڈش اکاڈمی آف سائنس نے میڈم کیوری اور پائرے کیوری کو ۱۹۰۳ء میں نوبل پرائز (فزکس) (NOBEL PRIZE IN PHYSICS) سے نوازا۔ فرنچ اکاڈمی آف سائنس (French Academy of Science) جس نے اب تک انہیں نظر انداز کیا تھا، اب انہیں کافی اچھی رقم سے نوازا۔

۱۹۰۶ء میں پائرے کیوری کی ایکسیڈنٹ سے موت ہو گئی۔ میڈم کیوری کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا، لیکن انہوں نے اسے برداشت کیا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہیں۔ ریڈیم پر ان کی ریسرچ جاری رہی۔ ۱۹۱۱ء میں انہیں کیمسٹری میں دوسرا نوبل پرائز ملا۔ یہ انعام انہیں خالص ریڈیم کو الگ کرنے کے لیے دیا گیا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میڈم کیوری کی بیٹی ایرین (IRENE) نے بھی فزکس میں ۱۹۳۵ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

ریڈیم کی ایجاد اور نوبل پرائز ملنے کے بعد میڈم کیوری عالمگیر

شہرت کی مرکز بن گئیں۔ پہلے انھوں نے دنیا کے لیے کچھ کیا۔ بعد میں دنیا نے
انہیں نوازا۔ روپیہ، پیسہ، شہرت، مقبولیت یہ ساری چیزیں ان کے
قدموں میں آکر جمع ہو گئیں۔ انہوں نے بھی اس کا صحیح مصرف لیا۔ انہوں
نے اپنے شوہر کی یاد میں پیرس میں ایک ریڈیم انسٹی ٹیوٹ قایم کیا جو ریسرچ
کام کرتا ہے اور عظیم کارہائے نمایاں انجام دے رہا ہے۔ پہلی جنگ
عظیم کے بعد امریکہ کی عورتوں نے ایک گرام ریڈیم کا تحفہ میڈم کیوری
کی خدمت میں پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء میں میڈم کیوری نے وارسا
(Warsaw) میں یعنی اس جگہ جہاں کہ وہ پیدا ہوئی تھیں، دوسرا
ریڈیم انسٹی ٹیوٹ قایم کیا اور امریکہ کی عورتوں کے ذریعے دیا گیا ایک
گرام ریڈیم اسی انسٹی ٹیوٹ کو دے دیا۔ یہ ہے عظیم انسانی کردار
کی پہچان۔

میڈم کیوری آج زندہ نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ۴ جولائی ۱۹۳۴ء
کو ہوا لیکن کیا وہ سچ مچ مر چکی ہیں؟ نہیں، وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اس
کرہ ارض پر پھیلی ہوئی انسان کی آبادی ریڈیم سے آج بھی مستفید ہو رہی
ہے۔

۷ نومبر ۱۹۸۷ء کو میڈم کیوری کی پیدائش کی ۱۲۰ ویں سال گرہ
ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے، ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے
ایک سائنس نواز کی حیثیت سے اور ایک ادنیٰ سماجی کارکن ہونے کی
حیثیت سے میں میڈم کیوری کی خدمت میں اپنا بہترین خراج عقیدت پیش
کرتا ہوں اور ان تمام جگہوں سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوں جہاں کہ
نے کام میں اپنا بیش قیمت وقت صرف کیا۔

میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ اگر میڈم کیوری دولت
ہونا چاہتیں تو انہیں اس کا پورا پورا موقع تھا۔ بڑی بڑی کمپنیاں ریڈ
کا فارمولا خریدنے کے لیے انہیں کچھ بھی دینے پر رضامند تھیں
لیکن انہوں نے فارمولا فروخت نہیں کیا، اسے پوری دنیا میں شایع ک
صرف اس لیے کہ انسانیت کو اس سے فائدہ پہنچے۔ یہ کتنی عظیم قربانی
یہ وہی قربانی ہے جس نے میڈم کیوری کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

میڈم کیوری کی زندگی، ان کے عظیم کارنامے
ان کی بے مثال قربانی، ان کا ٹھوس عزم اور ان کی بے پناہ
ہمارے لیے، ہمارے بچوں اور بچیوں کے لیے اور
آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ ہ
ان کی زندگی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

آیئے عہد کریں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں کچھ کارہا
نمایاں ضرور انجام دیں گے جس سے ملت، سماج، ملک اور انسا
کا بھلا ہو گا۔ یہی میڈم کیوری کی خدمت میں سب سے
خراجِ عقیدت ہو گا۔

* *

عالم، جاہل کو اس لیے پہچانتا ہے کہ وہ کبھی جاہل رہ چکا
ہے اور جاہل، عالم کو اس لیے نہیں پہچانتا کہ وہ کبھی عالم
نہیں رہا۔

(ارسطو)

حیاتِ سلیمان

ابو علی

[مولانا ابو علی اثری دار المصنفین اعظم گڑھ کی زندہ انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ اس وقت ان کی عمر بیاسی سال سے متجاوز ہے لیکن بحمد اللہ وہ اب بھی لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے فروری ۱۹۸۷ء کے تہذیب الاخلاق میں صاحبِ شعر الہند، مولانا عبد السلام ندویؒ پر مولانا ابو علی کا ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں بعض نئی باتوں کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اب ہم موصوف کا ایک دوسرا مقالہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جس میں انہوں نے اس راز پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ حیاتِ سلیمان، کس طرح عالم وجود میں آئی۔ سید سلیمان ندویؒ کا انتقال ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ہوا تھا۔ اس سال ۲۲ر نومبر کو ان کی چونتیسویں برسی ہوگی۔ اسی مناسبت سے اس مقالے کو نومبر کے شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے] (ادارہ)]

جب سے معارف نکلنا شروع ہوا ہے، کبھی اس نے اپنا کوئی خاص نمبر نہیں نکالا۔ اولاً تو نہ کبھی اس کا خیال پیدا ہوا اور نہ اس وقت تک معارف کے حلقے کا کوئی بڑا آدمی یا شبلی کے معاصرین میں سے کوئی جن سے خود مولانا شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ یا دار المصنفین کا تعلق رہا ہو دنیا سے اٹھا کہ اس کی یادگار میں خاص نمبر نکالنے کا خیال پیدا ہوتا۔ فارسی زبان کے مشہور مستشرق اور لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے مصنف مسٹر براؤن کا انتقال ہوا تو لوگوں نے ان علمی و ادبی تعلقات و روابط کی بنا پر جو ان کو مولانا شبلیؒ، سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین سے اس کے زمانۂ قیام سے تھے، ان کی یاد میں معارف کا خاص نمبر نکالنے کی فرمائش کی تو سید صاحب شذرات میں یہ لکھ کر خاموش ہو گئے کہ ع

نمی رویم بہ راہے کہ کاروان رفتست

سید صاحب کے قیام بھوپال کے زمانے میں جب حبیبِ شبلی، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کا انتقال ہوا تو اس محبت و یگانگت اخلاص و مودت اور ربط و تعلق کی بنا پر جو ان دونوں بزرگوں میں باہم تھا، مولانا شاہ معین الدین ندوی سب ایڈیٹر معارف نے معارف کا کچھ حجم بڑھا کر شروانی صاحب پر ارباب ذوق سے مضامین لکھوا کر شائع کرنے کی تجویز سید صاحب کے سامنے پیش کی تو سید صاحب نے اس کو بہت پسند کیا اور خود شروانی صاحب پر مضمون لکھ کر بھوپال سے بھیجا اس طرح گو معارف کی روایت تو نہیں ٹوٹی لیکن ایک مہینہ کا اچھی خاصی ضخامت کا معارف شائع کر دیا گیا جس پر شروانی نمبر نہیں لکھا گیا۔ سید صاحب کا ہم سب کی توقعات کے خلاف ایک مختصر سی بیماری میں نومبر ۱۹۵۳ء

میں کراچی میں انتقال ہوا، تو ہر طرف سے ان کی یادگار میں معارف کا ایک
خاص نمبر نکالنے کا تقاضہ شروع ہو گیا اور وہ اتنا بڑھا کہ اس کے سامنے
مولانا شاہ معین الدین ندوی کو جو اب بجائے سب ایڈیٹر کے چیف ایڈیٹر
تھے، سر تسلیم خم کر دینا پڑا اور اس کی زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں
اگرچہ سید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ یا یکجا سید صاحب
کے مخلصین اور قدردانوں سے مضامین حاصل کرتے کراتے اور پھر چھپتے
چھپاتے ڈیڑھ سال سے زیادہ لگ گئے، لیکن بالآخر شاہ صاحب کی محنت و
جانفشانی سے شائع ہو گیا اور خاص طور سے اس کا نام 'سلیمان نمبر' رکھا
گیا۔ اس کی ترتیب و تکمیل میں ملک کے ہر مکتبِ خیال کے اربابِ قلم نے حصہ
لیا ہے۔ اس میں دیوبند، ندوہ، علی گڑھ سب کی نمائندگی ہو گئی ہے۔ اس
میں علی گڑھ کے صاحب طرز نثر نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی ہیں۔ دیوبند
کے صدیق اکبر جیسی ضخیم کتاب کے مصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر
'برہان' بھی اور ایک مشہور ہندو اہل قلم اور عربی زبان و ادب کے عالم
جناب مالک رام بھی، جو غالبیات کے بھی ماہر ہیں۔

سید صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ان کی سوانح عمری کے لیے
ان کے قدردانوں کی طرف سے تقاضا شروع ہو گیا تھا اور وہ چاہتے تھے
کہ جس اہتمام و استناد کے ساتھ حیات شبلی لکھی گئی ہے۔ اسی اہتمام
اور تحقیق و استناد کے ساتھ جانشین شبلی کی بھی سوانح عمری لکھی جائے
مگر ظاہر ہے کہ وہ ان کی یہ خواہش خواہ وہ کتنے ہی اخلاص پر مبنی رہی ہو
اتنی جلد پوری نہیں کی جا سکتی تھی اس کے لیے کافی وقت کی ضرورت تھی۔
دوسرے سید صاحب جیسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح عمری لکھنا، جس
کی علمی خدمات اتنی وسیع اور جس کے کارنامے اتنے گوناگوں ہوں،
کوئی آسان کام نہ تھا کہ اس کے لیے فوراً آمادگی کا اظہار کر دیا جاتا۔
گو یہ فرض کبھی نہ کبھی ادا ہونا ضروری بھی تھا اور اس کی ذمہ داری ادارہ
ہی پر تھی جس کے وہ بانی تھے اور اس کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ ان
کے نام سے معارف کی تمام پچھلی روایات کے خلاف اس کی عمر میں پہلی مرتبہ جو
اس کا خاص نمبر نکالا گیا، وہ درحقیقت لوگوں کی اسی طلب کو پورا کرنا تھا
اس کو اس طرح مرتب بھی کیا گیا تھا کہ وہ سید صاحب کی زندگی کے قریب
قریب تمام پہلوؤں پر روشنی میں آ گئے ہیں یعنی وہ اس مرقع میں مفسر،

محدث، فقیہ، ادیب، انشاپرداز، شاعر، سوانح نگار، متکلم، صوفی، معلم
مصنف، جغرافیہ داں، زائر حرم، ماہر تعلیم، صاحب سیر و مغازی سب
کچھ نظر آتے ہیں اور ہر مصور نے اپنے اپنے ذوق و نقطۂ نظر سے ان کی
تصویر کشی کی ہے اور اپنے موقلم کا اعجاز دکھایا ہے۔ مثلاً مولانا عبدالماجد
دریابادی نے سید صاحب کے ادب و انشا پر اظہار خیال کیا ہے اور اس
میں ۱۹۱۲ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ آگرہ کے موقع پر
جب کہ دونوں بزرگ یعنی مولانا خود اور سید صاحب مہمانوں کے ایک
خیمہ میں اتفاق سے یکجا تھے، اپنی ایک ڈرامائی ادبی و شعری گفتگو کی
روداد لکھ کر سید صاحب کے ادبی و تنقیدی مقالات اور بعض ادبی
کانفرنسوں کے خطبوں کے ایک مجموعہ 'نقوش سلیمانی' سے ان کی
انشاپردازی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مولوی غلام محمد صاحب بی۔ا
مصنف تذکرۂ سلیمانی نے سید صاحب کے عرفانی پہلو پر بہت تفصی
سے روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ وہ اپنی ساری علمی مصروفیات کے
باوجود تمام عمر ایک شیخ کامل کی تلاش میں رہے جو اُن کی روحانی ر
میں مدد دے سکے۔ چنانچہ ان کے اس ذوق جستجو نے ان کو وقت
سب سے بڑے صاحب قلم و صاحب تصنیف شیخ طریقت اور روحا
کے ماہر کامل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے آ
رشد و ہدایت پر تھانہ بھون پہنچا دیا اور ان سے بیعت ہو گئے۔
صباح الدین عبدالرحمن نے جو سید صاحب کے عزیز بھی ہیں اور
بھی، سید صاحب کی سوانح حیات لکھی ہے، جس کو شاہ معین الد
صاحب نے حیات سلیمان کے مآخذ میں سرفہرست رکھا ہے ا
لکھا ہے کہ اس میں سید صاحب کے سوانح کا مختصر مگر جامع خا
ہے۔ خود شاہ صاحب نے چالیس صفحوں میں سید صاحب کی دینی
خدمات کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس لحاظ سے معارف کا یہ سلیمان
اردو رسالوں کے تمام شخصیات نمبروں سے، جو اس وقت تک نکلے
بدرجہا بڑھ گیا ہے اور ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا
اس جامعیت، رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود شائقین
سید صاحب سے والہانہ محبت رکھنے والوں کی اس سے تشنگی نہیں
سوانح عمری کے لیے ان کا تقاضا برابر جاری رہا، ان میں سے

کا نام تو مصنف نے حیات سلیمان کے دیباچے میں خاص طور سے لیا ہے۔ ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کا اور دوسرے مولانا عبدالباری صاحب تجدیدات اشرفیہ کا، دوسرے بزرگ کو تو اُن کی سوانح عمری دیکھنے کا اتنا شوق تھا، کہ انھوں نے شاہ صاحب کو مایوس ہو کر لکھا کہ کاش میری زندگی میں سیّد صاحب کی سوانح عمری شائع ہو جاتی۔ ان ہی تشنی نہ پانے والوں میں ایک سیّد صاحب کا ہمہ وقت کا خادم اور اُن کے ادب و انشا کا پرستار یہ راقم السطور بھی تھا جو ادیب و انشا پرداز و شاعر و اہل قلم کچھ بھی نہیں ہے جس کو علمی و ادبی حلقے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور شہرت و ناموری سے محروم ہے۔ میں نے سیّد صاحب کی وفات کے بعد اردو کے ان رسالوں اور اخباروں میں جن تک میری رسائی تھی، حیات سلیمان کے وجود میں آنے سے پہلے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اور ان کی علمی خدمات اور تصنیفات پر فرضی ناموں سے اتنے مضامین لکھے ہیں کہ پوری کتاب بن گئی ہے۔[1]

شروع شروع میں سیّد صاحب کی سوانح عمری کی تالیف کے لیے ان کے تلامذہ و منتسبین میں سے جن لوگوں پر میری نگاہ انتخاب پڑی تھی ان میں ایک ان ہی کے صوبہ بہار کے رہنے والے، ندوہ کے فاضل اور عربی زبان و ادب کے اداشناس مولانا مسعود عالم ندوی بھی تھے لیکن افسوس کہ ان کے یہ لائق اور ہونہار شاگرد جن سے اس کی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر بڑی علمی توقعات وابستہ تھیں، سیّد صاحب کے انتقال کے چھ سات ہی مہینے کے بعد ان سے جا ملا اور ساری حسرتیں اپنے ساتھ لے گیا۔

سیّد صاحب کی مستقل سوانح عمری کی تحریک کے لیے، میں نے پہلا مضمون "سیّد الملت" کے عنوان سے ۲۵؍ جنوری ۱۹۵۷ء کے صدق جدید میں لکھا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

سیّد صاحب شبلی کی طرح گو جینیس نہیں ہوں لیکن اپنے دور کی ایک اہم شخصیت ضرور تھے جن پر بلا ارادہ ہر شخص کی نظر پڑتی تھی اور وہ اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ان کا سفید صاف، براق دم شیروانی، نورانی چہرہ، زیر لب تبسم، ہر چیز بڑی پرکشش تھی۔ جلسوں اور انجمنوں میں تو اپنی سج دھج سے ساری فضا پر چھا جاتے تھے اور پورے مجمع کا مرکز نگاہ بن جاتے تھے۔ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو حقائق و معارف کا دریا بہا دیتے تھے۔ تاریخی و جغرافیائی معلومات کے لحاظ سے علما کے طبقے میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ سیرت ان کا خاص موضوع تھا اور جب اس پر بولتے تھے تو ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ خطبات مدراس اس فن میں ان کی تفرد کی ایک زندہ شہادت ہے جس کو پڑھ کر کتنے خطیب، مقرر اور ریسرچ اور اہل قلم ہو گئے۔ ان کی ہر کتاب جتنی تحقیقی ہوتی تھی، اتنی ہی فیض بخش بھی ہوتی تھی۔ انھیں پڑھ کر کتنے ملحد خدا آگاہ، کتنے گمراہ ہدایت یاب اور کتنے مذہب ناشناس، مذہب شناس اور خدا پرست ہو گئے۔ وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ندوۃ العلما کا جلسہ ہو، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس، خلافت کانفرنس ہو یا جمعیۃ علمائے ہند کی مقدس مجلس، ہندوستانی اکاڈمی ہو یا انجمن ترقی اردو، ارباب جبہ و دستار کا مجمع ہو یا ہیٹ و پتلون والوں کی محفل، ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے۔ ایسے جامع کمالات، جامع حیثیات و جامع خصوصیات بزرگ کی سوانح عمری کی تالیف ہر صاحب قلم کا

---

[1] میں نے اپنے ان مضامین کے مجموعے کے لیے سیّد صاحب کے مسترشد اور تذکرہ سلیمان کے مصنف مولوی غلام محمد صاحب بی۔اے کو خط لکھا تو انہوں نے حیرت انگیز طور پر بہت مایوس کن جواب دیا اور لکھا کہ میں خود اپنی کتابوں اور مضامین کے طبع و اشاعت کے لیے پریشان رہتا ہوں، آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ آپ ہندوستان ہی میں کسی ناشر سے بات چیت کیجیے۔ ممکن ہے آپ کا مقصد حاصل ہو جائے۔ میں نے یہاں فروغ اردو لکھنؤ سے رجوع کیا، جس نے شاہ صاحب کی ادبی نقوش اور میرے ایک دوست ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کی فانی پر ایک کتاب شائع کی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف مشہور مصنفوں کی کتابوں کے مسودوں کو چھاپتا ہے تاکہ ان سے جلد سے جلد منفعت حاصل کر سکے۔ کسی گمنام اہل قلم اور مصنف کے مسودے کو چھاپ کر اس کی اشاعت اور فروخت کا انتظار نہیں کر سکتا۔ بات معقول تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ حیات سلیمان چھپ گئی اور میرا وہ مجموعہ بھی میرے گجرانوالہ اسلام آباد کے ایک کرم فرما جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب نے جو اہل حدیث مسلک کی کتابوں کے پاکستان میں سب سے بڑے طابع و ناشر ہیں اپنے ادارہ ندوۃ المحدثین کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔

فریضہ ہے۔

اس کے لیے جناب غلام محمد صاحب[1] حیدرآبادی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی سے خاص طور سے درخواست ہے، مولانا مسعود عالم زندہ ہوتے تو وہ بھی اپنے حسن انشاء اور ذوقِ تحقیق کے لحاظ سے اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونے کے لائق تھے افسوس!

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

حیاتِ شبلی کے جہاں اور بہت سے مآخذ تھے، جن سے اس کی تالیف میں فائدہ اٹھایا گیا ہے، مکاتیبِ شبلی کی دونوں جلدیں بھی تھیں سب سے پہلے حیاتِ شبلی کا خاکہ سید صاحب کے ایما سے مولانا عبدالسلام ندویؒ نے ان ہی کے مکاتیب اور کچھ زبانی روایات سے تیار کیا تھا۔ اس طرح حیاتِ سلیمان کا ماخذ بھی معارف کے شذرات کے علاوہ، ان کے خطوط بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کا حلقۂ خط و کتابت بہت وسیع تھا، جس میں ہندوستان کے مشاہیر علماء و محققین کے علاوہ یورپ کے تمام ملکوں کے عربی و فارسی و اردو کے مستشرقین بھی داخل تھے، ان سب سے ان کی خط و کتابت تھی اور ان سے خطوط حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے لیے قرعۂ انتخاب کس کے نام نکل چکا ہے۔ وہ تو مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی نے اس مضمون کے آخر میں اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ قرعۂ انتخاب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اڈیٹر معارف کے نام پر عرصہ ہوا نکل چکا ہے اور وہ اس سلسلے میں ترتیب و تالیف اور اصلاح و مشورہ کی حد تک ہر خدمت کے لیے آمادہ ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس گمنام راقم سطور کے جواب میں ایک مہینے کے معارف کے شذرات میں حسب ذیل خیالات ظاہر کیے۔

صدق جدید میں حضرت سید صاحب کے کسی اہل قلم عقیدت مند نے ان کی سوانح عمری کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے متعلق مفید مشورے دیے ہیں، بعض بزرگوں نے بھی ادھر توجہ دلائی ہے اور کبھی کبھی اس کے متعلق استفسارات بھی آتے رہتے ہیں ـــ ان سب لوگوں کا یہ مخلصانہ جذبہ قابل قدر ہے۔

حضرت سید صاحب کی سوانح عمری کی تالیف بڑا اہم کام ہے۔ اسلامی علوم و فنون کا کوئی شعبہ اور قوم و ملت کی زندگی کا کوئی گوشہ اُن کے کارناموں سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے اُن کی سوانح عمری، محض ایک شخص کے سوانح و حالات نہیں ہوں گے، بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقریباً نصف صدی کی پوری علمی و مذہبی اور قومی و ملی تاریخ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہم کام کے لیے وقت درکار ہے۔

سلیمان نمبر تو حیات سلیمانی کا محض نقش ناتمام یا اجمالی خاکہ ہے اور سوانح عمری سید صاحب کے تمام کمالات اور علمی و مذہبی، قومی و سیاسی کارناموں کا ایک کامل مرقع ہوگی۔ مگر بہرحال اس سے شائقین کی طلب اور خواہش کا ضرور اظہار ہوتا ہے، جس کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مضمون نگار نے جو مشورے دیے ہیں، ان سے انشاء اللہ پورا فائدہ اٹھایا جائے گا اور اس سلسلہ میں جن اصحاب علم کے نام لیے ہیں، ان سے بھی مدد لی جائے گی۔ ان کے اس خیال سے بھی ہم کو اتفاق ہے کہ سید صاحب کی جیسی ہمہ گیر، جامع شخصیت کسی ایک حلقہ کی ملک نہیں، ان پر ہر صاحب صلاحیت اہل قلم کو لکھنے کا پورا حق ہے۔ ماشاء اللہ خود مضمون نگار میں اس کی پوری اہلیت موجود ہے۔ باقی یہ کام تو دارالمصنفین

---

[1] اس وقت تک مولوی غلام محمد بی۔ اے کی تذکرۂ سلیمان نہیں شایع ہوئی تھی۔

کے فرائض میں ہے۔ وہ اس کو ضرور پورا کرے گا اور
صاحب سوانح کے شایانِ شان پورا کرے گا۔"

اس کے پانچ مہینے کے بعد پھر اس ضرورت کی طرف "حیاتِ سلیمانی" کے عنوان سے فاران کراچی مئی ۱۹۵۷ء میں ایک مضمون لکھ کر اربابِ دارالمصنفین کو توجہ دلائی اور لکھا کہ جس طرح سیّد صاحب نے مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کی تکمیل کی۔ سیرۃ النبی کی جلدیں مکمل کیں۔ ان کے مکاتیب دو جلدوں میں جمع کیے۔ ان کا منتشر فارسی کلام اکٹھا کیا۔ ان کا سارا اردو کلام مرتب کیا۔ ان کے تمام علمی و ادبی، تنقیدی و مذہبی، تاریخی فقہی، قومی فلسفیانہ مضامین فن کے اعتبار سے الگ الگ شایع کیے۔ ان کے خطبات کی ایک جلد شایع کی۔ شعر العجم کا پانچواں حصّہ شایع کیا، جو اب تک مسودہ کی صورت میں تھا۔ شعر العجم اور موازنہ کا وہ حصّہ جو کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر سے متعلق ہے اس کو طالب علموں کی آسانی کے لیے انتخابِ شبلی کے نام سے شایع کیا۔ پھر سب سے آخر میں جب وہ تمام مکر وہاتِ دنیوی سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے استاد کی اس وصیت کے مطابق کہ جب تم تمام کاموں سے فارغ ہو تو لکھنا۔ حیاتِ شبلی کی تالیف کی طرف توجہ کی اور دو سال کی محنت شاقہ کے بعد جس کے دوران میں وہ شبلی منزل کے معتکف سے کہیں باہر نہیں نکلے، اس کو بھی مکمل کر دیا۔ وہ مولانا شبلیؒ کی تنہا سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، اصلاحی، سیاسی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ بن گئی ہے۔ اس کا مقدمہ جس کو انھوں نے تاریخ و تذکرہ کی سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد لکھا ہے۔ بجائے خود ایک مستقل کتاب اور سیّد صاحب کے ذوقِ تاریخ دانی کا شاہکار ہے۔

اس طرح آپ حضرات بھی اسی ترتیب سے سیّد صاحب کی علمی یادگاروں کی اشاعت کیجیے اور پھر حیاتِ سلیمان کی تالیف کی طرف پورے ذوق و شوق کے ساتھ توجہ فرمایئے اور وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیجیے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس گمنام کی ان سطور کی بھی اہمیت محسوس کی اور مئی ۱۹۵۷ء کے معارف کے شذرات میں حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"صدق جدید" کے ان ہی عقیدت مند نے فاران میں بھی حیاتِ سلیمان کی طرف توجہ دلائی ہے مگر وہ عقیدت مندی کے حجاب میں ایسا مستور ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے مگر اندازِ تحریر غماز ہے کہ وہ سیّد صاحب اور دارالمصنفین سے بڑا قریبی تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی صاحبِ ذوق و نظر ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ خدا کا نام لے کر راقم نے حیاتِ سلیمان لکھنا شروع کر دی ہے۔ اور سید صاحب کی ابتدائی زندگی سے لے کر پونہ کی پروفیسری بلکہ مولانا شبلی کی وفات تک کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔

سید صاحب کے اکثر علمی کارناموں اور ان کے مافوق العادت عروج و شہرت کا زمانہ درحقیقت دارالمصنفین کے قیام کے بعد کا ہے۔ اس زمانے کے حالات اور کارنامے ان کی زندگی کا اصل مرقع ہوں گے۔ اسی کی مرقع آرائی اصل کام ہے۔ دعا کیجیے کہ مولف کو اس مشکل مرحلے سے گزار دے اور استاد کا جو حق ہوتا ہے وہ پورا ہو جائے۔"

معارف سلیمان نمبر میں ملک کے دانش وروں اور ممتاز اربابِ قلم کے ساتھ سید صاحب کے بعض اہلِ قلم عزیزوں نے بھی سیّد صاحب پر مضامین لکھ کر، ان کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مثلاً سیّد صباح الدین عبدالرحمان، مولانا ابوظفر صاحب ندوی، سیّد حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر، اور سیّد ابو عاصم ایڈوکیٹ اس لیے ستمبر ۱۹۵۸ء کے فاران میں "علامہ سید سلیمان ندوی کی یاد" کے عنوان سے اس نمبر پر بڑی تفصیل کے ساتھ تبصرہ لکھا، تو آخر میں لکھا کہ جہاں حیاتِ سلیمان کی ذمہ داری جانشینانِ سیّد اور خصوصاً مولانا شاہ معین الدین ندوی اڈیٹر معارف پر ہے جس کے لیے انہوں نے پورے ذوق و شوق کے ساتھ تیاریاں شروع بھی کر دی ہیں اور وہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں، خود ان اعزا پر بھی ہے جن میں بعض بعض ملک گیر شہرت کے مالک بھی ہیں اور صاحبِ تصنیفاتِ کثیرہ بھی۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اوّل الذکر بزرگوں کے مضامین اور سید صاحب کے پھوپی زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی اور ہم درس مولوی سید نجم الہدیٰ کے بیانات

اور تحریریں اس کتاب کے ماخذ میں شامل کیں اور ان سے فائدہ اٹھایا اس کے بعد پورا مسودہ صاف کرا کے سید صاحب کے عمر بھر کے رفیق اور ان کے حالات کے سب سے بڑے واقف کار مولانا عبدالماجد دریابادی مرتب مکاتیب سلیمانی کو بھی دکھاتے اور ان سے مشورہ لیتے رہے۔

سید صاحب نے حیاتِ شبلی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"وہ (شبلی) ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے
اور جدید علوم کے بہت سے آراء و خیالات سے واقف بھی
تھے، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے
ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی بسے تھے، ساتھ ہی محقق
فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی
تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر
بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے
اور نئے زمانہ کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلے میں
بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گوناگوں رنگ
ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں"

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کسی قدر ترمیم و اضافہ کے ساتھ یہی خصوصیات و اوصاف و کمالات سید صاحب میں بھی تھے۔ سید صاحب کے دور میں علم و فن کے ہر میدان میں زمانے کا قدم بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ نئے نئے مذہبی مسائل و مباحث پیدا ہو گئے تھے۔ تلاش و تحقیق کا معیار پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا تھا اور بہت سی قومی و ملی و سیاسی تحریکیں بھی اس دور میں پیدا ہوئیں۔ اس کتاب میں بحد امکان اسی کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ اہل ذوق و نظر کے ہاتھ میں ہے۔

جس طرح حیاتِ شبلی سید صاحب کی زندگی کی آخری کتاب ہے اور انہوں نے اپنے استاد کی وصیت کے مطابق اس وقت مکمل کی، جب وہ اپنے تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو گئے، اور اس کی تالیف کے پورے دس برس کے بعد انتقال کر گئے۔ اسی طرح حیاتِ سلیمان بھی شاہ صاحب کی زندگی کی آخری کتاب ہے اور انہوں نے بھی اس کو سید صاحب ہی کی عمر میں جب کہ وہ بہت ساری

کتابیں لکھ چکے تھے، لکھا۔ اور اس کی تالیف کے دو ہی تین برس کے بعد انتقال کر گئے۔ جس طرح حیاتِ شبلی مولانا شبلی کی محض سادہ سوانح عمری نہیں بلکہ ان کے پورے دور کی علمی، ثقافتی اور ملی تاریخ ہے۔ اسی طرح حیاتِ سلیمان بھی سید کے دور کی جو نصف صدی تک محیط تھا، ہر قسم کی تاریخ بن گئی ہے۔ جس سے کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب کا زمانہ ہر قسم کی ملی، سیاسی، قومی، تعلیمی، علمی، لسانی خوبیوں کا زمانہ تھا اور ان سب سے ان کا گہرا تعلق تھا اور بعض بعض میں تو ان کا بڑا نمایاں حصہ بھی تھا۔ وہ اگلی صف کے لیڈروں میں تھے۔ گاندھی جی، موتی لال، اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، علی برادران کے ساتھ اُن کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ ہنگامۂ مسجد کانپور کے سلسلے میں ان ہی نے سب سے پہلے مشہد اکبر کے عنوان سے الہلال کلکتہ میں بہت ہی پرجوش اور ولولہ انگیز مضمون لکھا تھا، جس کی کل اشاعت گورنمنٹ بنگال نے ضبط کر لی تھی اردو کا ہندوستانی نام انہی نے دیا تھا اور ا عمر بھر اسی نام کی حمایت اور تبلیغ کرتے رہے۔ گو اس کا نام اردو ہی رہا اور ان کی اس تجویز کی طرف اعتنا نہیں کیا گیا مسلمانوں کے کلچرل اٹانومی یعنی تہذیبی خود مختاری کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا م خلافت سے ہندوستان کی اسلامی حکومتوں کا تعلق انہی نے تابہ کیا تھا جس پر ان کے متعدد رسالے ہیں۔ مگر یہ تمام مقالات مقا سلیمان کی پہلی جلد میں آ گئے ہیں اور اُن کا مطالعہ آسان ہو گیا۔ شاردا ایکٹ کے خلاف نابالغی کی شادی کی حمایت انہی نے کی تھ اور انہوں نے اس کے لیے قائدانہ رول ادا کیا تھا۔ اس لیے ان سب تحریکوں کی تفصیل بھی اس کتاب میں ضمناً آ گئی ہے اس کے علا دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی تاسیس، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور اس کی مفصل تا کے ساتھ ترکِ قیام دارالمصنفین، سفر بھوپال، قیام پاکستا اور پھر ان دونوں جگہوں میں انہوں نے جو علمی خدمات انجام دیں پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ دومرتبہ سفر حجاز، پھر نادر شاہ فرماں روائے افغانستان کی

دعوت پر ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ سفر کابل وغزنین و ہرات وقندہار کی روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلم بند ہو گئی ہے۔ اسلوب تحریر وطرز انشار کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنی، دلکش اور قابل مطالعہ اور اردو کے سوانحی ادب میں شبلی اسکول کی طرف سے حیات شبلی کے بعد ایک اور قیمتی اضافہ۔

حیات شبلی کی طرح حیات سلیمان کی بھی کسی قدر خدمت کا مجھے فخر حاصل ہوا جو میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کا پورا مسودہ صاف کیا، اس کی کاپیاں دیکھیں اور اس کے پروف پڑھے ۔ حیات شبلی کی طرح اس کے سبھی مضامین دیکھ کر مفصل فہرست بنائی کہ تنہا ان کے مطالعہ ہی سے پورا کتاب کے مطالب ومباحث نظر کے سامنے آجاتے ہیں، ا[illegible] کا مفصل اشاریہ (انڈکس) بنایا جو عین وقت پر کاغذ کی نا[illegible] برداشت گرانی کی وجہ سے شامل نہ کیا جا سکا، یہ شامل ہو[illegible] تو اس کا مطالعہ اور زیادہ آسان ہو جاتا ۔ فہرست میں [illegible] کا بھی ذکر ہے، اس پر جب نظر پڑتی ہے تو بے ا[illegible] اپنی محنت کے ضائع جانے کا غم تازہ ہو جاتا ہے ۔

اے صاحبو! اب زمانہ ایسا نہیں ہے کہ ہم صرف اپنے ہونہار پودوں کی پرورش کرنے پر بس کریں بلکہ زمانہ مقابلہ کے میدان میں بہت قوی اور زبردست پہلوان لایا ہے۔ پس جب تک کہ ہم بھی اپنی قوم کے جوانوں کو میدان میں نہ لائیں ہماری کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور اعلیٰ علوم میں جو اس زمانہ کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں، سربرآوردہ ہوں۔

سرسیدؒ

جدید مواصلاتی نظام اور آپٹکل فائبرس

مختار احمد

جدید دور میں مواصلاتی نظام نے قابل رشک ترقی کی ہے۔ آج ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹیلی وژن کا سلسلہ تمام دنیا میں اس طرح پھیل چکا ہے کہ ہزاروں میل کی دوریاں بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ آج دنیا کے کسی کونے میں رونما ہونے والے اہم واقعہ یا ہاکی، کرکٹ اور دیگر کسی میچ کو مواصلاتی سیارے کے ذریعے اپنے ٹیلی وژن پر اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی جدید مواصلاتی نظام اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ خبر یا اطلاع کو دور سے دور مقام تک کم سے کم خرچ پر بھیجا جا سکے۔ اب سے چند سال پہلے تک ریڈیو لہروں کا استعمال دور دراز کے مواصلاتی کاموں کے لیے عام تھا لیکن ریڈیو لہروں کی لمبائی زیادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اطلاع ایک ساتھ بھیجنا ممکن نہیں اس لیے اگر ہم زیادہ سے زیادہ خبریں یا اطلاعات بھیجنا چاہتے ہیں تو ہم کو ریڈیو لہروں کی فریکونسی (Frequency) سے زیادہ فریکونسی کا استعمال کرنا ضروری ہے تاکہ زیادہ بینڈ وِڈتھ (Band width) مل سکے۔ زیادہ فریکونسی کی لہروں کی لمبائی کم ہوتی ہے اور یہ کرۂ ہوائی سے زمین کی طرف واپس REFLECT نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان چھوٹی لہروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کا طریقہ ریڈیو لہروں کے بھیجنے کے طریقے سے الگ ہے۔

آج کے دور میں چھوٹی لہروں کے ذریعے خبریں بھیجنے کے تین ممکن طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے MICROWAVE TRANSMISION دوسرا مواصلاتی سیارے کے ذریعے اور تیسرا آپٹکل فائبر مواصلاتی نظام۔ اگر Micro wave مائکرو ویو کا استعمال کیا جائے تو قریب ہر ۲۰ کلو میٹر کی دوری پر خبریں دُہرانے کے میناروں (Repeater Towers) کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر مواصلاتی سیارے کا استعمال کیا جائے تو ان میناروں کی ضرورت تو نہیں رہتی لیکن مواصلاتی سیارے کو ہر چند سالوں کے بعد زمین کے مدار میں بھیجنے کی قیمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں زیادہ تر ممالک نہ تو اپنے سیارے بنا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو مدار میں چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لیے آپٹکل فائبر ہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اطلاعات (Informations) آسانی کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچائی جا سکتی ہیں۔ اس نظام کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ جیسے کہ ان کی Band width بہت زیادہ ہے کیوں کہ اس میں روشنی کی لہروں کا استعمال ہوتا ہے۔ اس میں بھی دہرانے والے میناروں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن دو میناروں کی دوری کافی زیادہ کی جا سکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ برقی مقناطیسی لہروں کی مداخلت سے پاک ہے۔

آپٹکل فائبر کے ذریعے مواصلات کی تاریخ کافی پرانی ہے اس کی ایجاد آج سے تقریباً سو سال پہلے گراہم بیل (Graham Bell) اور جون ٹنڈل (John Tyndall) وغیرہ نے کی تھی۔ لیکن اس کا تجارتی طور پر استعمال ابھی چند سال پہلے سے ہی شروع ہوا ہے۔

جون ٹنڈل (John Tyndall) ایک برطانوی سائنس داں تھا جس نے سب سے پہلے اپنے ایک تجربے کے ذریعے روشنی کو ٹیڑھے ترچھے راستے پر موڑا۔ اس نے پانی کے ایک فوارے پر روشنی کو ڈالا اور دیکھا کہ روشنی بھی پانی کی دھار کے ساتھ مڑ گئی۔ اس نے ثابت کیا کہ اس طرح روشنی کا پورا اندرونی

ریفلیکشن (Reflection) ہو سکتا ہے اور روشنی کو ایک
میڈیم (Medium) کے اندر حد بند کیا جا سکتا ہے۔
دراصل پانی کا Refractive Index ہوا کے مقابلے
میں زیادہ ہوتا ہے اور روشنی کا پورا اندرونی (Reflection
ہونے کی وجہ سے روشنی پانی کے اندر ہی رہ جاتی تھی۔ اس لیے
اگر شیشہ کا ایک تار بنایا جائے جو کہ High Refractive
Index کا ہو اور اس کے اوپر ایسا شیشہ لپیٹ دیا
جائے جو کہ (Light Refractive Index کا ہو تو
روشنی کا پورا اندرونی Reflection ہو سکتا ہے۔ دراصل
آپٹکل فائبرس اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔

کسی بھی مواصلاتی نظام کا کام اطلاعات کو ایک مقام سے
دوسرے مقام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جدید مواصلاتی نظام میں اطلاعات
بجلی کے اشارات (SIGNALS) کی صورت میں پہنچائی جاتی
ہیں۔ چوں کہ عام اطلاعات برقی صورت میں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ان
کو برقی اشارہ میں تبدیل کیا جانا ضروری ہے۔ پھر ان برقی
اشاروں کو مواصلاتی دھارے کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے
مقام پر پہنچائے جاتے ہیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان برقی اشاروں
کو واپس پھر اطلاعات میں تبدیل کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کو سمجھا جا سکے
اس طرح سے کسی بھی مواصلاتی نظام میں ایک ٹرانسمیٹر ایک ریسیور
(Receiver) اور ایک مواصلاتی دھارے کی ضرورت
ہوتی ہے۔

آپٹکل فائبر نظام میں چوں کہ روشنی کے ذریعے اطلاعات بھیجی جاتی
ہیں اس لیے اس کے ٹرانسمیٹر میں روشنی پیدا کرنے والے Diode
یا Diode Laser کا استعمال ہوتا ہے۔ روشنی کو آن اور
آف کر کے کسی بھی اطلاع کو 0 اور 1 ہندسہ کی صورت میں بھیجا
جا سکتا ہے۔ اس روشنی کو آپٹکل فائبر کے ساتھ جوڑ دیتے
آپٹکل فائبر شفاف شیشہ کے بنائے جاتے ہیں اس میں
کو جرمینیا (GeO_2) یا فاسفرس پنٹا آکسائڈ (P_2O_5)
سلیکن (Silicon) میں ملا کر اس کا Refractive Index
بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر جس شیشے کی پرت لپیٹی جاتی ہے۔ اس کا
Refractive Index کم کرنے کے لیے (B_2O_3) بو
آکسائڈ یا (F) فلورین ملا دیتے ہیں۔ یہ روشنی جب آپٹکل فائبر
دوسرے سرے پر پہنچتی ہے تو یہ ایک 0 اور 1 کے ہندسوں کو
اور اندھیرے کی صورت میں ایک لٹ کی طرح ہوتی ہے۔ اس
اور اندھیرے کی لٹ سے اطلاع حاصل کرنے کے لیے اس کو پھر
برقی اشاروں میں بدلنا پڑتا ہے۔ یہ کام ریسیور کرتا ہے
اس میں سیمی کنڈکٹر فوٹو ڈایوڈ MI CONDUCTOR
PHOTO DIODE) کا استعمال ہوتا ہے۔ ان ڈ
میں روشنی پڑنے سے برقی لہر پیدا ہوتی ہے، جس کے ذ
اطلاع واپس مل جاتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلا آپٹ
فائبر مواصلاتی نظام پونہ میں ۱۹۷۹ء قایم ہوا۔ مر
حکومت نے اس کو کافی اہمیت دے کر کئی نئے مواص
نظام قایم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ چند ہی
میں ہندوستان کے تمام بڑے شہر ایک دوسرے
آپٹکل فائبر کے ذریعے جوڑ دیے جائیں گے۔ اس کے علا
بڑے شہروں کا اندرونی مواصلاتی نظام بھی آپٹکل
کا استعمال زیادہ سے
زیادہ کریں گے۔

"ہمیں چاہیے کہ نہ تو گزشتہ پر ماتم کریں، نہ حال کے ہمت شکن نظاروں
سے افسردہ ہوں، بلکہ قدم اٹھائیں اور امید کے ایک نئے آغاز پر دستک دیں"
(مولانا ابوالکلام آزاد)

امجدی بیگم

(بیگم محمد علی جوہر)

عابدہ سمیع الدین

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب دنیائے اسلام کے مفکرین ایک نازک دوراہے پر کھڑے کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ آیا وہ بھی وطنیت کی آگ میں کود پڑیں یا وطنیت کو پس پشت ڈال کر بذریعہ مذہب امن وامان کا علم بلند کرنے کی کوشش کریں تو مولانا محمد علی جوہر نے ایک نسخہ پیش کیا۔

"جب وطن کا معاملہ ہے تو میں اوّل ہندوستانی، بعد میں مسلمان ہوں اور اسلام کا معاملہ ہے تو میں پہلے مسلمان بعد میں ہندوستانی ہوں۔"

بالفاظ دیگر انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ مذہب اور حب الوطنی میں کہیں کسی طور تصادم نہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے اس علم بردار نے کہا تھا کہ؛

آپ جو کہتے ہیں کہ جب تک انگریز رہیں گے ہم میں پھوٹ رہے گی۔ یہ میں نے مانا کہ درست ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ جب تک ہم میں پھوٹ رہے گی اس وقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے۔" [1]

اپنے اس مشن کی تکمیل میں آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انہوں نے جیل میں پتھر بھی توڑے اور زمین بھی کھودی اور جرأت وبے باکی، حب الوطنی اور مذہبی حمیت کی جو مثالیں قائم کیں وہ جنگ آزادی کی تاریخ کی سنہری سرخیاں ہیں۔

امجدی بیگم اسی مجاہد ملک و ملت کی رفیقۂ حیات و رفیق کار تھیں۔ ان کا تعلق رام پور کے ایک باحیثیت اور باوقار خاندان سے تھا۔ گھر میں دینی و مذہبی کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے سبب مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ مولانا محمد علی جوہر سے شادی کے بعد کلیتاً انہیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ طبیعت انتہائی قانع پائی تھی۔ مولانا کی فقیرانہ وقلندرانہ زندگی بھی اپنالی اور سیاسی مسلک بھی۔

مولانا محمد علی اور امجدی بیگم کے خوشگوار تعلقات کے سبب ہی مولانا کی طویل مجاہدانہ زندگی قید وبند کی صعوبتیں ہنسی خوشی جھیلتے گزر گئی۔ عبدالماجد دریا بادی رقم طراز ہیں:

"میاں بیوی میں میل و محبت شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیے عشق کی کیفیت تھی۔ عشق ایسا نہیں جس میں سوزش وشورش ہو اور جو تمام تر جوانی کے قوئ کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک وسکون ہوتا ہے اور عربی میں اس کے لیے لفظ انس ہوتا ہے۔" [2]

امجدی بیگم ہر جلسہ، ہر سفر، خلافت کانفرنس میں مولانا کے ساتھ شریک رہتیں اور برابر جلسوں و دیگر کارروائیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کانگریس کی ستیہ گرہ تحریک اور خلافت فنڈ کے لیے بی اماں (والدہ محمد علی) اور امجدی بیگم نے کروڑوں کا چندہ مہیا کیا۔ ستیہ گرہ تحریک جسے خلافت کمیٹی اور کانگریس نے مشترکہ طور پر منظور کیا تھا۔ اس کے مقاصد جیسے انگریزی مال کا بائیکاٹ، شراب کی دکانوں پہ دھرنا، فوجی بھرتی حرام اور انگریزی نوکریوں سے استعفیٰ کو کامیاب بنانے میں انہوں نے غیر معمولی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کے

دور دراز کے سفر کے اخراجات کا بار اٹھانے میں تحریک خلافت کے رضاکاروں اور مولانا محمد علی کے خاندان کی خواتین کے فراہم کیے ہوئے چندوں کے اہم کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میلکم ہیلی ممبر ہوم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں مولانا محمد علی کی فرد جرم گناتے ہوئے کہا تھا:

"ان کے گھر کی عورتیں تک چندہ جمع کرتی اور شورش برپا کرتی پھرتی ہیں۔" ۳؎

امجدی بیگم کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں مولانا محمد علی کا کہنا ہے کہ ان کے متعدد بار جیل کے سفر اس بات کا محرک بنے کہ آزادی کے جو چند لمحات ان کی معیت میں گزریں انہیں بیش قیمت جان کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کافی لمبا سفر کیا ہے اور پبلک مصارف پر کیا ہے۔ کیوں کہ ہوا یہ کہ جب اس نے میرے ساتھ سفر کرنا شروع کیا تو اسے میرا بیکار کا ضمیمہ بننا ناگوار گزرا اور کیوں کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا حساب و کتاب رکھنے والی تھیں اور کم سے کم اپنے عورتوں کے حلقے میں یقیناً وہ اتنی ہی اچھی منتظم بھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ہندوستانی عورتوں میں بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈا کرنا شروع کیا اور خلافت فنڈ میں اتنی رقمیں جمع کرنا شروع کیں کہ منتظمین نے انہیں اپنی طرف سے سفر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرتے اکٹھے گزارے۔ ہم مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فسادزدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے، مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ لیکن یہ بات میرے لیے تسکین بخش ہے جس میں کچھ میری حیرانگی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر۔" ۴؎

اس گرفتاری کی داستان کو گاندھی جی نے متعدد موقعوں پر دہرایا ہے اور امجدی بیگم کی آہنی قوت ارادی کو جگہ جگہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً ۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے گرفتاری کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مولانا محمد علی کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب ہم مدراس کے لیے سفر میں تھے۔ میں ٹرین سے ہی یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ والٹیر اسٹیشن پر ٹرین ۲۵ منٹ سے بھی زیادہ دیر تک رکی۔ مولانا محمد علی اور میں ٹرین سے اتر کر ایک میٹنگ کو خطاب کرنے چند قدم چلے ہی تھے کہ میں نے مولانا کو زور زور سے وہ نوٹس پڑھتے ہوئے سنا جو انہیں اسی وقت دیا گیا تھا۔ میں ان سے چند قدم آگے تھا۔ اس گرفتاری کے لیے دو سفید فام اور آدھی درجن ہندوستانی سپاہیوں کی پارٹی تعینات کی گئی تھی۔ افسر انچارج مولانا کو وہ نوٹس ختم کرنے سے قبل ہی بازو سے پکڑ کر لے گیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ میں مطلب سمجھ گیا۔ اب اس علم کو مجھے تنہا ہی بلند رکھنا ہے۔ خدا مجھے اس ساتھی کے مشن کو پورا کرنے کی صلاحیت بخشے جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے باعث فخر تھا...... میں نے مجمعے سے خطاب کیا اور عوام کو پرامن رہنے نیز کانگریس کا پروگرام کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ بعد میں مڑ کر میں اس مقام پر گیا جہاں مولانا کو حراست میں رکھا گیا تھا اور اُن سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ جواب ملا کہ صرف ان کی بیگم اور سکریٹری ہی کو اس کی اجازت ہے۔" ۵؎

اسی سلسلے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کے "نوجیون" (مراٹھی) میں بھی امجدی بیگم کے زبردست صبر و تحمل اور جذبہ ایثار کی تعریف میں انھوں نے لکھا:

"مجھے بیگم صاحبہ محمد علی کی جرأت پر غیر معمولی حیرت ہے جب وہ مولانا سے مل کر والٹیر اسٹیشن پر واپس

ہوئیں تو میں نے ان سے پوچھا آیا آپ کے دل میں کسی
طرح کا خوف تو نہیں ؟ انہوں نے بلا تامل جواب دیا
قطعاً نہیں۔ میرے شوہر نے اپنا فرض پورا کرنے سے
زیادہ کچھ نہیں کیا۔" اس گرفتاری کے بعد بھی وہ اسی
جرأت وہمت سے میرے ساتھ سفر کرتی رہیں . . . . .
برقعے میں ملبوس وہ زنانے و مردانے سبھی جلسوں میں
شرکت کرتی ہیں اور مختصر سی تقاریر بھی کرتی ہیں۔ جن کا
براہ راست اثر عوام کے دلوں پر ہوتا ہے۔ انہوں نے
ہر شخص سے کھادی پہننے، چرخہ کاتنے اور مسلم عوام
سے سمرنا فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل بھی کی ہے۔ کچھ
ہی عرصہ ہوا ان کی زندگی آرام و آسائش کی زندگی تھی
اور نفیس و ملایم لباس اُن کے پسندیدہ تھے لیکن اب
وہ موٹی کھادی کا ہرا برقعہ پہنتی ہیں جب کہ ایک مسلم
خاتون کو اپنی ہندو بہن کے مقابلے میں کپڑے بھی زیادہ
پہننے ہوتے ہیں اور بیگم صاحبہ کا جسم بھی کچھ ہلکا پھلکا
نہیں ہے، لیکن وہ ان تمام تکالیف کو ملک و مذہب
کی خاطر ہنسی وخوشی برداشت کر رہی ہیں۔ مدراس
میں میں نے مشاہدہ کیا کہ مسلم خواتین کے سفید موٹے
لباس میں ایک طرح کا تقدس نمایاں ہے۔ ہندو خواتین
کے رنگا رنگ ملبوسات موجودہ حالات میں مجھے پسند
نہیں آئے۔"

ہندوستانی خواتین کی قومی محاذ پر خدمات کے تذکرے
میں ۲۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے امجدی بیگم
کے لیے "ایک بہادر خاتون" کے عنوان سے خصوصی طور پر لکھا ہے
" بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے مجھے جو تجربات
ہوئے ہیں میں اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہوں
گا۔ گزشتہ سال انہوں نے پبلک کاموں میں اپنے
شوہر کی مدد کرنا شروع کیا۔ ابتدا سمرنا فنڈ کے لیے
چندہ جمع کرنے سے ہوئی۔ تب سے وہ ہمارے طویل
اور دشوار ترین، بہار، آسام و بنگال کے سفر میں بھی
شریک رہی ہیں۔ انہوں نے خواتین کے جلسوں سے بھی
خطاب کرنا شروع کیا ہے اور میں پورے وثوق سے
کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر
سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے
باوجود انتہائی پر اثر ہوتی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا وہ اپنے
شوہر کو بھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا
یہ آرٹ سکھا سکتی ہیں یا نہیں۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش
اور فتح مندی کا وقت اس وقت آیا جب اُن کے شوہر
کو والٹیر اسٹیشن پر ان سے چھین لیا گیا۔ میں نے انہیں
اس وقت دیکھا ہے جب وہ اس کمرے سے نکلیں جہاں
ان کے شوہر کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ وہ اسٹیشن
کی طرف جمے ہوئے قدموں سے چل رہی تھیں اور جب
میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے شوہر کی گرفتاری
کے سبب خوش ہیں ؟ ان کا فوری جواب تھا "یقیناً"۔ وہ
اپنے ملک و ملت کی خاطر جیل گئے ہیں"۔ ہم نے اپنا مدراس
کا سفر جاری رکھا۔ ساحل سمندر پر زبردست عوامی
جلسہ ہوا۔ سامعین اس وقت تک ان سے واقف
نہیں تھے۔ انہوں نے اونچی آواز میں بغیر کسی لڑکھڑاہٹ
کے خوبصورت ہندوستانی میں عوام سے خطاب کیا
اور میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ صحیح معنوں
میں بہادر شوہر کی بہادر بیوی ہیں"۔

جیل کی اذیت ناک زندگی اور محبوب شریک حیا
جدائی کے لمحات میں مولانا کے لیے قومی زندگی میں امجدی بیگم کی شرکت
دار و رسن کی آزمائش میں ان کی ثابت قدمی کا تصور نہ صرف ا
خوش کن تھا بلکہ نئے عزم و ولولے کا محرک بھی تھا۔

ہم میں او رتم میں ہوئے محبس وزنداں حائل
آؤ رو یا کریں اپنی تمنا حاصل

کراچی جیل سے ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کے گاندھی جی کو ل

ایک خط میں مولانا محمد علی نے انہیں اظہار تشکر کرتے ہوئے لکھا:

"پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا
تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں، لیکن بوجوہ چند در چند تاخیر
ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپ کے قلم سے نکلی ہوئی
بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں ان کارروائیوں
کے متعلق جو وہ والٹیر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی
رہی ہیں پڑھیں۔ اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا
...... غالباً میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا بھی تھا
کہ ہم میاں و بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت
کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور یہ ہندوستان میں ایک
غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد
ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے۔ اس جدائی
نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لیے محبوب
اور عزیز شریک زندگی بنا دیا اور گزشتہ عرصے
میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے
اختیار کی تھی، اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پرخطر زندگی
میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ میری نظروں میں
جس قدر عزیز و محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں
میں نصف بھی نہ تھی۔ وہ ریلوے پولس اسٹیشن میں
داخل ہوئی اور نہایت فراخ دلی سے مجھ سے کہا۔
"ہراساں نہ ہونا، میری اور میری بچیوں کی فکر نہ کرنا۔"
مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئی اور نہایت استقلال
کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی...... آپ
نے جو کچھ ہماری وکالت اور تعریف کے متعلق تحریر
فرمایا ہے۔ ان سب سے زیادہ مسرت بخش میرے
لیے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جاں باز
اہلیہ کی تعریف کی ہے۔ حقیقتاً میں اس قدر متاثر ہوا
ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں
کرتا۔ مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان بھی جلد ختم
ہو جائے گا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی
سے جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک
انگیز داد لیتی رہے گی۔[۵۸]"

والٹیر اسٹیشن پر گرفتاری کے وقت امجدی بیگم
ثابت قدمی اور سپاہیانہ رویے کا تاثر کتنا گہرا اور مولانا کو ا
کتنا فخر تھا، اس کا کھل کر اظہار انہوں نے کراچی جیل سے ہی لکھ
بی اماں کے نام اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔

"میں بھی چالیس اکتالیس سال کی عمر سے مہمان داخل
گھر پر آیا کرتا ہوں۔ پہلے بیتول کی قید پھر رہائی ہوتے
ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ
بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا کر چھ سات مہینے کو چھوڑ
دیا جائے تو جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی
میں ہی بسر ہوا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر کے اسٹیشن
پر قید کی ابتدا کا خیال کیا جائے تو تاہم یہی غنیمت
ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں کبھی ملاقات
کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے۔ ورنہ مُنّی غریب
کس کس کے بچوں کو پالتیں...... آپ میرا یہ خط امجدی
کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی کے الفاظ اسے
یاد دلا دیں کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی والٹیر کے
اسٹیشن کا سپاہیانہ رویہ جو اب تک قائم رکھا ہے قائم
رکھو، جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد

نوٹ: یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے 'ہمدرد' میں بھی مولانا نے اس ملاقات کا تذکرہ کیا ہے کہ "دشمنان ملک و ملت کے سامنے اس نے مجھ سے کہا
تم ہماری فکر نہ کرنا۔ خدا پہلے بھی رزاق تھا اور اب بھی وہی رزاق ہے تم صرف ایک واسطہ تھے۔ خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور ا
واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ رہا تمہارا کام سو اگر اجازت دو تو میں اسے کرتی رہوں گی۔"

شامل حالی ہے تو یہ عورت اپنے مسلمانوں اور ہندوستانی
بھائیوں کے سامنے کسی تھڑدلی کے اظہار سے نہ خود
شرمندہ ہوگی، نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور
اپنے شیردل ہزاروں مرنے والوں کو شرمندہ کرے گی۔"[۹]

مقدمہ کراچی کے دوران امجدی بیگم کراچی چلی گئی تھیں۔ مولانا کو سزا ہو جانے کے بعد وہ واپس علی گڑھ آ گئیں۔ طلبائے جامعہ نے ان کی ہمدردی میں ایک جلسہ محمد علی ہال میں کیا۔ نہایت دکھے دل سے نہایت اچھی زبان میں آپ نے ایک دل دوز تقریر کی۔ طلبائے جامعہ زار وقطار رو رہے تھے۔ وہ تو ان کو کیا ڈھارس دیتے، الٹے بیگم صاحبہ ہی ان کو ڈھارس دے رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا:

"بچو! بیشک مولانا کی سزایابی سے میں سخت مغموم ہوں
لیکن خداوند قدوس پر بے حد بھروسہ رکھتی ہوں۔
آدمی کی موت وزیست کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ٹھوکر
لگی اور آدمی مرجاتا ہے، پھانس لگتی ہے اور آدمی کی
زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو دو برس کی بات ہے، میں
تو یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ چاہے گا تو یہ دن
بھی نکل جائیں گے۔"

مولانا محمد علی جب تک جیل میں رہے ان کا کام جیل سے باہر ان کی والدہ اور بیوی انجام دیتی رہیں۔ جیسا کہ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں مولانا نے لکھا ہے:

"ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا
دروازہ بند ہو گیا تو میری ماں نے ایک ہاتھ میں تسبیح
اور دوسرے ہاتھ میں عصائے پیری کو لیا۔ نقاب
الٹ کر وہی کام کرنا شروع کر دیا جو ہم کیا کرتے تھے
مگر جسے حکومت نے خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال
کر ہم سے چھڑا دیا تھا۔ میری اہلیہ نے اس سے پہلے
ہی عورتوں میں جن کا ذوق وشوق مردوں سے کہیں
بڑھ کر تھا، اس کام کو شروع کیا تھا اور وہ میری رفیق
کار اور رفیق سفر بن گئی تھیں۔"

اور ان کی یہ رفاقت زندگی کے آخری سانس تک باقی رہی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی۔ دوسری آنکھ کی بینائی بھی جواب دے رہی تھی۔ گٹھیا کے اثرات بھی تھے اور ذیابیطس کے حملے بڑی شدت سے ہو رہے تھے، ڈاکٹر آرام وعلاج کا مشورہ دے رہے تھے لیکن مجاہد تھا کہ میدان جنگ کے لیے مچلا ہوا تھا۔ اسی شدید علالت کی حالت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وہ لندن روانہ ہوئے۔ حسب دستور امجدی بیگم اس آخری سفر میں بھی رفیق سفر تھیں جن کے بارے میں مولانا نے کہا تھا:

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں
شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے
جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل
جہاد کروں۔ تاآنکہ اس کام میں مرجاؤں۔ اس لیے
قرض دام لے کر بھیک مانگ کر جس طرح بھی ہو سکے
چار ہزار درہم فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے چلوں
گا۔ اس لیے کہ وہ زندگی کے سارے منازل ومراحل
میں میری رفیق سفر رہی ہیں۔"[۱۰]

مولانا کی شدید علالت اور وفات کے درمیانی وقفے میں امجدی بیگم نے جو خطوط ہندوستان اپنی بیٹی کے نام لکھے وہ اہم تاریخی دستاویز ہیں۔ معالجوں کے پیہم اصرار کے باوجود ملک وملت کی خاطر بستر مرگ پر بھی مولانا محمد علی کے آخری سانس تک مسلسل کام کیے جانے کی لگن ان خطوط کے آئینے میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے آخری شب وروز کی مشغولیات کی تفصیلات کا واحد ماخذ بھی یہی خطوط ہیں:

درج ذیل خط مولانا کی وفات کے بعد کا ہے جس میں باوجود غیر معمولی صبر وضبط کے ایک ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے:

"پیاری زہرہ! میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر۔
میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی ہیں

کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے
اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا، وہ سامنے آ کر رہا۔ میری
ایک بھی دعا قبول نہیں ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے
کو نہیں چاہتا تھا جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ
میں ابھی نہیں جاؤں گا جب پورا کام ہو جائے گا، اس کے
بعد پیرس جاؤں گا، علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا....
دو ڈاکٹروں کے ساتھ یہاں کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی
آئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی۔
سب پیتے رہے۔ مسٹر نہرا نے کہا آپ نے اس کا کچھ جواب
نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں۔ انھوں
نے کہا۔ بھائی ابھی ہندو و مسلمانوں کا معاملہ ٹھیک
ہو جانے دو۔ میں ہی تھا کہ کونڈہ میں جھنڈا اٹھایا
تھا اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا
اٹھاؤں گا۔ ابھی اس کا موقع نہیں ہے..... ڈاکٹر
مانک نے ایک روز کہا بھائی محمد علی تمہاری حالت
ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے۔ اگر اس کو
احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن
اگر اس کو زمین پر مار دو تو ٹوٹ جائے گا اور
تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں۔ میں تو آپ کو
یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد
چلے جائیے۔" [1]

اور بالآخر شیشہ ٹوٹ گیا۔ مجاہد حریت لندن اس
عزم کے ساتھ گیا تھا کہ غلام ہندوستان میں واپس نہیں ہوں گا۔
خدا نے اپنے محبوب بندے کی لاج رکھ لی۔ آخری سانس آزاد
لندن میں ہی لیا اور فلسطین میں تدفین ہوئی۔

امجدی بیگم کے لیے یہ غم جان لیوا تھا۔ گو لندن سے
واپسی پر کافی عرصے تک خلافت کمیٹی سے وابستہ رہیں، لیکن اندر
ہی اندر گھلتی رہیں اور تقریباً پندرہ سال بعد سفر آخرت پر روانہ
ہو گئیں اور یوں عمر بھر کی بے قراری کو قرار نصیب ہوا۔

آزاد ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر جیسے پیکر
حریت اور شہید قوم کو کبھی خراج تحسین پیش نہیں کیا گیا۔ نتیجے میں امجدی
بیگم کی شاندار و بے مثال قربانیاں بھی تاریخ کا ایک ورق پارینہ بن
گئیں۔ اس کی بڑی وجہ کوہاٹ کے ہندو مسلم فساد پر گاندھی جی اور
مولانا محمد علی میں اختلاف رائے تھا۔ مولانا، نہرو رپورٹ سے بھی خفا
تھے جو اُن کی قید کے دوران تیار کی گئی تھی اور جس کے بعد انہوں
نے کانگریس سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اختلاف بہرکیف انڈین
نیشنل کانگریس اور انقلابی رہنماؤں کے درمیان ہی نہیں خود اندرون
کانگریس نرم و گرم رہنماؤں کے درمیان ہمیشہ ہی رہا گو راہی سب
ہی ایک منزل کے تھے اور عوام کے کان ابھی تک تقسیم وطن کے تصور
سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

اچھا ہوا جو آپ نے دل سے بھلا دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

شاید آنے والا کوئی غیر جانب دار مورخ ان سبھی مختلف
راستوں کے مجاہدین حریت کی قربانیوں پر جمی گرد کو جھاڑ کر ان
کے صحیح خد و خال کو نمایاں کر سکے۔ اگر ایسا ہو سکا تو یہ قومی یکجہتی
کی جانب نمایاں پیش رفت ہوگی۔

---

[1] ہمدرد - ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء
[2] عبدالماجد دریابادی۔ محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ ص ۳۶۹
[3] محمد سرور۔ مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ و تاریخ ساز ص ۱۸۵۔
[4] " COLLECTED WORKS OF MAHATMA GANDHI :

MINISTRY OF INFORMATION, GOVT OF INDIA -
VOL. XXI - P. 176

۵۵	IBid P. 205
۵۶	IBID P. 218 - 219
۵۷	رئیس احمد جعفری - علی برادران - ص ۵۵۰
۵۸	" " ص ۵۴۹
۵۹	سید محمد ہادی علی برادران ص ۱۱۵
۶۰	محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند اوراق - دوئم ص - ۱۵۶
۶۱	ایضاً ص ۶۲۲ - ۶۲۵ -

"ہماری قوم میں صرف دو باتوں کی کمی ہے، اول یہ کہ تمام قوم میں بلکہ تمام مسلمان قوموں میں اور ان کی تمام آبادیوں میں بچوں کی تعلیم کا خیال کم ہے اور بالتخصیص اس تعلیم کا جس کی ضرورت حال کے زمانے میں ہے گویا کہ مطلق نہیں۔ دوسری بڑی آفت یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں مختلف خیالات اور مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ لوگوں کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ بعوض اس کے کہ موٹی بتی کا چراغ روشن کریں۔ اس کا ایک ایک تار الگ الگ کر کے جلاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کے بہت سے حصوں میں روشنی پھیلاتے ہیں مگر ایسی روشنی پلک جھپکانے تک کی بھی تو نہیں، پھر وہی اندھیرے کا اندھیرا ہے"

سر سید احمد خانؒ

لیزر سرجری

اصرار حسین و صغیر افراہیم

میڈیکل سائنس کے میدان میں روشنی اور ریڈیو تھراپی کا استعمال تحلیلی علاج کے لیے بطور ایجنٹ ہوتا آرہا ہے۔ طبی سائنس میں لیزر[1] سرجری کا آغاز ۱۹۶۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ البرٹ آئن اسٹائن نے ۱۹۱۷ء میں پیش کیا لیکن ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے وقفے میں سائنسدانوں نے لیزر کو اہمیت نہیں دی۔ اسی وجہ سے لیزر پر تحقیقی کام ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوئے۔ دنیا کا پہلا روبی لیزر ٹی۔ ایچ۔ میمن نے ۱۹۶۰ء میں بنایا ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک سیمی کنڈکٹر لیزر پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ پہلا سیمی کنڈکٹر لیزر ۱۹۶۲ء میں تیار ہوا۔

سن فرانسیسکو میں امریکن سرجنس کی ایک کانفرنس میں ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ایک اخباری بیان میں لیزر کے بارے میں اس طرح کہا گیا تھا:۔

”لیزر میں وہ قوت اور صلاحیت موجود ہے کہ وہ اسٹیل کو کاٹ سکتا ہے، سرطانی خلیات کو تباہ کرسکتا ہے۔ اس لیے لیزر کو دافع سرطان اسلحہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

اس وقت دنیا بھر کے سائنسدانوں نے لیزر کی اہمیت کو محسوس کرلیا ہے، اسی وجہ سے نوبل کمیٹی نے لیزر کے تحقیقی کام پر پہلا نوبل انعام ۱۹۶۴ء میں بوسو، پوکھورو (روس) اور ٹاؤنس (امریکہ) کو "بیسک ریسرچ ان دی فیلڈ آف کوانٹم الکٹرانکس لیڈنگ ٹو دا کریشن آف لیزر" پر مشترکہ طور سے دیا تھا۔

لیزر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۔ گیس لیزر ۲۔ سالڈ اسٹیٹ لیزر ۳۔ ڈائیوڈ لیزر ۴۔ الیکٹران لیزر

حیاتیاتی سائنس اور علم ادویہ میں مندرجہ ذیل قسم کے لیزر استعمال میں آتے ہیں:۔

۱۔ بلسٹر۔ این۔ ڈی لیزر (لہر لمبائی تقریباً nm ۱۰۶۰)
۲۔ سی ڈبلو کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر (لہر لمبائی تقریباً nm ۱۰.۶۰۰)
۳۔ ہیلیم نیون لیزر (لہر لمبائی تقریباً nm ۶۳۲.۸)
۴۔ الٹراوائلٹ نائٹروجن لیزر (لہر لمبائی تقریباً nm ۳۳۷.۱)
۵۔ ایکس۔ ای۔ لیزر (لہر لمبائی تقریباً nm ۵۹۵.۵، ۵۳۳.۳، ۴۹۵.۴)

لیزر کا استعمال آج جراحی کے ہر شعبہ میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے لیزر سرجری کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیزر کا استعمال نہ صرف جراحی کے لیے اوزار کا کام کرتا ہے بلکہ یہ زخم کو کاٹتا اور اس کو مندمل بھی کرتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے لیزر کو جراحی کے شعبے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ لیزر سرجری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے طریقۂ علاج سے کسی قسم کے بغلی اثرات نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپریشن کے دوران خون بھی ضایع نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو نائف اینڈ بلڈ لیس سرجری بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقۂ علاج میں جراحی کے دوران مریض کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی مریض کے جسم کے کسی حصہ کو چھونے

---

[1] (ایل۔ اے۔ ایس۔ ای۔ آر) لائٹ ایمپلی فیکیشن بائی اسٹیمولیٹڈ امیشن آف ریڈیئیشن۔

باندھنے اور پکڑنے کی حاجت درکار ہوتی ہے۔ لیزر کی شعاعیں جسم کے اندر انعکاس ہونے کے بعد باآسانی داخل ہو جاتی ہیں۔ موجودہ سرجری میں اندرونی آپریشن کے لیے مریض کے جسم کے مخصوص حصے کو کاٹ کر ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہ اوپن سرجری کبھی کبھی بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کا حل لیزر مائیکرو سرجری سے باآسانی کیا جا سکتا ہے۔ لیزر آپریشن تھیٹر اسپتال میں موجود تھیٹروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ تصویر نمبر ا میں لیزر تھیٹر دکھایا گیا ہے۔ اس کو ہم تین خاص حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔

تصویر لیزر آپریشن تھیٹر۔

۱۔ پہلے حصے میں دو این۔ڈی لحظاتی لیزر ہیں جو تقریباً J ۱۰۰۰ طاقت کی شعاعیں دیتے ہیں اور دوسرا سی۔ڈبلو کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر جس کی ماحصل قوت تقریباً ۵.۱۲ ہوتی ہے لیزر شعاعوں کو آئینہ اور عدسہ (لینس) کے ذریعے لیزر تھیٹر کے دوسرے حصہ تک لایا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں لیزر شعاعوں کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس حصہ کو اسکیننگ ڈیوائس کہتے ہیں جس کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے قابو میں کیا جاتا ہے۔ این۔ڈی۔ پلسڈ لیزر سے تین منٹ بعد چمکتے ہیں۔

ان کی تعداد (frequency) کو بڑھانے کے لیے سی۔ڈبلو کاربن آکسائڈ لیزر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیزر شعاعوں کو مریض پر بصری (آپٹکل گائڈ) کے ذریعے ڈالا جاتا ہے۔

۳ لیزر آپریشن تھیٹر کے تیسرے حصہ میں ٹیلی وژن اور ریڈیو کو کا رابطہ لیزر انجینرس اور لیزر ڈاکٹرس سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مریض کو لیزر بیم سے ظاہر (ایکسپوز) کرانے کے لیے انجینر کو ہدایت دیتے ہیں۔

لیزر جب کام کے مرحلہ میں ہوتا ہے تو اس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کو قابو میں رکھنے کے لیے ٹھ پانی کا لگاتار استعمال کیا جاتا ہے۔ لیزر کو گرد و غبار سے محفوظ ر لیے ویکوام ٹریپ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیزر تھیٹر کا درواز لیزر کا کام کرنا ایک دوسرے سے منسلک ہوتا ہے جب تک در صحیح طریقے سے بند نہیں ہو جاتا، لیزر کام کرنا شروع نہیں کرتا
علم طبعیات کے سائنس دانوں نے لیزر کو ایک ایسا وسیلہ جس میں شعاعوں کی شدت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھیلا صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے لیزر بیم کی بڑھی ہوئی ش اور قوت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیزر بیم کی انہیں صلاحیتوں کو اور علم حیاتیات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ لیز کے جسم کے متوازن خلیات کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور ان کو تباہ کر ہے۔ لیزر سرجری میں اس تکنیک کو رسولی یا سرطان کے خلیات کو ختم کے لیے لیزر بیم کا استعمال مناسب سمجھا جاتا ہے۔
۱۹۶۷ء میں خون پر لیزر کا اثر جاننے کے لیے تحقیقی کام تھے۔ خون کے نمونے کی جانچ جب مائکرو اسکوپ سے کی گئی تو ا سی کی بدلی ہوئی شکل نظر آئی اور ان میں چھوٹے چھوٹے سوراخ پائے گئے جو کہ انسانی نشو و نما کے لیے بے حد مضر ہیں لیکن ڈبلو سی پر لیزر بیم کا کوئی مضر اثر نہیں پایا گیا۔ یہاں یہ جاننا مناسب لیزر کا اثر اس کی طول موج (wave length) او کرنے کے وقت پر بھی ہوتا ہے۔ تحقیقی کاموں سے یہ واقف

ہے کہ nm 40 — 20 کا لیزر جسم پر صرف حرارت پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس سے زیادہ طاقت ور لیزر کم وقت میں ہی زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں سائنس دانوں نے درجۂ حرارت کے بڑھنے سے انسانی جسم پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں ؟ اس کی تحقیق کی ہے۔ اگر جسم کا درجۂ حرارت 40°C تک پہنچ جائے تو خلیوں کو باندھے رکھنے والی قوت ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ طاقت کچھ وقفے کے بعد دوبارہ کام کرنا شروع کر دیتی ہے جسم کا درجۂ حرارت جب 60°C تک پہنچ جاتا ہے تو جسم کے جاندار خلیات ضایع ہو سکتے ہیں اور ان میں موجود لحمیہ (پروٹین) اپنی شکل بدل لیتی ہے اگر درجۂ حرارت 80°C تک پہنچ جائے تو ڈی-این-اے اپنی خصوصیات بدل لیتی ہے۔ اگر درجۂ حرارت 100°C تک پہنچ جائے تو خلیوں میں موجود پانی بھاپ میں منتقل ہو جاتا ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے خلیے ایک دوسرے سے الگ ہونے لگتے ہیں اور وہاں پر سوراخ بن جاتے ہیں۔ یہی تکنیک سرطان جیسے موذی مرض سے بچاؤ/علاج میں لائی جاتی ہے۔ جب درجۂ حرارت 100°C سے زیادہ ہو جاتا ہے تو جسم پر بہت خراب اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ درجۂ حرارت اور زیادہ طاقتور لیزرس کا استعمال علاج کے لیے تجویز نہیں کیا جاتا ہے۔

لیزر دیپو رائی زیشن تکنیک (ایل-وی-پی) سرجری میں بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ مذکورہ تکنیک کا مخصوص استعمال سرطان یا رسولی کے مریضوں پر کیا جاتا ہے۔ لیزر سرجری آج بالخصوص آنکھ، دانت، کان، جگر، دماغ نسوانی اعضا اور چھاتی کے کینسر میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ مندرجہ ذیل میں لیزر کا استعمال مذکورہ شعبوں کے سرجری محکمے میں کس طرح سے اور کن کن بیماریوں میں کیا جا رہا ہے، اس کو مختصراً جاننے کی کوشش کریں گے۔

لیزر اور امراض چشم:۔ لیزر کا استعمال سب سے زیادہ امراض چشم کے شعبے میں ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے آنکھ کے مریض جن کو
۱۔ ذیابیطس ریٹینو پیتھی ۲۔ روشن آنکھ کے پردے کا غول (Detachment of Retina) ۳۔ ریٹینل اینجیو میٹوسیس ۴۔ موتیا بند ۵۔ آنکھ کا سرطان وغیرہ ہو، لیزر مائیکرو سرجری سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں روبی لیزر کا استعمال ڈیٹیچ منٹ آف ریٹینا کے مریضوں پر کیا گیا۔ لیزر کا استعمال آنکھ کے سرطان/رسولی کے مریضوں میں بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ آرگن لیزر کا استعمال سرطان کے مریضوں میں بہت مقبول ہے۔ لیزر بیم کے استعمال سے آنکھ کے سرطان سے متاثر حصّہ کو ضایع کر دیا جاتا ہے جس سے آنکھ کے دوسرے حصّوں کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

آرگن لیزر جن کی قوت mw ۳۰۰ - ۱۰۰ اور افشا وقت ۰.۵-۰.۲ سکنڈ کا استعمال ذیابیطس ریٹینو پیتھی کے مریضوں پر کیا جاتا ہے۔ ایلفینک آنکھوں کے مریضوں کا علاج آرگن فوٹو کوکولیٹر قوت mw ۱۰۵ - ۰.۴ اور افشا وقت ۲۰.۵ - ۰.۲ سکنڈ کے استعمال سے آنکھ کی پتلی بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان امراض کے علاوہ موتیا بند اور ریٹینل اینجیو میوسیس کا علاج لیزر سے کیا جا چکا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ لیزر سرجری آنکھ کے امراض میں بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

لیزر اور امراض گوش: لیزر مائکرو سرجری کان کے علاج میں بھی بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ کان کے اندرونی حصّہ کی سرجری بہت مشکل ہوتی تھی کیوں کہ جو آلات آپریشن میں استعمال ہوتے تھے، ان کا کان کے اندرونی حصوں تک پہنچنا بہت دشوار ہوا کرتا تھا۔ لیزر مائکرو سرجری سے اس دشواری کا حل تلاش کیا گیا ہے۔ لیزر بیم کو اسٹریو مائکرواسکوپ کے ذریعے کان کے اندرونی حصّوں کی جراحی ہوتی ہے۔ اس جراحی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرجری کے بعد کان کے اندر کسی بھی قسم کا کوڑا کرکٹ (ڈیبرس) یا بون ڈسٹ یا بون چپس وغیرہ نہیں رہ جاتے کیوں کہ لیزر سرجری میں خون بھی نہیں نکلتا ہے۔ اس لیے کان کے اندر کسی بھی قسم کی آلودگی (انفکشن) نہیں ہوتی ہے۔ این-ڈی لیزر یا روبی لیزر کی زیادہ تیز شعاعیں کان کے اندرونی حصوں اور کھوپڑی کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس لیے آرگن لیزر یا سی-ڈبلو کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر جن کی قوت w ۵ اور افشا وقت m.sec ۱۵۰ - ۱۵ تک کا ہی استعمال کرنا مناسب ہوتا ہے۔ آئی آر-کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر کان کے اندرونی حصوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

لیزر اور آرتھو پیڈک سرجری:۔ لیزر سرجری کی خصوصیات کے مدّنظر بون سرجنس اس کا استعمال بون کٹنگ یا بون گرافٹنگ میں کرتے ہیں۔

آسٹو مائی لائٹس اور وسکو لر لون ٹیومر میں. کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہڈی کے سرطان کے لیے لیزر سرجری امید کی کرن ہے۔ تصویر نمبر ۲ میں مذکورہ لیزر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

تصویر نمبر ۲ کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر۔

لیزر اِن نیورو سرجری:۔ دماغ کے سرطان / رسولی کا آپریشن جراحی میں سب سے مشکل تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ اکثر اس طرح کے آپریشن میں مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے یا اس کے جسم پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آج لیزر نیورو سرجری نے کافی ترقی کی ہے۔ لیزر بیم کو دماغ کے سرطان والے حصّے کو افشا کراتے ہیں۔ اس سے سرطان کے خلیے تباہ ہو جاتے ہیں اور آس پاس کے نارمل سیلس کو لیزر سرجری سے بچایا جاتا ہے۔ تصویر نمبر ۳ میں کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر سے دماغ کی جراحی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے

لیزر اِن لنگس / برین / انٹسٹائن کینسر:۔ پھیپھڑا، دماغ اور آنت کے سرطان میں فوٹو ریڈئیشن تھراپی (پی۔آر۔ٹی) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اس تکنیک میں مریض کو فوٹو سینسٹیو کیمیکل انجکشن کے ذریعے جسم میں داخل کر دیتے ہیں۔ سرطان والے حصّہ کو لیزر کی شعاعوں سے افشا کیا جاتا ہے۔ لیزر بیم اس حصّہ پر پی۔ایس۔سی کی وجہ سے زیادہ جذب ہوتی ہے۔ اس حصّہ پر فوٹو کیمیکل ردِّ عمل ہوتا ہے جو سرطانی خلیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

لیزر اور امراض جلد: لیزر کا استعمال جلد کے امراض میں بھی کیا جاتا ہے۔ ہیلیم نیون لیزر کو بیسل سیل کارسی نوما اور جلد سرطان پر استعمال کیا گیا ہے اور امید افزا نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ڈیسکے ریٹیوسس، ہائی پرکریٹوسس اور رایکن تھوسیس کے مریضوں کا علاج ہیلیم نیون لیزر سے کیا جاتا ہے۔ جلد کی دوسری بیماریوں میں بھی لیزر کا استعمال مستقبل قریب میں ہو سکے گا۔

(تصویر نمبر ۳ - کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر سے دماغ کی سرجری

لیزر اور امراضِ نسواں:۔ لیزر کا استعمال رحم، بیضہ دانی اور پستان کے سرطان میں بھی کامیابی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لیزر شعاعوں سے سرطانی خلیوں کو ویپورائی زیشن تکنیک سے ختم کیا جاتا ہے۔ اس سے چھاتی کے طبعی خلیوں کو بچایا جا سکتا ہے۔ لیزر مائکرو سرجری پستان کے سرطان کے لیے امید کی کرن بن کر نمودار ہوئی ہے۔

رحم کے سرطان کا علاج کچھ وقت پہلے تک ریڈیو تھراپی سے کیا جاتا تھا لیکن امراض نسواں کے سرجنس اس تکنیک سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے کیوں کہ ریڈیو تھراپی طریقہ علاج میں ڈاکٹر، نرس اور مریض ریڈیئشن سے محفوظ نہیں رہ پاتے تھے لیکن لیزر سرجری ان خطرات سے مبرا ہے۔ اس عمل جراحی کے تحت بچّہ دانی اور رحم کے منہ کے سرطان میں سی۔ ڈبلو کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر استعمال کیا جاتا ہے۔

گردے اور پیشاب کے امراض میں لیزر کا استعمال :

پیشاب کی نلی اور گردے کی جراحی بھی کافی مشکل ثابت ہوتی ہے لیکن لیزر بلڈلیس سرجری سے گردے کے سرطان کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس طرح پیشاب کے امراض میں بھی یہ طریقہ علاج کامیاب ثابت ہوا ہے۔

لیزر سے نقصانات :- آج حیاتیات اور علم ادویات میں لیزر کے استعمال پر کافی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ مستقبل قریب میں شاید میڈیکل سائنس کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں ہوگا جس میں لیزر کا استعمال نہ ہو۔ جہاں لیزر بنی نوع انسان کے لیے امید کی کرن ہے، وہاں اس کے استعمال سے کچھ نقصانات بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ایل۔ وی۔ ڈی کے استعمال سے خراب خلیوں کو ضایع کرتے وقت آس پاس کے طبعی خلیوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے جو نہایت تشویش ناک بات ہے۔ اس لیے لیزر کا استعمال اس وقت تک مناسب نہ ہوگا جب تک ہمارے پاس مکمل طور سے آراستہ لیزر آپریشن تھیٹر نہ ہوں اور ماہر سرجن و انجینیر بآسانی دستیاب نہ ہوں۔۔ اس وقت تک لیزر کا استعمال "لاسٹ ہوپ" کے طور پر کرنا ہی مناسب ہوگا۔

لیزر کا مستقبل :- لیزر کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مستقبل میں لیزر سے تمام جراحی کے امراض کا علاج بآسانی ہو سکے گا۔ ا[ور] وہ دن دور نہیں ہیں جب لیزر سرجری کو میڈیکل سائنس کے نصاب میں شامل کیا جائے گا۔ نئے نئے لیزر آپریشن تھیٹر بنائے جائیں گے اور [ماہر] سرجن اسپتالوں میں موجود ہوں گے۔ لیزر کا استعمال مستقبل میں بدیہ[illegible] رسولی، جگر کا سرطان، ریکٹم، شرم گاہ، عنق، نرخرہ اور ناک کا غدود وغیرہ کا علاج لیزر انڈواسکوپی اور مائکرو سرجری سے ممکن ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لیزر کے آلات میں بھی ترقی ہوگی لہٰذا علاج میں بھی سہولتیں فراہم ہوں گی۔ مستقبل میں لیزر ڈاکٹر ترقی یافتہ لیزر سرجری کے استعمال سے مریضوں کا بخوبی علاج کیا کریں گے۔ اس لیے لیزر مائکرو سرجری ان مریضوں کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھے گی جو مذکورہ امراض میں شفا سے ناامید ہو چکے ہوں گے۔

امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر، یا ایک کام سے چھڑا کر دوسرے کام کے لگائے جانے پر، جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں، یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے، تو کون شخص ہے جو ان کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا، گو کہ کیسے ہی ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے؟ اس قسم کی اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں گو وہ وحشی پنے کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے، تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں!

سر سید رح

ابرقوہی ــــ طب یونانی کا ایک نادر مخطوطہ

نعیم احمد خاں

دورِ حاضر میں طباعت اور کتابت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ روزانہ ہزاروں رسائل، اخبارات اور کتابیں طبع ہو رہی ہیں اور مختلف علوم و فنون پر لوگوں کے علمی کارنامے سامنے آ رہے ہیں جن سے کتب خانے بھرتے جاتے ہیں دنیا کی ہر لائبریری کی اہمیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس میں مخطوطات کا ذخیرہ کس قدر ہے۔ ان مخطوطات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ غیر مطبوعہ مخطوطہ بہ اعتبار موضوع۔
۲۔ اہم نوادرات یا اہم مصنف کی تصنیف۔
۳۔ مخطوطہ کی قدامت۔

طب ایک قدیم ترین طریقۂ علاج ہے اس کی ابتدا مصر میں ہوئی تھی۔ یونانی عہد میں جب مختلف موضوعات پر کتابیں سپرد قلم کی گئیں تو اس میں فن طب کو اولیت حاصل رہی۔ بقراط، تاوافرسطوس، جالینوس اور دیسقوریدوس جیسے ماہرین طب نے وہ علمی کارنامے انجام دیے جن کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی سے عربوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ عباسی عہد (۷۴۹ء–۱۲۵۸ء) جس میں مختلف علوم و فنون کے علاوہ طب پر خصوصی توجہ رہی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یونانی کتابوں کا ترجمہ ہے جن کو انہوں نے عربی میں منتقل کیا۔ اس عمل سے اس فن کی ترویج و تدوین میں مدد ملی۔ آج بھی طب یونانی کا بہت سارا علمی اور قیمتی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں مختلف لائبریریوں کی زینت ہے جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ یہ وہ مخطوطات ہیں جو علم طب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مذکورہ مخطوطہ اسی کی ایک کڑی ہے۔ اس کا تفصیلی تعارف پیش ہے۔

قطب الدین، ابوالفضل محمد بن اسحاق بن محمد المؤید الہمدانی الابرقوہی ثم المصری (۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء) ۱۳ویں صدی عیسوی کے نہ صرف فاضل طبیب بلکہ زبردست محدث تھے۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے حدیث کی سماعت کی ہے معالجات طب پر ان کی یہ کتاب جو کسی نام کے بجائے مصنف کے نام سے مشہور ہے اور طب کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پوری کتاب تقریباً ۷۷ ابواب میں تقسیم ہے اور ہر باب کے ذیل میں جسم کے کسی نہ کسی مرض یا مرض کی ذیلی اقسام کا تذکرہ ہے۔ ہر مرض کے سلسلے میں متعلق دواؤں کو مختلف شکلوں اور طریقوں سے استعمال کرانے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مفرد دوائیں جو مختلف امراض میں مذکور ہوئی ہیں، انہیں مناسب بدرقات کے ساتھ استعمال کرایا گیا ہے۔ مرض کی ماہیت، علامات نیز دوسرے احوال سے صرف نظر کر کے بطور علاج صرف ادویہ مفردہ کا تذکرہ کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ادویہ مفردہ میں بھی مصنف نے اس امر کی کوشش کی کہ ایک ہی مفرد دوا استعمال کی جائے۔ دواؤں کی کثرت متاخرین کا طریقہ ہے۔ متقدمین کے یہاں کم سے کم دواؤں کے استعمال پر جو زور دیا گیا ہے یہ کتاب اس کی بہ نمائندہ ہے۔ اس قسم کی دوسری کتابوں میں مثال کے طور پر "کتاب المغنی" اور "تذکرہ امام سویدی" کا نام لیا جاسکتا ہے۔

مخطوطے کی ندرت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف مرض کو دور کرنے والی دواؤں کا تذکرہ ہے بلکہ اُن امراض کو پیدا کرنے والی دواؤں کا تذکرہ بھی خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً صداع اور اس کی اقسام کے ذیل میں بھی ایسی دواؤں کا ذکر ہے جو ادویہ مصدعہ یعنی درد سر پیدا کرنے والی ہیں۔ مثلاً عنب، کرّاث، کندر، کبر، خردل، ریحان، توت، جوز، حرمل وغیرہ۔

بہت سے امراض کے ذیل میں بالخاصہ اثرانداز ادویہ کا بھی ذکر ہے مثلاً صداع میں تعلیق مرجان۔ صرع میں تعلیق عود صلیب اور نیم اسطوخودس نیز حجرالعتیق کی تعلیق وغیرہ۔

مانع حمل دوائیں بھی بکثرت بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ چمگادڑ کے پتے کا حمول، تخم حماض کا حمول مانع حمل بتایا گیا ہے۔ اسی طرح کی بکثرت اور دواؤں کا بھی اس میں ذکر ہے، جنہیں خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ مخطوطہ میں سر، آنکھ، ناک، کان، حلق، سینہ، پھیپھڑہ، قلب، معدہ، جگر و آنتوں، گردہ ومثانہ، ودامراض رحم کا مفصل تذکرہ ہے۔ امراض جراحیہ مثلاً ضربہ، سقطہ، کسر و خلع پر بھی خاصی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ سموم و تریاق اور حشرات الارض سے پیدا شدہ سمی اثرات اور ان کے مناسب تدارک پر بڑی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں فصول متفرقہ کے عنوان سے مختلف امراض سے متعلق مجرب، سریع الاثر، بغایت اثر انداز، بلیغ نفع جیسے لفاظ کے ساتھ بکثرت دواؤں کو درج کیا گیا ہے۔ چار صفحات پر پھیلی ہوئی اس قسم کی کم وبیش ۱۵۰ دوائیں ذکر کی گئی ہیں۔ مثلاً آطریلال کو برص میں مجرب لکھا ہے۔ زرنیخ احمر کو سرکہ میں حل کر کے اس کی کلیاں خرس میں بلیغ النفع بتائی ہیں۔ جرب العین میں زعفران اور شعیرہ کے لیے صبر سقوطری کا بطور سرمہ استعمال مجرب تحریر کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ادویہ مفردہ کے بدل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ایک نیا عنوان ہے جس کا انداز بیان ذکریا رازی کے رسالہ' ابدال ادویہ کے مانند ہے۔ یہ آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں دو سو سے زیادہ دواؤں کے بدل کا تذکرہ ہے۔ آخری صفحات میں دواؤں کے درجات مزاج کے لحاظ سے بھی منضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ پوری کتاب نہ صرف معالجات کے نقطۂ نظر سے بلکہ علم الادویہ کے لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

مخطوطہ کی کتابت ۱۲۰۷ھ میں کی گئی ہے یہ ۲۱۶ اوراق یعنی ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ اگرچہ مکمل ہے مگر صفحات بہت بے ترتیب مجلد ہیں۔ ابواب کی نشاندہی جلی اور رنگین قلم سے کی گئی ہے۔ اس کتاب کے ساتھ یوسفی کا رسالہ' ماکول و مشروب' بھی مجلد ہے۔ مخطوطہ لکھنؤ کے نامور طبیب حکیم مظفر حسین خاں کی ملکیت رہ چکا ہے اور اس پر ان کی مہر کندہ ہے۔ یہ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں موجود ہے۔

"ہر انصاف جس کا مطالبہ کمزوری کرے، رحم ہے اور اس دنیا میں قومیں رحم نہیں کیا کرتیں۔ یہاں صرف طاقت اور ضرورت کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اسی کا نام انصاف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حقیقت کے خلاف ہر فریب خیال سے انکار کر دیں۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۱۱ (نومبر ۸۷ء)

خُون اور اُس کی اہمیت

خاور عباس عباسی

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ خون ہمارے جسم میں موجود مختلف سیّالوں (FLUIDS) میں اہم ترین ہے۔ خون کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ صرف انسانی زندگی کا ہی نہیں بلکہ انسان کی صحت کا بھی خون سے گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارا جسم اربوں خلیوں (CELLS) سے مل کر بنا ہے۔ ان خلیوں کو زندہ رہنے کے لیے لگاتار توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو اس کے مختلف اجزا بہت چھوٹے چھوٹے ذرّات کی شکل میں پیٹ اور آنتوں کے ذریعے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں مگر اس غذا کو اربوں خلیوں تک پہنچانے کا کام ہمارے جسم میں رواں خون انجام دیتا ہے۔ خلیوں میں غذا کے استعمال یعنی اس کو توانائی (ENERGY) میں بدلنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ آکسیجن بھی خون کے ذریعے ہی ان خلیوں تک پہنچتی ہے مگر خون کا کام صرف خلیوں کو غذا اور آکسیجن پہنچا کر انھیں زندہ رکھنے تک ہی محدود نہیں ہے METABOLISM کے دوران خلیوں میں جو غیر ضروری یا نقصان دہ چیزیں بنتی ہیں، ان سے بھی انھیں خون ہی چھٹکارا دلاتا ہے۔ خون ہی ہمارے جسم کی قوت مدافعت کے لیے ذمّہ دار ہے جس کے ذریعے یہ ہمیں مختلف بیماریوں سے بچاتا ہے۔ ہمارے جسم کے درجۂ حرارت کو بھی خون ہی کنٹرول کرتا ہے۔ اس طرح ہمارے جسم کے نسیجوں میں پانی کی مقدار کو بھی خون کنٹرول کرتا ہے (ہمارے جسم کا تقریباً ۷۰ فیصد حصّہ پانی ہے)۔ چوٹ کو صحیح کرنے یا زخم کے بھرنے میں بھی خون کا اہم رول ہے۔ اِس کے علاوہ جسم میں موجود مختلف غدود سے خارج ہونے والے HARMONES کو جسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا کام بھی خون ہی کے ذمّے ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ خون کے جمنے کی صلاحیت بھی ہمارے جسم کے لیے کئی طرح سے مفید ہے

انسانی جسم اور خون۔ انسانی جسم کا تقریباً ۸ فی صد وز… خون کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک صحت مند نوجوان میں تقریباً پانچ لیٹر خون ہو… ہے۔ اس میں سے تقریباً ۸ فی صد پرانا خون (تقریباً ۴۰ ملی لیٹر) روزانہ … خون سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ خون کو جسم کے مختلف حصّوں تک پہنچانے … لیے دل ایک پمپ کی طرح کام کرتا ہے۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ خون … کی بائیں طرف والے حصّے سے شریانوں ARTERIES میں ہوتا ہو… جسم کے مختلف حصّوں تک پہنچتا ہے اور وہاں سے نسوں (…EINS) میں ہوتا ہوا دل کے دائیں حصّے میں پہنچ جاتا ہے۔ دوبارہ دوران میں آ… کے لیے خون کو پھیپھڑوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ پھیپھڑوں میں خو… آکسیجن کو جذب کر لیتا ہے اور خلیوں سے لائی گئی غیر ضروری گیس کا… ڈائی آکسائڈ کو خارج کر دیتا ہے جو کہ سانس کے ساتھ ساتھ پھیپ… سے باہر چلی جاتی ہے۔

اجزاءِ خون اور ان کی خصوصیات: خون کو دو حصّو… میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۵۵ فی صد حصّہ محلول کی شکل میں ہوتا ہے جسے '…LASMA' کہتے ہیں اور باقی ۴۵ فی صد حصّہ خلیوں کا ہوتا ہے جو کہ تین… کے ہوتے ہیں۔

لال خلیے R.B.C یا RED BLOOD CORBUSCLES

سفید خلیے W.B.C یا WHITE BLOOD CORPUSCLES

پلیٹلٹ - PLATELET

یہ سب خلیے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں بغیر خورد بین کے نہیں دیکھا جا…

لال خلیوں کی تعداد ۵۰ - ۴۰ لاکھ فی ملی لیٹر ہوتی ہے۔ ان خلیوں میں ایک خاص قسم کی لحمیہ (PROTEIN) ہوتی ہے جسے ہیموگلوبن (HAEMO-GLOBIN) کہتے ہیں اور اسی کی وجہ سے ان خلیوں کا رنگ لال ہوتا ہے۔ مردوں کے خون میں ہیموگلوبن کی مقدار ۱۵ - ۱۳ گرام فی صد ہوتی ہے اور عورتوں کے خون میں ۱۴ - ۱۲ گرام فی صد۔ خون کی کمی (ANAEMIA) میں اس لحمیہ کی مقدار ۱۰ گرام فی صد سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ ایک لال خلیہ تقریباً ۴ مہینے تک دوران خون میں رہتا ہے۔ سفید خلیے بھی کئی اقسام کے ہوتے ہیں یہ خلیے ہمارے جسم میں بیماریوں کے خلاف مدافعتی اور مزاحمتی قوت کے لیے ذمہ دار ہیں۔ سفید خلیوں کی ہی ایک قسم Lymphocytes ہوتی ہے۔ یہ ہمارے جسم میں باہر سے داخل ہونے والے جراثیموں اور دوسرے نقصان دہ مادوں کو بے اثر کرنے کے لیے Anti Bodies بناتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی Anti Bodies صرف ایک خاص قسم کے جراثیم یا دوسرے مادے کے خلاف اثر انداز ہوتی ہیں اور ہمارے جسم کو اس بیماری سے بچانے یا چھٹکارا دلانے کا کام انجام دیتی ہیں۔ اس کے برخلاف کچھ دوسرے قسم کے سفید خلیے ہر قسم کے جراثیم یا نقصان دہ مادے کے خلاف اثر رکھتے ہیں مگر وہ بھی ہمیں سب بیماریوں سے نہیں بچا سکتے۔

تیسری قسم کے خلیے (دراصل خلیوں کے ٹکڑے) جنھیں Platelet کہتے ہیں خون کے جمنے میں مدد کرتے ہیں۔

PLASMA میں دوسری چیزوں کے علاوہ کچھ خامرے (ENZYMES) بھی ہوتے ہیں۔ کچھ بیماریوں میں خاص قسم کے خامرے کی مقدار گھٹ یا بڑھ جاتی ہے اور اس طرح ہم مقدار کو ناپ کر اس بیماری کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

خون کیسے بنتا ہے۔

انسانی جسم میں خون ہڈیوں میں موجود BONE-MARROW سے بنتا ہے۔ ۵ سال کی عمر تک سب ہڈیوں میں خون بنتا ہے مگر بعد میں سب ہڈیاں خون کے بنانے میں حصہ نہیں لیتیں اور ۲۰ سال کی عمر کے بعد صرف بانہہ، ران، ریڑھ، کولہے اور سینے کی ہڈیاں ہی خون بنانے میں حصہ لیتی ہیں۔

بلڈ گروپ:

مختلف انسانوں کے خون کو الگ الگ گروپ میں بان
کا کام سب سے پہلے KARL LANDSTEINER نے کیا
ایک اہم طریقے کے مطابق جس کو A.B.O. SYSTEM کہتے ہیں انسا
خون چار گروپ کا ہوتا ہے۔

- A- گروپ
- B- گروپ
- AB- گروپ
- O گروپ

ایک دوسرے طریقے جس کو Rh SYSTEM کہتے ہیں انسا
خون کو دو گروپ میں بانٹا جاتا ہے Rh(+) یا Rh(-)۔

عام طور پر خون کے گروپ کو لکھنے میں دونوں سسٹم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا خون A گروپ کا او Rh(+) گروپ کا ہے تو اس کو A(+) گروپ لکھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں 'O' گروپ ۴۰ فیصد 'A' گروپ ۲۲ فی صد 'B' گروپ ۳۳ فی صد اور 'AB' گروپ ۵ فی صد لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح Rh(+) گروپ ۸۵ فی صد اور Rh(-) گروپ ۱۵ فی صد لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

بچوں کا بلڈ گروپ ان کے والدین کے بلڈ گروپ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جوڑے کے بچوں میں صرف کچھ خاص بلڈ گروپ ہی پائے جا سکتے ہیں۔

Rh گروپ ان شادی شدہ جوڑوں میں بہت اہمیت کا حامل ہے جن میں شوہر Rh(+) گروپ کا اور بیوی Rh(-) گروپ کی ہو۔ ایسی صورت میں یا تو ان کے کوئی بچہ زندہ پیدا نہیں ہوگا یا پھر پہلے بچے کے بعد سب بچے مردہ یا پیلیا (JAUNDICE) میں مبتلا پیدا ہوں گے۔ اس بیماری کو Rh-Incompatibility کہتے ہیں۔ حالاں کہ اس کا علاج ڈھونڈ لیا گیا ہے مگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔

BLOOD TRANSFUSION.

جب انسان کے جسم میں خون کی بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے تو اسے خون چڑھانے یا Blood Transfusion کی ضرورت پڑتی ہے مگر انسان کو ہر دوسرے انسان کا خون نہیں چڑھایا جا سکتا۔ نیچے خون لینے والے کا بلڈ گروپ اور ان اشخاص کا بلڈ گروپ دیا جا رہا ہے جن کا خون وہ لے سکتا ہے۔

خون لینے والے کا بلڈ گروپ	خون دینے والے کا بلڈ گروپ
'A'	'A', 'O'
'B'	'B', 'O'
A.B	'A', 'B', 'AB', 'O'
'O'	O

اگر کسی آدمی کے غلط گروپ کا خون چڑھا دیا جائے تو اس آدمی کا خون گھل سکتا ہے جس سے اس آدمی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

خون کا جمنا۔

جب ہمارے جسم میں کہیں چوٹ لگ جاتی ہے تو اکثر وہاں سے خون کا بہاؤ شروع ہو جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں ہی خون بہنا خود ہی بند ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تھوڑی سی چوٹ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ عام طور پر ۳ سے ۶ منٹ کے اندر خون کا بہاؤ رک جاتا ہے اور ۵ سے ۸ منٹ کے اندر خون چوٹ کی جگہ جم جاتا ہے۔

اہمیت :۔

حالاں کہ انسانی کردار یا (EMOTIONS) جذبات کا خون سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر اس کے علاوہ بھی خون بہت اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر کسی انسان کی صحت کا اندازہ اس کے جسم میں موجود خون سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خون کی جانچ کر کے بہت سی بیماریوں کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔

اگر دوران حمل انسانی جسم میں لوہے (IRON) کی کمی ہو جائے تو وہ عورت خون کی کمی (ANAEMIA) کا شکار ہو سکتی ہے، جس سے اس کی صحت اور بچے کی صحت دونوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے حاملہ عورتوں کو ہری سبزی، گڑ وغیرہ کھانے کی صلاح دی جاتی ہے جس میں (IRON) کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حاملہ عورتوں کو IRON TABLETS بھی کھانے کو دی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ پیٹ میں کیڑے HOOK WORM ہونے سے بھی آدمی خون کی کمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ کیڑے ان لوگوں کے پیٹ میں زیادہ پائے جاتے ہیں جو ننگے پیر رہتے ہیں۔

ہسپتال میں جانچ کے لیے خون دینے سے یا کسی ایسے کو خون دینے میں جس کو خون کی ضرورت ہو گھبرانا نہیں چاہیے۔ کیوں کہ اس سے جسم میں کوئی کمزوری نہیں آتی ہے اور صرف کچھ دنوں میں ہی خون کی مقدار پھر بڑھ جاتی ہے۔ اس دور میں جب کہ ہر چیز مصنوعی تیار کی جا رہی ہے۔ سائنس داں مصنوعی خون بنانے کی کوشش میں ہیں تاکہ وقت ضرورت اس کا استعمال کیا جا سکے۔

> " اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جاویں۔ خدا سے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا او. خدا ایسا ہی کرے۔ او خدا ایسا ہی کر ۔ آمین "۔
>
> سر سید "

مغربی یو پی کے تیرہ مسلم جونیر ہائی اسکولوں میں گزشتہ سال کے دوران

مسلم لڑکیاں تعلیم میں اور پیچھے گئیں

بیگم نصرت شیروانی

مغربی یو۔پی کے چار خالص مسلم گرلز جونیر ہائی اسکولوں اور نو کو ایڈ اسکولوں میں مسلم لڑکیوں کے نتائج چارٹ میں درج ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ گزشتہ سال کے دوران اس سطح پر ان اسکولوں میں مسلم لڑکیاں تعلیم میں بالکل آگے نہیں بڑھیں بلکہ تھوڑی سی پیچھے ہی گئیں۔ کتنی؟ پچھلے سال یعنی ۱۹۸۶ء میں ان ہی اسکولوں سے ملا کر چھیانوے مسلم لڑکیاں بورڈ امتحان میں شریک ہوئی تھیں۔ اس سال یعنی ۱۹۸۷ء میں صرف چورانوے شریک ہوئیں یعنی تعداد دو عدد کم ہو گئی۔ پچھلے سال ۳۷ سینتیس مسلم لڑکیاں فرسٹ ڈویژن لائی تھیں۔ اس سال ۳۶ چھتیس۔ یعنی تعداد ایک عدد کم ہو گئی پاس کی تعداد اور فیصد کا کالم نہیں رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ اس سال ان سب اسکولوں سے سو فیصد مسلم طالبات پاس ہوئیں۔ البتہ فرسٹ ڈویژن کا تناسب ۳۹ انتالیس فیصد سے گھٹ کر اڑتیس فیصد رہ گیا۔

مغربی یو۔پی کے علاوہ باقی یو۔پی (یعنی وسط و مشرقی یو۔پی) کے بالکل اتنے ہی جونیر ہائی اسکولوں میں مسلم لڑکیوں کے نتائج الگ سے پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان کا موازنہ مغربی یو۔پی کے ان اسکولوں کے اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جس سال کے دوران ان سب مشرقی یو۔پی کے اسکولوں سے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد قریب ڈیڑھ گنی ہو گئی۔ اسی سال کے دوران مغربی یو۔پی کے اسکولوں میں تعداد دو فیصد گھٹ گئی۔ فرسٹ ڈویژن کی تعداد بھی وسط و مشرقی یو۔پی میں قریب ہونے دو گنی ہو گئی اور مغربی یو۔پی میں ایک عدد کم ہو گئی۔

کوئی وجوہات؟

اس بات کی کوئی خاص وجہ ہماری تو سمجھ میں آئی ... وسط و مشرقی یو۔پی میں عموماً جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان کی سطح ... لڑکیاں خاطر خواہ بلکہ قابل تعریف رفتار سے آگے بڑھیں، ترقی کر ... مغربی یو۔پی میں عموماً یا تو وہیں کی وہیں رہیں یا پھر تھوڑی سی پیچھے چلی ... بہر حال اگر کوئی خاص وجہ ہے (یا کوئی خاص وجوہات ہیں) تو مغربی ... کے مسلم جونیر ہائی اسکولوں کے ذمہ داران ان پر روشنی ڈالیں ... ہوگی۔

حمیدیہ گرلز جونیر ہائی اسکول میرٹھ سے بورڈ امتحان ... ہونے والی طالبات کی تعداد ۳۳ تینتیس سے بڑھ کر چالیس ہو گئی۔ ذاک... جونیر ہائی اسکول بریلی میں بھی پانچ سے بڑھ کر سات ہو گئی۔ نیشن... ہائی اسکول ودھیڑو ضلع مظفر نگر میں بھی دو سے بڑھ کر چار۔ الاصلاح ... جونیر ہائی اسکول کمال پور ضلع بلند شہر میں صفر سے بڑھ کر تین ... سلیم مبشر ماڈل اسکول بدایوں میں بھی صفر سے بڑھ کر تین۔ ... تیرہ میں سے بھی پانچ اسکول ایسے ہیں جہاں بہر حال تعداد بڑھی مگر باقی آٹھ میں تعداد کم ہوئی۔ رحمانیہ گرلز جونیر ہائی ا... بدایوں میں بارہ سے گھٹ کر نو، سید منور علی گرلز جونیر ہائی ... بدایوں میں دس سے گھٹ کر نو۔ اس کے علاوہ ضلع بدایوں کے ... اسکولوں میں سے ایک آزاد اسکول گکرالہ میں تعداد ۲ دو سے

مغربی یو۔پی کے مسلم جونیئر ہائی اسکولوں میں مسلم لڑکیوں کے نتائج

۱۹۸۶ء شریک	فرسٹ	فیصد	جونیئر ہائی اسکول	مقام	ضلع	۱۹۸۷ء شریک	فرسٹ	فیصد
۱۲	۱	آٹھ	رحمانیہ		بدایوں	۹	۷	اٹھہتر
۱۰	–	صفر	سید منور علی		″	۹	–	صفر
–	–	–	سلیم مبشر		″	۳	–	صفر
۳۳	۲۱	چونسٹھ	حمیدیہ		میرٹھ	۴۰	۱۵	اڑتیس
۵۵	۲۲	چالیس	چار خالص مسلم گرلز اسکولوں میں			۶۱	۲۲	چھتیس
۶	۱	سترہ	مومن انصار	سہسوان	بدایوں	۵	۴	اسی
۲	۱	پچاس	آزاد	ککرالہ	″	–	–	–
۴	–	صفر	جعفری بیگم	سنگرام پور	″	۱	–	صفر
۵	۱	بیس	ذاکر حسین		بریلی	۷	۲	انتیس
۱	۱	سو	مولانا آزاد		″	–	–	–
۱	۱	سو	پپلیرہ		غازی آباد	–	–	–
۲	۱	پچاس	نیشنل	دودھڑو	مظفرنگر	۴	۳	پچھتر
–	–	–	الاصلاح	کمال پور	بلند شہر	۳	۳	سو
۲۰	۹	پینتالیس	پبلک نرسری	دیوبند	سہارنپور	۱۳	۲	پندرہ
۴۱	۱۵	سینتیس	نو کو ایڈ اسکولوں میں			۳۳	۱۴	بیالیس
۹۶	۳۷	انتالیس	تیرہ اسکولوں میں			۹۴	۳۶	اڑتیس

صفر رہ گئی۔ دوسرے جعفری بیگم اسکول سنگرام پور میں چار سے گھٹ کر ایک رہ گئی تیسرے مومن انصار اسکول سہسوان میں چھ سے گھٹ کر پانچ رہ گئی۔ گویا بدایوں ضلع کے ان پانچ اسکولوں میں ملاکر تعداد چھتیس سے گھٹ کر چوبیس رہ گئی۔ آخر کیوں؟ بدایوں میں جونیئر ہائی اسکول بورڈ امتحان کی سطح پر مسلم لڑکیوں کی تعداد کم ہونے کی طرف ان اسکولوں کے ذمہ داران کو متوجہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کی کوئی وجوہات بتائیں تو بڑا کرم ہوگا۔
بہیڑی کے ایک اسکول میں تو تعداد بڑھی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مگر

دوسرے مولانا آزاد اسکول میں مسلم لڑکیوں کی تعداد ایک سے گھٹ کر صفر ہو گئی طرح پپلیڑہ ضلع غازی آباد کے اسکول سے بھی پچھلے سال ایک مسلم لڑکی امتحان دیا تھا۔ مگر اس سال صفر اور سب سے آخر میں ضلع سہارنپور کے واحد موجود مسلم جونیئر ہائی اسکول سے بورڈ امتحان دینے والی مسلم تعداد بیس سے گھٹ کر صرف تیرہ رہ گئی۔ اس کے ذمہ داران بھی کم ہونے کی وجوہات پر غور کر کے کچھ فرمائیں تو مہربانی ہوگی

~~~~~~~~
~~~~~~~~

زندگی اور اس کا آغاز

شمیم اختر انصاری اور محمد مسرور اختر خاں

زندگی کیا ہے اور یہ کب اور کیسے وجود میں آئی یہ ایک ایسا معمہ ہے ہے جس کو حل کرنے میں انسانی تہذیب اپنے آغاز سے ہی کوشاں ہے۔ دو صدی قبل تک انسان اس معمہ کا حل قیاسیات کے ذریعے تلاش کرنے میں مشغول تھا۔ کیوں کہ اس دور تک سائنسی تحقیق فلسفہ کے زیر اثر تھی۔ بعد میں سائنسی تحقیق تجربات کے ذریعے شروع ہوئی جس کے نتیجے میں سائنس کے مختلف شعبوں میں انقلابی ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ زندگی اور اس کے آغاز کے متعلق سوچنے کا انداز فکر بدلا۔

زندگی کے آغاز کو جاننے سے پہلے زندگی کے معنی جاننا ضروری ہے اگر ہم اپنے ماحول کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہم لوگ زندگی کی مختلف شکلوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ زندگی کی بعض قسمیں ایسی ہیں جنھیں دیکھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زندگی کی دوسری بعض قسمیں ایسی ہیں جن کا ادراک ہم کسی سائنسی آلے کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ زندگی کی تمام اقسام میں لازمی طور پر ایک مشابہت پنہا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت ارسطو - (Aristotle, 384 — 322 B.C) نے زندگی کو ایک ایسی قوت تسلیم کیا ہے جو خود غذائیں حاصل کرکے نشو و نما پاتی ہے اور آخر میں ختم ہوجاتی ہے۔ ارسطو کے اس نظریے کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ زندگی (جاندار) ذاتی طور سے اپنی نقل (REPLICATION) بنانے اور غذائی مادّوں کو تحلیل (METABOLISM) کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لیے نوبل انعام یافتہ (Nobel Laureate) کیلی فورنیا کے پروفیسر ڈاکٹر میلون کیلون (Melvin Calvin) نے ۱۹۶۴ء میں زندگی کی تشبیہ ایسے نظام سے کی ہے جو توانائی (ENERGY) کو کفایت شعاری سے استعمال کرنے کے قواعد پر عمل کرتا ہے اور اس ترکیب کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ خصوصیات زندگی کی تمام اقسام میں پائے جانے والے دو طویل سالمات (Macro-Molecules) سے متعلق ہیں۔ جن کو لحمیہ (Proteins) اور نیوکلیک ایسڈ (Nucleic Acid) کہتے ہیں۔ لحمیہ حیاتی نظام کو برقرار رکھنے اور اس کو چلنے کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے۔ مختلف اقسام کے لحمیہ کے وجود میں آنے، ترتیب و ترکیب کا پیغام (Message) نیوکلیک ایسڈ میں ایک مخصوص کوڈ کی شکل میں پوشیدہ رہتا ہے۔ مزید یہ کہ نیوکلیک ایسڈ ان لحمیہ کے سالمات کی تعمیر کا راز نسل در نسل پہنچانے کا کام جاری رکھتے ہیں۔ یہ دونوں طویل سالمات نائٹروجن، آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، فاسفورس اور سلفر جیسے عناصر سے مل کر بنے ہیں۔ اس اعتبار سے زندگی مختلف مادّوں کی ایک مخصوص ترتیب کا نام ہے جس میں مذکورہ بالا خوبیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا (چکبست)

زندگی کے آغاز کے سلسلے میں مختلف نظریے ہیں۔ دنیا کے مذاہب کے مطابق زندگی کا آغاز کسی خارقی طاقت (Supernatural-Power) کی مداخلت کی وجہ سے ہوا۔ عیسائی مذہب کے نظریے کے مطابق (جو اسلامی نظریے کے بھی قریب ہے) زندگی کا آغاز کائنات کا ایک حصّہ ہے جس کو خدا نے چھ دن میں بنایا۔ بائبل میں اس کا ذکر تفصیل سے آتا ہے اور جس کی تائید قرآنی آیات سے

ہوتی ہے[ا] پہلے دن خدا نے جنت اور دنیا کو بنایا۔ دوسرے دن آسمان
کو زمین سے الگ کیا۔ تیسرے دن خشکی (Ground) اور درختوں کو
بنایا۔ چوتھے دن سورج، چاند اور تاروں کو بنایا۔ پانچویں دن مچھلیوں
اور پرندوں کو بنایا اور آخر میں زمین پر رہنے والے جانوروں اور
انسان کو پیدا کیا۔ زندگی کے تمام شعبوں میں عیسائیت کا غلبہ ہونے
کی وجہ سے کسی قسم کی، تقریباً دو صدی قبل تک تجرباتی تحقیق اس سلسلے
میں نہیں ہو سکی۔ لیکن سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں عیسائی مذہب
کے ماننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت کے لوگوں کا
خیال تھا کہ خدا نے جنگلی جانوروں اور ہوا میں پرواز کرنے والے
پرندوں کو مٹی سے پیدا کیا۔ (And out of the ground the
Lord God formed every beast of the field & every fowl of the air)
اس نظریے کے بانی ابے لزارو اسپیلنزانی (Abbé Lazzaro
Spallanzani) ایک اطالوی پادری تھے۔ یہ ایک ایسا نظریہ
پیش کیا گیا جس کی سائنسی دلیل تلاش کرنا انسانی عقل سے بعید و ناممکن
تھا۔ لہٰذا اس نظریے پر کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ دوسرے نظریے کے مطابق
زندگی کا آغاز پانی اور زمین میں خود بخود ہوا اور خدا نے زمین اور پانی
کو اس کام کے لیے صرف احکام جاری کیے تھے۔ (Let the waters
bring forth abundantly the moving creature that
hath life ---- let the earth bring the
living creature, after his
kind).
یہ نظریہ ایک رومن کیتھولک پادری جون ٹربنائل نیڈہم (John
Turberville Needham) کے زیر قیادت پرورش پاتا رہا۔ بعد
ازاں یہ نظریہ خود بخود زندگی کے آغاز (John Turberville
Needham) کے نام سے مشہور ہوا جس میں اس بات کا
اظہار کیا گیا کہ اس کائنات میں زندگی کا ظہور پانی اور خشکی میں خود بخود
وجود میں آیا۔ مثلاً روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیچڑ وغیرہ

سے حشرات الارض (Worms) اور سڑے ہوئے گوشت
تو نائدہ مکھیاں جنم لیتی ہیں۔ اس عام مشاہدہ کو اپنے نظریے کی
کے لیے دلیل بنایا۔
ایک اطالوی محقق فرانسسکو ریڈی (Francesco Redi)
نے سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک تجربہ کیا جس میں انہو
گوشت کو ڈھکے ہوئے برتن میں رکھا۔ تاکہ مکھیاں گوشت پر انڈ
نہ دے سکیں جس کے نتیجہ میں اس گوشت سے مکھیاں پیدا نہ
اس طرح اطالوی پادری اسپیلنزانی نے ایک فلاسک میں گو
یخنی کو خوب ابال کر فلاسک کو سیل بند کر دیا اور یہ مشا
کہ یخنی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ نیڈہم نے اس تحقیق
کو رد کرتے ہوئے یہ کہا کہ یخنی کو جوش دینے سے حیات کے
میں آنے کے لیے ماحول سازگار نہ رہا۔ لہٰذا یخنی میں کوئی تب
نہیں ہوئی۔ اس اعتراض کا جواب تقریباً سو سال کے بعد لو
(Louis Pasteur) نے اپنی تحقیق کے ذریعے اس ط
کیا کہ جوشیدہ یخنی کو فلاسک میں لے کر اس کے منہ کو گرم
بڑھا کر "S" کی شکل میں کر دیا اور اس کا منہ کھلا رکھا۔ تا
فضا سے تعلق قائم رہے لیکن پھر بھی یخنی میں کوئی خامی پیدا
بعد میں جب فلاسک کی گردن توڑ دی گئی تو کچھ عرصے بعد یخ
ہو گئی۔ اس تجربے سے اگرچہ نیڈہم کا قدیم نظریہ بُری طرح
لیکن محققین نے اپنے کام کی توجہ اس طرف مرکوز کر دی۔
بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سوئڈن کے کیمس
ارہنیس (Svante Arrhenius) کا خیال تھا کہ زن
اعتبار سے دائمی ہے کہ یہ تخم (Spores) کی شکل میں
سے دوسرے سیارے میں خلا کے ذریعے متعدی ہوتی
ہمارے زمین پر کسی دوسرے سیارے سے درآم
بعد میں یہ تخم اس سیارے پر بہت سے حیاتی اقسام کے
آنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو پینس پرمیا (Panspermia)
کہتے ہیں لیکن ارہنیس کا اس نظریے سے یہ بات مبہم ہے
سیارے پر زندگی کیسے وجود میں آئی۔ دوسرا اعترا

ا۔ سورہ یونس، آیت نمبر ۳

تخم کا مہلک شعاعوں اور درجۂ حرارت کی تبدیلی جیسے حالات میں ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک طویل سفر کرنا کیسے ممکن ہو سکا اور یہ تخم اپنی بقا کس طرح کر سکے۔ اس کے علاوہ ابھی تک کسی دوسرے سیارے پہ زندگی کی کوئی نشاندہی نہیں ہو پائی ہے۔

چارلس ڈارون (Charles Darwin) ۱۸۰۹ء جو ارتقا (Evolutionist) کے بہت مشہور محقق فلسفی ہوئے ہیں ان کا خیال ہے کہ زندگی کی شروعات ایک ایسے مختصر تالاب سے ہوئی جس میں امونیا فاسفورک ایسڈ، روشنی، حرارت اور برق بقدر ضرورت موجود تھے اور تالاب کا پانی قدرے گرم تھا۔ اس تالاب میں مختلف اقسام کے لحمیہ مرکب ہوئے۔ بعد ازاں یہ مرکبات مزید پیچیدہ سالماتی مرکبات میں تبدیل ہو گئے جو زندگی کے وجود میں آنے کے لیے ناگزیر تھے۔ ڈارون کا خیال تھا کہ مذکورہ بالا عمل موجودہ دور میں بھی ممکن ہے۔ لیکن اب یہ اس لیے ممکن نہیں ہے کہ مذکورہ سالمات مختلف قسم کے حیاتیات (Living Creatures) کے ذریعہ فوراً یا تو استعمال کر لیے جائیں گے یا حیاتیات ان کو اپنی غذا بنا لیں گے۔

روسی بائیوکیمسٹ اے۔ آئی۔ اوپرن (A.I. Oparin) جو ڈارون کے بنیادی اصولوں کے حامی تھے، نے ۱۹۲۴ء میں زندگی کے وجود میں آنے پر سب سے پہلی تفصیلی اور واضح کتاب تصنیف کی جس کا نام "اورجن آف لائف" (Origin of Life) تھا۔ اس میں موصوف نے اس بات کا اظہار کیا کہ زندگی کا آغاز غیر حیاتی اشیاء سے ہوا۔ یہ نظریہ "اے بائیوجنک اورجن آف لائف" (Abiogenic Origin of Life) کے نام سے مشہور ہوا اور یہ نظریہ ارتقاء طبقات الارض (Geological Evolution) کے سلسلے میں کی گئی تحقیقی نتائج سے بھی تقویت پاتا ہے۔ اس نظریے کو فروغ دینے والے اور سائنس داں بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے جے۔ بی۔ ایس ہیلڈین (J.B.S Haldane) امریکہ کے ایس ایل۔ ملر (S.L. Miller) اور جرمنی کے ایم۔ آئی۔ جن (M. Eigen) وغیرہ وغیرہ۔

اس نظریے کے مطابق زندگی ۲ ارب سال پہلے وجود میں

اس سے قبل زمین کا ماحول بہت ہی گرم تھا جو زندگی کے وجود او بقاء کے لیے سازگار نہ تھا۔ اس زمانے میں فضاء میں ہائیڈروجن، ا میتھین اور پانی (بھاپ کی شکل میں) موجود تھے۔ سورج سے آ والی الٹرا وائیلیٹ (Ultraviolet) شعاعیں اور آتش پہاڑوں کے شق ہونے سے جو توانائی پیدا ہوئی اس نے مذکور چاروں اشیاء کو مختلف مرکبات جیسے امینو ایسڈس (Amino acids) پیورینس (Purines) پرمیڈ (Pyrimidines) اور گلیسرین (Glycerine) میں تبدیل کر دیا جو اس وقت کے سمندر جھیلوں وغیرہ میں حا ہو گئے اور پہلی حیات کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔ اس محا کو سائنس داں نے پری موررڈیل سوپ (Primordial Soup) کی اصطلاح سے موسوم کیا۔ گلیسرین سے بعد میں نشاستہ اور بی امینو ایسڈس سے لحمیہ وجود میں آئے اور پیورینس اور پرمیڈ سے مختلف اقسام کے نیوکلیک ایسڈ کی تشکیل ہوئی۔ یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ لحمیہ میں مختلف اقسام کے امینو ایسڈس (جن تعداد بیس ہوتی ہے) مختلف تعداد اور ترتیب میں پائے جاتے جس کے نتیجے میں مختلف لحمیات بنتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کے تخلیق ہونے کا پیغام نیوکلیک ایسڈس میں پوشیدہ رہتا ہے لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مختلف اقسام کے نیوکلیک ایسڈس پیو اور پری میڈینس کے باہمی اختلاط سے وجود میں آئے۔ ا سے کچھ ایسے نیوکلیک ایسڈس بنے جو کارآمد اس اعتبار سے کہ وہ خود میں لحمیات بننے کا پیغام پوشیدہ رکھتے تھے۔ لہٰذا وقت قدرت نے اپنی طرح کے موزوں نیوکلیک ایسڈس او کے تعاون سے لحمیات تک زندگی کے آغاز کے لیے منتخب کر لیا بعد ازاں ان لحمیات نے تیزی سے کارآمد نیوکلیک ایسڈس سے یہ خود تشکیل ہوئے تھے) کی نقل تیار کرنی شروع کر دی۔ ان میں پری موڈیل سوپ بطور خام مال کثرت سے استعمال ہو اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے وجود میں آنے والی حیاتی ہیٹروٹروف (Heterotroph) تھی۔ جو غذا خود سے نہ بنا کر

اردگرد موجود بھری موڈیل سوپ سے حاصل کرتی تھی۔ یہ محدود سوپ کا
ذخیرہ آخرش کب تک کام آتا۔ بعد میں ان حیاتیات میں غذا حاصل کرنے کے
لیے مقابلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں کہیں تو یہ ہوا کہ لحمیات اور نیو
کلیک ایسڈس کے نظامِ ترکیب آپس میں مل جل کر کام کرنا شروع کر دیا
جس سے تحلیلی نظام (Metabolic Pathways) وجود میں آئے۔ دورِ
حاضر میں مذکورہ نظامِ حیات وائرس (VIRUS) میں مکمل طور پر
پایا جاتا ہے۔ ان نوزائدہ حیاتیات کو اپنے چاروں طرف کے ماحول مثلاً
مختلف نقصان پہنچانے والی شعاعیں اور مذکورہ
سوپ میں کہیں کہیں ناپسندیدہ یا حیات کش اجزا سے تحفظ کی اشد
ضرورت تھی۔ ان کی دفاع کے تحت کچھ حیاتیات کے تحلیلی نظام کی بقاء
کے لیے مذکورہ سوپ سے ان کے چاروں طرف ایک جھلی (Membrane)
بن گئی۔ اس ترکیب سے نہ یہ کہ صرف حیاتیات کے تحلیلی نظام کی حفاظت
ہوئی بلکہ ضرورت کے مطابق پیچیدہ اور وسیع تحلیلی نظام کا وجود ممکن
ہوسکا۔ اس سے خلیہ (Cell) کی بنیاد پڑی جو سائنسی تحقیق
کے مطابق آج سے تقریباً ۱۶ ارب سال قبل وجود میں آ گئی تھی۔ بعد
میں کچھ حیاتیات غذا کے حصول میں جدوجہد کرنے کے بجائے سورج
کی شعاعوں پانی وغیرہ سے اپنی غذا خود بنانی شروع کر دی، جو تقریباً
دس ارب سال قبل کا واقعہ ہے اور جس سے شعاعی ترکیب۔ Photo
(synthesis) کا عمل وجود میں آیا۔ اس عمل سے آکسیجن کثیر تعداد
میں ماحول میں خارج ہونے لگی جس سے فضا میں آکسیجن خاصی مقدار
میں جمع ہوگئی جو غذائی سالمات سے پوری توانائی تکسید (oxidation)
کے ذریعے فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ کیوں کہ اس سے پہلے
حیاتیات ان سالمات سے عملِ تخمیر (Fermentation) کے ذریعے
توانائی حاصل کرتی تھیں جس سے پوری توانائی فراہم نہیں ہوتی تھی۔
مثال کے طور پر ایک سو اسی گرام گلوکوز سے عمل تخمیر کے ذریعے
بتیس کلو کیلوری (Kilocalories) توانائی ملتی ہے جبکہ اسی
گلوکوز کی مقدار سے سات سو کلو کیلوری توانائی بذریعہ ا حاصل
ہوتی ہے۔ اس امر کے ساتھ ہی حیاتیات میں سانس (Respiration)
کا عمل بھی شروع ہوگیا۔

آکسیجن کی سب سے باہری تہہ سورج کی شعاعوں سے او
Ozone میں تبدیل ہوگئی جو سورج سے آنے والی مہلک شعا
کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی جس سے ماحول میں حیرت
تبدیلی آئی۔ خصوصاً آفتابی مہلک شعاعوں سے حیاتیات کا تحفظ
طور پر ہوگیا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اوزون کی عدم موجودگی زن
آغاز کے لیے ضروری تھی اور اس کی موجودگی زندگی کے تحفظ کا با
بنی۔ بہرحال اب حیاتیات کی قسموں اور شکلوں میں تبدیلیاں او
ہوئے اور اس طرح زندگی نے اس کائنات میں اپنی گرفت مض
مضبوط تر کرلی۔

لمرنے ۱۹۵۵ء میں مذکورہ بالا نظریے پر تجرباتی تحقی
جرنل آف امریکن کیمیکل سوسائٹی - Journal of American
Chemical Society) میں شائع کرایا۔ موصوف نے
اس طرح شروع کیا کہ زندگی کے آغاز کے زمانے میں سائنس دا
ماحول کا تذکرہ بکثرت کرتے آرہے تھے، اس ماحول کو مص
طریقوں سے اپنی تجربہ گاہ میں بنانے کا ساز و سامان مہ
ایک بڑے فلاسک میں امونیا، میتھین، ہائیڈروجن اور
کو جمع کر کے اس میں برقی شرارہ (Electric Spark)
کو کئی روز مسلسل جاری رکھا اور فلاسک کا تعلق باہری ماح
رکھا۔ جب یہ تجربہ پایہ تکمیل کو پہنچا اور فلاسک میں نوزائدہ مرکبا
کیا گیا تو اس میں بہت سے امینو ایسڈس، پیورنیس، پری میڈینز
اقسام کی شکر پائی گئیں۔ بعد میں دوسرے امریکی سائنس دا
(Sydney Fox) نے امینو ایسڈس کے مرکب کو ایک
ڈگری سیلسیس سے ایک سو اسی ڈگری سیلسیس تک گرم کر
کا اپنی تجربہ گاہ میں مشاہدہ کیا۔ ان لحمیات کو پروٹی نائڈز
(Noids) کہتے ہیں جس میں تقریباً پچاس سے نوے
پائے گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے سیاروں (چاند
قدیم چٹانوں کے تجزیے سے بھی امینو ایسڈس وغیرہ کی

۴۔ یہ سبھی تحقیق غیر حیاتی اشیاء سے زندگی کے وجود کی حامل ہیں۔
اختصاراً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ غیر حیاتی اشیاء سے زندگی کا وجود ایک ایسا امر تھا جس میں نیوکلیک ایسڈس اور لحمیات کو قدرت نے ایک دوسرے کا جزء لازم (Complementary) تخلیق کر کے زندگی کو مرکب کیا۔ لیکن ڈاکٹر اے۔جی کیرنس اسمتھ ۔ A.G. Cairns-Smith جو گلاسگو یونیورسٹی، انگلینڈ میں علم کیمیا کے ماہر ہیں، نے ۱۹۸۵ء میں یہ رائے پیش کی کہ مذکورہ تال میل سے پہلے ہی زندگی وجود میں آچکی تھی، جو قدرتی انتخاب کے تحت نیوکلیک ایسڈس اور لحمیات کے تال میل والے نظام کے آغاز اور ارتقاء میں معاون ثابت ہوئیں۔ بعد میں یہ قدیمی نظامِ حیات ختم ہو گیا۔ اس بات کو اس مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ شروع میں انسان ریاضی یعنی اعداد کا جوڑ گھٹانا، ضرب، تقسیم وغیرہ لکڑی یا مٹی کی بنی ہوئی گولیوں سے کیا کرتا تھا لیکن دورِ حاضر میں یہ کام کمپیوٹر کے ذریعے کیا جاتا ہے جو اعلیٰ تکنیک کا شاہکار ہے، حالاں کہ ان کمپیوٹر کا وجود اسی قدیمی فکر کا نتیجہ ہے جو ریاضی کے مسائل حل کرنے میں کوشاں تھیں اور کام کے اعتبار سے دونوں نظام میں مشابہت ہے لیکن دونوں کے مرکب ہونے میں الگ الگ مادّوں کا استعمال ہے۔ قدیمی حیاتی نظام کی مثال گولیوں والے نظام سے کی جا سکتی ہے اور نیوکلیک ایسڈس و لحمیات کے نظام کی تمثیل کمپیوٹرس سے دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کا خیال ہے کہ قدیم حیاتی نظام شاید مٹی (clay) سے مرتب تھا کیوں کہ مٹی کے سالمات کی ترتیب مسلسل (Repetitive sequence) ہوتی رہتی ہے جو زندگی کے معنی کو بہت حد تک پورا کرتی ہے لیکن اس نظریے پر مزید تحقیق نہیں ہو سکی ہے۔ اس طرح زمانۂ قدیم سے زندگی کے آغاز اور ارتقاء پر ماہرین کام کرتے آرہے ہیں، پھر بھی ابھی تک مکمل اور واضح طور پر کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی ہے، کیوں کہ جس ماحول کا تصور سائنس داں زندگی کے آغاز کے سلسلے میں کرتے ہیں، اسے پورے طور پر تجربہ گاہ میں تخلیق نہیں کیا جا سکا ہے۔ بہرحال اس سمت میں اب بھی تجربات ہو رہے ہیں جو آنے والے دور میں اس معمہ کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

۵۔ غذا کو حاصل کرنے کے اعتبار سے حیاتیات کو دو حصّوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اولاً وہ قسم جو اپنی خوراک سورج کی روشنی اور نمکیات وغیرہ سے تیار کرتی ہے۔ نباتات میں اس طرح کا نظامِ حیات پایا جاتا ہے جیسے آٹوٹرافس Autotrophs کہتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو اپنی خوراک خود نہیں بنا سکتے بلکہ دوسرے حیاتیات سے حاصل کرتے ہیں، انہیں ہیٹروٹرافس کہتے ہیں۔ مثلاً حیوانات، جراثیم اور وائرس وغیرہ

> "ہم میں سے ہر شخص جس کے دل میں ایمان موجود ہے، اس کو یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی، ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔"
>
> (مولانا ابوالکلام آزاد)

سگریٹ کا دھواں غیر سگریٹ نوشوں کے لیے بھی مضر

انجن گھوش | ترجمہ | مختارالحق

سگریٹ نوشی اور اس کے مضر اثرات پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ غالبًا اس سلسلے میں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ بس ضرورت ہے تو عمل کی۔ مگر زیر نظر مضمون سگریٹ نوشی کا ایک انتہائی تباہ کن پہلو پیش کرتا ہے۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ سگریٹ اپنے پینے والے کو ہی پیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اسے کھوکھلا بنا ڈالتی ہے۔ لیکن آپ کو یہ جان کر یقینًا حیرت ہوگی کہ سگریٹ اُن افراد کو بھی چاٹ جاتی ہے جو خود تو سگریٹ نہیں پیتے مگر سگریٹ پینے والوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ تو آیئے دیکھیں کہ اس چونکا دینے والے انکشاف میں کہاں تک صداقت ہے۔

(مترجم)

اِس حقیقت سے تقریبًا ہر خاص و عام واقف ہے کہ سگریٹ نوشی صحت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ساری دنیا کے ڈاکٹروں اور طبیبوں کی آرا بھی اس سلسلے میں یکساں ہیں۔ گلے میں خراش و جلن، بھوک کی کمی، خشک کھانسی اور سانس کی دوسری چھوٹی موٹی بیماریوں نیز پرانی کھانسی سے لے کر منہ، کھانے کی نلی، گردن اور پھیپھڑے کے کینسر تک کی بیماریاں کسی نہ کسی طرح تمباکو نوشی سے جڑی ہوتی ہیں۔ صرف چند برسوں کی بات ہے جب یہ خیال عام تھا کہ سگریٹ پینے سے صرف اس کے پینے والے ہی کو نقصان پہنچتا ہے مگر جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ ایسے افراد بھی مختلف (تمباکو نوشی والی) بیماریوں میں مبتلا ہیں جو سگریٹ تو نہیں پیتے لیکن سگریٹ پینے والوں کے ساتھ ان کے بیشتر اوقات گزرتے ہیں دوسرے لفظوں میں سگریٹ نہ پینے والے افراد بھی عین انہی بیماریوں کے شکار ہوتے ہیں جو سگریٹ پینے والوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ گویا غیر تمباکو

نوش حضرات اپنے تمباکو نوش دوستوں کے ساتھ ساتھ اپنی کو کم کرتے ہیں۔

تمباکو نوشی اور اس کے مضر اثرات کے متعلق ٹھوس مط میں جان ہاپکنس یونیورسٹی کے ریمنڈ پیرل نے کیا۔ اس نے ا سے ثابت کر دیا کہ کثرت سے تمباکو نوشی کرنے والے ۴۶ فیہ ۶۰ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہتے۔ ۱۹۵۰ء کے اوا اور امریکہ کے مختلف تحقیقی اداروں نے یہ ثابت کیا کہ زبا کے سرطان کی کئی قسمیں سگریٹ نوشی سے ہوتی ہیں جیسے جیٖ وسیع ہوتا جا رہا ہے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی جا رہی نوشی بے شمار امراض پیدا کرتی ہے۔

مخصوص قسم کی جانچوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہ کے دھوئیں میں ایسے بے شمار ذرات ہوتے ہیں جو ٹھوس ا

...ئوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے تینتیس سے زائد ذرّات صحت
...لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ گیس ذرّات میں سب سے زیادہ نقصان دہ
...بن مونو آکسائڈ اور ٹھوس میں نکوٹین (NICOTINE) اور
...ر (Tar) ہیں۔ کاربن مونو آکسائڈ انتہائی زہریلی گیس ہے جس کا ایک
...گریٹ کے دھوئیں میں تقریباً پانچ فیصد حصّہ ہوتا ہے۔ جب دھوئیں کو
...در نگلا جاتا ہے تو کاربن مونو آکسائڈ پھیپھڑوں کی جھلیوں سے گزرتے
...وئے خون کی نالیوں میں شامل ہو جاتی ہے جہاں وہ خون کے سرخ جسیموں
(RBC) میں ہیموگلوبن (Haemoglobin) کے ساتھ مل کر کاربوکسی ہیموگلوبن (CO–Hb)
...اتی ہے۔ آکسیجن عام طور پر آکسی ہیموگلوبن بنانے کے لیے ہیموگلوبن سے مل جاتی ہے۔ اس کے
بعد یہی آکسی ہیموگلوبن خون کے ذریعے جسم کے تمام خلیوں تک پہنچائی جاتی ہے اس طرح تمام خلیوں اور
بافتوں (TISSUES) تک آکسیجن کی مطلوبہ مقدار پہنچ جاتی ہے۔ چونکہ
ہیموگلوبن کے ساتھ کاربن مونو آکسائڈ آکسیجن کے مقابلے میں دو سو گنا زیادہ
ہوتی ہے۔ اس لیے کاربن مونو آکسائڈ کی قلیل ترین مقدار ہمارے خون میں
کاربوکسی ہیموگلوبن شامل کر لیتی ہے۔ اس طرح جسم کو مطلوبہ مقدار میں آکسیجن
نہیں مل پاتی۔ تجربوں اور مشاہدوں سے پتہ چلا ہے کہ ہر سگریٹ سے
ڈیڑھ سے دو فیصد کاربوکسی ہیموگلوبن کا اضافہ ہوتا ہے جو لوگ کثرت
سے (اندازاً ۲۰ سے ۲۵) سگریٹ پیتے ہیں ان کے جسم میں صبح سے شام تک
کاربوکسی ہیموگلوبن ۲۵ فیصد تک جمع ہو جاتی ہے۔ نیند کی حالت میں کاربن
مونو آکسائڈ کا بڑا حصّہ آہستہ آہستہ پھیپھڑے میں پہنچتا رہتا ہے۔ یہاں
سے پھر وہ سانس کے ساتھ باہر نکل جاتا ہے۔ جو لوگ تنفّس کی دشواریوں
سے دوچار ہیں انھیں کاربوکسی ہیموگلوبن کی زیادتی کی وجہ سے خاص تکلیف
اُٹھانا پڑتی ہے کیوں کہ انہیں آکسیجن کم ملتی ہے۔ دل کے امراض میں
مبتلا افراد بھی خاصے متاثر ہوتے ہیں کیوں کہ دل و دماغ کو خون کی سپلائی
بالکل کم ہو چکی ہوتی ہے۔

غیر تمباکو نوش افراد اپنے تمباکو نوش دوستوں کے پھیپھڑوں
سے باہر آتے ہوئے دھوئیں کو غیر محسوس طریقے سے سانس میں لے لیتے ہیں،
اور اس طرح ان کے پھیپھڑوں میں بھی کاربن مونو آکسائڈ اور کاربوکسی
ہیموگلوبن پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کو اس سلسلے میں خاص طور پر حاملہ عورتوں
اور ان کے شکم میں زیرِ پرورش بچوں کے متعلق ازحد تشویش ہے۔

سگریٹ کے دھوئیں میں پایا جانے والا تار (Tar) ایسی
کیمیائی اشیاء کا مرکب ہوتا ہے جو Poly Cyclic Aromatic
Hydrocarbons) کہلاتی ہیں۔ یہ کیمیائی اشیا انسانی جسم میں
کینسر پیدا کرنے کا بڑا سبب ہیں۔ بغیر فلٹر والی سگریٹوں میں تار کی مقدا...
نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ فلٹر کی وجہ سے مقدار میں بس قدرے
کمی آجاتی ہے۔ تار کی وجہ سے پھیپھڑوں میں جلن کے علاوہ کھانسی کے دو...
اور سانس کی دوسری بیماریاں عود کر آتی ہیں۔

تمباکو نوشی کی لت کی سب سے بڑی وجہ اس میں پائی جانے وا...
نکوٹین ہے۔ یہ کاربن، نائٹروجن اور ہائڈروجن کا مرکب ہوتی ہے اور ا...
سے تمباکو کا مزہ اور بُو متعین ہوتی ہے۔ نکوٹین اپنی اصلی حالت میں بے رنگ
ہوتی ہے مگر ہوا سے مل کر وہ بھورے رنگ کی ہو جاتی ہے۔ نکوٹین انتہ...
طاقت ور زہر ہے کہ خالص نکوٹین کے محض دو قطرے انسانی زندگی کا چ...
گل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ سگریٹ میں اس کی مقدار انتہائی قلیل ہوتی...
جو تمباکو کے پتے میں جذب ہو جاتی ہے۔ سگریٹ کا کش کھینچتے ہی نکوٹی...
تار (Tar) دھوئیں میں شامل ہو کر پھیپھڑوں کی ننھی ننھی ہوائی تھیلیو...
میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کا گزر خون کی نالیوں میں ہوتا ہے۔ ...
کش کے پندرہ سکنڈ کے اندر نکوٹین کے سالمے (MOLECULES)
دماغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ جسم کے مختلف اندرونی اعضاء بالخصوص جگ...
ENZYMES خارج کرتے رہتے ہیں جن سے نکوٹین بے اثر ہو...
ہے۔ بہرحال نکوٹین کے مضر اثرات کی صحیح وجہ اب تک واضح نہیں ہو...
ہے کیوں کہ نکوٹین جب قلیل ترین مقدار میں ہوتی ہے تو دل کی دھڑ...
خون کے دباؤ اور خون کے بہاؤ میں اضافہ کر کے وہ سرور بخشتی ہے جب
یہی مقدار اگر زیادہ ہو جائے تو اس سے Neuromuscular
Systems پر بُری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

چوہوں، کتّوں، بلّیوں اور بندروں پر کیے جانے والے تجربا...
سے پتہ چلتا ہے کہ خون کے بہاؤ کے نتیجے میں نکوٹین فوراً دماغ سے ...
مل جاتی ہے۔ بطور مثال چوہے کو جب نکوٹین کا انجکشن لگایا گیا تو ...
دماغ میں خون کا ارتکاز ہو گیا لیکن پانچ منٹ کے اندر خون کی مقد...
میں ۵ فیصد کمی آگئی اور ۶۰ منٹ کے بعد یہ مقدار گھٹ کر ایک فیص...

رہ گئی لیکن کثرت سے سگریٹ پینے والوں کے ضمن میں یہ بات صادق نہیں آتی کیوں کہ ابھی نکوٹین کا پہلا اثر زائل بھی نہیں ہونے پاتا کہ دوسری سگریٹ سلگالی جاتی ہے۔ نکوٹین کی زیادتی کے نتیجے میں پورا اعصابی نظام مفلوج ہو سکتا ہے اور بالآخر نبض ساکت ہو جاتی ہے۔

لندن کے Institute of Psychiatry کے مطابق غیر تمباکو نوش افراد بالخصوص بچے اپنے تمباکو نوش والدین اور گھر کے دیگر افراد کی تمباکو نوشی کے زیر اثر آکر نکوٹین کی خاصی مقدار جذب کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کو بھی پھیپھڑوں کا کینسر ہونے کے تمام تر امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں اگر ہر سال ایک لاکھ سگریٹ نوش افراد تمباکو نوشی سے پیدا شدہ امراض میں مبتلا ہوں گے تو کم از کم ایک ہزار غیر سگریٹ نوش افراد ان ہی امراض کے شکار ہوں گے لاوسیانا اسٹیٹ یونیورسٹی (LOUISIANA STATE UNIVERSITY) کے سائنس دانوں نے حال ہی میں بعض چونکا دینے والے انکشافات کیے ہیں جن کی رو سے سگریٹ کے دھوئیں میں ایسے FREE RADICALS پائے گئے ہیں جو ان سالموں (MOLECULES) کو بڑی تیزی سے تباہ کرتے ہیں جن سے جسم کے خلیوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ FREE RADICALS یوں بھی ہمارے جسم میں موجود رہتے ہیں جن کی وجہ سے انسان بوڑھا ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ Radicals صحت مند خلیوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ بہرحال یہ موضوع ایک الگ بحث کی طرف لے جاتا ہے FREE RADICALS کا ایک اہم ذریعہ تار ہے جس میں Quinones اور Hydroquinones نامی اشیاء ہوتی ہیں۔ ان RADICALS کا ایک اور ماخذ تمباکو کے دھوئیں سے

نکلنے والا نائٹرک آکسائڈ ہے۔ یہ نائٹرک آکسائڈ، آکسیجن سے [illegible] کر نائٹروجن ڈائی آکسائڈ بناتا ہے جو دھوئیں میں موجود مختلف [illegible] سے کیمیائی تعامل کر کے Alkyl اور [illegible]xyl Free Radicals میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تمباکو کا دھواں جب اندر کھینچا جاتا ہے تو ا[illegible] موجود Free Radicals پھیپھڑوں کی ہوائی تھیلیوں کی جلی[illegible] خلیوں کو تباہ کر دیتے ہیں اور اس طرح کینسر لاحق ہو سکتا ہے۔

غیر تمباکو نوش افراد پر تمباکو کے دھوئیں کے اثرات [illegible]

۱۹۸۶ء کے آخر تک ساری دنیا میں تقریباً ۱۸ جامع مطال[illegible] گئے جن میں سے ۱۵ نے انکشاف کیا کہ محض سگریٹ کے د[illegible] امراض میں گہرا ربط ہے۔ حال ہی میں ایک جاپانی گروپ [illegible] کے ذریعے پتہ چلا یا ہے کہ غیر تمباکو نوش بیویاں اپنے تمباکو نو[illegible] کے اثر میں آکر پھیپھڑوں کے کینسر کی شکار ہو گئی ہیں۔ ٹوکیو [illegible] انسٹی ٹیوٹ آف کینسر ریسرچ میں جاپانی محققوں نے حال ہی میں [illegible] کہ سگریٹ کا دھواں DNA کو بھی نقصان پہنچا سک[illegible] DNA کی ریخت FREE RADICALS کے نتیجے [illegible] ہے۔ اس طرح DNA کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کے زیادہ [illegible] موجود رہ جانے کے سبب صحت کا متاثر ہونا یقینی ہے ہے کہ GENETIC DISORDERS بھی پ[illegible] غیر تمباکو نوش افراد کو بھی بالکل یہی خطرات لاحق ہوں بہرحال اس ضمن میں ابھی خاطر خواہ پیش ر[illegible] ہے۔

"پس میں چاہتا ہوں کہ تمام میرے بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جاویں۔ ان دو لفظوں

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کو نہ بھولیں"

سر سید احمد

شہر علی گڑھ کی تعلیمی صورت حال

محمد ہارون

ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی آج بھی بہت کمی ہے جس کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے بھارت سرکار نے ۱۹۵۱ء میں کام شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آزاد ہندوستان میں منصوبہ بند طریقے سے ملک کی پیش رفت کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ تعلیم کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ایک طرف تو ۶ سے ۱۱ سال کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی قرار دی گئی اور دوسری طرف تعلیم بالغان کے مرکز جگہ جگہ قایم کیے گئے جن کے تحت ۱۵ سے ۳۵ سال کی عمر کے لوگوں کو تعلیم دینی شروع کی گئی۔ شروع کے دنوں میں تو لوگ اس طرف کم راغب ہوئے مگر کوششوں کے نتیجے میں دھیرے دھیرے لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جن لوگوں کو تعلیم بالغان کے مرکزوں کے ذریعہ تعلیم دی گئی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو پڑھایا جائے خواہ نہ پڑھایا جائے مگر ان کے بچوں کو ضرور تعلیم دی جائے۔

تعلیم بالغان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی شہر علی گڑھ میں ۶۰ مرکز کھول دیے ہیں۔ اس کام کی ابتدا ۱۹۷۸ء میں کی گئی تھی۔ اس دن سے لے کر آج تک سارے مراکز معروف عمل ہیں۔ ان میں سے ۳۰ مرکز مردوں کے لیے ہیں اور ۳۰ مرکز عورتوں کے لیے۔ اساتذہ کا انتخاب عام طور سے ان ہی محلوں سے کیا جاتا ہے تاکہ استاد اور شاگرد میں کوئی اجنبت حایل نہ رہے۔ جو لوگ ان مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کو تمام سہولتیں مفت دی جاتی ہیں۔ جیسے کتابیں، کاپیاں، پنسل، سلیٹ، ٹاٹ کی پٹی، لیمپ وغیرہ۔

ضلع علی گڑھ کی کل آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۵,۷۴۹۴۵ ہے۔ اس میں ۳۱٫۳۶ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ مردوں کی کل تعداد ۱۳,۹۸,۹۷۶ ہے جن میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعدا
۴۴٫۵۴ فیصد ہے اور عورتوں کی کل تعداد ۱۱,۷۵,۹۴۹ ہے جن
میں ۱۶٫۲۴ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

اسی طرح شہر علی گڑھ کا جو سروے ہوا ہے اس کے مطابق کل آبادی ۵,۹۲,۱۴۴ ہے اس میں ۴۳٫۲ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہ
مردوں کی کل تعداد ۳,۱۸,۵۵۱ ہے جن میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تع
۵۲٫۵۲ فیصد ہے اور عورتوں کی کل تعداد ۲,۷۴,۵۹۳ ہے جن
۳۳٫۵۴ فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم بالغان کے مراکز کے ۱۹۸۷
نتائج میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ان مرکزوں کے تحت ا
میں بیٹھنے والوں کی (یعنی مردوں اور عورتوں دونوں کی) کل تع
۸۱۱ ہے اور پاس ہونے والوں کی تعداد ۶۳۱ یعنی پاس ہو
والوں کی تعداد ۷۷٫۸۱ فیصد ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ۱
لوگوں نے اپنا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا یعنی ۲۰٫۷۲
درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اسی طرح درجہ دوم میں ۲۱۵ اف
پاس ہوئے یعنی ۲۶٫۵۱ فیصد درجہ سوم میں پاس ہونے والوں
تعداد ۲۴۸ یعنی ۳۰٫۵۸ فیصد۔ اب اس امتحان کا صنف وا
پیش خدمت ہے۔ اس بار کل ۳۰۸ مرد امتحان میں بیٹھے جن مي
۲۵۷ نے امتحان پاس کیا۔ یعنی ۸۳٫۴۴ فیصد نتیجہ رہا۔ ان مي
نے درجہ اول میں امتحان پاس کیا یعنی ۳۲٫۰۸ فیصد درجہ اول میں

رہے۔ درجہ دوم میں پاس ہونے والوں کی تعداد ۱۱۰ ہے جو کل کا ۳۵٫۷۱ فیصد ہے۔ اور درجہ سوم میں ۴۶ مرد پاس ہوئے یعنی ۱۴٫۹۴ فیصد کو درجہ سوم میں کامیابی ملی۔ ۵۰۳ خواتین اس امتحان میں شریک ہوئیں جن میں سے ۳۷۴ کامیاب ہوئیں۔ یعنی نتیجہ ۷۴٫۴ فیصد رہا۔ ان خواتین میں سے ۶۷ نے درجہ اوّل حاصل کیا۔ یعنی ۱۳٫۳ فیصد اوّل آئیں۔ ۱۰۵ نے درجہ دوم حاصل کیا۔ یعنی ۲۰٫۸۷ فیصد کو درجہ دوم ملا۔ اور ۲۰۲ کو درجہ سوم ملا یعنی ۴۰٫۰۲ فیصد خواتین درجہ سوم میں پاس ہوئیں۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی مزید وضاحت کے لیے ایک گوشوارہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ گوشوارہ ۵۱ مراکز کے نتائج کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں ۲۸ مراکز خواتین کے ہیں اور ۲۳ مردوں کے۔

مراکز تعلیم بالغان کے نتائج ایک نظر میں

۱۹۸۷

جملہ شرکا	کامیاب	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
۸۱۱	۶۳۱	۱۶۸	۲۱۵	۲۴۸
فی صد	۷۷٫۸۱	۲۰٫۷۲	۲۶٫۵۱	۳۰٫۵۸
۳۰۸ (مرد)	۲۵۷	۱۰۱	۱۱۰	۴۶
فی صد	۸۳٫۴۴	۳۲٫۸	۳۵٫۷۱	۱۴٫۹۴
۵۰۳ (خواتین)	۳۷۴	۶۷	۱۰۵	۲۰۲
فی صد	۷۴٫۴	۱۳٫۳	۲۰٫۸۷	۴۰٫۱۲

مردوں کے مراکز کے نتائج

۱۹۸۷ء

شریک	پاس	فرسٹ	سکنڈ	تھرڈ	مقام	فیصد پاس
۱۳	۱۱	۶	۲	۳	محسن الملک ہال	۸۴٫۶۲
[illegible]	.	〃	۳	۱	〃	۶۲٫۶۲

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۷	۳	—	۲	۱	شاہ جمال	۸۶٫
۱۹	۱۸	۱۱	۵	۲	〃	۷۴٫
۱۸	۱۴	۱	۹	۷	〃	۷۸٫
۱۲	۱۰	۱	۹	۳	ایبہ کوٹ	۲۳٫
۱۲	۱۲	۸	۳	۱	سرائے رحمان	۰۰٫
۱۳	۱۰	۶	۴	—	نگلہ قلعہ	۱۲
۲۵	۲۴	۱۳	۸	۳	نگلہ بھولا	۰۰
۱۰	۸	۳	۴	۱	〃	۰۰
۱۳	۱۳	۶	۶	۱	جگجیون نگر	۰
۵	۵	۳	۲	—	گلشن آباد	۰
۱۵	۱۵	۷	۷	۱	سرائے رحمان	۰
۱۴	۱۲	۱	۷	۴	〃	۱
۱۷	۱۵	۳	۹	۳	چوہڑپور	،
۲۴	۷	۱۳	۱	۶	خسرو نگر	
۱۹	۱۹	۵	۱۲	۲	نگلہ قلعہ	
۵	۵	۲	۲	۱	〃	
۸	۶	۱	۴	۱	ذاکر نگر	
۹	۹	۵	۴	—	گلشن آباد	
۱۳	۱۵	۲	۳	۵	〃	
۱۴	۱۲	۹	۳	—	〃	
۱۲	۱۱	۴	۷	—	〃	

عورتوں کے مراکز کے نتا

۱۹۸۷ء

۲۳	۲۱	—	۱۳	۸	زہرہ باغ	
۱۸	۱۶	۲	۱۰	۴	〃	
۱۵	۱۵	-	۱۲	۳	〃	

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۲۲	۱۵	۳	۱۱	۱	زہرہ باغ	۹۸/۱۸
۲۰	۱۳	—	—	۱۳	〃	۶۵/۰۰
۲۸	۲۷	۱۱	۸	۸	ملاح کانگلہ	۹۶/۴۳
۱۵	۱۳	—	—	۱۳	جمال پور	۸۶/۹۷
۱۶	۹	—	۲	۷	جیون گڑھ	۵۶/۲۵
۲۵	۲۳	۸	۱۳	۲	اپرکوٹ	۹۲/۰۰
۱۴	۱۴	—	—	۱۴	〃	۱۰۰/۰۰
۱۸	۱۴	—	—	۱۴	〃	۷۷/۷۸
۸	۳	—	—	۳	〃	۳۷/۵
۱۴	۱۲	—	۲	۱۰	〃	۸۵/۷۱
۹	۹	—	۲	۷	〃	۱۰۰/۰۰
۲۰	۹	—	—	۹	〃	۴۵/۰۰
۲۸	۲۸	—	۲۴	۴	رسل گنج	۱۰۰/۰۰

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱۰	۷	—	—	۷	رسل گنج	/۰۰
۸	۶	—	—	۶	سرائے رحمن	/۰۰
۱۹	۱۸	—	—	۱۸	〃	/۷۴
۱۸	۱۳	—	—	۱۳	〃	/۲۲
۲۸	۲۰	—	۴	۱۶	〃	۴۳
۱۴	۹	—	۲	۷	مسعود آباد	/۲۹
۱۸	۷	—	—	۷	شاہ جمال	/۸۹
۱۳	۱	—	۱	—	〃	۶۹
۲۰	۲	—	—	۲	〃	/۰۰
۴۵	۴۵	۴۴	-۱	۱	تولی پارا	۰۰
۸	۴	—	—	۴	اپرکوٹ	۰۰
۹	۱	—	—	۱	〃	۱

"تمام اخلاق اور صفات انسانی کا مجموعہ اور تمام لب لباب خدا کی مخلوق کے پیدا ہونے کا مقصد اُن پانچ حرفوں میں ہے جن کو ہم "اسلام" کہتے ہیں جب اس کی تفصیل پوچھو تو یقین کرو گے کہ درحقیقت وہ انسان کی صفات اندرونی و بیرونی کے مجموعے کا نام ہے پس ہم کو اس نام کا ادب کرنا اور جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو اس نام کا مصداق بنانا لازم ہے۔"

سر سیدؒ

اس شمارے کے مقالہ نگار

سید حامد۔	سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم)	معروف شاعر و ادیب
مفتی محمد نظام الدین حسین رضوی	استاد جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔ ضلع اعظم گڑھ
پروفیسر نسیم انصاری	پروفیسر سرجری ڈپارٹمنٹ، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مولانا ابو علی	دار المصنفین اعظم گڑھ
محترمہ عابدہ سمیع الدین	ریڈر پولیٹیکل سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر شمیم اختر انصاری	ڈپارٹمنٹ آف باٹنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر محمد مسرور اختر خاں	" " "
ڈاکٹر احرار حسین	ڈپارٹمنٹ آف فزکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر صغیر افراہیم	پوسٹ ڈاکٹرل اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
بیگم نصرت شیروانی	سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کمیٹی، دہلی۔
ڈاکٹر مختار احمد	ریڈر ڈپارٹمنٹ آف الکٹریکل انجینئرنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مختار الحق	کانچی نارہ، مغربی بنگال
نعیم احمد خاں	شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر اختر حسین آفتاب۔	صادق پور۔ پٹنہ
داور عباس عباسی۔	۹ مزمل ہوسٹل۔ وی۔ ایم۔ ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
محمد ہارون	ریسرچ اسکالر سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پرنٹر، پبلشر: اسرار احمد - مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پریس: ایس کے آفسیٹ پریس مطبوعہ

جلد ۶ دسمبر ۸۷ء شمارہ ۱۲

سرپرست: جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر	جوائنٹ ایڈیٹر
اسرار احمد	کبیر احمد جائسی
اسسٹنٹ ایڈیٹر	تزئین
شہاب الدین	سرفراز

انچارج سرکولیشن

مستقیم احمد خان

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT, ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ

انڈیا ... Rs. 30.00

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

اداریہ

ہندوستان کا مسلمان اس وقت حالات کے جس دوراہے پر حیران و پریشان کھڑا ہے، اس کا احساس تو اب عام ہوچلا ہے مگر حالات سے کس طرح نبرد آزما ہو کر اپنے تشخص کو بھی برقرار رکھا جائے اور قومی دھارے سے بھی دور نہ ہوا جائے اس پر اتفاق رائے کا ہونا تو دور رہا ابھی تک سنجیدگی سے غور و فکر کا سلسلہ بھی نہیں شروع ہوا ہے۔ کبھی کبھی بعض حساس اور درد مند حلقوں سے یہ آواز اٹھتی ضرور سنائی دیتی ہے کہ "مسلمانوں کو اپنی صلاحیت اور قوت کو متحد کر کے ایک گروہی یا جماعتی وقار پیدا کرنا چاہیئے"، ہم کو اس خیال کی قدر و قیمت اور معنویت سے تو کوئی انکار نہیں مگر سوال یہ ہے کہ صلاحیت و قوت کا اتحاد ہو تو کیسے

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمان موٹے موٹے دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ خواندہ مسلمانوں کا ہے اور دوسرا ناخواندہ۔ ان میں سے ہر طبقے کے مسایل جداگانہ ہیں۔ اسی لیے دونوں طبقے کے افراد ایک دوسرے کے مسایل سے بیگانہ و بے خبر ہیں۔ پڑھے لکھے طبقے کے مسلمان بھی دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقہ ان افراد پر مشتمل ہے جنہوں نے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر کے سند فراغت لی ہے اور دوسرا طبقہ ان مسلمانوں کا ہے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کا سند یافتہ ہے۔ پڑھے لکھے مسلمانوں کے ان دونوں طبقوں کے مسایل بھی جداگانہ ہیں۔ اس لیے بالعموم ایک طبقہ کے افراد دوسرے طبقے کی دنیا سے ناآشنائے محض رہتے ہیں۔ خواندہ مسلمانوں میں باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے ابھی حال ہی میں ایک حلقے کی طرف سے اس بات کی کوشش شروع کی گئی کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کچھ اصلاح کر کے عصری علوم کے بعض مضامین کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تاکہ دینی مدارس کے فارغین عصری علوم سے بھی کسی قدر آشنا رہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی کہ دینی مدارس کے اسا[تذہ] کی جو تنخواہیں ہیں، ان میں اس قدر اضافہ ہونا چاہیے کہ مکتب اور مدرسے کے "میاں جی" بھی تعیش کی نہیں بلکہ ایک گوار[ا] زندگی بسر کر سکیں۔ فروعی مسایل میں الجھنے اور اسی کو اصل مسئلہ سمجھنے کی عادت نے اس بے ضرر کوشش اور جائز مطا[لبے] کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ اگر یہ مخالفت "نادانوں" کی طرف سے ہوتی تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی جاتی، مگر جب یہ مخالفت اس حلقے کی طرف سے ہونے لگے جس کو خود ترمیم و اصلاح نصاب کا کا[م] شروع کرنا چاہیے تھا تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی دو ڈھائی ماہ پہلے ہمارے ایک معتبر اور بزرگ عالم دین نے علی گڑھ کے ایک جلسہ میں اعلان فرمایا کہ "وہ مولو[یوں] کو غریب رکھنا چاہتے ہیں"۔ ان کے نزدیک روپیہ پیسہ اتنا بڑا شر ہے کہ مومن اس سے جتنا بھی دور رہے کم ہے۔ ہم کو ما[حب] موصوف کے اس بیان پر تعجب سے زیادہ رنج ہوا۔ کاش ہمارے لائق صد احترام بزرگ نے سوچا ہوتا کہ روپیہ پیسہ فی نفسہ شر نہیں ہے، اس کا غلط استعمال، اس پر فخر و غرور اور اس کے ذریعے دوسرے کا استحصال یقیناً شر ہے۔ غریب جس احساس کم[تری] کا شکار ہوتا ہے، اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جس کا تعلق اس طبقے سے ہو۔ مولویوں کو غریب رکھنے کے معنی یہ ہوئے

کہ ان کو جان بوجھ کر جبری طور پر احساسِ کمتری کا شکار رکھا جائے اور اُن کی ساری زندگی جائز چیزوں کے حصول کا خواب دیکھتے ہی گزر جائے۔ ایک ایسا طبقہ جس کے دامنِ تربیت میں پروان چڑھ کر ایک پوری نسل جوان ہوتی ہو، اس کو احساسِ کمتری کا شکار رکھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ یہ ہماری عادتِ ثانیہ ہو چکی ہے کہ ہم اصل مسئلہ سے تو چشم پوشی کرتے ہیں مگر فروعی مسائل میں اُلجھ کر طرح طرح کے توہمات و تحفظات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے مذکورہ بزرگ نے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرمائی ہوتی تو وہ مولویوں کو غریب رکھنے کی بات نہ کرتے۔ بہرحال اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عصری یا دینی تعلیم کے نام پر مسلمانوں میں باہمی اتفاق و اتحاد پیدا ہونا خاصہ دشوار ہے۔

اس مایوسی کے بعد سوال سامنے یہ آتا ہے کہ کیا "مسلمانوں کا باہمی اتحاد و اتفاق" خالص مذہبی بنیادوں پر ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب ہے تو بہت تلخ مگر حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا نام آتے ہی ہر "ضیغمِ ملت" کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور بڑے ہی کرخت لہجے میں فرمایا جاتا ہے کہ "کس دبستانِ فکر کے مطابق"؟ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے والوں کے مطابق یا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے والوں کے مطابق؟ مقلدین کے مطابق یا غیر مقلدین کے مطابق؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ غیب جاننے والوں کے مطابق یا اس تصور کے منکرین کے مطابق؟ زور سے آمین کہنے والوں کے مطابق یا دھیرے سے آمین کہنے والوں کے مطابق؟ رفع یدین کرنے والوں کے مطابق یا تارکینِ رفع یدین کے مطابق؟ اگر ان سب سوالوں کے جواب میں کہا جائے کہ مذہبِ اسلام کے مطابق، تو اصرار اس بات پر ہوگا کہ اصل اسلام تو وہی ہے جس پر ہم عامل ہیں، بقیہ سارے افراد ضال، مضل اور جہنمی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بگڑے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا مذہب بھی اتحاد و اتفاق کا سبق نہیں پڑھا پا رہا ہے۔

مذہبی افراد سے مایوس ہونے کے بعد نظریں ان افراد کی طرف اُٹھتی ہیں جو دنیاوی علوم و فنون کے ماہر ہیں اور افلاطونِ وقت و سقراطِ زماں بنے ہوئے اپنے اپنے شاگردوں کے بڑے بڑے حلقے جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک سیدھے سادے ہندوستانی مسلمان کے درد کا درماں یہاں بھی مفقود ہے۔ اس دنیا میں حسد ہے، بغض ہے، کینہ ہے، اتہام تراشی ہے، کردار کشی ہے، دوسرے کو نیست و نابود کرنے کا جذبہ ہے۔ تاکہ زبان سے ہمیشہ "انا و لا غیری" کا پرفریب نغمہ پھوٹتا رہے اور ان کا نفسِ امارہ مسرور و مطمئن ہوتا رہے۔ ایسے عالم اور ماحول میں قوت و صلاحیت کے اتحاد کا نام لینا، چاند کو چھو لینے کی خواہش کے مترادف ہے۔ اگر واقعی اتحاد و اتفاق کو ایک قوت و طاقت کی شکل میں بروئے کار لانا ہے تو سب سے پہلے ہم میں سے ہر شخص کو اپنے اپنے پندار کے صنم کدے کو ویران کر کے "کوئے ملامت" کے طواف کے لیے نکلنا ہوگا۔ بیگانوں کے نہیں اپنوں کے پتھر کھانے ہوں گے، تلووں کو نہیں بلکہ پورے جسم کو لہو لہان کرنا ہوگا۔ فرد کو جماعت پر قربان کرنا ہوگا، تب کہیں جا کر ہم ہندوستانی مسلمان اس آگ کے دریا کو تیر کر پار کر سکیں گے جس کو اتحاد و اتفاق کہا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آگ کے دریا میں تیرنے کی ہمت ہم میں سے کتنوں میں ہے؟

[signature]

ایک ملّی و علمی سانحہ

ذرائع ابلاغ نے قارئین تہذیب الاخلاق تک یہ خبر پہنچا دی ہوگی کہ ۱۸ نومبر ۸۷ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم، رسالہ معارف کے ایڈیٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ممتاز اولڈ بوائے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھنؤ میں سڑک کے ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بہار کے مردم خیز خطہ دِسنہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے دسنہ کے ایک باعلم اور شریف خانوادہ میں آنکھیں کھولیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم دِسنہ ہی کے ایک مکتب میں حاصل کی۔ بعدازاں نالندہ کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم بنے، جہاں سے انہوں نے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آگئے اور یہاں سے بی۔ ٹی کی ڈگری لے کر اپنے وطن مالوف واپس گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اردو اور فارسی میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے بھی کیا۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں وہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ایما پر دارالمصنفین اعظم گڑھ تشریف لے گئے اور پچاس برس تک اس علم و حکمت کے سرچشمہ کے ایک خادم خصوصی بنے رہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے پیش نظر جو خصوصی کام تھے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ اردو میں تاریخ ہند پر اس تحقیقی انداز سے کام کیا جائے کہ غلط فہمیوں کے بادل چھٹ جائیں اور عہد وسطیٰ ہو یا عہد جدید، ہر عہد اپنی اصل شکل و صورت میں لوگوں کی نگاہوں میں جلوہ گر ہو۔ علامہ شبلی اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اپنے مجوزہ کام کی داغ بیل نہ ڈال سکے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحومین نے مل جل کر استاد کے مجوزہ اور نامکمل کاموں کو آگے بڑھایا۔ سید صاحب اور مولانا عبدالسلام ندوی دونوں ہی حضرات اپنے آپ کو تاریخ ہند کے مطالعے کے لیے وقف نہ کر سکے کیوں کہ ان حضرات کے پیش نظر اور بھی بہت سے کام تھے۔ اس لیے ان بزرگوں نے صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی تربیت اس طرح کی کہ وہ تاریخ ہند کے مطالعے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ مذکورہ بزرگوں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور صباح الدین صاحب نے اپنے آپ کو تاریخ ہند کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا۔

ان کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ان کی کتاب بزم صوفیہ سے ہوئی۔ بعدازاں انہوں نے بزم مملوکیہ اور بزم تیموریہ نام سے کتابیں لکھ کر اس سلسلے کی تکمیل کی۔ صباح الدین صاحب مرحوم نے تاریخ ہند کے مختلف گوشوں پر نئے نئے انداز سے کام اس بات کی طرف اشارے کیے ہیں کہ ابھی اس موضوع پر بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ اس سلسلے کی ان کی بعض مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں:

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک۔ ہندوستان کے مسلمان

حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ۔ عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں ۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں ۔ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشایخ کے تعلقات پر ایک نظر ۔ بابری مسجد تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں ۔

دار المصنفین اعظم گڑھ کے رفقا کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ علمی کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ ادبی کام بھی کرتے رہے ہیں۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے بھی اپنی یادگار میں دو ادبی کتابیں چھوڑی ہیں۔ ہماری مراد "دیوان فغاں" اور "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" سے ہے۔ میر و سودا کے معاصر اشرف علی خاں فغاں کی شاعری کی اہمیت کا احساس تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اپنے مقالے "دیوان فغاں" مطبوعہ معارف اپریل ۱۹۲۲ء میں دلایا تھا۔ صباح الدین صاحب نے فغاں کے دیوان کے متعدد قلمی نسخوں کا باہمی موازنہ و مقابلہ کر کے ایک ناقدانہ متن مرتب کیا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ سپرد قلم فرمایا جس کو "دیوان فغاں" کے نام سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے انجمن ترقی اردو کراچی سے شایع کیا۔ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" دو جلدوں میں ہے۔ اس کتاب میں صباح الدین صاحب نے ۱۹۶۹ء تک غالب کے متعلق شایع ہونے والی کتابوں اور مقالوں کا بھرپور اور مفصل تعارف کراتے ہوئے ان پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب اہل علم کے حلقے میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

دسمبر ۷۴ء میں شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے انتقال کے بعد وہ دار المصنفین کے ناظم منتخب ہوئے اور ان کی مدد کے لیے مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کو دار المصنفین بلایا گیا' لیکن ان دونوں بزرگوں کی رفاقت صرف پانچ برسوں تک ہی رہ سکی۔ ۷۹ء میں مولانا قدوائی نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد سے وہ اکیلے ہی علمی اور عملی دونوں نظامتوں کا بار اپنے کاندھے پر اٹھائے دار المصنفین کی خدمت میں ہمہ تن منہمک رہے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال اسی مہینے اور اسی تاریخ کو ہوا جو علامہ شبلی نعمانیؒ کا ماہ و روز وفات ہے۔ ان کی ابدی آرام گاہ کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا اسی جگہ علامہ شبلی' ان کے صاحبزادے حامد نعمانی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی آسودۂ خواب ہیں۔

ان کی ناگہانی وفات سے دار المصنفین میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ اس کو پُر فرمائے اور دار المصنفین پیش رفت کی راہوں پر گامزن رہے۔ ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت دار المصنفین اعظم گڑھ اور مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالٰی مرحوم کی بشری کمزوریوں کو معاف فرمائے اور اعلٰے درجات سے نوازے ۔ آمین

(ادارہ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ - ش ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۷ء)

مہذب قوموں کی پیروی

سرسید احمد خاںؒ

چھوٹا بچہ اپنے سے بڑے لڑکے کی باتوں کی پیروی کرتا ہے، اور کم سمجھ والا، اس کی جس کو وہ اپنے سے زیادہ سمجھ دار سمجھتا ہے، اور ناواقف اس کی جس کو وہ اپنے سے زیادہ واقف کار جانتا ہے۔ اسی طرح نامہذب قوم کو تہذیب یافتہ قوم کی پیروی کرنی ضرور پڑتی ہے۔ مگر بعض دفعہ یہ پیروی ایسی اندھادھندی سے ہوتی ہے جس سے بجائے اس کے کہ اس پیروی سے فائدہ اٹھاویں الٹا نقصان حاصل ہوتا ہے؛ اور جس قدر ہم نامہذب ہوتے ہیں، اس سے اور زیادہ ناشایستہ ہو جاتے ہیں۔

نامہذب آدمی جب تربیت یافتہ قوم کی صحبت میں جاتا ہے تو اُن لوگوں کو بہت عمدہ پاتا ہے، اور ہر بات میں ان کو کامل سمجھتا ہے۔ ہر جگہ ان کی تعریف سنتا ہے؛ مگر اُن میں جو خراب عادتیں ہیں، ان کو بھی دیکھتا ہے، مثلاً شراب پینا، جوا کھیلنا وغیرہ۔ بس یہ شخص ان باتوں کو بھی ان کے کمالوں ہی میں تصور کر لیتا ہے۔ ان میں جو خوبیاں اور کمالات درحقیقت ہیں، ان کو تو وہ حاصل نہیں کرتا، اور نہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر جو بری عادتیں ان میں ہیں، ان کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔

ایسا کرنا درحقیقت اس آدمی کی غلطی ہے کہ اس نے ان کے نقصوں کو ان کا کمال سمجھا ہے۔ وہ لوگ بسبب کسی دوسرے کمال و لیاقت اور خوبی کے جو ان میں ہے اور بسبب دوسری عمدہ خصلتوں کے جو انہوں نے حاصل کی ہیں، مہذب و شایستہ کہلاتے ہیں، نہ بسبب ان باتوں کے، جن کو اس نے سیکھا ہے۔ بلاشبہ مہذب آدمیوں کی برائیاں اُن کی بہت سی خوبیوں اور کمالوں کے سبب سے چھپ جاتی ہیں، اور لوگ اُن پر بہت کم خیال کرتے ہیں؛ تاہم وہ برائیاں کچھ ہنر نہیں ہو جاتیں، بلکہ جو برائی ہے وہ برائی ہی رہتی ہے، گو کہ ایک مہذب قوم ہی نہ ہوں۔

ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی قوم وہ کیسی ہی عمدہ اور ہو، مگر جو برائیاں اس میں ہیں، وہ اس کے وصف نہیں ہر ان کے کمال کی کمی ہے، جس کی پیروی ہم کو کرنی نہیں چاہیے۔ اگر خوب صورت آدمی کے منہ پر مسّہ ہو، تو ہم کو خوبصورت بننے کے لیے ویسا ہی مسّہ اپنے منہ پر نہ بنانا چاہیے۔ کیوں کہ وہ مسّہ خوب صورتی نہیں ہے، بلکہ اس کی خوب صورتی کا نقصان ہے۔ حالت میں ہم کو یہ خیال کرنا مناسب ہے کہ اگر یہ مسّہ کم منہ پر نہ ہوتا تو کتنا اور خوب صورت ہو جاتا!

ہم بلاشبہ اپنی قوم کو، اپنے ہم وطنوں کو، سولائزڈ قوم کی ترغیب کرتے ہیں، مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان خوبیاں ہیں اور جن کے سبب وہ معزز اور قابل ادب سمجھی جاتی سولائزڈ شمار ہوتی ہیں، ان کی پیروی کریں؛ نہ ان باتوں کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔

اسی سبب سے، جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم سولائزڈ قوم کی عمدہ خصلتوں اور عادتوں میں پیروی کی خوشی ہوتی ہے، اور جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اس نے ان کی برائیوں کی اور شراب پینی شروع کی، اور پکا متوالا ہو گیا اور جوا کھیلا اور بے قید ہو گیا، تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے۔ ہم کرتے ہیں کہ ہماری قوم عمدہ باتوں کو سیکھے گی اور بری بُرا سمجھے گی۔

اپنی رقم کراس چیک یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے اس بینک کو ارسال کردیں اور ارسال کرنے کی اطلاع راقم الحروف کو مندرجہ ذیل پتے پر دے دیں۔ وہ حضرات جو منی آرڈر سے روپیہ ارسال کرنا چاہتے ہیں، براہ راست راقم الحروف کو بھیج دیں۔ منی آرڈر سے وہی حضرات بھیجیں جنھیں چیک یا بینک ڈرافٹ سے بھیجنے میں دقت ہو۔ جو صاحب دہلی آنے والے ہوں، وہ اکٹھا کی ہوئی رقوم بہ نفس نفیس لاکر یہاں جمع کرسکتے ہیں۔ ٹرسٹ کے آڈیٹر، مسٹر کمال فاروقی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، دہلی جیمبر، دہلی میں ٹرسٹ کا اکاؤنٹ سال بہ سال آڈٹ ہوگا اور سالانہ رپورٹ کے ساتھ بورڈ آف ٹرسٹیز میں پیش کیا جائے گا۔ ہم وقتاً فوقتاً اردو اخبارات کے ذریعے (جنھوں نے کمال فراخ دلی سے ہماری طرف دست تعاون بڑھایا ہے) قارئین کو بھی اخبار اور چندہ، دونوں کی پیش رفت کی اطلاع دیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہماری رسائی ہر شہر کے اہل خیر اور اہل اعتبار تک نہیں ہے۔ لہٰذا اس اپیل کے ذریعے ہم اُن سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے اپنے شہروں میں ایک چھوٹی سی غیر رسمی انجمن یا کمیٹی اخبار کے وسایل فراہم کرنے کے لیے قایم کردیں اور تین معتبر اور معروف دستخطوں اور پتوں کے ساتھ راقم الحروف کو ایک خط ارسال کردیں اور مطلوبہ کتابیں کوپنوں کی اپنے حلقے کے کسی ایک صاحب کے نام طلب کرلیں۔ جو خط ٹرسٹ کے سکریٹری کو اس سلسلے میں بھیجا جائے گا، اس کا خاکہ منسلک ہے۔ ان کتابوں کی حفاظت اور ان پر چندہ کرنے کے لیے وہ صاحب ذمہ دار ہوں گے۔ وہ ان لوگوں کو چندہ وصول کرنے کے لیے کوپنوں کی کتابیں دے سکتے ہیں جن پر انھیں اعتبار ہو اور جو اپنا وقت اس بڑے کار خیر کے لیے دے سکتے ہیں۔ البتہ کوپنوں کا حساب ٹرسٹ کو وہی صاحب دیں گے جن کے نام کوپن، ٹرسٹ کی طرف سے جاری کیے گئے ہوں۔ کوپن کی کتابیں دکانوں پر بھی رکھی جاسکتی ہیں۔ مسجدوں میں نماز کے بعد ان پر چندہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا انتظار نہ کیا جائے کہ جب سب کوپن بک جائیں جبھی روپیہ بھیجا جائے، جیسے جیسے روپیہ آتا جائے، اسے بینک ڈرافٹ کی شکل میں بینک یا راقم الحروف کو بھیج دیا جائے۔

یہ مسئلہ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح وعزت اور موت وزیست کا مسئلہ ہے اور ان سارے وقتی، ہنگا اور مقامی مسایل سے کہیں زیادہ اہم اور دور رس ہے جن کی ہمیں وقتاً فوقتاً متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ راقم، ٹرسٹیان کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کی ملی حمیت سے اپیل کرنے کی جسارت ک ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یقین ہے کہ اس کے مسلما بھائی اس اپیل کی اہمیت اور اس لمحہ کی نزاکت کو سمجھیں گے ا اس ملک میں باعزت زندگی بسر کرنے اور ملک کے انتظام، ت اور ترقی میں حصہ لینے کی غرض سے ایک اعلیٰ انگریزی روزنامہ کرکے دم لیں گے۔ اس مقصد کے لیے وہ کوئی دقیقہ فروگذاش نہ کریں گے۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جن لوگوں نے اخبار ک اپنے ذمے لیا ہے، ان کی کوئی ذاتی غرض اس جریدے سے وابستہ نہیں یہ بار گراں انہوں نے فی سبیل اللہ اٹھایا ہے۔ آپ بھی فی سب ان کی دستگیری کیجیے۔ لوگوں نے انہیں ڈرایا ہے کہ مسلمانوں ک نہ اتنا سرمایہ، نہ اتنی صلاحیت کہ موجودہ بڑے بڑے روزنام مقابلہ کرسکیں۔ اُٹھیے اور ثابت کردیجیے کہ ملی کام کے لیے ضرورت پڑے تو پیٹ کاٹ کر سرمایہ فراہم کرسکتے ہیں اور م بروئے کار لاسکتے ہیں۔ ہمارے ناصیہ پر یہ بہت بُرا داغ۔ ہم آج تک ایک اعلیٰ معیار کا انگریزی روزنامہ نہیں نکال سکے داغ ہماری جبیں سے آپ ہی مٹا سکتے ہیں۔ للہ اٹھیے اور اس کام کو ضروری سرمایہ فراہم کرکے پایۂ تکمیل تک پہنچایے۔ یہ ن کہ کوئی دوسرا شخص آپ کے شہر میں اس کام کو شروع کرے گا خود پیش قدمی کیجیے، پھر یہ کام آسان ہو جائے گا۔ جو انجمنیں رفاہ کے دوسرے کاموں میں لگی ہوئی ہیں، وہ بھی اس کام کو اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ مقامی اسکولوں کی مجالس سپرد بھی یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کے انتظام پر ا اطمینان اور اعتماد ہو۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید اس بڑے کار خیر میں روپیہ دینے کے لیے لوگ فوراً تیار

گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شہر میں اس کام کو سلیقے سے کرنے کے لیے کچھ اہلِ خیر اور اہلِ درد مل کر ایک چھوٹی سی تنظیم بنالیں اور یہ طے کریں کہ ہمیں اس قدر روپیہ اتنے عرصے کے اندر جمع کرکے ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں داخل کرنا ہے اور اسی لائحۂ عمل کے مطابق جدوجہد کریں۔ روپیہ صرف ٹرسٹ کی رسید بکوں یا کوپنوں پر جمع کیا جائے گا، جن پر ٹرسٹ کے سکریٹری کی دستخطی مہر ہوگی۔ عوام سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ ٹرسٹ کی مستند رسید بک یا کوپن کے بغیر اخبار کے لیے چندہ ہرگز نہ دیں۔

یہ ہم فرقوں، مسالک، سیاسی پارٹیوں اور گروہ بندیوں اور ذاتیات کے اختلافات سے بالاتر ہے۔ ٹرسٹیان بحث اور مباحثے اور نزاع میں خود کو الجھانا نہیں چاہیں گے کہ ان کا مقصود ملت کی مجموعی تعداد اور ان کا مدعا ملت کی ہمہ جہت پیش رفت ہے۔ وہ روشنی اور علم، اتفاق و اتحاد، امن و آشتی، تعمیر و تنظیم کی اشاعت کے لیے مکلّف اور مسئول ہیں۔ علاوہ بریں ان کے پاس نزاع کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔

کوپن طلب کرنے کے لیے خط کا خاکہ

ہم لوگ، جن کے دستخط اور پتے ذیل میں درج ہیں، یہ تصدیق کرتے ہیں کہ جناب ________ ولد ________
ساکن محلہ ________ شہر ______ ضلع ______
ایک معتبر اور رفاہی ذہن رکھنے والے انسان ہیں، جن سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ مجوزہ انگریزی روزنامہ کے واسطے فی سبیل اللہ چندہ جمع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ انہیں ________ روپیے کی مجموعی قیمت کی کوپن کی کتابیں ہمارے علم و اطلاع میں بھیج دی جائیں۔ ہم اس امر میں ذاتی طور پر دلچسپی لیں گے کہ روپیہ جلد جمع ہو جائے اور ٹرسٹ کو اولین فرصت میں اس کا حساب بھیج دیا جائے۔

	نام	مکمل پتہ	پیشہ/عہدہ	دستخط
۱۔	نام	مکمل پتہ	پیشہ/عہدہ	دستخط
۲۔	"	"	"	"
۳۔	"	"	"	"

جوابِ دوست

وفا کے تقاضے

ذکر تھا علی گڑھ کا اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اور خود ہندوستان کے مستقبل کا تذکرہ بھی آگیا کیوں کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے۔ علی گڑھ تحریک دراصل ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا واسطہ جب یونانی فلسفہ، ہندوستانی ریاضی اور مصری علم الافلاک سے پڑا تو انہیں ان سب کی طرف بڑھنے میں کسی خاص ذہنی جدوجہد کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو یہ سمجھے کہ یہ وہی انعامات ہیں جن کا اشارہ انعمت علیہم میں کیا گیا ہے اور جن کو حاصل کرنے میں ان کی سمجھ میں عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ کی گہرائی اور گیرائی آئی۔ لیکن انیسویں صدی میں حالات بالکل مختلف تھے۔ اس وقت صرف ہندوستان ہی کے نہیں ساری دنیا کے مسلمان مغربی طاقتوں سے اپنے ملک ہار چکے تھے اور ذہنی اعتبار سے اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ علم و فن کی طرف سے کروٹ بدل کر غافل پڑے ہوئے تھے۔ میری نظر میں سرسید کے علاوہ اور کوئی دوسرا نام نہیں آتا جس نے انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا ہو کہ اگر غافل رہے تو علم کے قافلے اتنی دور جاچکے ہوں گے کہ تم دوڑ کر بھی انہیں نہ پکڑ سکو گے۔ پہلے تو معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی آواز صدا بصحرا ہو کے رہ جائے گی لیکن خود ان کی زندگی میں یہ جرس کارواں بن گئی۔

کارواں چلا، خستہ حال، خستہ پا اور خستہ دل، لوگ منزل کی تلاش میں چل نکلے، منزل کیا تھی یہ اچھی طرح سے تو کوئی نہیں بتاتا تھا لیکن تحت الشعور میں شاید ایک باعزت زندگی کی تلاش تھی۔ عزت جو ختم ہوچکی تھی اور رہتی بھی کیسے؟ اقتدار سے محروم، گرہ خالی اور علم کا ساتھ مدتوں سے چھوٹا ہوا۔ ایسوں کی [illegible] کرتا ہے۔ عزت کی تلاش میں نکلے، ستر بہتر برس کے [illegible] کا دور ختم ہوا۔ ملک کے ایک حصہ پر سیاسی اقتدار [illegible] ہوگیا لیکن ملک کے دوسرے رہنے والوں کی مرضی کے [illegible] اس لیے ان سے لاگ ڈاٹ کا بھی ایک سلسلہ قایم ہوگ[illegible] کی وجہ سے ان لوگوں کو بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا [illegible] علاقے میں مذہبی اقلیت میں رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم [illegible] کا کوئی دائمی حل نہیں ہوسکتا۔ البتہ افہام و تفہیم سے بہت [illegible] حل ہوسکتے ہیں۔

اصل سوال جو سرسید اور ان کے رفقاء کے [illegible] وہ یہ کہ اتنے بڑے ملک میں جہاں مسلمان بڑی عزت سے [illegible] تھے اب بدلے ہوئے حالات میں وہ کس طرح باعزت ز[illegible] کریں، تاریخی پس منظر، سماجی حالات، اور علاقائی حق[illegible] ایسی تھیں کہ اس مسئلہ کا کوئی سیدھا سادھا حل ممکن نہ[illegible] جستجو بہت کی گئی، لکھنؤ پیکٹ، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس[illegible] فارمولہ، لیاقت بھولا بھائی سمجھوتہ اور گاندھی جناح [illegible] یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ لیکن جب [illegible] نہیں ہوسکا تو مجبوراً تقسیم کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اگر یہ [illegible] تو کاش آپس کی رضامندی سے ہوا ہوتا۔ لیکن قسمت [illegible] اور تھا۔

تقسیم کے بعد جو دو ملک وجود میں آئے ان [illegible]

دشمنی ہو گئی کہ دونوں جگہ یہ سمجھا جانے لگا کہ ایک دوسرے کی مخالفت
ہی کے ذریعے اپنا وجود باقی رکھا جا سکتا ہے۔

اس نظریہ کی بدولت دونوں ملکوں کی اقلیتیں بہت سی مشکلات
میں مبتلا ہو گئیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی زمینداریاں ختم ہو گئیں
اور بڑی سرمایہ کاری میں ان کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔ ملازمتیں
ان کے لیے آسان نہیں ہیں۔ تعلیم میں بھی وہ اپنے ہم وطنوں سے بہت
پیچھے رہے جا رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی جماعتیں ان کے مسائل نہیں
سمجھ پاتیں۔ بائیں بازو والوں کا رویہ یہ ہے کہ اقتصادی مسائل تو
اسی وقت حل ہوں گے جب ہندوستان میں سرمایہ داری ختم ہو کر
سوشلزم قایم ہو جائے۔ لیکن سوشلزم قایم ہونے تک کیا ہو؟ جواب
ملتا ہے کہ سوشلزم کے قیام تک ملک کی اکثریت کی مشکلیں ویسی ہی رہیں
گی اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں گرفتار ہیں۔ جب یہ کہا جاتا
ہے کہ مشکلوں میں گرفتار دوسرے لوگوں کو تو پھر بھی کچھ سہولتیں حاصل
ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہماری پارٹی ہر قسم کے امتیازی سلوک کے
خلاف ہے اور جب کبھی مسلمانوں کے خلاف کوئی تعصب کا اظہار کرے
گا ہم اس کی سخت مخالفت کریں گے اور جہاں تک مخالفت کرتے بھی ہیں۔
جب کبھی فساد ہوتا ہے تو یہ پارٹیاں امن مورچہ بناتی ہیں اور شانتی کا
پرچار ہوتا ہے۔ لیکن ان باتوں سے نہ تو فسادات کا سلسلہ ملک
میں رکا اور نہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی
ہوئی۔ البتہ جب سے عرب اور افریقہ کے ملک آزاد ہوئے ہیں
اور انہوں نے معاشی ترقی کا راستہ اختیار کیا ہے، مسلمانوں کی
اقتصادی حالت ضرور بہتر ہوئی ہے۔ اب بہت سے شہروں میں ان
کے پکے مکانات بننے لگے ہیں اور بیرونی ممالک سے لائے ہوئے
سرمایہ کو کچھ لوگ کاروبار میں بھی لگا رہے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ملک گیر پیمانے پر کوئی سمجھوتہ نہیں
ہوا، لیکن مقامی طور پر معاملہ کچھ آگے بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے
کیرالا میں یہ صورت ہے کہ وہاں کے ہندوؤں، مسلمانوں اور
عیسائیوں نے اس طرح رہنا سیکھ لیا ہے کہ تینوں کو اپنی جنم بھومی
سے یکساں لگاؤ ہے۔

بنگال میں کمیونسٹ حکومت کو بھی عام مسلمانوں کی حمایت
حاصل ہے اور حکومت مسلمانوں کے مسایل حل کرنے کی کوشش
کرتی ہے۔ فسادات کا سختی سے مقابلہ کیا جاتا ہے اور کوشش یہ
ہے کہ پولیس میں مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر نوکری ملنے لگے۔

ادھر آسام میں فرقہ وارانہ مسئلہ کھل کر سامنے آ گیا ہے
لیکن حالات ایسا موڑ لے رہے ہیں کہ مسلمان شاید اپنے ہندو
بھائیوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

اسی طرح گجرات میں بھی شاید یہ ہو کہ مسلمان اپنے ہندو اور غیر
بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسا انتظام کر لیں جس میں آپس میں میل ملا
کے جان کی حفاظت ہو سکے۔ لیکن ہندی۔ اردو بولنے والے علاقوں
میں ہندو اور مسلمانوں کے سیاسی تعلقات بہت اچھے نہیں ہیں
اس کی ایک بہت بڑی وجہ زبان کا اختلاف ہے۔ جو زبان سرکا
کاروبار میں استعمال ہو رہی ہے وہ عام بول چال کی نہیں ہے
اور وہ زبان جو ان علاقوں کے شہروں میں بولی جاتی ہے، اسے
کاروبار میں استعمال کرنے پر حکومت تیار نہیں ہے اور اردو
کے استعمال کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ باوجود ایک
زبان بولنے کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بہت دور

آج سے بائیس برس پہلے جب ہم لوگ کلکتہ، جمشید پور او
رانچی کے فسادات میں یورپ سے ہندوستان آئے تھے، اس وقت
بھی میں ناامید نہیں تھا اور یہ سمجھ کے آیا تھا کہ وطن کو خوبصورت بنا
کی ذمہ داری بھی اس کے چاہنے والوں پر ہے۔ اگر ان چاہنے
والوں پر وقت پڑا ہے تو شاید یہ ان کی محبت کا امتحان ہے اور
ہم اپنی طرف سے تو کہہ چکے ہیں۔

نہ لا وسواس تو دل میں کہ تیرے چاہنے والے
سر مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

ہندوستان کے مسائل ایسے نہیں جن کا کوئی آسان حل نکالا
جا سکے۔ سب سے بڑا مسئلہ ذہنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں
کے رہنے والوں کا ایک بہت بااثر طبقہ انگریزوں کے آنے سے قبل کی
تاریخ ایک نئی روشنی میں دیکھتا ہے۔ وہ لوگ ہر اس چیز سے

بچنا چاہتے ہیں، جو انہیں سات آٹھ سو برسوں کی ایسی یاد دلائے
جس میں کسی گروہ کی بالادستی کا مظاہرہ ہو۔ ادھر مسلمانوں میں ایک
بہت بڑے طبقے کا خیال ہے کہ ہندوستان کی اصل تاریخ تو محمود
غزنوی کے حملے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ خیالات
رہیں گے، دل نہیں مل سکتے۔

اردو سے بیزاری کی ایک بہت بڑی وجہ اس کا رسم الخط
ہے کہ اس سے ان دنوں کی یاد آتی ہے جب ہندوستان میں مسلمانوں
کا تسلط تھا۔ غالباً اسی وجہ سے جو سندھی پاکستان سے ترک وطن
کر کے ہندوستان آئے ہیں، ان میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ سندھی
زبان کا رسم الخط بجائے فارسی کے دیوناگری کر دیا جائے۔ اردو کی
مخالفت کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اتنی شدید بیزاری بڑی
حد تک اس کے رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ ہم اس کا کوئی علاج نہیں
کر سکتے۔ چاہے سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے ایک دن اردو
قانونی طور پر ملک کے بعض حصوں کی دوسری زبان تسلیم بھی کر لی
جائے، لیکن رسم الخط سے بیزاری بہت دن رہے گی۔

بول چال کی زبان تو شمالی ہندوستان کے شہروں میں ہمالہ
سے نیچے ایک ہی جیسی ہے جسے چاہے اردو کہہ لیجیے چاہے ہندی
چاہے ہندوستانی، فلمی گانوں اور مکالموں کا بھی یہی حال ہے
لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں جس زبان میں خبریں ہوتی ہیں وہ
ہندوستان میں کہیں نہیں بولی جاتی پر کہتے اسے ہندی ہیں یہ ہندی
اس بھاشا سے کتنی مختلف ہے جس میں امیر خسرو کسی سے کہتے تھے۔

نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اس میں شک نہیں کہ زبان کے معاملے میں شمالی ہندوستان
کی روایات میں ایک طرح کی کمزوری رہی ہے اور وہ یہ کہ بول چال
کی عام زبان نہ تو سرکاری کاموں میں استعمال ہوتی تھی اور نہ علمی
کاموں میں۔ سنسکرت ہزاروں برس سے یہاں کی علمی زبان رہی
ہے، لیکن بول چال کی زبان بدلتی رہی ہے، پہلے پراکرتی تھی جس میں
گوتم بدھ نے عام لوگوں کو تعلیم دی۔ پھر پٹھانوں اور مغلوں کے

لوگ کھڑی بولی اور بعد میں اردو بولتے تھے۔ علمی زبان کا معاملہ
تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی بننے تک ہندو اپنی کتابیں سنسکرت میں
مسلمان عربی میں لکھتے تھے اور بعد کو جب بہت رعایت کی تو ف
میں لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ حالاں کہ بڑی مشکل سے۔ چنانچ
شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا ت
پر بہت اعتراض ہوئے۔

اردو میں علمی مشاغل کا سلسلہ تو سرسید اور ان
رفقاء نے شروع کیا اور اس کے بعد دولت عثمانیہ نے ہن
کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا، لیک
تو اس وجہ سے کہ جس علاقے میں اردو ذریعہ تعلیم بنی۔ اس
کے عام لوگ یہ زبان نہیں بولتے تھے اور دوسرے سیاس
کی وجہ سے یہ روایت ختم ہو گئی۔ اردو کا کتب خانہ نذر آتش

خیر اب ہر جگہ علاقائی زبانیں ترقی کر رہی ہیں اور آ
یہ علمی زبانیں بھی ہو جائیں گی۔ سرکاری کاموں کے لیے اب
میں علاقائی زبانیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ امید تو یہ
علاقے ہیں ہندی اور اردو بولی جاتی ہے وہاں کی س
زبان بھی آہستہ آہستہ عام فہم ہو جائے گی۔ ابھی تو ہم
ملک کے جذباتی اثرات سے بالکل آزاد نہیں ہوئے ہیں
اثرات ختم ہو جائیں تو شاید ہمارے علاقے میں ایسی زبا
پڑھی جائے جسے عوام آسانی سے سمجھ سکیں۔ کاش ایسی
حکومت کے دفتروں اور یونیورسٹیوں میں بھی لکھی اور
رسم الخط چاہے دونوں ہی رہیں۔ دیوناگری بھی اور فارسی

آپ کہیں گے کہ گاندھی جی بھی تو یہی کہتے تھے میں عرض کروں گا جی ہاں
کہ ہم گاندھی جی کی ہدایت کو فراموش نہ کر پائیں گے، ان سے عقیدت کا اظہار
سلام کرنے کے علاوہ بھی بہت طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ آسان
طرح سے لکھ کر ہم ان کی ایک بہت بڑی آرزو پوری کر دیں گے

ہمارے اردو اور ہندی بولنے والے علاقوں
کے متعلق جو پالیسی ہے، اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ
معیاری زبان نہیں بن پا رہی ہے کوئی ایسا پیمانہ نہیں

یہ کہا جا سکے کہ جو کچھ بولا جا رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں اس کا تلفظ اس کی گرامر اور تذکیر و تانیث صحیح ہے یا نہیں؟ لیکن باوجود اس خرابی کے ہمارے گیت، ہماری غزلیں، ہمارے ناٹک اور ہماری فلمیں بہت حد تک عوام کی زبان کی حفاظت کر رہی ہیں۔

افسوس کہ ہم میں سے بہت سوں کی نظر تہذیب کی باریکیوں تک نہیں جاتی۔ غالباً کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس، صنعت و حرفت کلاسیکی موسیقی اور رقص ہی سماج کو مہذب بنانے کے لیے کافی ہیں اگر ان کی نظر میں شعر و ادب، ناٹک اور فلم کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی تو کوشش کرتے کہ ایسی زبان رائج ہو جس میں ہماری تمام جمالیاتی قدریں نکھر سکیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں ہندوستان واپس آیا تو مجھے خود اپنی زبان کی غربت کا شدید احساس ہوا، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہنا شروع کیا کہ جب تک ہمارے بچے اس زبان میں سائنس نہیں پڑھیں گے جس میں ان کی مائیں انہیں لوریاں دیتی ہیں، اس وقت تک قوم کا مزاج سائنٹفک نہیں بن سکتا۔ سائنس کا محض ایک ملمع رہ جائے گا جو دنیاوی منفعت کے لیے ضروری ہے لیکن زندگی کے مسایل کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا سلیقہ غیر زبان میں سائنس پڑھ کر مشکل سے آئے گا، مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یورپ کے لوگ لاطینی ہی کو علمی زبان بنائے رکھتے تو ہرگز سائنس کے علوم میں اتنی ترقی نہیں کر سکتے تھے جتنی کہ پچھلے چار سو برسوں میں انہوں نے کی۔ ان چار سو برسوں میں جہاں ایک طرف سرمایہ داری نظام سارے یورپ پر رفتہ رفتہ چھا گیا، ویسے ہی قومی جذبات بھی بڑھے اور صدیوں کی کشمکش کے بعد آج یورپ میں ہر جگہ قومی حکومتیں قایم ہیں، اور ہر جگہ مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہے۔

میرے بہت سے دوستوں نے کہا کہ ہمارے برصغیر میں یہ بات کیسے ممکن ہے۔ یہاں کی تو سنسکرت کے علاوہ اور کسی زبان [illegible]

نہیں ہے۔ میں ان کی یہ بات مان لیتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ک
تھا کہ ہم لوگوں کو کوشش کرکے ایسی روایات قایم کرنا چاہییں۔ چنانچہ بغیر کسی مزید سوچ بچار کے میں نے یہ کام شروع کر دیا ا
سرجری کے بنیادی مسایل پر اردو میں مضامین لکھنا شروع کر د

میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کام کی ابتدا میں نے کی اردو میں سائنسی مضامین کا سلسلہ پاکستان میں تو شروع ہ
ہو چکا تھا اور شاید ہندوستان میں بھی مضامین لکھے گئے ہو
بہرحال میرا پہلا مضمون "کینسر" یونیورسٹی کے علمی جریدہ فکر و
میں شایع ہوا۔ اس کے بعد کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹ
ریسرچ نے جب ایک اردو رس
'سائنس کی دنیا' نکالا ت
کے پہلے پرچے میں میرا مضمون
میں پانی کی اہمیت' شایع ہو
آج کل ان دونوں رسالوں کی
ادارت سے میرا تعلق ہے۔

۱۹۷۵ء میں جب میں اسپتال کی ذمہ داریوں سے سبکد
ہوا تو میں نے یونیورسٹی میں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کا
سے شروع کیا۔ اس کام میں ڈاکٹر سید الظفر چغتائی نے پورا سا
دیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انہیں کی مشقتوں سے یہ کام سر
پایا۔ پہلے تو ہم لوگوں نے یونیورسٹی کے سینئر اساتذہ میں سے
کو میڈیکل فیکلٹی کے دفتر میں مدعو کیا اور ان سے اپنا مدعا بیان
کہ سو برس سے جو کام علی گڑھ میں ہو رہا ہے، اس کا علم بھی ہم میں
سب کو ہونا چاہیے۔ ابھی تک تو ہم صرف اپنے ہی مضمون کے متعلق
تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ باقی سائ
کے کاموں سے بھی واقفیت ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ کوشش
ہو کہ جو کام ہم کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ اردو میں لکھا جائے۔
نے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ سوسائٹی کا جلسہ مہینہ میں ایک
یونیورسٹی کے کسی ڈپارٹمنٹ میں ہوگا اور کوشش یہ ہو
کہ باری باری سے ہر ڈپارٹمنٹ میں جلسہ ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"بدترین بندے وہ ہیں جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں، دوستوں میں جدائی ڈلواتے اور پاک بندوں پر تہمت لگاتے ہیں۔" (مسند احمد)

چنانچہ تقریباً تین برس تک یہ سوسائٹی چلتی رہی اور اس کے جلسے مختلف شعبوں میں ہوتے رہے۔ عموماً ہر جلسہ میں دو مضامین اردو میں پڑھے جاتے اور پھر ان پر گفتگو ہوتی۔ جو مضامین پڑھے گئے ان میں ریاضی، فزکس، کیمسٹری، سرجری، نباتات، حیوانیات، طبقات الارض اور فارمیکالوجی پر مضامین مجھے یاد ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ میں فسادات شروع ہو گئے، جن کا سلسلہ تین برس تک جاری رہا۔ ان فسادات میں یونیورسٹی کی تعلیم کا بہت حرج ہوا اور اس سوسائٹی کا کام بھی رُک گیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں جب سید حامد صاحب وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے اس سوسائٹی کو باقاعدہ ایک انتظامی صورت دے دی اور اس کے جلسے بھی ہوئے لیکن اب اُن میں اس پر اصرار نہیں تھا کہ مضامین اردو میں پڑھے جائیں۔

اسی زمانے میں تہذیب الاخلاق کا اجرا بھی ہوا۔ یہ رسالہ سرسید علی گڑھ تحریک کے لیے سو برس پہلے نکالتے تھے۔ اب جب دوبارہ نکلنا شروع ہوا تو مجھے بھی اس سے منسلک کرکے بورڈ آف ٹرسٹیز کا ممبر اور ایڈیٹوریل بورڈ بنا دیا گیا۔

چنانچہ اردو میں سائنٹفک مضامین کا سلسلہ جاری ہے، ادھر حکومت ہند نے ترقی اردو بورڈ کے میڈیکل سیکشن سے بھی مجھے منسلک کر دیا اور ادارہ کے انسائکلوپیڈیا کے سرجری سیکشن کی ذمہ داری بھی مجھے دی۔ چنانچہ سرجری پر میں نے کلیدی مضمون بھی لکھا۔ انسائیکلوپیڈیا تو ابھی نہیں چھپی ہے لیکن اس مضمون کو علیحدہ سے اردو بورڈ نے شایع کر دیا ہے۔

اس سال مارچ کے مہینے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے مجھے نظام لکچرز دینے کی دعوت دی۔ خطبات کا موضوع "... ارتقاء" تجویز کیا گیا۔

غرض جب وفاداری پر بھروسہ ہو گیا تو اردو نے بھی ہمیں اپنے

خاموشی سے ہیبت پیدا ہوتی ہے، انصاف کرنے سے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، سخاوت و بخشش سے قدر و منزلت بڑھتی ہے، انکساری سے نعمت خداوندی میں اضافہ ہوتا ہے، رنج و غم میں صبر سے خوشی حاصل ہوتی ہے، روشِ عدل دشمن کو نیچا دکھاتی ہے، اور ذلیل و خوار شخص کے مقابلے میں بردباری دوستوں کی تعداد بڑھا دیتی ہے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

علم الحیاتیات کے اساتذہ سے خطاب

اطہر حسین صدیقی | ترجمہ | محمد ظہیر عالم

[علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کے زیر اہتمام منعقد ہوئے. ہائی اسکولوں کے علم الحیاتیات کے اساتذہ کے لیے تجدیدی کورس کے افتتاحی اجلاس میں دیے گئے خطبے کا اردو ترجمہ]

عزیز دوستو!

میرے لیے یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ ہائی اسکولوں کے علم الحیاتیات کے اساتذہ کے لیے منعقد کیے گئے اس تجدیدی کورس (ریفریشر کورس) کے ناظم کی حیثیت سے میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں۔ یہ فرض مجھے مرکز فروغ سائنس کی جانب سے تفویض کیا گیا ہے۔ ناظمین مرکز نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ہم اپنی جانب سے یہ پوری کوشش کریں گے کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اب یہ کورس کے اختتام پر ہی معلوم ہوگا کہ ہم ان کی توقعات پر کہاں تک پورے اترے۔ بہر حال یہ موقع جو مجھے میسر آیا ہے اسے غنیمت تصور کرتے ہوئے میں اس کورس کے تمام شرکار کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یہ امید رکھتا ہوں کہ آئندہ دو ہفتے کے دوران ہمارا آپ کا ساتھ بار آور ثابت ہوگا۔ بالخصوص اس لیے کہ آپ اور ہم دونوں ہی اساتذہ کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس عمل سے ہم دونوں ہی مستفید ہوں گے۔

آغاز ہی میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس ریفریشر کورس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کورس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بشمول یونیورسٹی، ملک کے مختلف حصوں کے اسکولوں کے بایولوجی۔ اساتذہ کا باہم اجتماع کیا جائے اور سر سید کے اس عظیم ادارہ کے اسا اور مختلف مقامات پر درس و تدریس میں مصروف ہمارے شریک ک بھائیوں کے مابین اشتراک عمل سے ایک دو آتشہ علمی تفاعل کی تک کی جائے۔

ہمارا طریقۂ کار یہاں تدریسی ہونے کی بہ نسبت تصوراتی اور تج زیادہ ہے۔ حقائق درسی کتابوں سے اخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن حقائق ج تصورات کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ سب ہی لوگ ان سے واقف ہ لہذا اس تمام سعی و جہد کا منشا یہ ہے کہ آپ ہمارے تجربات سے استفادہ کریں اور یہ کہ بایولوجی محض بطور مضمون امتحان پا کے خیال سے نہیں بلکہ تصور حیات کے نقطۂ نظر سے اس کی افاد ہماری کیسی نظر ہے، اس کا مشاہدہ کریں۔

زندگی کی کہانی، اس کی صورت و سیرت کو آپ کس قد بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہیں؟ روز مرہ کی زندگی میں اس علم بہترین استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یا یہ کہ اسے کس طرح ا کرنا چاہیے۔ بایولوجی علم الحیات کو کہتے ہیں اور یہ کہ انسان ہ کے باوصف ہمیں یہ معلوم کرنے کی شدید خواہش ہونی چاہیے کہ

اپنے جسم میں کیا کچھ ہنگامہ بپا ہے، نیز دیگر جانداروں میں زندگی کی رو کس نظام کے تحت حرکت پذیر ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس سوال کا جواب اوّل روز ہی معلوم کیا جانا چاہیئے۔ ادویہ، زراعت، ماہی گیری، اقتصادیات، صنعت وغیرہ میں بایولوجی کی اہمیت تو واضح ہے ہی، لیکن بنی نوع انسان کو اپنی ہی بقا کے لیے اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ ہر نئی نسل کے تیار ہونے تک ہمارے سائنسی علم کا خزانہ پانچ گنا بڑھ جاتا ہے۔ علم و حکمت کی اس نمایاں غیر معمولی ترقی رفتار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنس کا طریقۂ تعلیم اور بھی ناکافی اور مزید رسمی و رواجی ہو کر رہ جاتا ہے۔

فزکس اور کیمسٹری کا جو طریقۂ تعلیم تیسری اور چوتھی دہائی میں رائج تھا، وہی ساتویں اور ابتدائی آٹھویں دہائی میں بایولوجی پر بھی صادق آتا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ سرگرم علمی تحقیق بایولوجی کے مختلف میدانوں میں کی جا رہی ہے۔ جدید علم گزشتہ بتیس سالوں میں کئی گنا (۴ گنا) بڑھ گیا ہے اور اس صدی کے آخر تک (۲۰۰۰) سو گنا بڑھ جائے گا۔ جدید علم کے نام پر ہمیں قدیم و روایتی علم کے سرمایے کو کلیتاً فراموش و قربان نہیں کر دینا ہے بلکہ اس قدیم و جدید علم کے حسین امتزاج کو نئی نسل کو منتقل کر دینا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ اس ضمن میں پرانی نسل کے افراد کو نہایت اعلیٰ درجے کے حسن انتخاب کا ثبوت دینا ہوگا۔ اکثر ماہرین حیاتیات جن کی تربیت قدامت پسند طرز کے زمانے میں ہوئی وہ کسی قسم کی تبدیلی و تغیر نہیں چاہتے اور بایولوجی میں جدید تصورات کو جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ابھی تک قدیم و روایتی طریقۂ کار سے چپٹے ہوئے ہیں۔ سائنس کے تئیں یہ ترقی پسند رجحان نہیں ہے۔ اس تناظر میں میانہ روی کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ ایک طرف تو ہمیں اپنے طلبا کو بایولوجی کے بنیادی حقائق سے روشناس کرانا ہوگا دوسری طرف ہمیں اس وسیع علم کا احاطہ کرنا ہے جو گزشتہ چند دہائیوں کے دوران بصورت سیلاب امنڈ پڑا ہے۔ بالفاظ دیگر بایولوجی نہ صرف یہ کہ اعلیٰ سطح پر پڑھائی جانی چاہیے بلکہ ادنیٰ سطح پر بھی جاری ہو۔ ہماری زندگی کے ہمہ جہت قدرتی عمل کے تعلق سے فہم و ادراک کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ اس سیاق و سباق میں ایک حسین امتزاج پیدا کیے جانے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک بایولوجی یا اس مقصد کے تحت کسی بھی مضمون کو پڑھا[نے] کا تعلق ہے، استاد کے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہ طلبا کے سامنے اپنے مضمون کے مواد کو کس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ ہم م[یں] سے کچھ اوسط درجے کے، کچھ اچھے اور کچھ باکمال استاد ہیں۔ ایک با[کمال] استاد ہونے کا راز کیا ہے؟ یہ راز ایک حقیقت میں مضمر ہے۔ صرف یہ کہ وہ روزانہ ہی زندگی بھر کچھ زیادہ ہی سیکھنے کی سعی [کرتا] ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ وہ [کسی] چیز کو اپنے طلبا کے سامنے کس دل فریب اور ڈرامائی انداز میں [پیش] کرتا ہے۔ اس کی پیش کش ایک فطری جوش اور درس و تدریس [کے] جذبے سے سرشار ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے طلبا کو علم حاصل [کرنے] کی سچی لگن، ولولہ، تڑپ اور گہرے شوق و انہماک کے تجربے سے [ہمکنار] کر دے۔ ایک اچھے معلم کا بنیادی مقصد محض اپنے مضمون کو پسندیدہ ہی نہیں بلکہ اسے مکمل طور پر دلکش اور دلنشیں بنانا بھی ہے۔

ایک سائنس کے ٹیچر کو فی الواقع سائنس کا خبر رساں -mmu nicator of Science ہونا چاہیے۔ آپ کو اپنے مضمون [سے] عشق ہونا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ جب میں آ[پ سے] یہ کہتا ہوں کہ مجھے بایولوجی سے واقعتاً عشق ہے اور ہمہ وقت با[یولوجی] ہی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ ایک عالم حیاتیات کے نقطۂ نظر سے تمام قسم کی چیزوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مجھ پر یقین [ہے] کہ حیوانات میں پائے جانے والے حیاتیاتی مرادفات سے عام ا[نسانی] طرزِ عمل کے متعلق میرے بیشتر سوالوں کا مثبت جواب ملتا ہے۔

بایولوجی کے ٹیچر کے لیے جو ضروری امر ہے وہ یہ کہ وہ [طلبا] کو مندرجہ ذیل سوال کی تاکید کریں۔ بایولوجی میری زندگی سے سروکار کیوں نہیں رکھتی ہے یا یہ کہ ہم آخر بایولوجی کیوں پڑھ[یں؟] ان سوالوں کے جواب میں جب آپ بایولوجی پڑھانا شروع کریں [گے تو] آپ کو کماحقہٗ دلچسپ معلوم ہوگی۔ اس طریقے سے آپ طلبا کی توجہ [مبذول] رکھتے ہیں، پوری کلاس کو ایک فکری ذہن عطا کر دیتے ہیں ا[ور وہ] تعلیم کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ میں نے

اس کے تعلق سے چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ اگر آپ کو بایولوجی کی تعریف کرنی ہو یا اس سوال کا جواب دینا ہو کہ بایولوجی کیا ہے تو اس کے متعدد جواب ہو سکتے ہیں۔ جواباً آپ اس حد تک کہہ سکتے ہیں کہ بایولوجی حیوانی ڈھانچہ اور زندہ اجسام میں جاری و ساری زندگی کے گوناگوں قدرتی عمل کا مطالعہ ہے۔ میں نے اس تعریف کو محض اصولاً نہیں بلکہ ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی مہارت حاصل کی ہے۔ جس سے کہ نہ صرف یہ کہ آپ بایولوجی کی تعریف کو بھول نہیں سکیں گے بلکہ اس کو سمجھیں گے بھی۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں اردو کے مشہور شاعر چکبست کی زبان سے بایولوجی کی تعریف الہامی الفاظ کی صورت میں ادا ہوئی اور انتہائی جدید تحقیقات کی روشنی میں آج یہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے اُنھیں اجزا کا پریشاں ہونا

اس شعر کو پیش کرنے کے بعد میں ایک انڈے کی مثال دیتا ہوں۔ اگر آپ انڈے کو سینے دیے جانے کا موقع دیتے ہیں اور اس کی تنظیم و ترتیب کو بگڑنے اور برہم ہونے نہیں دیتے تو اکیس دنوں بعد آپ دیکھتے ہیں کہ انڈے سے باہر آنے والی زندگی نے ایک چوزے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہر کیف اگر اسی انڈے کو آپ ایک کڑاھی میں رکھ دیں اور حرارت پہنچا کر اس کی تنظیم و ترتیب کو پریشان کر دیں تو نتیجہ آملیٹ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ موت کی دلیل ہے زیست اور موت کے فلسفے کی ان دو مثالوں سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسری مثال جو میرے نقطۂ نظر کی تصدیق و تائید کرتی ہے، جراثیمی امراض سے اخذ کی جا سکتی ہے جن کی اس ملک میں بھرمار ہے اور ہم میں سے بیشتر کسی نہ کسی مرحلے پر ان امراض کی تکلیف سے دوچار ہوئے ہیں، پھر بھی ہم میں سے کوئی بھی ان امراض پر دھیان نہیں دیتا۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ امراض کوئی ڈرامائی علامت ظاہر نہیں کرتے۔ تاہم چند ایسے امراض ہیں جو ڈرامائی علامت ظاہر کرتے ہیں اور حتی کہ ایک معمولی شخص بھی اُن کو معلوم کر لیتا ہے مثال کے طور پر ملیریا، فیل پا، فائری سرپینٹ (Fiery Serpent)

درس و تدریس میں ڈرامہ کی اہمیت کو کافی طور پر واضح کرتے ہو[ئے] مقصد یہ کہ طالب علم کے سامنے حقایق، تصورات یا اصولوں کو مو[ثر] طریقے سے پیش کیا جانا چاہیے اور ایسی مثالوں سے مدد لی جا[ئے] جو روزمرہ کی زندگی سے لی گئی ہوں تاکہ وہ مختلف النوع حیا[تیاتی] عمل کی اہمیت کو سمجھے اور اس کی بجا طور پر تعریف کر سکے۔ [مثال] کے طور پر اگر آپ حیوانات میں تنفس کے موضوع پر درس د[ے] رہے ہوں تو آپ کو شعاعی ترکیب کے عمل [Pho]to Synthesis اور اس کے معکوس عمل کا حوالہ ضرور ہی دینا چاہیے۔ تاکہ طال[ب علم] کے ذہن میں ہر دو عمل کے مابین جو تعلق ہے اس کی تصویر پو[ری] طرح واضح ہو سکے۔ درس و تدریس کے جدید طریقوں کا اس[تعمال] کر کے، سماعتی و بصری آلات (Au]dio-Visual Aids) جیسے کہ اوور ہیڈ پروجیکٹر، سلائیڈ پروجیکٹر اور ویڈیو ٹیپ (جو کہ جانوروں میں جاری و ساری، زندگی کے عمل کا وا[ضح] ادراک و فہم پیش کرتے ہیں) کی مدد سے یہ تمام مقاصد حا[صل کیے] جا سکتے ہیں۔

آخر میں مَیں صرف ایک بات اور کہنا چاہوں گا وہ یہ کہ جب تک کہ آپ کو تعلیم و تعلم سے اُنسیت نہ ہوگی، ا[س] تک آپ ایک اچھے ٹیچر ثابت نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا پہلے اپنے مضم[ون سے] عشق اور لگاؤ پیدا کیجیے اور پھر کلاس میں جائیے۔ آپ [ایک] باکمال استاد ثابت ہوں گے۔

ارسطو نے کہا:

"شی کو شی سے دفع کرنا بہادری ہے اور شی کو خیر سے دفع کرنا فضیلت ہے۔"

ابن الہیثم اور علم مناظر و مرایا

الطاف احمد اعظمی (عینک)

قرون وسطیٰ میں جن مسلم ارباب علم و کمال نے سائنسی علوم و فنون بالخصوص ریاضی اور طبعیات کے شعبوں میں تحقیق و اجتہاد کے اعلیٰ نمونے پیش کیے اور جدید سائنسی ترقی کی مضبوط بنیاد فراہم کی ان میں ابن الہیثم کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔ اس عظیم مسلم سائنس داں کا پورا نام ابو علی الحسن بن الحسن بن الہیثم ہے۔ لاطینی میں ALHAZEN کے نام سے معروف ہے۔ یہ بصرہ میں ۳۵۴ھ/ (۹۶۵ء) میں پیدا ہوا اور ۴۳۰ھ (م ۱۰۳۹ء) میں قاہرہ میں فوت ہوا۔

ابن الہیثم نے جن علوم و فنون سے متعلق کتابیں لکھیں ان میں منطق، اخلاقیات، سیاسیات، شاعری، موسیقی اور علم کلام کے علاوہ بصریات، علم ہیئت، ریاضی اور طب شامل ہیں۔ زیادہ تر کتابیں ریاضی، طبعیات اور الٰہیات سے متعلق ہیں۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ کے بیان کے مطابق ابن الہیثم نے ۲۵ کتابیں علم ریاضی میں اور ۴۴ کتابیں طبعیات، الٰہیات اور طب سے متعلق لکھیں۔ ابن الہیثم کی ذہنی کاوشوں اور فکری ترکتازیوں کا اصل میدان یہی علوم تھے۔ بلاشبہ ان علوم میں اسے مرتبۂ اختصاص حاصل تھا۔ عصر جدید کا مشہور مورخ جارج سارٹن لکھتا ہے:

> وہ ایک عظیم ماہر طبعیات اور علم مناظر کا ایک عہد ساز عالم تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک فاضل ہیئت داں، ریاضی داں اور طبیب بھی تھا۔ اس کی کتاب "کتاب المناظر" کے لاطینی ترجمے نے مغرب کو کافی متاثر کیا ہے۔

بالخصوص راجر بیکن اور کیپلر جیسے مغربی سائنس دانوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ فی الواقع اس کتاب نے استقرائی طریقوں (experimental methods) کو کافی ترقی دی"۔

ہمارے اس مقالے کا تعلق صرف طبعیات (Physics) کی ایک شاخ علم مناظر و مرایا (Optics) کے میدان میں ابن الہیثم کی علمی تحقیقات اور فکری اجتہادات کے جائزے سے ہے جس سے دوسرے علوم میں اس کی فکری گیرائی و گہرائی، اصابت رائے اور نکتہ رسی خود بخود واضح ہو جائے گی۔ علم مناظر و مرایا سے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے دو جزو ہیں۔ ایک نظریۂ نور اور دوسرا نظریۂ ابصار (theory of vision)۔

(الف) نظریۂ نور

نور کی تعریف:۔ اصحاب تعالیم (mathematicians) مثلاً اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ نے روشنی کی تعریف یہ کی ہے کہ حرارت ناری ہے جو اجسام مضیئہ بذاتہٖ (self luminous bodies) سے خارج ہوتی ہے۔ جیسے سورج اور آگ سے نکلتی ہے اور جب یہ کسی مقعر آئینہ (concave mirror) سے منعکس ہو کر نقطۂ واحد پر متمرکز ہوتی ہے اور اس کے پاس کوئی موجود ہوتی ہے جو احتراق (burning) کو قبول کر سکتی ہے تو اس کو جلا دیتی ہے۔

فلاسفۂ طبعیین (Natural Philosophers)

اور اس کے متبعین کا نظریہ تھا کہ وہ قوت ناریہ ہے جو جنس ضو یعنی اس حرارت ناریہ کی جنس سے ہے جو اجسام مضیۂ بذاتہ سے خارج ہوتی ہے لیکن وقت میں وہ وجود ذاتی کی حامل شے نہیں ہوتی اور ذہن و نفس سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ تعریف فلسفہ ارسطو سے ماخوذ ہے۔ ابن الہیثم نے ان دونوں مسلکوں میں سے اوّل الذکر یعنی اصحاب تعالیم کے تجرباتی طریقوں کو لیا لیکن ان کے اصولوں کو بدل دیا اور اس میں اس نے فلاسفہ طبعیین کی پیروی کی اور اس طرح ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے اس نے ایک علیحدہ راستہ اختیار کیا۔ ابن الہیثم نے روشنی کو ایک عامل یا موثر خارجی قرار دیا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے وجود عینی (Real Existence) رکھتی ہے۔

خصوصیات نور :

ابن الہیثم نے بتایا کہ روشنی بعض اجسام میں نفوذ کرتی ہے اور بعض میں نفوذ نہیں کرتی۔ اوّل الذکر اجسام مشفہ (Transparent Bodies) ہے اور موخر الذکر اجسام کثیفہ (Opaque Bodies) کہلاتے ہیں۔ اجسام مشفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روشنی کو واپس کر دیتے ہیں اور اجسام کثیفہ روشنی کو قبول کرتے ہیں جن شفاف واسطوں (Mediums) سے روشنی نفوذ کرتی ہے۔ ان میں پانی، ہوا اور بلور داخل ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن الہیثم کا ایک بڑا کارنامہ یہ نظریہ ہے کہ روشنی اجسام منوّر کے ہر نقطہ (Point) سے اور ہر سمت میں خارج ہوتی ہے خط مستقیم (Straight Line) میں نفوذ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مختلف تجربات کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

> "جب سورج کی روشنی کسی تاریک کمرے میں کسی سوراخ سے داخل ہوتی ہے اور کمرے کی ہوا غبار یا دھواں کی وجہ سے مکدر ہو تو روشنی اس سوراخ کی سیدھ میں اور پھیلی ہوئی (ممتد) ظاہر ہوتی ہے اور اس سے گزر کر اپنے منتہی یعنی کمرے کی زمین یا دیوار تک پہنچتی ہے اور جب کمرے کی ہوا بالکل صاف ہوتی ہے تو امتداد ضوء بظاہر محسوس نہیں ہوتا اب تجربہ کرنے والا ایک کثیف جسم لے اور اس سے سوراخ اور موقع ضو کے درمیان سمت مستقیم کو قطع کرے تو وہ دیکھے گا

کہ روشنی جسم کثیف پر تو ظاہر ہوتی ہے لیکن کمرے یا دیوار کے اس مقام سے معدوم ہو جاتی ہے جہاں وہ پہلے ظاہر تھی۔

اس سلسلے میں ابن الہیثم نے صبح کی روشنی کو بھی بطو[ر] ... کے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اس لیے ہلکی ہوتی ہے کہ سور[ج] ... پورے جرم سے شعاعیں خارج ہو کر افق تک نہیں پہنچتیں۔ کیوں کہ ... افق کے نیچے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شعاعیں خط مستقیم میں چلتی ... لیے بھی روشنی مدھم ہوتی ہے۔

اقسام نور :

ابن الہیثم نے روشنی کی دو قسمیں قرار دی ... میں سے ایک کا نام اضواء ذاتیہ (...ENTIAL LIGHT) اور دوسرے کا نام اضواء عرضیہ (...IDENTAL LIGHT) ... ہے جو روشنی اجسام مضیۂ بذاتہ (...uminous Bodies) مثلاً سورج اور آگ سے نکلتی ہے وہ اضواء ذاتیہ ہے۔ کبھی ... اضواء اولیٰ (Primary Light) بھی کہتا ہے۔ یہ اضو[اء] ... کثیف اجسام کی سطوح پر واقع ہوتی ہیں تو اس کو روشن کر دیتی ... قسم کے مستفی اجسام کثیفہ سے جو اضواء خارج ہوتی ہیں، ان کو ... ثانی (Secondary Light) کہتا ہے اور جب یہ اضوا[ء] ... کثیفہ کی سطوح پر واقع ہوتی ہیں تو ان کو منوّر کر دیتی ہیں اور ا[ن] ... جو اضواء خارج ہوتی ہیں، ان کا نام اس نے اضواء ثالث رکھ[ا] ... اضواء ثانی اور اضواء ثالث ہی کا نام اضواء عرضیہ (...dental ...ght) ہے۔ اضواء ثانی یا ثالث ان اجسام سے خارج ... جو بذات خود منور نہیں ہوتے لیکن ان سے اجسام مضیۂ بذاتہ ... مستفیہ (وہ اجسام جو خود سے روشن نہیں ہوتے بلکہ خارج[ی] ... سے روشنی قبول کرتے ہیں) کے قرب کے سبب سے روشنی خا[رج ہوتی] ہے۔

ابن الہیثم نے ان ذاتی و عرضی اضواء کی بنیاد پر ضوء صب[ح] ... ضوء شفق کی کیفیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ صبح کی روشنی اس وقت سے شروع ...

ہوتی ہے جب رات کا ایک حصہ باقی رہ جاتا ہے دید روشنی عمود کی شکل میں افق مشرق سے پھیلتی ہے اور وسط آسمان تک جاتی ہے لیکن یہ نہایت کمزور ہوتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی قوی ہوتی ہے اور اس کی مقدار طول و عرض میں برابر بڑھتی اور نور کو قوی کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس ضوء منکشف کے مقابل زمین کا جو رُخ ہوتا ہے وہ ایک حد تک روشن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ فضا میں موجود روشنی کے مقابلے میں یہ روشنی کمزور ہوتی ہے۔ اس کے بعد فضا کی روشنی بدستور قوی ہوتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ افق مشرق اس سے پُر ہو جاتا ہے اور وسط آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور فضا روشنی سے ممتلی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اس وقت وہ روشنی بھی قوی ہو جاتی ہے جو زمین کے رُخ پر موجود ہوتی ہے اور دن پورے طور پر ظاہر ہو جاتا ہے لیکن اس حالت میں بھی سورج افق کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے اور دن اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ دن کے آخری حصے میں جب سورج غروب ہوتا ہے اور افق کے نیچے چلا جاتا ہے تو اس وقت بھی فضا اور زمین پر روشنی کی یہی کیفیت ملتی ہے"

قوانین نور :

قانون انعکاس :- روشنی جب کسی مسطح جسم (Smooth Body) مثلاً مسطح آئینہ پر پڑتی ہے تو وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے اسے ایک متعین سمت میں واپس بھیج دیتا ہے۔ اس کو روشنی کا انعکاس (Reflection of light) کہتے ہیں یہ انعکاس متعین ضابطے کے مطابق انجام پاتا ہے۔ مثلاً واقع کرن، واقع نقطہ (Point of Incidence) اور منعکس کرن (Reflected Ray) تینوں ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ واقع زاویہ (Angle of Incidence) انعکاس زاویہ (Angle of Reflection) کے مساوی ہوتا ہے۔ (شکل — ۱) یہی حقایق قانون انعکاس کہلاتے ہیں۔

(شکل —— ۱)

ابن الہیثم نے انعکاس کا جو تصور پیش کیا ہے وہ میکانکی ہے اور یہ امر باعث حیرت ہے کیوں کہ میکانکی تشریح کو نیوٹن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن الہیثم نے بتایا کہ جب کوئی جسم متحرک اپنی حرکت کے دوران میں کسی جسم ساکن سے ملاقی ہوتا ہے تو وہ اس کی حرکت کے استمرار کو روک دیتا ہے اور جسم متحرک پر جسم ساکن کی ہیئت کذائی کے اختلاف سے مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ یہ گویا انعکاس کی میکانکی تشریح ہے۔

ابن الہیثم نے حرکت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک حرکت طبعی اور دوسری حرکت عرضی۔ حرکت عرضی وہ حرکت ہے جو کسی جسم پر کسی کے فعل کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ حرکت طبعی کی مثال اس نے یہ دی ہے کہ اگر تجربہ کرنے والا (معتبر) لوہے یا تانبے کے ایک چھوٹے اور چکنے گولے کو جس کا وزن ایک مثقال سے زیادہ نہ ہو، کسی بلند مقام سے جو بیس گز سے زیادہ نہ ہو، لوہے کی مستوی اور افقی پلیٹ (مرآۃ) پر گرائے اور پلیٹ سے گولے کے ملاقی ہونے اور اس کے بعد کے واقعات پر تامل کرے تو اس تجربے سے ظاہر ہوگا کہ گولا پلیٹ سے ملاقی ہونے کے بعد بلندی کی طرف لوٹتا ہے، پھر نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔ اسی طرح اگر گولے کو دور کی مسافت سے گرایا جائے تو پلیٹ سے اس کی رجعت (انعکاس) زیادہ قوی ہوگی اور قریب کی مسافت سے گرانے پر رجعت کم ہوگی"۔

ابن الہیثم نے ایک دوسرے تجربے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی تلخیص یوں ہے:

"مذکورہ پلیٹ کو ایک ایسی دیوار میں پیوست کر دیا جائے
جو زمین کی سطح پر قایم ہو۔ اس طرح کہ اس کی سطح بلند
ہو۔ گولے کو تیر کمان میں رکھ کر پوری قوت سے پھینکا
جائے، اس طرح کہ پہلی حرکت پلیٹ کی سطح پر قایم عمود
(Perpendicular) کی سیدھ میں ہو اور
دوسری حرکت ایک ایسے خط کی سیدھ میں ہو جو پلیٹ
کی سطح پر مائل اور افق کے مقابل و موازی ہو۔ تجربہ کرنے
والا ان دونوں حالتوں پر غور کرے۔"

پہلی حالت کے متعلق ابن الہیثم لکھتا ہے کہ

"مشاہدہ کرنے والا دیکھے گا کہ گولا پلیٹ کی سطح سے
عمودی حالت میں لوٹتا ہے اور یہ بھی دیکھے گا کہ رجوع
کے وقت گولا افق کے مقابل ہوتا ہے اور پھر گر جاتا ہے"

حالتِ ثانی کے مشاہدہ کے متعلق لکھتا ہے:

"تامل کرنے والا دیکھے گا کہ گولا جس جہت سے پھینکا
گیا تھا اس کے مقابل کی جہت میں وہ لوٹتا ہے اور
یہ بھی دیکھے گا کہ وہ پہلی رجعت میں افق کے مقابل و
موازی خط میں متحرک ہوتا ہے اور پلیٹ کی سطح کی
طرف جھکا ہوتا ہے اور پھر گولا نیچے کی طرف گر جاتا ہے
جس وقت گولا پھینکنے والے کی حرکت قوی ہوتی ہے
تو گولے کا رجوع بھی قوی ہوتا ہے۔"

آگے مزید لکھتا ہے:

"اگر کوئی بھاری جسم بلندی سے گرایا جائے اور گرنے
کی جگہ سخت ہو مثلاً چٹان، لوہا یا اسی قسم کی چیزیں تو
وہ جسم نہ صرف راجع ہوتا ہے بلکہ قوی حرکت کے
ساتھ راجع ہوتا ہے۔ اگر گرنے کی جگہ نرم ہے جیسے
ریت یا اس کے مشابہ اشیاء تو اس میں رجوع کا
عمل نہیں ہوتا یعنی وہ چیز لوٹتی نہیں ہے اور اگر گرنے
والے جسم میں نرمی و سختی دونوں موجود ہیں۔ مثلاً چونا
یا لکڑی وغیرہ تو اس حالت میں رجوع کم در ہوتا ہے

اسی طرح اگر پھینکنے والے نے ایک پتھر کسی سمت میں پھینکا
اور یہ کسی سخت جسم سے اپنی حرکت کے ختم ہونے سے
پہلے ٹکرایا تو وہ راجع ہوگا، اگر حرکت قوی ہوگی تو
وہ اتنی ہی قوت سے راجع ہوگا اور اگر کسی نرم جسم
مثلاً اون، روئی، مٹی یا کسی اور سریع الانفعال جسم
سے ٹکرایا تو یا تو اس سے چمٹ جائے گا یا نیچے گر جائے
گا اور اپنی جہت حرکت کی طرف راجع نہ ہوگا اور اگر
کسی ایسے جسم سے ملاقی ہوا جس میں صلابت و لینت دونوں
ہیں تو صلابت کے اعتبار سے رجوع ضعیف ہوگا اور
پھر نیچے گر جائے گا۔"

ان مثالوں کو پیش کر کے ابن الہیثم نے بتایا کہ

"روشنی کا انعکاس بعینہٖ عمل میں آتا ہے۔ جس طرح
نیوٹن کے نظریۂ نور پر اعتراض وارد ہوا۔ اسی طرح ابن
الہیثم بھی اعتراض سے محفوظ نہ رہا۔ کیونکہ دونوں ہی
سائنس دانوں کا نظریہ میکانیکی تھا۔ ابن الہیثم پر جس
شخص نے اعتراض کیا وہ کمال الدین فارسی (متوفی
۱۳۱۱ء) تھا۔ یہ ایک نہایت تعجب خیز بات ہے کہ
کمال الدین فارسی نے حرکت اضواء کا جو نظریہ پیش
کیا وہ عہد حاضر کے نظریہ کے عین مطابق ہے۔ اس
نے بتایا کہ روشنی کی حرکت، حرکت اجسام کے بجائے
حرکت اصوات کے مطابق ہے۔ اسی کے الفاظ میں

"انما ھی علی نحو حرکۃ الاصوات لا علی نحو
حرکۃ الاجسام۔"

قانون انعطاف

جب روشنی ایک لطیف جسم (...parent Body
سے دوسرے لطیف جسم میں جس کی کثافت پہلے سے زیادہ ہو
نفوذ کرتی ہے (مثلاً ہوا اور پانی) تو دونوں جسموں کے در
سطح پر مڑ جاتی ہے۔ اس واقعے کو روشنی کا انعطاف (Re-
...tion of light) کہتے ہیں۔ اس کے بھی کچھ متعین منا

مثلاً جب روشنی کی شعاع ہوا سے پانی میں خط عمودی میں داخل ہوتی ہے تو یہ مڑتی نہیں بلکہ عمود کی سیدھ میں نفوذ کر جاتی ہے، لیکن جب یہ کسی اور زاویے سے پانی میں داخل ہوتی ہے تو یہ خط عمودی کی سمت میں مڑ جاتی ہے۔ ان حقائق کو قانون انعطاف کہتے ہیں۔

O	واقع نقطہ
AO	واقع کرن
OB	منعطف کرن
< AOC	واقع زاویہ
< DOB	انعطاف زاویہ

(شکل ـــــ ۲)
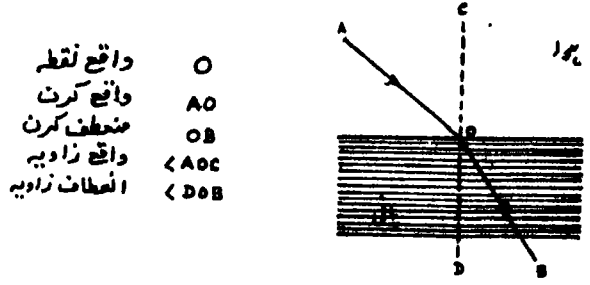
ابن الہیثم نے انعطاف نور سے متعلق جو کچھ لکھا ہے ہم اس کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

"کوئی متحرک جب وہ کسی جہت میں حرکت کرتا ہے تو اس کی حرکت یا تو ذاتی ہوتی ہے یا عرضی۔ اگر وہ کسی ایسے مانع سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی حرکت میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے تو لازمی ہے کہ وہ اس کی حرکت میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اگر ممانعت قوی ہوتی ہے تو اس کی حرکت کو اس جہت میں پھیر دیتی ہے جو اس کی جہت حرکت کے مضاد ہوتی ہے، اور اگر ممانعت ضعیف ہے تو اس کی حرکت کو نہ تو جہت مخالف میں پھیرنے پر قادر ہوتی ہے اور نہ ہی اس جہت میں نفوذ کرا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جس میں وہ متحرک ہوتی ہے۔ البتہ اس کی حرکت متغیر ضرور ہو جاتی ہے۔ طبعی متحرکات جو راست حرکت ہیں اگر وہ کسی جسم منفعل میں اس کے عمود پر نفوذ کرتے ہیں تو یہ نفوذ سہل ترین ہوتا ہے۔ ہم اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک تیلی تختی (لوح رقیق) لے اور اسے ایک وسیع سوراخ میں لگا دے اور اس کے کناروں کو میخوں سے مضبوطی کے ساتھ جکڑ دے۔ اس کے بعد لوہے کے ایک گولے کو لے اور تختی کے مقابل کھڑا ہو اور گولے کو پوری قوت کے ساتھ تختی پر اس طرح پھینکے کہ گولے کی حرکت سطح لوح پر عمود قائم میں ہو تو وہ دیکھے گا کہ گولا تختی کو پھاڑ کر نفوذ کر گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ گولے کو تختی کے مقابل کھڑا ہو کر پھینکنے کے بجائے تھوڑا ترچھے طور پر کھڑا ہو کر پہلی بار کی طرح پوری قوت کے ساتھ پھینکے تو وہ تختی پر سے پھسل جائے گا اور اس سے تختی میں کوئی شگاف پیدا نہ ہو سکے گا۔ بشرطیکہ وہ غایت درجہ پتلی نہ ہو اور اس کی حرکت بھی اس جہت میں نہ ہو سکے گی جس میں وہ متحرک ہے، بلکہ وہ دوسری جہت میں مڑ جائے گی۔"

ابن الہیثم نے ان تجرباتی مثالوں کی بنیاد پر انعطاف کے مسائل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس تجربے سے واضح ہو گیا کہ عمود پر حرکت سہل ترین اور قوی ہوتی ہے اور عمود کے قریب جو حرکات مائل ہوتی ہیں، ان کی حرکت عمود سے دور کی حرکات کے مقابلے میں سہل ہوتی ہے۔"

"پس جب روشنی کسی جسم لطیف سے ملاقی ہوتی ہے جو اس جسم سے جس میں وہ موجود ہوتی ہے، زیادہ کثیف ہوتا ہے تو وہ اس روشنی کو اس جہت میں نفوذ کرنے سے روکتا ہے جس میں وہ متحرک ہوتی ہے۔ اگر یہ ممانعت (Resistance) زیادہ قوی نہیں ہوتی ہے تو اس کو اس جہت میں لوٹانے سے قاصر رہتا ہے جہاں سے اس نے حرکت کی تھی، اور اگر روشنی کی حرکت خط عمود کا پر ہے تو یہ عمود پر اپنی قوت حرکت کی وجہ سے راست نفوذ کر جاتی ہے اور اگر اس کی حرکت خط مائل پر ہے یعنی ترچھے طور پر ہے تو وہ اپنی ضعف حرکت کی وجہ سے راست نفوذ پر قادر نہیں ہوتی اس

لیے وہ اس جہت میں مڑ جاتی ہے جس میں نفوذ کرنا اس
کے لیے اس جہت سے آسان ہوتا ہے جس میں وہ متحرک
ہوتی ہے"۔

" انعطاف اضواء مائلہ کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ جب
روشنی ترچھے طور پر ایک جسم لطیف سے گزر کر دوسرے
جسم لطیف کی سطح سے ملاقی ہوتی ہے جو پہلے کے مقابلے
میں زیادہ کثیف ہوتا ہے تو وہ جسم لطیف کی اس سطح
پر جو جسم کثیف سے ملحق ہوتا ہے، عمود کی جہت میں
مڑ جاتی ہے"۔

" جب روشنی جسم کثیف سے جسم لطیف میں پہنچتی ہے تو
جہت عمود کے خلاف مڑ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی
ہے کہ جب روشنی جسم لطیف میں حرکت کرتی ہے تو وہ
اس کی راہ میں کم رکاوٹ ڈالتا ہے جب کہ جسم کثیف
زیادہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مثلاً پتھر جب ہوا میں
حرکت کرتا ہے تو اس کی حرکت تیز اور آسان ہوتی ہے
اس حرکت کے مقابلے میں جب کہ وہ پانی میں حرکت کرتا
ہے کیوں کہ پانی ہوا سے کہیں زیادہ مدافعت کرتا ہے
جب روشنی جسم کثیف سے نکل کر جسم لطیف میں آتی ہے تو
اس کی حرکت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ جب روشنی جسم
لطیف کی سطح پر جو دو جسموں (لطیف و کثیف) کے درمیان
فصل مشترک ہوتی ہے، مائل ہوتی ہے تو اس کی حرکت
عمود خارج اور عمود قائم (جو مبدئی حرکت کے عمود پر بنتا
ہے) کے درمیان ہوتی ہے۔ اس حالت میں جسم کثیف
روشنی کی رفتار میں اس جہت سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے
جس میں عمود ثانی خارج ہوتا ہے۔ پس جب روشنی جسم کثیف
سے نکل کر جسم لطیف میں جاتی ہے تو جسم لطیف اس میں
اس جہت سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے جس میں عمود ثانی
خارج ہوتا ہے اور یہ مدافعت جسم کثیف کی مدافعت کے
مقابلے میں بہت قلیل ہوتی ہے۔ اس لیے روشنی کی حرکت
اس جہت میں ہو جاتی ہے جدھر سے مدافعت زیادہ ہوتی
ہے اور اس طرح روشنی جسم لطیف میں جہت عمود کے
خلاف مڑتی ہے"۔

ابن الہیثم نے انعکاس و انعطاف سے متعلق قدماء کی غلط
کی اصلاح بھی کی ہے۔ مثلاً یہ ایک غلط خیال جو دراصل اقلید
(۳۰۰ ق م) کی "کتاب المناظر" سے ماخوذ تھا، عام تھا کہ واقع
(Angle of Incidence) اور زاویۂ منعطف (Angle
of Refraction) مساوی ہوتے ہیں۔ ابن الہیثم نے قدم
کی متذکرہ غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے بتایا کہ واقع زاویہ اور
منعطف زاویہ یکساں نہیں ہوتے۔

قوانین انعکاس و انعطاف کی روشنی میں بعض مظا
واقعات کی تشریح:

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیدھی لکڑی جب پانی میں ڈو
ہوتی ہے تو وہ دیکھنے میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح پا
بھرے ہوئے پیالے میں پڑا ہوا سکہ کچھ اوپر اٹھا ہوا معلوم
ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چاند اور سورج جب افق
قریب ہوتے ہیں تو وہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علا
تاروں کا جھلملانا، قوس و قزح کی خوش رنگی اور صبح و شام
اوقات میں شفق کے خوشنما مناظر وغیرہ وہ واقعات ہیں جن سے
ہمارا سابقہ پیش آتا رہتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں ابن الہیثم وہ واحد سائنس
تھا جس نے سب سے پہلے مذکورہ بالا واقعات و مناظر کی صحیح سائنس
پیش کی اور ان کی اصل حقیقت سے دنیا کو بالکل صحیح طور پر آگا
اس نے بتایا کہ روشنی کی شعاعیں اپنے سفر میں جو راستہ اختیار
ہیں اور ان میں انعکاس یا انعطاف کا جو عمل واقع ہوتا ہے، اس
عینی مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری قوت باصرہ ہر حال
معتبر رہنما نہیں بن سکتی ہے۔ ابن الہیثم اس حقیقت سے بخوبی آ
کہ جیسے جیسے بلندی کی طرف جایا جائے فضا کی کثافت (ہوا
کم ہوتی جاتی ہے، اس بنیاد پر اس نے کہا کہ روشنی کی شعاع

فضا میں ترچھے طور پر (Obliquely) داخل ہوتی ہے تو
وہ خمیدہ راستہ (Curvilinear Path) اختیار کرتی ہے جو
زمین کی جہت میں قوسی (CONCAVE) ہوتا ہے۔ دماغ کسی
چیز کے مقام کو اس سمت میں محسوس کرتا ہے جس سمت میں روشنی کی شعاع
آنکھ میں داخل ہوتی ہے اور اسی لیے اجرام سماویہ کے اصل مقام کے
تعین میں ہماری آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ ہم انہیں سمت الراس
(Zenith) میں دیکھتے ہیں جب کہ ان کی اصل جگہ وہ نہیں ہوتی۔ اس
کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم ستاروں کو خط مماس (Tangent)
میں دیکھتے ہیں لیکن جب روشنی آنکھوں تک پہنچتی ہے تو وہ خمیدہ ہو کر
منعطف ہوتی ہے اس لیے ہم انہیں ان کے اصلی مقام پر دیکھنے سے
قاصر رہتے ہیں۔ ابن الہیثم نے بتایا کہ اسی وجہ سے ہم سورج اور
چاند کو ان کے طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد بھی دیکھتے ہیں اور
یہ عجیب وغریب فریب ہے۔ ابن الہیثم نے یہ بھی بتایا کہ ہوا سے گزرتی
ہوئی شعاع کا خم (CURVATURE) کثافت میں اضافہ ہونے
کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے۔ انعطاف میں اس تنوع (Variation)
کے واقع ہونے کی وجہ سے ثوابت (Fixed stars) جھلملاتے
نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ چاند اور سورج جب افق پر ہوتے
ہیں تو وہ ہم کو بڑے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ہمارا عینی مغالطہ ہے اور
اس کا سبب بھی عمل انعطاف ہے جو ارضی اشیاء (Terrestrial
object) کے درمیان میں حائل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے
ابن الہیثم نے مزید بتایا کہ عمل انعطاف ہی کے اثر سے سورج کی رویت
(Visibility) بڑھ جاتی ہے اور بایں طور رات کا اور تاریکی
کا وقفہ کم ہو جاتا ہے۔

ابن الہیثم نے بالکل صحیح طور پر ہوا کے انعکاسی عمل (Reflecting Action of the Air) کی بنیاد پر شفق کی نہایت خوبصورت
توجیہ پیش کی ہے۔ اس نے اس کے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا ہے
جس میں بتایا ہے کہ شفق اس وقت ختم ہوتی اور شروع ہوتی ہے جب
سورج افق سے ۱۹ ڈگری نیچے ہوتا ہے اور اس اصول پر اس نے
سب سے پہلے بالکل صحیح طور پر فضائی بلندی (Atmospheric height)

کا اندازہ لگایا اور بتایا کہ یہ ۵۸ ½ میل ہے۔

ابن الہیثم نے سب سے پہلے کیمرہ ابسکیورا (Camera
Obscura) کا استعمال کیا۔ اس نے گرہن کے د
میں ایک کھڑکی کے کواڑ میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنا کر اس کے مقا
کی دیوار پر سورج کے نیم قمری عکس کو دیکھا اور یہ گویا کیمرہ ابسـ
کا پہلا مشاہدہ تھا۔ اسی مشاہدہ کا نتیجہ فوٹو کیمرہ ہے جس سے
عکس کشی کی جاتی ہے۔

(ب) نظریۂ ابصار:

انسان اشیاء کو کیوں کر دیکھتا ہے؟ یہ بظاہر ا
سا سوال ہے اور اس کا جواب بھی سادہ طور پر دیا جا سکتا ہے
سے دیکھتا ہے، لیکن یہ سوال کہ آنکھیں کس طرح چیزوں کو دیکھ
ایک پیچیدہ سوال بن جاتا ہے۔ اس پیچیدہ سوال کا جواب مت
علماء وفضلا، یعنی یونانی، اسکندری اور ہندی ارباب علم د
جس طور پر دیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اس باب میں
کے جواب کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اس میدان میں ا
کوئی ہمسر نہیں اور اس کا علم وفضل سب پر فوقیت رکھتا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں قدماء کے خیالات نقل کر دیے
اس کے بعد ابن الہیثم کی گراں قدر تحقیق پیش کی جائے۔

... فیثاغورث (چھٹی صدی قبل مسیح) اور اس کے متبع
یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ اشیاء مرئی (مبصر) سے
کہ جب آنکھوں تک پہنچتے ہیں تو اس سے آدمی چیزوں کو د
یہ نظریہ نیوٹن کے نظریے کے بہت قریب ہے۔ فیثاغورث
زیادہ دن نہیں چل سکا اور امبیذقلیس (۴۲۵ ق م)
نظریے کی مخالفت کی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ ا
موجودات، عناصر (اجرام غیر متجزیہ) سے مل کر بنے ہیں
نزدیک عالم وجود میں دو قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ایک
کی قوت اور دوسری عداوت یا بغض کی۔ محبت کے عامل
سے عناصر ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں یعنی ہر مثیل
سے اور ہر نوع اپنی نوع سے اور عداوت کے عامل

اپنے غیر سے اور اشباہ اپنے اضداد سے دور بھاگتے تھے۔ اس کے نزدیک ادراک نام ہے موجوداتِ خارجی میں موجود عناصر کے اتصال کا ان عناصر سے جو انسان میں موجود ہیں اور ابصار (vision) یہ ہے کہ آنکھوں سے عناصر نکل کر ان عناصر سے مل جاتے ہیں جو اشیاء مرئی (Visible Things) سے نکلتے ہیں اور ان ہی کے اتصال سے دیکھنے کا عمل واقع ہوتا ہے۔

افلاطون (۴۲۸ — ۳۴۸ یا ۳۴۴ ق م) نے ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق آنکھ سے ایک شئے خارج ہوتی ہے جس کو اس نے "نار الٰہیہ" یا قوت نوریہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا تعلق جنس نور سے ہے جو اجسام مضیئہ بذاتہ سے خارج ہوتا ہے اور اس سے کثیف اجسام روشن ہو جاتے ہیں۔ جب یہ نار الٰہیہ دن کی روشنی میں خارج ہوتا ہے تو وہ اپنی نوع کے نور سے مل جاتا ہے اور جب مثل اپنے مثل سے اس کیفیت کے ساتھ متحد ہوتا ہے تو اس سے وہ شعاع بنتی ہے جس سے آنکھ شے مرئی کو دیکھتی ہے، لیکن تاریکی میں نور نہیں ہوتا اور آنکھ سے خارج ہونے والا نار الٰہیہ اپنے نوع کے نور سے مل نہیں پاتا جس کی وجہ سے وہ اتصال ہی واقع نہیں ہوتا جس سے کہ شعاع بن سکے اور بایں صورت نار الٰہیہ برباد ہو جاتا ہے اور چیزوں کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

افلاطون کے بعد اس مسئلہ پر ارسطو جیسے عالی دماغ اور روشن فکر مفکر نے غور کیا اور افلاطون کے خیال کی تردید کی، لیکن اس نے خود جو نظریہ پیش کیا وہ بھی حقیقت کی نقاب کشائی نہ کر سکا۔ اس نے کہا کہ روشنی ایک صفت یا کیفیت عارضہ ہے جو شفاف واسطے (جسم مشف) کے ذریعے جو آنکھ اور شے مرئی کے درمیان ہوتا ہے، ظاہر ہوتی ہے۔ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ روشنی بذات خود اپنا کوئی وجود رکھتی ہے یا یہ کہ وہ حرکت قبول کرتی ہے یا یہ کہ وہ ایک شے ہے جو شئے مرئی سے نکلتی ہے۔ وہ فی الواقع ایک صفت عارضہ ہے جو شفاف واسطے پر طاری ہوتی ہے اور جب یہ کیفیت اس سے زائل ہو جاتی ہے تو اسی کا نام تاریکی ہے۔ ابصار دراصل ایک انطباع ہے جو آنکھوں میں واقع ہوتا ہے نہ کہ شئے مرئی سے کوئی چیز نکل کر آنکھوں تک آتی ہے۔

ارسطو کے بعد کے فلاسفہ نے ارسطو اور افلاطون دونوں کے نظریات کو رد کیا اس سلسلے میں اپیقور (۳۴۱ — ۲۷۰ ق م) کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے ارسطو کے نظریے کو رد کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل شئے مرئی کی صورت آنکھ تک آتی ہے اور اس سے چیز دکھائی دیتی ہے فلسفہ اپیقوریہ کے عہد عروج ہی میں ایک دوسرا فلسفہ بھی مقبول تھا اور یہ رواقیہ کا فلسفہ تھا اور اس کا سرخیل زینون سٹومی (۳۳۶ — ۲۶۴ ق م) تھا۔ اس کے خیال کے مطابق صرف مادہ ہی وجود رکھتا ہے کیونکہ وہ محسوس ہوتا ہے۔ ایک جسم دوسرے جسم میں اسی وقت موثر ہوتا یا فعل کرتا ہے جب وہ ایک دوسرے کو مس کرتے ہیں' ادراک معاملہ بھی یہی ہے جو اس کے توسط سے ظاہر ہوتا ہے۔ فعل ابصار بھی اسی وقت ممکن ہے جب عضو حساس (sensory organ) کے درمیان مادی یا فعلی اتصال ہو اور یہ آنکھ اور شئے مرئی درمیان ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ آنکھ سے ایک مخروطی شکل کی شعاع نکلتی ہے جس کا راس آنکھ کے پاس اور اس کا قاعدہ (base) شئے مرئی کی سطح پر ہوتا ہے۔ جب آنکھ سے یہ شعاع نکلتی ہے اور شئے مرئی پر پڑتی ہے تو فعل ابصار واقع ہوتا ہے گویا آنکھ جو عضو حساس ہے، پھیل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شئے مرئی کو مس کرتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ابن الہیثم کے عہد تک بلکہ اس کے بعد بھی کافی دنوں تک جملہ ارباب علم و تحقیق ابصار کی حقیقت سے قطعی بے خبر تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ آنکھوں سے شعاع نکل کر شئے مرئی تک جاتی ہے اور اس سے وہ نظر آتی ہے۔ اس نظریے کی تردید ابن الہیثم نے ان الفاظ میں کی ہے:

"اگر دیکھنے کا عمل اس چیز سے ہوتا ہے جو آنکھ سے خارج ہوتی ہے اور شئے مرئی تک جاتی ہے تو یہ شے یا تو جسم ہوگی یا غیر جسم۔ اگر جسم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جب آسمان اور اس کے کواکب کو دیکھتے ہیں اور ان پر تامل کرتے ہیں تو عین اس وقت ہماری آنکھوں سے ایک شے نکل کر زمین و آسمان کے مابین

جو کچھ ہے، اس کو سمجھ دیتی ہے اور آنکھ میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس میں استحالہ لازم ہے اور یہ اپنی غایت و شناعت کی وجہ سے محال ہے۔ پس ابصار اس شے (جسم) سے نہیں ہوتا جو آنکھ سے نکلتی ہے اور اگر وہ غیر جسم ہے تو یہ چیز شئے مرئی کا ادراک نہیں کرسکتی ہے کیوں کہ اجسام ذی حیات ہی قابل احساس ہوتے ہیں۔ پس اس سے بھی ثابت ہوا کہ آنکھ سے کوئی چیز نکل کر شئے مرئی تک نہیں جاتی جس سے اس کا احساس ہوتا ہے۔"

اوپر جس گروہ علماء کے نظریے کی تردید کی گئی ہے وہ اصحاب تعالیم (Mathematicians) تھے۔ فلاسفۂ طبیعین (Natural Philosophers) کا نظریہ اس کے برعکس تھا یعنی شئے مرئی سے صورت (Form) نکل کر آنکھ تک جاتی ہے اور آنکھ اس شے کا ادراک کرتی ہے۔ ابن الہیثم نے اس نظریے کو ناکافی و نامکمل قرار دیا اور تفصیل سے بتایا کہ اشیاء مرئی کا ادراک حسب ذیل شرائط پر منحصر ہے:

(۱) شئے مرئی بذات خود منور ہو یا کسی اور ذریعے سے نور لے کر منور ہو۔ (۲) شئے مرئی اور آنکھ کے درمیان بعد ہو (۳) شئے مرئی آنکھ کے مقابل ہو۔ (۴) شئے مرئی اور آنکھ کے درمیان شفاف واسطہ ہو۔ (۵) شئے مرئی اور آنکھ کے درمیان کوئی جسم کثیف حایل نہ ہو۔ (۶) شئے مرئی کی سطح کے ہر نقطہ اور آنکھ کی سطح کے درمیان (قیاسی) خط مستقیم یا خطوط مستقیمہ ہوں اور کوئی جسم کثیف درمیان میں آکر اس کو قطع نہ کرے (۷) شئے مرئی حجم کے اعتبار سے غایت درجہ چھوٹی نہ ہو۔ (۸) شئے مرئی غایت درجہ لطیف نہ ہو جیسے ہوا۔

ابن الہیثم نے نہ صرف ابصار (Vision) کے متعلق اپنے پیش روؤں کی غلطی کی اصلاح کی بلکہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ اشیائے مرئی کی شکلیں آنکھوں میں بنتی ہیں اور آنکھیں ان کا ادراک کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اس سے پہلے کسی سے انجام نہ پاسکا۔ اس سلسلے میں جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے:

"ابن الہیثم نے بتایا کہ پردہ شبکی (Retina) ہی مرکز بصر ہے۔ روشنی سے اس میں جو تاثیرات و تحریکات پیدا ہوتی ہیں وہ عصب بصری (Optic Nerve) کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ اس تشریحی و منافع الاعضائی حقیقت (Anatomical and Physiological Truth) کو ابن الہیثم سے پہلے کسی شخص نے بیان نہ کیا تھا اور نہ اس وقت ایسا کرنا ممکن تھا ان حقایق کا انکشاف وہی شخص بخوبی کرسکتا تھا جس نے اعضائے انسانی کا عملی مشاہدہ چیر پھاڑ (Dissection) کے ذریعے کیا ہو جو اس وقت ممنوع تھا۔ ابن الہیثم نے نہایت خوبی و صحت کے ساتھ بتایا کہ ہم کسی چیز کو دونوں آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ایک کیوں دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ نظری اشکال (visual images) دونوں قرینہ کے متناسب حصے (Symmetrical Portion) پر بنتی ہیں۔ جدید فزیالوجی کے ماہرین کے لیے یہ مبنی بر حقیقت انکشاف نہایت حیرت انگیز ہے۔"

گزشتہ صفحات میں علم مناظر و مرایا سے متعلق ابن الہیثم کی جن بلند پایہ علمی تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں بلا تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس میدان میں جدید سائنس نے جو پیش رفت کی ہے وہ فی الواقع ابن الہیثم کی ذہنی مساعی کی منت ہے۔

اہم ماخذ

- ڈکشنری آف سائنٹفک بائیوگرافی (مطبوعہ نیویارک ۱۹۷۲ء)
- الحسن بن الہیثم بحوثہ وکشوفہ البصریہ (مصطفیٰ نظیف بک، طبع م...)
- دی انٹلکچول ڈیولپمنٹ آف یورپ (جان ولیم ڈریپر، طبع لندن ۱۳...)
- کتاب المناظر (ابن الہیثم، طبع کویت ۱۹۸۳ء)
- لیگیسی آف اسلام (سر ٹامس آرنلڈ و الفریڈ، طبع آکسفورڈ)
- حکمائے اسلام (عبدالسلام ندوی، طبع دار المصنفین اعظم...)

خلا میں انسان کے قدم

یوسف سعید

انسان کی کہانی بھی کتنی عجیب ہے۔ زندگی کے اس سفر نے، جس کی ابتدا آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل ہوئی، طرح طرح کے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ یہ انوکھا سفر پہلے پیدل اور پھر سواری کے چوپایوں کی مدد سے شروع ہوا۔ پہیے کی ایجاد نے اس کا رُخ ہی بدل دیا اس کے ذریعے سے چلنے والی طرح طرح کی سواریاں وجود میں آئیں۔ پھر صنعتی انقلاب کی بدولت آٹو موبائل، ریل انجن اور بجلی کے موٹر کی ایجاد نے اس سفر کی رفتار کچھ اور تیز کی۔ ہوائی جہاز نے انسان کا صدیوں پرانا آسمان میں اُڑنے کا ارمان پورا کر دیا اور اب انسان ان تیز رفتار سواریوں کے ذریعے زمین پر دوڑنے کے علاوہ نہ صرف سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں تیر سکتا ہے بلکہ فضا میں پرندوں کے مقابل اُڑ بھی سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی اس حدِ پرواز کو بھی پار کرتا ہوا اب وہ خلا کی طرف گامزن ہے۔

خلائی دور کا آغاز لگ بھگ اس وقت سے ہوا تھا جب اکتوبر ۱۹۵۷ء میں دنیا کی فضا سے پہلی بار باہر نکلنے والے مصنوعی سیارے اسپوتنک نے اپنے سگنل خلا سے زمین پر بھیجنے شروع کیے۔ خلائی سفر کا دوسرا اہم قدم خود انسان کا خلا میں جانا تھا۔ اس کا سہرا بھی روس کے ایک خلاباز یوری گگارین کے سر جاتا ہے جو ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو خلا میں داخل ہونے والے پہلے انسان تھے۔ یہ اور اس جیسی کئی دوسری خلائی مہمات نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان جو اب تک صرف اس کرۂ ارض کے عظیم خطرات سے کھیلا ہے اور زمین کے بیشمار قدرتی رازوں کو افشا کرنے میں کامیاب ہوا ہے، خلا میں بھی اسی کامیابی کے ساتھ قدم رکھ سکتا ہے اور اسی خیال کے ساتھ د[illegible] میں خلائی تحقیقات اور مہمات کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ کئی انس[illegible] اور غیر انسانی راکٹ خلا میں بھیجے گئے۔

اور آخر کار انسان کا ایک اور برسوں پرانا خواب بھی پورا [illegible] جب ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو امریکی خلاباز آرم اسٹرانگ نے چاند [illegible] خشک زمین پر پہلا قدم رکھا۔ اس قدم کے ساتھ ہی انسانیت کا سفر ایک نئی سمت کی جانب رواں دواں ہوا۔ چاند کے اس مشن کے [illegible] انسان کی توجہ نظامِ شمسی کے سیاروں کی جانب ہوئی اور پچھلے کئی [illegible] میں زمین پر سے تقریباً آدھا درجن غیر انسانی خلائی جہاز بھیجے گ[illegible] جن میں میرینر۔ ۱۰ (MARINER — 10) وائکنگ (VIKING) پایونیر۔ ۱۰ (PIONEER — 10) وایجر۔ ۱ (VOYAGER — 1) و[illegible] شامل ہیں۔ ان میں سے دو راکٹ تو اب تمام سیاروں سے گزرتے ہو[illegible] نظامِ شمسی سے بھی باہر نکل چکے ہیں اور انہیں کی بدولت آج ہم ز[illegible] پر بیٹھے ہی بیٹھے عطارد کی کھردری وادیوں اور وینس کی پگھلانے وا[illegible] گرم آب و ہوا سے لے کر مریخ کی سرخ مٹی اور جوپیٹر کے شعلوں [illegible] اور سیٹرن کے گرد بے شمار دائروں سے لے کر یورینس اور نیپچو[illegible] کے منجمد سمندروں تک پہنچ چکے ہیں۔

خلائی جہاز اور ان کی ساخت

اب آیئے ذرا اس بات پر غور کریں کہ یہ تمام راک[illegible] جو اب تک سیکڑوں خلابازوں، مصنوعی سیاروں اور دوسرے [illegible] سامان کو خلا میں لے جا چکے ہیں، آخر کس طرح اس قدر تیز رفتار[illegible]

خلا میں جاتے ہیں۔ خلائی سفر کا سب سے پہلا مرحلہ زمین کی کشش ثقل (گریویٹی Gravity) اور فضا کے غلاف سے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ عام طور پر راکٹوں میں ان کے اصل جسم کے ساتھ ایندھن کے ذخیرے کئی حصوں میں یکے بعد دیگرے نصب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک حصے کا ایندھن جلنے سے راکٹ ہوا میں بلند ہوتا ہے۔ جب اس کا ایندھن ختم ہو جاتا ہے تو یہ حصہ راکٹ سے الگ ہو کر گر جاتا ہے اور دوسرے حصے کا ایندھن استعمال ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ختم ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ راکٹ زمینی کشش کی قید سے آزاد ہو کر خلا میں داخل ہو جاتا ہے۔

ویسے اب تک جو راکٹ خلا میں بھیجے جاتے تھے وہ ایک ہی بار استعمال ہو سکتے تھے۔ یعنی خلا میں اپنی ایک خاص عمر کے بعد بیکار ہو جاتے تھے۔ مگر امریکہ کے خلائی شٹل نے خلائی سفر کو ایک نیا موڑ دیا۔ شٹل ایک ایسی ٹکنالوجی سے بنایا گیا ہے کہ یہ ایک بار خلا میں جاتا ہے اور اپنا سفر مکمل کر کے دوبارہ زمین پر ایک عام جہاز کی طرح لینڈ کرتا ہے اور اس کے بعد اسے دوبارہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کی شکل بھی ایک عام بوئنگ جہاز جیسی ہوتی ہے۔

انسان پر خلا کا اثر

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ خلا میں داخل ہونے کے بعد انسان کے اوپر کیا بیتی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان اور دوسرے جانداروں کے زندہ رہنے کے لیے کچھ اہم شرائط ہیں۔ یعنی آکسیجن، کشش ثقل اور خلا سے آنے والی مہلک شعاعوں سے بچاؤ۔ اب چوں کہ ہمارا کرۂ ارض اور اس کے گرد ہوا کا غلاف یہ تینوں ہی چیزیں ہمیں مہیا ہیں تو اسی لیے زمین پر زندگی کا وجود ممکن ہے۔ مگر زمین کے اس غلاف کے باہر یعنی خلا میں نہ تو آکسیجن ہے اور نہ کشش ثقل، اور خلائی شعاعوں کا خطرہ بھی ہے تو بھلا اس حالت میں انسان خلا میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

لیکن انسان نے ان مشکلات کا بھی حل نکالا۔ مہلک شعاعوں سے بچنے کے لیے خلا میں جانے سے پہلے ایک خاص قسم کا خلائی لباس (اسپیس سوٹ Space suit) پہننا پڑتا ہے جو خلا باز کے جسم
شعاعوں اور بہت تیز یا بہت کم درجۂ حرارت سے محفوظ رک
سانس لینے کے لیے اس سوٹ میں آکسیجن کے سلنڈر بھی لگ
ویسے راکٹ کے اندر بھی آکسیجن کا انتظام ہو
اب مسئلہ رہ جاتا ہے کششِ ثقل کا۔ کشش کے بغیر خلا
اپنا توازن کھو دیتی ہے۔ خلا میں پہنچ کر خلائی مسافروں کو ا
کا اندازہ تک نہیں ہو پاتا کہ کدھر راکٹ کی چھت ہے ا
فرش، وہ بس بیچ میں ہی تیرتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہو
کہ خلا میں کھانا کھاتے وقت ایک خلا باز کے ہاتھ سے کھا
پھسل کر تیرتی ہوئی دوسرے کے منھ میں پہنچ جاتی ہے۔ ا
علاوہ ایک مشکل اور بھی ہے، چوں کہ انسانی جسم کے اندر
اور ان کے فعلیات کچھ اس تناسب سے بنے ہیں کہ زمین کی
ہے بس اسی میں یہ اعضاء بالکل صحیح کام کر سکتے ہیں، لیکن
کم یا زیادہ ہو جائے تو اعضاء ٹھیک طرح اپنا فعل انجام
پاتے اور جسم میں کئی اندرونی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ا
سے بچنے کے لیے خلا بازوں کو سفر سے پہلے کافی تیاری کر
مہینوں پہلے سے ان کی جسمانی ٹریننگ ہوتی ہے جس میں مختل
اور بغیر کششِ ثقل کے چیمبر میں رہنے کی مشقیں شا
جس سے ان کا جسم بغیر کشش کے رہنے کا عادی بن جاتا۔
خلائی سفر کے دوران زیادہ مشکلات نہیں ہوتیں۔

خوراک بھی خلائی سفر کا ایک اہم مسئلہ
مسافت والے سفر کے لیے خلائی جہاز میں ضرورت کے
لے جائی جا سکتی ہے۔ لیکن بالفرض اگر ہمیں اپنے سب
مریخ پر بھی جانا ہو تو اس پورے سفر کے دوران ا
خوراک اور پانی لے جانا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ اس کا فا
میں طے ہوگا۔ اس کے لیے یہ کیا جاتا ہے کہ راکٹ میں
شدہ اشیاء اور انسانی فضلہ کو دوبارہ کام میں لاتے
کے ذریعے ان کی (Recycling) کر کے دوبارہ ا
میں تبدیل کیا جاتا ہے جو غذا کے طور پر استعمال ہوتا

تمام وٹامنس اور دوسرے ضروری مرکبات سے بھرپور ہوتی ہے۔

خلائی دور کا مستقبل۔

خلائی تحقیقات میں اب تک جتنا کارنمایاں انجام پایا ہے اور آج جس رفتار سے مزید ترقی ہو رہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا اب مشکل نہیں کہ مستقبل قریب میں انسان نظام شمسی کے دوسرے سیاروں مریخ، وینس اور جوپیٹر وغیرہ تک پہنچ پائے گا۔ ان سیاروں پر رہنے کے لیے شہر بنائے گا۔ خلا میں بھی شہر جتنے بڑے مصنوعی سیارے انسانی رہائش کے لیے بن سکیں گے اور اگر آئندہ سو سالوں میں انسان نظام شمسی کے تمام سیاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کی اگلی منزل کہکشاں کے ستارے ہوں گے۔ لیکن خلائی سفر کے جو ذرائع اس وقت انسان کے پاس ہیں، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ ستاروں کے درمیان بے انتہا طویل فاصلوں کو طے کر سکیں۔ مثلاً ہماری زمین سے نزدیک ترین ستارہ الفا سینچری (Alpha Centaury) بھی ہم سے اتنا دور ہے کہ وہاں سے نکلنے والی روشنی بھی ہم تک ساڑھے چار سال بعد پہنچتی ہے۔ یعنی اگر ہمارے خلائی جہاز روشنی کی رفتار سے بھی سفر کریں تو ساڑھے چار سال بعد وہاں پہنچ پائیں گے۔

لیکن چوں کہ اب تک انسان اپنی بے انتہا کوششوں کے بعد بھی کوئی ایسا سائنسی نظریہ نہیں تلاش کر پایا ہے جس کے ذریعے راکٹ روشنی کی رفتار یا اس سے بھی تیز رفتار سے سفر کر سکیں۔ اس لیے ستاروں کا سفر ابھی انسان کے لیے ایک خواب سا لگتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ آج سے ۵۰ سال بعد کوئی ایسی دریافت ہو جائے کہ ہم ستاروں تک پہنچ سکیں۔

> "جو چیز تم کو اعلیٰ درجے پر پہنچانے والی ہے وہ صرف "ہائی ایجوکیشن" (اعلیٰ درجے کی تعلیم) ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے بزرگ پیدا نہ ہوں گے، ہم ذلیل رہیں گے اوروں سے پست رہیں گے اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دل سوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کی ہیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا کچھ اور۔ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہہ دوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے، اپنے ہاتھوں کو دھو دوں"
>
> سر سید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ٦ ش ١٢ (دسمبر ١٩٨٧ء)

فنِ خطاطی — ایک اجمالی جائزہ

سید شفیق احمد

خطاطی نہ صرف انسان کے جمالیاتی ذوق کے اظہار کی آئینہ دار ہے بلکہ بذات خود ایک فن ہے، جو کتابت اور خوش نویسی سے جداگانہ اور بلند تر ہے۔ یوں تو فن خطاطی اور اس کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تاہم اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں سے اہل علم و ذوق کو روشناس کرایا جائے۔ اس سے ان فن کاروں کو حوصلہ ملے گا اور شاید یہ سعی فن خطاطی کو فروغ دینے میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔

جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت جلد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں نے بہت کم مدت میں علم و ہنر، تہذیب و ثقافت کے مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ بالخصوص خطاطی میں مسلمانوں کا ثانی ملنا دشوار ہے۔ اس کی شاید ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے رقص و موسیقی اور بت تراشی جیسے فنون لطیفہ کو ناجائز قرار دے دیا ہے۔ انسان جو فطرتاً فن کار ہے اور جس کی سرشت میں حسن پرستی ہے کیوں کر باز رہ سکتا تھا، خطاطی اُنہیں جذبات کی ایک دلکش ترجمانی ہے۔

حتمی طور سے یہ کہنا دشوار ہے کہ خطاطی کی ابتدا سب سے پہلے عربی زبان میں ہوئی یا فارسی زبان میں۔ تاریخ خطاطی میں سب سے پہلے آنے والا نام خالد ابن ابی الہیاج کا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کی شروعات شاید پہلے عربی زبان میں ہوئی تھی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی زبان کی خوش نویسی کے بھی اثرات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایران میں کتبہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ کتبہ نگاری آریائی نسل کے لوگوں کا عظیم شیوہ رہا ہے۔

خالد ابن ابی الہیاج کے بعد خوش نویسی اور خطاطی ایک بن گئیں اور پھر باضابطہ طور پر کتابت کے قوانین مرتب کیے گئے۔ خطاطی میں دوسرا اہم نام ابن مقلہ کا ہے۔ انہوں نے پہلے علم ہندسہ پر قوانین کتابت کو رقم کیا۔ ابن مقلہ نے اس موضوع [illegible] کتابیں لکھی ہیں۔ جن کے نام ہیں — رسالہ در علم خط و قلم۔ رسالہ میزان القلم، اصناف اور مقدمہ فی الخط۔

ابن مقلہ نے چھ طرح کے خطوط کا ذکر کیا ہے جن کے نام ریحان، ثلث، نسخ، توقیع اور رقاع۔ ابن مقلہ کے مستعصمی نے کتابت کے آٹھ اصولوں کو قلم بند کیا اور پھر [illegible] نے قواعد میں تجدید کی۔ جعفر تبریزی اور سلطان مشہدی نستعلیق، آداب خوش نویسی اور طریقہ مشق پر ایک کتاب" کے عنوان سے مرتب کی۔

سلطان محمود غزنوی کے دور میں چند مشہور خطاط [illegible] آئے۔ انہوں نے نہ صرف مروجہ خطاطی کو فروغ دیا بلکہ نئی [illegible] تلاش کیں، خط طغریٰ اسی دور کی ایجاد ہے۔ عین الحسن [illegible] خیال ہے کہ دانش وران ایران خط طغریٰ کو فن خطاطی میں [illegible] کرتے۔

عہد مغلیہ ہر لحاظ سے عہد زریں تھا۔ خطاطی کو [illegible] زبردست فروغ ملا۔ عبدالصمد نے خط فرو ہنجا میں [illegible]

ہوتی تھی۔ اکبر کے دور میں میر عبداللہ تبریزی نے خط نستعلیق کو بہت فروغ دیا۔ جہانگیر کے دور میں عبدالرحیم، میر عبداللہ، محمد صالح اور محمد شریف وغیرہ نامور خطاط گزرے ہیں۔ ایرانی نستعلیق کو شکستہ روش میں لکھنا اس دور کا خاصہ تھا۔ دورِ شاہجہانی میں عبدالرشید دیلمی نہایت مشہور خطاط تھے۔ شاہ جہاں کے دور ہی میں نسخ کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا اور اس کا سہرا عبدالباقی کے سر ہے۔ اسی دور میں چندر بھان اور سورج بھان نے بھی کافی ناموری حاصل کی۔ اورنگ زیب کو نسخ نستعلیق آمیز شکستہ میں کمال حاصل تھا۔ محمد باقر یاقوت رقم، قاضی عظمت اللہ وغیرہ دیگر ماہرین فن نے اس دور میں فن خطاطی کو جلا بخشی غیر مسلموں میں مثلاً لچھمن سنگھ، پریم ناتھ، شیر سنگھ، لالہ درگا پرشاد وغیرہ بھی اپنے زمانے کے نامور خطاط تھے۔

عہد حاضر میں تقریباً چودہ خطوط مروّج ہیں۔ ان کے نام ہیں کوفی، محقق، ثلث، ریحان، رقاع، اجازہ، توقیع، نسخ، تعلیق، شکستہ، طغری، رقع، دیوان اور نستعلیق۔ کچھ خطاطوں نے اپنے خطوط کو منفرد طور پر فروغ دیا۔ مثلاً خط ماہی، خط گلزار، خط نقشی اور خطِ رعنا وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ خط کوفی کا آغاز کوفہ میں ہوا تھا۔ دوسری اور تیسری ہجری میں خط کوفی میں اصلاحات ہوئیں اور اعراب کی ایجادات، حرکات، کشش، کرسی اور شان و صفا میں اس خط نے کافی ترقی کی۔ بقول شوکت صاحب حضور کا فرمان، حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ کے قرآن کریم کے نسخے اس خطِ قدیم کے مظہر ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں حسن بن حسین علی فارسی نے رقاع اور توقیع کے امتزاج سے خط تعلیق ایجاد کیا اور تعلیق اور نسخ کی آمیزش سے خطِ نستعلیق وجود میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ یاقوت مستعصمی خط نستعلیق کے موجد تھے۔ نسخ اور ثلث میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ ثلث کے مراکز دائرے اور کشش نسخ سے سہ چند پر کشش اور نوک دار ہوتی ہیں۔ رقاع ثلث سے زیادہ مزین ہوتا ہے۔ توقیع جلی ہوتا ہے۔ ریحان میں مراکز، دائرے قدرے پرکار اور بھرے ہوئے ہوتے ہیں جو ثلث سے مختلف ہوتا ہے لیکن یہ سبھی خطوط کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثل ضرور ہیں۔"

نقش و نگاری میں حروف تہجی کا استعمال یورپ میں سب پہلے پکاسو اور براک نے کیا لیکن کینوس پر اس کے استعمال کا وسارالی کے سر باندھا جاتا ہے۔ انیس فاروقی کا خیال ہے کہ

"جدید ہندوستان میں اگر تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو فن مصوری میں عربی الفاظ کو طغرے کی شکل میں پیش کرنے کا سب سے پہلا تجربہ مقبول فدا حسین نے بیسویں صدی کی چوتھائی دہائی میں کیا تھا۔ بعد ازاں تامل الفاظ کو لے کر پانیکر نے، گجراتی الفاظ کو لے کر سلطان علی نے، پاکستان میں نسخ طرز میں حنیف رامے اور طرز شکست کو لے کر اقبال جعفری نے بڑے کامیاب تجربے کیے۔"

نریندر نے ہندی حروف "اوم" پر ایک سیریز تیار کی۔ سالوں میں عربی خطاطی پر مشتمل کچھ تجربات رضا زیدی، عبدالحق ٹونکی اور ابن کلیم نے کیے ہیں۔ ابن کلیم نے ایک نیا خط، خطِ رعنا ایجاد کیا ہے۔ بلغ العلٰی بکمالہٖ ان کی مشہور کاوش ہے۔ محمد "اللہ" سیریز بھی بے حد کامیاب نمونہ ہے۔ موصوف کی ان ہی پر للت کلا اکادمی نے انہیں گولڈ میڈل سے نوازا تھا۔

خطاطی میں پیکر تراشی بھی ایک قدیم فن رہا ہے۔ بقول شوکت صاحب اکبر کے دور میں حافظ ابراہیم نے ایک مینا کار فرمان شاہی لکھ کر اپنے فن کا اس طرح کیا کہ بین السطور کے دندان موش اور نقاط و مراکز کو دو دیکھنے پر مرغان چمن ابھرتے سے نظر آتے ہیں۔ دور حاضر میں اپنا قدیم خطاطی کو انسانی اور حیوانی اشکال میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے پشکن وغیرہ کے اشعار کو مختلف اشکال دے کر خطاطی میں گرافک آرٹ کا بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ دیو بانی کرشنا نے بھی کچھ سال اپنی "اللہ" سیریز میں گرافکس کی نمائش کی تھی جو کافی مقبول ہوئی۔

گزشتہ چند برسوں میں بہت سے مصوروں اور خطا آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی اور احادیث نبوی کو مختلف طریقوں رنگوں میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں اہم نام صادقین کا ہے۔ مجتبیٰ کے الفاظ میں "وہ سچ مچ رنگ و نور کا آدمی تھا۔ صادقین ا

التجری فی البحر بامرہٖ وسخر لکم الانھٰر"

(خدا ہی قادر و توانا ہے جس نے سارے زمین و
آسمان پیدا کر ڈالے اور آسمان سے پانی برسایا پھر
اس کے ذریعے سے (مختلف درختوں سے) تمہاری
روزی کے واسطے طرح طرح کے پھل پیدا کیے اور
تمہارے واسطے کشتیاں تمہارے بس میں کر دیں۔
تاکہ اس کے حکم سے دریا میں چلیں اور ندیوں کو تمہارے
اختیار میں کر دیا)

: رمیانی دائرے میں ۔ " لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین"

مندرجہ بالا آیت کریمہ کے ذریعے تسخیر کائنات کی منظر کشی کی گئی
ہے۔ مثلاً جزو آیت "وانزل" کے پس منظر میں ابر دکھایا گیا ہے جو
اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پانی ہی حیات کا سرچشمہ ہے۔ من الثمرات
کے پس منظر کو مختلف خوبصورت رنگوں میں درختوں کے ذریعے دوسری
اہم ضرورت یعنی غذا کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ کشتیوں کے ذریعے
سرفراز نے نہ صرف تسخیر بحر کا تصور پیش کیا ہے، بلکہ حرکت میں برکت
کی فلاسفی کا بھی اظہار کیا ہے۔ آیت کے آخری حصے یعنی وسخر لکم الانھار
کو نہ صرف توازن کی فنی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کیا ہے
بلکہ یہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور
بھی ہیں۔ انسان کو منزل تلاش کرنے کے لیے یہ ایک چیلنج ہے۔ دائرہ
میں قرآن کا وہ آفاقی تصور ہے کہ اس کتاب مبین میں سارے
جہاں کا علم ہے۔ اسی لیے اس آیت کریمہ کو تصویر کے وسط میں
نمایاں جگہ پر رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں خط نستعلیق اور کوفی کی
ہم آہنگی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مندرجہ ذیل تصویر کا عنوان "علم کی فضیلت" ہے۔
آیت کریمہ ہے: ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

ترجمہ

(کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں)
اس آیت کو اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ ایک میزان (ترازو) کا خاکہ
ذہن میں ابھر آئے۔ لفظ "ھل" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ترازو کے
جھکے ہوئے پلڑے میں علم کی فضیلت سے متعلق ایک آیت

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

تحریر ہے تو دوسری جانب اٹھے ہوئے پلڑے میں جہالت کی ہجو سے متعلق
آیت:

لا نبتغی الجٰھلین (ہم جاہلوں کی صحبت کے خواہاں نہیں)
رکھی گئی ہے۔ تصویر میں عنوان کو مزید پُر اثر و پرکشش بنانے کے
لیے دو حدیثوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ جن میں پہلی ہے

اطلبوا العلم من المھد الی اللحد
(ماں کی گود سے لحد تک علم حاصل کرو)

اور دوسری ہے:

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ
(علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر
فرض ہے)

تصویر ملاحظہ کیجیے ۱۔
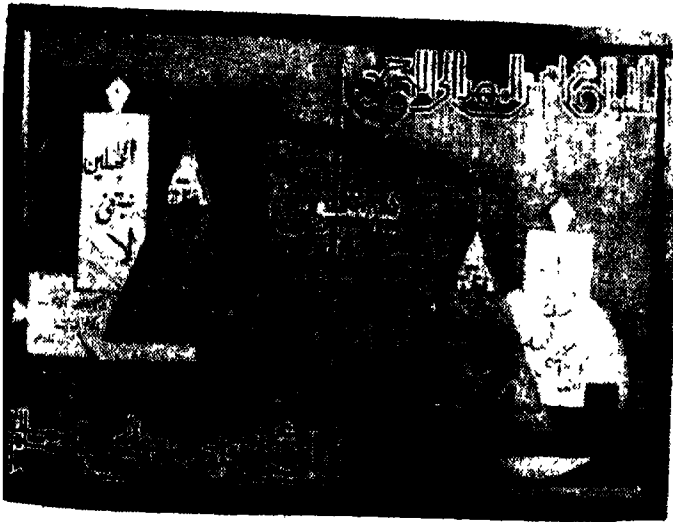
دور حاضر میں اس زوال پذیر فن کو پھر سے جلا دینے کی
کوشش کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ترقی اردو بورڈ، وزارت
تعلیم، حکومت ہند کی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔ حکومت کی
مالی امداد سے بہت سی جگہوں پر خطاطی کے مراکز کھولے گئے
ہیں، جہاں خطاطی کی تربیت دی جاتی ہے۔ ایک ایسا ہی مرکز

علی گڑھ میں بھی کھولا گیا ہے۔ امید ہے ان مراکز سے نئے فلیق ٹونکی، کلیم، صادقین اور سرفراز پیدا ہوں گے اور اس فن کو فروغ دیں گے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔
مسلم کیلیگرافی۔

۲۔ ڈاکٹر زیڈ اے۔ ڈیسائی
ٹائمس آف انڈیا۔ ۱۹۶۱ء

۳۔ محمد اسحاق۔
فن تحریر کی تاریخ۔

۴۔ مولانا احترام الدین احمد شاغل
صحیفۂ خوش نویساں۔

۵۔ صاحبزادہ شوکت علی خاں۔ ڈائریکٹر عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ راجستھان۔ ٹونک
اسلامی ہند میں فن خطاطی۔ امتیازات وخصوصیات۔

۶۔ انیس فاروقی۔
لیتین۔ ماہنامہ آج کل نئی دہلی۔ مئی ۱۹۷۹ء

۷۔ خطاطی کے چند شاہ کار
اداریہ ماہ نامہ آج کل۔ نئی دہلی مارچ ۱۹۸۰ء

۸۔ مہدی عباس حسینی
فن کار و فقیر۔ ماہنامہ آجکل مارچ ۱۹۸۷ء

۹۔ مجتبیٰ حسین۔
صادقین رنگ و لوز کا آدمی۔ آج کل مارچ ۱۹۸۷ء

۱۰۔ سید عین الحسن عابدی
خوش نویسی راہ اسلام۔ شمارہ۔ (صفحہ ۴۶)

۱۱۔ ٹی۔ این کول۔
اے فریش لک ایٹ کیلیگرافی (امینہ آہوجہ)
السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ مارچ ۷، ۱۹۸۲ء

عبداللہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری ماں نے ایک دن مجھے بلایا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ میری ماں نے کہا: "آؤ بیٹا، تمہیں فلاں چیز دوں گی" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا! تم اسے کیا چیز دینا چاہتی ہو؟ انھوں نے کہا: میں اسے کھجور دینا چاہتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: "اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو یہ تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔"

(ابو داؤد)

ابن بطوطہ ــــ ایک عظیم سیاح

ابوسعد خان

ابن بطوطہ کا اصل نام محمد بن عبداللہ ابن بطوطہ ہے لیکن مشہور ابن بطوطہ کے نام سے ہیں۔ ابن بطوطہ کی پیدائش مراکش کے شہر تنجیر میں ۱۳۰۴ء کو شہر قاضی کے گھرانے میں ہوئی۔ وہیں پروان چڑھے اور ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی سیروسیاحت کے بہت شوقین اور دلدادہ تھے۔ وہ دنیائے اسلام کے ایک عظیم سیاح بنے۔ ابن بطوطہ کو اسلامی دنیا کا مارکوپولو کہنا بے جا نہ ہوگا۔ دراصل انہوں نے مارکوپولو سے بھی زیادہ مدت تک اور کافی وسیع علاقے کی سیاحت کی۔ انہوں نے کل ۷۵ ہزار میل کا سفر کیا۔

ابن بطوطہ نے جن ملکوں کا سفر کیا اُن میں زیادہ تر مسلمان حکمراں تھے۔ وہ جہاں بھی گئے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور ان کو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کی گئیں۔ ابن بطوطہ کو اپنے سفر کے دوران مختلف صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے انتہائی دشوار گزار اور خطرناک راستوں سے گزرنا پڑا۔ وہ تیس سال تک اپنے وطن سے دور رہے۔ وہ افریقہ، ایشیا اور یورپ کے بیشتر ممالک میں پہنچے۔ اس طرح انہوں نے معلومات کا ایک وسیع و عریض ذخیرہ جمع کر لیا تھا جس کو اپنے "سفرنامہ" میں درج کیا۔ ابن بطوطہ کا "سفرنامہ" اب بھی دُنیا کا سب سے بڑا سفرنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی سیاحت اور معلومات کا اس زمانے کی جغرافیہ میں ایک خاص مقام تھا۔

ابن بطوطہ کا سفر کرنے کا خاص مقصد شروع میں حج کرنا تھا۔ وہ سب سے پہلے خشکی کے راستے اسکندریہ اور قاہرہ کی طرف روانہ ہوئے اور پھر بحر قلزم تک پہنچے۔ وہاں سے بحر قلزم کے ساحلی اور غازہ پٹی ہوتے ہوئے یروشلم پہنچ گئے۔ یروشلم اور فلسطین کے دوسرے مقامات کی سیر کرنے کے بعد وہ گیلیلی جھیل سے ہوتے ہوئے دمشق پہنچے۔ دمشق سے شامی ریگستان میں گھومتے پھرتے مکہ معظمہ پہنچ اور حج کا فریضہ ادا کیا۔ مدینہ سے بغداد ہوتے ہوئے بصرہ اور جنوبی ایران کے شہر اصفہان اور پھر شیراز گئے۔ شیراز میں کچھ قیام کے بعد وہ کوفہ، موصل ہوتے ہوئے دوبارہ مکہ شریف۔ مکہ معظمہ میں تین سال قیام کے دوران انہوں نے اسلامی قانون گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ یہاں سے عدن ہوتے ہوئے وہ افریقہ کے مشرقی سواحل پر واقع اسلامی علم و فن کے مراکز مومباسا اور زنجبار گئے۔ زنجبار سے بذریعہ پانی کے جہاز وہ خلیج فارس کے لیے روانہ ہوئے۔ بصرہ پہنچ کر وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔

مکہ معظمہ سے اناطولیہ کے پٹھار اور وہاں سے بحر روم پر واقع مشہور بندرگاہ ادالیا (Adalia) جا پہنچے۔ وہاں پر اس وقت غلاموں کی خرید و فروخت بہت زوروں پر تھی۔ ابن بطوطہ نے بھی کچھ غلام خریدے۔ یہاں سے وہ قسطنطنیہ چلے گئے۔ قسطنطنیہ سے ایک قافلے کے ساتھ وسطی ایشیا کی طرف روانہ ہوئے۔ وسطی ایشیا کے متعدد شہروں مثلاً سمرقند، بخارا، خراسان، ترمیز وغیرہ سے ہوتے ہوئے شمال مغربی افغانستان کے شہر ہرات پہنچ گئے اور پھر کابل پہنچے۔ کابل میں قیام کے بعد ہندوکش پہاڑ کو پار کرکے ۱۳۳۳ء میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ کو عبور کرکے

ملتان پہنچے۔ پنجاب اور سندھ کے دوسرے مقامات کی سیر کی۔ اس وقت ہندوستان کا بادشاہ محمد تغلق تھا۔ وہ اہلِ علم کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ خود ایک جیّد عالم تھا۔ ابن بطوطہ کی آمد کی خبر جب شہنشاہ کو پہنچی تو اس نے ابن بطوطہ کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ محمد تغلق ابن بطوطہ کی خوش اخلاقی، دور اندیشی اور ذہانت سے کافی متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے ابن بطوطہ کو دہلی کا قاضی مقرر کر دیا۔ محمد تغلق اعلیٰ عہدوں کے لیے نیک لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ ابن بطوطہ قاضی کے عہدے پر تقریباً آٹھ سال تک فائز رہے اور بہت اچھی طرح اپنے فرائض انجام دیے۔

محمد تغلق نے ابن بطوطہ کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیجا۔ وہ کالی کٹ، مالدیپ، شری لنکا اور چٹاگاؤں ہوتے ہوئے ملایا پہنچ گئے۔ اس دوران ان کو راستے میں بہت ہی تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کالی کٹ کے پاس اُن کا جہاز بھی طوفان کی نذر ہو گیا تھا۔ ملایا سے سماترا، جاوا ہوتے ہوئے چین کے شہر کینٹن پہنچ گئے۔ چین کا بادشاہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور چین کی ایک ریاست کا گورنر بھی بنا دیا۔ چین میں رہتے ہوئے انہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگی اتفاق سے انہیں اپنا ایک ہم وطن بھی مل گیا۔ چین سے وہ اپنے وطن واپس ہوئے۔ واپسی میں وہ جاوا، سماترا، شری لنکا، مالابار، عمان، فارس اور بغداد ہوتے ہوئے دمشق پہنچے۔ ۱۳۴۹ء میں چوتھی دفعہ حج کرنے کے بعد وہ اپنے وطن مراکش پہنچ گئے۔ اپنے وطن میں قیام کے بعد وہ غرناطہ چلے گئے۔ غرناطہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا علم و فن کا مرکز تھا۔ غرناطہ سے وہ پھر فیض (مراکش) چلے آئے۔ فیض میں وہ شاہ مراکش کے مشیر خاص بنے۔ جس آدمی نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سیاحت میں گزار دیا ہو، وہ بھلا ایک جگہ کیوں کر قیام کر سکتا۔ یوں بھی ابن بطوطہ بڑی بے چین طبیعت کے مالک تھے وہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صحرائے اعظم کے سفر کا قصد کیا۔ وہ صحرائے اعظم کی خاک چھانتے اور سفر کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہوئے بالآخر ٹمبکٹو پہنچے۔ اس دوران انہوں نے سلجماسا اور تگدا (Tagadda) کا بھی سفر کیا۔ بادشاہ کی طرف سے واپسی کا حکم ملتے ہی وہ ۱۳۵۴ء
پہنچ گئے اور زندگی کے باقی سال وہیں گزارے اور بادشاہ
سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔

ابن بطوطہ نے "سفرنامہ" میں اپنی ۷۵ ہزار میل لمبی
کا تذکرہ بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے
میں تاریخی مقامات و عمارات، قوموں کے طرز معاشرت، رسم و
اور طریق بود و باش کو بہت اچھی طرح قلم بند کیا ہے۔ انہوں
افریقہ اور ایشیا کے بیشتر علاقوں کے سماجی، ثقافتی اور تہذیبی
کا بخوبی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے سرسبز میدان، پہاڑ، برفیلی چوٹیاں
حسین وادیاں اور سمندری موجوں کا تذکرہ بھی بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے گنگا، جمنا، دجلہ، فرات، نیل
سر دریا، آمو دریا، سندھ اور ہانگہو وغیرہ دریاؤں کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے "سفرنامہ" میں چین کی فصلوں
پھلوں، جانوروں، دھاتوں، قیمتی پتھروں، کوئلے اور اس کی توانائی کے استعمال کا ذکر بھی موجود ہے۔

ابن بطوطہ، سلطان محمد تغلق کے عہد میں آٹھ سال تک دہلی میں قاضی کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے "سفرنامہ" میں سلطان کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق "محمد تغلق روزہ نماز کا بڑا ہی پابند تھا وہ عالم اور دین دار لوگوں کی بہت قدر کرتا تھا.... سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے اور ستر شفاخانے تھے۔" ابن بطوطہ نے گنگا کی پاکی، ذات پات کے بندھن اور ستی سسٹم کا اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ستی رواج کو بہت ہی ظالمانہ اور بھیانک قرار دیا۔ ایک بار ایک مظلوم عورت کو ستی ہوتے دیکھ کر وہ بے ہوش بھی ہو گئے تھے ان کے "سفرنامہ" میں ہندوستان کے شہروں، دریاؤں، پہاڑوں اور زراعت وغیرہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

ابن بطوطہ نے جزائر مالدیپ کی خوبصورتی کا تذکرہ کیا ہے ان کے مطابق اس وقت مالدیپ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے

زیادہ تھی اور مالدیپ کی حکمراں بھی ایک عورت ہی تھی۔ ابن بطوطہ نے جزائر مالدیپ میں بھی قاضی کے عہدے پر کام کیا۔ انہوں نے یہاں اسلام کی اشاعت کا کام بھی انجام دیا۔

ابن بطوطہ دنیائے اسلام کے ایک عظیم سیاح رہے ہیں۔ ان سے زیادہ بہادر اور نڈر سیاح دنیائے اسلام میں شاید ہی کوئی دوسرا گزرا ہو۔ انہوں نے دنیائے اسلام کے چپے چپے کی معلومات حاصل کرنے کی جی توڑ کوشش کی۔ وہ پہلے مسلم سیاح تھے جنہوں نے مشرقی اور شمالی افریقہ کے بیشتر ممالک صحرائے اعظم، عرب، شام، ترکی، فلسطین، عراق، ایران، افغانستان، وسطی ایشیا، ہندوستان، مالدیپ، شری لنکا، ملایا، سماترا، جاوا اور چین وغیرہ ممالک کا سفر کیا۔ انہوں نے چین سے سوڈان تک صرف سیاحت ہی نہیں کی بلکہ وہاں کی طبعی، ثقافتی، سماجی، تہذیبی اور معاشی معلومات بھی حاصل کیں۔ یہ معلومات آج بھی تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو بھی دیکھا اور جو کچھ بھی محسوس کیا ان سب کو خوب صورتی کے ساتھ اپنے 'سفر نامہ' میں درج کر دیا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابن بطوطہ نے سیاحت کے میدان میں جو عظیم کارنامہ انجام دیا اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے جو راستہ ہموار کیا اس کا فائدہ اس کی قوم کے لوگ نہ اٹھا سکے۔ دوسری قوموں نے اس کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر نئے نئے علاقوں اور جگہوں کی دریافتیں شروع کر دیں۔ اہل یورپ کے دلوں میں یہ شوق پیدا ہوا کہ مشرقی ایشیا کو جانے والے نئے نئے راستے دریافت کیے جائیں کیوں کہ پرانے تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ پرتگال کے بادشاہ ہنری کی سرپرستی، مالی امداد اور حوصلہ افزائی سے کولمبس نے 'نئی دنیا' کی دریافت کی۔ یہ دریافت دنیا کی عظیم ترین دریافت تھی۔ کولمبس کے بعد بہت سے جہاز راں مثلاً واسکوڈی گاما، میگیلان، کیپٹن کک، اور امریگو ویسپکی وغیرہ نے نئے نئے خطوں کی دریافتیں کیں۔ نئے خطوں اور ملکوں کی دریافتوں سے تجارتی راستوں میں بے انتہا تبدیلی واقع ہوئی اور اس کا اثر مسلمانوں کی دولت اور تجارت پر بھی پڑا۔ چنانچہ ترکوں کی تباہی کا اصل سبب یہی ہوا۔ یورپی اقوام نئے اور پرانے بحری راستوں پر حاوی ہو گئیں اور اس طرح رفتہ رفتہ عالمی تجارت ان کے ہاتھ میں آگئی اور مسلمان پستی کی طرف بڑھتے ہی گئے۔

ابن بطوطہ کو مرے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں
لیکن اس کی روح، اس کا ذوقِ تجسس ابھی زندہ ہے۔
کاش یہ ذوقِ تجسس پھر سے مسلم قوم میں پیدا ہو جائے۔
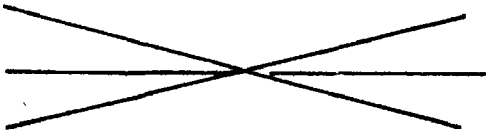
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی اپنے دوست کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دوست سوچ سمجھ کر بنائے۔"

مشکوٰۃ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۶ - ش ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۷ء)

سائنس کا شہر — تری یستے

صابرہ خاتون

اٹلی کے شہر تری یستے (TRIESTE) میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کے قایم کردہ بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبعیات (International Centre for Theoretical Physics) کی جانب سے ایٹمی و سالماتی طبعیات کی علمی کانفرنس (۹ مارچ تا ۳ اپریل ۱۹۸۷ء) میں مجھے شرکت کی دعوت ملی۔ کسی بھی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے کا یہ میرا دوسرا موقع تھا۔

میں علی گڑھ سے اپنے شعبے کے دو اور شرکاء کے ساتھ دہلی کے نئے ہوائی اڈے (اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ) سے صبح پانچ بجے ایر انڈیا کے بوئنگ ۷۴۷ سے روانہ ہوئی۔ ہندوستانی وقت کے مطابق دن کے ڈھائی بجے اعلان ہوا کہ ہم لوگ اب روم ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ وہاں کے وقت کے مطابق صبح کے سوا نو بجے تھے اور اس وقت کا درجۂ حرارت ۲۰° سیلسیس تھا۔

جہاز سے اترتے ہی اٹلی کی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں نے ہماری وہ خاطر کی کہ ہم اکڑ کر رہ گئے۔ روم ہوائی اڈے میں داخل ہوتے ہی یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اندرا گاندھی ہوائی اڈہ اسی کی نقل ہے۔ روم کا ہوائی اڈہ رقبے کے اعتبار سے کافی بڑا ہے۔ اس میں ۴۱ دروازے ہیں جو جہاز میں داخلے کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں ہر دومنٹ پر ایک جہاز آتا یا جاتا نظر آتا ہے۔

روم سے اپنی منزل مقصود تری یستے پہنچنے کے لیے یہاں کی لوکل فلائٹ ال اطالیہ ملی۔ ایک گھنٹہ بعد جہاز اترا۔ ہوائی اڈے کی بس نے تری یستے کے ریلوے اسٹیشن لے جاکر چھوڑ دیا۔ پھر وہاں سے بذریعہ ٹیکسی ہم لوگ بخیر و عافیت سینٹر پہنچ گئے جہاں مجھے Adriatico Palace Hotel میں ایک ترکی خاتون پروین اری کان کے ساتھ ٹھہرا دیا گیا۔

اس سینٹر کا قیام پروفیسر عبدالسلام کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی نے حکومت اطالیہ کے تعاون سے قایم کیا۔ بعد میں یونسکو اور دوسری حکومتوں نے بھی مالی تعاون فراہم کرنا شروع کیا۔ اب یہ مرکز دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی منازل سر کر رہا ہے۔ اٹلی کے وزیراعظم کا کہنا ہے کہ کوئی وزیر اگر مجھ سے سو ڈالر مانگتا ہے تو میں منع کر دیتا ہوں لیکن پروفیسر سلام اگر مجھ سے دس لاکھ ڈالر کی فرمایش کرتے ہیں تو مجھے منع کرنا گوارا نہیں ہوتا۔

اس مرکز کے اغراض و مقاصد میں سے کچھ یہ ہیں:
تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے ماہرین طبعیات کو عصر حاضر کی ترقی سے روشناس کرانا۔ لایق سائنسدانوں کی ہمت افزائی کرنا اور ان میں جوش اور لگن سے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا وغیرہ۔

ابتدا میں یہاں صرف طبعیات کے مختلف موضوعات پر کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اکتوبر ۱۹۸۶ء سے ریاضی کی کانفرنس کا بھی انعقاد ہونے لگا۔ عبدالسلام کا ارادہ اسے تیسری دنیا کے ممالک کے لیے سارے سائنسی علوم کا مرکز بنانے کا ہے۔ اگلے برس سے

ماہرین کیمیا کی بھی کانفرنس شروع ہونے کا امکان ہے۔ اس وقت سینٹر کے پاس تین عمارتیں ہیں جہاں بیک وقت دو کانفرنسیں بآسانی چلتی رہتی ہیں۔ سینٹر کی خاص بلڈنگ (ICTP) کہلاتی ہے۔ اسی میں ڈائریکٹر پروفیسر عبدالسلام کا کمرہ ہے۔ ایک لائبریری ہے جس میں ۳۵ ہزار کتابیں اور ۵۰۰ بین الاقوامی جرائد آتے ہیں۔ کمپیوٹر ہے۔ فوٹو کاپی کرنے کی مشینیں ہیں۔ سینٹر کا بہت بڑا عملہ ہے جو بحسن و خوبی اپنا کام تن دہی اور نیک نیتی سے انجام دیتا ہے۔ یہ عملہ اطالوی، انگریز، افریقی غرضیکہ کئی ممالک کے افراد پر مشتمل ہے۔

۹ مارچ کو صبح آٹھ بجے رجسٹریشن ہوا۔ بعد ازاں سب شرکاء کو ایک ایک آئی۔ کارڈ (I. Card) دے دیا گیا۔ اٹلی میں ہر شخص کے پاس آئی کارڈ ہونا ضروری ہے۔ سلام صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ انہوں نے (I.C.T.P.) کی مختصر تاریخ بیان کی اور بار بار سخت محنت اور لگن سے کام کرنے کی تلقین کی۔ بعد ازاں سارے شرکاء کا تعارف ہوا۔ کانفرنس میں ۹۷ شرکاء تھے۔ چینی اور ہندوستانی شرکاء کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بقیہ پاکستان، شری لنکا، بنگلہ دیش ملیشیا، انڈونیشیا، فلسطین، فلپائن، ترکی، ارجنٹائنا، مصر، نائیجریا ایتھوپیا اور پیرو وغیرہ کے تھے۔ چار نامور سائنس دان ڈائریکٹر کے عہدے پر مامور کیے گئے تھے جو کچھ شرکاء کو ایک ساتھ بلا کر یکے بعد دیگرے انٹرویو لیا کرتے تھے۔

کانفرنس کے اوقات صبح سوا نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک اور پھر دو سے پانچ تک تھے۔ جس میں نامور سائنس دان لیکچر دینے آتے اور جاتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ شرکاء کو سیمینار لیکچر بھی دینے تھے جن میں انہیں اپنا تحقیقی کام پیش کرنا تھا۔ چنانچہ ۲ اپریل کو مجھے اپنا ریسرچ پیپر پیش کرنا تھا جو بخیر و خوبی ہو گیا۔

کانفرنس کے سبھی شرکاء اطالوی کھانے کھاتے تھے جو قدرے مختلف تھا۔ گائے کا گوشت، مرغ اور مچھلی زیتون کے تیل میں بھنے ہوتے تھے جن پر نمک چھڑکا رہتا تھا۔ مسالوں سے دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ چاول روز ملتے تھے یہاں کے مخصوص کھانے پیزا، میکرونی اور پاستہ وغیرہ تھے۔ گوشت مشین کا کٹا ہوا ہوتا تھا جس میں ہڈی

نام کی کوئی چیز کبھی نظر نہیں آئی۔

ایک روز سلام صاحب کی سکریٹری نے اردو جاننے والا کو طلب کیا۔ اردو میں سائنس کی کسی کتاب کے لیے سلام صاحب ایک پیغام لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ سلام صاحب ایک پیراگراف انگریزی میں لکھ کر اپنی انگریز سکریٹری کو یہ کہہ کر دے گئے تھے کہ کسی علی گڑھ والے سے اس کا ترجمہ کرا کے بھیج دینا۔ اس ترجمے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ وہ ترجمہ یہ تھا:

"مجھے مکمل یقین ہے کہ امن، خصوصاً نیوکلیائی امن و امان جلد ہی قایم ہو سکے گا۔ درحقیقت انسانیت اس نیوکلیائی خطرے سے پوری طرح باخبر ہو چکی ہے اور عظیم طاقتوں کو بھی اس کا احساس ہو چکا ہے کہ اپنی حفاظت کی ضمانت کی حد سے زیادہ اسلحوں کا انبار لگانا کتنا فضول ہے۔ نیوکلیائی امن کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کم ازکم سو ارب ڈالر جو کہ عالمی اسلحوں پر خرچ کیے جا رہے ہیں ایک ہزار ارب کا دسواں حصہ ہے، انسانی فلاح و بہبود کے لیے مہیا کیا جا سکے گا۔ دنیا کے سیاست دانوں سے میری استدعا ہے کہ وہ کم ازکم اس سو ارب کا دسواں حصہ یعنی دس ارب ترقی پذیر ممالک کی امداد پر خرچ کریں جس میں سے ایک ارب انہیں ترقی پذیر ممالک میں سائنس اور تعلیمی ترقی پر خرچ کیا جائے۔ اگر یہ ممکن ہو سکا تو ایک انقلاب رونما ہوگا۔ میری تمنا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ میں تہ دل سے دعا گو ہوں کہ بنی نوع انسان کلی طور سے حقیقی امن و سکون سے ہمکنار ہو اور جس انقلاب کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں، وہ جلد ہی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئے۔"

کانفرنس میں "سائنس اور اسکی ترقی" کے موضوع پر لکچر بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک روز پاکستان کے نسیم احمد صاحب کا لکچر تھا۔ یہ بھٹو کے زمانے میں ڈنمارک میں سفیر رہے تھے۔ آج کل تیسری دنیا کی سائنس کی اکاڈمی کے مشیر کار ہیں۔ لکچر کے دوران انہوں نے

کہا کہ مسلمانوں میں سائنسی ترقی میں رکاوٹ کی سب سے بڑی وجہ روایتی
مذہب پرستوں کی بیجا دخل اندازی ہے۔ ان کی یہ بات سن کر کچھ شرکا بھڑک
اُٹھے مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔

نسیم صاحب نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں
سر سید نے ایم۔ اے۔ او کالج قایم کر کے سائنسی تعلیم پر زور دیا تو
مذہبی علماء کے ایک طبقے نے نہ صرف انہیں بُرا بھلا کہا بلکہ ان پر کافر اور
مرتد کا فتوی بھی عاید کر دیا۔

دوسری مثال انہوں نے سلیم آتا ترک کی دی جس کے زمانے میں
نئی نئی پرنٹنگ مشین آئی تھی۔ وہ اس مشین سے قرآن پاک چھپوانا چاہتا تھا
لیکن مذہبی لیڈروں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا۔ وہ نہ مانا اور
قرآن پاک چھپوالیا جس پر اس کے خلاف کفر کا فتوی دے کر اسے
قتل کرا دیا گیا۔

کراچی یونیورسٹی کے فزکس کے ہیڈ محمد رفیع صاحب نے بھی
اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ بہت پُر لطف آدمی تھے۔ ایک روز
باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ ارے بھئی! تم ہندوستانی ہم کو زندہ کیوں
نہیں رہنے دیتے۔ ذرا سی بندر بھبکیوں سے ڈر جاتے ہو کہ پاکستان
بم بنا رہا ہے۔ ہم لوگ تمہارے ڈر اور خوف سے یہ بھی نہ کہیں تو
کیا کریں!

سوئیڈن کے پروفیسر سوان برگ جو ہماری کانفرنس کے ڈائرکٹر
بھی تھے اور کبھی ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے، ایک روز رات
کے کھانے پر سارے ہندوستانیوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے
لگے۔ ان کو پہلے یہ بتایا گیا کہ ہم لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں
پہلے ہندو مذہب اور اس کے رسم و رواج پر بات ہوئی۔ جہیز کی رسم
پر بہت دل برداشتہ ہوئے۔ کہنے لگے کہ میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ اگر
اس قسم کی رسم ہمارے یہاں ہوتی تو میں بھی زندگی بھر پریشان رہتا۔
مگر اس بات سے ضرور متاثر ہوئے کہ شادی میں والدین کی مرضی شامل
حال رہتی ہے۔ چوں کہ ان کے ملک میں معاملہ مختلف ہے۔ بعد ازاں مسلم
خواتین زیر بحث آئیں۔ ایک غیر مسلم نے فوراً لقمہ دیا کہ اب تو مسلم پرسنل لا
بدل چکا ہے جس کے مطابق مسلم خواتین کے حقوق ان سے چھین لیے گئے ہیں

میں نے کہا، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ قانون تو ہمارے حق میں ہے
آپ اسے سمجھ نہیں پائے! پھر سوان برگ نے میری رائے پوچھا میں
نے بتایا کہ اسلام میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ نباہ نہ ہو
میں خواتین طلاق لے سکتی ہیں۔ لڑکیوں کو جہیز کم لانے پر جلانے
زیادہ تر اکثریتی طبقے میں ہے۔ یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوئے

میری ترکی روم پاٹنر پروین اری کان سیدھی اور پیاری
مسلم خاتون تھی۔ کوئی اسے فرانسیسی سمجھتا تھا اور کوئی اطالوی۔ اس کا
رہن سہن یورپین تھا۔ نماز پڑھنا نہیں جانتی تھی جس کا تصور وار
اپنے والدین کو ٹھہراتی تھی۔ ہاں! ہر روز صبح اٹھ کر "بسم اللہ
الرحمٰن الرحیم" پڑھنا اس کا معمول تھا۔ عربی زبان سیکھنے کی
حسرت تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ روزہ رکھتی ہے۔ اس کے ملک میں
کٹر سنی مسلمان کی حکومت ہے اور ۹۹٪ فیصد آبادی انہیں لوگوں
پر مشتمل ہے۔ شادی اسلامی طور طریقے سے ہوتی ہے۔ جہیز دیا جاتا
ہے جسے ترکی زبان میں چیز کہتے ہیں۔ لڑکی کی شادی میں خاندان کے
سب ہی افراد سونے کا زیور اسے تحفہ میں دیتے ہیں۔ چلتے وقت اس
نے کئی ہندوستانی شرکا، کو ترکی سے لائے ہوئے تحائف پیش کیے۔

۲۸ مارچ کو اطلاع ملی کہ رات کو دو بجے سب لوگ
اپنی اپنی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر لیں۔ ہم لوگوں کے لیے یہ چیز بڑی عجیب
تھی۔ مگر یہاں آفس کے اوقات میں تبدیلی کرنے کے بجائے گرمیوں
میں گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے اور جاڑوں میں ایک گھنٹہ آگے کر لی جاتی ہے۔

تری یستے:- یہ پورا شہر نصف دائرہ نما ہے جس کے
ایک طرف سمندر اور دوسری جانب
پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ یہ سمندر آبنائے (GULF) ہے جسے
(ADRIATICO SEA) کہتے ہیں۔ یہاں جاڑوں میں بہت تیز
اور برفیلی ہوا چلتی ہے جسے عرف عام میں بوراہ کہا جاتا ہے۔ اس ہوا
کی رفتار اکثر دو سو کلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جس وقت یہ ہوا چلتی ہے
آمد و رفت کا سلسلہ قطعی منقطع ہو جاتا ہے۔

اس شہر کی آبادی صرف دس لاکھ ہے۔ مکان چھوٹے مگر خوبصورت
ہوتے ہیں۔ جن کی چھتیں عموماً کھپریل کی بنی ہوتی ہیں۔ چودہ پندرہ منزل

...ہا عمارتیں نظر نہیں آتیں۔ کرایہ پر مکان ملنے میں کوئی دشواری
...ی۔ ان بلند و بالا عمارتوں میں رہنے والے ہر شخص کے پاس ایک
...ہوتا ہے جس کا اسپیکر دروازے پر لگا ہوتا ہے۔ گھنٹی بجنے
...ت میں اوپر سے ہی بذریعہ ٹیلی فون نام معلوم کرکے دروازے کا
...دبانے پر دروازہ کھل جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بجلی بھی جل جاتی
ہے۔ ایک خاص وقفہ بعد دروازہ اور بجلی از خود بند ہو جاتے ہیں۔

یہاں ہفتہ پانچ دن کا ہوتا ہے۔ سنیچر اتوار کو سارے ادارے
بند رہتے ہیں۔ بازار صبح ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک
اور پھر شام کو تین سے سات بجے تک کھلا رہتا ہے۔ بازار اتوار اور
...یر کو بند رہتا ہے۔ کہیں کہیں طباکچی کی دوکانیں کھلی مل جاتی ہیں جہاں
سے سگریٹ اور اخبار خریدے جاسکتے ہیں۔

ونڈو شاپنگ کا رواج عام ہے۔ عموماً فروخت ہونے والا
ہر سامان شوکیس کی زینت بنا رہتا ہے جس پر قیمت بھی لکھی رہتی ہے۔
ونڈو شاپنگ کے ذریعے پسند کرکے سامان خرید لیا جاتا ہے۔ اس
سے دوکاندار کا وقت ضایع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

شہر بھر میں نہ تو کوئی دوا کی دوکان نظر آئی اور نہ ہی کسی درزی
ہر عمر کے لوگوں کے لیے ریڈی میڈ کپڑے بآسانی مل جاتے ہیں۔
زیادہ تر دوکانوں کا کام خواتین نے سنبھال رکھا ہے جو عموماً
سیلز گرلز ہوتی ہیں جبکہ مرد فیٹ کار اور اسکوٹر کے کارخانوں
میں کام کرتے ہیں۔

شہر میں قدم قدم پر ہوٹل ہیں اور ہر ایک میں سیلف سروس
ہے۔ خواتین بھی گھر جانے کے بجائے دوپہر کا کھانا ہوٹلوں میں کھالیتی ہیں
مردوں سے زیادہ عورتیں سگریٹ نوشی کے میدان میں آگے ہیں۔ یہ
وقت اپنے کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔

یہاں کے لوگ دانستہ انگریزی بولنے سے احتراز کرتے ہیں
اب نئی نسل انگریزی پڑھ رہی ہے۔ بوڑھے لوگ انگریزی سے قطعی
نابلد ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے
ان کا ربط صرف لفٹ میں ہلو تک ہی محدود رہتا ہے۔ بوڑھے لوگوں
کی ذمہ داری حکومت نے سنبھال رکھی ہے۔

سڑک کے قوانین ہندوستان سے کچھ مختلف ہیں۔ یہاں
دائیں جانب گاڑیاں چلتی ہیں جن کی کم سے کم رفتار ۶۰ کلو میٹر ہوتی ہے
اس شہر میں افراد کم اور کاریں زیادہ نظر آتی ہیں۔ یہاں کا تناسب
گیارہ افراد پر ایک کار کا ہے جب کہ ہندوستان میں دو آدمیوں
پر ایک سائیکل کا۔

لوکل بسوں کے اوقات مقرر ہیں جو اپنے وقت پر ہی چلتی ہیں
اور صرف اسٹاپ پر ہی رکتی ہیں۔ راستے میں آپ انہیں کہیں نہیں
روک سکتے۔ بسوں میں تین دروازے ہوتے ہیں جنھیں ڈرائیور اپنی
جگہ پر بیٹھے بیٹھے بند کرتا اور کھولتا ہے۔ ڈرائیور کے لیے الگ کیبن ہوتا
ہے۔ بسوں میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا۔ پورے ماہ بسوں میں سفر
کرنے کا پاس ہوتا ہے جسے ریتے (RETE) کہتے ہیں۔ ریتے
نہ ہونے کی صورت میں بس کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ جو سڑک کے کنارے
سب مشینوں سے پانچ سو لیرا ڈال کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اکثر و
بیشتر ٹکٹ کی چیکنگ ہوتی ہے۔ ٹکٹ نہ ہونے کی صورت میں بیس
ہزار لیرا بطور فائن لیا جاتا ہے۔ اس ڈر سے ہر شخص بس میں ٹکٹ
لے کر ہی سوار ہوتا ہے۔ بس کے اندر ایک مشین لگی ہوتی ہے ٹکٹ
کو اس مشین میں ڈال کر (PUNCH) کرتے ہیں جس کی اطلاع ڈرائیور
کو سرخ رنگ کی روشنی سے ہو جاتی ہے۔ پورے شہر میں ایک بس
بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کا شیشہ چٹخا یا ٹوٹا ہوا ہو۔ بسوں میں
بیٹھنے کے لیے سیٹیں کم ہوتی ہیں۔ اور ہر بس میں کچھ نشستیں معذور لوگوں
کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ سنیچر اور اتوار (WEEK END) کو
بسوں کے اوقات بدل جاتے ہیں اور کچھ کا سرے سے راستہ ہی تبدیل
ہو جاتا ہے۔ یہ چیز غیر ملکیوں کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

عموماً شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں مگر کہیں کہیں تنگ بھی ہیں۔ پتلی
سڑکوں پر موٹریں صرف آتی یا جاتی ہیں جب کہ کشادہ سڑکوں پر
آمد و رفت دونوں کا انتظام ہے۔ کاریں سڑک کے دونوں جانب
پارک کی جاتی ہیں۔ رات میں کاریں سڑک کے کنارے ہی کھڑی رہتی
ہیں کیوں کہ چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آتے
ہیں۔ —

یہاں کے باوردی پولس والے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ زیب تن کیے موٹر سائیکلوں پر پورے شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کسی حادثے یا واقعے کی اطلاع ملتے ہی دو منٹ کے اندر پولس جائے واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ اس موقع پر پولس کی گاڑی آمد و رفت کے قوانین کی پروا کیے بغیر زوں زوں کی صدا بلند کرتی ہوئی اسی انداز سے جاتی ہے جس طرح ہندوستان میں آگ بجھانے والی گاڑی۔

مارچ اپریل میں ہر سمت یہاں خزاں رسیدہ درخت ہی نظر آتے ہیں۔ بعد ازاں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ موسم گرما میں یہاں کے لوگوں کا محبوب مشغلہ کشتی رانی ہے۔ بیشتر لوگوں کی اپنی کشتیاں ہوتی ہیں، جنھیں یہ کار کے پیچھے ٹرالی میں رکھ کر گھر لے جاتے ہیں۔ ہر کشتی میں وائرلیس لگا ہوتا ہے تاکہ وقتِ ضرورت پولس کی امداد لی جا سکے۔

پرندوں میں (SEA GULLS) سمندر کے پانی پر بیٹھی ہوئی ہر طرف نظر آتی ہیں۔ سردی کے باعث کوّے بالکل نہیں پائے جاتے کبوتر، بلیاں اور انواع و اقسام کے کتے ہر طرف دوڑتے نظر آتے ہیں۔ لوگ ان جانوروں کو بڑے شوق سے پالتے ہیں۔

ایک روز علی الصباح چار پانچ سو لوگ سائیکلوں پر دوڑتے نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج (SUNNY DAY) ہے۔ سمندر کے کنارے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ گو باہر اب بھی کوٹ پہننے کی ضرورت تھی۔ کچھ لوگ نیم برہنہ سمندر کے کنارے بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے اور کچھ کشتیوں پر سیر کر رہے تھے۔ شام کی گہما گہمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں ذرا سی دیر میں سڑکوں پر سناٹا ہو جاتا تھا وہاں آج چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بھیڑ دیکھ کر فوراً اسپیشل بسیں چلائی گئیں اور پولس کا گشت لگاتار ہوتا رہا۔

یہاں کے لوگ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ کوڑا ہمیشہ کوڑے دان میں پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ ایک روز ہم لوگ ایک پارک میں گھومنے گئے۔ لوٹتے وقت ذرا سی دیر ہو گئی۔ دیکھا گیٹ بند ہو چکا ہے۔ بشکل تمام وہاں کی صفائی کرنے والی نے گیٹ کھول تو دیا مگر بار بار ہاتھ کے اشارے سے یہ جتاتی رہی کہ پارک ٹھیک نو بجے بند ہو جایا کرتا ہے۔ رکھتی ہے رتی میں

سینٹر کے قیام کے بعد سے یہاں غیر ملکی سائنس داں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس لیے لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ شہر جلد ہی 'سائنس شہر' کے نام سے شہرت اختیار کر لے گا۔

مشہور مقامات :-

یہاں کا مشہور چرچ سینٹ جسٹس (St. Justo) ہے۔ یہیں ایک قلعہ بھی ہے جو کسی بھی ہندوستانی قلعہ کے سامنے بچہ نظر آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ علاقہ جرمن فوجوں نے مسمار کر دیا تھا۔ ایک مجسمہ ہے جس میں چار افراد ایک آدمی کو پچھاڑ کر مختلف ہتھیاروں سے مارنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہاں سے سارا تریسٹ صاف نظر آتا ہے۔

سب سے اونچی پہاڑی پر واقع بی بی مریم کی چرچ (Monument) جس کا ڈیزائن ہرگتی میدان میں بنے ہوئے (Hall of Nations) کے مشابہ ہے۔

یہاں کا میرا مارے (MIRA MARE) پارک کافی بڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ جس میں جگہ جگہ کانسے کے مجسمے نصب ہیں، ہر طرف صفائی اور باقاعدگی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ سات توپیں رکھی ہیں جن پر ۱۸۶۰ء کندہ ہے۔ ہر توپ اسی زمانے کی بنی ہوئی لکڑی کی گاڑی پر رکھی ہے۔ یہ توپیں ہر سمت موڑی جا سکتی ہیں۔

اس پارک سے ملحق میرا مارے محل ہے۔ سمندر کے کنارے بنا ہوا یہ محل ۱۸۷۰ء میں چودہ سال کے عرصے میں بن کر تیار ہوا تھا۔

تریسٹ سے دس کلومیٹر دور گروتا جیگانتے (Grotta Gigante) نامی غار سیاحوں کی کشش کا خاص مرکز ہے۔ اس کی معلومات ۱۸۴۰ء میں ہوئی تھی لیکن ۱۹۰۸ء سے یہ عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ یہ تقریباً ۳۰۰ فٹ گہرا، ۹۰۰ فٹ لمبا اور ۲۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ ۵۱۲ پتھر کی سیڑھیاں طے کر کے اس کے نشیب میں پہنچا جا سکتا ہے۔ اس غار کی خصوصیت یہ ہے

کہ پورے سال اس کا درجہ حرارت ۱۲° سیلسیس رہتا ہے۔
لہذا بین الاقوامی اہمیت کے حامل آلات زلزلہ پیما (Seismographs)
اور پیمائش ارض سے متعلق ثلکن (Geodetical Pendulum)
لگائے گئے ہیں۔ جن سے شعبہ طبقات الارض کے لوگ فیض یاب
ہوتے ہیں۔ اس کی چٹانوں میں لوہا اور فارفورس وافر مقدار میں
موجود ہے۔ یہ غار ایک دریا کی دین ہے جو برسہا برس بہنے
کے بعد زمین کے اندر چلی گئی تھی اور ۴۰ کلو میٹر دور جا کر پھر نکلی
ہے۔ پہلے غار کو ٹارچ سے دکھانے کا انتظام تھا لیکن اب جگہ جگہ
بجلی کے قمقمے لگا دیے گئے ہیں۔

تری یستے سے ملحق ایک گاؤں ہے جو مُجیا گاؤں
(Muggia Village) کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں حضرت
عیسیٰؑ کا چرچ ہے۔ جس وقت ہم لوگ چرچ میں داخل ہوئے۔ دعا
ہو رہی تھی اور پادری کوئی چیز پھونک پھونک کر ہر شخص کے منہ میں
رکھ رہا تھا۔ پروین نے بتایا کہ یہ شراب میں ڈبل روٹی کا ٹکڑا
بھگو کر سب کو کھلا رہا ہے۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ شراب حضرت
عیسیٰؑ کا خون اور روٹی ان کا جسم ہے۔ اس لیے یہ دونوں چیزیں
ایک ساتھ کھلائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کچھ
بیٹھے تھے، کچھ آ رہے تھے، کچھ جا رہے تھے اور دعا چل رہی تھی۔ دعا ختم ہوئی تو
گانا شروع ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے ہماری طرف سرسری نگاہ ڈالی اور
اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

تری یستے میں چلنے والی ٹرام ہم لوگوں کے لیے نئی چیز تھی۔ یہ
بلندی پر واقع پہاڑی علاقے اوپی چینا تک جاتی ہے۔ یہ سائز
اور شکل میں بس جیسی ہوتی ہے لیکن یہ بجلی کے ذریعے ریل کی پٹری پر
چلتی ہے۔ اس کے دونوں جانب انجن لگے ہوتے ہیں۔ رسی کی مدد
سے بیک وقت ایک ٹرام اتاری اور دوسری چڑھائی جاتی ہے
اترتے وقت ٹرام اتنی ٹیڑھی ہو جاتی ہے کہ سطح زمین سے ۲۵° . ۳۰°
کا زاویہ بن جاتا ہے۔

تری یستے میں چھوٹا سا مچھلیوں کا عجائب گھر بھی ہے جس میں
عجیب و غریب قسم کی مچھلیاں تھیں۔ تین مچھلیاں شکل و صورت میں
سانپ کے مانند تھیں۔ ان میں اور سانپ میں تفریق صرف اس طرح ہو سکی
کہ ان کے زبان نہیں تھی۔ کچھ مچھلیوں پر پھول کا شبہ ہوتا تھا۔ ایک
جگہ کچھ گھونگھے رکھے ہوئے تھے۔ چشم زدن میں وہ ہلے اور پھر چلنا
شروع ہو گئے۔ گویا وہ بھی مچھلیاں تھیں۔ یہاں ایک جوڑا پنگئین کا
بھی موجود ہے۔ جسے لوگ بڑے اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ
یہ ٹھنڈا علاقہ ہے۔ اس لیے پنگئین بہت اطمینان سے یہاں رہ
رہی ہیں۔

وینس:- ایک روز سینٹر کی جانب سے وینس گھومنے
کے لیے بس کا انتظام کر دیا گیا۔ وقت مقررہ
پر بس آئی۔ بس کیا تھی۔ بس بس ہی تھی۔ اس کا دروازہ ہوائی
جہاز کی طرح کھلا۔ اندر داخل ہوئے تو جہاز کی مانند سیٹیں
اور اسی طرح مائیکروفون لگے ہوئے تھے۔ ہر شخص بس کو حیرت
سے دیکھ رہا تھا۔ پروین نے بتایا کہ اس قسم کی بسیں ترکی میں بھی
چلتی ہیں۔ انہیں جمبو سٹیرا کہتے ہیں۔ ان میں ڈرائیور کے لیے نیچے
کیبن ہوتا ہے اور اوپر صرف مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ۔ بس
ہر طرف سے بند، ایرکنڈیشنڈ اور جب چلنا شروع ہوئی تو
مزہ آ گیا۔ ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ دو گھنٹے میں سر کر کے ہم
لوگ ایک پل سے گزرے جو سمندر کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس
پل کی چوڑائی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے، کہ اس پر سے
ایک ساتھ چار موٹریں اور چار ریل گاڑیاں گزر سکتی ہیں۔ کچھ
دور جا کر بس رک گئی۔ پھر اسٹیمر میں بیٹھے۔ کافی دیر اسٹیمر کا لطف
اُٹھانے کے بعد ہم لوگ وینس پہنچ گئے۔

یہ پورا شہر سمندر کے اوپر واقع ہے۔ ۶۰۰ء دراز
قبل یہاں ۱۱۸ چھوٹے چھوٹے جزائر تھے جنھیں نہروں اور پلوں
کی مدد سے ایک دوسرے سے جوڑ کر تین بڑے بڑے جزیرے
بنا لیے ہیں۔ کچھ جزیرے اب بھی ویران پڑے ہیں جہاں سوائے
جنگل کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک جزیرے سے دوسرے
جزیرے تک جانے کے لیے موٹر بوٹ، اسٹیمر، کشتیاں اور
جہاز چلتے ہیں۔ اسٹیمر کو یہاں ٹیکسی کہتے ہیں۔ کیوں کہ آمد و رفت

ں واحد ذریعہ یہی ہے۔

جزیرے کے اندر ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جانے
ے چھوٹی چھوٹی کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں گنڈولہ کہتے
۔ یہ کشمیر کے شکارے کے مانند ہوتی ہیں۔ یہاں کی تقریباً ہر
ت پانی میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ تین یا چار منزلہ یہ عمارتیں پانی کے
لکڑی ڈال کر غالباً لوہے کے شہتیروں پر قایم ہیں۔ یہاں
شہور عمارات میں ڈکل محل (Ducal Palace) اور
ینٹ مارکو (Saint Marco) قابل دید ہیں۔

ڈکل محل میں بہت باریک نقاشی کی گئی ہے۔ اس کے تہلے
ے دردور تک چلے گئے ہیں۔ یہ محل آمنے سامنے ایک جیسا بنا
ہے اور فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے صحن میں کبوتروں کا
نڈ سیاحوں کو دانہ کھلانے پر مجبور کیے بغیر نہیں رہتا۔

سینٹ مارکو ایک چرچ ہے جس کی چھت پر سونے کے
نی سے مختلف تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ یہ سونے کا پانی ۴۰۰۰
ربع گز کے رقبے میں کیا گیا ہے جسے پورا ہونے میں کئی سو برس
ل گئے تھے۔

ڈکل محل کے قریب ایک جیل خانہ ہے۔ تقریباً ۸۰۰ سال
بل کچھ قیدی بذریعہ ایک پل اس میں لائے گئے تھے جنھوں نے
بہت آہ و فغاں کی تھی۔ جب سے اس پل کا نام "آہ و فغاں پل"
رکھ دیا گیا ہے۔ اس سے آگے اطالوی موسیقار انٹونیو ویوالدی
(ANTONIO VIVALDI) کا محل ہے جو کلاسیکی موسیقی کا مانا
ہوا استاد تھا۔ یہاں سے آگے جایئے تو بہت بڑی نہر نظر آتی
ہے جسے ریالٹو نہر اور اس پر تعمیر سترہ پل کو ریالٹو پل کہتے ہیں
یہ پل کافی پرانا مگر دل کش ہے یہاں سے راستہ بازار کی طرف
جاتا ہے۔ بازار ہر طرف زیورات سے آراستہ و پیراستہ نظر آتے
ہیں۔ یہ زیورات مورینہ گلاس کے بنے ہوتے ہیں جو اس شہر کا
مخصوص تحفہ ہے۔

وینس بہت بڑا سیاحی مرکز ہے۔ اس لیے ہر جگہ
ہوٹل اور ریسٹورانٹ نظر آتے ہیں۔ یہاں کا بندرگاہ بھی بہت
پرانا ہے۔ رات میں وینس کی خوب صورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے
جھلملاتے برقی قمقموں کا پانی میں دور تک عکس اس کی خوبصورتی میں
چار چاند لگا دیتا ہے۔

ایک مہینہ لکھنے پڑھنے، لیکچر سننے، گھومنے اور تفریح کرنے
کے بعد ہم لوگوں نے (ICTP) کو خیر باد کہا۔ نہ جانے کتنے سائنس
داں روزانہ یہاں آتے ہیں اور یہاں سے فیض یاب ہو کر واپس
جاتے ہیں اور یہ سب ایک واحد شخص پروفیسر عبدالسلام
کی بدولت ہے جن کا اطالوی عوام لوہا مانتے ہیں۔ سینٹر کا
قیام تیسری دنیا کے ممالک کے لیے عموماً اور مسلم سائنس دانوں
کے لیے خصوصاً ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس قسم
کے مراکز مسلم ممالک میں بھی قایم ہوتے۔ شارجہ کے شیخ کرکٹ
پر پانی کی طرح روپیہ بہا سکتے ہیں۔ ایران و عراق اپنے زعم میں
ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کاش
یہ لوگ عبدالسلام صاحب سے کچھ سبق حاصل کر سکتے۔ ہم
لوگوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پروفیسر عبدالسلام کو اٹلی
میں جو عزت و توقیر اور ان کے سینٹر کو جو عظمت بخشی ہے وہ رہتی
دنیا تک قایم رہے۔ آمین۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اور جھوٹے بولنے سے ہمیشہ
بچے رہو کیونکہ جھوٹ بولنے کی
عادت بدی کی راہ دکھاتی ھے
اور بدی دوزخ تک پہنچاتی
ھے۔"

(متفق علیہ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۷ء)

مسلم فرسٹ ڈویژن پانچ گنی

بیگم نصرت شیروانی

یو۔پی کے بائیس مسلم گرلز اداروں (بارہ انٹر کالجوں اور دس اسکولوں) سے ملاکر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء میں دو ہزار اٹھاسی طالبات شریک ہوئیں۔ ایک ہزار پانچ سو نواسی یعنی چھہتر فیصد پاس ہوئیں اور دو سو دس یعنی دس فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ ان مسلم اداروں کے ٹوٹل نتائج تو اچھے ہی کہے جائیں گے۔

ہم نے ان میں سے مسلم طالبات کے نتائج الگ کرکے اس کا موازنہ غیر مسلم طالبات کے نتائج سے کیا ہے۔ چارٹ ملاحظہ فرمائیے۔ مسلم طالبات چھہتر فیصد پاس۔ غیر مسلم طالبات اکیاسی فیصد پاس۔ ایک ہزار سات سو اٹھائیس مسلم طالبات میں سے ایک سو چالیس یعنی آٹھ فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ دوسری طرف تین سو ساٹھ غیر مسلم طالبات میں سے ستر یعنی انیس فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں گویا دونوں اعتبار سے مسلم طالبات کا مجموعی رزلٹ اپنی غیر مسلم ہم جماعتوں سے کمتر رہا۔ خاص کر فرسٹ ڈویژن کے تناسب کے معاملے میں یہ فرق بہت نمایاں ہے۔

اب یہ ان اداروں کے ذمہ داران اور خاص کر مسلم طالبات اور ان کے والدین کے سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے اپنے ہی اداروں میں مسلم طالبات پیچھے کیوں رہیں؟ سات ادارے (پانچ اسکول اور دو کالج) ایسے ہیں جہاں سے صرف مسلم طالبات نے بورڈ امتحان دیا۔ ان سب سے ملاکر پانچ سو ستر مسلم طالبات شریک ہوئیں۔ چار سو چودہ یعنی تہتر فیصد پاس ہوئیں اور چھتیس یعنی چھ فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ ایک اسکول سے صرف غیر مسلم طالبات شریک ہوئیں اور کوئی مسلم طالبہ شریک نہیں ہوئی۔ اس کا نام ہے رفیع میموریل ہائر سکنڈری اسکول مسولی ضلع بارہ بنکی۔

باقی چودہ اداروں (چار اسکولوں اور دس کالجوں) سے ملاکر ایک ہزار ایک سو اکسٹھ مسلم طالبات شریک۔ آٹھ سو چوراسی یعنی چھہتر فیصد پاس اور ایک سو چار یعنی نو فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ گویا بحیثیت مجموعی ان اداروں میں مسلم طالبات کے نتائج کچھ بہتر نظر آتے ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم طالبات دونوں ساتھ پڑھتی ہیں۔ جن اداروں میں صرف مسلم طالبات پڑھتی ہیں ان کے نتائج کچھ کمتر ہیں۔

یہ بات مجموعی طور پر صحیح ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر ایک ادارے پر پوری طرح صادق آتی ہو۔ مثلاً خالص مسلم اداروں میں سے پہلے پانچ کا رزلٹ اسی فیصد پاس سے زیادہ ہے۔ یعنی مکسڈ اداروں کے اوسط سے بہتر ہے۔ پہلے دو میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب بھی اوسط سے بہتر ہے۔ گویا کوئی ضروری نہیں کہ خالص مسلم اداروں کا رزلٹ مکسڈ اداروں سے کمتر ہی ہو۔ کسی کا بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ خالص مسلم اداروں کا مجموعی رزلٹ مکسڈ اداروں کے مجموعی رزلٹ سے کمتر نظر آیا۔ یہ حقیقت پیش کردی۔

۱۹۷۶ء میں بارہ [۱۲] مسلم گرلز انٹر کالجوں سے ملاکر ہائی اسکول بورڈ امتحان میں اکیس [۲۱] مسلم طالبات نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ ۱۹۸۷ء میں ۱۰۰ مسلم طالبات نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ یعنی تعداد قریب پانچ گنی ہوگئی۔ دس مسلم گرلز ہائی اسکولوں میں سے تین ایسے ہیں جو ۱۹۷۶ء میں بھی ہائی اسکول تھے اور تب ان تین میں سے ملاکر صرف تین عدد مسلم طالبات فرسٹ ڈویژن لائی تھیں (عائشہ رشید اسکول سے دو، منی گنج اسکول سے ایک اور رفیع میموریل اسکول سے صفر) اس سال یعنی ۱۹۸۷ء میں ان ہی اداروں سے ملاکر اٹھارہ مسلم طالبات فرسٹ ڈویژن لائی ہیں۔ یعنی تعداد چھ گنی ہوگئی۔ ان کے علاوہ باقی سات نئے مسلم گرلز

ہائی اسکولوں سے ملاکر بائیس مسلم طالبات فرسٹ ڈویژن لائی ہیں۔ اس طرح کل تعداد ایک سو ۱۴۰ چالیس ہوگئی۔

یوپی کے بائیس گرلز اداروں میں موازنہ

ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء

مسلم						غیر مسلم			
شریک	پاس	فیصد	فرسٹ	ادارہ کا نام - مقام	ضلع	شریک	پاس	فیصد	فرسٹ
۲۰	۱۹	پچانوے	۵	محمدیہ بنکر	کانپور	—	—	—	—
۱۳۹	۱۱۸	پچاسی	۱۹	انڈسٹریل	سہارنپور	—	—	—	—
۴۱	۳۴	تراسی	۳	عالیہ - مئوناتھ بھنجن -	اعظم گڑھ	—	—	—	—
۳۳	۲۷	بیاسی	۱	نجیب الدولہ نجیب آباد	بجنور	—	—	—	—
۵۵	۴۴	اسی	۲	مسلم نسواں	سیتاپور	—	—	—	—
۳۵	۲۲	ترسٹھ	—	رحمانیہ چاندپور	بجنور	—	—	—	—
۲۴۴	۱۵۰	اکسٹھ	۶	عبدالسلام مسلم	مرادآباد	—	—	—	—
—	—	—	—	رفیع میموریل - مسولی	بارہ بنکی	۱۲	۱۲	سو	۷
۳۵	۳۵	سو	۱۲	عائشہ رشید - لار	دیوریہ	۱۵	۱۵	سو	۵
۲۱	۲۱	سو	۱۱	فتح پور	اعظم گڑھ	۲۵	۲۵	سو	۵
۲۵	۲۵	سو	۲	مفتی گنج	لکھنؤ	۱۲	۱۱	بانوے	۶
۳۲	۳۱	ستانوے	۸	قدوائی میموریل	الہ آباد	۶۶	۶۴	ستانوے	۲۵
۹۴	۸۴	نواسی	۱۵	اسماعیل نیشنل	میرٹھ	۲۴	۲۳	پچانوے	۱۱
۲۴۱	۲۱۵	نواسی	۱۷	حمیدیہ	الہ آباد	۴	۳	پچھتر	—
۶۰	۵۳	اٹھاسی	۱۰	آل احمد امروہہ	مرادآباد	۱	—	صفر	—
۴۷	۴۱	ستاسی	۷	نسواں	اعظم گڑھ	۳	۳	سو	۱
۴۰	۳۳	تراسی	۵	بیگم خیر	بستی	۹۸	۸۴	چھیاسی	۹
۲۳۲	۱۸۶	اسی	۶	مسلم جوبلی	کانپور	۲	۱	پچاس	—
۲۳	۱۸	اٹھتہر	—	قدوائی انجان شہید	اعظم گڑھ	۴	۲	پچاس	—
۵۵	۴۱	پچھتر	۲	ابوالکلام آزاد کھیری	لکھیم پور	۲۹	۲۲	پچھتر	—
۸۲	۴۸	چھپن	۳	ساجدہ	جون پور	۲۵	۱۵	ساٹھ	۱
۱۷۰	۵۳	اکتیس	۲	نیشنل	شاہ جہاں پور	۴۰	۱۱	اٹھائیس	—
۱۶۲۸	۱۲۹۸	پچھتر	۱۴۰	بائیس کا ٹوٹل		۳۶۰	۲۹۱	اکیاسی	۷۰

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۷ء)

فلکیات کی ابتدائی منزلیں

عبدالقیوم

انسان اپنے ابتدائی زمانے سے ہی چاند سورج اور ر
روں کو متحیر اور دہشت بھری نظروں سے دیکھتا چلا آرہا ہے
ر خالق کائنات کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا ہے۔ ابتدا میں
ند اور سورج کو ہی خالق کائنات مانا گیا۔ لیکن انسانی ذہن میں
شیدہ قوت تجسس نے کبھی بھی انسان کی حیثیت خاموش تماشائی
ی نہیں رکھی۔ کھوج، تحقیق اور تجسس جیسی صلاحیتوں کے باعث ہی
ج انسان کرۂ ارض سے چھلانگ لگا کر ابتدائی معبود چاند پر پہنچ چکا
ہے اور دوسرے سیاروں پر پہنچنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

انسانی فطرت نے کبھی بھی تحقیقات کو اپنی ضروریات سے الگ
نہیں رکھا۔ قدیم تہذیب میں علم ہیئت کو عملی حیثیت حاصل تھی۔ سب
سے پہلے مصری مذہبی رہنماؤں نے جو کیلنڈر تیار کیا اس کا خاص مقصد
دریائے نیل میں آنے والے سیلاب کی پیشین گوئی کرنا تھا۔ کیونکہ
مصر کی معیشت اسی سیلاب سے جڑی ہوئی تھی۔ چین کے پاس بھی
اس وقت قابل اعتماد کیلنڈر موجود تھا۔ مزید چین میں اس وقت
دم دار تاروں اور گرہن کے ریکارڈ بھی موجود تھے۔ اس وقت چین
میں یہ عام تصور پایا جاتا تھا کہ سورج گرہن اس وقت ہوتا ہے جب
کہ بھوکا اژدہا اسے نگلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ۵۰۰ قبل مسیح کے پہلے
کے زیادہ تر فلکی اہم واقعات چین کے پاس موجود ہیں۔ مثال کے طور پر
۲۱۳۶ قبل مسیح سورج گرہن اور ۳۸۰۰ قبل مسیح بیبی لونین
(BABY LONIAN) علم ہیئت کی تاریخ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے ستاروں کو مختلف گروپ
یا جھرمٹ میں کس نے بانٹا اور پلانٹ یا سیاروں کو ستاروں سے
الگ کس نے محسوس کیا لیکن یہ واضح ہے کہ تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح چین، مصر
ہندوستان اور میسوپوٹامیا (Mesopotamia) میں ستاروں
کے مختلف نقشے موجود تھے لیکن موجودہ ستاروں کے جھرمٹ کا نظام
جو رائج ہے وہ یونانی ہے۔ حالاں کہ ستاروں کے بارے میں اس
وقت لوگوں کا علم بالکل محدود تھا۔ ستاروں کو اس وقت صرف
ٹھوس گولے میں جڑا چمکتا ہوا نقطہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ کافی حیرت ناک
بات ہے کہ دنیا کا مشہور ہرم (Great Pyramid)
جو کہ فرح کی چوتھی پیڑھی کی قبر ہے اور ۷۵۰۰ مربع فٹ رقبہ پر مشتمل
ہے اس طرح بنایا گیا ہے کہ آج بھی قطب تارہ کی طرف نشاندہی کرتا
ہے۔ حالاں کہ ہرم کی شروعات ۲۵۰۰ قبل مسیح ہوئی تھی۔ اس وقت
لوگوں کو قطب تارے کے بارے میں صحیح علم بھی نہیں تھا۔

روزمرہ کے مشاہدات اور فکری نظریات کو یکجا کرنے کی سب
سے پہلے سنجیدہ کوشش یونانی فلسفیوں نے کی۔ جس کے نتیجے میں آفتاب
علوم و فنون سب سے پہلے قدیم یونانی سرزمین پر چمکا جس کی روشنی
سے سارا جہاں جگمگا اٹھا۔ یونانی فلسفیوں نے تقریباً ۸۰۰ سال
تک (Thales کی پیدائش ۶۲۴ قبل مسیح سے Ptolemy
کی موت ۱۸۰ عیسوی تک) علوم و فنون میں دنیا کی رہنمائی کی۔

زمین کے بارے میں سب سے پہلا نظریہ (Thales) کا ہے
اس نے دنیا کو چپٹا اور کائنات کا مرکز تصور کیا۔ اس کے نظریے
میں یونانی فوقیت کی جھلک ملتی ہے۔ کیوں کہ اس نے یونان کو

چپٹی دنیا کا اوپری حصہ تصور کیا۔ جہاں سے وہ سارے کائنات
کو دیکھ سکتا تھا اور بقیہ انسانی نسلوں کو زمین کے دوسرے حصوں
کی طرف رکھا۔ اسی دور میں بے بی لونین (Babylonian) تصور
بھی دنیا کا ملتا ہے جس کے مطابق کائنات ایک پیالہ نما شکل میں ہے
اور زمین ہموار سطح کی شکل میں کائنات کے ایک کنارے معلق ہے جہاں
سے ساری کائنات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

دنیا کے چپٹے ہونے کا تصور ارسطو (Aristotle
۳۲۵ - ۳۸۴ قبل مسیح) نے سب سے پہلے اپنے منطقی انداز سے
رد کیا تھا۔ اس نے ثابت کیا کہ اگر دنیا چپٹی ہے تو جو تارے اسکندریہ
سے نظر آ رہے ہیں وہ دوسرے شمالی حصے (Athens) سے بھی نظر
آئیں گے جب کہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ دوسری دلیل جو پیش کی گئی وہ چاند
گرہن کے مشاہدات پر مبنی تھی۔ چاند گرہن کے دوران دنیا کی چاند
پر پڑنے والی پرچھائیں کی گولائی سے یہ ثابت کیا گیا کہ دنیا چپٹی
نہیں ہے۔ عام خیالات میں اور فکری نظریات میں بھی دنیا کو کائنات
کا مرکز ہونے کا افتخار حاصل تھا۔ اس کو اس حیثیت سے معزول
کرنے کی سب سے پہلی کوشش (Aristarcus of Samos)
نے ۲۸۰ قبل مسیح کی تھی لیکن ناکامی ہاتھ لگی۔ اس نے سورج کو مرکز
مانا اور زمین کو سورج کے چاروں طرف گھومنے کا تصور پیش کیا لیکن
کسی کی بھی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی اختیار کر لی۔
Anaxagoras نے اسی دوران سورج کو یونان کے -Pelo
ponneese سے بڑا لال گرم پتھر ہونے کی تعلیم دی۔ جس کی
وجہ سے اس پر عدم اتفاق کا جرم ماند ہوا اور اس کو سزائے موت
کے بجائے ملک بدر کر دیا گیا۔ Aristotle کے دنیا گول ہونے
کے تصور کو لوگوں نے ماننے سے انکار کیا لیکن Eratosthenes
(of Cyrene ۲۰۰ قبل مسیح) نے سب سے پہلے دنیا کو
گول مانتے ہوئے اس کا قطر نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے چھڑی کی
پرچھائیں کی مدد سے اسکندریہ اور Cyrene میں تجربہ کیا اور
زمین کا قطر کافی حد تک صحیح نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے
معلوم کیے ہوئے قطر کی ناپ کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں استعمال کیے
ہوئے قطر سے زیادہ صحیح تھی۔ اسی زمانے میں فلکیات پر کافی کام
ہوا لیکن Hipparcus of Nicaea کا کام قابل ذکر
ہے۔ اس نے ۱۳۰ قبل مسیح گرہن پر کام کیا اور اس کی تشریح کرنے
کی کوشش کی۔ اس نے سیاروں کی حرکت پر بھی تفصیلی کام کیا اور
۸۵۰ تاروں کی ایک فہرست بھی تیار کی۔ اسی نے قطب تارہ کے
مقام میں تبدیلی کو بھی محسوس کیا جسے ہم آج Precession کہتے ہیں۔

اس عہد رفتہ کا سب سے ذہین اور مشہور فلسفی اسکندریہ
کا Ptolemy (۱۲۰-۱۸۰ء) تھا جس نے کائنات کے نظام کو
پائے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ نظام اسی کے نام سے
مشہور ہوا اور تقریباً ۱۸۰۰ سال کے بعد بھی ہندو کیلنڈر
کی شکل میں رائج ہے۔ یہ نظام Ptolemy کی موت کے
۱۴۰۰ سال بعد تک مسلم حقیقت تھا۔ لیکن سترھویں صدی میں غلط
ثابت کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی یہ اپنی جگہ اتنا مکمل ہے کہ اس نظام
کے ذریعے بھی دنیا کے بیشتر اہم واقعات کی نشاندہی صحیح طور پر کی
جا سکتی ہے لیکن اس نظام کے ذریعہ اندازہ حساب کافی مشکل
ہوتا ہے۔

آپ اگر چاند سورج اور دیگر پلانٹ کے طلوع و غروب
اور حرکت پر غور کریں تو ایسا ظاہر ہوگا کہ سورج کے علاوہ بقیہ سبھی
شروع میں پچھم سے پورب کی طرف اور پھر پورب سے پچھم کی طرف
چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پیچیدہ حرکت کا حل Ptolemy
نے خوش اسلوبی سے دیا۔ اس کے نظام میں زمین رکی ہوئی حالت
میں کائنات کا مرکز تصور کی گئی اور سورج، چاند اور دیگر پلانٹ
کو زمین کے چاروں طرف اپنے اپنے مدار میں حرکت میں مانا گیا۔ مدار
کی تشکیل ان کی دوری کے مطابق کی گئی۔ سب سے نزدیک چاند پھر
عطارد، زہرہ، سورج، مریخ، مشتری اور زحل کو رکھا گیا۔
اس کے آگے تاروں کو ایک گولے میں جڑا ہوا مانا گیا۔ یہ نظام
سات آسمان کا تصور بھی تھا۔ Ptolemy نے چاند، سورج
اور دیگر سیاروں کی حرکت کو دو حرکتوں کا مجموعہ قرار دیا۔ اس
کے مطابق یہ سبھی الگ الگ ایک چھوٹے سے دائرے میں ایک

رلز کے چاروں طرف، جو کہ خاص مدار پر ہر وقت رہتا ہے Epicycle
ہا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خاص مرکز Deferent
مدار میں زمین کے چاروں طرف چکر لگا رہے ہیں۔ یونانی فلسفیوں
وششیں ہم لوگوں تک یونانی کاموں کا عربی ترجمہ 'المجسطی' کے
ے پہنچی ہیں۔

Ptolemy کی موت کے بعد قابل ذکر کام ہندوستان
رف Arya Bhat ۴۷۶ء کا ہے۔ اس نے سب سے پہلے
ریہ پیش کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ جیسا کہ ظاہر
ہے کہ Ptolemy کے بعد کافی عرصے تک خاموشی رہی
موشی سائنس کی دنیا میں ایک نئے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئی
ین صدی میں اسلام کے ظہور نے بالکل نقشہ ہی بدل دیا۔ یونانی
ہ کو شکست دینے اور موجودہ سائنس کے آغاز میں عرب کے خیالی
اب کا سب سے بڑا دخل ہے۔ کائنات پر غور کرنے اور سمجھنے
لیے قرآنی آیتیں متحرک ثابت ہوئیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ کلام
ـیں ۲۵۰ آیتیں صرف ایسی ہیں جو کہ قانون سازی کے متعلق ہیں
راس کے مقابلے میں ۷۵۰ آیات ہیں، جو کہ قرآن کے آٹھویں حصے
برابر ہے، اللہ جلّ شانہٗ نے بار بار یہ ہدایت کی ہے کہ ہم
ـ کائنات کے بارے میں سوچیں، غور کریں اور اس کو سمجھنے اور
ئنات کے راز کو فاش کرنے میں اپنی کوششوں کو صرف کریں
ام پاک میں اللہ نے علم الیقین کے ذریعے یہ تنبیہ کی ہے
ہم کائنات کا گہرا مطالعہ کریں۔ کیوں کہ کائنات مثل آئینہ ہے جس
ہم خالق کائنات کو دیکھ سکتے ہیں جس کے لیے روشنی کا کام
رآن کرے گا۔

یہاں پر چند آیتیں کلام پاک سے منقول ہیں جن کو پڑھ
ر ہم بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ آیتیں کس حد تک عرب میں سائنسی
ہذیب کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئی ہوں گی۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ
رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ : (۱۳ : ۲)

[وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور دلائل کو صاف صاف
بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا
یقین کر لو۔]

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ
مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۵۴ : ۱۸)

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے
ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں]

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ (۳۳ : ۱۴)

[تمہارے نفع کے واسطے چاند اور سورج کو مسخر
بنایا]

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۳ : ۲۱)

[اور وہ ایسا ہے کہ اس نے رات اور دن اور
سورج و چاند بنائے۔ ہر ایک اپنے دائرے
میں تیر رہے ہیں۔]

اِن آیات کو پیش کرنے کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کلام
پاک کو سائنس کی روشنی میں دیکھیں۔ کیوں کہ سائنسی ایجادات
وقت کا شکار ہوتی رہتی ہیں جب کہ کلام پاک مکمل اور قیامت تک
رہنے والی پاک کتاب ہے۔

انہیں آیات کریمہ کی برکت تھی کہ رومن شہنشاہیت کے
زوال اور اسلام کا جھنڈا اسپین، فارس، شمالی افریقہ اور
شمالی ہندوستان میں بلند ہونے کے بعد ساتویں اور آٹھویں صدی
میں مسلمانوں نے سائنس کی دنیا میں رہبری حاصل کی اور دنیا
کے امام بن گئے۔ یہی زمانہ تھا جب کہ موجودہ سائنس کا آغاز
ہوا۔ سب سے پہلے عرب سائنس داں نے آٹھویں صدی میں غیر
سائنسی رائج گنتی کے رومن نظام کو ختم کر کے گنتی کے سائنسی
نظام کو لاگو کیا۔ اس کے بعد گنتی میں صفر کی شمولیت کی گئی۔ یہ عربی
نظام آج تک رائج ہے۔ انگریزی میں بھی جو گنتی لکھنے کا طریقہ ہے
عربی نظام سے ہی جانا جاتا ہے۔

آٹھویں اور نویں صدی میں خلفاء، المنصور (۷۵۴-۷۷۵)

ہارون رشید (۷۸۶ — ۸۰۹) اور مامون رشید (۸۱۳ — ۸۳۳)
کے زمانے میں دوسری زبانوں میں موجود علوم وفنون کو ترجمہ کرکے
عربی میں منتقل کردیا گیا۔ ان میں ٹالمی، ارسطو، یوکلیڈ، آرشمیڈیز
ہپوکریٹس کے کام توجہ کے مرکز ہیں۔ ان سبھی ترجموں کو بغداد
میں مامون رشید کی ۸۳۰ء میں بنائی گئی لائبریری میں رکھا گیا۔

خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں ہی بیت الحکمۃ
(Bayat Al Hikma) کی تشکیل ہوئی، جن کے ممبران ماشاء
اللہ حجاج بن یوسف، انصاری، نوبخت خان قابل ذکر
ہیں۔

مامون نے ہی شمسیہ (Shamsia) اور قاسیون
(Qasiyun) میں دو رصد گاہیں مشاہدہ کرنے کے لیے
بنائیں۔ ابو عبد اللہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اسی زمانے
میں ایک فلکیاتی زیج تیار کیا جس کا استعمال اسپین سے لے
کر چین تک ہوتا تھا۔ یہ پہلا زیج تھا کیوں کہ اس کے لیے صفر کی
غیر موجودگی اور رومن نظام کی
پیچیدگی کی وجہ سے زیج تیار کرنا
تقریباً ناممکن تھا۔

درج بالا سے یہ ظاہر ہے
کہ عربوں میں سائنسی علوم کے فروغ
میں اسلامی تعلیمات سب سے زیادہ معاون اور مددگار ثابت
ہوئیں جب کہ اس کے برعکس سولہویں صدی میں یورپ میں سائنس
کے عروج سے عیسائیت کے نظریات کو خطرہ محسوس ہوا جس کی وجہ
سے سائنس اور مذہب میں ٹکراؤ ہوا اور یورپی کلیساؤں نے سائنس
کے نظریات کو غیر مذہب قرار دیا لیکن بدقسمتی سے اس کو ہم لوگوں
نے ذہن نشین کر لیا۔

۱۵۴۳ء میں پولینڈ کے کاپرنیکس (Copernicus
(۱۴۷۳ — ۱۵۴۳) نے ایک کتاب De Revolutionibus
(Orbium) چھپوائی جس میں Ptolemy کے نظریے کو
غلط قرار دیا اور ثابت کیا کہ زمین سورج کے چاروں طرف
چکر لگاتی ہے۔ اس نظریے کو پاپائے روم نے مذہب کے خلاف
مانا اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا لیکن کاپرنیکس نے پہلے ہی چالاکی
رکھی تھی کہ اس کتاب کو پاپائے روم کے نام معنون کر رکھا تھا
جس کی وجہ سے کتاب اور وہ تو بچ گئے لیکن اس کے نظام کی حمایت
کے جرم میں Giordano Bruno کو ۱۶۰۰ عیسوی میں
زندہ جلا دیا گیا۔ مزید پاپائے روم نے اس کتاب کو پڑھنا
ممنوع قرار دیا اور یہ پابندی ۱۸۳۵ عیسوی تک عاید رہی۔

اسی عہد میں ڈنمارک کے سائنس داں ٹائیکو براہے
(Tycho Brahe ۱۵۴۶ — ۱۶۰۱ء) نے علم فلکیات
میں کافی کام کیا۔ بغیر آلات کی مدد سے ہی (۱۵۷۵ — ۱۵۹۵)
اس نے ستاروں اور سیاروں کا بہت ہی صحیح اور گہرا مطالعہ
کیا۔ کچھ لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ننگی آنکھ سے اتنا صحیح
مشاہدہ اب شاید ممکن نہیں ہے اور نہ اس کے پہلے تھا۔ اس
نے ستاروں کی فہرست تیار کی۔ ۱۵۷۲ء میں new star
کو بھی دیکھا جو کہ ستاروں کے دھماکہ کے ساتھ پھوٹنے پر بنتا ہے
اور نادر شے ہے۔ ٹائیکو براہے نے ۱۵۷۷ء میں دم دار
تارے کا مشاہدہ کیا۔ لیکن اپنے عقائد عیسائیت کی بنا پر زمین
کی مرکزیت کا آخری دم تک حامی رہا۔

کیپلر (Kepler ۱۵۷۱ — ۱۶۳۰ء) ٹائیکو براہے
کا معاون اور شاگرد تھا۔ اس کو اپنے استاد کے مشاہدات
پر اس قدر یقین تھا کہ اس کے تمام مشاہدات کی روشنی میں اس
نے ثابت کیا کہ زمین اور دیگر پلانیٹ سورج کے چاروں طرف
ایک بیضوی مدار میں گھومتے ہیں اور ایک خاص وقفہ کے بعد ایک
خاص جگہ سے گزرتے ہیں۔ اس وقفہ اور مدار کی سورج سے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
قرابت کا حق ادا کرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں جو احسان کے بدلے میں احسان
کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو رشتہ توڑنے والوں سے رشتہ جوڑے اور حق تلفی پر بھی قرابت کا حق ادا کرے۔ (صحیح بخاری)

دوری میں ایک خاص نسبت ہے۔ یہ قانون ۱۶۰۹ء اور ۱۶۱۹ء
میں شائع ہوئے۔

بہر حال عصری علم فلکیات گلیلیو (۱۵۶۴ــــ۱۶۴۲ء)
کا بہت ممنون احسان ہے کہ اس نے اپنی ۱۶۰۸ء میں ایجاد کردہ
دوربین سے مشاہدات اور نظریات کو یکجا کیا۔ اس دوربین
کی مدد سے اس نے مشتری کے چار چاند اور زہرہ کے دلکش
مناظر دیکھے۔ چاند اور سورج کے دھبوں کا مطالعہ کیا۔ کہکشاں
کو لاتعداد تاروں سے بھرا پایا۔ دوربین سے مشاہدات کی روشنی
میں اس نے کاپرنیکس کے نظریے کو صحیح قرار دیا جس نے سائنس
کے رُخ کو موڑ دیا لیکن اس عدم اتقا کے جرم میں ۱۶۳۳ء میں
اسے جیل میں ڈال دیا گیا اور جیل میں ہی ۹ سال کی مشقت
کے بعد انتقال فرمایا۔

میرا خیال ہے کہ اس مضمون کا اختتام بابائے
سائنس یعنی نیوٹن کے ذکر کے بعد زیادہ مناسب ہوگا۔ کیوں کہ
سائنس کی دنیا میں واحد شخص نیوٹن (۱۶۴۲ــــ۱۷۲۷ء)
ہے جس کی تحقیقات اور ایجادات نے سائنس میں عموماً اور
علم فلکیات میں خصوصاً ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ ایک
عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت ہندوستان میں تاج محل
بن رہا تھا، اسی زمانے میں نیوٹن نے سائنسی
تاج محل یعنی (Principia) (۱۶۸۷ء) کی
بنیاد ڈالی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۶ شمارہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۷ء)

تعلیم اور ذریعۂ معاش

بدر الدین

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا چند سال سے برابر احساس بڑھ رہا ہے۔ خاص طور پر میں نے سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سید ہاشم علی اختر صاحب موجودہ وائس چانسلر اور احمد رشید شیروانی صاحب کی کئی تقریروں اور مضامین میں اسی کا تذکرہ پایا، اگرچہ ان لوگوں کا خطاب تو خاص طور پر مسلم یونیورسٹی، مسلم کالجز یا مسلم اسکولوں سے ہوتا ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس بھی اس زبوں حالی سے خالی نہیں ہیں۔

اور اسباب پر نگاہ ڈالیے تو اساتذہ کی بے توجہی، عدم دلچسپی یا صرف مشاہرہ کی حد تک لگاؤ تقریباً ہر جگہ عام ہے۔ پھر طلباء سے جب کوئی کام لینے والا یا کام کا احساس دلانے والا نہیں تو وہ کیوں محنت کریں اور کیسے کریں؟

سرپرست اس لیے تعلیم سے بددل ہیں کہ اسکول بھیجنے میں ۸، ۱۰ سال مسلسل خرچ کریں، اولاد کی سفید پوشی کا سامان فراہم کریں پھر نوکری نہ ملے تو مزید بوجھ برداشت کریں۔ آخر وہ یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ پڑھانے کے بجائے کسی ہنر یا دستکاری میں ڈالیں تو اولاد پر خرچ کرنے کے بجائے آمدنی کا ذریعہ نکلے گا۔ اب اگر سرپرست کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اولاد کو انسانیت، سلیقہ مندی اور علم کے زیور سے آراستہ کرنا بھی بجائے خود ایک مقصد ہوتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات اس لیے نہیں آتی کہ پیٹ روٹی مانگتا ہے اور بدن چھپانے کے لیے کپڑا ضروری ہے، یہ کہاں سے آئے؟ گویا آج کا انسان علم برائے علم نہیں، علم برائے زندگی کا خواہشمند ہے اس خواہش کو ہمارے تعلیمی ادارے کس حد تک پورا کر پاتے ہیں یہ قابل غور ہے۔

میرے خیال میں یونیورسٹیوں میں جہاں مختلف کورسز کے ذریعے فنی مہارتیں پیدا کرنے کی سہولیات موجود ہیں، ان سے طلباء خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور رہے ہمارے دینی مدارس جو دین کے قلعے سمجھے جاتے ہیں وہ اپنے تقلیدی کتابی علم سے الگ ہر کام اور ہر علم کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ چاہے عملی زندگی سے یہ نظریہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔

اب ذرا مندرجہ ذیل واقعہ میں دو طلباء کا احساس ملاحظہ فرمایئے۔

چند روز قبل میں ایک ضرورت سے موری گیٹ دہلی کی ایک ویران مسجد میں گیا، جہاں قرب وجوار میں تمام غیر مسلم آباد ہیں۔ مسجد سے متصل ایک مسلمان ٹھیکیدار کا لکڑی کا کارخانہ ہے اور مسجد کے حجرے میں دو نوجوان لڑکے رہتے ہیں۔ ایک آسامی لڑکا جو چند سال قبل دینی تعلیم حاصل کرنے وطن سے آیا تھا، مگر مدرسہ کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر اب درزی کا کام کر رہا ہے اور کامیاب ہے مطمئن ہے۔ دوسرا لڑکا بھی بنگال کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ عربی پڑھنے گھر سے آیا تھا مگر چار پانچ سال دینی مدارس میں گزار کر ادھوری تعلیم چھوڑ دی۔ اب دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس کے ذریعے بی۔ اے کر رہا ہے اور مستقبل سے پُر امید ہے۔

میں چوں کہ تقریباً چوتھائی صدی سے درس وتدریس سے تعلق رکھتا ہوں اور عرصہ تک مدارس اور یونیورسٹیوں کی خاک چھانی ہے اس

لیے اس میدان سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے لڑکوں سے سوالات شروع کر دیے۔ جب میں نے پوچھا کہ تم نے مدرسے کی تعلیم کیوں چھوڑی تو درزی کا کام کرنے والا لڑکا پھوٹ پڑا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ جواب دینے کے لیے بھرا بیٹھا ہو۔ کہنے لگا میں کیا پڑھتا اور کہاں پڑھتا؟ میں وطن سے نکل کر ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں گیا۔ کئی مدرسوں میں پڑھنے کی کوشش کی مگر کسی جگہ مجھے نہ کوئی پڑھنے والا نظر آیا نہ پڑھانے والا۔ اکثر مدرسوں میں آنے والے ہزاروں طلباء کی آمد کا مقصد صرف وظیفہ، کھانا اور رہائش کی سہولت حاصل کر کے وقت گزارنا ہوتا ہے۔ اساتذہ کلاسوں میں آتے ضرور ہیں مگر چند منٹ پڑھاتے ہیں۔ باقی غیر درسی گفتگو میں وقت گزار کر چلے جاتے ہیں۔ طلباء مدرسے سے قیام گاہ میں آ کر کبھی درسی کتاب اٹھا کر نہیں دیکھتے بلکہ فلمی یا جذباتی تصاویر کے رسالوں سے تسکین حاصل کرتے ہیں یا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے محلہ میں ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ کسی کو اپنے مستقبل کی ادنیٰ فکر نہیں۔ جس حال میں وقت گزار رہا ہے وہ اسی میں مطمئن ہے۔

پورے مدرسے میں شاید چند طلباء اور دو ایک استاد ایسے نکلتے ہیں جن کو پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی ہو۔ بیشتر منتظمین کی دلچسپی مدرسے سے اس حد تک ہوتی ہے کہ طلباء کی تعداد بڑھتی رہے تاکہ مہمانان رسول کے نام پر علم دین کی تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ چندہ وصول کیا جاتا رہے۔ اپنی قیام گاہوں میں جملہ سہولیات فراہم ہوں، اس کے علاوہ معتقدین اور متوسلین کی تعداد میں ایسے افراد کا اضافہ ہوتا رہے جو ملکی اور غیر ملکی دورے کے مواقع فراہم کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ مدرسے کی تعمیرات میں ایسا شاندار اضافہ ضرور ہوتا رہے جو لوگوں کے لیے جاذب نظر ہو۔

میں نے ان دونوں طلباء کے بیان میں کسی حد تک مبالغہ تو پایا مگر میری یہ ہمت نہیں تھی کہ ان کے بیان کو سراسر غلط قرار دے دوں، کیوں کہ میں خود بہت سے مدارس کے حالات سے واقفیت رکھتا ہوں۔

اب ذرا ایک دینی مدرسے کے ذمہ دار کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔ ایک مرتبہ میں ایک بڑے دینی مدرسے کے مہتمم صاحب سے ملا اور عرض کیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے مدارس کے طلباء کے لیے ایک اچھا موقع فراہم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن مدارس کو جامعہ ان کی درخواست پر منظوری دے دیتی ہے، ان کے طلباء براہ راست یہاں بی۔ اے سال اول میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہوں نے ہائر سکنڈری معیار کی انگریزی کا امتحان پاس کیا ہو، یا جس مدرسے سے آ رہے ہیں اس میں ہائر سکنڈری معیار کی انگریزی کا مضمون داخل درس ہو۔ اس طرح ایک فارغ التحصیل طالب علم تین سال لگا کر تمام مضامین میں بی۔ اے کر سکتا ہے اور آگے کی اعلیٰ تعلیم کا راستہ کھل جاتا ہے۔

مہتمم صاحب نے بغور میری باتوں کو سن تو لیا مگر ناگواری کے ساتھ فرمایا، ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اکابر دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیوی تعلیم حاصل کرنے کو ایسا فرماتے تھے جیسے گھوڑے کی سواری کرنے کے بعد کوئی گدھے کی سواری کرے۔" میں اس جواب پر خاموش ہو گیا مگر میں نے بارہا مذکورہ مہتمم صاحب کو دیکھا کہ وہ اپنی مسند پر بیٹھ کر اپنے خطوط پر انگریزی میں پتہ لکھوانے کے لیے اپنے ماتحت پرائمری اسکول کے ایک ماسٹر کو بلوایا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شکل میں ایک اسپ تازی کا شہسوار، خر سوار سے مدد حاصل کرنے میں کوئی توہین محسوس کرتا تھا یا نہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں میں اساتذہ کی عدم دلچسپی سے طلباء کی بددلی اور ترک تعلیم نیز بعض ذمہ داروں کا طرز کہن پر اصرار ہی اہم کشمکش ہے جو آج دینی تعلیم کی زبوں حالی کا سبب ہے۔

مگر اس سے میرا مقصد کوئی دینی مدارس سے بددلی پیدا کرنا یا ذمہ داروں پر محض نکتہ چینی کرنا نہیں ہے۔ کیوں کہ میرے سامنے دوسرے نمونے بھی ہیں۔

ابھی مارچ ۸۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مرکز فروغ سائنس کی طرف سے دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کے عنوان پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں تقریباً ۲۰۰ مدارس کے مہتمم حضرات اور اساتذہ کرام جمع ہوئے تھے۔ یہ وہ

...م روشن خیال اصحاب تھے جو موجودہ عصری تقاضوں کے مطابق مدارس ... نصاب میں تبدیلی، اضافہ اور انگریزی وغیرہ کی شمولیت کے خواہشمند ...ے اور چاہتے تھے کہ مدارس کی بنیادی تعلیم کو ہاتھ لگائے بغیر جدید مضامین ... اضافہ کیا جائے، توقع ہے کہ اس کانفرنس کے عنقریب دوررس ...ثبت نتائج نکلیں گے۔

عربی مدارس کے طلبا کی تصویر کا ایک رُخ آپ نے اوپر ...لاحظہ فرمایا۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ گزشتہ ۸ - ۱۰ سال میں دارالعلوم ...یوبند، ندوۃ العلما لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مدرسہ ...فلاح بلریا گنج سے آنے والے میں نے ایسے بہت سے باصلاحیت ...لبا دیکھے اور ان سے تدریسی تعلق قایم ہوا جنھوں نے جامعہ ملیہ ...یں آکر بی - اے کیا۔ ان کی عربی استعداد پہلے ہی بہت اچھی ...تھی یہاں آکر انگریزی میں محنت کی، عربی ٹائپ سیکھا، ترجمہ کرنے ...لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بی - اے کرتے ہی اچھی معقول ملازمتوں پر چلے گئے ...ان میں بیشتر آج عرب ممالک میں معیاری مناصب پر فائز ہیں۔

دینی تعلیم اور معاشی ذرایع

دینی مدارس کے بعض ذمہ دار حضرات کے اس نظریے کو میں ہمیشہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش کو صرف درس نظامی کی تدریس میں منحصر رکھنا چاہیے۔ یہی دین کی خدمت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے خیالات رکھنے والے لوگ سیاسی مقاصد کے لیے گرفتاری دینے اور جیل جانے کو دین کا ایک حصہ سمجھتے ہیں یا جھوڑ پھونک تعویذ گنڈے میں عوام کی خدمت کا پہلو نکال لیتے ہوں مگر اس تقلیدی روش سے ہٹ کر اگر کوئی انگریزی سندی پڑھانے لگے یا سبزی بیچنے لگے تو بہرحال اس کا علم بے فیض ہوگیا یا دینی مدرسے اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو بعض علما کی محفل میں میرے علم میں آئیں۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے صرف ان صحابہ کرام کی حیاتِ مقدسہ کے نمونے کافی ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست علم دین حاصل کرتے تھے اور اپنی تجارت وزراعت کے کاموں کو بدستور جاری رکھتے تھے۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بار اُٹھانے کے بعد جب اپنے ذریعۂ معاش کے لیے تجارتی کپڑے کی گٹھری کندھے پر اُٹھانے کی ضرورت محسوس کی تو آج ہم دین کی خدمت کے ساتھ دوسرا ذریعۂ معاش کیوں نہیں اختیار کرسکتے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقیہ امت اور امام اعظم ہوتے ہوئے اگر کپڑے کے ایماندار تاجر کی حیثیت سے مشہور ہوسکتے ہیں تو ہم اُن کے ادنیٰ پیروکار کیوں نہیں ہوسکتے۔

میرے خیال میں تبلیغ دین اور تدریس علم دین کو مخصوص انداز اور جماعت بندی کے ساتھ درس نظامی کی تدریس اور کلمہ و نماز کی تلقین کے دائرہ میں محصور کردینا دینی تعلیمات کو محدود کردینا ہے۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو اس کی تجارت، ملازمت دکان اور گھر باہم معاملات، انفرادی اور اجتماعی ہر مشغولیت دین کی تبلیغ ہوگی وہ ہر جگہ ہر وقت اسلامی تعلیمات کی منہ بولتی تصویر ہوگا، وہ صرف اپنوں کو زبانی دین کی تلقین کرنے سے زیادہ غیروں کو اپنے روزمرہ کے کاموں میں عملی زندگی میں دکھائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔

قابلِ رشک نوجوان

دو تین سال ہوئے تیونس سے ایک بزرگ عالم اور مفتی تشریف لائے تھے۔ دہلی کے کئی اداروں نے انہیں مدعو کیا اور ان کی بزرگی، علمیت اور دین داری سے بہت متاثر ہوئے۔

ان کے ساتھ ایک ۲۵، ۳۰ سال کا باریش نوجوان تھا جو اکثر ان کی خدمت میں رہتا تھا؛ میں نے اس سے تفصیلی بات کی تو

> حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
> "وہ شخص ایمان سے محروم ہے جو امانت دار نہیں اور وہ شخص دین سے خالی ہے جو اپنے عہد کا پابند نہیں۔"
> (مشکوٰۃ)

پتہ چلا یہ حافظ قرآن ہے، تیونس کی ایک مسجد میں امام اور خطیب ہے، انگریزی، عربی اور فرنچ خوب اچھی طرح جانتا ہے، تینوں زبانوں کا ٹائپسٹ ہے اور مذکورہ عالم کی جلد خط و کتابت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ان کی کار بھی ڈرائیو کرتا ہے۔ مجھے اس نوجوان کی زندگی پر بڑا رشک آیا۔

مدارس اور فنی تعلیم

کسی بھی ادارہ میں تمام طلباء یکساں صلاحیت اور یکساں ذوق کے نہیں ہوتے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر مدرسے کا ہر طالب علم مفسر، محدث اور فقیہ یا ادیب بن کر نکلے۔ ظاہر ہے کچھ طلباء اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق افتاء، تفسیر یا حدیث و فقہ، خطابت و امامت میں اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں مگر کچھ ایسے ضرور ہوں گے جن کا رجحان تعلیم کے بعد تدریسی لائن اختیار کرنے کے بجائے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے جلدی کوئی روزگار اختیار کرنے کا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں اگر مدرسے کے ذمہ دار ان کے روزگار کے لیے معاون بن جائیں تو یہ بھی ایک دینی خدمت ہو گی۔ ظاہر ہے مدارس کے مخصوص ماحول اور طرز زندگی میں کسی دستکاری کی ٹریننگ کا شعبہ قایم کرنا مشکل ہو گا مگر کم از کم صنعتی شہروں میں وہاں کی خاص صنعت سے رابطہ قایم کر کے استفادہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مثلاً بنارس اور اس کے قرب و جوار میں قالین سازی اور بنارسی کپڑے کے ایسے کارخانے ہیں جن کے مسلمان مالک خود مدارس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور مالی تعاون بھی کرتے ہیں، ان سے درخواست کی جائے کہ اپنے کارخانوں میں مدرسے کے شوقین طلباء کو حسب استطاعت جز وقتی کام کرنے کا موقع دیں اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

میرٹھ میں قینچی سازی، علی گڑھ میں تالہ، مرادآباد میں برتن، لکھنؤ میں لکھنوی کرتے اور دیگر شہروں میں مشہور صنعتیں بہت کارآمد ہو سکتی ہیں۔ دہلی میں اردو کے بہت سے رسائل اور اخبارات نکلتے ہیں ان میں کام کرنے کے لیے طلباء کو پروف ریڈنگ اور کتابت کے فن سے واقفیت مفید ہو سکتی ہے۔ دہلی اور قرب و جوار کے مدارس میں عربی ٹائپنگ کی سہولت مہیا ہو تو بہت سے طلباء اس صاف ستھرے کام کو ذریعہ معاش بنا سکتے ہیں۔

> حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
> جو کوئی علم کی طلب میں گھر سے نکلے تو وہ اللہ کے راستے میں ہے جب تک واپس نہ لوٹے۔
> جامع ترمذی

> "میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں، ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہو گا۔ پس غور طلب یہی امر ہے کہ تعلیم کی ترقی کیوں کر ہو۔"
>
> سرسید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۶ ش ۱۲ (دسمبر ۸۷ء)

مولانا حالی کی ملی خدمات

عارف الاسلام

حالی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا؛

حالی زنوا ہائے جگر سوز نیاسود
تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

ہم اس مختصر جائزے میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ "نوا ہائے جگر سوز" کیا تھا اور اس نے کس طرح ملت کے خزاں دیدہ چمن میں زندگی کی نئی امنگ پیدا کی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کے ہاتھ سے عنان حکومت چھین کر انہیں محکوم و بیکس بنا دیا۔ ایسے پُر آشوب دور میں ملت میں قنوطیت کو دور کرکے زندہ رہنے اور کچھ کرنے کی آرزو پیدا کرنے میں حالی کی شخصیت اور شاعری کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ان کی جگر سوزی اور انکے ترقی پسند خیالات نے قوم میں جدید انداز فکر اور تعلیمی، ثقافتی و اقتصادی ترقی کے لیے کچھ کرنے کی ہمت پیدا کی۔ سیاسی و معاشی تغیرات نے حالی میں قومی ترقی کا احساس پیدا کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کی نظر قدیم تہذیب، علوم و فنون اور آئین و رسوم کو بدلنے کی طرف جاتی ہے۔ ان کے خیال میں قومی زندگی کی بنیادوں میں سرتاسر خلل پیدا ہو گیا ہے؛

کی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل
راس تھا اگلوں کو جو موسم گیا کب کا نکل
جو تمدن کی عمارت گئے تھے اسلاف چھوڑ
آ گیا اس کی بنیادوں میں سرتاسر خلل

ہیں نئی رسمیں نئے آئیں نئی ہے چال ڈھال
اور نئے علم و ہنر کا ہے جدھر دیکھو عمل

حالی زمانے کو شانِ کبریا کہتے ہیں اور مسلمانوں کو نئی حقیقتوں کو تسلیم کرنے اور زمانے کے موافق عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں؛

جس کو کہتے ہیں زمانہ ہے وہ شان کبریا
اس کے وعدے ہیں اٹل اسکی وعیدیں ہیں اٹل
جو چلے منزل گہ دنیا میں چال اس کے خلاف
رفتہ رفتہ اس کی چالوں نے دیا ان کو کچل

مسلمانوں میں اخلاقی انحطاط کو دیکھ کر حالی کو انتہائی شدید رنج ہوتا ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی تمام تر نشانیاں ان کو مسلمانوں میں نظر آتی ہیں؛

تغلب میں بدنیتی میں دغا میں   نمود اور بناوٹ فریب اور ریا میں
سعایت میں بہتان میں افترا میں   کسی بزم بیگانہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے
بڑھے پھر کیوں نہ شان اسلام ہم سے

کسی بھی معاشرے کی اخلاقی اصلاح کے لیے اس معاشرے کی اقتصادی حالت کا بہتر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ لہذا حالی کی نظر ان رسوم پر بھی جاتی ہے جن کی ادائیگی پر بے اختیار و بیجا خرچ ہوتا ہے یہ اسراف صرف رسوم تک ہی محدود نہ تھا بلکہ عام مسلمان کفایت شعاری کو مذموم اور رکیک فعل سمجھنے لگے تھے۔ اسراف کے خلاف حالی اپنی آواز یوں بلند کرتے ہیں؛

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ حب مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹانا رائیگاں اور اس قدر
آج ہی گویا نصیب دشمناں
آپ کا دنیا سے ہے عزم سفر

مسلمانوں کی عام معاشی بدحالی کو دیکھتے ہوئے حالی بخل کو اسراف پر ترجیح دیتے ہیں۔ محکومی اور افلاس معاشرے کو بے انتہا متاثر کرتے ہیں۔ انسان اخلاقی اعتبار سے گر جاتا ہے حتیٰ کہ دین و ایمان تک افلاس کی زد میں آجاتے ہیں۔ وہ اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

فلاکت جسے کہیے ام الجرائم — نہیں رہتے ایماں یہ جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم — مصلی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

معاشرت کی اصلاح میں حالی نے عملی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ "اصلاح معاشرت کی امید اسی وقت کی جا سکتی ہے جب ہمارے علماء اور واعظین اس ضروری کام کی طرف متوجہ ہوں"۔ اور بہت سی خامیوں کے علاوہ تقدیر کے مروجہ عقیدہ سے بھی حالی بہت نالاں ہیں۔ ان کے نزدیک اسباب میں جو مختلف تاثیریں ہیں، اسی کا نام تقدیر الٰہی ہے وہ یہ نہیں مانتے کہ جو نفع و نقصان ہونے والا ہے وہ ضرور ہو گا خواہ تدبیر کی جائے یا نہ کی جائے۔ اسی طرح توکل کے معنی اپنے آپ کو عاجز سمجھنے اور خدا پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ تدبیر ان کی نظر میں فطرت انسانی کا خاصہ اور کامیابی کا سیدھا راستہ ہے۔ تقدیر پرست کاہلوں کی خبر لیتے ہوئے حالی کہتے ہیں ؎

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل — کہ مقسوم ہی کو [illegible] باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل — برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی
نکموں کے ہیں سب دلکش ترانے — سلانے کو قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کرکے حیلے بہانے — نہیں جاتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

قوم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے حالی تین شرطوں پر زور دیتے ہیں۔ محنت، علم اور ہنر۔ یہ تین چیزیں ہوں تو کامیابی یقینی ہے۔ تعلیم کے بارے میں حالی کے خیالات واضح ہیں۔ وہ سرسید کی اس بات سے متفق ہیں کہ پرانے علوم و فنون جو جمود اور انحطاط کے عالم میں تھے، ان کی تحصیل سے موجودہ دور میں فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

وہ مغربی معقولیت اور سائنس کے سرسید ہی کی طرح قائل ہیں اور مسلمانوں کی غفلت و تعصب کو ان کی ترقی کی راہ کا روڑا تصور کرتے ہیں ؎

شائع ہیں جو مغربی علم و فن کے — وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے — کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہیں نقش اہل یوناں کی رائیں
جو اب وحی اترے تو ایماں نہ لائیں

حالی مسلمانوں کی مشکلات کا حل مغربی علم و فن کی تحصیل میں سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے وہ علوم جن کی بنیاد سائنس پر ہے۔ سائنسی تحقیقات نے مغرب میں جو انقلاب برپا کیا تھا وہ اس سے پوری طرح باخبر تھے۔ تحقیق اور ایجادات کی صلاحیتوں کے سبب نت نئی فتوحات سامنے آرہی تھیں ؎

اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہیں آج
بڑھ رہا ہے دم بدم یوں آج کل علم بشر

قوت ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

علم و دانش پر منحصر تعلیم و ترقی کے اس دور میں مسلمان اپنے
زت طریقے سے جینے کا سامان اسی وقت پیدا کر سکتے ہیں جب وہ
ریدتعلیم کی طرف مائل ہوں ورنہ ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے
ٹ جانا یقینی ہے۔

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دوں گا

تعلیم نسواں کے بارے میں حالی کے خیالات سر سیّد سے
تلف تھے۔ سر سیّد عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ سمجھتے
تھے کہ پہلے مردوں کی تعلیم کا انتظام تو ہو جائے اس کے بعد وہ خود
ہی عورتوں کو پڑھانے کا انتظام کریں گے لیکن حالی عورتوں کے لیے
زمانہ حال کی تعلیم کا انتظام اتنا ہی ضروری خیال کرتے ہیں جتنا کہ
مردوں کے لیے۔ سر سید کی پیروی کرتے ہوئے حالی کالج کے
قیام کے مقاصد پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ اک اک کو سجھاتا ہے
نہ چھوڑیں دین کا دامن رہیں دنیا میں عزت سے
سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے
نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت
معزز کس طرح بنتے ہیں گر اس کو سکھاتا ہے

مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو رائج کر کے سر سیّد
نے قوم پر جو احسان کیا ہے، اس کا اتنا شدید احساس حالی
کے یہاں پایا جاتا ہے کہ الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔

ہمارے شکر سے اے قوم احسان اس کا بالا ہے
کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے

"اے دوستو! تم میری بات مانو یا نہ مانو۔ میرا خیال صحیح ہو یا غلط۔ میں اپنی آواز تمہارے کانوں تک پہنچا دیتا ہوں۔ جب تک تم ایسا بندوبست نہ کرو گے کہ تمہاری قوم کے لڑکے ایک جگہ رہ کر تعلیم پاویں اور یکساں تربیت اور یکساں خیال ان میں پیدا ہوں اور ایک ساتھ اپنے قومی مجمع میں رہ کر قومیت کی بو اُن میں سماوے، اس وقت تک ہم قوم کو قوم نہیں بنا سکتے۔ اگر ہم نے اپنی قوم کو قوم نہ بنایا تو ہم نے اس سے زیادہ کہ جنگل کے چند وحشی جانوروں کو پالا اور کچھ نہیں کیا۔"

سر سید احمد خاںؒ

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

راحت ابرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی "سرسید تقریبات" کا اہتمام انتہائی جوش و عقیدت کے ساتھ کیا گیا۔

یوم سرسید کے موقع پر ۱۷ اکتوبر کو کینیڈی ہال میں تہنیتی جلسہ بھی منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے شرکت فرمائی۔

سرسید تقریبات کا آغاز شعبۂ اردو کے زیر اہتمام سرسید سمینار سے ہوا جس میں ملک کے نامور دانشوروں نے سرسید کی علمی اور ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

مورخہ ۱۲ اکتوبر کو اس سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے کہا کہ سال میں ایک مرتبہ سرسید کو سلیقہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا اس ملک اور یہاں کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے اور آج اس ملک میں جتنے بھی اہم عہدوں پر مسلمان ہیں وہ کسی نہ کسی طور پر سرسید کے احسان مند ہیں۔

سمینار کے کنوینر اور شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی محض ایک یونیورسٹی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے جس کے دامن میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی کئی صدیاں آباد ہیں۔ مسلم یونیورسٹی ایک ایسی گذرگاہ ہے جس کے حاشیوں پر قرآن پاک کی آیتیں کندہ ہیں۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ سرسید نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے آداب سکھلائے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ عقل کو رہنما بنائیں، جذبات کو بے لگام نہ ہونے دیں۔ ماضی سے طاقت حاصل کریں لیکن اسے پاؤں کی بیڑی اور راہ کی رکاوٹ نہ بننے دیں۔ اپنے آپ کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ڈھالیں۔ اپنی افتاد طبع کا رشتہ علوم کے مزاج کے ساتھ جوڑیں، علم سے عقل کو چمکائیں، بھلے اور برے میں امتیاز کرنا سیکھیں اور زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دیں، انتہا پسندی سے دامن بچائیں، اعتدال اور توازن اور مصلحت و آشتی کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں۔

اس سرسید سمینار میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر حقی، پروفیسر رویندر بھرمر، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر کنور پال سنگھ، ڈاکٹر اصغر عباس، ڈاکٹر شہریار، پروفیسر شمیم احمد، ڈاکٹر اقبال احمد انصاری وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

یونیورسٹی لٹریری کلب کی جانب سے بھی "کل ہند سرسید میموریل انٹر ورسٹی مباحثہ" کا اہتمام پہلی مرتبہ کیا گیا جس میں سولہ یونیورسٹی کی ٹیموں نے حصّہ لیا۔ اس مباحثہ میں اول، دوئم اور سوئم آنے والوں کو بالترتیب ایک ہزار آٹھ سو

نچ سو روپیہ کا نقد انعام بھی مہمانِ خصوصی کے دستِ مبارک سے
یا گیا۔ اس کے ساتھ ہی "سر سید میموریل ٹرافی" بھی مہمان خصوصی
ی کی گئی۔

کینڈی ہال میں تہنیتی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی
فاروق عبداللہ نے کہا کہ سر سید نے صرف تعلیم کے میدان
ں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو بدلنے میں بھی اہم
ر ادا کیا۔ انہوں نے اس ادارہ سے اپنی ملّی وابستگی کا ثبوت
ہوئے مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم غریب و نادار طلباء کی
ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی حکومت کی جانب سے
ال پانچ لاکھ روپیے کی امداد کا اعلان فرمایا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کہا کہ سر سید نے اس امید پر
ادارہ قائم کیا تھا کہ یہاں سے جو مسلمان نکلیں گے وہ سارے ملک
پھیل جائیں گے اور دوسروں کو جلا بخشیں گے مگر بدقسمتی سے فرقہ پرستی
اس ملک کے دو ٹکڑے کر دیے اور جو تعلیم ہم نے حاصل کی
وہ تقسیم کی نذر ہو گئی اور آج ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو
ستقبل تاریک نظر آتا ہے جس کی ایک اہم وجہ فرقہ پرستی
۔ سر سید نے ہمیشہ تمام مذاہب کے درمیان اتحاد کی باتیں
ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی صرف ہندوستانی
۔ یہاں متحد ہو کر فرقہ پرستی کے خلاف لڑنا چاہیے اور سر سید کے
م کو نسل در نسل تک پہنچانا چاہیے۔ تاکہ جدید ہندوستان
میر ہو سکے۔

انھوں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ سیاسی جماعتوں سے
ے کو الگ رکھیں اور نئے ہندوستان کو بنانے کے لیے نئے
ستوں کو تلاش کریں اور یہاں سے جو لعل و جواہر نکلیں وہ
ری زمین کو روشن کر دیں۔

اس موقع پر وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے
کہ مسلم یونیورسٹی کو ہندوستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں
ر کیا جاتا ہے۔ یہاں ۱۸۰ سے دن سے زیادہ پڑھائی ہوئی اور گزشتہ
ھائی سال کے عرصہ میں طلبا کی کوئی ہڑتال نہیں ہوئی۔ یہاں کے طلبا
ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے ساتھ ہی اسلامی تہذیب کے
بھی نمائندے ہیں۔

وائس چانسلر صاحب نے اعلان کیا کہ امسال دسمبر کے آخر
تک اسٹوڈنٹس یونین کے انتخاب کرا دیے جائیں گے۔ انہوں نے کہا
کہ حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے کمپیوٹر کے لیے کورس بھی
شروع کیے جا رہے ہیں اور امسال میڈیکل کالج میں طلبا کے داخلوں
کے لیے مزید پچاس سیٹوں کی باضابطہ منظوری حاصل ہونے کے
ساتھ ۲ کروڑ ۹۲ لاکھ روپیہ کی زائد امداد بھی یو۔ جی۔ سی
سے مل جائے گی۔

اس موقع پر پرو چانسلر الحاج عبیدالرحمٰن خاں
صاحب شیروانی، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر رویندر
بھرمر، ڈاکٹر مسعود عالم، سہیل قدوائی، حسین احمد صدیقی،
نینہ سالم نے بھی سر سید احمد خاں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اس سے قبل سر سید ہاؤس میں سر سید نمائش
کا بھی اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح پرو وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن
صاحب نے فرمایا۔

سر سید کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے
بعد نماز فجر یونیورسٹی جامع مسجد میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔

یونیورسٹی کے کرکٹ پویلین پر ۱۰ ہزار افراد
کو عشائیہ دیا گیا جو یونیورسٹی کی اعلیٰ اقدار اور قدیم روایات
کا آئینہ دار تھا۔ پوری یونیورسٹی کو دلہن کی مانند سجایا
گیا تھا۔

موت کو آسان سمجھو، کیونکہ
موت کی تلخی صرف اس کے خوف سے
ہوتی ہے۔
سقراط

اس شمارے کے مقالہ نگار

جناب سید حامد	سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر نسیم انصاری	ڈپارٹمنٹ آف سرجری، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ
پروفیسر اطہر حسین صدیقی	ڈپارٹمنٹ آف زولوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جناب الطاف احمد اعظمی (علیگ)	آئی۔ ایچ۔ ایم۔ آر، ہمدرد نگر، دہلی۔
جناب سید شفیق احمد	ڈی۔ ایف۔ او۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر صابرہ خاتون	ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر حافظ بدرالدین	ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔
جناب محمد ظہیر عالم	پی۔ آر۔ او۔ آفس۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جناب یوسف سعید	۹۹۔ اے۔ ذاکر باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔
جناب ابو سعد خاں	گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، کوٹ دوار۔ (گڑھوال) یو۔ پی۔
بیگم نصرت شیروانی	سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کیٹی دہلی۔
ڈاکٹر عبدالقیوم	ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر عارف الاسلام	ڈپارٹمنٹ آف اسٹیٹسٹکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مدیر منتظم: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق ایڈمنسٹریشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ: ... آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Ro[illegible]ligarh phone : 4185